فاعتبروا یا اولی الابصار
القرآن
آپ بیتی
سوانح
برکۃ العصر، شیخ الحدیث، قطب العالم
حضرت مولانا محمد زکریا الکاندھلوی
ثم المہاجر المدنی قدس سرہ
۱
ناشر مکتبہ عمر فاروق
4/501
شاہ فیصل کالونی کراچی

جدید تصحیح شدہ ایڈیشن

فاعتبروا یا اولی الابصار (القرآن)

آپ بیتی

نمبر ۱ تا ۵

سوانح

برکۃ العصر شیخ الحدیث قطب العالم

حضرت مولانا محمد زکریا الکاندھلوی

ثم المہاجر المدنی قدس سرہ

نامِ کتاب .... آپ بیتی (جلد اوّل)
مؤلف .... حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہٗ
اشاعت دوم .... جدید تصحیح شدہ ایڈیشن
ضخامت................ 576
قیمت ....
ناشر.................. فیاض احمد 021-4594144-8352169
موبائل 0334-3432345
مکتبہ عمر فاروق شاہ فیصل کالونی نمبر ۴، کراچی نمبر ۲۵

قارئین کی خدمت میں

کتاب ہذا کی تیاری میں تصحیح کتابت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، تاہم اگر پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو التماس ہے کہ ضرور مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں ان اغلاط کا تدارک کیا جاسکے۔

۔جزاء کم اللہ تعالیٰ جزاءً جمیلاً جزیلاً۔

"آپ بیتی نمبر ا" و "سوانح یوسف"

"آپ بیتی نمبر ۲" یا "یادِ ایام نمبر ا"

بابِ اول

باب دوم

''آپ بیتی نمبر۳'' یا ''یادِ ایام نمبر۲''

باب سوم

باب چہارم

’’آپ بیتی نمبر۴‘‘ یا ’’یادِ ایام نمبر۳‘‘

باب پنجم

باب ششم

آپ بیتی نمبر ۵ یا یادِ ایام نمبر ۴

باب ہفتم

باب ہشتم

☆......☆......☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ ط

یہ کوئی مستقل رسالہ ہے اور نہ کوئی مستقل مضمون جب عزیزی مولوی محمد ثانی سلمہٗ نے عزیزم مولانا محمد یوسف صاحب نور اللہ مراقدہم ورحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح شائع کی تو اپنی محبت اور علی میاں کی شفقت کی وجہ سے اس کا باب اول اس نا کارہ کے متعلق تھا، وہ علی میاں سے لکھوایا، جس پر میں نے ذیل کا خط عزیز محمد ثانی کو لکھا تھا کہ جو باتیں لکھنے کی تھیں۔ وہ چھوڑ دیں اور جو نہ لکھنے کی تھیں وہ لکھ دیں۔ جب رسالہ اسٹرائک طباعت کے واسطے دیا تو مجھے خیال ہوا کہ طلبہ پر تنبیہات کے ساتھ یہ نا کارہ مثال کے طور پر ان تنبیہات کو بھی ذکر کر دے جو اس نا کارہ پر میرے والد صاحب قدس سرہٗ کی طرف سے ہوئیں تا کہ طلبہ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ان نا کارہ خیالات میں جو جمود اور تنگ نظری ہے وہ بڑی تنبیہات کے بعد پیدا ہوئی اور دوسروں کے عیوب کے ساتھ اپنے عیوب بھی ظاہر کر دوں تا کہ اعتدال پیدا ہو جائے:

میں ہوں کرتا ہوں گلہ اپنا، نہ غیروں کی بات
وہ یہی آخر کہیں گے اور کیا کہنے کو ہیں

فقط:

زکریا

تنقید بر سوانح یوسفی

صلاح کار کجا و من خراب کجا، ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

عزیز گرامی قدر و منزلت! عافاکم اللہ وسلم، بعد سلام مسنون تمہاری کتاب سے بہت ہی مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے دونوں جہاں میں بہترین جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کے منافع دینی و دنیوی سے بھرپور متمتع فرمائے۔ امید سے زیادہ بہتر لکھی اگرچہ اس کے بہت سے اجزاء متفرق میں سن چکا تھا لیکن مسلسل سننے میں جو لطف آیا وہ پہلے نہیں آیا تھا، کاش میری آنکھیں قابل نظر ہوتیں تو ایک دو شب ہی میں نمٹا دیتا۔ مجھے اکابر کی سوانح پڑھنے کا ساری عمر سے شوق ہے۔ شروع کرنے کے بعد چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا، دن میں تو کبھی فرصت نہیں ملی، عشاء کے بعد ضروری مطالعہ سے فراغت کے بعد شروع کیا کرتا تھا اور اکثر صبح بھی کردی اس لیے کہ مجھے شباب کے زمانہ میں تمام رات جاگنا بہت آسان تھا۔ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ اکثر اخیر شب میں تشریف لاتے، تین چار بجے پہنچتے اور تشریف آوری کے تار کا بہت اہتمام تھا اور چونکہ ایک عیب مجھ میں رہ رہا ہے کہ سوکر اٹھنا میرے بس کا نہیں تھا، اس لیے عشاء کے بعد سے اپنا کام شروع کردیتا تھا اور دو تین بجے پاپیادہ ریل پر پہنچ جاتا تھا کہ میں معذوری سے پہلے کبھی ریل پر سواری میں نہیں گیا، اسی بناء پر اکابر کی سوانح ہمیشہ ایک شب یا دو شب میں پوری کی، حضرت گنگوہی، حضرت سہارنپوری، حضرت شیخ الہند، حضرت تھانوی، حضرت مدنی اور حضرت سید صاحب، چچا جان وغیرہم نور اللہ مراقدہم کی سوانح اور مکاتیب اسی ذوق وشوق سے پورے کیے لیکن اب آنکھوں کی معذوری نے دوسرے کا محتاج بنادیا اور دوسروں کے لیے

وصل ہو یا فراق ہو غالب جاگنا ساری رات مشکل ہے

کی بناء پر مہمانوں سے فراغ کے بعد ایک دو گھنٹہ ہوتا رہا۔ اس لیے کئی شب لگ گئیں۔ ایک باب کے سوا جو تم نے علی میاں سے لکھوایا ساری کتاب میں بہت لطف آیا۔ البتہ یہ باب تم نے گلاب کے حوض میں ایک بوتل پیشاب کی ڈال کر یا مہذب الفاظ میں نہایت نفیس مخمل میں پرانے ٹاٹ کا پیوند لگا کر کتاب کو بدنما کردیا۔ اس کے باوجود اس باب میں بہت سی خامیاں رہ گئیں۔ اگر میں اس کا مسودہ پہلے سن لیتا تو بہت سی اصلاحیں کراتا۔ جو باتیں نہ لکھنے کی تھیں ان میں اطناب ممل کردیا اور جو لکھنے کی تھیں ان میں ایجاز مخل کردیا۔

''دو (۲) نازک امتحان وتوفیق الٰہی'' کے لکھنے میں مجھے کوئی بار نہیں، محض اس وجہ سے کہ شاید کسی

اللہ کے بندے کو اس نوع کی توفیق نصیب ہو جائے لیکن علی میاں نے صرف دو لکھے اور وہ بھی بہت مجمل (۱) اور اس سے زائد کی نفی بھی فرمادی۔

(۱) پہلے خیال تھا کہ میرا یہ خط سوانح یوسفی کے ساتھ شائع ہوگا، اس لیے میں نے ان دونوں امتحانات کو مجمل ہی چھوڑ دیا تھا، لیکن اب جب کہ یہ مستقل شائع ہو رہا ہے اس لیے خیال ہوا کہ اس کو مفصل لکھ دوں، میں نے یہ واقعہ تفصیل سے لکھوایا تھا۔ لیکن لکھوانے کے بعد میرے کاتب عزیز مولوی شاہد سلمہٗ نے بتایا کہ یہ تو آپ بیتی میں آچکا ہے بڑا قلق ہوا کہ لکھوانے میں بڑا وقت خرچ ہوا تھا۔ یہ واقعات تفصیل سے آپ بیتی جلد دوم میں بعنوان علی گڑھ کی ملازمت کی تجویز میں لکھا جا چکا ہے۔

دوسرا واقعہ جس کو علی میاں نے مختصراً لکھا ہے میں تو اس کو بھی مفصل لکھوا رہا تھا کیونکہ مجھ کو ضعف و پیری اور میرے حافظہ کی وجہ سے یہ یاد نہیں رہتا کہ کون سا واقعہ کہاں لکھا گیا، لیکن عزیز موصوف نے بتایا کہ یہ واقعہ بھی آپ بیتی میں گزر چکا ہے، مگر اس وقت متعدد احباب کے تلاش کرنے کے نہیں ملا، اس لیے اس واقعہ کو عزیز مولوی یوسف مرحوم کی سوانح سے نقل کرا رہا ہوں کہ ایسا نہ ہو کہ نقل کراؤں اور پھر وہ کہیں مطبوعہ مل جائے..... علی میاں کہتے ہیں:

اس (علی گڑھ کے واقعہ) سے بڑا امتحان چند دنوں کے بعد پیش آیا۔

کرنال میں نواب عظمت علی خاں مظفرنگر کے مشہور وقف کی جانب سے ایک بڑا تبلیغی دارالعلوم قائم کیا گیا۔ جس کی خصوصی غرض و غایت یہ تھی کہ اسلام کی تبلیغ اور اس کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے نیز جدید شبہات اور مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے جو اس وقت اپنی تبلیغی کوششوں میں بہت سرگرم تھے، ایسے فضلاء تیار کیے جائیں جو عربی و انگریزی دونوں سے واقف ہوں اور علوم قدیم و جدید دونوں کے جامع ہوں۔ اس کے لیے یہ تجویز ہوئی کہ بڑے وظائف و دیگر مستند عربی مدارس کے فضلاء کو انگریزی اور کالجوں و یونیورسٹیوں کے فارغین کو عربی پڑھائی جائے۔ مولانا سر رحیم بخش صاحب مرحوم جو ریاست بہاولپور کے صدر کونسل اور ایجنٹ تھے اس تحریک کے بڑے سرپرستوں میں سے تھے۔ ان کا تعلق گنگوہ، رائے پور اور سہانپور سے خادمانہ اور مخلصانہ تھا اور وہ مظاہر علوم کے بھی سرپرستوں میں سے تھے۔ انہوں نے ابتدائی مدرس حدیث کے لیے شیخ کا انتخاب کیا اور اس کے لیے سہانپور کا مستقل سفر کیا، ضابطہ کی تین سو ماہوار تنخواہ کے علاوہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ سہولتیں دینے کا وعدہ فرمایا۔ مثلاً رمضان کی چھٹی (اور) حضرت کی خدمت میں رہنے کے لیے ہر سال تین ماہ کی چھٹی بلا وضع تنخواہ، اجناس کی سہولت، ان سب کے ساتھ ساتھ ان کی صرف ایک شرط یہ تھی کہ حضرت پر یہ ظاہر نہ ہو کہ یہ مدرسہ کے مدرس کو کسی اور جگہ کے لیے آمادہ کریں، انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ایک دو سال کی چھٹی لے لو اور یہ کہو کہ قرض کا بار زیادہ ہے، شادی بھی ہو چکی ہے اور بچے بھی ہیں، مدرسہ کی تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا، اس وقت شیخ کی تنخواہ بیس روپے تک پہنچی تھی، مولانا سر رحیم بخش صاحب کے دیرینہ تعلقات ان کی بزرگانہ، مخدومانہ حیثیت ان کا پرخلوص اصرار، قرض کا بار، تنخواہ کی قلت اور ترقی کے امکانات کا فقدان یہ سب وہ حقائق تھے جو اس پیش کش کو قبول کرنے کی ترغیب بھی دیتے تھے اور ان کے لیے شرعی اخلاقی علمی دلائل بھی پیش کرتے تھے۔ یہ ایک نوجوان عالم کے لیے جو ذہانت کے جوہر سے آراستہ اور حدیث و ادب میں شہرت یافتہ تھا ایک بڑی آزمائش تھی۔ شیخ اس وقت حقیقۃً ایک دوراہے پر کھڑے تھے، اگر وہ اثبات میں فیصلہ کرتے تو ان کی زندگی کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا اور آج شاید ان سطور

حالانکہ اس نوع کے وقائع بہت کثرت سے پیش آئے اور مجھے تعجب ہے کہ اس قسم کے واقعات تو تذکروں میں علی میاں کے سامنے متعدد بار آئے ہوں گے۔ ان میں کا سب سے پہلا واقعہ جو میری عمر اور حالات کے اعتبار سے زیادہ اہم تھا، وہ تھا جو میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے انتقال سے تیسرے دن پیش آ گیا۔ بڑے حضرت اقدس رائے پوری شاہ عبدالرحیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو اس سیہ کار کے ساتھ جو محبت تھی، وہ اسی کا عکس اور آئینہ تھا جس کو حضرت مولانا عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے شیخ کے اتباع میں پورا فرمایا وہ سب تو آپ کے سامنے ہے۔ یہ درحقیقت حضرت رائے پوری ثانی کا اپنے شیخ کا کمال اتباع تھا۔ میرے والد صاحب قدس سرہٗ سے بڑے حضرت رائے پوری کو اس سے بھی زیادہ تعلق تھا۔ میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد میری ابتداء یتیمی میں وہ دلداریاں اور شفقتیں فرمائی ہیں کہ ان کی تفاصیل تمہاری پوری سوانح یوسفی بن سکتی ہے۔ میرے والد صاحب کے انتقال سے دوسرے ہی دن میرے بچپن اور والد صاحب کے بارِ قرض کی بناء پر حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم صاحب نے یہ ارشاد فرمایا کہ امور بالا بہت قابل فکر ہیں تم ابھی بچے ہو، تجارت سے واقفیت نہیں، مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کو تجارت میں بہت مہارت ہے اور حضرت نے صحیح فرمایا کہ مولانا مرحوم کو اس لائن میں بہت مہارت تھی اس لیے تم اپنا کتب خانہ لے کر میرٹھ منتقل ہو جاؤ اور مولانا عاشق الٰہی صاحب کی زیر نگرانی تجارت کرو تو انشاء اللہ قرضہ بھی جلدی ادا ہو جائے گا اور متعلقین کی کفالت کا انتظام بھی سہولت سے ہو جائے گا۔ حضرت قدس سرہٗ نے بہت ہی شفقت اور طویل تقریر سے یہ مضمون

کے لکھنے کی نوبت نہ آتی کہ عرصہ ہوا وہ اسکیم فیل ہو چکی، مدرسہ کا نام ونشان باقی نہیں رہا، اس کے لائق مدرسین کچھ تو پیوند خاک ہو گئے اور کچھ گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں، نظر بہ اسباب ظاہر شیخ کا معاملہ اس سے کچھ مختلف نہ ہوتا، لیکن توفیق الٰہی نے دستگیری فرمائی اور جس کو شیخ الحدیث کے لقب سے مقبول خاص وعام ہونا تھا اور جس سے خدا کو حدیث کی خدمت طلبۂ علوم دینیہ کی تربیت اور ایک عالمگیر دینی تحریک (تبلیغ) کی سرپرستی اور مشائخ عصر کی جانشینی کا اہم کام لینا تھا اس کو اس معاملہ میں صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطاء فرمائی گئی۔ شیخ کے الفاظ میں سنیے، فرماتے ہیں:

''اس ناکارہ نے مولانا مرحوم سے کہا کہ آپ کے احسانات مجھ پر بہت زیادہ ہیں ان احسانات کے مقابلے میں مجھے آپ سے معذرت کرنی نہایت ہی نامناسب ہے لیکن ان سب کے باوجود آپ تو مجھ سے یہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت سے اجازت لوں لیکن آپ کے براہِ راست کہنے پر اگر حضرت مجھے حکم بھی فرمائیں تو میں عرض کروں گا کہ اس حکم کی تعمیل سے معذور ہوں۔'' عزیمت کا یہ جواب سن کر مولانا رحیم بخش صاحب جو بڑے جوہر شناس اور جہاں دیدہ تھے کبیدہ خاطر نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے جواب کی بڑی قدر کی اور فرمایا کہ میں تمہارا معتقد تو پہلے سے تھا لیکن اس جواب سے میں اور زیادہ معتقد ہو گیا۔

ارشاد فرمایا جس کو میں نے مختصر نقل کیا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت میرے پاؤں کے نیچے کی زمین نکل گئی۔ میں نے آبدیدہ ہو کر عرض کیا کہ حضرت اگر یہ حکم ہے تو سر آنکھوں پر اور اگر یہ مشورہ ہے تو میری تمنا تو یہ ہے کہ حضرت سہارنپوری تو انشاء اللہ تشریف لے ہی آئیں گے (حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ اس وقت نینی تال جیل میں بمد تفتیش محبوس تھے جس کا قصہ تذکرۃ الخلیل میں مفصل موجود ہے) میری تمنا ہے کہ حضرت سہارنپوری کی زندگی میں کسی دوسری جگہ نہ جاؤں۔ حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ نے میرا جواب سن کر فرمایا کہ بس بس! اور انتہائی مسرت اور انتہائی اخلاص کے ساتھ مجھے اس قدر دعائیں دیں کہ آج بھی وہ دعائیں میرے لیے انتہائی موجبِ لذت ہیں اور ان کی برکات ہر وقت محسوس کرتا ہوں اور ارشاد فرمایا کہ میری بھی یہی خواہش تھی۔ مگر مولانا عاشق الٰہی صاحب نے بہت اصرار کیا تھا کہ زکریا میرے کہنے کو مانتا نہیں آپ اس کو حکم فرمائیں کہ وہ میرٹھ منتقل ہو جائے اور جو وجوہ مولانا نے بتلائی تھیں وہ ظاہر تھیں، اس لیے میں نے مشورہ دیا تھا۔ یہ جواب سن کر اللہ مجھے معاف کرے مجھے مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر اتنا غصہ آیا کہ حد نہیں۔ اگرچہ مولانا میرٹھی نے ازراہِ شفقت فرمایا تھا۔ مگر میری حماقت کہ تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں نے مولانا کی شفقت کا بدلہ بہت ہی گرانی کے ساتھ دیا۔ اگر اس وقت کوئی لفظ گستاخی کا مولانا مرحوم کی شان میں نکل گیا تو اللہ ہی معاف فرمائے اور مولانا کو اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

دوسرا (۱) تیسرا ابتلاء وہی ہے جس کو علی میاں نے تحریر فرمایا، گو بہت مختصر لکھا، بہر حال صحیح لکھا۔

چوتھا ابتلاء، وہ اس ناکارہ کے سفر حج سے واپسی کے تین چار سال بعد جن کی تاریخیں تو صحیح مل ہی جائیں گی کہ وہ خطوط میرے کباڑ خانہ میں کسی بستہ کے اندر ضرور موجود ہوں گے، یہ پیش آیا کہ سفر حج سے واپسی، ۴۶ھ سے، دورہ شریف کے اسباق مستقل میرے یہاں ہونے لگے اور چونکہ والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں ابوداؤد کا سبق مستقل اور مسلسل رہا اور پھر ''بذل'' میں اس ناکارہ کا اشتغال بھی مسلسل اسی کے ساتھ رہا اس لیے یہ کتاب تو ۷۳ھ جب تک حضرت مولانا عبداللطیف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سابق ناظم کا انتقال نہیں ہوا، مسلسل اور مستقل میرے ہی پاس رہی، اس کے علاوہ دوسری کتابیں نسائی شریف، بخاری شریف جلد اول وغیرہ بھی ہوتی رہیں، لیکن ابوداؤد شریف کو اہل مدرسہ نے ہمیشہ میری ہی سمجھا اور میں نے بھی اس کو ہمیشہ اپنی ہی سمجھا اس لیے جو طلبہ ابوداؤد پڑھ کر جاتے تھے وہ اپنی محبت سے اس کے ذکر، تذکرہ اور جیسا کہ لوگوں کی عادت ہے اِطْرَاءُ الْمَادِح کے ساتھ کرتے رہا کرتے تھے۔ ان ہی مادحین میں سے میرے

(۱) یہ دوسرا واقعہ علی گڑھ کا اور تیسرا کرنال کا ہے۔

مخلص دوست مولوی عادل قدوسی گنگوہی بھی تھے، جنہوں نے ۴۲ھ میں دورہ سے فراغت حاصل کی، یہ تو مجھے یاد نہیں کہ حدیث کی کیا کتاب مجھ سے پڑھی، لیکن یہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ دائرۃ المعارف حیدرآباد میں تصحیح کے کام پر ملازم ہو گئے اور وہاں کے مطبع کے اکابر میں وہ اونچی نگاہ سے دیکھے جانے لگے، انہوں نے نہ معلوم اہل مطبع کو کیا جھوٹی سچی باتیں سنائی کہ دو تین سال بعد ان کا ایک بہت ہی طویل خط یاد پڑتا ہے کہ سات آٹھ ورق کا بہت ہی دل لبھانے والا پہنچا، جس میں لکھا تھا کہ دائرہ میں بیہقی کے اسماء رجال کی تالیف کا مشورہ طے ہوا اور یہاں مجلس نے دو آدمیوں کا انتخاب کیا ہے، حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا اور تیرا اور ان دو میں بھی تجھے ترجیح ہے، اس لیے کہ کام بہت لمبا ہے اور حضرت شاہ صاحب کی مشیخت وضعف و پیری اور تیرے شباب و جوانی کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے زمانہ میں پوری نہ ہو سکے۔ تنخواہ آٹھ سو روپے اور ایک موٹر تیرے استعمال کے لیے سرکاری، جس کا پٹرول اور ڈرائیور کی تنخواہ وغیرہ جملہ چیزیں سرکاری ہوں گی تاکہ تو جہاں جس وقت جانا چاہے جا سکے، مکان بھی سرکاری ہوگا۔ ان میں تو کوئی چیز اللہ کے احسان سے دل لبھانے والی نہیں تھی، جس کو میں نے لبھانا لکھا وہ یہ تھی دائرہ کی ملازمت صرف چار گھنٹہ ہوگی، باقی میں تو مختار ہوگا کہ جو چاہے کرے، دائرہ کے کتب خانے پر تو تیرا اختیار ہوگا ہی کہ جس وقت چاہے تو آئے اور جس وقت چاہے لکھے، کتب خانہ آصفیہ کے اوپر تجھے یہ اختیار ہوگا کہ جتنی دیر چاہے بیٹھ کر کتابیں دیکھے اور جو چاہے کتابیں منگا لے اور تو چونکہ ''اوجز المسالک'' لکھ رہا ہے اس لیے اس کی تالیف میں جتنی آسانی یہاں ہو سکتی ہے وہ مظاہر علوم میں نہیں اور دائرہ تجھ سے جو کام لینا چاہتا ہے وہ بھی علم حدیث کا ہی ہے اور بہت ہی اوجز کی تالیف کی سہولتیں لکھی تھیں۔ جس کے جواب میں اس ناکارہ نے صرف ایک کارڈ لکھا تھا کہ جس میں نہ القاب نہ آداب:

''مجھ کو جینا ہی نہیں بندۂ احساں ہو کر''

فقط: زکریا

صرف یہ مصرعہ لکھا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ عزیز کا خط آیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، اس نے بہت ہی شفقت و محبت سے لکھا تھا کہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر۔ ''اَوجز'' کی تالیف جتنی بہتر یہاں ہو سکتی ہے سہارنپور میں نہیں ہو سکتی، لیکن اس وقت تو مجھ پر ملازمت سے وحشت کا ایسا اثر مسلط تھا کہ نظر ثانی کی بالکل گنجائش نہ تھی۔ مگر بعد میں کبھی کبھی اس ابتلاء کے متعلق اب تک یہ خیال آتا رہتا ہے کہ معلوم نہیں میں نے اچھا کیا یا برا کیا۔ اس زمانہ میں ملازمت سے طبیعت کو وحشت ہی بہت تھی، لیکن اوجز کی تالیف میں بہت سی سہولتیں اور مواد ملتا۔

اس کے بعد پانچواں ابتلاء تقسیم ہند سے دو تین سال پہلے پیش آیا۔ وہ یہ کہ اسی ابوداؤد شریف کی برکت سے بنگالی طلبہ (جن کی تقسیم ہند سے پہلے تک بہت ہی کثرت سے آمد تھی، ان میں سے اب بھی مشرقی پاکستان کے مدارس میں صدر مدرس یا شیخ الحدیث ہیں) نے نہ معلوم کیا کیا کہا اور کس کس سے کہا۔ وہاں سے چاٹگام یا ڈھاکہ کے مدرسہ عالیہ کے منتظمین کا ایک بہت لمبا خط آیا۔ نام میں اس وقت تردد ہے جس میں وہاں کی مشیخت حدیث کے لیے اور صرف ترمذی، بخاری شریف پڑھانے کے لیے بارہ سو روپے تنخواہ پر اس ناکارہ کو بہت ہی اصرار سے بلایا تھا اور ایک تار ارجنٹ اس مضمون کا کہ خط کے جواب کا شدت سے انتظار ہے، مگر اس وقت تک خط نہیں پہنچا تھا اور دو روز بعد دوسرا ارجنٹ جوابی تار ''خط کے جواب کا سخت انتظار ہے'' ملا۔ اس وقت خط پہنچ چکا تھا۔ تار کا جواب تو میں نے صرف یہ لکھ کر کہ ''معذوری ہے''۔ مفصل خط میں ان کو میں نے لکھا کہ ''جن دوستوں نے آپ سے میرا نام لیا ہے انہوں نے محض حسن ظن سے غلط روایت پہنچائی ہیں، یہ ناکارہ نہ اس کا اہل ہے اور نہ متحمل''۔

اس کے بعد البتہ اللہ کا احسان ہے کہ پھر کوئی واقعہ اس قسم کا پیش نہیں آیا اور بجز حیدرآباد والے واقعہ کے اور سب پر اللہ کا بہت ہی شکر ادا کیا کہ اللہ نے بہت ہی کرم واحسان فرمایا۔ اگر ان میں سے کسی ایک میں پھنس جاتا تو صورۃ جو ایک ڈھونگ بنا رکھا ہے یہ بھی نہ رہتا۔

البتہ حیدرآباد والے واقعہ میں یہ ضرور خیال آتا ہے کہ شاید ''لامع'' ''اَوْجَز'' خوب اچھی لکھی جاتی اور چونکہ مدرسہ کا قصہ بھی نہ ہوتا اس لیے فراغت بھی خوب ملتی اور جلدی لکھی جاتی۔ لٰکِنَّ الْخَیْرَ فِیْمَا وَقَعَ۔

یہ چند واقعات اس زمانے کے ہیں جب عرفاً شعور کا زمانہ سمجھا جاتا تھا۔ حقیقی شعور تو اب تک بھی نصیب نہیں ہوا لیکن جو زمانہ عرفی بے شعوری کا تھا اور اگر یوں کہوں کہ ابتدائی ابتلاء کا تھا تو بے محل نہ ہوگا۔ مرزا ثریا جاہ مرحوم کا ذکر تو میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور عزیز مولوی یوسف مرحوم کی سوانحوں میں کثرت سے گزر چکا، ان کو میرے دادا صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے بہت ہی عقیدت اور محبت تھی انہوں نے میرے دادا نور اللہ مرقدہٗ سے باصرار یہ خواہش اور تقاضا کیا کہ میں اپنی عمر کی قیصر جہاں بیگم کا نکاح عزیز مولوی محمد یحییٰ صاحب سلمہٗ سے کرنا چاہتا ہوں، دادا صاحب پسند تو نہ کرتے تھے مگر مرزا صاحب کے شدید اصرار پر انہوں نے میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے اِسْتِمْزَاج کیا، والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے معذرت کر دی، جس کا صاحبزادی مرحومہ کو بھی بہت قلق تھا۔ مگر اس خاندان سے میرے والد صاحب اور چچا جان نور اللہ مرقدہما اور اس ناکارہ کے بھی ابتدائی دور میں ایسے تعلقات وابستہ تھے جیسے گھر والوں کے ہوتے ہیں۔ میرے والد

صاحب اور چچا جان نوراللہ مرقدہما کی کثرت سے آمدورفت قیصر جہاں مرحومہ کے مکان میں ہوتی تھی۔ جب کبھی میرا جانا ہوتا تو مرحومہ باوجود اپنی انتہائی نفاست، نزاکت کے مجھے۔ اپنے پاس سلایا کرتیں اور بہت لپٹ کر سویا کرتی تھیں، میری عمر اس وقت ٦، ٧ سال کی تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے۔ مرحومہ نے کئی مرتبہ میرے سامنے والد صاحب سے اصرار کیا کہ مجھے تو آپ نے قبول نہ کیا مگر زکریا میرا بچہ ہے میں اس کو اپنا بیٹا بناؤں گی، اپنے پاس رکھوں گی اور اپنی لڑکی سے اس کا نکاح کروں گی۔ والد صاحب کا جواب تو ہوتا تھا کہ جس چیز کو میں نے اپنے لیے پسند نہ کیا اس کے لیے کیسے پسند کروں؟ مگر ان کا شدید اصرار از خود رفتہ تھا کی بناء پر ایک مرتبہ میرے والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے امتحاناً مجھ سے دریافت فرمایا، میں نے عرض کیا کہ ''پاندان لیے لیے پھرنا میرے بس کا نہیں''۔ اس کی شرح یہ ہے کہ مرحومہ کے شوہر مرزا محمد شاہ کو مرحومہ سے عشق تھا، وہ نہایت نفیس مسہری پر بیٹھی رہتی تھیں اور مرزا شاہ مرحوم پاندان ان کے پاس لا کر رکھتے اور یہ کہتے تھے کہ ''بیگم ایک پان کھلا دو''۔ مجھے یہ چیز اس قدر ناگوار ہوتی کہ اپنے خاندان کے بالکل ضد، ہمارے گھر کا تعامل بیوی گویا محکومہ خادمہ ہے۔ خاوند کا منصب ہے بیوی سے یہ کہے کہ ایک پان بنا لا۔

والد صاحب کا امتحان اور میرا جواب:

میرے اس جواب پر والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے خود اپنا قصہ مجھے سنایا۔ یہ ارشاد فرمایا کہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی مجھ سے بچپن میں قیصر جہاں کے نکاح کے متعلق دریافت فرمایا تھا تو میں نے یہ جواب دیا تھا کہ ان شہزادی سے نکاح کے بعد بوریے پر لیٹنا تو کبھی نصیب نہیں ہوگا اور یہ قصہ سنا کر یہ فرمایا کہ میرے اور تیرے جواب میں آسمان زمین کا فرق ہے، تیرے جواب سے تکبر کی بو ٹپکتی ہے۔ اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے کہ بہت ہی باریک نگاہ سے میری ہر حرکت کو دیکھا کرتے تھے۔

یہ ساری باتیں تو ایک ابتلاء کے دور کی ہیں اور یہ بھی چند واقعات ذکر کیے ورنہ ان جزئیات کے لیے ایک ''الف لیلہ'' چاہیے۔ اللہ جل شانہٗ نے ہر ہر موقع پر انتہائی کرم اور لطف اور مدد فرمائی۔

انوکھی تربیت:

اس سے زیادہ اہم اور نہایت ہی اہم عنوان ''تربیت'' کا تھا، جس کو علی میاں نے بالکل ہی اڑا دیا، ضمناً کہیں کہیں ایک دو واقعے آ گئے ہیں، یہ عنوان بھی بہت طویل ہے، جس طرح میرے والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے اس سیہ کار کی تربیت فرمائی وہ درحقیقت بہت ہی اہم اور بہت ہی دقیق اور شدید نگرانیوں کے ساتھ ہوئی۔ اگر مجھ میں کچھ بھی صلاحیت ہوتی تو میں یقیناً آج کچھ بنا

ہوا ہوتا، مگر مثل مشہور ہے کہ کتے کی دم بارہ سال نلکی میں رکھی مگر وہ سیدھی ہو کر نکلی۔

میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں سب سے زیادہ شدت ترک تعلقات پر تھی، ان کا مقولہ جو بار بار انہوں نے ارشاد فرمایا یہ تھا کہ ''آدمی چاہے کتنا ہی غبی اور کند ذہن ہو اگر اس میں تعلقات کا مرض نہیں تو وہ کسی وقت ذی استعداد بن کر رہتا ہے اور آدمی چاہے جتنا بھی ذی استعداد، ذہین اور علم کا شوقین ہو اگر اس کو تعلقات کا چسکہ ہے تو وہ اپنے جوہروں کو کھو کر رہے گا۔''

اس کے ساتھ ساتھ ابتداء عمر میں امردوں کا کسی سے میل جول ان کے نزدیک خطرناک تھا، اس کو علی میاں نے تحریر تو فرمایا، جیسا کہ (صفحہ ۷۹) پر لکھا ہے، لیکن اس کو الٹا کر دیا، یہ تو میری مجال ہی نہ تھی کہ میں کسی کو سلام کروں یا میں از خود کسی ایسے شخص کے پاس جماعت کی نماز میں کھڑا ہوں جس کے پاس اس سے پہلے کی نماز میں کھڑا ہو چکا ہوں۔ اگر کوئی دوسرا اجنبی مجھے سلام کر لیتا تھا تو مجھ سے جواب طلب ہو جاتا کہ یہ کون ہے؟ اور اگر کوئی ایسا شخص جو پہلی نماز میں بھی میرے برابر ہوتا تھا، اتفاقاً میرے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا تو مجھے ڈر کے مارے نیت توڑ کر جانا پڑ جاتا تھا۔ اس لیے کہ اس کو بھگتنا تو مجھے پڑتا تھا اور اس خیال سے کہ پاس والے کو یہ خیال ہوگا کہ کیا بات ہوئی، کبھی کھانسنے کا بہانہ کرتا تھا اور کبھی ناک پکڑ کر کہ گویا نکسیر آ گئی ہے، وہاں سے نکلتا تھا اور ان دونوں چیزوں کا ردعمل اب اس زور سے ہو رہا ہے کہ سلام کا تو کہنا ہی کیا میری معذوری کی وجہ سے دونوں طرف اٹھانے والے گویا متعین ہیں۔

اس کے ساتھ ہی میرے والد صاحب کی نگاہ میں بڑی اہم چیز صاحبزادگی کا مسئلہ بھی تھا، ان کا بار بار کا سینکڑوں دفعہ کا سنا ہوا مقولہ کہ یہ صاحبزادگی کا سُور بہت دیر میں نکلتا ہے، اس ناکارہ کے متعلق اگر کبھی ان کو کسی فعل سے اس کا شبہ بھی ہو جاتا تھا تو پھر خیر نہیں ہوتی تھی۔ ابھی ایک واقعہ اس سلسلہ میں لکھوں گا۔

میرے پیارے دوست! لکھنے کی چیزیں تو یہی تھیں علی میاں نے ایران، توران اور فضول باتیں لکھ دیں، ان سے کسی کو کیا فائدہ ہوگا اور میری نگاہ میں تو مبالغہ بھی بہت ہے، مختصراً اپنی تربیت کے چند واقعات ضرور لکھوں گا، اگر چہ یہ چیزیں بعد از وقت ہیں، اگر میں مسودے کو پہلے دیکھ لیتا تو امید تو نہیں تھی کہ علی میاں ان کو میرے الفاظ میں چھاپ دیں گے لیکن میں تو اصرار کر ہی دیتا۔ میں تو حدیث پاک کے سبقوں میں ہمیشہ انہی واقعات کو بہت لطف اور مزے سے نقل کرتا ہوں اور بڑی دعائیں دیتا ہوں کہ ان کے جوتوں ہی کی برکت سے دینداری کی ظاہری صورت بنائے بیٹھا ہوں اور ان کی ہر مار پر بڑی دعائیں دیتا ہوں، گو اس وقت بتقاضائے عمر اور نافہمی جتنا بھی رویا ہوں یا رنج وغضب کیا ہو ظاہر ہے۔

چندواقعات ضرور سنو تم کو لطف آئے یا نہ آئے مجھے تو لکھنے میں لطف آئے ہی گا:

(۱)......میری عمر تین چار سال کی تھی، اچھی طرح سے چلنا بھی بے تکلف نہیں سیکھا تھا، سارا منظر خوب یاد ہے اور ایسی باتیں ''اَوْقَعُ فِیْ الذِّهْن'' ہوا کرتی ہیں، میری والدہ نور اللہ مرقدھا کو مجھ سے عشق تھا، ماؤں کو محبت تو ہوا ہی کرتی ہے، مگر جتنی محبت ان کو تھی اللہ ان کو بہت بلند درجے عطا فرمائے، میں نے ماؤں میں بہت کم دیکھی، اس وقت انہوں نے میرے لیے ایک خوبصورت تکیہ چھوٹا سا سیا تھا، ایک بالشت میری موجودہ بالشت سے چوڑا اور ڈیڑھ بالشت لمبا، اس کی ہیئت بھی کبھی نہیں بھولوں گا، اس کے اوپر گوٹہ، گوکھرو، کرن بنت وغیرہ سب کچھ ہی جڑا ہوا تھا، نیچے لال قند کا غلاف اور اس پر سفید جالی کا جھالر، بہت ہی خوشنما، وہ مجھے اتنا محبوب تھا کہ بجائے سر کے میرے سینے کے اوپر رہا کرتا تھا، کبھی اس کو پیار کرتا، کبھی سینے سے چمٹایا کرتا، والد صاحب نے آواز دے کر فرمایا کہ ''زکریا مجھے تکیہ دے دے''۔ مجھ میں پدری محبت نے جوش مارا اور اپنے نزدیک ایثار اور گویا دل پیش کر دینے کی نیت سے میں نے کہا کہ ''میں اپنا تکیہ لے آؤں''۔ فرمایا کہ ''ورے آ'' میں انتہائی ذوق وشوق میں کہ ابا جان اس نیاز مندی اور سعادت مندی پر بہت خوش ہوں گے، دوڑا ہوا گیا، انہوں نے بائیں ہاتھ سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر اور داہنے ہاتھ سے منہ پر ایسا زور سے تھپڑ رسید کیا کہ آج تک تو اس کی لذت بھولا نہیں اور مرتے وقت تک امید نہیں کہ بھولوں گا اور یوں فرمایا کہ ''ابھی سے باپ کے مال پر یوں کہتا ہے کہ اپنا لاؤں، کچھ کما کر ہی کہنا کہ اپنا لاؤں''۔ اللہ ہی کا فضل وکرم ہے اور محض اس کا ہی لطف واحسان ہے کہ اس کے بعد سے جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو دل میں یہ مضمون پختہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ اپنا اس دنیا میں مال نہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ دن بہ دن یہ مضمون پختہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

(۲)......میری عمر آٹھ سال کی تھی، حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے وصال کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا، حضرت کے وصال کے بعد والد صاحب نے خانقاہ شریف ہی میں بچوں کو تعلیم دینا شروع کر دیا تھا اور جس وقت یہ واقعہ لکھ رہا ہوں خوب یاد ہے کہ اسّی (۸۰) لڑکے تھے، ان میں قاعدہ بغدادی پڑھنے والے بھی تھے اور حماسہ اور ہدایہ اولین پڑھنے والے بھی۔ اوپر کے اسباق تو والد صاحب اور چچا جان پڑھایا کرتے تھے اور ہر اونچی جماعت والے کے ذمہ اس سے نیچے والی جماعت کے اسباق ہوتے تھے کہ اپنے پڑھے اور ان کو پڑھائے اور والد صاحب کے سامنے یہ اسباق پڑھائے جاتے تھے۔ خانقاہ کی مسجد میں اس وقت تک والد صاحب ہی نماز پڑھاتے تھے۔ نماز شروع ہوگئی اور میں خانقاہ کی مسجد میں ایک طاق تھا، اس پر ہاتھ رکھ کر لٹکنے کی کوشش میں تھا مگر

اس پر میرا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا۔ ان شاگردوں میں ایک شخص مولوی صغیر احمد تھے جو معلوم نہیں اب حیات ہیں یا نہیں مگر گنگوہ کے رہنے والے اور بعد میں بمبئی کے بڑے واعظوں میں ہو گئے تھے، وہ وضو کر کے جلدی سے آئے اور ادھر رکوع شروع ہو گیا، انہوں نے تیزی سے آ کر محبت کی بناء پر مجھے طاق پر لٹکا دیا، مجھے غصہ آ گیا کہ میری مساعی جمیلہ میں اس نے ٹانگ کیوں اڑائی۔ جب سب سجدہ میں گئے تو میں نے مولوی صغیر کی کمر میں زور سے ڈُکّ مارا، چوٹ تو ان کو کیا لگتی مگر آواز بہت ہوئی۔ نماز پڑھتے ہی مقدمہ قائم ہو گیا، خانقاہ میں گولر کے نیچے سارا مجمع اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی سہ دری کے آخری در کے سامنے ابا جان اور مطالبہ یہ ''کہ کس نے مارا تھا اور کس کے مارا تھا؟'' مگر ڈر کی وجہ سے کوئی بولا نہیں۔ دس بارہ منٹ کے بعد فرمایا کہ اچھا اب تو سبق کا حرج ہو رہا ہے سبق کے بعد سب کی چھٹی بند، جب تک کہ تحقیق نہ ہو جائے۔ عصر کے بعد دوبارہ میدان حشر قائم ہوا، ان کا مطالبہ اور جواب میں سکوت۔ انہوں نے فرمایا کہ کسی ایک کو بھی جانے کی اجازت نہیں، چاہے صبح ہو جائے اور میں اپنے دل میں یہ دعائیں کر رہا تھا کہ جو ہونا ہو گا ہو جائے گا مولوی صغیر جلدی سے بتا دیں خواہ مخواہ سب پھنس رہے ہیں۔ بالکل میدانِ حشر کا منظر تھا جس کی بناء پر سب پریشان پھر رہے تھے۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد مولوی صغیر نے دبی ہوئی اور مری ہوئی آواز زبان سے کہا کہ ''میرے مارا تھا''۔ اب تو مقدمہ کا بہت سا حصہ گویا طے ہو چکا۔ اس پر سختی سے مطالبہ ہوا کہ ''کس نے؟'' مگر وہ چپ۔ جب اس نے دیکھا کہ ''ضَـرَبَ یَضْـرِبُ'' ہونے کو ہے تو اس نے میری طرف اشارہ کیا کہ ''اس نے''۔ اس پر والد صاحب نے فرمایا کہ ''اِس نے؟'' انہوں نے کہا جی پھر فرمایا کہ ''اس نے؟'' اس وقت والد صاحب کا دستور عصر کے بعد گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مزار پر حاضری کا تھا، یہ نابکار بھی ساتھ ہوتا اور میری ایک چھوٹی سی چھتری تھی جو ٹوٹ گئی تھی اور اس کی ڈنڈی کو لکڑی بنا لیا تھا جو مزار پر جانے کے وقت میں میرے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی، میرے ہی ہاتھ سے چھین کر اتنا مارا کہ وہ چھوٹی سی لکڑی بھی دو جگہ سے ٹوٹ گئی اور صرف ایک لفظ ان کی زبان پر ہر مار پر ہوتا تھا ''ابھی سے صاحبزادگی کا یہ سُوز''۔ انہیں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ بدصاحبزادگی باپ کے شاگرد کو مار دیا۔ سردی کا زمانہ تھا اور میں روئی کا انگرکھا پہنا کرتا تھا مگر اس وقت نہیں تھا، اس لیے کہ صبح اور عشاء کے وقت پہنا کرتا تھا اور عصر کے وقت چونکہ سردی نہیں ہوتی تھی، اس وقت صرف ایک ہی کرتہ بدن پر تھا۔ میرے بازو اتنے سُوج گئے تھے کہ پندرہ دن تک انگرکھا بالکل نہیں پہن سکا۔ اس وقت تو نہیں مگر ان کا ایک خاص مقولہ جو کئی دفعہ مجھ سے فرمایا، یہ تھا کہ ''اگر تو پٹتے پٹتے مر گیا تو تُو شہید ہو گا، مجھے ثواب ہو گا''۔ آپ خود سوچیں کہ جس کا یہ نظریہ ہو وہ کیا کسر چھوڑے گا۔

(۳)......اسی زمانے کا قصہ ہے کہ اس نابکار کو بزرگی کا جوش ہوا اور مغرب کے بعد حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے حجرے کے سامنے لمبی نفلوں کی نیت باندھ لی، ابا جان نے آکر زور سے تھپڑ مارا اور فرمایا کہ ''سبق یاد نہیں کیا جاتا'' میرے چچا جان'' اس زمانے میں بڑی لمبی نفلیں پڑھا کرتے تھے، بعد مغرب سے عشاء کی اذان کے قریب فارغ ہوا کرتے تھے، لیکن والد صاحب کے یہاں مختصر سے نوافل کے بعد تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا، اس وقت تو مجھے بہت غصہ آیا کہ خود تو پڑھی نہیں جاتی، دوسرے کو بھی پڑھنے نہیں دیتے، مگر جلدی ہی سمجھ میں آگیا کہ بات صحیح تھی، وہ نفلیں بھی شیطانی حربہ علم سے روکنے کے واسطے تھا، اس لیے کہ جب نفلیں پڑھنے کا دور آیا تو اب نفس بہانے ڈھونڈتا ہے۔

(۴)......میری عمر دس سال تھی، میری والدہ گنگوہ سے رامپور جارہی تھیں، بہلی میں اور بھی چند مستورات تھیں اور میں بھی تھا، ایک ٹٹو (گھوڑی) جس کے ساتھ اس کا چلانے والا بھی تھا، اس پر والد صاحب تشریف فرما تھے۔ والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو گھوڑے کی سواری کی عادت نہ تھی مگر معمولی سا ٹٹو جس کے ساتھ چلانے والا بھی ہو اس پر دو دفعہ بیٹھنے کی نوبت آئی، راستہ میں ایک جگہ والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ازراہِ شفقت ارشاد فرمایا کہ ''تو گھوڑی پر بیٹھے گا؟'' میں نے بہت شوق سے کہا ''جی'' اور شوق سے کود پڑا اور گھوڑی پر بیٹھ کر شوق سے عزت میں گھوڑا کو بہلی کے سامنے لایا، میری والدہ نے اور دوسری مستورات نے جب میں قریب پہنچا، کچھ زبان سے اور کچھ اشارے سے کہ بُری بات ہے ابا تو پیدل جارہے ہیں اور تو گھوڑی پر بیٹھا ہے۔ میں نے ابا جان سے عرض کیا کہ عورتیں یوں کہہ رہی ہیں۔ انہوں نے بہت غصہ میں فرمایا کہ ''اندھی کے تجھے نظر نہیں آتا، عورتیں ہی کہہ رہی ہیں تیری آنکھیں پھوٹ گئیں ہیں''۔ مابدولت بیک بنی و دو گوش گھوڑی سے اتر کر گاڑی میں بیٹھ گئے، اس بات پر مجھے اللہ کا شکر ہے کہ کوئی گرانی نہیں ہوئی اور میرے ذہن میں تھا کہ تو نے برا کیا۔

(۵)......میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو اس کا بھی بہت اہتمام تھا کہ میرے پاس پیسہ نہ رہے، کسی دوسرے سے پیسہ لینا تو درکنار کسی کھانے پینے کی چیز کا لینا بھی ناممکن تھا بلکہ اس کے شبہ پر بھی سخت تحقیقات ہوتی تھیں، جیسا کہ اگلے نمبر پر مستقل ایک واقعہ ذکر کروں گا، البتہ خود پیسے دینے کا معمول تھا اور ساتھ یہ کہ میرے پاس پیسہ نہ رہیں، اس لیے جب مجھے کچھ دینے کا ارادہ فرماتے تو پہلے والدہ سے فرمادیتے کہ زکریا کو اتنا پیسہ یا روپیہ دینا ہے اور والدہ نور اللہ مرقدھا اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی اونچے درجے عطا فرمائے، مجھ سے محبت بے انتہا تھی، اسی وقت سے مجھے قرض دینے کے فضائل اور ثواب اتنے لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی سناتیں اور آخرت میں کارآمد ہونے کی

ترغیبیں اور دنیا میں جو خرچ ہو اس کی لغویت بتلاتیں اور اس کے بعد پھر فرماتیں کہ "تیرے پاس کچھ پیسے ہوں تو دے دے تجھے ثواب ہوگا"۔ کچھ تو واقعی والدہ کی محبت اور کچھ ثواب کی اہمیت تو اس وقت کہاں ہوتی، البتہ "مَنْ نُوْقِشَ فِی الْحِسَابِ فَقَدْ عُذِّبَ" کا نقشہ بغیر حدیث پڑھے ہی سامنے تھا اس لیے کہ ان پیسوں کا حساب دینا تو کارے دارد تھا اور اسی کا یہ اثر ہوا کہ اب تک پیسہ جیب میں رکھنے کی عادت نہیں۔ اللہ نے دوست واحباب ایسے مہیا کرر کھے ہیں کہ وہ ہر وقت میری فرمائشیں پوری کرتے رہتے ہیں اور دو چار دن میں ایک بل مجھے دے دیتے ہیں اور یہ وہی دستِ غیب کا نسخہ ہے جو کسی تبلیغی اجتماع میں صوفی عبدالرب صاحب کو بتلایا تھا۔

(۶)......اس سے پہلے نمبر میں لکھا تھا کہ شبہ پر تحقیقات ہوتی تھیں ایک واقعہ مثال کے طور پر لکھ رہا ہوں، مدرسہ قدیم (دفتر مدرسہ مظاہر علوم) کی چھت پر والد صاحب کا قیام اور پیشاب کی جگہ اسی چھت پر اس کے بالمقابل تھی، والد صاحب پیشاب کے لیے تشریف لے گئے، راستہ میں ایک جگہ سے کباب کی خوشبو آئی جو مولانا ظفر احمد صاحب پاکستانی شیخ الاسلام پاکستان نے کسی طالب علم سے بعد مغرب یہ کہہ کر کہ ایک کباب لا کر یہاں رکھ دینا میں نفلوں کے بعد لے لوں گا، نماز کی نیت باندھ لی۔ والد صاحب کے بعد میں پیشاب کو گیا۔ والد صاحب کو یہ شبہ ہوا کہ وہ کباب اس نے منگائے تھے اور پیشاب کے بہانے سے یہ کھا کر آیا ہے، مجھ سے مطالبہ فرمایا کہ "وہ کباب کس کے ہیں؟" میں نے لاعلمی ظاہر کی، اول تو سختی سے فرمایا، پھر جا کر ان کو دیکھا تو وہ وہیں رکھے تھے۔ چونکہ مولانا ظفر احمد صاحب زمانے میں شریکِ دسترخوان تھے۔ جب سب حضرات کھانے کے واسطے بیٹھے تو مولانا ظفر احمد صاحب نے کسی طالب علم سے فرمایا کہ وہاں کباب رکھے ہیں وہ اٹھالاؤ تو والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اطمینان ہوا۔

(۷)......پیسوں کے سلسلے میں ایک عجیب واقعہ سناؤں، ان کی تعلیم کا طرز تو عجیب و نرالا تھا، ان کے یہاں اہم کتاب کے شروع پر یا ختم پر مٹھائی کے نام سے کچھ پیسے ملنے کا بھی دستور تھا جو میرے ساتھ مخصوص نہیں تھا بلکہ مخصوص شاگردوں میں سب ہی کے ساتھ تھا۔ لیکن میرے ساتھ یہ خصوصیت تھی کہ ان پیسوں کی مٹھائی کھانا سخت معیوب تھا، بلکہ نہایت سنگین جرم تھا کہ یہ ان کے یہاں چٹورپن تھا، بلکہ ان پیسوں کا مصرف کوئی ضرورت کی چیز کتاب وغیرہ یا والدہ کے توسط سے کوئی مقوی دماغ چیز تھی۔ جب میرا فقہ شروع ہوا اور ان کے یہاں تعلیم میں بھی جدت تھی، جس کا اثر چچا جان کی تعلیم میں بھی تھا کہ ان کے یہاں درس نظامی کی پابندی نہیں تھی بلکہ ہر شخص کی حیثیت کے موافق کتاب تجویز ہوتی تھی "الفیہ ابن مالک" کا سبق روزانہ حفظ سنا کرتے تھے۔ ان کے یہاں ہدایۃ النحو اور کافیہ ساتھ ہوا کرتا تھا، کافیہ کی ترتیب پر جتنا سبق شام کو کافیہ کا مناسب ہوتا اس کی

بقدر صبح کو ہدایۃ النحو ہوتی تا کہ وہ کافیہ کے لیے مطالعہ کا کام دے، اسی طرح قدوری اور کنز ساتھ ہوتی کنز کی کی ترتیب پر۔ جب میرا فقہ شروع ہوا یعنی قدوری اور کنز کی بسم اللہ ہوئی تو مجھے بیس روپے انعام ملے تھے اور دینے کے بعد فرمایا کہ ''ان کا کیا کرو گے؟'' میں چونکہ بھیڑیے کی آنکھ سے سبق پڑھے ہوئے تھا، میں نے کہا کہ میرا یوں جی چاہتا ہے کہ اپنے چاروں بزرگ حضرت سہارنپوری، حضرت دیوبندی، حضرت رائے پوری، حضرت تھانوی کو پانچ پانچ روپے کی مٹھائی پیش کروں، یہ میری تجویز کسی اخلاق پر تو مبنی تھی ''مَنْ حُوْسِبَ عُذِّب'' کے ڈر سے تھی، بڑی شاباش ملی اور میری فہم ودانش پر مبارکباد، پھر فرمایا کہ ''مٹھائی کیا دے گا؟'' اس کے بعد لکھنے والے نے کہا کہ یہ قصہ الخ علی میاں سوانح میں حاشیہ، صفحہ نمبر۹۷ پر لکھ چکے ہیں، اس لیے اسی جگہ پر ختم کر دیا۔ البتہ ابتدائی حصہ کی ترتیب اور میری تجویز کی وجہ اس میں نہیں ہے۔

(۸)..... کاندھلہ کی عید کا واقعہ بھی علی میاں نے صفحہ نمبر۴۷ پر لکھا تو ہے مگر بہت مختصر۔ رمضان المبارک ۲۸ھ میں جب کہ میری عمر تیرہ سال کی تھی اور سہارنپور آنے کے بعد پہلی عید تھی، کاندھلہ اس سے پہلے شاید تین چار سال کی عمر میں ایک عید کی تھی، اس کی چہل پہل، عید گاہ میں بچوں کے ساتھ جانا اور عید گاہ کے مناظر خوب یاد تھے، ۱۵ رمضان کے آس پاس والد صاحب نے ازراہِ شفقت ومراحم خسروانہ فرمایا کہ ''تیرا کاندھلہ عید کرنے کو جی چاہتا ہے؟'' میں نے بڑے زور سے کہا کہ ''جی'' فرمایا کہ ''اچھی بات ہے ۲۹ کو بھیج دوں گا''۔ خوب یاد ہے کہ یہ پندرہ دن خوشی کے اندر ہر روز عید تھا اور ہر رات شب قدر، کبھی خوشی میں اچھل بھی پڑتا تھا اور ایک ایک دن بڑی مشکل سے گزارتا تھا اور جب ۲۹ کی رات آئی تو پھر کیا پوچھنا، سوچتا تھا کہ اب کس کے ساتھ جانا طے ہوگا ۲۹ کی صبح کو میں تو ہر آن:

''چون گوش روزہ دار بر اللہ اکبر است''

اس آواز کا منتظر تھا کہ یہ فرمائیں کہ ''جافلاں کے ساتھ چلا جا''، انہوں نے دس گیارہ بجے کے قریب نہایت رعب دار منہ بنا کر فرمایا کہ ''بس کیا کرے گا جا کر؟'' آواز سے تو ہم رو ہی نہیں سکتے تھے، آنسوؤں پر قابو ہی نہیں تھا، بے اختیار نکل پڑے اور حجرہ میں جا کر پھر جو ہچکیوں کے ساتھ رونا شروع کیا، اللہ بہت ہی معاف فرمائے جو منہ میں آیا سب کچھ کہہ دیا۔ بھلا اس جھوٹے وعدہ کی کیا ضرورت تھی؟ بزرگ ہو کر بھی مکاری کرتے ہیں، میں نے کون سی درخواست یا منت کی تھی، اپنے آپ خود ہی تو وعدہ کیا اور وہ دن اور دوسرا عید کا دن میرے لیے محرم تھا اور وہ میری لال آنکھوں اور آنسوؤں کو خوب دیکھ رہے تھے مگر ایک لفظ نہیں کہہ کر دیا۔ عید سے دوسرے دن یوں فرمایا کہ ''میرا جی تو چاہتا تھا تیرے بھیجنے کو اور میرا ارادہ بھی تھا مگر جتنی خوشی تو نے جانے کی کی وہ مجھے اچھی نہیں

لگی۔''اس وقت تو بھلا آپ کیا جانیں کہ کیا سمجھ آتی مگر اب واقعی سمجھ میں آ گئی کہ ''لِکَیْلَا تَاسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰکُمْ'' کی داغ بیل پڑ گئی۔

(۹)...... مجھے کبھی بچپن میں اچھا پہننا یاد نہیں، اپنے ہوش سے پہلے والدہ نے پہنائے ہوں تو یاد نہیں، ان زمانے میں ہر جمعہ کو سر منڈانا بھی ضروری تھا کہ بال بھی زینت ہیں، کاندھلہ میرا وطن ہے لیکن عمر بھر میں کبھی بھی تین مرتبہ کے علاوہ ایک دو شب سے زیادہ قیام یاد نہیں، بلکہ ہوا ہی نہیں، پہلی دفعہ ان تین میں سے والد صاحب کی حیات میں ہے جس کا قصہ لکھ رہا ہوں اور دو (۲) دفعہ ان کے وصال کے بعد۔ ان میں سے پہلی مرتبہ ۳۶ھ میں جب کہ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سہارنپور سے دہلی منتقل ہوئے، روانگی سے قبل بیماری یہیں شروع ہو گئی تھی، کاندھلہ دو چار روز بعد علاج ٹھہرنے کا ارادہ تھا مگر مرض نے اتنا طول پکڑا کہ ہر روز ان کی حیات کا آخری دن تھا۔ اس کی سرگزشت بھی بڑی عجیب ہے اور بڑے عجیب واقعات اس میں پیش آئے جو بڑی لمبی داستانیں ہیں اس بیماری میں چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے جنات کی بیعت ہوئی۔ یہ قیام سب سے زیادہ طویل ہوا۔ تیسری مرتبہ ۴۲ھ میں جب کہ میری حقیقی پھوپھی مرحومہ سخت علالت کے بعد انتقال فرما گئیں۔ ان کے انتقال کا بھی بڑا عجیب واقعہ ہے۔ بہت سخت بیمار تھیں، اشارہ سے نماز پڑھتی تھیں۔ اسہال کبدی کئی دن سے تھے کہ بوقت صادق یوم دوشنبہ ''مجھے جلدی بٹھا، مجھے جلدی بٹھا تو پیچھے سہارا لگا دے'' مجھے خیال ہوا کہ اذان کا وقت ہو گیا ہے مبادا اس میں دیر ہو جائے، میں نے ایک دوسرے عزیز کو اشارہ کیا وہ جلدی سے بیٹھ گئے۔ انہوں نے جلدی میں فرمایا کہ تو بیٹھ حضور تشریف لے آئے اور ہاتھ سے کوٹھے کی طرف اشارہ کیا کہ حضور تشریف لے آئے اور یہ کہتے ہی گردن پیچھے کو گر گئی۔ رَحِمَهَا اللّٰهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً.

ایک اہم واقعہ:

اس جگہ جس واقعے کو لکھنا ہے وہ بہت ہی اہم ہے اور بہت ہی عجیب ہے، اوائل ۳۰ھ میں جب کہ میری عمر ۱۵ برس کی تھی، میری والدہ مرحومہ کاندھلہ میں نہایت ہی سخت علیل ہوئیں اور ایسی علیل ہوئیں کہ ہر دن ان کی زندگی کا آخری تھا (اگرچہ اس مرض میں انتقال نہیں ہوا) والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو جب اس شدت مرض اور مایوسی کی حالت اور میری یاد کی خبر پہنچی تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ پانچ سات دن کا قصہ ہے مجھے کاندھلہ بھیج دیا اور اتنا لمبا چوڑا کام میرے سپرد کر دیا کہ پندرہ سولہ گھنٹے تک بھی پورا نہ ہو سکے۔ روزانہ تاریخ وار مقامات کے سو (۱۰۰) لغت لکھنا اور صراح وغیرہ دوسری کتب کی مدد سے ان کا ترجمہ بھی لکھنا۔ پھوپھا مرحوم (پھوپھا رضی الحسن صاحب) سے سلم

العلوم کا سبق پڑھنا۔ایک منزل روزانہ قرآن کی دو تین مرتبہ پڑھنے کے بعد دادی صاحبہ (جو حافظۂ قرآن تھیں) کو سنانا اور تین سبق فارسی کے گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، حاجی محسن مرحوم کو پڑھانا۔

چونکہ مجھے کبھی اچھا کپڑا پہننے کی نوبت نہ آئی تھی اور میری والدہ کی انتہائی خواہش اور تمنا یہ تھی کہ وہ مجھے کبھی اچھے کپڑے پہنے ہوئے دیکھیں، مگر والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے وہ بھی نہیں بنا سکتی تھیں، چونکہ وہ ان کی مایوسی کی حالت تھی اور ہر دن کو وہ اپنا آخری دن سمجھتی تھیں، اس لیے انہوں نے میری خالہ و پھوپھیوں سے اپنی خواہش کا اظہار فرمایا اور چونکہ ہر رشتہ دار اس وقت ان کی ہر دل جوئی کا متمنی تھا، اس لیے سب نے مل کر نہایت نفیس جوڑا میرے لیے سیا، والدہ نے یہ بھی کہا کہ اگر میں زندہ رہی تو اس کے دام ادا کر دوں گی۔ سب نے کہا کہ ایسے لفظ مت کہو کیا یہ تمہارا ہی بچہ ہے ہمارا نہیں، بہر حال ان کی عجلت پر نہایت عمدہ جوڑا سلا۔ جواب تک نظروں میں ہے۔

نہایت ہی نفیس حسین ایک گلابی بنیان، اس پر نہایت ہی باریک اچکن کا کرتہ اور نہایت ہی عمدہ ''سیلے کا عمامہ'' اور چونکہ اس وقت میرے تمام عزیز علی گڑھ میں پڑھتے تھے اور سب سلیپر پہنتے تھے گو اس سے پہلے میں نے نہ کبھی پہنے اور نہ پسند آیا۔ ساری عمر دھوڑی کا جوتہ اور وہ بھی بغیر پھول کے، مگر ماحول کا تو اثر ہوتا ہی ہے۔ بھائی اکرام، ظہیر الحسن مرحوم، ماسٹر محمود، یہ سب لوگ سلیپر پہنتے تھے مگر معمولی اور اس وقت ہمارے اور والدہ مرحومہ کے شوق سے خریدا جا رہا تھا، اس لیے باٹا کا نہایت ہی مضبوط سولہ روپے کا سلیپر خریدا اور اس وقت کے سولہ آج کے پچاس روپے سے کم تو نہ ہوں گے، دو تین دن میں بڑی محنت اور بہت عجلت سے میری خالہ اور پھوپھیوں نے بہت ہی نفیس جوڑا سیا۔ درمیان میں مکان کا انداز بھی سنئے۔ اس زمانے میں یہ نوعیت ہوتی تو تھی۔ بہت سے قصبات میں، مگر ہمارے مکانوں کی نوعیت یہ تھی کہ صدر دروازے کے متصل تو مردانہ بیٹھک تھی اور دروازہ (۲) ایسا تھا کہ اگر اس کو بند کر دیا جائے تو اندر کے مکانات میں جن کے اندر کھڑکیاں اور دروازے تھے ایک مکان میں گھس کر بغیر پردہ کرائے عورتیں ایک دوسرے کے مکانات میں آ جا سکتی تھیں اور چور کھڑکی (۳) میں اور صدر دروازے میں تقریباً دو (۲) فرلانگ کا فرق ہے اور اندر سب مکانات ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ مکانات کا تحفظ بھی اور غالباً غدر کے زمانے میں اس نوعیت کے بنائے گئے تھے کہ اگر فوج کی یورش صدر دروازے کی طرف سے چلے تو مستور کھڑکی کی طرف کو فوراً نکل جائیں۔ حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ بھی کئی دن تک ان مختلف مکانات میں مستور رہے۔ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ والدہ کی اور میری دونوں کی خیر خبر لینے کے واسطے کاندھلہ تشریف لے گئے اور صدر دروازہ سے نہیں گئے کہ ان کے پہنچنے کا شور ہو جائے گا، چور کھڑکی میں ایک گھر سے دوسرے گھر میں پردہ کراتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ

ابھی آ کر ملوں گا، اس دروازے پر پہنچے جو میری والدہ کے گھر کے بالکل سامنے تھا، مابدولت اس شاہی جوڑے کو پہن کر اوراس کی نمائش کرنے کے واسطے دروازے سے نکل رہے تھے۔

ایک دم ایک کی نگاہ دوسرے پر پڑی، ان کی نگاہوں میں شیر ببر کی طرح سے خون کی لہر دوڑ گئی اور میں لنگور کے سامنے بندر ایسی حالت میں تھا کہ پاؤں کے نیچے زمین نہیں تھی اور انہوں نے للکار کر فرمایا کہ '' آ گے آ''۔ تعمیل کے سوا چارہ کیا تھا اور وہ نہایت ہی نفیس اور مضبوط جوتا جو چار پانچ منٹ پہلے ہی پاؤں میں ڈالا تھا وہ ان کے ہاتھ میں تھا اور بجائے پیر کے سر پر پڑا پڑ پڑ رہا تھا اور ایک لفظ زبان پر تھا کہ '' تجھے معشوق بننے کے واسطے بھیجا تھا؟'' اور دروازہ ایک دم بند کرادیا گیا اور سارے گھروں کی مستورات مجھے چھڑانے کے واسطے وہاں جمع ہوگئیں، ابا جان نے ایک ڈانٹ پلائی کہ جو چھڑائے گا اس کے جوتا ماروں گا۔ بلامبالغہ سو (۱۰۰) کے قریب تو سر پر پڑے ہوں گے۔ یہ اس اللہ کا احسان تھا کہ ایڑی کی طرف نہیں پڑے بلکہ نیچے کی طرف سے پڑے، جس سے سر نہیں پھٹا۔ البتہ صَبغ کی طرح سے دماغ کا بہترین علاج ہوگیا۔

وہ عمامہ تو اسی وقت تہ کر کے چھوٹی ہمشیرہ کے نکاح کے لیے رکھا گیا اور اچکن کے کُرتے کی بھی دو (۲) کرتیاں بہن کی شادی کے لیے بنا کر رکھ دی گئیں اور وہ بنیان اور سلیپر عزیز ظہیر الدین مرحوم کو نذرانہ ہوگیا اور عمدہ لٹھے کا پاجامہ اس وقت تو جھک مار کر اُتارنا ہی پڑا اور ہم پھر وہی کرپاوہی جالی۔

اچھے کپڑوں سے نفرت:

اللہ کے فضل وانعام واحسان سے اچھے کپڑے سے جو نفرت اس وقت دل میں بیٹھی تھی اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور اب واقعی اس کے اندر تصنع نہیں کہ اب اچھے کپڑے سے مجھے اس قدر نفرت سی ہوگئی ہے کہ اپنے ہی نہیں دوسرے کے بدن پر بھی اچھا نہیں لگتا اور اب دماغ میں یہ چیز جم گئی کہ اچھے کپڑے کے اندر کیا فائدہ اگر اچھی غذا کھائی جائے تو خیر دماغ وجسم کو طاقت دیتی ہے مگر اچھے کپڑے سے نہ رنگ ورُوپ میں فرق پڑے اور نہ بدن میں طاقت آئے پندرہ بیس دن میں وہ اس سے زیادہ میلا ہوجاتا ہے جتنا کہ کھدر بھی نہیں ہوتا میرے حضرت اقدس رائے پوری شاہ عبدالقادر صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے بارہا اچھے اچھے کپڑے عنایت فرمائے اور بارہا فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ تجھے اچھے کپڑوں میں دیکھوں، مگر اپنی نالائقی وحماقت سے وہ اچھے اچھے کپڑے جو حضرت کے پاس ہدایا میں آئے تھے اپنی بچیوں کی شادیوں میں دے دیے۔

کرنل اقبال کا ساٹھ روپے گز کا جوڑا سلوانا:

کرنل اقبال بھوپالی میرے بہت ہی کرم فرما اور مخلصوں میں تھے اور محسن بھی تھے، بار بار کثرت

سے مکہ جاتے تھے اور ہر دفعہ میں کوئی مادی ہدیہ مصلّی، رومال وغیرہ ضرور لاتے تھے حالانکہ میں سختی سے ہر دفعہ ان سے لڑتا، اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، ایک مرتبہ انہوں نے عزیزان مولوی یوسف مرحوم اور مولوی انعام سلّمہٗ سے یہ کہا کہ میرا ارادہ بہت دنوں سے شیخ کے لیے بہت بہترین کُرتہ سینے کا ہو رہا ہے۔ عزیزان نے بہت زور سے ان کو منع کر دیا کہ بغیر اجازت نہ بنوانا وہ پہنے گا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں ساٹھ روپے گز کے حساب سے پانچ گز کپڑا ان کے لیے خرید کر لایا ہوں۔ تم شیخ کا کُرتہ چپکے سے مجھے دے دو، میں سلوا کر خود پہنا کر آؤں گا۔ عزیز مولوی انعام سلّمہٗ نے کہا کہ بالکل نہیں وہ سلا ہوا بھی پھاڑ دے گا، پہلے پوچھ لو...... مرحوم کو بار بار کی لڑائی سے تجربہ ہو چکا تھا اس لیے یہ کہا کہ پوچھنے کی تو ہمت نہیں مگر میرا خیال تھا کہ جب وہ سل جائے گا تو اس کا کُرتہ کسی دوسرے کو تو آئے گا نہیں اس لیے وہ پہن ہی لے گا۔ اللہ کا بڑا ہی احسان ہے اور ایک دو نہیں بیسیوں واقعات اس نوع کے پیش آ چکے ہیں۔ کچھ اچھے کپڑے کی نفرت سر پر سلیپر نے دل میں ایسی پیدا کر دی کہ اب دوسروں پر بھی اچھا کپڑا بُرا لگتا ہے۔

جہیز میں کیا دیا جائے:

شادیوں میں عمدہ کپڑوں سے اِس قدر نفرت ہوگئی کہ اِس کا اظہار نہیں کر سکتا، جہیز اور بری کے نام سے اِس قدر روپیہ ضائع کیا جاتا ہے جو محض بے کار ہے یہ شاہانہ جوڑے جو جہیز اور بری میں دیے جاتے ہیں اور کئی کئی سو میں تیار ہوتے ہیں وہ بالکل بے کار اور اضاعت مال ہے وہ اِس قابل نہیں ہوتے کہ گھروں میں پہنے جا سکیں، ایک دو مرتبہ عمر بھر میں کسی کی شادی میں دکھلاوے کے لیے پہننے کے علاوہ کوئی مصرف اِن کا نہیں، پھر وہ رکھے رکھے گل جاتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مر جائے تو مدرسوں کے اندر جا کر کوڑیوں کے بھاؤ نیلام ہوتے ہیں۔

میں لڑکیوں کو دینے کا مخالف نہیں ہوں بلکہ بڑا مُعین ہوں، مگر کپڑے اور لمبی چوڑی دعوتوں کا بہت مخالف ہوں، ان دونوں لغویات میں جس قدر روپیہ خرچ ہوتا ہے اتنی رقم کا زیور اگر لڑکیوں کو دے دیا جائے تو کس قدر اُن کے لیے وقت پر کام آنے والی چیز ہے، زیوروں میں بھی ایسے زیوروں کا مخالف ہوں جن کے اندر گھڑائی تو بہت جائے اور مالیت کچھ نہ ہو کہ اگر بہ وقتِ ضرورت فروخت کیا جائے تو گھڑائی کی تو قیمت ہی نہیں، اگر ایسے زیور جن کے اندر گھڑائی تو نہ ہو اور مالیت زیادہ ہو جیسے کڑے وغیرہ تو ان بیچاریوں کے وقت پر کام آ جائے، اللہ تعالیٰ کسی کو حج کی سعادت عطا فرمائے تو کرایہ تو تیار ملے، کہاں سے کہاں پہنچ گیا، یہ میری ضربات کی آخری ضرب تھی، اس کے بعد ایک آدھ تھپڑ تو شاید کبھی لگا ہو ورنہ قابلِ یاد کوئی مار نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم

سے والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ کو ان ضربات کی بہتر سے بہتر جزائے خیر عطا فرمائے اور ہر مار پر لاکھوں رحمتیں ان پر نازل فرمائے، آمین ثم آمین! کہ یہ ناکارہ سیاہ کار کتے کی دم کی طرح سے جس کو اس کے مالک نے بارہ سال تک نلی میں اس لیے رکھا کہ وہ سیدھی ہو جائے اور بارہ سال کے بعد وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی تھی۔ حالت تو اپنی خراب ہی رہی لیکن ان تنبیہات اور تربیت اور اللہ کے فضل واحسان کی وجہ سے آدمیوں میں شمار ہونے لگا۔ ورنہ نہ معلوم کس جون میں ہوتا۔

(۱۰)......مار خوب یاد رہا کرتی ہے۔ مار تو نمبر ۹ پر ختم ہوگئی۔ البتہ تنبیہات ضرور باقی رہ گئی تھیں۔

والد صاحب کا طرزِ تعلیم ''دسواں واقعہ'':

جس طرح میں لکھ چکا ہوں کہ ان کا طرزِ تعلیم بالکل الگ تھا۔ مشکوٰۃ شریف میں نے ترجمہ سے نہیں پڑھی، ساری بلا ترجمہ پڑھی۔ اس میں یہ اجازت تھی کہ جس لفظ کا جی چاہے ترجمہ پوچھ لوں اور وہ امتحاناً کبھی کبھی پوچھتے رہتے تھے۔ ترجمہ مظاہر حق کا دیکھنا تو جرم تھا، ہدایہ اور طحاوی کا دیکھنا ضروری تھا اور صحاح کی کتابوں میں سے جس کتاب کی حدیث ہو اس کو نکال کر اس کے حواشی دیکھنے کی اجازت تھی۔ قانونِ تعلیم یہ تھا کہ ہر حدیث کے بعد یہ بتانا ضروری تھا کہ حنفیہ کے موافق ہے یا خلاف، اگر خلاف ہے تو حنفیہ کی دلیل اور حدیث پاک کا جواب، یہ تمام گویا حدیث کا جزو لازم تھا جو میرے ذمہ تھا۔ اپنی دلیل نہ بتانا تو یاد نہیں، اس لیے کہ ہدایہ اور اس کی شروح اور حواشی اور فقہ کی دوسری کتابیں دیکھنے کی نوبت کثرت سے آتی رہتی تھی۔ البتہ حدیث کا جواب کبھی کبھی نہیں دے سکتا تھا تو وہ خود بتاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک وعید کی حدیث کی توجیہ میں بندہ نے یوں کہہ دیا کہ ''تشدد پر محمول ہے''۔ اتنی ڈانٹ پڑی کہ کوئی حد نہیں۔ اچھی طرح یاد نہیں شاید تھپڑ بھی لگا اور یہ ارشاد فرمایا کہ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ڈرانے کے واسطے جھوٹ بول دیا۔ کچھ سوچ کر بھی کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹ بول سکتے ہیں تیرے ڈرانے کے واسطے؟'' اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ ''تشدید کی توجیہ احکام میں ہوا کرتی ہے، جیسا کہ شارب خمر کے بارے میں چوتھی مرتبہ پینے کی صورت میں قتل کا حکم ہے اور اسی قسم کے تشدیدی احکام اور اخبار کی حدیث میں تشدید نہیں ہو سکتی'' اس کے بعد جب کبھی اکابر شراح کے کلام میں اخبار کی حدیث میں تشدید کا لفظ دیکھتا ہوں تو ڈانٹ یاد آجاتی ہے۔

ان کو یہ بھی اہتمام تھا کہ شاگرد سے استاذ کی بے ادبی نہ ہو، میں نے چونکہ مشکوٰۃ شریف اس طرز سے پڑھی جو اوپر گزرا اور مدرسہ کے اندر مشکوٰۃ اور حدیث کی کتب لمبی لمبی تقریروں سے ہوتی تھی، میں نے کئی دفعہ اجازت چاہی کہ حدیث کی فلاں کتاب کی سماعت کرلوں۔ بڑی شدت سے

منع فرمایا کہ حدیث کی کتاب اپنے اور حضرت قدس سرہٗ کے علاوہ کسی سے نہیں پڑھنی، البتہ مَنطِقْ وَنُطِق کی کتاب کسی اور سے پڑھے تو مضائقہ نہیں اور ارشاد فرمایا کہ ''تو چونکہ بے ادب گستاخ ہے، منطق فلسفہ وغیرہ کے اساتذہ میں سے اگر کسی کی گستاخی کرے گا تو وہ کتابیں جاتی رہیں گی، بَلا سے جاتی رہیں لیکن حدیث کے اساتذہ میں سے اگر کسی کی تو نے گستاخی کی تو یہ گوارا نہیں کہ تیری حدیث ضائع ہو''

''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا''

میرے ہی قلم سے تحریر:

(۱)...... یہ سارے افسانے خواب ہی ہوگئے اور یہ سارے مراحل والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے وصال سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ختم ہوگئے، اس کے بعد گویا نگرانی ختم ہوگئی۔ انتقال سے تقریباً ایک سال پہلے یا اس سے بھی کچھ زائد، حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ جن کا شدید اصرار والد صاحب کے بار بار بلانے پر رہتا تھا، ان کے خط کے جواب میں والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے میرے ہی قلم سے تحریر فرمایا کہ ''اب تک عزیز زکریا کی بیڑی میرے پاؤں میں ایسی زنجیر بنی ہوئی تھی کہ میں اس کی وجہ سے کہیں آ جا نہیں سکتا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب اس کی طرف سے اطمینان ہوگیا ہے۔

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کو چونکہ بہت اشتیاق رہتا تھا اسی لیے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ رائے پور طویل قیام کے لیے تشریف لے گئے اس ناکارہ نے ان کی تشریف بری کے بعد مکاری سے ان کی یاد اور ان کی غیبت سے اپنے نقصان کا اظہار کیا تو جواب میں تحریر فرمایا ''بڑوں کی نگرانی کی حاجت اس وقت تک رہتی ہے جب تک تعلق مَعَ اللہ پیدا نہ ہو اور اس کے بعد ضرورت نہیں رہتی، اللہ کا شکر ہے کہ اس کے فضل سے تمہارے اندر پیدا ہوگیا اب میری ضرورت نہیں رہی۔''

کاش اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم اور لطف و احسان سے والد صاحب کے اس حسن ظن کو ان کے بعد میرے دوسرے اکابر اور احباب و اصاغر کے حسنِ ظن کو ''اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ'' کے عالی شان فرمان کے وجہ سے صحیح فرما دے تو اس کے لطف و کرم اور ان احساناتِ عظیمہ سے بعید نہیں جو ہمیشہ ہی میری ناپاکیوں کے باوجود رہے۔

فقط

یہ تو آپ کی سوانح کے صرف ایک باب پر تنقیدی استدراک تھا، اس کے علاوہ بھی کچھ نشانات سنے میں لگائے ہیں، ان کو بھی درج کرتا ہوں، تاکہ طبع ثانی میں ان کی رعایت ہو جائے۔

محمد زکریا

مظاہر علوم۔ سہارنپور

بروز جمعہ ۶ شعبان ۸۷ھ

دوسرے نشانات چونکہ کتاب کی طباعت کے متعلق تھے اس لیے ان کی تصحیح کے لیے کتاب ہی بھیج دی گئی۔

☆......☆......☆

اِن نینوں کا یہی بسیکھ
وہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھ
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے

عزیز مولوی محمد ثانی سلمہٗ کے پاس جو مضمون میں نے بھیجا تھا وہ صرف اوپر والا تھا، جب اس کی اشاعت کا خیال ہوا تو بعض دوستوں کا اصرار ہوا کہ میں نے چند روز ہوئے جو مضمون مدرسین و ملازمینِ مدرسہ مظاہر علوم کی خدمت میں بھیجا تھا وہ بھی اس کے ساتھ شائع ہونا ضروری ہے، مجھے بھی مناسب معلوم ہوا کہ اپنے ساٹھ سالہ قیام مظاہر علوم کے دوران جو کچھ دیکھا اور اکابر کے متعلق سُنا وہ بھی کچھ حذف واضافے کے ساتھ اجمالاً دوستوں کے سامنے آجائے کہ یہ واقعات اب سے کچھ پہلے تو سب کو معلوم اور زبان پر جاری تھے مگر اب ان واقعات کے دیکھنے اور سننے والے بھی ختم ہوتے جارہے ہیں، آیندہ کسی کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ اکابر کا معمول مدارس کے سلسلے میں کس قدر احتیاط اور شدت کا رہا۔ یہ ناکارہ طلب علم کے زمانے میں ۱۳۲۸ھ میں آیا تھا جب کہ میری عمر تیرہ سال سے کم تھی اور اب ربیع الآخر ۱۳۸۸ھ شروع ہوگیا، تقریباً ساٹھ سال اس مدرسہ کے اندر ہوگئے ہیں، دیکھا اور سنا تو بہت کچھ اور ان سب کا احصاء دشوار بھی اور بڑی طویل کتاب چاہتا ہے، لیکن نمونہ کے طور پر چند واقعات اہلِ مدارس کی خدمت میں ضرور پیش کرنے کا دل چاہتا ہے کہ شاید کسی اللہ کے بندے کو ان اکابر کے اتباع کی توفیق نصیب ہوجائے۔ بہت اختصار کے ساتھ صرف نمونہ کے طور پر چند واقعات ذکر کرتا ہوں۔

حضرت شاہ عبدالرحیم کا مشہور مقولہ:

(۱) ......قدوۃ الاتقیاء حضرت مولانا الحاج شاہ عبدالرحیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ سرپرست دارالعلوم دیوبند ومظاہر علوم سہارنپور کا یہ مقولہ بہت ہی مشہور تھا اور سنا بھی ہے کہ مجھے مدارس کی سرپرستی سے جتنا ڈر لگتا ہے اتنا کسی سے نہیں لگتا۔ اگر کوئی شخص کسی کے یہاں ملازم ہو وہ مالک کے کام میں کوتاہی کرے، خیانت کرے، کسی قسم کا نقصان پہنچائے، ملازمت سے علیحدہ ہوتے وقت یا مرتے وقت مالک سے معاف کرالے تو معاف ہوسکتا ہے لیکن مدرسوں کا روپیہ جو عام غرباء اور اور مزدوروں کے دو دو پیسے ایک ایک آنے کا چندہ ہوتا ہے ہم سب سرپرستانِ مدرسہ اس کے مالک تو نہیں، امین ہیں۔ اگر اس مال کے اندر افراط وتفریط ہو تو ہم لوگوں کے معاف کرنے سے معاف تو ہو نہیں سکتا۔ اس لیے کہ دوسرے کے مال میں ہم کو معافی کا کیا حق ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ ہم اگر

بمصالح مدرسہ چشم پوشی کریں تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ ہم سے درگزر فرمالے۔ لیکن اگر اپنے ذاتی تعلقات سے ہم لوگ تسامح کریں تو ہم بھی جرم کے اندر شریک ہیں۔ لیکن جرم کرنے والے سے کسی حال میں بھی معاف نہیں ہوسکتا کہ حقوق العباد ہے اور جن کا مال ہے وہ اتنے کثیر ہیں کہ ان سے معاف نہیں کرایا جاسکتا۔

حضرت اقدس مولانا الحاج احمد علی صاحب کا کمال تقویٰ:

(۲)..... حضرت اقدس شیخ مشائخ المحدثین مولانا الحاج احمد علی صاحب محدث سہارنپوری، بخاری، ترمذی کتب حدیث کے محشی اور مشہور عالم محدث ہیں۔ جب مظاہر علوم کی قدیم تعمیر کے چندہ کے سلسلے میں کلکتہ تشریف لے گئے تو وہاں مولانا کا اکثر قیام رہا ہے اور وہاں کے لوگوں سے وسیع تعلقات تھے تو مولانا مرحوم نے سفر سے واپسی پر اپنے سفر کی آمد و خرچ کا مفصل حساب مدرسہ میں داخل کیا تو وہ رجسٹر میں نے خود پڑھا۔ اس میں ایک جگہ لکھا تھا کہ کلکتہ میں فلاں جگہ میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔ اگرچہ وہاں چندہ خوب ہوا لیکن میری سفر کی نیت دوست سے ملنے کی تھی چندہ کی نہیں تھی۔ اس لیے وہاں کی آمد و رفت کا اتنا کرایہ حساب سے وضع کرلیا جائے۔

(۳)..... حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی قدس سرہٗ (جو گویا مظاہر علوم کے بانی ہیں) کا یہ معمول میری جوانی میں عام طور سے مشہور اور لوگوں کو معلوم تھا کہ مدرسہ کے اوقات میں جب کوئی مولانا قدس سرہٗ کا عزیز ذاتی ملاقات کے لیے آتا تو اس سے باتیں شروع کرتے وقت گھڑی دیکھ لیتے اور واپسی پر گھڑی دیکھ کر کتاب میں ایک پرچا رکھا رہتا تھا اس پر تاریخ وار ان منٹوں کا اندراج فرمالیتے تھے اور مہینہ کے ختم پر ان کو جمع فرما کر اگر نصف یوم سے کم تو آدھ روز کی رخصت اور اگر نصف یوم سے زیادہ ہوتا تو ایک یوم کی رخصت مدرسہ میں لکھوا دیتے۔ البتہ اگر کوئی فتویٰ وغیرہ پوچھنے آتا تھا یا مدرسہ کے کسی کام سے آتا تو اس کا اندراج نہیں فرمالیتے تھے۔

(۴)..... حضرت اقدس سیدی مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ جب یکسالہ قیام حجاز کے بعد آخر ۳۴ھ میں مظاہر علوم میں تشریف لائے تو میرے والد مولانا محمد یحییٰ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا شروع ذیقعدہ میں انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت نے مدرسہ سے تنخواہ لینے سے یہ تحریر فرما کر انکار کردیا تھا کہ "میں اپنے ضعف و پیری کی وجہ سے کئی سال سے مدرسہ کا کام پورا نہیں کرسکتا لیکن اب تک مولانا محمد یحییٰ صاحب میری نیابت میں دورہ کے اسباق پڑھاتے تھے اور تنخواہ نہیں لیتے تھے وہ میرا ہی کام سمجھ کر کرتے تھے اور میں وہ دونوں مل کر ایک مدرس سے زیادہ کام کرتے تھے، اب چونکہ ان کا انتقال ہو چکا ہے اور میں مدرسہ کی تعلیم کا پورا کام نہیں کرسکتا اس لیے قبول تنخواہ سے معذور ہوں۔" اس پر حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے بڑی طویل تحریرات ہوئیں۔

حضرت رائپوری نے لکھا کہ آپ کے وجود کی مدرسہ کو سخت ضرورت ہے، آپ کے وجود سے مدرسہ کا سارا انتظام باحسن وجوہ قائم ہے اس لیے آپ کو مدرسہ اب تعلیم کی تنخواہ نہیں دے گا بلکہ ناظم مدرسہ کی تنخواہ دے گا۔ حضرت کے مدرسہ میں تشریف نہ رکھنے سے مدرسہ کا نقصان ہے۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت رائپوری کی بڑی تائید فرمائی۔ اس پر حضرت سہارنپوری نے تنخواہ لینی قبول فرمائی۔

حضرت سہانپوری کا تنخواہ سے انکار:

اس سے قبل کا قصہ تو بہت مشہور ہے کہ حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی تنخواہ چالیس روپے تھی اور عرصہ تک یہی رہی اور جب بھی ممبرانِ مدرسہ کی طرف سے حضرت کی ترقی کا مسئلہ پیش ہوتا تو حضرت ارشاد فرماتے کہ میری حیثیت سے یہ بھی زائد ہے۔ مگر جب ماتحت مدرسین کی تنخواہ چالیس تک پہنچ گئی تو ممبران نے اصرار کیا کہ آپ کی وجہ سے نیچے کے مدرسین کی ترقی رک جائے گی کہ صدر مدرس سے دوسروں کی تنخواہ بڑھ جائے اس پر حضرت نے اضافہ قبول فرمایا۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے متعلق بھی اس نوع کا قصہ معروف ہے کہ حضرت نے پچاس سے زیادہ کے اضافے کو قبول نہیں فرمایا۔ لیکن عرصہ کے بعد اسی اشکال کی وجہ سے حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے اضافہ قبول فرمایا۔

مدرسہ کی اشیاء ذاتی استعمال کے لیے نہیں:

(۵)...... میں نے خود تو یہ واقعہ نہیں دیکھا مگر دو (۲) واسطوں سے سنا ہے کہ حضرت اقدس سہارنپوری کی خدمت میں ایک صاحب عزیزوں میں سے جو بڑے مرتبہ کے آدمیوں میں سے تھے ملاقات کے لیے تشریف لائے، حضرت سبق پڑھا رہے تھے، اختتام سبق تک تو حضرت نے توجہ بھی نہ فرمائی۔ ختم سبق کے بعد حضرت ان کے پاس تشریف لائے، انہوں نے اصرار کیا کہ حضرت اسی جگہ تشریف رکھیں، حضرت نے ارشاد فرمایا کہ مدرسہ نے یہ قالین اسباق پڑھانے کے لیے دیا ہے ذاتی استعمال کے لیے نہیں۔ اس لیے اس قالین سے علیحدہ بیٹھ گئے۔

البتہ یہ واقعہ میرا ہمیشہ کا دیکھا ہوا ہے کہ مدرسہ قدیم (دفتر مدرسہ) میں حضرت کی ہمیشہ دو (۲) چارپائی رہتی تھیں، ان ہی پر حضرت آرام فرماتے تھے ان ہی پر بیٹھتے تھے، مدرسہ کی اشیاء کو میں نے استعمال کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

مہتمم اور مدرسین مظاہر جلسہ کے موقع پر بھی اپنے گھر سے کھانا کھاتے:

(۶)...... مظاہر علوم کا جب سالانہ جلسہ ہوتا تھا، میں نے اکابر مدرسین وملازمین میں سے کبھی

کسی کو جلسہ کے کھانے یا چائے یا پان کو کھاتے نہیں دیکھا۔ جملہ حضرات مدرسین اپنا اپنا کھانا کھاتے تھے جب بھی وقت ملے۔ البتہ حضرت قدس سرہٗ مدرسہ کے خصوصی مہمانوں کے ساتھ کھاتے تھے، لیکن حضرت کے مکان سے دس بارہ آدمیوں کا کھانا آتا تھا جو متفرق مہمانوں کے سامنے رکھ دیا جاتا تھا۔ اسی میں سے حضرت تناول فرماتے تھے۔ مدرسہ کی کوئی چیز کھاتے نہیں دیکھا۔ مولانا عنایت الٰہی صاحب مہتمم مدرسہ شب وروز مدرسہ کے اندر رہتے اور ظہر کے وقت یا رات کے بارہ (۱۲) بجے اپنے دفتر کے کونے میں بیٹھ کر ٹھنڈا اور معمولی کھانا تنہا کھالیتے تھے۔

مولانا ظہور الحق صاحب مدرس مدرسہ اس زمانے میں مطبخ طعام کے منتظم ہوتے تھے اور چوبیس گھنٹے مطبخ کے اندر رہتے تھے لیکن سالن چاول وغیرہ کا نمک کسی طالب علم سے چکھواتے تھے، خود نہیں چکھتے تھے۔ جب وقت ملتا اپنے گھر جا کر کھانا کھا آتے۔ اسی طرح سے دیگر اکابر مدرسین کو میں نے کوئی شے مدرسہ کی چکھتے نہیں دیکھا۔

ان سب احتیاطوں کے باوجود حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ جب ۴۴ھ میں مستقل قیام کے ارادہ سے حجاز تشریف لے گئے تو اپنا ذاتی کتب خانہ یہ فرما کر مدرسہ کے اندر وقف کر گئے تھے کہ نہ معلوم، مدرسہ کے کتنے حقوق ذمہ رہ گئے ہوں گے۔

(۷)......میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے زمانے میں مدرسہ کا مطبخ جاری نہیں ہوا تھا نہ مدرسہ کے قریب کسی طباخ کی دوکان تھی، گھر والوں کے نہ ہونے کے زمانے میں جامع مسجد کے قریب ایک طباخ کی دکان تھی جس کا نام اسماعیل تھا۔ اس کے یہاں سے کھانا آیا کرتا تھا۔ سردی کے زمانے میں وہاں سے آتے آتے خصوصاً شام کو ٹھنڈا ہو جاتا تھا، تو سالن کے برتن کو مدرسہ کے حمام کے سامنے اندر نہیں بلکہ باہر رکھوا دیتے تھے، اس کی تپش سے وہ تھوڑی دیر میں گرم ہو جاتا تھا، تو یہ فرما کر دو تین روپے ہر ماہ چندہ کے اندر داخل فرمایا کرتے تھے کہ مدرسہ کی آگ سے انتفاع ہوا ہے۔ تنخواہ تو میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے سات سالہ قیام مدرسہ میں کبھی لی ہی نہیں۔

حضرت مولانا عنایت الٰہی کے دو قلمدان اور پنشن کا واقعہ:

(۸)......حضرت مولانا الحاج عنایت الٰہی صاحب مہتمم مدرسہ، اللہ ان کو بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے، مدرسہ کے مہتمم بھی تھے، مفتی بھی تھے اور عدالتی تمام کاروبار ان ہی کے ذمہ تھے اور اس معنی میں محصل چندہ شہر بھی تھے کہ محصل چندہ شہر جب کسی کے متعلق یہ کہتا کہ فلاں صاحب نے چندہ نہیں دیا، دو مرتبہ جا چکا ہوں تو حضرت مہتمم صاحب اپنے گھر آتے جاتے اس کے گھر جاتے اور خوشامد فرماتے کہ تمہارا چندہ نہیں آیا۔ ان کی خوبیوں کا بیان تو اس مختصر تحریر میں نہیں آ سکتا۔ لیکن دفتر کے اندر ان کے پاس دو قلمدان رہتے تھے، ایک ذاتی، ایک مدرسہ کا۔ ذاتی قلمدان میں کچھ

ذاتی کاغذ رہتے۔ اپنے گھر کوئی ضروری پرچہ بھیجنا ہوتا تو اپنے قلمدان سے لکھتے، مدرسہ کے قلمدان سے کبھی نہیں لکھتے تھے۔ گرمیوں میں سات بجے کے قریب اور سردیوں میں آٹھ بجے کے قریب آتے اور عصر کے بعد واپس تشریف لے جاتے۔ ساری دوپہر کام کرتے اور آتے ہوئے اہلِ چندہ کے گھر ہوتے ہوئے آتے۔ لیکن حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ نے ایک مرتبہ دوسرے ملازمین کی ترقی کے ساتھ یہ کہہ کر ان کی ترقی روک دی تھی کہ مدرسہ کے اندر دیر میں تشریف لاتے ہیں۔ میں نے ہر چند عرض کیا کہ حضرت چھ گھنٹے سے زیادہ کام کرتے ہیں بار بار سفارش اور اصرار بھی کیا، لیکن حضرت فرماتے رہے کہ مدرسہ کے اوقات کی پابندی ملازم کے لیے ضروری ہے۔

(۹)..... حضرت مہتمم صاحب کی جدوجہد اور جانفشانی، ہمہ تن مدرسہ کے امور میں اشتغال اتنے کثیر واقعات ہیں جو اس قابل تھے کہ ان کی مکمل سوانح لکھی جاتی۔

آخر زمانۂ حیات میں امراض کی کثرت اور ضعف کی وجہ سے میں نے یہ تجویز پیش کی کہ حضرت مہتمم صاحب کی پنشن ہو جائے۔ مہتمم صاحب مدرسہ کے ابتدائی قیام کے وقت میں ابتدائی طالب علموں میں تھے، اس کے بعد مُعین مدرس ہوئے اور ترقی فرماتے فرماتے مدرس دوم تک جا پہنچے، دورے کے اسباق بھی اس زمانے میں مرحوم کے یہاں ہوئے۔ ۲۳ھ سے باوجود مرحوم کے شدید انکار کے بضرورتِ مہتمم مقرر ہوئے اور اسی عہدے پر ۴۷ھ ۲۰ جمادی الثانیہ کو انتقال ہوا۔ غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ.

اخیر زمانہ میں ضعف و پیری کے علاوہ شدید امراض کا ابتلاء رہا۔ صبح کو ڈولی میں بیٹھ کر مدرسہ آتے اور بعد عصر ڈولی میں بیٹھ کر واپس تشریف لے جاتے۔ اس مشقت کو دیکھ کر مجھے ترس آتا تھا۔ میں نے تفصیلی حالات لکھ کر حضرات سرپرستانِ مدرسہ کی خدمت میں مرحوم کی خدماتِ جلیلہ کے پیش نظر خصوصی طور پر پنشن کی تجویز پیش کی تھی۔ حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سرپرست مدرسہ نے یہ تحریر فرمایا کہ ''مدرسہ کے موجودہ چندہ سے پنشن جائز نہیں ہے، اس کے لیے آپ ایک مستقل مد قائم کر کے چندہ کریں، اس میں سے پنشن دی جا سکتی ہے، مہتمم صاحب کے متعلق جو لکھا وہ بالکل صحیح ہے، میں اس سے زیادہ واقف ہوں، ان کے لیے جو تم مناسب سمجھو تنخواہ تجویز کر کے مخصوص احباب سے چندہ مقرر کرا لو۔ پانچ روپیہ ماہانہ میں اپنی ذات سے دوں گا۔''

حضرت سہارنپوری کی اسباق کی نگرانی:

(۱۰)..... حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کو اس کا بہت اہتمام تھا کہ مدرسین اسباق کے اوقات کی بہت پابندی فرماویں۔ حضرت کا قانون یہ تھا کہ گھنٹے کے پانچ منٹ بعد فوراً سبق شروع ہو جائے، اس سے پہلے شروع نہ ہو اور گھنٹے سے پانچ منٹ پہلے ختم ہو جائے تا کہ طلبہ کو ایک درس گاہ

سے دوسری درس گاہ جانے میں دقت نہ ہو اور سبق کا حرج نہ ہو۔ اس کے خلاف اگر کسی مدرس کی شکایت ہوتی تو حضرت کے یہاں سے مدرس سے جواب طلب ہوتا۔ حضرت قدس سرہٗ کا رعب جملہ مدرسین پر اتنا زیادہ تھا کہ بجائے سخت لفظ کہنے کے صرف پوچھ لینا ہی مدرس کے لیے کافی تھا۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ کو اس کا بھی بہت اہتمام تھا کہ اسباق اعتدال سے ہوں۔ حضرت اس کے نہایت شدید مخالف تھے کہ شروع میں لمبی چوڑی تقریریں ہوں اور آخر میں کتاب رمضانی تراویح کی طرح سے جلدی جلدی پڑھائی جائے، اس کی شکایت پر بڑے سے بڑے مدرس کو بھی تنبیہ سے گریز نہیں فرماتے تھے۔ اسی نظریہ کے ماتحت اور حضرت قدس سرہٗ کے آخری سہ سالہ زمانۂ تعلیم کے نقشوں کے موافق وہ نقشۂ تعلیم تیار کیا گیا جو عرصہ سے مدرسہ مظاہر علوم میں معمول بہ ہے۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں تعلیم کی نگرانی کا بھی ایک خاص معمول تھا جب طلبہ کی طرف سے کسی مدرس کی شکایت گزرتی تو حضرت قدس سرہٗ کی اپنی سہ دری میں جہاں حضرت تشریف فرما ہوتے تھے، عین سبق کے وقت مدرس کے پاس یہ پیغام پہنچتا کہ فلاں سبق گھنٹہ کے نیچے ہوگا۔ یہ ایک اصطلاحی لفظ اس زمانے میں بن گیا تھا، جس کی شرح یہ ہے کہ حضرت کہ سہ دری میں ایک گھنٹہ لٹکا ہوا تھا جو آج بھی ہے، مدرس گھنٹہ کے نیچے بیٹھتا اور طلبہ جن کی جماعت اس وقت چھوٹی ہوتی تھی مدرس کے تینوں طرف اور حضرت قدس سرہٗ اپنی جگہ حجرے کے سامنے تشریف فرما رہتے اور پورے گھنٹہ وہاں سبق ہوتا اور حضرت ساکت سنتے رہتے، سبق کے بعد اس وقت حضرت کچھ نہ فرماتے۔ اس کے بعد اگر طلبہ کی شکایت صحیح ہوتی اور معمولی ہوتی تو مدرس کو تنبیہ فرماتے اور اگر شدید ہوتی تو دو چار روز کے بعد وہ دوسرے مدرس کے یہاں منتقل کر دیتے اور اگر طلبہ کی شکایت غلط ہوتی تو معمولی سرغنوں کا کھانا بند اور اگر سخت ہوتی تو ان کا اخراج فرما دیتے۔ اس کا اثر ہمیشہ یہ رہا کہ مدرسین کو فکر رہتا کہ نہ معلوم سبق کب گھنٹہ کے نیچے پڑھانا پڑ جائے اور طلبہ کو بھی شکایت کے اندر بہت غور و فکر کی ضرورت ہوتی، کہ اگر حضرت کے نزدیک شکایت غلط ہوئی تو کھانا بند ہو جانا معمولی بات ہے اور اخراج کا امکان۔

اس کے علاوہ حضرت قدس سرہٗ کا یہ بھی معمول تھا کہ خصوصی مہمانوں کو مدرسہ دکھلانے کے لیے خود تشریف لے جاتے اور مہمان کو درس گاہ کے سامنے گشت کراتے ہوئے جس درس گاہ کے سامنے دل چاہے دس پندرہ منٹ کھڑے رہتے۔ اس ناکارہ کو گھنٹے والے قصے سے تو کبھی سابقہ نہیں پڑا، لیکن دوسرے مرحلے سے بارہا گزرنا پڑا۔ اس ناکارہ کو اپنی جوانی میں بخار وغیرہ امراض کی وجہ سے سبق ناغہ کرنے کی عادت نہیں تھی۔ ایک دفعہ مشکوٰۃ شریف کا سبق نہایت شدتِ بخار کے اندر پڑھا رہا تھا، مُصَرَّاۃ کی بحث تھی اور میں اپنے بخار کے دوران میں زوروں پر تھا۔ اس زمانے کے

سفیر ہند مقیم جدہ مدرسہ میں تشریف لائے حضرت ان کو مدرسہ دکھلانے خود تشریف لے گئے اور دارالحدیث کے سامنے جہاں مشکوٰۃ ہورہی تھی تقریباً پندرہ منٹ سے زیادہ قیام فرمایا، مجھے حضرت کے کھڑا ہونے کا بالکل علم نہ ہوسکا، دفعۃً حضرت قدس سرہٗ پر نظر پڑی اور زبان لڑکھڑا گئی اور حضرت فوراً آگے بڑھ گئے۔ بعد میں طلبہ نے بتایا کہ حضرت تقریباً پندرہ منٹ سے کھڑے تھے۔

اخبار بینی سے نفرت:

(۱۱)......اس ناکارہ کی ابتدائی مدرسی کے زمانے میں مظاہرعلوم کا کوئی طالب علم اخبار دیکھنا جانتا ہی نہیں تھا۔ دارالعلوم کے بھی دو چار طالب علموں کے علاوہ کوئی نہ جانتا تھا کہ اخبار کیا چیز ہے، اس زمانے میں ہم لوگوں کے تفریحی معمولات اکابرِ سلسلہ کی کتب بینی تھی۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصانیف گویا ہم لوگوں کے لیے اخبار تھے۔ عام طور سے مدرسین اور اوپر کے طلبہ کے شوق وذوق ان اکابر کی کتابوں کا مطالعہ تھا۔

اب اس مبارک مشغلہ کے بجائے اخبارات، لغویات، دوستوں کا مشغلہ رہ گیا ہے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجا ست تا بہ کجا

صاحب کے طالب علمی کے واقعات:

(۱۲)......حضرت اقدس مولانا الحاج شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری نوراللہ مرقدہٗ نے اپنی طالب علمی کے واقعات بہت ہی کثرت سے سنائے یہ ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ سردی میں کوئی کپڑا سردی کا نہیں تھا، کسی سے اظہار کو غیرت مانع تھی۔ اس کی انتہائی کوشش میں رہتا تھا کہ اس کی کسی کو خبر نہ ہو۔ جب تک مسجد کے کواڑ کھلے رہتے حمام کے سامنے سینکنے کے بہانے سے بیٹھا رہتا اور جب سب چلے جاتے تو مسجد کے اندر زنجیر لگا کر مسجد کی صف کے ایک کونے پر لپٹ کر کروٹیں بدلتا ہوا دوسرے کونے تک پہنچ جاتا، وہی صف اوڑھنا بچھونا بن جاتی تھی۔ سر اور پیروں کی طرف سے خوب ہوا لگتی رہتی تھی۔ تہجد کے وقت اسی طرح کروٹیں بدلتا ہوا دوسری جانب آجاتا صف بچھ جاتی۔ پھر ارشاد فرمایا وہ سردی تو گزر گئی لیکن اللہ کے فضل سے اس کے بعد کوئی سال ایسا نہیں گزرا کہ مالک کی طرف سے ایک دو لحاف عمدہ ہدیہ کے اندر نہ آئے ہوں۔ حضرت نوراللہ مرقدہٗ نے اپنی طالب علمی کی جدوجہد اور رائپور کی ابتدائی حاضری کے واقعات اتنی کثرت سے سنائے کہ ان کے لکھنے کے واسطے بڑا دفتر چاہیے۔

حضرت نے ارشاد فرمایا کہ سہارنپور کی طالب علمی کے دور میں داخلہ بند ہو چکا تھا مطبخ تو

مدرسہ کے اندر اس وقت تک قائم ہی نہیں ہوا تھا۔ طلبہ کو وظیفہ ملا کرتا تھا، دار الطلبہ بھی نہیں بنا تھا، اس لیے طلبہ کا قیام مساجد میں رہتا تھا۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ایک مسجد میں ہمارا پانچ آدمیوں کا قیام تھا، ایک طالب علم امام تھا، اس کا کھانا محلّہ سے آتا تھا اور دو کا وظیفہ مدرسہ سے تھا، وہ اسباق سے فارغ ہونے کے بعد اپنی روٹی خود ہی پکایا کرتے تھے، کبھی دال بھی پکا لی ورنہ چٹنی، تین آدمیوں کا کھانا ہم پانچ آدمی کھایا کرتے تھے۔ پیٹ صرف اس دن بھرتا تھا جب کہ محلّہ میں کسی جگہ دعوت ہوتی تھی یا جمعرات وغیرہ کو مسجد میں کوئی اور کچھ دے جائے ورنہ آدھی بھوک ہی اکثر کھانے کی نوبت آتی تھی۔

حضرت نے موجودہ طلبہ کے ہنگاموں پر کئی مرتبہ ارشاد فرمایا کہ یہ تم لوگوں نے مطبخ جاری کر کے کیا ہے۔ دونوں وقت پکی پکائی بے فکری سے ملتی ہے، اس لیے کبھی روٹی کچی مل جاتی ہے، کبھی سالن ناپسند ہو جاتا ہے۔ ہم لوگوں کو اسباق کے بعد اس زمانے میں اپنی اپنی روٹی پکانے کی فکر پڑ جاتی تھی اپنے ہی ہاتھ سے طلبہ عام طور سے پکاتے تھے، کچی پکی جیسے پک جاتی تھی اسی کو غنیمت سمجھتے تھے، اپنی پکائی ہوئی ہوتی تھی اس میں عیب نہیں نکلتا تھا اب مطبخ سے پکی پکائی ملے ہے، سینکڑوں عیوب اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور شکم سیر روٹی کھا کر لغویات کی سوجھے ہے، ہم لوگوں کو اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ خرافات کی سوجھے۔ حدیث پاک کے اندر بھی اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

"اَلَا یُوْشَکُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلیٰ اَرِیْکَتِہٖ یَقُوْلُ عَلَیْکُمْ بِھٰذَا الْقُرْآنِ فَمَا وَجَدْتُمْ فِیْہِ مِنْ حَلَالٍ فَاَحِلُّوْہُ فَمَا وَجَدْتُمْ فِیْہِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْہُ وَاِنَّمَا حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ کَمَا حَرَّمَ اللّٰہُ." (الحدیث)

ترجمہ: "عنقریب ایک زمانہ آئے گا کہ ایک آدمی پیٹ بھرا اپنے مزین تخت پر بیٹھا ہوا کہے گا کہ بس قرآن پاک کو مضبوط پکڑو، ہم صرف اسی کو مانیں گے جو حلال و حرام قرآن میں ہے۔ حالانکہ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ ایسی ہی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہیں۔" (مشکوٰۃ بروایت ابی داؤد)

ارشاد مبارک، ان لوگوں کے بارے میں ہے جو حدیث شریف کا انکار کرتے ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا کہ یہ ساری باتیں پیٹ بھرائی اور پیسے سے پیدا ہوتی ہے۔ فقر و فاقہ میں لغویات اور خرافات کی نہیں سوجھتی۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ اپنے رائپور کی حاضری کے ابتدائی دور کے قصے بھی بہت ہی لطف اور مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے، کیونکہ اپنے شیخ حضرت اقدس مولانا شاہ عبد الرحیم صاحب رائپوری قدس سرہٗ کے خادم خاص تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شیخ قدس سرہٗ کو لٹانے کے بعد

جب دو پہر کو حضرت آرام فرماتے تو میں کواڑ بند کر کے مہمانوں کے کھانے پکنے کی جگہ جاتا، معز الدین مرحوم جو بڑے حضرت کے مہمانوں کے کھانے پکانے کے منتظم تھے وہ سب مہمانوں کو کھلا کر مطبخ بند کر کے اپنے گھر چلے جاتے، میں وہاں جا کر دیکھتا کبھی ایک آدھ روٹی بچی ہوئی ہوتی، سالن کی دیگچیوں سے پونچھ کر کھالیتا اور کبھی کچھ بھی بچا ہوا نہیں ہوتا تھا تو سوکھے ہوئے ٹکڑے طاقوں وغیرہ میں رکھے ہوئے مل جاتے تھے ان کو پیالے میں ڈال کر پانی میں بھگو کر نمک ڈال کر اور اگر نمک نہ ملتا تو بغیر نمک ہی کے کھالیا کرتا تھا، کبھی پیٹ بھرتا کبھی نہ بھرتا کسی دوسرے سے تو کیا کہتا میں نے کبھی معز الدین مرحوم سے یہ بھی نہیں کہا کہ تم نے میرے واسطے روٹی نہیں رکھی اور بھی اس قسم کے واقعات سنا کر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کے خدام کے لیے اگر کھانا نہ بچے تو منتظم کی جان کو آجائیں۔

لکھنے کا واقعہ حضرت حاجی صاحب کا:

(۱۳)......میرے چچا جان مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے مجھے ایک مرتبہ کارڈ لکھا کہ کئی دن سے تم کو ایک ضروری خط لکھنے کا تقاضا تھا، مگر میرے پاس کوئی پیسہ نہ تھا، قرض لینے کو دل نہ چاہا۔ آج اللہ نے پیسے عطا فرمائے ہیں تم کو خط لکھ رہا ہوں۔

اور سید الطائفہ حضرت الحاج مولانا امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک قصہ تو مشہورِ عالم ہے کہ مکہ مکرمہ میں کئی دن کے فاقوں کے بعد ایک ایسے مخلص دوست سے جس سے بڑے تعلقات بھی تھے دو ہلل قرض مانگے تھے اس نے عذر کر دیا، اس پر حضرت کو بہت ہی رنج و قلق ہوا کہ کیوں مانگے تھے۔ اس کے بعد حضرت قدس سرہٗ نے خواب میں دیکھا کہ ابتلاء کا دور ختم ہو گیا اب فتوحات کا دور ہے، پھر جو فتوحات ہوئیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ ہم لوگوں سے ذرا بھی تکلیف برداشت نہیں ہوئی۔

(۱۴)......یہ واقعہ جو آگے لکھوا رہا ہوں میرے سامنے کا تو نہیں ہے مگر میرے ایک عزیز مرحوم نے کئی بار سنایا کہ وہ دہلی کی کسی مسجد میں امام تھے اور چچا جان قدس سرہٗ کا ابتدائی دور تھا، وہ ایک مرتبہ رمضان میں یہ سمجھ کر کہ چچا جان دلی کے پیر ہیں رمضان میں بہت فتوحات ہوتی ہوں گی وہ ظہر کے بعد عصر کے وقت نظام الدین پہنچے۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا معمول عصر کے بعد سے مغرب تک ذکر بالجہر کا تھا، عین افطار کے وقت خدام سے پوچھتے کہ کوئی چیز افطاری کو ہے؟ جو ماحضر ہوتا خدام پیش کر دیتے اور جو کچھ کھانا ہوتا مغرب کے وقت ہی تناول فرما لیتے، وہی افطاری ہوتی اور وہی افطاری کے بعد کا کھانا۔ جب افطار کا وقت ہو گیا اور چچا جان نے حسبِ معمول پوچھا کہ لاؤ بھائی کچھ ہے کسی نے کہا کہ حضرت کچھ اور تو ہے نہیں کل کے گولر بچے ہوئے ہیں۔ چچا جان

نے فرمایا کہ واہ واہ، واہ واہ ضرور لاؤ میرے عزیز بھی شریک ہوگئے چچا جان نے چار پانچ گولر کھا کر اور پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کیا، مغرب کی نماز پڑھائی اور نفلوں کے اندر مشغول ہوگئے۔ عشاء کی اذان تک حسب معمول نفلیں پڑھتے رہے، اذان کے قریب فارغ ہوکر تھوڑی دیر لیٹے، پھر عشاء اور تراویح بڑے اطمینان سے پڑھائیں۔ وہ غریب عزیز سوچتا ہی رہا کہ کھانے کا نمبر کب کو آئے گا۔ نظام الدین رکے رہنے والے طلبہ اپنا کھانا خود پکاتے تھے اور پکانے کے بعد ایک ایک دو دو روٹی ان کو تقسیم ہوجاتی تھی، وہ اپنے ہاتھ پر رکھ کر کھا لیتے تھے، چچا جان کو تو کیا احساس ہوا ہوگا مگر ان عزیز نے رات بڑی مشکل سے گزاری۔ سحر کے وقت پھر وہی افطاری والا منظر تھا اور وہی گولروں کا لوٹا تھا اور وہی سحری اور وہی شکر۔ صبح کی نماز کے بعد اس عزیز نے دلی آنے کی اجازت چاہی۔ چچا جان بہت ہنسے اور فرمایا کہ بالکل اجازت نہیں ہے۔ اس نے اپنی ضروریات کا بہت اظہار کیا مگر انہوں نے منظور نہیں فرمایا۔ غریب نے سارے دن روزہ پر روزہ چند گولروں کے سحر و افطار کے ساتھ رکھا تھا، کہا کرتا تھا کہ جو کچھ میرے اوپر گزری تھی میں ہی جانتا تھا۔ دوسرے دن عصر کے بعد وہی ذکر کا منظر تھا اور مرحوم عزیز کہا کرتا تھا کہ میری جان کو بن رہی تھی کہ اب پھر وہی گولر آئیں گے۔ قبیل المغرب دہلی سے ریڑھی پر رکھی ہوئی نہایت لذیذ مرغن بریانی کی ایک دیگ آئی جس کی خوشبو سے ساری مسجد مہک رہی تھی۔ چچا جان نے افطار کے وقت فرمایا کہ "آؤ بھائی لطیف! یہ بریانی تمہارے ہی واسطے آئی ہے۔" مرحوم کہا کرتا تھا کہ دوسرے دن افطار و سحر میں اتنی رغبت اور لذت سے پیٹ بھر کر کھائی کہ عمر بھر یاد رہے گی۔

صرف روٹی پہ گزارا کرنا:

(۱۵)...... میری دادی کے نانا حضرت مولانا مظفر حسین صاحب قدس سرہٗ کے نام نامی سے ابھی تک ہندو پاک کے ہزاروں آدمی واقف ہیں، ان کی طالب علمی کا ابتدائی دور دہلی میں گزرا، بازار سے کھانا خرید کر کھایا کرتے تھے لیکن صرف روٹی خریدتے تھے، سالن کبھی نہیں خریدتے تھے اور بغیر سالن کے خشک روٹی کھایا کرتے تھے، اس لیے کہ اس زمانے میں دہلی کی دکانوں میں جو سالن پکتا تھا اس میں اچور کا ڈالنا لازم تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ آموں کے باغوں کی بیع قبل از بدوِ صلاح ہوتی ہے جو جائز نہیں ہے، اس لیے سالن سے کبھی روٹی نہ کھاتے تھے۔ اس کا اثر تھا کہ کسی مشتبہ مال کو حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کا معدہ قبول نہیں کرتا تھا، اگر کسی جگہ غلطی سے بھی مشتبہ مال کھانے کی نوبت آجاتی تو فوراً قے ہوجاتی تھی۔ بہت سے واقعات اس سلسلہ کے حضرت مرحوم کے مشہور و معروف ہیں۔ حضرت مرحوم کے کچھ حالات "تذکرۃ الخلیل" میں، جو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کی سوانح ہے، جس میں حضرت مولانا مظفر حسین صاحب، حضرت

اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری، حضرت شیخ الہند، مولانا محمود الحسن صاحب اور میرے والد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب، حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھوی خلیفہ حضرت گنگوہی قدس سرہم کے حالات بھی مختصر طور پر ذکر کیے گئے ہیں مذکور ہیں۔ ان بزرگوں کے حالات نیز حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی قدس سرہما، حضرت شیخ الہند، حکیم الامت مولانا تھانوی نور اللہ مراقدہم کی سوانح مستقل شائع ہو چکی ہیں جن سے ان حضرات کے مجاہدات، تقویٰ وطہارت، دنیا سے بے رغبتی، آخرت کے اندر ہمہ تن مشغولی مفصل موجود ہے۔ احباب کو ان کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے، ان اکابر کے حالات سے سبق لینا چاہیے کہ دنیا کی زندگی چاہے جتنی بھی زیادہ ہو جائے بہرحال ختم ہونے والی ہے، موت سے کسی کو چارہ نہیں ہے اور آخرت کی زندگی دائمی ہے کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ سمجھ دار اور عقلمند کا کام ہے دائمی زندگی کے لیے جو کچھ کرسکتا ہو کر لے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''خدا کی قسم! میں تم لوگوں پر فقیر کا اندیشہ نہیں کرتا، مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ دنیا تم پر پھیل جائے گی جیسا کہ پہلوں پر پھیل چکی ہے اور تم اس میں دل لگا بیٹھو گے جیسا کہ وہ لوگ لگا بیٹھے ہیں اور یہ دنیا تم کو بھی ایسے ہی ہلاک کر دے گی جیسے ان لوگوں کو ہلاک کیا ہے۔'' (مشکوۃ بروایت شیخین)

ان حضرات اکابر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشادات کو دل میں جگہ دے رکھی تھی اور ان پر عمل کر کے دکھلا دیا۔ ہم لوگوں کو نہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر عمل کی توفیق، نہ ان اکابر جن کے ہر قول و فعل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، کے اتباع کی امنگ اور شوق۔

فالی اللہ المشتکیٰ

أُولٰئِکَ آبَائِیْ فَجِئْنِیْ بِمِثْلِهِمْ
إِذَا جَمَعَتْنَا یَا جَرِیْرُ الْمَجَامِعُ

خدا یاد آئے جن کو دیکھ کر وہ نور کے پتلے
نبوت کے یہ وارث ہیں یہی ہیں ظلِّ رحمانی
یہی ہیں جن کے سونے کو فضیلت ہے عبادت پر
انہیں کے اتقا پر ناز کرتی ہے مسلمانی
انہیں کی شان کو زیبا نبوت کی وراثت ہے
انہیں کا کام ہے دینی مراسم کی نگہبانی
رہیں دنیا میں اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہوں

پھریں دریا میں اور ہرگز نہ کپڑوں کو لگے پانی
اگر خلوت میں بیٹھے ہوں تو جلوت کا مزہ آئے
اور آئیں اپنی جلوت میں تو ساکت ہو سخن دانی

لکھنے کو بہت جی چاہتا ہے مگر اس کے لیے تو بڑے دفتر چاہیں، نمونہ کے لیے یہ بھی کافی ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

فقط
محمد زکریا
مظاہر علوم سہارنپور
۱۵ ربیع الآخر ۸۸ھ

اضافات بر حواشی وغیرہ یکم شعبان المعظم ۱۳۹۶ھ جمعۃ المبارک

جس میں

حضرت اقدس شیخ الحدیث، عارف کبیر
مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہٗ کے
طفولیت تعلیم، تدریس، تالیف کے حالات
تفصیل سے ذکر کیے گئے ہیں۔

مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ، شاہ فیصل کالونی نمبر ۴ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم ط

یہ رسالہ جیسا کہ اس کی تمہید سے معلوم ہوگا آپ بیتی نمبر۲ تجویز تھا اور لکھتے وقت ابتداءً خیال یہی تھا کہ جس طرح اس کے حصہ نمبر۱ کے درمیان مختصراً واقعات آئے ہیں ایسے ہی اس میں بھی آجائیں گے اور اسی کے برابر آپ بیتی نمبر۲، و نمبر۳ میں علی گڑھ کے قیام میں جتنے واقعات متفرق یاد آتے رہیں گے لکھواتا رہوں گا۔ مگر اس کے شروع ہی میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مضامین کو الگ الگ فصول اور ابواب میں تقسیم کر دیا جائے اور شروع ہی میں آٹھ باب ذہن میں آگئے تھے اور علی گڑھ کے چندروزہ قیام میں آٹھوں بابوں پر کچھ اجمالی اور کچھ تفصیلی واقعات لکھے جا چکے تھے یہاں آکر جب اس کو صاف نقل کرایا تو وہ مستقل ایک طویل رسالہ بن گیا۔ اس لیے متعدد دوستوں بالخصوص مولوی عبدالرحیم متالا سلمہٗ کا اصرار ہے کہ اس کو اول کا جزء نہ بنایا جائے بلکہ اس کو مستقل ایک رسالہ یادِایام کے نام سے شائع کرایا جائے کہ اس کے مضامین اول سے بہت مختلف ہیں۔ اس لیے اس کا نام آپ بیتی نمبر۲ یا یادِایام نمبر۱ سے موسوم کرتا ہوں اور چونکہ یہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اس لیے خیال ہے کہ ہر نمبر میں دو دو باب آجائیں گے جو معتدل اور مناسب رسالوں کی شکل میں شائع ہو سکیں گے۔

فقط والسلام

محمد زکریا کاندھلوی

۱۵ شعبان المعظم ۱۳۹۰ھ

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

باب اول

اعمال کا مدار نیتوں پر ہے

[فَاعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنِ] [لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَ لٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ] ”اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ، وَ اِنَّمَا لِاِمْرِیءٍ مَّانَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَ مَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوْ اِلٰی امْرَأَۃٍ یَنْکِحُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ“

ترجمہ: اللہ جل شانہٗ کا پاک ارشاد ہے کہ ”اس کی عبادت اخلاص کے ساتھ کرو اور یہ کہ اس کے پاس قربانی کا گوشت یا اس کا خون نہیں پہنچتا، بلکہ اس کے پاس تقویٰ اور پرہیزگاری پہنچتی ہے۔“

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ ”اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور آدمی کو وہی ملتا ہے جس کی وہ نیت کرے۔ جس کی ہجرت اپنی نیت کے اعتبار سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی۔ اللہ کے نزدیک اور مال کے اعتبار سے بھی اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوگی اور جس کی ہجرت دنیا یا کسی عورت سے نکاح کی غرض سے ہوگی اس کی ہجرت بھی اسی کی طرف ہوگی جس کی نیت کی ہو۔“

یہ حدیث پاک بڑی جامع ہے۔ بعض علماء نے اس حدیث کو آدھا علم کہا ہے۔ بلکہ میرے نزدیک تو تصوف سارا کا سارا یہی ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

حدیث پاک میں دو جملے ارشاد فرمائے گئے ہیں کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جس کی نیت کرے۔ دوسرا مرحلہ پہلے کی تائید بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ اکثروں نے کہا ہے اور مستقل دوسرا مضمون بھی ہوسکتا ہے اور یہ زیادہ اچھا ہے اور وہ یہ کہ آدمی کسی نیک کام میں جتنی نیتیں کرلے اللہ تعالیٰ سب ہی کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔ مولانا نواب قطب الدین صاحب نے مظاہر حق میں اس کی بہت سی مثالیں لکھی ہیں۔ مثلاً مسجد کے جانے میں بہت سی نیتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ نیت اعتکاف کی کرے اور اس کے ساتھ اس کی بھی نیت کرے کہ رب کریم کے گھر حاضری ہے اور کریم اپنے یہاں آنے والوں کا اکرام کرتا ہی ہے۔ اسی سے نماز کے انتظار میں جتنی

دیر بیٹھے گا اس کا مستقل ثواب ہوگا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص نماز کے انتظار میں رہتا ہے وہ نماز ہی میں رہتا ہے اور یہ کہ اس مقام پر آنکھ، کان اور دیگر اعضاء کی معاصی سے حفاظت کا مقام ہے کہ بازار وغیرہ میں یہ سب اعضاء کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا رہتے ہیں، ان سے حفاظت کی نیت کرے کہ اس کا مستقل ثواب ہوگا اور یہ نیت کرے کہ اس پاک جگہ میں دعا درود پڑھتا رہوں گا اس کا مستقل ثواب ہے اور یہ نیت بھی کرلے کہ یہاں یکسوئی اور کمال توجہ الی اللہ نصیب ہوگی جس کا مستقل ثواب ہے اور یہ بھی نیت کرلے کہ وضو کرکے نماز کے لیے جانے کا ثواب حج اور عمرہ کا ہوتا ہے اور یہ بھی نیت کرلے کہ امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور علم حاصل کرنا اور علم سکھانا مجمع کی وجہ سے مسجد میں میسر ہوتا ہے اور یہ بھی نیت کرے کہ مسلمانوں سے ملاقات ہوگی کہ مستقل عبادت ہے اور انہیں سلام کرنے کا موقع ملے گا اور آخرت کے امور میں اللہ کی بارگاہ میں مراقبہ اور فکر کا موقع ملے گا اور اسی طرح سے بہت سے امور پیدا ہو سکتے ہیں اور جتنے امور کی آدمی نیت کرلے گا ان کا مستقل ثواب ملے گا۔ مالک کے یہاں عطا میں کوئی کمی نہیں ہے:

تو وہ داتا ہے کہ دینے کے لیے
درترے رحمت کے ہیں ہردم کھلے

تقریباً تین سال ہوئے عزیز مولوی سید محمد ثانی ندوی لکھنوی نے عزیز گرامی قدر و منزلت مولانا الحاج محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح لکھی تھی، اس کا ایک باب اس سیہ کار کے متعلق تھا، مکرم محترم مولانا الحاج ابوالحسن علی میاں صاحب نے خود اپنے دستِ مبارک سے لکھا تھا۔ ساری کتاب کا مسودہ تو طباعت سے پہلے وقتاً فوقتاً مجھے دکھایا گیا، لیکن اس باب کا مجھ سے اخفا کیا جو طبع ہونے کے بعد دیکھا، جس پر میں نے عزیز مولوی محمد ثانی سلمہ کو لکھا کہ تم نے اس باب کا اضافہ کرکے ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگا کر ساری کتاب ہی کو بدنما کر دیا اور میں نے اس پر تنقید کے طور پر ایک خط لکھا، جس میں لکھا کہ جو باتیں لکھنے کی تھیں وہ تو آپ نے لکھی نہیں اور جو نہ لکھنے کی تھیں وہ لکھ دیں وہ بھی مختصر اور اجمال کے ساتھ اور میں نے چند واقعات جو میرے نزدیک قابلِ تحریر تھے لکھ کر عزیز موصوف کو دیے، جن کو سن کر بعض دوستوں کا اصرار ان کی طباعت پر ہوا۔ وہ اس قابل نہیں تھی کہ مستقل چھپتی لیکن دوستوں کے شدید اصرار پر میں نے دو سال ہوئے اسے اپنے رسالہ اسٹرائک کا جزء بنا کر آپ بیتی کے نام سے شائع کر دیا۔

اس وقت سے دوستوں کا برابر تقاضا ہے کہ وہ بہت مختصر ہے، اس پر کچھ مزید اضافہ ضرور کیا جائے، بالخصوص گزشتہ سال سفرِ حجاز سے واپسی میں رائے ونڈ کے طلبہ عزیز نے تو بہت ہی زیادہ اصرار کیا اور یہ بھی بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے اس رسالہ کو اساتذہ سے سبقاً سبقاً بار بار پڑھا اور ان

کے اساتذہ نے بھی اس کی تصدیق وتوثیق کی۔ لیکن یہ کوئی علمی مشغلہ نہیں تھا، جس کے لیے بہرحال وقت نکالنا ضرور ہوتا کہ مجھے اپنی آنکھوں کی معذوری کے باوجود رسالہ ''جزء الحج والعمرۃ'' کا زیادہ اہتمام ہورہا تھا اور اسے اکثر اوقات پڑا پڑا سنتا تھا کہ مجھے ۱۰ جمادی الثانی ۹۰ ھ مطابق ۲۲ اگست ۷۰ء کو علی گڑھ کے ہسپتال میں اپنی آنکھ کے علاج کے سلسلے میں دوبارہ جانا پڑا کہ پہلی مرتبہ ۲۹ ذی الحجہ ۸۹ ھ مطابق ۸ مارچ ۷۰ء کو آپریشن کے لیے جانا ہوا تھا اور ۱۴ مارچ کو آپریشن ہوا تھا، لیکن اس وقت تو بات کرنے کی اور خط وکتابت کی بھی ممانعت تھی، مگر آنکھ میں صفائی نہ آنے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ تین دن کے لیے بلایا تھا کہ تین دن کے معائنہ کے بعد وہ بتلائیں گے کہ مزید قیام کی ضرورت ہے یا نہیں؟ چنانچہ ڈاکٹروں نے، اللہ ان سب ہی کو جزائے خیر دے، تین چار دن تک ہر جزءِ بدن کے معائنے کیے بعد میں معلوم ہوا کہ مجھے دس بارہ دن یہاں قیام کرنا ضروری ہے، ان ایام میں خالی پڑے پڑے مجھے خیال ہوا کہ دوستوں کی اس فرمائش کو پورا کردوں اور جو کچھ ان ایام میں ہوسکے ان کو لکھ کر آپ بیتی نمبر۲ بنادوں، پھر اگر کبھی مقدر میں ہوا تو نمبر۳ کی بھی گنجائش ہے۔ اس لیے آج ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳۹۰ھ بمطابق ۲۶ اگست ۷۰ء چہارشنبہ کو بسم اللہ کرادی۔

چونکہ ہر ایک گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد ڈاکٹروں کی آمد ہوتی ہے اور انجکشنوں اور معائنوں کا سلسلہ رہتا ہے اس لیے مسلسل وقت ملنا تو یہاں بھی دشوار ہے تاہم چونکہ یہ خیال ہے کہ خبر نہیں یہاں کتنا قیام ہے اس لیے جو وقت بے کار جائے اس میں کوئی کام کی چیز آجائے۔

اگرچہ ڈاک نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا، کل ایک مہمان جو سہارنپور سے آئے ہیں وہ ایک دن کی ڈاک باون (۵۲) خطوط ہندی، پاکی، مکی، مدنی، لندن اور افریقی وغیرہ لے کر آئے ہیں، جن کے سننے میں بھی کئی دن لگیں گے اور آج رات کو ایک اور صاحب آرہے ہیں، دیکھئے وہ کتنے خط لاویں۔ اس کے باوجود جتنا بھی وقت ملتا رہا دن میں اور رات میں اس کا مسودہ لکھا گیا۔ چونکہ رات کو نیند بہت کم آتی تھی اس لیے رات کو وقت زیادہ ملتا تھا اللہ تعالیٰ دوستوں کو جزائے خیر دے کہ وہ بھی میری وجہ سے اپنی نیند ضائع کرتے تھے۔

وہاں کے اٹھارہ روز کے قیام میں جو اس کی ابتداء کے بعد سے ۱۳ ستمبر تک ہوئے، آٹھ بابوں کا مسودہ تقریباً تیار ہوگیا، جن میں سے بعض ابواب کے مضامین تو پورے آگئے اور بعض ابواب کے مضامین بطورِ فہرست جو یاد آتے رہے وہ لکھے گئے، تکمیل سہارنپور آنے کے بعد ہوئی۔

ان میں سب سے پہلا باب ''حسنِ نیت'' کے متعلق ہے۔ دوسرا ''درس وتدریسِ مظاہر علوم وتالیفات'' کے متعلق ہے۔ تیسرا ''اپنی چند بری عادتوں کا بیان'' ہے۔ چوتھا جو درحقیقت تیسرے باب ہی کا جز ہے ''حوادث اور شادیوں میں اپنا معمول''۔ پانچواں ''تحدیث بالنعمۃ'' ہے۔ چھٹے

میں ''اپنے بچوں کی کچھ تفصیلات''، جو درحقیقت میں پانچویں ہی باب کا جز ہے۔ ساتواں باب ''تقسیم ہند'' اور آٹھواں باب ''متفرقات''۔ ان میں بعض اجمالاً اور بعض تفصیلاً علی گڑھ میں لکھے جاچکے تھے، شاید کبھی موقع ہو تو ان پر اضافہ بھی ہو جائے۔

پہلا باب جس کے متعلق قرآن پاک کی دو آیتیں اور ایک حدیث پاک بھی لکھی جاچکی ہے وہ ایمان واسلام، احسان وسلوک سب ہی کا لُبِّ لُباب ہے اور خلاصہ ہے۔ چند واقعات اس سلسلے میں یاد آگئے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا سوال اور بندہ کا جواب:

(۱)...... مولانا حبیب الرحمٰن رئیس الاحرار کے دیکھنے والے تو ابھی بہت ہوں گے اور نام سننے والے تو بہت زیادہ۔ منتہاء میں تو مرحوم کو مجھ سے بہت زیادہ محبت ہوگئی تھی اور تعلق اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ وہ بجائے دہلی کے سہارنپور میرے پاس رہنے کی تمنائیں بڑی کثرت سے کیا کرتے تھے بلکہ اصرار بھی اور میں اپنے بےکار اور ان کے باکار ہونے کی وجہ سے اس کو کبھی قبول نہیں کرتا تھا۔ لیکن ابتداء میں میرے اور مرحوم کے تعلقات بہت ہی خراب تھے۔ ان کی تو مظاہر میں کبھی ان زمانے میں آمد نہیں ہوتی تھی۔ لیکن مجھے دیوبند بھی کبھی حضرت قدس سرہٗ کا فرستادہ بن کر کتب خانے سے کسی کتاب کی تلاش میں یا محترمین مہتممین رحمہم اللہ تعالیٰ سے کسی بات پر مشورہ کے لیے جانا ہوتا تھا۔ ایک بجے والی سے جانا ہوتا تھا اور ہمروزہ واپسی کے ارادہ سے جانا ہوتا تھا۔

رئیس الاحرار صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مجھ سے بہت واقف تھے کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں۔ مدرسہ کا مدرس ہوں اور میں ان سے صرف تنا واقف تھا کہ لدھیانہ کا کوئی طالب علم جس کو پڑھنے پڑھانے سے کوئی تعلق نہیں لیڈری کرتا تھا، وہ چونکہ گھومتے رہتے تھے اس واسطے میری دیوبند کی ہر مرتبہ کی آمد پر دو تین مرتبہ ان کا سامنا ہوتا اور وہ بہت ہی چلا کر مجھے سنا کر بہت ناراضی کا اظہار کیا کرتے تھے، اس لیے کہ انہیں معلوم تھا کہ میں سیاست سے بالکل بے تعلق، اخبار بینی کا دشمن ہوں اور اس زمانے میں دیوبند، سہارنپور میں اخبار بینی آئی بھی نہیں تھی۔ سہارنپور کا کوئی طالب علم یا مدرس تو اخبار بینی جانتا ہی نہ تھا کہ کیا بلا ہے۔ حضرت قدس سرہٗ کی چارپائی پر عصر کے بعد دو چار اخبار پڑے رہتے تھے جن کو کوئی باہر کا مہمان اٹھا کر دیکھ لیتا تھا۔ دیوبند میں مولانا اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے ہمنوا تو نہایت مخالف اور اخبار بینی کے دشمن۔ لیکن مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ مدرسین کوئی ایک آدھ دیکھ لیتا تھا۔ رئیس الاحرار صاحب مرحوم جب مجھے دیکھتے، دور سے چلا کر کہتے ''ایسے شخص کا وجود زمین پر بوجھ ہے، یہ مرکیوں نہیں جاتے، ان کے لیے زمین کا اندرون زمین کے بیرون سے بہتر ہے۔'' وغیرہ وغیرہ اور اس ناکارہ کی اتنی جرأت تو نہیں ہوتی

تھی کہ پکار کر کچھ کہتا۔ مگر ایک دو طالب علم جو مجھے دیکھ کر میرے ساتھ ہو لیتے تھے ان سے پیاماً کہلوا دیتا تھا کہ ''اس شخص کو مدرسہ کی روٹی کھانا حرام ہے، مدرسہ کا چندہ لیڈری کے واسطے نہیں آتا۔ جس شخص کو پڑھنے پڑھانے سے کوئی واسطہ نہ ہو، مطالعہ سبق سے کوئی کام نہ ہو اس کو مدرسہ کی روٹی کھانا حرام ہے۔ مدرسہ کے اندر قیام ناجائز ہے۔ مدرسہ کی ہر قسم کی اعانت حاصل کرنا گناہ ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ اس پیام پر مرحوم اور بھی زیادہ برافروختہ ہوا کرتے۔ کئی سال یہی قصہ رہا۔

مگر اللہ جل شانہٗ نے مرحوم کی دستگیری فرمائی کہ اعلیٰ حضرت قدوۃ الاتقیاء فخر الاولیاء حضرت مولانا الحاج شاہ عبدالرحیم رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے اخیر زمانہ حیات میں حضرت قدس سرہٗ سے حضرت الحاج شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے کہ اس زمانے کا دستور یہی تھا کہ اعلیٰ حضرت سے جو شخص بیعت ہونا چاہتا تھا، ضعف ونقاہت کی وجہ سے حضرت خود تو نہ فرماتے تھے، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ بیعت کے الفاظ کہلا دیتے تھے۔ بڑوں کے ہاتھ میں ہاتھ دینا اثر سے خالی نہیں جاتا۔ چنانچہ یہ تعلق رنگ لائے بغیر نہیں رہا اور اخیر میں تو رئیس الاحرار کو حضرت مولانا عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے عشق کا تعلق ہو گیا تھا اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی وجہ سے اس سیہ کار سے بھی، لیکن شروع کے چند سال ایسے گزرے کہ مرحوم اپنی سیاحت میں رہتے۔ کلکتہ، بمبئی اور پشاور وغیرہ ان کی روزمرہ کی گزرگاہ تھی اور سہارنپور ہر جگہ کا جنکشن۔ اس لیے جب سہارنپور سے گزر ہوتا تو ہر وزہ واپسی یا ایک شب قیام کے لیے رائے پور بھی جاتے۔

اس کے دیکھنے والے تو آج بھی سینکڑوں ہیں کہ حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس سیہ کار کے ساتھ عشق کا سا تعلق تھا، جملہ معترضہ کے طور پر ایک واقعہ لکھتا ہوں کہ میرے مخلص دوست صوفی اقبال پاکستانی ثم المدنی جو پاکستان میں ملازم تھے جب حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ پاکستان جاتے اور صوفی اقبال مجھے خط لکھتے تو بہت اصرار سے مجھے لکھا کرتے کہ میرے خط کے جواب میں حضرت رائے پوری کو سلام ضرور لکھ دیجیو۔ اس لیے کہ جب میں عصر کے بعد کی مجلس میں یوں کہہ دیتا ہوں کہ شیخ کا خط آیا ہے حضرت کو سلام لکھا ہے تو فوراً چارپائی کے قریب بلایا جاتا ہوں اور فوراً خیریت وحالات وغیرہ دریافت کرنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے مغرب تک چارپائی کے قریب بیٹھنا نصیب ہو جاتا ہے۔

اس تعلق کی بناء پر جب کوئی شخص رائے پور حاضر ہوتا تو حضرت کا پہلا سوال یہ ہوتا کہ شیخ سے مل کر آئے یا نہیں؟ اگر وہ کہتا کہ مل کر آیا ہوں تو بڑی بشاشت سے بات پوچھتے، خیریت پوچھتے، کیا کر رہے تھے؟ کوئی پیام دیا وغیرہ وغیرہ اور اگر وہ کہتا کہ نہیں مل کر آیا تو زیادہ التفات نہ فرماتے، بلکہ جیسا تعلق ہوتا ویسا ہی برتاؤ کرتے۔ اس مجبوری کو بہت سے ایسے لوگ جن میں رئیس الاحرار

بھی تھے باوجود دل نہ چاہنے کے نہایت گرانی کے ساتھ کھڑے کھڑے مصافحہ کرنا ضروری سمجھتے تاکہ وہ یہ کہہ سکیں کہ ہو کر آیا ہوں اور سلام عرض کیا ہے اور میں بھی اس قسم کے لوگوں سے باوجود جی نہ چاہنے کے چاہے کتنی ہی مشغولی کا وقت ہو اور کتنا ہی ضروری کام کررہا ہوتا ضرور بلاکر حضرت کی خدمت میں سلام عرض کردیتا۔ مبادا وہ جاکر کہہ دیں کہ میں تو حاضر ہوا تھا باریابی نہ ہوئی۔

رئیس الاحرار مرحوم سے کئی سال سے صرف اس نوع کی ملاقات رہی۔ ایک مرتبہ ۱۰ بجے صبح کو میں اوپر اپنے کمرے میں نہایت مشغول تھا، مولوی نصیر نے اوپر جاکر کہا کہ "رئیس الاحرار آئے ہیں رائے پور جارہے ہیں صرف مصافحہ کرنا ہے۔" میں نے کہا "جلدی بلاؤ" مرحوم اوپر چڑھے اور زینے پر چڑھتے ہی سلام کے بعد مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا کر کہا کہ "رائے پور جارہا ہوں اور ایک سوال آپ سے کرکے جارہا ہوں اور پرسوں صبح واپسی ہے اس کا جواب آپ سوچ رکھیں، واپسی میں جواب لے لوں گا۔ یہ تصوف کیا بلا ہے؟ اس کی کیا حقیقت ہے؟" میں نے مصافحہ کرتے کرتے یہ جواب دیا کہ "صرف تصحیح نیت۔" اس کے سوا کچھ نہیں۔ جس کی ابتداء اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ سے ہوتی ہے اور انتہا "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ" ہے۔ میرے اس جواب پر سکتہ میں طاری ہوگئے اور کہنے لگے "دلی سے یہ سوچتا آرہا ہوں کہ تو یہ جواب دے گا تو یہ اعتراض کروں گا اور یہ جواب دے گا تو یہ اعتراض، اس کو تو میں نے سوچا ہی نہیں۔" میں نے کہا کہ جاؤ تانگے والے کو بھی تقاضا ہوگا، میرا بھی حرج ہورہا ہے، پرسوں تک اس پر اعتراض سوچتے رہنا۔ اس کا خیال رہے کہ دن میں لمبی بات کا وقت نہیں ملنے کا، دو چار منٹ کو تو دن میں بھی کرلوں گا۔ لمبی بات چاہو گے تو مغرب کے بعد ہوسکے گی۔" مرحوم دوسرے ہی دن شام کو مغرب کے قریب آگئے اور کہا کہ "کل رات کو تو ٹھہرنا مشکل تھا، اس لیے مجھے فلاں جلسہ میں جانا ہے اور رات کو تمہارے پاس ٹھہرنا ضروری ہوگیا، اس لیے ایک دن پہلے ہی چلا آیا۔" اور یہ بھی کہا کہ "تمہیں معلوم ہے مجھے تم سے کبھی نہ عقیدت ہوئی نہ محبت۔" میں نے کہا "علیٰ هذا القیاس۔" مرحوم نے کہا "مگر تمہارے کل کے جواب نے مجھ پر تو بہت اثر کیا اور میں کل سے اب تک سوچتا رہا۔ تمہارے جواب پر کوئی اعتراض سمجھ میں نہیں آیا۔" میں نے کہا "انشاء اللہ مولانا اعتراض ملنے کا بھی نہیں۔"

"اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" سارے تصوف کی ابتداء ہے اور "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ" سارے تصوف کا منتہا ہے۔ اسی کو نسبت کہتے ہیں، اسی کو یادداشت کہتے ہیں، اسی کو حضوری کہتے ہیں۔

حضوری گر ہمی خواہی، ازو غافل مشو حافظ
مَتیٰ مَاتَلْقَ مَنْ تَهْوِیْ دَعِ الدُّنْیَا وَ اَمْهِلْهَا

میں نے کہا ''مولوی صاحب سارے پاپڑ اسی کے لیے پیلے جاتے ہیں۔ ذکر بالجہر بھی اسی واسطے ہے، مجاہدہ اور مراقبہ بھی اسی واسطے ہے اور جس کو اللہ جل شانہٗ اپنے لطف وکرم سے کسی بھی طرح یہ دولت عطاء کردے اس کو کہیں کی بھی ضرورت نہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کیمیاء اثر سے ایک ہی نظر میں سب کچھ ہو جاتے تھے اور ان کو کسی چیز کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اس کے بعد اکابر اور حکماء امت نے قلبی امراض کی کثرت کی بناء پر مختلف علاج جیسا کہ اطباء بدنی امراض کے لیے تجویز کرتے ہیں، روحانی اطباء نے روحانی امراض کے لیے ہر زمانے کے مناسب اپنے تجربات جو اسلاف کے تجربات سے مستنبط تھے نسخے تجویز فرمائے ہیں جو بعضوں کو بہت جلد نفع پہنچاتے ہیں، بعضوں کو بہت دیر لگتی ہے۔''

پھر میں نے مرحوم کو متعدد قصے سنائے، جن میں سے ایک قصہ تو میں نے اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے سنا اور کئی مرتبہ سنا اور میں نے بھی حدیث کے اسباق میں اور دوستوں کی مجالس میں ہزاروں مرتبہ اس کو سنایا ہوگا وہ یہ کہ:

قصبہ پانی پت کا ضلع کرنال ہے، ان دونوں کے درمیان جمنا چلتی تھی، معلوم نہیں اب بھی ایسا ہے یا نہیں، جمنا کا ہر جگہ دستور یہ ہے کہ خشکی کے زمانے میں لوگ جوتے ہاتھ میں لے کر پار ہو جاتے ہیں، جہاں پانی زیادہ ہو وہاں کشتیاں کھڑی رہتی ہیں، ملاح دو چار پیسے لے کر ادھر سے ادھر پہنچا دیتے ہیں، لیکن جب جمنا طغیانی پر ہو تو پھر عبور ناممکن ہوتا ہے۔

ایک شخص پانی پت کا رہنے والا، جس پر خون کا مقدمہ کرنال میں تھا اور جمنا میں طغیانی اور نہایت زور۔ وہ ایک ایک ملاح کی خوشامد درآمد کرتا رہا، مگر ہر شخص کا ایک جواب کہ اس میں تیرے ساتھ اپنے آپ کو ڈبوئیں گے۔ وہ بیچارہ غریب پریشان روتا پھر رہا تھا۔ ایک شخص نے اس کی بدحالی دیکھ کر کہا کہ اگر میرا نام نہ لے تو ترکیب بتاؤں، جمنا کے قریب فلاں جگہ ایک جھونپڑی پڑی ہوئی ہے اس میں ایک صاحب مجذوب قسم کے پڑے رہتے ہیں، ان کے جا کر سر ہو جا، خوشامد، منت سماجت (خوشامد پر ایک قصہ کیمیاء کا یاد آ گیا، وہ باب ہشتم میں یاد رہا تو انشاء اللہ لکھواؤں گا) جو کچھ تجھ سے ہو سکے کسر نہ چھوڑنا اور جتنا بھی برا بھلا کہیں حتیٰ کہ اگر تجھے ماریں بھی تو منہ نہ موڑنا۔ چنانچہ یہ شخص ان کے پاس گیا اور ان سے خوشامد درآمد کی، انہوں نے اپنی عادت کے موافق خوب ملامت کی کہ میں کوئی خدا ہوں، میں کیا کر سکتا ہوں؟ مگر جب یہ روتا ہی رہا (اور رونا تو بڑے کام کی چیز ہے، اللہ تعالیٰ مجھے بھی نصیب فرماوے) تو ان بزرگ نے کہا کہ ''جمنا سے کہہ دے کہ اس شخص نے جس نے نہ عمر بھر کچھ کھایا نہ بیوی کے پاس گیا، اس نے بھیجا ہے کہ مجھے راستہ

دے دے۔'' چنانچہ یہ گیا اور جمنا نے راستہ دے دیا۔ اس کا تو کام ہو گیا۔

اس میں کوئی استبعاد نہیں، پہلے انبیاء کے معجزات اس امت کی کرامات ہیں اور پانی پر چلنے کے قصے تو صحابہ کرام کے بھی تواریخ میں منقول ہیں اور کراماتِ صحابہ رضی اللہ عنہ تو مستقل ایک رسالہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے لکھا گیا تھا، جس میں علاء بن الحضرمی صحابی رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں ایک جہاد میں جو کسریٰ سے ہوا تھا۔ سمندر میں گھوڑے ڈال دینا اور سمندر کو پار کر دینا جس میں زینیں بھی نہ بھیگیں، نقل کیا گیا ہے۔ عامل کسریٰ یہ دیکھ کر ایک کشتی میں بیٹھ کر یہ کہہ کر بھاگ گیا کہ ان سے ہم نہیں لڑ سکتے۔ اس واقعے کو ابن عبدالبر اور تاج الدین سبکی نے بھی مختصراً ذکر کیا ہے۔

اس جھونپڑی میں ان بزرگ کے بیوی بچے بھی تھے۔ دینداروں کی بیویاں ڈیڑھ خصم ہوتی ہیں، یہ بیچارے اس فکر میں رہتے ہیں کہیں زیادتی نہ ہو جائے۔ وہ اس سے غلط فائدہ اٹھا کر سر پر چڑھ جاتی ہیں، ان بزرگ کی بیوی نے رونا شروع کیا کہ ''عمر بھر کبھی کچھ کھایا نہیں، بغیر کھائے ہاتھی بن رہا ہے، اس کو تو تُو جانے تیرا خدا۔ مگر تُو نے جو یہ کہا کہ میں بیوی کے پاس کبھی نہیں گیا، یہ ہتہ کی دھاڑ میں کہاں سے لائی؟'' انہوں نے ہر چند سمجھایا کہ ''یہ میری ہی اولاد ہے، میں نے ان کی اولاد ہونے سے انکار نہیں کیا۔'' مگر اس نے اتنا رونا چلانا شروع کیا کہ ''تو نے میرا منہ کالا کر دیا، وہ ساری دنیا میں جا کر کہے گا کہ پیر صاحب تو بیوی کے پاس گئے نہیں، یہ اولاد کہاں سے آ گئی؟'' ہر چند پیر صاحب نے سمجھانا چاہا مگر اس کی عقل میں نہیں آیا اور جتنا جتنا وہ کہتے وہ روتی۔ جب بہت دیر ہو گئی تو ان پیر صاحب نے یوں کہا کہ میں نے ساری عمر خوب کھایا اللہ کا شکر ہے اور تیرے سے صحبت بھی ہمیشہ خوب کی، تجھے بھی معلوم ہے لیکن بات یہ ہے کہ میں نے بچپن میں ایک مولانا سے وعظ میں بات سنی تھی۔ وہ یہ کہ جو کام اللہ کے واسطے کیا جائے وہ دنیا نہیں دین بن جاتا ہے اور عبادت بن جاتا ہے اور ثواب بن جاتا ہے، اس وقت سے میں نے جب بھی کوئی چیز کھائی یا تو اس نیت سے کھائی کہ اس سے اللہ کی عبادت پر قوت حاصل ہو یا اس نیت سے کھائی کہ لانے والے اور کھلانے والے کا دل خوش ہو۔ اسی طرح سے میں شادی کے بعد سے تیرے پاس خوب گیا، لیکن یہ قصہ پہلے سے سنا ہوا تھا اس لیے جب بھی میں تیرے پاس گیا تیرا حق ادا کرنے کی نیت پہلے سے کر لی کہ اللہ نے بیوی کا حق رکھا ہے۔

میں نے تو یہ قصہ اپنے والد صاحب سے بار بار ایسے ہی سنا۔ مگر مولانا الحاج ابوالحسن علی میاں صاحب دام مجدہم نے حضرت الحاج شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی نقشبندی بھوپالی کے جو مفلوظات جمع کیے ہیں اس کے صفحہ ۳۵۶ پر یہ قصہ دوسری نوع سے نقل کیا ہے۔ جو حسبِ ذیل ہے:

حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ ایک بزرگ دریا کے کنارے پر تھے، دوسرے

بزرگ دوسرے کنارے پر۔ ایک بزرگ نے جو متاہل اور صاحب اولاد تھے، اپنی بیوی سے کہا کہ ''کھانے کا ایک خوان لگا کر دریا کے دوسرے کنارے پر جو دوسرے بزرگ رہتے ہیں ان کے پاس لے جاؤ اور ان کو کھانا کھلا کر آؤ'' بیوی نے کہا کہ دریا گہرا ہے، میں اس کو کس طرح پار کر کے دوسرے کنارے جاؤں گی؟'' فرمایا کہ ''جب دریا میں قدم رکھنا تو میرا نام لے کر کہنا کہ اگر میرے اور میرے شوہر کے درمیان وہ تعلق ہو جو زن وشوہر میں ہوا کرتا ہے تو مجھے ڈبو دے ورنہ میں پار ہو جاؤں۔'' اس نے یہی کہا۔ یہ کہنا تھا کہ دریا پایاب ہو گیا اور گھٹنوں گھٹنوں پانی میں وہ دریا کے پار ہو گئیں۔ انہوں نے کھانے کا خوان ان دوسرے بزرگ کو پیش کیا انہوں نے اس کو اکیلے تناول فرما لیا (یعنی ختم کر دیا) جب واپس ہونے کا وقت ہوا تو ان کو فکر ہوئی کہ آنے کا وظیفہ تو مجھے معلوم ہو گیا، اب جاتے وقت کیا کہوں؟ ان بزرگ نے ان کی پریشانی دیکھی تو ان سے دریافت کیا، انہوں نے کہا کہ ''میں دریا کیسے پار کروں'' انہوں نے فرمایا کہ ''پہلی مرتبہ دریا کو کس طرح پار کیا تھا؟'' انہوں نے کہا کہ ''میرے شوہر نے مجھے یہ ہدایات کی تھی کہ میں اس طرح کہوں انہوں نے فرمایا کہ اب جائے تو میرا نام لے کر کہنا کہ ''اس نے ایک لقمہ بھی کھایا ہو تو میں ڈوب جاؤں ورنہ پار ہو جاؤں۔'' چنانچہ وہ پار ہو گئیں۔

اب انہوں نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ آپ نے صاحبِ اولاد ہو کر خلاف واقعہ بات کیوں کہی؟ اور ان بزرگ نے آنکھوں کے سامنے پورا کھانا تناول کرنے کے باوجود ایک لقمہ بھی کھانے سے انکار کیوں کیا؟'' تو ان بزرگ نے جواب دیا کہ ''میں نے جو کچھ کیا امرِ الٰہی سے کیا اپنے نفس کی خواہش سے نہیں کیا اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ امرِ الٰہی سے کیا نفس کا اس میں کچھ حصہ نہ تھا اور دنیا جو کچھ کرتی ہے اور جس کا رواج ہے وہ نفس کے تقاضے کو پورا کرنا ہے امرِ الٰہی پیش نظر نہیں ہوتا، اس لیے دنیا جس کو ازدواجی تعلق اور شکم پُری اور نا ؤنوش سمجھتی ہے، ہم دونوں میں سے کوئی اس کا مرتکب نہیں ہوا۔''

لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ واقعہ وہ پہلا ہو۔ اس قسم کے واقعات متعدد ہو سکتے ہیں۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس قسم کے واقعات پانی پر چلنا، دریا میں گھوڑوں کا اتار دینا مشہور ہیں۔

یہاں تک پہنچا تھا کہ عصر کے بعد کی مجلس میں شاہ علم اللہ صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے حالات سنائے جا رہے تھے۔ اس میں ایک قصہ کان میں پڑا تھا۔ اس میں لکھا ہے کہ شاہ علم اللہ صاحب نے حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ تعالیٰ کا تذکرہ فرمایا کہ ایک مرتبہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں ایک نہر حائل تھی، اس کے قریب پہنچتے ہی اچانک اس میں صاف راستہ بن گیا۔ حضرت خواجہ صاحب نے یہ دیکھ کر فرمایا ''هٰذَا مَكْرُ اللّٰهِ هٰذَا مَكْرُ اللّٰهِ''۔ اس کے بعد انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ ''یہ نہر اسی حالت میں ہو جائے بندہ لوٹ جائے گا، یا کوئی دوسرا

راستہ اختیار کرلے گا لیکن تیری اس آزمائش سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔''

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ جب سلطان العارفین کو کرامات سے اس درجہ خوف اور گریز تھا اور خدا کی شانِ بے نیازی سے وہ اس قدر ترساں ولرزاں رہتے تھے تو دوسرے کس شمار میں ہیں۔ طالبِ حق کو چاہیے کہ اللہ جل شانہٗ کے سامنے حضور درحضور کے سوا کسی اور چیز کے طلب گار نہ ہو ''کُلُّ مَا شَغَلَکَ عَنِ اللّٰہ فَھُوَ صنمک'' جو چیز تمہیں اللہ سے مشغول کردے وہی تمہارا بت ہے۔

فقط

اس قصہ پر مجھے میرے حضرت، میرے محسن، میرے ماویٰ، میرے ملجا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کا ایک عجیب واقعہ یاد آیا۔ میرے جملہ اکابر کے یہاں تصرفات کی کوئی وقعت کبھی نہیں ہوئی، بلکہ ان کے روکنے کی کوشش ہوئی۔ میرے ایک مخلص دوست، جو عمر میں مجھ سے بہت بڑے مولوی حافظ عبدالرحمٰن صاحب گنگوہی میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بہت خاص شاگردوں میں تھے اور یہ بہت بڑی پارٹی تھی بیس پچیس لڑکوں کی جو عربی پڑھتے تھے، فارسی اور قرآن پڑھنے والے تو سو سے زائد تھے، یہ گنگوہ میں والد صاحب سے پڑھا کرتے تھے۔ جب ۲۸ھ میں میرے والد صاحب قدس سرہٗ مستقل قیام کے ارادے سے مظاہر میں آگئے تو یہ سب خدام بھی آگئے اور علوم کی تکمیل ان سب کی مظاہر میں ہوئی اور پھر علوم ظاہریہ کی تکمیل کے بعد یہ سب میرے حضرت مرشدی مہاجر مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بیعت بھی ہوئے۔ ان میں سے مولوی عبدالرحمٰن صاحب شملہ کے قریب کسولی ایک جگہ ہے وہاں کے امام ہوگئے اور بڑے اونچے اونچے حالات خطوط میں لکھا کرتے تھے اور چونکہ حضرت قدس سرہٗ کی ڈاک بھی میں ہی لکھتا تھا اس لیے دوستوں کے حالات بھی معلوم ہوتے رہتے تھے۔ مولوی عبدالرحمٰن مرحوم کا، اللہ تعالیٰ ان کو بہت بلند درجات عطا فرماوے، ایک بہت ہی طویل عجیب خط لکھا جس میں اپنے بہت سے مکاشفات، تصرفات، خوارق بہت ہی لمبے لکھے تھے اور میں حضرت قدس سرہٗ کو خط سنا رہا تھا اور باغ باغ ہو رہا تھا کہ لونڈا چوتھے آسمان پر پہنچ گیا، میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب خط کے جواب میں میرے حضرت قدس سرہٗ نے یہ لکھوایا کہ فرائض اور نوافل مسنونہ کے سوائے جملہ نوافل، جملہ اذکار واوراد ایک قلم موقوف رکھیں۔'' میں بالکل حیرت میں رہ گیا کہ یہ کیا ہوا؟

اور بھی متعدد قصے، ہمارے اکابر کے اس قسم کے پیش آئے۔ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہ قدس سرہٗ کے متعدد خطوط میں بھی جب خوارق اور تصرفات یا مکاشفات ہوتے تھے تو میرے حضرت بجائے حوصلہ افزائی کے اس قسم کے الفاظ لکھوایا کرتے تھے: ''ان چیزوں کی طرف التفات ہرگز نہ کریں کہ یہ ترقی سے مانع ہیں۔''

ہر نیکی صدقہ ہے بیوی سے صحبت بھی صدقہ ہے:

میں نے مولانا رئیس الاحرار صاحب سے یہ بھی کہا کہ بچپن میں اس قسم کے قصے، کہانیوں کے ذیل میں سنے جاتے تھے، یا والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اسباق میں سناتے تھے کہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا اسباق میں قصے سنانے کا معمول ہو گیا تھا، جس کا ایک واقعہ ان حالات میں فتح القدیر کے سلسلے میں بھی آوے گا لیکن جب مشکوٰۃ شریف پڑھانے کی نوبت آئی تو یہ مضمون حدیث پاک میں تشریح سے ملا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے جو مشکوٰۃ شریف کے باب صلوٰۃ الضحیٰ میں منقول ہے کہ آدمی میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں، جب آدمی صبح کو صحیح و سالم تندرست اٹھتا ہے تو ہر جوڑ کی صحت و سلامتی کے بدلے اس کے ذمہ ایک صدقہ (شکرانہ) واجب ہوتا ہے ایک دفعہ ''سبحان اللہ'' کہنا ایک صدقہ ہے، ''الحمدللہ'' کہنا صدقہ ہے، لا الٰہ الا اللہ'' کہنا صدقہ ہے، اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے، امر بالمعروف صدقہ ہے، راستہ میں سے کوئی تکلیف دہ چیز کانٹا وغیرہ ہٹا دینا صدقہ ہے، آدمی اپنی بیوی سے صحبت کرے یہ بھی صدقہ ہے اور دو رکعت چاشت کی نماز ان سارے ۳۶۰ صدقوں کا قائم مقام ہے (اس لیے کہ نماز میں ہر جوڑ سے کام پڑتا ہے، اس لیے نماز کی دو رکعت سب کے قائم مقام ہو جاتی ہے) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا، یا رسول اللہ! آدمی اپنی بیوی سے شہوت پوری کرتا ہے، اس میں بھی صدقہ ہے؟ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اللہ جل شانہٗ بہت ہی درجاتِ عالیہ اپنی اور ان کی شایانِ شان عطا فرماوے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذرا ذرا سی بات پر دریافت کر کے امت کے لیے بہت کچھ ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اشکال پر یوں فرمایا کہ اگر اس پانی کو بے محل رکھے یعنی حرام کاری کرے تو کیا گناہ نہیں ہوگا؟ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا، ضرور ہوگا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر یعنی اگر حرام سے بچنے کی نیت سے اپنی بیوی سے صحبت کرے تو کیوں ثواب نہ ہو۔''

اس کی تائید بہت سی روایات اور مضامین سے بھی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ کا لطف و احسان اور اس کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی برکتیں تو لَا تَعُدْ وَ لَا تُحصٰی ہیں مگر ہم لوگ اپنی ناقدری سے ان قیمتی جواہرات اور موتیوں کو پاؤں سے روندتے ہیں، ان کی طرف التفات نہ کریں تو اپنا ہی نقصان ہے:

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

اخلاص سے آگ لینے جانے میں بھی پیمبری مل جاتی ہے۔ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک مشہور مقولہ جو سینکڑوں دفعہ سنا ہوگا کہ ''اتباعِ سنت کے ساتھ اتباع کی نیت سے بیت الخلاء

میں جانا خلافِ سنت نفلیں پڑھنے سے زیادہ افضل ہے۔" یہی وہ چیز ہے جس سے میں نے اس مضمون کی ابتداء کی تھی۔

تنبیہ

صاحبزادوں کی تربیت کے لیے درخواست:

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق میں نے جو اپنی ابتدائی لڑائی لکھی اور بہت سخت تھی، بڑی ناشکری ہوگی اگر اس کا تکملہ اور منتہا نہ لکھوں آخر میں تو مرحوم کو حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ علیہ کی برکت سے اتنی محبت ہوگئی تھی جس کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کرچکا ہوں کہ مولانا مرحوم مستقل میرے پاس قیام پر اصرار فرماتے رہے۔ مولانا نے ازراہِ محبت یہ بھی اصرار کیا کہ وہ اپنے چھوٹے لڑکوں کو میری تربیت میں رکھیں، میں نے باوجود ان کی شفقت ومحبت واصرار کے معذرت کردی۔ انہوں نے حضرت اقدس سیدی ومولائی شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے اصرار بہت زور سے کرایا تو میں نے حضرت سے کہا کہ یہ رئیس الاحرار کے صاحبزادے ہیں، میرا ان کا جوڑ نہیں کھانے کا۔ مولانا مرحوم نے کہا کہ تیری ساری شرائط منظور ہوں گی اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ اس کے ضامن ہوں گے، تو قرعۂ فال عزیز گرامی قدر ومنزلت مولوی رئیس الرحمٰن ناظم مدرسہ والی مسجد خالصہ کالج لائلپور کے نام نکلا کہ ان کی تعلیم اس وقت ایسی تھی کہ میرے پاس جوڑ کھاسکتی تھی، میں نے چار شرائط لگائیں۔

(۱)......اخبار دیکھنے کی بالکل اجازت نہیں ہوگی۔ اگر کوئی شکایت کسی وقت اخبار دیکھنے کی مجھ تک پہنچی تو سلام علیک۔

(۲)......کسی جلسے میں جانے کی اجازت نہ ہوگی، چاہے ابا جان کی تقریر ہو چاہے شاہ بخاری کی، چاہے حضرت مدنی قدس سرہٗ کی، چاہے اس تقریر میں میں خود بھی شریک ہوں، چاہے میں کسی لحاظ ملاحظہ سے اجازت بھی دے دوں۔

مولانا مرحوم نے ان دونوں شرائط کو بہت ہی بشاشت سے قبول فرمایا اور فرمایا کہ میری اور شاہ جی کی تقریر میں جانے کی ہرگز اجازت نہیں، سیاست ہمارے گھر کی لونڈیاں ہے، ہم اس سے نمٹنے کے بعد سیاست دو مہینے میں سکھلا دیں گے۔

(۳)......تیسری شرط یہ رکھی کہ مدرسہ سے بغیر اجازت باہر نکلنا نہ ہوگا۔

(۴)......چوتھی شرط یہ کہ طلبہ سے تعلقات نہ رکھنے ہوں گے نہ دوستی کے، نہ دشمنی کے، نہ محبت کے، نہ مخالفت کے۔

عزیز موصوف کو اللہ بہت ہی جزائے خیر دے، میں ہمیشہ اس کی اس ادا کا ممنون رہوں گا کہ پہلی دو شرطوں پر تو اس نے میری امید سے بہت زیادہ عمل کر کے دکھلا دیا، حتی کہ ایک دو سال بعد جب میں نے مَضَرّت نہ سمجھ کر اکابرِ ثلاثہ مذکور کی تقریر میں جانے کی اجازت بھی دی اور دل سے دی، اخلاص سے دی تب بھی عزیز موصوف نے کہہ دیا کہ اب تو وعدہ پورا کرنا ہی ہے۔

اسی کا وہ ثمرہ تھا کہ حضرت اقدس سیدی ومولائی حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی نگاہ میں بھی عزیز موصوف منظورِ نگاہ بن گیا اور حضرت اقدس سرہٗ کی طرف سے خلافت بیعت عطا ہوئی۔ اللہ جل شانہٗ اپنے فضل وکرم سے عزیز موصوف کو نیز عبدالجلیل کو بھی دونوں ایک ہی سال کے مظاہر کے فارغ التحصیل ہیں، یعنی ۶۰ھ کے اور دونوں کو ہی حضرت قدس سرہٗ کی طرف سے خلافت عطا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ دونوں سے اپنی مخلوق کی ہدایت کا کام لے۔

البتہ تیسری چوتھی شرط پر وہ پختگی نہ دکھا سکا جو پہلی دو شرطوں پر دکھلائی اگر میں یہ کہوں کہ اس میں میری ہی کمزوری کو دخل تھا تو بے محل نہ ہوگا۔

مولوی انیس الرحمٰن ومولوی عبدالجلیل صاحبان کا ذکرِ جمیل:

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے اصرار میں کچھ عزیز عبدالجلیل کو بھی دخل تھا جو حضرت قدس سرہٗ کا بھتیجا میرے ہی پاس رہتا تھا، مدرسہ میں پڑھتا تھا، بہت ہی یکسو قابلِ رشک زندگی گزارتا تھا، اس کی ایک ادا اس وقت کی مجھے بہت ہی پسند تھی کہ جب حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کی آمد پر حضرت کا قیام یا دعوت کسی جگہ ہوتی تو یہ کبھی کھانا کھائے بغیر حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی مجلس میں نہیں جاتا تھا، میرے یہاں سے کھانے سے نمٹ کر جاتا تھا اور لوگوں کے اصرار پر بھی شدت سے انکار کر دیتا تھا کہ ''میں کھا کر آیا ہوں۔'' حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ بھی فرماتے اور میں تقاضے کرتا مگر یہ ہمیشہ ہی عذر کرتا کہ میں کھا کر آیا اور عذر جھوٹا نہیں ہوتا تھا قبل از وقت بھی گھر سے کھانا لے کر وہ کھا کر جاتا، بلکہ بعض دفعہ تو پہلے سے دعوت کرنے والوں کو بھی یہ کہہ کر عذر کر دیتا تھا کہ اس وقت آنے میں سبق کا حرج ہوگا یا مطالعہ کا حرج ہوگا۔

☆......☆......☆

باب دوم

درس وتدریس اور مظاہر علوم وتالیفات:

اس ناکارہ کی پیدائش ۱۱ رمضان المبارک ۱۳۱۵ھ کی شب میں رات کو ۱۱ بجے تراویح کے بعد ہوئی، جیسا کہ معروف ہے اس سیہ کار کا نسب نامہ مع اپنی ساری شاخوں کے اور سارے شجرۂ خاندان کے میری تاریخِ کبیر میں بہت مفصل مشرح موجود ہے، مگر تیس برس سے پہلے پہلے کے تو سارے بچے کچے اس میں موجود ہوں گے، اس کے بعد کچھ مشاغل اور کچھ آنکھوں کی مجبوری سے اب بیس پچیس سال سے اس کا سلسلہ چھوٹ گیا ورنہ وہ بہت مفصل ہے کوئی دیکھنا چاہے تو شوق سے دیکھ لے۔ نیز اس کا کچھ حصہ حالات مشائخ کاندھلہ میں مولوی احتشام صاحب بھی شائع کر چکے ہیں۔

ڈھائی برس کی عمر تک یہ ناکارہ کاندھلہ رہا۔ سنا ہے کہ اس قدر نالائق تھا کہ میرا کھیل توڑ پھوڑ تھا، میری نانی میرے لیے بہت سے برتن ڈول چھوٹی موٹی مٹی کی پیالیاں جو اس زمانے میں بہت کثرت سے کمہاریاں بنایا کرتی تھیں اور گھروں میں بچوں کو کھیلنے کے واسطے قیمتاً دے جایا کرتی تھیں، جس مکان میں اس ناکارہ کی پیدائش ہوئی تھی اس میں ایک چبوترہ بہت اونچا تھا جو اب تک خوب یاد ہے، یہ ناکارہ اس چبوترے کے اوپر بیٹھ کر ان پیالیوں اور ڈول وغیرہ کو زور سے نیچے پھینکتا اور جب وہ ٹوٹ جاتیں تو خوب خوش ہوتا اور جب نہ ٹوٹتیں تو بچوں کی طرح نیچے اتر کر بڑی مشقت سے اس کو اوپر لے جا کر پھر نیچے پھینکتا۔ سنا ہے کہ میری والدہ نور اللہ مرقدہا میری اس ناپاک حرکت پر مجھے ڈانٹا کرتیں تو میری نانی مرحومہ میری والدہ پر خفا ہوتیں کہ میری زندگی میں اگر تو نے میرے بچے کو کچھ کہا تو تیری خیر نہیں جب اس کا دل برتن پھوڑ کر خوش ہوتا ہے تو مجھے تو اس کی خوشی چاہیے۔

ڈھائی برس کی عمر میں گنگوہ حاضری ہوئی تو وہاں حضرت قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ کے سب خدام کے یہاں والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی وجہ سے لاڈ ہی لاڈ اور پیار تھا۔ یہ منظر تو مجھے اب تک یاد ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے بڑے بھائی حضرت مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ واعلی اللہ مراتبہٗ اس سیہ کار کو اپنی گردن پر دن بھر بٹھائے رکھتے ایک ٹانگ سینے کے ایک طرف دوسری ٹانگ دوسری طرف لٹکائے ہوئے میں گردن پر سوار رہتا، وہ اسی حالت میں اپنے کام میں مشغول رہتے، بازار جاتے یا کسی کام کو جاتے تب بھی میں ان کی گردن پر سوار رہتا، نماز کے وقت البتہ اتار دیتے تھے۔ حضرت مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ ۲۰ھ میں گنگوہ حاضر ہوئے تھے اور اوائل ۲۴ھ میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے وصال کے بعد مدینہ منورہ واپس

چلے گئے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کی خودنوشت سوانح نقش حیات کے صفحہ ۶۵ پر اسی طرح موجود ہے، مگر میری تاریخ کبیر میں ۲۶ھ میں ان کا ہندوستان ہونا مذکور ہے۔

ہمارے خاندان میں عموماً چوتھے یا پانچویں برس بچہ پڑھنے بیٹھ جاتا تھا مگر میں سات برس کی عمر یا اس سے زائد پر بھی پڑھنے نہیں بیٹھا۔ میری دادی صاحبہ رحمہا اللہ تعالیٰ میرے والد صاحب پر خوب خفا ہوتیں، مجھے ان کی خفگی کے الفاظ بھی خوب یاد ہیں کہ ''یحییٰ! اولاد کی محبت سب کو ہوا کرے مگر اولاد کی محبت میں اندھے نہیں ہوجایا کرتے۔''

میرے والد صاحب دودھ پینے کے زمانے میں پاؤ پارہ یاد کر چکے تھے اور سات برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر چکے تھے اور اس کے ساتھ میرے دادا سے مخفی اپنے چچا جان رحمہ اللہ تعالیٰ سے فارسی سکندر نامہ، زلیخا، بوستان وغیرہ سب کو پڑھ چکے تھے اور میرے دادا صاحب نے ان کو سات برس کی عمر میں یوں کہہ دیا تھا کہ ''ایک قرآن روز پڑھ لیا کرو باقی سارا دن چھٹی، چھ ماہ کے بعد عربی شروع کروائیں گے۔'' میرے والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں صبح کی نماز پڑھتے ہی اپنی چھت پر بیٹھتا، وہ اپنی نانی صاحبہ کے مکان کی چھت بھی دکھلایا کرتے اور ظہر سے پہلے قرآن شریف ختم کر کے پھر اتر کر روٹی کھایا کرتے تھا اور شام کو اپنے شوق سے ابتدائی عربی شروع کر دی تھی۔ اس لیے میری دادی صاحبہ کو اور بھی زیادہ غصہ آتا وہ فرماتیں کہ ''یہ بیل آسمان پر جا رہا ہے تو آخر اس سے کیا کرائے گا؟ جوتے گٹھوائے گا، چمار بناوے گا، پاخانہ کمواوے گا، بھنگی بناوے گا، آخر تو نے کیا سوچ رکھا ہے؟'' ان کی شدید خفگی مجھے خوب یاد ہے اور میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک جواب کہ ''آپا جو دن کھیلنے کو ملیں کھیلنے دو، ایک دفعہ جب اوکھل میں سر دے گا تو پھر قبر میں جاتے ہوئے نکلے گا۔'' اس جواب پر بہت ناراض ہوتیں کہ ''آخر اوکھل میں سر دینے کا کوئی وقت آوے گا یا مرنے کے بعد دے گا؟'' مجھ پر براہِ راست بھی خفا ہوتیں کہ ''فلاں بچے کے اتنے سپارے ہوگئے فلاں کے اتنے ہوگئے، تیرے کتنے ہوئے اندھے؟''

ساتواں یا آٹھواں سال تھا۔ گنگوہ میں جناب الحاج ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب مظفر نگری جو حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے وہ اور ان کے اہلیہ عاشق زار۔ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے لیے بڑے اہتمام سے پلاؤ پکایا کرتے تھے، مجھے بھی خوب یاد ہے، ان کا پکانا بھی اور حضرت اقدس گنگوہی قدس سرہٗ کے ساتھ کھانا بھی معلوم نہیں روزانہ ایک مرغ تو ضرور کٹتا تھا اور اس میں نہ معلوم کتنی چیزیں پڑتی تھیں، مرغے بھی ڈاکٹر صاحب نے بہت پال رکھے تھے اور ان کو بھی نہ معلوم کیا کیا کھلایا جاتا تھا۔

انہی ڈاکٹر صاحب کے متعلق تذکرۃ الرشید میں ایک قصہ یاد پڑتا ہے بچپن کا پڑھا ہوا ہے کہ

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! یہ ڈاکٹر صاحب یہاں کیا کرتے ہیں؟ مطلب یہ تھا کہ ذکر شغل سلوکی مشاغل جس میں خانقاہ کے سارے خدام ہر وقت مشغول رہتے تھے، ڈاکٹر صاحب ان میں زیادہ مشغول نہ رہتے تھے۔ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے بے ساختہ فرمایا کہ ''مجھے پلاؤ کھلانے کے لیے۔''

ان کی اہلیہ محترمہ سے ہمارا قاعدہ بغدادی شروع ہوا۔ پڑھنے پڑھانے کا تو ہمیں کچھ یاد نہیں، دو باتیں ضرور یاد ہیں، ابا جان کی یہاں کتابوں کی دکان تھی، قاعدہ بغدادی کی گڈی ہمیں معلوم تھی، تین چار دن میں پہلا پھاڑ کر دوسرا لے آیا کرتے تھے، دوسری بات یہ خوب یاد ہے کہ ڈاکٹر صاحب اوران کی اہلیہ مرحومہ، اگر یہ ناکارہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہوتا تھا تو اس پلاؤ میں سے میرا حصہ ضرور نکالتے تھے۔ اس کے علاوہ بادام اور کشمش اور کھویا، یہ تین چیزیں بھی خوب یاد ہیں۔ اس کے علاوہ بھی دن بھر کھانے میں گزرتا تھا، یاد نہیں قاعدہ بغدادی کتنے دنوں میں پڑھایا نہیں پڑھا، اس کے بعد ہمارا سیپارہ لگ گیا۔

کسی مکتب میں یا کسی باقاعدہ حافظ صاحب کے پاس تو پڑھنے کی نوبت کبھی آئی نہیں، اس واسطے کہ آپ بیتی نمبرا میں یہ مضمون گزر چکا ہے کہ میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے یہاں پڑھنے سے زیادہ اہم اختلاط سے حفاظت تھی۔ اسی واسطے قرآن پاک اب تک بھی فارسی میں پڑھ رہا ہوں۔

میرے ابا جان کے خاص شاگردوں میں ایک صاحب حافظ ابراہیم صاحب رسولپوری بھی تھے جو گنگوہ میں ابا جان کے پاس پڑھا کرتے تھے، قرآن اچھا پڑھتے تھے حافظ تھے، ایک دن کے واسطے ہماری شاگردی ان حافظ صاحب کے حوالہ ہوئی اور سر منڈواتے ہی اولے پڑ گئے۔ ہوا یہ کہ اس دن میری اپنی والدہ صاحبہ سے لڑائی ہوگئی، ایک پیسہ کہیں سے آ گیا تھا، اس میں ایک طرف تو سکہ تھا دوسری طرف تلوار کا نشان تھا، مجھے بہت اچھا لگتا تھا، میں نے والدہ مرحومہ نور اللہ مرقدہا کے پاس امانت رکھوایا تھا، ان کو کچھ اہمیت نہ ہوئی، انہوں نے خرچ کر ڈالا، ایک دن پہلے اس سیہ کار نے ان سے مانگا، انہوں نے فرمایا کہ وہ خرچ ہوگیا، کہیں سے آوے گا تو دے دوں گی، اس زمانے میں اس قسم کے اکثر سکے آتے رہتے تھے، اپنے غصہ سے تو یہ سیہ کار اب تک بھی عاجز ہے۔ غصہ میں رات کو روٹی نہ کھائی، صبح کو والدہ صاحبہ نے جدید استاد حافظ صاحب مرحوم سے کہلوادیا کہ اس نے رات غصہ میں روٹی نہیں کھائی۔ حافظ صاحب مرحوم نے فرمایا کہ جا روٹی کھا کر آ، میں نے کہا کہ ''جی میرا پیسہ مل جاوے گا تو کھالوں گا۔'' انہوں نے فرمایا، ''اچھا تو کان پکڑ لے اور جب روٹی کھاوے گا چھوڑ دیجیے۔'' پکڑ لیے، جب حافظ صاحب سبق کے لیے گئے جو آدھ پون گھنٹے کا تھا اس وقت چھوڑ دیئے، جب دور سے آتے دیکھا تب پکڑ لیے، دو ایک گھنٹہ کے بعد پھر وہ

ابا جان کے پاس سبق کے لیے گئے پھر چھوڑ دیئے، پھر وہ ظہر کی نماز کے لیے تشریف لے گئے پھر چھوڑ دیئے، عصر کی نماز تک یہی قصہ رہا۔ رات بھی روٹی نہ کھائی تھی اس واسطے ماں پر جو گزرنی چاہیے تھے گزری۔ دوپہر کو والدہ کو معلوم ہوا کہ حافظ جی نے چھٹی بند کر رکھی ہے جب تک روٹی نہ کھاوے گا چھٹی نہیں ملے گی اور میری ایک درخواست تھی کہ "تلوار کا پیسہ مل جاوے تو کھالوں گا۔"

عصر کے بعد جب ابا جان کو یہ قصہ معلوم ہوا تو ہماری یہ ایک روزہ شاگردی ختم ہوگئی۔ ابا جان نے حافظ صاحب کو فرمایا کہ "حافظ جی تربیت کے لیے تو میں خود کافی ہوں، آپ کے سپرد تو اس وجہ سے کیا تھا کہ آپ کے سامنے بیٹھ کر یہ یاد کرتا رہے گا۔"

ہماری شاگردی تو اس وقت سے ختم ہوگئی، مگر یہ حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اللہ ان کو بہت ہی بلند درجے عطا فرماوے، بعد میں بہت اصرار سے اس سیہ کار سے بیعت بھی ہوگئے۔ جب وہ میرے جوتے کو ہاتھ لگاتے تو میں ان سے کہتا "ایسا ہرگز نہ کیجئے آپ میرے استاد ہیں۔" وہ مرحوم بہت ہی شرمندہ ہوتے۔ ایک مرتبہ میں نے ان کو اس حرکت سے روکنے کے لیے جواباً ان کے جوتے کو سیدھا کر کے رکھ دیا، اس پر وہ بیچارے بہت ہی پشیمان ہوئے۔ میں نے کہا کہ "جب آپ میرے جوتے کو ہاتھ لگاویں گے اس کا ردِ عمل میں یہی کروں گا۔"

حافظ صاحب کی ولادت تقریباً ۱۳۰۲ھ میں ہے اور وصال ۵ جمادی الثانی ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۳ اگست، ۱۹۳۷ء شبِ جمعہ۔ حافظ صاحب نے رائپور کے مدرسہ میں قرآن پاک حفظ کیا اور وہیں اردو وغیرہ پڑھی۔

اس کے علاوہ ایک عرصہ کے بعد عالی جناب حافظ محمد صالح صاحب نکور در ضلع جالندھر کے اصل رہنے والے تھے، جو حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے اجل خلفاء میں سے تھے، نہایت بزرگ، نہایت نیک، نہایت متواضع، نہایت خاشع خاضع، بڑی کثرت سے نفلیں پڑھنے والے، وہ جب حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو تبرکاً میرے والد صاحب نے مجھے ان کی شاگردی میں بھی حصولِ برکت کے لیے چند روز رکھا، جب تک حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا گنگوہ میں قیام رہا۔

اس کے علاوہ جب بھی کاندھلہ جانا ہوتا تو ہمارے کاندھلہ کے مشہور معروف حافظ، استاذ الکل حافظ رحیم بخش صاحب ابن حافظ خدا بخش عرف "حافظ منگو" میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور ان کے معاصرین اور ان سے چھوٹی پیڑھی میرے بعد تک کی ساری ہی حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد ہیں۔ وہ قوم کے نیل گر تھے اور نیل کا کام ان کے گھر میں ہوتا تھا۔ مرحوم چھٹی لینا بیماری یا کسی اور حرج میں جانتے ہی نہ تھے۔ ایک دفعہ بہت شدید بیماری میں چند روز کے لیے جب اٹھنے

کے قابل نہ تھے، گھر پر رہے تو ہم شاگردوں کو مکان ہی میں بلا لیا تھا، وہیں پڑے پڑے پڑھاتے تھے۔ بہت ہی بزرگ اور نیک تھے۔ چائے وغیرہ تو اس زمانے میں کاندھلہ میں دوا کے لیے تلاش سے بھی نہ ملتی تھی اس لیے یہ مد تو تھا ہی نہیں، اپنے محلہ کی مسجد میں صبح کی نماز پڑھنے کے بعد اور وظائف پڑھتے ہوئے کاندھلہ کے مشہور مدرسہ قرآنیہ میں تشریف لاتے جو جامع مسجد کے بالکل مقابل تھا، آتے ہی پہلے جامع مسجد میں تشریف لے جاتے، اشراق کی نماز پڑھتے، نماز پڑھ کر مکتب میں آتے اور تسابقین جس میں یہ ناکارہ بھی کبھی ہوتا جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور حافظ صاحب کے سلام پھیرتے ہی جہاں انہوں نے جوتے پہنے دو تین ایک دم سبق سنانا شروع کر دیتے تھے۔ مرحوم جو پہلے بسم اللہ کر دیتا اس کا شروع کر دیتے باقی کو کہہ دیتے کہ ''چشت'' جو ہمارے یہاں ڈانٹ کا ایک فقرہ ہے۔ اس مکتب میں ایک انار کا چھوٹا سا درخت تھا۔ گرمی سردی ہر موسم میں جب اس انار کے درخت کی جڑ میں دھوپ آجاتی تو حافظ صاحب اپنی جگہ سے اٹھتے، نہایت اطمینان سے جامع مسجد تشریف لے جاتے، تجدید وضو فرماتے، چاشت کی نماز بہت اطمینان سے پڑھتے اور ان کے اٹھتے ہی سارے مکتب کے بچے اپنے اپنے قرآن جزدان میں بند کر دیتے مگر کیا مجال تھی کہ کوئی لڑکا پہلے جا سکے، حالانکہ اگر دو چار بھی چلے جاتے تو کیا پتہ چلتا۔ مگر ایک بچے کی بھی ہمت نہ ہوتی، چاہے کتنا چھوٹا ہو کہ حافظ صاحب سے پہلے جا سکے۔ چاشت کی نماز پڑھ کر حافظ صاحب مکتب میں آتے اور جوتا نکالنے سے پہلے ہی کسی لڑکے سے کہتے کہ ''لا میری لنگی اٹھا دے۔'' یہ اعلان چھٹی کا تھا۔ حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد فرمانا اور لڑکوں میں ایک دم بھگدڑ مچنا، اخیر میں حافظ صاحب ہی تنہا مدرسہ سے نکلا کرتے۔ حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مارتے کم تھے، مگر ان کا رعب اس قدر سخت تھا کہ اب تک بھی اس کے تصور سے خوف سا آجاتا ہے۔ دوسرے مدرس دوم حافظ عبدالسبحان مرحوم تھے۔ وہ اتنا سخت مارتے تھے کہ ان کے درجہ میں ہر وقت کہرام مچا رہتا۔ حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی پہلی تنبیہ یہ ہوا کرتی ''یاد نہیں کرتا سبحان کے پاس بھیج دوں گا۔''

یہ ناکارہ جب کاندھلہ دو چار دن کو جاتا حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی شاگردی میں داخل ہو جاتا، شاید دو ڈھائی سپارے پوری مقدار مختلف سالوں کی ہوگی۔ حافظ صاحب کو میرے دادا نور اللہ مرقدہٗ نے اس مدرسہ میں دو روپے پر مدرس رکھا تھا، پندرہ بیس برس بعد معے ہو گئے تھے۔ ہمارے کاندھلہ کے اکابر جب علی گڑھ سے وابستہ ہوئے تو انہوں نے بہت ہی کوشش کی کہ حافظ صاحب کو کالج میں قرآن کا مدرس بنا کر ۴۰، ۵۰، ۶۰، ۱۰۰ تک لے جایا جاوے۔ حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ایسے کا بٹھایا ہوا ہوں کہ ۷۰۰ پر بھی نہیں جا سکتا۔

سنا گیا ہے کہ حافظ صاحب مرحوم پہلے پہلوانی کرتے تھے اور کسی پہلوان کے پچھاڑنے کے لیے میرے دادا کے پاس تعویذ لینے گئے۔ ان کو پسند آ گئے، انہوں نے حال دریافت کیا۔ ''کون ہو؟ کہاں رہتے ہو؟'' نیل گر ہوں!، پہلوانی کرتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا، ''کچھ اور بھی آتا ہے؟'' انہوں نے کہا قرآن حفظ کیا ہے۔ دادا نے قرآن سنا اور اس کے بعد پہلوانی سے توبہ کرائی، بیعت کیا اور فرمایا کہ ۲ روپے مہینہ میں دے دوں گا تم بچوں کو قرآن پڑھایا کرو اور نیل گروں کی مسجد میں ان کو بٹھا کر محلّہ کے بچوں کو سپرد کر دیا۔ دادا صاحب کے جانے کے بعد شرفائے قصبہ نے اس میں اپنی توہین سمجھی کہ ان کے بچے نیل گر سے پڑھیں، انہوں نے اپنے بچوں کو اٹھالیا، چند ماہ بعد جب دادا صاحب دوبارہ آئے اور حال معلوم کیا تو بہت ناراض ہوئے اور ان کے لیے جامع مسجد کے سامنے منہدمہ مسجد میں مدرسہ بنادیا۔

میرے دادا صاحب کے انتقال کے بعد میرے تایا صاحب مولانا محمد صاحب سے بھی نیاز مندانہ تعلق رہا اور میرے چچا تو ان کے شاگرد تھے، میں نے بارہا دیکھا کہ چچا جان جب کاندھلہ جاتے تو حافظ صاحب کی بہت ادب سے اہتمام سے دست بوسی کرتے۔ حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا حکیم صدیق احمد صاحب کاندھلوی یکے از خلفاء قطب عالم گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے قرآن شریف کا لفظی ترجمہ حرفاً حرفاً پڑھا۔

مشہور ہے کہ حافظ صاحب کی چالیس سال تک تکبیر تحریمہ ایک دفعہ کے علاوہ فوت نہیں ہوئی۔ ۱۳۴۷ھ میں ۹۰ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ ان کے حافظ کردہ ۴۰۰ کے قریب ہیں اور کیرانہ کے راستے میں اپنی باغیچی میں مدفون ہیں۔ (کذا فی مکتوب الحاج صوفی افتخار الحسن کاندھلوی) حضرت حافظ صاحب کو فارسی بہت اچھی آتی تھی۔ اپنے صاحبزادوں کو خود فارسی پڑھایا کرتے تھے۔

ان دو بزرگوں کے علاوہ کسی سے قرآن پاک پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ نقل نظامی قرآن جس میں میں نے پڑھا اور اس کا ہر صفحہ آیت پر ختم ہوتا ہے ایک صفحہ کے متعلق میرے والد صاحب کا حکم یہ تھا کہ ''اس کو ۱۰۰ دفعہ پڑھ دو پھر چھوڑ دو، یاد ہونے کے ذمہ دار نہیں۔'' کبھی سو ۱۰۰ دفعہ پڑھا ہو تو یہ بھی اندازہ ہو کہ کتنی دیر میں سو دفعہ ہوتا ہے۔ اپنی ایک حماقت ساری عمر یاد رہے گی کہ دس پندرہ منٹ میں آکر کہہ دیتا کہ سو دفعہ ہو گیا اور اپنے کلام کو موثق اور مؤکد بنانے کے واسطے یا اپنی حماقت کے اظہار کے واسطے خود ہی کہہ دیتا کہ آج بالکل صحیح صحیح ہوا کل تو کچھ گڑبڑ بھی تھی اور ابا جان کا یہ مقولہ بھی ہمیشہ یاد رہے گا کہ ''آج کا بالکل صحیح صحیح کل تو معلوم ہو جاوے گا سمجھ تو اب تک بھی نصیب نہ ہوئی اس وقت تو عمر بھی سمجھ کی نہ تھی کبھی ابا جان کے اس ارشاد کا مطلب ہی سمجھ میں نہ آیا کہ آج کا بالکل صحیح کل کو معلوم ہو جاوے گا۔ سارا قرآن پاک اسی طرح پڑھ کر ختم کر دیا اور حافظ ہو گئے۔

میری دادی صاحبہ نور اللہ مرقدہا حافظہ تھیں اور بہت اچھا یاد تھا۔ سال بھر کا معمول خانگی مشاغل، کھانے پکانے کے علاوہ ایک منزل روزانہ کا تھا اور رمضان میں چالیس پارے روزانہ کا تھا۔ ان کے کچھ حالات تذکرۃ الخلیل میں بھی ہیں۔ جب وہ گنگوہ میں ہوتیں تو میرا سبق ان کے ذمہ تھا، وہ نہ ہوتیں تو والد صاحب کبھی اپنے سامنے کسی بچے کو بٹھا کر سنوا دیتے۔ جن میں میرے مخلص دوست مولوی عبدالرحمٰن صاحب گنگوہی جن کا ذکر اس میں پہلے گزر چکا ہے یا میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے محبوب شاگرد مولوی سعید مرحوم گنگوہی ہوا کرتے تھے اور گویا قرآن شریف ختم ہو، جانے کے بعد مولوی سعید مرحوم کے ذمہ میرا سپارہ سننا بھی تھا۔ اس میں ایک پارہ میں سو۱۰۰ غلطیاں معاف تھیں اور والد نور اللہ مرقدہٗ بھی کبھی سفر میں سنا کرتے تھے مگر اس میں تو جو یاد تھا وہ بھی بھول جاتا تھا۔

رمضان المبارک میں قرآن کا ابتدائی معمول:

قرآن شریف کی یاد تو کماحقہ، اب تک بھی نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن ۳۸ھ سے ماہ مبارک میں ایک قرآن روزانہ پڑھنے کا معمول شروع میں ہوا تھا جو تقریباً ۸۰ھ تک رہا ہوگا، بلکہ اس کے بھی بعد تک۔ ابتدائی معمول یہ تھا کہ سوا پارہ جس کو عموماً حکیم اسحاق صاحب کی مسجد میں سنانے کی نوبت آتی تھی یا میرے حضرت نور اللہ مرقدہٗ قدس سرہٗ کے گھر میں، اس کو تراویح کے بعد شب میں قرآن پاک دیکھ کر اور اکثر ترجمہ کے ساتھ سحر تک چار (۴) پانچ (۵) دفعہ پڑھتا تھا، گرمیوں کی شب میں کچھ کم، سردیوں میں کچھ زائد۔ اس کے بعد تہجد میں اس کو دو مرتبہ اس کے بعد سحر کھانے کے بعد سے لے کر صبح کی نماز تک اور نماز کے بعد سونے تک ایک دفعہ اور پھر صبح کو سونے کے بعد اٹھ کر جو عموماً دس بجے ہوا کرتا تھا، چاشت کی نماز میں سردیوں میں ایک مرتبہ، گرمیوں میں دو دفعہ۔ اس کے بعد ظہر کی اذان سے پندرہ منٹ پہلے تک ایک یا دو مرتبہ دیکھ کر پھر ظہر کی سنتوں میں ابتداء دو مرتبہ، اول کی سنتوں میں ایک دفعہ اور آخر کی دو سنتوں میں دوسری دفعہ اور بعد میں ہر دو سنتوں میں ایک ہی مرتبہ رہ گیا۔ ظہر کے بعد دوستوں میں سے کسی کو ایک مرتبہ سنانا اور پھر عصر تک موسم کے اختلاف کی وجہ سے ایک یا دو دفعہ پڑھنا۔ عصر کے بعد کسی دوسرے اونچے آدمی کو سنانا۔ ابتداء حضرت کی حیات تک حافظ محمد حسین صاحب اجراڑوی کو، اس کے بعد دو تین سال تک مولوی اکبر علی صاحب مدرس مظاہر علوم کو، اس کے بعد بہت عرصہ تک مفتی محمد یحییٰ کو اور ان ہی کے ساتھ ان کے دونوں بھائی حکیم الیاس، مولوی عاقل بھی شریک ہونے لگے۔ مغرب کے بعد نفلوں میں ایک دفعہ پڑھنا اور نفلوں کے بعد تراویح تک ایک دفعہ پڑھنا۔ تراویح کے بعد یہ پارہ ختم ہو جاتا تھا اور اگلے کا نمبر شروع

ہو جاتا تھا۔ ۲۴ گھنٹے میں اس کی تشکیل ضروری تھی کہ ۳۰ پارے پورے ہو جائیں۔ اللہ کے انعام وفضل سے سالہا سال یہی معمول رہا، اخیر زمانے میں بیماریوں نے چھڑادیا۔

اس زمانے کا ایک لطیفہ بھی یاد آ گیا، جو کئی سال تک بہت مشہور رہا۔ میرے عزیز مخلص دوست طیب رامپوری، میرے دوسرے مخلص مولوی عامر سلمہ کے والد، اس زمانے میں ان کی آمدورفت بہت کثرت سے تھی اور چونکہ بہت مختصر وقت کے لیے آتے تھے اور سیاست کی خبریں بہت مختصر ۲ الفاظ میں جلدی جلدی سنا جاتے تھے، اس لیے ان کی آمد میں میرے یہاں کوئی پابندی نہیں تھی۔ ایک مرتبہ رمضان میں ۸۔ ۹ بجے صبح کو آئے مولوی نصیر سے کہا کہ کواڑ کھلوادو۔ اس نے کہا رمضان ہے خود زنجیر کھڑکھڑانے کا ارادہ کیا، اس نے منع بھی کیا اور یہ بھی کہا کہ ''یا تو وہ سو رہا ہوگا نیند خراب ہوگی اور اگر اٹھ گیا ہوگا تو نفلوں کی نیت باندھ لی ہوگی، کھڑکھڑاتے رہو۔'' اس پر خفا ہو کر مدرسہ میں چلے گئے۔ راستہ میں مولوی منظور احمد خاں صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ملے، انہوں نے کہا، ''حکیم جی تم کہاں آ گئے؟ شیخ کے یہاں تو رمضان ہے۔'' اس پر کچھ سوچ پیدا ہوئی اور نصیر پر سے کچھ غصہ کم ہوا۔ اس کے بعد حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں پہنچے، وہ ڈاک لکھوا رہے تھے، فرمایا ''حکیم جی کہاں آ گئے، شیخ کے یہاں تو رمضان ہے۔'' وہاں سے اٹھ کر مفتی محمود صاحب کے حجرے میں گئے، مفتی صاحب کا قیام اس زمانے میں مدرسہ قدیم ہی کے حجرہ میں تھا، مفتی جی نے بھی یہ فقرہ دہرادیا۔ حکیم جی نے پوچھا ''آخر رمضان میں کوئی وقت بات کا ملاقات کا ہو سکتا ہے یا نہیں؟'' مفتی جی نے کہا تراویح کے بعد آدھ گھنٹہ۔ حکیم جی نے کہا مجھے تو رامپور واپس جانا ہے۔ تب مفتی جی نے کہا کہ ظہر کی نماز سے پندرہ منٹ پہلے تشریف لائیں گے اس وقت مل لینا ظہر کی نماز کے بعد گھر جاتے ہوئے راستے میں مل لینا وہ ظہر سے پہلے مسجد میں آئے تو میں نیت باندھ چکا، ظہر کی نماز کے بعد میں نے پھر سنتوں کی نیت باندھ لی، بڑی دیر تک انہوں نے انتظار کیا، مگر جب دیکھا کہ رکوع کا ذکر ہی نہیں، اس لیے کہ اس زمانے میں سنتوں میں دو دفعہ پارہ پڑھنے کا معمول تھا، وہ بڑی دیر انتظار دیکھ کر مٹر گشت میں چلے گئے، وہ واپس آئے تو میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر قرآن پاک سنانے میں مشغول ہو گیا تھا، وہ بہت کھٹ کھٹ کر کے اوپر چڑھے اور جاتے ہی بہت زور سے ''بھائی جی سلام علیکم، بات نہیں کرتا صرف ایک فقرہ کہوں گا، رمضان اللہ کے فضل سے ہمارے یہاں بھی آتا ہے مگر یوں بخار کی طرح کہیں نہیں آتا۔ سلام علیکم جا رہا ہوں، عید کے بعد ملوں گا۔'' میں نے کہا ''وعلیکم السلام'' اور پھر قرآن سنانے میں مشغول ہو گیا۔

بندہ کی ابتدائی فارسی:

۲۵ھ سے میری فارسی اردو اس حالت میں شروع ہوگئی کہ قرآن پاک تو گویا پڑھا بے پڑھا

برابر تھا، مگر ہم حافظوں میں شمار ہونے لگے۔ میں نے فارسی زیادہ تر اپنے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے پڑھی۔ ان پر اس زمانے میں بزرگی کا بہت ہی غلبہ تھا، مجاہدات سلوک کا بہت زور تھا، خانقاہ قدوسیہ کے پیچھے ایک بہت مختصر آب چک تھی، اس میں ایک بوریے پر آنکھ بند کیے ہوئے دوزانوں بیٹھے رہا کرتے تھے۔ میں سبق کے لیے جاتا تو قانون یہ تھا کہ ایک کتاب چچا کے سامنے کھول کر رکھ دیتے، ایک ساتھی میرا اور تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں، ہم دونوں دوسری کتاب میں پڑھتے۔ بیٹھنے کے بعد بسم اللہ کر کے سبق شروع کر دیتے، اگر اس میں ذرا دیر ہوتی تو چچا جان نور اللہ مرقدہٗ ایک انگلی سے اپنے سامنے کی کتاب بند کر دیتے اور گویا تاخیر کے عتاب میں سبق بند، ہم تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے آتے اور کبھی دوبارہ شروع کرتے اور کتاب کھول کر دوبارہ ان کے سامنے رکھتے تو موج تھی کبھی پڑھا دیتے کبھی ''چشت'' فرما کر اٹھا دیتے۔ سبق میں اپنے ہی مطالعہ پر مدار تھا۔ معمولی غلطی پر ''چشت'' کہتے یا ''ہوں'' اور فحش غلطی پر پھر وہی ایک انگلی سے کتاب بند کر دیتے۔

اس سیہ کار میں اس زمانے میں بولنے کا مرض بہت زیادہ تھا، چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے مجھ سے فرمایا کہ ''اگر تو چھ ہفتے چپ رہے تو میں تجھے ولی کر دوں۔'' اس زمانے میں چھ ہفتے تو درکنار چھ دن بھی چپ رہنا مصیبت تھا۔ میں نے بڑے ہو کر نظام الدین می ایک مرتبہ ان کو یہ ارشاد یاد دلایا ان کو یاد آ گیا، میں نے کہا کہ '' آپ نے اس وقت میں چھ ہفتے کو فرمایا تھا۔ اب میں چھ ماہ کامل چپ رہ کر دکھلاؤں۔'' چچا جان نے فرمایا کہ ''وہ بات تو گئی، وہ تو اس وقت کی تھی۔''

اس زمانے میں چچا جان دن میں سارا دن مراقبہ کرتے، نہ معلوم کیا سوچا کرتے اور مغرب سے عشاء تک نفلیں پڑھتے۔ اس زمانے میں چچا جان کو جَو کی روٹی کا اتباع سنت میں کھانے کا شوق پیدا ہوا اور ان کے ساتھ ہم نے بھی زور دکھلائے، تقریباً چھ ماہ چچا جان کا یہ دستور رہا۔ اس کے بعد کسی بیماری کی وجہ سے حکیم صاحب نے اس کو منع کر دیا، جس پر میرے والد صاحب نے بھی ان کو روک دیا اور وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ ورنہ تین چار روٹی جَو کی پکنا خوب یاد ہے اور چچا جان کے ساتھ اپنا کھانا بھی۔

گنگوہ سے سہارنپور میں آمد:

رجب ۲۸ھ میں یہ ناکارہ سہارنپور آ گیا، اس لیے کہ دو تین ماہ قبل میرے والد صاحب قدس سرہٗ مستقل قیام کے ارادے سے گنگوہ سے سہارنپور منتقل ہو گئے۔ دار العلوم کا جلسہ دستار بندی، اس میں تقریباً کتب خانہ کا بہت سا حصہ گنگوہ سے دیوبند منتقل ہوا تھا کہ اکابر دیوبند نے حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی تالیفات کی اشاعت کی وجہ سے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر اصرار کیا تھا کہ اپنا کتب خانہ اور اپنی دکان دار العلوم کے جلسۂ دستار بندی میں لگا دیں۔ اس سے فراغ پر وہ سارا کتب خانہ دیوبند سے سہارنپور منتقل ہوا اور چونکہ چھکڑوں میں آیا اور دیوبند بھی چھکڑوں میں ہی گیا

تھا۔اس لیے کتابیں خراب بہت ہوئیں۔ ہزاروں کتابوں کی سلائی ٹوٹی۔

سہارنپور آ کر با قاعدہ عربی تعلیم شروع ہوئی اور اس سے پہلے ابتدائی عربی اور فارسی زیادہ تر چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے اور کم والد صاحب قدس سرہٗ سے پڑھنے کی نوبت آئی، لیکن سہارنپور آنے کے بعد با قاعدہ ہماری ایک مستقل جماعت بنی، جس کے دوسرے ساتھی میرے حضرت قدس سرہٗ اعلی اللہ مراتبہ کے عزیز مظہر علی خاں راجو پوری تھے اور تیسرے ساتھی سید محفوظ علی گنگوہی جو بعد میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے سالے بن گئے تھے اور اس کے بعد دیو بند منتقل ہو گئے تھے۔ جب مرحوم کی ہمشیرہ کی شادی حضرت شاہ صاحب سے ہوگئی، اس وقت تک وہ سہارنپور ہی میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس مقیم رہے اور اس سے پہلے گنگوہ میں بھی میرے والد صاحب ہی کے پاس پڑھتے تھے۔ یہاں آ کر با قاعدہ میرے ساتھی بن گئے تھے اور مستقل جماعت ہماری تین آدمیوں کی خصوصی جماعت شمار ہونے لگی۔ سید محفوظ صاحب کے دیو بند جانے کے بعد ہم دو ہی رہ گئے۔

صرف پڑھانے کا والد صاحب کا ایک خاص طریقہ تھا۔ وہ الفاظ لکھوا دیا کرتے تھے اور کچھ قواعد لکھوا دیتے تھے۔ مثلاً اجوف، ناقص وغیرہ کے۔ میں نے میزان منشعب معروف ومتداول نہیں پڑھی۔ اس زمانے میں میرے ہی لیے غالباً ایک میزان منشعب خاص تصنیف ہوئی تھی جو دو دو ورق کی تھی آسی مدراسی پریس میں چھپی تھی اس میں میرے مقدر سے گردان بھی بجائے فَعَلَ یَفْعِلُ کے ضَرَبَ یَضْرِبُ کی تھی، میزان میں بھی وہی تھی منشعب میں بھی وہی تھی جو دو دو ورق کی تھی اسی مدراسی پریس میں چھپی تھی اس میں میرے مقدر سے بھی وہی تھی اور عمل میں بھی وہی اور اس کے بعد وہ ایسی کہیں گم ہوگئی کہ تلاش سے بھی نظر نہ پڑی۔

والد صاحب کا طرزِ تعلیم:

میرے والد صاحب کے یہاں پہلے قواعد زبانی یاد کرائے جاتے تھے اور اس کے بعد ان قواعد کا اجراء تختی یا ردی کاغذوں پر کرایا جاتا تھا، اس کے بعد پھر مجھے یاد ہے کہ صرف میر اور پنج گنج تین تین چار چار دن میں سنا دی تھیں ان میں وقت نہیں خرچ ہوا۔ اس واقعہ کی کچھ تفصیل اِکمال الشیم کے مقدمہ میں بھی گزر چکی ہے۔ البتہ فصول اکبری میں بہت وقت خرچ ہوا۔ رمضان میں تعطیل نہیں ہوتی تھی، البتہ رمضان کی کتابیں علیحدہ ہو جایا کرتی تھیں۔ میری صرف صغیر کی کاپی پر جو ابتدائی زمانہ کی مشق کی ہوئی ہے، میری طالب علمی کی کتابوں کا بھی ایک نقشہ جو مقدر سے مل گیا وہ اس جگہ درج کراتا ہوں، اتفاق سے بہت پرانی کاپی غالباً ۲۸ھ کی ہے، جس پر نقشہ ملا، شروع کے تین سال کا ہے۔ اتنا یاد ہے کہ اس زمانے میں رمضان کی کتابیں بالکل الگ ہوتی تھیں پہلے

رمضان میں نحومیر ہوئی تھی اسی کے ساتھ جملوں کی ترکیب نحومیر کے قواعد کے مطابق بنوائی گئی۔نحو کے چند سبق میں نے مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی شیخ الاسلام حال پاکستان سے بھی پڑھے ہیں۔مولانا سے میں نے صرف نحومیر ہی کے چند سبق پڑھے اور کچھ پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔اس لیے کہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ زیادہ تر خود ہی پڑھایا کرتے تھے۔مولانا ظفر احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا حال اکمال الشیم کے مقدمہ میں خود ان کے گرامی نامے سے لکھا جاچکا ہے۔ان کی پیدائش ان کی تحریر کے موافق ۱۳ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ ہے۔مدرسہ مظاہر علوم میں ۵ جمادی الثانی ۲۹ھ کو مدرس مقرر ہوئے۔۳۵ھ میں طویل رخصت لے کر اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان منتقل ہوگئے۔اَطَالَ اللّٰہُ بَقَائَہٗ

وہ نقشہ یہ ہے

سال اول از رمضان ۲۸ھ تا شعبان ۲۹ھ:

نحومیر تمام۔شرح مأتہ مع ترکیب تمام۔ہدایۃ النحو تمام۔کافیہ کبری تمام۔ایساغوجی تمام۔مرقاہ (تمام) شرح تہذیب (نصف)۔مفید الطالبین (باب اول) نفحۃ الیمن (دو قصیدہ از باب دوم)۔ الفیہ (تمام)۔ابن مالک (نصف)۔فصول اکبری (ثلث)۔ترجمہ پارۂ عم (تمام)۔تبارک الذی (نصف)۔مجموعہ چہل حدیث (یہ پانچ چہل حدیثوں کا مجموعہ، شاہ ولی اللہ صاحب اور ملا جامی کا اس زمانے میں بہت مشہور اور شائع تھا)۔

سال دوم رمضان ۲۹ھ تا شعبان ۳۰ھ:

بقیہ الفیہ۔بقیہ شرح تہذیب۔قطبی تصدیقات و تصورات مع میر۔تلخیص فن اول۔مقامات ۲۳ مقامے۔حساب تا کسورِ عام۔بقیہ ترجمہ تبارک الذی۔نفحۃ الیمن باب اول، باب ثانی، باب خامس۔قصیدہ بردہ۔بانت سعاد۔قصیدہ ہمزیہ۔

سال سوم رمضان ۳۰ھ تا شعبان ۳۱ھ:

مختصر۔نور الانوار۔متنبی۔سبعہ معلقہ۔حسامی۔شرح جامی ۶،احصہ۔کنز۔قدوری۔میبذی۔سلم۔

سال چہارم رمضان ۳۱ھ تا شعبان ۳۲ھ:

کاپی میں اس کی تفصیل نہیں، مدرسہ کی روئداد میں صفحہ ۱۰۱ پر اس سال کی کتب مُمتَحَنَہ یہ ہیں: مشکوٰۃ شریف۔ہدایہ اولین۔متنبی۔حماسہ۔طحاوی۔شرح نخبہ۔الفیہ عرفی۔مگر اس کا امتحان نہیں دیا۔

سال پنجم رمضان۳۲ھ تا شعبان۳۳ھ:

کاپی میں اس سال کی کتب بھی درج نہیں ہیں۔ مدرسہ کی روائد سے نقل کرر ہا ہوں:
ملاحسن۔ حمداللہ۔ میر زاہد۔ امورِ عامہ۔ میر زاہد ملا جلال۔ میر زاہد رسالہ غلام یحییٰ۔ مؤطا محمد۔ طحاوی۔ اقلیدس۔ شمس بازغہ۔ مگر اقلیدس، شمس بازغہ کا امتحان نہیں دیا۔ مؤطا امام مالک کا امتحان بغیر پڑھے دیا تھا، ممتحن کو یہ علم ہوگیا تھا کہ بغیر پڑھے دیا ہے، اس لیے انہوں نے بغیر پڑھے کی رعایت کی کہ فیل کر دیا اور کرنا چاہیے تھا۔

سال ششم رمضان۳۳ھ تا شعبان۳۴ھ:

کتب مقروءہ از والد صاحب:
اس سیہ کار نے حدیث کی کتابوں کا امتحان نہیں دیا۔
ترمذی شریف۔ بخاری شریف۔ ابوداؤد شریف۔ ہدایہ ثالث (ابتدائی حصہ)۔ نسائی شریف (تمام)۔

سال ہفتم رمضان۳۴ھ تا محرم ۳۵ھ:

نزد حضرت اقدس رحمہ اللہ تعالیٰ: بخاری شریف (دوسری مرتبہ)۔ ترمذی شریف۔ شروع سال میں حضرت اقدس رحمہ اللہ تعالیٰ نینی تال جیل میں تھے۔ آخر ذی الحجہ میں تشریف آوری ہوئی تھی۔

شوال۳۵ھ تا شعبان۳۶ھ:

نزد حضرت قدس سرہٗ۔ ابوداؤد شریف۔

شوال۳۶ھ تا شعبان ۳۷ھ:

نزد حضرت قدس سرہٗ۔ مسلم شریف۔ نسائی شریف۔
میں اکمال الشیم کے مقدمہ میں لکھ چکا ہوں کہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص شاگردوں کے پڑھانے میں مجتہد تھے، کسی نصاب کے پابند نہیں تھے، ان کے یہاں زبانی تعلیم زیادہ اہم تھی بہ نسبت کتابی تعلیم کے۔ ادب کے درمیان میں بہت زور تھا، نحو میر کے ساتھ ہی عربی سے اردو، اردو سے عربی بنوانے کا اہتمام تھا۔ ادب میں چہل حدیثوں کا بہت دستور تھا۔ ایک چہل حدیثوں کا مجموعہ تھا۔ جس میں شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، ملا جامی، قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ کی چہل حدیث پڑھائی جاتی تھیں۔
ان کے یہاں کافیہ ہدایۃ النحو ساتھ پڑھانے کا معمول تھا۔ جتنی شام کو کافیہ پڑھائی ہوتی صبح کو

اتنی ہدایۃ النحو ہو جاتی، گویا ہدایۃ النحو کافیہ کی جگہ مطالعہ ہوتا۔ اسی طرح سے کنز اور قدوری ساتھ ہوتی، اس طرح پر کہ کنز اصل ہوتی اور قدوری بمنزلہ مطالعہ کے ہوتی، جتنی شام کو کنز ہوتی اس کی ترتیب کے موافق صبح کو قدوری ہو جاتی۔

ادب کی کتابوں میں وہ محشیٰ کتابوں میں پڑھانے کے مخالف تھے۔ میں نے مقامات جو پڑھی وہ کلکتہ کی مطبوعہ میرے لیے خاص طور سے وی پی منگائی گئی تھی۔ جس میں نہ کوئی حاشیہ تھا نہ اعراب۔ سبعہ معلقہ انہوں نے اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر پڑھایا اس لیے کہ موجود، سبعہ معلقہ سب محشی تھے۔ اسی طرح متنبی بھی ان کے دست مبارک کی لکھی ہوئی پوری موجود ہے۔

کسی کتاب کا پورا ہونا حدیث کے علاوہ ان کے یہاں ضرور نہ تھا بلکہ ہر کتاب کا نصاب یہ تھا کہ جب آٹھ سبق ایسے پڑھ لو کہ استاد جو چاہے پوچھ لے اور شاگرد کچھ نہ پوچھے وہ کتاب گویا پڑھ لی، اس کے بعد ختم کرنا ضروری نہ تھا۔ اگر شاگرد کا جی چاہتا تو دوبارہ کی طرح سے فرفر سنا کر ختم کر دیتا، نہ جی چاہتا تو کچھ ضروری نہ تھا۔ البتہ حدیث پاک کے ختم کا ضرور اہتمام تھا۔

الفیہ ابن مالک اس ناکارہ نے پورا پڑھا اور اس کا سبق حرفاً حرفاً سنا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہاتھ کی ہتھیلی پر ہر شعر کا ابتدائی کلمہ لکھ لیتا تھا، پھر سارا شعر یاد آ جاتا تھا۔ پڑھنے کے زمانے میں اس کی ایک اردو شرح بھی لکھی تھی۔ تالیفات میں اس کا ذکر آئے گا۔

شرح جامی کے متعلق نقشہ میں ۱۶، لکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ الفیہ کے بعد ایک دفعہ کاندھلہ جاتے وقت سہارنپور کے اسٹیشن پر شرح جامی شروع ہوئی تھی، کاندھلہ کے اسٹیشن تک بغیر ترجمہ کے میں پڑھتا چلا گیا۔ ابا جان نے کہیں کہیں مطلب پوچھا، میں نے بتلا دیا۔ کاندھلہ جا کر ایک دن قیام رہا، وہاں بھی ایک گھنٹہ سبق ہوا، تیسرے دن واپسی پر کاندھلہ کے اسٹیشن سے سبق شروع ہوا تھا سہارنپور کے اسٹیشن تک ختم ہو گیا تھا۔ ان تین دن میں مرفوعات تو ساری ہو گئی تھیں منصوبات کا بھی بہت سا حصہ ہو گیا تھا۔ میری شرح جامی بھی قسمت سے نہ معلوم کہاں سے آئی تھی، بہت ہی مختصر حاشیہ۔ مجھے اس وقت پتہ نہیں چلا کہ اس میں حاصل محصول کیا چیز ہوتی ہے؟ جب مدرسی کے زمانہ میں ایک مرتبہ شرح جامی بحث اسم پڑھانے کی نوبت آئی، اس کے حواشی دیکھنے شروع کیے تو میں دیکھتا دیکھتا تھک گیا، تحریر، سنبٹ، سوال کابلی، سوال باسولی، حاشیہ عبدالرحمٰن، حاشیہ عبدالغفور، نہ معلوم کتنے حواشی دیکھے، مگر یہ حاصل محصول ختم ہو کر نہ دیا جب پتہ چلا کہ یہ بھی کوئی معرکۃ الآراء چیز ہے۔

اسی طرح اکثر کتابوں کی تعلیم میری ناقص ہی رہی۔ عبارت تیز اور صاف پڑھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ایسی تیز اور صاف پڑھتا تھا کہ استاذ کو بھی خیال ہوتا کہ خوب سمجھ کر پڑھ رہا ہے، اسی وجہ سے اب تک بھی جاہل کا جاہل رہا۔

البتہ حدیث پاک کا مجھے بھی اہتمام رہا، وہ میں نے بھی بڑی محنت سے پڑھی، اس میں بھی کئی معرکے ہیں جو عنقریب آنے والے ہیں۔

مولانا ماجد علی صاحب اُستاذ منطق:

میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے مجھے منطق سُلَّم تک پڑھا کر چھڑادی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے رفیق درس حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے زمانے میں مولانا ماجد علی صاحب مانی کلاں ضلع جونپور کے رہنے والے، منطق کے امام، استاذ الاساتذہ، ان کے زمانے میں معقول و منطق شہرۂ آفاق تھی۔ انہوں نے میرے والد صاحب قدس سرہٗ سے وعدہ لے رکھا تھا کہ زکریا کو منطق میں پڑھاؤں گا اور میرے والد نے وعدہ کرلیا تھا، اس لیے انہوں نے سُلَّم تک منطق پڑھا کر چھڑادیا اور ان کا ارادہ تھا کہ دینیات سے فارغ ہونے کے بعد ایک سال کے لیے مینڈھو بھیجوں گا جہاں مولانا مرحوم مدرس تھے۔ مولانا ماجد علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مناطقہ کے امام تھے ان کی صفات مناطقہ کی صفات ہونا ہی چاہیے تھا۔ مرحوم کا مشہور مقولہ تھا کہ ترمذی تو مولوی محمود یعنی شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کچھ پڑھا لیتے ہیں اور ابوداؤد مولوی خلیل صاحب یعنی میرے حضرت قدس سرہٗ اسی بناء پر انہوں نے اپنے ایک خاص شاگرد مولوی فضل الرحمٰن ٹونکی کو جنہوں نے بارہ برس تک ان سے منطق پڑھی تھی۔ ابوداؤد پڑھنے کے واسطے میرے حضرت کے پاس بھیجا تھا اور میرے حضرت قدس سرہٗ نے بھی ان کو تنہا بڑے اہتمام سے ابوداؤد پڑھائی، لیکن بخاری کے متعلق مولانا ماجد علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا مقولہ تھا کہ ''اس میں تو کچھ کہہ سکتا ہوں تو میں ہی کہہ سکتا ہوں۔'' اسی وجہ سے مولانا مرحوم میرے والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے بار بار یہ اصرار کرتے تھے کہ ''زکریا کو جلدی بھیج دو میری خواہش یہ ہے کہ بخاری بھی میں ہی پڑھاؤں۔'' میرے والد صاحب کہتے تھے کہ منطق کا تو میرا وعدہ ہے، لیکن دینیات سے فارغ ہونے کے بعد بھیجوں گا مرحوم کا یہ مقولہ میں نے خود بھی سنا جو میرے سامنے میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے کہا کہ ''مولوی صاحب آپ اس کا حرج کر رہے ہیں، یہ میرے پاس آنے کے بعد یوں کہے گا کہ میں بخاری بھی تم سے ایک دفعہ دوبارہ پڑھنا چاہوں۔'' میرے والد صاحب کا ہمیشہ یہ جواب ہوتا تھا کہ ''منطق کا تو وعدہ ہے مگر بخاری کے متعلق تم اگر یوں نہ کہہ دو کہ مولوی زکریا تمہاری اس میں کیا رائے ہے تو کوئی بات نہیں۔'' اور اس پر کچھ خوش نہ ہوتے تھے۔

میرے حضرت قدس سرہٗ نے ایک مرتبہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ ''زکریا نے منطق کہاں تک پڑھی؟'' تو میرے والد صاحب نے مولانا ماجد علی صاحب سے اپنا وعدہ ذکر کردیا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نے بڑے زور سے لاحول پڑھ کر ارشاد فرمایا کہ ''منطق کے

واسطے کہیں بھیجنا نہیں۔'' اس بناء پر اپنی طبیعت کے خلاف میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو مجھے منطق پڑھوانی پڑی۔ اسی لیے اس نقشہ میں میرا ایک سال خالص منطق کا ہے۔

میری منطق کا سال:

میرے منطق کے تین استاذ ہیں۔ قطبی میر تک تو میں نے اپنے چچا جان نور اللہ مرقدۂ سے مدرسہ کے اوقات میں پڑھی۔ البتہ شرح تہذیب حضرت ناظم صاحب مولانا عبد اللطیف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے قطبی سے پہلے خارج میں عصر کے بعد پڑھی تھی۔ وہ میرے والد صاحب کے حجرے میں تشریف لایا کرتے تھے، میرے والد صاحب کا حجرہ کتب خانے کا غربی حصہ تھا اور اس کے باہر کا حصہ جہاں اب تک کتب خانہ کی جدید عمارت آ گئی اس وقت بالکل خالی تھا اسکی منڈیر پر بیٹھ کر پڑھایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو بہت جزائے خیر دے۔ سلم، میبذی اور میر زاہد، امورِ عامہ حضرت مولانا عبد الوحید صاحب سنبھلی مدرس دوم مظاہر علوم سے دو سالوں میں پڑھیں۔ اس کے علاوہ منطق کی ساری کتابیں میرے مشفق استاد حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب سابق ناظم مظاہر علوم سے اس طرح پڑھیں کہ میر زاہد، ملا جلال، ملا حسن تو مدرسہ کے گھنٹوں میں ان ہی کے یہاں ہوتی تھیں، اس کے علاوہ باقی سب کتابیں عشاء کے بعد پڑھیں۔ سردیوں کے بعد سے میرا سبق شروع ہوتا تھا، اس طرح پر کہ ایک چارپائی پر تو نیم دراز میں ہوتا تھا اور درمیانی چارپائی پر میرے چچا جان نور اللہ مرقدۂ بغیر کتاب کے لیٹے رہتے تھے، اس لیے کہ منطق انہوں نے بھی نہیں پڑھی تھی اور اگر میں یوں کہوں کہ منطق کی سب کتابوں میں، اپنے عمِ محترم، استاذ، نائب الشیخ چچا جان کا رفیق درس ہوں تو بے محل نہیں۔ تیسری چارپائی پر حضرت ناظم صاحب لحاف اوڑھے لیٹے ہوتے تھے۔ عشاء کے بعد سے سردیوں کے موسم میں بارہ بجے تک سبق ہوتا تھا اور حضرت ناظم صاحب کے اعزہ حکیم تقی اور مولوی عبد الوحید، اس زمانے میں مدرسہ میں پڑھتے تھے، میری اور چچا جان والی چارپائیاں ان ہی کی ہوتی تھیں، وہ دونوں زبان سے تو کیا کہہ سکتے تھے، دل دل میں جو کچھ کہہ سکتے ہوں وہ ظاہر ہے، مگر چونکہ طالب علم تھے اس واسطے حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تاکید تھی کہ میرے سبق تک مطالعہ دیکھیں، وہ دونوں میرے کتاب کے سبق کے ختم ہونے تک کچھ اونگھتے ہوئے دیکھتے، بیچارے بارہ بجے تک صبر کرتے اور شاذ و نادر ہی ۱۲ بجے خلاصی ہوتی۔ بارہ بجے ہم تینوں استاذ شاگرد اٹھ کر بازار چلے جاتے اور ناظم صاحب ان دونوں سے کہہ دیتے کہ آگ جلا کر ذرا سا پانی چائے کا رکھ دو۔ غصہ تو دونوں کو بہت آتا، مگر ''حکم حاکم مرگ مفاجات'' وہ چائے کا پانی رکھتے اور چائے دم کر کے رکھتے اور ہم تینوں بازار سے دودھ، شکر اور مٹھائی خرید کر لاتے، پیسے اکثر ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہوتے اور کبھی چچا جان

کے اور کبھی میرے والد صاحب قدس سرہٗ بھی نہایت ناراضی کے ساتھ غصہ کے ساتھ اس مد میں کچھ مرحمت فرمادیتے۔ میرے والدین کا قیام اس زمانے میں اس مختصر مکان میں تھا جو مدرسہ قدیم کی مسجد کے غربی جانب ہے۔ ابا جان بارہ بجے تک تو انتظار کرتے لیکن بارہ کے دس، بارہ منٹ بعد تحقیق کے لیے تشریف لاتے۔ حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قیام اس زمانے میں اس مکان میں تھا جو اب ''گاڑہ بورڈنگ'' کے نام سے مشہور ہے اور میرے مکان کے بالکل متصل ہے، میں نے ساری منطق تقریباً اسی مکان میں پڑھی۔ اگر ابا جان کو آنے پر معلوم ہوتا کہ استاد شاگرد سب بازار گئے ہوئے ہیں تو واپس چلے جاتے اور اگر ہم واپس آجاتے تو کبھی ہلکی سی ڈانٹ بھی پڑتی ''ارے بھائی سبق کی تو مجبوری ہے، اس کے بعد کا وقت ضائع نہ کرنا چاہیے۔'' حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کو بھی خطاب فرماتے کہ تم لوگوں کو بھی اٹھنا ہے حضرت ناظم صاحب نور اللہ مرقدہ کبھی ہنس کر فرمایا کرتے تھے کہ ''حضرت تکان ہو جاتا ہے اس لیے چائے کی ضرورت پیش آتی ہے۔'' ابا جان چپ ہو جاتے۔ حضرت ناظم ان پر بھی چائے کا اصرار کرتے مگر اکثر غصے میں نہیں پیتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ حمد اللہ اٹھارہ یا انیس دن میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوئی نور اللہ مرقدہٗ کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالرحیم صاحب مرحوم بھی مدرسہ میں پڑھتے تھے اور وہ حمد اللہ کئی دفعہ پہلے پڑھ چکے تھے، انہیں حمد اللہ سے عشق تھا۔ میرا بہت مذاق اڑایا کرتے تھے کہ حمد اللہ بھی ایسی چیز ہے کہ آدمی اٹھارہ دن میں پڑھ لے، وہ اٹھارہ برس میں پڑھنے کی کتاب ہے۔ مجھے سنا کر لوگوں سے کہتے کہ ''آپ نے اٹھارہ دن میں حمد اللہ پڑھی ماشاء اللہ کیا کہنا۔'' مقدر کی بات کہ حمد اللہ کے امتحان میں دونوں شریک تھے، اس سیہ کار کے نمبر بڑھ گئے اور ان کے غالباً ان کے غرور کی وجہ سے گھٹ گئے۔ اس زمانہ میں اساتذہ پر بدگمانی کا کوئی نالائق سے نالائق بھی شبہ نہیں کرسکتا تھا، مگر وہ مرحوم بار بار یوں کہتے تھے کہ ''عقل میں نہیں آتا کہ تیرے نمبر کیسے بڑھ گئے؟'' میرا تو خیال یہ ہے کہ وہ مشکوٰۃ شریف پڑھتے وقت بھی حمد اللہ کا سبق سنا کرتے تھے، کہ دونوں سبقوں کے مدرس قریب قریب بیٹھتے تھے۔

مجھے اقلیدس پڑھنے کے زمانے میں اس سے بڑا شغف ہو گیا تھا، اس لیے کہ ابتدائی زمانہ میں صیغے بنانے کی مشق ابا جان نے بہت کرادی تھی، اس لیے اقلیدس کے زمانے میں اسکی شکلیں گھڑنے کا بہت شوق تھا، میرے پرانے کاغذات میں میری صَرف صغیر، صرف کبیر، اقلیدس کی کاپیاں بھی بہت پڑی ہوئیں ہیں۔ شمس بازغہ ہفتہ عشرہ تو متن وشرح دونوں پڑھیں مگر جب یہ اندازہ ہوا کہ متن اور شرح میں زیادہ فرق نہیں اس لیے وہ ایک ہفتہ صرف متن پڑھ کر چھوڑ دیا تھا۔

اس سال میں امتحان کی کتابوں میں مؤطاً امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ ہے، مگر میں نے اس کو بغیر پڑھے امتحان دے دیا تھا۔ اقلیدس شمس بازغہ کا پڑھنا تو خوب یاد ہے۔ اقلیدس کی کاپیاں بھی بہت پڑی ہیں حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے دونوں کتابیں پڑھیں مگر امتحان ان کتابوں کا نہیں ہوا اور تصریح شرح چغمینی بھی تھوڑی تھوڑی حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے ہی پڑھی تھی۔ ان سب کے کفارہ کے لیے اخیر سال میں اپنے حضرت قدس سرہٗ سے مؤطاً امام محمد اور طحاوی پڑھی تھی۔ طحاوی کا امتحان نہیں دیا کیونکہ اس سے پہلے سال دے چکا تھا۔

اساتذہ کرام کے احوال:

یہ غالباً میں لکھوا چکا ہوں کہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے بار بار ارشاد فرمایا کہ ''میں تجھے فقہ، حدیث اپنے اور حضرت کے علاوہ کسی سے پڑھنے نہیں دوں گا، منطق و نطق جس سے چاہے پڑھ لے، اس لیے کہ تو بے ادب اور گستاخ ہے، حدیث اور فقہ کے علاوہ کسی اور کتاب کے استاد کی بے ادبی کرے گا اور وہ علم ضائع ہو جائے گا۔ بلا سے۔ لیکن حدیث اور فقہ کی کوئی کتاب ضائع ہو جائے یہ مجھے گوارا نہیں۔'' اس لیے میں نے فقہ کی ابتدائی کتابیں تو اپنے چچا جان سے پڑھی ہیں اور انتہائی اپنے والد صاحب سے اور حدیث کی کتابیں صرف اپنے والد صاحب اور حضرت قدس سرہٗ سے۔

اس کے علاوہ میرے صرف تین استاذ ہیں۔ نحو میر کے چند سبق مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ شیخ الاسلام پاکستان سے پڑھے ہیں جو اس وقت سہارنپور میں مدرس تھے۔ اپنے طلب کے سلسلہ میں اس کا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ مولانا نے اپنی پیدائش اور تعلیم وغیرہ خود اپنے گرامی نامے میں مفصل تحریر فرمائی جس کو میں اپنے اکمال الشیم کے مقدمہ میں پورا لکھ چکا ہوں، مولانا نے اپنی ولادت ۱۳ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ لکھی ہے، جو پہلے گزر چکی۔ ان کی ابتدائی تعلیم تھانہ بھون میں ہوئی اور انتہائی کانپور کے مدرسہ جامع العلوم میں، جس کی تفصیل مولانا کے اپنے والا نامہ میں موجود ہے جو اکمال الشیم کے مقدمہ میں لکھا جا چکا۔

ان کے علاوہ میرے منطق کے استاذ صرف دو ہیں: ایک مولانا عبدالوحید صاحب سنبھلی رحمہ اللہ تعالیٰ جن سے میں نے تین کتابیں مدرسہ کے اسباق کے ساتھ پڑھیں، سُلم العلوم، میبذی، میر زاہد، امور عامہ اور ان تین کے علاوہ سب حضرت مولانا عبداللطیف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے پڑھیں حضرت مولانا عبدالوحید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ منطق و فلسفہ کے امام تھے علمِ ہیئت کی کتابیں کسرے کی مدد سے اتنی تفصیل سے سمجھاتے تھے کہ طالب علم کے ذہن میں ساری باتیں بہت وضاحت سے آ جاتی تھیں۔ حضرت مولانا کی ولادت تقریباً ۱۲۹۰ھ میں سنبھل ضلع مراد آباد میں

ہوئی۔ ابتدائی عمر میں ان کے والد نے اردو اسکول میں تعلیم دلائی اور اس سے فراغ کے بعد دنیوی کاروبار میں لگا لیا۔ مگر اللہ جل شانہٗ نے علم کا اعلیٰ درجہ مقدر فرمایا تھا، اس لیے ابتداء سرائے ترین ضلع مراد آباد کے مدرسہ عربیہ میں داخل ہوئے، مگر چونکہ وہ گھر سے ڈھائی میل دور کے فاصلہ پر تھا، آمد ورفت میں وقت زیادہ خرچ ہوتا تھا، اس لیے حسن پور ضلع مراد آباد کے مدرسہ میں مولانا احمد الدین سرحدی کے پاس صَرف ونحو کی تعلیم پوری کی۔ اس کے بعد کسی ماہر فن سے علومِ عقلیہ پڑھنے کا شوق ہوا اور معلوم ہوا کہ مولانا غلام محمد صاحب ان فنون کے امام ہیں، چنانچہ ان کی خدمت میں حسن پور سے گھر والوں کو اطلاع کیے بغیر پیدل چل دیے، دو آنے صرف پاس تھے، ایک ماہ میں لاہور پہنچے، وہاں علومِ عقلیہ کی تکمیل اور خاص طور سے علمِ ہیئت میں تبحر حاصل کیا اور معلوم ہوا کہ لاہور کے قیام میں حضرت اقدس شاہ عبد القادر صاحب قدس سرہٗ رائپوری بھی مولانا موصوف کے رفیقِ درس رہے۔ علومِ آلیہ کی تکمیل کے بعد حدیث شریف کی تکمیل کے لیے دار العلوم تشریف لائے اور فراغت کے بعد تقریباً پانچ برس مدرسہ سرائے ترین میں تدریس کی خدمت انجام دی، اس کے بعد نعمانیہ امرتسر میں صدر مدرس رہے، اس کے بعد مینڈھو ضلع علی گڑھ کے مدرسہ میں مدرس رہے، وہاں کے قیام میں جلسۂ دستار بندی ہوا، اس میں حضرت سہارنپوری، مولانا احمد حسن صاحب امروہی اور اعلیٰ حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب رائپوری نے شرکت فرمائی اور حضرت سہارنپوری نے نواب صاحب سے جو مدرسہ کے سرپرست اور مربی تھے، مولانا مرحوم کو مظاہر علوم کے لیے طلب کیا، نواب صاحب مرحوم نے حضرت مولانا کے اصرار پر اجازت دے دی اور حضرت مولانا عبد الوحید صاحب ۱۹ ذی الحجہ ۲۸ھ کو مظاہر میں تشریف لائے۔ ذی قعدہ ۳۳ھ میں بعض خانگی مجبوریوں کی وجہ سے استعفاء دے دیا اور ربیع الثانی ۳۵ھ میں دوبارہ تشریف لائے اور مظاہر سے پھر دوبارہ استعفاء دے کر اولاً مدرسہ شاہی مراد آباد میں اور پھر منڈھو میں چند سال مدرس رہ کر دار العلوم مئو میں صدر مدرسی پر تشریف لے گئے اور وہاں سے علالت کی وجہ سے مکان تشریف لے گئے اور چند ماہ کی علالت کے بعد غرۂ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ میں بعمر ۶۳ سال داعیٔ اجل کو لبیک کہا، مولانا مرحوم کی مستمر و مستقل عادت ہمیشہ نیچے نظر کر کے چلنے کی تھی۔ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بیعت تھے۔

(منقول از مکتوب مولانا محمد حیات صاحب ناظم مدرسہ حیات العلوم مراد آباد مختصراً)

مولانا حیات صاحب نے ولادت تقریباً ۹۰ھ لکھی، لیکن وصال ۵۵ھ بعمر ۶۳ سال لکھا، اس حساب سے ولادت ۱۲۹۲ھ میں ہوتی ہے، بعد میں مولانا مرحوم کے صاحبزادے قاری مُعید صاحب نے لکھا ہے۔ مظاہر علوم میں آمد کا سال اپنی تاریخ کبیر سے لکھا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا

گیا کہ چلنے میں اور سبق میں مولانا نیچی نظر رکھتے تھے، تقریر نہایت متانت سے آہستہ آہستہ فرمایا کرتے تھے۔ مولانا مرحوم کا ایک مقولہ اس ناکارہ نے کئی بار سنا، نہایت نیچی نظر فرما کر متانت سے کئی دفعہ ہاتھ دائیں سے بائیں کرکے ارشاد فرماتے تھے کہ ''ہمیں اس کا یقین ہے، بالکل اعتراف ہے، اس میں نہ تواضع ہے اور نہ مبالغہ ہے کہ ہم لوگ ان کتابوں کے پڑھانے کے ہرگز قابل نہیں۔'' مختلف الفاظ سے اس مضمون کو دہراتے اور پھر ایک دم منہ اوپر کو اٹھا کر جماعت کی طرف اسی طرح سے ہاتھ سے اشارہ کرکے زور سے فرماتے کہ ''یہ جو بیٹھے ہیں یہ ہم سے بھی پڑھنے کے قابل نہیں ہیں۔'' سرمہ لگانے کی مولانا مرحوم کو بہت کثرت سے عادت تھی۔

حضرت استاذ مولانا الحاج الحافظ عبداللطیف صاحب سے تقریباً منطق وفلسفہ کی بندہ نے ساری ہی کتابیں پڑھیں جیسا کہ تفصیل سے گزر چکا۔ مولانا کی ولادت، میری تاریخ کبیر میں خود مولانا کی ارشادفرمودہ کہیں درج ہے، مگر چونکہ علی گڑھ میں ہوں، واپسی پر اگر کسی نے ڈھونڈ کر بتلادی تو درج کی جائے گی۔ قرآن پاک حضرت حافظ صاحب نے اپنے وطن پور قاضی ہی میں ایک بگھرے کے حافظ صاحب حافظ امانت علی صاحب سے پڑھا، جو مدرسہ تعلیم الاسلام جامع مسجد پور قاضی میں مدرس تھے اور اب تک یہ مدرسہ اسی نام سے قائم ہے۔ اس کے بعد ابتدائی فارسی اپنے والد صاحب مولانا جمیعت علی صاحب سے جو گورنمنٹ کالج بہاولپور میں شعبۂ عربی فارسی کے صدر تھے حاصل کی، پھر حضرت اقدس سہارنپوری کی بہاولپور تشریف بری کے موقع پر مولانا جمیعت علی صاحب نے حافظ صاحب کو مولانا کے سپرد کردیا اور حضرت قدس سرہٗ مولانا کو سہارنپور لے آئے اور یہاں آکر از ابتدا تا انتہا مظاہر علوم میں پڑھا۔ البتہ تین ماہ کے لیے شہر میں کچھ فتنہ کے خوف سے حافظ صاحب کو دیوبند بھیج دیا گیا اور وہاں صحت اور آب وہوا کی موافقت نہ ہونے کی وجہ سے واپس تشریف لے آئے۔ عمر شریف تقریباً ۷۵ سال کی ہوئی۔

(منقول از مکتوب عزیز مولوی عبدالرؤف سلمہٗ ابن حضرت مولانا عبداللطیف صاحب قدس سرہٗ)

حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ۱۵ھ میں مدرسہ کے کتب خانہ سے بوستان، قال اقول، ایساغوجی، مراح وغیرہ لیں اور ۲۳ھ میں اعلیٰ حضرت رائپوری قدس سرہٗ کی تجویز سے جس کی تفصیل تحریر احکام سرپرستان میں موجود ہے، مدرس مقرر ہوئے اور مولانا عنایت الٰہی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مستقل اہتمام کی طرف منتقل ہوئے اور ان کے متعلقہ اسباق میں سے جلالین تو مہتمم صاحب ہی کے پاس رہی مگر شرح وقایہ، اصول الشاشی، تہذیب مولانا موصوف کی طرف منتقل ہوئی اور اس کے بعد کتب متفرقہ ہوئیں اور شوال ۳۹ھ سے مولانا موصوف کے یہاں ترمذی، بخاری پہلی مرتبہ درس میں ہوئی اس لیے کہ حضرت قدس سرہٗ کا صبح کا وقت بذل المجہود کے لیے

فارغ کرلیا گیا تھا۔ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کی ہمرکابی میں شوال ۲۳ھ میں حج کو تشریف لے گئے۔ ۱۳ صفر ۴۸ھ کو دہلی میں بضرورتِ مدرسہ تشریف لے گئے تھے وہاں شیخ رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی کوٹھی پر مرض ہیضہ ہوگیا، سب ڈاکٹروں نے اور طبیبوں نے جواب دے دیا۔ شیخ رشید احمد صاحب نے سو روپے پر ایک کار کرکے حضرت ناظم کو سہارنپور روانہ کیا۔ حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو پچھلی سیٹ پر تکیوں کے سہارے لٹایا۔ یہ ناکارہ اور چچا جان قدس سرہٗ نیچے جوتوں کی جگہ بیٹھے۔ کسی کو امید نہ تھی کہ جمنا بھی پار کرسکیں گے بالکل آخری حالت تھی، مگر جمنا کا پار کرنے کے بعد جب حضرت ناظم کو افاقہ شروع ہوگیا تو پور قاضی (وطن) کی سڑک پر پہنچ کر شدت سے اصرار فرمایا کہ ''میں گھر ہوتا آجاؤں۔'' ہم لوگوں نے شدت سے انکار کیا، مگر اللہ کی قدرت کے کرشمے کہ میں اور چچا جان ان کو سہارا دے کر مکان پر لے گئے جو سڑک کے قریب ہی ہے، سہارنپور پہنچنے پر الحمد للہ مرض بہت تخفیف تھی لیکن ضعف اور مرض کا کچھ اثر کئی ماہ رہا۔ اس کے بعد ۲۲ صفر ۷۳ھ کو بضرورتِ مدرسہ رنگون تشریف لے گئے اور وہاں طبعیت ناساز ہوئی ۲۰ جمادی الثانی کو واپسی ہوئی اور واپسی کے بعد سے مرض کی شدت بڑھتی ہی چلی گئی، بالآخر ۲ ذی الحجہ ۷۳ دوشنبہ کی صبح ۱۰ بجے وصال ہوگیا اور ڈھائی بجے شام کو حاجی شاہ میں اس مجسمہ اخلاق کو سپرد خاک کردیا گیا۔

مؤطا امام محمد اپنے حضرت قدس سرہٗ سے میں نے کئی سال تک پڑھی اس لیے کہ جب حضرت قدس سرہٗ نے بذل کی مشغولی کی وجہ سے ترمذی، بخاری پڑھانی چھوڑ دی تھی تو اس زمانے میں کئی سال تک جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ مؤطا امام محمد ہوا کرتی تھی اور یہ سیہ کار سیہ کار ہی مستقل اس کا قاری تھا کہ جلدی اور صاف پڑھنے کی مشق تھی اور دوسروں کے پڑھنے میں دیر لگتی تھی۔ اس ناکارہ کے پڑھنے سے تین چار جمعہ میں ختم ہوجاتی تھی۔

نقشہ جو اوپر درج کیا گیا ان میں بعض کتابیں تو مدرسہ کے امتحان میں شامل ہوتی تھیں اور بعض نہیں ہوتی تھیں، اس لیے کہ جو کتابیں مدرسہ کے نصاب میں نہیں ہوتی تھیں یا امتحان کے زمانے میں یا امتحان کے بعد ہوتی تھیں وہ امتحان میں شامل نہیں ہوتی تھیں۔

میں نے اکمال کے شروع میں لکھوا دیا ہے اور بھی بعضی تحریرات میں آچکا ہے کہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ مدارس کے موجود طرزِ تعلیم کے بہت ہی خلاف تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ ''اس سے استعداد نہیں بن سکتی کہ مدرس تو رات بھر مطالعہ دیکھے اور سبق میں ساری تقریریں کرے اور طلبہ عظام کا احسان ہے کہ وہ سنیں یا نہ سنیں، ادھر ادھر مشغول رہیں۔'' ان کا مشہور و معروف طرزِ تعلیم جو انکے خاص شاگرد اُن مولانا عبد اللہ صاحب گنگوہی اور میرے چچا جان میں بھی رہا وہ یہ کہ سارا بار طالب علم کے اوپر رہے، وہ مطالعہ دیکھے، سبق کی تقریر کرے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ استاد

کا کام صرف یہ ہے کہ ''ہوں'' کرے یا ''اوں ہوں'' کرے۔ اگر طالب علم زیادہ لغویات کہے تو طالب علم کے منہ پر کتاب پھینک کر مارے، چاہے کتاب کی جلد ٹوٹ جائے یا طالب علم کی ناک ٹوٹ جاوے۔'' یہ ان کا مقولہ مشہور ہے مگر اس پر عمل میں نے نہیں دیکھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شارب خمر کے بارے میں چوتھی بار قتل کرنے کا حکم فرمادیا، مگر اس پر عمل نہیں فرمایا گیا۔ اسی طرز سے میرے والد صاحب اور چچا جان نے پڑھایا۔

میری فارسی اور ابتدائی تعلیم عربی تو چچا جان سے ہوئی اور منطق بھی میر قطبی تک، اسکے بعد منطق کی تین کتابیں سُلّم، میبذی اور میر زاہد امور عامہ حضرت مولانا عبدالوحید صاحب سے، جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ ساری منطق فلسفہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب سابق ناظم مظاہر علوم سے، ادب اور فقہ صرف والد صاحب سے، قدوری، نفحۃ الیمن وغیرہ کے بعض سبق چچا جان رحمہ اللہ تعالیٰ سے اور حدیث صرف والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ اور حضرت قدس سرہٗ سے۔ مدرسہ میں حدیث کی جو کتابیں دوسرے مدرسین کے یہاں ہوتی تھیں۔ ان میں بڑی لمبی تقریریں ہوتی تھیں۔ ان کو تقریر کرتے دیکھ کر بہت منہ میں پانی بھرتا۔ بار بار والد صاحب سے اجازت لے کر میں حدیث کا کوئی سبق مدرسہ میں سن لیا کروں مگر ہمیشہ نہایت سختی سے منع کرتے بلکہ ڈانٹ کر ہر دفعہ یہ فرمایا کرتے کہ ''تو بے ادب، گستاخ ہے۔ میرا ادب تو جوتے کے زور سے کرتا ہے اور اپنے حضرت کا دل سے کرتا ہے۔'' اور یہ ایک خاص واقع کی طرف اشارہ تھا جس کی طرف انہوں نے زبانی بھی کئی دفعہ فرمایا کہ ''اپنے حضرت کے حجرہ کی چھت پر بھی نہیں جاتا اور میری چھاتی پر بھی چڑھنے کو تیار رہتا ہے، جس کی شرح یہ تھی کہ میرے والد صاحب کا حجرہ کتب خانہ کا عربی کمرہ تھا جو اب کتب خانہ کا جزء بن گیا اور باہر کا حصہ بالکل خالی تھا جس کو میں شرح تہذیب کے سبق کے ذکر میں ذکر بھی کر چکا، والد صاحب کے حجرہ سے زینہ میں آنے کے لیے حضرت قدس سرہٗ کے حجرہ کی چھت پر آنا پڑتا تھا تو میں بجائے اس چھت کے برابر کی منڈیر پر سے ہمیشہ گزرتا تھا تھی تو ریا کاری، اس لیے کہ حقیقی ادب تو اب تک بھی نصیب نہیں ہوا اس بناء پر میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ ''تو بے ادب اور گستاخ ہے، اگر منطق فلسفہ کے کسی استاذ کی بے ادبی کردی اور وہ ضائع ہوگیا تو میری بلا سے لیکن اگر حدیث پاک کے کسی استاذ کی ذرا بھی تو نے بے ادبی کردی تو مجھے یہ گوارا نہیں کہ تو حدیث پاک کی برکات سے محروم ہوجاوے۔'' اور بالکل ہی صحیح فرمایا ہے۔ مجھ سے تو حقیقی ادب اپنے کسی استاذ کا نہیں ہوسکا۔ اگرچہ میری بے ادبی کے باوجود میرے استاذ مذکورین کو اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے بہت ہی محبت اور شفقتیں فرمایا کرتے تھے۔ حضرت قدس سرہٗ اور والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے

علاوہ ہر استاذ کا برتاؤ میرے ساتھ ایسا مساویانہ رہا جیسا کہ میں ان کا ہم عصر اور رفیقِ درس ہوں۔

ایک عجیب قصہ یا خواب:

جس دن میں نے یہ میبذی شروع کی اس کی رات کو دیکھا تھا کہ میں ہاتھی پر سوار ہوں۔ ابا جان سے عرض کیا، انہوں نے فرمایا کہ ہاتھی کی شکل سُور جیسی ہوتی ہے۔ تیرا میبذی کا پڑھنا یہ سور کے ہم شکل پر سوار ہونا ہے۔ اللہ جانے یہی تعبیر ہوگی یا کچھ اور۔ تعلیمی زمانے کی سرگزشتیں تو بہت لمبی ہیں، سب کا احاطہ بھی کرنا بہت مشکل ہے۔

یہ مختلف تحریرات میں پہلے گزر چکا اور یہ معروف چیز ہے کہ میری ابتدائی تربیت قیدیوں کی طرح ہوئی، بغیر والد صاحب اور چچا جان کے کہیں جانے کی اجازت نہ تھی۔ میرا انتہائی کھیل یا ابتدائی کھیل یا پورا کھیل ''بیت بازی'' تھی، ہم تینوں ساتھی مظہر اور حکیم محفوظ گنگوہی ثم الدیوبندی، جب بھی ابا جان کی نگاہ سے ذرا اوجھل ہوتے تو بیت بازی شروع کر دیتے۔ ایک دفعہ حماقت سوار ہوئی کہ بیت بازی کا کھیل قرآن پاک کی آیات سے شروع کر دیا۔ یعنی ایک شخص آیت پڑھے اور آیتِ شریف کا آخری حرف جو ہو دوسرا شخص وہ آیت پڑھے جس کے شروع میں یہ حرف ہو۔ میرے دونوں ساتھی حافظ نہیں تھے اور میں بھی صرف نام کا تھا۔ مگر خوب یاد ہے کہ نہ معلوم آیتیں کس طرح سوچ لیا کرتے تھے۔ یہ حماقت تین چار دفعہ ہوئی اور پھر بالکل چھوٹ گئی اور منشاء اس کا یہ ہوا کہ عجیب بات تھی کہ جس دن یہ حرکت ہوتی اس دن بلا کسی معقول وجہ کے پٹائی ہو جاتی۔ اس تجربہ نے دو تین دفعہ کے بعد ہی توبہ کرا دی۔

میری اصل محنت کا زمانہ منطق کے سال سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے محنت تو کم وبیش عربی کے ساتھ ہی شروع ہوگئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی دوسرا مشغلہ تھا ہی نہیں۔ کہیں جانا آنا نہ تھا، لیکن منطق کے سال میں چونکہ کتابیں بھی بہت سی پڑھیں۔ حضرت مولانا عبدالوحید صاحب سے جو کتابیں پڑھیں وہ تو مدرسہ کے سبق کے ذیل میں پڑھیں لیکن حضرت ناظم صاحب سے جو کتابیں پڑھیں وہ اپنے والد صاحب کے طرز کے موافق زیادہ تر بلا ترجمہ کے پڑھیں، لیکن مطالعہ ان کا دن میں دیکھنے کی خوب نوبت آتی تھی۔

ابتداء مشکوٰۃ:

۷ محرم الحرام ۳۲ھ کو ظہر کی نماز کے بعد میری مشکوٰۃ شریف شروع ہوئی، والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی ظہر کی امامت بھی کی تھی کہ اس زمانے میں نماز وہی پڑھایا کرتے تھے اور نماز کے بعد غسل فرمایا اور اس کے بعد اوپر کے کمرے میں جو آج کل مہمان خانہ ہے اس زمانے میں فارسی

خانہ تھا اور مدرسہ کے اوقات کے علاوہ میرے والد صاحب اور ہم سب کی گویا رہائش گاہ بھی تھا، اس میں اس در کی طرف جو مسجد کی طرف کھلتا ہے اور وہ مدرس اول فارسی کے بیٹھنے کی جگہ تھی ان کا گدہ وغیرہ وہاں بچھا رہتا تھا۔ اس پر کچھ بچھا کر دو رکعت نفل پڑھی، پھر میری طرف متوجہ ہوکر مشکوٰۃ شریف کی بسم اللہ اور خطبہ مجھ سے پڑھوایا۔ پھر قبلہ کی طرف متوجہ ہوکر پندرہ بیس منٹ تک بہت ہی دعائیں مانگیں، مجھے معلوم نہیں کیا کیا دعائیں مانگیں، لیکن میں اس وقت ان کی معیت میں صرف ایک ہی دعا کرتا رہا کہ ''یا اللہ! حدیث پاک کا سلسلہ بہت دیر میں شروع ہوا، اس کو مرنے تک اب میرے ساتھ وابستہ رکھیے۔'' اللہ جل شانہٗ نے میری ناپاکیوں، گندگیوں، سیئات کے باوجود ایسی قبول فرمائی کہ محرم ۳۲ھ سے رجب ۹۰ھ تک تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوئی ایسا زمانہ نہیں گزرا کہ جس میں حدیث پاک کا مشغلہ نہ رہا ہو۔ اگرچہ دعا کے وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے، اگر میں نے پڑھ بھی لیا پھر مدرس بھی ہوگیا تو حدیث پاک پڑھانے تک دس بارہ برس تو لگ ہی جاویں گے کہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب جو یکم ۱۳۲۱ھ سے مدرس تھے اس وقت تک مشکوٰۃ تک نہیں پہنچے تھے، مگر اللہ جل شانہٗ مسبب الاسباب ہے کہ جب وہ کسی کام کا ارادہ فرماوے تو اسباب تو خود اس کی مخلوق ہے۔

۳۲ھ میں مشکوٰۃ پڑھی۔ ۳۳ و ۳۴ھ میں دورہ۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ ۳۵ھ سے بذل شروع ہوئی جو ۴۵ھ میں ختم ہوئی اور اس کے بعد اوجز کی تالیف شروع ہوئی جو ۵۷ھ میں ختم ہوئی اور اس کے ساتھ ہی دوسرے علم حدیث کے تالیفی سلسلے بھی شروع ہوتے رہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب تک ساتھ دے رہے ہیں اور شوال ۴۱ھ سے علم حدیث کی تدریس کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو ۸۸ھ تک رہا اور اس کے بعد نزول آب کی وجہ سے تدریس کا مبارک سلسلہ چھوٹ گیا۔ اللہ ہی کا شکر و احسان ہے کہ اب ۹۰ھ تک تو حدیث کی تالیف کا سلسلہ باقی ہے، دیکھیے میری بداعمالیاں اس کو آگے باقی رہنے دیں گی یا نہیں۔

دورہ کا سال:

شوال ۳۳ھ میں میرے دورہ کا سال شروع ہوا، میرے ذہن میں یہ تھا کہ نہ تو مجھے کہیں ملازمت کرنی ہے نہ مدرسی کا شوق، اس لیے دورہ کی کتابیں ایک سال میں پڑھنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ ابوداؤد شریف میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا خاص سبق تھا، جو میرے حضرت قدس سرہٗ کے زمانے میں بھی اہتمام سے میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہوتا تھا۔ شوال ۳۳ھ میں حضرت قدس سرہٗ نے حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ کی معیت میں حجاز کا وہ مشہور و معروف معرکۃ الآراء سفر کیا جس میں کابل کی طرف سے آکر ہندوستان پر حملے کا منصوبہ بنایا گیا

تھا اور اس کے قصے اب تو مشہور و معروف ہو چکے ہیں، حضرت مدنی قدس سرہٗ کی مختلف تصانیف میں اور مولانا محمد میاں صاحب سابق ناظم جمیعۃ العلماء کی تصانیف میں مختصر و مطول آ چکے ہیں اور حضرت قدس سرہٗ کی غیبت میں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے اسباق ترمذی، بخاری بھی میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس آ چکے تھے۔ لیکن میرے ذہن میں چونکہ سارے دورہ کی کتابیں ایک سال میں پڑھنا نہیں تھا، اس لیے میں نے صرف ابوداؤد میں شرکت کی اور والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو بہت خوشی سے انہوں نے اس کی اجازت دی۔ چند ہی روز بعد میرا کاندھلہ جانا ہوا تو میرے پھوپھا مولانا رضی الحسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ فرمایا کہ "تو نے ترمذی بخاری یحییٰ سے کیوں نہیں پڑھی؟" میں نے اپنا منصوبہ بتایا۔ انہوں نے فرمایا، "میرا اندازہ یہ ہے انہیں اس بات کا احساس ہے کہ تو نے ان سے ترمذی نہیں پڑھی۔" مجھے بڑی حیرت ہوئی، بڑا تعجب ہوا۔ میں اسی دن آنے والا تھا اس لیے کہ ایک ہی شب کے لیے گیا تھا، مگر میں نے کاندھلہ سے ہی ایک خط والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں بہت زور کا لکھا کہ پھوپھا صاحب سے یہ معلوم ہوکر بڑی حیرت ہوئی، میں نے جو کچھ کیا جناب والا کی اجازت سے ہی کیا۔ وہ خط میری واپسی کے ایک دن بعد پہنچا۔ اس کو پڑھ کر میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "نہیں، میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی، میاں رضی کو کسی بات سے شبہ ہوا ہے۔" مگر میں نے اندازہ یہ کیا کہ پھوپھا صاحب کی روایت صحیح ہے اور والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر اس کا احساس ضرور ہے، اس لیے میں نے اپنی تجویز کے خلاف ابوداؤد شریف کے ساتھ ترمذی بھی شروع کر دی۔ ترمذی شریف کے بعد بخاری شریف اور ابوداؤد شریف کے بعد نسائی شریف والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہوئی اور چونکہ بخاری شریف پہلی دفعہ ہوئی تھی اس لیے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے نسائی شریف کا گھنٹہ بھی بخاری جلد ثانی کو دے دیا اور نسائی شریف جمعہ جمعہ پوری کرائی۔ بخاری شریف جلد ثانی میں کتاب، التفسیر میں آدھے صفحہ سے زیادہ ایک گھنٹہ میں سبق کسی دن میں نہ ہوتا تھا۔ آیات کا پڑھنا اور اس کے بعد امام بخاری کی تفسیر کے متعلق کلام فرمانا۔ حافظہ چونکہ ماشاء اللہ اچھا تھا اس لیے آیت کے پڑھنے میں تو ان کو دیر نہیں لگتی تھی، فوراً پڑھتے تھے۔ اس لیے کہ قرآن پاک بہت از بر تھا۔ البتہ آیات کی مشہور تفسیر اور امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی تفسیر اور ان دونوں میں تطابق میں دیر لگتی تھی۔

میرے والد صاحب کی تدریس بخاری:

اس زمانے میں میرا ایک رفیقِ درس حسن احمد مرحوم سہارنپوری محلہ کھالہ پار کا رہنے والا، نہایت ہی متین، نیک اور میرے والد صاحب قدس سرہٗ کا گویا عاشق زار، اتنا معتقد کہ حد نہیں۔ دورہ سے

پہلے تو میری مرحوم سے جان پہچان کچھ زیادہ نہ تھی، صرف ایک نیک طالب علم سمجھتا تھا۔ مگر دورہ میں اس کے جوہر کھلے۔ مرحوم میرے پاس ہی بیٹھتا تھا اور میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تقریر نقل کرتا تھا۔ میں نے اس کو جوانی کے زمانے میں کبھی کوئی فحش مذاق کرتے نہ دیکھا نہ سنا۔ میرے اور مرحوم کے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے دورہ میں دو اہتمام تھے۔

حدیث کے سبق میں وضو کا اہتمام:

ایک یہ کہ کوئی حدیث ایسی نہ ہو کہ استاد کے سامنے پڑھنے سے رہ جائے، دوسرے یہ کہ بے وضو کوئی حدیث نہ پڑھی جائے۔ میرا اور مرحوم کا دستور یہ تھا کہ ہم میں سے جس کو وضو کی ضرورت پیش آجاتی، اس لیے کہ ۵، ۶ گھنٹے مسلسل سبق ہوتا، وہ دوسرے کو کہنی مار کر ایک دم اٹھ جاتا اور دوسرا ساتھی فوراً ابا جان پر کوئی اشکال کر دیتا اگرچہ اس کی نوبت تو بہت کم آتی تھی مہینے دو مہینے میں اس کی نوبت آتی تھی اس لیے کہ صحت اچھی تھی اس سیہ کار کا تو اس زمانے میں ظہر کے وضو سے عشاء پڑھنے کا معمول سالہا سال رہا پھر بھی کبھی نہ کبھی ضرورت پیش آجاتی والد صاحب پہلی ہی مرتبہ میں سمجھ گئے تھے کہ ایک دم ایک ساتھی اٹھا اور ایک منٹ میں آستینیں اتارتا ہوا بھاگا ہوا آرہا ہے اس سے ان کو بھی اندازہ ہو گیا تھا اور اس چیز سے ان کو مسرت بھی تھی ایک دفعہ حسن احمد مرحوم اللہ تعالیٰ اس کو بہت ہی درجے عطاء فرماوے میرے کہنی مار کر ایک دم اٹھا اور اس کے اٹھتے ہی میں نے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے عرض کیا کہ حضرت! فتح القدیر میں یوں لکھا ہے اور بالکل بے سوچ کہا، میرے بھی ذہن میں بالکل نہیں تھا کہ فتح القدیر میں کیا لکھا ہے، لیکن میرے اس فقرہ پر کہ ''حضرت فتح القدیر میں یوں لکھا ہے۔'' میرے والد صاحب بے ساختہ ہنس پڑے اور کتاب میں نشان رکھ کر اور اس کو بند کر کے مجھ سے فرمایا کہ ''جب تک حسن احمد آئے میں تمہیں ایک قصہ سنا دوں، میں تمہاری فتح القدیر سے کہاں لڑتا پھروں گا۔'' میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا دستور اسباق میں قصے سنانے کا بہت کثرت سے تھا اور میرے حضرت قدس سرہ کا بالکل نہ تھا اور میں نے حدیث پاک دونوں سے پڑھی۔ اس لیے سال کے شروع کے تین چار ماہ تو والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا اتباع رہا اور اخیر سال میں حضرت قدس سرہٗ کا۔ بہرحال والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فتح القدیر کی بحث کی جگہ ایک قصہ سنا دیا۔ ہم دونوں نے وضو میں آدھے منٹ سے زائد بھی نہ لگتا تھا، اس لیے کہ اوپر ہی لوٹوں میں پانی بھرا رہا کرتا تھا، آداب کی رعایت تو اب تک بھی نصیب نہیں ہوئی اور وضو کے چار فرائض پر ہاتھ پھیرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ اس کے بعد والد صاحب قدس سرہٗ کا معمول یہ ہو گیا کہ ہم دونوں میں سے جو بھی اٹھتا، والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ایک قصہ

سنا دیتے تھے۔ لیکن حضرت قدس سرہٗ کے دورہ میں اس کی پابندی تو رہی کہ کوئی حدیث ایسی نہیں ہوئی کہ جو استاذ کے سامنے نہ ہوئی ہو۔ لیکن وضو کا یہ اہتمام نہ ہوسکا، اگرچہ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں صرف دو ہی گھنٹے سبق ہوتا تھا، اس لیے وضو کا ٹوٹنا بھی یاد نہیں اور والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں ۵، ۶ گھنٹے ہوتا تھا۔ میری مسلم شریف اور ابن ماجہ والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ ہوسکی، اس لیے کہ مسلم شریف اس سال ناظم صاحب کے یہاں پہلی دفعہ گئی ہوئی تھی اور ابن ماجہ کئی سال سے مولانا ثابت علی صاحب کے یہاں ہوتی تھی اور یہ میں لکھوا چکا ہوں کہ والد صاحب نے طے کر رکھا تھا کہ حدیث کی کتاب میرے اور حضرت کے علاوہ کسی سے نہ ہوگی۔

دورہ کے ختم پر اس سیہ کار نے اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے ہدایہ ثالث شروع کی، اس زمانے میں مطالعہ کا چسکا پڑ گیا تھا۔ حدیث کی کتابیں ہو چکی تھیں، دن بھر خوب مطالعہ دیکھتا تھا اور مغرب کے بعد موچیوں کی مسجد میں جہاں میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا قیام اکثر رہتا تھا، ہدایہ کا سبق ہوتا تھا، میں تنہا ہی تھا، ہدایہ پر نقلی اور عقلی، احادیث کے اور کفایہ اور عنایہ کے، فتح القدیر کے خوب اعتراضات کیا کرتا تھا۔ والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے دو دن کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ ''طالب علموں کی طرح پڑھنا ہو تو پڑھ مدرسوں کی طرح پڑھنا ہو تو اپنے آپ جا کر اشکال جواب دیکھتے رہو۔''

مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنے کسی استاذ پر کبھی دل میں اعتراض پیدا نہ ہوا، نہ یہ گھمنڈ پیدا ہوا کہ میرے اشکال کا جواب استاذ سے نہیں آیا، یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے۔

۱۰ ذی قعدہ کو میرے والد صاحب قدس سرہٗ کا انتقال ہوگیا، یا تو ایک سال پہلے یہ جذبہ تھا کہ ترمذی شریف، بخاری شریف حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ ہی سے پڑھنی ہے اور ابا جان سے شروع نہ کی، لیکن ان کے انتقال کے بعد دستور یہی ہے کہ قدر اور محبت زندگی میں کم ہوتی، انتقال کے بعد بڑھ جاتی ہے، اب یہ جذبہ پیدا ہوا کہ ترمذی شریف، بخاری شریف پڑھ لی، دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، ورنہ والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی حیات میں یہ جذبہ تھا کہ حضرت کی واپسی پر دوبارہ پڑھوں گا۔ مگر والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کے بعد یہ خیال دل سے نہ یہ کہ نکل گیا، بلکہ اس کا عکس دل میں جم گیا۔

حضرت سے دوبارہ احادیث پڑھنا:

حضرت قدس سرہٗ کی نینی تال سے واپسی پر ترمذی شریف جو اب تک میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کے بعد سے بند تھی، حضرت کے یہاں شروع ہوئی اور حضرت نے تشریف

لاتے ہی اس سیہ کارکواور میرے عزیز دوست مخلص اور رفیق حسن احمد مرحوم کو دونوں کو یہ حکم فرمایا کہ ''ترمذی شریف، بخاری شریف مجھ سے دوبارہ پڑھو۔'' انکار کی تو کیا مجال تھی اور اس کا شائبہ بھی کسی حرکت سے ظاہر نہیں کر سکتے تھے کہ دوبارہ پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ اسی زمانے میں اس سیہ کار نے خواب دیکھا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ ارشاد فرمارہے ہیں کہ ''مجھ سے دوبارہ بخاری شریف پڑھ۔''

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ مالٹا تشریف لے جاچکے تھے، بہت سوچتا رہا کہ خواب کی تعبیر کیا ہوگی؟ حضرت قدس سرہٗ سے خواب عرض کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ اس کی تعبیر بھی یہی ہے کہ مجھ سے بخاری شریف دوبارہ پڑھو۔ اس وقت تو اپنی حماقت سے تعبیر سمجھ نہ آئی، لیکن بعد میں سمجھ میں آگیا کہ اس وقت شیخ الہند فی الحدیث کا مصداق، حضرت قدس سرہٗ کے علاوہ اور کون ہوسکتا تھا۔ بہر حال، تعمیل ارشاد میں شروع تو ہم دونوں نے کردیا، لیکن میرا رفیق حسن احمد مرحوم اس سال فنون کی کتابیں پڑھتا تھا اور وہ بخاری شریف کے نیچے کسی مطالعہ کی کتاب کو رکھتا تھا۔ میں اس پر شدت سے انکار کرتا تھا۔ کہ یہ تو بہت بے ادبی ہے، حدیث پاک کی بھی اور استاذ کی بھی، ایسا ہرگز نہ کر۔ مگر اس کو میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے عشق تو ان کی زندگی میں ہی تھا اور ان کے انتقال کے بعد میری طرح یہ جذبہ اور بھی بڑھ گیا تھا کہ اب تو حدیث کسی سے نہیں پڑھنی۔ میں نے اس کے بالمقابل یہ کوشش کی کہ اتنے قوی اشکالات دمادم کروں کہ حضرت قدس سرہٗ تبحر علمی کو دیکھ کر یوں فرمادیں کہ تجھے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، تقریباً یہ سال میرا ایسا گزرا کہ رات دن میں دو ڈھائی گھنٹہ سے زیادہ سونے کی نوبت نہیں آئی۔ اس لیے کہ مدرس ہوگیا تھا۔ جس کا قصہ آگے آرہا ہے اور دو سبق میرے دو استادوں کے یہاں سے اصول الشاشی چچا جان نوراللہ مرقدہٗ کے یہاں سے علم الصیغہ مولانا ظفر احمد صاحب کے یہاں سے منتقل ہوکر آئے تھے اور دونوں میری بے پڑھی کتابیں تھیں، جس کی تفصیل آئندہ تدریس میں آئے گی۔ اصول الشاشی کے مطالعے میں کئی گھنٹے خرچ ہوتے۔ لیکن عشاء کے بعد سے رات کے تین چار بجے تک میں ترمذی شریف، بخاری شریف کا مطالعہ دیکھا کرتا تھا اور فتح الباری، عینی، قسطلانی، سندھی کے ابواب بہت ہی بالاستیعاب اور غور سے دیکھتا اور جہاں کوئی اشکال پیش آتا، اس کو نوٹ کرلیتا۔ جواب نوٹ نہ کرتا اور صبح کو حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں، اللہ مجھے بہت ہی معاف فرمائے۔ دمادم اعتراضات کرتا، مگر اللہ کا بڑا ہی احسان ہے، اسی کا لطف وکرم ہے۔ اَللّٰهُمَّ لَآ اُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ، مجھے اس کا کبھی واہمہ نہیں ہوا کہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ سے میری بات کا جواب نہیں آتا۔ جب شیطان ذرا سا وسوسہ کا شبہ بھی ڈالتا تو میں اپنے دل سے کہتا ''بے غیرت ساری رات تو کتاب دیکھی تجھے

اعتراض کرتے شرم نہیں آتی۔'' دوڈھائی ماہ اسی مناظرے میں گزار دیے۔ اس واقعہ کو مولانا عاشق الٰہی صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے تذکرۃ الخلیل میں بھی کچھ اجمالاً لکھا ہے۔

میرا اور حسن احمد مرحوم کا یہ معمول تھا کہ سبق کے بعد ہم دونوں حضرت کے پیچھے پیچھے دار الطلبہ سے مدرسہ قدیم تک آتے، حضرت قدس سرہٗ، دو ماہ کے بعد حسب معمول دار الطلبہ سے تشریف لا رہے تھے اور ہم دونوں پیچھے تھے، مدرسہ قدیم کے قریب املی کی ٹال جہاں آج کل آرا مشین لگ گئی ہے، اس کے بالمقابل حضرت کھڑے ہوگئے اور ہم دونوں کی طرف متوجہ ہوکر یوں ارشاد فرمایا کہ ''ساری عمر سے یہ تمنا رہی کہ ابوداؤد شریف پر کچھ لکھوں اور کئی دفعہ شروع بھی کیا مگر پورا نہ ہوسکا۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کی حیات میں ہمیشہ تقاضا رہا کہ لکھوں اور جو اشکال ہوگا حضرت سے پوچھتا رہوں گا۔ حضرت کے بعد طبیعت سرد ہوگئی۔ لیکن پھر خیال ہوا ہمارے مولانا یحییٰ صاحب تو حیات ہیں جہاں اشکال ہوگا ان سے الجھتے رہیں گے۔ مگر ان کے انتقال پر تو خیال بالکل ہی نکل گیا تھا۔ اب یہ خیال ہے کہ اگر تم دونوں میری مدد کرو تو شاید لکھ سکوں۔'' حضرت کا ارشاد صحیح تھا اس لیے کہ میں نے خود حضرت کے مسودات میں ایک مسودہ دیکھا تھا جس پر ''حَلُّ الْمَعْقُوْد فِیْ اَبِیْ دَاوٗد مَرّۃً ثَالِثَۃً'' کا لفظ لکھا ہوا تھا، مسودہ کو دیکھا جائے جو مدرسہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، نام میں کچھ اشتباہ ہے، علی گڑھ سے واپسی پر اگر وقت ملا تو میں خود دیکھ کر تصحیح کرادوں گا، اگر کوئی دیکھنا چاہے تو مدرسہ کے کتب خانہ میں دیکھ لے۔ میں نے عرض کیا کہ ''حضرت! ضرور اور یہ میری دعا کا ثمرہ ہے۔'' حضرت نے فرمایا ''اس کا کیا مطلب؟'' میں نے مشکوٰۃ شریف کی ابتدائی دعا کا ذکر کرکے عرض کیا کہ ''حضرت اب تک اس کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آرہی تھی، اب سمجھ میں آگئی کہ آٹھ دس برس تو حضرت کو اس شرح میں لگ ہی جائیں گے اور اس وقت انشاء اللہ یہ ناکارہ بھی حضرت کی برکت سے حدیث پڑھانے تک پہنچ ہی جائے گا۔'' حضرت کا چہرہ مسرت سے کھل گیا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ خوبصورت بہت تھے۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا مقولہ میرے حضرت کے متعلق کہیں طبع شدہ بھی میں نے دیکھا ہے اور سنا بھی ہے کہ مولانا خلیل احمد صاحب تو گلاب کا پھول ہیں۔ اس لیے کہ حضرت قدس سرہٗ کے چہرے پر غصہ اور خوشی ایسی صاف نظر آیا کرتی تھی کہ بے تکلف محسوس ہوا کرتی تھی۔

ابتداء تالیف بذل المجہود:

حضرت قدس سرہٗ نے اگلے دن مجھے بلا کر کتب خانہ سے کتابوں کے نکالنے کی ایک فہرست مجھے لکھوائی۔ چنانچہ ۲ ربیع الاول کو مدرسہ کے کتب خانہ سے کتابیں لی گئیں اور دار الطلبہ کے خزانے والے کمرہ میں بذل المجہود کی تالیف کی ابتداء ۳ یا ۴ ربیع الاول ۳۵ھ میں ہوئی۔ اس کے بعد بھی

میں اسی جذبہ اور کوشش میں کہ حضرت دوبارہ نہ پڑھنے کی اجازت دے دیں۔ میرے ساتھی میرے بے جا سوالات پر بہت ہی چیں بجبیں ہوتے، خاص طور پر مجھے بخاری شریف میں اشکالات کی زیادہ سہولت پیدا ہوگئی، دو گھنٹے میں سبق ایک صفحہ سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ جمادی الاول آگیا اور بخاری شریف کے چند پارے ہوئے۔ حضرت قدس سرہ، نے ایک دفعہ یوں ارشاد فرمایا کہ ''میں تو رجب میں بہاولپور کا وعدہ کر چکا ہوں، کتاب بہت باقی رہ گئی۔ میرے بعد مولوی ثابت علی صاحب، مولوی عبداللطیف سے پوری کر لیجیو۔'' اس فقرہ سے زمین پاؤں سے نکل گئی، میں نے اپنے دل میں سوچا کہ جو آپ سے بھی پڑھنا نہ چاہتا ہو وہ اگلے سے کیا پڑھے گا۔

میرا اور حسن احمد کا معمول دارالحدیث میں حضرت قدس سرہٗ کے داہنی طرف بیٹھنے کا تھا، وہاں ایک الماری رکھی رہتی تھی، اس میں حضرت قدس سرہٗ کی اور میری اپنی کتابیں رہتی تھی، اس لیے کہ میرے مطالعہ کی کتاب دوسری میرے گھر پر تھی۔ یہ منظر بھی ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ حضرت قدس سرہٗ کا معمول ہمیشہ جنوبی زینہ کی طرف جانے کا تھا اور اوپر جا کر ہمیشہ دارالحدیث کے پہلے دروازے سے داخل ہوتے، طلبہ ایک دم کھڑے ہو جاتے، تپائیاں ہٹا دیتے، حضرت کے لیے ایک دم راستہ کھل جاتا۔ ارشادِ بالا کے بعد جب دوسرے دن حضرت سبق کو تشریف لے گئے اور دارالحدیث کے پہلے دروازے سے اندر قدم رکھا اور سامنے میں اپنی جگہ پر نہیں تھا تو وہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے اندر گھوم رہا ہے کہ حضرت اپنی جگہ ششدر کھڑے رہ گئے، قدم آگے نہیں بڑھایا، اس لیے کہ شروع محرم سے آج پہلا دن تھا کہ میں اپنی جگہ نہیں تھا، میں یہ منظر دیکھ کر جہاں بیٹھا تھا وہاں سے کھڑا ہوا، حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دیکھ لیا اور قدم آگے بڑھایا، اس لیے کہ آج یہ ناکارہ حضرت کے سامنے جماعت کے بیچ میں بیٹھا ہوا تھا اور حضرت کے بیٹھتے ہی رمضانی حافظوں کی طرح سے جو میں نے بخاری شریف پڑھنی شروع کی کہ نہ کوئی اشکال تھا، نہ کوئی شبہ تھا۔ کبھی آدھا پارہ، کبھی پون پارہ، دونوں گھنٹہ میں ہی پڑھتا تھا، کسی اور کو پڑھنے بھی نہیں دیا، جمادی الثانی میں بخاری شریف ختم کر دی۔

ایک دفعہ احتیاطاً حضرت کے کان میں ڈال بھی دیا کہ ''حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کا سفر تو تجویز ہو گیا اور بخاری شریف حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ سے ہی پوری کرنی ہے۔'' مگر حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر ''لا یا نعم'' نہیں فرمایا۔

تیسرا دور شروع ہوا:

میں نے شوال میں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ ''حضرت! بذل کے لیے وقت بہت تھوڑا ملتا ہے، اس لیے بذل پہلے صرف تیسرے چوتھے گھنٹے میں ہوتی تھی، میرا خیال ہے کہ ترمذی

شریف حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کے حوالے کر دیں اور بجائے صبح کے شام کو ابوداؤد
شریف پڑھا دیا کریں، میری ترمذی شریف، بخاری شریف تو حضرت کے پاس ہوگئی، میری تمنا یہ
ہے کہ بقیہ کتابیں بھی ہر سال ایک ایک کتاب ہو کر پوری ہو جائیں۔'' حضرت نے بڑی مسرت
سے اس کو قبول فرمالیا اور اس لیے کہ ایک تو اس میں بذل کے لیے زیادہ وقت ملتا تھا جو حضرت کے
عین تمنا تھی، دوسرے اس سیہ کار کے اوپر حضرت کی شفقت بے پایاں کی وجہ سے ابوداؤد کے
پڑھانے سے حضرت کو مسرت تھی، اس لیے شوال ۳۵ھ سے حضرت کے یہاں ابوداؤد ہوئی، شعبان
تک اور شوال ۳۶ھ میں، میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت کے یہاں اس سال مسلم شریف
ہوگی، حضرت نے فرمایا کہ بہت اچھا اور اس سال مسلم شریف اور نسائی شریف حضرت کے پاس
پڑھی، ابن ماجہ شریف دونوں بزرگوں کے پاس پڑھنے کی نوبت نہیں آئی، البتہ مدینہ پاک میں
۴۵ھ میں بذل المجہود ختم ہونے کے بعد ابن ماجہ حضرت قدس سرہٗ سے شروع کی تھی اور چند سبق
پڑھے تھے۔ لیکن پھر ماہ مبارک آ گیا اور پھر حضرت کی طبیعت ناساز ہوگئی اس لیے پوری نہ ہو سکی۔

طحاوی سے میرے والد اور انور کشمیری کا شغف:

طحاوی شریف اولاً میں نے اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے مشکوٰۃ کے ساتھ پڑھی۔ میرے
والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اور حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ شیخ الحدیث
دار العلوم دیوبند کو طحاوی شریف سے بہت خصوصی تعلق تھا، اسی بناء پر گنگوہ کے قیام میں والد
صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے طحاوی کا اردو ترجمہ بھی شروع فرمایا تھا۔ اس کا اشتہار بھی دیا گیا تھا۔ اس
کا بہت سا حصہ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے بھی ابا جان کی تعمیل حکم میں لکھا، مگر مقدر سے پورا
نہ ہو سکا۔ اَسانید کو چھوڑ کر متونِ حدیث کا خلاصہ اور امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی نظر کو تفصیل سے لکھنا
یہ موضوع تھا۔ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک دفعہ مجھ سے فرمایا کہ میری
خواہش ہے کہ طحاوی کی دونوں جلدیں داخل درس ہوں، میں دار العلوم میں اس پر قابو نہ پا سکا، تم
مظاہر علوم میں مجھ سے زیادہ با اختیار ہو اور حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ صحیح فرمایا تھا، اس
زمانے میں ایسا ہی تھا۔ چنانچہ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تعمیل ارشاد میں، میں نے مظاہرِ علوم
میں طحاوی شریف کا مستقل گھنٹہ کیا تھا، لیکن باوجود کوشش کے دونوں جلدیں پوری ہونے پر میں بھی
قابو نہ پا سکا، کئی دفعہ تقسیم اسباق میں، میں نے یہ پیش کش کی ابوداؤد اور پھر بخاری شریف کی جگہ
مجھے طحاوی دی جائے، مگر اہلِ مدرسہ نے ان دونوں کتابوں کو طحاوی سے زیادہ اہم سمجھا اور ایک سبق
سے زائد یہ ناکارہ بھی اپنی تالیفی سلسلہ کی وجہ سے پڑھانے کے لیے تیار نہ تھا۔ خدا کرے آیندہ
کوئی طحاوی شریف کا شوقین اس کی دونوں جلدوں کو پورا کرا دیا کرے۔ مشکوٰۃ والے سال میں

اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نور اللہ مرقدہٗ سے تقریباً ایک جلد پوری اور دوسری کا کچھ حصہ پڑھا اور اس کے بعد مؤطاً امام محمد کے ساتھ کچھ حصہ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں پڑھا۔ حضرت قدس سرہٗ کا معمول اول ترمذی شریف، اس کے بعد بخاری شریف اور اس کے ختم پر مؤطاً امام محمد اور طحاوی شریف پڑھانے کا سلسلہ چند سال رہا، اس لیے بندہ نے طحاوی شریف کا معظم حصہ اولاً اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے تقریباً ڈیڑھ جلد پڑھی اور اس کے بعد تبرکاً دوسرے سال میں کچھ حصہ حضرت قدس سرہٗ سے پڑھی۔

یہ تو طالب علمی کا دور تھا، جو بہت ہی عجلت میں چند واقعات لکھے۔

اب مدرسی کی سنو:

محرم ۳۵ھ کے شروع میں یہ ناکارہ مدرس ہوا۔ جب میری مدرسی کا اور میری طرف اسباق منتقل ہونے کا اعلان ہوا تو میرے عزیز محترم دوست مولوی ادریس صاحب کاندھلوی مؤلف التعلیق الصبیح، جو آج کل جامعہ اشرفیہ لاہور میں اعلیٰ مدرسین میں شمار ہیں، حدیث وتفسیر کی کتابیں کثرت سے پڑھاتے ہیں انہوں نے بہت اخلاص ومحبت سے ایک نصیحت کی جس نے مجھے بہت کام دیا۔ انہوںؒ نے کہا ''میاں صاحب! ایک بات غور سے سن لو، تم نے جس طرح خود پڑھا ہے، مدرسوں میں یہ طرز نہیں چلنے کا۔ طالب علم دمادم شکایتیں کریں گے اور نالائق بن کر مدرسہ سے الگ کر دیئے جاؤ گے، میری ایک نصیحت جو مدارس کے طرزِ تعلیم اور طلبہ کے مزاج کے موافق ہے اور جس سے تم طالب علم کی نگاہ میں محبوب بن جاؤ، تم اس کی ذرا پرواہ نہ کرنا کہ طالب علم نے مطالعہ دیکھا یا نہیں دیکھا، سبق یاد کیا یا نہیں۔ اگر تم نے طلبہ سے مطالعہ پر وہ گرفت کی جو تم سے کی گئی تو تمہارے خلاف طلبہ میں شور مچ جائے گا۔ وہ یہ نہیں کہنے کے کہ ہم سے مطالعہ کی گرفت کی جاتی ہے یا ہم سے گزشتہ سبق سنا جاتا ہے، وہ تمہیں نالائق ثابت کرنے کی کوشش کریں گے اور تمہارے خلاف پڑھا نہ سکنے کی، سمجھا نہ سکنے کی شکایت کریں گے۔ اس لیے میری مخلصانہ نصیحت کو اہتمام سے سن لو کہ جو تمہارے منہ میں آئے کہتے چلے جانا، یہ نہ سوچنا کہ یہ طالب علم کی استعداد کے موافق ہے یا اس سے اونچی بات ہے۔ یہ بھی نہ پوچھنا کہ کل میں نے کیا کہا تھا، کس نے یاد کیا کس نے نہیں۔''

اس نصیحت نے مجھے اخیر تک بہت کام دیا۔ میری جہالت پر ان کی نصیحت نے بہت ہی پردہ ڈالے رکھا۔

میرے ابتدائی تقرر کے وقت جو محرم سے ہوا تھا، دو سبق ایک میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں سے اصول الشاشی کا اور دوسرا حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی حال شیخ الاسلام پاکستان جو اس وقت مظاہر علوم کے مدرس تھے علم الصیغہ منتقل ہو کر آیا اور دونوں کتابیں میری بے پڑھی

تھیں۔ علم الصیغہ کا کچھ زیادہ فکر نہ ہوا، البتہ اصول الشاشی اہم تھی۔ جماعت بھی اس کی کچھ بڑی تھی۔ میں نے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے پوچھا کہ سبق کہاں سے ہوگا؟ تو انہوں نے بتایا کہ فَصْلٌ فِیْ الْاَمْرِ کے ایک ورق کے بعد سے ہے مگر میں نے اس لیے کہ مجھے طلبہ کا اندازہ تھا کہ طالب علم دھوکہ دیا کرتے ہیں۔ چچا جان سے امر کی بحث دو ورق پڑھ لیے، ایک طلبہ کا پڑھا ہوا اور دوسرا بے پڑھا، ان سے تو اپنے ہی ضابطے پر پڑھے کہ جلدی جلدی، لیکن چونکہ اعلان بدھ کو ہو گیا تھا اور شنبہ سے سبق شروع تھے، اس لیے دو تین دن میں کتب اصول میں اصول الشاشی کے شروح و حواشی، نور الانوار و منار، اس کی شرح کشف الاسرار، حسامی اور اس کی جتنی شروح مل سکیں، توضیح تلویح، دو دن میں اَمْر کی ابتدائی بحث سب میں نے خوب دیکھی اور درس گاہ میں پہنچنے کے بعد اجنبیانہ پوچھا، سبق کہاں سے ہے؟ سب نے متفق اللسان ہو کر کہا فَصْلٌ فِیْ الْاَمْرِ سے۔ میں تو پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ دھوکہ دیں گے، میں نے ایک گھنٹہ امر کی بحث میں خرچ کر دیا۔ معلوم نہیں کیا کیا کہا ہوگا۔ اتنا یاد ہے کہ پہلا دن تو فَصْلٌ فِیْ الْاَمْرِ پر خرچ ہوا تھا۔ اس کے بعد پورا ایک ہفتہ اس ایک ورق میں لگا جو چچا جان، ایک دو دن میں پڑھا چکے تھے۔ مولوی ادریس صاحب کو اللہ جزائے خیر دے، ان ہی کی نصیحت اور تجربہ کا یہ ثمرہ تھا۔

ایک ہفتہ بعد میرے پاس اصول الشاشی کی جماعت نہایت مئوکد تحریری اور زبانی درخواست لے کر پہنچی کہ ''ہم اصول الشاشی تجھ سے اول سے پڑھنا چاہتے ہیں۔'' میں نے کہہ دیا ''مدرسہ کا سبق ہے میرا ذاتی سبق نہیں، مہتمم صاحب حکم دیں گے تو مجھے انکار نہیں۔'' چونکہ ایک بڑے مدرس کے یہاں سے منتقل ہو کر آئی تھی، اس لیے باضابطہ تحریری درخواست کی تو لوگوں نے ہمت نہیں کی، البتہ خصوصی لوگوں نے زبانی ان سے کہا، انہوں نے انکار کر دیا۔ البتہ یہ نفع ضرور ہوا کہ بعض اکابر مدرسین، نیز بعض طلبہ، بعض منتظمین کو میرے امرد اور کم عمر اور حسین و جمیل ہونے کی وجہ سے مدرسی پر اعتراض تھا۔ مگر اکابر کی طرف سے چونکہ تجویز تھی اور علی الاعلان اعتراض کا اس زمانے میں دستور نہیں چلا تھا، بالخصوص بڑوں کی طرف سے، اس لیے مہتمم صاحب کو بھی کچھ سوجھ رہا تھا اس لیے اصول الشاشی کی جماعت کی اس درخواست نے مہتمم صاحب کو میری طرف سے مطمئن کر دیا۔ اللہ ان پڑھنے والوں کو بڑی جزائے خیر دے۔

میرا ابتدائی تقرر میرے حضرت قدس سرہٗ کی تجویز خاص پر ہوا تھا۔ اعلیٰ حضرت رائے پوری حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''قرضہ بہت ہے، شادی بھی عنقریب ہونے والی ہے، کم سے کم تنخواہ خاص ہونی چاہیے۔'' اس پر اصرار بھی فرمایا۔ مگر میرے حضرت نے فرمایا کہ ''مدرسہ کی روایت کے بھی یہ خلاف ہے، رعایت ہی رعایت ہے۔'' اس لیے کہ مولانا

منظور احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سہارنپوری میرے سے پانچ برس پہلے کے مدرس تھے اور اس وقت تنخواہ ترقیات ہوکر ص تک پہنچتی تھی جو میرے تقرر کے ساتھ بھی میری وجہ سے ص ہوئی تھی۔ مولانا مرحوم کا ابتدائی تقرر شوال ۳۰ھ میں بلاتنخواہ معین مدرس کا ہوا تھا اور شوال ۳۲ھ سے دس روپے مشاہرہ پر تنخواہ دار ملازم ہوئے تھے اور پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے مدرس دوم تک پہنچے تھے اور ۲ ۳ھ جمادی الاول ۸۸ھ بوقت صبح انتقال فرما گئے اور حاجی شاہ میں مدفون ہوئے نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مرتبہ۔

مولانا ظفر احمد صاحب کے پاس بھی سبق اس وقت میزان منشعب سے شروع ہوکر قدوری تک پہنچے تھے۔ یہ دونوں چیزیں بھی معترضین اور حاسدین کے لیے موجب تکدر اور گرانی تھیں۔ خود مولانا منظور احمد صاحب کو بھی فطرتاً خیال تو ضرور ہونا چاہیے تھا مگر انہوں نے اس کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ البتہ مجھ سے یہ اصرار کیا کہ ''میں نے اصول الشاشی اب تک پڑھائی نہیں اور قدوری کئی دفعہ پڑھا چکا ہوں، اصول الشاشی تیری بے پڑھی ہے، قدوری تیری پڑھی ہوئی ہے، تجھے اس میں آسانی رہے گی۔'' میں نے مولانا مرحوم سے کہا کہ ''بالکل صحیح فرمایا، بہت آسانی رہے گی۔ اصول الشاشی میری پڑھی ہوئی بھی نہیں ہے، لیکن میں مہتمم صاحب سے کہوں کہ آپ کو بدل دیجیے یہ دشوار ہے، اس لیے کہ مہتمم صاحب شروع ہی میں نالائق فرمادیں گے، آپ اگر مہتمم صاحب سے درخواست کرکے تبادلہ کرلیں گے تو مجھے کوئی گرانی نہ ہوگی۔'' مرحوم کو اس کی ہمت اس لیے نہ ہوئی کہ حضرت قدس سرہٗ کے دور میں اخیر دور تک کسی مدرس کا خود سبق مانگنا انتہائی عیب سمجھا جاتا تھا اور یہ چیز اس کے تکبر کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ یہ اپنے کو بڑا آدمی سمجھتا ہے۔ اس زمانے میں کسی مدرس کو کسی سبق کی خواہش ہوتی اور خواہش تو ہوتی ہی رہتی تھی، تو اس کا دستور یہ تھا کہ کوئی مدرس اپنے دوست کو اس پر آمادہ کرلیتا تھا کہ جب تقسیم اسباق کا وقت آئے اور کتاب کا نام لی جائے تو تُو میرے نام پر تجویز کرادینا۔ اس لیے مولانا منظور صاحب کی اور بھی ہمت نہ ہوئی کہ مہتمم صاحب سے کہیں اور ان کی بات حضرت کے یہاں پہنچ جائے۔

کتب زیر تدریس زکریا عفی عنہ

ازمحرم ۳۵ھ تا شعبان ۳۵ھ:

علم الصیغہ۔ مائۃ عامل منظوم۔ شرح مائۃ۔ خلاصہ نحو میر۔ نفحۃ الیمن۔ منیۃ المصلی۔ اصول الشاشی۔ قال اقول، تین سبق مستقل۔

ازشوال ۳۵ھ تا شعبان ۳۶ھ:

مرقاۃ۔ قدوری۔ شرح تہذی۔ کافیہ۔ نورالایضاح۔ اصول الشاشی۔ شرح جامی۔ بحث فعل، بحث اسم نصف پر منتقل ہوگئی۔ عجب العجاب۔ نفحۃ الیمن۔

ازشوال ۳۶ھ تا شعبان ۳۷ھ:

مقامات۔ سبعہ معلقہ۔ قطبی میر۔ کنز۔ قدوری۔ اصول الشاشی۔

ازشوال ۳۷ھ تا شعبان ۳۸ھ:

ہدایہ اولین۔ حماسہ بعد عشاء۔ بذل کی وجہ سے بعض سبق خارج میں ہوا کرتے تھے۔ ایک سبق حضرت کی اشراق کی نماز تک اور ایک سبق عصر کی نماز کے بعد بھی اکثر پڑھانے کی نوبت آئی، شعبان ۳۸ھ میں حجاز چلا گیا اور محرم ۳۹ھ میں واپسی ہوئی، اس زمانہ کے سبق یاد نہیں، لیکن ہدایہ اولین تین دفعہ پڑھانے کی نوبت آئی اور قطبی میر تو لَا تُعَدُّ وَلا تحصیٰ، شوال ۳۶ھ سے شعبان ۴۴ھ تک شاید ہی کوئی ایسا سال گزرا ہوگا جس میں قطبی تصدیقات اور میر قطبی میرے یہاں نہ ہوئی ہو۔ اکابر مدرسین منطق سے گھبراتے تھے، میر قطبی اور قطبی تصدیقات اور شرح تہذیب کی جماعت بھی اکثر میرے ہی یہاں رہتی تھی۔ شرح تہذیب کی جماعت بھی میرے تک پہنچ جاتی تھی۔

اس زمانے کے مدرسین اتنی اعلیٰ تحقیق سے نہیں پڑھاتے تھے جیسا کہ اس زمانہ کے علماء کرام پڑھاتے ہیں کہ کوئی کتاب الا ماشاء اللہ نصاب تک نہیں پہنچتی۔ میں نے تین سال ''نورالانوار'' پڑھائی اور ہر سال ''نورالانوار'' کے بعد اس کی جگہ حُسامی ہوا کرتی تھی۔ بحث فعل کے بعد بحث اسم بھی اکثر تین ربع کے قریب ہوجاتی تھی۔ دورہ کے سبق صرف تین گھنٹے ہوتے تھے۔ دو میں ترمذی، بخاری اور ایک میں ابوداؤد، پھر مسلم پھر نسائی اور دورہ کے اسباق میں ایک سبق بیضاوی شریف کا تھا، اس کے بعد مَدَارک۔ اس کے بعد کشاف۔ ایک گھنٹہ ہدایہ اخیرین کا تھا، اس کے بعد درمختار۔ ایک گھنٹہ توضیح تلویح کا تھا۔ اس کے بعد مسلم الثبوت۔ اس کے بعد کوئی تیسری کتاب بھی اکثر ہوجاتی تھی۔ سب سے پہلے دورہ میں سے توضیح نکلی تھی اور اس کا گھنٹہ مسلم شریف کو دیا گیا تھا۔ پھر ہدایہ نکلا۔ پھر بیضاوی نکلی۔ اب ماشاء اللہ چھ گھنٹے دورہ شریف کو دیئے جارہے ہیں پھر بھی حضرات محققین عظام رات کو اور جمعہ کو پڑھاتے ہیں پھر بھی مشکل سے دورہ پورا ہوتا ہے اور اب تو محققین عظام جلالین وہدایہ وغیرہ بھی ماشاء اللہ رات کو پڑھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی تحقیقات میں اور اضافہ فرمادیں۔

میری طالب علمی اور ابتدائی مدرسی میں ۴۶ھ تک بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ حضرت قدس سرہٗ کے

دور میں رات کو پڑھانا مدرس کی نالائقی سمجھا جاتا تھا کہ کتاب پڑھانے پر قادر نہیں تو بالکل صحیح ہے۔

از شوال ۴۰ھ تا شعبان ۴۱ھ:

رجب ۴۱ھ سے بخاری کے تین پارے ناظم صاحب کے یہاں سے منتقل ہو کر آئے۔

از شوال ۴۱ھ تا شعبان ۴۲ھ:

مشکوۃ شریف ا

از شوال ۴۲ھ تا شعبان ۴۳ھ:

مشکوۃ شریف ۲

از شوال ۴۳ھ تا شعبان ۴۴ھ:

مشکوۃ شریف ۳

از شوال ۴۴ھ تا صفر ۴۶ھ:

شوال ۴۴ھ میں سفر حجاز کو روانگی ۴۵ھ میں مدینہ طیبہ کا قیام اور وہاں مدرسہ شرعیہ میں مغربی طلبہ کو ابوداؤد شریف اور الحاج عبدالحمید کو مقامات عربی زبان میں پڑھائی اور بعض کتب کی تالیف، جو نقشہ تالیفات میں آ رہی ہیں۔

از ۱۸ صفر ۴۶ھ تا شعبان ۸۸ھ:

یہ ناکارہ ۱۸ صفر ۴۶ھ کو حجاز کے طویل سفر سے واپس پہنچا۔ ۱۸ صفر ۴۶ھ کو ابوداؤد صفحہ ۸۰ سے ناظم صاحب سے منتقل ہو کر آئی۔ اس کے ساتھ ہی نسائی شریف شروع ہوئی، اس کے بعد مؤطأ امام محمد، بخاری از جزء ۱۲ چار پارے، اس کے بعد سے ابوداؤد شریف تو مستقل ۵۷ھ تک اس ناکارہ کا سبق رہا۔ بخاری شریف کے متعلق حضرات سرپرستان نے ۴۶ھ میں یہ تجویز کر دیا تھا کہ ترمذی صدر مدرس مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے پاس ہو اور بخاری شریف زکریا کے پاس، اس لیے کہ حضرت ناظم صاحب کے پاس انتظامی کام بہت بڑھ گئے تھے۔ مگر ناظم صاحب کو اس پر بہت زیادہ تأثر قلق اور گرانی تھی اور ہونی بھی چاہیے۔ اس لیے زکریا نے سرپرستان کی اجازت سے یہ طے کر دیا کہ ترمذی تو مستقل صدر مدرس کے پاس رہے اور بخاری شریف کا افتتاح ناظم صاحب کرا دیا کریں اور بقرعید کے بعد وہ زکریا کے پاس منتقل ہو جایا کرے اور جلد ثانی ناظم صاحب بعد مغرب پڑھا دیا کریں۔

۵۳ھ میں ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا رنگون کا سفر ہوا، اس سال ابوداؤد کے ساتھ بخاری کی

دونوں جلدیں بھی زکریا کے پاس ہوئیں۔

۴۷ھ میں بھی ناظم صاحب کی مسلسل علالت کی وجہ سے دونوں جلدیں مع ابوداؤد کے زکریا کے پاس ہوئیں۔ ناظم صاحب کے انتقال کے بعد سے ابوداؤد مولانا اسعد اللہ صاحب کی طرف منتقل ہوکر بخاری شریف کی دونوں جلدیں زکریا کے پاس رہیں۔ تا شعبان ۸۸ھ۔

صفر ۴۶ھ کے بعد سے چونکہ زکریا کے اوقات زیادہ فارغ تھے، اس لیے دورہ کے مدرسین میں سے علالت یا طویل سفر کی وجہ سے جس کا سبق منتقل ہوتا ترمذی، مسلم وغیرہ وہ زکریا کے پاس منتقل ہوا کرتا تھا۔ شمائل تو کئی سال مسلسل رہی، جس کی تفصیل میں تطویل ہے، کاپی تقسیم اسباق میں تفاصیل موجود ہیں۔ مسلسلات کی ابتداء میں تو خصوصی احباب وقتاً فوقتاً اجازت لیتے رہتے تھے، لیکن ۵۳ھ سے باضابطہ زکریا کے سبق ختم ہونے کے بعد جمعہ کو ہونے لگی، جو ۸۸ھ تک رہی۔

۸۹ھ میں زکریا کا قیام حجاز میں رہا۔ اس لیے بخاری شریف مولانا یونس صاحب کی طرف منتقل ہوئی، اس لیے مسلسلات بھی انہی کے پاس ہوئی۔ ۲۳ رجب ۹۰ھ کو مسلسلات کا شور ہوگیا اور تقریباً ڈیڑھ ہزار کا مجمع ہوگیا، جس میں اکابر وخواص بھی بہت جمع ہوگئے تھے۔

ان خانوں میں کتابوں کا استیعاب نہیں۔ دو چار اہم کتابوں کی یادداشتیں ہیں، قطبی میر تو ہر سال دو تین دفعہ ہوجاتی تھی، اس لیے کہ منطق سے سب ہی گھبراتے تھے۔ چھوٹا مدرس میں ہی تھا، قطبی میر تو ہوتی ہی تھی۔ تہذیب اور شرح تہذیب کی جماعت بھی میرے یہاں قطبی تک پہنچ جاتی تھی۔ نورالانوار اور اس کے بعد حسامی تین سال مسلسل ہوئی۔ سالوں کی تعیین صحیح اندارج میں نہ ملی۔ اس زمانے کا نقشہ موجود تو ہے مگر اس وقت ملا نہیں، ممکن ہے بعد میں کسی کو ملے تو اضافہ ہوجائے۔

شوال ۳۶ھ میں ایک اہم واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ اوپر لکھ چکا ہوں، حضرت قدس سرۂ کے زمانے میں کسی مدرس کی یہ ہمت نہ پڑی تھی کہ اپنے لیے کوئی کتاب مانگے۔ حضرت قدس سرۂ کی موجودگی میں مہتمم صاحب اسباق کا نقشہ اور مدرسین کا نقشہ لے کر بیٹھتے تھے، کتاب کا نام پکارا جاتا اور اکابر مدرسین میں سے کوئی شخص کسی مدرس کا نام تجویز کردیتا، اگر کسی دوسرے مدرس کی طرف سے کوئی جرح نہ ہوتی تو حضرت کی منظوری پر اس کے نام لکھ دی جاتی۔ اکابر مدرسین میں سے اگر کسی کی طرف سے جرح ہوتی، مثلاً اونچی معلوم ہوتی یا اس سے نیچے کتاب ابھی نہیں پڑھائی، یا پوچھ لیجئے آپ کو اس کتاب کے پڑھانے میں کوئی اشکال تو نہ ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ۔ تو پھر دوسرے مدرسین کی تائید کے ساتھ یا نکیر کے ساتھ حضرت قدس سرۂ کا فیصلہ ناطق ہوتا۔

یہ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ کوئی مدرس اپنے لیے کوئی کتاب نہیں مانگ سکتا تھا، البتہ جو کتاب کوئی مدرس کئی دفعہ پڑھا چکا ہو اس کے مانگنے میں کوئی تردد نہیں ہوتا تھا۔

کوئی مدرس نئی کتاب مانگنا چاہتا تھا تو آپس کے مدرسین میں یہ طے ہوجاتا تھا کہ جب فلاں کتاب کا نام آئے تو اس کے نام تجویز کرادی جائے۔

مجھے ادب سے کچھ شوق بھی تھا اور والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے پڑھایا بھی کچھ محنت سے تھا، شوال ۳۶ھ میں میں نے مہتمم صاحب سے عرض کیا ''اگر نامناسب نہ ہو تو مقامات تقسیم اسباق کے وقت میں میرے لیے تجویز فرمادیں۔'' مہتمم صاحب نے بہت ہی شفقت سے یہ فرمایا کہ ''ایک ہی سال تیری مدرسی کا ہوا ہے، ابھی تقاضا ہی کیا ہے؟ انشاء اللہ مقامات بھی پڑھائے گا اور حدیث بھی پڑھائے گا، جلدی نہ کر، ابھی ہرگز مناسب نہیں۔'' میرا خیال تھا کہ اگر مہتمم صاحب نیم راضی ہوں تو پھر کسی مدرس سے، چچا جان یا مولانا ظفر احمد سے کہوں کہ وہ مقامات میرے نام کرادیں۔ اس لیے کہ زیادہ جرح مہتمم صاحب یا مولانا ثابت علی صاحب مرحوم کی طرف سے ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے میں ادب کی سب کتابیں پہلے گھنٹے میں ہوتی تھیں اور اس گھنٹے میں جلالین شریف، مختصر المعانی، شرح جامی بحث اسم بھی ہوتی تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب کے یہاں امسال جلالین ان کے بڑے شوق پر میرے چچا جان نے تجویز کرائی تھی اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں ان کی خواہش سے مختصر المعانی آئی تھی۔

سبعہ معلقہ کا سبق:

جب ادب کی کتابوں کا نمبر شروع ہوا تو متنبی کا نام بولا گیا اور وہ مولانا ثابت علی صاحب کے یہاں لکھی گئی تھی، اس لیے کہ ادب کے سبق اس زمانے میں تین ہی مدرسوں کے یہاں ہوا کرتے تھے۔ مولانا ثابت علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، مولانا ظفر احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور چچا جان نور اللہ مرقدہٗ متنبی کے بعد سبعہ معلقہ کا نام بولا گیا۔ ادب کی کتابیں آدھ گھنٹہ بھی ہوجاتی تھیں، اس کے علاوہ دوسری کتابیں ایک گھنٹہ ہوتی تھیں یا دو گھنٹے۔ جب متنبی کے بعد سبعہ معلقہ کا نام لیا گیا، ادب کے تینوں مدرسین کا گھنٹہ پر ہوچکا تھا اور مولانا ظفر احمد صاحب اور چچا جان اپنی اپنی کتاب بدلنا پسند نہیں کرتے تھے کہ پہلی دفعہ ہورہی تھی اور جب ان سے کہا گیا کہ اپنی اپنی کتابیں بدل لو تو انہوں نے عرض کیا کہ پہلی پہلی دفعہ آئی ہیں اور ادب کی کتابیں یہ حضرات کئی دفعہ پڑھا چکے تھے۔ مہتمم صاحب نے مولانا ثابت علی صاحب پر اصرار کیا کہ متنبی اور سبعہ معلقہ آدھا آدھا گھنٹہ پڑھادیں مولانا ثابت علی صاحب نے ذرا شدت سے انکار کیا، جلدی بولنے کے مولانا بہت عادی تھے، فرمایا ''پہلے گھنٹہ میں آدھ گھنٹہ مشکل ہے، پہلے گھنٹہ میں آدھ گھنٹہ مشکل ہے'' یہ لفظ دو دفعہ دہرایا اور فرمایا کہ ''چائے بھی تو پینی ہوتی ہے۔'' مولانا مرحوم اپنی چائے خود اپنے ہاتھ سے بناتے تھے اور بڑی لذیز ہوتی تھی۔ تین چار منٹ سکوت اور ردوقدح میں گزرے۔ مولانا عبداللطیف

صاحب نے زکریا کا نام پیش کر دیا۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے بڑے زور سے تائید کی ''ضرور بہت اچھی پڑھائے گا۔'' میرے چچا جان نے بھی فرمایا کہ ''اچھی پڑھائے گا۔'' اس میں اگر مخالفت کرتے تو مولانا ثابت علی صاحب کرتے، مگر وہ بھی متبنّی کی وجہ سے دبے ہوئے تھے۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، ''لکھ دو'' پھر کیا تھا، مجھے وہ منظر ہمیشہ یاد رہے گا اور بڑا لطف آتا ہے۔

مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ:

حضرت مہتمم صاحب کے ہاتھ میں قلم اور نقشے پر جھکے ہوئے اور بہت دبی ہوئی آواز سے فرمایا: ''میں نے تو مقامات کو بھی انکار کر دیا تھا۔'' مِـن مِن تو سب نے سنی مگر مطلب میں ہی سمجھا۔ اس کے بعد مقامات کا نام لیا گیا، اب تو میری بھی زبان روز سے کھل گئی، میں نے عرض کیا ''میں تو دونوں کتابیں آدھے گھنٹے میں پڑھا دوں گا، بلکہ حضرت مہتمم صاحب اگر اعلان فرما دیں تو مقامات کا سبق آدھ گھنٹہ پہلے ہی شروع ہو جائے گا تو دونوں سبق پون پون گھنٹہ ہو سکتے ہیں۔ مجھے چائے پینی نہیں نہ میں چائے پیتا ہوں۔'' وہ بھی میرے نام لکھی گئی۔ مقامات پر تو کوئی شور شغب نہ ہوا، اس لیے کہ یہ جماعت مشکوٰۃ کی جماعت تھی لیکن سبعہ معلقہ کی جماعت دورے کے بعد کی جماعت تھی اور یہ وہ لوگ تھے جو گزشتہ سال دورے میں میرے ایک ساتھی بھی رہ چکے تھے، اس لیے معلقہ کی جماعت نے بہت زور و شور ابتداء میرے خلاف اسی طرح کیا کہ حضرت قدس سرہٗ تک نہیں پہنچا، البتہ مہتمم صاحب تک بڑی بڑی شکایات پہنچتی تھیں۔ اس زمانے میں مدرسہ کا قانون یہ تھا کہ مدرس ہر کتاب کو جس کو پڑھائے تو دو نسخے ایک مطبع کے بھی لے سکتا تھا، ایک گھر پر مطالعہ کے لیے، ایک درس گاہ میں پڑھانے کے لیے اور مختلف مطابع کی تو ہر کتاب کا ایک نسخہ مختلف حواشی کی وجہ سے بھی لے سکتا تھا۔ اس سیہ کار نے ایک تو مکاری یہ کی کہ کوئی نسخہ معلقہ کا مدرسہ سے نہیں لیا اور شرحیں بھی اپنے نام پر کوئی نہیں لی، ایک آدھ مولانا ظفر احمد صاحب سے کہہ کر ان کے نام پر لی، ایک چچا جان کے نام پر اور معلقہ کے چند نسخے مختلف مطابع کے میرے تجارتی کتب خانے میں بھی موجود تھے۔ جو لوگ میرے مخالف تھے اور وہ ابتدائی مدرسین بھی جن کو میرے معلقہ پر رشک وحسد فطری چیز تھی، انہوں نے ان طلبہ کی بہت مدد کی اور جو لوگ معلقہ پڑھ چکے تھے ان کو بھی پڑھا کر میرے سبق میں مجھے دق کرنے کے واسطے بھیجا کرتے تھے، مگر اللہ کے انعامات کا نہ یہ سیہ کار شمار کر سکتا ہے نہ شکر ادا کر سکتا ہے، جو لوگ مجھے دِق کرنے کے واسطے معاند بن کر معلقہ میں شریک ہوا کرتے تھے ان کی درخواستیں معلقہ میں داخلہ کی مہتمم صاحب کے پاس دمادم پہنچنی شروع ہوئیں۔

ایک صاحب نے جو میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بھی مخالفین میں سے تھے، مہتمم صاحب سے کہا کہ ''معلقہ والے بہت رو رہے ہیں ان کا ناس تو مار دیا، ان کو حضرت مولانا ذوالفقار

صاحب کی اردو شرح ''التعلیقات علی السبع المعلقات مدرسہ سے دے دو کہ ان کو کچھ تو پتہ چلے۔''
مہتمم صاحب نے فرمایا کہ اردو شرح ادب کی کتاب کی ملنے کی ممانعت ہے، مگر ان صاحب نے بہت زور دیا کہ ''معلقہ والے بہت رو رہے ہیں۔'' مہتمم صاحب نے فرمایا کہ ''میرے پاس تو معلقہ میں داخل ہونے کی درخواستیں آ رہی ہیں، تم کیوں رو رہے ہیں؟'' لیکن ان کے شدید اصرار پر مہتمم صاحب نے ایک تحریر میرے پاس بھیجی کہ ''معلقہ کے طلبہ تعلیقات مانگتے ہیں، تیری کیا رائے ہے؟'' میں نے اس پر لکھ دیا کہ ''میرا کوئی حرج نہیں، بڑے شوق سے دے دیں لیکن طلبہ کے لیے اردو ترجمہ مضر سمجھتا ہوں۔'' مولانا ادریس صاحب کی نصیحت نے یہاں بھی مجھے بہت کام دیا اور اس دن سے میں تعلیقات کو خاص طور سے دیکھ کر جاتا تھا اور کبھی کبھی اپنی حماقت سے یہ لفظ بھی کہہ دیتا تھا کہ ''تم میں سے کسی کے پاس تعلیقات ہو تو دیکھ لینا، مولانا نے یہ مطلب تحریر فرمایا مگر میرے نزدیک یہ مطلب زیادہ اچھا ہے۔'' اس پر اور بھی طلبہ میں شوق و ذوق پیدا ہوا اور معلقہ کی شرکت کی درخواستیں بھی بڑھ گئیں تو آخر میں ناظم کتب خانہ نے لکھا کہ ''معلقہ کا کوئی نسخہ کتب خانہ میں نہیں ہے، مزید خریدنے کی اجازت دی جائے، اس پر حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتب خانے سے دریافت کیا کہ ''زکریا کے پاس کتنے نسخے ہیں؟'' کتب خانے نے جواب دیا کہ اس کے پاس نہ کوئی متن ہے اور نہ کوئی شرح۔ مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس قاصد سے وہی اصل کتاب کی درخواست لانے والا تھا، دریافت فرمایا کہ وہ اپنی کتاب میں پڑھاتا ہے؟ طالب علم نے جواب دیا کہ اس کے پاس تو کوئی کتاب نہیں ہوتی، اشعار حفظ پڑھتا ہے اور حفظ ہی ترجمہ اور مطلب سب کچھ کہتا ہے۔'' لڑکپن تھا، زمانہ جاہلیت تھا، سبعہ معلقہ کے سارے ہی اشعار عشقیہ مضامین کے تھے، بالخصوص امرؤ القیس کا قصیدہ خوب یاد تھا۔ حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے میرے حضرت قدس سرہٗ کے یہاں درخواست لکھی کہ ''سبعہ معلقہ کتب خانہ میں ختم ہو گئی جماعت بڑھ رہی ہے، مزید خریداری کی اجازت دی جائے۔'' میرا اندازہ یہ ہے جو اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میرے حضرت قدس سرہٗ کو بھی مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس تحریر سے بڑی مسرت ہوئی، حضرت قدس سرہٗ نے لکھوا دیا کہ ''دس نسخے فوراً خرید لیے جائیں۔'' دوسری صبح کو میں اپنے مکان سے دار الطلبہ سبق پڑھانے کے لیے جا رہا تھا اور مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کھالے پار کی طرف سے مدرسہ تشریف لا رہے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے اور بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے، مرحوم کا مکان قاضی کے محلے میں تھا، لیکن نور اللہ مرقدہٗ کا دستور یہ تھا کہ گھر سے چلتے وقت ایک دن غربی نالے سے آتے اور ایک دن شہر کے بیچ بازار سے آتے اور ایک دن مشرقی نالہ کھالہ پار کی طرف سے آتے اور ان کے گھر سے مدرسہ تک

تینوں سڑکوں پر جن جن چندہ دینے والوں کے گھر پڑتے، چاہے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہوتے، ان کے گھر جا کر بہت خوشامدانہ لہجے میں کہتے ''بھائی تمہارا چندہ نہیں آیا، وہ بہت شرمندہ ہو کر یا تو اسی وقت پیش کرتا یا تھوڑی دیر بعد خود لے کر مدرسہ آتا۔

حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے، وہ مہتمم مدرسہ بھی تھے، مفتی مدرسہ بھی وہی تھے کہ ان کے زمانہ میں کوئی مستقل مفتی اخیر زمانہ کے علاوہ نہیں تھے، خصوصی محصلِ چندہ شہر بھی وہی تھے کہ محصل شہر تو ایک اور صاحب تھے، لیکن جب وہ یہ کہتے کہ ''فلاں کے یہاں گیا تھا اس نے چندہ نہیں دیا'' تو مہتمم صاحب خود اس کے گھر جا کر تقاضا فرماتے جیسا کہ اوپر لکھا گیا اور مقدمات کی عدالتی کاروائی میں بھی خود جایا کرتے، کوئی ناظم اوقاف علیحدہ نہیں تھے جو عدالتی کام کرتا۔ اللہ بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے، جب میں مقابلہ سے سلام کرتے ہوئے آگے گزرا تو یہ منظر بھی ہمیشہ یاد رہے گا کہ حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے تسبیح جوان کے ہاتھ میں تھی وہ پڑھتے ہوئے آرہے تھے، میرے مونڈھے پر ماری اور فرمایا کہ ''تیرے سبعہ معلقہ نے تو میری آنکھ نیچی کردی، میں نے تو مقامات کو بھی انکار کردیا تھا، بھائی معاف کردیجئے۔'' مجھے بھی بہت ندامت ہوئی اور اب بھی جب یہ قصہ یاد آتا ہے تو مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تواضع پر بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں۔ میں نے عرض کیا، حضرت اس میں معافی کی کوئی بات نہیں۔ جناب کا ارشاد ابتدائی مدرس ہونے کے لحاظ سے بالکل مناسب تھا۔'' میں نے عرض کیا کہ معلقہ بالخصوص امرؤ القیس کا قصیدہ پڑھنے کے زمانے ہی سے یاد تھا اور یہ واقعہ تھا کہ مجھے معلقہ جتنا یاد تھا مقامات اتنی یاد نہیں تھی اور اس معلقہ کے ہنگامے نے:

خدا شرّے برانگیزد درو خیرے نہاں باشد

میری ادب دانی کو اتنی شہرت دی کہ مولانا بدر الحسن صاحب کا جو قصہ علی میاں نے مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح کے صفحہ ۹۱ پر لکھا ہے وہ اسی کا ثمر تھا وہ بہت مختصر لکھا گیا ہے۔

مولانا بدر الحسن صاحب، جو اس زمانے میں لکھنؤ میں سب جج تھے کاندھلہ تشریف لے جاتے وقت سہارنپور آئے کہ راستہ ادھر سے بھی ہے، سہارنپور میں ان کا قیام خواجہ مظاہر حسن مرحوم کے مکان پر ہوا کرتا تھا۔ وہاں قیام فرمایا اور دن کا زیادہ حصہ حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں اور میری تعزیت میں مدرسہ میں گزرتا، انہوں نے نہایت خفیہ میری تحقیقات خوب کیں، اللہ جزائے خیر دے اور جب ہر شخص کی زبان سے میری ادب دانی سنی تو مرحوم کو بہت مسرت ہوئی اور مجھ سے ازراہِ شفقت فرمایا کہ ''تیرے ادب کی بڑی تعریف سنی ہے، تیرے لیے مولوی فاضل کا امتحان دینا بہت آسان ہے، جلد از جلد امتحان کا فارم بھیج دے، اس میں تیری کامیابی یقینی ہے، اس کے بعد

میں تجھے اپنے ساتھ لکھنؤ لے جاؤں گا اور چند مہینے انگریزی پڑھا کر زبان کا امتحان بی اے کا دلوا دوں گا، اس کے بعد علی گڑھ کالج کے ناظم دینیات کی ملازمت جو صرف میری ایک تحریر پر مل سکتی ہے، تین سو روپے تنخواہ ہے تجھے مل جائے گی۔'' میں نے معذرت کردی۔ وہ خاندان میں بڑے شمار ہوتے تھے، ان کے سامنے سب اہلِ خاندان ادب کی وجہ سے چپ رہتے تھے، بہت کم گو تھے، میں نے بہت ادب سے معذرت کردی کہ سہارنپور چھوڑنے کا تو ارادہ نہیں ہے، انہیں گراں ہوا، فرمایا: ''بے وقوف ہے۔'' ایک آدھ لفظ اور بھی کہا، مگر میں ساکت رہا۔ انہوں نے اگلے دن کاندھلہ جا کر میرے والد کے حقیقی ماموں اور میری اہلیہ مرحومہ کے حقیقی تایا مولانا شمس الحسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو جو خاندان میں نہایت غصیار ے مشہور معروف تھے اور ان کے سامنے بھی خاندان کے بڑوں کی ان کے غصہ کی وجہ سے بولنے کی ہمت کم ہوتی تھی، مجھے سمجھانے کو بھیجا، مرحوم کو حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے مجھ پر شفقت تھی اس لیے وہ حضرت قدس سرہٗ سے بیعت ہو چکے تھے۔ مرحوم کی عادت یہ تھی کہ جس بات کو وہ بہت اہتمام سے کہنا چاہا کرتے تھے تو ابتداء کلام اس طرح ہوا کرتی تھی ''اے کہے تو ایک بات کہہ دوں۔'' اس سے اہمیت مقصود ہوتی تھی اور اس جملہ کو دو دفعہ کہا کرتے تھے۔ وہ عصر کے وقت تشریف لائے، میرے یہاں چائے کا دور چل رہا تھا۔ فرمایا کہ ''تیرے پاس آیا ہوں۔'' میں سمجھ گیا۔ مرحوم میرے باپ کے حقیقی ماموں اور اہلیہ مرحومہ کے حقیقی تایا تھے۔ میں نے چائے پیش کی اور عرض کیا کہ اب تو وقت بہت قریب ہو گیا، وقت تھوڑا ہی ہے، مغرب کی نماز پڑھتے ہی حاضر ہو جاؤں گا۔ نماز پڑھتے ہی میں ان کو لے کر زنانہ مکان کی چھت پر چلا گیا۔ سردی کا موسم تھا، مغرب سے لے کر عشاء کی اذان ہو گئی، وہ مجھے سمجھاتے رہے اور میرے لڑکپن پر بعض مرتبہ چہرے پر غصہ بھی آ جاتا تھا۔ ان کے ارشاد کا خلاصہ یہ تھا کہ شادی ہو چکی ہے، گھر ولادت بھی قریب تھی، سب سے بڑی بچی اہلیہ مولوی یوسف مرحوم کی ولادت کا زمانہ قریب تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ ہمشیرہ کی شادی بھی کرنی ہے، آٹھ ہزار قرضہ بھی ہے، پندرہ روپے تنخواہ میں کیا کیا کرے گا؟

میرے جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ ''یہ تو ہمیشہ سنا اور پڑھا ہے، جناب کو اس سے بھی انکار نہ ہوگا کہ مقدر میں جو ہے وہ تو مل کر رہے گا اور جو مقدر میں نہیں ہے وہ کہیں نہیں مل سکتا۔ میں جس ماحول میں ہوں اس میں اگر اپنی گندگیوں سے محفوظ رہوں یہ بھی اللہ کا احسان ہوگا، اس کم عمری میں عنفوان شباب میں علی گڑھ کے ماحول میں میرا محفوظ رہنا بہت ناممکن ہے، وہ فرماتے تھے دنیا دارالاسباب ہے اسباب کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے، محض مقدر پر نہیں رہا جا سکتا۔'' میں نے عرض کیا، بالکل صحیح فرمایا، ذرا اس میں تامل نہیں لیکن اسباب کے درجے میں دو سبب موجود ہیں،

ایک مدرسہ کی ملازمت، جو یقیناً محدود ہے، دوسرے کتابوں کی تجارت جس میں اللہ جل شانہٗ جتنا بھی عطا فرمائے، کوئی تحدید نہیں۔'' عشاء کی اذان پر میرے مخدوم ومکرم میرے والد صاحب کے ماموں رحمہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ''اے کہے تو ایک بات کہہ دوں؟'' میں نے کہا ''ضرور'' تو نے جو کچھ کہا، اگر دل سے ہو تو تیرا منہ چوم لینے کے قابل ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ تو نے سب کچھ زبان زوری سے کہا ہے، میں نے عرض کیا ''دعا فرمائیں کہ اللہ جل شانہٗ اس کو دل سے بھی کردے۔'' وہ بھی تشریف لے گئے۔

میرے بعض معاصر عزیزوں کو جن کا نام لکھنا نہیں چاہتا، میری یہ حرکت اس قدر ناگوار ہوئی کہ چند ماہ بعد جب کاندھلہ گیا تو میرے بڑوں نے تو کوئی تعرض نہ کیا، مگر میرے معاصرین نے بہت ہی طعن وتشنیع سب وشتم کیا اور ایک عزیز مرحوم نے تو سب سے زیادہ غصے کا اظہار کیا، حتیٰ کہ چند معاصرین اعزہ کسی مجلس میں بیٹھے ہوتے تو وہ مرحوم خفا ہو کر یہ کہہ کر اٹھ جاتا کہ میں ایسے کمینے لوگوں کے پاس بیٹھنا گوارا نہیں کرتا، جو صدقے وزکوٰۃ کی روٹیوں کو عزت کی تنخواہ پر ترجیح دیتے ہوں۔'' اور مرحوم خوب خفا ہوا لیکن اللہ جل شانہ کا اس سیہ کار کے ساتھ ایک خاص معاملہ ہمیشہ رہا کہ جو ابتداء میں بہت زور سے خفا ہوئے وہ انتہا میں اتنے ہی زیادہ محبت، عقیدت اور اگر یوں کہوں کہ عشق میں مبتلا ہوئے تو غلط نہیں۔ مرحوم اخیر زمانے میں کئی سال بیمار رہا، اللہ بہت ہی مغفرت کرے، مجھے بار بار بلانے کے تار بھی دیتا، میرا بار بار جانا تو بہت مشکل تھا، کبھی کبھی چلا جاتا۔ وہ مرحوم اکثر یہاں آتا، کئی کئی دن رہتا اور اس کا اصرار یہ تھا کہ ''میرے سینے پر ہاتھ رکھ، اس سے سکون ہوتا ہے۔''

تقسیم جائیداد میں بڈھانہ کا سفر:

اس علی گڑھ والے قصہ کے چند سال بعد ایک واقعہ منجانب اللہ پیش آیا۔ ہمارے یہاں جدّی جائیداد نامعلوم کئی پشتوں سے مشترک چلی آرہی تھی، ایک دفعہ کاندھلوی اعزہ کا جرنیلی حکم پہنچا: ''تقسیم جائیداد میں تحصیل بڈھانہ میں سب افراد کو جانا ہے، سب کی شرکت نہایت ضروری ہے۔'' میں نے اول تو بڑی معذرت کی کہ وکالت نامہ جس کے نام کہو لکھ کر بھیج دوں۔'' مگر معلوم ہوا اور سارے ہی خاندان کا اصرار ہوا کہ بڈھانہ جانا بہت ضروری ہے۔ ایک شخص کے نہ ہونے سے سب کا معاملہ گڑبڑ میں پڑ جائے گا۔ بالجبوری جانا پڑا۔ بڈھانہ کے تحصیل دار صاحب، جناب الحاج احمد حسن صاحب گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ جن کی ''مناجات احمد حسن'' مشہور ومعروف ہے، کے پوتے تھے، وہ صورت شناس تو نہ تھے مگر گنگوہ کی وجہ سے میرے والد صاحب اور میرے نام سے خوب واقف تھے کاندھلوی رؤسا سے ان کے اچھے تعلقات تھے، بڑی دعوتیں اور ڈالیاں ان کی خدمت میں پہنچا کرتی تھیں۔ اس لیے کہ روز کے مقدمات ان حضرات کے رہتے تھے اور باوجود

اس کے جیسا مقدمات میں ہوا کرتا ہے، بعض مقدمات میں کئی کئی دن لگ جاتے۔ تجویزیں یہ ہورہی تھیں کہ معلوم نہیں کتنے دن بڈھانہ میں ٹھہرنا پڑے گا، میں تو بڈھانہ سے بالکل ناواقف تھا، ان حضرات کی روز کی آمدورفت تھی اور آپس میں اختلاف رائے ہورہا تھا کہ کس کے مکان پر ٹھہرا جائے؟ ہر شخص اپنے تعلق والے کو ترجیح دیتا تھا۔

علی الصباح کاندھلہ سے بہت سا کھانا دانا نہایت لذیز، مرغن روٹیاں اور مرغے ساتھ تھے، کاندھلہ سے چل کر دس بجے کے قریب بڈھانہ پہنچے، تجویز یہ ٹھہری کہ پہلے سیدھے تحصیل میں چلیں۔ سامان کھانا وغیرہ سب ان بہلیوں میں چھوڑ دیا جوان حضرات کی تھیں۔ ۲۵، ۳۰ آدمیوں کا مجمع سب روساء آگے آگے اور یہ ناکارہ کسمپرسی کی حالت میں پیچھے پیچھے، پیشکار صاحب نے دور سے مجھے دیکھا اور ایک دم اپنی کرسی سے اٹھ کر اور پیچھے سے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی کرسی پر بیٹھنے کا اصرار کیا، میں نے شدت سے انکار کیا کہ میرے اعزہ ان میں بعض میرے اکابر بھی ہیں کھڑے ہیں اور میں بیٹھ جاؤں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ مگر پیشکار صاحب ہرگز نہ مانے اور زبردستی مجھے بٹھا دیا۔ یہ میرے سارے اعزہ نہایت سوچ میں پڑ گئے کہ کھلایا تو ساری عمر ہم نے، یہ کیا ہورہا ہے؟ ان کی زبردستی پر میں بیٹھ گیا اور انہوں نے کاغذات لے کر تحصیلدار صاحب سے کہا کہ حضور! سب سے پہلے ان کا کام ہوگا۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں تو انہوں نے میرے والد صاحبؒ کا نام لے کر کہا کہ ان کے صاحبزادے ہیں، مظاہر علوم میں مدرس ہیں۔ تحصیلدار صاحب نے کہا کہ اچھا اچھا، ان سے تو میں واقف ہوں۔ مگر میں بہت سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ یہ کہاں سے واقف ہیں۔ اللہ جل شانہ پیشکار صاحب اور تحصیلدار صاحب کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، اگر زندہ ہوں تو ترقیات عطا فرمائے اور عالم بقاء میں جا چکے ہوں تو بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے۔ تحصیلدار صاحب نے فوراً کاغذات لے کر گھنٹہ پون گھنٹہ تک بہت غور سے ان کو پڑھا، میں بیٹھا رہا اور یہ سب کھڑے رہے، ایک دو صاحب بینچ پر بیٹھ گئے اور تحصیلدار صاحب نے گھنٹہ پون گھنٹہ میں سب نمٹا کر دستخط کر کے کاغذات پیشکار کے حوالے کر دیے، میرے سب اعزہ کو حیرت ہورہی تھی اور سب سے زیادہ مجھے کہ یہ کیا ہورہا ہے؟

وہاں سے واپسی پر پیشکار صاحب میری مشایعت کو آئے اور تحصیل کے دروازے پر انہوں نے اپنی جیب سے بیس روپے نکال کر دونوں ہاتھوں سے مجھے پیش کیے میں نے بہت شدت سے انکار کیا، آپ کا تو یہی بہت بڑا احسان ہے کہ آپ نے ہمیں جلد فارغ کر دیا، ہم تو سوچ رہے تھے کہ رات کہاں ٹھہریں گے۔ میرے اعزہ نے میری تائید کی کہ پیشکار صاحب اس کی ضرورت نہیں، آپ نے تو بڑا احسان کیا، ہم سب کو جلدی نمٹا دیا، مگر وہ بہت اصرار کرتے رہے، میرے شدید انکار پر

انہوں نے یہ روپے جیب میں ڈال کر یہ کہا کہ ''یہ دو تین برس ہوئے میں نے آپ سے سہارنپور میں قرض لیے تھے، آپ نے مجھے پہچانا نہیں، میں فلانا ہوں۔'' ان کے تعارف پر مجھے یاد آیا کہ وہ مظاہر علوم کے کتب خانے میں ملازم رہ چکے ہیں اور اس زمانے میں مجھ سے قرض لیا تھا۔ ان کے اس کہنے پر میں نے کہا کہ ''پیشکار صاحب اب تو انکار کر دیا سو کر دیا، معاف ہیں۔'' پیشکار صاحب تو مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے، میرے عزیز مرحوم نے جو علی گڑھ کے قصبے میں بہت زیادہ ناراض سال دو سال تک رہا، یہ کہا کہ آج تو تُو نے مجھے نیچا دکھلا دیا، میں تو قرض معلوم ہونے پر کبھی بھی واپس نہ کرتا اور الٹا ان کے سر ہو جاتا، کہ کئی برس کے قرض کی ادائیگی کو بھی ایسی طرح دے رہے تھے جیسے بڑا احسان کر رہے تھے، نذرانہ دے رہے تھے۔'' مجھے بھی حماقت سوار ہوئی، ایک چبھتا ہوا فقرہ کہہ دیا ''بھائی تم بڑے لوگ ہو، رؤسا ہو، میں فقیر، غریب، ذلیل زکوٰۃ کی روٹیاں کھانے والا، تمہارا مقابلہ کہاں کر سکوں۔'' جن دو چار کو پرانا واقعہ معلوم تھا وہ تو سمجھے کہ میں نے کیا کہا، لیکن مرحوم بہت شرمندہ ہوئے اور مجھے اس کے بعد سے بارہا قلق ہوا کہ کیوں حماقت کی؟ بات میں بات نکل جاتی ہے، کہیں سے کہیں بہک جاتا ہوں قصہ تو تھا معلقہ کا پہنچ گیا تحصیل بڈھانہ میں۔

آپ بیتی کے واقعات تو بہت ہی عجیب وغریب اور مالک کے ''لَا تَعُدُّ وَلَا تُحْصٰی'' انعامات کے مظاہر ہیں۔

بہر حال معلقہ کا مرحلہ تو اللہ کے انعام واحسان سے ایسی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا کہ جس کا شکر ادا نہیں ہو سکتا، لیکن لوگوں پر گرانی بالخصوص ان پر جو اس کو بدلنا چاہتے تھے اور ناکام ہوئے، بلکہ ان کی کوششوں کا الٹا اثر ہوا اور ایک مخالفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس سلسلے کی جزئیات تو بہت لمبی چوڑی ہیں لیکن اس سلسلے کا اہم مسئلہ آئندہ سال شوال ۳۷ھ میں پیش آیا، میں نے اپنے حضرت قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ ''حضرت دل یوں چاہتا تھا کہ حضرت کے زیر سایہ فقہ کی کتابیں پڑھا لیتا، ہدایہ ایک دو سال حضرت کے زیر تربیت پڑھا لیتا تو پوچھنے میں سہولت رہتی۔'' حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا ''بہت اچھا۔'' میں نے عینِ تقسیم اسباق سے تھوڑی دیر پہلے حضرت قدس سرہٗ سے عرض کیا تھا۔ جب حضرت قدس سرہٗ، مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات تقسیم کے لیے بیٹھے تو بیٹھتے ہی حضرت قدس سرہٗ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ ''تم نے ہدایہ اولین کو کہا تھا یا اخیرین کو؟'' میں نے عرض کی کہ حضرت! اولین کو۔ حضرت قدس سرہٗ نے مہتمم صاحب سے فرمایا ''ہدایہ اولین پہلے اس کے نام لکھ دو پھر آگے چلو۔'' اس پر سارے ہی مدرسین کی آنکھیں کھلی رہ گئیں، حتیٰ کہ جو حضرات گزشتہ سال معلقہ میں میرے حامی تھے وہ بھی سوچ میں پڑ گئے کہ کنز صرف ایک سال ہوئی ہے اور اس وقت دستور یہ تھا کہ ہر مدرس کے پاس نئی

کتاب کم سے کم تین سال ہونا ضروری تھا اور شرح وقایہ پڑھانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ مگر حضرت کے حکم کے بعد پھر کون بول سکتا تھا۔ ہدایہ اولین لکھا گیا اور جو گزشتہ سال معلقہ میں اپنی مساعی کو ناکام دیکھ چکے تھے، ان کو پھر اپنا غصہ نکالنے کا موقعہ ملا اور تقسیم اسباق کا نقشہ چسپاں ہوتے ہی ایک محاذ اس ناکارہ کے خلاف پیدا ہوا۔ مگر میرے حضرت قدس سرہٗ نوراللہ مرقدہٗ تقسیم اسباق کے بعد اس خیال سے کہ مدرسین اور طلبہ کو کتابیں لینے میں کئی دن لگیں گے سیوہارہ وغیرہ کے سفر میں تشریف لے گئے اور یہاں حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے۔ ہدایہ کے تبادلہ کی یورش ہوئی۔ مولانا ثابت علی صاحب تو مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر بات بات میں برساہی کرتے تھے اور خوب خفا ہوا کرتے تھے، ہدایہ کے متعلق مولانا عبداللطیف صاحب نے بھی مہتمم صاحب سے کہا کہ ”طلبہ میں شورش ہے اس کو بدل دینا چاہیے۔“ مہتمم صاحب نے فرمایا کہ ”آپ کو معلوم ہے کہ حضرت نے بیٹھتے ہی کس اہتمام سے ہدایہ کو لکھوایا تھا، میں تو نہیں بدل سکتا، آپ تحریری حکم بھیجیں کہ صدر مدرس ہیں، مہتمم جزئیات ہیں، نگران دارالطلبہ ہیں، آپ کے حکم کی تعمیل میں بدل دوں گا۔“ اتنی ہمت تو مولانا عبداللطیف صاحب بھی نہ کرسکے کہ حضرت قدس سرہٗ کے حکم کو تحریری حکم سے منسوخ کرسکیں۔ اس ہدایہ میں مولانا عبدالشکور صاحب کاملپوری بھی تھے جو بعد میں کئی سال مظاہر میں مدرس رہے۔ تقسیم کے بعد راولپنڈی میں مدرس ہوگئے تھے اور حال ہی میں ۲۳ رجب ۹۰ھ مطابق ۲۵ ستمبر ۷۰ء بروز جمعہ پونے چار بجے شام طویل بیماری کے بعد پنڈی میں انتقال ہوا۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ واعلی اللہ مرتبہ۔

طلبہ نے ہدایہ کی تبدیلی کی درخواست مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام لکھی اور سب نے اس پر دستخط کیے مگر مولوی عبدالشکور صاحب مرحوم نے دستخط کرنے سے انکار کردیا اور انہوں نے یہ کہا کہ حضرت سفر میں ہیں یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ بغیر حضرت کے کوئی نہیں بدل سکتا اور تمہارا سبق شروع کرنے سے پہلے یہ کہنا کہ ہم نہیں پڑھتے، اس کی کوئی وجہ نہیں، چندروز سبق پڑھ لو، تمہیں یہ کہنے کا حق ہوگا کہ سبق ہماری سمجھ میں نہیں آتا، ابھی سے کیا عذر کرو گے؟ یہ بات طلبہ کی سمجھ میں آگئی اور سبق شروع ہوگیا اور معلقہ کے مخالفین نے یہاں بھی طلبہ کو شہ دی اور مولوی ادریس صاحب کی نصیحت نے یہاں بھی بہت کام دیا۔ میں نے دو تین دن تک تو مسلسل فقہ کی لغوی، اصطلاحی تعریفیں، ان کا درجہ، مصنف کے احوال اور جو جو سمجھ میں آیا سب کچھ کہا اور تین دن کے بعد بسم اللہ سے لے کر کتاب الطہارۃ تک ایک صفحہ پانچ دن میں پڑھایا۔ اس کے بعد بعض طلبہ تو ڈھیلے پڑگئے، لیکن بعض شری طلبہ نے پھر بھی درخواست کا ارادہ کیا، مگر اکثریت نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ”درخواست کا حشر معلوم ہے۔“ ”گھنٹہ کے نیچے سبق ہوگا۔“ یہ اس زمانے کی ایک خاص

اصطلاح تھی۔ وہ یہ کہ جس مدرس کے خلاف طلبہ کی طرف سے تبدیلِ سبق کی درخواست ہوتی تھی تو عین سبق کے وقت بلا پہلے سے کسی اطلاع کے حضرت قدس سرہٗ کا حکم مدرس کے پاس پہنچتا تھا کہ ''سبق گھنٹے کے نیچے ہوگا۔'' اور گھنٹہ سے مراد وہ گھنٹہ ہوتا تھا جو مدرسہ قدیم میں حضرت قدس سرہٗ کی سہ دری میں لگ رہا تھا۔ جواب تک اسی جگہ ہے مدرس گھنٹے کے نیچے بیٹھتا، طلبہ چاروں طرف اور حضرت نوراللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مرتبہٗ اپنے حجرہ مبارک کے دروازے پر اپنی مخصوص جگہ پر جو ہر وقت حضرت کے بیٹھنے کی تھی، تشریف رکھتے، طالب علم اس وقت میں مدرس کو خوب دق کرتے اور مدرس، حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے مرعوب بھی بہت ہوتا۔ ایک مصیبت عظمٰی کا وقت ہوتا تھا۔ حضرت اس وقت کچھ نہیں فرماتے تھے، اگر حضرت کے نزدیک طلبہ کی شکایت بجا ہوتی تو مدرس کو خاص طور سے مطالعہ کی تنبیہ فرماتے، مگر تنہائی میں اور اگر طلبہ کی شکایت زیادہ قوی ہوتی اور مدرس کا نقص حضرت کے ذہن میں آجاتا تو پندرہ بیس دن بعد وہ کتاب کسی بہانے سے بدل دی جاتی اور اگر طلبہ کی شکایت غلط ہوتی تب تو نمبر۱ معمولی تنبیہ، نمبر۲ شری لوگوں کا حسب مناسب وقت کھانا بند، نمبر۳ شری لوگوں کا اخراج۔ یہ قانون سب لوگوں کو معلوم تھا، اس لیے اکثریت نے شدت سے انکار کیا کہ ہم دستخط نہیں کریں گے۔ درخواست کا حشر، گھنٹہ کے نیچے سبق ہوگا اور اس کا حشر معلوم ہے کہ اخراج اگر نہ ہوا تو کھانا تو کم از کم بند ہو ہی جائے گا۔ اس پر وہ درخواست رُل گئی۔

اس سیہ کار کے ساتھ یہ دو واقعے تو مخالفت کے پیش آئے، اللہ کے فضل سے ان دو کے علاوہ کوئی واقعہ ان چون (۵۴) سالہ مدرسی میں طلبہ کی طرف سے اعراض یا ناگواری کا پیش نہیں آیا۔ بلکہ طلبہ اور اس سیہ کار کی طرف اسباق کے منتقل ہونے کی مساعی کے پیش آتے رہے۔

بلکہ ۱۳۴۱ھ میں حضرت قدس سرہٗ کی طرف سے ایک اہم واقعہ پیش آگیا۔ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں شوال میں ترمذی دو گھنٹے ہوا کرتی تھی اور صفر کے آخر میں عموماً ختم ہو جاتی تھی اور اس کے بعد اُنھی دو گھنٹوں میں بخاری شریف شروع ہوتی اور اوائل رجب میں ختم ہو جایا کرتی یہ ہمیشہ کا دستور تھا۔ حضرت قدس سرہٗ اس کے سخت مخالف تھے اور بار بار مدرسین پر نکیر بھی کرتے تھے کہ شروع سال میں لمبی لمبی تقریریں کی جائیں اور اخیر سال میں رمضانی حافظ کی طرح بلا تقریر کتاب پوری کرائی جائے۔ مولانا عبداللطیف صاحب کے یہاں چونکہ ترمذی، بخاری کی شروعات تھیں، اس لیے دوسرے مدرسین کی طرح ابتداء میں تقاریر کا زور ہوا اور جمادی الاخریٰ کے ختم تک بخاری کی ایک جلد بھی پوری نہ ہوئی۔ حضرت خوب ناراض ہوئے اور مہتمم صاحب سے فرمادیا کہ بخاری کے پارے دوسرے مدرسین پر منقسم کردیئے جائیں۔ اس سیہ کار کا نام بھی خاص طور پر لیا۔ اس کو بھی کچھ پارے دے دینا۔ یہ فرما کر حضرت تو ایک دو دن کے لیے کسی سفر

میں بلندشہر وغیرہ کہیں تشریف لے گئے۔ مجھ پر اس قدر بوجھ ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے مشکوٰۃ بھی اس وقت تک نہیں پڑھائی تھی۔ میں نے مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ ''بہت نامناسب ہوگا۔ آپ مجھے ہرگز نہ دیں۔ حضرت مولانا ثابت علی صاحب اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب ہی کو دیں۔'' مہتمم صاحب نے بھی موافقت کی۔ ان دونوں حضرات کو پانچ پانچ پارے دے دیئے گئے اور ساتھ آٹھ پارے مولانا عبداللطیف صاحب کے پاس بدستور رہے۔ تیسرے دن حضرت سفر سے واپس تشریف لائے، میں ڈاک لکھ رہا تھا۔ مہتمم صاحب سے دریافت کیا، ''پارے بانٹ دیئے؟'' مہتمم صاحب نے عرض کیا ''حضرت تقسیم کردیئے اس نے لینے سے انکار کردیا۔'' حضرت اس سیہ کار پر خوب ناراض ہوئے۔ فرمایا ''بہت اچھا۔ انکار کردیا تو ہماری پاپوش سے یوں چاہتے ہیں کہ ہماری خوشامد ہو۔''

حضرت قدس سرہٗ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ غصہ میں چہرہ سرخ ہوجاتا تھا۔ تھوڑی دیر حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے سکوت فرمایا اور پھر نعلین شریفین اٹھا کر مکان تشریف لے جانے لگے۔ میں نے جلدی سے حضرت کے ہاتھ سے نعلین شریفین لے لیے اور پیچھے پیچھے دروازے تک گیا۔ دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہوکر میری طرف متوجہ ہوکر نہایت غصہ میں فرمایا: ''کچھ کہنا ہے؟'' میں نے عرض کیا کہ ''حضرت تو ناراض ہی ہوگئے۔'' فرمایا ''ناراض نہ ہوں جب میرا کہنا نہ مانا۔'' میں نے کہا ''حضرت! توبہ توبہ مجھے تو یہ خیال ہوا کہ مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی۔ دوسرے مدرسہ والے کیا کہیں گے کہ نوعمر لڑکے کو جس نے مشکوٰۃ بھی نہیں پڑھائی، بخاری دے دی۔'' حضرت نے فرمایا کہ ''نوعمر لڑکے کو میں کیا جانوں، دوسرے لوگ کیا جانیں، اگر کوئی الزام دے گا تو مجھے دے گا۔ تمہیں تو نہیں دے گا۔'' میں نے عرض کیا کہ ''حضرت مجھے تعمیل ارشاد میں کیا انکار ہے۔'' حضرت نے فرمایا ''کہنا مان لوگے میں راضی ہوجاؤں گا۔'' میں وہاں سے آکر مہتمم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے کہا کہ ''آپ نے تو پٹوا ہی دیا۔'' آپ کو بحیثیت مہتمم کہنا چاہیے تھا کہ اس کے پاس مناسب نہیں تھا، اس لیے میں نے نہیں دی۔'' مہتمم صاحب نے فرمایا ''ہاں مجھے پٹوانا چاہتا تھا۔'' اسی وقت از ۱۳ تا ۱۵ پاروں کا اعلان اس سیہ کار کے نام ہوا۔ اس بخاری شریف میں قاری سعید مرحوم بھی تھے جو بعد میں مفتی اعظم مظاہر علوم ہوگئے تھے۔

ممکن تھا کہ اس بخاری پر کوئی معلقہ یا ہدایہ کی طرح خرخشہ اٹھتا، لیکن طلبہ میں میرے انکار اور حضرت قدس سرہٗ کی ناراضگی کا شہرہ قاری سعید مرحوم کے ذریعے اعلان سے پہلے ہی ہوگیا تھا، اس لیے اگر کوئی کہنا بھی چاہتا تو اس واقعے کے بعد کس کی ہمت پڑ سکتی تھی۔

اسٹرائک کی لعنت مدرسے میں نہیں تھی:

اسٹرائک کی لعنت اس وقت تک ہمارے مدارس میں نہیں آئی تھی۔ مدارس عربیہ والے اس منحوس لفظ کو جانتے ہی نہ تھے کہ کیا ہوتا ہے، اس وقت تک ہر بڑے چھوٹے کے نزدیک مدرسہ کے احسانات اہم اور قابل لحاظ تھے۔

ایک اصول جو میرے اکابر کے یہاں خاص طور سے تھا کہ دوسروں کے جو حقوق اپنے ذمہ ہوں ان کو ادا کرنا اپنا فریضہ ہے اور اپنے حقوق جو دوسروں کے ذمہ رہ جائیں، ان کی وصولی کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کا خاص طور سے اس قانون پر عمل تھا، وہ کسی بات میں یہ نہیں سوچتے تھے کہ دوسرا کیا کررہا ہے، وہ ہر بات میں یہ سوچتے تھے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے ملفوظات میں بھی اور عزیز یوسف مرحوم کی تقاریر میں بھی یہ مضمون بہت کثرت سے ملے گا اور حدیث پاک سے بھی مستنبط ہوتا ہے:

"لَیْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُکَافِی وَلٰکِنَّ الْوَاصِلَ الَّذِیْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَ".

"صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو برابر سرابر کا معاملہ رکھے، یعنی یوں کہے کہ جیسا وہ کرے گا ویسا میں کروں گا۔ بلکہ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اس کے ساتھ قطع رحمی کی جائے تو وہ قطع رحمی کرنے والے کے ساتھ بھی صلہ رحمی کرے۔" (مشکوٰۃ عن البخاری)

مدرسین کا مدرسہ کی خدمت:

مدرسہ کے معاملات میں نہ صرف اس ناکارہ کا، بلکہ اس زمانے کے تقریباً ہر مدرس اور ملازم کا یہ قانون اور اصول موضوعہ کے طور پر طے شدہ مفروضہ تھا کہ ہمارا کوئی حق مدرسہ پر نہیں، جو مدرسہ کی طرف سے مل رہا ہے وہ اللہ کا احسان اور اسی کا عطیہ ہے اور ثانیاً مدرسہ کا احسان ہے اور ہم لوگوں کا کوئی حق مدرسہ پر نہیں اور مدرسہ کا ہر کام چاہے کتنا ہی معمولی سا ہو حتیٰ کہ درس گاہ میں جھاڑو تک دینے سے بھی مدرس کو عار نہیں تھا۔

اس زمانے میں یاد نہیں کہ استنجاء کے ڈھیلوں کی اینٹوں کے لیے یا حمام کی لکڑیوں کے لیے کسی ملازم یا مزدور کو بلانے کی ضرورت کبھی پیش آئی ہو۔ میں نے دربان سے کہہ رکھا تھا کہ جب اینٹوں یا لکڑیوں کی گاڑی آئے اوپر درس گاہ میں مجھے اطلاع کردے۔ میں گھنٹے کے ختم پر ایک طالب علم کو مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے پاس یہ کہہ کر بھیج دیتا تھا کہ "اینٹیں آئی ہوئی ہیں، میں نیچے جارہا ہوں۔" مولانا مرحوم بھی فوراً نیچے پہلے پہنچ جاتے اور ہم دونوں کو جاتے دیکھ کر دونوں کے یہاں کی جماعتیں ایسی دوڑتیں کہ ہم سے پہلے وہاں پہنچ جاتے۔ ہم دونوں کو ایک پھیرا بھی

مشکل سے کرنا ہوتا تھا کہ راستے میں کوئی طالب علم چھین لیتا تھا۔ لیکن اینٹیں ہوں یا لکڑیاں دو تین منٹ سے زائد گاڑیوں کے خالی ہونے میں نہ لگتے تھے، بہت سے طالب علموں کو ایک ہی پھیرا کرنا پڑتا تھا۔ نوعمر لڑکے اپنی جرأت دکھانے کیلیے ۲ پھیرے کر لیتے تھے۔

بہت سی جزئیات اس نوع کی ملیں گی۔ اب اس کے بالمقابل یہ منظر دیکھ کر کسی ملازم سے یوں کہیں کہ پنکھا اٹھادے تو یہ سوچ کر کہ یہ میرا کام نہیں، اس کا معاوضہ کیا ہوگا۔ کسی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:

ان نینوں کا یہی بسیکھ
وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

تعلیمی مخالفت کے متعلق لکھا جا چکا، معاقہ اور ہدایہ کے علاوہ کسی تعلیمی سلسلے میں مخالفت نہیں ہوئی۔ البتہ انتظامی سلسلے کے درمیان مختلف محاذ میرے خلاف شروع سے رہے اور بالکل سمجھ میں نہیں آیا کہ جتنا میں اس لائن سے بھاگا اتنا ہی میرے سر تھوپی گئی اور غور کے باوجود بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ مصیبت میرے کیوں لادی گئی؟

غالباً ۳۸ھ یا ۳۹ھ کا واقعہ ہے، میرے حضرت قدس سرہ اعلی اللہ مرتبۂ بہاولپور تشریف لے جارہے تھے اور حضرت مولانا عبداللطیف صاحب نوراللہ مرقدۂ بھی ہمرکاب تھے اور ہمارے مدرسہ کے ایک مدرس بھی ساتھ تھے، جو میرے بڑے مخلص، ان کا کھانا پینا اکثر میرے ساتھ، چائے تو مستقل میرے ساتھ پیتے ہی تھے، انہوں نے بہاولپور کے راستے میں بہت ہی اخلاص و محبت اور انتہائی راز میں ناظم صاحب سے کہا کہ ''میں آپ سے ایک بات بہت اخلاص سے راز میں کہتا ہوں، یہ مولوی زکریا جو حضرت کے ساتھ اتنی چاپلوسی ہر وقت کرتے ہیں، ان کا مقصد حضرت رحمہ اللہ تعالی کے بعد حضرت کی جگہ قائم مقام ہونے کا ہے، آپ کو گرانے کے لیے یہ سب کچھ کیا جارہا ہے۔'' ناظم صاحب کو اللہ بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے، انہوں نے کسی تصنع سے نہیں بہت اخلاص سے اس مرحوم سے یوں کہا: ''اگر مولوی زکریا کا ایسا ارادہ ہو تو وہ یقیناً اس کے بہت اہل ہیں، میں ان کے لیے کوشش کروں گا۔'' اور اتنا زور باندھا کہ وہ بیچارے اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔ اس کے بعد ناظم صاحب نے حضرت قدس سرہٗ سے ان کا یہ مقولہ نقل کر کے اپنی طرف سے بہت پرزور سفارش کی ''حضرت! مولوی زکریا اس کے بہت اہل ہیں، حضرت ان کو نائب ناظم بنادیں، میں ان کی انتہائی مدد کروں گا۔'' حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا: ''وہ صاحب تو بے وقوف ہیں، اس سے تو میں واقف ہوں، اسے تو کوئی بنائے گا جب بھی نہیں بنے گا۔'' حضرت قدس سرہٗ نے بالکل صحیح فرمایا، مجھے اس سے ہمیشہ بہت ہی وحشت رہی۔

۴۴ھ میں میرا حج کا ارادہ بالکل نہیں تھا، شادی بھی ہو چکی تھی، دو بچیاں بھی ہو چکی تھیں اور ایک بچہ پیدا ہو کر انتقال کر چکا تھا، چوتھے کی امید تھی، قرضہ بدستور تھا۔ تعلیم میں اونچے مدرسوں میں شمار تھا، حدیث کے اسباق شروع ہو چکے تھے۔ شعبان ۴۴ھ میں حضرت قدس سرہٗ نے اپنی غیبت کے لیے جو انتظامات لکھوائے اس میں اس سیہ کار کو صدر مدرس بنایا اور حضرت عبداللطیف صاحب کو ناظم مدرسہ۔ وہ تحریر تھی تو بڑی راز میں، حضرت مہتمم صاحب لکھنے والے تھے، لیکن اس ناکارہ سے زیادہ راز نہیں تھا، اس لیے کہ وہ کاغذات اس ڈاک کے تھیلے میں رہتے تھے جو میرے پاس رہتا تھا اور جب میں نے یہ پڑھا کہ اس سیہ کار کا نام مدرس اول میں لکھا گیا تو میرا دماغ چکرا گیا، اس لیے میری نگاہ میں مدرس اول کے فرائض بہت سخت تھے سارے مدرسے کی تعلیم کا صدر مدرس واحد ذمہ دار، مدرسین کی تعلیم کی نگرانی بھی شرعاً عقلاً عرفاً اس کے ذمے۔ اس سے زیادہ مصیبت یہ تھی کہ جہاں کوئی علمی اجتماع یا کسی اونچی جگہ مدرسہ کا کوئی خصوصی احتفال ہوتا، صدر مدرسہ کے نام وارنٹ ہوتا کہ ''آپ آیئے۔'' میں نے حضرت قدس سرہٗ سے جب وہ اوپر پیشاب کے لیے تشریف لے جا رہے تھے اور یہ ناکارہ استنجاء کا لوٹا لے کر ریاکاری سے پیچھے پیچھے گیا اور جب حضرت استنجاء سکھلا رہے تھے، میں نے بہت سوکھا سامنہ بنا کر یوں عرض کیا ''حضرت بذل کا کیا ہوگا؟'' حضرت قدس سرہٗ نے بہت قلق کے ساتھ فرمایا کہ ''کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوگا؟'' ''تمہارے بغیر تو میں لکھ نہیں سکتا اور تمہارے جانے کی کوئی صورت نہیں، اہل وعیال ساتھ ہیں، طویل قیام ہے۔'' میں نے عرض کیا کہ حضرت اب تو یہ خیال ہے کہ ''میں حجاز چلوں۔'' حضرت قدس سرہٗ کا چہرہ اس وقت مجھے خوب یاد ہے خوشی سے کھل گیا۔ استنجاء پاک کر کے وضو کر کے نیچے تشریف لائے اور بیٹھ کر فرمایا، ''تمہارے خرچ کا کیا ہوگا؟'' میں نے عرض کیا کہ ''حضرت اس کا تو بالکل فکر نہیں کریں۔ میں ۳۸ھ میں بھی قرض لے کر گیا تھا، حالانکہ اس وقت ملنا بہت دشوار تھا اور اس وقت بہت آسان ہے، اب بھی لے لوں گا۔'' حضرت نے فرمایا ''تمہاری مدرسہ میں تنخواہ بھی کچھ جمع ہے۔''

اس کی شرح یہ ہے کہ ۳۵ھ میں جب میں ملازم ہوا تھا اور میری تنخواہ پندرہ روپے ہوئی تھی۔ اس وقت بڑے حضرت اقدس رائے پوری شاہ عبدالرحیم صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے مدرسہ میں تو سفارش کی تھی کہ ''پندرہ روپے تنخواہ بہت کم ہے، کم از کم پچیس روپے ہونی چاہیے۔'' اور مجھ سے یوں ارشاد فرمایا کہ ''جب اللہ توفیق دے مدرسہ کی تنخواہ چھوڑ دینا۔'' جس کا اثر یہ تھا کہ میرا حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے ارشاد کی وجہ سے تو تنخواہ لینے کو بالکل جی نہیں چاہتا تھا، مگر میرے حضرت قدس سرہٗ لیتے تھے، اگرچہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے کبھی نہیں لی، پھر بھی چونکہ میرے حضرتؒ لیتے تھے اس لیے نہ لینا بے ادبی سمجھتا تھا، اس لیے کسی ماہ میں اس کا غلبہ ہوتا تھا کسی ماہ

اسکا، البتہ نہ لینے کی وجہ سے میری ترقیاں رکتی رہیں، جب مدرسین کی ترقی کا وقت آتا اور دوسرے مدرسین کی ترقی ہوتی تو میں اس سے پہلے مہینوں میں تنخواہ لینے والا ہوتا تو میری بھی چار پانچ روپے ترقی ہوجاتی اور جس زمانے میں تنخواہ نہ لیتا، مہتمم صاحب فرمادیتے ''وہ تو پہلے ہی سے نہیں لیتا، اس کی کیا ترقی؟''

بہر حال محرم ۳۵ھ سے شعبان ۴۴ھ تک نو سو پینتالیس روپے میری تنخواہ کے جمع تھے جو اس زمانے میں حج کے اخراجات سے بہت زائد تھے، حج کا خرچ اس زمانے میں زیادہ سے زیادہ کا چھ سو روپے تھے۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں یہ تھا کہ بقدر اخراجات لے کر بقیہ اہل وعیال کے خرچ کے لیے دے دیئے جاویں۔ میں نے عرض کیا کہ ''حضرت اس کا فکر نہ فرماویں، خرچ کا انتظام ہوجائے گا، اس تنخواہ کا لینا تو جائز نہیں۔'' اکابر کی خدمت میں گستاخ تو ہمیشہ ہی رہا۔ حضرت نے فرمایا ''کیوں؟'' عرض کیا ''حضرت جن مہینوں کی تنخواہ نہیں لی ان میں اس نیت سے پڑھایا کہ تنخواہ نہیں لوں گا، اب اس کے لینے کا کیا حق ہے؟'' حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ''تم نے کوئی درخواست مدرسہ کو دی؟ تم اَجیر تھے، مدرسہ مُستأجر، تمہیں یک طرفہ فسخ اجارہ کا کیا حق تھا؟ جب تک کہ ہم قبول نہ کریں۔'' میں نے عرض کیا ''حضرت اس میں اجارے کی تو کوئی بات نہیں، ایک شخص کام کرتے ہوئے یہ نیت کرلے کہ لوجہ اللہ کر رہا ہوں اس کے بعد معاوضہ لینے کا کیا حق ہے؟'' حضرت ناظم صاحب بھی تشریف فرما تھے انہوں نے حضرت سے عرض کیا ''حضرت میں انہیں سمجھا دوں گا۔'' حضرت بہت خوش ہوئے اور میں بھی بہت خوش ہوا، حضرت کے سامنے تو میں بہت ادب سے ڈرتے ڈرتے کوئی لفظ کہوں گا اور ناظم سے خوب کھل کر مناظرہ ہوا، انہوں نے حضرت سے عرض کردیا کہ ''حضرت یہ نہیں مانتا'' حضرت تھانوی قدس سرہٗ بھی مدرسہ کے سرپرستوں میں تھے اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی تھانہ بھون کے مفتی اعظم اور مجھ سے بے حد بے تکلفی، میں نے ان سے کہا کہ ''مدرسہ کے کاغذات میری تنخواہ کے سلسلے میں حضرت کے پاس آویں گے، حضرت سے میری تنخواہ نامنظور کرادیجیو۔'' انہوں نے حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے نہ معلوم کیا کہا، جب میری درخواست ڈیڑھ سال کی چھٹی کی اور مہتمم صاحب کی طرف سے اس پر یہ تحریر کہ اس کی تنخواہ بھی کچھ رکی ہوئی ہے اس کے دینے کی بھی اجازت دی جائے۔ تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے چھٹی بخوشی منظور فرمائی اور تنخواہ کے متعلق تحریر فرمایا کہ ''اگر قبض الوصول میں تنخواہ درج ہے اور انہوں نے وصول نہیں کی تو اس میں سرپرستان سے اجازت کا کیا مطلب؟ دی جائے اور اگر اس میں کوئی اور اشتباہ ہے تو اس کو ظاہر کیا جائے تا کہ اس پر غور کیا جائے۔'' مولانا عاشق الٰہی صاحب بھی اس وقت سرپرست بنائے گئے تھے، یہاں آئے، میں نے ان سے

بھی عرض کیا کہ ''تم سرپرست ہو اس تنخواہ کا لینا میرے لیے جائز نہیں، اسے نامنظور کردیجئے۔''
لیکن حضرت قدس سرہٗ کی منظوری کے بعد حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ تو رد فرما سکتے تھے، خدام میں سے کس کو ہمت پڑتی؟ یہ گستاخیاں تو اللہ میاں نے اس ناکارہ کے حق میں رکھی تھیں، جو ہمیشہ کرتا رہا، مولانا عاشق الٰہی صاحب نے اول تو مجھ سے مناظرہ کیا اور جب ناظم صاحب کی طرح وہ بھی مناظرے میں غالب نہ آئے تو انہوں نے بحیثیت سرپرست میرے کاغذ پر لکھا ''ڈیڑھ سالہ رخصت منظور ہے اور تنخواہ کے سلسلے میں جیسا کہ اس کی طرف سے رخصت کی درخواست ہے، اسی کی طرف سے یہ درخواست بھی ہونی چاہیے کہ میری تنخواہ مدرسہ سے دلوائی جائے۔'' حضرت قدس سرہٗ نے جب حضرت میرٹھی کی تحریر دیکھی تو سمجھ گئے کہ میرا ان سے بھی مناظرہ ہوا تو میرے حضرت قدس سرہٗ نے بہت ہی شفقت سے مجھ سے یوں فرمایا کہ ''بذل میرا ذاتی کام تو نہیں، مدرسہ ہی کا کام ہے، اگر میں سرپرستان کی منظوری کے بعد تمہیں بکارِ مدرسہ اپنے ساتھ لے جاؤں اور آمد و رفت کے خرچ کے علاوہ وہاں کے قیام کی تنخواہ مدرسہ سے دلواؤں تو تم کیا کہو گے؟'' میں نے عرض کیا ''حضرت! یہ عرض کروں گا بالکل جائز ہے ذرا تردد نہیں۔'' حضرت نے فرمایا ''تمہاری جمع شدہ تنخواہ تو بہت کم ہوگی جتنا کہ اس صورت میں مدرسہ تم کو دے گا۔'' میں نے کہا ''بالکل صحیح ہے۔'' حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا ''پھر تم یہی سمجھ لو۔'' اس پر میں نے تنخواہ تو لے لی، لیکن حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی نسبت کچھ ایسا غالب تھا کہ مدینہ منورہ پہنچ کر میں نے سب سے پہلے مہتمم صاحب کو ایک خط لکھا، جس میں اس تنخواہ کا کوئی ذکر نہیں کیا، البتہ یہ لکھا کہ ''میرا ارادہ ایک عرصہ سے مدرسہ کے ان حقوق کے معاوضہ میں جو مجھ پر ہیں مدرسہ میں ایک بڑی رقم پیش کرنے کا ہو رہا ہے مگر آپ کو معلوم ہے کہ مجھ سے جمع ہونا ناممکن ہے، اس لیے بالفعل میری طرف سے صرف ایک ہزار روپے کا وعدہ اس طرح تحریر فرمالیں کہ اسی ماہ جمادی الاولیٰ سے مبلغ پانچ روپے ماہانہ میری واپسی تک میرے کارکن مولوی نصیر الدین سے اور بعد واپسی کے خود مجھ سے وصول فرماتے رہیں، اگر اس کے پورا ہو جانے سے قبل میرا انتقال ہو جائے تو اس وقت جس قدر رقم باقی ہو وہ میری وصیت ہے جو کہ متروکہ سے وصول کی جائے۔'' الخ محررہ از مدینہ طیبہ۔ ۵ جمادی الاولیٰ ۴۵ھ۔

اللہ کے فضل سے جب یہ رقم ادا ہوگئی تو مجھے رائپوری جذبہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے پہلے زمانہ میں جو تنخواہیں لی ہیں وہ بھی واپس کردی جائیں۔ اللہ نے وہ بھی واپس کرادیں۔

لِلّٰہِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّۃُ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ کُلُّہٗ،
اَللّٰھُمَّ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ، اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ.

ذیقعدہ ۴۵ھ میں جب اس ناکارہ کی بذل کے اختتام کے بعد واپسی ہونے لگی تو حضرت مولانا سید احمد صاحب قدس سرہٗ بانی مدرسہ شرعیہ نے میرے وہاں مستقل قیام پر بہت ہی اصرار کیا اور میرے حضرت قدس سرہٗ سے بار بار درخواست کی ''مدرسہ شرعیہ کی صدر مدرسی کے لیے اس کو قیام کی اجازت دے دیں۔'' مگر میرے حضرت قدس سرہٗ نے یہ فرمایا کہ'' آپ کا مدرسہ ابھی ابتدائی ہے اور مظاہرِ علوم عروج پر ہے، اس کے لیے اس کے واپس جانے کی زیادہ ضرورت ہے، میری غیبت میں اس کا قیام وہاں ضروری ہے، اس کے نہ جانے سے مدرسہ کو نقصان کا اندیشہ ہے۔'' مولانا سید احمد صاحب کا ارشاد تھا جس کو انہوں نے حضرت سے بھی کئی بار عرض کیا کہ میں مولوی الیاس کے پاس اس کے بیوی بچوں کا کرایہ بھیج دوں وہ پہنچا دیں گے۔ مگر حضرت نے قبول نہ کیا اور میری واپسی کے وقت حضرت نے جب عارضی غیبت کے انتظامات کو مکمل فرمایا تو بڑی لمبی تحریر مدرسہ کے انتظامات کے سلسلہ میں حضرت مولانا سید احمد صاحب سے لکھوائی، اس میں سیہ کار کے متعلق دو نمبر لکھوائے۔

بندہ کی مشیر ناظم کی تجویز:

ایک یہ کہ زکریا کو حدیث سے جتنی مناسبت ہے، میں اسے خوب جانتا ہوں، اس لیے اس کو مدرسہ کا شیخ الحدیث تجویز کرتا ہوں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ صدر مدرس حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب ایک سال پہلے ہو چکے تھے، ان کو اس عہدہ سے ہٹانے کی کوئی وجہ نہیں تھی، اس عہدہ کی ابتداء اس سیہ کار سے ہوئی، ورنہ اس سے پہلے مدارس میں مدرسِ اول اور شیخ الحدیث ایک ہی عہدہ تھا۔ حضرت اقدس مدنی قدس سرہٗ نے کئی مرتبہ تفریحاً ومزاحاً یہ ارشاد بھی فرمایا کہ'' یہ نیا عہدہ آپ کی خاطر تصنیف کیا گیا ہے۔'' مگر پھر دارالعلوم کو بھی ایسی ہی مجبوری کی وجہ سے شیخ الحدیث اور مدرسِ اول دو عہدے بنانے پڑے۔ حضرت قدس سرہٗ کی یہ تحریر جب یہاں پہنچی اور حضرات سرپرستان کے یہاں منظوری کے لیے گئی تو اور تو کون انکار کرتا حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اس پر ایک اشکال فرمایا کہ'' ان سے پہلے اکابر مدرسین مولانا ثابت علی صاحب، مولانا عبداللطیف صاحب وغیرہ موجود ہیں، ان کے لیے یہ تفوق موجبِ تکدر نہ ہو، اس کو غور کر لیا جائے۔'' حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت تھانوی کا یہ اشکال میرے حضرت کو لکھا تو میرے حضرت قدس سرہٗ نے جواب میں لکھا کہ'' اگر اہلِ مدرسہ کو من حیث المدرسہ مدرسہ کی طرف سے اس میں کوئی تردد ہے تو میں اپنی طرف سے یہ خطاب اس کو دیتا ہوں۔'' حضرت قدس سرہٗ کی برکت سے اس نے ایسی شہرت پائی کہ نام سے زیادہ مشہور ہو گیا۔

انگریزوں کے زمانے میں حضرت قدس سرہٗ کے تار بہت کثرت سے کراچی، لکھنؤ، کلکتہ وغیرہ

سے آتے تھے، ان میں پتہ صرف ''شیخ الحدیث صاحب سہارنپور رحمہ اللہ تعالیٰ'' ہوتا، مدرسہ کا نام بھی نہیں ہوتا تھا، مگر پہنچ جاتے تھے۔

دوسرا نمبر میرے حضرت قدس سرہٗ نے اس سیہ کار کے متعلق ''نائب ناظم مدرسہ'' کا لکھا۔ اس عہدے سے مجھے اس سے بھی زیادہ وحشت ہوئی جتنی ایک سال پہلے صدر مدرسی کے عہدے سے ہوئی تھی، میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ اس انتظامی جھگڑے میں پڑ کر پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ تو جاتا رہے گا، ناظم صاحب کے مزاج میں پھیلاؤ بہت ہے، یہ ساری مصیبت مجھے بھگتنی پڑے گی۔ یہ تحریر حضرت مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے قلم کی تھی، میں نے حضرت مرحوم سے بہت ہی خوشامد لجاجت سے عرض کی کہ ''اس مصیبت کو میرے سے ہٹائیے۔'' انہوں نے کہا، حضرت کی تجویز ہے تمہیں خوش ہونا چاہیے۔'' چنانچہ میں نے بڑی خوشامد کی اور یاد پڑتا ہے کہ پاؤں بھی پکڑے اور آبدیدہ ہو کر ان سے درخواست کی، انہوں نے میری حالت دیکھ کر حضرت سے عرض کیا کہ حضرت میں نے اس تحریر کا زکریا سے ذکر نہیں کیا، مگر معلوم نہیں کہ اس نے کہاں سے دیکھ لی، وہ تو اس سے بہت ہی گھبرا رہا ہے اور رنجیدہ ہے، یوں کہتا ہے کہ میرا علمی حرج بہت ہو جائے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ ''مجھے اس پر اطمینان ہے کہ وہ اپنا علمی حرج بالکل نہیں کرے گا، اس نے تو مجھے بھی کبھی رسید نہیں دی، وہ ان موجودہ سرپرستوں کے بس کا نہیں۔ یہ سرپرست اس سے کوئی ایسا کام نہیں لے سکتے جس میں اس کا حرج ہو۔''

حضرت مولانا سید احمد صاحب سے مایوس ہو کر میں نے حضرت مولانا عبد القادر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاؤں پکڑے کہ حضرت مولانا کو بھی حضرت قدس سرہٗ نے اپنی روانگی حجاز ۴۴ھ میں مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور شیخ رشید احمد صاحب کے ساتھ مدرسہ کا سرپرست بنایا تھا۔ میں نے حضرت رائپوری سے عرض کیا کہ ''وہ تحریر آپ کو بحیثیت سرپرست ضرور دکھائی جائے گی، اللہ کے واسطے اس کو منظور نہ کریں''۔ حضرت رائپوری نے فرمایا ''بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ حضرت ایک تحریر لکھیں اور میں اس پر انکار کروں۔'' چنانچہ جب وہ تحریر مکمل ہو گئی تو میرے حضرت قدس سرہٗ نے حضرت رائپوری کو بحیثیت سرپرست وہ تحریر دکھلائی اور اس کی تاکید فرمائی کہ ''کوئی اشکال ہو تو ضرور کہیں، میرے لکھنے کی وجہ سے سکوت نہ فرماویں۔'' اور میں اس وقت، خوب یاد ہے، بڑی لجاجت سے اس دعا میں مشغول تھا کہ ''یا اللہ! یہ مصیبت مجھ سے ہٹا لے۔'' جب حضرت رائپوری اسے ملاحظہ فرما چکے اور حضرت قدس سرہٗ نے پوچھا ''کوئی اشکال تو نہیں'' تو حضرت رائپوری نے اپنی عادت کے موافق اول تو بڑی توبہ کی ''حضرت توبہ توبہ! حضرت کی تحریر میں کیا اشکال ہوگا؟'' مگر حضرت قدس سرہٗ کو بھی حضرت رائپوری کی عادت تواضع کی معلوم تھی،

اس لیے کئی دفعہ اصرار فرمایا کہ ''کوئی اشکال ہو تو فرمادیں۔'' اس پر حضرت نے پھر یہ کہہ دیا کہ ''حضرت بڑی بے ادبی ہے، گستاخی ہے، ایک خلجان توبہ توبہ یہ پیش آیا کہ مولوی زکریا کے متعلق حضرت نے دونمبر لکھے پہلے نمبر میں تو ان کی حدیث دانی کو اور علو شان کو ایسا بڑھایا کہ مدرسہ میں کوئی ان جیسا حدیث داں نہیں ہے اور دوسرے نمبر میں حضرت نے ان کو نائب لکھا۔'' حضرت نے بے تکلف کاغذ اپنے دستِ مبارک میں لے کر ''نائب'' کے لفظ پر اپنے دستِ مبارک سے قلم پھیر کر اس کے اوپر ''مشیر'' کا لفظ لکھ دیا۔ ''مشیرِ ناظم'' کا عہدہ مدرسہ میں پہلے بھی تھا کہ کئی سال قبل حضرتِ اقدس تھانوی قدس سرہٗ نے سرپرستی کی ذمہ داریوں سے معذوری ظاہر کر کے سرپرستی سے استعفاء دیا تھا۔ اس وقت میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ اور حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کے والد مولانا جمعیت علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ دونوں مشیرِ ناظم تجویز کیے گئے تھے۔

یہاں واپسی کے دو تین سال بعد حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، شیخ رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا سر رحیم بخش صاحب تینوں کا مشورہ بعض امور کی بناء پر یہ ہوا کہ نظامت کے دو حصے کیے جائیں، ایک ناظمِ تعلیمات اور دوسرا ناظمِ مالیات۔ ناظمِ مالیات کا عہدہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کے سپرد رہے اور ناظمِ تعلیمات کا عہدہ اس ناکارہ کی [illegible]ف منتقل کیا جائے۔ اس تجویز کے وقت میں بھی اس ناکارہ نے بہت ہی شدت سے خلاف کیا، [illegible] ان تینوں بزرگوں نے میرے شدید اختلاف کے باوجود یہ تجویز مدرسہ میں پاس کر کے ''احکامِ [illegible]ستاں'' میں لکھ کر بقیہ حضرات سرپرستان سے بھی منظوری کرالی۔ ان کی تشریف بری کے بعد [illegible]ں نے الحاج شیخ رشید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو ایک زوردار خط لکھا، جس میں میں نے لکھا کہ [illegible]رے اور ناظم صاحب کے تعلقات اس قدر مضبوط اور بہتر ہیں کہ اگر ایک جان دو قالب کہا [illegible]ئے تو بے محل نہ ہوگا۔ ناظم صاحب میرا اس قدر لحاظ فرماتے ہیں کہ گویا مجھے بڑا بنا رکھا ہے اور وہ میرے استاذ ہیں، اس تجویز کے بعد تعلقات میں وہ خوشگواری ہرگز نہیں رہ سکتی جو پہلے تھی، یا تو اس تجویز کو منسوخ فرمادیں، ورنہ انشاء اللہ آپ حضرات تلاش کرتے پھریں گے کہ زکریا نامی بھی کوئی شخص مظاہر علوم میں کبھی تھا۔'' شیخ صاحب کو اللہ جزائے خیر عطا فرمائے، بہت ہی بلند درجے عطا فرماوے، بہت ہی مدبر، دوراندیش، مدرسہ کے معاملات میں اپنے جذبات کو ہمیشہ پسِ پشت ڈالا۔ مرحوم کے جملہ معترضہ کے بیسویں واقعات اس کے شاہد عدل ہیں اور بہت ہی لطف آمیز۔ جملہ معترضہ کے طور پر ایک واقعہ اس وقت شیخ صاحب کی علوِ شان، مدرسہ کی مصالح کو اپنی مصالح پر مقدم کرنے کا لکھواتا ہوں۔

سہارنپور میں جمعیۃ العلماء کا مشہور و معروف اجلاس ۴۵ء ہونے والا تھا، تین دن کا اجلاس تھا۔

میں نے حضرت ناظم صاحب سے کہا کہ جمعیۃ کے اجلاس کے دنوں میں مدرسہ میں تین دن کی چھٹی ہوگی۔ حضرت ناظم نے غصے سے فرمایا ''یہ کیسے ہو سکے گا؟ آج جمعیۃ کے واسطے چھٹی کر دیں، کل کو لیگ والے کریں گے اس میں بھی چھٹی کرنی پڑے گی، پھر احرار، کانگریس، یہ تو روز کی بھرمار ہے اور مدرسہ کا تعامل بھی ان اجلاسوں میں چھٹی کا نہیں، یہ تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔'' بڑی مدلل تقریر فرمائی۔ میں نے ساری سن کر پھر کہہ دیا کہ ''جمعیۃ کے اجلاس کے درمیان مدرسہ میں چھٹی ہوگی۔'' ناظم صاحب کو غصہ آ گیا، مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے کہا، وہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے اجل خلفاء میں تھے، انہوں نے اور بھی زیادہ شدت سے انکار کیا کہ ''چھٹی ہرگز نہیں ہوگی۔'' اتفاق سے شیخ رشید احمد صاحب آ گئے، حضرت ناظم صاحب نے بہت تعجب سے میری شکایت شیخ جی سے کی اور کہا کہ یہ تو روز کے قصے ہیں، جو مضمون اوپر گزرا۔

شیخ صاحب کو اللہ بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، بڑے ہی سمجھ دار تھے اور اس سے بڑھ کر کمال یہ تھا کہ مدرسہ کی مصالح اپنے جذبات پر ہمیشہ مقدم سمجھتے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ ''چھٹی ضرور کرنی ہے اور ہم سے اجازت ہرگز نہ لینا، ہم لوگ اس چھٹی کی بہت مخالفت کریں گے، بالخصوص حضرت تھانوی کے انکار کے بعد آپ کو چھٹی کرنی مشکل ہو جائے گی اور چھٹی کرنی ضروری ہے، بہت سے بہت یہ ہوگا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات پیش آئی تو میں اعتراض کروں گا کہ آپ نے ہماری بغیر منظوری کیسے کر دی؟ آپ لکھ دیجئے گا کہ عین وقت پر شیخ الحدیث صاحب وغیرہ کی رائے یہی ہوئی، اس کی گنجائش نہ تھی کہ سرپرستان سے اجازت لی جائے، لہٰذا معاف فرماویں، آیندہ لحاظ رکھا جائے گا۔'' ناظم صاحب اور شیخ صاحب کی گفتگو میرے سامنے نہیں ہوئی لیکن اول شیخ جی مرحوم نے اور ان کے جانے کے بعد ناظم صاحب نے ایک ہی مضمون سنایا اور ناظم صاحب نے مجھ سے تعجب سے فرمایا کہ ''شیخ جی تو دلی کی لیگ کے صدر ہیں، مسٹر جناح کے بڑے دوست ہیں وہ بھی جمعیت کی چھٹی کی تائید کر گئے ہیں۔'' میں نے عرض کیا ''حضرت بڑی کھلی ہوئی بات ہے، دیوبند میں ایک ہفتے کی چھٹی ہے اور جلسہ لیگ، کانگریس کا نہیں جمعیۃ العلماء کا ہے، ایسی حالت میں مظاہر علوم سبق پڑھائیں، بہت مشکل ہوگا۔'' اس کے علاوہ شیخ صاحب کے اپنے جذبات کے خلاف مدرسہ کے مصالح کو مقدم رکھنے کے واقعات بہت ہیں۔

میرے اس خط پر جس کا نظامت کے دو ٹکڑوں کے متعلق اوپر ذکر آیا شیخ صاحب کو (اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرماوے) بہت غصہ آیا ان کا والا نامہ آیا کہ حکم نامہ پہنچا، ہم تو یہ سمجھے کہ سرپرست بھی آپ ہی ہیں ناظم بھی آپ ہی ہیں، جس سے جو کام لینا ہوا، حکم نامہ لکھ دیا، آپ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی اور میں نے مولانا عاشق الٰہی صاحب اور سر رحیم بخش صاحب کو لکھ دیا کہ یہ

تجویز بعض مصالح کی بناء پر ابھی قابلِ عمل نہیں، آیندہ اجتماع پر اس میں دوبارہ غور ہو جائے گا۔''

ان سب باتوں کے باوجود معلوم نہیں اس سیہ کار کے متعلق بعض احمقوں کو یہ خیال کیوں ہوتا تھا کہ میں نظامت پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں۔

ایک بات ضرور تھی کہ مدرسہ میں خواص اور صاحبزادوں کے خلاف میرا ہاتھ زیادہ چلتا تھا اور اس میں بھی حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب، قاری سعید صاحب مرحوم مجھ کو زیادہ ابھارتے تھے، بلکہ تقریباً مجبور کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک بہت بڑے خاص بلکہ اخص الخواص نے مدرسہ میں ایک درخواست دی کہ مجھے فلاں حجرہ تنہا کو دے دیا جائے اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے ان کی خصوصیات کی بناء پر اس پر سفارش بھی لکھ دی، لیکن میرے پاس فوراً خود ہی آئے اور فرمایا کہ ''فلاں نے حجرہ کی درخواست دی اور میں نے سفارش بھی کر دی، مگر تنہا حجرہ مانگنے والے کے لیے نہایت مضر ہے ہی، مدرسہ کے لیے بھی مضر ہے۔'' میں نے کہا ''پھر آپ نے مضر سمجھنے کے باوجود سفارش کیوں کی؟'' فرمایا کہ ''مجبوری تھی، مگر آخر منظوری تمہاری ہی ہوگی، اس لیے جلدی اطلاع کرنے کے لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔'' حضرت ناظم صاحب کی خدمت میں جب وہ درخواست مع صدر مدرس صاحب کی سفارش کے پہنچی تو انہوں نے لکھ دیا کہ ''اگر شیخ الحدیث صاحب منظور کر لیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔'' میں نے انکار لکھ دیا۔ درخواست دینے والے کو اس ناکارہ پر جتنا بھی غصہ آئے وہ معذور ہے کہ صدر مدرس صاحب نے سفارش لکھ دی، ناظم صاحب نے منظوری دے دی اور میں نے انکار لکھ دیا۔

اس قسم کے قصے تقریباً روزانہ ہی پیش آتے تھے، اس وجہ سے خواص اکثر مجھ سے خفا رہتے اور ان کی خفگی بالکل برمحل تھی۔ حضرت ناظم صاحب کے خواص، مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے خواص اور دونوں سے بڑھ کر میرے حضرت قدس سرہٗ کے خواص، ان لوگوں کے خلاف میرا ہی ہاتھ زیادہ چلا کرتا تھا، اس لیے ان خواص کا مجھ سے ناراض رہنا یا ہونا، بالکل برمحل تھا۔

اخبار مدینہ کا غلط الزام:

۵۷ھ میں اخبار مدینہ کے ایڈیٹر بزمی صاحب مرحوم کے ایک عزیز مدرسہ میں پڑھتے تھے، انہوں نے چند خواص کی جن کی ناراضگی مجھ سے برمحل اور فطری تھی، میرے خلاف شکایت لکھ کر اور لکھوا کر اخبار مدینہ کے دفتر میں بھیج دی، ایڈیٹر مرحوم کو کیا خبر؟ انہوں نے مختلف خطوط ایک شخص کے خلاف شکایات کے دیکھے تو انہوں نے میرے خلاف اخبار مدینہ ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ مطابق ۹ جون ۳۸ء میں ایک مضمون بہت سخت لکھ دیا۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ نے جب اس کو پڑھا تو ایڈیٹر صاحب کو سخت خط لکھا کہ ''شیخ الحدیث صاحب کے خلاف آپ نے جو مضمون لکھا ہے، میں

ان سے اس وقت سے واقف ہوں جب کہ ان کی عمر بارہ برس کی تھی اور اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا، ان کے خلاف جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ بالکل غلط ہیں۔'' حضرت کے ارشاد میں اس واقعے کی طرف اشارہ ہے، جب کہ ۱۳۲۷ھ میں حضرت قدس سرہٗ کا دو ماہ مسلسل گنگوہ میں قیام رہا، اس وقت میری عمر بارہ برس کی تھی اور وہی میرا ابتدائی تعارف حضرت مدنی قدس سرہٗ سے ہے، اس کی تفصیل شاید کہیں آ جائے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رئیس الاحرار نے مجھ سے بیان کیا کہ میں لاہور میں ہوٹل میں چائے پی رہا تھا، جب میں نے مدینہ کا یہ مضمون دیکھا میں نے ہوٹل ہی میں بیٹھے ہوئے ایک کارڈ ایڈیٹر صاحب کو لکھا کہ ''میں شیخ الحدیث صاحب سے اس وقت سے واقف ہوں جب ان کی طالب علمی کا آخری دور تھا، میں اس وقت سے انتہائی واقفیت کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ اطلاعات جو آپ کو دی گئی ہیں انتہائی غلط ہیں۔'' مولانا الحاج مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند اور حضرت شاہ یٰسین صاحب نگینوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے خطوط کا تو مجھے علم ہے۔ سنا ہے کہ لکھے گئے بہت سے، لیکن ایڈیٹر مرحوم نے کسی اور کے خط کے جواب کی تو ضرورت نہیں سمجھی البتہ حضرت مدنی قدس سرہٗ کو لکھا کہ میرے پاس اس کے خلاف شکایات کے خطوط کا انبار ہے آپ جب فرمائیں میں لے کر حاضر ہو جاؤں۔ حضرت نے لکھا ''یہاں لانے کی ضرورت نہیں، فلاں تاریخ میری خالی ہے، میں اس تاریخ پر سہارنپور پہنچ جاؤں گا، آپ بھی مولانا مجید حسن صاحب مالک خبار مدینہ کو لے کر سہارنپور پہنچ جائیں۔'' اور ایک کارڈ سے حضرت نے مجھے بھی اطلاع فرمادی کہ ''میں ان لوگوں کے ساتھ فلاں تاریخ کو ان شکایات کی تحقیق کرنے آؤں گا جو فلاں اخبار میں چھاپی گئی ہیں۔'' میں نے اپنے سرپرستان کو بھی اس کی اطلاع کردی، حضرت میرٹھی کو تو ناگوار ہوا کہ سرپرستان سے مشورے کے بعد تاریخ مقرر ہونا چاہیے، لیکن شیخ رشید احمد صاحب کو اللہ بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے انہوں نے لکھا کہ شوق سے آئیں میں بھی اس تاریخ پر سہارنپور پہنچ جاؤں گا۔ معلوم نہیں رئیس الاحرار صاحب کو کس طرح اطلاع ہوئی کہ وہ بھی تاریخ سے ایک دن پہلے پہنچ گئے۔

۱۷ جولائی ۱۹۳۸ء مطابق ۱۸ جمادی الاول ۱۳۵۷ھ کو یہ حضرات تشریف لے آئے اور صبح کے کھانے کے بعد سے لے کر دوپہر کو لیٹے بھی نہیں، رات کے بارہ بجے تک شاکی لوگوں کو ایک ایک کو بلایا جاتا اور ان کے بیانات قلمبند کیے جاتے تھے، مغرب کے بعد تک ان کا سلسلہ رہا۔ اس ناکارہ کے خلاف تو ایک شکایت سب کی مشترک تھی کہ نظامت کو مفلوج کر رکھا ہے، اس پر قبضہ کرلیا ہے، ناظم صاحب ایک عضو معطل بن گئے ہیں لیکن جب وہ اس کے کچھ جزئیات اور ثبوت مانگتے تو شاکی چپ ہو جاتا۔ ایڈیٹر صاحب کہتے کہ ''حضرت سے مرعوب ہیں۔'' حضرت فرماتے

''پھر تحقیق کی کیا صورت؟'' بعض ملازمین اور بعض مدرسین کے متعلق بھی کچھ شکایات انہوں نے کیں جس کے متعلق ان سے دریافت کیا گیا، مجھ سے کوئی چیز دریافت نہیں کی، البتہ حضرت ناظم صاحب قدس سرۂ سے میرے متعلق سوال کیا گیا اور حضرت مدنی قدس سرۂ نے بلند آواز سے جس کو دور والوں نے بھی سنا، یہ فرمایا ''یہ آپ کے شاگرد یہ کہتے ہیں کہ مولوی زکریا نے آپ کو بالکل مفلوج کر رکھا ہے، آپ کو عضو معطل بنا دیا ہے۔'' حضرت ناظم صاحب قدس سرۂ نے فرمایا ''بالکل غلط، بے بنیاد، یہ شیخ الحدیث صاحب میرے دستِ راست، ان کے مشوروں اور رہنمائی سے مجھے بڑی سہولتیں ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو مجھے بڑی دقت ہو اور اگر یہ نظامت قبول کریں تو میں بڑی خوشی سے ان کے حق میں دستبردار ہوں۔'' حضرت مدنی قدس سرۂ نے ارشاد فرمایا ''اسے کہیں مدعی سست گواہ چست۔'' اس کے بعد جو فیصلہ لکھا وہ یہ تھا:

''مدینہ'' مورخہ ۹ جون ۳۸ء میں مدرسہ مظاہر علوم کے متعلق شکایات ونقائص کی جو تفصیل شائع ہوئی تھی ان کی ہم نے آج تحقیقات کی اور ہم اس امر کا اعتراف کرنے میں مسرت محسوس کرتے ہیں کہ یہ شکایتیں بے اصل اور بے بنیاد ہیں، مدرسہ کے اربابِ اہتمام کے تمام کاموں میں نیک نیتی اور دیانت داری بدرجہ اتم پائی جاتی ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ یہ حضرات مدرسہ کی اصلاح اور درستگی کے کاموں کی طرف ہمیشہ متوجہ رہیں گے اور جو چیزیں اصلاح طلب ہوں گی ان کی اصلاح میں کامل انہماک اور شفقت کا ثبوت دیں گے۔

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ	ابوسعید بزمی، ایڈیٹر مدینہ
حبیب الرحمٰن لدھیانوی، صدر احرار	محمد مجید حسن، مالک اخبار مدینہ
سرپرست مدرسہ	رشید احمد عفی عنہ

یہ تحریر ایڈیٹر ہی کے قلم کی تھی، آخر الفاظ بھی اس کے اصرار پر لکھے گئے، ورنہ حضرت قدس سرۂ بعض الفاظ کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن ایڈیٹر کو اس پر حیرت اور غصہ اور قلق تھا کہ اس ناکارہ کے خلاف کوئی شکایت، جو خطوط کے انبار میں تھی نہ مل سکی اور مجھے اس کی خوشی تھی کہ میرے حضرت قدس سرۂ نور اللہ مرقدہٗ کے خلاف ۱۳۲۰ھ میں جو طوفان اٹھا اس سال کی روئدادوں میں اس کا ذکر بھی ہے، وہ بھی ممبروں کے خلاف مدرسہ پر جبر وقبضہ کا تھا۔ ۱۳۰۸ھ سے لے کر ۱۳۲۰ھ تک ایک ہنگامہ مدرسہ کے خلاف مدرسہ کے اندر اور باہر قائم رہا جو اس وقت کی روائدادوں سے کچھ نہ کچھ مترشح ہوتا ہے، اگرچہ حضرت قدس سرۂ ۱۳۰۸ھ میں مدرسہ میں نہیں تھے، بلکہ ۱۳۱۴ھ میں آئے تھے، مگر اس فتنہ کی ابتداء ۱۳۰۸ھ سے ہی شروع ہوگئی تھی۔

۱۳۲۰ھ سے حضرت قدس سرۂ کی برکات سے جو مدرسہ میں روحانی اور مادی ہر نوع کی ترقیات

ہوئی ہیں وہ آج دنیا کے سامنے ہیں۔ اللہ کی شان، اللہ کے کاموں کی حکمت کون پہچان سکتا ہے، شاید: "الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ لَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ" کا مظہر ہو۔

دارالعلوم دیوبند میں بھی ۱۳۰۴ھ سے لے کر ۱۳۱۸ھ تک اندرونی، بیرونی خلفشار کثرت سے ہوتا رہا، جس کی طرف اجمالاً حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے نقشِ حیات ص ۱۲۳ میں اشارہ بھی فرمایا ہے اور تذکرۃ الخلیل (ص ۱۷۳ طبع جدید) میں بھی اس کا کچھ مختصر حال ہے۔ اسی زمانے میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ اور نواب چھتاری صاحب کو خلفشار مٹانے کے واسطے دیوبند تشریف لانا پڑا۔ اس زمانے کا ایک مکتوب حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا اپنے دستِ مبارک کا لکھا ہوا، جس کا فوٹو تذکرۃ الرشید جلد دوم کے ختم پر چھپا ہوا ہے، جس کی عبارت یہ ہے:

از بندہ رشید احمد عفی عنہ

برادرانِ مکرمانِ بندہ، مولوی محمود حسن و مولوی خلیل احمد صاحب مد فیوضہما!

بعد سلام مسنون، مطالعہ فرمایند

آپ دونوں کے چند خطوط پہنچے، جس سے وہاں کا حال معلوم ہوتا رہا۔ آج مولوی خلیل احمد صاحب کا خط آیا، جس سے پریشانی مدرسین کی دریافت ہوئی، لہٰذا یہ تحریر ضروری ہوئی۔

میرے پیارے دوستو! تم کو کیوں اضطراب و پریشانی ہے؟ تم تو "وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ" پر قانع رہو اور مدرسہ سے آپ کو فقط اتنا تعلق ہے کہ درس دیئے جاؤ۔ اگر مدرسہ بند حق تعالیٰ کرادے گا تم اپنے گھر بیٹھ رہنا، اگر مفتوح رہا درس میں مشغول رہنا۔ جو تم سے درس کرانا اہلِ شہر کو منظور نہ ہوگا تو دوسرا باب مفتوح ہو جائے گا، تم کس واسطے پریشان ہوتے ہو، خبر بھی مت ہو کہ کیا ہو رہا ہے، اپنا کام کیے جاؤ۔ تمہارے برابر تو کسی کے دست و پا نہیں چلتے، تم کیوں بے دست و پا اپنے آپ کو لکھتے ہو؟ جس کام کے تم ہو اس میں تکرار نہیں۔ اب فقط نزاع یہی ہے کہ اہلِ شوریٰ کی زیادت ہو، تمہارا کیا حرج ہے، تم اپنا کام کرو۔ حاجی صاحب مصلحت کا کام کرتے ہیں وہ اپنی تدبیر میں رہیں۔ خواہ کچھ ہو ہماری تمہاری مرضی کے موافق ہو یا مخالف اور اہلِ شوریٰ خود سب اختیار حاجی صاحب کو دے کر مطمئن ہو گئے، تم پر کیا بار ہے؟ پس تم جیسے لوگوں سے تردّد کا ہونا بے موقع ہے، تم کسی امر میں لب کشا مت ہو، کوئی پوچھے تو جواب دو درس کے بارے میں ہم سے پوچھو جو ہمارا کام ہے، انتظام وغیرہ کو نہ ہم جانیں نہ ہم دخل دیں اور اندیشۂ بدمعاشاں بھی کچھ مت کرو۔ شعر حضرت شیخ المشائخ قدس سرہٗ کو مدِ نظر رکھو:

قصد ظالم بسوئے کشتن ما دلِ مظلومِ مابسوائے خدا
اوودریں فکرتا بماچہ کند؟ مادریں فکر تا خدا چہ کند؟

اے عزیزان! بروزاول مقدر ہوچکا ہے، ذرہ ذرہ جو واقع ہوگا۔ مدرسہ کے امور میں بھی وہی واقع ہوگا اور ہوکر رہے گا، خواہ کوئی دفع کرے یاواقع کرے، پھرتم کیوں سرگشتہ ہوتے ہو؟

ہرچہ از محبوب رسد، شیریں بود

ہم کون ہیں؟ بے اختیارِ محض ہیں، اگر چہ بظاہر مختار ہیں، ہم پر جوگزرے گا وہ عین لطف ہوگا اور جو عالم میں صادر ہوگا وہ عین مصلحت ہوگا، خواہ خرابیٔ مدرسہ ہو یا بقا، خواہ عزت ونصب ہمارا تمہارا ہو، خواہ ذلت وعزل، تم یہ سب وقائع بازیگر کے سانگ سمجھ کر اپنے درس کے شغل میں بسر کرو، ایں وآں کوزید وعمر پر چھوڑو۔

ہر کس بخیال خویش خبطے دارد

نہ کوئی مفسد کا کچھ کرسکے نہ کوئی مصلح کرسکتا ہے، سب فاعلِ مختار کرتا ہے۔

"وما تشآء ون إلا أن يشاء الله"

من از بیگانگان ہرگز نہ نالم کہ بامن آنچہ کرد آں آشنا کرد

"وهو ارحم الراحمين" بس تمام ہوا قصہ وہاں کی خبر کا مشتاق ہوں، بشر ہوں، اپنے دوستوں کا دعاگو، خیر طلب ہوں، تم کو کوئی گزند نہیں مطمئن رہو، نہ مدرسہ کہیں جارہا ہے۔ ہر شخص کو اپنے اپنے خیال پر نازاں جان کر کالائے بدبریش خاوند کرو اور دم بخود ہوکر می نوش وے بنوش وچیز سے مخروش۔ فقط

سب عزیزوں کو بعد سلام مسنون یہ ہی مضمون جان بخش بعد سلام مسنون فرمادیں، جو دوستاں اہل تدبیر ہیں۔ ان کا شکر یہ ادا کرتا ہوں۔ مضمون شکرو رضاان سے کہہ دیں اور جس کو چاہو سلام کہہ دینا۔
یہ وقت اور یہ خروش اہلِ فساد عین مصلحت ہے اس کا جس قدر غلغلہ ہوگا اسی قدر مفید ہوگا انجام خیر ہی خیر۔ واصب ووائم رہے گا۔

(......رشید احمد......)

جب مظاہر کا یہ ہنگامہ ختم ہوگیا تو ناظم صاحب اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن اور اکابر مدرسین کی خاص طور سے یہ رائے ہوئی کہ جن لوگوں نے جھوٹے الزامات مدرسہ پر لگائے اور وہ اب تک گمنام ہی چل رہے تھے اب کھل کر سامنے آگئے، ان کا اخراج اب بہت ضروری ہے۔ تین دن تک ان حضرات کا ان کے اخراج پر اصرار تھا اور یہ ناکارہ شدت سے مخالفت کررہا تھا۔ حضرت ناظم صاحب اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب رحمہما اللہ نے یہ کہہ کر میری مخالفت کو نظر انداز کردیا کہ چونکہ

اس میں ان کی ذات کا معاملہ ہے اس لیے ان کی رائے اس میں معتبر نہیں، ان میں ایک صاحب ایسے تھے جن کے بڑوں سے حضرت ناظم صاحب کے بڑے تعلقات تھے اور وہ صاحب تھے جن کی وجہ سے حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کو دقت اٹھانا پڑتی۔ اس لیے میں بار بار عرض کرتا رہا کہ حضرت میں اپنی وجہ سے نہیں عرض کر رہا، آپ حضرات کی وجہ سے عرض کر رہا ہوں کہ آپ حضرات کو بڑی دقت اٹھانی پڑے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اخراج کے دوسرے ہی دن ناظم صاحب کی خدمت میں وہ صاحب آئے جن کے متعلق میں نے کہا تھا اور ناظم صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے بہت صفائی سے بلا جھجک ان سے کہہ دیا کہ شیخ الحدیث صاحب سے بات کر لیجئے۔ وہ صاحب میرے پاس آئے، میں ان کی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گیا اور سچ یہ ہے کہ اللہ مجھے معاف فرمائے کہ اس وقت ناظم صاحب پر بڑا غصہ آیا۔ مگر چونکہ یہ تقریباً روزمرہ کا قصہ ہوگیا تھا کہ حضرت ناظم صاحب، جھگڑوں میں ہمیشہ اس سیہ کار کو آگے کر دیا کرتے تھے، یہی وہ چیز تھی جس کی وجہ سے حضرت ناظم صاحب نے حضرت مدنی قدس سرہٗ کے سامنے یہ الفاظ کہے تھے کہ "اگر یہ نہ ہوں تو مجھے بڑی دقت ہو" یہ بالکل صحیح کہا تھا۔ بہت سے مواقع پر اس کی نوبت آ چکی تھی کہ میری رائے کے خلاف کوئی بات اکابر مدرسہ نے تجویز کر دی اور میں سختی سے عرض کرتا رہا کہ فلاں مشکل پیش آئے گی اور جب وہ مشکل پیش آتی تو یہ سب حضرات اسی سیہ کار کے سر تھوپ دیتے، کئی اہم واقعات اس نوع کے بھی موقع ہوا تو لکھواؤں گا۔

سہارنپور کی جامع مسجد میں لیگ کا جلسہ، پٹنہ میں لیگ کا اجلاس وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے مدرسہ کے موجودہ اکابر خوب واقف ہیں۔ اگرچہ نئی امت کے لیے یہ بالکل غیر معلوم۔ میں نے اشارہ لکھ دیا، نہ معلوم لکھوانے کی نوبت آئے یا نہ آئے۔

مگر یہ واقعہ ابھی تک بہت سے دوستوں کو معلوم ہے، اسی وجہ سے حضرت مولانا عبداللطیف صاحب قدس سرہٗ ناظم مدرسہ کا اس سیہ کار کے متعلق مشہور مقولہ تھا، وہ پچاس دفعہ کہا ہوگا کہ "اس کی بات بے سمجھے مان لیا کرو، چھ مہینہ پہلے کی کہتا ہے"۔ میرے حضرت اقدس رائے پوری کا بھی اس قسم کا مقولہ میرے سلسلے میں بہت مشہور ہے۔

بہر حال جب وہ صاحب جن کے متعلق طلبہ کے اخراج کے سلسلے میں میں نے حضرت ناظم صاحب سے کہا تھا کہ وہ سب سے پہلے آپ کے پاس آئیں گے، وہ میرے پاس تشریف لائے اور آتے ہی مجھ سے یہ کہا کہ ان کے قصور میں تو کوئی انکار نہیں، لیکن اخراج میں نظر ثانی کی کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟ میں نے ان سے کہا کہ "یہ اجتماعی مشورے سے طے ہوا ہے، اس میں انفرادی رائے نہ یہ ناکارہ کوئی دے سکتا ہے، نہ حضرت ناظم صاحب، آپ ایک درخواست حضرت ناظم

صاحب کی خدمت میں پیش کر دیجئے، دوبارہ مشورہ میں نظرثانی ہوسکتی ہے، انفراداً نہیں"۔ چنانچہ وہ درخواست دوبارہ شوریٰ میں آئی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں تو پہلے ہی مخالف تھا، اب بھی میرے نزدیک کوئی بات نہیں گئی اس پر لکھ دیا جائے کہ "فلاں صاحب کی سفارش سے اخراج ملتوی کردیا جائے"۔ البتہ اس میں ایک اشکال ہوگا، وہ یہ کہ ہر اخراج پر اس سے زیادہ زوردار سفارش آسکتی ہے، اس لیے اور کوئی اچھا عنوان اختیار کرلیا جائے، لیکن وہ حضرات اخراج کے التواء پر راضی نہ ہوئے، اس لیے دوبارہ بھی یہی لکھا گیا کہ غور وخوض کے بعد بھی اس اخراج کے التواء کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ مدرسہ کو بہت شدید نقصان پہنچایا گیا ہے۔ اس کے بعد جن جن مشکلات کی طرف اس سیہ کار نے اشارہ کیا تھا وہ ساری پیش آئیں اور سب کی نگاہوں میں یہ سیہ کار ہی مطعون رہا کہ چونکہ اس کا قصہ تھا اس واسطے اس نے نکلوادیا۔

واقعات تو اس سیہ کار کی پچپن سالہ مدرسی دور کے نہ معلوم کتنے ہیں، ان سب کا احصاء مشکل ہے، ہر باب میں نمونہ کے طور پر دو، چار لکھوا کر ختم کردیا کرتا ہوں، اس لیے اس مضمون کو ختم کرکے تالیفات کی یادداشت لکھواتا ہوں کہ وہ بھی اہم ہے۔

اس باب کے شروع میں درس وتعلیم اور تالیفات تین مضمون تھے، اب یہ تیسرا مضمون ہے۔

تالیفات:

لکھنے کی مشق تو بچپن ہی سے شروع ہوگئی تھی، گو خط تو اب تک اچھا نہ ہوا، مگر صحیح اور پختہ اتنا ہوگیا تھا کہ "بذل المجہود" کی تالیف کے زمانہ میں کئی مرتبہ حاسدین نے بذل کی کتاب اس بہانہ سے منتقل کرائی کہ فلاں صاحب بہت خوش خط لکھتے ہیں ان سے لکھوائی جائے۔ لیکن استاذ الکل منشی محبوب علی صاحب جنہوں نے بذل المجہود کی پہلی جلد لکھی اور وہ اس زمانے کے سارے ہی کاتبوں کے استاد یا استاد کے استاد تھے، اللہ ان کو بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے، انہوں نے میرے حضرت قدس سرہٗ سے یوں کہا کہ حضرت! میرے لیے تو ان بدخط سے ہی نقل کرادیا کریں، ان کے شوشے اور نقطے بہت صحیح ہوتے ہیں، مجھ جیسے جاہل کے لیے ایسی تحریر زیادہ کارآمد ہے جس کے نقطے اور شوشے زیادہ صحیح ہوں خوشخط پڑی نہ ہو۔

بہرحال ابتداء تو تختی پر اب ت سے ہوئی، اس کے بعد تھوڑے ہی دنوں بعد تختی پر قرآن شریف پڑھنے کے زمانے میں بہشتی زیور کی نقل شروع ہوئی اور اس کے بعد فارسی کی کتابوں کی نقل اور ترجمہ تختی پر شروع ہوا۔ اس کے بعد مستقل تالیف کا سلسلہ شروع ہوا جس میں سب سے پہلے ابا جان ایک دو لفظ بنا کر اور صرف کے قواعد بتا کر یوں فرمایا کرتے تھے کہ "اس کے صیغے بناؤ"۔ اس زمانے میں اس کی مشق ایسی بڑھی کہ رات دن اسی سوچ میں گزرتا تھا، "بت" کے تیس چالیس صیغے

بنانے تو اب بھی یاد ہیں اور اس کی کاپیاں بھی میرے کاغذات میں اب تک پڑی ہیں۔ جب دہلی جانا ہوتا تھا تو مظفر نگر سے اگلا اسٹیشن کھاتولی ہے دہلی تک اس کے صیغے بناتا جایا کرتا تھا۔

اس دور کے بعد پھر ادب کا ذوق شروع ہوا تو سہارنپور سے دہلی تک اشعار کا دور تھا۔ کھڑکی سے منہ باہر نکال کر شعر پڑھتا جایا کرتا تھا۔ اس کے بعد قرآن پاک کا دور شروع ہوا۔ سہارنپور سے دہلی تک ۱۵ اور ۲۰ تک کے درمیان میں پاروں کا ہمیشہ معمول رہا۔ اس زمانہ میں ریل کے سفر بذل کی طباعت کی وجہ سے بہت کثرت سے ہوا کرتے تھے۔

(۱) شرح الفیہ اردو:...... غیر مطبوع

درس کے دوسرے سال میں جب الفیہ شروع کیا تو ساتھ ساتھ اس کی اردو شرح بھی شروع کی، جو کل تین جلدوں میں پوری ہوئی۔ پہلا جزء بہت مفصل شرح کے طور پر، اس کے بعد مختصر ہوتی چلی گئی اور ۱۸ شعبان ۲۹ھ پنجشنبہ کو پوری ہوئی۔ اس کا مسودہ المماری میں موجود ہے۔

(۲) اردو شرح سلم:...... غیر مطبوع

جس سال میں سلم پڑھی یعنی ۳۲ھ میں حضرت مولانا عبدالوحید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بہت طویل تقریر فرماتے تھے اور میں سبق کے ساتھ پنسل سے لکھا کرتا تھا اور سبق کے بعد صاف کیا کرتا تھا۔

یہ دونوں مسودے چند سال ہوئے تو پورے تھے، اب چند سال سے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔

(۳) اضافہ براشکال اقلیدس:...... غیر مطبوع

۳۲ھ میں جب اقلیدس پڑھی تو کچھ اس وقت ایسا مزہ آیا کہ اس کے قواعد پر اپنی طرف سے شکلیں گھڑا کرتا تھا۔ اس کی کاپیاں اضافہ براشکال اقلیدس کے نام سے اب تک محفوظ ہیں۔

(۴) تقریر مشکوٰۃ:...... غیر مطبوع

ابتداء زمانہ طالب علمی میں پڑھنے کے زمانہ میں بہت مختصر لکھی تھی، پھر شوال ۴۱ھ میں پہلی دفعہ مشکوٰۃ پڑھانی شروع کی تو اس کو سامنے رکھ کر اور حواشی کی مدد سے دوبارہ لکھی یہ تقریر طبع تو نہیں ہوئی مگر شاید سو سے زائد نقلیں طلبہ و مدرسین لے جا چکے ہیں۔

(۵) تقاریر کتب حدیث:...... غیر مطبوع

اس ناکارہ نے کتب صحاح اولاً اپنے والد صاحب سے پڑھیں، ثانیاً حضرت قدس سرہٗ سے۔ ہر شیخ کی درس کی تقریروں کی نقل کا اہتمام تھا، مگر مکمل اور مرتب نہیں۔ البتہ حضرت قدس سرہٗ کی نسائی شریف کی تقریر مختصر مکمل میری تالیف کی المماری میں ہے۔ مجھے خوب یاد ہے میرے حضرت

قدس سرہٗ اگر کوئی حرف ایسا فرماتے تھے جو بین السطور میں ہو اس کو بھی نقل کر لیتا تھا، یہ سمجھ کر کہ میرے حضرت کا فرمایا ہوا ہے۔

(۶) مشائخ چشتیہ:......غیر مطبوع، (۷) احوالِ مظاہر علوم:......غیر مطبوع

جب یہ ناکارہ پڑھنے سے فارغ ہو گیا تو ۳۵ھ مدرسی کے ابتدائی دور میں دو رسالے لکھنے شروع کیے تھے، ایک اولاً مشائخ چشتیہ، جس میں اپنے شیخ قدس سرہٗ سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک جملہ مشائخ کے حالات تبرکاً لکھنا شروع کیے تھے، اکثروں کے پورے ہو گئے اور بعض کے پورے نہیں ہوئے۔

اسی طرح نظرِ براداءِ حقوق مظاہر علوم، اس کے پچاس سالہ حالات ابتداء بناء سے ۳۴ھ تک سن وار۔ اھ بنائی مطابق ۱۳۸۳ھ ہر سال کی آمد و خرچ کی میزان، فارغ التحصیل لوگوں کی تعداد اور تقرر، علیحدگی، ملازمین اور متفرق حالات، یہ بھی تقریباً حصہ اول تو پورا ہو گیا اور مدرسہ کے اکثر حالات جو مدرسہ کی روئدادوں وغیرہ اور اشتہاروں میں چھپے ہیں۔ وہ ۳۵ھ کے بعد سے اسی سے لیے گئے ہیں۔ ارادہ یہ تھا کہ دوسرے حصے میں ان سب اکابر کے مختصر حالات بھی لکھوں گا لیکن مدرسی کے اسباق کے علاوہ بذل کی مشغولیت بھی بڑھتی گئی۔ اس لیے یہ دونوں رسالے باوجود بہت بڑی مقدار میں ہو جانے کے ناقص ہی ہیں اور اب تو تکمیل کی کوئی صورت بھی نہیں۔

(۸) تلخیص البذل:......غیر مطبوع

ربیع الاول ۳۵ھ جب سے بذل المجہود شروع ہوئی تھی اس ناکارہ کا معمول یہ رہا کہ حضرت قدس سرہٗ کے اٹھنے کے بعد سے لے کر اس دن کے لکھے کا ایک خلاصہ ساتھ ساتھ لکھتا رہتا تھا جس میں ابحاثِ طویلہ کے خلاصوں کو اپنی عبارت میں اپنی یادداشت کے واسطے نقل کر دیا کرتا تھا۔ یہ بھی تقریباً سب جلدوں کے ساتھ ساتھ ہوتی رہی۔ اسانید سے تو بحث نہیں کرتا تھا۔ الّا یہ کہ کسی خاص سند پر کوئی بحث کرنی ہو۔

(۹) شذرات الحدیث:......غیر مطبوع

ناکارہ کا معمول یہ رہا کہ بذل کے لکھنے کے زمانے میں شروع بخاری وغیرہ میں جب کسی دوسری کتاب کے متعلق کوئی مضمون نظر سے گزرتا تو میں نے ہر کتاب کی ایک کاپی بنا رکھی تھی اور اس کتاب کے نام سے اس کاپی پر لکھتا تھا: ''شخ'' (شذرات بخاری) اسی طرح شم، شت، شد وغیرہ۔ صحاح ستہ کی ہر کتاب اور مؤطائین اور طحاوی اور ہدایہ کی کاپیاں بنا رکھی تھیں۔ اس کو تفصیل سے اس واسطے لکھوا رہا ہوں کہ میری مطبوعہ تالیفات میں ''کذا فی الشذر و البسط فی

الشذر'' کے حوالے کہیں کہیں آ گئے ہیں۔

اس ناکارہ کی بذل کی تالیف کے زمانہ میں اس کی بہت خواہش رہا کرتی تھی کہ کوئی شخص حضرت سے دو چار منٹ کو بات کرنے کے واسطے آ جائے تو میں جلدی جلدی وہ دیکھے ہوئے مضامین شذرات کی کاپیوں پر لکھ لوں۔ اگرچہ حضرت قدس سرہٗ کو اس وقت میں کسی کا بات کرنا بہت ناگوار ہوتا تھا۔ جس کو میں خوب سمجھتا تھا، مگر میں اپنی غرض کو چاہتا تھا کہ ایک دو منٹ کو کوئی آتا رہے۔ مجھے اس کا وقت صرف ڈاک کی آمد پر ملتا تھا کہ مدرسہ کی ڈاک اول حضرت قدس سرہٗ کے پاس آتی تھی، حضرت قدس سرہٗ اپنی ڈاک چھانٹ کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے اور میری میرے پاس ڈال دیتے تھے نہ تو حضرت اس وقت اپنی ڈاک پڑھتے تھے نہ یہ ناکارہ۔ البتہ اگر قلم سے یا مرسل کے نام سے کوئی اہم خط سمجھتے تو حضرت بھی سرسری دیکھ لیا کرتے تھے اور میں بھی۔

ایک لطیفہ اس جگہ کا بہت پرلطف یاد آ گیا۔ حضرت قدس سرہٗ کی اہلیہ کی طرف کے کوئی عزیز جو کسی جگہ تھانیدار تھے اور اس زمانے کا تھانیدار اس زمانے کا وائسرائے ہوتا تھا۔ نہایت لحیم شحیم، وجیہ، تھانیداری سوٹ میں ملبوس آئے۔ میرا منہ چونکہ دروازے کی طرف ہوتا تھا اور حضرت قدس سرہٗ کی پشت، اس لیے میں ان کو دور سے آتا ہوا دیکھ کر بہت ہی خوش ہوا، اس لیے کہ میرے کئی شذرات جمع ہو رہے تھے اور مجھے یہ فکر ہو رہی تھی کہ کہیں میں بھول نہ جاؤں۔ انہوں نے آ کر حضرت قدس سرہٗ کو پشت کی طرف سے سلام کیا اور حضرت ادھر متوجہ ہوئے اور میں نے بذل کی کاپی ہاتھ سے رکھ کر جلد ہی سے اپنے شذرات اٹھا لیے۔ ہمارے مدرسہ کے ناظم کتب خانہ بھائی مظہر صاحب جو ابتدائی زمانہ میں میرے شریک درس بھی رہ چکے تھے، ان تھانیدار صاحب کے بہت قریب کے رشتہ دار تھے، وہ ساتھ تھے۔ چند منٹ وہ بیٹھے اور حضرت بڑی گرانی سے ان سے باتیں کرتے رہے اور میں نے جلدی جلدی اپنے شذرات پورے کیے۔ جب وہ واپس چلے گئے اور حضرت ادھر متوجہ ہوئے، میں نے بذل لکھنی شروع کر دی۔ وہ صاحب کے اٹھنے کے بعد مجھ پر بہت ہی ناراض ہوئے۔ باہر جا کر بھائی مظہر سے کہا کہ بزرگوں کے پاس بیٹھنے والوں کے بھی اخلاق ایسے خراب ہوا کرتے ہیں۔ یہ شخص جو حضرت کے پاس بیٹھا ہوا ہے اس قدر مغرور اور متکبر ہے کہ ''میں اتنی دیر بیٹھا رہا اور حضرت اس قدر شفقت سے مجھ سے باتیں کرتے رہے، لیکن اس مغرور اور بددماغ نے ایک دفعہ بھی تو نگاہ اٹھا کر یوں نہیں دیکھا کہ یہ آدمی بیٹھا ہے، گدھا بیٹھا ہے، کتا بیٹھا ہے، سور بیٹھا ہے۔'' بھائی مظہر نے اس ناکارہ کی طرف سے بہت صفائی پیش کی کہ ''یہ بات نہیں بلکہ یہ مشغول بہت رہتا ہے۔'' لیکن ان کے دماغ میں یہ بات نہیں آ سکی کہ ایسی بھی مشغولیت ہو سکتی ہے۔ وہ دیر تک خفا ہی ہوتے رہے۔ ان کی خفگی بجا تھی کہ ناواقف آدمی کو یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ

اس قسم کی مشغولیت بھی ہوسکتی ہے اوراس ناکارہ کا وہ زمانہ درحقیقت طلب علم کا تھا۔ بسا اوقات رات دن میں ڈھائی تین گھنٹے سے زیادہ سونا نہیں ہوتا تھا اور بلا مبالغہ کئی مرتبہ بلکہ بہت سی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ روٹی کھانی یاد نہیں رہی کہ مہمانوں کا ہجوم اس زمانے میں میرے پاس نہیں ہوتا تھا۔ البتہ طلبہ ساتھ کھانے والے ہوتے تھے، ان سے کہہ دیا تھا کہ تم کھالو میرا انتظار نہ کرو۔ عصر کے وقت جب ضعف معلوم ہوتا تھا اس وقت یاد آتا کہ دوپہر روٹی نہیں کھائی اور رات کو کھانے کا معمول تو اس سے پہلے چھوٹ گیا تھا تیس پینتیس گھنٹے روٹی کھائے ہوئے گزر جاتے تھے۔

(۱۰) جزء حجۃ الوداع والعمرات:......مطبوع

جب میں پہلی دفعہ مشکوۃ پڑھا رہا تھا جو شوال ۴۱ھ میں شروع ہوئی تھی تو ۲۲ ربیع الاول شب جمعہ ۱۲ بجے لکھنا شروع کیا تھا اور ایک دن ڈیڑھ رات میں شنبہ کی صبح کو پورا کر دیا تھا۔ اب تو مشائخ اکابر دیکھ کر تعجب فرماتے ہیں کہ ایک دن ڈیڑھ رات میں تو اس کی نقل بھی مشکل ہے۔ ہر سال یہ ناکارہ اور دیگر مدرسین جب کسی حدیث کی کتاب کی کتاب الحج پڑھاتے تھے تو دو چار دن اس کو مانگ لیتے تھے۔ متعدد اکابر مدرسین کے پاس اس کی نقلیں بھی تھیں، مگر طبع کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا، بلکہ بعض لوگوں نے جب طباعت کی فرمائش کی تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ تو یادداشتیں ہیں، طباعت کا ارادہ نہیں۔

لیکن گزشتہ سال مدینہ منورہ میں شعبان ۸۹ھ میں دفعۃً اس کی طباعت کا خیال پیدا ہوا اور آخر ذیقعدہ ۸۹ھ میں اس رسالہ کا سننا شروع کیا۔ نزولِ آب کی وجہ سے آنکھیں بے کار تھیں، اس لیے عزیزان مولوی عاقل، مولوی سلمان نے سنانا اور صاف کرنا شروع کیا اور ۲۶ھ ربیع الثانی ۹۰ھ پنجشنبہ اس کی تبییض پوری ہوئی اور اس کے چند روز بعد میں نے خواب میں دیکھا، کسی شخص نے مجھ سے یہ کہا کہ ''اس کی تکمیل حضور کے عمروں کے بیان کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اس لیے ۱۷ جمادی الاولیٰ ۹۰ھ بروز بدھ ''جزء العمرات'' کی تالیف شروع ہوئی اور ۱۵ رجب ۹۰ھ یوم جمعہ کو ختم ہوگئی اور شعبان ۹۰ھ میں پہلی طباعت لیتھو میں ہوئی اور اسی وقت دوسری طباعت ندوہ لکھنؤ میں ٹائپ پر شروع ہوگئی۔

(۱۱) خصائلِ نبوی شرح شمائل ترمذی:......مطبوع

بذل کی طباعت کے لیے بار بار دہلی جانا ہوتا تھا۔ ہر پندرہ بیس دن میں ایک دو شب کو جانا ہوتا تھا، رات کو گاڑی ایک بجے رات سہارنپور سے چلتی تھی اور جب تک بذل کی طباعت کا سلسلہ رہا یہ گاڑی بدستور رہی اور دو یا تین دن دہلی میں قیام رہتا تھا، پروفوں کے دیکھنے کے بعد جتنا وقت

بچتا اس میں اس کو لکھا کرتا تھا۔ ۴۳ھ میں اس کی تالیف شروع ہوئی تھی اور ۸ جمادی الثانی ۴۴ھ شبِ جمعہ میں پوری ہوئی، اس کی تالیف در یہ کلاں کی مسجد میں ہوئی کہ وہیں دن بھر میرا قیام ہوتا تھا اور جب واپس آتا تو اس کے سارے کے سارے کاغذات ایک صندوقچی میں بند کر کے حاجی عثمان خان صاحب مرحوم کی دکان پر رکھ آتا۔ خصائل کے شروع میں اس کا مختصر حال لکھا جا چکا ہے اور متعدد مرتبہ طباعت کے بعد ۶۰ھ میں اس میں اضافہ ہوا۔

(۱۲) حواشی بذل المجہود:...... غیر مطبوع

بذل المجہود کی طباعت کے بعد سے اس پر حواشی کا سلسلہ اس ناکارہ کی طرف سے شروع ہوا اور اخیر زمانہ تک یعنی ۸۸ھ تک ابوداؤد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں جو نئی بات نظر پڑتی رہی، وہ بذل کے حاشیہ پر لکھتا رہا، وہ ایک مستقل ذخیرہ بن گیا۔

(۱۳) تحفۃ الاخوان:...... مطبوع

(۱۴) شرح عربی جزری:...... غیر مطبوع

(۱۵) رسالہ دراحوال قراء سبعہ۔ البدور مع نجومہم الاربعۃ عشر:...... غیر مطبوع

۴۵ھ میں جب یہ سیہ کار مدینہ پاک ایک سالہ قیام کی نیت سے گیا اور وہاں کچھ تجوید پڑھنے کا شوق ہوا اور المقریٔ الشہیر استاذ الاساتذہ القاری حسن شاعر جو اس زمانہ میں بھی معمر تھے اور مکہ اور مدینہ کے قراء کے مشہور استاد تھے، بڑا شہرہ ان کا تھا، ان سے شاطبی شروع کی، لیکن پہلے ہی سبق میں ان سے لڑائی ہوگئی، اس لیے کہ حضرت قاری صاحب نے یوں فرمایا کہ ”مطلب سمجھنے کی ضرورت نہیں، اشعار حفظ یاد کرلو۔“ اس ناکارہ نے عرض کیا اشعار تو ضرور حفظ کر کے سنایا کروں گا، مگر اتنے مطلب نہ سمجھوں اتنے قرآن کے الفاظ کی طرح سے اس کے اشعار کو یاد کرنے سے کیا فائدہ؟ میرے حضرت قدس سرہٗ کو کئی ماہ بعد اس قصہ کی خبر ہوئی تو حضرت نے ارشاد فرمایا ”تو نے مجھ سے نہ کہا شاطبی تو تجھے سمجھا کے میں پڑھاتا قاری صاحب کی شاگردی تو اسی دن ختم ہوگئی تھی، لیکن ان کی شفقت ومحبت اب تک بھی رہی، چنانچہ گزشتہ سال ۸۹ھ میں جب مدینہ پاک حاضری ہوئی اس وقت بھی وہ زندہ تھے اور بہت ہی ضعیف، بہت ہی معمر، خبر سنتے ہی دو آدمیوں کے سہارے تشریف لائے اور ہر مجلس میں اس ناکارہ کے متعلق، سید محمود کے یہاں اور بڑوں بڑوں کے یہاں بہت فخر سے فرماتے رہے کہ یہ میرا تلمیذ رشید ہے اور ہمیشہ اسی لفظ سے تعارف کرایا کرتے اور میں ان کے ”رشید“ کہنے پر اس قدر شرمندہ ہوتا ہوں کہ نالائق سے لڑائی تو پہلے ہی دن ہوگئی تھی، پھر بھی میں رشید ہی رہا۔ لیکن ان کی شفقت اس سال بھی بہت رہی۔ ”تحفۃ

الاخوان فی بیانِ احکام تجوید القرآن'' ان کی عربی تالیف ہے، وہ چونکہ اردو سے واقف نہیں تھے اور ان کے ہندی شاگرد بہت کثرت سے ہر سال ان سے چندروزہ قیام میں بھی کچھ نہ کچھ ان کی عام شہرت کی وجہ سے ان سے پڑھتے تھے، اس لیے انہوں نے مجھے حکم دیا کہ اس کا اردو ترجمہ لکھوں، وہ میں نے ایک دو دن میں کردیا اور ۸ جمادی الاولیٰ ۴۵ھ کی تاریخ اس کے خاتمہ پر لکھی ہوئی ہے۔ اس کے متعلق ایک بڑا لطیفہ بھی پیش آیا، جو عنقریب لکھوں گا اور بھائی الحاج احمد علی صاحب راجو پوری مہاجر مدینہ منورہ کی مساعی جمیلہ سے یہ ان کی حیات تک پندرہ بیس دفعہ چھپا، ان کی وفات کے بعد کا حال معلوم نہیں۔ لیکن مظاہر علوم کے کتب خانہ میں اس کا مطبوعہ ایک نسخہ تو یقیناً ہے جس کے متعلق بارہا لوگوں نے مجھے بتایا، زائد کی مجھے خبر نہیں۔

دوسرا رسالہ ''شرح عربی جزری'' غیر مطبوع بھی قاری صاحب موصوف کے تعمیل حکم میں عربی طلبہ کے واسطے لکھی تھی، اس کی طباعت کا حال مجھے معلوم نہیں، البتہ اس کی نقل میرے ساتھ ہندوستان بھی آئی تھی، جو میرے مسودات میں ہے۔

تیسرا رسالہ ''دراحوال قراءِ سبعہ'' بھی مدینہ پاک کے قیام میں لکھا، جس میں قراءِ سبعہ اور ان کے چودہ شاگردوں کے مختصراً احوال لکھے تھے، یہ اپنے شوق سے لکھا تھا کہ بذل کے لکھنے کے بعد جو وقت بچتا وہ علمی ذوق کی وجہ سے ان ہی میں خرچ ہوتا۔ بالخصوص رات کا وقت کہ مسجد نبوی کے تو کواڑ لگ جاتے اور جلدی سونے کی کبھی عادت نہیں پڑی۔ بہت سی چیزیں تبرکاً تھوڑی تھوڑی نقل کرکے بھی لایا تھا، جس میں معجم کبیر، اوسط اور شرح طحاوی للعینی، جو اب بحمد اللہ مولوی یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کی مساعی جمیلہ سے مدرسہ میں پوری کا عکس آگیا ہے یہ مصر سے وہاں کے قیام میں نہایت حسین نہایت خوبصورت گیارہ جزء گیارہ اشرفیوں میں نقل کرائے تھے، مگر افسوس! یہاں آنے کے بعد جلدی ہی دو بزرگوں کی کشمکش سے کھوئی گئی، کہ وہ دونوں حضرات اس کے مشتاق تھے اور بار بار ایک دوسرے سے منگاتے تھے، میں تو مطمئن رہا کہ ان دونوں میں سے کسی کے پاس ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ درمیان میں کسی قاصد کو پسند آگئی۔

جس لطیفہ کا اوپر ذکر ہوا وہ یہ ہے:

حضرت اقدس تھانوی قدس سرہٗ نوراللہ مرقدہٗ کا دستور یہ تھا کہ اگر مجمع زیادہ ہوتا تب تو کھانا خانقاہ شریف میں آتا، لیکن ہم خدام میں سے اگر دو چار ہوتے تو حضرت قدس سرہٗ مکان ہی پر لے جاتے اور ہر دو اہلیہ میں سے جونسی اہلیہ کا نمبر ہوتا ان کے مکان پر کھانا کھانے کی نوبت آتی البتہ چھوٹی محترمہ کے یہاں کھانا کھانے کی زیادہ نوبت آئی، ایک مرتبہ چھوٹی اہلیہ کے زنانہ مکان پر چھت پر یہ ناکارہ اور حضرت مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ صرف ہم دو کھانے میں تھے اور

حضرت قدس سرہٗ خود بنفسِ نفیس اندر سے کھانا لارہے تھے، جس کی بڑی شرم آرہی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ ہاتھ میں دو رکابیں لیے ہوئے اندر سے تشریف لارہے، مستورات بھی قریب ہی کمرہ میں تھیں اور ہم صحن میں کھانا کھانے بیٹھے تھے، حضرت اندر سے بہت ہی ہنستے ہوئے تشریف لائے، وہ منظر بھی بہت آنکھوں میں کانوں میں اور دل میں گونج رہا ہے، حضرت نے فرمایا ''مولانا زکریا صاحب آج ایک عجیب بات معلوم ہوئی کہ آپ قاری بھی ہیں،'' میں نے عرض کیا ''حضرت بالکل نہیں، میں تو فارسی میں قرآن پڑھوں'' حضرت نے فرمایا ''مجھے بھی یہی معلوم تھا کہ آپ قاری نہیں ہیں، مگر یہ عورتیں بہت ساری جمع ہیں اور متفق اللسان اس پر اصرار کررہی ہیں کہ آپ قاری ہیں اور آپ سے قرآن سننے کی میرے واسطے سے باصرار درخواست کررہی ہیں''۔ مجھے معلوم تھا کہ بھائی احمد علی اس سال مع اہلیہ آئے ہوئے ہیں میں نے پوچھا کہ ''حضرت! بھائی احمد علی صاحب کی اہلیہ تو ان میں نہیں؟'' حضرت نے فرمایا ''کیسے سمجھا؟ وہ تو ہیں''۔ میں نے عرض کیا کہ ''تو روایت صحیح ہے'' اور پھر میں نے تحفۃ الاخوان اور شرح جزری کا سارا قصہ سنایا اور میں نے کہا کہ ''حضرت! میں مدینہ میں تو قاری ہوں، ہندوستان میں نہیں''۔

(۱۶) اوجز المسالک شرح موطا امام مالک ۶ جلد:...... (مطبوع)

تالیف کا سلسلہ اور چسکہ تو ۳۵ھ سے بڑھتا ہی گیا ۴۵ھ میں مدینہ پاک میں جب بذل المجہود قریب الختم ہوئی اور یہ خیال تو طے شدہ تھا کہ حدیث پاک کا ہی مشغلہ رکھنا ہے، اگرچہ حدیث کے اسباق مدرسہ میں شروع ہوگئے تھے، پھر بھی تالیفی ذوق تو تھا ہی، مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ بذل کے بعد کوئی کتاب لکھنے کے لیے سوچنی چاہیے، میرے ذہن میں بہت مختصر مؤطا امام مالک آئی اور مدینہ پاک کی مناسبت سے موطا امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی شرح ''اوجز المسالک'' کے نام سے غرۂ ربیع الاول ۴۵ھ کو اقدام عالیہ میں بیٹھ کر بسم اللہ لکھی اور بذل کے ختم ہونے تک تو دو چار سطریں لکھی جاتی تھیں اور بذل کے ختم کے بعد ۲۱ شعبان ۴۵ھ سے مدینہ پاک سے روانگی تک تقریباً تقریباً ڈیڑھ جلد کا مسودہ ہوگیا، لیکن ہندوستان واپسی کے بعد مشاغل کا ایسا ہجوم رہا اور اس کے درمیان میں دوسری تصانیف کا بھی سلسلہ رہا جیسا کہ آئندہ سالوں سے معلوم ہوجائے گا۔ تدریس کے علاوہ مدرسہ کے دوسرے مشاغل نے بھی بہت وقت لیا، اس لیے تیس سال سے زائد اس کی تالیف میں لگ گئے۔

میری سفر حجاز سے واپسی پر ۶۴ھ کے شروع میں میرے حضرت قدس سرہٗ کا ارشاد آیا کہ بذل المجہود کی طرح میں ترمذی کی شرح لکھوں اور میرے ذہن میں یہ تھا کہ ایک آدھ سال میں اوجز ختم ہوجائے گی اس لیے کہ ڈیڑھ جلد اس کی مدینہ پاک میں دو تین مہینہ میں ختم ہوچکی تھی اور اس کے

بعد میری خواہش طحاوی کی شرح لکھنے کی تھی، اس لیے کہ مجھے طحاوی سے بہت بچپن سے محبت تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے طحاوی شریف کی شرح اردو لکھنی شروع کی تھی اور اس کا اشتہار بھی دے دیا تھا۔ بہرحال میں نے حضرت قدس سرہٗ کو لکھا کہ ''میرا خیال طحاوی پر کچھ لکھنے کا ہے، آیندہ جیسے ارشاد ہو''۔ حضرت قدس سرہٗ نے لکھا کہ ''طحاوی غیر متداول ہے اور ترمذی متداول ہے ہر مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس کی زیادہ ضرورت ہے''۔ اسی خط و کتاب میں میرے حضرت قدس سرہٗ کا وصال ۱۵ ربیع الثانی ۴۶ھ میں ہو گیا، پھر میں نے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے مشورہ کیا کہ ترمذی میں شروع کروں یا اوجز پوری کروں؟ چچا جان کی رائے بھی ہوئی کہ وہ درمیان میں ہے، پہلے اس کو پوری کر لی جائے۔ حضرت قدس سرہٗ کی حیات میں تو ارادہ کر لیا تھا کہ فوراً مدینہ منورہ حاضر ہو جاؤں اور حضرت ہی سے ابتداء کراؤں اور بذل کی طرح جب تک حضرت کی حیات رہے حضرت لکھواتے رہیں اور لکھتا رہوں، لیکن اوجز نے جوانی کا سارا زمانہ لے لیا، اس کے بعد ہمت بھی کچھ قاصر ہو گئی اور حضرت مدنی قدس سرہٗ کے شدید اصرار پر ''لامع'' شروع ہو گئی اور اس کے بعد ''عد نفسک فی الاموات'' میں داخل ہو گیا۔

(۱۷) فضائل قرآن:......(مطبوع)

حضرت شاہ یٰسین صاحب یکے از خلفاء قطب عالم گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ جو ہر سال مظاہر علوم کے جلسے میں آیا کرتے تھے اور ۲۷ ذیقعدہ ۴۸ھ کے جلسہ کے موقع پر بہت زور سے اصرار فرما گئے ان کے تعمیل ارشاد میں اوائل ذی الحجہ میں شروع ہوئی اور ۲۹ھ کو ختم ہوئی۔ فضائل کا یہ پہلا رسالہ ہے جو حضرت شاہ صاحب کی تعمیل حکم میں لکھا گیا اور فضائل کا سب سے آخری رسالہ ''فضائل درود'' بھی شاہ صاحب کے ارشاد سے لکھا گیا۔

(۱۸) فضائل رمضان:......(مطبوع)

رمضان ۴۹ھ میں چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے تعمیل ارشاد میں نظام الدین میں لکھی گئی اور ۲۷ رمضان المبارک میں ختم ہوئی۔

(۱۹) قرآن عظیم اور جبریہ تعلیم:......(مطبوع)

۴۹ھ میں جبریہ تعلیم کا بہت زور رہا، جس کے خلاف حضرت حکیم الامت تھانوی اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہما نے بہت زیادہ مساعی جمیلہ فرمائیں۔ چچا جان نے اس ناکارہ کی وساطت سے حضرت مدنی قدس سرہٗ کی صدارت میں متعدد جلسے بھی کرائے۔ اس سلسلے میں بھی ایک لطیفہ ہے مگر طویل۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ ممبرانِ اسمبلی کے نام خطوط تحریر فرمایا کرتے تھے اسی سلسلے

میں اس ناکارہ نے یہ ایک خط جو تقریباً ۳۲ صفحات پر طبع ہوا ہے لکھ کر چھپوا کر ممبرانِ اسمبلی اور دیگر سربرآوردہ مسلمانوں کے پاس بھیجا تھا۔ ۱۳ محرم ۵۰ھ میں لکھا گیا۔

(۲۰) فضائل تبلیغ:...... (مطبوع)

یہ بھی چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے تعمیل ارشاد میں لکھی گئی اور چند روز میں ۵ صفر شب دوشنبہ ۵۰ھ میں پوری ہوئی۔

(۲۱) الکوکب الدری:...... (مطبوع)

یہ قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ کی ترمذی شریف کی تقریر ہے جس کو میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے پڑھنے کے زمانہ میں عربی میں لکھا تھا اور مشائخ درس بہت کثرت سے اس کی نقلیں بہت گراں قیمت سے طلبہ سے کراتے رہے۔ نقلیں تو اس کی بہت ہوئی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے حضرت میاں صاحب مولانا الحاج اصغر حسین صاحب دیوبندی نے چھتر (۷۵) روپے میں نقل کرائی تھی۔ میں نے اس کی نقل دینے میں کبھی بخل نہیں کیا، اگرچہ بہت سے لوگوں نے مجھے بہت ہی منع کیا، بالخصوص منطقی علماء نے اور بہت سے احباب کا شدید اصرار اس کی طباعت پر رہا بالخصوص حضرت مدنی قدس سرہٗ کا، مگر میرے ذہن میں یوں تھا کہ وہ مسودہ ہے علماء میں سے جب تک کوئی نظر ثانی اور مختصر حواشی اس پر نہ لکھے نہ طبع کرائی جائے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے بار بار درخواست کی، بالخصوص مولانا مرحوم سے اس وجہ سے کہ انہوں نے ترمذی کی شرح لکھنی شروع کی تھی۔ لیکن مشاغل کی وجہ سے کوئی بھی راضی نہ ہوا۔

مجھے ۵۱ھ میں یہ معلوم ہوا کہ ایک صاحب نے اس کو بحالہ چھاپنا شروع کر دیا ہے اور کئی جزء چھاپ بھی لیے، جس پر مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ غلط چھپ جائے گی، اس لیے اوجز کی تالیف چند سال کے لیے روک کر اس کا کام شروع کرنا پڑا اور جلد اول کے حواشی اور نظر ثانی سے وسط ربیع الاول ۵۲ھ میں فراغت ہوئی اور جلد ثانی سے ۱۶ رجب ۵۳ھ میں فراغت ہوئی۔ ان ہی وجوہ سے اوجز کی تالیف میں دیر ہوتی چلی گئی۔

(۲۲) حکایات صحابہؓ:...... (مطبوع)

صفر ۵۷ھ میں اجڑارے جاتے ہوئے میرٹھ میں نکسیر کا شدید حملہ ہوا جو مغرب کے بعد سے شروع ہو کر صبح کو آٹھ بجے تک مسلسل رہا اور تقریباً دو گھڑے کے قریب خون ساری رات نہ معلوم کہاں سے پیدا ہوا اور نکسیر کی ابتداء بھی اپنی ایک حماقت سے جو حضرت مدنی قدس سرہٗ کی بے تکلفی کی بناء پر پیدا ہوئی تھی لمبا قصہ ہے۔

بہرحال علی الصباح یہ ناکارہ بجائے اجزاء رے کے حضرت ناظم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ فرسٹ کلاس ڈاکٹروں اور حکیموں کی طرف سے چند ماہ تک دماغی کام سے روک دیا گیا۔

میرے حضرت میرے مربی میرے محسن حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری کا ارشاد تقریباً چار برس سے اس کی تالیف کا ہو رہا تھا۔ مگر اپنے مشاغل کے ہجوم کی وجہ سے تعمیل کا وقت نہ ملا، اس بیماری کے زمانے کو غنیمت سمجھ کر تعمیلِ ارشاد میں پڑے پڑے کچھ لکھتا رہا اور ۱۲شوال ۵۷ھ کو پوری ہوگئی کہ کچھ دنوں بعد سبق کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا اور اسی کے ساتھ اعتدال کی تالیف بھی شروع ہوگئی تھی جو آگے آرہی ہے۔

(۲۳) الاعتدال فی مراتب الرجال:......(مطبوع)

۵۶ھ اور اوائل ۵۷ھ کانگریس اور لیگ کے اختلافات نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ اکابر کی شان میں بے حد گستاخیاں اور بے ادبیاں ہوئیں اور بعض لوگوں نے دوسرے خیال کے امام کو فرائض جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں مصلّے سے بھی ہٹا دیا اور جس جگہ جس فریق کا غلبہ ہوا اس جگہ دوسرے خیال کے مُردوں کو قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا۔

اس سیہ کار کے پاس اس زمانے میں خطوط کی بڑی بھرمار تھی۔ علیحدہ علیحدہ جواب دینا مشکل تھا، اس کے باوجود لکھنا پڑتا تھا۔ ایک عزیز نے میرے بہت سے خطوط جمع کر کے سب اشکالات کو ایک خط کی صورت میں لکھ کر اس کے جواب کا مطالبہ کیا۔ میں نے بھی علیحدہ علیحدہ جواب لکھنے سے اس کو آسان سمجھا کہ ایک کاپی پر اس کو مفصل نقل کرالیا اور ۲۹ شعبان ۵۷ھ کو یہ جواب ختم ہوگیا۔ اس کے بعد ہر شخص کو مختصر جواب لکھنے کے بعد یہ لکھتا "تفصیلی گفتگو زبانی ہوگی، یہاں آجاؤ"۔ یہاں آنے پر اس کو کاپی دکھا دیتا۔

اتفاق سے میرے چچا جان اور حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہما کو اس کا علم ہوگیا، دونوں نے بہت اصرار اس کی اشاعت کا کیا، بلکہ حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ نے تو میر آل علی صاحب کو حکم دیا کہ وہ اور شاہ مسعود حسن صاحب مل کر اس کو طبع کرادیں، جس پر میں نے یہ کہہ کر شدت سے انکار کر دیا کہ "حضرت کسی دوسرے کے طبع کرانے کی ضرورت نہیں میں اس کو عوام میں پھیلانا نہیں چاہتا، مخصوص کو دکھاتا ہوں" اور پھر ان دونوں بزرگوں کی تعمیل ارشاد میں چند روز میں اس کو طبع کرالیا۔

حضرت مدنی قدس سرہٗ نے طبع کے بعد بہت پسند فرمایا اور ہمیشہ سفری بیگ میں اس کا نسخہ رکھا رہتا تھا۔ ان ہی بزرگوں کی برکت کا اثر تھا کہ یہ کتاب اندازہ سے زائد مقبول ہوئی، سنجیدہ طبقہ اور علماء نے بہت پسند کیا، بیس پچیس مطابع میں ہندو پاک کے کئی کئی مرتبہ طبع ہوئی اور گزشتہ سال اس

کے نمبر ۴ کا ترجمہ عزیزم مولوی عبدالرحیم متالا نے گجراتی میں کر کے ''درد اور دوا'' کے نام سے شائع کرایا اور اس سال بمبئی کے احباب کے تقاضوں پر اس نمبر کو ''مسلمانوں کی پریشانیوں کا بہترین علاج'' کے نام سے اردو میں ۲۵ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ کو شائع کرایا گیا۔

(۲۴) مقدمات کتب حدیث:......(غیر مطبوع)

اس ناکارہ نے مختلف ایام میں ۴۶ھ سے ۵۶ھ تک کے دوران ''ایک مقدمہ علم الحدیث'' لکھا تھا۔ جو ''مقدمہ اوجز'' میں طبع ہو گیا۔ اس کے علاوہ سب کتابوں کا ''مقدمۃ الکتاب'' بھی لکھا، جس میں اس کتاب کی خصوصیات، مصنف اور اس کے حالات اس کتاب کے مناسب جو چیزیں تھیں، ان میں سے ''مقدمۃ البخاری'' بہت سے اضافوں کے ساتھ ''مقدمہ لامع'' میں چھپ چکا ہے۔

مقدمہ بذل المجہود ابوداؤد بہت مفصل لکھا تھا اور بذل المجہود کے شروع میں اس کی طباعت کا بھی ارادہ تھا۔ مگر حضرت قدس سرہٗ نے خود اس کا مقدمہ مختصر لکھوا دیا۔ مجھے یہ عرض کرتے ہوئے شرم آئی کہ میں نے مفصل لکھ رکھا ہے، اس لیے طباعت کی نوبت نہ آئی۔

اسی طرح بقیہ کتب ستہ کی نیز شمائل ترمذی و نیز طحاوی وغیرہ کے مقدمۃ الکتب لکھے ہوئے میری الماری میں موجود ہیں۔

(۲۵) فضائل نماز:......(مطبوعہ متعدد بار)

چچا جان کے تعمیل ارشاد میں لکھا گیا اور ۷ محرم ۵۸ھ شب دوشنبہ میں پورا ہوا۔

(۲۶) فضائل ذکر:......(مطبوعہ متعدد بار)

یہ بھی چچا جان قدس سرہٗ کے تعمیل ارشاد میں لکھا گیا اور ۲۶ شوال ۵۸ھ شب جمعہ میں پورا ہوا۔

(۲۷) فضائل حج:......(مطبوعہ متعدد بار)

عزیز مولانا یوسف مرحوم نے جب حجاج کا کام شدت سے شروع کیا تو مجھ پر تقاضہ کیا کہ فضائل حج میں ایک رسالہ ضرور لکھ دوں۔

۳ شوال ۶۶ھ کو اس کی ابتداء ہوئی اور ۱۴ جمادی الاول ۶۷ھ بروز جمعرات فراغت ہوئی۔

نفس رسالہ سے تو فراغت شوال ہی میں ہو گئی تھی۔ پس کچھ حکایات کا اضافہ سہارنپور واپسی پر ہوا۔

اس رسالہ کے متعلق ایک خواب۔ میرا تو جیسے نہ چاہتا تھا کہ لکھواؤں مگر بعض دوستوں کا جو اس وقت مسودہ لکھوانے کے وقت موجود تھے اصرار ہے کہ ضرور لکھواؤں۔

جب یہ رسالہ لکھا جا رہا تھا تو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے ایک مخلص خادم

ذاکر وشاغل نہایت متقی بزرگ نے ایک خواب دیکھا کہ حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور یہ ناکارہ دونوں مل کر بیت اللہ شریف کی تعمیر کررہے ہیں۔ انہوں نے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ سے خواب عرض کیا۔ حضرت نے فرمایا ''شیخ کو لکھ دو''۔ انہوں نے مجھے لکھا۔ اس ناکارہ نے جواب میں لکھا کہ ''تعبیر صاف ہے، اس ناکارہ نے ایک رسالہ فضائل حج میں لکھا ہے جو آج کل زیر طبع ہے، انشاء اللہ یہ رسالہ بیت اللہ شریف کی تعمیر روحانی میں معین ہوگا''۔ چنانچہ ہزاروں خطوط اس نوع کے پہنچے کہ اس رسالہ سے حج وزیارت میں بہت لطف آیا۔

(۲۸) فضائل صدقات:...... (مطبوع)

چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی علالت کے زمانہ میں بار بار دو رسالوں کی تاکید فرمائی تھی، ایک فضائل زکوٰۃ اور ایک فضائل تجارت حتیٰ کہ ایک دن عصر کی نماز کی تکبیر ہورہی تھی تو صف میں سے آگے منہ نکال کر کہا ''دونوں رسالوں کو یاد رکھنا بھولنا نہیں''۔ مگر جیسا کہ فضائل حج اور فضائل صدقات کی تمہید میں تفصیل سے لکھا گیا۔ شوال ۶۶ ھ میں ۴۷ء کے ہنگامہ کی وجہ سے چار ماہ سے زائد نظام الدین میں محبوس رہنا پڑا۔ لہٰذا فضائل حج کے ختم ہونے کے بعد اسی قیامت کے یاد دلانے والے ہنگامے میں نظام الدین میں اس کی ابتداء ہوئی اور سہارنپور واپسی کے بعد ۲۲ صفر ۶۸ ھ کو ختم ہوئی۔

(۲۹) لامع الدراری تین جلد:...... (مطبوعہ)

اوجز کی فراغت کے بعد جیسا کہ لامع کے شروع اور خاتمہ پر لکھا گیا ہے کہ ۷ محرم ۱۳۷۶ھ یوم چہار شنبہ کو اس کی ابتداء ہوئی اور ۱۰ ربیع الاول ۸۸ ھ کو کتاب مکمل ہوئی اور چونکہ اپنے ضعف اور امراض کی کثرت کی وجہ سے تالیف حدیث کے سلسلے کو ختم سمجھ رہا تھا اس لیے ۱۷ ربیع الاول ۸۸ ھ مطابق ۱۴ جون ۶۸ء کو اس کے اختتام کی ایک دعوت کی، جو شروع میں تو بہت مختصر مدرسہ کے مدرسین اور مخصوص احباب، سو ڈیڑھ سو کا اندازہ تھا، مگر نہ معلوم کس طرح اس کی ایسی شہرت عام ہوئی کہ دہلی، لکھنؤ، کلکتہ، بمبئی تک خبریں پہنچ گئیں اور تقریباً ایک ہزار کا مجمع جمعہ کی شب اور صبح تک جمع ہوگیا۔ برابر دیگیں بڑھتی رہیں اور پلاؤ زردہ مولوی نصیر الدین، شیخ انعام اللہ، شیخ اظہار وغیرہ کی مساعی جمیلہ سے بہت جلد تیار ہوتا رہا اور اس غلط شہرت سے کہ آج عزیزان زبیر وشاہد کا نکاح ہے۔ حالانکہ اس کا کوئی تذکرہ یہاں نہیں تھا۔ مقامی وبیرونی عورتوں کا مجمع بھی گھر میں بہت ہوگیا تھا۔

(۳۰) فضائل درود شریف:...... (مطبوع)

اس کی تالیف بھی حضرت شاہ یٰسین صاحب نگینوی کی وصیت کے موافق ہے، حضرت شاہ

صاحب کا وصال ۳۰ شوال ۶۰ھ شب پنجشنبہ میں ہوا تھا اور انہوں نے وصال کے وقت اپنے مخلص خادم اور اجل خلفاء عبدالعزیز صاحب دہلوی کو یہ وصیت کی تھی کہ ''زکریا سے کہہ دیجیو کہ جس طرح تو نے فضائل قرآن لکھی ہے، میرے کہنے سے فضائل درود بھی لکھ دے''۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے وصال کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم بار بار زبانی اور تحریری تقاضے شدت سے کرتے رہے۔ مگر بداعمالیوں نے مہلت نہ دی، لیکن ۸۳ھ کے حج میں مدینہ پاک حاضری پر شدت سے اس کا تقاضا شروع ہوا، واپسی پر بھی تساہل ہوتا رہا اور ۲۵ رمضان ۸۴ھ کو بسم اللہ کر ہی دی اور ۶ ذی الحجہ ۸۴ھ کو دفعۃً ختم کر دی کہ عزیزی مولوی یوسف مرحوم کے انتقال کے تار آنے پر اپنی زندگی سے کچھ ایسی مایوسی ہوئی کہ جتنی لکھی تھی اسی پر ختم کر دی۔

(۳۱) رسالہ اسٹرائک:...... (مطبوعہ)

مدارس عربیہ میں اسٹرائک کی روز افزوں وبا سے جتنی نفرت اس سیہ کار کو ہے اتنی شاید ہی کسی کو ہو اور اس میں میرے دو بزرگ حضرت تھانوی اور حضرت مدنی نور اللہ مرقدہما بھی بہت مخالف تھے۔ روز افزوں اسٹرائک کی مصیبت کی وجہ سے یہ رسالہ ۱۲ ربیع الاول ۸۸ھ کو لکھا گیا، جس میں اکابر مذکورین کے ارشادات بھی نقل کیے گئے۔

(۳۲) رسالہ آپ بیتی:...... (مطبوعہ)

عزیز مولوی محمد ثانی سلمہ نے عزیز مولانا محمد یوسف مرحوم کی سوانح عمری لکھی اور اس میں ایک باب علی میاں نے عزیز یوسف کے مشائخ میں اس سیہ کار کا بھی اپنے قلم سے لکھ دیا۔ میں نے علی میاں کو لکھا کہ ''جو باتیں لکھنے کی تھیں وہ تو آپ نے لکھی نہیں اور جو نہ لکھنے کی تھیں وہ لکھ دیں''۔ اس پر ایک مضمون ان کو لکھا اور احباب کے اصرار پر اس میں کچھ اضافہ کے ساتھ ۱۵ ربیع الثانی ۸۸ھ کو آپ بیتی کے نام سے ایک رسالہ شائع کر دیا۔ یہ رسالہ جو اب لکھوا رہا ہوں اسی کا دوسرا حصہ ہے، کل چھ حصے طبع ہو چکے ہیں۔

(۳۳) اصول حدیث علی مذہب الحنفیہ:...... (غیر مطبوعہ)

مسلکِ حنفیہ پر اصول حدیث کا ایک متن جو ۸ جمادی الاول ۴۲ھ کو شروع کیا تھا اور ۱۰ جمادی الاول کو ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اس پر حواشی کا سلسلہ ۸۸ھ تک چلتا رہا، جو مضمون ذہن میں آتا اس کو لکھتا رہا۔

(۳۴) الوقائع والدھور:...... (غیر مطبوعہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور اس کے بعد خلفائے راشدین اور اس کے بعد

سلاطینِ بنی امیہ وغیرہم کے حالات۔ جلد اول میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے، جلد ثانی میں خلفاء راشدین کےاور جلد ثالث میں ان کے بعد والوں کے۔ ۲۵ محرم ۴۲ھ یوم جمعہ کوابتداء کی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک جو نیا واقعہ ملتا رہا اس سال کی جلد میں نکال کر لکھتا رہا۔ اس کا سلسلہ ۸۸ھ تک چلتا رہا۔

(۳۵) المؤلفات والمؤلفین:...... (غیر مطبوعہ)

معروف کتب حدیث وفقہ اور معروف مؤلفین کے حالات اور ان کے احوال کے مواضع جن جن کتابوں میں تھے، ان کے حوالے، اس کی ابتداء یکم جمادی الثانی ۷۴ھ کو ہوئی تھی۔ ۸۸ھ تک اس کا سلسلہ چلتا رہا۔ ۸۸ھ اس ناکارہ کے علمی انہماک کا گویا خاتمہ ہے کہ آنکھوں نے بھی بالکل جواب دے دیا اور دماغ اور قویٰ نے بھی ساتھ چھوڑ دیا اب تو

ماہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم!

(۳۶) تلخیص المؤلفات والمؤلفین:...... (غیر مطبوعہ)

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس میں مؤلفین کے نام اور بہت مختصر سوالات جمع کیے گئے اور تفصیل کے لیے رسالہ بالا کا حوالہ لکھ دیا۔

(۳۷) جزءالمعراج:...... (غیر مطبوعہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج شریف کے متعلق ایک مستقل رسالہ لکھنا شروع کیا تھا، جس کے کئی جزءتو ہو گئے مگر تکمیل کو نہیں پہنچا۔

(۳۸) جزوفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم:...... (غیر مطبوعہ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الوصال کی ابتداء، دن اور تاریخ، ازواج مطہرات کے یہاں دورہ اور اخیر میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے یہاں تشریف آوری اور مرض کی شدت وغیرہ احوال کی روایات جمع کی گئیں مگر افسوس مکمل نہ ہوسکا۔

(۳۹) جزءافضل الاعمال:...... (غیر مطبوعہ)

افضل الاعمال کے بارے میں روایات بہت مختلف وارد ہیں اس لیے میں نے اس رسالہ میں ان سب روایات کو جمع کیا اور مشائخ نے ان میں جمع کے متعلق جو توجیہات کیں ان میں سے بھی اکثر نقل کی ہیں مگر رسالہ پورا نہ ہوسکا۔

(۴۰) جزءروایت الاستحاضہ:...... (غیر مطبوعہ)

استحاضہ کی روایات میں جو تعارض ہے وہ حدیث پڑھنے پڑھانے والوں سے مخفی نہیں۔ میرے حضرت قدس سرہٗ اعلی اللہ مراتبہ نے بذل المجہود کا باب الاستحاضہ لکھوانے کے بعد یوں ارشاد فرمایا تھا کہ استحاضہ کے ابواب میں ہمیشہ ہی اشکال رہا۔ خیال تھا کہ بذل المجہود میں سمجھ میں آ جائیں گے مگر اس میں بھی سمجھ میں نہیں آئے اور سچ فرمایا۔ کوکب لکھی، اوجز لکھی، لامع لکھی، لیکن پھر بھی حل نہ ہوئے۔ چنانچہ کوکب کے حاشیہ پر حمنہ بنت جحش کے قصہ میں بندہ نے اپنی ایک خاص رائے لکھی ہے جو سارے مشائخ اور شراح کی رائے کے خلاف ہے۔ میرے حضرت اقدس مدنی نور اللہ مرقدہٗ ایک دفعہ دیوبند سے صرف اس حدیث کی وجہ سے تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ ''صرف اس حدیث کی وجہ سے آیا ہوں، تم نے بات بہت معقول لکھی، مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کو یہ الہام سارے مشائخ سارے شراح کے خلاف کہاں سے ہوا، آپ کے حضرت نے بذل المجہود میں وہی لکھا جو سارے شراح لکھا رہے ہیں، ملا علی قاری شراح ترمذی سب ایک مضمون پر متفق ہیں، مگر آپ نے نیا مطلب کہاں سے نکالا، کوئی مستند اس کا آپ کے پاس ہے؟'' میں نے عرض کیا، مشکل الآثار طحاوی سے یہی مطلب مستنبط ہوتا ہے۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا، پھر تو بڑا قوی ماخذ ہے اور مشکل الآثار نکلوا کر دیکھی۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کوکب اور لامع کو قطب عالم حضرت گنگوہی کی وجہ سے اہتمام سے دیکھا کرتے تھے اور لوگوں کو ترغیب بھی دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بلکہ کئی دفعہ حضرت نے فرمایا: ''آپ نے کوکب کا حاشیہ لکھایا ہے، اوجز کا اشتہار دیا ہے، ہر مسئلہ میں والبسط فی الاوجز لکھتے ہیں، ایک دفعہ یہاں دیکھو، ایک دفعہ وہاں''۔

حدیث پاک میں چونکہ اس ناکارہ کی مرغے کی ایک ٹانگ بہت سی جگہ الگ رہی، اس لیے میرے حضرت مدنی قدس سرہٗ ان پر اکثر مراجعت فرمایا کرتے تھے۔ اعلی اللہ مراتبہٗ''۔

(۴۱) جزءرفع الیدین:...... (غیر مطبوعہ)

رفع الیدین مشہور مسئلہ ہے، اس ناکارہ نے ان سب روایات کو ایک جگہ جمع کیا اور ان پر تفصیلی کلام کا بھی ارادہ تھا، مگر مقدر سے پورا نہ ہو سکا۔

(۴۲) جزءالاعمال بالنیات:...... (غیر مطبوعہ)

یہ تو بڑی جامع حدیث ہے اور بہت سے مسائل اس سے ثابت ہوتے ہیں۔ اس رسالہ کی ابتداء بھی اسی حدیث سے کی گئی ہے۔ جس میں نمونے کے طور پر کچھ ذکر کیا گیا ہے۔

اپنی زندگی کے زمانہ میں اس حدیث پر بھی بڑا تفصیلی کلام شروع کیا تھا، کچھ لکھا بھی مگر پورا نہ ہوسکا۔

(۴۳) جزء اختلافات الصلوٰۃ:...... (غیر مطبوعہ)

مشکوٰۃ شریف پڑھانے کے زمانے میں میری تقریر کا خلاصہ یہ رہا کہ رفع یدین، فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، وغیرہ تین چار مسائل کی کیا خصوصیت ہے کہ جس پر یہ معرکے، مناظرے مجادلے، ہر جگہ ہوتے رہتے ہیں۔ اختلاف یہ ہے کہ رفع یدین سنت ہے یا عدم رفع، اسی طرح سے آمین بالجہر وغیرہ میں اسی نوع کے اختلاف ہیں۔ اس کے لیے میں نے نماز کی چار رکعتوں کے اختلاف جمع کرنے شروع کیے تھے۔ اس وقت دو سو سے زائد ہوگئے تھے، بعد میں ان پر اور اضافے بھی ہوئے۔

میں حدیث کے اسباق میں اولاً تو اجمالاً اسی فہرست سے یہ بیان کیا کرتا تھا کہ ان چار میں کیا خصوصیت ہے کہ یہ اعتقادیات کے درجہ میں ہوگئے اور اس کے بعد اسی رسالہ کی مدد سے ہر باب میں اس باب کے اختلافی مسائل کی تفصیل بیان کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد سے اس میں کچھ اضافہ بھی ہوتا رہا۔

(۴۴) جزء اسباب اختلاف الائمہ:...... (غیر مطبوعہ)

مظاہر علوم سے ایک رسالہ ''المظاہر'' کے نام سے مفتی جمیل احمد صاحب کی زیر ادارت نکلنا شروع ہوا تھا، اس میں اس ناکارہ کا ایک مضمون اس سلسلے کا شروع ہوا تھا کہ ''ائمہ اربعہ میں اتنا وسیع اختلاف کیوں ہے جب کہ سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اقوال وافعال ہی سے استدلال کرتے ہیں''۔

اس رسالے کے مختلف پرچوں میں تقریباً اسی (۸۰) صفحے اس مضمون کے شائع ہوچکے تھے، اس کے بعد مضمون تو اور بھی لکھا ہوا تھا مگر رسالہ ''المظاہر'' بند ہوگیا اور وہ شائع نہ ہوسکا۔ بیسیوں احباب کے خطوط اس زمانہ میں آئے کہ ہم نے یہ رسالہ تیرے مضمون کی وجہ سے شروع کیا تھا، اگر یہ مضمون کسی اور رسالہ میں شروع ہو رہا ہو تو اس کا پتہ لکھ دیں، ورنہ اس کو ایک مستقل رسالہ میں شائع کردیں۔

(۴۵) جزء المبہمات فی الاسانید والروایات:...... (غیر مطبوعہ)

احادیث کی اسانید میں بھی اور روایات میں بھی بہت سے نام مبہم آتے ہیں، اس ناکارہ نے ان سب کے نام دوسری احادیث سے تلاش کر کے لکھنے شروع کیے تھے اور اچھا خاصا ذخیرہ ہوگیا تھا،

ان میں ان مبہمات کو چھوڑ دیا گیا جو تہذیب، تقریب، تعجیل وغیرہ میں آ گئے ہیں۔

(۴۶) رسالہ التقدیر:......(غیر مطبوعہ)

ایک زمانے میں یہ مضمون رات دن دماغ میں چکر کھاتا تھا کہ آدمی کے مقدر میں جتنا ہوتا ہے اس سے زائد نہیں ملتا اور نہ اس سے کم ملتا ہے، مثلاً اگر کسی کے مقدر میں مرغیاں کھانا ہے وہ بہر حال مرغی کھائے گا۔ یا حضرت بن کر کھائے یا کما کر اپنے پیسوں کی کھائے یا لیڈر بن کر کھائے اور اگر کوئی ہنر بھی اس کے پاس نہیں تو وہ کسی رئیس یا اعلیٰ حاکم کا خانسامہ بنے گا۔ اس کی بہت سی جزئیات لکھی تھیں۔

جس کے مقدر میں جیل ہے وہ چوری یا ڈاکہ مار کر جیل میں جائے گا ورنہ سیاسی لیڈر بن کر جائے گا ہی، اکابر کے قصے بھی اس میں لکھے تھے اور تعویذوں کی بدولت ہر آنے والے کے گھر کے حالات بھی پوچھ لیتا تھا کہ کیا آمد ہے؟ کیا کھاتے ہو؟ اور وہ یہ سمجھ کر تعویز میں اسکی بھی ضرورت ہے سب بتا دیتا تھا۔ بڑی اونچی تنخواہوں والے بیماری کی وجہ سے حکیم ڈاکٹروں نے سب کچھ منع کر رکھا ہے۔ ابلی ہوئی دال یا بغیر گھی کا سالن وغیرہ وغیرہ۔ بغیر نام کے بہت سے قصے اس میں جمع کیے تھے۔

جس کے مقدر میں موٹر کی سواری لکھی ہے، وہ ہزار بارہ سو کما کر اپنی موٹر خریدے یا توفیق الٰہی سے حضرت جی بن جائے یا لیڈر یا پھر ڈرائیور۔ اس رسالہ کے پورا کرنے کا مجھے بھی ہمیشہ اشتیاق رہا، مگر مقدر نہ ہوا۔ اس میں واقعات بہت عبرت انگیز لکھے ہوئے ہیں جو اس زمانہ کے اخبارات سے بھی نقل کیے تھے۔

(۴۷) سیرت صدیق:......(غیر مطبوعہ)

یہ رسالہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی سوانح میں رسالہ "الصدیق" والوں کے اصرار پر جو غالباً مظاہر علوم ہی سے نکلتا تھا، لکھنا شروع کیا تھا، مسودہ تو بہت سا ہو گیا تھا، لیکن طباعت کی نوبت شاید ایک ہی آدھ پرچہ میں آئی، پھر وہ پرچہ ہی بند ہو گیا تھا۔ اس وقت تو نہ پرچہ یاد ہے نہ غالباً کہیں ملے گا۔ جتنا یاد تھا اتنا لکھوا دیا۔

(۴۸) رسالہ فوائد حسینی:......(غیر مطبوعہ)

حضرت اقدس سیدی وسندی شیخ الاسلام مدنی قدس سرہٗ کی تشریف آوری پر بسا اوقات علمی تذکرہ بھی ہوتا رہتا تھا، اس میں جو مضامین عالیہ بندہ کے نزدیک قابل حفظ ہوتے تھے ان کو رسالہ میں جمع کرتا رہتا تھا، بڑے اچھے مضامین ہیں، مگر پورا ہونے کی اور طباعت کی نوبت نہیں آئی۔

ان کے علاوہ اجزاء اور رسائل تو بہت سے ناقص و کامل لکھے ہوئے ہیں مگر علی گڑھ کے قیام میں جتنے ذہن میں آئے اور یاد رہے وہ تو لکھوا دیے، تاریخیں البتہ ان کی علی گڑھ میں چھڑا دی تھیں۔ وہ سہارنپور واپسی پر احباب نے اصل کتابوں سے دیکھ کر لکھ دیں، اس لیے کہ اس ناکارہ کو تو اب آنکھوں کی معذوری کی وجہ سے تلاش کرنا اور لکھنا مشکل ہے اور اسی وجہ سے بہت سے مسودات جو اس وقت یاد نہیں آئے رہ بھی گئے۔

اس کے بعد کاغذات میں سے عزیز عاقل سلمان اور مولانا یونس صاحب کو سرسری طور پر میرے جنگل میں سے جو ملے ان کو بھی نیچے درج کرا رہا ہوں۔

(۴۹) حواشی کلام پاک:...... (غیر مطبوعہ)

اسی تحریر میں کسی دوسری جگہ پر یہ گزر چکا ہے کہ اس ناکارہ کا معمول ۳۸ھ سے لے کر ۸۵ھ تک ماہ مبارک کی راتوں میں سونے کا نہیں تھا بغیر رمضان المبارک کے تو کلام مجید دیکھ کر پڑھنے کا وقت بہت ہی کم ملتا رہا، لیکن رمضان المبارک میں دو چار رمضانوں کے علاوہ تمام علمی کام سب بند ہو جاتے تھے اور قرآن پاک کے دیکھ کر پڑھنے کا معمول ماہ مبارک میں بہت اہتمام سے ہو جاتا تھا۔ تراویح کے بعد سے تہجد کے وقت ترجمہ کے تدبر و تفکر کے ساتھ پڑھنے کی نوبت آتی تھی اور اس میں جو اشکال پیش آتا تھا، اسی وقت تفاسیر سے مراجعت کر کے بین السطور کے حواشی پر لکھ لیتا۔ مگر افسوس کہ چار پانچ سال سے ان کے پڑھنے سے بھی معذور ہوں۔

(۵۰) حواشی الاشاعۃ...... (غیر مطبوعہ)

الاشاعۃ فی اشراط الساعۃ طلب علم کے زمانہ سے میرے پاس تھی اور میں نے اس کے ہر دو (۲) ورق کے درمیان میں ایک سادہ ورق لگوا کر جلد بندھوا رکھی تھی اور ۳۵ھ تک وقتاً فوقتاً اس پر حواشی کا اندراج اس کی مندرجہ روایات کا حوالہ اور فتح الباری وغیرہ سے جو کلام صاحب اشاعہ نے نقل کیا اس پر فتح الباری وغیرہ کے صفحات نیز اس کا کوئی مضمون کسی دوسری جگہ ملا تو اپنے حواشی پر لکھ دیا۔

(۵۱) حواشی وذیل التہذیب:...... (غیر مطبوعہ)

حافظ ابن حجر کی تہذیب، تقریب، تعجیل وغیرہ پر حواشی تو سب ہی پر لکھتا رہا، لیکن تہذیب التہذیب پر کثرت سے لکھے گئے اور ذیل التہذیب کے نام سے مستقل بارہ جلدیں مجلد کرا کر تہذیب کے موافق اس پر صفحے ڈال دیے تھے کہ اس پر تہذیب کا استدراک اور ذیل لکھا جائے، مگر تہذیب پر حواشی تو لکھنے کی زیادہ نوبت آئی مگر اس ذیل پر لکھنے کی نوبت کم آئی۔

(۵۲) حواشی اصول الشاشی، ھدایہ وغیرہ:...... (غیر مطبوعہ)

اصول الشاشی اس ناکارہ نے ابتداء ۳۵ھ میں پڑھائی، جیسا کہ تدریس کے نقشے میں گزر چکا ہے۔ اس کے بعد بھی ایک دو دفعہ پڑھانے کی نوبت آئی اور ہدایہ ابتداء شوال ۳۷ھ میں پڑھایا تھا اور اس کے بعد بھی تین چار بار پڑھانے کی نوبت آئی۔ ہر دفعہ میں اس پر حواشی کا اضافہ ہوتا رہا۔ اس ناکارہ نے جتنی کتابیں بھی پڑھائیں وہ اپنی ذاتی کتابوں میں پڑھایا۔ مدرسہ کی کتاب میں کوئی کتاب نہیں پڑھائی اور چونکہ لکھنے کا مرض شروع ہی سے ہے، اس لیے میری ہر کتاب پر جو میں نے پڑھائی، قلیل وکثیر حواشی موجود ہیں۔

(۵۳) حواشی مسلسلات:...... (غیر مطبوعہ)

مسلسلات کی ۶۴ھ سے تو مخصوص طلبہ دورہ حدیث کے بعد اجازت لیا کرتے تھے، لیکن ۵۲ھ سے وہ دورہ کے بعد ایک مستقل باضابطہ سبق بن گیا۔ اسی وقت سے بندہ نے اس کے حواشی بھی شروع کیے جو مسلسل بالصوفیہ میں آرہی تھیں۔ نقشہ بنا کر دوبارہ سہ بارہ طبع کرایا۔ حواشی کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی اور اس کے رجال پر مستقل کلام علیحدہ لکھا جس کو رجال المسلسلات کے نام سے موسوم کیا۔

(۵۴) جزء مکفرات الذنوب:...... (غیر مطبوعہ)

احادیث شریفہ میں جن جن اعمال کو کفارہ ذنوب بتایا ہے ان سب کا مجموعہ احادیث کو اختصاراً اجمالاً جمع کیا گیا ہے، تفصیل کا وقت نہیں ملا۔

(۵۵) جزء ملتقط المرقاۃ:...... (غیر مطبوعہ)

شوال ۴۱ھ میں جب پہلی مرتبہ مشکوٰۃ المصابیح مستقل پڑھانی شروع کی تو ۲۹ ذی الحجہ یوم الاثنین سے اس رسالہ کی ابتداء کی۔ اس میں مرقاۃ کو دیکھتے ہوئے جو خصوصی قابل حفظ مضمون ہوتے تھے، ان کو شذرات کے طور پر جو نمبر ۹ میں گزرے نوٹ کرتا رہتا تھا۔

(۵۶) جزء ملتقط الرواۃ عن المرقاۃ:...... (غیر مطبوعہ)

یہ رسالہ بھی اسی زمانہ میں ذیقعدہ ۴۱ھ کے آخری جمعہ کو شروع کیا تھا، اس میں ان رواۃ کو جمع کیا تھا، جن پر ملا علی قاری نے مرقاۃ میں کلام کیا ہے۔ پہلے جزء کا التقاط ۲۹ ذی الحجہ ۴۱ھ بروز دوشنبہ کو پورا ہوا۔

(۵۷) معجم المسند للامام احمد:...... (غیر مطبوعہ)

مسند امام احمد کی روایات ترتیب صحابہ پر ہیں جس میں حدیث کا تلاش کرنا بڑا مشکل ہے، اس

رسالہ میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے ان سب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روایات کی فہرست لکھی گئی ہے، جس میں ہر صحابی کی احادیث مع جلد وصفحہ درج کی گئی ہے، بہت مفید رسالہ ہے، جس سے احادیث کا نکالنا بہت آسان ہے۔

(۵۸) جزء المناط:......(غیر مطبوعہ)

احادیث میں مناط کا مسئلہ بہت اہم ہے اور ائمہ اربع کے اختلافات کا زیادہ مدار مناط ہی پر ہے، جس میں تنقیح المناط اور تحقیق المناط اور تخریج المناط کے ابحاث اور فروع ذکر کیے گئے ہیں۔

(۵۹) رسالہ مجدّدِ دین ملت:......(غیر مطبوعہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ میری امت میں ہر صدی میں ایک مجدد پیدا ہوگا۔ جس کے متعلق ہر زمانہ کے محققین نے اپنی اپنی تحقیق کے موافق اکابر امت میں جو مجدد کہے گئے ہیں ان کی فہرست لکھی ہے۔ اس رسالہ میں ان سب اکابر کے اقوال جو مختلف زمانوں میں مختلف اکابر نے لکھے ہیں، چودھویں صدی تک کے جمع کیے گئے ہیں۔

(۶۰) جزء صلوٰۃ الاستسقاء:......(غیر مطبوعہ)

(۶۱) وجزء صلوٰۃ الخوف:......(غیر مطبوعہ)

(۶۲) وجزء صلوٰۃ الکسوف:......(غیر مطبوعہ)

ان تینوں مسئلوں میں روایت میں بھی اختلاف اور تواریخ میں بھی اختلاف ہے کہ ان تینوں نمازوں کی ابتداء کب ہوئی اور کتنی مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی، کہاں کہاں پڑھی؟

ان تینوں رسالوں میں تینوں نمازوں کی روایت بھی جمع کی گئی ہیں اور اپنی طرف سے بعض روایات کو ترجیح بھی دی گئی ہے جن کا خلاصہ اوجز میں بھی آ گیا ہے۔

(۶۳) جزء ما قال المحدثون فی الامام الاعظم:......(غیر مطبوعہ)

یہ کئی جز کا رسالہ ہے جس میں حضرات امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی شان میں ائمہ محدثین کے اقوال جرح وتعدیل اور ان پر کلام نقل کیا گیا ہے۔

(۶۴) جزء تخریج حدیث عائشہؓ فی قصۃ بریرہؓ:......(غیر مطبوعہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی احادیث حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے قصہ میں مختلف وارد ہوئی ہیں۔ اس رسالہ میں ان سب کو جمع کیا گیا ہے تاکہ دیکھنے والے کو بیک نظر سب اختلافات معلوم ہو جائیں۔

(۶۵) تقریر نسائی شریف:......(غیر مطبوعہ)

یہ بہت مفصل تقریر ہے جو اس ناکارہ نے ۴ ربیع الثانی ۱۳۴۱ھ میں لکھنی شروع کی تھی اور ساعۃ مبارکہ آخر ساعت من یوم الجمعہ جمادی الثانی ۱۳۴۱ھ میں ختم ہوئی۔ اس میں وہ تقریر بھی آگئی جو میں نے حضرت قدس سرہ سے پڑھنے کے زمانے میں نقل کی تھی اور میرے والد صاحب کی دو تقریریں جو انہوں نے اپنے حضرت گنگوہی قدس سرہ سے نقل کی تھیں، ان کے علاوہ حضرت امام نسائی رحمہ اللہ تعالیٰ کے قال ابوعبدالرحمٰن کی شرح مفصل آگئی ہے۔ نیز اس کے لیے زہرالربیٰ اور سندھی علی النسائی بالاستیعاب دیکھی اور مدرسہ میں ابتداء میں احادیث کی کتابوں کے متعلق ہر کتاب کا ایک نسخہ برائے مدرس مخصوص ہوتا تھا، اسی میں حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نے پڑھایا اور ان ہی میں حضرت سہارنپوری اور دیگر مدرسین نے پڑھایا۔ نسائی شریف کے اس نسخہ پر قلمی حواشی بھی بہت ہیں، ان میں سے ما یتعلق بالکتاب کو بھی بندہ نے اپنی اس تقریر میں جمع کردیا ہے اور دیگر اکابر کی تقریریں جو مجھے ملیں ان سے بھی ما یتعلق بالکتاب کو اس تقریر میں جمع کیا گیا ہے۔ اس تقریر کو اکثر مدرسین نے نسائی شریف پڑھانے کے زمانے میں نقل بھی کیا ہے۔

(۶۶) جزء أمراء المدینۃ:......(غیر مطبوعہ)

اکثر روایات میں امیرِ مدینہ کی عبارت سے واقعات نقل کیے گئے ہیں: **قال امیر المدینہ کذا۔ فعل امیر المدینہ کذا** ۔ اس رسالہ میں امراءِ مدینہ کے ناموں کی تعیین اور ان کے امارت کے زمانہ کی ابتداء و انتہا جمع کی گئی ہے تاکہ واقعات میں امیر کی تعیین ہوسکے۔

(۶۷) جزء طرق المدینۃ:......(غیر مطبوعہ)

مدینہ منورہ سے مکہ کی طرف آنے کے لیے چار راستے مشہور و معروف ہیں، سلطانی، فرعی، غائر اور شرقی۔ اس رسالہ میں ان چاروں راستوں کی تفصیل اور ان کے منازل ذکر کیے گئے ہیں اور ان کے مختصر حالات بھی افسوس کہ رسالہ حجۃ الوداع کی تالیف کے وقت یہ رسالہ مل نہ سکا بعد میں ملا ورنہ اس سے بہت مدد ملتی۔

(۶۸) جزء ما یشکل علی الجارحین:......(غیر مطبوعہ)

ائمۂ جرح و تعدیل کے کلام میں بعض رجال کے متعلق جارحین کے کلام پر کچھ اشکالات پیش آتے ہیں اس رسالے میں ان اشکالات کو جمع کیا ہے۔

(۶۹) جزء الجہاد:......(غیر مطبوعہ)

جہاد کی تعریف، اس کے شرائط، امارت اور خلیفہ شرعی کی شرائط بیان کیے گئے ہیں۔

(۷۰) جزء النکحۃ :......(غیر مطبوعہ)

امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے نکاحوں کی تفصیل اور ان کے احوال اور ان عورتوں کا ذکر جن کے نکاح میں اختلاف ہے اور جن عورتوں سے خطبہ ہوا مگر نکاح نہیں ہوا ان کی تفاصیل اور آخر میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کا ذکر ہے۔

(۷۱) مشائخ تصوف:......(غیر مطبوعہ)

اکابر صوفیہ کے مختصر حالات۔ یہ رسالہ مشائخ چشتیہ کے علاوہ ہے۔ وہ تو مشائخ چشت کے ساتھ مخصوص تھا اور اس میں معروف صوفیاء کے حالات درج ہیں۔

(۷۲) اوّلیات القیامۃ :......(غیر مطبوعہ)

اس رسالہ میں وہ احادیث جمع کی گئی ہیں جن کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (اول ما یسئل یا اول مایفعل) فرمایا جیسے ''اول ما یحساب العبد یوم القیامہ الصلوۃ'' اور ''اول ما یقضی فی الدماء ۔اول الناس یقضی علیہ یوم القیامہ رجل استشھد الحدیث'' وغیرہ وغیرہ۔

(۷۳) مختصات المشکوٰۃ:......(غیر مطبوعہ)

مرقات میں یا دوسری شروح میں جو مضامین مشکوۃ شریف کی کتاب کے حل سے تعلق رکھتے تھے وہ اس رسالہ میں جمع کیے گئے ہیں، یعنی جو مضامین احادیث سے تعلق رکھتے ہیں وہ اس میں نہیں لیے گئے، بلکہ خاص وہ مضامین جو نفس کتاب سے متعلق ہیں، ان کو جمع کیا گیا ہے۔

(۷۴) رسالہ ردمودودیت:

۷۰ھ میں مودودیت کی کتابیں بہت ہی کثرت سے پڑھنے کی نوبت آئی۔ تقریباً تین رسائل اور کتب مودودی صاحب اور ان کی جماعت کی شب وروز جاگ کر پڑھیں اور یادداشتیں ایک رسالہ کی صورت میں جمع کی تھیں اور یہی رسالہ حضرت مدنی قدس سرہٗ کی اکثر تالیفات کا بھی مأخذ ہے اور قاری سعید صاحب کی تالیف ''کشفِ حقیقت'' کا بھی مأخذ ہے اور اس ناکارہ نے تقریباً پچاس بڑی تقطیع کے صفحات پر خود بھی ایک رسالہ لکھا تھا، باوجود اکابر اور احباب کے شدید اصرار کے طباعت کی نوبت نہیں آئی۔ یہ رسالہ میرے مسودات میں موجود ہے۔ بھائی اکرام کے ہاتھ کا نقل کیا ہوا ہے۔

(۷۵) مشرقی کا اسلام:......(غیر مطبوعہ)

عنایت اللہ مشرقی کا تذکرہ اور اس کی کتابوں کو بھی ایک زمانے میں بہت کثرت سے دیکھا اور

اس کی کفریات کو ایک رسالہ میں جمع کیا یہی رسالہ قاری سعید صاحب مفتی مظاہر علوم کے رسالہ مشرقی کا اسلام مطبوعہ کا مأخذ ہے۔

(۷۶) میری محسن کتابیں:

مولانا الحاج ابوالحسن علی ندوی نے ایک زمانہ میں اخبارات میں اس عنوان پر مضامین لکھوانے کا تقاضا کیا تھا اور اس ناکارہ پر تحریراً و تقریراً کئی دفعہ تقاضا کیا، اس پر اس ناکارہ نے زبانی تو یوں کہا تھا کہ ''میری محسن کتابیں تو ابا جان کا جوتا تھا'' لیکن ان کے اصرار پر ایک رسالہ اس سلسلے میں بھی تصنیف کرنا شروع کیا تھا، جس میں ہر دور کی اپنی پسندیدہ کتابیں لکھی تھیں، مضمون ناقص رہ گیا پورا نہ ہو سکا۔

(۷۷) نظام مظاہر علوم:

مولانا شبیر علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ جب مظاہر علوم کے ابتداءً سرپرست بنے تو انہوں نے مدرسہ کے سابقہ نظام کے متعلق تحریراً اور تقریراً بہت ہی معلومات دریافت کیں، اس کے جواب میں اس ناکارہ نے یہ بہت ہی اہم رسالہ لکھا تھا، جس میں میرے کئی ماہ تتبع اور تلاش میں بھی خرچ ہوئے تھے۔ بہت بڑی تقطیع کے تقریباً سو صفحے سے زائد تھے لیکن افسوس کہ اس سال مولانا مرحوم اولاً حجاز اور وہیں سے پاکستان تشریف لے گئے۔

اس رسالہ کے متعلق پاکستان پہنچنے کے بعد میں نے استفسار کیا تو مولانا مرحوم نے لکھا ''مجھے یاد نہیں وہیں متروکات میں رہ گیا ہوگا''۔ مولانا ظہورالحسن صاحب مقیم خانقاہ اشرفیہ اور مولانا عبدالوہاب صاحب مرحوم نائب مہتمم مظاہر علوم سے بھی دریافت کیا کہ شاید ان کے پاس ہو، نہ ملا۔ اس کی نقل میرے کاغزات میں بھی نہایت باریک میرے قلم کی لکھی ہوئی ہے، مگر وہ نمی کی وجہ سے ایک دوسرے سے چپک گئے۔ مظاہر علوم کی نہایت مستند بہترین ابتدائی تاریخ تھی جس کا مجھے بھی بے حد قلق ہے۔

مولانا شبیر علی صاحب ۲۳ ربیع الثانی ۶۳ھ میں سرپرست مقرر ہوئے اور شوال ۶۹ھ میں حج کو گئے اور وہاں سے مستقل پاکستان چلے گئے اور شب سہ شنبہ ۲۸ رجب المرجب ۸۸ھ کو انتقال ہو گیا رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

(۷۸) جامع الروایات والاجزاء:......(غیر مطبوعہ)

اس ناکارہ نے اپنی ابتداء زندگی میں جس کو میں ۳۵ھ کے بعد سے شروع سمجھتا ہوں اور ۸۸ھ پر ختم سمجھتا ہوں۔ کتب احادیث کے اطراف لکھنے شروع کیے تھے جن کی روایات کو جامع الروایات کے نام سے جمع کرنا شروع کیا تھا اور ان کی تفاصیل کو اجزاء کے نام سے لکھنا شروع کیا

تھا اور اس میں صحاح ستہ، موطئین، طحاوی، حاکم، بیہقی وغیرہ کے اطراف لکھنا شروع کیے تھے، بہت بڑا ذخیرہ اس کا ہو چکا تھا جس کو مشکوٰۃ کی ترتیب سے شروع کیا تھا، مشکوٰۃ تو پوری ہوگئی تھی، خیال تھا کہ جملہ حدیث کی کتابوں کو بھی نقل کروں، لیکن پھر زندگی ختم ہوگئی اس لیے اس کی تالیف ناقص رہ گئی۔ کاش کہ کوئی پوری کرنے والا ہوتا!

(۷۹) معجم رجال تذکرۃ الحفاظ للذھبی:...... (غیر مطبوعہ)

تذکرۃ الحفاظ چار جلدوں میں طبع ہوئی ہے اور ہر جلد کی فہرست الگ ہے اور اس میں بھی مشہور لقب اور کنیت سے رواۃ کو ذکر کیا گیا ہے، اس ناکارہ نے اس رسالے میں چاروں جلدوں کی ایک فہرست مرتب کی تھی جس میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے ناموں کی فہرست لکھی تھی اور ہر نام کو اس کے نام کے اعتبار سے اسی کے حرف میں لکھا تھا۔

(۸۰) تبویب تاویل مختلف الاحادیث لابن قتیبۃ:...... (غیر مطبوعہ)

ابن قتیبہ کی ''تاویل حدیث'' مشہور کتاب ہے مگر مبوّب نہیں ہے کیف ما اتفق احادیث کو جمع کر دیا ہے۔ اس ناکارہ نے ابوابِ فقہیہ کی ترتیب پر اس کی تبویب کی تھی جو ۵ جمادی الاول ۴۳ھ جمعہ میں لکھی گئی۔

(۸۱) تبویب مشکل الاثار:...... (غیر مطبوعہ)

امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی مشکل الآثار چار جلدوں میں ہے اور اس کی فہرست بھی مسلسل مضامین کے اعتبار سے غیر مرتب ہے۔ اس ناکارہ نے ان چار جلدوں کی فہرست کو ابوابِ فقہیہ کے اعتبار سے مرتب کیا تھا۔

(۸۲) معجم الصحابۃ التی اخرج عنہم، ابوداؤد الطیالسی فی مسندہ:...... (غیر مطبوعہ)

امام ابوداؤد طیالسی نے بھی مسند احمد کی طرح سے صحابہ کی روایات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مراتب کے اعتبار سے نقل کی تھیں جس سے وہی فائدہ اٹھا سکتا تھا جو مراتب صحابہ سے واقف ہو۔ اس ناکارہ نے ان سب صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روایات کی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے جمع کی۔

(۸۳) تبویب احکام القرآن للجصاص:

امام ابوبکر جصاص رازی قدس سرہ کی ''احکام القرآن'' کی فہرست قرآن پاک کی ترتیب کے موافق ہے، اس سے وہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جو حافظ قرآن ہو، اس لیے اس کے مضامین کو علیٰ

ترتیب ابواب الفقہیہ مرتب کیا گیا ہے۔

یہاں تک ختم کرنے کے بعد یہ باب تالیف کا ختم کرتا ہوں۔ اب تک ان ہی رسائل واجزاء کا پتہ چلا ہے، میرے اندازے میں پچیس تیس ابھی اور بھی ہیں، لیکن اپنی فضیلت کے اظہار کے واسطے اتنے بھی کافی ہیں، اللہ تعالیٰ اس ریا کاری کو معاف فرمائے، آج ۱۵ شعبان کو یہ نمبر ختم ہو رہا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آئندہ نمبر اور ابواب آج کے بعد لکھے جائیں گے، یہ تو شروع میں لکھوا چکا ہوں کہ علی گڑھ کے قیام میں آٹھ بابوں کا اجمالی خاکہ اور بہت سے مضامین تفصیل سے پورے ہو گئے تھے۔ چنانچہ باب سوم و چہارم بھی وہیں مکمل ہو چکے تھے اور بقیہ نمبروں کو بھی کچھ نہ کچھ لکھا جا چکا تھا، سہولت اور آپ بیتی نمبرا کی رعایت سے بقیہ نمبروں کو بھی مختصر کرنے کا خیال ہے۔

......☆☆☆☆☆......

آپ بیتی نمبر ۳

یا

یادِ ایام نمبر ۲

جس میں

عارفِ کبیر، شیخ الحدیث، حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی قدس سرہٗ کی بعض مخصوص عاداتِ مبارکہ، حوادث وشادیوں میں آپ کا طرزِ عمل نیز اپنے بعض اکابر کے حوادثِ انتقال کا تفصیلی تذکرہ اور بعض عجائبات قدرت کے مشاہدات نہایت مؤثر انداز میں مذکور ہیں۔

ناشر

مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ، شاہ فیصل کالونی نمبر ۴ کراچی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

نَحۡمَدُهٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِهِ الۡکَرِیۡمِ ط

یہ رسالہ آپ بیتی نمبر۳ یا یادِ ایام نمبر۲ سلسلہ کا دوسرا رسالہ ہے اس سے پہلے رسالہ کی تمہید میں لکھا جاچکا ہے کہ اس ناکارہ نے اپنے قیام علی گڑھ کے دوران آٹھ ابواب پر مشتمل مضامین کا ایک اجمالی خاکہ لکھوایا تھا، یہاں آکر جب ان کو صاف نقل کرایا تو وہ ایک طویل مضمون ہوگیا۔ جس کی وجہ سے اس کو چار نمبروں پر تقسیم کرنا پڑا، ہر نمبر میں دو باب ہیں۔

باب اول: ''اعمال کا مدار نیتوں پر ہے''

باب ثانی: ''درس وتدریس اور تالیفات''

رسالہ نمبر۱ میں گزر چکے ہیں۔ زیرِ نظر رسالہ نمبر۲ میں بھی دو باب ہیں۔

باب سوم: ''میری چند بری عادتیں''

باب چہارم: ''حوادث اور شادیاں اور ان میں میرا طرزِ عمل''

بقیہ ابواب انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد شائع ہوجائیں گے۔

فقط والسلام

محمد زکریا کاندھلوی

۵ صفر ۱۳۹۱ھ

باب سوم

اِس سیہ کار کی چند بُری عادتیں

میں ہی کرتا ہوں گلہ اپنا، نہ سن غیروں کی بات
وہ یہی آخر کہیں گے اور کیا کہنے کو ہے

(۱)......مہمان بالخصوص خصوصی اور اہم یا محض اجنبی آنے والوں سے یہ سوال کہ کیا نظامِ سفر ہے یا کب تک قیام ہے؟ ایک مستقل معمول ۳۵ھ سے ہے اور یہ چیز میں نے میرٹھ کے اکابر سے سیکھی تھی، عالی جناب الحاج فصیح الدین صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی الحاج وجیہ الدین صاحب کے مخلص دوست میرے حضرت مرشدی نور اللہ مرقدہٗ کے بڑے مخلص خادم الحاج رشید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ جن کے متعلق محاسن وخوبیوں کا بہت بڑا دفتر چاہیے، مختصر یہ ہے کہ ان کے وصال کے بعد جب حضرت اقدس مولانا الحاج عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ چاٹگام تشریف لے گئے اور ان کے مزار پر پہنچے تو واپسی میں مجھ سے بلاواسطہ خصوصی تعلقات رہے، مگر مزار پر پہنچ کر اس قدر انوار وبرکات دیکھے کہ میں حیرت میں رہ گیا۔ میرے اکابر اربعہ حضرت اقدس سہارنپوری، حضرت اقدس تھانوی، میرے والد صاحب، میرے چچا جان حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مراقدہم ہر ایک سے اس قدر محبانہ اور محبوبانہ تعلق تھا کہ کہیں موقع ہوا تو دو چار قصے ان کی اہم خصوصیات کے بھی کہیں آجائیں گے۔ اس وقت تو میں یہ لکھوا رہا تھا کہ ۳۵ھ سے میں نے اپنے حضرت قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ کا یہ معمول دیکھا کہ جب بھی دہلی، خورجہ، امروہہ، اجراڑہ بلند شہر وغیرہ کسی بھی ایسی جگہ جانا ہوتا کہ جہاں میرٹھ راستے میں پڑے تو ناممکن تھا کہ میرٹھ آتے یا جاتے اترے بغیر حضرت کا سفر پورا ہو جائے اور یہ خادم بھی اکثر اسفار میں حضرت کا ہم رکاب رہتا تھا۔ ان میں سے حضرت کی تشریف بری کی اگر پہلے سے اطلاع ہوتی تو یہ سب چھاؤنی یا شہر کے اسٹیشن پر ملتے اور بسا اوقات حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کو اپنے غایت تعلق کی وجہ سے بغیر اطلاع دے دیئے بھی جانے کی نوبت آجاتی۔ خان بہادر الحاج فصیح الدین صاحب تاجرِ اسلحہ مالک الٰہی بخش اینڈ کو چھاؤنی میرٹھ ان سب کے بڑے تھے، حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ سیدھے ان کی کوٹھی پر تشریف لے جاتے اور یہ سب خبر سنتے ہی دوڑے ہوئے آتے اور مصافحہ کے ساتھ ہر ایک کا پہلا سوال یہ ہوتا کہ حضرت کیا نظامِ سفر ہے؟ مجھے اس وقت بہت غصہ آتا، بڑے مہمل لوگ ہیں، مصافحہ نہیں، خیریت نہیں، پہلا سوال کہ کب جاؤ گے؟ مگر ان دوستوں کا سوا بڑے ہی اخلاص پر مبنی تھا،

جیسا کہ اس کے اگلے نمبر پر آ رہا ہے۔ میں نے اس کو اپنی بری عادت میں شمار کیا، اس لیے کہ میرا سوال تو اخلاص پر مبنی نہیں ہوتا، خود غرضی پر مبنی ہوتا ہے، مگر ان کا واقعی اخلاص پر جیسا آگے آ رہا ہے۔

مہمان سے سوال کہ قیام کب تک ہے اس کا ماخذ:

اس کے بعد میں نے حضرت حکیم الامت حضرتِ اقدس تھانوی قدس سرہ کے معمولات میں بھی یہ چیز پڑھی اور سنی ہے کہ حضرت خاص مہمان سے نظام سفر معلوم کر لیتے۔ اس میں بڑی مصلحت معلوم ہوئی کہ ہر آنے والے کے متعلق اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کب تک قیام ہے تو اپنی سہولت اور اس کی سہولت کے اعتبار سے بالخصوص مشغول لوگوں کے لیے وقت نکالنے کی گنجائش ہو جاتی ہے۔ اس کے خلاف میں بسا اوقات دقتیں بھی اٹھائیں کہ لوگوں نے عین سبق کے وقت یا کسی ضروری کام کے درمیان میں کہا کہ اسی وقت جانا ہے اور ایک ضروری کام سے آئے تھے، اس وقت اپنے اوپر بہت غصہ آتا ہے کہ آتے ہی کیوں نہ پوچھ لیا۔ اگرچہ اس میں بعض دفعہ بعض لوگوں کی جہالت سے نامناسب چیزیں پیدا ہوئیں۔ ایک صاحب کا قریب دو (۲) برس ہوئے ایک خط آیا، اس قسم کے خطوط تو مختصر مفصل آتے ہی رہتے ہیں، مگر یہ عجیب تھا اس نے لکھا کہ "میں ایک ہفتہ قیام کے ارادے سے تیرے پاس آیا تھا، تو نے اجازت نہ دی، روتا ہوا واپس چلا آیا، جب سے طبیعت بے چین ہے۔" میں نے لکھا کہ "مجھے تو بالکل یاد نہیں آیا کیوں اجازت نہ دی، تم ہی لکھو تو یاد آئے کہ میں نے کس بات پر تم کو جانے کو کہہ دیا"؟ اس کا جواب اس شخص نے لکھا کہ میرا ارادہ ایک ہفتہ قیام کا تھا، تو نے جاتے ہی، مصافحہ پر پوچھ لیا "کب تک ٹھہرو گے"؟ میرے منہ میں جلدی سے دو (۲) دن نکل گئے، پھر دو دن بعد روتا ہوا چلا آیا، میری ہمت نہ پڑی۔ میں نے اس کو ڈانٹ کا خط لکھا کہ "قصور اپنا الزام مجھے دیتے ہو، میں نے کب جانے کو کہا تھا"؟

اس نوع کے کئی لطیفے اور بھی پیش آئے، لیکن اس قسم کے لطائف کے مقابلے میں سہولتیں زیادہ ہیں۔

(۲)...... یہ نمبر حقیقت میں نمبر ا کا تکملہ ہی ہے اور یہ بھی میں نے میرٹھ کے اکابر ثلاثہ ہی سے سیکھا ہے جس کا اوپر ذکر آیا اور یہی وہ بات تھی جس کو میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ ان کا یہ فعل اخلاص پر مبنی تھا۔

حضرت اقدس کا عام معمول یہ تھا کہ شام کی گاڑی سے پہنچتے تو رات کے قیام کے بعد صبح کی گاڑی سے آگے روانہ ہو جاتے، چاہے سہارنپور کی طرف یا دوسری طرف جدھر جانا ہو۔ یہ احباب جب حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ سے نظام پوچھ لیتے تو اسی مجلس میں ذرا الگ ہو کر تینوں کہتے "شام کا کھانا تمہارے یہاں، صبح کا ناشتہ فلاں کے ہاں اور روانگی کے وقت ناشتہ دان میں توشہ فلاں کے یہاں۔ اس میں ذرا بھی ایک منٹ کو بھی تاخیر نہ ہو"۔ فوراً تینوں کا مرحلہ طے ہو جاتا، کبھی کبھی آپس میں تغیر بھی ہو جاتا، اس وقت مجھے دقت ہے صبح کا ناشتہ میرا، دوسرا کہتا بہت اچھا، البتہ ریل کا ناشتہ

اس وقت میں ہوتا جب سہانپور کی طرف آمد ہوتی۔ اگر دوسری طرف جانا ہوتا تو راستے کا ناشتہ نہ ہوتا، مگر تیسرے نمبر کی قضا اس وقت متعین ہو جاتی کہ اگلی آمد میں پہلا وقت ان کا۔

مجھے کبھی یاد نہیں کہ ان اکابر میں سے کبھی کسی نے یوں کہا ہو کہ ”حضرت! ایک گاڑی مؤخر کر دیں“۔ یہ ادا مجھے ان لوگوں کی بہت پسند آئی۔ اللہ بہت ہی جزائے خیر دے اور اس حرکت نے مجھے بہت ہی بدنام کیا۔ میرے اکثر اکابر کے کئی کئی واقعات بہت ہی کثرت سے پیش آئے، صرف نمونہ کے واسطے تین بزرگوں کے تین واقعے لکھواتا ہوں۔

(۳) (الف)...... سب سے پہلے مولانا الحاج ابوالحسن علی میاں صاحب زادمجدہم جب ان کی آمد ہمارے نواح میں شروع ہوئی، جس کو یہ حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ چچا جان الحاج مولانا محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح میں بار بار لکھ چکے ہیں، رائے پور کی حاضری کے لیے سہارنپور تو جنکشن تھا اور مولانا دام مجدہم اپنے تعلق اور محبت کی وجہ سے ایک دو روز ٹھہر کر رائے پور جایا کرتے۔ چند مرتبہ کی آمد و رفت میں علی میاں نے حضرتِ اقدس رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کو ایک خط لکھا، جس کا تذکرہ علی میاں نے تو مجھ سے نہیں حضرتِ اقدس رائے پوری نوراللہ مرقدہ نے خود علی میاں کا خط اور اپنا جواب مجھے سنایا۔ علی میاں نے حضرتِ اقدس کی خدمت میں یہ خط لکھا کہ ”جب سہارنپور جانے پر زکریا سے ملاقات ہوتی ہے تو اس قدر محبت اور شفقت سے ملتا ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت ہی اشتیاق و مسرت ہو رہی ہے۔ لیکن جب بھی ذرا برسبیلِ تذکرہ ہی جانے کا ذکر آیا ایسی جلدی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے جس سے معلوم ہو ہے کہ بہت ہی بوجھ ہو رہا تھا“۔ علی میاں نے حضرت کو لکھا کہ ”کئی مرتبہ صرف خیال کے درجے میں آنے کا ذکر کیا اور ان سے کہا کہ خیال یہ ہے کہ اس گاڑی سے چلا جاؤں اور انہوں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیے، تو اس کے مصافحے کی پیش قدمی پر ارادہ کر لینا پڑا“۔ یہ بھی لکھا کہ ”کئی مرتبہ ریل پر آنے کے بعد شدید تقاضا واپسی کا پیدا ہوا، مگر اس خیال سے واپس نہ گیا کہ مصافحہ کر کے واپس آ گیا ہوں اب کس منہ سے واپس جاؤں“۔ حضرتِ اقدس نے علی میاں کو جواب لکھا کہ ”آپ اس کا بالکل خیال نہ کریں، اس کے شکار آپ تنہا ہی نہیں ہیں ہم سب ہیں“۔

اس سیہ کار کے اس نوع کے واقعات میرے دو (۱) مخدوم (۲) آقا حضرت رائے پوری، حضرت مدنی نوراللہ مرقدہما کے ساتھ بارہا پیش آئے، جیسا کہ حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے علی میاں کو لکھا کہ ”ہم سب اس کے شکار ہیں“۔ بالکل صحیح تحریر فرمایا۔

(۴) (ب)...... حضرت اقدس رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت مدنی کے ساتھ بارہا اس قسم کے واقعات مجھ گستاخ بے ادب کے پیش آئے، حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہ کا

معمول ۴۶ھ سے حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی طویل بیماری شوال ۴۷ھ جو منصوری پر ہوئی تھی، ہر ماہ تین دن کے لیے سہارنپور تشریف لانے کا رہا اور جب یہ طویل علالت شروع ہوگئی تو حضرت قدس سرہ کا یہ پیام پہنچا کہ ''صحت میں کوئی مہینہ تیرے پاس آنے میں نہیں چھوڑا، اب ملاقات تیرے اختیار کی چیز ہے''۔ اسی ارشاد نے اس سیہ کار کو مجبور کیا کہ جس زمانے میں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کا قیام بہٹ میں شاہ مسعود کی کانگرو والی کوٹھی پر رہا میں شام کو ہمیشہ حدیث پاک کا سبق پڑھانے کے بعد بہٹ جاتا تھا، مغرب تک کوٹھی پر پہنچتا، شب وہاں گزار کر صبح کی نماز کے بعد سہارنپور آجاتا۔ جس زمانے میں حضرت اقدس کی ماہانہ تشریف آوری کا دور تھا تیسرے دن رات کو بہٹ سے کار آجاتی اور علی الصباح چائے کے بعد حضرت تشریف لے جاتے تھے۔

(۱)...... ایک مرتبہ حسبِ معمول حضرت اقدس تشریف لے جارہے تھے سامان بند چکا تھا، حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ مصافحوں سے فراغ پر تشریف بری کے لیے اٹھ رہے تھے، میرے بچے طلحہ نے جب کہ اس کی عمر غالباً تین سے چار سال کے درمیان ہوگی، حضرت قدس سرہ کے کرتہ کا پلہ پکڑ کر اپنے بچپن کی وجہ سے کہا ''حضرت آج نہیں''۔ ''حضرت فوراً چبوترے پر بیٹھ گئے''، بھائی الطاف سے کہا ''سامان کھول دو، آج نہیں جانا ہے''۔ میں نے ہر چند اصرار و تقاضا کیا کہ ''حضرت یہ نا سمجھ بچہ ہے، اس کو خبر نہیں کہ میں نے کیا کہا ہے؟ بھائی الطاف! سامان ہرگز نہیں کھلے گا''۔ میرا تو بار بار یہ اصرار اور حضرت کا بار بار یہ ارشاد کہ ''سامان کھول دو میں نہیں جاؤں گا''۔ حضرت نے فرمایا کہ ''اس گھر میں آج تک کسی چھوٹے بڑے کی زبان سے ''آج نہیں'' کا لفظ میں نے سنا ہی نہیں، آج پہلی دفعہ کان میں پڑ رہا ہے''۔

میرے دونوں حضرات رائے پوری اور مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس قسم کے واقعات میرے بیسیوں نکلیں گے۔

سہارنپور کا تبلیغی اجتماع:

(۲)...... حضرت رائے پوری قدس سرہ کے ساتھ اس وقت ایک اور اہم واقعہ یاد آگیا، جس کو عزیز محمد ثانی نے سوانح یوسفی صفحہ ۳۲۲ پر مختصر طور پر لکھا ہے۔ ۲۴ شوال ۷۳ھ میں سہارنپور کا تبلیغی اجتماع ہوا تھا۔ حضرت قدس سرہ بھی پاکستان سے دہلی ہوتے ہوئے ۲۶ھ شوال کو سہارنپور میں پہنچے۔ مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات شب کے اجتماع کی تقریروں سے فراغ پر سب ریل پر پہنچ گئے، ریل سے حضرت کی تشریف آوری ہوئی۔ میں نے مصافحہ کے ساتھ پوچھا ''حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نظام کیا ہے؟ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''کل پرسوں دو (۲) دن بعد سہارنپور طے کر کے آیا ہوں، تیسرے دن جیسا آپ کا ارشاد ہو''۔ میں نے عرض کیا ''کل کے

قیام کی بھی اجازت نہیں، صبح کی اذان کے بعد اپنی جماعت کریں چائے تیار ملے گی، مدرسہ کی جماعت سے پہلے تشریف لے جائیں"۔ حضرت نے فرمایا "تکان ہو رہی ہے ایک دن قیام کی تو ضرور اجازت دے دیں"۔ میں نے عرض کیا "صبح کی اذان کے بعد آدھے گھنٹہ کی بھی اجازت نہیں"۔ تبلیغی احباب کو جتنا غصہ آنا چاہیے تھا وہ قرین قیاس تھا، مجھے الطاف بھائی کا غصہ ہمیشہ یاد رہے گا، بہت ہی غصہ آیا کہ دنیا تو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے ٹھہرنے کی خوشامد کرے اور یہاں حضرت خود فرمادیں اور یہ یوں کہے کہ نہیں۔ سب کی مخالفتوں کے باوجود صبح کی اذان کے بعد میں نے روانہ کر دیا۔ میں نے حضرت سے عرض کیا "جون کا مہینہ، گرمی کی شدت، ہمارے یہاں راحت کی کوئی جگہ نہیں اور یہ تبلیغ والے کل رات کو جلسے میں تھوڑی دیر کی خواہش وتمنا اور مجھ ہی سے درخواست کرائیں گے، پرسوں صبح کو ہمارا جلسہ ختم ہو جائے گا، ظہر کے وقت میں اور عزیز یوسف رائے پور حاضر ہوں گے، دو دن قیام کریں گے"۔ کار میں بیٹھنے کے بعد شاہ مسعود نے بہت قیام کی درخواست کی، حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ "جب شیخ نے سہارنپور نہ ٹھہرنے دیا، تو اب کہیں نہیں ٹھہرتا"۔ طلوع آفتاب تک رائے پور پہنچے۔ رائے پور کے پہنچنے کے بعد دو دن تک ہر آنے والے سے سنتا رہا اور خوب سنا کہ حضرت قدس سرہٗ نے اتنی **لا تعدو لا تحصیٰ** دعائیں دی اور ہر آنے والے سے رائے پور کا ہو یا دیہات کا فرماتے کہ "میرا تو دو دن قیام کا ارادہ تھا مگر شیخ نے نہ مانا، محبت اس کا نام ہے، محبت کرنا بھی کوئی ان ہی لوگوں سے سیکھے، کیا عقل میں آئے کہ حضرت شیخ کا دل نہ چاہتا ہوتا، مگر میری راحت کو اپنی خواہش پر غالب کر کے دکھلا دیا۔ اللہ تعالیٰ بہت بلند درجے عطا فرمائے، اللہ تعالیٰ ان کو بھی ایسی ہی راحت دے، اللہ یوں کرے۔ اللہ یوں کرے"۔ دو دن تک وہ دعائیں ملیں کہ اب تک بھی جب کبھی اپنی زبردستی کا خیال آجاتا ہے دل خوش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں اور عزیز مولانا یوسف مرحوم جلسہ کے اختتام پر منگل کی دوپہر کو رائے پور حاضر ہوئے۔

حضرت مدنی کا بندہ کے ساتھ تعلق اور اثناء اسفار میں تشریف آوری کا اہتمام:

(ج)...... پہلے دو قصے بلکہ تین، ایک علی میاں کا، دوسرا حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ کے لکھوا چکا ہوں۔ میرے حضرت سیدی وسندی، ماوائی وملجائی، شیخ الاسلام حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ قدس سرہٗ اعلیٰ اللہ مراتبہ کو جو شفقت ومحبت اس سیہ کار پر رہی اس کے دیکھنے والے سینکڑوں نہیں ابھی تک ہزاروں آنکھیں موجود ہیں، حضرت قدس سرہٗ کا ہمیشہ مستقل اور مستمر معمول یہ رہا کہ دیوبند سے رڑکی لائن پر جاتے ہوئے سہارنپور کے قصبات میں کسی جگہ جاتے ہوئے اگر ایک گھنٹہ کا وقفہ بھی ملتا تھا تو واپسی کا تانگہ لے کر ضرور کرم فرماتے تھے، ہر چند کہ میں بار بار تکلیف کے خیال سے گستاخانہ لہجے میں نکیر بھی کرتا۔ سینکڑوں واقعات اس کے گزرے،

جو اصل واقعہ اس جگہ لکھوانا ہے وہ تو آگے آرہا ہے، بیچ میں ایک چھوٹا سا فقرہ لکھواتا ہوں۔

(۱) ایک مرتبہ دسمبر کا زمانہ، سردی زور پر، بارش اس سے بھی زیادہ، ساڑھے گیارہ بجے رات کے میں اپنے مکان کے دروازے پر کتاب دیکھ رہا تھا، دروازے ہی میں سویا کرتا تھا۔ زنجیر زور سے کھٹکی، پوچھا ''کون ہے؟'' ارشاد ہوا ''حسین احمد''۔ ننگے پاؤں اٹھ کر کواڑ کھولے اور تعجب سے پوچھا ''حضرت اس وقت بارش میں؟'' ارشاد ہوا کہ لکھنؤ جانا ہے، کلکتہ میل دو گھنٹہ لیٹ ہے۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ تم جاگ رہے ہو گے، اس لیے خیال ہوا کہ تمہارے درشن کر آؤں۔ میں نے نہایت گستاخی سے کہا، ان مبارک ہونٹوں سے یہ لفظ بڑا ثقیل ہے، میں نے چائے کی درخواست کی، فرمایا ریل پر جا کر پیوں گا، چائے پی کر بارش میں جانا پڑے گا، تانگہ بھی باہر بھیگتا رہا اور حضرت ایک گھنٹہ تشریف فرما کر کچھ خصوصی ارشادات فرما کر تشریف لے گئے۔

یہ بات تو بیچ میں آ گئی تھی، سینکڑوں واقعات اس نوع کے پیش آئے، ان کے لیے ایک ''الف لیلہ و لیلہ'' چاہیے۔

بندہ کے ساتھ حضرت مدنی کے ہمرکابی میں اطراف سہارنپور کے اسفار:

اس وقت جو قصہ مقصود تھا، وہ بھی ایک عجیب ہے۔ دسمبر کی رات، حضرت قدس سرہ آبھہ ایک گاؤں نانوتہ کے قریب تشریف لے گئے تھے، ویسے تو اس زمانے کا اکثر یہ معمول تھا کہ حضرت ضلع سہارنپور کے کسی قصبے یا گاؤں میں جاتے تو سٹیشن سے کار میں سیدھے میرے گھر تشریف لاتے، مجھے کار میں بٹھا کر اپنے ہمراہ لے جاتے تھے، تین چار گھنٹے کا سفر ہوتا تھا، واپسی میں مجھے مکان پر اتار کر اسی کار میں اسٹیشن تشریف لے جاتے اور وہاں سے ریل میں، اکثر دیوبند سے سہارنپور کا سفر آمد و رفت کا ریل میں ہوتا اور سہارن پور کے اسٹیشن سے اسٹیشن پر واپسی تک کار میں آبھہ، نانوتہ، بہٹ، رائے پور، گنگوہ کے سفر میں اکثر معیت رہی۔ ریڑھی تاجپورہ کے سالانہ جلسے کا تو خاص مستمرہ دستور تھا کہ حضرت قدس سرہ شام کو چار بجے کی گاڑی سے دیوبند سے تشریف لاتے، چائے نوش فرماتے، عصر کی نماز مدرسہ کی مسجد میں پڑھ کر کار میں ریڑھی جاتے، مغرب وہاں پڑھ کر ایک گھنٹہ آرام فرماتے، اٹھنے کے بعد کھانا نوش فرماتے۔ یہ ناکارہ دسترخوان پر تو شریک ہوتا لیکن کھانے میں شریک نہ ہوتا، اس لیے کہ رات کو کھانے کا معمول نہیں تھا۔ عشاء کے بعد مدرسہ کے جلسہ میں پورے بارہ بجے تک وعظ فرماتے، پورے بارہ بجے وعظ ختم کر کے تقریباً آدھا گھنٹہ مصافحوں میں لگتا اور کار میں مجھے بٹھا کر میرے دروازے پر چھوڑ کر اسی کار میں سٹیشن تشریف لے جاتے اور ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے دیوبند اور علی الصباح مدرسہ کا سبق۔

حضرت کے سفر آبھہ کا واقع سردی اور بارش:

(۲)......اصل واقعہ دسمبر والا جو لکھنا شروع کیا تھا وہ مؤخر ہوتا جارہا ہے۔ایک مرتبہ آبھہ کار میں تشریف لے گئے۔معلوم نہیں کہ یہ ناکارہ ساتھ کیوں نہیں تھا؟ غالباً مدرسہ کی کوئی ضرورت تھی۔ دوسرے دن مغرب کے بعد حضرت قدس سرہ آبھہ سے واپس تشریف لائے، اس قدر زوردار طوفانی بارش کہ کمرہ سے باہر پاؤں رکھنا مشکل، اتنی ہی زوردار سردی اور حضرت قدس سرہ کو شدت سے بخار، آتے ہی فرمایا کہ مغرب نہیں پڑھی ہے، راستے میں دیر ہوتی چلی گئی، کہیں اترنے کی جگہ نہیں ملی، مشلح وغیرہ سب بھیگ رہا ہے، میں نے جلدی سے لنگی پیش کی، کپڑے اتارے، لنگی اور چادر میں حضرت نے مغرب کی نماز پڑھی، دو تین خادم بھی ساتھ تھے، اتنے حضرت نے نہایت ہی اطمینان سے مغرب کی جماعت کرائی، میں نے دو انگیٹھیاں بھروا کر منگوائیں اور عزیزم مولوی نصیر الدین کو اللہ بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے، دارین کی ترقیات سے نوازے اور ان چیزوں کے ثمرات وہ خود بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، وہ بغیر کہے چائے تیار کر کے لے آیا، چائے کی پیالی پیش کی گئی اور میں نے اپنی بری عادت کا مظاہرہ کیا۔کار تو سہارنپور تک ہی گئی تھی، وہ حضرت کو اتار کر چلی گئی، میں نے عرض کیا ''حضرت نظام سفر''؟ ارشاد فرمایا کہ ''خیال یہ ہے کہ اسی وقت ساڑھے دس کی گاڑی سے چلا جاؤں''۔ میں نے عرض کیا ''بہتر ہے''۔مگر ایک منٹ سکوت کے بعد میں نے عرض کیا ''حضرت بارش بڑی زور کی ہو رہی ہے، سردی بھی زوروں پر ہے، بخار بھی شدت سے ہے، معلوم نہیں دیوبند اس گاڑی کی اطلاع بھی ہے یا نہیں''؟ حضرت نے یہ ارشاد فرمایا کہ ''اطلاع تو نہیں ہے، لیکن اگر سواری نہ ملی تو اسٹیشن کی مسجد میں لوگ رہتے ہیں''۔میں نے عرض کیا جیسے ارشاد ہو مگر اس وقت میں اور صبح چھ بجے میں کوئی زیادہ فرق تو ہے نہیں۔حضرت قدس سرہ نے نہایت تبسم سے جن کو اب یاد کر کے رونا آتا ہے (از کاتب الحروف: یہ لفظ لکھواتے وقت شیخ کی آنکھوں میں سے پانی نکل پڑا) یہ ارشاد فرمایا ''فرق تو کچھ نہیں ہے میں یہ دیکھ رہا تھا کہ آپ ان حالات میں کیا ارشاد فرمائیں گے''؟ میں نے عرض کیا ''وہ تو حضرت نے ملاحظہ فرمالیا۔میں عرض کر چکا ہوں کہ بہتر ہے جیسی آپ کی رائے ہو''۔اس پر حضرت قدس سرہ نے ارشاد فرمایا کہ ''نہیں صبح ہی کو جاؤں گا، صرف تمہیں دیکھنا تھا''۔بہت سے واقعات ہیں اس نوع کے۔

حضرت مدنی کی لکھنؤ سے واپسی:

(۳)......ایک مرتبہ حضرت لکھنؤ سے آرہے تھے، حضرت کا ہمیشہ معمول یہ رہا کہ اگر وقت میں ایک گھنٹہ کی بھی یا زائد کی گنجائش ہوتی تو خود مکان پر تشریف لاتے ورنہ تار لکھنؤ یا مرادآباد سے

ضرور دیتے اور یہ ناکارہ اگر وقت پر تار پہنچ جاتا تو اسٹیشن پر ضرور جاتا، فسادات کے زمانے میں اسٹیشن پر سکھوں کی کار میں پندرہ روپے پر اسٹیشن گیا ہوں۔ البتہ جب تار ہی بعد میں پہنچتا تھا تو معذوری ہوتی۔ ایک مرتبہ حضرت قدس سرہ لکھنؤ سے تشریف لا رہے تھے، گیارہ بجے رات کو تار ملا، میں اسی وقت ریل پر حاضر ہوا، بارہ بجے گاڑی آئی، میں نے مصافحہ کے ساتھ پوچھا، ''حضرت! نظام''؟ یوں فرمایا ''اسی وقت ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے دیوبند جانے کا ارادہ ہے''۔ میں نے عرض کیا ''وہاں کوئی اطلاع ہے''؟ فرمایا ''وہاں کوئی اطلاع نہیں دی ہے کہ تار دیر میں پہنچتا ہے''۔ میں نے پوچھا ''اس وقت دیوبند اسٹیشن پر سواری ملے گی''؟ ارشاد فرمایا ''نہیں''۔ میں نے کہا ''تو پھر مدرسہ تشریف لے چلیے''۔ ارشاد فرمایا کہ ''تم اپنے اصولوں کے خلاف کیوں کہتے ہو''؟ میں نے عرض کیا ''حضرت! میرا اصول اکابر اور مہمانوں کے واسطے ہے کوئی مصیبت کے واسطے نہیں''۔ حضرت نے خوب تبسم فرمایا اور مدرسہ تشریف لے آئے۔۔۔۔۔۔۔ اللہ میرے سارے ہی بزرگوں کو عالی مراتب نصیب فرمائے۔ جتنی جتنی میں نے بے ادبیاں، گستاخیاں اپنے اکابر کی شان میں کیں ہیں اتنی ہی ان کی شفقتیں، محبتیں، کرم فرمائیاں بڑھیں۔

(۴)......اوپر کے واقعات اس سیہ کار کے اپنے اکابر کے ساتھ رہے۔ اس کے بالمقابل میری بری عادتوں میں سے ایک عادت یہ بھی ہے کہ جیسا کہ اس سیہ کار کو ہمیشہ اکابر کے ساتھ ان کی رائے کے خلاف قیام نہ کرنے پر اصرار رہا اسی طرح اپنے قیام پر بھی تجویز سے زائد قیام پر بہت ہی لڑائیاں بے ادبیاں، گستاخیاں ہوئیں، اللہ تعالیٰ سب ہی کو معاف فرمائے۔

اپنی انتہائی بے ادبی کا پہلے ایک قصہ لکھوا کر پھر اصل قصہ لکھواؤں گا جو اس وقت مقصود ہے۔

دیگر اکابر کی طرح چچا جان کی بندہ کے زیادہ سے زیادہ قیام کی خواہش:

(الف)......میرے چچا جان میرے مرشد و استاد حضرت اقدس تھی وصنوابی کی بھی میرے دوسرے اکابر و احباب کی طرح سے ہمیشہ یہ خواہش رہتی کہ اس سیہ کار کا قیام جتنا بڑھ جائے چاہے صرف ایک گاڑی ہی کیوں نہ ہو بڑھ جائے۔ ایک مرتبہ نظام الدین کے سہ روزہ قیام کے بعد چوتھے دن سہارنپور کی واپسی تجویز ہوئی۔ اس زمانے میں جناب الحاج حافظ عبدالحمید صاحب چربی والے قصاب پورہ دہلی کا چچا جان قدس سرہ اور ان سے زیادہ اس سیہ کار پر شفقتوں کا زور تھا۔ دہلی کا کوئی سفر ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں جاتے یا آتے میں ان کے یہاں ہو کر نہ آتا ہوں۔ قرار یہ پایا کہ علی الصباح نظام الدین سے چل کر ناشتہ حافظ صاحب کے یہاں کرنے کے بعد پونے نو کی ریل سے یہ سیہ کار سہارنپور روانہ ہو جائے اور چچا جان قدس سرہ اپنے معمول کے مطابق مجھے اسٹیشن پہنچانے کے واسطے ساتھ تشریف لائے۔

چچا جان کے نماز میں طویل قیام کا قصہ:

ناشتہ سے فراغ پر پونے آٹھ بجے چچا جان نے نماز کی اتنی لمبی نیت باندھی کہ رکوع کرنا بھول گئے۔ تقریباً سوا آٹھ بجے تھے، میں نے جس بے چینی سے ان کے رکوع کا انتظار کیا وہ آج بھی یاد ہے اور سوا آٹھ بجے وہاں سے پاؤں پیدل چل کر راستے میں سے تانگہ لے کر اسٹیشن پہنچ گیا۔ ایک دو آدمی میرے ساتھ اسٹیشن تک آئے اور ایک دو آدمی تانگے پر سوار ہونے کے بعد چچا جان کو اطلاع کرنے کے لیے واپس چلے گئے۔ چچا جان قدس سرہ، اللہ ان کو بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے اور میری بے ادبی اور گستاخی کو معاف فرما کر جو اذیت ان کو میری حماقتوں سے ہوئی ہوا پنی شایانِ شان ان کو بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ آج تک جب یہ واقعہ یاد آجاتا ہے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اللہ سے بہت ہی توبہ کرتا ہوں، اللہ ہی مجھے معاف فرمائے اور حضرت چچا جان رحمہ اللہ تعالیٰ کے لیے بہت ہی دعائیں کرتا ہوں، میری نالائقیوں پر ان کی محبت بڑھتی گئی۔

کاندھلہ کا سفر اور اعزہ کا لوئی جانا:

(ب)...... جو اصل واقعہ اس جگہ لکھوانا ہے، وہ بھی ان ہی حماقت کے نمونوں کا نمونہ ہے، غالباً ۳۹ھ کا قصہ ہے۔ ۳۸ھ سے ماہِ مبارک میں رات کے نہ سونے کا معمول شروع ہو گیا تھا، جو پہلے سفرِ حج میں مکہ مکرمہ سے سیکھ کر آیا تھا۔ میرے چچا جان قدس سرہ کا ہمیشہ یہ معمول اخیر تک رہا کہ جب کاندھلہ کا ارادہ ہوتا تھا یا میرا ارادہ ہوتا تھا تو ایک دوسرے کو اطلاع کر دیتے تھے کہ فلاں وقت کاندھلہ جانا ہے، اس لیے کہ دونوں کی خواہش یہ رہتی تھی کہ ساتھ ہی جانا ہو۔ میں نے چچا جان نور اللہ مرقدہ کو اخیر رمضان میں لکھا کہ میرا عید سے اگلے دن کاندھلہ کا ارادہ ہے اور حضرت قدس سرہ کا بھی عید سے اگلے روز کسی جگہ کا سفر تھا اس لیے اور بھی اطمینان تھا چچا جان نے منظور فرمایا، عید سے اگلے دن بندہ سہارنپور سے اور چچا جان دلی سے کاندھلہ پہنچے، گاڑی کا میل کاندھلہ اسٹیشن پر ہوتا تھا، بیک وقت دونوں بارہ بجے کے قریب اسٹیشن پر اترے۔ قصبے میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہم عصر عزیز سب کاندھلہ کے قریب لوئی ایک قصبہ ہے غالباً دس میل ہے، بھائی اکرام الحسن، ماسٹر محمود الحسن، مد فیوضہما، عزیزم بھائی ظہیر الحسن مرحوم، حاجی محسن مرحوم، وغیرہ اعزہ سب لوئی گئے ہوئے ہیں'' مستورات نے ہمارے جاتے ہی ایک آدمی بھیج دیا کہ دونوں چچا بھتیجے آئے ہوئے ہیں اس آدمی نے لاپرواہی برتی، اس کو کیا اہمیت تھی، وہ شام کو لوئی پہنچ کر اپنے عزیزوں میں ٹھہر گیا، صبح کو اس نے کنور اصغر علی خان مرحوم جن کی ملاقات کے لیے یہ کاندھلوی پارٹی گئی ہوئی تھی وہاں جا کر یہ پیام پہنچایا، یہ سب احباب واعزہ چائے پی رہے تھے جس کے ہاتھ میں جتنی پیالی تھی

وہیں چھوڑ کر ایک دم اٹھ گئے۔ کنور اصغر علی خاں مرحوم نے بہت اصرار کیا کہ "میں ابھی گاڑی منگواتا ہوں تم لوگ چائے پی لو"۔ ان عزیزوں نے اللہ ان کی محبت کا بہترین بدلہ عطا فرمائے دیر کے خیال سے ایک نہ سنی اور پیالیاں بیچ میں چھوڑ کر جلدی چل دیئے اور کہہ دیا "گاڑی جلدی بھیج دو جہاں ملے گی بیٹھ جائیں گے"۔ انہوں نے جلدی جلدی پیچھے پیچھے گاڑی بھیجی اور جس جس کو جہاں گاڑی ملتی رہی بیٹھتا رہا اور یہ سب نو بجے کے قریب کاندھلہ پہنچے اور میں اس ڈر کی وجہ سے کہ یہ لوگ آکر ٹھہرنے پر اصرار کریں گے نو بجے سے پہلے چچا جان کے ساتھ اسٹیشن پر آ گیا، گاڑی وہی کل کی بارہ بجے والی تھی جس سے آمد ہوئی تھی اور اسٹیشن پر ہی میل ہوتا تھا۔ ان لوگوں کو جب قصبہ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ دونوں اسٹیشن جا چکے ہیں تو یہ سب ان ہی گاڑیوں میں جن میں لوئی سے آئے تھے، اسٹیشن پہنچ گئے گاڑی میں تین گھنٹے باقی تھے، انہوں نے اولاً چچا جان سے قیام کی درخواست کی، چچا جان نے نہایت تبسم سے یہ فرمایا کہ اس کو راضی کرلو، اگر یہ ٹھہر گیا تو میں بھی بخوشی ٹھہروں گا اور اگر یہ چلا گیا تو مجھ پر تمہارا اصرار تم بھی جانو ظاہر داری ہی کا ہے، سب ہنس پڑے اور مجھ پر دھاوا بول دیا میں نے شدت سے انکار کیا کہ "میں حضرت سے ایک رات کی اجازت لے کر آیا ہوں، ہرگز نہیں ٹھہروں گا، اسی ڈر کے مارے اسٹیشن آ گیا ہوں"۔ اس کا اس سیہ کار کو ہمیشہ ہی بہت اہتمام رہا کہ حضرت اقدس سے واپسی کا جو وقت عرض کر کے گیا اس میں کبھی تخلف نہیں ہوا، میرے حضرت اقدس سرہٗ کو بھی میری یہ بات بہت پسند تھی، یہ سب معاصر تھے، عزیز و اقارب تھے، بے تکلف دوست تھے، سب کی اصلاح یہ ہوئی کہ اس کو ایک چارپائی پر سب مل کر لٹادو اور رسہ سے باندھ کر نعش کی طرح چارپائی پر لے چلو، سارے گویا بچے تھے، کم وبیش عمروں کا تفاوت تھا، میں نے قسم کھالی کہ "اگر سہارنپور آج نہ گیا تو عمر بھر کاندھلہ نہ آؤں گا"۔ میرے اس فقرے پر سب سے نازک ترین عزیز مولوی ظہیر الحسن مرحوم بی اے علیگ تو بغیر بولے، بغیر ملے، بغیر مصافحہ کیے، نہ مجھ سے ملا نہ چچا جان سے، لوئی کی ایک گاڑی میں بیٹھ کر قصبہ میں چلا گیا، بھائی ماسٹر محمود الحسن صاحب جو آج کل پاکستان میں ہیں کئی سال سے مکہ مکرمہ مقیم تھے وہ گاڑیوں کے روانہ ہونے تک ساتھ رہے نہ بولے نہ بات کی۔ بھائی اکرام صاحب دام مجدہم جو میرے بہت ہی مخلص محبوب ترین عزیز ساری عمر رہے، بہت کثرت سے ان کا ذکر کہیں کہیں آئے گا بہت خندہ پیشانی سے نہایت محبت اور تعلق سے گاڑیوں کی روانگی تک بولتے بات کرتے رہے۔ حاجی محسن مرحوم نے بار بار کہا کہ "چونکہ رمضان میں ساری رات جاگنے کا دستور شروع کر دیا ہے، دماغ پر خشکی آگئی ہے، میاں صاحب تیل کی مالش کیا کرو نہیں تو جنون ہو جائے گا" وغیرہ وغیرہ۔

کئی واقعات میری زندگی میں اس نوع کے پیش آئے، اس میں حضرت اقدس مدنی قدس سرہٗ کی

نافرمانیاں مجھ سے بہت ہوئی، اللہ ہی معاف فرمائے کہ حضرت نے بخوشی واپسی کی اجازت دی مگر یہ ناکارہ خلافِ طبع مصافحہ کر کے واپس چلا آیا۔ اب اپنے ان جرائم کی تلافی اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ بہت ہی زاری اور الحاح کے ساتھ مالک الملک سے اپنی تقاصیر کی معافی چاہوں اور ان اکابر کے لیے ان کی شفقتوں اور اذیتوں کا جو اس سیہ کار سے پہنچیں، بہترین بدلہ کریم آقا سے مانگوں۔

مہمل جواب مہمان کا یہ کہ جب تک ارشاد ہو قیام کروں گا:

(۴)......میری ان ہی بری عادتوں میں سے جو اوپر گزریں ایک بری عادت یہ تھی کہ میرے اس سوال پر کہ ''کب تک قیام ہے؟'' بہت سے لوگ یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ ''جب تک حضرت کا ارشاد ہو؟'' یہ مہمل جواب مجھے ہمیشہ بہت برا لگا ہے، میں ان کے اس جواب پر ہمیشہ یہ کہا کرتا ہوں کہ ''واہ واہ! میرے چھوٹے بھائی یعنی مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ہر شخص سے تین چلے مانگا کرتے تھے میں تو ان کا بڑا بھائی ہوں اس لیے چار چلے تو آپ قیام کیجیے، اس کے بعد غور کریں گے'' اور جب وہ یوں کہتا ہے کہ اتنا تو میں نہیں ٹھہر سکتا تو پھر میں کہا کرتا ہوں کہ ''پھر جناب نے یوں کیوں فرمایا تھا کہ جب تک تو کہے، میں نے آپ کے جواب سے یہ سمجھا کہ آپ بھی میری طرح سے گھر سے فالتو ہیں مجھے تو آپ کی ضروریات کا حال معلوم نہیں، اب دوبارہ بتائیے کب تک ٹھہر سکتے ہیں؟'' اس پر دو چار دن یا زیادہ سے زیادہ ہفتہ عشرہ نکلا کرتا ہے۔

میرا مقصد اس سوال سے یہ ہوا کرتا ہے کہ آنے والے کی مدتِ قیام معلوم ہونے کے بعد اپنے اوقات کی رعایت کرتے ہوئے اس سے بات کرلوں، اگر ہم روزہ جلدی جانے والا ہے تو اسی وقت بات کرنے کی کوشش کروں اور اگر اس کے وقت میں گنجائش ہے تو اپنے اوقات کی رعایت رکھتے ہوئے اس کے واسطے وقت تجویز کروں کہ اپنے طالب علمانہ مشاغل کی وجہ سے دن میں وقت بچنا مشکل ہوتا ہے۔ میرے تخلیوں اور تفصیلی بات کے لیے وقت مغرب کے بعد سے لے کر سونے کے وقت تک نکل سکتا ہے اس لیے کہ اپنے امراض اور اعذار کی وجہ سے اب رات کو علمی کام نہیں ہوتا۔

ایک بری عادت دوبارہ دعوت مہمان اور اس کے تین قصے:

(۵)......ان ہی بری عادتوں میں سے ایک بری عادت جس میں مجھے اپنے آقا و مولائی و ملجا و سیدی و سندی، حضرت شیخ الاسلام مدنی نور اللہ مرقدہٗ قدس سرہٗ اعلیٰ اللہ مراتبہ کی طبع مبارک کے خلاف یہ بری عادت ہمیشہ رہی کہ میرے حضرت مدنی قدس سرہٗ کے مہمان کی کوئی دعوت کرتا تو حضرت کو ازراہ محبت و شفقت داعی و مدعو دونوں پر غصہ آجاتا، حضرت قدس سرہٗ داعی سے ڈانٹ کر فرماتے: ''تم میرے مہمان کو چھینتے ہو؟'' اور مہمان سے فرماتے ''آپ سے دال روٹی نہیں کھائی جاتی،

مال کھانے کو جی چاہتا ہے؟''

اس کے بالمقابل اس سیہ کار کا ہمیشہ معمول یہ رہا کہ اگر میرے مہمان کی کوئی دعوت کرے اور مجھے اس کا بخوشی پسند کر لینا معلوم ہو جائے تو میں کبھی مانع نہیں ہوتا بلکہ بڑی خوشی خندہ پیشانی سے قبول کر لیتا ہوں بشرطیکہ مہمان اس کو خوشی سے پسند کرے بلکہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میرا مہمان داعی کی دعوت کو زیادہ پسند کرتا ہے اور محض میرے لحاظ سے میرے یہاں کھانا چاہتا ہے تو میں از خود داعی کی سفارش کر دیتا ہوں۔

(الف)......مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رئیس الاحرار، جن کا کچھ حال پہلے گزر چکا اور ان کے اس ناکارہ سے تعلقات روز افزوں شروع ہو گئے تھے، ایک مرتبہ سہارنپور آئے۔ سہارنپور کے ایک صاحب نے ان کی دعوت کی، انہوں نے اس خیال سے کہ زکریا کو ناگوار ہو گا، سختی سے انکار کر دیا ان کے داعی میری اس بری عادت سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے اصرار سے کہا کہ آپ منظور کر لیجئے میں اس سے نمٹ لوں گا۔ رئیس الاحرار صاحب نے کہا کہ بہت بے ادبی ہے میں خود اجازت لے کر آتا ہوں۔ ان داعی نے بہت اصرار کیا کہ آپ اس کا بالکل فکر نہ کریں میں اس سے خوب واقف ہوں، مگر رئیس الاحرار نے نہ مان کر دیا، ظہر کی نماز کے بعد میں اپنے مکان کے دروازے پر قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا یاد نہیں رمضان تھا؟ غالباً رمضان ہی تھا اس لیے کہ رمضان ہی میں ظہر کے بعد تلاوت کا اکثر معمول رہا ہے۔ مولانا نے آتے ہی سلام کیا، میں نے تلاوت بند کر کے سلام کا جواب دیا اور پوچھا'' کچھ فرمانا ہے؟'' انہوں نے ایک طویل تمہید شروع کی۔ میں نے ایک منٹ میں اندازہ کر کے ان سے کہا کہ ''اگر کسی نے شام کی آپ کی دعوت کی ہے تو بخوشی منظور ہے بشرطیکہ آپ پسند فرمائیں''۔ میرے اس روکھے جواب پر وہ سکتہ میں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا میں نے کہہ دیا کہ ''اس کی بالکل فرصت نہیں، عشاء کے بعد بات ہو گی''۔ یاد آیا کہ رمضان ہی تھا اور رمضان میں ہمیشہ میرا چوبیس گھنٹوں میں تراویح کے بعد کی چائے میں گھنٹہ آدھ گھنٹہ دوستوں اور مہمانوں سے ملاقات کا معمول رہا۔ تراویح کے بعد میں نے ان سے اپنی اس بری عادت کا ذکر کیا اور میں نے کہا کہ آپ کے داعی نے صحیح کہا کہ وہ میری اس عادت سے خوب واقف ہیں میرا دستور یہ ہے کہ میرے مہمان کی جب کوئی دعوت کرتا ہے اور مجھے یہ اندازہ ہو جائے کہ وہ بخوشی پسند کرتا ہے تو میں کبھی مانع نہیں بنتا، اس لیے کہ جب کوئی شخص دعوت کرے گا وہ کچھ خاطر ضرور کرے گا، میں اپنے مہمان کا نقصان کیوں کروں کہ لنگی باندھ کر حوض میں کود جا۔ البتہ مہمان ہی اگر مال چھوڑ کر دال کھانا چاہے تو مجھے بھی زبردستی نہیں، سر آنکھوں پر۔ چنانچہ متعدد وزراء ہند و بیرونِ ہند کے جب اس ناکارہ کے مہمان ہوئے اور میں نے

ان کے اکرام میں کچھ اہتمام کیا تو انہوں نے شدت سے اس پر نکیر کی اور یہ کہا کہ ''یہ چیزیں تو ہمیں روز ملتی رہتی ہیں ہم تو آپ کے لنگر کا کھانا کھانے آئے تھے وہ ہمیں نہیں ملتا''۔ ایک وزیر صاحب نے یہ کہا ''ہمیں تو آپ اپنے مدرسہ کے مطبخ کا کھانا کھلائیے''۔ ان کے لیے بعض طالب علموں کا میں نے کھانا لے کر اپنے دستر خوان پر بلایا، ان کا کھانا وزیر صاحب نے کھایا اور وزیر صاحب کی مرغی بریانی ان طالب علموں نے کھائی اور بھی کئی واقعے اس نوع کے گزرے۔ ایسوں کے لیے میں بھی پسند نہیں کرتا کہ کوئی ان کی دعوت کرے۔

دعوت کے سلسلے میں میرے دو اکابر حضرتِ اقدس مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرتِ اقدس رائپوری، کا خاص معمول رہا ہے، یہ دونوں حضرات اس سیہ کار کے یہاں کا کھانا چھوڑ کر کسی دوسری جگہ کا کھانا بلا کسی سخت مجبوری کے ہرگز پسند نہیں فرماتے تھے لیکن دونوں اکابر کا معمول آپس میں ضد تھا۔

(ب)......میرے حضرتِ اقدس مدنی قدس سرہٗ کی آمد پر جب کوئی دعوت کرتا تو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ شدت سے فرما دیتے کہ ''کھانا زکریا کے یہاں کھانا ہے''۔ بارہا اس کی نوبت آئی، ایک مرتبہ جمعیۃ علماء ضلع کی کانفرنس حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلائی گئی، خواجہ اطہر صاحب ضلع کے صدر تھے، دو بجے سے عصر تک جمعیۃ کانفرنس ہوتی رہی۔ عصر کے بعد حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ مدرسہ تشریف لانے لگے خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ ''حضرت یہ کیا؟'' فرمایا کہ ''کھانا زکریا کے یہاں کھانا ہے''۔ انہوں نے بہت اصرار کیا کہ جمعیۃ آپ کی طرف سے طلب کی گئی ہے۔ حضرت نے فرمایا ''جس کام کے واسطے طلب کی تھی وہ کام ہوگیا، میں نے کھانے کی دعوت نہیں کی تھی، آپ کھلائیے''۔ خواجہ صاحب نے بہت ہی اصرار فرمایا مگر حضرت نے قبول نہ فرمایا۔ مجھے خود بھی اس کا واہمہ نہ تھا کہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ جمعیۃ کو چھوڑ کر تشریف لے آئیں گے۔

اسی طرح سے مولانا منظور النبی مرحوم نے ایک دفعہ ایک کانفرنس حضرت کی طرف سے بلائی، مغرب تک کانفرنس رہی اور مغرب کے بعد حضرت اس سیہ کار کے گھر تشریف لے آئے، مولوی صاحب کو بہت ہی ناگوار بھی ہوا، میں نے چپکے سے خوشامد کی کہ ''اکابر کے منشاء پر عمل حقیقی تعلق اور محبت کی علامت ہے، میں نے تو کوئی درخواست نہیں کی، اگر میں درخواست کرتا تو آپ کا غصہ بجا تھا کہ آپ کے مہمان کو کیوں چھینا لیکن یہ تو حضرت کا خود منشا ہے، اس پر آپ کو بھی ہتھیار ڈال دینا چاہیے''۔ بیسیوں واقعات میرے حضرت مدنی قدس سرہٗ کے اس قسم کے پیش آئے۔

(ج)......اسی مدکا اور اس کا بالمقابل معمول حضرت اقدس رائپوری قدس سرہٗ کا رہا۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی تشریف آوری پر کوئی دعوت کرتا، بہت خندہ پیشانی سے قبول کرتے، جان و مال میں برکت کی بہت دعائیں دیتے، بہت دل داری فرماتے اور جب دعوت کرنے والا خوشی سے

آسمان پر پہنچ جاتا تو آخر میں چپکے سے فرمادیتے کہ ''ساڑھے گیارہ بجے کچے گھر میں کھانا لے آئیں''۔ وہ بیچارہ یہ تو کیا کہہ سکتا تھا کہ ''مردنی موقوف مقبرہ مسمار''۔ حضرت بہت اچھا، حضرت ضرور۔ بعضی دفعہ مجھے بھی داعی سے ندامت ہوتی، مگر میں کیا کر سکتا تھا۔

(د)......حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے حالات میں بھی ایک عجیب واقعہ اس نوع کا آنے والا ہے جو اسی جگہ زیادہ مناسب ہے، اکابر کی عظمت کی وجہ سے یہ دو تین واقعات لکھ دیئے ہیں، ورنہ میری بری عادت کی وجہ سے بعض مہمانوں کو یہ خیال ہو جاتا کہ یہ مہمان کو ٹالنا چاہتا ہے، لیکن جن کی آمد و رفت کچھ بڑھ جاتی ہے تو وہ حالت سے واقف ہو جاتا ہے۔

(۲)......میری بری عادتوں میں سے ایک بری عادت یہ رہی کہ میٹھے سے ہمیشہ نفرت اور گوشت سے ہمیشہ عشق رہا، جن کے بہت ہی کثرت سے واقعات پیش آئے۔ نمونہ کے طور پر چند واقعات لکھواؤں گا۔ واقعات تو میری ستر سالہ زندگی میں نہ جانے کیا کیا گزرے اور حکیم الامت حضرت اقدس تھانوی قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ کا فرمان جو اپنے بارے میں کئی دفعہ ارشاد فرمایا کہ ''میری قدردانی جتنی میرے بڑوں نے کی میرے چھوٹوں نے نہیں کی''۔ مجھ پر واقعی یہ فقرہ حرف بہ حرف صادق آرہا ہے، میرے اکابر، میرے مشائخ بہت ہی میری خواہشات کا اہتمام فرماتے تھے، میری مٹھائی نہ کھانا چونکہ ابتداء میں ضرب المثل تھا، میرے حضرت قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ نے کئی دفعہ فرمایا کہ مولوی زکریا اتنے دنوں سے میرے پاس بیٹھتے ہیں ان کو تو میٹھے کا شوق نہیں ہوا مجھے نمکین کا ہو گیا، اپنی اپنی قوت کی بات ہے۔

ابتداء میں تو مجھے مٹھائی سے گویا نفرت تھی اب تو اچھی خاصی کھانے لگا۔ میرے حضرت رائپوری قدس سرہٗ نے بھی ایک دفعہ یہی جملہ دہرایا تھا میرے ان دونوں بزرگوں کو میٹھے کا شوق تھا۔ ایک دفعہ میرے حضرت اقدس قدس سرہٗ کے یہاں کئی دور سے مٹھائی آئی وہ آتے آتے خراب ہو گئی نازک مٹھائی تھی میں اور میرے دو رفیق مظہر و محفوظ، جن کا باب دوم میں ذکر آچکا مخصوص جماعت کہلاتی تھی، حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''بچوں کو بلا کر کھلا دو'' ہم اوپر سے بلائے گئے، میں نے ذرا سی چکھ کر چھوڑ دی۔ میرے رفیقِ درس مظہر علی راج پوری مٹھائی کے شوقین ہونے میں ضرب المثل تھے، وہ زردہ بھی مصری یا بورہ مزید ڈال کر کھایا کرتے تھے اور ان کے یہاں کی رساول بھی ہم کاندھلہ والوں میں سے کسی سے نہیں کھائی جاتی تھی، ان کے یہاں رساول (رس کی کھیر) گھر میں نہیں پکتی تھی بلکہ ان کے کڑھاؤں میں پکتی تھی جن میں گڑ بنتا تھا اور جب رس پکتے پکتے آدھارہ جاتا تھا تب ان میں چاول پڑتے تھے۔ میرا عذر تو حضرت کے یہاں اور جو اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے متفق اللسان ہو کر سب نے قبول کر لیا اور کہا کہ یہ تو مٹھائی

نہیں کھاتا، میرے رفیق مظہر کے سب سر ہوگئے کہ تو تو شوقین ہے کھا۔ ان کو بہت غصہ آیا۔ حضرت کی اہلیہ محترمہ سے عزیز داری تھی بچپن تھا، مجھ سے کہنے لگے "سڑی ہوئی مٹھائی کی عادت نہیں ہے گرم گرم امرتیاں ہوں تو ایک بھی نہ چھوڑوں"۔ میں تو ساکت رہا، مگر سب اس کے سر ہوگئے اور متفق اللسان ہوگئے، اس کو اور محفوظ کو کھانی پڑی۔ اس کے بالمقابل گوشت کے بہت سے واقعات ہیں۔

مولانا منظور نعمانی نے چچا جان رحمہ اللہ تعالیٰ کے حالات میں کسی جگہ بغیر نام کے لکھا ہے کہ "چچا جان اپنے ایک عزیز کے لیے گوشت کا بہت اہتمام فرمارہے تھے جس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی"۔

یہ انہوں نے صحیح لکھا، چچا جان اور حضرتِ اقدس رائپوری کے یہاں میرے گوشت کا بہت ہی اہتمام ہوتا تھا۔ جب میرے جانے کا دن ہوتا تو دونوں بزرگوں کے یہاں بلکہ حضرت میرٹھی نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں بھی میرے لیے کبابوں کا بہت اہتمام ہوتا تھا، بازار اور گھر کے دونوں منگوائے جاتے تھے اور کئی طرح کے گوشت کا سالن بھی بنواتے تھے، لیکن اس سیہ کار کا دستور حضرت میرٹھی اور حضرت تھانوی قدس سرہما کے یہاں بے اطلاع جانے پر ہمیشہ روٹی کھا کر جانے کا تھا۔ حضرت میرٹھی نور اللہ مرقدہٗ کئی مرتبہ ناراض بھی ہوئے کہ اتنا سویرے کیسے کھالیا؟ اور حضرت تھانوی اعلی اللہ مراتبہ نے بھی کئی دفعہ دس بجے کی گاڑی سے پہنچنے پر دریافت فرمایا کہ "کیا آپ صبح ہی کھالیتے ہیں؟" اور میں ان دونوں اکابر کے یہاں حاضری پر اپنی عادت کے خلاف چائے کے ساتھ ایک دو لقمہ روٹی کا ضرور کھا کر جاتا تھا۔ حضرت تھانوی کے ارشاد پر میں عرض کیا کرتا تھا کہ "حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ! چونکہ رات نہیں کھائی تھی اس لیے صبح ہی کھالی" اور یہ صحیح تھا کیونکہ رات کو نہ کھانے کا معمول بہت برس سے تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ حضرت میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ کھا کے جانے پر ناراض ہوتے تھے اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ نے اس ناکارہ کے متعلق تحریراً و تقریراً ابتدائی زمانہ میں یہ ارشاد فرمادیا تھا کہ تم میرے یہاں کے قواعد سے مستثنیٰ ہو لیکن اس کے باوجود چونکہ ان دونوں اکابر کے یہاں قواعد کی پابندی بہت تھی اور میں دوسرے بے وقت آنے والوں پر ڈانٹ سنتا رہتا تھا، اس لیے میں بھی ان کے قواعد کا احترام کرتے ہوئے کبھی بغیر کھائے نہ جاتا تھا اور اس کے بالمقابل جب حضرت رائپوری یا چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں جانے کا ارادہ ہوتا تو ایک دن پہلے کھانا کھانا چھوڑ دیتا تھا۔ اس میں میرے حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ تو بہت سے واقعات پیش آئے۔

(الف)...... ایک دفعہ چچا جان قدس سرہٗ عصر کے وقت دہلی سے تشریف لائے آتے ہی فرمایا کہ "رائے پور چلنا ہے"۔ میں نے کہا کہ "ضرور، چائے پی لیجئے"۔ چائے میں ذرا تاخیر ہوگئی، رائپور جانے والے اڈے پر پہنچے، موٹریں اس وقت تک نہیں چلیں تھیں، گھوڑے تانگوں میں جانا

ہوتا تھا، تانگے کی تلاش میں دیر ہوگئی، مغرب کی اذان کا وقت قریب ہوگیا۔ چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ مغرب پڑھ کر چلیں گے۔ میں نے تانگے والے کو راضی کرلیا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر تانگے میں بیٹھ گئے، عشاء کی اذان کے وقت بہٹ پہنچے، چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ ''شاہ زاہد حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے مل کر چلیں گے''۔ میں نے عرض کیا ''اب تو دیر ہوگئی، وقت ہوگیا واپسی میں ملیں گے''۔ چچا جان نے فرمایا کہ ''معلوم نہیں کہ واپسی میں وقت ملے یا نہیں، اب تو رات اپنی ہے ابھی ملتے چلو''۔ میں نے عرض کیا ''میں تو نہیں جاؤں گا آپ ہو آئیں'' چچا جان نے کئی دفعہ ارشاد فرمایا۔ میں زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا کہ آپ ہو آئیں میں یہاں بیٹھا ہوں، جب تشریف لے آئیں گے تو آپ کے ساتھ چلوں گا۔ چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ آخر کیا ضد ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ''وقت ہوگیا، وہ کھانے پر اصرار فرمائیں گے اور بہت اصرار فرمائیں گے اور رئیسوں کے یہاں کا کھانا ہم جیسے غریبوں کا نہیں ہوتا کہ دس منٹ میں ماحضر پیش کریں، وہ اہتمام فرمائیں گے دو گھنٹے اس میں لگ جائیں گے اور پھر وہ فرمائیں گے کہ اب تو دیر ہوگئی آرام فرمائیں، صبح کو میں اپنی گاڑی میں بھیج دوں گا، بہت سا وقت ضائع ہو جائے گا''۔ چچا جان نے فرمایا کہ ''ہم کھانے کو نہیں مانیں گے،'' میں نے عرض کیا کہ وہ بہت زیادہ اصرار کریں گے اور انکار مشکل ہو جائے گا۔ یہ بات چچا جان نے بھی قبول فرمائی اور رائپور چل دیے۔ گرمی کا زمانہ تھا، گیارہ کے بعد رائپور پہنچے، سب سو چکے تھے۔ حضرت قدس سرہٗ بھی اپنی چھپری میں آرام فرما رہے تھے۔ حضرت کے حجرے کے آگے دالان میں کھونٹی پر ایک لالٹین ہمیشہ جلتی رہتی تھی، وہاں پہنچ کر بہت آہستہ آہستہ بوریئے نکالے، ان کو بچھایا اور وضو کیا۔ ہم آٹھ دس آدمی تھے اور نماز کے لیے آہستہ آہستہ میں نے تکبیر شروع کی اور چچا جان مصلے پر آگئے تھے، ایک دم حضرت قدس سرہٗ لیٹے ہوئے بیٹھ گئے، سب حضرت کو دیکھ کر چھپری کی طرف دوڑ پڑے، مصافحے کیے، حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''میں دیر سے چلت پھرت تو دیکھ رہا تھا مگر میرا خیال تھا کہ یہ لوگ (یہاں کے مقیمین) میرے لیٹنے کے بعد کچھ امرود وغیرہ کھایا کرتے ہیں شاید یہ کچھ کررہے ہوں''، پھر فرمایا کہ ''حضرت کھانا؟''

میری عادت تو رات کو کھانے کی نہیں تھی مگر مجھے خیال رہا کہ میرے انکار پر دوسرے لوگوں کو انکار کرنا پڑے گا، وہ رات کو بھوکے رہیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ ''ضرور کھائیں گے'' اور یہ کہہ کر میں نے زور سے حاجی ظفر کو آواز دی وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گئے تھے، میں نے کہا کہ ''حاجی جی آٹھ آدمی ہیں روٹی کھائیں گے۔'' اللہ تعالیٰ حاجی ظفر کو اور اس کی اہلیہ کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، دین و دنیا کی راحتیں عطا فرمائے، رائپوری دربار کے حاضرین جو وہاں سے ذرا بھی خصوصی تعلق رکھتے ہیں وہاں سے خوب واقف ہیں کہ ان دونوں میاں بیوی نے ہمیشہ

پچاس ساٹھ مہمانوں کا کھانا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں تیار کیا، پھر آٹھ آدمی ان کے یہاں کے تھے، میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ میرے لیے کوئی اہتمام اس وقت نہ کرنا، میں تو صبح کو کھاؤں گا، میرے لیے تو صرف دو تین انڈوں کی ٹکیاں اور کیریوں کی خوب مرچیں ڈال کر چٹنی تیار کر دو، چنانچہ ہم نے اتنے نماز پڑھی اتنے کھانا تیار تھا، میں نے چچا جان سے عرض کیا کہ اتنی جلدی وہاں نہ ملتا۔

حضرت اقدس رائپوری قدس سرہٗ کے یہاں اور حضرت کی وجہ سے سارے ہی ہندوستان بلکہ عرب میں بھی مرغا میرے کھانے کا جزو بن گیا تھا۔ یہ حقیقت میں بڑا ہی لطیف قصہ ہے جو انشاء اللہ میرے حج کے بیان میں آئے گا۔ گوشت سے انتہائی رغبت اور بغیر گوشت کے کھانا نہ کھا سکنے کے واقعات تو بہت کثرت سے ہیں، لیکن ایک عجیب واقعہ ۱۳ھ میں یہ پیش آیا کہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے درس کی خصوصیات جو اس رسالہ میں بھی کہیں کہیں آئیں گی اور اکمال الشیم کی تمہید میں بھی تفصیل سے گزر چکی، وہ یہ تھا کہ اونچے درجے کے طلبہ کے ذمے جو سمجھ دار اور ذی استعداد ہوں ان سے چھوٹے درجے کے طلبہ کے اسباق متعلق ہوتے تھے، وہ ابا جان کے سامنے بیٹھ کر پڑھانے ہوتے تھے۔ ۳۱ھ میں میرے پاس مقامات ہوا کرتی تھی جس میں عزیزان حکیم ایوب، مولوی نصیر الدین، شیخ انوار احمد اور ایک اور لڑکا تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں۔ اس سال میرے بہت زوردار خارش ہوئی اور اتنی سخت ہوئی کہ اس کی پھنسیاں چیچک کی پھنسیوں کی طرح انگوروں کی مانند سارے بدن پر پھیل گئی، ان میں سے راد (پیپ) ہر وقت نکلا کرتی تھی، میرے بستر پر بہت سی راکھ اور نیم کے پتے بچھتے تھے اور وہ راد میں تر ہو جاتے تھے اور روزانہ بدلے جاتے تھے، گوشت، نمک مرچ سب بند تھا، بڑی ہی تدبیریں سب اطباء نے کیں، ایک چیز کاڑھا کہلاتی ہے، اس میں شاہترہ، چرائتہ نیم کے پتے اور نہ معلوم دس بارہ چیزیں، وہ تین دن تک پکا اور اس کی نو بوتلیں۔ ایک گلاس یعنی آدھی بوتل صبح اور آدھی شام میں پینی پڑتی تھی اور اس میں تعفن اس قدر تھا کہ بوتل کا منہ کھلتے ہی ناک سڑ جاتی تھی، ناک بند کر کے جس مصیبت سے پیتا تھا، اب تک یاد ہے، وہ بھی ختم ہو گیا اور میرے تقریباً روزانہ فاقے ہی فاقے رہتے تھے۔ یہ عزیزانِ مذکور مجھ سے مقامات پڑھا کرتے تھے۔ مدرسہ قدیم کی غربی جانب جو ایک چھوٹا سا مکان ہے اور اس میں صرف دو کمرے تھے، ایک شرقی، اس میں میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا سونا ہوتا تھا اور وہ ان کی قیام گاہ تھی اور غربی جانب میں میں اور میری والدہ، میری بہن وغیرہ سب رہتے تھے، اس میں شمال کی جانب ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس میں لوہے کی سنخیں لگی ہوئی تھیں اور میری چارپائی کے اوپر زنانہ طرف ایک لمبا سا پردہ پڑا رہتا تھا اور اس جنگلہ کے پاس باہر کی طرف بیٹھ کر یہ لوگ ''مقامات'' پڑھا کرتے تھے اور بھی ایک دو سبق چھوٹے بچوں کے تھے۔ میری والدہ نور اللہ

مرقد ھانے کچھ پیسے بھی اِکنیاں، دونیاں میرے پلنگ کے سرہانے ڈال رکھی تھیں کہ صدقہ کے طور پر جنگلے کی طرف جانے والوں کو اپنے ہاتھ سے دیتا رہوں۔ سردی کا موسم تھا، میں نے مقامات کے سبق کے بعد عزیز نصیر الدین سے کہا کہ ذرا ٹھہر جاؤ، جب سب چلے گئے میں نے ان کو ایک دونی دی، اس زمانے میں ایک پیسے کا ایک کباب اتنا موٹا اور لمبا چوڑا آتا تھا کہ آج کل وہ آنے میں جتنا آتا ہے، وہ بھی اس کا آدھا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کے کباب لے کر آئے اور اس میں خوب مرچیں، ترشی اور پیاز ڈال لانا اور خوب کاغذ میں بند کر کے لانا اور اگر کسی سے کہا تو اتنے جوتے ماروں گا کہ سر گنجا ہو جائے گا۔ انہوں نے لا کر جنگلے میں مجھے دے دیے اور میں نے پردے کے پیچھے پڑے پڑے ان سب کو کھا لیے، کھانے کو تو کھا لیا اور بہت ہی مزہ آیا، مگر کھانے کے بعد جو مجھ پر گزری وہ بھی خوب یاد ہے، سر تو چکرا گیا اور سارے بدن میں وہ مرچیں لگیں کہ تڑپا دیا، لیکن:

خدا شرے بر انگیز دوراں خیرے نہاں باشد

دو گھنٹے بعد پاخانہ کا اتنے زور کا تقاضا ہوا کہ بڑی مشکل سے بھاگ کر پاخانہ میں گیا، اس وقت پاخانہ میں جانے کے لیے بھی دو آدمیوں کو پکڑ کر لے جانا ہوتا تھا، لنگی بندھی ہوئی تھی، بیٹھنے سے پہلے ہی اسہال شروع ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی وہ پھنسیاں جن میں دو گھنٹے پہلے راد نکل رہی تھی ایسی خشک ہوئیں کہ میں نے پاخانہ ہی میں بیٹھے بیٹھے ٹانگوں کی، پیٹ کی، کمر کی سب پھنسیوں پر سے کھرنڈ اتار اتار کر وہیں پھینک دیے، والدہ کو بہت فکر ہو رہی تھی اور انہوں نے ایک دو دفعہ آواز بھی دی کہ پاخانہ میں اتنی دیر کیوں لگ گئی؟ لیکن جب میں باہر آیا تو میری والدہ اور سب حیرت میں رہ گئے کہ اس کی خارش کیا ہوئی۔ سب نے بہت ہی پوچھا کہ کون سی دوا تو نے کھائی اور کس کے کہنے سے کھائی؟ کسی نے پوچھا کہ کیا کوئی عمل پڑھا غرض بہت ہی تحقیقات سب نے کیں۔ مگر میں نے بھی والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی زندگی تک تو کسی سے کہہ کر نہ دیا۔

لیکن براہِ کرم کوئی دوسرے صاحب اس مجرب نسخہ پر عمل نہ کریں، میری ہی زندگی تھی جو میں اس دن بچ گیا۔ ہر شخص کی عادات، حالات اور مزاج الگ ہوتا ہے اور اللہ جل شانہ کا معاملہ بھی ہر شخص کے ساتھ الگ ہے۔ اس سلسلے میں جملہ معترضہ کے طور پر ایک قصہ اور نقل کراتا ہوں۔

اس سیہ کار کو ٹھنڈے پانی کا مرض جو بچپن سے شروع ہوا تھا اور بڑھاپے تک بھی نہ گیا، تقریباً پچیس سال کا واقعہ ہے، میرا ایک مخلص دوست مولوی عبد المجید مرحوم اللہ تعالیٰ اس کو بلند درجات عطا فرمائے، میری بڑی ہی خدمت کی، دسمبر کے مہینے میں میرے واسطے برف خریدنے گیا، برف والے نے ان کی مولویانہ صورت دیکھ کر ان کو خوب گھورا۔ مرحوم نے کہا کہ ''حضرت شیخ کے واسطے چاہیے۔'' برف والے نے بہت غصے سے کہا کہ کوئی شیخ ہو یا قاضی ہو

آج کل بجز شرابی کے کوئی برف نہیں پی سکتا۔''

میرے حضرت اقدس رائپوری قدس سرہٗ نوراللہ مرقدہٗ کا دستور تھا کہ جب گنوں کی موسم میں رائپور حاضر ہوتا تو رات کو اپنے حجرہ شریفہ کی چھت پر دسمبر اور جنوری کے مہینے میں میرے لیے رس منگا کر عشاء کے بعد رکھوا لیتے تھے اور آخر شب میں تہجد کے بعد صبح کی نماز سے پہلے اتروا کر اس سیہ کار کو پلاتے تھے اور وہ برف جمنے کے قریب ہو جاتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حکم تھا کہ اور کوئی اس میں حضرت شیخ کا اتباع ہرگز نہ کرے۔ کئی مرتبہ اس کی خاص طور سے ممانعت فرمائی۔ ایک بزرگ حضرت کے یہاں رہتے تھے۔ شاہ جی سکندر علی پنجاب کے، انہوں نے اس ناکارہ کا بچا ہوا رس تھوڑا سا پی لیا، صبح کو حضرت سے عرض کیا کہ حضرت بہت ہی مزیدار تھا اور بہت ہی لذیذ تھا اور پنجابی زبان میں بھی دو ایک فقرے اس کی تعریف میں کہے۔ حضرت بہت ناراض ہوئے۔ اللہ تعالیٰ شاہ جی کی مغفرت فرمائے، اسی دن ان کو بخار ہو گیا اور وہی بخار مرحوم کے وصال کا سبب بن گیا۔ نوراللہ مرقدہٗ۔

ایک دفعہ میرے کاربنکل نکل آیا۔ ذی الحجہ کا مہینہ تھا، حضرت اقدس رائپوری قدس سرہٗ یہاں تشریف فرما تھے، حضرت کو میری صحت اور بیماری کا بہت ہی اہتمام اور فکر رہا کرتا تھا، ذرا سی معمولی بیماری بھی معلوم ہو جاتی تو اتنا اہتمام فرماتے کہ حد نہیں اور یہ مرض تو سنا ہے کہ بڑا خطرناک ہوتا ہے حضرت کو بڑا فکر ہو گیا، ادھر اُدھر شہر میں کہرام مچ گیا، ڈاکٹر صاحب اسی وقت بلائے گئے، انہوں نے بھی دیکھ کر پریشانی کا اظہار کیا اور بیک وقت میری کمر میں بارہ انجکشن بہت گہرے لگائے جس نے اس سارے حصے کو جس میں کاربنکل کا اثر تھا اپنے اندر لے لیا، اس پر وہ ڈاکٹر صاحب تعجب بھی کرتے تھے کہ اتنے گہرے انجکشن لگے مگر اس پر اثر نہ ہوا۔ اس ناکارہ کو ہمیشہ سے بہت بچپن سے ۹ ذی الحجہ کے روزہ کی عادت رہی اور اس میں افطار کے بعد ایک پیالی چائے کے علاوہ رات کو کچھ نہیں کھاتا تھا، اس لیے کہ اللہ کے یہاں کل کو دعوت ہے۔ میرے سب گھر میں روٹی نہ پکتی تھی، نہ آتی تھی، اب تو آٹھ دس برس سے مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے یہ معمول چھوٹ گیا اور مہمانوں کی وجہ سے بہت اہتمام سے روٹی پکتی بھی ہے، مگر اس سے پہلے سالہا سال تک یہ دستور رہا کہ تین دن تک میرے گھر میں روٹی نہیں پکتی تھی اور میرا ایک تفریحی فقرہ بھی بہت مشہور تھا کہ اگر قربانی کے گوشت کے ساتھ روٹی بھی دعوت کا جزء ہوتی تو صدقۂ فطر بھی ایام اضحیٰ میں ہوتا۔ اس زمانے میں اگر کسی مہمان کے واسطے روٹی کی ضرورت پیش آتی تو بازار سے منگوانی پڑتی میرے کاربنکل کے انجکشن ۸ ذی الحجہ کو لگے، سب تیمارداروں نے مع حضرت قدس سرہٗ کے ڈاکٹر صاحب پر زور دیا کہ یہ پرہیز بالکل نہیں کرتے، ڈاکٹر صاحب نے جو میرے بہت ہی کرم فرما تھے اور بعد میں تو اور بھی زیادہ ہو گئے، پرہیز کی بہت ہی تاکید کی۔ ان بیچاروں کو میرے معمول

یا دستور کچھ معلوم نہ تھا انہوں نے بڑے اہتمام سے فرمایا کہ دیکھئے چار پانچ دن تک آپ گوشت کے سوا کوئی چیز نہ کھائیں۔ ایک دم مجلس میں قہقہہ شروع ہوگیا۔ میرے حضرت رائپوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرمانے لگے ''جس کو اللہ کھلاوے اس کو کون روکے۔'' اب یہ سب چیزیں چھوٹ گئیں، میٹھا نمکین سب برابر ہوگیا، گوشت کی بھی کوئی اہمیت نہ رہی لیکن ترجیح تو ہے ہی۔

آج کل ہمارے علی گڑھ کے ڈاکٹر صاحب نے بھی میرے لیے یہ فرمایا ہے کہ تیرا بلڈ پریشر گرا ہوا ہے جس کے بڑھنے کی ضرورت ہے اس کے لیے کٹڑہ کا گوشت تیرے لیے زیادہ مفید ہے، دوسرے درجے کے مرغے کا اور بھی میرے گوشت کے قصے بڑے عجیب ہیں۔

سفر سے نفرت:

(۷)...... میری بری عادتوں میں جو ہمیشہ سے ہے۔ ''سفر سے وحشت ہے۔'' یہ ابتدا ہی سے میری عادت اور طبیعتِ ثانیہ بن گئی۔ اس کی ابتداء جیسا کہ میں اپنے متعدد رسالوں میں اور غالبًا الاعتدال میں لکھ چکا ہوں، اپنے والد صاحب کے ابتدائی زمانہ میں کہیں نہ جانے پر جبرو پابندی تھی اور وہ میرے لیے ایسی عادت بن گئی کہ اب نہیں بلکہ ساری عمر سے سفر میرے لیے ایک مصیبت بنا رہا۔ جہاں کہیں سفر ہوتا تو سفر سے تین دن پہلے سے اس کی وحشت اور بلا مبالغہ اس کی فکر سے بخار اور واپسی کے بعد کئی دن تک اس کا تکان اور خمیازہ، بخار، سر میں درد۔ یہ چیزیں ہمیشہ سے بڑھتی ہی رہیں اور اپنے دوا کابر مرشدی حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ اور ان سے بھی بڑھ کر حضرت شیخ الاسلام مدنی قدس سرہٗ۔ ان دونوں کو دیکھتا تھا تو بڑا رشک کرتا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام کو دیکھنے والے ابھی تک کثرت سے موجود ہیں کہ ان کے یہاں جمعرات کی شام دیوبند سے دہلی جانا اور عشاء کے بعد دہلی کے ایک اجتماع میں صدارت کرنا اور پھر ایک جلسۂ شوریٰ میں شرکت کرنا اور اس کے بعد راتوں رات نانوتہ آنا، صبح کی نماز کے بعد وہاں جلسہ میں تقریر کرنا اور اس کے بعد سنسار پور گیارہ بجے کے قریب ایک جلسہ میں تقریر کرنا اور جمعہ کی نماز کے بعد بہٹ میں تقریر کرنا اور اس کے بعد ساڑھے چار بجے کے ایکسپریس سے دیوبند جانا اور عشاء کے بعد سبق پڑھانا۔ یہ ایک مرتبہ کا واقعہ نہیں ہے، اس قسم کے بیسیوں واقعات ہمیشہ کا معمول تھا۔

میرے حضرت مرشدی قدس سرہٗ بذل نہایت اطمینان سے لکھواتے رہتے۔ حضرت منتظم خاص حاجی مقبول احمد صاحب بستر وغیرہ سب مکمل کر کے اس میں کپڑے وغیرہ رکھ کر باندھ کر گاڑی کے وقت تانگہ منگا لیتے اور جب تانگہ آجاتا تب اوپر اطلاع کرتے کہ ''تانگا آگیا''۔ اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نہایت اطمینان سے جو عبارت لکھوا رہے ہوتے اس کو پوری کراتے اور وہاں سے اُٹھتے، کھڑے کھڑے مکان پر تشریف لے جاتے اور وہاں سے آکر تانگہ میں بیٹھ کر جاتے اور میں سوچتا

رہتا کہ گاڑی کا وقت قریب آ گیا، حضرت کو فکر نہیں اور مجھے دو دن پہلے سے ''السفر قطعة من العذاب'' کا اتنا سہم ہوتا کہ کوئی کام اطمینان سے نہیں ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احباب کے اصرار اسفار پر ہوتے رہتے ہیں اور واقعی میرا دل بھی دوستوں کی خواہش کو پورا کرنے کو چاہتا ہے مگر ''خوئے بدرا بہانہ بسیار'' سفر کی ہمت بالکل نہیں ہوتی، اس قدر طبیعت واقعی بیمار ہوجاتی ہے کہ دوستوں کو اس کا یقین آنا بھی مشکل ہے۔

جب میرے اعزہ علی گڑھ میں پڑھتے تھے، غالباً پچاس برس پہلے، علی گڑھ کا ارادہ اور وعدہ ایک پارٹی سے ہوا، جب فارغ ہوکر آئی تو دوسری پارٹی سے ہوا، جب وہ بھی فارغ ہوکر آئی، تو تیسری پارٹی سے ہوا اور واقعی ارادہ اور وعدہ پختہ ہوا۔ مگر مقدر، سب اعزہ انگریزی پڑھ کر اور ڈگریاں حاصل کر کے آگئے۔ ہم ارادے ہی میں رہے۔ مگر اس کا ردعمل اب آنکھوں کے علاج نے کرادیا کہ دو (۲) ماہ تو علی گڑھ میں ایک ایک ماہ کا قیام ہو چکا، آیندہ کی خبر نہیں اور یہاں کے دوران قیام ہی میں یہ ''آپ بیتی'' لکھوا رہا ہوں۔

تقریباً پچاس سال ہوئے، بعض دوستوں کے شدید اصرار پر مظفر نگر کا وعدہ کیا اور واقعی پختہ ارادہ تھا اور پختہ وعدہ تھا۔ لیکن اپنے سفر کی وحشت کی وجہ سے ٹلتا ہی رہا۔ اب تو وہ حضرات بھی ختم ہوگئے، جن سے وعدہ تھا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، آمین!

حضرت مدنی کے گھٹنوں کا علاج بجلی کے ذریعے:

حضرت قدس سرہٗ ایک مرتبہ ۱۵ ربیع الاول ۷۰ھ میں مظفر نگر گھٹنوں کا علاج بجلی سے کرانے کے لیے ایک عشرہ کے واسطے تشریف لے گئے، جن احباب سے وعدہ تھا اور وہ حیات تھے، انہوں نے اس ناکارہ کو بہت ہی زور سے لکھا کہ تمہارا اتنے دنوں سے وعدہ ہے اور اس وقت حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ یہاں مقیم ہیں بہت اچھا موقع ہے، عیادت بھی ہوجائے گی ہمارا وعدہ بھی پورا ہو جائے گا اور انہوں نے حسن ظن پر کہ حضرت قدس سرہٗ بھی پسند فرمائیں گے، حضرت سے ذکر کر دیا۔ حضرت کا گرامی نامہ اسی ڈاک سے فوراً آیا کہ میری طبیعت بحمد اللہ بہت اچھی ہے، تم مظفر نگر کا ہرگز ارادہ نہ کرنا میں یہاں سے فارغ ہونے کے بعد دو تین دن میں پہلے سہارنپور آؤں گا پھر دیوبند جاؤں گا۔ چنانچہ حضرت قدس سرہٗ مظفر نگر سے مع سامان و حشم و خدم ریل میں سوار ہوکر، ان سب کو تو دیوبند اُتار دیا اور تنہا سہارنپور تشریف لا کر اگلی گاڑی سے واپس ہوئے۔

اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے نواسے چچا یعقوب رحمہ اللہ تعالیٰ نور اللہ مرقدہٗ کو اس ناکارہ سے محبت عشق کے درجے میں تھی اور ان کی زندگی میں شاید ہی کوئی دو تین مہینے اس ناکارہ کو گنگوہ کی حاضری سے خالی گیا ہو، وہ اپنی والدہ حضرت صاحبزادی صاحبہ نور اللہ مرقدہا کی طرف سے ہمیشہ

گنگوہ کے جانے پر اصرار کیا کرتے تھے، باوجودیکہ ان کی حیات میں بہت کثرت سے حاضری ہوتی تھی، مگر ان کی محبت اس کو کافی نہ سمجھتی تھی اور میرا یہ عذر کہ حضرت قدس سرہٗ کا حرج ہوتا تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے حضرت قدس سرہٗ سے گنگوہ چلنے کی درخواست کی اور آبھے والوں کا بھی بہت اصرار ہو رہا تھا، حضرت نے دونوں جگہ کا قبول فرمالیا۔ قرار یہ پایا کہ اسی وقت ریل سے نانوتہ اور ظہر کے بعد نانوتہ سے آبھہ اور شب کو آبھے قیام کے بعد علی الصباح گنگوہ اور دوسرے شام کو گنگوہ سے واپسی۔ حضرت قدس سرہٗ نے منظور کرلیا کہ دو دن میں تین جگہ نمٹ جائیں گی۔ میں حضرت کی خدمت میں ڈاک لکھ رہا تھا، چچا یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب تو آپ کے حرج کا عذر نہیں۔ حضرت خود تشریف لے جا رہے ہیں، میں چپ۔ واقعی کوئی عذر نہ تھا اور یہ ناکارہ بھی ہم رکاب ہوگیا۔ چچا یعقوب کی ایک بہترین عادت یہ تھی کہ جب ریل کا سفر ہوتا، ہر اسٹیشن پر اُترتے، کسی واقف سے ملاقات ہو جائے، کسی نے جانے والے کے ہاتھ کہیں پیام بھیج دیں، مجھے یہ عادت معلوم تھی، میں رامپور کے قریب حضرت کے قریب ہوگیا۔ جب رامپور کے اسٹیشن پر اُترے، میں نے حضرت سے عرض کیا کہ تعمیل میں تو حاضر ہوگیا مگر میرے پاس تو بذل کی بہت سی کاپیاں مقابلہ کے لیے رکھی ہیں۔ یہ خیال تھا کہ حضرت کا کوئی سفر ہوگا تو مقابلہ کرلوں گا، حضرت نے نہایت تیزی سے فرمایا کہ وہاں کیوں نہیں کہا؟ میں نے کہا کہ حضرت نے حکم نافذ فرمادیا، اس وجہ سے ہمت نہیں پڑی اور فرمایا کہ نانوتہ سے فوراً واپس ہو جاؤ۔ نانوتہ پہنچنے کے بعد جب آبھے جانے کے لیے سواریوں کی تنظیم شروع ہوئی اور حضرت قدس سرہٗ کی گاڑی میں اس سیہ کار کا نام بھی تجویز ہوا تو حضرت قدس سرہٗ نے فوراً فرمایا کہ نہیں یہ آگے نہیں جائے گا۔ اس کو واپس ہونا ضروری ہے۔ اس وقت کا چچا یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا غصہ بھی ہمیشہ یاد رہے گا۔ فرمانے لگے کہ میں قصداً اس وقت سے تیرے ساتھ ہوں کہ کہیں چپکے سے توا اڑنگا نہ لگادے، میں نے تو تجھے حضرت سے بات کرنے کا موقع نہیں دیا، تو نے کس وقت بات کی بس اتنا بتلادے؟ میں تو چپ اور حضرت نہایت زور سے فرما رہے ہیں، نہیں نہیں اس کا جانا ضروری ہے اور وہ مرحوم بار بار پوچھتے رہے مجھے بتادے بات تو نے کہاں کی؟ جب میں یہاں پہنچا تو حضرت قدس سرہٗ کے ایک عزیز جو ہمیشہ اس کوشش میں رہا کرتے تھے کہ ان کا ایک عزیز اس سیہ کار کی جگہ بذل میں لگ جائے، میری نانوتہ سے واپسی پر نہایت غصہ سے فرمانے لگے کی یہ باتیں ہوں دل میں گھر کرنے کی، اس کا دل بالکل سفر کو نہیں چاہتا تھا، میں اس کے چہرے کو خوب دیکھ رہا تھا، حضرت کے حکم کی تعمیل میں چلا گیا تھا، راستہ میں ایسی پٹی پڑھائی ہوگی جس سے حضرت بھی خوش ہو گئے ہوں گے کہ میرے کام کی وجہ سے جا رہا ہے۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے کیا پڑھایا تھا؟ میں نے کہا

کا پیاں مقابلہ کی رہ گئی تھیں، فرمانے لگے ضرور رہ گئی تھیں، سفر کو دل نہ چاہ رہا تھا، میں بھی تو صبح کو دیکھ رہا تھا کہ کس مجبوری کو تو نے ہاں کی تھی

بہت سے واقعات ہیں جو یاد آتے چلے جارہے ہیں۔ بعض مرتبہ تو مجھے شیخ الہند قدس سرہٗ کا بھی اتباع کرنا پڑا۔ میں نے سنا ہے کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ پر جب کسی ایسی جگہ جانے پر اصرار ہوتا جہاں جانے میں کوئی دینی امر مانع ہوتا، اول تو انکار فرماتے، لیکن جب زیادہ اصرار ہوتا اور طبیعت کے خلاف کوئی مجبور کرتا تو اسہال کی گولی نوش فرمالیتے۔ مجھے تو ایک آدھ دفعہ اس کا سابقہ پڑا، ورنہ میرے لیے تو سفر کا تصور ہی بیماری کے لیے ہمیشہ کافی سے زیادہ رہا۔

بری عادت سفارشوں سے نفرت:

(۸)...... میری بری عادتوں میں سے ایک نہایت شدید اور بدترین عادت یہ ہے کہ "مجھے سفارش سے ہمیشہ وحشت رہی۔" میں نے سنا کہ میرے دادا صاحب نور اللہ مرقدہٗ جب نواب چھتاری کے یہاں جاتے تو اپنے ساتھ اتنی درخواست لَا تُعَدُّ وَلَا تحصیٰ لے جاتے کہ حد نہیں۔

اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کو تو ہمیشہ خود بھی دیکھا کہ حضرت قدس سرہٗ سے جو شخص جہاں بھی سفارش چاہتا ہے مہتمم مدرسہ ہو چاہے وزیرِ اعلیٰ صوبہ ہو یا وزیرِ اعلیٰ مرکز فوراً اس کے نام کی سفارش کر دیتے۔ میں تو بعض دفعہ عرض کر دیتا تھا کہ آپ سے اگر کوئی یہ سفارش کرائے کہ پنتھ صاحب وزیرِ اعلیٰ استعفاء دے کر مجھے اپنی جگہ وزیرِ اعلیٰ کر دیں تو آپ اس کی بھی سفارش فرما دیں، حضرت ہنس دیتے۔

مجھے سفارش ہمیشہ اسی واسطے گرانی رہی کہ اب سفارش، سفارش کے درجہ میں نہیں رہی، جس کے متعلق "اشفعوا توجروا ولیقض اللہ علی لسان رسولہ ماشاء" ارشاد فرمایا گیا ہے، اسی بناء پر مجھے سفارش سے ہمیشہ گھبراہٹ رہی کہ وہ اب سفارش کے درجہ میں نہیں بلکہ وہ اب بار اور حکم کے درجہ میں ہو گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات ہدیہ کے قبول کرنے کی ترغیب میں وارد ہوئے ہیں، لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد بخاری شریف میں وارد ہے کہ ہدیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو ہدیہ تھا اب تو رشوت ہے اور سچ فرمایا۔

ایک دفعہ میرے عزیز مولوی ظہیر الحسن مرحوم نے یہ کہا کہ اگر کوئی شخص میری سفارش قبول نہ کرے تو میری ہمیشہ کے لیے اس سے لڑائی ہو جاتی ہے اس سے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں، جانا آنا بھی بند کر دیتا ہوں۔ میں نے مرحوم سے کہا کہ جو میری سفارش رد کر دے مجھے اس سے زیادہ

خوشی ہوتی ہے بہ نسبت اس سے کہ جو اس کو قبول کر لے۔ اس لیے کہ سفارش قبول کرنے والے کے متعلق مجھے یہ فکر ہو جاتی ہے کہ کہیں اس پر بوجھ نہ پڑا ہو۔

اسی بناء پر تقسیم سے پہلے مسلمان حاکم جو بکثرت آتے تھے اور جو مسلمان حاکم آتا تھا وہ کہیں سے آنے سے پہلے اس سیہ کار کا نام سن لیتا تھا اور آنے کے بعد بہت جلد ملاقات کے لیے آیا کرتا تھا اور میرا ہمیشہ دستور یہ رہا کہ جب کوئی مسلمان حاکم آتا تو ابتدائی ملاقات میں اس کا بہت اعزاز کر کے اس کو بہت اکرام سے درخواست کرتا کہ آئندہ کرم نہ فرمائیں اور جب وہ بہت تعجب سے پوچھتے کہ کیوں؟ ہماری تو خواہش یہ ہے کہ بہت کثرت سے حاضر ہوں تو میں ان سے کہتا کہ آپ تو حاکم ہیں آپ تک تو لوگوں کی رسائی مشکل اور جاتے ہوئے ڈریں گے اور اس غریب پر ہر شخص مسلّط رہے گا کہ جج صاحب، ڈپٹی صاحب، منصف صاحب تیرے یہاں آتے ہیں ہماری سفارش لکھ دے۔ یہ ناکارہ مصیبت میں پھنس جائے گا۔

ایک آدھ صاحب نے تو میری درخواست قبول کی اور دو ڈپٹیوں کے متعلق جن کے نام کے اندر تردّد ہے اور ان سے بے تکلفی بہت ہو گئی تھی انہوں نے کہا، آنا کبھی نہ چھوڑیں گے آپ جتنا منع کریں، اس کا اطمینان دلاتے ہیں کہ ناحق میں آپ کی سفارش قبول نہ کریں گے میں نے ان سے بہت ہی کہا کہ قبول کرنا تو آپ کا کام ہے اور بعد کا کام ہے میں تو مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔

اس سلسلہ میں ایک عجیب لطیفہ یا واقعہ یا قصہ پیش آیا۔ میرے ایک عزیز الحاج مولوی محمود الحسن کاندھلوی اسلامیہ اسکول کے ہمیشہ مدرس دوم رہے، مگر کبھی کبھی وہ پرنسپل کے نہ ہونے کی وجہ سے پرنسپل بھی بنتے رہتے تھے۔ چونکہ کثرت سے میرے یہاں آمدورفت تھی، اسکولوں کے سبھی طلبہ کو میری عزیز داری کا حال معلوم تھا، صبح سے لے کر شام تک سینکڑوں نہیں، ہزاروں کہوں تو مبالغہ نہیں ہوگا، لوگ مجھ پر مسلط ہو گئے کہ ماسٹر صاحب تمہارے عزیز ہیں، کل کو لڑکے کا امتحان ہے آپ سفارش کر دیں۔ اول اول تو میں نے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ امتحان میں سفارش ہرگز نہ چاہیے۔ میں تو خود ایک مدرسہ کا ذمہ دار ہوں اور امتحان میں سفارش کا سخت مخالف ہوں۔ مگر میں جتنا وجوہ و دلائل بیان کرتا اتنے ہی زیادہ مجھ پر خوشامد و اصرار اور مدرسہ اور شہر کے اکابر صبح سے شام تک میں عاجز آ گیا، کوئی کام نہ کر سکا۔ دوپہر تک تو میں نے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی، مگر جب میں نے دیکھا کہ یہ سمجھانا بالکل بے کار ہے تو میں نے ظہر کے بعد سے کہنا شروع کیا اچھا کل صبح کو آپ آیئے میں ضرور سفارش کروں گا اور مغرب کے بعد میں نے اپنے عزیز بھائی محمود الحسن کو آدمی بھیج کر بلایا اور میں نے اپنی مصیبت اور پریشانی کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ انکار پر تو مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی، اس کی وجہ سے تم کو بلایا کہ میں کل صبح سے جو آئے اس

کی سفارش بغیر پڑھے لکھنی شروع کر دوں گا، میرے اور تمہارے دونوں کے امن اور خلاصی کی صورت ایک ہی ہے کہ جو میری سفارش لے کر جائے میرا نام دیکھ کر بغیر پڑھے پھاڑ کر اس کے منہ پر پھینک دینا کہ ان کا کام تو یہی ہے کہ بیٹھے بیٹھے سفارشیں لکھتے رہتے ہیں۔ اول تو بھائی محمود نے میری تجویز پر عمل کرنے سے شدت سے انکار کر دیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے اور میں کیسے کرسکتا ہوں، مگر جب میں نے ان کو سمجھایا کہ میری اور تمہاری دونوں کی خلاصی اسی میں ہے۔ اگر میری سفارش کے بعد اتفاقیہ کوئی شخص خود بھی پاس ہوگیا تو لوگ تمہیں متہم اور ملزم قرار دیں گے کہ سفارش پر پاس کر دیا۔ بڑی دیر میں ان کی بھی بات سمجھ میں آئی اور اگلے دن علی الصباح میں نے سفارشات زوردار لکھنا شروع کیں اور بھائی محمود نے اللہ ان کو جزائے خیر دے، میری تجویز پر عمل کرنا شروع کیا۔ دس بارہ ہی لکھی ہوں گی کہ اسکول میں اس کی شہرت ہوگئی کہ ماسٹر صاحب اور ان کے خانگی تعلقات خراب ہیں اور اس کی جستجو شروع ہوئی کہ میری ان کی لڑائی ذاتی ہے یا خاندانی ہے اور اس کا منشأ کیا ہے؟ مجھ سے اور ان سے تو کسی نے براہ راست نہ پوچھا مگر میں سنتا رہا کہ اس کی جستجو رہی ہے۔ لیکن دس بارہ کے بعد ان کو بھی امن ہوگیا اور مجھے بھی ہوگیا اور یہ بدنامی کہ ان کے آپس کے تعلقات خراب ہیں، میرے اور ان کے لیے بہت آسان تھی اس مصیبت کے مقابلہ میں جو سفارشات پر آتی۔

اپنے اکابر میں حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا اُسوہ اس ناکارہ کے لیے اتباع کو کافی ہے کہ حضرت قدس سرہٗ بھی اس سے بہت پہلوتہی فرماتے تھے۔ اب بھی اس ناکارہ کو ایسے لوگوں سے سفارش سے بہت بار ہوتا ہے جو سفارش کو حکم کا درجہ دیں۔ خود اس سیہ کار نے اکابر کی سفارشوں کو بسا اوقات اپنی نااہلیت سے قبول نہیں کیا۔

دارالعلوم کی ایک اسٹرائک میں میرے ایک عزیز بہت قریبی، شریک تھے میں نے مظاہر علوم میں شدت سے یہ اعلان کر دیا تھا کہ دارالعلوم کا کوئی اسٹرائکی مظاہر علوم میں داخل نہیں کیا جائے گا۔ میرے اس عزیز کے والد مرحوم جو میرے بھی بزرگ اور میرے بڑوں کے بھی بزرگ اور حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے بھی اخص الخواص، وہ مرحوم اپنے بچے کو لے کر آئے۔ ہمارے ناظم صاحب نور اللہ مرقدہ اعلی اللہ مرقدہٗ ایسے موقعوں پر بلکہ بسا اوقات اس کی نوبت آتی تھی یہ کہہ کر الگ ہوجاتے تھے کہ زکریا سے بات کر لیجئے۔ میرے مرحوم بزرگ یہ سن کر کہ زکریا سے بات کر لیجئے بہت خوش ہوئے کہ اب تو گھر کی بات ہوگئی۔ مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ اسے مظاہر میں داخلہ کے واسطے لایا ہوں ناظم صاحب نے تیرے حوالے کر دیا، میں نے عرض کر دیا کہ مدرسہ نے یہ طے کر دیا ہے کہ دارالعلوم کا کوئی اسٹرائکی مظاہر میں داخل نہ ہوگا۔ اول تو مرحوم نے مجھے شفقت سے فرمایا پھر ذرا ڈانٹ کر فرمایا۔ میں نے کہا یہ میری ذات کا قصہ نہیں ہے مدرسہ کا قصہ ہے اور

مدرسہ کی مصالح ہمیشہ ذاتی تعلقات پر مقدم ہونے چاہئیں۔ مرحوم نے فرمایا کہ اگر میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی سفارش لکھوا کر لاؤں تو کیا کرے گا؟ اگر چہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سفارش کا مسئلہ بہت مشکل تھا مگر مرحوم کے تعلقات پر مجھے یہ اندیشہ ضرور ہوا کہ اگر مرحوم نے درخواست کی تو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ قانونی اور آئینی الفاظ میں ضرور کچھ تحریر فرمادیں گے۔ میں نے مرحوم سے عرض کیا کہ اگر حضرت قدس سرہٗ نے سفارش فرمائی تب تو میں حضرت سے عرض کردوں گا کہ حضرت مدرسہ کا قصہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے قبول کرنے سے معذرت کردی تھی اور اگر حضرت نے بحیثیت سرپرست حکم دیا اور یہ تحریر فرمایا کہ میں بحیثیت سرپرست حکم دیتا ہوں تو پھر مجھے کوئی عذر نہ رہے گا اور نہ صرف عزیز موصوف کو بلکہ جتنوں کے لیے حضرت فرمائیں گے داخل کرلیا جائے گا۔ یہ خود میں بھی سمجھتا تھا اور وہ بھی سمجھتے تھے کہ حضرت ایسا کیسے تحریر فرماسکتے ہیں؟

مدرسہ کے مصالح ذاتی مصالح پر مقدم ہیں

اور میرے حضرت مدنی کے یہاں سفارش کا تو صلائے عام تھا، روزمرہ کا یہی قصہ رہتا تھا، جہاں تک مدرسہ کے حدود میں گنجائش ہوتی، تعمیل ارشاد میرے لیے فخر تھا، لیکن جہاں میرے خیال میں مدرسہ کے قوانین کے خلاف ہوتا وہاں کسی موقعے پر معذرت کردیتا۔

ایک صاحب ایک مرتبہ بڑی زوردار سفارش حضرت مدنی کی لائے خط میرے نام تھا، میں نے خط کو پڑھ کر بے ادبی کے ساتھ ایسے رکھ دیا کہ جیسے کوئی چیز تھی ہی نہیں، وہ صاحب کہنے لگے آپ اس کے متعلق کیا فرماتے ہیں، میں نے کہا کہ یہ خط حضرت کا میرے نام ہے، اس میں یہ نہیں لکھا کہ آپ مجھ سے جواب طلب کریں، میں حضرت کے خط کا اپنے آپ جواب لکھ دوں گا آپ کو جواب لینے کے لیے نہیں لکھا۔ کہنے لگے کہ آپ اس پر لکھ دیجئے کہ میں قبول نہیں کرتا۔ میں نے کہا کہ آپ کو تو جواب دینے کو اس میں لکھا نہیں۔ کہنے لگے پھر میری سفارش واپس کردیجئے، میں نے کہا یہ حضرت کا والا نامہ میرے نام ہے، آپ قاصد ہیں، آپ نے خط پہنچادیا، آپ دوبارہ حضرت سے لکھوا کر لایئے کہ میں نے جو خط بھیجا تھا وہ ان ہی کے ہاتھ واپس کردیا جائے، بہت دیر تک انہوں نے مجھے دق کیا، میں نے کہا آپ کا اس خط سے کوئی واسطہ ہی نہیں، آپ کے ہاتھ حضرت نے ایک خط بھیجا ہے جیسا ڈاکیہ کے ہاتھ بھیجتے ہیں، کہنے لگے میرے متعلق ہے، میں نے کہا آپ کو کیا حق تھا اس خط کے پڑھنے کا جو میرے نام تھا؟ کہنے لگے میں نے ہی لکھوایا تھا، میں نے کہا آپ نے حضرت سے اس کی اجازت لے لی تھی کہ آپ اس خط کو پڑھیں گے؟ بہر حال میں نے یہ خط واپس بھی نہیں کیا اور تعمیل بھی نہیں کی اور جب کئی روز کے بعد حضرت قدس سرہٗ تشریف لائے

تو میں نے زبانی معذرت کردی حضرت نے فرمایا میں نے کوئی حکم نہیں دیا تھا، سفارش ہی تو کی تھی، میں نے عرض کیا کہ بعضوں کی سفارش حکم کا درجہ رکھتی ہے، حضرت مدنی کے ساتھ تو اس نوع کے بہت سے واقعات پیش آئے مدرسہ کے طلبہ اور ملازمین کے سلسلہ میں بھی اور سیاسی مسائل میں بھی۔

(۹)......میری بری عادتوں میں سے ایک عادت یہ ہے کہ میں تعلیمی سلسلوں میں چند امور میں اکثر علماء عصر کا شدید مخالف ہوں:

(الف)......میرا اور میرے اکابر کا جو دستور رہا وہ طلبہ کو اخبار بینی، جلسہ بازی اور مجلس سازی ان سب چیزوں کو طالب علم کے لیے میں مہلک سمجھتا ہوں ہماری طالب علمی کے زمانے میں بلکہ ابتداء مدرسی کے زمانے میں بھی طلبہ تو طلبہ مدرسین کے یہاں بھی اخبار بینی کا دستور نہ تھا، پہلے بھی اس سلسلہ میں لکھوا چکا ہوں، میرے خیال میں طلباء کی اسٹرائکوں میں اور ان فسادات اور ہنگاموں میں جو مدارسِ عربیہ میں کثرت سے ظہور پذیر ہیں اخبار بینی کو بہت دخل ہے، وہ اخبارات میں اسکولوں کے، مزدوروں کے قصے پڑھتے ہیں اور بیوقوف یہ نہیں سمجھتے کہ وہ وارثانِ انبیاء علیہم السلام اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نام لیوا ہیں، وہ اس قابل تھے کہ اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دانتوں سے مضبوط پکڑ کر دنیا کے مقتداء بنتے اور وہ احمق دوسروں کا تھوکا چاٹ کر دوسروں کے مقتدی بنتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تورات کا نسخہ پڑھنے پر چہرۂ انور سرخ ہو گیا تھا، جس کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے محسوس فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اے عمر! تجھے تیری میا روئے (یعنی تو مرجا) دیکھتا نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر غصہ کے آثار ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب چہرۂ انور کو دیکھا تو خوف زدہ ہو کر دوزانو بیٹھ کر جلدی جلدی ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ غَضَبِ اللّٰہِ'' الخ پڑھنا شروع کیا کہ میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں اللہ کے غضب سے، اس کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے غضب سے۔ ہم لوگ اللہ کو رب ماننے پر، اسلام کو اس کا دین ماننے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ماننے پر راضی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس وقت موجود ہوتے اور تم مجھ کو چھوڑ کر ان کا اتباع کرتے تو سیدھے راستے سے گمراہ ہو جاتے اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے اور میرا زمانہ نبوت پاتے تو وہ خود میرا اتباع فرماتے۔ (کذا فی المشکوٰۃ)

اور اسی نوع کے دوسرے قصے میں ایک دوسری حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی سے ایک دوسرا قصہ نقل کیا گیا ہے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم یہود سے بعض ایسی باتیں سنتے ہیں جو ہم کو اچھی معلوم ہوتی ہیں، آپ کی رائے اور اجازت ہو تو ہم بعض ان میں

سے لکھ لیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم کو اپنے دین کے بارے میں ایسا تردد ہے جیسا یہود و نصاریٰ متردد تھے، میں تمہارے پاس ایک صاف ستھری شریعت لے کر آیا ہوں، اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو میرے اتباع کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ (مشکوٰۃ)

اس نوع کے بہت سے مضامین احادیث میں آئے ہیں اور ہم لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع تو بعد کی چیز ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال واقوال پڑھنے کی بھی فرصت نہیں ہے، ہم کو اخبارات چاہئیں، ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ فرانس، امریکہ کیا کہتے ہیں، کافر لوگ کیا کرتے ہیں اور ان کا تھوکا چاٹنے میں وہ مزہ آتا ہے کہ شہد کھانے میں بھی وہ مزہ نہ آئے، اگر یہ کہا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا ترجمہ سن لو یا دیکھ لو تو اس کے لیے وقت نہیں ملتا اور اخبارات و رسائل کے لیے اسباق تو درکنار نماز کی جماعت بھی فوت ہو جائے تو پرواہ نہیں ہے، عوام کا تو ذکر نہیں، جو لوگ دیندار کہلاتے ہیں اور ان سے بھی زیادہ جب میں طلبہ کے متعلق یہ دیکھتا ہوں کہ مسجد میں تکبیر اولیٰ کے اہتمام کی بجائے دوکان پر بیٹھے ہوئے اخبار دیکھ رہے ہیں تو میں ہی جانتا ہوں کہ میرے دل پر کیا گزرتی ہے۔

(ب)......میں مدارسِ عربیہ کے درمیان میں ہندی، انگریزی کے داخل کرنے کا ہمیشہ سے شدید مخالف ہوں۔ ہمارے اکابر نے ان مدارس میں انگریزی کو داخل کرنے کی کبھی اجازت نہیں دی، ہمیشہ مخالفت فرمائی۔ اسی طرح ہندی کا حال ہے، میں مدارسِ عربیہ میں اس کے داخلے کا بھی سخت مخالف ہوں۔

جب یہ ناکارہ دارالعلوم دیوبند کا ممبر شوریٰ تھا، ایک صاحب نے ضروریاتِ زمانہ سے متاثر ہو کر بہت زور شور سے دارالعلوم کے نصاب میں ہندی داخل کرنے کی تحریک کی، میں نے نہایت شدت سے مخالفت کی، میں نے کہا کہ انگریزی اور ہندی کے لیے گاؤں در گاؤں اسکول کھلے ہوئے ہیں یہ لاکھوں میں دو چار بچے عربی پڑھنے کے لیے آگئے ہیں تم ان کو بھی اسی میں دھکیل رہے ہو۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی اس وقت حیات تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور بلند درجات عطا فرمائے، میری تائید میں بہت زوردار تقریر انہوں نے فرمائی اور کہا کہ سب کو معلوم ہے کہ میں ہندی کا کتنا حامی ہوں، مگر میں دارالعلوم کی چاردیواری میں شیخ الحدیث صاحب کے ساتھ ہوں، یقیناً اس کو اسلاف کے طرز پر جتنا بھی زیادہ سے زیادہ ممکن ہو رکھنا چاہیے۔ اصل محرک صاحب نے ضرورتِ زمانہ پر زور دیا، مولانا مرحوم نے میری وکالت کرتے ہوئے کہا کہ ان مدارس کی ابتدا میں انگریزی کی ضرورت اس سے زیادہ سخت تھی جتنی آج کل ہندی کی بتلائی جاتی

ہے اور میں خود بھی اسی کا ہم خیال ہوں، مگر دار العلوم کی حدود میں شیخ الحدیث کے ساتھ ساتھ ہوں، مجھ غریب کی آواز میں تو اتنا زور نہ ہوتا مگر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے جوش وخروش کو دیکھنے والے اب تک بھی خوب ہیں۔

• میں نے پہلے کسی جگہ پر یہ لکھوایا ہے کہ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ باوجود اپنے سیاسی زوروں کے اس ناکارہ کی رائے اپنی رائے کے خلاف قبول فرماتے تھے اور جہاں کہیں ان کی رائے کے بہت خلاف ہوتی وہاں بھی وہ اس سیہ کار کی رائے کو بغیر نام کے ذکر ضرور کر دیتے تھے، دار العلوم کے مسائل میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا بھی یہی معمول رہا ہے کہ وہ بسا اوقات اپنے سیاسی رجحان کی مخالفت کے باوجود دار العلوم کے مسائل میں اس سیہ کار کو بہت اہمیت دیتے تھے۔

(ج)......اسی طرح سے یہ ناکارہ مدارسِ عربیہ میں صنعت وحرفت کا بھی شدید مخالف رہا اور ہے، مظاہر علوم میں حضرت قدس سرہٗ کی حیات تک تو جو کوئی اس کا محرک آتا اس سے حضرت قدس سرہٗ خود نمٹ لیتے، ہم لوگوں کو نوبت ہی نہیں آتی تھی، لیکن حضرت قدس سرہٗ کے وصال کے بعد حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے دور میں بہت سے اہلِ خیر نے یہ پیشکش کی کہ آپ شعبۂ صنعت وحرفت مدرسہ میں داخل کر لیں۔

حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تو ہر شخص سے فرما دیتے کہ حضرت شیخ سے بات کر لو اور مجھ سے جو کوئی کہتا میں یہ جواب دیتا کہ بجائے اس کے کہ آپ اس کو مدرسہ میں داخل کریں اور اس کے سارے اخراجات آپ برداشت کریں آپ اس کو شہر میں مستقل شعبہ کی حیثیت سے جاری کر دیں اور جو مدرسہ سے فارغ ہوتا رہے گا اور اپنے مستقبل کے لیے درس وتدریس کے نہ ہونے کی وجہ سے سوچے گا تو میں اس کو ضرور مشورہ دوں گا کہ وہ ضرور صنعت وحرفت سیکھے، سائل یا فقیر نہ بنے۔

مجھے ان تین چیزوں میں زیادہ مخالفت تجربہ سے ہوئی ہے ابتداء تو اکابر کا طرز عمل ہے کہ تصوف میرے اکابر اور مظاہر علوم اور دار العلوم کے اکابر کی جان رہی ہے، دونوں مدارس کے اکابر میں شاید ایسا کوئی بھی نہ ہوگا جو کسی سے بیعت نہ ہوا ہو اور ذکر وشغل میں کسی درجہ میں اشتغال نہ ہوا ہو، لیکن اس کے باوجود طالب علموں کے بیعت کرنے میں حضرت اقدس قطب عالم گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کو جس قدر شدت رہی سب کو معلوم ہے، اس لیے کہ طلب علم کے ساتھ دوسری چیز جوڑ بالکل نہیں کھاتی، اگرچہ طلبہ کی موجودہ بے راہ روی کو دیکھ کر کہ وہ فراغ سے پہلے ہی اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتے ہیں، متاخرین نے صرف بیعت کو اختیار کر لیا تھا، لیکن ذکر وشغل کی اب بھی اجازت نہیں ہے، اس واسطے کہ علم کے ساتھ خواہ کوئی مشغلہ ہو وہ علم کے لیے نہایت مُضر ہے۔ علم کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ ''اتنے تو اپنے آپ سارے کے سارے کو مجھے نہیں دے دے گا،

اس وقت تک میں تھوڑا سا حصہ بھی تجھ کو نہیں دوں گا۔''

یہ اسلاف کے کارنامے کہ وہ علم کو اللہ کے واسطے پڑھاتے رہے اور صنعت وحرفت سے اپنی روزی کماتے رہے، گزر گئے۔ اب تو اس میں نہ مبالغہ ہے اور نہ تصنع کہ بہت سے ذی استعداد لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے شوق سے یا بڑوں کے جبر سے انگریزی میں لگے اور پھر انگریزی نے ان کو اپنی طرف کھینچ لیا اور ان کے ذی استعداد ہونے کا اب تک قلق ہے، بہت سے دوستوں نے ہمارے ہی مدرسہ میں معین مدرسی کی درخواست دی، بہت حتمی وعدے کیے اور بہت سے وعدے کیے کہ مدرسہ کا ذرا حرج نہ ہوگا اور بقیہ وقت اپنی تجارت میں لگایا لیکن ایک ہی سال کے اندر تجارت نے ان کو اپنی طرف کھینچ لیا اور مدرسہ کو خیر باد کہنا شروع کیا، دنیا کی کشش اور مال ودولت کی کشش فطری چیز ہے، اللہ جل شانہ نے بھی اس پر تنبیہ فرمائی ہے، سورۂ قیامۃ میں ارشاد ہے:

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْ نَ الْعَاجِلَةَ وَ تَذَرُوْ نَ الْاٰخِرَةَ الآية

خبردار! ''تم لوگ دنیا کو محبوب رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو''۔

عام حالت دنیا کی یہی ہے، اسی وجہ سے میں ان کا ہمیشہ مخالف رہا اور ہوں کہ یہ سب چیزیں دنیا ہیں جن کی محبت فطری ہے اور علم دین آخرت ہے، یہ کمبخت دنیا ہم پر غالب آجاتی ہے اور آخرت یعنی علم دین ہم سے چھوٹ جاتا ہے، لیکن اللہ اگر کسی کو توفیق دے تو میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تجارت بھی کرتے رہے اور پڑھنے پڑھانے میں اخیر تک مشغول رہے، تجارت نے ان کے کسی کام میں ذرا بھی حرج نہیں کیا، مگر یہ سب شواذ میں سے ہے، دیکھنا عمومی حالت کا ہوتا ہے۔

(د)......اسی طرح یہ ناکارہ تبدیلِ نصاب کا بھی سخت مخالف ہو گیا، میں اپنی طلب علم کی تفصیلات میں لکھوا چکا ہوں کہ میں نے درس نظامی کی پابندی سے نہیں پڑھا، میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ تدریس میں خود مجتہد تھے، اس لیے اپنی ابتداء مدرسی میں تو تبدیلِ نصاب کا خبط مجھ پر بھی خوب سوار تھا، ۳۵ھ سے ۳۸ھ تک ساری دنیا کے نصاب ڈھونڈ کر منگائے تھے ندوہ کا، اہل حدیث کے مدارس کا، حرمین کے مدارس کا اور دو نصاب مرتب کیے، ایک مطول۔ ایک مختصر۔ اول نصاب آٹھ سالہ ان لوگوں کے لیے جن کو پڑھنے کے بعد پڑھانے کے اسباب میسر ہوں، مالی اور گھریلو حالات سے، مثلاً یہ کہ ان کے خاندان میں اوپر سے علم کا ذوق وشوق چلا آرہا ہو، دوسرا مختصر نصاب، سہ سالہ، ان لوگوں کے لحاظ سے جن کے متعلق یہ معلوم ہو کہ یہ پڑھنے پڑھانے کے کام کے نہیں بلکہ یہ پڑھنے پڑھانے کے بعد طبیب یا کاشتکار بنیں گے، شطرنج کے کھلاڑیوں کی طرح سے میرا دماغ دن رات ان ہی میں گھومتا رہتا تھا اور بہت ہی غور وخوض سے میں نے یہ نصاب مرتب کیا تھا، اُس وقت تو ایک مختصر سا رسالہ لکھ کر شائع کرنے کا بھی ارادہ تھا لیکن جوں جوں

تدریس کا زمانہ یا تجربہ بڑھتا رہا، تبدیلِ نصاب کا خبط میرے دماغ سے نکلتا رہا، ایک دو کتاب کا تغیر علوم آلیہ میں ہو جائے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں، لیکن فقہ، اصولِ حدیث و تفسیر اور علوم آلیہ کی اہم کتب کافیہ، شرح جامی جیسی کتب میں تغیر کا بالکل قائل نہیں ہوں جس کی بہت سی وجوہ ہیں، بڑی وجہ تو یہ ہے کہ انگریزی نصاب کے آئے دن کے تغیرات کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ اگر مدارس عربیہ میں بھی یہ سلسلہ شروع ہو گیا اور ہر دس بارہ برس کے بعد نئی نسل اپنی جولانیاں دکھانی شروع کرے گی اور کیوں نہ کرے گی تو یہ نصاب رفتہ رفتہ وہ شیر بن جائے گا جس کی تصویر اپنی کمر پر کھینچوانی چاہی تھی لیکن دم، ہاتھ، پاؤں، کان، ناک ہر ایک کے بنانے میں جب تکلیف ہوئی تو وہ یہ کہہ کر انکار کرتا رہا کہ بغیر دُم کا بھی تو شیر ہوتا ہے اور بغیر ہاتھ کا بھی شیر ہوتا ہے۔

(۱)......درسِ نظامی کی ابتدا کی طرح سے ہر محقق اور ہر باا ثر یہ چاہے گا کہ اس کی تصنیف ضرور داخل نصاب ہو، جس کی نظیریں اپنی ابتداء مدرسی سے لے کر اب تک بارہا خوب دیکھیں، لیکن درسِ نظامی کو اللہ نے وہ مقبولیت عطا فرما رکھی ہے کہ اس میں عمومی کھپت کی گنجائش نہیں رہی، اس لیے لوگوں کی مساعی اس کے خلاف ناکام ہی ہوتی آ رہی ہیں۔

(۲)......مروّجہ نصاب کی اتنی خدمت ہو چکی ہے، شروح وحواشی ضرورت سے زیادہ لکھے جا چکے ہیں جن کا حال اہل علم کو خوب معلوم ہے، متبدل نصاب کی اتنی خدمت کرنے والے میرے خیال میں اب پیدا نہ ہوں گے اور اگر چہ ہمت والے آستینیں چڑھائیں گے بھی تو جتنی شروح و حواشی درسِ نظامی کی کتب پر سو برس میں لکھی گئی ہیں، ان سے آدھی کے لیے کم از کم پچاس برس چاہئیں اور اتنی مدت میں اگر یہ سلسلہ جاری ہو گیا تو نہ معلوم کتنی تبدیلیاں اور پیدا ہوں گی۔

(۳)......میں دوسروں کو تو نہیں کہوں گا مگر اپنے شاگردوں کو جرأت کر کے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی استعداد جیسی ہے وہ موجودہ نصاب کی کتب کو تو شروح وحواشی کی مدد سے کسی نہ کسی درجہ میں پڑھالیں گے، لیکن کوئی نئی کتاب جس کی نہ شرح ہو نہ حاشیہ، تو نوے (۹۰) فیصد ایسے ہیں جو نہیں پڑھا سکتے، ایک شرح جامی کو لے لو کہ اس کی جگہ اگر ابن عقیل رکھ دی جائے جو مجھے بھی یاد ہے کہ میں نے اپنے خبط کے زمانے میں نصاب میں تجویز کی تھی، تو اس کا پڑھانے والا اگر علماء زمانہ کی توہین نہ ہو تو میرے خیال میں بہت دشواری سے ملے گا، اس لیے کہ اس کی کوئی شرح نہیں ملے گی اور شرح جامی کی اُردو، عربی، فارسی بے حد شروح ملیں گی، جو مدرسین حضرات سے دیکھی بھی نہیں جائیں گی، ابن ماجہ کی جگہ اگر تیسیر الوصول رکھ دی جائے تو ان دونوں کے شروح بکثرت موجود نہ ہونے کے باوجود مختلف مطابع، مختلف حواشی اس قدر کافی ہیں کہ شروح کی ضرورت نہیں اور تیسیر الوصول کا ایک بھی حاشیہ نہیں ملے گا، ابن ماجہ شریف کے لیے انجاح الحاجہ کافی سے زیادہ ہے اور

ایک انجاح الحاجہ ہی ایسا متبرک حاشیہ ہے کہ اس جیسا تیسیر الوصول کے لیے ملنا بھی مشکل ہے، یہ مدرسین کی نئی پود جن میں سے بہت سے تو اپنی وجاہت اور سفارشوں سے مدرس ہو گئے اور ان کے پڑھنے کا زمانہ ہماری نگاہوں میں ہے۔ اُردو کی شرح اور حواشی دیکھ کر کچھ دال دلیہ کر سکتے ہیں، مگر جن کی کوئی شرح نہ ہو اس کو اپنی تقریر کے زور سے اُڑا دی تو ممکن ہے جس کے متعلق میرا خود ذاتی تجربہ بھی ہے کہ بعض نو مدرسین جن کی تقریر شستہ ہو، آج کل جس کا رواج ہے وہ اپنے زور سے چلا تو دیتے ہیں مگر جب خود نہیں سمجھے تو طالب علم کیا سمجھے گا۔

باب چہارم

حوادث وشادیاں

میری ان ہی بری عادات میں سے ایک بری عادت ساری عمر بچپن سے شادیوں میں شرکت سے نفرت ہے، لیکن اس کے بالمقابل جنازوں میں شرکت کی رغبت، اہمیت۔ دونوں کے چند واقعات آپ بیتی کے لکھواؤں گا۔

شادیوں میں جانے سے مجھے ہمیشہ بچپن سے وحشت سوار رہی، حالانکہ بچپن میں ان کا بہت شوق ہوتا ہے اور بعض دفعہ تو ''وَ نَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ فَقَالَ اِنِّي سَقِيْم'' پر مجھے عمل کرنا پڑتا تھا اور اس میں کچھ کذب یا توریہ نہیں تھا کہ امراضِ ظاہرہ سے زیادہ امراض باطنہ کا شکار رہا اور جوں جوں امراضِ باطنہ میں کمی ہوتی رہی امراضِ ظاہرہ اس کا بدل ہوتے رہے۔ اس لیے ''اِنِّی سَقِیْم'' سے کوئی دَور بھی خالی نہیں تھا اور کبھی کبھی شیخ الہند قدس سرہٗ کے اُسوہ پر بھی عمل کرنا پڑا۔ اگرچہ یہ سیہ کار اپنے اکابر کا اتباع کسی جگہ بھی نہ کرسکا۔

میرے اکابر کے اس میں ہمیشہ دو نظریئے رہے، ایک حضرت سہارنپوری اور حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہما کا کہ اگر سفر سے کوئی عذر مانع ہوا تو صفائی سے کہہ دیا کہ وقت نہیں اور فرصت نہیں ہے۔ اس کے بالمقابل حضرت شیخ الہند اور حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ اور ہر دو حضرات رائے پوری نور اللہ مرقدہم کا یہ معمول رہا کہ یہ لوگ اصرار کرنے والوں کے سامنے بالکل عاجز ہوجاتے تھے اور ہتھیار ڈال دیتے تھے، خواہ کتنی ہی مشقت اُٹھانی پڑے۔ میں نے حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ سے علیحدہ علیحدہ دو موقعوں پر ایک ہی سوال کیا کہ جب مجبوری اور معذوری ظاہر ہے تو شدت سے آپ کیوں انکار نہیں کرتے؟ دونوں اکابر نے اللہ بلند درجات عطا فرمائے بڑا ہی قابل اتباع وعبرت جواب دیا، اگرچہ دونوں نے مختلف عبارتوں سے جواب ارشاد فرمایا، یہ فرمایا کہ اس کا ڈر لگنے لگتا ہے کہ اگر یہ مطالبہ ہو کہ ہم نے اپنے ایک بندے کو تیرے پاس بھیجا تیری کیا حقیقت تھی، ہم نے ہی تو اس کو بھیجا تھا، تو نے اس کو ٹھکرا دیا، تیری کیا حقیقت تھی، اس کا کیا جواب دوں گا۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے جس معمول کا اوپر ذکر کیا گیا، وہ یہ تھا کہ جب کوئی مجبور کرتا اور جانے میں کوئی معذوری ہوتی تو کوئی مسہل دوا نوش فرمالیا کرتے تھے، اسہال کو عذر فرمالیا کرتے تھے، اسہال کا عذر ایسا کہ ہر ایک کو محسوس ہوتا ہے، صاف انکار کرنے سے اپنے کو مشقت میں ڈالنا ان اکابر کو آسان تھا۔

فصل اوّل...... حوادث

(۱)......۳۴ھ تک تو یہ ناکارہ اپنے والد صاحب کی حیات میں محبوس، قیدی، نظر بند، کہیں جا آ سکتا نہیں تھا۔ ۱۰ ذیقعدہ ۳۴ھ میں میرے والد صاحب کا انتقال ہوا، اتفاق کی بات ہے جس صبح کو میرے حضرت مرشد العرب والعجم حضرت سہارنپوری کا جہاز بمبئی کی گودی پر لگا اسی صبح کو سہارنپور میں میرے والد صاحب کا انتقال ہوا، ایک عجیب واقعہ اس وقت کا ہے، یہ تو اتفاق کی بات تھی کہ بمبئی جہاز سے اُترتے ہی حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ انگریزوں کی قید میں نینی تال حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحریک کی تفتیش میں لے جائے گئے۔ اس سے پہلے بڑی ہی مسرتیں جھوم رہی تھیں۔ کوئی دہلی، کوئی بمبئی کا سامان باندھ رہا تھا، میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے ایک مخلص دوست شیخ حبیب احمد صاحب مرحوم نے پوچھا حالانکہ اس وقت تک کسی بیماری کا اثر تک نہیں تھا کہ مولوی صاحب آپ بمبئی جائیں گے یا دہلی؟ تو میرے والد صاحب نے جواب دیا تھا کہ میں تو اپنی جگہ پڑا پڑا ملاقات کرلوں گا، وہی حال ہوا کہ حضرت کے تشریف لانے پر وہ حاجی شاہ میں لیٹے ہوئے تھے، بہر حال میرے والد صاحب کے انتقال اور میری ابتدائی مدرسی کے بعد سے لے کر ۴۷ء کے ہنگامہ، تقسیم ہند کے وقت تک کا کوئی مدرسہ کا طالب علم اور غربی جانب اسلامیہ اسکول کے محاذات میں جو مسجدیں ہوتی تھیں، کسی مسجد کا رہنے والا کوئی طالب علم ایسا نہیں رہا ہوگا جس کو نہلانے اور کفنانے میں یہ ناکارہ مستقلاً شریک نہ ہوا ہو، ابتداءً اکیلا ہوتا تھا اور میرے ساتھ دو چار طالب علم، لیکن ۴۷ھ سے محی، صدیقی، مخلصی مفتی سعید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جن کی بے تعلقی اور تعلق کا قصہ بھی رئیس الاحرار کی طرح بڑا عجیب ہے، علی گڑھ کے قیام میں موقع ملا تو وہ بھی آجائے گا بڑا ہی عجیب قصہ ہے، میرے دست و بازو ہوگئے اور آخر میں تو میری معذوری کے بعد وہی اصل ہوگئے تھے، وہ میرے ساتھ اس مبارک کام میں شریک رہا کرتے تھے، اپنے ہاتھ سے غسل دینا، بالخصوص جن طلبہ کو چیچک نکل آئی ہو اور اپنے ہاتھ سے کفن پہنانا، قبرستان میں دفن تک شریک رہنا۔

البتہ اس سلسلہ میں ایک نہایت بُری عادت یہ بھی رہی کہ تعزیت میں آنے والے کبھی اچھے نہیں لگے، اگرچہ یہ ناکارہ دوسروں کی تعزیت میں اطلاع پاتے ہی پہنچتا۔ اس لیے کہ لوگوں کو بہت شدت سے میرے جانے کا اہتمام ہوتا، بہت شدت سے منتظر رہتے، لیکن مجھے میری تعزیت کے واسطے آنے والے کبھی اچھے نہ لگے، اِلّا ماشاء اللہ، حضرت مدنی حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہما جیسے تو مستثنیٰ تھے کہ ان کی آمد سے واقعی تعزیت ہوتی تھی، لیکن عام آنے والوں کو نہایت شدت سے منع کردیتا تھا۔

حادثۂ انتقال والد صاحب:

(۱)...... میری زندگی کا سب سے اہم اور ابتدائی واقعہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا حادثۂ انتقال جو ۱۰ ذیقعدہ ۳۴ھ کو ہوا۔

میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے ذمہ انتقال کے وقت آٹھ ہزار روپے قرض تھے۔ جس کا کچھ حال تذکرۃ الخلیل میں حضرت میرٹھی لکھ چکے ہیں۔ مجھ پر ان کے قرض کا بہت ہی بوجھ تھا کہ اللہ جل شانہ کے یہاں مطالبہ نہ ہو۔ میں نے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کے بعد چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے مشورہ سے دوستوں کو کارڈ لکھے کہ میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا ان کے ذمہ جو قرض تھا وہ میری طرف منتقل ہو گیا، یہاں آنے کی ہر گز ضرورت نہیں، وہیں سے دعائے مغفرت و ایصال ثواب اپنی دست وسعت کے مطابق کرتے رہیں۔ جن سے کچھ لین دین تھا ان کے خط میں یہ اضافہ بھی ہوتا تھا کہ والد صاحب کے ذمہ کچھ قرض ہو تو اس کی تفصیل سے مطلع کریں۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نے تو نینی تال سے واپسی پر میری اور چچا جان کی اس تجویز کو پسند نہیں فرمایا، بلکہ یوں ارشاد فرمایا کہ یوں لکھنا چاہیے تھا کہ ان کا ترکہ کتابیں ہیں، اپنے قرضہ کے بقدر لے لو۔ میرا بڑا دل خوش ہوا کہ اگر میرے کارڈوں سے پہلے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی تشریف آوری ہو جاتی تو حضرت کی تجویز کے خلاف لکھنا ناممکن تھا اور مجھے یہ لکھتے ہوئے غیرت آتی تھی کہ کتابیں لے جاؤ۔ اس موقع پر بھی تین عجیب واقعے پیش آئے:

(الف) والد صاحب کے انتقال کی اس قدر شہرت آن کے آن میں ہوتی رہی کہ تقریباً ۸ بجے صبح کو انتقال ہوا، ۹ بجے تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی۔ تدفین میں بہت معرکہ رہا، حکیم اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور حکیم یعقوب رحمہ اللہ تعالیٰ جن سے میرے والد صاحب کے بہت ہی خصوصی مراسم تھے، ان کی تمنا خواہش یہ تھی کہ اپنے اپنے باغ میں تدفین عمل میں آئے۔ مگر ہمارے اہلِ محلّہ بالخصوص جناب الحاج فضل حق صاحب جو بانیانِ مدرسہ میں ہیں ان کے صاحبزادے جناب شیخ حبیب احمد صاحب اور ان کے رفقاء لٹھ لے کر تشریف لائے کہ تدفین حاجی شاہ میں ہوگی ورنہ یہاں معرکہ ہو جائے گا اور اہل محلّہ بھی اس پر مُصر تھے اور چونکہ مولانا محمد مظہر صاحب بانی مظاہر علوم کا مزار مبارک بھی حاجی شاہ میں تھا۔ اس لیے اہل مدرسہ کی رائے بھی وہیں کی ہوئی۔

انتقال کے وقت گھر میں صرف میری والدہ مرحومہ تھیں، (جن کو اسی وقت سے بخار شروع ہو گیا اور دس ماہ بعد بڑھتے بڑھتے تپ دق تک پہنچا کر مورخہ ۲۵ رمضان المبارک لیلۃ القدر میں میرے والد صاحب کے پاس ہی پہنچا دیا)۔ اس وقت گھر میں صرف میری چھوٹی بہن مرحومہ جس کی عمر اس وقت غالبًا تیرا (۱۳) چودہ (۱۴) برس کی ہوگی اور اہلیہ مرحومہ تھیں اور کوئی نہیں تھا۔ مجمع رات

تک لَا تعدّ وَلا تحصٰی ٹوٹ پڑا، کھانے کی مہمانوں کے لیے انتظام کرنے کی کوئی صورت نہ تھی بجز اس کے میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے شاگردانِ رشیدان شام تک بازار جاتے آتے رہے، روٹی کچوری اسٹیشن تک جہاں جس دکان پر ملی وہ بیچارے خرید کرلاتے رہے۔ جہاں تک یاد ہے تین چار سو روپے کی صرف کچوریاں منگوائی تھیں، جو دکاندار شام تک پھرتی سے پکاتے رہے، یوں یاد پڑتا ہے کہ ایک پیسے کی ایک اچھی کچوری آتی تھی۔ میں بھی خواص کے ساتھ شرکت کرتا تھا تا کہ اصرار سے ان کو کھلاؤں۔ اتنی کچوریں اس سے پہلے نہ عمر بھر میں کھائیں بلکہ اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں، نہ آئندہ کو کوئی احتمال۔ میرا لوگوں کے کھانے پر اصرار اور ان کے ساتھ کھانے پر میں نے اپنے کانوں سے کئی فقرے سنے۔ ایک یہ کہ اس کو اپنے باپ کے مرنے کی بہت ہی خوشی ہو رہی ہے، کیا بات ہے؟ دوسرے یہ کہ باپ کی زندگی میں بڑی قید میں رہتا تھا، آج آزادی ملی ہے۔ بعض ناواقف آپس میں یہ بھی پوچھتے تھے کہ یہ اس کے باپ نہیں معلوم ہوتے، اس کی والدہ کے دوسرے خاوند ہوں گے۔

تفصیل ادائیگی قرضہ:

(ب) میرے والد کے ذمے آٹھ ہزار قرض تھا اور میری عمر تقریباً انیس (۱۹) سال تھی، قرض خواہوں کو یہ فکر ہو گیا تھا یہ رقم ماری گئی۔ ایسے خصوصی تعلق رکھنے والوں نے بھی ایسے شدید تقاضے کیے جس کا واہمہ بھی نہ تھا۔ اس سال مالی حیثیت سے مجھے بہت ہی پریشانی ہوئی، شاید اس کی تفصیلات کہیں آ جائیں۔ مالک الملک کے اس قدر احسانات لَا تعُدُّ وَلا تحصیٰ برسے ہیں کہ ''وَاِنْ تَعُدُّوْ ا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا'' کا اعتقاد ہی نہیں عملی تجربہ ہے۔

(ج)...... میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا تجارتی کتب خانہ اشتہاری قیمت سے تو قرضے کی حیثیت سے کچھ زائد تھا، لیکن تجارتی اور نیلام کی صورت سے قرضہ سے بہت کم تھا۔ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مخلص دوست عالی جناب شاہ زاہد حسن صاحب رئیس بہٹ مرحوم کا یہ اصرار تھا کہ میں کتب خانہ کو فوراً بیچ دوں اور اس کے بعد قرضہ جتنا باقی رہ جائے اس کو مرحوم ازراہِ کرم اپنے پاس سے ادا کریں گے اور میں مرحوم کے یہاں کسی دوسری جگہ ملازمت بچوں کے پڑھانے کی اختیار کروں۔ میں نے اس تجویز کا شدت سے انکار کر دیا۔ اس پر شدید ناراض ہو گئے۔

(د)...... میری ہمشیرہ مرحومہ چونکہ نابالغ تھیں اور مجھ سے حساب کا رکھنا بہت مشکل تھا، قرضے کا بھی بڑا مرحلہ تھا، اس لیے میں نے مرحومہ کی طرف سے اپنے چچا جان کو وکیل بنایا اور کاندھلہ کی نھیالِ والی جائداد مسکونہ اور صحرائی کا حساب لگا کر والدہ اور دادی اور ہمشیرہ کی طرف لگا دیا جو بہت

تھوڑی تھوڑی مقدار میں آیا اور کتب خانہ جس کی مقدار بہت ہی کم تھی اپنی طرف لگالیا اور قرضہ بھی اپنی طرف لگالیا اللہ نے وہ احسان فرمایا ہے کہ آج دنیا بھی دیکھ رہی ہے کہ کسی نواب یا بادشاہ کو یہ وسعت کہاں حاصل ہوگی جو اس سیہ کار کو حاصل ہے۔ البتہ ابتدائی ایک سال لوگوں کے اس اندیشے سے کہ رقم ضائع ہوجائے گی مجاہدے کا ضرور گزرا۔ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے چند مخلص دوست حکیم خلیل صاحب دیوبندی ثم سہارنپوری مقیم کھالہ پار جو خود تو مالدار نہیں تھے مگر ان کے محلّہ کے متعدد نوربافِ متمول بہت معتقد تھے اور محلّہ پٹھانپورہ کے متعدد پیسے والے اور مولانا منفعت علی صاحب سابق وکیل سہارنپور جو تقسیم کے بعد کراچی جاکر انتقال کرگئے اور سب سے آخر میں میرے مخلص، میرے محسنِ اعظم جناب الحاج حبیب احمد صاحب جن کے صاحبزادے بہاولپور میں افسر الاطباء رہ کر انتقال فرماگئے، ساکن محلّہ منڈی کلاں یہ سب میرے والد صاحب قدس سرہٗ کی وجہ سے مجھ پر شفیق تھے، چونکہ لوگوں کے مطالبے تھے، میں ہر دن کے لوگوں سے وعدے کرلیا کرتا تھا کہ کل کو انشاء اللہ ادا کردوں گا۔ چوتھے گھنٹے کا سبق پڑھا کر دار الطلبہ سے سیدھا کھالہ پار جاتا، حکیم خلیل صاحب سے کہتا کہ آج شام تک پانچ سو کے دینے کا وعدہ ہے، وہ مجھے اپنے مطب میں بٹھا کر ایک پنسل اور ایک کاغذ لے کر اپنے معتقد نوربافوں میں جاتے جوان کے گھر کے قریب رہتے تھے اور جاکر کہتے، بھائی ہمارے مولوی صاحب کو پیسے چاہئیں، بولو کون کیا دے گا؟ کوئی دس دیتا، کوئی بیس دیتا، کوئی کم وبیش، وہ پندرہ بیس منٹ میں ایک فہرست لکھ کر لاتے جس پر نام، رقم، وعدہ درج ہوتا تھا، اس فہرست کو اپنے قلم دان میں رکھتے اور میرے پاس تشریف لاکر مجھے دوسرا پرچہ لکھواتے۔ فلاں تاریخ کو دس روپے، فلاں تاریخ کو بیس روپے، فلاں میں پندرہ، فلاں میں پچیس۔ میں یہاں سے نمٹ کر فوراً پٹھانپور جاتا اور وہاں بھی اس دن کا مطالبہ پورا نہ ہوتا تو مولانا منفعت علی صاحب کے پاس جاتا جو اس زمانے میں محلّہ مطربان میں رہتے تھے۔ جہاں میری غرض پوری ہوجاتی واپس آجاتا اور آخری درجے میں جناب الحاج حبیب احمد صاحب کے پاس جاتا، وہ خود بھی پیسے والے تھے اور ان کے پڑوسی بھی۔ وہ صورت دیکھتے ہی پوچھتے کتنی کسر باقی ہے؟ میں کہتا کہ حاجی جی آج تو بہت باقی ہے، آٹھ سو ابھی باقی ہیں، وہ جاتے اور جتنی کسر ہوتی فوراً لادیتے۔ یہ روزانہ کا معمول اس وجہ سے بن گیا تھا کہ لمبے وعدے پر اور زیادہ مقدار میں اس وقت پیسے نہیں ملتے تھے۔ مرحوم کو پندرہ بیس ہی دن میں کسی ذریعے سے یہ معلوم ہوگیا جس کا میں نے تو اظہار نہیں کیا کہ یہ دار الطلبہ سے سیدھا بغیر کھانے کھائے چل دیتا ہے کھانا نہیں کھاتا۔ موصوف اچھے پیسے والے تھے مگر لباس اور غذا بہت ہی معمولی، سرکاری نمبردار بھی تھے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں سیدھا آتا ہوں تو اللہ ان کو بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے کہ مرحوم

کو آخر میں مجھ سے بہت ہی محبت ہوگئی تھی۔ میرا لڑکپن تھا، اس کے باوجود مرحوم نے وصیت کی تھی کہ مجھے غسل بھی زکریا ہی دے اور نماز بھی وہی پڑھائے۔ جب مرحوم کو یہ معلوم ہوا کہ میں بغیر کھانا کھائے جاتا ہوں تو جب میں جاتا اور وہ اس وقت میں میرے منتظر رہتے، صورت دیکھتے ہی پوچھتے کہ کتنی کسر ہے؟ میں کہتا پانچ سو کی، جب ہی اٹھتے زنانہ مکان میں جاتے، تین چار روٹی رکابی میں اس وقت کوئی سالن ابلا ہوا گوشت بھجی وغیرہ روٹی پر رکھ کر لوٹے میں پانی اور اس کی ٹونٹی میں گلاس لٹکا ہوا لاکر مجھے دیتے اور کہتے کہ اتنے تو روٹی کھا، اتنے میں تیرے لیے پیسے لاؤں اور جب میں کہتا کہ حاجی جی واقعی بالکل بھوک نہیں، تو بہت بے تکلفی کے ساتھ بلا مذاق واقعیت کے ساتھ کہتے کہ بھاگ جا میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے۔ جھک مار کر کھانا پڑتا اور اپنی غرض باولی بغیر بھوک کھاتا تھا۔ وہ واپس آکر دیکھتے کہ میں نے کچھ کھایا ہے یا نہیں اگر ایک دو روٹی کھالیتا تو پیسے دیتے ورنہ بے تکلف فرمادیتے تشریف لے جاؤ پیسے نہیں ہیں۔ اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے، میری بہت ہی مدد کی جیسا کہ اُوپر معلوم ہوگیا کہ مجھے تو روزانہ شام کو سینکڑوں کی ادائیگی کرنی پڑتی تھی اور روزانہ ہی تقاضے رہتے تھے، اس لیے ان مرحوم کا ایک دستور اور بھی تھا۔ وہ نمبر دار تھے اور سرکاری روپیہ داخل کرنے کے واسطے نکوڑ جانا پڑتا تھا، امن کا زمانہ تھا، اپنی سائیکل پر اکثر بار کی صبح کو روپے لے کر جاتے، شام کو اسی سائیکل پر نکوڑ سے سیدھے دار الطلبہ پہنچتے۔ درس گاہ میں میرے پاس جاکر کہتے کہ ڈیڑھ ہزار میری جیب میں ہیں آج فلاں وجہ سے وہ داخل نہ ہوسکے کل کو اتوار ہے پرسوں تک کے واسطے چاہئیں تو لے لے اور اگر وہ یوں کہہ دیتے کہ پرسوں کو چھٹی ہوگئی ہے دو (۲) دن کی گنجائش اور ہے تو پھر میری عید تھی۔ میں اس رقم کو لے کر شام کو کسی بڑے قرض خواہ کے پاس جاتا اور اس وقت تو میرے پاس روپے ہیں آپ کا جی چاہے تو مجھ سے لے لیجئے اور نوٹ ان کے سامنے کردیتا اور اس کی وجہ سے مجھے ایک دو ماہ کی توسیع ضرور مل جاتی۔ ان مخلصین میں خاص طور عالی جناب میرے محسن الحاج حافظ زندہ حسین صاحب مرحوم بھی تھے۔ اللہ ان کو بہت ہی درجاتِ عالیہ نصیب کرے۔ ان کے احسانات کا اپنی شایانِ شان بہترین بدلہ عطاء فرمائے۔ ابتدائی زمانے میں بہت ہی قرض دیا، مگر مرحوم میں دو (۲) خاص ادائیں تھیں۔ ایک یہ کہ ابتداء میں پانچ سو اور ایک سال بعد سے ایک ہزار سے زائد نہیں دیتے تھے اور ''اللہ کے فضل سے'' ان کا تکیۂ کلام تھا۔ میں جب بھی کچھ مانگتا وہ اس سے آدھے کا فوراً وعدہ کرتے۔ میں کہتا کہ حافظ جی پانچ سو کی بڑی ضرورت ہے، وہ فرماتے کہ ''اللہ کے فضل سے ڈھائی سو تو میں دے دوں گا، ڈھائی سو کا کہیں اور سے انتظام کرلو۔'' میں نے بھی دو تین مرتبہ کے بعد سمجھ لیا تھا کہ جتنے کی ضرورت ہوتی اس سے دوگنا مانگتا اور وہ اللہ کے فضل سے اس سے آدھے کا یعنی میری بقدر

ضرورت کا فوراً وعدہ کر لیتے اور فرماتے کہ اگلی نماز لیتا آؤں گا، مجھے کبھی جانا نہ پڑا۔ وہ اگلی نماز میں مرحمت فرما دیتے۔ دوسری خاص ادا مرحوم میں یہ تھی کہ وہ وعدہ ایک دن پہلے پوچھتے کہ حضرت جی! آج کیا تاریخ ہے؟ اور اور میں کہتا حافظ جی خوب یاد ہے...... اللہ اپنے فضل و کرم سے ان کو اور میرے سارے محسنوں کو جن جن کے بھی جس نوع کے احسان جانی، مالی، جاہی، علمی، سلوکی، اخلاقی مجھ پر ہوئے ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم، انعام واحسان سے اپنی شایانِ شان ان کے احسانات سے بہت زیادہ بڑھا کر ان کو بدلہ عطا فرمائے۔ میری یہ دعا اپنے سارے محسنوں کے لیے بیس برس کی عمر سے روز مرّہ کی اہم دعاؤں میں شامل ہے۔ اس میں تخلف تو یاد نہیں کہ کبھی عمر بھر میں ہوا ہو، کئی کئی مرتبہ ہو جاتی ہے۔ ماہ مبارک اور سفر حجاز میں تو خوب یاد ہے کہ یہ سیہ کار، نابکار، بے کار و بدکار اپنے محسنوں کے احسانات کا بدلہ بجز دعاء کے اور کچھ نہیں کرسکتا، اللہ تعالیٰ ہی اپنے کرم سے قبول فرمائے۔

البتہ دوستوں کو نہایت تجربہ کی وصیت اور نصیحت کرتا ہوں، بالخصوص جن کو قرض سے کوئی کام پڑتا ہو کہ قرض کے ملنے میں وعدہ پر ادا کرنے کو جتنا مجرب اور حصولِ قرض کے لیے سہل نسخہ میں نے پایا ایسا کوئی بڑے سے بڑا نسخہ نہیں پایا مجھے ابتدائی چند ماہ میں بے شک دقت اُٹھانی پڑی، لیکن چند ہی ماہ میں بعد لوگوں کو وعدے پر ادائیگی کا یقین ہوگیا تو پھر قرض میں اس اس قدر سہولت رہی کہ صرف پرچہ یا کسی معتمد کے ہاتھ زبانی پیام قرضہ لینے کے لیے کافی تھا۔

میرے محلے کے دوستوں کا مشہور مقولہ تھا کہ جسے کچہری میں کسی ضرورت سے روپیہ لے جانا ہو گھر کی الماری میں سے نکالنے میں تو دیر لگے گی کچہری جاتے ہوئے راستے میں اس سے لیتے جاؤ جیب میں ملیں گے۔ ایک دن پہلے اس سے کہہ دو کہ ''کل کو ۱۰ بجے کے قریب کچہری جانا ہے، ۸ بجے اس کی جیب میں پہنچ جائیں گے۔'' اسی کا ثمرہ تھا کہ ایک زمانے میں مجھے بعض لوگوں سے ساٹھ ہزار تک قرض لینا پڑ گیا۔ اس مالک کا احسان ہے اور مالک کے کس کس احسان کو شمار کروں۔

بچیوں کے حج کے قرضے کی کیفیت اور مالک کی قدرت کے کرشمے:

۷۴ھ میں مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بچیوں کو حج کرانے کو جی چاہتا ہے، میں نے کہا بڑے شوق سے۔ اپنا اور مولوی انعام صاحب کا اور غالباً دو بچیوں کا انتظام تو آپ کے ذمے اور بقیہ میں کردوں گا۔ انہوں نے بڑی خوشی سے قبول فرمایا اور شعبان میں کہہ دیا کہ جن صاحب نے ہمیں قرض دینے کا وعدہ کیا تھا انہوں نے عذر کر دیا۔ ہمارا انتظام بھی اس وقت تمہیں ہی کرنا ہے اور میرے پاس قریبی رشتہ دار مستورات کا کئی سال کا قرضہ اسی نام سے جمع تھا کہ وہ تھوڑا تھوڑا دیتی رہتی تھیں کہ جب ہم حج کو جائیں تو لے لیں گے۔ میں نے اپنی بیوی بچیوں سے

اعلان کر دیا کہ پہلے اپنا اپنا زیور فروخت کرو اس کے بعد جس کے خرچہ میں جتنی کمی ہو وہ بطور قرض میں دوں گا، جب تمہارے پاس آجائے دے دینا، نہ آئے تو اللہ معاف کرے۔ سب سے پہلے تو اپنے اللہ کا احسان، اس مالک کے کسی احسان اور انعام کا شکر ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد اپنی بیوی اور بچیوں کا ممنونِ احسان کہ اس قدر خوشی اور مسرت سے ہر ایک نے اپنی ایک ایک چیز لا کر مجھے نہ دی نہ بتائی بعض اپنے اعزہ کے واسطے سے فوراً بازار فروختگی کے واسطے بھیج دی۔

میرے ایک مخلص دوست حاجی جان محمد پشاوری جو اس زمانے میں سہارنپور میں مستقل رہتے تھے اور وہیں کام کرتے تھے اور میرے بڑے مخلص جاں نثار تھے، سب نے اپنا اپنا زیور فروختگی کے واسطے ان ہی کو دیا کہ وہ ہم سب کی نگاہوں میں بہت معتمد تھے۔

انہوں نے رات کو مجھے مشورہ دیا کہ ایسا ہرگز نہ کیجئے۔ زیور دو (۲) طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جن میں مالیت تو ہوتی ہے مگر ان کی گھڑائی صنعت زیادہ نہیں ہوتی۔ دوسری قسم وہ جن میں مالیت تو بہت کم ہوتی ہے، مثلاً تیس چالیس روپے کا سونا اور اس کی دلآویز، دل کش صنعت ستر (۷۰)، اسی (۸۰) روپے کی ہوتی ہے۔ فروختگی میں صنعت کی کوئی قیمت نہیں ہوا کرتی اور اصل مالیت میں ربع کے قریب خوردہ کے نام سے کٹوتی ہوتی ہے۔ ایسے زیور جو بنتے ہیں تقریباً ڈیڑھ دو سو میں فروخت ہوتے ہیں چالیس پچاس میں، ان کو ہرگز نہ فروخت کرائیں۔ مجھے زیورات کی اس تفصیل سے کبھی پہلے کام نہیں پڑا تھا، میں نے ان حاجی جی سے کہہ کر اس قسم کے زیورات لڑکیوں کو واپس کرا دیے اور بچیوں سے کہہ دیا یہ میرے قرض میں رہن ہیں تم میں سے کسی کو اس میں تصرف کی اجازت نہیں جب تک میرا قرضہ ادا نہ ہو۔ اس کے بعد میں نے سب کا حساب لگایا تو مع مولانا یوسف صاحب مولانا انعام صاحب کے تقریباً ستائیس ہزار روپے کی میزان ہوئی جس کی مجھے ضرورت تھی۔ میں نے شعبان ۷۴ھ میں اپنے دوستوں کو پرچے لکھے کہ مجھے ستائیس ہزار روپے کی ضرورت ہے اس میں سے تم کتنا اور کتنے زمانے کے واسطے دے سکتے ہو؟ اس وقت کچھ لینا نہیں ہے میرے پاس رکھنے کی جگہ نہیں ہے، ۹ شوال کو یہ قافلہ سہارنپور سے روانہ ہوگا، ۸ شوال کو آپ کی موعودہ رقم لوں گا، مجھے صرف اس وقت حساب کے واسطے اتنا پختہ معلوم ہو جائے کہ آپ کتنی رقم کتنے دنوں کے واسطے دے سکتے ہیں؟ اَللّٰھُمَّ لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ تین دن میں جو پرچوں کے جواب ملے ہیں ان کی میزان چھتیس ہزار تھی۔ میرے پرچے کا مضمون صرف وہ تھا جو اوپر لکھا ہے اور اس میں بھی مالک کے عجائب کرشمہ ہائے قدرت دیکھئے میرے ایک مخلص دوست کا ایک گاؤں بڑی دعاؤں کے بعد تیس ہزار میں انہی ایام میں فروخت ہوا تھا جس کی فروختگی کی شیرینی بھی وہ مجھے کھلا چکے تھے۔ دوسرے صاحب کا دس ہزار میں ایک باغ فروخت ہوا تھا اس کی

بھی شیرینی میں کھا چکا تھا۔ میرے ذہن میں یہ تھا اور اپنے تعلقات کی قوت پر بڑا گھمنڈ تھا اور کوئی تردد بھی نہ تھا کہ سارا نہیں تو معظم حصہ ان دونوں سے وصول ہوگا۔ مگر دونوں نے اس زور کی معذرت کی کہ ایک پیسے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ مجھے واقعی ذرا بھی قلق نہ ہوا۔ اللہ کا بڑا احسان ہے۔ معاً مجھے یہ خیال ہوا کہ تو نے بندہ پر نگاہ رکھی کیوں؟ تیری سزا یہی ہے اور اس کے بالمقابل جو مالک کے کرشمہ ہائے قدرت دیکھے وہ بھی بڑی لمبی داستانیں ہیں۔ مولوی نصیر نے مجھ سے کہا کہ ایک پرچہ فلاں کو بھیج دے میں نے کہا تیری عقل ماری گئی، اس بیچارے کے پاس کہاں پیسہ؟ مولوی نصیر نے کئی دفعہ اصرار کیا۔ میں نے نہیں مانا، اس نے زبردستی میرے پرچوں میں سے ایک پرچہ اٹھا کر لڑکے کے ہاتھ میرے اس دوست کے پاس بھیج دیا۔ وہ جواب لایا کہ کل کو جواب دوں گا۔ میں مولوی نصیر پر (اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے کہ میری بے جا ڈانٹیں ہمیشہ سنیں) بہت خفا ہوا کہ تو نے مجھے بھی شرمندہ کیا انہیں بھی شرمندہ کیا، میں نے پہلے سے کہا تھا کہ اس غریب کے پاس کچھ نہیں ہے، اسے جواب دیتے ہوئے شرم آئی اور تو نے مجھے ذلیل کیا۔ دوسرے دن دوپہر کو وہ صاحب اپنا کھانا لے کر ساتھ کھانے کے واسطے آئے۔ کھانے کے بعد تخلیہ کیا اور ایک پرچہ لکھا ہوا مجھے دیا، جس میں لکھا تھا کہ ''پانچ ہزار روپے ایک سال کے لیے تو بڑی سہولت سے دے سکتا ہوں اور دس ہزار تک دو سال کے لیے معمولی سے وقت کے ساتھ اور پندہ ہزار تین سال کے لیے ذرا زیادہ وقت ہے۔'' میں نے پہلی پیشکش قبول کر لی اور کہہ دیا کہ ۸ شوال کو پانچ ہزار لے لوں گا۔ میرا ایک اور دوست مخلص نوعمر لڑکا آیا اور یہ کہا کہ میرے پاس ایک ہزار کی رقم ہے جس کی نہ تو میرے ماں باپ کو خبر نہ میری بیوی کو، آپ جب کہیں لا دوں گا، ادا کرنے کی بالکل فکر نہیں۔ میرے پاس ان کے رکھنے کی جگہ بھی نہیں، پانچ سات برس میں جب میں بااختیار ہوں گا لے لوں گا، ابھی تو باپ کا دست نگر ہوں، جہاں کہیں سے کچھ ملتا رہتا ہے اسے جمع کرتا رہتا ہوں، رکھنے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ میرے ایک اور مخلص دوست نے رمضان میں مجھ سے کہا کہ تو نے فلاں فلاں کو پرچے لکھے مجھے تو کہا ہی نہیں۔ میں نے کہا تیرے پاس کھانے کو تو ہے ہی نہیں، بے تکلفی تھی محبت تھی، یہی فقرہ میں نے کہا کہ تیرے پاس کھانے کو تو ہے نہیں تیرے پاس سے کیسے قرض مانگوں؟ اس نے کہا کہ میرے پاس بھی ایک ہزار روپے سب سے مخفی ہیں، میں کل صبح کو لاؤں گا۔ میں نے کہا ہرگز نہیں، ۸ شوال کو لوں گا، میرے پاس رکھنے کی جگہ نہیں۔ اس نے کہا کہ رمضان میں خرچ کرنے کا بڑا ثواب ہے، میرے سے تو تم اللہ کے واسطے اور پاؤں پکڑ لیے کل کو ہی لے لو کہ رمضان ہے پر میرے ہی پاس امانت رکھوا دیجیو۔ میں نے کہا شوق سے لے آئے، چنانچہ وہ اگلے روز لایا اور پھر میرا قرض کر کے اپنے ساتھ ہی لے گیا۔

اس سلسلے میں، میں اپنے محسنِ اعظم عالی جناب الحاج میر آل علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا بہت ہی ممنون ہوں، انہوں نے فرمایا اتنی سی بات کے لیے کیا پرچہ بازی کی ضرورت تھی، میں پچیس ہزار تو میں اکیلا ہی دے دوں گا جب تجھے سہولت ہوادا کرتے رہنا۔ میں نے بہت ہی ان کا شکریہ بھی ادا کیا اور بہت ہی دعائیں بھی دیں اور ان سے کچھ نہیں لیا اور ان سے کہہ دیا کہ اب تو میری مطلوبہ رقم پوری ہو چکی اور میں ان سب کا احسان اٹھا چکا ہوں ان میں سے جس جس کی رقم کی ادئیگی کا وقت آتا رہے گا آپ سے مانگتا رہوں گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ایسے ہی اپنے محسن متولی ریاض الاسلام کاندھلوی کا بھی اس میں شکرادا کیے بغیر نہیں رہ سکتا، انہوں نے مجھے دس بارہ خط لکھے۔ میں نے سنا ہے کہ تیری بچیاں حج کو جارہی ہیں، میری انتہائی تمنا ہے کہ تھوڑی سی شرکت میری اس میں قبول کرلے۔ میں نے بہت معذرت کی مگر وہ نہ مانے اور ان کے کئی احسان ان کے خوابوں کی بدولت پہلے اٹھا چکا تھا، اس لیے غالباً دو ہزار کی رقم یا اس سے کچھ زائد مرحوم نے بلا قرض عطا فرمائی جو میں نے سب حج کو جانے والیوں پر مولانا یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ وانعام کے علاوہ تقسیم کردی اور ان دونوں کے متعلق ان کو لکھ دیا کہ ان دونوں کا معاملہ آپ جانیں وہ جانیں میں اس میں کچھ دخل اثباتاً یا نفیاً نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ میر صاحب اور متولی صاحب اور میرے سارے ہی محسنوں کو ان کے احساناتِ جانی و مالی اور ہر نوع کے احسانات کا اپنی شایانِ شان بہترین بدلہ عطاء فرمائے:

گفتگو آئین درویشی نبود
ورنہ با تو ماجرا ہاد اشتیم

اب تو چونکہ وقت نکل گیا۔ اس قسم کے قصوں میں تفریح کے سوا کچھ نہ رہا، ورنہ اس قسم کے تذکرے بھی پہلے صورت سوال اور بہت گراں ہوتے تھے، شاید میری جوانی میں میری یہ کہانیاں کسی نے سنی بھی نہ ہوں گی۔ اب تو اکثر تذکروں میں لطائف تحدیث بالنعمۃ کے طور پر آتے رہتے ہیں۔

عزیزو!...... تم نے کیا کیا پرانے مردے اکھڑوانے شروع کردیے اگر علی گڑھ کا قیام کچھ لمبا ہو گیا تو نہ معلوم کیا کیا عجائب قدرت لوگوں کے کان میں پڑیں گے۔ اس حج کے متعلق ایک المناک واقعہ یہ ہے کہ میرے حضرت اقدس سیدی وسندی مولانا الحاج حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہٗ بھی اپنی اہلیہ کے ساتھ اسی جہاز میں تشریف لے گئے جس میں میری بچیاں اور مولانا یوسف صاحب ومولانا انعام صاحب تھے۔ حضرت قدس سرہ نے حج سے واپسی پر مجھ سے کئی بار قلق سے فرمایا کہ مجھے جہاز میں بیٹھنے کے بعد معلوم ہوا کہ تیرا بھی خیال کچھ تھا، اگر مجھے واہمہ اور شبہ بھی ہو جاتا تو تجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جاتا۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے قلق پر مجھے بھی بہت قلق

ہوا، میرے لیے عین سعادت تھی اور میرا یہ پختہ ارادہ بھی تھا اور رئیس الاحرار صاحب سے وعدہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ اس سال ہوائی جہاز سے جا رہے تھے میرا ارادہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ چپکے سے ہوائی جہاز سے چلا جاؤں گا، لیکن مقدرات اٹل ہوتے ہیں، حضرت اقدس رائپوری سے ایک شب کے لیے نظام الدین جانے کی اجازت چاہی کہ وہاں کے حالات دیکھتا آؤں۔ حضرت نے یہ کہہ کر اجازت نہ دی کہ میری حالت تو یہ ہو رہی ہے، میں رات کو اگر مر گیا تو میرے جنازے کی نماز کس طرح پڑھا سکے گا؟ یہی وہ زمانہ تھا جس کے متعلق اوپر لکھوا چکا ہوں کہ میں شام کے دوسرے گھنٹے میں حدیث پاک کا سبق پڑھا کر سیدھا بہٹ جاتا اور گانگرو والی کوٹھی میں عصر پڑھتا، جہاں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کا مستقل قیام تھا چونکہ روز کا جانا ہوتا تھا اور علی الصباح آنا ہوتا تھا، اس زمانے کے لاری والے بھی ہندو مسلمان دونوں ہی رعایت کرتے تھے، بہٹ میں گاڑی نہیں روکتے تھے بعض مرتبہ سواریاں شور بھی مچاتیں مگر وہ بہٹ کے قریب جا کر اس تیزی سے نکلتے کہ مجھے گانگرو کے پل پر اتار کر واپس بہٹ آ کر سواریاں اتارتے مجھے بہت ہی ندامت ہوتی اور میں خوشامد بھی کرتا مگر وہ نہیں مانتے تھے اور یہ کہتے کہ ان کا دومنٹ میں کیا حرج ہوگا آپ تو نماز پڑھیں گے۔ اللہ ان سب کو بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ حضرت قدس سرہٗ کے اس فقرہ پر نہ صرف نظام الدین کا جانا ملتوی کیا بلکہ حجاز کے سفر کا ذکر زبان پر لانا بھی حضرت قدس سرہٗ کی گرانی کا سبب سمجھا۔ حضرت قدس سرہٗ کے اس مرض نے اتنا طول پکڑا کہ ڈاکٹر برکت علی صاحب مرحوم کے اصرار پر حضرت قدس سرہٗ کو بجائے بہٹ کے سہارنپور تشریف لانا پڑا اور کچھ زمانہ مدرسہ قدیم کے مہمان خانہ میں ڈاکٹر برکت علی صاحب کی تجویز سے قیام کیا۔ اس سال کی عید الاضحیٰ بھی مدرسہ قدیم کی مسجد میں پڑھی اور اپنے اس چند روز قیام کے حضرت قدس سرہٗ نے مدرسہ کے چندہ کے نام سے بہت بڑا کرایہ ادا کیا، جو حضرت قدس سرہٗ کے خدام کے لیے خاص طور سے سبق آموز اور عبرت انگیز ہے۔ اس ناکارہ نے بہت عرض کیا کہ حضرت کا قیام مدرسہ کی ضرورت میں داخل ہے، مدرسہ کو حضرت کے قیام سے بہت زیادہ نفع ہے مگر حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے منظور نہیں فرمایا، خود بھی چندہ کے نام سے کرایہ ادا کیا اور آنے والے مہمانوں سے بھی خاص طور سے تاکید کر کے چندہ دلوایا کہ حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے ان لوگوں کا بھی مدرسہ میں قیام ہوتا تھا، خاص طور سے پاکستان سے آنے والے مہمان سے بھی چندہ دلوایا۔

بات کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے، ابتداء میں تو یہ قصہ شادیوں میں شرکت سے نفرت اور جنازہ میں شرکت کے شوق سے چلا تھا۔

شادیوں میں شرکت سے نفرت بالخصوص تالیف بذل کے زمانے میں:

(ھ)..... مجھے شادیوں میں شرکت سے ہمیشہ نفرت رہی۔ کاندھلہ میں خاندان کا سب سے چھوٹا تھا، جب خاندانی بزرگوں میں سے کسی کا شادی میں شرکت کا خط آتا اس پر اظہار مسرت خوشی نہ معلوم کیا کیا لکھتا اور ظہر کے بعد وہ کارڈ حضرت کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ کی عادت مبارک ایسے موقعہ میں بڑی عجیب لطیف قابلِ اقتداء تھی جب خدام میں سے کوئی اس قسم کا خط پیش کر دیتا یا زبانی تذکرہ کرتا، حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ خط پڑھ کر یا بات سن کر ارشاد فرماتے۔ کیا رائے ہے؟ اگر وہ شخص (اجازت مانگنے والا) خوشی یا ضرورت کا اظہار کرتا تو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے، ہاں ہاں مناسب ہے ہو آؤ اور بخوشی اجازت دے دیتے اور اگر اس کی طرف سے بے اعتنائی دیکھتے تو حضرت بھی فرمادیتے کیا کرو گے؟ حرج ہوگا۔ مجھے بارہا اس قسم کے پرلطف قصے دیکھنے میں آئے۔ جب میں خط پیش کرتا تو حضرت نہایت تبسم خندہ پیشانی سے دریافت فرماتے، کیا رائے ہے؟ میں عرض کرتا، حضرت! بذل کا بہت حرج ہو جائے گا، لیکن میں تو انکار نہیں کر سکتا، میرے اکابر خفا ہو جائیں گے۔ تو حضرت فرماتے انکار تو میں لکھوا دوں گا، چونکہ ڈاک بھی میں ہی لکھتا تھا تو میں عرض کرتا کہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ انکار کا خط میں نہیں لکھوں گا، تو حضرت کسی دوسرے کو بلا کر جو اکثر حاجی مقبول صاحب ہوتے تھے لکھواتے تھے کہ عزیز موصوف کے آنے سے میرا بڑا حرج ہوگا، امید ہے کہ میری خاطر عزیز موصوف کی عدم حاضری کو معاف فرما دیں گے۔ پھر کس کی مجال تھی کہ لب کشائی کر سکتا اور ڈاک میں ہر دو (۲) خط میرا اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک ساتھ پہنچتا تھا۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ خوب یاد آیا۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ بھائی اکرام صاحب سے مجھے سارے خاندان میں انتہائی محبت رہی۔ اگرچہ اب مدرسہ نے اس پر کچھ پردہ ڈال رکھا ہے۔ میری والدہ کے حقیقی چچازاد بھائی میرے مخلص دوست ماموں حکیم محمد یامین صاحب جو آج کل مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں، ان کی شادی ۱۲ جمادی الاول ۵۰ھ مطابق ۲۴ ستمبر ۳۱ء بروز جمعہ کیرانہ میں ہوئی۔ بعد عصر چچا جان نے نکاح پڑھایا۔ مہر کے سلسلے میں ایک لطیفہ پیش آیا کہ تائے سعید مرحوم مہتمم مدرسہ صولتیہ لڑکی کے باپ نے مہر فاطمی تجویز کیا اور جب قصبہ کے شرفاء نے اصرار کیا کہ مہر دس ہزار اور پانچ ہزار سے کم ہرگز نہ ہوگا تو تائے سعید مرحوم نے فرمایا کہ میری بیٹی حضرت فاطمہ سے بڑھ کر نہیں ہے مہر فاطمی ہوگا، چنانچہ اسی پر نکاح ہوا اور قصبہ کے رؤساء مولانا سعید سے ناراض ہو گئے اور کافی عرصہ تک کبیدہ خاطر رہے کہ لڑکی بوجھ رہی تھی جو ایک سو پچیس (۱۲۵) کے عوض چلتی کر دی۔

بھائی اکرام نے مجھے کاندھلہ سے ایک کارڈ لکھا، جس میں شروع میں تین شعر تھے جن میں سے صرف پہلا یاد رہ گیا:

میں نہیں جانتا قبلہ قبلی
بات ہے صاف بھائی شبلی

اگلے دو شعروں میں اس قسم کا مضمون تھا کہ ہمارے ساتھ آؤ، پلاؤ قورمہ وغیرہ ہمارے ساتھ کھاؤ۔ اس کے بعد یہ مضمون تھا کہ عزیز یامین کی شادی فلاں دن تجویز ہوئی ہے، علی الصباح کاندھلہ سے بارات جائے گی، میں اور فلاں، فلاں، ان پانچ چھ کے نام جن کا عید کے موقعہ پر لوئی کے سلسلہ میں نام گزر چکا، ایک جگہ بیٹھے ہیں، ہمارا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اگر اس میں شرکت کرنا چاہے گا تو بڑے سے بڑا عذر بھی تجھے مانع نہیں اور اگر تیرا جی نہیں چاہے گا تو ایک سے ایک بڑھ کر ایسا قوی عذر ہوگا جس کا جواب دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہوگا۔ ہماری تمنا، خواہش، استدعا یہ ہے کہ ایک رات کا احسان سب پر کردے۔ اگر تو منظور کرے تو آسان صورت یہ ہے کہ ساری بارات غالباً تیس چالیس بہلیاں تھیں، علی الصباح روانہ ہو جائیں گی اور ہماری دو گاڑیاں ریل کے وقت پر اسٹیشن پہنچ جائیں گی اور اسٹیشن سے تم کو لے کر سیدھے کیرانہ چلے جائیں گے۔ میں نے لکھا اور مجھے اپنا جواب بھی خوب یاد ہے کہ تم نے ایسا زوردار خط لکھ دیا کہ میرا بھی جی چاہ گیا۔ انشاء اللہ وقت مقررہ پر کاندھلہ کے اسٹیشن پر اُتر کر سیدھا کیرانہ جاؤں گا۔ چنانچہ ساری بارات صبح کو ناشتہ کے بعد سے لے کر انکی منکتی ظہر کے قریب کیرانہ پہنچی اور مجلس طعام کے منتہی پر ہم لوگ بھی پہنچ گئے۔ کھانے اور چائے اور بعد عصر تقریب نکاح میں شرکت کے بعد اگلے دن صبح بارات رخصت ہوکر کاندھلہ آئی۔ میں ایک ہی رات کی نیت سے گیا تھا۔ جب میں نے دوپہر کو واپسی کا ارادہ کیا تو میرے والد صاحب کے حقیقی ماموں مولانا رؤف الحسن صاحب نے مجھے بہت بُرے طریقہ سے ڈانٹا۔ مجھے ان کی ڈانٹ خوب یاد ہے اور فرمایا کہ آج ہرگز نہیں جاسکتا، کل کو ولیمہ سے فراغ پر جانا ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ میں حضرت سے ایک ہی رات کی اجازت لے کر آیا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ کچھ مضائقہ نہیں، میں لکھ دوں گا، مجھے یہ جواب بالکل پسند نہیں آیا۔ اتفاق سے ماموں یامین کے بڑے حقیقی بھائی پروفیسر حافظ محمد عثمان صاحب جو اس زمانے میں علی گڑھ میں غالباً بارہ سو روپے تنخواہ پر ملازم تھے، وہ نکاح میں شریک نہ ہوسکے تھے۔ اس لیے کہ کسی مجبوری سے چھٹی نہ مل سکتی تھی۔ میں نے حضرت ماموں سے عرض کیا، اجی ان کے حقیقی بھائی تو نکاح میں بھی شریک نہ ہوئے اس کو تو آپ نے کچھ فرمایا نہیں، فرمانے لگے اور بہت غصے میں فرمایا کہ اس کی تو مجبوری تھی چھٹی نہ ملی، مجھے بھی چونکہ ان کے عتاب پر گرانی ہورہی تھی، میں نے کہا کہ حضرت جی یہ تو کوئی

مجبوری نہ تھی استعفاء دے کر چلے آتے، اصل مجبوری تو میری ہے کہ میں حضرت سے کیا عرض کروں گا۔ اس پر ماموں صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو غصہ تو بہت آیا مگر کچھ فرمایا نہیں اور میں عین گاڑی کے وقت ریل پر بھاگ آیا۔ اپنے معمول کے مطابق پہلے سے اس واسطے نہیں آیا کہ کبھی ماموں صاحب کو خبر ہوجائے اور وہ آدمی بھیج کر بلالیں۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہ حقیقی ماموں اور میری اہلیہ مرحومہ کے والد، مجھ سے اس قدر محبت تھی کہ میں واقعی بیان سے عاجز ہوں، ان کی شفقتیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ بات میں بات نکلتی رہتی ہے ایک قصے پر دوسرا قصہ یاد آتا رہتا ہے۔ اگر علی گڑھ کے قیام میں کچھ وسیع وقت مل جائے تو ایک الف لیلۃ ولیلۃ میں بھی لکھوادوں۔

بندہ کا سفر مظفرنگر اور آموں کا قصہ:

حضرت مولانا الحاج رؤف الحسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ یعنی میرے والد کے حقیقی ماموں اور ان کی پہلی اہلیہ مرحومہ جو میری خوش دامن تھی اور مرحوم کی دوسری اہلیہ، دونوں کا قیام مظفرنگر رہتا تھا اور ہمیشہ ہی دونوں کا شدید اصرار میری مظفرنگر حاضری کا رہا اور مجھے کبھی توفیق نہ ہوئی اللہ ہی معاف فرمائے اور تینوں مرحومین کو بہت ہی زیادہ بلند درجے ان کی محبت کے عطا فرمائے۔ ایک دفعہ میرے چچا جان قدس سرہٗ نے نظام الدین سے یہ لکھا کہ جھنجھانہ میں تبلیغی اجتماع ہے، فلاں گاڑی سے میں شاملی پہنچوں گا، تم بھی فلاں گاڑی سے شاملی پہنچ جاؤ، میں شاملی میں تمہارا انتظار کروں گا اور پھر جھنجھانہ کے تبلیغی اجتماع میں جانا ہے یہ جھنجھانہ تو ہمارا اجدادی وطن ہے ہی، عالی جناب الحاج محمد شفیع صاحب قریشی امیر جماعتِ تبلیغ پاکستان کا بھی وطن ہے، انہیں کی تحریک اور اصرار پر یہ اجتماع ہو رہا تھا۔ جھنجھانہ سے واپسی پر سہارنپور آنا تھا اور چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کو دہلی جانا تھا، ان کی تشریف بری ظہر کے وقت قرار پائی۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ ماموں رؤف الحسن صاحب ہمیشہ مظفرنگر کا اصرار فرماتے ہیں، کبھی نوبت نہیں آتی، اگر کوئی صورت ایسی ہوجائے کہ میں صبح کو مظفرنگر چلا جاؤں اور دو (۲) بجے کی گاڑی سے سہارنپور۔ قریشی صاحب کو اللہ بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے انہوں نے میرے دو رفیقوں کے لیے مظفرنگر تک کار کا انتظام کر دیا اور ماموں صاحب نور اللہ مرقدہٗ اور ممانی صاحبہ رحمہا اللہ تعالیٰ میری حاضری پر حد سے زیادہ مسرور کہ نہ معلوم کیا نعمت آگئی۔ تین گھنٹے میں نہ اس میں مبالغہ ہے نہ تصنع، بازار کی اور گھر کی میٹھی نمکین، پھیکی اور ترش پھل اور شیرینیاں شاید پچاس کے قریب جمع کر دی ہوں گی، مجھے دیکھ کر بہت ہی کلفت ہوئی، میں نے ممانی سے تیز لہجے میں کہا کہ ممانی اتنی چیزیں کوئی کھا بھی سکے گا۔ انہوں نے کہا کہ ساری عمر میں پہلی دفعہ تیری آمد ہوئی ہے وقت کم ملا میں تو اور بھی کچھ کرتی۔ میرے ساتھیوں کا کھانا باہر بھیج دیا گیا۔ میں اور ماموں صاحب، وہ سرہانے اور میں پائنتی اور ایک ایک رکابی میں پانچ پانچ

سالن ذرا ذرا سا اور ایک ایک رکابی پر دو دو رکابی رکھی ہوئی۔ کھانا شروع ہوا ماموں صاحب نے ایک لقمہ منہ میں رکھا اور دوسرا ہاتھ میں لیا اور جوتا پہن کر باہر چلے گئے، رنج اور قلق سے سناٹے میں رہ گیا کہ میری کس بدتمیزی پر ماموں صاحب کو غصہ آیا۔ میرا لقمہ بھی ہاتھ کے ہاتھ میں رہ گیا۔ میں نے ممانی سے پوچھا کہ ماموں کس بات پر خفا ہوگئے؟ مرحومہ نے بڑی شفقت سے یوں کہا، پیارے بچے روٹی کھالے، ناراض نہیں ہیں، تیرے ماموں کی ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ جب آموں کا موسم ختم ہو جاتا ہے تو آٹھ دس دن ان کی یہی فاقوں کی حالت رہتی ہے۔ آٹھ دن سے مظفر نگر میں آم کسی قیمت پر نہیں ملتا اور ان کے فاقے چل رہے ہیں اور یہ جو لقمہ منہ میں رکھ لیا یہ بھی دروازے پر جا کر تھوک دیا ہوگا، مرغی وغیرہ کھالے گی، ان کے حلق سے نہیں اُترا ہوگا۔ یہ سن کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس لیے کہ میں اس زمانے کچھ آموں کا شوقین بھی نہیں تھا اور میرے نزدیک گوشت کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس کے بغیر روٹی کھانا ناممکن ہو۔ میں ۴ بجے کی گاڑی سے سہارنپور پہنچ گیا، اسٹیشن سے مدرسہ تک اس زمانے میں میں سواری کا محتاج نہیں تھا، کبھی سواری نہیں لیتا تھا۔ گھر تک پہنچا ہی تھا کہ مولوی نصیر نے یوں کہا کہ ملیح آباد سے ایک بلٹی آموں کی آئی تھی، وصول تو کرلی کھولی نہیں۔ اس زمانے میں مظاہر علوم کے اندر مظفر نگر اور اس کے نواح کے طالب علم کئی پڑھتے تھے، میں نے سڑک ہی پر کھڑے کھڑے ایک آدمی دار الطلبہ بھیجا کہ کوئی طالب علم مظفر نگر جانے والا ہو تو آدھا کرایہ اور مدرسہ سے چھٹی میں ناظم صاحب سے خود دلوادوں گا، فوراً چلا آئے، ایک دم پانچ چھ بھاگ آئے، میں نے ایک ہوشیار سے لڑکے کو آموں کی ٹوکری حوالے کردی اور دونوں طرف کا کرایہ دے دیا، آدھے کا وعدہ تو اس مصلحت سے کیا تھا کہ مفت کرایہ پر بہت سے آجائیں گے۔ مگر آدھے پر کئی آگئے، میں نے ماموں صاحب کا پتہ بتلایا اور حضرت ناظم صاحب کی خدمت میں ایک پرچہ لکھ دیا کہ فلاں طالب علم کو اپنی ایک ضرورت کے لیے میں مظفر نگر بھیج رہا ہوں، کل دوپہر تک کی رخصت اس کی میری درخواست پر قبول فرمائیں۔

مغرب سے پہلے وہ لڑکا وہاں پہنچ گیا۔ وہاں کاندھلہ کے میرے ایک عزیز جو باغوں کے اور آموں کے دھنی اور دلدادہ تھے، ان کا باغ آموں کا بہت مشہور و معروف تھا اور نہ معلوم کتنی انواع ان کے باغ میں تھیں۔ وہ شام کو اتفاق سے ماموں صاحب کے مہمان تھے۔ سنا گیا ہے کہ وہ آم اس قدر لذیذ تھے کہ ماموں صاحب نے نہ کبھی اس جیسا آم کھایا تھا نہ ان کاندھلوی عزیز نے، دوسرے دن میرے ان عزیز مرحوم نے کاندھلہ جا کر اپنے ملازم کو صحیح تعداد میں مجھے تردد ہے کہ تین سو سے تو کم نہیں تھے اور پانچ سو سے زائد نہ تھے، روپے لے کر بھیجا کہ جس قسم کے آم تم نے کل مولانا رؤف الحسن صاحب کو بھیجے ہیں جس قیمت پر اور جتنے بھی مل سکتے ہوں میرے ملازم

کے ہاتھ بھیج دیں، میں نے اسی پرچہ کی پشت پر جب ہی جواب لکھ کر حوالہ کر دیا کہ مجھے تو معلوم نہیں کہ وہ کیسے آم تھے مظفرنگر میں یہ واقعہ پیش آیا تھا، یہاں پہنچ کر مولوی نصیر نے ایک بلٹی کا ذکر کیا، میں نے بغیر کھولے وہ بلٹی مظفرنگر بھیج دی تھی، مجھے بالکل نہیں معلوم کہ وہ کس قسم کے آم تھے۔ میرے نزدیک اس واقعہ کو اہمیت بھی نہ تھی۔

چچا جان کا یکشبانہ قیام کاندھلہ میں معمول:

میرا عموماً چھ مہینے، آٹھ مہینے میں ایک شب کے لیے کاندھلہ جانا ہوا کرتا تھا، کاندھلہ کے رؤساء میں جملہ قصباتی شرفاء کی طرح سے ہمیشہ پارٹی بازی زوروں پر رہتی، بالخصوص الیکشن کی مصیبت سے ہر موقعہ پر جا کر سن لیا کرتے تھے کہ آج کل فلاں فلاں میں چل رہی ہے، ہم بھی تفریحاً آپس کی لڑائیاں سُن آیا کرتے، مگر میرا اور چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ اپنی یک شبانہ حاضری میں جملہ اعزہ کے گھروں پر جا کر ان سے ایک ایک دو دو منٹ کے لیے ضرور ملتے تھے، اکثر اعزہ اس پر خفا بھی ہوتے تھے، زبان سے تو وہ یہ کہتے کہ ذرا سا وقت ہوتا ہے وہ بھی سب پھرنے میں خرچ ہو جاتا ہے اور اندر خانہ ان کو غصہ اس پر ہوتا کہ جب ہماری لڑائی ہے تو پھر یہ کیوں ملتے ہیں۔ مگر میرے اور چچا کے طرز معاشرت کو دیکھ کر اس عتاب کو علی الاعلان کہنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

غالباً آٹھ ماہ بعد میرا کاندھلہ جانا ہوا اور اپنی عادت کے موافق سب گھروں کو چکر لگایا۔ میرے محترم عزیز برادر معظم ماسٹر محمود الحسن کاندھلوی اس وقت کاندھلہ میں تھے، میرے ساتھ وہ بھی بادل ناخواستہ میری خاطر مٹر گشت میں چل دیے، جب میں اپنے ان عزیز کے پاس جن کے آموں کا قصہ اوپر آیا ہے۔ میں نے جا کر سلام کیا، انہوں نے منہ پھیر لیا، میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا مرحوم نے ہاتھ کھینچ لیا۔ بھائی محمود کا اس وقت غصہ کے مارے چہرہ سُرخ ہو رہا تھا، میں نے ایک مونڈھا کھینچا اور ان عزیزی کے قریب دو (۲) منٹ بیٹھ کر چلا آیا۔ انہوں نے میری طرف منہ نہیں کیا۔ جب وہاں سے واپس آ رہا تھا، بھائی محمود نے کہا بے غیرت بے حیا پھر بھی ان کے یہاں آئے گا، میں نے کہا ضرور آؤں گا۔ یہ ان کا فعل تھا جو انہوں نے کیا، وہ میرا فعل ہوگا جو میں کروں گا۔ ہمیں حدیث پاک میں ''صِلْ مَنْ قَطَعَکَ'' کا حکم دیا گیا ہے، مگر میں اندر اندر سوچتا رہا اور خوب سوچتا رہا کہ ان کی لڑائیاں تو آپس کی ہمیشہ کی تھیں، میرے ساتھ تو یہ برتاؤ کبھی نہیں ہوا۔ چند ہی منٹ میں سوچتے سوچتے مجھے وہ آموں والا قصہ یاد آ گیا تو میں نے بھائی محمود سے کہا کہ بھائی محمود خوب یاد آ گیا اور میں نے آموں والا قصہ سُنا کر یوں کہا کہ بھائی یہ معذور ہیں، ان کی عقل سے یہ بات اُونچی ہے کہ آدمی آموں کی بلٹی کو بغیر دیکھے بغیر کھولے چلتا کر دے۔

لڑائی کے بعد انتہاء تعلقات کا زور:

ان مرحوم کے ساتھ قصے تو کئی پیش آئے مگر مالک کا ایک عجیب احسان یہ بھی رہا کہ جس جس سے ابتداءً لڑائی رہی اُسی سے وہ تعلقات بڑھے کہ باید وشاید۔ یہ مرحوم عمر میں مجھ سے بڑے تھے، اخیر میں ان کا یہ اصرار رہا کہ تجھ ہی سے بیعت ہوں گا اور تیرے ہی پاس پڑ کر مروں گا، اتنا بڑھا کہ حد وحساب نہیں، بار بار خطوط لکھتے، آدمی بھیجتے، میں نے ان کو کئی دفعہ لکھا کہ میرے دو (۲) بزرگ حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت رائے پوری حیات ہیں۔ سیاسی حیثیت سے حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ سے آپ کے خصوصی تعلقات بھی ہیں، ان دونوں میں سے جون سے کو آپ پسند کریں میں بیعت کے لیے خود لے کر چلوں گا، بیعت کراؤں گا، مگر موصوف نے ایک مان کر نہ دی اور اسی پر اصرار کرتے رہے کہ بیعت تو تجھ ہی سے ہونا ہے۔

اس سیہ کار کے ساتھ جس جس کا تعلق ابتداءً نفرت کا ہوا انتہا عشق ومحبت پر جا کر ختم ہوا۔ اسی وقت تیں چالیس نام دفعتہً ذہن میں آگئے جو ساٹھ برس کی عمر میں اولاً مخالف اور انتہاء جانثار رہے۔ خوامخواہ ایک فضول مد شروع ہوگئی، مگر میں بھی خالی نہیں ہوں، دوستوں کی یاد کم از کم ان کے لیے دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ تو ہے ہی۔ پڑھنے والوں سے بھی بہت اصرار سے میری درخواست ہے کہ میرے ان اکابر اور دوستوں کو جن کے قصے آپ اس رسالہ میں پڑھیں یا سنیں دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب سے فراموش نہ کریں۔ مجھ پر احسان ہوگا۔

دوسرا حادثہ والدہ مرحومہ کا انتقال:

(۲)..... میری زندگی کا سب سے اہم اور پہلا واقعہ میرے والد صاحب کے انتقال کا تھا، جو نمبر۱ میں لکھا گیا اور میرے والد کے انتقال کے دن ہی سے میری والدہ مرحومہ نور اللہ مرقدہا، اعلی اللہ مراتبہا کو بخار شروع ہوا، تھوڑے ہی دنوں میں تپ دق کی طرف منتقل ہوگیا اور دس ماہ چند ایام بعد ۲۵ رمضان المبارک شبِ قدر میں عین تراویح کے وقت ان کا وصال ہوگیا۔ اس رمضان میں یہ ناکارہ حکیم محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی مسجد میں ان کے شدید اصرار پر تراویح پڑھاتا تھا۔ حکیم صاحب مرحوم کو بھی شوق تھا کہ جلدی سے فراغت ہوجائے۔ وہ معذور وبیمار اور مجھے بھی شوق کہ جلدی سے فارغ ہو کر دار الطلبہ میں حضرت قدس سرہٗ کے پیچھے جا کر بہ نیت نوافل حضرت کا قرآن سنوں اور دار الطلبہ کی مسجد سے آدھ گھنٹہ قبل حکیم جی کی مسجد میں نماز شروع ہوتی تھی۔ میری جلد بازی اور حضرت قدس سرہٗ کا وقار واطمینان۔ میں اپنی مسجد سے فارغ ہو کر حضرت کے یہاں دوسری یا تیسری رکعت میں شریک ہوجایا کرتا تھا۔ حادثہ کی رات میں میری والدہ مرحومہ پر کوئی

خاص تغیر نہ تھا، مگر جب انہوں نے افطار کے بعد شدید اصرار سب پر کیا کہ روٹی جلدی کھائیں۔ جب میں حکیم جی کی مسجد میں پہنچا تو حکیم صاحب نے فرمایا کہ آج صرف آدھا پارہ پڑھنا ہے۔ میں نے کہا کیوں؟ انہوں نے ڈانٹ دیا کہ چل چل جلدی پڑھا اور جلدی سے تراویح ختم کرا کر یوں کہا کہ سیدھے دارالطلبہ نہ جانا، والدہ کی خیر خبر لے کر جانا۔ مجھے اس وقت تک کوئی واہمہ بھی اس قسم کا نہ تھا۔ میں جب گھر پہنچا تو میری والدہ مرحومہ کو نزع شروع ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تو اللہ کے یہاں پہنچ گئیں اور میں دارالطلبہ حاضر ہوا، حضرت قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ ''حضرت والدہ کا انتقال ہو گیا۔'' میرے حضرت قدس سرہٗ کو مجھ سے جتنی محبت تھی، اس کو دیکھنے والا اب کوئی نہیں رہا۔ میری چھوٹی اولاد میں جب بھی کسی کا انتقال ہوتا اور میں حسبِ معمول بذل لکھنے بیٹھ جاتا۔ حضرت مجھے گھر جانے کا تقاضہ کرتے۔ میں عرض کرتا کہ حضرت میں جا کر کیا کروں گا، عزیزان، مولوی حکیم ایوب، مولوی نصیر میرے یہاں کے ہر کام کے ذمہ دار تھے۔ عرض کرتا کہ حضرت! ایوب و نصیر دفن کرا آئیں گے، میرے جانے میں بذل کا حرج ہوگا، لیکن کئی مرتبہ یہ نوبت آئی کہ میری درخواست پر املاء شروع کرایا اور ایک دو سطر لکھوا کر یوں فرما کر اُٹھ گئے کہ مجھ سے تو نہیں لکھوایا جاتا۔ بہر حال جب میں نے اپنی والدہ کے انتقال کا حال عرض کیا تو ایک سناٹا سا رہ گیا اور حضرت پر مکمل سکوت۔ میں نے دو منٹ بعد عرض کیا کہ ''حضرت نماز جنازہ کی تمنا تھی، مگر حضرت تو اعتکاف میں ہیں۔'' حضرت نے بے ساختہ فرمایا کہ پیشاب تو قبضہ کی چیز ہے۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ کا دستور یہ تھا کہ تراویح کے بعد دس پندرہ منٹ خدام کے پاس بیٹھتے، پھر پیشاب کرتے پھر وضو فرماتے، پھر مسجد میں واپس جا کر آرام فرماتے۔ اس رات کو حضرت پیشاب کے لیے نہیں اُٹھے اور جب میں گھر واپس آیا تو تقریباً غسل وغیرہ سے فراغت ہو چکی تھی، کفن میں بھی میں نے لمبا کام نہیں کیا، مختصر سا کفن تھا، جو گھر میں کپڑے موجود تھے پہنا کر اور اوپر وہی سیاہ چادر جو ہر وقت میں اوڑھا کرتا تھا نعش پر ڈال دی۔ حضرت باہر تشریف لائے پیشاب و وضو کیا، نماز جنازہ پڑھائی اور واپس مسجد میں تشریف لے گئے اور میں اپنے دوستوں کے ساتھ قبرستان چلا گیا۔ میرے دوستوں نے جو مدرسہ کے طلبہ بھی تھے گورکن کو پرے ہٹا کر آدھ گھنٹے میں ایسی بہترین قبر تیار کی جو سنت کے بالکل موافق تھی اور جنازہ کی نماز سے لے کر تدفین سے فراغ پر سوا گھنٹے میں اپنے گھر پہنچ گئے۔ اگلے دن میں نے بہت مخصوص لوگوں کو خط لکھوائے کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا، رمضان میں ہرگز آنے کا ارادہ نہ کریں، دعائے مغفرت ایصالِ ثواب سے مجھے مسرور فرمائیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کا بہت جی خوش ہوا ہوگا کہ رمضان میں سفر بہت مشکل ہوتا ہے، میری قریبی رشتہ دار بھی رمضان کے بعد آئے۔

پہلی اہلیہ کا انتقال اور بندہ کے نکاح ثانی کی تحریک:

(۳)...... اس کے بعد میرے خانگی واقعات میں میری پہلی اہلیہ مرحومہ کا انتقال ہے۔ یعنی عزیزان ہارون، زبیر، شاہد کی نانی۔ یہ میری پہلی اہلیہ مرحومہ ہے۔ اس کا انتقال زچگی کی حالت میں ہوا کہ آخری بچی صفیہ ۲۴ ذیقعدہ ۵۵ھ کو مغرب کے قریب پیدا ہوئی اور اسی وقت کے احتباس نفاس ہوگیا اور ۵ ذی الحجہ ۵۵ھ بدھ کی شب میں مغرب عشاء کے درمیان میں انتقال ہوا۔ جس کی شادی کا قصہ آئندہ شادیوں کے ذیل میں آرہا ہے۔ بچی پچپن دن زندہ رہی، جس کو اس کی بڑی بہنوں اور والدۂ طلحہ جو اس وقت تک میرے نکاح میں نہیں تھی نے پرورش کیا۔ پھر وہ بھی ۲۱ محرم ۵۶ھ کو اپنی ماں سے جا ملی اور اس کے قریب ہی دفن ہوئی اور میں نے اپنی عادت کے موافق اگلے دن اطلاعی کارڈ لکھ دیے کہ یہاں کی آمد و رفت میں جتنا کرایہ اور وقت خرچ ہو اس کا صدقہ اور تلاوت کا ایصالِ ثواب کر کے اطلاع دیں۔

میری اسی اہلیہ کے انتقال کا بھی عجیب واقعہ ہے۔ آخری بچی پیدا ہوئی تھی اور احتباس نفاس شروع ہوگیا۔ مجھے اپنی بے حسی سے کچھ احساس نہ ہوا۔ عزیزم حکیم یعقوب صاحب علاج کرتے رہے، اپنے بڑوں کے مشورے سے۔ مگر دو ہی دن بعد میرے مکان کے متصل مکان جواب گارڈن بورڈنگ کے نام سے مشہور ہے اس میں ایک مسلمان ڈاکٹرنی عباسیہ بہت ہی مشہور ڈاکٹرنی تھی، سہارنپور کے مسلمانوں میں اس کا علاج بہت ہی مشہور و معروف تھا اور یہ مکان بھی ذاتی اس کا خرید تھا۔ ۴۷ء کے ہنگامے میں وہ پاکستان چلی گئی تھی۔ روانگی کے وقت وہ اپنا یہ مکان بہت ہی کم قیمت یعنی پانچ ہزار روپے پر گویا مجھے مفت دینا چاہتی تھی، بہت ہی اصرار کیا، اللہ اسے بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے۔ میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ میں کسٹوڈین کے جھگڑے میں کہاں پھنسوں گا۔ ہر چند مجھے مولوی نصیر نے اللہ ان کو جزائے خیر دے انہوں نے اور دوسروں نے بہت اصرار کیا کہ مقدمہ سے تو ہم نمٹ لیں گے تو قبول کر لے۔ مگر اس زمانے میں تو ساری ہی و نیاز اهـد الی الله منـقـطـع عـن الـدنـيـا ہو رہی تھی، مجھے اپنا موجودہ ذاتی مکان ہی وبال معلوم ہو رہا تھا، اس لیے شدت سے انکار کر دیا۔ اس ڈاکٹرنی کو میرے گھر والوں سے بھی خصوصی تعلق ہوگیا تھا، اللہ تعالیٰ اس کو جزائے خیر عطا فرمائے وہ ڈاکٹرنی بہت اہتمام سے کئی کئی بار آتی، خود اپنے ہاتھ سے عمل علاج کرتی، دوائیں پلاتی، شرمگاہ میں دوا رکھتی، انجکشن لگاتی، انتقال کے دن مورخہ ۴ ذی الحجہ ۵۵ھ کی صبح کو اس نے یہ کہا کہ میری دوائیں تو کارگر نہیں ہو رہی ہیں، اسے سرکاری شفاخانے میں لے جانے کی یا تو مجھے اجازت دیں، ورنہ وہاں کی نرسوں کو بلائیں، میں مرض سمجھا دوں گی اور وہ دوائیں لا دیں گے۔ دوسری صورت پر عمل کیا گیا دو نرسیں آئیں، بہت غور و خوض سے انہوں نے

دیکھا، عباسیہ ڈاکٹرنی سے بھی مشورہ ہوا اور مجھ سے مریضہ سے دور جا کر یہ کہا کہ مریضہ کو تو اس کی ہوا بھی نہ لگے۔ اگر ان انجکشنوں کے بعد ٦ گھنٹے تک مریضہ زندہ رہی تو زندگی کی امید ہے ورنہ آخری وقت ہے۔ اس پر مجھے بھی فکر ہوا، میں مغرب کی نماز پڑھ کر خلافِ عادت مرحومہ کے پاس جا کر بیٹھا۔ اس نے کہا تم اپنا حرج کیوں کرتے ہو؟ اپنا کام کرلو۔ میں نے کہا کہ نہیں حرج نہیں ہے، تھوڑی دیر میں چلا جاؤں گا۔ غالباً میری خلافِ عادت بیٹھنے سے مرحومہ کو شبہ ہوا۔ تو اس نے کہا ''اچھا میری تجہیز وتکفین کا سامان کردو۔'' میں نے جبری تبسم پیدا کر کے بہت اہتمام سے کہا کہ وہ تو نمٹنے کے بعد ہوا کرے پہلے نہیں ہوا کرتا۔ اس نے کہا اچھا ایک بات کہوں تم نے لڑکیوں کا نکاح تو کھڑے کھڑے بے اطلاع کردیا۔ اس کی مراد مولانا یوسف مرحوم اور مولانا انعام صاحب کی شادیاں تھیں جس کا عجیب قصہ انشاء اللہ ان اوراق ہی میں آجائے گا۔ مرحومہ نے کہا کہ ان کی شادیاں تو تم نے کھڑے کھڑے بغیر کسی اطلاع کے کردیں، رخصتی میں کوئی کپڑا زیور وغیرہ ضرور دے دیجیو، کبھی ننگی ہی چلتی کردو۔ میں نے کہا لاحول ولا قوة اور بہت زور سے تین دفعہ لاحول پڑھی اور اس سے کہا کہ اللہ کہ بندی بیماری میں اس قسم کے خیالات پاس نہیں آنے دیا کرتے توبہ توبہ توبہ۔ اس نے کہا کہ اچھا تو پھر کچھ پڑھ کر سناؤ، میں نے کہا یہ کام کی بات کہی۔ چونکہ جنات کا بھی اثر سمجھا جارہا تھا اس لیے سورۂ یٰسین تو ابتداءً نہیں پڑھی، پہلے سورۂ جن پڑھی پھر منزل پڑھی، پھر یٰسین پڑھی اور یٰسین پڑھتے پڑھتے اس کا سانس آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا گیا۔ میری یٰسین سے پہلے وہ ختم ہوگئی۔ شب ہی میں نے تجہیز وتکفین ہوگئی تھی صبح کی نماز پڑھتے ہی گھنٹہ بھر میں تدفین ہو گئی، میرے حضرت رائپوری قبرستان تشریف لے گئے۔ قبرستان سے واپسی پر مجھے خوب یاد ہے اور میرے حضرتِ اقدس رائپوری قدس سرہٗ تو اس فقرہ کو شاید پچاسوں دفعہ سے زائد دوہرا چکے ہوں گے۔ میں نے مولوی نصیر صاحب سے کہا (مہمان زیادہ جمع ہو چکے تھے) نصیر پیارے مرنے جینے کے قصے تو ہر وقت کے ہیں دیکھ حضرت نے چائے نہیں پی۔ پچیس تیس آدمیوں کی تو جلدی بنالا۔ پھر پانی کو کہتا آ کہ رکھتے ہیں، جب تک بھی سلسلہ چلے اور مطبخ میں دو دیگ پلاؤ کے واسطے جب ہی میں نے پرچہ بھیجا۔ حضرتِ اقدس رائپوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرمانے لگے، ''حضرت کے یہاں رنج وغم کا تو دروازہ کھلتا ہی نہیں۔ یہ حادثہ بھی جشن ہی بن گیا۔'' مرحومہ کے انتقال کے بعد فوراً رات ہی ارجنٹ تار مظفر نگر مرحومہ کے والد، اپنے باپ کے حقیقی ماموں مولانا رؤف الحسن صاحب کو دے دیا کہ فوراً آؤ۔ وہ گھبرا گئے۔ صبح کی نماز سے پہلے ہی ریل سے پہنچ گئے۔ مجھے خوب یاد ہے۔ بڑا ہی ان پر رشک بھی آیا، بڑی دعائیں بھی میں نے ان کو اس وقت دیں اور بعد میں بھی دیں کہ محبت اس کو کہتے ہیں کہ جب وہ اپنی بچی کو سپردِ خاک کر کے قبرستان سے واپس آرہے تھے تو

میرے چچا جان سے راستے میں کہا کہ "عزیز القدر زکریا ابھی بچہ ہی ہے اس کی دوسری شادی میں دیر نہ کرنا۔ جلد کسی جگہ سوچ کر مجھے اطلاع کرو میں وہاں اس کے نکاح کی تحریک کروں گا۔"

مرحومہ کے انتقال کے بعد میں اپنے مشاغلِ علمیہ کی وجہ سے بالکل ہی یہ طے کر چکا تھا کہ دوسرا نکاح نہیں کروں گا کہ بڑا حرج ہوگا۔ اس مرحومہ کے انتقال کے بعد بلا مبالغہ پچیس تیس اہم جگہوں سے اس سیہ کار کی شادی پر اصرار آئے اور بہت ہی دینی اور دنیوی جگہوں سے مطالبے ہوئے۔ میرے دو شیخ، حضرت اقدس مدنی قدس سرۂ اور حضرتِ اقدس رائپوری قدس سرۂ کو بھی لوگوں نے سفارشی بنایا۔ ایک مرتبہ حضرتِ اقدس رائپوری عین صبح کے وقت تشریف لائے اور فرمایا کہ حضرت بہت ہی مجبور کیا گیا ہوں۔ ہر چند میں نے ان صاحب سے معذرت بھی کی شیخ کا ارادہ تو نکاح کا ہے نہیں۔ مگر انہوں نے میرے پاؤں پکڑ لیے، مجھے مجبور کر دیا۔ یہ اپنی لڑکی کا نکاح آپ سے کرنا چاہتے ہیں، بڑی جائیداد کے مالک اور ساری جائداد اگر آپ قبول کریں تب تو آپ کے نام کر دیں، ورنہ لڑکی کے نام۔ میں نے عرض کیا آپ کو معلوم ہے کہ میرا تو ارادہ شادی کا نہیں ہے۔ فرمایا مجھے تو معلوم تھا، میں نے ان صاحب سے بہت انکار کیا مگر انہوں نے بہت اصرار کیا اس لیے حاضر ہوا۔

میری چچا زاد بہن والدۂ طلحہ سلمہٗ کی منگنی دوسری جگہ ہو چکی تھی، وہاں شادی کی تیاریاں بھی تھیں۔ حافظ محمد حسین صاحب اجراڑوی حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے خادم، میرے حضرت قدس سرہٗ کے رمضان کے سامع، میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے خاص دوستوں میں، اکثر نظام الدین جاتے ایک ایک دو دو ماہ قیام کرتے، کسی وقت میں چچا جان نے ان سے درخواست کی ہوگی کہ ہمشیرۂ یوسف کے لیے صالح خاوند چاہیے۔ اہلیۂ مرحومہ کے حادثۂ انتقال کے بعد حافظ محمد حسین نے اجراڑہ سے چچا جان کو پیام بھیجا کہ "ہمشیرۂ یوسف کے لیے صالح خالی ہو گیا ہے جا کر اس سے نکاح کر دو۔" میرے چچا جان کے ذہن میں پہلے سے نہیں تھا اس لیے کہ اس کی منگنی دوسری جگہ طے شدہ تھی تیاری بھی مکمل تھی۔ میرے چچا جان قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ اس پیام پر دہلی سے سیدھے اول کاندھلہ تشریف لائے اور والدۂ طلحہ کے سابقہ مجوزہ شوہر کے والد کے پاؤں پکڑ لیے اور عرض کیا کہ "لڑکی تو میں آپ کو دے چکا مگر میرے بھتیجے کا جو حادثہ پیش آیا اس کے بعد میری عاجزانہ درخواست آپ سے یہ ہے کہ آپ اپنی اس بچی کو بجائے اپنے صاحبزادے کے عزیز زکریا کو دے دیں تو مجھ پر احسان ہے کہ وہ بھی آپ ہی کا بچہ ہے۔" ماموں صاحب چچا جان کی گفتگو سن کر آبدیدہ ہو گئے اور یوں کہا کہ "میری تمنا تو یہ تھی کہ مولانا اسماعیل صاحب (میرے دادا صاحب نور اللہ مرقدہٗ) کی اولاد میں میری اولاد کا بھی کہیں پیوند لگ جاتا، مگر تم نے جو مجبوری اور ضرورت بتلائی وہ تو یقیناً میری بھی ضرورت ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔" اس کے بعد چچا جان سہارنپور

تشریف لائے اور اس سیہ کار سے اپنی خواہش اور ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے عرض کیا کہ "جناب کو تو معلوم ہے کہ میرا بالکل نکاح کا ارادہ نہیں، لیکن جناب کا اگر حکم ہے تو میں کیا انکار کرسکتا ہوں؟ نکاح پڑھ دیجئے۔" چچا جان نے فرمایا کہ ابھی نہیں مجھے مشغولی ہے دو چار دن بعد دیکھا جائے گا۔ میں نے عرض کیا۔ "نکاح پڑھنے میں کتنی دیر لگتی ہے تین چار منٹ لگیں گے، لڑکے موجود ہیں پڑھ دیجئے۔" چچا جان نے فرمایا ابھی لڑکی سے استیمار نہیں ہوا، تغیر زوج کا اس کو علم نہیں ہوا۔ میں نے خیال کیا تھا کہ پہلے لڑکی کے خسر اور تم سے نمٹ لوں اور پھر یوسف کی والدہ ہمشیرہ سے ذکر کروں گا۔ میں نے عرض کیا "بہت اچھا۔" اس شادی کی دلچسپ داستان تو شادیوں کے سلسلے میں آئے گی۔ اس وقت تو تعزیت چل رہی تھی۔

عزیز طلحہ کے بڑے بھائی کے انتقال پر چچا جان کے علمی مراسلہ:

میری اس اہلیہ سے ایک لڑکا عزیز طلحہ کا بڑا بھائی سب سے پہلے پیدا ہوا، نظام الدین ہی میں پیدا ہوا، چند ماہ بعد وہیں انتقال ہوگیا، مجھے اس معصوم کے دیکھنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔ اس وقت تو اس کے انتقال کا قصہ لکھنا تھا۔ اس کے انتقال کی اطلاع چچا جان کے کارڈ سے ہوئی۔ ۹ بجے ڈاک آتی تھی، میں بذل لکھ رہا تھا، حضرت املاء کرا رہے تھے، اتنے حضرت قدس سرہٗ اپنی ڈاک اجمالاً چند منٹ میں یہ دیکھا کرتے تھے کہ کوئی ضروری خط تو نہیں، اتنے میں بھی جلدی جلدی اپنی ڈاک کا ضروری خط دیکھ لیتا۔ چچا جان کے اس کارڈ کو میں نے الگ رکھ لیا، جب حضرت اپنی ڈاک ملاحظہ فرما چکے تو یہ کارڈ میں نے حضرت کی تپائی پر رکھ دیا اور قلم دوات لے کر لکھنے میں مشغول ہوگیا۔ حضرت نے خط ملاحظہ فرمانے کے بعد نہایت لڑکھڑائی ہوئی آواز میں ایک جملہ لکھوانا شروع کیا جو پورا نہ ہوسکا اور یہ فرما کر اٹھ کر تشریف لے گئے کہ "مجھ سے تو نہیں لکھوایا جاتا۔" میں اس زمانے میں مدرسہ کے کتب خانہ ہی میں حضرت کی تشریف بری کے بعد اپنا کام کیا کرتا تھا اور وہی شذرات لکھا کرتا تھا جس کا ذکر پہلے گزر چکا۔ ظہر کے وقت اٹھتا، بھاگتے دوڑتے کبھی ظہر کے بعد روٹی کھاتا، پھر مدرسہ کے سبق میں چلا جاتا یا حضرت کی ڈاک میں۔ ظہر کے وقت کارڈ گھر بھیج دیا، معلوم نہیں کوئی سی بچی روئی یا نہیں روئی۔ اگلے دن ڈاک میں عزیز مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا نہایت ہی رنج وغم اور قلق و اضطراب سے لبریز خط پہنچا، جس میں اپنی بہت زیادہ بے چینی اور رنج کا اظہار تھا۔ میں نے اس کا نہایت تفریحانہ جواب دیا۔ اس زمانے میں میرا خطوط لکھنے کا وقت رات کے بارہ بجے کے بعد شروع ہوتا تھا تاکہ جتنا وقت اس میں خرچ ہو وہ سونے کے اوقات میں سے کٹوتی ہوجائے، کام کے اوقات میں سے ضائع نہ ہو۔ میں نے رات بارہ بجے سے خوب تنبیہی تفریحی خط عزیز یوسف مرحوم کو لکھا۔ یاد پڑتا ہے کہ اس کی

ابتداء اس شعر سے تھی:

عشق با مردہ نباشد پائیدار　　عشق را باقی و با قیوم دار

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　آگے آگے دیکھ تو ہوتا ہے کیا

دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ اس وقت اچھی طرح یاد نہیں کیا ہے؟ میرے چچا جان نے یہ خط پڑھ لیا۔ مجھے نہایت عتاب کا خط لکھا، حوادث پر ایسے خطوط ہرگز نہیں لکھا کرتے جن سے جرأت، بیبا کی، حوادث سے عدم تاثر معلوم ہوتا ہو، وغیرہ وغیرہ۔ خوب ڈانٹا۔ میں تو اپنے سارے اکابر کی شان میں ہمیشہ ہی گستاخ رہا۔ میں نے چچا جان کی خدمت میں یہ لکھا کہ ''امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے دو ترجمۃ الباب باندھے ہیں: اول ''باب من جلس عند المصيبة يعرف فيه الحزن'' اور دوسرا ''باب من لم يظهر حزنه عند المصيبة''۔ جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ کا قصہ لکھا کہ ان کا چھوٹا بچہ سخت علیل تھا، جب اس کا انتقال ہو گیا، باپ نے پوچھا، بچہ کیسا ہے؟، ماں نے کہا آج تو بالکل راحت سے ہے۔ کپڑے پہنے، کھانا وغیرہ تیار کیا، خوشبو لگائی، جو مختلف روایات میں وارد ہوا ہے۔ خاوند نے ان کو سچا سمجھا۔ کھانا بھی کھایا، پھر صحبت بھی کی۔ جب خاوند نماز کو جانے لگے تو بیوی نے کہا بچہ کا انتقال ہو گیا ہے نماز کے بعد اس کو دفن کر دیں۔ خاوند نے صبح کو یہ قصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صحبت بھی کی تھی، انہوں نے اقرار کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری اس رات میں اللہ برکت فرمائیں گے اور برکت کی دعا دی۔ چنانچہ اس رات کی صحبت سے ایک صاحبزادے عبداللہ پیدا ہوئے اور ان کے نولڑکے پیدا ہوئے جو سب حافظ قرآن ہوئے۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے لکھا کہ پہلا باب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا فعل ہے اور دوسرا صحابیہ کا۔ میں نے لکھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل رأفت وشفقت علی الامۃ ہے، اس کو میرے شیخ نے پورا کر دیا کیونکہ وہ یہ کہہ کر اٹھ گئے تھے کہ مجھ سے نہیں لکھوایا جاتا اور دوسرے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا فرمائی۔

چچا جان نے پھر مجھے ایک ڈانٹ کا خط لکھ دیا۔ اللہ ان کو بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے، والد صاحب کے بعد وہ میری تربیت کا اپنے آپ کو مستقل ذمہ دار سمجھتے تھے۔ میرا دل تو چاہا کہ ان کے کارڈ کا بھی جواب لکھوں مگر ڈر کے مارے نہیں لکھا کہ وہ مزید ناراض نہ ہوں۔ میرے چچا جان قدس سرہٗ میری اصلاح وتربیت کے لیے بعض مرتبہ معمولی سی بات پر زیادہ ناراض ہو جایا کرتے تھے اور تو کسی کی پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی مگر ایک دو مرتبہ حضرت رائپوری قدس سرہٗ کے سامنے جب اس قسم کا واقعہ پیش آیا اور حضرت نے تنہائی میں چچا جان سے پوچھا کہ حضرت یہ تو کوئی اتنی ناراضی کی بات نہ تھی تو حضرت چچا جان یہ فرماتے کہ حضرت! آخر میں چچا بھی تو ہوں۔

میری اہلیۂ مرحومہ سے بارہ اولادیں ہوئیں، چار لڑکے جو شیر خواری میں چل دیئے آٹھ لڑکیاں جن میں تین تو شیر خواری میں گئیں اور دو عروسی کے بعد۔

چوتھا حادثہ میرے چچا کا انتقال:

(۴)...... میرے اکابر کے حوادث کا سلسلہ تو بہت وسیع ہے۔ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ اور ان کے اجل خلفاء۔ مگر میں یہاں اس وقت چند نمونے خانگی کے لکھوا رہا ہوں۔

جب میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا ۲۱ رجب ۶۳ھ مطابق ۱۳ جولائی ۴۴ء بروز پنجشنبہ بوقت اذانِ صبح وصال ہوا تو میں نظام الدین میں تھا۔ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے وصال پر ایک مشترک کارڈ حضرت ناظم صاحب، مولانا عبدالرحمٰن صاحب، مولانا اسعد اللہ صاحب کے نام لکھا کہ آپ حضرات میں سے کوئی نظام الدین تکلیف فرمانے کا ارادہ نہ کریں۔ میں خود ہی کل یا پرسوں حاضری کا ارادہ کر رہا ہوں اور جب میں نے یہ لکھ دیا کہ میں خود ہی حاضری کا ارادہ کر رہا ہوں تب کون ارادہ کرتا؟ اور یہ لفظ میں نے قصداً جان کر لکھا تھا کہ جب ان حضرات کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایک دو دن میں آنے کا ارادہ کر رہا ہے تو پھر کوئی نہیں آئے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایک تحریر اپنے مشہور و معروف مضمون کی لکھوا کر مدرسہ کے بورڈ پر لگوادی۔ نیز میرے نظریئے اور مضمون کی روشنی میں نظام الدین کے حضرات کی طرف سے آفاقِ عالم میں مختصر اور مفصل خطوط بھیجے گئے کہ نظام الدین میں آنا محض رسمی تعزیت ہے۔ اصل تعزیت وہ کام ہے اور اس میں ہم لوگوں کا ہاتھ بٹانا ہے جس میں چچا جان تشریف لے گئے۔ اس کا اللہ کے فضل سے بہت اچھا اثر ہوا کہ اتنی کثرت سے جماعتیں نکلیں کہ حضرت چچا جان کی حیات میں بیک وقت اتنی نہ نکلی تھیں۔

حادثہ بڑی لڑکی کا انتقال:

(۵)...... جن دو (۲) لڑکیوں کی عروسی کے بعد انتقال ہوا، ان میں سے پہلی اور سب سے بڑی لڑکی والدۂ مرحومہ عزیز ہارون سلمہٗ ہے۔ اس کی موت کا قصہ میں اپنے کسی رسالہ میں لکھ چکا ہوں کہ کئی سال تپ دق میں بیمار رہ کر ۲۹ شوال ۶۶ھ مطابق ۱۵ ستمبر ۴۷ء کو مغرب کی نماز کے سجدہ میں انتقال ہو گیا، جب کہ وہ اشارے سے سجدہ کر رہی تھیں۔

حادثہ انتقال دوسری لڑکی شاکرہ:

(۶)...... اس کے علاوہ دوسری لڑکی شاکرہ مرحومہ کا انتقال ۱۲، رجب دوشنبہ ۶۹ھ مطابق یکم مئی ۵۰ء کو ہوا۔ وہ بھی مرحومہ ایک بڑے رنج اور اور صدمہ کا شکار ہو کر تپ دق میں مبتلا ہو گئی تھی۔ مگر اللہ نے صبر و شکر اتنا عطا فرمایا تھا کہ اس نے اپنی کسی بہن پر بھی کبھی رنج و قلق کا اظہار نہ کیا۔ اللہ

تعالیٰ کا شکر ہر وقت ادا کرتی تھی اور اپنے نام کا حق ادا کر گئی۔ جس حادثہ میں اس کی موت ہوئی اس حادثہ کے بعد اس نے بچیوں کو قرآن پڑھانا شروع کر دیا تھا اور سارے دن اسی میں مشغول رہتی۔ حب دق کی حالت میں بھی بڑے بڑے بچیوں کو بڑے اہتمام سے محنت اور محبت کے ساتھ پڑھایا کرتی تھی۔ اتفاق سے مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سہارنپور آئے ہوئے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ گھر گیا تو مرحومہ نے یٰس پڑھنے کی فرمائش کی۔ مولانا یوسف صاحب نے پڑھی اور جب ''سَلامٌ قَولاً مِنْ رَّبٍ رَّحِیْم'' پر پہنچے تو نہ معلوم مولانا یوسف صاحب مرحوم پر ایک جذبہ اور جوش آیا اور اس آیت شریفہ کو تین بار پڑھا۔ تیسری کے درمیان میں میری مرحومہ بچی کی رُوح پرواز کر گئی۔

میں نے اس مرحومہ کے انتقال کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دی، نوعمر بچی تھی۔ کوئی خاص امتیازی شہرت نہ تھی۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب دو ہفتہ کے اندر اندر میرے پاس دو سو سے کہیں زیادہ کارڈ پہنچے، مضمون مشترک سب کا مختلف الفاظ کے ساتھ ایک تھا۔ ''حضرت! صاحبزادی صاحبہ کے انتقال کا حال فلاں سے معلوم ہوا۔ حاضری کو طبیعت بے چین ہے۔ مگر چونکہ حضرت والا کا اصول پہلے سے معلوم تھا اس لیے سہارنپور آمد ورفت کا اتنا کرایہ اور آمد ورفت کے دو دن میں اتنی تلاوت ہو سکتی تھی، پیسوں کا صدقہ اور تلاوت کا ایصالِ ثواب کر کے جناب کی خدمت میں اطلاعی کارڈ ارسال ہے۔'' میرے اللہ کا کتنا احسان ہے، مجھے اس مرحومہ کی تعزیت کرنے والوں سے اس قدر مسرت پہنچی کہ اس کے حادثۂ انتقال کا قلق اس کثرت سے جانی ومالی ایصال میں دب گیا۔ میرا یہ معمول اس وقت تک مشہور ہو چکا تھا، کہ سب سے پہلے اپنے والد صاحب کے انتقال پر، پھر اپنی والدہ کے، پھر اہلیہ مرحومہ اور پھر چچا جان کے انتقال پر ایک ہی مضمون سب دوستوں کو لکھا گیا تھا، اس لیے یہ چیز مشہور ہو گئی۔

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ دیوبند سے شاہجہانپور کسی اجتماع میں جا رہے تھے، سہارنپور کے اسٹیشن پر ان کو مرحومہ بچی کے حادثہ کا حال معلوم ہوا، ٹکٹ رڈی کر دیا اور اسٹیشن سے اجتماع میں تار دیا کہ ''میں آ نہیں سکتا خط کا انتظار کریں۔'' اور میرے پاس تشریف لے آئے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں چبوترے پر ویسے ہی بغیر کچھ بچھائے پڑا ہوا تھا۔ مولانا مرحوم سے بہت ہی بے تکلفی ہو گئی تھی اتنی زیادہ کہ اس کے واقعات بھی بہت عجیب ہیں اور آخر میں تو مولانا کا یہ تعلق اتنا بڑھ گیا کہ تقریباً ہر جمعہ کو ۹ بجے کی گاڑی سے آتے، جمعہ کے بعد کھانے میں شرکت کرتے اور ۴ بجے کی گاڑی سے دیوبند واپس چلے جاتے۔ میں نے آتے ہی مولانا مرحوم سے مطالبہ کیا آپ کہاں؟ فرمایا کہ شاہجہاں پور جا رہا تھا، اسٹیشن پر حادثہ کی اطلاع ہوئی، تار دے کے آ گیا۔ میں نے کہا آپ نے بڑا تیر مارا۔ جلسہ میں تشریف لے جاتے مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت کرتے

کراتے اور اس جلسہ کی شرکت کا اجر وثواب مرحومہ کو بخش دیتے تو میرا کتنا دل خوش ہوتا۔ یہ کہہ کر میں نے کہا کہ لیٹ جاؤ، اب تک کی گفتگو میں میں پڑا ہوا تھا اور وہ بیٹھے ہوئے تھے، لیٹ گئے۔ اس کے بعد میں نے مولانا مرحوم سے اپنا قانونِ تعزیت جو والد صاحب قدس سرہٗ کے زمانے سے چل رہا تھا، مفصل سُنایا۔ فرمایا کہ حضرت قانون تو بہت ہی قیمتی ہے، کاش لوگ اس پر عمل کرلیں تو جانے والوں کے لیے بھی بڑا سرمایہ اور رہنے والوں کے لیے بھی بڑا ذخیرہ ہے مگر کوئی عمل نہیں کرے گا۔ میں نے کہا کم از کم تم جیسوں کو تو اس کی تبلیغ کرنی چاہیے اور براہِ کرم آیندہ میرے کسی حادثہ میں ہرگز تکلیف نہ فرمائیں اور پھر میں نے زبردستی ۱۲ بجے کی گاڑی سے ان کو شاہجہانپور روانہ کردیا۔

اس مرحومہ کے انتقال پر مجھے قلق بھی بہت ہوا، اس واسطے کہ اس نے ناگہانی مصیبت اُٹھائی اور مسرت بھی اس معنیٰ میں بہت ہوئی کہ میرا خیال یہ ہے کہ شاید اللہ ہی کی طرف سے یہ بات ہو کہ اس مرحومہ کے لیے ایصالِ ثواب کے جتنے خطوط میرے پاس آئے ہیں، اکابر کو چھوڑ کر اعزہ میں سے کہیں کسی کے متعلق اتنے ایصالِ ثواب اور صدقہ کے خطوط نہیں پہنچے ہوں گے۔ تیسرے دن حضرت اقدس مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ اعلی اللہ مراتبہٗ مع اہلیہ محترمہ علی الصباح پہنچ گئے اور میں نے نہایت تجاہل عارفانہ کے ساتھ عرض کیا حضرت! کیسے تشریف آوری ہوئی؟ حضرت نے ڈانٹ کر ارشاد فرمایا کہ مجھے خبر بھی نہیں کی۔ میں نے عرض کیا حضرت کوئی ایسی اہم چیز نہیں تھی، یہ قصے تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا، مجھے تو رات ۱۲ بجے معلوم ہوا، میں تو اسی گاڑی سے آرہا تھا مگر گھر میں سے اصرار کیا کہ میں بھی چلوں گی، بے وقت ان کے لانے میں دِقت تھی، اس لیے علی الصباح آیا۔ میں نے عرض کیا کہ ''حضرت وہیں سے دعائے مغفرت، ایصالِ ثواب فرمادیتے تو وہ مرحومہ کے لیے زیادہ قیمتی ہوتا، آج کے بخاری کے سبق کا ایصالِ ثواب فرمادیتے۔'' اچھی طرح تو الفاظ یاد نہیں مگر یہ یاد پڑتا ہے کہ حضرت نے اس قسم کے الفاظ فرمائے تھے کہ آنے سے وہ حذف تھوڑے ہوگئے، یہ بھی سہی وہ بھی سہی۔ اس مرحومہ کی شادی کا بھی عجیب قصہ ہے، یاد رہا تو اپنی جگہ آئے گا۔

حادثہ انتقال عزیز یوسف مرحوم:

(۷) ان حوادث کی آخری کڑی عزیز گرامی قدر منزلت مولانا الحاج محمد یوسف صاحب نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ کا حادثہ جانکاہ ہے جس کی تفاصیل اخبارات و رسائل میں شائع ہوچکی ہیں اور خوب ہوئی ہیں، چند واقعات جن کا تعلق میری ذات سے ہے مختصراً لکھوا رہا ہوں۔

مورخہ ۲۹ ذی قعدہ ۸۴ھ مطابق ۲ اپریل ۶۵ء بروز جمعہ عزیز مرحوم کی سہارنپور آمد کی اطلاع

تھی، جمعہ کی صبح کو عزیز مرحوم کی بیماری کا تار آیا۔ مجھے پاکستانی احباب پر بہت ہی غصہ آیا، اس واسطے کہ ان سب احباب کی مستقل اور مستمر عادت عزیز یوسف مرحوم کے سلسلے میں اور اس سے کہیں زیادہ حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے معاملے میں ہمیشہ یہ رہی کہ عین وقت پر بیماری کے تار دمادم آنے شروع ہو جاتے اور اس کے بعد مولانا یوسف مرحوم کا تو ہفتہ عشرہ مؤخر کر دینا اور حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کو آٹھ دس ماہ مؤخر کر دینا ایک معمولی بات تھی۔ مجھے بیماری کا یقین ذرا نہ آیا، میں جمعہ کی نماز کے بعد کھانا کھا کر سونے کے ارادہ سے لیٹا تھا کہ ۴ بجے کے قریب عزیز طلحہ نے مجھے آکر اُٹھایا اور کہا کہ ''صابری صاحب کا آدمی کھڑا ہے، لاہور سے فون آیا ہے کہ ماموں حضرت کا انتقال ہو گیا۔'' موت کے لیے نہ تو کوئی وقت ہے نہ اس میں کوئی استبعاد، میں اُٹھ کر وضو کر کے مدرسہ کی مسجد میں جا بیٹھا اور نماز کی نیت باندھ لی۔ اس لیے کہ طلحہ کی اس روایت کے ساتھ ساتھ چاروں طرف ہجوم نے گھیرنا شروع کر دیا اور مجھے ایسے وقت میں لغو باتیں کہ ''کیا ہو گیا؟ کیا بیمار تھے؟ کب ہوا؟ کون خبر لایا؟'' لغویات سے بہت ہی وحشت ہوا کرتی ہے کہ یہ اہم اور قیمتی وقت بہت ہی مبارک ہوتا ہے، جس میں طبیعت ''منطقع عن الدنیا متبتل الی الآخرۃ'' ہوتی ہے، اس وقت کی تلاوت بھی قیمتی، ذکر و فکر بھی قیمتی۔ مجمع بڑھتا ہی چلا گیا۔ مدرسہ، سڑک سب بھر گیا اور میں نے تکبیر تک سلام پھیر کر ہی نہ دیا، عصر کی تکبیر پر سلام پھیرا اور گھر جا کر۔ وہاں خبر پہنچ چکی تھی، مگر میرے گھر کی سب بچیوں کو اللہ بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، اپنی مرضیات پر عمل کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے، نامرضیات سے حفاظت فرمائے، وہ اس کی خوب عادی ہو چکی ہیں کہ وہ ایسے موقع پر تلاوت یا تسبیح لے کر بیٹھ جاتی ہیں اور ہر آنے والی کو زائد تسبیح رکھی ہو تو وہ ورنہ اپنے ہاتھ کی تسبیح دے دیا کرتی ہیں اور خود بغیر تسبیح کے شروع کر دیتی ہیں کہ اس کی عادی ہیں۔ میں نے زنانہ دروازہ پر آکر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا کہ ''وہ حادثہ تو تم نے سُن ہی لیا، بہت مشغول رہنا، تمہارے پاس عشاء کے بعد آؤں گا، اس سے پہلے پڑھنے پڑھانے میں لگی رہو۔''

دروازے سے نکلا تو گھر سے مدرسہ تک ہجوم ہی ہجوم تھا۔ میں تُرش رُوئی کیساتھ ان دوستوں سے یہ کہتے ہوئے کہ ''مجھے تو اس وقت کچھ ضروری پڑھنا ہے، آپ لوگ یہاں تشریف رکھیں، مدرسہ میں تشریف رکھیں اور خوب باتیں کریں، ایسی فراغت کا وقت پھر کب ملے گا۔'' اس گفتگو کے بعد مجمع منتشر ہو گیا اور میں مسجد میں جا کر بیٹھ گیا، البتہ وہاں بولنے کی آواز کان میں پڑتی رہیں۔ عصر سے آدھے گھنٹے بعد عزیز طلحہ، صابری صاحب کے دوسرے آدمی کو ساتھ لے کر آیا کہ دوسرا ٹیلیفون آیا ہے۔ ''حضرت جی رحمہ اللہ تعالیٰ کے دفن کے مسئلہ پر ہنگامہ ہو گیا ہے۔ حافظ

صدیق صاحب وغیرہ ہندی اہلِ میوات دہلی جانے پر اصرار کر رہے ہیں اور مقامی حضرات یہاں تدفین پر اور فیصلہ تیری رائے پر۔"

مجھے اس کا واہمہ بھی نہ تھا کہ دہلی تابوت کسی طرح آسکتا ہے، اس لیے کہ اس سے قبل مُرشد العالم حضرت اقدس مولانا الحاج شاہ عبدالقادر صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے وصال پر مجھے یہ باور کرایا گیا تھا کہ رائے پور منتقل ہونے کی کوئی صورت ممکن نہیں تھی۔ حالانکہ حضرت نوراللہ مرقدہٗ کی خواہش وتمنا اور جملہ خدام خاص طور سے اپنے بھتیجے عبدالجلیل سے یہ وعدہ لینا میرے اور سب کے سامنے کا تھا کہ نعش کے روکنے کی کوشش نہ کیجیو اور جب میں نے ڈھڑیاں تدفین پر مطالبہ کیا کہ یہ کیوں ہوئی؟ تو مجھے بہت زور سے متعدد احباب کے خطوط میں بتایا گیا تھا کہ رائے پور لانے کی کوئی صورت ممکن نہیں تھی: (۱) حکام سے اجازت۔ (۲) ڈاکٹروں کی اجازت۔ (۳) دماغ میں، دونوں مونڈھوں پر، گردن کی دونوں طرف، سینے پر، ٹانگوں پر شگاف آکر سب جگہ دوائیں بھری جائیں گی۔ (۴) ان سب کے باوجود بھی نعش کا بغیر تعفن کے پہنچنا ناممکن۔ میں نے ان راویوں کو سچا سمجھا اور چونکہ حضرت قدس سرہٗ کے خدام بڑے بڑے اعلیٰ مدبرین، وزراء، ڈاکٹر سارے ہی شامل تھے اور سب ہی کو حضرت کی تمنا کا حال معلوم تھا اور پھر حضرت کا تابوت منتقل نہ ہوسکا، مجھے تو اس کا واہمہ بھی نہ تھا، بلکہ کسی درجے میں بھی خیال نہ تھا کہ عزیز مرحوم کا تابوت منتقل ہوسکتا ہے۔ میں نے حافظ صدیق صاحب وغیرہ کی دلداری میں اپنی رائے کے خلاف یوں سمجھ کر مفت کرم داشتن ہے یہ کہلا دیا کہ "اگر نظام الدین آمد کی کوئی صورت ہوسکتی ہو تو مقدم ہے ورنہ رائے ونڈ کے مدرسہ میں۔" مگر میری حیرت کی انتہاء نہ رہی، جب آٹھ بجے تیسرا ٹیلیفون آیا کہ "تابوت تیار ہے۔ ۱۱ بجے لاہور سے چل کر ۱ بجے دہلی پہنچ جائے گا۔" میں بڑی دیر تک عزیز یوسف مرحوم کے مسئلے کو چھوڑ کر حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے مسئلہ میں کھو گیا کہ حضرت کی تمنا کے باوجود، اصرار وخواہش کے باوجود، محبت کے دعویداروں نے کس طرح یہ اقدام کیا؟

عشاء کی نماز پڑھ کر حسب وعدہ گھر میں گیا تھا کہ عزیز ہارون، بابو ایاز وغیرہ کار لے کر سہارنپور پہنچے، اس لیے کہ نظام الدین میں بہت مجمل خبر عصر کے قریب کسی کی روایت سے حادثے کی صرف پہنچی تھی، میں نے ہارون سے کہا کہ "تم یہاں کہاں؟ تمہارے یہاں تو تابوت پہنچ رہا ہے۔" اور سمجھایا کہ اللہ جل شانہٗ نے اس سیہ کار کے واسطے کار بھیجی ورنہ میرے جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میں نے ہارون سے کھانے کا تقاضا کیا۔ اس نے کہا کہ جمعہ کے بعد کھایا ہے، تو میں نے کہا تم لوگ عشاء کی نماز پڑھ آؤ اتنے چائے تیار ہوجائے گی۔ انہوں نے نہایت عجلت میں نماز پڑھی اور عجلت میں چائے پکائی گئی۔ ۱۱ بجے سہارنپور سے کار میں چل کر ۳ بجے نظام الدین پہنچنا ہوا۔ راستہ خوب

صاف ملا اور سنانے میں خوب لطف آیا۔ لیکن تین جگہ قسمت سے پھاٹک بند ملے، پہلا ہی پھاٹک روڑکی والا بہت پہلے سے بند کر دیا تھا۔ بڑی خوشامد کی کہ گاڑی قریب نہیں ہے مگر ایک نہ مانی اور آدھا گھنٹہ لے ہی لیا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ نعش کے آنے میں بھی تاخیر ہوئی اور ہم سے ذرا پہلے نظام الدین پہنچی۔ اس کی تفاصیل تو مذ زائد ہی ہیں اور رسائل، اخبارات سوانحوں میں آ بھی چکی ہیں۔ یہاں میرا مقصد تو یہ ہے کہ اس حادثہ میں بجائے تعزیت کے لیے آنے کی شدید ممانعت کے دہلی اہل مرکز کی طرف سے اور ان ہی کے ساتھ میری طرف سے بھی تعزیت کرنے والوں کو بلانے کا وہ زور رہا کہ ساری عمر کی کسر نکل گئی۔ مگر یہ بلانا بھی حقیقت میں اس نہ بلانے سے زیادہ قیمتی تھا جواب تک پیش آیا، اس لیے کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمی روزانہ آتے اور آتے ہی ان کی تشکیل کر کے کسی جانب جماعت میں برائے ایصال ثواب مولانا یوسف مرحوم چلتا کر دیا جاتا۔
اس دن تو ہنگامہ بہت ہی زیادہ رہا، بات کرنے کی بھی نوبت نہ آئی۔ دوسرے دن مولوی انعام سلمۂ نے مجھ سے فرمایا کہ تیرے حکم کی تعمیل میں جنازہ یہاں تک آ گیا، ورنہ مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے تو حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے تابوت کے نزاع میں ہمیشہ مجھ سے یہ کہا اور کئی دفعہ کہا کہ ''میری نعش کہیں منتقل نہ کی جائے، اگر ریل میں انتقال ہو جائے تو قریب کے اسٹیشن پر اُتار کر وہیں جنگل میں دفن کر دینا، جس جگہ کا ٹکٹ ہو وہاں بھی نہ لے جانا۔'' میں نے ان سے کہا کہ ''اللہ کے بندو جب مرحوم کی تمہارے پاس ایک وصیت تھی تو تمہیں اس پر عمل کرنا چاہیے تھا۔''
تو عزیزم مولانا انعام الحسن صاحب نے فرمایا کہ ''وہاں ہنگامے کی ایسی صورت پیدا ہو رہی تھی کہ جس میں نزاع کا اندیشہ تھا، تیرا نام آتے ہی ہر فریق چپ ہو گیا، ورنہ اہل لاہور کا شدید اصرار تھا کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مقبرہ میں دفن کیا جائے اور تبلیغی احباب کا رائیونڈ میں اور ہندی میواتیوں کا زور تھا کہ دہلی لیا جانا ہوگا ورنہ یہیں ہنگامہ ہو جائے گا۔ تیرے نام پر تینوں فریق چپکے ہو گئے اور حافظ صدیق نے کہہ دیا کہ اس کے حکم کے خلاف تو ہم نہیں بول سکتے۔''
میں نے کہا کہ پھر کم از کم مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی وصیت ٹیلیفون پر نقل کرانی چاہیے تھی، مجھے تو پہلے سے اس کا حال معلوم نہ تھا، میں تو کبھی دہلی نہ منگواتا، البتہ رائے ونڈ کو ضرور پسند کرتا۔'' کیا کیا قصے لکھے جائیں اور لکھوائے جائیں۔ ورنہ ان چوہتر (۷۴) برس میں کیا کیا دیکھا، کیا کیا سنا، کیا کیا گزری، بہت طویل قصے ہیں اور عبرت کے لیے تو میں اس قسم کے بعض واقعات میں بڑا فکر میں پڑ جاتا ہوں کہ مالک کی قدرت کے عجب کرشمے ہیں۔
گزشتہ واقعات، خاندانی اہم اموات کا تذکرہ تھا، جن کی تعزیت سے میرا خصوصی تعلق رہا۔ اکابر کے سلسلہ کے حوادث میں بھی بعض عجیب قدرت کے کرشمے دیکھنے پڑے۔

اکابر میں پہلے حادثہ انتقال حضرت گنگوہیؒ:

(۱)...... اس سلسلے میں سب سے اول قطب الارشاد سید الطائفہ حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ قدس سرہٗ اعلی اللہ مراتبہٗ کا حادثۂ وصال دیکھا، جو ۸ یا ۹ جمادی الثانیہ علی اختلاف رؤیۃ الہلال ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء جمعہ کے دن چاشت کے وقت ہوا، وہ منظر اب تک آنکھوں کے سامنے ہے۔ جمعہ کی نماز کے بعد تدفین عمل میں آئی۔ صبح کے بعد سے اور جنازہ کے اُٹھنے تک اس قدر سناٹا رہا کہ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ آدمی کی آواز نہیں جانور کی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی، لب ہر شخص کے خوب ہل رہے تھے اور اس قدر مکمل کہ قرآن پڑھنے کی بھی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ حفاظ بھی قرآن پڑھ رہے تھے اور ناظرہ خواں بھی مسجد میں بیٹھ کر قرآن خوب کثرت سے پڑھ رہے تھے، مگر زبان پر ایسا سکوت کہ آواز کا نام نہیں۔ اگر کوئی شخص کسی سے بات پوچھتا بھی تھا تو ایک دو منٹ بعد اشارے سے جواب ملتا۔ جمعہ کی نماز تو میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو پہلے حضرت قدس سرہٗ کی علالت سے امامت کر رہے تھے پڑھائی بہت بھرّائی ہوئی آواز میں، جنازہ کی نماز حضرت شیخ الہند نے حضرت صاحبزادہ صاحب کے حکم سے پڑھائی۔ اس لیے کہ سارے ہی اجل خلفاء موجود تھے۔ حضرت صاحبزادے سے پوچھا گیا، انہوں نے کہا کہ ''مولوی محمود پڑھائیں گے۔'' میں تو بہت ہی بچہ تھا۔ چھپ چھپ کر قبرستان جارہا تھا اور جگہ جگہ سے ہٹایا جارہا تھا، راستے میں مخلص کہتے کہ ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ۔ قبر شریف تک تو پہنچ ہی نہ سکا، اس لیے کہ تقریباً چاروں طرف سے ایک میل زائد جگہ کا لوگوں نے احاطہ کر رکھا تھا۔ منظر خوب یاد ہے۔

دوسرا سانحۂ ارتحالی بڑے حضرت رائے پوری:

(۲)...... اس کے بعد ۲۶ ربیع الثانی ۳۷ھ میں پیلوں میں حضرت اقدس قطب الاتقیاء رأس التواضع والصفا حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کا منظر دیکھا، میرے حضرت قدس سرہٗ نے سہارنپور میں ایک شب پہلے خواب دیکھا کہ چاند گرہن ہوگیا۔ خواب دیکھتے ہی بے چینی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اماں جی مرحومہ یعنی اہلیۂ محترمہ حضرت قدس سرہٗ نے پوچھا کہ کیا بات ہوئی؟ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا یہ خواب دیکھا ہے۔ مولانا محمود الحسن مالٹا میں ہیں اور مولانا عبد الرحیم صاحب عرصہ سے بیمار ہیں۔ اللہ ہی خیر فرمائے۔ علی الصباح حضرت پیلوں کا ارادہ فرمایا۔ مجھے یہ خواب اسی طرح یاد ہے۔ تذکرۃ الخلیل صفحہ ۲۶۷ میں کچھ معمولی تغیر خواب کے نقل میں ہے۔ یہ گاؤں شاہ زاہد حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ رئیس بہٹ کا خریدا ہوا تھا، آب وہوا اس کی بہت اچھی تھی اور انگریزوں کی چند کوٹھیاں اس میں تھیں جن سے خریدا گیا تھا۔ بہت ہی

ہوادار بہت ہی پُر فضا جگہ تھی۔شاہ صاحب کی درخواست پر حضرت قدس سرہٗ زندگی کے آخری ایام میں تبدیلِ آب وہوا کی وجہ سے یہاں تشریف لے آئے تھے۔یہیں وصال ہوا۔وصال کے بعد جنازہ رائے پور گیا۔حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کی تشریف آوری تو صبح کو ہوگئی تھی۔وصال اگلی شب میں ہوا۔دوسرے دن اخیر شب میں ہی سہارنپور میں خبر گونج گئی تھی۔ہمارے یہاں مدرسہ میں ششماہی امتحان ہورہا تھا۔اس زمانے میں امتحان اتنی شدید چیز تھی کہ مدرسہ کے کسی ملازم کو مدرس ہو، اہل دفتر، محصلِ چندہ ہو، ناظم کتب خانہ ہو، کسی کو کسی حال میں بھی چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ محصلین چندہ بھی اس زمانے میں اگر دُور دراز نہ ہوں تو واپس بلائے جاتے تھے۔کتب خانہ صبح کو اور مالیات کا دفتر بھی صبح کو بند رہتا تھا۔

مولانا ثابت علی صاحب کا انتقال:

ہمارے مدرسہ کے مدرسِ دوم حضرت مولانا ثابت علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ اور حضرت مولانا عبدالطیف صاحب سابق ناظم مظاہر علوم کے حقیقی چچا ۱۲۸۳ھ یعنی جب سے مدرسہ کی ابتداء ہوئی اس وقت سے مدرسہ کے طالب علم ابتداء فارسی سے لے کر آخر دورہ تک مدرسہ ہی میں تعلیم پائی اور یکم محرم ۹۷ھ میں دوروپے وظیفہ طلبہ جو پہلے سے تھا وہ بدستور رہ کر دوروپے معین المدرسی کی تنخواہ مقرر ہوکر چارروپے پر تقرر رہا اور معین المدرسی کے ساتھ ۱۲۹۸ھ میں تکمیلِ حدیث اور ۹۹ھ میں صرف بیضاوی پڑھی اور ترقی کرتے کرتے تدریس حدیث تک پہنچے اور چودہ (۱۴) دن مرض احتباس البول میں بیمار رہ کر شب جمعہ ۲۰ ربیع الثانی ۴۲ھ میں بعمر پینسٹھ (۶۵) سال سہارنپور ہی میں انتقال فرمایا اور حاجی شاہ قبرستان میں جہاں مدرسہ کے اکثر اکابر اور میرے والدین، اہلیہ مرحومہ اور بعض لڑکیاں مدفون ہیں وہیں حضرت مولانا دفن ہوئے۔مولانا مرحوم حضرت قدس سرہٗ کی روانگی پر مدرسِ اول ہی ہوتے۔مگر ۳۳ھ میں جب حضرتِ اقدس رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ معرکۃ الآراء سفر میں تشریف لے جارہے تھے تو اپنی نیابت کے لیے میرے والد صاحب قدس سرہٗ کی تحریک اور اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی تائید سے مولانا ثابت علی صاحب کے بھتیجے مولانا عبدالطیف صاحب کو مدرسِ اول بنادیا تھا۔

مولانا عبدالطیف کی صدر مدرسی:

میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحریک کا مطلب یہ کہ چونکہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ۲۸ھ سے قائم مقام صدر مدرس تھے، اس لیے حضرت کے طویل سفر میں ان ہی کو مدرسِ اول ہونا چاہیے تھا مگر والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر کہ صدر مدرسی کے واسطے جس متانت،

انتظامی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ مولوی عبداللطیف میں زیادہ ہے میرے حضرت نے بھی اس تجویز کو پسند کیا اور بڑے حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی۔ حضرت مولانا ثابت علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس پر رنج وقلق طبعی چیز تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ مولانا مرحوم کئی دن تک ''الرجل و قدمہ و الرجل و بلاؤہ'' یہ مشہور حدیث ابوداؤد شریف میں ہے، جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد منقول ہے جس کا مطلب یہ ہے آدمی اور اس کی قدامت ومشقت یعنی خدمات کی رعایت ضروری ہے۔ اس حدیث پاک کو گنگنایا کرتے۔ مگر چونکہ اصل واستحقاق سب کی نگاہوں میں میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا تھا

مولانا ثابت علی صاحب کی نگرانی امتحان:

مولانا ثابت علی صاحب کے درجے میں دوسرے مدرس مولانا عبدالوحید صاحب سنبھلی بھی تھے۔ اس لیے کچھ مولانا ثابت علی کی حق تلفی نمایاں نہ ہوئی، لیکن اپنی علوِ شان، قدامت، جلالت کی وجہ سے امتحان کی رُوحِ رواں خاص طور سے وہی تھے اور بہت ہی اہتمام سے محافظین کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ طلبہ کی نگرانی تو مدرسین حضرات کرتے اور مولانا مرحوم سب سے زیادہ مدرسین کی نگرانی فرماتے۔ ان کی نگرانی کا منظر بھی کاغذ پر لانے کا نہیں، بلکہ کر کے دکھانے کا ہے۔ بڑے غور سے دائیں طرف دیکھ رہے ہیں ایک دم بائیں طرف منہ پھیر لیا۔ لیکن زیادہ نگرانی مولانا مرحوم کی محافظوں پر ہوتی۔ دو (۲) محافظ مدرسین اکابر میں سے بھی اگر اس موقعہ پر ایک دوسرے سے مختصری بات کرتے تو مولانا مرحوم جن کے کلام میں بہت عجلت تھی اور بہت جلدی بولا کرتے تھے، وہیں ڈانٹ دیتے تھے اور مولانا عبدالوحید صاحب کے علاوہ سارے ہی مدرسین مولانا کے شاگرد تھے۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تو امتحان گاہ میں ہوتے نہ تھے۔ مولانا مرحوم جلدی جلدی فرماتے ''میاں صاحب، میاں صاحب، میاں صاحب تم تو بات کرنے لگے وہ اپنا کام کر لیں گے۔'' مجھے تو ان کا زور دکھلانا تھا ورنہ یہ جگہ اس مضمون کی تھی نہیں۔

میں نے حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحب مہتمم مدرسہ نور اللہ مرقدہٗ سے بیلوں جانے کی اجازت مانگی۔ مہتمم صاحب کو اللہ بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے، مجھ پر بچپن ہی سے شفیق تھے، چپکے سے اجازت دے دی اور یہ کہا کہ ''چپکے سے چلا جا، مولوی ثابت نہ دیکھیں۔'' میں بہت ہی آہستگی سے اُٹھا، مگر مولانا ثابت علی صاحب نے نہ جانے کہاں سے دیکھ لیا، حادثہ کی خبر ان کو بھی ہو چکی تھی۔ میرے اور میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے تعلق کی بنا پر ان کو شبہ ہوا کہ یہ جا تو نہیں رہا، ایک دم شور مچا دیا ''یہ کہاں جا رہا ہے، یہ کہاں جا رہا ہے؟'' اور میں دارالطلبہ قدیم کے زینے تک تو ذرا تیز قدموں سے چلا اور زینے پر سے اس زور سے بھاگا ہوں کہ کچھ انتہا نہ رہی کبھی کوئی

آدمی پکڑ کر واپس نہ لے جائے۔ مہتمم صاحب نے شروع میں تو ادھر سے منہ پھیر لیا، امتحان کا بالکل افتتاح ہو رہا تھا، سوالات کے پرچے بٹ رہے تھے، مہتمم صاحب عمداً اس طرف مشغول ہو گئے اور مولانا مرحوم شور مچاتے رہے اور میرے ساتھ کوئی پیسہ نہیں تھا، مگر پھر بھی گھر اس واسطے نہ گیا کہ کبھی مولانا ثابت علی صاحب کا قاصد پکڑ نہ لے جائے۔ اس نیت سے چلا تھا کہ کہیں تو کوئی واقف ملے گا ہی، چار پانچ آنے کی سواری بہٹ تک تانگے کی تھی، موٹریں نہیں چلی تھیں، تانگے بھی صرف بہٹ تک آتے تھے۔ اڈے پر پہنچ کر ایک صاحب مل گئے ان سے چار آنے ادھار لیے اور مولانا ثابت علی صاحب کے ڈر کے مارے یَا رَبِّ سَلِّمْ سَلِّم کہتا ہوا حدودِ سہارنپور سے نکل گیا، جب جان میں جان آئی۔ بہٹ سے پیلوں آ رہا تھا کہ ادھر سے جنازہ آتا ہوا نظر آیا راستے ہی سے جنازہ کے ہمراہ رائپور پہنچ گیا، نماز میرے حضرت قدس سرہٗ نے پڑھائی تھی۔ تدفین کے بعد مولانا ثابت علی صاحب کے ڈر کے مارے اسی وقت الٹے پاؤں بہٹ آیا، وہاں تو واقف بہت مل گئے تھے، پیسے بہت سے ادھار لے لیے تھے، نہ معلوم سواری پوری ملے یا ناقص، رات میں سہارنپور پہنچ گیا۔ حضرت اگلے دن تشریف لائے۔

تیسرا حادثہ انتقال حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ:

(۳)...... اس کے بعد حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کا حادثۂ وصال دیکھا اور مالک کی قدرت کا عجیب کرشمہ دیکھا۔ یہ سیہ کار کہ جس کو حاضری کی بہت ہی کم توفیق ہوتی تھی تجہیز و تکفین میں شریک اور میرے آقا میرے سردار حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ جو سفر و حضر کے رفیق، مالٹا میں بھی ساتھ نہ چھوڑا ایک دن پہلے جدا ہو گئے اور تجہیز و تکفین اور تدفین میں بھی شریک نہ ہو سکے، بڑی عبرت کا قصہ ہے:

امروہہ میں شیعہ سنی مناظرہ طے ہو چکا تھا، کئی مہینے پہلے سے اعلان اشہار وغیرہ شائع ہو رہے تھے، اخبارات میں زور و شور تھا۔ سہارنپور سے میرے حضرت قدس سرہٗ پہنچ گئے اور لکھنؤ سے مولانا عبدالشکور صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ دونوں اس نوع کے مناظرہ کے امام، شہرۂ آفاق، اہل تشیع جواب تو بہت ہی زوروں پر تھے۔ ان دونوں حضرات کے پہنچنے پر اس کوشش میں لگ گئے کہ مناظرہ ہرگز نہ ہو اور التواء بھی سنّیوں کی طرف سے ہو اس لیے انہوں نے مولوی محمد علی جوہر مرحوم کو آدمی بھیج کر دہلی سے بلایا اور مرحوم نے مناظرہ کے خلاف آپس کے اتحاد پر مجامع میں اور مجالس میں ۲۴ گھنٹے تک وہ زور باندھے کہ حد نہیں۔ میں نے مرحوم کو عمر بھر میں اسی وقت دیکھا نہ اس سے پہلے دیکھا نہ بعد میں دیکھنا یاد ہے۔ میں نے مرحوم سے کہا کہ مجھے آپ سے ملنے کا عرصہ سے اشتیاق تھا، میرا

خیال یہ تھا کہ وہ شاید ایک دومنٹ میرے اشتیاق پر دیں اگرچہ مجھ سے واقفیت نہیں تھی۔ مگر وہ میرے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا عبدالشکور صاحب کے اقدام پر بہت ہی ناراض ہو رہے تھے اس لیے انہوں نے سخت ناراض ہو کر یہ کہا کہ اس سے نمٹ لوں پھر ملوں گا۔ سارے دن یہ ہنگامہ رہا۔ دوسرے دن ۷ اربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو علی الصباح میرے حضرت قدس سرۂ نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام بہت مختصر پرچہ اس مضمون کا لکھوایا صورت حال یہ ہے اور سنیوں کی طرف سے اس وقت التواء ہرگز مناسب نہیں آپ میرے نام ایک خط جلدی بھیج دیں کہ ''مناظرہ جاری رکھا جائے'' یا ''مناظرہ ملتوی نہ کیا جائے۔'' بہت مختصر پرچہ میں لے کر امروہہ سے دہلی روانہ ہوا۔ جب میں اسٹیشن پر پہنچا تو دو چار آدمی ملے مصافحہ کیا، میں نے ان سے پوچھا کون؟ کیسے؟ انہوں نے کہا کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرۂ جو اس گاڑی سے کلکتہ جارہے ہیں، ان کی زیارت کے واسطے آئے ہیں۔ میرے پاس نہ کاغذ نہ پنسل۔ ایک کاغذ ردی اسٹیشن سے ڈھونڈا اور ایک کوئلہ اٹھایا اور جو مجھے اسٹیشن پر پہنچانے کے واسطے گیا تھا اس کے ہاتھ کوئلے سے حضرت قدس سرۂ کے نام پرچہ لکھا کہ ''حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرۂ کو وہیں اتار لیں۔'' میں یہ کہہ کر دہلی روانہ ہو گیا۔ میرے حضرت نے گاڑی پر آدمی بھیجا اور حضرت سے اترنے کو فرمایا۔ باوجود اس کے کہ حضرت کا کلکتہ کا ٹکٹ تھا اور سامان سفر ساتھ تھا، میرے حضرت کے حکم پر حضرت مدنی وہیں اتر گئے۔ انقیادِ اکابر میں نے جتنا حضرت مدنی قدس سرۂ میں دیکھا اتنا کم کسی دوسرے میں دیکھا اپنی طبیعت کے جتنے بھی خلاف ہو مگر اپنے بڑوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینا ان ہی کا حصہ تھا اور سارے دن مناظرے کے متعلق زوردار تقریریں فرمائیں، جس میں فریقین کو یہ نصیحت کے یہ زمانہ آپس میں اشتعال کا نہیں ہے، اس وقت میں تو غیر مسلموں سے بھی صلح کرنے کی شدید ضرورت ہے چہ جائیکہ آپس میں لڑائی جھگڑا کیا جائے۔ میں حضرت قدس سرۂ کا گرامی نامہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام لے کر مغرب کے قریب حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی قیام گاہ پر پہنچا تو حضرت شیخ الہند قدس سرۂ پر مرض کا شدید حملہ تھا، پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی، دوسرے دن صبح کو وصال ہو گیا اور دنیا بھر میں تار ٹیلیفون دوڑنے لگے۔ حضرت مدنی قدس سرۂ کے نام کلکتہ اور اس کے قرب و جوار کے چند اسٹیشنوں پر تار دیے گئے، جہاں تک اہل الرائے کی یہ رائے ہوئی کہ صبح کی جس گاڑی میں حضرت مدنی گئے ہیں وہ اس وقت تک کہاں پہنچے گی اس جگہ سے لے کر کلکتہ تک ہر مشہور اسٹیشن پر تار دیا گیا میں نے کہا ایک تار حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کو امروہہ بھی دے دو۔ سب نے مجھے بے وقوف بتلایا اور بعضوں نے یہ سمجھا کہ یہ حضرت سہارنپوری کو تار دلوانا چاہتا ہے، حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام سے۔ ہر شخص نے کہا آخر

امروہہ کا کیا جوڑ؟ میں نے کہا ''احتیاطاً۔'' جناب الحاج مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہٗ اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے باوجودیکہ میں سیاسی حیثیت سے ان کے ساتھ نہیں تھا، ممکن ہے کسی جگہ مولانا مرحوم کا تذکرہ ذرا تفصیل سے آسکے۔ لیکن مفتی صاحب مرحوم کو شفقت بہت تھی اور بہت وقعت سے میری بات قبول فرمایا کرتے تھے، بہت سے سیاسی اور مذہبی مسائل میں اپنی رائے کے خلاف میری رائے کو ان الفاظ سے شائع کیا ہے کہ ''بعض مخلص اہلِ علم کی رائے یہ ہے گو میری رائے نہیں۔'' اس قسم کی کوئی عبارت اس وقت کے وقف بل میں بھی شائع ہوئی ہے جو مفتی صاحب نے لکھا تھا۔ بہت سے وقائع اس قسم کے مفتی صاحب کے ساتھ پیش آئے کہ میری رائے کو انہوں نے اپنی رائے کے خلاف انتہائی تبسم اور خوشی کے لہجے میں بہت اہتمام سے قبول کیا۔ اس موقع پر بھی میرے بار بار اصرار اور لوگوں کے انکار پر تیز لہجے میں فرمایا کہ ''جب یہ بار بار فرما رہے ہیں تو آپ کو ایک تار امروہہ دینے میں کیا مانع ہے؟'' چنانچہ تار دیا گیا، شاید ارجنٹ نہ دیا ہو کہ دینے والوں کی رائے کے خلاف ہو۔ دوسرے دن امروہہ تار پہنچا اور تیسرے دن علی الصباح حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے مکان پر پہنچے۔ یہ ناکارہ اس وقت تک امروہہ روانہ نہیں ہوا تھا بلکہ جا ہی رہا تھا، وہ منظر ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ انتہائی ساکت قدم بالکل نہیں اٹھتا تھا۔ ہر قدم ایسا اٹھ رہا تھا جیسے ابھی گر پڑیں گے۔ مصافحہ بھی ایک آدھ ہی نے کیا، میں نے تو کیا نہیں، ہر شخص اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ مولانا مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کے مردانہ مکان کے سامنے کی سہ دری میں جا کر دو زانو بیٹھ گئے اور چپ۔ دو چار اور حاضرین بھی گھر میں موجود تھے وہ بھی جمع ہو کر مولانا کے پاس بیٹھ گئے اور میں قدرت کا کرشمہ سوچتا رہا کہ جو شخص سفر و حضر میں کسی وقت بھی جدا نہ ہوا ہو، وہ انتقال سے ایک دن بعد قبر پر حاضر ہوا اور جس کو حاضری کی نوبت کبھی نہ آئی ہو وہ دہلی سے لے کر تدفین تک جنازہ کے ساتھ ساتھ رہے۔

عجب نقشِ قدرت نمودار تیرا:

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کی نمازِ جنازہ دہلی میں میرے چچا جان رحمہ اللہ تعالیٰ نے پڑھائی اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے حقیقی بھائی مولانا محمد حسین صاحب نے شرکت نہیں کی تاکہ ولی کو اعادہ کا حق رہے، انہوں نے دیوبند آنے کے بعد پڑھائی۔

ان ہی عجائب قدرت میں اس سیہ کار کی حضرت رائپوری کے جنازہ میں عدم شرکت ہے جس کا ذکر آگے آئے گا اور منشی رحمت علی صاحب جالندھری کے جنازہ میں شرکت، جن کے یہاں زندگی

میں کبھی جانا نہ ہوا اور بھی کئی نظائر اس کے ہیں جن میں اس ناکارہ کی اپنے حضرت قدس سرہٗ کے جنازہ میں عدم شرکت کہ یہ ناکارہ چند ماہ پہلے مدینہ پاک سے مظاہر علوم کی وجہ سے واپس کر دیا گیا تھا، جیسا کہ تفصیل سے نمبر۴ میں آ رہا ہے اور حضرت الحاج حافظ فخر الدین صاحب کے جنازے میں عزیز مولانا یوسف سہارنپور کے اجتماع کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے، حالانکہ حضرت حافظ صاحب نظام الدین کے ہمیشہ کے حاضر باشوں میں سے تھے اور حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری پاکستان سے ہمیشہ سیدھے سہارنپور آنے والے اس مرتبہ دہلی کے راستے سے آئے اور وہاں جنازہ کے اندر ۲۵ شوال کی صبح کو فتح پوری میں شرکت فرمائی۔

چوتھا حادثہ انتقال حضرت کا وصال:

(۴)......اس کے بعد اپنے حضرت مرشدی سیدی ومولائی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا حادثۂ انتقال بھی نمبر۳ ہی کا نمونہ ہے کہ یہ ناکارہ ۳۵ھ سے سفراً حضراً ہر وقت کا حاضر باش، لیکن وصال کے وقت دور کر دیا گیا کہ ذیقعدہ ۴۵ھ میں مدینہ منورہ سے واپسی ہوئی اور ربیع الثانی ۴۶ھ بروز چہارشنبہ جب کہ عرب کی ۱۶ اور ہندوستان کی ۱۵ تاریخ تھی میرے حضرت قدس سرہٗ نے مدینہ پاک میں وصال فرمایا۔ مولانا طیب مغربی صدر مدرس مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ نے مصلی الجنائز میں نماز پڑھائی۔

پانچواں حادثہ انتقال حضرت تھانویؒ:

(۵)......حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا وصال۔ حضرت کی علالت میں حاضری تو اکثر اور بار بار ہوتی رہی۔ ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ سہ شنبہ علی الصباح میں اپنے کمرہ میں تھا، بھائی اکرام نے اوپر پہنچ کر حادثے کی اطلاع کی اور میں اسی حال میں اٹھ کر سب طرف کے کواڑ لگا کر سیدھا اسٹیشن دوڑ گیا، وہاں جا کر معلوم ہوا کہ گاڑی کا وقت بہت ہی قریب ہے بلکہ چھوٹ رہی تھی، ٹکٹ لے کر چلتی گاڑی میں بیٹھ گیا، مدرسہ کے دوسرے احباب اس گاڑی تک نہ پہنچ سکے، معلوم ہوا اہلِ شہر کی کوشش پر چھوٹی لائن کے افسروں نے دو اسپیشل تھانہ بھون کے لیے چند ڈبوں کے منظور کر لیے، پہلا اسپیشل تو تقریباً دو گھنٹے کے بعد پہنچ گیا۔ دوسرا اسپیشل تدفین کے بعد پہنچا۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے عیدگاہ میں جنازہ کی نماز پڑھائی۔ لیکن سکوت کا جو منظر گنگوہ میں دیکھا تھا اور پھر کچھ حصہ اس کا رائپور میں، وہ پھر کہیں نصیب نہ ہوا۔ طبائع کے اضطراب اور بے چینی پر مکمل غلبہ تو گنگوہ میں دیکھا کہ جانور تک بھی نہیں بول رہے تھے، ''لِلّٰہِ مَآ اَخَذَ وَلَهٗ مَآ اَعْطٰی''۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی علالت میں بار بار جانا ہوا۔ وصال سے چند روز قبل چھوٹی اہلیہ

مرحومہ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ پیر و منگل کی درمیانی شب میں ۱۰ بج کر ۴۰ منٹ پر وصال ہوا۔ نور اللہ مرقدہٗ و اعلی اللہ مراتبہٗ وصال سے چند روز پہلے اس دار الحزن والمحن سے طبیعت اکتا گئی تھی، کئی مرتبہ فرمایا: ''یا اللہ! میں اس سنڈ اس میں کب تک پڑا رہوں گا۔''

چھٹا حادثہ انتقال حضرت میرٹھیؒ:

(۶)......ان ہی حوادث میں حضرت میرٹھیؒ نور اللہ مرقدہٗ کا حادثۂ انتقال بھی ہے جس کو میں ارشاد الملوک کی تمہید میں لکھ بھی چکا ہوں کہ یکم شعبان ۱۳۶۰ھ مطابق ۲۵ اگست ۱۹۴۱ء دوشنبہ کی صبح کو ۶ بجے وصال ہوا۔ ۴ بجے شام کو مکان کے قریب ہی اپنے خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ حادثہ کے وقت بھی ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ حضرت اقدس مولانا عبد القادر صاحب رائپوری نور اللہ مرقدہٗ ایک سفر سے سہارنپور واپس تشریف لائے اور اس ناکارہ زکریا سے ارشاد فرمایا کہ حضرت میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ کی شدتِ علالت کی خبریں سنی جارہی ہیں خیال یہ ہے کہ رائپور جانے سے پہلے حضرت میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عیادت کرتا جاؤں بشرطیکہ تو بھی ساتھ ہو۔ میں نے قبول کرلیا اور قرار یہ پایا کہ اتوار کو دیوبند چلیں، شب کو وہاں قیام رہے، پیر کو صبح میرٹھ چلے جاویں، شام کو واپسی ہو جائے منگل کو حضرت رائپور تشریف لے جاویں۔ چنانچہ اتوار کے دن ظہر کے وقت دیوبند حاضری ہوئی اور پیر کی صبح کو حضرت مدنی سے میرٹھ جانے کی اجازت چاہی۔ حضرت نے اپنی عادتِ شریفہ کے موافق اجازت میں تأمل فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ آج عقیقہ ہے، میں ابھی بکرے کٹواتا ہوں، اس کا گوشت کھا کر دس بجے کی گاڑی سے چلے جانا، یہ عقیقہ عزیزم مولوی ارشد سَلَّمَہٗ، کا تھا، مگر نہ معلوم علی الصباح میرٹھ جانے کا فوری تقاضا میری طبیعت پر اور مجھ سے زیادہ حضرت کی طبیعت پر کیوں ہوا؟ اور بہت ہی گرانی اور طبیعت کے تکدر سے حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ سے جانے کی اجازت لی جس کا طبیعت پر دوپہر تک بہت ہی قلق رہا۔ حضرت قدس سرہٗ نے بھی بڑی گرانی سے اجازت دی۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ۶ بجے صبح کو مولانا میرٹھی کا انتقال ہو چکا ہے اور دو تار سہارنپور پہلا حادثے کی اطلاع کا اور دوسرا جنازے کی نماز میں انتظار کا سہارنپور جا چکے ہیں اور حادثے کی اطلاع کا تار دیوبند حضرت مدنی کی خدمت میں روانہ ہو چکا ہے، اس کی وجہ سے جو گرانی، ندامت، کلفت صبح تھی کہ حضرت کی منشاء کے خلاف آنا ہوا وہ جاتی رہی۔ جنازہ اس ناکارہ کے انتظار میں رکھا ہوا تھا، تجہیز و تکفین کے بعد جنازہ کی نماز ہوئی۔ ظہر سے پہلے ہی تدفین ہوگئی اور شام کو حضرتِ اقدس رائپوری نور اللہ مرقدہٗ کی ہمرکابی میں سہارنپور واپسی ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ حضرت میرٹھی نے اس سیہ کار کے لیے نماز جنازہ کی وصیت فرمائی تھی۔

منشی رحمت علی کے انتقال میں بندہ کی شرکت:

(۷)......عجائب قدرت میں اس ناکارہ کا منشی رحمت علی صاحب (جو اعلیٰ حضرت بڑے حضرت رائپوری قدس سرہٗ کے اجل خلفاء میں سے تھے) کے انتقال میں شرکت ہے حالانکہ منشی صاحب کی زندگی میں باوجود اپنی اور ان کی خواہش کے کبھی حاضری نہ ہوئی۔ ان کی شدت علالت کی خبر پر حضرت اقدس مولانا الشیخ الحاج عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے تشریف لے جانے کا ارادہ کیا اور اس سیہ کار کو بھی ہم رکاب چلنے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ دس پندرہ روز پہلے حاضری ہو ہی گئی۔ منشی صاحب رموز واسرار پر بہت کلام فرماتے تھے، تعبیر خواب میں خاص ملکہ تھا۔ شب یک شنبہ ۲۱ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۱ھ میں جالندھر میں بمرض فالج وصال فرمایا۔

آٹھویں حادثہ انتقال حضرت مدنی قدس سرہ اور حضرت کی طویل بیماری:

(۸)......میرے اکابر میں جن حوادث سے اس ناکارہ کو سابقہ پڑا انہی اہم ترین حوادث میں حضرت اقدس مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا حادثۂ وصال ہے، حضرت کی طبیعت ناساز تو آخری رمضان ۷۶ھ میں بانسکنڈی (کچھاڑ) ہی میں ہو گئی تھی کہ حضرت نے یہ رمضان اور اس سے پہلا رمضان بانسکنڈی ہی میں گزارا تھا۔ ۴، رمضان کی شب میں شدت سے بخار ہوا، اس کے باوجود افطار نہیں فرمایا۔ ۲۶ شوال کو واپسی کی اطلاع تھی، علالت کا سلسلہ چلتا رہا ۲۲ شوال کو بیس مرتبہ اسہال ہوا، اس واسطے عین وقت پر التواء ہوا۔ دیوبند کے حضرات بھی استقبال کے لیے سہارنپور تک تشریف لائے اور واپس ہوئے ۲ ذیقعدہ شنبہ کو حضرت قدس سرہٗ تشریف لائے، بندہ اپنی عادت کے موافق اسٹیشن پر حاضر ہوا اور چونکہ حضرت کی طبیعت ناساز تھی اور اس کی اطلاعات سنی جارہی تھیں۔ اس لیے بندہ اپنی عادت کے موافق جو حضرت اقدس رائپوری کے ہر سفر میں پیش آتی تھی لکڑی لے کر اسٹیشن کی مسجد کے اندر کے دروازے پر کھڑا ہو گیا، مسجد مجمع سے لبریز تھی۔ بندہ نے اعلان کیا کہ جو مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے گا لکڑی ہاتھ پر ماروں گا۔ حضرت قدس سرہٗ ضعف کی وجہ سے نہایت ہی آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے تشریف لائے حضرت کی تشریف آوری کے بعد زکریا سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ زکریا نے دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے کہ میں ان لوگوں پر تشدد کر رہا ہوں یہ کیا کہیں گے۔ حضرت نے اس ناکارہ کا ہاتھ کھینچ کر مصافحہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ آج کل کے مولویوں کا یہی کام ہے کہ دوسروں کو منع کرتے ہیں اور خود کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد لاری سے دیوبند تشریف لے گئے اور باوجود علالت کے طویل وعریض اسفار اپنی عالی ہمتی سے فرماتے رہے۔ میری بچی (حکیم الیاس کی اہلیہ) کی علالت کی اطلاع سنی، تو دفعۃً بلا اطلاع بڑی

صاحبزادی سلمہا کے ساتھ ۲۸ ذیقعدہ پنجشنبہ کو بعد مغرب تشریف لائے اور جمعہ کی شام کو واپس تشریف لے گئے۔ اسی حالت میں مدراس، بنگلور، میسور کا طویل دورہ۔ ۱۵ ذی الحجہ کو دیوبند سے بذریعہ کار دہلی اور اگلے دن صبح کو بذریعہ طیارہ دہلی سے شروع ہوا اور

مقدمہ لامع و کوکب و اوجز کی تمہید بقلم حضرت مدنی:

۴ محرم ۷۷ھ کو دہلی بذریعہ طیارہ اور اگلے دن دیوبند پہنچے۔ دورہ تو یہ بہت طویل تھا لیکن علالت کی شدت کی وجہ سے مختصر کرنا پڑا کہ چند قدم چلنے سے اور معمولی تقریر سے تنفس کی شدت ہو جاتی تھی۔ حکیم اسماعیل دہلوی نے مدراس سے واپسی پر بلغم تجویز کیا تھا اور اس کا نسخہ استعمال کیا گیا مگر فائدہ نہ ہوا۔ دیوبند کے ڈاکٹر نے قلب کا پھیلاؤ تجویز کیا اور ضروری قرار دیا کہ سہارنپور کے سول سرجن کو جلد دکھلایا جائے۔ جمعرات ۱۱ محرم ۷۷ھ کو رائپور کا سفر تجویز تھا تو تکرار سفر سے بچنے کے لیے معائنہ بھی اس سفر میں طے ہوا چنانچہ جمعرات کی شام کو ۴ بجے سہارنپور پہنچے اور ہسپتال میں سول سرجن نے ایکسرے اور معائنہ کیا اور دیوبند کے ڈاکٹر کی موافقت کی۔ اس کے بعد رائپور تشریف لے گئے، رات کو ساڑھے دس بجے رائپور پہنچے۔ حضرت رائپوری سو چکے تھے مگر کسی نے اطلاع کر دی، صبح کو عین واپسی کے وقت بھائی الطاف کے معمولی اصرار پر قیام فرمایا اور زکریا سے فرمایا کہ مجھے ''مقدمۂ لامع'' کی تاخیر سے بہت ندامت ہو رہی ہے۔ اس ناکارہ کی ''اوجز'' اور ''لامع'' اور ''کوکب'' کے مقدمہ کی تمہید تینوں حضرت اقدس سرہٗ کے دست مبارک سے لکھی ہوئی ہے یہ مقدمہ حضرت کے پاس چند ماہ سے رکھا ہوا تھا، مگر لکھنے کا موقع نہیں مل سکا، اس پر حضرت نے فرمایا تھا اور فرمایا کہ دیوبند سے طے کر کے آیا تھا کہ بہٹ یا سہارنپور میں لکھوں گا۔ آزاد صاحب کے کمرے میں ۱۱ بجے تک لکھا اور پھر جمعہ کی نماز مسجد باغ میں پڑھ کر عصر تک پھر لکھا۔ مگر ضعف کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ بعد مغرب چل کر شب بہٹ میں گزاری۔ صبح شنبہ کو وہاں سے چل کر سہارنپور ڈاکٹر برکت علی کو کچے گھر میں دکھایا گیا اور شام کو ۵ بجے دیوبند تشریف لے گئے۔ اس دوران میں یاد ہے دورے پڑتے رہے اور ڈاکٹر برکت علی صاحب دوسرے تیسرے دن جاتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کو بہت اہتمام تھا کہ وہ جب جاویں اس ناکارہ کو بھی ساتھ لیتے جاویں اور عزیز مولانا اسعد سلمہ کے قاصد بھی اکثر ناکارہ کے پاس آتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر آجاؤ۔ ۱۹ صفر سے حضرت پر نظر کا اثر زیادہ محسوس ہوا کہ ہر کھانے پینے کی چیز سے امتلاء سحر کا اثر تو تقریباً سال بھر سے محسوس کیا جا رہا تھا اور اس کے ازالے کی تدابیر بھی ہو رہی تھیں۔ قلبی دورے کے بار بار اعادہ کی وجہ سے یکم ربیع الاول پنجشنبہ کو ڈاکٹر برکت علی مرحوم کے اصرار پر یہ تجویز ہوا کہ دہلی میں قلبی امراض کے ماہر ڈاکٹر کے شفاخانے میں داخلہ کیا جائے۔ مولوی اسعد سلمہ نے دہلی ٹیلیفون

کے ذریعے سے جمعیۃ کے وساطت سے سارے انتظامات مکمل کر لیے اور اتوار کی صبح کو بذریعہ کار جانا بھی طے ہوگیا۔ لیکن جمعہ کی شام کو حکیم عبدالجلیل صاحب نے آ کر عزیز مولوی اسعد سلمہ سے با اصرار دہلی کا سفر ملتوی کرایا کہ حضرت میں سفر کا تحمل بالکل نہیں ڈاکٹر برکت علی نے سفر سے پہلے اور سفر کے دوران کی دوائیں بھی دے دی تھیں لیکن عدم تحمل کی وجہ سے اور سب لوگوں کے مشورہ کی وجہ سے ۴ ربیع الاول سے پھر حکیم عبدالجلیل کا علاج شروع ہوگیا اور دہلی سے عبدالحمید صاحب اور بریلی سے حکیم محمد صدیق صاحب کو بلانے کے تار دیے گئے مگر حکیم عبدالحمید صاحب پاکستان جارہے تھے، البتہ حکیم محمد صدیق صاحب پہنچ گئے۔ ربیع الثانی کے آخری ہفتے میں تنفس کی شکایت شدت سے بڑھ گئی۔ باوجود نیند کے غلبہ کے جس کروٹ بھی لیٹتے تنفس کا غلبہ بہت شدت سے ہوجاتا۔ یکم جمادی الاول سے استفراغ کا غلبہ ہوگیا۔ ہر دوا، غذا قے میں نکل جاتی۔ ۲ جمادی الاول دوشنبہ کو پھر ڈاکٹر برکت علی صاحب کو لے کر زکریا حاضر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے مایوسی کا اظہار زکریا سے کیا اور نسخہ بھی تجویز کیا۔ حضرت قدس سرہ سے زکریا نے تخلیہ میں کہا کہ مولوی حمید الدین صاحب کا کلکتہ سے خط آیا ہے کہ پہلا اثر سحر کا تو زائل ہوگیا، لیکن ساحر نے دوبارہ شدید ترین سحر کیا ہے۔ ۷ جمادی الاول شنبہ کو صبح کی نماز کی ایک رکعت پڑھنے کے بعد زنانہ مکان میں چوکی سے چکر آنے کی وجہ سے گر گئے۔ حضرت نے فرمایا کہ عمر بھر میں کبھی دورانِ سر نہیں ہوا۔ اتوار کی صبح کو زکریا ڈاکٹر برکت علی صاحب کو لے کر گیا اور اتوار کے دن سے صحت کی خبریں جمعرات تک آتی رہیں حضرت قدس سرہ نے یہ بھی فرمایا کہ محمود کا خط شدید تقاضے کا آیا تھا کہ اگر تو منظور کرے تو میں ہوائی جہاز لے کر دہلی پہنچ جاؤں اور آپ کو میں مع اہل وعیال لے آؤں، دونوں حکومتوں سے میں خود نمٹ لوں گا۔ حضرت نے زکریا سے فرمایا کہ ایک دن تیرا انتظار بھی کیا کہ مشورہ سے جواب لکھوں، مگر محمود کے انتظار کی وجہ سے میں نے لکھ دیا کہ جو دینی وعلمی خدمت یہاں کر سکتا ہوں وہاں نہیں ہوسکتی۔ زکریا نے عرض کیا ''حضرت بالکل سچ فرمایا۔''

جمعرات تک روزانہ صحت کے اضافے کی خبریں آتی رہیں۔ ۱۲ جمادی الاول ۷۷ھ مطابق ۵ دسمبر ۵۷ء جمعرات کے دن زکریا دارالحدیث میں بخاری کا سبق پڑھا رہا تھا کہ عبداللہ مؤذن نے جا کر کہا کہ حضرت مدنی کا انتقال ہوگیا۔ محمود علی خاں کے ہاں ٹیلیفون آیا ہے۔ زکریا وہاں سے اٹھ کر سیدھا ریل پر پہنچ گیا کہ گاڑی کا وقت قریب تھا۔ بعد میں مولانا اسعد سلمہ کی بھیجی ہوئی کار بھی پہنچی مگر زکریا جا چکا تھا۔

جمعرات کی صبح کو عزیزان مولوی اسعد و ارشد سلمہما کو آپس کے اتحاد ومحبت کی نصیحتیں بھی فرمائیں اور دوپہر کو بلا سہارا کمرہ سے صحن میں کھانا کھانے کے لیے تشریف لے گئے تھے اور اہلیہ کو

صبر علی المصائب کی تلقین فرماتے رہے، پون بجے سونے کے لیے لیٹے تھے، ڈھائی بجے تک خلاف معمول نماز کے لیے نہ اٹھنے پر اہلیہ محترمہ دیکھنے گئیں تو برد اطراف پایا، جس پر مولوی اسعد کو آدمی بھیج کر بلایا کہ آج سب بے فکر تھے کہ طبیعت بہت اچھی ہے۔ ڈاکٹر نے آکر کہا کہ تشریف لے گئے۔ ۹ بجے شب کے جنازہ کی نماز کا اعلان ہوا، لیکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا تار مراد آباد سے پہنچا کہ ''ہم روانہ ہوچکے۔'' اُن کے لینے کے لیے روڑکی کار بھیجی گئی کہ سیدھے آجاویں۔ ساڑھے بارہ تک انتظار کے بعد جنازہ کی نماز ہوئی وہ حضرات نماز کے بعد پہنچے۔ ۳ بجے تدفین عمل میں آئی۔ تقریباً تیس ہزار کا مجمع بتلایا جاتا ہے، اعلی اللہ مراتبہ نور اللہ مرقدہٗ۔

نواں حادثہ انتقال حضرت رائپوری مع تفصیل شدید بیماری:

(۹)...... میرے اکابر نور اللہ مراقدہم کے حوادث میں میرے لیے آخری حادثہ سخت ترین حادثہ میرے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب قدس سرہٗ کا حادثہ وصال ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جس کا بیان کسی دوسری جگہ آرہا ہے۔ حضرت قدس سرہ کا معمول بار بار پاکستان تشریف لے جانے کا ہوگیا تھا۔ اس لیے کہ حضرت قدس سرہٗ اوران کے شیخ اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہٗ سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر پاکستان ہی میں تھے۔ خود حضرت قدس سرہٗ کا وطن بھی پاکستان ہے، اس لیے کئی مرتبہ تشریف بری ہوئی، جس کو علی میاں حضرت قدس سرہٗ کی سوانح میں مفصل لکھ چکے ہیں۔

آخری تشریف بری معرکۃ الآراء تھی، اس لیے کہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کو گویا مرض الوصال شروع ہوگیا تھا، جس کی ابتداء ۱۸ اشوال ۷۴ھ مطابق ۱۰ جون ۵۵ء بروز جمعہ منصوری پر ہوچکی تھی۔ دفعۃً بہت طبیعت ناساز ہوئی، صبح کے کھانے میں مچھلی کھائی تھی، جس سے بخار اور سینے میں درد ہوا۔ شنبہ کو زکریا کو بلانے کے لیے آدمی آیا، مگر مجبوری کی وجہ سے اس دن جانا نہ ہوا۔ پیر کی صبح کو اولاً عزیز جلیل کا منصوری سے تقاضے کا خط اور پھر شام تک دو تار بلانے کے آئے۔ منگل کی صبح کو زکریا، قاری سعید مرحوم، میر صاحب، خان صاحب منصوری گئے۔ ۴ بجے شام پہنچے طبیعت اچھی پائی۔ ابتداء سال ہونے کی وجہ سے حضرت کے ارشاد پر بدھ کو واپسی ہوگئی اور ۲ ذیقعدہ کو حافظ عبدالعزیز صاحب و عزیز جلیل منصوری سے واپس آکر لاہور چلے گئے۔ ۱۲ ذی قعدہ یک شنبہ کی صبح کو صوفی عبدالمجید صاحب اپنی کار میں حضرت کو منصوری سے لے کر بہٹ پہنچے اور دوشنبہ کی صبح کو صوفی صاحب تو اپنی کار میں لاہور روانہ ہوگئے اور حضرت کا قیام بہٹ میں گانگروں والی نہر کی کوٹھی پر اس وجہ سے ہوا کہ ڈاکٹر کو وہاں آنے جانے میں سہولت رہے۔ ۱۹ ذیقعدہ یک شنبہ کی صبح کو حضرت کا ایکسرے کے لیے سہارنپور آنا طے تھا۔ لیکن اذان سے پہلے بہٹ سے زکریا کے پاس کار پہنچی کہ ا بجے شب شدید دل کا دورہ پڑا ہے، ڈاکٹر برکت علی کو لے کر فوراً آؤ۔ فوراً اذان کے بعد اپنی صبح کی

جماعت کر کے ڈاکٹر صاحب کو ساتھ لے کر روانگی ہوئی اور مریضوں کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کی صبح ۸ بجے کی لاری سے واپسی ہوئی اور دوشنبہ سے زکریا کا روزانہ کا معمول ابوداؤد شریف کا سبق پڑھا کر سیدھے لاری سے بہٹ جانا اور علی الصباح چائے کے بعد تالیفی مشاغل اور سبق کی وجہ سے واپس آنا۔ ۲۶ ذیقعدہ یک شنبہ کو حضرت ایکسرے کے لیے تشریف لائے اور مدرسہ قدیم میں قاری سعید صاحب کے دارالافتاء میں جو دروازے کے اوپر تھا اب مہمان خانہ بن گیا، ڈاکٹر برکت علی کی رائے سے قیام ہوا کہ ہوادار جگہ ہے۔ منگل کی صبح سے زکریا نے آیاتِ شفا لکھ کر پلانا شروع کی۔ ۵ ذی الحجہ کو ڈاکٹر صاحب نے دوا بالکل بند کر دی کہ مرض کا کوئی اثر نہیں ہے۔ البتہ احتیاط بہت ضروری ہے، حرکت بالکل نہ ہو۔

عید الاضحیٰ کی نماز حضرت قدس سرہٗ نے مدرسہ قدیم کی مسجد میں ساڑھے چھ بجے ادا کی اور دارالطلبہ میں ساڑھے آٹھ بجے ہوئی، مہمانوں کا ہجوم حضرت کی عیادت کے سلسلے میں روز افزوں رہا۔ ۲۴ ذی الحجہ یک شنبہ کی صبح کو حضرت قدس سرہٗ شاہ صاحب کی کار میں سہارنپور تشریف لے گئے اور گویا مرض کا اثر نہیں رہا اور تندرستی ہوگئی، لیکن معمولی عوارض کا سلسلہ چلتا رہا، جس کے لیے ڈاکٹر صاحب سے وقتاً فوقتاً مراجعت کی نوبت آتی رہتی تھی، لیکن اصل مرض قلبی دورے کا اثر ڈاکٹر صاحب کے قول کے موافق بالکل نہیں رہا۔ بدھ یکم شعبان ۷۵ھ کی شب میں صوفی عبدالمجید، ڈاکٹر محمد امیر صاحب، بھائی افضل، حافظ عبدالعزیز صاحب وغیرہ آٹھ نفر ۳ بجے شب کے سہارنپور پہنچے اور صبح کو چائے کے بعد رائے پور حضرت قدس سرہٗ کا رمضان پاکستان گزارنے کی درخواست واصرار لے کر پہنچے اور جمعہ کی شام واپس آ کر لاہور چلے گئے۔ تین دن تک حضرت کا رمضان پاکستان گزارنے پر اصرار رہا، مگر حضرت نے پختہ ارادہ نہیں کیا اور سارے شعبان میں کئی بار پاکستانی وفود آئے اور پاکستان رمضان کرنے پر شدید اصرار کرتے تھے، لیکن بالآخر حضرت نے امسال ماہ مبارک رائے پور گزارنا طے فرمالیا۔ اس سے قبل کئی رمضان پاکستان میں گھوڑا گلی متصل راولپنڈی میں گزارے تھے۔ اس سال حضرت اقدس رائے پوری نے رائے پور میں اور حضرت اقدس مدنی نے ماہ مبارک بانسکنڈی میں گزارا۔

۱۲ صفر ۷۶ھ میں صوفی عبدالمجید صاحب و ڈاکٹر محمد امیر صاحب وغیرہ حضرت قدس سرہٗ کو لینے کے لیے دوبارہ تشریف لائے، مگر ضعف وعلالت کی وجہ سے اس مرتبہ بھی حضرت تشریف نہیں لے گئے۔

شب یکشنبہ ۲۱ ربیع الاول ۷۶ھ کو صوفی جی، بھائی اسلم صاحب، اکرم افضل اپنی اپنی کاروں میں لاہور سے چل کر سہارنپور پہنچے اور دوسرے دن صبح کو مع زکریا، علی میاں، عزیزان یوسف و انعام رائے پور روانہ ہوئے اور دوشنبہ کی صبح کو مع حضرت قدس سرہٗ اپنی نماز پڑھ کر ایسے وقت

سہارنپور پہنچے کہ مدرسہ میں جماعت ہورہی تھی اوراسی وقت کاروں سے لدھیانہ روانہ ہوگئے اور اور۱۰ بجے بخیریت لدھیانہ پہنچ گئے۔ شام کو ۸ بجے مولوی عبدالمنان کا تار لدھیانہ بخیر رسی کا پہنچ گیا۔ وہاں نے منگل کو چل کر ۱۰ بجے لاہور پہنچ گئے۔ جلیل کا تار بخیر رسی کا آیا۔ ۳ ماہ لاہور کے قیام کے بعد ۲ فروری ۷۵ھ کو لائل پور تشریف لے گئے۔ ۳ شوال ۷۶ھ کا دیا ہوا تار صوفی جی کا پہنچا کہ حضرت خیریت سے ہیں۔ آج لائل پور سے لاہور واپس آگئے اور روزانہ تار، ٹیلیفون سے حضرت کی سہارنپور کی ناسخ ومنسوخی کی خبریں آتی رہیں۔ ۱۱ شوال کو بذریعہ کار لدھیانہ پہنچے۔ وہاں سے ٹیلیفون ملانے پر جواب ملا کہ ”کل صبح کو واپسی ہے اور زکریا کو ساتھ لے کر سیدھے رائے پور جانا ہے۔“ چنانچہ ۱۲ شوال کی صبح کو ۵ بجے لدھیانہ سے چل کر ۱۰ بجے سہارنپور اور زکریا کو ساتھ لے کر ۱۲ بجے رائے پور پہنچ گئے۔ علالت کا سلسلہ تو کم وبیش چل ہی رہا تھا، عزیزان مولوی یوسف وغیرہ کو علالت کی خبر پہنچی تو وہ یکشنبہ یکم ذی الحجہ کی شب میں دلی سے آکر علی الصباح مع زکریا رائے پور حاضر ہوئے اور بدھ کی صبح کو رائے پور سے واپس آکر دہلوی حضرات واپس گئے۔

۲۰ ذی الحجہ کی شب میں حضرت پر پھر قلبی دورہ پڑا، ایک گھنٹہ تنفس بھی خراب رہا۔ ۳ محرم کو علی میاں بھی حضرت کے دورے کی خبر سن کر لکھنؤ سے آئے اور علی الصباح رائے پور جا کر پانچ دن میں واپس ہوئے۔

۱۴ ربیع الاول ۷۷ھ کو حضرت رائے پوری کا پیام پہنچا کہ ”تمہاری برکت سے بتیس (۳۲) سال کے بعد آج سے مرچ کھانی شروع کردیں، مرچ کی طرف خود بخود رغبت پیدا ہوگئی۔“ یہ غالباً کسی مرض ہی کا اثر ہوگا ورنہ حضرت قدس سرہٗ تو مرچ بالکل نہیں کھا سکتے تھے اور یہ اثر بھی کچھ ہی دنوں رہا پھر جاتا رہا۔

۸ ربیع الثانی ۷۷ھ یوم جمعہ کو چودھری عبدالمجید صاحب اور بھائی کے برادرِ بزرگ بھائی اسلم صاحب پہنچے، تاکہ حضرت قدس سرہٗ کو پاکستان لے جانے پر اصرار بھی کریں اور تاریخ کی تعیین بھی کرائیں۔ دوسرے دن بھائی اکرام رائے پور گئے تو حضرت قدس سرہٗ نے ان سے فرمایا کہ ”سفر کی بالکل ہمت نہیں مگر یہ بے حد اصرار کر رہے ہیں، یہ جرأت اللہ جل شانہٗ نے شیخ الحدیث ہی کو دی ہے کہ سختی سے انکار کرکے اس پر جم جائیں، ان دونوں کو راضی کرلو کہ اس وقت تو معاف کردو۔“ چنانچہ سب کے زور دینے سے چند ماہ کا التواء ہوگیا اور ایک صاحب سے فرمایا کہ ”جتنی محبت یہ پاکستان والے کرتے ہیں اگر تم ان سے آدھی بھی کرلو تو میں کیوں مارا مارا پھروں۔“ پیر کو التواء کا تار لاہور دے دیا گیا، لیکن منگل کو مولوی عبدالمنان کا پاسپورٹ تیار ہوکر دہلی سے آگیا۔ بدھ کو پھر سفر طے ہوگیا۔ یہ مراحل ہمیشہ حضرت قدس سرہٗ کے ہر سفر میں پیش آتے، چاہے ہند سے پاک کا

ہو یا پاک سے ہند کا۔ تار مہینوں چلتے رہتے تھے۔

۲۸ ربیع الاول پنجشنبہ کی صبح کو صوفی جی کار سے لے کر پہنچ گئے۔ زکریا بھی رائے پور ساتھ گیا۔ بعد نماز جمعہ حضرت قدس سرہٗ کی ہمرکابی میں رائے پور سے چل کر آدھ گھنٹہ میں سہارنپور اور تقریباً آدھ گھنٹہ میں دیوبند حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عیادت کو پہنچ گئے۔ دیوبند قیام کے بعد شام ہی کو واپسی ہوگئی اور شنبہ کے دن دوپہر کو اپنی ظہر پڑھ کر لدھیانہ کے لیے روانہ ہوگئے اور دوسرے دن علی الصباح ۳ ربیع الثانی ۷۷ھ مطابق ۲۴ نومبر ۵۷ء کو لاہور پہنچ گئے ۲۳ فروری تک لاہور میں قیام رہا۔ ۲۴ فروری کی صبح کو لائلپور تشریف لے گئے اور یکم مارچ کو پھر لاہور تشریف لے آئے، تاکہ فوراً ہی ہندوستان روانہ ہو جائیں۔ مگر وہاں آنے کے بعد پھر اصرار شروع ہوئے۔ ناسخ منسوخ کی تاریخیں روزنامچہ ہیں، حالانکہ نومبر میں روانگی کے وقت نہایت مؤکد مواثیق اور مواعید اہلِ پاکستان سے طے ہوگئے تھے کہ اس سال کا رمضان رائے پور گزارنا ہے، مگر ناسخ منسوخ ہوتے ہوتے رمضان ۷۷ھ بھی پاکستان صوفی جی (صوفی عبدالمجید صاحب مرحوم) کی کوٹھی پر گزارا۔ ۷ شوال کو دو دن کی لگاتار کوشش کے بعد ٹیلیفون ملا۔ جس پر بھائی عبدالوہاب متھلوی نے جواب دیا کہ جلیل لائلپور گیا ہوا ہے، ڈاکٹر یوسف علی صاحب ماہر قلب نے بہت غور سے حضرت کا معائنہ کرنے کے بعد چھ ہفتہ مکمل آرام اور سفر نہ کرنے پر اصرار کیا کہ قلبی حالت قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ ۱۱ ذیقعدہ کی شب میں ہمارے مدرسہ کے نائب مہتمم تعلیمات مولانا عبدالمجید صاحب جو بکارِ مدرسہ لائل پور گئے ہوئے تھے حضرت قدس سرہٗ کا شدید تقاضا بنام زکریا کہ عطاء الرحمٰن اور شاہ مسعود کو میرے لینے کے لیے جلدی بھیج دو۔ شاہ مسعود صاحب چند روز کے بعد چلے گئے۔ ۲۵ ذیقعدہ کو برادران اکرام، محمود لاہور سے واپس آئے، معلوم ہوا کہ حضرت نے شاہ صاحب کو یہ کہہ کر باصرار روک لیا کہ تم چلے گئے تو میری واپسی میں بڑی تاخیر ہو جائے گی۔ ۱۴ ذی الحجہ مطابق ۲ جولائی کو بہت مشکل سے میر آل علی صاحب نے ٹیلیفون ملایا۔ جواب ملا کہ حضرت کی طبیعت آہستہ آہستہ صحت کی طرف ترقی کر رہی ہے، ابھی روانگی کچھ طے نہیں ہے۔ اس کے بعد کئی دفعہ تاریخیں تجویز ہوئیں اور تخلیوں کے بعد التواء ہوتا رہا۔

بالآخر ۲۳ ربیع الاول ۷۸ھ مطابق ۱۸ اکتوبر ۵۸ء کو حضرت اقدس رحمہ اللہ تعالیٰ مع صوفی جی وغیرہ فرنٹیر میل سے چل کر رات کو ۳ بجے سہارنپور پہنچے، شاہ صاحب کے مکان پر قیام فرمایا اور مسلسل قیام بہٹ ہاؤس رہا۔ زکریا کا معمول حدیث کا سبق پڑھا کر سیدھا بہٹ ہاؤس جا کر عشاء کے ایک گھنٹہ بعد واپسی کا رہا اور چونکہ حضرت قدس سرہٗ کا رمضان بھی اس سال بہٹ ہاؤس ہوا۔ اس لیے زکریا کا بعد عصر کا اسماع بھی نہیں ہو سکا۔ قبل عصر جا کر عصر بھی حضرت کے ساتھ پڑھتا اور

تراویح شاہ مسعود کے پیچھے پڑھ کر دس بجے واپسی ہوتی۔
حضرت قدس سرہٗ شروع کے دو ایک دن بیٹھ کر پھر ڈاکٹر کے منع کرنے پر لیٹ کر اور اس کے کچھ دنوں بعد بغیر تراویح کے لیٹے لیٹے سنتے رہے۔ ڈاکٹر برکت علی صاحب کا علاج اہتمام سے ہوتا رہا۔ روزوں کی ممانعت تھی، اس سال عید الاضحیٰ کی نماز بھی حضرت قدس سرہٗ نے بہت ہاؤس ہی میں پڑھی۔ پاکستانی احباب کی بہت کثرت سے آمد اور تقاضے ہوتے رہے۔ بالآخر ابراہیم پہلوان لائلپوری نے حضرت سے بات کر کے ٹکٹ خرید لیے اور حضرت قدس سرہٗ مع خدام ۲۸ ربیع الاول ۷۹ھ مطابق ۳ ۱ اکتوبر ۵۹ء فرنٹیر میل سے شب میں ۲ بجے روانہ ہوگئے اور اگلے دن شام کو صوفی جی کا تار لاہور بخیر رسی پہنچ گیا۔ اس دوران میں لاہور اور لائلپور والوں میں خوب رسہ کشی ہوئی اور دونوں میں سخت کلامیاں بھی ہوئیں جن کی تفصیل تو غالباً حضرت اقدس رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح میں علی میاں لکھ چکے ہوں گے، اس وقت تو کچھ یاد نہیں، لیکن یہ رمضان حضرت قدس سرہٗ کا لائلپور میں ہوا۔ ۴ شوال کو حسب قرارداد صوفی جی وغیرہ لاہور سے کاریں لے کر گئے، سامان بھی رکھا گیا۔ پانچ سو (۵۰۰) کے قریب حضرات نے مصافحہ بھی کر لیا۔ لیکن لائلپور والے سول سرجن کی تحریر لے آئے کہ تین ماہ ہرگز سفر مناسب نہیں، اندراج کٹوا دیا گیا، سفر ملتوی ہوا اور چونکہ یہ حربہ پاکستانی احباب ہمیشہ حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ کیا کرتے تھے، اس لیے ایک دوسرے کی تجاویز کو خوب سمجھتا تھا۔ لاہور کی واپسی ملتوی ہوگئی، بالآخر ایک سال سترہ یوم کے بعد ۲۵ ربیع الثانی ۸۰ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۶۰ء کو شب دوشنبہ میں فرنٹیر سے حضرت واپس تشریف لائے اور "بہٹ ہاؤس" میں قیام رہا۔ حضرت قدس سرہٗ کا رائے پور تشریف لے جانے کا بہت ہی تقاضا رہا، مگر مولوی عبدالمنان صاحب شدت سے علاج کی سہولت کی وجہ سے مخالفت کرتے رہے، لیکن افسوس کہ ڈاکٹر برکت علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جو حضرت کا بہت ہی اہتمام سے علاج کرتے تھے اور باوجود خود قلبی مریض ہونے کے روزانہ حضرت کو دیکھنے آتے تھے، اُن پر ۹ شعبان ۸۰ھ شب جمعہ میں قلبی دورہ پڑا اور فوراً ساڑھے گیارہ بجے انتقال فرما گئے اور جمعہ کے دن بعد نمازِ جمعہ حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے بہٹ ہاؤس میں نمازِ جنازہ ہوئی اور حاجی شاہ میں تدفین ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد سے ان کے جانشین ڈاکٹر فرحت علی صاحب نے بھی حضرت کے علاج میں بہت ہی اہتمام فرمایا۔ جزاہم اللہ اور جب ڈاکٹر برکت علی صاحب کا انتقال ہوگیا اور یہ عذر بھی نہ رہا تو بالآخر ۲۵ شعبان ۸۰ھ دوشنبہ کو رائے پور کو روانگی ہوئی۔ زکریا بھی ہم رکاب تھا۔ یہ رمضان رائے پور میں گزرا۔
ربیع الثانی ۸۱ھ میں صوفی صاحب کے تار حضرت کو لے جانے کے لیے بار بار آتے رہے اور حضرت قدس سرہٗ کی طرف سے سفر کی ہمت نہ ہونے کی وجہ سے التواء کے تار بکثرت جاتے رہے،

جن کو ان حضرات نے خدام کی طرف سے سمجھا، اس لیے ۹ جمادی الاول جمعہ کو صوفی جی مع بھائی اکرام صاحب بذریعہ کار سہارنپور اور شنبہ کو رائے پور پہنچے، زکریا بھی ساتھ تھا، ان حضرات نے بار بار حضرت قدس سرہٗ سے تشریف لے چلنے کی درخواست کی، حضرت معذرت فرماتے رہے۔ ان حضرات نے مشورہ میں یہ طے کیا کہ جب زکریا واپس ہو جائے پھر اصرار کیا جائے۔ زکریا نے بدھ کے روز واپسی کی اجازت چاہی۔ حضرت قدس سرہٗ نے یہ فرما کر کہ اتنے مشکلوں اور تقاضوں سے تو تم کو بلایا ہے، اجازت سے انکار کر دیا۔ لیکن جمعرات کے دن بخاری شریف کے زیادہ باقی رہنے کے عذر کی وجہ سے اجازت ملی، مگر گرانی سے۔ اس لیے کہ زکریا ہر ہفتہ، جمعہ کی نماز کے بعد جا کر اتوار کی صبح کو واپس آتا رہا اور بخاری شریف کے ختم پر ۴ ارجب شنبہ کی صبح کو ایک ہفتہ کی نیت سے حاضر ہوا۔ حضرت قدس سرہٗ بہت ہی خوش ہوئے، لیکن جب پنجشنبہ کو واپسی کی اجازت چاہی تو تکدر سے فرمایا کہ ''شیخ الحدیث ہو کر دھوکہ دیتے ہو ایک ہفتہ کہاں ہوا؟'' لیکن جمعہ اور بعض مجبوریوں کی وجہ سے جمعہ کی صبح کو واپسی ہوگئی اور حسب سابق جمعہ کو جا کر اتوار کی صبح کو واپسی ہوتی رہی۔ ماہِ مبارک کے متعلق یہ تجویز کیا کہ نصف سہارنپور گزرے اور نصف رائے پور۔ چنانچہ ۱۵ رمضان کو رائے پور کا ارادہ تھا مگر مولانا یوسف صاحب کی آمد کے انتظار میں ۱۷، کو قبل عصر ان کی آمد ہوئی اور اسی وقت ان کی گاڑی میں روانہ ہو کر افطار حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ ہوا۔ مولانا یوسف صاحب تو دوسرے دن واپس آگئے اور زکریا مستقل ٹھہر گیا۔ البتہ ایک دو دن کے لیے درمیان میں بعض ضرورتوں کی وجہ سے آنا ہوا۔ اس کے بعد یکم شوال ۸۱ھ پنجشنبہ ساڑھے سات بجے عید کی نماز حضرت کی معیت میں باغ کی مسجد میں آزاد صاحب کی اقتداء میں پڑھ کر فوراً سہارنپور واپسی ہوگئی، یہاں عید کی نماز اس وقت تک نہیں ہوئی تھی۔

چونکہ حضرت کا سفر پاکستان طے شدہ تھا، اس لیے زکریا کی بار بار آمد ہوتی تھی اور ہر مرتبہ جا کر آنا بہت مشکل ہوتا تھا کہ حضرت کو گرانی ہوتی تھی۔ ۵ شوال کو رائے پور کی حاضری پر حضرت قدس سرہٗ کی غیبت میں حافظ عبدالعزیز صاحب سے طویل گفتگو کے بعد زکریا نے حضرت قدس سرہٗ کی غیبت میں حافظ صاحب کے مستقل رائے پور میں قیام کا اعلان کیا۔ علی میاں نے حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی سوانح میں بھی صفحہ ۲۰۴ پر مختصراً اس قصہ کو لکھا ہے۔ ۳۰ شوال کو واپسی کی درخواست پر مصافحہ کرتے وقت حضرت قدس سرہٗ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اس لیے واپسی ملتوی کر دیا۔ ۳ ذیقعدہ کو واپسی ہوئی، چونکہ مدرسہ کا ابتدائے سال تھا، تقسیم اسباق وغیرہ امور میں مدرسہ کو بھی زکریا کی ضرورت پیش آتی رہتی تھی۔

اس کے بعد چونکہ حضرت کا سفر طے ہو چکا تھا اور جنرل شاہ نواز نے اپنے اسپیشل میں لے جانا

طے کیا تھا اور ہر جگہ تار بھی روانہ ہو گئے تھے کہ وزیر صاحب کا اسپیشل فلاں وقت پہنچے گا، لیکن چار پانچ دن پہلے مردوں اور عورتوں کا اتنا ہجوم ہوا کہ حد نہیں۔ جس کی وجہ سے حضرت قدس سرہٗ کا بلڈ پریشر ایک دو (۲) دن قبل دو سو دس (۲۱۰) تک پہنچ گیا، ڈاکٹر فرحت علی صاحب نے بہت شدت سے سفر کے خلاف فیصلہ دیا اور سب جگہ التواء کے تار دے دیے گئے۔ جنرل شاہ نواز نے جواہر لال کی ایک ضروری تجویز کو بھی یہ کہہ کر تعمیل سے معذرت کر دی تھی کہ اس تاریخ میں مجھے حضرت کو بورڈ پر پہنچانا ہے۔ التواء کے بعد جنرل صاحب رائے پور پہنچے اور یہ درخواست کی کہ "آئندہ جب ارادہ ہو دو تین دن پہلے تار سے اطلاع کر دیں۔" مگر حضرت قدس سرہٗ کا سفر روزانہ ناسخ منسوخ ہوتا رہا اور ۲۵ ذیقعدہ ۸۱ھ مطابق یکم مئی ۶۲ء شب منگل میں فرنٹیر سے روانگی ہوئی اور یہ حضرت قدس سرہٗ کی پاکستان کو آخری روانگی ہے کہ پھر واپسی نہ ہو سکی۔

روانگی سے پہلے حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے بہت لجاجت، خوشامد، منت و سماجت سے ایک مجلس میں جس میں یہ ناکارہ بھی حاضر تھا، صوفی عبدالمجید صاحب اور بعض خصوصی احباب پاکستان جناب الحاج مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب، حضرت کے برادر زادے مولوی عبدالجلیل اور ان کے دوسرے عزیز مولوی عبدالوحید وغیرہ موجود تھے، یہ درخواست پیش کی کہ "مجھے پاکستان میں نہ روکا جائے اور میری رائے پور واپسی میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے کہ میری تمنا اپنے حضرت کے قدموں میں دفن ہونے کی ہے۔ اس سے جانے کو دل نہیں چاہتا، مگر تم دوستوں کے اصرار پر جا رہا ہوں۔" میرے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا تھا کہ "زندگی بھر تو ساتھ ہی رہے تمنا یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی ساتھ ہی رہیں، مگر ہوتا ہے وہ جو اللہ چاہے۔"

حضرت کی وصیت خواہش دفن کے بارے میں:

اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کا یہ مقولہ پہلے بھی حضرت نے بار بار دُہرایا، صحت کے زمانے میں بھی کئی دفعہ دُہرایا۔ صحت کے زمانے میں اس ناکارہ نے ایک دفعہ اس "مگر" پر اشکال بھی کیا تھا اور حضرت بالکل ساکت و صامت رہے اور جب بھی حضرت کا مقولہ نقل کرتے، میں اس مگر میں گم ہو جاتا۔

بہر حال آخری پاکستان روانگی سے دو دن پہلے حضرات بالا کو اہتمام سے جمع کر کے اپنی تمنا اور خواہش ظاہر کی اور خاص طور سے عبدالجلیل کو مخاطب کر کے وعدہ لیا کہ مانع نہیں بنے گا اور حضرت حافظ عبدالعزیز صاحب لانے کے ذمے دار بنائے گئے اور صوفی عبدالمجید صاحب بھیجنے کے ذمے دار اور کئی کئی مرتبہ قول و قرار ہوئے اور جب وہاں پہنچنے کے بعد طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو بار بار ہندوستان راؤ عطاء الرحمٰن اور شاہ صاحب کو تقاضے کے خطوط بھی لکھوائے، جن میں سے تیس (۳۰)

چالیس (۴۰) تو میرے واسطے سے ہوں گے کہ ''اگر مجھے لے جانا چاہتے ہو تو جلد آ کر لے جاؤ آخری وقت ہے۔'' میں ہر خط کی شاہ صاحب کو اطلاع دیتا رہا کہ ان کا قیام سہارنپور ہی میں تھا اور راؤ عطاالرحمٰن کو رائے پور پیام بھیجتا رہا۔ مگر یہ لوگ کچھ حضرت کی زندگی کی طرف سے ایسے مطمئن تھے کہ ان کو اس کا واہمہ بھی نہ تھا کہ وقت موعود جلدی آتا جا رہا ہے۔ عالی جناب الحاج نجم الدین صاحب مدراس بوٹ ہاؤس والے حضرت قدس سرہٗ کو لینے کے واسطے پاکستان تشریف لے گئے۔ حضرت نے فرمایا جی تو میرا بھی چاہ رہا ہے، مگر شاہ مسعود اور راؤ عطاالرحمٰن کی آمد پر جانے کا ارادہ ہے۔ یہ لاہور سے سیدھے سہارنپور اور پھر رائے پور حاضر ہوئے۔ لیکن بقول اعلیٰ حضرت کے ''مگر ہوتا وہ ہے جو اللہ چاہتا ہے۔'' شاہ مسعود صاحب تو ارادہ ہی فرماتے رہے، راؤ عطاالرحمٰن اس ناکارہ کے شدید اصرار پر شدتِ علالت نے مایوسی کی حالت تک پہنچا دیا تھا اور ایک ایک دن میں مختلف احباب کے تین چار تار زکریا کے نام صبح سے شام تک آتے کہ افاقہ ہے، خطرناک ہے، افاقہ ہے، خطرناک ہے، پہنچتے رہتے تھے۔ اس وقت غفلت ہے، اس وقت صحت ہے، بالآخر مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس ۱۴ ربیع الاول ۸۲ھ مطابق ۱۶ اگست ۶۲ء پنجشنبہ کو لاہور سے ٹیلیفون پہنچا کہ رات ۹ بجے وصال ہو گیا۔ اس وقت ۹ بجے جنازہ کی نماز ہو گی۔ مولوی یوسف صاحب نے اسی وقت زکریا کے پاس ایک آدمی اجازت کے لیے بھیجا کہ ہم لوگ لاہور روانہ ہو جائیں گے؟ زکریا نے انکار کر دیا کہ ''جب ۹ بجے نماز ہو گئی ہو گی تو تجہیز و تکفین اگر وہاں ہوئی تو شرکت نہیں ہو سکتی اور اگر جنازہ یہاں آ رہا ہے تو ایسا نہ ہو کہ آپ وہاں جائیں اور جنازہ یہاں آ جائے۔'' زکریا کے پاس رات سے کوئی برقیہ نہیں آیا تھا، تاروں کی تحقیق کی گئی، ٹیلیفون ملائے گئے، صابری صاحب کے صاحبزادے الحاج افضال صاحب آئے کہ لاہور کے ٹیلیفون سے حادثہ کی اطلاع ملی ہے اور ساتھ ہی پاکستان ریڈیو کی خبر سے یہ سُنا کہ جنازہ براہِ لائلپور، سہارنپور جائے گا۔ زکریا نے سہارنپور کی تردید کر دی کہ براہِ لائلپور کے ساتھ سہارنپور کا کوئی جوڑ نہیں، ان میں سے ایک خبر غلط ہے۔'' شام کے چھ بجے بھائی افضل کا بہت مفصل تار پہنچا کہ صبح ۱۱ بج کر ۲۰ منٹ پر وصال ہو گیا۔ اس کے بعد متعدد تار اس کی تائید میں پہنچے۔ حافظ عبدالعزیز صاحب ایک دن قبل سرگودھا اپنا پاسپورٹ وغیرہ لینے جا چکے تھے حادثہ کی اطلاع پر جمعرات کو عصر کے وقت ایسی حالت میں پہنچے کہ عصر کی نماز کے بعد فوراً جنازہ ٹرک پر رکھ کر ڈھڈیاں کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ حافظ صاحب بہت بیتابی سے کہتے رہے کہ مجھے زیارت تو کرنے دو، مگر ہجوم کی کثرت اور ڈھڈیاں لے جانے کی عجلت میں کسی نے التفات نہیں کیا۔

چونکہ جنازہ سہارنپور لانے کی امیدیں پہلے سے تھیں اور پاکستانی ریڈیو سے اشتباہ بھی پیدا ہو گیا تھا، اس لیے شدت سے انتظار تھا، لیکن کوئی اطلاع تدفین کے متعلق شنبہ کی صبح تک نہ مل سکی۔ شنبہ کی شب میں میر آل علی صاحب راؤ یعقوب علی خاں صاحب جو ڈھڈیاں نہیں گئے تھے لاہور ہی سے واپس آ گئے۔ ان سے جنازہ کے ڈھڈیاں جانے کا حال معلوم ہوا۔ زکریا نے عزیز مولوی جلیل کو بہت سخت خط لکھا کہ حضرت کی تمنا کا احترام بہت ضروری تھا، لیکن اس نے اتنی طویل معذوریاں، مجبوریاں، قانونی مشکلات اور نعش مبارک کے خراب ہونے کا خطرہ وغیرہ لکھے جن کی تکذیب کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ لیکن جب ۲۹ ذیقعدہ ۸۴ھ کو مولانا یوسف صاحب کی نعش کے متعلق کوئی بھی اشکال قانونی نہ پیش آیا نہ کوئی دِقت، تو پھر اور بھی زیادہ رنج ہوا۔ سعادت کی بات حضرت قدس سرہٗ کی تمنا کو اپنے جذبات پر مقدم رکھنا تھا۔ حافظ عبدالعزیز صاحب نے تو بہت ہی کوشش کی، اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے، مگر ان کی کوشش ہجوم میں بالخصوص آخری وقت ہو جانے پر مثمر نہ ہو سکی، البتہ سہارنپوری جو احباب انتقال کے وقت موجود تھے، ان پر ہمیشہ تعجب رہا اور رہے گا کہ اتنے اونچے مدبّر، وسیع التعلقات ہونے کے باوجود حافظ صدیق نوح والوں کے برابر بھی نہ پہنچ سکے۔ جن لوگوں نے حضرت قدس سرہٗ کی تمنا کا خون کیا ہے، چاہے وہ پاکی ہوں یا ہندی۔ معلوم نہیں کل کو کس طرح سے حضرت قدس سرہٗ کے سامنے ہوں گے اور جن لوگوں نے نعش مبارک کے لانے کی انتہائی کوشش کی چاہے وہ کامیاب نہ ہوئے ہوں وہ حضرت کے سامنے سُرخرو ضرور ہوں گے۔ تمنا میں تو یہ ناکارہ بھی دوسرے فریق کے ساتھ ہمیشہ رہا۔ لیکن دفن کے بعد قبر شریف کو دوبارہ اکھاڑنے میں مجبور تھا کہ مسئلہ تو وہ ہے جو مفتیانِ عظام فرمادیں۔ اہلِ فتاویٰ سے میں نے براہِ راست حاصل کیے، بالخصوص ان لوگوں کے جو معروف بالفتویٰ ہیں، ہندی تھے یا پاکی۔ ان سب نے نبش کو ناجائز بتایا، اس لیے میں نبش کے مسئلہ میں ان حضرات کا متبع رہا اور جس نے میری ذاتی رائے پوچھی میں نے دونوں مسئلوں میں احباب اور مخلصین کے تعلق کی رعایت نہ کرتے ہوئے صفائی سے اپنی رائے ظاہر کر دی اور اس کا بھی ہمیشہ قلق رہا کہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے ۴۷ھ میں میری بچیوں کے حج کے وقت مجھے تو حج سے یہ کہہ کر روک دیا کہ میرے جنازے کی نماز کون پڑھائے گا؟ مگر ہوتا وہی ہے جو مقدر میں ہے، یہ ظاہری بُعد ہم لوگوں کی نگاہ میں بعد ہے، عالمِ برزخ میں تو سب ایک ہیں، نہ معلوم کون کون کہاں کہاں تشریف فرما ہیں۔

ہمارے اہلِ محلّہ کا ہمیشہ ایک دستور رہا کہ ہمارے اکابر میں سے جس کسی کا وصال ہوتا، ایسا زور اس کی تدفین پر ہوتا کہ جھگڑے کا اندیشہ ہو جاتا۔ چنانچہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے متعلق حکیم صاحبان کی رائے تھی کہ ان کے باغ میں تدفین ہو، مگر اہلِ محلّہ نے وہ زور

باندھا کہ کچھ انتہا نہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ لیکن ہمارے متعلقین طلبہ یا دوسرے بعض اعزہ میں سے کسی کا پہلے انتقال ہوتا تو وہ گورِ غریباں میں جاتا، اب تک بھی یہی دستور ہے۔ میں نے ایک دفعہ اپنے آقا اپنے مرشد حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ سے شکوہ کیا تو میرے حضرت نے یہ فرمایا۔ "یہ بُعد سارا زمین کے اوپر کا ہے زمین کے اندر عالمِ برزخ میں بُعد نہیں ہے، بہر حال مقدرات اپنی جگہ اٹل ہیں۔" حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی خواہش وتمنا پوری نہ ہونے کا قلق جتنا ہے وہ ہمیشہ ہی رہے گا اور حضرت قدس سرہٗ کے وصال کے بعد میں نے دوستوں کو جو خط لکھے، اس میں بھی میں نے اپنے قلق کا بہت ہی اظہار کیا۔ لیکن دفن کے بعد نبش قبر تو ہمارے اختیار سے باہر کا مسئلہ بن گیا تھا۔ مسائل میں جذبات کو تو دخل نہیں، اس میں تو درمختار اور شامی ہی کو امام ماننا پڑتا ہے اور ان حضرات کی آراء مقدم ہوتی ہیں جو ہر وقت فتاویٰ میں رہتے ہیں۔

عالمِ برزخ میں بُعد نہیں:

بات میں بات پیدا ہوتی چلی جارہی ہے۔ اکابر کے حالات بھی وصال کے بہت کثرت سے دیکھے اور گھر کی مستورات اور اقارب کے بھی، دفعتہً تین واقعات جن میں سے دو (۲) تو گزر بھی چکے، ایک اپنی سب سے بڑی لڑکی والدۂ ہارون کا انتقال، جو اس تحریر میں بھی مختصر گزر چکا، کسی دوسری تحریر میں بھی گزر چکا۔ مرحومہ نے بہت ہی تکلیفیں اٹھائیں، اس کو بھی تپ دق ہوگئی تھی، عین مغرب کی نماز کے دوران جب کہ وہ دوسری رکعت کے سجدہ میں تھی، اشارے سے نماز پڑھ رہی تھی قبلہ کی طرف منہ تھا، ایسی قابلِ رشک ہیئت سے گئی ہے کہ اس کے چہرے کے انوار اب تک یاد ہیں۔ میری دوسری لڑکی شاکرہ مرحومہ کے متعلق بھی لکھ چکا ہوں کہ مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سورۂ یٰسین پڑھ رہے تھے "سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ" پر ایسا جذبہ مولانا مرحوم کو آیا کہ تین دفعہ اس لفظ کو پڑھا اور تیسری میں لونڈیا کی روح بھی ساتھ چل دی۔ اس میں کوئی تصنع یا توریہ نہیں کہ جس دن اس کی شادی ہوئی تھی اور وہ عروسی بنی ہوئی اچھی لگ رہی تھی، اس سے زیادہ خوبصورت انوار میں لبریز سفید کفن میں سر کے بال سینے پر پڑے ہوئے، اب تک اس کا وہ منظر آنکھوں کے سامنے ہے اور رہے گا۔ بیسیوں اعزہ مستورات کو انتقال کے بعد دیکھا، مگر ایسی حسین صورت مجھے یاد نہیں۔

تیسرا عجیب واقعہ مجھے اپنی پھوپھی صاحبہ نور اللہ مرقدھا کے ساتھ پیش آیا۔ مجھے کاندھلہ بلا سخت مجبوریوں کے، جو دو چار دفعہ پیش آئیں، ان میں پھوپھی صاحبہ رحمہا اللہ تعالیٰ کے حادثۂ انتقال کے

وقت دو تین شب قیام کی نوبت آئی۔ آثار اس کے کئی دن پہلے سے شروع ہو گئے تھے، ساری رات میں، بھائی اکرام، حاجی محسن مرحوم میری پھوپھی کے داماد تھے، نمبروار جاگا کرتے تھے، انتقال کی شب میں صبح صادق سے ذرا پہلے وہ لیٹی ہوئی تھیں، ایک دم گھبرا کر بیٹھنے کی کوشش کی اور دروازے کی طرف دیکھ کر مجھ سے فرمایا کہ ''جلدی اُٹھا کر مجھے سہارے سے بٹھا دے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔'' چونکہ صبح کی اذان بالکل قریب تھی مجھے یہ خیال ہوا کہ نہ معلوم کتنی دیر لگ جائے جماعت فوت نہ ہو، حاجی محسن سے کہا کہ ''جلدی بیٹھو۔'' میری پھوپھی مرحومہ نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا ''تو بیٹھ''۔

رَحِمَهُمُ اللّٰهُ كُلُّهُمْ رَحْمَةً وَّاسِعَةً

☆......☆......☆

فصل ثانی......تقریبات اور شادیاں

اللہ جل شانہٗ کے انعامات، احسانات اس نابکار، بدکار، سیہ کار پر اپنی ناپاکی اور گندگی کے باوجود بارش کی طرح ہمیشہ برسے۔

میں جب سہارنپور ابتداء میں آیا تھا، یعنی ۲۸ھ میں، میں نے خواب میں دیکھا کہ ''مدرسہ کے مہتمم حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحب نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہٗ اس سیہ کار سے لپٹ گئے اور مجھے خوب بھینچا۔'' میں نے اپنے حضرت اقدس مرشدی قدس سرہٗ سے اس خواب کا ذکر کیا تھا تو حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''عنایت الٰہی تمہارے شاملِ حال ہے۔'' یہ تعبیر ہر چیز پر اور ہر ہر وقت میرے ساتھ رہی اور اللہ نے اپنے فضل وکرم سے ہر ہر موقع پر اپنی عنایت کو اس سیہ کار پر بارش کی طرح برسایا۔ ہر جزوِ زندگی میں جتنی میں نے نافرمانیاں کیں اتنی ہی مالک کی طرف سے عنایات میں اضافہ ہوتا رہا۔ خدا کرے کہ استدراج نہ ہو۔ ان میں سے ایک معمولی مسئلہ تقریبات اور شادیوں کا بھی ہے۔

میں نے دو (۲) اپنی اور ہمشیرہ زادی اور بنات اور ولد و اسباط کی تقریباً سولہ (۱۶) سترہ (۱۷) شادی کیں اور ہر شادی میں اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وہ کرم فرمایا کہ کبھی یہ پتہ نہ چلا کہ نکاح کیا یا دو رکعت پڑھ لی۔

نکاح کی مروجہ رسم کی مذمت:

نکاح ایک عبادت ہے، جس کو لوگوں نے ایک مصیبت بنالیا۔ علماء نے لکھا ہے کہ دو (۲) عبادتیں ایسی ہیں کہ جو حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے شروع ہو کر قیامت تک بلکہ جنت میں بھی باقی رہیں گی، ایک ایمان، دوسری نکاح۔

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا اور ارشاد فرمایا ''نکاح میری سنت ہے جو میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں۔'' مگر ہم لوگوں نے اس بابرکت سنت کو بے حد لغویات اس میں شامل کر کے اس کو ایک مصیبت عظمیٰ بنالیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں یہ سنت ہی کا درجہ رکھتا تھا۔ یہ لغویات جو ہم نے شامل کر لی ہیں، اُن کا شائبہ بھی اُس زمانے میں نہیں تھا۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جو عشق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس کے کچھ نمونے اپنے رسالے حکایاتِ صحابہ میں لکھ چکا ہوں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ایک

مشہور صحابی ہیں، عشرۂ مبشرہ میں ہیں، حضور کے جاں نثاروں میں ہیں، مگر اپنی شادی میں حضور کو بلانا تو درکنار خبر بھی نہ کی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کپڑوں پر کچھ ''صفرہ'' کا اثر دیکھا، یہ ایک قسم کی خوشبو ہے جو اس زمانے میں شادیوں کے موقع پر استعمال کی جاتی تھی اس کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ کیا تم نے شادی کر لی؟ انہوں نے عرض کیا، جی حضور!

اس ناکارہ نے ایک رسالہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے نکاح اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کی تفاصیل جس کا ذکر تالیفات میں گزر چکا ہے، تفصیل سے لکھا ہے، مگر طبع نہ ہو سکا۔

بندہ کا پہلا نکاح:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ ''جو نکاح بہت ہلکا پھلکا ہو وہ بہت مبارک ہے۔'' مگر افسوس ہے کہ ہم نے اس مبارک سنت کو اپنی رسوم کی بدولت مشکل ترین بنا دیا ہے۔ نہ معلوم کتنی نمازیں اس کی نذر ہو جاتی ہیں، بعض جگہ تو مصیبت یہ ہے کہ عین نماز کے وقت بارات رخصت ہوتی ہے کہ جس سے دولہا، دلہن اور سارے باراتیوں کی جماعت فوت ہوتی ہے، جس کی ابتداء اس نحوست سے ہوتی ہو اس کی منتہا پر آپس میں لڑائیاں، فتنہ، فساد جتنا ہو وہ کم ہی ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ جو حمل اس صحبت سے ٹھہرے جو نماز کے وقت میں کی گئی ہو یعنی اس سے نماز فوت ہوئی ہو تو اس سے جو بچہ پیدا ہوگا وہ ''عَاقٍ بِالْوَالِدَیْن'' ہوتا ہے یعنی والدین کا نافرمان اور ان کو تکلیف پہنچانے والا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرمائے اور ہم کو ہدایت سے نوازے اور اس سے بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ ان ہی لغویات کی وجہ سے لڑکیاں ایک لمبی عمر تک بیٹھی رہتی ہیں، شادی کا انتظام نہیں ہو سکتا اور اس سے زیادہ بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ بعض جگہ اس مصیبت کے لیے سُود پر روپیہ لینا پڑتا ہے، جس کے متعلق قرآن پاک میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی اور اعلانِ جنگ بتایا گیا ہے۔ اللہ سے لڑائی اور اس کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلانِ جنگ کے بعد کون پنپ سکتا ہے اور ان کی ساری مصیبتوں کا عذر اور مجبوری یہ بتائی جاتی ہے کہ ''ناک کٹ جاتی ہے۔'' میں نے سینکڑوں اکابر و احباب کو ان خرافات کے بغیر سادگی کے ساتھ نکاح کرتے دیکھا مگر کسی ایک کی بھی ناک کٹی ہوئی نہ دیکھی،

آپ بیتی کے چند واقعات اس جگہ لکھوانے ہیں:

(۱)......سب سے پہلے اس ناکارہ کی پہلی شادی ۲۹، صفر بروز دوشنبہ ۳۵ھ میں ہوئی۔ جس کا

ذکر میری والدہ صاحبہ کے انتقال کے سلسلہ میں آ بھی چکا ہے میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے حادثۂ انتقال کے دن ہی سے میری والدۂ مرحومہ کو بخار شروع ہوا تھا، جس نے اخیر میں ان کو والد صاحب سے جا کر ملا ہی دیا۔ میری والدہ مرحومہ نے میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے انتقال جو ۱۰ ذیقعدہ ۳۴ھ کو ہوا، اس سے کچھ دنوں بعد میرے حضرت قدس سرہٗ کے پاس ایک آدمی بھیجا کہ ''طبیعت خراب ہے، زندگی کا اعتبار نہیں، میری خواہش یہ ہے کہ زکریا کا نکاح جلد ہو جائے تا کہ گھر کھلا رہے۔'' اس وقت میری ہمشیرہ بھی بہت چھوٹی اور اکیلی تھی۔ حضرت قدس سرہٗ نے اسی وقت کاندھلہ خط لکھوا دیا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ کا طرز کاندھلہ کے جملہ اکابر کے ساتھ اور جملہ کاندھلہ کے اکابر کا طرز میرے حضرت کے ساتھ ایسے گھر کے چھوٹے بڑوں کا سا تھا کہ حضرت قدس سرہٗ بھی بے تکلف احکام جاری فرماتے تھے، جیسے گھر کا بڑا کیا کرتا ہے اور کاندھلہ کے سارے اکابر حضرت قدس سرہٗ کے ارشاد کو ایسا اہم قابلِ وقعت سمجھتے تھے کہ ذرا کچھ چوں و چراں نہ کرتے۔ سینکڑوں واقعات اس قسم کے پیش آئے۔ میرے حضرت کا خط جاتے ہی وہاں سے جواب آیا کہ ''جیسا ارشاد ہو، جب چاہیں تشریف لے آئیں۔''

تاریخ مقرر فرمادی اور میرے ہم زلف عزیز ظہیر الحسن مرحوم کا بھی میرے ساتھ ہی نکاح تجویز کر دیا کہ حضرت کی تشریف آوری ہو رہی ہے۔ حضرت تشریف لے گئے، یہ ناکارہ اور چچا جان اور حضرت کے دو خادم، یہ جملہ بارات کاندھلہ پہنچی، میرے حضرت نے نکاح پڑھایا۔ اس وقت تک ہمارے خاندان کا مہر ''مثل'' اسی ہزار ٹکے دو (۲) دینار زرِ سُرخ'' تھا۔ یہی عام طور سے ہر نکاح میں ہوتا تھا۔ حضرت نے نکاح کی ابتداء میں مہر دریافت فرمایا تو یہی بتایا گیا۔ حضرت نے لاحول پڑھی اور فرمایا کہ اس کے روپے بناؤ۔ خاندان کے سب اعزہ محاسبین موجود تھے۔ اتنے حضرت نے خطبہ پڑھا، کسی نے جلدی سے ڈیڑھ ہزار کہہ دیا اور حضرت نے میرا نکاح ڈیڑھ ہزار پر پڑھا دیا، میرے بعد جب عزیز ظہیر الحسن مرحوم کا نمبر آیا تو سب نے کہا حضرت ڈیڑھ نہیں ڈھائی ہزار ہوتے ہیں، اس وقت سے ہمارے خاندان کا مہر مثل ڈھائی ہزار قرار پا گیا۔ جو میری بچیوں کے دور تک رہا۔ خاندان میں اب بھی یہی ہے مگر میری بچیوں کا حضرت مدنی قدس سرہٗ مہر فاطمی تجویز کر گئے، جس کا قصہ آگے آئے گا۔

شادی ہوگئی اور میں نے یوں کہلوایا کہ ''کاندھلہ تو میرا وطن اصلی ہے۔ اہلیہ کو لے جانے کا جھگڑا میرے بس کا نہیں، میں دو تین دن کاندھلہ ٹھہر کر سہارنپور آ جاؤں گا۔'' حضرت نے فرمایا'' وہ کون انکار کرنے والا، باپ بن کر تو میں آیا ہوں، لڑکی کل کو میرے ساتھ جائے گی، البتہ جلدی جلدی آنے جانے میں تو واقعی دقت ہوگی، دس پندرہ دن وہاں قیام کے بعد مولوی شمس الحسن صاحب جا

کر لے آئیں گے۔'' یہ میری اہلیہ مرحومہ کے حقیقی تایا اور ہمارے خاندان میں سب سے زیادہ غصہ والے اور نازک مزاج تھے۔ ان کا ذکر ''آپ بیتی نمبر۱'' میں میری علی گڑھ کی ملازمت کے سلسلہ میں آچکا ہے، مگر چونکہ حضرت قدس سرہٗ سے بیعت تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ ان کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے اور میرے حضرت کو بھی کہ مجھے کبھی اہلیہ مرحومہ کو یا موجودہ لڑکیوں میں سے کسی کو کبھی بھی کاندھلہ لے جانے اور لانے کی دِقت نہیں ہوئی۔

دو تین سال تک تو مولانا شمس الحسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ یہ بیگار رہی کہ ایک دو ماہ بعد میرے حضرت کا خط پہنچ جاتا کہ ''عزیزہ کو پہنچا دو'' یا ''عزیزہ کو لے جاؤ''۔ کئی سال تک یہ قصہ رہا۔ اس کے بعد سے کاندھلہ کے بچوں کی تعلیم کا سلسلہ مظاہر میں شروع ہوگیا، اولاً مولوی احتشام، پھر مولوی قمر الحسن مرحوم، پھر مولوی مصباح، مسلسل کئی سال تک یہی بچے لاتے لے جاتے رہے، اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے۔ اس کے بعد تو عزیزانِ مولوی یوسف مرحوم اور مولوی انعام الحسن صاحب کا سلسلہ شروع ہوگیا جو اب تک جاری ہے۔

ہمشیرہ مرحومہ کی شادی:

(۲)......میری ہمشیرہ مرحومہ کی شادی ہے یعنی عزیز مولوی سلمان سلمہ کی نانی، میری والدہ کے انتقال کے وقت ہمشیرہ مرحومہ کی منگنی تو کاندھلہ کے ضابطہ کے موافق بچپن ہی میں ہوگئی تھی۔ لیکن عزیز سلمان کے نانا ہمیشہ باہر رہے، اپنے والد رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس منٹگمری قیام رہا کہ ان کے والد صاحب ہمیشہ وہیں ملازم رہے، آنا جانا بالکل بھی نہیں تھا۔ حکیم ایوب صاحب کے والد حکیم یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے میرے والد صاحب سے اس کی خواہش اور تمنا ظاہر کی کہ میری ہمشیرہ مرحومہ کا نکاح حکیم ایوب سے ہو۔ حکیم ایوب میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے بہت ہی لاڈلے شاگردوں میں سے تھے۔ والد صاحب نے کہا کہ میری تو عین تمنا ہے مگر یہ قصہ انفرادی نہیں بلکہ خاندانی ہے، اس کی منگنی ہوچکی ہے، اس کے توڑنے میں خاندان میں اختلاف پیدا ہوں گے، رنجشیں پیدا ہوں گی، اس لیے معذوری ہے۔ میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد حکیم یعقوب صاحب نے مجھ سے بھی فرمایا۔ میں نے بھی وہی جواب دیا کہ حکیم ایوب صاحب تو میرے لیے سب سے بہتر ہیں مگر آپ خود خیال کریں جس چیز کو میرے باپ نہیں کر سکے میں کیسے کر سکوں گا۔ حالانکہ حکیم ایوب صاحب اس وقت میں میرے لیے ابتداءً محبّ اور انتہاً محبوب تھے۔ یہ دونوں فقرے معنی دار ہیں۔

''ابتداءً محبّ'' کا مطلب تو یہ ہے کہ جب میں رجب ۲۸ھ میں سہارنپور آیا تھا تو حکیم ایوب

صاحب نے مجھ سے ظہر کی نماز سے فراغ پر مسجد کے دروازے سے نکلتے ہوئے سجدۂ سہو کا ایک مسئلہ پوچھا تھا، میں نے لاپرواہی سے جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ حکیم جی نے کہا ''مسئلہ تو مجھے معلوم ہے، میرا کئی مہینوں سے تجھ سے بات کرنے کو جی چاہ رہا تھا مگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی اس لیے مسئلہ پوچھا۔'' میں ہنس پڑا اور ایک دو بات کھڑے کھڑے کی، تم کون ہو؟ کہاں رہتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔

اور دوسرا فقرہ ''انتہاءً محبوب'' کا مطلب یہ ہے کہ میرے والد صاحب کے انتقال تک تو حکیم جی کا ہر وقت کا رہنا سہنا کچے گھر ہی کا تھا، صرف رات کو عشاء کے بعد اپنے گھر جاتے، صبح آجایا کرتے میرے والد صاحب سے بھی ان کو عشق کے درجہ کی محبت تھی۔ چنانچہ جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوا تو یہ زنانہ مکان کے دروازے میں غش کھا کر گر گئے تھے، بڑی مشکل سے ان کو چارپائی پر لٹا کر گھر پہنچایا تھا اور میرے والد صاحب کے انتقال کی پریشانی کے ساتھ حکیم جی کے والد اور تایا کو ان کی فکر پڑ گئی تھی۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کے بعد یہ مجھ سے منہ موڑ کر حضرت مولانا ثابت علی صاحب کے خصوصی تلمذ میں پہنچ گئے تھے، جس کا مجھے اس وقت بہت قلق ہوا۔ مگر میں ابتدائی مدرس بھی نہیں ہوا تھا اور یہ حدیث تک پہنچ گئے تھے، اگرچہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال تک زیادہ تر مجھ سے ہی پڑھتے تھے، اس لیے اور بھی قلق ہوا مگر اب تو پھر ان کی محبوبیت مدرسہ کی وجہ سے عود کر آئی۔ یہ میرے رسالہ میں بار بار ظاہر ہوگا کہ مدرسہ کا جو شخص جتنا لحاظ رکھتا ہے مجھے اس سے بہت ہی زیادہ محبت بڑھتی ہے اور جو ملازم ہو کر مدرسہ کے امور میں تساہل تسامح کرتا ہے مجھے اس سے چاہے کتنی ہی محبت ہو نفرت کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ حکیم جی باوجودیکہ ملازم نہیں ہیں مگر جب سے سرپرستِ مدرسہ ہوئے ہیں مدرسہ کے ہر کام کو میرے ذوق کے موافق اپنا کام سمجھتے ہیں، بالخصوص تعمیر کو، توسیع چندہ کی کوشش کو، نظامت کے امور میں مشورہ کو۔ غرض کسی کام کو یہ نہیں سمجھتے کہ یہ میرا فرضِ منصبی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر، صحت وقوت عطا فرمائے کہ اب تو ان کی صحت نے بہت جواب دے رکھا ہے۔

خوانخواہ بات میں بات آجاتی ہے، بہرحال حکیم جی سے میری ہمشیرہ کی شادی مقدر نہ تھی نہ ہوئی۔ لیکن چونکہ اس کے مجوزہ شوہر یعنی عزیز سلمان کے نانا باہر رہتے تھے، مستقل قیام منٹگمری پنجاب میں رہتا ہی تھا، لیکن دو سال سے بصرہ محاذِ جنگ پر گئے ہوئے تھے وہاں سے واپسی ۳۰ محرم ۳۷ھ مطابق ۱۸ء کو ہوئی، اس وجہ سے کاندھلہ آنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس لیے خاندان کے دوسرے لوگوں نے میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کے بعد مجھ پر بہت ہی زور ڈالے کہ میں خاندان کے دوسرے افراد فلاں فلاں میں سے کسی سے نکاح کروں اور عزیز سلمان

کے نانا کی اس قدر سخت تر شکایتیں کاندھلہ اور پنجاب سے پہنچیں کہ ان کی وجہ سے میں ڈر گیا۔
میں اعلیٰ حضرت قطب الاقطاب حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا، سارے حالات پیش کیے۔ حضرت قدس سرہٗ نے تقریباً دس منٹ تک بلکہ شاید اس سے زائد مراقبہ فرمایا اور پھر سر اُٹھا کر فرمایا کہ ''اللہ کا نام لے کر دو، اللہ خیر کرے۔'' میں نے رائے پور سے واپس آتے ہی کاندھلہ خط لکھ دیا کہ یہ اس وقت کاندھلہ چھٹی پر آئے ہوئے تھے۔ میرے خط پر میرے حقیقی نانا حافظ محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے چھوٹے بھائی حافظ محمد یونس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ یعنی ان کے والد ان کو اپنے ساتھ لے کر سہارنپور پہنچ گئے۔ نہ کوئی بارات ساتھ تھی نہ کوئی اور آدمی۔
میرے آقا میرے مرشد حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کی ٹانگ میں اُس زمانہ میں تکلیف تھی، مدرسہ تشریف نہیں لاتے تھے، یہ ناکارہ جماعت کرانے حضرت کی خدمت میں جایا کرتا تھا، مغرب کی نماز کے وقت جب میں پہنچا تو میں نے عرض کیا کہ ''حضرت ہمشیرہ کا مجوزہ شوہر عصر کے بعد آ گیا ہے، اس وقت حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نکاح پڑھ دیں تو صبح کو کاندھلہ بہن کو لے جائے۔'' حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے اس وقت کوٹھے میں لیٹے لیٹے نکاح پڑھا دیا، میں اور چچا جان، حضرت قدس سرہٗ کے ایک دو خادم چار پانچ آدمی تھے۔ نکاح کے بعد صبح کو ہمشیرہ مرحومہ کو ان کے خاوند کے ساتھ بھیج دیا...... چچا جان نور اللہ مرقدہٗ ساتھ تشریف لے گئے تھے، نہ کچھ ساتھ سامان تھا، نہ کپڑے، نہ برتن، چونکہ سب کو اندازہ تھا کہ بچی ہے یتیم ہے کسی نے ان چیزوں کی طرف التفات بھی نہیں کیا۔ البتہ میری والدہ نے کچھ برتن پہلے سے رکھے تھے اور کچھ کپڑے بھی، اس وقت تو کچھ نہیں دیا گیا۔ البتہ حسبِ ضرورت وہ لے جاتی رہی۔ لیکن جب وہ سسرال والوں سے علیحدہ ہو کر اپنے مستقل مکان میں مقیم ہوئی، اس وقت میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ گھر کے سامان میں سے کھانے پکانے کا ہو، استعمال کا ہو جو تیرا جی چاہے لے جا۔ نیز میں نے اپنی والدہ نور اللہ مرقدہا کے انتقال پر عام گھروں کے دستور کے موافق کہ بہنیں اپنی رضا و خوشی سے اپنا حصہ بھائیوں کو دے دیا کرتی ہیں، اس کا حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ مرحومہ نے بہت خوشامد کی، بہت روئی بھی کہ میں تو آخر تمہارے ہی ذمے رہوں گی، کہاں جاؤں گی، ماں نہیں، باپ نہیں۔ میں نے کہا ضرور رہے گی ان شاء اللہ اور ماں اور باپ دونوں کا بدل کر کے دکھاؤں گا۔ لیکن حصہ تیرا ضرور الگ کروں گا۔ میں نے اپنے منتظم جائیداد حاجی محسن صاحب مرحوم سے کہہ دیا تھا کہ دو (۲) حصے میرے اور ایک حصہ ہمشیرہ کا جو تقسیم کے ضابطے تمہارے ہوتے ہوں اس کے موافق کر دو۔ انہوں نے کئی دن بعد مجھ سے ازراہِ شفقت فرمایا کہ کنویں والا حصہ تیرے قرعہ میں لگا دیا ہے۔ میں جانتا بھی نہ تھا کنویں والا

کیا بلا ہے اور کیا اہمیت اس کو ہے۔ میں نے کہہ دیا ''نہیں وہ تو ہمشیرہ کی طرف لگے گا۔'' ان بے چاروں نے تو مجھ پر بڑا احسان رکھا تھا، میرے شدت انکار پر وہ مجھ سے ناراض ہوگئے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ''پھر آپ اس جھگڑے میں نہ پڑیں، میرا زمین کی آمدنی سے کیا سہارا ہوسکتا ہے، سارا ہی ہمشیرہ کے نام لکھوا دو۔'' اول تو مرحوم اس کو تفریح سمجھے، لیکن جب میں نے بڑوں سے یہ کہہ دیا کہ یہ دس (۱۰) بارہ (۱۲) من غلّہ مجھے کیا کفایت کرے گا؟ وہ بچی ہے، اس کو کام دے گا، آپ اسی کے نام لکھوا دیں، تب مرحوم نے میری مرضی کے موافق اس کو کر دیا۔

(۳)، (۴)...... مجھے اپنی بچیوں میں سب سے پہلا سابقہ اور معرکۃ الآراء سابقہ سب سے بڑی دو (۲) بچیوں والدۂ ہارون، والدۂ زبیر کا مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، ومولانا انعام الحق صاحب کے نکاح سے پڑا۔

عزیزان مولوی یوسف مولوی انعام کی شادی:

(الف)...... ہمارے خاندان کا قدیم دستور اصول موضوعہ کے طور پر یہ طے شدہ تھا کہ جب کوئی لڑکی پیدا ہو تو اس کا اقرب ترین نامحرم گویا شادی کے لیے متعین تھا۔ یہی وہ واقعہ ہے جس کو مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بعض مؤرخین نے گڑبڑ کر کے نقل کر دیا۔ ہوا یہ تھا کہ جب ہارون کی والدہ پیدا ہوئی تو دایہ نے اس بات کو کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے، اس عنوان سے اعلان کیا تھا میری چچی کو مخاطب کر کے کہ آپا تمہیں مبارک باد دوں کہ اللہ نے تمہارے یوسف کے بہو دی۔ یہ منگنا ہو گیا تھا۔

والدۂ زبیر کے متعلق ذہنوں میں تو سب کے مندرجہ بالا قاعدہ کے موافق طے شدہ تھا، لیکن دو ایک سال بعد بھائی اکرام صاحب کا ایک کارڈ آیا کہ ''والد صاحب کے تعمیل حکم میں لکھ رہا ہوں، تمہاری دوسری بچی سے عزیز انعام کے نکاح کی تجویز کو فرمایا ہے۔'' میں نے اس کے جواب میں لکھ دیا تھا کہ پھوپھا میرے بھی بڑے ہیں اس کے بھی بڑے ہیں، میرے سے کیا پوچھنا؟ یہ ہوا منگنا مولانا انعام الحسن صاحب کا۔

چچا جان نور اللہ مرقدہٗ ہر سال مظاہر علوم کے سالانہ جلسے میں شنبہ کی شام کو تشریف لایا کرتے تھے، حسب معمول مورخہ ۲ محرم ۵۴ھ مغرب کے قریب تشریف لائے اور فرمایا کہ ''ہمارے یہاں میوات میں جلسوں میں نکاحوں کا دستور پڑ گیا۔ کل کے جلسے میں حضرت مدنی سے یوسف وانعام کا نکاح پڑھوا دوں؟'' میں نے کہا شوق سے پڑھوا دیجئے مجھ سے کیا پوچھنا۔ عشاء کی نماز کے کچھ دیر بعد میں نے اہلیہ مرحومہ اور دونوں بچیوں کے کان میں ڈال دیا کہ چچا جان کا ارادہ یہ ہے کہ کل کے

جلسے میں دونوں بچیوں کا نکاح پڑھوادیں میری اہلیہ مرحومہ نے اس کے لفظ مجھے خوب یاد ہیں یہ کہا کہ ''تم دو چار دن پہلے کہتے تو میں ایک جوڑا تو ان کے لیے سلوا دیتی۔'' مجھے اپنا جواب بھی خوب یاد ہے اور میرے جواب پر مرحومہ کا سکوت بھی ''اچھا مجھے خبر نہیں تھی یہ ننگی پھر رہی ہیں، میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ کپڑے پہنے پھرتی ہیں۔'' میرے جواب پر مرحومہ بالکل ہی ساکت ہوگئی۔

جامع مسجد آتے ہوئے حضرت مدنی سے میں نے عرض کردیا کہ یوسف وانعام کا نکاح پڑھنے کے لیے چچا جان فرمارہے ہیں۔ حضرت نے بہت ہی اظہار مسرت فرمایا۔ کہا ''ضرور پڑھوں گا، ضرور پڑھوں گا۔'' اور جامع مسجد میں پہنچنے کے بعد بیٹھتے ہی فرمایا کہ ''مہر کیا ہوگا؟'' میں نے عرض کیا کہ ہمارے یہاں مہر مثل ڈھائی ہزار ہے۔ حضرت جی کو غصہ آ گیا، فرمایا کہ میں مہر فاطمی سے زیادہ ہرگز نہیں پڑھوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو شرعی چیز ہے۔ فقہاء کے نزدیک مہر مثل سے کم پر سکوت کافی نہیں بالتصریح اجازت کی ضرورت ہے تھوڑی دیر میرا اور حضرت کا جامع مسجد کے در میں بیٹھے بیٹھے مناظرہ ہوا میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اندر سے تو میرے ساتھ مگر حضرت جی کے غصے کی وجہ سے چپ تھے اور میں خوب ڈانٹیں سن رہا تھا۔ میری اہلیہ مرحومہ کے والد مولانا رؤف الحسن صاحب جو میرے قریب ہی بیٹھے تھے انہوں نے مجھ سے فرمایا۔ ''جیسے حضرت فرمارہے ہیں مان لو۔'' میں نے کہا ''یہ تو شرعی چیز ہے۔'' میرے چچا جان نے فرمایا ''بچیوں میں سے کون سی انکار کردے گی اور یہ نکاح نکاحِ موقوف بن جائے گا؟ اور جب تم گھر جا کر اظہار کردوگے تو تکمیل ہوجائے گی۔''

حضرت قدس سرہٗ ممبر پر تشریف لے گئے اور سادہ نکاحوں کی فضیلت برکت پر لمبا چوڑا وعظ شروع کیا اور حضرت کی محبوب ترین گورنمنٹ برطانیہ کا ذکر تو کسی جگہ چھوٹتا ہی نہیں تھا، اس نکاح کے وعظ میں بھی وہ بار بار آتا رہا۔ حضرت مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی ثم الدہلوی جو حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد اور ہمارے سارے اکابر کے محبوب تھے، اس جلسے میں تشریف فرما تھے، مجھ سے فرمایا کہ ''میں ساڑھے دس بجے کی گاڑی سے جانا ضروری سمجھتا ہوں اور مولانا کی طبیعت خوب زوروں پر چل رہی ہے اگر نکاح مولانا پہلے پڑھ دیں تو میری اور ساتھیوں کی تمنا یہ ہے کہ اس میں شرکت کرتے جاویں۔'' میں نے حضرت کی خدمت میں ممبر پر پرچہ بھیج دیا کہ بعض مہمانوں کو اس گاڑی سے جانے کی ضرورت ہے، ان کی درخواست ہے کہ نکاح پہلے پڑھ دیں۔ حضرت قدس سرہ کو خیال ہوگیا کہ بعض لیگی حضرات میری تقریر سننا پسند نہیں کرتے اس لیے اوّل تو خوب ممبر پر ناراض ہوئے اور فرمایا کہ ''اصل غلطی تو مجھے ممبر پر کھڑا کرنا ہے اور اس بے ایمان حکومت کو کہے بغیر میں رہ نہیں سکتا، جس کو سننا ہو وہ سنے اور جس کو میری تقریر سننا گوارا نہ ہو وہ چلا

جائے۔'' لیکن معاً دونوں لڑکوں یوسف و انعام کو ممبر کے پاس کھڑے کر کے خطبہ پڑھ کر نکاح پڑھ دیا اور پھر اپنے وعظ میں مشغول ہو گئے۔

جلسے کے بعد فرمانے لگے ''فلاں لیگی صاحب کو میری تقریر سے گرانی ہو رہی ہو گی۔'' میں نے کہا ''نہیں حضور، جناب کے الحاج حکیم جمیل الدین صاحب کو جانے کا تقاضا ہو رہا تھا اور ان ہی کے تقاضے پر میں نے پرچہ بھیجا تھا، مگر آپ تو رستے چلتے لیگیوں کے سر ہوتے پھرتے ہیں۔'' حضرت نے فرمایا کہ پھر پرچے میں یوں کیوں نہ لکھا کہ حکیم جمیل الدین صاحب جانا چاہتے ہیں۔''

نکاح تو ہو گیا مگر وہ گالیاں مجھ پر پڑیں کہ یاد رہیں گی۔ لڑکوں سے تو لوگ واقف نہیں تھے اور میری لڑکیاں ہونے کا اعلان آ ہی گیا تھا، لڑکے دونوں حسین جمیل امرد اور مدنی رومال دونوں کے سروں پر، جو میں نے ہی رکھے تھے، جلسے میں جاتے ہوئے دے دیے تھے۔ دو تین فقرے نقل کراتا ہوں فقرے تو بہت ہے:

(۱)......ان مولویوں کا بھی کچھ تک نہیں، دو خوبصورت لونڈے دیکھے تھے تو لونڈیاں ہی حوالے کر دیں۔

(۲)......بمبئی کے سیٹھوں کے لونڈے جلسے میں آئے تھے، پیسے والا دیکھ کر لڑکیاں ہی دے دیں۔

(۳)......پہلے سے جانتے ہوں گے ویسے رستے چلتے کیا حوالہ کر دیتے۔ ارے نہیں ان مولویوں کا کچھ تک نہیں۔

(۴)......ہمارے محلّہ کے ایک بڑے متمول، رئیس اعظم، دیندار، متشرع بزرگ نے اپنے گھر جا کر بڑی ہی خوشی اور مسرت سے میری بچیوں کے نکاح کا تذکرہ کیا، ان کی اہلیہ مرحومہ خوب خفا ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں ہی کی مغفرت فرمائے کہنے لگیں ''گھر میں تو چوہے قلابازیاں کھاویں، کھانے کے واسطے کچھ ہے نہیں، ہر وقت ہمارے دروازے پر قرض کے واسطے آدمی کھڑا رہتا ہے وہ یوں نہ کرتا تو اور کیا کرتا؟ تم مجھے سناؤ اللہ کے فضل سے اللہ میاں نے بہت کچھ دے رکھا ہے، مال و دولت دے رکھی ہے، خدا نہ کرے کہ میں اپنے بچے کا نکاح فقیروں کی طرح کروں۔''

اس کے بعد چونکہ خاندان کی ساری روایات کے خلاف تھا اور اب تک کوئی نکاح اس طرح نہیں ہوا تھا، اس لیے کاندھلہ میں بھی اس نکاح پر چہ می گوئیاں تو بہت ہوئیں، ایک صاحب کا فقرہ مجھے پہنچا کہ ''زکریا نے اپنی بھی ناک کٹوا دی اور ہم سب کی بھی۔ بھلا نکاح یوں ہوا کرتے ہیں۔'' میں نے اس کا جواب اہتمام سے بھیجا کہ ''میری تو کٹی نہیں اور میں نے قاصد سے کہا کہ تو بھی ہاتھ لگا کر دیکھ لے اور کہہ دیجئے کہ میں دیکھ کر آیا ہوں، اس کی تو کٹی نہیں اور کسی کی مجھے خبر نہیں۔''

تایا سعید مرحوم کیرانوی سابق ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ جن کے ساتھ ہمارے خاندانی تعلقات بھی قدیم، حکیم یامین صاحب مہاجر مکی کے نکاح کے سلسلہ میں بھی ان کا ذکر خیر گزر چکا ہے۔ جب ان کو اِن دو نکاحوں کی خبر ہوئی تو انہوں نے کاندھلہ میں فرمایا کہ ''اس نے بہت بُری رسم جاری کردی۔ بھلا شادیاں اس طرح ہوا کرتی ہیں، خیر نہ خبر، یہ تو اعزہ کی مسرتوں کا زمانہ ہوتا ہے، مسرت انگیز خبروں کا پہلے سے ذکر تذکرہ ہونا چاہیے، خوشی کی لہر دوڑے زکریا کو اس کی سزا ملنی چاہیے۔'' میں نے بڑے اہتمام سے تایا مرحوم کے پاس اس کا جواب بھیجا کہ ''جناب کی تجویز بہت مناسب ہے، ضرور اس سیہ کار کو سزا ملنی چاہیے اور سزا جرم کے مناسب ہوا کرتی ہے چونکہ اس سیہ کار نے اعزہ میں سے کسی کو اپنی بچیوں کے نکاح میں نہیں بلایا۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اعزہ میں سے کوئی بھی کبھی مجھے اپنی تقریب میں نہ بلائے۔'' تایا سعید مرحوم نے پیام بھیجا ''اس کو تو سزا نہیں کہتے، یہ تو تیری عین منشأ کے مطابق ہو گیا۔ اس کی سزا یہ ہے کہ ہر شخص تجھے اپنی ہر تقریب میں دو مرتبہ بلائے۔ ایک مرتبہ اپنی تقریب میں اور دوسری دفعہ سزا میں۔'' گھر کے مردوں پر تو گرانی خوب سنی، لیکن عتاب تایا سعید مرحوم کے علاوہ کسی کا نہیں پہنچا۔

البتہ گھر کی مستورات کی طرف سے خوشیوں کے، مسرتوں کے، دعاؤں کے پیامات پہنچے۔ اللہ تمہیں بہت ہی جزائے خیر دے، بہت ہی اچھا راستہ نکال دیا، اللہ کرے یہ چل پڑے۔ شادیاں تو مصیبت بن گئیں۔ سُودی قرض تک سے بھی اب تو پرہیز نہیں رہا جس کی عام طور سے لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ مگر بھائی زکریا سچی بات ہے کہ بعض بعض گھروں میں تو شادی کی لعنت سے سود تک بھی گھر میں گھس گیا۔ اللہ تمہیں جزائے خیر دے، اللہ یوں کرے، اللہ یوں کرے، فلاں فلاں کے نکاح بھی اسی طرح جلد کرادو۔

(ب)...... اس زمانے میں عزیز مولویان یوسف وانعام سہارنپور ہی میں پڑھتے تھے اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ ہمارے مدرسہ کے سرپرستان میں تھے اور حضرتِ اقدس رائپوری قدس سرہٗ بھی سرپرست تھے، مدرسہ کے اجتماع سرپرستان میں دونوں حضرات کی اکثر تشریف آوری ہوتی رہتی ہے۔

ربیع الاول ۵۵ھ میں حضرات سرپرستان کا اجتماع تھا۔ حضرتِ اقدس رائپوری چچا جان ودیگر سرپرستان تشریف لائے ہوئے تھے۔ چچا جان نے ارشاد فرمایا: ''خیال یہ ہے کہ کل کو جاتے وقت یوسف وانعام کی بیویوں کو لے جاؤں۔'' میں نے کہا ''جیسے رائے عالی ہو، مگر لڑکے دونوں یہاں پڑھ رہے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بناء تو ان ہی کے گھر میں ہوئی تھی، میرا خیال یہ ہے کہ ان دونوں لونڈوں کی بناء یہاں ہی کرادیں۔'' چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا ایک مقولہ میرے متعلق

بہت معروف ومشہور، نہ معلوم بیسیوں دفعہ فرمایا ہوگا کہ'' تجھے نہ معلوم اپنے کام کی حدیثیں بہت یاد رہتی ہیں۔'' چچا جان نے فرمایا'' بہت اچھا۔''

میں نے ۱۲ ربیع الاول ۵۵ ھ مطابق ۳ جون ۳۶ ء کو عصر کے وقت بچیوں سے کہہ دیا کہ'' اپنی بہنوں کو کپڑے پہنا دو، رات کو ان کی یہیں رخصتی ہے۔'' مولانا یوسف مرحوم کو اپنے کمرے میں اور مولانا انعام الحسن صاحب کو کچے گھر میں تجویز کیا۔ مقدر کی بات کہ خوب بارش ہوئی اور اوپر مولانا یوسف صاحب خوب بھیگے کہ وہ چھجے کے نیچے تھے۔

حضرات سرپرستان کی آمد پر اور مہمانوں کی آمد پر کھانے کا دستور تو ہمیشہ سے ہے، مہمانوں کی کثرت رہتی ہی ہے۔ میں نے عشاء کے بعد، عزیزم مولوی عامر انصاری رامپوری جو اس وقت مظاہر علوم میں پڑھتے تھے اور مجھ سے ہمیشہ خصوصی محبت رہی اور وہ بڑھتی ہی رہی اس میں روز افزوں اضافہ اب تک بھی ہے۔ میں نے عشاء کے بعد، اس کو بلا کر یوں کہا کہ پلاؤ بچ گئی، کاندھلہ کے دس بارہ عزیز اس زمانہ میں مظاہر علوم میں پڑھتے تھے میں نے عامر سے کہا کہ سب بچوں کو بلالو، آج بچیوں کی رخصتی ہو رہی ہے تمہاری دعوت ہے۔ سب عصر کے بعد کھا چکے تھے۔ مگر عزیز عامر کے پیام پر ایک عزیز نے غصہ میں یوں کہا کہ'' شادیوں کی دعوت یوں ہوا کرتی ہے کھا چکا میں، میں نہیں جاتا۔'' اس عزیز کے علاوہ کسی نے کوئی تامل نہیں کیا، پیام سنتے ہی ایسے خوشی سے آئے کہ جیسا بہت ہی میں نے کچھ کرم کیا ہو۔ عزیز عامر نے میرے اس عزیز کو جواب بھی حیات ہے اور پاکستان میں ہے۔ یہ جواب دیا کہ'' تیری عقل ماری گئی، بھائی زکریا نہیں بلا رہے ہیں حضرت شیخ الحدیث صاحب بلا رہے ہیں، یہ نخرے جب کیجئے جب بھائی زکریا کاندھلہ میں تجھے بلائیں اور وہاں وہ کبھی تجھے بلانے کے نہیں۔'' وہ بیچارہ شرما کر ساتھ آ گیا عزیز عامر سلمہ کا یہ فقرہ میں ہمیشہ بہت مزے لے کر دورہ کے اسباق میں سناتا رہا ہوں:

محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی!

چونکہ عزیزان مولویان یوسف وانعام یہیں پڑھتے تھے، اس وجہ سے لڑکیوں کے نظام الدین جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ میرے گھر ہی میں شب جمعہ کو دونوں کی چارپائیاں علیحدہ علیحدہ بچھوا دی جاتیں، جب سال کے ختم پر وہ حضرات نظام الدین گئے اپنی اپنی بیویوں کو بھی چچا جان کی معیت میں ساتھ لے گئے۔

نکاح والدہ سلمان:

(۵)...... میری ہمشیرہ زادی والدۂ سلمان کا نکاح بھی ایک معرکۃ الآراء نکاح بن گیا۔ خاندان

کے دستور کے موافق خاندان میں ایک جگہ اس کی منگنی ہو چکی تھی، مگر قرابت کے اعتبار سے دو تین جگہ زیادہ قریب تھیں، مگران کا قیام پنجاب میں تھا، اس کے والد ماموں شعیب صاحب جو پنجاب ہی میں رہتے تھے ان کا نہایت زوردار خط میرے پاس آیا کہ ''میں تو حالات سے واقف نہیں، سب سے بہتر اور سب سے زیادہ دیندار جگہ جو ہو وہاں کرنا چاہتا ہوں، تمہارے مدرسہ کے طالب علموں میں کوئی دیندار ملے تو اس سے کردو۔'' میں نے لکھا کہ ''دیندار تو بہترین موجود ہے یعنی مفتی یحییٰ، مگر خاندان میں منگنی ہو چکی ہے، قرابت کا قصہ ہے، تعلقات کشیدہ ہوں گے اور بے دینی وہاں بھی نہیں ہے۔'' انہوں نے پھر زوردار الفاظ میں لکھا کہ ''مجوزہ شخص داڑھی منڈاتا ہے آپ کو خبر نہیں۔'' مجھے تو واقعی خبر نہ تھی، میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ نہیں نکلی ہوگی۔ میں نے چچا جان سے مشورہ کیا۔ چچا جان نوراللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ بھائی شعیب کی بات کا کیا جواب ہوسکتا ہے۔'' چنانچہ جب چچا جان نوراللہ مرقدہٗ نے میری بھانجی کا مدرسہ قدیم کی مسجد میں عصر کے بعد نکاح پڑھایا تو تمہید میں یہ فرمایا کہ ''بھائی شعیب صاحب کو اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجہ عطا فرمائے کہ انہوں نے تو وہ کہا کہ جو مجھے اور شیخ الحدیث کو کہنا چاہیے تھا، یعنی ''دیندار کے مقابلے میں کسی کی رعایت نہیں۔'' اور ہم دونوں نے وہ کہا جو انہیں کہنا چاہیے تھا کہ قرابت کی رعایت زیادہ ضروری ہے۔''

ماموں شعیب صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، ان کے دین پسند رجحان سے نکاح تو ہوگیا، لیکن خاندان والوں کی جو یورش اس ناکارہ پر ہوئی، ہر ایک کے ذہن میں یوں تھا کہ بھائی شعیب تو کسی کو جانتے نہیں اور چچا جان نوراللہ مرقدہٗ کی رائے میری رائے کے تابع ہے۔ خاندان سے باہر نکاح کی بدعت زکریا کا کارنامہ ہے۔ اس میں ایسے عزیز قریب رشتہ دار تک خفا ہوئے کہ جن سے اس قسم کی ناراضگی کا واہمہ بھی نہیں تھا اور میرے ایک عزیز ماموں شعیب کے بھائی تو مجھ سے اتنے ناراض ہوئے کہ دو برس تک ملاقات پر بات بھی نہیں کی اور اتنے سخت ناراضگی کے خط لکھے کہ کچھ حدوحساب نہیں۔ میں نے دبے لفظوں میں ایک دو دفعہ ان کو لکھا بھی کہ یہ چیز ماموں شعیب صاحب کی دین پسندی کا ثمرہ ہے۔ مگران کو اس کا بالکل یقین نہیں آیا کہ میں نے زبردستی ایسا نہیں کرایا۔

اس قصہ کے تو بڑے واقعات ہیں مگر اس کے اکثر افراد انتقال کر چکے ہیں، اب تو اتنا ہی کہوں گا کہ اللہ جل شانہٗ ان عتاب کرنے والوں کو، ناراض ہونے والوں اور انتہائی سب وشتم کرنے والوں کو معاف فرمادے اور ہمارے گھر میں خاندان سے باہر شادی کا یہ پہلا واقعہ ہے، پھر تو ان حکیموں نے مجھے ایسا گھیرا کہ میری ساری لڑکیاں چن چن کر لے لیں۔

تیسری چوتھی بچیوں کا نکاح:

(۶)، (۷)......ان کے بعد میری دو (۲) لڑکیاں شاکرہ مرحومہ جس کا تذکرہ حوادث اور اموات میں گزر چکا اور اس کی چھوٹی بہن، جواب مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی بیوہ ہے، کا نکاح ساتھ ہوا۔ شاکرہ مرحومہ کا جس سے نکاح ہوا تھا، حسن دیوبند پڑھتا تھا اور اس سے چھوٹی بہن کا مجوزہ شوہر سعید الرحمٰن سہارنپور پڑھتا تھا، بڑا ہی سعید بچہ تھا۔ اسم بامسمیٰ تھا، اس کی خوبیوں کے واسطے ایک دفتر چاہیے، چونکہ اس کی والدہ مرحومہ کا انتقال ہوگیا تھا اس لیے وہ مع اپنی بہن کے میرے ہی پاس رہا کرتا تھا۔ بچپن میں شرارت کرتے میں نے اس کو نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ بہت بلند درجہ عطا فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ۱۸، ۱۹ شوال ۶۶ھ مطابق ۴، ۵، اگست ۴۷ء کی درمیانی شب، شب جمعہ میں مرحوم کا انتقال ہوا۔ ہنگاموں کا زمانہ تھا کہ ڈاک بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جاسکتی تھی۔ کئی ماہ بعد مرحوم کے حادثہ انتقال کی خبر نظام الدین میں پہنچی جب کہ میں اپنی سب بچیوں سمیت ۴۷ء کے ہنگاموں میں نظام الدین میں محبوس تھا۔

حسن کے والد نے مجھ سے کہا کہ "میں اپنی بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس نکاح میں شرکت نہیں کرسکتا۔ میرے لیے تو بہت مشکل ہے کہ مجھے خبر ہو اور میں شریک نہ ہوں، تیرے لیے بہت آسان ہے کہ تو مجھے خبر بھی نہ ہونے دے۔ اگر بغیر اطلاع کے نکاح کردے تو مجھ پر بہت احسان ہوگا۔" میں نے مرحوم سے کہا کہ "تمہاری ذاتی مجبوریاں تو نہایت لغو ہیں، تمہاری مصلحت کا تقاضا ہے تو مجھے بھی انکار نہیں۔" میں نے حسن کے ہاتھ ایک دستی پرچہ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں لکھا کہ "دو (۲) بچیوں کے نکاح کا خیال ہو رہا ہے، جس دن سہارنپور کی طرف تشریف لانا ہو حامل عریضہ حسن کو ساتھ لیتے آئیں۔" حضرت قدس سرہٗ نے اپنی ڈائری میں فوراً نوٹ کرلیا، زبانی اسی وقت اس کا جواب دے دیا کہ "میں پرسوں لکھنؤ جا رہا ہوں، پہلے سے رات کی گاڑی آنے کا خیال تھا، اب خیال ہے کہ ۴ بجے کی گاڑی سے آجاؤں گا، عصر کے بعد نکاح ہو جائے گا۔" چنانچہ ۱۹ ربیع الاول ۶۵ھ مطابق ۲۲ اپریل ۴۶ء دوشنبہ کو حضرت تشریف لائے، حسن بھی ساتھ تھا۔ سعید الرحمٰن تو پہلے سے یہیں تھا۔ عصر کے بعد نکاح ہوگیا اور مغرب کے بعد ماشاء اللہ شادی کی دعوت بھی ہوگئی۔ کسی کو بلانا تو یاد نہیں، ویسے بھی حضرت مدنی قدس سرہٗ کی وجہ سے ادھر اُدھر کے احباب جمع ہو ہی گئے تھے۔ سعید الرحمٰن مرحوم تو سہارنپور میں پڑھتا تھا اور میرے ہی گھر میں قیام تھا اس لیے اسی دن عشاء کے بعد اس کی بناء تو میرے ہی گھر میں ہوگئی اور دوسرے دن حسن کے ساتھ اس کی بیوی کو کاندھلہ بھیج دیا گیا۔ بھائی اکرام ساتھ گئے۔ اس سے کہہ دیا تھا کہ جمعہ تک کاندھلہ میں قیام کرے، جمعہ کے دن شاکرہ کو یہاں چھوڑتا جائے۔ خود دیوبند چلا

جائے۔اس کے بعد ہر شب جمعہ میں دیوبند سے آتا رہتا تھا۔

(۸)......اس ناکارہ کی دوسری شادی کا مسئلہ بھی بہت معرکتہ الآراء ہے،حوادث کے ذیل میں گزر چکا ہے کہ میں نے اپنی پہلی اہلیہ مرحومہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی سے بہت ہی شدت سے انکار کر دیا تھا اور بلا مبالغہ بیس پچیس جگہوں سے بہت ہی تقاضے ہوئے اور جن میں بعض کے متعلق حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی سفارش فرمائی۔ایک کے متعلق تو حضرت رائپوری قدس سرہٗ بہت اہتمام سے تشریف لائے،مگر میں اپنی معذوریوں اور اس وجہ سے کہ ادائے حقوق نہیں کر سکتا،شدت سے انکار کرتا رہا۔لیکن چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے ہمشیرۂ مولوی یوسف مرحوم کے متعلق فرمایا تو مجھے انکار کی گنجائش نہیں رہی اور میں نے عرض کی کہ''پھر نکاح پڑھتے جایئے۔''انہوں نے کہا کہ تغیر زوج کے واسطے استیمار کی ضرورت ہے۔میں دو تین دن میں خط لکھ دوں گا اس پر چلے آنا۔حضرتِ اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی تشریف آوری تو بار بار ہوتی رہتی تھی،مجھے تو اپنا ذکر کرنا بالکل یاد نہیں۔لیکن معلوم نہیں حضرت کو کس طرح سے علم ہو گیا۔حضرت کے متعدد اعزہ اس زمانہ میں یہاں پڑھتے تھے حضرت قدس سرہٗ کو چچا جان کی ابتدائی گفتگو کا علم ہو چکا تھا،انہوں نے مجھ سے بہت اصرار سے ارشاد فرمایا کہ''میں ضرور چلوں گا۔''میں نے عرض کیا کہ''میں لے کر نہیں جاؤں گا۔''حضرت نے بار بار اصرار فرمایا میں نے عرض کیا حضرت ہم لوگوں کو بارات وغیرہ کے قصے سے اور زیادہ احتیاط برتنی چاہیے کہ بہت ہی توغل،حد سے زیادہ اسراف ہونے لگا ہے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ''میں باراتی بن کر تھوڑا ہی جاؤں گا حضرت کا خادم بن کر جاؤں گا۔'' میں نے پھر بھی قبول نہیں کیا۔مگر حضرت قدس سرہٗ کے بھانجے مولوی عبدالرحمٰن شاہ پوری بھی یہاں پڑھتے تھے۔میرے یہاں رہتے تھے۔حضرت نے ان کو تاکید فرمائی اور کرایہ بھی دیا کہ بہت اہتمام سے خبر رکھیں اور جس دن حضرت دہلوی کا خط بلانے کا آجائے فوراً،اگر سواری نہ ملے تو مستقل تانگہ بہٹ کا کر کے مجھے اطلاع کریں۔مجھے اس کی خبر بھی نہیں ہوئی۔چچا جان کا والا نامہ آنے پر میں نے تجویز کیا کہ کل کو ۱۰ بجے کی گاڑی سے چلا جاؤں،کسی کو لے جانے کا ارادہ نہیں تھا،نہ کسی باراتی کو نہ کسی خادم کو۔مگر علی الصباح ۷ ربیع الثانی ۵۶ھ مطابق ۱۷ جون ۳۷ء پنجشنبہ کو حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ قدس سرہٗ اعلی اللہ مراتبہٗ اللہ بہت ہی بلند درجہ عطا فرمائے تشریف لے آئے۔میں نے عرض کیا کہ''میں اس گاڑی سے روانگی ملتوی کر دوں۔''حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ''مجھے بھی واپسی کا تقاضا نہیں،دو چار دن ٹھہرنے میں اشکال نہیں۔''لیکن چچا جان یہ تحریر فرما چکے تھے کہ ۱۰ بجے کی گاڑی سے آجانا،اسٹیشن پر سواری مل جائے گی۔یہ ناکارہ، حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ اور ان کے چند خدام حافظ عبدالعزیز صاحب،بھائی الطاف

وغیرہ کے ساتھ ریل پر پہنچا اور اسی گاڑی سے جس سے ہم لوگ سوار ہونے کا ارادہ کر رہے تھے یعنی ۱۰ بجے کی گاڑی سے حضرتِ اقدس مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ نور اللہ مرقدہٗ ٹانڈہ سے تشریف لا رہے تھے، اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ یہ سمجھے کہ حضرت کی آمد کی اطلاع مجھے ہوگئی اور میرا مستقل معمول تھا کہ جب حضرت کی آمد کی اطلاع ہوتی تو اسٹیشن پر ضرور حاضر ہوتا اور اگر حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کا سہارنپور میں قیام ہوتا تو حضرت بھی اسٹیشن پر ضرور تشریف لے جاتے۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ہم دونوں کو اسٹیشن پر دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ ''اچھا، میری اطلاع کس طرح ہوئی؟ میں نے تو تار نہیں دیا تھا، اس لیے کہ وقت تنگ رہ گیا تھا۔'' حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کا اپنی آمد پر تار دینے کا بڑا اہتمام تھا۔ حضرت کے ارشاد پر قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں، حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا کہ ''حضرت کی آمد کی اطلاع تو نہیں تھی ان حضرت کا نکاح ہو رہا ہے۔'' حضرت مدنی قدس سرہٗ نے عتاب آمیز لہجہ میں فرمایا ''اور ہمیں خبر بھی نہیں کی؟'' حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ ''حضرت میں بھی زبردستی ساتھ ہوں، انہوں نے مجھے بھی خبر نہیں کی اور ساتھ لے جانے سے صاف صاف انکار کر دیا کہ میں نہیں لے جاتا، میں نے تو جاسوس مقرر کر رکھا تھا کہ جب حضرت دہلوی کا خط آئے تو مجھے فوراً اطلاع ہو جائے۔ کل شام مجھے اطلاع ہوئی، صبح ہی حاضر ہو گیا۔''

حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ نے حضرت رائے پوری کے ہاتھ چچا جان کے پاس پیام بھیجا کہ مولوی الیاس سے کہہ دیں کہ ''نکاح میں پڑھاؤں گا، میرے بغیر نکاح نہ ہوگا، میں تو اسی گاڑی سے چلتا مگر مستورات بھی ساتھ ہیں سامان بھی ساتھ ہے ان کو اُتار کر اگلی گاڑی سے آجاؤں گا۔'' میں نے اول تو رد کیا کہ ''حضرت تکلیف نہ فرمائیں۔'' ایک ڈانٹ اور پڑی۔ ''میں آپ سے نہیں کہہ رہا ہوں، میں مولوی الیاس کے پاس پیام بھیج رہا ہوں کہ نکاح میں پڑھاؤں گا۔'' اس پر میں نے عرض کیا کہ ''حضرت پھر حرج نہ فرمائیں جب حضرت کو سہولت ہو تشریف لے آئیں۔ حضرت رائے پوری کو بھی دو چار دن نظام الدین کے قیام میں دِقت نہ ہوگی اور یہ ناکارہ بھی حضرت کا انتظار کرے گا۔'' حضرت نے فرمایا: ''اس کی ضرورت نہیں میں شام کو آجاؤں گا۔''

یہ قصہ مجھے اسی طرح بہت ہی خوب یاد ہے، کوئی اس میں تردد کسی قسم کا نہیں۔ حضرت رائے پوری کو مولوی عبدالرحمٰن شاہ پوری کا جا کر اطلاع کرنا اور حضرتِ اقدس مدنی کا دس بجے کی گاڑی سے اسٹیشن پر ملنا اور مجھے ڈانٹ۔ یہ سب باتیں خوب یاد ہیں۔

مگر میرے روزنامچے میں تھوڑا سا تغیر ملا، جس کا کوئی جوڑ سمجھ میں نہیں آتا اور مجھے نظر نہیں آتا جس سے اندازِ تحریر سے کچھ جوڑ پیدا ہوتا، میرے رجسٹر میں حضرت مدنی کا شب پنجشنبہ میں

سہارنپور آنا لکھا ہے اور صبح کو ۵ بجے سے دیوبند تشریف لے جانا اور حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق لاہور سے کلکتہ میل سے آنا اور اسی ۵ بجے کی گاڑی سے بندہ کے ساتھ جانا لکھا ہے۔ حضرت رائے پوری کا ۳ بجے آ کر ۵ بجے جانا عقل میں نہیں آتا، معلوم نہیں کہ لکھنے میں کیا اشتباہ ہوا۔

اس بات میں رجسٹر اور یاد دونوں برابر ہیں کہ دیوبند تک حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ ساتھ تشریف لے گئے اور دیوبند اُتر کر شام کی گاڑی سے دہلی تشریف لے گئے اور یہ ناکارہ اور حضرت رائے پوری دونوں اس گاڑی سے سیدھے دہلی چلے گئے۔ رجسٹر میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ مظفر نگر سے اسی گاڑی سے میرٹھ تشریف لے گئے اور شام کو وہ بھی دہلی پہنچ گئے۔ سہارنپور سے دیوبند تک حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ بہت ہی مسرت کے ساتھ تفریح فرماتے رہے اور اپنی اٹیچی کھول کر عطر اگر کی بند شیشی نکالی اور تیل کی طرح ہاتھ کی ہتھیلی پر سارا اُلٹ کر اس سیہ کار کے میلے کھدر کے کرتے پر مل دی۔ میں حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کی حیات تک ان کے خوف کے مارے ہمیشہ کھدر کا کرتا پہنتا تھا، اس لیے کہ سیہ کار پر حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ شفقت وکرم بھی تھا کہ بغیر کھدر کا کرتہ اگر میرے بدن پر دیکھتے تو فوراً بلا تکلف پھاڑ دیتے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کھدر کے میلے کرتہ پر یہ بڑھیا عطر کیوں ضائع فرما رہے ہیں۔ حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ کھدر پر عطر خوب مہکتا ہے۔ میں نے عرض کیا ع

"کَمَا ضَاعَ عِقْدٌ عَلٰی خَالِصَہ"

حضرت ہنس پڑے۔ حضرت اپنے دونوں مبارک ہاتھوں سے عطر ملتے جاتے تھے اور بار بار فرماتے تھے کہ نائی دولہا کے عطر ملا کرتا ہے، ساری شیشی ختم کر دی اور شام کی گاڑی سے دہلی پہنچ گئے، ایک غلط فہمی سے شب کو مسجد عبدالرب میں قیام ہوا اور اگلے روز جمعہ کو علی الصباح نظام الدین تشریف لے گئے اور بعد نماز جمعہ اس سیہ کار کا نکاح بمہر فاطمی پڑھا۔ زکریا نے عرض کیا کہ مہر فاطمی مجمل ہے اور مختلف فیہ بھی ہے، سکہ رائج الوقت سے اس کی تعیین فرمائی جائے۔ حضرت نے نہایت تبسم سے اور زور سے فرمایا کہ "دولہا شرمایا کرتے ہیں چپ رہو۔" میں نے عرض کیا کہ دین میں حیاء جائز نہیں ہے، یہ مسئلہ کی بات ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ پانچ سو درہم۔ میں نے کہا کہ یہ بھی مختلف فیہ ہے۔ سکہ رائج الوقت بتائیے، فرمایا کہ تقریباً ایک سو تینتیس (۱۳۳) روپے ہوتے ہیں۔ زکریا کے اس مناظرہ کو خواجہ حسن نظامی مرحوم نے اپنے کسی رسالہ میں جو اس وقت نکلتا تھا تفصیل سے لکھا ہے۔

حضرت مدنی قدس سرہٗ تو اسی وقت شام کو ۵ بجے واپس تشریف لے آئے اور ان ہی کے ساتھ حضرت میرٹھی بھی واپس تشریف لے آئے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کو دہلی کے اسٹیشن پر چھ ماہ تک

دہلی میں عدم داخلہ کا نوٹس دیا گیا اور زکریا مع اہلیہ یعنی والدۂ طلحہ اور حضرت رائے پوری مع خدام و عزیزان یوسف وانعام بارہ نفر اتوار کی صبح کو ۱۲ بجے کی گاڑی سے چل کر ساڑھے آٹھ بجے سہارنپور پہنچے اور ہم سب کا کرایہ حضرت اقدس رائے پوری نے دیا اور حضرت نے اپنی طرف سے زکریا کے ولیمہ کا اعلان فرمایا، جس کو راؤ یعقوب علی خاں نے عملی جامہ پہنایا اور حضرت میرٹھی بلا طلب ۹ بجے کی گاڑی سے ولیمہ میں شرکت کے لیے تشریف لائے۔ زکریا نے درخواست کی تھی کہ ولیمہ میں شرکت نہ فرمائیں۔

مولوی یوسف کا عقد ثانی اور حکیم الیاس کا نکاح:

(۹)، (۱۰)......عزیزم مولانا یوسف مرحوم نور اللہ مرقدۂ کا عقد ثانی ہے۔ جب مولانا مرحوم کی پہلی اہلیہ کا انتقال ہوا یعنی والدۂ ہارون کا، تو میں نے مرحوم کو شدت سے انکار کر دیا تھا کہ تم دوسرے نکاح کا ہرگز ارادہ نہ کرو، مشاغل کا ہجوم ہے تمہیں فرصت بالکل نہیں، نیز میں نے یہ بھی کہا کہ اس کے باوجود اگر تمہارا ارادہ ہو تو تم جہاں تجویز کرو دہلی یا کاندھلہ میں اس کے لیے تکمیل وتحریک کے لیے تیار ہوں۔ عزیز مرحوم نے یوں کہا کہ ''آپ کا مشورہ تو مناسب ہے لیکن اگر کسی وقت نکاح کا خیال ہوا تو کروں گا آپ ہی کی لڑکیوں میں سے کسی سے اور کسی جگہ کرنے کا ارادہ نہیں''۔ میں نے خاندان کی کئی لڑکیوں کا نام لیا، جن کے متعلق والدۂ ہارون کے انتقال کے بعد عزیزم مولانا یوسف مرحوم کے لیے میرے پاس بہت سی جگہ سے سفارشات اور تقاضے آئے تھے۔ عزیزم مرحوم نے کہہ دیا کہ اگر کرنا ہے تو آپ کے یہاں اور کہیں کرنا نہیں ہے۔ کچھ دنوں کے بعد عزیز مرحوم نے کہا کہ نکاح کی ضرورت ہے اور کرنا آپ ہی کے یہاں ہے۔ میں نے مرحوم سے کہا کہ میرے پاس اس وقت دو لڑکیاں ہیں۔ ایک بیوہ اور ایک کنواری۔ بیوہ عزیزم مولوی سعید الرحمٰن کی بیوی تھی جس کا اوپر ذکر آیا۔ عزیز مرحوم نے کہا۔ میرے لیے دونوں برابر ہیں۔ میں نے پھر اصرار سے کہا نہیں جس میں تمہیں ذرا بھی ترجیح ہو میں اس کے لیے تیار ہوں اور اگر واقعی تمہارے نزدیک دونوں برابر ہیں تو میرے نزدیک بیوہ کو ترجیح ہے، اس لیے کہ وہ غمزدہ ہے، شادی کے بعد جلدی ہی اس کے خاوند کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم نے یوں کہا کہ بہت مناسب ہے۔

نیز حکیم ایوب صاحب کے صاحبزادے حکیم الیاس کے متعلق حکیم ایوب صاحب مجھ سے کئی دفعہ کہہ چکے تھے، میں ہر دفعہ میں یہ کہتا تھا کہ تمہارے سب بچوں میں حکیم الیاس سے جتنی مجھے محبت ہے اتنی کسی سے نہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حکیم الیاس کو اللہ تعالیٰ بہت ہی جزائے خیر دے ان کو بچپن سے مجھ سے بہت محبت تھی۔ جب شادی کا ذکر تذکرہ بھی نہیں تھا اور میری دہلی کی آمد و

رفت بہت کثرت سے تھی تو حکیم الیاس اللہ بہت ان کو جزائے خیر عطا فرمائے دن اور رات میں محض اطلاع پر اسٹیشن جاتا تھا، حالانکہ میں نے کئی بار منع بھی کیا کہ محض اطلاع پر نہ آیا کرو۔

مولانا یوسف صاحب کا تو طے ہو ہی چکا تھا، ان کی نظام الدین سے آمد کا میں نے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا، مگر اتفاق سے حضرتِ اقدس رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ سہارنپور تشریف فرما تھے اور اسی وقت لکھنؤ تشریف لے جا رہے تھے، مولوی یوسف کی آمد پر حضرت قدس سرہٗ نے نکاح میں شرکت کی خواہش بھی ظاہر کی اور یہ بھی کہا کہ لکھنؤ اطلاع کر چکا ہوں اسی وقت جانا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میرے یہاں کی تقریبات کوئی ایسی موقت نہیں ہوتیں، آپ کی واپسی پر دیکھا جائے گا۔ عزیز یوسف چلا گیا۔ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی لکھنؤ سے واپسی پر جس کی اطلاع عزیز مولوی یوسف کو نظام الدین میں ہوگئی تھی وہ بھی آگئے۔ میں نے حکیم ایوب صاحب سے دوپہر کے کھانے کے بعد کہلوایا کہ عزیز یوسف کا نکاح عصر کے بعد پڑھوانے کا خیال ہے اور حکیم الیاس کے متعلق تم بہت دفعہ کہہ چکے ہو، اب تو میں نے بھی ارادہ کر ہی لیا۔ عزیز الیاس سے کہہ دیں کہ عصر کی نماز مدرسہ قدیم میں پڑھے۔ تمہیں اپنا اختیار ہے اور کسی کو اطلاع نہ کریں۔ مگر نہیں معلوم حکیم ایوب کے بڑے بھائی حکیم یامین صاحب کو کسی طرح خبر ہوگئی کہ وہ مجھ سے مخفی اس وقت ایک کار لے کر دیوبند پہنچ گئے اور حضرت مدنی قدس سرہٗ سے کہا کہ شیخ الحدیث صاحب کی دولڑکیوں کا نکاح عصر کے بعد ہو رہا ہے، اس نے تو نہیں بھیجا لیکن ان میں سے ایک کا میرے بھتیجے کے ساتھ ہے، میری درخواست ہے کہ حضرت تشریف لے چلیں۔ حضرت قدس سرہٗ کو اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجہ عطا فرمائے۔ حضرت نے فرمایا کہ شیخ الحدیث صاحب کی لڑکیوں کے نکاح کے لیے طلب کی ضرورت نہیں اور حضرت قدس سرہٗ کو اس وقت بخار بھی بڑا شدید تھا اور قاری اصغر صاحب مرحوم نے حکیم یامین صاحب پر بہت عتاب بھی فرمایا کہ تم لوگ اپنے جذبات میں حضرت کی راحت کی بالکل پرواہ نہیں کرتے مگر حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا ''میں ضرور جاؤں گا۔'' شدید بخار میں ۱۹ ربیع الثانی ۶۹ھ چہار شنبہ کو تشریف لائے اور نکاح دونوں کا پڑھا کر اسی وقت اسی کار میں تشریف لے گئے۔ ان دونوں کے ساتھ مولوی نصیر الدین کی سب سے بڑی لڑکی زبیدہ مرحومہ کا بھی حضرت نے نکاح پڑھایا۔ مولوی نصیر الدین نے سو (۱۰۰) روپے کا نوٹ بہت توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ حضرت نے گھورا اور شدت سے انکار کیا۔ میں نے عرض کیا کہ ضرور لے لیجیے۔ میں نے نصیر کے ہاتھ میں سے لے کر حضرت کی جیب میں رکھ دیا اور عرض کیا کہ بڑے موذی کا مال ہے ضرور قبول فرمالیں۔ اس پر حضرت ہنس پڑے۔

عزیز مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تو دوسرے ہی دن اپنی اہلیہ کو نظام الدین لے کر

چلے گئے، والدۂ طلحہ، والدۂ سلیمان بھی ساتھ گئیں اور عزیز مولوی نصیر الدین کی لڑکی زبیدہ مرحومہ کی رخصتی ۲۷ شعبان ہوئی۔

عزیز حکیم الیاس کے نکاح سے ایک ماہ بعد ۸ جمادی الاول یکشنبہ کو میں نے عشاء کے بعد جب سب سونے کے واسطے لیٹ گئے، اپنی بچیوں سے کہا کہ "الیاس کی گھر والی کو چائے وائے پلا دینا" میرا خیال یہ ہے کہ اذان پر میں خود پہنچا دوں گا۔" اور حکیم ایوب صاحب کے پاس آدمی بھیجا، وہ سونے کے لیے لیٹ گئے تھے، اس لیے کہ سردی کا زمانہ تھا، گیارہ بج چکے تھے، میں نے مولوی عبدالمجید مرحوم کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ "اذان کے وقت میں مولوی الیاس کی گھر والی کو لے کر آؤں گا گھر والوں سے کہہ دو کہ اذان کے وقت کوئی زنجیر کھٹکھٹائے تو نام پوچھ کر دروازہ کھول دیں، کبھی مجھے دق ہونا پڑے۔" حکیم جی کا جواب آیا کہ مجھے تو انکار نہیں مگر تجھے اس وقت دِقت ہوگی اگر اجازت دے تو میں اور الیاس ایک رکشہ لے کر اس کو لے آئیں اور کسی کو خبر نہ ہوگی۔" چنانچہ دوشنبہ کی صبح کو اذان کے بعد حکیم جی اور الیاس ایک رکشہ لے کر آگئے اور عزیزہ کو مع ایک دو عزیزوں کے جو یہاں موجود تھے لے کر چلے گئے۔ خود ان کے گھر والوں کو بھی صبح کی نماز کے بعد پتہ چلا کہ بیگم گھر میں آگئی۔ میرے ایک مخلص دوست حاجی نور الٰہی عرف شیخ بدھو پندرہ بیس دن سے روزانہ دریافت کرتے تھے کہ میرے گھر والے بہت اصرار کر رہے ہیں۔ اللہ کے واسطے میرے گھر والوں کو ضرور خبر کر دیں کسی کو کریں یا نہ کریں۔ مرحوم اس زمانے میں صبح کی چائے میرے ساتھ پیا کرتے تھے۔ میں نے صبح کی چائے میں ان سے کہہ دیا کہ "وہ تو چلی گئی، پہلے سے کہنے کا موقع نہ ہوا۔" مرحوم کو بڑا قلق ہوا، اپنے گھر جا کر کہا کہ وہ جالی اب تم شور مچاتی رہو۔

(۱۱)......اب تک ساری شادیاں میری پہلی اہلیہ مرحومہ کی اولاد کی ہوئیں دوسری اہلیہ کی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا عزیز طلحہ ہے۔ دونوں بچیوں میں سے بڑی کے متعلق حکیم ایوب صاحب نے عزیز مولوی عاقل کے متعلق کئی دفعہ تحریک کی اور میں نے وہی جواب دیا جو چچا جان نے عزیز یوسف کی ہمشیرہ کے متعلق مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہارے قابل نہیں ہیں، یہی میں نے حکیم ایوب سے دُہرایا۔ اس کے بعد ایک صاحب نے مجھ سے سفارش اور میرے ذریعہ سے اپنی بہن کا پیام عاقل کے لیے دیا، میں نے حکیم ایوب صاحب سے پیام بھی پہنچایا اور سفارش بھی زور سے کی۔ حکیم ایوب صاحب نے کہا کہ جب تک آپ کی اس بچی کا کہیں نکاح نہ ہوگا میں عزیز عاقل کا کہیں نکاح نہیں کروں گا، جب آپ کی بچی کا کہیں ہو جائے گا تو میں اس کے لیے بھی تلاش کر لوں گا۔

عزیز ہارون طلحہ وعاقل کا نکاح:

عزیز مولوی یوسف مرحوم کا عمرہ پر جانے کا خیال ہوا، انہوں نے مجھے لکھا کہ ”عمرہ پر جانا ہے، خیال یہ ہے کہ جانے سے پہلے عزیزان ہارون وطلحہ کا نکاح ہو جائے۔“ میں نے لکھ دیا جب چاہو آجاؤ اور چونکہ حضرتِ اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی طبیعت ناساز تھی اس لیے یہ تجویز ہوا کہ عزیز یوسف مرحوم کی گاڑی میں ہم سب رائے پور چلے جائیں، وہیں ان دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائے۔ ظہر کی نماز میں حکیم جی کی مسجد میں میں نے حکیم ایوب صاحب سے کہا کہ عزیزان ہارون و طلحہ کے نکاح کی تجویز ہو رہی ہے۔ ہم لوگ اس وقت رائے پور جا رہے ہیں، میرا خیال یہ ہے کہ عزیز عاقل کو بھی ساتھ لیتے جائیں۔ جب آپ کا اصرار ہے تو اس کو بھی پڑھوا دیں۔ ہم لوگ تو اسی وقت عصر سے پہلے جا رہے ہیں، خیال یہ ہے کہ عزیز عاقل کو بھی ساتھ لیتے جائیں، تمہیں تو رات کے قیام میں وہاں دِقت ہوگی، اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ تم تکلیف کر کے کیا کرو گے، تاہم اگر تمہارا آنے کا ارادہ ہو تو صبح کو میر صاحب کی گاڑی سے آجانا اور عزیزی عاقل کو تم اپنے ساتھ لے آنا اور بجائے شام کے صبح ۹ بجے نکاح پڑھا دیں گے۔ چنانچہ حکیم جی صبح کو مع عزیز عاقل، عزیز اسرائیل پہنچ گئے اور ۹ بجے حضرتِ اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کی موجودگی میں حضرت ہی کے حجرہ میں عزیز مولوی یوسف مرحوم نے تینوں کا نکاح پڑھ دیا، لیکن عزیز ہارون کے خسر مولوی اظہار صاحب نے اصرار کیا کہ ان کی خوشدامن وغیرہ سب کا مہر پانچ ہزار ہے اور عزیز طلحہ کے خسر صوفی افتخار صاحب نے کہا کہ ہمارے یہاں کا مہر مثل ڈھائی ہزار ہے، میں نے کہا کہ بھائی میری بچیوں کا مہر مثل تو حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ ”مہر فاطمی“ تجویز کر گئے ہیں، لہٰذا بیک مجلس تین نکاح تین مہروں پر ہوئے۔ حکیم ایوب صاحب تو اسی وقت واپس آ گئے۔ عزیز عاقل کو میں نے اپنے ساتھ آنے کے لیے روک لیا۔ اگلے دن ہم سب ساتھ واپس ہوئے۔

۱۸ ذی الحجہ ۸۰ھ کو مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، حافظ عبد العزیز دہلوی کی کار میں ہارون کی اہلیہ کو رخصتی کر کے نظام الدین لے گئے اور عزیز طلحہ کی رخصتی ۸۳ھ میں ہوئی، جب کہ ہم لوگوں کا سفرِ حج طے ہو گیا تھا، اس ناکارہ نے مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو لکھ دیا کہ ”جب تم سہارنپور آؤ تو راستہ سے اہلیہ عزیز طلحہ کو لیتے آنا۔“ عزیزان یوسف وانعام ۸ شوال بروز شنبہ حاجی شفیع کی کار میں عزیز طلحہ کی اہلیہ کو لانے کے واسطے کاندھلہ اُترے۔ حاجی غلام رسول صاحب کلکتہ کے پندرہ بیس نفر پنڈوہ کے تبلیغی اجتماع کی تاریخ لینے کے واسطے اسی دن دہلی پہنچنے والے تھے، جب ان کو معلوم ہوا کہ مولانا یوسف صاحب اس تاریخ میں سہارنپور ہوں گے تو سیدھے

سہارنپور پہنچ گئے اور جب یہاں آ کر معلوم ہوا کہ مولانا یوسف صاحب کاندھلہ میں ہیں تو صابری صاحب کی کار میں کاندھلہ چلے گئے۔

چند ماہ بعد ۱۱ رجب ۸۱ھ بروز چہارشنبہ عزیز مولوی یوسف مرحوم سہارنپور کے قریب سیکری کے تبلیغی اجتماع میں جانے کے لیے رائے پور ہوتے ہوئے سہارنپور پہنچے۔ حکیم ایوب صاحب نے کہا کہ اگر آپ عاقل کی اہلیہ کو آج بھیج دیں تو مولوی یوسف صاحب کو کل عاقل کے ولیمہ میں شرکت کر کے جائیں گے۔ میں نے کہا کچھ مضائقہ نہیں۔ میں نے مولوی یوسف مرحوم سے کہا کہ حکیم جی کل کو سیکری سے واپسی پر تمہیں عزیز عاقل کے ولیمہ کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس وجہ سے اپنے کسی کام کا حرج کرنا نہیں، البتہ وہاں والوں سے یہ ضرور کہہ دیں کہ کل کو ایک ولیمہ کی شرکت کا وعدہ کر کے آیا ہوں۔ اطمینان سے جب تمہیں فراغت ہو آجانا، میں تو تمہارا انتظار کروں گا اور جس کا جی چاہے تمہارا انتظار کرے یا نہ کرے۔ چنانچہ مولانا یوسف صاحب مرحوم دوسرے دن پنجشنبہ ۱۲ رجب کو عصر کی اذان کے قریب آئے، اسی وقت ہم لوگوں نے کھانا کھایا۔

اس سے پہلے چہارشنبہ کے دن عصر کے بعد حکیم ایوب صاحب آئے، ان کا ہمیشہ کا معمول عصر کے بعد آنے کا تھا، مگر وہ آ کر بیٹھ جایا کرتے تھے لیکن اُس دن وہ بجائے بیٹھنے کے کھڑے ہو گئے، میں نے کہا بیٹھنا ہو تو بیٹھ جاؤ ورنہ اُڑ جاؤ، وہ تو چلے گئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد عزیز عاقل آیا، اس سے میں نے اور بھی زیادہ تفریح کا فقرہ کہا جو شائع کرنے کے قابل نہیں، زبانی تو کہہ دیا۔

جب میں مغرب کی نماز کو جا رہا تھا میں نے عزیزان ہارون، طلحہ سے کہا کہ مجھے تو مغرب کے بعد دیر لگتی ہے تم مغرب کی نماز پڑھتے ہی ڈولی میں اپنی بہن کو حکیم جی کے یہاں پہنچا دینا۔ مغرب کے بعد محلّہ کے ایک مخلص دوست نے یہ کہا بھی کہ میں چپکے سے ڈولہ اُٹھالاؤں محلّہ میں موجود ہے مگر عزیزان ہارون وطلحہ وغیرہ نے کہا کہ شیخ ابا کو گرانی ہوگی، اس لیے یہ دونوں عزیز عاقل کی اہلیہ کو میرے مسجد سے آنے سے پہلے وہاں پہنچا کر آئے۔ اگلے دن ۱۲ رجب ۸۱ھ بروز جمعرات حکیم جی نے مختصر ولیمہ کر دیا، مگر میں نے اور حکیم جی نے عزیز یوسف مرحوم کے انتظار میں عزیز موصوف کی واپسی پر عصر کے وقت کھانا کھایا۔

عزیز سلمان کا نکاح:

(۱۴)...... میری سب سے چھوٹی بچی کا نکاح، جو دوسری اہلیہ کی دوسری بچی ہے، میری ہمشیرہ مرحومہ کے نواسے عزیزم مولوی سلمان سلمہ سے ہوا۔ خاندانی حیثیت سے اس کی منگنی تو بہت ابتداء ہی میں ہو چکی تھی۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ شاید بچی کے پیدا ہونے پر ہو چکی تھی اور مجھے یہ بھی یاد نہیں

کہ مجھ سے کسی نے پوچھا بھی ہے، اس لیے کہ یہ تو خاندان کے قانون ''اَقْرَبُ ذَکَرٍ غَیْرِ مَحْرَمٍ'' میں داخل تھا۔ مولوی انعام الحسن کی آمد پر ۲ ذیقعدہ ۸۶ھ مطابق ۱۴ فروری ۶۷ء بعد عصر مسجد قدیم میں زکریا نے اعلان کر دیا کہ ایک نکاح ہے، سب حضرات تھوڑی دیر تشریف رکھیں، اب تو اس ناکارہ کے لیے یہ کوئی چیز قابلِ التفات، قابلِ توجہ بھی نہ رہی تھی۔ مولوی انعام الحسن سلّمہٗ نے مہر فاطمی پر عصر کے بعد نکاح پڑھ دیا اور مغرب کی نماز کے بعد جب کہ یہ ناکارہ مسجد میں تھا، عزیز طلحہ و ہارون بابو جی کی کار میں حکیم جی کے ہاں پہنچا بھی آئے۔ عزیز مولوی انعام منگل کی دوپہر کو ولیمہ کھانے کے بعد کاندھلہ ہوتے ہوئے نظام الدین گئے۔

(۱۳)، (۱۴)..... میری لڑکیاں تو نمٹ گئیں، اب نواسوں کا نمبر شروع ہوا، اگرچہ ایک نواسہ عزیز ہارون کا نمبر ۱۱ کے تحت گزر چکا۔

عزیزان شاہد و زبیر کا نکاح:

شوال ۸۸ھ میں عزیزان مولوی انعام، ہارون وغیرہ کا تو تبلیغی قانون کے موافق کہ ہر تیسرے سال حج کو جانا ہے، سفرِ حج متعین تھا اور اس ناکارہ کے حج کا مسئلہ ہمیشہ ہی بیم و رجاء میں رہتا ہے۔ اللہ کا لطف و احسان، فضل و کرم اور اور حرمین کے اعزہ و احباب کا اصرار ہمیشہ حاضری پر زور دیتا رہتا ہے اور میری بداعمالیاں، سیئات مانع بنتی رہتی ہیں، اس وقت بھی میرے حج کا مسئلہ بیم و رجاء میں تھا۔ عزیز مولوی انعام نے مجھے دہلی سے لکھا کہ اگر آپ کا ارادہ سفرِ حجاز کو ہو گیا ہو تو عزیزان زبیر، شاہد کا نکاح پڑھاتے آئیں، میری شرکت کی وجہ سے تاخیر نہ کریں، آپ کی شرکت میری شرکت کا نعم البدل ہے۔ لیکن اس وقت تک اس سیہ کار کا سفر پختہ نہ ہو سکا تھا اور بعد میں خود مولانا انعام الحسن صاحب نے نظام الدین کی بعض ضروریات کی بناء پر میرا سفر ملتوی فرما دیا تھا اور علی میاں بھی میرے سفر کے التواء میں اور یہاں کی ضروریات میں مولانا انعام الحسن صاحب کے ہمنوا تھے۔ اس ناکارہ کا سفر ملتوی ہو گیا تو مولانا انعام الحسن صاحب الوداع کے لیے تشریف لائے، ان کی آمد پر حکیم ایوب صاحب کی رائے ہوئی۔ دار الطلبہ جدید کے دار الحدیث کا افتتاح بھی اس وقت ہو جائے۔ چنانچہ ۲۵ شوال ۸۸ھ یوم چہار شنبہ کی صبح کو اول اس سیہ کار نے بخاری شریف کا سبق شروع کرایا، جس کی تجویز تو پہلے سے مولانا یونس صاحب کے متعلق ہو چکی تھی مگر ان کا بھی اصرار تھا کہ بسم اللہ یہ ناکارہ کراتا جائے۔ چنانچہ بخاری شریف کی بسم اللہ کے بعد عزیز مولوی انعام سلّمہٗ نے دونوں نواسوں کا نکاح دونوں نواسیوں کی بہنوں سے ''مہر فاطمی'' پر پڑھ دیا۔ خیال تو یہ تھا کہ رخصت بھی اسی وقت کرا دیں، مگر دونوں طلب علم میں مشغول تھے، مولوی انعام صاحب

کا ہوا کہ مبادا رخصتی تعلیم میں حارج ہو۔ میں نے تو کہا بھی کہ تمہارا اور عزیز یوسف مرحوم کا تو طالب علمی میں نکاح ہوا اور طالب علمی ہی کے زمانے میں رخصتی ہوئی تھی۔ مگر عزیز مولوی انعام الحسن سلّمہٗ نے یوں کہا کہ دور بدل گیا اور صحیح کہا۔

نکاح کی عجلت بھی ان عزیزوں اور دوستوں کو اس خیال سے تھی کہ اس ناکارہ کی امراض کی کثرت اوا اور راعذار کی وجہ سے حجاز سے واپسی کی نوبت نہ آئے۔ شادیاں تو اللہ کے لطف و کرم سے، اس کے فضل واحسان سے ساری ایسی سہولت اور آسانی کے ساتھ ہوئیں کہ اللہ تعالیٰ دوستوں کو بھی نصیب فرمائے، جہیز کا قصہ کسی کے ساتھ پیدا نہ ہوا۔

حکیم الیاس سلّمہٗ کو میں نے شادی کے بہت دنوں بعد کہا تھا کہ ہمارے یہاں پیالے بہت جلدی گم ہو جاتے ہیں اور مہمانوں کے لیے اکثر ضرورت ہوتی ہے، بار بار منگاتا ہوں، پھر کھوئے جاتے ہیں۔ تو جہیز کے نام سے پندرہ بیس خرید کر اپنے گھر رکھ لے، وہ ملک تو تیری اہلیہ کی ہے اور کام میرے مہمانوں کے آئیں گے۔ چنانچہ عزیز موصوف کے یہاں وہ پیالے اس کی شادی کے بعد سے رکھے ہوئے ہیں۔ بہت معمولی قسم کے، جو اس سے زیادہ میرے کام آتے ہیں۔ اکثر مہمانوں کے موقع پر عزیز موصوف کھانے کے وقت تو ہوتا ہی ہے جب پیالوں میں کھانے کی کوئی چیز کہیں سے آجاتی ہے تو عزیز موصوف خود ہی پیالے لے آتا ہے اور لے جاتا ہے یا میں آدمی بھیج دیتا ہوں۔

البتہ جہیز کے سلسلے میں ایک نہایت قابلِ فخر چیز میری سب بچیوں کے لیے یہ ہے کہ ان سب کے جہیز کے لحاف بچھونا میں نے ضرور دیا اور بہت عمدہ دیا، لیکن یہ بھی اللہ کا ایک احسان ابتداءً اور حضرت مولانا الحاج شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا احسانِ عظیم ثانیاً جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت قدس سرہٗ ہر سال یا دوسرے سال ایک نہایت ہی نفیس اعلیٰ قسم کا لحاف، بچھونا اس ناکارہ کو مرحمت فرماتے تھے اور حضرت کا اصرار شدید ہوتا تھا کہ میں اس کو استعمال کروں، مگر چونکہ وہ اعلیٰ قسم کا ہوتا تھا میرے استعمال کے قابل نہیں ہوتا تھا، اس لیے میں اس کو نہایت مضبوط رسی سے ترپال میں باندھ کر اپنے کمرے کے سامنے لٹکا دیتا تھا اور جب کسی لڑکی کی شادی ہوتی تھی تو اس وقت تو نہیں، اس سے ایک دو ماہ پہلے یا اس کے ایک دو ماہ بعد اس کے حوالے کرتا تھا، یہ بھی ایک عجیب قدرت کا کرشمہ ہے۔ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے اپنی طالب علمی کے قصے بہت ہی سنائے۔ نیز اپنی رائے پور کی ابتدائی حاضری کا بھی۔

حضرت قدس سرہٗ نے کئی مرتبہ یہ قصہ بھی سنایا۔ شاید یہ قصہ میری کسی تحریر میں آچکا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں ایک سال سردی کا ایسا گزرا کہ سردی سے بچاؤ کا کوئی کپڑا لحاف، بچھونا، کملی،

رضائی وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ کسی سے اظہار کی غیرت نے اجازت نہ دی، مغرب کے بعد سے کتاب لے کر جس مسجد کے اندر قیام تھا اس کے حمام کے سامنے بیٹھ جاتا، لوگ سمجھتے کہ بعض آدمیوں کو آگ سے سینکنے کا مرض ہوتا ہے۔ اس کو بھی سینکنے کا شوق ہے جب سب نمازی چلے جاتے، مسجد کا کواڑ لگا کر مسجد کے کونے میں صف پر لیٹ کر اور صف کو ہاتھ سے پکڑ کر کروٹیں لیتا ہوا دوسرے کونے پر چلا جاتا۔ وہ صف ساری مجھ سے لپٹ جاتی، وہی اوڑھنا تھا اور وہی بچھونا تھا۔ سر کی طرف سے اور پاؤں کی طرف سے رات بھر خوب ہوا آتی۔ جب اخیر شب ہوتی تو اسی صف کے کروٹیں بدلتے بدلتے دوسری طرف آجاتا، صف ساری بچھ جاتی۔ حضرت نے کئی دفعہ ارشاد فرمایا کہ حضرت وہ سردی تو گزر گئی۔ لیکن اس کے بعد سے کوئی سردی ایسی نہیں گزری جس میں ایک عمدہ لحاف، بچھونا اللہ کی طرف سے عطا نہ ہوا ہو۔ یہی وہ لحاف بچھونے تھے جو اکثر اس سیہ کار کو مرحمت فرمادیتے، زیادہ خوبصورت ہوتا تو اس سیہ کار کو مرحمت فرمادیتے، کم درجہ کا ہوتا تو کسی اور کو یا اپنے استعمال میں ضرورت ہوتی تو لے آتے، یہ چونکہ بہت عمدہ مخمل کا یا اطلس کا ہوتا تھا، اس لیے میں اس کو احتیاط سے رکھوا دیتا۔ میری سب سے چھوٹی بچی تک بڑی دو لڑکیوں سے لے کر حضرت قدس سرہٗ کے لحاف بچھونے جہیز کے نام سے دیے گئے۔

جہیز میں بقدر ضرورت برتنوں کے دینے میں تو خلاف نہیں اگر واقعی ضرورت ہو اور زیور کا دینا پسندیدہ بشرطیکہ ایسا ہو کہ اس میں مالیت تو زیادہ ہو اور گھڑائی بہت کم ہو، تا کہ ضرورت کے وقت بچیوں کے کام آسکے اور اپنی ہمت کے موافق ضرور دیا جائے۔

زیور ضرور دیا جائے، کپڑوں کی مخالفت:

البتہ جہیز بَری کے کپڑوں کا بہت مخالف ہوں کہ وہ عمدہ عمدہ قیمتی جوڑے اس قابل تو ہوتے نہیں کہ گھر میں پہن لیے جائیں، صندقوں کی زینت ہو کر گلتے ہیں یا خدانخواستہ موت کا حادثہ پیش آجائے تو مدرسہ میں داخل ہو کر معمولی داموں میں نیلام ہوتے ہیں۔ اگر ایک دو جوڑا اگر قیمتی بھی بنالیا جائے تب بھی کچھ مضائقہ نہیں کہ وہ کہیں جانے آنے میں استعمال ہوسکتا ہے، لیکن بہت سے قیمتی جوڑے اسراف اور اضاعتِ مال کے سوا کچھ نہیں۔ اس سلسلے کے درمیان آپ بیتی نمبر۱ صفحہ نمبر۲۴ (بالکل شروع کے واقعات میں واقعہ نمبر۹ کے آخر میں ہے) پر بھی کچھ لکھ چکا ہوں۔ اس سے اس قدر نفرت ہوگئی ہے کہ بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔

میرے بچپن میں ایک چیز ''سراسری'' کے نام سے مشہور تھی۔ وہ اس قدر لغو چیز تھی کہ حد نہیں۔

ایک اوڑھنے کی چادر ہوتی تھی جس پر مختلف قسم کے موتی چھوٹے چھوٹے بھی اور بادام کے برابر بڑے بڑے بھی اور اس سے بڑے بھی جیسے نادیہ نیل کے اوپر کوڑیوں والی چادر ہوتی ہے، اتنے جمے رہتے تھے کہ لَا تُعَدُّ وَلَا تُحصیٰ اور درمیان میں گوٹہ کی اور گھوکھرو کی انواع اتنی زیادہ کہ کپڑا کسی جگہ سے نظر نہیں آتا تھا اور عروس کے لیے یہ ایک عذاب عظیم تھا۔ اس لیے میرا اندازہ یہ ہے کہ اس کا وزن ایک دھڑی سے کسی حال کم نہ تھا، بچی پر جب اوڑھایا جاتا تھا تو وہ غریب پسینہ پسینہ ہوکر سارے کپڑے بھیگ جاتے تھے۔ جب کسی لڑکی کی شادی ہوتی تو وہ سراسری پانچ چھ دن کے لیے مانگ لی جاتی۔ وہ تو ایک مصیبت تھی لیکن اس کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ خیال رہا کہ، اگر ایک عمدہ لباس فاخرہ خاندان میں بنا کر رکھ لیا جائے اور جہاں کہیں شادی ہو وہ آٹھ دس دن کے لیے مانگ کر دے دیا جائے تو بہت اچھا ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ حدیث پاک سے بھی یہ چیز مستنبط ہوتی ہے۔ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بخاری شریف میں درمیان میں ''باب استعارۃ الثیاب للعروس وغیرھا'' ایک مستقل باب باندھ کر میرے اسی مضمون کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ شادی میں اگر دلہن کے لیے کوئی کپڑا وغیرہ مانگ لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس باب کے اندر امام بخاری رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک سفر میں اپنی بہن کا ہار مانگ کر لے جانا ذکر ہے۔ اس سے زیادہ واضح دوسرا باب کتاب الہبہ میں باندھا ''باب الاستعارۃ للعروس عند البناء'' (دلہن کے واسطے رخصتی کے وقت کپڑے کا مانگ لینا) اور اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک قصہ نقل کیا ہے، وہ فرماتی ہیں کہ ''میری اس لونڈیا کو دیکھو یہ اس کرتے کو اپنے گھر کے اندر پہننے سے بھی انکار کرتی ہے، (یوں کہتی ہے کہ میں نہیں پہنتی، یعنی ناک چڑھاتی ہے۔) حالانکہ میرے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسی قسم کا ایک کرتہ تھا، مدینہ میں جب کسی عورت کی شادی ہوتی میرے پاس آدمی آتا کہ دو چار دن کو اپنا کرتہ دے دو۔'' فقط............ میں نے جب یہ حدیث بخاری شریف میں پڑھی تھی اس وقت سے بڑا ہی لطف آ رہا ہے۔

اگر ایک مشترک لباس نہ ہو تو کم از کم شادی کے وقت اپنی گھر کی شادی شدہ بہنیں اپنی بہن کو نئی شادی کے لیے ایک نیا کرتہ چندروز مانگا دے دیں تو کیا اشکال ہے؟ اسی طرح سے زیور بھی۔

زیور سے تو مجھے سابقہ پڑا ہے کہ جس لڑکی کی رخصتی فوری طور پر ہوئی ذرا سا اشارہ اس کی بہنوں کی طرف کر دیا اور انہوں نے میرے اشارے سے بھی آگے بڑھ کر اپنا اپنا زیور پہنا دیا اور مہینوں خبر نہ لی۔ جب اس کا بن گیا واپس لے لیا۔ اگر آپس کے تعلقات اچھے ہوں، محبت ہو، اخلاص ہو، ساری چیزیں آسان ہیں۔ شادی تو خوب آسان ہے، جس کو آج کل لوگوں نے بہت ہی مصیبت عظمیٰ بنا دیا۔

شادی کی دعوت سے نفرت:

اور جہیز بَری سے زیادہ شادیوں کی دعوت سے بھی مجھے نفرت ہے۔ اس ناکارہ کے یہاں دیکھنے والوں کو سب ہی کو معلوم ہے کہ مہمانوں کا ہجوم بعض اوقات دو سو ڈھائی سو تک ضرور پہنچ جاتا ہے، بلکہ بعض مرتبہ تو دس بارہ دیگوں کی نوبت بھی پکنے کی آئی۔ لیکن شادیوں کی مد میں ایک دفعہ بھی مجھے یاد نہیں کہ کوئی ایک دیگ پکوائی ہو۔

اور شادیوں کی دعوت میں ایک مصیبت عظمیٰ یہ ہے کہ اگر ایک کو بلایا تو دوسرا خفا ہو جائے گا اور اس کو بلایا تو پھر تیسرا خفا ہو جائے گا۔ کہیں تو مجبوری کی وجہ سے نام بڑھتے ہیں اور کہیں ناموری کی وجہ سے اور جو شروع ہی میں ناک کٹوا لے جو واقع میں تو کٹے گی نہیں تو پھر نہ تو قرض لینا پڑے اور نہ سود دینا پڑے۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ جب کوئی یہ کہے کہ تم نے دعوت نہ کر کے اپنی ناک کٹوالی، تو اس کے جواب میں یہ کہہ دے کہ میری تو کٹی نہیں۔

......☆☆☆☆☆......

جس میں
شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا مہاجر مدنی قدس سرہٗ
کے تحدیث بالنعمۃ کے طور بعض اہم واقعات حضرت
گنگوہیؒ و دیگر اکابر مشائخ کی خصوصی شفقتیں حجاز مقدس
کے اسفار ۱۳۸۹ھ تک کے حالات اور اس دوران کے
حجوں کی تفصیل مذکور ہے

ناشر
مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ، شاہ فیصل کالونی نمبر ۴ کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ ط

جیسا کہ آپ بیتی نمبر۳ کی ابتداء میں گزر چکا کہ اِس کے ہر حصہ میں دو باب تجویز ہیں، اس کے پہلے باب میں تحدیث بالنعمۃ کے طور پر اکابر کی شفقتوں کا مختصر حال، حضرتِ گنگوہی، حضرتِ سہارنپوری، حضرتِ اقدس رائپوری شاہ عبدالرحیم صاحب، حکیم الامت حضرتِ تھانوی، حضرت شیخ الاسلام مدنی، حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری، والد صاحب اور چچا جان نور اللہ مراقدہم کے بھی چند واقعات آ گئے ہیں، اس لیے کہ ان دونوں کے حالات کے لیے تو بڑا دفتر چاہیے۔

اور دوسرے باب میں اس سیہ کار کے حجازِ مقدس کے اسفار کی تفاصیل، سفر کا زمانہ، ابتداء اور انتہا اور دورانِ سفر کے چند واقعات جو تحدیث بالنعمۃ سے تعلق رکھتے ہیں درج کیے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان واقعات کو دوستوں کے لیے خیر و برکت کا سبب بنا دے کسی فتنہ کا سبب نہ بنائے۔

محمد زکریا کاندھلوی

۶ جمادی الثانی ۱۳۹۱ھ

باب پنجم

التحدیث بالنعمة

"اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ"

پہلا دور قطب عالم حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ:

اپنے ابتدائی دور کے بہت سے حالات اور اللہ جل شانہٗ کے انعامات واحسانات کا کچھ بیان باب دوم کی ابتداء میں گزر چکا، پہلے یہ لکھ چکا ہوں کہ یہ ناکارہ ڈھائی برس کی عمر میں کاندھلہ سے گنگوہ گیا اور حضرت قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ کا دور تھا اور حضرت قدس سرہٗ کی اس ناکارہ کے والد پر بہت ہی توجہ اور خصوصی نظر تھی خادم خاص اور کاتب خطوط اور شریک حجرہ تھے، اس لیے حضرت کے خدام میں ہر شخص انتہائی شفقت سے پیش آتا، خانقاہ سے باہر ایک مٹھائی کی دکان تھی، ابواس دوکاندار کا نام تھا، اس نے گویا بیٹا بنا رکھا تھا۔ جب میں مولانا سیّد احمد صاحب کی گردن پر سوار ادھر کو گزرتا وہ بیٹا بیٹا کہہ کر اپنی دکان سے بھاگتا اور دو تین مٹھائی کی ڈلیاں میرے ہاتھ پر رکھتا، میرے ہاتھ سے تو وہ سنبھلتی بھی نہ تھیں۔ حضرت مولانا سید احمد صاحب قدس سرہٗ اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور اپنے مونڈھے کے اوپر کو چلتے چلتے مجھے کھلا بھی دیتے۔ گنگوہ میں ہر ہفتہ پینٹھ لگتی تھی جو اَب بھی لگتی ہے۔ اس میں دور دور کے دکاندار حضرت قدس سرہٗ کی زیارت کے اشتیاق میں اپنی اپنی دکانیں لے کر آیا کرتے تھے۔ بڑوت کے ایک مخلص حضرت گنگوہی کے جاں نثار خادم حاجی مولا بخش ان کی جوتوں کی دکان تھی۔ ہر ہفتہ تشریف لاتے اور بہت اصرار کرتے کہ مجھے ایک جوڑا جوتے کا دے جائیں اور جب پہلا جوتا صحیح وسالم ہوتا تو ابا جان انکار فرما دیا کرتے تھے۔ اس مجبوری کو مجھے اگلے ہفتہ اس کو چاقو سے کاٹنا پڑتا تھا اور پانی میں بھگونا پڑتا تھا۔

اس سیہ کار نے مشائخ کے پانچ دور دیکھے اور ہر دور کے اکابر ومشائخ اس سیہ کار کی ناپاکی اور گندگی کو ملاحظہ کرتے ہوئے بھی اپنی شفقتوں میں اضافہ ہی فرماتے رہے، سب سے پہلا دور حضرت قطب عالم حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا ہے دوسرا دور ان کے اجل خلفاء حضرت سہارنپوری، حضرت شیخ الہند، اعلیٰ حضرت رائپوری کا، تیسرا دور چچا جان اور ان کے معاصرین کا، چوتھا دور حضرت مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے معاصرین کا، پانچواں دور حضرت مولانا

انعام الحسن صاحب زاد مجدہم کا دیکھ رہا ہوں مدرسہ کی نظامت کے بھی چار دور مجھ پر گزر گئے، سب سے پہلا دور حضرت اقدس قدس سرہ کا، دوسرا حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کا، تیسرا حضرت مولانا اسعداللہ صاحب زاد مجدہم کا اور چوتھا دور قاری مظفر حسین صاحب کا دیکھ رہا ہوں اور چار ہی دور خانقاہوں کے دیکھے سب سے پہلے اعلیٰ حضرت قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ کی خانقاہ کا دور دیکھا، جس کی لذت اپنے بچپن کے باوجود اب تک دل و دماغ میں ہے، اس کے بعد بڑے حضرت رائپوری قدس سرہٗ کی خانقاہ کا دیکھا۔ اس کے بعد حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کی خانقاہ کا دور دیکھا، اس کے بعد دوسرے حضرت رائپوری قدس سرہٗ کی خانقاہ کا دور دیکھا اور ان سب سے پہلے خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کا دور دیکھا تو نہیں مگر جناب الحاج حکیم ضیاء الدین صاحب خلیفہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید قدس سرہٗ نے تفاصیل اس خانقاہ کی لکھی ہیں اس سے اس کا منظر سامنے آ گیا، مگر افسوس کہ اب ساری خانقاہیں خاموش ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے کوئی سی خانقاہ کو آباد کر دے تو اس کے کرم سے کچھ بعید نہیں۔

دونوں دور کے مشائخ واکابر نے خواہ تصوف کے ہوں یا نظامت کے ہوں ہمیشہ ہی شفقتیں اور محبتیں فرمائیں، کس کس کے حالات اور شفقتیں لکھواؤں، اکابر مشائخ کے چند اہم واقعات لکھوا رہا ہوں لیکن ایک ضروری بات کے اوپر بہت ہی اہتمام سے متنبہ کرنا چاہتا ہوں بہت ہی اہم بات ہے، اکابر کے وصال کے بعد یا یہ کہیے کہ ہر شیخ کے انتقال کے بعد بہت سے لوگ ان کے بعد والوں میں وہ صفات دیکھنا چاہتے ہیں جو شیخ نور اللہ مرقدہٗ میں تھیں اور یہ ظاہر بات ہے کہ ہر بعد والا پہلے سے کچھ نہ کچھ کم ہی ہوگا۔ الا ماشاء اللہ۔ جو لوگ جانے والے بزرگ کی صفات بعد والے میں نہ دیکھ کر ان سے رجوع میں پہلو تہی کرتے ہیں، وہ حقیقت میں اپنا بڑا نقصان کرتے ہیں۔ میں نے اس بات کو بہت ہی غور سے حضرت قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ کے زمانے سے دیکھنا شروع کیا ہے۔ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے اجل خلفاء کے دور میں بہت معاصرین کو دیکھا جو حضرت قطب عالم سے بیعت تھے اور ان خلفاء کے معاصر تھے۔ وہ یہ بات دیکھ کر کہ حضرت گنگوہی والی بات ان حضرات میں نہیں ہے رجوع نہ کر سکے۔ اس کا مجھے بہت ہی قلق رہا کیونکہ وہ میری نگاہ میں اقرب الی النسبت بلکہ صاحب نسبت بھی تھے۔ اگر وہ ان اجل خلفاء میں سے کسی کی طرف رجوع کرتے تو بہت آگے نسبت ہوتی اسی طرح ان اجل خلفاء کے بعد تیسری پشت والوں میں بھی بہت دیکھے۔ تیسری پشت والوں کو تو میں نے بہت سمجھایا بھی۔ چچا جان قدس سرہٗ کے بعد عزیز مولوی یوسف کے متعلق بہت سے لوگوں نے مجھ سے یہ شکایت کی کہ ''حضرت جی'' میں حضرت دہلوی والی بات نہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ تم نے سچ کہا۔ مگر حضرت دہلوی میں حضرت

سہارنپوری والی بات ہم نے نہیں دیکھی۔ میں نے ان لوگوں سے بہت کثرت سے اور عزیزی مولانا یوسف صاحب کے بعد ان پانچوں پشت والوں سے بہت یہ کہا اور میرے نزدیک یہ بہت قابل غور بات ہے کہ یہ تم نے سچ کہا کہ مولانا محمد یوسف صاحب میں وہ بات نہیں جو چچا جان قدس سرہٗ میں تھی۔ مگر تم ان کے معاصرین پر نگاہ ڈالوگے تو تم ان کے بعد والوں میں وہ بات نہیں پاؤ گے۔ جو عزیز مولوی یوسف میں ہے۔ اب عزیز مولانا انعام الحسن کے دور میں بکثرت یہ فقرے سنتا ہوں کہ حضرت مولانا یوسف صاحب والی بات نہیں تو میں کہا کرتا ہوں کہ میرے دوستو! بعد میں یہ بات بھی نہیں ملنے کی۔ جو مولانا انعام الحسن صاحب میں ہے۔ جانے والا تو ہٹ کر آتا نہیں۔ لیکن اس تو ہم سے کہ موجودین میں وہ بات نہیں جو جانے والوں میں تھی ان سے نفع حاصل نہ کرنا اپنے کو نقصان پہنچانا ہے۔ میں نے اپنے والد صاحب سے اپنے بچپن میں بار بار ایک فقرہ سنا اور اپنے دور میں اس کا خوب مشاہدہ کیا وہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ معلوم نہیں ایک رمضان میں کیا تغیر ہو جاتا ہے کہ دو سال کے دورہ والوں میں زمین آسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔ ان کی زبان مبارک سے تو یہ لفظ بار بار سنا اور اپنے پچاس سالہ تدریسِ حدیث کے دور میں خود مشاہدہ بھی کر لیا۔ حدیث کے پڑھانے کے ابتدائی دور میں بعض بعض طلبہ ایسے اچھے اشکالات کیا کرتے تھے کہ جی خوش ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن انتہا میں بعض دفعہ تقریر کرتے ہوئے تقریر کو درمیان میں اس وجہ چھوڑنا پڑتا تھا کہ مخاطبین میں سے کوئی اس کو سمجھ نہیں رہا تھا۔ بہر حال اس وقت تو مجھے اکابر کے سلسلہ کے چند واقعات اپنی شفقتوں کے دکھلانے ہیں۔

(۱)......سب سے پہلا دور حضرت قطب عالم قطب الاقطاب حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہٗ کا تھا۔ میری عمر ڈھائی برس کی تھی جب گنگوہ حاضر ہوا اور آٹھ برس کی تھی جب حضرت قدس سرہٗ کا وصال ہوا، شعور تو اب تک بھی نصیب نہ ہوا مگر وہ تو عرف میں بھی بے شعوری کا زمانہ تھا، اس بے شعوری اور بے تمیزی کے زمانے میں بھی اپنی چند حماقتیں ضرور یاد ہیں، سب سے پہلی تو یہ کہ حضرت قدس سرہٗ چار زانو تشریف فرما ہوتے اور یہ بے ادب بدتمیز گستاخ حضرت قدس سرہٗ کے دونوں گھٹنوں پر ایک ایک پاؤں رکھ کر حضرت قدس سرہٗ کی گردن میں ہاتھ ڈال کر لپٹ کر کھڑا ہو جاتا تھا، اب جب خیال آتا ہے تو دھڑ دھڑی آجاتی ہے کہ میرے کپڑوں میں سے کتنی بدبو حضرت کو آتی ہوگی اور کتنی تکلیف حضرت کو پہنچی ہوگی۔

یہ بھی خوب یاد ہے کہ حضرت قدس سرہٗ کی معیت میں حضرت کے ساتھ کھانا کھانے کی کئی دفعہ نوبت آئی اور حضرت کو چونکہ نزول آب ہو چکا تھا اس لیے حضرت قدس سرہٗ تو بہت آہستہ آہستہ نوش فرماتے اور مجھے اس عمر میں جو بدتمیزی کرنی چاہیے تھی وہ کیا بیان کروں۔ البتہ چونکہ حضرت

قدس سرہٗ کی صاحبزادی جناب الحاج حافظ محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی والدہ ماجدہ برابر کھڑی ہوا کرتی تھیں اوران کے بارعب چہرے سے میں ڈرا کرتا تھا۔ اس لیے جب وہ ادھر اُدھر ہوتیں تو جلدی سے دست درازی کیا کرتا تھا۔ لیکن بعد میں بڑے ہوکر حضرت صاحبزادی صاحبہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی براہِ راست جو شفقتیں ہوئیں وہ بھی لا تعد و لا تحصیٰ ہیں۔ شاید ایک دو واقعہ کہیں لکھوادوں۔ یہ میں باب دوم میں لکھوا چکا ہوں کہ جب میں حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ شریک نہ ہوتا تو ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اوران کی اہلیہ محترمہ میرے لیے پلاؤ خاص طور سے رکھا کرتی تھیں۔

یہ بھی خوب یاد ہے کہ حضرت قدس سرہٗ کو امرودوں کا بہت شوق تھا اور چونکہ دانت نہیں تھے، اس لیے حضرت مولانا سید احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ۔ حضرت قدس سرہٗ کے لیے ایسی باریک درقیاں امرودوں کی کاٹتے جیسے پتنگ کا کاغذ ہوتا ہے۔ بڑی ہی مہارت تھی۔ حضرت قدس سرہٗ کے سامنے سے جو کچھ بچتا اس کا واحد وارث میں ہی تھا۔ اس کے علاوہ حضرت کی چارپائی کے نیچے پھل مٹھائی وغیرہ کی ٹوکریاں اور ہنڈیاں رکھی رہا کرتیں ان پر بھی چوری سے نہیں اگر غصب سے کہوں تو بے محل بھی نہیں بہر حال غاصبانہ تصرف میرا ہی ہوتا تھا۔ غصب میں نے اس لیے کہا کہ میرے والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ اگر دیکھتے تو گھورتے اور مجھے جھڑک بھی دیتے تھے۔ لیکن حضرت مولانا سید احمد صاحب جو حضرت قدس سرہٗ کی اس قسم کی چیزوں کے منتظم تھے ان کی طرف سے اذن عام تھا بلکہ والد صاحب کے گھورنے یا جھڑکنے پر میں اگر اس چیز کو واپس ڈال دیتا اور وہ دیکھ لیتے تو اٹھا کر چپکے سے اور کبھی ان کے سامنے بھی مجھے دے دیتے، حضرت قدس سرہٗ کے یہاں عام معمول چائے کا مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ تھا یا نہیں، لیکن یاد پڑتا ہے کہ کبھی کبھی دو حصہ دودھ اور ایک حصہ چائے کی ایک چھوٹی پیالی ہوتی تھی، البتہ صبح کے وقت میں دو تین بیضوں کا نیم برشت ایک تکیہ بنا کرتا تھا۔ وہ بہت ہی عجیب چیز ہوا کرتی تھی اور بہت اہتمام سے بنا کرتا تھا۔ مولانا مرحوم تین بیضوں کو تقریباً آدھ گھنٹہ پھرکی سے اس قدر پھینٹتے کہ وہ پھول کر بڑا پیالہ ہو جاتا۔ پھر اس کو پکتے ہوئے گھی میں فرائی پان میں ڈالتے جس سے وہ بلا مبالغہ پھول کر ایک چھوٹے نان کے برابر ہو جاتا۔ پھر جلدی جلدی اس کو بسترے کی طرح لپیٹتے جس سے وہ گاؤ تکیہ معلوم ہونے لگتا جو اندر کی طرف سے تو بالکل کچا اور اوپر سے چلّی کی طرح پکا ہوا۔ بہت ہی لذیذ ہوتا۔ اس میں سے ایک دو چمچہ تو حضرت قدس سرہٗ نوش فرمایا کرتے تھے۔ باقی وہ سارا گاؤ تکیہ اس حقیر فقیر زاہد عن الدنیا کے حوالہ ہو جاتا۔ اکابر میں کوئی ہوتا تو ایک دو چمچہ بطور تبرک ان کی خدمت میں بھی پیش کیا جاتا۔ حضرت قدس سرہٗ کو ٹھنڈے پانی کا بڑا اہتمام اور شوق تھا۔ گرمیوں میں حضرت کے لیے بعد ظہر

اولے کا شربت شورۂ قلمی میں ٹھنڈا کیا جاتا۔ پندرہ بیس منٹ تک حضرت مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدۂ المونیم کے ڈبوں میں اس کو ٹھنڈا کیا کرتے تھے اندر کے بند ڈبے میں شربت ہوتا اور باہر کے کھلے ڈبے میں شورہ وہ پندرہ بیس منٹ تک اس کو گھماتے جس سے وہ برف سا ہو جاتا، وہ اندر کے بند ڈبہ کو بالکل صاف کر کے کہ کہیں اس کے اندر اثر نہ رہ جائے گلاس میں حضرت قدس سرہٗ کو پلانے کے لیے نکالتے اور باہر حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں پیش کرنے کو لے جاتے اور ایک چوتھائی کے قریب اس ڈبہ میں خاص طور سے اس سیہ کار کے لیے بھی چھوڑ جاتے، حضرت قدس سرہٗ کے گلاس میں جتنا بچتا اسی میں میرا اولا حصہ ملا کر مجھے مرحمت فرما دیتے۔

ایک دفعہ حماقت سوار ہوئی، مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ تو حضرت قدس سرہٗ کو پلانے باہر تشریف لے گئے اور اس حریص اور لالچی نے ان کے آنے سے پہلے ہی شورہ سے وہ ڈبہ نکال کر منہ کو لگایا، اندر کا شربت تو دیر میں پہنچا اور باہر جو شورہ تھا وہ سب سے پہلے منہ کو لگ گیا۔ جس سے سارا منہ کڑوا اور خراب ہو گیا کہ تھوکتا تھوکتا تھک گیا۔ اتنے میں مولانا تشریف لے آئے۔ میری حالت دیکھ کر ڈانٹا کہ ایسی کیا گھبراہٹ تھی میں تو آ ہی رہا تھا کئی مرتبہ کلی کرائی پھر وہ بقیہ شربت پلایا۔ اس سیہ کار نابکار نے جملہ مشائخ کے یہاں سے مادی مال ہی کھائے اور اپنی بد اعمالیوں سے روحانی کچھ نہ کھایا۔

اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نور اللہ مرقدۂ اعلی اللہ مراتبہٗ کی ہمرکابی میں عیدگاہ جانا بھی خوب یاد ہے، ایک پالکی میں سرہانے کی طرف حضرت قدس سرہٗ ہوتے اور دوسری طرف (یعنی پاؤں کی جانب) یہ سیہ کار بیٹھا ہوا کرتا اور بڑے بڑے مشائخ درس، اکابر، صوفیا، محدثین اس کو اُٹھانے والے ہوتے۔ دس بارہ آگے ہوتے دس بارہ پیچھے اور دو سو ڈھائی سو کا مجمع اِدھر اُدھر، تشبیہ تو اچھی ہے نہیں مگر کوئی اور لفظ سمجھ میں نہیں آیا کہ جنازہ کی طرح سے ایسی جلدی جلدی کندھا بدلتے کہ میں بیٹھا اس منظر کی سیر کیا کرتا تھا۔ خانقاہ سے عیدگاہ تک نہایت آہستہ خراماں خراماں وہ پالکی چلتی اور ہر شخص کو تمنا ہوتی کہ مجھے بار بار یہ سعادت ملے ہمت والے نوجوان تو دو دو بار نمبر لگا لیتے جس کو میں دیکھتا رہتا اور ضعفاء ایک آدھ ہی چکر لگا پاتے۔ مگر چونکہ اہل تواضع اور احترام کا خاص منظر تھا اس لیے دوسرے آنے والے کے بعد پہلے والے کو ہٹنے میں ذرا تامل نہیں ہوتا تھا۔

ایک حماقت ساری عمر یاد رہے گی، حضرت قدس سرہٗ کی سہ دری اور شرقی جانب ایک بہت بڑا چبوترہ تھا، اس کے اوپر ایک بہت بڑا چھپر پڑا رہتا تھا وہ گویا میرے والد صاحب اور ان کے متعلقین و خدام ادب کی قیام گاہ تھی اس میں چارپائیاں بھی پڑی رہتیں اور سردیوں میں پرال اور گرمیوں میں چٹائیاں وہی گویا میری بھی قیام گاہ تھی۔ جب حضرت قدس سرہٗ دوپہر کا کھانا کھا کر مکان سے تشریف لاتے اور خانقاہ شریف کے اندر داخل ہوتے تو میں اس قدر زوردار جھٹکے سے

''السلع معلیکم'' کہتا کہ دونوں عینوں کو ایسے جھٹکے سے کہتا اور حضرت قدس سرہٗ اتنے ہی زور دار جھٹکے سے وعلیکم السلام کہتے کہ حضرت قدس سرہٗ کی آواز اب بھی کانوں میں گونج رہی ہے اور اجل خلفاء اور اکابر علماء جب حضرت قطب عالم کی مجلس میں بیٹھتے تو ایسا سر جھکا کر بیٹھتے ''کان علیٰ رؤسھم الطیر'' سناٹا چھایا ہوا ہوتا۔ البتہ حکیم محمد اسمٰعیل صاحب جو بعد میں بمبئی میں حکیم اجمیری کے نام سے مشہور ہوئے۔ جب وہ گنگوہ حاضر ہوتے تو وہ کچھ نہ کچھ بات اکثر کرتے رہتے۔ یا حضرت صاحبزادے حکیم مسعود صاحب جن کا گدی دار موڑھا حضرت قدس سرہٗ کی چارپائی کے قریب پائنتی کی جانب ہوتا یا میرے والد قدس سرہٗ ڈاک سنانے کے لیے تشریف لاتے اور بہت چھوٹے سے بغیر گدی کے موڑھے کو چارپائی کے قریب لاکر اس پر بیٹھتے اور ڈاک سناتے۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے اکابر معمولی موڑھوں پر ایسے چپ چاپ آہستہ آہستہ دبے پاؤں موڑھوں پر آکر بیٹھتے کہ آہٹ نہ ہو۔ الّا یہ کہ خود حضرت قدس سرہٗ کسی سے مخاطب ہوں تو وہ نہایت عجلت سے نہایت آہستگی سے جس کے اندر آواز نہ ہو موڑھے کو قریب کر کے بیٹھتا اور جواب دیتا۔ ایک مقولہ حضرت قدس سرہٗ کا میں نے خود تو نہیں سنا۔ مگر میں نے والد صاحب اور چچا جان ہر دو سے کئی مرتبہ سنا ہے جو آگے آرہا ہے۔ حضرت قدس سرہٗ مکان سے کھانا کھا کر جب تشریف لاتے تو خدام مکان سے خانقاہ تک پیچھے پیچھے آیا کرتے تھے۔ وہ حضرت قدس سرہٗ کے سہ دری میں تشریف لانے پر اپنی اپنی جگہوں پر واپس لوٹ جاتے تھے۔ دستور یہ تھا کہ جب حضرت قدس سرہٗ دونوں وقت کھانا کھانے مکان تشریف لے جاتے تو خدام میں سے دو چار نہایت آہستہ آہستہ پیچھے ہو لیتے۔ حضرت قدس سرہٗ کا ہاتھ پکڑ کر کوئی نہیں چلتا تھا۔ بلکہ حضرت قدس سرہٗ کے ہاتھ میں ایک لکڑی ہوتی تھی اسی کی مدد سے بغیر سہارے کے تشریف لاتے اور لے جاتے۔ خدام جو مکان جانے پر ساتھ جاتے وہ حضرت قدس سرہٗ کے فارغ ہونے تک باہر دروازہ ہی پر کھڑے رہتے یا بیٹھ جاتے اور حضرت کی واپسی پر ساتھ ساتھ خانقاہ آتے ہوئے جب حضرت قدس سرہٗ سہ دری تک آتے تو وہ لوٹ جاتے۔ ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ تشریف لائے۔ حضرت نے سہ دری میں قدم رکھا اور خدام لوٹ گئے اور حضرت نے سہ دری میں کھڑے ہو کر فرمایا کوئی ہے؟ میرے والد صاحب نے عرض کیا کہ حضرت! یحییٰ اور الیاس ہیں۔

اللہ کا نام کتنی ہی غفلت سے لیا جائے اثر کیے بغیر نہیں رہتا:

حضرت نے نہایت جوش میں فرمایا، اللہ کا نام چاہے کتنی ہی غفلت سے لیا جائے اثر کیے بغیر نہیں رہتا، حضرت قدس سرہٗ کا ارشاد بالکل صحیح ہے، اسی وجہ سے جملہ مشائخ سلوک میں اللہ کا ذکر

اور ورد جاری ہے کہ یہ اثر کیے بغیر نہیں رہتا، ایک دوسرا ارشاد حضرت کا میں نے مکاتیب میں دیکھا اور مشائخ سے سنا بھی حضرت قدس سرہٗ ایسے لوگوں کو جو تصوف کی باریکیاں یا کسی چیز کی لم یا اصطلاحی چیزیں پوچھا کرتے تھے تو حضرت قدس سرہٗ کا جواب مجھے بہت ہی پسند آیا کہ یہ بندہ صوفیاء کی اصطلاحات سے واقف نہیں حضرت قدس سرہٗ کے احوال یہ ناکارہ ارشاد الملوک کے مقدمہ میں بھی نہایت مختصراً لکھوا چکا ہے اور اوجز کے مقدمہ میں بھی۔ حضرت قدس سرہٗ کی صورت مبارک میں جو کشش تھی وہ آج تک بھی دل کو کھینچ رہی ہے۔

دوسرا دور مرشدی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہ:

دوسرے دور کے مشائخ کے حالات کیا کیا لکھوں اور کس طرح لکھوں۔ سب سے اول میرے مرشد میرے آقا سیدی وسندی حضرت الحاج مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری تو رجب ۲۸ھ سے ہوگئی تھی لیکن میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے انتقال یا یوں کہوں کہ شوال ۳۳ھ تک براہ راست حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری کم ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود حضرت کی جو شفقتیں تھیں وہ بے پایاں تھیں۔ حضرت کی نگاہ محبت تو بہت شروع ہی سے تھی اسی کا وہ ثمرہ تھا جو میری تعلیم کے بارے میں گزر چکا کہ حضرت قدس سرہٗ نے مجھے منطق کی تعلیم کے لیے مولانا ماجد صاحب کی خدمت میں بھیجنے سے منع کر دیا اور ایک سال کے لیے بھی اپنے اقدام عالیہ سے جدا کرنا گوارا نہیں فرمایا۔ براہِ راست حضرت قدس سرہٗ سے تعلق والد صاحب کے انتقال کے بعد سے پیدا ہوا اور حضرت نے واقعی باپ بن کر دکھلا دیا۔ میری پہلی شادی کے سلسلہ میں ایک واقعہ گزر چکا کہ میں نے کاندھلہ جا کر اپنی پہلی شادی کے موقعہ پر اہلیہ مرحومہ کو یہاں لانے سے انکار کر دیا تھا کہ کاندھلہ بھی میرا وطن ہے وہیں پانچ سات دن رہ کر چلا آؤں گا۔ اہلیہ کے لانے اور لے جانے کا جھگڑا مشکل ہے تو حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ وہ کون ہے انکار کرنے والا باپ بن کر تو نکاح کرانے کے لیے میں آیا ہوں۔

چھ ماہ تک مدرسہ قدیم سے باہر نہ نکلنا:

ایک مرتبہ حضرت کی غایت شفقت اور میری کثرت حاضری کو دیکھ کر ایک صاحب نے حضرت قدس سرہٗ سے میرے سامنے یہ پوچھا کہ یہ حضرت کے صاحبزادے ہیں؟ تو حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا تھا کہ یہ بیٹے سے بڑھ کر ہیں۔ مجھے ابا جان کے جوتوں کی بدولت باہر آنے جانے سے شروع ہی سے نفرت تھی۔ میں اپنے کسی رسالہ میں لکھ چکا ہوں کہ ایک مرتبہ میرا نیا جوتا اٹھ گیا تھا تو جہاں تک یاد ہے۔ چھ ماہ تک دوسرا جوتا خریدنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس لیے کہ جمعہ بھی

مدرسہ قدیم میں ہوتا تھا اور دارالطلبہ بھی اس وقت تک نہیں بنا تھا اور بیت الخلا میں بوسیدہ جوتے پڑے رہا کرتے تھے۔ اس لیے مجھے چھ ماہ تک باہر نکلنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

بندہ کا نمائش میں جانے سے انکار:

یہ اسی کا اثر تھا کہ جب سہارنپور میں نمائش ہوئی تو جناب الحاج حافظ مقبول احمد صاحب مرحوم جو میرے والد صاحب سے بہت خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ اپنے بچوں کو نمائش دکھلانے کے لیے کسی رئیس کی فٹن لے کر آئے اور چونکہ شہر میں نمائش پہلی مرتبہ ہو رہی تھی، اس لیے اس کی شہرت بہت ہی ہو رہی تھی انہوں نے میرے والد صاحب سے اپنے بچوں کے ہمراہ مجھے بھی نمائش میں لے جانے کی اجازت چاہی۔ والد صاحب نے اس شرط پر اجازت دے دی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ رکھیں۔ انہوں نے مجھ سے چلنے کو فرمایا۔ میں نے پوچھا کہ وہاں کیا ہوگا؟ انہوں نے فرمایا کہ دکانیں لگتی ہیں میں نے کہا کہ دکانیں تو یہاں سے اسٹیشن تک بہت ہیں۔ انہوں نے ازراہِ شفقت بہت اصرار کیا۔ مگر میرا جی نہ چاہا۔ اسی کا اثر تھا کہ کبھی سیر و تفریح کا شوق نہیں ہوا۔ صفر ۴۳ھ مطابق ستمبر ۲۴ء میں یوپی وغیرہ میں طوفانی بارش آئی جس میں سہارنپور کا مشرقی نالہ اتنا بھرا کہ محلہ کھالہ پار بالکل الگ ہوگیا اور اس نالہ کا پانی مدرسہ قدیم کی سیڑھیوں تک آگیا اور اس نالے کے ہر پل پر پولیس کا پہرہ رہتا تھا کہ کوئی شخص اس پل پر نہ گزرے۔ کیونکہ ہر پل کے گرنے کا خطرہ تھا۔ دہلی تا غازی آباد کی ساری گاڑیاں کئی ماہ بند رہیں۔ اس لیے کہ وہاں بھی جمنا نے ریل کی پٹری جگہ جگہ سے توڑ دی تھی۔ دہلی سے سہارنپور کی گاڑیاں انبالہ کو آتی تھیں۔ ساری یوپی میں اس طوفانی بارش سے بہت نقصانات ہوئے۔ کھادر کے حصہ میں سنا گیا کہ آدمی اور سانپ دونوں درختوں پر نہایت سلوک سے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کو کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔

اس زمانے میں بھی سیر کے شوقین تو ہر حالت میں سیر ہی میں رہتے ہیں عبرت تو حاصل ہوتی نہیں سیر ہی کی سوجھتی ہے۔ محلّہ خانعالم پورہ میں شہر کی کئی ندیاں اور نالے باہم ملتے ہیں۔ وہ حصہ سمندر بن رہا تھا اور مخلوق سارے دن اس کی تفریح میں رہتی تھی۔ حضرت قدس سرہٗ کی مجلس میں ذکر آیا کہ خانعالم پوری کی ندی کل سے اتنی بھر رہی ہے کہ سارے شہر میں پانی بھر جانے کا اندیشہ ہوگیا حضرت قدس سرہٗ اس کا حال دریافت فرما رہے تھے۔ جناب الحاج مقبول احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے جن کا اسم گرامی میری اس تحریر میں بار بار آرہا ہے اور شاید کہیں تفصیل بھی آگئی ہے فرمایا کہ مولوی زکریا بھی تو کل دیکھنے گئے تھے۔ ان سے دریافت فرمالیں۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نے انتہائی سادگی سے فرمایا نہیں یہ نہیں گئے۔ حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو غصہ آگیا کہنے لگے کہ

ایسی بھی کیا خوش اعتقادی یہ تو سامنے بیٹھے ہیں دریافت فرمالیں؟ اور میں چپ حضرت قدس سرہٗ نے دوسری بار بھی یہی فرمایا کہ نہیں یہ نہیں گئے۔ حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زور سے فرمایا آخر اس سے دریافت تو فرمالیں۔ میرے حضرت نے فرمایا کیوں جی تم گئے تھے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت بالکل نہیں مجھے یہ خبر پہنچی تھی کہ حاجی خلیل احمد صاحب کا مکان پٹھان پورہ میں گر گیا۔ ان کے گھر کو دیکھنے گیا تھا۔ حضرت نے فرمایا یہ بالکل صحیح ہے۔ حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ خوش اعتقادی ہو تو ایسی ہو اور واقعہ بھی یہی تھا۔ پٹھانپورہ خانعالم پورہ سے اِدھر ایک محلّہ ہے۔ اس میں میرے والد صاحب کے ایک مخلص دوست حاجی خلیل احمد صاحب مرحوم رہتے تھے جن کو میرے والد صاحب سے بہت ہی خصوصی تعلق تھا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ کو بھی اس کا خوب علم تھا میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی کثرت سے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ اس لیے میرے حضرت قدس سرہٗ نے بے تکلف فرمادیا کہ یہ صحیح ہے۔

ایک مرتبہ مدرسہ کے ایک طالب علم کا اخراج حضرت قدس سرہٗ نے طے کیا۔ میں نے مخالفت کی اور عرض کیا کہ حضرت اس کے اندر یہ اندیشہ ہے۔ حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید فرمادی کہ نہیں حضرت کوئی اندیشہ نہیں۔ حضرت نے اخراج فرمادیا۔ معاً وہی اندیشہ سامنے آگیا۔ حضرت قدس سرہٗ کو اس کا بڑا فکر ہوا اور حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو بھی ندامت ہوئی۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ہمارے قلندر نے تو پہلے ہی مخالفت کی تھی۔ ہم نے ہی نہ مانی۔ میں نے عرض کیا حضرت فکر نہ فرمائیں دعاء وتوجہ فرمائیں انشاء اللہ یہ اندیشہ جاتا رہے گا۔ حضرت کو اس جواب سے اتنی مسرت ہوئی کہ اس کی لذت اب تک مجھے معلوم ہوتی ہے اور حضرت کی دعاء وتوجہ سے فوری خطرہ جو پیش آیا تھا۔ وہ اسی طرح فوراً دور ہوگیا۔ **اللّٰھم لک الحمد کلہ ولک الشکر کلہ.**

حضرت کا ارشاد ''ہمارے قلندر نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا''

حضرت قدس سرہٗ کا ہندوستان میں بھی اور مدینہ پاک میں بھی بہت کثرت سے یہ معمول تھا کہ جب کبھی کھانے میں یہ سیہ کار شریک ہوتا تو حضرت قدس سرہٗ کوئی بوٹی یا کباب کا ٹکڑا بہت شفقت سے دستِ مبارک سے مرحمت فرمایا کرتے تھے مجھے تو کبھی اس کی طرف التفات بھی نہیں ہوا کہ حضرت کی شفقتیں اس سے بہت زائد رہتی تھیں۔ لیکن مدینہ پاک میں تو یہ نا کارہ تو دونوں وقت کھانے میں شریک ہوتا ہی تھا۔ حضرت قدس سرہٗ رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ بھی بسا اوقات کھانے میں یا کسی دوسری چیز کے کھانے میں شرکت فرماتے حضرت رائے پوری نے مجھے ارشاد فرمایا کہ تجھ

پر بڑا رشک آتا ہے کہ جب حضرت تجھے کوئی چیز کھانے کی مرحمت فرماتے ہیں تو پہلے اس چیز کو خوب گھورتے ہیں پھر مرحمت فرماتے ہیں۔ کاش مجھے بھی اسی طرح سے گھور کر کوئی کھلاتا۔ اس کے بعد میں نے بھی خیال کیا تو واقعی حضرت اقدس رائے پوری نے صحیح فرمایا تھا۔ کاش اس قسیٔ القلب پر بھی کوئی اثر ہو جاتا۔ مدینہ پاک کے قیام میں یہ ناکارہ بذل لکھا کرتا تھا اور صبح کی چائے کے بعد سے مسلسل چھ گھنٹے حضرت کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی تو ایک بار یہ نابکار ناپاک سیہ کار بذل لکھتے ہوئے نہ معلوم کن کن خیالات اور واہی تباہی خیالات میں مستغرق تھا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نے عبارت لکھواتے لکھواتے نہایت تیز وتند لہجے میں ارشاد فرمایا ''من تبو مشغول و تو با عمـــر و زیـد '' مجھے اب تک بھی جب وہ منظر یاد آ جاتا ہے تو ایک سناٹا چھا جاتا ہے میں ان لغو خیالات پر اور حضرت کے اس ارشاد پر پسینہ پسینہ ہو گیا۔ میرا کرتہ اور پاجامہ پسینہ کے اندر بھیگ گیا۔ اس وقت بھی بہت سوچا اور بعد میں بھی بہت سوچا۔ مگر اب تک یہ یاد نہیں آیا کہ کیا خرافات میرے دل میں تھی۔ جس پر حضرت نے یہ ارشاد فرمایا۔ حضرت قدس سرہٗ کی یہ توجہات کسی قابل پر ہوتیں تو نہ معلوم وہ کہاں پہنچتا یہ سیہ کار اپنے سارے ہی مشائخ کی شان میں گستاخ رہا۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے سچ کہا تھا کہ چونکہ بے ادب ہے حدیث پاک کے استاذ کے علاوہ کسی اور استاذ کی بے ادبی کرے گا اور وہ فن ضائع ہو جائے گا تو بلا سے۔ یہ قصہ میرے طلب علم کے حالات کے اندر گزر چکا۔ مگر حق یہ ہے کہ مجھ سے نہ حضرت والد صاحب کا ادب ہو سکا نہ حضرت قدس سرہٗ کا۔

مدینہ پاک میں میں نے اپنی حماقت اور گستاخانہ عادت کے مطابق مولوی عبداللہ جان مرحوم کے متعلق چونکہ ان کا دستور یہ تھا کہ ہر ہفتہ ایک لمبا سا خط ان کا پہنچتا تھا۔ جس کو یہ جمعہ کے دن شروع کر دیتے اور روزانہ تاریخوار اپنے، مدرسہ کے، شہر کے، یاد کے، محبت کے حالات تاریخوار لکھ کر ہر جمعرات کو ڈاک میں ڈال دیا کرتے تھے۔ ایک سادہ کاغذ سبز جو چوڑان میں تو تقریباً اسی سائز کے برابر جس پر یہ رسالہ ہے اور لمبان میں ڈیوڑھا۔ نیلے فونٹین پین سے سارا خط اور سرخ سے روزانہ کی تاریخ ان کا خط گویا شہر اور مدرسہ کے حالات کا روزنامچہ ہوتا تھا۔ شاید تین چار سو ورق ہوں، جو میرے کاغذات میں دو گتوں کے اندر رسی سے بندھے ہوئے پڑے ہیں۔ لوگوں نے مجھ پر بہت اصرار کیا کہ یہ اردو کی بہترین خدمت ہے۔ اس کو طبع کرا لے۔ اس وقت تو چونکہ اشتغال علمی اونچی چیزوں میں سے تھا اس لیے التفات بھی نہیں ہوا۔ آج کل دور ہوتا تو شاید طبع کرا لیتا۔

بہت اُونچے بیرسٹر تھے لندن اور نہ جانے کہاں کہاں سے ڈگریاں لے کر آئے تھے۔ محمد احمد صاحب کاظمی مولوی منفعت علی صاحب مرحوم اور یہاں کے ہندو مسلم وکلاء اور بیرسٹران کے

شاگرد تھے ان کی بھی میرے حضرت قدس سرہٗ سے ابتدائی نیازمندی ایک طلاق کے مسئلہ میں ہوئی تھی۔اس زمانہ میں حضرت قدس سرہٗ کے تعمیل ارشاد میں بہت سی اردو کی مستند مصنفوں کی کتابیں ناول اور خطوط دن رات بکثرت پڑھیں اور میرا کام یہ تھا کہ جہاں جہاں لفظ ''جواب'' آجائے، وہاں حاشیہ پر نشان لگاتا جاؤں۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ لفظ جواب اردو میں کن کن معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔مولوی صاحب مرحوم کو مجھ سے بھی بہت تعلق ہوگیا تھا ۴۶ھ میں حجاز سے واپسی کے بعد وہ بہت اہتمام سے اس سیہ کار کے پاس ہندو مسلمان وکیلوں کو عصر کے بعد لاتے اور ان سے کہتے کہ ارے تم لوگ کیا جانو چائے پینا۔ چلو میں تمہیں ایک مولوی کے یہاں چائے پلواؤں۔ پھڑک جاؤ گے۔اس زمانہ میں اس سیہ کار کو بھی چائے کا بہت شوق تھا اور مجمع بھی زائد نہ ہوتا تھا۔ پانچ سات آدمی عموماً اور مہمان ہوتے تو دس پندرہ ہوجاتے اتنے میں آدمی جیسی چاہے بڑھیا چائے پی لے۔دوسو کے مجمع میں تو دیگ ہی پکتی ہے۔بہر حال مولانا عبداللہ جان مرحوم کو مجھ سے اور میرے ابا جان سے محبت بہت تھی اور حضرت قدس سرہٗ سے تو گویا عشق تھا اور ہر ہفتہ ان کا بہت لمبا چوڑا خط جاتا جس کو یہ ناکارہ بہت مزے لے لے کر سناتا۔ کیونکہ اپنے وطن کی داستان ہوتی تھی اور حضرت بھی بڑے شوق سے سنتے تھے۔

ایک دفعہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ مولوی عبداللہ جان کو حضرت سے عشق تو ہے مگر یہ ذکر وشغل بالکل نہیں کرتے۔ حضرت ان کو کچھ ذکر تلقین فرمادیں۔ حضرت نے فرمایا وہ پوچھیں تو بتلاؤں گا۔بغیر پوچھے کیوں بتلاؤں؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت پوچھنے کی کیا بات ہے۔جب وہ اپنے کو حضرت کے سپرد کر چکے ہیں محبت بھی بہت ہے۔حضرت نے فرمایا وہ پوچھیں جب ہی تو بغیر پوچھے میں کیوں بتلاؤں؟۔میں نے عرض کیا کہ میں کچھ لکھ دوں؟ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا اپنی طرف سے جو چاہے لکھ دیجیو میری طرف سے کچھ نہیں۔ میں نے عرض کیا حضرت میرے لکھنے سے کیا ہوتا ہے اسی زمانے میں حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ بھی مدینہ پاک میں تشریف رکھتے تھے اور عصر سے مغرب تک حضرت قدس سرہٗ کی مجلس میں خادمانہ تشریف رکھتے تھے،حضرت رائے پوری کے ساتھ بھی دس بارہ خادم ہمراہ تھے۔

ایک مرتبہ حضرت رائے پوری نے میرے حضرت سے بطور معذرت کے عرض کیا کہ حضرت ایسی بے حسی کا زمانہ ہے کہ اول تو ان لوگوں کو خود ہی احساس چاہیے کہ جب میں خادمانہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو ان کو بھی حاضر ہونا چاہیے تھا لیکن میں ان لوگوں کو ترغیب بھی دیتا رہتا ہوں۔ پھر بھی حاضری کی توفیق نہیں ہوتی۔ حضرت قدس سرہٗ نے حضرت رائے پوری سے ارشاد فرمایا کہ حضرت !اس کا بالکل خیال نہ فرمائیں۔ مجھے تو اس میں بہت غیرت آتی ہے۔ میں

نے تو اپنے شیخ یعنی قطب عالم گنگوہی کے متعلق بھی کبھی کسی کو ترغیب نہیں دی پھر اپنے صاحبزادے مرحوم کی بیعت کا قصہ سنا کر اس ناکارہ کی طرف ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ یہ تو ان باوا بیٹوں کا دستور ہے کہ جوان کی طرف ذرا جھکے یہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ مجھے تو اس میں بڑی غیرت آتی ہے۔ میرے نزدیک تو کسی کی غرض ہو تو دس دفعہ آئے ورنہ میری پاپوش سے۔ حضرت کا ارشاد کہ ان باوا بیٹوں کی تو یہ عادت ہے اسی مولوی عبداللہ جان کے واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ اس زمانے میں یہ ناکارہ ان کی بار بار سفارش کر رہا تھا۔ اس قصہ کو مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الخلیل طبع جدید طبع کردہ حکیم محمد الیاس سلمہ کے صفحہ ۴۴۴ پر مختصراً نقل کیا ہے۔ وہ مخلص دوست جن کو مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تحریری فرمایا ہے یہی مولوی عبداللہ جان مرحوم تھے۔ البتہ تذکرۃ الخلیل میں اور میرے اس بیان کردہ واقعے میں یہ فرق ہے کہ مجھے بیعت کا قصہ حضرت کے صاحبزادے حافظ محمد ابراہیم کا یاد ہے اور مولانا نے یہ قصہ حضرت کے داماد محمد یامین کا لکھا ہے جب حضرت قدس سرہٗ کا ۴۴ھ میں مستقل قیام کی نیت سے سفر ہوا تو الوداعی سفر کئی جگہ کے حضرت نے فرمائے۔ یہ سیہ کار بھی ساتھ تھا۔ میرٹھ میں حماقت سوار ہوئی۔ دسترخوان پر انواع بہت تھیں میں نے عرض کیا حضرت کے طفیل میں بہت ہی انواع ولذائذ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائیں۔

اس وقت تک اس ناکارہ کا حج طے نہیں ہوا تھا جیسا کہ سفر حج میں آرہا ہے۔ حضرت قدس سرہٗ نے بے ساختہ فرمایا کہ اب تک طفیل میں کھایا تھا۔ اب اصالتاً کھاؤ گے۔ حضرت قدس سرہٗ کے حجرہ میں سے ایک مرتبہ کسی کی امانت گم ہوگئی۔ چونکہ حجرہ کا کھولنا ڈاک باہر نکالنا۔ ڈاک کا سامان اندر رکھنا وغیرہ وغیرہ اسی سیہ کار کے متعلق تھا اور یہ میں متعدد بار لکھ چکا ہوں کہ حضرت قدس سرہٗ کی ان شفقتوں اور الطاف کی وجہ سے مجھ پر اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور میرے والد صاحب پر تھیں شروع ہی سے حاسدین کا حملہ ہم تینوں پر رہا۔ چنانچہ بعض کرم فرماؤں نے اس چوری کا الزام اس سیہ کار پر لگایا اور حضرت سے عرض کیا کہ حضرت اسی کی آمدورفت حجرہ کے اندر کثرت سے ہے۔ حضرت نے نہایت صفائی سے ارشاد فرمایا کہ اس کا کام نہیں۔ اللہ کا انعام احسان شکر تو یہ ناکارہ کر ہی نہیں سکتا۔ بعد میں محقق ہو گیا کہ ایک دوسرے صاحب کی حرکت تھی۔ تحریک خلافت کے زمانے میں جلسوں کا بہت زور تھا کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جس میں دس بارہ جگہ شہر میں جلسے نہ ہوں اور دس بارہ جگہ کے باہر سے مطالبے نہ ہوں۔ اسباق پڑھانے مشکل ہوگئے۔ بالخصوص مولوی قدوسی مرحوم کی طلب ہر جگہ سے بہت ہوتی تھی اور خاص طور سے لوگ ان کو اس وجہ سے بلاتے کہ ان کے وعظ عوام میں بہت پسند ہیں اس وجہ سے مولوی قدوسی کے اسباق بہت ناغہ ہوتے تھے مسلسل ایک ایک ہفتہ سبق نہیں ہوتا تھا اس لیے ان کے متعلق خاص طور سے وہ تجویز ہو

گیا تھا کہ وہ ہر جلسہ میں نہ بھیجے جائیں۔ مخصوص جلسوں میں حضرت کی اجازت سے جائیں۔

ایک مرتبہ کاندھلہ میں خلافت کا جلسہ تھا۔ وہاں کے لیڈروں نے ہمارے ایک عزیز حافظ شریف کو میرے پاس بھیجا کہ حضرت قدس سرۂ سے اجازت لے کر مولوی قدوسی کو کاندھلہ بھیج دو۔ حافظ شریف نے مجھ سے آکر کہا مجھے چونکہ اندازہ تھا میں نے حافظ شریف سے کہہ دیا کہ میں تو بہت چھوٹا ہوں بڑے حضرات مثلاً مولانا عبداللطیف صاحب حاجی مقبول صاحب ان میں سے کسی سے درخواست کرو۔ بات معقول تھی۔ اس لیے ان کی سمجھ میں آگئی۔ انہوں نے حضرت مولانا عبداللطیف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کی۔ مولانا نے جواب دیا کہ ان کا حرج بہت ہو چکا ہے۔ میری ہمت حضرت سے اجازت لینے کی نہیں پڑتی۔ انہوں نے حضرت حاجی مقبول صاحب سے کہا۔ انہوں نے کہا کہ ''ارے حضرت کے لاڈلے سے کیوں نہیں کہتا۔'' (یعنی ناکارہ) انہوں نے میرا جواب نقل کر دیا کہ میں تو بچہ ہوں اس پر حاجی صاحب کو غصہ آگیا اور فرمایا وہ بچہ ہے اگر وہ یوں کہے......تو حضرت جی اس کی خاطر میں یوں کہیں گے...... بھائی شریف میرے سر ہوگئے کہ میں کل سے دھکے کھا رہا ہوں۔ اب معلوم ہوا کہ کنجی تو تیرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے کہا کہ سچ ہے کاندھلہ کاندھلہ ہی ہے۔ بڑے بڑے جس کام کو نہیں کر سکتے بھلا میں کس طرح کر دوں۔ لیکن ان کے شدید اصرار پر میں نے حضرت سے عرض کیا کہ یہ بھائی شریف دو دن سے پڑے ہیں اور اہل کاندھلہ ایک جلسہ کرانا چاہتے ہیں اور مولوی قدوسی پر چلنے کا اصرار ہے، حرج تو بہت ہوگیا۔ اب جیسے ارشاد عالی ہو۔

حضرت قدس سرۂ نے اپنی عادت مبارکہ (جیسا کہ تفصیل سے لکھوا چکا ہوں) کے موافق فرمایا۔ کیا رائے ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت اگر جمعہ کی صبح کو چلے جائیں اور جمعہ کے بعد تقریر کر لیں اور عصر کے بعد کاندھلہ سے جو گاڑی چلتی ہے اس سے واپس آجائیں تو یہاں عشاء تک پہنچ جائیں گے۔ سبق کا حرج نہیں ہوگا۔ حضرت نے فرمایا بہت اچھی بات۔ میں نے بھائی شریف اور مولانا قدوسی صاحب ہر دو سے کہہ دیا کہ حضرت نے اجازت مرحمت فرمادی جمعہ کی صبح کو جا کر شام کو آجائیں۔ اس پر مولوی قدوسی نے کہا کہ یہ جمعہ تو میرا رکا ہوا ہے۔ اگلے جمعہ کو آؤں گا۔ چنانچہ اگلے جمعہ کا اعلان کرا دیا۔

ان حافظ شریف صاحب کے ساتھ ایک عجیب لطیفہ پیش آیا۔ جو لکھوانے کے قابل ہے۔ یہ عین کھانے کے وقت پہنچے تھے اور کوئی چیز فوری طور پر خاطر کی سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے تھوڑی سے دودھ جلیبیاں بازار سے منگوالیں اور بھگو کر ان کے سامنے ایک پیالہ میں رکھ دی مجھے ترشی کا شوق بچپن سے رہا اور اب تک بھی ہے۔ ترشی بچپن ہی سے ہر نوع کی خوب کھائی۔ اتفاق سے اس وقت

کہیں سے عرق نعناع کی بوتل آئی ہوئی تھی اور میرے دسترخوان پر پیاز مرچ کتر کر اس پر عرق نعناع ڈال کر لانے کا دستور تھا۔ میں تو اس کو کھاتا ہی تھا۔ مگر اور لوگ اس کو نہیں کھاتے تھے۔ ''الا ماشاء اللہ'' حافظ شریف نے جلیبیوں پر تواضع بلکہ اصرار مجھ پر کھانے کا کیا میں نے سادگی سے کہہ دیا کہ میں تو عرق نعناع کھا رہا ہوں۔ میری حالت اور تعجب کی انتہا نہ رہی اور بہت مسرت ہوئی کہ جب میری زبان سے یہ فقرہ نکلا تو دسترخوان پر آٹھ دس طلبہ میرے پاس رہنے والوں میں سے جو میرے ساتھ کھانا کھا رہے تھے سب نے چپکے چپکے نعناع کے ایک دو پیاز کھا لیے۔ حافظ شریف نے سب کی تواضع کی لیکن سب کا جواب یہ تھا کہ ہم نے نعناع کھالیا۔ حافظ شریف نے کہا کہ میں بھی نعناع کھالوں میں نے کہا شوق سے۔ مگر ان دودھ جلیبیوں کے دام مجھے دے دیجیو۔ مگر مجھے اپنے ان لڑکوں کی یہ ادا بہت ہی اچھی لگی اور بہت ہی پسند آئی اور یاد پڑتا ہے کہ میں نے کھانے کے بعد چپکے سے کچھ انعام بھی ان لڑکوں کو دیا تھا۔

یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ اس پیاز کھانے کی ابتداء عزیز عبدالجلیل برادر زادہ حضرت اقدس رائے پوری نے کی تھی، جو اس وقت یہیں رہتا تھا اور میرا شریک دسترخوان تھا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ حضرت قدس سرہٗ کی شفقتیں اور محبتیں **لا تعد و لا تحصیٰ** نہ لکھوائی جاسکتی ہیں اور نہ ان کا احصاء ہوسکتا ہے اس رسالہ میں مختلف مضامین کے ذیل میں مختلف چیزیں آئیں گی اور بہت سی گزر چکیں۔ تعلیم و تدریس کے باب میں لکھوا چکا ہوں کہ ابتدائی مدرسی پر میری ہدایہ کی درخواست پر حالانکہ اس وقت تک کنز صرف ایک سال پڑھائی تھی حضرت قدس سرہٗ نے تقسیم اسباق میں بیٹھتے ہی فرمایا کہ تم نے ہدایہ اولین کو کہا یا ہدایہ اخیرین کو۔ گویا دونوں میں ہر ایک دینے کے لیے تیار تھے۔ نیز بخاری شریف کے سبق کے نہ لینے پر جو ڈانٹ پڑی ہے۔ وہ بھی حضرت ہی کی شفقت کا نتیجہ ہے اگر زندگی اور توفیق ہوئی تو ۳۸ھ اور ۴۴ھ کے حجوں کے ذیل میں بہت سے واقعات آجائیں گے۔ حضرت قدس سرہٗ کی اپنی شان اور جلالت قدر کے باوجود اس سیہ کار کے ساتھ ابتداء زمانۂ تدریس میں تو میری یتیمی کی وجہ سے اور انتہاءً اس سیہ کار کے بذل کے ساتھ اشتغال کی وجہ سے شفقتیں اور محبتیں اور تعلق بڑھتا ہی رہا کیونکہ میرے حضرت کو بذل کے ساتھ عشق تھا اور اس ناکارہ کو بھی بذل سے ابتداء ہی سے عشق تھا۔ اس وجہ سے حضرت کی شفقتیں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ درحقیقت بذل کی تالیف اس ناکارہ پر اللہ تعالیٰ کا ایک بڑا ہی احسان تھا کہ اس کی وجہ سے میری ساری گندگیوں اور کوتاہیوں پر حضرت التفات نہ فرماتے تھے۔

تیسرا دور شیخ الہند قدس سرہٗ:

اعلیٰ حضرت شیخ الہند حضرت مولانا الحاج محمود حسن صاحب قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت

میں (اور جیسا کہ آگے آرہا ہے) اعلیٰ حضرت رائے پوری کی خدمت میں اس سیہ کار کی حاضری کی نوبت کم آئی۔ حضرت شیخ الہند کی خدمت میں تو بہت ہی کم آئی، اس لیے کہ اپنے والد صاحب قدس سرہٗ کی حیات میں تو یہ ناکارہ اسیر محض تھا کہیں باہر آنا جانا تو درکنار۔ گنگوہ سہار نپور کے قیام میں بھی کہیں مقامی جگہوں پر آنا جانا نہیں ہوتا تھا۔ والد صاحب کے وصال کے بعد جو ذیقعدہ ۳۴ھ میں ہوا۔ حضرت شیخ الہند گویا اسیر مالٹا بن چکے تھے۔ مالٹا کے قیام کے زمانہ میں تو صرف اتنا ہی ہوتا تھا کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ کے خطوط مالٹا سے اس سیہ کار کے نام کبھی کبھی آتے رہتے تھے۔ ان میں حضرت شیخ الہند کی طرف سے اس ناکارہ کے خطوط کے جواب میں سلام ودعائیں آتی رہتیں۔

حضرت شیخ الہند کی مالٹا سے واپسی:

۲ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ مالٹا سے روانہ ہوئے اور راستہ میں مختلف شہروں میں قید کی حالت میں قیام کے بعد ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو بمبئی جہاز سے اُتر کر رہا ہوئے اور ۲۶ رمضان المبارک کو دیو بند پہنچے۔ عید سے دوسرے دن یہ ناکارہ سیدی و مرشدی حضرت اقدس سہار نپوری کے ساتھ دیو بند حاضر ہوا۔ ان دونوں اکابر کا بغل گیر ہونا بھی خوب یاد ہے اور حضرت شیخ الہند کا نہایت مسرت کے ساتھ یہ ارشاد کہ ''مولوی حسین احمد مولانا کے لیے سبز چائے بناؤ'' بھی خوب یاد ہے۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے نہایت مسرت کے لہجے میں فرمایا حضرت ابھی لاتا ہوں۔ اس وقت یہ ناکارہ بھی ہمرکاب تھا اور حضرت نے بہت شفقت ومحبت سے مصافحہ کے بعد یاد پڑتا ہے کہ سر پر ہاتھ بھی پھیرا تھا۔ اس کے بعد حضرت شیخ الہند کے اسفار باوجود امراض کے بہت کثرت سے ہوئے اور آخر زمانہ میں دلی میں قیام رہا۔ ان ایام میں دیو بند یا دہلی میں زیارت وحاضری تو ہوئی مگر بہت تھوڑے سے وقت کے لیے۔ البتہ شوال ۳۳ھ سے پہلے جب ان دونوں حضرات کا حجاز کا سفر طے ہورہا تھا۔ اس زمانہ میں حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے ایک ہفتہ مستقل مدرسہ مظاہر علوم میں قیام فرمایا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے سوانح خودنوشت میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ حضرت سہار نپوری کو اس تحریک کا تفصیلی علم مدینہ منورہ میں ہوا۔ جب کہ حضرت شیخ الہند نے حضرت سہار نپوری اور حضرت شیخ الاسلام سے اس کا تفصیلی حال بیان کیا۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کو حضرت شیخ الہند نے تفصیلی احوال سنائے اور حضرت سہار نپوری چونکہ پہلے سے راز دار تھے اس لیے حضرت سہار نپوری کو بھی اس مکالمے میں شامل کیا۔ اس کا بہت ہی قلق ہوا کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ کی حیات میں اس پر گفتگو کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ گو خیال کئی مرتبہ آیا۔ ورنہ میں

حضرت اقدس مدنی سے اس کی تفاصیل بیان کرتا۔ کہ حضرت مدنی تو ان حضرات کے سفرحجاز سے قبل مدینہ منورہ تھے اور یہ ناکارہ اس وقت سہارنپور میں تھا۔

ایک ہفتہ مظاہر علوم میں:

حضرت شیخ الہند کا سفرحجاز کو روانگی سے قبل حضرت کا قیام ایک ہفتہ مدرسہ مظاہر علوم ہی میں رہا اور اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور مولانا الحاج احمد صاحب رامپوری رحمہ اللہ تعالیٰ کا قیام بھی اس زمانہ میں سہارنپور ہی رہا۔ یہ چاروں حضرات صبح کی چائے کے بعد مدرسہ کے کتب خانے میں تشریف فرما ہوتے۔ کیونکہ تعلیم اس وقت تک شروع نہیں ہوئی تھی اور طلبہ کے کتب خانہ سے کتب لینے کا موقعہ بھی نہیں تھا۔ کتب خانہ کا دروازہ جوان کی نشست گاہ سے بہت دور تھا اس کی اندر کی زنجیر لگ جاتی اور ان چار حضرات کے علاوہ کوئی شخص اندر نہیں جا سکتا تھا۔ ½۱۱ بجے سے حاجی مقبول احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جو حضرت کے گویا گھر کے منتظم تھے، کھانا کا تقاضہ شروع کرتے اور نیچے سے آواز دے کر بار بار کہتے کہ حضرت کھانا آ گیا ہے۔ ٹھنڈا ہو گیا اور اُوپر سے شروع شروع میں تو جواب ہی نہیں ملتا تھا اور پھر دو چار مرتبہ کے بعد حکیم احمد کھڑکی میں سے کہتے کہ ابھی آتے ہیں، ابھی آتے ہیں۔ ظہر کی اذان کے قریب یہ حضرات اترتے اور جو کچھ ٹھنڈا یا گرم ہوتا اس کو جلدی جلدی نوش فرماتے۔ اسی درمیان میں ظہر کی اذان ہو جاتی۔ نہایت اطمینان سے وضو اور فرائض اور سنتوں سے فراغ پر پھر کتب خانہ میں پہنچ جاتے اور عصر کی اذان پر اُترتے۔ بعد عصر البتہ تخلیہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس وقت چائے ہُوا کرتی تھی اور مغرب کے بعد نوافل سے فراغت پر کھانا کھانا اور مہمانوں سے ملاقات کرنا۔ تین چار دن تک یہی سلسلہ رہا جو لوگ اجمالاً حضرت شیخ الہند کی تحریک سے واقف تھے وہ تو اجمالاً سمجھے ہوئے تھے۔ کہ کس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے۔ اس وقت یہ ناکارہ تحریک کا صرف نام ہی سنے ہوئے تھا اور اس زمانہ میں بعض حاسدین کی طرف سے میرے والد صاحب کو مدرسہ سے علیحدہ کرنے کی تدابیر بھی ہو رہی تھیں۔ میں نے ایک مرتبہ والد صاحب سے عرض کیا کہ یہ سب حضرات جناب ہی کے مسئلہ میں گفتگو فرما رہے ہیں؟ میرے والد صاحب نے بہت لمبی لاحول پڑھی اور فرمایا کہ میرا مسئلہ اتنا اہم تھوڑا ہی ہے کہ صبح سے شام تک اس کے اندر محو رہیں۔ یہ تو نہ معلوم کہاں ہیں بہت اونچی پرواز کر رہے ہیں۔

حضرت شیخ الہند اور میرے حضرت کے درمیان بے تکلفی:

ان ہی ایام میں اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے ذمے حضرت شیخ الہند کی غیبت میں ان کی تحریک کی سرپرستی تجویز ہوئی تھی اور حضرت سہارنپوری کا حضرت شیخ الہند کے ساتھ جانا تجویز

ہوا۔ مگر اس طرح پر کہ علیحدہ علیحدہ سفر ہو۔ اس لیے کہ حکومت کی نگاہ میں دونوں مخدوش تھے۔ خیال یہ ہوا کہ اگر ایک گرفتار ہو جائے تو دوسرا حجاز پہنچ جائے۔ چنانچہ حضرت سہارنپوری کی روانگی پہلے ہوئی اور حضرت شیخ الہند کی بعد میں۔ حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ وسط شوال ۳۳ھ میں سہارنپور سے روانہ ہوئے اور ۲۲ ذیقعدہ ۳۳ھ کہ مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ باوجود ارادہ کے اس جہاز سے نہ جا سکے۔ بعد میں تشریف لے گئے۔

یہ میں اپنی طلب علم کے زمانہ میں لکھ چکا ہوں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت شیخ الہند فرما رہے ہیں کہ مجھ سے بخاری دوبارہ پڑھو اور حضرت شیخ الہند کے جنازہ میں شمولیت کو بھی حوادثات وعجائبات قدرت میں لکھوا چکا ہوں۔ شوال ۳۳ھ سے پہلے مظاہر کے جلسہ میں ہر سال حضرت شیخ الہند اعلیٰ حضرت رائے پوری اور حضرت تھانوی تینوں حضرات سہارنپوری قدس سرہٗ کی خدمت میں تشریف آوری کا منظر بھی خوب دیکھا۔ اس مجلس میں مجمع تو بہت بڑا ہو جاتا تھا لیکن یہ چاروں اکابر ممتاز جگہ پر ایک ہی مقام پر تشریف فرما ہوتے۔ اس میں حضرت شیخ الہند اور حضرت سہارنپوری کی نشست تو بہت مساویانہ ہوتی تھی اور گفتگو بھی بہت مساویانہ ہوتی تھی۔ زیادہ ادب و احترام نہیں ہوتا تھا اور اعلیٰ حضرت اقدس رائے پوری اور حضرت اقدس تھانوی کی نشست ان دونوں حضرات کے سامنے مؤدبانہ ہوتی تھی اور گفتگو بھی بہت مؤدبانہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی تشریف آوری حجاز کے یکسالہ سفر سے پہلے جلسے کے علاوہ بھی کبھی ہوتی رہتی تھی۔ یہ منظر تو میں نے ان چاروں اکابر کے یہاں بہت کثرت سے دیکھا کہ جب کسی ایک کی بھی آمد کسی دوسرے بزرگ کے یہاں ہوتی تو میزبان کو اتنی مسرت ہوتی کہ بس قابل دید تھی۔ حضرت سہارنپوری کے مزاج میں انتظام اور نظم بہت تھا اور شیخ الہند قدس سرہٗ کے مزاج میں بے تکلفی بہت تھی۔ ایک مرتبہ حضرت شیخ الہند مع دو تین خدام کے مدرسہ آئے۔ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ نے فوراً بازار سے مٹھائی منگوائی اور جب وہ آ گئی تو حضرت قدس سرہٗ نے چٹائی بچھوائی اور اپنے دست مبارک سے چمڑے کا دسترخوان بچھایا اور خود اندر حجرہ میں طشتریاں لانے کے واسطے چلے گئے کہ ان میں قاعدہ سے مٹھائی رکھیں۔ حضرت شیخ الہند نے حضرت مدنی قدس سرہٗ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ مولوی حسین احمد اتنے وہ رکابیاں لائیں اتنے اس کو نمٹا دو۔ چنانچہ اتنے حضرت سہارنپوری رکابی لے کر آئے۔ وہ مٹھائی نمٹ چکی تھی۔ کیونکہ ان کے ساتھ خدام بھی تھے۔ شاید حضرت شیخ الہند اور حضرت مدنی نے ایک ایک مٹھائی کھائی ہو۔ مگر ہم جیسے حریصوں کے لیے تو ایسے مواقع کبھی کبھی ملتے ہیں۔ حضرت سہارنپوری نے حجرہ سے باہر آ کر ارشاد فرمایا "ان کے واسطے رکابیاں لاؤ"۔ اپنا اور حضرت شیخ الاسلام مدنی کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔

یہ تو میں پہلے لکھوا چکا ہوں کہ حضرت صاحبزادی کی حیات میں حضرت مدنی، چچا جان نور اللہ مرقدہما اور اس ناکارہ کی حاضری گنگوہ بکثرت ہوتی تھی۔ حضرت مدنی کی تو بہت ہی کثرت سے ہوتی تھی۔ لیکن چچا جان کی مشغولی اور دوری کی وجہ سے کم ہوتی تھی۔ لیکن خواہش چچا جان کی یہی رہتی تھی کہ جب حضرت مدنی اور اس ناکارہ کی روانگی ہو تو مجھے بھی اطلاع ہو جائے اگر حضرت مدنی کی فوری تشریف آوری ہوتی تب تو مجبوری تھی۔ لیکن اگر مجھے پہلے سے معلوم ہو جاتا کہ فلاں تاریخ ہ ڈائری کے اندر گنگوہ کی لکھی گئی ہے تو میں چچا جان کو ضرور اطلاع کر دیتا۔

ایک بہت ہی عجیب اور لطیف قصہ ہے ایک مرتبہ ہم تینوں گنگوہ حاضر ہوئے۔ وہاں پہلے سے کسی نے اطلاع نہیں دی تھی۔ چچا یعقوب صاحب اور ان کی والدہ حضرت صاحبزادی صاحبہ کو ہم میں سے جو بھی پہنچ جاتا اس قدر مسرت اور عید آجاتی کہ کچھ انتہا نہیں وہ منظر اب تک آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے اور اس مرتبہ تو تینوں ساتھ تھے نہایت عجلت میں کئی طرح کے تھوڑے تھوڑے سالن تیار کیے۔ لذیذ اور جلدی کھانا پکانے میں حضرت صاحبزادی صاحبہ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان کا مشہور مقولہ تھا کہ تم آٹھ آدمی ایک ایک روٹی لے کر بیٹھ جاؤ اگر درمیان میں تار ٹوٹے تو میرا ذمہ۔ اور ہم لوگوں میں سے اگر کوئی ایک یا سب تنہا ہوتے تو (یعنی کوئی غیر ساتھ نہ ہوتا) تو زنانہ مکان میں کھانا کھایا کرتے اور اگر لوگ بھی ساتھ ہوتے تو مردانہ میں کھاتے چونکہ ہم تین تھے لہٰذا اندر زنانہ میں کھانا کھانے گئے۔ حضرت صاحبزادی صاحب نے خوان میں کئی طرح کے کھانے نکال کر جناب الحاج چچا یعقوب صاحب کے ہاتھ بھیجا۔ وہ سالن رکھ کر گرم گرم روٹیاں لینے گئے۔ حضرت مدنی نے مجھ سے اور چچا جان سے کہا کہ اتنے وہ روٹیاں لائیں سالن نمٹا دو۔ پھر کیا تھا میرا تو لڑکپن تھا اتنے وہ روٹی لائے۔ سب برتن صاف ہو گئے۔ دیکھ کر حیرت بھی کی اور جا کر کہا کہ اماں جی ان حضرتوں نے تو سالن رکھا کھا لیا اور وہ روٹی رکھ کر سالن لائے۔ حضرت نے فرمایا یہ بھی نمٹا دو۔ پھر وہ سالن لا کر روٹیاں لینے گئے تو سالن نمٹا دیا۔ اس پر حضرت صاحبزادی صاحبہ نور اللہ مرقدہا کمرے کے دروازہ پر خود تشریف لائیں اور فرمایا ''اے تم تینوں کھلاتے تو ہو حضرت، تمہارا بچپن ابھی تک نہیں گیا۔'' حضرت مدنی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ یہ حاجی یعقوب ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔ روٹی ہو تو سالن نہیں سالن ہو تو روٹی نہیں کھلاتے ہیں یہ مذاق کر رہے ہیں اور میں نے عرض کیا کہ حضرت ہو جائیں یا اور کچھ۔ بہر حال آپ کے بچے رہیں گے۔ فرمانے لگیں تمہارے اس بچپن پر میرا بہت جی خوش ہوا۔ بہت دفعہ حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ خاص طور سے اس نوع کے واقعات اس سیہ کار کے پیش آئے۔

چوتھا دور اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہٗ:

اعلیٰ حضرت شیخ المشائخ قدوۃ الاتقیاء حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہٗ کی خدمت میں بھی حاضری کی نوبت کم آئی۔ لیکن حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے زمانہ سے زیادہ ہوئی۔ میری اصالتاً حاضری تو میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد سے حضرت قدس سرہٗ کے وصال ۲۶ ربیع الثانی ۳۷ھ تک رہی لیکن والد صاحب کی حیات میں بھی ان کی ہمرکابی میں رجب ۲۸ھ سے ان کے وصال ۱۰ ذیقعدہ ۳۴ھ تک بار بار ہوئی۔ اس سیہ کار کی سب سے پہلی حاضری گنگوہ کے قیام میں جب میری عمر دس گیارہ سال کی تھی اپنے والد صاحب کے ساتھ ہوئی مولانا عبدالقادر صاحب کو پہچاننا تو یاد نہیں۔ حضرت کی کوئی امتیازی حالت بھی اس وقت نہ تھی۔ اتنا یاد ہے کہ اعلیٰ حضرت نے اپنے ایک خادم سے جو کثرت سے حجرہ شریف میں آتے جاتے تھے یوں ارشاد فرمایا تھا کہ مولوی صاحب جو مٹھائیاں وغیرہ اندر رکھی ہے وہ سب صاحبزادے صاحب کو دے دو اور ان صاحب نے اندر کی جانب جو حضرت قدس سرہٗ کے حجرہ کے غربی جانب دوسرا حجرہ تھا اب تو اس کا دروازہ بھی مستقل ہو گیا۔ اس وقت وہ کتب خانہ تھا۔ اس میں کئی ہانڈیاں متفرق مٹھائیوں کی اور نمکین کی رکھی ہوئی تھیں اس سیہ کار کے حوالہ کر دی تھیں۔ البتہ اس وقت میں حافظ عبدالرحیم صاحب سلمہ جو اس وقت میں حضرت کا کھانا لاتے تھے وہ ضرور یاد ہیں اور ان سے اس زمانہ میں جان پہچان اور دوستی بھی ہو گئی تھی اور اعلیٰ حضرت کے حکم سے اس زمانہ میں نہر کا مخرج یعنی جس پہاڑ سے نہر نکلی ہے (بوگری والا) اس کی سیر بھی کرائی گئی تھی اور چونکہ میرا پہلا سفر تھا اور بچپن تھا اس لیے بہت سی چیزوں کی سیر کرائی تھی اور چونکہ اعلیٰ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کو تیرنا بہت آتا تھا اس لیے حضرت نے خود تیر کر تیرنا بھی دکھایا تھا اور یہ ناکارہ آل کدو کے تونبوں کو بغل میں لے کر چند منٹ تیرا تھا۔ مگر قابو میں نہیں آیا۔ اس کے بعد رجب ۲۸ھ میں سہارنپور آنے کے بعد سے تو حاضری دن بدن بڑھتی ہی رہی۔ جب بھی اس ناکارہ کی ابتداء تبعاً اور انتہاء اصالتاً حاضری ہوتی تو حضرت قدس سرہٗ کے یہاں جو بھی پھل یا مٹھائی رکھی ہوئی ہوتی تو حضرت ارشاد فرماتے کہ مولوی عبدالقادر جو کچھ رکھا ہو صاحبزادے صاحب کے حوالہ کر دو۔ یہ ناکارہ حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ خود بھی کھاتا اور مکتب کے بچوں کو بھی بانٹتا۔

رائے پور کا رمضان:

اعلیٰ حضرت رائے پوری کے یہاں رمضان مبارک کا جتنا اہتمام دیکھا مشائخ کے یہاں اتنا نہیں پایا۔ ۲۹ شعبان کو جملہ حاضرین سے مصافحہ کر لیتے اور فرماتے کہ بس بھائی، اب عید پر ملیں

گے اور جو لوگ حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں رمضان کرنے کے لیے باہر سے آتے تھے ان سے ملاقات کا بالکل وقت نہیں تھا۔ مسجد میں جاتے آتے دور سے حاضرین زیارت کر لیتے مصافحہ یا بات چیت کا نمبر عید کے بعد آتا۔ البتہ اخص خدام جیسے مولانا اللہ بخش صاحب۔ منشی رحمت علی صاحب وغیرہ حضرات کو اتنی اجازت ہوتی کہ تراویح کے بعد جب حضرت مولانا عبدالقادر صاحب سادی چائے لے جاتے اور اعلیٰ حضرت ایک دو فنجان نوش فرماتے اتنے یہ حضرات حاضر رہتے۔ البتہ اگر کوئی خاص مضمون شروع ہو جاتا تو کئی کئی گھنٹے لگ جاتے۔ ایک مرتبہ میں نے سنا کہ حقیقت محمدیہ پر اعلیٰ حضرت نے عشاء کے بعد تقریر فرمائی تو مسلسل کئی گھنٹے کئی دن تک ہوتی رہی۔

ایک دفعہ اس سیہ کار کو والد صاحب کے زمانہ میں (یعنی رمضان ۳۴ھ میں) رائے پور رمضان گزارنے کا شوق ہوا اور والد صاحب نے اجازت بھی مرحمت فرما دی۔ اس لیے کہ والد صاحب کے وصال کے ایک سال پہلے مجھے نیم آزادی مل گئی تھی اور خود میرے ہی سے والد صاحب نے اپنے انتقال سے ایک سال پہلے اعلیٰ حضرت رائے پوری کو خط لکھوایا تھا کہ اب تک عزیزی زکریا کی زنجیر میرے پاؤں میں ایسی پڑی ہوئی تھی کہ میں کہیں آنے جانے سے معذور تھا۔ مگر اب اللہ کا شکر ہے کہ اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ اب آپ جب اور جہاں فرمائیں حاضر ہو جاؤں۔ چنانچہ حضرت کے ارشاد پر اعلیٰ حضرت اور میرے والد صاحب کا قیام بہٹ رہا اور اس سیہ کار نے بھی والد صاحب کی آزادی پر اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کو ایک عریضہ لکھا کہ یہ ناکارہ حضرت والا کی خدمت میں رمضان گزارنا چاہتا ہے۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے ازراہِ شفقت تحریر فرمایا کہ رمضان کہیں آنے جانے کا نہیں ہوتا اور نہ ملنے کا۔ اپنی جگہ پر یکسوئی سے کام کرتے رہو۔ اس گستاخ نے دوبارہ خط لکھا کہ صرف اخیر عشرے کی اجازت مرحمت فرما دیں۔ اس کا جو جواب آیا وہ اتفاق سے میرے کاغذات میں مل گیا۔ جس کو تبرکاً نقل کراتا ہوں۔

''برخوردار مولوی زکریا سلمہٗ اللہ۔ از احقر عبدالرحیم بعد سلام مسنون ودعا۔

تمہارا خط پہنچا مضمون معلوم ہوا۔ جو سبب شروع ماہ مبارک میں عدم قیام کا ہے وہ اخیر ماہ میں بھی موجود ہے۔ باقی تم اور تمہارے ابا جان زبردست ہو۔ ہم غریبوں کی کیا چل سکے۔ یہ تمہاری زبردستی ہے کہ جو اس وقت ماہِ مبارک میں تم کو جواب لکھوا رہا ہوں۔ باقی جو ذکر و شغل حضرت مولانا سلمہ نے تلقین فرمایا ہے وہی کرنا چاہیے۔ عائشہ کو دعا، تمہاری والدہ مکرمہ کی خدمت میں سلام بخدمت جناب مولانا مولوی یحییٰ صاحب السلام علیکم۔''

راقم عبدالرحیم

از رائے پور

یہ خط حضرت قدس سرہٗ کے بھانجے مولانا اشفاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ ان کی طرف سے یہ اضافہ تھا۔ ''از محمد اشفاق عفی عنہ السلام علیکم واقع میں ہوز بر دست اس میں کچھ شک نہیں۔ فقط۔'' مگر میرے والد صاحب نے فرمایا کہ تیری وجہ سے حضرت کی یکسوئی میں فرق پڑے گا اور حضرت کو تیرے کھانے پینے کا فکر رہے گا۔ اس لیے حضرت کا حرج نہ کر اور یہ میرے والد صاحب نے بالکل صحیح فرمایا تھا۔ حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب قدس سرہٗ کے اہتمام کو جو اس ناکارہ کی حاضری پر ہوتا تھا بہت سے لوگ دیکھنے والے اب بھی موجود ہیں یہ سب کچھ اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہ کے تعلق کا ثمرہ اور عکس تھا اور اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے اس ارشاد کا ردعمل حضرت رائے پوری ثانی نے کیا کہ جو رمضان رائے پور میں ہوتا حضرت کی خواہش ہوتی کہ یہ ناکارہ رائے پور حاضر ہو مگر بدقسمتی سے نفس امارہ دینی اعذار کا ٹنٹا سامنے کھڑا کر دیتا۔ لیکن حضرت قدس سرہٗ کی حیات کا آخری رمضان اس وجہ سے کہ اس زمانے میں ہفتہ کے تین دن رائے پور گزرتے تھے اور چار دن سہارنپور اس لیے رمضان بھی نصف سہارنپور گزرا نصف رائے پور۔ مگر اللہ کے محبوبوں کی شفقت سے بھی اس سیہ کار نے کچھ نہ لیا۔''

میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے انتقال کے بعد میں اپنی مدرسی کے ذیل میں لکھ چکا ہوں کہ ایک جانب تو اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے مدرسہ میں یہ سفارش کی کہ پندرہ روپے تنخواہ کم ہے کم از کم پچیس روپے ہونا چاہیے اور دوسری جانب اس سیہ کار سے از راہ شفقت و محبت ارشاد فرمایا کہ مدرسہ کی تنخواہ خطرہ کی چیز ہے جب اللہ توفیق دے چھوڑ دیجیو۔ حضرت قدس سرہٗ کی ہی توجہ اور شفقت کا اثر تھا کہ اللہ نے چھوڑنے کی توفیق عطا فرما دی۔ میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد مدرسہ کے خزانچی کا ایک واقعہ تفتیش کا پیش آ گیا۔ ہر وقت اس کے متعلق کچھ مساعی ہو رہی تھیں اس کا بہت فکر تھا۔ حضرت نے استفسار فرمایا اس میں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے اپنی حماقت سے حضرت کے استفسار پر یہ لکھ دیا کہ والد صاحب کے انتقال کے بعد اب ان امور کی اس ناکارہ کو اطلاع نہیں ہوتی۔ یہ کیا ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم اور انعام سے اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کو بہت ہی بلند درجے عطا فرمائے کہ میرے اس احمقانہ جواب پر حضرت قدس سرہ رائے پور تشریف لائے اور مجھے علیحدہ بٹھا کر یہ سارا واقعہ بڑی تفصیل سے سنایا۔

میں بلا تصنع اور بلا مبالغہ لکھواتا ہوں اس میں ذرا تو یہ یا مبالغہ نہیں کہ جب بھی یہ منظر یاد آتا ہے سناٹا چھا جاتا ہے۔ خبر نہیں کیا حماقت کی تھی۔ میں اپنے والد صاحب کے انتقال کے بعد تقریباً چھ ماہ تک ان کو بہت ہی کثرت سے خواب میں دیکھا کرتا تھا۔ دن ہو یا رات اور اکثر خواب اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں لکھا کرتا تھا۔ اس لیے کہ اپنے حضرت قدس سرہٗ سے ڈرتا تھا اور

اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی بارگاہ میں ان کی شفقتوں کی وجہ سے بہت گستاخ تھا اور میری ان حماقتوں پر حضرت قدس سرہٗ اس قدر تبسم اور مسرتوں کا اظہار فرماتے تھے کہ اس وقت تو یہ گستاخیاں بھی معلوم نہ ہوئیں۔ خواب تو بہت سے یاد ہیں اور میرے انبار میں خطوط بھی اعلیٰ حضرت رائے پوری اور دیگر اکابر کے تو ہزاروں ملیں گے:

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا

ایک مرتبہ اس سیہ کار نے خواب میں دیکھا کہ والد صاحب نے مجھے خواب میں تین کتابیں دیں۔ کافیہ، شافیہ، مقامات، میرے حضرت قدس سرہٗ تو اس وقت نینی تال جیل میں تھے۔ اس لیے میں نے حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی خدمت میں لکھا۔ حضرت کا جو جواب آیا وہ بھی اس وقت میرے سامنے ہے۔ حضرت نے تحریر فرمایا:

برخوردار مولوی زکریا سلمہٗ۔ از احقر عبدالرحیم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

''تمہارے دو خط مولوی عبدالقادر صاحب کے نام آئے۔ میری معذوری جو باعث تاخیر جواب ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ اب مختصراً عرض کرتا ہوں پہلے خواب کی تعبیر۔ ہر چیز کی تعبیر کی ضرورت نہیں۔ فقط ایک جملہ خلاصہ ہے۔ اس کی تعبیر جو اپنے خیال میں آئی وہ عرض کرتا ہوں۔ وہ صرف یہ ہے کہ کافیہ، شافیہ اور مقامات امانت کو معیشۃ کافیہ و حالۃ شافیہ و مقامات السلوک والوصول۔ یہ تینوں بشارتیں حق تعالیٰ نے تمہاری طبیعت میں ودیعت رکھی ہیں۔ جو اپنے اپنے وقت پر ظہور پذیر ہوں گی دوسرے خواب کی تعبیر کی ضرورت نہیں۔ سب قصہ ہی دنیا کا چند روزہ ہے۔ خصوصاً عالم آخرت کے مقابلہ میں تو ساری دنیا کی عمر ہی کچھ نہیں۔'' فقط

میں نے اعلیٰ حضرت کو یہ واقعہ بھی لکھا تھا کہ کثرت سے جب سوتا ہوں والد صاحب کو خواب میں دیکھتا ہوں۔ اس کا جواب اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کا تو اس وقت سامنے نہیں۔ مگر اس کے متعلق حضرت مولانا عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک کارڈ سامنے ہے۔ جو حسب ذیل ہے:

سیّدی و مولائی حضرت دام مجدکم۔ از احقر عبدالقادر۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

''والا نامہ شرفِ صدور ہو کر باعث سرور ہوا۔ حضرت تعجب کی کیا بات ہے۔ مجھ جیسوں کو پوچھتا ہی کون ہے اور کس کو جواب نہیں دیتا ہوں۔ جناب بھی بوجہ اس تعلق کے جو کہ حضرت مرحوم مغفور (یعنی میرے والد صاحب) کے ساتھ تھا یاد فرماتے ہو۔ جس کا یہ ناکارہ نہایت ممنون ہے اور باعث سعادت دارین سمجھتا ہے۔ نصف اخیر خط کا پورا خواب حضرت قدس سرہ کو سنایا اور دوبارہ جناب کو جواب لکھوانے کی یاد دہانی بھی کر دی۔ یہ کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ جناب کو جواب کب

لکھوایا جائے گا۔ تعبیر تو جو حضرت اقدس لکھوادیں گے وہ ہوگی۔ اپنا خیال یہ ہے کہ آنجناب پریشان نہ ہوا کریں۔ محض یہ ہے کہ حضرت مرحوم کی روحانیت متوجہ ہے جس کی بڑی خوشی ہے چونکہ وہ یقیناً مصفّٰی اور کثافت سے بالکل مبرّا ہے۔ یہ جو کچھ آپ دیکھتے ہیں یا جواب ملتا ہے جناب کے خیالات اور تفکرات کا عکس ہے۔ جب خود آدمی اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتا۔ بات ہی کیا ہے خام خیالی ہے۔ اصل بات تو وہ ہوگی جو کہ حضرت قبلہ لکھوادیں گے۔ بس اتنی عرض ہے کہ احقر کو ایک نالائق خادم سمجھا کیجئے۔ کچھ نہیں فقط آپ لوگوں کا سہارا ہے۔''

ایک بات یاد آ گئی جو کہ بہت اہم ہے اور بہت قابلِ اہتمام دوستوں کو خاص طور سے اس کی تاکید کرتا ہوں۔ اس کا ضرور اہتمام رکھیں۔ حدیث پاک میں آتا ہے: ''جو شخص کسی کو کسی گناہ کے ساتھ عار دلاتا ہے۔ وہ مرنے سے پہلے اس میں ضرور مبتلا ہوتا ہے۔'' یہ مضمون میرا بہت ہی مجرب ہے اور بہت سے لوگوں پر اس کا تجربہ کر چکا ہوں۔ دوستوں کو وصیت اور نصیحت کرتا ہوں کہ کسی کو کسی گناہ پر عار دلانا بڑی سخت چیز ہے۔ اس کو نصیحت کرنا۔ اس کو تنبیہ کرنا امر آخر ہے اور اس کو عار دلانا یا ذلیل کرنا امر آخر ہے اس سے بہت ہی بچیں۔ اس وقت یہ حدیث پاک اس خاص واقعہ پر یاد آئی۔

یہ سیہ کار اپنی حماقت سے اپنے بچپن میں جب یہ دیکھتا تھا کہ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے دانت بالکل نہیں اور حضرت تمباکو کے ساتھ پان تناول فرماتے تو اس کو چار پانچ منٹ میں ویسے کے ویسے نکال کر اگالدان میں ڈال دیتے تو میں اپنی حماقت سے یہ سوچا کرتا تھا کہ ان کو پان کھانے کی کیا ضرورت پیش آ رہی ہے۔ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں پان توڑ کر کھانے کا دستور نہیں تھا بلکہ چھوٹا سا پان بغیر چھالیہ کے کھاتے اور تھوڑی دیر بعد ویسے کے ویسے اگالدان میں پھینک دیا کرتے تھے۔ اب میں اس حماقت کو دس برس سے بھگت رہا ہوں۔ دانت ٹوٹ گئے اور پان کا مرض ہے بہت باریک باریک ٹکڑے کر کے کھاتا ہوں تو اپنے آپ کو بڑی ملامت کرتا ہوں کہ تجھے پان کھانے کی کیا مصیبت ہے۔

بات میں بات یاد آتی ہے اور اس قسم کی باتیں لکھوانے کو بھی جی چاہتا ہے۔ آپ بیتی تو فضول ہی لکھوائی، مگر اس قسم کی باتیں بہت مفید اور کارآمد ہوتی ہیں۔ میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے انتقال پر چند واقعات بڑے عجیب پیش آئے۔ تقریباً چھ ماہ دن میں یا رات میں جب بھی میں سوتا تھا، والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھتا تھا اور خواب میں خوب محسوس ہوتا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے اور میں ان کو خواب میں دیکھ رہا ہوں۔ بہت سی باتیں ان سے عنوان دریافت کرتا کہ ایک بات جلدی سے یہ بتا دیجئے پھر تو میری آنکھ کھل جائے گی۔ اس زمانے میں بہت سے ایسے حضرات بھی تعزیت کے لیے آئے جن کو اللہ تعالیٰ نے کشف قبور کی دولت سے نوازا تھا۔

چنانچہ ایک بزرگ تشریف لائے اور انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ ''مولانا یحییٰ صاحب نے چند پیغامات دیے ہیں۔

(۱)...... میرے قرضہ کی بالکل فکر نہ کر، کیونکہ مجھ پر اس کا بالکل بار نہیں۔

(۲)...... فلاں شخص کی وجہ سے مجھ پر کوئی گرفت نہیں اس کو اپنی حرکتوں کی وجہ سے بہت نقصان ہوا ہے۔

(۳)...... ''اللہ والوں سے ڈرتے رہا کرو، ان کی اُلٹی بھی سیدھی ہوتی ہے۔'' پہلے دو نمبر تو بالکل صحیح ہیں میری سمجھ میں بھی آ گئے۔ کیونکہ مجھے والد صاحب کے قرض کی بہت فکر تھی کہ ان پر ان احادیث کے بارے میں جو مقروض کے لیے وارد ہوئی ہیں کوئی گرفت نہ ہو رہی ہو۔ اسی لیے میں نے والد صاحب کے انتقال کے بعد چچا جان کے مشورے سے سب لوگوں کو خطوط لکھ دیے کہ ان کا قرضہ میری طرف ہے۔ جس کا بیان والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کے سلسلہ میں باب چہارم حوادث میں گزر چکا۔ (۲) بھی سمجھ میں آ گیا کہ ایک صاحب کو میرے والد صاحب سے بغض پیدا ہو گیا تھا اور وہ حضرت کے یہاں بہت مقرب تھے اور ان کے متعلقین چچا جان نور اللہ مرقدۂ اور اس ناکارہ سے بہت خفا تھے، اسی کے ثمرہ میں چچا جان اور اس ناکارہ کو حضرت قدس سرہٗ پرسی، آئی، ڈی بتاتے اور میرے سبعہ معلقہ کی ابتدائی تدریس میں ان سب دوستوں نے بہت مخالفت کی تھی۔ ایک عرصہ بعد والد صاحب کا یہ ارشاد بھی دیکھ لیا۔ کیونکہ وہ صاحب حضرت کے یہاں سے پھر معتوب بنا کر نکالے گئے اور جب اس ناکارہ نے حضرت قدس سرہٗ کے یہاں ان کی سفارش کی تھی تو حضرت قدس سرہٗ نے بڑے تعجب سے فرمایا تھا کہ تم بھی اس کی سفارش کرتے ہو۔ میں نے عرض کیا ہاں حضرت ضرور کرتا ہوں کہ حضرت کی ناراضی سے اس کا دین خراب ہو جائے گا۔ لیکن (۳) کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا کہ اُلٹی تو بہر حال اُلٹی ہے، لیکن ابا جان کا یہ ارشاد کہ اللہ والوں سے ڈرتے رہو، ان کی الٹی بھی سیدھی ہے سمجھ میں نہیں آیا۔

۴۶ھ میں حجاز سے واپسی پر حضرت اقدس رائے پوری ساتھ تھے، میرے مرشد میرے حضرت قدس سرہٗ نے حضرت رائے پوری کی زبانی مدرسہ میں حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو یہ پیغام بھیجا کہ فلاں شخص کے متعلق تمہارا رویہ مناسب نہیں۔ حضرت رائے پوری نے حضرت ناظم صاحب کو یہ پیام پہنچا دیا۔ حضرت ناظم صاحب نے فرمایا کہ فلاں شخص حضرت کو جھوٹی شکایت لکھتا ہے۔ میری طرف سے اس پر کوئی زیادتی نہیں۔ میرے نزدیک حضرت ناظم صاحب کا یہ جواب بالکل صحیح تھا کہ یہ شخص بہت جھوٹی شکایات حضرت ناظم صاحب کی لکھتا ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب قدس سرہٗ حضرت ناظم صاحب کے اس جواب پر کچھ خوف زدہ

سے ہو کر ساکت ہو گئے۔ مجھے اپنے والد صاحب کا یہ کشف والا پیام (۳) یاد آیا۔

میں نے حضرت رائے پوری کو یہ کشف والا مقولہ سنایا کہ اس کا مطلب کبھی سمجھ میں نہیں آیا اور اس وقت حضرت ناظم صاحب کے جواب پر میں نے آپ کو کچھ خوف زدہ دیکھا حالانکہ حضرت ناظم صاحب نے صحیح فرمایا تھا کہ حضرت کا یہ ارشاد اس شخص کی جھوٹی شکایت پر مبنی ہے۔ حضرت رائے پوری نے میرے اس اشکال کے جواب میں بہت ہی صحیح فرمایا کہ یہ تو تم نے صحیح کہا کہ اُلٹی بات بہر حال اُلٹی ہے، لیکن اہلِ اللہ کے قلوب میں اگر کسی سے تکدر پیدا ہو جائے خواہ کسی غلط بات کی ہی وجہ سے پیدا ہو تو ان کے پاک دل کا تکدر رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ اس شخص کو کسی مصیبت میں پھانس دیتا ہے، یہ بات میری خوب سمجھ میں آگئی اور ان کے نظائر بھی دیکھے۔ اس لیے میں اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا کشفی پیام دوستوں کو ضرور اہتمام سے پہنچاتا ہوں کہ ان اللہ والوں سے بہت ڈرتے رہنا۔ ان کے دل میں تمہاری طرف سے تکدر نہ پیدا ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور میرے دوستوں کو بھی اس سے محفوظ رکھے۔ غالباً میں اپنے رسالہ الاعتدال میں بھی اس نوع کا ایک مضمون لکھوا چکا ہوں کہ کسی شخص کا معتقد نہ ہونا امر آخر اور اس کی مخالفت اور بے ادبی امر آخر ہے۔ تم اللہ والوں میں سے کسی کے معتقد نہیں ہوتے نہ ہو۔ مگر اس کی مخالفت یا کوئی حرکت جس سے اس کے دل میں تکدر پیدا ہو بہت بچنا۔

بات پر بات یاد آتی ہے اور کہیں سے کہیں نکلی چلی جاتی ہے۔ میں تو اعلیٰ حضرت رائے پوری کی شفقتیں لکھوا رہا ہوں کہ مجھے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں بھی حاضری کا موقع باوجود اس کے کہ اعلیٰ حضرت کی زندگی کا زمانہ حضرت شیخ الہند کے زمانہ سے زیادہ پایا۔ لیکن بذل کے شروع ہو جانے کی وجہ سے حاضری کا موقعہ کم ملا۔ لیکن جتنا بھی ملا اس میں حضرت کی شفقتیں بہت زیادہ رہیں۔ آپ بیتی نمبر ا کے صفحہ ۸ پر لکھوا چکا ہوں کہ اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے مولانا میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مشورہ پر مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں کتب خانہ لے کر میرٹھ منتقل ہو جاؤں اور میرے اس جواب پر کہ ''میری یہ تمنا ہے کہ حضرت سہارنپوری کی حیات تک کہیں باہر نہ جاؤں۔'' حضرت رائے پوری نے انتہائی مسرت سے فرمایا کہ بس بس اور انتہائی مسرت کے ساتھ مجھے اتنی دعائیں دیں کہ جن کا مشاہدہ اب تک خوب کر رہا ہوں۔ اس سیہ کار کا دستور تقسیم ہند سے پہلے زندوں اور مُردوں کی طرف سے قربانی کے حصص کی کثرت کا بہت تھا۔ آٹھ دس گائیں تو مستقل خود میری ہی ہوتی تھیں اور جس کی گائے میں ایک آدھ حصہ بچ جاتا تھا۔ اس کے لیے عام دستور تھا کہ وہ مجھے اطلاع کرے اور میرا حصہ اپنے یہاں کر لے۔ نسبی، سلوکی، علمی، مشائخ، خصوصی صحابۂ کرام، ائمۂ فقہ، ائمۂ حدیث، غرض جتنی بھی گنجائش ہوا کرتی مجھے حصہ لینے میں انکار نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس کے

ساتھ یہ بھی شوق تھا کہ اکابر کے جانوروں میں میرا حصہ ہو جائے۔ حضرت اقدس سہارنپوری اعلیٰ حضرت رائے پوری اور عجیب بات یہ کہ حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے جانوروں میں بھی ایک ایک حصہ ہوتا تھا۔ جس کے گوشت وغیرہ سے مجھے کوئی تعلق نہیں، وہ جس طرح چاہیں تصرف فرمادیں۔ حضرت رائے پوری ثانی نے تو اس کا ردِعمل یہ کیا کہ مستقل ایک جانور میری طرف سے حضرت خود کیا کرتے تھے چاہے رائے پور میں ہوں چاہے پاکستان میں۔ رائے پور کے قیام میں حضرت کا ارشاد ہوتا تھا کہ میں ۱۲ کو ضرور پہنچوں اور جانور میرے سامنے ہی ذبح ہو۔ اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے زمانے کا ایک کارڈ چونکہ نظر پڑ گیا، وہ بھی درج کرا رہا ہوں، جو حسبِ ذیل ہے:

سیّدی ومولائی حضرت دام مجدکم، از احقر عبدالقادر السلام علیکم ورحمۃ اللہ

''والا نامہ شرف صدور ہو کر باعث افتخار خاکسار ہوا۔ مضمون حضرت اقدس سلمہٗ کی خدمت شریف میں عرض کیا۔ بلکہ کچھ بلفظ پڑھ کر سنایا یہی جی چاہا اور اپنے نزدیک یہی مناسب سمجھا۔ وقت بھی مناسب ملا۔ یہ ارشاد فرمایا کہ یوں خدمت والا میں لکھ دے کہ بندے کی سعادت تو ہے، یا سعادت جانتا ہے۔ غرض حضرت اقدس سلمہٗ نے اس گائے میں جو یہاں آنجناب والا صفات بوساطت شاہ صاحب ارسال فرمائیں گے۔ ایک حصہ کی شرکت قبول، بخوشی فرمائی۔ اب احقر عرض پرداز ہے، حضور پُر نور نے اس کی تفصیل نہ تحریر فرمائی، آیا وہ حصہ حضور انور اپنی طرف سے حضرت اقدس سلمہٗ کو عطا فرمارہے ہیں یا قیمتاً حضرت سلمہٗ خریدیں گے۔

یہ آپ کا غلام غبی بہت ہے، پوری بات نہیں سمجھتا، حضرت خفا نہ ہوں اور دعاء سے فراموش بھی نہ کیا جاؤں، آخر آپ ہی کا ہوں جیسا بھی ہوں۔ حضرت سلام فرماتے ہیں اور طبیعت بدستور سابق ہی ہے۔ تین چار روز سے شب کو کسی قدر حرارت ہوتی ہے۔''

اس خط پر رائے پوری کی مہر ۶ ستمبر ۱۸ء کہ ہے جو قمری حساب سے ذی الحجہ ۳۶ھ بنتا ہے۔ ایک خط اور بھی اس وقت میرے سامنے ہے۔ ذخیرہ تو جیسا کہ بار بار لکھ رہا ہوں ہزاروں کی تعداد ہے، اس وقت اتفاق سے ایک لفافہ سامنے آ گیا، جس میں اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے خطوط ہیں۔ ہیں تو بہت سے جن میں سے چند کا نمونہ اندراج کرایا۔ ایک خط حسب ذیل ہے:

سیدی ومولائی حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سلمہٗ، از احقر عبدالقادر السلام علیکم ورحمۃ اللہ

''والا نامہ شرف صدور ہوا۔ اللہ تعالیٰ جناب کو صحتِ عاجلہ عطا فرمائے۔ جناب کا خط حضرت اقدس سلمہٗ کو سنانے لگا۔ اس قدر ہنسی آئی پورا خط سنا نہ سکا۔ دو دفعہ کر کے بمشکل سنایا۔ یہ ارشاد فرمایا کہ کوئی خط مولوی زکریا کا میرے پاس نہیں آیا۔ البتہ مولوی الیاس کے خط آئے۔ ان کا

جواب بھی لکھوا دیا گیا۔ باقی ویسے خط مولوی زکریا کو اس وجہ سے لکھا کہ اکثر آدمی آتے رہتے ہیں، ان سے خبر ملتی رہتی ہے اور یہاں سے بھی پوچھوا بھیجا گیا۔ چنانچہ مولانا عاشق الٰہی صاحب ابھی گئے ہیں ان کے ہاتھ سلام وغیرہ کہلا بھیجا گیا۔ حضرت اقدس سلمہٗ کو بھی کئی روز سے بخار آ رہا ہے اور ضعف بہت ہے۔ نماز میں بھی قیام بتکلف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جناب کو جلد صحت عطا فرمائے۔ جناب کی زیارت کو جی چاہتا ہے، دیکھئے کب ہو۔ آج کل ڈاک کے مدار المہام مخدوم مکرم حضرت ملا جی صاحب سلمہٗ ہیں۔ واقعی جناب نے خوب پوچھا۔ بزرگ تو بڑے ہیں۔ خطوط بھجوانے کی کچھ زیادہ حاجت نہیں سمجھتے۔ جس کسی کو کچھ کہنا ہو خود آ کر بالمواجہ کہو۔ دور دور سے تیر چلانا کچھ حضرت ملا جی کو بھاتا نہیں۔ حضرت اقدس مدظلہٗ اور مولوی الیاس صاحب وغیرہ کو دست بستہ سلام و دعا۔“

رائے پور کی مسجد باغ کا افتتاح:

جب باغ کی تعمیر ہوئی تو اس کے افتتاح کے لیے اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے میرے والد صاحب کو بلایا اور بہت تاکیدی خط ایک ڈاک میں ایک دستی روانہ فرمائے۔ جس میں بہت تاکید سے مسجد کی افتتاح کے لیے بلایا گیا تھا اور یہ لکھا تھا کہ ضرور آنا ہوگا۔ کوئی عذر مسموع نہ ہوگا۔ میرے والد صاحب اس کی تعمیل میں تشریف لے گئے۔ یہ ناکارہ بھی ساتھ تھا۔ بہٹ تک تو تانگہ تھا اور اس کے بعد پاؤں تشریف لے گئے دھوپ بڑی تیز تھی۔ آدھی پٹری پر جا کر لیٹ گئے۔ مجمع دیہات کا بہت پٹری پر گزر رہا تھا، جانے والوں سے دو تین منٹ کے بعد پیام بھیجتے کہ آدھے راستے تو پہنچ گیا ہوں، اگر دیر ہو جائے تو تھوڑا انتظار فرمائیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ۲ بجے کے قریب پہنچے تھے۔ غسل فرمایا اور اعلیٰ حضرت نے جوڑا مع عمامہ کے تیار کرا رکھا تھا۔ اسے پہن کر جمعہ کی نماز پڑھائی۔ جس وقت میں یہ خط سن رہا تھا مکرم محترم جناب الحاج حافظ عبد العزیز صاحب گمتھلوی میرے پاس تشریف فرما تھے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ ان دونوں خطوں کی مجھے ضرورت ہے۔ میں نے بصد احترام پیش کر دیے۔ اس کے علاوہ بھی اعلیٰ حضرت کے خطوط اس لفافہ میں کئی تو ملے، دوستوں کا اصرار جس کے نقل پر ہوا، وہ کرا دیے۔ ایک خط میرے والد صاحب کے انتقال پر جو حضرت نے تحریر فرمایا وہ یہ ہے:

برخوردار مولوی زکریا سلمہٗ از احقر عبد الرحیم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

”اس وقت گیارہ بج کر بیس منٹ پر تار جو بہٹ شاہ صاحب کے پاس آیا تھا، بندہ کے پاس حاجی غلام محمد صاحب لے کر آئے۔ جس سے اچانک اس حادثۂ عظیمہ انتقال مولانا محمد یحییٰ صاحب کی خبر معلوم ہو کر سکتہ کی حالت ہوگئی۔ طبیعت پر ایک ایسی حیرت ہے جو تحریر میں نہیں آ سکتی

ہے۔مشیت ایزدی میں کسی کو دخل نہیں۔وہ مالک مختار ہے وہ اپنی ملک میں جو چاہے تصرف کرے اس سے جلد اطلاع دو کہ مرض پیش آیا۔اس فوری حادثہ سے ایک سخت حیرت ہے۔میں اسی وقت یہاں سے چل دیتا مگر اپنی حالت کی وجہ سے سخت مجبور ہوں۔اس وقت زیادہ کیا لکھوں۔''

راقم عبدالرحیم از رائے پور

بروز شنبہ

بوقت گیارہ بج کر بیس منٹ

اسی سلسلہ کا دوسرا والا نامہ:

برخوردار مولوی محمد زکریا سلمہٗ اللہ تعالیٰ ،از احقر عبدالرحیم السلام علیکم ورحمتہ اللہ

''یہ حادثہ ایسا ہے کہ جس نے طبیعت کو بہت مضمحل کر دیا۔مجھ کو تو صدمہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ مگر یہاں پر مرد وعورت جس کسی نے سنا سب کو صدمہ ہے۔بجز صدمہ اُٹھانے کے اور کوئی کیا کرسکتا ہے۔طبیعت بے اختیار ہے اور تمہارے پاس آنے کو طبیعت چاہتی ہے،مگر اس وجہ سے فوراً حاضر نہیں ہوسکا کہ ضعف اس درجہ کا ہوگیا کہ کھڑے ہوتے ہوئے چکر آتا ہے۔اندیشہ گرنے کا ہوتا ہے۔مسجد تک جانے میں مغرب اور عشاء اور صبح کو بغیر دوسرے شخص کے پکڑے جا نہیں سکتا ہوں۔ادھر شاہ صاحب چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ان کی صحت کی حالت میں سواری کا انتظام بسہولت ہو جاتا تھا۔اب ایسی سواری دستیاب نہیں کہ جس میں رائے پور سے بہٹ تک پہنچوں۔عنقریب ارادہ کررہا ہوں کہ کوئی سواری کا انتظام ہو جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ حاضر ہوں گا۔ بیل گاڑی کی حرکت سے دماغ پر ایک ایسا اثر پہنچتا ہے کہ جس کی تاب نہیں لاسکتا ہوں۔اگر چہ یہ صدمہ تو ایسا ہے کہ تم کو تو لکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔مگر آخر مشیت ایزدی پر صبر کرنا اور راضی برضا رہنا اس کے سچے بندوں کا کام ہے۔اُمید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ تمہاری یہی حالت ہوگی۔

اپنی والدہ صاحبہ اور ہمشیرہ صاحبہ کی جہاں تک ہو سکے تسلی کرو اور صبر اور راضی برضا ہونے کا ان کو اجر سناؤ۔اگر چہ عنوان اس صدمہ کا بہت وجوہ سے بہت بڑھا ہوا ہے مگر آخر ہمیں تمہیں سب کو پس وپیش یہی راہ طے کرنا ہے۔مالکِ حقیقی اپنے جو چاہے کرلے کسی کو مجال دم زدن نہیں،رضا وتسلیم بندوں کا کام ہے۔زیادہ کیا عرض کروں۔یہ نہیں معلوم ہوا کہ کیا مرض پیش آیا اور کس وقت انتقال ہوا۔عائشہ کو بہت بہت دعاء اور اپنی والدہ مکرمہ کی خدمت میں سلام ودعاء عرض کر دینا۔''

از جانب مولوی عبدالقادر صاحب ملا جی صاحب ومولوی رستم علی صاحب ومولوی سراج الحق صاحب بعد سلام مسنون مضمون واحد ہے۔

راقم عبدالرحیم

از رائے پور، بروز اتوار

اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کو میرے والد صاحب کے بُلانے کا اتنا ہی اشتیاق و اصرار رہتا تھا، جس کا نمونہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب نوراللہ مرقدہٗ کو اس سیہ کار کو بُلانے پر اصرار کے دیکھنے والے ابھی بہت ہیں۔ اعلیٰ حضرت کا اصرار اور خواہش یہ رہتی تھی کہ میرے والد صاحب کثرت سے بار بار رائے پور جائیں اور خوب ٹھہریں۔ اسی کا اتباع حضرت رائے پوری ثانی نے اس سیہ کار کے ساتھ کر کے دکھایا، بلکہ اس سے زیادہ کر دکھایا۔ اعلیٰ حضرت کا ایک خط میرے والد صاحب کے نام دوستوں کے اصرار پر اس سلسلے کا نقل کرا رہا ہوں:

المخدوم المکرم حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب مدفیوضہم، از احقر عبدالرحیم السلام علیکم ورحمۃ اللہ
''آپ سے ملنے کی غرض سے بہت آنے کو بہت جی چاہتا رہا۔ مگر اول تو سواری اختیاری نہیں ہے۔ دوم یہ کہ شاہ صاحب کو احقر کے جانے پر اُوپر کا کمرہ خالی کرنا پڑتا ہے کہ جس میں وہ خود تشریف رکھتے ہیں۔ بہت آپ کا تشریف لانا طمانیت کا ہو تو فرمادیں، تاکہ بہت حاضر ہونے کا قصد کروں۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ آپ جمعرات کو تشریف لائیں اور جمعہ کو واپس ہونے لگیں۔ اس صورت میں تو مجھے آنے جانے کی ہی بہت تکلیف ہوگی۔ طمانیت سے ٹھہرنا ہو تو تشریف لائیں۔''

راقم عبدالرحیم از رائے پور

۵ ذیقعدہ ۱۳۳۴ھ

اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کو میرے والد صاحب سے بہت ہی محبت اور تعلق تھا۔ ۲۸ھ کے سفر میں بہت ہی خواہش اور تمنا رہی کہ والد صاحب کو حج میں ساتھ لے جائیں اور والد صاحب بھی تیار تھے۔ ٹیکے وغیرہ لگوا لیے تھے۔ عین وقت پر کچھ ایسی مجبوریاں پیش آئیں کہ والد صاحب کو سفر ملتوی کرنا پڑا۔

ایک دفعہ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے میرے والد صاحب سے ارشاد فرمایا کہ پنجاب کا ایک لمبا سفر ہے اور اعلیٰ حضرت رائے پوری کا سفر بھی حضرت مدنی کی طرح سے گھوڑے سوار نہ ہوتا تھا بلکہ حضرت رائے پوری ثانی کی طرح سے نہایت اطمینان کا ہفتوں اور مہینوں کا ہوتا تھا۔ مگر اس سفر میں چونکہ میرے والد صاحب بھی ساتھ تھے، اس لیے اعلیٰ حضرت کو مشقت تو بہت اُٹھانی پڑی لیکن سفر بہت طویل اور اپنی عادت شریفہ کے خلاف عجلت کا ہوا، جس پر مجھے بھی بہت قلق ہوتا تھا۔
اعلیٰ حضرت نے میرے والد صاحب سے فرمایا کہ یوں جی چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ پنجاب کا سفر تو حضرت بھی فرمالیں، بہت سے مشتاق ایسے ہیں جو آنہیں سکتے۔ حضرت گنگوہی کے خدام بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ جناب کی زیارت کے بھی مشتاق ہیں۔ میرے والد نے تین شرطوں کے ساتھ قبول فرمایا۔ پہلی شرط یہ کہ اس سفر میں جو نقد ہدایا آئیں تو وہ میرے والد صاحب کے، کھانے پینے

اور کپڑے قسم کی جو اشیاء ہوں وہ حضرت کی۔ دوسرے یہ کہ ہر جگہ پر کھانے اور آرام کرنے میں میرے والد صاحب آزاد ہوں گے، حضرت کے پابند نہ ہوں گے۔ تیسرے یہ کہ میں واپسی میں ہمرکابی کا پابند نہیں ہوں، جہاں سے میرا جی چاہے گا واپس آ جاؤں گا۔ حضرت اقدس نے تینوں شرطیں منظور فرمالیں۔ یہ ناکارہ بھی ہمرکاب تھا۔

پہلی منزل یہاں سے انبالہ ہوئی۔ حافظ صدیق صاحب کے مکان پر قیام ہوا۔ اس کے بعد خانپور، لدھیانہ، جگراؤں، رائے پور گوجران تک یہ سفر ہوا۔ ہر جگہ جہاں جانا ہوتا سب سے پہلے اعلیٰ حضرت فرماتے کہ صاحبزادے اور حضرت کا بستر الگ کر دو، پہلے چار پائی اور بستر وغیرہ بچھوا کر میرے والد صاحب کو وہاں لٹوا دیتے۔ یہ ناکارہ شوق میں حضرت کے ساتھ رہتا۔ ہر جگہ پر ہزاروں کا مجمع حضرت کو گھیر لیتا۔ مصافحوں اور بیعت کی اس قدر بھر مار ہوتی کہ کچھ انتہا نہیں۔ کھانا تو میرے والد صاحب کو علیحدہ کھانے کی نوبت نہیں آئی اس میں تو اعلیٰ حضرت کی شرکت ہوتی تھی، لیکن لیٹنے میں کبھی ساتھ نہ ہوا اور اعلیٰ حضرت کو بعض مرتبہ تو کئی کئی دن رات لیٹنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ رتھ اور بیل گاڑیوں میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور تیسرے گاؤں۔ بعض مرتبہ تو چوبیس گھنٹے میں تین چار گاؤں نمٹا دیتے۔ میں تو بچہ تھا کیا تھکتا۔ مگر اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ پر تکان اس قدر محسوس ہوتی تھی کہ کچھ حد نہیں ہے اور تکان کا کیا قصور، صبح کی نماز پڑھ کر ایک جگہ سے چلے اور خدام وعشاق سینکڑوں کی تعداد میں گاڑیوں کے دونوں اطراف پروانہ وار خوشی خوشی میں جھومتے بھاگتے دوڑتے چلتے تھے۔ دوسرے گاؤں میں پہنچے تو میرے والد صاحب تو لیٹ جاتے اور اعلیٰ حضرت عشاق کے ہجوم میں بیٹھ جاتے تھے۔ کہیں لسی کا دور کہیں چائے کا دور چلتا۔ حضرت تو ایک دو گھونٹ پی کر چھوڑ دیتے۔ مگر مجمع کی کثرت کی وجہ سے چائے کا دور بھی دیر تک چلتا اور لسی کا بھی۔ مگر حضرت قدس سرہٗ اتنی دیر مصافحہ اور بیعت سے نمٹ کر اگلی منزل کے لیے گاڑی میں تشریف رکھتے۔ یہ ناکارہ کبھی حضرت قدس سرہٗ کی گاڑی میں ہوتا اور کبھی اپنے والد صاحب کی، اسی سفر میں رائے پور گوجراں میں حضرت مولانا احمد الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا نکاح بھی میرے والد صاحب نے پڑھایا تھا۔

رائے پور گوجراں کے قریب کوئی دریا تھا جس پر کشتیوں میں بیٹھ کر عبور ہوا تھا۔ ادھر کی گاڑیاں ادھر ہی رہ گئی تھیں اور رائے پور گوجراں سے ہزاروں کی تعداد میں پیادہ اور پچاس بناٹھ گھوڑیاں بڑی خوبصورت جواب تک نگاہوں میں پھر رہی ہیں۔ ان کو دیکھ کر اس لالچی کے منہ میں پانی بھر گیا۔ کہ گھوڑی پر بیٹھیں گے چڑھنا آتا نہیں تھا۔ ایک نہایت اونچی گھوڑی نہایت ہی سفید جس پر کالے دھبے۔ اس قدر خوشنما قریب قریب گویا چتکبری اس پر ایجاب رحمہ اللہ تعالیٰ

والغفر ان نے بیٹھتے ہی ایڑ ماردی اور وہ ایسی بے تحاشہ دوڑی کہ اپن تو چار جامہ کے اوپر سر بسجود ہوگئے اور اس نے دریا کا رخ کرلیا۔ مگر اللہ رے پنجابی نوجوان میں پچیس شہسوار ایک دم انہوں نے اپنی گھوڑیوں پر چڑھ کر میری گھوڑی کا سامنا روک لیا اور چار پانچ نے آگے سے اس کا لگام پکڑ کر اس کو کھڑا کیا اور وہ آپے سے باہر ہورہی تھی اور کئی نوجوانوں نے تو میرا سامنا روکنے کے لیے اپنی گھوڑیاں دریا میں ڈال دیں۔ اللہ نے زندگی مقدر میں لکھی تھی ورنہ ہم نے تو اپنے ڈوبنے میں کچھ کسر نہیں چھوڑی تھی۔

یہ معلوم ہوا کہ وہ گھوڑی بہت اصیل تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ کبھی اس کے ایڑ نہیں ماری گئی تھی۔ مگر ان نوجوانوں کا بھی منظر ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رہتا ہے بڑے ہی ماہر تھے انہوں نے میری گھوڑی کے ساتھ اپنے گھوڑے نہیں دوڑائے۔ کہ اس سے وہ گھوڑی اور نہ بھڑکے بلکہ دائیں بائیں جانب بہت تیزی سے بھگا کر اور ایک دم اپنے گھوڑوں کی باگیں میری گھوڑی سے بہت آگے کی طرف پھیر کر کچھ تو دریا کے کنارے پر اور کچھ دریا کے ابتدائی حصہ میں پہنچ گئے۔ اس گھوڑی نے ان کی گھوڑیوں پر پھلاندنا بھی چاہا ایسی بے قابو ہوئی کہ اللہ کو زندگی رکھنی ہی تھی اس ناکارہ نے اپنے مرنے کی کوشش میں تو کچھ کسر چھوڑی نہیں۔ مگر موت تو وقت ہی پر آتی ہے۔

سہارنپور کی ابتدائی آمد میں مدرسہ قدیم کے کتب خانہ کے دونوں جانب جو کمرے ہیں۔ ان کی کھڑکیوں کے باہر چھوٹے چھوٹے سائبان لگ رہے ہیں۔ ان کے لوہے کے سریوں پر لٹکنا اور مہمان خانہ کے سامنے شرقی جانب جو چھجہ ہے اس کے سریوں پر کھیلنا یعنی بازی گروں کی طرح پھرنا۔ سڑک پر ہر دیکھنے والا شور مچاتا۔ ارے مرنے کو جی چاہ رہا ہے کیا؟ مدرسہ قدیم کے کتب خانہ کے سامنے جو چھجہ ہے نماز کے اوقات میں اس پر دائی دُکا کھیلنا کہ میرے اور میرے ساتھیوں مظہر و محفوظ کے لیے یہ قانون تھا کہ ہم تینوں اپنی جماعت اندر کریں۔ اختلاط کی وجہ سے مسجد کی جماعت کی ایک زمانہ تک اجازت نہیں تھی نیز گرمیوں کے دوپہر میں جب سب سو جائیں گھر یا رات کے وقت سیڑھیوں پر اترنے چڑھنے کا دستور نہیں تھا بلکہ مدرسہ قدیم کے دروازے کے برابر جو ایک کھمب کھڑا ہوا ہے اور اس پر چھجہ رکھا ہوا ہے اسی پر کو اترنا اور اس پر کو چڑھنا۔ ایسے معمولات تھے کہ کسی وقت گرتا تو وہیں نمٹ جاتا۔ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ **لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ** کہاں منہ ماردیا۔

تیسری شرط بھی حضرت قدس سرہٗ نے پوری فرمادی کہ مدرسہ کے حرج کی وجہ سے میرے والد صاحب پہلے تشریف لائے اور مجھے یاد نہیں کہ حضرت قدس سرہٗ نے خود ارشاد فرمایا یا والد صاحب کی درخواست پر اجازت مرحمت فرمائی بہر حال یہ ناکارہ اور والد صاحب تشریف لے آئے اور اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی علالت کا زمانہ بہت ہی طویل گزرا تو تقریباً سات آٹھ سال علالت کا

سلسلہ رہا اور روز افزوں اضافہ ہی ہوتا رہا حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی ثم الدہلوی مستقل معالج تھے۔ بار بار تشریف لاتے اور کئی کئی دن قیام فرماتے مگر:

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ہر نوع کا علاج کیا گیا۔ مگر ہر علاج بجائے صحت کی طرف لانے کے علالت کی شدت کی طرف لے جاتا تھا اس زمانے میں والد صاحب کی بہت کثرت سے آمد و رفت تھی اور اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کو اشتیاق اور تقاضا رہتا تھا۔ میرے والد صاحب نے اس زمانے میں کئی دفعہ فرمایا بیماری وغیرہ کچھ نہیں یوں سمجھ رکھا کہ میری موت کا وقت قریب ہے اور موت کے قریب مقبولین کو جو مرنے کا اشتیاق ہوتا ہے وہ ابھی ہے نہیں۔ میں جا کر اول تو اس پر مناظرہ کرتا ہوں کہ کیا آپ کو علمِ غیب ہے کہ میرا وقت موعود آ گیا اور اس کے بعد احادیث رحمت اور آیاتِ قرآنی بکثرت سناتا ہوں۔ مثنوی شریف کے وہ اشعار بھی سناتا ہوں جو رحمتِ چاہئیں کے متعلق ہیں اور زور سے اطمینان دلاتا ہوں کہ آپ گھبرائیں نہیں جب وقتِ موعود آئے گا تو وہ ساری چیزیں پیدا ہو جائیں گی جن کا آپ کو اشتیاق ہے۔ اس سے طبیعت دو چار دن کو اُبھر جاتی ہے۔ اُٹھنے بیٹھنے لگتے ہیں۔ کچھ غذا شروع ہو جاتی ہے لیکن دو چار دن کے بعد وہ بات ختم ہو جاتی ہے اسی وجہ سے میرے بلانے کا بار بار تقاضہ رہتا ہے اور میرا بھی دل چاہتا ہے کہ دو چار ماہ مستقل قیام کروں مگر مدرسہ کے اسباق کی مجبوری کو زیادہ ٹھہرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ شوال ۳۳ھ میں حضرت اقدس سہارنپوری قدس سرہٗ کے اور حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے طویل سفرِ حجاز کی وجہ سے حضرت سہارن پوری کے اسباق ترمذی، بخاری بھی والد صاحب کے ہی ذمہ ہو گئے تھے اور ان کے اپنے اسباق ابوداؤد، نسائی شریف وغیرہ تو تھے ہی۔ البتہ مسلم شریف اس سال پہلی مرتبہ مولانا عبداللطیف صاحب کے پاس ہوئی تھی۔

میرے والد صاحب کے سفر کی وجہ سے دورے کے اہم اسباق کا حرج ہوتا تھا۔ اس لیے بہت کثرت سے ایسا ہوتا تھا کہ جمعرات کی شام کو جا کر شنبہ کی علی الصباح واپسی ہوتی تھی۔ موٹریں بھی اس زمانے میں نہیں تھیں۔ شاہ زاہد حسین مرحوم بہتر سے بہتر گھوڑا انتخاب کر کے رکھتے اور اس کو دُگنی اُجرت دیتے۔ اس زمانے میں ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ روپے میں عموماً بہٹ سے سہارنپور تانگہ آیا کرتا تھا۔ لیکن شاہ صاحب مرحوم اپنی انتہائی کفایت شعاری اور حسنِ انتظام کے باوجود اس کو تین روپے دیا کرتے تھے اور وہ بہٹ سے سہارنپور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں پہنچا دیتا تو میرے والد صاحب اس کو مزید انعام دیا کرتے تھے۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ اپنی بیماری کے اخیر زمانے میں پیلوں جو بہٹ اور مرزا پور کے درمیان ایک گاؤں ہے جس کو شاہ زاہد حسن صاحب نے خرید

لیا تھا۔ وہاں انگریز منیجروں کا قیام رہتا تھا اور ان کی بنائی ہوئی متعدد کوٹھیاں نہایت ہوادار ان میں سے ایک کوٹھی میں حضرت کا قیام تھا آب وہوا کی عمدگی کی وجہ سے نیز لب سڑک ہونے کی وجہ سے ڈاکٹروں کی آمد میں سہولت تھی۔ حضرت قدس سرہٗ کی بیماری کا زمانہ وہیں گزرا اور انتقال بھی وہیں پر ہوا اور وصال کے بعد نعش مبارک رائے پور لائی گئی تھی۔ حضرت قدس سرہٗ کی طویل علالت میں اس سیہ کار کا بیلوں جانا کئی دفعہ ہوا۔

ایک زمانے میں آموں کی ابتدا تھی اور مجھے پکے آم کھانے کا شوق تو بہت ہی کم رہا لیکن کیریاں (کچے آم) کھانے کا بہت ہی شوق ہمیشہ رہا اور اس زمانے میں تو بہت ہی تھا۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا کہ میرا یہ باغ فروخت شدہ نہیں ہے۔ کچے آم کھانے کو جی چاہے یا چٹنی بنانے کو تو شوق سے استعمال کریں۔ میری ہی مِلک ہیں۔ پھر کیا تھا اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے حضرت مولانا عبدالقادر سے فرمایا کہ نمک مرچ پسوا کر ان کو دے دینا۔ حضرت مولانا نور اللہ مرقدہٗ نے مٹی کی ایک بڑی رکابی میں نمک اور مٹی کی ایک رکابی میں لال مرچیں پسوا کر میرے حوالہ کردیں۔ جو مولانا ہی کی قیام گاہ پر چھوڑ دیں۔ دو دن میرا قیام رہا۔ خوب یاد ہے کہ نہ روٹی کھائی نہ چاول کھائے اور نہ کوئی اور چیز کھائی۔ حالانکہ بڑی نعمتیں دستر خوان پر تھیں۔ چاقو میرے ہاتھ میں رہتا اور دن بھر قلمی آموں کی کیریاں کھایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی مٹھائی یا پھل وغیرہ کچھ بھی نہ کھایا۔ حالانکہ حضرت اقدس مولانا عبدالقادر صاحب بہت ہی اصرار فرمایا کرتے تھے۔

پانچواں دور حکیم الامت حضرت تھانوی:

اعلیٰ حضرت حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کا زمانہ بہت پایا اور حضرت کی شفقتیں بھی بے پایاں چونکہ حضرت سہارنپوری کے زمانہ میں حضرت اقدس تھانوی کی سہارنپور میں تشریف آوری بکثرت ہوتی تھی اور معمول یہ تھا کہ جب بھی سہارنپور کی طرف کو پورب لائن یا پنجاب لائن جانا ہوتا وہاں سے واپسی ہوتی تو شباب کے زمانہ میں مدرسہ تشریف لائے بغیر روانگی نہیں ہوتی تھی۔ بہت ہی شاذ ونادر ایسا ہوتا تھا کہ وقت کی قلت کی وجہ سے مدرسہ تشریف لانا نہ ہوا اور اگر کبھی ایسا ہوتا تو ہم خدام اسٹیشن پر ضرور حاضر ہوا کرتے۔ ایک دفعہ یہ ناکارہ اسٹیشن پر حاضر ہوا۔ بڑا مجمع موجود تھا۔ جب میں نے مصافحہ کیا تو مصافحہ کے ساتھ ہی حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ اکابر کے یہاں تربیت کے بھی طرق عجیب اور مختلف ہوتے ہیں۔ اکتساب بھی ایک طریقہ ہے۔ وہ زمانہ بذل المجہود کی اس سیہ کار کی کتابت کا تھا۔ اسی زمانے میں اس ناکارہ کو تھانہ بھون حاضری کی کثرت سے نوبت آتی تھی۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں بذل المجہود مولانا شبیر علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پریس میں تھانہ بھون میں طبع ہوتی تھی۔ چونکہ بذل کا

مسودہ بھی یہی ناکارہ لکھتا تھا اور پندرہ بیس دن میں اولاً تھانہ بھون پھر اس کے بعد دہلی طباعت کے لیے بار بار جانے کی نوبت آتی تھی۔ لیکن یہ محض اللہ کا انعام احسان اور میرے حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی توجہ و برکت کہ جس پریس میں بھی بذل کا کام ہوتا وہ اپنے سب کام چھوڑ کر بذل کا کام شروع کر دیا کرتا تھا۔

تھانہ بھون کے بعد دہلی میں دریبہ کلاں میں ایک ہندوستانی پریس تھا جو کہ بہت بڑا تھا اور اس میں بیک وقت آٹھ، دس مشینیں چلتی تھیں۔ اس کا مالک اور سارا عملہ غیر مسلم تھا۔ مگر اس مالک کے دل میں اللہ نے کچھ ایسی محبت ڈال دی تھی کہ میرے پہنچتے ہی وہ اپنے منیجر سے نہایت زور سے کہتا کہ اتنے ان مولانا صاحب کا کام نہ ہو کسی مشین پر کوئی نیا پتھر نہیں چڑھے گا۔ اس کے بھی بڑے ہی عجیب قصے ہیں اور بہت ہی مالک کے احسانات **لاتعد و لا تحصیٰ** ہیں لیکن اس وقت یہ ناکارہ حضرت تھانوی کے حالات لکھوا رہا ہے۔ تھانہ بھون کی طباعت کا قصہ ۳۸ھ یا ۳۹ھ کا ہے۔ تھانہ بھون میں عموماً علی الصباح پہنچتا۔ اس زمانے میں چھوٹی لائن کی گاڑیاں دن رات میں کئی چلتی تھیں۔ گو وہ اب مرحوم ہو چکی ہے اور سالِ رواں میں یکم ستمبر ۰ےھ سے سب بند کر دی گئی ہیں۔ اگرچہ لوگ کہتے ہیں کہ عارضی بند ہوئی ہیں اور موٹروں کی کثرت نے اس کو فیل کر دیا۔ سہارنپور تا دہلی میں کئی نوع کی موٹریں سرکاری وغیر سرکاری چل پڑیں اور اس سے زائد ٹیکسیوں کی بھرمار۔

بہر حال یہ ناکارہ علی الصباح تھانہ بھون پہنچتا اور مولانا شبیر علی صاحب مرحوم حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے میرے جاتے ہی سب کا پیاں جموا دیتے اور ظہر کے وقت تک مجھے چھ، سات پروف مل جاتے اور شام تک ان کی واپسی کا تقاضا ہوتا۔ تاکہ اگلے دن ان کی سنگسازی اور طباعت شروع ہو جائے۔ اس لیے یہ ناکارہ مسجد کے شمالی جانب سہ دری میں گرمی کا موسم تھا اور اس زمانے میں اس ناکارہ کو پسینہ اتنا کثیر آیا کرتا تھا کہ ہر سفر میں ایک پائجامہ بالکل گل جایا کرتا تھا۔ یہاں تو میں پائجامہ پہنتا ہی نہ تھا۔ دو لنگیاں میرے استعمال میں رہتی تھیں۔ جب دو تین گھنٹے میں وہ بالکل بھیگ جاتی تو وہ لے لیتا۔ شب و روز میں سات مرتبہ ٹھنڈے پانی سے غسل کا دستور تھا اور یہاں پائجامہ پہن کر سو نہیں سکتا تھا۔ چونکہ میں اپنے کمرے میں اکیلا ہوا کرتا تھا۔ اس لیے چاروں طرف سے کواڑ لگا کر سو جاتا۔ مگر سفر میں محض لنگی باندھے سونے پر قادر نہیں تھا۔ کیونکہ میرے اندر ایک مرض بچپن سے اب تک یہ ہے کہ جب لنگی باندھ کر سوتا ہوں تو صبح کو کروٹوں میں نہ معلوم کس طرح لنگی پیٹ پر آجاتی ہے اور ٹانگیں کھل جاتی ہیں۔ اس لیے سفر میں ہمیشہ سوتے وقت پاجامہ پہننے پر مجبور رہا۔ لیکن دن میں ہمیشہ لنگی ہی ہوا کرتی تھی۔ تھانہ بھون کی حاضری میں گرمی کی شدت کی وجہ سے میں شمالی سہ دری میں کرتا نکال کر اور پردوں کو بہت غور سے نہایت جھک کر عصر کے وقت تک

دیکھتا رہتا تھا اور یہی ظہر سے لے کر عصر تک کا وقت حضرت اقدس حکیم الامت کی عام مجلس کا تھا۔ مجھے اس کا بہت قلق رہتا تھا کہ تھانہ بھون رہتے ہوئے بھی حضرت کی خدمت میں حاضری کا وقت نہیں ملتا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ بہت قلق کے ساتھ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ لوگ تو بہت دور دور سے حاضر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ناکارہ یہاں رہ کر بھی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ میرے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے ایسا جواب مرحمت فرمایا کہ میری مسرت کے لیے مرنے تک کافی ہے۔ حضرت نے فرمایا مولوی صاحب اس کا آپ بالکل فکر نہ کیجیے۔ آپ اگرچہ میری مجلس میں نہیں ہوتے مگر میں ظہر سے عصر تک آپ ہی کی مجلس میں رہتا ہوں میں بار بار آپ کو دیکھتا رہتا ہوں اور رشک کرتا ہوں کہ کام تو یوں ہوتا ہے۔ میں آپ کو ظہر سے عصر تک اپنے اوراق سے سر اُٹھاتے نہیں دیکھتا۔

ایک دفعہ اس سیہ کار نے حضرت سے دریافت کیا کہ شرح صدر کے خلاف کرنے سے کیا نقصان ہوتا ہے۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ اہلِ نسبت کو شرح صدر کے خلاف نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے کبھی جسمانی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ ایک بزرگ تھے۔ ان کا خیال ہوا کہ فلاں عالم صاحب کی عیادت کرنی چاہیے۔ وہ عالم ہیں، چناں ہیں چنیں ہیں۔ مگر طبیعت نے شدت سے اباء کیا۔ کئی دفعہ اپنے آپ کو سمجھایا کہ اول تو عیادت سنت پھر عالم کی۔ اپنے شرح صدر کے خلاف زبردستی چل دیے۔ چند قدم چلے تھے کہ پاؤں پھسل گیا اور گر پڑے۔ پیر ٹوٹ گیا۔ لوگ اُٹھا کر گھر لے آئے۔ اس سیہ کار کا خیال یہ ہے کہ یہ اونچے لوگوں کی باتیں ہیں۔ جس کا شرح صدر:

"گفتۂ او گفتۂ اللہ بود"

کا مصداق ہو۔ لیکن اس سیہ کار کو باوجود نا اہلیت کے اس کا تجربہ بہت ہے کہ جب بھی کوئی شرح صدر کے خلاف سفر کیا یا تو جانے سے پہلے ہی بیمار ہوا یا دوران سفر وغیرہ ہوا اس کو بہت ہی بھگتنا پڑا، پھر سفر کے بعد کئی دن تک خمیازہ بھگتنا پڑا۔ جب بھی کوئی قصہ پیش آیا تو حضرت تھانوی کا ارشاد یاد آیا۔

ایک مرتبہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اس سیہ کار سے فرمایا اور میں تنہا ہی حاضر ہوا تھا کہ مولوی زکریا ایک اشکال بہت دن سے پیش آ رہا ہے۔ کئی دفعہ اس کو سوچ چکا ہوں کہ دنیا بھر کے سارے پاگل ایک ایک ہو کر میرے ہی پاس کیوں آتے ہیں اور پھر ایک قصہ سنایا کہ ایک حکیم غالبًا جالینوس نام لیا تھا مجھے اس وقت تردد ہے شاید بقراط ہو وہ جا رہا تھا۔ راستہ میں کسی پاگل نے اس کو سلام کیا۔ اس حکیم کو بہت ہی فکر ہوا کہ اس پاگل نے مجھے سلام کیا۔ "اَلْجِنْسُ یَمِیْلُ اِلَی الْجِنْسِ" ہیں مجھ میں تو جنون کا اثر نہیں۔ گھر جا کر غسل کیا اور دافع جنون دوا کھائی میں نے عرض

کیا کہ حضرت بالکل نہیں۔ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب دام مجدہم بھی ہر وقت یہی فرماتے ہیں کہ یہ سارے پاگل چن چن کر میرے ہی پاس کیوں آتے ہیں۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ اچھا دوسرں کے پاس بھی جاتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت سب کو یہی شکایت ہے حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم کو بہت جزائے خیر عطا فرمائے تم نے میرا بوجھ بہت ہلکا کر دیا ہے مجھے تو یہ خیال تھا کہ صرف میرے پاس ہی آتے ہیں۔

حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو مجھ سے بچپن میں بہت محبت تھی اگر چہ اخیر زمانے میں لیگ اور کانگریس کے جھگڑے کی وجہ سے اس میں کمی آگئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ کے ساتھ اس ناکارہ کے خصوصی تعلق کی بناء پر بار بار میرے شدید ترین کانگریسی ہونے کی شکایات پہنچتی رہتی تھیں اور حضرت حکیم الامت کو کانگریس سے ایسی نفرت تھی جیسی اس سیہ کار کو اسٹرائک سے۔ چنانچہ جب ''مجلس دعوۃ الحق'' حضرت نے قائم فرمائی اس کے ممبران میں کسی نے اس ناکارہ کا نام بھی پیش کیا تو حضرت نے بڑے تعجب سے یہ کہہ کر کہ ''وہ تو مولوی حسین احمد کا خاص آدمی ہے'' اس ناکارہ کا نام لکھنے سے انکار کر دیا اور چند روز بعد ہمارے مدرسہ کے مفتی اور میرے رشتہ کے ماموں مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب مرحوم جو حضرت تھانوی کے مخصوص خدام میں سے تھے۔ جب وہاں حاضر ہوئے تو حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے بڑے استعجاب سے ان سے یہ کہا کہ میری مجلس میں فلاں صاحب نے مولوی زکریا کا نام بھی بتلایا ہے۔ تو مولوی اشفاق الرحمٰن نے کہا کہ حضرت وہ تو بغیر تلی کا ٹینڈر ہے ہر ایک کے ساتھ لڑھک جاتا ہے۔ حضرت والا کے ساتھ اس کا تعلق مولوی حسین احمد صاحب سے کم نہیں۔ مگر حضرت قدس سرہٗ نے سابقہ روایات کثیرہ کے مقابلہ میں اس کو اہمیت نہیں دی اور ان روایات کا محمل بھی صحیح تھا اس لیے کہ حضرت شیخ الاسلام مدنی قدس سرہٗ کی تو تقریباً روزانہ نہیں تو ہر دوسرے تیسرے روز آمد و رفت ضرور رہتی تھی۔ اس لیے کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کا دستور یہ تھا کہ دہلی سے پنجاب یارڑ کی لائن پر جب بھی جانا ہوتا اگر دو گھنٹے کی بھی گنجائش ملتی تو حضرت میرے گھر ہو کر ضرور تشریف لے جایا کرتے اور اس کے علاوہ رئیس الاحرار کا جب بھی رائے پور آنا جانا ہوتا تو میرے پاس ضرور قیام کرتے۔ ایسے ہی مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی جب رائے پور کی آمد و رفت ہوتی یا مستقل ان کو لوگ سہارنپور بلاتے تو ہر صورت میں قیام کثیر و قلیل میرے گھر پر ہوتا۔ عطاء اللہ شاہ بخاری کا تو مشہور مقولہ تھا کہ ''کچا گھر'' (یعنی میر گھر جو اس زمانے میں بالکل کچا تھا اور اسی نام سے اب تک مشہور ہے) مشترک پلیٹ فارم ہے۔ ساری گاڑیاں اسی پلیٹ فارم سے گزرتی ہیں کبھی کہتے کہ ''یہ تو جنکشن ہے ساری گاڑیاں اسی اسٹیشن پر سے گزرتی ہیں۔ لیگ کی ہو یا احرار کی ہو، کانگریس کی ہو یا جمعیت کی''۔

شاہ صاحب مرحوم کی ابتدائی آمد کا بھی ایک عجیب لطیفہ ہے۔ سب سے پہلی آمد جوان کی اہم جلسہ میں ہوئی۔ (اور جس کی تاریخ میرے رجسٹر میں محفوظ ہوگی) سہارنپور کے لوگوں نے بہت اصرار تمنائیں، درخواستیں ان کو بلانے کی کیں اور جب انہوں نے سہارنپور پہنچنے کا وعدہ کرلیا تو چونکہ وہ رئیس البُغاۃ تھے۔ گورنمنٹ کی نگاہ میں بہت مخدوش اب مسئلہ یہ مشکل ہوا کہ ان کا قیام کہاں ہو؟ اس لیے کہ ان کو ٹھہرانا ہر شخص کو مخدوش معلوم ہوتا تھا اور یہ ڈر تھا کہ ان کے ساتھ میں بھی گرفتار نہ ہو جاؤں۔ اس واسطے جتنے بلانے والے تھے وہ سب مل کر ایک وفد کی صورت حضرت مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ شاہ صاحب چناں اور چنیں ہیں ہمارے مکانات ان کی شان کے مناسب نہیں ہیں، مدرسہ ہی ان کی شان کے مناسب ہے۔ ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص ادا تھی۔ وہ نہایت بے تکلفی سے بلا جھجک یہ کہہ دیتے تھے کہ اتنے میں شیخ الحدیث سے بات نہ کروں اتنے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لوگوں نے اصرار کیا کہ انہیں ابھی بلا لیجئے۔ ناظم صاحب نے فرمادیا کہ یہ وقت ان کی مشغولی کا ہے شام کو خبر لے لیں۔ ان لوگوں کے جاتے ہی حضرت ناظم صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ فلاں فلاں آئے تھے بہت اصرار اس پر کر رہے ہیں کہ شاہ صاحب کا قیام مدرسہ میں رہے۔ میں نے عرض کردیا کہ آپ ان سے بے تکلف میری طرف سے کہہ دیجئے کہ مدرسہ میں ان کا قیام ہرگز نہیں ہوسکتا۔ مدرسہ کو ان کے قیام سے نقصان کا اندیشہ ہے البتہ کچے گھر میں ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ تو ہے ہی باغیوں کا ٹھکانا۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قیام تو ہر وقت کا تھا۔ رئیس الاحرار کی بھی کثرت سے آمد و رفت تھی۔ میری شاہ صاحب سے اس سے پہلے کوئی ملاقات نہ تھی۔ نام طرفین کا ایک دوسرے نے سُن رکھا تھا۔ میں نے اس دعوت دینے والے سے یہ بھی کہا کہ جب تمہارا حوصلہ ٹھہرانے کا نہیں تھا تو دعوت دینے کی کیا مصیبت پڑ رہی تھی؟ شاہ صاحب تشریف لائے اور ان کی آمد پر بڑا جلوس نکلا اور وہ جلوس ان کو مدرسہ تک لا کر جب مدرسہ میں پہنچا تو ناظم صاحب نے ان سے کہہ دیا شاہ صاحب کے سامنے ہی کہ شاہ صاحب کا قیام تو شیخ الحدیث صاحب کے مکان پر طے ہوا تھا۔ شاہ صاحب تو میرا نام پہلے ہی سنے ہوئے تھے اور جنہوں نے ان کو دیکھا ہے اور ان کی باتیں سُنی ہیں وہ خوب واقف ہیں کہ ان کو تعریف اور مذمت دونوں میں کمال کا درجہ حاصل تھا۔ انہوں نے اللہ ان کو بہت ہی بلند درجات عطاء فرمائے، اس زور وشور سے میرے گھر قیام پر مسرت کا اظہار فرمایا کہ کچھ انتہا نہیں۔ ہوشیار تھے، سمجھ دار تھے، دنیا دیکھے ہوئے تھے، جلوس تو ختم ہوگیا۔ وہ چند آدمیوں کے ساتھ میرے مکان پر تشریف لے آئے اور میرا مکان اس زمانے میں اسم با مسمیٰ کچا گھر تھا۔ صرف ایک کوٹھری تھی وہ بھی کچی۔ شاہ صاحب مع سامان آ کر بوریئے پر بیٹھ گئے۔ اوّل تو

انہوں نے میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے۔ اس کے بعد میرے مکان کی تعریفیں شروع کیں کہ نانا ابا صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کی یاد تازہ ہوگئی۔ حضرت کیا عرض کروں؟ کتنی مسرت اس مکان کو دیکھ کر ہوئی، اسلاف کا دور آنکھوں میں پھر گیا۔

چناں چنیں یہ وہ، پھر کہنے لگے حضرت یہ لوگ مجھے شوق میں بُلا تو لیتے ہیں مگر مجھے ٹھہراتے ہوئے ڈرتے ہیں اور اسی واسطے میں کہیں جاتے ہوئے بہت انکار کرتا ہوں، لیکن جب وعدہ کر لیتا ہوں تو ان بلانے والوں کو نانی یاد آتی ہے کہ اس باغی کو کہاں ٹھہرائیں۔ لیکن یہ میری خوش قسمتی، خوش بختی نہ معلوم کیا کیا کہا کہ جب میں دیوبند جاتا ہوں تو وہاں بھی وہاں کے شیخ الحدیث مولانا انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا مکان میری قیام گاہ تجویز ہوتی ہے اور یہاں، یہاں کے شیخ الحدیث کا مکان میری خوش قسمتی سے میری قیام گاہ تجویز ہوا۔ قیام تو ان کا میرے یہاں برائے نام ہی ہوا، اس لیے کہ تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ کہیں کسی صاحب کے یہاں دعوت میں چلے گئے۔ وہاں سے لوگ اپنے اپنے یہاں لیے پھرے، پھر جلسہ ہوگیا۔ کچھ معمولی کھانے پینے کی تواضع میں نے بھی کی۔ اس کے بعد کئی دفعہ رائے پور آتے جاتے قیام ہوا اور یہ سب روایات حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ تک پہنچتی رہتی تھی۔ اس لیے میرا کانگریس یا جمعیتی ہونا حضرت قدس سرہٗ کے ذہن میں بہت ہی مستحکم تھا۔

کچھ دنوں بعد جناب الحاج شیخ رشید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ تھانہ بھون حاضر ہوئے جو حضرت حکیم الامت کے یہاں بہت معتمد اور اُونچے سمجھے جاتے تھے، دہلی کے مسلم لیگ کے صدر تھے۔ مسٹر جناح کے خاص دوست اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی مجلس دعوۃ الحق کے رکن رکین تھے۔ حضرت قدس سرہٗ بہت ہی استعجاب سے شیخ جی سے یہ کہا کہ فلاں شخص نے مجلس میں مولوی زکریا کا نام بھی پیش کیا۔ مجھے بہت تعجب ہوا، وہ تو مولوی حسین احمد کا خاص آدمی ہے۔ تو شیخ جی نے بھی بہت زور سے نام پیش کرنے والے کی تائید کی اور عرض کیا کہ حضرت میں تو ان کا نام خود ہی پیش کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ان کو مولانا حسین احمد صاحب سے جتنا بھی تعلق ہو لیکن جناب والا سے بھی عقیدت کم نہیں ہے اور جتنا کسی کانگریسی یا جمعیتی سے تعلق ہو اس سے زیادہ مجھ سے ہے، میں اس سے خوب واقف ہوں۔ مگر چونکہ حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ کے پاس روزانہ حضرت مدنی کی آمد اور میری حضرت مدنی قدس سرہٗ کے ساتھ قرب وجوار کے اسفار میں معیت خوب پہنچتی رہتی تھی اور پہنچانے والے بھی حواشی سے پہنچاتے تھے۔

چنانچہ ایک صاحب اللہ انہیں معاف کرے حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی مجلس میں اس سیہ کار پر یہ افتراء کیا کہ وہ تو یوں کہتا ہے کہ تھانہ بھون جا کر کیا کرو گے دیوبند حضرت مدنی کی خدمت میں جاؤ۔ جن صاحب نے مجھ سے یہ نقل کیا وہ حضرت کی مجلس میں اس وقت موجود تھے اور حضرت کے

خاص لوگوں میں سے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھے بہت ہی اس روایت پر رنج وقلق ہوا اور اس پر تعجب بھی ہوا کہ اکابر کے حاشیہ نشین اس قدر دروغ گو بھی ہو سکتے ہیں۔ مجھے تمہارا حضرت تھانوی کے ساتھ تعلق عرصہ سے معلوم ہے میں نے تردید کرنے کا ارادہ بھی کیا مگر جرأت نہ ہوئی۔ غرض اسی قسم کے واقعات حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کو پہنچتے رہتے تھے، جن کی بناء پر اس سیہ کار کو حضرت مدنی کے خاص لوگوں میں سمجھنا بے محل نہیں تھا اور حضرت مدنی قدس سرہٗ کے ساتھ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کا اس زمانے میں مسلک کا شدید اختلاف تھا۔ اس سلسلے میں کئی رسالے اس زمانے میں شائع ہوتے تھے جس میں سے ایک رسالہ البوادر النوادر شائع بھی ہو چکا ہے۔

اس لیے جس شخص کا بھی حضرت مدنی قدس سرہٗ سے خصوصی تعلق معلوم ہوتا تھا وہ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے یہاں پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ مگر ان حضرات اکابر کا آپس کا اختلاف ہم جیسے نااہلوں کا اختلاف نہیں تھا بلکہ اس نوع کا اختلاف تھا جس کی نظیر جنگ جمل، جنگِ صفین میں گزر چکی ہے اور اس کے متعلق میں مفصل کلام اپنے رسالہ اعتدال میں کر چکا ہوں۔

چنانچہ یکم محرم ۱۳۵۱ھ میں سول نافرمانی اور قانون شکنی کے جرم میں مظفر نگر کے اسٹیشن پر سے حضرت مدنی کو گرفتار کر کے جیل بھیجا گیا اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو اس کی اطلاع ملی تو ظہر سے عصر تک کی مجلس میں حضرت مدنی کی گرفتاری پر نہایت ہی رنج وغم اور قلق کا اظہار فرماتے رہے اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے اس کا احساس نہیں تھا کہ مجھے مولانا حسین احمد صاحب سے اتنا تعلق ہے اور جب کسی شخص نے حاضرین مجلس میں سے یہ عرض کیا کہ حضرت گورنمنٹ نے کوئی ظلم تو نہیں کیا، اس نے تو صرف دہلی کے داخلے پر بندش لگائی تھی، وہ تو خود ہی قانون شکنی کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ تو حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا تھا کہ آپ اس فقرے سے مجھے تسلی دینا چاہتے ہیں۔ حضرت سید حسین رضی اللہ عنہ بھی تو یزید کے مقابلے کے لیے خود ہی تشریف لے گئے تھے۔ یزید نے ان کو جبراً تو قتل نہیں کیا تھا۔ لیکن حضرت سید حسین رضی اللہ عنہ کا غم تو ساری دنیا آج تک نہیں بھولی۔

میں بھی کہاں سے کہاں چلا گیا۔ لکھ تو یہ رہا تھا کہ ابتداء حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو اس سیہ کار سے بہت ہی تعلق اور محبت وشفقت تھی۔ میری ابتداء سہارنپور کی حاضری میں حضرت قدس سرہٗ نے میرا ایک امتحان بھی لیا تھا۔ اس شعر کا مطلب پوچھا تھا:

اگر بر جفا پیشہ بشتافتے
کھا زدست قہرش اماں یافتے

میں نے فوراً مطلب بتا دیا تو میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے یہ فرمایا کہ آپ نے سمجھا ہوگا، کسی جاہل کا پڑھایا ہوا ہے۔ حضرت نے فرمایا کیوں نہیں ماشاء اللہ آپ کے عالم ہونے میں

کیا شک ہے۔ میرے والد صاحب کا برتاؤ حضرت سہارنپوری اور حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہما کے ساتھ تو بہت ادب کا تھا۔ حضرت سہارنپوری کی طرف تو حضرت قطب عالم حضرت گنگوہی کے وصال کے بعد رجوع ہی کر لیا تھا اور اجازت و خلافت بھی ان ہی سے ملی تھی۔ لیکن اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ سے محبت اکابر ثلثہ سے زیادہ تھی اور ابتداءً بے تکلفی بھی بہت تھی، لیکن کچھ ہی عرصہ بعد حضرت قطب عالم گنگوہی کی طرف سے ایک صاحب کشف قبور نے یہ پیام دیا تھا کہ مولوی یحییٰ سے کہہ دینا کہ مولانا رائے پوری کے ساتھ ایسی بے تکلفی نہ کیا کریں اس وقت سے کچھ احترام شروع ہو گیا تھا۔ لیکن حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ کے ساتھ بے تکلفی کا برتاؤ اخیر تک رہا اور بہت زیادہ۔ جو ہم جیسے بچوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا اور وہ فقرے نقل بھی کرانے، مشکل ہیں۔ اسی کا اثر تھا کہ حضرت حکیم الامت کو ابتداءً اس سیہ کار کے ساتھ بہت ہی محبت اور تعلق تھا۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے حضرت حکیم الامت کے ساتھ بے تکلفی کے واقعات تو بہت کثرت سے ہیں، دو لکھواتا ہوں۔

ایک مرتبہ میرے والد صاحب تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ افطار کا وقت ہوا۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ آپ کے یہاں افطار کا کیا دستور ہے؟ حضرت حکیم الامت نے فرمایا کہ گھنٹے اور جنتریوں کے بعد تین چار منٹ میں شرح صدر اور اطمینان کے لیے انتظار کیا کرتا ہوں۔ میرے والد صاحب نے گھڑی دیکھی اور آسمان کی طرف اِدھر اُدھر دیکھا اور افطار شروع کر دیا اور ان کے ساتھ ان کے خدام نے بھی شروع کر دیا اور حضرت اقدس تھانوی اور ان کے خدام انتظار میں رہے۔ ایک دو منٹ کے بعد حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ اتنے میرا شرح صدر ہوگا اتنے یہاں تو کچھ رہنے کا نہیں۔

تراویح کے بعد حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے میرے والد صاحب سے پوچھا کہ مولانا سحر کا کیا معمول ہے۔ والد صاحب نے کہا کہ ایسے وقت ختم کرتا ہوں کہ دن بھر یہ خیال رہے کہ روزہ ہوا کہ نہیں (یہ تو مبالغہ تھا ورنہ دو تین منٹ صبح صادق سے پہلے ختم کرنے کا معمول تھا) حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ میرا صبح صادق سے ایک گھنٹہ قبل فارغ ہونے کا ہے۔ والد صاحب نے کہا کہ آپ اپنے وقت پر کھالیں، میں اپنے وقت پر۔ ڈیڑھ دن کا روزہ میرے بس کا نہیں۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا یہ تو نہیں ہوگا، کھائیں تو ساتھ۔ ایسا کریں کہ ایک دن کے لیے آپ کچھ مشقت اُٹھالیں اور ایک دن کے لیے میں آپ کی خاطر مشقت اٹھالوں گا۔ اس پر فیصلہ ہوا کہ پون گھنٹے پہلے شروع کر دیا جائے تاکہ ۱۵، ۲۰ منٹ کھانے میں لگیں گے اور تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے فراغت ہو جائے۔ والد صاحب کی اس بے تکلفی کا ایک اور واقعہ لکھواتا ہوں۔ کہ جب اعلیٰ

حضرت سہارنپوری اور حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ ۱۳۳۳ھ میں طویل سفرِ حجاز کے لیے تشریف لے گئے تو میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی بے تکلفی کے سلسلہ میں جو نہایت ہی زیادہ تھی اور اعتدال سے بڑھی ہوئی تھی۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی خدمت میں ایک خط لکھا کہ اب تک تو آپ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کی وجہ سے رڑکی یا پنجاب جاتے ہوئے بہت اہتمام سے مدرسہ تشریف لاتے تھے، لیکن اب حضرت تو طویل قیام کے ارادے حجاز تشریف لے گئے اور میری بہ نسبت آپ کو سفر آسان ہے۔ اس لیے اب آپ کو ہر ماہ میری زیارت کے لیے ایک سفر کرنا ہوگا اور حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے اپنے اس تعلق اور بے تکلفی کی بناء پر تحریر فرمایا کہ بڑی خوشی سے لیکن چند شرائط ہیں۔

جب میں کہیں آگے جا رہا ہوں گا تب تو میرا کرایہ اس کے ذمہ ہوگا جہاں میں جا رہا ہوں گا۔ لیکن جس ماہ آگے نہیں جانا ہوگا اور صرف آپ سے ملاقات کے لیے سہارنپور آؤں گا تو میرا کرایہ اور میرے ایک رفیق کا آمد و رفت کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ آپ کو دینا ہوگا اور جب میں واپس آؤں گا تو ایک مٹی کی ہانڈی میں ماش کی دال ناشتہ میں دینی ہوگی اور وہ ہانڈی واپس نہیں ہوگی۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو ماش کی دال کا بہت شوق تھا اور خاص طور سے میری والدہ مرحومہ کے ہاتھ کی دال بہت پسند تھی۔ یہاں میں نے اکثر دیکھا کہ حضرت اقدس کی تشریف آوری پر دسترخوان پر بہت ہی لذیذ چیزیں جمع ہوتی تھیں۔ فرنی بھی، شاہی ٹکڑے بھی، مگر حضرت اقدس اُڑد کی دال کی رکابی لے کر اس کو فرنی کی طرح چمچے سے نوش فرماتے۔ بعض مرتبہ تو میں نے دیکھا کہ روٹی کے صرف ایک دو لقمے کھا کر نہ پلاؤ کھایا نہ فرنی کھائی، اُڑد کی دال کی دو تین رکابیاں فرنی کی طرح کھالیں۔ یوں ارشاد فرمایا کرتے کہ اپنے گھر میں جب دو تین دن ماش کی دال نہیں پکتی تو میں مطالبہ کرتا کہ اللہ کی ہر نعمت پکتی رہتی ہے اُڑد کی دال نہیں پکتی۔

میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے دور میں تو اس معاہدے پر دو تین دفعہ عمل ہوا، لیکن اس گستاخ بے ادب نے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد اعلیٰ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کو اپنی حماقت سے لکھا تھا کہ حضرت والد صاحب کے اس وعدہ میں میراث جاری ہوگی یا نہیں؟ اعلیٰ حضرت نے تحریر فرمایا کہ ضرور ہوگی۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا یہ والا نامہ میرے اکابر کے خطوط میں موجود ہے۔ مگر اس وقت سامنے نہیں ہے۔ اس پر عمل کی نوبت میرے ساتھ نہیں آئی، البتہ ایک اہتمام اس سیہ کار کی طرف سے چند سال تک رہا کہ ماش کی دال جب تک میری والدہ حیات رہیں میں تشریف بری پر پیش کر دیتا اور ایک اہتمام حضرت قدس سرہٗ کی طرف کئی سال تک مسلسل رہا کہ یہاں کی تشریف آوری پر اگر کوئی شخص حضرت کی دعوت کرتا تو جس کے واسطے اس کو

پہلے سے خط لکھنا پڑتا کہ معلوم ہوا کہ حضور کی تشریف آوری فلاں وقت ہو رہی ہے اگر حضور والا مکان پر قدم رنجہ فرما دیں تو زہے عزت ورنہ میں کھانا مدرسہ ہی میں پہنچا دوں گا۔ حضرت قدس سرہٗ کا جواب یہ ہوتا کہ میں مستقل مہمان مولوی زکریا کا ہوں تم ان سے اجازت لے لو اور جو مجھ سے اجازت لیتا تو میں اُسی بُری عادت کے موافق جو مہمان کے متعلق شروع میں لکھ چکا اجازت تو ضرور دے دیتا، اگرچہ میرا دل بالکل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس خوف سے کہ مبادا حضرت کو تشریف بری میں دِقت ہو یہ شرط کر لیتا کہ کھانا مدرسہ قدیم میں آئے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے اس سیہ کار کا نام میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے انتقال کے بعد برفی رکھ دیا تھا۔ جب میں حاضر ہوتا نہایت تبسم کے ساتھ برفی کا لفظ دو دفعہ فرما کر وعلیکم السلام فرمایا کرتے۔

اس کا شانِ نزول یہ ہے کہ جب میں کاندھلہ جاتا تھا تو تھانہ بھون کے اسٹیشن پر گزر ہوتا اور اسٹیشن پر سے کوئی شخص حضرت قدس سرہٗ کی زیارت کے لیے جانے والا ہوتا تو میں ریل پر سے خرید کر اس کے ساتھ تین چار سیر برف بھیج دیا کرتا۔ لے جانے والا اپنے کسی کپڑے میں لپیٹ لیتا۔ وہاں پہنچ کر پیش کرتا۔ اپنا کپڑا دھوپ میں ڈال دیتا وہ سوکھ جاتا۔ ایک مرتبہ ایک مخلص حاجی محمد جان صاحب محلہ نئی بانس کی مسجد کے امام تھانہ بھون کے اسٹیشن پر اُترے میں نے اپنی حماقت سے حسب عادت ان کو برف دے دی اور یہ دریافت نہ کیا کہ آپ کے پاس کوئی کپڑا ہے یا نہیں۔ ان کے پاس اللہ ان کو بہت ہی بلند درجات عطا فرمائے۔ کوئی کپڑا تو تھا نہیں کسی کاغذ یا پتے پر رکھ کر کھلا ہوا لے گئے۔ ان بیچاروں کا ہاتھ بھی ٹھٹھر گیا ہوگا۔ ایسی حالت میں جب خانقاہ پہنچے اور حضرت کی خدمت میں پیش کیا تو حضرت قدس سرہٗ نے دریافت فرمایا کہ اسی طرح اسٹیشن سے لا رہے ہو۔ انہوں نے عرض کر دیا، کپڑا کوئی تھا نہیں۔ حضرت کو جلال آ گیا کہ جب تمہارے پاس کپڑا کوئی تھا نہیں تو اس سے عذر کیوں نہ کر دیا۔ یہ اسٹیشن سے یہاں تک آتے ہوئے جتنا گھلا ہے وہ کس کا گیا۔ ان بے چاروں کے عتاب کا خیال آ جاتا ہے تو مجھے رنج ہوتا ہے کہ میری وجہ سے ان پر ڈانٹ پڑی اور میرا نام کئی سال تک برفی رہا۔

ایک مرتبہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے مدرسہ کے ایک ملازم کے متعلق جو حضرت ناظم صاحب کے عزیز بھی تھے۔ مجھے راز میں ایک خط لکھا اور یہ قصہ ان کے عزیز کا تھا، اس لیے یہ بھی لکھ دیا کہ مولوی عبداللطیف صاحب کو اس خط کی خبر نہ ہو تو زیادہ اچھا ہے مبادا کہ ان کو تکلیف ہو بشرطیکہ یہ تغیر آپ اپنی رائے سے کر سکتے ہوں۔ میں اس زمانہ میں نظامت اور مدرسہ پر جتنا حاوی تھا وہ تو اس زمانہ کے سب ہی آدمیوں کو معلوم ہے۔ میں اپنی تجویز سے تغیر بالکل بے تردد کر سکتا تھا اور اس پر ناظم صاحب کو کوئی گرانی بھی نہ ہوتی۔ مگر میں نے ناظم صاحب سے عرض کیا کہ آپ سے راز

میں ایک خط ہے میرے پاس جو آپ کو دکھانا ہے اور عمل مجھے کرنا ہے۔ حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ملاحظہ کرنے کے بعد فرمایا ضرور یہ تغیر کر دو اس کو میرا بھی دل چاہتا تھا۔ مگر تم سے مشورہ کا سوچ رہا تھا موقعہ نہیں ہوا تھا۔ اب تو مؤکد ہو گیا۔ میں نے ایک حکم نامہ لکھ دیا کہ فلاں صاحب کو فلاں جگہ سے فلاں جگہ منتقل کر دیا جائے۔ حضرت ناظم صاحب نے اس پر دستخط فرما کر لکھ دیا کہ ضرور کر دیا جائے۔ حضرات سرپرستان سے منظوری لے لی جائے گی۔ صاحب قصہ بیچارے ہمیشہ ہی مجھ سے ناراض رہے اور ان کی ناراضی بجا ہے کہ وہ تفصیل سے ناواقف اور میرے پاس وہ راز ہے میں کیسے ظاہر کرتا۔

یہ میں پہلے لکھوا چکا ہوں کہ ان اکابر اربعہ کے درمیان میں حضرت سہارنپوری حضرت شیخ الہند اور اعلیٰ حضرت رائے پوری اور حضرت حکیم الامت تھانوی اعلی اللہ مراتبہم ونور اللہ مراقدہم کے یہاں جب ایک دوسرے کو یہاں کوئی مہمان ہوتا تو گویا عید آتی۔ ایک مرتبہ حضرت سہارنپوری قدس سرہ تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ یہ سیہ کار بھی ہمراہ تھا۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے تھانہ بھون کے ایک معروف و مشہور معمر بزرگ کو ان کی علوشان کی وجہ سے بلا لیا اور کھانے میں اتنی انواع تھیں کہ لا تعد ولا تحصی۔ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے ان صاحب نے اس دعوت پر بڑی سخت تنقید اپنی مجالس میں کی کہ یہ علماء سادگی اور زہد پر تقریریں تو ایسی لمبی لمبی کریں۔ میں نے رکابیاں گنیں صرف چار آدمی تھے اور اتنی رکابیاں تھیں۔ مجھے صحیح تعداد یاد نہیں۔ باسٹھ یاد پڑتا ہے۔ آٹھ دس طرح کی تو چٹنیاں اور اچار تھے۔ کئی طرح کے مربے۔ کئی طرح کے سالن۔ چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو ان کی تنقید اور عیب جوئی پر قلق بھی ہوا۔ اپنی مجالس میں اس پر رنج فرمایا کہ میں نے تو ان کا اعزاز کیا اور وہ رکابیاں گننے ہی میں رہے۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا جو مجھے اب تک بھی خوب محفوظ ہے کہ حضرت یہ تکلف میں نے نہیں کیا آپ نے کرایا۔ اگر حضرت کی تشریف آوری جلدی جلدی ہو تو پھر اتنا تکلف کیوں ہو۔ یہ سارا واقعہ حضرت کے کسی ملفوظ میں طبع بھی ہو چکا ہے۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا معمول ہم مخصوص خدام کے ساتھ یہ تھا کہ اگر ہم دو تین ہوتے تو زنانہ مکان میں کھانا ہوتا۔ ایک مرتبہ یہ ناکارہ اور حضرت مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ مہمان تھے اور چھوٹے گھر میں مغرب کے بعد کھانے کے لیے حاضر ہوئے۔ حضرت قدس سرہٗ خود ہی اندر سے کھانا لا رہے تھے اور مجھے بہت ہی شرم آ رہی تھی۔ یہاں تک لکھوانے کے بعد یاد آیا کہ یہ قصہ تالیف میں نمبر۱۳ رسالہ تحفۃ الاخوان کے ذیل میں گزر چکا ہے۔

ایک دفعہ یہ ناکارہ اور حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ حاضر خدمت ہوئے حضرت قدس سرہٗ

نے کھانے سے تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے ٹھنڈا پانی پیا اور کھانے کے وقت ارشاد فرمایا کہ آپ کے ساتھ کھانا کھانے کو دل چاہ رہا تھا اسی لیے قصداً بغیر پیاس کے ٹھنڈا پانی پیا تھا کہ شاید بھوک لگ جائے مگر اس سے بھی نہ لگی۔ اس لیے ساتھ کھانے سے تو معذور ہوں۔ اسی وقت پہلی دفعہ یہ بات معلوم ہوئی کہ ٹھنڈے پانی کو بھوک لگنے میں خاص دخل ہے۔ میرے استفسار پر حضرت نے اس کی تصدیق بھی فرمائی کہ ٹھنڈے پانی کو بھوک لگنے میں خاص دخل ہے۔ ایک مرتبہ حضرت قدس سرۂ نے اس ناکارہ سے ازراہِ شفقت یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ تم میرے یہاں کے قوانین سے مستثنیٰ ہو۔ اس کے باوجود یہ ناکارہ خانقاہ کے قوانین کا حتی الوسع بہت اہتمام کرتا تھا۔ اس لیے حضرت تھانوی قدس سرۂ اور حضرت میرٹھی کے یہاں جب بھی بلا اطلاع کھانے کے وقت میں جانے کی نوبت آتی بلا بھوک ایک دو لقمے ضرور کھا کر جاتا اور حضرت کے استفسار پر کہ آپ نے صبح ہی کھالیا تھا میرا یہ جواب ہوتا کہ رات کو کھانے کی نوبت نہ آتی تھی۔ اس لیے صبح کو کھالیا تھا۔

بذل کی طباعت کے زمانے میں اکثر ایک دو شب قیام کی نوبت آتی حضرت قدس سرۂ نے کئی دفعہ ارشاد فرمایا کہ کھانا گھر سے آجایا کرے گا۔ مگر میں نے بہت ہی ادب اور اصرار سے اس کی اجازت لے لی تھی کہ حضرت میں خانقاہ کے مہمانوں کی طرح سے اپنے کھانے کا انتظام طباخ کے یہاں کرلوں تو مجھے اس میں راحت رہے گی۔ تو حضرت نے قبول فرمالیا تھا۔ ایک لڑکا تھا۔ اس کے گھر والے خانقاہ کے مقیمین اور واردین کا کھانا بڑے ہی شوق اور محبت سے پکایا کرتے تھے وہ دو تا تین آنے فی خوراک لیا کرتا تھا۔ پانچ چپاتیاں اور ایک سالن دال یا بھجی یا لوکی۔ تھانہ بھون میں گوشت بہت کم ہوتا۔ ہفتے میں دو تین دن ہوتا تھا، لیکن اس ناکارہ کا وہ دور تھا کہ جس میں بغیر گوشت کے روٹی نہیں کھا سکتا تھا میں نے اس سے یہ طے کرلیا کہ دو خوراک مستقل میری جب تک میں وہاں رہوں۔ اس میں خانقاہ کا وہی کھانا جو دو آدمیوں کا وہاں کے معمول کے مطابق ہوتا وہ ہوتا تھا اور اس کے ساتھ ہی میں نے آدھ سیر گوشت فی وقت اپنا علیحدہ پکوانا تجویز کرلیا تھا۔ جس میں سارے سامان کے دام میرے اور پکوائی کی اجرت ۴ آنے فی وقت علیحدہ۔ میں نے مولوی شبیر علی مرحوم سے کہا کہ یہاں کا قانون تو یہ ہے کہ دو آدمی مل کر کھانا نہ کھائیں اور میری عادت یہ ہے کہ میں نے کبھی اکیلا کھایا ہی نہیں۔ انہوں نے فرمایا اللہ ان کی مغفرت فرمائے بلند درجات عطا فرمائے۔ ان سے اس زمانے میں بے تکلفی بھی بڑھی ہوئی تھی۔ ان کا بھی لڑکپن تھا اور اس ناکارہ کا بھی ہنسی مذاق بھی بہت ہوتا تھا۔ انہیں اشعار بھی بہت یاد تھے۔ حضرت تھانوی قدس سرۂ کے دولت خانہ پر تشریف لے جانے کے بعد ہمارے یہاں شعر و شاعری بھی ہو جاتی اور اگر اتفاق سے عالی جناب خواجہ عزیز الحسن صاحب کی تشریف آوری ہوتی پھر تو پوچھنا ہی کیا۔ مولوی

شبیر علی صاحب نے فرمایا کہ تو فکر نہ کر بڑے ابا کے گھر تشریف لے جانے کے بعد دونوں وقت میں اور بھائی ظفر تیرے ساتھ کھایا کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا۔

مولانا شبیر صاحب مرحوم اور مولانا ظفر احمد صاحب شیخ الاسلام پاکستان نے بھی بار بار اصرار فرمایا کہ تیرے انتظام سے ہمیں گرانی ہوتی ہے مگر میں نے کہہ دیا کہ اگر ایک دو دن کی مہمانی ہوتی تو میں کبھی بھی خود انتظام نہ کرتا، لیکن یہ تو مستقل روزمرہ کی آمد ہے اس میں دوسرے کے سر پڑنا مجھے بہت گراں ہے اور اس میں کچھ تھانہ بھون کی خصوصیت نہیں۔ میری شروع ہی سے اب تک یہ عادت ہے کہ دو چار دن کی مہمانی میں تو کچھ اشکال نہیں ہوتا لیکن مستقل کسی دوسرے کے ذمے پڑ جانا میری غیرت نے کبھی گوارا نہیں کیا۔ اگر کہیں میں قیمتاً انتظام کرنے پر قادر نہ ہوا تو میں نے ہدیہ یا کسی دوسرے عنوان سے اس میں رقم سے چوگنا ضرور دیا۔ جو مجھ پر خرچ ہوئی ہے اللہ تعالیٰ ہی کھانا پکانے والے مخلص دوست کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے۔

تھانہ بھون میں روزانہ گوشت نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جلال آباد میں روزانہ ہوتا تھا اس لیے وہ میرے لیے ہمیشہ جلال آباد سے گوشت منگوا کر پکواتا اور اگر کسی دن وہاں سے بھی نہ ملتا تو مرغا کٹواتا۔ اللہ جل شانہٗ اسے بہترین اگر زندہ ہو تو دارین کی ترقیات سے نوازے اور چل دیا ہو تو مغفرت فرما کر بلند درجات عطاء فرمائے۔ اس قدر میرے کھانے کا اہتمام کرتا کہ میرا جی خوش ہوتا۔ میں کبھی کبھی اس کو انعام بھی دیتا۔ وہ بھی میری آمد کا بہت ہی مشتاق رہتا۔ بہرحال جب حضرت قدس سرہٗ دونوں وقت مکان تشریف لے جاتے تو میں اور مولانا شبیر علی مرحوم اور مولانا ظفر احمد تینوں اپنا اپنا کھانا لے کر اکٹھے کھاتے اور میرا بچا ہوا کھانا میرا طباخ لے جاتا۔ لیکن میرا سالن کم بچتا تھا اس لیے کہ گوشت علی الدوام میرے ہی کھانے میں ہوتا تھا اور شوربا بھی اس میں مطبخ جیسا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ گاڑھا ہوتا تھا۔ ایک دو مرتبہ ایسا بھی دوپہر کے کھانے میں ہوا کہ ہم لوگوں کو کھانا شروع کرنے میں دیر ہوئی اور حضرت قدس سرہٗ اپنے مکان سے تشریف لے آئے اور ہم کو مجتمع کھاتے ہوئے دیکھا مگر کچھ فرمایا نہیں، نیچی نگاہ کر کے گزر گئے۔

والد صاحب کا بہشتی زیور کو طبع کرانا:

ایک چیز کا تعلق میری ذات سے تو نہیں ہے لیکن میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ضرور ہے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی تالیفات مفید عام اور مخلوق کے لیے دینی ترقیات کا جتنا ذریعہ ہیں وہ تو ظاہر ہے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں اور ان میں بہشتی زیور کو جو مقبولیت عامہ حاصل ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ لیکن بندہ کا خیال یہ ہے کہ اس میں میرے والد صاحب قدس

سرہٗ کے عمل کو بہت دخل ہے۔ حوادث میں لکھوا چکا ہوں کہ والد صاحب کے انتقال کے وقت ۸ ہزار روپے ان پر قرض تھا۔ اس میں ان کی تجارت کو بہت زیادہ دخل تھا۔ خاص طور سے بہشتی زیور کی طباعت ان کے زمانے میں دس بارہ ہزار سالانہ کی ہوتی تھی۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرتا تھا جس میں بہشتی زیور کا کوئی حصہ بلالی پریس ساڈھورہ ضلع انبالہ میں زیرِ طبع نہ ہو۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے قرضے میں پریس کے بھی چار پانچ ہزار باقی تھے۔ ان کے زمانہ میں ساڑھے تین آنہ فی حصہ عام اس کی قیمت رہی اور ۲را، ۷ (ساڑھے سات) پیسے فی حصہ اس کی پڑت تھی اور تاجروں کو ہمیشہ نصف قیمت پر یعنی ۷ پیسے پر دیا جاتا اور عوام کو بھی اکثر بالخصوص مدرسہ مظاہر علوم کے سالانہ جلسے اور دارالعلوم دیوبند کے ۳۸ھ کے دستار بندی کے جلسے پر سب کتابیں جلسے کے ایک دن کے لیے اور دارالعلوم کے تین دن کے لیے نصف قیمت ہوگئی تھی۔ بہت سے لوگوں کو بہشتی زیور کامل کے پانچ سات نسخے اس طرح پر دیے جاتے تھے کہ جب فروخت ہوجائیں تو آدھی قیمت مجھے بھیج دیں آدھی قیمت خود رکھ لیں۔

میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد کئی برس تک اس ناکارہ کے نام دس پندرہ روپے کے منی آرڈر اس مضمون کے آتے رہے کہ ہمیں مولانا مرحوم نے اتنے بہشتی زیور دیے تھے وہ فروخت ہوگئے تھے۔ مگر قیمت ادا کرنے کی اب تک نوبت نہیں آئی۔ جب حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے حیاۃ المسلمین تالیف فرمائی اور اپنی تالیفات میں اس کو بہت ہی اہم ارشاد فرمایا اور واقع میں بھی بہت اہم ہے اور حضرت قدس سرہٗ نے بہشتی زیور کی طرح سے اس کی عام اشاعت کی تمنا ظاہر فرمائی تو مجھے اپنے والد صاحب بہت یاد آئے۔ کاش ان کی حیات میں یہ کتاب تصنیف ہوتی تو بہشتی زیور سے اس کی اشاعت المضاعف ہوجاتی۔

میرا بار بار جی چاہا کہ اس کو طبع کر کے ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم کروں۔ لیکن اس ناکارہ کے علمی مشاغل کی وجہ سے مجھے پہلے سفر حج ۳۸ھ کے بعد سے اپنے کتب خانہ کے کام کرنے کا وقت نہ ملا۔ اللہ تعالیٰ مولوی نصیر الدین صاحب کو جزائے خیر دے کہ ہمیشہ انہوں نے میری کتابوں کی طباعت اور فروختگی کا اہتمام کیا اور اب چند سال سے مہمانوں کے ہجوم کی وجہ سے میرے عزیز داماد مولوی حکیم محمد الیاس صاحب میری کتابوں کی طباعت کا اہتمام کرتے ہیں کہ مولوی نصیر کو مہمانوں کے خورد و نوش کے انتظام سے ہی فرصت نہ رہی۔ اللہ تعالیٰ میرے دونوں محسنوں کو اور میرے سب ہی محسنوں کو جس کا کسی نوع کا احسان جانی و مالی، جاہی، علمی، سلوکی، نسبی احسان ہے اپنی شایانِ شان ان کے احسانات کا بہترین بدلہ دارین میں عطا فرمائے کہ یہ سیہ کار اپنے محسنوں کے احسان کا بدلہ بجز دعاء کے اور کیا کر سکتا ہے۔

ماحول کا اثر تو لازمی اور دائمی ہے اسی وجہ سے حدیث پاک میں اچھے جلیس کی ہم نشینی کی ترغیب اور بُرے جلیس سے اجتناب کا حکم وارد ہوا ہے۔ تھانہ بھون کے قیام میں چونکہ ہر وقت ذاکرین کا زور رہتا تھا، اس سیہ کار کو بھی ذکر کا شوق رہتا اور حضرت قدس سرہٗ نے جو بتا رکھا تھا صبح کی نماز کے بعد پریس کے کھلنے تک حضرت حافظ ضامن صاحب قدس سرہٗ کی قبر پر بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا، بڑا لطف آتا تھا۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب اس وقت میں تھانہ بھون کے مفتی بھی تھے اور امام بھی تھے۔ وہ بہت ہی شفقت فرمایا کرتے تھے اور اونچے الفاظ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ان وجوہ سے اس سیہ کار کو خیال ہوا کہ میں بھی کچھ دنوں یکسوئی کے ساتھ ذکر شغل کروں اور اس لیے میں نے وہیں سے حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں یہ لکھا کہ مدرسہ کی مشغولی کی وجہ سے ذکر شغل میں پابندی نہیں ہو سکتی۔ اگر حضرت اجازت فرمادیں تو یہ ناکارہ کہیں یکسوئی کے ساتھ ذکر و شغل چار، چھ مہینے کرلے۔ حضرت قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا کہ اس کی ضرورت نہیں اسباق کے ساتھ جتنا تھوڑا بہت ہوتا رہے کرتے رہا کرو:

"خوئے بدرا بہانہ بسیار"

میرے لیے بہانہ مل گیا اور اب تک بھی کبھی توفیق نہیں ہوئی۔ اس سیہ کار کا دستور یہ بھی رہا کہ حضرت حکیم الامت کی مجلس میں بہت کم جانا ہوتا اور حضرت کے یہاں کی حاضری کا وقت متعین طور پر ظہر سے عصر تک تھا۔ اس لیے یہ ناکارہ اس کا اہتمام رکھتا تھا کہ حضرت کی مجلس میں بے وضو کبھی نہ بیٹھے اللہ نے اس کی توفیق عطا فرمائی۔ قصے تو میرے اکابر کے اس ناکارہ کے ساتھ بہت ہی ہیں اور مجھے ان سب کے لکھوانے میں لطف بھی آرہا ہے۔ مگر ساٹھ سالہ حالات لکھوانے کے واسطے تو بڑا دفتر چاہیے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ اپنی علالت کے زمانہ میں اخیر دور میں بجائے مدرسہ کے قیام کے مولوی منفعت علی صاحب وکیل مرحوم کے مکان پر قیام فرمانے لگے تھے۔ اس لیے کہ وہاں استنجے وغیرہ کی سہولت زیادہ تھی۔ ایک دفعہ حضرت تشریف لائے۔ وکیل صاحب کے مکان پر قیام تھا۔ میں نے تلبینہ پکوا کر جو ایک مسنون حریرہ ہے حضرت قدس سرہٗ کے معالج خاص اور مجاز بیعت حکیم محمد خلیل صاحب جو میرے مخلص دوست اور مجھ پر بہت ہی شفیق تھے۔ ان سے اجزاء بتا کر دریافت کر چکا تھا کہ حضرت کے لیے مضر تو نہیں۔ انہوں نے اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے یہ فرمایا کہ کچھ مضر نہیں۔ میں نے وہ پکوا کر حضرت کی خدمت میں بھیجا اور پرچہ لکھا کہ یہ مسنون غذا ہے اور میں نے طبیب سے اجازت لے لی کہ یہ مضر نہیں۔ حضرت نے اس کے جواب میں میرے پرچہ پر لکھا کہ میں اس کو مسرت سے قبول کرتا ہوں اگر آپ یہ نہ لکھتے کہ یہ مسنون ہے۔ موجودہ صورت میں یہ اشکال پیدا ہو گیا کہ اگر میں نے اس کو

رغبت سے نہ کھایا تو ایک مسنون چیز سے بے رغبتی ہو جائے گی۔ میں نے پھر واپس کیا اور عرض کیا کہ حضرت کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن اگر پسند نہ آیا تو یہ قصور پکانے والی کا ہوگا نہ کہ اصل شئی کا۔ ہم روزانہ اس کا تجربہ کرتے ہیں کہ ایک پکانے والی ایک چیز کو بہت لذیذ پکاتی ہے اور دوسری اسی چیز کو نہایت بدمزہ۔ اس کے بعد بھی رائے مبارک نہ ہو تو اصرار نہیں ہے۔ حضرت نے رکھوا تو لیا مگر یہ معلوم نہیں کہ نوش فرمایا کہ نہیں۔

چھٹا دور شیخ الاسلام حضرت مدنی:

حضرت شیخ الاسلام مولانا الحاج سیّد حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہٗ کو اس ناکارہ پر شفقت ومحبت اس وقت سے ہے کہ جب کہ اس ناکارہ کی عمر ۱۲ سال سے بھی کم تھی ۲۷ھ میں حضرت مدنی قدس سرہٗ نے تقریباً دو ماہ قیام گنگوہ شریف کیا اور مسلسل روزے رکھا کرتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ حضرت عصر کی نماز خانقاہ کی مسجد میں پڑھا کر سیدھے قطب عالم کے مزار پر تشریف لے جاتے مغرب تک وہاں مراقب رہتے اور غروب سے پانچ سات منٹ پہلے اُٹھتے اور ہمارا گھر خانقاہ کے راستہ میں تھا۔ میری والدہ مرحومہ کئی نوع کی افطاری پھلکیاں وغیرہ تیار کر کے رکھتیں اور ایک دسترخوان چارپائی پر بچھا کر اس پر آٹھ دس طرح کی افطاریاں رکھ دیتیں اور میں باہر کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا اور جب دور سے حضرت مدنی کو آتا دیکھتا بھاگ کر اپنی والدہ سے کہتا کہ آ گئے آ گئے۔ وہ جلدی سے پردے میں ہو جاتیں۔ اتنے حضرت دروازے تک پہنچ جاتے اور میں دروازے سے آ جاؤ، تشریف لے آؤ کا شور مچاتا۔ حضرت اندر تشریف لاتے بہت اطمینان سے افطار فرماتے۔ اسی قانون کے تحت جو میں اپنے والد صاحب کے افطار کا حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے حال میں لکھوا چکا ہوں۔ خوب اطمینان سے افطار فرمانے کے بعد پانی وغیرہ پینے کے بعد ہاتھ دھو کر کلی کر کے خانقاہ میں تشریف لے جاتے اور نماز پڑھاتے کہ اس زمانے میں مستقل امام وہی تھے خانقاہ میں پہنچ کر ایک لوٹے سے پانی کے دو گھونٹ پی کر گویا افطار کر کے مصلے پر پہنچ جاتے۔ یہ حقیقت میں تو یہ تھا کہ حضرت مدنی حضرت صاجزادے صاحب حکیم مسعود احمد صاحب کے مستقل مہمان تھے اور حکیم صاحب کے لیے موجب گرانی تھی کہ وہ کہیں دوسری جگہ افطار کریں۔ یہی وہ دور ہے جس کے متعلق باب دوم میں ''مدینہ'' کے ایڈیٹر کو حضرت نے تحریر فرمایا تھا کہ میں اس وقت سے واقف ہوں جب کہ اس کی عمر ۱۲ برس کی تھی اس کے بعد سے تو پھر جب بھی ملاقات ہوتی شفقتوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اخیری زمانے کا حال تو میں پہلے لکھوا چکا ہوں کہ دیوبند سے رڑکی اور پنجاب یا چھوٹی لائن پر جانے آنے میں اگر ایک گھنٹے کا بھی فرق ہوتا تو واپسی کا تانگہ لے کر مکان تک تشریف لاتے اور ان ہی شفقتوں نے مجھے اپنے دوا کابر حضرت

مدنی اور حضرت رائے پوری ثانی قدس سرہما کی شان میں بہت گستاخ بنا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی معاف فرمائے۔ ان دونوں اکابر کا اس سیہ کار کے ساتھ تعلق اور اس ناکارہ کا ان دونوں بزرگوں کے ساتھ گستاخانہ برتاؤ دیکھنے والے ابھی تک ہزاروں موجود ہیں۔

تقسیم سے پہلے جو آخری حج حضرت مدنی قدس سرہٗ کا ہوا تو بندہ کے نام تار آیا کہ میں فلاں تاریخ کو فرنٹیر سے پہنچوں گا۔ میری ایک عادت ہمیشہ مستقل اور دائمی یہ رہی جو اَب نہیں ہے کہ نہ سونا تو میرے قبضے کی چیز تھی۔ دو تین رات مسلسل نہ سونا آسان تھا۔ لیکن سونے کے بعد اُٹھنا میرے بس کا نہیں تھا بچپن میں میری والدہ مرحومہ رمضان میں سحری کے لیے انتہائی مشقت سے اُٹھاتیں مگر میں نہیں اٹھتا تھا۔ وہ بٹھا کر بڑی مشکل سے دو چار لقمے سحری کے کھلاتیں۔ جن کا کھانا مجھے بالکل یاد نہیں ہوتا تھا۔ البتہ صبح کو اس چیز کا ذائقہ ہوتا جو سحری میں کھاتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ جوانی کے زمانے میں والدین کے انتقال کے بعد ایک مرتبہ رات کو بارش ہوئی۔ گرمی کا زمانہ تھا میں باہر سورہا تھا۔ بالکل پتہ نہیں چلا صبح کو اُٹھنے کے بعد دیکھا تو ساری چارپائی بستر سارا بھیگ رہا تھا اور میں بھی بھیگ رہا تھا اس سے بڑھ کر یہ کہ ۳۸ھ کے حج میں شریف مرحوم کے زمانے میں جب کہ غارت ولوٹ مار کی کثرت کی وجہ سے مدنی قافلے راستے پر سے نہیں جاسکتے تھے اولاً سمندر کے کنارے اور آخراً جبل غائر پر کو جاتے تھے۔ اسی راستہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کا سفر فرمایا تھا۔ اس میں پہاڑ کی چڑھائی کی وجہ سے آخری تین منزلوں میں شُغدُف شُبری وغیرہ کچھ نہیں جاسکتے تھے۔ اونٹ کی خالی پشتوں پر حجاج رات کو چلتے لیکن گرنے کے خوف سے اُونٹ پر نہیں بیٹھ سکتے تھے اور چونکہ کوئی سایہ کا سامان شغدف وغیرہ نہیں تھا علی الصباح آفتاب نکل آتا تھا اور کوئی درخت وغیرہ بھی آس پاس نہیں ہوتا لیکن یہ ناکارہ مدینہ جاتے ہوئے بھی اور اسی طرح واپسی میں احرام کی حالت میں ننگے بدن صرف ٹانگوں میں ایک لنگی اسی ریت پر ہندی بارہ بجے تک سوتا۔ جب اٹھتا تو میرے نیچے کا ریت پسینے کی کثرت سے ایسا ٹھنڈا اور بھیگا ہوا ہوتا کہ جیسا کسی نے پانی کا گھڑا ڈال رکھا ہو اور گرمی کی شدت کی وجہ سے سارے رفقاء کے منہ سرخ ہوتے اور وہ مجھ پر خوب خفا ہوتے کہ دھوپ سے تیری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ بہر حال چونکہ سو کر اٹھنا میرے بس کا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے جب مجھے اخیری شب میں کہیں جانا ہوتا یا حضرت مدنی قدس سرہٗ کی آمد کا کہیں سے تار آیا ہوتا کہ حضرت کے علاوہ اور کسی کے لیے تو میں اسٹیشن پر نہیں جاتا تھا تو میرا دستور یہ تھا کہ میں عشاء کے بعد سے اپنے لکھنے کا کام شروع کردیتا اور اسٹیشن جانے تک بہت سہولت اور انہماک سے لکھتا رہتا۔ چونکہ حضرت قدس سرہٗ کا تار کراچی سے فرنٹیر سے پہنچنے کا تھا اور وہ صبح کے چار بجے اسٹیشن پر آتا تھا۔ میں بہت اطمینان سے اُوپر بیٹھا لکھ رہا تھا کہ ۱۲ بجے کے قریب

میرے زینے پر نہایت شدت سے زور زور سے پاؤں مار کر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا تو حضرت شیخ الاسلام صاحب میرے کمرے پر پہنچ گئے۔ میں ایک دم اُٹھا اور اپنی حماقت سے گستاخانہ لفظ کہا کہ مشائخ حدیث مشائخ سلوک حج سے آتے ہوئے بھی تو جھوٹ اور دھوکہ دہی سے احتراز نہیں فرماتے یہ فرنٹیر کا وقت ہے؟ اور یہ کہہ کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ حضرت ایک چمٹ گئے اور خوب معانقہ فرمایا جس کی لذت اب تک یاد ہے۔ حضرت قدس سرۂ نے اللہ تعالیٰ بہت بلند درجات عطاء فرمائے اور حضرتین مولانا مدنی ورائے پوری کی شفقتوں کا بہتر سے بہتر بدلہ عطاء فرمائے۔ یہ ارشاد فرمایا کہ جب کراچی میل لاہور پہنچا تو کسی نے یہ کہا کہ کلکتہ میل سامنے چھوٹ رہا ہے۔ وہ دو گھنٹہ لیٹ تھا۔ میں چھڑی اور مشکیزہ ہاتھ میں لے کر چلتی گاڑی میں کلکتہ میل میں سوار ہو گیا ساتھیوں کو بھی ایک دو کے سوا جن کو میں لاہور کے اسٹیشن پر ریل سے اُترتے ہوئے کہہ کر آیا کہ میں سہارنپور اسٹیشن پر ملوں گا کسی کو خبر نہیں ہے مستورات اور سارا سامان فرنٹیر سے آرہا ہے میں نے سوچا کہ دو گھنٹہ تم سے مل لوں گا۔ یہ فرما کر ارشاد فرمایا چلو جولاھے کو اُٹھا دیں قطب عالم حضرت گنگوہی قدس سرۂ کے منجھلے نواسے جناب حافظ محمد یوسف صاحب مرحوم انصاری گنگوہی ممبر شوریٰ دارالعلوم دیو بند انگریزی دور میں سرکاری ملازم تھے۔ بہت اُونچی تنخواہ اور افسران کی نگاہ میں بہت باعزت و باوقار سرکاری حیثیت سے بہت ہی امتیازی شخصیت و شان رکھتے تھے۔ ترک موالات کے زمانہ میں سرکاری ملازمت سے استعفاء دے کر سہارنپور میں مستقل قیام کر لیا تھا اور یہاں کھدر کے بُننے کی کھڈیاں کئی ایک لگالی تھیں۔ اس وقت سے حضرت مدنی قدس سرۂ کے یہاں ان کا لقب جولاہہ پڑ گیا تھا:

لگتی ہیں گالیاں بھی منہ سے ترے بھلی

میں نے کہا ضرور چلیے میں یہ کہہ کر لیمپ گل کر کے ساتھ ہو لیا اور زینے سے اترتے وقت میں نے پوچھا کہ اور چائے؟ حضرت نے یہ ارشاد فرمایا کہ ضرور نصیر سے کہہ دو کہ بنا کر وہیں لے آئے۔ نصیر اپنے مکان میں سو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کو آواز دے کر جگایا اور کہا کہ حضرت تشریف لے آئے دو کیتلی (چائے دان) چائے کی ایک بہت بڑی ہلکی چائے کی اور ایک چھوٹی تیز چائے کی بنا کر حافظ یوسف صاحب کے یہاں جلدی لے آؤ۔ وہاں پہنچے تو وہ مرحوم سو رہے تھے کئی آوازوں میں بیدار ہوئے اور اٹھ کر گھڑی دیکھ کر آنکھیں ملتے ہوئے آئے اور کہا کہ میری گھڑی میں تو ابھی بارہ ہی بجے ہیں گھڑی بند ہو گئی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ بے فکری سے سو رہے ہیں اور ایک ہم ہیں:

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں

میں نے عرض کیا کہ اب بھی کچھ پوچھنے میں کسر رہ گئی۔ مشرق، مغرب، ہند و عرب تو پیچھے پیچھے پھرتے ہیں وہاں بیٹھ کر حافظ یوسف صاحب سے وہی بیان فرمایا کہ کلکتہ میل لیٹ تھا میں نے سوچا کہ دو گھنٹہ دوستوں سے مل لیں گے۔ اتنے میں مولوی نصیر الدین چائے لے آئے اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے۔ اطمینان سے چائے پی۔ سفر کے حالات حضرت سناتے رہے۔ ڈھائی بجے کے قریب حافظ یوسف صاحب کو تقاضہ کیا کہ آپ اسٹیشن نہ جائیں اور مجھ سے فرمایا کہ چلو اسٹیشن میں نے کہا کہ میں تو بغیر حکم کے بھی چلوں گا۔ جب ہی اسٹیشن کے لیے تانگہ منگایا اور پونے تین بجے کے قریب اسٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں سو ڈیڑھ سو کا مجمع جمع ہو چکا تھا۔ حضرت تانگہ سے اترے اور وہاں کہرام مچ گیا۔ کوئی کہے کہ حضرت تشریف لے آئے اور کوئی دور سے کہتا ہے کہ بالکل جھوٹ ابھی تو گاڑی میں سوا گھنٹہ ہے اور کسی نے کہا کہ گاڑی تو آ گئی ہم نے تو دیکھی نہیں۔ حضرت مشلح اوڑھے چھڑی ہاتھ میں لے کر نہایت وقار سے ہر شخص سے فرما رہے تھے کہ آپ اگر مجھے پہچانتے ہیں اور میں حسین احمد ہوں تو مل لیجیے بہت اطمینان سے لوگوں سے مصافحے کیے۔ اتنے میں فرنٹیر میل آ گیا۔ چونکہ وہ دیوبند نہیں ٹھہرتا اس لیے سارا سامان جو حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ ہر چھوٹے بڑے سفر میں خوب ہوا کرتا تھا اور اس مرتبہ تو حج سے تشریف لا رہے تھے۔ وہ سارا سامان سہارنپور کے اسٹیشن پر اُتار دیا گیا اور جب ہی ساڑھے چار پر پسنجر جاتا تھا اس میں رکھا گیا۔ بہت ہی بھاگ دوڑ ہوئی۔ مگر حضرت قدس سرہٗ کو سامان کی کثرت سے کبھی فکر نہ ہوتی تھی اور میں حضرت کے سامان کو دیکھ کر ہمیشہ سہم جاتا تھا کہ اتنا سامان کس طرح جائے گا۔ چھ بجے کے قریب حضرت قدس سرہٗ دیوبند پہنچے اور آٹھ بجے بخاری کا سبق پڑھایا اور اس سیہ کار کو جب کہیں سفر درپیش ہو تو تین دن پہلے بلکہ ایک ہفتہ پہلے سے اس کے سہم میں بخار ہو جاتا ہے۔ اور دس دن بعد تک تکان اور بخار رہتا ہے:

ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بہ کجا

میرے حضرت اقدس سہارنپوری قدس سرہٗ کا بھی یہی دستور تھا کہ جب کہیں جانا ہوتا تو بہت اطمینان سے بذل لکھواتے رہتے اور جب حاجی مقبول صاحب سامان بندھوا کر تانگہ پر رکھ کر یہ اطلاع دیتے کہ تانگہ آ گیا تو حضرت نہایت اطمینان سے لکھواتے ہوئے اٹھتے اور گھر کے دروازے پر کھڑے جاتے اور پھر تانگہ میں بیٹھ جاتے میرا تو اپنے بزرگوں کے قصے لکھوانے کو بہت جی چاہتا ہے خواہ کسی کو پسند آویں یا نہ آویں مجھے تو بہت مزہ آتا ہے اور حضرت مدنی اور حضرت رائے پوری ثانی کی تو اتنی شفقتیں ہیں کہ بڑے بڑے دفتروں میں بھی نہیں آ سکتیں ایک مرتبہ دوپہر کا وقت گرمیوں کا زمانہ ایک بجے دوپہر کو میں اپنے گھر کے دروازے میں سویا کرتا

تھا، کیونکہ بجلی پنکھے کا دور نہیں شروع ہوا تھا، میں سونے کے لیے لیٹا سرہانے کی طرف سر اُٹھا کر دیکھا تو حضرت قدس سرہٗ کھڑے ہیں۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر مصافحہ کیا اور پہلا سوال یہ کیا کہ حضرت کھانا؟ ارشاد فرمایا کہ اگر کھانا کھالیتے تو تمہارے یہاں کیوں آتے؟ حضرت کے پیچھے پیچھے علامہ ابراہیم مرحوم اور ان کے پیچھے نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا مبارک علی صاحب مرحوم اور یکے بعد دیگر ایک لائن لمبی تھی جن کو میں نے اس وقت شمار بھی نہ کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بارہ تھے حضرت قدس سرہٗ تو کچے گھر میں آگئے اور پیچھے پیچھے جملہ رفقاء اور میں ننگے پاؤں اندر گیا اور اپنی بچیوں سے پوچھا کہ حضرت کئی آدمیوں کے ساتھ ہیں کچھ کھانے کو ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہ روٹی کا ٹکڑا اور نہ کچھ سالن جس کی وجہ یہ تھی کہ کھانے کے وقت بے اطلاع آٹھ دس مہمان عین وقت پر پہنچے تھے اس لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ بلکہ بچیوں نے بھی آدھی بھوک کھائی تھی۔

اللہ جل شانہٗ ہر دو میری بیویوں اور سب بچیوں کو بہت ہی جزائے خیر دے مہمانوں کے سلسلہ میں ان سے بہت راحت پہنچتی ہے۔ تیس چالیس مہمانوں کا کھانا آدھ پون گھنٹہ میں تیار کر دینا ان کے یہاں بہت ہی معمولی بات رہی۔ بشرطیکہ گھر پر کئی ہوں میں نے کہا کہ جلدی سے ایک آٹا گوندھے اور ایک جلدی سے دیگچی میں مصالحہ بھونے اور میں باہر ننگے پاؤں گیا۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کی کرامت کہ سڑک پر پہنچتے ہی میں نے دیکھا کہ میرا قدیمی قصاب صوفی کرم الٰہی جو ہمیشہ سے میرے یہاں گوشت لاتا ہے اور مجھے بھی اس سے محبت وتعلق ہے اس کے سوا کسی کا گوشت پسند نہیں آتا۔ بہت آہستہ آہستہ بہت دور سے آرہا ہے میں ننگے پاؤں اس کی طرف بھاگا اور اس کو آواز دی کہ جلدی آ۔ وہ جلدی سے آیا۔ میرے سوال پر اس نے کہا کہ گوشت بھی ہے اور قیمہ بھی ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے قیمہ دے اور جلدی سے دونوں ہاتھوں میں سارا قیمہ جو تین سیر کے قریب ہوگا لے کر گھر پہنچا تو دونوں چولہوں میں آگ جل چکی تھی اور ایک پر توا رکھا تھا اور ایک پر مصالحہ بھن رہا تھا۔ میں نے جلدی سے وہ گوشت مصالح میں ڈال کر کہا کہ جلدی سے پکاؤ اور دو بچیوں سے کہا کہ توے پر بیٹھو ایک پیڑے بنا کر روٹی بنائے اور دوسرے توے پر سینکے وہ بجائے دو کے تین بیٹھ گئیں۔ ایک گوشت بھون رہی تھی۔ اور اس وقت چار ہی گھر میں تھیں اور میں نے باہر آکر شور مچایا کہ بھائی کسی نے دستر خوان نہیں بچھایا۔ ارے بھائی دستر خوان بچھاؤ اور ہاتھ دھلاؤ۔ حضرت قدس سرہٗ سمجھے کہ کھانا تیار رکھا ہوگا۔ سب کے ہاتھ دھلائے اور ترتیب سے بیٹھنے اور دستر خوان بچھانے میں دو تین منٹ لگ گئے میں اندر گیا تو دس بارہ روٹیاں تیار ہو چکی تھیں اور قیمہ بھی نیم برشت ہو چکا تھا۔ میں اطمینان سے تین رکابی میں قیمہ لایا اور تین جگہ روٹیاں رکھیں۔ ایک دم حضرت قدس سرہٗ کو خیال ہوا کہ پہلے کا کچھ نہیں حال ہی کا پکا ہوا ہے۔

حضرت کو تو تعجب نہیں ہوا کہ بارہا حضرت کو سابقہ پڑ چکا تھا۔ لیکن علامہ ابراہیم مرحوم جوفن معقول کے مشہور امام تھے، فرمانے لگے کہ کیا آپ کو ہمارے آنے کا پہلے سے علم تھا یا آپ کو کشف ہوگیا۔ میں نے کہا کہ جناب کہ یہاں بیٹھنے کے بعد یہ گوشت قصاب کے یہاں سے خریدا گیا ہے، فرمانے لگے کہ یہ بات عقل میں نہیں آتی۔ میں نے کہا کہ ہر بات معقول نہیں ہوتی۔ کچھ عقول سے بالاتر بھی ہوتی ہیں۔ حضرت مدنی نے علامہ سے فرمایا کہ مناظرہ نہ کرو جلدی سے کھالو دیر ہو رہی ہے۔ ان کے یہاں تو یہ قصے چلتے ہی رہتے ہیں اور پھر مجھ سے فرمایا کہ ان میں سے میرے ساتھ کوئی نہیں۔ مولانا اشفاق صاحب (اعلیٰ حضرت رائے پوری کے بھانجے دارالعلوم کے ممبر شوریٰ) کا جب سے انتقال ہوا جس کو کئی دن گزر گئے۔ روز رائے پور جانے کا ارادہ کرتا رہا لیکن جب سبق کے بعد گھر جاتا تو کوئی نہ کوئی اہم مہمان یا کوئی مانع پیش آجاتا تھا اس لیے آج میں نے ارادہ کیا کہ سبق پڑھ کر درس گاہ سے سیدھا ریل پر چلا جاؤں۔ میں رائے پور کا ارادہ کئی دن سے کر ہی رہا تھا ان لوگوں میں سے جس جس نے سنا پیچھے ہو لیے۔ ان میں سے بعض سے ملاقات دیوبند کے اسٹیشن پر ہوئی تو بعض سے سہارنپور کے اسٹیشن پر۔ میرے ساتھ ان میں کوئی نہیں۔ کھانا کھا کر جب ہی رائے پور چلے گئے۔

اتنا مجھے خوب یاد ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ کے دروازے میں مصافحہ کے وقت سے گیارہویں منٹ پر دسترخوان بچھ گیا تھا۔ میرے حضرت مدنی قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ کے صرف کھانے ہی کے مد میں اگر شفقتیں اور واقعات گنواؤں تو ان کا احاطہ بھی بہت دشوار ہے۔ بارہا اس کی نوبت آئی کہ حضرت تشریف لائے اور میں دارالطلبہ سبق میں تھا۔ حضرت نے دروازے پر کسی بچے کو آواز دے کر ارشاد فرمایا کہ حسین احمد کا سلام کہہ دو اور کہہ دو کہ جو کھانے کو رکھا ہے جلدی بھیج دو گاڑی کا وقت قریب ہے اور جب اندر سے بچیوں کی یہ آواز سنتے کہ اباجی کو جلدی سے مدرسہ سے بلالاؤ تو حضرت للکار کے فرماتے کہ مجھے اباجی کی ضرورت نہیں ہے۔ کھانے کی ضرورت ہے، ہو تو بھجوادو، ورنہ میں جا رہا ہوں۔

کئی دفعہ اس کی نوبت آئی کہ میرے دارالطلبہ سے آنے تک حضرت کھانا شروع فرمادیتے یا تناول فرمالیتے تھے اور ارشاد فرماتے کہ آپ کا آپ کے گھر والوں نے حرج کیا ہے میں نے نہیں بلوایا۔ حضرت قدس سرہٗ کا معمول جمعرات کے سفر کا ہمیشہ سے تھا اور کبھی کبھی جمعہ کو بھی آتے جاتے سہارنپور کا نمبر آجاتا۔ میری عادت اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ہی کے زمانے سے جمعہ کے دن جمعہ کے بعد کھانے کی ہمیشہ رہی۔ مجھے پہلے کھا کر جمعہ کی نماز میں لطف نہیں آتا اور حضرت قدس سرہٗ کا معمول ہمیشہ جمعہ سے پہلے کھانے کا تھا خواہ وقت قلیل ہی ہو۔ سفر میں تو ہمیشہ

میزبان ان کی رعایت کرتے اور میں تابع ہوتا۔ مگر سہارنپور میں خوب رسہ کشی ہوتی۔ میری خاطر حضرت تو فرماتے کہ میں جمعہ کے بعد کھاؤں گا اور میں کہتا کہ نہیں حضرت میں جمعہ سے پہلے کھاؤں گا مگر اس میں حضرت قبول نہ فرماتے اور غلبہ جمعہ کے بعد ہی کو ہو جاتا اور میں بھی جھوٹا سچا اصرار کر کے خاموش ہو جاتا۔

ایک مرتبہ حضرت سفر سے تشریف لائے جمعہ کا دن گیارہ بجے کے قریب فیصلہ جمعہ کے بعد کھانے پر ہو گیا۔ کھانے کے دوران میں ایک صاحب شہر کے آگئے اور بہت اصرار سے اپنے ادارے میں چند منٹ کے لیے تشریف لے جانے کا وعدہ لے گئے۔ میں نے مخالفت بھی کی کہ حضرت وہاں جا کر دیر بہت ہو جائے گی یہ صاحب جلدی نہیں چھوڑیں گے۔ حضرت قدس سرہٗ کو ساڑھے چار بجے کے ایکسپریس سے سیدھے دہلی جانا تھا کہ وہاں کسی اجتماع میں عشاء کے بعد شرکت کا وعدہ تھا۔ مگر حضرت مدنی اور حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہما دلداری اور دلجوئی کے پتلے تھے قبول فرمالیا تین بجے کے قریب ان کی کار میں ان کے ادارے میں گئے۔ کار نے راستہ میں بہت پریشان کیا اور ان صاحب نے حسب عادت بہت تاخیر کی اور جب اسٹیشن پہنچے تو گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ مگر چہرۂ انور پر ذرا بھی ناگواری یا ملال کا اثر نہ تھا۔ وہیں تو حضرت نے تار دیا کہ دوسری گاڑی سے آؤں گا اور خادم کو توشہ دان دے کر بھیجا کہ شیخ الحدیث سے کہو جو کچھ رکھا ہے دے دیں۔ معلوم ہوا کہ اسٹیشن پر بہت سے مخلصوں نے خوشامد اور منت سماجت کی کہ کھانا وہیں سے آئے گا۔ کس کس شفقت کو یاد کروں اور روؤں اور رُلاؤں۔

ایک دفعہ تشریف لائے۔ گرمی کا موسم، میں نے حضرت کے خادم سے پوچھا کہ تھرماس میں برف ہے۔ وہ یہ سمجھے کہ پینے کے واسطے پوچھا ہے۔ وہ کہنے لگے تھوڑا سا ہے لاؤں۔ میں نے کہا کہ پینے کو نہیں پوچھتا بلکہ میرے تھرماس میں سے اپنے تھرماس میں بھرلو۔ وہ کوئی نئے خادم تھے۔ کہنے لگے کہ نہیں حضرت اس میں ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ جتنی جگہ ہے اس میں بھرلو، بخیل کا مال ہے جتنا ہو وصول کرلو۔

ایک مرتبہ میرے پاس دہلی کے ایک صاحب نے گاجر کے حلوے کا ایک پیکٹ بذریعہ ڈاک بھیجا اور اسی دن معلوم ہوا کہ حضرت تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے احترام و اشتیاق میں اس کو اپنے کمرے کے سامنے چھینکے پر رکھوا دیا۔ اس زمانہ میں میرا قیام مستقل اُوپر کے کمرے میں شب و روز رہتا تھا۔ حضرت کے تشریف لاتے ہی میں نے ایک مخلص سے کہا کہ بھائی چھینکے پر سے پیکٹ اُٹھا کر کھول کر حضرت کی خدمت میں پیش کرو۔ حضرت نے خود ہی پیش قدمی فرمائی اور چھینکے پر سے اس کو اُتار لیا اور اس کے کپڑے کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ وہ تو بادشاہ تھے، ان کی نگاہ میں

ایسی معمولی چیزیں کیا تھیں اور میں بقول ان کے بخیل، اول تو مجھے اس کپڑے پر قلق ہوا کہ کیسا ضائع ہوا اور حضرت نے ایک دوا نگلی تو اس میں سے خود نوش فرمائی اور باقی سارا جس کی مقدار اندازاً دو سیر ہوگی ایک ایک لقمہ سارے مجمع کو جو حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ ان کے آنے پر ہمیشہ ہو جاتے تقسیم فرما دیا اور میری نہ تواضع فرمائی اور نہ چکھایا اور سارا ختم کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ بخیل اس کو پھر چھینکے پر رکھ دیتا۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ کو کھدر سے تو عشق تھا اور ولایتی کپڑے سے نفرت تھی یہ تو ساری دنیا کو معلوم ہے لیکن اس سیہ کار کے حال پر ایک مزید شفقت یہ تھی کہ میرے بدن پر جب بھی بدیسی کرتہ دیکھتے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایسے زور سے چاک فرماتے کہ نیچے تک وہ پھٹ جاتا تھا۔ حضرت قدس سرہٗ کی حیات تک ڈر کے مارے کھدر کا میرے یہاں بہت ہی اہتمام رہا۔ چونکہ حضرت قدس سرہٗ کی آمد کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ نہ دن نہ رات۔ اس لیے گرمی میں بھی کھدر کا کرتا جھک مار کر پہننا پڑتا تھا۔

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی صاحبزادی نور اللہ مرقدہا کو حضرت سہارنپوری سے بہت محبت تھی اور حضرت کو بھی بہت ہی زیادہ ان سے عقیدت ومحبت اور ان کا احترام تھا۔ میرے حضرت کھدر بالکل نہیں پہنتے تھے۔ حضرت صاحبزادی صاحبہ نور اللہ مرقدہا نے بہت اہتمام سے روئی منگوا کر بہت ہی باریک سوت خود کاتا اور ایک جوڑا کرتہ پاجامہ ٹوپی خود اپنے دست مبارک سے سیا اور میرے حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا۔ حضرت قدس سرہٗ نے ایک جمعہ تو ان کے احترام میں اس جوڑے کو پہن کر پڑھا اور دوسرے دن اس ناکارہ کو یہ کہہ کر عطاء فرما دیا کہ تم مولوی حسین احمد کی خاطر میں ہر وقت کھدر پہنتے ہی ہو اس کو بھی پہن لینا۔

جب اعلیٰ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ نے بعض اعذار کی وجہ سے مدرسے کی تشریف آوری سے عذر فرما دیا تھا تو میرے حضرت قدس سرہٗ نے حضرت مدنی کو تار دیا جو اس وقت کلکتہ میں تشریف فرما تھے کہ جلسہ میں تمہاری شرکت ضروری ہے۔ حضرت مدنی کو اللہ تعالیٰ بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کسی دوسری جگہ تشریف لے جانا تھا۔ وہاں کا التواء کا تار دے کر فوراً سہارنپور تشریف لے آئے۔ چونکہ خاص طور سے بلائے گئے تھے اس لیے مدرسہ کے مہمان خانہ میں حضرت مدنی کے قیام کا اہتمام میرے حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا، تانگہ سے اُتر کر حضرت مدنی مدرسہ میں تشریف لے گئے۔ میرے حضرت سے مصافحہ اور دست بوسی فرمائی۔ خدام سامان لے کر پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ میرے حضرت نے فرمایا کہ سامان اوپر مہمان خانہ میں لے جاؤ۔ حضرت مدنی نے ارشاد فرمایا کہ میرا سامان کچے گھر میں جائے گا۔ اس کے بعد سے جب تک

مظاہر علوم کا سالانہ جلسہ ہوتا رہا جو تقسیم ہند تک بڑے اہتمام سے ہوتا رہا اور اس کے بعد بعض مجبوریوں کی وجہ سے بند ہوگیا۔ حضرت ہمیشہ دو مرتبہ کے علاوہ سالانہ جلسہ میں تشریف لاتے رہے اور حضرت حکیم الامت کے بعد مدرسہ کے جلسہ کے واعظ حضرت شیخ الاسلام ہی بن گئے، دو مرتبہ تشریف نہ لاسکے۔ ایک مرتبہ تو جلسہ کے موقع پر حضرت مدح صحابہ کے سلسلے میں لکھنؤ جیل میں تھے، اس جلسہ میں بعض مفسدین نے کچھ خلفشار پھیلایا، جلسہ کو بند کرنے کی کوشش بھی کی اور ایک مرتبہ باوجود دیوبند تشریف فرما ہونے کے میری حماقت سے تشریف آوری نہ ہوئی۔

میں مطمئن رہا کہ حضرت کو جلسہ کی تاریخ معلوم ہے، دفتر سے ضابطہ کا خط اور اشتہار جاچکا ہے اور خود حضرت کو بھی مدرسہ کے جلسہ کا اہتمام رہتا تھا، مجھ سے اکثر ایک دو ماہ قبل دریافت فرمالیا کرتے تھے کہ اپنے جلسہ کی تاریخ نوٹ کرادو کبھی میری تاریخ کہیں دوسری جگہ کی ہو جائے اور تم خفا ہو۔ اس لیے میں بالکل مطمئن تھا۔ حضرت تشریف نہ لائے اور دیوبند میں مقیم رہے۔ جلسہ کے دن شام کو تشریف لائے، اس لیے کہ بعض خصوصی مہمانوں سے خود حضرت کو بھی ملنا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آج تو بڑا انتظار کرایا خیر تو ہے۔ فرمایا کہ تم نے بلایا ہی نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! مدرسہ سے تو مطبوعہ اشتہار اور خط دونوں گئے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ وہ تو گئے تھے مگر اب تک معمول ہمیشہ یہ رہا کہ مدرسہ کے خط کے ساتھ یا علیحدہ مستقل حکم نامہ تمہارا بھی جاتا تھا، اب کے نہیں گیا، میں نے سمجھا کہ میری آمد تمہارے نزدیک مناسب نہیں ہے۔ اس وقت اپنی حماقت پر بہت ہی قلق ہوا۔ اس کے بعد سے کبھی مستقل عریضہ نہیں چھوڑا۔ اتنے واقعات اس وقت ذہن میں ہیں کہ اوجز کی چھ جلدیں حضرت مدنی ورائے پوری کے حالات میں آسکتی ہیں۔

میرے حضرت مدنی قدس سرہٗ کو ترمذی کے سبق میں کوکب الدری کے دیکھنے کا بہت اہتمام تھا اور طلبہ کو ترغیب بھی فرماتے تھے اور کبھی کبھی مستقل سفر دیوبند سے سہارنپور کا اوجز کوکب کے سلسلے میں فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ آپ نے کوکب کا حاشیہ لکھا ہے یا اوجز کا اشتہار دیا ہے۔ ہر جگہ دو تین لفظ لکھ کر لکھ دیتے ہیں کہ ''والبسط فی الاوجز''۔ ایک دفعہ کوکب دیکھو اور ایک دفعہ اوجز دیکھو۔ حضرت اکثر بہت ہی شفقت سے کوکب اور اوجز کے مضامین پر اصل ماخذ کا بھی مطالبہ فرمایا کرتے تھے، یہ آپ نے کہاں لکھ دیا، اس کا ماخذ دکھایئے۔ اس کے متعلق بعض واقعات تالیفات میں گزر رہے ہیں۔ ایک اہم واقعہ تو جزء الاستحاضہ میں گزر گیا۔

ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ نے میری دیوبند حاضری پر یہ ارشاد فرمایا کہ تم نے اوجز کی کتاب الحج میں ایک ایسی اچھی بات لکھی ہے جس سے بہت دل خوش ہوا اور امام بخاری کے بہت سے اعتراضات تمہاری تقریر سے اُٹھ گئے۔ حضرت سبق کو تشریف لے جارہے تھے۔ میرا حضرت کے

ارشاد پر ندامت سے کچھ ایسا سر جھکا کہ تفصیل نہ پوچھ سکا کہ میری کون سی تحریر تھی جس سے امام بخاری کے جملہ اعتراضات ختم ہو گئے۔ بعد میں بھی کئی مرتبہ خیال آیا مگر حیا کی وجہ سے نہ پوچھ سکا۔

"لامع الدراری" بھی دراصل حضرت کے شدید اصرار پر لکھی گئی۔ کوکب کے بعد سے حضرت اس کی طباعت کا بہت ہی اصرار فرما رہے تھے اور میں اوجز کی تکمیل کا عذر کر دیتا۔ ایک مرتبہ بہت ہی قلق سے فرمایا کہ میرے سامنے طبع ہو جاتی تو میں بھی متمتع ہوتا، میرے بعد طبع کرو گے تو ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ بہت ہی قلق اور رنج ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت کے مرض الوصال اور شدت علالت میں بہت ہی زور باندھ کر چار صفحے اس کے چھاپے تھے، جو حضرت کی خدمت میں مستقل آدمی کے ہاتھ بھیجے تھے، جو وصال کے وقت حضرت کے سرہانے رکھے رہے مگر مقدر کہ حضرت قدس سرہٗ کی زندگی میں کم از کم ایک ہی جلد طبع ہو جاتی تو بے حد مسرت ہوتی۔ لیکن مقدرات کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ اللہ جل شانہٗ لامع کا اجر وثواب حضرت کو مرحمت فرمادے کہ حضرت ہی کے حکم سے لکھی گئی۔

حضرت قدس سرہٗ سے علمی گفتگو بھی خوب ہوتی اور مناظرے بھی خوب ہوتے تھے۔ بہت سے مضامین کو اس ناکارہ نے "افادات حسینیہ" کے نام سے جمع بھی کر رکھا ہے، جس کا تذکرہ تالیفات میں گزر چکا ہے۔ خطبات کی تالیف میں جو حضرت کثرت سے لکھا کرتے تھے۔ اکثر کسی طالب علم کے ہاتھ پرچہ بھیج دیتے کہ فلاں فلاں حدیث کے حوالے بھیج دو، میں بڑے اہتمام سے اسی وقت لکھ کر بھیجا کرتا تھا۔

حضرت قدس سرہٗ دستی پنکھے کے بہت خلاف تھے۔ کچے گھر میں جب کوئی جھلنے کھڑا ہوتا تو ڈانٹ سنتا، میں خوشامد کرتا تو مجھ پر بھی ڈانٹ پڑ جاتی۔ ایک مرتبہ حضرت نے بہت زور سے فرمایا کہ کسی حدیث میں اس کا ثبوت ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے تو بجلی کے پنکھے کا بھی ثبوت نہیں ملا، جو حضرت کے کمرے میں لگا ہوا ہے، حضرت ہنس پڑے۔ اس کے بعد میں نے ایک حدیث حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے مسجد میں جماعت کو پنکھا کرنے کی نقل کر کے بھیجی اور جب اگلی دفعہ تشریف لائے تو میں نے ایک لڑکے سے کہا کہ حضرت کو پنکھا کر، اب تو حدیث بھیج دی، اب کیا کسر ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ غیر معروف کتاب کی حدیث بھیجی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ساری احادیث معروف کتابوں میں ہیں اسی طرح ارشاد فرمایا کہ یہ بدن دبانے کا ثبوت کہاں ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مباحات میں ہر ایک کے لیے حدیث تلاش کرنا بڑا مشکل ہے۔ اس کی حدیث تو میں تلاش کر کے بھیج دوں گا۔ چنانچہ دوسرے دن ایک طالب علم کے ہاتھ بھیج دی۔

اس ناکارہ کا دستور تو رات کو کام میں مشغول رہنے کا خوب رہا اور ساری رات جاگنا معمولی

بات تھی۔ حضرت قدس سرہٗ بار بار فرمایا کرتے تھے کہ تمہاری اس چیز پر بڑا رشک آتا ہے۔ میری تو یہ مصیبت ہے کہ جہاں عشاء کے بعد کتاب ہاتھ میں لی نیند کا اس قدر غلبہ ہو جاتا ہے کہ بیٹھنا مشکل ہوتا ہے۔ اخیر شب میں کتاب دیکھنے کی حضرت کی خصوصی عادت تھی اور یہ ناکارہ اس سے عاجز تھا۔ تھوڑی دیر سو کر ایک دو بجے اُٹھ کر صبح تک کتاب دیکھنا حضرت کے یہاں بہت معمولی چیز تھی۔ بسا اوقات اس کی نوبت آئی کہ حضرت تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ ایک مضمون لکھنا ہے، اس کے ماخذ نشان رکھ کر میرے سرہانے رکھ دو۔ اس وقت شروع رات میں دیکھنا میرے بس کا نہیں، اُٹھ کر دیکھوں گا۔ میں جن کتابوں میں فوراً ملتا وہ حضرت کے سرہانے رکھ دیتا۔ ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ معاہدات یہود کی ضرورت ہے، اس کی روایات جہاں جہاں ہوں اور اس قسم کے مضامین ہوں نشان لگا کر رکھ لینا۔ کل رات کو یہاں سوؤں گا حوالہ نقل کر کے لے جاؤں گا۔

ایک دفعہ حضرت قدس سرہٗ رمضان ٹانڈہ گزار کر تشریف لائے اتفاق سے حضرت رائے پوری ثانی بھی سہارنپور تشریف رکھتے تھے۔ حضرت نے حسب معمول تار دیا اور میں صبح کو دس بجے اسٹیشن پر حاضر ہوا اور حضرت رائے پوری میرے ساتھ اسٹیشن تشریف لے گئے۔ یہ حضرت رائے پوری کی مستقل عادت تھی کہ جب ان کے قیام سہارنپور میں حضرت تشریف لاتے اور میں اسٹیشن جاتا تو حضرت ضرور تشریف لے جاتے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ حضرت رائے پوری سے مل کر بہت ہی خوش ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ تم دونوں کی مجھے بڑی ضرورت ہو رہی تھی۔ میں تم دونوں سے ایک اہم مشورہ کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس وقت مستورات ساتھ ہیں، سامان بھی ساتھ ہے۔ میں ان سب کو دیوبند پہنچا کر اگلی گاڑی سے واپس آجاؤں گا۔ حضرت کا قیام یہاں کب تک ہے۔ قبل اس کے کہ حضرت رائے پوری کچھ ارشاد فرمائیں مجھ گستاخ کو پیش قدمی کی عادت ہمیشہ رہی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کا ارادہ آج ہی جانے کا تھا۔ جناب والا کی خبر سن کر ملتوی کیا تھا اور شام واپسی کا ارادہ ہے، مگر جب بھی حضرت والا تشریف لائیں، ان حضرت کا قیام یہاں ضرور رہے گا۔ آپ فوراً واپسی کا ارادہ ہرگز نہ فرمائیں، جب سہولت ہو بہت اطمینان سے کل یا پرسوں تشریف لے آئیں۔ حضرت تشریف رکھیں گے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ بالکل نہیں، میں حضرت کا حرج بالکل نہیں کرنا چاہتا۔ سامان اور مستورات وغیرہ کو پہنچا کر ابھی واپس آتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت بالکل نہیں۔ ان حضرت کو نہ تو بخاری کا سبق پڑھانا ہے اور نہ مؤطا کی شرح لکھنی ہے ان کو نور پھیلانا ہے، رائے پور کی جگہ دو تین دن سہارنپور بیٹھ کر نور پھیلا دیں گے۔ دونوں حضرات بہت ہنسے اور میرے حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے بہت زور سے میری بات کی تائید کی کہ ہاں حضرت انھوں نے صحیح فرمایا میں تو بے کار ہوں نہ مجھے یہاں

کوئی کام اور نہ وہاں۔ میں جب تک حضرت تشریف لاویں گے خوشی سے انتظار کروں گا۔ مگر حضرت مدنی قدس سرہ دوسری گاڑی سے فوراً تشریف لے آئے ظہر کی نماز کے بعد مدرسہ کے قدیم مہمان خانے میں جواب کتب خانہ کا جزو بن گیا شرقی دیوار کی طرف دونوں اکابر تشریف فرما تھے۔ دیوار کے قریب تکیئے رکھے ہوئے تھے اور سامنے خادمانہ دوزانوں بیٹھنے سے میں عرصے سے معذور ہوں چوزانوں بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت مدنی نے فرمایا کہ مودودیوں کی کتابوں کے براہ راست دیکھنے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ کچھ تراشے لوگ بھیجتے رہے اور کچھ احوال خطوط سے معلوم ہوتے رہے۔ ان ہی پر میں رائے قائم کرتا رہا۔ تم دونوں کا موقف اس سلسلہ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت رائے پوری قدس سرہ کا دستور تو دیکھنے والے سینکڑوں موجود ہیں ان کا ایک عام ارشاد تھا کہ میں تو ان حضرت (یعنی یہ ناکارہ) کے پیچھے ہوں۔ جو یہ حضرت فرمادیں گے۔ وہی میری رائے ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ دونوں کی جوتیوں کی خاک اپنے سر پر ڈالنا باعث نجات اور فخر اور موجب عزت سمجھتا ہوں۔ لیکن مودودیوں کے بارے میں اگر آپ کوئی حکم متفقہ میری رائے کے خلاف دیں گے تو بہت ادب سے عرض کروں گا کہ تعمیل حکم سے معذور ہوں۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ یہ ہے ہمارے جوتوں کی خاک کی حقیقت۔ حضرت رائے پوری خوب ہنسے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت تقریباً میں پانچ کے قریب کتابیں امسال دیکھ چکا ہوں جو زبردستی مجھے دکھلائی گئیں اور ان پر میرے اشکالات ایک جگہ نوٹ ہیں چنانچہ تالیفات کے سلسلہ میں اس کا ذکر گزر بھی چکا ہے۔ حضرت اطمینان سے تشریف لائیں تو میں اصل کتابوں کی عبارتیں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ جن پر مجھے اشکالات ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا میں دو دن بعد دو شب قیام کے لیے آؤں گا اس کے بعد کوئی رائے قائم کروں گا۔ مجلس ختم ہوگئی اور دونوں حضرات شام کو اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ دو دن بعد حضرت قدس سرہٗ مولانا اعزاز علی صاحب کو لے کر تشریف لائے اور دو دن مستقل قیام فرمایا۔ مہمان خانہ قدیم وہ کمرہ جو دارالافتاء کے نیچے ہے اور اب کتب خانہ کا جزو ہے اور مدرسہ کے زینہ کے منتہا پر اس جانب کواڑ بھی لگے ہوئے تھے۔ غالباً اب نہیں رہے۔ صبح کو چائے کے بعد میں اور حضرت قدس سرہٗ اور مولانا اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ زینے والے کواڑوں کی زنجیر لگا کر اس کمرہ میں بیٹھ جاتے تھے۔ حضرت کئی کئی ورق اول سے آخر تک مسلسل پڑھنے کے بعد نشان لگا کر مولانا اعزاز علی صاحب کو دیتے کہ یہاں سے یہاں تک عبارت نقل کردو۔ کبھی کبھی قاری صاحب مرحوم کو بھی نقل کی یا کسی افتاء کی کتاب کی مراجعت کے لیے بلالیا جاتا تین شب دو دن مسلسل ان دونوں حضرات کا یہاں قیام رہا اور شہر میں جیسا عوام کی عادت ہوا کرتی ہے خوب قیاس آرائیاں ہوئیں کہ یہ کیا اہم مسئلہ درپیش

ہور ہا ہے عام طور سے لوگ سیاسی مسائل کے اوپر رائے زنیاں کرتے۔ مگر اونچے لوگ اس کی تردید کر دیتے کہ سیاسی مسائل میں شیخ الحدیث اور مفتی کی کیا ضرورت ہے کوئی علمی مسئلہ ہوگا۔ سامنے جنگلے پرسے لوگ کھڑے ہو کر کئی کئی گھنٹے گھورتے رہتے بعض سیاسی اونچے لوگ آتے اور اپنے علوشان کی بنا پر کواڑ کھلوانا چاہتے آوازیں دیتے تو میں اپنی جگہ سے اٹھتا نہیں اشارہ سے انکار کر دیتا۔ حضرت کچھ آڑ میں کو ہوتے تھے اور کچھ آگے کو ہوتے تھے پورے نظر نہیں آتے تھے۔ نیچے مدرسہ والوں سے کہہ رکھا تھا کہ جو آوے اس سے کہہ دیجیو کہ بارہ بجے سے پہلے ملاقات نہیں ہوگی یا پھر عصر کے بعد۔ عصر سے مغرب تک مجلس عامہ رہتی اور مغرب سے عشاء تک سیاسی لیڈروں کے حضرت سے تخلیہ کی ملاقاتیں اور کھانا عشاء کے بعد پھر میں ہمرکاب مہمان خانہ میں پہنچ جاتا ایک دو گھنٹہ تو حضرت کتابیں دیکھتے پھر ارشاد فرماتے بھائی ہمیں تو نیند آگئی۔ نشان رکھ کر چلے جاؤ اور مولانا اعزاز علی صاحب کو اس عشاء کے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں کچھ حضرت حوالے بتا دیتے وہ ان کو نقل کرتے رہتے۔ بات پر بات یاد آجاتی ہے میرے حضرت مدنی کا ایک بڑا عجیب دستور میرے ساتھ سالہا سال یہ رہا اکثر مہینے دو مہینے میں ایک پھیرا کبھی تو سونے کی مد میں ہوتا اور کبھی کوئی اہم مضمون لکھنے کے واسطے حضرت تشریف لاتے اور فرماتے تین رات ہو گئیں سوئے ہوئے۔ نیند کا بڑا خمار ہے۔ دیوبند میں سونے کی جگہ بالکل نہیں میں نے سوچا تیرے یہاں سوؤں گا میں عرض کرتا ضرور میں کچے گھر میں گرمی میں باہر اور سردی میں اندر کمرے میں چار پائی بچھا کر حضرت کو لٹا کر کسی تیل ملنے والے کو سرہانے بٹھا کر اور باہر کا قفل لگا کر تالی اپنے ساتھ لے کر اوپر چلا جاتا لوگ مولوی نصیر سے مطالبہ کرتے کہ قفل کھولدو کہتے کہ تالی تو میرے پاس نہیں وہ تو اوپر ہے اوپر ہر شخص کی جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ لیکن اونچے لوگ جن کے نام لکھنا تو مناسب نہیں سمجھتا اوپر پہنچ جاتے اور مجھ پر اصرار فرماتے کہ ضروری کام ہے کواڑ کھول دو۔ میں اول تو ذرا متانت سے عرض کرتا کہ حضرت کئی روز کے جاگے ہوئے ہیں سونے ہی کے لیے تشریف لائے ہیں ایسی حالت میں جناب کو تو خود ہی چاہیے۔ مگر بعض بڑے آدمی ذرا اپنی علوشان کی وجہ سے اس جواب کو بھی اپنی توہین سمجھتے تو میں کہتا کہ آپ کو تو حضرت کا یہاں تشریف لانا معلوم نہیں تھا آپ یوں سمجھے کہ دیوبند ہیں کار لے کر دیوبند تشریف لے جائیے اور وہاں جا کر جب یہ معلوم ہو کہ سہارنپور گئے ہوئے ہیں تو واپس آکر مجھ سے کواڑ کھلوائیے اتنے وقت ہو ہی جائے گا۔ بعض لوگ تو نصیر ہی کے پاس سے واپس ہو جاتے تھے اور بعضے اوپر جا کر میرے پہلے یا دوسرے جواب پر خواستہ یا ناخواستہ واپس آجاتے۔ لیکن بعض لیڈر اس پر بھی زور دکھلاتے تو پھر میں بھی زور دکھلاتا۔ میں کہتا کواڑ تو نہیں کھلیں گے آپ کا جب تک جی چاہے تشریف رکھیے۔ میرا بھی حرج ہوگا مناسب یہ ہے کہ باہر

بوریئے پر تشریف رکھیے۔ مجھے بڑا لطف آتا جب عتابات اور گالیاں سنتا۔ باتیں تو کئی یاد آگئیں لیکن میں نے اوپر لکھا تھا۔ دو مد تھے تشریف آوری کے دوسرا مد جس کے لیے حضرت اہتمام سے تشریف لاتے کسی اہم مضمون کا لکھنا ہوتا تھا۔ وہ اگر طویل ہوتا یعنی ایک دو روز کا ہوتا تو حسین آباد تشریف لے جاتے دو چار گھنٹہ کا ہوتا تو ایک گاڑی سے یہاں تشریف لے آتے اور وہی سارا منظر جو اوپر سونے کے سلسلے میں گزرا وہی یہاں بھی ہوتا۔ حضرت قدس سرہ کا معمول گرمی ہو یا سردی اگر شب کو سونے کی نوبت آتی تو کچے گھر ہی میں آرام فرماتے تھے سردی میں تو کوئی دقت نہ تھی۔ لیکن گرمی میں بہت ہی اصرار کرتا کہ مدرسہ کی چھت پر بہت ہی اچھی ہوا آئے گی منت خوشامد کرتا۔ حضرت فرماتے کہ مجھے جیل کی کوٹھریوں کی عادت ہے۔ ایک دفعہ حضرت قدس سرہٗ اور مولانا عزیز گل صاحب اور دو مہمان مغرب کے وقت تشریف لائے علی الصباح گنگوہ جانا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ گرمی بڑی شدید ہے برسات کا زمانہ تھا آج تو مدرسہ کی چھت پر بڑے کمرے میں چارپائی بچھوادوں۔ بڑی اچھی ہوا آئے گی۔ حضرت نے فرمایا کہ میں تو کچے گھر ہی میں سوؤں گا ان لوگوں کے لے بچھوا دیجیو۔ میں نے مولانا عزیز گل صاحب سے اللہ ان کو بہت ہی خوش رکھے۔ پوچھا کہ آپ کی وہاں چارپائیاں بچھوادوں جو مولانا عزیز گل سے کبھی مل چکا ہوگا وہ ان کے طرز گفتگو سے خوب واقف ہوگا کہنے لگے کہ ہم بھی وہیں مریں گے جہاں یہ مرے گا چونکہ اس زمانے میں گھر والے نہیں تھے اس لیے میں نے بقیہ حضرات کی چارپائیاں زنانے مکان کی سہ دری میں بچھوادیں کہ وہاں فی الجملہ ہوا تھی۔ ایک بات اور یاد آگئی اور یہ بھی یاد نہیں کہ کہیں اور لکھوا چکا کہ نہیں۔ حضرت مدنی اور حضرت رائے پوری ثانی کا معمول یہ رہا کہ سفر ہو یا حضران دونوں حضرات کی چارپائی مجمع سے علیحدہ ہوتی تھی اور یہ ناکارہ اس ضابطہ سے دونوں کے یہاں مستثنیٰ تھا۔ ایک مرتبہ آبھہ حضرت مدنی تشریف لے گئے یہ سیہ کار بھی ساتھ تھا حسب معمول سب رفقاء کی چارپائیاں مختلف کمروں میں بچھیں حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ان کی چارپائی میرے ہی کمرے میں ہوگی۔ آبھہ والے بھی حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ بے تکلف تھے۔ کہنے لگے کہ حضرت جی یہ کیا بات ہے کہ خادم لوگوں کی چارپائیاں تو دور ہوں ان کی کیا خصوصیت ہے کہ حضرت ہی کے پاس ہو۔ قبل اس کے کہ حضرت قدس سرہ جواب مرحمت فرمائیں۔ میں بول پڑا کہ اس کی وجہ بتلاؤں وہ یہ کہ یہ دونوں حضرات رات کو بہت مشغول رہتے ہیں اور آدمیوں کے قرب سے ان کا حرج ہوتا ہے اور میں تو ایسا ہوں جیسے تمہاری یہ بکریاں یہاں بندھ رہی ہے۔ ایک چارپائی کے قریب وہ بھی بندھی ہوئی ہے ایک میں بھی سہی جانوروں سے حرج نہیں ہوتا آدمیوں سے ہوتا ہے میں نے اپنے اکابر میں اپنے والد صاحب اور حضرت مدنی قدس سرہٗ کو اخیر شب میں

بہت ہی آواز سے روتے سنا۔ بسا اوقات ان اکابر کے رونے سے مجھ جیسے کی آنکھ بھی کھل جاتی تھی۔ جس کی آنکھ سونے کے بعد بڑی مشکل سے کھلتی ہے۔ حضرت مدنی قدس سرہ ہندی کے دوہے بڑے درد سے پڑھا کرتے تھے۔ میں ہندی سے واقف نہیں اس لیے مضامین کا تو پتہ نہیں چلتا تھا۔ لیکن رونے کا منظر اب تک کانوں اور دل میں ہے۔ جیسے کوئی بچہ کو پیٹ رہا ہو اور وہ رو رہا ہو۔ ہمت و جفا اور مشقت اٹھانا تو میں نے اپنے سارے اکابر میں حضرت مدنی کے برابر کسی کو نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ ۱۲ ربیع الاول کے موقع پر حضرت سہارنپور تشریف لائے ہوئے تھے۔ اہل شہر نے اصرار کیا کہ آج ہمارے یہاں سیرت کا جلسہ ہے۔ زکریا نے کہہ دیا کہ اب مولود کا نام سیرت ہو گیا۔ نہ معلوم حضرت مدنی قدس سرہٗ کس خیال میں تھے سختی سے انکار فرمادیا کہ میں نہیں آؤں گا اور خوب ڈانٹا کہ تم لوگوں کو عقیدت ساری ۱۲ ربیع الاول ہی کو آتی ہے سال میں کبھی توفیق ہوتی ہے جلسہ کرنے کی؟ لوگوں نے کہا حضرت ہم تو ہر وقت متمنی رہتے ہیں کوئی مانتا نہیں۔ سنا تا نہیں۔ حضرت نے فرمادیا کوئی سننے کے لیے تیار ہو تو میں سنانے کے لیے تیار ہوں۔ لوگوں نے اپنی حماقت سے استقبال کا خوب اظہار کیا۔ حضرت قدس سرہٗ نے ہر ہفتہ تشریف لانے کا وعدہ فرمالیا اور جمعرات کی رات اس کے لیے متعین ہو گئی۔ اس لیے کہ جمعہ حضرت کا کئی کئی ماہ کا پہلے سے موعود ہوتا تھا۔ تقریباً چار ماہ مسلسل اگر کسی دوسری جگہ کا طویل سفر نہ ہوتا تو حضرت جمعرات کی شب میں ساڑھے آٹھ بجے کی گاڑی سے تشریف لاتے اسٹیشن سے سیدھے جامع مسجد جاتے اور نماز کے بعد وعظ شروع فرماتے۔ ساڑھے بارہ ایک بجے اس سیہ کار کے مکان پر تشریف لاتے۔ چونکہ مجھے معمول معلوم تھا اور میری پہلی اہلیہ مرحومہ کو حضرت قدس سرہٗ کے لیے کھانے یا پینے کی چیزوں کا بہت ہی زیادہ اہتمام تھا وہ بارہ بجے چائے کا پانی رکھ دیتی اور حضرت کی آواز اوپر چڑھنے کی جب آتی کہ میرا قیام اس وقت اوپر کے کمرے میں تھا تو چائے دم کرتی اور زور سے کھڑکا کرتی اور میں جلدی سے آکر چائے لے جاتا۔ حضرت پر اس وقت چونکہ تعب ہوتا تھا اس لیے پیتے تو تھے رغبت سے اور بار بار مجھ سے فرماتے کہ آپ اس غریب کو ناوقت ستاتے ہیں۔ میں عرض کرتا کہ میں نے نہیں کہا اس نے اپنے شوق سے خود پکائی اور چونکہ مجھے معمول معلوم تھا اس لیے چارپائی اور بستر پہلے سے تیار ہوتا۔ حضرت چائے پی کر آرام فرماتے، میں نے اختیاری سونا اور سو کر اختیاری جاگنا اپنے اکابر میں صرف اپنے حضرت قدس سرہٗ اور حضرت مدنی میں دیکھا۔ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کو بار ہا دیکھا کہ ریل پر تشریف لے جا کر گاڑی اگر دس پندرہ منٹ لیٹ ہوتی تو حضرت فرماتے کہ میں تو اتنے سولوں گا اور کوئی خادم جلدی سے بستر پلیٹ فارم پر کھول دیتا اور حضرت تکیہ پر سر رکھتے ہی سو جاتے اور دس منٹ کے اندر خود اٹھ جاتے۔ میرے

حضرت قدس سرہٗ کبھی کبھی یہ بھی ارشاد فرماتے کہ سونے کے ارادے کے بعد مجھے اکثر تکیہ پر سر رکھنے کی بھی خبر نہیں ہوتی ہے یہ مقولہ میں نے اپنے چچا جان سے بھی اکثر سنا کہ ماہ مبارک میں وتروں کے بعد چارپائی پر تشریف لے جا کر تکیہ پر سر رکھنے سے پہلے ہی آنکھ لگ جاتی تھی۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا معمول ماہ مبارک میں تراویح کے بعد فوراً سونے کا تھا اور بارہ ساڑھے بارہ بجے اٹھ کر سحر تک کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے کا تھا اور جہر سے قرآن پاک پڑھتے۔ صبح کو اذان کے ساتھ ہی نماز ہو جاتی اور اس کے بعد خود مصلے پر بیٹھ کر اشراق تک اوراد و وظائف پڑھتے اور خدام کو تقاضا کر کے سلا دیتے۔ کہاں سے کہاں چلا گیا۔ بہر حال حضرت مدنی قدس سرہٗ کی نیند اس قدر قابو کی تھی کہ سینکڑوں دفعہ میرے یہاں رات دن میں آرام فرمانے کی نوبت آئی اور میں نے حضرت کی راحت کی وجہ سے بارہا اس کی کوشش کی کہ کوئی حرکت نہ ہو اور کوئی نہ بولے چاہے گاڑی نکل جائے مگر حضرت قدس سرہٗ گاڑی سے آدھ گھنٹہ پہلے ایک دم اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ اس ہفتہ واری آمد میں بھی رات کو ساڑھے چار پر گاڑی جاتی تھی اور چار بجے سے پانچ سات منٹ قبل اٹھ جانا طے شدہ تھا۔ میں حضرت کے اٹھتے ہی کسی شخص کو تانگے کو بھیجتا اور پہلی اہلیہ مرحومہ اس وقت بھی چائے تیار رکھتی اس وقت کی چائے پر حضرت زیادہ ناراض ہوتے تھے کہ میں دیوبند جا کر پی لوں گا۔ چائے کے وقت پہنچ جاؤں گا۔ میرے اصرار پر کبھی تو پی لیتے اور کبھی عتاباً انکار فرما دیتے تھے۔ کیا کیا مناظر آنکھوں کے سامنے آ گئے پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ایک دفعہ حضرت قدس سرہٗ تانگہ پر تشریف لائے اور فرمایا کہ وقت تنگ ہے مدینہ پاک کے لیے درخت خریدنے ہیں کہ حج کے لیے تشریف لے جا رہے تھے۔ فرمایا کہ تانگہ پر بیٹھ جاؤ۔ تانگہ میں ہی ملاقات ہو جائے گی۔ ٹھہرنے کا وقت نہیں جلدی واپسی ہے۔ میں نے جلدی سے مولوی نصیر کو آواز دی اور ان کو بھی تانگہ میں اس خیال سے بیٹھا لیا کہ حضرت تو درخت خرید کر خود ہی اٹھا لیں گے اور مجھے شرم آئے گی اور مجھ سے اٹھنے مشکل ہوں گے۔ اس لیے مولوی نصیر اٹھا لیں گے۔ راستہ میں حضرت نے فرمایا کہ حج کو نہیں چلتے میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے تو اس وقت بڑی مشغولی ہے اسی نصیر کو لیتے جاویں کرایہ میرے ذمہ اور بقیہ اخراجات کھانے پینے کے آپ کے ذمے۔ حضرت نے فرمایا کہ ضرور میں نے اور حضرت قدس سرہٗ نے نصیر پر بہت ہی اصرار کی مگر اس نے بھی عذر کر دیا۔ اتنے میں ایک بہت لمبی چوڑی تعمیر آ گئی۔ قربان خاں مرحوم کے باغ میں جانا تھا جن کا دفتر تو شاہ مدار میں تھا پہلے وہاں گئے ان کا دوسرا باغ کچہری سے دور تھا وہاں جاتے ہوئے اس تعمیر پر کو گزرے میں نے پوچھا کہ کیا ہے اس لیے کہ مجھے کبھی چالیس سالہ قیام سہارنپور میں وہاں جانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ اس کو نہیں جانتے۔ میں نے عرض کیا کہ نہیں حضرت میں تو

یہاں کبھی نہیں آیا۔ فرمایا کہ یہ کچہری وہ دیوانی ہے یہ کلکٹری ہے وغیرہ وغیرہ میں نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت کی برکت نے کچہری تک تو پہنچا دیا۔ آپ جیل بھی پہنچا کر رہیں گے۔ فرمایا کہ تم لوگوں کی اس بے تعلقی نے انگریز کو ہم پر مسلط کر رکھا ہے تم کچہری سے اتنا ڈرتے ہو جیسے سانپ سے ڈرتے ہو فرمایا کہ ہمارے مفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایک دفعہ ایک میراث کے مسئلہ کی تصدیق کے لیے سمن پہنچ گیا۔ کچہری آنے کے ڈر سے بخار آگیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت جناب والی قوت کہاں سے لاویں۔ فرمایا کہ یہ سب بزدلی کی باتیں ہیں۔ غرض بہت سے پودے خریدے۔ حضرت قدس سرہٗ کا ہمیشہ معمول رہا کہ جب کبھی مدینہ پاک تشریف لے جاتے تو سید محمود صاحب کے باغ کے لیے بہت سے بیج پھلوں اور پھولوں کے اور بہت سے پودے کئی کئی ٹوکروں میں لے جاتے خاص طور سے آم کے پودے کثرت سے لے جاتے مگر ہمیشہ خراب ہو گئے بالآخر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی برکت سے دو تین درخت بار آور ہو گئے۔ گزشتہ سال ۸۹ھ میں جب مدینہ پاک قیام تھا تو سید صاحب زادمجدہم نے اپنے باغ کے آم کھلائے۔ اللہ تعالیٰ بہت جزائے خیر عطاء فرمائے۔ آم تو گزشتہ سال اللہ کے فضل سے مدینہ پاک میں ہندوپاک۔ افریقہ، لندن، بحرین، شام وغیرہ نہ معلوم کتنے ملکوں کے کھائے احباب اپنی شفقتوں سے دوسرے تیسرے دن کہیں نہ کہیں سے لاتے ہی رہتے تھے۔ شاید ہندوستان سے زیادہ ہی کھانے کی نوبت آئی ہو۔ میں بھی شتر بے مہار کی طرح سے کبھی ادھر چلا جاتا ہوں اور کبھی ادھر۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کی کیا کیا شفقتیں لکھواؤں۔ حضرت اقدس کا معمول تقسیم سے پہلے تک کثرت سے تشریف بری کا تھا اور جب بھی تشریف لے جانا ہوتا تھا تو اس سیہ کار کے لیے ایک عطر عود کی بڑی شیشی لانے کا معمول تھا ۶۰ھ میں حضرت قدس سرہٗ نے ایک عطر عود کی شیشی مرحمت فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا کہ یہ ستر سال کا ہے اور سترہ روپیہ تولہ اس کی قیمت ہے۔ اس کا قانون یہ ہے کہ اس کی قیمت میں ایک روپیہ سالانہ کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اب چونکہ یہ ستر سال کا ہے اس لیے اس وقت اس کی قیمت ستر روپے ہے۔ میں نے بھی اس کو بڑی احتیاط سے اس پر چٹ لگا کر اور یہی عبارت لکھ کر ایک ڈبہ میں محفوظ رکھ دیا تھا۔ اپنے بخل کی وجہ سے خود تو اب تک استعمال نہیں کیا البتہ گزشتہ سال ۸۹ھ میں حضرت قدس سرہٗ کے برادر خورد حضرت الحاج سید محمود صاحب کی خدمت میں اس کا ایک ربع پیش کیا تھا اگر میرے مرنے کے وقت کسی کو یاد رہے اور مل جاوے تو اس میں سے تھوڑا سا میرے کفن پر بھی مل دیں۔ اس وقت ۹۰ھ میں تو اس کی قیمت سو روپے فی تولہ ہو گئی ہو گی کیونکہ اس کی عمر سو سال ہے واقعی شیشی کھولنے سے کمرہ مہک جاتا ہے۔ ایک قصہ لکھوانے کا تو نہیں ہے مگر میرے دوستوں کا اصرار ہے کہ ضرور لکھواؤں حضرت کی شفقتیں تو بے

پایاں تھیں اور جتنی حضرت کی شفقتیں بڑھتی جاتی تھیں میری گستاخیاں بڑھتی جاتی تھیں۔ایک دفعہ کچھ تذکرہ اکابر کا اور جنت کا چل رہا تھا۔میں نے عرض کیا کہ حضرت جنت میں میرے بغیر جانا نہیں ہوگا، حضرت نے نہایت سادگی میں بلا تامل فرمایا کہ ہاں ضرور۔ایک سال بعد بلکہ اس سے بھی زیادہ میرے تو ذہن میں بھی نہیں رہا حضرت تشریف لائے میں دار الطلبہ تھا مجھے آدمی بلانے گیا۔اتنے میں آتا ایک صاحب مدرسہ کے قریب ہی اپنے گھر آموں کے لیے لے گئے۔میں جب دارالطلبہ سے آیا تو معلوم ہوا کہ فلاں صاحب کے یہاں چلے گئے میں وہاں پہنچا تو آم بھیگے ہوئے تھے اور حضرت تشریف فرما میرا انتظار فرما رہے تھے۔میں نے کہا کہ ایسا کیا تقاضا تھا پہلے ہی تشریف لے آئے حضرت نے فرمایا کہ ہر جگہ ساتھ لے جانے کا وعدہ تو نہیں کر رکھا جہاں کا وعدہ ہے وہاں کا ہے۔مجھے اس قدر مسرت اور حیرت ہوئی کہ حضرت کو ایک سال کے بعد تک کیسے یاد رہا۔اس کے بعد تو پھر انشاء اللہ اپنی مغفرت کی بھی ڈھارس بندھ چلی ورنہ و امتازوا الیوم ایھا المجرمون کا خوف غالب رہتا تھا اور ہے اللہ تعالیٰ ان اکابر کی جوتیوں میں اس سیہ کار کو بھی جگہ دے دے تو اس کے لطف وکرم سے کیا بعید ہے۔حضرت مدنی قدس سرہٗ کی شفقت ومحبت کے قصے لاتعد ولا تحصیٰ ہیں اور یاد بھی بہت ہیں۔بہت سی چیزوں میں خودنمائی بھی مانع ہو جاتی ہے ایک دفعہ اس سیہ کار کو معمولی سا بخار ہوا کسی جانے والے طالب علم سے حضرت نے خیریت دریافت کی۔اس نے کہہ دیا بخار ہو رہا ہے۔حضرت اسی وقت اسی گاڑی سے تشریف لے آئے اور کچے گھر کے دروازے میں قدم رکھتے ہی یہ شعر پڑھا

تعاللت کی اشجی و مابک علته تریدین قتلی قد ظفرت بذلک

میں ایک دم حضرت کی آمد پر کھڑا ہو گیا۔فرمایا اچھے خاصے ہو شور مچا رکھا ہے بخار کا۔میں نے عرض کیا میں نے حضور کی خدمت میں کونسا تار یا ٹیلیفون کیا تھا کہ میں مر رہا ہوں۔فرمایا ساری دنیا میں شور مچ گیا بخار کا، بخار والا یوں نہیں کھڑا ہوا کرتا۔میں نے عرض کیا

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اور واقعی ہوا بھی ایسا ہی، حضرت کی تشریف آوری کی برکت سے بخار جاتا رہا۔ایک ادا حضرت مدنی قدس سرہٗ کی بڑی پسند آیا کرتی تھی۔ایک ادا کیا ادائیں تو ہزاروں بلکہ لاکھوں اور ایک سے ایک بڑھ کر:

فدا ہو آپ کی کس کس ادا پر
ادائیں لاکھ اور بے تاب دل ایک

میں نے بارہا دیکھا کہ جب حضرت مدنی قدس سرہٗ کی آمد حضرت مرشدی سیدی قدس سرہٗ کی خدمت میں ایسے وقت ہوتی جب حضرت کا درس جاری ہوتا تو بہت خاموشی سے آکر قاری کے برابر بیٹھ جاتے نہ سلام نہ مصافحہ نہ ملاقات اور جب قاری حدیث ختم کرتا تو اس کو اشارہ سے روک کر خود حدیث کی قراءت شروع کر دیتے۔ اس سے میرے حضرت کو حضرت مدنی کی آمد کا حال معلوم ہو جاتا اور سبق کے ختم پر سلام اور مصافحہ وغیرہ ہوا کرتا۔ اللہ جل شانہ اس سیہ کار کو بھی حسن ادب کی توفیق عطاء فرمائے۔ جب حضرت کراچی جیل سے تشریف لائے اس وقت کا منظر ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ حضرت مرشدی قدس سرہٗ مکان تشریف لے جا رہے تھے اور حضرت مدنی اسٹیشن سے تشریف لا رہے تھے۔ مدرسہ قدیم کی مسجد کے دروازے پر آمنا سامنا ہوا۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ حضرت مرشدی قدس سرہٗ کے ایک دم قدموں میں گر پڑے۔ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ نے جلدی سے پاؤں پیچھے کو ہٹا کر سینہ سے لگایا اور طرفین کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کے بڑے بھائی حضرت مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ کی شفقتیں تو اس سیہ کار پر اس وقت سے رہیں جب میری عمر ڈھائی برس تھی۔ جیسا کہ میں اپنی گنگوہ کی حاضری کی ابتداء میں لکھ چکا ہوں اور مدینے پاک سے اخیر زندگی تک روضہ اقدس کی خاک وغیرہ بھیجنے کا معمول اخیر تک رہا اور ۴۵ھ میں جبکہ اس سیہ کار کا قیام مدینہ پاک میں رہا اس وقت کی شفقتوں کا تو پوچھنا ہی کیا جس حجرہ میں میرا قیام تھا اس میں رطب اور جب رطب کا زمانہ نہ ہوتا تو ایک صندوق عمدہ کھجوروں کا ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ میں کھاتا اور بانٹتا اگلے دن صبح کو پھر پُر کر دیا جاتا۔ ایک ڈبہ تازہ پنیر کا بھرا رہتا۔ ایک زیر زمزم شریف سے پر رہتی اور کیا کیا بتاؤں علی الصباح ایک مستقل براد (کیتلی) دودھ کی چائے جس میں مشک وعنبر خوب پڑا ہوتا میری قیام گاہ پر آجاتی۔ یہ تو لمبی داستانیں ہیں اس وقت تو ان کا ایک گرامی نامہ جو میرے والد صاحب کے انتقال پر تعزیت کے سلسلے میں آیا تھا۔ وہ اتفاق سے سامنے نظر پڑ گیا۔ اس کے لکھوانے کو میرا بھی جی چاہا۔ مستقل عنوان تو کوئی مولانا مرحوم کا ہے نہیں اور اگر لکھا جائے تو بہت طویل مضمون ہو جائے۔ لیکن اس خط کے نقل کرانے کو میرا بھی جی چاہا بڑے مزے کا ہے۔ اس لیے تبعاً حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے حالات ہی میں نقل کرانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے:

بسم اللہ!

عزیزم میاں مولوی محمد زکریا صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ

از جانب خاکسار سید احمد غفرلہ بعد اہدائے سلام آں کہ احقر بخیریت رہ کر صحت وعافیت تمہاری مع جملہ کچے بچے کا خواستگار ہے اگرچہ آپ مدرس ہو گئے ہیں ہم جیسے دور افتادہ کو کیوں خیال

میں لانے لگے۔ مگر اول تو اس عاجز کو آپ کے والد بزرگوار سے اور مرحوم کو اس نابکار سے کچھ ایسا تعلق مخلصانہ تھا۔ جس کی وجہ سے اگر آپ خدانخواستہ بے اعتنائی بھی برتو گے تو اینجانب علیہ الرحمۃ و الغفر ان ایسے نہیں ہیں کہ چپکے ہو کر بیٹھ رہیں الحاصل حافظ محمد یعقوب صاحب کے خط سے آپ کے والد ماجد صاحب مرحوم کا اس دارفانی کو چھوڑ کر دارِ جاودانی کی طرف منتقل ہونا معلوم ہو کر جو کچھ اثر قلب پژمردہ پر ہوا ہے عالم الغیب ہی جانتا ہے۔ مگر عزیزم کیا کیا جائے۔ بجز انا للہ وانا الیہ راجعون کے چارہ نہیں۔ اسی پر صلوٰات من ربہم کا انعام ملنے کی توقع ہے۔ اب آپ کو چاہیے کہ ''سرلابیہ'' کا کرشمہ کر دکھاؤ۔ جیسے کہ اپنے کمالات علمی واخلاقی کی وجہ سے ہر دلعزیز تھے تم بھی اپنے آپ کو ویسا ہی ثابت کرو:

ان الفتي من يقول ها انا ذا ليس الفتي من يقول كان ابي

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مدظلہم العالی کی خدمت میں عرصہ ہوا ایک عریضہ ارسال کیا تھا۔ اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد دوسرا عریضہ بھائی مقبول صاحب کی خدمت میں ارسال کیا۔ مگر تعجب ہے کہ آج تک کسی کا جواب نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں راستہ میں ضائع ہوا۔ آپ مہربانی کر کے دونوں حضرات و نیز جملہ واقفین کی خدمت میں مودبانہ سلام عرض کر دیں اور خصوصیت سے حضرت مولانا مدظلہم اور مولانا رائے پوری ظلہم کی خدمت اقدس میں زبانی یا بذریعہ تحریر اس عاجز کی طرف سے نہایت ادب سے سلام مسنون کے بعد دعائے فلاح دارین کی التجا کر دیں اور اگر ہمت کر کے دو چار پیسہ کا ٹکٹ خرچ کر کے اس عاجز کو مدینہ منورہ کے پتہ پر دو چار حرف خیر و عافیت وغیرہ کے لکھ بھیجیں تو آپ کی سعادت مندی سے بعید نہیں معلوم ہوتا۔ میاں الیاس کو بھی ایک خط لکھا ہے مگر وہ تو ہمیشہ کے سست درست اپنے مطلب میں چست ہیں۔ ہم جیسے نابکاروں کی دلداری کی کیا پرواہ کریں گے۔ مگر یاد رہے کہ خدانخواستہ یہ سراپا عصیان ہندوستان میں آ گیا تو ایسی خبر لے گا کہ وہ بھی یاد کریں گے اور اگر خدانخوستہ وہ مدینہ منورہ آ گئے تو پھر کیا پوچھنا۔ ہندوستان کا راستہ ہی نہ بھلا دیا تو کہنا۔ اب اینجانب رحمہ اللہ تعالیٰ عنقریب ملک شام کو طلاق مغلظہ دے کر دو چار روز میں مدینہ منورہ کو بھاگا چاہتے ہیں بس گویا کہ پابرکاب ہیں کیا عجب ہے کہ راستہ میں قدس شریف کی بھی زیارت سے شرف حاصل ہو۔ نہیں تو سوئز ہوتے ہوئے ینبوع میں جا کودیں گے اور پھر کیف خلقت پر سوار ہو کر منزل مقصود کی راہ لیں گے۔ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب مدظلہم کے واسطے ایک سماوار مولانا خلیل احمد صاحب مدظلہم نے خرید کر ارسال کرنے کے واسطے ارشاد فرمایا تھا۔ اپنی بدنصیبی کے اثر سے کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اب جا کر دیکھیں گے مل گیا تو روانگی کی فکر کریں گے۔ میاں زکریا یاد رکھو اگر میرے خط کا جواب نہ دیا تو میں روٹھ جاؤں

گا۔ پھر کتنا بھی مناؤ گے منوں ہی گا نہیں۔ بس اور زیادہ بات چیت نہیں کرتا۔

اس کے بعد یہ عبارت بھی تھی جس کو مولانا مرحوم نے قلمزد کر دیا تھا ''شکل اول کا نتیجہ ظہور پذیر ہوا ہوتو اس کو دعاء و پیار۔ نہیں تو موجب تاخیر کیا ہے۔ ایجناب علیہ الرحمۃ کے نتیجہ صاحب تو اپنی ماں کو بھی لے گئے اکیلے رہنا ہی گوارا نہیں ہوا اور طرفہ یہ کہ خود مدینہ میں اور اماں جان تبوک میں فقط۔

سید احمد غفرلہ ۲۶ جمادی الاولیٰ ۳۷ھ:

حضرت مولانا کے والا نامے میں سماوار کے سلسلہ میں جو لفظ ہے کہ '' کچھ کا کچھ ہو گیا'' اس لفظ میں اشارہ اس حادثہ عظیمہ کی طرف ہے جب کہ مدینہ کے بالکلیہ انخلاء کا حکومت ترکیہ نے اپنے آخری دور میں حکم کیا تھا اور حضرت سید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اڈریانوپل (شام) کی طرف منتقل کیے گئے تھے۔ اس کا مختصر حال حضرت مدنی قدس سرہٗ کی خود نوشت سوانح (نقش حیات) جلد اول ص ۴۰ پر ہے شام سے واپسی کے متعلق جو مولانا نے اس خط میں لکھا ہے وہ اسی طویل غیبت سے واپسی کا ذکر ہے اور جب ۳۸ھ میں اس ناکارہ کی پہلی حاضری حجاز مقدس ہوئی اس وقت مولانا سید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نئے نئے واپس شدہ تھے۔ حضرت مولانا سید احمد صاحب قدس سرہٗ کے مکاتیب کا بھی بڑا ہی ذخیرہ اس سیہ کار کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اور جو ظرافت و محبت کا نمونہ اوپر کے خط میں ہے اس کے نمونے بھی ان خطوط میں بہت ملیں گے۔ بالخصوص ۳۸ھ کے بعد سے وصال تک روز افزوں سلسلہ بڑھتا ہی رہا۔ ۴۶ھ کے بعد سے چونکہ مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کے مدرسہ شرعیہ کا حساب اور ہندوستان کا چندہ مدرسہ شرعیہ کی روئداد کا شائع ہونا بھی اسی سیہ کار سے متعلق ہو گیا تھا اس لیے کوئی ہفتہ بھی لمبے چوڑے خط سے خالی نہ جاتا تھا اور اس کے درمیان میں لطائف و ظرائف اور محبت آمیز فقرے کثرت سے ہوتے تھے۔ ان کے ایک شاگرد رشید الحاج عبد الحمید جو آج کل جدہ کے کسی بڑے عہدے پر فائز ہیں ۴۵ھ میں میری مدینہ پاک سے واپسی کے بعد ان کی شادی ہوئی۔ میں اور مولانا مرحوم خوب چاہتے رہے کہ میرے سامنے ہو جائے مگر مقدر نہ ہوا۔ میری مدینے سے روانگی کے کچھ دنوں بعد ہوئی تو حضرت مولانا مرحوم نے ایک پر ظرافت خط لکھا تھا کہ آپ کی روانگی کے بعد آپ کے عبد الحمید صاحب دولہا بن گئے ہیں چناں چنیں میں نے آپ کی طرف سے پانچ گنی (اشرفی) ان کے نکاح میں خرچ کر کے آپ کے حساب میں درج کر دی ہیں۔ میں نے بھی اس کے جواب میں ترکی بہ ترکی ان کو دولہا بنے ہوئے نہ دیکھنے کی حسرت اور شادی میں عدم شرکت پر قلق اور پانچ گنی کی قلت پر افسوس لکھ دیا اب تو میرا بہت ہی دل چاہ رہا ہے کہ حضرت مولانا سید احمد صاحب کی شفقتیں اور کچھ خطوط نقل

کرادیں مگر وقت نہیں ہے۔ جو چیزیں علیگڑھ میں لکھوا چکا ہوں وہی پوری ہو جائیں تو غنیمت ہے،

حضرت شاہ یٰسین صاحب نگینوی رحمۃ اللہ علیہ:

یکے از خلفاء قطب عالم مولانا گنگوہی قدس سرہٗ جن کا مختصر ذکر یہ ناکارہ اپنے رسالہ فضائل درود کی ابتداء میں بھی لکھ چکا۔ مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں ان کا دستور ہمیشہ تشریف لانے کا تھا اور جلسہ کے بعد ہفتہ عشرہ اس سیہ کار کے پاس قیام ہوتا۔ صورت سے بزرگی ٹپکتی تھی۔ بہت ہی شفقت فرماتے تھے۔ بہت ہی اہتمام سے اس سیہ کار کے سبق میں تشریف لے جاتے اور بہت ہی انتہائی ادب سے **کانّ علیٰ رؤسھم الطیر** کا مصداق بنے ہوئے نیچی نگاہ کیے ہوئے ایسے تشریف رکھتے کہ مجھے ان کی نشست پر بڑا رشک آتا تھا۔ میرے اصرار پر میرے قریب ہی تشریف فرما ہوتے۔ شفقتیں تو بہت یاد ہیں مجھے اس وقت ان کی ایک کرامت یاد آ گئی۔ اسی کی وجہ سے ان کا نام نامی لکھوایا ہے میری عادات سیہ میں ایک بری عادت یہ بھی تھی کہ جب سبق میں جاتا تو ڈبیہ بٹوہ میرے ساتھ ہوتا اور اگالدان کی بجائے مٹی کا لوٹا مستقل دار الحدیث میں رہتا اور سبق کے دوران میں پان بھی کھاتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا کہ میں پان کھانے کو تو منع نہیں کرتا۔ آپ سبق کے درمیان میں نہ کھایا کریں۔ اس دن سے تقریباً بیالس سال ہوئے مجھے یاد نہیں کہ کبھی میں سبق میں ڈبیہ لے کر گیا ہوں یا سبق کے درمیان میں پان کھایا ہو سبق میں باوضو ہونے کا اہتمام تو ہمیشہ رہا مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ حدیث پاک کا سبق کبھی بے وضو پڑھایا ہو لیکن شاہ صاحب کے اس ارشاد کے بعد سے سبق کو جاتے ہوئے ہمیشہ بہت اہتمام سے کلی کر کے جاتے تھا اور اس پر ہمیشہ قلق رہا کہ شاہ صاحب نے یوں کیوں فرمایا کہ پان کھانے کو تو منع نہیں کرتا۔ کاش یہ بھی فرمادیتے کہ پان نہ کھایا کرو تو ان کی برکت سے اس مصیبت عظمیٰ سے نجات مل جاتی یہ میں ہر دو رسائل بالا کے درمیان میں لکھ چکا ہوں کہ میرے فضائل کی ابتدائی تالیفات میں فضائل قرآن ہے اور آخر میں فضائل درود اور یہ دونوں حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے تعمیل ارشاد میں لکھی گئیں۔ کہ فضائل قرآن ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ میں ختم ہوئی اور فضائل درود ۶ ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ کو ختم ہوئی۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے اپنے اجل خلفاء شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی دعاء جو کو مرحوم کے قول کے موافق بار بار تاکید کی معلوم ہوا کہ انتقال کے وقت اس کی بڑی تاکید فرمائی کہ میرے بعد زکریا سے تعلقات رکھیں۔

حضرت اقدس رائے پوری ثانی حضرت الحاج مولانا عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ وبرد مضجعہ کی خدمت میں اس سیہ کار کی حاضری بہت قدیم اور حضرت کا دور بھی حضرت اقدس مدنی کی طرح سے خوب پایا۔ میری حاضری سہارنپور کی رجب ۲۸ھ میں ہے جیسا کہ کئی جگہ لکھا جا چکا

ہے۔ اس سے پہلے گنگوہ کے قیام میں ایک مرتبہ اپنے والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے ساتھ رائے پور کی حاضری خوب یاد ہے۔ اعلیٰ حضرت کا دور تھا۔ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب قدس سرہٗ کو اس وقت کا پہچاننا تو یاد نہیں اور حضرت کی کوئی امتیازی حالت بھی اس وقت کچھ نہ تھی اتنا یاد ہے کہ اعلیٰ حضرتؒ نے اپنے ایک خادم سے جو کثرت سے حجرہ شریف میں آتے جاتے تھے یوں ارشاد فرمایا تھا کہ مولوی صاحب! جو مٹھائی وغیرہ اندر رکھی ہے وہ سب صاحبزادے صاحب کو دے دو جیسا کہ اعلیٰ حضرت کے حال میں گزر چکا۔ اس کے بعد سے اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے وصال تک تو کوئی امتیازی تعارف مجھے اپنے سیدی ومولائی حضرت رائے پوری ثانی سے نہیں ہوا۔ البتہ حضرت نوراللہ مرقدہٗ مجھے بحیثیت صاحبزادہ خوب پہچانتے تھے اور چونکہ اعلیٰ حضرت کا کاتب بھی اس زمانے میں ایک نہیں تھا۔ عام ڈاک تو ملا جی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ (جناب ملا عبدالعزیز صاحب والد ماجد حافظ عبدالرشید صاحب) لکھا کرتے تھے۔ اس واسطے خطوط میں بھی کوئی تعیین نہیں ہوا کرتی تھی۔ اس سیہ کار کو تو یاد نہیں لیکن حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے اللہ ہی مجھے معاف فرمادے کئی دفعہ مجھ سے فرمایا کہ آپ کو وہ زمانہ یاد نہیں جب آپ ہم سے پاؤں دبوایا کرتے تھے۔ اللہ ہی معاف فرمادے معلوم نہیں کہ یہ لفظ نقل کرانے کا بھی ہے یا نہیں۔ اس کی اصل یہ ہے کہ جب یہ سیہ کار اپنے والد صاحب کے انتقال کے بعد رائے پور حاضر ہوتا تو کنویں کے قریب جو بنگلہ ہے اس کے سامنے بے حیائی سے چارپائی پر پڑ جاتا اور اعلیٰ حضرت کے بہت سے مخلص خدام اعلیٰ حضرت کی شفقت دیکھ کر مجھے سب لپٹ جاتے ممکن ہے کہ حضرت اقدس رائے پوری بھی اس وقت ان لوگوں میں ہوں۔ مگر میں ان کو خاص طور سے نہیں پہچانتا تھا۔ میرا تعارف حضرت رائے پوری ثانی سے اعلیٰ حضرت کے وصال کے بعد سے شروع ہوا۔ جب کہ تین چار برس تک حضرت رائے پوری ثانی اپنے مکان سے تشریف لاکر مہینہ دو مہینہ یہاں قیام فرماتے اس زمانے میں آتے جاتے سہارنپور بھی قیام فرماتے۔ اس کے بعد سے جو تعلق بڑھنا شروع ہوا تو اخیر دور کے دیکھنے والے اب تک ہزاروں موجود ہیں اور ۴۵ھ میں جب یہ ناکارہ یک سالہ قیام کے لیے مدینہ پاک بذل المجہود کے سلسلے میں حاضر ہوا اور ماہ رجب میں حضرت رائے پوری نوراللہ مرقدہٗ بھی مدینہ تشریف لے گئے تو کئی مرتبہ سفر میں بھی اور سفر کے بعد بھی یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ معاف کرے کہ میں حج کی یا حضرت مدظلہ کی زیارت کے لیے نہیں آیا بلکہ تمھاری محبت کھینچ کر لائی ہے۔ آٹھ ماہ سے تمھاری زیارت نہیں ہوئی اس نے بےچین کر رکھا ہے۔ یہ حضرت رائے پوری کا دوسرا سفر حج تھا۔ پہلا سفر حج ۲۸ھ میں اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے ساتھ ہوا۔ اس سفر کے واقعات بھی بہت ہی عجیب اور اہم ہیں اور حضرت اقدس رائے پوری کے واقعات تو کہاں

تک لکھواسکوں اس سفر کے واقعات اس سیہ کار کے حجوں کی تفصیل میں آرہے ہیں۔لیکن اس حج کے بعد سے حضرت قدس سرہٗ کی محبت اور شفقت میں بہت ہی اضافہ ہوگیا اور چونکہ اس سفر کے اخیر میں یعنی ذیقعدہ ۴۵ھ میں حضرت اقدس نے اس سیہ کار کو اجازت بیعت بھی فرمادی تھی۔اس لیے حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی محبت میں المضاعف اضافہ ہوگیا۔اس سیہ کار نے حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے پاؤں پکڑے تھے کہ اللہ کے واسطے اجازت کی خبر ہندوستان میں نہ کریں۔حضرت نے فرمایا ضرور کروں گا اور وہیں سے لوگوں کو خطوط لکھنے شروع کردیے اور یہاں آکر خوب شور مچایا:

داماں نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار گل چیں بہار تو ز داماں گلہ وارد

اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ اور ان ہی کی اتباع میں حضرت رائے پوری قدس سرہٗ دلداری کے تو پتلے تھے۔جب کہیں تشریف لے جاتے کبھی موعودہ وقت پر واپس تشریف نہیں لاتے تھے۔چاہے کتنا ہی پختہ وعدہ ہو۔مگر جب لوگوں نے خوشامد درآمد کی تو ملتوی فرمادیا۔حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کو چچا جان سے ملنے کا اور چچا جان کو حضرت سے ملنے کا بہت ہی اشتیاق رہتا تھا۔ہر ایک یوں چاہتا تھا کہ جلد سے جلد ملاقات ہو۔ایک دفعہ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ رائے پور سے تشریف لائے دہردودن جانا تھا۔میں نے عرض کیا کہ چچا جان کا والا نامہ بھی آیا ہے۔انھوں نے حضرت کا نظام سفر اور قیام پوچھا ہے فرمایا واہ واہ۔میرا بھی ملنے کو حضرت دہلوی سے بہت ہی دل چاہ رہا تھا۔آپ تکلیف فرما کر ان کو یہ لکھ دیں کہ فلاں دن تشریف لاویں۔چار دن کے وقفہ سے حضرت نے ان کا دن متعین کردیا۔میں نے کہا کہ میں تو نہیں لکھوں گا۔مولوی عبدالمنان لکھ دیں گے۔فرمایا کہ نہیں حضرت! آپ اتنی بدگمانی نہ کریں میں ضرور آؤں گا۔میں نے کہا کہ میں ہرگز نہیں لکھوں گا۔آخر مولوی عبدالمنان تو آپ کے کاتب ہیں۔فرمایا کہ نہیں حضرت ہی لکھیں گے میں نے عرض کیا کہ میں ہرگز نہیں لکھوں گا۔فرمانے لگے کہ حضرت ہی سے لکھواؤں گا اور آپ کو دکھلادوں گا۔کہ میں وعدہ پختہ کرنا بھی جانتا ہوں جب حضرت نے حکماً فرمایا تو میں نے لکھ دیا اور ساری بات بھی لکھ دی۔اتفاق کی بات کہ چچا جان بھی اس تاریخ کو نہ آسکے اور حضرت قدس سرہٗ بھی وعدہ کے دن سے تیسرے دن تشریف لائے اور آتے ہی دروازے سے مصافحہ سے پہلے فرمایا کہ حضرت آپ نے نہیں آنے دیا۔بالکل آپ نے نہیں آنے دیا۔ہوا یہ کہ سب ہی نے اصرار کیا اور میں نے کہا کہ مجھے اب کے حضرت کو اپنے وعدہ کا سچا ہونا بتلانا ہے۔سب ہی نے اصرار کیا خاص طور سے ڈاکٹر محمد امیر صاحب اور مستری صاحب نے تو بہت ہی زور لگائے۔مگر میں مانا نہیں۔لیکن چلنے کے بعد سے جو بارش شروع ہوئی لوگوں نے پھر بھی اصرار کیا مگر میں نے مانا

نہیں۔ لیکن بارش اتنے زور کی ہوئی کہ پانچ میل پر آ کر انجن فیل ہوگیا۔ نہ ادھر کے رہے اور نہ ادھر کے۔ بہت دیر ہوگئی مغرب کا وقت ہوگیا۔ مجبوراً یہاں سے جانے والی لاری میں بڑی مشکل سے میں اور دو آدمی سوار ہوئے اور بقیہ دوسری لاری میں واپس گئے۔ ایسا تصرف نہیں کیا کرتے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت توبہ توبہ بھلا میں تصرف حضرت پر کروں گا۔ اگر ہوگا تو ڈاکٹر صاحب کا ہوگا۔ حضرت قدس سرہٗ کی یہ بھی بہت ہی خواہش رہا کرتی تھی کہ میں اسفار میں حضرت کے ساتھ چلوں۔ شروع شروع میں بہت ہی اصرار فرمایا مگر مجھ پر اس زمانہ میں طالب علمی کا غلبۂ حال تھا اب وہ دور یاد آ کر بڑی ندامت ہوتی ہے کہ حضرت نے بڑی محبت شفقت اور اصرار سے ہمرکاب چلنے کا اصرار فرمایا اور میں نے حرج کا عذر کر دیا۔ اس کے باوجود حضرت کے ساتھ متعدد اسفار بھی ہوئے۔ ہر سفر میں اہم واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ ریل کا سفر ہوا۔ یہاں سے مرادآباد اور وہاں سے بریلی تشریف لے جانا ہوا۔ ہر جگہ حضرت قدس سرہٗ تو اس کی کوشش فرماتے کہ لوگوں کا اس سیہ کار سے زیادہ سے زیادہ تعارف ہو۔ حضرت تخلیہ میں تشریف لے جاتے اور میزبانوں سے کہتے کہ لوگوں کی ان سے ملاقات کراؤ۔ حضرت قدس سرہٗ کی بہت ہی کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ تعلق پیدا کریں اور مجھے اس قدر وحشت ہوتی کہ میں اپنی کوئی کتاب لے کر نقل کی یا تالیف کی دوسرے کمرے میں بیٹھ کر اندر کے کواڑ لگالیتا اللہ ہی معاف فرمادے۔ حضرت کی شفقت اب ندامت ہوتی ہے۔ حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کو ہمیشہ یہ شوق رہا کہ میرے بدن پر اچھا کپڑا دیکھیں بار بار اس کا اظہار بھی فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کو اچھے کپڑے پہنے ہوئے دیکھوں۔ مگر جیسا کہ یہ ناکارہ آپ بیتی نمبر ا میں لکھ چکا ہے کہ ابا جان کے ان جوتوں کی بدولت جو ابتداء عمر میں بجائے پاؤں کے سر پر پڑ چکے تھے۔ واقعی مجھے اچھے کپڑے سے نفرت ہوگئی۔ اس لیے حضرت جب کوئی اچھا کپڑا مرحمت فرماتے تو میں بچیوں یا دامادوں میں سے کسی کو دے دیتا۔ ایک مرتبہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے میری لاعلمی میں میرا ایک جوڑا حافظ صدیق سے منگایا جو میرے کپڑوں وغیرہ کے منتظم ہیں اور اس کے مطابق ایک بہت خوبصورت جوڑا سلوا کر بھیجا جس کو میں نے بہت ہی احترام سے پہنا۔ یہ میں پہلے لکھوا چکا ہوں کہ میری بچیوں کے سارے لحاف حضرت قدس سرہٗ کے عطاء فرمودہ ہیں دو لاکھ مرغوں کا قصہ یاد نہیں کہ پہلے لکھوایا یا نہیں وہ تو دوبارہ لکھوا رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں بھی میں اکثر مرغا یا مرغی آتی تو میں اپنے دوستوں میں سے کسی کو دے دیتا۔ حضرت کو بھی کسی طرح اس کا علم ہوگیا تو حضرت نور اللہ مرقدہٗ کا معمول یہ بن گیا تھا کہ جب کوئی مرغا لائے تو اس سے یہ فرمادیتے کہ سالم نہ دینا، مولوی نصیر کی ٹال میں ذبح کر کے پھر دینا۔ ان مرغوں کا قصہ یاد پڑتا ہے کہ کہیں پہلے لکھوا چکا ہوں۔

۴۵ھ کے سفرِ حج سے واپسی پر حضرت قدس سرہٗ بھی ساتھ تھے۔ تین چار اونٹ حضرت کے اور حضرت کے رفقاء کے اور تین چار ہی میرے اور میرے ساتھیوں کے۔ قافلہ تو سارا اکٹھا ہی رہتا۔ مگر مکہ مکرمہ سے جدہ آتے جاتے وقت حدیبیہ کی منزل میں رات کا وقت ہوگیا۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا۔ قافلے تو دونوں بالکل برابر، مگر اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ صبح کو آپس میں ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ حضرت کے خدام نے تو حضرت کے لیے دو چوزے خرید لیے تھے اور ہمارے رفقاء کو کچھ ملا نہیں، تو کھچڑی پکائی۔ حضرت کو یہ معلوم ہوا تو بہت ہی قلق ہوا اور اس گستاخ نے بھی تفریحاً یہ کہہ دیا کہ اکیلے اکیلے آپ نے یہ مزے اُڑائے۔ حضرت قدس سرہٗ نے ازراہِ شفقت فرمایا کہ جدہ جاکے اس کی قضا کروں گا میں نے کہا کہ حرم کی ایک نیکی ایک لاکھ کے برابر ہے۔ حضرت نے فرمایا انشاء اللہ ہندوستان جاکر دو لاکھ مرغیاں کھلانی ہیں۔ کراچی پہنچنے کے بعد حضرت نے انبالہ تک خدام کو خطوط لکھوائے۔ اس میں یہ بھی لکھوایا کہ میرا خیال تو راستہ میں تم دوستوں سے ملتے ہوئے جانے کا تھا۔ مگر چونکہ شیخ الحدیث صاحب ساتھ ہیں اس لیے اب تو سیدھے جانا ہے بعد میں آؤں گا۔ لیکن میرے ذمے حضرت شیخ کی دو لاکھ مرغیاں قرض ہیں۔ فلاں گاڑی سے فلاں اسٹیشن پہنچوں گا۔ ایک دو مرغیاں پکا کر لیتے آنا۔ کراچی سے سہارنپور تک ہر اسٹیشن پر چار پانچ بلکہ کہیں دس بارہ تک ملتی رہیں۔ اس کے بعد سے اس ناکارہ کی مرغ خوری نے ایسی شہرت پائی کہ گویا مرغا ہی میری غذا بن گیا۔

حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کے بہت سے واقعات پہلے بھی گزر چکے ہیں۔ چونکہ ترتیب تو ذہن میں نہ تھی اس لیے بہت سے قصے مکرر بھی ہوگئے۔ حضرت قدس سرہٗ کی بیماری اور انتقال حوادث کے ذیل میں گزر چکا ہے۔ بیماری کے زمانہ میں حضرت کا اصرار اور خواہش یہ رہتی تھی کہ یہ ناکارہ مستقل حضرت کی خدمت میں قیام کرے۔ یہ بھی درحقیقت اپنے شیخ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کا اتباع اور اثر تھا۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کو اپنے طویل مرض میں جو انتقال سے کئی سال پہلے شروع ہوگیا تھا بہت ہی خواہش اور اصرار تھا کہ میرے والد صاحب ہر وقت پاس رہیں، مگر ان کو اسباق وغیرہ کی مجبوری تھی، اسی کے اتباع میں حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی بھی یہی خواہش رہتی کہ یہ سیہ کار بیماری کے زمانے میں حضرت کے پاس رہے۔ بار بار تقاضے اور اصرار منصوری سے جب مرض کی ابتداء ہوئی تو تار اور آدمی بار بار پہنچے۔ مگر نابکار کو:

"خوئے بدرا بہانہ بسیار"

علاوہ مدرسہ کے اسباق کے اپنی تالیف کا مسئلہ بھی سدراہ ہوتا تھا۔ مگر اعذار میں بیان تو نہیں کرتا تھا۔ آخری سال رجب کا مہینہ اور مجھ پر بخاری شریف کے ختم کا بوجھ، میں نے اجازت چاہی۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ بخاری شریف تو پڑھاؤ گے، ہم کہاں رہیں گے۔ کیا کسوں خبر نہیں، اس وقت کچھ علمی غلو ایسا سوار تھا کہ حضرت کی ان شفقتوں کو اب دیکھ کر رونا آتا ہے۔ بارہا اس کی بھی نوبت آئی کہ میں بلا اطلاع حاضر ہوا اور حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے بلا کسی تحریک کے یہ فرمایا کہ بھائی شیخ آرہے ہوں گے خیال رکھنا۔ مجھے وہاں پہنچ کر یہ بات معلوم ہوتی تھی۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی اس آخری بیماری کے زمانے میں سواری منگانے کی پابندی چھوڑ دی تھی، اس لیے کہ کثرت سے حاضری ہوتی تھی اور حضرت کو علم ہو جانے پر حضرت پر کہیں سے کار مہیا کرنے کا بوجھ ہو جاتا تھا اور پٹری پر رکشہ کے لیے کوئی پابندی نہ تھی۔ بہٹ میں ایک نو عمر لڑکا تھا، رکشہ چلاتا تھا، نام اس وقت یاد نہیں۔ اللہ اس کو بہت ہی جزائے خیر دے، بہٹ پر میرا انتظار کرتا تھا۔ میں لاری سے اُترتے ہی رکشہ پر سوار ہو کر رائے پور بیس پچیس منٹ میں پہنچ جاتا تھا اور واپسی کے لیے اس کو وقت بتا دیتا۔ وہ بسا اوقات صبح کی اذان کے وقت سردی میں رکشہ لے کر جاتا تھا، جس پر مجھے بہت ہی ترس آتا تھا۔ واپسی میں حضرت کو کار کا بہت اہتمام تھا۔ اگر پاکستانی احباب میں سے کوئی موجود ہوتا تو حضرت سے زیادہ ان لوگوں کا اصرار ہوتا کہ ہم پہنچا کر آئیں گے۔

پاکستانی کاریں ماشاء اللہ کیا کہنا۔ بالخصوص بھائی اکرام کی کار میں کئی دفعہ مجھے یہ دیکھنا پڑا کہ یہ چل رہی ہے یا کھڑی ہے۔ ذرا حرکت معلوم نہ ہوتی تھی اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے حجرے سے لے کر کچے گھر کے دروازے تک صرف بائیس منٹ میں پہنچتی تھی۔ عزیزم الحاج ابوالحسن صدیقی اس وقت میرے پاس ہے جو بارہا اس قسم کی گاڑیوں میں میرے ساتھ آیا ہے اور عرصہ سے مستقل میرا رفیق سفر ہے۔ بالخصوص رائے پور کے سفر کا تو مستقل رفیق۔ وہ کہتا ہے کہ اس کار میں آٹومیٹک گیئر تھے، اس کو ہم سمجھتے نہیں وہی سمجھتا ہے، میں تو ان گاڑیوں کی ہمیشہ دواداؤں پر کہ حرکت بالکل نہیں اور بائیس منٹ میں اس دروازے سے اس دروازے تک پہنچنا حیرت میں رہتا تھا۔ وہ احباب ہمیشہ مجھے میرے دروازے پر اُتار کر اور جب ہی واپس جاتے اور وہاں کی چائے میں شریک ہو جاتے۔ پاکستان کے سفروں میں بھی ان کاروں سے بہت سابقہ پڑا۔ یہ داستان شروع ہو گئی، بات کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے۔

اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانے میں ہمیں پیسہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ مجال ہے کہ اعلیٰ حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کے خدام یا والد صاحب کے دوستوں میں سے مجھے کوئی پیسہ دے دے۔ ان کی اتنی پٹائی ہوتی تھی کہ اس کے ڈر کی وجہ سے پیسہ کی جنت سے پٹائی کی دوزخ سامنے آ جاتی تھی۔ اسی کا اثر تھا کہ مجھے اپنے والد رحمہ اللہ تعالیٰ صاحب کے انتقال کے بعد کسی شخص کا ہدیہ جو بزرگی کی لائن سے دیتا تھا اس سے اس قدر نفرت تھی کہ کوئی حد و حساب

نہیں۔ البتہ گھر کے رشتہ دار مستثنیٰ تھے۔ جن کے متعلق اپنے کسی رسالہ میں لکھوا بھی چکا ہوں کہ میرے والد صاحب کی حقیقی خالہ جب بھی میں کاندھلہ جاتا تو دو پیسے دیا کرتی تھیں اور جب کبھی ان کے پاس پیسے نہ ہوتے اور معذرت کرتیں تو میں ان کی خدمت میں ایک روپیہ پیش کرتا تھا اور اپنے دو پیسے لیا کرتا تھا مگر دوسری لائن سے پیسہ لینے سے مجھے اس قدر نفرت تھی کہ اللہ ہی مجھے معاف فرمائے۔ یااللہ، یارحمٰن، یارحیم تو محض اپنے فضل وکرم سے مجھے معاف فرما اور جن مخلصوں کو میری اس حرکت سے اذیت پہنچی ہوان کو اپنی شایان شان بہتر سے بہتر بدلہ عطاء فرما۔ بعض ہدیہ دینے والوں کے نوٹ ایک، دو، پانچ، دس کے پھاڑے بھی ہیں۔ جب میں انکار کرتا اور وہ اصرار کرتے تو اپنی حماقت سے نوٹ لے کر اس کو پھاڑ دیتا تھا۔ مگر قاعدہ یہ کہ ہر گناہ ابتداء میں بڑا گراں ہوتا ہے۔ مگر جب عادت پڑ جاتی ہے تو پھر آسان ہو جاتا ہے۔ بلکہ اب تو احساس بھی نہیں ہوتا۔

میرے مخلص دوستوں میں سے ایک دوست حاجی جان محمد صاحب پشاوری تھے جو آج کل پاکستان میں جاکر پاسپورٹ کی گڑبڑ کی وجہ سے وہیں پھنس گئے۔ وہ ابتداء میں بہت ہی ہدایا لایا کرتے تھے اور میری خوب لڑائیاں ہوتی تھیں۔ اس وقت جو قصہ لکھوانا چاہتا تھا اور یہ سب اسی کی تمہید تھی۔ وہ یہ کہ:

ایک مرتبہ میرے حضرت رائے پوری اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہما عصر کے بعد کچے گھر میں چبوترے پر تشریف فرما تھے اور میں اپنی چارپائی پر۔ مجمع اس وقت زائد نہیں آیا تھا، دو ایک آدمی آچکے تھے۔ حاجی جان محمد صاحب اللہ ان کو بہت ہی خوش رکھے اور ان کے احسانات کا بہت ہی بدلہ عطاء فرمائے۔ ایک چائے کا ڈبہ لائے۔ مجھ پر حماقت سوار ہوئی، میں نے اس کو پھاڑ کر زور سے دیوار پر دے مارا۔ وہ ساری چائے ڈور ڈور تک منتشر ہوگئی۔ میرے دونوں بزرگوں کو بہت ناگوار ہوا، جس کا مجھے بھی احساس ہوا، میرے حضرت اقدس رائے پوری تو بالکل ساکت وصامت دس پندرہ منٹ تک بیٹھے رہے۔ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے چار پانچ منٹ کے بعد ناگواری کے لہجے میں فرمایا کہ یوں ناک مار کر کھانا ہمیں نہیں آیا۔ حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کے ہدایا تو **لاتعد و لا تحصیٰ** شروع میں تو یہ کہہ کر انکار کرتا تھا کہ حضرت یہاں بھی خدام بہت ہیں۔ حضرت ان کو مرحمت فرمادیں۔ ایک مرتبہ ناگواری کے تیز لہجہ میں حضرت نے فرمایا کہ انکار نہ کیا کرو، میں خود نہیں دیتا۔ اس کے بعد سے نہ صرف حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی عطایا اور ہدایا میں ڈھیلا پن ہوا بلکہ اور دوسرے ہدایا میں بھی ڈھیلا پن ہوگیا۔

مشائخ سلوک کا بھی ایک مقولہ نظر سے بارہا گزرا کہ بے طلب کسی چیز کے آنے پر اگر کوئی انکار کرے تو طلب پر بھی نہیں ملتی۔ اس کو فضائل صدقات حصہ دوم فصل ششم کی حدیث نمبر۴ کے ذیل

میں آداب ہدیہ میں لکھ چکا ہوں۔ مگر اس کے ساتھ جب امام غزالی کے ارشادات سامنے آتے ہیں اور مشائخ کے ارشادات بھی کہ اشراف نفس نہ ہو، دینے والا مخلص ہو تو پھر ڈر لگنے لگتا ہے۔ حضرت اقدس رائے پوری کے واقعات تو اتنے اُونچے ہیں کہ مجھے لکھوانے سے بھی ڈر لگتا ہے۔

ایک دفعہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے رائے پور میں ارشاد فرمایا کہ میرا جی یوں چاہتا ہے کہ تو مجھے اجازت بیعت دے دے تا کہ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کی نسبت سے بھی مجھے کچھ مل جائے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر دست بوسی کے بعد عرض کیا کہ حضرت توبہ توبہ ایسی بات فرمائیں۔ حضرت مولانا احمد الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی بلند درجات عطاء فرمائے۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت یہ اجازت نہیں دیتے تو آپ ان کو اجازت دے دیں تا کہ ان کے سلسلے میں آپ کی شرکت ہو۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا میری طرف سے تو بڑی خوشی سے اجازت ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا احمد الدین صاحب کو بہت ہی بلند درجات عطاء فرمائے۔ بڑے ہی مخلص تھے۔ یہ سیہ کار پہلے لکھوا چکا ہے کہ جب حضرت مرشدی قدس سرہٗ نے اس ناکارہ کو اجازت مرحمت فرمائی تو حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ وہاں ہی موجود تھے۔ میں نے حضرت کے پاؤں پکڑے تھے کہ اللہ کے واسطے اظہار نہ فرمائیں اور یہ کوئی تصنع نہ تھا۔ اللہ کی قسم مجھے اب تک شرح صدر نہیں ہے کیونکہ میری حالت واقعی اس قابل نہیں ہے۔ مگر حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی جواب دہی کے ڈر سے اب تک بیعت کر رہا ہوں۔

میں نے ابتداء میں بہت انکار کیا مگر ایک مرتبہ کاندھلہ جانے پر وہاں کی مستورات چچا جان کے سر ہوگئیں کہ آپ حکماً اس سے بیعت کرادیں میں مسجد میں تھا اور چچا جان گھر میں تشریف فرما تھے مجھے آدمی بھیج کر بلایا یہ چچا جان کے حالات میں آئے گا کہ وہ بعض مرتبہ چچا جان ہونے کا حق ادا کرنے کے واسطے ضرورت سے زیادہ ڈانٹ دیتے تھے۔ جب میں گھر پہنچا تو چچا جان نے ایسا غصہ کا منہ بنا رکھا تھا، فرضی غصہ میں چہرہ لال تھا۔ مستورات کو سب کو کوٹھے میں جمع کر رکھا تھا اور اس کے برابر کی چارپائی خالی چھوڑ رکھی تھی اور خود دوسری چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنے سر مبارک پر سے عمامہ اتارا۔ اس کا ایک کونہ میرے ہاتھ میں پکڑایا اور دوسرا دروازے میں ان عورتوں کو پکڑا دیا اور نہایت غصہ میں فرمایا کہ ان کو بیعت کر میں نے کچھ اوں آں کرنی چاہی ایک ڈانٹ پلائی بیعت کر۔ یہ اس سیہ کار کی بیعت کرنے کی ابتدا ہے۔

یہ بیعت علی منہاج النبوۃ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بھی سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بیعت اسلام کی۔ حضرت اقدس قطب عالم مولانا گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے دستِ مبارک پر بھی گنگوہ میں سب سے پہلے ایک عورت اعلیٰ حضرت حاجی صاحب نور

اللہ مرقدہٗ کے حکم سے بیعت ہوئی تھی۔ حضرت اقدس مدظلہم کی نسبت بھی حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی نسبت کا عکس ہے کہ جملہ امور تصوف مع مشاغل علمیہ خدمت حدیث تعلیماً وتصنیفاً ظاہر باہر ہے۔

اس کے بعد حضرت اقدس مدنی اور حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہما سے بارہا اجازت چاہی اور بلا مبالغہ ایک سے زائد مرتبہ ہر ایک کی خوشامد کی ہوگی۔ کہ بیعت نہ کرنے کی اجازت دے دیں میرے حضرت اقدس مدنی کا ایک جواب تھا کہ اپنے کو اہل سمجھتا ہی کون ہے اور حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کا جواب اس سے زیادہ سخت ہوتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے پاکستان بہت ہی زوردار اور شدت سے لکھا کہ میری حالت بہت ہی ابتر اور خراب ہوتی جارہی ہے۔ حضرت بیعت نہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمادیں۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کا بہت ہی ڈانٹ کا خط آیا جو میرے خطوط کے خزانے میں محفوظ ہے۔ عزیز جلیل کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ حضرت نے لکھا تھا کہ اعلیٰ حضرت سہارنپوری نے آپ کو بیعت کرنے کی اجازت دی اور حضرت دہلوی (یعنی میرے چچا جان) نے حکماً آپ سے بیعت کی ابتدا کرائی۔ میں اور حضرت مدنی بار بار آپ سے تقاضہ کرتے رہتے ہیں۔ اب آپ کے اطمینان کے لیے حضرت جبرئیل علیہ السلام تو اترنے سے رہے۔ یا اللہ یا اللہ یا اللہ تو ہی ان بزرگوں کے حسنِ ظن کی لاج رکھئے یہ میں نے پہلے بھی لکھوایا کہ یہ واقعات مولوی یونس کی زبردستی سے لکھوادیے ورنہ حضرت اقدس رائے پوری کے ارشادات تو واقعی اتنے اونچے ہیں کہ میری نقل کرانے کی ہمت نہیں ہے۔

میرے والد ماجد صاحب نور اللہ مرقدہ:

مجھے ان سب اکابر کی نہ تو سوانح لکھنی ہے اور نہ ان چند اوراق میں یہ دریا نقل کیے جاسکتے ہیں۔ کچھ خصوصیات اپنے ساتھ کے تعلقات کی نمونۃً اشارہ کرنی تھی وہ بھی تحدیث بالنعمہ کے طور پر۔ میرے والد صاحب قدس سرہٗ پیدائش سے ہی بہت ذکی الحس تھے ان کے کچھ حالات تذکرۃ الخلیل میں بھی آچکے ہیں۔ میں نے ان کی زبانی بھی یہ روایت کئی مرتبہ سنی جو انہوں نے اپنی والدہ (میری دادی) سے نقل کی فرمایا کرتے تھے کہ میری والدہ کے دودھ نہ تھا اس لیے مجھے دایہ نے دودھ پلایا لیکن اگر روزانہ غسل کرکے اور خوشبو لگا کر دودھ نہ پلاتی تو میں دودھ نہ پیا کرتا تھا۔ دو برس کی عمر میں جب دودھ چھٹا تو اس وقت پاؤ پارہ حفظ تھا اور سات برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرچکے تھے۔ جس میں اپنی ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں۔ میری ابتدائی عمر میں میرے سب بڑوں کا دستور یہ تھا کہ کوئی شخص اپنے والدین یا اپنے کسی بڑے کے سامنے گود میں لینا تو درکنار اس کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا۔ انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا۔

میری پیدائش کے ساتویں دن وہ دوپہر کے وقت میں رمضان کا مہینہ سب سو رہے تھے میری

والدہ کی نانی کے مکان پر جہاں میں پیدا ہوا تھا تشریف لائے۔ میری والدہ کی نانی کو مجھ سے بہت ہی محبت تھی۔ انہوں نے میرے عقیقے کے لیے سنا ہے کہ بہت تیاریاں شروع کر دیں تھیں۔ سارے محلے اور برادری اور دور دور تک اقرباء کو دعوت دینے کا ارادہ تھا اور تاریخ مقرر کرنے کے مشورے ہو رہے تھے وہ ساتویں دن میری والدہ کی نانی کے مکان پر آئے، گھر میں ایک عورت تھی اس کو آواز دے کر فرمایا کہ ذرا بچے کو دروازے میں لے آ میری والدہ کی نانی نے خیال کیا کہ پدری محبت نے جوش کیا بچے کو دیکھنے کو جی چاہ رہا ہوگا۔ انہوں نے ایک نہالچے پر جس پر میں پڑا ہوا تھا عورت کے ہاتھ دروازے میں بھیج دیا۔ والد صاحب نائی کو ساتھ لائے تھے میرے بال کٹوا کر ان کو ایک پڑیا میں لپیٹ کر اس عورت کے ہاتھ گھر بھیج دیے کہ بال تو میں نے کٹوا دیے بکرے تم کٹوا دو اور ان بالوں کے بقدر چاندی صدقہ کر دو میری نانی کو بہت صدمہ ہوا کہ ساری امنگیں اور حوصلے خاک میں مل گئے۔ اس کے بعد میں آپ بیتی نمبر ۱ میں اپنی مار پٹائی کے قصے خوب لکھ چکا ہوں کہ اگر میرے مارتے مارتے تو مر جائے گا تو تُو شہید ہوگا اور مجھے ثواب ملے گا۔ بہت سے دیکھنے والوں کو اکثر یہ خیال آتا تھا کہ میں ان کا لڑکا نہیں بلکہ اپنی والدہ سے کسی پہلے خاوند کا ہوں۔ حالانکہ میری والدہ کا نکاح ابتداءً پہلا ہی میرے والد سے ہوا تھا۔ البتہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا پہلا نکاح میری حقیقی خالہ مرحومہ سے ہوا جو میری والدہ کی بڑی حقیقی بہن تھیں۔ ان کے بعد میری والدہ سے جلد ہی ہو گیا تھا۔

یہ تو مجھ سے بھی والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے کئی مرتبہ فرمایا کہ تیری خالہ کے انتقال کے بعد اس کے حسنِ صورت، حسنِ سیرت کی وجہ سے تیری والدہ کے لیے بہت ہی دعائیں کیں اور بڑی ہی کوششوں سے تیری والدہ سے نکاح ہوا اور اس کے بعد اولاد سے محبت تو فطری ہوتی ہے۔ مگر اس سیہ کار کے ساتھ ان کی محبت تادیب میں مستور ہو گئی تھی۔ یہ بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشاد پر عمل تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے "**ما نحل والد ولده من نحل افضل من ادب حسنٍ**" (كذا في المشكوٰة و عن الترمذی وغیرہ) یعنی کسی باپ نے اپنی اولاد کو حسن ادب سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دیا۔ دوسری حدیث میں ارشاد ہے "**لان يودب الرجل ولده خير له من ان يتصدق بصاع**" (كذافي المشكوٰة عن الترمذی) کوئی شخص اپنی اولاد کی تادیب کرے یہ اس سے اچھا ہے کہ ایک صاع (یعنی ۳½ سیر کھجور) صدقہ کرے۔ اس قسم کی روایات کی بنا پر ان کی نگاہ میں میری محبت میری تادیب تھی۔

اس وقت تو فطری طور پر بچپن کی وجہ سے ناگواری ہونی ہی چاہیے تھی مگر اب بہت دعائیں دیتا ہوں کہ ان کی سختی اور شدائد کی وجہ سے آدمیوں کی صورت میں ہوں ورنہ معلوم نہیں کن حالات میں

ذلیل وخوار پھرتا۔ان کے بہت سے حالات میری ابتدائی تعلیم وغیرہ کے ذیل میں گزر چکے ہیں۔ ان کی یہ بھی غایت شفقت تھی کہ مجھے دینیات یعنی فقہ وحدیث اپنے اور حضرت قدس سرہٗ کے علاوہ کسی سے نہ پڑھنے دیں اور بار بار فرمایا کرتے تھے کہ تو گستاخ بے ادب ہے اگر کسی اُستاد کی بے ادبی کی تو وہ فن جاتا رہتا ہے میں نہیں چاہتا کہ تیرا فقہ وحدیث ضائع ہو۔کوئی دوسرا فن ضائع ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔

میں حضرت مدنی کے حال میں لکھ چکا ہوں کہ میں نے اپنے اکابر میں بہت بے تابی سے رونے والا حضرت مدنی قدس سرہٗ اور اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو دیکھا۔قرآن شریف پڑھنے کا بہت ہی کثرت سے معمول تھا۔خالی اوقات میں بہت کثرت سے حفظ قرآن شریف پڑھتے رہتے تھے اور اخیر شب میں جہر و بکا کے ساتھ ان کو اس کا بہت ہی اہتمام تھا کہ اس سیہ کار کا کوئی وقت ضائع نہ ہو۔اسی کا یہ اثر تھا کہ اللہ کے فضل سے اور ان کی توجہ سے یہ چیز معتاد بن گئی۔اپنے شاگردوں کے لیے اور بالخصوص اس ناکارہ کے لیے نظام الاوقات لکھوانے کا بڑا اہتمام تھا۔ہر موسم میں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ اپنا نظام الاوقات بنا کر مجھے دکھلاؤ۔ان کا ہر کتاب کے ختم پر شیرینی کے پیسے دینے کا معمول اپنے تعلیمی سلسلے میں لکھوا چکا ہوں اور ساتھ ہی اس کی نگرانی بھی کہ میں اپنی رائے سے ان کو خرچ نہ کرسکوں۔وہ چونکہ بہت ہی باکمال تھے۔فقہ وحدیث از براور علم ادب تو ان کے یہاں قاعدہ بغدادی کی حیثیت رکھتا تھا۔اب یہ ناکارہ و نابکار تو اب تک بھی کسی چیز میں ان کا اتباع نہ کرسکا۔

اس لیے کئی دفعہ فرمایا کہ ایک مولانا تھے۔مجھ جیسے علامہ ان کا ایک لڑکا تھا نالائق تجھ جیسا۔جب ان کا انتقال ہونے لگا تو لڑکے کو بلا کر یوں فرمایا کہ نالائق تو نے کچھ نہ کیا۔باپ کے مرید وشاگرد ہر طرف سے تیرے پاس آ کر کہیں گے کہ حضرت صاحبزادے فلاں بات کیوں کر ہے تو یہ کہہ دیجیے کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے بات بنی رہے گی۔ان کا یہ ارشاد تو میرے سر ایسا پڑا کہ سن چالیس ہجری سے حدیث پاک کے اسباق ہونے شروع ہوئے تھے اور مجھے اختلاف مذاہب کا کچھ ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ ہر مسئلہ میں فلاں امام کا یہ مذہب ہے فلاں کا یہ ہے۔ایسا زبان پر چڑھ گیا تھا۔اس کو میں اپنے رسالہ الاعتدال میں بھی کچھ تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔مشکوٰۃ شریف پڑھانے کے زمانے میں نماز کی چار رکعت کے اختلاف ایک رسالہ میں لکھے تھے جو میری تالیفات کے ذیل میں گزر بھی چکا۔اس وقت نماز کی چار رکعت میں دوسو سے زائد مسئلہ مختلف فیہ ملے تھے اور اس کے بعد علماء کا آپس کا اختلاف میری نگاہ میں ایسا ہلکا بن گیا کہ موجودہ زمانے میں جب علماء میں کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا ہے اور لوگ اس کو بہت اہمیت دیتے ہیں تو مجھے اس اہمیت دینے سے کلفت

ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں بھائی مسلوں میں اختلاف ہوا ہی کرتا ہے۔ تمہیں جن پر اعتقاد ہو اس کے قول پر عمل کرلو۔ اس میں لڑائی، مناظرہ، مجادلہ کی کیا ضرورت ہے۔

والد ماجد اور میرے حضرت کے بعض مسائل میں اختلاف:

میرے والد صاحب قدس سرہٗ اور میرے حضرت قدس سرہٗ کے درمیان میں متعدد مسائل میں اختلاف تھا۔ مگر چونکہ مجادلہ اور مخالفت نہیں تھی اس لیے عوام تو عوام خواص کو بھی اس کی ہوا نہیں لگتی تھی۔ ان میں سے ایک مسئلہ مثال کے طور پر لکھتا ہوں۔ قربانی کے جانور میں دو تین شرکاء اگر ایک حصہ مشترک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کرنا چاہیں بشرطیکہ خود ان کے حصے اپنے بھی اس جانور میں ہوں۔ یہ صورت میرے والد صاحب کے نزدیک جائز تھی اور میرے حضرت کے نزدیک ناجائز۔ میرے والد صاحب اُوپر رہتے تھے اور حضرت قدس سرہٗ کا قیام نیچے رہتا تھا۔ قربانی کے زمانہ میں متعدد لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ مسئلہ حضرت کے پاس پوچھنے آتے تو میرے حضرت یوں فرمادیا کرتے تھے کہ میرے نزدیک تو ناجائز ہے مولانا یحییٰ صاحب کے نزدیک جائز ہے۔ تو اُوپر جاکر ان سے مسئلہ پوچھ لے وہ تجھے اجازت دے دیں گے۔ تو اس پر عمل کرلینا۔ اس کے بعد میرے نزدیک یہ صورت جائز ہے اور ہمارے مدرسہ کے مفتی سابق (مفتی سعید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) اور سابق ناظم عبداللطیف صاحب قدس سرہٗ حضرت قدس سرہٗ کے مسلک کے مطابق ناجائز بتاتے تھے اور ہر ایک کا فتویٰ ایک دوسرے کو معلوم تھا میں نے ان دونوں حضرات سے گفتگو بھی کی انہوں نے میری نہیں مانی۔ میں نے ان کی نہیں مانی۔ مگر نہ کبھی اشتہار بازی ہوئی نہ جنگ وجدل ہوا۔

حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کے تابوت کے مسئلہ میں مَیں نے لوگوں سے ہمیشہ یہی کہا کہ اس میں جنگ وجدل اور منازعت کی کوئی بات نہیں ہے۔ نہ مناظرے اور مباحثے کی نہ اشتہار بازی کی جیسا کہ ہمیشہ مسائل میں اختلاف ہوتا آیا۔ اس مسئلے میں بھی اختلاف ہے اس میں منازعت کی کیا بات ہے اور لڑائی جھگڑے کی کیا ضرورت ہے۔ متانت سے افہام وتفہیم میں کوئی مضائقہ نہیں کسی ایک فریق کی سمجھ میں نہ آئے تو اس پر لعن طعن سب وشتم بے جا ہے اور یہ ناکارہ تو اس میں اتنا وسیع ہے کہ مسلم لیگ، کانگریس، جمعیۃ، احرار کے مسائل مختلف فیہا میں کبھی کسی سے نہ اُلجھا اور نہ کبھی کسی سے لڑا۔ ایک لطیفہ اس وقت یاد آ گیا۔

مسلم لیگ کانگریس کے دور میں بھی یعنی تقسیم سے پہلے میرے حضرت مدنی شیخ الاسلام قدس سرہٗ تو کانگریس کی حمایت میں جتنے زوروں پر تھے کبھی کو آج معلوم ہے اور اس کے مقابل حضرت تھانوی قدس سرہٗ اس کی مخالفت اور حضرت کے اتباع میں مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی شیخ الاسلام پاکستان مسلم لیگ کی حمایت میں حضرت مدنی سے کم نہیں تھے۔ ممبروں پر، جلسوں میں،

اشتہارات میں ایک دوسرے کی تردید دونوں طرف سے جتنی شدت سے ہوتی تھی وہ ابھی تک سبھی کو معلوم ہے اور مقدر سے دونوں اکابر میرے مہمان ہوا کرتے تھے۔ لیکن مولانا ظفر احمد صاحب کی تشریف آوری ہوتی تھی تو دو تین دن قیام ہوتا تھا اور حضرت مدنی کے حالات میں گزر چکا ہے کہ حضرت کی تشریف آوری منٹوں اور گھنٹوں کی ہوا کرتی تھی۔

ایک مرتبہ اسی دور میں مولانا ظفر احمد صاحب زادمجد ہم ودام ظلہم تشریف فرما تھے دو تین دن سے آئے ہوئے تھے۔ مدرسہ میں قیام تھا میرے مہمان تھے۔ میں دارالطلبہ گیا ہوا تھا۔ ایک لڑکے نے مجھے جا کر اطلاع دی کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ آئے ہیں، کچے گھر میں ہیں۔ میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی اور اب تک بھی جب اس منظر کا مجھے خیال جاتا ہے اور اپنی اس وقت کی پریشانی یاد آتی ہے تو دھڑ دھڑی سی آجاتی ہے۔ میں دارالطلبہ سے بہت تیزی کے ساتھ مدرسہ قدیم آیا اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب زادمجد ہم سے درخواست کی کہ حضرت مدنی تشریف لے آئے، مکان پر ہیں۔ حضرت کا قیام گھنٹہ آدھ گھنٹہ سے زیادہ نہیں ہوگا آپ ابھی تکلیف نہ فرمائیں، کھانے کے بعد حضرت کی تشریف بری کے بعد میں آپ کو بلالوں گا۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے اللہ ان کو بہت ہی درجے عطاء فرمائے یہ فرمایا کہ کیوں؟ میری حاضری سے کیا نقصان ہوگا، میں ابھی آؤں گا۔ میں نے بڑی خوشامد ومنت کی کہ اللہ کے واسطے ہرگز کرم نہ فرمائیں، مگر جتنا میں نے خوشامد کی اتنا ہی انہوں نے اصرار کیا کہ نہیں ابھی آؤں گا۔ میں نے کہا حضرت میرے بڑے ہیں وہ کچھ ارشاد فرمائیں گے تو میں بالکل جواب نہیں دوں گا۔ ان سے مایوس ہو کر میں کچے گھر میں حاضر ہوا اور حضرت مدنی قدس سرہٗ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب کئی دن سے آئے ہوئے ہیں اور میرے مہمان ہیں۔ میں ان سے کہہ آیا ہوں کہ ابھی آپ نہ آئیں، حضرت کی تشریف بری کے بعد آپ کو بلالوں گا۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کیوں؟ میں ان سے کیا چھین لوں گا یا وہ مجھ سے کیا چھین لیں گے۔

میری یہ گفتگو حضرت سے ہو رہی تھی کہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب کچے گھر میں پہنچ گئے۔ حضرت ان کو دیکھ کر بہت ہی مسرت سے اُٹھ کھڑے ہو کر مصافحہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اچھا یہ ابوالدیک صاحب بھی یہاں تشریف فرما ہیں۔ اس کی شرح یہ ہے کہ جب عزیز مولوی عمر احمد ابن مولانا ظفر احمد پیدا ہوئے تو ان کی تاریخ ولادت مرغ محمد تجویز کی گئی تھی۔ اس وقت سے حضرت مدنی قدس سرہٗ نے تفریحاً مولانا ظفر احمد صاحب کی کنیت ابوالدیک تجویز کر رکھی تھی اور اکثر ملاقات پر اسی لفظ سے مخاطبت ہوتی تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے دست بوسی کی اور میں پھر بھی ڈرتا ہی رہا اور یارب سلم سلم پڑھتا رہا۔ جلدی سے دسترخوان بچھایا دونوں اکابر نے آمنے سامنے

بیٹھ کر کھانا نوش فرمایا۔طرفین سے خیریت اہل وعیال کے حالات وغیرہ امور ہوتے رہے۔تقریباً پون گھنٹے بعد حضرت مدنی قدس سرہٗ تشریف لے گئے اور میری جان میں جان آئی۔کوئی سیاسی لفظ اس مجلس میں نہیں آیا۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے ارشاد فرمایا کہ مٹھائی کھلاؤ۔میں نے کہا ضرور مگر آپ سے زیادہ حضرت شیخ الاسلام ہیں۔مجھے یہ فکر تھی کہ اگر ایک ڈانٹ پڑ گئی تو کیا ہوگا۔مولانا نے فرمایا کہ میں تو پہلے کہہ چکا تھا کہ مولانا اگر ڈانٹیں گے تو کچھ نہیں بولوں گا۔مجھے مولانا کی بڑائی یا علو شان سے انکار نہیں،مولانا کو ہر طرح اپنا بڑا سمجھتا ہوں،لیکن کیا کریں،ہم دیانۃً کانگریس کو مسلمانوں کے حق میں نہایت ہی مضر سمجھتے ہیں۔اس لیے اخبارات،اشتہارات اور منبروں کی تقریر میں تردید پر مجبور ہیں۔یہ تو ہولیا،اب اس کا تکملہ سنو۔

ابھی دو تین سال کی بات ہے جب جمعیۃ اور مشاورت میں خوب چل رہی تھی۔مولانا منظور صاحب نعمانی میرے مہمان تھے اور رات سے تشریف لائے ہوئے تھے۔انہوں نے مجھ سے تخلیہ کا وقت مانگ رکھا تھا اور میں نے ان کے لیے ظہر کے بعد کا وقت تجویز کر رکھا تھا۔میں ظہر کے فرض مسجد میں پڑھ رہا تھا۔سلام پھیرتے ہی چپکے سے داہنی ایک لڑکے نے کان میں کہا کہ مولانا اسعد صاحب تشریف لائے ہیں اور کچے گھر میں ہیں۔پھر دوسری طرف سے ایک شخص نے بائیں کان میں کہا کہ مولانا اسعد تشریف لے آئے اور کچے گھر میں ہیں۔میں نے ان سے کہا ''اُونٹ پہاڑ کے نیچے سے نکل چکا'' بھاگ جاؤ۔

اطمینان سے سنتیں پڑھ کر میں نے مولانا محمد منظور صاحب مدفیوضہم سے اُوپر مہمان خانہ میں کہلوایا کہ عزیز مولانا اسعد صاحب سلمہٗ آگئے اور ان کا قیام اپنے والد صاحب قدس سرہٗ کے طریق پر گھنٹے آدھ گھنٹہ کا ہوگا۔اس کے بعد آپ کو بلائیں گے۔اس کے بعد میں نے کچے گھر میں آکر عزیز مولانا اسعد سلمہٗ سے کہا کہ کوئی تخلیہ کی بات ہو تب تو خیر ورنہ مولانا منظور صاحب کو میں نے یہ وقت دے رکھا ہے۔ان کو بھی بلالوں مہمان خانہ میں ہیں۔عزیز موصوف نے کہا مجھے تو دس منٹ تخلیہ کے چاہئیں۔میں نے سب کو اٹھا دیا اور عزیز موصوف سے تخلیہ کے بعد ان کے رفقاء کو اپنے رفقاء کو اور مولانا منظور صاحب کو بھی مہمان خانہ سے بلایا اور ان کی آمد کے بعد میں نے دونوں کو سنایا کہ ظہر کی نماز کے بعد ایک دم میرے اُوپر یورش ہوگئی کہ حضرت مولانا اسعد صاحب تشریف لے آئے۔میں نے ان سے کہا کہ اُونٹ پہاڑ کے نیچے سے نکل چکا بھاگ جاؤ اور پھر اس جملہ کی شرح میں حضرت مدنی قدس سرہٗ اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب زادمجدہم کا قصہ سنایا اور اب بیک وقت مختلف الالوان کے جمع ہونے پر کچھ زیادہ فکر نہیں ہوتا اس لیے کہ اب میرے

دوست ہی رہ گئے اکابر تو تشریف لے گئے۔ اللہ میرے سب اکابر کو بہت ہی بلند درجے عطاء فرمادے بہت ہی خوبیوں کے مالک تھے۔ اس کے بعد ایک دو موقعہ پر مختلف الالوان عناصر کے اجتماع پر جب نزاعی گفتگو شروع ہوئی تو میں نے دونوں سے عرض کر دیا کہ حضرت جی مرغے تو باہر جا کر لڑیں کھانا کھانا ہو تو کھائیں۔ ورنہ اللہ حافظ۔ مجھے مسائل خلافیہ میں جنگ و جدول اور نزاع سے بہت نفرت ہے اور اختلاف علماء کو رحمت سمجھتا ہوں۔ اپنے رسالہ الاعتدال میں اس کو تفصیل سے لکھوا چکا ہوں۔ اس وقت تو اپنے والد صاحب کے مختصر احوال لکھوانے تھے۔

میں تعلیم کے سلسلہ میں لکھ چکا ہوں کہ مجھے اور میرے رفیق مولوی حسن احمد کو والد صاحب والے دورے میں اس کا بہت ہی اہتمام تھا کہ نہ کوئی حدیث اُستاد کے سامنے چھوٹے اور نہ بے وضو پڑھی جائے۔ ایک دفعہ میرا ساتھی مولوی حسن احمد مرحوم وضو کے واسطے اُٹھا اور حسب معمول میرے کہنی ماری۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت فتح القدیر میں یوں لکھا ہے۔ ابا جان بہت ہنسے اور فرمایا کہ میں تمہاری فتح القدیر سے کہاں لڑوں گا۔ تم کو ایک کہانی سنا دوں۔ ان کا معمول اسباق میں عبرت کے قصے سنانے کا تھا اور خوب سنایا کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ کبھی کبھی سبق میں رو دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد ہمیشہ مستقل ایک معمول ہو گیا تھا کہ جب ہم میں سے کوئی ایک اٹھتا، ابا جان کوئی قصہ شروع کر دیتے۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو طلب علم کے زمانے میں علمی شغف بہت تھا۔ ایک زمانے میں ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ ان کی آنکھوں میں نزول آب ہونے کو ہے۔ کتاب کم دیکھا کریں بالخصوص رات کو کتب بینی نہ کریں۔ یوں فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کئی ماہ تک اس قدر محنت اور کتب بینی کی اس خیال سے کہ پھر تو یہ آنکھیں جاتی رہیں گی جو کچھ دیکھنا ہوا بھی دیکھ لیں۔ میرے والد صاحب نظام الدین میں رہتے تھے اور مدرسہ حسین بخش میں پڑھتے تھے۔ یوں فرمایا کرتے تھے کہ صبح کی نماز کے بعد مدرسہ پڑھنے آتا تھا اور دوپہر کو فراغت کے بعد نظام الدین جاتا اور ظہر کے بعد پھر آ کر عصر کے بعد واپس آتا۔ تقریباً یہ راستہ ساڑھے تین میل ہے۔ چودہ میل تقریباً روزانہ ہو گئے۔

میرے والد صاحب کی تعلیم بمدرسہ حسین بخش:

اس قصہ کو بہت اہمیت کے ساتھ کتب احادیث کی مواقیت صلوٰۃ میں بیان فرمایا کرتے تھے، جس میں صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ ہم عصر کی نماز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھ کر اپنے گھر مغرب سے پہلے پہنچ جاتے تھے۔ یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں ہمیشہ نظام الدین سے مدرسہ حسین بخش پینتیس (۳۵) منٹ میں پہنچتا تھا۔ کبھی کبھی اس سے ایک دو منٹ کم تو ہوتے مگر زیادہ

نہیں۔ مجھے تو کبھی اس کے اندر استبعاد نہیں ہوا، اس لیے کہ یہ ناکارہ خود اپنے شباب کے زمانے میں رائے پور کی پٹری جو ساڑھے تین میل ہے تیس پینتیس منٹ کے درمیان میں پہنچا ہوں۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اکثر کتب مدرسہ حسین بخش میں پڑھیں، مگر وہاں حدیث پڑھنے سے انکار فرمادیا۔

بڑا عجیب قصہ ہے، اگر چہ میری ذات سے اس کا تعلق نہیں ہے مگر میرے والد صاحب کے کمالات سے ضرور ہے۔ یہ قصہ تذکرۃ الخلیل میں بھی آچکا ہے۔ یہ فرمایا کرتے تھے کہ دہلی میں حدیث پڑھنے سے آدمی غیر مقلد ہو جاتا ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میرے بھائی مولوی محمد صاحب نے چونکہ حدیث پاک گنگوہ میں پڑھی تھی، اس لیے میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا بہت معتقد ہو گیا تھا اور طے کرلیا تھا کہ اگر حدیث پڑھوں گا تو حضرت سے ورنہ نہیں پڑھوں گا اور اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ امراض کی کثرت اور بہت سے عوارض کی وجہ سے کئی سال پہلے سے حدیث کے اسباق بند فرما چکے تھے۔ مدرسہ حسین بخش والوں کی خواہش اور اصرار تھا کہ میرے والد صاحب حدیث ان کے مدرسہ میں پڑھیں کہ اس میں میرے دادا صاحب کی وجہ سے ان کے مدرسہ کی شہرت اور مقبولیت تھی۔ میرے والد صاحب کے شدید انکار پر انہوں نے میرے دادا صاحب پر اصرار کیا کہ مولوی یحییٰ کم از کم بخاری شریف کے امتحان میں شریک ہو جائیں۔ اس کو میرے والد صاحب نے قبول فرمالیا۔

نظام الدین کا مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا حجرہ جو مسجد کی دائیں جانب ہے۔ اب تو وہ شاندار ہوگیا۔ اس وقت میں وہ بہت بوسیدہ تھا اور چھت بھی بہت نیچی تھی۔ مسجد کی طرف کا دروازہ تو اسی طرح تھا جیسا اب ہے لیکن جس جگہ آج کل زنانے مکان کی کھڑکی ہے وہاں بجائے کھڑکی کے ایک مختصر دروازہ قدِ آدم تھا اور زنانے مکان کی جگہ کیکر اور خودرو درخت اتنی کثرت سے اور گنجان خاردار کھڑے ہوئے تھے کہ وہاں چلنا بھی بہت دشوار تھا۔ میں نے بھی اس کی یہ حالت دیکھی ہے۔ اس جگہ ایک رَو بھی بہتی تھی۔

والد صاحب کا طرزِ تعلیم:

جس میں گندا پانی بہتا تھا اور مچھروں کی بھی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس منظر کو میں نے بھی دیکھا ہے۔ میرے والد صاحب شب و روز اس حجرے کے اندر رہتے تھے۔ میرے دادا کے شاگردوں میں دو ایک لڑکے تھے جن کے ذمے یہ تھا کہ ہر اذان پر دو لوٹوں میں پانی بھر کر اس جنگل والے دروازے کی طرف پہنچادیں اور دونوں وقت کھانا بھی اسی دروازے پر جا کر ان کے پاس رکھوادیں۔ وہ

فرماتے تھے کہ میں سنتوں اور نماز سے فارغ ہو کر اپنی کتاب دیکھنے میں مصروف ہو جاتا تھا اور نماز کی تکبیر پر مسجد کا دروازہ کھول کر جماعت میں شریک ہو جاتا اور نماز کا سلام پھیرتے ہی اندر آکر سنتیں پڑھتا۔ اسی دوران میں کاندھلہ سے میری شادی کے سلسلہ میں میری طلبی کا تار پہنچا تو اس کو نظام الدین والوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ وہ کئی ماہ سے یہاں نہیں ہے۔ غالباً میرے دادا صاحب کاندھلہ ہوں گے۔ انہوں نے ہی یہ تار دیا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے پانچ چھ ماہ میں بخاری شریف، سیرت ابن ہشام، طحاوی، ہدایہ، فتح القدیر بالاستیعاب اس اہتمام سے دیکھیں کہ مجھے خود حیرت ہے۔ ممتحنین میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جن کے پاس بخاری شریف کا امتحان تھا اور حضرت شیخ الہند جن کے پاس ترمذی شریف کا تھا اور حضرت مولانا احمد حسن صاحب ودیگر اکابر کے پاس دوسری کتب کا۔

کھانے کی مجلس میں میرے دادا صاحب اور یہ سب حضرات شریک تھے، تو حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ نے میرے دادا صاحب سے فرمایا کہ آپ کے لڑکے نے ایسے جوابات لکھے ہیں کہ اچھے مدرس بھی نہیں لکھ سکتے اور اسی امتحان کی بناء پر حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے سفارش فرمائی تھی کہ حضرت نے اعذار کی وجہ سے سبق بند کر دیے، مگر ایک سال دورہ میری درخواست پر اور پڑھادیں کہ مولانا اسمٰعیل صاحب کاندھلوی ثم الدہلوی کے لڑکے مولوی یحییٰ کا میں نے امتحان لیا ہے۔ ایسا ذہین طالب علم بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ اعلیٰ حضرت قطب عالم گنگوہی قدس سرہٗ پہلے سے بھی میرے والد صاحب کا اصرار اور شرط سن رہے تھے اور میرے دادا صاحب سے واقفیت بھی تھی۔ اس پر حضرت نے یکم ذیقعدہ ۱۱ھ کو ترمذی شریف شروع فرمائی، جو بہت ہی آہستہ اور تھوڑی دیر ہوا کرتی تھی اور ذی الحجہ ۱۲ھ میں ایک سال کے اندر ترمذی شریف ختم ہوئی۔ اس کے بعد بخاری شریف شروع ہوئی جس کی تفصیل میں لامع کے مقدمہ میں لکھوا چکا ہوں چونکہ میرے والد صاحب کا یہ اہتمام تھا کہ کوئی حدیث استاذ کے سامنے پڑھنے سے نہ چھٹے۔

ایک موقع پر اعلیٰ حضرت کے اصرار پر والد صاحب کاندھلہ تشریف لے گئے اور اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے ان کی غیبت میں سبق نہ پڑھانے کا وعدہ فرمالیا۔ جب واپس تشریف لائے تو قاری ایک ولایتی تھے۔ انہوں نے ایک باب چھوڑ کر اگلے باب سے سبق شروع کیا۔ میرے والد صاحب اور دوسرے شرکاء نے ٹوکا کہ ایک باب اس سے پہلا باقی ہے۔ چونکہ وہ ولایتی تھی زور میں نہ مانے۔

چند ماہ بعد میری دادی صاحبہ کے اصرار پر حضرت قدس سرہٗ نے میرے والد صاحب کو کاندھلہ جانے کو ارشاد فرمایا۔ والد صاحب نے عرض کیا کہ مجھے پہلے ہی روانگی کا قلق ہے کہ میرا ایک باب چھوٹ گیا۔ حضرت نے فرمایا کل کو وہی باب ہوگا اور سبق میں بیٹھتے ہی اعلیٰ حضرت نے دریافت

فرمایا کہ مولوی یحییٰ تمہارا کون سا باب چھوٹ گیا اور حضرت نے سب سے پہلے وہی باب پڑھایا۔ اتفاق سے قاری اس دن بھی وہی ولایتی تھے۔ اس باب کے ختم پر ان کے منہ سے یہ نکل گیا کہ کوئی اور باب چھوٹ گیا ہوتو وہ بھی پڑھوالو۔ اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کو غصہ آ گیا اور غصہ میں فرمایا چلوتو تو باؤلا ہے۔ چند ہی روز بعد یہ طالب باؤلا ہو گیا۔

اس زمانے میں کوے کا مسئلہ بھی زوروں پر تھا۔ یہ طالبِ علم ایک بانس کے اُوپر کوے کو باندھ کر سارے دن گنگوہ کی گلیوں میں یہ اعلان کرتا پھرتا کہ یہ کوا حلال ہے۔ ''اللّٰهم انا نعوذ بک من غضبک و غضب رسولک و غضب اولیائک'' یہی وہ بات ہے جس کو پہلے بھی لکھوا چکا ہوں کہ اللہ والوں سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کے غصے سے محفوظ رکھے۔ میں نے بھی کوکب الدری میں اس باب کو اسی جگہ پر رہنے دیا جس جگہ حضرت نے پڑھایا تھا، اپنی جگہ پر منتقل نہیں کیا اور اس کے حاشیہ میں اسی قصہ کی طرف اشارہ ہے۔

ایک عجیب واقعہ یاد آ گیا کہ میں پہلے بھی کسی جگہ لکھوا چکا ہوں کہ میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد دن یا رات میں جب بھی سوتا تھا، والد صاحب کو خواب میں دیکھتا تھا۔ ایک واقعہ اسی زمانے میں یہ پیش آیا۔ میں اُوپر رہا کرتا تھا اور زینے کے اُوپر کے کواڑ لگا لیا کرتا تھا جو نہایت معمولی اور کمزور تھے۔ تین مہینے انتقال کو گزرے ہوں گے۔ ایک رات کو آواز سنائی دی، معلوم نہیں کس کی تھی، مگر مشابہ والد صاحب کی آواز کے تھی۔ زور سے کسی شخص نے کہا کہ نیچے کے کواڑ کیوں نہیں لگتے؟ اور اس آواز سے سب گھر کے بڑے سوتے ہوئے جاگ اُٹھے۔ ہم کو آج تک پتہ نہ چل سکا کہ کس کی آواز ہے۔ والد صاحب کی آواز کے بہت مشابہ ہے۔

اس سیہ کار نے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانے میں ایک خواب دیکھا تھا کہ کتابوں کا ایک ڈھیر ہے، مسجد کے مینارے کی طرح سے، میں اس خواب کے بعد بہت ہی ڈر گیا، بڑی بے ادبی سمجھی۔ میرے والد نے یہ تعبیر دی کہ انشاء اللہ کتابوں پر عبور ہوگا۔ تعبیر تو بالکل صحیح ہوئی اور اللہ کے لطف واحسان سے ہزاروں سے متجاوز کتابوں پر عبور ہوا۔ مگر عزیزم مولوی یونس سلمہٗ یوں کہتے ہیں کہ تو نے ایک عرصہ ہوا یہ نقل کیا تھا کہ والد صاحب نے اولاً تو فرمایا کہ تو بہت بڑا گستاخ ہے اور پھر تعبیر دی۔ میرے بچپن میں جب میری عمر پانچ چھ سال کی تھی۔ میرے والد صاحب کے ایک محبوب شاگرد نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص نے ان کو چاول دیے اور میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ میرے والد صاحب نے اس وقت یہ تعبیر دی تھی کہ اس بچے کو ''ثبات فی الدین'' نصیب ہوگا اور بعد میں معلوم ہوا کہ حدیث میں بھی اس کی تعبیر یہی ہے۔

میں بارہا مختلف تحریرات میں لکھوا چکا ہوں کہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس کا بہت فکر

سوار رہتا تھا کہ میرے اُوپر کہیں صاحبزادگی کا گھمنڈ نہ سوار ہو جائے۔ ان کا مشہور مقولہ تھا۔ جس کو انہوں نے سینکڑوں دفعہ کہا ہوگا کہ صاحبزادگی کا سور بڑی مشکل سے نکلتا ہے۔ اس لیے وہ بسا اوقات بڑے مجمع میں بے وجہ بھی مجھ کو ڈانٹ دیا کرتے تھے، اور بعض دفعہ خود فرما بھی دیا کرتے تھے کہ بات تو کچھ ایسی نہیں تھی مگر مجھے یہ خیال ہوا کہ تیرے اُوپر صاحبزادگی کا سور نہ سوار ہو جائے۔ ایک دفعہ انبالہ سے کلکتہ میل پر واپسی ہو رہی تھی یہ ناکارہ بھی ابا جان کے ساتھ تھا۔ اس کی تیز رفتاری پر متوجہ فرما کر یوں فرمایا کہ دیکھ سفر اس طرح قطع ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ شعر پڑھا، جو اکثر مجھے سنا کر پڑھا کرتے تھے:

ترا ہر سانس نخل موسوی ہے
یہ جز رو مد جواہر کی لڑی ہے

ان واقعات میں کوئی ترتیب تو ہے نہیں۔ نہ مسلسل لکھوانے کی نوبت آ رہی ہے۔ ''کیف ما اتفق'' جب وقت ملتا ہے اکابر میں سے جن کے حالات ہوتے ہیں جو یاد آ جاتا ہے لکھوا دیتا ہوں۔ اسی وجہ سے اکابر کے حالات میں سے بہت سے واقعات مکرر بھی آ گئے ہیں۔ یہ میں ''اکمال الشیم'' کے مقدمہ میں لکھوا چکا ہوں کہ ان کا طرزِ تعلیم بالکل علیحدہ تھا اور طرز تربیت تو اس سیہ کار کے ساتھ تو بڑا ہی سخت تھا۔ دس سال کی عمر سے یعنی ۲۵ھ سے لے کر ۳۲ھ تک کا زمانہ مجھ پر بہت سختی کا گزرا۔ اس زمانہ میں اچھا کپڑا پہننے کی اجازت بالکل نہیں تھی۔ اسی بناء پر میری والدہ مرحومہ کے اچھے جوڑے پر میری پٹائی ہوئی تھی، جس کو میں آپ بیتی نمبر۱ میں لکھوا چکا ہوں۔ ہر جمعہ کو سر منڈوانا ضروری تھا۔ گرمی ہو یا سردی نماز میں اگر دو نمازوں میں ایک شخص میرے پاس ہو جاتا تو مجھ سے جواب طلب ہوتا تھا کہ تیری نماز فلاں ہی کے پاس ہوتی ہے اور کہیں ادا نہیں ہوتی۔ رستے چلتے کوئی مجھے سلام کر لیتا تھا تو مجھ سے جواب طلب ہوتا تھا کہ یہ کون ہے اور جب میں لاعلمی ظاہر کرتا تو پھر ارشاد فرماتے تو پھر سارے مجمع میں تو ہی ملا تھا اس کو سلام کرنے کے واسطے، لیکن یہ ساری سختیاں اللہ کے فضل سے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال سے ایک ڈیڑھ سال پہلے ختم ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد تو انہوں نے میرے دو تین سخت امتحان لے کر بس پھر آزادی دے دی تھی۔ اس کے بعد تو بہت ہی شفقتیں اور اعتماد اور حسن ظن بہت ہی بڑھ گیا تھا اللہ تعالیٰ ان کے حسن ظن ہی کو سچا کر دیں۔

ان کے رائے پور کے سفر میں اس ناکارہ کا کچھ دل گھبرایا۔ میں نے ان کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا۔ ان کا ایک والا نامہ محبت سے لبریز آیا جس میں انہوں نے اس سیہ کار کے متعلق لکھا تھا کہ تعلق مع اللہ پیدا ہو گیا ہے میں اس کو پورا لکھوانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ مگر عزیز سلمان نے کہا کہ یہ

آپ بیتی نمبرا میں گزر چکا۔ اس سب کے باوجود نکیر اخیر تک نہیں گئی۔ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ یک سالہ قیام کے بعد جو حضرت شیخ الہند کے ساتھ ۳۳ھ میں روانگی ہوئی تھی۔ جس دن بمبئی پہنچے اسی دن میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ والد صاحب کے انتقال کا تار حضرت کو بمبئی میں پہنچا اور حضرت اس کو سن کر سکتہ میں رہ گئے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ لیکن اس سے تین چار دن پہلے حضرت کا عدن سے تار آیا کہ فلاں جہاز سے تشریف لا رہے ہیں۔ اس تار پر جتنی مسرت سہارنپور والوں کو اور حضرت اقدس سے تعلق رکھنے والوں کو ہونی چاہیے تھی ظاہر ہے۔ میں نے اس تار کی اطلاع پر اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ اور نظام الدین کاندھلہ۔ گنگوہ سب جگہ مژدہ کے خطوط لکھ دیے دوسرے دن والد صاحب نے مجھ سے ہی اعلیٰ حضرت کو رائے پور خط لکھوانا شروع کیا۔ جس کی ابتداء یہ تھی:

مژدہ اے دل کہ دگر باد صبا ز آمد
ہد ہد خوش خبر از شہر سبا باز آمد

میں نے اپنی حماقت سے خط کے دوران میں کہہ دیا کہ میں نے بھی اطلاع کا ایک عریضہ کل لکھ دیا تھا۔ فرمایا کہ ابھی تو باوا زندہ تھا۔ ابھی سے استقبال کا جھنڈا ہاتھ میں کیوں لے لیا۔ اس وقت تو میں بہت سوچتا رہا کہ اس میں کون سی ڈانٹ کی بات تھی مگر بعد میں خیال آیا کہ اس میں بے ادبی ضرور تھی۔

ان کے طرز تعلیم کے متعلق تو بہت ہی کچھ لکھوانے کو دل چاہتا تھا۔ مگر بہت ہی طول ہو جائے گا وہ مدرسہ میں قائم مقام صدر مدرس تھے۔ ابوداؤد شریف، مسلم شریف اور نسائی شریف ان کے مستقل سبق تھے اور حضرت کی غیبت میں حضرت قدس سرہٗ کے سبق ترمذی بخاری بھی ان کے یہاں منتقل ہوتی رہتی تھی۔ وہ احادیث کے اسباق کے مقابلے میں ابتدائی کتابوں کے پڑھانے کا زیادہ اشتیاق رکھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ بنیاد ابتداء سے پڑتی ہے استعداد کی بھی، اصلاح اور تقوے کی بھی اور جب بنیاد خراب ہو جائے تو پھر اخیر میں تعمیر اچھی نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ تدریس حدیث کے زمانے میں مدرسہ سے یہ مطالبہ کرتے رہے کہ مجھے ابتدائی سبق دے دو مگر اہل مدرسہ اس کو کیسے مانتے۔

انہوں نے ایک مرتبہ مدرسہ میں یہ تجویز پیش کی کہ درجہ ابتدائی کا مدرس ایسا ہونا چاہیے جس نے شرح جامی سے اُوپر کچھ نہ پڑھا ہو کہ ایک دو ہوشیار سمجھداروں کو ابتدائی کتب مجھ سے پڑھوا کر اور بعد کی تعلیم بند کر کے مدرس بنا دیا جائے۔ کہ وہ کہتے تھے کہ پورا مولوی ہمیشہ ترقی کی فکر میں رہتا ہے اور جب اس کو متوسط کتب مل جاتی ہیں تو ابتداء میں اس کی توجہ نہیں رہتی اور جب اس نے شرح جامی سے اُوپر پڑھا نہیں ہوگا تو وہ اُوپر کی کتابیں نہیں مانگے گا۔

یہ ناکارہ اس زمانے میں مختصر المعانی پڑھتا تھا۔ احمقوں نے یہ شہرت دی کہ یہ اپنے لڑکے زکریا کو تعلیم چھڑا کر مدرسہ میں ملازم رکھنا چاہتے ہیں۔ احمقوں کو یہ بھی خیال نہ آیا کہ جس شخص نے اپنی اعلیٰ تنخواہ کبھی نہ لی ہو۔ اس کو میری ابتدائی تنخواہ کی کیا خواہش ہوگی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھوا چکا ہوں ان کو طحاوی شریف سے بڑی مناسبت تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ طحاوی مشکوٰۃ شریف کے ساتھ ترجمہ کے ساتھ پڑھائی جائے۔ چنانچہ اس ناکارہ نے اسی طرح پڑھا ہے۔ احادیث کا ترجمہ تو میں نے مشکوٰۃ شریف میں کبھی نہ کیا۔ طحاوی میں کیا کرتا۔ لیکن امام طحاوی کی نظر کا ترجمہ ضرور کراتے تھے۔

شاید میں کہیں لکھوا چکا ہوں اسی رسالہ میں یا ''اکمال الشیم'' کے مقدمہ میں کہ انہوں نے قطب عالم حضرت گنگوہی کے انتقال کے بعد طحاوی کی اردو شرح لکھنی شروع کی تھی۔ جس میں اسانید کو چھوڑ کر متن حدیث کا ترجمہ مکررات کے حذف کے ساتھ اور امام طحاوی کی نظر کا ترجمہ بسط و تفصیل کے ساتھ کیا تھا مگر پہلے لکھا جا چکا کہ اس زمانے میں طحاوی شریف ترمذی، بخاری شریف کے ختم ہونے کے بعد اس کے گھنٹہ میں حضرت قدس سرہ کے یہاں سو دو سو ورق ہوا کرتے تھے۔

مجھ سے ایک دفعہ مولانا انور شاہ صاحب نے یہ فرمایا کہ مولوی زکریا صاحب میں تو دیوبند پر قابو یافتہ نہیں ہوں لیکن تم مظاہر علوم پر قابو یافتہ ہو۔ میرا دل چاہتا ہے کہ طحاوی شریف پورے سال ہوا کرے۔ میں اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی وجہ سے پہلے سے طحاوی شریف کا دلدادہ تھا۔ مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے بعد میں نے مظاہر علوم کے دورۂ حدیث میں طحاوی شریف کا پورا گھنٹہ شروع سال سے تجویز کرا دیا تھا۔ جب تک عبدالرحمٰن صاحب کا قیام یہاں رہا وہ مستقلاً مولانا کے یہاں ہوتی رہی اور ان کے پاکستان تشریف لے جانے کے بعد مولانا اسعد اللہ صاحب کے یہاں اب سے ایک سال قبل تک ہوتی رہی، مگر میری کوشش کے باوجود دونوں جلدیں کسی سال پوری نہ ہو سکیں۔

میں نے بارہا مدرسہ سے یہ درخواست کی کہ طحاوی شریف کا سبق مجھے دے دیا جائے، مگر اپنی تالیفی مشغولیت کی وجہ سے تین سبق لینے پر میں آمادہ نہیں تھا اور ابوداؤد یا بخاری شریف کی جگہ طحاوی شریف ان لوگوں نے دینا گوارا نہ کیا کہ یہ دونوں زیادہ اہم ہیں۔ میں نے کئی دفعہ یہ کہا کہ دو سال کے لیے دے دو، میں دونوں جلدیں ختم کرا کر دکھا دوں گا۔ مگر چونکہ اولاً ابوداؤد اور چند سال کے بعد اس کے ساتھ بخاری شریف میرا مستقل سبق ہو گیا اس لیے اہل مدرسہ نے مجھے طحاوی شریف نہ دی۔

میرے چچا حضرت اقدس مولانا محمد الیاس صاحب قدس سرہٗ بانی جماعت تبلیغ:

میرے صنوالاب نائب الشیخ مربی واستاذ کی شفقتیں تو میرے حال پر جتنی بھی ہونی چاہیے تھیں ظاہر ہے، مگر ان شفقتوں کے ساتھ ساتھ آخر میں ان کا طرز ایسا ہو گیا تھا، جس نے مجھے بہت ہی شرمندہ کر رکھا تھا اور جیسا کہ میں نے حضرت اقدس مدنی اور حضرت اقدس رائے پوری کے حالات میں لکھوایا ہے کہ ان اکابر کے بعض فقرے اب نقل کرنے کے قابل نہیں، اس کے باوجود بھی میں نے بہت نامناسب قصے لکھوا دیے۔ البتہ چچا جان کے ابتدائی حالات ضرور لکھوانے کو جی چاہتا ہے۔ اگر چہ بہت سے قصے میری ابتدائی تعلیم اور حالات سے گزر گئے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اس وقت سے اپنے چچا جان کو نہایت عابد، زاہد، متقی اور پرہیزگار پایا۔ میرا ابتدائی دوران کے شدید مجاہدوں کا تھا۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ کر نفلوں کی نیت باندھا کرتے تھے اور عشاء کی نماز کے وقت سلام پھیرا کرتے تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد کی طویل نفلوں کا دستور تو ہمیشہ رہا، مگر عشاء کی اذان کے قریب تک پڑھنے کا معمول رمضان میں اخیر تک رہا۔ اس زمانے میں ایک دستور چچا جان کے چپ اور خاموش رہنے کا تھا۔ یاد نہیں کہ دن رات میں شاید کوئی لفظ بولتے ہوں۔ اس زمانے میں مجھ سے فرمایا کہ اگر تو چھ ہفتے چپ رہے تو میں تجھے ولی کر دوں۔ مجھ میں اس زمانے میں بلاوجہ بھی بولنے کا مرض تھا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد نظام الدین میں میں نے ان سے عرض کیا کہ میں چھ ماہ چپ رہ کر دکھا دوں، وہ فرمانے لگے وہ بات گئی۔ میری ابتدائی تعلیم میں چچا جان کے کچھ واقعات اس سلسلہ میں گزر چکے ہیں۔

اس زمانے میں چونکہ وہ چھوٹے تھے، اس لیے والد صاحب کی اگر کہیں دعوت ہوتی تو ان کو بھی ساتھ لے جانا ضروری تھا اور وہ اد با یا تو اضعاً یہ ظاہر کرنا نہ چاہتے تھے کہ میرا روزہ ہے۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ روزہ ہے۔ مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ فلاں جگہ دعوت میں جانا ہے، میرے پاس بیٹھنا۔ چنانچہ وہ لقمہ بناتے، منہ بھی چلاتے مگر ان کا بنایا ہوا لقمہ میرے منہ میں جاتا تھا۔ جب وہ چاول وغیرہ کا لقمہ بناتے یا روٹی کا لقمہ سالن میں لگاتے تو میں ان کے ہاتھ لے کر اپنے منہ میں رکھ لیتا، وہ دوسرا لقمہ شروع کر دیتے۔ دیکھنے والے میری بدتمیزی سمجھتے۔

ایک عجیب قصہ یاد آ گیا۔ ایک صاحب مولوی شیر محمد صاحب ولایتی ہندوستان میں عربی پڑھنے آئے اور مختلف مدارس میں معقول کی کتب اتنی کثرت سے پڑھیں کہ **لا تعد ولا تحصیٰ** جہاں کہیں منطق کے استاد ملے وہیں پہنچے بارہ چودہ برس کے بعد گھر والوں کے شدید تقاضوں پر گھر گئے کہ لڑکی کے گھر والوں کے تقاضے کافی عرصے سے ہو رہے تھے۔ ان کے جانے پر بڑا

استقبال ہوا کہ ہندوستان سے علم پڑھ کر آئے ہیں۔ بڑے زور و شور سے شادی کا اہتمام وانتظام ہوا۔ ایک مولانا صاحب ابنِ ماجہ لے کر ان کے پاس آئے کہ میری صحاح کی سب کتب ہو چکیں، صرف ابنِ ماجہ شریف رہ گئی ہے۔ یہ حدیث پڑھ کر نہ گئے تھے اس لیے بڑی شرم آئی کہ علامہ ہونے کی اتنی شہرت ہو رہی ہے، انہوں نے ان سے تو معذرت کی کہ میں اپنی بدقسمتی سے حدیث پاک کے سوا سب ہی کچھ پڑھ کر آیا ہوں، مگر میں ایک حدیث کا استاد ہندوستان میں دیکھ کر آیا ہوں۔ انشاء اللہ چند ماہ بعد حدیث پڑھ کر آؤں گا اور تم کو ضرور پڑھاؤں گا۔ شادی ہوگئی۔ شب زفاف میں بیوی سے بہت منت سماجت سے یہ سارا قصہ کہہ کر چند ماہ کی اجازت مانگی اور یہ بھی کہا کہ لوگ تجھے طعن دیں گے۔ کوئی کچھ کہے گا اور کوئی کچھ کہے گا۔ کوئی کہے گا کہ بیوی سے نفرت ہوگئی۔ مجھے اللہ کی قسم تو بہت ہی پسند آئی اور چناں چنیں (مجھے اس میں تردد ہے کہ دوسرے دن بھاگ آئے یا تیسرے دن) اور چپکے سے بلا اطلاع وہاں سے چل کر سیدھے گنگوہ پہنچے اور میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے پورا قصہ سنایا۔

ان کو میں نے بھی دیکھا اور خوب دیکھا۔ میں نے ان کا پڑھنا بھی دیکھا اور مطالعہ بھی، وہ ولایتی تھے۔ قراءت ان سے نہ ہوتی تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد والد صاحب کے یہاں سبق شروع ہوتا تھا اور سحر کے وقت ختم ہوتا تھا۔ قرأت کبھی میرے والد صاحب خود فرماتے اور کبھی چچا جان۔ زیادہ تر چچا جان فرماتے اور ان ولایتی مولوی صاحب پر مجھے بہت ہی رشک آتا تھا۔ میں نے ان کو کسی وقت دن میں خالی نہیں دیکھا۔ لال مسجد کی چھت کے اُوپر ایک حجرہ تھا اسی میں ان کا قیام تھا۔ اس میں پڑے رہا کرتے تھے۔ ایک میرے والد صاحب کے شاگرد مولوی سعید گنگوہی مرحوم تھے، ان کے ذمہ ان کا کھانا لانا تھا جو میرے والد صاحب نے کسی کے گھر مقرر کر رکھا تھا۔ مولوی سعید سے مولانا شیر محمد صاحب نے یہ کہہ رکھا تھا کہ کھانا لا کر اس طاق میں رکھ دیا کرو اور سالن تم لے جایا کرو۔ وہ سالن تو دونوں وقت اپنے گھر لے جاتے اور کچھ بڑھیا مال ہوتا تو وہیں صاف کر دیتے۔ ولایتی مولوی ہر وقت چادر اوڑھے رکھتے تھے۔ اس چادر کو پھیلا کر مولوی سعید اس پر رکھ دیتے۔ میں نے ان کو روٹی کھاتے دیکھا ہے کہ مطالعہ بڑے غور سے کرتے رہتے، خوب حاشیہ وغیرہ دیکھتے اور ایک لقمہ توڑ کر بغیر سالن کے منہ میں رکھ لیتے اور پان کی طرح اس کو چبا لیتے اور کھا کر لوٹے میں جو پانی رہتا اس کو پی لیتے، گرم ہوتا یا ٹھنڈا۔

مجھے اس وقت بھی ان کے مطالعہ پر بڑا رشک آتا تھا۔ حالانکہ میں اس وقت بہت ہی بچہ تھا اور اب جب کبھی وہ منظر یاد آتا ہے بڑا لطف آتا ہے اور حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی کا مقولہ یاد آجاتا ہے کہ ''کام تو یوں ہوا کرے۔'' مگر پڑھنے اور پڑھانے والوں دونوں ہی کا کمال تھا کہ

ساری رات پڑھنے پڑھانے میں ہی خرچ فرمادیتے تھے۔

مظاہر علوم کی تدریس:

چچا جان قدس سرہٗ ان مجاہدات، عبادات، ریاضات کی وجہ سے کتب خانہ کے کسی کام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ایک منشی محمد حسین صاحب فیض آبادی تھے جو میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں گویا منیجر تھے اور کتب خانہ کا سارا کام اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے زمانے میں بھی اور حضرت کے وصال کے بعد بھی وہی کیا کرتے تھے۔ بڑی محنت اور جانفشانی اور دل سوزی سے کیا کرتے تھے۔ ایک عادت مرحوم کی یہ تھی کہ میرے والد صاحب جب کبھی سفر میں ہوتے تو وہ ان کی آمدہ ڈاک پر پتہ کاٹ کر جہاں ابا جان کا قیام ہوتا وہاں کا پتہ لکھ دیتے اور انہی خطوط پر اپنا مضمون بھی لکھ دیا کرتے تھے جو قانونی جرم تھا۔ مگر اس کی ان کو خبر نہ تھی۔ اتفاق سے ایک مرتبہ ان پر مقدمہ قائم ہوگیا اور سنا یہ گیا کہ یہ تو سنگین جرم ہے۔ وہ روپوش ہوکر مکہ مکرمہ چلے گئے اور وہیں انتقال بھی ہوا۔ منشی صاحب مرحوم نے ایک مرتبہ میرے چچا جان کو ڈانٹ کر یوں ہی پھرتے رہتے ہو کوئی کام کتب خانہ کا بھی کرلیا کرو۔ میرے والد صاحب کو بہت ہی ناگوار ہوا اور منشی جی کو خوب ڈانٹا اور فرمایا کہ منشی جی میں تو یوں سمجھتا ہوں کہ اسی کی برکت سے مجھے روزی مل رہی ہے۔ حدیث پاک میں بھی یہی مضمون آیا ہے۔ ''**ھل تنصرون و ترزقون الا بضعفائکم**'' (کذا فی المشکوٰۃ بروایۃ البخاری) رزق اور تم کو مدد کیا ضعفاء کے علاوہ کسی اور وجہ سے ہوتی؟ گنگوہ سے واپسی پر ۲۸ھ میں جب اکابر مظاہر علوم بہت سے حج کو چلے گئے تو ان کی غیبت میں چچا جان مظاہر علوم کے مدرس بنائے گئے تھے۔ زبان میں کچھ لکنت تھی جو بات چیت میں تو بالکل ظاہر نہ ہوتی تھی۔ مگر تقریر اور سبق میں بھی تقریر زور سے ہوتی تو اس کا اثر ظاہر ہوتا، جس سے بعض طالب علم کبھی شکایت بھی کرتے تھے مگر مجھ سے متعدد لوگوں نے بعد میں بیان کیا کہ ان سے پڑھنے والے علمی حیثیت سے بہت اونچے پہنچے۔

نظام الدین منتقل ہونا اور بیماری کا شدید حملہ:

میرے تایا ابا جان (مولانا محمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) کے انتقال کے بعد اہلِ نظام الدین کے اصرار پر نظام الدین کی مسجد میں منتقل ہوئے۔ اتفاق سے اس انتقالی دور میں چچا جان کی طبیعت بہت ہی ناساز ہوگئی۔ مرض سہارنپور سے شروع ہوا۔ راستہ میں کاندھلہ دو تین دن قیام کا ارادہ تھا۔ وہاں پہنچ کر بہت ہی شدت مرض نے اختیار کی۔ حکیموں نے پانی پینے کو منع کردیا اور وہ غصے میں جوش میں پانی پینے کو دوڑتے۔ حالانکہ حرکت بھی دشوار تھی۔ یہ ناکارہ اس پوری بیماری میں ان

کی خدمت میں رہا۔ بڑے وقائع اس میں پیش آئے۔ ایک معمولی سی بات یہ کہ بہت بڑی جماعت جنات کی ان سے بیعت ہوئی۔ ایک دفعہ اصرار ہوا کہ بخار کا علاج چلتے پانی میں نہانا ہے اور حکیم نے وضو کو بھی منع کر رکھا تھا۔ تیمم سے نماز پڑھتے تھے۔ مجھ پر خفا ہوئے کہ ان حکیموں کی ایسی تیسی۔ تم ان کے مقابلے میں حدیث کے علاج کو انکار کرتے ہو۔ میں نے عرض کیا حدیث شریف ظنی ہے قطعی نہیں اور پھر یہ علاج جو احادیث میں وارد ہوئے ہیں یہ کلی نہیں۔ ہر شخص کے لیے اور ہر موسم کے لیے نہیں ہوا کرتے۔ طبیب کا علاج بھی مشروع ہے اور وہ احوال کے مناسب ہوتا ہے۔ غرض خوب مناظرہ ہوا اور مجھے خوب ڈانٹا، لیکن ان پر حدیث پاک کے اتباع کا جوش تھا، اس لیے خوب ڈانٹ پلائی کہ حدیث پاک کے مقابلے میں تم کسی حکیم کا نام لیتے ہو۔ یہ ولولہ بعض اوقات زوروں پر آجاتا تھا۔

ماحول کا اثر اور اس کے چند واقعات:

ایک ہمارے مخلص دوست مرحوم نے ان کو ایک خط سہارنپور سے دہلی لکھا۔ جس میں ایک عزیز کی بیماری کی تفصیل لکھ کر ایک تعویذ منگایا تھا اور جواب کے لیے اپنے پتہ کا لفافہ لکھا تھا۔ چچا جان نے ان کے لفافہ پر سے ان کا پتہ کاٹ کر میرا پتہ اور ان ہی کے خط پر یہ مضمون تحریر فرمایا کہ ان سے یہ کہہ دو کہ مغرب اور صبح کی نماز کے بعد بیمار کو مسجد میں لا کر تم سے دم کرائیں اور مجھے ایک دعا لکھی کہ تم یہ دعا پڑھ کر ان پر دم کر دیا کرو اور اگر وہ اس دعا سے اچھے نہ ہو تو ایسے کو زندہ رہنے کی ضرورت نہیں مر جانا اچھا ہے۔

میرا لڑکا عزیز طلحہ غالباً دو ڈھائی برس کا تھا۔ نظام الدین میں اتنا شدید بیمار ہوا کہ مایوسی کی حالت ہوگئی اور ان کو کسی تبلیغی جلسہ میں تشریف لے جانا تھا۔ جاتے ہوئے غالباً قاری داؤد مرحوم سے یا اسی نوع کے کسی اور سے ہمارے مدرسہ کے مدرس حدیث مولوی یونس صاحب کہتے ہیں کہ مجھے مولوی یونس میواتی مرحوم یاد ہیں اور بعض کو میاں جی موسیٰ کا نام یاد ہے کہا کہ دیکھ اگر میری واپسی سے پہلے طلحہ مر گیا تو اتنا ماروں گا کہ یاد رکھو گے۔

ان واقعات میں کچھ اشکال نہیں۔ ممکن ہے کہ چچا جان کو یہ کشف ہوا کہ اس کی صحت فلاں کی زور دار دعا پر موقوف ہے اس لیے سخت لفظ کہے۔ معلوم ہوا کہ عزیز ہارون کی والدہ کی شدت علالت میں بھی عزیزم مولانا یوسف صاحب مرحوم نے بھی اس قسم کا جملہ میاں جی موسیٰ سے کہا تھا۔ حدیث پاک میں ہے "ان من عباد اللّٰہ لو اقسم علی اللّٰہ لأبرہ أو کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام" اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ اس کو

ضرور پورا فرمادیں گے۔ یہاں ایک بہت اہم چیز قابلِ لحاظ یہ بھی ہے کہ بعض روایات میں یہ بھی آیا ’’ومن یتال علی اللّٰه یکذبه‘‘ جواللہ تعالیٰ پر بتکلف قسم کھائے گا اللہ تعالیٰ اس کو جھوٹا کر دیں گے۔اس کے لیے دونوں حدیث بہت ہی غور کی اور اہم ہیں ہر ایک کا مصداق الگ الگ ہے۔

جو حضرات واقعی اہلِ اللہ ہیں وہ اگر جوش میں کوئی بات فرمادیں وہ پہلی حدیث کا مصداق ہے اور جو اپنے آپ کو بزرگ ثابت کرنے کے واسطے پیش گوئیاں کریں وہ دوسری حدیث کے مصداق ہیں۔ میں اپنی کسی تالیف میں اس کو تفصیل سے لکھ بھی چکا ہوں۔اس ناکارہ کا ذوق والد صاحب قدس سرہٗ کی برکت سے کچھ علمی ہو گیا تھا۔اگر چہ رسمی بیعت شوال ۳۳ھ میں حضرت قدس سرہٗ کے یکسالہ قیام حجاز کی روانگی کے موقع پر ہوگئی تھی مگر ذکر شغل کی توفیق اب تک بھی نہ ہوئی۔

میرے چچا جان قدس سرہٗ اللہ تعالیٰ ان کو بلند درجات عطاء فرمائے۔ان کی شفقتیں بچپن سے مجھ بہت بڑھتی رہیں۔ وہ مجھ پر بیعت کے بعد سے بہت ہی اصرار فرماتے رہے کہ تو ذکر کرلیا کر۔ مگر میں ہمیشہ اپنی نالائقی سے یہ جواب دیا کرتا تھا کہ ’’ہر کسے را بہر کارے ساختند‘‘ ضربیں آپ لگائیں سبق میں پڑھاؤں۔ یہ لائن میرے بس کی نہیں ہے اور نہ میں اس کا اہل ہوں وغیرہ وغیرہ۔ مگر چچا جان کی شفقتیں ہمیشہ بہت ہی متقاضی رہیں۔ میں پہلے لکھوا چکا ہوں کہ بذل کی طباعت کے سلسلے میں جب بھی تھانہ بھون ہوتی تھی تو وہاں کا ماحول ہر وقت اسی کا تھا اور ماحول کا اثر تو ہوتا ہی ہے۔اس کے بڑے تجربے ہیں۔ایک غیر متعلق بات یاد آ گئی۔

میرا ایک مخلص دوست لئیق مرحوم مظاہر علوم سے فارغ ہوا۔استعداد بڑی اچھی تھی۔میرے بڑے خصوصی تعلق والوں میں تھا۔حضرت مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ کی بھی اس پر بڑی شفقتیں تھیں۔اس لیے فراغ پر میں نے از خود اس کو مظاہر علوم کی شاخ میں ۲۰ روپے تنخواہ پر مدرس تجویز کیا۔اس نے بخوشی پسند کیا،مگر دو تین دن بعد آ کر اس نے قلت تنخواہ کا عذر کیا اور کہا کہ کم از کم پچیس روپے پر کام کر سکتا ہوں۔ میں نے معذرت کر دی کہ بیس بھی تمہاری خصوصیات کی وجہ سے ہیں،ورنہ شاخ کی تنخواہیں پندرہ سے متجاوز نہیں ہیں۔ میں نے اس مرحوم کو تنخواہ کے غیر مقصود اور نا قابل التفات ہونے پر ترغیب اور نصیحت بھی کی۔مگر اس نے خانگی ضروریات وغیرہ وغیرہ نہ معلوم کیا کیا ضروریات بیان کیں اور اس نے منظور نہ کیا۔مولوی سعید خاں صاحب کا دور تھا۔ وہ اس کو ترغیب دے کر نظام الدین لے گئے۔وہاں تدریس اور تبلیغ دونوں کام اس کے حوالے ہوئے اور آٹھ روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔نظام الدین کی حاضری تو میری ہوتی رہتی تھی۔ وہ مرحوم اکثر ملتا رہتا تھا۔ چونکہ چچا جان کے دور میں بھی مدرسہ اور تبلیغ کی سرپرستی اس ناکارہ کے ذمہ تھی۔ایک سال بعد میرے پاس ایک درخواست وہاں کے مہتمم صاحب کی طرف سے پہنچی کہ مدرسہ کے یہ

مدرسین ہیں جن میں چار پانچ نام تھے ان میں ایک لئیق مرحوم کا بھی تھا۔ مہتمم صاحب نے لکھا تھا کہ ان لوگوں کی آٹھ روپے تنخواہ ہے۔ اگر چہ ان کی طرف سے کوئی درخواست نہیں ہے مگر میری سفارش ہے کہ دو روپے کا اضافہ ہر ایک کی تنخواہ میں کر دیا جائے۔ میں نے لکھا کہ ضرور، بلکہ چار روپے کا۔ مگر چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ ابھی تو دو روپے ہی رہنے دو، ہمارے مدرسین کی عادت نہ بگاڑو۔ میں نے مغرب کے بعد لئیق مرحوم کو بلایا۔ وہ انداز سے یا کسی کی روایت سے سمجھ گیا۔ مجھے اس کا گردن جھکا کر آنا اب تک یاد ہے۔ نہایت شرمندہ، نہایت محجوب، میں نے پوچھا کہ لئیق تو وہی تو ہے وہ خاموش رہا۔ میں نے کہا کہ خاموش رہنے کی ضرورت نہیں، میں تو بات پوچھتا ہوں۔ تم کو معلوم ہے کہ میں نظام الدین کا سرپرست ہوں اور میرا یہاں والوں سے تعلق بھی تجھ کو معلوم تھا۔ تو نے ہمارے بیس روپے پر تو ٹھوکر ماردی اور دو سال سے یہاں آٹھ روپے پر کام کر رہا ہے۔ اس مرحوم نے اللہ تعالیٰ اس کو بہت ہی درجات عطاء فرمائے۔ بہت مخلص اور نیک تھا۔ بہت ہی شرمندگی سے یوں کہا کہ ماحول کا اثر ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ آپ کو تو یاد ہوگا کہ بیس روپے بڑی خوشی سے میں نے قبول کیے تھے۔ مگر شاخ کے سب مدرسوں نے مجبور کیا کہ پچیس سے کم پر راضی نہ ہونا، تیری وجہ سے ہمارا بھی راستہ کھلے گا۔ لئیق مرحوم کے علاوہ اور بھی کئی ساتھ میرے اس نوع کے واقعے پیش آئے کہ یہاں کے ماحول میں اور نظام الدین کے ماحول میں بہت ہی تفاوت خاص طور سے چچا جان کے دور میں پیش آتا رہتا تھا۔

یہاں کئی آدمیوں کو ہم نے دس روپے معین مدرسی پر رکھنا چاہا اور وہاں جا کر وہ بلا تنخواہ محض کھانے پر تبلیغ و تدریس کا کام کرتے رہے۔ اگر چہ اس میں چچا جان کی برکت کو خاص دخل تھا۔ لیکن دوسرے درجے میں ماحول کا بھی اثر تھا اور یہ تو کئی سال ہوئے رمضان کے آنے والوں کے خطوط کئی ماہ تک آتے رہتے ہیں کہ رمضان مبارک میں جو لذت ذوق وشوق ذکر و تلاوت میں محسوس ہوتی تھی، وہ یہاں آکر نہیں رہی اور میں یہی جواب لکھواتا رہتا ہوں کہ یہ ماحول کا اثر ہے۔ آپ لوگ وہاں کا ذکر کا ماحول پیدا کریں تو یہ لذت وہاں بھی محسوس ہونے لگے گی۔ چچا جان کی شفقتیں بہت ہی زیادہ ہیں۔ مگر بعض دفعہ وہ ڈانٹ بھی خوب پلایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ عزیزان مولانا یوسف مرحوم، مولانا انعام صاحب سلمہٗ یہاں دورہ پڑھتے تھے تو عزیز یوسف مرحوم کے داہنے ہاتھ میں زخم ہو گیا، شگاف آیا اور بہت ہی مرحوم کو تکلیف اٹھانی پڑی۔ سال کا ختم تھا۔ جمادی الثانیہ آگیا۔ چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ سال تو قریب الختم ہے۔ کتابیں پوری ہو گئیں، معمولی سی رہ گئی ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ لڑکوں کو ساتھ لیتا جاؤں۔ تمہاری کیا رائے ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اللہ کا شکر ہے عزیز یوسف کو افاقہ ہے۔ دو چار روز میں انشاء

اللہ اچھا ہو جائے گا۔ امتحان قریب ہے۔ اس میں شرکت مناسب ہے۔ چچا جان میری عدم موافقت رائے پر ناراض ہوئے اور خود رائی پر خوب ڈانٹا۔ میں نے عرض کیا جناب نے مشورہ پوچھا تھا۔ مشورے میں تو جو خیر ہو وہی دیانت سے بتانا چاہیے۔ آپ اگر حکم فرماتے کہ میں لے جا رہا ہوں اور میں اس کی مخالفت کرتا تو خود رائی ہوتی۔ اس پر اور بھی ناراض ہوئے۔ حضرت رائے پوری بھی اس مجلس میں اول سے آخر تک شریک تھے اور نہایت ساکت رہے۔ میرے اُٹھنے کے بعد چچا جان نے حضرت رائے پوری سے پوچھا کہ میرا ناراض ہونا آپ کو ناگوار ہوگا۔ حضرت رائے پوری نے فرمایا کہ ہاں حضرت! سمجھ میں نہیں آیا۔ بات تو حضرت شیخ کی صحیح ہے۔ جب آپ نے مشورہ پوچھا تھا تو پھر بات تو وہی کہنی چاہیے تھی جو ان کی رائے تھی۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے بہت سادگی سے یوں فرمایا کہ حضرت! میں آخر چچا بھی تو ہوں۔ اس پر حضرت رائے پوری ہنس پڑے اور فرمایا کہ جناب کے چچا ہونے میں کیا انکار ہے کہ وہ کہیں اپنے آپ کو بڑا آدمی نہ سمجھنے لگے۔ یہاں اپنے بزرگوں کا ایک عجیب قصہ یاد آیا۔

میرے اجداد میں حضرت مولانا نور الحسن صاحب کاندھلوی بڑے مشہور اساتذہ کرام اور درس و تدریس کے امام اور دور دور کے ولایتی ان سے پڑھنے کے لیے آتے تھے اور ان کے والد ماجد مولانا ابو الحسن صاحب علمی درجہ میں ان کے برابر نہیں تھے۔ جنہوں نے کاندھلہ دیکھا وہ اس سے واقف ہیں کہ ہمارا مکان جو بڑا گھر کہلاتا ہے اس پر ایک کمرہ بنگلہ نما جس کی کھڑکیاں مسجد کی طرف باہر کھل رہی ہیں حضرت مولانا نور الحسن صاحب مسجد میں طلبہ کو سبق پڑھا رہے تھے۔ ولایتی قدآور مستعد طلبہ سبق میں شریک تھے۔ مولانا ابو الحسن صاحب نے اوپر کے کمرے سے آواز دے کر کہا کہ نور الحسن تم تو بالکل گدھے ہو۔ ولایتی شاگردوں کو جوش زیادہ آیا اور سب کے چہرے سُرخ ہو گئے۔ مولانا نور الحسن صاحب نے شاگردوں کا تیور دیکھا تو فرمایا کہ کچھ نہیں کچھ نہیں پڑھو۔ وہ یوں فرما رہے ہیں کہ میں باپ ہوں یہ بیٹا ہے۔

ان کا ایک عجیب قصہ ہے۔ میں بھی شتر بے مہار کی طرح کہیں سے کہیں منہ مار دیتا ہوں۔ برسات کا موسم تھا اور دھوپ بہت تیزی پر تھی۔ مولانا نور الحسن صاحب اپنی قلمی کتابوں کو دھوپ میں پھیلا رہے تھے اور پھیلاتے وقت ان کو صاف بھی کرتے تھے۔ مولانا ابو الحسن صاحب (ان کے والد) ان سے بار بار یہ فرماتے تھے کہ میاں نور الحسن دھوپ تیز ہے، وہ فرماتے کہ ابا جی ابھی آتا ہوں اور یہ کہہ کر پھر اپنی کتابوں کے پھیلانے میں لگ جاتے۔ دو تین دفعہ مولانا ابو الحسن صاحب نے ان کو تقاضہ کیا وہ جواب میں یہی کہتے رہے۔ دو تین دفعہ کے بعد مولانا ابو الحسن اُٹھے اور مولانا نور الحسن کے صاحبزادے (اپنے پوتے) خورد سال مولوی ضیاء الحسن صاحب کو اُٹھا کر

باہر چارپائی پر دھوپ میں بٹھادیا۔مولانا نورالحسن صاحب کہنے لگے۔ اباجی بڑی تیز دھوپ ہورہی ہے۔مولانا ابوالحسن صاحب نے فرمایا کہ اباجی کے دل پر بھی بڑی دیر سے یہی گزررہی ہے۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا۔اس ناکارہ کے چچاجان قدس سرہٗ کا ایک مشہور مقولہ تھا جو بارہا فرمایا کہ میری تبلیغ کا جتنا یہ (زکریا) مخالف ہے اتنا بڑے سے بڑا مخالف بھی مخالف نہ ہوگا اور میری تبلیغ کی تقویت اور حمایت جتنی اس سے حاصل ہے اتنی میرے کسی موافق سے موافق اور معین وکارکن سے بھی حاصل نہیں ہے اور دونوں ارشادان کے بالکل صحیح تھے۔ پہلے جملہ کی شرح تو یہ ہے کہ یہ ناکارہ سیہ کار نابکار علمی زور پر اشکالات خوب کیا کرتا تھا۔ یہاں بھی ایک جملہ معترضہ آگیا۔میرے مخلص دوست قاری مفتی سعید مرحوم نے ایک مرتبہ مجھ سے یوں فرمایا کہ حضرت دہلوی کی چیزوں پر جتنا تم اعتراض کرتے تھے، مولوی یوسف مرحوم کی باتوں پر اتنا اعتراض نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ بالکل صحیح کہا۔ چچاجان کے سامنے تو میری حیثیت ایک شاگرداور خورد کی تھی۔ میرے اعتراض سے نہ تو ان کی شان پر کوئی اثر پڑتا تھا اور نہ کام پر۔عزیز یوسف کے ساتھ میرا معاملہ بڑائی کا ہے۔مجمع میں اس پر اعتراض کرنے سے کام پر بھی اثر پڑے گا اور اس کے وقار پر بھی۔اس لیے مجھے جو کہنا ہوتا ہے،تنہائی میں کہتا ہوں۔

چچاجان نوراللہ مرقدہٗ کے دوسرے جملے کا مطلب یہ تھا جس کو انہوں نے باربار مجمع میں بھی فرمایا کہ میری یہ نسبت میرے معاصرین خاص طور سے حضرت مدنی، حضرت میرٹھی نوراللہ مرقدہما وغیرہ جتنا اس سے دبتے ہیں، مجھ سے نہیں دبتے۔ یہ میرے لیے وقایہ ہے۔اگر یہ نہ ہوتو وہ مجھے دبالیں اور یہ بالکل صحیح ہے۔ان دونوں اکابر کے یہاں اس سیہ کار کی بہت ہی شنوائی تھی۔

ایک دفعہ نظام الدین میں یہ ناکارہ اور حضرت رائے پوری تشریف فرما تھے۔ چچاجان قدس سرہٗ نے خواب دیکھا کہ سب سے آگے چچاجان چل رہے ہیں،ان کے پیچھے میں چل رہا ہوں، میرے پیچھے حضرت اقدس مرشدی ومولائی سہارنپوری چل رہے ہیں۔ فرمایا کہ اس کی تعبیر دو۔حضرت اقدس رائے پوری نے اپنی عادت کے موافق فرمادیا کہ اس کی تعبیر تو شیخ دیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ پہلا جزو تو صاف ہے کہ میں آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہوں مگر چلا نہیں جاتا مگر دوسرا جزو سمجھ میں نہ آیا۔فرمانے لگے کہ بس! یہ خواب تو بہت صاف اور واقعہ ہے۔ کسی تعبیر کا محتاج نہیں ہے۔ میری پشت پناہی صرف تم سے ہورہی ہے۔ اگر تم نہ ہوتو میرے معاصرین مجھ کو دبالیں گے اور تمہاری پشت پناہی حضرت نوراللہ مرقدہٗ سے ہورہی ہے کہ حضرت کی وجہ سے یہ حضرات تم سے دب جاتے ہیں اور یہ بالکل صحیح فرمایا۔ بیسیوں واقعات اس قسم کے پیش آئے جن کا لکھوانا اب بے ادبی ہے۔ دوواقعے دونوں بزرگوں کے ایک ایک لکھواتا ہوں۔

تقسیم سے پہلے انگریزوں کے زمانے میں جبریہ تعلیم کا بڑا زور تھا۔ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ دونوں اس کے سخت مخالف تھے اور حضرت مدنی قدس سرہٗ اس کے موافق تھے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے اپنے مدرسہ کے مفتی مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی مرحوم کو اسی کام پر لگا رکھا تھا اور ان کو چچا جان قدس سرہٗ کی ماتحتی میں دے رکھا تھا۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی اپنی مساعی جمیلہ تو ممبران اسمبلی وغیرہ کے نام خطوط اور وفود کی تھی۔ اس زمانے میں ایک رسالہ اس ناکارہ نے قرآن عظیم اور جبریہ تعلیم تالیف کیا تھا اور چچا جان و مولانا عبدالکریم صاحب کی مساعی اس کے خلاف جلسوں وغیرہ کے کرنے کی تھیں جگہ جگہ جلسے کرایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ دونوں دوپہر کے وقت تشریف لائے کھانے کے لیے دسترخوان بچھ چکا تھا۔ چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے پاس ایک کام کے لیے آئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ارشاد فرمائیں۔ فرمایا کہ دہلی میں ایک بہت بڑا جلسہ جبریہ تعلیم کے خلاف کرنا ہے اور حضرت مدنی کی صدارت میں کرنا ہے تجھے دیوبند جانا ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ ضرور لیکن حفظ کا استثناء تو میری سمجھ میں آتا ہے ناظرہ کا سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے کہ حفظ پر تو دوسرے کام سے ضرور اثر پڑتا ہے۔ لیکن ناظرہ میں کچھ تاخیر ہو جائے اور اس کے ساتھ وہ لوگ اُردو حساب بھی پڑھ لیں تو اس میں آپ کا کیا حرج ہے۔ چچا جان نے فرمایا کہ مناظرہ مت کرو چلو۔ میں نے عرض کیا کہ وہاں تو مجھے ہی بولنا پڑے گا۔ پہلے کچھ سمجھ تو لوں۔ مولوی عبدالکریم نے فرمایا کہ حضرت تھانوی نے دونوں کا استثناء کرنے کے لیے فرمایا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت تھانوی کون بزرگ ہیں۔ کہاں رہتے ہیں؟۔ یہ سن کر ان کا چہرہ غصہ سے لال ہوگیا۔ یہاں سے اُٹھ کر چچا جان سے کہنے لگے کہ اس کے تو عقائد خراب ہو گئے ہیں۔ چچا جان نے ان ہی کے سامنے مجھ سے یہ فقرہ سنا یا میں نے کہا کہ تعجب ہے کہ مولوی صاحب آپ اتنے اُونچے ہو کر بھی یہ بات نہ سمجھے۔ حضرت تھانوی زاد مجدہم کا ارشاد میرے اور آپ کے لیے حجت ہے۔ لیکن جن سے بات کرنے جا رہے ہو ان کی حیثیت تو معاصرت کی ہے اور مسلم لیگ و کانگریس کی وجہ سے آپس کے تعلقات جیسے ہیں وہ آپ کو معلوم ہیں اور مجھے بھی۔ ان کے لیے یہ چیز حجت نہیں بنے گی کہ مولانا تھانوی نے فرمایا ہے کوئی دلیل بتلاؤ جوان کو سمجھائی جائے۔ اتنے میں گاڑی کا وقت ہوگیا اور ہم لوگ دو بجے والی سے دیوبند گئے۔ چچا جان آگے آگے ان کے بائیں جانب ذرا پیچھے کو میں اور میری بائیں طرف چچا جان کے پیچھے مولوی عبدالکریم صاحب۔ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے دروازے پر جب پہنچے تو حضرت اپنے مردانے مکان کی سہ دری سے باہر کو تشریف لا رہے تھے۔ ملاقات پر بہت ہی اظہار مسرت کے ساتھ مجھ سے فرمایا کہ دہلی سے آ رہے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ یہی حضرات

سہارنپور سے آرہے ہیں اسی گاڑی سے دہلی سے آئے تھے اور مجھے ساتھ لے کر بارگاہِ عالی میں حاضر ہوئے ہیں۔ بہت تیز لہجہ میں فرمایا کہ کیا حکم ہے؟ میں نے کہا کہ یہ لوگ دہلی میں ایک بہت بڑا جلسہ حضور کی صدارت میں جبریہ تعلیم کے خلاف کرنا چاہتے ہیں۔ غصہ آگیا فرمایا کہ ہرگز صدارت نہیں کروں گا۔ تم لوگ سب کو جاہل رکھنا چاہتے ہو۔ میں نے کہا کہ حضرت جی! آپ ساری دنیا کو عالم بنائیں ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ جو قرآن پاک پڑھ رہے ہیں ان کو جبراً نہ لیں۔ حضرت نے کھڑے کھڑے فرمایا کہ قرآن پاک کا انتظام آپ لوگ خارج میں کریں۔ قرآن شریف کا بہانہ کر کے یہ لوگ تعلیم سے ہٹ جاتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ تشریف تو رکھئے بیٹھ کر بات کریں گے۔ کمرے میں تشریف لے گئے۔ میں نے عرض کیا کہ خارج اوقات میں حفظ قرآن کیسے ہوسکتا ہے سارے دن محنت کر کے بھی مشکل سے ہوتا ہے فرمایا کہ میں نے تو جیل میں یاد کیا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ یہی ریزولیشن پاس کرادیجئے کہ جس کو قرآن پاک حفظ کرنا ہے وہ جیل چلا جائے۔ اس پر ہنس پڑے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت جلسہ تو ہوگا اور جناب کی صدارت میں ہوگا۔ اللہ جل شانہٗ بہت ہی بلند درجات عطاء فرمائے۔ ان کی شفقتیں محبت یاد کر کے رونے کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔ ایسا خوشدلی سے استقبال فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ کیا اسی گاڑی سے چلنا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ابھی نہیں۔ ابھی تو دہلی جا کر جلسے کا انتظام کریں گے۔ حضرت نے اپنی ڈائری نکالی اور اس میں مولانا الیاس صاحب کا جلسہ نوٹ فرمالیا اور تاریخ بتلادی اس کے بعد پھر جوش میں فرمانے لگے میں حفظ کے استثناء کو تو کہوں گا مگر ناظرہ کے استثناء کی کوئی وجہ نہیں میں نے عرض کیا کہ مضمون کی آپ پر کوئی پابندی نہیں۔ جو چاہے آپ ارشاد فرمائیں کہ جس کو حفظ کرنا ہے وہ جیل جائے۔ قرار یہ پایا کہ فلاں تاریخ کو چار بجے کے ایکسپریس سے یہ ناکارہ سہارنپور سے سوار ہوگا اور اسی گاڑی سے دیوبند سے حضرت مدنی سوار ہوں گے اور نو بجے کو دہلی میں جلسہ ہوگا۔ جب دہلی پر اسٹیشن پر پہنچے تو سارا پلیٹ فارم لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ شیخ الاسلام زندہ باد ''جمعیۃ العلماء زندہ باد'' کانگریس زندہ باد کے نعروں سے پورا اسٹیشن گونج رہا تھا اور میں سارے راستے یہ سوچتا چلا گیا کہ اگر حضرت نے ناظرہ کے عدم استثناء کا اعلان کردیا تو اور مصیبت آجائے گی۔ اسٹیشن پر مجمع کے درمیان میں حضرت مولانا الحاج مفتی کفایت اللہ صاحب بھی موجود تھے۔ ان کو دیکھ کر میرا دل خوش ہوگیا۔ اس لیے کہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس سیہ کار کی بات کی بہت ہی وقعت تھی۔ اس لیے کہ بیسیوں نہیں بلکہ سینکڑوں مرتبہ دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کی ممبری میں جمعیۃ کے مشوروں میں وقف بل کے مسئلے میں اس کی نوبت آئی کہ جب میری رائے مفتی صاحب کے خلاف ہوئی تو یا تو انہوں نے میری رائے خوشی سے قبول فرمائی

یا بڑی فراخدلی سے یہ لکھ دیتے کہ بعض مخلص اہلِ علم کے رائے یہ ہے۔ وقف بل کے مسودے میں یہ بھی لفظ میری رائے کے ساتھ بغیر نام کے چھپا ہوا ہے۔ اتفاق سے مفتی صاحب اسی ڈبہ کے قریب تھے جس میں یہ ناکارہ اور حضرت مدنی تھے۔

حضرت مدنی قدس سرہٗ تو استقبال والوں کے مصافحے میں ایسے پھنسے کہ کوئی حد نہیں اور چاروں طرف سے مجمع ان پر گرنے لگا اور میں نے مفتی صاحب کو بہت ہی غنیمت سمجھا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور میں نے عرض کیا کہ استثناء ناظرہ اور حفظ دونوں کا کرنا ہے اور یہ حضرت حفظ کے لیے تو تیار ہیں مگر ناظرہ کو نہیں مانتے۔ مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطاء فرمائے کہنے لگے کہ نہیں استثناء تو دونوں ہی کا ہونا چاہیے۔ میں نے بھی کہا کہ ہاں بغیر اس کے کام نہیں چلے گا۔ جلسے میں جا کر تقریر شروع ہو جائے گی۔ راستہ میں ہی نمٹ لیں۔

حضرت مدنی قدس سرہٗ کی عادت شریفہ یہ تھی جس کا بارہا میں نے مشاہدہ خود بھی کیا کہ مفتی صاحب کی بات حضرت کے یہاں بہت وقیع اور اہم سمجھی جاتی تھی۔ بارہا میں نے دیکھا کہ حضرت نے اپنی رائے پر مفتی صاحب کی رائے کو ترجیح دی۔ مفتی صاحب میرے کہنے پر آگے بڑھے اور میں ذرا فصل سے پیچھے پیچھے کہ حضرت کی نظر مجھ پر نہ پڑے اور یہ نہ سمجھیں کہ یہ کہلوا رہا ہے۔ مفتی صاحب نے اسٹیشن کے زینے پر حضرت کے قریب ہو کر کان میں یہ کہا کہ حضرت استثناء حفظ و ناظرہ دونوں کا کرنا ہے۔ مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اگر کسی نے بات کرتے دیکھا ہوگا تو اس کو اندازہ ہوگا کہ کس طرح گردن ہلا کر بات فرمایا کرتے تھے۔ میرے سامنے تو وہ منظر خوب ہے۔

حضرت نے نہایت جوش میں فرمایا کہ نہیں ناظرہ کے استثناء کی کوئی وجہ نہیں۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ حضرت پہلے چند پارے ناظرہ پڑھ کر ہی تو حفظ میں لگتے ہیں جب وہ ناظرہ میں اور کام میں لگ جائیں گے تو پھر ان کو حفظ کا وقت کب ملے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ بہت اچھا۔ سیدھے جلسہ گاہ میں تشریف لے گئے۔ جلسہ کی شروعات بہت پہلے سے ہو چکی تھیں۔ سیدھے ممبر پر تشریف لے گئے اور جاتے ہی زوردار تقریر اپنی ''مہربان گورنمنٹ'' کے خلاف کی کہ لطف آ گیا اور کہا کہ ''ہمارے دین کو برباد کرنا چاہتی ہے اور ہمارے قرآن کو ضائع کرنا چاہتی ہے۔ اس کو ہمارے مذہب میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہم اپنے قرآن پاک کی تعلیم کو کسی طرح ضائع نہ ہونے دیں گے۔ ناظرہ کا بھی استثناء کرنا ہوگا اور حفظ کا بھی استثناء کرنا ہوگا۔ چچا جان بہت ہی حیرت اور سوچ میں یہ سمجھے کہ راستہ میں کوئی گفتگو مجھ سے ہوئی ہوگی۔ غرض بہت زوردار جوش و خروش گورنمنٹ برطانیہ کو گالیاں دے کر اور ایک ریزولیشن قرآن پاک کی تعلیم خواہ حفظ کی ہو یا ناظرہ کی ہو جبریہ تعلیم سے مستثنیٰ ہونا نہایت ضروری ہے۔ تقریباً ڈیڑھ بجے تک جلسہ اور اس کے

بعد مختصر سا کھانا نوش فرما کر علی الصباح دیوبند تشریف لے آئے اور آکر بخاری کا سبق پڑھا دیا۔ بعد میں چچا جان نے مجھ سے پوچھا کہ تمہاری کوئی گفتگو ریل میں ہوئی ہوگی۔ میں نے کہا بالکل نہیں۔ دوسرا قصہ دوسرے حضرت کا بھی لکھواہی دوں اگرچہ بڑی گستاخیاں ہیں۔

چچا جان کا اصرار حضرت رائے پوری پر یہ رہتا تھا کہ دہلی تشریف آوری زیادہ ہوا کرے اور کئی دن کے واسطے ہوا کرے ایک دفعہ کچے گھر میں بیٹھے ہوئے حضرت سے چچا جان نے فرمایا کہ حضرت کی تشریف آوری تو دہلی خوب ہوتی ہے مگر جی چاہتا ہے کہ زیادہ دن کے لیے کثرت سے ہوا کرے۔ حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا کہ حضرت میری حاضری تو ان پر موقوف ہے یہ جب آئیں اور جب تک رہیں میں حاضر ہوں اکیلے آنا تو بہت مشکل ہے۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کو اپنا چچا جان ہونا یاد آگیا۔ خوب ناراض ہوئے فرمایا کہ اللہ کے بندے جب حضرت کا آنا اتنا آسان ہے تو پھر بھی اتنی دیر کیوں ہوتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ میرے چچا جان، میرے استاذ، میرے جانشین شیخ اور صنوالاب۔ یہ حضرت جی (حضرت رائے پوری) یوں کیوں نہیں فرماتے کہ جب آپ ارشاد فرمائیں میں حاضر ہوں یہ کیوں فرماتے ہیں کہ یہ جب کہے میں حاضر ہوں۔ اب دونوں بزرگ خاموش ہوگئے۔

تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد میں نے یوں کہا اجی چچا جان! بات یوں ہے اگر یہ یوں کہہ دیں کہ جب آپ فرمادیں گے تو آپ ابھی بگل بول دیں گے کہ کل کو چلیں گے اور میرا دستور یوں ہے اور یہ حضرت اس کی شہادت بھی دیں گے کہ جب مجھے دہلی جانا ہوتا ہے تو میں ان حضرات سے یہ عرض کرتا ہوں کہ دہلی کا خیال ہے بشرطیکہ کسی جلسے میں نہ جانا ہو۔ میرے اس کہنے پر اگر یہ حضرت یوں ارشاد فرمائیں کہ جی تو میرا بھی چاہ رہا ہے تب تو میں ان سے عرض کیا کرتا ہوں کہ کب کا ارادہ ہے اور آپس کے صلاح مشورے سے تاریخ مقرر ہو جاتی ہے۔ آپ کو اطلاع دی جاتی ہے اور میرے ارادے کے اظہار پر اگر یہ حضرت ارشاد فرمادیں کہ میرا بھی سلام عرض کر دینا اور دعاء کی درخواست کر دینا تو میں کبھی بھی ان سے چلنے کو نہیں کہتا۔ حضرت رائے پوری بہت ہی ہنسے اور چچا جان سے فرمایا کہ حضرت انہوں نے بالکل سچ سچ فرمایا ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں ضعیف آپ کے جنرلی احکام کا متحمل نہیں۔ چچا جان نے فرمایا کہ جلدی ہی تاریخ مقرر کرلو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کے سامنے نہیں ہوگی۔ چچا جان تشریف لے گئے میں نے حضرت رائے پوری سے عرض کیا کہ آپ نے تو مجھے پٹوا ہی دیا۔ اب آپ بے تکلف جس وقت راحت ہو اس وقت تجویز فرمادیں۔ چچا جان کے اس ارشاد کی کہ جلدی تاریخ مقرر کرلو کوئی پابندی نہیں ہے۔ الزام میرے اوپر رہے گا اور یاد پڑتا ہے کہ میں نے شعر بھی پڑھا تھا:

تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

حضرت نے فرمایا کہ تاریخ جلدی ہی مقرر کرلو حضرت دہلوی کو تو غصہ آرہا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت تو ایک ہی دن کے لیے تشریف لائے تھے شاید ادھر سے اُدھر جانے میں تکلیف ہو۔ دو چار دن ہفتہ عشرہ بعد جب دل چاہے مقرر فرمالیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جزاکم اللہ۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے سہولت شنبہ میں ہے کہ جمعہ یہاں کا ذرا اہم ہوتا ہے۔ فرمایا کہ بہت اچھا میں جمعہ کی شام کو شاہ صاحب کی کار میں آجاؤں گا۔ شنبہ کی تاریخ مقرر کرلو، چچا جان تو منتظر تھے میں نے عرض کیا کہ شنبہ کا دن مقرر ہوگیا۔ چچا جان بہت خوش ہوئے تین چار روز کے بعد واپسی کے وقت چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ میں تم کو سہارنپور تک پہنچانے چلوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ ہمارے اعزاز کی ضرورت نہیں۔ ریل سیدھی سہارنپور جائے گی، راستہ معلوم ہے تقریباً دس منٹ میں اس پر اُلجھا۔ حضرت رائے پوری نے بھی میری تائید فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ اب تو ملاقات ہوگئی۔ پندرہ بیس دن کے بعد تشریف لائیں میں بھی آپ کی ہمرکابی میں رائے پور آؤں گا۔ مگر انہوں نے قبول نہ فرمایا۔ شدید گرمی کا زمانہ تھا طے ہوا کہ صبح کو چھ بجے چلیں گے اور جب طے ہوگیا تو چچا جان نے فرمایا کہ راستہ میں میرٹھ اُترنا ہے۔

اب میں سمجھا کہ ان کے اصرار کا اصل مبنیٰ کیا تھا۔ حضرت اقدس (رائے پوری) نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ واہ واہ ضرور میرا بھی کئی دن سے جانے کو جی چاہ رہا ہے مگر ان کے (ناکارہ) کے بغیر جانے کی ہمت نہ پڑی اور ان سے کہنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ اس وقت بہت اچھا موقع ہے آپ بھی ہوں گے یہ بھی ہوں گے۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو اُتروں گا نہیں سیدھا سہارنپور جاؤں گا۔ آپ دونوں حضرات اس گاڑی سے اُتر کر دوسری گاڑی سے سہارنپور تشریف لے آئیں وہاں استقبال کروں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر تم نہیں اُترو گے تو میں بھی نہیں اُتروں گا۔ میں نے عرض کیا کہ چچا جان آپ کے ساتھ ہوں گے۔ چچا جان نے زور سے فرمایا کہ نہیں تم بھی اُترو گے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ حضرات کو میرٹھ گئے ہوئے بہت دن ہوگئے ہیں میں تو جاتا ہی رہتا ہوں اور آپ دونوں کے لیے میری کوئی پابندی بھی نہیں ہے۔ مگر چچا جان نے مجمع عمومیہ ایک ڈانٹ پلائی کہ نہیں چلنا ہے۔ میں ''قہر درویش بر جان درویش'' چپکا ہوگیا۔

حضرت میرٹھی وحضرت رائے پوری سے میری اور چچا کی تبلیغی سلسلہ میں گفتگو:

آٹھ بجے کے قریب میرٹھ پہنچے۔ حضرت میرٹھی نور اللہ مرقدہٗ اس قدر خوش ہوئے کہ کچھ حد و حساب نہیں اکابر کے ایک دوسرے کے یہاں مہمانی کے جو مناظر اُوپر لکھوا چکا ہوں اس سے بہت

زیادہ خوشی میں اچھل گئے اور دو گھنٹے میں اتنے لوازمات اکٹھے کیے کہ حیرت ہوگئی۔ حضرت رائے پوری کے لیے دو تین طرح کا سالن بے مرچ کا اور اس سیاہ کار کی چونکہ مرچیں اور گوشت ضرب المثل تھا اس لیے سیخ کے کباب گرم گرم دو تین مرتبہ منگائے گئے۔ شامی کباب گھر میں پکوائے گئے۔ میرٹھ کہ نہاری بھی بہت مشہور ہے وہ بازار سے منگا کر اور میری رعایت سے اس میں بہت سے مرچیں اور گھی ڈلوا کر خوب بھنوایا۔ ربڑی، بالائی، فیرنی، پلاؤ یہ سب چیزیں خوب یاد ہیں۔ گرمیوں کا چونکہ موسم تھا اور حضرت میرٹھی قدس سرہٗ کے زنانے مکان کے نیچے ایک تہ خانہ ہے نہایت ٹھنڈا۔ مولانا کو مکان بنانے کا بہت ہی سلیقہ تھا۔ بڑی بڑی جدتیں آتی تھیں۔ اس تہ خانہ کا ایک زینہ زنانے میں اور ایک مردانے میں اگر اس کو زنانہ کرنا ہے تو مردانہ زینہ بند کر دیا جاوے اور اگر مردانہ کرنا ہو تو زنانہ زینہ بند کر دیا جاتا ہے۔ مولانا نے اس میں خوب چھڑکاؤ کرایا تین چار پائیاں بچھوائیں اور خالی جگہ میں بوریا اس پر سپیتل پاٹی کا فرش بچھوایا اور کھانے سے فارغ ہو کر بہت خوشی خوشی ہم لوگ آگے آگے اور مولانا میرٹھی ہمارے پیچھے پیچھے تہ خانہ پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے چار پائیوں کا ارادہ کیا۔

لیکن مولانا نے چچا جان کو خطاب فرما کر کہا کہ حضرت مولانا آپ کی خدمت میں بہت دنوں سے کچھ عرض کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ میری وہاں حاضری نہ ہوئی اور آپ یہاں تشریف نہ لا سکے۔ اس وقت یہ دونوں حضرات بھی تشریف فرما ہیں مجھے کچھ عرض کرنا ہے تھوڑی دیر تکلیف فرما دیں۔ نشست اس طرح کہ میں اور حضرت رائے پوری ایک جانب اور چچا جان و حضرت میرٹھی برابر برابر دوسری جانب۔ حضرت میرٹھی نے عرض کیا کہ تبلیغ تو سر آنکھوں پر اس سے تو کسی کو انکار نہیں اس کے ضروری ہونے میں بھی اور مفید ہونے میں بھی مگر جتنا غلو آپ نے اختیار کر لیا یہ اکابر کے طرز کے بالکل خلاف ہے آپ کا اوڑھنا بچھانا سب تبلیغ ہی بن گیا۔ آپ کے یہاں نہ مدارس کی اہمیت نہ خانقاہوں کی۔ چچا جان کو غصہ آ گیا۔ فرمایا کہ جب ضروری آپ بھی سمجھتے ہیں تو آپ خود کیوں نہیں کرتے اور جب کوئی کرتا نہیں تو مجھے سب کے حصہ میں فرض کفایہ ادا کرنا ہے۔ غرض دونوں بزرگوں میں خوب تیز کلامی ہوگئی اور حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کو کچھ ایسا رنج و قلق ہوا کہ کانپنے لگے۔

میں نے چپکے سے حضرت رائے پوری کے کہنی مار کر (وہ دونوں اپنی تقریر میں تھے انہوں نے سنا بھی نہیں) کہا کہ ''میرٹھ اُتریں گے'' ''میرٹھ اُتریں گے'' دو دو تین تین سانس کے فصل سے یہ جملہ تین مرتبہ کہا۔ میں بھی چار پانچ منٹ خاموش بیٹھا رہا اور جب میں نے دیکھا کہ دونوں اکابر کا جوش ڈھیلا پڑ گیا تو میں نے عرض کیا کہ حضرت میں بھی کچھ عرض کروں تو تینوں حضرات نے متفق

اللسان ہوکر فرمایا کہ ضرور ضرور۔ حضرت رائے پوری نے فرمایا کہ اتنی دیر سے چپ بیٹھے رہے پہلے ہی سے بولتے۔ میں نے کہا کہ بڑوں کی باتوں میں سب کا چھوٹا کیا بولتا۔

میں نے حضرت میرٹھی کی طرف متوجہ ہوکر عرض کیا کہ حضرت آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ میں ان سب اشکالات میں آپ کے ساتھ ہی ہوں۔ اس لفظ پر چچا جان کو غصہ آ گیا۔ مگر بولے کچھ نہیں۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ کام کوئی دین کا ہو یا دنیا کا ہو تو چند مطلب بغیر نہیں ہوا کرتا۔ کام تو جو ہوتا ہے، یکسوئی سے اس کے پیچھے پڑ جانے سے ہوتا ہے۔ حضرت رائے پوری نے میری تائید کی کہ سچ فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ ذرا ٹھہر جایئے۔ اسی زمانے میں حضرت مرشدی سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کا ایک عتاب حضرت میرٹھی پر مدرسہ کے سلسلے میں ہو چکا تھا۔ جس کا حال مجھے اور مولانا میرٹھی کو صرف معلوم تھا اور کسی کو نہیں۔ میں نے کہا کہ حضرت کا یہ ارشاد آپ کو یاد نہیں رہا جو ابھی گزرا ہے کہ میرے ساتھ تعلق تو مدرسہ کے ساتھ تعلق ہے جس کو میرے مدرسہ کے ساتھ جتنا تعلق ہے اتنا ہی مجھ سے ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ساری دنیا میں ایک ہی مدرسہ ہے مظاہر علوم اس کے علاوہ اور کوئی مدرسہ نہیں؟ اور ابھی جلدی جلدی دو تین واقعے انہماک کے جس میں حضرت امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ کے وصال کا حادثہ اور بھی کئی قصے سنائے۔ میں نے کہا کہ حضرت! چچا جان اپنے اس حال میں مغلوب ہیں آپ کو بھی معلوم ہے اور ہم کو بھی اور کوئی کام بغیر غلبۂ حال کے نہیں ہوتا۔ خبر نہیں کیا بات کہ حضرت میرٹھی کو ایک دم ہنسی آ گئی اور میرے چچا جان بھی ہنس پڑے۔ بات کو بھی دونوں ختم کرنا چاہتے تھے۔ حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا کہ اسی وجہ سے تو (ناکارہ) آپ سے کہتے ہیں کہ آپ کو ہر جگہ لے جانے کی ہم کو اسی وجہ سے تو ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے حضرت میرٹھی سے عرض کیا کہ اتنے تو مال کھلا دیے میرے سے تو بیٹھنا مشکل ہو رہا ہے۔ اب آپ تشریف لے جاویں ہم کو آرام کرنے دیں، چنانچہ مولانا ایک دم اٹھ گئے۔ جب حضرت میرٹھی تشریف لے گئے تو میں نے دونوں بزرگوں سے عرض کیا کہ اسی وجہ سے تو خوشامد کر رہا تھا کہ سیدھے سیدھے چلے جاؤ۔ حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا کہ واقعی اگر آپ کی بات مان لیتے تو بہت ہی اچھا ہوتا۔ چچا جان نے فرمایا کہ نہیں بہت اچھا ہوا میں بھی ایک دفعہ کھل کر بات کرنے کو بہت دنوں سے سوچ رہا تھا۔ اس سے اچھا موقعہ نہیں ملتا تھا تمہارے اترنے پر میں نے اسی واسطے اصرار کیا تھا۔

ظہر کے لیے اٹھے تو پھر وہ ملاطفت اور انبساط اور شام کی چائے میں وہی فتوحات اور خندہ پیشانی۔ حضرت میرٹھی نے بھی چلتے وقت فرمایا کہ بہت ہی اچھا ہوا کہ تمہارے سامنے گفتگو ہو گئی کبیدگی پر اگر بات ختم ہوتی مجھے بھی قلق ہوتا۔ تیرے بول پڑنے سے خوشگواری پر ختم ہو گئی۔ یہ دو

نمونے تو میں نے چچا جان کے خواب کے اوران کے ارشاد بالا کے مثال میں دونوں اکابر حضرت مدنی حضرت رائے پوری کا ایک ایک قصہ لکھوادیا:

ورنہ با تو ماجرا ہا داشتیم:

چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے ڈانٹ کے علاوہ شفقتوں کے واقعات بھی **لا تعد ولا تحصی** ہیں۔ان کے یہاں تبلیغی سلسلہ میں بھی جب کوئی بات پیش آتی تو وہ بے تکلف فرمادیتے کہ شیخ کے یہاں جب تک پیش نہ ہو اس وقت تک فیصلہ نہیں کر سکتا۔میرے دہلی کے ہر سفر میں کئی کئی مسئلے ایسے ہوا کرتے تھے کہ جن کے متعلق میں سنتا تھا کہ وہ میرے مشورے اور منظوری پر رکے ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ میں حاضر ہوا تو چچا جان نے فرمایا کہ ہمارے دوستوں کا اصرار یہ ہے کہ تبلیغی جماعت جب گشت کے واسطے جائے تو ایک مختصر سا جھنڈا ان کے پاس ہونا چاہیے میں نے عرض کیا کہ بالکل نہیں۔فرمایا کہ کیوں؟ میں نے کہا کہ آپ کی جماعتیں تو نماز کے لیے بلانے جاتی ہیں اور مسجد میں جمع کرتی ہیں اور نماز کے لیے جھنڈا نصاریٰ رد ہو چکا ہے۔فرمایا کہ جزاکم اللہ بس بھائی ملتوی۔ایک معمول چچا جان قدس سرہٗ کا مستقل یہ تھا اور بڑی باریک بات ہے کہ وہ جب کسی تبلیغی اجتماع سے واپس آتے تو ایک سفر رائے پور ضرور فرماتے،ورنہ کم از کم سہارنپور کا اور اگر دونوں کا موقع نہ ہوتا تو تین دن اعتکاف اپنی مسجد میں فرمایا کرتے تھے اور یہ ارشاد فرمایا کرتے کہ جلسوں کے زمانے میں ہر وقت مجمع کے درمیان میں رہنے سے طبیعت اور قلب پر ایک تکدر پیدا ہو جاتا ہے،اس کے دھونے کے واسطے یہ کرتا ہوں۔میں یہ مضمون لکھوا رہا تھا کہ اتفاق سے مولانا منظور نعمانی زادمجدہم دیوبند سے تشریف لائے اور اس وقت تشریف فرما بھی ہیں۔انہوں نے فرمایا کہ یہ مضمون خود حضرت دہلوی کے ملفوظات میں خود ان کا ارشاد بلفظہ منقول ہے۔

چنانچہ چچا جان کے ملفوظات منگوائے گئے جس کے الفاظ یہ ہیں۔فرمایا ''مجھے جب میوات بھی جانا ہوتا ہے تو میں ہمیشہ اہلِ خیر اور اہلِ ذکر کے مجمع کے ساتھ جاتا ہوں۔پھر بھی عمومی اختلاط سے قلب کی حالت اس قدر متغیر ہو جاتی ہے کہ جب تک اعتکاف کے ذریعہ اسے غسل نہ دوں یا چند روز کے لیے سہارنپور یا رائے پور کے خاص مجمع اور خاص ماحول میں جا کر نہ رہوں قلب اپنی حالت پر نہیں آتا۔''

دوسروں سے کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ ''دین کے کام کے لیے پھرنے والوں کو چاہیے کہ گشت اور چلت پھرت کے طبعی اثرات کو خلوتوں کے ذکر وفکر کے ذریعہ دھویا کریں۔'' انتہی بلفظہ۔ مضمون تو یہ حدیث پاک سے بھی مستنبط ہے کہ مجمع کا اثر بڑوں کے قلب پر بھی پڑ جاتا ہے۔مشکوٰۃ

شریف کی کتاب الطہارۃ میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھا رہے تھے۔ اس میں سورۂ روم تلاوت فرمارہے تھے کہ اس میں تشابہ لگا سلام پھیرنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگ اچھی طرح وضو نہیں کرتے (نماز میں شریک ہو جاتے ہیں) اور یہ لوگ ہماری قراءت قرآن میں گڑبڑ پیدا کرتے ہیں۔ کذا فی المشکوٰۃ بروایۃ النسائی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر اچھی طرح وضو نہ کرنے والوں کا اثر پڑ جاتا ہے تو پھر مجمع کا اثر جس میں ہر قسم کے فاسق وفاجر بھی موجود ہوں مشائخ کے اوپر کیوں نہ پڑے گا۔ جن اکابر ومشائخ کو مجامع سے کام پڑتا ہو تبلیغ میں ہو جلسوں اور مواعظ میں ہو بلکہ میرے نزدیک تو مدرسین کو بھی۔ کیونکہ طلبہ کی جماعت میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اپنے تزکیۂ قلوب کی طرف بہت توجہ اہتمام اور فکر کرنا چاہیے۔ اعتکاف کا اہتمام تو ہر شخص کو بہت دشوار ہے، لیکن ایسے مجامع کے درمیان میں اور ان کے بعد بھی کچھ وقت مراقبہ اور تسبیح اور درود شریف واستغفار میں کثرت سے خرچ کرنا چاہیے۔

چچا جان کے مرض الوصال کے زمانہ میں یہ ناکارہ کثرت سے حاضر ہوتا تھا اور مدرسہ کے اسباق کی وجہ سے طویل قیام نہ ہوتا تھا۔ اس واسطے بار بار واپسی ہوتی۔ ایک دفعہ چچا جان نے شفقت اور قلق کے ساتھ یوں فرمایا میرے جنۃ کی خاطر اتنی تکلیف کرتے ہو جس سے مجھے بہت ہی ندامت ہوتی ہے۔ اگر میرے کام کی خاطر تم اتنی جلدی جلدی آؤ تو میرا دل کتنا خوش ہو۔ جب حالت مایوسی کی ہوگئی تو اس ناکارہ نے طویل قیام کیا اور یہ میرے رجسٹر میں موجود ہوگا کہ میری آخری حاضری کس تاریخ کو ہوئی اور وصال تک وہیں قیام رہا۔ اس وقت میں حضرت اقدس مولانا عبدالقادر صاحب بھی موجود تھے۔ جناب الحاج حافظ فخر الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی بھی جو ایک دو دن کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے تھے مگر حالت کو دیکھ کر دو تین ہفتہ وہیں تشریف فرمارہے۔

چچا جان کے مجازین اور عزیز یوسف کی جانشینی:

چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے سے مایوسی کی حالت میں وصال سے دو تین دن پہلے اس سیہ کار سے کہا کہ میرے آدمیوں میں چند لوگ صاحبِ نسبت ہیں۔ عزیز مولانا یوسف صاحب، قاری داؤد صاحب، سید رضا صاحب، مولانا انعام صاحب ان کے علاوہ حافظ مقبول صاحب اور مولوی احتشام صاحب کو اس سے پہلے اجازت ہو چکی تھی۔ چچا جان نے فرمایا میرے بعد ان میں سے کسی ایک کو مولانا رائے پوری کے مشورے سے بیعت کے لیے تجویز کردو۔ میری رائے حافظ مقبول

حسن صاحب کے متعلق تھی کہ ان کو بہت پہلے سے خلافت ملی تھی۔ مدینہ منورہ سے ان کی خلافت کے متعلق مجھے لکھا کہ تیری رائے موافق ہو تو ان کو اجازت دے دو۔ ورنہ میری واپسی کا انتظار کرو۔ مگر حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کی رائے عالی عزیز مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق تھی۔ میں نے حافظ مقبول کی وجہ ترجیح عرض کی اور یہ بھی کہا کہ عزیز یوسف نے ذکرو اذکار زیادہ نہیں کیے۔ حضرت کا مشہور جملہ جو بارہا انہوں نے فرمایا کہ تم لوگوں کی ابتداء وہاں سے ہوتی ہے جہاں ہم جیسوں کی انتہاء ہوتی ہے۔ اس جملہ کو ارشاد فرما کر ارشاد فرمایا کہا ان کو اذکار ضرورت نہیں۔ میں نے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے پوری بات عرض کر دی۔ چچا جان نے حضرت اقدس رائے پوری کی تصویب کرتے ہوئے فرمایا کہ میرا بھی یہی خیال تھا کہ میوات والے جتنے یوسف پر جمع ہو سکتے ہیں کسی اور پر نہ ہوں گے۔ میں نے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کی طرف سے ایک پرچہ لکھا کہ میں ان لوگوں کو بیعت کی اجازت دیتا ہوں۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے میری تحریر کے بیچ میں ''میں ان لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اجازت دیتا ہوں'' یہ جملہ بڑھوا دیا۔ مشائخ کے ہاں ایک نسبت خاصہ ہوتی ہے جو شیخ کے انتقال پر کسی ایک کی طرف جو شیخ سے زیادہ نسبت اتحادیہ رکھتا ہو اس کی طرف منتقل ہوا کرتی ہے۔

چچا جان قدس سرہٗ کے انتقال پر مولانا ظفر احمد صاحب نے ارشاد فرمایا کہ حضرت دہلوی کی نسبت خاصہ میری طرف منتقل ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ اللہ مبارک فرمائے۔ حضرت حافظ فخر الدین صاحب نے مجھ سے تو نہیں فرمایا مگر سنا کسی سے فرمایا تھا کہ میری طرف منتقل ہوئی۔ جب مجھ تک یہ فقرہ پہنچا تو میں نے کہا کہ اللہ مبارک فرمائے۔ حضرت اقدس رائے پوری کا رمضان مبارک میں یعنی چچا جان کے انتقال سے دو ماہ بعد رائے پور سے ایک والا نامہ آیا، جس میں حضرت قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا کہ حضرت دہلوی کی نسبت خاصہ کے متعلق مختلف روایات سُننے میں آئیں۔ میرا خیال تمہارے متعلق تھا، مگر میری کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ اب حضرت حافظ فخر الدین صاحب کا والا نامہ آیا ہے، جس میں انہوں نے بڑے زور سے میرے خیال کی تائید لکھی ہے۔ اس لیے میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں، میں نے اسی وقت جواب لکھا کہ ''حضرت آپ حضرات نہ معلوم کہاں ہیں وہ تو لونڈا لے اُڑا۔''

شوال میں جب حسب معمول عید کے بعد رائے پور حاضری ہوئی تو عزیز مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی میرے ساتھ تھے۔ حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا کہ رمضان میں تو میں نے آپ کے خط کو تواضع پر محمول کیا تھا، لیکن اب تو مولانا یوسف کو دیکھ کر آپ کی بات کی تصدیق کرنی پڑی۔ آپ نے بالکل سچ اور صحیح فرمایا۔ اب اس میں بالکل تردد نہ رہا۔ چچا جان کی

بیماری میں بھی عزیز یوسف مرحوم اکثر نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔ لیکن چچا جان کے انتقال کے بعد صبح کی نماز جو اس نے پڑھائی ہے میرا دل تو اسی نے کھینچ لیا تھا اور میں اسی وقت سمجھ گیا کہ الوداعی معانقہ بیٹے کو دے گئے۔ ہوا یہ تھا کہ انتقال کے وقت بلکہ نزع شروع ہونے کے وقت چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے عزیز مولانا یوسف صاحب کو بلایا جو سو رہے تھے اور انتقال صبح اذان سے کچھ پہلے ہوا تھا اور بلا کر یوں فرمایا تھا کہ ''آ یوسف لپٹ لے ہم تو جا رہے ہیں۔'' وہ چچا جان کے سینے پر گر گیا اور بندہ کے خیال میں اسی وقت القائی کا القاء ہوا تھا۔ واللہ اعلم۔

تحدیث بالنعمۃ کے سلسلہ میں چند واقعات:

اس باب میں بہت کچھ لکھوانے کو جی چاہتا تھا۔ مگر ان میں خود ستائی بھی بہت ہی ہے اور صرف اکابر کی شفقتوں پر ہی قناعت کر لی۔ البتہ دوستوں کا اصرار ہے کہ ایک واقعہ اور تحدیث بالنعمۃ کے ذیل میں لکھوا دوں۔ یہ تو بیسیوں واقعات سے معلوم ہو چکا بالخصوص آپ بیتی نمبر۱ میں بھی کہ اس ناکارہ کی زندگی والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی حیات میں سخت ترین مجرم قیدیوں کی سی گزری۔ کہیں آنے جانے کی بغیر والد صاحب یا چچا جان نور اللہ مرقدہما کے اجازت نہ تھی۔

چچا زکریا مرحوم کی شادی اور اس میں بندہ کی شرکت اور وہاں کے دو لطیفے:

قطب عالم حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے سب سے چھوٹے نواسے چچا زکریا مرحوم جو مع اپنے اہل و عیال کے ۴۷ء کے فسادات میں غالباً غازی آباد کے اسٹیشن پر شہید کر دیے گئے تھے۔ ان کا نکاح حافظ ابراہیم صاحب گنگوہی کی صاحبزادی سے تجویز ہوا۔ حافظ ابراہیم صاحب اس وقت میں کھنہ جو سرہند شریف سے آگے ہے وہاں تھانیدار تھے۔ ان کے اہل و عیال بھی سب وہیں رہتے تھے۔ وہاں بارات گئی۔ حضرت قطب عالم کے سب سے بڑے نواسے چچا یعقوب صاحب کا اصرار ہوا کہ وہ مجھے بھی بارات میں ساتھ لے کر جائیں والد صاحب نے بھی تھوڑے سے اصرار کے بعد نواسوں کی خوشنودی کی بناء پر اس شرط پر اجازت دی کہ میں ہر وقت ان کے ساتھ رہوں۔ ان کو میرے والد صاحب کا میرے ساتھ کا برتاؤ پہلے سے معلوم تھا۔ انہوں نے بہت زور سے شرط قبول کر لی اور اس کو بہت اہتمام سے ہر جگہ پر نبھایا بھی۔ وہ ہر وقت مجھے اپنے ساتھ رکھتے۔ ان کو پیدل چلنے کا بہت شوق تھا۔ کھنہ کے اسٹیشن سے سب لوگ تو سواریوں میں گئے اور چچا یعقوب مجھے اپنے ساتھ پیدل لے کر گئے۔

پہلا لطیفہ تو وہاں یہ ہوا کہ ایک جگہ پہنچ کر دو سپاہی بندوق لگائے ہوئے تلوار ہاتھ میں لیے دور کھڑے تھے۔ معمولی سی روشنی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر ان دونوں نے کہا کہ ہُو ہُو ہُو۔ حافظ ابراہیم

صاحب بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے بھی اس طرح جواب دیا۔ اس پر ان دونوں نے جھک کر سلام کیا اور ایک طرف کو ہو گئے۔ میں نے چچا یعقوب صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا بلا تھی؟ انہوں نے کہا کہ یہاں سے تھانہ شروع ہو گیا ہے۔ یہ پہرے دار ہیں، انہوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے اس کا جواب دیا کہ میں داروغہ ہوں۔ انگریزی تو چچا یعقوب بھی نہیں جانتے تھے۔ بظاہر موقع و محل سے وہ سمجھے۔ حافظ ابراہیم صاحب نے بتایا کہ یہاں رات میں آنے والوں سے سوال کیا جاتا ہے کہ کون ہے اور اگر وہ صحیح جواب نہ دے تو دوسری مرتبہ کہا جاتا ہے کہ اپنی جگہ کھڑے رہو۔ اگر وہ کھڑا ہو جائے تو وہ لوگ اس سے تحقیق کرتے ہیں کہ کون ہے، کیوں آیا ہے۔ لیکن اگر دوسری دفعہ بھی جواب نہ دے تو ان لوگوں کو گولی مار دینے کی اجازت ہے۔

سرہند شریف کے مزار پر حاضری:

ہم جب کھنہ پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ ان سب لوگوں نے تو کھانا کھایا اور معلوم نہیں کب سوئے۔ مگر میں جاتے ہی بغیر کھائے پڑ کر سو گیا۔ ایک دن دو شب قیام رہا۔ تیسرے دن وہاں سے مع دلہن کے واپسی ہوئی۔ میں تو چچا یعقوب صاحب کے ساتھ لٹکم تھا۔ میرا ٹکٹ بھی ان ہی کے پاس تھا۔ سرہند شریف آنے کے بعد مجھے بالکل خبر نہیں، نہ یاد کہ میں ریل سے کس طرح اُترا۔ بغیر ٹکٹ کے مجھے پلیٹ فارم سے بابو نے کیسے نکلنے دیا۔ میں نے تھوڑی دیر میں اپنے آپ کو روضۂ شریف کے پاس پایا۔ روضہ شریف کے پاس ایک سکھ کی دوکان پر گوشت روٹی فروخت ہو رہی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ چار پیسے میرے پاس تھے۔ میں نے کھانا خریدنے کا اس سے بہت ہی اصرار کیا۔ مگر جتنا اصرار کیا اتنی ہی شدت سے وہ انکار کرتا رہا۔ چونکہ اس کے منہ پر ڈاڑھی تھی اس لیے مجھے اس پر غیر مسلم ہونے کا شبہ بھی نہ ہوا اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ سکھوں کے ڈاڑھی ہوتی ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ سکھ تھا اور اس کے پاس جھٹکے کا گوشت تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے احسان سے حفاظت فرمائی۔

دن بھر روضہ کی پشت کی طرف جو جالیاں تھیں وہاں رہا۔ شام کے وقت وہاں سے چل کر اسٹیشن آیا اور اخیر شب میں سہارنپور پہنچا۔ معلوم نہیں کہ روضہ سے اسٹیشن تک بغیر پیسے میں کیسے آیا۔ یکہ (گھوڑا تانگہ) میں آنا تو خوب یاد ہے، نہ تو وہاں کے اسٹیشن پر مجھ سے کسی نے ٹکٹ کا مطالبہ کیا اور نہ سہارنپور کے اسٹیشن پر۔ چچا یعقوب اور سارے ساتھیوں پر میری گمشدگی کی وجہ سے کیا گزری اور یہاں پہنچ کر میرے والدین پر کیا گزری یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ بلکہ ظاہر ہے، یہاں پہنچنے کے بعد میرا خیال تھا کہ خوب پٹائی ہوگی، مگر جب میں والد صاحب کے سامنے آیا اور انہوں نے بہت

غصہ کی آواز سے پوچھا کہ تو کہاں رہ گیا تھا اور میں نے قصہ سنایا کہ مجھے تو خبر نہیں۔ میں تو ریل میں تھا مجھے ریل سے اُترنا یاد ہے اور نہ میں سرہند کے راستوں سے واقف۔ میں نے تو اپنے آپ کو اسٹیشن اور ریل کے بعد مزار پر پایا۔ یہ اس سیہ کار کی سب سے پہلی حاضری تھی اس کے بعد دوسری حاضری غالباً اعلیٰ حضرت رائے پوری کے حالات میں لکھوا چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے احسانات تو لاکھوں ہیں کتنے شمار کرائے جائیں۔

ایک قصہ اور یاد آیا معلوم نہیں کہ پہلے کہیں لکھوا تو نہیں چکا۔ اس لیے کہ بہت سے واقعات تو علی گڑھ میں لکھوائے گئے۔ واپسی کے بعد ان کے سننے میں اور چیزیں بھی اضافہ ہوتی رہیں۔ یہ ناکارہ اپنی نالائقی سے حضرت مرشدی قدس سرہٗ کو لینے کے لیے اسٹیشن نہیں جایا کرتا تھا حرج کا بہانہ نفس وشیطان پڑھاتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت رنگون سے تشریف لا رہے تھے۔ یہ ناکارہ ایک ضرورت سے پٹھان پورہ گیا ہوا تھا۔ وہ اسٹیشن کے قریب تھا مجھے یاد آیا کہ حضرت کی تشریف آوری ہو رہی ہے اور کبھی اسٹیشن پر حاضری کی توفیق نہیں ہوتی۔ گاڑی کا وقت قریب تھا اور پیسہ جیب میں ڈالنے کی عادت والد صاحب نے ڈالی ہی نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ اسٹیشن پر بہت سے خدام ملیں گے کسی سے کہہ دوں گا کہ میرا بھی پلیٹ فارم لے لے۔ مگر جب میں اسٹیشن پر پہنچا تو گاڑی کا وقت بالکل قریب تھا اور سب خدام استقبال کے لیے اندر پلیٹ فارم پر پہنچ چکے تھے۔

قرض پلیٹ فارم ٹکٹ خریدنا:

میں ٹکٹ گھر کے قریب پہنچا اور وہاں کے بابو سے کہا کہ پیسہ میرے پاس اس وقت نہیں ہے۔ اگر آپ بطور قرض پلیٹ فارم دے سکتے ہوں تو دے دیں اس نے کھٹک کر کے فوراً ایک پلیٹ فارم میرے حوالہ کر دیا۔ میں اندر جو پہنچا تو سب سے پہلے مولانا منظور احمد خان صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مدرس مدرسہ مظاہر علوم سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ چار پیسے جیب میں ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ بہت۔ میں نے کہا آپ کو تکلیف تو ہوگی آپ بابو صاحب کو چار پیسے دے آئیں اور ان کا شکریہ بھی ادا کر دیں۔ میں پلیٹ فارم قرض لے کر آیا ہوں۔ مولوی صاحب مرحوم نے فرمایا کہ آپ کیوں میرا مذاق اُڑاتے ہو، کہیں پلیٹ فارم بھی قرض مل سکتا ہے؟ میں نے کہا کہ ملا تو نہیں کرتا لیکن جس کا سارا کاروبار قرض پر چلتا ہو اس کو مل جاتا ہے۔ انہوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ تو میں نے کہا کہ لاؤ مجھے چار پیسے دو گاڑی آنے والی ہے۔ کہنے لگے کہ ہاں تم کو دے دوں گا اور جب میں پیسے لے کر ٹکٹ گھر کی طرف چلا تو وہ میرے پیچھے بہت تیزی سے ٹکٹ گھر کی طرف چلے اور جا کر اس سے پوچھا کہ کوئی شخص تم سے قرض پلیٹ فارم لے گیا ہے۔ اس نے کہا

ہاں لے گیا ہے مولوی صاحب نے اس سے پوچھا کہ قرض بھی پلیٹ فارم مل سکتا ہے۔اس نے کہا ملتا تو نہیں۔مگر اس کی صورت کہہ رہی تھی وہ دھوکا نہیں کر رہا۔ہمیں بھی یہ امور اکثر پیش آجاتے ہیں۔ہم سمجھتے ہیں کہ جیب میں پیسے ہیں۔مگر جیب میں ہاتھ ڈالیں تو خیال غلط نکلتا ہے۔لہٰذا یہ کوئی ایسی بات نہیں۔میری وجہ سے مولانا مرحوم کی گاڑی بھی چھوٹ جاتی جس کا مجھے قلق ہو رہا تھا۔کیونکہ جب میں اسٹیشن پہنچا تو گاڑی سامنے آچکی تھی۔مگر اللہ کے احسانات کا کیا پوچھنا کہ عین اسٹیشن کے قریب آخری سگنل نہیں دیا گیا اور جب مولانا منظور احمد صاحب پل پر پار ہو کر آخری پلیٹ فارم پر پہنچ گئے تب گاڑی کا سگنل ہوا اور گاڑی اندر آ گئی۔

بسم اللہ الرَّحمٰن الرَّحیم

نحمدهٗ و نصلی علی رسوله الکریم

امابعد! یہ ناکارہ سفرِ حجاز کی وجہ سے رسالہ کو ختم کر چکا تھا اور اس کے بعد اپنا دستی بیگ کہ وہی ہر سال سفرِ حجاز میں میرے ساتھ رہا کرتا ہے اس نیت سے اٹھوایا کہ اس میں کوئی چیز رکھنی ہو یا نکالنی ہو۔کیونکہ گزشتہ سال سفر سے واپسی کے بعد سے اس کو دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔اس وقت جو دیکھا تو اس مرتبہ اس میں ایک لفافہ ملا جو ۸۳ھ کے حج میں جاتے ہوئے بندہ نے رکھا تھا۔اس کے بعد کئی مرتبہ مکہ مکرمہ میں حاضری ہوئی اور ان خطوط کی زیارت بھی ہوئی۔مگر چونکہ دو سال سے نزولِ آب تھا اس وجہ سے نہ یہ خطوط ذہن میں رہے اور نہ اس کی زیارت ہو سکی۔اس وقت میرے دوستوں نے جب اس بیگ کو کھولا اور زائد کاغذات نکال کر ضروری کاغذات رکھے تو یہ لفافہ مجھے بتایا گیا اس کو سن کر مجھے بہت قلق ہوا۔اگر پہلے اس کا علم ہوتا تو ان خطوط کو اپنے مواقع پر درج کراتا۔اب عجلت میں اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ میں ان خطوط کی نقل اپنے دوستوں کو دیتا جاؤں کہ ابواب التحدیث بالنعمۃ کے ختم پر ان کو یکجائی نقل کر دیں کہ ہر ایک ان میں سے تحدیث بالنعمۃ ہے۔گو ہر ایک مختلف ابواب کے ہیں۔اس لفافہ میں بعض اکابر کے علاوہ ایک خط عزیز ماجد سلمہ کا بھی ملا جو تحدیث بالنعمۃ کا جزء ہے،اس کو بھی آخر میں نقل کر دیا۔

مکتوب نمبر۱:

حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ

از مکہ معظمہ حارۃ الباب

مورخہ: ۲۵، جمادی الاول ۱۳۱۱ھ

از فقیر امداد اللہ عفی عنہٗ بخدمت سراپا جود وسخا حامی شریعت وطریقت جناب نواب (نواب چھتاری مرحوم ۱۲) محمد محمود علی خان صاحب متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

جب سے آپ تشریف لے گئے ہیں دل کو بہت قلق ہے۔ امید ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ آپ مع الخیر والعافیت اپنے وطن پہنچ کر اپنے فرزندان وعزیزان واقارب کے دیدار سے مسرور وشادکام ہوئے ہوں گے۔ آپ بہت جلد اپنے مزاج مبارک کی خیریت وحالات سفر ودیگر حالات سے سرفراز فرمائیں۔ چونکہ فقیر کو آپ سے محبت للہ ہے اور (الدین النصیحۃ) بڑی خیر خواہی دین کی ہے۔ اس لیے خیر خواہانہ تحریر ہوتا ہے۔ آپ اپنی ریاست کا انتظام اور حق داروں کے ادائے حقوق کا بندوبست اس طرح سے کرکے یہاں تشریف لائیں کہ آپ کو کچھ تشویش نہ رہے۔ کیونکہ جب تک قلب تعلقات وتشویشاتِ دنیاوی میں مشغول رہے گا عبادت وطاعت کی لذت وحلاوت ہرگز نہ ملے گی۔ بلکہ جب تک دل ماسوا اللہ سے پاک وصاف نہ ہوگا تب تک نہ سچی توحید حاصل ہوگی اور نہ جمالِ مبارک حق آئینہ دل میں مشاہدہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے بندے کو ایک ہی قلب مخصوص اپنے واسطے عطاء کیا ہے کوئی دوسرا دل نہیں ہے کہ اس میں دوسرے تعلقات ومشاغل کو جگہ ہو۔ حرمین شریفین میں دل کو امور ومشاغل ہند میں مشغول رکھنا اس سے بہتر یہ ہے کہ ہند میں رہ کر دل کو حرمین شریفین کی طرف متوجہ رکھنا، کیونکہ حقیقت ہجرۃ قلب سے ہے۔ اگر قلب ہند میں رہا اور صرف ظاہری جسم حرمین شریفین میں رہا تو یہ ہجرۃ حقیقی نہ ہوئی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عمل معتبر قلب کا ہے ''ان اللّٰہ تعالیٰ ینظر الیٰ قلوبکم ولا ینظر الیٰ صورکم''۔ اصلی ہجرت تو یہ ہے کہ اللہ کے واسطے اللہ کے سوا سب کو چھوڑ کر صرف اللہ کا ہو رہے اگر یہ نہ ہو سکے تو اس قدر ضرور ہے کہ آپ کو اور اپنی اولاد واموال وریاست اور سب کاموں کو اللہ کی وکالت کے سپرد کرکے خود تدبیر وبندوبست سے فارغ ہو جائے جب اللہ قادر رحیم وکریم وعلیم کو اپنا وکیل وکارساز بنا دیا تو بندۂ عاجز کسی کا محتاج نہ رہے گا۔ جب تک اللہ ورسول کی محبت سب چیزوں پر غالب نہ ہوگی اور امورِ دینی امورِ دنیا پر یعنی باقی فانی پر غالب نہ ہو جائیں گے تب تک بندہ کا ایمان پورا نہیں ہونے کا۔ مسلمان کو کامل مسلمان ہونے کی کوشش وفکر تو سب پر مقدم وفرض ہے، پس اپنے متعلق کوئی

جھگڑا وتعلق دنیاوی نہ رکھیں۔ جب سب اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیے اور دنیا پر عقبیٰ کو مقدم کردیا تو سب کام درست وٹھیک ہوگئے۔ دنیا فانی بگڑی تو کیا اور بنی تو کیا۔ جب اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیا تو ہرگز نہ بگڑے گی۔ عقبیٰ ودین کی درستی ہوگی تو ہفت اقلیم کی سلطنت بھی اس کے نزدیک بے حقیقت ہے۔ حضرت مولانا روم فرماتے ہیں:

عشق برمردہ نباشد پائیدار عشق رابر حق وبرقیوم دار

اللہ تعالیٰ کے سوا سب فانی ہے اور عشق باقی باقی ہے۔ یا اللہ فانی کی محبت یعنی اولا دو اموال کی محبت اللہ حی وقیوم کی محبت سے ہم سب کو نہ روکے۔ پس مکہ اور مدینہ میں رہنے کا لطف جب ہی ہے کہ دل سب سے فارغ وخالی ہو۔ بہت علوم پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں جب عمل نہ ہو۔ نقل ہے کہ امام ابو یوسف صاحب نے حضرت ابراہیم قدس سرہٗ سے کہا کہ درویشی کے واسطے علوم کا سیکھنا ضروری ہے تو آپ نے جواب دیا کہ میں نے ایک حدیث سنی ہے (حب الدنیا راس کل خطیئة) جب اس حدیث پر عمل کرلوں تو اور علم سیکھوں۔ ہدایت کے واسطے ایک آیت ایک حدیث کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو توفیق عمل عطاء فرمائیں اور اپنی رضامندی پر چلائیں اور ماریں حقیقت میں اس حدیث پر عمل ہوجائے تو انسان مقبول خدا ہوجائے۔

صفات ذمائم جو مہلکات ہیں مثل طمع، حرص، حسد، کینہ، عداوت، غضب کبر بخل وغیرہ سب حب دنیا سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایسا ہی صفات حمیدہ مثل صبر وتوکل ورضا وقناعت وتواضع وسخاوت وحلم وغیرہ سب ترک حب دنیا سے حاصل ہوتے ہیں۔ اولاد کے برابر عزیز اور والدین کے برابر شفیق و مہربان کوئی نہیں مگر اس حب دنیا کی وجہ سے آپس میں مخالفت وعداوت ہوجاتی ہے اور جب حب دنیا ہی نہیں رہی تو سارے جہاں کے غیر عزیز دوست ہوجاتے ہیں (اللّٰھم اجعلنا منھم)۔ ایک بات ضروری یہ ہے کہ دادودہش کا جھگڑا بھی اپنے ساتھ نہ ہو تو بہتر ہے۔ بلکہ کل مد صدقات خیرات بھی متعلق ریاست کردی جائے۔ بندہ کو اپنے آپ کو اپنے جسم وروح کو اللہ تعالیٰ کو دے دینا یہ ہی حقیقی سخاوت وجوادی ہے۔ جب اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کو دے دیا تو اب کوئی جود وسخاوت باقی نہ رہی۔ اب اس کو لاکھ وکروڑ روزانہ خرچ کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ اہل اللہ کے برابر کوئی جواد وسخی نہیں ہوسکتا۔ فقیر کی یہ بھی صلاح نہ ہوتی کہ آپ اپنے مصارف کے واسطے کچھ ریاست مقرر کرلیں۔ لیکن چونکہ ساری عمر نظر اسباب پر رہی اس لیے اس بارے میں فقیر کچھ نہیں کہتا آپ اپنے نفس سے زیادہ واقف ہیں کیونکہ درویشی میں یہ بڑا شرک ہے کہ رہے تو باب اللہ وباب الرسول پر اور رزق مانگے ہندوستان سے۔ کسی امیر کے دروازہ پر ہی کسی دوسرے سے مانگ کر کھانا امیر کی غیرت وغصہ کا سبب ہے یہ کوئی بڑے درجات ومراتب کی بات نہیں بلکہ کمال ایمان اور کمال ادب کی بات ہے۔

پس آپ صرف اپنے ضروری خرچ کے سوا زیادہ مقرر نہ کریں کہ لوگ آپ کی تضیع اوقات اور تشویش کے باعث ہوں۔ بڑی خرابی امراء اور رئیسوں کی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ انہوں نے مشورہ لینے کی سنت کو اپنی کج فہمی سے ترک کر دیا۔ مسلمانوں کی تعلیم کے واسطے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" تاکید فرمائی ہے۔ نصرانیوں نے اس حدیث پر اس درجہ عمل کیا کہ ہزاروں قسم کی مجلسیں مقرر کیں ہر اخبار اور ہر رعیت کو رائے دینے کا مجاز کیا۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہے ان کو بھی معلوم ہے۔ مسلمانوں کو خبط ہے کہ جب ہم دوسروں سے رائے لیں گے تو ہم کو لوگ کم عقل سمجھیں گے۔ ہماری حکومت میں شریک ہو جائیں گے یا تکبر سے کسی کو مشورہ کے قابل نہیں سمجھتے۔ غرض کہ اس قسم کے بیسیوں خبط ہیں۔ پس اپنے خیر خواہوں سے مشورہ کر کے اپنے سب کاموں کا انتظام وانصرام بخوبی کر کے تشریف لائیں۔ اگرچہ پانچ چار مہینہ زیادہ ہی توقف کرنا پڑے تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ ادھورا کام چھوڑ کر آنے میں پھر ویسے ہی تشویش وتردد رہے گی۔ زمانہ میں عقل کے ساتھ دیانت دار کمیاب ہیں۔ اگر ایسے لوگ مل جائیں تو اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کرنا چاہیے اور ایسے آدمی کی بہت قدر کرنی چاہیے "لا یشکر اللّٰہ من لا یشکر الناس" خود اللہ تعالیٰ شاکر و مشکور ہے۔ ہر شخص کی استعداد واعمال کے مطابق برتاؤ فرماتا ہے۔ نیکوں کو ہر ایک نیکی کے بدلے دس سے کم نہیں زیادہ کہ انتہاء نہیں عنایت کرتا ہے اور برائی کا بدلہ ایک برائی خود فرماتا ہے "افمن کان مؤمنا کمن کان فاسقا لایستوون" اس مسئلہ پر بھی فرنگیوں نے ایسا عمل کیا کہ جیسا چاہیں ادنیٰ ملازم یا ادنیٰ رعیت کچھ اچھا کام کرتی ہے تو اس کا کیسا شکر کرتے ہیں۔ اگر ملازم ہے تو ہمیشہ اس کی کارگزاری کی کتاب میں تعریف وتوصیف لکھتے ہیں اور اس کی خدمت کے لائق برابر ترقی کرتے ہیں حتیٰ کہ بعض وقت دس روپیہ والے کی ترقی ہزار دو ہزار تک ہو جاتی ہے ویسا ہی بذریعہ خطاب وغیرہ کے ملازم ورعایا کی عزت کرتے ہیں۔ اس سے اس کی دیانت وہمت بڑھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر دیانت دار اور غیر دیانت دار کے ساتھ ایک سا سلوک ہوگا تو دیانت دار کی ہمت اس کی خیر خواہی کی طرف سے سست ہو جائے گی۔ پھر تو سب کام خراب ہو جائیں گے۔

مسلمان رئیسوں کی زیادہ خرابی اس سے ہوئی کہ انہوں نے اہل نا اہل میں تمیز نہ کی اور بہت رئیسوں نے جان بھی لیا کہ فلاں شخص عاقل دیانت دار ہے مگر تکبر یا بد عقلی کی وجہ سے اس کی قدر نہیں کرتے۔

بعضوں کو یہ خبط ہے کہ اگر ہم اس کی تعریف کریں گے یا ترقی کریں گے تو یہ خراب ہو جائیں گے۔ نعوذ باللہ اپنی عقل کو اسرار شریعت سے بھی بڑھ کر سمجھنے لگے۔ فقیر نے بار بار دیکھا کہ دیانت

دار کو خائن خود رئیس کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ملازم نے اپنے اوقات کو تو اپنے آقا کے ہاتھ اپنی رفع حوائج کے واسطے بیچ ڈالا۔ جب آقا کو اپنے ملازم کی حاجات وضروریات کا خیال نہ ہوگا۔ مثلاً اس کی حیثیت کو موافق اس کی رفع حاجت پچاس میں ہو اور وہ پچیس دے تو وہ ملازم اور حاجتوں کو کہاں سے پورا کرے۔ آخر وہ خیانت کی طرف مجبور ہوگا۔ پس اس میں اللہ اور رسول کے قانون کے موافق کاروائی ہونے سے سب امور ٹھیک ہوتے ہیں۔

عزیزم مولوی منور علی صاحب سلمہ کو ان کے مکان پر بتاکید بھیج دیجئے اور عزیز مولوی رشید احمد صاحب سلمہٗ یا دیگر برادران طریقت سے جیسے عزیزم مولوی محمد انوار اللہ صاحب وغیرہ سے آپ ملیں تو بہت خوب ہے۔ آپس میں ملنے سے اپنی جماعت میں محبت واتحاد واتفاق کی ترقی ہوتی ہے۔ آپ بھی کوشش وہمت کریں کہ فقیر کی جماعت علماء میں موافقت واتحاد کی ترقی ہو للہیہ محبت کی فضیلت کا کچھ حد وحساب نہیں۔ آپ کی رباط شامیہ میں چند دنوں سے پانی اور روشنی موقوف ہے۔ حالانکہ آپ کی طرف سے بہت جگہوں پر بڑی فیاضی سے سبیل وغیرہ جاری ہے۔ یہاں پانی دینا اور جگہوں سے افضل ہے۔ انتظام کے وقت قاری احمد صاحب کے مدرسہ کا بھی خیال رہے بلکہ حرمین شریفین میں جن جن کا مقرر ہے ان سب کو متعلق ریاست کر دیجئے کہ سب کو وہیں سے آجائے، آپ کو کوئی طلب وتقاضا کرنے میں تشویش میں نہ ڈالے۔ فقط

مکتوب نمبر۲:

حضرت اقدس قطب عالم مولانا گنگوہی

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہٗ۔ بعد سلام مسنون

آنکہ بندہ بخیریت ہے۔ آپ کے خط سے حال دریافت ہوا۔ عرصہ کے بعد آپ کا خط آیا۔ مجھے آپ کے لیے دعائے خیر سے کیا دریغ ہے۔ آپ لکھیں یا نہ لکھیں میں اپنے احباب و متعلقین کے لیے ہمیشہ دستِ بہ دعاء رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آپ کو شاید پہلے بھی کسی وقت لکھا گیا ہو اب پھر تحریر ہے کہ آپ بعد نماز عشاء سو بار ”حسبنا اللّٰہ و نعم الوکیل“ پڑھ لیا کریں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں وہی سب کا کفیل اور کارساز ہے۔ فقط والسلام

از بندہ محمد یحیٰ السلام علیکم

آپ کی تشویش سے تشویش ہے۔ داموں کا کچھ تقاضا نہیں ہے۔ مگر اپنی عملداری میں ان دو پرچوں کی کافی تشہیر فرمادیں۔ فقط والسلام

مکتوب نمبر۳:

از بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہٗ

بعد سلام مسنون، آنکہ بندہ بخیریت ہے۔

مژدۂ عافیت باعث طمانیت ہوا۔ میں دعاء گو ہوں، دعائے خیر کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ چونکہ نجات اور فلاح بجز اتباع سنت کے میسر و نصیب نہیں ہے۔ اس لیے اتباع سنت سے چارہ نہیں ہے۔ اسی لیے بیعت کی جاتی ہے اور اسی واسطے تحصیل علم ہے۔ جب یہ نہیں ہے تو سب ہیچ اور بے فائدہ ہیں۔ زیادہ اس بارے میں لکھنے کی حاجت نہیں۔ ''اطیعو اللّٰہ و اطیعو االرسول'' اور ''فاتبعونی یحببکم اللّٰہ'' خود وارد ہوا ہے۔ فقط والسلام

از کاتب الحروف یحییٰ عفی عنہٗ بعد سلام مسنون

گزارش آنکہ یہ اشتہار دو چار کی نظر سے گزار دیں۔ اس میں تعلیم الدین، امداد السلوک، اتمام النعم، جزاء الاعمال نہایت مفید ہیں اور ہر شخص کے دیکھنے کے قابل ہے۔ فقط والسلام،

۱۷رذوالقعدہ ۱۸ھ

مکتوب نمبر۴:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی

بسم اللّٰہ الرّحمن الرّحیم

کم ترین خلائق محمد قاسم مولوی احمد حسن صاحب کی خدمت میں بعد سلام مسنون عرض پرداز ہے کہ پیر جی مخدوم بخش صاحب کا خط جو آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا حاجی صاحب کے ہاتھ پہنچا۔ پیر جی صاحب کی شدت بیماری سے بہت رنج ہے۔ خداوند کریم ان کو شفاء عنایت فرمائے۔ ان کے اخلاق اور عنایتیں یاد آتی ہیں اور جی کڑھتا رہتا ہے۔ بندہ عجیب ہے۔ (فوٹو پر دھبہ آ گیا ہے، جس کی وجہ سے یہ لفظ نہیں پڑھا گیا) ساری بات خدا کے ہاتھ ہے جو چاہے سو کرے اور بیعت کا حال کیا کہوں۔ میں تو بخدا اپنے آپ کو اس کے لائق نہیں سمجھتا۔ پر بزرگوں کے فرمانے کے موافق کرتا ہوں۔ لیکن تاہم اپنی طرف سے بیعت کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی صاحب کبھی گرد ہوتے ہیں اور نوبت لاچاری کی پہنچتی ہے تو حضرت پیر و مرشد کی طرف بیعت کر لیتا ہوں۔ مگر ظاہر ہے کہ جیسی بزرگوں کی شان ہوتی ہے انہیں کے موافق اگر کوئی شخص نکلتا ہے تو خیر نہیں تو بزرگوں کے نام پر بٹہ لگتا دیکھ کر جی کو رنج ہوتا ہے۔ سو پورا پورا ہونا اور ظاہر و باطن کے درست ہونا لوگوں کو کہاں میسر۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ ظاہر تو موافق شریعت و سنت ہو جائے۔ اس لیے جس سے

یہ امید ہوتی ہے کہ یہ شخص بدعات کے باب میں میرا کہنا مان لے گا تو البتہ میں دریغ کم کرتا ہوں، ورنہ بجز انکار کچھ تدبیر بن نہیں پڑتی اور پیر جی سے یہ توقع مشکل ہے۔ خیر ان کی خدمت میں بعد سلام اور مزاج پُرسی یہ عرض کر دینا اگر وہ منظور فرمائیں تو بندہ غائبانہ حضرت کی طرف سے ان کو بیعت کر چکا ہے اگر انہوں نے اس بیعت کو نبھایا تو موافق حدیث ''بیعة فمن وفی فاجره علی اللّٰه'' کے انشاء اللہ ان کو اجر عظیم ہوگا، ورنہ موافق ''ومن اصاب من ذٰلک شیئاً'' ان کا اللہ کے ساتھ معاملہ باقی رہے گا۔ مگر اتنا اور بھی عرض کر دینا کہ بیعت کی ایک ظاہر شکل ہے خدا سے دوسروں کو گواہ کر کے اس کا توڑنا سخت بُرا ہے۔ فقط

(۵)...... حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے حالات میں تلبینہ کا ایک قصہ لکھوا چکا ہوں۔ اتفاق سے ان خطوط میں حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے ساتھ تلبینہ کے قصہ کی وہ مراسلت بھی مل گئی، وہ بھی درج ذیل ہے:

بحضرت اقدس ادام اللہ ظلالل برکاتہم۔ بعد ہدیہ سلام نیاز آنکہ یک نہایت مختصر ہدیہ پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ احادیث میں ایک چیز تلبینہ کے نام سے وارد ہوئی ہے، جس کے اجزاء ملا علی قاری نے آٹا، دودھ اور شہد لکھے ہیں۔ ذرا سی زعفران کا خوشبو کی مد میں اضافہ میں نے کر دیا۔ ایک مرتبہ تجربۃً عرصہ ہوا پکوائی تھی تو بہت لذیذ معلوم ہوئی تھی، بے اختیار اس وقت دل چاہا کہ شاید حضرت والا کو بھی پسند آئے اس وقت اس کی کیا صورت ہوگی یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ مگر اجزاء کو جوڑ دیا۔ بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: ''تقول سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول ان التلبینةتجم فواد المریض و تذهب الحزن وفی اخری للبخاری عن عائشة انها کانت تأمر بالتلبینة و تقول هو البغیض النافع قال الحافظ ابن حجر فی الفتح و قع عند احمد و ابن ماجة عن عائشة مرفوعا علیکم بالبغیض النافع التلبینة یعنی الحساء و اخرجه النسائی من وجه اخر عن عائشة و زاد والذی نفس محمد بیده انها لتغسل بطن احدکم کما یغسل احدکم الوسخ عن وجهه بالماء'' اس کی اصل روایات سے رقیق ہونا معلوم ہوتا ہے، مگر معلوم ہوا کہ حضرت کو شاید جامد پسند ہو کہ فیرینی کو رغبت سے نوش فرمانا معلوم ہوا اس لیے جامد کرا دیا۔ حکیم خلیل احمد صاحب سے اجزاء لکھ کر اس کا استفسار بھی کر لیا کہ حضرت کے لیے مضر نہیں ہے۔

زکریا کاندھلوی

جواب:

مجی محبوبی دام حبہم ،السلام علیکم

ایسا متبرک ہدیہ کس کو نصیب ہوتا ہے، مگر غلبۂ محبت سے اس میں تدبر سے کام نہیں لیا گیا۔ جیسا کہ عشق کے لیے لازم ہے، ورنہ عقل کا فتویٰ یہ تھا کہ مجھ کو بتایا نہ جاتا کہ کیا ہے جب خلوئے ذہن کی حالت میں اس کی پسندیدگی ظاہر کرتا، اس وقت اس کی حقیقت ظاہر کر دی جاتی۔ اب میں اس سوچ میں ہوں کہ استعمال نہ کرنا موہم اعراض ہے استعمال کے بعد رغبت کا نہ ہونا محتمل تو ہے اگر یہ احتمال واقع ہوتو اس سے بے رغبتی کا اظہار موہم اعتراض ہے اور یہ دونوں امر موہم صورۃ نہایت سوءادب ہے۔ اب آپ کا تبرک اس انتظار میں رکھ لیا ہے کہ آپ اس مضیق سے مجھ کو نکالیے۔

فقط والسلام: اشرف علی

بحضرت اقدس ادام اللّٰہ ظلال برکاتکم و متعنا بافاداتکم و فیوضکم

بہت ہی اچھا ہوا کہ حضرت والا نے ایک اشکال کی طرف تنبیہ فرمائی، جس کی طرف اس وقت ذہن کو التفات بھی نہیں ہوا تھا، مگر پہلے بسا اوقات بعض اشیاء کے متعلق اس نوع کے اشکالات پیش آجاتے تھے۔ اب انشاء اللہ حضرت کی برکت سے اس کے حقیقی جواب کی طرف رہنمائی ہو جائے گی۔ اس لیے اپنا ناقص خیال خدمت والا میں پیش کر کے استصواب اور حضرت والا کے ذہن میں کوئی اور جواب ہوتو استفادہ چاہتا ہوں۔ چند امور بندہ کے ناقص خیال میں ہیں۔

(۱)......اس خاص موقعے پر تو خود حدیث کے الفاظ میں ''البغیض النافع '' سے اس کو تعبیر کیا گیا ہے۔ جس میں مریض کے ناپسند ہو جانے پر گویا تصریح ہے۔

(۲)...... بندہ ناکارہ نے اپنے پہلے عریضہ میں یہ عرض کیا تھا کہ اس وقت اس کی کیا حقیقت ہوگی، تو یہ اللہ ہی کو معلوم ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کو بعینہ وہ شئی کہنا تو ممکن ہی نہیں اور ترکیب کیفیت کے تغیرات سے لذت وغیرہ امور میں تغیر ہو ہی جاتا ہے۔ اس لیے ناپسندیدگی کو اس ترکیب کی طرف منسوب کرنا بہت اقرب معلوم ہوتا ہے۔ ایک سالن کو ہم لوگ ہر وقت مشاہدہ کرتے ہیں کہ پکانے والیاں ایک ہی نوع کا مصالحہ سب ڈالتی ہیں، لیکن ایک کا پکا ہوا لذیذ ہوتا ہے اور وہی سالن ان ہی اجزاء سے دوسری کا پکایا ہوا لذیذ نہیں ہوتا اور یہ یقینی چیز ہے کہ صحابیات جیسی پکانے والیاں اب کہاں نصیب ہوسکتی ہیں۔ حافظ یعقوب صاحب گنگوہی کی والدہ صاحبہ جیسا سالن پکاتی ہیں ہمیشہ میری اہلیہ مرحومہ نے کوشش کی کہ ویسا پک جائے مگر نہ پک سکا۔

زکریا کاندھلوی

جواب:

السلام علیکم

(۲) تو میرے ذہن میں نہیں تھا۔ مگر (۱) میرے بھی ذہن میں تھا لیکن اپنے ضعف عقل کے سبب اس سے اس لیے شفاء نہ ہوئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تجویز کے بغیض فرمانے کا حق ہے۔ مگر حضور کے غلاموں کی اس کی ہمت نہیں ہو سکتی اور (۲) میں بھی ایک گونہ نسبت پھر بھی ہے اس لیے وہ کم ہمتی مشترک ہے۔ ان سب مقدمات میں غور کرنے سے یہ فیصلہ قرار پاتا ہے کہ اقویاء وسیع النظر کے مناسب آپ کی تحقیق ہے اور ضعفاء قاصر النظر کے لیے میرے احتمالات ''و انا من الضعفاء عسیٰ ان اتقوی فیما بعد و حسبنا اللہ و نعم الوکیل'' ۔

اصل قصہ یہ نارکارہ لکھوا چکا ہے کہ حضرت نے تلبینہ کو رکھ تو لیا تھا پہلے ہی عریضہ پر اور واپس دوسرے پر بھی نہیں کرایا۔ مگر میں تحقیق سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت نے نوش فرمایا یا نہیں یاد پڑتا ہے کہ کسی خادم نے یہ کہا تھا کہ حضرت نے نوش فرمایا۔ مگر یہ روایت محقق نہیں۔ فقط

اعلیٰ حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی شفقتیں تو اس سیہ کار پر اسی وقت سے روز افزوں تھیں جب یہ ناکارہ بارہ سال کی عمر میں سہارنپور آ گیا تھا اور حکیم الامت قدس سرہ کی آمد اس زمانہ میں حضرت مرشدی قدس سرہ کی وجہ سے بہت ہی کثرت سے ہوتی تھی اور چونکہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہ کے ساتھ حکیم الامت قدس سرہ کا برتاؤ بہت مساویانہ اور دوستانہ ایسا تھا کہ ہم نوعمر بچے اس سے بہت حیرت کرتے تھے۔ میرے والد صاحب قدس سرہ کا تعلق حضرت سہارنپوری کے ساتھ بہت ہی زیادہ ادب واحترام کا تھا۔ اس لیے والد صاحب قدس سرہ نے حضرت گنگوہی قدس سرہ کے بعد میرے حضرت مرشدی سہارنپوری سے رجوع کر لیا تھا اور حضرت سہارنپوری ہی سے میرے والد صاحب کو بیعت کی اجازت بھی تھی۔ اس لیے مولانا سہارنپوری کا بہت ہی ادب فرمایا کرتے تھے۔

مکتوب نمبر۵:

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، رئیس الاحرار بنام زکریا

۱۹ دسمبر ۵۲ء

محترم زید مجدکم، السلام علیکم

آپ کے خطوط نے اور بالخصوص اس خط نے جو عربی کے دو اشعار میں حضرت اقدس کو الوداع کہی جس کے آخر میں یہ ہے کہ اگر مر گئے تو قیامت میں ملاقات ہو جائے گی اور حضرت کا اس خط

کا پڑھ کر آنکھوں پر لگانا اور پھر سر پر رکھنا اور پھر اپنی جیب میں محفوظ کر لینا، اس واقعہ سے خاص لوگوں میں ایک پریشانی سی پیدا ہوگئی ہے۔ مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی نے آج مجھ سے یہ روایت بیان کی کہ آپ نے کسی مجلس میں مولانا علی میاں لکھنوی سے فرمایا کہ میں جس حال میں گزر رہا ہوں، اگر وہ حالت نہ بدلی تو میں چھ مہینے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرے جیسا کند ذہن اور بے خبر آدمی ایسی باتوں کے سمجھنے سے قاصر ہے مگر اس دفعہ حضرت کی روانگی کا طریقہ اور آپ کی بے چینی اور حضرت مدنی مدظلہٗ العالی کا یہ فرمانا کہ کیوں جانے دیا۔ ان باتوں سے ایک قسم کی پریشانی مجھ جیسے لوگوں کو ضرور پیدا ہوگئی۔ اس معمہ کا کچھ نہ کچھ حل ضرور معلوم ہونا چاہیے۔ اگر میں چلنے پھرنے کے قابل ہوتا تو خود حاضر ہو کر تمام حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ میرے لیے دعاء فرمائیں کہ صحت کے ساتھ توجہ الی اللہ بھی نصیب ہو۔

والسلام

مذکورہ بالا خط کا جواب بندہ نے جو دیا اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پر آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

آپ آئندہ کی باتیں ایسے شخص سے دریافت کرتے ہیں جو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ''کما یحب و یرضی'' کے لیے بھی علم غیب کا قائل نہیں۔ اس سلسلہ میں نہ سوچ کیجئے نہ کھوج کی فکر کیجئے۔ صرف دو اشعار اس کا خلاصہ ہیں:

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زبان سوزد
و گردم در کشم ترسم کہ مغز استخوان سوزد

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

زکریا

۴ ربیع الثانی ۷۲ھ

مکتوب نمبر ۶:

مولانا انعام الحسن صاحب بنام زکریا

مخدوم مکرم معظم محترم مدظلہم العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

الحمد للہ خیریت ہے، امید ہے کہ مزاج اقدس بخیر ہوں گے۔ والد صاحب کے ہمراہ عریضہ

ارسال کرنے کا ارادہ تھا، مگر کچھ ایسی صورت ان تین چار ایام میں رہی کہ بیٹھ کر لکھنے کی نوبت نہیں آئی اب اس وقت مولوی عبدالمنان صاحب کا لاہور سے خط آیا جو ارسال ہے۔ الحمدللہ حضرت اقدس بخیریت پہنچ گئے۔ حضرت عالی نے جس بات کے متعلق تحریر فرمایا تھا کہ حضرت اقدس کے بعجلت واپسی کا تذکرہ اگر کسی مجلس میں ہو تو اس کو تحریر کیا جائے۔ اخیر وقت تک نہیں آیا۔ اخیر وقت میں جب کہ حضرت اقدس ہوائی اڈے پر تشریف لے جا رہے تھے اور اس کار میں حضرت اقدس کی معیت میں بندہ و مولانا یوسف صاحب اور حافظ مقبول حسن صاحب تھے۔ راستہ میں ارشاد فرمایا کہ جب بھی سہارنپور جاؤ حضرت شیخ کی خدمت میں بہت بہت سلام عرض کر دینا۔ پھر مولوی یوسف صاحب سے بھی ارشاد فرمایا کہ دونوں کہہ دینا۔ تھوڑی دیر میں ارشاد فرمایا کہ اب کے واپسی میں سہارنپور قیام نہیں ہوا، اگرچہ جاتے ہوئے دو رات قیام رہا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ حضرت شیخ کی طبیعت میں بڑا اضمحل ہے جو کیفیات حضرت اقدس گنگوہی نوراللہ مرقدہٗ کی آخر میں تھیں وہ ہیں اور اس سے رعب ہوتا ہے اور طبیعت مرعوب ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے ڈر لگتا ہے۔ بندہ نے عرض کیا کہ حضرت ٹکٹ وغیرہ سب چیزیں ہو چکی تھیں۔ رائے پور سے عجلت بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ ارشاد فرمایا کہ جی طبیعت میں گھبراہٹ ہے۔ گھبراتا نہ تو نکلنا نہ ہوتا۔ اسی طرح وہاں جا کر ابھی سے گھبرانا شروع کروں گا۔ انتہی۔ نیز حضرت عالی کا ایک والا نامہ جو حضرت اقدس کی خدمت میں آیا ہے، جس میں صرف دو شعر ہیں اس کے مطلب میں طبیعت بہت زیادہ پریشان ہے۔ امید ہے والد صاحب بخیر پہنچ گئے ہوں گے۔ سلام مسنون

انعام الحسن قبیل جمعہ

مکتوب نمبر۷:

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نوراللہ مرقدہٗ

اس تحریک کا خلاصہ یہ ہے کہ مدرسہ کی تعلیم کے زمانہ میں جو کچائی باقی رہ گئی ہے۔ اس کو دور کرنے کے لیے کلمہ، نماز، چھوٹے بڑوں کے آداب و باہمی حقوق، درستی، نیت اور لغزشوں کے موقعوں سے بچنے کے علم و عمل سیکھنے کے لیے ان اصول کے ساتھ اپنے بڑوں سے بچا لیتے ہوئے ان لوگوں کے پاس جائیں جو ان سے بالکل مرحوم ہیں تاکہ ان کی کچائی دور ہو جائے اور ان کو واقفیت حاصل ہو۔

مکتوب نمبر۸:

۴ محرم الحرام ۵۲ھ مطابق ۲۹ اپریل ۳۳ء یوم شنبہ از مدینہ منورہ

عزیز محترم مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث متعنا اللہ بطول حیاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

آپ کا گرامی نامہ آج ۴محرم الحرام کو موصول ہوا۔ مدرسہ مظاہر علوم کے بخیر وعافیت جلسہ کے کامیاب ہوجانے کی خبر سے نہایت مسرت ہوئی۔ حق تعالیٰ شانہٗ ہمارے بزرگوں کو ہمیشہ باہم متالف متعاضد متعاون رکھے۔ بندہ دوسری محرم یوم الخمیس علی الصباح الحمدللہ ثم الحمدللہ زیارت روضہ مطہرہ اور سعادت صلوٰۃ وتسلیم سے شرف اندوز ہوا۔ حق تعالیٰ میرے اور میرے سب دوستوں کے لیے موجب خیر وبرکت اور باعث ثبات فرمادیں۔ آپ نے وہاں (نظام الدین) کی بہت سے مشکلات اور روپوں کے مختلف ضرورتوں کے لیے تقاضے کی شکایتیں لکھی ہیں۔ میری حاضری کی وجوہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ حضرات ان ضرورتوں کا احساس فرمادیں اور آنکھوں سے دیکھیں اور اس کی اہمیت اور واقعی اور غیر واقعیت کی تحقیق میں آپ بھی میرے برابر ہوں اور پھر سب مل کر یا تو اس کو کرو یا اس کو سب مل کر چھوڑ دیں۔ ورنہ تم ہی بتاؤ کہ میں تنہا کیا کروں؟ یہی مضمون میری طرف سے شیخ صاحب کی خدمت میں عرض کردینا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس تبلیغ کی چھیڑ چھاڑ مجھ سے نہ ہو یہ تو مجھ سے نہیں ہوسکتا اور کسی نظم کا میں اہل نہیں، کوئی نظم میرے قابو کا نہیں، تو اب کیا صورت ہو؟ تین صورتیں ہیں یا یہ کہ میں وہاں کا ارادہ ملتوی کردوں اور عرب میں قیام کروں اور یا ہندوستان میں آنا ہو تو مستقل توجہ کرنے والی ایک جماعت مستعدان امور کے نظم کے واسطے مجھے اطمینان دلادیں اور تیسری صورت یہ ہے کہ میں اگر ان امور کی طرف نظر نہ رکھوں۔ مجھے تم جیسے دوستوں خصوصاً تمہارے حکم کی تعمیل سے گریز اور انکار نہیں۔ مگر ایسی کوئی صورت ان تین میں سے یا کوئی چوتھی صورت جس کا آپ امر فرمادیں، میں اس کے لیے تیار ہوں۔ رقوم کے متعلق بات یہ ہے کہ میں قرض لینے کو کس بھروسہ پر کہہ دوں، یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ باقی نوح کے مدرسہ کے علاوہ سب ضرورتیں غالب ہے کہ پوری کردینے کی ہیں۔ یہ اصول البتہ ضروری ہے کہ پہلے خود ان مواضع میں کوشش کرائی جائے۔ پھر بھی ضرورت ہو تو اس کا بندوبست کیا جائے۔

بخدمت جناب شیخ صاحب بعد سلام مسنون مضمون واحد

فقط والسلام

سب بزرگوں اور ملنے والوں کی خدمت میں سلام مسنون، گھر میں اور سب بچوں کو دعوات کہہ دینا۔ مساجد اور تبلیغ کی امداد کے لیے حافظ عبدالحمید صاحب سے بعد سلام مسنون فرمادیں کہ صاحبزادہ کی شادی کی خبر موجب مسرت ہے اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے۔ انشاء اللہ عنقریب میں

حاضر ہو جاؤں گا۔کوئی خاص تقاضہ نہ ہوتو میرے آنے پر ہی کیجئے گا۔عزیز یوسف کی محنت کی خبر سے خوشی ہوئی ماشاءاللہ وہ ہمیشہ سے محنتی ہے۔محنت کے زمانے اس کومحنت سے روکنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے میں بھی دماغ کا کمزور ہوں اور یہ بھی میری طرح بے وقت محنت کر کے دماغ سے بے کار نہ ہو جائے میں نے حافظ مقبول صاحب وغیرہ کو مخصوص (اس تحریر میں حافظ مقبول صاحب اور قاری داؤد صاحب کی اجازت بیعت کو اس ناکارہ اور حضرت اقدس رائے پوری کی اجازت پر مشروط کیا تھا۔کہ اگر آپ دونوں کی رائے ہو تو ان دونوں کو میری طرف سے بیعت کی اجازت دے دو) تحریریں بھیجنے کے لیے آپ مولانا رائے پوری کے مشورہ کے ساتھ وابستہ کیا تھا اور یہاں مولوی شفیع الدین کے تقاضہ سے روانہ کیا تھا۔بغیر آپ حضرات کے مشورہ کے میں ایسی بات میں پیش قدمی کی جرأت اور غیرت رکھتا ہوں۔

از اُدون خدام احتشام بعد سلام نیز گرامی نامہ عزت بخش ہوا۔فقط

مکتوب نمبر۹:

آخری تحریر حضرت دہلوی بقلم مولانا ظفر احمد صاحب بسلسلۂ امارت مولانا یوسف صاحب مرحوم وتکملۂ آں تحریر از مولوی یوسف۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آج صبح حضرت اقدس مولانا محمد الیاس صاحب کا یہ پیغام پہنچا کہ میری جماعت میں بہت سے اہل ہیں۔شیخ الحدیث اور مولوی ظفر احمد تیسرا نام حضرت مولانا عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ہے جو غالباً نقل میں رہ گیا جس کو ان میں سے منتخب کریں اس سے ان لوگوں کو بیعت کرادیں جو مجھ سے بیعت ہونا چاہتے ہیں۔پھر یہ پیام پہنچا کہ مجھے چند لوگوں پر (جن کے نام بھی بتلائے تھے) اعتماد ہے۔بعد ظہر ہم اس ارشاد کی توضیح کے لیے حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ ہمیں یہ پیام پہنچا تھا کہ مجھے اپنے چند لوگوں پر اعتماد کا مفہوم خلافت اور اجازت تھی یا کیا تھا۔سکوت کے بعد فرمایا کہ مولوی شفیع الدین صاحب (حضرت مولانا شفیع الدین بجنوری مہاجر مکی جو حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب کے اجل خلفاء میں تھے۔مکہ میں مقیم رہے اور وہیں وصال ہوا۔) صاحب نے قاری داؤد اور حافظ مقبول حسن پر اعتماد ظاہر کیا تھا۔اس وقت میں نے ان کے احترام کی وجہ سے حرم کے رہنے والے ہیں ان کو اجازت دے دی تھی۔مگر اب مجھے ان پر پہلے سے بہت زیادہ اعتماد ہے اور ان کے علاوہ اور بھی چند لوگوں پر اعتماد ہے۔مولوی یوسف میں استعداد بہت ہے۔ میں نے اس کو پاس انفاس بتایا تھا اور بہت دن سے کر رہا تھا۔سید رضا بھی ذکر و شغل میں لگے

ہوئے ہیں اور سوزش و درد سے کام کرتے ہیں۔مولوی احتشام کو میں نے اجازت دے دی مگر ایک شرط کے ساتھ جو انہیں سے معلوم کر لینا۔(مولوی احتشام کو وہ شرط یاد نہ آئی تو ہمارے دریافت کرنے پر) پھر فرمایا کہ وہ شرط یہ ہے کہ علماء کا احترام کریں (از زکریا مجھ سے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ شرط یہ بھی ہے کہ امراء سے تعلق نہ رکھیں) علماء سے نیاز مندی کا تعلق رکھیں۔ ہمارے مزید دریافت کرنے پر فرمایا کہ مولوی انعام بھی بہت اچھے ہیں۔انہوں نے ذکر و شغل بھی بہت کیا ہے۔ یہ بھی اسی قبیل سے ہیں۔ البتہ علم کا احترام زیادہ ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ ہم تینوں (تیسرے حضرت رائے پوری) کی رائے یہ ہے کہ سب سے پہلے آپ مولوی محمد یوسف سلمہٗ کو اجازت دے دیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک ان میں شرائط اجازت موجود ہیں۔ عالم ہیں، باعمل ہیں، متورع ہیں اور ہمیں امید ہے کہ وہ اپنی تکمیل کرلیں گے اور ان کے علاوہ دوسروں کو بھی اس شرط سے اجازت دی جائے کہ وہ اپنی تکمیل سے غافل نہ ہوں۔فرمایا ہاں جو آپ تینوں کی رائے ہے بہت مبارک ہے اور تکمیل کے لیے تم خود ان سے تاکید کے ساتھ کہہ دینا۔سلسلہ کا قیام یوں ہی رہتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ میری طرف سے نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سمجھنا چاہیے۔ پھر دعاء فرمائی کہ اے اللہ ان تینوں صاحبوں نے جو تجویز کیا ہے اس میں برکت فرما اور جو اس میں ہم سے کوتاہی ہوئی ہو اس کو معاف فرما اور ہمیں خلوص عطاء فرما۔اس کے بعد ہم نے عرض کیا کہ جو لوگ اس وقت بیعت ہونا چاہتے ہیں، ہماری رائے یہ ہے کہ ان کو آپ ہی بیعت فرمالیں۔ جس کی صورت یہ ہو کہ کپڑے کا ایک سرا حضرت کے ہاتھ میں اور بیعت ہونے والوں کو ایک شخص کلمات بیعت تلقین کرتا رہے۔فرمایا نہیں۔اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بہت گر گیا ہوں، مجھے بہت تعجب ہوگا۔ ہم نے عرض کیا کہ پھر اعلان کر دیا جائے کہ جو بیعت چاہیں وہ مولوی یوسف صاحب سے بیعت ہو جائیں، وہ حضرت سے ہی بیعت ہوگی۔ فرمایا ہاں مناسب ہے اور آپ تینوں کا ہاتھ اس پر ہوگا۔

تنبیہ: یہ تحریر بطور اول مسودے کے لکھی گئی اور حضرت کو قبل عصر سنا دی گئی۔ حضرت کی تصدیق کے بعد اس کو صاف کر دیا گیا۔

ظفر احمد عفا اللہ عنہ تھانوی

۲۰ رجب ۶۳ھ مطابق ۱۲ جولائی ۴۴ء بروز چہار شنبہ

مکتوب نمبر ۱۰:

آخری گفتگو چچا جان نور اللہ مرقدہٗ عزیز یوسف مرحوم کے ساتھ

بدھ کے روز چار بجے کے قریب حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ ورفع درجاتہ فی الآخرۃ والدنیا وارزقنا حبہ واتباعہ حق الحب والاتباع۔ بندہ داہنی جانب بیٹھا ہوا تھا۔ آواز دی تو بندہ بائیں جانب چہرۂ انور کے متصل آبیٹھا۔ فرمایا حضرات کہاں ہیں؟ میں نے عرض کیا مولوی احتشام صاحب کے حجرہ میں مشورہ فرمار ہے ہیں۔ فرمایا تم اس مشورہ میں شریک نہیں میں نے عرض کیا اگر جناب فرمادیں تو میں جا بیٹھوں۔ فرمایا تمہارے ہی متعلق تو مشورہ ہے اور تم اس میں شریک نہیں۔ خیر جب بلائیں تو چلے جانا۔ پھر فرمایا میرا تمہارا کھیل ہو کر نہ رہ جائے۔ اہل اللہ کی طرف سے جو چیز ملا کرتی ہے وہ حق ہوتی ہے۔ پھر یہ شعر پڑھا:

دادِ وے را قابلیت شرط نیست
بلکہ شرطِ قابلیت داد و یست

پھر ارشاد فرمایا کہ علماء کے لیے قصیدہ بردہ اور شیم الحبیب کا مطالعہ عظمت واحترام کے ساتھ کہ بغیر عظمت وشوق کے بے کار ہے۔ شیم الحبیب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت منکشف ہوگی۔ اس کے بعد غالباً فرمایا قصیدہ سے تعلق پیدا ہوگا۔ پھر فرمایا آخر شب میں قرآن شریف پڑھنے کی دعوت دیتے رہنا اور اپنے لیے اس کی صورت پیدا ہونے تک تمنا رکھنا۔

فقط

مکتوب نمبر۱۱:

عزیز ماجد علی بنام زکریا

مخدومی و معظمی حضرت اقدس دامت برکاتکم و متعنا اللّٰہ والمسلمین بطول بقائك و برکات انفاسك السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ،

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ دیگر احوال یہ ہیں کہ رمضان المبارک میں اعتکاف کے درمیان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بشارت دی تھی، جس کو میں وہاں بیان نہ کر سکا تھا۔ وہ بشارت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”زکریا یعنی (حضرت والا) رسالہ فضائلِ درود کی وجہ سے اپنے معاصرین پر سبقت لے گیا۔“

اس ناکارہ کو اس پر تعجب بھی ہوا کہ حضرت والا کی احادیث کی اور دین کی محنت کی اور بھی خدمات ہیں جو بہت اونچی ہیں۔ لیکن بعد کو اشکال رفع ہوا کہ دل میں یہ بات کہ رسالہ فضائل درود حضرت والا کے عشق نبوی کی دلیل ہے اور اس اعتبار سے بھی حضرت والا دوسروں پر سبقت لے گئے ہیں۔ نیز کافی عرصہ ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی اس ناکارہ کو یہ بشارت بھی ملی تھی کہ جمعہ

کے روز آپ کوئی مخصوص درود یا قصیدہ پڑھتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ہی پسند ہیں۔ اگر ایسا ہے تو وہ درود یا قصیدہ اس ناکارہ کو بھی بتا دیجئے ممنون ہوں گا۔ نیز یہ بھی دریافت کرنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت زیادہ فضیلت کی بات ہے یا حالت کشف میں اسی طرح خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو زیادہ معتبر ہے یا علم کشف کی گفتگو زیادہ معتبر ہے۔ عید کے بعد علی گڑھ جانا ہوا تو یہاں لوگوں نے اس ناکارہ سے اس بات کی تحقیق چاہی کہ بھائی خالد صاحب کو کیا حضرت والا کی طرف سے اجازت بیعت ہوگئی ہے؟ چونکہ اس ناکارہ کو علم نہیں تھا، اس لیے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ اگر حضرت والا نے بھائی خالد صاحب کو اپنی طرف سے بیعت کی اجازت دے دی ہو تو مطلع فرمائیے۔ نیز میرٹھ میں احباب مولانا مسعود الٰہی صاحب کے بارے میں بھی احقر سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کو حضرت والا کی طرف سے اجازت ہے یا نہیں؟ اگر ان کو ہو تب بھی مطلع فرمائیے گا جواب کا انتظار ہے۔ دعاؤں و توجہات کی عاجزانہ درخواست ہے۔ خصوصاً دورۂ حدیث کی تکمیل کے لیے۔

فقط

ناکارہ ماجد علی خاں جہاں نما جلی کوٹھی

میرٹھ

(موصولہ احبیب عنہ ۲۸ شوال)

اللہ تعالیٰ خواب کو میرے اور تمہارے لیے مبارک کرے۔ پسند آنے کے واسطے اونچی چیز ہونا ضروری نہیں۔ کسی رنڈی کے کتے کو پانی پلانا بھی پسند آ جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب میں دیکھنا اور اس کا معتبر ہونا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور کشف میں احتمال غلطی کا ہے۔ حدیث میں بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں اور اس کا مدار صاحب کشف کی علوشان پر ہے۔ بندہ کا معمول جمعہ کے دن بعد عصر ''اللّٰهم صل علی سیدنا محمد النبی الامی و علی اٰله وسلم تسلیما'' اسّی (۸۰) مرتبہ پڑھنے کا ۲۵، ۳۰ سال سے ہے۔ فضائل درود کی تالیف کے بعد سے اس کے اخیر کے دو قصیدے ملا جامی اور حضرت نانوتوی کا کبھی کبھی سننے کی نوبت آ جاتی ہے۔ خالد کو اجازت نہیں مسعود الٰہی کو ہے۔

والسلام

......☆☆☆☆☆......

باب ششم

جملہ حجوں کی تفصیل

حضرت کی ہمرکابی میں بندہ کا سب سے

پہلا سفرِ حج ۳۸ھ اور ساتھ جانے والے رفقاء:

یہ بات دراصل باب پنجم کا جزو اور تکملہ ہے جو شروع میں تو ایک ہی باب تھا۔ مگر حجوں کی اہمیت اور حج کے زمانے کے واقعات کی خصوصیت کی وجہ سے اس کو مستقل باب بنا کر اس کو گویا باب پنجم کا جزو بنا دیا۔ اس سیہ کار کا سب سے پہلا حج ۳۸ھ میں حضرت اقدس مرشدی ومولائی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی ہمرکابی میں ہوا۔ یہ حج اس ناکارہ کا حجۃ الاسلام اور حج فرض تھا۔ ۲، شعبان ۳۸ھ کو سہارنپور سے روانگی ہوئی۔ حضرت قدس سرہٗ کی اہلیہ محترمہ اور حاجی مقبول احمد صاحب کے علاوہ حضرت مولانا منظور احمد خاں صاحب سہارنپوری مدرس مظاہر علوم خادم خاص اور حضرت قدس سرہٗ کی اہلیہ کے برادر زادہ حاجی انیس احمد صاحب انبہٹوی اور حضرت کے اخص الخدام مولوی محمد اسحاق صاحب بریلوی جن کا مستقل قیام سہارنپور میں تھا اور ہر سفر میں حضرت کے خصوصی خادم رہتے تھے اور میرے عزیز مولوی لطیف الرحمٰن کاندھلوی جو حضرت قدس سرہٗ کے بعد ہمیشہ حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں رہے۔ نیز میرے قریبی رشتہ دار متولی طفیل احمد صاحب بھی ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی خدام سہارنپور سے اور رستہ سے شریک ہوتے رہے۔ بمبئی پہنچنے تک رفقاء کا مجمع دو سو ہو گیا تھا اور ہر شخص حضرت قدس سرہٗ کی ہمرکابی کی وجہ سے حضرت جی کے جہاز میں سفر کا متمنی اور مشتاق تھا۔ اس میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جن کی دلداری حضرت کو مقصود تھی۔

حضرت اقدس قدس سرہ کا رفقاء کی وجہ سے جہاز چھوڑ دینا:

جب بمبئی پہنچے ایک جہاز تیار تھا مگر اس میں بیس پچیس ٹکٹوں کی گنجائش تھی اور حضرت قدس سرہ اور ان کے مخصوص رفقاء اس میں آ بھی سکتے تھے۔ مگر حضرت نے رفقاء کی دلداری کی وجہ سے اس کو چھوڑ کر اس کے بعد والے جہاز جس کا نام زیانی تھا کے تین سو ٹکٹ خرید والیے۔ کیونکہ بمبئی کے قیام کے میں مجمع اور بھی بڑھ گیا تھا۔ جو جہاز اس وقت تیار تھا وہ بہت ہی بڑا اور آرام دہ تھا اور زیانی بہت ہی چھوٹا اور تکلیف دہ تھا۔ بمبئی کے احباب نے بہت ہی اصرار بھی فرمایا کہ موجودہ جہاز زیادہ

آرام دہ ہے مگر حضرت نے قبول نہ فرمایا بلکہ رفقاء کی ہی معیت کو ترجیح دی۔

بمبئی میں دیو بندیوں کے داخلوں کی ممانعت:

یہ زمانہ وہ تھا کہ بمبئی میں علی الاعلان دیو بندیوں کا داخلہ سخت خطرناک تھا۔ اس سے پہلے حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ پر بمبئی میں حملہ بھی ہو چکا تھا اور حضرت سہارنپوری قدس سرہ کے ساتھ مجمع بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ اس لیے وہاں کے غریب میزبانوں نے کہ رؤساء تک ہم غرباء کی رسائی نہ تھی اور آج کل تو اس کا ردعمل مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی برکت سے یہ ہو رہا ہے کہ دیو بندیوں کو ہر وقت اصرار اور تقاضے بمبئی آنے کے ہوتے رہتے ہیں۔ بہر حال وہاں کے غرباء میزبانوں نے حضرت اور ان کے رفقاء کا قیام بمبئی سے پندرہ بیس میل دور ایک قبرستان میں کیا۔ خیمے وغیرہ لگائے گئے اور زیارتی جہاز کے انتظار میں بیس روز وہاں قیام ہوا۔ سہارنپور سے بمبئی تک تو فتوحات کا وہ زور رہا کہ **لا تعد و لا تحصیٰ** مٹھائیاں اور پھل اور قسم قسم کے کھانے۔

سفر حج کے دوران کھانے کا انتظام:

بمبئی پہنچ کر حضرت نے ہم مخصوص رفقاء کو جمع کر کے فرمایا کہ بھائی یہاں سے سفر شروع ہو رہا ہے اور رفقاء نے لکھا ہے کہ دو دو چار چار مل کر اپنا جوڑ ملا لو۔ بھائی طفیل احمد صاحب جن کا اُوپر ذکر آیا وہ سہارنپور ہی سے مجھ سے اصرار فرما رہے تھے کہ میں ان کا پورے سفر میں مہمان بنوں اور ان سے زیادہ اصرار میرے عزیز ماموں لطیف الرحمٰن صاحب کا تھا۔ اس لیے کہ وہ پہلے سے متولی طفیل صاحب کے ساتھ ہو گئے تھے اور ان دونوں سے بڑھ کر متولی صاحب کے ملازم ملا عبد العزیز جو کاندھلہ کے قریب ایک گاؤں کھندراولی کا رہنے والا تھا اور متولی طفیل صاحب نے سفر کے لیے ملازم رکھ لیا تھا، وہ سہارنپور سے ہی میری خوشامد کر رہا تھا کہ اگر آپ میرے میاں صاحب کے ساتھ آجائیں تو میرا کھانا پکانے میں بڑا جی لگے گا۔ حضرت کے اس ارشاد پر خوشی حسب مراتب تینوں ہی کو ہوئی عبد العزیز بیچارا کیا بولتا۔ ماموں لطیف نے حضرت سے کہا کہ بھائی طفیل شروع سے کہہ رہے ہیں مولوی زکریا کو کہ میرے ساتھ ہو جا۔ مگر یہ نہیں مانتا۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ بھائی میرے ساتھ کوئی نہیں۔ ہر ایک اپنا اپنا انتظام خود کرے۔ اس پر تینوں کے تینوں خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے اور میں چپ سہم گیا۔

اگلے دن صبح کو میں نے حاجی مقبول احمد صاحب کو جو حضرت قدس سرہ کے مدار المہام اور اندرو باہر کے کارکن تھے۔ ان کا تذکرہ پہلے بھی آ چکا ہے جس پر خفا ہوتے تھے اسے جہنم میں پہنچا دیتے تھے اور جس سے راضی ہوتے اسے عرشِ معلیٰ پر پہنچا دیتے۔ راضی اور ناراض بھی بہت جلد ہوتے۔

میں نے ان سے تخلیہ میں کہا کہ حاجی جی میں آپ کے ساتھ رہوں گا اور جیب میں سے چھ سو روپے نکال کر ان کے سامنے رکھ دیے۔ اس زمانے میں حج کے سلسلہ میں چھ سوایسے تھے جیسے آج کل ڈھائی ہزار کہ چھ سو روپے میں آدمی نہایت راحت سے مکہ، مدینہ، کھجور، زمزم، تسبیح، رومال، مصلیٰ وغیرہ سب کام کر لیتا تھا۔ حاجی جی کو اس وقت اللہ کے فضل سے کچھ شفقت آرہی تھی بہت مسرت سے روپے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیے اور فرمایا کہ تم جیسوں کے لیے مجھے ہرگز انکار نہیں۔ میں نے تو حضرت سے ایسے لوگوں کے متعلق انکار کیا تھا جو یہ کہے کہ میرا تو ایک بکس اور حضرت کے پچیس بکس اور پھر کشتی ومزدوروں کا کرایہ برابر کیوں؟ میں ہر ایک کا سامان الگ الگ کہاں تلواؤں گا۔ کہ کس کا کتنے سیر اور کتنے من ہے اور تیرے متعلق مجھے یقین ہے کہ میں تجھے حساب بتلاؤں گا بھی تو تو سنے گا نہیں اور میں اپنا اور حضرت کا سارا محصول تیرے حساب میں لکھوادوں گا تو تجھے خوشی ہی ہوگی۔ میں نے کہا کہ جناب نے یہ سچ فرمایا حساب وغیرہ مجھے نہیں چاہیے اور مجھے آپ ہرگز نہ دیں۔ مجھے تو سہارنپور جا کر یہ بتلادیں کہ کتنا میرا حساب میں اور چلا اسی دن انشاء اللہ پیش کردوں گا۔ حاجی صاحب مرحوم نے فرمایا کہ اس کا تو مجھے تیرے کہے بغیر یقین ہے۔

اگلے دن شام کو حضرت قدس سرہٗ نے پوچھا کہ کیوں بھائی کس کا جوڑ کس سے بیٹھا لوگوں نے اپنے اپنے جوڑ بتلائے۔ ماموں لطیف نے کہا میں تو متولی طفیل کے ساتھ ہوں مگر مولوی زکریا نہیں مانتے یہ کہتے ہیں کہ میں تو حضرت ہی کے ساتھ ہوں۔ پہلی رات تو میں سہم گیا تھا آج میں بہت مطمئن تھا کہ قلعہ فتح کر چکا تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ نہیں بھائی میرے ساتھ نہیں بھائی طفیل کے ساتھ ہو جاؤ جب یہ کہہ رہے ہیں۔ یہ ناکارہ گستاخ تو ساری عمر کا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں حضرت کے ساتھ نہیں۔ میں تو حاجی مقبول صاحب کے ساتھ ہوں۔ میں نے اپنے سارے پیسے ان کے حوالے کر دیے اور انہوں نے قبول فرمالیے۔ وہ پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے خوب وہ منظر یاد ہے کہ حضرت قدس سرہٗ کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا اور فرمایا کہ انہوں نے قبول کر لیا۔ میں نے کہا جی حضرت، حضرت نے فرمایا کہ پھر مجھے کیا انکار ہے میں تو ان ہی کی وجہ سے اصرار کر رہا تھا۔ حاجی صاحب مرحوم نے فرمایا کہ ایسے لوگوں کو مجھے انکار نہیں اور اپنی صبح والی تقریر پھر دہرادی۔ حضرت قدس سرہٗ نے حاجی مقبول صاحب کی تصویب فرمائی کہ یہ تم نے سچ کہا اس کو تو حساب کا خیال بھی نہ آئے گا۔ اب ہم مستقل شریک دسترخوان ہو گئے اور اخیر تک رہے۔

جہاز میں اور جدہ میں اتر کر اور مکہ مکرمہ میں تراویح:

اس دوران میں حضرت قدس سرہٗ راندیر بھی تشریف لے گئے تھے۔ مولوی اسحاق مرحوم ساتھ

تھے۔ ۲۷ یا ۲۸ شعبان کو بمبئی سے جہاز روانہ ہوا اور بارہ دن میں دس رمضان کو جدہ پہنچا۔ دوسرے یا تیسرے دن یکم رمضان جہاز ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ اس سیہ کار کو بھی جہاز میں دوران سر اور امتلاء بہت رہتا تھا اُٹھنا بھی مشکل ہوتا تھا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ کو بھی امتلاء تو نہیں مگر دوران سر خوب رہتا اور پورے جہاز کے سفر میں رہتا۔ ۲۹ شعبان کو حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ کیوں بھائی تراویح کا کیا ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ دوران سر سے تو نمٹا جا سکتا ہے مگر امتلاء کا درمیان تراویح میں کیا ہوگا۔ حضرت نے فرمایا کہ اس کی کوئی بات نہیں قے ہوگی وضو کر لینا۔ باوجود دوران سر اور ضعف و پیری کے اور زیان جہاز چونکہ چھوٹا تھا خوب حرکت کرتا تھا۔ اس کے باوجود ساری تراویح حضرت نے کھڑے ہو کر پڑھی۔ آٹھ رکعت میں آدھا پارہ حضرت قدس سرہٗ پڑھتے تھے اور اس کے بعد کا پون پارہ بارہ رکعت میں یہ سیہ کار پڑھتا تھا۔

جدہ پہنچ کر سامان اُتارنے میں اور کسٹم وغیرہ کے جھگڑوں میں سب ہی تھک گئے تھے۔ حاجی صاحب مرحوم نے نہایت غصہ میں مجھ سے فرمایا کہ عقیدت میں بڑے میاں کو لے کر کھڑے نہ ہو جانا کچھ ان کے ضعف کا بھی خیال کر لینا۔ کیونکہ اس کا ڈر تھا کہ نہ معلوم سفر میں حاجی جی کہاں میرا پتہ کاٹ دیں۔ ان کا حکم تھا کہ میں حضرت سے درخواست کروں کہ تراویح کی تو آج ہمت نہیں یہ تو مجھ سے نہ ہو سکا۔ لیکن جب حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ کیوں بھائی مولوی زکریا کیا حال ہے۔ میں نے حاجی صاحب کے ڈر کے مارے یوں عرض کر دیا کہ حضرت تھکان تو بہت ہے۔ لیکن میری ندامت اور قلق کی انتہاء نہ رہی کہ جب میں نے دیکھا کہ حضرت قدس سرہٗ نے پوری تراویح خوب اطمینان سے پڑھی۔ میں بار بار حضرت کو دیکھتا رہا اور اپنے اوپر افسوس کرتا رہا کہ کیوں جواب دیا اور کئی بار خیال آیا کہ حضرت سے عرض کروں کہ حاجی صاحب کے حکم سے میں نے معذرت کی تھی۔ مگر مرحوم کے ڈر کے مارے اس کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ نماز کے دوران دو تین مرتبہ حضرت کے قریب گیا بھی اور یوں عرض کرنے کو جی چاہا کہ حضرت کے ضعف کی وجہ سے عذر کیا تھا مگر حاجی صاحب کا خوف غالب رہا کہ وہ مجھ سے ناراض ہوں گے۔ مگر ندامت اور قلق اب تک بھی ہے۔

جدہ ایک دن قیام کے بعد مکہ مکرمہ پہنچے۔ شریف کا زمانہ تھا نہایت بدنظمی کا۔ ہم لوگوں نے جدہ سے مکہ تک کوئی اونٹ نہیں کیا بلکہ منیٰ، عرفات میں کسی جگہ نہیں کیا۔ بلکہ حضرت قدس سرہٗ کے اونٹ کے ساتھ ساتھ پیدل چلتے رہے اور بے فکری سے کبھی ادھر اُدھر بھی ہو جاتے تھے۔ میں شوق میں کچھ آگے بڑھ گیا۔ حضرت قدس سرہٗ نے بلا کر خوب ڈانٹا اور فرمایا کہ اُونٹ کے ساتھ ساتھ رہو، ذرا ادھر اُدھر نہ ہو۔ پیشاب وغیرہ کے واسطے بھی دور نہ جاؤ کہ بدو تم کو مار کر کپڑے وغیرہ سب اُتار لے گا۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر حضرت قدس سرہٗ نے حضرت مولانا محب الدین صاحب خلیفۂ اجل اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ سے ملاقات فرمائی اور معانقہ کیا۔ حضرت مولانا نے حضرت قدس سرہٗ سے فرمایا اجی مولانا، ارے مولانا! آپ کہاں آ گیا۔ ہمارے یہاں تو قیامت کبریٰ آنے والا ہے۔ عمرہ کر کے گھر واپس چلے جاؤ، ہمارے یہاں تو آگ برسنے والا ہے۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر حضرت قدس سرہ نے ایک نہایت عمدہ قاری صاحب کے پیچھے تراویح شروع کی قاری توفیق ان کا نام تھا۔ بہت ہی اچھا پڑھنے والے تھے۔ دو پارے حرم شریف میں روزانہ سناتے تھے۔ ان کے پیچھے جماعت کافی ہوتی۔ حضرت کا مصلیٰ تو امام کے پیچھے ہوتا تھا اور چونکہ تینوں صفیں بہت پہلے سے بھر جاتی تھیں اس لیے ہم لوگوں کو جگہ بہت پیچھے ملتی تھی۔ بالکل میرے پیچھے محاذات میں ایک لڑکا شافعی نہایت عمدہ اور نہایت تیز پڑھتا تھا۔ اس لیے یہ ناکارہ قرآن تو اس کا سنتا تھا کہ وہ میرے بالکل قریب اور جہری الصوت تھا مگر رکوع سجود قاری توفیق کے ساتھ کرتا تھا۔

حرمین شریفین میں تراویح کے واقعات:

اس زمانے میں حرمین شریفین میں عشاء کی نماز بجائے ڈیڑھ کے ڈھائی بجے ہوا کرتی تھی اور حرمین کے حضرات ہندوستان والوں پر بہت خفا ہوا کرتے تھے کہ یہ ہندی لوگ ایسے بیوقوف ہیں کہ سارے سال تو مغرب وعشاء میں ان کے یہاں دو ڈھائی گھنٹے کا فصل ہوتا ہے اور رمضان میں صرف ڈیڑھ گھنٹے کا۔ کھانا کھایا اور تراویح کو چل دو۔ افطار کے بعد کھانا کھانے میں چائے وغیرہ پینے میں دو گھنٹے تو کم از کم چاہئیں۔ اب تو ڈھائی گھنٹہ کا فصل مکہ میں نہیں رہا۔

۸۹ھ کا رمضان شریف بھی اس ناکارہ نے حرمین شریفین میں گزارا۔ اب عشاء کی نماز ۲ بجے ہوتی ہے۔ حضرت قدس سرہ قاری توفیق کے پیچھے تراویح پڑھ کر جو تقریباً ساڑھے چار بجے عربی فارغ ہوتے تھے مکان تشریف لے جاتے تھے۔ ہم خدام مولانا منظور احمد صاحب، حاجی انیس، یہ ناکارہ اور مولوی اسحاق مرحوم حضرت قدس سرہٗ کو مکان پر پہنچا کر کپڑے نکال کر ایک لنگی باندھ کر اور دوسری لنگی کاندھے پر ڈال کر تنعیم عمرے کے احرام کے لیے چلے جاتے۔ سواری پر کبھی نہیں گئے۔

ایک دفعہ عربی گدھے پر سوار ہونے کا شوق ہوا۔ نہایت ہی خوبصورت اور آنکھیں ہرنیوں کی آنکھوں کی مانند نہایت حسین اور اُوپر نہایت خوشنما لال رنگ کی دھاریاں۔ مگر وہاں کا یہ دستور تھا کہ حاجی کو گدھے پر بٹھا کر گدھے کا مالک اس کے ایک ڈنڈا مار دیتا۔ ساتھ جانے کا دستور نہیں تھا۔ نہ اس میں لگام اور نہ چار جامہ وہ گدھے اس قدر سدھے ہوئے سنجیدہ کہ باب العمرہ سے جو ایک دوڑ لگاتے تھے تو مسجد تنعیم پر جا کر سانس لیتے تھے۔ چاہے سوار ان کے اوپر ہو اور چاہے گر جائے۔ آدھ گھنٹہ وہاں ٹھہر کر وہ گدھے سیدھے باب العمرہ پر واپس آجاتے تھے۔

ایک دفعہ ان کے حسن و جمال کی وجہ سے ان پر سواری کا شوق ہوا تو پانچ سات منٹ ہم گدھے پر رہے اس کے بعد اس نے تو مسافت پوری کر ہی لی۔ چونکہ لڑکپن تھا۔ بھاگنے دوڑنے کا شوق تھا اس لیے گھنٹے سوا گھنٹے میں واپس آکر طواف وسعی کر کے بال تو روز روز کہاں ہوتے تھے دو چار قرش میں سر پر استرا پھرواتے۔ گھر آکر کپڑے پہنتے سحری کھاتے اور صبح کی نماز پڑھ کر جو سوتے تو قبیل ظہر ہی اٹھتے۔ رمضان کی رات کا جاگنا اسی سال سے شروع ہوا ہے۔ بڑے مزے اور لطف سے رمضان گزرتا رہا۔

ایک عربی کا حضرت کی دعوت کرنا اور اس کا دلچسپ قصہ:

ایک دن ایک مکی عرب کے یہاں حضرت قدس سرہٗ کی دعوت ہوئی ہم لوگ تو یہ سمجھتے رہے کہ ہم سے کیا واسطہ، حاجی صاحب نے گھر میں اطلاع کر دی ہوگی اور حاجی صاحب نے گھر میں اطلاع نہیں کی تھی۔ وہ فرماتے تھے کہ مجھے دعوت ہی کی خبر نہیں ہوئی۔ بہرحال اماں جی نے سب کا کھانا پکوالیا اور قبیل مغرب دعوت کا کھانا۔ ماشاء اللہ عربوں کی دعوت تھی خوان پر خوان گھر آگئے اور حاجی جی کا غصہ اور پارہ آسمان پر چڑھ گیا۔ خوب ناراض ہوئے۔ کھانے کو تو سب تیار ہو جاتے ہیں اتنی زبان ہلاتے ہوئے بھی بوجھ معلوم ہوتا تھا اور ان سے اماں جی کم خفا ہوئیں۔ ارے مجھ بڑھیا کا خیال کر لیتے۔ گرمی میں روزے میں پکانے میں بھی دقت اور پکوانے میں بھی دقت ہے۔ حضرت قدس سرہٗ نے کچھ نہیں فرمایا۔ حاجی صاحب مرحوم اور اماں جی رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے رہے کہ یہ کل کو باسی ہوگا۔ اس کو روزے دار کیسے کل کو کھائیں گے۔ مغرب کے بعد کچھ کھایا اور کچھ دعوت کا حضرت نے دوسرے لوگوں کو دلوایا۔ مگر پھر بھی بہت تھا۔ حسب معمول عمرے سے فراغ پر ہم نے سحری کھائی۔ اماں جی نے معمول کے موافق دے دیا۔ ہم نے کھالیا میں نے حاجی انیس صاحب سے کہا کہ اور لاؤ۔ وہ اُوپر لینے گئے۔ اماں جی نے کہا کہ دعوت کا کھانا بہت مزے کا لگا۔ انہوں نے اور تھوڑا سا دے دیا۔ ہم نے اس کو ختم کر کے کہا کہ اور لاؤ۔ بھائی انیس محرم تھے وہی لایا کرتے تھے۔ وہ اور لینے گئے۔ اماں جی نے فرمایا کہ آج تو ہاضمہ بہت ہی کھل رہا ہے۔ بھائی انیس نے کہا کہ خالہ جی وقت تھوڑا ہے جلدی دے دو۔ اماں جی نے اور دے دیا۔ بھائی انیس مرحوم بھی ان ہی کے بھانجے تھے۔ کہنے لگے کہ خالہ اچھی طرح سے دے دو بار بار آنا پڑتا ہے وہ زکریا نہیں مانتا، اماں جی نے فرمایا کیا بات ہے تمہارے ساتھ اور کوئی ہے۔ حاجی انیس نے کہا کہ کوئی نہیں ہے۔ وقت تھوڑا ہے جلدی دو، انہوں نے فرمایا کہ یہ رکھا ہے سب لے جاؤ۔ وہ سب لے آئے ہم نے سب کھالیا۔ میں نے حاجی جی سے کہا کہ اور لے آؤ حاجی پھر اوپر گئے ان کو بھی

کچھ مزہ آ رہا تھا اور مجھے سب سے زیادہ کہ مغرب کے وقت ڈانٹ سن رہے تھے۔ اماں جی نے فرمایا کہ یہاں کچھ نہیں رہا اور پکانے کا بھی وقت نہیں۔ اماں جی کی اور بھائی انیس کی اچھی خاصی لڑائی ہوگئی کہ اسی پر خفا ہو رہی تھیں لاؤ اب دو۔ صبح کو حاجی مقبول نے مطالبہ کیا کہ ارے رات تم نے کیا کیا کہیں چھپا کر رکھ لیا۔ میں نے کہا کہ چھپا کر کس کے واسطے رکھتے کوئی جورو بیٹھی تھی یہاں۔ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں مقدمہ پیش ہوا۔ اماں جی نے فرمایا کہ رات کو لڑکوں نے معلوم نہیں کیا کیا۔ گھر کا اور دعوت کا سب کھالیا۔ انیس اور ماننگنے آیا تھا میں نے انکار کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے اپنے قرب خاص سے نوازے بہت ہی شفقت سے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے روز بھوکے ہی رہتے ہوں گے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت بالکل نہیں۔ اللہ کا فضل ہے۔ روزانہ سیر ہو کر کھاتے ہیں۔ ہمارا لڑکپن ہے دو دو وقت کا ایک وقت کھالیں تو بھی گرانی نہیں ہوتی۔ دو وقت نہ بھی ملے تب بھی کوئی بیتابی نہیں ہوتی۔ مگر اماں جی اور حاجی جی کی اخیر تک سمجھ میں نہ آیا کہ اس رات کو لڑکوں نے کیا کیا۔

ہم لوگوں کی مدینہ پاک حاضری اور سفری داستان:

اسی سفر میں مکہ مکرمہ میں عید الفطر کی صبح کو مولانا محمد حسین حبشی ثم المکی یکے از خلفاء حضرت سیدی و مرشدی قدس سرہٗ کی درخواست پر حدیث مسلسل بیوم العید کی اجازت حضرت قدس سرہٗ نے عطاء فرمائی۔ قراءت اس سیہ کار نے کی تھی۔ رمضان المبارک کے بعد حضرت اقدس نے ہم لوگوں سے فرمایا کہ میں تو مدینہ منورہ کچھ طویل قیام کے ارادہ سے آیا تھا۔ مگر مولانا محب الدین صاحب تو مجھے حج تک قیام کی بھی اجازت نہیں دیتے فوراً واپس جانے کا تقاضہ فرما رہے ہیں۔ میری حاضری تو مدینہ منورہ کئی دفعہ ہو چکی اور قیام کی اب گنجائش نہیں ہے۔ تم لوگوں کا پہلا سفر ہے معلوم نہیں کہ پھر مدینہ حاضری ہو یا نہ ہو تم مدینے ہو آؤ اور حضرت نے ہم چاروں کا سامان اور پیسے وغیرہ تو وہیں الحاج علی جان مرحوم کی دوکان پر جمع کرا دیے۔ میرے پیسے تو حاجی مقبول صاحب مرحوم کے پاس تھے اور ہم لوگوں کو بارہ دن جانے کے اور بارہ دن واپسی کے اور تین دن مدینہ پاک قیام کے حساب سے دال چاول ہمارے ساتھ کر دیے اور چار آنہ یومیہ کے حساب سے چوبیس یوم کی جمال کی بخشش اور دس روپے مزید دلوا دیے۔ میرے پاس کچھ اپنے بھی تھے۔ چونکہ انتہائی بدامنی کا زمانہ تھا۔ راستے نہایت خطرناک اور مخدوش تھے خوب لوٹ مار راستہ میں ہوتی تھی۔ اس لیے بہت ہی قلیل حجاج مدینہ منورہ گئے۔ ہمارے بدو کے تین اونٹ تھے دو ہم چاروں کے اور ایک اونٹ سہارنپور کے پٹھانپورہ محلّہ کی ایک عورت اور اس کے خاوند کا تھا، ہم اس کو شیبہ کے نام سے پکارا

کرتے تھے نام یاد نہیں۔ تین اونٹ آبھے کے خان صاحبان حاجی رفیق محمد اور ان کے رفقاء کے تھے، تین اونٹ حسن پور کے خان صاحبان عبدالوحید خاں وغیرہ کے تھے اور دو یا تین اونٹ حاجی نظام الدین صاحب جاذم والے کانپوری یکے از خدام حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے تھے۔ یہ گیارہ بارہ اونٹوں کا قافلہ ہمارا تھا۔ اسی طرح پندرہ بیس اونٹوں کے قافلے اور بھی دس بارہ تھے۔ چونکہ سلطانی راستہ بہت مخدوش تھا اور لٹیرے اس راستہ پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے پڑے رہتے تھے۔ اس لیے اس سال قافلے بجائے سیدھے راستے کے جدہ ہو کر سمندر کے کنارے جبل غائر کے اُوپر کو گئے تھے۔ یہ پہاڑ نہایت ہی خطرناک اور مخدوش تھا، اب تک اس کے تصور سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ ایک جانب تو اس کے پہاڑ آسمان تک پہنچا ہوا ہے۔ دوسری جانب اس کے غار تحت الثریٰ تک اس میں ایک چھوٹی سی شاہراہ (بٹیا) پر کو ایک ایک اُونٹ جمال نکیل پکڑ کر لے چلتا تھا کہ اگر ذرا اس کا پاؤں لغزش کھائے تو تحت الثریٰ میں گرے اور اُونٹ کا پتہ بھی نہ چلے اور سواریاں ساری پیدل دو دو اونٹوں کے درمیانی فاصلے میں چلتی تھیں۔

یہ حصہ تو بہت ہی خطرناک تھا جو مدینہ پاک سے تین منزلہ پہلے تھا۔ اس پہاڑ سے کچھ پہلے سارے شغدف اُتار دیے گئے تھے۔ اونٹوں کی پشتوں پر سامان باندھ دیا تھا اور اسی پر جہاں کھلا راستہ ملتا حاجی سوار ہو جاتے اور جہاں کوئی چڑھائی وغیرہ آتی اتر جاتے۔ یہ منزل تو بہت ہی دشوار گزار تھی لیکن بہت محفوظ کہ اتنے آدمی خود اس جگہ نہ پہنچے دور سے کسی کو نہ دیکھ سکتا تھا معلوم ہوا کہ حضور اقدس کا سفر ہجرت بھی اسی راستہ سے ہوا تھا۔ غائر کی منزل سے نکلنے کے بعد کھلا میدان آگیا تھا جس میں اونٹ حسب معمول رات کو چلتے تھے مگر چونکہ شغدف وغیرہ پہاڑ سے پہلے اُتار دیے گئے تھے اونٹوں پر سامان کے اُوپر بیٹھنا پڑتا تھا۔ اسی لیے ذرا سی نیند کے جھونکے میں سواریاں اونٹ پر سے آم کے ٹپکے کی طرح سے خوب گرتی رہتی تھیں۔ یہ نا کارہ تو رات کو اونٹ پر سوار ہی نہ ہوتا تھا مگر دوسروں کے لیے یہ مشکل تھی کہ دن میں دھوپ کی تمازت اور کسی قسم کا سایہ وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے ان بیچاروں کو دن میں بھی سونے کی نوبت نہ آتی تھی۔ اس مجبوری کو اُونٹوں پر بیٹھنا پڑتا تھا اور خوب گرتے تھے۔ اس سیہ کار وہ زمانہ صحت کی عمدگی کے اعتبار سے ایسا تھا کہ گرمی سردی دونوں کا احساس نہ ہوتا تھا۔ میں منزل پر پہنچ کر اول وقت ساتھیوں کے ساتھ نماز پڑھ کر ٹھنڈے ریت پر خوب سوتا تھا۔ اس وقت تو سبھی اول وقت نماز پڑھ کر سو جاتے تھے۔ مگر اوروں کی مصیبت یہ تھی کہ جہاں دھوپ میں تمازت آتی وہ جاگ جاتے اور میں تقریباً ہندوستانی گیارہ بارہ بجے کے درمیان اٹھتا۔ میرے پسینے سے میرے نیچے کا ریت اس قدر بھیگ جاتا کہ لگتا کسی نے پانی ڈال رکھا ہے۔ واپسی پر چونکہ احرام کی وجہ سے بدن پر کپڑا بھی کوئی نہیں ہوتا تھا اس لیے گرمی

کی وجہ سے ایسے دھاپڑ پڑ گئے تھے جو بلا مبالغہ کبوتر کے انڈوں کے برابر ہوتے تھے۔

میں نے تو اس مدینہ کے سفر میں کسی دن کھچڑی نہیں کھائی۔ مکہ مکرمہ سے نکلتے ہی ہر منزل پر ایک دنبہ خرید لیتے تھے۔ جو ایک یا دو مجیدی کا آجاتا تھا۔ اس زمانہ میں مجیدی وہاں کا ایک عام سکہ تھا جیسے اس زمانے میں ریال ہوتا ہے۔ خریدتے ہی آبجے کے جملہ احباب چونکہ مشاق شکاری تھے وہ اس کو دس پندرہ منٹ میں ذبح کر کے کھال نکال کر بوٹیاں کر لیتے تھے۔ اور کھال کسی بدو کو دے دیتے تھے۔ وہ بدو کھال لے کر اس قدر خوش ہوتا اُچھلتا کودتا لوگوں کو دکھاتا پھرتا اور دنبہ کی بوٹیاں فوراً چار جگہ تقسیم ہو جاتیں۔ چاروں دسترخوان پر جن کا اُوپر ذکر آیا یعنی ہمارا، آبجے والوں کا، حسن پور والوں کا اور کانپور والوں کا اور لوگ تو اُترتے ہی کھچڑی پکاتے اور اس میں سے کھاتے اور دنبہ پکنے کے بعد روٹی پکا کر رات کے واسطے ساتھ لے لیتے۔ لیکن یہ ناکارہ کھچڑی نہ کھاتا تھا۔ اپنے دنبہ میں سے ایک دو بوٹی کھا کر بقیہ تینوں دسترخوان کا دنبہ چکھتا کہ ہر ایک کو اصرار اور اشتیاق تھا۔ چونکہ حضرت قدس سرہٗ نے چلتے وقت مکہ سے اس سیہ کار کو قافلہ کا امیر بنا دیا تھا۔ اس لیے چاروں جماعتوں کے یہاں جا کر ان کی خیر خبر لینا ان کی یا ان سے جمال کو کچھ شکایت ہو اس کو سننا اور اس کا تصفیہ کرنا۔ اسی میں کچھ کھانا پینا اس سیہ کار کا مشغلہ تھا۔ مولوی لطیف الرحمٰن مرحوم میرے عزیز بھی تھے اور ہم عمر بھی تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے میرے دونوں ساتھیوں مولانا منظور احمد رحمہ اللہ تعالیٰ اور حاجی انیس مرحوم کو بہکایا کہ ہم لوگ تو پکاویں اور یہ امیر صاحب یوں ہی ٹہلتے پھرتے ہیں، ایک دن ان سے بھی پکوانا چاہیے۔ مولانا منظور احمد نے ان کو سمجھایا کہ تمہارا امیر ہے چناں چنیں ہے۔ سب کی خیر خبر لیتا ہے یہ بھی تو ایک کام ہے۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے بہت ہی سمجھایا مگر وہ دونوں راضی نہ ہوئے۔

ایک دن انہوں نے متفقہ طور پر مجھ سے کہا کہ حضرت، امیر صاحب آپ کو بھی تو کچھ پکانا چاہیے، میں نے کہا بڑے شوق سے مگر مجھے پکانا نہیں آتا۔ ماموں لطیف نے کہا کہ ہم نے ساری عمر باورچی گری کی ہے؟ میں نے کہا کہ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تم سے بہتر پکانے والا اس مجمع میں کوئی نہیں ہے طباخ بھی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا اور یہ واقعہ بھی تھا مرحوم کا قیام اس زمانہ میں سہارنپور ہی میں تھا، پکانے کے نہایت شوقین اور نہایت لذیذ کھانے پکاتے تھے۔ مچھلی، کوفتے، پلاؤ۔ سہارنپور میں شوقیہ بہت مرتبہ ان سے پکوائی مگر اس دن ان کو غصہ آرہا تھا کہنے لگے کہ میں نے باورچی کی ملازمت آج تک کہیں نہیں کی۔ تھوڑی سی تو تو میں میں کے بعد میں نے کہا کہ لڑائی کی بات نہیں۔ تم لوگ بتاتے رہو ہم پکائیں گے۔ مرحوم نے کہا ہم نہیں بتائیں گے۔ میں نے کہا کہ جانے دو۔ لکڑیاں بیچنے والی تو ہر قافلہ والوں کے پاس پہنچ جاتی تھیں۔ پتھروں کا چولہا بنا کر اور

لکڑیاں اس میں رکھ کر دیا سلائی اس میں لگائی۔ بھلا دیا سلائی سے لکڑی کیسے جل سکتی ہے۔ ہم نے تین چار دیا سلائیاں پھونک دیں۔

وہ شیبہ جس کا اونٹ ہمارے ساتھ تھا اس کی بڑھیا بیوی اپنے میاں سے کہنے لگی کہ ان مولانا صاحب کو آگ جلانا بالکل نہیں آتی تو جلادے۔ میرے محترم دونوں بزرگ اس پر بگڑ پڑے کہ تو نے ہماری آگ بھی جلائی؟ اس نے کہا کہ تم کو تو جلانی آتی ہے۔ ہمارے ان مولانا صاحب کو آتی نہیں۔ اس بڑھیا نے اس بوڑھے سے کہا کہ ارے نہیں میرے چولہے کی ساری لکڑیاں ان کے چولہے میں رکھ آ۔ اس کا چولہا خوب جل رہا تھا۔ میں نے اپنے چولہے کی لکڑیاں نکال کر ان کے چولہے کی طرف ڈال دیں اور دیگچی میں پانی خوب بھر کر ہم نے پوچھا کہ کھچڑی کتنی پڑے گی وہ دونوں خوب ناراض ہوئے کہ جان جان کر باؤلا بنتا ہے۔ میں نے کہا کہ تمہارا نقصان ہوگا میں تو پکا دوں گا۔ مولانا منظور احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے جلدی سے اٹھ کر میری دیگچی میں سے آدھا پانی لوٹے میں ڈالا۔ میں بھی یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں نے اس بھری دیگچی میں کھچڑی ڈالی تو پانی نکل کر آگ بجھا جاوے گی وہ بڈھا اور بڑھیا بھی خوب ہنس رہے تھے اور ان کے ہنسنے پر میرے دونوں محترموں کو خوب غصہ آرہا تھا۔ مولانا منظور احمد صاحب نے فرمایا کہ دو لپیں بھر کر کھچڑی کی ڈال دو اور پھر ایک لپ نمک کی بھر کے اس میں ڈالنے کا ارادہ کیا تو وہ بوڑھا بولا کہ اجی مولوی صاحب خراب ہو جائے گی۔ ہم نے کہا تو بتادے۔ اس نے چٹکی نمک لے کر ذرا سا ڈال دیا۔ حاجی انیس صاحب کو زور سے بولنے کی عادت بہت تھی۔ کہنے لگے کہ کبھی تو نے ہماری ہانڈی کی بھی خبر لی۔ بقیہ تینوں دستر خوان بھی قریب قریب تھے۔ پہلے تو آبھے کے پٹھان لمبے لمبے قد آور لمبی لمبی لاٹھیاں لے کر آئے کہ ارے شیخو! تمہارے یہاں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ آپس کی بات ہے جاؤ۔ وہ کہنے لگے کہ مولوی صاحب آپ کو ہمارا بھی امیر بنایا ہے ان کا اکیلے کا نہیں۔ دیکھو بھئی شیخو! اگر ہمارے امیر کی شان میں گستاخی کی تو ہم سر پھوڑ دیں گے اور ان لوگوں کو واقعی غصہ آگیا اور مجھ سے کہنے لگے کہ دیکھو امیر صاحب، اگر تم نے آج سے ان کے یہاں روٹی کھائی تو آپ کی بھی خیر نہیں۔ اتنے میں یکے بعد دیگرے حسن پور اور کانپور والے بھی آگئے انہوں نے متانت اور تہذیب سے گفتگو کی۔ مضمون ایک ہی تھا ان سے تو یہ کہا کہ تم نے ہمارے امیر صاحب کو چناں چنیں کہا اور مجھ سے اصرار کیا کہ آج سے کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ میں نے کہا کہ میں تو پہلے سے بھی کھانا تمہارے ساتھ ہی کھاتا ہوں، باقی میں اپنے ساتھیوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ان کا مطالبہ صحیح ہے مجھے پکانے میں شریک ہونا چاہیے مگر میں اپنی ناواقفیت کی وجہ سے یہ سمجھ کر کہ بدوؤں سے لڑنا بھی ان کا کام

ہے وہ میں نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ بہر حال بڑی خوشامد کے بعد ان سب کو واپس کیا۔

میرا جمال فرج اللہ نام طائف کا رہنے والا میرے ہم عمر لڑکا تھا۔ پہلے ہی دن سے اس سے دوستی ہوگئی وہ چار آنہ فی نفر بخشش لاتا اور میرے پاس امانت رکھواتا۔ میں اس سے کہتا کہ رکھنے کی جگہ نہیں ہے اس کا جب (تربوز) خرید لاؤ چونکہ قافلے نہیں تھے اس لیے راستہ کی چیزیں بڑی سستی تھیں اور تربوز خربوزہ راستہ میں خوب ملتے تھے۔ وہ ہر منزل پر کئی کئی تربوز اور خربوزے خرید لاتا اور ہم سب رفقاء اور ادھر ادھر کے آدمی مل کر کھاتے۔ اس جمال کو مجھ سے محبت حد سے زیادہ ہوگئی تھی۔ میں اکثر اخیر کی منزلوں میں پاؤں چلتا تھا۔ ایک مرتبہ پاؤں پر کانٹا چبھ گیا اور وہ ٹوٹ گیا اللہ تعالیٰ اس جمال کو جزائے خیر عطاء فرمائے۔ وہ رورہا تھا اور بدؤں کو نکچنڈی لے کر یکے بعد دیگرے بلاتا اور رو کر یہ کہتا تھا کہ یہ کانٹا اس کے پاؤں میں نہیں بلکہ میرے دل میں چبھ رہا ہے۔ جلدی نکالو۔

سارے سفر میں اس کی امانت جو مجھ پر قرض تھا ۲ مجیدی ہوگئے تھے۔ میں تو مطمئن تھا کہ مکہ جا کر ادا کردوں گا۔ چونکہ لاقانونی دور تھا اور جب حاجی یوں کہتے کہ ہم واپسی پر تمہاری شریف حسین سے شکایت کریں گے تو بدو کہتے کہ "من شریف؟ انا شریف" (شریف کون ہے شریف تو میں ہوں) اس لیے جب واپسی پر مکہ قریب ہوا تو پھر حاجیوں نے زور دکھانا شروع کیا کہ ہم حکومت سے شکایت کریں گے۔ ہندی سفارت خانے میں جاؤ ان سب کو پکڑواؤ۔ ان سب کو ڈر کے مارے سارے اونٹ والے قافلے کو عشاء کے بعد مکہ پہنچا کر اپنے اپنے اونٹ لے کر ایسے فرار ہوئے کہ کسی کا پتہ ہی نہ چلا۔ میں بھی فرج اللہ کو اس کے قرضہ کی وجہ سے اور انعام دینے کی وجہ سے بہت تلاش کرتا رہا، مگر آج تک اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ اس کا قرضہ مدرسہ میں لقطہ کے نام سے تصدیق بھی کرچکا ہوں اور اس کو اب تک خوب یاد کرتا ہوں۔

مدینہ پاک میں بجائے تین دن کے ایک ماہ قیام کرنا:

پہلے لکھوا چکا ہوں کہ جبل غائر سے پہلے سارے شغدف رکھ دیے تھے۔ مگر جو شخص بدو کو پانچ اشرفی دیتا اس کا شغدف تو وہ لے جانے پر تیار تھے۔ ایک یا دو کے سوا کوئی شخص پانچ اشرفیاں دینے پر تیار نہ ہوا۔ میرا جمال بہت ہی شدید اصرار کرتا رہا ہے تمہارا شغدف بلا معاوضہ جائے گا۔ میں نے زبردستی اُونٹ پر سے اُتار لیا کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ میرے اکیلے کا شغدف جائے، مجھے اس میں ساتھیوں سے ندامت ہوتی ہے اور سب کا لے جانا واقعی خطرناک تھا۔ ایک دو شغدف کو اس طرح پر کہ ایک جمال تو اونٹ کو پکڑے اور ایک دو شغدف کو پکڑیں جا سکتا تھا۔ ہم لوگ اوائل شوال میں مکہ سے چل کر بیس شوال کے قریب مدینہ طیبہ پہنچے۔ اس زمانے میں قانون یہ تھا کہ مدینہ پاک

میں قیام کی صرف تین دن کی اجازت تھی۔ اس کے بعد اگر کوئی ٹھہرنا چاہے تو اپنے بدو کو راضی کرے اور ایک اشرفی روزانہ فی نفر جمال کو دے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے احسانات کی کیا انتہا ہے ہمارے مدینہ پہنچنے پر ہمارے قافلہ کا ایک اونٹ مر گیا۔ زمانہ چونکہ بے اطمینانی اور بداعتمادی کا تھا اس لیے بدوؤں کو وہاں قرض نہ مل سکا حکومت بھی اس وقت بدوؤں کی خدمت کرنے سے معذور تھی۔ بدو ہم سے کہتے تھے کہ اگر تم لوگ ہم کو قرض دے دو مکہ جا کر ادا کر دیں گے تو ہم اونٹ خرید لیں گے، ہمارے پاس پیسے نہیں اور میں ان سے یہ کہتا کہ ہمیں تو ہمارے شیخ نے صرف تین دن کے کھانے کا سامان دیا تھا۔ اب یا تو تم لوگ لے چلو یا ہمارے کھانے کا انتظام کرو۔ وہ بے چارے خوشامد کرتے اور ہم اللہ معاف کرے ان کو ڈانٹ دیتے آٹھ دس دن میں ایک مرتبہ امیر مدینہ کے پاس بھی شکایت لے کر پہنچ جاتے وہ ایک بالا خانے پر چار پانچ بدو نہایت عمدہ مشلح پہنے ہوئے برابر برابر بیٹھے تھے اور ہماری شکایت پر معذرت کرتے کہ تمہارے بدو کا اونٹ مر گیا اس کو کہیں قرضہ نہیں ملتا۔ تم کو تکلیف تو ہو رہی ہے۔ مگر مدینہ کی تکلیف اجر سے خالی نہیں۔ اللہ کے احسانات کی کیا انتہا ہے کہ بجائے تین دن کے ایک ماہ کے قریب مدینہ پاک میں قیام رہا اور پانچ گنی روزانہ دینے کے بجائے جمالوں کو خوب ڈانٹ اور امراء مدینہ کی طرف سے خوشامدیں مزید برآں ہوتی رہیں۔

آخر ذی قعدہ میں جب حج کا وقت بہت ہی تنگ رہ گیا تو اسی روسیا نے روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر واپسی کی اجازت چاہی اور عرض کیا کہ ساتھیوں میں سے بہت سے حج بدل والے ہیں۔ اگر حج نہ مل سکا تو ان ساتھیوں کو بڑی دقت ہوگی۔ روضۂ اقدس پر درخواست پیش کرتے ہی معلوم ہوا کہ بدو کو کہیں سے پیسے قرض مل گئے وہ اونٹ کی تلاش میں ہے۔ کل کو اونٹ مل جائے گا پرسوں کو واپسی ہے۔

بندہ کے پاس مولانا شیر محمد صاحب کا امانت رکھوانا اور اس پر میری شرائط:

اسی وقت مجھ سے ایک شخص نے کہا کہ مولانا شیر محمد صاحب گھوٹکی (سندھ پاکستان) والے جو آخر میں مہاجر مدینہ بن کر وہیں جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔ حضرت حکیم الامت کے مخلص خدام اور میرے والد صاحب کے مخلص دوست مدینہ آئے ہوئے ہیں اور کل سے مجھ کو تلاش کر رہے ہیں۔ وہ مجھ کو دو دن سے تلاش کر رہے ہیں۔ مل کر لپٹ گئے اور فرمایا کہ کل سے تم کو تلاش کر رہا ہوں۔ ہمارا قافلہ پرسوں سے آیا ہوا ہے ہم ایک مصیبت میں پھنس رہے ہیں وہ یہ کہ گرمی کی شدت کی وجہ سے ہم لوگ اپنے شغدفوں پر قالین بندھوا لائے تا کہ دھوپ کی تمازت سے امن رہے جب سے یہاں آئے ہیں ہمارا قافلہ تو رؤسا کا مشہور ہو رہا ہے اور

تمہارے متعلق پرسوں سے ہر شخص کی زبان سے یہ سن رہا ہوں کہ ایک ہندی قافلہ فقیروں کا پڑا ہوا ہے جن کے پاس کھانے کو نہیں ہے۔ ہر بچہ بڑے کی زبان پر تمہارے متعلق یہی ہے اور ہمارے متعلق ہر شخص کی زبان پر رؤسا کا قافلہ مشہور ہو رہا ہے۔ ہم کو اپنی جانوں کا خطرہ ہے ہمارے پاس بہت سی اشرفیاں ہیں اللہ کے واسطے ان کو تو اپنے پاس رکھ لے مکہ جا کر لے لوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ جیسے خطرہ آپ کے لیے ہے سب ہی کے لیے ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ پر کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا۔ سب جانتے ہیں کہ ان کے پاس کھانے کو بھی نہیں ہے ان کو اپنے تکیہ میں سی لو میں نے کہا کہ آپ کو تو معلوم ہے کہ بدو راستہ کے درمیان میں تکیوں پر کھودا مارتے ہیں اگر ان کو ذرا بھی شبہ ہو گیا تو گنیوں کی بھی خیر نہیں اور میری بھی خیر نہیں۔ انہوں نے بہت ہی خوشامد کی اللہ کے کس کس احسان کا شکر ادا ہوسکتا ہے کہ اس غربت کی حالت میں مالک نے وہ مدد فرمائی۔ بڑے اصرار کے بعد میں نے تین شرطوں کے ساتھ قبول کرلیا۔

نمبر۱ مکہ میں ادا نہیں کروں گا۔ ہندوستان پہنچ کر چار ماہ میں ادا کروں گا۔

نمبر۲ یہ کہ اشرفیاں نہیں لوں گا ان کے ہندی نوٹ بنا کر آپ مجھے دیجئے۔

نمبر۳ مکہ میں حضرت کو اس کی اطلاع نہ ہونی چاہیے۔ انہوں نے تینوں شرطوں کو بڑی خوشی سے قبول کرلیا اور مجھے سات آٹھ ہزار کے نوٹ ہندی لاکر دے دیے۔

میں ان کو جیب میں ڈال کر اول اپنے رفقاء کے پاس اور پھر آبھے، کان پور، حسن پور والوں کے پاس گیا کہ بھائی دیکھو پرسوں کی روانگی طے ہوگئی۔ تمہیں کھجوریں خریدنے کے واسطے جتنے پیسے چاہئیں لے لو۔ اول تو میرے ساتھیوں نے میرا مذاق اڑایا کہ مدینہ پاک میں بھی ایسی بناوٹی باتیں کرتے ہو۔ مگر جب میں نے نوٹوں کا گٹھا نکال کر سامنے کیا تو ہر شخص پوچھنے لگا کہ یہ کہاں سے آئے۔ میں نے کہا کہ تم کو اگر چاہئیں تو بتاؤ ورنہ میں دوسروں پر احسان رکھوں۔ چنانچہ میں نے اور میرے رفقاء نے چار سو پانچ سو کی کھجوریں خریدیں اور حضرت مدنی قدس سرہٗ کے برادر معظم حضرت مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے توسط سے تجار کے اونٹوں پر براہِ راست بھیج دیں اور بقیہ رقم دوسرے رفقاء پر جس نے جو مانگا ہزار دو ہزار دو شرطوں کے ساتھ ان کو قرض دیا۔ ایک تو یہ کہ مکہ میں حضرت قدس سرہٗ کو خبر نہ ہو، دوسرے ہندوستان پہنچ کر تین ماہ کے اندر اندر مجھے ادا کردیے جائیں۔

مولانا سید احمد صاحب کی فیاضیاں:

حضرت قدس سرہٗ کو حاجی انیس صاحب کے ذریعہ کچھ پتہ چلا۔ تفصیل حاجی انیس کو بھی معلوم نہ تھیں۔ مگر حضرت قدس سرہٗ نے جواب طلب نہ فرمایا۔ ہمارے مدینہ سے چند روز قبل حضرت

مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ اپنی طویل جلاوطنی کے بعد جس کا ذکر پہلے آچکا ہے مدینہ پاک آئے تھے۔ ان کی وجہ سے ہم چاروں کا قیام ان کے اس ذاتی مکان میں تھا جس کو انہوں نے اور ان کے والد صاحب اور حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ بہت ہی خوشنما اور پُر فضا کئی کمرے برابر اور ہر کمرے میں مستقل کنواں، اندر کے صحن میں کھجوروں کے درخت جن پر رطب آرہی تھیں۔ حضرت مولانا احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی فیاضی کا تو کیا پوچھنا۔ وہ اپنی بے سروسامانی کی حالت میں علی الصباح ایک رطب کی قرض خرید کر میرے کمرے میں رکھ دیتے اور ہم لوگ شام تک اس کو ختم کر دیتے۔ دونوں وقت نہایت لذیذ کھانے بازار سے خرید کر لاتے اور اپنے دست مبارک سے اس میں مرچیں اور گھی ڈال کر خوب بھونتے، بڑے اصرار سے کھلاتے۔ تازہ پنیر دونوں وقت کی چائے دودھ کی۔ غرض مدینہ پاک کے اس ایک ماہ قیام میں ہم چاروں کو نہ کچھ خریدنا پڑا نہ پکانا پڑا۔ آخر ذیقعدہ میں مدینہ پاک سے چل کر بارہ دن میں جہاں تک یاد ہے ۴ ذی الحجہ کو مکہ پہنچے۔ یہی تاریخ سید الکونین فخر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حجۃ الوداع میں مکہ مکرمہ میں پہنچنے کی ہے۔

حج کے بعد حضرت مولانا محب الدین صاحب قدس سرہٗ کے شدید اصرار کے باوجود ایک ماہ کے قریب مکہ میں قیام رہا اور محرم کے دوسرے عشرے میں روانہ ہو کر دو تین دن بمبئی میں قیام کے بعد ۸ صفر ۳۹ھ میں حضرت قدس سرہٗ کی ہمرکابی میں سہارنپور پہنچنا ہوا اور اس کے بعد وہ حرمین شریفین میں شریف حسین کی بغاوت اور سعودی حکومت کا قیام ہوا جس میں بہت قتل عام ہوا۔

اس سفر میں ایک عجوبہ بھی پیش آیا۔ حضرت قدس سرہٗ کو مظاہر علوم کے ساتھ گویا عشق تھا۔ ہر نوع کی فلاح و بہبود ہر وقت ملحوظ خاطر تھی۔ خاص طور سے کتب خانہ کے لیے کوئی نادر کتاب کہیں مل جاتی تو حضرت مدرسہ کے لیے اس کے حصول کی بہت ہی کوشش فرمایا کرتے تھے۔ اسی سفر میں مدرسہ کے لیے صبح الاعشیٰ خرید کر لائے تھے جو اسی زمانے میں چھپی تھی اور مکہ مکرمہ میں تازہ پہنچی تھی اور ہندوستان میں کہیں نہیں آئی تھی۔ اسی سفر میں حضرت قدس سرہٗ الحاج عبداللہ عبیداللہ علی جان والوں کے یہاں تشریف لے گئے۔ ان کے یہاں مصنف عبدالرزاق کا قلمی نسخہ تھا۔ حضرت قدس سرہٗ نے مدرسہ کے لیے اس کے خریدنے کی خواہش فرمائی۔ انہوں نے سو (۱۰۰) گنی اس کی قیمت بتائی۔ حضرت نے فرمایا کہ بہت زیادہ مقدار ہے۔ انہوں نے کہا یہ بھی حضرت کی رعایت سے ہے۔ ان کے پاس سے اٹھ کر جب باہر نکلے تو میں نے عرض کیا کہ حضرت اس کی اجازت لے لیں کہ ہم لوگ اس کو نقل کر لیں۔ حضرت نے فرمایا کہ واپسی کے چند دن باقی ہیں اتنے میں کیسے نقل ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت انشاء اللہ ضرور ہو جائے گی۔ آپ اجازت تو لے لیں۔ حضرت

نے فرمایا کہ بہت دشوار ہے وقت ہی کہاں ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت لے تو لیں۔ حضرت وہیں سے واپس ہوئے اور ان سے نقل کی اجازت مانگی۔ انہوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔ دس بارہ دن واپسی کے رہ گئے ہیں کیوں انکار کریں، یہ کہہ دیا کہ بڑے شوق سے نقل کرائیں۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ کا مدرسہ سے تعلق:

میں نے اس کو لا کر جلدی جلد توڑی اور اس کا زیادہ حصہ اپنے ذمہ اور بقیہ متولی طفیل صاحب کاندھلوی، مولانا منظور احمد صاحب، بھائی انیس صاحب اور مولوی اسحاق، مولوی عبدالمجید تھانوی، قاری عبدالعزیز مدرس تجوید مظاہر علوم، مولوی لطیف الرحمٰن، مولوی حبیب احمد نارنولی وغیرہم کے ذمہ تقسیم کر دیا جو اس سفر میں ساتھ تھے۔ صبح سے لے کر ظہر تک ہم لوگ اس کو نقل کرتے اور عصر سے مغرب تک میں اور حضرت قدس سرہٗ اس کا مقابلہ کیا کرتے۔ دس پندرہ دن میں نقل ہو گئی۔ ہندوستان واپسی کے ایک دو دن پہلے اس کی جلد بنوا کر حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ حاجی عبید اللہ صاحب کے مکان پر حاضری ہوئی اور وہ کتاب واپس کی۔ انہوں نے کتاب لے کر کہا کہ حضرت میں تو پہلے ہی عرض کرنے کو تھا وقت بہت تھوڑا ہے اس میں کیسے نقل ہو سکتی ہے۔ حضرت قدس سرہٗ نے اس سیہ کار کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان بچوں کو جزائے خیر دے، انہوں نے نقل کر لی۔ انہوں نے کہا کہ حضرت پوری نقل ہو گئی۔ حضرت نے فرمایا، جی ہاں اللہ کا شکر ہے ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور ان کو یقین بھی نہیں آیا۔ کہنے لگے کہ حضرت وہ نقل میں ضرور دیکھوں گا۔ میں نے کہا کہ میں ابھی لاتا ہوں۔ میں لے کر ان کو دکھانے لایا۔ اتنا ضرور تھا کہ کئی خط تھے اور عجلت میں خوشخط بھی نہ لکھی جا سکی۔ مگر دس بارہ دن میں دونوں جلدیں پوری ہو گئیں تھیں۔

دوسرا اور تیسرا حج

بندہ کا حضرت قدس سرہ کی ہمرکابی میں دوسرا حج اور واپسی پر تیسرا حج:

اس سیہ کار کا ۴۴، ۴۵ھ میں میرے آقا میرے مرشد حضرت قدس سرہٗ کی ہمرکابی میں ہوا۔ میرے حضرت کی ہمیشہ سے تمنا مدینہ پاک میں موت کی تھی۔ ۳۸ھ میں بھی اسی تمنا میں تشریف لے گئے تھے مگر مولانا محب الدین صاحب کے اصرار سے واپس آنا پڑا۔ اس مرتبہ بھی حضرت قدس سرہٗ طویل قیام کے ارادہ سے تشریف لے گئے اور مدرسہ سے ڈیڑھ سال کی رخصت لی۔ چونکہ حضرت قدس سرہٗ کا طویل قیام کا ارادہ تھا اور اس سیہ کار کی ملازمت کے علاوہ قرض کا بار بھی تھا

اور دو بچیاں والدہ ہارون اور والدہ زبیر پیدا ہو چکی تھیں۔ ان سب کی خورد ونوش کا بھی انتظام تھا۔ اس لیے میرے اور حضرت قدس سرہٗ دونوں کے ذہن میں اس ناکارہ کا جانا نہیں تھا، اسی لیے میرے اور حضرت قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہ اعلی اللہ مراتبہٗ نے اپنی غیبت کے جو انتظامات لکھوائے اس میں حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو ناظم اور اس سیہ کار کو صدر مدرس بنا دیا۔ یہ تحریر میری لکھی ہوئی نہیں تھی۔ حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی تھی۔ مگر چونکہ ڈاک کا تعلق مجھ ہی سے تھا۔ ہر وقت کے حجرہ کی آمد ورفت بھی تھی اور وہ میرے ہی کاغذات میں رکھی ہوئی بھی تھی۔ اس لیے میں نے اس کو راز میں بھی نہیں سمجھا اور پڑھ لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر کہ مجھے صدر مدرس بنایا گیا ہے میرے ہوش اُڑ گئے۔ حضرت اوپر پیشاب کے لیے تشریف لے گئے اور یہ ناکارہ پیچھے پیچھے لوٹا لے کر پہنچا۔

حضرت کا سفر حیدر آباد اور ایک ہفتہ قیام:

میں نے عرض کیا کہ بذل کا کیا ہوگا۔ حضرت نے بہت ہی فکر اور سوچ سے فرمایا، فکر تو مجھے بھی ہو رہی ہے۔ تمہارے بغیر تو میں لکھ بھی نہیں سکتا۔ جس کی تفصیل پہلے گزر گئی۔ اس ناکارہ کی ہم رکابی طے ہوگئی اور چونکہ حیدر آباد کے احباب کا حضرت قدس سرہٗ پر بہت دنوں سے اصرار تھا کہ حیدر آباد دو چار دن کے لیے تشریف لے آئیں۔ اس لیے قرار پایا کہ اماں جی رحمہ اللہ تعالیٰ اور حاجی مقبول اور سب رفقاء سہارنپور سے سیدھے بمبئی جائیں اور حضرت قدس سرہٗ ایک ہفتہ کے لیے حیدر آباد ہو کر جائیں۔

یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا کہ ایک خادم کا حضرت کے ساتھ ہونا بہت ضروری ہے اور چونکہ فرسٹ کلاس کا سفر تھا۔ اس وقت میں سہارنپور سے بمبئی تک کا کرایہ گیارہ بارہ روپے تھا اور سہارنپور سے حیدر آباد کا کرایہ فرسٹ کلاس چونسٹھ روپے تھا۔ میں جلدی سے بول پڑا کہ حضرت کی ہمرکابی میں میرا نام لکھ دو۔ اماں جی وغیرہ سارا قافلہ سہارنپور سے بمبئی ۲۳ شوال پنجشنبہ ۴۴ھ کو روانہ ہوا اور چونکہ حضرت قدس سرہٗ کو حیدر آباد ایک ہفتہ قیام کرنا تھا اس لیے وہ ایک ہفتہ قبل ۱۶ شوال پنجشنبہ مطابق ۲۹ اپریل ۲۶ء کو حیدر آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ حضرت قدس سرہٗ کا اور اس سیہ کار کا ٹکٹ تو فرسٹ کلاس کا تھا اور مولوی زکریا قدوسی مرحوم کا سرونٹ کا۔

اگلے دن اس ناکارہ کی روانگی حیدر آباد اور ریل کے اسٹیشنوں کا فریضہ:

اہلِ مدرسہ سے خوب الوداعی معانقے ہوئے۔ راستے میں بھی اسٹیشن تک خوب ہوئے اور اسٹیشن کا تو پوچھنا ہی کیا۔ چونکہ حضرت قدس سرہٗ گویا عمر بھر کے واسطے الوداع فرما رہے تھے اس

لیے نہ صرف قرب وجوار بلکہ دُور دُور کا مجمع الوداع کے واسطے آیا ہوا تھا اور سارا اسٹیشن ڈٹ رہا تھا۔ سب سے رخصت ہو لیے اور گارڈ نے سیٹی بھی دے دی جب یاد آیا کہ حضرت قدس سرہٗ کا خاص بکس جس میں ساری امانتیں اور سب کے کرائے اور غالباً کچھ خصوصی سامان حیدرآباد لے جانے کا بھی تھا اور وہ عمومی سامان کے ساتھ اسٹیشن پر پہلے سے اس لیے نہیں بھیجا گیا تھا کہ وہ بہت مہتم بالشان تھا۔ تجویز یہ تھی کہ وہ حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ فٹن میں رکھا جائے گا، اس میں رکھنا بھول گئے۔ عین وقت میں یہ ناکارہ اور مولوی قدوسی مرحوم اُتار دیے گئے کہ کل کو اسی گاڑی سے صندوق لے کر چلیں۔ دہلی تک تو حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ جانے والے بہت ہو گئے تھے۔ فرسٹ میں بھی اور تھرڈ میں بھی لیکن اس کے بعد حیدرآباد تک حضرت کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔

جب میں اسٹیشن سے پیدل مدرسہ آ رہا تھا اور ہزاروں کا مجمع حضرت کو رخصت کر کے واپس آ رہا تھا۔ اسٹیشن سے مدرسہ تک وہ گالیاں سُنیں لا تعد و لا تحصی۔ ہر ایک کہہ رہا تھا کہ یہ مولوی کیسے مکار ہیں۔ دیکھو یہ ریل پر سب سے معانقہ کر رہا تھا۔ ''جب نہیں کہا گیا کہ میں نہیں جا رہا۔'' ابے فلانے، ابے یہ آگے آگے جو مولوی جا رہا ہے'' دیکھو کیسا دغا باز ہے۔ اس وقت تو ہر ایک سے مصافحہ کر رہا تھا۔'' مجھ سے بھی بیسیوں نے پوچھا کہ ''جی آپ تو حج کو جا رہے تھے؟'' یہ تو میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ صندوق رہ گیا کہ خواہ مخواہ لوگوں کو اپنے پیچھے لگاتا تھا۔ بعضوں نے تو کہہ دیا کہ بھائی کچھ کام یاد آ گیا۔ بعضوں سے کہا کہ میں نے کب کہا کہ میں حج کو جا رہا ہوں، تو نے کیوں معانقہ کیا؟

غرض مدرسہ تک خوب لتاڑ پڑی اور اگلے دن تک بھی لتاڑ پڑتی رہی۔ اگلے دن یہ ناکارہ صندوق لے کر اسی شام کے چار بجے کے ایکسپریس سے جو اس زمانہ میں بھوپال کو جاتی تھی روانہ ہوا۔ یہ ناکارہ مع بکس کے فرسٹ کلاس میں اور مولوی قدوسی مرحوم سرونٹ میں۔ بکس کی وجہ سے مجھے بھی اکیلے ڈر لگ رہا تھا کہ فرسٹ میں اور کوئی تھا ہی نہیں۔ منمار تک تو ایکسپریس سے جانا ہوا۔ وہاں سے حیدرآباد تک ریاستی ریل میں جو چھوٹی لائن سہارنپور تا شاہدرہ سے بھی چھوٹی تھی سوار ہوئے، مگر تیز وہ اس سے بہت چلتی تھی۔ میں فرسٹ کلاس میں پاؤں پھیلائے پڑا ہوا تھا اور ہر اسٹیشن پر سر اُٹھا کر اسٹیشن کی سیر کرتا تو عجیب منظر دیکھا۔ ہر اسٹیشن پر پچیس تیس آدمی فرسٹ کلاس کے سامنے رکوع تک جھک کے دونوں ہاتھوں سے سلام کر رہے تھے۔ میں بھی ہاتھ کے اشارے سے جواب دیتا رہا اور یہ سمجھتا رہا کہ یہاں فرسٹ کلاس کے مسافروں کے ساتھ یہی ہوتا ہوگا۔ گاڑی میں تو میں اکیلا تھا۔ وہاں حضرت مولانا نصر اللہ کے بڑے صاحبزادے مولوی محمود صاحب مرحوم چند رفقاء کے ساتھ مجھے لینے آئے۔ وہاں بھی یہی منظر ہوا تو میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے؟ وہ بہت ہنسے، کہنے لگے ایک بہت بڑے افسر کا تبادلہ ہوا ہے اور اس کا اسی گاڑی سے آنا

طے تھا۔ اس کے استقبال کے لیے یہ لوگ آئے تھے اور اس سے واقف نہیں۔ ان میں بھی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کوئی تو کہتا کہ افسر صاحب یہی ہیں اور کوئی کہتا یہ تو مولوی صاحب ہیں افسر ایسے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر ممارتا حیدرآباد کی سلامی کی شرح معلوم ہوئی۔

ایک ہفتہ تک حیدرآباد میں جانی میاں جو حیدرآباد کے معروف لوگوں میں اور ہمارے سب اکابر سے خصوصی تعلق رکھنے والوں میں تھے۔ دارالعلوم کی شوریٰ کے ممبر بھی تھے۔ ان کے ہاں قیام رہا۔ حد سے زیادہ حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے انہوں نے مدارات اور خاطریں کیں۔ میرے عزیز مولوی ادریس صاحب کاندھلوی حال شیخ التفسیر جامعہ اشرفیہ لاہور مولوی فیض الدین صاحب وکیل کے یہاں ان کو عربی پڑھانے پر ملازم تھے اور خالی اوقات میں آصفیہ کے کتب خانہ میں اپنی تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے۔ وکیل صاحب کے یہاں بھی مولوی ادریس کی وجہ سے میرا تقریباً روزانہ ہی جانا ہوتا تھا، وہ بھی بڑی خاطر کرتے تھے۔ وہاں کے احباب کا اصرار حضرت قدس سرہٗ کی نظام صاحب سے ملاقات پر ہوا۔ حضرت قدس سرہٗ نے یہ فرمادیا کہ میرا صرف ایک ہفتہ قیام ہے، اس کے بعد بمبئی جانا ضروری ہے کہ میرے سب رفقاء اس وقت تک بمبئی پہنچ جائیں گے۔ اس میں اشکال یہ ہوا کہ اگر نظام صاحب کے یہاں معروضہ ملاقات کا پیش کیا گیا اور نظام صاحب نے وقت ایک ہفتہ کے بعد کا مقرر کردیا تو اس کو چھوڑ کر بمبئی جانا مناسب ہوگا۔ اس لیے ملاقات کی درخواست کی رائے تو ملتوی ہوگئی۔ البتہ حضرت قدس سرہٗ نے بذل المجہود کی جلد اول اور ثانی جن کی نہایت خوبصورت جلدیں سہارنپور میں بنوا رکھی تھیں اور ان کے شروع میں نہایت مطلا حسین مطبوعہ کاغذ نظام صاحب کے نام کا لگوا رکھا تھا بھیجیں۔ اس کی بنا پر نظام صاحب کے یہاں سے دو تین دفعہ خاصا (یعنی دعوتی کھانا) بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ آیا۔ کھانا تو کچھ معمولی ہی سا تھا مگر اس کے برتن وغیرہ خوان اور خوان پوش وغیرہ بہت زریں۔ معلوم ہوا کہ نظام صاحب خود بھی ایسا ہی سادہ کھانا کھاتے ہیں۔

بہرحال ایک ہفتہ قیام کے بعد ۲۵ شوال شنبہ کی صبح ۹ بجے حیدرآباد سے روانہ ہوکر یک شنبہ کی صبح بمبئی پہنچے اور بمبئی سے ۷ ذیقعدہ پنجشنبہ ۴۴ھ مطابق ۲۰ مئی ۲۶ء کو جدہ نامی جہاز سے روانہ ہوکر ۱۷ کو کامران پہنچے جہاں ۲۴ گھنٹے کا قرنطینہ تھا۔ چونکہ کئی دن پانی میں گزرے تھے اس لیے خشکی پر بڑا ہی لطف آیا۔ کھلا میدان سمندر کی ٹھنڈی ہوا۔ ریت پر بڑی میٹھی نیند آئی اور تو کوئی چیز اس وقت یاد نہیں، انڈے مرغیاں بہت ہی کثرت سے تھیں۔ میں نے تو صرف انڈے ہی لے کر اور رفقاء کے یہاں فرائی پان میں کڑکڑا کر خوب انڈے کھائے، انڈے تو ایک پیسے کے کئی آتے تھے، مرغیاں خوب یاد ہیں کہ دو دو آنہ کی آتی تھیں۔ بیس عدد تو حاجی مقبول صاحب نے حضرت قدس سرہٗ کے

دستر خوان کے لیے لیں اور تیس عدد متولی جلیل کاندھلوی مرحوم نے لیں۔ اسی طرح بہت سے رفقاء نے بیس سے کم لینا تو کسی کا یاد نہیں پچاس تک لیں اور ان سب کو ذبح کر کے نمک ڈال کر بغیر پانی کے گھی میں بھون کر رکھ لیں۔ گھی بھی بہت سستا تھا اور جدہ تک اور بعض نے مکہ تک تھوڑی تھوڑی اس میں سے لے کر پانی مصالحہ ڈال کر پکاتے رہے اور کھاتے رہے۔ اس سیہ کار کے فرائض میں سے تو ہر دستر خوان کا نمک چکھنا ضروری تھا۔ ہر ایک دستر خوان پر مرغی کی ایک دو ٹانگیں میرے لیے مخصوص ہوتیں۔ چونکہ حضرت قدس سرہٗ مستقل قیام کے ارادہ سے تشریف لے گئے تھے اس لیے سامان بہت سارا تھا۔ جدہ جا کر بقدر ضرورت مختصر سامان مکہ کے لیے حضرت نے رکھا اور باقی سارا سامان جدہ میں مطوف کے وکیل کے ذریعہ سے جدہ کے تجار کے سامان کے ساتھ براہِ راست مدینہ منورہ بھیج دیا۔

سفر خرچ کی میزان:

اس سیہ کار کی بھی سنو! ۳۸ھ کے سفر میں بہت مختصر سامان تھا یعنی ایک ڈبل زین کا تکیہ کا بہت بڑا غلاف اس میں تین چار جوڑے کپڑے کے ایک چادر دو کپڑے احرام کے ایک دو لنگی زائد بس یہ سامان بجائے روئی کے تکیہ کے غلاف کے اندر تھا۔ لیکن اس مرتبہ چونکہ میں بھی ڈیڑھ سال قیام کے ارادہ سے گیا تھا۔ اس لیے ایک بکس بھی میرے ساتھ تھا جس میں سات آٹھ جوڑے۔ لنگیاں، تولیے اور نہ معلوم کیا کیا۔ میرے سفر حجاز کی کاپی میں بالتفصیل لکھا ہوا ہے۔ ایک بستر ہ بہت بڑا سارا ترپال میں بندھا ہوا۔ جس میں لحاف بچھونا، رضائی، کمبل اور اس میں دو تکیے وہی ۳۸ھ جیسے۔

جب یہ طے ہوا کہ یہ ناکارہ حضرت کے ساتھ ایک ہفتہ کے لیے حیدر آباد جائے گا تو ۳۸ھ کے قاعدہ کے موافق ایک تکیہ کا غلاف جس میں دو جوڑے دو لنگیاں ایک سلی ہوئی اور ایک بغیر سلی ہوئی اور ایک مصلیٰ نما گدیلہ ایک رسی میں باندھ کر یہ سامان تو اپنے ساتھ رکھا اور اپنا بستر ہ اور بکس جانے سے کئی دن قبل بذریعہ بلٹی ریل میں بمبئی بھیج دیا۔ جب یہ ناکارہ حیدر آباد پہنچا تو اس خیال سے کہ جہاز میں کیا ضرورت پیش آئے گی۔ اپنا حیدر آباد والا سامان اپنے ساتھ رکھا اور ان دونوں چیزوں کو بہت زیادہ مضبوط سُتلی کی ڈوریوں سے بندھی ہوئی تھی جہاز کے گودام (نیچے کے حصے) میں ڈلوا دیئے اور جدہ پہنچنے کے بعد حضرت قدس سرہ کے فالتو سامان کے ساتھ اپنا ٹرنک اور بستر ہ بھی حضرت کے سامان میں رکھوا دیا۔ تاجروں کا حال ایسا ہی ہوتا ہے بالخصوص حج کے زمانے کی مشغولی میں، حضرت قدس سرہٗ کا یہ سامان جس میں ٹرنک اور بستر ہ بھی تھا۔ ربیع الاوّل میں مدینہ پاک پہنچا۔ روز ارادہ کرتا تھا کہ ٹرنک کو اور بستر کو کھولوں۔ مگر کاہلی اور مشغولیت اور سب سے اہم یہ ہے کہ حضرت مولانا سید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی برکت سے کہ انہوں نے میرے حجرے میں

بہترین گدے اور لحاف پہلے سے بچھا رکھے تھے کمبل وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ اس ناکارہ کو اپنا سامان کھولنے کی نوبت نہ آئی اور جب ذیقعدہ ۴۵ھ میں اس سیہ کار کی واپسی ہوئی تو میں نے حضرت مولانا سید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو دونوں چیزیں یہ کہہ کر حوالے کر آیا تھا کہ جب اس سامان کی اب تک ضرورت پیش نہ آئی تو اب اس بوجھ کو لے جا کر کیا کروں گا۔ آپ ان کو ملاحظہ فرمالیں کوئی چیز آپ کو پسند آئے تو میرے لیے موجب عزت، پسند نہ آئے تو جس کو چاہے تقسیم کر دو۔ یہ تو میں نے نہیں پوچھا کہ انہوں نے کیا کوئی چیز خود بھی رکھی یا دوسروں کو دی۔ البتہ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں کے مدرسین اور طلبہ کو کچھ دے دیا تھا اور یہ ناکارہ اپنا وہی حیدرآباد والا سامان لے کر ذیقعدہ میں واپس آ گیا۔ البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ ۳۸ھ میں جب یہ ناکارہ روانہ ہوا تو چھ سو روپے میرے پاس تھے اور جب سہارنپور واپس پہنچا تو میرے سفر خرچ کی میزان اٹھارہ سو روپے تھی جو مولانا شیر محمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے قرضہ سے ملی تھی اور جب ۴۴ھ میں یہاں سے روانہ ہوا تو میرے پاس سفر خرچ اٹھارہ سو روپے تھا۔ لیکن محرم ۴۶ھ میں واپس ہوا تو میری میزان خرچ اڑتالیس سو روپے تھے جس میں کچھ نذرانے بھی تھے اور کچھ حضرت مولانا سید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نور اللہ مرقدہٗ نے یہاں دہلی وغیرہ کے بعض احباب کے پاس سامان منگانے کے لیے کچھ رقوم دی تھیں۔ یہ پتہ نہیں یہ سارے پیسے کاہے میں خرچ ہوئے۔ جبکہ اس سارے سال میں مجھے اپنے پاس سے ایک دن بھی کھانا نہیں پڑا اس لیے کہ جاتے ہوئے حضرت قدس سرہٗ کا مہمان تھا اور مدینہ کے قیام میں حضرت کے ساتھ ساتھ مولانا سید احمد صاحب کا بھی مہمان تھا اور دونوں کا مہمان ہونا جب معلوم ہوا جب ایک دن مجھے بخار آیا تو میرے لیے مونگ کی کھچڑی میرے کمرے میں حضرت قدس سرہٗ کے دولت کدہ سے الگ آئی اور حضرت مولانا کے مکان سے الگ آئی۔

کھچڑی پر ایک قصہ یاد آ گیا۔ اماں جی اور حاجی مقبول صاحب کو کھچڑی کا بہت شوق تھا۔ سہارنپور کے قیام میں بھی سردی میں حضرت قدس سرہٗ کے مکان پر اکثر پکتی تھی اور جس دن پکتی حضرت حاجی صاحب کی طرف سے آدمی پر آدمی اُوپر کتب خانہ میں جہاں حضرت بذل لکھوانے جایا کرتے تھے کہ گھر بلایا ہے۔ حضرت فرماتے کہ آ رہا ہوں۔ تیسرے چوتھے تقاضہ پر حضرت یہ کہہ کر اُٹھتے کہ کھچڑی پکی ہوگی اسی کی مصیبت آ رہی ہے۔ میں نے کئی دفعہ کہا کہ کھچڑی پکا کر تم کھالیا کرو میرا حرج نہ کیا کرو۔ میں اپنے وقت پر آ کر روٹی کھالوں گا۔ مدینہ پاک میں بھی سردی میں کھچڑی خوب پکی اور جب کھانے پر کھچڑی آتی تو مولانا سید احمد صاحب جلدی سے اُٹھتے اُوپر کی منزل میں تشریف لے جاتے جہاں ان کا زنانہ مکان تھا اور بہت بڑے پیالہ میں گھی گرم کر کے

لاتے اور ایک دم اس کو کھچڑی کی رکابی میں اُلٹ دیتے اور فرماتے کہ اس کا نام گھی چری ہے اور گھی اس میں شوربے کی طرح بہہ جاتا۔ حضرت بھی ناراضی کا اظہار فرماتے اور میں بھی ان کے سر ہوتا کہ آپ نے کھانے کے قابل نہیں چھوڑی۔ اُوپر کے حصہ کو تو ہم کھالیتے اور نیچے کا حصہ جس میں گھی کا شوربا بہتا ہوا ہوتا ملا اللہ بندہ، ملا نذیر کہ یہ دونوں خادم بھی اس وقت میں ساتھ تھے ان کے حوالہ کر دیتے۔ کہ اس میں کھچڑی اور ملا کر کھالیں۔ ان کے تو بہت مزے آتے گھی بہتی کھچڑی کھاتے۔ کھچڑی کا نہ مجھے شوق تھا اور نہ حضرت کو تھا۔

بات کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے کامران میں ایک شب قیام کے بعد ۱۸ ذیقعدہ کو جدہ کو روانگی ہوئی اور تیسرے دن ۲۱ کو جدہ پہنچے۔ دو شب وہاں قیام رہا اور وہاں سے ۲۵ اونٹوں پر مکہ مکرمہ حاضری ہوئی۔ مکہ مکرمہ میں باب ابراہیم کے سامنے ایک گلی تھی اس گلی میں کئی مکانات بہت بوسیدہ تھے۔ اس زمانے تک مکہ مکرمہ اور مدینہ پاک کے سارے ہی مکانات بوسیدہ خستہ حال پرانی وضع کے تھے۔ باب ابراہیم کی اس گلی میں دو تین مکان تھے۔ اس میں سے ایک مکان جو کسی بیوہ کا تھا ۳۸ھ میں بھی یہی مکان کرایہ کے لیے لیا گیا تھا۔ جو حضرت کے معلم سید مصطفیٰ نے پہلے سے لے رکھا تھا اور اس مرتبہ بھی انہوں نے یہی مکان کرایہ پر لیا۔ اس کی دو منزلیں تھیں نیچے کی منزل میں ہم خدام کا قیام تھا اور اوپر کی منزل میں حضرت اور اماں جی رحمہما اللہ تعالیٰ کا۔ ۳۸ھ اور ۴۴ھ کے دونوں سفروں میں ہم خدام نے نہ تو جدہ سے مکہ تک کوئی اونٹ وغیرہ کیا تھا اور نہ مکہ سے منیٰ عرفات کی آمد و رفت کے لیے۔ حضرت قدس سرہٗ اور اماں جی کے اُونٹ کے ہمراہ ہمارا سفر پیدل ہوتا تھا۔ بڑے لطف کا سفر تھا۔ اب تک خوب یاد آتا ہے۔ عرفات کے میدان میں دو چھوٹے چھوٹے خیمے ایک زیادہ چھوٹا جس کو چھولداری کہتے تھے، جس میں اماں جی اور ان کی خادمہ رحمتی کاندھلوی مُلّا نذیر کی بیوی تھیں اور ایک بڑا خیمہ جس میں حضرت قدس سرہٗ اور ہم سب خدام، حضرت قدس سرہٗ کا عرفات کے میدان میں تن تنہا دعاؤں میں حفظ اور دیکھ کر مشغول رہنا خوب یاد ہے اور ہم خدام بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی سفر میں حضرت کی برکت سے خانہ کعبہ کی داخلی بھی نصیب ہوئی کہ شیبی صاحب نے تعلقات کی وجہ سے مخصوص خدام کے لیے کعبہ شریف کو کھولا تھا۔ ۲۶ ذی الحجہ یوم چہار شنبہ بعد عصر ۹ بجے عربی مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کے لیے روانگی ہوئی۔ اہل عرب اکثر غروب کے تین گھنٹے قبل عصر پڑھ لیتے ہیں۔ کیونکہ غروب بارہ پر ہوتا ہے اس سفر کی تفاصیل یہ ناکارہ اکمال الشیم کے مقدمہ میں تفصیل سے لکھ چکا ہے۔

۸ محرم دوشنبہ ۴۵ھ کو مدینہ پاک میں داخل ہوئے اور مدرسہ شرعیہ قدیم میں (اب تو مدرسہ شرعیہ بالکل بدل گیا) اُترے اور اس کے قریب ہی حضرت مولانا سید احمد صاحب نے ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا، جس کی تین منزلیں تھیں۔ سب سے تحتانی منزل مولانا سید احمد صاحب کی مردانی منزل تھی اور اُوپر کی دو زنانی۔ لیکن حضرت قدس سرہٗ کی تشریف بری کے بعد دوسری منزل کی حضرت کی تالیف کے لیے خالی کر دی اور اپنی مستورات کو اُوپر پہنچا دیا۔ اسی اُوپر کی منزل میں مولانا مرحوم کا ایک بکری خانہ بھی تھا، جس میں بہت سی بکریاں بندھی رہتی تھی۔ حضرت کے وہاں کے قیام کے تفصیلی حالات اکمال الشیم کے مقدمہ میں لکھوا چکا ہوں، اس کا اعادہ یہاں تکرار محض ہوگا۔ جس کا دل چاہے اس میں دیکھ لے، میرے چچا جان بھی اس سفر میں حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ تشریف لے گئے تھے اور ان کا ارادہ وہاں طویل قیام کا تھا، مگر روضۂ اقدس سے واپسی کا اشارہ ہوا کہ تم سے کام لینا ہے۔ اس کی تفاصیل علی میاں چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کی سوانح میں اس ناکارہ کی روایات سے بہت تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

چچا جان قدس سرہٗ اپنا حج فرض ۳۲ھ میں کر چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے ۴۴ھ کا حج میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی طرف سے کیا اور یہ ناکارہ اپنا حج فرض ۳۸ھ میں کر چکا تھا اس لیے میں نے ۴۴ھ کا حج اپنی والدہ کی طرف سے کیا اور ۴۵ھ کا مدینہ سے واپسی پر اپنے والد صاحب کی طرف سے کیا۔ وہاں کے قیام میں اشراق کی نماز کے بعد سے ہندوستانی ۱۱ بجے تک حضرت قدس سرہٗ نہایت یکسوئی کے ساتھ بذل المجہود کے املاء میں مشغول رہتے۔

حضرت قدس سرہٗ کی توجہ اور شفقت کا ایک قصہ:

یہ ناکارہ نابکار لغویات میں بچپن سے لے کر اس پیری تک ہمیشہ ہی مبتلا رہا۔ ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ نہایت توجہ سے املاء کرا رہے تھے اور یہ سیہ کار ہاتھوں سے تو لکھ رہا تھا اور دل سے نہ معلوم کس خرافات میں لگ رہا تھا۔ حضرت قدس سرہٗ نے املاء کراتے کراتے نہایت جوش سے فرمایا:

"من بتو مشغول و تو با عمرو زید"

اب تک بھی وہ منظر یاد ہے اور ہمیشہ ہی یاد رہے گا کہ حضرت کے اس ارشاد پر مجھے ایک دم پسینہ آ گیا اور بہت ہی سوچنے پر بھی اس وقت یاد نہ آیا کہ میں کس خرافات میں لگ رہا تھا۔ حضرت قدس سرہٗ یہ الفاظ فرما کر پھر املاء کرانے لگے۔ اس ارشاد مبارک کے فرماتے وقت نہ تو کتاب پر سے سر مبارک اُٹھایا۔ فتح الباری سے عبارت لکھواتے رہے۔ عبارت کے درمیان ہی ارشاد فرمایا۔ اللہ میرے حضرت قدس سرہٗ کو بہت ہی درجے عطاء فرمائے کہ حضرت نے اپنی توجہ شفقت الطاف

میں کبھی کسر نہ فرمائی۔ کاش کہ یہ سیہ کار کسی قابل ہوتا۔

میرے حضرت قدس سرہٗ کا معمول بلا طلب کسی کو اوراد اشغال کچھ بتانے کا نہیں تھا، جس کی تفصیل بھی اکمال کے مقدمہ میں گزر چکی ہے۔ لیکن یہ سیہ کار مدینہ پاک کے اس قیام میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پیچھے پیچھے نماز کے لیے حاضر ہورہا تھا۔ دکۃ اغوات کے قریب پہنچ کر حضرت کھڑے ہوگئے اور پیچھے منہ کرکے اس سیہ کار کو بلا طلب ارشاد فرمایا کہ پاس انفاس کرلیا کرو۔ مگر افسوس کہ کبھی کچھ نہ کرکے دیا۔

ہندوستان کے قیام میں نو (۹) سال اور کچھ مہینوں میں بذل المجہود کی ساڑھے تین جلدیں لکھی گئیں اور مدینہ پاک میں ۸ ماہ میں ڈیڑھ جلد پوری ہوگئی اور ۲۱ شعبان ۴۵ھ یوم چہار شنبہ بوقت ۹ بجے ہندی بذل المجہود کا اختتام ہوا اور حضرت کو اتنی مسرت اس کی تھی کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی اور ۲۳ شعبان جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کے بعد مدرسہ شرعیہ میں حضرت قدس سرہٗ نے بڑی طویل و عریض دعوت علماء مدینہ کی کی۔ جس کے دعوت نامے بھی طبع کرائے۔ وہ تو دعوت نامہ بھی اکمال الشیم کے مقدمہ میں لکھوا چکا ہوں مدینہ طیبہ کی برکات کا تو کیا پوچھنا۔ یہ ناکارہ اوجز المسالک کی ڈیڑھ جلد کا مسودہ مدینہ پاک کے چند ماہ کے قیام میں لکھ لایا تھا اور ساڑھے چار جلد ہندوستان میں تیس (۳۰) سال میں پوری ہوئیں۔ مدینہ پاک سے ۱۶ ذیقعدہ ۴۵ھ کو روانگی ہوئی۔ ایک عجیب بات اس وقت پیش آئی۔ معلوم نہیں لکھنے کی ہے یا نہیں۔ روضۂ اقدس پر الوداعی سلام کے وقت بے اختیار بے ارادہ زبان سے یہ لفظ بار بار نکل رہا تھا کہ حضور جلدی بلالیں۔

مدینہ پاک سے واپسی اور اونٹوں کا لاری سے بدکنا:

ظہر کے بعد مدینہ پاک سے روانگی ہوئی۔ اس وقت تک کوئی لاری مدینہ پاک نہیں پہنچی تھی۔ میں اور حضرت اقدس رائے پوری دونوں حضرت مولانا سیّد احمد صاحب کی مدد سے اس تحقیقات میں تھے کہ لاری کب آنے والی ہے۔ جس کی خبر کئی مہینے سے سن رہے تھے۔ حضرت قدس سرہٗ نے ایک مرتبہ دریافت فرمایا کہ روانگی کی کوئی تاریخ طے ہوئی میرے منہ سے نکل گیا کہ حضرت لاری کا انتظار ہے، اس کے آنے کی خبریں سن رہے ہیں۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا، نہیں جی اونٹوں ہی پر جاؤ سنت ہے۔ اس پر اونٹوں کی تیاری ہوئی۔ اُونٹوں پر ظہر کے بعد چل کر گھنٹہ سوا گھنٹہ میں باب العنبر یہ تک پہنچے تو سامنے سے لاری آرہی تھی۔ غریب اونٹوں نے کبھی اس کو دیکھا نہیں تھا۔ لاری والے نے زور سے ہارن بجایا اور دمادم کئی دفعہ بجایا۔ اس پر اونٹ جو بدکے ہیں اور شتر بے مہار کی مثل صادق آئی ہے کہ کوئی ادھر کو بھاگ رہا ہے کوئی

اُدھر کو۔ اُن کو بھاگتے دیکھ کر لاری والے نے ہارن تیز کر دیا۔ جس پر اونٹوں میں اور بھی ہیجان پیدا ہوا۔ سارے شغدف اُونٹوں پر سے خوب گرے۔

حاجی احمد خاں صاحب راج پوری بھی مع اہلیہ کے ہمارے ساتھ تھے اور انہوں نے اپنے شغدف کو اس قدر بچار کھا تھا کہ تعزیہ بنا رکھا تھا۔ جگہ جگہ اس میں سامان رکھنے کے بانات کی جیبیں لگا رکھی تھیں، وہ اتنا ٹوٹا کہ اس کی لکڑیاں بھی الگ الگ ہوگئیں۔ سارے قافلہ نے باب العنبر یہ کے باہر پڑاؤ ڈالا اور یہ ناکارہ مغرب کے بعد مدرسہ شرعیہ واپس گیا۔ جس وقت یہ ناکارہ مدرسہ شرعیہ کے سامنے باب المجیدی سے آگے بڑھا تو حضرت قدس سرہٗ عشاء کی نماز کے بعد دولت کدے پر واپس جا رہے تھے۔ مولانا سید احمد لالٹین لیے ہوئے حضرت کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔

اس ناکارہ نے مولانا مرحوم کو زور سے آواز دی۔ ''علی رسلک ایها الشیخ السید احمد'' وہ میری آواز پہچان کر ایک دم کھڑے ہوئے اور حضرت قدس سرہٗ بھی کھڑے ہوگئے۔ میں دوڑ کر حاضر ہوا۔ حضرت نے فرمایا خیر تو ہے۔ میں نے سارا قصہ سنایا۔ حضرت تو اندر تشریف لے گئے اور یہ ناکارہ اور مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ ساری رات مدرسہ شرعیہ کی چھت کے اُوپر شب عید منانے میں مشغول رہے، نہ خود سویا نہ مولانا کو سونے دیا۔ اگلے دن ظہر کے بعد واپسی ہوئی۔

دوسرے دن بہت ہی کوشش کی کہ روضۂ اقدس پر جلد حاضری کی درخواست کروں مگر آورد تھی آمد نہ تھی۔ میرے حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ ساتھ تھے۔ میرے مرشد حضرت سہارنپوری قدس سرہ نے الائمۃ من قریش کہہ کر اس سیہ کار کو امیر اور اس امارت کو جتنا حضرت اقدس رائے پوری نے نبھایا کسی اور نے نہیں نبھایا اور اس سیہ کار نے بھی اپنی حماقت سے اپنی امارت کا بہت ہی زور دکھلایا۔ حضرت رائے پوری کے ساتھ ان کے خدام بھائی خلیل، محمد علی، وغیرہ مستعد جوان تھے۔ وہ حضرت کا شغدف بدوؤں سے نہیں بندھواتے تھے، خود اس قدر مضبوط باندھتے تھے کہ ذرا حرکت نہیں ہوتی تھی۔ حضرت کے رفقاء میں ایک رئیس بھی تھے۔ ان کو یہ شکایت تھی کہ میرا شغدف ایسا نہیں باندھا جاتا جیسا حضرت کا ہوتا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ ان کو سمجھایا کہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ خدام کو جتنا اہتمام حضرت کا ہوگا اتنا میرا یا آپ کا ہوسکتا ہے؟ اگر چہ وہ احباب حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے اس ناکارہ کا شغدف تو حضرت جیسا ہی باندھتے تھے مگر ان رئیس صاحب کی خاطر میں نے اپنا نام بھی ان کے ساتھ شامل کرلیا۔ دو تین منزل تو وہ خفا ہوتے رہے اور میں سمجھاتا رہا۔

چوتھی منزل پر میں نے شور مچا کر ''اوگف الاول'' کہا جس کا مطلب تھا کہ سب سے اگلے اونٹ کو روک دو کہ قافلہ جب ہی رک سکتا تھا۔ جب پہلا اونٹ رُکے اور بدوؤں کا یہی جملہ معروف تھا۔ جب قافلہ کھڑا ہوگیا، میں نے کہا بحیثیت امیر میں حکم دیتا ہوں کہ حضرت مولانا عبدالقادر

صاحب اپنے اونٹ سے اُتر کر فلاں صاحب کے اونٹ پر سوار ہو جائیں اور فلاں صاحب حضرت کے اونٹ پر۔ حضرت فوراً اپنے اونٹ سے اُتر گئے اور فلاں صاحب نے اُترنے سے انکار کیا۔ اس ناکارہ نے قافلہ کو چلنے کا حکم دے دیا اور حضرت اقدس سے عرض کیا کہ آپ پیدل چلیں۔ حضرت قدس سرہٗ تھوڑی دیر پیدل چلتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان رئیس صاحب نے بڑی خوشامد ومنت سماجت کی اور عہد کیا کہ آیندہ بالکل شکایت نہیں کروں گا۔ اس پر اس ناکارہ نے قافلہ رکوا کر حضرت کو سوار کرایا۔ اسی سفر کے منتہا پر دو لاکھ مرغیوں کا قصہ پیش آیا جو پہلے گزر چکا ہے اور بھی کئی بڑے واقعات اس مبارک سفر میں پیش آئے، کہاں تک لکھوایا جائے۔

بندہ کی قافلہ امارت:

اس کے بعد ناکارہ کے دو سفر حج باوجود تیاری اور ارادہ کے مقدر نہ تھے۔ پہلا حج تو ۶۹ھ میں حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی معیت میں، حضرت قدس سرہٗ کا یہ سفر اس ناکارہ کی معیت ہی کی وجہ سے طے ہوا تھا۔ حضرت قدس سرہٗ پاکستان کے طویل سفر سے واپس تشریف لائے اور آنے کے بعد فرمایا کہ اس سفر میں تم بہت یاد آئے، اس لیے کہ اس سفر میں ہوائی جہاز میں کثرت سے بیٹھنا ہوا اور جب میں ہوائی جہاز میں بیٹھتا تو تم خوب یاد آتے کہ یہ سواری تو تمہارے لیے مناسب ہے، مگر میں سوچتا رہا کہ پاکستان آنا تو تمہارا ناممکن اور ہندوستان میں بھی ہوائی جہاز میں بیٹھنے کی کوئی صورت نہیں۔ تم کو ہوائی جہاز سے مکہ لے چلوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت ضرور۔ سامانِ سفر مکمل ہو گیا، تیاری پختہ ہو گئی ہے، لیکن اس زمانے میں بمبئی سے ہوائی جہاز حدود مصر کے اُوپر سے گزرتا تھا اور بمبئی اور کراچی میں انفلوئنزا کی وباء عام پھیل گئی اور خوب شہرت ہو گئی۔ عین جہازوں کی روانگی کے وقت حکومتِ مصر نے اعلان کر دیا کہ بمبئی اور کراچی کا کوئی جہاز ہماری حدود کے اوپر سے پرواز نہیں کر سکتا۔ حضرت قدس سرہٗ کے ارادۂ سفر کی وجہ سے رائے پور اور قریب وجوار کے لوگوں نے بھی حج کا ارادہ کر لیا۔ جب ہوائی جہاز کا التواء ہوا تو اس سیہ کار نے معیت سے عذر کر دیا کہ بحری سفر کا میرا دماغ متحمل نہیں ہے۔ پہلے دو سفروں میں بھی دورانِ سر اور امتلاء بہت زیادہ رہ چکا تھا اور اب تو اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ یہ حج تو تمہاری ہی وجہ سے طے ہوا تھا، ملتوی تو میں بھی کر دیتا، مگر میرے التواء سے ان لوگوں کا بھی ملتوی ہو جائے گا جن پر فرض ہے، اس لیے مجھے تو ان کی مجبوری کی وجہ سے جانا پڑے گا۔ قلق تو اس سیہ کار کو بھی بہت رہا اور حضرت قدس سرہٗ کو خوب رہا۔ مگر بحری سفر کا واقعی مجھے تحمل نہیں ہے۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے علی میاں سے بھی اس سفر میں عین وقت پر یعنی شوال میں معیت کی

خواہش فرمائی اور علی میاں نے کچھ مصارف کی حیثیت سے تامل ظاہر کیا۔ میں نے کہا کہ لاحول ولا قوۃ پیسوں کا خیال نہیں کیا کرتے۔ میں نے تو دونوں حج قرض سے ہی کیے ہیں۔ علی میاں نے کہا قرض میرے بس کا نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ:

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

میں تو اپنی ایک لڑکی شاکرہ مرحومہ کا حج بدل تجویز کر دیا اور جب ہی قرض لے کے مولانا کو رقم بھی پیش کر دی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو بہت ہی بلند درجات عطاء فرمائے۔ ان کے احسانات بھی اس سیہ کار پر **لاتعد و لا تحصیٰ** ہیں۔ مولانا نے حج بدل تو مرحومہ کا کیا ہی لیکن خطوط سے بھی معلوم ہوا اور زبانی بھی کہا کہ حج سے فراغ کے بعد سے مصر روانگی تک مرحومہ کی طرف سے بہت سے عمرے بھی کیے۔ مگر حضرت قدس سرہٗ کی ہمرکابی میں اس مرتبہ حج نہ کرنے کا قلق اب تک ہے۔ میرے حضرت رائے پوری کے احسانات کا نہ شمار نہ احصار، اللہ تعالیٰ اپنی شایانِ شان ان کا بدلہ مرحمت فرمادے۔

جب حضرت اس سفر حج سے واپس لائے تو ارشاد فرمایا کہ سارے سفر میں یہ سوچتا رہا کہ تمہارے واسطے کوئی ایسی چیز لے کر جاؤں جس سے تمہارا واقعی جی خوش ہو۔ مشلح، مصلیٰ اور کئی چیزیں ذہن میں آئیں، مگر میں ہر چیز کے متعلق یہ سوچتا رہا کہ میری خاطر تم اظہارِ مسرت تو بہت کرو گے مگر تمہارا دل خوش نہ ہوگا۔ بہت غور و خوض کے بعد میں نے مسجدِ نبوی سے عمرے کا احرام تمہاری طرف سے باندھا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت خود ہی ارشاد فرمادیں کہ اس احسانِ عظیم کے برابر کوئی دوسرا ہدیہ ہوسکتا ہے؟ عمرہ اور پھر آپ کا اور وہ بھی مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ انشاء اللہ میرے لیے تو یہی ایک چیز کافی ہے۔

حضرت رائے پوری کا ہدیہ عمرہ بندہ کے لیے:

حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے اس احسان اور اخلاص و محبت کی برکت کہ اس کے بعد سے جو احباب کی طرف سے اس سیہ کار کی جانب سے جو عمروں کا سلسلہ بندھا ہے تو بڑھتا ہی چلا گیا۔ بعض سالوں میں تو مکی مدنی اور آفاقی احباب کی طرف سے سو سو عمروں سے زائد کی اطلاعیں ملیں اور اب تو دس بارہ برس سے عمروں کے ساتھ حج بدل کا بھی سلسلہ شروع ہوگیا اور بعض سنین میں دس دس بارہ بارہ حج بدل کی اطلاعیں ملیں اور ان سب کا ثواب "**من سن سنتہ حسنۃ فللہ اجرھا واجر من عمل بھا** حدیث کی بناء پر حضرت اقدس رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کو مل رہا ہے اور میرا بھی حضرت کے عمرے کے بعد یہ مستقل معمول بن گیا کہ جانے والے احباب سے خاص یہ

فرمائش کرتا ہوں کہ میرے لیے کوئی ہدیہ، مصلیٰ، رُومال، تسبیح وغیرہ ہرگز نہ لائیں۔ بعض بے تکلف دوستوں کے اس قسم کے ہدایا سختی سے ان کو واپس کر دیے۔ میرا ہدیہ مکہ مکرمہ کا طواف وعمرہ ہے اور مدینہ پاک کا روضۂ اقدس پر صلوٰۃ وسلام ہے۔ میرے نزدیک اصل ہدایا یہی ہیں اور رُومال و مصلیٰ وغیرہ تو لغو اور بے کار ہیں اور اب تو ہماری بدقسمتی سے اس سے بھی معاملہ اوپر ہو گیا ہے کہ مکہ مکرمہ کے ہدایا گھڑیاں اور ریڈیو وغیرہ بن گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

عرفات کے موقع پر آندھی، طوفانی بارش اور حضرت رائے پوری کی کرامت:

والی اللہ المشتکی میں اپنے بعض رسائل میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور اب بھی لکھواتا ہوں کہ اس ناکارہ کے لیے اُوپر مذکورشدہ اشیاء ہی ہدایا ہیں، یہ لغویات میرے نزدیک ہدایا نہیں ہیں اور ایک رنج وہ واقعہ بھی اس سال کے حج کے متعلق سوچتا رہا کہ لکھواؤں یا نہیں کہ امسال عرفات کے موقع پر اس زور کی آندھی اور طوفانی بارش ہوئی کہ خیمہ بھی اُکھڑ گئے۔ حجاج کو اولے اور بارش کی بڑی تکلیف اُٹھانی پڑی۔ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ نے تقریباً آدھ گھنٹہ قبل حکماً اپنے رفقاء کو لاریوں میں سوار کرا دیا اور ساتھیوں کو تعجب بھی ہوا کہ ابھی سے لاریوں میں بیٹھنے کا حکم کیوں ہے۔ لیکن جب بارش اور اولوں کی بھرمار اور خیموں کا گرنا دیکھا تب حضرت کی کرامت کا حال معلوم ہوا۔ بعد میں سُننے میں آیا کہ اس دن عرفات میں بھی ریڈیو پر گانا ہوتا رہا۔ ایسی حالت میں اگر آفات نہ آئیں تو کیا آئے۔ آسمانی اور ارضی حوادث کا رونا تو ہم ہر وقت روتے ہیں، مگر یہ کبھی نہ سوچا کہ:

”اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست“

رمضان ۹۰ھ میں مشرقی پاکستان کے طوفانوں سے حالات:

اسی رمضان ۹۰ھ میں مشرقی پاکستان میں جو لرزہ خیز طوفان آیا، جس کے سُننے اور نقل کرنے کی بھی ہمت نہیں ہے۔ اس کا جو پس منظر معلوم ہوا تو بجز اس کے اور کیا کہا جائے کہ اللہ کی رحمت اُمت کے حال پر شامل ہے کہ معمولی عذاب پر قناعت فرما لیتے ہیں۔ ورنہ تو ہم لوگ اپنے آپ کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ پاکستان کے خطوط سے اس وقت طوفان کی جو خبریں معلوم ہوئیں، ان کا لکھوانا اور سننا دونوں بہت مشکل ہے۔ بہت سے خطوط میں سے دو مکتوب عزیزم الحاج مولوی احسان الحق جو تبلیغی جماعت کے ساتھ اس طوفان کی خبر پر مشرقی پاکستان گئے اور الحاج صغیر احمد صاحب لاہوری جنہوں نے مشرقی پاکستان سے آنے والوں کے حالات نقل کیے، ان میں سے چند واقعات نقل کرا رہا ہوں۔

۱۱، ۱۲ رمضان کی درمیانی شب میں جو کہ شب جمعہ تھی ۱۲ بجے کے قریب نہایت شدت کی آواز اوراس کے ساتھ سمندر کا پانی بانسوں اُوپر اچھل کر اس زور سے آبادیوں پر سے گزرا کہ کچھ انتہا نہیں۔ پہلے ڈیڑھ سومیل کی رفتار سے تیز آندھی، جس میں خوفناک آوازیں بھی تھیں چلی۔ پانی سمندر کا بعض جگہ پچیس تیس فٹ تک ہوگیا تھا۔ پانی اول تو نمکین پھر سخت گرم اُوپر سے بارش، جس کا ہر قطرہ جسم میں سوئی کی طرح چبھتا تھا۔ آتے وقت پانی کی رفتار کم تھی۔ لیکن جاتے وقت اس میں بلا کی طاقت اور زور تھا۔ سب کچھ ہی بہا کر لے گیا۔ انسان کیا بڑے بڑے درخت بھی بہا کر لے گیا۔ لاکھوں انسان کروڑوں جانور ڈیڑھ گھنٹے میں ختم ہوگئے۔ بچنے والوں میں مرد زیادہ ہیں اور عورتیں کم۔ بچے تو معلوم ہوتا ہے سارے ہی ختم ہوگئے۔ رہ جانے والے بھی ہوش وحواس گم کر بیٹھے اوراپنے ہاتھوں سے اپنے بچوں کو پانی میں پھینکنا پڑا۔ نفسا نفسی کا قیامت والا منظر تھا۔ البتہ جن گھروں میں تعلیم وتبلیغ ہوتی تھی یا جو اس وقت ذکرودعاء میں لگ گئے اوراس افراتفری کے عالم میں بھی سحری اور نماز فجر کا خیال رکھا، ان کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بچادیا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ پڑوس کے گھر میں تیرہ فٹ پانی اوراس گھر میں دوتین فٹ پانی۔ ساری مسجدیں پانی میں ڈوب گئیں، لیکن جس میں ساتھی (یعنی رفقاء جماعت تبلیغ) ذکرودعاء میں مشغول تھے اس کے اندر پانی گیا ہی نہیں۔ غرض کہ ایسی ایسی غیبی نصرتیں ہوئیں کہ ان کی وجہ سے اس طوفان کے بعد ساتھیوں کے ایمان میں اضافہ ہوا جبکہ اوروں کے تو ہوش وحواس گم اوران کی زبانوں پر کفریہ کلمات تک آگئے۔ صرف کام کرنے والے ساتھی ہی لاشوں کو دفن کرنے میں لگے۔

حضرت! ساری اُمت مسلمہ ہی کی بداعمالیوں کی وجہ سے یہ طوفان آیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ ان سیلاب زدہ علاقوں میں پہلے جو کلمات، دینی لباس، علماء، ڈاڑھی، روزہ، شعائر اسلام کا استہزاء و تضحیک کے بارے میں زبانوں پر آئے تھے، ان کو نقل کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ اللہ کی شان کہ جس علاقہ میں حفاظتی بند لگایا تھا، اس علاقہ میں اسی بند سے ٹکرا کر پانی اور علاقوں سے زیادہ اونچا ہوگیا اوراسی میں سب سے زیادہ تباہی آئی۔ زیادہ تر وہ علاقے متاثر ہوئے جہاں زانی، شرابی اوراس سے بڑھ کر بھی جو کچھ اور برائی ہوسکتی تھی اس کے مرتکب رہا کرتے تھے۔ اس بستی میں ایک مؤذن صاحب کا گھرانہ نو (۹) افراد پر مشتمل رہا کرتا تھا۔ وہ اپنے مکان کی چھت (چھپر) پر بیٹھ گئے۔ پانی آیا اس نے چھپر کو اوپر اُٹھایا اور دو درختوں کی ٹہنیوں کے بیچ میں پھنسا دیا۔ اس طرح سے وہ بالکل محفوظ رہے۔ متاثر ہونے والوں کا بیان بھی مختلف معلوم ہوتا ہے کہ حسب حال پانی نے معاملہ کیا۔ کہتے ہیں پانی اس قدر سرد تھا کہ اس کی خنکی نے مارڈالا۔ کچھ کہتے ہیں، پانی اس قدر گرم تھا کہ اس کی گرمی نے مارڈالا اور کچھ کہتے ہیں کہ پانی میں چکر یا ایسی قوت تھی

کہ اس نے اپنی پلیٹ میں لے کر اٹھا اٹھا کر پہنچا وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا حج جس کے نہ کرنے کا قلق ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ۷۴ھ کا حج ہے۔ عزیزم حضرت الحاج مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی برکت سے کہ وہ میری درخواست پر میری سب بچیوں کو حج کو لے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے اور بلند درجات عطاء فرمائے اور اس سفر میں حضرت اقدس شیخ الاسلام مولانا مدنی بھی تشریف لے گئے تھے اور بمبئی سے ایک ہی جہاز سے حضرت قدس سرہٗ اور مولانا محمد یوسف صاحب کا ساتھ ہوا۔ میں نے بھی اس سفر میں جانے کا ارادہ کر رکھا تھا، لیکن بحری کی تو میری ہمت نہ تھی اور رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا اس سال ہوائی جہاز سے جانا پہلے سے طے شدہ تھا۔ میں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ ان کے ساتھ ہوائی جہاز سے چلا جاؤں گا اور ہوائی جہاز ہی سے واپس آ جاؤں گا۔ حضرت مدنی کے ساتھ حج میں شریک ہو جاؤں گا۔ وقت بھی زائد خرچ نہ ہوگا اور کچھ دقت بھی نہ ہوگی۔ لیکن حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کی طبیعت ناساز تھی اور مستورات کے قافلہ کی روانگی کے بعد اور زیادہ خراب ہوگئی۔ بہٹ میں گانگرو والی کوٹھی میں قیام تھا۔ اس سیہ کار کا معمول روزانہ سبق پڑھا کر عصر کے بعد بہٹ جا کر علی الصباح واپسی کا تھا اور حضرت کی طبیعت روز افزوں خراب ہوتی چلی گئی۔ میں نے ایک دن حضرت سے عرض کیا کہ مولوی یوسف صاحب کے بعد سے نظام الدین جانے کی ضرورت ہو رہی ہے۔ اجازت ہو تو ایک دورات کے لیے نظام الدین ہو آؤں۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہارے پیچھے مر گیا تو میرے جنازے کی نماز کون پڑھائے گا۔ اس فقرے پر اس سیہ کار نے حجاز کا تو ارادہ ہی ملتوی کر دیا کہ جب دہلی کی اجازت پر یہ جواب ہے تو حجاز کی اجازت سے طبیعت پر بہت ہی اثر ہوگا۔ اس کے کچھ دن بعد حضرت بہٹ سے سہارنپور منتقل ہوئے اور مدرسہ میں قیام ہوا۔ بقرعید کی نماز بھی یہاں مدرسہ ہی میں پڑھی اور جب یہ قافلہ واپس آیا تو حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ نے بہت ہی رنج و قلق کے ساتھ یہ ارشاد فرمایا کہ مجھے جہاز میں بیٹھنے کے بعد معلوم ہوا کہ تمہارا بھی ارادہ تھا۔ اگر جانے سے پہلے معلوم ہو جاتا تو زبردستی تم کو اپنے ساتھ لے لیتا۔ میں نے پوری بات عرض کر دی کہ طیارہ سے ارادہ تھا۔ مگر حضرت رائے پوری کی شدتِ علالت اور فقرہ کی وجہ سے حاضری نہ ہو سکی۔ قلق مجھے بھی بہت ہے کہ حضرت کے ساتھ حج نصیب ہو جاتا۔

بندہ کا چوتھا حج اور تیسرا سفرِ حجاز:

۸۴ھ میں ہے۔ یہ بھی حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی برکت سے ہے۔

عزیزم مرحوم رجب سے اس پر مصر تھے کہ میں ان کی ہمرکابی میں حج کو جاؤں اور میں اپنے امراض واعذار اور تالیفی مشاغل کی وجہ سے انکار کرتا رہا۔ جتنا میرا انکار ہوتا اس سے زیادہ عزیز موصوف کا اصرار ہوتا۔ شوال میں میرے ایک دہلوی مخلص محسن نے میرے رفیقِ سفر الحاج ابوالحسن صدیقی سے یہ کہا کہ حضرت دہلوی حج کو جارہے ہیں۔ اگر شیخ بھی ان کے ساتھ جائیں تو تمہارا اور ان کا کرایہ میرے ذمے۔ حالانکہ ان کو مولانا یوسف صاحب کے اصرار اور میرے انکار کی خبر بھی نہ تھی۔ مولانا یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان سے زیادہ شدید اصرار کرنے والا ابوالحسن پیدا ہوگیا۔ میں نے بھی اس کو من جانب اللہ سمجھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات پیش آئی کہ میرا پکا پاسپورٹ مولانا یوسف صاحب کے مخلص مہمان نے ایک دن میں بنوادیا اور وہ مقدر سے کچھ دنوں کے بعد کھو بھی گیا۔ مگر مولانا یوسف صاحب کے تصرف سے وہ ایسی جگہ سے ملا جہاں کئی مرتبہ تلاش کیا جاچکا تھا۔ لیکن میں اپنے واقعی اعذار کی بنا پر معذرت ہی کرتا رہا۔ عزیزم مرحوم نے یہ کہا کہ میرا پہلا حج اپنے والد صاحب (میرے چچا جان) کے ساتھ ہوا تھا اور دوسرا حج حضرت مدنی کی معیت میں ہوا۔ مجھے ایک سرپرست کی ضرورت ہے میں نے کہا کہ اب تو تم ماشاءاللہ خود سرپرست ہو۔ مرحوم کے دلائل نے تو مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا۔ لیکن جب ایک مرتبہ اس نے بہت ہی خوشامد سے یہ لفظ کہا کہ: ”بھائی جی میرا دل چاہتا ہے کہ آپ تشریف لے چلیں اور ارادہ فرما ہی لیں۔“ میں نے کہا کہ اس کا کوئی جواب نہیں۔ میں نے ان محسن صاحب کے کرایہ کو بھی شدت سے انکار کردیا تھا لیکن وہ اصرار ہی کرتے رہے اور ایک مرتبہ سہارنپور کی آمد پر میرے شدید انکار کے باوجود وہ عشاء کے وقت میرے بستر کے نیچے پانچ ہزار کے نوٹ رکھ گئے اور عزیز ابوالحسن کو اطلاع کر گئے کہ وہ بستر کے نیچے رکھے ہیں۔ وہاں سے اُٹھالینا۔ اب تو متعین ہی ہوگیا۔

چنانچہ ۶ ذیقعدہ مطابق ۲۱ مارچ ۶۳ء شنبہ کی صبح کو حاجی عظیم اللہ نصیرالدین کی کار میں جلال آباد تھانہ بھون جھنجھانہ ہوتے ہوئے بعد مغرب نظام الدین دہلی پہنچے اور وہاں سے ۱۰ ذیقعدہ چہارشنبہ کی صبح کو فرنٹیر میل سے بمبئی روانہ ہوئے۔ جمعرات کی صبح کو بمبئی پہنچے اور بہت سے احباب کے شدید اصرار تھے کہ ہمارے یہاں قیام ہو۔ مگر اس کے باوجود مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس سیہ کار کی وجہ سے حاجی دوست محمد صاحب کی کالونی میں قیام تجویز کیا کہ وہ ہوائی اڈہ سے قریب اور شہر سے بارہ میل دور ہے تاکہ ہجوم اس سیہ کار کے اوپر زیادہ نہ رہے۔ موصوف بار بار دن رات شہر جاتے تھے اور وہاں سے طعام و نوم کے لیے میری قیام گاہ پر آتے تھے۔ البتہ جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کے بعد عام اجتماع میں جو جامع مسجد بمبئی میں تھا یہ ناکارہ بھی شریک ہوا اور وہاں سے ۱۴ ذیقعدہ اتوار کی صبح کو آٹھ بجے ہوائی جہاز سے چل کر ہندوستانی ڈیڑھ بجے جدہ پہنچے۔ الحاج

ارشد مرحوم ہم لوگوں کو اپنی کار میں لے کر سیدھے اپنے مکان چلے گئے۔کئی احباب کسٹم میں پھنسے رہے۔مگر بحمداللہ کوئی زیادہ دیر اس میں نہ لگی۔عزیزم ابوالحسن مولوی ہارون حافظ صدیق، مولوی الیاس مرحوم نیرانوی پہلے سے بحری جہاز سے جدہ پہنچ گئے تھے۔مطار پر ان سے ملاقات ہوئی۔ عزیز سعدی سلمہ سے اس وقت تک میری جان پہچان نہ تھی ماموں یامین سے خوب تھی۔مگر عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔وہ مولانا یوسف صاحب سے لپٹنے کے بعد تخلیہ میں کچھ گفتگو کر کے بظاہر نظام طے کر کے جلدی ہی مکہ چلے گئے۔ بعد عصر چل کر بعد مغرب مکہ مکرمہ میں داخلہ ہوا۔مغرب مدرسہ صولتیہ میں پڑھی اور اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ رہا۔جدہ میں بہت سی کاریں جمع ہو گئی تھیں۔ہر شخص کا اصرار تھا کہ اس سیہ کار کو اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کو اپنی کار میں لے کر جائے۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ عزیز مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تو بھائی ارشد صاحب کی کار میں ہوں اور یہ ناکارہ اور عزیزم مولانا انعام الحسن، مولوی ہارون، بھائی شمیم کی کار میں مولانا سلیم صاحب کے ساتھ ہوں۔عشاء حرم شریف میں پڑھی۔اس کے بعد کھانا کھایا یہ پہلے بھی کئی دفعہ لکھ چکا ہوں کہ اس ناکارہ کو لنگی میں سونا مجمع میں بہت مشکل ہے۔اس لیے جب بھی عمرہ کا احرام باندھا، چاہے کتنی ہی دقت ہو اور تاخیر ہو سر منڈا کر اور پاجامہ پہن کر جب لیٹتا ہوں حج کی تو البتہ مجبوری ہے۔ بہر حال بڑے مجمع کے ساتھ عمرہ کیا۔مدرسہ صولتیہ کے حضرات نے اپنی کتب حدیث وتفسیر کا اختتام ہم لوگوں کی آمد پر موقوف کر رکھا تھا، پہنچنے سے دو تین روز بعد اختتام کتب کا جلسہ کیا۔جس میں ہم لوگوں سے کتب حدیث کی ایک ایک کتاب ختم کرائی۔

منیٰ میں راونگی:

مکہ ۸ ذی الحجہ یوم دوشنبہ کو منیٰ روانگی ہوئی۔عزیز مولانا محمد یوسف صاحب مرحوم کے سابق مطوف سید سلیمان ہاشم تھے۔ان کا انتقال ہو چکا تھا۔اسی سال سے ہمارے مطوف سید مکی مرزوقی تجویز ہوئے۔ جو اس کے بعد سے اب تک ہر حج وعمرے کے رہے۔ بڑے ہی نیک بزرگ، خدمت گار اور فیاض ہیں۔ان کی دعوتیں بھی بڑی زوردار ہوتی ہیں۔۱۳ ذی الحجہ کو منیٰ سے واپسی ہوئی۔

علماءِ عرب سے ملاقاتیں:

مدرسہ صولتیہ کے دیوان میں جہاں اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی اور حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نوراللہ مرقدہما کا قیام رہتا تھا، بھائی سلیم کی شفقتوں کی وجہ سے وہاں اس ناکارہ کا قیام تجویز ہوا اور اس کے برابر کے دوسرے دیوان میں عزیزم مولانا محمد یوسف صاحب

اور مولانا انعام ہارون وغیرہ تھے۔ اس سیہ کار کا نام او جزو کو کب کی وجہ سے کافی مشہور ہو گیا تھا اور بہت عرصہ کے بعد جانا ہوا تھا اس لیے مکہ مکرمہ، طائف، نجد، جدہ، مدینہ پاک کے علماء و رؤساء بہت ہی کثرت سے ملاقات کی غرض سے آتے تھے اور یہ ناکارہ بد بیاری اپنے دیوان میں روپوش پڑا رہتا تھا اور ان آنے والوں کو مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ خوب وصول فرماتے دوڈھائی گھنٹہ ان کے سامنے خوب زوردار تقریر فرماتے اور جب دیکھتے کہ اب سامعین اُکتانے کو ہیں تو میرے پاس چپکے سے آدمی بھیجتے کہ ان کے انتظار کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے میں لے کر آ رہا ہوں، میں اجازت دے دیتا اور دس منٹ میں عزیزم مرحوم ان سے فرمادیتے کہ آپ کو بھی بڑی دیر ہو گئی۔ حضرت شیخ کی طبیعت بھی ناساز ہے وہ بے چارے سب چلے جاتے اور رات کو کھانے پر عزیز موصوف مجھے خوب جتایا کرتے کہ بھائی جی میں نے ان لوگوں کی وجہ سے آپ کو تکلیف دی، میں ان کی مجبوریوں کی وجہ سے آپ کو لایا ہوں۔ بھائی جی یہ لوگ کبھی میرے پاس بھی نہ آتے آپ کی برکت سے ہی یہ لوگ میری سن رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مختلف عنوانات سے یہ مضمون بار بار دہراتے تھے اور اس میں مجھے انکار نہیں کہ اس سفر کے دوران بہت ہی خواص کا مجمع آتا رہا۔ نام تو اس ناکارہ کا تھا لیکن حقیقت میں برکت اسی مرحوم کی تھی۔ اس لیے کہ یہ ناکارہ تو اس کے بعد ۸۶ھ میں بھی گیا اور پھر ۸۹ھ میں تو تقریباً سال بھر رہا مگر معدودے چند کے علاوہ ۸۳ھ والوں میں سے شاید ایک دو ہی آئے ہوں گے۔

مدرسہ شرعیہ میں قیام:

۲۷ ذی الحجہ ۹ مئی ۶۴ء شنبہ کی صبح کو مکہ مکرمہ سے چل کر ظہر بدر میں پڑھی۔ ملک عبدالحق صاحب کی پک اپ میں روانگی ہوئی، وہ چلانے کے ماشاء اللہ ضرب المثل ماہر ہیں۔ مکی مرزوقی نے اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے مستورہ میں ہماری دعوت کا بہت زوردار انتظام کر رکھا تھا اور مستورہ سے پہلے یہ مسئلہ زیرِ بحث تھا۔ میری اور مولانا یوسف کی رائے یہ تھی کہ سیدھے چلیں اور ظہر بدر میں پڑھیں اور بقیہ رفقاء کی رائے یہ تھی کہ مکی مرزوقی کی دعوت کی وجہ سے مستورہ میں کھانا کھا کر ظہر پڑھیں اور پھر آرام کریں اور عصر بدر جا کر پڑھیں۔ جب مستورہ قریب آیا میں نے ملک عبدالحق صاحب سے کہا کہ کسی کی نہ سننا تیز چلاؤ۔ ملک صاحب کی گاڑی میں پیچھے سے خوب شور ہوتا رہا اور مکی مرزوقی بھی سڑک پر دونوں ہاتھوں سے روکنے کا اشارہ کرتے رہے۔ میں نے ہاتھ کے اشارہ سے ان کو بھی آگے چلنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ بیچارے دعوت کا سارا سامان جس میں بیس پچیس مچھلیاں بھی تلی ہوئی تھیں اور قسم قسم کے پھل کیلا تربوز وغیرہ اپنی کار میں لے کر بدر پہنچے

وہاں ظہر کی نماز ہو چکی تھی۔ اس لیے ہم نے اولاً اپنی ظہر کی نماز پڑھی اور پھر کھانا کھا کر قہوہ خانہ کی چارپائیوں پر آرام کیا عصر کے بعد شہداء بدر کے مزارات کی زیارت کی۔ مغرب کی نماز مسجد عریش میں پڑھی وہاں معلوم ہوا کہ یہ مسجد مغرب کے فوراً بعد بند ہو جاتی ہے، عشاء اور فجر میں نہیں کھلتی۔ مگر مغرب کی نماز پڑھتے ہی جو مولانا یوسف صاحب نے پڑھائی تھی عربی اور اردو میں مولانا موصوف کی تقریر کا اعلان ہوا۔ حجاز میں عام طور پر مغرب سے ڈیڑھ گھنٹہ بعد عشاء ہو جاتی ہے یہ سارے حجاز کا مستقل وقت ہے۔ لیکن مولانا مرحوم نے تین گھنٹہ مسلسل تقریر فرمائی اس کے بعد اسی مسجد میں عشاء پڑھی۔ عشاء کے بعد کچھ لوگ مسجد ہی میں سوئے اور کچھ لوگ قہوہ خانہ میں واپس آ کر مکی مرزوقی کی دوپہر کی دعوت کا بقیہ اور کچھ مزید اضافہ بھی مکی مرزوقی نے کر دیا تھا وہ خوب کھایا اور کچھ مسجد عریش والوں کے لیے بھیج دیا۔ میرے حضرت اقدس قدس سرہٗ کو ہمیشہ بدر جانے کی تمنا رہی، مگر اس وقت تک مدینہ سے بدر تک کوئی راستہ نہ تھا۔ اُونٹوں پر پہاڑوں سے گزرتے ہوئے تین دن میں بدر پہنچنا ہوتا تھا اور اب تو اللہ کے فضل سے صرف دو گھنٹہ میں کار پہنچ جاتی ہے۔

۲۸ ذی الحجہ کی صبح کو مدینہ منورہ حاضری ہوئی۔ عزیز گرامی قدر و منزلت مولانا الحاج محمد اسعد سلمہ مدنی ابن حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ جو اس سال کے حج میں شریک تھے اور اس سیہ کار سے پہلے مدینہ پہنچ چکے تھے، انہوں نے مدرسہ شرعیہ کے تحتانی حصہ میں برابر برابر جو دو کمرے ہیں ان میں سے بڑا کمرہ اس سیہ کار کے لیے اور چھوٹا مولانا یوسف صاحب کے لیے تجویز کر رکھا تھا اور دونوں کو سید حبیب صاحب اور ان کے والد ماجد سید محمود صاحب مدفیوضہم کی سعی و برکت سے عروس بنا رکھا تھا اور عزیز مولانا اسعد سلمہ بہت دیر سے ہمارے انتظار میں بھی تھے۔ حالانکہ بدر سے ہم نے ایک آدمی بھیج دیا تھا کہ قیام مدرسہ شرعیہ میں ہی ہوگا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مکہ ہی سے مدینہ منورہ کے بہت سے احباب نے اپنے اپنے مکان مولانا یوسف صاحب کے لیے خالی کر رکھے تھے اور کئی رباط والوں کا بھی اصرار تھا۔ میں نے مولانا یوسف صاحب سے اپنی راحت کی وجہ سے یہ کہہ دیا تھا کہ مجھے راحت شرعیہ میں ہے اور تمہارے ساتھ تقریباً ڈیڑھ سو کا مجمع ہے تم اپنا قیام کسی بڑے مکان میں تجویز کر لو۔ مگر مرحوم کو واقعی اس سیہ کار سے محبت اور اس سے زیادہ غلط حسنِ ظن کی وجہ سے بہت عقیدت تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ میرا قیام تو آپ ہی کے ساتھ رہے گا اور مجمع ایک جگہ تو نہیں آ سکتا اس کو تو متفرق ہی کرنا پڑے گا۔ چنانچہ کچھ احباب مدرسہ شرعیہ کی دوسری منزل پر اور کچھ متفرق طور پر دوسرے مکانوں میں ٹھہرائے گئے۔ البتہ عزیزم مولانا اسعد سلمہ سے ان کی رائے کے خلاف میں نے یہ کہہ کر مولانا یوسف کے پاس لوگوں کی آمد زیادہ رہے گی اور بڑا کمرہ دروازہ سے اقرب بھی ہے۔ مجھے بڑے حجرے میں دو دقتیں ہوں گی۔ ایک یہ

کہ بیت الخلاء دور ہوگا اور دوسرے یہ کہ ہر آنے والا پہلے میرے حجرے میں جائے گا اس لیے میں نے اور مولانا یوسف صاحب نے حجروں کا تبادلہ کرلیا۔ میں نے مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے کہا کہ تم مواجہہ شریف پر حاضر ہوآؤ۔ میں نابکار کسی وقت اقدام عالیہ میں حاضر ہو جاؤں گا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ پہلی دفعہ حاضری تو تیرے ہی ساتھ ہوگی عزیزم مولانا الحاج اسعد سلمہ نے بھی اصرار فرمایا کہ میں صبح سے آپ کے انتظار میں حاضر نہیں ہوسکا۔ اس وجہ سے اس روسیاہ کو بھی مواجہہ شریف پر حاضر ہونا پڑا، ورنہ میں اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے یہ چاہتا تھا کہ اقدام عالیہ ہی کی جانب سے صلوٰۃ وسلام کرلوں گا۔ بیس دن قیام کے بعد مولانا یوسف صاحب نے واپسی کا ارادہ فرمایا۔ اس لیے کہ ان کو مکہ مکرمہ اور طائف کے دو اجتماعوں میں شرکت کرنی تھی۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ طائف جانا میرے بس کا نہیں۔ آپ تشریف لے جائیں اور مولانا انعام کریم صاحب مجھ پر اصرار کررہے ہیں کہ میں تجھے جدہ سے ہوائی جہاز کی روانگی سے ایک دن قبل جدہ پہنچادوں گا۔ بھائی سید حبیب صاحب نے بھی اس کی پرزور تائید کی۔ مگر مولانا یوسف صاحب نے اس سیہ کار کے ہمراہ چلنے پر اصرار فرمایا اور یہ قرار پایا کہ کچھ دن وہ اپنی روانگی مؤخر کریں اور کچھ میں مقدم کروں۔ اس لیے یکم صفر ۸۴ھ مطابق ۱۳ جون ۶۴ء شنبہ کو مدینہ پاک سے علی الصباح چل کر ظہر جدہ میں پڑھی اور بعد عصر وہاں سے چل کر مغرب مسجد حدیبیہ میں پڑھی اور عشاء کے قریب مکہ مکرمہ حاضری ہوئی اور اپنی عادت کے موافق رات ہی میں عمرہ سے فراغت ہوئی۔

وہاں پہنچنے کے بعد بھائی سلیم، الحاج ماسٹر محمود اور مکہ کے بہت سے حضرات نے شدید اصرار اس پر کیا کہ زکریا طائف ہرگز نہ جائے گا کہ سڑک اس قدر خراب ہے کہ اس کے جھٹکے کا تحمل زکریا سے نہیں ہوسکتا۔ ان سب نے مجھے براہِ راست بھی سختی سے الگ الگ منع کیا اور مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر اور بھی شدید اصرار کیا کہ تم کیسا ظلم کررہے ہو کہ اس کو ایسی حالت میں لے جارہے ہو۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں ظہر کے بعد لیٹا ہوا تھا بھائی سلیم صاحب بہت اہتمام سے مستقل اسی بات کے لیے اترے اور بیٹھتے ہی کہا میں نے سنا آپ بھی طائف تشریف لے جارہے ہیں۔ میں نے کہا ضرور تشریف لے جارہے ہیں۔ فرمانے لگے بھائی جی اس کا بالکل ارادہ نہ کریں۔ بہت ہی خراب راستہ ہے خدانخواستہ کوئی تکلیف ہوگئی تو کیا ہوگا اور حرم شریف کی لاکھوں نمازیں جائیں گی۔ مگر جب مجھ سے وہ مایوس ہوگئے تو باہر جاکر عزیز مولانا یوسف کے سر ہوگئے۔ عزیز موصوف بھی میرے پاس آیا ''بھائی جی طائف کو تو سب ہی منع کررہے ہیں۔'' میں نے کہا پیارے اگر تو مجھے مدینہ چھوڑ آتا تو تیرا احسان ہوتا لیکن مکہ میں نہیں رہنے کا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ

میں ہوگی مجھ پر یورش اور تو ہونے کا نہیں۔ یہ ساری بلا مجھ پر رہے گی۔

بندہ کا طائف میں تبلیغی سفر:

۸صفر مطابق ۲۰ جون شنبہ کی صبح کو طائف کی روانگی ہوئی دو گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔ وہاں بڑے اہتمام اجتماع کے ہو رہے تھے۔ ایک اجتماع مسجد عباس میں ہوا۔ دو اجتماع بخاریوں کی دو مسجد میں ہوئے۔ ۱۰صفر مطابق ۲۲ جون کی صبح کو واپسی ہوئی۔ واپسی پر تو سب سے پہلے عزیز شمیم نے اظہار مسرت مبارکباد دی۔ پھر بھائی سلیم نے کہا کہ بھائی کرامتوں سے لڑنا ہمارے بس کا نہیں اور پھر ہر شخص نے آکر بہت ہی تعجب وحیرت کا اظہار کیا۔

جدہ میں تبلیغی اجتماع:

معلوم یہ ہوا کہ امیر فیصل صاحب پہلی دفعہ طائف جانے والے تھے اس واسطے ان کی وجہ سے ڈائنامیٹ کے ذریعہ دن رات پہاڑ توڑے گئے اور سڑک اس قدر تازہ بتازہ تارکول کی تھی اور اس پر ریت بچھا ہوا تھا کہ کہیں اونچ نیچ نہیں تھی۔ واپسی میں مکہ مکرمہ اور جدہ میں بھی اجتماعات ہوئے۔ عزیز مولانا یوسف صاحب کی تو ہر گفتگو تقریر تھی جو مسلسل گھنٹوں ہوتی رہتی تھی۔ جہاں وہ بیٹھتے وہیں اجتماع ہو جاتا۔ ۲۳ جون کو بعد عصر مکہ سے چل کر مغرب مسجد حدیبیہ میں پڑھ کر عشاء کے وقت جدہ پہنچے۔ ایک دن وہاں قیام میں بھی بزاز وردار اجتماع میمنوں کی مسجد میں ہوا۔ انہیں کے محلّہ میں قیام تھا۔

واپسی از جدہ برائے پاکستان اور وہاں کے اسفار کے مختصر حالات:

۲۵ جون کو جدہ سے بذریعہ طیارہ کراچی پہنچے اور ۲۹ جون کو کراچی سے لائل پور، یکم جولائی بروز بدھ کی شام کو وہاں سے سرگودھا۔ چوبیس گھنٹے میں قیام کے بعد ۲ جولائی کو عصر کی نماز کے بعد ڈھڈیاں حاضری ہوئی۔ ٦ جولائی دوشنبہ کی صبح کو وہاں سے چل کر دوپہر کو تلاگنگ پہنچے، وہاں جنرل حق نواز صاحب نے پہلے سے اونچے حکام اور اونچے طبقے کے احباب کو خاص طور سے مدعو کر رکھا تھا۔ کھانے کے بعد ظہر کی نماز پڑھ کر ہم سب تو سونے کے ارادہ سے لیٹ گئے اور مولانا یوسف صاحب عصر تک اس مجمع سے گفتگو میں مشغول رہے۔ اول وقت عصر پڑھ کر مغرب راولپنڈی میں پڑھی، وہاں سے ۱۰ جولائی کی صبح کو لاہور پہنچے۔ شاہی مسجد میں جمعہ کے بعد پہلے سے اجتماع کا اعلان تھا۔ مولانا یوسف صاحب تو عصر تک وہاں رہے اور یہ ناکارہ شروع ہی سے بلال پارک کی مسجد میں جو لاہور کی تبلیغی جماعت کی مرکزی جگہ ہے پہنچ گیا تھا، وہیں جمعہ پڑھا، وہیں شام تک آرام کیا، وہیں مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی فارغ ہو کر پہنچ گئے۔ شنبہ کی صبح کو لاہور کے

عربی مدارس میں بذریعہ کار ایک گشت کیا۔ احباب سے ملاقاتیں ہوئیں شنبہ کی شام کو رائے ونڈ جو سارے مغربی پاکستان کا تبلیغی مرکز ہے پہنچے اور اگلے دن لاہور واپسی ہوئی۔ جناب الحاج الحافظ صوفی عبدالمجید صاحب کا شروع ہی سے اصرار سرائے مغل لے جانے پر تھا اور احباب ویزا نہ ہونے کا عذر کر رہے تھے۔ انہوں نے بہت ہی کوشش کر کے ویزا حاصل کیا اور منگل کی صبح کو سرائے مغل گئے عصر کے بعد وہاں سے واپسی ہوئی۔ ۱۶ جولائی پنجشنبہ کو سوا دو بجے لاہور سے چل کر ساڑھے تین پر دہلی پالم کے اڈہ پر پہنچے۔

۱۹ جولائی اتوار کی صبح کو دہلی سے چل کر کاندھلہ میں چائے متولی ریاض الاسلام صاحب کے باغ میں پی اور چونکہ عزیز الیاس صاحب مرحوم جو ہم سے پہلے اپنی بیماری کی وجہ سے حافظ صدیق کے ساتھ مدینہ سے روانہ کیا جا چکا تھا اور دہلی پہنچ کر اس کی علالت کی شدت کی خبر سنی تھی، اس لیے عزیز مولانا انعام الحسن صاحب کی تجویز پر وہ اور مولانا یوسف اور یہ ناکارہ، بھائی شمیم مکی اور اطفال شاہد زبیر وغیرہ جو استقبال کے لیے دہلی گئے ہوئے تھے دو کاروں میں نیرانہ عزیز الیاس کی عیادت کو گئے۔ متولی ریاض نے کھانا بہت تیار کرا رکھا تھا ان کا اصرار تھا کہ ان کے باغ میں کھانا کھائیں۔ میں نے ان کا کھانا ساتھ لیا اور کچھ عزیز الیاس مرحوم نے جلدی جلدی تیار کرایا کھانا نیرانہ میں کھایا اور حضرت مدنی قدس سرہٗ کے مزار پر حاضری دیتے ہوئے مغرب دارالطلبہ جدید کی مسجد میں پڑھی۔ مغرب کے بعد اول مولانا یوسف نے تقریر کی اور پھر عشاء تک مصافحے ہوئے اور مسجد مذکور میں عشاء پڑھ کر گھر پہنچے اور اگلے دن دوشنبہ کی صبح کو گنگوہ اور شام کو واپسی اور منگل کی صبح کو رائے پور جا کر شام کو واپسی اور دوسرے دن ۲۳ جولائی چہارشنبہ کی صبح کو کاندھلہ جا کر ۲۴ جولائی پنجشنبہ کی دوپہر کو زکریا کی واپسی سہارنپور کو ہوئی اور عزیز مولانا یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کی نظام الدین کو۔ مجھے خوب یاد ہے الوداعی معانقے کے وقت عزیز مولانا یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ نے بہت روتے ہوئے آنسو پڑ رہے تھے ہچکی لگ رہی تھی فرمایا کہ چار ماہ کی ہر وقت کی رفاقت کے بعد آج جدائی ہو رہی ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

اختتام سفر:

اس سفر میں تبلیغی اجتماع اور تمام اطراف و جوانب کے ممالک کے مبلغین کا اجتماع اور جملہ حجاج کی گرویدگی دیکھ کر مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ یہ اعلان اور قانون بنا کر آئے تھے کہ ہر تیسرے سال حج پر حاضری ہوگی اور شیخ الحدیث بھی ساتھ ہوا کریں گے اور اس ضابطہ کے موافق ۸۵ھ کو جانا گویا طے شدہ تھا۔ لیکن ۲۹ ذیقعدہ ۸۴ھ جمعہ کو مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا

لاہور میں حادثۂ انتقال ہوگیا۔ جس کی وجہ سے ۸۵ھ کا حج ملتوی کرنا پڑا کہ نظام الدین کی ضروریات بہت بڑھ گئیں تھیں اور بجائے اس کے ۸۶ھ میں مولانا انعام الحسن صاحب کی زیر قیادت چوتھا سفر حجاز ہوا۔

یہ میرا پانچواں حج ہے

احباب کا اصرار سفر حج کا:

اس سیہ کار نے اس سال بالکل ارادہ اپنے امراض واعذار کی وجہ سے نہیں کر رکھا تھا۔ لیکن برادرم الحاج مولانا محمد سلیم مکی نے ماہ مبارک میں خواب دیکھا کہ یہ سیہ کار مکہ پہنچا اور جبل ابی قبیس پر قیام کیا۔ انہوں نے خود ہی تعبیر یہ لے لی کہ چونکہ اس سال مولانا انعام الحسن صاحب اور مولوی ہارون آرہے ہیں اور شیخ پر کوئی تقاضہ یہاں سے نہیں گیا۔ انہوں نے عزیزم الحاج محمد شمیم کو رمضان ہی میں جدہ بھیجا اور اس ناکارہ کا ویزا ٹکٹ وغیرہ سب ایک دو دن میں تیار کراکر نظام الدین بھیج دیے۔ مجھے اس سے گرانی بھی ہوئی کہ بغیر استفسار محض خواب پر یہ بنیاد قائم کرلی ہے۔ میں نے ان کو بھی معذوری کا خط لکھدیا اور مولانا انعام صاحب کے اصرار پر تو پہلے سے انکار کر رکھا تھا۔ لیکن چونکہ مولانا یوسف صاحب کے بعد مولانا انعام کا یہ پہلا حج تھا۔ اس لیے مولانا موصوف اور یہاں کی احباب تبلیغ کا اصرار تھا کہ زکریا کو اس سال ضرور ساتھ لائیں۔

اہل بمبئی نے مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری کے پاس دہلی تا بمبئی کے دو ٹکٹ ہوائی جہاز کے میرے اور میرے رفیق سفر الحاج ابوالحسن کے بھیج کر تار اور ٹیلیفون سے شدید اصرار کر رکھا تھا کہ زکریا کو ضرور ساتھ لائیں اس لیے کہ اس کا بمبئی آنا بغیر سفر حج کے دشوار ہے۔ میں نے بمبئی کے ٹکٹ کو واپس کرنے کا بہت تقاضہ لکھا تھا۔ مگر مولانا انعام الحسن نے اس کے واپس کرنے سے انکار کردیا کہ اگر نہ جانا ہوا تو صرف اتنا ہی ہوگا کہ دو ٹکٹ ضائع ہوجائیں گے۔ یہ ناکارہ چونکہ نہ جانا طے کیے ہوئے تھا اس لیے ۷ ذیقعدہ ۸۶ھ مطابق ۱۸ فروری ۶۷ء شنبہ کی صبح کو بذریعہ کار عزیزان مولانا انعام صاحب اور مولوی ہارون کی مشایعت کے لیے دہلی گیا۔ چونکہ صرف دو دن کے لیے گیا تھا اس لیے نہ تو کوئی سامان ساتھ تھا اور نہ کوئی کپڑا وغیرہ ساتھ تھا، نہ یہاں گھر والوں کو اس ناکارہ کے حج کے لیے جانے کی کوئی اطلاع تھی۔ عزیز ابوالحسن بھی میرے ساتھ دہلی تک گیا تھا۔ وہاں پہنچنے پر اتوار، پیر دو دن سب ہی کے اصرار میرے سفر حجاز پر ہوتے رہے اور میں بھی بار بار استخارہ کرتا رہا۔ مولانا ابوالحسن علی میاں بھی وہاں موجود تھے۔ ان کا بھی شدید اصرار ہوا، مجھے

اطمینان تھا کہ میرا پاسپورٹ بھی گم ہے، لیکن وہاں کے احباب نے ڈاکٹر سید محمود ایم پی کی وساطت سے میرے پاسپورٹ کی گمشدگی کی درخواست اور اس کی جگہ نیا پاسپورٹ بھی ایک ہی دن میں حاصل کر لیا، اس کو بھی تائید غیبی اور طلب سمجھا۔ اس لیے منگل ۱۰ ذیقعدہ کو عین ان حضرات کی روانگی کے وقت میں نے جانے کا ارادہ کر ہی لیا اور کار میں ہوائی اڈے کے لیے بیٹھ گیا اور اڈہ پر میرے محترم عزیز مولانا الحاج سید اسعد مدنی اور جناب الحاج عبدالرشید صاحب خورجوی ایس پی صاحب اپنی کار لے کر پہنچ گئے۔ اس لیے کہ عزیز موصوف کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کو علی الصباح دہلی پہنچ کر میرا بارادہ حج روانہ ہونا معلوم ہوا تو وہ اسی وقت ہوائی اڈے پہنچ گئے اور وہاں عزیز موصوف نے ایس پی صاحب کی وساطت سے اس کی بھی اجازت حاصل کر لی اسی کار میں جہاز پر سوار کرائیں گے۔

چونکہ اس سیہ کار کا یہ سفر بلا ارادہ ہوا اور میرے گھر والوں کو بھی میری روانگی کا حال رات کو ان لوگوں سے معلوم ہوا جو رات کو دہلی تک پہنچا کر واپس آئے تھے۔ اس لیے عزیزم الحاج ابوالحسن سلمہ بھی ساتھ نہ جا سکا۔ دوسرے دن اس نے پاسپورٹ ویزا وغیرہ کی سعی کی اور سفیر سعودی عرب مقیم دہلی کو اللہ بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے انہوں نے یہ کہ ابوالحسن زکریا کا خادم ہے، ساتھ جانے سے رہ گیا۔ فوراً ویزا دے دیا۔ وہ رات کو سہارنپور آیا اور اپنے یہاں سے اپنا سامانِ مختصر سا ساتھ لے کر دوسرے دن بذریعہ ریل بمبئی چلا گیا اور چونکہ ہمارا ہوائی جہاز روانہ ہو چکا تھا اور اس کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی نہ تھا اس لیے وہ بحرین کے راستے سے بھائی جمیل حیدر آبادی رفقاء کے ساتھ بعد میں مکہ مکرمہ پہنچا۔

بمبئی میں مولانا وصی اللہ صاحب کے مستقر پر ان کی زیارت کے لیے حاضری:

ہمارا طیارہ دہلی سے ۲۱ فروری کو ۹½ بجے چل کر ۱۱½ بمبئی پہنچا۔ اُترتے ہی اوّل حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کے مستقر پر ان کی زیارت کے لیے سب گئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ مولانا آج ہی صبح اس جگہ سے کسی دوسری جگہ ناراض ہو کر منتقل ہو گئے جس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ الیکشن کا زمانہ تھا۔ کسی صاحب نے اخبار میں چھاپ دیا کہ مولانا فلاں صاحب کے حامی ہیں۔ فریق مخالف نے اس کی پرزور تردید کی۔ مولانا مرحوم کو اس پر غصہ آیا کہ غلط طور پر ان کے نام کو الیکشن والے استعمال کر رہے ہیں اس لیے مولانا کے سابقہ مستقر سے دوسرے مستقر پر حاضر ہوئے۔ مولانا مرحوم بہت ہی شفقت اور محبت سے ملے اور باصرار سو روپے ہدیہ سنیہ کے طور پر مرحمت فرمائے۔ ۲۳ فروری جمعرات کی صبح کو ۷ بجے بمبئی سے طیارہ روانہ ہوا۔ کراچی پچاس منٹ اور ظہران آدھ گھنٹہ اور ریاض

پچاس منٹ ٹھہرتے ہوئے ظہر کے بعد عربی ۷ بجے کے قریب جدہ پہنچے۔
قدوائی صاحب سفیر ہند متعین جدہ کو عزیزم بھائی شمیم کے ذریعہ سے زکریا کی آمد کا حال معلوم ہوگیا تھا۔ اس لیے وہ اپنی کار لے کر مطار پر پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ ان کی وجہ سے اس سفر میں بہت سی راحتیں پہنچیں، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل وکرم سے راحت وآرام سے رکھے۔ مطار سے ہم سب کو اپنی کار میں بٹھا کر کسٹم کے سامنے روکا۔ یہ ناکارہ کار میں بیٹھا رہا عزیزانم مولانا انعام، ہارون کسٹم میں گئے۔ مگر سفیر صاحب کی وجہ سے ان کو بھی زیادہ دیر نہیں لگی۔ چند منٹ میں فارغ ہوکر آگئے اور سفیر صاحب کے مکان پر جاکر بعد ظہر کھانا کھایا۔ اس کے بعد عصر حدیبیہ میں پڑھتے ہوئے مغرب کے وقت مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔

روانگی مدینہ طیبہ اور عبدالعزیز ساعاتی کے مکان پر قیام:

رات کو عمرے سے فراغت کے بعد حسب سابق شنبہ کے روز صبح کو مدرسہ صولتیہ کی کتب حدیث وتفسیر کا اختتام کرایا۔ ۲۱ ذی الحجہ کو مغرب سے پہلے مکہ سے چل کر مغرب حدیبیہ میں پڑھی، عشاء کی اذان کے قریب جدہ پہنچے اور مسجد بن لادن جو آج کل تبلیغی مرکز ہے اس کے قریب حافظ محمد رمضان صاحب کے مکان میں قیام ہوا۔ پہلے دن مسجد حنفی میں اجتماع ہوا اور دوسرے دن مسجد پٹی میں بعد مغرب اجتماع ہوا اور یہ مسجد عرصہ سے تبلیغی مرکز تھا۔ ۲۳ ذی الحجہ پیر کے روز شام کو اسی مسجد میں عربوں کا بڑا اجتماع ہوا۔ منگل کے روز اشراق کے وقت مدینہ طیبہ کے لیے روانگی طے تھی۔ مگر ملک عبدالحق صاحب کی گاڑی خراب ہوگئی۔ ایک گھنٹہ انتظار کے بعد دو کاریں فی کار نوے ریال کرایہ کر کے عربی ۳ بجے مدینہ پاک کو روانگی ہوئی۔ ظہر کے وقت بدر پہنچے اور شب کو قیام کے بعد بدھ کی صبح کو عربی ½۱۲ بجے چل کر ۳ بجے مدینہ پاک حاضری ہوئی۔
جدہ سے مدینہ ۴۲۴ کلومیٹر ہے اور بدر سے ۱۴۹ کلومیٹر ہے اور چونکہ مدینہ پاک میں اس سیہ کار کی اطلاع پہلے سے نہیں تھی اور مدرسہ شرعیہ حجاج سے پُر ہوگیا تھا۔ اس لیے مکہ ہی سے عبدالعزیز ساعاتی کے مکان میں قیام طے ہوگیا تھا۔ جو انہوں نے ہم لوگوں کی وجہ سے کرایہ پر نہیں دیا تھا اور بہت بڑا نقصان گوارا کیا تھا۔ یہ مکان صوفی اقبال کی رباط کے بالکل قریب تھا۔ اس لیے ناکارہ کا قیام تو صوفی اقبال صاحب کے مکان میں اور دوسرے حضرات کا جو دو سو کے قریب تھے، الحاج عبدالعزیز ساعاتی کے مکان میں قیام ہوا۔ وہاں پہنچنے کے بعد الحاج سید محمود صاحب کا اور ان سے بڑھ کر مولانا انعام کریم صاحب کا اصرار ہوا کہ مدرسہ شرعیہ خالی ہوگیا۔ وہاں منتقل ہوجائیں۔ مگر ان سے وعدہ ہو چکا تھا۔ اس لیے بڑی ندامت کے ساتھ سید صاحب سے معذرت کر دی جس کا

قلق ہے۔سید صاحب کے یہاں پہلے سفر میں بھی زوردار دعوتیں ہوئیں۔ پہلے سفر میں بڑے اہتمام سے سید صاحب نے ایک عصرانہ اپنے باغ میں دیا تھا۔ اس مرتبہ بھی اصرار فرمایا مگر معذرت کرنی پڑی کہ مسجد نبوی کی نماز زیادہ اہم ہے۔

۲۲اپریل ۶۷ء ہندی ۱۱المحرم ۸۷ھ شنبہ کی صبح کی نماز کے بعد مدینہ پاک سے ملک عبدالحق کی گاڑی میں روانگی ہوئی۔مگر وہ شروع ہی سے خراب تھی رابغ پہنچ کر اس نے بالکل جواب دے دیا۔ براہِ راست مکہ کی گاڑی کی تلاش میں رہے، نہ ملنے پر مجبوراً مغرب سے ایک گھنٹہ قبل جدہ کی کار کرایہ پر لی۔مغرب کی نماز راستہ میں پڑھی اور بعد مغرب جدہ پہنچے اور وہاں سے مکہ کے لیے کار کرایہ کر کے وہاں سے چلے اور عشاء کے ایک گھنٹہ بعد مکہ مکرمہ میں حاضری ہوئی۔رات ہی کو عمرہ ادا کیا۔

یہ عمرہ حضرت مرشدی سہارنپوری قدس سرہٗ کی طرف سے کیا تھا اور اس سے پہلا تمتع حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کیا تھا۔۲۶اپریل چہارشنبہ کی صبح کو ملک عبدالحق کی گاڑی میں مکہ سے چل کر جدہ پہنچے۔چونکہ قدوائی صاحب کا شدید اصرار پہلے سے تھا۔مکہ میں بھی کئی مرتبہ انہوں نے اصرار فرمایا کہ ہندوستان جاتے ہوئے قیام میرے یہاں ہوگا۔اس لیے سیدھے ان کے مکان پر گئے کہ ان کو پہلے سے اطلاع تھی۔مگر وہ کسی ہوائی جہاز کی روانگی کے سلسلہ میں مطار گئے ہوئے تھے۔ان کے مکان پر جا کر سب سو گئے۔وہ عربی ۶ بجے کے قریب واپس آئے۔زکریا سو رہا تھا اور مولوی انعام صاحب جاگ رہے تھے۔عربی ۷ بجے اُٹھنے پر نماز پڑھی اور کھانا کھایا اور مسجد بن لادن مرکز تبلیغ کے قریب حافظ رمضان کے مکان پر پہنچے۔ جہاں ہم سب رفقاء کا سامان صبح سے جمع ہو رہا تھا۔وہاں سے قبیل مغرب مطار کی مسجد میں پہنچے۔قدوائی صاحب کا اصرار تھا کہ میں قیام گاہ ہی پر آرام کروں۔وہ جہاز کی پرواز سے پانچ منٹ پہلے مجھے وہاں سے سوار کرا کے سیدھے ہوائی جہاز پر پہنچا دیں گے۔مگر زکریا نے قبول نہیں کیا۔ جملہ رفقاء مع اصحاب صولتیہ مغرب سے قبل مطار کی مسجد میں پہنچ گئے۔البتہ وہاں سے اور سب رفقاء تو مختصر سنتیں پڑھ کر طیارہ پر پہنچ گئے۔قدوائی صاحب نے زکریا کو شدت سے منع کر دیا کہ سب کے ساتھ جانے میں بہت وقت ہوگی۔ بڑی دیر لگے گی۔ میں جہاز کی پرواز سے دو تین منٹ پہلے سیدھے یہاں سے سوار کرا کے بالا بالا جہاز پر پہنچا دوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے کہ مجھے مسجد سے بٹھا کر ایک منٹ میں ہوائی جہاز کی سیڑھی پر پہنچا دیا۔

واپسی از حجاز پاک براہ پاکستان:

مولانا انعام الحسن صاحب عزیز ہارون ابوالحسن بھی اسی کار میں تھے اور عربی ڈیڑھ بجے یعنی مغرب سے ڈیڑھ گھنٹہ بعد طیارہ نے پرواز کی اور پاکستانی وقت کے مطابق ایک بجے شب کے کراچی کے مطار پر پہنچے۔ اسی وقت حاجی فریدالدین صاحب کی برکت سے کہ وہ کراچی کے ہوائی اڈہ کی بہت اُونچی شخصیت ہیں۔ ان کی برکت سے زکریا اور ابوالحسن بھائی یوسف رنگ والوں کی کار میں مکی مسجد پہنچ گئے۔ بقیہ حضرات دوسری کاروں میں تقریباً ایک گھنٹہ بعد پہنچے۔ زکریا تو پہنچ کر اپنی جماعت کر کے کھانے کو انکار کر کے سو گیا۔ بقیہ نے آ کر نماز پڑھ کر کھانا کھایا۔ جمعرات کا سارا دن ہجوم میں گزرا۔ جمعہ کی صبح کو مفتی شفیع کے مدرسہ میں جا کر ایک گھنٹہ قیام کے بعد مکی مسجد واپس آئے۔ پہلے سے طیارہ کی اطلاع ½11 پر پرواز کی تھی۔ مکی مسجد پہنچ کر اول ۱۱ بجے کی پھر ½10 بجے کی اطلاع ملی، کیونکہ بارش کا سلسلہ خوب تھا جو کراچی میں صبح سے اور دہلی میں دو روز پہلے سے چل رہا تھا اس لیے عام خیال تھا کہ طیارہ ½11 بجے سے بھی زیادہ مؤخر ہوگا اس لیے سب مطمئن تھے۔

مطار سے ٹیلیفون پر معلوم ہوا کہ ½10 بجے جا رہا ہے تو نہایت عجلت میں مطار پر پہنچے۔ زکریا کے متعلق پہلے یہ طے تھا کہ حاجی فریدالدین صاحب عین وقت پر طیارہ پر پہنچا دیں گے۔ مگر طیارہ کی تقدیم کی وجہ سے جنرل صاحب کی کار میں مطار پر پہنچے اور مطار والوں کی کرسی پر ان کے عملہ کی مدد سے طیارہ پر پہنچے۔ زکریا کی کرسی کی وجہ سے طیارہ میں دس منٹ کی تاخیر بھی ہوئی کہ مطار سے سارے بڑے چھوٹے شہرت سن کر جمع ہو گئے۔ پاکستانی دس بج کر چالیس منٹ پر طیارہ نے پرواز کی اور وقت مقررہ سے ۲۰ منٹ پہلے کراچی کے وقت سے ۱۲ بج کر دس منٹ پر اور دہلی کے وقت سے بارہ بج کر چالیس منٹ پر پالم کے اڈہ پر پہنچ گئے۔ زکریا مع اطفال و ابوالحسن، حاجی نصیرالدین علی گڑھ کی کار میں ایک بجے نظام الدین مسجد پہنچے۔ مگر ڈرائیور ناواقف تھا۔ اس لیے راستہ میں دیر لگی اور مولانا انعام الحسن صاحب مطار پر دعاء کرا کر زکریا کے ساتھ ہی مسجد میں پہنچے۔ بقیہ رفقاء آہستہ آہستہ ۲ بجے تک پہنچتے رہے۔

واپسی در سہارنپور:

نظام الدین کے احباب نے دو دن پہلے سے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جمعہ بجائے ڈیڑھ بجے کے ڈھائی بجے ہوگا۔ اس لیے سب نماز میں شریک ہو گئے اور طے ہوا کہ اتوار کی صبح کو حضرت میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مزار پر حاضری دیتے عصر سہارنپور دارالطلبہ جدید کی مسجد میں پڑھی جائے، لیکن دونوں مزاروں پر حاضری دیتے ہوئے ½11 بجے سہارنپور پہنچ

گئے۔ اس لیے کہ ہجوم کے ڈر سے نظام الدین سے اپنی جماعت علیحدہ کر کے چپکے سے روانہ ہوگئے تھے۔ ½۱۱ بجے دار الطلبہ قدیم میں ناظم صاحب سے ملاقات کے بعد مدرسہ قدیم میں تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد مکان آئے اور چونکہ عام اطلاع عصر کے وقت دار الطلبہ جدید کی تھی، اس لیے مخصوص لوگوں سے ملاقات تو ظہر کے بعد ہوتی رہی، لیکن عمومی ملاقات اور مصافحہ دار الطلبہ جدید میں عصر کے بعد سے مغرب تک ہوئے۔ لیکن مغرب کے بعد بھی جدید ہجوم آیا۔ اس لیے مغرب کے بعد بھی ایک گھنٹہ تک ہوئے۔

پیر کی صبح کو علی گڑھ کی کار میں اول گنگوہ اور وہاں سے واپسی پر ابو الحسن کے اصرار پر اسلامیہ اسکول میں پرنسپل وغیرہ سے مصافحہ کرتے ہوئے سوا گیارہ پر گھر پہنچے، پہلے سے پیر کے دن گنگوہ سے واپسی پر رائے پور کا وعدہ فرمایا تھا مگر کچھ کاروں کی گڑبڑ کی وجہ سے رائے پور کاندھلہ دونوں ملتوی ہوئے اور شام کو ۴ بجے مولانا انعام الحسن صاحب سیدھے دہلی چلے گئے۔ کاندھلہ کے جملہ رجال تو نظام الدین پہنچ گئے تھے اور مستورات ساری سہارنپور آگئیں۔ اس لیے پیر کی شب زکریا نے بخاری شریف کا سبق شروع کرادیا۔ جس کی افتتاح ۲۷ شوال چہارشنبہ کو جانے سے پہلے ہو چکی تھی۔

اس کے بعد مجوزہ قانون کے موافق ۸۸ھ کا حج طے تھا۔ اس سیہ کار کا افریقہ کے احباب کے پاس سے ٹکٹ آگیا جو مولانا انعام الحسن صاحب وغیرہ کے ساتھ آیا تھا۔ معطی صاحب کا نام تو مجھے معلوم نہیں، اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے۔ اس مرتبہ بھی اس سیہ کار کی طرف سے تو اپنے امراض کی وجہ سے تکاسل ہی تھا اور چونکہ امراض کی کثرت کی وجہ سے بخاری شریف کا سبق بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے زکریا کا اصرار تھا کہ اگر جائیں تو ایک دو سال قیام کریں جلد واپس نہ آئیں اور میرا یہ مقولہ بہت ہی مشہور ہوگیا کہ ''اگر جاؤں تو آؤں کیوں اور آؤں تو جاؤں کیوں''۔ اس لیے کہ اپنی ناکارگی، گندگیوں کی وجہ سے وہاں کے قیام کی اہلیت نہیں اور امراض واعذار کی وجہ سے تدریس و تالیف کا موقع نہیں رہا اور مولانا انعام الحسن صاحب بھی اس خوف سے کہ واپس آنے میں پاؤں نہ ملے، لے جانے میں متأمل تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ نظام الدین کے مسائل بھی پیش آئے کہ جن کی وجہ سے وہاں کے احباب مولانا انعام الحسن صاحب کی غیبت میں اس ناکارہ کا قیام سہارنپور اور وقتاً فوقتاً نظام الدین جاتے رہنا ضروری سمجھتے تھے۔ علی میاں بھی ان کے بہت زور کے حامی تھے اور میرے جانے کے مخالف۔ لیکن چونکہ مولانا انعام الحسن صاحب وغیرہ کا جانا طے ہو چکا تھا، اس لیے وہ زکریا سے الوداعی ملاقات کے لیے ۲۳ شوال کو سہارنپور آئے۔ دار الطلبہ جدید کی دار الحدیث جناب الحاج حکیم محمد ایوب صاحب نے اپنے اہتمام سے بہت ہی ذوق وشوق سے بنوائی تھی۔

ان کا اصرار تھا کہ زکریا اس کا افتتاح کرے۔ اس لیے ۲۵ شوال چہار شنبہ کی صبح کو مولوی یونس صاحب سے اول الحدیث المسلسل بالاولیۃ پڑھوائی۔ پھر زکریا نے بخاری شریف کی پہلی حدیث حفظ پڑھی۔ کیونکہ آنکھوں میں نزول آب تھا اور پڑھ کر یہ کہا کہ بھائی تقریر تو اس کی بہت لمبی چوڑی ہے۔ وہ تو مولانا یونس صاحب کریں گے، تبرکاً بسم اللہ میں نے کرادی ہے۔

اس کے بعد مولانا انعام الحسن صاحب نے عزیزان زبیر، شاہد کا نکاح ہر ایک کی بہن سے مہر فاطمی پر پڑھایا اور آدھے گھنٹہ تک خوب دعائیں کرائیں اور نکاح میں بجائے چھوہاروں کے پنڈ کھجوریں تقسیم ہوئیں۔ ظہر کے بعد عزیزان مولانا انعام الحسن و ہارون اپنی گاڑی میں دہلی چلے گئے۔ ۱۳ ذیقعدہ ۸۸ھ مطابق یکم فروری ۶۹ء شنبہ کے دن عزیزان مولانا انعام الحسن و ہارون کے جہاز کی روانگی ۹ بجے طے تھی۔ اس لیے ۸ بجے مطار پر پہنچ گئے وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بمبئی جانے والا جہاز ابھی کلکتہ کھڑا ہے۔ وہاں سے آکر پھر بمبئی جائے گا۔ اس واسطے مولانا محمد عمر صاحب نے مطار پر ایک لمبی تقریر شروع کردی۔ جس میں مطار کا عملہ بھی شریک رہا۔ ان کی تقریر پر نقد ایک جماعت مشایعت کرنے والوں میں سے بمبئی پیدل جانے کے لیے تیار ہوگئی جو وہیں سے روانہ ہوئی۔ ۲۱/۲ا پر جہاز آیا اور ۱۲ بج کر ۵۵ منٹ پر پرواز کی اور ۳ بجے بخیریت بمبئی پہنچ گئے۔

عزیزان مطار سے اُتر کر حاجی دوست محمد صاحب کے یہاں گئے اور دوسرے دن شہر میں منتقل ہوگئے۔ بہت زور شور کے اجتماعات جامع مسجد وغیرہ میں ہوتے رہے۔ ان اجتماعات کی نظیر پہلے سفروں میں نہیں ہوئی۔ منگل کی دوپہر کو ۱۱/۲ا بجے چل کر کراچی پہنچے۔ ڈیڑھ گھنٹہ وہاں قیام رہا۔ ظہر پڑھ کر روانہ ہوئے، عصر ریاض میں پڑھی اور مغرب جدہ کے ہوائی اڈہ پر اور سفیر ہند قدوائی صاحب کے ہاں چائے پی۔ وہ بار بار زکریا کے نہ جانے پر اظہار افسوس کرتے رہے اور یہ کہ دل بجھ گیا اور ہمشیرہ سعدی کے یہاں کھانا کھا کر عشاء حدیبیہ میں پڑھ کر سعدی کے گھر ۵ بجے عربی پہنچے۔ اس نے پہلے سے بہت زور باندھ رکھے تھے اور دستر خوان چنا ہوا تھا کہ بھائی سلیم کا ڈانٹ کا ٹیلیفون پہنچا کہ یہاں کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے، لیے بیٹھے ہیں، تم کہاں لیے پھر رہے ہو۔ سعدی تو اللہ اس کو بہت بلند عطاء فرمائے لقمہ چھوڑ کر اٹھ گیا۔ بقیہ سب نے دو دو چار چار لقمے کھائے۔ پھر جا کر سلیم کے یہاں کھانا کھایا۔ لیکن بھائی سلیم صاحب بالکل ساکت رہے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ تیرے نہ آنے کی وجہ سے ان کو قلق تھا۔ اگلے دن سے اپنے مشاغل اجتماعات میں مشغول ہوگئے۔ ترکوں، افریقیوں وغیرہ ہر ملک کے الگ الگ اجتماعات ہوئے۔ حج سے فراغ پر ۱۳ مارچ مطابق ۲۳ ذی الحجہ کو مدینہ کے لیے روانہ ہوئے شب کو بدر میں قیام کے بعد صبح جمعہ کو مدینہ پاک پہنچے۔

حجاز پاک میں سیلاب کی تفصیلات:

اس سال مکہ مکرمہ میں انتہائی طوفانی بارش ۳ ذیقعدہ مطابق ۲۲ جنوری چہار شنبہ کی صبح کو ہوئی مکہ مکرمہ پر نہایت ابر مسلط تھا۔ ظہر سے دو گھنٹہ قبل اس زور کی بارش شروع ہوئی کہ راستے سب بند ہو گئے۔ موٹریں سیلاب میں پتوں کی طرح بہہ گئیں۔ کاریں اوپر تلے دھنس گئیں۔ حرم شریف میں باب کعبہ سے دو بالشت اوپر پانی پہنچ گیا اور حرم شریف کی مٹی اور کنکریوں کی وجہ سے پانی کے سب مخرج بند ہو گئے۔ سابق مقام ابراہیم کا صرف چاند نظر آرہا تھا۔ زمزم شریف کا کنواں بالکل اٹ گیا۔ بہت سی لاشیں اس میں گریں۔ زمزمیوں کے جو خلوے حرم جدید کے نیچے تھے لوگوں نے اس کے اندر کے دروازے بند کر رکھے تھے وہ سب انتقال کر گئے تاریخ میں پہلی مرتبہ حرم شریف میں ظہر کی نہ عمومی نماز ہوئی نہ اذان۔ مغرب تک پانی بھر گیا اور مکبرہ پر جو چند آدمی محبوس تھے انہوں نے ہی وہاں اذان کہی اور وہیں نماز پڑھی۔

معلوم ہوا کہ جدہ میں اس سے دگنی بارش رہی۔ مکہ سے آمدہ خطوط بالخصوص عزیز سعدی کے بہت ہی تفصیلات سے اور درد انگیز واقعات سے لبریز آتے رہے۔ معلوم نہیں ان خطوط کے پڑھنے سے علی میاں پر کیا اثر ہوا کہ انہوں نے اس سیہ کار پر جلد مکہ جانے پر تقاضا کیا اور بہت بلبلا کر اس پر اصرار کیا کہ دعاء کر و میرے چلنے کی بھی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ اللہ کے یہاں اضطراری دعاء تو فوراً قبول ہوتی ہے۔ بلا وہم و گمان جامعہ مدینہ پاک کا ایک اجتماع حکومت نے طے کیا۔ جس میں علی میاں کو خاص طور سے مدعو کرنے کے احکام جاری کیے گئے اور ان کے اور ان کے رفیق کے ٹکٹ بھی آگئے اور زکریا پر ساتھ چلنے کا شدید اصرار کیا۔ زکریا نے دو شرطوں سے قبول کیا۔ اول یہ کہ اتنے حضرات نظام الدین واپس نہ آئیں اتنے نہیں جانا۔ دوسرے یہ کہ جس جہاز سے آپ تشریف لے جائیں گے اس میں نہیں جاؤں گا۔ اس لیے کہ وہاں آپ کا زوردار استقبال ہوگا اور آپ ہر ایک سے اس سیاہ کار کا تعارف کرائیں گے۔

واپسی مولانا انعام الحسن صاحب از حجاز:

علی میاں نے پہلی شرط قبول کر لی اور دوسری شرط کو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں آپ کا تعارف کسی سے نہیں کراؤں گا۔ عزیزان کی مدینہ واپسی ۵ ۱ اپریل مطابق ۷ محرم ۸۹ھ ہندی شنبہ کے دن ہو کر دو تین مکہ اور دو دن جدہ قیام کے بعد ۱۱ اپریل کو جدہ سے سعودی جہاز میں جو صرف کراچی تک آتا ہے روانہ ہوئے اور وہاں سے ۱۴ اپریل کو جرمنی جہاز سے ۲ بجے دہلی پہنچے۔ چونکہ زکریا کا مجوزہ سفر ۲۶ اپریل کا ان کی واپسی کی خبر پر طے ہو گیا تھا۔ اس لیے سہارنپور کی جملہ مستورات کو ایک مستقل

لاری دوسو روپے میں نظام الدین تک کرایہ کر کے ان سے یہ بھی شرط کر لی تھی کہ کاندھلہ کی مستورات کو متولی ریاض کے باغ سے بٹھا لے۔ یہ مستورات مع اطفال ۲۵ محرم مطابق ۱۳ اپریل یکشنبہ کو سہارنپور سے علی الصباح چل کر کاندھلہ کی مستورات کو لیتی ہوئی شام کو نظام الدین پہنچ گئیں۔ زکریا کا چونکہ مجوزہ سفر قریب تھا اس لیے وہ نہیں گیا۔

بندہ کی روانگی حجاز پاک ۸۹ھ بمعیت علی میاں وغیرہ:

۱۴ اپریل کو اڈہ پر اتنا ہجوم تھا کہ نظام الدین کے جو بچے ہوائی جہاز پر استقبال کے لیے گئے ہوئے تھے دہاں نہ مل سکے نظام الدین واپس آ کر ملے۔ عزیزان مولانا انعام و ہارون وغیرہ نظام الدین کے احباب جمعہ ۱۸ اپریل کو جمعہ کے بعد زکریا سے ملنے آئے اور دوشنبہ کو واپس چلے گئے اور ۵ صفر ۸۹ھ مطابق ۲۳ اپریل ۶۹ء چہار شنبہ کی صبح اذان کے بعد اپنی جماعت کر کے بہ نیت صوم علی گڑھ والوں کی کار میں گنگوہ مزار پر حاضر ہوئے نظام الدین پہنچا۔ اللہ سے دعاء کی تھی کہ یہ سفر سہارنپور سے مدینہ کی بہ نیت صوم باوضو پورا ہو جائے۔ اللہ نے اپنے فضل سے پورا فرما دیا۔ ورنہ پیشاب کی کثرت سے ہوائی جہاز میں بہت ہی فکر تھا کہ پیشاب کے بعد معاً وضو کرنے میں بھی نہ معلوم کتنے میل گزر جائیں گے۔ مگر اللہ نے کرم فرمایا۔ انعام فرمایا، احسان فرمایا۔ فللّٰہ الحمد والمنة.

علی میاں بھی روانگی سے ایک دن پہلے مع مولوی سعید الرحمٰن ومولوی معین اللہ دہلی پہنچ گئے تھے۔ ۲۶ اپریل مطابق ۸ صفر ۸۹ھ یوم شنبہ کو لکھنوی حضرات کی معیت میں زکریا ابوالحسن ۹ بج کر ۲۰ منٹ پر دہلی سے چل کر ۱۰ بج کر ۵۵ منٹ پر بمبئی کے ہوائی اڈہ پر پہنچے وہاں مطار پر علی میاں نے بہت طویل دعاء کرائی اور مطار پر عزیز عبدالرحیم متالا اور بہت سے احباب سورت وگجرات وغیرہ کے ملے۔ عزیز عبدالرحیم آئندہ مکہ کے سفر میں میرے ساتھ رہا۔ قیام حاجی دوست محمد صاحب کی کالونی میں ہوا۔ زکریا شہر میں نہیں گیا البتہ علی میاں متعدد جگہوں پر احباب کے اصرار پر گئے اور ۲۹ اپریل سہ شنبہ ۱۱½ بجے بمبئی سے چل کر ظہر کراچی کے مطار پر تقریباً ایک ہزار کے مجمع کے ساتھ پڑھی، اس کے بعد چل کر قبیل مغرب جدہ پہنچے اور مطار کی مسجد میں مغرب پڑھ کر حدیبیہ میں عشاء عزیز عبدالرحیم کے اقتداء میں پڑھی اور وہاں سے صولتیہ جا کر کھانے سے فراغ کے بعد عمرہ سے فراغ حاصل کیا اور عمرہ سے فراغ کے بعد مخصوص رفقاء کے ساتھ عزیز سعدی سلمہ کے مکان پر چلا گیا۔

اس پورے آٹھ ماہ قیام میں اس آمد کے علاوہ جو رمضان المبارک میں یا رمضان کے بعد ہندوستان واپسی کے لیے ہوئی مستقل معمول یہی رہا کہ عشاء کے بعد کھانے سے فراغ پر یہ ناکارہ

مع اپنے مخصوص احباب قاضی عبدالقادر صاحب، عبدالرحیم، یوسف وغیرہ عمرہ کر کے عزیز سعدی سلمہ کے مکان پر جا کر رات کو سوتے اور وہیں سے حرم شریف میں صبح کی نماز پڑھنے کے بعد واپس سعدی کے یہاں جاتے تھے اور وہاں سے عربی ۲ بجے کے قریب ناشتہ سے فراغ پر مدرسہ صولتیہ آجاتے تھے۔ وہاں آکر ایک گھنٹہ صلوٰۃ ضحیٰ اور ۵ بجے تک ڈاک اور ملاقات خصوصی اور تخلیہ وغیرہ کے بعد ۵ بجے حرم شریف آتے اور ظہر سے فراغ پر مدرسہ صولتیہ واپس جا کر یہ ناکارہ تو لیٹ جاتا تھا بقیہ جملہ رفقاء کھانے سے فراغ پر لیٹتے تھے اس ناکارہ کا معمول سالہا سال سے ایک وقت کھانے کا ہے جو ہندوستان میں ہمیشہ صبح کا رہا اور حجاز میں ہر سفر میں ہمیشہ عشاء کے بعد کا رہا کہ عشاء پڑھ کر صولتیہ میں کھانے سے فراغ پر عمرہ یا طواف سے فراغ پر سعدی سلمہ کے یہاں جاتے تھے۔ ملک عبدالحق صاحب اور ان کے صاحبزادے عزیزم عبدالحفیظ کو اللہ تعالیٰ بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ ملک صاحب نے اس سیہ کار کے مکہ پہنچنے سے پہلے ایک پک اپ (گاڑی) مستقل پندرہ ہزار ریال میں خرید کر اس سیہ کار کے حوالہ کر دی تھی۔ جو مکہ مکرمہ میں اور مدینہ منورہ ہر جگہ میرے ساتھ رہتی تھی اور ان کے صاحبزادے بلند اقبال عزیزم مولوی عبدالحفیظ سلمہ دونوں جگہ ہر وقت میرے ساتھ ہی رہے اور نمازوں میں یا کہیں دوسری جگہ جانا ہوتا تو وہ مجھے لیے لیے پھرتے تھے میں نے ہر چند کوشش کی کہ کم از کم پٹرول کے دام مجھ سے لے لیں۔ مگر ملک صاحب نے اس کو بھی قبول نہ کیا۔ مکہ سے مدینہ اور مدینہ سے مکہ عموماً اسی گاڑی میں آنا ہوا اور اس راستہ میں ملک صاحب خود چلاتے تھے۔ ان کو اپنی گاڑی کے چلانے میں بہت مشق ہے مکہ سے مدینہ اکثر ساڑھے چار سے پانچ گھنٹہ کے درمیان میں پہنچ جاتے تھے۔

حرمین شریفین کے قیام میں عصر کے بعد سے گیارہ بجے تک عمومی مجلس ہوتی جس میں مقامی اور آفاقی لوگ ملاقات کے لیے کرم فرماتے رہتے تھے۔ گیارہ بجے پیشاب وضو سے فراغ پر ہر دو متبرک مقامین کی مسجد میں حاضری ہوتی تھی اور مغرب سے عشاء تک وہیں مسجد میں قیام ہوتا اور عشاء کے بعد کھانے سے فراغ پر مکہ مکرمہ میں پانچ بجے تک ڈاک یا کسی کتاب کا سننا تھا۔ علی میاں بھی دہلی سے جدہ تک اس سیہ کار کے ساتھ رہے جدہ پہنچ کر یہ ناکارہ مکہ مکرمہ چلا گیا۔ جیسا کہ اوپر نظام گزرا اور علی میاں تو جامعہ مدینہ کے اجتماع میں شرکت کی غرض سے گئے تھے اور اس کا اجلاس ایک دن پہلے سے شروع ہو گیا تھا، اس لیے وہ شب کو جدہ میں الحاج نور ولی صاحب کے مکان پر ٹھہر کر منگل کی صبح کو طیارہ سے آدھ گھنٹہ میں مدینہ پاک پہنچ گئے۔

یہ ناکارہ مع اپنے مخصوص رفقاء کے ۱۵ مئی کی صبح کو ملک عبدالحق صاحب کی گاڑی میں صبح ساڑھے دس بجے عربی چل کر مدینہ پاک ظہر کے وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ وہاں جا کر ظہر سے

پہلے غسل سے فراغ ہوا۔ مسجدِ نبوی میں حاضری ہوئی۔

روزوں کا سلسلہ سہارنپور سے شروع ہو گیا تھا اور باوجود سفر اور گرمی کے کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی جو صرف اللہ کا احسان وکرم وفضل تھا۔ اس لیے ۸ مئی سے ''صیام شھرین متتابعین توبۃ من اللّٰہ'' کی نیت کرلی اور احباب واکابر کے شدید اصرار کے باوجود خیبر کے سفر تک اس کا سلسلہ رہا۔ چونکہ علی میاں کو اپنی آنکھ دکھانے اور احباب کے اصرار پر لندن جانا تھا اس لیے ۲۵ مئی کو زکریا علی میاں وغیرہ مکہ مکرمہ واپس ہوئے۔ علی میاں صاحب ۶ جون جمعہ کی نماز کے بعد لندن جانے والے تھے۔ اس لیے زکریا مع رفقا کے ۵ جون جمعرات کو مدینہ کے لیے واپس ہوئے اور رات بدر میں گزار کر جمعہ کے دن مدینہ پاک حاضری ہوئی اور ۱۱ جون کو تبلیغ کا ماہانہ اجتماع مدینہ پاک کا پہلے سے طے تھا اور زکریا کی وجہ سے اگلے ماہ جولائی کا اجتماع بھی مدینہ میں طے ہوا۔ زکریا نے اصرار بھی کیا کہ اپنے معمول کے مطابق جہاں کا دستور ہے وہاں طے کرلو یہ نا کارہ وہاں ہی چلا جائے گا مگر ان لوگوں نے مدینہ پاک ہی میں طے کیا کہ ۹ جولائی کو ہوگا۔

تبلیغی سفر:

اللہ تعالیٰ کے احسانات متزایدہ میں جو اس سفر میں روز افزوں رہے ایک فضل واحسان یہ بھی رہا کہ اس سفر کے جملہ تبلیغی اجتماعات میں خیبر، ینبوع، طائف، مکہ، جدہ وغیرہ میں نا کارہ کی شرکت ہوتی تھی۔ سہ روزہ تبلیغی اجتماع خیبر کا طے ہوا اور زکریا نے بھی اپنی شرکت پر اصرار کیا۔ مگر احباب نے شدت سے انکار کیا کہ وہاں بجلی نہیں اور گرمی شدید ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس سفر میں باوجود قدیم وجدید امراض کے صحت بہت اچھی رہی۔ اس لیے ۱۲ جولائی کو حرم شریف میں صبح کی نماز پڑھ کر خیبر کے لیے روانہ ہوئے۔ عربی ڈیڑھ بجے خیبر پہنچے۔ جماعت کا قیام مسجد علی میں طے ہوا اور نا کارہ کے لیے شدید انکار کے باوجود مسجد سوق کے قریب ایک مکان تجویز ہوا جو درحقیقت ایک اسکول تھا اور آج کل گرمی کی چھٹیوں کی وجہ سے خالی تھا۔ بھائی محمد علی صاحب مکہ بجلی والے اور الحاج عبدالحفیظ وغیرہ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ ان لوگوں نے ایک فیکٹری والوں سے بات کر کے تین دن کے لیے ان سے چار سو ریال میں اپنی بنائی ہوئی بجلی مستعار لی جو ان کی فیکٹری میں جارہی تھی اور اس نے یہ کہہ کر جو تار وغیرہ بجلی کا سامان تم لائے ہو وہ کرائے کے بدلہ میں میرے لیے چھوڑ دو۔ مقاصہ کرلیا۔

شہداءِ خیبر کی زیارت اور وہاں دل بستگی وکشش:

اجتماعات مسجدِ علی اور دوسری مساجد میں ہوتے رہے۔ جن کی تفاصیل میرے روزنامچے میں

ہے۔ان میں سیہ کار کی بھی شرکت ہوتی رہی۔مسجد علی کے قریب بلا کسی دیوار وغیرہ کے جنگل میں شہداء خیبر کی قبور تھیں۔ان پر حاضری ہوئی۔جتنی کشش اور دل بستگی ان قبور پر تھی اتنی حرمین کے کسی قبرستان میں نہیں ہوئی۔اس پر بڑی حیرت بھی ہوئی اور کئی دن تک اس کا اثر بھی رہا۔اکابر ہند علی میاں، مولانا انعام الحسن صاحب وغیرہ سے بندے نے اس کی وجہ دریافت کی کہ بقیع اور جنت المعلیٰ میں اتنی کشش نہیں جتنی یہاں ہوئی۔مدینہ پاک کے کئی ماہ قیام میں ان قبور پر بار بار جانے کا تقاضہ رہا۔ان اکابر نے جاذبیت کی وجوہ مختلف بتائیں۔اس سیہ کار کے خیال میں یہ ہے کہ وہاں کے حاضر ہونے والے بہت کم ہیں، حاضری کی نوبت دور ہونے اور جنگل کی وجہ سے کم آتی ہے۔اس لیے وہاں کی مقدس ارواح کی توجہ آنے والوں کی طرف زیادہ ہوئی۔۱۵ جولائی کو خیبر سے واپسی ہوئی۔اس کے بعد چونکہ ہر اجتماع میں اور تبلیغی گشت میں یہ ناکارہ شرکت کا وعدہ کر چکا تھا اس لیے ۲ اگست مطابق ۱۷ جمادی الاولیٰ ہندی شنبہ کو بعد عصر زکریا ٹیکسی میں اور بقیہ رفقاء ملک صاحب کی گاڑی میں روانہ ہوئے۔عزیز یوسف متالا اسی دن صبح کو مع اپنے رفقاء کے لندن سے جدہ ہوتے ہوئے مدینہ پاک پہنچا تھا۔حالانکہ ہم نے کوشش کی تھی کہ اس کو جدہ میں ہمارے مکہ آنے کی اطلاع مل جائے مگر اطلاع نہ مل سکی، اس لیے وہ مستقل ٹیکسی کر کے مدینہ سے پھر ہمارے ساتھ مکہ واپس آئے۔یہ ناکارہ مع رفقاء عربی رات کے سعدی کے مکان پہنچے۔کھانے سے اور نماز سے فراغ پر ساڑھے چار بجے حرم پہنچے۔

سفر طائف:

عمرے سے فراغ کے بعد سعدی کے گھر واپس ہوئے اور بدھ کی صبح کو بذریعہ ٹیکسی اور ملک صاحب کی گاڑی میں ۲½ بجے عربی مکہ سے چل کر ۴½ بجے طائف پہنچ گئے۔تین دن وہاں قیام رہا مختلف اجتماعات ہوئے۔جس میں مولانا سعید خان صاحب الحاج فضل عظیم وغیرہ نے تقاریر کیں اور جمعہ کے دن ۴½ بجے مسجد عباس میں پہنچے چونکہ ملک فیصل صاحب بھی اس زمانے میں طائف تھے اور وہ اسی مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔اس لیے مسجد کے چاروں طرف دور تک سنگین پہرہ رہتا تھا اور کوئی کار مسجد کے دروازہ تک نہیں جا سکتی تھی۔لیکن یہ ناکارہ اقبال خلجی صاحب کی کار میں تھا۔انہوں نے فوجیوں سے خوشامد کر کے مسجد تک لے جانے کی اجازت لے لی۔

ملک صاحب کے آتے ہی خطبہ کی اذان شروع ہوگئی۔ملک صاحب اس دروازہ سے آئے جو امام کے قریب قبلہ کی جانب تھا۔وہ نماز کا سلام پھیرتے ہی چلے گئے۔امام نے خطبہ بہت ہی مختصر پڑھا۔حالانکہ حجاز میں عام طور پر خطبے بہت لمبے ہوتے ہیں اور نمازیں بہت مختصر۔عزیزم مولوی

اسماعیل بدات نے جو میرے بعد بحرین کے راستہ مکہ پہنچے تھے انہوں نے بیان کیا کہ الخبر میں خطبہ تو ایک گھنٹہ ہوا اور نماز تین منٹ۔

بہرحال ہم لوگ جمعہ کی نماز پڑھ کر حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے مزار پر دیر تک حاضری کی اپنے مستقر پر واپس آئے اور عصر کی نماز پڑھ کر جس ٹیکسی میں یہ ناکارہ گیا تھا اس سے حتمی وعدہ عصر طائف میں پڑھنے کا ہو بھی گیا تھا اور بہت ہی گرویدگی کا اس نے اظہار بھی کیا تھا اور موعودہ وقت پر پہنچ بھی گیا۔ لیکن اتنے ہم لوگوں کا مسجد سے سامان ٹیکسی تک آیا اس کو کسی اور نے زیادہ کرایہ دے کر اپنے لیے طے کرلیا۔ ہم نے ہر چند وعدے یاد دلائے لیکن سوّاق نے صفائی سے کہہ دیا کہ انہوں نے کرایہ زیادہ دے دیا۔ فَاِلَی اللّٰہِ الْمُشْتَکیٰ۔

مکہ مکرمہ میں حاضری:

اس لیے جملہ رفقاء ۱۶ نفر ملک عبدالحق کی گاڑی میں بھر گئے اور بہت اندیشہ تھا کہ یہ گاڑی راستہ میں جواب دے گی۔ لیکن اللہ کے فضل سے عصر کے بعد چل کر مغرب میدانِ عرفات جبلِ رحمت پر پڑھی۔ بڑا ہی دل لگا میدان صاف تھا سکون کا وقت تھا۔ دل تو چاہتا تھا کہ دو تین گھنٹے رات کے یہاں گزاروں مگر قاضی عبدالقادر صاحب وغیرہ رفقاء کے اصرار پر پون بجے یہاں سے چل کر ایک بجے مکہ میں داخل ہوئے اور مکہ کے بازاروں میں اتنی دیر لگی کہ 1½ بجے مدرسہ صولتیہ ہوتے ہوئے حرم میں پہنچے اور عمرہ سے فراغ پر عزیز سعدی کے یہاں پہنچے وہاں کھانا وغیرہ کھایا۔

سفر ینبوع:

دو دن مکہ میں قیام کے بعد ینبوع کا سہ روزہ اجتماع تجویز تھا چونکہ عزیز عبدالرحیم سلمہ کی طبیعت خیبر سے خراب ہوئی تھی اور علالت بڑھتی ہی چلی گئی۔ طائف میں خاص طور سے خراب رہی۔ طائف میں تو اس سیہ کار کی طبیعت بھی بہت ہی خراب رہی۔ نہ کچھ کھانے کی نوبت آئی نہ نیند اچھی طرح آئی۔ حرارت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ وہاں کے پھلوں کے بہت سے اصرار ہوئے۔ خاص طور سے برشومی کے متعلق بہت اصرار رہا کہ بہت سے لوگ لے کر آئے۔ مگر ایک بھی چکھنے کی نوبت نہ آئی۔ حالانکہ حجازِ مقدس کے اس آٹھ ماہ قیام میں طبیعت بہت اچھی رہی عزیز عبدالرحیم کی بیماری کی وجہ سے مولانا سعید خان صاحب نے یہ طے کیا کہ وہ مکہ سے جدہ ہو کر ینبوع پہنچیں کہ عزیز عبدالرحیم کو طیارہ پر سوار کراسکیں۔ چنانچہ یہ حضرات دوشنبہ ۱۱، اگست مطابق ۲۶ جمادی الاولیٰ ہندی کو صبح ملک صاحب کی گاڑی میں روانہ ہو گئے اور ہم لوگ اسی دن مسجد حرام میں عصر پڑھ کر بذریعہ ٹیکسی ینبوع روانہ ہوئے۔ مگر ہمارا سوّاق بہت ہی حقہ اور چائے کا شوقین تھا۔ اس لیے وہ

آدھ گھنٹہ جدہ کے مفرق پر اور آدھ گھنٹہ بدر کے مفرق پر چائے اور حقہ میں مشغول رہا۔ یہ حضرات مولوی سعید خان صاحب وغیرہ عصر کے وقت ینبوع پہنچ گئے تھے۔ عشاء کے بعد دیر تک انتظار کرکے یہ ہماری تلاش میں چلے۔ مگر جدہ میں ملاقات ہوگئی۔ ینبوع کے امام بہت ہی غلط قرآن پڑھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہی رحم فرمادے۔

یہاں کے قیام میں مچھلیاں بہت ہی ارزاں عجیب لمبی چوڑی ملیں ایک مچھلی غالباً ۱۵ کلو کی تھی۔ جس میں کانٹا بہت کم، سارے مجمع نے صبح و شام دونوں وقت اسی کا شوربا پیا بدھ کی صبح کو زکریا عزیز یوسف متالا کی وجہ سے ٹیکسی میں کہ یوسف کو بدر کی سیر کرانی تھی کہ اس کی پہلی حاضری تھی روانہ ہوئے۔ بقیہ رفقاء ملک صاحب کی گاڑی میں ½۱۲ پر بدر پہنچے۔

جدہ کے اجتماع میں شرکت:

وہاں سے ۲ بجے چل کر ½۴ پر مدرسہ شرعیہ پہنچے۔ طائف میں دمام اور جدہ کے ماہانہ تبلیغی اجتماعات طے ہوگئے تھے اور دونوں جگہ کے احباب نے زکریا سے شرکت کا وعدہ بھی لے لیا تھا۔ لیکن عبدالرحیم تو روانہ ہو چکا تھا اور ابوالحسن کو دمام سے سہارنپور جانا تھا اور اسماعیل یوسف کا ویزا وہاں کا نہیں تھا۔ کسی رفیق کے نہ ہونے کی وجہ سے زکریا کو دمام کا سفر ملتوی کرنا پڑا البتہ جدہ کے ماہانہ اجتماع میں شرکت ہوئی۔

۲۸ ستمبر مطابق ۱۴ رجب یکشنبہ کی صبح کو نماز کے بعد مسجد نبوی سے حضرت اقدس سہارنپوری قدس سرہٗ کی طرف سے احرام باندھ کر ملک صاحب کی گاڑی میں مکہ کے لیے روانگی ہوئی۔ مگر اب تک کہ معمول کے خلاف کہ اس سفر میں کئی دفعہ مکہ مدینہ کے درمیان میں آمدورفت ہوئی۔ لیکن دماغ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ مگر آج خلاف معمول گاڑی کے چلتے ہی دوران سر شروع ہوا۔ بدر تک پہنچنا مشکل ہوگیا۔ بڑی مشکل سے بدر تک پہنچا گاڑی روک کر تھوڑی دیر زمین پر لیٹا لیموں وغیرہ کھائے لیکن امتلاء اور دورانِ سر گیا نہیں۔ بہت مشقت کے ساتھ ۵ بجے مدرسہ صولتیہ پہنچے دو دن مکہ قیام کے بعد بدھ کی صبح کو جملہ رفقاء اور بعد عصر زکریا جدہ کے لیے روانہ ہوا۔ راستہ میں بیعت الشجرہ کی جگہ پر آدھ گھنٹہ قیام کیا۔ جو مسجد حدیبیہ سے آگے بڑھ کر تقریباً آدھ میل پر بائیں جانب واقع ہے۔ وہاں چل کر جدہ میں مغرب کی نماز مسجد بن لادن میں پڑھی۔ وہاں دو دن اجتماع ہوتے رہے اور جمعہ کی صبح کو شوریٰ سے فراغ پر ۴ بجے عربی چل کر مسجد حرام میں جمعہ کی نماز ادا کی اور شنبہ کو مدینہ پاک واپسی ہوئی۔

حاضری مکہ مکرمہ بمعیت علی میاں:

علی میاں اور منظور صاحب رابطہ کے اجتماع کی شرکت کے لیے ۱۴، اکتوبر یکم شعبان ہندی سہ شنبہ کو مکہ مکرمہ پہنچے تھے اور ۲۶ اکتوبر مطابق ۳ شعبان کو رابطہ کے اجتماعات سے فارغ ہو کر مدینہ پاک پہنچ گئے تھے اور ۹ نومبر ۲۹ شعبان عربی اور ۲۷ ہندی یکشنبہ کو صبح ۲/۱، ۳ بجے عربی علی میاں کے ساتھ مدینہ پاک سے چلے۔ چونکہ اس مرتبہ رابطہ عالم اسلام کی گاڑی علی میاں کے ساتھ رہی ان کے اصرار پر یہ ناکارہ بھی رابطہ کی گاڑی میں ½۱۰ بجے صولتیہ پہنچے اور اپنی عصر پڑھی۔ بقیہ رفقاء ڈاکٹر اسماعیل اور ملک صاحب کی گاڑی میں مغرب سے عشاء تک حسب معمول حرم میں قیام رہا اور عشاء اطمینان سے پڑھنے کے بعد مدرسہ صولتیہ واپس پہنچے۔

تراویح مکہ مکرمہ:

تو ایک دم گولوں کی آواز شروع ہوگئی، حالانکہ وہاں دستور قدیم کے موافق یہ سنا گیا تھا کہ اگر عشاء کی نماز کے بعد گولوں کی آواز آئے تو آدھ گھنٹہ بعد تراویح کی نماز شروع ہوتی ہے۔ مگر ہم لوگ آواز سنتے ہی پیشاب وضو سے فارغ ہو کر مسجد حرام میں پہنچے تو دو رکعت تراویح کی ہو چکی تھیں۔

حرمین شریفین میں معمول یہ ہے کہ دو حافظ مل کر تراویح پڑھاتے ہیں ہر امام آدھا پارہ پڑھتا ہے۔ اس ناکارہ کا معمول تراویح اور کھانے سے فراغ پر یہ تھا کہ تنعیم جا کر روزانہ عمرہ کرتا۔ علی میاں بھی ساتھ ہوتے اور اکثر وہ دن میں ہی عمرہ سے فارغ ہو جاتے تھے۔ ۱۵ دن مکہ مکرمہ میں قیام رہا۔

واپسی مدینہ طیبہ از مکہ مکرمہ در رمضان:

۲۴ نومبر مطابق ۱۵ رمضان المبارک چہار شنبہ کو زکریا مکہ مکرمہ سے مدینہ پاک روانہ ہوا اور علی میاں اور مولوی منظور ایک دن پہلے مکہ سے جدہ آ چکے تھے اور اپنا رہا پندرھواں پارہ تراویح میں خود پڑھا اور سفیر ہند کے یہاں دعوت ہوئی اور ۱۵ رمضان ۲۴ نومبر کو ہندوستان واپس ہوئے۔

مکہ مکرمہ میں پندرہویں شب میں پارہ نمبر ۱۵ ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہاں ہمیشہ ایک ہی پارہ پڑھا جاتا ہے اور رمضان ہمیشہ ۲۹ کا ہوتا ہے لیکن اعلان ہمیشہ چاند کا دیر میں ہوتا ہے تراویح کے بعد پارہ نمبر ۳۰ ہو کر پھر چاند کا اعلان ہوتا ہے لیکن مدینہ پاک میں ۲۹ کو قرآن پاک ختم ہوتا ہے۔ وہاں بھی دو حافظ پڑھتے ہیں۔ لیکن سولہویں شب میں وہاں پارہ نمبر ۱۷ ہوا لہٰذا ہم لوگوں نے اپنا پارہ نمبر ۱۶ اکیسویں شب امام حرم کی تراویح ختم کے بعد (کہ چار رکعت ہم سب نے امام حرم کے پیچھے نفل پڑھی تھی) عزیز یوسف متالا کے اقتداء میں اپنے معتکف میں پڑھیں۔ ۲۰ رمضان کی شام

سے اعتکاف کیا۔ باب عمر رضی اللہ عنہ کے قریب معتکف تھا۔ ۲۹ کا چاند ہوا۔ عشاء کے فرضوں کے بعد قاضی صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں اعلان کیا کہ شہادت شرعیہ سے روایت ثابت ہوگئی اور رمضان ختم ہوگیا۔ منگل کو عید ہوئی۔

روانگی از مدینہ طیبہ برائے ہندو پاک:

پہلے سے ۲ شوال کی واپسی تجویز تھی۔ لیکن تبلیغی اجتماع اس ماہ بھی اس ناکارہ کی وجہ سے مدینہ میں ہی رکھا گیا تھا۔ اس وجہ سے تین دن اجتماع میں گزرے اور عربی ۷ شوال مطابق ۱۵ دسمبر کو مدینہ سے مکہ مکرمہ کے لیے واپسی ہوئی۔ اس مرتبہ شب کا قیام بجائے سعدی کے صولتیہ میں ہوا کہ سردی شروع ہوگئی تھی۔ ۲۱ دسمبر یکشنبہ کو بعد عصر مکہ سے جدہ کے لیے روانگی ہوئی۔ عین مغرب کے وقت جدہ پہنچے۔ ۲۲ دسمبر کی صبح کو سعودی جہاز سے ۲ بجے عربی چل کر ۳ بجے دوپہر کو کراچی پہنچے، ائیرپورٹ کی مسجد میں ظہر پڑھی۔ موجودین سے مصافحہ کر کے حاجی فریدالدین کی گاڑی میں مکی مسجد پہنچے۔ ائیرپورٹ کا مجمع جو کئی ہزار تھا عصر تک مکی مسجد پہنچا۔ عصر سے مغرب تک روزانہ مصافحوں کا سلسلہ چلتا جو مغرب کے وقت بغیر تمامی کے بند ہو جاتا۔ مغرب کے بعد بیعت کا سلسلہ رہتا۔

۲۶ دسمبر جمعہ کی شام کو عشاء کے بعد ۸ بجے طیارہ سے چل کر ½۹ بجے لاہور پہنچے۔ بلال پارک کی مسجد میں قیام ہوا۔ اتوار کی صبح کو ½۱۱ بذریعہ کار چل کر ½۱۲ بجے رائیونڈ پہنچے چکر اور امتلاء اور دورانِ سر خوب رہا۔ بھائی افضل کے مکان پر مالٹے کا عرق پینے سے قے ہوئی۔ یہاں بھی مجمع بہت زیادہ رہا۔ ۲ جنوری ۷۰ء جمعہ کے دن مطابق ۲۲ شوال ۸۹ھ جمعہ کی نماز کے بعد گیارہ کاریں اور دو لاریوں کے ساتھ لائل پور روانگی ہوئی۔ راستہ میں عصر کی نماز سرائے مغل میں صوفی صاحب کے مزار پر پڑھی۔ وہاں سے فراغ پر مغرب کے وقت لائل پور پہنچے۔ جماعت ہو رہی تھی۔ زکریا کو امتلاء اور چکر کی شدت ایسی ہوئی کہ جاتے ہی لیٹ گیا اور آدھ گھنٹہ بعد اپنی جماعت کی۔ شنبہ کو لائل پور میں قیام رہا۔ دوپہر کو جناب الحاج الحافظ مولانا عبدالعزیز صاحب گمتھلوی سرگودھا سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ اس ناکارہ نے آمد پر اظہار افسوس بھی کیا کہ کل کو تو میں آپ کے یہاں حاضر ہو ہی رہا تھا۔ عصر کے وقت سرگودھا واپس چلے گئے۔ ۴ جنوری اتوار کو ۱۱ بجے سرگودھا روانہ ہوئے۔ راستے میں زینت مل نیر پہلوان ابراہیم کے کارخانہ پر چند منٹ قیام کے بعد چنیوٹ کے مدرسہ میں ٹھہرتے ہوئے سرگودھا پہنچے۔ مدرسہ کے ناظم ہمارا انتظار کر کے سرگودھا جا چکے تھے۔ اس لیے مدرسہ میں قیام کی نوبت نہیں آئی۔ سرگودھا میں ظہر کے بعد حافظ صاحب کے یہاں کھانا کھایا۔ زکریا نے اس سفر میں دن میں ناشتہ اور کھانے میں شرکت نہیں کی۔ وہاں پہنچ کر بھی چکروں کی وجہ

سے تاخیر سے ظہر پڑھی۔ حافظ صاحب نے بھی زکریا کے ساتھ پانچوں نمازیں گھر ہی پر پڑھیں اور امامت کرائی۔ دوشنبہ کی صبح کو روانگی طے تھی۔ مگر کھانے پر حافظ صاحب نے بہت اصرار کیا اور سارے مجمع کی بہت زوردار دعوت کی۔ جس میں پلاؤ زردہ کے علاوہ خوب مختلف انواع کے کھانے تھے۔ ظہر کی نماز پڑھ کر سارا مجمع ڈھڈیاں کے لیے روانہ ہوگیا۔ عصر کے قریب وہاں پہنچے۔ زکریا حافظ صاحب کے یہاں سے اپنے ساتھ پلاؤ لایا تھا۔ وہاں جاکر گرم کرکے کھایا۔

۱۰ جنوری کو مولوی عبدالجلیل کے ایک بچہ کا زکریا نے قرآن ختم کرایا۔ شیرینی بھی زکریا نے تقسیم کرائی اور بڑے لڑکے ابراہیم کا نکاح ان کے بھائی رفیق کی لڑکی سے حافظ عبدالعزیز صاحب نے مہر فاطمی پر پڑھایا۔ اسی دن بعد ظہر وہاں سے چل کر عصر جہاوریاں میں (قاضی عبدالقادر صاحب کے مکان پر) پڑھی۔ اتوار کی صبح کو ناشتہ کے بعد وہاں سے چل کر عصر کے وقت راولپنڈی پہنچے۔ قریشی صاحب کی مسجد میں قیام طے تھا۔ لیکن چند وجوہ سے اس مکان میں قیام ہوا، جس میں عزیز مولانا یوسف صاحب کے ساتھ قیام ہوا تھا۔ ۱۷ جنوری ۰ے ءشنبہ کو اپنی ظہر پڑھ کر بذریعہ طیارہ براہ لاہور عصر کے وقت کراچی پہنچے۔ وہاں سے ۱۹ جنوری دوشنبہ کو طیارہ کے لیے حاجی فرید کی گاڑی میں روانگی ہوئی۔

جہاز بجائے ½۱۰ بجے کے ۱۱ بجے روانہ ہوکر سوا بارہ بجے اور ہندی پون بجے دلی پالم اڈہ پر پہنچے۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ علی میاں، مولانا منظور، یونس سلیم صاحب طیارہ پر موجود تھے۔ حضرات نظام الدین بھوپال کے اجتماع میں گئے ہوئے تھے۔ طیارہ پر اول بھائی شفیع صاحب نے مولانا عمران خان صاحب کا شدید اصرار و تقاضا کہ مجھ کو طیارہ سے یا فرسٹ کلاس سے اسی وقت بھوپال بھیج دیں۔ میرا بھی عرصہ سے بہت جی چاہ رہا تھا کہ ہر سال مولانا کا اصرار ہوتا تھا، لیکن اڈہ پر لکھنؤ، علی گڑھ، بہار، بنگال کا تقریباً پانچ ہزار کا مجمع تھا۔ ان سے بغیر ملے بھی جانا مشکل تھا اور وہ اجتماع کا آخری دن بھی تھا۔ البتہ شاہ یعقوب صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی زیارت ضرور ہوجاتی، مگر مجمع کی کثرت مانع ہوئی۔ مولانا انعام الحسن صاحب نے لوگوں سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر زکریا بھوپال نہ آئے تو بذریعہ تار ٹیلیفون سے اطلاع کردی جائے۔ چنانچہ اسی وقت اطلاع کردی گئی۔ اس کے جواب میں ان کا ٹیلیفون آیا کہ وہ منگل کو بذریعہ طیارہ پہنچ رہے ہیں، چنانچہ وہ منگل کی شام کو عشاء کے قریب پہنچ گئے اور کلکتہ اور بہار کے احباب بدھ کی صبح کو ریل سے۔ منگل کا دن عورتوں کے اجتماع کا تھا۔ جس میں مولوی انعام کی شرکت ضروری تھی، مگر نہ ہوسکی۔ فیاللاسف۔

واپسی از دہلی:

۱۲ ذیقعدہ مطابق ۲۱ جنوری بدھ کا دن نظام الدین گزرا، جمعرات کی صبح کو ½8 بجے علی گڑھ والوں کی کار میں نظام الدین سے چل کر حضرت میرٹھی اور حضرت مدنی کے مزار پر حاضر ہوتے ہوئے اسلامیہ اسکول تین بجے پہنچے۔ اس لیے کہ زکریا نے دہلی سے ابوالحسن کو اس کے اسکول کی وجہ سے پیر ہی کو سہارنپور بھیج دیا تھا۔ مگر منیجر صاحب اور پرنسپل صاحب نے بدھ کے دن ابوالحسن کو واپس کر دیا کہ زکریا کو لے کر سیدھا اسکول پہنچے اور یہ دن بکار اسکول شمار ہوگا۔ اس لیے بالا بالا اسکول گیا۔ ½3 بجے وہاں سے چل کر مدرسہ قدیم کی مسجد میں تحیۃ الشکر کے بعد خصوصی احباب سے ملاقات ہوئی۔ عصر کی نماز حسب تجویز و اعلان دارالطلبہ جدید میں پڑھی۔ جمعہ کے دن مولانا صاحب مولوی عبید اللہ، مولوی محمد عمر وغیرہ دس نفر عشاء کے بعد بذریعہ ریل پہنچے کہ ان کی کار میں نظام الدین کی مستورات جمعہ کے وقت پہنچ گئیں تھیں۔ اگلے دن گنگوہ حاضری ہوئی اور عصر کے بعد واپسی ہوئی۔ ظہر کے قریب قاری طیب صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے۔ مگر اس ناکارہ کے نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے سہارنپور پہنچنے سے پہلے ہی واپس چلے گئے۔ اس لیے تجویز ہوا کہ یکشنبہ کو بجائے جھنجھانہ اور لوہاری کے دیوبند چلیں۔ لیکن رات ہی کو بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا کہ کہیں بھی جانا نہ ہو سکا۔ پیر کے دن حضرات نظام الدین بارش ہی میں دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔

اس سفر میں اللہ کے احسانات اتنے لا تعد و لا تحصیٰ ہوئے کہ اپنی بداعمالیاں ان کو ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ مبشرات اس سیہ کار کو تو کم اور اس سیہ کار کے متعلق مقامی اور دین دار کو بہت ہی کثرت سے ہوئے۔ ایک بات میرا بھی لکھوانے کو جی چاہ گیا۔

۴۲ء میں اس سیہ کار نے اپنی یادداشت کے واسطے ایک رسالہ حجۃ الوداع کے سلسلہ میں لکھا تھا۔ اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کو مسلسل متن کی صورت میں لکھا تھا اور شرح اور بین السطور میں مختلف روایات کے درمیان جمع اور مختلف مذاہب کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ طباعت کا کبھی خیال بھی نہ آیا اور کبھی اگر کسی نے کہا بھی تو اس کو انکار کر دیا۔ مگر مدینہ پاک کی اس حاضری میں شعبان میں بار بار بلا کسی وجہ کے یہ داعیہ پیدا ہوتا رہا کہ ہندوستان واپسی ہو تو اس کو طبع کیا جائے۔ چنانچہ واپسی ہوتے ہی ذیقعدہ میں اس کا سننا شروع کیا۔ اس لیے یہ ناکارہ نزول آب کی وجہ سے خود دیکھنے سے معذور ہو گیا تھا۔ یہاں آ کر احباب نے بھی اس کی طباعت پر اصرار کیا اور ۲۶ ربیع الثانی پنجشنبہ کو اس کا سننا اور تبییض پوری ہوئی۔ میں تو بے فکر ہو گیا تھا۔

اس سفر کے مبشرات میں سے ایک بشارت اور جزء حجۃ الوداع والعمرات کی تالیف:

مکرر ۳ جمادی الاولیٰ بدھ کی دوپہر کو خواب دیکھا۔ کہ "کوئی شخص کہہ رہا ہے جس کو میں بصورت رجل سمجھ رہا ہوں کہ حجۃ الوداع کے تکملہ میں حضور کے عمرے ضرور لکھنے چاہئیں اور میں نے خواب ہی میں خود لکھنا شروع کر دیا اور جعرانہ کی دو حدیثیں جامع الطریق طریق مکہ اور اصح بمکہ کبائت پر خواب ہی میں کلام لکھ لیا۔"

جاگنے کے پندرہ دن تک سوچ وفکر میں رہا۔

شوق جاذب اور اعذار مانع اکابر کے اصرار پر ۱۷ جمادی الاولیٰ چہار شنبہ کی صبح کو بسم اللہ کر ہی دی۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ ۱۵ رجب ۹۰ھ کو مکمل ہو گیا اور اس کے اختتام سے قبل الحاج مولوی سلیمان افریقی نے جو گزشتہ سال مدینہ منورہ میں بھی میرے ساتھ رہے یہ خواب دیکھا کہ "ان کو زیارت مدینہ پاک کا اشتیاق ہو رہا ہے اور وہاں کی حاضری کے شوق میں چل رہے ہیں۔ جب اس سیہ کار کے مکان کے قریب پہنچے تو میرے مخلص مولوی یونس صاحب مدرس حدیث مظاہر علوم میرے گھر سے نکل رہے تھے۔ ان کے دریافت کرنے پر کہ کہاں جا رہے ہو، انہوں نے کہا کہ مدینہ پاک جا رہا ہوں۔ مولوی یونس نے کہا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کچے گھر میں تشریف فرما ہیں۔"

"جب وہ کچے گھر میں آئے تو دیکھا کہ سیّد الکونین فخر الانبیاء والمرسلین اس چارپائی پر لیٹے ہیں جس پر یہ ناکارہ لیٹتا ہے اور یہ سیہ کار چارپائی کے قریب بیٹھا ہوا جزء حجۃ الوداع سنا رہا تھا۔ مولوی سلیمان نے سلام کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور حضور مصافحہ فرما کر بھی جزء حجۃ الوداع سننے میں مشغول ہو گئے ﷺ۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تسلیما کثیرا۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ۔

☆......☆......☆

جس میں

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی سرہٗ نے تقسیمِ ہند کے اہم واقعات، اکابرِ سلسلہ کے متفرق حالات، نسبت کی اقسام اور خلافت و بیعت سے متعلق اہم مضامین درج کرائے ہیں۔

ناشر

مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ، شاہ فیصل کالونی نمبر ۴ کراچی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ط

نَحۡمَدُهٗ وَ نُصَلِّيۡ عَلٰى رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡم ط

جیسا کہ اس سے پہلے نمبروں میں گزر چکا کہ اس کے ہر حصہ کے اندر دو باب تجویز کیے گئے ہیں، اسی طرح اس حصہ میں بھی دو باب ہیں، پہلے باب میں تقسیم ہند سے متعلق عبرت آموز واقعات اور مولانا محمد یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے معمولات اور دوسرے باب میں اکابر مشائخ کے متفرق حالات اور نسبت صوفیہ کی اقسام اور طریق باطن سے متعلق اہم مضامین درج کیے گئے ہیں۔

اس سلسلہ کا آخری مضمون بہت ہی اہم ہے اور نہایت ہی اہتمام سے مطالعہ اور محفوظ رکھنے کے قابل ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان مضامین کو دوستوں کے لیے خیر و برکت کا سبب بنائے۔

محمد زکریا عفی عنہٗ

۲۹ شوال ۹۱ھ

باب ہفتم

تقسیمِ ہند

تقسیم ہند کا زور وشور تو کئی سال سے روز افزوں تھا، دن ورات جلسے جلوس نعرے اور شور و شغب ہر وقت رہتا تھا، کانگریس کا پلہ اس نوع میں زیادہ غالب تھا اور مسلم لیگ کا مغلوب تھا، جو شخص مسلم لیگ سے ذرا بھی تعلق رکھتا یا کانگریس کے ساتھ خصوصی تعلق کا اظہار نہ کرتا تو ٹوڈی، انگریزوں کا نمک خوار اور ان کا پٹھو، غلام کے نعروں سے علی الاعلان مطعون کیا جاتا اور کانگریس والے مسلم لیگ کی نگاہوں میں کانگریس کے غلام اور ان کے زرخرید وغیرہ وغیرہ الفاظ سے یاد کیے جاتے۔ ایک دوسرے کی تفسیق تضلیل ایسی برملا ہو رہی تھی کہ کچھ انتہا نہیں۔ اسی سے متاثر ہو کر اس ناکارہ نے رسالہ ''الاعتدال'' لکھا تھا جو دونوں طبقوں میں پسند کیا گیا۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کے سفری بیگ میں تو مستقل رہتا تھا اور حضرت تھانوی قدس سرہ، کی مجلس میں بھی اس کا ذکر تذکرہ میں نے سنا مگر صحیح الفاظ نہیں پہنچے۔ اس لیے نقل نہیں کرتا۔ البتہ دونوں طبقہ کے سنجیدہ حضرات، اکابر سیاستدانوں نے بہت پسندیدگی کا اظہار کیا اور سینکڑوں خطوط اس کے سلسلہ میں آتے رہے۔ یہ ناکارہ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد سے عزیز مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے اصرار پر اکثر پورا رمضان نظام الدین اعتکاف میں گزارتا تھا، لیکن ۶۴ھ کے رمضان کا نصف حصہ سہارنپور گزارا۔ لیگیوں کا یہ نعرہ پاکستان لے کر رہیں گے، مر کریں گے، مار کرلیں گے، خون سے لیں گے، ہر جلوس کا نعرہ تھا۔ لیکن رمضان کی راتوں میں تراویح کے بعد سے لے کر سحر تک یہ نعرے کانوں میں پڑتے رہتے تھے۔ میں نے بہت سے لوگوں سے منع کرایا اور بار بار کہلوایا کہ رمضان مبارک کی یہ راتیں اجابت دعاء کی ہیں، اس کے درمیان میں تم پاکستان ضرور مانگو، مگر مار کر، مر کر خون سے نہ مانگو۔ لیکن ایک جوش اور خمار سوار تھا۔ حدیث پاک میں آتا ہے اپنی اولاد اور مال کو بددعائیں نہ دیا کرو۔ اللہ جل شانہٗ کے لیے بعض اوقات ایسے ہوتے ہیں جس میں جو مانگو وہ ملتا ہے ''فان للّٰہ ساعات لا یرد فیھن سائلاً'' یہ مضمون متعدد الفاظ کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ مشکوٰۃ شریف میں بروایت مسلم حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا کہ اپنے نفسوں پر بددعائیں نہ کرو اور اپنے مال و اولاد پر بددعائیں نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری بددعاء ایسے وقت میں ہو جس میں اللہ جل شانہٗ تمہاری دعائیں قبول فرما لے۔ عورتوں میں یہ مرض بہت ہی زیادہ ہے کہ بچوں کے رونے، پریشان کرنے پر تو وہ ان بچوں کو بددعائیں دیتی ہیں کہ تو مر جا، گڑ جا ہو

جب وہ بددعائیں قبول ہو جاتی ہیں تو پھر خود ہی روتی پھرتی ہیں۔

ماثور دعاؤں کی اہمیت:

میں تو دعاؤں میں بھی ہمیشہ اسباق کے اندر اس کی تاکید کرتا رہتا ہوں کہ دعائیں بھی ماثور و منقول مانگا کرو، اس لیے کہ حدیث پاک میں کوئی دین و دنیا کی ضرورت ایسی نہیں چھوڑی جس کو مانگ کر بتایا نہ گیا ہو، ایک قصہ غیر متعلق سا اس کے مناسب لکھواتا ہوں جو بڑوں سے بار بار سنا اور میں بھی اپنے اسباق میں کثرت سے اس کو نقل کرتا ہوں کہ دعائیں اپنے الفاظ میں نہ مانگا کرو، بلکہ آقاء نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک الفاظ میں مانگا کرو، ایک تو محبوب کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کی مالک کے یہاں قدر بہت زیادہ ہے اور وہ الفاظ اس قدر جامع ہوتے ہیں کہ ان میں مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ایک گاؤں کا کوئی ڈوم تھا، پیدل چلا جا رہا تھا، راستہ میں تھک گیا اور یہ کہتا جا رہا تھا کہ یا اللہ ایک گھوڑا چاہیے اور بے تحاشہ اضطرار کے ساتھ یہی دعاء مانگ رہا تھا اور آخر میں بے وقوف نے غصہ میں آ کر یہ کہہ دیا کہ یا اللہ گھوڑا نہیں تو گھوڑے کا بچہ ہی دے دے، مالک کے یہاں اضطراری دعاء بہت جلد قبول ہوتی ہے، میرا اپنی ذات کے لیے بھی بیسیوں دفعہ کا یہ تجربہ ہے کہ جو دعاء اضطراری طور پر مانگی گئی ہے وہ بہت جلد قبول ہوتی ہے، اس گاؤں کا جمان اپنی گھوڑی پر سوار آ رہا تھا اس کی گھوڑی راستہ میں بیا گئی اور بچہ کو لے جانا اُس کے لیے مصیبت بن رہا تھا، اُس نے گاؤں کے اس ڈوم کو دیکھ کر آواز دی ''او ڈوم کے'' اس گھوڑی کے بچہ کو اپنے کاندھے پر اُٹھا لے۔ وہ بے چارہ چلنے سے معذور تھکا ہوا تھا، بہت ہی حسرت سے کہنے لگا کہ ''یا اللہ مانگی تھی تلے کو مل گئی اُوپر کو۔''

اس لیے میں اپنے دوستوں سے بہت اہتمام سے اور ان کے توسط سے ان کی مستورات سے تاکید کرتا ہوں کہ غصہ کے اندر اپنی اولاد کو مار تو جتنا چاہے لیں مگر بددعائیں نہ دیا کریں۔ دوسرے یہ کہ جہاں تک ہو سکتا ہے ماثور دعاؤں کا اہتمام کیا کریں۔

تقسیم کا اثر دین اور علم پر:

بہر حال لیگیوں کی دعائیں قبول ہوئیں اور ہندوستان تقسیم ہوا، لیکن وہی ہوا جو رمضان المبارک کی راتوں میں مانگا تھا، مار کر، مر کر اور خون بہا کر پاکستان لیا، اس زمانے کے بھی واقعات بڑے اہم اور بہت کثرت سے ہیں، میرے دو اکابر حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی نور اللہ مرقدہما مختلف الرائے تھے اور جو لوگ دونوں سے تعلق رکھتے تھے ان کے

لیے مشکل مسئلہ تھا، مولوی منفعت علی صاحب وکیل مرحوم جن کا تقسیم کے بعد پاکستان منتقل ہوکر کراچی میں انتقال ہوا اللّٰھم اغفرہٗ وارحمہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مخصوص شاگرد تھے، ان کا تذکرہ طلب علم کے سلسلہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ ابتداءً میرے والد صاحب کے نہایت معتقد اور مخلص دوست اور اس وجہ سے مجھ سے بھی بے حد بے تکلف اور خصوصی تعلق رکھتے تھے، اس کے بعد حضرت تھانوی سے بیعت ہوئے اور حضرت کے مخصوص خدام میں شامل ہوگئے سہارنپور کی مسلم لیگ کے روح رواں اور غالباً صدر بھی رہے، مسلم لیگ میں بڑا غلو رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک مرتبہ ایک پرچہ لکھا کہ میں کسی اشاعت یا بیان کے واسطے نہیں پوچھتا صرف اپنی طمانیت قلب اور اس تعلق کی وجہ سے جو مولانا مرحوم (میرے والد صاحب) کو مجھ سے رہا ہے تقسیم کے بارے میں تیری رائے پوچھنا چاہتا ہوں۔ بہت راز میں ہے کسی سے کہوں گا نہیں۔ بہت مختصر الفاظ میں تحریر فرمادیں۔ میرا دل تو چاہا کہ ان کو یہ لکھ دوں کہ زبانی گفتگو کرو مگر میں نے سوچا کہ زبانی میں نہ معلوم میری طرف سے کیا سمجھیں اور کیا نقل کریں۔

میں نے ان کو مختصراً الفاظ میں لکھا کہ یہ ناکارہ سیاست سے بالکل واقف نہیں، اس کو سیاسی حضرات جانیں، لیکن اتنا میرے ذہن میں ضرور ہے کہ دوآبہ یعنی گنگا جمنا کا درمیانی حصہ جو حضرت گنگوہی، نانوتوی اور تھانوی کی برکات سے دین اور علم وسلوک وتقویٰ کا مرکز بنا ہوا ہے کہ دنیا میں آج اس کی نظیر نہیں وہاں تو یہ برکات صرف تلوار کے زور سے مٹادی جائیں گی اور جو حصہ پاکستان کا تجویز ہے اس میں ان اکابر کی نہ نظیر ہے نہ پیدا ہوسکتی ہے، جن سے مراکز دینیہ مدارس عربیہ، مکاتب قرآنیہ اس نمونے کے قائم ہوسکیں۔

چنانچہ وہی ہوا کہ اللہ کے فضل وکرم سے دیوبند اور سہارنپور کے مدارس کی صورت تو اگرچہ باقی ہے مگر پنجاب، سندھ، بنگال وغیرہ کے طلبہ کی آمد یہاں بند ہوگئی اور ان کے علاوہ مشرقی پنجاب کے سینکڑوں مدارس جو نہایت ہی اخلاص کے ساتھ یکسوئی کے ساتھ حضرت رائے پوری اور ان کے مرشد اعلیٰ حضرت رائے پوری دونوں کی برکات سے دین کا کام انجام دے رہے تھے وہ سب نیست ونابود ہوگئے۔ فالی اللہ المشتکیٰ۔

دورانِ قیام نظام الدین کے تقسیم کے موقع کے واقعات تلاشی وغیرہ:

اس ناکارہ کا معمول چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے بعد سے اکثر پورا رمضان نظام الدین گزارنے کا تھا۔ جیسا کہ ابھی لکھوا چکا ہوں۔ تقسیم والے سال حسب معمول ۲۹ شعبان ۶۶ھ مطابق ۱۹ جولائی ۴۷ء بروز شنبہ دہلی روانہ ہوا اور بعد ظہر دہلی پہنچا اور عصر کے وقت نظام الدین پہنچا۔ چونکہ

۲۹ تاریخ تھی اس لیے حسبِ معمول عصر کی نماز پڑھ کر ایک ماہ کے لیے اعتکاف کی نیت سے چچا جان کے معتکف میں بیٹھ گیا۔ اسی رمضان المبارک کی ۲۷ شب قدر میں ۱۲ بجے ۱۵ اگست کو مجوزہ تقسیم کا اعلان ہوا اور اس شب میں مولانا منظور نعمانی نے خوب زور دار دعائیں رو رو کر کرائیں کہ ان کا قیام بھی اس زمانے میں نظام الدین میں تھا اور بھی بہت سے اہل خیر حضرات کا قیام اس رمضان میں وہاں رہا۔ مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نے بھی یہ رمضان وہیں گزارا۔ کشت و خون، قتل وغارت گری، لوٹ مار کا سلسلہ بنگال، بہار میں تو کئی ماہ پہلے ہی سے شروع ہو چکا تھا اور روز افزوں تھا۔ تقسیم کے بعد ہند و پاک میں وہ خون کی ندیاں بہیں کہ الامان والحفیظ، ان کی تفصیل نہ تو میرا موضوع ہے اور نہ اس کی ہمت ہے۔ قرآن شریف اور احادیث پاک میں قیامت اور حشر کا جو منظر پڑھا تھا:

”یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ لِکُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ“

(ترجمہ) ”یاد کرو اس دن کہ آدمی بھاگے گا اپنے بھائی اور ماں باپ اور بیوی اور اولاد سے اور ہر شخص کے لیے ایک خاص حالت ہوگی، جس کی وجہ سے وہ ہر شخص سے بے تعلق ہوگا۔“

یہ سب منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ نظام الدین سے اسپیشل تبادلۂ آبادی کے سلسلہ میں مغرب کے بعد روانہ ہوا کرتا تھا اور ظہر کے بعد نظام الدین کی مسجد اس قدر بھر جاتی تھی کہ مسجد کے باہر بھی دور دور تک آدمی ہی آدمی ہوتے تھے اور عصر کے بعد بالکل خالی ہو جاتی اور ایک ہُو کا عالم ہوتا تھا۔ اسپیشل کی روانگی کے بعد اسّی (۸۰) اسّی (۸۰) شیر خوار بچے اسٹیشن پر پائے گئے جن کو ان کے ماں باپ اسٹیشن پر چھوڑ کر ریل میں سوار ہو گئے تھے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ ان بچوں کو کہاں چھوڑ رہے ہو تو وہ نہایت بیدردی سے جواب دیتے کہ اگر صحیح سلامت پاکستان پہنچ گئے تو وہاں اور پیدا ہو جائیں گے۔ اس بوجھ کو کہاں اُٹھائیں گے۔ اسپیشل پر فوجی پہرہ بھی ہوتا تھا اور ہتھیاروں سے مسلح ہوتے تھے۔ مگر:

وہی قاتل وہی مخبر وہی منصف
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

دونوں طرف کی ہوا اس قدر خراب تھی کہ جو پولیس والے محافظ بن کر یہاں یا وہاں جاتے تو پیش قدمی نہ سہی مگر چشم پوشی خوب کرتے تھے چنانچہ اسپیشلوں پر خوب حملے، لوٹ مار ہوتی۔ ۲۲ ستمبر کو جانے والا اسپیشل آٹھ دن میں لاہور پہنچا اور اس پر خوب قتل وغارت ہوا۔ گائے، بھینس، بکریاں، مرغیاں اپنے اپنے گھروں میں بلا کسی انتظام کے ویسے ہی چھوڑ جاتے تھے خواہ بھوکے

مریں یا کوئی دوسرا درندہ کھا جائے۔ جو دیندار کہلاتے تھے وہ نظام الدین کے تبلیغی مرکز میں چھوڑ جاتے تھے۔ چار ماہ تک تقریباً یہ ناکارہ بھی نظام الدین میں گویا محبوس رہا۔ دہلی سے راشن لانا تو مصیبت عظمیٰ تھا۔ یہ جانور کاٹ کاٹ کر بغیر روٹی غلہ کے بقرعید کی طرح سے کھائے۔ کیونکہ دہلی کے راستے بالکل مخدوش اور مسدود تھے اور راشن سبزی منڈی میں ملتا تھا۔ جہاں سکھ ہی سکھ تھے۔ کسی کی بھی ہمت ہم لوگوں میں سے وہاں جانے کی نہیں ہوتی تھی۔ مگر ہمارے الحاج بابو ایاز صاحب اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی ہمت اور قوت عطاء فرمائے وہ اسی حال میں وہاں سے راشن لایا کرتے تھے۔ مگر راشن پندرہ آدمیوں کا اور مستقل رہنے والا مجمع پانچ سو کے قریب تھا۔ لیکن بچوں کے لیے وہ راشن کام دے دیتا تھا۔ ان کے اس طرح جانے پر سب لوگ حیرت کرتے تھے۔

ایک دفعہ وہ سبزی منڈی سے راشن لے کر نظام الدین آرہے تھے وہاں سے ایک تانگہ لیا۔ اس میں ایک بابو جی اور تین سکھ۔ دلی سے نکل کر ان سکھوں نے کہا کہ تو ہمارے بیچ میں کیسے بیٹھ گیا اور اگر ہم تجھ کو ختم کر دیں تو پھر کیا ہو۔ انہوں نے نہایت جوش اور جرأت و بے باکی سے یہ کہا کہ تم مجھے ہرگز نہیں مار سکتے اور ہمت ہو تو مار کر دکھلا دو۔ وہ بھی سوچ میں پڑ گئے۔ آپس میں کچھ اشارے کنائے بھی ہوئے اور آستینیں سونت کر کہنے لگے کہ ہم کیوں نہیں مار سکتے؟ انہوں نے اس سے زیادہ جوش سے کہا کہ میرے پاس ایک چیز ہے تم میرے مارنے پر قادر ہی نہیں ہو سکتے۔ وہ اللہ کے فضل و کرم سے کچھ ایسے مرعوب ہوئے کہ نظام الدین تک سوچتے ہی رہے اور اشارے بھی کرتے رہے۔ ان سے اترتے وقت پوچھا کہ تم وہ چیز بتلا دو کیا ہے۔ بابو جی نے کہا وہ چیز بتلانے کی نہیں ہے اور باقی تم دیکھ چکے کہ تم لوگ باوجود ارادے کے مجھے مار نہ سکے اس ناکارہ نے جب ان سے پوچھا کہ وہ کیا بات تھی انہوں نے فرمایا کہ آپ نے ہی تو مجھے ایک دعاء بتلا رکھی ہے۔ ''اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَنَعُوْذُ بِکَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ'' میں یہ پڑھتا تھا۔ میں یہ سوچتا ہی رہا کہ بتلانے والے پر تو اس کا کچھ اثر نہ ہوا اور یہ اس سے کس قدر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بہت ہی غیرت آئی۔ اعتقاد کی قوت کی بات ہے۔ واقعی ہے اس میں نہ ذرا تردد ہے اور نہ ذرا شک کہ اللہ تعالیٰ کے پاک کلام میں اس سے زیادہ قدرت اور قوت ہے۔ بشرطیکہ ہم میں جوش ایمانی ہو۔ میں پہلے کسی جگہ لکھوا چکا ہوں کہ میرے چچا جان نے ایک بیمار کے لیے ایک دعاء لکھ کر مجھے حکم فرمایا تھا کہ فلاں شخص پر یہ دعاء پڑھ کر دم کر دیا کرو اور اس سے اگر وہ اچھا نہ ہوا تو اس کا مرجانا بہتر ہے۔ اس موقع پر تو واقعی قرآن پاک اور احادیث کی دعاؤں کا اس قدر تجربہ ہوا کہ کوئی حد نہیں۔ اللہ جل شانہٗ اس زمانے کا سا اعتقاد اور دعاؤں پر یقین بغیر فساد و ہنگامہ کے اب بھی نصیب فرمادے تو اس کا کرم ہے۔ میرا اپنا بھی بہت سی چیزوں کا تجربہ ہے۔ تلاشی مکان کی اور

مسجد بنگلہ کی اس زمانے میں خوب ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ بہت بڑی گورکھا فوج ہتھیاروں سے مسلح نہ معلوم ان بیچاروں کو کیا غلط روایات پہنچی تھیں کہ وہ سب آئے یہ سیاہ کار مسجد میں تھا۔ ''وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ'' یہ آیت اتنی کثرت سے زبان پر بے اختیار جاری ہوئی کہ تعجب ہوا۔ دس پندرہ آدمی اور نیچے چھتوں پر تلاشی لیتے رہے۔ مگر کسی چیز کو چھیڑا تک نہیں۔ معلوم نہیں کہ نظر نہیں آئی یا کوئی اور بات پیش آئی۔ کئی مرتبہ نظام الدین کی مسجد بنگلہ (مرکز تبلیغ) پر حملہ کی موثق روایات سننے میں آئیں۔ مگر ہر مرتبہ میں اللہ جل شانہ نے اس قدر مدد فرمائی کہ مغرب کے وقت سے جو بارش اور اولوں کا زور شروع ہوتا تھا تو سارے راستے مسدود ہو جاتے تھے۔ اس زمانے میں ایک عجیب واقعہ سُننے میں آیا تھا۔ اللہ جانے کیا حقیقت تھی۔ ایک فسادیوں کا ہجوم بھوگل کی طرف سے حملہ کے لیے آیا۔ لیکن ایک دم ہی بھاگ گیا لوگوں نے ان سے پوچھا کہ کیا بات پیش آئی انہوں نے کہا کہ یہاں کے زندہ تو زندہ مردے بھی لڑتے رہتے ہیں اور مقابلہ کے لیے تیار ہیں۔ ان لوگوں نے بیان کیا کہ جب ہم مسجد بنگلہ کے قریب پہنچے تو قبروں سے مردے اٹھتے ہوئے نظر آئے اس لیے ہم واپس ہوگئے۔ یہ میں نے ایک ہی قصہ لکھوایا۔ اس قسم کے بہت سے قصے ہیں معلوم نہیں کہ یہ قصے لکھوانے کے بھی ہیں یا نہیں۔

جب یہ ناکارہ اخیر شعبان میں نظام الدین گیا تو گرمی کا زمانہ تھا۔ صرف ایک کرتہ، پائجامہ لنگی ساتھ تھی۔ اس زمانے میں میرا دستور یہی تھا کہ جمعہ کے دن لنگی باندھ کر دھونے والوں کو کپڑے دے دیے اور دھونے والے آپس میں لڑتے بھی خوب تھے کہ کون دھوئے اس لیے بھی کوئی اشکال نہ ہوتا تھا دو تین گھنٹے میں سوکھ گئے تو پہن لیے۔ اس لیے استعمال کا کوئی کپڑا ان تین کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ چار ماہ وہاں محبوس رہنا پڑا۔ اس میں خوب سردی آگئی، کپڑا خریدنے کا کہاں موقع تھا کہ دہلی آنا تو بہت خطرناک تھا میرے مخلص دوست صوفی اقبال ہوشیار پوری ثم الباکستانی ثم المدنی بھی میرے ساتھ محبوس تھے وہ میری سردی کو محسوس کرکے ایک فوجی سے دو روپے میں ایک سوئٹر خرید کر لائے تھے۔ میں سوئٹر پہننے کا نہایت مخالف تھا، بلکہ مجھے اس سے نفرت تھی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی نہ پہنا اور نہ اپنے بچوں کو پہنایا۔ مگر مجبوری سب کچھ کرا دیتی ہے۔ میں نے اس کو پندرہ برس تک پہنا۔ اس کے بعد میرے ایک دوست مرحوم وہ کئی سال سے مجھ سے مصر تھے کہ اس سوئٹر کا قصور معاف کردو اور یہ بطور تبرک مجھے دے دو میں اس کو اپنے کفن میں رکھوالوں گا اور میں ان سے یہ کہتا کہ دو روپے کا جب مجھے اور ملے گا تب دوں گا۔ مگر دو روپے کا کہیں نہیں ملتا تھا۔ پندرہ برس کے بعد انہوں نے ایک نیا سوئٹر مجھے لاکر دیا اور کہا واقعی دو روپے کا لایا ہوں۔ مجھے یقین

تو نہ آیا۔ مگر میں نے دو روپے اور اپنا سوئٹر ان کے حوالے کر دیے۔ اس کے بعد سے اپنا قدیم لباس روئی کی کمری گویا چھوٹ ہی گئی اور پھر تو سوئٹر علماء حضرات کے طبقہ میں بھی استعمال ہونے لگا۔
ایک عجیب واقعہ اس زمانے میں پیش آیا۔ میرا معمول ہمیشہ ۲۹ شعبان کو جا کر پورے ماہ کا اعتکاف کر کے نظام الدین میں عید کی نماز سویرے سے پڑھ کر وہاں چلنے کا تھا اور شام تک سہارنپور پہنچ جاتا تھا۔ لیکن اس سال کچھ تو ہنگاموں کی خبروں سے اور کچھ عزیز ہارون سلمہٗ کی والدہ کی شدت علالت کی وجہ سے کہ اس کی حالت ایسی تھی کہ ہر روز گویا آخری دن تھا۔ مجھے دو تین دن کی تاخیر ہوئی، یہاں سب کو بہت فکر ہوئی۔ میرے عزیز الحاج ماسٹر محمود الحسن صاحب کاندھلوی جو اس زمانے میں اسلامیہ اسکول میں سیکنڈ ماسٹر تھے اور کبھی کبھی پرنسپل بھی ہوتے تھے جن کی سفارش کا قصہ امتحان کے سلسلہ میں پہلے بھی لکھوا چکا ہوں وہ بھی میری تاخیر کی وجہ سے میرے حال کی تحقیق کرنے کے لیے نظام الدین پہنچے اور ان کے ساتھ میرا مخلص دوست اور حضرت مدنی قدس سرہٗ کا جاںنثار مولوی عبدالمجید مرحوم جلالوی بھی تھا جو میرے یہاں مستقل رہتا تھا۔ بہت ہی محبت و اخلاص والا تھا، اس کی حضرت مدنی کی جاںنثاری کی مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے کہ جب وہ افواہًا بھی یہ سن لیتا کہ حضرت دیوبند یا لکھنؤ سے رات کو آنے والے ہیں تو رات بھر اسٹیشن پر گزارتا اور ہر گاڑی دیکھتا اور اللہ تعالیٰ اس کو بہت جزائے خیر دے۔ جب حضرت قدس سرہٗ کے اسٹیشن پر آنے کے بعد اگر دو گاڑیوں میں ایک گھنٹہ کا بھی فصل ہوتا تو وہ واپسی کا تانگہ اسٹیشن سے کر کے مجھے سوتے ہوئے کو اٹھاتا اور یوں کہتا کہ حضرت تشریف لے آئے گاڑی میں اتنی دیر ہے میں واپسی کا تانگہ لے آیا ہوں۔ پھر مجھے نہ جانے کا کیا عذر تھا۔
ایک دفعہ مرحوم کی میں تو حماقت ہی کہوں گا مگر محبت میں حماقتیں ہو ہی جاتی ہیں رات کو حضرت مدنی قدس سرہٗ تشریف لائے اور دوسری گاڑی میں ایک گھنٹہ کا فصل تھا۔ اس نے تانگہ والے سے کہا کہ جلدی چل، آنا جانا ہے، جو تو کہے گا وہ دوں گا۔ تانگہ والے نے ایک روپیہ بتایا، اس نے کہا کہ میں ایک کی جگہ پانچ دوں گا جلدی لے چل۔ وہ تانگے والا پانچ منٹ میں میرے گھر لایا اور گھوڑا پسینہ پسینہ ہو رہا تھا بلکہ ہونک رہا تھا مجھے بہت ہی غصہ آیا اور غصہ میں جی چاہا کہ جانے سے انکار کر دوں۔ مگر حضرت قدس سرہٗ کو چونکہ وہ لانے کی اطلاع کر کے آیا تھا۔ اس لیے جانا پڑا اور روپے بھی مجھے بھگتنا پڑے۔
بھائی محمود اور مولوی عبدالمجید صاحب ۳ شوال کو میری خبر لینے کے واسطے ساڑھے چار بجے والے ایکسپریس سے دہلی پہنچے۔ گھورا گھاری تو اس گاڑی پر بھی ہوئی اور ان کے ڈبے کو بھی فسادیوں نے گھورا اور نعرے بھی لگائے۔ اس کے بعد جو گاڑی چھ بجے سہارنپور سے چلی اس پر

دورالہ کے اسٹیشن پر قتل عام ہوا اور اس کے بعد سے سہارنپور تا دہلی کا راستہ گویا بالکل بند ہوگیا۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ جب دیوبند سے دہلی جاتے اور بار بار جانا پڑتا تھا تو دیوبند سے سہارنپور آتے یہاں سے مرادآباد جاتے۔ وہاں سے مختلف راستوں سے دہلی آتے جو راستے فی الجملہ نسبتاً مامون تھے۔ عزیز عبدالمجید مرحوم کے نام کے ساتھ اس کا اور قصہ حماقت کا لکھوادوں۔ نظام الدین کے چار ماہ جس میں پان بالکل نہیں ملتا تھا۔ عزیزان مولوی یوسف وانعام اور بہت سے مقیمین پان کے مجھ سے بھی زیادہ عادی تھے۔ لیکن پان نہ ملنے کی وجہ سے چھالیہ چونا کتھا کھالیتے تھے۔ مجھے یہ پسند نہیں تھا اس لیے تقریباً چھوٹ ہی گیا تھا۔ عزیز عبدالمجید اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمائے اور مجھے بھی۔ اس نے پانچ روپے میں ایک دیسی پان ایک سکھ سے دہلی سے منگایا تھا۔ اس پر مجھے تانگہ والے قصے سے بھی زیادہ رنج وقلق ہوا۔ مگر ''حب الشیٔ یعمی و یصم'' جب بھائی محمود صاحب کو اس پان کی خبر ہوئی تو انہوں نے مولوی عبدالمجید مرحوم کے ہاتھ سے لے لیا اور ان کو بھی اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ نہ خود کھایا نہ کسی اور کو دیا۔ میں نے بہت ہی اصرار کیا کہ مولوی یوسف صاحب کو آدھا پان دے دو مگر وہ نہ مانے اور پان کے ذرا ذرا سے تعویز کے سے ٹکڑے کر کے اس پر کتھا چونا لگا کر دو تین ٹکڑی روزانہ مجھے کھلاتے تھے۔ شاید آٹھ دن میں ختم کیا۔ گویا پانچ روپے وصول کرادیے۔ چونکہ ڈاک بھی اس زمانے میں بند ہوگئی تھی، آمدورفت کا تو ذکر ہی کیا، اس لیے میرے ایک داماد مولوی سعید الرحمٰن مرحوم کا کاندھلہ میں انتقال ہوا۔ اس کی اطلاع مجھے دو ماہ بعد ملی۔

ایک صاحب جن کا نام لکھنا مناسب نہیں، تقسیم سے بہت پہلے حضرت اقدس رائے پوری ثانی قدس سرہٗ سے بیعت تھے اور پٹیالہ میں ملازم تھے۔ ان کی رائے پور کثرت سے حاضری ہوتی تھی اور جب وہ رائے پور جاتے تو راستہ میں ایک شب میرے پاس ضرور قیام فرماتے۔ ایک مرتبہ رائے پور جاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں فلاں اسکول میں ملازم تھا۔ تیری ''حکایاتِ صحابہ'' پڑھ کر میں نے اسکول سے استعفاء دے دیا۔ مجھے بہت ہی غصہ آیا، اس لیے کہ میں تاوقتیکہ دوسری صورت معاش کی پیدا نہ ہو استعفاء دینے کا بہت مخالف ہوں، میں نے ان سے کہا کہ ''حکایات صحابہ'' میں کہیں بھی اس قسم کا مضمون نہیں مل سکتا، آپ کتاب لائیے اور مجھے دکھائیے کہ کہاں لکھا ہے۔ جب میں نے زور اور ڈانٹ کر کہا تو انہوں نے کہا کہ اس میں تو نہیں لکھا مگر مجھ پر اس کا یہی اثر ہوا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ میری کتاب سے یہ اثر ہوا کم ازکم مجھ سے دریافت تو کر لیتے۔ ابھی واپس جاؤ اور استعفاء واپس لو، انہوں نے کہا کہ استعفاء تو منظور ہو چکا ہے اب واپسی کی کوئی شکل نہیں، ان کو چونکہ تبلیغ سے اور نظام الدین سے بھی تعلق تھا اس لیے میں نے ان کو مشورہ دیا کہ رائے پور جاؤ، آٹھ دس دن قیام کے بعد نظام الدین چلے جانا اور وہیں

مستقل قیام کرنا اور ہر ماہ میں چار پانچ یوم کے لیے رائے پور آجایا کرو اور حضرت رائے پوری سے بھی میرا یہ مشورہ نقل کر دینا۔ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کا زمانہ دیکھنے والے تو ابھی ہزاروں موجود ہیں کہ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں اس سیہ کار کی رائے اگر حضرت کی رائے کے خلاف بھی ہوئی تب بھی وہ اس پر اس قدر پسندیدگی کا اظہار فرماتے کہ گویا یہی حضرت کی بھی رائے ہے۔ حضرت نے اس تجویز کو معلوم نہیں دل سے یا میری دلداری سے بہت پسند فرمایا، ان کا عرصہ تک یہی معمول رہا۔ تقسیم کے زمانے میں وہ بھی نظام الدین میں محبوس تھے۔

اس زمانے کا عام دستور یہ تھا الا ماشاء اللہ کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے جو کوئی پاکستان جانے کی اجازت مانگتا تو خود اس پر ناراض ہوتے اور فرماتے کہ تم موت سے ڈر کر جاتے ہو، موت کا وقت مقرر ہے، وہ نہ ہندوستانیوں کو چھوڑے گی نہ پاکستانیوں کو اور اس سیہ کار سے جو اجازت لیتا، میں خوشی سے اس کو اجازت دے دیتا۔ اس زمانے میں نظام الدین کی مسجد جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ظہر سے بھرنا شروع ہوئی اور عصر تک خالی ہو جاتی کہ اسپیشل مغرب کے بعد روانہ ہوتی تھی۔ مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ صبح سے شام تک ممبر پر تقریر کرتے رہتے اور اللہ پر اعتماد موت کے ڈر سے فرار کی ندامت وغیرہ اُمور کو بہت ہی جوش سے بیان فرمایا کرتے تھے اور جب کسی ضرورت سے مولانا مرحوم منبر سے اُتر جاتے تو یہ مولوی صاحب موصوف فوراً منبر پر پہنچ جاتے اور مولانا مرحوم سے بھی زیادہ زوردار انداز میں ان کے مضمون کو واضح کرتے اور پاکستان نہ جانے پر زور دیتے اور جب مولانا مرحوم آتے تو یہ صاحب منبر سے اُتر جاتے۔

ایک مرتبہ مولانا یوسف صاحب ظہر کی نماز پڑھتے ہی کسی ضرورت سے گئے اور ان صاحب نے فوراً منبر پر جا کر نہایت شدت سے حسب معمول تقریر شروع کی میں بھی مولوی یوسف مرحوم کے حجرے میں بیٹھا سن رہا تھا اور مولانا یوسف صاحب مرحوم جب منبر پر پہنچ گئے تو یہ صاحب منبر سے اُتر کر فوراً حجرے میں آئے اور آتے ہی مجھ سے کہا کہ آپ مجھے اجازت مرحمت فرمادیں، میں پاکستان جانا چاہتا ہوں، میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ابھی تو کتنے زور شور سے تقریر کی اور اب پاکستان جانے کی اجازت مانگ رہے ہیں۔ میں نے اپنی عادت کے موافق کہہ دیا کہ شوق سے چلے جائیں۔ کہنے لگے میں حضرت جی (مولانا محمد یوسف صاحب) کی زبان سے اجازت چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ میری اجازت حضرت جی ہی کی اجازت ہے۔ شوق سے چلے جاؤ، انہوں نے نہایت زور سے اور بہت گھبرائی ہوئی صورت میں یوں کہا کہ حضرت آج ہی اسپیشل سے جانا ہے اور حضرت جی کی زبان سے اجازت چاہتا ہوں۔ میں نے مولانا یوسف صاحب کے پاس ایک آدمی بھیجا کہ ایک منٹ کو میری ایک بات سن لیں تقریر ختم نہ کریں۔ وہ مرحوم میرے اس نوع

کے نازیبا احکام کو بہت وقعت اور دل سے قبول کیا کرتے تھے، وہ لوگوں سے کہہ کر بیٹھے رہیں میں ابھی آتا ہوں، بھائی جی نے بلایا ہے ایک دم منبر سے اُتر کر آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی یہ جانا چاہتے ہیں میں نے ان کو اپنی اور تمہاری طرف سے اجازت دے دی۔ مگر یہ تمہاری زبان سے اجازت مانگتے ہیں۔ مرحوم نے بہت ہی غصہ سے کہا کہ بھائی جی کی اجازت کے بعد میری اجازت کی کیا ضرورت ہے شوق سے چلے جاؤ۔ اس کے بعد مرحوم اپنی تقریر میں چلے گئے اور ان صاحب سے میں نے کہا کہ اللہ حافظ!

وہ اسی وقت نظام الدین کے بہت سے خواص کو بہت اہتمام سے جمع کر کے مسجد سے باہر نیم کا درخت ہے اس کے نیچے لے گئے جہاں بابو ایاز صاحب کا ہوٹل ہے اور جا کر بہت زوردار تقریر جتنی اُوپر مسجد میں منبر پر لوگوں کو روکنے کے لیے کر رہے تھے اس سے زیادہ زوردار اب لوگوں کو جانے پر آمادہ کرنے کے لیے کی اور کہا کہ حضرت جی (مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) تو حضرت شیخ کی وجہ سے مجبور ہیں اور حضرت شیخ محض شہادت کے شوق میں یہاں پڑے ہوئے ہیں اور ان کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہاں اب دین کا کام کوئی نہیں ہوسکتا اور ان قبروں کی پرستش یا حفاظت ہمارا کام نہیں ہے۔ بہت ہی انہوں نے ترغیبیں دیں مگر خواص میں سے تو کوئی راضی نہ ہوا، عوام کچھ ان کے ساتھ ہی چلے گئے۔ یہ مسئلہ بھی تین چار ماہ تک بہت ہی معرکۃ الآراء رہا کہ پاکستان جانے والے احباب حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر بہت ہی شدید اصرار کرتے تھے، بعض اکابر تو روزانہ پچیس تیس ہوائی جہاز لے کر آتے کہ مولانا محمد یوسف صاحب کو مع ان کے گھر والوں کے لے جائیں، ان کا اصرار تھا کہ مسلمان بکثرت وہاں منتقل ہوگئے ہیں۔ اس لیے مولانا یوسف صاحب کا وہاں جانا ان کی دینی اصلاح کی خاطر بہت ضروری ہے، نیز اس وقت یہاں کی جو متزلزل حالت تھی اور یوپی و دہلی کا جو عام انخلاء ہورہا تھا اس کی وجہ سے یہاں دینی کام کی امیدیں کم معلوم ہوتی تھیں، مگر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک جواب تھا کہا اگر بھائی جی تشریف لے جائیں گے تو میں بھی جاؤں گا ورنہ نہیں۔ ان کی وجہ سے اس سیہ کار پر بھی ہر وقت یورش رہتی۔

دہلی اور اس کے علاوہ کے احباب ہر وقت مصر رہتے کہ یہ ناکارہ بھی جلد پاکستان جانے کا فیصلہ کرلے اور میرا صرف ایک جواب تھا کہ میں جب تک اپنے دو بزرگ حضرت اقدس مولانا مدنی و مولانا رائے پوری نور اللہ مرقدہما سے مشورہ نہ کرلوں اس وقت تک کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا۔ ان دوستوں کا اصرار تھا کہ آپ ایک پرچہ لکھ دیں، ہم ان دونوں بزرگوں سے اجازت منگالیں گے۔ میں کہتا تھا کہ میں اجازت کو نہیں کہا مشورے کو کہا ہے اور وہ زبانی ہوسکتا ہے۔ جب بھی مقدر ہوگا

دونوں سے زبانی بات کر کے رائے قائم کرسکتا ہوں۔ میرے بعض اعزہ کا بھی بہت ہی شدت سے میرے اور مولانا محمد یوسف صاحب کے جانے پر اصرار تھا مگر مجھ سے کہنے کی تو ان لوگوں میں ہمت نہیں پڑتی تھی، لیکن ان جانے والے دوستوں کے ذریعہ سے بہت اصرار کراتے تھے۔ یہ بھی ہر وقت کا ایک مستقل معرکہ تھا اور راستے ہر طرف کے مسدود تھے۔ اس لیے حضرات شیخین مولانا مدنی مولانا رائے پوری نور اللہ مرقدہما سے بات کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

محرم ۶۷ھ کے شروع میں میرے مخلص و محسن مولوی نصیر الدین سلمہٗ جو میری دکھتی ہوئی رگ سے خوب واقف تھے، انہوں نے ایک پرچہ مجھے لکھا جو بڑی مشکلات سے دستی پہنچا۔ جس میں انہوں نے لکھا کہ ''اوجز المسالک جلد رابع کے لیے کاتب مل گیا ہے اور میں نے کام شروع کر دیا ہے اور اس میں آپ کی ضرورت ہے۔'' اوجز جلد رابع کی طباعت تقسیم سے پہلے شروع ہو چکی تھی، میرا بہت سا روپیہ اس کی کتابت اور طباعت کے کاغذ میں خرچ ہو چکا تھا، لیکن تقسیم کے ہنگامے نے اس سب کو غتر بود کر دیا تھا جس کا مجھے بہت قلق تھا اور حالات کے پیش نظر یہ امید بھی نہ تھی کہ اس کی طباعت ہو سکے گی۔ مولوی نصیر کے اس خط پر جو انہوں نے محض دھوکے سے صرف میرے بلانے کے لیے لکھا تھا مجھے واپسی کا تقاضا ہو گیا اور میں نے عزیزم مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے واپسی کی اجازت مانگی۔ مجھے ان کے الفاظ جب یاد آتے ہیں جب ہی چبھتے ہیں۔

انہوں نے آبدیدہ ہو کر کہا بھائی جی! آپ اس حال میں مجھے چھوڑ کر جائیں گے۔ اس وقت میں ایک دوسرا مرحلہ نظام الدین سے دہلی منتقل ہونے کا بھی تھا۔ اس میں حضرت الحاج حافظ فخر الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ پیش پیش تھے اور بلّی ماران میں انہوں نے کئی مکان زنانہ، مردانہ، جماعتوں کے قیام کے واسطے تجویز کر رکھے تھے اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے حافظ صاحب موصوف کے خصوصی تعلقات تھے اس لیے وہ ان پر بہت زور دیتے تھے کہ ہم سب کو دہلی منتقل کرا دیں۔ مولانا مرحوم بھی ہم لوگوں کی حفاظت کی خاطر حافظ صاحب کے ہم خیال تھے۔ مگر جتنی شدت حافظ صاحب کو تھی ان کو نہیں تھی، لیکن حافظ صاحب کے شدید اصرار پر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ ان کو بلند درجات عطاء فرمائے کئی مرتبہ سرکاری ٹرک لے کر ہم لوگوں کو دہلی جانے کے واسطے نظام الدین پہنچے۔ مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے منتقل ہونے کی بالکل نہ تھی۔ کہتے تھے کہ اگر اس کو خالی کر دیا اور اس پر پناہ گزینوں نے قبضہ کر لیا تو پھر یہاں سے منتقل ہونا مشکل ہو جائے گا پناہ گزینوں کا بھی ہر وقت وہاں ہجوم رہتا تھا اور وہ بھی وہاں کے رہنے والوں کو خوب ڈراتے دھمکاتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اس اشکال میں مولانا یوسف کے ساتھ تھے کہ دوبارہ قبضہ کرنا آسان نہیں ہے۔ اس

مرحلہ پر بھی یہ ناکارہ عزیز موصوف کی پشت پناہ بنا ہوا تھا اور حضرت الحاج حافظ فخر الدین صاحب تو بہت اصرار سے حکم فرماتے تھے۔ لیکن اس سیہ کار پر زیادہ زور نہیں دیتے تھے۔ عزیز مرحوم نے میری واپسی کے ارادہ پر یہ بھی کہا کہ آپ کی تشریف بری کے بعد ایسا نہ ہو کہ حافظ صاحب دہلی منتقل ہونے پر بھی اصرار فرمادیں۔ میں نے کہا کہ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ تم میری غیبت میں زور سے کہہ سکتے ہو کہ اتنے زکریا اجازت نہ دے، میں منتقل نہیں ہوسکتا۔ ایک عجیب بات بڑی حیرت کی تھی جواب تک سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ یہ کہ شوال ذیقعدہ میں اس قدر نحوست درودیوار پر چھار ہی تھی کہ ان کو دیکھ کر بھی ڈر لگتا تھا بہت ہی سوچا کرتا تھا کہ یہ سیاہی کس چیز کی ہے۔ وہاں تو میں نے کبھی کسی سے اس کا اظہار نہیں کیا البتہ حضرت اقدس رائے پوری سے واپسی پر تذکرہ کیا لیکن شروع ذی الحجہ سے وہ سیاہی دفعۃً کم ہونی شروع ہوئی اور بقرعید کے بعد سے انوارات محسوس ہونے لگے۔ میں نے عزیزم مولانا یوسف صاحب مرحوم کو اس کی وجہ سے اطمینان دلایا کہ اب فکر کی کوئی بات نہیں مطمئن رہو۔ ظلمت ونور کا تو میں نے اظہار نہ کیا۔ لیکن مرحوم کو اطمینان خوب دلایا۔

۲۸ ذی الحجہ ۶۶ھ مطابق ۱۲ نومبر ۴۷ء کو حضرت مدنی قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ دیوبند سے روانہ ہو کر شب کو مظفر نگر میں قیام فرما کر دوپہر کو بڑی دقت سے دہلی پہنچے۔ وہاں گاندھی جی، جواہر لال نہرو نے اس پر بہت قلق اور اظہار افسوس کیا کہ آپ اس قدر مشقت اور تکلیف اُٹھا کر تشریف لائے ہیں آپ اطلاع کرادیا کریں سرکاری ٹرک آپ کو لایا کرے گا وہی لے جایا کرے گا اور اس وقت بھی ان لوگوں نے حضرت قدس سرہٗ کے لیے ایک سرکاری ٹرک تجویز کیا۔ جو حضرت کو دیوبند لے جائے اور چار فوجی گورکھا اس پر ہتھیاروں سے مسلح حفاظت کے لیے مقرر ہوئے۔

حضرت قدس سرہٗ نے اس ناکارہ کو نظام الدین اطلاع کرائی کہ میں سرکاری ٹرک میں فوجی پہرے کے ساتھ دیوبند جارہا ہوں، تمہاری مستورات (جو سب نظام الدین، والدہ ہارون کی شدت علالت کی وجہ سے ۲۱ شعبان ۶۶ھ گئی ہوئی تھیں اور وہاں ہی محبوس تھیں) کو اس وقت میرے ساتھ جانے میں سہولت رہے گی میں تو پہلے ہی سے آنے کے لیے سوچ رہا تھا۔ مستورات کی آمد کے لیے اس سے زیادہ آسان صورت کوئی نہ تھی۔ اس لیے مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی طیب خاطر سے نہیں بلکہ قلق سے سب کو اجازت دے دی اور ۳ محرم ۶۷ھ مطابق ۱۷ نومبر ۴۷ء دوشنبہ کی صبح کو حضرت نے اپنا ٹرک نظام الدین بھیج دیا اور زکریا مع مستورات مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے طرفین کے آبدیدہ نگاہوں کے ساتھ رخصت ہو کر سوار ہوگئے۔

وہ ٹرک چاروں طرف سے پردوں سے بند تھا اور چاروں کونوں پر چار گورکھا مسلح کھڑے ہوئے تھے۔ آگے کے حصہ میں حضرت اقدس مدنی قدس سرہ اور عزیز مولوی عبدالمجید مرحوم اور عالی

جناب محمود علی خاں صاحب رئیس کیلاشپور جو اتفاق سے دہلی گئے ہوئے تھے اپنی ریوالور کے ساتھ آگے بیٹھے تھے اور یہ ناکارہ مستورات کے ساتھ پیچھے تھا۔ نو بجے دہلی سے چل کر ے میل کے قریب پہنچے تھے کہ دفعۃً ٹرک خراب ہو گیا۔ بہت ہی دقت اور مشقت سے اس کو دھکے لگائے۔ مستورات کو اُتارنا مشکل تھا، لیکن حضرت مدنی قدس سرہٗ نے باوجود اپنے ضعف و پیری کے بدنی قوت سے زیادہ اپنی روحانی قوتوں کے ذریعہ اس کو بنفس نفیس دھکیلا۔ حضرت ہی کی برکت سے وہ چل سکا ورنہ اس قدر سخت وزنی تھا کہ ہم چند ضعفاء کے قابو کا نہیں تھا۔ ہم لوگوں کے دھکیلنے سے وہ ذرا بھی جنبش نہ کرتا۔ حضرت قدس سرہٗ کے زور سے ہی وہ حرکت کرتا تھا۔ بہت مشکل سے پانچ چھ گھنٹے میں سونتا تک پہنچا۔ وہاں ایک مدرسہ بچوں کا تھا۔ گاؤں والے اور مدرسہ والے حضرت قدس کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور وہ لوگ اپنے یہاں سے مکئی، چاول، وغیرہ جس قسم کی بھی ان کے یہاں روٹیاں تھیں اور ساگ وغیرہ لے کر آئے، چونکہ میرے ساتھ عورتیں تھیں اس لیے مدرسہ کا ایک حصہ خالی کر کے مستورات کو پہنچایا اور میں اور حضرت قدس سرہٗ مسجد میں چلے گئے اور فوجی ٹرک کو درست کرتے رہے۔ ٹیلیفون تو وہاں کوئی تھا نہیں۔ ایک فوجی گاڑی ادھر سے جاتی ہوئی ملی۔ ان فوجیوں نے ان کے ذریعہ کوئی پیام بھی بھیجا۔ مغرب کے بعد وہ ٹرک درست ہوا۔ انہوں نے چلنے کا تقاضا کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ میرے ساتھ مستورات ہیں بے وقت جانے میں دقت ہے۔ اب صبح کو چلیں گے۔ مگر وہ فوجی گورکھے کہاں مانتے، زیادہ اصرار کیا تو جلدی جلدی عشاء کی نماز پڑھی۔ کھانا کھایا ٹرک میں چونکہ چاروں طرف پردہ تھا اور چاروں کونے پر فوجی تھے۔ اس لیے راستہ بحمد اللہ کسی نے تعرض نہیں کیا۔ مظفر نگر آکر حضرت قدس سرہٗ نے ایک حکیم صاحب کے مکان پر ٹرک ٹھہرا کر مجھ سے یہ فرمایا کہ دیو بند میرے جانے کے بعد یہ آگے نہیں جائیں گے۔ تم کو مستورات کی وجہ سے دقت ہوگی۔ میں مظفر نگر سے دیو بند دن میں آسانی سے چلا جاؤں گا۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے ان حکیم صاحب کے مکان پر خوب زنجیریں بجائیں میرے سامنے تو کواڑ کھلے نہیں۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ تم کو دیر ہو رہی ہے اور فوجی لوگوں کو بھی خوب تقاضا ہو رہا تھا۔ اس لیے مظفر نگر سے براہ رڑکی سہارنپور صبح کے چار بجے پہنچے۔ اس لیے کہ دیو بند تا سہارنپور کی پختہ سڑک اس وقت تک نہیں بنی تھی۔ زکریا، مولوی عبدالمجید مرحوم اور عالی جناب محمود علی خاں صاحب مع اپنے ریوالور کے تھے۔ کیلاش پور پر میں نے عرض کیا کہ آپ اُتر جائیں۔ مگر اللہ ان کو بہت جزائے خیر عطاء فرمائے انہوں نے فرمایا کہ مجھے تو اس میں یقیناً راحت ہے کہ میں اپنے گھر پر سے گزر رہا ہوں مگر میں آپ کو تنہا نہیں جانے دوں گا۔ وہ میرے ساتھ سہارنپور تشریف لائے۔

کرفیو مظفر نگر میں بھی لگا ہوا تھا اور سہارنپور میں بھی تھا اور مظفر نگر و سہارنپور دونوں جگہ میں بلیک

آؤٹ بھی تھا، کوئی بجلی نہیں چل رہی تھی۔ مکان پر بالکل اندھیرا پایا۔ ٹرک والوں نے اور فوجیوں نے مکان پر پہنچنے کے بعد جلد اُترنے کا تقاضہ کیا۔ مولوی عبدالمجید مرحوم گھر میں آئے تو سب کواڑ مردانہ زنانہ، اندر باہر سے کھلے پڑے تھے۔ وہ یہ سب منظر دیکھ کر بہت حیرت زدہ ہوا اور آبدیدہ ہو کر کہنے لگا کہ حضرت یہاں تو کوئی نہیں سب پاکستان چلے گئے۔ کیونکہ ڈاک کا سلسلہ بھی تقریباً کئی ماہ سے بند تھا اس لیے ایک کا دوسرے کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ مولوی نصیرالدین کے مکان کے اندر کی طرف زنجیر لگ رہی تھی مولوی عبدالمجید مرحوم نے خوب زنجیر بجائی۔ آوازیں دیں اور میں نے بھی خوب آوازیں دیں۔ مگر وہاں سے زنجیر نہ کھلی اور نہ آواز کا جواب دیا۔ تین چار منٹ ہی اس بھاگ دوڑ میں گزر رہے ہوں گے کہ ٹرک والوں نے ہمارا سامان اُتار کر نیچے ڈال دیا اور مستورات سے تقاضا کیا کہ جلد اُتر جاؤ۔ میں نے ان کو کتب خانہ کے چبوترے پر بٹھایا۔ اندھیرے میں یہ بھی پتہ نہ چلا کہ کیا اترا کیا رہا اور یہ بھی فکر تھا کہ مقامی پولیس کرفیو کی وجہ سے باہر بیٹھے ہوئے ہونے پر نہ ستائے۔ خان صاحب بھی اسی ٹرک میں سہارنپور والے مکان میں چلے گئے جو بازار میں تھا اور ٹرک والے کا راستہ بھی ادھر ہی کو تھا۔

دس پندرہ منٹ تک میرے اور مولوی عبدالمجید کے شور کرنے پر مولوی نصیر نے اپنے دروازہ کا ذرا سا کواڑ کھول کر اندر جھانکا اور میں نے ڈانٹ کر کہا کہ اللہ کے بندے کواڑ تو کھول میں زکریا ہوں۔ اس پر اس نے دونوں کواڑ کھولے۔ سلام کیا میں نے کہا کہ جلدی لالٹین لاؤ وہ یکے بعد دیگرے دو لالٹین جلا کر لائے۔ ایک لالٹین لے کر مولوی عبدالمجید مرحوم مکان میں آئے اور بہت ڈرتے ڈرتے مکان کو سب کو اندر باہر اوپر نیچے پاخانہ وغیرہ دیکھا کہ کہیں کوئی آدمی تو نہیں۔ دوسری لالٹین سے اوّل مستورات کو میں نے گھر میں پہنچایا پھر میں نے مولوی نصیر نے اور مولوی عبدالمجید مرحوم نے جلدی جلدی وہاں سے سامان اٹھوایا۔ مکان کے دروازے میں سب کو جمع کیا اور مولوی نصیر سے مطالبہ بھی کیا کہ یہ سارے کواڑ کیوں کھلے ہوئے پڑے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ عصر کے بعد لگانا یاد نہیں رہا اور مغرب کے بعد کرفیو ہوگیا۔ میں نے ان سے کہا یہ تو کوئی عذر نہیں۔ جب یہاں کوئی تھا ہی نہیں تو یہ کیوں کھلے صبح کی نماز میں جب یہ ناکارہ مسجد میں گیا تو اولاً محلہ میں اور پھر سارے شہر میں میری واپسی کا ایسا شور مچا اور ایسے زوردار اونچے اونچے فقرے سنے کہ مجھے بھی گیدڑ کی طرح سے اپنے پری ہونے کا شبہ ہونے لگا۔ ہمارے محلہ کے بہت سے لوگ اور اس کے ساتھ شہر کے بھی بہت سے احباب پاکستان جانے کے لیے ان کیمپوں میں پہنچ چکے تھے جو کچہری کے پل سے اُتر کر کثرت سے لگے ہوئے تھے۔

میری واپسی پر سب سے پہلے شیخ اظہار احمد تاجر چوب جو میرے بہت مخلص دوست اور ان کے

والد جو اس وقت حیات تھے وہ بھی بڑے تاجر چوب تھے اپنے گھر والوں کو مع اپنے سارے سامان کے کیمپ سے واپس لے آئے اور میں نے سنا کہ شام تک دوسو آدمی ایک دوسرے کو دیکھ کر واپس ہوگئے۔ مجھے سفر کی تکان کا مرض تو ساری عمر سے ہے اور یہ سفر تو بڑی مشقت سے گزرا تھا اس لیے یہاں آکر شدید بخار ہوا۔ حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ میری بیماری کی اطلاع سن کر اگلے دن چہار شنبہ کی صبح کو تشریف لائے اور تین دن قیام فرمایا اور شنبہ کی صبح کو واپس تشریف لے گئے۔ ۱۰محرم ۶۷ھ دوشنبہ کی صبح کو حضرت مدنی قدس سرہٗ ڈیڑھ بجے تشریف لائے اور کار میں گنگوہ تشریف لے گئے۔ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ بھی دوشنبہ کی صبح کو حضرت مدنی کی آمد کی خبر پر دوشنبہ کی صبح کو ہی تشریف لے آئے تھے مگر حضرت مدنی اسٹیشن سے سیدھے گنگوہ تشریف لے گئے۔ اس لیے نظام سفر واپسی کا معلوم نہ ہوسکا۔ اس لیے حضرت رائے پوری قدس سرہٗ حضرت مدنی کا دن بھر انتظار فرما کر بعد عصر واپس تشریف لے گئے۔ مغرب بعد حضرت واپس تشریف لائے اور حضرت رائے پوری کی آمد وانتظار وواپسی کا حال معلوم ہوا تو علی الصباح بہٹ تشریف لے گئے اور وہاں جا کر جب معلوم ہوا کہ حضرت تو رائے پور جا چکے تو پیچھے پیچھے رائے پور تشریف لے گئے اور دونوں اکابر عصر سے پہلے سہارنپور تشریف لائے اور بعد مغرب وہ معرکۃ الآراء مشورہ ہوا جس کا بہت سی جگہ اس زمانے میں رسائل واخبارات میں ذکر آیا تھا۔ علی میاں نے بھی حضرت رائے پوری کی سوانح میں اس کا ذکر کیا ہے میں دہلی سے واپسی پر حضرت مدنی قدس سرہٗ سے اور سہارنپور آمد پر حضرت رائے پوری سے عرض کر چکا تھا کہ دہلی میں بہت زور اصرار میرے اور عزیز یوسف کے پاکستان چلے جانے پر رہا۔ مگر میں آپ دونوں حضرات کے مشورے پر اپنے سفر کو معلق کیے ہوئے ہوں اور عزیز یوسف کا سفر مجھ پر موقوف ہے۔ رائے پور میں اسی دن حضرت اقدس رائے پوری بھی اشارۃً اس قسم کا ذکر کر چکے تھے۔ کہ پنجاب والوں کا مجھ پر زور رہا مگر میں نے حضرت والا اور حضرت شیخ کے مشورے پر موقوف کر رکھا ہے۔ اس لیے یہ دونوں حضرات مشترک طور پر واپس تشریف لائے اور بعد مغرب کچے گھر میں یہ سیہ کار اور دونوں اکابر مشورے کے لیے جمع ہوئے اور اس کی ابتداء حضرت رائے پوری نے اس عنوان سے کی کہ حضرت! (خطاب حضرت مدنی کو تھا) اپنے سے تعلق رکھنے والے تو سارے مشرقی اور مغربی پنجاب کے تھے اور حضرت قدس سرہٗ (اعلیٰ حضرت رائے پوری) کے متعلقین بھی زیادہ تر ان ہی دو جگہ کے تھے۔ مشرقی تو سارا مغربی کی طرف منتقل ہوگیا، ان سب حضرات کا بہت اصرار ہو رہا تھا کہ میں بھی پاکستان چلا جاؤں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بھی حضرت اقدس رائے پوری کو پاکی مسلمانوں کی ضرورتوں کا بار بار احساس دلاتے تھے اور خود اپنا جانا بھی حضرت رائے پوری کی تشریف بری پر محمول کیے ہوئے

تھے اور یہ بھی حضرت نے فرمایا کہ میرا تو مکان بھی مغربی میں ہے اوران سب مظلومین کی دلداری بھی اسی میں ہے۔ شروع رمضان ہی سے ان کا اصرار ہو رہا ہے مگر آپ دونوں حضرات کے مشورے پر میں نے معلق کر رکھا ہے۔ یہاں تو پھر بھی اللہ کے فضل سے اہل اللہ ہیں مگر وہاں اللہ اللہ کرنے والوں کا سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا۔ کچھ شہید ہو گئے، کچھ اُجڑ گئے اور تقریباً حضرت کی گفتگو کا رخ یہ تھا کہ وہاں قیام ضروری ہے۔ اس سب کو سن کر حضرت مدنی قدس سرہٗ نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ ہماری اسکیم تو فیل ہو گئی۔ ورنہ نہ تو یہ قتل و غارت ہوتا اور نہ یہ تبادلۂ آبادی ہوتا۔

حضرت مدنی کا فارمولہ یہ تھا کہ صوبے سب آزاد ہوں، داخلی امور میں سب خود مختار، خارجی امور، فوج، ڈاکخانہ وغیرہ سب مرکز کے تحت۔ مرکز میں ہندو مسلم سب برابر ہوں گے۔ ۴۵، ۴۵ اور ۱۰ اجملہ اقلیتیں، گاندھی جی نے اس کو منظور کر لیا تھا مگر مسٹر جناح نے اس کا انکار کر دیا۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ اگر ہماری تجویز مان لیتے تو نہ کشت و خون کی نوبت آتی اور نہ تبادلۂ آبادی کی۔ اب میں تو کسی کو بھی جانے سے نہیں روکتا۔ اگرچہ میرا وطن مدینہ ہے اور محمود وہاں بلانے پر اصرار بھی کر رہا ہے۔ مگر ہندوستانی مسلمانوں کو اس بے سرو سامانی اور دہشت اور قتل و غارت گری میں چھوڑ کر میں نہیں جا سکتا۔ اور جسے اپنی جان و مال، عزت و آبرو دین اور دنیا یہاں کے مسلمانوں پر نثار کرنی ہو وہ یہاں ٹھہرے اور جس کو تحمل نہ ہو وہ ضرور جائے۔

حضرت مدنی ورائے پوری کے مشورہ سے ہندوستان سے منتقل قیام کا فیصلہ

حضرت قدس سرہٗ کے اس ارشاد پر میں جلدی سے بول پڑا کہ میں تو حضرت ہی کے ساتھ ہوں۔ حضرت اقدس رائے پوری نے فرمایا کہ تم دونوں کو چھوڑ کر میرا جانا بھی مشکل ہے۔ میں نے تو اس گفتگو کو کسی سے نقل نہیں کیا اور توقع ان حضرات سے بھی معلوم نہیں ہوئی، لیکن عشاء کی نماز پڑھتے ہی عمومی شور ہر شخص کی زبان پر سنا کہ اکابر ثلاثہ کا فیصلہ یہاں رہنے کا ہو گیا ہے اور پھر ان ہی دونوں بزرگوں کی برکت تھی اور اصل تو اللہ ہی کا انعام و احسان تھا کہ ایک دن پہلے جو لوگ تشویش میں تھے وہ اگلے دن اطمینان کی سی باتیں کر رہے تھے۔ یہ زمانہ بھی قیامت کی یاد کو بہت ہی تازہ کر رہا تھا اور دنیا کی بے ثباتی ہر شخص پر ایسی مسلط تھی کہ بڑے بڑے قیمتی برتن تانبے، لوہے کے بہت ہی معمولی پیسوں میں فروخت ہوئے۔ دہلی میں نیلام ہوتے تھے اور تانبہ کے برتن بلا مبالغہ دو ڈھائی آنے سیر فروخت ہوتے۔ رئیس لوگ اپنی کاروں میں نظام الدین اسپیشلوں میں سوار ہونے کے لیے جاتے اور کار اسٹیشن پر چھوڑ کر ریل میں سوار ہو جاتے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے کئی

مرتبہ افسوس سے فرمایا کہ یہ لوگ سڑکوں پر عمدہ کاریں چھوڑ کر جارہے ہیں، اگر جمعیۃ کو دی جائیں تو ان کو فروخت کرکے جمعیۃ کے کام میں لایا جاسکتا ہے۔اب اس طرح لاوارثی مال کو کیا کام میں لایا جائے۔لاقانونیت اس طرح پھیلی ہوئی تھی کہ اس کے قصے بھی بہت ہی ناقابلِ تحریر ہیں۔

حضرت الحاج حافظ فخر الدین صاحب کی صاحبزادی اپنے خاوند کے ساتھ روہتک میں رہتی تھیں، حاملہ تھیں، روہتک والوں کا پیدل اخراج وہاں کے حکام نے تجویز کردیا۔حضرت حافظ صاحب نے اپنے تعلقات کی وسعت اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی مدد سے جواہر لال سے یہ بھی لکھوادیا کہ ان کی لڑکی کو پیدل والی جماعت سے مستثنیٰ کردیا جائے، مگر روہتک کے تھانیدار نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ یہاں کا جواہر لال میں ہوں۔ مجھے اس وقت ۳۸ھ کا حج خوب یاد آتا تھا جس کی تفصیل پہلے گزرچکی کہ جب کوئی حاجی کسی بدو کی شکایت کسی مقوم سے کرتا اور یہ کہتا کہ میں مکہ جاکر شریف سے شکایت کروں گا تو ان کا مقولہ تھا ''من شریف؟ انـا شـریف'' (شریف کون ہے، میں شریف ہوں) اس زمانے میں دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ ان کو بلند درجات عطاء فرمائے، سارے دن دہلی کے فساد زدہ علاقوں میں نہایت بے جگری سے پھرتے تھے۔مسلمانوں کو دلاسہ دیتے اور گالیاں سُنتے، مگر اللہ ان کو مراتب عالیہ نصیب فرمائے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے تحمل اور برداشت خوب عطاء فرمایا تھا اور ان سے بڑھ کر میرے حضرت مدنی قدس سرہٗ تھے۔سارے ہندوستان کا اس خطرے کے زمانے میں دورہ فرماتے اور مصائب پر ان کا اجر سناتے، بڑے لانبے لانبے دورے حضرت کے مسلمانو ں کو جمانے کے سلسلہ میں ہوئے۔ایک چیز پر مجھے بہت ہی رشک آیا، نہایت شدید مخالفت معاند لیگی جنہوں نے حضرت نوراللہ مرقدہٗ کو منہ در منہ بہت کچھ کہا اور سنایا، حضرت ان کو بھی بہت ہی تسلی کے خطوط تحریر فرماتے اور خود جاکر ان کو دلاسہ دیتے اور ایسی گفتگو فرماتے جیسے یہ حضرت کا بہت ہی معین ومددگار ہے۔

مجھے دوآبے کے متشدد لیگیوں کے متعلق خود سننے کی اور حضرت قدس سرہٗ کے گرامی نامے دیکھنے کی نوبت آئی کہ گھبرائیں نہیں انشاء اللہ حالات کسی وقت سازگار ہوں گے، آپ کو جو تکلیف پیش آئے مجھے لکھیں میں انشاء اللہ ہر نوع کی مدد کروں گا، بعض لیگیوں کی سفارش کے لیے ہندو حکام کے پاس بھی تشریف لے گئے، جن کے نام میں لکھوانا نہیں چاہتا، مگر حضرت کے علوشان کی داد ہمیشہ دوں گا کہ جن لوگوں نے حضرت کی شان میں غائبانہ اور منہ در منہ سخت الفاظ کہے حضرت نے ان کی سفارشیں اور اس بات تک کی ضمانتیں لیں کہ اب یہ لوگ آپ کے خلاف کچھ نہیں کہیں گے، مگر لیگی حضرات کو اس پر بھی اعتماد نہ ہوا اور نہ حضرت کی اس سفارش کی قدر فرمائی اور پاکستان چلے

گئے۔ حضرت کواللہ تعالیٰ اعلیٰ درجات سے نوازے اس زمانے میں حضرت قدس سرہٗ پر تاثر بہت تھا بسااوقات تقریروں میں کسی کسی بات پر آبدیدہ بھی ہوجاتے تھے:

وہ محروم تمنا کیوں نہ سوئے آسماں دیکھے
کہ جو منزل بہ منزل اپنی محنت رائیگاں دیکھے

اللّٰهم اغفرله وارحمه رحمة واسعة

☆......☆......☆

باب ہشتم

متفرقات

یہ بات بہت ہی طویل ہے۔ اگر چہ اس کا اجمال بھی علی گڑھ میں ہو چکا تھا، مگر اس کی تبیض اور تفصیل باقی ہے اور چونکہ اس سیہ کار کے سفرِ حج اور اس سے زیادہ سفرِ ہجرت کی خبریں نامعلوم ہر سال کہاں سے پھیل جاتی ہیں، حالانکہ ہجرت کے متعلق میں ہر سال تحریراً تقریراً اخبارات کے ذریعہ سے بھی لوگوں کو مطلع کرتا رہا ہوں کہ میرا بالکل ہجرت کا ارادہ نہیں ہے اور نہ ہجرت اتنی آسان ہے۔ سیّد الکونین صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''فان شان الهجرة شديد'' الحدیث رواہ ابوداؤد۔ ہجرت کا معاملہ بڑا سخت ہے اور آج کل تو سعودی قوانین ایسے سخت ہیں کہ اگر کوئی ہجرت کرنا بھی چاہے تو بہت دشوار ہے۔ مگر معلوم نہیں کہ کس بناء پر اس ناکارہ کی ہجرت ہر سال پھیلتی رہتی ہے اور اکثر جمادی الثانی سے، ورنہ شوال سے تو اس قسم کے لوگوں کا ہجوم بڑھتا رہتا ہے جو ملاقات کے لیے آتے ہیں اور آج کل بھی بہت بڑا ہجوم اسی سلسلہ میں ہو رہا ہے، اس لیے توقع نہیں کہ اس سفر سے پہلے یہ باب پورا ہو جائے۔ البتہ واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ میرے عزیز کاتبین میں سے کوئی پورا کر دے تو کرم ہوگا، ورنہ جتنا ہو جائے اس کو طبع کرا دوں گا۔ یہ واقعات جو اس باب میں آرہے ہیں وہ سب غیر مرتبط اور مختلف مضامین اور مختلف احباب کے ہیں اس لیے نمبروار لکھواتا ہوں۔

اکابر مدارس کا اہتمام اور مال وقف کی اہمیت:

(۱)...... مجھے اپنے اکابر کے طرزِ عمل اور ان سے ورثہ میں جو چیز ملی ہے وہ مدارس کا اہتمام، اوقاف کے مال کی اہمیت، جس کے متعلق آپ بیتی نمبر ا میں بھی کئی واقعات لکھوا چکا ہوں اور اس تحریر میں بھی اپنے حضرت قدس سرہٗ کا یہ مقولہ لکھوا چکا ہوں کہ مجھ سے تعلق کا مدار تو میرے مدرسہ سے تعلق پر ہے، جس کو میرے مدرسے کے ساتھ جتنا تعلق ہے اتنا ہی مجھ سے ہے اور اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کا مقولہ بھی پہلے آچکا ہے کہ مجھے مدارس کی سرپرستی سے جتنا ڈر لگتا ہے اتنا کسی چیز سے نہیں لگتا، طویل مضمون آپ بیتی نمبر ا میں گزر چکا ہے۔ نیز اپنے والد صاحب قدس سرہٗ کا معمول بھی مدرسہ کے متعلق آپ بیتی نمبر ا میں لکھوا چکا ہوں کہ وہ اپنا سالن سردی میں مدرسے کے حمام کے سامنے رکھا کرتے تھے، نہ حمام کے اندر ہوتا نہ اس کی آگ نکال کر اس پر ہوتا اور اس

انتفاع پر چندہ کے نام سے سردی کے مہینے میں دو تین روپے جمع کراتے تھے اور بھی اکابر کے احتیاط کے سلسلہ میں قصے وہاں گزر چکے ہیں اس لیے سب سے اول اپنے عزیزوں کو اپنے دوستوں کو اپنے سے تعلق رکھنے والوں کو اس کی نصیحت اور اس کی وصیت کرتا ہوں کہ مدرسہ کے مال میں بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے مدرسہ کے اوقات کا بہت ہی اہتمام کریں، یہ نہ سمجھیں کہ مجھے کون ٹوک سکتا ہے۔ یہ اللہ کا مال ہے اور اس کا مطالبہ کرنے والا اور اس پر ٹوکنے والا بڑا سخت ہے جس کے یہاں نہ کوئی سفارش چلے گی نہ کوئی وکالت۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس سیہ کار نے محض مالک کے فضل سے اوقاتِ اسباق کی وہ پابندی کی جس پر سرپرستان نے بھی تحریراً استعجاب لکھا ہے۔

مظاہر علوم کی ماہانہ تقسیم کے نقشہ کی ترتیب:

حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی قدس سرہٗ کے ذمہ ان کی سرپرستی کے زمانے میں مدرسین کے اسباق اور خواندگی کے نقشوں کی نگرانی تھی۔ ماہانہ دستخط نگرانی کے تو صدر مدرس کے ہوتے تھے لیکن سال کے درمیان میں اور سال کے ختم پر ایک دو مرتبہ وہ بھی نقشوں کو ملاحظہ کرتے تھے اور ہر مرتبہ اس سیہ کار کے نقشہ پر نصاب کی ماہانہ پابندی پر پسندیدگی اور مبارکباد لکھ کر جایا کرتے تھے۔ اگر وہ نقشے اب بھی دفتر مدرسہ میں ہوں گے تو ان پر تحریر ضرور ملے گی۔ ماہانہ تعلیم کی پابندی بھی بہت اہم ہے۔

مظاہر علوم کا خصوصی امتیاز حضرت قدس سرہٗ کے زمانے میں اور حضرت کے وصال کے چند سال بعد تک یہ رہا کہ تعلیم میں استواری، اعتدال خوب ہوتا تھا۔ حضرت قدس سرہٗ اس کے شدید مخالف تھے کہ شروع سال میں لمبی لمبی تقریروں میں وقت ضائع کیا جائے اور آخر سال میں رمضانی حافظ کی طرح فرفر ختم کرا دیا جائے۔ اس پر متعدد مرتبہ میرے حضرت نے اکابر مدرسین کو مجمع میں ڈانٹا کہ مجھے یہ ہرگز پسند نہیں کہ کتاب کے شروع میں طول دیا جائے اور آخر میں دورہ چلایا جائے۔ حضرت قدس سرہٗ کے زمانے میں کوئی کتاب خارج پارات کو نہیں ہوتی تھی۔ اس کے بھی حضرت بہت مخالف تھے۔ کہ طلبہ کو مطالعہ کا وقت کب ملے گا؟ مگر اب تو ''چشم بددور'' مدرسہ کے گھنٹوں میں سبق کم ہوتے ہیں اور خارج میں زیادہ۔ اگر کسی کتاب کے متعلق اہتمام سے غور کیا جائے گا تو ایک تہائی مدرسہ کے گھنٹوں میں ملے گی اور دو تہائی خارج اوقات میں پڑھا کر پوری کی گئی ہوگی۔ فالی اللّٰہ المشتکیٰ حضرت قدس سرہٗ کے وصال کے کئی سال بعد تک حضرت کا اثر باقی رہا۔ لیکن چند سال بعد جب اس میں انحطاط دیکھا گیا تو اس سیہ کار نے اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب کاملپوری سابق صدر مدرسہ نے مل کر اور حضرت قدس سرہٗ کے زمانے کے پانچ سالہ ماہانہ نقشے

سامنے رکھ کر ایک نقشہ مرتب کیا تھا جو اب مدرسہ کے نصاب کے نام سے حالات مدرسہ میں طبع شدہ ہے۔ ہم دونوں نے بہت غور وخوض کے بعد پانچ سالہ نقشوں کو بہت اہتمام سے دیکھنے کے بعد خود بھی حضرت قدس سرہٗ کے زمانے میں کئی سال پڑھایا تھا۔ اس لیے ہر گھنٹے کی کتابوں کو ایک ہوں یا دو، جس طرح حضرت کے زمانے میں پڑھائی جاتی تھی اس کو نو حصوں پر تقسیم کر کے دو حصے پہلی سہ ماہی کے اور تین حصے دوسری سہ ماہی اور چار حصے تیسری سہ ماہی کے اور پھر ہر سہ ماہی کے مقررہ حصوں کو تین تین ماہ پر علی التناسب تقسیم کر دیا تھا۔ لیکن پہلی سہ ماہی کا حصہ علی التساوی تقسیم کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ ذیقعدہ میں بالکل ابتداء ہونے کی وجہ سے تقریر لمبی ہوتی ہے۔ ذی الحجہ میں عید کی تعطیل آتی ہے اور محرم کا آخری ہفتہ امتحان کے لیے ہوتا ہے۔

بہرحال میں اپنے دوستوں کو اس کی تاکید کرتا ہوں کہ مدرسہ کا کوئی مال، یا تعلیمی حق تم پر باقی نہ رہے اور تمہارے جتنے حقوق بھی مدرسہ پر رہ جائیں ان کو غنیمت سمجھو کیونکہ مدرسہ کے جتنے حقوق تم پر رہ جائیں گے ان کی ادائیگی بڑی مہنگی ہوگی اور تمہارے حقوق جتنے مدرسہ پر رہ جائیں گے اس کا معاوضہ تم کو بڑا قیمتی ملے گا۔ میرے بہت سے مخلص دوست و عزیز جن سے مجھے انتہائی تعلق اور محبت تھی ان سے مدرسہ کے حقوق میں کوتاہی کی وجہ سے مجھے بہت ہی تکدر اور قلق رہا۔ اس کے بالمقابل میرے کئی دوست ایسے ہیں جن سے ابتداء میں مجھے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ بے تعلقی تھی مدرسہ کے کام میں اہتمام اور احتیاط سے وہ میرے محبوب دوست بن گئے۔

قاری سعید مرحوم سے تعلق:

قاری مفتی سعید احمد صاحب جن کی ولادت عید الاضحیٰ کے دن صبح صادق کے وقت، سن میں مرحوم کو تردد تھا کہ ۲۰ھ تھی یا ۲۱ھ تھی کئی دفعہ یہ کہا کہ صحیح سن اجراڑہ میں کہیں لکھا ہوا ہے۔ مگر باوجود تلاش کے ملا نہیں، عزیزم مولوی اطہر نے بتایا کہ مجھ سے انہوں نے ایک وقت اپنی عمر ۵۵ سال بتائی تھی۔ اس لیے اس حساب سے پیدائش ۲۲ھ ہوتی ہے۔ یہی رسم المفتی کے حاشیہ میں انہوں نے لکھا ہے۔ ابتدائی تعلیم قرآن پاک حافظ محمد حسین صاحب سے پڑھا، جس پر ان کو ناز بھی تھا اور ابتدائی فارسی عربی بھی اجراڑہ میں پڑھی۔ شوال ۳۶ھ میں مدرسہ مظاہر علوم میں آئے۔ ابتدائی کتب عربی اس سیہ کار سے پڑھیں اور جملہ کتب کی تکمیل ابتداءً ۴۳ھ میں مدرسہ کے استاذ قراءت ہوئے اور انتہاءً ۴۷ھ میں نائب مفتی مقرر کیے گئے پھر مفتی اعظم بھی ۵۲ھ میں ہوگئے تھے۔ ابتدائے تعلیم میں ان کے متعدد اسباق میرے پاس تھے۔ اجراڑہ کے کئی طلبہ آئے ہوئے تھے، چونکہ قاری صاحب اپنے کو جناب الحاج حافظ محمد حسین صاحب جن کا حال پہلے آچکا ہے ان کا

خاص شاگرد ہونے کی وجہ سے اُونچا سمجھتے تھے اور صاحبزادگی کی بُو بھی کچھ موجود تھی اور یہ بارہا میری آپ بیتی نمبر۱ میں اور اس رسالہ میں بھی گزر چکا ہے کہ والد صاحب کے جوتوں کی بدولت مجھے صاحبزادگی سے نفرت ہوگئی تھی، اس لیے مرحوم مجھ سے خفا رہتے تھے اور میں مرحوم سے۔ ۴۷ھ میں جب وہ نائب مفتی ہوگئے اور یہ ناکارہ حجاز سے واپسی پر اپنے خیال میں کچھ اُونچا آدمی بن کر آیا تھا تو میں نے مرحوم سے درخواست کی کہ بعد ظہر میرا ایک سیپارہ قرآن پاک کا رمضان میں سن لیا کریں، اُنہوں نے بہت صفائی سے کہہ دیا کہ وہ مدرسہ کا وقت ہے کہ اس زمانے میں غیر رمضان کی طرح رمضان میں بھی دفتر اور افتاء دونوں کا وقت صبح وشام ہوتا تھا، اگر ناظم صاحب فرمادیں گے تو سنوں گا ورنہ نہیں۔ ناظم صاحب (حضرت مولانا عبداللطیف صاحب) کی جو شفقتیں اس سیہ کار پر تھیں ان کے لحاظ سے اس میں ذرا تأمل نہ تھا کہ میں ان سے عرض کروں اور وہ بہت زور سے حکم نامہ جاری فرمادیں۔ لیکن مجھے مرحوم کا یہ جواب بہت ہی اچھا معلوم ہوا اور میں نے ان سے کہا کہ جزاک اللہ تم نے بہت ہی اچھا جواب دیا۔ اس کے چند ماہ کے بعد ایک قصہ پیش آیا کہ یہ ناکارہ اور ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مدرسہ عربیہ اجراڑہ کے سرپرست تھے اور سالانہ جلسہ میں بڑے اہتمام سے جایا کرتے تھے۔ اس سال اتفاق سے میں تو پہلے ہی عذر کر چکا تھا، حضرت ناظم صاحب کا ارادہ بہت پختہ تشریف لے جانے کا تھا۔ مگر عین وقت پر ناظم صاحب کو بھی عذر پیش آگیا، انہوں نے مجھ سے مشورہ فرمایا۔

میں نے کہا کہ قاری سعید احمد وہاں کے حالات سے زیادہ واقف ہیں۔ آپ ان کو ایک تحریر میری اور اپنی طرف سے لکھ دیں میں بھی دستخط کردوں گا کہ وہ ہم دونوں کی طرف سے نیابۃً وہاں کے امور طے کرآئیں۔ ناظم صاحب نے بہت پسند فرمایا۔ مگر قاری صاحب نے فرمایا کہ میں تو وہاں گھر کا آدمی ہوں کسی دوسرے کو تجویز کردو۔ میں نے کہا کہ کوئی دوسرا اندرونی حالات سے واقف نہیں۔ نہ معلوم کیا طے کر کے آئے تم حالات سے واقف ہو تم ہی مناسب ہو۔ وہ حکماً چلے گئے اس ناکارہ کی صحت وقوت اس زمانے میں بہت اچھی تھی اور حضرت قدس سرہٗ کے ارشادات کی بنا پر مدرسہ کے ہر کام کا نگراں بھی میں اپنے آپ کو سمجھتا تھا۔ اگرچہ براہِ راست احکام کبھی جاری نہیں کیے۔ بلکہ جس کے متعلق جو کچھ لکھنا یا کہنا ہوتا وہ حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی وساطت سے ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے کچھ احمقوں نے یہاں تک بھی لکھا اور شائع کیا کہ ناظم مدرسہ تو یہ ناکارہ ہے، ناظم صاحب میرے کاتب اور میرے منشی ہیں۔ ''معاذ اللہ''۔ بہرحال میں چند ماہ بعد اپنی کسی غرض سے مدرسہ کے کتب خانہ میں گیا اور اپنی عادت کے موافق کہ میں جب بھی کتب خانہ میں جاتا تو مدرسین کی حاضری کا رجسٹر بھی بہت غور سے دیکھ کر آتا اور اس میں کوئی افراط وتفریط

دیکھتا تو اول کتب خانے والوں سے استفسار کرتا اور اگر ضرورت ہوتی تو حضرت ناظم صاحب سے تفریط و تقصیر پر تحریری مطالبہ کراتا۔ اس دن میں نے رجسٹر میں قاری سعید احمد صاحب کی ان ایام کی رخصت دیکھی۔ میں نے کتب خانے والوں سے دریافت کیا کہ قاری سعید احمد مرحوم ہمارے بھیجے ہوئے بکار مدرسہ اجراڑہ گئے ہیں ان کی رخصت کیوں ہے۔ کتب خانے والوں نے کہا کہ انہوں نے خود اپنی رخصت لکھوائی ہے۔ میں نے کتب خانے سے واپسی پر راستہ میں قاری سعید احمد مرحوم سے مطالبہ کیا۔ ان کا مستقل قیام اس زمانے میں اس کمرے میں رہتا تھا جو آج کل مہمان خانہ ہے دفتر مدرسہ کے دروازے کی چھت پر ہے اور وہی اس زمانے میں دارالافتاء بھی تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ بکار مدرسہ گئے تھے آپ نے رخصت کیوں لکھوائی۔

مجھے اپنا مطالبہ اور ان کا جواب اور اپنا جواب الجواب خوب یاد ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میرا گھر بھی تو وہیں ہے، بہر حال میں اپنے گھر بھی گیا تھا۔ مجھے اپنے الفاظ خوب یاد ہیں۔ میں نے کہا کہ تُو تو بڑا اچھا لونڈا نکلا۔ کل سے دوپہر کی روٹی میرے ساتھ کھایا کر۔ اللہ اس مرحوم کو بہت ہی بلند مراتب عطاء فرمائے ترقیات سے نوازے میری اس پیشکش کو ایسا نبھایا کہ جب تک وہ اپنے مرض الوصال میں چارپائی پر سے اٹھنے سے معذور نہ ہوگئے کبھی بھی دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کا نہ چھوڑا بلکہ ان کے ذاتی مہمان بھی اگر آ جاتے ان کا بھی کھانا گھر سے منگا کر میرے ساتھ ہی ان کو کھلاتے تھے اور میرے جو مہمان خصوصی آتے تھے ان کے ساتھ شام کو بھی بجائے میرے وہ ہی میزبانی کرتے تھے اور تعلق دن بدن بڑھتا ہی چلا گیا اور پھر تو میرے سفر و حضر کے مصاحب بن گئے اور انہوں نے بہت ہی حق دوستی ادا کیا مرحوم کے لیے بہت ہی دعائیں کرتا ہوں۔ مرحوم بہت عرصہ تک شدید بیمار رہے۔ تقریباً ایک سال تک مختلف امراض اور سحر بھی تجویز کیا گیا اور ۲ صفر ۷۷ھ بروز پنجشنبہ بوقت نماز فجر کو انتقال فرمایا۔ اللّٰھم اغفر لہٗ وارحمہٗ واعلیٰ درجاتہ

مرحوم کا ایک معمول بہت اہتمام کے ساتھ یہ بھی تھا کہ عید الفطر کی صبح کو مدرسہ قدیم سے صبح کی نماز پڑھا کر پہلے اس ناکارہ کے مکان پر آتے اور وہاں کھجور سے افطار اور چائے وغیرہ پینے کے بعد اور اسی دوران میں ان کے گھر سے بہت مزیدار پلاؤ بھی آ جاتی تھی۔ اس کو بھی اسی مجلس میں ہم لوگ لقمہ لقمہ کر کے ختم کر دیتے اس سے نمٹ کر وہ اپنے گھر جاتے تھے۔ یکم شوال ۷۶ھ کو مرحوم کا ایک دستی پرچہ میرے نام آیا کہ ۴۸ھ سے اب تک ۲۸ سال کے عرصہ میں کوئی عید ایسی نہیں گزری کہ میں نے نماز صبح کے بعد آپ کے یہاں حاضری نہ دی، افسوس ہوا کہ آج میں اپنی شدید بیماری کی وجہ سے حاضری سے محروم ہوں، مجھے اس کا جس قدر افسوس ہے اس کا آپ کو بھی علم ہوگا۔ میں اس پرچہ کو پڑھ کر بیتاب ہوگیا اور اسی وقت عید سے پہلے مرحوم سے مل کر آیا اور مرحوم خوب مل کر

رویا اور مجھے بھی رُلایا۔ اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجات عطاء فرمائے۔ اس کی خوبیاں اگر لکھوں تو مستقل ایک دفتر چاہیے۔ میرے رائے پور کے سفر کا تو آخر زمانہ میں مستقل رفیق بن گیا تھا اور حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی بہت ہی شفقت ہوگئی تھی۔ اگر مرحوم کے بغیر جانا ہوتا تو حضرت دریافت فرماتے کہ تمہارے دوست نہیں آئے۔ جب حضرت مولانا اشفاق احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد حضرت رائے پوری نے اپنے مدرسہ کے لیے ایک مستقل نظام بنانا چاہا اور اس کے سرپرستوں کی ایک کمیٹی مستقل بنائی اس میں قاری صاحب مرحوم کو بھی سرپرستوں میں لکھا تھا۔ مگر وہ نظام نہ چل سکا۔

مولانا عبداللطیف سے تعلق اور ان کے چند واقعات:

(۲)......اسی طرح سے حضرت الحاج استاذی المکرم حضرت مولانا عبداللطیف صاحب نور اللہ مرقدہٗ ناظم مدرسہ جن کا ذکر خیر میرے اساتذہ میں بھی گزر چکا ہے مجھے ان سے ابتدائی محبت تعلق تو اپنے ابتدائی شاگردی کے زمانے میں ہوگیا تھا مگر ۴۵ھ کے بعد جب یہ ناکارہ مشیر ناظم بنا اس وقت سے حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال تک بڑھتا ہی رہا۔ حتیٰ کہ انتقال کے قریب جب حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے قاری سعید مرحوم سے خانگی امور میں ایک وصیت نامہ لکھوایا تو قاری صاحب کے ہاتھ میرے پاس بھیجا کہ اس کو میری زندگی میں کسی پر ظاہر نہ کریں میرے بعد اس وصیت پر عمل کرنا اور کرانا آپ کے ذمہ ہے۔ خانگی امور میں بھی بہت کثرت سے مشورہ فرمایا کرتے تھے اور اہلیہ محترمہ کو بعض مرتبہ اس سیہ کار کی وساطت سے تنبیہ فرمایا کرتے تھے اور اہلیہ محترمہ بھی بعض مرتبہ اس سیہ کار کے واسطے سے بعض امور ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے منوایا کرتی تھیں۔ چنانچہ عبدالرؤف سلمہٗ کے نکاح کے موقعے پر کئی امور اس قسم کے پیش آئے جو اہلیہ محترمہ کو بھی خوب یاد ہوں گے اور اس ناکارہ کے تعلق کا اضافہ مدرسہ ہی کے تعلق کی وجہ سے ہوا تھا کہ ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو کبھی یہ خیال نہ ہوا کہ میں ناظم مدرسہ ہوں یا محصل چندہ ہوں، یا دربان، نہ اس کا خیال کبھی ہوا کہ یہ مدرسہ کا وقت ہے یا نہیں۔ طالب علم دوپہر میں عصر کے بعد مغرب کے بعد، عشاء کے بعد جب بھی درخواست لے جاتا فوراً اس کو ملاحظہ فرماتے اور حکم تحریر فرماتے۔ میں اپنی بدخلقی سے بسا اوقات طالب علم سے لڑ پڑتا کہ درخواست کا کوئی وقت بھی ہوتا ہے مگر وہ کبھی نہیں فرماتے تھے۔ نہایت اہتمام سے مطبخ میں بہت کثرت سے تشریف لے جاتے اور اکثر ایک خوراک معائنہ کے لیے خرید فرماتے اور وہیں آدھی چوتھائی روٹی کھا کر روٹی سالن کا معائنہ فرمانے کے بعد بقیہ وہیں کسی منشی یا طباخ کو دے دیتے۔ کبھی یہ نہیں سوچا کہ یہ کام

ناظم مطبخ کا ہے روٹی سالن بغیر قیمت کے کبھی نہ چکھتے حالانکہ وہ چکھنا بضرورت مدرسہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی نانوں پر کلونجی اور گڑ کی چاشنی کبھی اپنے پاس سے اور کبھی کسی کو ترغیب دے کر ڈلواتے تھے۔

ڈپٹی عبدالرحیم صاحب ڈپٹی نہر جمن شرقی بڑے ہی مخلص اور بڑے نیک بزرگ حضرت مرشدی قدس سرہٗ کی تعمیل حکم میں وہ ہمارے مطبخ کے آنریری نگراں بھی رہے۔ دونوں وقت مدرسہ میں جا کر حساب کی جانچ کیا کرتے تھے۔ ہر ماہ کے شروع میں جنس اپنے سامنے تلواتے تھے، ذرا سی کمی، زیادتی پر سخت مطالبہ فرماتے۔ مجال نہ تھی کہ گوشوارہ میں دو دن کی تاخیر ہو لے۔ مطبخ کا حساب ان کی نگرانی کے زمانے میں جتنا صاف قابلِ رشک رہا نہ اس سے پہلے کبھی ہوا اور نہ ان کے بعد اور نہ آئندہ کی امید۔ اس مکان میں کرایہ پر رہتے تھے جو میرے مکان کے متصل ہے اور اب گاڑہ بورڈنگ کے نام سے مشہور ہے، مجھ پر بھی بہت ہی شفیق اور مہربان تھے اور بہت محبت فرمایا کرتے تھے حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ان سے فرمائش کر کے من دو من مچھلیاں منگوایا کرتے تھے اور اس دن مطبخ میں مچھلی اور چاول پکتے تھے۔ حضرت ناظم صاحب کی عادت شریفہ یہ بھی تھی کہ سردی کے موسم میں شلجم کا میٹھا اچار ڈالتے تھے بار بار خود ڈالتے تھے اور سب مدرسین کے ہاں تقسیم فرماتے تھے اور کبھی کبھی اس سیہ کار کو بھی حکم فرماتے تھے کہ تمہارے لیے میٹھا اچار ڈالنا ہے۔ میں اس زمانے میں میٹھا اچار بالکل نہیں کھاتا تھا۔ پانی کا ترش اچار کھاتا تھا ان کی خوشنودی کی وجہ سے میں بھی عرض کرتا کہ پانچ سات دھڑی شلجم کا مصالحہ لکھوا دیجئے اور مولوی نصیر کو پرچہ دے دیا کرتا۔ حضرت ناظم صاحب بہت ہی شوق سے بناتے تھے میں ایک چوتھائی ان کی خدمت میں پیش کرتا اور کچھ گھر بھیجتا تھا اور باقی میرے دوست بھی کچھ کم نہ تھے۔ اس جگہ تو یہ لکھوانا تھا کہ کبھی کبھی سردی کے موسم میں ایک دو دفعہ بلکہ زائد بھی دوستوں سے تحریک کر کے کئی کئی من شلجم منگا کر کئی کئی مٹکوں میں اچار ڈالتے اور جب دس بارہ دن میں تیار ہو جاتا تو سارا دارالطلبہ مہک جاتا تھا اور اس کی تیاری پر مطبخ سے کھچڑی پکواتے اور سب طلبہ کو کھچڑی کے ساتھ دو دو تین تین قتلے اچار کے دیتے۔ مرحوم کو بھنگی کی نگرانی کرنے میں بھی کبھی عار نہ آیا۔ بھنگی کے ساتھ جا کر پاخانہ کماتے وقت ڈانٹ پلاتے کہ یہاں پانی نہیں ڈالا، یہاں فنائل نہیں ڈالا، کبھی یہ خیال نہیں فرمایا کہ یہ کام درباں کا ہے۔ بھنگی کی نگرانی دربان کے ذمے ہے میرا کام نہیں۔ لوٹے جو مدرسہ میں آتے ان کو اپنے سامنے گنواتے۔ کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ لوٹے گنوانا میرا کام نہیں، ناظم صاحب کو کبھی اس کا واہمہ بھی نہیں گزرا کہ مدرسہ کا وقت کب شروع ہوتا ہے اور کب ختم۔ صبح کی نماز کے بعد سے رات کو دس گیارہ بجے تک وہ گویا ہر وقت مدرسہ کے ملازم تھے۔ جہاں تعمیر ہوتی روزانہ وہاں تشریف لے جاتے، کبھی بھی یہ واہمہ نہیں گزرا کہ یہ کام ناظم مالیات کا ہے، جب کبھی اپنی ذاتی ضرورت کی وجہ

سے کہیں کا سفر فرماتے بڑے اہتمام سے اپنے ساتھ ''رسید بہی'' مدرسہ کے اشتہارات، معائنہ جات، ساتھ لے کر جاتے، کبھی یہ واہمہ بھی نہیں ہوا کہ میں محصل چندہ نہیں ہوں اور نہ اس کا خیال آیا کہ میں تو رخصت پر جا رہا ہوں۔ جب کہ کسی دعوت یا تقریب میں جاتے تو میرے حضرت مرشدی کے اتباع میں ان کو متوجہ فرماتے کہ بھائی اپنی تقریب میں ہمارے مدرسے کو ضرور یاد رکھنا۔ حضرت ناظم صاحب کی ان ہی اداؤں نے مجھے زمانہ طالب علمی ہی سے اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ کہ وہ اپنے باضابطہ مدرسہ کے ناظم ہونے سے پہلے ہی سے مدرسہ کی خیر خواہی میں منہمک تھے۔

ایک مرتبہ حاجی مقبول احمد صاحب نے جن کا ذکر خیر پہلے بھی آ چکا مجھ سے محبت بھی فرماتے تھے اور بلا وجہ خفا بھی ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے (میری طرف اشارہ کر کے) کہ مجھ کو اس سے بڑی محبت ہے مگر مجھے اس کی اس بات پر غصہ آوے کہ یہ مولوی عبداللطیف کے ساتھ یوں کیوں ہو گیا ''لحمہ لحمی دمہ دمی'' بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ میرے خلاف ناظم صاحب کو ان کے عزیزوں نے بہت سخت خط لکھے۔ ناظم صاحب نے بھی ان کا سخت جواب لکھا اور پھر لکھ کر اصل خط مع اپنے جواب کے لے کر میرے پاس آئے کہ فلاں نے خط لکھا تھا میں نے یہ جواب دیا۔ میں عرض کرتا حضرت آپ کا جواب زیادہ سخت ہے فرمانے لگے کہ تم نے اس کی بدتمیزی نہیں دیکھی کہ یہ لفظ اس نے تمہارے متعلق لکھ دیا۔ کیا لکھوں جس کا حال بھی شروع کرتا ہوں تعلق اور محبتوں کے سینکڑوں واقعات ذہن میں آ جاتے ہیں۔ میں تو نہایت عجلت میں چند نمونے لکھوا رہا ہوں۔

مدرسہ کی رخصت کا قانون:

(۳)...... مدرسہ کے معاملات میں ایک چیز بڑے تجربے میں آئی۔ اب تو اس میں کمی ہے جس کی وجہ میں اکابر مدرسہ اور کام کرنے والوں میں اخلاص کی کمی سمجھ رہا ہوں۔ لیکن میری ابتدائی مدرسی بلکہ انتہائی طالب علمی کے زمانے میں ایک چیز کا خوب تجربہ ہوا اور ایسا کہ حد نہیں۔ مدرسہ کا قانون یہ ہے کہ بیماری کی چھٹی اس وقت لی جاتی ہے جب مدرسہ کا کام کرنے کی طاقت و وسعت نہ رہے اور مدرسہ کے کام میں دِقت زیادہ ہونے لگے۔ میں نے دیکھا کہ جب کسی بھی ملازم نے معمولی سی بیماری میں چھٹی لی مثلاً سر میں معمولی سا درد یا طبیعت میں کچھ اضمحلال ہوا تو پھر وہ شخص اچھی طرح سے بیمار ہوئے بغیر نہیں رہا۔ میں ہمیشہ یہ سوچتا رہا کہ یہ مدرسہ کی حق تلفی کی سزا ہے یا ''لا تتمارضوا فتمرضوا'' کا مظہر ہے۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''بتکلف بیمار نہ بنو ورنہ حقیقتاً بیمار بن جاؤ گے۔'' الحدیث۔ اس قسم کے واقعات بہت مشاہدہ میں آئے، نام تو لکھواتا نہیں، لیکن میں نے اپنے بے تکلف دوستوں کو ہمیشہ معمولی بیماری میں چھٹی لینے پر بھی ڈانٹا

اور بعض مرتبہ پیشن گوئی بھی کر دی کہ یہ بیمار ہوگا تیار رہو۔ اسی طرح مدرسہ کے سلسلے میں ایک تجربہ اور ہوا جس کے واقعات تو اس ۶۲ سالہ قیام مدرسہ میں کہ میں رجب ۲۸ھ میں آیا اور اب شوال ۹۰ھ ہے بہت کثرت سے دیکھے۔

مدرسہ کی حق تلفی کا خمیازہ:

جن لوگوں نے مدرسہ کے مال میں کوئی خیانت کی یا کوئی مدرسہ کے حقوق میں زیادہ کوتاہی کی وہ یا تو بیماری میں مبتلا ہوا یا کسی مقدمہ میں پھنسا۔ یا پھر اس کے یہاں چوری ہوئی۔ میرے ایک بہت ہی مخلص اور بزرگ ایک جگہ ملازم تھے اور ڈیڑھ سو روپے تنخواہ تھی وہ پانچ سو یا سات سو تنخواہ پر بہت دور دراز تشریف لے گئے۔ ان کی تشریف بری کے تقریباً سال بھر بعد ان کے مکان پر چوری ہوئی اور زبردست نقصان ہوا اللہ مجھے معاف فرمائے میں تو گستاخ ہوں ہی۔ میں نے ان کی خدمت میں ایک خط لکھا کہ حادثہ سے رنج ایک فطری چیز ہے مگر اس حادثہ پر بجائے تعزیت کے مبارکباد دوں گا کہ یہ ضرورت سے زیادہ تحصیل مال کے لیے اتنی دور کا سفر کرنا آپ کی شان کے مناسب نہ تھا۔ آپ دینی حیثیت سے بہت اُونچی جگہ تھے۔ جس کی موجودہ جگہ ہرگز مقابلہ نہیں کرسکتی۔ ان کا میرے پاس بڑے عتاب کا خط آیا کہ اس حادثہ فاجعہ پر ہر ایک نے رنج وغم تعزیت اظہار ہمدردی اور غم میں شرکت لکھی، مگر آپ نے مبارکباد لکھی میں نے پھر لکھا کہ میں نے تو خط کے شروع میں ہی لکھ دیا تھا۔ کہ رنج فطری چیز ہے ہونا ہی چاہیے۔ مگر آپ کی شان کے مناسب نہ تھا کہ اہم دینی خدمت کو آپ نے چھوڑا اور بڑی تنخواہ پر دوسری جگہ تشریف لے گئے۔ اس قصہ کو اگرچہ نمبر کے شروع حصے سے زیادہ تناسب نہیں مگر قریب ہی قریب ہے۔

(۴)...... اللہ تعالیٰ کے انعامات تو لا تعد ولا تحصیٰ ہیں ان کا احصاء وشمار تو کسی طاقت بشری سے بھی ممکن نہیں۔ ایک واقعہ اور یاد آ گیا جو تحدیث بالنعمۃ کے ذیل میں ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہاں ذہن میں نہیں رہا۔ سہارنپور کے قیام میں مالک نے ہمیشہ ہی دوستوں کو مجھ پر ایسا مسلط کر رکھا کہ اس ناکارہ کے نہلانے کے وقت بھی ابتدائے مدرسی سے ہی یا ایک دو سال بعد اتنے احباب جمع ہو جاتے ہیں، میں ان کو منع کرتا ہوں، روکتا ہوں اور خفا بھی ہوتا ہوں مگر غسل جمعہ میرا غسل میت ہی ہوتا ہے۔ بدن کو ملنے والے ہاتھ، کمر، پاؤں کو رگڑنے والے ہر ایک الگ الگ بہت سے ہو جاتے ہیں۔ ۴۴ھ میں جب یہ ناکارہ حضرت قدس سرہٗ کے ساتھ ایک سالہ قیام کے لیے گیا تو مدینہ منورہ حاضری پر ابتداءً کچھ اجنبیت سی تھی۔ مقامی احباب سے تعلقات زیادہ وسیع نہیں تھے۔

مدینہ منورہ میں ایک ڈاکو کا مجھ سے تعلق:

میرے مدینہ منورہ پہنچنے پر ایک نہایت پہلوان لحیم شحیم آدمی نہ معلوم مجھ پر کیوں مسلط ہو گیا۔ اجنبی آدمی جان نہ پہچان۔ مگر جمعہ کے دن زبردستی وہ میرے کپڑے لے کر دھوتا اور جمعہ کے روز اس قدر بے دردی سے غسل کے وقت بدن رگڑتا کہ ایک بھی دس پر غالب تھا۔ میں نے اس سے بارہا پوچھا کہ تم کون ہو؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟ ہمیشہ اس نے یہی جواب دیا کہ مستقل قیام کے لیے مدینہ پاک آیا ہوں۔ اللہ نے مجھ پر کرم کیا، احسان کیا، اپنے حبیب پاک کے دربار میں قیام کی توفیق دی، لیکن جب میں ذیقعدہ میں واپس ہونے لگا تو ایک دو دن پہلے اس نے بھی کہا کہ میں بھی ہندوستان جا رہا ہوں۔ میں نے بہت استعجاب سے پوچھا کہ تو تو مستقل قیام کے لیے کہہ رہا تھا اب واپس جا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے آپ کو کبھی اپنا قصہ ہی نہیں سنایا، آپ نے کئی دفعہ پوچھا بھی، مگر مجھے یہ خیال ہوا کہ کہیں آپ مجھ سے زیادہ نہ ڈر جائیں۔ مجھے نکال نہ دیں۔

میں ریاست رام پور کا ایک مشہور ڈاکو ہوں کئی قتل کر چکا ہوں۔ مجھ پر قتل کا مقدمہ ہو گیا اور وارنٹ میرے نام جاری ہو گیا۔ میں وہاں سے روپوش ہو کر یہاں آ گیا۔ اللہ نے میری سچی توبہ قبول کر لی اور اپنے فضل سے آپ تک پہنچا دیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ واپسی کی کوئی صورت نہیں، اس لیے کہتا تھا کہ ہمیشہ کے لیے آ گیا ہوں۔ کل میرے گھر سے خط آ گیا کہ تیرا مقدمہ ختم ہو گیا اب شوق سے آ جا، اس لیے جا رہا ہوں۔ تم ہی سوچو کہ اس قصہ میں بھی مالک کا مجھ پر کتنا احسان تھا کہ میری خدمت کے لیے ایک ڈاکو کو مدینہ میں ہی پہنچا دیا اور جب آنے لگا تو اس کو معافی بھی مل گئی۔

"اللّٰهم لا أحصي ثناءً عليك انت كما أثنيت علىٰ نفسك رب أعني علىٰ ذكرك و شكرك و حسن عبادتك."

ماموں عثمان مرحوم کا ایک دلچسپ واقعہ:

(۵)......اسی کے مناسب ایک قصہ یاد آیا۔ میرے ایک ماموں تھے، پروفیسر حافظ محمد عثمان، میری والدہ کے حقیقی چچازاد بھائی، علی گڑھ میں پروفیسر تھے، غالباً ڈیڑھ ہزار تنخواہ تھی یا کچھ کم ہوگی۔ اس کے بعد پشاور منتقل ہو گئے تھے اور ریٹائر ہونے تک وہیں مقیم رہے، مرحوم کو مجھ سے بڑی ہی محبت تھی اور ان کے دو چھوٹے بھائی الحاج ماموں داؤد صاحب جو آج کل ایبٹ آباد کے مشہور وکلاء میں ہیں اور ان کے چھوٹے بھائی الحاج ماموں حکیم یامین صاحب جو آج کل مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے ناظم مالیات ہیں۔ یکے بعد دیگرے ہر ایک مظاہر علوم کے فارغ التحصیل ہیں۔ ماموں عثمان صاحب مرحوم اس سیہ کار اور اپنے بھائیوں کی وجہ سے علی گڑھ کے قیام میں بھی اور

پشاور کے قیام میں بھی تقسیم سے پہلے تک کاندھلہ آتے جاتے سہارنپور ضرور آتے اور چونکہ واقعی مجھ سے بہت محبت وشفقت فرمایا کرتے تھے، اس لیے گھنٹوں مجھ سے مناظرے بھی کرتے تھے، ان کا اصرار تھا کہ عربی طلبہ کو عربی کے ساتھ انگریزی ضرور پڑھائی جائے تاکہ معاشی مشکلات سے بے فکری رہے، صرف عربی پڑھنے سے جو تنخواہیں ملتی ہیں وہ ناکافی ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کہ ناکارہ اس وقت بھی اور اب تک بھی عربی کے ساتھ انگریزی یا کسی دوسری تعلیم یا دستکاری وصنعت کا بہت سخت مخالف ہے۔ اس لیے کہ تجربہ یہ ہے کہ دوسری چیزوں میں اشتغال کے بعد عربی تعلیم میں بہت نقصان پہنچتا ہے۔ مگر مرحوم عربی پڑھنے والوں کی مالی بدحالی اور انگریزی پڑھنے والوں کی خوشحالی کو خوب بیان کرتے تھے، اسی بناء پر انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی ماموں داؤد کو جس کی عربی علمی استعداد بہت عمدہ تھی اور مولانا عبدالرحمن صاحب سابق صدر مدرس مظاہر علوم نے بھی ۴۵ھ میں مجھے مدینہ پاک ان کے متعلق لکھا تھا کہ مولوی داؤد بہت ذی استعداد ہیں چناں چنیں ہیں ان کو مدرسہ میں ضرور رکھا جائے۔ مگر عثمان مرحوم نے ان کو اپنے نظریہ کے موافق انگریزی پڑھا کر ہم سے کھودیا، ماموں عثمان مرحوم ایک مرتبہ جمعہ کے دن تشریف لائے۔ بارہ بجے کے قریب مجھے غسل کرانے کے لیے ایک فوج مجھ پر مسلط ہوگئی، وہ بہت غور سے دیکھتے رہے، غسل کے بعد کہنے لگے کہ یہ ٹھاٹ ہیں۔ میں نے کہا کہ ہم فقیروں کے کیا ٹھاٹ ہیں، ٹھاٹ تو آپ رئیسوں کے ہیں جن کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپے ہے، کہنے لگے کہ ہم کو نہلانے والے دو بھی نہیں ملتے یہاں دس لپٹ رہے ہیں۔ جمعہ کی نماز کے بعد کھانے میں شرکت ہوئی۔ اتفاق سے اس زمانے میں میرے بائیں ہاتھ کی انگلی میں کچھ نکل رہا تھا، اس پر پایہ تو لگا ہوا نہیں تھا البتہ مرہم لگا ہوا تھا۔ اس لیے اس زمانے میں میرے دوست احباب کھانے سے فارغ ہوتے ہی پانی کا لوٹا سلفچی وغیرہ لے کر آتے اور میں ہاتھ پھیلا دیتا۔ ایک آدمی پانی ڈال دیتا اور دوسرا شخص صابن سے ہاتھ دھو دیتا اور تیسرا جلدی سے تولیہ سے ہاتھ پونچھ دیتا۔ کہنے لگے کہ مولوی زکریا! خدا کی قسم تنعم کی بھی کوئی حد ہو، تم سے اپنا ہاتھ بھی نہیں دھلتا، وہ بھی خدام ہی دھوتے ہیں۔ میں نے کہا، ماموں جی! میں تو فقیر آدمی ہوں، میری تو ڈیڑھ ہزار تنخواہ بھی نہیں۔ آپ انگریزی پڑھے ہوئے ہیں ڈیڑھ ہزار تنخواہ ہے، میں انگریزی سے ناواقف ہوں، بھلا میں آپ کی کیا حرص کرسکتا ہوں، فرمانے لگے کہ ایسی تیسی ڈیڑھ ہزار کی یہاں تو دو آدمی بھی ہاتھ دھلانے کے لیے نہیں ملتے۔ کہنے لگے مجھے تخلیہ میں کچھ بات کرنی ہے۔ میں نے کہا کہ آج تو موقعہ نہیں ملے گا، کل صبح کو اوپر کمرہ میں چلیں وہاں بات ہوجائے گی۔

وہاں کمرے میں پہنچتے ہی ایک پنجہ لٹکا ہوا ملا۔ جو لکڑی کا بھی ہوتا ہے اور تانبے پیتل کا بھی ہوتا ہے۔ ایک لانبی سی ڈنڈی اور اس کی جڑ میں ہاتھ کی اُنگلیوں جیسے نشان ہوتے ہیں۔ کمر وغیرہ

کھجانے کے کام آتا ہے۔ حدیث پاک میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں ہے، ''ومع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم مدری یحک به راسه کذا فی المشکوٰة عن الصحیحن'' کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک مدری (پنجہ) تھا جس سے سر مبارک کو کھجا رہے تھے۔ اس کو دیکھتے ہی ماموں عثمان کہنے لگے کہ یہ کیا چیز ہے؟ میں نے کہا کہ یہ کمر کھجانے کے لیے ہے، اگر کوئی خادم نہ ہو اور خود ہی کھجانا پڑ جائے تو اس سے مدد ملتی ہے۔ انہوں نے بہت غور سے اس کو اٹھا کر دیکھا۔ میں نے کہا کہ پسند ہو تو آپ کی نذر ہے کہنے لگے کہ پسند تو ہے واقعی بڑی اچھی چیز ہے اور ہم جیسوں کے لیے تو بہت ضروری جن کے پاس خدام نہ ہوں، مگر تم سے لیتے ہوئے غیرت آتی ہے۔ میں نے کہا غیرت کی کوئی بات نہیں۔ میری ڈیڑھ ہزار روپے تنخواہ نہیں ہے جس پر میں یہ کہوں کہ میں دوسری خرید لوں گا۔ لیکن قوی امید ہے کہ جس مالک نے یہ دی ہے وہ اور بھی دے دے گا۔ آپ اسے شوق سے لے جائیں۔ میں نے بہت ہی اصرار کیا مگر اپنا دل چاہنے کے باوجود نہ لے گئے، نہ معلوم کیا غیرت آئی۔ لیکن مرحوم کا یہ مناظرہ آخر تک رہا۔ ان کا وہی فقرہ مختلف عنوانات سے کہ دنیا دارالاسباب ہے اور میرا وہی جواب کہ مقدر سے زیادہ کہیں نہیں مل سکتا۔ جس کی کچھ تفصیل آپ بیتی نمبرا میں لکھوا چکا ہوں میں نے ان سے بارہا یہ بھی کہا آپ سے کہنے کی تو بات نہیں اللہ تعالیٰ معاف فرمادے، تمہاری ڈیڑھ ہزار اور میری ضابطہ میں صرف ۳۵ روپے تنخواہ ہے وہ بھی کبھی ملتی ہے اور کبھی نہیں، مگر آپ خود ہی ملاحظہ فرمالیں کہ الحمدللہ یہ ناکارہ مالی حیثیت اور راحت و آرام کے اعتبار سے آپ سے کہیں زیادہ ہے۔ کہنے لگے کہ تمہاری اور بات ہے، اس پر ہر ایک کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے کہا اور بات ہے، اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ان سے کئی مرتبہ یہ بھی کہا کہ آپ ہی سوچئے کہ ایک کتا آپ کے دروازے پر پڑ جائے، آپ کے مکان کی حفاظت کرے اور ہر آنے والے پر بھونک کر متنبہ کرے تو کیا آپ کی غیرت تقاضہ کرے گی کہ اس کو کوئی ٹکڑا نہ ڈالیں۔ آپ مجبور ہوں گے کہ دسترخوان کی بچی ہوئی روٹی، ہڈی اس کو ضرور ڈالیں۔ تو مالک الملک رب العالمین جس کے ایک لفظ ''کن'' میں دنیا کے سارے خزانے ہیں، اس کے دروازے پر کوئی شخص اس کے کام کی نیت سے اخلاص سے بغیر خود غرضی کے اس کے دین کی خدمت کے واسطے پڑ جائے، کیا وہ اپنے خدمت گاروں کو بھوکا ننگا رکھ سکتا ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں ساری دنیا سے زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ غیرت مند ہیں۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ آپ کی غیرت تو تقاضہ نہ کرے کہ وہ کتا بھوکا رہ جائے اور اللہ جل جلالہٗ کی غیرت اس کا تقاضہ کرسکتی ہے کہ اس کے دین کی خدمت کرنے والا بھوکا رہ جائے یہ ناممکن ہے اور جن اکابر کے یا

سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے فقر و فاقہ کے واقعات ہوئے ہیں وہ اختیاری خود مانگے ہوئے ہیں اور عین محبوب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات تو خود مصرح ہیں۔

مشکوٰۃ شریف میں ترمذی شریف مسند احمد کے حوالے سے حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے واسطے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے مجھ سے یہ پیش کش فرمائی کہ ''اگر تم چاہو تو مکہ کے سارے جنگلوں، سنگستانوں کو سونا بنا دیا جائے۔'' میں نے عرض کیا کہ ''یا اللہ مجھے نہیں چاہیے، میں چاہتا ہوں کہ ایک دن شکم سیر ہو کر کھاؤں اور ایک دن فاقہ کروں، تاکہ جس دن بھوکا رہوں آپ کے سامنے دست سوال پھیلاؤں، عاجزی کروں اور آپ کو یاد کروں اور جس دن پیٹ بھر کر کھاؤں، اس دن تیرا شکر ادا کروں اور حمد و ثنا کروں۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور دعاء ہے ''اللّٰھم اجعل رزق اٰل محمد قوتاً'' اے اللہ میری اولاد کی روزی بقدر کفایت عطاء فرما۔ اسی دعاء کی وجہ سے سادات عموماً مالدار نہیں ہوتے، الا ماشاء اللہ۔ مشکوٰۃ شریف کی دوسری طویل روایت میں نقل کیا گیا ہے کہ ''اگر میں چاہوں تو سونے کے پہاڑ میرے ساتھ ہر جگہ پھرا کریں۔'' اللہ تعالیٰ کی اس میں بڑی حکمتیں ہیں۔

ایک قصہ میں نے پہلے بھی لکھوایا، جو میں نے اپنے والد صاحب سے بیسیوں مرتبہ سنا ہے مگر باوجود تتبع کے مجھے اب تک نہیں ملا، فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اماں جی کو (یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) جزائے خیر عطاء فرمادے وہ ہمارا تو ناس مار گئیں لیکن اُمت کا بھلا کر گئیں۔ وہ یہ بددعاء دے کر گئیں کہ ''اللہ ان علماء کی روزی پریشان کردے'' اور اُمت کے لیے یقیناً بڑی خیر کی دعاء ہے۔ ہم مولویوں کو بے فکری اور اچھی طرح کھانے کو مل جائے تو ہم سیدھے منہ کسی سے بات بھی نہ کریں۔ ان مدرسوں کے چندوں کی بدولت ہر ایک سے خوشامد کرنی پڑتی ہے، فاسق و فاجر، ڈاڑھی منڈوں کے سامنے بھی جھکنا پڑتا ہے۔

حافظ یوسف رائپوری نور اللہ مرقدہ کا عجیب واقعہ:

(۶)...... یہ واقعات کسی خاص شخصیت سے متعلق یا کسی خاص مضمون کے ساتھ مرتبط نہیں۔ کیف ما اتفق جو علی گڑھ میں چارپائی پر پڑے پڑے یاد آتے رہے نوٹ کراتا رہا۔ حضرت الحاج حافظ محمد یوسف صاحب رامپوری قدس سرہٗ ابن قطب الاقطاب سید شہداء زمانہ حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمہ اللہ تعالیٰ جن کے مختصر حالات یہ ناکارہ ارشاد الملوک کی تمہید میں لکھوا چکا ہے۔ حافظ محمد یوسف صاحب بڑے اونچے لوگوں میں تھے۔ ''الولد سِرّ لابیہ'' کے سچے مصداق تھے۔ اپنے والد صاحب قدس سرہٗ کی طرح سے بڑے ظریف خوش طبع، بھوپال میں تحصیل دار

رہے آخر میں رامپور تشریف لے آئے تھے۔ ایک دن میرے ماموں مولانا حافظ محمود صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے جو قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم کے خسر تھے، ان کے لڑکپن میں فرمایا کرتے تھے کہ محمود ہمارے پاس کچھ چٹکلے ہیں ہم سے پوچھ لینا، گھر بیٹھے دو سو روپے ملا کریں گے۔ اس زمانے کے دو سو آج کل کے دس ہزار کے بقدر تھے۔ مجھے اپنے بچپن کا خوب یاد ہے کہ ایک پیسے کا سولہ گنڈے کوڑیوں کے آتے تھے یعنی ۶۴ عدد، کیونکہ ایک گنڈا چار عدد کوڑیوں کا ہوتا تھا۔ معمولی گھرانے والی عورتیں بچے کو ایک پیسہ دے کر یوں کہا کرتی تھیں کہ دو کوڑی کا نمک، دو کوڑی کی مرچیں، دو کا دھنیہ، ایک کی ہلدی اور چار کوڑی کا گوشت۔ سولہ سترہ کوڑیوں میں یعنی ایک پیسہ کے چوتھائی حصہ میں گھر کی یہ سب چیزیں آجاتی تھیں۔ حافظ محمود صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

عصر کی نماز میں تکبیر ہو رہی تھی، صف سے آگے کو منہ نکال کر فرمایا کہ ارے محمود ہماری بات یاد رکھنا کل کو ہمیں سفر میں جانا ہے۔ وہ سمجھے کہ گنگوہ یا جھنجھانہ وغیرہ جانا ہوگا کہ اس زمانے میں یہ اکابر کچھ سواریوں کے محتاج نہ تھے۔ لنگی کاندھے پر اور لکڑی ہاتھ میں بس چلے جا رہے ہیں۔ لمبے لمبے سفر اسی طرح پیدل طے فرمایا کرتے تھے۔ تذکرۃ الخلیل میں حضرت مولانا مظفر حسین صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے اس قسم کے واقعات نقل کیے گئے ہیں۔ اگلے روز حافظ صاحب نے گنگوہ، تھانہ بھون، جھنجھانہ، دیوبند وغیرہ خطوط تحریر فرمائے کہ آج سفر کا ارادہ ہے، لوگ سمجھے کہ اکثر قرب وجوار میں بھی جاتے رہتے ہیں ممکن ہے کہ بھوپال کا ارادہ ہوگا یا کسی قریب جگہ کا۔ دوسرے دن عصر کی نماز جماعت سے پڑھی اور مسجد کے صحن کے سامنے ایک چارپائی پڑی تھی اور اس پر اکثر لیٹا بھی کرتے تھے، وہاں پہنچ کر کرتہ نکالا، صرف لنگی بندھی ہوئی تھی قبلہ کی طرف منہ کر کے لیٹ گئے اور یہ جا وہ جا۔ نمازی مسجد سے نکل کر محل (حویلی) جو مسجد کے قریب بہت مشہور ومعروف مکان اعزہ کے ہیں وہاں تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ مسجد کا مؤذن بھاگا ہوا گیا کہ چلو حافظ جی کو دیکھو کیا ہوا۔ جب سب واپس آئے تو دیکھا کہ حضرت حافظ صاحب ابدی سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔

جس زمانے میں حضرت حافظ صاحب نور اللہ مرقدہٗ بھوپال میں تشریف فرما تھے اس زمانے کے تصرفات کے قصے بھی بہت مشہور ہیں۔ اخفاء حال بہت تھا، دوسروں کے سامنے تہجد بھی نہیں پڑھتے تھے، ایک تقریب میں تشریف لے گئے بعض اعزہ کو خیال ہوا کہ آج حافظ صاحب کے معمولات دیکھنے کا موقع ملے گا، جب سب لیٹ گئے اور حافظ صاحب نے اندازہ کیا کہ یہ سب سو گئے ہوں گے تو چپکے سے اُٹھے، لوٹا اُٹھانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ایک صاحب جلدی سے چارپائی پر بیٹھ گئے۔ حافظ صاحب جلدی سے اپنی چارپائی پر لیٹ گئے، آدھے پون گھنٹے بعد یہی صورت

پیش آئی۔ حافظ صاحب پھر لیٹ گئے، تیسری دفعہ جب یہ قصہ پیش آیا تو ان صاحب کے پیٹ میں درد اس قدر شدید ہوا کہ تڑپ گئے۔ حافظ صاحب سے معافی مانگی اور جب وہ بہت بے قرار ہوا اور حافظ کو ترس آیا تو فرمایا کہ دوسروں کو ستانے کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔ جب حافظ صاحب بھوپال میں تحصیل دار تھے تو میرے نانا نور اللہ مرقدہٗ ان کا نام بھی حافظ محمد یوسف صاحب ہی تھا اپنے بچپن میں ان کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔ بڑے قصے حضرت حافظ کے سنایا کرتے تھے اور بے تکلف بھی بہت تھے۔

ایک مجذوب بھوپال میں آیا، بڑی اس کی شہرت اور خوارق وکشوف میں مشہور اور ہر شخص سے اس نے تمنا ظاہر کی کہ میں حضرت حافظ صاحب سے تخلیہ میں دو بات کرنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے کہا کہ حافظ محمد یوسف صاحب کاندھلوی تو ان سے کہہ سکتے ہیں اور کسی کو جرأت نہیں ہے۔ وہ نانا ابا کے پاس آئے، انہوں نے اپنے زورِ تعلق میں وعدہ فرمالیا اور حضرت حافظ صاحب سے آکر کہا کہ ایک مجذوب صاحب چناں ہیں اور آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں ان کو کس وقت بلاؤں۔ حضرت حافظ صاحب نے فرمایا کہ میں اس نالائق سے نہیں ملنا چاہتا۔ نانا ابا نے کہا کہ حضرت وہ تو اتنے پہنچے ہوئے ہیں کہ وہیں بیٹھے ہوئے آپ سے مل لیں گے۔ حافظ صاحب نے فرمایا کہ میں تو اس کے باپ کو بھی نظر نہیں آسکتا جا بھاگ جا۔ نانا ابا نے معذرت کردی، اس نے سب کی خوشامد بہت کی مگر حافظ صاحب نے قبول نہیں فرمائی۔

سنا ہے کہ میرے نانے ابا کو اللہ معاف فرمائے کہ بچپن میں ناچ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ حافظ صاحب کو خبر نہیں تھی اتفاق سے کسی نے شکایت کردی۔ حضرت حافظ صاحب نے میرے نانا صاحب کو بلایا کہ میاں یوسف! ہم نے سنا ہے کہ تم کو ناچ دیکھنے کا بہت شوق ہے اور آج تو سنا ہے کہ بہت ہی عمدہ ناچنے والی آئی ہے، دیکھو ناچ یوں نہیں دیکھا کرتے کہ فقیروں کی طرح منہ الالل کر دیکھنے کھڑے ہوگئے اور اپنی جیب سے پانچ روپے نئے نکال کر ان کو دیے اور فرمایا کہ ناچ دیکھنے کا دستور یہ کہ وہ جب سامنے آکر ٹھمری لگادے تو ایک روپیہ اس کی طرف پھینکو، پھر دیکھو کہ وہ کیسا تم کو گھورے گی اور جب تمہاری طرف آئے گی تو پھر تمہاری طرف ہی دیکھے گی۔ نانا ابا اس قدر خوش ہوئے کہ اجازت بھی ملی اور روپے بھی اور نماز عشاء کے بعد پہلے ہی سے جا کر اگلی صف میں کھڑے ہوگئے۔ سارا میدان مجمع سے لبریز اور اس کی آمد کا مشتاق تھا، تھوڑی دیر میں معلوم ہوا کہ اس ناچنے والی کے پیٹ میں سخت درد ہے، حکیم، ڈاکٹر لیجیو دیجیو خوب شروع ہوئی، رات بارہ بجے تک سراپا اشتیاق اور دست بہ دعاء۔ مگر ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔'' رات کو جب نانا ابا واپس لوٹے تو حضرت آرام فرمانے چلے گئے تھے۔ صبح کو وہ روپے حضرت حافظ صاحب کے

پیروں میں پھینکے اور عرض کیا کہ مجھے ویسے ہی منع فرما دیتے، آپ نے اس بیچاری کو کیوں مارا۔ حضرت حافظ صاحب نے بطور تجاہل عارفانہ کے پوچھا کہ کیا ہوا؟ عرض کیا کہ آپ کو خبر نہیں کیا ہوا؟ آپ ہی نے تو اس غریب کو مارا۔ نانا ابا فرمایا کرتے تھے کہ اس دن سے ناچ سے ایسی وحشت ہوئی کہ ناچ کے نام سے بھی تے ہوتی تھی۔ قصے تو بچپن میں ماموں محمود صاحب رامپوری سے اور نانا ابا سے خوب ہی سنے۔ اس وقت کچھ اچھی طرح یاد بھی نہیں آرہے اور طول بھی ہوتا جارہا ہے۔

نانا ابا اور ان کے تعویذ

(۷)...... میرے نانا صاحب کو تعویذ کا بہت ہی شوق تھا۔ حضرت حاجی صاحب گنگوہی قدس سرہٗ، حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی اور نہ معلوم کتنے نام بتایا کرتے تھے محض تعویذ سیکھنے کے لیے۔ ان اکابر کی خدمت میں تشریف لے گئے۔ بعض تعویذ کی زکوٰۃ انہوں نے ساری رات دریا میں ایک پاؤں سے کھڑا ہو کر ادا کی اور بعض جگہ صرف ایک سیکھنے کے لیے کئی کئی دن سفر بھی اختیار کیے۔ ان کے تعویذ اور وظیفے بھی بڑے زوردار تھے۔ جو بیمار ایسا ہوتا کہ سارے تیماردار اس سے عاجز آچکے ہوں تو تیماردار کہتے کہ نانا ابا، بڑے ابا، دادا ابا، مختلف خطابات دے کر کہتے کہ اب تو وظیفہ پڑھ دو باقی سب عاجز آچکے ہیں۔ اول تو وہ ٹال مٹول کرتے اور پھر سختی سے ڈانٹتے اور پھر جب بہت ہی اصرار ہوتا تو مریض کے قریبی رشتہ داروں سے اجازت لیتے کہ پڑھ دوں؟ اور جب سب متفق اللسان ہو کر کہتے کہ پڑھ دیجئے تو بیٹھ کر پڑھتے، اس میں عجیب تاثیر میں نے خود دیکھی۔ یہ وظیفہ تقریباً تین گھنٹے کا ہوا کرتا تھا۔ لیکن عموماً دو گھنٹے بعد یا تو گھر والے کفن کے لیے آدمی بھیج دیتے یا مریض اپنے سہارے سے بیٹھ کر یہ کہتا کہ بھوک لگ رہی ہے کچھ کھانے کو دے دو، ایک خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔

ایک معرکۃ الآراء وظیفہ چوری کے لیے بھی تھا۔ ہر چوری پر تو کبھی نہیں پڑھتے تھے خواہ کوئی کتنا ہی اصرار کرے۔ بعض دفعہ تو درخواست کرنے والوں کو ڈانٹتے کہ اللہ نے اس کی روزی اسی میں رکھی تھی تو زبردستی کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جس چوری کے متعلق ان کو بھی اہمیت پیدا ہو جاتی تو اس کے واسطے وہ بھی پڑھا کرتے تھے اور آس پاس جہاں شبہ ہوتا تو جاسوس مقرر کرتے کہ کسی کو دست جاری ہوئے یا نہیں اور جہاں معلوم ہوتا کہ فلانے کو دست لگ گئے وہاں چپکے سے پیام بھیجتے کہ اگر تو نے واقعی چوری کی ہے تو وہ چیز چپکے سے میرے پاس دے جا میں نام ظاہر نہیں کروں گا ورنہ جتنی چاہے دوائیاں اور دعائیں کرلے یاڑی دستوں سے مرجائے گا۔ وہ شخص چپکے سے بھیج دیتا اور دست بند ہو جاتے اور مالک کو بلا کر وہ چیز اس کو دے دیتے تھے اور وہ لوگ جتنا چاہے

اصرار کر لیتے کہ اس کا نام بتا دو، مگر وہ نام نہیں بتاتے تھے۔

ان کے اور بھی معرکۃ الآراء تعویذوں کے قصے ہیں۔ بیماری چونکہ کئی سال رہی اس لیے انہوں نے اپنی بیماری کے زمانے میں جب تین سال تقریباً ان کی بیماری کو گزر گئے میں اتفاق سے کاندھلہ گیا ہوا تھا۔ میری مستقل عادت ہمیشہ رہی کہ ایک ہی رات جاتا ہوا ایک ایک چکر اپنے سب رشتہ داروں کے یہاں حسب مراتب ضرور کیا کرتا۔ حسب مراتب کا مطلب یہ ہے کہ کہیں تو ایک دومنٹ اور کہیں پندرہ منٹ، آدھ گھنٹہ بیٹھتا۔ میں جب نانا ابا کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے فرمایا میں تو تجھے بہت دنوں سے بہت ہی یاد کر رہا ہوں تجھے معلوم ہے کہ میں نے یہ تعویذ کس محنت سے حاصل کیے اور کتنے مفید اور مجرب اور کارآمد ہیں۔ تیرے سوا تو میرا کسی کو دینے کو دل چاہتا نہیں۔ میرا یوں جی چاہتا ہے کہ تو ایک دو دن ٹھہر کر میری بیاض مجھے سنا دے، میں اس میں جو تجھے بتانا ہو گا بتا دوں گا۔ میں نے عرض کیا، جی نانا ابا میں حضرت سے ایک ہی دن کی اجازت لے کر آیا تھا۔ اس لیے اب تو نہیں ٹھہر سکتا آئندہ سفر میں انشاءاللہ دو دن کی اجازت لے کر آؤں گا۔

مجھے تعویذوں کا شوق اس وقت تو کیا اب تک بھی نہیں ہوا۔ وہ تو زمانہ میرے طلب علم کا تھا، مجھے نانا صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے کہنے پر اس قدر بوجھ پڑا کہ اب تک بھی یاد ہے۔ میرا خیال تھا کہ طبیعت ناساز ہے، اگلے پھیرے تک چل دیں گے۔ میں تقریباً چھ سات مہینے کے بعد گیا وہ حیات تھے، میں اس ڈر کے مارے ملنے بھی نہیں گیا۔ آٹھ، نو مہینے کے بعد پھر دوبارہ کاندھلہ جانا ہوا اور انہیں خبر ہوگئی کہ وہ بار بار پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بلایا اور قلق کا اظہار کیا اور کہا کہ تو پہلے پھیرے میں مجھ سے مل کر بھی نہیں گیا۔ میں نے کہا بہت عجلت میں آنا ہوا تھا اور اب بھی بہت جلدی میں آنا ہوا ہے اور اس واسطے دو تین دن قیام ضروری ہے۔ میں انشاءاللہ مستقل وقت لے کر واپس آؤں گا۔ ان کو اپنی اس بیاض کا بہت ہی اہتمام تھا۔ مجھے تو قلق اب بھی نہیں ہوا، اس لیے کہ مجھے تعویزوں سے بالکل ہی مناسبت نہیں۔ میرے تعویذوں کی ابتداء تو یہ ہے کہ میرے حضرت قدس سرہٗ کے ہاتھ میں رعشہ تھا، جب حضرت قدس سرہٗ سے کوئی شخص تعویذ مانگتا میں ہر وقت حاضر رہتا ہی تھا۔ حضرت ارشاد فرما دیتے، اس مرض کے مناسب کوئی قرآن کی آیت یا دعاء یاد ہو تو لکھ دو میں لکھ دیتا۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ حضرت کی برکت سے اس میں فائدہ دے دیتے۔ ابتداءً تو یہی معمول رہا۔ مگر جب تعویذوں کی بھرمار ہوگئی تو بجائے قرآن پاک کی آیت یا حدیث پاک کی دعاء کے کوئی اللہ کا پاک نام لکھ دیتا اور اللہ جل شانہٗ اپنے پاک ارشاد ''انا عند ظن عبدی بی '' یعنی میں بندہ کے ساتھ ہوں اس کے حسن ظن کا معاملہ کرتا ہوں، کی بنا پر اللہ تعالیٰ اس میں بھی فائدہ دے دیتے تھے اور اب تو کئی سال سے یہ سلسلہ بھی نزول آب کی وجہ سے بند ہو گیا۔ دوسرے

احباب ہی جو میں بتا دیتا ہوں لکھ دیتے ہیں۔ مجھے نانا ابا کے زمانے میں خبر نہیں تھی کہ یہ تعویذوں والا مسئلہ بھی میرے پیچھے اس بُری طرح پڑے گا، ورنہ دو چار اہم تعویذ سیکھ ہی لیتا۔

ایک بادشاہ اور کیمیا کا ایک عجیب قصہ:

(۸)......ایک عجیب قصہ بڑی عبرت کا میں نے اپنے والد صاحب سے کئی مرتبہ سنا، ایک بادشاہ تھا۔ اس کو کیمیا کی دھت تھی اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ جس کو کیمیا کا مرض پڑ جاتا ہے۔ اس کی عقل و ہوش شطرنج کے کھلاڑی سے بھی زیادہ کھو جاتا ہے۔ میں نے اپنے کئی دوستوں کو دیکھا جن کو اس کا چسکا تھا۔ جب ان کا راستے میں کہیں ساتھ ہو جاتا وہ قدموں پر نگاہ جمائے کبھی ادھر کبھی اُدھر دیکھتے جایا کرتے اور جہاں کہیں شبہ ہو جاتا وہاں کھڑے ہو کر اور بوٹوں کو دیر تک مل مل کر سونگھتے تھے۔ بادشاہ بھی اسی فکر میں ہر وقت رہتا۔ وزراء کا ناطقہ بند رکھتا۔ ایک وزیر نے کہا کہ حضور اتنے متفکر رہتے ہیں، حضور کی سلطنت میں تو فلاں سقہ فلاں جگہ رہتا ہے بڑا ماہر ہے اسے خوب بنانی آتی ہے۔ بادشاہ کو بڑی حیرت ہوئی، کہنے لگا ہماری سلطنت میں اس کا جاننے والا ہے اور ہم اتنے پریشان ہو رہے ہیں۔ چار سنتری بھیج دیے کہ اس سقے کو پکڑ لاؤ۔ سقہ پیش ہوا، کپڑے پھٹے ہوئے، لنگوٹا بندھا ہوا بدن پر، بجائے کرتے کے ایک گاڑھے کی کمری بہت پھٹی ہوئی۔ بادشاہ کو اس کی صورت دیکھتے ہی بہت نفرت ہوئی۔ اس سے پوچھا کہ تجھے کیمیا بنانی آتی ہے؟ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ”حضور تو بادشاہ ہیں، سمجھ دار ہیں، دنیا کے حاکم ہیں، اگر مجھے کیمیا آتی تو میرا یہ حال ہوتا جو حضور دیکھ رہے ہیں۔ میں بھی کوئی محل ایسا ہی بناتا جیسا حضور کا ہے۔“ بات معقول تھی بادشاہ کی بھی سمجھ میں آگئی، چھوڑ دیا اور اس وزیر کو بُلا کر ڈانٹا۔ وزیر نے قسم کھائی کہ حضور مجھے تو خوب تجربہ ہے، اسے خوب آتی ہے۔ بادشاہ نے سلطنت کا انتظام ولی عہد کے سپرد کیا، بدن پر بھبھوت ملا تا کہ پہچانا نہ جائے اور اس وزیر کو ساتھ لے کر سقہ کے گھر پہنچا، جب اس نے گھر کا نشان بتایا وزیر کو چلتا کر دیا۔ ”حب الشیٔ یعمی ویصم“ چیز کی محبت آدمی کو اندھا بہرا کر دیتی ہے۔ جب وہ سقہ گھر سے نکلا یہ بیٹھا رہا۔ جب وہ شام کو پانی ڈالنے جانے لگا تو اس کے ساتھ ہو لیا۔ کہنے لگا بڑے میاں آپ تو بہت بوڑھے ہو گئے ہیں، آپ کو تو بڑی دقت ہوگی، میں تو گھر سے فالتو مارا مارا پھرتا ہوں، اگر آپ مجھے ٹھکانے بتا دیں تو میں ہی گھروں میں پانی ڈال آیا کروں، سقہ نے کہا نہیں بھائی میری تو روزی اسی میں ہے تو اپنا کام کر۔ کہنے لگا بڑے میاں تم مجھے کچھ اچھے ہی بہت لگے ہو، میں تو تمہاری خدمت میں رہنا چاہتا ہوں، تم سے کچھ مانگنے کا نہیں، نہ مجھے روٹی چاہیے اور نہ کچھ۔

شام کو سقہ نے جب وہ روٹیاں مانگ کر لایا، بادشاہ کی تواضع کی مگر اس نے انکار کر دیا کہ مجھے بالکل بھوک نہیں، غمزدہ ہوں، پریشان ہوں، میں تو کئی کئی دن کا فاقہ کرتا ہوں، سقہ نے بڑے اصرار سے دو چار لقمہ کھلائے۔ (یہاں پھر میں وہی کہوں گا جو ابھی ماموں عثمان کے قصہ میں کہہ کے آیا، ایک سقہ کی غیرت نے تو تقاضہ نہ کیا کہ ایک آدمی اس کا کام کرے اور وہ بغیر اس کے روٹی کھالے، مگر ہم لوگوں کو اس کا بالکل یقین نہیں آتا کہ ہم اخلاص سے اللہ کا کام کریں اور وہ ہمیں بھوکا مار دے، البتہ اتنا فرق ہے سقہ عالم الغیب نہیں تھا، اس لیے دھوکہ میں آگیا۔ مالک عالم الغیب ہے اسے حقیقت حال معلوم ہے کون واقعی اخلاص سے مالک کا کام کر رہا ہے اور کون دھوکہ کر رہا ہے۔)

غرض بادشاہ نے سقہ کی بہت ہی خدمت کی۔ دن بھر اس کا پانی بھرتا، رات کو جب سقہ لیٹتا اس کا خوب بدن دباتا، ہٹا کٹا جوان، قوی، سقے کو بھی پانچ سات دن میں وہ مزا آیا کہ لطف ہی آگیا۔ دو تین مہینے سقے نے خوب ٹٹولا خوشامد کی کچھ کھالے، کچھ پیسے مقرر کر لے۔ بادشاہ نے کہا۔ اجی میاں مجھے مزدوری کرنی ہوتی تو دنیا میں بہت مزدوریاں، مجھے تو تم اچھے لگتے ہو۔ میں تو راستے میں بیٹھ گیا تھا، تمہاری صورت مجھے کچھ اچھی لگی۔ اگلا شعر تو میں نے اپنے والد سے نہیں سنا۔ مگر واقعے کے مناسب تھا یاد آ گیا:

گرے میری نظروں سے خوبان عالم
پسند آگئی تیری صورت کچھ ایسی
دیر وحرم میں روشنی شمس و قمر سے ہو تو کیا
مجھ کو تو تم پسند ہو اپنی نظر کو کیا کروں
گورے کالے پرنہیں موقوف
دل کے آنے کے طریقے نرالے ہیں
دید لیلیٰ کے لیے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشہ ان کا

غرض بادشاہ نے وہ محبت کے جذبے دکھائے کہ سقہ بھی سوچ میں پڑ گیا کہ یہ بڑھاپے میں عاشق زار کہاں سے پیدا ہو گیا۔ کبھی کہتا، ابا جی لنگی باندھ کے کپڑے دے دو میں دھلاؤں، ارے بھائی میں تو خود دھولوں گا، اجی تم بڑھاپے میں کہاں تکلیف اٹھاؤ گے، ان میں جوئیں ڈھونڈتا۔ خوب پٹڑے پر چھیت چھیت کر صاف کرتا۔ کچھ پیسے تو ضرور ساتھ ہوں گے۔ بڈھے کو جھانسہ دے کر کچھ ادھر اُدھر سے کھالیتا مگر بڈھے کے سامنے اپنے فقر وفاقہ اور زہد کا زور دکھاتا۔ چار پانچ

مہینے بعد بڈھے نے کہا۔''ارے لونڈے مجھے کیمیا آتا ہے، بادشاہ نے بھی مجھ سے پوچھا تھا۔ میں (سخت گالی دے کر) اس کو بھی انکار کر آیا۔ تجھے ضرور بتاؤں گا۔'' بادشاہ کی جان میں جان تو آ گئی۔ مگر زبان سے اتنی سختی سے انکار کیا کہ کیمیاء کی ایسی کی تیسی، مجھے تو تمہاری محبت نے مار رکھا ہے۔

آٹھ دس دن تک سقہ اصرار کرتا رہا۔ بادشاہ انکار کرتا رہا۔ ایک دن بڈھے نے کہا، میں بڈھا ہو گیا ہوں یہ اِلم (علم) میرے ساتھ ہی چلا جائے گا۔ کسی اور کو تو میں بتانے کا نہیں۔ تجھے ضرور بتاؤں گا۔ بھائی محبت سے محبت ہوتی ہے مجھے بھی تجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ اگرچہ تو نے مجھے اپنا حال تو بتایا نہیں، کون ہے کہاں سے آیا ہے؟

ابا جی کیا اپنا حال بتاؤں۔ لاوارثی ہوں، یونہی مارا مارا پھرتا ہوں، گھر بھی بھول بھال گیا کہ کہاں تھا، اب تو تم ہی اپنا بیٹا بنالو (غرض میں تو آدمی گدھے کو بھی باپ بنالیتا ہے یہ تو بہر حال آدمی تھا) ایک صبح ہی صبح سقہ بادشاہ کو ساتھ لے کر جنگل کی طرف گیا اور پچیس تیس بوٹیاں اس کو دکھائیں اور اسی سے توڑوائیں اور گھر آ کر اسی سے کیمیا بنوائی۔ بادشاہ تو اس پر مر ہی رہا تھا، خوب غور سے دیکھا اور رات ہی کو بھاگ گیا۔ اگلے دن سقہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ ''کمبخت بہت ہی دھوکہ باز تھا، بے ایمان، یوں کہے تھا مجھے تجھ سے محبت ہے۔ انجان آدمی سے تو کبھی منہ نہ لگائے۔''

اپنے تخت پر پہنچ کر ان ہی سنتریوں کو بھیجا وہ پکڑ لائے بادشاہ نے پوچھا ارے سقے سنا تجھے کیمیا آتی ہے۔ اجی میاں آپ نے تو پہلے بھی پوچھا تھا، مجھے کیمیا آتی تو میں یوں مارا مارا پھرتا۔ مگر پانچ چھ مہینے جس نے پاؤں دبائے ہوں وہ کہاں چھپ سکے تھا۔ سقہ اس کے منہ کو گھورتا رہا۔ بادشاہ نے کہا مجھے بھی پہچان لیا۔ سقہ نے کہا میاں خوب پہچان لیا۔ بادشاہ نے کہا، تو یہ کیا کہہ رہا ہے۔ سقہ نے کہا میاں کیمیا تو پاؤں دبانے سے آتی ہے بادشاہ بن کر نہیں آتی، میاں کیمیا کے واسطے تو سقہ بننا ضروری ہے۔ سنا ہے بادشاہ بہت ہی خوش ہوا اور اسے بہت ہی انعام دیا۔ اگلا شعر بھی میرا سنا ہوا نہیں، میری ہی طرف سے اضافہ ہے۔

تمنا دردِ دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
سُرخرو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد
رنگ لاتی ہے حنا پتھر سے پس جانے کے بعد

سقے نے بات تو بہت ہی صحیح اور پتہ کی کہی، خاکساری، تواضع اور خوشامد سے جو ملتا ہے وہ بڑائی اور تکبر سے نہیں ملتا۔ اس قسم کے قصے تو اپنے بڑوں سے بہت سُن رکھے ہیں۔ مگر رسالے میں نمونے ہی لکھوائے ہیں۔

مپند ار جانِ پدر گر کسی
کہ بے سعی ہر گز بجائے رسی

میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ محنت، جفا کاری، پستی کے بڑے قصے سنایا کرتے تھے۔ اللہ انہیں بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"من تواضع لله رفعه الله او كما قال صلى الله عليه وسلم."

(ترجمہ) "جو اللہ کے لیے تواضع کرے اللہ اس کو بلند درجے عطاء فرماتے ہیں۔"

یہاں تو تواضع بھی اللہ کے لیے نہیں تھی غرض کے واسطے تھی۔ مگر تواضع اور سقہ کے پاؤں دبانے نے کیمیا سکھادی۔

ایک نابینا اہل حدیث کا قصہ:

(۹)......ابتدائی مدرسی میں ایک اہلِ حدیث نابینا جس کا نام تو مجھ کو یاد نہیں مگر میرے کمرے میں ان کی تالیف "میزان الشریعۃ" کے بہت سے حصے رکھے ہیں، وہ نابینا تھے اور اہلِ حدیث میں سے تھے۔ وہ مشکوٰۃ کی احادیث کے (جو مسلک اہل حدیث کے موافق ہوں) چھوٹے چھوٹے رسالے تصنیف کیا کرتے تھے۔ ایک باب الوضو، ایک میں باب التیمم، ایک میں باب الحیض وغیرہ خود ہی تالیف کرتے اور خود ہی طبع کرایا کرتے تھے۔ سہارنپور میں ہمیشہ اس ناکارہ کے مہمان رہتے اور دیوبند میں حضرت مولانا الحاج سید انور شاہ صاحب کے مہمان رہتے تھے۔ ان کا دستور یہ تھا کہ درس گاہوں میں جاتے، مدرس کو ایک نسخہ پیش کرتے۔ میری اور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی وجہ سے اکثر مدرسین بھی ان سے واقف تھے اکثر مدرسین نذرانہ لینے کے بعد اس کی قیمت تین آنہ یا کم وبیش دے دیا کرتے تھے اور ان کی درخواست پر طلبہ سے بھی کلمۃ الخیر کہہ دیا کرتے تھے۔ لیکن بعض لوگ اس وجہ سے کہ کوئی خاص مضمون ان کے اندر نہیں ہوتا تھا بجز روایات معروفہ مطابق اہلِ حدیث کا ترجمہ دیکھ کر معذرت کر دیا کرتے تھے۔

یہ ناکارہ ان کی آمد پر بیس پچیس نسخے ہمیشہ خریدتا۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سوڈیڑھ سو نسخے ہمیشہ خریدتے اور ہم دونوں مشتہرہ قیمت سے زیادہ ہی دیا کرتے تھے۔ ان کی معذوری اور حدیث پاک کی خدمت اور حق مہمانی کی بناء پر اور ان کے جانے کے بعد ان کے رسالوں کو طلبہ حدیث میں یہ کہہ کر تقسیم کر دیتے تھے کہ رسائل گو مسلکِ اہل حدیث کے ہیں مگر ان احادیث کا ترجمہ تو بہر حال ہے ہی۔ ان کے سامنے اس وجہ سے نہیں دیا کرتے تھے کہ اس مفت کی وجہ سے ان کی خریداری پر اثر نہ پڑے، ان کے رسالے اب بھی میرے کتب خانہ میں اوپر کمرے

میں ہوں گے۔جن پر ان کا نام و پتہ چھپا ہوا ہوگا۔وہ نابینا اور ایک کم عمر سا لڑکا ان کے ساتھ ہوتا تھا، جو ان کو سب جگہ لیے لیے پھرتا۔رات کو مغرب کے بعد وہ میرے قریب بیٹھ کر اپنا حساب لکھوایا کرتے تھے۔مجھے ان کے حساب میں بڑا لطف آیا کرتا تھا۔رسالوں پر قیمت تو طبع شدہ ہوتی تھی، مگر وہ کسی شخص کو قیمت نہیں بتایا کرتے تھے، جس کا جو جی چاہے دے دے وہ خوشی سے قبول کر لیتے تھے اور جو قیمت نہ دے بلکہ جزاک اللہ کہہ کر نمٹا دے تو وہ اس سے مطالبہ بھی نہیں کرتے تھے۔

شام کو جب حساب لکھواتے تو اس میں اس طرح لکھواتے ''دو نسخے فی دو آنہ، تین نسخے فی ڈھائی آنہ، چار نسخے فی تین آنہ، آٹھ نسخے فی جزاک اللہ'' بہت ہی سیدھے بھولے بھالے آدمی تھے۔اس زمانے میں اہلِ حدیث احباب سے اس ناکارہ کے تعلقات بڑی کثرت سے رہتے تھے۔اس زمانے میں دیوبند، سہارنپور میں اہل حدیث طلبہ بہت کثرت سے پڑھتے تھے۔مگر وہ اہلِ حدیث ہونا ظاہر نہیں کرتے تھے۔لیکن اس ناکارہ نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ مجھ سے اخفاء نہ کریں، بے تکلف گھر پر آکر اپنے اشکال حل کیا کریں، بہت سے طلبہ آتے تھے۔اللہ ان کو جزائے خیر عطاء فرمائے اور ان میں سے بعض بیعت بھی ہوئے، بعض ان میں سے یہ بھی کہتے کہ اگر آپ حکماً کہیں تو ہم رفع یدین، آمین وغیرہ چھوڑ دیں۔میں ان کو منع کر دیتا کہ جب تم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشاد کے ذوق شوق میں کر رہے ہو تو میں کیسے حکم دے سکتا ہوں؟

مولوی عبدالجبار اہل حدیث:

(۱۰) ......ایک بزرگ تھے مولانا عبدالجبار صاحب کھنڈیلوی پہلے جے پور میں شیخ الحدیث تھے، اس کے بعد پھر مختلف مدارس میں شیخ الحدیث رہے اور تقسیم کے بعد اکوڑہ خٹک میں شیخ الحدیث رہے، میری ابتداء مدرسی میں مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی مرحوم سے انہوں نے کوئی حدیث کا سوال کیا مولانا مرحوم بھی اکثر حدیث پاک کے اشکالات لکھتے رہتے تھے۔مولانا نے ان کو اس سیہ کار کا پتہ بتا دیا۔پھر تو انہوں نے اپنے انتقال تک خوب سلسلہ رکھا۔میرا خیال یہ ہے خود مولانا مرحوم کے یہاں بھی اور اس ناکارہ کے یہاں بھی ان کے خطوط مع مسودہ جوابات محفوظ ہیں کئی دفعہ مرحوم نے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ ہماری خط و کتابت شائع ہو جائے، بہت مفید ہے، میں نے ہمیشہ یہ لکھ دیا کہ کوئی تالیفی چیز تو ہے نہیں۔اس میں چھاپنے کے واسطے غور و خوض اور نظر ثانی کی ضرورت ہوگی۔مرحوم نے کئی دفعہ اصرار کیا کہ بہت مفید ہے ان کو شائع کر دیا جائے یا پھر مجھے اجازت دو میں چھاپ دوں گا۔مگر میں نے نہ خود چھاپے اور نہ اجازت دی، کیونکہ خطوط

وقتی چیز ہوتی ہے اور ان میں اکثر ماحول اور تخاطب کے مطابق مضامین ہوتے ہیں، اگر میرے دوستوں میں سے کوئی نظر ثانی کے بعد بالخصوص عزیزان مولوی عاقل، مولوی سلمان شاہد اس کو چھاپنا چاہیں تو شوق سے، ان میں کوئی مسئلہ اختلافی نہیں بلکہ صحاح کی مختلف احادیث پر اشکال اور ان کے جوابات ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے قراءت خلف الامام کی حدیث پر بھی ایک اشکال لکھا تھا جس پر میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ یہ مسائل تو برسہابرس سے چلے آرہے ہیں، ختم ہونے والے نہیں۔ حدیث پاک کے متعلق جو اشکالات ہیں وہ شوق سے فرمادیں، میری اوجز المسالک پر مرحوم نے ایک بہت ہی مفصل تبصرہ پاکستان کے کسی اخبار میں شائع کرایا تھا۔ جس پر ان کے بعض دوستوں نے ان کو سخت ملامت لکھی، مرحوم نے ان کو لکھا کہ محض مقلد ہونے کی وجہ سے کتاب سے نفرت نہ کرو، اس کو دیکھو بڑا خزینہ ہے، میں نے جو کچھ تبصرہ کیا ہے بہت غور وخوض اور بہت تفصیل سے دیکھنے کے بعد کیا ہے۔

ایک اہل حدیث کا قومہ میں ہاتھ نہ چھوڑنا:

(۱۱)...... میرے ایک مخلص دوست رفیق درس مظاہر علوم میں ملازم تھے۔ قلت تنخواہ کی وجہ سے چھوڑ کر دوسری جگہ جا کر ملازم ہوگئے، جن کے یہاں ملازم تھے وہ ایک بڑے ڈاکٹر اور زوردار اہلِ حدیث تھے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ جب رکوع سے اُٹھ کر رفع یدین کیا کرتے تو ہاتھوں کو گراتے نہیں تھے بلکہ کانوں تک اُٹھائے اُٹھائے سجدہ میں چلے جاتے۔ میرے ان دوست نے لکھا کہ وہ تو عادی ہیں ان کو اس کی بڑی مشق ہے۔ لیکن میں جب رکوع سے اُٹھنے کے بعد ہاتھ اُٹھائے اُٹھائے سجدہ میں جاتا ہوں تو میں گر جاتا ہوں، بہت ہی جلد از جلد کوئی صورت میرے لیے نکالو، میری تازہ تازہ ملازمت ہے، جب میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ یہ تو مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، علامہ شوکانی اور بڑے بڑے اکابر اہل حدیث کا بھی مسلک نہیں، تو ڈاکٹر صاحب یہ کہتے ہیں کہ تقلید کے واسطے تو امام ابوحنیفہ، امام شافعی رحمہما اللہ کیا کم ہیں جو میں کسی کی تقلید کروں مجھے تو حدیث پاک دکھاؤ۔

اللہ کا انعام واحسان کہ ان کا خط پڑھتے ہی مجھے حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت یاد آئی جو صحاح کی کتب میں مختلف الفاظ سے ہے، مجھے یاد ہے کہ اس روایت کے اندر رکوع سے اُٹھنے کے بعد یہ الفاظ ہیں "حتی استقر کل عضو فی موضعه" مگر اس وقت ابوحمید کی روایت کے اندر ابوداؤد میں معتدلاً کا لفظ ملا ہے جس کا مفہوم یہی ہے۔ ابوداؤد کے اندر حضرت ابو مسعود انصاری کی روایت میں یہ لفظ ہیں "ثم قال سمع اللہ لمن حمدہ فقام حتی استقر

کل شئی منه" (الحدیث) اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ابوداؤد میں ہے "لم یسجد حتی یستوی قائما" (الحدیث) اور عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث نسائی میں ہے جس کے الفاظ ہیں "ثم رفع راسه فقام حتی استوی کل شئی منه" (الحدیث) اور بھی متعدد روایات میں نے لکھوائی تھیں۔ ممکن ہے کہ مکتوب الیہ کے پاس وہ خط اب بھی محفوظ ہو۔ میں نے ان کو لکھا کہ رکوع کے بعد رفع یدین کر کے "استقر کل عضو فی موضع" جب ہی ہوسکتا ہے جب ہاتھ نیچے چھوڑ دیے جائیں۔ ان کے ڈاکٹر نے میرے اس جواب کو بہت پسند کیا اور ہاتھ چھوڑنا شروع کر دیا۔ میرے ان رفیق نے بہت شکریہ کا خط لکھا کہ میں تو بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

مجھے اہل حدیث سے مخالفت نہیں:

(۱۲)...... مجھے اہل حدیث سے ذاتی عداوت تو ہے نہیں، جب تک کہ وہ اکابر ائمہ کی شان میں بے ادبی نہ کریں، میرے ذہن میں یہ ہے کہ شریعت تو صرف اللہ اور اس کے پاک رسول ہی کا کلام ہے، لیکن اس پر عمل کرنے میں اور روایات کی صحیح جرح وتعدیل میں ائمہ مجتہدین اور ائمہ اربعہ کا قول مجھ جیسے نابلد کی تحقیق پر بہت مقدم ہے۔ بلکہ ان حضرات کے ارشادات ائمہ محدثین سے بھی مقدم ہیں۔ اس لیے کہ یہ حضرات ائمہ بخاری و مسلم کے اساتذہ یا استاذ الاستاذ ہیں اور زمانۂ نبوت سے بہ نسبت ائمہ محدثین کے زیادہ قریب ہیں اس لیے روایات کے قبول اور رد میں ان حضرات کا مرتبہ اور ہم پایہ لوگوں سے کیا بلکہ ائمہ محدثین سے بھی کہیں زیادہ اونچا ہے، اس لیے کہ حضرت امام احمد بن حنبل جو امام بخاری کے مشہور استاذ ہیں وہ امام شافعی کے شاگرد ہیں اور امام شافعی امام محمد کے مشہور شاگرد ہیں جن کا مشہور مقولہ ہے کہ میں امام محمد کی کتابیں دیکھ کر فقیہ ہوا ہوں اور امام محمد امام اعظم کے مشہور شاگردوں میں ہیں اور امام بخاری کی ثلاثیات جن میں امام بخاری سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک تین واسطے ہیں۔ بخاری میں کل بائیس ہیں اس میں امام بخاری کی بیس روایات امام اعظم کے شاگرد یا شاگردوں سے ہیں، ہماری مثال اس بندر کی سی ہے جو ایک گرہ ہلدی کی لے کر ڈگڈگی بجانے لگا کہ میں بھی پنساری ہوں۔

احکام شرعیہ پر بغیر مصلحت سمجھے عمل کرنا ضروری ہے:

(۱۳)...... میرا ہمیشہ خیال یہ بھی ہے اور اس پر میرے یہاں بہت اہتمام رہا کہ اپنے عمل اور دوستوں سے نصیحت میں بھی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کے اتباع میں جتنا ہو سکے غلو اور اہتمام کریں تاوقتیکہ اپنے مذہب کے خلاف نہ ہو جیسا کہ اس سے پہلے نمبر میں بھی اشارہ

کر چکا ہوں۔ اس ناکارہ نے بہت عرصہ ہوا ایک رسالہ اختلاف ائمہ لکھا تھا جو رسالہ ''المظاہر'' میں شائع ہوتا تھا، جس کا ذکر تالیفات میں بھی گزر چکا ہے۔ اس میں اس سیہ کار نے بہت تفصیل سے ائمہ مجتہدین کے اختلاف کی وجوہ اور اسباب مع امثلہ بہت کثرت سے لکھے تھے۔ جب تک رسالہ جاری رہا میرا مضمون بھی جاری رہا۔ اس میں میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشادات اگر سمجھ میں نہ آئیں تب بھی ان پر عمل ضروری ہے، اگر اپنی سمجھ میں نہ آئے تو اپنی فہم کا قصور تصور کرے۔ میں غالباً یہ قصہ لکھوا چکا ہوں کہ میری ایک چھوٹی بچی جب اس نے قاعدہ بغدادی شروع کیا اور ''آنَ بانَ'' کی تختی شروع کی تو اپنی والدہ مرحومہ کے سر ہوگئی، چار پانچ سال کی عمر تھی، چھوٹی سی بچی اس کا مناظرہ اور ضد، مجھے بھی بڑا اچھا لگا۔ اس نے کہا کہ الف زبر آ، نون زبر نَ آنَ، ب الف زبر با نون زبر نَ بانَ، تانَ، ثانَ اخیر تختی تک پڑھ کر جب اس کا نمبر آیا کہ ہمزہ الف زبر آ، نون زبر نَ آنَ، تو وہ اپنی والدہ سے اُلجھ پڑی اور بھولی بھالی زبان اب تک یاد ہے وہ بار بار الف با کی تختی شروع سے پڑھتی اور حجت قائم کرتی اور اخیر میں ہمزہ پر آ کر پھر جرح شروع کرتی کہ یہ آنَ کیوں ہے، ہمزانَ ہونا چاہیے۔ بہت ہی صبح سے دوپہر تک اپنی ماں سے لڑتی کہ یہ ہمزان کیوں نہیں بنتا۔ ماں کے پاس تو کوئی جواب نہیں تھا، اس نے تو اپنی جان بچالی کہ جب تیرے ابا آئیں گے ان سے پوچھئے۔ کہنے لگی کہ میں تو ہمزان ہی یاد کروں گی۔ دوپہر کو مقدمہ پیش ہوا۔ جواب میرے پاس بھی بجز اس کے کیا تھا کہ ابھی تو تو بچی ہے جب بڑی ہوگی تب پوچھنا۔

دوسرا قصہ بھی اسی کا یا اس سے چھوٹی بہن کا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی ماں سے اس پر جرح کرتی تھی کہ جب دودھ کو آگ پر گرم کرتے ہیں تو اس پر ملائی کہاں سے آتی ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ احکام شرعیہ میں ہم لوگ اپنے آپ کو محقق اعلیٰ کیوں سمجھ جاتے ہیں، جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کو سوچ لینا چاہیے کہ نبوت کا درجہ ہم سے بڑھا ہوا ہے، ہم ناسمجھ ہیں، وہاں تک رسائی نہیں۔ مثال کے طور پر غسل جنابت ہی کو لے لو ساری عمر فقہاء اس کو غسل تعبدی لکھتے چلے آئے، کہ منی نکلتی تو ہے پیشاب گاہ کے چھوٹے سے سوراخ سے اور غسل سارے بدن کا فرض ہے، اس کو جملہ علماء نے فقہاء نے تعبدی لکھ کر چھوڑ دیا یعنی خلاف قیاس حکم شرعی یہی ہے۔ مگر چند سال ہوئے اس ناکارہ کو ہر چیز کے پڑھنے کا مرض تھا اور صحت و بصارت بھی قوی تھی۔ چند ڈاکٹروں کی تحقیق نظر سے گزری تھی، انہوں نے لکھا کہ جب آدمی کو شہوت کے ساتھ انزال ہوتا ہے تو بدن کے مسامات سے ایک سمیت باہر ظاہر ہوتی ہے جو نظر نہیں آتی۔ اگر اس کو نہایت اہتمام سے رگڑ کر جلدی صاف نہ کیا جائے تو دو چار گھنٹے کے بعد وہ سمی مادہ مسامات کے ذریعہ اندر چلا جاتا ہے اور بہت سے

امراض پیدا کرتا ہے۔ اس لیے بہت اہتمام سے صابن کے ساتھ غسل کرنا چاہیے، اس میں مجھے تو بہت ہی لطف آیا، اس لیے کہ خروج منی سے سارے بدن کے دھونے کی مصلحت بھی سمجھ میں آئی۔ جس کی احادیث میں تاکید آئی ہے۔ حتیٰ کہ امام مالک کے نزدیک رگڑ کر دھونا غسل جنابت میں فرض ہے اور غسل کی جلدی کی تاکید کی مصلحت بھی معلوم ہوگئی۔ اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کی سہولت کے لیے تاخیر بھی قولاً عملاً کر کے دکھلا دی۔ اسی طرح سے مردوں کی داڑھی اور عورتوں کی چوٹی کا مسئلہ یہ تو عرصہ سے سننے میں آرہا تھا کہ انگلستان میں پائیریا کا مرض اتنا عام ہے کہ جوان لڑکیاں بھی اپنے سارے دانت نکلوا دیتی ہیں اور پھر مصنوعی بنواتی ہیں۔ کئی سال ہوئے وہاں کے ڈاکٹروں کی ایک تحقیق نظر سے گزری کہ دانتوں کی رطوبت کے لیے مردوں کی داڑھی اور عورتوں کی چوٹی کے بال جاذب ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے امراض میں بالخصوص جریان، آتشک وغیرہ میں انگریز ڈاکٹر ختنہ کو بہت ضروری بتاتے ہیں۔

شب معراج میں حضور کے قلب اطہر میں ایمان وحکمت بھرنا:

(۱۴)......اس سلسلہ کا ایک مسئلہ شب معراج میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے شق الصدر کے بعد ایمان وحکمت کا بھرنا تھا۔ بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ شب معراج میں حضرت جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے اور سینہ مبارک چاک کر کے قلب اطہر کو نکالا، اس کو زمزم شریف کے پانی سے دھویا اور سینے مبارک میں ایمان وحکمت بھر دیا۔ اپنی ابتداء طالب علمی میں اس حدیث پاک پر احمق لوگوں کے بہت اعتراضات سنے کہ ایمان وحکمت ایسی چیز ہے جس کو بھر دیا جائے۔ اخبارات میں بھی اس حدیث پاک پر اعتراضات پڑھے اور نیچری لوگوں کے اشکال بھی خوب پڑھے۔ مگر اللہ پاک کا ارشاد حدیث قدسی میں ہے کہ قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ لوگوں کے عذر زائل نہ کر دیے جائیں یعنی جب تک احمق لوگوں کے مہمل اشکالات کا جواب دُنیا میں نہیں دکھایا جائے گا۔ جب سے بجلی کا علاج جاری ہوا ہے نہ کوئی چیز بوتل میں نظر آتی ہے اور نہ کسی طرح سے محسوس ہوتی ہے، مگر علاج والے کارنامے سناتے ہیں کہ چالیس (۴۰) گھوڑوں کی طاقت بھر دی، اسی (۸۰) گھوڑوں کی طاقت بھر دی وغیرہ وغیرہ۔ معلوم نہیں وہ کیا چیز بھری جاتی ہے بجلی کی قوت ایمان کی قوت کا کب مقابلہ کرسکتی ہے۔ قیامت والی احادیث میں کثرت سے اس قسم کے مضامین آئے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ جل شانہٗ اولین وآخرین کو ایک زمین پر جو میدانِ حشر ہے جمع فرمائیں گے اور آواز دینے والے کی آواز سب سنیں گے اور مجمع کو ہر شخص دیکھے گا، اس پر بڑے اعتراضات لوگوں کے سنے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر

قیامت تک کی بے شمار مخلوق کس طرح سب ایک شخص کی آواز سن سکتے ہیں اور کس طرح مجمع کو سب دیکھ سکتے ہیں، لیکن اب لاؤڈ اسپیکر، ٹیلیفون اور اس سے بڑھ کر ٹیلی ویژن نے سارے اشکالات کو ''هَبَاءً مَّنثُورًا'' کر دیا ہے۔ چاند پر چڑھنے کا واقعہ آج کل معرکۃ الآراء مسئلہ بن رہا ہے، بندہ کے خیال میں تو یہ یاجوج و ماجوج کی احادیث کا مشاہدہ ہے، اس میں ہے کہ وہ فساد برپا کرنے کے بعد آسمان والوں کو قتل کرنے کے لیے آسمان کی طرف تیر پھینکیں گے اور وہاں سے حکم ہوگا کہ ان کے تیروں کو خون میں رنگ دو، اس کو دیکھ کر وہ بے وقوف کہیں گے کہ ہم نے آسمان والوں کو بھی قتل کر دیا، جن جن چیزوں پر ان احمقوں کے اشکالات ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان سب کا جواب مشاہدہ کے طور پر قیامت سے پہلے ہی دکھا دیا اور جو اشکالات رہ گئے ہیں ان کے جوابات بھی ان لوگوں کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کے لیے قیامت سے پہلے ظہور پذیر ہو جائیں گے۔

(۱۵)..... حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ کو نہاوند کی جنگ میں امیر بنا کر بھیجا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ میں خطبہ پڑھتے ہوئے یا خطبہ کے بعد زور سے ''یا ساریة الجبل'' فرمایا۔ یعنی ''اے ساریہ! پہاڑ کو اپنی پشت کے پیچھے کر لو اور اس سے آگے بڑھ جاؤ۔'' مدینہ والے بھی حیرت میں رہ گئے کہ یہ خطبہ کے درمیان میں غیر متعلق بات کیوں فرمائی اور نہاوند میں حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ بھی حیرت میں رہ گئے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہاں سے بول رہے ہیں۔ اس کے بعد نہاوند سے ایک قاصد آیا، اس نے بیان کیا کہ جب ہمارا مقابلہ دشمن سے ہوا اور انہوں نے ہم کو مغلوب کر لیا تو ہم کو ایک آواز آئی کہ ''یا ساریة الجبل'' (جس کا ترجمہ گزر چکا ہے) تو ہم نے اپنی پشتوں کو پہاڑ سے چپکا لیا۔ اللہ جل شانہ نے دشمنوں کو مغلوب کر دیا۔ ملا علی قاری تحریر فرماتے ہیں کہ اس واقعہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کئی کرامتیں ہیں۔ مدینہ میں بیٹھے ہوئے نہاوند کے معرکہ کا معائنہ کرنا اور ان کی آواز کا سینکڑوں میل پہنچ جانا اور پورے لشکر کا ان کی آواز کا سن لینا اور ان کی تجویز سے معرکہ پر غالب آ جانا وغیرہ وغیرہ، پھر اس واقعہ کو بھی وائرلیس اور لاسلکی نے سچا کر دکھایا۔ (مرقات طبع جدید)

صحابہ کرام کی کرامات کے واقعات:

(۱۶)..... اکابر صوفیاء کے خوارق و کرامات پر بھی اس قسم کے احمق لوگ اعتراض ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں، لیکن احادیث پاک میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات میں اس قسم کی نظیریں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ مگر ہم لوگوں کو لغویات اخبارات اور ناولوں سے فرصت ہو تو؟

احادیث پاک اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نگاہوں میں اس قسم کے واقعات کی کوئی اہمیت نہیں تھی، اس لیے ان کو اہمیت سے ذکر نہیں فرمایا کرتے تھے۔ مشکوٰۃ شریف میں بخاری کی روایت سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ہم کھانا کھایا کرتے تھے اور اس کھانے سے تسبیح کی آواز سنا کرتے تھے۔ اسی طرح مشکوٰۃ شریف کی دوسری روایت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت سفینہ کا ایک قصہ نقل کیا گیا ہے کہ وہ نصاریٰ کے ساتھ لڑائی میں ملک روم کے اندر ایک مرتبہ راستہ بھول گئے یا کافروں نے قید کرلیا۔ پریشان حال تھے کہ ایک شیر سامنے آیا، انہوں نے اس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں اور اس کو اپنی سرگزشت سنائی، وہ شیر ان کی طرف متوجہ ہوا اور قریب آیا اور دُم ہلاتا ہوا آگے آگے ہولیا، یہ اس کے پیچھے پیچھے چل دیے اور لشکر تک پہنچ گئے اور ان کے پہنچنے کے بعد وہ شیر واپس گیا۔

حج کے موقع پر دو آدمیوں کی دعائیں:

(۱۷)......مشکوٰۃ شریف پڑھانے کے زمانے میں ایک قصہ مجھے تو یاد ہے کہ میں نے مرقاۃ میں دیکھا تھا، مگر میں تو لکھنے پڑھنے سے بھی معذور ہوگیا اور اب دوستوں سے کہا تو ان کو ملا نہیں۔ مگر قصہ بہت عجیب اور اہم ہے اور جو مضمون میں اس رسالے میں بار بار لکھوا رہا ہوں کہ اللہ کے یہاں اصل قیمت اخلاص کی ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حج کو گیا۔ میں نے کعبہ میں دیکھا کہ ایک شخص کعبہ شریف کا پردہ پکڑ کر اتنے زور سے رو رو کر دعائیں مانگ رہا ہے کہ اس کے شور سے کعبہ کا طواف کرنے والے بھی پریشان ہورہے ہیں مگر ایک منٹ کو بھی اس کا قلب خدا کی طرف متوجہ نہ ہوا۔

اس کے بعد میں منیٰ گیا، اس کے بازار میں میں نے اس شخص کو دیکھا کہ اس نے ایک ہزار دینار کا کپڑا فروخت کیا، مگر ایک منٹ کو بھی اس کا دل غافل نہ ہوا۔ بالکل صحیح ہے ہم لوگوں کی یہی حالت ہے، ہماری نمازیں دعائیں سب رسمی ہیں۔ طوطے کی طرح سے رٹے ہوئے الفاظ کہتے رہتے ہیں اور ہم کو ذرا پتہ نہیں چلتا کہ کیا کہہ رہے ہیں، اللہ کے ہاں اخلاص کی قدر ہے شور شغب مقبول نہیں ہے۔

ایک آرہ کش کا ایک عجیب واقعہ:

(۱۸)......ہمارے مدرسہ کے ناظم حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کے والد بزرگوار حضرت مولانا جمعیت علی صاحب بہاولپور میں مدرس تھے۔ ایک دفعہ کتاب دیکھ رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک وہ اہتمام سے مطالعہ کرتے رہے۔ ایک آرا کش (لکڑ ہارا) ان کے قریب اپنے آرے

سے لکڑی کاٹ رہا تھا۔ جب ایک ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تو وہ مولانا مرحوم سے کہنے لگا کہ اجی مولوی جی! تم اتنی دیر سے کتاب کو گھور رہے ہو تم کو کیا ملا؟ اور دیکھو میں نے اتنی دیر میں اتنے تختے کاٹ دیے۔ مولانا مرحوم کو خوب ہنسی آئی۔ فرمانے لگے کہ اپنا اپنا ذوق ہے، میں یہ کہوں گا کہ تم نے اتنی دیر میں کیا کیا۔ اچھا یہ بتا تیری تمنا اور ذوق کیا ہے۔ کہنے لگا اجی مولانا صاحب کیا پوچھو، میری تمنا تو یہ ہے کہ چارپائی پر گاؤ تکیہ لگائے پڑا رہوں اور حقہ برابر میں رکھا ہوا ہو اور چاروں طرف سے کھیڑ کھیڑ آواز آرا چلنے کی میرے کان میں پڑتی رہے، فقط۔ مجھے اس قصہ میں ہمیشہ بڑا لطف آیا اور ذوق والوں کے مناظر بھی سامنے آ گئے۔ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا کہ جن کی زندگی ہی اس پر ہے کہ وہ یکسوئی کے ساتھ مراقب ہوں اور چاروں طرف ذاکرین کی آواز ان کے کان میں پڑتی ہو۔ اس میں کوئی تصنع نہیں کہ میں نے ایسوں کو دیکھا کہ جن کی صحت کا مدار ہی ذاکرین کی آواز پر ہے۔ جب یہ ہو تو ان کو طاقت کے انجکشن کا کام دیتا رہتا ہے اور جب یہ نہ ہو تو ان کو اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔

مولوی نصیرالدین ناظم کتب خانہ یحیوی:

(۱۹)......مولوی نصیرالدین ناظم کتب خانہ یحیوی میرے بہت ہی شدید ترین محسن ہیں۔ اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے اور ان کے احسانات کا اپنی شایانِ شان دین و دنیا میں بہترین بدلہ عطاء فرمائے۔ میں اپنی عمومی دعاؤں کے ساتھ جو سارے محسنوں کے لیے کرتا ہوں، ان کے لیے خصوصی دعائیں بھی کرتا ہوں مگر میں اپنے متعلق اپنے چچا جان قدس سرہٗ کا یہ مقولہ پہلے نقل کر چکا ہوں کہ میری تبلیغ کو جتنا نفع زکریا سے ہے اتنا مجھے اپنے معاون کارکنوں سے بھی نہیں اور میری تبلیغ کا جتنا مخالف یہ ہے اتنا کوئی مخالف سے مخالف بھی نہیں۔ چچا جان نوراللہ مرقدہٗ کے اس مقولہ کو اگر میں مولوی نصیرالدین کے متعلق دہراؤں تو بالکل بجا ہے کہ جتنی اعانت انہوں نے میری علمی، عملی، بدنی کی ہے اتنی نہ کسی رشتہ دار نے کہ نہ اہل وعیال نے کی۔ ستاون (۵۷) برس ان کو میرے پاس رہتے ہوئے ہو گئے۔ اس مدت میں مجھ سے ذرا بھی مناسبت پیدا نہیں ہوئی، بلکہ ہر چیز میں میری ضد اور مخالف ہیں۔ جس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

یہ موضع جلالیہ قصبہ بہٹ کے رہنے والے ہیں۔ اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے زمانے میں رائے پور میں حافظ یوسف علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ میرے والد صاحب قدس سرہٗ کی اعلیٰ حضرت کے زمانے میں رائے پور کی آمد و رفت کثرت سے ہوا کرتی تھی، بالخصوص اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی طویل بیماری میں اعلیٰ حضرت کو میرے والد کے بُلانے پر اصرار رہتا تھا، اس لیے کثرت سے تشریف لے جاتے تھے اور وہاں کے دورانِ قیام میں

حافظ یوسف صاحب کے مکتب میں ایک چھپر کی جھونپڑی میں ان اوقات کے علاوہ جو اعلیٰ حضرت کے پاس رہنے کے تھے والد صاحب کا وہاں وقت گزرتا تھا۔ بالخصوص گرمیوں کا دوپہر وہاں گزرتا۔ اس زمانے میں مکتب کے بعض طلبہ بڑے ذوق وشوق سے والد صاحب کی خدمت کیا کرتے تھے۔ جن میں مولوی نصیر الدین صاحب بھی تھے۔ جن کو اپنی پیدائش صحیح قمری تو یاد نہیں البتہ ۱۹۰۱ عیسوی بتاتے ہیں۔ ۱۹۰۱ عیسوی ۱۳۱۸ ہجری کا آخر اور ۱۳۱۹ھ اوائل ہے۔ قرآن شریف حفظ اور ابتدائی اُردو حساب وغیرہ رائے پور کے مدرسہ میں پڑھا۔ ذی الحجہ ۳۰ھ میں حافظ یوسف جو حضرت رائے پوری کے مدرسہ میں اول استاد تھے، ان کے یہاں کوئی شکایت پہنچی، جس پر پٹائی کے ڈر سے بھاگ کر سہارنپور والد صاحب کے پاس آئے کہ ان سے خوب تعارف تھا، لیکن والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس زمانے میں کئی دن کے لیے نظام الدین گئے ہوئے تھے، مجھ سے کچھ شناسائی نہیں تھی۔ انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ حضرت مولانا (میرے والد صاحب) نے مجھ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ جب تیرا قرآن شریف پورا ہو جائے تو میرے پاس آنا میں تجھے عربی پڑھاؤں گا۔ مجھے چونکہ واقفیت نہیں تھی اس لیے میں نے مسجد بہادران متصل مظاہر علوم کے ایک حجرے میں جہاں اور طلبہ بھی رہتے تھے ان کو والد صاحب کے آنے تک رکھوا دیا اور کہہ دیا کہ کھانا دونوں وقت میرے گھر سے لے جایا کرو اور والد صاحب کی تشریف آوری پر انہوں نے ان کو مسجد بہادران سے منتقل کر کے مسجد موچیاں جو حکیم محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مکان کے قریب ہے اور میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا اکثر قیام اوقاتِ درس کے علاوہ کثرت سے وہاں رہا کرتا تھا۔ اس میں منتقل کر دیا، اس مسجد میں دو حجرے تھے، جس میں مدرسہ کے طلبہ رہتے تھے، خاص طور سے وہ جن کو والد صاحب سے خصوصی تعلق ہو، دو تین سال اسی مسجد میں قیام رہا۔

۳۳ھ میں جب میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے میرا موجودہ مکان کرایہ پر لیا تو اس میں زنانہ اور مردانہ دو حصے تھے۔ اس میں یہ اور قاری معین الدین آروی جو آج کل مولوی قاری حافظ ہیں اور ان کے بیان کے موافق بیس پچیس دن میں انہوں نے قرآن پاک حفظ کیا تھا اور مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد چچا جان کے ارشاد سے ان کو نظام الدین کے مدرسہ میں مدرس تحت بنایا گیا تھا اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا انعام الحسن صاحب دونوں ان کے شاگردوں میں ہیں اور ان کے لڑکے بھی آج کل علماء بن کر متفرق شہروں میں مقیم ہیں خود ضلع آرہ کے ایک قصبہ میں کسی مدرسہ کے ناظم ہیں لیکن ابتداء میں جب وہ یہاں آتے تھے تو اردو بھی نہ جانتے تھے۔ لیکن میرے والد صاحب قدس سرہٗ کی برکت اور بقول مولوی شبیر علی تھانوی مرحوم کے جس کو انہوں نے اپنے اس خط میں لکھا ہے جو اکمال الشیم کے مقدمہ میں طبع شدہ ہے کہ میرے

والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو پڑھانا نہیں بلکہ گھول کر پلانا آتا تھا۔ چند سال میں اردو، فارسی، ابتدائی عربی سب کچھ پڑھا دیا اوران کے انتقال کے بعد میں نے مدرسہ میں داخل کرادیا تھا مگر آخر تک میرے ہی مکان پر رہا اور ۴۱ھ میں دورہ شریف سے فارغ بھی ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ علم وعمل میں برکت عطاء فرمائے۔

اس جگہ تو مولوی نصیرالدین کا حال لکھنا شروع کیا تھا کہ میرے والد صاحب کے انتقال تک مولوی نصیر کے مراسم مجھ سے بھی ہوگئے اور میری خارش کے زمانے میں مجھ سے مقامات بھی پڑھی، اس کا ذکر پہلے گزر چکا اور میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد اسباق تو مدرسہ میں ہوگئے تھے، مگر قیام ان کا بھی میرے مکان (کچے گھر) میں ہی رہا اور میرے تجارتی کتب خانہ میں معمولی کام پیکٹ وغیرہ بنانا باندھنا ان کے حوالہ تھا اور فرمائشوں کی تعمیل میں خود کرتا تھا اور ۳۸ھ کے پہلے سفرِ حج میں کتب خانہ کا کام ان کے اور حکیم ایوب صاحب سلمہٗ کے حوالہ کر کے گیا تھا اور حج سے واپسی کے بعد کچھ نہ کچھ دیکھ بھال اس سیہ کار کی ہوتی تھی، لیکن شوال ۴۴ھ میں جب دوسری مرتبہ اس سیہ کار کی حج کو روانگی ہوئی تو تقریباً سولہ ماہ میں واپسی ہوئی۔ اس وقت ہمہ تن کتب خانہ مولوی نصیر کے حوالہ کر کے گیا تھا، عزیز موصوف کو ہمیشہ یہ گھمنڈ اور مجھ پر یہ الزام رہا کہ یہ تجارت سے بڑا ناواقف ہے اور بہت ہی اس کی کوشش بوسائط کرتا رہا کہ یہ کتب خانہ کلی طور پر میرے انتظام میں دے دے اور میں اس پر چار چاند لگادوں۔

یہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ میرے والد صاحب کے انتقال کے وقت ان کے ذمہ آٹھ ہزار روپے قرض تھا۔ جو محض اللہ کے لطف وکرم اور احسان سے شوال ۴۴ھ میں صرف ایک ہزار رہ گیا تھا۔ جو یہ ناکارہ حجاز کو جاتے وقت مولوی نصیر کے حوالہ کر گیا تھا اور ان کو ایک ہزار کی وہ رقوم بھی بتا گیا تھا جو اس ناکارہ کی دوسرے لوگوں کے ذمہ تھی لیکن جب یہ ناکارہ سولہ ماہ بعد واپس آیا تو انہوں نے کتب خانہ کو چار چاند نہیں بلکہ آٹھ چاند لگا رکھے تھے، یعنی میرے کتب خانہ کے ذمے آٹھ ہزار روپیہ مزید قرض کر رکھا تھا اور ایسے اجنبی لوگوں سے قرض لیا تھا۔ جنہوں نے ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ اس ناکارہ نے اپنے دوستوں سے قرض لے کر اس کو ادا کرایا اور ان کو ہمیشہ سمجھایا اور اب تک باوجود اس کے کہ ہمیشہ ہی اللہ جل شانہ کے احسانات اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہتا ہے، مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ مالک کا معاملہ ہر شخص کے ساتھ علیحدہ ہے، تجارتی اصول والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ تجارتی ہی اصول کا ہے اور بے اصولوں کے ساتھ معاملہ کرم واحسان کا ہے، باوجودیکہ میں ان کا احسان مند ہوں اور ہمیشہ ان کے لیے دل سے دعائیں بھی کرتا رہتا ہوں مگر طبیعت کا جوڑ آج تک نہیں لگ سکا، میں ہمیشہ کتابوں کے حق تالیف کو رجسٹرڈ کرانے کا شدید

مخالف ہوں اور اس کو شرعاً جائز بھی نہیں سمجھتا۔ اختری بہشتی کا تحشیہ یحیوی کتب خانے نے کرایا تھا اور اجرت تحشیہ اور طباعت بھی کتب خانہ یحیوی کی طرف سے ہی ہوئی۔ مولانا نصیر الدین صاحب نے اس کو رجسٹرڈ کرالیا اور میرے ایک مخدوم زادے نے جب اس کو طبع کرالیا یہ سمجھ کر کہ میں ان سے کیا تعرض کروں گا اور ان کا خیال بھی بالکل صحیح تھا۔ تو مولانا نصیر الدین صاحب نے ان پر دعویٰ بھی کرادیا۔

مجھے نہ ان کے رجسٹرڈ کرانے کی خبر اور نہ دعویٰ دائر کرنے کی، شیخ رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس زمانے میں دہلی میں ان سربرآوردہ لوگوں میں تھے کہ حکام ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ اس لیے ان کے ذریعہ سے مقدمہ میں فوری کامیابی ہوئی اور کتابیں ضبط ہوگئیں اور شیخ رشید احمد صاحب نے مجھے مژدہ کی اطلاع کردی میں حیرت میں پڑ گیا کہ کیسا مقدمہ اور کیسی کتابوں کی ضبطی، میں نے جب تحقیق کیا تو سارا قصہ معلوم ہوا۔ میرے رنج وقلق اور غصہ کی انتہا نہ رہی، میں نے منت، خوشامد، ڈانٹ ڈپٹ سبھی کچھ کیا، مگر انہوں نے بجائے درخواست قبول کرنے کے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کو میرے خلاف ایک بہت سخت خط لکھا کہ ان کو کتب خانے کی آمدنی سے تو کوئی تعلق نہیں، کھانے کے وقت جتنے مہمان ہوتے ہیں ان کے علاوہ رستہ چلتے لوگوں کو بھی دعوت دے دیتے ہیں اور تجارت کا جو حال ہے وہ بھی آپ کو معلوم ہے، میں نے ایک کتاب کو رجسٹرڈ کرا لیا تھا جس کی وجہ سے مجھ پر سخت عتاب ہے۔ میں نے تین دن سے نہ کچھ کھایا اور نہ سویا، دن رات روتے گزر گئے ہیں۔ یہ خط انہوں نے رجسٹری بھیجا، مجھے اس خط کی بھی کوئی خبر نہ ہوئی۔

ایک دن دوپہر کے وقت دسترخوان بچھ چکا تھا چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور جناب الحاج الحافظ فخر الدین صاحب تشریف لائے اور چہرہ پر غصہ نمایاں بلکہ چہرہ سرخ ہو رہا۔ میں چچا جان کو دیکھ کر کھڑا ہوگیا، مگر چہرہ پر غصہ بہت ہی ظاہر ہو رہا تھا چچا جان نے تشریف لاتے ہی سلام و مصافحہ سے پہلے ہی فرمایا کہ تم نے تو پریشان کردیا۔ اس وقت تمہاری وجہ سے آنا پڑا۔ تم سے تخلیہ میں کچھ کہنا ہے۔ میں کانپ گیا اور میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے ''ماحدث و ماقدم'' مجھے بھی سب یاد آ گیا نہ معلوم کس نے کیا شکایت لکھ دی ہوگی۔ اس وقت کھانا چچا جان نے اور حافظ صاحب نے تو غصہ میں نہیں کھایا اور میں نے فکر میں نہیں کھایا۔ کھانے کے بعد مجھے چونکہ یہ فکر تھا کہ نہ معلوم کیا شکایت پہنچی ہوگی اس لیے میں ان دونوں حضرات کو حکیم ایوب صاحب کی بیٹھک میں لے گیا اور سب دروازے لگا لیے اور چچا جان نے بیٹھتے ہی غصہ میں فرمایا کہ تمہیں آمدنی کا کوئی فکر نہیں ہے، خرچ کی تم کو کوئی خبر نہیں وہ نصیر الدین بیچارہ دن رات فکر میں رہتا ہے یہاں تک کہنے پر میری جان میں جان آ گئی اور ہوش وحواس بھی

درست ہوئے، مجھے اس کا اندازہ ہو جاتا تو اتنی دور بھی نہ لے جاتا۔ بلکہ کھلے کواڑ ان سے تخلیہ کرتا پھر انہوں نے فرمایا کہ مولوی نصیر نے مجبور ہو کر ایک کتاب کو رجسٹرڈ کرایا تو تم اس پر خفا ہونے لگے، کئی دن سے نہ اس نے کچھ کھایا اور نہ وہ سویا۔ میں نے عرض کیا حضرت چچا جان! کتابوں کی رجسٹری تو جائز بھی نہیں، مولوی نصیر الدین نے جناب الحاج مفتی کفایت اللہ صاحب سے رجسٹری کے جواز کا فتویٰ بھی منگا رکھا تھا۔ جس کی نقل بھی انہوں نے چچا جان کے پاس بھیجی تھی۔ چچا جان نے فرمایا کہ اس کے پاس مفتی کفایت اللہ کا فتویٰ ہے، میں نے عرض کیا کہ حضرت! میرے پاس حضرت گنگوہی کا فتویٰ ہے۔ مولوی نصیر اگر حضرت گنگوہی کے مقابلہ میں مفتی صاحب کا فتویٰ پیش کرے تو تعجب نہیں، مگر میں یا آپ حضرت گنگوہی کے مقابلہ میں مفتی صاحب کا فتویٰ قبول کر سکتے ہیں، چچا جان تو میری گفتگو کے بعد بالکل خاموش ہو گئے اور خفگی بالکل زائل ہو گئی۔ البتہ یہ فرمایا کہ اتنی ناراضگی نہیں چاہیے تھی اس کی محنت اور جانفشانی کی رعایت ضرور چاہیے۔ لیکن میرے محترم حضرت حافظ فخر الدین صاحب کا غصہ بالکل کم نہ ہوا۔ انہوں نے واپسی تک نہ تو مجھ سے بات کی اور نہ چلتے وقت مصافحہ کیا۔ چچا جان بھی دوسری گاڑی سے یہ فرما کر چلے گئے کہ میں تو بہت مشغولی میں آیا ہوں قیام کا وقت بالکل نہیں تمہارے مولوی نصیر نے اپنی پریشانی کا ایسا سخت خط لکھا کہ مجھے فوراً آنا پڑا۔

ان کے تشریف لے جانے کے بعد میں نے مولوی نصیر الدین سے کہہ دیا کہ میری کتاب کی تو رجسٹری رہ نہیں سکتی، آج سے یہ ''اختری بہشتی زیور'' تمہاری ملک میں ہے تمہاری نذر ہے۔ اس کے سب مطبوعہ نسخے اور اس کی پلیٹیں وغیرہ سب تمہاری نذر ہیں اور اس دن سے یہ کتاب مولوی نصیر الدین کی ملک ہو گئی اور میں نے اخبارات میں بھی اس کا اعلان کرا دیا تھا۔ وہ اخبارات بھی اب تک میرے کمرے میں ہوں گے۔ تین چار سال بعد یہ ناکارہ ایک مرتبہ نظام الدین حاضر ہوا۔ تو چچا جان نے فرمایا کہ ارے بھائی تمہارے نصیر کی خود غرضی اور یہ کہ وہ تمہارے مال کو اپنے نام سے بنک میں جمع کرتا ہے وغیرہ وغیرہ اس قسم کی شکایات تو بہت ہی آرہی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! یہ وہی مولوی نصیر ہیں جن کی بدولت مجھ پر عتاب ہوا تھا۔ فرمایا کہ ہاں! ہیں تو وہی، مگر اب تو اس قدر ان کی شکایات آرہی ہیں کہ حد نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ جب آپ تک اتنی شکایات باوجود دور ہونے کے آرہی ہیں تو مجھ تک کتنی پہنچتی ہوں گی۔ مگر میرے ذہن میں ایک بات ہے کہ ابا جان کے انتقال کے بعد قرضہ تو آٹھ ہزار کا تھا اور کتب خانہ نیلام کی حیثیت سے پانچ ہزار کا تجویز کیا جا رہا تھا۔ میں نے دو حج بھی کر لیے اگرچہ میرے اخراجات میں کتب کو دخل کم ہے۔ محض اللہ کے فضل و کرم کو دخل ہے ظاہری اسباب میں کتب خانہ ہی ذریعہ تھا ہدایا وغیرہ کا

سلسلہ اس وقت تک شروع نہ ہوا تھا اور جو ہوتا بھی تو مجھے اس سے وحشت بھی بہت ہوتی تھی اپنی شادی کی اور اپنی ہمشیرہ کی بھی کی، مہمانوں کا سلسلہ بھی رہتا ہی ہے اور یہ تو آپ کو مولوی نصیر نے اسی وقت لکھ دیا تھا کہ کتب خانہ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں سب کچھ میں ہی کرتا ہوں اور اب تو اس میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ کہ میں واقعی کتب خانہ میں جا کر قدم نہیں رکھتا اور مجھے اپنی تصنیف وتالیف وتدریس سے اتنی فرصت بھی نہیں، اگر میں یہ سمجھوں کہ وہ محنت کر رہا ہے اور مضاربہ کے طریق پر آدھا تہائی مجھے بھی دے دیتا ہے تو اس میں شکایت کی کیا بات ہے۔

میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اس جواب پر بہت ہی خوش ہوئے اور اتنی دعائیں ذوق وشوق سے دیں کہ مجھے بھی لطف آگیا۔ اللہ تم کو بہت ہی خوش وخرم رکھے، بہت ہی برکت عطاء فرمادے، اللہ کا بہت ہی احسان ہے کہ اس سیہ کار کے اُوپر ابتداءً اکابر کی اور اب دوستوں کی دعاؤں کی وہ بھرمار ہے کہ کم کسی کو نصیب ہوتی ہوں گی سب سے ابتدائی دعائیں تو اعلیٰ حضرت رائے پوری کی جو میرے والد صاحب کے انتقال کے فوراً بعد ہی میرٹھ تجارتی کتب خانہ منتقل نہ کرنے پر ملیں تھیں کہ اصل ثمرہ تو میں ان ہی دعاؤں کا سمجھ رہا ہوں اور اس کے بعد میرے حضرت قدس سرہٗ اور حضرت تھانوی اور جملہ اکابر کی دعائیں شامل حال رہیں اللہ تعالیٰ سب کو قبول فرمادے۔ اس کے تھوڑے دن بعد مولوی نصیر الدین صاحب نے ہم کو لال جھنڈی دکھلائی کہ تمہارے مہمانوں کا خرچ میرے بس کا نہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ میری اور میرے مہمانوں کی روزی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ رکھی ہے تیرے ذمہ نہیں۔ اس کے بعد سے اگر میں یہ کہوں کہ مالی احسان تو ان کا مجھ پر نہیں رہا بلکہ اس کا عکس ہی ہوا تو بے محل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اب چند سال سے میری کتابوں کی طباعت کا سلسلہ بھی بجائے ان کے میرے مخلص عزیز داماد مولوی حکیم الیاس کے ذمہ ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو بھی اور جملہ میرے محسنوں کو اپنی شایانِ شان بدلہ عطاء فرمادے۔ مگر وہ بھی مسلسل امراض کا شکار رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو صحت عطاء فرمادے۔ میں یہ لکھ رہا تھا کہ عزیز مولوی نصیر الدین کے ابتداءً مالی بھی اور انتہاءً جانی احسانات بہت بڑھ گئے۔ مہمانوں کا ہجوم اور بہت سے حضرات بے وقت دن میں ظہر کے بعد اور رات کو عشاء کے بعد بے اطلاع آتے ہیں، مجھے تو بعض مرتبہ بڑی کلفت پہنچتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ مولوی نصیر کو جزائے خیر عطاء فرمادے کہ وہی ان لوگوں کے کھانے کا انتظام کرتے ہیں اس کے علاوہ قرآن پاک کی تلاوت کا اہتمام اور قرآن پاک کے مکاتب کے جاری کرنے کا بھی اس کو بہت شوق ہے اور انشاء اللہ اس کی مغفرت کے لیے یہ چیزیں کافی سمجھتا ہوں، لیکن اس کے بالمقابل مقدمات اور ان کی پیروی سے بھی اس کو عشق ہے جس سے مجھے انتہائی نفرت ہے، اپنا نہ ہو تو دوسروں کے مقدمہ میں دلچسپی لینا اس کے لیے کھانا ہضم کرنے کا بہترین چورن ہے۔

اللہ تعالیٰ معاف فرمادے۔اس ناکارہ کوتو مقدمہ کے لفظ سے اتنی نفرت ہے کہ کھانا کھانے کے بعد اگر کسی مقدمہ کا ذکر آجاتا ہے تو امتلا ہو جاتا ہے اور اس کا کھانا ہضم ہو جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کو بھی اس بلا سے نجات عطاء فرمادے۔اس ناکارہ کو تو مقدمات سے اتنی نفرت ہے کہ ہماری جدی جائداد جھنجھانہ میں ایک لاکھ روپے سے زائد بتلائی جاتی ہے۔میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد ۳۶ھ میں جھنجھانہ کے چند نوجوان شرفاء میرے پاس آئے،انہوں نے کہا کہ تمہاری جائداد کی ہم نے تحقیق کرالی ہے وہ اسی ہزار ۸۰،۰۰۰ روپے کی ہے،ہم لوگ اس کے خریدار ہیں۔بالمقطع تیس ہزار ۳۰،۰۰۰ میں اس کو خریدنا چاہتے ہیں،روپیہ نقد دیں گے اور ضمانت کے لیے ہم کوئی دھوکہ نہیں کرر ہے اور آپ کے اطمینان کے لیے میرے والد کے حقیقی ماموں مولانا رؤف الحسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ وکیل مظفرنگر،میرے حقیقی پھوپھا مولانا رضی الحسن صاحب کاندھلوی (مولانا انعام الحسن صاحب امیر التبلیغ نظام الدین دہلی کے حقیقی جدامجد) اور میرے رشتہ کے دوسرے پھوپھا حکیم عبدالحمید صاحب رئیس بڈ ولی اور میرے بعض اعزہ کا بھی نام لیا کہ اپنے تعارف اور توثیق کے لیے ان سب کی تحریرات بھی آپ کو لادیں گے۔آپ سہارنپور ہی میں رہیں گے صرف ایک بیعنامہ تیس ہزار نقد میں اس مضمون کا لکھنا ہوگا کہ میں نے اپنی جائداد جو جھنجھانہ میں ہے بعوض تیس ہزار فلاں فلاں کے ہاتھ فروخت کی اور پھر انہوں نے کہا کہ آگے مقدمات کرنا اور ان کے قبضہ سے چھڑانا یہ سب کام ہم خود کریں گے۔تیرا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔تم اکابر ثلاثہ مذکورہ سے اس سلسلہ میں مشورہ کرلو۔ہم ان کے پاس گئے تھے انہوں نے کہا کہ اس کا تعلق مولوی زکریا کی ذات سے ہے وہ ہر قسم کی توثیق اور ہم لوگوں کے متعلق اطمینان دلانے کو تیار ہیں میں نے شدت سے انکار کر دیا۔ان کو بڑی حیرت ہوئی اور بار بار تعجب سے سوال بھی کرتے رہے کہ تم کو اتنی بڑی رقم نقد مل رہی ہے پھر کیوں انکار کرتے ہو،تمہارا اس سے کوئی واسطہ نہ ہوگا،میں نے ان سے کہا کہ میری یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں جب بائع ہوں گا تو مدعا علیہ میں کیوں نہیں بنوں گا،مقدمات کی لغویت میرے بس کی نہیں،میں طالب علم آدمی ہوں مجھے طلب علم میں جو مل رہا ہے اس پر تیس ہزار نہیں اس پر تیس لاکھ بھی قربان ہو سکتے ہیں اللہ ان دوستوں کو جزائے خیر عطاء فرمادے کہ وہ بھی میری مدد کے واسطے آئے تھے،مگر ان مقدمات کی وحشت نے مجھے ذرا بھی ان کی بات کی طرف متوجہ نہ کیا۔

حضرت سہارنپوری کا دب کر مصالحت کی کوشش کرنا:

اس وقت ایک لطیفہ اور یاد آ گیا معلوم نہیں کہ اپنے حضرت مرشدی سہارنپوری کے حالات میں لکھوا چکا ہوں یا نہیں،حضرت قدس سرہٗ کا انبہٹہ میں کسی عزیز سے کوئی نزاع ہوا۔جس میں حضرت

اقدس نے دب کر صلح اور فیصلہ کرنا چاہا اور ان کے مطالبہ کے حق میں کچھ رقم دینی چاہی۔ ان صاحب نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ حضرت نے ایک دفعہ اضافہ فرمایا، دوسری مرتبہ فرمایا اور پھر تیسری مرتبہ بھی کچھ اضافہ کیا مگر وہ صاحب ہر مرتبہ صلح سے انکار کرتے رہے۔

تیسری مرتبہ کے بعد حضرت نے ان کو پیام بھیجا کہ اب مصالحت ختم ہے دعویٰ کردیا جائے۔ اس پر ان صاحب کا پیام آیا کہ میں مصالحت آخری نمبر پر تیار ہوں، حضرت نے ارشاد فرمایا کہ اب تو نمبر ایک پر بھی صلح نہیں ہوسکتی۔ اب جو کچھ ہوگا عدالت میں ہوگا۔ تم نے یہ سمجھا ہوگا کہ مولوی ہے مقدمہ کے لفظ سے ڈر جائے گا اور میں عزیز داری اور آپس میں نزاع کم کرنے کے واسطے دیتا چلا گیا۔ مگر تم نے یہ نہیں سوچا ہوگا کہ میں جہاں ایک طرف مولوی ہوں، دوسری طرف انبہٹہ کا شیخ زادہ بھی ہوں، اب کسی حال میں صلح نہیں ہے۔ انہوں نے کئی صاحب کے ذریعہ ابتدائی درجہ پر صلح کرنی چاہی، مگر حضرت نے انکار فرمادیا پھر انہوں نے دعویٰ کیا اور وہ ناکام ہوئے، ان ناکامی کے بعد حضرت قدس سرہٗ نے ان سے کہلوایا کہ یہ تو میں نے آپ کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کیا، اب بھی جتنا آپ کا حق شرعی ہے وہ میں دوں گا۔ چنانچہ حضرت نے وہ ان کو مرحمت فرمادیا۔

(۲۰)......ایک نہایت اہم اور ضروری امر جو میں آپ بیتی نمبر۱ میں غالباً کئی جگہ لکھوا چکا ہوں اور آپ بیتی نمبر۲ و نمبر۳ میں بھی اس کا کچھ مضمون گزرا ہے کہ میں مدرسہ کے مسئلہ میں وقف کے مال میں اپنے بڑوں سے اور اپنے دوستوں سے کبھی لڑنے میں نہیں چوکا اور چھوٹوں سے تو پوچھنا ہی کیا۔ اس وجہ سے کہ میں نے اپنے اکابر کے اکابر کو اس میں بہت ہی محتاط پایا۔

اس سلسلے میں کئی قصے آپ بیتی نمبر۱ میں لکھوا چکا ہوں کہ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نور اللہ مرقدہٗ مدرسہ کے اسباق کے وقت میں اگر کوئی شخص کسی ذاتی بات کے لیے آتا تو وہ گھنٹہ دیکھ لیا کرتے تھے اور اتنے منٹ نوٹ کرلیتے تھے جتنے بات میں خرچ ہوئے اور مہینہ کے ختم پر ان کے گھنٹہ بنا کر اگر آدھے دن سے کم ہوتے تو آدھے دن کی رخصت درج کراتے اور آدھے دن سے زائد ہوتا تو پورے دن کی رخصت فرماتے تھے۔

میں یہ بھی لکھوا چکا ہوں کہ حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحب نور اللہ مرقدہٗ وہ مہتمم مدرسہ بھی تھے اور مفتی مدرسہ بھی اور عدالتی کاروبار کے لیے کوئی مستقل شخص نہیں تھا۔ سب مقدمات کی خود ہی پیروی کرتے تھے اور ان کے لیے دہرہ دون بھی اکثر جانا ہوتا تھا۔ لاریاں اس زمانے میں نہیں تھیں، ریل سے یا ایک منزل بیچ میں رُک کر گھوڑے تانگے سے جانا ہوتا تھا محرر کو ساتھ لے کر خود تشریف لے جاتے تھے۔ محصل چندہ شہر جب یہ شکایت کرتا کہ فلاں فلاں شخص نے چندہ نہیں دیا تو وہ ایک کاغذ پر ان کا نام و پتہ لکھ لیتے اور ان کے مکان پر خود تشریف لے جاتے۔ اس کو میں پہلے

تفصیل سے لکھوا چکا ہوں اور وہ اپنی معذوری کی وجہ سے عموماً صبح کو اپنی ڈولی میں تشریف لاتے۔ ساری دوپہر گرمی میں بھی مدرسہ کا کام کرتے رہتے تھے۔ ظہر کی اذان سے آدھ گھنٹہ پہلے دفتر میں ہی زمین پر لیٹ کر آرام فرماتے۔ اس کے باوجود ۴۴ھ میں حضرت قدس سرہٗ جب طویل قیام کے لیے حجاز تشریف لے جارہے تھے اور غیبت کے انتظامات کا پرچہ لکھوایا تو حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحب کے متعلق لکھوایا کہ وہ اپنی ضعف و پیری کی وجہ سے مدرسہ کے اوقات کی پابندی نہیں کرسکتے، اس لیے آئندہ ہر قسم کے گریڈ اور ترقی سے مستثنیٰ رکھے جائیں۔

میں بہت ہی گستاخ تھا اور حد سے زیادہ بے ادب۔ میں نے بارہا سفارش کی کہ حضرت دو تین آدمیوں سے زیادہ کام کرتے ہیں اور ان کے کام بھی گنوائے، حضرت نے فرمایا کہ یہ سب صحیح ہے مگر ان کے دفتر میں دیر سے آنے سے سارے ماتحتوں پر اثر پڑتا ہے اور ماتحت بھی وقت کی پابندی میں سستی کرتے ہیں۔ اس کے بعد سے جب بھی میں کسی مدرسہ کے ناظم یا مہتمم یا کسی بھی ذمہ دار کو مدرسہ کے اوقات میں تاخیر کرتے دیکھتا ہوں تو ''من رأی منکم منکراً'' الحدیث کی بنا پر ہاتھ سے روکنے کی تو کہیں بھی قدرت نہیں ہے لیکن زبان سے جہاں کہہ سکتا ہوں وہاں کسر نہیں چھوڑتا ہوں اور جہاں اس کی بھی قدرت نہ ہو وہاں قلبی تعلقات پر تو بے اختیار اثر پڑتا ہے۔

میرے بہت سے مخلص دوست ایسے جن سے مجھے بہت ہی قلبی محبت تھی مدرسہ کے قصوں نے مجھے ان سے یا ان کو مجھ سے بہت ہی دور کردیا، میں شاید یہ بھی لکھوا چکا ہوں کہ اب کی تو خبر نہیں کہ مجھے حالات کا علم نہیں رہا مگر جب حالات کا علم ہوتا رہتا تھا تو میں نے کثرت سے اس کا تجربہ کیا کہ جس نے بے وجہ کسی ذاتی ضرورت کی وجہ سے رخصت اتفاقیہ کے بجائے رخصت بیماری کی، وہ یا تو واقعی بیمار ہوا اور یا کوئی مالی نقصان پہنچا، دسیوں واقعات مجھے خوب یاد ہیں،

ایک صاحب کسی گاؤں کے رہنے والے جمعرات کے دن کچھ وقت سے پہلے چلے جاتے اور شنبہ کے دن گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد آیا کرتے تھے۔ میں نے کئی مرتبہ ناصحانہ سمجھایا اور تنبیہ بھی کی لیکن انہوں نے التفات نہیں کیا۔ ان کے یہاں اتنی زوردار چوری ہوئی کہ بہت ہی رنج و قلق ہوا اور یہ تو اکثر دیکھنے میں آیا کہ کوئی بیماری یا ناحق کا مقدمہ ایسا پیچھے لگتا ہے جو بہت ہی نقصان پہنچاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ہم سب کو سمجھ عطاء فرمائے اور اللہ تعالیٰ مجھے ہی معاف فرمائے اور میرے اکابر کو میری گستاخیوں اور بے ادبیوں پر بہت ہی بہتر سے بہتر بدلہ عطاء فرمائے۔

میں نے ایک دفعہ اپنے مخدوم سیدی وسندی حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ حضرت کی علوشان کی وجہ سے کوئی کہہ سکے یا نہ کہہ سکے مگر حضرت کے اسفار کی کثرت تنخواہ کے ساتھ بہت دل میں کھٹکتی ہے۔ حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے ملازمت کے

وقت ان سب چیزوں کو ممبران مدرسہ سے طے کرلیا تھا کہ میں ان وجوہ سے اسفار پر مجبور ہوں اور پھر حضرت نے وہ شرائط نامہ بھی مجھے دکھایا جو ہر وقت حضرت کے بیگ میں رہتا تھا۔ اس میں واقعی اس سے بہت زیادہ کی گنجائش دی ہوئی تھی جتنے حضرت اسفار فرمایا کرتے تھے اور اہلِ مدرسہ بھی مجبور تھے کہ جن حالات میں انہوں نے حضرت شیخ الاسلام کے پاؤں پکڑ کر بلکہ اقدام پر ٹوپی رکھ کر مدرسہ میں قیام کی درخواست کی تھی، اس وقت میں حضرت مدنی قدس سرہٗ کے علاوہ دارالعلوم کو سنبھالنے والا کوئی اور نہیں تھا ایک مرتبہ اس ناکارہ نے اپنے چچا جان سے بھی عرض کیا تھا کہ آپ مبلغین کو جو کچھ عطاء فرماتے ہیں اس کا کوئی ضابطہ اور قانون ضرور ہونا چاہیے۔ قصہ تو بہت لمبا ہے۔ چچا جان نے ارشاد فرمایا کہ میں تبلیغ کی مد میں کسی شخص کا چندہ قبول نہیں کرتا۔ میں صاف کہہ دیتا ہوں کہ آپ اپنے ہاتھ سے خود خرچ کریں اور مجھ سے مشورہ کریں، لیکن جو شخص یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ آپ کی ملک ہے آپ کو کلی اختیار ہے کہ اپنے اوپر خرچ کریں یا کسی دوسرے پر، وہ میں لے لیتا ہوں۔

جب یہ ناکارہ ۴۶ھ میں ایک سالہ قیام کے بعد حجاز سے ہندوستان واپس آیا اور مستقل طور پر تنخواہ نہ لینے کا ارادہ سرپرستان سے ظاہر کیا کہ میں مدرسہ میں شام کے دو گھنٹے کے علاوہ نہیں دے سکتا کہ صبح کا وقت میری تالیف و تصنیف کا ہے تو حضرات سرپرستان نے یہ کہا کہ ہم شام کے دو گھنٹے کے لیے تجھے پوری تنخواہ دیں گے۔ اس ناکارہ نے کہا کہ مال اللہ تعالیٰ کا ہے۔ ایک تہائی وقت میں آپ پوری تنخواہ کیسے دے سکتے ہیں؟ سرپرستان حضرات نے فرمایا کہ مدرسہ کی مصالح اور ضرورت کو ہم سمجھتے ہیں کہ ایک شخص کو کتنی تنخواہ دینی چاہیے۔ میں نے کہا کہ آپ حضرات اپنے پاس سے مرحمت فرمادیں تو سر آنکھوں پر لیکن مدرسہ کے مال سے مجھے خود بھی سوچنا چاہیے کہ میں اتنی تنخواہ کا مستحق ہوں یا نہیں؟ ان حضرات نے بہت اصرار فرمایا مگر اس ناکارہ نے قبول نہیں کیا۔ اس لیے میرے اکابر نے ہمیشہ بالخصوص میرے حضرت قدس سرہٗ نے ترقی کو یہ کہہ کر انکار کیا کہ میری حیثیت کے موافق یہ موجودہ تنخواہ بہت ہے۔

بلکہ ذیقعدہ ۳۴ھ میں جب حضرت قدس سرہٗ کی حجاز کے طویل سفر سے واپسی ہوئی اور میرے والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا تو حضرت نے تنخواہ لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اب تک مولانا یحییٰ صاحب میری جگہ سبق پڑھاتے تھے اور میں اور وہ دونوں مل کر ایک مدرس سے زیادہ کا کام کرتے تھے، لیکن مولانا کے انتقال کے بعد میں ایک تنہا ایک مدرس کا کام نہیں کر سکتا، اس لیے مدرسہ کی تنخواہ لینی مجھے جائز نہیں۔

غالباً پہلے بھی یہ قصہ لکھا جا چکا ہے، بہت طویل قصہ ہے، اسی بناء پر اس ناکارہ کو اس مسئلہ پر

بہت ہی خوف رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی میری لغزشوں کو معاف فرمادے۔ میں اپنے دوستوں میں جب کسی شخص کے متعلق مدرسہ کے اوقات میں یا معاملات میں تساہل دیکھتا ہوں تو بہت ہی طبیعت کو تکدر ہوتا ہے۔ میں چاہے اس کو ٹوک سکوں یا نہیں، لیکن طبیعت اندر سے بہت مکدر رہوتی ہے۔ اس کے بالمقابل مدرسہ کے معاملات میں جس کو محتاط دیکھتا ہوں اس سے اگر میرا کوئی تکدر پہلے سے ہو تو وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ غالباً قاری سعید مرحوم کا قصہ بھی لکھوا چکا ہوں کہ ابتداءً ان سے تعلقات کچھ کشیدہ ہی رہے مگر صرف دو باتوں نے ابتداءً میرا قرآن پاک سُننے سے مدرسہ کے وقت میں انکار کیا اور اس کے بعد انہوں نے اجراڑہ کے مدرسہ میں بکار مدرسہ جانے کو باوجود محض اس وجہ سے کہ وہاں ان کا گھر تھا انہوں نے رخصت لکھوائی۔ ان کو ایسا محبوب بنایا کہ ''ندمانی جزیمۃ'' بنادیا۔ گو موجودہ مدرسہ کے عملے میں بہت سے لوگوں کی تحقیقات بھی کرا رہتا ہوں کہ کون کون وقت پر مدرسہ کے دفاتر میں آیا اور آنے کے بعد مدرسہ کے کام میں مشغول ہے یا لغویات میں، اسی طرح سے مدرسین میں بھی باوجودیکہ میں اب اپنے اعذار و امراض کی وجہ سے تقریباً دو سال سے مدرسہ کے انتظامات سے غیر متعلق ہوں، پھر بھی اکثر آدمی بھیج کر یا آنے والے دوستوں سے تحقیق کرتا رہتا ہوں کہ کس مدرس نے وقت پر سبق شروع کرایا اور وقت پر ختم کرایا اور کس نے اول یا آخر میں زیادتی کی۔ اول الذکر لوگوں کی دعوت کرنے کا بھی مجھ پر تقاضہ رہتا ہے اور ان کی مدارات کا بھی اور ثانی الذکر اشخاص کے متعلق طبیعت میں تکدر بڑھتا رہتا ہے۔

علی گڑھ کے اندر جو مواد ذہن میں تھا وہ سب ختم ہو گیا اور ان واقعات کے لکھوانے میں مزید مضامین بھی ذہن میں آئے، مگر ایک تو رمضان کے بعد سے طبیعت بہت ہی خراب چل رہی ہے۔ کچھ دنوں تک میں رمضان کے بعد کا تکان سمجھتا رہا۔ مگر طبیعت روز افزوں گرتی جا رہی ہے ادھر ماہ رمضان المبارک سے سفر حجاز کا بھی ذکر و تذکرہ زوروں پر ہے، اگرچہ اپنے امراض ظاہرہ و باطنہ کی بناء پر امید تو نہیں کہ حاضری میسر ہوگی، مگر جیسا کہ پہلے بھی متفرق جگہ لکھ چکا ہوں کہ مجھے معمولی سفر کا بھی سہم بہت سوار ہوتا ہے، دہلی تک کے سفر میں کئی دن پہلے سے دورانِ سر اور حرارت شروع ہو جاتی ہے اور سفر سے واپسی کے بعد کئی دن تک اثر رہتا ہے اور یہ تو بہت طویل سفر ہے اور بیماری کی وجہ سے اس کا اثر بھی بہت ہو رہا ہے۔ اس لیے اب تو دوستوں سے رخصت ہوتا ہوں:

پھر بھی آئیں گے گر خدا لایا

اگر موقع ہوا تو ممکن ہے کہ اس سلسلہ کا پانچواں اور چھٹا حصہ بھی مکمل ہوگا۔ انشاء اللہ اکابر و احباب کے بہت ہی قصے یاد آتے چلے گئے اور لکھنے کے دوران میں اس خیال سے بہت سے قصے اس لیے بھی چھوڑ دیے کہ اس تحریر سے کوئی دینی یا دنیاوی نفع سمجھنے میں نہیں آیا، مگر بار بار چھوڑنے کے بعد دوستوں کے اصرار پر کہ علی گڑھ میں جو کچھ مسودہ کی شکل میں لکھا جا چکا ہے اس کی تبیض ضروری ہے اس کو پورا کرا دیا۔

واللّٰہ الموافق لما یحب و یرضیٰ و صلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیّدنا و مولانا محمد و اٰلہٖ وصحبہٖ و بارک وسلم تسلیماً کثیراً۔

زکریا کاندھلوی
۹ ذیقعدہ ۱۳۹۰ھ
صبیحۃ یوم الخمیس

......☆☆☆☆☆......

ضمائم

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْم

یہ ناکارہ اوائل ذیقعدہ ۹۰ھ میں حج کو جاتے ہوئے یہ مسودات اپنے دوستوں کو جو طباعت کا کام کررہے ہیں حوالہ کر گیا تھا۔ واپسی پر ۴ جون ۷۱ء مطابق ۹ ربیع الثانی ۹۱ھ کو دہلی پہنچا، وہاں پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ آپ بیتی نمبر۳ کی طباعت ہوچکی، جس کے چند نسخے مجھے دہلی میں ملے اور میں نے اسی وقت وہیں سے اپنے ایک مخلص دوست کے ہاتھ چھ (۶) نسخے حجاز مقدس بھیج دیے کہ میری ہمیشہ سے یہ عادت ہے کہ جو کتاب بھی طبع ہوتی ہے اس کا پہلا نسخہ ہمیشہ مدینہ پاک کسی دوست کے پاس بھیجنے کا اہتمام رہا۔ عربی ہو تو سید محمود صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی خدمت میں بھیجتا تھا یا مدرسہ شرعیہ میں اور اب سید صاحب کے وصال کے بعد سے ان کے صاحبزادے سید حبیب صاحب کے پاس بھیجتا ہوں اور اگر اردو میں ہو تو اردوداں دوستوں میں سے کسی کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ ان چھ نسخوں میں سے دو مدینہ پاک کے احباب کے تھے اور چار مکی احباب کے۔ چند ہی دنوں میں اس کے بہت سے نسخے مفت یا قیمتاً ختم ہوگئے۔ اتفاق سے میرے مخلص دوست مولانا عبدالحکیم جونپوری مظاہری جن سے ان کے دورہ شریف پڑھنے کے زمانے میں بہت ہی خصوصی تعلقات ہوگئے تھے، چونکہ خوش قلم تھے اس لیے میری بہت سی چیزوں کی نقل کرنے کی بیگار بھی مولانا موصوف کے ذمہ تھی اور اب تو وہ مدرسہ ضیاء العلوم جونپور کے ناظم ہونے کے علاوہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب الہ آبادی کے اجل خلفاء میں ہیں، مجھ سے ملنے کے واسطے آئے۔ میں نے آپ بیتی نمبر۳ ان کو دی اور میرے ہی پاس بیٹھ کر انہوں نے دیکھنا شروع کیا، دیکھتے ہی دیکھتے فرمایا کہ دوسرے صاحبزادے کی پیدائش تو اس زمانے میں تھی جس زمانہ میں میں دورہ میں تھا۔ ہم لوگوں نے دورہ کی جماعت کی طرف سے متفقہ شیرینی کا مطالبہ بھی کیا تھا اور بہت زوردار شیرینی بھی آپ سے وصول کی تھی، غور سے دیکھنے سے مجھے بھی معلوم ہوا کہ یہاں دولڑکوں کے دو قصے غلط ہوگئے۔

اس کے علاوہ عزیزم الحاج محمد شمیم بن برادرم الحاج محمد سلیم مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ سے خط آنے شروع ہوئے، اس میں آپ بیتی نمبر۳ پر کچھ اشکال اور کچھ اضافوں کے اصرار کیے۔ میں نے ان کو لکھ دیا کہ اصلاحات تو جب بھی سمجھ میں آئیں ضرور لکھیں مگر اضافوں کی گنجائش نہیں۔ اس وقت چونکہ آپ بیتی نمبر۵ کی کتابت قریب الختم ہے، اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ آج ۲۲ جمادی الثانیہ ۹۱ھ مطابق ۱۵ اگست ۷۱ء تک اصلاحات واضافات جو موصول ہوئے ہیں انہیں نقل

کرادوں کہ اس وقت یہ حصہ کتابت کے بعد پریس میں جارہا ہے۔آیندہ بھی کوئی چیز حصہ پنجم کی طباعت سے پہلے ملی تو اس میں شامل کردی جائے گی اور اس کے بعد ملی تو احباب اصلاح کرتے رہیں گے۔ کیونکہ یہ رسالے میں نے جبکہ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بیماری کی حالت میں علی گڑھ کے شفاخانے میں لکھوائے تھے اس لیے املاء میں کچھ تسامح بھی ہوا ہے۔

اصلاح متعلقہ تولد ولد اوّل:

(۱)......آپ بیتی نمبر ۳ پر دولڑکوں کا قصہ غلط ہوگیا ہے۔صحیح عبارت یہ ہے کہ "میری سابقہ اہلیہ سے ایک لڑکا محمد موسیٰ نام رمضان ۴۳ھ میں سہارنپور میں پیدا ہوا، چند ماہ بعد نظام الدین میں انتقال ہوگیا۔اس وقت تو اس کے انتقال کا قصہ لکھا تھا۔" یہاں سے لے کر آخر تک کی عبارت صحیح ہے اور اس سے اُوپر کی چند سطریں "میری اہلیہ سے ایک لڑکا طلحہ کا بڑا بھائی پیدا ہوا جس کا نام عبدالحیٔ تھا۔" یہ دوسرے لڑکے کا قصہ ہے۔ پہلے لڑکے کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ چچا جان کے خط سے اس کے انتقال کی اطلاع ہوئی میں اس وقت بذل المجہود لکھوا رہا تھا، اخیر تک عبارت صحیح ہے اور دوسرے صفحہ پر دوسرے دن ڈاک سے عزیز یوسف کا خط آیا، یہاں سے لے کر اخیر تک کا واقعہ دوسرے لڑکے عبدالحیٔ کا واقعہ ہے اور یہ واقعہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے۔اس بچہ کی پیدائش ۱۸ ربیع الثانی ۵۸ھ نظام الدین میں پنجشنبہ کو ہوئی۔اسی کا نام عبدالحیٔ تھا۔ مجھے اس معصوم کے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے انتقال کے بعد اگلے دن کی ڈاک سے الخ یہ عبارت صحیح ہے، آگے کے اشکالات عزیزم الحاج شمیم مکی کے خطوط سے منقول ہیں۔

اصلاح بسلسلہ نکاح ماموں یامین:

(۲)......میں نے آپ بیتی نمبر ۳ پر ماموں یامین کی شادی کا قصہ نقل کیا ہے اس پر عزیزم الحاج محمد شمیم مکی کا خط پہنچا، جس میں لکھا کہ ماموں عثمان کی عدم شرکت میں آپ سے سہو ہوا۔وہ تو شریک تھے اور ان کی شرکت میں بڑے لطائف گزرے۔ان کا خط بعینہٖ نقل کراتا ہوں، نیز میں نے ان کو جواب لکھوادیا کہ میرا مناظرہ یا حکم عدولی دادا رؤف الحسن مرحوم سے جو ہوئی تھی وہ ولیمہ میں شرکت کے متعلق تھی۔ ولیمہ میں ان کی شرکت قطعاً نہیں تھی، اسی پر میرا مناظرہ تھا۔اب یاد آیا کہ نکاح میں شرکت کے بعد ماموں عثمان صاحب ولیمہ میں شرکت سے معذرت کرکے میری طرح پہلے ہی چلے گئے تھے۔ چونکہ یہ ساری بحث ولیمہ ہی کے متعلق تھی میں سمجھا کہ شاید نکاح میں بھی وہ شریک نہ ہوسکے تھے نیز بھائی اکرام کے کارڈ سے ایک شعر میں نے لکھا ہے (آپ بیتی نمبر ۳ پر) اب رسالہ طبع ہونے پر بھائی اکرام صاحب نے بقیہ اشعار بھی سنادیے، وہ یہ ہیں:

جانتا نہیں میں قبلہ قبلی بس بات یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف فرماؤ آج کی رات کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیہ سمجھو اس کو پلاؤ قلیا

نقل مکتوب بھائی شمیم سلمہٗ :

بعد سلام مسنون! آپ نے آپ بیتی نمبر۳ پر پھوپھا یامین صاحب کی شادی کے مضمون میں ابا رؤف الحسن صاحب مرحوم کے تذکرہ کے ساتھ خالو عثمان صاحب مرحوم کا پھوپھا یامین صاحب کی شادی میں شریک نہ ہوسکنے کا ذکر فرمایا ہے۔ بھائی ابا (جناب الحاج محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ) کو اور پھوپھا یامین کو اس پر حیرت ہے کہ شاید خالو عثمان مرحوم کا نام لکھنے میں سہو ہوگیا اول تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خالو عثمان شریک نہ ہوئے ہوں۔ کیونکہ شادی کے کرتا دھرتا وہی تھے۔ دوسرے یہ دلچسپ واقعہ خالو عثمان صاحب ہی کے ساتھ پیش آیا تھا کہ پھوپا کی شادی میں رات کو خوب زور دار بارش ہوئی، بارات کو مولوی بدرالاسلام صاحب کے وسیع مکان میں ٹھہرایا گیا تھا جس کے بے حد وسیع صحن اور چبوترے پر شامیانہ لگایا گیا تھا اور یہ شامیانہ خصوصی طور پر مظفر نگر سے نواب لیاقت علی خاں (وزیر اعظم پاکستان) یا ان کے والد کے یہاں سے آیا تھا اور انہوں نے ہی بڑے شوق سے بھیجا تھا۔ شادی میں کنور عنایت علی خان بھی مع اپنے لنگاڑوں کے شریک تھے اور بار بار کہہ رہے تھے کہ کیا مولوی کی بے مزہ شادی ہے، سارے مُردے آکر جمع ہوگئے ہیں۔ رات کو عشاء کے بعد زوردار بارش شروع ہوئی، سینکڑوں آدمی شامیانے کے نیچے سو رہے تھے کہ ایک دم قیامت کا شور اٹھا اور یہ جب جنگم شامیانہ ٹوٹ کر اس طرف جھک گیا جدھر سب سے الگ خالو عثمان صاحب کا پلنگ تھا۔ شامیانے پر جتنا پانی تھا وہ سارا ڈھل کر خالو عثمان پر گرا، وہ اور ان کے ساتھ ۵، ۱۰ آدمی ہزاروں مشک ٹھنڈے پانی میں نہاگئے۔ لوگوں کے بستر بھیگے، شامیانہ کے ڈنڈے اور لکڑیاں لوگوں کے سروں میں لگیں۔ لوگ اندھیرے میں اُٹھ کر بھاگے تو کسی کا پاؤں کسی کے چہرے پر تو کسی کے پیٹ پر۔ رات کے اندھیرے میں اور بارش میں وہ افراتفری مچی کہ لطف ہی آگیا۔ سب سے زیادہ خالو عثمان کی بنی۔ صبح کو ناشتہ پر کنور صاحب مرحوم نے اعلان فرمایا کہ رات والا کارنامہ ان کا تھا اور انہوں نے اپنے ایک نوکر کو چھت پر چڑھا کر شامیانے کی رسیاں کٹوادی تھیں اور بار بار یہ کہتے تھے کہ مکہ کی لونڈیا ہے (اس لیے کہ تائے سعید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کیرانوی مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کا قیام مکہ مکرمہ میں رہتا تھا اور ان کی صاحبزادی سے یہ نکاح ہوا تھا) اور کاندھلہ کے مولویوں کا لونڈا۔ ان دونوں کی شادی میں تفریح نہ ہوئی تو کیا میری شادی

میں ہوگی اور اپنے تکیہ کلام گالی دے کر کہنے لگے کہ شامیانہ میں نے کٹوایا ہے، جس ماں کے پوت میں ہمت ہو سامنے آجائے۔ الغرض کنور صاحب نے اس شادی کو باغ و بہار بنادیا۔ خالو عثمان صاحب کے پاس دوسرا جوڑا نہیں تھا تو کنور صاحب نے زبردستی اپنا جوڑا ان کو پہنایا۔ بھائی ابا کا خیال ہے کہ کنور صاحب کے ہنسی مذاق اور پھکڑ پن پر شاید کوئی فقرہ خالو عثمان صاحب نے کہہ دیا تھا جس کا انتقام کنور صاحب نے اس طرح لیا کہ شامیانے کی تین طرف کی رسیاں اس طرح کٹوائیں کہ سارا پانی آدھی رات کو بے چارے خالو عثمان پر گرا۔ فقط

الجواب:

عزیزم شمیم نے جو قصہ بارش وغیرہ کا لکھوایا وہ تو مجھے یاد نہیں کہ میں تو اپنے ہم عمروں کے ساتھ ایک مستقل مکان میں تھا، لیکن میں نے جو واقعہ ولیمہ کے سلسلہ میں لکھوایا اس میں کوئی تردد نہیں اور میرے دادا رؤف الحسن صاحب مرحوم سے یہ کہنا کہ ماموں عثمان صاحب کی کیا مجبوری ہے ملازمت ہی تو ہے چھوٹ جائے گی تو اور کہیں مل جائے گی۔ مگر میں حضرت (قدس سرہٗ) سے ایک دن کی اجازت لے کر آیا ہوں، خوب یاد ہے اور دادا رؤف الحسن صاحب کا انتہائی غصہ کی وجہ سے سکوت کا منظر اور چہرہ کا تغیر بھی میرے سامنے ہے، اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ میری طرح ماموں عثمان صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی صرف نکاح میں شریک ہوئے ہوں گے ولیمہ میں نہیں شریک ہوں گے، جس کو میں نے دلیل بنایا۔ عزیزم الحاج محمد شمیم سلمہٗ کی نے کنور صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا، اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ اللہ ان کو معاف فرمائے، مرحوم کے کارنامے اس سے بہت اونچے اُونچے ہیں۔ میرے کاندھلوی اکابر اقارب سے بہت ہی خصوصی دوستانہ سے بھی بڑھ کر تعلقات تھے۔ ۱۵، ۱۵، ۲۰، ۲۰ دن کاندھلہ میں مستقل قیام کرتے تھے۔ قصبہ لوئی ضلع مظفر نگر کے مشہور رئیس تھے۔ اس واقعہ کے ساتھ مرحوم کے بیسیوں واقعات دل و دماغ میں گھوم گئے۔ میرے بچپن میں ان کا بڑھاپا تھا۔ نمونہ کے طور پر دو تین واقعات ان کے بھی لکھوا دیتا ہوں۔

(الف)......میری عمر آٹھ سال سے زائد نہ تھی۔ اپنی والدہ کے ساتھ ایک آدھ روز کے لیے کاندھلہ جانا ہوتا تھا۔ ہمارے مکان کے قریب مظہر الحق مرحوم کا مکان تھا، اس زمانہ کے آپس کے تعلقات کا تو اگر اب ذکر بھی کیا جائے تو شاید یقین نہ آئے۔ آپس میں اتنی محبتیں تھیں کہ جنت کے تعلقات کا جو منظر احادیث میں پڑھا ہے: ''قلوبهم على قلب رجل واحد لا اختلاف بينهم ولا تباغض '' یہ اپنے اکابر و اقارب میں بہت دیکھا کنور صاحب ڈپٹی صاحب کے چبوترے پر ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نانی اماں کے مکان سے نکل کر مسجد کی طرف جارہا

تھا۔ مجھے آواز دی بیٹا یہاں آنا۔ میں چبوترہ پر چڑھ کر ان کی کرسی کے پاس گیا، انہوں نے اپنی دونوں باہیں میری گردن میں ڈالیں اور میرے سر پر بڑی محبت سے دونوں ہاتھ پھیرے اور کہا کہ بیٹا دیکھ! او بیٹا! مرنے کے بعد تو تو جنت میں ضرور جائے گا اور دادا دوزخ میں پڑا ہوا ہوگا۔ بس دیکھ دادا کا ہاتھ پکڑ کر دوزخ سے کھینچ کر اپنے پاس لے جائیے۔

(ب)......ایک مرتبہ مجھے کہنے لگے بیٹا! قرض حسنہ جانے کسے کہتے ہیں؟ ہم حقیقت تو اب تک بھی نہیں جانتے مگر جو سنا تھا کہ ثواب کی نیت سے بغیر سود کے اللہ کے واسطے قرض دے اپنی کوئی غرض نہ ہو، اس قسم کی کوئی بات میں نے کہی، کہنے لگا بیٹا یوں نہیں۔ تو نہیں جانتا یہ قرض حسنہ نہیں قرض ہنسنا ہے کہ کسی سے بڑے پکے وعدے پر قرض لے اور جب وہ غریب وعدہ پر مانگنے آئے تو ایک قہقہہ مار کر ہنس دے۔ وہ یوں تو منت ساجت ہر موقعہ پر کرلے اور تو ہر موقعہ پر ہنس دے، یہ دو واقعے تو مجھے پیش آئے اور ان کے علاوہ اور بھی بیسیوں واقعات سنے ہیں۔

(ج)......یہ میرا اسی وقت کا سنا ہوا ہے کہ مظفر نگر میں ایک غیر مسلم ڈپٹی صاحب نوجوان تھے، ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ کنور صاحب مرحوم ایک بہت موٹا سا لٹھ اپنے ہاتھ میں رکھا کرتے تھے جو ان کے سر سے بھی اونچا تھا۔ اس کو درمیان میں پکڑ کر چلا کرتے تھے۔ ڈپٹی صاحب کی تعزیت کے لیے ہندو مسلمانوں کا بہت اجتماع تھا۔ ان کے مکان پر آدمیوں کا بڑا ہجوم تھا۔ کنور صاحب بھی اپنا لٹھ لے کر نہایت رنجیدہ منہ بنا کر کراہتے ہوئے، کھانستے ہوئے پہنچے، کیونکہ ہمیشہ مظفر نگر کے مجسٹریٹ رہے اس لیے ہندو مسلمان سب ہی باطن سے نہ سہی ظاہر سے ان کی بہت ہی عزت کیا کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر سب مجمع اُٹھ گیا۔ ڈپٹی صاحب کی برابر کی کرسی ان کے لیے خالی ہو گئی، بیٹھ کر کہنے لگے ڈپٹی صاحب جب سے سنا ہے، بہت ہی رنج و قلق ہے ماں کا رشتہ ہی ایسا ہے کہ آدمی ہمیشہ روئے ہی (یہ تمسخر تھا، انہیں معلوم تھا کہ ڈپٹی صاحب کی بیوی کا انتقال ہوا ہے) ارے بھائی ڈپٹی پیارے مرنا تو سب کو ہے مگر ماں باپ کا بدل کہاں مل سکے۔ ماں کی محبت تو کبھی بھی بھلائی نہیں جاسکتی، سنا ہے کہ فرضی آنسو بھی گرائے۔ کسی صاحب نے جن کی کرسی ان کے برابر تھی اُٹھ کر کان میں کہا کہ کنور صاحب ڈپٹی صاحب کی والدہ کا انتقال نہیں ہوا اہلیہ محترمہ کا ہوا ہے۔ زور سے کہنے لگے "لاحول ولا قوۃ" ارے میں نے تو ماں کی خبر سُنی تھی اسی واسطے تو میں صبح سے رو رہا ہوں، بیوی کا کیا رونا، پُرانی گئی نئی آئے گی، تم چلو ابھی میرے ساتھ کنواری کہے کنواری، رانڈ کہے رانڈ، جیسی کہے ویسے کرادوں، تو ہندو ہے اس واسطے ایک ہی ہوسکتی ہے مسلمان ہوتا تو چار کرادیتا۔ ارے پیارے ڈپٹی (ڈپٹی صاحب نوعمر تھے) بیوی کو رویا نہیں کرتے، تو دیکھ اب تجھے نئی مل جائے گی۔ دو چار دن میں تو اس کے ساتھ لگ جائے گا۔ مجمع میں تو کھلکھلا کر کوئی

نہیں ہنسا مگر چپکے چپکے مجلس عزاء مجلس مزاح بن گئی۔

(۵) حضرت مولانا الحاج الحافظ قاری محمد طیب صاحب دام مجدہم کے چھوٹے بھائی قاری محمد طاہر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ دیوبند سے ایک اخبار نکالا کرتے تھے۔ غالباً ''الانصار'' اس میں کوئی مضمون کسی اعلیٰ افسر کے خلاف شائع ہو گیا۔ ان صاحب نے ہتک عزت کا دعویٰ کر دیا وہ چونکہ بڑے آدمی تھے، اس لیے وکلاء سے مشورے سے ان کے جواب دعویٰ کی تجویزیں کئی دن تک خوب ہوتی رہیں۔ مدعی کی کوشش تھی کہ وارنٹ بلا ضمانت کسی طرح سے جلدی جاری ہو جائے، جس کی وجہ سے سب ہی بڑوں چھوٹوں کو فکر تھی، کنور صاحب مظفر نگر سے دیوبند پہنچے، کہنے لگے طاہر بیٹا! اتنی سی چیز سے گھبرا گئے۔ جواب دعویٰ لکھ دو کہ میں تو ایک مہینہ سے کنور صاحب کے یہاں لوئی شکار کھیلنے کے واسطے گیا ہوا تھا۔ میری غیبت میں یہ مضمون لکھا گیا۔ مدعی کو بھی عزیز طاہر مرحوم ہی سے کچھ عداوت تھی۔ عزیز مرحوم نے کہا، تایا جی آپ عدالت میں کس طرح کی جھوٹی قسم کھائیں گے کہ یہ میرے ساتھ شکار میں تھے۔ کہنے لگے کہ اپنے مقدمے میں ہزار قسمیں جھوٹی کھائی ہیں۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پوتے کے لیے اگر ایک جھوٹی قسم کھا لوں گا تو خدا کی قسم میری ساری جھوٹی قسموں کا کفارہ ہو جائے گا، چنانچہ جوابِ دعویٰ میں یہی لکھا گیا کہ میں اس زمانے میں کنور صاحب کے ساتھ لوئی شکار کے لیے گیا ہوا تھا اور کنور صاحب کی تصدیق پر مقدمہ خارج ہو گیا اور نئے مدیر پر دعویٰ کرنا مدعی کا بھی مقصود نہیں تھا۔ ان ستر سالوں میں کیا کیا مناظر اہل دنیا کے ان آنکھوں نے دیکھے، ان سب کو لکھا جائے تو کم از کم آدھی عمر پینتیس سال اور چاہئیں۔

(۳)......عزیزم الحاج شمیم مکی نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا کہ آپ بیتی نمبر۳ میں آپ کے والد ماجد رحمہ اللہ تعالیٰ کی علالت اور وفات کی تفصیلات نہیں ہیں، جب کہ والدہ صاحب اور اہلیہ کے حالات وفات درج ہیں۔

الجواب:

یہ صحیح ہے کہ یہ آپ بیتی جیسا کہ بار بار لکھا جا چکا ہے کوئی مستقل تالیف مسلسل نہیں ہے علی گڑھ کے دوسفروں میں جب کہ علمی کاموں سے روک دیا گیا تھا۔ پڑے پڑے کیف ما اتفق جو واقعات یاد آتے رہے لکھواتا رہا۔ بہت سے اہم واقعات چھوٹ گئے اور بہت سے واقعات بے ترتیب بھی آگئے اور بہت سے مکرر بھی ہو گئے۔ اس وقت تک یہ واہمہ بھی نہیں تھا کہ یہ طبع بھی ہوں گے۔ لکھنے کے بعد دوستوں کے اصرار اور اپنے شدید انکار کے باوجود طباعت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی علالت بھی کچھ طویل نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن سے بھی کم

علالت رہی۔۹ ذیقعدہ جمعہ کی صبح سے طبیعت میں اضمحلال اور افسردگی تھی، عزیز مولوی حکیم مولوی محمد ایوب سلمہٗ سے فرمایا کہ کوئی کتاب دیکھنے کے واسطے لا۔ کچے مکان میں تشریف فرماتے تھے۔ عزیز حکیم ایوب مدرسہ میں والد صاحب کے کتب خانہ میں گئے اور وہ دو تین مختلف کتابیں عربی اشعار کی کہ اس کا ذوق تھا لائے مگر اس کو ناپسند کردیا، وہ پھر دوبارہ گئے اور سلوک کی کتابیں لائے۔ مگر اسے بھی پسند نہیں کیا۔ جمعہ کی نماز دارالطلبہ میں اطمینان سے پڑھائی۔ جمعہ کے بعد حسب معمول کھانا کھا کر لیٹ گئے تو کچھ اسہال کا سلسلہ معمولی شروع ہوا۔ جو عشاء تک بڑھتا رہا۔ عشاء کے بعد یوں فرمایا کہ مولوی عبداللہ جان صاحب وکیل (مشہور بیرسٹر جو میرے حضرت قدس سرہٗ کے جانثاروں میں تھے تذکرۃ الخلیل میں بھی ذکر ان کا کہیں کہیں آیا ہے اور میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے خاص دوستوں میں تھے) کے یہاں جانا ہے، انوار کی والدہ کے مقدمہ کی سفارش کرنا ہے۔ شیخ ابرار رئیس محلہ چوب فروشان کے بڑے بھائی کا نام انوار ہے، جو اس وقت میرے والد صاحب کے پاس حکیم ایوب مولوی نصیر کے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ ان کا کوئی مقدمہ تھا، وہ مرحومہ میرے حضرت قدس سرہٗ اور میرے والد صاحب کے ساتھ بہت ہی محبت رکھتی تھی، ان کا اصرار تھا کہ اگر آپ مولوی عبداللہ جان صاحب سے کچھ فرمادیں تو میرے لیے بہت مفید ہوگا۔ تاریخ مقدمہ کے قریب تھی۔ عشاء کے بعد ان کے یہاں جانے کا ارادہ کیا۔ مولانا ظفر احمد صاحب شیخ الاسلام پاکستان جو اس زمانے میں مظاہر علوم میں مدرس تھے اور میرے والد صاحب سے بہت ہی اخص الخصوص تعلق تھا، ان سے اور میرے چچا جان مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے فرمایا کہ تم دونوں بھی میرے ساتھ چلو، ایک لوٹا ساتھ لے لینا کہ اگر استنجا کی ضرورت ہوئی تو نالہ کی پڑی پر فارغ ہوجاؤں گا۔ یہ نالہ جو کھالہ پار کے داہنی جانب میں ہے اس وقت میں بہت ہی ویران تھا۔ اب تو عمارتوں کی اتنی بھرمار ہے کہ آباد شہر بن گیا۔ ان دونوں نے عرض کیا کہ ہم آپ کا پیغام پہنچادیں گے آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ فرمایا اچھا زکریا کو بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ ہم تینوں مولوی عبداللہ جان وکیل کی کوٹھی پر گئے جو اسٹیشن کے قریب رہتے تھے۔ راستے میں یہ دونوں حضرات کچھ ایسی گفتگو کرتے گئے اور آئے تو میں تو کچھ سمجھ نہ سکا، بچپن تھا خلاصہ یہ تھا کہ ہم نے مولانا (یعنی والد صاحب) کی نہ تو کبھی قدر کی نہ ان کے رتبہ کو پہچانا۔ مولانا کے بے تکلفانہ طرز سے جو ہر چھوٹے کے ساتھ رہا کرتا تھا ہم بھی ساری عمر گستاخ بنے رہے۔

یہ دونوں ایسے ہی گفتگو کرتے چلے گئے اور آئے۔ میں سوچتا رہا کہ معمولی اسہال ہیں، یہ تو ایسی باتیں کر رہے ہیں جیسے سخت بیمار ہوں، واپسی پر معلوم ہوا کہ دستوں میں اضافہ ہوگیا۔ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور میرے سب گھر والوں کا علاج حکیم محمد ایوب صاحب سرپرست مدرسہ

مظاہر علوم کے والد حکیم محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا رہا اور میرے حضرت قدس سرہٗ اور ان کے سب گھر والوں کا علاج حکیم صاحب کے بڑے بھائی حکیم ایوب کے تایا حکیم محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا رہا کرتا تھا، حکیم محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بڑے ہی حاذق طبیب ہندوستان میں شاید ہی دو چار آدمی ان کے ہم پلہ ہوں، مگر علاج میں باہر بہت کم جاتے تھے اور یہاں بھی بہت ہی استغناء کے ساتھ علاج کیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے ان کی طرف رجوعات بہت کم تھیں اور چھوٹے بھائی حکیم محمد یعقوب صاحب فنی حیثیت سے تو بڑے بھائی کا مقابلہ بالکل نہیں کر سکتے تھے لیکن اللہ جل شانہٗ نے ہاتھ میں شفا عطاء فرما رکھی تھی، ان کی طرف رجوعات اتنی کثرت سے ہوتی تھیں کہ شاید شہر میں کسی طرف ہوتی ہوں۔ حکیم صاحب کو اطلاع دی گئی اور انہوں نے گھنٹہ گھنٹہ بھر کے فصل سے کئی دوائیں دیں مگر دست بجائے کم ہونے کے بڑھتے گئے۔ اخیر میں حکیم صاحب مرحوم نے اسہال بند کرنے کی کوئی سخت دوا دے دی، معلوم نہیں کیا تھی مگر صبح کو جب حکیم اسحاق صاحب نے ان سے دریافت فرمایا اور انہوں نے بتایا تو وہ اپنے چھوٹے بھائی حکیم یعقوب صاحب پر مجمع میں ہی ناراض ہو گئے کہ کیا ستم کر دیا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس دوا سے اسہال تو بند ہو گئے اور ایسے بند ہوئے کہ بند پڑ گیا۔ دونوں بھائیوں نے مختلف دوائیں دیں، پیٹ پر بہت سی ادویہ کو پیس کر گہرا لیپ بھی کرایا، حکیم یعقوب صاحب نے صابن کی ایک قاش کاٹ کر اس پر بہت سے دوائیں مل کر اپنے ہی ہاتھ سے انیمہ بھی کیا حکیم اسحاق صاحب خود اس وقت وہیں کھڑے تھے اس انیمہ کو دیکھ کر فرمایا کہ اب کیا ہو؟ یہ دونوں حضرات انیمہ کے بعد اپنے اپنے گھر کسی دوائی کی تجویز کے لیے گئے، یہ ہمارے مکان کے دروازے سے چند ہی قدم آگے نکلے ہوں گے اور ہم سب اجابت کے منتظر انیمہ کے اثر کے امیدوار کہ اتنے میں ہمارے مدرسہ کے مہتمم صاحب گھر سے مدرسہ آتے ہوئے علالت کی خبر سن کر عیادت کی نیت سے ہمارے گھر پہنچے کہ اس سے پہلے جمعہ کا دن ہونے کی وجہ سے اور یہ کہ رات تک علالت کا شدت سے اثر نہیں تھا، عام طور سے علالت کی شہرت بھی نہیں تھی۔

مہتمم صاحب نے مردانہ مکان میں گھستے ہی نہایت حزین آواز میں کہا کہ ارے چارپائی کا رُخ جلدی بدلو، اسی وقت فوراً چارپائی کا رُخ بدلا گیا۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ چارپائی کے غربی جانب کھڑے ہوئے یٰسین شریف پڑھ رہے تھے اور والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی زبان پر نہایت سرعت کے ساتھ ضرب کے ساتھ بغیر جہر اسمِ ذات کا ذکر شدت سے جاری تھا، بار بار جیب تالو کو لگتی ہوئی نظر آتی تھی اور ان کی اس ضرب کے ساتھ یہ ناکارہ بھی اسمِ ذات کا ذکر نہایت شدت جہر کے ساتھ بغیر اختیار کر رہا تھا۔ ان کی اللہ کے ساتھ میری اللہ بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی، جو لطف،

لذت اس وقت کے ذکر بالجہر میں آرہی تھی وہ آج تک کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ چند منٹ بعد وصال ہوگیا۔ حکیم اسحاق و یعقوب صاحب کو اطلاع دی گئی وہ اتنے واپس آئے روح پرواز کر چکی تھی۔ عزیز حکیم محمد ایوب سلمہٗ صبح سے تو یہیں تھے اور والد اور تایا کے ساتھ چند منٹ پہلے واپس گئے تھے، ان ہی کے ساتھ واپس آئے اور دروازے میں آکر چکر کھا کر بیہوش ہوکر گر گئے والد صاحب کے ساتھ ان کے بھی لینے کے دینے پڑ گئے۔ ان کے بھائی وغیرہ ایک کھٹولے پر لٹا کر ان کو گھر لے گئے، وہاں ہوش میں لانے کی دوائیں استعمال کرائیں اور یہاں بجلی کی طرح سے شہر بھر میں شور مچ گیا۔ ہمارے کچے گھر میں تو اتنی جگہ نہیں تھی جو آرہے تھے مدرسہ میں جمع ہو رہے تھے کہ اتنے میں تدفین کا مسئلہ معرکۃ الآراء بن گیا، حکیم صاحبان کی رائے تمنا اصرار کے ساتھ یہ تھی کہ ان کے باغ میں ان کے جدی قبرستان کے اندر تدفین عمل میں آئے اور ہمارے محلّہ کے چند احباب جن میں جناب الحاج شیخ حبیب احمد صاحب ولد اکبر جناب الحاج فضل حق صاحب جو اعلیٰ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے خادم خاص اور مظاہر علوم کے محسنِ اعلیٰ تھے ان کا اور ان کے چند دوستوں کا اصرار یہ تھا کہ محلّہ کے قبرستان حاجی شاہ میں تدفین عمل میں آئے گی۔ حکیم صاحبان متین صاحب وقار لوگ تھے اور شیخ حبیب احمد صاحب مع اپنے رفقاء کے لمبی لمبی لاٹھیاں لے کر مکان کے دروازے پر آگئے کہ تدفین حاجی شاہ میں ہوگی ورنہ لٹھ بازی ہوجائے گی۔ چونکہ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب قدس سرہٗ بانی مظاہر علوم کا مزار مبارک بھی وہیں ہے اس لیے ان حضرات کو اصرار کا اور بھی زیادہ موقع تھا، بالآخر وہیں تدفین عمل میں آئی۔ انتقال ۸ بجے ہوا اور ۱۰ بجے تدفین سے فراغ پر میں گھر واپس آگیا اور تعزیت کرنے والوں کا ہجوم رات دیر تک روز افزوں رہا جیسا کہ حوادث کے ذیل میں والد صاحب کے حادثہ میں ذکر کر چکا ہوں، جس وقت بھائی شمیم مکی کا یہ خط پڑھا جا رہا تھا اور میں یہ سطور لکھوا رہا تھا میرے مخلص دوست الحاج مفتی محمود حسن گنگوہی مفتی دارالعلوم دیوبند بھی میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے دو واقعات اپنے سنے ہوئے بیان کیے جن کو میں نے انہی کے الفاظ میں یہاں لکھوا دیا ہے۔

(الف)...... مفتی صاحب نے کہا کہ مجھ سے حضرت صاحبزادی صاحبہ یعنی اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی صاحبزادی جناب الحاج چچا محمد یعقوب صاحب کی والدہ محترمہ نے خود سنایا کہ ایک دن مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے گھر کی ضروریات کا سامان منگایا۔ گھر میں سے دریافت کیا کہ خلاف عادت یہ سامان کیوں منگایا۔ کیا سفر میں جانے کا ارادہ ہے؟ پھر وضو کرتے ہوئے ایک آواز آئی کہ مولانا آرہے ہیں۔ (حضرت مولانا سہارنپوری کا تار عدن سے آچکا تھا کہ فلاں تاریخ کو بمبئی پہنچ رہا ہوں) اس پر مولانا یحییٰ صاحب نے فرمایا کہ پھر ہم بھی جا رہے ہیں۔

اہلیہ نے پوچھا کہ آپ کہاں جارہے ہیں، جواب دیا جہاں سے مولانا آرہے ہیں (یعنی حجاز مقدس) گھر میں سے کہا کہ میں بھی چلوں گی، جواب دیا کہ تم میرے ساتھ نہیں جاسکتی تم کو زکریا پہنچائے گا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کو تنہا کیسے جانے دوں گی۔ فرمایا کہ میں تو کندھے پر لنگی ڈالی لاٹھی ساتھ میں لے کر چل دوں گا اسی روز شام کو طبیعت خراب ہوئی اور اگلے روز صبح کو انتقال فرمایا۔ رحمہٗ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ فقط

اززکریا

حضرت قدس سرہٗ کے عدن کے تار پر شہر اور مدرسہ میں خوشی کی جولہریں دوڑ رہی تھیں وہ تو ظاہر ہے۔ بہت سے تو بمبئی جانے کا ارادہ کر رہے تھے اور دہلی کا ارادہ کرنے والے تو بہت تھے۔ حاجی حبیب احمد صاحب جن کا اوپر دفن کے سلسلہ میں ذکر آچکا ہے میرے والد صاحب کے بے تکلف دوستوں میں تھے اور مرحوم کی مجھ پر بھی بعد میں بہت شفقتیں رہیں۔ صبح کی چائے عموماً میرے ساتھ پیا کرتے تھے ان کے ایک صاحبزادہ نے ایک دفعہ کہا کہ بہت بری بات ہے کہ آپ ہمیشہ صبح کی چائے میں وہاں پہنچ جاتے ہیں ہمیں بہت غیرت آتی ہے کہنے لگے جا بیوقوف وہ تو میرے لیے تم بیٹوں سے بھی زیادہ بڑھ کر ہے مرحوم نے میرے حضرت کے تار کے آنے پر میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے پوچھا اجی مولانا آپ کہاں تک جائیں گے بمبئی یا دہلی، والد صاحب نے فرمایا میں تو اسٹیشن تک بھی نہیں جانے کا، اپنی جگہ پڑا پڑا ہی زیارت کرلوں گا، اس وقت تو لوگ اس کو مذاق کا فقرہ سمجھے کہ میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو بھی مزاح کی عادت بہت تھی، لیکن شنبہ کی صبح کو میرے والد صاحب کا وصال ہوا اور شنبہ کی دوپہر کو حضرت قدس سرہٗ کا جہاز بمبئی پہنچا اور والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے حاجی شاہ قبرستان میں پڑے پڑے ہی زیارت کی ہوگی۔

(ب)...... دوسرا واقعہ مفتی محمود صاحب نے یہ لکھوایا کہ پیر جی جعفر صاحب ساڈھوڑی (اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے مشہور خادم تذکرۃ الرشید میں بھی جن کا بار بار ذکر آیا ہے) نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے (یعنی پیر جی ظفر نے) سہارنپور مولانا یحییٰ صاحب کی ملاقات کے لیے آنے کا ارادہ کیا۔ انبالہ میں ایک مجذوبہ عورت انگریزی ٹوپ اوڑھتی اور ہاتھ میں بید رکھتی تھی اور سب صیغے مذکر کے اپنے لیے بولا کرتی تھی، لوگ اس کو خان صاحب کہا کرتے تھے میں (پیر جی جعفر صاحب) اس کی طرف سے گزرا تو اس نے کہا کہ سہارنپور جارہا ہے۔ مولوی صاحب (مولانا یحییٰ صاحب) سے یوں کہنا کہ:

ہمیں بھی یاد رکھنا ذکر گر دربار میں آئے

میں سہارنپور آگیا۔ مولانا سے یہ مصرع بیان کیا کہ یہ اس مجذوبہ نے کہا ہے، اس پر مولانا کے

چہرہ کا رنگ زرد ہوگیا۔ میں سہارنپور سے جب انبالہ واپس ہورہا تھا کہ مولانا کا انتقال ہوگیا۔ میں نے غور کیا تو دوسرا مصرع ذہن میں آیا وہ یہ تھا:

عدم کے جانے والو کوچۂ جاناں میں جب پہنچو
ہمیں بھی یاد رکھنا ذکر گر دربار میں آئے

(۴)......عزیزم الحاج شمیم مکی نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا کہ میری ایک خصوصی درخواست یہ ہے کہ اگر آپ قبول فرمائیں کہ آپ بیتی کے اختتام پر ایک نقشہ بالتفصیل یا تذکرہ اپنے خاندان کے تمام افراد بزرگوں، اعزہ، مستورات اور احباب و متعلقین وبچگان کی پیدائش ووفات کی تواریخ اور مقام دفن وغیرہ جو آپ کے علم میں ہوں یا تاریخ کبیر میں درج ہو یا احباب سے لکھ کر معلوم کرلیا جائے حسب سہولت اور میرے خیال میں اس کی ابتداء حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے ہو۔ الحمدللہ آپ کے ہاں تو اکثر مواد موجود ہے، تمام اعزہ کے نام تین چار صفحات پر مع تواریخ آجائیں گے۔ اسی کے ساتھ ایک خانہ میں یہ بھی آجائے کہ کس کی شادی کس سے ہوئی ہے۔ بہرحال اس کی ترتیب تو آپ ہی زیادہ عمدگی سے فرما سکتے ہیں۔ خاندان پر آپ کا یہ بڑا احسان ہوگا۔ خاندان واحباب و متعلقین کو آپ ذکر بدوام بخشیں گے۔

فقط

اس کا جواب میں نے بھائی شمیم کو لکھوادیا کہ نسب نامہ تو میری تاریخ کبیر میں حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی بارہویں پشت جناب شیخ قطب شاہ نور اللہ مرقدہٗ سے موجود ہے اور بارہویں پشت میں حضرت مفتی صاحب آتے ہیں۔ ان کے اُوپر کے انساب اور ان کے اجزاء بھی درج ہیں اور مفتی صاحب سے لے کر عزیز سلمان، عاقل سلمہما کی اولاد تک بھی درج ہیں، لیکن یہ کام ایسا نہیں ہے کہ آپ بیتی کا جزء بن سکے یا دوچار صفحوں میں آسکے۔ چھ صفحے میری تاریخ کبیر کے اس کی تقطیع ہدایہ کے برابر ہے بھرے ہوئے ہیں۔ کبھی ہندوستان آؤ تو زیارت کرلینا۔ نقل تمہارے بس کی بھی نہیں، بھائی شمیم! جب میں زندہ تھا تو بہت کچھ کرڈالا۔ علی میاں زادمجدہم تو اپنی تالیف میں میری تاریخ کبیر سے بہت کچھ نقل کراتے ہیں۔ ان کا کئی دفعہ یہ بھی خیال ہوا کہ ان کے پاس کوئی مشین ہے جس میں ہر تحریر کا فوٹو آجاتا ہے۔ میری اس تاریخ کبیر کا فوٹو لیا جائے۔ بہرحال تمہاری اس فرمائش کا مواد تو میرے یہاں بہت کچھ ہے مگر اس کی تعمیل سے معذوری ہے۔ میرے بچوں میں تو کوئی اس قابل نہیں کہ اس کی تکمیل یا طباعت کراسکے۔ اللہ جل شانہٗ خاندان میں سے کسی کو توفیق عطاء فرمائے تو نقل دینے میں مجھے بھی انکار نہیں۔

(۵)...... بھائی شمیم نے لکھا کہ آپ بیتی نمبر ۱-۲-۳ پڑھنے کے بعد بہت سی چیزیں ذہن میں

آرہی ہیں۔ مگر بے ادبی اور دخل در معقولات کے خیال سے لکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔ فقط

الجواب:

نہ تو اس میں بے ادبی ہے نہ دخل در معقولات۔ تمہارے ذہن میں بہت سی باتیں آرہی ہیں اور میری ستر سالہ عمر میں تو لاکھوں واقعات ہیں۔ لیکن مستقل وقت تو اس معذوری میں بھی اگر خرچ کیا جا سکتا ہے تو حدیث پاک کی خدمت میں ہو سکتا ہے، تمہیں تو معلوم ہے کہ یہ آپ بیتی حصہ اول تو صرف عزیزم مولانا یوسف صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی سوانح مؤلفہ عزیزم الحاج مولوی محمد ثانی کے ایک باب پر استدراک تھا اور بقیہ چار حصہ آنکھ بنوانے کے زمانے کی اوقات گزاری تھی۔ اگر دوسری آنکھ بنوانے کی نوبت آئی، جس میں کئی سال سے نزول ماء بھی ہے اور احباب کا تقاضہ بھی ہے تو ممکن ہے کہ اس میں کوئی اضافہ ہو سکے۔ البتہ مطبوعہ میں کوئی چیز قابل اصلاح ہو تو ضرور درج کردیں، اس کو دوبارہ سن لوں گا لیکن جدید واقعات کے لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ واقعات تو لاکھوں ہیں اور آپ بیتی نمبر۴ کی کتابت ہو چکی ہے زیر طباعت ہے۔ یہ اضافے بھی جو تم نے لکھوائے ضمیمہ کے طور پر ۵ کے ختم پر لکھوانے کو کہہ دیا اس لیے کہ ۵ کی بھی کتابت قریب الختم ہے۔

(۶)...... بھائی شمیم نے لکھا کہ آپ بیتی کے سبق آموز عبرت انگیز اور بے حد دلچسپ اور دینی اور دنیوی اعتبار سے مفید حالات و واقعات کو بار بار پڑھتے رہنے کو دل چاہتا رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک عرض ہے کہ مجھے کاندھلہ میں آپ کے والد مرحوم کے متعلق ایک عجیب قصہ سننے میں آیا تھا کہ کاندھلہ میں بڑا زبردست ہیضہ یا طاعون پھیلا اور اس شدت کے ساتھ کہ گھروں اور راستوں سے مُردے اُٹھانے والا تک نہیں رہا تھا اور برسات کا زمانہ تھا۔ جبکہ امرود کی خوب ریل پیل بھی تھی۔ برسات میں ویسے بھی سنا ہے امرود سخت مضر اور ہیضہ و بدہضمی کا گھر ہے کوئی شخص مُردہ کو ہاتھ لگانے کا روادار نہیں تھا۔ ایسے سخت حالات میں آپ کے والد صاحب اور ان کے ساتھ ایک صاحب اور تھے جن کو اللہ نے مسخر کر دیا تھا۔ یہ دونوں قصبہ کے اموات کو نہلاتے، نماز پڑھتے اور خود ہی قبریں کھود کر دفن کرتے، سارے دن یہی معمول تھا۔ بھائی تک بھائی کی نعش کے پاس جانے کا روادار نہیں تھا۔ مگر حضرت مولانا یحیٰی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اللہ نے ایسی ہمت عطاء کی تھی کہ سینکڑوں مسلمان اموات عزت و احترام کے ساتھ ان کے ہاتھ سنگوائی گئیں اور اس قصہ میں سب سے دلچسپ پہلو اور قدرت الٰہی کا مشاہدہ یہ تھا کہ یہ دونوں حضرات سارے دن امرود کھاتے تھے، جس کے متعلق یہ یقین تھا کہ جس نے امرود کھایا اس کو ہیضہ ہوا۔ یہ بھی سنا ہے کہ یہ دونوں حضرات جنازہ لے جا رہے ہیں جیبوں میں امرود پڑے ہوئے ہیں اور واپسی میں امرود کھا رہے

ہیں۔ واپسی میں بڑے گھر کے چبوترے پر بیٹھ کر دو پہر کے کھانے کی بجائے امرود کھاتے رہتے اور پھر قصبہ میں اموات کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ جس گھر میں رونا پیٹنا سنا وہاں جا کر تسلی تشفی کی احادیث سنائیں، عمل صالح کی تلقین کی اور خود تجہیز و تکفین کے انتظام میں لگ گئے۔

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس کو ضرور آپ بیتی میں شامل فرمادیں اور ایسے نہ معلوم کتنے واقعات ہوں گے۔ شیخ اباجی! گزارش ہے کہ آپ بیتی کو آپ ہرگز مختصر نہ فرمائیں۔ ''نحن نقص علیک احسن القصص'' اللہ تک نے فرمایا ہے، پھر آپ کی نیت تو عبرت اور اصلاح کی ہے۔ ان واقعات سے لوگوں کے قلوب نرم ہوں گے۔ فقط

الجواب:

بھائی شمیم یہ واقعہ مختصر تو میرا سنا ہوا ہے، اس تفصیل سے نہیں جو تم نے بیان کیا۔ اموات کی کثرت میرے والد صاحب کا ہر میت کی تجہیز و تکفین کرنا اور کھانے کی جگہ امرود کھانا لیکن نہ تو متصل سند سے سنا اور نہ میرے زمانہ ہوش کا قصہ ہے۔ میری تو شاید پیدائش سے پہلے کا قصہ ہے، اس لیے تمہارے خط کی عبارت نقل کرادی ہے اور اجمالی تصدیق اپنی بھی۔ مگر تفصیلات مجھے یاد نہیں۔ البتہ اس نوع کے واقعے میرے والد صاحب کی زندگی کے بہت ہیں تم نے لکھا کہ آپ بیتی کو مختصر نہ کرنا، میرے پیارے یہ کوئی مقصود چیز نہیں۔ علم حدیث کو چھوڑ کر اس میں لگنا کوئی پسندیدہ چیز نہیں۔

(۷)...... بھائی شمیم نے یہ بھی لکھا حضرت قبلہ مولانا یحییٰ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق مجھ سے بھائی افتخار صاحب نے سنایا تھا کہ حدیث پر ان کو اس قدر عبور تھا اور ہزار ہا احادیث ان کو اس طرح ازبر تھیں کہ جمعہ کی نماز دہ گنگوہ کی مسجد میں پڑھایا کرتے تھے اور اس سے قبل حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس غسل کر کے جب مسجد کے لیے روانہ ہوتے تو راستہ میں زبانی بغیر لکھے ہی احادیث سے اپنے ذہن میں خطبہ تیار کر لیتے۔ برسوں یہی معمول رہا۔ آپ بیتی کے مطالعہ سے ان کا حدیث سے تعلق اور تعمق کا تو بخوبی علم ہو جاتا ہے اگر اس قسم کے واقعات آپ کے علم میں ہوں تو ضرور اضافہ فرمادیں۔ فقط

الجواب:

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے زمانے میں میرے والد صاحب کو حضرت کی حیات میں ایک آدھ دفعہ امامت کی نوبت آئی ہوگی۔ اس لیے کہ حضرت قدس سرہٗ خود ہی امامت فرمایا کرتے تھے، البتہ حضرت قدس سرہٗ کی بیماری کے زمانے میں کبھی پڑھانے کی نوبت آئی اور جس جمعہ کو حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا وصال ہوا وہ جمعہ بھی سب اکابر کی موجودگی میں میرے والد صاحب

نے ہی پڑھایا تھا۔ مفتی محمود صاحب نے جو اس وقت میرے پاس اس واقعہ کی تسوید کے وقت موجود ہیں یہ واقعہ سنایا۔ جس سے بھائی شمیم کے واقعہ کی تائید ہوتی ہے کہ یہ واقعہ خانقاہ شریف کی مسجد کا نہیں بلکہ گنگوہ کی جامع مسجد کا ہے کہ اس کی ابتدائی تعمیر کے زمانے میں حضرت اقدس گنگوہی قدس سرہٗ کو اس کی تعمیر کا بہت اہتمام تھا۔ اس لیے کہ غیر مسلم علاقہ تھا اور جامع مسجد کی جگہ وہاں پر ایک ٹیلہ تھا اس میں سے ایک پتھر نکلا تھا جس پر جامع مسجد لکھا ہوا تھا، اس لیے اس جگہ پر جامع مسجد بنوانا حضرت نے تجویز فرمایا اور ابتداء تعمیر کے بعد مولانا یحییٰ صاحب ہر جمعہ کو وہاں جمعہ پڑھانے جایا کرتے تھے اور ہر جمعہ کو نماز کے بعد اور نماز سے پہلے جامع مسجد کے لیے چندہ کی تحریک فرمایا کرتے تھے اور ہر اعلان کی ابتداء میں اپنی طرف سے پانچ روپے کا چندہ دیا کرتے تھے۔ جس کے لیے نہ معلوم کہاں سے بہت ہی سفید چاندی کے روپے نئے نئے لایا کرتے تھے۔ فقط

غالبًا صوفی افتخار نے جس خطبہ کا واقعہ ذکر کیا وہ اس جامع مسجد کے راستہ کا ہوگا کہ یہ خانقاہ شریف سے بہت دور ہے۔ خانقاہ کی مسجد تو حضرت کے حجرے کے برابر ہی ہے۔ اپنے ہی آپ سے خطبہ تصنیف کر کے پڑھا دینا ان کے یہاں کوئی اہم چیز نہیں تھی۔ سہارنپور کے زمانہ تدریس حدیث میں وصال تک حدیث کی بہت سی کتابیں بالخصوص جس زمانہ میں نزول آب ہو گیا تھا، بغیر دیکھے ہی حفظ پڑھانے کی نوبت آتی تھی اور جس زمانہ میں آنکھ کا آپریشن ہوا اس زمانہ میں بھی تقریبًا چھ (۶) ماہ تک بغیر کتاب دیکھے بغیر مطالعہ کے سبق پڑھانے کی نوبت آئی۔ عزیز مولوی عاقل سلمہٗ، مولانا صدیق احمد صاحب جموی مرحوم سابق مدرس مظاہر علوم کے حوالہ سے واقعہ نقل کیا کہ مولانا محمد یحییٰ صاحب کی آنکھیں جس زمانے میں بنی ہوئی تھیں اور آنکھ پر سبز پٹی بندھی ہوئی تھی تو حدیث کا سبق پڑھاتے وقت ایک گاؤں کا آدمی آیا۔ سلام کیا اور کہا کہ رائے پور اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی خدمت میں جا رہا ہوں، اس پر مولانا یحییٰ صاحب نے فرمایا کہ حضرت سے کہنا کہ مظاہر علوم کے ایک اندھے مدرس نے سلام کہا ہے۔

(۸)......از مکتوب بھائی شمیم سلمہٗ آپ بیتی میں حج اور سفر حرمین کے متعلق ہے۔ اس میں گزارش ہے کہ آپ نے ۸۳ھ میں جو بخاری شریف اور اس کے بعد کے حج میں نسائی شریف مدرسہ میں ختم کرائی تھی اور گزشتہ سفر میں بابرکت دیوان میں صبح کو عزیزان زعیم وحشیم کی جلالین شروع کرا کر دعاء فرمائی تھی اور اس سفر میں بروز بدھ ۵ ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ کو بعد نماز ظہر آپ نے اسی دن دیوان میں ان کی مشکوٰۃ شریف شروع کرائی تھی اور بھائی انعام صاحب نے دعاء کرائی تھی اور آپ نے اپنے پاس سے گاجر کا حلوہ تقسیم کیا تھا، منجملہ اور باتوں کے اگر ان چاروں کا بھی آپ اضافہ فرما دیں تو عین کرم ہوگا۔ فقط

الجواب:

بھائی شمیم! تمہاری محبت اور تمہارے احسانات کی وجہ سے میں نے تمہارے خط کے یہ سب اجزاء ضمیمہ میں نقل کرادیے ہیں، لیکن اس نوع کے واقعات تو آپ بیتی کا مقصد نہیں، اگر اس نوع کا واقعہ کہیں آ گیا تو مجھے یاد نہیں، کسی اور سلسلہ میں تبعاً آ گیا ہوگا۔ ورنہ کتب احادیث کا افتتاح بخاری شریف کا افتتاح واختتام تو نہ معلوم کتنے مدارس کا ہوا ہوگا۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ عزیزان مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا انعام الحسن صاحب سلمہٗ کی مشکوٰۃ شریف کی بسم اللہ کئی ماہ تک مؤخر کی کہ مجھے اتفاقیہ حاضری میں دیر ہوتی رہی اور پھر اپنی موجودگی میں باوجود میرے شدید انکار کے خود پاس بیٹھ کر مجھ سے کرائی اور ترمذی شریف کی بسم اللہ قبل از وقت یہ کہہ کر اس سیہ کار سے کرائی کہ تمہارے دوبارہ آنے کا انتظار نہ کرنا پڑے ترمذی شریف کی بسم اللہ کراتے جاؤ۔ عزیزان کو صرف ابوداؤد پڑھنے کے لیے ایک سال کے لیے سہارنپور بھیجا، جس میں انہوں نے ابو داؤد کے علاوہ حدیث کی دوسری کتابیں بھی دوسرے اکابر حدیث سے پڑھیں یا سُنیں۔ یہ واقعات تو بہت **لا تعد ولا تحصیٰ** ہیں مگر آپ بیتی کی لائن اس کی نہیں، تمہارے جملہ خطوط کا جواب ہوگیا۔ آیندہ اس نوع کے واقعے یا کسی نوع کے اضافے کی تو گنجائش نہیں البتہ چونکہ آپ بیتی علی گڑھ میں معذوری کی حالت میں لکھوائی گئی ہے اس لیے کسی واقعہ کی اصلاح کی ضرورت ہو تو فوراً لکھ دیں کہ نمبر ۵ کی طباعت ابھی باقی ہے۔ باقی اضافے تو ستر سالہ زندگی میں ہر نوع کے لاکھوں ذہن میں ہیں۔

(۹) ...... یہ کتاب طبع ہو ہی رہی تھی کہ بعض ضروری باتیں خیال میں آتی رہیں اور اپنی عادت کے مطابق دوستوں سے اکابر کے قصے اور اکابر کی یادگاریں تذکرہ کرنے کا معمول ہی ہے۔ جس بات کے متعلق دوستوں نے اصرار کیا کہ یہ واقعہ ضرور آپ بیتی میں آنا ہے، میں نے کہہ دیا کہ نقل کر دو۔ اسی سلسلہ میں میں نے ایک واقعہ سنایا دوستوں کا اصرار تھا کہ یہ تو بہت اہم ہے ضرور لکھوا دیں۔ میں نے کہا طبع ہونے تک جو چاہے لکھوا لو، جب طباعت ہو جائے گی تو سلسلہ خود ہی ختم ہو جائے گا۔

فتویٰ پر بغیر تحقیق دستخط نہ کرنا:

وہ واقعہ یہ ہے۔ ۳۵ھ میں ابتدائی مدرسی میں مدرسہ کے دستور کے مطابق جو فتاویٰ آتے اس پر دیگر مدرسین کی طرح یہ ناکارہ بھی سرسری دیکھ کر اکابر کے دستخطوں پر اعتماد کرتے ہوئے دستخط کر دیا کرتا تھا، ایک فتویٰ اکابر مدرسین میں سے ایک بزرگ کا لکھا ہوا تھا۔ ان کے لکھنے پر اعتماد اور

سرسری نظر سے دیکھنے کے بعد دیگر مدرسین کی طرح اس پر میں نے بھی دستخط کر دیے۔ یہ فتاویٰ ابتداء میں یا دیگر مدرسین کے دستخط کے بعد میرے حضرت میرے مرشد حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں پیش کیے جایا کرتے تھے اور حضرت قدس سرہٗ کے دستخط بغیر باہر نہیں جایا کرتے تھے۔ یہ فتویٰ جب حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں پیش ہوا تو حضرت نے فتویٰ پر یہ لکھ کر اس میں یہ غلطی ہے دوبارہ درست کرو۔ اس کو واپس کر دیا اور کسی مدرس سے بھی مطالبہ نہیں کیا۔ لیکن از راہِ شفقت اللہ جل شانہ میرے جملہ اکابر کو ان کی شفقتوں کا بہت ہی بہتر سے بہتر بدلہ عطاء فرمائے، مجھ سے دریافت کی کہ اس فتویٰ پر پڑھ کر دستخط کیے یا بغیر پڑھے ہی دستخط کر دیے، میں نے کہا کہ سرسری دیکھا تھا مگر فلاں حضرت کا لکھا ہوا تھا اور سب مدرسین کے دستخط ہونے کی وجہ سے زیادہ غور کی ضرورت نہ سمجھی۔ میرے حضرت قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ نے ایک ڈانٹ پلائی کہ دستخط فتوؤں کی تصدیق اور اس کی شہادت ہے۔ بغیر تحقیق کے کیوں دستخط کیے۔ وہ ڈانٹ مجھ پر ایسی مؤثر ہوئی کہ اس کے بعد کسی ایسے مسئلہ کے علاوہ جو بندہ کے خیال میں بالکل کھلا ہوا نہ ہو اور اس پر اس ناکارہ کے دستخط کی خاص وجہ بھی نہ ہو دستخط بھی نہیں کرتا بلکہ اس ناکارہ کے نام جو فتاویٰ ڈاک سے آتے ہیں وہ بھی جواب کے کاغذ پر یہ لکھوا کر "یہ ناکارہ مفتی نہیں ہے اس لیے فتاویٰ ہمیشہ مفتی مدرسہ سے دریافت کرنا چاہئیں۔ آپ کا خط مع جوابی لفافہ کے مفتی صاحب کے حوالہ کر رہا ہوں، دارالافتاء میں بھیج دیتا ہوں۔"

(۱۰)......اس ناکارہ کے دفتر میں میرے اکابر حضرت اقدس گنگوہی سے لے کر جملہ اکابر کے سینکڑوں خطوط محفوظ ہیں۔

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا

خطوط کا انبار تو اتنا ہے کہ اگر ان کو شائع کیا جائے تو کئی ہزار صفحات چاہئیں، مگر میرے بچے آج کل میرے اکابر کے خطوط پر بہت مسلط ہیں، جب میری آنکھیں کام دیتی رہیں میں نے اس خزانے کی کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دی، مگر اپنی معذوری کی بدولت اور اس وجہ سے کہ میں تو لب گور ہوں اور یہ میرے بچے اللہ ان کو بہت ہی خوش رکھے ہر نوع کی ترقیات سے نوازے، کوئی خط لا کر پھر اصرار کریں کہ اس کو ضرور لکھوا دیں تو باوجودیکہ بعض خطوط کے متعلق میرا جی نہیں چاہتا کہ معلوم نہیں عوام کی عقول ان کی متحمل بھی ہوگی یا نہیں، مگر میرے دوست مدرسین مظاہر علوم خاص طور سے مفتی محمود صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند جب اس کو ضروری مفید اور غیر مضر بتاتے ہیں تو میں اجازت دے دیتا ہوں کہ لکھوا دو۔

صراحت کے ترکِ طعام کی ابتداء:

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ کے اصول وضوابط اور جواب طلبی سے ابھی تک بہت سے احباب واقف ہیں۔ بہت سوں پر یہ گزری ہوگی اور بہت سوں نے سنا ہوگا۔ غالباً میں لکھوا چکا ہوں کہ حضرت قدس سرہٗ کو بہت ہی ضرورت سے زیادہ میرے والد صاحب کی وجہ سے مجھ پر شفقت تھی۔ چنانچہ حضرت قدس سرہٗ نے زبانی بھی اور تحریری بھی مجھ سے کئی دفعہ ارشاد فرمایا کہ تُو میرے یہاں قواعد سے مستثنیٰ ہے لیکن اس کے باوجود یہ ناکارہ حضرت کے قواعد کا بہت اہتمام کرتا تھا۔ اگر بے وقت گاڑی کے پہنچنے کا اندازہ ہو تو بغیر بھوک بھی اپنے گھر سے کچھ کھا کر جاتا تھا اور حضرت بعض مرتبہ استفسار بھی فرماتے کہ کھانے کا ابھی وقت بھی نہیں ہوا تھا آپ نے کیوں کھالیا، تو عرض کرتا کہ حضرت رات کھانے کی نوبت نہیں آتی تھی، اس لیے چائے کے ساتھ تھوڑی سی کھالی اور یہ جھوٹ نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اس ناکارہ کا معمول اپنی ابتدائی مدرسی یعنی ۳۵ھ سے ایک وقت کھانے کا ہوگیا تھا۔ جس کی ابتداء تو حرج سے ہوئی تھی کہ رات کے کھانے میں مطالعہ کا بھی حرج ہوتا تھا، نیند بھی جلدی آتی تھی، پانی بھی زیادہ پیا جاتا تھا، ابتداء میری ایک چھوٹی بہن مرحومہ (معلوم نہیں واقعہ کہیں لکھوا چکا ہوں یا نہیں) کھانا لے کر اُوپر میری کوٹھڑی میں پہنچ جاتی اور لقمہ بنا کر میرے منہ میں دیتی رہتی اور دیکھتی رہتی کہ جب منہ چلنا بند ہو جاتا تو دوسرا لقمہ دے دیا کرتی تھی، اس ناکارہ کو التفات بھی نہ ہوتا تھا کہ کیا کھلایا۔ ایک یا دوسال بعد اس کو بھی بند کر دیا، اس زمانے میں بھوک تو خوب لگتی تھی مگر حرج کا اثر بھوک پر غالب تھا، چند سال بعد بھوک تو جاتی رہی، لیکن میرے اکابر حضرت مدنی، حضرت رائے پوری ثانی اور چچا جان نور اللہ مراقدہم میں سے کسی کی آمد ہوتی تو بڑے شوق اور رغبت سے ان کے ساتھ کھانے میں شرکت کرتا، لیکن ان حضرات قدس اللہ اسرارہم کے انتقال کے بعد تو بھوک ایسی گئی کہ اگر دوسرے وقت کھاتا ہوں تو پیٹ میں گرانی ہوتی ہے۔ اب تو صرف ایک ہی وقت کھانے کا معمول بن گیا۔ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ ہندوستان کے قیام میں وہ ایک وقت دن کا ہوتا ہے اور حجاز مقدس کے قیام میں وہ ایک وقت شام کا ہوتا ہے کہ مشاغل کے اعتبار سے دونوں جگہ کے لیے یہی وقت مناسب ہے۔

لکھوا تو یہ رہا تھا کہ حضرت تھانوی سے مجھے اس بات کے کہنے میں کہ رات نہیں کھائی تھی اس لیے صبح کھالی تھی، کوئی جھجک نہیں محسوس ہوتی تھی۔ یہ بھی غالباً پہلے لکھوا چکا ہوں کہ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا یہ معمول تھا کہ وہ جب بھی سہارنپور تشریف لاتے اور وقت میں ذرا بھی گنجائش ہوتی تو وہ اس ناکارہ کو ساتھ لے کر تھانہ بھون یا دیوبند یا گنگوہ یا رائے پور ضرور تشریف لے جایا

کرتے ہر سفر میں چاروں جگہ میں سے کسی ایک یا دو جگہ جانے کا خاص معمول تھا۔ ایک مرتبہ تشریف آوری پر چچاجان نے ارشاد فرمایا کہ تھانہ بھون حاضری کو زیادہ دن ہوگئے، صبح کو تھانہ بھون چلنا ہے۔ میں نے عرض کیا بہت اچھا اور اپنے معمول کے مطابق خود بھی ایک آدھ لقمہ کھایا، اس لیے کہ صبح کی چائے میں ناشتہ کی اس ناکارہ کو کبھی بچپن سے عادت نہیں۔ مفت کے ایک دو بیضے مل جائیں تو اس سے انکار نہیں لیکن مول کے وہ بھی پسند نہیں۔

بہر حال اس ناکارہ نے بھی بلا رغبت ایک دو لقمے کھائے اور چچاجان کو بھی کھلائے اور حسب دستور تھانہ بھون حاضری پر حضرت کے استفسار پر عرض کر دیا کہ کھالیا۔ حضرت نے فرمایا کیوں؟ میرا وہی جواب۔ حضرت قدس سرہٗ کی مجلس ختم ہونے کے بعد ہمارے ایک عزیز بھائی ظریف صاحب مرحوم کا تقریباً ۱۵، ۲۰ یوم پہلے انتقال ہو چکا تھا، ان کے یہاں تعزیت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ چچاجان نور اللہ مرقدہٗ اور میری بھی رائے تھی۔ حضرت قدس سرہٗ کے مکان پر تشریف لے جانے کے بعد ہم لوگ ان کے یہاں گئے۔ ان کے لڑکے بھائی اختر مرحوم نے اصرار کیا کہ ہم لوگوں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا، آپ بھی شرکت فرمالیں۔ میں نے شدت سے انکار کر دیا کیونکہ ہم حضرت کے یہاں یہ کہہ چکے تھے کہ کھالیا، یہی عذر میں نے بھائی اختر سے بیان کر دیا۔ لیکن چچاجان نے فرمایا کہ حضرت ضرور لاؤ اور مجھ سے فرمایا کہ ایسے موقعہ پر دلداری ضرور کرنی چاہیے۔ میں نے عرض کیا اگر حضرت کے یہاں رپورٹ پہنچ گئی تو جواب طلبی ہوجائے گی کہ میرے یہاں انکار کر دیا اور وہاں کھالیا۔ چچاجان کو اس کا واہمہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے بھائی اختر سے کہا کہ ضرور لاؤ، آنے پر میں نے بھی چند لقمے کھائے۔ میں ڈر رہا تھا کہ نہ معلوم حضرت کے یہاں یہ کس عنوان سے پہنچے گا وہی خطرہ سامنے آیا۔ ایک صاحب نے جن کا نام میں لکھوانا نہیں چاہتا، حضرت قدس سرہٗ کے یہاں یہ شکایت کر دی کہ یہ دونوں تعزیت میں آئے تھے وہیں کھانا کھایا اور ان لوگوں نے حضرت سے یہ جھوٹ بولا کہ حضرت کی خدمت میں آئے ہیں۔

خط و کتابت از حکیم الامت قدس سرہ برائے دفع ابہام گرامی گرانی طبع:

حضرت قدس سرہٗ کا ایک عتاب نامہ بذریعہ ڈاک پہنچا۔ وہ مکتوب مبارک اور اس پر میرا جواب، میرا دل تو نہیں چاہتا تھا کہ اس کو طبع کرایا جائے مگر دوستوں کا اصرار ہے کہ اس میں تنبیہ ہے اور اصلاح ہے، اگرچہ تیرے متعلق شکایت غلط تھی مگر اکابر کے یہاں ان چیزوں میں احتیاط رکھنی چاہیے اور یہ صحیح بھی ہے، مجھے تو اس سے روزانہ ہی سابقہ پڑتا ہے۔ بہت سے لوگ اپنے مقدموں میں آتے ہیں اور شام کو جب واپسی کا وقت نہیں رہتا یا دوسرے دن کی تاریخ ہوجاتی ہے

تو اس قدر بے تکلف اور بلا جھجک آکر کہتے ہیں کہ حضرت کی زیارت کو آئے ہیں صبح کو چائے کے بعد مصافحہ کر کے رخصت ہوتے ہیں اور پھر شام کو جب کاروائی مکمل نہیں ہوتی تو پھر آکر ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت آج مقدمہ کی تاریخ تھی کام ہوا ہی نہیں۔ اس پر مجھے تھانہ بھون بہت یاد آجاتا ہے۔ بہر حال اس سلسلہ کی حضرت قدس سرہٗ کی خط و کتابت بھی ایسے لوگوں کے لیے تنبیہ ضرور ہے جو مشائخ کے یہاں جا کر جھوٹ بولتے ہیں، بھائی ظریف تھانوی کے قصے کے سلسلہ میں حضرت قدس سرہٗ سے جو خط و کتابت ہوئی وہ حسب ذیل ہے:

(مکتوب حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ بنام ناکارہ و چچا جان قدس سرہٗ)

''مکرمانم سلمہٗ اللہ تعالیٰ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ کل کے واقعہ سے تجربہ ہوا کہ بعض اوقات متحمل الاشتراک حضرات اضیاف سے پوچھنے پر بھی صاف نہیں معلوم ہوتا کہ کس کے مہمان ہیں اور اس معلوم نہ ہونے سے ضروری انتظام میں جو خلل واقع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس لیے آیندہ کے لیے احقر نے یہ معمول مقرر کر لیا کہ جب پوچھنا غیر کافی ہے تو پوچھنا نہ چاہیے، ایسے حضرات بے تکلف خود فرما دیا کریں کہ ہم تیرے یا فلاں شخص کے مہمان ہیں، اس کے بعد خدمت سے عذر نہیں اور اس فرمانے کو میں اپنا فخر سمجھوں گا، ایسے حضرات کو اس معمول کی اطلاع کر دی ہے، اسی سلسلہ میں آپ دونوں حضرات کی خدمت میں بھی بے تکلف عرض کرنے کی جسارت کی۔

والسلام

اشرف علی از تھانہ بھون

(جواب: از زکریا):

''مخدوم و مطاع بندہ ادام اللہ ظلال برکاتکم، بعد ہدیہ سلام نیاز آنکہ۔''

گرامی نامہ نے مفتخر فرمایا، حقیقۃً اس گڑبڑ سے خود اپنے ہی کو کلفت ہوئی تھی مگر اتفاق بے مقصد پیش آیا۔ حضرت تک چونکہ یہ قصہ پہنچ گیا اس لیے تفصیل کی ضرورت پیش آئی ورنہ میں اپنے اکابر تک ایسی معمولی باتیں پیش کرنے کا عادی نہیں۔ میری عادت اول سے یہ ہے کہ بے وقت جب کہیں پہنچنا ہو تو گھر سے خواہ بھوک نہ ہو کچھ کھا کر جاتا ہوں، لیکن اس کے بعد بھی اگر میزبان کی خوشی ہو تو دوبارہ کھانے میں تامل نہیں کرتا۔ چنانچہ تھانہ بھون حاضری میں بھی بسا اوقات یہاں سے کھا لینے کے بعد مولانا ظفر احمد صاحب کے ارشاد پر مکرر ان کے ساتھ شرکت کی نوبت آئی۔ میں حسب معمول اس مرتبہ بھی کھا کر گیا تھا، اس لیے بے تکلف عذر کر دیا تھا۔ وہاں پہنچ کر چچا جان سے اس کا تذکرہ آیا، انہوں نے ارشاد فرمایا کہ آج بھائی ظریف کے یہاں کھانا چاہیے کہ انہیں

ملال نہ ہو، میں نے اس کو رسم سمجھ کر عذر کر دیا اور بالآخر مولانا ظفر احمد صاحب پر اس کا فیصلہ ٹھہرا، انہوں نے بھی چچا جان کی تائید فرمائی، لیکن ابتدائے حضرت کے سوال پر چونکہ وہ اپنے خیال کو عرض نہ کر سکے اور میں نے اپنے خیال کو گستاخانہ عرض کر دیا، اس لیے بھی طے شدہ امر ہو گیا۔ مگر وہاں پہنچ کر ان کے گھر والوں کا زیادہ اصرار ہوا اور باوجود ہمارے یہ عرض کر دینے کے کہ مولانا ظفر احمد صاحب کے یہاں طے ہو چکا، ان کی خواہش ہوئی کہ تھوڑی سی شرکت کر لی جائے۔ اس لیے ان کی دلداری کہ مصدومہ تھیں، مقدم سمجھی گئی اور وہاں بھی شرکت کی کہ ان کی دلداری اہم خیال کی گئی۔ اس کے بعد مولانا ظفر احمد صاحب کے پورا قصہ بھی مع اپنے چچا جان کے اختلاف رائے کے سنا دیا تھا اور اب حضرت سے بھی مفصل عرض کر دیا۔ اس میں جو امر اصلاح کے قابل ہو حضرت ضرور ارشاد فرما دیں، انشاء اللہ اس پر عمل ہوگا۔ نیز حضرت ہی اس کا تصفیہ فرما دیں کہ اس سفر میں وہاں کا کھانا رسم تھا یا نہیں۔ باقی حضرت کا اصول سر آنکھوں پر، میں تو اس سے قبل بھی حضرت کے یہاں بے تکلف مانگ کر کھا چکا ہوں، بے وقت حاضری پر گھر والوں کو تکلیف دینا خلافِ ادب سمجھتا ہوں اور اطلاع کی اس لیے ہمت نہیں ہوتی کہ متعدد مرتبہ باوجود پختہ قصد کے عوارض سے ٹل گیا۔ دوسری جگہ تو بعد میں عذر کا لکھ دینا کافی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن حضرت کے یہاں اس کو بھی دل گوارا نہیں کرتا۔

از چچا جان بعد سلام نیاز مضمون واحد وہ اسی وقت دہلی تشریف لے جا رہے ہیں، اس لیے خود عریضہ لکھنے کا وقت نہیں ملا۔ فقط محتاج، عفو گستاخ

زکریا

(جواب: از حضرت اقدس حکیم الامۃ قدس سرہٗ)

مشفق مکرم دام فیضہم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

آپ کے کریمانہ جواب سے جس قدر مسرور و مطمئن ہوا اس سے زیادہ خجل ہوں، بارک اللہ تعالیٰ فی مکارمکم اگر میرے نیاز نامہ میں دوبارہ نظر غائر فرما لی جائے تو واضح ہوگا کہ مجھ پر کھانے کے اختلال نظام سے اثر نہیں ہوا، اس کا تعلق مولوی ظفر احمد صاحب سے ہے اور تعلقات کے تفاوت سے احکام متفاوت ہو جاتے ہیں۔ میں زیادہ اس سے متاثر ہوا کہ جو امر بعد میں معلوم ہوا کہ آپ میاں ظریف والوں کے مہمان تھے وہ میرے استفسار پر ظاہر نہیں فرمایا گیا، اس کو ظاہر نہ کرنے کی کوئی مصلحت سمجھ میں نہیں آئی اور اس ظاہر نہ کرنے میں ظاہر ہے کہ مصالح مختل ہو جاتے ہیں۔ کم سے کم تشویش اس کا اثر لازمی ہے، نیز تعلق خصوصیت اس سے بالکل آبی ہے، مقصود اس توضیح سے اپنے کلام کی تفسیر ہے نہ کوئی شکوہ، وہ تو ختم ہو چکا اور اس کے ختم کے ساتھ اس عزم جدید

کو بھی ختم کرتا ہوں یعنی اب خود بھی پوچھ لیا کروں گا۔

میری اس جسارت سے جس کا نام میں نے صفائی رکھا ہے طبع لطیف پر جو اثر ہوا ہو اس کی معافی چاہتا ہوں اور رسم ہونے نہ ہونے کے متعلق جو تحریر فرمایا ہے بفضلہ تعالیٰ اس کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ باقی میرا معمول اب تک جب تعزیت کے لیے سفر کرتا تھا کھالیتا تھا۔ اگر اس کے خلاف تحقیق ہو تو آیندہ احتیاط رکھوں گا۔ فقط والسلام

اشرف علی

(جواب: از زکریا عفی عنہٗ)

''مخدومی و مخدوم العالم ادام اللہ ظلال برکاتکم، بعد ہدیہ سلام نیاز آنکہ''۔

گرامی نامہ اقدس عین انتظار و تشویش میں پہنچا، حضرت کی گرانی کی بڑی فکر تھی، الحمد للہ کہ بے حد مسرت و اطمینان بخش ہوا۔ مگر چونکہ اس میں ایک لفظ تھا جو کسی درجہ تاثر کو مشعر ہے اور میں اپنی طرف سے حضرت کے قلبِ مبارک پر ذرا سا بھی تاثر نہیں چاہتا۔ اس لیے مکرر عریضہ کی جرأت کرتا ہوں، میرے والد صاحب کی بڑی تربیت و تنبیہ تھی کہ بزرگوں کے قلب میں کسی قسم کا میل نہ ہو اور اللہ کا انعام ہے کہ اس کے بہت سے فوائد مجھے محسوس بھی ہوئے اور حدیث ''**من عادی لی ولیا فقد اذنتہ بالحرب**'' سے مستانس بھی ہے۔ اس لیے ایک مرتبہ اور حضرت کی خدمت اقدس میں درخواست کرتا ہوں کہ جو تأثر الفاظ ذیل سے معلوم ہوتا ہے وہ بھی حضرت زائل فرمادیں۔ حضرت کا ارشاد ہے کہ ''میں زیادہ اس سے متاثر ہوا کہ جو امر بعد میں معلوم ہوا کہ آپ میاں ظریف والوں کے مہمان تھے۔'' الخ

اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ وہ اپنے خیال میں اصل نہ تھا بلکہ تبعاً تھا اس لیے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی۔ درحقیقت حاضری کی اصل یہ تھی کہ چچا جان کی جب بھی دہلی سے کسی ضرورت سے تشریف آوری ہوتی ہے۔ ان کی تمنا و اصرار تین جگہ حاضری کی ہوتی ہے۔ گنگوہ، تھانہ بھون اور رائے پور مولانا عبدالقادر صاحب سے ملنے کے لیے۔ مگر ان تینوں جگہ کے لیے میری ہمرکابی شرط ہوتی ہے، مجھے مدرسہ کی اور اپنی ضروریات کی وجہ سے اتنا وقت نہیں ملتا کہ تینوں جگہ حاضر ہوسکوں اس لیے ان تینوں جگہ میں سے کبھی صرف کوئی سی ایک کی نوبت آتی ہے اور کبھی دو کی، چنانچہ اس مرتبہ گنگوہ حاضری نہ ہوسکی، البتہ تھانہ بھون اور رائے پور کی حاضری ہوگئی۔

ان کا ارشاد حادثہ کے معلوم ہونے سے پہلے مجھ سے ہوچکا تھا کہ تھانہ بھون حاضری کو زیادہ دن ہوگئے رائے پور سے واپسی پر وہاں بھی چلنا۔ مگر میں ہفتہ کا درمیان ہونے کی وجہ سے متامل تھا۔ لیکن جب یہ دوسرا محرک پیدا ہوگیا تو حاضری کا قصد پختہ کرلیا۔ بالجملہ حضرت کے قلب مبارک

میں جتنا خفیف بھی اثر ہے اس کے ازالہ کا متمنی و مستدعی ہوں کہ اکابر کی گرانی کو میں اسباب ہلاکت سمجھتا ہوں۔ فقط

محتاج کرم زکریا سہارنپور

(جواب: از حضرت اقدس قدس سرہٗ)

''مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ''

مجھ کو وسوسہ بھی نہیں ہوا کہ ان الفاظ کی دلالت بقائے تاثر پر ہوسکتی ہے۔ نہ میرا قصد تھا اور نہ اب تاثر باقی ہے بہر حال اب تو الٹا میں ہی شرمندہ ہوں کہ میں نے لکھا ہی کیوں تھا۔ مگر ہمیشہ سے یہی عادت رہی اور پختہ ہوگئی کہ دوستوں سے معاملہ صاف رہے، اب کچھ اثر باقی نہیں بالکل مطمئن رہئے اور مجھ کو اپنا مخلص سمجھئے۔ اگر یہی معلوم ہو جاتا کہ اصالۃً یہاں آنا ہوا ہے اور تبعاً ظریف کے یہاں تو مجھ کو ابہام نہ ہوتا۔ خصوصاً وہاں کھانا کھانا اس ابہام کا اور مؤید ہوگیا۔ توبہ توبہ کہاں اکابر اور کہاں اصغر الاصاغر، صلاح کار کجا و من خراب کجا، احسن اللہ تعالیٰ عاقبتناً۔ فقط

ماہ مبارک میں اس ناکارہ کا اکابر سے خط و کتابت

(۱۱)......اس ناکارہ کا معمول ماہِ مبارک میں تقریباً چالیس سال سے خط و کتابت کا بالکل نہیں مگر یہ کہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے جو مدرسہ سے تعلق رکھتی ہیں یا اور کوئی خاص مجبوری ہو تو لکھنے پڑتے ہیں۔ لیکن اس ضابطہ میں ایک استثناء ہمیشہ سے رہا وہ یہ کہ اکابر کی خدمت میں ایک دو خط اس تشریح کے ساتھ کہ اس کے جواب کی ہرگز ضرورت نہیں صرف دعاء کی یاد دہانی ہے، لکھنے کا ہمیشہ سے رہا۔ اس سلسلہ میں اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے متعدد خطوط باوجود میرے اس لکھنے کے کہ جواب کی ضرورت نہیں اور باوجود اس اہتمام کے کہ اعلیٰ حضرت رائے پوری اول اور حضرت اقدس رائے پوری ثانی حضرت مولانا عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے میرے انبار میں متعدد موجود ہیں اور حضرت شیخ الاسلام مدنی قدس سرہٗ کا تو یہ بھی اہتمام تھا کہ حضرت اقدس باوجود اپنے مشاغل اور ماہِ مبارک کے اہتمام کے ایک دو کارڈ ماہِ مبارک میں اگر میں نہ لکھوں تب بھی حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ تحریر فرمایا کرتے تھے۔ عموماً اس میں ایک یا دو شعر ہوا کرتے تھے۔ یہ سارے کارڈ کہیں محفوظ ہیں اور وہ اشعار اتنے اونچے ہوتے تھے کہ یہ ناکارہ ان کا مصداق نہیں بن سکتا۔ مگر حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے تعلق کے اظہار اور شفقت کو یاد کر کے رونے کے سوا اب کچھ نہیں رہا۔ ایک کارڈ کا مضمون جو حضرت نے متعدد رمضانوں میں لکھا تھا یہ تھا:

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

ایک ماہِ مبارک کے کارڈ کا شعر یہ تھا۔

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے ابرِ کرم، بحرِ سخا، کچھ تو ادھر بھی

مجھے یہ شعر اسی طرح یاد ہے، کارڈ سامنے نہیں بعض خطوط میں عربی کے اشعار بھی تحریر فرمائے۔ اسی طرح اس سیہ کار کا بھی معمول ہر ماہِ مبارک میں ایک دو کارڈ حضرت مدنی کو لکھنے کا تھا اس میں بھی ایک دو شعر ہوا کرتے تھے یہ دونوں شعر مجھے بھی اپنے مختلف کارڈوں پر رمضان میں لکھنا بہت یاد ہے چونکہ حضرت قدس سرہٗ کا اہتمام اور معمول مجھے معلوم تھا اس لیے حضرت کی روانگی کے بعد جہاں کہیں بھی حضرت قدس سرہٗ کا رمضان گزرتا میں انتیس شعبان یا یکم رمضان کو کارڈ لکھ دیتا تاکہ میرا کارڈ جوابی نہ بنے بلکہ ابتدائی درخواست بنے اس واقعہ کی تسوید کے وقت بھی مفتی محمود صاحب میرے پاس ہیں فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کا ایک کارڈ حضرت مدنی کے نام ان کے کسی خلیفہ کے پاس دیکھا جس میں صرف یہ مصرعہ تھا۔

''چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی''

فقط

اس کا دوسرا مصرعہ یہ ہے۔

''بیاد آرا محبان بادہ پیمارا''

اسی طرح ہر دو شیخین رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے خطوط بھی میرے خزانے میں محفوظ ہیں، یہ چیزیں اکابر کے حالات میں آنا چاہئیں تھیں مگر چونکہ اس وقت ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا اس لیے میرے بچوں نے اعلیٰ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کا ایک کارڈ یہ کہہ کر دکھلایا کہ اس کو تو ضرور نقل کرنا ہے۔ میں نے منع بھی کیا کہ اس قسم کے کارڈ نقل کرنا مناسب نہیں ہیں مگر جیسا کہ میں نے اوپر تحریر کیا ان بچوں کا اصرار ہے کہ یہ تبرکات ہیں اور ان سے اپنے اکابر کی تواضع معلوم ہوتی ہے۔ میری درخواست دعاء پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا کارڈ حسب ذیل ہے:

''مکرمی دام فیضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ''

محبت نامہ نے مسرور فرمایا صحیح جواب تو یہ ہے کہ:

صلاح کار کجا و من خراب کجا
ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

لیکن چونکہ دعاء کے لیے صلاح شرط نہیں بلا صلاح بھی عبادت ہے اس لیے دل سے دعاء کرتا ہوں اور خود بھی اس کا متمنی ہوں۔ والسلام

اشرف علی

ایک صاحب کے کارڈ پر حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کا یہ ارشاد ملا۔

''بخدمت مولوی محمد زکریا صاحب، السلام علیکم۔ میرے چھوٹے بھائی کا خط شاید آپ کے پاس اس مضمون کا آیا ہو کہ کوئی شوہر اپنی بی بی پر ظلم کرتا ہے اول انہوں نے مجھ سے کہا کہ یہ ساڈھوڑہ کا قصہ ہے۔ اگر کوئی مخلص دوست وہاں ایسا ہو کہ کوئی شوہر کو فہمائش کر دے تو اچھا ہے ان کو آپ کا پتہ میں نے ہی بتایا تھا کہ شاید ان کا کوئی ذی اثر ملنے والا وہاں ہو سو میں بھی ثواب کے لیے لکھتا ہوں کہ اگر کسی مصلحت کے منافی نہ ہو تو اس کا خیال رکھئے۔ (آگے اس شوہر اور بیوی کا نام بھی تحریر فرمایا ہے)۔ فقط

رمضان المبارک حضرت تھانوی وحضرت سہارنپوری رحمہا اللہ کے معمولات:

(۱۲)......اس ناکارہ نے جب فضائل رمضان لکھا تو اس میں اپنے اکابر کے کچھ معمولات لکھے تھے، تھانہ بھون مجھے رمضان گزارنے کی نوبت کبھی نہیں آئی اور اس سیہ کار کو خواجہ عزیز الحسن مجذوب سے بڑی بے تکلفی تھی کہ وہ حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ اور میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد بھی ہمیشہ تھانہ بھون کی حاضری میں جاتے ہوئے اور واپسی میں ایک دو شب سہارنپور قیام فرمایا کرتے تھے، اس لیے میں نے حضرت حکیم الامت کے رمضان کے معمولات بہت اہتمام سے دریافت کیے۔ اس خط میں حضرت کے تو معلوم نہ ہو سکے مگر بعض دوستوں کا اصرار ہے کہ اکابر کے معمولات میں تیرے اس استفسار کو بھی بڑا دخل ہے۔ اس لیے ان کی خواہش ان کے درج کرنے کی ہے۔

''مکتوب زکریا بنام خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمہ اللہ تعالیٰ''۔

مخدومی حضرت خواجہ صاحب زادمجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ، یہ سن کر کہ آپ کچھ طویل مدت کے لیے تھانہ بھون مقیم ہیں، بے حد مسرت ہوئی، حق تعالیٰ شانہٗ ترقیات سے نوازیں، اس وقت باعثِ تکلیف دہی ایک خاص امر ہے جس کے لیے بڑے غور کے بعد جناب ہی کی خدمت میں عرض کرنا مناسب معلوم ہوا کہ حضرت مولانا کے یہاں آپ سے زیادہ بے تکلف شاید کوئی نہ ہو۔ اس لیے جناب کو اس میں سہولت ہوگی۔ مجھے حضرت کے معمولاتِ رمضان شریف معلوم کرنے کا اشتیاق ہے خود حضرت سے پوچھتے ہوئے تو ادب مانع ہے اور خود حاضر ہو کر دیکھوں تو ایک دو روز

میں معلوم کرنا مشکل ہے۔اس لیے جناب کوواسطہ بناتا ہوں۔امید ہے کہ تکلیف کوگوارا فرمائیں گے۔سوالات سہولت کے لیے میں خود ہی عرض کرتا ہوں۔

(۱)وقتِ افطار کا کیا معمول ہے۔یعنی جنتریوں میں جو اوقات لکھے جاتے ہیں ان کا لحاظ فرمایا جاتا ہے یا چاند وغیرہ کی روشنی کا۔(۲)اگر جنتری پر مدار ہے تو تقریباً کتنے منٹ احتیاط ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی۔(۳)افطار میں کسی خاص چیز کا اہتمام ہوتا ہے یا "کل ما تیسر" اگر اہتمام ہوتا ہے تو کس چیز کا۔(۴)افطار اور نماز میں کتنا فصل ہوتا ہے۔(۵)افطار مکان پر ہوتا ہے یا مدرسہ میں۔(۶)مجمع کے ساتھ افطار فرماتے ہیں یا تنہا۔(۷)افطار کے لیے کھجور یا زمزم کا اہتمام فرمایا جاتا ہے یا نہیں۔(۸)مغرب کے بعد نوافل میں کماً یا کیفاً کوئی خاص تغیر ہوتا ہے یا نہیں، اگر ہوتا ہے تو کیا۔(۹)اوّابین میں تلاوت کا کیا معمول ہے۔رمضان اور غیر رمضان دونوں کا معمول ہے۔(۱۰)غذا کا کیا معمول ہے، یعنی کیا کیا اوقات غذا کے ہیں، نیز رمضان اور غیر رمضان میں کوئی خاص اہتمام کی کمی زیادتی کے اعتبار سے معتاد ہے یا نہیں۔(۱۱)تراویح میں امسال تو معلوم ہوا ہے کہ علالت کی وجہ سے مدرسہ میں سُنتے ہیں مگر مستقل عادت شریفہ کیا ہے،خود تلاوت یا سماع اور کتنا روزانہ۔(۱۲)ختم کلام مجید کا کوئی خاص معمول مثلاً ستائیس (۲۷) شب یا اُنتیس (۲۹) شب یا کوئی اور شب ہے یا نہیں۔(۱۳)تراویح کے بعد خدام کے پاس تشریف فرما ہونے کی عادت شریفہ ہے یا نہیں،فوراً مکان تشریف لے جاتے ہیں یا کچھ دیر کے بعد تشریف لے جاتے ہیں تو یہ وقت کس کام میں صرف ہوتا ہے۔(۱۴)مکان تشریف لے جا کر آرام فرماتے ہیں یا کوئی خاص معمول ہے،اگر آرام فرماتے ہیں تو کس وقت سے کس وقت تک۔
(۱۵)تہجد میں تلاوت کا کیا معمول ہے،یعنی کتنے پارے کس وقت سے کس وقت تک۔(۱۶)سحر کا کیا معمول ہے یعنی کس وقت تناول فرماتے ہیں اور طلوع فجر سے کتنا قبل فارغ ہو جاتے ہیں۔
(۱۷)سحر میں دودھ وغیرہ کسی چیز کا اہتمام ہے یا نہیں،روٹی تازی پکتی ہے یا رات کی رکھی ہوئی۔
(۱۸)صبح کی نماز معمول کے وقت اسفار میں ہوتی ہے یا کچھ مقدم۔(۱۹)دن میں سونے کا وقت ہے یا نہیں،اگر ہے تو صبح کو یا دوپہر کو۔(۲۰)روزانہ تلاوت کا کوئی خاص معمول ہے یا نہیں یعنی کوئی خاص مقدار تلاوت کی رمضان میں مقرر فرمائی جاتی ہے یا نہیں۔(۲۱)کسی دوسرے شخص کے ساتھ دَور کا یا سنانے کا معمول ہے یا نہیں۔(۲۲)تلاوت حفظ اکثر فرمائی جاتی ہے یا دیکھ کر۔
(۲۳)اعتکاف کا معمول ہمیشہ کیا رہا اور اعتکاف عشرہ سے زیادہ کا مثلاً اربعینہ کا کبھی حضرت نے فرمایا یا نہیں۔(۲۴)اخیر عشرہ میں اور بقیہ حصۂ رمضان میں کوئی فرق ہوتا ہے یا نہیں۔(۲۵)ان کے علاوہ کوئی خاص عادت شریفہ آپ لکھ سکیں گے،بہت ہی کرم ہوگا۔اگر مفصل جواب تحریر

فرمائیں گے اور اگر حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے معمولات کا پتہ لگا سکیں تو کیا ہی کہنا کہ حضرت مولانا ہی کی ذات اب ایسی ہے جو حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مفصل معمولات کچھ بتا سکتی ہے۔ جناب کو بہت ہی تکلیف تو ضرور ہوگی۔ مگر مشائخ کے معمولات خدام کے لیے اسوہ ہوکر انشاء اللہ بہتوں کو نفع ہوگا۔ دعاء کا متمنی اور مستدعی۔ فقط السلام

زکریا عفی عنہٗ

الجواب:

مخدوم و مکرم و معظم مدفیوضکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

گرامی نامہ شرف صدور لایا۔ چونکہ حضرت اقدس کے بعض بلکہ اکثر معمولات رمضان المبارک پر میں خود ہی مطلع نہ تھا، اس لیے بضرورت جناب کا والا نامہ خدمت اقدس میں پیش کیا تو حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ صرف یہ لکھ دیا جائے کہ اگر چاہیں وہ براہِ راست خود مجھ سے دریافت کرلیں۔ جواباً اطلاعاً عرض ہے، چونکہ اعتکاف میں ہوں، اس لیے پنسل سے لکھ رہا ہوں، گستاخی معاف ہو۔ والسلام

طالب دعائے خیر عزیز الحسن عفی عنہٗ (اس خط پر کوئی تاریخ نہیں)

اس خط کے نقل کرانے پر بعض دوستوں کو خواہش ہوئی اور خود میرا بھی جی چاہا کہ ان سوالات کے جواب میں سیّدی وسندی و مرشدی حضرت اقدس سہارنپوری قدس سرہٗ کے معمولات نقل کراؤں، اگرچہ اجمالی طور پر فضائل رمضان میں اور تذکرۃ الخلیل میں گزر چکے ہیں، لیکن ان مسلسل سوالات کے جواب میں مسلسل جواب لکھواؤں کہ حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں ۲۸ھ سے ۴۵ھ تک رمضان گزارنے کی نوبت آئی۔ بجز ۳۴ھ کے کہ اس رمضان المبارک میں حضرت قدس سرہٗ مکہ مکرمہ میں تھے اور یہ ناکارہ سہارنپور میں تھا۔

(۱) حضرت قدس سرہٗ کے یہاں گھڑی کا اہتمام اور اس کے ملانے کے واسطے مستقل آدمی تو تمام سال رہتا تھا، لیکن خاص طور سے رمضان المبارک میں گھڑیوں کے ڈاک خانے اور ٹیلیفون وغیرہ سے ملوانے کا بہت اہتمام رہتا تھا۔ افطار جنتریوں کے موافق ۲۔۳ منٹ کے احتیاط پر ہوتا تھا۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ، رائے پور میں چونکہ طلوع آفتاب اور غروب بالکل سامنے صاف نظر آتا تھا۔ اس لیے دونوں وقت گھڑیوں کے ملانے کا اہتمام طلوع و غروب سے بہت تھا۔ میرے والد صاحب اور چچا جان نور اللہ مرقدہما کے یہاں جنتریوں پر زیادہ مدار نہیں تھا نہ گھڑیوں پر۔ بلکہ ’’اذا اقبل اللیل من ھھنا وادبر النھار

من ھھنا'' آسمان پر زیادہ نگاہ رہتی تھی۔

(۲) اُوپر گزر چکا کہ جنتری کے اعتبار سے ۲۔۳ منٹ کی تاخیر ہوتی تھی۔

(۳) کھجور اور زمزم شریف کا بہت اہتمام ہوتا تھا۔ سال کے دوران میں جو حجاج کرام زمزم اور کھجور ہدایا لاتے تھے وہ خاص طور سے رمضان شریف کے لیے رکھ دیا جاتا تھا۔ زمزم شریف تو خاصی مقدار میں رمضان تک محفوظ رہتا۔ لیکن کھجوریں اگر خراب ہونے لگتیں تو رمضان سے پہلے تقسیم کردی جاتیں۔ البتہ افطار کے وقت آدھی یا پون پیالی دودھ کی چائے کا معمول تھا اور بقیہ اس سیہ کار کو عطاء ہوتا تھا۔

(۴) حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے زمانے میں تقریباً دس منٹ کا فصل ہوتا تھا، تاکہ اپنے گھروں سے افطار کر کے آنے والے اپنے گھر سے افطار کر کے نماز میں شریک ہوسکیں۔

(۵) حضرت کا معمول مدرسہ میں افطار کا رہا۔ چند خدام یا مہمان ۱۵۔۲۰ کے درمیان ہوتے تھے۔ مدینہ منورہ میں مدرسہ شرعیہ میں افطار کا معمول تھا۔

(۶) گزر چکا۔ (۷) نمبر۳ میں گزر چکا۔

(۸) مغرب کے بعد کے نوافل میں کماً کوئی تغیر نہیں ہوتا تھا، کیفاً ضرور ہوتا تھا کہ معمول سے زیادہ دیر لگتی تھی۔ عموماً سوا پارہ پڑھنے کا معمول تھا اور ماہِ مبارک میں جو پارہ تراویح میں حضرت سناتے وہی مغرب کے بعد پڑھتے۔

(۹) سابقہ میں گزر چکا۔

(۱۰) اوابین کے بعد مکان تشریف لے جا کر کھانا نوش فرماتے تھے۔ تقریباً ۲۰۔۲۵ منٹ اس میں لگتے تھے۔ کماً اس وقت کی غذا میں بہت تقلیل ہوتی تھی۔ ہم لوگوں کے یہاں یعنی کاندھلہ اور گنگوہ میں سحر میں پلاؤ کھانے کا بالکل معمول نہیں تھا بلکہ سخت خلاف تھا کہ اس کو موجب پیاس خیال کرتے تھے، سحر میں پلاؤ سب سے پہلی مرتبہ سہارنپور میں حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں کھائی، اس سیہ کار کا معمول ہمیشہ سے افطار میں کھانے کا کبھی نہیں ہوا۔ اس لیے کہ تراویح میں قرآن شریف سنانے میں دِقت ہوتی تھی۔ البتہ جب تک صحت رہی سحر میں اناڑی کی بندوق بھرنے کا دستور رہا۔ ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ مجلس میں اس کا ذکر آگیا کہ یہ ناکارہ افطار میں نہیں کھاتا، تو حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ افطار میں کس طرح کھایا جائے، جو کھاتے ہیں وہ بھی ضابطہ ہی پورا کرتے ہیں۔

(۱۱) میرے حضرت قدس سرہٗ کے اخیر کے دو سالوں کے علاوہ کہ ضعف و نقاہت بہت بڑھ گیا تھا، ہمیشہ تراویح میں خود سنانے کا معمول رہا۔ دارالطلبہ بننے سے پہلے مدرسہ قدیم میں تراویح

پڑھایا کرتے تھے۔ دارالطلبہ قدیم بن جانے کے بعد پہلے سال میں تو حضرت کی تعمیل حکم میں میرے والد صاحب نے قرآن پاک سنایا تھا۔ اس کے بعد ہمیشہ حضرت قدس سرہٗ کا وہاں قرآن پاک سنانے کا معمول رہا۔

(۱۲) اکثر ۲۹ کی شب میں ختم قرآن کا معمول تھا۔ چند روز تک شروع میں سوا پارہ اور اس کے بعد اخیر تک ایک پارہ کا معمول تھا۔ اس سلسلہ میں ایک عجیب وغریب قصہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی قدس سرہٗ کا معروف ہے کہ اگر رمضان مبارک ۲۹ کا ہوتا تو حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کا معمول یکم رمضان کو دو پارے پڑھنے کا تھا اور ۳۰ کا ہوتا تو یکم رمضان کو ایک پارہ پڑھا کرتے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نور اللہ مرقدہٗ یکم رمضان کو اپنی مسجد میں تراویح پڑھانے کے بعد شاہ عبدالقادر صاحب کی مسجد میں تحقیق کے لیے آدمی بھیجا کرتے کہ بھائی نے آج ایک پارہ پڑھایا دو۔ اگر معلوم ہوتا کہ دو پڑھے تو شاہ صاحب فرمایا کرتے، اب کے رمضان ۲۹ کا ہوگا، یہ علمِ غیب نہیں کہلاتا بلکہ علمِ کشف کہلاتا ہے۔

(۱۳) تراویح کے بعد ۱۵۔۲۰ منٹ حضرت قدس سرہٗ مدرسہ میں آرام فرماتے تھے۔ جس میں چند خدام پاؤں بھی دباتے اور قرآن پاک کے سلسلے میں کوئی گفتگو بھی رہتی مثلاً کسی نے غلط لقمہ دے دیا یا تراویح میں اور کوئی بات پیش آئی ہو اس پر تبصرہ، تفریح چند منٹ تک ہوتی۔ حضرت قدس سرہٗ کے پیچھے تراویح پڑھنے کے لیے دور دور سے حفاظ آتے۔ یہ ناکارہ اپنی تراویح پڑھانے کے بعد جو اکثر حکیم اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی مسجد میں اور کبھی کبھی اماں جی کے اصرار وارشاد پر حضرت قدس سرہٗ کے مکان پر پڑھانے جاتا تھا۔ جلد جلد فراغت کے بعد حضرت قدس سرہٗ کے یہاں پہنچ جاتا۔ اس وقت تک حضرت قدس سرہٗ کے یہاں ۴۔۶ رکعتیں ہوتیں۔ اس لیے کہ حکیم صاحب مرحوم کی مسجد میں نماز سویرے ہوتی تھی اور مدرسہ دارالطلبہ کی مسجد میں تاخیر سے اور یہ ناکارہ اپنی نااہلیت سے پڑھتا بھی بہت جلدی تھا۔ ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ نے سورۂ طلاق شروع کی اور ''یاایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن الآیہ'' آیۂ شریفہ شروع کی اور اس نابکار نے جلدی سے لقمہ دیا ''یا ایھا الذین آمنوا اذا طلقتم النساء'' حضرت حافظ محمد حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تو حضرت قدس سرہٗ کے مستقل سامع تھے۔ ہر سال اجراڑہ سے سہارنپور رمضان گزارنے تشریف لایا کرتے تھے۔ نیز حضرت مولانا عبداللطیف صاحب اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہما اقتداء میں تھے، تینوں ایک دم بول ''یا ایھا النبی'' تراویح کے بعد حسب معمول لیٹنے کے بعد حضرت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا۔ مولوی زکریا سو رہے تھے، میں نے عرض کیا حضرت بالکل نہیں، مگر ''اذا طلقتم النساء فطلقوھن واحصوا العدۃ، و اتقوا

اللّٰہ ربکم و لا تخرجو ھن" سارے جمع کے صیغے تھے، مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ "یا ایھا الذین آمنوا" ہوگا۔ "یا ایھا النبی" مفرد کیوں ہوگا۔

حضرت اقدس سہارنپوری نے ارشاد فرمایا، قرآن شریف میں بھی قیاس چلاتے ہو۔ میں نے عرض کیا، حضرت یہ تو قیاس نہیں، یہ تو قواعد نحو یہ کی بات تھی ایک مرتبہ حافظ محمد حسین صاحب نے غلط لقمہ دے دیا۔ میں نے ایک دم صحیح لقمہ دیا۔ حضرت حافظ صاحب کی زبان سے بے اختیار نکل گیا نماز ہی میں "ہاں" اور پھر جو میں نے بتایا تھا وہی حافظ صاحب نے بتایا۔ تراویح کے بعد کے وقفے میں میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت میرا لقمہ لیا یا حافظ کا، میرا مطلب یہ تھا کہ حافظ صاحب کی نماز تو "ہاں" کہنے سے ٹوٹ گئی اور حضرت نے اگر ان کا لقمہ لیا ہوگا تو میں عرض کروں گا کہ سب کی ٹوٹ گئی۔ حضرت قدس سرہٗ میری حماقت کو سمجھ گئے، حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میں باؤلا تھا جو ان کا لقمہ لیتا۔ اس قسم کے تفریحی فقرے یا کسی آیت شریفہ کے متعلق کوئی تفسیری نکتہ ہوتا تو اس پر بھی گفتگو فرماتے رہتے، ایک مرتبہ "وان تعدو ا نعمة اللّٰہ" کے متعلق ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ایک ایک نعمت میں ہزاروں نعمتیں شامل ہیں۔ اس لیے تعدد ارشاد فرمایا گیا۔

(۱۴) تراویح کے بعد چند منٹ قیام کے بعد جیسا کہ اوپر لکھا مکان تشریف لے جاکر ۱۵۔۲۰ منٹ گھر والوں سے کلام فرماتے اور محلّہ کی کچھ مستورات اس وقت آجاتیں ان سے بھی کچھ ارشاد فرماتے، اس کے بعد ڈھائی تین گھنٹے سونے کا معمول تھا۔

(۱۵) تہجد میں عموماً دو پارے پڑھنے کا معمول تھا کبھی کم وبیش حسب گنجائش اوقات۔ بذل المجہود میں جب نظائر والی حدیث آئی جو مصحف عثمانی کی ترتیب کے خلاف ہے تو حضرت قدس سرہٗ نے اس ناکارہ سے فرمایا تھا کہ اس حدیث کو ایک پرچہ پر نقل کر دینا، آج تہجد اسی ترتیب سے پڑھیں گے۔ یہ فرطِ محبت اور فرطِ عشق کی باتیں:

"محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھادے گی"

سنا ہے کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کا معمول وتروں کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنے کا تھا، کسی نے عرض کیا کہ حضرت آدھا ثواب آیا ہے، حضرت نے فرمایا ہاں بھئی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اتباع میں جی زیادہ لگے ہے، بڑا ثواب زیادہ نہ ہو۔ میرا خیال یہ ہے کہ ضابطہ میں تو آدھا ہی ثواب ہے مگر یہ جذبۂ عشق شاید پورے حصہ سے بھی بڑھ جائے۔ مشہور ہے کہ مجنوں لیلیٰ کے شہر کے کتوں کو پیار کرتا تھا۔

(۱۶) تقریباً صبح صادق سے باختلاف موسم دو یا تین گھنٹے پہلے اُٹھنے کا معمول تھا اور صبح صادق سے تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے سحر کا معمول تھا ۱۵۔۲۰ منٹ میں فراغت ہو جاتی تھی۔ یعنی

طلوع فجر سے ۱۵۔۲۰ منٹ پہلے۔

(۱۷) سحر میں دودھ وغیرہ کسی چیز کا اہتمام نہیں تھا، کبھی ہدایا میں پھینیاں آجاتیں تو بلا اہتمام سب گھر والوں کے لیے بھگودی جاتیں ایک آدھ چمچہ حضرت قدس سرہٗ بھی نوش فرمالیتے، البتہ پلاؤ کبھی کبھی سحر میں حضرت کے یہاں پکائی جاتی تھی، البتہ افطار میں کبھی نہیں پکا کرتی تھی شاید میں پہلے کہیں لکھوا چکا ہوں حضرت قدس سرہٗ کے یہاں سے قبل کاندھلہ یا گنگوہ میں سحر میں پلاؤ کھانا جرم تھا۔ مشہور یہ تھا کہ اس سے پیاس لگتی ہے مگر حضرت قدس سرہٗ کے یہاں کھانے کے بعد سے جب تک اس ناکارہ کی صحت رہی اور سحور کا اہتمام رہا اس وقت تک تو میرا معمول سحر میں پلاؤ کھانے کا رہا اور اب تو دس بارہ سال سے جب سے مہمانوں کا ہجوم بڑھ گیا۔ افطار میں پلاؤ اور گوشت روٹی کے علاوہ سحر میں میٹھے چاولوں کا بھی ہوگیا، حضرت قدس سرہٗ کے یہاں سحر میں تازی روٹی پکتی تھی۔ البتہ سحر میں چائے کا معمول حضرت کے یہاں تھا، اس ناکارہ کا اپنا سحر میں کبھی چائے پینا یاد نہیں، کیونکہ رمضان میں نماز فجر کے بعد سونے کا معمول ہے ۳۸ھ یعنی پہلے سفر حج سے رمضان میں رات کو نہ سونے کا معمول شروع ہوا تھا جو اب سے ۷، ۸ سال پہلے تک بہت اہتمام سے رہا۔ لیکن اب تو امراض نے سارے ہی معمولات چھڑا دیے۔

(۱۸) حضرت قدس سرہٗ کے یہاں رمضان میں اسفار میں نماز پڑھنے کا معمول تھا، البتہ غیر رمضان سے دس بارہ منٹ قبل۔

(۱۹) حضرت قدس سرہٗ کا معمول بارہ مہینے صبح کی نماز کے بعد سے تقریباً اشراق تک سردیوں میں حجرے کے کواڑ بند کرکے اور شدید گرمی میں مدرسہ قدیم کے صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر اوراد کا معمول تھا اس میں مراقبہ بھی ہوتا تھا۔ بارہ مہینے اشراق کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد ۳۵ھ سے پہلے بخاری اور ترمذی شریف کے سبق کا وقت تھا۔ لیکن ۳۵ھ کے بعد بذل کی تالیف کا وقت ہوگیا تھا جو ہر موسم میں ۱۱، ۱۲ بجے تک رہتا۔ لیکن ماہ رمضان مبارک میں اشراق کی نماز پڑھنے کے بعد ایک گھنٹہ آرام فرماتے۔ اس کے بعد گرمی میں ایک بجے تک بذل لکھواتے اور سردی میں ۱۲ بجے تک اس کے بعد ظہر کی اذان تک قیلولہ کا معمول تھا۔

(۲۰) رمضان میں حضرت قدس سرہٗ کا معمول ہمیشہ وصال سے دو سال قبل تک خود تراویح پڑھانے کا تھا، ظہر کی نماز کے بعد تراویح کے پارے کو ہمیشہ حافظ محمد حسین صاحب اجراڑوی کو سنایا کرتے تھے کہ وہ اسی واسطے رمضان المبارک ہمیشہ سہارنپور کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی غیبت میں اس سیہ کار کو بھی سننے کی نوبت آئی، البتہ مدینہ پاک میں ظہر کے بعد پارہ سننا اس ناکارہ کے متعلق تھا اور میرے سفر حجاز سے واپسی پر چونکہ بذل بھی ختم ہوگئی تھی، اس لیے ظہر کی نماز کے بعد

مستقل ایک پارہ اہلیہ محترمہ کو سنانے کا دستور تھا اسی پارہ کے جوظہر کے بعد سنانے کا معمول تھا۔ مغرب کے بعد اوابین میں اور رات کو تراویح میں پڑھتے تھے۔

(۲۱) ۳۳ھ کے سفر حج سے پہلے عصر کے بعد میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے دَور کا معمول تھا جو اسی پارہ کا ہوتا تھا۔ جو تراویح میں سناتے، میں نے اپنے والد صاحب قدس سرہٗ کے علاوہ کسی اور سے دور کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

(۲۲) حضرت قدس سرہٗ کو دیکھ کر تلاوت کرتے ہوئے کم دیکھا ہے البتہ کبھی کبھی ضرور دیکھا ہے۔

(۲۳) حضرت نور اللہ مرقدہٗ کو وصال سے دو سال قبل کہ ان دو سالوں میں امراض کا جو اضافہ ہو گیا تھا ان میں سے قبل میں نے کبھی آخری عشرے کا اعتکاف ترک فرماتے نہیں دیکھا اور دار الطلبہ بننے سے قبل مدرسہ قدیم کی مسجد میں کرتے تھے اور دار الطلبہ بننے کے بعد یعنی ۳۵ھ سے دار الطلبہ میں فرماتے تھے اور اس عشرہ میں بھی بذل کی تالیف ملتوی نہیں ہوتی تھی بلکہ مسجد کلثومیہ کی غربی جانب جو حجرہ ہے اس میں بیس تاریخ کو تالیف سے متعلقہ سب کتابیں جاتیں تھی جو صبح کی نماز کے بعد یہ ناکارہ اٹھا کر مسجد میں رکھ دیتا اور تالیف کے ختم پر پھر اسی حجرہ میں منتقل کر دی جاتیں۔ عشرہ اخیر کے علاوہ میں نے کبھی اعتکاف کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

(۲۴) میں نے کوئی خاص فرق نہیں دیکھا۔ بجز اس کے کہ اٹھنے میں کچھ تقدیم ہو جاتی۔ اگر چہ میں اجمالی طور پر فضائل رمضان میں لکھ چکا ہوں کہ حضرت قدس سرہٗ اور حضرت حکیم الامت کے یہاں رمضان اور غیر رمضان میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا بخلاف حضرت شیخ الہند اور اعلیٰ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہما کے کہ ان دونوں کے یہاں رمضان اور غیر رمضان میں بہت فرق ہوتا تھا جیسا کہ میں نے فضائل رمضان میں لکھ چکا ہوں۔

(۲۵) اس کے علاوہ کہ اخبار دیکھنے کا جو معمول کسی کسی وقت غیر رمضان میں ہوتا تھا وہ رمضان میں نہیں ہوتا تھا بلکہ رمضان میں ان دو سالوں کے علاوہ جن میں میرے والد صاحب کے ساتھ دور ہوا۔ تسبیح ہاتھ میں ہوتی تھی اور زبان پر اور اد آہستہ آہستہ، کوئی خادم بات دریافت کرتا تو اس کا جواب مرحمت فرما دیتے کچھ لوگ دس پندرہ کے درمیان میں جیسے متولی جلیل صاحب، متولی ریاض الاسلام صاحب کاندھلہ سے اور میرٹھ سے رمضان کا کچھ حصہ گزارنے کے لیے حضرت کے پاس آجایا کرتے تھے، مگر اعتکاف نہیں کیا کرتے تھے اس لیے کہ عید سے ایک دن پہلے گھر واپس جانا چاہتے تھے۔

مکتوبات حضرت تھانوی بسلسلہ لفظ ''امام'' نام نامی حضرت حسین رضی اللہ عنہ

(۱۳) مکتوب زکریا بنام حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ

بحضرت اقدس ادام اللہ ظلال برکاتکم ونورنا بانور افیوضکم، بعد سلام مسنون آنکہ۔ ایک امر میں حضرت اقدس کا ذوق اپنے عمل کے لیے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام پر امام کا لفظ تحریر وتقریر میں استعمال کرنا مناسب ہے یا نہیں؟ استعمال میں تشبہ بالرفض کا شبہ ہے کہ اصل اطلاق اس کا شیعہ کے یہاں سے ہے۔ عدم استعمال میں تشبہ بالخروج کا شبہ ہے کہ اب یہ لفظ اہل سنت کے کلاموں میں اتنی کثرت سے استعمال ہونے لگا کہ گویا جزو نام بن گیا۔ اپنے اکابر کی کلامیں دونوں طرح کی ملتی ہیں فتاویٰ مولانا عبدالحیٔ صاحب ماثبت بالسنہ للشیخ عبدالحق وغیرہ میں سید حسن وسید حسین کو لفظ امام کے ساتھ متعدد جگہ استعمال کیا گیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے خطبہ میں عن الامامین الھمامین ہے، حضرت گنگوہی کے رسائل ردشیعہ میں نہیں ہے۔ جناب حسن جناب حسین اور حضرت حسن وغیرہ کے الفاظ ہیں۔

دعاء کا محتاج: زکریا کاندھلوی مظاہر علوم سہارنپور ۲۰۔
ذیقعدہ ۵۷ھ

الجواب:

(۱۴) ''میرا ذوق ہی کیا۔ مگر میرے اعتقاد میں یہ تشبہ اس لیے نہیں کہ اس کا شیوع اس قدر ہو گیا کہ خصوصیت کا شائبہ نہیں رہا البتہ اگر اطلاق کے وقت اس کا خیال آجاتا ہے تو بجائے امام کے حضرت کا لفظ استعمال کرتا ہوں اور اولیٰ سمجھتا ہوں۔''

اس ناکارہ زکریا کا معمول ایک عرصہ سے یہ ہے کہ حضرت قطب الارشاد حکیم الاسلام حضرت اقدس شاہ ولی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہٗ کو مسند الہند کہا کرتا ہوں اور لکھا کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ناکارہ نے ۴۰ھ سے حدیث شریف پڑھانی شروع کی تھی۔ اس وقت میں دیکھا کہ اپنے سلسلہ کی ساری اسانید حضرت مسند الہند پر جمع ہو جاتی ہیں۔ تو میں نے یہ سوچا کہ دوسرے مسالک والوں کی سندیں بھی تحقیق کروں۔ چنانچہ میں نے اس وقت میں ہر مدرسہ چھوٹا ہو یا بڑا اہل حدیث کا ہو یا اہلِ بدعت کا ہو یا کسی بھی مسلک کا ہو اور وہاں حدیث پڑھائی جاتی ہو ان کو ایک ایک جوابی کارڈ لکھا جس میں یہ لکھا کہ آپ کی سند حدیث میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ کا سلسلہ ہے یا نہیں؟ مجھے کسی مسلک والوں کے خط سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کوئی بھی حدیث پڑھانے والا ہندوستان میں ایسا ہے جس کا سلسلہ سند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے واسطہ سے بچ گیا ہو، ایسا تو ضرور ہوا کہ بہت سے مشائخ حدیث کی ایک سند ولی اللہ واسطہ سے اور اس کے علاوہ دوسری سندیں بھی ان کو حاصل ہیں، چنانچہ خود میرے حضرت قدس

سرہٗ کی سند ولی اللہ خاندان کے علاوہ مکہ مکرمہ مدینہ منورہ کے مشائخ سے ہے جیسا کہ مقدمہ بذل المجہود، لامع الدراری، مقدمہ اوجز میں تفصیل سے مذکور ہے اس لیے میں حضرت قطب عالم شاہ ولی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کو مسند ہند کہا کرتا ہوں، حضرت مسند الہند قدس سرہٗ کے تین رسالے ''الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین'' دوسرا رسالہ ''الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین'' اورتیسرا ''النوادر فی حدیث سید الاوائل والاواخر'' ان میں دوسرا رسالہ الدر الثمین تو مطبع مجتبائی میں ترجمہ کے ساتھ چھپا ہوا ملتا تھا۔ لیکن پہلا اور تیسرا نایاب قلمی میرے حضرت قدس سرہٗ کے پاس تھا۔ ان تینوں رسالوں کو حضرت یکجائی ۱۳۳۰ھ میں چھپوایا تھا اور اس وقت سے حضرت قدس سرہٗ کا معمول یہ تھا کہ اگر کوئی سمجھ دار ذی علم اس کی سند اور اجازت کی درخواست کرتا تو حضرت اس کو انفرادا یا اجتماعا پوری سن کر یا اوائل سن کر اجازت فرمادیا کرتے۔ اس سیہ کار کو سب سے پہلے اس کی اجازت شوال ۱۳۳۳ھ میں، جبکہ حضرت قدس سرہٗ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کی معیت میں طویل قیام بلکہ براہِ حجاز قسطنطنیہ کابل وغیرہ سے ہندوستان پر حملہ کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ حضرت قدس سرہٗ کی مشایعت کے لیے اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہٗ تشریف لائے تھے۔ لیکن اللہ والوں کی مخالفت تو سنت قدیمہ ہے۔ انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین بھی مشرکین اور منافقین کی ایذاء رسانی سے نہ چھوٹے۔ بعض مفسدوں کو یہ خیال ہوا اور سنا یہ تھا کہ محض تفریحا کہ حضرت سہارنپوری کا سفر حجاز روکا جائے اور اس کے لیے ایک جھوٹا مقدمہ قائم کر کے حضرت قدس سرہٗ پر دعویٰ کر دیا کہ عین وقت پر سمن کی تعمیل کرا کر سفر کو روک دیا جائے۔ حضرت قدس سرہٗ اس کی وجہ سے دو دن تک اہلِ رائپور کے اس مکان میں جو دار الطلبہ قدیم کی برابر میں ہے روپوش رہے۔ اسی مکان میں اعلیٰ حضرت رائپوری نور اللہ مرقدہٗ کا قیام تھا۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ اعلیٰ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ نے درخواست کی یا حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ نے از خود ارشاد فرمایا ہوگا۔

مسلسلات کی پہلی اجازت:

غرض اس وقت حضرت کے سفر حجاز سے دو تین روز قبل اس مکان میں اس سیہ کار کی مسلسلات کی پہلی اجازت ہے جس میں اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب سابق ناظم مدرسہ مظاہر علوم، میرے چچا جان حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی حال شیخ الاسلام پاکستان شریک تھے اور بہت ہی لذائذ سے یہ اجازت ہوئی تھی جس کا منظر آنکھوں کے سامنے ہے اس کے بعد سے چونکہ حضرت قدس

سرہٗ کی حجاز واپسی کے بعد سے آخر ۴۵ھ تک یہ سیہ کار سفراً وحضراً حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ کا ہم رکاب رہا اس لیے عموماً کوئی شخص اجازت لینے کے لیے آتا تو یہ ناکارہ بھی اس میں شریک رہتا، بلکہ اکثر قراءت بھی میں ہی کرتا، مگر یہ اجازت عموماً انفراداً ہوتی۔ اس ناکارہ کی سفرحجاز سے واپسی ۴۶ھ کے بعد سے ابوداؤد شریف کا سبق مستقل طور پر میرے متعلق ہوگیا اور ابوداؤد شریف کے ختم پر طلبہ کے اصرار پر اول مخصوص طلبہ کو اس کے بعد رفتہ رفتہ ابوداؤد کی پوری جماعت اور اس کے بعد سے قرب وجوار کے مدارس کے طلبہ نے بھی شرکت کرنی شروع کی اور اس ناکارہ نے بھی ان تینوں رسائل کا مطالعہ کئی سال تک مسلسل اجازت کے موقعوں پر کیا۔ ان میں سے دورسالے درثمین اور نوادر کے اندر تو زیادہ تحقیق کی بات نہیں تھی۔ بجز اس کے کہ النوادر میں بعض معمر صحابہ کی روایات ذکر کی گئی تھیں۔ جن پر محدثین نے بڑے سخت کلام کیے ہیں اور مسلسلات کے بعض رواۃ پر بھی سخت کلام کیا۔ جس کے متعلق مجھے یہ اشکال پیدا ہوا کہ ان رسائل کی اجازت دینا جائز ہے یا نہیں، حضرت مسند ہند کی تالیف اور میرے حضرت قدس سرہٗ کا ان کو طبع کرانا اور مسلسل اجازت دینا تو محرک تھا لیکن محدثین کا کلام موجب اشکال تھا۔ اس لیے ۵۲ھ میں اس ناکارہ نے جملہ اکابر حضرت شیخ الاسلام مدنی، حضرت حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی شاگرد حضرت قطب عالم گنگوہی، مولانا کفایت اللہ صاحب دہلی مفتی اعظم ہند اور بیسیوں اکابر اور معاصرین کو جوابی کارڈ لکھے، میری عادت ہمیشہ اپنی زندگی یا صحت کے زمانے میں یہ رہی کہ جب مجھے مسئلہ میں اشکال پیش آتا تھا تو اپنے اکابر اور معاصرین اور بعد میں شاگردوں سے بھی جو استفسار میں عار نہیں ہوا، جن جن کو مناسب سمجھتا ایک ایک جوابی کارڈ لکھوادیتا کہ مجھے اس مسئلہ میں اشکال ہے اس کے متعلق تمہاری معلومات کیا ہیں، اسی سلسلہ میں ۵۲ھ میں تقریباً پچاس خطوط لکھے جن کے جواب میں اکثریت تو ایسے حضرات کی تھی جنہوں نے اس کتاب سے لاعلمیت ظاہر کی اور بعض نے لکھا کہ محدثانہ کلام کی طرف التفات نہیں ہوا۔ اسی سلسلہ میں حضرت حکیم الامت نوراللہ مرقدہ کو بھی ایک عریضہ لکھا تھا۔ جس کا جواب حضرت قدس سرہٗ نے جو ارشاد فرمایا وہ دونوں یہاں درج کراتا ہوں۔

خلاصہ استفسار از:

حضرت اقدس حکیم الامۃ کا مسلسلات کے سلسلہ میں ایک مکتوب

حضرت اقدس حکیم الامۃ مولانا تھانوی ادام اللہ ظلال برکاتکم

مجدد عصر حضرت مسند ہند شاہ ولی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے رسائل ثلثہ میں بہت سی روایات

محدثین کے قاعدہ کے موافق متکلم فیہ بلکہ بعض کو موضوع بھی کہا گیا ہے۔ بالخصوص رتن ہندی اور ابوالدنیا وغیرہ سے جو روایات منقول ہیں کہ رتن ہندی کی صحابیت محدثین کے نزدیک ثابت نہیں، اصابہ میں ان کے متعلق طویل کلام کیا ہے اور ابوالدنیا کو لسان المیز ان میں سخت الفاظ سے تعبیر کیا ہے ایسے حالات میں ان روایات کا معمول شاہ صاحب کے زمانے سے متداول ہے مجھے حضرت مولانا سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ سے اجازت ہے۔ اب بھی بعض طلبہ کے اصرار پر بندہ کبھی کبھی روایت کرتا ہے، امسال یہ خلجان درپیش ہے کہ حسب قاعدۂ محدثین یہ موضوعات کی روایت ہے اور شاہ صاحب کی تالیف ہونا اور اپنے اکابر کی روایت یہ دونوں امر اس کے معارض ہیں اکابر کے ساتھ حسن ظن ان پر اعتماد ان کی چھان بین اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس طرف التفات نہ ہو اور محدثین کی تحقیق فن رجال ائمہ کا فیصلہ اس سے مانع ہے کہ ان کی روایت کی اجازت دی جائے۔ ایسی حالت میں خلجان ہے کہ ہم لوگوں کے لیے کون سی تحقیق راجح ہے، حجاز میں بعض مشائخ کے یہاں متداول ہے اگر اجازت نہ دی جائے تو اس تسلسل کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے جو تیرہ سو برس سے باقی ہے اور اجازت دی جائے تو وعید دخول فی الکذب کا اندیشہ ہے اھ مختصراً۔

الجواب:

مکرمی السلام علیکم آپ نے غایت ورع واحتیاط سے اس کو ضرورت سے زیادہ اہم ٹھہرا لیا۔ آخر ابن ماجہ وغیرہ میں بھی بعض احادیث موضوع کہی گئیں۔ مگر ان کی روایت بلا نکیر برابر ہوتی ہے۔ اکابر کا روایت کرنا دلیل ثبوت کسی حال نہیں۔ ان کو جو پہنچا روایت کر دیا۔ روایت کرنا اور بات ہے اور ثبوت کا حکم کرنا اور بات ہے۔ البتہ روایت کر کے اس کے عدم ثبوت کو مع درجۂ عدم ثبوت کے ظاہر کر دینا ضروری ہے اس طرح سے موضوعات کی روایت بالاجماع جائز ہے۔ اس سے زیادہ کوئی بات ذہن میں نہیں باقی دوسرے علماء سے مراجعت کرنے سے شاید اس سے زیادہ تحقیق ہو سکے۔

والسلام اشرف علی

۲۳ رجب ۱۳۵۲ھ اھ بلفظہ

(یہ مضمون رسالہ النور رمضان ۱۳۵۲ھ میں شائع بھی ہو چکا)

مکتوب زکریا بنام حضرت سہانپوری بسلسلہ ذکر

(۱۵) خلاصہ مکتوب زکریا بنام:

حضرت اقدس سیدی سندی ومرشدی سہارنپوری قدس سرہٗ

(۱) ذکر میں بعض وقت وساوس سے لذت وتوجہ نہیں رہتی ذکر کے وقت کوئی تصور ارشاد فرما دیں

کہ جس سے طبیعت کو اس کی طرف متوجہ کر لینے کی وجہ سے انتشار خیال نہ رہے۔
(۲) بعض وقت عجلت کی وجہ سے اور بعض وقت بلا تنگی وقت بھی اطمینان سے ذکر پورا نہیں ہوتا۔ ایسے وقت میں تعداد کا پورا ہونا ضروری ہے اگر چہ جلدی جلدی ہو یا اتنے وقت میں جس قدر ہو سکے اتنا کر لیا جائے ضحیٰ کی نماز کے علاوہ بقیہ ارشادات کی تعمیل حضرت کی توجہ سے ہو رہی ہے۔ ضحیٰ کا وقت مشین چلنے کا ہے اس میں فراغت نہیں ہوتی۔ حضرت والا سے توجہاتِ عالیہ کی استدعا ہے۔

الجواب:

(۱) ذکر کیے جایئے ذوق شوق کے پیدا ہونے کی فکر نہ کیجئے۔ توجہ کے لیے حدیث ''تعبد اللّٰہ کانک تراہ'' کے مضمون کو پیش رکھئے۔
(۲) رات دن کے چوبیس گھنٹے میں معینہ ذکر کی تعداد کو پورا کر لیا کیجئے۔
(۳) ضحیٰ کا وقت ارتفاع شمس سے زوال تک ہے۔ محدثین کے نزدیک ضحیٰ اور اشراق ایک چیز ہے اور جو نوافل مشین سے پہلے پڑھے جائیں گے وہ ضحیٰ ہی ہیں۔ فقط والسلام
''مشین کا مطلب یہ ہے کہ یہ ناکارہ بذل المجہود کی طباعت کے سلسلہ میں تھانہ بھون اور دہلی آتا جاتا رہتا تھا اور تین چار دن بسا اوقات وہاں قیام رہتا تھا یہ خط تھانہ بھون کی حاضری کے موقع کا بظاہر ہے۔''

وصیت نامہ سہانپوری رحمہ اللہ تعالیٰ

(۱۶) حضرت قدس سرہ کی عادت شریفہ اکثر یہ رہی کہ بیماری کے زمانے میں وصیت نامہ تحریر فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سہارنپور میں طبیعت بہت ناساز رہی۔ ایک ہفتہ تک باہر بھی تشریف نہ لا سکے۔ یہ سیہ کار ہر نماز کے وقت نماز پڑھانے کے لیے مکان پر جایا کرتا تھا۔ حالت کچھ مایوسی کی ہو چکی تھی۔ اس وقت میں حضرت قدس سرہٗ نے یہ وصیت نامہ مجھ سے ہی تحریر کرایا تھا۔

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

حامد او مصلیا و مسلما. هذه وصية من المدبر عن الدنيا المقبل الى الأخرة خليل احمد وفقه اللّٰه للتز و دلغد املیها علیٰ حسب ماقال رسول الله ﷺ ما حق امری مسلم يبيت ليلتين وله شئى يوصى فيه الا و وصية مكتوبة عنده أو كما قال رواه البخارى و غيره من ارباب الصحاح فاوصي بامور أحدها أن أدفن عند قبر استاذى مولانا محمد مظهر النانوتوى رحمه اللّٰه بعدالاستيذان

من أصحاب المقبرة و ملاكها و ان يحفر الحصة الاولىٰ من القبر علىٰ قدر نصف قامة الانسان الىٰ السرة و هي أدنى مرتبة الحفرأو إلى الصدر و هي أعلاها و يحفرون الحصة الثانية منها التى تسمى بالشق و يجعل عمقها علىٰ قدر ذراع او قريباً من ذلك بحيث تنفصل اللبنات أو القصب عن الجسد ويكتفى علىٰ هذا علىٰ خلاف ماهو معمول في السهار نفور فانهم يحفرون الحصة الاولىٰ من القبر علىٰ قد رالشبرين أو قريباً و يحفرون الحصةالثانية التى تسمى بالشق و يعمقونها كثيرا و هي خلاف السنة ثانيها ليس على فيما احفظ من الدين و ثالثها ان مالى على الناس من الديون فتفصيله ان مائة روبية علىٰ مولوى انوار احمد ورقعة مكتوبة موجودة و خمس عشرة روبية على العزيز محمد صالح وعدة ربابى على العزيز لطيف احمد ابن اخى رشيد احمد و هي من دين مولوى فيض احسن على لطيف احمد و يعلم هو مقدارها و مكتوب عنده. خمس و عشرون روبية علىٰ مولوى اسحٰق البريلوى واما الودائع والا مانات فالعدد الكثير منه عند الحافظ الحاج محمد اسمٰعيل و حافظ محمد عثمان و ما أتذكر تعداد ها و هي عند هما محفوظة مكتوبة فاما الرقوم التى عند الحافظ محمد اسمٰعيل و محمد عثمان ففيها خمس مائة روبية لزوجتى والدة ام هانئ و هي ملكها ليس لى فيها حق حصل لها من تركة ام هانئ المرحومة بنتها و ما بقي من الرقوم فاوصى فيه إلاأن يعطى منه الف روبية بنت بنتي عطية و اربعمائة لبنت "اخى فاطمة بنت مولوى نذير احمد المرحوم و ما بقي منها فيقسم على حسب امر الشريعة بين مستحقى التركة و أوصى ايضا ان لا تكشف زوجتى والدة ام هانئ عما أغلقت عليت بابها فانما في البيت حوائج البيت أو ماكان عندها من الحلي و الثياب والظروف والسرر فكلها لها تتصرف فيها كيف تشاء و تعطى من تشاء الاأن المنا سب لها أن تعطى بعضٰ الظروف والسرروغير ذلك من الحوائج عطيه و امها و أماما كان لى من الثياب والحوائج المختصة فكلها تدخل فى المدرسة غير الساعةالكبيرة وواحدة من الساعة الصغير تختاز ها فتكون عندها فى البيت و أوصى من الرقوم المذكورة أن تكون منها بعدى مأتى روبية عند زوجتى لتكون للصرف على احبابى الواردين بعد ى للتعزية وغير ها نعم بقى لى من الدين بان لى على

اولاد حافظ احمد جان الف و أربعمائة روبية و قدصار القضاء بها من الحكومة فالورثة لو شاؤا ان يسعوا في و صولها فعلوا. فقط

جمادی الاخری سنہ ۴۰ھ

ایک ضروری تنبیہ:

(۱۷) (ایک ضروری تنبیہ) بڑی فحش غلطی آپ بیتی نمبر۳ صفحہ ۲۳۶ پر حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کے پاکستان سے واپسی کے سلسلہ میں یہ لفظ لکھا گیا کہ اگر میرا وہاں انتقال ہو جائے تو میری نعش کو روکا نہ جائے۔ اصل ارشاد حضرت کا یہ تھا کہ مجھے روکا نہ جائے یہ ارشاد تو تقریباً ہر سفر میں ہوتا تھا۔ اس لیے کہ اہلِ پاکستان کی ہمیشہ یہ عادت تھی کہ وہ یہاں سے تو بہت وعدے مواعید صرف ایک ماہ دو ماہ کے کر کے لے جاتے تھے اور وہاں جانے کے بعد مختلف جہات سے اتنا زور حضرت قدس سرہٗ پر ڈالتے تھے کہ واپسی مشکل ہو جاتی تھی اور کئی کئی ماہ لگ جاتے تھے بار بار تشریف آوری میں ناسخ ومنسوخ بھی ہوتا تھا اس سے ہر وہ شخص واقف ہے جو حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ کسی سفر میں رہ چکا ہو، یا وہاں کے قیام میں حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ ان دوستوں کی محبت کی کشاکشی دیکھی ہو، وہاں جانے کے بعد لاہور لائل پور کی کشاکشی مستقل مرحلہ ہوتا تھا اس میں بہت وقت لگتا۔ اس لیے حضرت کو ہر مرتبہ روانگی کے وقت اس کے عہد ومواثیق لینے پڑتے کہ مجھے روکا نہ جائے۔ آخری مرتبہ حضرت نے بہت زائد مواثیق لیے اور حضرت حافظ عبدالعزیز کو واپسی کا ذمہ دار بنایا۔ اس وقت تو ہر شخص کے ذہن میں حسب معمول زندگی میں واپس لانے کا مطلب تھا۔ لیکن وصال کے بعد عام طور سے زبانوں پر نعش کی واپسی کا لفظ چل پڑا۔ اسی مغالطے کی بناء پر آپ بیتی نمبر۳ میں املا کی غلطی یا کاتب کے سہو کی وجہ سے یہ لکھا گیا کہ ''اگر میرا انتقال ہو جائے تو میری نعش کو نہ روکا جائے۔'' یہ فحش غلطی ہے بلکہ ارشاد عالی یہ تھا کہ میری واپسی میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے، جو احباب حضرت قدس سرہٗ کے ارشادات سنتے رہتے تھے ان کا بیان تو یہ ہے کہ حضرت اپنے وجود کو نعش فرمایا کرتے تھے کہ اس نعش کو کہاں کہاں اٹھائے پھرتے ہو، بہت سوں نے سنا ہوگا۔ میں نے بھی بار ہا یہ لفظ سنا۔ لہٰذا آپ بیتی میں جہاں جہاں لفظ نعش ہو اس کی اصلاح کر لی جائے جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ صفحہ ۹۹ پر بھی یہی لفظ ہے اس کے علاوہ جہاں ملے ضرور تصحیح کریں، ان دونوں مواقع کی تصحیح تو میں نے طبع ثانی کے لیے پلیٹوں پر کرنے کو کہہ دیا ہے، لیکن جن کے پاس طبع سابق کے نسخے پہنچ گئے ہوں وہ اس کی اصلاح کر لیں کہ یہ غلطی ہے۔

ایک اہم مضمون متعلق خلفاء:

(۱۸) ایک نہایت اہم مضمون جو دس بارہ سال سے یہ ناپاک ہر رمضان میں کئی کئی مرتبہ اور بغیر رمضان کے بھی اپنے خصوصی احباب سے کہتا رہا اور کہتا رہتا ہے اور مفصل ومختصر تقریریں کرتا رہتا ہے وہ یہ کہ بیعت کی اجازت دراصل بمنزلہ مدارس کی سند کے ہے، جو تعلیم کی تکمیل یا اہلیت کی سند ہوتی ہے اس کے بعد اگر کوئی شخص علم سے فراغ کے بعد پڑھنے پڑھانے کے مشغلہ میں مشغول رہے تو علوم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اگر پڑھنے پڑھانے کے سلسلہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے سلسلہ میں مثلاً زراعت، تجارت وغیرہ میں لگ جائے تو علم سے مناسبت جاتی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت اقدس حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ کو اپنی سالانہ وصیت بسلسلہ خلفاء میں یہ لکھنا پڑتا تھا کہ فلاں صاحب دوسرے مشغلہ میں لگ گئے ہیں اور اس مشغلہ کو چھوڑ دیا۔ اس لیے ان کا نام خارج کرتا ہوں، چنانچہ انفاس عیسیٰ ص ۱۴۳ میں حضرت حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے۔ ''اجازت شیخ دلیل کمال نہیں بلکہ دلیل مناسبت ہے۔''

(حال):

از تحریر مجازیت خود شرم می آید خود بخود خیال کمال می آید

(تحقیق):

ایں اعتقاد کمال نیست کہ مضر باشد وسوسہ است کہ مضر نیست در چنیں اوقات استحضار عیوب کنند و بدل آرند کہ اجازت دلیل کمال نیست بلکہ دلیل مناسبت است۔ چنانچہ دستار فضیلت بعد فراغ کتب می بندند اگرچہ عالم کامل نہ باشد صرف مناسبت مدار ایں رسم باشد کمال بفراسخ دور است اھ، ایک دوسرے مقام پر انفاس عیسیٰ میں حضرت حکیم الامت کا ارشاد ہے کہ جیسے علوم درسیہ میں سند فراغ دی جاتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ابھی اسی وقت کو ان علوم میں کمال کا درجہ حاصل ہو گیا۔ بلکہ محض اس ظن غالب پر سند دی جاتی ہے کہ اس کو ان علوم سے ایسی مناسبت پیدا ہوگئی ہے کہ اگر وہ برابر درس ومطالعہ میں مشغول ہے تو قوی امید ہے کہ رفتہ رفتہ اس کو کمال کا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا، پھر اگر وہ اپنی غفلت اور ناقدری سے خود ہی مناسبت اور استعداد کو ضائع کردے تو اس کا الزام سند دینے والوں پر ہرگز نہیں بلکہ خود اسی پر ہے۔ اسی طرح جو کسی کو اجازت دی جاتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ فی الحال ہی اس کو ان اوصاف میں کمال کا درجہ حاصل ہو گیا ہے، بلکہ محض اس ظن غالب پر اجازت دی جاتی ہے کہ اس کو فی الحال تو ان اوصاف میں درجہ ضرور یہ حاصل ہو گیا اور اگر وہ برابر اس کی تکمیل کی فکر اور کوشش میں رہا تو قوی امید ہے کہ رفتہ رفتہ

اس کو آئندہ ان اوصاف میں کمال کا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا ارشاد تو یہاں تک ہے کہ مشائخ بسا اوقات نا اہل کو بھی اجازت دے دیتے ہیں۔ چنانچہ انفاس عیسیٰ میں لکھا ہے کہ "مشائخ بعض دفعہ کسی نا اہل میں شرم وحیا کا مادہ دیکھ کر اس اُمید پر اس کو مجاز کر دیتے ہیں کہ جب وہ دوسروں کی تربیت کرے گا تو اس کی لاج وشرم سے اپنی بھی اصلاح کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک دن کامل ہو جائے گا۔" اسی طرح دوسرا ارشاد ہے "بعض دفعہ غیر کامل کو مشائخ اجازت دیتے ہیں کہ شاید کسی طالب مخلص کی برکت سے اس کی بھی اصلاح ہو جائے۔ کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی پیر نا اہل ہے اور اس کا مرید کوئی مخلص ہے تو طالب صادق کو تو حق تعالیٰ اس کے صدق وخلوص کی برکت سے نواز ہی دیتے ہیں، جب وہ کامل ہو جاتا ہے تو پھر حق تعالیٰ پیر کو بھی کامل کر دیتے ہیں کیونکہ یہ اس کی تکمیل کا ذریعہ بنا تھا۔"

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے نا اہل کی اجازت کے متعلق جو ارشاد فرمایا ہے وہ بہت دقیق ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسباب بالا کی بناء پر ہر نا اہل کو اجازت دی جا سکتی ہے۔ بلکہ مشائخ کے حالات میں اس قسم کی چیزیں پائی گئیں ہیں کہ بعض اوقات کسی مرید کی وجہ سے شیخ کی ترقی ہوئی اور خوب ہوئی اس کے واقعات تو متعدد مشہور ہیں۔ ایک ڈاکو تھا وہ اپنی ضعف و پیری میں شیخ بن گیا اور لوگوں کو بیعت بھی کرنا شروع کر دیا۔ اللہ کے یہاں تو اخلاص کی قدر ہے۔ یہ تو طے شدہ اور اصول موضوعہ ہے طالبین کو ان کے اخلاص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نوازا اور خوب نوازا۔ ایک مرتبہ ان طالبین کی جماعت نے شیخ سے عرض کیا کہ ہم لوگوں نے مشائخ کے مقامات کو دیکھنا شروع کیا اور سب اکابر کے مقامات معلوم ہو گئے۔ مگر حضرت کا مقام اتنا عالی ہے کہ ہم سب مل کر بھی اس کو نہیں پہچان سکے۔ اللہ تعالیٰ کے نام میں برکت تو ہوتی ہی ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا یہ مقولہ کہیں لکھوا چکا ہوں کہ اللہ کا نام چاہے کتنی ہی غفلت سے لیا جائے اثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ اس مصنوعی پیر پر بھی اللہ کے نام کا آخر اثر ہو کر رہا۔ وہ مریدوں کی یہ بات سُن کر رو دیا اور اس نے پھر اپنی حقیقت بیان کی اور مریدوں سے درخواست کی کہ اب تم میری مدد کرو۔ ان سب نے مل کر توجہ کی تو اللہ نے اس پیر کو بھی نواز دیا۔ اللہ والوں کی توجہ رنگ لائے بغیر نہیں رہتی۔ اصل چیز اخلاص ہے۔ جس کی وجہ سے پیر کا نا اہل ہونا بھی مرید کے اخلاص کی بدولت اس کو مضر نہیں ہوتا۔

چنانچہ میں نے اپنے والد صاحب سے ایک قصہ سنا تھا کہ ایک ڈاکو تھا۔ جب تک شباب وقوت رہی خوب ڈاکے مارے لیکن جب ضعف وپیری لاحق ہوئی اور اعضاء نے جواب دے دیا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ اب کیا پیشہ اختیار کیا جائے۔ ساتھیوں نے بتلایا کہ پیری

مریدی ایک ایسا پیشہ ہے جس میں بے محنت مشقت خوب مزے اُڑتے ہیں۔ قصہ تو طویل ہے اور شاید میں اسے اور اس قسم کے بعض اور قصے اپنے رسائل میں لکھ بھی چکا ہوں۔ اس مصنوعی پیر کی لغویات کے ساتھ ساتھ ایک سچا طالب اس کے پاس پہنچا۔ یہ اپنے لغویات میں مشغول تھا۔ مگر اس کی طلب اور صدق نیت نے پیر کی خرافات کی طرف توجہ بھی نہ ہونے دی۔ اس نے جا کر بہت ادب سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ میں آپ سے اللہ کا راستہ سیکھنے آیا ہوں، وہ چونکہ غلطی سے ناوقت پہنچ گیا تھا اس لیے وہ اس کے بے وقت آنے پر بہت ناراض ہوا اور کہا کہ اللہ کا راستہ یوں نہیں آتا۔ یہ کہہ کر اس کو ایک پھاوڑا دیا اور کہا کہ فلاں باغ میں اس کی گولوں کو صاف کرو۔ اس کی ڈولیں بناؤ اور نالیاں درست کرو۔

وہ اسی وقت پھاوڑا لے کر تحقیق کرتا ہوا اس باغ میں پہنچا اور اس کی مرمت شروع کر دی باغ والے مزاحم ہوئے کہ تو ہمارے باغ میں کیوں دخل دیتا ہے اس نے بہت منت خوشامد کر کے کہا کہ مجھے تمہارے باغ سے کچھ لینا نہیں ہے مجھے میرے پیر نے اس باغ کے صاف کرنے کو اور مرمت کرنے کو کہا ہے۔ اول اول تو وہ لوگ بہت ڈرتے رہے اس کو مارا پیٹا بھی۔ مگر یہ دیکھ کر یہ نہ کھانے کو مانگتا ہے نہ اور کچھ جو کچھ روکھی سوکھی ہوتی ہے وہ کھالیتا ہے۔ تین مہینے اسی حال میں گزر گئے۔

مشہور یہ ہے کہ ابدال میں سے جب کسی کا انتقال ہوتا ہے تو غوث وقت کی مجلس میں اس کا بدل منتخب ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی ابدال کا انتقال ہوا اور غوث کی مجلس میں انتخاب کے لیے ابدال حضرات نے اپنی اپنی رائے سے لوگوں کے نام بتلائے حضرت غوث نے سب کے نام سن کر یہ کہا کہ ایک نام ہمارے ذہن میں بھی ہے اگر تم پسند کرو۔ سب نے عرض کیا ضرور ارشاد فرمائیں۔ حضرت نے فرمایا کہ فلاں فلاں مالی بڑا مخلص ہے سچی طلب رکھتا ہے۔ بہت اخلاص سے مجاہدہ میں مشغول ہے۔ سب نے اس رائے کو بہت پسند کیا۔ پھر سب نے مع حضرت غوث اس پر توجہ ڈالی۔ جس کی وجہ سے اسی وقت اس پر انکشافات ہوئے اور طی الارض کرتا ہوا اور پھاوڑا باغ والوں کے یہ کہہ کر حوالہ کر دیا کہ یہ فلاں پیر صاحب کا ہے جو فلاں گاؤں میں رہتے ہیں اور میں جا رہا ہوں ہر چندان لوگوں نے خوشامد منت سماجت کی کہ ذرا اپنا حال تو بتلا دے مگر اس نے کچھ نہیں بتلایا اور کہا سنا معاف کرا کر وہیں سے غائب ہو گیا۔

یہی مطلب ہے اس مشہور مقولہ کا کہ ''پیرمن خس است اعتقادمن بس است۔'' اللہ تعالیٰ کے یہاں اخلاص کی قدر ہے۔ خود اس سیہ کار کو میرے حضرت مرشدی قدس سرہٗ نے میرے ایک عریضہ کے جواب میں لکھا تھا کہ میری کوئی حقیقت نہیں میری مثال نل کی سی ہے جتنی طلب ہوگی اتنا ہی مبدا فیاض سے عطاء ہوگا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ آئے گا نل ہی کے ذریعہ، یہ مضمون لطیف

بھی ہے اور دقیق بھی بعض لوگوں کو مشائخ حقہ کے بعض خلفاء پر بھی اشکال ہوتا ہے کہ اس کو کیوں اجازت مل گئی۔ مشائخ حقہ کے خلفاء پر اعتراض نہ کرنا چاہیے کہ یہ درحقیقت مشائخ حقہ ہی پر اعتراض ہے۔ ہمیں اور تمہیں کیا معلوم مشائخ نے کس باریک بینی اور دوراندیشی سے اس کو اجازت دی ہے۔ تم زائد سے زائد یہ تو کر سکتے ہو کہ اگر تم کو ان سے اعتقاد نہیں تو مرید نہ ہونا۔ نیز اس کے ساتھ یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ مشائخ کے یہاں اجازت کے بھی مختلف طرق ہوتے ہیں۔

شیخ الطائفہ قطب الاقطاب شیخ المشائخ حضرت الحاج امداد اللہ صاحب کا ارشاد ہے کہ میرے خلفاء دو قسم کے ہیں ایک وہ جن کو میں نے از خود بلا یا درخواست اجازت دی ہے وہی اصل خلفاء ہیں۔ دوسرے وہ جنہوں نے درخواست کی کہ اللہ کا نام بتلا دوں؟ میں نے کہا بتلا دیا کرو، یہ اجازت پہلے درجہ کی نہیں ہے۔ اھ ہمارے حضرت مولانا الحاج الشاہ عبدالقادر صاحب کے یہاں بھی یہ دونوں طریقے رائج تھے کہ بعض کو بیعت کی اجازت دے دیا کرتے تھے اور بعض کو یہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا نام بتلا دیا کرو۔

میرے سامنے ایک واقعہ پیش آیا میں اس وقت حضرت کی خدمت میں حاضر تھا ایک جگہ کے چند معزز حضرات تشریف لائے ان میں سے ایک صاحب کے متعلق انہیں کے ساتھیوں نے پوچھا کہ یہ حضرت کے خلیفہ ہیں۔ حضرت قدس سرہٗ نے صفائی سے ارشاد فرمایا کہ نہیں، میں نے اجازت نہیں دی۔ ان صاحب نے کہا کہ حضرت نے یہ ارشاد فرمایا کہ کوئی اللہ کا نام پوچھے تو بتلا دینا حضرت نے فرمایا کہ یہ خلافت یا اجازت ہوئی؟ اور حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تو باقاعدہ مجازین کے دو طبقے تھے۔ ایک مجازین بالبیعت دوسرے مجاز بالصحبۃ مضمون تو یہ بہت طویل ہے اور شاید میرے دوستوں کے پاس اس قسم کے مضامین جو میں نے مختلف مجالس میں کہے ہیں، کچھ اضافہ کے ساتھ لکھے ہوئے بھی ہوں۔ بہر حال مقصود یہ تھا کہ اجازت کا نہ تو گھمنڈ ہونا چاہیے نہ اس کو دلیل کمال یا دلیل تکمیل سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اجازت کے بعد تو محنت و مشقت میں اور اضافہ ہونا چاہیے۔ حضرت قطب الارشاد گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کو اعلیٰ حضرت نے بیعت کرنے کے آٹھویں روز خلافت و اجازت عطاء فرما دی تھی اور فرمایا تھا کہ میاں مولوی رشید احمد جو نعمت حق تعالیٰ نے مجھے دی تھی وہ آپ کو دے دی آئندہ اس کو بڑھانا آپ کا کام ہے۔ حضرت قطب العالم قدس سرہٗ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں اس وقت بہت ہی متعجب ہوا کہ حضرت کیا فرماتے ہیں وہ کون سی چیز ہے جو اعلیٰ حضرت کو حق تعالیٰ نے دی تھی اور مجھے عطاء ہوئی۔ آخر پندرہ برس کے بعد معلوم ہوا کہ کیا تھا۔ (تذکرۃ الرشید جلد اول)

تذکرۃ الرشید یہ میں لکھا ہے کہ بیعت کے وقت حضرت قدس سرہٗ نے اعلیٰ حضرت حاجی صاحب سے عرض کیا کہ مجھ سے ذکر وشغل اور محنت ومجاہدہ کچھ نہیں ہوسکتا۔ اعلیٰ حضرت نے تبسم کے ساتھ فرمایا ''اچھا کیا مضائقہ ہے۔'' اس تذکرہ پر کسی خادم نے دریافت کیا کہ حضرت پھر کیا ہوا؟ آپ نے جواب دیا اور عجیب ہی جواب دیا کہ ''پھر تو مرمٹا'' فقط حضرت نے بالکل صحیح فرمایا شیخ المشائخ ہونے کے بعد آخر زمانے تک سنا ہے کہ ذکر بالجہر نہیں چھوڑا۔ میں نے اپنے اکابر میں مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو شدید بیماری سے کچھ پہلے تک اور حضرت شیخ الاسلام اور اپنے چچا جان کو دیکھا کہ بہت اہتمام سے ذکر بالجہر کرتے رہے اور مشائخ سلوک کا تو یہ مقولہ مشہور ہے کہ ''جس چیز کی برکت سے یہاں پہنچے اب اس کو چھوڑتے ہوئے شرم آتی ہے''۔ بہر حال خلافت واجازت نہ تو کسی عُجب اور بڑائی کا سبب ہونا چاہیے اور نہ اس کے بعد تساہل یا تغافل ہونا چاہیے کہ اس سے یہ دولت جاتی رہتی ہے۔ اکابر کے یہاں اجازت کے بارے میں مَیں نے اپنے مشائخ کو دو طریقوں پر پایا ہے۔ بعض اکابر کے یہاں تسہیل پائی جیسے کہ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے یہاں اور حضرت حکیم الامت کے کلام میں بھی گزر چکی ہے اور بعض حضرات کے یہاں تشدد تھا۔ چنانچہ حضرت قطب الارشاد گنگوہی قدس سرہٗ کے یہاں، حضرت کے بعض خدام نے عرض کیا کہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ نے بیعت کی اجازت فرمادی۔ لیکن حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ میرے یہاں تو ابھی کچھ کام کرنا پڑے گا۔ حضرت گنگوہی کے خلفاء میں بھی حضرت سہارنپوری وحضرت شیخ الہند کے یہاں بہت تشدد تھا۔ حضرت شیخ الاسلام مدنی قدس سرہٗ کے یہاں اولاً گو تشدد تھا، لیکن پھر آخر میں تسہیل پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ اس ناکارہ کے ذہن میں یہ ہے کہ صوفیہ کے یہاں نسبت کے چار درجے ہیں، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

سلوک کی نسبت چار قسمیں:

لیکن نسبت کی حقیقت کے متعلق حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک ارشاد عام فہم ہے۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''نسبت کے لغوی معنی ہیں لگاؤ وتعلق کے اور اصطلاحی معنی ہیں بندہ کا حق تعالیٰ سے خاص تعلق، اطاعت دائمہ وذکر غالب اور حق تعالیٰ کا بندہ سے خاص قسم کا تعلق یعنی قبول و رضا۔ جیسا عاشق مطیع اور وقار معشوق میں ہوتا ہے اور صاحب نسبت ہونے کی یہ علامت تحریر فرمائی کہ اس شخص کی صحبت میں رغبت ''الی الآخرہ'' اور ''نفرۃ عن الدنیا'' کا اثر ہو اور اس کی طرف دینداروں کی زیادہ توجہ ہو اور دنیاداروں کی کم۔ مگر یہ پہچان خصوصاً اس کا جزء اول عوام میں مجوبین

کو کم ہوتی ہے اہلِ طریق کو زیادہ جب نسبت کے معنی معلوم ہو گئے تو ظاہر ہو گیا کہ فاسق و کافر صاحب نسبت نہیں ہوسکتا۔ بعض لوگ غلطی سے نسبت کے معنی خاص کیفیات کو (جو ثمرہ ہوتا ہے ریاضت و مجاہدہ کا) سمجھتے ہیں۔ یہ کیفیت ہر مرتاض میں ہوسکتی ہے۔ مگر یہ اصطلاح جہلاء کی ہے۔ فقط (انفاس عیسیٰ) اس سے معلوم ہوا کہ نسبت ایک خاص نوع کے تعلق کا نام ہے اور جس قدر تعلق قوی ہوگا اسی قدر نسبت بھی قوی ہوگی۔ عمومی نسبت تو ہر مسلمان کو اللہ جل شانہ سے ہے، لیکن یہ نسبت خاص قسم کی محبت اور خصوصی تعلق کا ثمرہ ہوتا ہے اور جیسا کہ محبت کے مراتب اور عشق کے درجات ہوتے ہیں ایسے ہی اس نسبت کے درجات بھی نہایت متفاوت اور کم و بیش ہوتے رہتے ہیں اس کا منتہیٰ تو دریائے عشق میں ڈوب جانا ہے۔

عبث ہے جستجو بحر محبت کے کنارے کی
بس اس میں ڈوب ہی جانا ہے اے دل پار ہوجانا

لیکن شیخ المشائخ حضرت اقدس شاہ عبدالعزیز صاحب نے تفسیر عزیزی میں نسبت کی چار قسمیں فرمائی ہیں۔ جو سمجھنے کے اعتبار سے اور ایک دوسرے کو ممیز کرنے کے واسطے بہت مفید ہیں۔ حضرت قدس سرہٗ کا ارشاد تو فارسی میں ہے اور اس مضمون کو یہ ناکارہ لامع الدراری کے حاشیہ پر عربی میں لکھ چکا ہے۔ حضرت قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ صوفیاء کی اصطلاح میں نسبت کی چار قسمیں ہیں۔

اول نسبت انعکاس:

سب سے ابتدائی تو انعکاسی کہلاتی ہے یعنی ذکر و شغل کی کثرت سے دل کا زنگ دور کرنے کے بعد اس میں آئینہ کی طرح سے ایسی صفائی اور شفافی پیدا ہو جائے کہ اس میں ہر چیز کا عکس آئینہ کی طرح ظاہر ہو جاتا ہو۔ یہ شخص جب شیخ کی خدمت میں جاتا ہے تو شیخ کے قلبی انوار اور اثرات کا عکس اس کے قلب پر پڑتا ہے اس کو نسبت انعکاسی کہتے ہیں۔ اس کا اثر سالک کے قلب پر اس وقت تک رہتا ہے جب تک شیخ کے پاس رہے یا اس ماحول میں رہے۔ لیکن جب شیخ کی مجلس یا وہ ماحول ختم ہو جاتا ہے تو یہ اثر بھی ختم ہو جاتا ہے۔ بندہ کے خیال میں اس کی مثال فوٹو کی سی ہے کہ اس میں ہر وہ چیز منعکس ہو جاتی ہے جو اس کے سامنے ہو اور جب اس کو ہٹا لیا جائے تو وہ ختم ہو جاتی ہے لیکن فوٹو کی طرح سے اس کو مصالحہ وغیرہ کے ذریعہ سے پختہ کرایا جائے تو وہ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ اس نسبت پر بھی بعض مشائخ اجازت دے دیتے ہیں جس کے متعلق حضرت تھانوی کے کلام سے اوپر گزر چکا ہے کہ اگر مجاہدہ و ریاضت سے اس کو باقی رکھا جائے تو باقی رہتا ہے بلکہ مزید پختہ

ہو جاتا ہے بندہ کے خیال میں یہی وہ درجہ ہے جس کو حضرت تھانوی نے بایں مضمون لکھا ہے کہ ''بعض مرتبہ غیر کامل کو بھی مجاز بنا دیا جاتا ہے۔ اس کو جو ناقص یا نااہل کہا گیا ہے وہ کمال کے اعتبار سے ہے اس درجہ کی اجازت جس کو حاصل ہوتی ہے اس کو بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ یہ باقی رہے بلکہ ترقی کر سکے۔

دوسری نسبت القائی:

دوسرا درجہ جس کو حضرت شاہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے وہ نسبت القائیہ جس کی مثال حضرت نے لکھی ہے کہ کوئی شخص چراغ لے کر اس میں تیل اور بتی ڈال کر شیخ کے پاس لے جائے اور اس کے عشق کی آگ سے لو لگائے۔ حضرت نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ درجہ پہلے سے زیادہ قوی ہے اور اس درجہ والے کے واسطے شیخ کی مجلس میں رہنے کی شرط نہیں بلکہ شیخ کی مجلس سے غائب بھی ہو جائے تو یہ نسبت باقی رہتی ہے اور جب تک تیل اور بتی رہے گی یعنی اوراد و اشغال کا اہتمام رہے گا کہ یہی چیزیں اس مشعل ہدایت کی تیل اور بتیاں ہیں اس وقت تک یہ نسبت باقی رہے گی۔ اس نسبت کے لیے تیل بتی تو اذکار و اشغال ہیں اور بادِ مخالف یعنی معاصی وغیرہ سے حفاظت بھی ضروری ہے۔ کہ بادِ مخالف سے چراغ گل ہو جایا کرتا ہے۔ یہاں ایک باریک نکتہ یہ ہے کہ جس درجہ کی تیل بتی میں قوت ہوگی اتنے ہی درجہ کی مخالف ہوا کو برداشت کر سکے گی۔ یعنی اگر معمولی سا چراغ ہے تو ہوا کے ذرا سے جھونکے سے بجھ جائے گا گویا ذرا سی معصیت سے ختم ہو جائے گا۔ لیکن اگر چراغ قوی ہے تو معمولی ہوا اس کو گل نہیں سکتی۔ بندہ کے خیال میں اس جگہ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ہر شخص کو اپنی حفاظت تو نہایت اہتمام سے کرنی چاہیے۔ مبادا کسی معصیت کے سرزد ہونے سے یہ بجھ جائے، لیکن اگر کسی دوسرے صاحب نسبت کے متعلق کسی واقعی یا غیر واقعی معصیت کی خبر سُنی تو ہرگز اس کی فکر میں نہ رہے، نہ اس کے شیخ پر اعتراض کی فکر کرے، نہ معلوم اس کی مشعل کس قدر تیز ہو، بندہ کے خیال میں میرے اکابر کی اکثر اجازتیں اسی نسبت القائی پر ہیں۔ چنانچہ بہت سے اکابر اور ان کے مجازین کے حالات میں یہ دیکھنے اور سننے میں آیا ہے کہ جب ان کو اجازت دی گئی تو ایک بجلی سی ان میں کوند گئی، جس کے اثرات مختلف ظاہر ہوئے۔ بندہ کے خیال میں یہ بجلی کی سی جو کیفیت کوندتی ہے، یہ شیخ کی نسبت کا القا ہوتا ہے، جس کے بہت سے مظاہر دیکھے اور سنے ہیں یہ نسبت پہلی نسبت کے بمقابل زیادہ قوی ہوتی ہے۔ لیکن دو چیزوں کی اس میں بہت ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تیل بتی کے بقا اور اس کے اہتمام کی یعنی اوراد و اشغال کی دوسرے بادِ صرصر سے حفاظت کی اگرچہ معمولی سی ہوا اس کو ضائع نہیں کرتی، لیکن معمولی ہوا بھی ایک دم تیز ہو جاتی ہے اور معمولی معصیت بھی ایک دم کبیرہ بن جاتی ہے۔

تیسری نسبت اصلاحی:

تیسرا درجہ جو حضرت شیخ المشائخ نے لکھا ہے وہ نسبت اصلاحی کا ہے۔ حضرت نے لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے کہ یہ نسبت دونوں سے بہت قوی ہے۔ حضرت نے اس کی مثال لکھی ہے کہ ایک شخص نہر کھودے اور اس کو خوبصورت بنائے اور اس کی ڈولیں درست کرے اور اس کو کھود کر اس کا دہانہ کسی دریا سے ملا دے۔ اس دریا سے پانی کا دھارا زور شور سے اس نہر میں آجائے کہ معمولی عارض بھی پتے ٹہنیاں معمولی اینٹ روڑے اس کے پانی سے سیل کو نہیں روک سکتے بلکہ اس کے ساتھ بہتے چلے جائیں گے، الا یہ کہ کوئی نقب اس نہر میں لگ جائے یا کوئی چٹان اس نہر میں آ کر حائل ہو جائے۔ بندہ کا خیال ہے کہ قدماء کی اجازتیں زیادہ تر اسی پر ہوتی تھیں کہ وہ اولاً تزکیہ نفوس واخلاق پر بہت زور لگاتے تھے اور جب نفس مزکی ہو جاتا تھا اس کے بعد اوراد واذکار کی تلقین کے بعد اجازت مرحمت فرمایا کرتے تھے۔ اکابر کے مجاہدات اور تزکیہ کے قصے اگر لکھے جائیں تو بڑا دفتر چاہیے اور وہ آپ بیتی بھی نہیں ہے۔ صرف مثال کے لیے شاہ ابوسعید صاحب گنگوہی قدس سرہٗ جو مشائخ چشتیہ کے مشاہیر مشائخ میں سے ہیں۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہٗ کے پوتے ہیں، جن کا مزار شریف گنگوہ شریف میں موجود ہے کا واقعہ مختصر طور پر لکھواتا ہوں۔ واقعہ تو جیسا اکابر سے سنا اور کتب تواریخ میں پڑھا بھی زیادہ طویل ہے، لیکن ارواح ثلثہ میں اس کو حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی روایت سے مختصر نقل کیا ہے، اس کو بعینہ نقل کراتا ہوں۔

ایک روز فرمایا کہ شاہ ابوسعید گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ بغرض بیعت شاہ نظام الدین بلخی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں بلخ تشریف لے گئے۔ شاہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ کو اطلاع ہوئی کہ صاحبزادہ تشریف لاتے ہیں تو ایک منزل پر آکر استقبال کیا اور بہت اعزاز واکرام کے ساتھ لے کر بلخ پہنچے وہاں پہنچ کر صاحبزادہ صاحب کی خوب خاطریں کیں۔ ہر روز نئے نئے اور لذیذ سے لذیذ کھانے پکوا کر کھلائے، ان کو مسند پر بٹھاتے خود خادموں کی جگہ بیٹھتے۔ آخر شاہ ابوسعید نے اجازت چاہی کہ وطن واپس ہوں تو شاہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے اشرفیاں بطور نذر پیش کیں، اس وقت شاہ ابوسعید نے عرض کیا کہ حضرت اس دنیوی دولت کی مجھے ضرورت نہیں ہے نہ اس کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔ مجھے تو وہ دولت چاہیے جو آپ ہمارے یہاں سے لے کر آئے ہیں۔

بس اتنا سننا تھا کہ شاہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ آنکھ بدل گئے اور جھڑک کر فرمایا کہ جاؤ طویلہ میں جا کر بیٹھو اور کتوں کے دانہ راتب کی فکر رکھو۔ غرض یہ طویلہ میں آئے، شکاری کتے ان کی تحویل

میں دے دیئے گئے کہ روز نہلائیں دھلائیں اور صاف ستھرا رکھیں، کبھی حمام جھکوایا جاتا اور کبھی شکار کے وقت شیخ گھوڑے پر سوار ہوتے اور یہ کتوں کی زنجیر تھام کر ہمراہ چلتے۔ آدمی سے کہہ دیا گیا کہ یہ شخص جو طویلہ میں رہتا ہے اس کو دو روٹیاں جو کی دونوں وقت گھر سے لا کر دیا کرو۔ اب شاہ ابوسعید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جب کبھی حاضر خدمت ہوتے تو شیخ نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھتے، چماروں کی طرح دور بیٹھنے کا حکم فرماتے اور التفات بھی نہ فرماتے تھے کہ کون آیا اور کہاں بیٹھا۔ تین چار ماہ بعد ایک روز حضرت شیخ نے بھنگن کو حکم دیا کہ آج طویلہ کی لید جمع کر کے لے جائے تو اس دیوانے کے پاس سے گزرے جو طویلہ میں بیٹھا رہتا ہے۔ چنانچہ شیخ کے ارشاد کے بموجب بھنگن نے ایسا ہی کیا۔ پاس سے گزری کہ کچھ نجاست شاہ ابوسعید پر پڑی۔ شاہ ابوسعید کا چہرہ غصہ سے لال ہوگیا۔ تیوری چڑھا کر بولے، "نہ ہوا گنگوہ ورنہ اچھی طرح مزا چکھاتا۔" غیر ملک ہے شیخ کے گھر کی بھنگن ہے اس لیے کچھ نہیں کر سکتا"۔

بھنگن نے قصہ حضرت شیخ سے عرض کر دیا۔ حضرت نے فرمایا، ہاں ابھی بو ہے صاحبزادگی کی۔ پھر دو ماہ تک خبر نہ لی۔ اس کے بعد بھنگن کو حکم ہوا کہ آج پھر ویسا ہی کر، بلکہ قصداً کچھ غلاظت شاہ ابوسعید پر ڈال کر جواب سنے کہ کیا ملتا ہے۔ چنانچہ بھنگن نے پھر ارشاد کی تعمیل کی۔ اس مرتبہ شاہ ابو سعید نے کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکالا، ہاں تیز اور ترچھی نگاہ سے اس کو دیکھا اور گردن جھکا کر خاموش ہو رہے۔ بھنگن نے آ کر حضرت شیخ سے عرض کیا کہ آج تو میاں کچھ بولے نہیں، تیز نظروں سے دیکھ کر چپ ہو رہے۔ حضرت شیخ نے فرمایا، ابھی بُو باقی ہے۔ پھر دو چار ماہ کے بعد بھنگن کو حکم دیا کہ "اس مرتبہ لید گوبر کا بھرا ٹوکرا سر پر پھینک ہی دینا کہ پاؤں تک بھر جائیں۔" چنانچہ بھنگن نے ایسا ہی کیا۔ مگر اب شاہ ابوسعید بن چکے تھے جو کچھ بننا تھا۔ اس لیے گھبرا گئے اور گڑگڑا کر کہنے لگے، "مجھ سے ٹھوکر کھا کر بیچاری گر گئی کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟" یہ فرما کر گری ہوئی لید جلدی جلدی اُٹھا کر ٹوکرہ میں ڈالنی شروع کی کہ لا میں بھر دوں۔"

بھنگن نے قصہ حضرت شیخ سے آ کر کہا کہ آج تو میاں جی غصہ کی جگہ اُلٹے مجھ پر ترس کھانے لگے اور لید بھر کر میرے ٹوکرے میں ڈال دی، شیخ نے فرمایا، "بس اب کام ہوگیا" اسی دن شیخ نے خادم کی زبانی کہلا بھیجا کہ آج شکار کو چلیں گے۔ کتوں کو تیار کر کے ہمراہ ہونا۔ شام کو شیخ گھوڑے پر سوار خدام کا مجمع جنگل کی طرف چلے۔ شاہ ابوسعید کتوں کی زنجیر تھامے پا بہ رکاب ہمراہ ہولیے۔ کتے تھے زبردست شکاری کھاتے پیتے توانا اور ابوسعید بے چارے سوکھے بدن کمزور، اس لیے کتے ان سے سنبھالے سنبھلتے نہ تھے۔ بہتیرا کھینچتے روکتے مگر وہ قابو سے باہر ہوئے جاتے تھے۔ آخر انہوں نے زنجیر اپنی کمر سے باندھ لی، شکار جو نظر پڑا تو کتے اس پر لپکے۔ اب شاہ ابوسعید بے

چارے گر گئے اور زمین پر گھسٹتے کتوں کے کھنچے کھنچے چلے جاتے تھے۔ کہیں اینٹ لگی کہیں کنکر چبھی، بدن سارا لہولہان ہوگیا۔ مگر انہوں نے اُف نہ کی۔ جب دوسرے خادم نے کتوں کو روکا اور ان کو اُٹھایا تو یہ تھر تھر کانپے کہ حضرت خفا ہوں گے اور فرمائیں گے حکم کی تعمیل نہ کی، کتوں کو روکا کیوں نہیں؟ شیخ کو تو امتحان منظور تھا سو ہولیا۔

اسی شب شیخ نے اپنے مرشد قطب العالم شیخ عبدالقدوس کو خواب میں دیکھا کہ رنج کے ساتھ فرماتے ہیں، ''نظام الدین میں نے تجھ سے اتنی کڑی محنت نہ لی تھی جتنی تو نے میری اولاد سے لی۔'' صبح ہوتے ہی شاہ نظام الدین نے شاہ ابوسعید رحمہما اللہ کو طویلہ سے بلا کر چھاتی سے لگایا اور فرمایا کہ خاندانِ چشتیہ کا فیضان میں ہندوستان سے لے کر آیا تھا۔ تم ہی ہو جو میرے پاس سے اس فیضان کو ہندوستان لیے جاتے ہو۔ مبارک ہو وطن جاؤ۔ غرض مجازِ حقیقت بنا کر ہندوستان واپس فرمایا۔

ارشاد الملوک میں لکھا ہے کہ جب مرید توبہ کے مقام کو صحیح کر چکے اور ورع و تقویٰ کے مقام میں قدم مضبوط جما کر زہد کے مقام میں قدم رکھے اور اپنے نفس کو ریاضت و مجاہدات سے ادب دے چکے تو اس کو خرقہ پہننا جائز ہو جاتا ہے فقط۔ اسی وجہ سے وہ حضرات اپنے خلفاء کو اجازت دینے کے بعد مختلف اقالیم میں منتقل کر دیا کرتے تھے اور وہاں کی اصلاح ان کے سپرد کر دیا کرتے تھے۔ ایسے درجہ کے لوگوں کو مشائخ کی خدمت میں کثرت سے حاضری کی ضرورت نہیں رہتی۔ مگر حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تحریر فرمایا ہے کہ ''شیخ کے ہوتے ہوئے اس سے استغناء بعد تکمیل بھی نہ چاہیے۔ کیونکہ گو مجاز ہو جانے کے بعد شیخ سے سلسلۂ استفادہ جاری رکھنا درجہ ضرورت میں نہ رہے، لیکن ترقیات کے لیے تو پھر بھی اس کی حاجت رہتی ہے بلکہ اکثر احوال میں یہ افادہ درجۂ ضرورت میں بھی رہتا ہے۔ لہٰذا شیخ حق سے استغناء کسی حال میں بھی نہ چاہیے اور جنہوں نے اپنے کو مستقل سمجھ لیا ان کی حالت ہی متغیر ہوگئی۔ اھ (انفاس عیسیٰ)

مطلب یہ ہے کہ ضرورت استفادہ دوسری چیز ہے اور استغناء دوسری چیز ہے یعنی اپنے کو شیخ سے مستغنی اور اپنے کو مستقل سمجھے تو یہ یقیناً مضر ہے، بلکہ بعض اوقات کمال کے بعد بھی کبھی کبھی احتیاج پیش آجاتی ہے۔ اسی بنا پر میں نے اپنے حضرت قدس سرہٗ نور اللہ مرقدہٗ کو بارہا کہتے ہوئے سنا اور بعض خطوط میں خود ہی اس ناکارہ سے لکھوایا کہ میرے بعد اگر کہیں مشورہ کی نوبت آجائے تو فلاں فلاں سے کرتے رہیں۔ البتہ یہاں ایک نہایت اہم بات قابلِ لحاظ یہ ہے کہ شیخ سے یا جن لوگوں کا شیخ نے نام بتایا ہے یا جو شیخ کے مسلک پر ہوں اور دلالۃ حال سے ان سے رجوع و مشورہ شیخ سے رجوع و مشورہ کے خلاف نہ ہو ایسے لوگوں کی طرف رجوع کیا جائے اور مشورہ لیا جائے

اور جن کا مسلک شیخ کے مسلک کے خلاف ہو اندازہ سے یہ معلوم ہو جائے کہ شیخ ان سے رجوع یا مشورہ کو پسند نہ کریں گے تو ان سے رجوع نہ کرنا چاہیے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی انفاس عیسیٰ میں تحریر فرمایا ہے کہ شیخ کے ماسوا دوسرے شیخ کی خدمت میں دو شرط سے جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کا مذاق شیخ کے مذاق کے خلاف نہ ہو، دوسرے یہ کہ اس سے تعلیم وتربیت میں سوال نہ کرے فقط اور عوام کے لیے اس سے بھی زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ شیخ کی زندگی میں سلوک اور احوال کے متعلق کسی دوسرے سے رجوع نہ کرے۔ بجز اس کے کہ خود شیخ سے قولاً یا دلالۃً ان سے رجوع کرنے کی اجازت ہو اور بعض جاہل جو اس فن سے بالکل ہی نابلد ہیں اور بالکل ہی احمق ہیں وہ یہ ظلم کرتے ہیں، جس کا آج کل بہت زور ہو رہا ہے کہ بیک وقت کئی کئی مشائخ سے بیعت ہو جاتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں وہیں بیعت ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اس زمانہ میں مشائخ کو بھی اس پر تنبیہ کر دینی چاہیے کہ جو شخص اہلِ حق میں سے کسی ایسے شخص سے مرید ہو کہ وہ ابھی حیات ہے تو دوسرے سے بیعت نہ ہو۔ اس مرتبہ میں حضرت شاہ صاحب نے جو تحریر فرمایا ہے کہ معمولی عارض پتے ٹہنیاں معمولی اینٹ روڑے اس کے پانی کے سیل کو نہیں روک سکتے، بندہ کے خیال میں اس سے مراد حیوانی تقاصیر ہیں۔ شیطانی تقاصیر بہت سخت ہیں، وہ بمنزلہ چٹان کے ہیں۔ جس کو میں اپنے رسالے، اسٹرائک میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں اور اسی درجہ میں شیخ کی ناراضی اور اس کا تکدر بھی داخل ہے۔ میں رسالہ اسٹرائک میں یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ ہمارے سلسلہ کا مدار عقیدت اور محبت پر ہے یعنی شیخ کی طرف سے محبت اور مرید کی طرف سے عقیدت ہو۔ مشائخ سلوک کا مشہور مقولہ ہے کہ شیخ کی معمولی ناراضی اتنی مضر نہیں ہوتی جتنی مرید کی طرف سے عقیدت میں کوتاہی مضر ہے۔ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ قدس سرہٗ نے انفاس عیسیٰ میں تحریر فرمایا ہے کہ طریق باطن میں اعتراض اس قدر برا ہے کہ بعض اوقات کبائر سے برکات منقطع نہیں ہوتے، مگر اعتراض سے فوراً منقطع ہو جاتے ہیں، اس طریق میں یا تو کامل اتباع کرے ورنہ علیحدگی اختیار کرے:

از خدا خواہیم توفیق ادب ادب محروم گشت از فضل رب
بے ادب تنہا نہ خود را وشت بد بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

دوسری جگہ پر تحریر فرماتے ہیں کہ شیخ کے ساتھ گستاخی سے پیش آنے والا برکات باطنی سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ شیخ کے ساتھ جو نسبت ہوتی ہے کیا وہ بھی قطع ہو جاتی ہے، فرمایا کہ ہاں! شیخ کے ساتھ جو نسبت ہوتی ہے وہ بھی قطع ہو جاتی ہے۔ گستاخی بڑی خطرناک چیز ہے گو معصیت نہیں ہے مگر خاص اثر اس کا معصیت سے بھی زیادہ ہے اس طریق میں سب

کوتاہیوں کا تحمل ہو جاتا ہے، مگر اعتراض اور گستاخ کا نہیں ہوتا:

ہرکہ گستاخی کند اندرطریق گردد اندروادی حسرت غریق

ہر کہ بیباکی کند در راہ و دوست رہزن مرداں شد و نامرداوست

اس نسبت والے اکابر مشائخ سے اگر کوئی لغزش عوام کی نگاہ میں محسوس ہو تو اس پر اعتراض ہرگز نہ کریں، کیا بعید ہے کہ اس لغزش کو ان کی نسبت کا سیلاب بہائے لیے چلا جائے اور تم اس کی عیب جوئی اور لغزشوں پر نگاہ کر کے اپنے کو ہلاکت میں ڈال دو۔ چنانچہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے تو ایک اہم وصیت فرمائی ہے جو ابوداؤد شریف میں بہت تفصیل سے ہے۔ اس میں ارشاد فرماتے ہیں کہ حکیم سے بھی بعض باتیں گمراہی کی نکل جاتی ہیں اور منافق بھی بعض مرتبہ کلمۃ الحق کہہ دیتا ہے۔ شاگرد نے عرض کیا اللہ آپ پر رحم کرے ہمیں کس طرح معلوم ہو کہ یہ حکیم کی بات گمراہی کی ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ حکیم کی ایسی باتوں سے اجتناب کرو جس کو لوگ (علماءِ حق) یوں کہیں کہ فلاں نے یہ بات کیسے کہہ دی۔ لیکن یہ بات تجھ کو اس حکیم سے دُور نہ کر دے۔ کیا بعید ہے کہ وہ حکیم تو عنقریب اپنی بات سے رجوع کر لے (یا اپنے فعل سے توبہ کر لے) اور تو ہمیشہ کے لیے اس سے محروم ہو جائے، مطلب یہ کہ علماء حقہ کی غلط بات میں پیروی تو نہ کی جائے اور نہ ہی ان کے اس قسم کے قول و فعل کا اتباع کیا جائے لیکن ان پر سب وشتم نہ کیا جائے۔ اس میں بڑے مضرات ہیں جن کو یہ ناکارہ اپنے رسالہ الاعتدال میں بہت تفصیل سے لکھ چکا ہے۔

ایک اہم اور ضروری وصیت:

یہاں نہایت ہی اہم اور نہایت ہی ضروری امر یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اس نسبت والے اکابر کے کسی نامناسب فعل میں اتباع ہرگز نہ کیا جائے اگرچہ یہ مضمون اُوپر بھی آچکا ہے مگر اہتمام کی وجہ سے میں دوبارہ لکھتا ہوں۔ مثلاً نسبت القائی والے ان حضرات کی کسی لغزش میں یہ سمجھ کر اتباع کریں کہ یہ امر فلاں حضرت نے بھی کیا ہے یا کہا ہے تو ان کے لیے سخت مضر ہے۔ اس لیے پہلے لکھا جا چکا ہے کہ نسبت القائی والوں کے لیے ذرا سا مانع بھی ان کی نسبت کے زوال کا سبب ہوتا ہے اور اس کی نسبت والے حضرات کی لغزشیں سیلاب میں بہہ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا راتوں کے چپکے چپکے رونا صرف کفارہ بلکہ بسا اوقات ''فاولئک یبدل اللہ سیاتھم حسنات'' کا مصداق بن جاتا ہے اور نسبت القائی والا ان کی حرص کر کے اپنے کو نیچے گرا دے گا اور جب نسبت القائی والے کا یہ حال ہے تو انعکاسی والے کا تو پوچھنا ہی کیا۔ یہ بہت ہی اہم اور

قابلِ لحاظ بات ہے۔ میں بسا اوقات بعض مبتدیوں کو بعض منتہیوں کی لغزشوں میں حرص کر کے اپنی جگہ سے بہت دُور گرتے ہوئے دیکھ چکا ہوں، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

حضرت شاہ صاحب نے نسبت کی چوتھی قسم اتحادی بتائی ہے۔ جو سب سے اعلیٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ اپنی نسبت روحانیہ کو جو حامل کمالات عالیہ ہے۔ مرید کی رُوح کے ساتھ قوت سے متصل کر دے اور اپنی نسبت کو قوت کے ساتھ دبوچ کر یا اور کسی طرح سے مرید کے قلب میں پیوست کر دے اور گویا شیخ و مرید میں روحانی اعتبار سے کوئی فرق نہ رہے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

چوتھی نسبت اتحادی:

حضرت شاہ صاحب نے اس چوتھی نسبت کی مثال میں ایک عجیب قصہ حضرت خواجہ باقی اللہ کا جو حضرت مجدد الف ثانی کے شیخ تھے ان کا مزار مقدس دہلی میں ہے، ان کے متعلق لکھا ہے، ان حضرات کو کوئی شخص ہدایا دے تو بعض اوقات بڑی گرانی سے محض ہدیہ دینے والے کی دلداری کی بنا پر قبول کرتے ہیں، لیکن جو ہدیہ غایت احتیاج کے وقت آئے اس کو بہت ہی قدر سے قبول کرتے ہیں۔ اس وقت کی دعاء بہت دل سے نکلتی ہے۔ ایسے وقت کی دعاؤں میں معطی کے لیے یہ حضرات جو کچھ مانگتے ہیں اللہ اپنے فضل سے عطاء فرما دیتے ہیں۔ ایسے وقت کی دعائیں ہر وقت نہیں ہوتیں۔ لیکن جب ہوتی ہیں تو تیر بہدف ہوتی ہیں اور بہت جلد پوری ہوتی ہیں۔ ایسی ہی دعاؤں کو دیکھ کر بعض لوگوں کو مشائخ کے متعلق یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ حضرت کی زبان سے جو نکلتا ہے وہ پورا ہو جاتا ہے حالانکہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اہم وقت ان حضرات کے یہاں وہ ہوتا ہے جب ان کے ہاں کوئی مہمان اللہ والا آ جائے اور پاس کچھ نہ ہو اس وقت کا ہدیہ ان کے یہاں بہت قیمتی ہوتا ہے، یہ میں پہلے اکابر کے حالات میں لکھوا چکا ہوں کہ جب میرے اکابر میں سے کوئی ایک دوسرے کے یہاں مہمان ہوتا تو میزبان کی یہ خواہش ہوتی کہ جو خاطر ہو سکے کر دوں۔

بہر حال اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ صاحب کے یہاں کچھ مہمان اہم آ گئے، ایک بھٹیارے کی دکان حضرت کی قیام گاہ کے قریب تھی، اس بھٹیارے نے دیکھا کہ کچھ نیک قسم کے مہمان بے وقت آئے ہیں۔ اس نے بہت بڑا خوان لگا کر اور اس میں مختلف قسم کے کھانے رکھ کر حضرت خواجہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت خواجہ صاحب

نے پوچھا یہ کیا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ حضرت کے یہاں کچھ مہمان آئے ہیں، میں ان کے لیے کچھ لایا ہوں قبول فرمالیں۔ حضرت کو بہت ہی مسرت ہوئی اور وہی بے اختیاری شان کے ساتھ فرمایا "مانگ کیا مانگتا ہے"۔ اس نے عرض کیا کہ مجھے اپنے جیسا بنادو۔

حضرت نے تھوڑی دیر تامل کر کے فرمایا کہ کچھ اور مانگ لے، طباخ نے کہا کہ بس یہی چاہیے۔ چونکہ حضرت زبانِ مبارک سے یہ فرما چکے تھے کہ مانگ کیا مانگتا ہے اس لیے اس کے تین مرتبہ کے اصرار پر اس کے حجرۂ مبارکہ میں لے گئے، اندر سے زنجیر لگالی۔ اس کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرح سے کہ انہوں نے نزول وحی کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تین مرتبہ دبوچا تھا اور ہر مرتبہ یہ فرمایا تھا کہ پڑھو، دو مرتبہ کے دبوچنے میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا کہ میں قاری نہیں اور تیسری دفعہ میں دبا کر جو حضرت جبرئیل نے بتایا وہ پڑھنا شروع کر دیا۔ یا حضرت خواجہ صاحب نے کوئی اور توجہ فرمائی ہوگی آدھ گھنٹہ بعد جب حجرہ کھول کر باہر تشریف لائے تو دونوں کی صورت تک بھی ایک ہوگئی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ حضرت خواجہ صاحب تو جیسے حجرہ میں گئے تھے ویسے ہی باہر تشریف لے آئے۔ لیکن وہ طباخ سُکر (بے خودی) کی حالت میں تھا اور کچھ دیر بعد اسی حالت میں انتقال ہوگیا اللہ بلند درجے عطاء فرمائے۔ موت تو آنی ہی تھی اور اس کا جو وقت مقرر تھا اس میں تقدم و تاخر نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن اس کی خوش قسمتی کہ ساری عمر تو طباخی کی اور موت کے وقت خواجہ جیسا بن کر آخرت کے بھی مزے لوٹے۔

شاہ غلام بھیک کا واقعہ:

اسی نوع کا ایک قصہ حضرت شاہ غلام بھیک نور اللہ مرقدہٗ کا مشہور ہے کہ وہ اپنے شیخ شاہ ابوالمعالی قدس سرہٗ کے عاشق تھے اور جب حضرت شیخ سفر میں جاتے تو یہ بھی ہمرکاب ہوتے۔ ایک مرتبہ حضرت شیخ قدس سرہٗ سہارنپور خدام کے اصرار پر تشریف لائے اور شاہ غلام بھیک بھی ہمرکاب تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ شیخ کے یہاں آج کل فاقوں پر فاقے چل رہے ہیں۔ اس لیے حضرت شیخ قدس سرہٗ کی جہاں دعوت ہوتی شاہ غلام بھیک دعوت کرنے والے سے یہ طے کر لیتے کہ دو آدمیوں کا مزید کھانا دینا پڑے گا اور روزانہ عشاء کی نماز کے ساتھ حضرت کو لٹا کر دو نفر کا کھانا لے کر پاپیادہ انبہٹہ جو سہارنپور سے ۱۶ میل ہے تشریف لے جاتے اور اہلیہ کو کھانا دے کر فوراً واپس آتے اور تہجد کے وقت حضرت کی خدمت میں آجاتے۔ چند روز بعد حضرت انبہٹہ پہنچے تو اہلیہ سے پوچھا کہ کس طرح گزری تو ان کو اس سوال پر بڑا تعجب ہوا۔ انہوں نے عرض کیا کہ اس مرتبہ تو آپ روزانہ کھانا بھیجا کرتے تھے پھر گزر کا سوال کیسا اور بیان کیا کہ دو گھڑی رات گزرنے پر شاہ بھیک

روزانہ کھانا دے جایا کرتے تھے۔ شیخ یہ سن کر خاموش ہوگئے اور باہر آکر شاہ بھیک سے پوچھا تو انہوں نے صورت حال عرض کردی اور کہا کہ اماں جی اور صاحبزادی صاحبہ تو فاقہ کرتے اور بھیک اپنا پیٹ بھرتا، اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا، شیخ کو اس جواب پر مسرت ہوئی اور یہ فرمایا کہ تو نے میرے توکل میں تو ضرور فرق ڈالا مگر خدمت کا حق ادا کردیا اور اپنی چھاتی سے لگا لیا اور روحانی نعمت جو کچھ دینی تھی وہ عطاء فرمادی۔ شاہ بھیک نے اپنے قلب کو نورِ معرفت سے معمور دیکھا تو شیخ کے قدم چوم لیے اور مستانہ وار شوق میں یہ دوہا زبان سے نکلا:

بھیکا مالی پرواریاں پل میں سو سو بار
کاگا سے ہنس کیا اور کرت نہ لاگی بار

یعنی بھیک (اپنے مرشد) ابوالمعالی پر ہر آن سو سو دفعہ قربان ہو کہ انہوں نے اس کو زاغ سے ہنس بنا دیا۔ (یعنی ناکارہ و نااہل سے اہل بنا دیا اور ایسی جلدی بنایا کہ دیر بھی نہ لگی) ادھر سینہ سے سینہ لگا اور ادھر ولایت و معرفت الٰہیہ نصیب ہوگئی۔ اس قصہ میں دعوت میں شرط کرنے میں کوئی اشکال نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعوت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی بھی شرط فرمائی تھی۔ (تذکرۃ الخلیل جدید صفحہ ۲۹)

حضرت جبرائیل کا حضور کو دبوچنا:

سینہ سے سینہ ملا کر سب کچھ ملنے کے واقعات مشائخ کے کثرت سے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی رائے مبارک یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء وحی کے وقت تین مرتبہ دبوچنا نسبت اتحادیہ پیدا کرنے کے لیے ہے اور جس مقدس ہستی کی ابتداء ترقی حضرت جبرئیل سے اتحاد کے ساتھ شروع ہوئی ہو اس نے ۲۳ سالہ زندگی میں کہاں تک ترقی کی ہوگی اس کو تو اللہ ہی جانے یا وہ جانے جس نے یہ مراتب حاصل کیے۔ لیکن اتنا ضرور ہر آدمی بھی جانتا ہے کہ جس نے ابتداء میں تین مرتبہ دبوچ کر ابتدا کرائی تھی، تیرہ برس بعد شب معراج میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہہ کر پیچھے رہ گئے کہ

اگر یک سرموئے برتر پرم فروغِ تجلی بسوزد پرم

کہ میری تو پرواز کی انتہا ہوچکی۔ اگر ایک بال برابر بھی آگے بڑھوں تو تجلی باری سے جل جاؤں گا اور پھر سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبرئیل علیہ السلام کو چھوڑ کر قاب قوسین تک پہنچ گئے اور پھر اس کے بعد زندگی کے دس سال تک کیا کیا ترقیاں کی ہوں گی اس کو وہی جانتے ہیں جن پر حقیقت محمدیہ کی حقیقت منکشف ہوگئی ہو۔ حضرت شاہ صاحب کا ارشاد تو اتنا ہی ہے کہ حضرت

جبرئیلؑ کے دبوچنے سے نسبت اتحادیہ حاصل ہوئی لیکن اس سیہ کار کا خیال یہ ہے کہ یہ سلوک تفصیلی تھا۔ غارِ حرا میں چھ ماہ تک انقطاع عن الدنیا و توجہ الی اللہ کے ساتھ قلب اطہر میں وہ صفائی اور نور تو پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا جو نسبت انعکاسی کا محل ہوتا ہے اور حضرت جبرئیل علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی صورت دیکھ کر صفاتِ ملوکیت کا انعکاس تو شروع ہی ہو گیا تھا اور پہلی مرتبہ دبوچنے میں نسبت القائی اور دوسری مرتبہ میں نسبت اصلاحی اور تیسری مرتبہ میں نسبت اتحادی پیدا ہو کر وہ صفات ملوکیت جس کا انعکاس ابتداء وہلہ میں حاصل ہوا تھا وہ تیسری مرتبہ دبوچنے میں طبیعت ثانیہ بن گیا اور جس کی ابتداء میں فرشتوں کے خصائل بلکہ سیّد الملائکہ جبرئیلؑ کے خصائل طبیعت ثانیہ بن گئے ہوں اس کے ۲۳ سالہ مجاہدات اور تعلق مع اللہ میں کتنی ترقیات ہوئی ہوں گی۔ اگر اس کی کوئی مثال کہی جاسکتی ہے تو بس یہی ہے کہ:

میان عاشق و معشوق رمزیست کراماً کاتبیں راہم خبر نیست

میں نے اپنے اکابر کے بعض خدام میں بھی اس نسبت اتحاد کی جھلک پائی کہ گفتگو میں، طرز کلام میں، رفتار میں، کھانے پینے کی اداؤں میں اپنے شیخ کی بہت ہی مناسبت تھی۔ مگر خود نابلد ہوں، نابالغ بلوغ کی لذتوں سے کب واقف ہوتا ہے۔ میری مثال اس شعر کی سی ہے:

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ماہ مبارک قریب آرہا ہے اور میرا کاتب آپ بیتی نمبر ۵ ختم کرنے کے واسطے مضمون مانگ رہا ہے۔ اس لیے آج ۸ شعبان ۹۱ھ کو یہ مضمون ختم کر کے کاتب کے حوالے کر رہا ہوں جو لغزشیں اس ناکارہ سے اپنی سوء فہم سوء حافظہ سے اس میں ہوئی ہوں ان کو اللہ ہی معاف فرمائے۔ دوستوں کو بہت ہی شدید اصرار بلکہ اکابر کے تقاضہ بھی اس سلسلہ کو باقی رکھنے کے ہیں کہ خالی اوقات میں کیف ما اتفق اکابر کے احوال جو بھی یاد آجایا کریں لکھوادیا کروں۔ مگر ضعف پیری اور امراض کی کثرت میں دل یہ چاہتا ہے کہ حدیث پاک کی کوئی خدمت بقیہ زندگی میں ہو جائے تو مالک کا احسان ہے۔ اس رسالہ کی ابتداء کیا تھی؟ عزیز مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح میں علی میاں کے ایک باب پر تنقید تھی۔ لیکن پھر اس کشکول میں نہ معلوم کیا کیا آگیا اور اکابر کے حالات شروع میں تو مجھے بھی نہ معلوم کیا کیا یاد آتے چلے گئے ان کا حصار بھی طاقت سے باہر ہے۔ اللہ والوں کے حالات بالخصوص میرے اکابر کے حالات کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ:

داماں نگہ تنگ و گل حُسن تو بسیار
گل چیں بہا رتو زو اماں گلہ دارد

میرے اکابر کے احوال اور ان سب گلدستوں کے مختلف پھول کو کوئی غور سے دیکھے تو تخلق باخلاق اللہ کا منظر اس گلدستہ میں خوب پائے گا بشرطیکہ اللہ نے دیدۂ عبرت عطاء فرمایا ہو:

دید لیلیٰ کے لیے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا ان کا

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْب

اللّٰھم اغفرلی ما وقع فیہ من الخطاء والزلل و ما لا ترضیٰ بہٖ من العمل فانک عفو کریم. غفو ر حلیم، رؤف الرحیم و صلی اللہ علی سیّد الاولین والآخرین سیّد الانبیاء والمرسلین صاحب المقام المحمود والحوض المورود والشفاعۃ الکبریٰ و من دنی فتدلّٰی و کان قاب قوسین أو أدنی و علیٰ الہٖ و أصحابہٖ و أتباعہٖ حملۃ الدین المتین الیٰ یوم الدین.

و اٰخر دعونا ان الحمد لِلّٰہ ربّ العالمین

۸ شعبان المکرم ۱۳۹۱ھ

......☆☆☆☆☆......

تکملہ

یہ رسالہ ماہ مبارک کے قرب کی وجہ سے اوائل شعبان میں ختم کر دیا تھا، اس ناکارہ کا معمول ماہِ مبارک میں مغرب عشاء کے درمیان مہمانوں کے کھانے سے فراغ کے بعد دوستوں سے خصوصی ملاقات کا وقت ہے۔ اس میں احباب سے خصوصی درخواستیں اہتمام سے عمل کرنے کے لیے کہتا رہتا ہوں۔ یہ نسبتوں والا مضمون بھی مختصر و مفصل ہر رمضان میں سنانے کی نوبت آتی رہتی ہے کہ ذاکرین بالخصوص جن کو اس سیہ کار نے اجازت دی ہے۔ ان کا خصوصی اجتماع ہوتا ہے۔ اس لیے خاص طور سے ان کو تنبیہ کرتا رہتا ہوں کہ اجازت سے مغرور نہ ہوں بلکہ اس کی وجہ سے ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔ جس سے بہت فکر چاہیے، اس سال چونکہ اس ناکارہ کی طبیعت زیادہ ناساز تھی، بولنا دشوار تھا۔ اس وقت کچھ بجائے زبانی کہنے کے اکابر کے مضامین سے کچھ سنواتا رہا۔ انفاس عیسیٰ کے خاتمہ پر ایک نہایت اہم عبرت آموز واقعہ ذکر کیا ہے۔ یہ واقعہ ''حیٰوۃ الحیوان دمیری'' سے مفتی محمد شفیع صاحب سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، حال ناظم دارالعلوم کراچی نے محرم ۴۳ھ میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا۔ جو انفاس عیسیٰ سے زیادہ مفصل ہے اور اس سیہ کار نے بھی اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے بارہا اس کو سنا جو دونوں سے زیادہ مفصل تھا اور نہایت ہی اہم سبق آموز عبرت انگیز ہے کہ آدمی کو بالخصوص جو کسی دینی منصب میں علمی ہو یا سلوکی یا اور کوئی دینی خدمت میں قدم رکھتا ہو اس کو اس قصہ سے زیادہ عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ بالخصوص عجب و گھمنڈ اور کسی دوسرے کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھنے سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے اور حضرت شیخ سعدی نور اللہ مرقدہٗ کے پیر و مرشد شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ کی نصیحت کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بہت ہی جامع اور اہم ہے، وہ فرماتے ہیں:

مرا پیر دانائے روشن شہاب
دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ بر خویش خود بین مباش
دگر آنکہ بر غیر بد بیں مباش

فرماتے ہیں کہ مجھے میرے روشن ضمیر شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ نے کشتی میں بیٹھے ہوئے دو نصیحتیں فرمائی تھیں۔ ایک یہ کہ اپنے اُوپر کبھی خود بینی میں مبتلا نہ ہونا۔ دوسرے یہ کہ

دوسرے کے اوپر بدبینی تحقیر نہ کرنا۔ بہت اہم نصیحت ہے۔ یہ قصہ بھی جو آگے آرہا ہے خود بینی اور بدبینی کا نہایت عبرت آموز سبق ہے۔ اس سے بہت عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ حضرت تھانوی نے تو بہت مختصر لکھا جس کی ابتداء یہ ہے کہ آدمی کو ہرگز زیبا نہیں کہ آدمی اپنی حالت پر ناز کرے اور دوسروں کو حقیر سمجھے، خود نفسِ ایمان بھی اپنے اختیار میں نہیں، بس حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ہم کو یہ دولت عطاء فرما رکھی ہے۔ لیکن وہ جب چاہیں سلب کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ابوعبداللہ ایک بزرگ تھے۔ بغداد میں ان کی وجہ سے تیس (۳۰) خانقاہیں آباد تھیں۔ وہ ایک بار مع اپنے مجمع کے چلے جا رہے تھے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اس قصہ کو ذرا زیادہ تفصیل سے لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:

شیخ اندلسی کا عبرت آموز قصہ:

ذیل کا مضمون عبرت آموز واقعہ علامہ دمیری کی ''حیٰوۃ الحیوان'' مطبوعہ مصر سے نقل کیا جاتا ہے سن ہجری کی دوسری صدی ختم پر ہے، آفتابِ نبوت غروب ہوئے ابھی زیادہ مدت نہیں گزری۔ لوگوں میں امانت دیانت اور تدین وتقویٰ کا عنصر غالب ہے۔ اسلام کے ہونہار فرزند جن کے ہاتھ پر اس کو فروغ ہونے والا ہے کچھ برسرکار ہیں اور کچھ ابھی تربیت پا رہے ہیں۔ ائمہ دین کا زمانہ ہے، ہر ایک شہر علماء دین وصلحاء متقین سے آباد نظر آتا ہے۔ خصوصاً مدینۃ الاسلام (بغداد) جو اس وقت مسلمانوں کا دارالسلطنت ہے۔ اپنی ظاہری اور باطنی آرائشوں سے آراستہ گلزار بنا ہوا ہے۔ ایک طرف اگر اس کی دلفریب عمارتیں اور ان میں گزرنے والی نہریں دل لبھانے والی ہیں تو دوسری طرف علماء اور صلحاء کی مجلسیں، درس وتدریس کے حلقے ذکر وتلاوت کی دلکش آوازیں خدائے تعالیٰ کے نیک بندوں کی دلجمعی کا ایک کافی سامان ہے۔ فقہاء ومحدثین اور عُبّاد وزہاد کا ایک عجیب وغریب مجمع ہے۔ اس مبارک مجمع میں ایک بزرگ ابوعبداللہ اندلسی کے نام سے مشہور ہیں جو اکثر اہل عراق کے پیر ومرشد اور استاذ محدث ہیں۔ آپ کے مریدین کی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ چکی ہے، جن کا ایک عبرتناک واقعہ اس وقت ہدیۂ ناظرین کرتا ہے۔

یہ بزرگ علاوہ زاہد وعابد اور عارف باللہ ہونے کے حدیث وتفسیر میں بھی ایک جلیل القدر امام ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کو تیس (۳۰) ہزار حدیثیں حفظ تھیں اور قرآن شریف کو تمام روایات قراءت کے ساتھ پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے سفر کا ارادہ کیا، تلامذہ اور مریدین کی جماعت میں سے بہت سے آدمی آپ کے ساتھ ہو لیے، جن میں حضرت جنید بغدادی اور حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ہیں۔ حضرت شبلی قدس سرہٗ کا بیان ہے کہ ہمارا قافلہ خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے

نہایت امن و امان اور آرام و اطمینان منزل بہ منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ہمارا گزر عیسائیوں کی ایک بستی پر ہوا۔ نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ لیکن پانی موجود نہ ہونے کی وجہ سے اب تک ادا نہ کر سکے تھے۔ بستی میں پہنچ کر پانی کی تلاش ہوئی۔ ہم نے بستی کا چکر لگایا۔ اس دوران میں ہم چند مندروں اور گرجا گھروں پر پہنچے جن میں آفتاب پرستوں، یہودیوں اور صلیب پرست نصرانیوں کے رہبان اور پادریوں کا مجمع تھا۔ کوئی آفتاب کو پوجتا اور کوئی آگ کو ڈنڈوت کرتا تھا اور کوئی صلیب کو اپنا قبلہ حاجات بنائے ہوئے تھا۔ ہم یہ دیکھ کر متعجب ہوئے اور ان لوگوں کی کم عقلی اور گمراہی پر حیرت کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ آخر گھومتے گھومتے بستی کے کنارے پر ہم ایک کنوئیں پر پہنچے جس پر چند نوجوان لڑکیاں پانی پلا رہی تھیں۔ اتفاق سے شیخ مرشد ابو عبداللہ اندلسی کی نظر ان میں سے ایک لڑکی پر پڑی جو خداداد حسن و جمال میں سب ہجولیوں سے ممتاز ہونے کے ساتھ زیور اور لباس سے آراستہ تھی، شیخ کی اس سے آنکھیں چار ہوتے ہی حالت دگرگوں ہونے لگی۔ چہرہ بدلنے لگا، اس انتشار طبع کی حالت میں شیخ اس کی ہجولیوں سے مخاطب ہو کر یہ کہنے لگے یہ کس کی لڑکی ہے؟

لڑکیاں: ”یہ اس بستی کے سردار کی لڑکی ہے۔“

شیخ: ”پھر اس کے باپ نے اس کو اتنا ذلیل کیوں بنا رکھا ہے، کنویں سے خود ہی پانی بھرتی ہے۔ کیا وہ اس کے لیے کوئی ماما نوکر نہیں رکھ سکتا جو اس کی خدمت کرے۔“

لڑکیاں: ”کیوں نہیں مگر اس کا باپ ایک نہایت عقیل اور فہیم آدمی ہے۔ اس کا مقصود یہ کہ لڑکی اپنے باپ کے مال و متاع حشم خدم پر غرہ ہو کر کہیں اپنے فطری اخلاق خراب نہ کر بیٹھے اور نکاح کے بعد شوہر کے یہاں جا کر اس کی خدمت میں کوئی قصور نہ کرے۔“

حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شیخ اس کے بعد سر جھکا کر بیٹھ گئے اور تین دن کامل اس پر گزر گئے کہ نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں اور نہ کسی سے کلام کرتے ہیں۔ البتہ جب نماز کا وقت آتا ہے تو نماز ادا کر لیتے ہیں۔ مریدین اور تلامذہ کی کثیر التعداد جماعت ان کے ساتھ ہے، لیکن سخت ضیق میں ہیں، کوئی تدبیر نظر نہیں آتی۔

حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تیسرے دن میں نے یہ حالت دیکھ کر پیش قدمی کی اور عرض کیا کہ ”اے شیخ! آپ کے مریدین آپ کے اس مستمر سکوت سے متعجب اور پریشان ہیں، کچھ تو فرمایئے کیا حال ہے؟“

شیخ: ”(قوم کی طرف متوجہ ہو کر) میرے عزیزو! میں اپنی حالت تم سے کب تک چھپاؤں۔ پرسوں میں نے جس لڑکی کو دیکھا ہے، اس کی محبت مجھ پر اتنی غالب آ چکی ہے کہ میرے تمام اعضاء

وجوارح پراس کا تسلط ہے۔اب کسی طرح ممکن نہیں کہ اس سرزمین کو چھوڑ دوں۔''

حضرت شبلی: اے ہمارے سردار آپ اہلِ عراق کے پیر و مرشد علم و فضل اور زہد و عبادت میں شہرۂ آفاق ہیں۔آپ کے مریدین کی تعداد بارہ ہزار سے متجاوز ہو چکی ہے، بطفیل قرآن عزیز ہمیں اور ان سب کو رسوا نہ کیجئے۔

شیخ: ''میرے عزیزو! میرا اور تمہارا نصیب، تقدیر خداوندی ہو چکی ہے، مجھ سے ولایت کا لباس سلب کر لیا گیا اور ہدایت کی علامات اُٹھالی گئیں۔'' یہ کہہ کر رونا شروع کر دیا اور کہا:

''اے میری قوم! قضاوقدر نافذ ہو چکی ہے۔اب کام میرے بس کا نہیں ہے۔''

حضرت شبلی فرماتے ہیں کہ ہمیں اس عجیب واقعہ پر سخت تعجب ہوا اور حسرت سے رونا شروع کیا شیخ بھی ہمارے ساتھ رو رہے تھے، یہاں تک کہ زمین آنسوؤں کے اُمنڈ آنے والے سیلاب سے تر ہو گئی۔اس کے بعد ہم مجبور ہو کر اپنے وطن بغداد کی طرف لوٹے۔لوگ ہمارے آنے کی خبر سُن کر شیخ کی زیارت کے لیے شہر سے باہر آئے اور شیخ کو ہمارے ساتھ نہ دیکھ کر سبب دریافت کیا۔ہم نے سارا واقعہ بیان کیا۔

واقعہ سن کر لوگوں میں کہرام مچ گیا۔شیخ کے مریدوں میں سے کثیر التعداد جماعت تو اسی غم و حسرت میں اسی وقت عالم آخرت کو سدھار گئی اور باقی لوگ گڑگڑا کر خدائے بے نیاز کی بارگاہ میں دعائیں کر رہے کہ اے مقلب القلوب! شیخ کو ہدایت کر اور پھر اپنے مرتبہ کو لوٹا دے۔اس کے بعد تمام خانقاہیں بند ہو گئیں اور ہم ایک سال تک ایسی حسرت و افسوس میں شیخ کے فراق میں لوٹتے رہے، ایک سال کے بعد جب ہم مریدوں نے ارادہ کیا کہ چل کر شیخ کی خبر لیں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں، تو ہماری جماعت نے سفر کیا اور اس گاؤں میں پہنچ کر وہاں کے لوگوں سے شیخ کا حال دریافت کیا۔

گاؤں والے: ''وہ جنگل میں سور چرا رہا ہے۔''

ہم: ''خدا کی پناہ یہ کیا ہوا؟''

گاؤں والے: ''اس نے سردار کی لڑکی سے منگنی کی تھی۔اس کے باپ نے اس شرط پر منظور کر لیا اور وہ جنگل میں سور چرانے کی خدمت پر مامور ہے۔''

ہم: ''یہ سُن کر ششدر رہ گئے اور غم سے ہمارے کلیجے پھٹنے لگے، آنکھوں سے بے ساختہ آنسوؤں کا طوفان اُمنڈنے لگا، بمشکل تمام دل تھام کر اس جنگل میں پہنچے جہاں وہ سور چرا رہے تھے۔دیکھا تو شیخ کے سر پر نصاریٰ کی ٹوپی ہے اور کمر میں زنار باندھی ہوئی ہے اور اس عصا پر ٹیک لگائے ہوئے خنزیروں کے سامنے کھڑے ہیں جس سے وعظ اور خطبے کے وقت سہارا لیا کرتے

تھے۔ جس نے ہمارے زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا۔ شیخ نے ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ کر سر جھکا لیا۔ ہم نے قریب پہنچ کر السلام علیکم کہا۔

شیخ: "(کسی قدر دبی زبان سے) وعلیکم السلام۔"

حضرت شبلی: "اے شیخ! اس علم و فضل اور حدیث و تفسیر کے ہوتے ہوئے آج تمہارا کیا حال ہے؟"

شیخ: "میرے بھائیو! میں اپنے اختیار میں نہیں ہوں۔ میرے مولا نے جیسا چاہا مجھے ویسا کردیا اور اس قدر مقرب بنانے کے بعد جب چاہا کہ مجھے اپنے دروازے سے دور پھینک دے تو پھر اس کی قضا کو کون ٹالنے والا تھا۔" اے عزیزو! خدائے بے نیاز کے قہر و غضب سے ڈرو، اپنے علم و فضل پر مغرور نہ ہو۔ اس کے بعد آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر کہا، اے میرے مولا! گمان تو تیرے بارے میں ایسا نہ تھا کہ تو مجھ کو ذلیل و خوار کر کے اپنے دروازے سے نکال دے گا۔ یہ کہہ کر اللہ تعالیٰ سے استغاثہ کرنا اور رونا شروع کر دیا۔

(میرے والد صاحب اس قصہ کو سناتے وقت یہ شعر بھی شیخ کی طرف پڑھا کرتے تھے)

بے نیازی نے تری اے کبریا
مجھ غریب و خستہ کو کیا کیا کیا؟

(غالباً یہ کسی عربی شعر کا ترجمہ کسی اردو داں شاعر نے کیا ہوگا)

اور شیخ نے آواز دے کر کہا: "اے شبلی اپنے غیر کو دیکھ کر عبرت حاصل کر۔"

(حدیث میں ہے "السعید من وعظ بغیرہ" یعنی نیک بخت وہ ہے جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے۔

حضرت شبلی رونے کی وجہ سے لکنت کرتی ہوئی آواز سے نہایت دردناک لہجے میں:

"اے ہمارے پروردگار ہم تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں اور تجھ ہی سے استغاثہ کرتے ہیں۔ ہر کام میں ہم کو تیرا ہی بھروسہ ہے، ہم سے یہ مصیبت دور کر دے کہ تیرے سوا کوئی دفعہ کرنے والا نہیں۔"

خنزیران کا رونا اور ان کی دردناک آواز سنتے ہی سب کے سب وہیں جمع ہو گئے اور زمین پر مرغ بسمل کی طرح لوٹنا، تڑپنا اور چلانا شروع کر دیا اور اس زور سے چیخے کہ ان کی آواز سے جنگل اور پہاڑ گونج اٹھے۔ یہ میدان میدانِ حشر کا نمونہ بن گیا۔ ادھر شیخ حسرت کے عالم میں زار زار رو رہے تھے۔

حضرت شبلی: ''شیخ! آپ حافظ قرآن تھے اور قرآن کو ساتوں قراءت سے پڑھا کرتے تھے، اب بھی اس کی کوئی آیت یاد ہے؟''

شیخ: ''اے عزیز مجھے قرآن میں دو آیت کے سوا کچھ یاد نہیں رہا۔''

حضرت شبلی: ''وہ دو آیتیں کون سی ہیں؟''

شیخ: ''ایک تو یہ ہے ''وَمَنْ یُّهِنِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ. اِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ'' (جس کو اللہ ذلیل کرتا ہے اس کو کوئی عزت دینے والے نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا اور دوسری یہ ہے ''وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ'' ۔(جس نے ایمان کے بدلے میں کفر اختیار کیا تحقیق وسیدھے راستہ سے گمراہ ہوگیا۔)

شبلی: ''اے شیخ! آپ کو تیس ہزار حدیثیں مع اسناد کے برزبان یاد تھیں اب ان میں سے بھی کوئی یاد ہے۔''

شیخ: ''صرف ایک حدیث یاد ہے''یعنی من بدل دینه فاقتلوه (جو شخص اپنا دین بدل ڈالے اس کو قتل کر ڈالو)

ہم یہ حال دیکھ کر بصد حسرت و یاس شیخ کو وہیں چھوڑ کر واپس ہوئے اور بغداد کا قصد کیا۔ ابھی تین منزل طے کرنے پائے تھے کہ تیسرے روز اچانک شیخ کو اپنے آگے دیکھا کہ نہر سے غسل کر کے نکل رہے ہیں اور باآواز بلند شہادتین ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' ۔پڑھتے جاتے تھے۔ اس وقت ہماری مسرت کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس کو اس سے پہلے ہماری مصیبت اور حسرت و یاس کا اندازہ ہو۔

شیخ: (قریب پہنچ کر) ''مجھے ایک پاک کپڑا دو اور کپڑا لے کر سب سے پہلے نماز کی نیت باندھی، ہم منتظر ہیں کہ شیخ نماز سے فارغ ہوں تو مفصل واقعہ سنیں تھوڑی دیر کے بعد شیخ نماز سے فارغ ہوئے اور ہماری طرف متوجہ ہو کر بیٹھ گئے۔''

ہم: ''اس خدائے قدیر وعلیم کا ہزار ہزار شکر، جس نے آپ کو ہم سے ملایا اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد پھر درست فرمادیا، مگر ذرا بیان تو فرمایئے کہ اس انکار شدید کے بعد پھر آپ کا آنا کیسے ہوا۔''

شیخ: ''میرے دوستو! جب تم مجھے چھوڑ کر واپس ہوئے میں نے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعاء کی کہ خداوندا مجھے اس جنجال سے نجات دے میں تیرا خطا کار بندہ ہوں اس سمیع الدعاء نے بایں ہمہ میری آواز سن لی اور میرے سارے گناہ محو کردیے۔''

ہم: ''شیخ! کیا آپ کے اس ابتلا (آزمائش) کا کوئی سبب تھا؟''

شیخ: ''ہاں جب ہم گاؤں میں اُترے اور بت خانوں اور گرجا گھروں پر ہمارا گزر ہوا۔ آتش پرستوں اور صلیب پرستوں کو غیر اللہ کی عبادت میں مشغول دیکھ کر میرے دل میں تکبر اور بڑائی پیدا ہوئی کہ ہم مومن موحد ہیں اور یہ کمبخت کیسے جاہل واحمق ہیں کہ بے حس و بے شعور چیزوں کی پرستش کرتے ہیں، مجھے اس وقت ایک غیبی آواز دی گئی:

''یہ ایمان وتوحید کچھ تمہارا ذاتی کمال نہیں کہ سب کچھ ہماری توفیق سے ہے۔ کیا تم اپنے ایمان کو اپنے اختیار میں سمجھتے ہو جوان کو حقیر سمجھتے ہو۔ اگر تم چاہو تو ہم تمہیں ابھی بتلا دیں۔''

اور مجھے اسی وقت یہ احساس ہوا کہ گویا کوئی جانور میرے قلب سے نکل کر اُڑ گیا ہے۔ جو درحقیقت ایمان تھا۔

حضرت شبلی: ''اس کے بعد ہمارا قافلہ نہایت خوشی اور کامیابی کے ساتھ بغداد پہنچا۔ سب مریدین شیخ کی زیارت اوران کے دوبارہ قبول اسلام سے خوشیاں منا رہے ہیں۔ خانقاہیں اور حجرے کھول دیے گئے۔ بادشاہِ وقت شیخ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا اور کچھ ہدایہ پیش کیے۔ شیخ پھر اپنے قدیم شغل میں مشغول ہو گئے اور پھر وہی حدیث وتفسیر، وعظ وتذکیر تعلیم وتربیت کا دور شروع ہو گیا۔ خداوند عالی نے شیخ کا بھولا ہوا علم پھر ان کو عطاء فرما دیا۔ بلکہ اب نسبتاً پہلے سے ہر علم وفن میں ترقی ہے۔ تلامذہ کی تعداد چالیس ہزار اور اسی حالت میں ایک مدت گزر گئی ایک روز ہم صبح کی نماز پڑھ کر شیخ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک کسی شخص نے حجرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں دروازہ پر گیا تو دیکھا کہ ایک شخص سیاہ کپڑوں میں لپٹا ہوا کھڑا ہے۔''

میں: ''آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کیا مقصود ہے؟''

آنے والا: ''اپنے شیخ سے کہہ دو کہ وہ لڑکی جس کو آپ فلاں گاؤں میں (اس گاؤں کا نام لے کر جس میں شیخ مبتلا ہوئے تھے) چھوڑ کر آئے تھے آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہے۔''

سچ ہے کہ جب کوئی خدا تعالیٰ کا ہو کر رہتا ہے تو سارا جہاں اس کا ہو جاتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے منہ موڑ لیتا ہے تو ہر چیز اس سے منہ موڑ لیتی ہے:

''چواز دگشتی ہمہ چیز از تو گشت''

میں شیخ کے پاس گیا۔ واقعہ بیان کیا۔ شیخ سنتے ہی زرد ہو گئے اور خوف سے کانپنے لگے، اس کے بعد اس کو اندر آنے کی اجازت دی۔

لڑکی دیکھتے ہی زار زار رو رہی ہے۔ شدتِ گریہ دم لینے کی اجازت نہیں دیتا کہ کچھ کلام کرے۔

شیخ: ''(لڑکی سے خطاب کر کے) تمہارا یہاں آنا کیسے ہوا؟ اور یہاں تک تمہیں کس نے پہنچایا۔''

لڑکی: ''اے میرے سردار! جب آپ ہمارے گاؤں سے رخصت ہوئے اور مجھے خبر ملی، میری بے چینی اور بے قراری جس حد کو پہنچی اس کو کچھ میرا دل ہی جانتا ہے، نہ بھوک رہی نہ پیاس، نیند تو کہاں آتی، میں رات بھر اسی اضطراب میں رہ کر صبح کے قریب ذرا لیٹ گئی اور اس وقت مجھ پر کچھ غنودگی سی غالب ہوئی، اسی غنودگی میں مَیں نے خواب میں ایک شخص کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ اگر تو مؤمنات میں داخل ہونا چاہتی ہے تو بتوں کی عبادت چھوڑ دے اور شیخ کا اتباع کر اور اپنے دین سے توبہ کر کے شیخ کے دین میں داخل ہو جا۔''

میں: ''(اسی خواب کے عالم میں اس شخص کو خطاب کر کے) شیخ کا دین کیا ہے؟''

شخص: ''اس کا دین اسلام ہے۔''

میں: ''اسلام کیا چیز ہے؟''

شخص: ''اس بات کی دل اور زبان سے گواہی دینا کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برحق رسول و پیغمبر ہیں۔''

میں: ''تو اچھا میں شیخ کے پاس کس طرح پہنچ سکتی ہوں۔''

شخص: ''ذرا آنکھیں بند کر لو اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔''

میں: ''بہت اچھا، یہ کہا اور کھڑی ہوگئی اور ہاتھ اس شخص کے ہاتھ میں دے دیا۔''

شخص: ''میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھوڑی دور چل کر بولے۔ بس آنکھیں کھول دو۔''

میں نے آنکھیں کھولیں۔ اپنے کو دجلہ (ایک نہر ہے جو بغداد کے نیچے بہتی ہے) کے کنارے پایا۔ اب میں متحیر ہوں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہوں کہ میں چند منٹوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

اس شخص نے آپ کے حجرہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ سامنے شیخ کا حجرہ ہے وہاں چلی جاؤ اور شیخ سے کہہ دو کہ آپ کا بھائی خضر (علیہ السلام) آپ کو سلام کہتا ہے۔ میں اس شخص کے ارشاد کے موافق یہاں پہنچ گئی اور اب آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں، مجھے مسلمان کر لیجیے۔ شیخ نے اس کو مسلمان کر کے اپنے پڑوس کے ایک حجرہ میں ٹھہرا دیا کہ یہاں عبادت کرتی رہو۔ لڑکی عبادت میں مشغول ہوگئی اور زہد و عبادت میں اپنے اکثر اقران سے سبقت لے گئی۔ دن بھر روزہ رکھتی ہے اور رات بھر اپنے مالک بے نیاز کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔ محبت سے بدن ڈھل گیا۔ ہڈی اور چمڑے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ آخر اسی میں مریض ہوگئی اور مرض اتنا ممتد ہوا کہ موت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور اب اس مسافر آخرت کے دل میں اس کے سوا کوئی حسرت باقی نہیں کہ ایک مرتبہ شیخ کی زیارت سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرے۔ کیونکہ جس وقت

سے اس حجرے میں مقیم ہے نہ شیخ نے اس کو دیکھا ہے اور نہ یہی شیخ کی زیارت کر سکی۔ جس سے آپ چند گھڑی کے مہمان کی حسرت ویاس کا اندازہ کر سکتے ہیں، آخر شیخ کو کہلا بھیجا کہ موت سے پہلے ایک مرتبہ میرے پاس ہو جائیں۔ شیخ یہ سن کر فوراً تشریف لائے، جاں بلب لڑکی حسرت بھری نگاہوں سے شیخ کی طرف دیکھنا چاہتی ہے مگر آنسوؤں میں ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اسے ایک نظر بھر کر دیکھنے کی مہلت نہیں دیتیں۔ آنسوؤں کا ایک تار بندھا ہوا ہے مگر ضعف سے بولنے کی اجازت نہیں۔ لیکن اس کی زبان بے زبانی یہ کہہ رہی ہے۔

دم آخر ہے ظالم دیکھ لینے دے نظر بھر کر
سدا پھر دیدۂ تر کرتے رہنا اشک فشانی

آخر لڑکھڑائی ہوئی زبان اور بیٹھی ہوئی آواز سے اتنا لفظ کہا۔ السلام علیکم۔ شیخ (شفقت آمیز آواز سے) تم گھبراؤ نہیں، انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب ہماری ملاقات جنت میں ہونے والی ہے۔ لڑکی شیخ کے ناصحانہ کلمات سے متاثر ہو کر خاموش ہو گئی اور اب یہ خاموشی ممتد ہوئی یہ مہر سکوت صبح قیامت سے پہلے نہ ٹوٹے گی۔ اس پر کچھ دیر نہیں گزری تھی مسافر آخرت نے اس دار فانی کو خیر آباد کیا۔

شیخ اس کی وفات پر آبدیدہ ہیں۔ مگر ان کی حیات بھی دنیا میں چند روز سے زائد نہیں رہی۔ حضرت شبلی کا بیان ہے کہ چند ہی روز کے بعد شیخ اس عالم فانی سے رخصت ہوئے کچھ دنوں کے بعد میں نے شیخ کو خواب میں دیکھا کہ جنت کے ایک پُر فضا باغ میں مقیم ہیں اور ستر حوروں سے آپ کا نکاح ہوا ہے جن میں پہلی وہ عورت جس کے ساتھ نکاح ہوا وہ لڑکی اور اب وہ دونوں ابدالآباد کے لیے جنت کی بیش قیمت نعمتوں میں خوش وخرم ہیں۔

"ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ"

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد انفاس عیسیٰ میں نقل کیا ہے کہ جب یہ حال ہے تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس وقت جو ہماری حالت درست ہے وہ ہمارے مستقل اختیار سے ہے۔ علاوہ اس کے یہ بھی تو سمجھنا چاہیے کہ اگر کوئی شخص بہت حسین ہو مگر وہ اپنے چہرے پر کالک مل لے تو اس کا قدرتی حسن حقیقۃً زائل نہ ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی بدشکل ہو مگر وہ پاؤڈر مل لے تو کیا وہ حسین ہو جائے گا۔ تو بعض لوگوں کا ایمان ایسا ہی ہوتا ہے جیسا پاؤڈر۔ ایسے ہی بعض لوگوں کا کفر ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کالک۔ جب ذرا ہٹا تو اصل رنگ عود کر آیا اور اس کا ہٹ جانا اپنے مستقل اختیار میں نہیں ہے یہ حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے تو پھر کیا زیبا ہے کہ آدمی اپنی حالت پر ناز کرے

اور دوسروں کو حقیر سمجھے۔ فقط یہ قصہ میں نے اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے بھی سنا تھا۔ اس میں ایک شعر جو اُوپر گزر چکا وہ فرماتے تھے کہ اس شعر کو شیخ ابو عبداللہ اندلسی کثرت سے پڑھا کرتے تھے، غالباً عربی کا کوئی شعر ہوگا جس کا اردو میں کسی نے ترجمہ کیا۔ اس کے ساتھ اس قصہ کی ابتداء میں میرے والد صاحب نے جو سنایا تھا وہ یہ تھا کہ اس زمانے کے ایک بزرگ نے غلبۂ حال میں یہ فرمایا ''قدمی علی رقبۃ کل ولی'' (ترجمہ) کہ ''میرا قدم ہر ولی کی گردن پر ہے''۔ ان اندلسی بزرگ نے جب یہ مقولہ سنا تو فرمادیا ''الالانـــــا'' وہ بزرگ نہ معلوم اس وقت کہاں تھے، انہوں نے ان کا انکار سن کر یہ فرمادیا کہ ''جس کی گردن پر میرا قدم نہیں اس کی گردن پر سور کا قدم ہے''۔ مگر یہ واقعہ مجھے اس وقت کسی جگہ نہیں ملا۔ مولانا الحاج ابو الحسن علی نے سن کر فرمایا کہ یہ واقعہ میں نے کسی کتاب میں اسی طرح دیکھا جس طرح آپ نے اپنے والد صاحب سے سنا مگر اس وقت حوالہ یاد نہیں۔

یہاں ایک ضروری بات یہ قابلِ لحاظ ہے کہ اس قسم کا واقعہ حضرت پیران پیر کا بھی ہے نور اللہ مرقدہم جس کو امداد المشتاق میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ سے نقل فرمایا ہے، فرمایا کہ ایک روز دو آدمی آپس میں بحث کرتے تھے ایک کہتا تھا کہ حضرت شیخ معین الدین چشتی رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی سے افضل ہیں اور دوسرا حضرت شاہ عبدالقادر کو شیخ پر فضیلت دیتا تھا۔ میں نے کہا کہ ہم کو نہ چاہیے کہ بزرگوں کی ایک دوسرے پر فضیلت بیان کریں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْض'' جس سے معلوم ہوا کہ واقع میں تفاضل ہے لیکن ہم دیدۂ بصارت نہیں رکھتے۔ اس واسطے مناسب شان ہماری نہیں ہے کہ محض رائے سے ایسی جرأت کریں، البتہ مرشد کو تمام اس کے معاصرین پر فضیلت باعتبار محبت کے دینا مضائقہ نہیں ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اپنے باپ کی محبت چچا سے زیادہ ہوتی ہے اور اس میں آدمی معذور ہے۔ اس نے یعنی قادری نے دلیل پیش کی کہ جس وقت حضرت شاہ عبدالقادر نے ''قدمی علیٰ رقاب اولیاء اللّٰہ'' فرمایا تو حضرت معین الدین نے فرمایا ''بل علی عینی'' یہ ثبوت افضلیت حضرت شاہ عبدالقادر کا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سے تو فضیلت حضرت معین الدین صاحب کی حضرت غوث پر ثابت ہوسکتی ہے نہ برخلاف اس کے کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالقادر اس وقت مرتبہ الوہیت یعنی عروج میں تھے اور حضرت شیخ مرتبۂ عبدیت یعنی نزول میں اور نزول کا افضل ہونا عروج سے مسلم ہے۔

(امداد المشتاق)

قدمی علیٰ رقبۃ کل ولی اور اکابر کے اس نوع کے اقوال کا صحیح محمل:

یہ قصہ شیخ اندلسی کا دوسری صدی کے ختم کا ہے اور حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ تعالیٰ کی وفات ۵۶۱ھ میں ہے۔ یعنی چھٹی صدی ہجری کا ہے۔ یہ میں نے اس لیے متنبہ کر دیا کہ ایک قصہ کا دوسرے سے خلط نہ ہو۔ اصل قصہ شیخ اندلسی کے متعلق یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ میں آپ بیتی میں کسی جگہ اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی یہ وصیت نقل کرا چکا ہوں کہ ان اللہ والوں سے بہت ڈرتے رہنا چاہیے۔ ان کی الٹی بھی سیدھی ہو جاتی ہے اور اس کلام کی شرح بھی حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ سے نقل کر چکا ہوں۔ اس لیے ان اکابر کے ایسے جملوں پر جو اُوپر نقل کیے گئے ''قدمی علی رقبة کل ولی'' یا اس نوع کے بعض دوسرے اکابر کے جملے مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے متعدد ارشادات جن میں سے بعض اوجز کے مقدمہ میں بھی نقل کر چکا ہوں، جس میں ان کی کتاب تفہیمات سے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں۔

''ومن نعم اللّٰہ علی ولا فخر ان جعلنی ناطق ھذہ الدورۃ و حکیمھا و قائد ھذہ الطبقة و زعیمھا فنطق علیٰ لسانی و نفث فی نفسی فان نطقت باذکار القوم و أشغالھم نطقت بجوا معھا الیٰ اٰخر ما بسط فیہ۔''

اس قسم کے الفاظ حضرت شاہ صاحب کے کلام میں بھی اور حضرت پیرانِ پیر اور دیگر اکابر کے کلام میں پائے جاتے ہیں، ان الفاظوں پر نا سمجھوں کو چیں بجبیں نہ ہونا چاہیے۔ اس قسم کی چیزیں اکابر کو بعض اوقات میں اکراماً اور اعزازاً وقتی طور پر عطاء ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ ارواحِ ثلاثہ میں بروایت حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھا ہے کہ ایک بزرگ خواجہ احمد جام مستجاب الدعوات مشہور تھے۔ ایک عورت ان کی خدمت میں اپنے ایک نابینا بچے کو لائی اور عرض کیا کہ اپنا ہاتھ اس کے منہ پر پھیر دیجئے اور اس کی آنکھیں اچھی کر دیجئے۔ اس وقت آپ پر شان عبدیت غالب تھی۔ اس لیے نہایت انکسار کے ساتھ فرمایا کہ میں اس قابل نہیں ہوں، اس نے اصرار کیا مگر پھر آپ نے وہی جواب دیا۔ غرض کہ تین چار مرتبہ یوں ہی ردّ و بدل ہوئی۔ جب آپ نے دیکھا کہ وہ مانتی ہی نہیں تو آپ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہتے ہوئے چل دیے کہ یہ کام تو حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تھا۔ وہ اندھوں اور مبروصوں کو اچھا کرتے تھے۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ الہام ہوا کہ تو کون، عیسیٰ کون اور موسیٰ کون؟ پیچھے لوٹ اور اس کے منہ پر ہاتھ پھیر، نہ تم اچھا کر سکتے ہو نہ عیسیٰ ''ما می کنیم'' (ہم کرتے ہیں) آپ یہ سن کر لوٹے اور ''ما می کنیم، مامی کنیم'' فرماتے جاتے تھے اور جا کر اس کے منہ پر ہاتھ پھیر دیا اور آنکھیں اچھی ہو

گئیں۔ یہ قصہ بیان فرما کر حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ احمق لوگ یوں سمجھ جایا کرتے ہیں کہ یہ "مامی کنیم" خود کہہ رہے ہیں، حالانکہ ان کا قول نہیں ہوتا بلکہ وہ حق تعالیٰ کا قول ہوتا ہے۔ جب کوئی کسی گویئے سے عمدہ شعر سنتا ہے تو اس کو اپنی زبان سے بار بار دہراتا ہے اور مزے لیتا ہے۔ اسی طرح وہ اس الہام کی لذت سے حق تعالیٰ کا ارشاد "مامی کنیم" بار بار دہراتے تھے۔

حضرت تھانوی قدس سرہٗ اس حکایت کے اندر حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ قولہ وہ حق تعالیٰ کا قول ہوتا ہے۔ اقول منصور حلاج (کے قول انا الحق) کی سب سے اچھی تاویل یہی ہے اور یہ حکایت حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ سے اس احقر نے بھی سُنی ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ مجھ کو ان بزرگ کا نام لینا یاد نہیں اور اوّل بار جو اس عورت کو جواب دیا اس کا لہجہ جوش کا یاد ہے۔ وہ یہ کہ میں عیسیٰ ہوں جو اندھوں کو اچھا کروں اور "ما می کنیم" کی جگہ "ما کنیم" یاد ہے۔

مقصد اس ساری تحریر سے یہ ہے کہ آدمی کو اپنی فکر میں ہر وقت مشغول رہنا چاہیے۔ دوسروں کی تنقید یا عیب جوئی کی فکر میں نہ پڑنا چاہیے، خاص طور سے اکابر کے جو کہ معتمد، مقتدیٰ و علماء ہوں ان کے اقوال و افعال کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے۔ خلافِ شرع میں اتباع کسی کا نہیں، لیکن ان کے اقوال و افعال کی ذمہ داری تم پر نہیں۔ مجھ سے چند سالوں سے ایک لغو سوال کثرت سے خطوط میں کیا جارہا ہے کہ فلاں حضرت نے فلاں کو کیوں اجازتِ بیعت دے دی۔ میں تو ان لغویات کا جواب اکثر یہ دیا کرتا ہوں کہ جب قبر میں منکر نکیر تم سے یہ سوال کریں گے تو تم بے تکلف کہہ دینا مجھے خبر نہیں۔ آخرت کا معاملہ بڑا سخت ہے اور عجب پندار اور دوسروں کی تحقیر تنقیص یہ نہایت خطرناک امور ہیں۔ جیسا کہ اُوپر کے سور کے قصہ سے معلوم ہوگیا۔ اللہ ہی محفوظ رکھے، ان سے بھی بہت زیادہ بچنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے دوستوں کو اس سے محفوظ رکھے۔

وَمَا تَوْفِيْقِىْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ

محمد زکریا عفی عنہٗ
۳ شوال ۱۳۹۱ھ

فن، زبان اور امتحان کی ضرورت کو پورا کرنے والی

اساس الحکمۃ

اردو شرح

ہدایۃ الحکمۃ

جسے ڈاکٹر شیر علی صاحب مدظلہم نے طلبہ کرام کے لیے "عسل مصفّی" قرار دیا

خصوصیات:

☆ دقیق عبارت کا شستہ اور عام فہم حل
☆ مغلق مقامات کی توضیح بذریعہ تمہیدات
☆ پیچیدہ مباحث کی تشریح بذریعہ نقشہ جات
ہر بحث سے متعلق خاکے (ڈایا گرام)

تقاریظ:

حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب
شیخ الحدیث دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب
استاذ حدیث دار العلوم کراچی

تالیف:
محمد طفیل قاسمی

مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ
شاہ فیصل کالونی 4 کراچی

جدید کتابت

اعلیٰ امپورٹڈ کاغذ

احاطۂ دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن

تصنیف

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

ترتیب

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

ناشر

مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ شاہ فیصل کالونی 4 کراچی

فاعتبروا یا اولی الابصار
القرآنی
آپ بیتی
سوانح
برکۃ العصر، شیخ الحدیث، قطب العالم
حضرت مولانا محمد زکریا الکاندھلوی
ثم المہاجر المدنی قدس سرہ
۲
ناشر مکتبہ عمر فاروق
4/501
شاہ فیصل کالونی کراچی

فاعتبروا یا اولی الابصار القرآن

نمبر ۶ تا ۷

سوانح

برکۃ العصر شیخ الحدیث قطب العالم

حضرت مولانا محمد زکریا الکاندھلوی

ثم المہاجر المدنی قدس سرہ

نام کتاب .... آپ بیتی جلد دوم
مؤلف .... حضرت مولانا محمد زکریا الکاندھلوی قدس سرہٗ
اشاعت دوم .... جدید تصحیح شدہ ایڈیشن
ضخامت 544
قیمت ....
ناشر .... فیاض احمد 021-4594144-8352169
موبائل 0334-3432345
مکتبہ عمر فاروق شاہ فیصل کالونی نمبر ۴، کراچی نمبر ۲۵

قارئین کی خدمت میں

کتاب ہٰذا کی تیاری میں تصحیحِ کتابت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، تاہم اگر پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو التماس ہے کہ ضرور مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں ان اغلاط کا تدارک کیا جا سکے۔

۔جزاء کم اللّٰہ تعالیٰ جزاءً جمیلاً جزیلاً۔

”آپ بیتی نمبر۶“

فصل نمبر ۳

فصل نمبر ۴

فصل نمبر ۵

فصل نمبر ۱۵

فصل نمبر ۱۶

فصل نمبر ۱۷

......☆☆☆☆☆☆......

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

نَحْمَدُهٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْم ط

اس ناکارہ کا ارادہ آپ بیتی نمبر ۵ کے بعد اس سلسلہ کو ختم کر دینے کا تھا، لیکن میرے بہت سے احباب کے خطوط کثرت سے اس مضمون کے آئے کہ ان رسائل سے بڑا نفع پہنچا اور تربیت کے لیے یہ مضامین بڑے مفید ثابت اس کے پیش نظر ناکارہ کا خیال ہوا کہ اپنے اکابر کے طرز تعلیم و تربیت اور ان کے زہد و ورع و اخلاص اور علمی انہماک کے واقعات جو اپنے بزرگوں سے سنے یا دیکھے، مختصراً لکھ دیئے جائیں کہ ان کا پڑھنا، پڑھانا یقیناً موجب برکت ہے، اس لیے اس رسالہ کو سترہ (۱۷) فصلوں پر تقسیم کر دیا گیا۔ حق تعالیٰ ان مضامین کو سب دوستوں کے لیے نافع اور موجب برکت بنائے۔ آمین

محمد زکریا کاندھلوی

آپ بیتی نمبر ۶

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

امابعد! یہ آپ بیتی کچھ اس بُری طرح ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی کہ کئی دفعہ اس کو ختم کر چکا ہوں لیکن پھر کسی نہ کسی جانب سے آ کر میرا ہاتھ دبا لیتی ہے۔ آپ بیتی نمبر ۵ کو خلفاء کے مضمون کے متعلق اور نسبت کی تحقیق پر ختم کر کے یہ طے کر لیا تھا کہ اب اس کا سلسلہ نہیں چلانا، تاکہ اس وقت میں کوئی علمی کام کیا جائے۔ گو اس وقت اپنے امراض ظاہرہ و باطنہ کی وجہ سے کسی علمی کام کا نہ رہا۔ پھر بھی دلی تمنا یہ تھی کہ جو سانس باقی ہے وہ حدیث پاک ہی کے مشغلہ میں گزر جائے، لیکن بہت سے احباب کے خطوط کثرت سے اس مضمون کے پہنچے کہ یہ رسائل بہت نافع ہیں اور تربیت میں مفید۔ بعض دوستوں کے خطوط اس مضمون کے آئے کہ ہم ان کو اپنے مدارس میں داخل درس کریں۔

متعدد جگہ طباعتوں کی خبریں تو بہت کثرت سے پہنچتی رہتی ہیں۔ وہ خطوط جو اس سلسلہ کو باقی رکھنے کے متعلق آتے رہے، ان کو تو یہ جواب لکھتا رہا یہ کوئی مقصود سلسلہ نہیں تھا، بلکہ آنکھ بنوانے کے لیے علی گڑھ کے فارغ وقت میں آنکھ بند کر کے پڑے پڑے جو متفرق قصے ذہن میں آتے رہے، وہ میرے دوست لکھتے رہے۔ یہ کوئی مقصود تالیف نہیں، لیکن شاید کہیں لکھوا چکا ہوں کہ میرے سفر حجاز کی طویل غیبت نے یہ بار بار ہوتی رہی۔ میرے بعض عزیز بچوں کو بالخصوص میرے نواسہ عزیز شاہد سلمہٗ کو کتب خانہ پر مسلط کر دیا اور وہ بعض اہم خطوط چھانٹ چکے ہیں۔ جن کے متعلق ان کا اصرار ہے کہ یہ خزینہ ضرور محفوظ ہو جائے۔ بعض خطوط کے سننے کے بعد تو میری بھی رائے ہوئی کہ ضرور محفوظ ہو جائیں۔ ورنہ بعد میں دیمک اور کیڑوں کی نذر ہوں گے، اس لیے جو کچھ یاد آیا اس کو چند فصلوں کے ذیل میں لکھوا رہا ہوں۔

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر۱:

اکابر کا طرزِ تعلیم

اس سلسلہ کی سب سے اہم چیز میرے اکابر کا طرزِ تعلیم ہے۔ اس کے متعلق جب میں خاص طور سے اپنے دوستوں کو کوئی قصہ سناتا ہوں تو ان کا اصرار ہوتا ہے کہ یہ کام ضرور محفوظ ہونا چاہیے۔ اس پر میری بھی رال ٹپک جاتی ہے، اس لیے کہ موجودہ طرزِ تعلیم سے مجھے انتہائی نفرت ہے، اس لیے کہ میرے خیال میں (اللہ مجھے معاف فرمائے) آج کل کے طرزِ تعلیم میں اخلاص کچھ کم معلوم ہوتا ہے، خدا نہ کرے بلکہ اپنا علوشان اور معاصرین اور مدرسین پر تفوق روز افزوں ہے۔

حضرت سہارنپوری موجودہ طرزِ تعلیم کے مخالف تھے

میرے اکابر بالخصوص میرے والد صاحب اور میرے حضرت قدس سرہٗ اس طرزِ تعلیم کے بہت مخالف رہے۔ جیسا کہ آپ بیتی کے مختلف مواقع میں یہ مضمون بکثرت گزر چکا ہے کہ میرے حضرت اس کے بہت شدید مخالف تھے۔ بلکہ اکابر مدرسین کو مجمع میں تنبیہ بھی فرما دیا کرتے تھے کہ مجھے ہرگز یہ پسند نہیں ہے کہ ابتداء میں تو لمبی لمبی تقریریں کی جائیں اور سال کے ختم پر اوراق گردانی کی جائے۔ میرے حضرت قدس سرہٗ کے زمانے میں کوئی کتاب نہ تو خارج از اوقاتِ مدرسہ ہوتی تھی نہ رات کو ہوتی تھی اور نہ جمعہ کو ہوتی تھی، صرف حضرت قدس سرہٗ کے اخیر زمانہ تعلیم میں جب اسفار کی کثرت ہوئی اور میرے والد صاحب قدس سرہٗ سال کے ختم پر ایک دو ماہ کے لیے گنگوہ بلائے جاتے تو وہ جمعہ کو پڑھاتے یا کچھ حصہ خارج از وقت مدرسہ پڑھاتے۔ رات کو پڑھانے کے حضرت خاص طور سے اس وجہ سے بھی مخالف تھے کہ طلبہ کو مطالعہ اور تکرار کا وقت نہیں ملتا۔ اس لیے اس پر بڑی شدت سے نکیر فرماتے اور چونکہ وہی اثر اس سیہ کار میں بھی ابتدائے تعلیم سے مرکوز ہے، اس لیے اس کا خلاف بہت ہی چبھتا ہے۔

(۱) میں آپ بیتی کے مختلف مواقع پر اپنے والد صاحب کا بھی یہ نظریہ لکھ چکا ہوں، وہ فرمایا کرتے تھے کہ موجودہ مدارس کا یہ طرز کہ مدرس تقریر کرتا رہے اور طلبہ کا کرم ہے سنیں یا نہ سنیں۔ مدرس تقریر کرتا رہے اور طلبہ اِدھر اُدھر نظری تفریح کرتے رہیں کے بہت ہی خلاف تھے۔ ان کا ارشاد تھا کہ اس حالت میں استعداد کیسے پیدا ہوسکتی ہے۔ آپ بیتی نمبر۲ پر اپنے طلب علم کے قصہ میں لکھ چکا ہوں کہ ان کا مشہور مقولہ یہ تھا کہ اُستاد کا کام چپ بیٹھنا ہے طالب علم کی غلطی پر اُوں،

ہُوں کر دینا اور زیادہ غلطی پر کتاب منہ پر پھینک کر مار دینا چاہیے، کتاب کی جلد ٹوٹ جائے، چاہے اس کی ناک۔ اگرچہ اس وعید کی نوبت میرے سامنے نہیں آئی۔ اس کو میں آپ بیتی نمبر۲ میں مفصل لکھ چکا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں فارغ التحصیل علماء کی مقداریں تو ہزاروں لاکھوں تک پہنچ رہی ہیں، لیکن جہاں کہیں سے مدرس کی طلب آتی ہے تو چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ ان کا طرز یہ تھا کہ طالب علم اتنا مطالعہ دیکھے کہ کتاب حل کر کے اُستاد کو سنا دے اور جو اشکال کرنا ہو کرے۔

موجودہ مدرسین کا یہ عذر: کہ یہ طرز پندرہ بیس طلبہ میں تو چل سکتا ہے، سو (۱۰۰) دوسو (۲۰۰) طلبہ کی جماعت میں نہیں چل سکتا، بندہ سیہ کار کی نگاہ میں دو وجہ سے نا قابل التفات ہے۔ اول تو اہلِ مدارس کی یہ خواہش ہے کہ ہمارے مدرسہ کے طلبہ تعداد میں بہت زیادہ ہوں بندہ کو پسندیدہ نہیں۔ بلکہ ہر جماعت میں اتنے طلبہ لیے جائیں جن کو ایک مدرس سنبھال سکے اور زائد کو انکار کر دے۔ جہاں طلبہ کی کثرت ہے وہاں مدارس کی کثرت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ بعض مدارس کے مدرسین و مہتممان طلبہ کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ دوسرے اس وجہ سے کہ دوسو (۲۰۰) طلبہ کی جماعت میں سے مدرسین لاعلی التعیین کسی طالبِ علم سے کہہ دے کہ عبارت پڑھو۔ اس سے کم از کم عبارت اور مطلب دریافت کرے اور کوتاہی پر تنبیہ کرے تاکہ پھر ہر طالب علم کو یہ فکر پیدا ہو کہ نہ جانے کل کس کا نمبر آجائے۔ میرے والد صاحب کا یہ طرزِ تعلیم ان کے مخصوص شاگردوں میں خاص طور سے میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور مولانا عبد اللہ صاحب گنگوہی من اجل خلفاء مرشدی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ جو میرے والد صاحب کے خاص طور سے شاگرد رشید تھے اور انہوں نے تین برس میں ساری کتابیں میرے والد صاحب سے پڑھی تھیں اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی میرے والد صاحب سے اس طلب پر کہ مجھے اپنے دو عزیزوں کے واسطے (یعنی مولانا ظفر احمد صاحب شیخ الاسلام پاکستان اور مولانا شبیر علی صاحب سابق مہتمم خانقاہ اشرفیہ جو بعد میں کراچی تشریف لے جا کر انتقال فرما گئے) ایک اچھا مدرس چاہیے۔ اس پر میرے والد صاحب نے مولانا عبد اللہ صاحب کو تجویز کیا تھا جس کی تفصیل اکمال الشیم کے مقدمہ میں مذکور ہے۔ مولانا شبیر علی صاحب اُستاد مولانا عبد اللہ صاحب کے حالات میں لکھتے ہیں کہ:

میرے اُستادِ محترم (یعنی مولانا عبد اللہ صاحب) کے اُستاذ الاساتذہ (مولانا محمد یحیٰ صاحب) نے عمر بھر کسی کو پڑھایا نہیں بلکہ گھول کر پلایا ہے تو شاگرد رشید کیوں نہ ایسے ہوتے۔ چنانچہ جب استاذ کے سپرد کیا گیا تو اول مجھے کچھ اردو پلائی پھر فارسی شروع کرادی۔ اس زمانے میں آمد نامہ وغیرہ سے فارسی شروع کرائی جاتی تھی۔ مگر استاذِ محترم کو تو گھول کر پلانا تھا۔ لہٰذا میری تعلیم کے

لیے ایک مستقل کتاب تیسیر المبتدی شروع فرمائی۔ گھول کر پلانے کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ جب میری عمر چودہ (۱۴) سال کی تھی تو ہدایہ مشکوٰۃ وغیرہ سب مجھے گھول کر پلا چکے تھے۔ مولانا ظفر احمد صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

مولانا عبداللہ صاحب گنگوہی کی ابتدائی تعلیم و دیگر حالات

مولانا عبداللہ صاحب کو ابتدائی تعلیم صرف ونحو ادب میں کامل مہارت تھی۔ میں نے میزان، منشعب، پنج گنج کے ساتھ ساتھ تیسیر المبتدی پڑھی تھی۔ حصہ صرف ختم ہونے کے بعد نحو میر کے ساتھ اس کا حصہ نحو پڑھا تھا۔ مولانا اس زمانہ میں ہم سے اردو کی عربی اور عربی کی اردو بنوایا کرتے تھے۔ عصر کے بعد سیر وتفریح کو جاتے اور ہمیں ساتھ لیتے۔ خود قرآن شریف پڑھتے جاتے اور ہم سے قرآن کے صیغے دریافت کرتے جاتے اور نحوی ترکیب بھی پوچھتے جاتے، اسی طرح نحو میر پڑھنے کے زمانے ہی میں مجھے عربی لکھنے اور بولنے کی مشق ہوگئی۔ میں نے اسی زمانہ میں اپنے ایک ساتھی کو دیوبند خط لکھا تو اس میں عربی کے چند اشعار بھی لکھے تھے جن میں سے ایک شعر یاد ہے۔

انا ما رأیتک من زمن   فاز داد فی قلبی الشجن

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے میرا یہ خط دیکھ لیا تو بہت ہی دھمکایا کہ ابھی سے شعر وشاعری کا مشغلہ شروع کر دیا، ابھی تو محنت کرنے اور یاد کرنے کا زمانہ ہے۔ مگر مولانا عبداللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے فرمایا کہ میں نے اگرچہ ظفر کو شعر وشاعری پر دھمکایا ہے مگر آپ کی خوبی تعلیم کا مجھ پر بہت اثر ہوا کہ نحو میر پڑھنے والے کو عربی شعر بنانے کی لیاقت ہوگئی۔ اگرچہ شعر کیا تھے محض تک بندی تھی، مگر نحوی ترکیب صحیح تھی۔ میں نے مولانا عبداللہ صاحب مرحوم سے میزان، منشعب پنج گنج، نحو میر، شرح مأۃ عامل، ہدایۃ النحو اور ادب کی ایک کتاب ''الطریف و الادیب الظریف'' اس کے بعد قدوری اور ترجمہ قرآن پڑھی تھیں۔ یہ زمانہ ۱۳۲۳ھ کا تھا۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کو مکشوف ہوا کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کا وصال قریب ہے، اس لیے حضرت حکیم الامت نے استاذ مرحوم سے کہا کہ آپ مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بیعت ہیں اب مولانا کا وقت قریب ہے آپ مدرسہ تھانہ بھون سے چھ ماہ کی رخصت لے کر حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں چلے جائیں۔ مولانا عبداللہ کی غیبت میں ترجمہ قرآن کا کچھ حصہ مولانا شاہ لطف رسول سے اور تلخیصات عشر کا کچھ حصہ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ سے پڑھا اور بقیہ اپنے بڑے بھائی مولانا سعید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے پڑھتا رہا۔ پھر حضرت حکیم الامت نے فرمایا کہ میں نے تو تفسیر بیان القرآن لکھنا شروع کر دی ہے۔ اب مجھے درس کا وقت نہیں ملے گا۔ میں تم دونوں (مجھے اور بھائی سعید مرحوم) کو اپنے خاص تلامذہ کے پاس کانپور

کے مدرسہ جامع العلوم میں داخل کرنے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا ہوں، وہاں تکمیل کرلو۔ چنانچہ ہم دونوں کو ساتھ لیا اور جامع العلوم کانپور میں داخل کرادیا۔

جب میرا امتحان داخلہ مولانا محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بردوانی نے لیا تو پوچھا آپ نے اب تک کیا پڑھا ہے۔ میں نے وہی کتابیں گنادیں جن کا اوپر ذکر آیا ہے۔ فرمایا کہ نہ آپ نے کافیہ پڑھا اور نہ شرح جامی اور نہ مختصر المعانی، تو اب کیا پڑھنے کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا کہ اگر تھانہ بھون میں تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا تو میں اس وقت ہدایہ، جلالین، مشکوٰۃ اور تیسیر الاصول پڑھتا۔ فرمایا بغیر نورالانوار اور مختصر المعانی کے آپ مشکوٰۃ، جلالین کیسے پڑھ لیں گے۔ اچھا اس وقت ہدایہ آخرین پڑھنے والا جہاں سے پڑھ رہا ہے اس سے آگے آپ پڑھیں۔ میں نے عبارت صحیح پڑھ دی۔ فرمایا ترجمہ کیجئے، میں نے ترجمہ بھی صحیح کر دیا۔ فرمایا مطلب بیان کیجئے، میں نے کہا اس عبارت کا تعلق ذرا اُوپر سے ہے، ذرا اُوپر سے دیکھ لوں۔ اتنا سنتے ہی فرمایا تم ہدایہ، مشکوٰۃ، جلالین ضرور پڑھ لوگے۔ یہ ہدایہ آخرین پڑھنے والے نہ عبارت صحیح پڑھتے ہیں نہ ترجمہ صحیح کرتے ہیں اور نہ ان کو اس کی خبر کہ کس مضمون کا تعلق کس سے ہے۔ چنانچہ نام داخل کردیا اور حضرت حکیم الامت سے عرض کیا یہ تو آپ کی کرامت ہے کہ بغیر شرح جامی، مختصر المعانی، نورالانوار پڑھے مولوی ظفر ہدایہ آخیرین کی عبارت صحیح پڑھ گئے اور ترجمہ بھی صحیح کردیا۔ حالانکہ نہ پہلے سے مطالعہ کیا نہ کتاب کو دیکھا۔ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ ہنسنے لگے اور فرمایا کہ یہ کرامت نہیں بلکہ تعلیم کی خوبی ہے۔ ہمارے یہاں مولوی عبداللہ صاحب ابتدائی تعلیم بہت اچھی دیتے ہیں کہ نحو میر اور ہدایۃ النحو پڑھنے والوں کو عربی سے اُردو اور اُردو سے عربی بنانے کی پوری مشق ہو جاتی ہے۔ فقط

افاضات یومیہ میں لکھا ہے کہ ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں حضرت حکیم الامت نے ارشاد فرمایا کہ یہ جو آج کل مدارس میں اساتذہ نے ایک طرز اختیار کیا ہے کہ طلبہ کی مرضی پر اسباق رکھے جاتے ہیں، یہ بالکل ہی غلط طرز ہے۔ اس طرز میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ اساتذہ کو چاہیے کہ طالبِ علم کی استعداد اور قوت کو دیکھ کر کتاب کا انتخاب کریں۔ تاکہ آیندہ کے لیے محنت کارآمد ہو۔ دوسرے طلبہ کے دماغ اور اخلاق خراب ہوتے ہیں۔ ایسے برتاؤ سے اساتذہ کو اپنا محکوم سمجھتے ہیں ایسی ہی باتوں کی بدولت مدارس میں خرابیاں پیدا ہوگئیں۔

(افاضات یومیہ ۶/۲: ص ۳۱۴، ۲۶۵)

میں امتحان لے کر آیندہ کی کتابیں تجویز کرتے ہیں، جس میں ممتحن کی رائے بہت اہم ہوتی ہے۔ مگر جب تک طلبہ میں پڑھنے کا ذوق تھا وہ صحیح صحیح کتابیں پڑھی ہوئی لکھتے تھے۔ اس پر بھی ممتحن ان کی استعداد کے موافق ان کو بعض کتابوں میں پہلے لوٹا دیتے تھے۔ جوں جوں بدذوقی بڑھتی جاتی ہے، طلبہ بے پڑھی کتابوں کو پڑھی ہوئی لکھ دیتے ہیں، جو اپنی ذہانت سے کامیاب ہو جاتا ہے وہ اس پر فخر کرتا ہے۔ حالانکہ اگر ان کو ذوق ہو تو ان کو جو کتابیں پڑھی ہوئی بھی خام ہوں، ان کو مطلوبہ کتابوں میں لکھوانا چاہیے کہ ایک آدھ سال کی تاخیر سے اگر استعداد میں پختگی آجائے تو ان ہی کے لیے کار آمد ہے۔ جو طلبہ قدیم پہلے سے پڑھتے ہوتے ہیں۔ دفتر سے ایک رجسٹر پر ان کی سابقہ کتابیں لکھی جاتی ہے اور حسب نصاب مجوزہ آیندہ کی کتابیں بھی مطلوبہ کتب کے خانہ میں لکھ دی جاتی ہیں۔ بعد ظہر اکابر مدرسین اجتماعی حیثیت سے بیٹھ کر اس پر نظر کرتے ہیں، جو کتاب مدرسین کے نزدیک کسی وجہ سے اس کی استعداد کی وجہ سے مناسب نہیں ہوتی، اس کی جگہ دوسری کتاب تجویز کی جاتی ہے۔

جب تک میرے حضرت قدس سرہٗ کا دور رہا حضرت خود بھی تشریف فرما ہوتے تھے۔ اس وقت تو کسی طالب علم کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ مدرسین کی تجویز کے خلاف لب کشائی نہیں دل سے بھی اس پر گراں ہو اور اکابر کی تجویز کو سعادت سمجھتے تھے۔ حضرت قدس سرہٗ کے بعد حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب دام مجدہم کے دور نظامت میں یہ ناکارہ بھی اس مجلس میں شریک ہوا کرتا تھا اور مدرسین کی تجویز کو حکماً منواتا تھا۔ طلبہ بعض اپنے اعذار بیان کرتے اور مدرسین ان کو قبول کر لیتے تب تو خیر ورنہ رجسٹر میں لکھوا دیتا کہ اب تو مدارس کی کثرت ہے جہاں آپ کی مرضی کے مطابق تعلیم ہو وہاں تشریف لے جائیں۔ اب تیسرے دور میں قانون تو یہی ہے اور یہ ناکارہ دس بارہ برس سے اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اس اہم مجلس میں شرکت سے معذور ہو گیا۔ اس لیے سنا ہے کہ بعض طالب علم اصرار سے اپنی درخواست منظور کرا لیتے ہیں، جو بندہ کے خیال میں بھی بقول حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ اپنے حق میں اچھا نہیں کرتے۔ طالب علم کی استعداد اور اس کے مناسب کتاب جتنے اساتذہ سمجھ سکتے ہیں، وہ بے وقوف کہاں سمجھ سکتے ہیں۔

میرے والد صاحب کا طرز تعلیم

میں آپ بیتی نمبر۲ میں اپنے والد صاحب کا طرزِ تعلیم تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ وہ صرف کے قواعد زبانی لکھوا کر اور پھر دو حرف ''بت'' مجھے لکھوا کر مجھ سے صیغے بنواتے، جس کی تفصیل پہلے

گزر چکی۔ میں نے صرف میر، پنج گنج تین چار دن میں سنا دی تھی۔ نحو میر کے زمانہ میں اُردو سے عربی، عربی سے اُردو بنوانے کا زور تھا۔ نحو میر کے ساتھ مختصر چہل حدیث پڑھانے کا خاص دستور تھا ہدایۃ النحو اور کافیہ کا سبق ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ جس میں کافیہ اصل اور ہدایۃ النحو اس کے تابع۔ جتنی صبح کو ہدایۃ النحو پڑھی اتنی شام کو کافیہ پڑھی۔ کافیہ کی ترتیب اصل ہوتی تھی۔ اسی طرح قدوری اور کنز پڑھی۔ صبح کو قدوری بطور مطالعہ کے اور اسی مقدار کی کنز شام کو۔ میں پہلے لکھوا چکا ہوں کہ اس سیہ کار نے شرح جامی کاندھلہ کے سفر میں صرف تین دن میں پڑھی تھی۔ پڑھتے ہوئے ہمیں پتہ نہ چلا کہ حاصل محصول کیا بلا ہے۔ جب شرح جامی مدرسہ میں پڑھائی تب پتہ چلا کہ حاصل محصول تو بڑے معرکہ کی بحث ہے اور الحمد للہ اٹھارہ دن میں پڑھی تھی۔ اس کی تفاصیل تو یہ ناکارہ اپنی تعلیم میں آپ بیتی نمبر۲ پر لکھوا چکا ہے یہاں تو صرف اکابر کا طرزِ تعلیم وتدریس دکھلاتا ہے۔

حضرت گنگوہی کی ابتدائی تعلیم اور ذکاوت کے واقعات

(۲)...... قطب الارشاد حضرت اقدس مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کی ابتدائی تعلیم کا تفصیلی حال تذکرۃ الرشید میں مفصل لکھا ہے، اس میں صفحہ اٹھائیس پر لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی اور مولانا محمد قاسم صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ ایسے ہم سبق اور ساتھی بنے کہ آخرت میں بھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ اللہ جل شانہٗ نے فلک علم کے ان منیرین کو وہ ذکاوت عطاء فرمائی تھی کہ میر زاہد قاضی، صدرا، شمس بازغہ ایسا پڑھا کرتے تھے جیسے حافظ منزل سناتا ہے۔ کہیں کوئی لفظ دریافت کرنا ہوتا تو دریافت کر لیتے تھے باقی ترجمہ تک بھی نہیں کرتے تھے۔ مولانا کے دوسرے شاگردوں کو یوں خیال ہوتا تھا کہ کچھ سمجھے سمجھائے نہیں یوں ہی ورق گردانی کرتے اور کتابوں کے ختم کرنے کا نام چاہتے ہیں۔ چنانچہ کسی نے مولانا سے کہہ بھی دیا، مگر مولانا مملوک العلی صاحب نے یہ جواب دیا:

''میاں میرے سامنے طالب علم بے سمجھے چل نہیں سکتا۔'' اور دوسری جگہ صفحہ اُنتیس (۲۹) پر لکھتے ہیں کہ گنگوہی قدس سرہٗ نے مشکوٰۃ شریف شاہ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین شاہ ولی اللہ صاحب نور اللہ مراقدہم کو پڑھ کر سنائی یعنی ترجمہ وغیرہ کچھ نہیں۔ آگے لکھتے ہیں کہ کبھی کبھی ان دونوں منیرین اور قمرین کے درمیان کسی مسئلہ پر بحث ہو جاتی اور گھنٹوں تک رہا کرتی۔ اُستاد نور اللہ مرقدہم بھی بہت غور سے ان دونوں کے مباحثہ کو سنتے اور ہمہ تن اس طرف متوجہ ہو جاتے اور کبھی لوگوں کے ٹھٹ لگ جاتے اور خاص وعام کا مجمع ہو جاتا۔

ایک مرتبہ ایک اُستاد نے دونوں کی تقریر سن کر یہ کہا: ''قاسم ذہین آدمی ہے، اپنی ذہانت سے قابو میں نہیں آتا ورنہ اس مسئلہ میں رشید احمد حق پر ہے۔''

تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ حضرت امام ربانی کی ذکاوت فطری تھی مولوی ڈپٹی کریم بخش صاحب مقنن ریاست گوالیار نے جو دہلی کے طالب علمی کے زمانہ میں حضرت کے ہم سبق رہ چکے ہیں۔ ایک مرتبہ مولوی اسماعیل صاحب گنگوہی سے فرمایا کہ تمہارے حضرت سے ملاقات ہوئے مجھے پچاس سال ہوئے، اب تو حضرت کے علم کی شہرت ہونی ہی چاہیئے ہم نے طالب علمی کے زمانہ میں دیکھا ہے کہ سارے طالب علم مولوی صاحب سے ڈرتے تھے اور مدرسہ کے طلبہ نے مولانا کالقب ''ھل من مبارز '' رکھ چھوڑا تھا۔ آگے لکھتے ہیں جس زمانہ میں حضرت گنگوہی مولانا کریم بخش صاحب پنجابی کی خدمت میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک ولایتی طالب علم آیا جس کا دعویٰ تھا کہ مجھے کوئی پڑھا نہیں سکتا۔ وہ شافیہ پڑھتا تھا۔ مولوی کریم بخش صاحب کو ولایتی کا دعویٰ پسند نہ آیا۔ اُستاذ نے حضرت امام ربانی سے کہا کہ یہ جار بردی ہے۔ اس طالب علم کو سبق پڑھا کر آؤ، یادرکھنا اگر نیچا دیکھ کر آئے تو سر گنجا کردوں گا۔ حضرت امام ربانی کتاب بغل میں دبا کر اُٹھے اور سیدھے ولایتی کے پاس پہنچے، باتوں باتوں میں کتاب کھولی اور بحث شروع کردی۔ یہاں تک کہ ولایتی طالب علم حیران ہوگیا اور کہا کہ ہم کو پوری کتاب دہرادو۔ اس وقت حضرت نے کتاب بند فرمائی اور کہا پڑھانا منظور نہیں، صرف تیری ناک کاٹنی تھی۔ جن علماء کے متعلق تجھے یہ خیال ہوا کہ پڑھا نہیں سکتے اُن کے ادنیٰ شاگرد نے زِچ کردیا اور حضرت اُستاذ سے آکر کہا کہ حضرت پڑھا آیا اور مات کرآیا۔

حضرت گنگوہی فرماتے تھے کہ مختلف اساتذہ کے یہاں ہم نے پڑھا مگر تسکین نہیں ہوتی تھی مگر حضرت مملوک العلی صاحب کے یہاں اطمینان ہوا اور مولانا نے بہت تھوڑے عرصہ میں کتابیں ختم کرادیں۔ گویا اُستاذ نے گھول کر پلادیا۔ آگے لکھتے ہیں کہ حضرت گنگوہی کا دہلی میں قیام چار سال رہا، جس میں منطق وفلسفہ ادب وہیئت، ریاضی، تفسیر اصول اور فقہ معانی وغیرہ پڑھی۔ زمانہ طالبِ علمی میں حضرت قدس سرہٗ اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کا دوسرے کو پڑھانے کا اہتمام بھی کرتے تھے۔

حضرت گنگوہی کی تدریس

یہ تو طالبِ علمی کا مختصر حال ہے۔ اس کے بعد گنگوہ کے قیام میں ہرفن کی مختلف کتابیں پڑھائیں۔ مگر ۱۳۰۰ھ کے بعد سے صرف دورۂ حدیث کا معمول رہ گیا تھا، جو شوال میں شروع ہو کر شعبان میں ختم ہوجاتا۔ تمام دورہ کی کتابیں حضرت خود ہی پڑھاتے، ابتداء میں صرف صبح کو سبق ہوتا تھا، جو اشراق کے بعد شروع ہوکر چاشت کے وقت ختم ہوجاتا اور ختم سال پر ایک گھنٹہ ظہر کے بعد بھی شروع ہوجاتا۔ ایک شخص صحاح ستہ کی سب کتابیں مع مؤطائین دس (۱۰) گیارہ مہینے

میں پڑھادے۔ آج کل کے محققین کی نگاہ میں بے چارہ کیا پڑھاتا ہوگا، لیکن حضرت قدس سرہٗ کا دورۂ حدیث اس قدر مشہور تھا کہ دُور دُور سے مدرسین پڑھنے کے واسطے آیا کرتے تھے۔

خوانِ خلیل کے جام نمبر۲ کے ضمیمہ پر میں نے لکھوایا تھا کہ مولانا احمد صاحب رامپوری کا دورہ ۱۵ شوال کو شروع ہوا اور ۱۷ شعبان ۱۳۰۴ھ کو ختم ہوا۔ اس سے اگلا سال جس میں مولانا سعید الدین صاحب رامپوری تھے۔ ۲۱ شوال ۱۳۰۴ھ کو شروع ہوا، تاریخ اختتام تو نہیں ملی، لیکن حسبِ معمول شعبان ۱۳۰۵ھ میں ختم ہوا ہوگا۔ ۸ھ سے حضرت قدس سرہٗ نے امراض اور عوارض کی کثرت سے سالانہ دورہ کو ملتوی فرمادیا تھا اور تین چار سال کے تعطل پر میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے اصرار اور حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کی سفارش پر کہ میری درخواست پر ایک دورہ اور پڑھا دیجئے۔ اس پر حضرت قدس سرہٗ نے یکم ذیقعدہ ۱۱ھ کو ترمذی شریف شروع کرائی جو صرف ایک گھنٹہ ہوتی تھی کہ امراض کی کثرت اور عوارض کی شدت کی وجہ سے اس سے زیادہ وقت نہ ملا۔ اسی وجہ سے یہ دورہ دو سال میں ہوا اور ترمذی ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ کو یعنی چودہ ماہ کے اندر ختم ہوئی۔ اس کے چار دن بعد ابوداؤد شریف شروع ہوئی، یعنی ۲۲ ذی الحجہ پنجشنبہ کو شروع ہوئی۔

اس کے بعد چونکہ نزول آب کے آثار بھی شروع ہو گئے تھے۔ اس لیے بقیہ کتب کو عجلت سے طلبہ کے اصرار پر ختم کرایا اور ۷ ربیع الاول پنجشنبہ ۱۳۱۳ء کو ابوداؤد ختم فرمائی اور اس کے بعد بخاری شریف دو دن بعد ۹ ربیع الاول شنبہ کے دن شروع ہوئی اور یکم جمادی الاولیٰ جو جلد اول ختم ہوکر اور اس کے بعد جلد ثانی شروع ہوئی، جو ۱۷ جمادی الثانیہ کو ختم ہوئی اور اس کے بعد چونکہ نزول آب کی شدت ہوگئی تھی، اس لیے نہایت عجلت میں دو ماہ کے اندر مسلم شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ پوری فرمائی اور ۲۳ شعبان ۱۳۱۳ھ کو یہ دورہ ختم ہوا، اس کے باوجود حضرت قدس سرہٗ کی جامع تقاریر کو کب الدری علی جامع الترمذی ''لامع الدراری علی جامع البخاری'' کے نام سے مطبوع ہوچکی ہیں اور ان ہی کے بقدر الدر المنضود علی سنن ابی داؤد غیر مطبوع ہے، نیز میرے والد صاحب قدس سرہٗ کی مختصر تقاریر مسلم شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ بھی موجود ہیں، جن کی طباعت کی تمنا دل کے دل ہی میں رہی۔ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی تدریس کتب کا یہی معمول تھا جو اُوپر لکھا گیا۔ ان میں ترمذی شریف پر محدثانہ، فقیہانہ کلام زیادہ ہوتا تھا اور بخاری شریف کے درس میں تراجم پر کلام ان کے علاوہ بقیہ کتب میں کوئی حدیث غیر مکرر یا کوئی نئی بات ہوتی تو اس پر کلام ہوتا۔

آج کل ماشاء اللہ ۵، ۶ مدرس مل کر ۱۱، ۱۲ گھنٹے پڑھا کر دورہ ختم کراتے ہیں اور اخیر میں اس سے بھی زیادہ عجلت ہوتی ہے جو قطبِ عالم کو نزول آب کی وجہ سے کرنی پڑتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی حضرت قطبِ عالم کی نظر طلبہ کی اصلاحات پر بھی رہتی۔ تذکرۃ الرشید صفحہ ۹۵ میں لکھا ہے، اس کے

ساتھ ہی آپ کی نظر طلبہ کی نشست و برخاست، حرکات وسکنات، رفتار و گفتار، چال ڈھال، وضع قطع غرض ہر ظاہری حال پر برابر قائم رہتی تھی کہ کوئی طرز خلاف شروع تو نہیں ہے۔ اگر کسی کو اپنے پڑھے ہوئے علم پر عمل کا شائق نہ دیکھتے تو اس کی اصلاح کا زبان اور دل سے خیال رکھتے تھے۔ اشارہ سے، تصریح سے، ترغیب سے، ترہیب سے، نرمی سے، سختی سے جب تک متبع شرع نہ ہو جاتا اس وقت تک آپ کو بے چینی رہتی تھی۔

حضرت امام ربانی آنے والے طلبہ میں اہلیت اور صلاحیت کا بھی بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ جس طالب علم میں کجی پاتے یا یہ سمجھ جاتے کہ پڑھنے کے بعد اس سے ضلال یا اضلال کا اندیشہ غالب ہے اس کو کبھی سبق شروع نہ کرواتے بلکہ لطائف الحیل سے ٹال دیتے یا وہ روکھا برتاؤ فرماتے تھے جس سے وہ خود بد دل ہو کر چلا جائے۔

دوسری جگہ تذکرہ الرشید جلد اول صفحہ ۱۹۹ میں لکھا ہے۔ حضرت کی صاحبزادی صاحبہ نے قرآن پاک کے ختم کرنے کے بعد باپ سے قرآن پاک کے ترجمہ پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو حضرت امام ربانی طلبہ کے درس کے بعد جب کھانے کے لیے مکان تشریف لے جاتے تو اول اہلیہ مرحومہ قرآن مجید سنا کر صاف کیا کرتیں اور پاؤ پارہ سنایا کرتیں اس کے بعد صاحبزادی صاحبہ کو ترجمہ قرآن مجید پڑھایا کرتے اور جب صاحبزادی صاحبہ نے ترجمہ شروع کیا تو رشتہ داروں کی چند لڑکیاں بھی اس لذیذ نعمت میں شرکت کے لیے شامل ہو جاتیں۔ چنانچہ عام فہم اردو زبان میں آیات کا ترجمہ پڑھاتے اس ضمن میں ضروریاتِ دین کی تعلیم فرماتے جاتے۔ مسائل بتاتے، اتباع شرع کی رغبت دلاتے خدا کی نافرمانی سے ڈراتے اور تہذیب اخلاق کی تاکید فرماتے جاتے تھے۔ یہ نسوانی درس حضرت امام ربانی کی طرف سے تقریباً آدھ گھنٹہ کا وعظ ہوتا تھا۔ جس میں مستورات کی اصلاحِ نفس کا حق ادا کیا جاتا تھا۔

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی ابتدائی تعلیم اور ذکاوت کے واقعات

(۳)...... اعلیٰ حضرت مولانا الحاج محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ کے تفصیلی حالات تو مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی سوانح قاسمی کی تین جلدوں میں لکھ چکے اور اس کا متن متین اعلیٰ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ کا بہت وجیز قابلِ دید نہایت اختصار کے ساتھ علیحدہ چھپ چکا ہے۔ مولانا مناظر احسن صاحب کی لکھی ہوئی کتاب اسی کی شرح ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ لکھتے ہیں (صفحہ ۲۴) کہ مولانا احقر سے چند ماہ بڑے تھے۔ ان کی پیدائش شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ میں ہے اور تاریخی نام خورشید حسین ہے میرے والد صاحب جب حج

سے واپس تشریف لائے تو مجھے اور مولانا مرحوم کو دہلی ساتھ لے گئے۔ آخری ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ میں روانگی ہوئی اور ۲ محرم ۶۰ھ کو دہلی پہنچے اور ۴ محرم کو سبق شروع ہوئے۔ مولانا تو کافیہ پڑھتے تھے اور میں میزان وگلستان پڑھتا تھا۔ والد صاحب مرحوم نے میرے ابواب کا سننا اور تعلیلات کا پوچھنا ان کے سپرد کیا تھا اور جمعہ کی تعطیل کی شب میں صیغوں اور ترکیبوں کا پوچھنا مولانا کا معمول تھا۔ مولانا سب چیزوں میں ساتھیوں سے عمدہ رہتے تھے۔ ہمارے مکان کے قریب مسجد میں طالب علموں کا مجمع رہتا تھا۔ ان سے پوچھ پاچھ ہوتی اور جب مولانا کا نمبر آتا تو مولانا سب پر غالب رہتے۔ پھر مولانا ایسے آگے بڑھے کہ کوئی ساتھ نہ چل سکا۔

منطقی کتابیں میر زاہد قاضی، صدرا، شمس بازغہ ایسا پڑھا کرتے جیسے حافظ منزل سناتا ہے۔ کہیں کہیں کوئی لفظ دریافت فرماتے اور ترجمہ نہ کرتے۔ حضرت گنگوہی کے قصے میں یہ واقعہ گزر چکا ہے۔ والد صاحب نے مولانا کو کہہ دیا تھا کہ اقلیدس پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا تم خود مطالعہ کرو۔ چند دنوں میں مولانا نے مطالعہ کر لیا۔ اس واقعہ کی شہرت ہوئی۔ طلبہ نے پوچھ پاچھ کی، مگر مولانا کب مات کھانے والے تھے۔ اسی زمانہ میں منشی ذکاء اللہ صاحب چند مشکل سوالات اقلیدس کے کسی ماسٹر کے بھیجے ہوئے لائے۔ ان کے حل کر لینے پر مولانا کی اور شہرت ہوئی۔ سوانح یعقوبی میں تو یہ قصہ بہت مختصر ہے ارواح ثلثہ میں صفحہ ۲۵۴ میں لکھا ہے کہ مولانا کا نام تو کالج میں داخل تھا لیکن بطور خود پڑھتے تھے اور امتحان کی شرکت لازمی تھی۔ چنانچہ جب امتحان کا زمانہ آتا تو رام چندر جو بڑا مہندس تھا، ہندسہ کا اُستاذ تھا، اس نے مولانا نانوتوی کو بھی داخل ہندسہ کرنا چاہا، لیکن مولانا مملوک العلی صاحب نے کہہ دیا تھا کہ قاسم درس میں تو داخل نہ ہوگا امتحان میں شریک ہوگا۔ جب امتحان کا زمانہ آیا تو مولانا نے فرمایا کہ بھائی قاسم! اقلیدس کا امتحان دینا ہوگا، اس کے اوپر اشکال دیکھ لینا۔ مولانا نانوتوی نے ایک رات میں اقلیدس دیکھی۔ کالج میں اس کی شہرت ہوگئی کہ فلاں طالب علم بغیر پڑھے ہندسہ کا امتحان دے گا اور رام چندر کو بھی اس کی خبر ہوگئی۔ تب اس نے اپنے مایہ ناز شاگرد مولوی ذکاء اللہ صاحب کو جو فن ہندسہ میں صاحب تصانیف بھی تھے، بُلا کر چند مشکل سوالات سمجھا دیئے اور حضرت کی خدمت میں بطور امتحان بھیجا۔ اس کے جوابات کے بعد مولانا نے فرمایا کہ چند سوالات میں بھی کرتا ہوں۔ چنانچہ کیے، مگر وہ جوابات سے عاجز رہ گئے۔ مولانا مناظر احسن صاحب لکھتے ہیں (صفحہ ۲۵۱ جلد ۱) کہ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم طریقہ سے عربی زبان میں ان چیزوں کی تعلیم مولانا مملوک العلی صاحب سے وہ پا چکے تھے، صرف دیکھ لینا اور حساب کی مشق کر لینا کافی تھی۔

ارواح ثلاثہ میں یہ لکھا ہے کہ ایک انگریز مہندس نے اشتہار دیا تھا کہ اگر کوئی شخص مثلث کے

زاویہ کو تین حصوں میں دلیل سے ثابت اور منقسم کردے تو ڈیڑھ لاکھ روپے انعام ہے۔ مظفرنگر کے منصف صاحب بھی فن ریاضی اور ہندسہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ انہوں نے اس پر دلائل قائم کیے اور اپنے زعم میں اس کو ثابت کر دیا اور میرٹھ پہنچے۔ وہاں کے ایک حاکم اعلیٰ کو وہ دلائل دکھلائے۔ اس نے کہا کہ بالکل صحیح ہے۔ آپ اس کا اعلان کریں ضرور آپ انعام کے مستحق ہوں گے، لیکن ان کو اطمینان نہ ہوا کہ اگر اس پر مولانا ایک نظر ڈال لیں تو اطمینان ہو جائے۔ اتفاق سے مولانا نانوتوی کا مظفرنگر آنا ہوا تو منصف صاحب نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب (جو بعد میں حضرت گنگوہی کے خاص لوگوں میں تھے) سے کہا کہ کوئی ایسا وقت میسر آ سکتا ہے جس میں مولانا نانوتوی اس پر ایک نظر ڈالیں۔ انہوں نے کوشش کی مگر وقت نہ مل سکا، یہاں تک کہ مولانا کی روانگی کا وقت آ گیا اور اسٹیشن پر تشریف لائے تو گاڑی میں دس بارہ منٹ باقی تھے تو منصف صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ میری تحریر کو ذرا سنا دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مولانا سے ذکر کیا اور مولانا سے منظوری پر منصف صاحب نے وہ تحریر سنائی۔ اس کو سرسری طور پر مولانا نے سنا اور فرمایا کہ سب صحیح ہے مگر دلیل کا فلاں مقدمہ نظری ہے، حالانکہ اقلیدس کے تمام دلائل کی انتہا بدیہیات پر ہوتی ہے۔ چونکہ وہ صاحب فن تھے فوراً سمجھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے منصف صاحب سے ہنس کر کہا کہ تمہیں کیا مصیبت آئی تھی کہ تم نے مولانا کو یہ تحریر سنائی اور اپنی ساری کاوش دماغ کو غلط ثابت کر دیا۔ تم اعلان کر دیتے اشتہار دینے والے کیا سمجھتے۔

مولانا محمد یعقوب نور اللہ مرقدہٗ تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا امتحان میں شریک نہ ہوئے۔ سب اہل مدرسہ کو بالخصوص ہیڈ ماسٹر کو جو اس وقت انگریزی کے مدرس اول تھے بہت رنج ہوا۔ اسی دوران میں والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا گیارہویں ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ میں بمرض یرقان صرف گیارہ دن بیمار رہ کر انتقال ہو گیا۔ لخلخہ سنگھانا اور پنکھا کرنا ہم سب کا معمول تھا۔ ہم سب تو سو جاتے مگر مولوی صاحب برابر بیٹھے رہتے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب حضرت کی سوانح میں لکھتے ہیں کہ غالباً ایک سال نانوتوی نے اپنے اُستاذ مولانا مملوک العلی صاحب سے تنہا تعلیم حاصل کی اور جب ۱۲۶۱ھ میں مولانا گنگوہی بھی دہلی پہنچ گئے تو یہ دونوں حضرات ساتھ ہو گئے۔ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی کیفیت درس و تدریس مفصل تو نہیں ملی چیدہ چیدہ حالات کہیں کہیں ملتے ہیں۔ حضرت کی سوانح جلد اول صفحہ کے حاشیہ پر قاری طیب صاحب زاد مجد ہم تحریر کرتے ہیں کہ میں نے اپنے متعدد بزرگوں سے سنا کہ منطق و فلسفہ وغیرہ کی بڑی بڑی کتابوں کی تدریس کے موقع پر جب طالبِ علم صفحہ ڈیڑھ صفحہ کی عبارت پڑھ لیتا تو حضرت کی عادت شریفہ تھی کہ اس سبھی عبارت کا مطلب چند لفظوں میں بیان کر کے فرماتے کہ بس ان کا مطلب یہ ہے۔ اب تم قاسم کی سنو اور پھر

اس علم وفن سے متعلق مکنون علوم وفنون کا دریا بہہ پڑتا۔

ایک موقع پر مولانا عبدالعلی صاحب (جو بعد میں مدرسہ عبدالرب دہلی کے محدث ہوئے) نے عرض کیا کہ نہیں! ہم قاسم کی نہیں سنتے، ہمیں تو کتاب کا مطلب اس کی عبارت سے سمجھا دیا جائے۔ اس کے بعد حضرت والا ان کی بہت رعایت فرمانے لگے اور جب وہ کتاب کا مطلب اور عبارت کتاب سے پوری طرح سمجھ جاتے تب حضرت اپنے علوم کی تقریر شروع فرماتے۔ مولانا مناظر احسن صاحب دوسری جگہ جلد اول صفحہ ۴۱۸ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سابق مہتمم دارالعلوم کی روایت سے نقل فرماتے ہیں کہ مولانا چھتہ میں جب اقلیدس پڑھاتے تھے اور شکل کھینچنے کی ضرورت پڑتی تھی تو چٹائی کا کونہ اُٹھا کر زمین میں اُنگلی سے شکل کھینچ کر بتا دیتے تھے۔ نہ پرکار تھی نہ اوزار۔ اس قصہ کو ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۵۶ میں بھی نقل کیا ہے۔ (از زکریا اس چیز میں ہمارے مدرسہ کے صدر مدرس حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری رحمہ اللہ تعالیٰ بھی حضرت نانوتوی کے متبع تھے۔ کاغذ پر یا سلیٹ پر خط کھینچ کر شکل ہاتھ سے بنا دیتے تھے)۔ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ نے اپنے اساتذہ کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ جب میں دیوبند میں پڑھتا تھا تو خالی گھنٹہ میں حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے جلالین کے درس میں شریک ہوتا تھا۔

(تمہید تربیت السالک: ص ۲)

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی بھی حضرت حکیم الامت پر ان کی فطری سعادت کی وجہ سے خصوصی شفقت تھی۔ ایک مرتبہ نانوتوی قدس سرہٗ نے حکیم الامت سے پوچھا کہ کیا کتابیں پڑھتے ہو؟ حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ مجھ پر اس سوال کا کچھ ایسا رعب پڑا کہ میں کتابوں کے نام بھول گیا۔ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے اس کو محسوس فرما کر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع فرما دیں۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ دیکھو ایک تو پڑھنا ہوتا ہے اور ایک گننا ہوتا ہے۔ محض پڑھنا کافی نہیں گننے کی بھی ضرورت ہے۔ پھر ایک قصہ سنایا کہ ایک عالم تھے جو ہدایہ کے حافظ تھے۔ ان سے ایک دوسرے عالم نے جو ہدایہ کے حافظ نہ تھے لیکن ہدایہ کو خوب سمجھ کر پڑھا تھا۔

ایک مسئلہ کا ذکر آیا، حافظ ہدایہ نے پوچھا کہ یہ مسئلہ کونسی کتاب میں ہے، غیر حافظ نے کہا ہدایہ میں ہے۔ انہوں نے کہا ہدایہ میں نہیں ہے، ہدایہ تو مجھے حفظ یاد ہے، اس میں تو کہیں نہیں ہے۔ غیر حافظ نے کہا یہ مسئلہ تو ہدایہ ہی میں ہے اور ہدایہ منگا کر مسئلہ دکھایا، جس میں وہ مسئلہ بعینہٖ تو مذکور نہ تھا لیکن اس سے مستنبط ہوتا تھا۔ جس کی تقریر پر حافظ ہدایہ نے بہت افسوس سے کہا بس جی حقیقت میں ہدایہ کو تم نے ہی پڑھا ہے، ہم نے گویا پڑھا ہی نہیں محض حفظ کر لینے سے کیا ہوتا ہے۔

اھ حضرت نانوتوی نے یہ قصہ نقل فرما کرارشاد فرمایا کہ یہ فرق ہے پڑھنے اور گننے میں۔
(اشرف السوانح: ص ۱۳۵)

حضرت سہارنپوری کا طلب علم اور طرز تعلیم

(۴)۔۔۔۔۔سیدی و مرشدی حضرت الحاج مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے طلب علم اور تدریس کے واقعات تو تذکرۃ الخلیل میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ مجھے اس وقت اکابر کے طرز تدریس ہی پر متوجہ کرنا ہے، اس لیے مختصراً اسی نوع کے قصے ذکر کرنے ہیں۔ یہ پہلے لکھوا چکا ہوں کہ میرے حضرت اس کے شدید مخالف تھے کہ ابتداء میں لمبی تقریریں کی جائیں اور آخر میں رمضانی حافظ کی طرح ورق گردانی کردی جائے، یہ بھی لکھوا چکا ہوں کہ اس سلسلہ میں حضرت قدس سرہٗ نے اکابر مدرسین کو مجمع میں ڈانٹا ہے کہ مجھے یہ طرز بہت ناپسند ہے۔ میرے حضرت قدس سرہٗ کے یہاں جب تک ترمذی شریف، بخاری شریف مستقل ہوتی رہی اور صبح کے پہلے دو گھنٹوں میں سبق تھا۔ ماہ صفر کے کسی حصہ میں ترمذی شریف ختم ہوجاتی تھی۔ اس کے ختم ہونے کے بعد اس کی جگہ بخاری شریف شروع ہوجاتی تھی۔ اول کے چند ایام چھوڑنے کے بعد حضرت قدس سرہٗ جب سبق شروع کراتے تو جہاں سبق کے شروع کا نشان رکھا ہوا ہوتا تھا، سبق کے شروع میں اس نشان کو نکال کر اور پانچ ورق گن کر پانچ ورق کے بعد وہ نشان رکھ دیتے تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی اور بارہا اس کو بہت غور سے دیکھا کہ دوسرے گھنٹے کے ختم پر وہ پانچ ورق بھی ختم ہوجاتے نہ تو کبھی گھنٹہ بچتا نہ کبھی ورق بچتا۔ میں بہت کثرت سے اس منظر کو غور کرتا رہا۔ اس میں احکام کے ابواب بھی آتے اور رقاق و آداب کے بھی آتے تھے، تقریر بھی کم و بیش ہوتی تھی لیکن ان پانچ ورقوں میں تخلف نہیں ہوتا۔ میں بہت سوچا کرتا تھا کہ کیا بات ہے کبھی سمجھ میں تو نہیں آئی۔ البتہ آخر سال جس میں یہ سیہ کار خود بخاری شریف میں شریک تھا ناکارہ سے اس کوشش میں تھا کہ حضرت دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہ سمجھ کر اجازت دے دیں۔ جس کی تفصیل شاید اپنی طلب علم کے سلسلہ میں مفصل لکھوا چکا ہوں۔ اس میں البتہ اس دستور میں ضرور فرق پڑا کہ شروع میں رات بھر شروح وحواشی دیکھ کر صبح کو اتنے طویل اشکالات کیا کرتا کہ شروع کے ایک دو مہینے میں ایک دو اوراق سے زیادہ نہیں ہوئے اور سال کے اخیر پر آدھا پون پارہ روز پڑھا کرتا تھا۔ آپ بیتی نمبر۲ میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ میرے حضرت قدس سرہٗ ۱۴ھ میں دارالعلوم سے مظاہر علوم کی صدر مدرسی پر تشریف لائے اور حضرت قدس سرہٗ کی چند سالہ تدریس کو مختصراً یہ ناکارہ مظاہر علوم کی رُودادوں سے نقل کرکے تذکرۃ الخلیل کی طباعت کے وقت مولانا میرٹھی کی خدمت میں بھیج چکا تھا اور تفصیل میرے رسالہ احوال مظاہر علوم میں کئی سال کی تعلیم حضرت قدس سرہٗ کی ملے گی۔

۱۵ھ ایک سالہ تعلیم جو مدرسہ کی رُوداد میں طبع ہوئی، وہ یہ ہے کہ بخاری شریف تمام، ابوداؤد شریف تمام، ترمذی شریف تمام، مسلم شریف تا صفحہ ۳۰، پھر غالباً کسی دوسری جگہ منتقل ہوگئی۔ شرح نخبۃ الفکر تمام، شرح عقائد مع خیالی تمام، حسامی بقدر نصاب، مقامات حریری ۲۵ مقالے، ملا جلال دو مرتبہ تمام، سلم العلوم تصورات، ملا حسن تمام، میر زاہد رسالہ تمام، غلام یحییٰ تمام، حمد اللہ تا صفحہ ۷۹، مطول تا نصاب تلخیص المفتاح تا صفحہ ۵۰۔ ایک سال میں ان سولہ (۱۶) اہم کتابوں کا پورا کرنا ظاہر بات ہے فضول تقریروں کے ساتھ تو ہو نہیں سکتا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ کی تقریر بہت ہی جامع مختصر ایسی ہوتی تھی کہ شائقین سبق کے درمیان ہی نوٹ فرمالیا کرتے تھے۔ اگر کوئی اشکال حواشی و شروح کا کوئی کرتا تو حضرت ذرا تفصیل سے اس کا جواب دے دیتے۔

مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الخلیل صفحہ ۱۹۵ میں حضرت قدس سرہٗ کی تدریس کا معمول تحریر فرمایا ہے اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ میرا خود بھی تجربہ یہی ہے کہ آپ کی تقریر مختصر اور جامع ہوتی تھی صاف اور عام فہم لفظوں میں عبارت کا ترجمہ کرتے اور مطلب سمجھاتے اور آواز زیادہ اونچی نہ ہوتی، مگر پھر بھی ۵۰، ۶۰ طلبہ کے دائرہ تک باآسانی پہنچتی تھی۔ مفہوم عبارت سمجھانے کے بعد آپ طلبہ کو شبہ اور اعتراض کا موقع دیتے اور پھر مُسکرا کر جواب دیا کرتے تھے۔ بات کرنے میں آپ کے دہن سے پھول جھڑتے اور تقریر گویا موتیوں کی لڑی ہوتی تھی۔ اخیر زمانہ عمر میں آپ کی آواز مرتعش ہوگئی تھی، مگر تسلسل و حلاوت وہی تھا جو جوانی کے زمانہ میں تھا۔

بڑے درجہ کی پندرہ سولہ ضخیم کتابوں کا ختم سال سے قبل تمام کرا دینا آپ کے لیے معمولی بات تھی اور کامل چھ ساتھ گھنٹے درس دینا اور دماغ و زبان سے کام لیے جانا آپ کی عادت بن گیا تھا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ کا معمول بڑے اہتمام سے مدرسین کے اسباق کی نگرانی کرنا تھا۔ مگر اس کا بھی بڑا ہی عجیب طرز تھا۔ حضرت کا خاص معمول یہ تھا کہ خصوصی مہمانوں کو مدرسہ اور دار الطلبہ دکھانے خود تشریف لے جاتے اور گشت کرتے ہوئے مدرسین کے اسباق کے سامنے بھی دو دو چار چار منٹ قیام فرماتے۔ اس سے اس ناکارہ کو بھی بہت سابقہ پڑا۔ شاید لکھوا چکا ہوں کہ ایک مرتبہ اس سیہ کار کو زور کا بخار ہو رہا تھا اور مشکوٰۃ شریف کا سبق ہو رہا تھا۔ میرے حضرت قدس سرہٗ جدہ کے سفیر ہند کو لے کر دار الطلبہ تشریف لے گئے۔ مجھے حضرت کی تشریف بری کا احساس نہیں ہوا۔ حدیث مصراۃ کی بحث تھی۔ دفعتاً حضرت قدس سرہٗ پر نظر پڑ گئی، میری زبان لڑکھڑا گئی اور حضرت بڑھ گئے، بعد میں طلبہ نے بتایا کہ حضرت تقریباً ۱۵ منٹ سے کھڑے ہوئے تھے، اسی طرح دوسرے مدرسین کے اسباق میں بھی مہمانوں کے ساتھ جاتے رہے، بعض سبقوں میں ۵ منٹ بعض میں ۷ منٹ تک کھڑے رہتے۔ مدرس بچارے کو کیا خبر کہ آج کوئی مہمان آوے گا اور

حضرت اس کو ساتھ لے آئیں گے۔ لیکن مدرسین کو اس کا فکر مستقل سوار رہتا۔

حضرت شیخ الہند کا طرزِ تعلیم

(۵)...... حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کا طرزِ تعلیم جیسا کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے ذکر محمود نمبر۴ پر تحریر فرمایا، یہ تھا کہ جس کو حضرت حکیم الامت کے الفاظ میں نقل کراتا ہوں۔ عادت شریفہ تقریر کتاب میں یہ تھی کہ اکثر نفس مطلب پر اکتفا فرماتے تھے۔ جس کا نتیجہ کتاب کا جلدی نکلنا، کتاب سے طالبِ علم کو کامل مناسبت اور اس سے کامل استعداد ہو جاتا تھا۔ حسن وجاذبیت و وضاحت تقریر میں مولانا کا ثانی غالباً اب تک بھی ذہن میں نہیں ہے۔ ''ذَالِکَ فَضلُ اللّٰہِ یوتیہِ مَن یَشاءُ'' آگے نمبر۷ پر تحریر فرماتے ہیں''۔ معمول یہ تھا کہ جب طالب علم عبارت پڑھ چکتا تو لمبی سے لمبی عبارت کا نہایت مختصر اور جامع خلاصہ ایسا بیان فرمادیتے کہ پھر طالبِ علم کو اس کی تفصیل کو سمجھ لینا آسان سے زیادہ آسان ہو جاتا۔ گویا اس تفصیل کا اس اجمال پر منطبق کرنا ہی رہ جاتا اور مطلب سمجھنے میں ذرہ برابر گنجلک نہ رہتی تھی۔ اس کی یہ برکت تھی کہ کتابیں اس قدر جلد جلد ختم ہوتی تھیں جیسے کوئی مشین میں ڈھالتا ہو۔ حتیٰ کہ ہدایہ اخیرین کا ایک معتد بہ حصہ بلا ترجمہ ہی نہایت سہولت سے پڑھنا یاد ہے۔ آگے نمبر۹ میں لکھتے ہیں، حدیث میں کبھی کبھی طلبہ کی درخواست پر خود بھی عبارت پڑھتے جس کی روانی اور مفہوم لہجہ کا لطف مشاہدہ ہی سے معلوم ہو سکتا ہے اور خوبی یہ کہ درمیان درمیان ایسے وقفات لطیفہ بھی ہوتے کہ جس کا دل چاہے اپنے شبہات وسوالات اطمینان سے حل کر سکے۔ اس حالت کے جوابات میں ایک خاص اختصار اور اسکات کی شان ہوتی تھی۔

حضرت حکیم الامت ذکر محمود کے شروع میں تحریر فرماتے ہیں کہ میں طالب علمی کے زمانہ میں ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ میں دیو بند حاضر ہوا تو اس وقت حضرت شیخ الہند مدرس چہارم تھے۔ میرے اسباق میں ملا حسن، مختصر المعانی حضرت شیخ الہند کے پاس ہوئی۔ آگے نمبر۶ میں لکھتے ہیں کہ فراغ درسیات تک میرے اسباق حضرت شیخ الہند کے پاس مسلسل رہے۔ معقولات میں حمد اللہ، میر زاہد رسالہ، میر زاہد، ملا جلال اور حدیث میں متعدد کتب جن کی تفصیل رسالہ سبع سیارہ میں ہے اور فقہ میں ہدایہ اخیرین، سبع سیارہ میں حضرت حکیم الامت نے بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف کا تو کچھ حصہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اور حضرت شیخ الہند سے پڑھنا لکھا ہے۔ بقیہ کتب ابوداؤد شریف، نسائی شریف، ابنِ ماجہ اور موطا امام ملک حضرت شیخ الہند سے پڑھنا لکھا ہے۔

اشرف السوانح میں جا بجا آتی رہی ہے۔ اشرف السوانح صفحہ ۲۷ پر لکھا ہے کہ طلبِ علم کے زمانہ میں حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کسی سے ملتے جلتے نہ تھے یا تو پڑھنے میں لگے رہتے یا اگر کسی وقت فرصت ہوتی تو اپنے اُستادِ خاص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اوّل کی خدمت میں جا بیٹھتے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کہیں تشریف لے گئے تو اپنے دوسرے استاذ حضرت مولانا سید احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت مولانا نے آمد کا سبب پوچھا تو حضرت حکیم الامت نے صاف کہہ دیا کہ آج حضرت مولانا تشریف لے گئے ہیں، خالی وقت ہے اس لیے آ گیا ہوں۔

آگے جلد اصفحہ ۴۶ اشرف السوانح پر لکھتے ہیں کہ حضرت کا طرزِ تعلیم اس قدر سلیس و نفیس تھا کہ جو طالب علم دو چار سبق بھی حضرت والا سے پڑھ لیتا پھر کسی اور اُستاذ سے اس کی تسلی نہ ہوتی۔ چنانچہ حضرت والا فرمایا کرتے ہیں کہ میں جب پڑھاتا تھا تو اپنے اُوپر بہت تعب برداشت کر کے پہلے سے سبق کی تقریر کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا پھر پڑھاتا تھا۔ اس لیے میری ساری تقریر نہایت سلیس اور سہل اور باترتیب ہوتی تھی، جس کی وجہ سے مشکل مضامین بھی طالبِ علم کے لیے پانی ہو جاتے تھے اور باآسانی ذہن نشین ہو جاتے تھے۔ گو مجھ کو تو سہل کر کے تقریر کرنے میں بہت تعب ہوتا تھا، لیکن طلبہ کو کسی مقام کے سمجھنے میں ذرا اُلجھن نہ ہوتی تھی۔

چنانچہ صدرا میں ایک مشہور مقام ہے، مثنات بالتکریر جو بہت ہی مشکل سمجھا جاتا تھا، جب کتاب میں وہ مقام آیا تو میں نے قبل اس کے کہ طالبِ علم کو اس کی اطلاع دوں اس کے مضمون کی ایک سلیس تقریر کر دی، لیکن یہ نہیں معلوم ہونے دیا کہ یہ تقریر کسی مشکل مقام کے متعلق ہے بلکہ یونہی سرسری طور پر اس مضمون کی تقریر کر دی۔ چونکہ میں نے بہت ہی سہل کر کے تقریر کی تھی۔ طالب علم کی سمجھ میں خوب آ گئی۔ ان طالب علم کا نام مولوی فضل حق تھا۔ وہی مدرسہ جامع العلوم سے سب سے پہلے فارغ التحصیل ہونے اور بعد فراغ عرصہ تک قنوج میں مدرس بھی رہے۔ جب انہوں نے اقرار کر لیا کہ میں خوب سمجھ گیا تب میں نہ کہا کہ یہ وہی تو مقام تھا جس کو مثنات بالتکریر کہتے ہیں۔ بس یہ سنتے ہی وہ چونکنے ہوئے تو میں نے کہا بس بس اب نہ ڈرو اب تو پار ہو گئے، پھر میں نے پوچھا، اب بتاؤ یہ بھی کوئی مشکل مقام تھا؟ انہوں نے کہا کہ اجی ہم کو تو اس سے بہت ہی ڈرا رکھا تھا، لیکن یہ تو کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ اس پر میں نے یہ شعر پڑھا:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خون نہ نکلا

مقام تو واقعی مشکل تھا، لیکن میں نے اس کی تقریر ایسی بے فکری اور سلاست سے کی کہ نہایت سہولت کے ساتھ ان کی سمجھ میں آ گئی۔ البتہ خود مجھ کو سہل کر کے بیان کرنے میں بہت تعب اٹھانا پڑا۔ دوسرے کا بوجھ میں نے اپنے اوپر لے لیا اور میں پڑھانے میں ہمیشہ یہی کرتا تھا اور آج کل اساتذہ اپنے اوپر ذرا مشقت نہیں ڈالنا چاہتے۔ بات یہ ہے کہ شفقت نہیں رہی محض ضابطہ پری رہ گئی ہے۔ حضرت یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ''میں نے پڑھاتے وقت ضرورت سے زائد تقریر نہیں کی، صرف حل کتاب پر اکتفا کیا، زوائد سے طالب علموں کا بھی وقت ضائع نہیں کیا اور میں اسی کی تاکید اپنے ماتحت مدرسین پر بھی رکھتا ہوں بلکہ کبھی کبھی جا کر ان کے پڑھانے کی جانچ بھی کیا کرتا تھا۔ اساتذہ زیادہ تر اپنی قابلیت کے اظہار کے لیے نکات و دقائق کی تقریریں کیا کرتے ہیں جن سے کتاب کے اصل مطلب میں بھی خلل ہو جایا کرتا ہے، بعض یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ جب تک اس قسم کی تقریریں نہ کی جائیں استاد کی مہارت کے متعلق طلبہ کی تسلی نہیں ہوتی لیکن طلبہ کی یہ تسلی دیکھنی چاہیے یا ان کا نفع، ان کا نفع تو اسی میں ہے کہ اصل کتاب کو اچھی طرح حل کر دیا جائے کیونکہ استعداد اسی سے پیدا ہوتی ہے اور جب استعداد پیدا ہو جائے گی تو پھر نکات و دقائق خود ہی سمجھ میں آنے لگیں گے، لہٰذا استاذ کا اصل مطمح نظر یہی ہونا چاہیے۔

افاضات یومیہ حصہ دہم ملفوظ صفحہ ۶۸ میں لکھا ہے کہ میں (یعنی حضرت تھانوی) 'جب جامع العلوم کانپور میں مدرس اول تھا، میں نے اپنے ایک ہم وطن طالب علم کو ایک منتہی طالب علم کے حوالے کر دیا کہ ان کو فصول اکبری پڑھا دو، ایک بار میں نے متعلم کا امتحان لیا تو انہوں نے فن کے متعلق بہت اِدھر اُدھر کی تحقیقات بیان کیں، جب امتحان لے چکے تو میں نے استاد کو بلایا کہ تم کو میں نے فصول اکبری پڑھانے کے لیے کہا تھا یا شرح فصول اکبری؟ کہنے لگے 'فصول اکبری! میں نے کہا تم نے ان کو فصول اکبری کی شرح پڑھائی ہے، کیونکہ جو مضامین اِدھر اُدھر کے بیان کیے ہیں وہ فصول اکبری میں کہاں ہیں؟ وہ خاموش ہو گئے، پھر میں نے کہا کہ تم اس طالب علم کے سامنے نفس کتاب کا مطلب بیان کر دیا کرو اس سے ان میں استعداد پیدا ہوگی' پھر فرمایا کہ کتاب میں مصنف سے کہیں کہیں غلطیاں بھی ہوتی ہیں تو اس غلطی کی تاویل اور توجیہ بھی نہیں کرنی چاہیے، جیسا کہ عام مدرسین کی عادت ہے بلکہ ظاہر کر دینا چاہیے کہ یہاں مصنف سے غلطی ہوئی ہے ورنہ ان غلطیوں کی تاویل اور توجیہ کرنے سے شاگرد میں یہی مضر عادت تاویل کی پڑ جاتی ہے، دوسرے تاویل کی ضرورت ہی کیا ہے مدرس مصنف کا ذمہ دار تو نہیں ہے، مدرسین کا منصب تو صاف ناقل کا ہے اس کے ذمہ صرف تصحیح نقل ہے کہ یہ بتا دے کہ کتابوں کی عبارت کا مطلب یہ ہے اور کتاب کا حل کر دے، خواہ کتاب غلط ہو یا صحیح ہو، البتہ اگر کوئی مضمون غلط ہو اس کا غلط ہونا ظاہر کر دے،

بس کافی ہے۔ اس سے طالب علم میں استعداد پیدا ہوتی ہے، اسی طرح خارج کتاب مضامین بیان نہ کرے، کیونکہ یہ اِدھر اُدھر کی باتیں یاد تھوڑا ہی رہتی ہیں، جب وہ باتیں طالب علم کو یاد نہیں رہ سکتیں پھر ان کو بیان کردینے سے فائدہ ہی کیا ہوا۔

تسہیل تعلیم البیان صفحہ ۲۲ پر تحریر فرمایا ہے کہ جب سبق پڑھایا جائے تو سبق کو ایسا سمجھایا جائے کہ طالب علم اس کو خوب سمجھ لے جو کتابیں سبقاً پڑھائی جاتی ہیں، ان میں بعض تو صرف ونحو، منطق ومعانی وغیرہ کے علوم ہوتے ہیں جو مقصود نہیں، مگر علم کا وسیلہ ہیں، ان کی تقریر اس طرح کرائیں کہ کتاب کی عبارت پڑھوائی جائے اور اس کے مضامین کو حل کردیا جائے، زیادہ طول نہ دیا جائے، اس میں علاوہ صفائی تقریر کے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ ان کو پڑھانے کا طریقہ بھی معلوم ہوجائے گا۔

ہمارے بزرگوں کے پڑھانے کا طریقہ بھی یہی تھا کہ وہ حضرات محض کتابوں کو حل کرادیتے تھے اور زیادہ کچھ نہ بتاتے تھے، البتہ کوئی خاص بات بتانا ضروری ہوئی تو اس کو بیان فرمادیتے تھے اور اگر پڑھانے میں کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تو صاف کہہ دیتے کہ یہ مقام ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ طریقہ حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے موروث چلا آتا ہے اس میں ایک نفع یہ ہے کہ طالب علم کو مدرس پر ہمیشہ بھروسہ رہتا ہے کہ مجھے جو کچھ بتایا جارہا ہے صحیح ہے، ورنہ طالب علم کو مدرس پر ہٹ دھرمی کا شبہ رہتا ہے اور جھک جھک میں وقت خراب ہوتا ہے، غرضیکہ درس اور تقریر کے وقت نفس مطلب بیان کریں اور زیادہ تحقیقات کو بالکل حذف کردیں، کیونکہ یہ تقریریں کتاب پڑھانے کا طریقہ بتانے کے لیے کی جاتی ہیں، طبیعت کی جولانیاں دکھانے کے لیے نہیں، پھر درس کے وقت جو فضولیات بیان کی جاتی ہیں وہ یاد بھی نہیں رہتیں اور وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔

مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم گنگوہی کہتے تھے کہ جب میں دہلی مدرس ہوکر گیا تو ولایتی طالب علم میرے سپرد ہوئے اور سلّم شروع ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ تحقیق سے پڑھو گے یا سیدھا سادہ؟ کہنے لگے ہم تو تحقیق سے پڑھیں گے۔ میں نے رات کو بہت کتابیں دیکھ کر صبح کو نہایت تحقیق سے پڑھایا۔ دوسرے دن میں نے پھر یہی سوال کیا انہوں نے کہا ہم تو تحقیق سے پڑھیں گے کہا کہ اگر تحقیق سے پڑھو گے تو کل جو کچھ میں نے بتایا تھا، اس کو میرے سامنے بیان کردو تاکہ مجھے یہ اندازہ ہو کہ تم میں تحقیق پڑھنے کی قابلیت ہے یا نہیں؟ یہ سن کر سب کے سب میرا منہ تکنے لگے اور ایک بھی بیان نہ کرسکا۔ تب میں نے ان سے کہا کہ تم نے باوجودیکہ مجھ سے یہ تقریریں سنی ہیں دوبارہ بیان نہ کرسکے اور میں نے باوجودیکہ اس مقام پر استاذ نے یہ تقریریں نہیں کی تھیں، پھر بھی تحقیقات بیان کردی آخر اس کا کیا سبب ہے؟ معلوم ہوا کہ اصل چیز استعداد کا پیدا ہونا ہے جو کتاب کا مطلب سمجھ لینے سے پیدا ہوتی ہے، ان تقریروں سے استعداد پیدا نہیں ہوتی،

اس لیے کتاب کے اصل مطلب کو خوب سمجھنے کی ضرورت ہے تب وہ سمجھے اور کتاب کے سمجھا دینے پر کفایت کی غرض مدرس کے لیے لیکچر کا طرز بہت مضر ہے۔
میں نے اپنے پڑھانے کا ہمیشہ یہی طرز رکھا کہ کتاب کو حل کر دیا، زائد باتیں کبھی بیان نہ کیں اور وہ بھی اس طرح کہ بڑے بڑے مشکل مقامات بھی طالب علم کو مشکل نہیں معلوم ہوئے۔ فقط اس نابکار زکریا کو بھی مولانا صدیق احمد صاحب گنگوہی جیسا واقعہ پیش آیا۔ مدرسہ میں ایک مرتبہ کنز الدقائق کا سبق ایک معمر بزرگ جو بہت ہی متقی صاحب استعداد تھے ان کو دیا، انہوں نے کتاب کا مطلب واضح طور پر سمجھایا اور رموز و اختلافات کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی، طلبہ نے ایک ہفتہ کے بعد مہتمم صاحب کی خدمت میں شکایت پیش کی، اس نابکار کو حدیث کے پڑھنے کی ابتداء ہی سے اختلاف علماء کا چسکا پڑ گیا تھا، میں نے مہتمم صاحب کی خدمت میں شکایت پیش کی کہ کنز کا سبق اس ناکارہ کو دے دیا جائے اور ان شاء اللہ جتنے اختلافات بین السطور ہیں ان سے زیادہ بیان کروں گا مگر شرط یہ ہے کہ اگلے دن پہلے دن کا سبق سنا کروں گا اور جو شخص اختلافات بیان نہیں کر سکے گا، اس کو کنز سے نکال دوں گا۔ طالب علم نے اپنی درخواست واپس لے لی، اس میں تو شک نہیں کہ مدرسین کی تقریر بہت ہی فضول اور زائد ہونے لگی، لیکن اس کے ساتھ اس میں بھی شک نہیں کہ طلبہ کو پڑھنے پڑھانے سے کوئی خاص غرض نہیں رہی وہ بھی صرف اتنا ہی دیکھنے لگے کہ کون سے مدرس کے یہاں تقریر لمبی ہو۔

حضرت مولانا الیاس صاحب کا طرز تعلیم

(۷)..... میرے چچا جان حضرت مولانا الیاس صاحب نور اللہ مرقدۂ کے متعلق میں اپنے والد صاحب کے طرز تعلیم میں لکھوا چکا ہوں کہ ان کا مخصوص طرز ان کے مخصوص شاگردوں میں خوب نمایاں رہا۔ مولانا عبد اللہ صاحب کے متعلق تو والد صاحب ہی کے ضمن میں مختصر حالات لکھے جا چکے۔ میرے چچا جان کے متعلق بہت مختصر حالات بھی کہیں کہیں آپ بیتی میں گزر چکے ہیں کہ میری فارسی کے تعلیم زیادہ تر چچا جان سے ہوئی وہ زمانہ چچا جان کے نہایت ہی مجاہدات کا اور ''تبتل الی اللہ و انقطاع عن الدنیا'' کا تھا۔ روزے بھی کثرت سے رکھا کرتے تھے، نوافل کا سلسلہ بھی مغرب سے عشاء تک رہا کرتا تھا۔ میں آپ بیتی نمبر۲ میں لکھوا چکا ہوں کہ ان کا طرز تعلیم یہی تھا کہ میں مطالعہ دیکھ کر جاتا۔ وہ آنکھ بند کیے ہوئے بیٹھے رہتے، جانے کے بعد ایک میں اور میرا ساتھی ایک کتاب کھول کر ان کے سامنے رکھ دیتے اور سبق شروع کر دیتے اور اپنے ہی مطالعہ سے عبارت کا ترجمہ کرتے، سبق کا مدار اپنے مطالعہ پر تھا، معمولی غلطی پر چشت کرتے اور

فحش غلطی پر ایک اُنگلی سے کتاب بند کردیتے گویا سبق ندارد۔

میرے چچا کا جو طرزِ تعلیم تھا اس کے متعلق ایک عجیب قصہ ماہنامہ ''تذکرۂ دیوبند'' محرم ۷۸ھ میں نظر سے گزرا تھا کہ مامون الرشید جب تقریباً پانچ برس کا ہوا تو بڑے اہتمام سے اس کی تعلیم و تربیت شروع ہوئی، دربار میں جو علماء اور مجتہدین فن موجود تھے ان میں سے دو شخص یعنی کسائی نحوی اور یزیدی قرآن پڑھانے کے لیے مقرر ہوئے، مامون کا سن ہی کیا تھا، مگر طباعی اور فطانت کے جواہر ابھی سے چمک رہے تھے کسائی کی تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ مامون کو پڑھنے کے لیے کہتا تھا اور آپ چپکا سر جھکائے بیٹھا رہتا تھا، مامون کہیں غلط پڑھ جاتا تو فوراً کسائی کی نگاہ اُٹھ جاتی، اتنے اشارے سے مامون متنبہ ہوجاتا اور عبارت کو صحیح کر لیتا۔

ایک دن سورۂ صف کا سبق تھا، کسائی حسب عادت سر جھکائے سن رہا تھا، جب مامون اس آیت پر پہنچا ''یا ایھا الذین امنو لم تقولون مالا تفعلون'' (اے ایمان والوں وہ بات کیوں کہتے ہو؟ جو کرتے نہیں) تو بے اختیار کسائی کی نظر اُٹھ گئی، مامون نے خیال کیا کہ شاید آیت کے پڑھنے میں کچھ غلطی کی، مگر جب پھر مکرر پڑھا تو معلوم ہوا کہ صحیح پڑھی تھی، تھوڑی دیر کے بعد جب کسائی چلا گیا تو مامون ہارون کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ اگر حضور نے کسائی کو کچھ دینے کے لیے کہا تو ایفاء فرمائے ہارون نے کہا کہ ہاں! اس نے قاریوں کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کرنے کی درخواست کی تھی جس کو میں نے منظور بھی کیا تھا، اس نے تم سے کچھ تذکرہ کیا، مامون نے کہا، نہیں ہارون نے کہا پھر تم کو کیونکر معلوم ہوا، مامون نے اس کا ماجرا عرض کیا اور کہا کہ خاص اس آیت پر کسائی کا دفعۃً چونک پڑنا بے وجہ نہیں ہوسکتا۔ ہارون اپنے کمسن بیٹے کی اس ذہانت سے نہایت متعجب اور خوش ہوا۔ (عیون الحدائق مطبوعہ یورپ: ص۳۴۴)

یزیدی مامون کا صرف معلم نہ تھا بلکہ اتالیق بھی تھا اور مامون کے عام افعال و عادات کی نگرانی اس سے متعلق تھی، اس فرض کو یزیدی نہایت سچائی سے ادا کرتا تھا۔ ایک دن یزیدی اپنے معمول پر آیا۔ مامون اس وقت محل میں تھا، خدام نے یزیدی کے آنے کی اطلاع کی، مگر کسی وجہ سے مامون کو باہر آنے میں دیر ہوئی، نوکروں نے موقع پا کر یزیدی سے شکایت کی کہ آپ جب تشریف نہیں رکھتے تو صاحبزادے تمام ملازموں کو نہایت دق کرتے ہیں۔ مامون جب باہر آیا تو یزیدی نے چھ سات بید مارے، اتنے میں خادموں نے وزیر السلطنت جعفر بن یحیٰ برمکی کے آنے کی اطلاع کی۔ مامون فوراً آنسو پونچھ کر فرش پر جا بیٹھا اور حکم دیا کہ اچھا آنے دو، جعفر حاضر ہوا اور دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ یزیدی کو ڈر پیدا ہوا کہ مامون جعفر سے کہیں میری شکایت نہ کردے۔ جعفر چلا گیا تو یزیدی نے پوچھا کہ میری شکایت تو نہیں کی؟ مامون نے سعادت مندانہ لہجہ میں کہا

''استغفر اللہ'' میں ہارون رشید کو تو کہنے کا نہیں جعفر سے کیا کہوں گا، کیا میں یہ نہیں سمجھتا کہ تادیب تعلیم سے مجھ کو کس قدر فائدے پہنچیں گے۔ (منتخب کتاب المختار فی نوادر الاخبار: ص ۱)

علی میاں نے مختصر حالات چچا جان کے طرز تعلیم کے لکھے ہیں اور بالکل صحیح لکھے ہیں وہ ان کی سوانح کے صفحہ ۶۱ پر لکھتے ہیں کہ حدیث کا سبق پڑھاتے تو پہلے وضو کرتے پھر دو رکعت نفل پڑھتے۔ از زکریا میں نے اپنے دوستوں میں قاری سعید مرحوم کو بھی اس کا بہت پابند دیکھا، جب وہ ترمذی کا سبق پڑھانے جاتے تو بہت اہتمام سے وضو کرتے دو رکعت نفل پڑھتے اس کے بعد ترمذی شریف کا سبق پڑھانے دار الطلبہ جاتے۔ آگے علی میاں لکھتے ہیں کہ حضرت دہلوی نے فرمایا کہ حدیث کا حق تو اس سے زیادہ ہے یہ اقل درجہ ہے، حدیث پڑھاتے وقت کسی سے بات نہ کرتے، کوئی معزز آدمی آجاتا تو درس چھوڑ کر اس کی طرف التفات نہ فرماتے، مدرسہ کے اسباق اور طلبہ کی طرف ہمہ تن متوجہ رہتے، بڑی جانکاہی اور جانفشانی کے ساتھ طلبہ کو چھوٹے بڑے سبق پڑھاتے، بعض ایام میں اسی اسی طلبہ مختلف اسباق کے چھوٹے بڑے خود پڑھاتے یا طالب علم سے پڑھواتے، مشغولیت اور انہماک کا اندازہ اس سے ہوگا کہ کسی زمانہ میں مستدرک حاکم کا درس صبح کی نماز سے پہلے ہوتا تھا، مولانا طریق تعلیم اور کتب درس میں اپنا مخصوص طرز اور ذاتی رائے رکھتے تھے۔ (یہ وہی ہے جس کو میں اپنے والد صاحب کے طرز تعلیم میں لکھوا چکا ہوں کہ خود چچا جان نے بھی اسی طرز سے پڑھا) مطالعہ پر زیادہ زور تھا، چاہتے تھے کہ سبق ایسا تیار کر کے لایا جائے کہ ہُوں کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے عبارت کی صحت عربیت اور صرف و نحو کے قواعد کے عملی اجراء کی طرف خاص توجہ تھی، کتابوں میں عام مدارس کے نصاب و نظام کی پابندی نہ تھی، بہت سی ایسی کتابیں زیر درس تھیں جن کی تعلیم کا مدارس میں رواج نہیں ہے۔ مسائل کے ذہن نشین اور مستحضر کرنے اور طلبہ میں تفہیم کی قدرت پیدا کرنے کے لیے نئی نئی صورتیں اختیار فرماتے جو بہت مؤثر اور کارگر ہوتیں۔

مولانا کو مدرسہ کی ظاہری حالت اور تعمیر کی طرف بالکل توجہ نہ تھی آپ کے رفیق قدیم حاجی عبدالرحمٰن نومسلم مرحوم کی سعی پر مولانا کی طبیعت کے خلاف دہلی کے بعض حضرات نے کچھ حجرے تو تعمیر کروا دیئے۔ مولانا واپس تشریف لائے تو سخت ناراض ہوئے، مدت تک حاجی صاحب سے نہیں بولے اور فرمایا کہ اصل چیز تعلیم ہے کہ جب سے مدرسوں کی عمارت پکی ہوئی تعلیم کچی ہوگئی۔

حضرت شاہ اسحاق صاحب کا ایک پادری سے مناظرہ

طرز تعلیم کے سلسلہ میں ولی اللہ خاندان کا ایک عجیب طویل قصہ ارواح ثلاثہ میں لکھا ہے کہ دہلی

میں ایک پادری آیا جو بہت ہی مشہور پادری اور لستان تھا، اس نے علماء دہلی کو مناظرہ کا چیلنج دیا، اس وقت خاندان عزیزیہ کے مخالف علماء کو ایک موقع ملا، انہوں نے پادری کو پٹی پڑھائی کہ خاص طور سے یہاں شاہ اسحاق صاحب بہت مشہور عالم کہلاتے ہیں، ان کو خاص طور سے مناظرے کی دعوت دے، اس نے یہ سن کر کہ حضرت شاہ صاحب بہت مشہور علماء میں ہیں، شاہ صاحب کو دعوت دی، شاہ صاحب چونکہ بہت سیدھے اور کم گو تھے زبان میں بھی معمولی لکنت تھی، اس لیے مخالفین کو خیال ہوا کہ آج اس خاندان کو زک دینے کا بہت اچھا موقع ملے گا، بہت خوشیاں منائیں، احباب نے بھی شاہ صاحب سے درخواست کی کہ آپ اپنا کسی کو وکیل بنادیں، مگر شاہ صاحب نے فرمایا:

''اس نے مجھ کو ہی دعوت دی ہے میں ہی مناظرہ کروں گا وکیل بنانے کی ضرورت نہیں۔''

اس سے احباب کو فکر تھی۔

بادشاہ بھی حضرت شاہ صاحب کے مخالفین میں تھا، اسی کی موجودگی میں مناظرہ قرار پایا، اس لیے وقت مقررہ سے پہلے ہی بہت بڑا مجمع لال قلعہ میں پہنچ گیا، اللہ کی قدرت جب وہ پادری حضرت شاہ صاحب کے سامنے آیا تو بدن پر لرزہ پڑ گیا، زبان گونگی ہوگئی اور ایک حرف بھی زبان سے نہ نکلا، جب کچھ دیر ہوگئی تو حضرت شاہ صاحب نے فرمایا:

''آپ کچھ فرمائیں گے یا میں ہی کچھ عرض کروں۔''

پادری نے کہا:

''آپ ہی فرمایئے۔''

شاہ صاحب نے بہت زور وشور سے اسلام کی حقانیت اور عیسائیت کا بطلان مدلل فرمایا۔''

پادری بالکل ساکت تھا نہ حضرت شاہ صاحب کے کلام پر کوئی اعتراض کیا نہ کوئی اپنی طرف سے سوال کیا۔

جب اس کا عجز سب پر کھل گیا تو حضرت شاہ صاحب نے ان مخالف علماء کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

''ہمارے خاندان کا قاعدہ رہا ہے کہ وہ تفسیر قرآن شریف سے پہلے تورات وانجیل اور زبور پڑھا دیا کرتے تھے، کیونکہ بغیر ان کتابوں پر عبور ہوئے قرآن شریف کا لطف نہیں آتا۔ اس قاعدے کے موافق مجھے بھی یہ سب کتابیں پڑھائی گئی تھیں، اس لیے میں عیسائی مذہب سے ناواقف نہیں ہوں اور پھر فرمایا کہ اگر اسحاق کو ذلت اور شکست ہوئی تو کچھ بات نہ تھی کیونکہ مجھے علم کا دعویٰ ہی کب ہے لیکن اسلام تو تمہارا بھی تھا اس سے تمام مخالفین پر پانی پڑ گیا اور مناظرہ ختم ہوگیا۔'' (ارواحِ ثلاثہ: ص۱۱۴)

فصل نمبر۲

طلبہ کی تربیت اور اس کی اہمیت

میرے اکابر نور اللہ مرقدہم کے یہاں طلبہ کے آداب پر بھی خصوصی نگاہ رہتی تھی۔ اول تو اس زمانہ میں اکابر اساتذہ کا احترام طلبہ کے اندر کچھ ایسا مرکوز تھا کہ اب وہ باتیں یاد آکر بہت ہی رنج و قلق ہوتا ہے۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ قدہٗ کو بھی اس کا بہت ہی احساس تھا، افاضات یومیہ حصہ ششم مطبوعہ تھانہ بھون صفحہ۳ پر ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں:

''فلاں مدرسہ میں ایک وقت میں اکابر کی ایسی جماعت تھی کہ ہر قسم کی خیر و برکات موجود تھیں، ظاہر کے اعتبار سے بھی اور باطن کے اعتبار سے بھی اس وقت تعمیر اتنی بڑی نہ تھی مگر ایک ایسی چیز اتنی بڑی تھی کہ مدرسہ خانقاہ معلوم ہوتا تھا، ہر چہار طرف بزرگ ہی بزرگ نظر آتے تھے، اب سب کچھ ہے اور پہلے سے ہر چیز زائد ہے مگر وہی چیز نہیں جو اس وقت تھی گویا جسد ہے روح نہیں۔''

میں نے مہتمم صاحب سے کہا تھا کہ اگر اس موجودہ حالت پر مدرسہ نے ترقی بھی کی، تو یہ ترقی ایسی ہوگی جیسے مر کر لاش پھول جاتی ہے جو کہ ضخامت میں ترقی ہے مگر پھولنے کے بعد وہ جس وقت پھٹے گی اہل محلہ اہل بستی کو اس کا تعفن پاس نہ آنے دے گا۔

اس زمانہ خیر و برکت میں ایک مرتبہ مدرسہ میں ایک انجمن قائم ہوتی تھی ''فیض رساں'' اس کا نام رکھا گیا، ایک لڑکا تھا فیض محمد اس کے نام پر انجمن کا نام رکھا گیا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے سنا تو فرمایا خبیثو! ایک ایک آدھ، سب کو ٹھیک کردوں گا، میں انجمن قائم کراؤں گا اور سب نالائقوں کو نکالوں گا، بس فیض کی بجائے حیض جاری ہوگیا، اب تو اسی جگہ ایک دو کیا پچاسوں انجمنیں ہیں تعلیم و تربیت ختم اور اب تو نہ استاد کا ادب رہا، نہ مہتمم صاحب کا ادب رہا، نہ پیر کا ادب رہا، نہ باپ کا ادب، اب چاہیں انجمنیں قائم کریں یا کمیٹیاں قائم کریں، اسباق پڑھیں یا نہ پڑھیں، کون پوچھ سکتا ہے، کون مؤاخذہ کرسکتا ہے، اس ناکارہ نے اپنے اکابر کے سامنے جو طلبہ کا طرز دیکھا اور وہ اکابر کی برکت سے بغیر کہے اکابر کی توجہ اور طلبہ کی سعادت سے ہم لوگوں کی طالب علمی کے زمانہ میں یہ چیزیں طلبہ میں ایسی پختہ تھیں کہ ان پر کہنے یا ٹوکنے کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی، لیکن اس ناکارہ کو اپنے مدرسی کے زمانہ بالخصوص حدیث پاک کی تدریس کے زمانہ میں جو ۴۰ھ سے شروع ہوگیا تھا، حدیث کے متعلق مقدمۃ الحدیث، مقدمۃ الکتاب پر مختصر کلام کے بعد اپنے اصول عشرہ خاص طور سے بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی

اور پہلے دن یہ دس اصول بتا کر (اس ناکارہ کی بداخلاقی کا زور تھا) اس لیے صاف یہ بھی کہہ دیا کرتا تھا کہ میں ان چیزوں کے خلاف زبان سے نہیں کہوں گا ہاتھ سے کہوں گا، اس زمانہ میں اس ناکارہ کی علمی سلسلہ میں تو زبان زیادہ چلتی تھی، لیکن طلبہ کی عملی حالت پر بجائے زبان کے ہاتھ زیادہ چلتا تھا، اس ناکارہ کے اصول عشرہ جن پر مجھے خاص طور سے زور تھا وہ یہ ہیں:

(۱)...... سبق کی غیر حاضری میرے یہاں سخت ترین جرم تھا میرے حاضری کے رجسٹر اس زمانے کے موجود ہیں سالوں کے درمیان میں (ب) بیماری کی تو کہیں کہیں ملے گی یا (ر) رخصت کی، لیکن (غ) غیر حاضری کا برسوں میں بھی تلاش سے مشکل سے ملے گا۔ ہمارے مدرسہ کے مدرس دوم مولانا منظور احمد خان صاحب نور اللہ قدہٗ بہت ہی رحم دل بہت ہی متواضع تھے ان کے رجسٹروں میں (غ) بہت ملتا تھا اور ان کا خاص مقولہ جو بار بار انہوں نے مختلف سالوں میں طلبہ سے کہا کہ زکریا کے سبق میں حاضری کا کوئی ثواب نہیں تم وہ تو ڈر کے مارے ہے، ثواب میرے یہاں کی حاضری میں ہے چونکہ اکابر کا مجھ سیہ کار پر اعتماد بھی تھا، اس لیے میری بے جا حرکتوں پر اکابر کی طرف سے دارو گیر نہیں ہوتی تھی، میرے یہاں جو طالب علم اس زمانہ میں غیر حاضر ہوتا تو میں اس سے دوسرے دن یہ کہہ دیتا کہ میں نے تمہارا نام ابوداؤد شریف یا بخاری شریف میں سے کاٹ دیا ہے، بجائے اس کے کہ میں آپ کی شکایت مہتمم صاحب کے یہاں غیر حاضری کی کروں، اب آپ مہتمم صاحب کے یہاں میری شکایت جا کر کریں کہ اس نے بغیر حکم اہتمام کے میرا نام کتاب میں سے کاٹ دیا ہے، اب آپ دوبارہ مہتمم صاحب کا حکم لائیے کہ آپ کا نام کتاب میں داخل کردوں، میں آپ کا نام کاٹ چکا ہوں

(۲)...... صف بندی کا اہتمام نماز کی صفوف کی طرح سے کسی کا آگے بیٹھنا کسی کا پیچھے بیٹھنا بے ترتیب بیٹھنا اس سیہ کار کو بہت ہی گراں گزرتا تھا۔

(۳)...... وضع قطع کے اوپر بھی اس سیہ کار کو بہت ہی زیادہ شدت سے اہتمام رہتا تھا، علماء سلف کی وضع قطع کا خلاف اس سیہ کار کو بہت ہی گراں گزرتا تھا، بالخصوص ڈاڑھی کے معاملہ میں اول تو اس زمانہ میں مدرسہ کا فارم داخلہ ہی ایسے شخص کو نہیں ملتا تھا جو ڈاڑھی منڈاتا تھا، لیکن اگر کسی مجبوری سے یا طالب علم کے عہد و پیمان پر داخلہ کا فارم مل بھی جاتا تو اس سیہ کار کے سبق میں حاضری کی اجازت نہ تھی۔

ایک صاحب نہ معلوم کس وجہ سے اس حرام فعل کے ارتکاب کے باوجود دورہ میں داخل ہوگئے، اس سال میرے یہاں ابو داؤد شریف ہوتی تھی، وہ حضرت مہتمم صاحب اور اکابر مدرسین کی سفارش بھی لائے کہ ان کا نام ابوداؤد شریف میں داخل کردیا جائے، مگر اس سیہ کار نے عذر کردیا کہ

جب تک ڈاڑھی کا مُوا اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیتا داخلہ سے معذور ہوں۔ اس طالب علم کو بھی اس پر ضد یا غصہ تھا کہ میرے معاصرین بلکہ بعض اکابرین کے یہاں بھی اس کا نام داخل ہے اور مجھے شدت سے انکار، مگر اس سیہ کار نے اپنی بدخلقی کی وجہ سے اخیر تک ان کا نام نہیں داخل کیا، لیکن چند سال بعد ان صاحب کا خط بیعت کی درخواست لیے آیا، مجھے یاد آ گیا۔ میں نے ان کو لکھا کہ میری بدخلقی اور تشدد کا تم تجربہ کر چکے ہو، ایسی حالت میں مناسب ہے کہ تم کسی حلیم و بردبار شیخ کی طرف متوجہ ہو، اس صاحب نے بہت اصرار سے لکھا کہ میرے لیے تمہارے ہی جیسے متشدد کی ضرورت ہے۔

(۴)......اس ناکارہ کی عادت یہ تھی کہ "کتاب الحدود" وغیرہ کی روایات میں جو فحش لفظ آ گیا جیسا انکتھا یا امصص بظر اللات وغیرہ الفاظ ان کا اُردو میں لفظی ترجمہ کرنے میں مجھے کبھی تامل نہیں ہوا، میں نے کنایہ سے ان الفاظ کا ترجمہ کبھی نہیں بتایا، میرے ذہن میں یہ تھا کہ جیسا اردو میں ان کا ترجمہ ہے ویسے ہی عربی میں ان کے اصل الفاظ ہیں، میں اپنی ناپاک اور گندی زبان کو سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی پاک زبانوں سے اونچا نہیں سمجھتا تھا، لیکن اسباق کے شروع میں اپنے اصول عشرہ میں اس پر نہایت شدت سے متنبہ کرتا تھا کہ ان فحش الفاظ پر اگر کوئی شخص ہنسا، جس سے وہ حدیث پاک کے ترجمہ کی بجائے گالی بن جائے تو سبق ہی میں پٹائی کروں گا اور میں خود بھی ترجمہ کرتے وقت ایسا منہ بناتا تھا جیسا بڑا غصہ آ رہا ہو، جس کی وجہ سے اول تو طالب علم کو ہنسنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، لیکن اس پر بھی اگر کوئی بے حیاء تبسم بھی کر لیتا تو میں اس کی جان کو آ جاتا تھا۔

(۵)......کتاب کے اوپر کہنی وغیرہ رکھ دینا بھی جیسا کہ بعض طالب علموں کی عادت ہوتی ہے اس سیہ کار کے یہاں نہایت بے ادبی اور گستاخی تھی، اس پر پہلے ہی دن نہایت زور سے نکیر اور تنبیہ کر دیا کرتا تھا اور اس سے بڑھ کر نمبر۲ کتاب پر کہنی رکھ کر اور ہاتھ پر منہ رکھ کر سونا تو اس سے بھی بڑا سخت ظلم تھا اس پر نہایت شدت سے تنبیہ تو پہلے ہی دن کر دیتا تھا اور اس زمانہ میں اس سیہ کار کا بدن چونکہ نہایت ہی ہلکا پھلکا سوکھی لکڑی کی طرح سے تھا اس لیے بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ طالب علم نے حدیث پڑھی اور میں نے تقریر کی اور جب طالب علم نے دوسری حدیث شروع کی تو میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر نہایت پھرتی سے سونے والے کو ایک تھپڑ مار کر اپنی جگہ بیٹھ جایا کرتا تھا، دورہ کے طلبہ نہایت متحیر رہ جاتے کہ یہ کیا ہو گیا، مگر چونکہ لوگوں کو میری عادت معلوم ہو گئی تھی اس لیے وہ سمجھ جایا کرتے تھے کہ کوئی غریب سو گیا ہو گا، میں اس میں اکابر مدرسین کی اولاد اور مخصوصین کی بھی بالکل رعایت نہیں کرتا تھا۔

میرے حضرت میرے مرشد میرے آقا نور اللہ مرقدہٗ اعلیٰ اللہ مراتبہ کے ایک عزیز کی بھی عادت تھی، مجھے کئی دفعہ اس کے ساتھ یہ عمل کرنا پڑا میرے حضرت کے یہاں میری شکایت بھی پہنچی مگر میرے حضرت کو اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجات عطاء فرمائے، میری شکایت پر ہمیشہ ہی تسامح فرمایا بلکہ طرف داری فرمائی، اس شکایت پر بھی میرے حضرت کا جواب یہ تھا کہ کیا میں اس کو (زکریا کو) اس بات پر تنبیہ کروں کہ تم نے حدیث کی بے ادبی پر کیوں مارا۔

(۷)...... حدیث پاک کے سبق میں خاص طور سے بیٹھنے پر بھی میں خصوصی تنبیہ شروع سال میں کر دیتا تھا کہ چوکڑی مار کر نہ بیٹھیں، دیوار سے ٹیک لگا کر نہ بیٹھیں، حدیث پاک کی کتابوں کا نہایت ادب ظاہراً و باطناً ملحوظ رکھیں، کسی نقل و حرکت سے حدیث کی کتاب کی بے ادبی ظاہر نہ ہو۔

(۸)...... لباس پر بھی میں خصوصی تنبیہ شروع میں کر دیتا تھا، میں ان سے کہا کرتا تھا کہ دنیا میں سینکڑوں مذاہب سینکڑوں طریقے لباس کے ہیں، مگر ایک چیز میں تم خود ہی غور کرو کہ مقتداؤں کا لباس ایک ہے یعنی لمبا کرتا، لمبا چوغا، چاہے مسلمان ہو چاہے پادری ہو، چاہے مجوس ہو، چاہے ہنود ہو، بالخصوص اونچا کرتا سرین تک اور تن پائجامہ کی تو میں بہت تشنیع کیا کرتا تھا کہ ایسے لوگوں کو نماز کی صف اول میں ہرگز نہیں کھڑا ہونا چاہیے کہ وہ زبان حال سے دوسروں کو بے حیائی کے ساتھ اپنے اعضاء مستورہ کا حجم دکھلا رہے ہیں۔

(۹)...... ائمہ حدیث اور ائمہ فقہ کے ساتھ نہایت ادب اور نہایت احترام اور ان پر اعتراض چاہے قلبی ہی کیوں نہ ہو ہرگز نہ کیا جائے بعض لوگ حنفیت کے زور میں دوسرے ائمہ پر اور بعض بیوقوف ائمہ حدیث پر تنقیدی فقرے کہتے ہیں یہ مجھے بہت ناگوار ہوتا تھا میں نے قطب الارشاد حضرت گنگوہی کا ایک مقولہ بچپن میں سنا تھا غالباً ''تذکرۃ الرشید'' میں یہ قصہ لکھا بھی گیا کہ حضرت قدس سرہٗ نے حنفیت کی تائید میں کوئی تقریر فرمائی جس پر طلبہ جھوم گئے کسی نے جوش میں کہہ دیا کہ اگر حضرت امام شافعی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی اس تقریر کو سنتے تو رجوع فرمالیتے، تو حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا توبہ توبہ ''استغفر اللہ'' حضرت امام ربانی اگر موجود ہوتے تو میری یہ تقریر ایک شبہ ہوتی اور حضرت مجتہد اس کا جواب فرما دیتے، اب تو چونکہ ائمہ مجتہدین موجود نہیں ہیں ان کے اقوال ہمارے سامنے ہیں ان اقوال میں ہم حضرت ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اقرب الی القرآن والحدیث پاتے ہیں اس لیے اس کی تائید کرتے ہیں ورنہ مجتہدین میں سے کوئی ہوتا تو ان کی اتباع کیے بغیر چارہ نہ ہوتا، او کما قال

(۱۰)...... مجھے اس پر بھی بہت زور تھا اور ابتداء ہی میں طلبہ کو اس پر متنبہ کر دیا کرتا تھا کہ معاصر مدرسین کا کوئی قول آپ نقل کریں تو شوق سے مگر مدرس کا نام ہرگز نہ لیں، اس سلسلہ میں چونکہ

حضرت عبدالرحمن صاحب نوراللہ مرقدہٗ صدرالمدرسین کے یہاں ترمذی شریف ہوتی تھی اوراس سیہ کار کے یہاں ہمیشہ ابوداؤ دشریف اوران دونوں کی روایات ابواب فقہیہ کے طرز پر ہوتی تھیں اوراس زمانہ میں طالب علم کچھ سمجھدار بھی تھے، وہ میری اور مولانا مرحوم کی تقریر میں جب اختلاف پاتے تو بڑے زور سے مجھ پر یا مولانا پر اعتراض کرتے۔

مجھے معلوم ہوا تھا کہ مولانا مرحوم نے بھی اپنے سبق میں اس پر نکیر کی تھی کہ تم شیخ کا نام لے کر مجھے مرعوب کرنا چاہتے ہو، جو اعتراض کرنا ہوا کرے بغیر شیخ کے نام کے کیا کرو۔ میں نے بھی اس پر کئی سالوں میں کئی دفعہ طلبہ پر نکیر کی کہ مولانا کا نام لے کر اعتراض ہرگز نہ کریں کہ مولانا کا نام سننے کے بعد اس پر رد کرنا بے ادبی ہے اور سکوت کرنا اپنی رائے کے خلاف کو قبول کرنے کے ہم معنی ہے۔

حدیث کی کتابیں تو دوسرے حضرات مدرسین کے یہاں بھی ہوتی تھیں مگر اس سیہ کار اور مولانا کے سبقوں میں یہ چیزیں کثرت سے پیش آیا کرتی تھیں "تلک عشرۃ کاملۃ" پر یہ ناکارہ شروع ہی میں ایک زوردار تقریر کرتا تھا اور پھر سال بھر تک ان میں سے ہر نمبر کے خلاف پر تنبیہ کرتا تھا، اس نمبر میں میں نے ایک چیز لکھوائی ہے کہ میرے حضرت کے یہاں سے اس نابکار کی شکایات تو ہوتی ہی رہتی تھیں، کچھ سچ بھی ہوتی تھیں اور کچھ حاسدین کی شفقتوں کا بھی ظہور تھا مگر میرے حضرت کو اللہ بہت ہی بلند درجات عطاء فرمائے، مجھے یاد نہیں کہ کسی شکایت پر اس سیہ کار پر عتاب ہوا ہو، اسی واسطے اخلاق درست نہ ہوئے۔

میں نے نمبر۲ میں لکھوایا کہ میری شکایات پر حضرت نے بجائے مجھے کچھ فرمانے کے میری حمایت ہی فرمائی، ایک بہت ہی عجیب قصہ اس وقت یاد آ گیا کہ ۴۴ھ کے حج میں اعلیٰ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نوراللہ مرقدہٗ بھی تشریف فرما تھے اور انبالہ کے ایک بزرگ حضرت رائے پوری نوراللہ مرقدہ کے مخلص اور میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بھی مخلص اوران دونوں کی وجہ سے اس سیہ کار پر بھی بہت شفقتیں فرمایا کرتے تھے، یعنی حافظ محمد صدیق صاحب انبالوی بھی اس سفر میں ساتھ تھے، ان کی بچی غالباً سات، آٹھ سال کی عمر ہوگی مگر پنجاب کا نشوونما یوپی سے بڑھا ہوا رہتا ہے اور پنجاب میں پردہ کا رواج بہت ہی شاذونادر ہے، بالخصوص بچوں کے حق میں، وہ بچی اگر زندہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی ہر نوع کی مدد فرمائے، دین ودنیا کی ترقیات سے نوازے مرگئی ہو تو اللہ تعالیٰ مغفرت فرما کر اپنے جوار رحمت میں زیادہ سے زیادہ قرب عطاء فرمائے۔

وہ اماں جی کو مسجد نبوی میں پانچوں وقت نماز کے لیے لے جایا کرتی تھی کہ اس کا مکان بھی حضرت قدس سرہٗ کے مکان کے قریب ہی تھا، میں نے ایک دفعہ اس بچی کو یہ کہا کہ اری تو بڑی

ہوگئی بغیر برقع کے نہ آیا کر، اس نے منہ پھیر کر گویا عملی انکار کیا، زبان سے کچھ نہیں کہا مسجد میں جاتے آتے کبھی کبھی سڑک پر وہ نظر پڑ جاتی تھی۔ دوسرے دن جب وہ نظر پڑی تو میں نے پھر ٹوکا کہ میں نے کہا تھا برقع بنانے کو تو نے بنایا نہیں، اس نے کوئی حرکت تو نہیں کی مگر چپ ہو کر چلی گئی۔ ایک آدھ دن بعد وہ پھر نظر پڑی، میں نے آواز دے کر اس کا نام لے کر کہا کہ میں نے تجھے کئی دفعہ برقع بنانے کو کہا تو نے اب تک نہیں بنایا۔ اب کے بغیر برقع کے دیکھا تو ایک دھول رسید کروں گا۔

وہ بجائے اماں جی کو نماز میں لے جانے کے روتی ہوئی گھر چلی گئی اور اماں جی کی اس دن حرم کی نماز فوت ہوگئی، اس کو بلا کر پوچھا تو اس نے سارا قصہ سنا دیا اور اماں جی نے ناراضگی کا اظہار فرمادیا کہ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے اور اس سے بڑھ کر ان کے بھائی میرے مخدوم جناب الحاج مقبول احمد جن کا ذکر پہلے بھی آ گیا بہت ہی ناراض ہوئے، مقدمہ میرے حضرت قدس سرہٗ تک پہنچا، اماں جی نے بھی حرم کی نماز فوت ہونے پر بہت ہی ناراضگی کا اظہار فرمایا، حضرت قدس سرہٗ نے اس لڑکی کو بلایا وہ واقعی یا مصنوعی بہت روتی ہوئی گئی، حضرت نے بہت ہی شفقت سے محبت سے پیار سے اس سے فرمایا کہ:

پیاری بچی! بات یہ ہے کہ تو اس (زکریا) کو تو دیکھ ہی رہی کیسا مسٹنڈہ بن رہا ہے اور وہ کسی کے قابو کا تو ہے نہیں اگر اس نے تیرے تھپڑ مار دیا تو تو گر پڑے گی اور اگر اس پر میں نے اس کے تھپڑ مارا تو اس پر تو کوئی اثر ہو۔ نہ کا نہیں الٹی میری ہی انگلیاں دکھ جائیں گے، اس لیے میری سمجھ میں تو یوں آوے، اچھا یہی ہے کہ تو برقع ہی بنالے۔

جو حضرات مجھ پر خفا ہو رہے تھے ان کا تو ایک ہی فقرہ ہمیشہ کا تھا کہ حضرت اس کی بات تھوڑی ٹال سکیں، لیکن اس کے والد مرحوم کو جب یہ سارا قصہ پہنچا تو بے چارے اسی وقت جا کر بازار سے برقع کا کپڑا لائے، گھر میں مشین تھی، کئی نے مل کر اس کو جلدی جلدی سی لیا اور نماز کے وقت برقع اوڑھ کر آئی تو میں نے بھی اس کو بہت شاباشی دی، حضرت قدس سرہٗ کا ایک واقعہ لکھواتا ہوں واقعے یاد آجاتے ہیں۔

میرے حضرت قدس سرہٗ کو میری ناپاکی، گندگی، نالائقوں کے باوجود حسنِ ظن بہت تھا اور شفقت اس سے بھی زیادہ، دو واقعے اس وقت میرے ذہن میں زور سے آئے، یاد نہیں کہیں لکھوا چکا ہوں یا نہیں، میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے وصال تک تو حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری کی زیادہ نوبت نہیں آتی تھی لیکن والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کے بعد ۳۵ھ میں بذل کے شروع ہوجانے کی وجہ سے اور اس سیہ کار کی طرف ڈاک منتقل ہوجانے کی وجہ سے حضرت

کی تشریف آوری پر کنجی حضرت سے لے کر حجرہ کھول کر ڈیکس اور خطوط ڈاک وغیرہ نکال کر لانا اس سیہ کار ہی کے ذمہ تھا اور اس دوران میں ڈاک لانے یا رکھنے کے لیے یا کسی خط کی تلاش کے لیے بار بار حجرہ میں جانا بھی ہوتا تھا۔

حضرت قدس سرہٗ کے ڈیکس میں ایک صاحب کی امانت ایک طلائی زیور مختصر سا رکھا ہوا تھا وہ چوری ہو گیا، متعدد لوگوں نے کہا کہ اس کی آمد و رفت ہر وقت رہتی ہے اسی نے اُٹھایا ہوگا، ان کی بدگمانی بے محل بھی نہ تھی کہ آٹھ ہزار کا مقروض تھا اور اس کے باوجود فضول خرچ، مگر حضرت قدس سرہٗ سے جب کسی نے کہا کہ یہ اس کا کام ہے تو حضرت نے بے ساختہ فرمایا کہ یہ کام اس کا نہیں بعض بے ادب لوگوں نے حضرت سے کہا بھی کہ حضرت کو بہت ہی حسن ظن شروع ہی میں ہو گیا، ابھی اس کا حال بھی معلوم نہیں ہوا، بچہ ہے مگر حضرت ہر دفعہ بے ساختہ یہ فرماتے تھے کہ اس کا کام نہیں، میرے رب کے احسانات کی تو کوئی انتہا ہی نہیں، ہفتہ عشرہ نہیں گزرا تھا کہ چور کا پتہ بھی چل گیا اور اس نے اقرار بھی کر لیا اور چیز واپس بھی آ گئی، تب میری جان میں جان آئی کہ اور مالک کا شکر تو یہ نا پاک کیا ادا کر سکتا تھا کہ اب تک کسی ایک نعمت کا بھی شکر ادا نہ ہو سکا۔

اسی کے ساتھ ایک دوسرا واقعہ بھی یاد آیا، مجھے تو یاد ہے کہ میں لکھ چکا ہوں مگر میرے احباب جو ہر وقت آپ بیتی پر لپٹے رہتے ہیں شدت سے انکار کرتے ہیں کہ یہ واقعہ نہیں آیا، مگر ایک دوست نے بتایا کہ آپ بیتی نمبر ۴ حضرت قدس سرہٗ کے احوال میں یہ مفصل قصہ گزر چکا، مجھے تو اس قصہ کا آخر جزء صرف حضرت قدس سرہٗ کی شفقت اور اعتماد بیان کرنا ہے کہ جب حاجی صاحب نے فرمایا کہ زکریا بھی تو کل خانعالم پورہ کی سیر کرنے گیا تھا اس سے پوچھ لیجئے تو میرے حضرت قدس سرہٗ نے بے ساختہ فرمایا کہ یہ نہیں گیا حاجی صاحب کو غصہ آ گیا کہنے لگے ایسی بھی خوش اعتقادی کیا، یہ تو سامنے بیٹھے ہیں ان سے دریافت فرمالیں اور میں چپ لرز رہا تھا، حضرت قدس سرہٗ نے دوسری مرتبہ فرمایا "نہیں نہیں یہ نہیں گیا" حاجی صاحب نے غصہ میں فرمایا کہ آخر اس سے دریافت تو کر لیں حضرت نے مجھ سے پوچھا، میں نے عرض کیا کہ حضرت وہاں تو نہیں گیا، میں نے سنا کہ حاجی خلیل صاحب کا گھر گر گیا تھا وہاں گیا تھا حضرت نے فرمایا یہ صحیح ہے وہاں ضرور گئے ہو گے، لیکن خانعالم پورہ کا پانی ان کے مکان کے قریب تک پہنچ گیا تھا اس لیے وہ دریا سارا سامنے ہی تھا ان صاحب کو تو میرے جواب پر بہت غصہ آیا مگر بات واقعی یہی تھی۔

یہ حاجی خلیل صاحب مرحوم بڑے حضرت رائے پوری قدس سرہٗ سے بیعت اور حضرت مولانا عبد القادر صاحب اور میرے والد صاحب کے جانثاروں میں تھے اور بڑے غریب آدمی تھے، میرے والد صاحب اکثر رات کو ان کے یہاں جاتے اور وہ بڑی خاطریں کرتے کھانا اور چائے

اور یہ اور وہ مگر اخیر میں ان سب کی قیمت سے زیادہ میرے والد صاحب چپکے سے دے دیتے، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب بھی کبھی کبھی ان کے مہمان ہوتے اور ان کی مسجد میں قیام کرتے اور وہ مع مہمانوں کے بڑی فیاضی سے دعوتیں کرتے اور چپکے سے اس ناکارہ سے کہہ دیتے کہ میرے پاس تو پیسے ہیں نہیں پیسے آپ کو دینے ہوں گے اور یہ ناکارہ بہت ہی مسرت اور خوشی اپنے والد صاحب کے اتباع میں پیش کیا کرتا تھا کہ میرے حضرت قدس سرہٗ کو ان کا بڑے حضرت رائے پوری اور میرے والد صاحب سے خصوصی تعلق کا حال خوب معلوم تھا اسی لیے حضرت نے بے ساختہ فرما دیا تھا کہ وہاں ضرور گئے ہوں گے، میرے حضرت قدس سرہٗ کے حسنِ ظن اور شفقتوں کے قصے تو کئی یاد آئے مگر اس وقت تو مضمون کچھ اور چل رہا تھا۔

محدثین نے طالب حدیث کے آداب بہت کثرت سے لکھے ہیں جن کو یہ ناکارہ مقدمہ اوجز میں مختصر طور سے لکھ چکا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ طالب علم کے لیے سب سے پہلے جو چیز واجب ہے وہ تصحیح نیت ہے یعنی علم کے حاصل کرنے میں مقصود صرف اللہ کی رضا ہونی چاہیے اگر مدرسی کرے تو بھی پیسوں کی نیت سے نہ کرے بلکہ اشاعت علم کو اپنا مقصد سمجھنا چاہیے اور جو تنخواہ مل جائے اس کو اللہ کا عطیہ سمجھنا چاہیے، محدثین نے لکھا ہے کہ اغراض دنیا کی نیت سے علم حاصل کرنے سے بہت ہی زیادہ احتراز کرنا چاہیے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص علم دین کو دنیا کی غرض سے حاصل کرنا چاہے اس کو جنت کی ہوا بھی نہیں لگے گی۔ حماد بن سلمہ کا مقولہ ہے:

''جو حدیث پاک کو غیر اللہ کے لیے پڑھے وہ اللہ کے ساتھ مکر کرتا ہے اللہ جل شانہ سے کثرت سے توفیق اور اعانت علی الصواب والسداد کی دعاء کرتا رہے اور اخلاق حمیدہ اپنے میں پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کرتا رہے اور اس کے بعد انتہائی انہماک سے طلب علم میں مشغول ہو کسی دوسری طرف ذرا بھی توجہ نہ کرے۔

یحییٰ بن کثیر کا مقولہ ہے ''بدن کی راحت کے ساتھ علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔''

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وہ شخص کامیاب نہیں ہے جو علم کو کاہلی اور لاپرواہی سے حاصل کرے بلکہ جو شخص نفس کی ذلت اور معاش کی تنگی کے ساتھ حاصل کرے گا وہ کامیاب ہوگا۔''

اور یہ تو مثل مشہور ہے ''من طلب العلی سھر اللیالی '' جو اونچا مرتبہ حاصل کرنا چاہے وہ راتوں کو بیدار رہے اور طالب علم کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے استادوں کا نہایت احترام کرے۔ مغیرہ کہتے کہ ہم استاد سے ایسا ڈرتے تھے جیسے لوگ بادشاہ سے ڈرا کرتے ہیں، حدیث پاک میں بھی یہ حکم ہے کہ جن سے علم حاصل کرو ان سے تواضع سے پیش آؤ۔

اپنے شیخ کو سب سے فائق سمجھے، حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا مقولہ ہے:

''جو اپنے استاد کا حق نہیں سمجھتا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا، استاد کی رضا کا ہر وقت خیال رکھے اس کی ناراضگی سے پرہیز کرے، اتنی دیر اس کے پاس بیٹھے بھی نہیں جس سے اس کو گراں ہو، استاد سے اپنے مشاغل اور جو پڑھنا ہے اس کے بارے میں خاص طور سے مشورہ کرتا رہے اس سے نہایت احتراز کرنا چاہیے کہ شرم اور کبر کی وجہ سے اپنے ہم عمر یا اپنے سے عمر میں چھوٹے سے علم حاصل کرنے میں پس وپیش کرے۔''

اصمعی کہتے ہیں:

''جو علم حاصل کرنے کی ذلت نہیں برداشت کرے گا، وہ عمر بھر جہل کی ذلت برداشت کرے گا۔''

یہ بھی ضروری ہے کہ استاد کی سختی کا تحمل و برداشت کرے یہ نہایت اختصار سے مقدمۃ اوجز سے چند اصول نقل کیے گئے ہیں اور یہ تو نہایت مشہور مقولہ اور نہایت مجرب ہے کہ استاد کی بے حرمتی سے علم کی برکات سے ہمیشہ محروم رہتا ہے اور والدین کی بے حرمتی کرنے والا روزی سے ہمیشہ پریشان رہتا ہے، لوگ آج کل بہت ہی بے روزگاری اور معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہیں، لیکن وہ غور کریں تو اپنی جوانی کے زمانہ میں والدین میں سے کسی کی بے حرمتی کی ہوگی، مجھے تو اس کا بہت تجربہ ہے، محدثین اپنے استاد کی جلالت شان پر بہت ہی زور دیتے ہیں۔

حضرت تھانوی کا ملفوظ آداب

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ افاضات یومیہ (حصہ نہم) میں فرماتے ہیں کہ جب میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے حدیث پڑھتا تھا تو اس زمانے میں حضرت مولانا گنگوہی کے یہاں بھی حدیث کا دورہ شروع ہو گیا اور طالب علم یہاں ٹوٹ ٹوٹ کر وہاں جانے لگے مگر مجھے الحمد للہ کبھی اس کا وسوسہ بھی نہیں ہوا کہ وہاں چلا جاؤں حالانکہ میرا یہ عقیدہ تھا اور اب بھی ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی مولانا محمد یعقوب رحمہ اللہ تعالیٰ صاحب سے علم و فضل میں بہت بڑھے ہوئے تھے لیکن باوجود اس کے جب کسی نے مجھ سے چلنے کے لیے کہا تو میں نے یہی جواب دیا کہ جس دن مولانا فرمادیں کہ میں نہیں پڑھاتا اس وقت کسی دوسرے کو ڈھونڈوں گا، بلاضرورت مولانا کو نہیں چھوڑونگا۔ (اشرف السوانح)

میں نے اس واقعہ کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ بچپن میں جب کلام مجید حفظ فرمارہے تھے تو والد ماجد نے کسی وجہ سے حضرت والا کے استاد کو بدلنا چاہا، لیکن حضرت والا کسی طرح راضی نہ ہوئے

اور مچل گئے کہ نہیں میں تو ان ہی سے پڑھوں گا یہاں تک کہ والد صاحب مجبور ہو گئے اور انہیں استاد کو رکھنا پڑا۔

حکایات صحابہ میں لکھا ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ جو استاد کی قدر نہیں کرتا وہ کامیاب نہیں ہوتا۔''

حکایات صحابہ میں بہت قصے علمی انہماک کے باب میں اساتذہ کی قدر اور علمی انہماک کے گزر چکے ہیں اس باب کو بھی طلبہ کو ضرور دیکھنا چاہیے۔

افاضات یومیہ میں دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ہم نے حضرت مولانا یعقوب صاحب کو چھوڑ کر مولانا گنگوہی کی خدمت میں جانے کا ارادہ نہیں کیا بلکہ بڑے مدرس کو چھوڑ کر چھوٹے مدرس سے پڑھا اور سند ان سے بھی نہیں لی بلکہ جب سند فراغ اور دستار بندی کا وقت ہوا تو ہم لوگ یعنی جن جن کی جلسہ میں دستار بندی ہونی تجویز ہوئی تھی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت ہم نے سنا ہے کہ جلسہ میں ہماری دستار بندی کی جائے گی اگر یہ حکم ہے تو ہمیں انکار نہیں اور اگر ہمارے اختیار کو بھی اس میں دخل ہے تو ہم باادب عرض کرتے ہیں کہ اسے موقوف فرما دیا جائے، اس واسطے کہ ہمیں کچھ آتا جاتا تو ہے نہیں، مدرسہ کی بدنامی ہوگی کہ ایسے نالائقوں کی دستار بندی کی گئی تو لیجیے ہم سند کے لیے تو کیا کہتے، کہا تو یہ کہا اور ملتی ہوئی دستار بندی کو اپنی طرف سے روک دیا اور یہ نہیں کہ تکلف سے بلکہ سچے دل سے۔

جب ہم لوگوں نے یہ کہا تو مولانا کو جوش آ گیا اور فرمایا:

''کون کہتا ہے کہ لیاقت نہیں، اس کو تم جانو یا ہم جانیں، ہم اساتذہ کے سامنے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اور تم لوگوں کو یہی سمجھنا چاہیے ورنہ قسم خدا کی جہاں جاؤ گے تم ہی تم ہو گے میدان خالی ہے۔''

یہ فقرہ کہ میدان خالی ہے کئی بار فرمایا، اب ڈر کے مارے بولے نہیں کہ کہیں مولانا خفا نہ جائیں، ہم لوگ مولانا سے ڈرتے بہت تھے پھر مولانا نے یہ تماشہ کیا کہ عین جلسہ میں فرمایا:

''ہم نے ان لوگوں کو قرآن وحدیث، فقہ، فلسفہ، منطق وغیرہ اتنے فنون میں فارغ کر دیا ہے اور ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ یہ ان فنون میں صاحب کمال ہو گئے ہیں، اگر کسی کو ان کے فضل وکمال میں شک ہو تو وہ جس فن میں چاہیں اسی جلسہ میں ان کا امتحان لے لیں''۔

لو صاحب! ہم تو دستار بندی ہی سے ڈر رہے تھے اور اس کو ملتوی کرنے کی درخواست کی تھی، یہاں مولانا نے علی الاعلان برسر جلسہ فرما دیا کہ جو چاہے اس وقت ان کا امتحان لے لے، مگر صاحب! ان حضرات کی ہیبت ایسی تھی کہ کسی کی مجال نہ تھی جو ہم سے سوال کرتا اور محض اہلیت ہی نہیں بلکہ سب کو یقین تھا کہ جیسا مولانا فرما رہے ہیں یہ ویسے ہی ہوں گے، کسی نے امتحان کی

درحقیقت کوئی ضرورت ہی نہ سمجھی اور اس موقع پر بھی ہمیں کوئی سند نہیں دی گئی، بس یہ دستار سند تھی اس کے بعد جب پڑھانے کا وقت آیا تو اول ہی میر زاہد امور عامہ کا سبق میرے ذمہ ہوا، دوپہر کو مطالعہ جو کیا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا دعاء کی، اے اللہ میاں! استاذ تو موجود نہیں، اگر یہ مقام حل نہ ہوا تو پڑھاتے وقت بڑی ذلت ہوگی، پھر ظہر کی نماز پڑھ کر جو مطالعہ کرنے بیٹھا ہوں تو کتاب بس پانی تھی۔ پھر خدا کے فضل سے ایسی طبیعت کھلی کہ اس زمانہ میں کانپور میں بڑے بڑے فضلاء موجود تھے اور کئی مدرسے تھے اور بعض طلبہ مشترک بھی تھے، کسی کو یہ پتہ نہ چلا کہ اس کو کچھ آتا نہیں، ہاں یہ رکاوٹ تو کچھ دن رہی کہ طلبہ کہتے تھے کہ یہ بہت کم عمر ہے اس سے پڑھنے میں عار معلوم ہوتی ہے بس سات آٹھ طالب علموں کو لے کر بیٹھا رہتا تھا۔ کوئی کم عمر سمجھ کر پڑھتا ہی نہ تھا، پھر جو ڈاڑھی بڑی ہوئی، طالب علموں کی تعداد بھی بڑھنے لگی، بس پھر طالب علم خوب آنے لگے، پھر تو یہ حالت تھی کہ خدا کے فضل اور بزرگوں کی دعاء سے جس نے مجھ سے ایک بار بھی پڑھ لیا پھر کبھی اس نے کسی دوسرے سے پڑھنا پسند نہ کیا۔

حضرت مولانا محمود حسن صاحب فرماتے تھے کہ میں بارہا گنگوہ حاضر ہوا اور جی میں بھی آیا کہ حضرت مولانا سے عرض کروں کہ مجھے بھی حدیث کی سند دیجئے، لیکن کبھی اس درخواست کی ہمت ہی نہ پڑی، جب اس نیت سے گیا تو یہی خیال ہوا کہ تو یہ تمنا لے کر تو جاتا ہے، لیکن تجھے کچھ آتا جاتا بھی ہے، بارہا خیال ہوا کہ عرض کروں کہ سب کو حضرت سند دیتے ہیں مجھے بھی دے دیجئے، مگر پھر خیال ہوا کہ مولانا پوچھ بیٹھیں کہ تجھے کچھ آتا بھی ہے جو سند لیتا ہے تو کیا جواب دوں گا، اس لیے کبھی اس درخواست کی ہمت ہی نہ ہوئی، حالانکہ مولانا دیوبندی ہندوستان میں حدیث کے اندر بے نظیر تھے تو جناب ہم نے تو وہ وقت دیکھا ہے، اب یہ کہ درخواستیں کرتے ہیں کہ ہمیں سند دے دو، جس نے وہ زمانہ دیکھا ہو بھلا اس کو ایسی باتوں کا کیونکر تحمل ہو۔

شمرد ایک فرانسیسی تھا اس کی ایک بیگم تھی جس کا امراء میں بڑا درجہ تھا، یہاں تک کہ اس کے پاس مثل والیان ملک کے فوج بھی تھی، میرٹھ میں جو بیگم کا پل مشہور ہے وہ بھی اسی کا بنوایا ہوا ہے، اس کی ایک کوٹھی تھی جو فرانسیسی وضع پر بنی ہوئی تھی، وہ اپنے ملازموں کی بڑی قدردان تھی، وہ کہا کرتی تھی کہ میں تمہیں ایسا کر کے چھوڑوں گی کہ تم کہیں کے نہیں رہو گے، تمہیں کوئی بھیک بھی نہیں دے گا، وہ کہتے کہ حضور اتنی عنایت کرتی ہیں اور حضور کے یہاں ہم تعلیم یافتہ ہے تو ہمیں ملازمت کی کیا کمی۔ وہ کہتی کہ دیکھ لینا۔ چنانچہ یہ دیکھا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ملازم کسی اور کسی کی ملازمت نہ کر سکے۔ نہ دیسا کوئی قدردان ملا نہ نوکری کر سکے۔ اس کے مرنے کے بعد وہ لوگ واقعی بھوکے مرے۔ ہمارے بزرگوں نے بھی ہمیں اس طرح نکما کر دیا۔ اب کوئی پسند ہی نہیں آتا۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے تم بھی بدل جاؤ۔ بھائی ہم سے تو اب بدلا نہیں جاتا تمہیں اختیار ہے کسی نے کہا ہے:

زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ بساز

زمانہ بدل گیا ہے تو بھی بدل جا، لیکن ہم تو یہ کہتے ہیں:

زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ مساز

اور زمانہ کیا بدلتا اگر درحقیقت دیکھا جائے تو زمانہ ہمارا تابع ہے۔ ہم ہی تو زمانہ کو بدلتے ہیں زمانہ بیچارہ ہمیں کیا بدلے گا۔ جب ہم اپنے آپ کو بدل دیتے ہیں تب ہی زمانہ بدلتا ہے۔ زمانہ ہم سے علیٰحدہ کوئی چیز تھوڑا ہی ہے تو جب زمانہ کو ہم خود بدل سکتے ہیں تو ہم اس کو محفوظ بھی کر سکتے ہیں یہ اکبر حسین جج کا نکتہ ہے۔ بڑی اچھی بات ہے، کہتے تھے کہ لوگ زمانہ کی برائی کرتے ہیں کہ بھائی کیا کریں زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ جب تم سب بدل گئے تو یہی زمانہ کا بدلنا ہوگیا۔ زمانہ کوئی مستقل چیز تھوڑا ہی ہے، زمانہ تو تم خود ہو واقعی سچ کہا ہے، زمانہ کی حقیقت تو خود ہم ہی ہیں، ہم اگر نہ بدلیں تو زمانہ بھی نہ بدلے۔ کیا اچھی بات کہی، بڑا حکیمانہ دماغ تھا۔ فقط

میرے بچا جان نوراللہ مرقدہٗ کا بھی اصول اپنی تبلیغ میں یہی تھا کہ تم ماحول کے تابع مت بنو، ماحول کو اپنے تابع بناؤ، تم دنیاداروں اور بے دینوں کی روش پر نہ چلو، اپنی روش پر مضبوط جمے رہو، ماحول اپنے آپ بدل جائے گا، اللہ پاک کا بھی ارشاد سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے ''لا تمدن عینیک الیٰ ما متعنا به'' [الآیۃ] ہرگز ان چیزوں کی طرف آپ آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھیے، جن سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کے لیے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ دنیوی زندگی کی رونق ہے اور آپ کے رب کا عطیہ بدرجہا بہتر ہے اور دیرپا ہے۔

(ترجمۃ حکیم الامۃ)

ہمارے اجداد میں مولانا نور الحسن صاحب کاندھلوی مشہور اکابر علماء میں ہیں، جن کی ولادت ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۲۷ھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم تو اپنے اعمام واجداد سے حاصل کی اور ۱۲۴۷ھ میں تکمیل کے لیے دہلی کا سفر کیا اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی، مفتی صدر الدین صاحب وغیرہ اکابر سے تکمیل علم دین کی، طلب علم کا اتنا شوق تھا کہ مفتی صدر الدین صاحب نے ان کی درخواست پر وقت نہ ہونے کا عذر کر دیا، لیکن مولانا کے شدید اصرار پر مفتی صاحب نے یہ کہا کہ کچہری جاتے آتے وقت مل سکتا ہے، مولانا نور الحسن صاحب نے اس کو قبول کیا اور جب مفتی صاحب پالکی میں کچہری تشریف لے جاتے تو مولانا پالکی کے ساتھ دوڑتے ہوئے سبق پڑھتے جاتے اور کچہری جانے پر مولانا وہیں انتظار میں بیٹھے رہتے اور جب واپس

آتے تو واپسی میں بھی اسی طرح پالکی کے ساتھ دوڑتے ہوئے سبق پڑھتے۔

مفتی صاحب نے کئی مہینے جب اس شوق اور طلب کو دیکھا تو مستقل وقت تجویز کردیا، کچھ دنوں بعد انگریزی ملازمت، پھر ریاست الور کی ملازمت کے بعد اپنے وطن کاندھلہ تشریف لے آئے اور اپنے گھر کے قریب متصل مسجد میں درس جاری کردیا طلبہ کا ہجوم شروع ہوگیا، طلبہ کا کھانا بھی مولانا کے گھر سے آتا تھا اور اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ گھر کا کھانا طلبہ میں تقسیم ہوگیا اور گھر کے لوگ بھوکے رہ جاتے تھے۔

ایک مرتبہ سورت کے رئیس مولوی محمد سورتی شہرت سن کر تشریف لائے کئی نوکر اور بہت کچھ سامان ان کے ساتھ تھا نہایت شان وشوکت کا ایک عمدہ مکان کرایہ پر لے کر رہائش کا انتظام کیا اور روزانہ لباس بدل کر سبق کے لیے آتے ملازم کتاب لیے ساتھ ہوتا تھا اسی طرح چند روز گزرے۔

حضرت مولانا نورالحسن نے جب ان کو ذکی اور ہونہار پایا تو ایک دن فرمایا کہ صاحبزادے! باپ کی دولت اس طرح ضائع نہ کرو، اگر علم حاصل کرنا ہے تو یہ کپڑے اور پیالہ لو اور مسجد میں دیگر طلبہ کے ساتھ رہو، کھانا دونوں وقت گھر سے مل جایا کرے گا، اگر یہ نہیں ہوسکتا تو بے کار وقت اور دولت ضائع نہ کرو اس شان وشوکت کے ساتھ علم دین کی دولت ہاتھ نہیں آسکتی، انہوں نے پیالہ اور کپڑے ہاتھ میں لیے اور مسجد میں جا کر لباس کو تبدیل کیا اور ملازمین اور تمام سامان کو گھر واپس کردیا، پھر چند سال رہ کر تکمیل تعلیم کی

(منقول از رسالہ مشائخ کاندھلہ: ص ۱۵۰ مصنف مولوی احتشام الحسن مرحوم)

ارواحِ ثلاثہ میں لکھا ہے کہ حضرت نانوتوی نوراللہ مرقدہٗ کی خدمت میں حیدرآباد کے دو نواب زادے پڑھنے کے لیے آئے ہوئے تھے، حضرت کبھی کبھی ان سے پاؤں دبوایا کرتے تھے، ایک بار فرمایا:

"مجھ کو تو اس کی ضرورت نہیں کہ ان سے پاؤں دبواؤں مگر علم اسی طرح آتا ہے۔"

(ارواح ثلاثہ: ص ۲۷۶)

علم تو یقیناً اسی طرح حاصل ہوتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی مشہور سجادہ اپنے ابتدائی زمانہ میں میرے والد صاحب قدس سرہٗ سے پڑھنے کے لیے گنگوہ گئے تھے، میرے والد صاحب کے انتقال پر انہوں نے اپنے رسالہ منادی میں بہت طویل مضمون تعزیت کا لکھا تھا۔ جو میرے حجرہ کے جنگل میں کہیں محفوظ بھی ہوگا۔ انہوں نے بھی لکھا تھا کہ استاد نے میری سجادگی توڑنے کے لیے ایک پیالہ مجھے دیا ایک صاحب کے گھر کھانا مقرر کردیا اور حکم تھا کہ دونوں وقت خود جا کر لایا کرو۔ یہ بھی

لکھا تھا کہ استاد کے مسواک مارنے کے نشانات اب تک بھی شاید میرے بازوؤں پر ہوں کہ وضو کرتے ہوئے سبق پڑھایا کرتے تھے اور غلطی پر مسواک بازو پر مارا کرتے تھے اور بھی کئی واقعے تھے جو اس وقت یاد نہیں۔ کہیں رسالہ شاہد یا عزیزان مولوی عاقل و مولوی سلمان نے نکال دیا تو اور بھی واقعات مل جائیں گے۔

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کا قصہ تو بہت مشہور ہے کہ بخاریٰ کے امیر (گورنر) نے امام بخاری سے درخواست کی کہ وہ اس کے گھر جا کر اس کو اور اس کی اولاد کو حدیث پڑھایا کریں۔ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس سے انکار کر دیا کہ میں حدیث پاک کے علم کو ذلیل نہیں کرنا چاہتا۔ جس کو پڑھنا ہے، میری مجلس میں آجایا کرے۔ اس پر امیر بخاریٰ نے دوسری درخواست کی کہ میری اولاد کے لیے کوئی مخصوص وقت مقرر کر دیں، جس میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو۔ امام بخاری نے اس سے بھی انکار کر دیا کہ میں کسی قوم کے لیے وقت خاص نہیں کر سکتا، جس میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو۔ اس پر امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا بخاریٰ سے اخراج کیا گیا۔

(مقدمہ لامع)

حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی اس قسم کا واقعہ مشہور ہے کہ ہارون رشید نے ان کی خدمت میں ایک درخواست کی تھی کہ حریم خلافت میں قدم رنجہ فرما کر شہزادوں کو علم حدیث پڑھا دیں۔ "امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہلا بھیجا کہ علم کے پاس لوگ خود آتے ہیں، وہ دوسروں کے پاس نہیں جاتا"۔ انہوں نے اس بات سے ہارون کو اور بھی غیرت دلائی کہ "یہ علم تمہارے گھر سے نکلا ہے اگر تم ہی اس کی عزت نہ کرو گے تو وہ کیوں کر عزت پا سکتا ہے"۔

اس معقول جواب کو ہارون نے نہایت خوشی سے تسلیم کیا اور شہزادوں کو حکم دیا کہ امام موصوف کی درسگاہ عام میں حاضر ہوں۔ (تذکرہ دیوبند)

مقدمہ اوجز میں یہ قصہ اس طرح نقل کیا گیا کہ اول ہارون رشید نے مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ وہ اس کے گھر جا کر پڑھایا کریں۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ہارون رشید مع اپنی اولاد کے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی مجلس درس میں حاضر ہوا اور یہ درخواست کی کہ ہارون اور اس کی اولاد کے لیے مخصوص مجلس فرما دیں کہ اور کوئی شریک نہ ہو۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ فرمایا: "جب عوام کو خواص کی وجہ سے روکا جائے گا تو خواص کو بھی فائدہ نہیں ہوگا۔" (مقدمہ اوجز لیتھو)

مشائخ کاندھلہ میں حضرت مولانا نور الحسن صاحب کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے:

"حضرت مولانا نور الحسن صاحب کے حلقۂ درس میں جنات بھی شریک ہوتے تھے ایک مرتبہ

بعد مغرب ایک طالب علم کمرہ میں بیٹھ کر پڑھ رہا تھا کہ چراغ گل ہوگیا۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ جاؤ اس کو مسجد کے چراغ سے جلالاؤ، اس نے چراغ ہاتھ میں لیا اور وہیں کمرہ سے ہاتھ بڑھا کر مسجد کے چراغ سے روشن کیا۔ حضرت مولانا نے اس کو خوب سرزنش کی اور کہا کہ اگر کوئی دوسرا اس حرکت کو دیکھ لیتا تو ڈر جاتا۔ آیندہ اس قسم کی حرکت سے منع فرمایا۔''

(از زکریا) جنات کے واقعات تو ہمارے خاندانوں میں بہت کثرت سے علی التواتر مشہور ہیں اور بڑے عجیب قصے ہیں۔ یہاں تو بے محل ہو جائیں گے کہیں موقع ملا تو بیسیوں قصے تو مجھے بھی یاد ہیں۔

حضرت مولانا نورالحسن صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی اور بہت معروف کہ وہ بیک وقت کئی کام کیا کرتے تھے۔ بائیں ہاتھ سے تسبیح پڑھتے رہتے تھے، داہنے ہاتھ سے کتاب نقل کرتے رہتے تھے، ان کی لکھی ہوئی کتابیں ہمارے جدی کتب خانہ میں بہت تھیں۔ سامنے شاگرد سبق پڑھتے رہتے تھے۔ اس درمیان میں لوگ ملنے جلنے والے آتے رہتے تھے کوئی مسئلہ پوچھتا، کوئی اور بات دریافت کرتا تھا اس کے جواب ساتھ ساتھ نمٹاتے رہتے تھے۔ حضرت مولانا کی تصانیف بھی بہت مختلف فنون میں ہیں۔ جن کی تفصیل مشائخ کاندھلہ میں ہے۔ ۱۱محرم الحرام بروز سہ شنبہ بوقت شام ۱۲۸۵ھ کو وفات پائی۔ اللّٰھم اغفر له وارحمه و نور مرقدهٗ

طالبِ حدیث کے آداب اور اس سلسلے کے اکابر کے واقعات

اشرف السوانح جلد ا صفحہ ۴۷ میں لکھا ہے کہ حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ اپنے تجربہ کی بناء پر طلبہ کو یہ ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ تم تین باتوں کا التزام کرلو پھر میں ٹھیکہ لیتا ہوں اور ذمہ دار ہوتا ہوں کہ تمہیں استعداد علمی حاصل ہو جائے گی۔ اول یہ کہ جو سبق پڑھنا ہو اس کا مطالعہ ضرور کر لیا جائے اور مطالعہ کوئی مشکل کام نہیں کیونکہ مطالعہ کا مقصود صرف یہ ہے کہ معلومات اور مجہولات متمیز ہو جائیں بس اس سے زیادہ کاوش نہ کرے پھر سبق کو استاد سے اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لے بلا سمجھے آگے نہ چلے۔ اگر اس وقت استاد کی طبیعت حاضر نہ ہو تو پھر کسی دوسرے وقت سمجھ لے اس کے بعد ایک بار خود بھی مطلب کی تقریر کرے بس ان تینوں التزامات کے بعد پھر بے فکر رہے چاہے یاد رہے یا نہ رہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ استعداد ضرور پیدا ہو جائے گی۔ یہ تینوں باتیں تو درجہ وجوب میں ہیں اور ایک بات درجہ استحباب میں ہے وہ یہ کہ کچھ آموختہ بھی روزانہ دہرالیا کرے۔

مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے نظام تعلیم و تربیت صفحہ ۳۹۴ میں اکابر کے درس و تدریس کے واقعات کثرت سے لکھے ہیں۔ اس میں لکھتے ہیں کہ ایک سید میر اسماعیل بلگرامی

مختلف حلقۂ درس سے استفادہ کرتے ہوئے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی خدمت میں پہنچے اور استاد سے عرض کیا کہ مجھے کوئی وقت دیا جائے انہوں نے فرمایا کہ مستقل وقت تو ہے نہیں فلاں طالب علم کے سبق میں شریک ہوجایا کریں اور اس کو سنتے رہا کریں۔ چند ہفتے گزر گئے۔ میر اسماعیل نے کوئی سوال اعتراض وغیرہ استاد سے نہ کیا۔ جو زمانہ کے اعتبار سے بہت بعید چیز تھی۔ اس زمانہ کی طرح سے یہ طریقہ تو تھا نہیں کہ استاد تقریر کرتا رہے اور طالب علم سننے والوں کی صورت بنا کر بیٹھا رہے۔ استاد کے لیے نو وارد طالب علم کا یہ رویہ نا قابل برداشت تھا اس لیے ملا عبدالحکیم نے شاگرد سے مطالبہ کیا کہ زمانہ گزر گیا، تمہاری طرف سے کوئی سوال واعتراض نہیں ہوا؟

شاگرد نے عرض کی کہ مجھے سبق سننے کی اجازت ہوئی تھی بولنے کی نہیں۔ اگر فقیر کے لیے جو بلگرام سے صرف آپ سے پڑھنے کے لیے سیالکوٹ آیا تھا۔ کچھ وقت تجویز فرمائیں احسان ہوگا، استاد نے کہا کہ آج کل عصر سے مغرب تک درمیان میں کچھ وقت مل سکتا ہے فقط۔ ان اکابر کے یہاں کچھ چار، چھ گھنٹے کی پابندی نہیں تھی، شاید آپ بیتی میں کسی جگہ لکھا جاچکا ہے کہ میرے چچا جان کے یہاں عزیز یوسف مرحوم اور ان کی جماعت کے لیے مستدرک کا وقت صبح کی اذان کے بعد تھا اور میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہ کے یہاں تو ہر وضو کے ساتھ ایک مستقل سبق ہوتا تھا۔

مولانا مناظر احسن صاحب شاہ عبدالحق صاحب کے متعلق نظام تعلیم وتربیت صفحہ ۲۰۲ میں لکھتے ہیں کہ جب مطالعہ کرتے ہوئے آدھی رات سے زیادہ گزر جاتی تو والد صاحب از راہ شفقت فرماتے تھے بابا کیا کر رہے ہو، میں جلدی سے لیٹ کر کہتا کہ سویا ہوا ہوں کیا ارشاد ہے، اس کے تھوڑی دیر بعد اٹھ جاتا اور پھر مطالعہ میں لگ جاتا، شیخ نے یہ بھی لکھا کہ چراغ بعض مرتبہ میری دستار اور بال میں لگ جاتا اور مجھے پتہ نہیں چلتا۔

حضرت سلطان نظام الدین کے متعلق لکھا ہے کہ طلب علمی کے زمانہ میں اساتذہ سے سوال و جواب کی وجہ سے ان کا نام نظام الدین بحاث پڑ گیا تھا، دوسری جگہ صفحہ ۲۶۰ پر سلطان المشائخ کے طالب علمی کا حال لکھتے ہیں کہ میں خود نے اپنی دادی کی روایت سے نقل کیا کہ سلطان المشائخ جب بابا فرید الدین سے عوارف وغیرہ پڑھتے تھے، عمر بیس سال کی تھی تو میں نے دیکھا کہ سلطان المشائخ کے کپڑے بالکل گندے ہوگئے ہیں، میری دادی سے ان کا حال نہ دیکھا گیا انہوں نے اصرار کیا کہ تمہارے کپڑے بہت گندے اور بوسیدہ ہوگئے ہیں، اگر آپ دے دیں تو میں اس کو دھو دوں اور پیوند لگا دوں۔ اول تو انہوں نے مانا نہیں، بڑی منت سماجت کے بعد راضی ہوئے تو دادی نے اپنی چادر دے دی تاکہ وہ اوڑھ لیں اور دادی نے دھو کر پیوند لگا کر دیئے، سلطان المشائخ کے پاس دوسرا جوڑا بھی نہیں تھا جس کو وہ پہن لیتے اتنی دیر میری دادی کی چادر اوڑھے رہے، ایک

کتاب لے کر کونہ پر چلے گئے اور جب تک کپڑے دھلے اور پیوند لگے کتاب دیکھتے رہے۔

ارواحِ ثلاثہ میں لکھا ہے کہ مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی شاہ عبدالقادر صاحب سے حدیث پڑھتے تھے۔شاہ صاحب بڑے صاحب کشف تھے،اس خاندان میں آپ کا کشف سب سے بڑا ہوا تھا،جس روز مولوی فضل حق صاحب کسی ملازم پر کتابیں رکھوا کر لے جاتے گو پہنچنے سے پہلے خود لے لیتے شاہ صاحب کو کشف سے معلوم ہو جاتا تھا اسی روز مولوی صاحب کو سبق نہیں پڑھاتے تھے اور جب خود لے جاتے حضرت کو کشف ہو جاتا اس روز سبق پڑھاتے۔

(ارواح ثلاثہ:ص ۵۷)

ارواحِ ثلاثہ میں لکھا ہے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سفرِ حج میں تھے،اس سفر میں آپ کا جہاز ایک بندرگاہ پر ٹھہر گیا مولانا کو معلوم ہوا کہ یہاں جہاز چند روز قیام کرے گا چونکہ آپ کو معلوم ہوا کہ یہاں سے قریب کسی بستی میں ایک بہت معمر عالم اور محدث رہتے ہیں۔اس لیے جہاز سے اتر کر ان کی خدمت میں روانہ ہو گئے جب ان کی خدمت میں پہنچے اور گفتگو ہوئی تو مولانا کو ان کی شہرت علم کی تصدیق ہو گئی اور آپ نے ان سے حدیث کی سند کی درخواست کی ان عالم صاحب نے دریافت کیا کہ تم نے کس سے حدیث پڑھی ہے،مولانا نے فرمایا شاہ عبدالغنی صاحب سے وہ عالم شاہ عبدالغنی صاحب کو نہ جانتے تھے،اس لیے دریافت کیا کہ شاہ عبدالغنی صاحب نے کس سے پڑھی ہے مولانا نے فرمایا شاہ اسحاق صاحب سے وہ شاہ اسحاق صاحب سے بھی واقف نہ تھے اس لیے پوچھا کہ شاہ اسحاق صاحب نے کس سے پڑھی ہے،مولانا نے فرمایا شاہ عبدالعزیز صاحب سے،وہ شاہ عبدالعزیز صاحب سے واقف تھے،جب ان کا نام سنا تو فرمایا کہ اب میں تم کو سند دوں گا اور یہ بھی فرمایا:

''شاہ ولی اللہ طوبیٰ کا درخت ہے۔''

پس جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں جنت ہے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں ہیں وہاں جنت نہیں،یوں ہی جہاں شاہ ولی اللہ کا سلسلہ ہے وہاں جنت ہے اور جہاں ان کا سلسلہ نہیں وہاں جنت نہیں،اس کے بعد انہوں نے مولانا کو حدیث کی سند دے دی۔خان صاحب نے فرمایا کہ یہ قصہ خود میں نے حضرت مولانا نوتوی سے بھی سنا ہے۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ باوجود کامل ہونے کے دوسرے اہل کمال سے استفادہ فرمانا کمال تواضع وحرصِ دین کی دلیل ہے۔''**وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون**'' ارواحِ ثلاثہ صفحہ ۲۰۷،حضرت شیخ کا طوبیٰ سے تشبیہ دینا بالکل صحیح ہے،میں نے اپنے ابتدائی مدرسے میں ۴۰ھ میں جہاں تک یاد ہے چالیس سے زیادہ جوابی کارڈ مختلف مدارس

میں لکھے تھے، چاہے وہ اہل حدیث کا ہو یا اہل بدعت کا ہو، کسی بھی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو، مجھے غیر منقسم ہندوستان میں اس وقت کوئی شیخ الحدیث ایسا نہیں ملا تھا جس کا سلسلہ سند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے بچ کر نکلا ہو۔ یہ تو کثرت سے ملا کہ ایک سند شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے سلسلہ کی اور دوسری سند دوسرے سلسلہ کی اس طرح خود میرے شیخ حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہ کی متعدد اسانید ہیں جو مقدمہ اوجز میں تفصیل سے ذکر کی گئی ہیں، حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کی بھی متعدد سندیں ہیں جیسا کہ الیانع الجنی میں ہے، لیکن کوئی ایسا شیخ غیر منقسم ہندوستان میں مجھے نہیں ملا جس کی کسی سند میں حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نہ آتے ہوں حضرت دہلوی نور اللہ مرقدہٗ کے ملفوظات میں مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے طلبہ کے متعلق تین اصول بہت ہی تفصیل سے لکھوائے ہیں کئی صفحوں پر ہیں ان کا بعینہ نقل کرانا تو بہت مشکل ہے کہ بہت طویل ہیں مگر اس قابل ہیں کہ ہر طالب علم کو دیکھنا چاہیے۔

وہ حضرت دہلوی کے مرض الوصال کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ آج بتاریخ ۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۳ھ بروز چہار شنبہ رات میں دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کی ایک جماعت آئی۔ رات بوقتِ عشاء حضرت کو اسہال کا ایک دورہ ہوگیا تھا، جس سے ضعف انتہا کو پہنچا ہوا تھا بات کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ بعد نمازِ فجر خاکسار مرتب کو بلایا اور ارشاد فرمایا کان بالکل میرے لبوں سے لگادو اور سنو! یہ طلبہ اللہ کی امانت اور اس کا عطیہ ہیں، ان کی قدر اور اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ ان کا وقت ان کی حیثیت کے مناسب پورے اہتمام میں کام میں لگایا جائے اور ذرا سا وقت بھی ضائع نہ جائے۔ یہ بہت کم وقت لے کر آئے ہیں، پہلے میری دو تین باتیں انہیں پہنچادو۔

(۱)......اپنے تمام اساتذہ کی توقیر اور ان سب کا ادب واحترام آپ کا خصوصی اور امتیازی فریضہ ہے۔ آپ کو ان کی ایسی تعظیم کرنی چاہیے جیسی کہ ائمہ دین کی کی جاتی ہے، وہ آپ لوگوں کے لیے علم نبوی کے حصول کا ذریعہ ہیں اور جس شخص نے کسی کو دین کی ایک بات بھی بتلائی، وہ اس کا مولیٰ ہوجاتا ہے، پھر علم دین کے مستقل اساتذہ کو جو حق ہے، وہ سمجھا جاسکتا ہے بلکہ اگر ان کے درمیان کچھ نزاعات بھی ہوں تب بھی ادب اور تعظیم کا تو تعلق سب کے ساتھ یکساں رہنا چاہیے خواہ محبت کسی کے ساتھ کم اور کسی کے ساتھ زیادہ ہو لیکن عظمت میں فرق نہیں آنا چاہیے اور دل میں ان کی طرف سے بدی نہ آنا چاہیے۔

قرآن مجید نے تو ہر مومن کا یہ حق بتایا ہے کہ ان کی طرف سے اپنے دلوں کے صاف رہنے کی اللہ تعالیٰ سے دعاء کی جایا کرے۔ فرمایا ''وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا'' (اور نہ رکھ ہمارے دلوں میں ایمان والوں کا کینہ) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے'' لا

یبلغنی احد عن احد شیئاً فانی احب ان اخرج الیکم وا نا سلیم الصدر ''(تم میں سے کوئی مجھے ایک دوسرے کی باتیں نہ پہنچایا کرے میں چاہتا ہوں کہ میں جب تمہارے پاس آؤں تو میرا سینہ سب کی طرف سے صاف ہو۔)

(۲)......علمِ دین کے اساتذہ کے حقوق کا معاملہ اور بھی زیادہ نازک ہے تو ان طلبہ کو میرا ایک پیغام تو یہ پہنچاؤ کہ اپنی زندگی کے اس پہلو کی اصلاح کی یہ خاص طور سے فکر کریں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ''علم لا ینفع'' سے پناہ مانگی اور اس کے علاوہ بھی عالم بے عمل کے لیے جو سخت وعیدیں قرآن وحدیث میں آئی ہیں وہ آپ کے علم میں ہیں۔

(۳)......تیسری بات ان طلبہ سے یہ کہی جائے کہ ان کا وقت بڑا قیمتی ہے اور وہ بہت تھوڑا وقت لے کر آئے ہیں۔ لہٰذا اس کا ایک لمحہ بھی یہاں ضائع نہ کریں بلکہ یہاں کے اصولوں کے مطابق تعلیم و مذاکرہ کے کاموں میں لگے رہیں۔ اھ مختصراً (ملفوظات حضرت دہلوی: ص ۱۲۷)

بہت طویل مضمون ہے اور بہت اہم۔ اعتدال میں بھی اس مضمون پر بہت طویل کلام لکھا ہے اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ طے شدہ امر ہے اور عادت اللہ ہمیشہ سے یہی جاری ہے کہ اساتذہ کا احترام نہ کرنے والا کبھی بھی علم سے منتفع نہیں ہوسکتا۔ جہاں کہیں ائمہ فن طالب علم کے اصول لکھتے ہیں، اس چیز کو نہایت اہتمام سے ذکر فرماتے ہیں اور محدثین نے تو مستقل طور پر آداب طالب کا باب ذکر کیا ہے جو اوجز المسالک کے مقدمہ میں مفصل مذکور ہے اس میں اس چیز کو خاص طور سے ذکر کیا ہے۔

امام غزالی علیہ الرحمۃ نے بھی ''احیاء العلوم'' میں اس پر مفصل بحث فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ استاد کے ہاتھ میں کلیۃً اپنی بات دے دے اور بالکل اسی طرح انقیاد کرے جیسا کہ بیمار مشفق طبیب کے سامنے ہوتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: ''جس نے مجھے ایک حرف پڑھا دیا میں اس کا غلام ہوں۔ چاہے وہ مجھے فروخت کر دے یا غلام بنا دے''۔

علامہ زرنوجی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''تعلیم المتعلم'' میں لکھا ہے کہ میں طلبہ کو دیکھتا ہوں کہ وہ علم کے منافع سے بہرہ یاب نہیں ہوتے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ علم حاصل کرنے کے شرائط اور آداب کا لحاظ نہیں رکھتے اسی وجہ سے محروم رہتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے ایک مستقل فصل اساتذہ کی تعظیم کے ضروری ہونے میں لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں طالب علم علم سے منتفع ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ علم اور علماء اور اساتذہ کا احترام نہ کرے۔ جس شخص نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ احترام سے کیا ہے اور جو گرا ہے وہ بے حرمتی سے گرا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''یہی وجہ ہے کہ آدمی گناہ سے کافر نہیں ہوتا دین کے کسی جزو کی بے حرمتی کرنے سے کافر ہوجاتا ہے۔''

''ونعم ما قیل'':

از خدا خواہیم توفیق ادب
بے ادب محروم گشت از فضل رب

ہم اللہ تعالیٰ سے ادب کی توفیق چاہتے ہیں کہ بے ادب اللہ کے فضل سے محروم ہوتا ہے۔ ادب تاجیست از فضل الٰہی، بنہ بر سر برو ہر جا کہ خواہی۔ یعنی ادب فضل خداوندی کا ایک زبردست تاج ہے، اس کو سر پر رکھ کر جہاں چاہے چلتے جاؤ اور یہ مثل تو مشہور ہے، باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب۔

امام سعد الدین شیرازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''میں نے مشائخ سے سنا ہے جو شخص یہ چاہے کہ اس کا لڑکا عالم ہوجائے اس کو چاہیے کہ علماء کا اعزاز واکرام بہت کرتا رہے اور ان کی خدمت کثرت سے کرے اگر بیٹا عالم نہ ہوا تو پوتا ضرور عالم ہوجائے گا۔''

امام شمس الائمہ حلوانی کا قصہ مشہور ہے کہ وہ کسی ضرورت سے کسی گاؤں میں تشریف لے گئے۔ وہاں جتنے شاگرد تھے وہ استاد کی خبر سن کر زیارت کے لیے حاضر ہوئے مگر قاضی ابوبکر حاضر نہ ہوسکے۔ بعد میں جب ملاقات ہوئی تو استاد نے دریافت کیا۔ انہوں نے والدہ کی کسی ضروری خدمت بجالانے کا عذر کیا۔ شیخ نے فرمایا:

''رزق میں وسعت ہوگی مگر رونق درس حاصل نہ ہوگی۔''

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ویسے بھی عام طور سے مشہور ہے کہ والدین کی خدمت رزق میں زیادتی کا سبب ہوتی ہے اور اساتذہ کی خدمت علم میں ترقی کا۔

میرا تو تجربہ یہاں تک ہے کہ انگریزی طلبہ میں بھی جو لوگ طالب علمی میں اساتذہ کی مار کھاتے ہیں، وہ کافی ترقیاں حاصل کرتے ہیں۔ اونچے اونچے عہدوں پر پہنچتے ہیں۔ جس غرض سے وہ علم حاصل کیا تھا، وہ نفع پورے طور پر حاصل ہوتا ہے اور جو اس زمانہ میں استادوں کے ساتھ نخوت و تکبر سے رہتے ہیں، وہ بعد میں اپنی ڈگریاں لیے ہوئے سفارشیں ہی کراتے ہیں۔ کہیں اگر ملازمت مل بھی جاتی ہے تو آئے دن اس پر آفات ہی رہتی ہیں۔ بہرحال جو علم بھی ہو اس کا کمال اس وقت تک ہوتا ہی نہیں اور اس کا نفع حاصل ہی نہیں ہوتا، جب تک کہ اس فن کے اساتذہ کا ادب نہ کرے چہ جائیکہ ان سے مخالفت کرے۔

کتاب ''ادب الدنیا والدین'' میں لکھا ہے کہ طالب علم کے لیے استاد کی خوشامد اور اس کے سامنے تذلل (ذلیل بننا) ضروری ہے۔ اگر ان دونوں چیزوں کو اختیار کرے گا نفع کمائے گا اور دونوں کو چھوڑ دے گا تو محروم رہے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ طلب علم کے سوا کسی چیز میں خوشامد کرنا مومن کی شان نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''میں طالب علم ہونے کے وقت ذلیل بنا تھا اس لیے مطلوب ہونے کے وقت عزیز بنا''۔

بعض حکیموں کا قول نقل کیا ہے:

''جو طلب علم کے تھوڑی سی ذلت کو برداشت نہیں کرتا ہمیشہ جہل کی ذلت میں رہتا ہے۔''

(اعتدال: ص ۴۸)

اعتدال میں دوسری جگہ یہ ہے کہ امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ طالب علم کے لیے بہت سے آداب و شرائط ہیں ان میں سے اہم اور اصل اصول دس ہیں ان کے منجملہ ایک یہ بھی ہے کہ اپنے آپ کو کسی دوسری چیز میں مشغول نہ کرے۔ اہل وعیال اور وطن سے دور جا کر علم حاصل کرے۔ تاکہ خانگی ضروریات مشغول نہ بنائیں کہ تعلقات ہمیشہ علم سے پھیرنے والے ہوتے ہیں اور اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے ''ما جعل اللّٰہ لرجل من قلبین فی جوفہ''۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے کسی آدمی کے دو دل نہیں پیدا فرمائے ہیں، اسی وجہ سے مشہور ہے کہ علم اس وقت تک تجھ کو اپنا تھوڑا سا حصہ بھی نہیں دے گا جب تک کہ تو اپنے آپ کو ہمہ تن اس کے حوالے نہ کردے۔ وہ فرماتے ہیں:

''جو دل مختلف چیزوں میں مشغول رہے وہ کھیت کی اس نالی کی طرح ہے جس کی ڈول بنی ہوئی نہ ہو کہ کچھ حصہ اس میں اِدھر اُدھر چلا جائے گا اور کچھ حصہ پانی کا ہوا بن کر اڑ جائے گا، صرف تھوڑا سا پانی رہے گا جو کھیت کے لیے کارآمد نہ ہو سکے گا۔'' (اعتدال: ص ۴۲)

میں نے بچپن میں والد صاحب سے ایک قصہ سنا تھا اور کئی دفعہ سنا کہ ایک متاہل شخص نے عربی پڑھنی شروع کی اور گھر کی ضروریات نے اس کو پریشان کرنا شروع کیا بیوی، بچے والا تھا وہ طلب علم کے شوق اور جذبہ میں بڑی دور نکل گیا، پڑھنا شروع کیا کچھ دنوں گھر والوں کو پتہ نہیں چلا۔ پھر پتہ چلا تو خطوط کی بھرمار شروع ہوگئی۔ دو چار خط تو انہوں نے پڑھے جس میں پریشانیاں بلانے کا سخت تقاضہ طبیعت پریشان ہوئی، انہوں نے غسل خانہ میں سے ایک ٹوٹا ہوا گھڑا لا کر اپنے حجرے میں رکھ لیا اور دس بارہ سال تک جو خط، جو تار، جو رجسٹری آئی بغیر پڑھے اس میں ڈالتے رہے آٹھ سال تک رخ بھی نہ کیا۔ فراغ ہونے کے بعد گھڑے کو الٹا پرانے خطوط اوپر آگئے ترتیب وار پڑھنا شروع کیے۔ کسی میں بچہ کی بیماری تھی کسی میں بچی کی یاد کا ذکر تھا۔ کسی میں بیوی کی بیماری کا

ذکر تھا۔ کسی میں بیوی کا انتقال، ماں کا انتقال، باپ کا انتقال، جب دیکھا کہ سب ہی عزیز و اقارب چل دیئے تو یوں سوچ کر کہ اب جا کر کیا کروں گا وہیں مدرسی شروع کردی۔ فقہی حیثیت سے تو علماء ہی بتادیں گے مگر کام تو اسی طرح ہوتا ہے کام بغیر اس کے نہیں ہوتا۔

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر۳

''اکابر کا طلبِ علم میں انہماک''

میں آپ بیتی نمبر۴ میں اپنے والد صاحب کے حالات میں لکھ چکا ہوں کہ میرے والد صاحب کے طالب علمی کے زمانہ میں ڈاکٹروں نے یہ کہہ دیا تھا کہ ان کی آنکھوں میں نزولِ آب شروع ہوگیا کتب بینی ہرگز نہ کیا کریں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے یہ خبر سن کر کتب بینی میں اتنی محنت کی اس خیال سے کہ پھر تو یہ آنکھیں جاتی رہیں گی۔ جو کرنا ہے ابھی کرلیں۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ مدرسہ حسین بخش والوں کا اصرار ان کے والد یعنی میرے دادا پر یہ تھا کہ وہ دورۂ حدیث میں شریک ہوں، جس پر والد صاحب نے انکار کردیا، لیکن امتحان میں شرکت قبول کرلی۔ نظام الدین کے ایک حجرہ میں جو بہت ہی تنگ و تاریک تھا اور اس میں جنگل کی طرف ایک دروازہ کھلا ہوا تھا وہاں پر اب کھڑکی ہے، اس میں شب و روز مطالعہ میں مشغول رہتے اور ایک دولڑکے متعین تھے کہ وہ اذان کے بعد ایک دولوٹے وضو، استنجاء کے لیے رکھ دیں اور دونوں وقت کھانا لاکر اسی کھڑکی میں سے میرے پاس رکھ دیں۔

اس زمانہ میں کاندھلہ سے ایک تار شادی کے سلسلہ میں ان کے بلانے کا آیا تو نظام الدین کے حضرات نے یہ کہہ کر واپس کردیا کہ وہ کئی ماہ سے یہاں نہیں ہیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے پانچ چھ ماہ میں بخاری شریف، سیرت ابنِ ہشام، طحاوی، ہدایہ، فتح القدیر اتنے انہماک سے دیکھی کہ جس کے بعد امتحان کی تعریف حضرت سہارنپوری ممتحن نے بڑے مجمع میں کی اور اسی بناء پر حضرت گنگوہی سے سفارش کی، جس پر حضرت گنگوہی نے آخری دورہ پڑھایا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ سبق کے بعد سب سے پہلے میں استاد کی تقریر عربی میں نقل کرتا تھا، اس کی مدد سے دوسرے رفقاء درس اردو میں اپنی تقریریں نقل کیا کرتے تھے۔ یہ قصہ بھی گزر چکا ہے کہ پورے دورہ میں ان کی ایک حدیث بھی ایسی نہ گزری جو استاد کے سامنے نہ پڑھی گئی ہو۔

آپ بیتی نمبر۴ پر مولوی شیر محمد صاحب ولایتی کا قصہ بھی بہت مفصل لکھوا چکا ہوں کہ میرے والد صاحب نے ان کو چار ماہ میں پورا دورہ گنگوہ میں پڑھایا۔ عشاء کے بعد سبق شروع ہوتا اور سحر تک جاری رہتا۔ ''فوائد جامعہ شرح عجالہ نافعہ'' صفحہ ۱۲ میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ پڑھنے کے زمانہ میں جاڑے کی سخت ٹھنڈی ہوا اور گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں ہر روز دوبار دہلی کے مدرسہ میں جاتا تھا۔ جو غالباً ہمارے مکان سے دو میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ دوپہر

کو گھر میں بس اتنی قیام رہتا جتنی دیر میں ایسے چند لقمے کھالیتا جو عادۃً صحتِ جسم کو برقرار رکھے۔ بس اوقات ایسا ہوتا کہ سحر سے پہلے مدرسہ پہنچ جاتا اور چراغ کے سامنے صبح تک ایک ایک جزء لکھ لیتا عجب تربات یہ کہ تمام اوقات پڑھی ہوئی کتب اور کتابوں کی بحث اور تکرار میں مشغول ہوئے پھر بھی میں ان شروح اور حواشی کو جو مطالعہ سے گزرتی قلم بند کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ میرے والدین فرمایا کرتے تھے کہ رات کو وقت پر سویا کرو اور دن میں کچھ وقت بچوں کے ساتھ کھیلا کرو۔ میں کہتا کہ آخر کھیل کود سے غرض تو دل ہی کو خوش کرنا ہے۔ میرا جی اسی سے خوش ہوتا ہے کہ میں کچھ پڑھوں، لکھوں۔

اعلیٰ حضرت گنگوہی کا علمی انہماک

ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ میں شاہ عبدالغنی صاحب کی خدمت میں جب پڑھا کرتا تھا جہاں پر میرا کھانا مقرر تھا وہاں میں خود لینے جایا کرتا تھا۔ راستہ میں ایک مجذوب پڑے رہا کرتے تھے۔ ہمیں پڑھنے کی طرف اس قدر مشغولیت تھی کہ درویش کیا کسی چیز کی طرف بھی طبیعت کو التفات نہ تھا۔

ایک روز وہ مجذوب مجھ سے بولے ''کہ مولوی تو کہاں جایا کرتا ہے۔''

''میں نے عرض کیا کھانا لینے جایا کرتا ہوں''۔

''انہوں نے کہا کہ میں تجھ کو دونوں وقت اسی طرف جاتا دیکھتا ہوں۔ کیا دوسرا راستہ نہیں ہے''؟۔

میں نے عرض کیا:

''دوسرا راستہ بازار میں ہوکر ہے، وہاں ہر قسم کی چیز پر نگاہ پڑتی ہے، شاید کسی چیز کو دیکھ کر طبیعت کو پریشانی ہو۔''

مجذوب نے کہا:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تجھے خرچ کی تکلیف رہتی ہے۔ میں تجھ کو سونا بنانا بتلا دوں گا، تو میرے پاس کسی وقت آئیو۔''

''میں اس وقت تو حاضری کا اقرار کر آیا، مگر خانقاہ پہنچ کر پڑھنے لکھنے میں یاد ہی نہ رہا۔''

دوسرے دن وہ مجذوب پھر ملے اور کہا: ''مولوی تو آیا نہیں۔''

''میں نے کہا کہ مجھے پڑھنے سے فرصت نہیں ہوتی جمعہ کو آؤں گا۔''

الغرض جمعہ آیا اور اس دن بھی کتاب وغیرہ دیکھنے میں مجھے یاد نہ رہا

اور وہ پھر ملے پھر انہوں نے کہا: ''مولوی تو وعدہ کر گیا تھا اور نہیں آیا۔''

میں نے عرض کیا: ''مجھے تو یاد نہیں رہا۔''

آخر دوسرے جمعہ کا وعدہ کیا اور اسی طرح کئی جمعہ بھولا۔

آخر ایک جمعہ کو وہ مجذوب خود میرے پاس خانقاہ میں آئے اور مجھے شاہ نظام الدین صاحب کی درگاہ میں لے گئے۔ وہاں ایک گھاس مجھے دکھائی اور مقامات بتائے کہ فلاں فلاں جگہ یہ گھاس ملتی ہے اور مجھ سے کہا کہ خوب دیکھ لے۔

میں نے اچھی طرح پہچان لی آخر وہ تھوڑی سی توڑ کر لائے اور میرے حجرہ میں آکر مجھے سامنے بٹھا کر اس سے سونا بنایا۔ سونا بن گیا اور مجھے بنانا آگیا۔

وہ مجذوب مجھ سے یہ کہہ کر کہ اس کو بیچ کر اپنے کام میں لائیں اور اپنے مقام پر چلے گئے۔

مجھے کتاب کے مطالعہ کے آگے اتنی مہلت کہاں تھی کہ اس کو بازار میں بیچنے جاؤں۔

آخر دوسرے دن وہ مجذوب پھر ملے اور کہا:

''مولوی تو نے وہ سونا بیچا نہیں، خیر میں ہی بیچ لاؤں گا۔ دوسرے وقت آئے اور میرے پاس سے وہ لے گئے اور بیچ کر اس کی قیمت مجھ کو لا دی۔

پھر ایک روز وہی مجذوب ملے اور کہنے لگے کہ مولوی میں یہاں سے جاتا ہوں تو میرے ساتھ چل اور اس بوٹی کو پھر دیکھ لے۔

غرض پھر مجھے ساتھ لے چلے اور سلطان جی صاحب میں وہ بوٹی پھر دکھائی اس کے بعد پھر کہیں چلے گئے۔ (تذکرۃ الرشید حصہ دوم: ص ۲۸۸)

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ جب میں استاذی مولانا مملوک العلی صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں پڑھتا تھا میرے تمام بدن کے اوپر خارش نکل آئی۔ میں ہاتھوں میں دستانے پہن کر سبق پڑھنے کے لیے حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان ایام میں بھی ایک دن سبق ناغہ نہیں کیا۔ ایک روز مجھ کو زیادہ خارش میں مبتلا دیکھ کر حضرت استاذی نے فرمایا کہ میاں رشید تمہارا تو وہ حال ہو گیا بقول شخصے:

یکتن و خیل آرزو دل بچہ مدعا دہم
تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(تذکرہ الرشید: ص ۲۷۴ / ج ۲)

دیگر اکابر کے واقعات

مشائخ کاندھلہ صفحہ ۷۱ میں مفتی الٰہی بخش صاحب کے متعلق ایک عجیب قصہ لکھا ہے کہ ایک

مرتبہ دہلی میں بعض علماء کے درمیان بعض مسائل میں بحث ہوگئی اور آپس میں طے نہ کر سکے۔ شاہ دہلی نے اس کو قلم بند کرا کر ایک شتر سوار کے ہاتھ کاندھلہ مفتی صاحب کے پاس بھیجا، شتر سوار مغرب کے وقت پہنچا اور مفتی صاحب کی خدمت میں وہ سوالات پیش کیے۔ مفتی صاحب نے اسی مجلس میں برجستہ ان کے جواب مع حوالۂ کتب تحریر فرما کر طلبہ کے حوالے کیے کہ ان حوالوں کو اصل کتب سے ملالیں اور خود کھانا کھانے اندر تشریف لے گئے۔ اتنے میں حضرت مفتی صاحب کھانا کھا کر تشریف لائے طلبہ نے حوالوں کا کتابوں سے مقابلہ کر لیا تھا اور اسی وقت جواب لفافہ میں بند کر کے شتر سوار کے حوالہ کر دیا۔ شتر سوار نے عرض کیا کہ حضور شاہی حکم یہ ہے کہ جواب ملنے تک ٹھہرنا، اس کے بعد دیر نہ کرنا حضور میں صبح کا چلا ہوا ہوں، تھک رہا ہوں، حضور جواب صبح کو عطاء فرمادیں۔ چنانچہ مفتی صاحب نے صبح کو عطاء کیا اور وہ شام تک دہلی پہنچ گیا اور جب ان جوابات کو علماء کرام کے سامنے رکھا گیا تو سب نے ان کی صحت کو تسلیم کیا اور حیران رہ گئے کہ ایسے مغلق مسائل کا استدلال جواب، اس تھوڑے سے وقت میں کس طرح لکھا گیا۔ فقط

نظام تعلیم وتربیت صفحہ ۸۴ میں شیخ جنید حصاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق لکھا ہے کہ تین دن میں پورا قرآن شریف مع اعراب یعنی زیر، زبر، پیش کے نہایت خوشخط لکھا اور شیخ علی متقی نے اپنے استاذ کی تعمیل ارشاد میں بارہ ہزار اشعار کی کتاب بارہ راتوں میں پوری کر دی اور دن میں دوسرے مشاغل بھی رہتے تھے۔ صرف رات میں نقل کی جاتی تھی۔ اسی کتاب صفحہ ۸۹ میں مولانا عصمت اللہ صاحب سہارنپوری کے متعلق لکھا ہے کہ مولانا آزاد ارقام فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے مشہور علماء میں سے ہیں گونا بینا ہیں، لیکن شرح جامی اور تصریح کے جس نے حواشی دیکھے ہیں وہ اندازہ کر سکتا ہے کہ مولانا کو اللہ جل شانہٗ نے کتنی استعداد عطاء فرمائی ہے۔ بالخصوص تصریح کے حواشی ان سے بہتر میں نے نہیں دیکھے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ شاہ عبدالعزیز نور اللہ مرقدہٗ کی بینائی تو عرصہ سے جا چکی تھی لیکن اخیر عمر میں تھوڑی دیر کے لیے اختلاج قلب کا بھی دورہ ہونے لگا تھا اور اختلاجی دورہ کے وقت حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ مکان سے نکل کر جامع مسجد تک ٹہلتے تھے اور اس چلنے کی حالت کے باوجود اختلاج کے مقامات حریری کا سبق پڑھایا کرتے تھے۔ مقامات حریری کے سبق کا وقت یہی مقرر تھا جب وہ باہر تشریف لے جائیں تو شاگرد ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے یہ ناکارہ حکایات صحابہ کے اخیر میں اکابر کا انہماک اور بہت سے ان کے کارنامے تفصیل سے لکھ چکا ہے۔ مثال کے طور پر دو ایک واقعے یہاں نقل کراتا ہوں۔ امام دارقطنی حدیث کے مشہور امام رہے ایک مرتبہ استاذ کی مجلس میں بیٹھے تھے استاذ پڑھ رہے تھے اور یہ کوئی کتاب نقل کر رہے تھے ایک ساتھی نے اعتراض کیا کہ تم دوسری طرف متوجہ ہو۔ کہنے لگے کہ میری اور تمہاری توجہ

میں فرق ہے۔ بتاؤ استاذ نے اب تک کتنی حدیثیں سنائی، وہ سوچنے لگے۔ دارقطنی نے کہا کہ شیخ نے اٹھارہ حدیثیں سنائی ہیں پہلی یہ تھی، دوسری یہ تھی، اسی طرح ترتیب وار سب کے سب مع سند سنادیں۔ حافظ اثرم مشہور محدث ہیں۔ حج کو تشریف لے گئے۔ وہاں خراسان کے دو بڑے استاذ حدیث حرم شریف میں علیحدہ علیحدہ درس دے رہے تھے۔ ہر ایک کے درس میں بڑا مجمع موجود تھا۔ یہ دونوں حلقوں کے بیچ میں بیٹھ گئے اور دونوں استادوں کی حدیثیں بیک وقت نقل کردیں۔ عبداللہ ابن مبارک مشہور محدث ہیں۔ خود کہتے ہیں کہ میں نے چار ہزار استادوں سے حدیث حاصل کی ہیں۔ علی بن حسن کہتے ہیں کہ ایک رات سخت سردی تھی میں اور ابن مبارک مسجد سے عشاء کے بعد نکلے، دروازہ پر ایک حدیث پر گفتگو شروع ہوگئی، میں بھی کچھ کہتا رہا، وہ بھی فرماتے رہے۔ وہیں کھڑے کھڑے صبح کی اذان ہوگئی۔ حمیدی مشہور محدث ہیں۔ رات بھر لکھتے تھے اور گرمی کے موسم میں ایک لگن میں پانی بھر لیتے اور اس میں بیٹھ کر لکھتے۔ شاعر بھی تھے، ان کے دو شعر یہ ہیں:

لقاء الناس ليس يفيد شيئا
سوى الهذيان من قيل وقال
فاقلل من لقاء الناس إلا
لأخذ العلم أو إصلاح حال

ترجمہ: ''لوگوں کی ملاقات کچھ فائدہ نہیں دیتی بجز قیل قال کی بکواس کے، اس لیے لوگوں کی ملاقات کم کر بجز اس کے کہ علم حاصل کرنے کے واسطے استاد سے یا اصلاحِ نفس کے واسطے کسی شیخ سے ملاقات ہو۔''

امام طبرانی مشہور محدث ہیں بڑے کثیر التصانیف ہیں، ان کی کثرت تصانیف دیکھ کر کسی نے پوچھا کہ اتنی کتابیں کس طرح لکھ دیں۔ کہنے لگے کہ تیس (۳۰) سال بوریوں پر گزار دیئے یعنی رات دن بوریوں پر پڑے رہتے تھے۔ امام ترمذی مشہور محدث ہیں۔ احادیث کا کثرت سے یاد کرنا اور یاد رکھنا ان کی خصوصی شان تھی۔ بعض محدثین نے ان کا امتحان لیا اور چالیس (۴۰) ایسی حدیثیں سنائیں جو غیر معروف تھیں۔ امام ترمذی نے فوراً سنادیں۔ خود امام ترمذی کہتے ہیں کہ میں نے مکہ مکرمہ کے راستہ میں ایک شیخ کی احادیث کے دو جزء نقل کیے تھے۔ اتفاق سے خود ان شیخ سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے درخواست کی کہ وہ دونوں جزء احادیث کے استاذ سے سن بھی لوں۔ انہوں نے قبول کرلیا، میں سمجھ رہا تھا کہ وہ جزء میرے پاس ہیں، مگر استاد کی خدمت میں گیا تو بجائے ان کے دو سادے جزء ہاتھ میں تھے۔ استاد نے سنانا شروع کیا اتفاقاً ان کی نظر پڑ گئی تو

میرے ہاتھ میں دو سادے جزء تھے ناراض ہو کر فرمایا تمہیں شرم نہیں آتی۔ میں نے قصہ بیان کیا اور عرض کیا کہ آپ جو سناتے ہیں وہ مجھے یاد ہو جاتا ہے۔ استاد کو یقین نہ آیا۔ فرمایا اچھا سناؤ۔ میں نے سب حدیثیں سنادیں۔ فرمایا کہ یہ تم کو پہلے سے یاد ہوں گی۔ میں نے عرض کیا کہ اور نئی حدیثیں سنادیجئے۔ انہوں نے چالیس (۴۰) حدیثیں اور سنادیں۔ میں نے ان کو بھی فوراً سنادیا اور ایک بھی غلطی نہیں کی۔

امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کا تو مشہور قصہ ہے کہ مسجد نبوی میں عشاء کے بعد سے ایک مسئلہ میں گفتگو شروع کرتے اور صبح کی اذان شروع ہو جاتی، نہ ان میں کوئی طعن و تشنیع ہوتا نہ کوئی اور نامناسب بات اور اسی جگہ صبح کی نماز پڑھتے۔ ابن جوزی رحمہ اللہ تعالیٰ محدث ہیں، یتیمی کی حالت میں پرورش پائی۔ ایک مرتبہ منبر پر کہا کہ میں نے اپنی ان انگلیوں سے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں۔ دو سو پچاس سے زیادہ خود ان کی اپنی تصنیفات ہیں۔ کہتے ہیں کہ کوئی وقت ضائع نہیں جاتا تھا۔ چار جزء روزانہ لکھنے کا معمول تھا۔ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ، اپنی طالب علمی کے زمانہ میں تنہا ایک جھلنگے پر پڑے رہتے تھے۔ روٹی کبھی پکوا لیتے تھے اور کئی کئی وقت تک کھا لیتے تھے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں کہ میرے پاس ایک کھانا پکانے والا تھا۔ اس کو یہ کہہ رکھا تھا کہ جب مولوی صاحب کھانا کھائیں سالن دے دیا کرو۔ مگر بدقت کبھی اس کے اصرار پر لے لیتے تھے ورنہ روکھا سوکھا ٹکڑا چبا کر پڑے رہتے تھے۔ فقط

(سوانح قاسمی: ص ۲۹/ج ۱)

تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ آپ اس قدر محنتی تھے کہ شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں شاید سات آٹھ گھنٹے بمشکل سونے کھانے اور دیگر ضروریات شرعیہ و طبعیہ میں خرچ ہوتے ہوں گے اور اس کے علاوہ سارا وقت ایسی حالت سے گزرتا تھا کہ کتاب نظر کے سامنے ہے اور خیال مضمون کی تہہ میں ڈوبا رہتا ہے۔ مطالعہ میں آپ اس درجہ محو ہوتے تھے کہ پاس رکھا ہوا کھانا کوئی اٹھا کر لے جاتا تو آپ کو خبر نہ ہوتی۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ کتاب دیکھتے دیکھتے آپ سو گئے اور صبح کو معلوم ہوا کہ رات کھانا نہیں کھایا تھا۔ مدرسہ کو آتے جاتے آپ کبھی اِدھر اُدھر نہیں دیکھتے تھے۔ لپکے ہوئے جاتے اور جھپٹے ہوئے آتے تھے۔ (تذکرۃ الرشید: ص ۲۵/ج ۱)

اس ناکارہ کی ابتدائی مدرسی کے زمانہ میں مہمانوں کا ہجوم تو تھا نہیں۔ بسا اوقات رات کو کچھ ضعف سا معلوم ہوتا، سوچنے پر معلوم ہوا کہ دوپہر کو کھانا نہیں کھایا۔

تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ حضرت امام ربانی نے بارہا فرمایا کہ جب میں اور مولوی محمد قاسم صاحب دہلی میں استاد رحمہ اللہ تعالیٰ سے پڑھتے تھے اور ہمارا ارادہ ''سلم'' شروع کرنے کا ہوا،

لیکن مولانا کو فرصت نہ تھی، اس لیے انکار فرماتے تھے۔ بالآخر میں نے عرض کیا کہ حضرت! ہفتہ میں دوبار صرف پیر اور جمعرات کو پڑھا دیا کیجئے، خیر یہ منظور ہوگیا اور ہفتہ میں دو سبق ہونے لگے تو اس سبق کی ہمیں بڑی قدر تھی۔ ایک روز یہی سبق ہو رہا تھا کہ ایک شخص نیلی لنگی کندھے پر ڈالے ہوئے آنکلے اور ان کو دیکھ کر حضرت مولوی صاحب مع تمام مجمع کے کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ لو بھائی حاجی صاحب آگئے، حاجی صاحب آگئے۔

اور حضرت مولانا نے مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ لو بھائی رشید اب سبق پھر ہوگا۔ مجھے سبق کا بہت افسوس ہوا اور میں نے مولوی محمد قاسم صاحب سے کہا کہ بھئی یہ اچھا حاجی آیا، ہمارا سبق ہی گیا۔ مولوی محمد قاسم صاحب نے کہا، ہاہا ایسا مت کہو۔ یہ بزرگ ہیں اور ایسے ہیں، ایسے ہیں۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی حاجی ہمیں مونڈیں گے۔ حضرت حاجی ہم دونوں کا حال دریافت فرمایا کرتے تھے اور یوں کہا کرتے تھے کہ سارے طالب علموں میں وہ دو طالب علم (مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ) ہوشیار معلوم ہوتے ہیں۔

(تذکرہ الرشید: ص۴۱ر ج۱)

از زکریا۔

عشق اول در دل معشوق پیدا می شود
چوں برآید درر دل عاشق ہو ید می شود

ارواحِ ثلاثہ میں لکھا ہے کہ مولوی عبدالحیٔ صاحب لکھنوی کی بابت لوگ کہتے ہیں کہ تصنیف کا اوسط اتنے روزانہ کا پڑتا ہے۔ ہمارے حضرت نے فرمایا کہ بے چاروں کا دماغ اسی میں ضعیف ہوگیا، صرع ہوگیا تھا۔ ڈاکٹروں نے ہر چند منع کیا، مگر نہیں مانے۔ علمی خدمت کے مقابلہ میں بے چاروں نے جان تک کی پرواہ نہ کی۔

(ارواحِ ثلاثہ: ص۷۷)

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر۴

مشائخ کے یہاں معمولات کا اہتمام

میں نے اپنے جملہ اکابر کو اپنے معمولات کا بہت ہی پابند دیکھا۔

(اشرف السوانح:ص ۲۷ رج ۱)

میں حضرت تھانوی کا ایک ارشاد لکھا ہے کہ انضباطِ اوقات جب ہی ہوسکتا ہے جب اخلاق و مروت سے مغلوب نہ ہو اور ہر کام کو اپنے وقت اور موقع پر کرے اور تو اور حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ جو حضرت والا کے استاد تھے۔ ایک بار مہمان ہوئے۔ حضرت والا نے راحت کے سب انتظام کر کے جب تصنیف کا وقت آیا تو باادب عرض کیا، حضرت میں اس وقت کچھ لکھا کرتا ہوں۔ اگر حضرت اجازت دیں تو کچھ دیر لکھ کر بعد کو حاضر ہو جاؤں۔ فرمایا، ضرور لکھو میری وجہ سے اپنا حرج نہ کرو۔ گو اس روز حضرت والا کا دل لکھنے میں لگا نہیں، لیکن ناغہ نہ ہونے دیا تا کہ بے برکتی نہ ہو۔ تھوڑا سا لکھ کر حاضرِ خدمت ہو گئے۔

اس سیہ کار کے ساتھ بھی اس سلسلہ میں ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ یاد نہیں کہ آپ بیتی میں کہیں گزر چکا یا نہیں۔ اس سیہ کار کی عادت بری عادتوں میں سے یہ بھی رہی کہ صبح کی تالیف کے وقت میں حضرت اقدس مدنی حضرت رائے پوری اور چچا جان کے علاوہ کسی بھی بڑے یا چھوٹے عزیز و اجنبی کا آنا بہت ہی گراں ہوتا تھا۔ ان تین کے علاوہ کسی کے لیے وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ البتہ یہ تین حضرات اس قاعدہ سے مستثنیٰ تھے اور ان کی تشریف آوری پر تالیف کا کام مجھ سے نہیں ہوتا تھا، مگر حضرت اقدس مدنی کا قیام تو زائد سے زائد ڈیڑھ گھنٹہ کا رہتا تھا اور چچا جان نور اللہ مرقدہٗ میرے اس وقت میں زنانہ میں یا دوسرے احباب سے ملنے تشریف لے جاتے۔ البتہ حضرت اقدس رائے پوری کا قیام رہتا۔ میں ایک مرتبہ حسبِ معمول چائے کے بعد حضرت رائے پوری کی خدمت میں بہت ہی ذوق و شوق سے بیٹھا ہوا تھا۔ تقریباً تین گھنٹہ بعد سر میں ایسا زور سے درد ہوا اور چکر آیا کہ بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ میں ایک دم حضرت نور اللہ مرقدہٗ سے یہ عرض کر کے کہ حضرت ابھی حاضر ہو رہا ہوں اٹھا۔ حضرت کو یقیناً کشف ہوا یا میرے اس طرح فوری اٹھنے سے فکر ہوا۔ دریافت فرمایا کہاں جا رہے ہو۔ میں عرض کر کے چلا گیا۔ حضرت ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ میں اس وقت تو فوری طور پر چلا گیا۔ اوپر دار التالیف میں گیا، قلم ہاتھ میں لیا اور کچھ لکھنا شروع کیا۔ چند ہی منٹ میں وہ درد وغیرہ سب جاتا رہا۔ ذرا بھی اثر نہ رہا۔ میں اٹھ کر چلا آیا۔ واپسی پر پھر حضرت

نے باصرار پوچھا۔ اول تو میں نے ٹالنا چاہا، مگر حضرت کے بار بار اصرار پر میں نے پوری بات عرض کردی۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ اسی واسطے تو بار بار پوچھ رہا ہوں۔ میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میری وجہ سے حرج نہ کیا کرو۔ معمولات کے چھوٹنے سے بسا اوقات جسمانی مرض ہوا کرتا ہے، یہ سب ہی کو پیش آتا ہے۔ اسی لیے اکابر معمولات کی پابندی کا اہتمام کرتے ہیں۔ میں نے اپنے اکابر کو بھی نظم اوقات اور معمولات کی پابندی کا بہت ہی پابند پایا۔ میرے والد صاحب کا تو خاص معمول تھا کہ اپنے مخصوص شاگردوں سے سب سے پہلے کام جو لیتے وہ نظام الاوقات ان سے ہی بنوا کر اس میں مطالعہ، کھانا، سبق سب آجائے، اس کو ملاحظہ فرما کر اگر اصلاح کی کوئی ضرورت سمجھتے تو اصلاح کر کے اس کے حوالے فرما دیتے اور پھر اس پر پابندی کی تاکید فرماتے اور نگرانی بھی فرماتے تھے۔

حضرت تھانوی کا ملفوظ

میں نے اپنے حضرت مرشدی کے معمولات کو تو ۳۵ھ کی ابتداء سے ۴۵ھ کی انتہا تک خوب دیکھا۔ گرمی سردی کسی موسم میں بھی ان میں تغیر نہ ہوتا تھا۔ اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا جہاں تک زمانہ یاد ہے اس میں بھی کوئی تخلف نہیں پایا۔ حضرت حکیم الامت کا ملفوظ حسن العزیز جلد اول صفحہ ۴۹۵ میں لکھا ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب کے پاس تو کوئی بیٹھا ہوا ہوتا تو اشراق اور چاشت بھی قضا کر دیتے تھے۔ حضرت گنگوہی کی اور شان تھی کوئی بیٹھا ہو جب وقت اشراق کا یا چاشت کا آیا وضو کر کے وہیں نماز پڑھنے کھڑے ہوگئے، یہ بھی نہیں کہ کچھ کہہ کر اٹھیں کہ میں نماز پڑھ لوں یا اٹھنے کی اجازت لیں۔ جہاں کھانے کا وقت آیا لکڑی لی اور چل دیئے۔ چاہے کوئی نواب ہی کا بچہ بیٹھا ہو، وہاں یہ شان تھی جیسے بادشاہوں کی شان۔ ایک تو بات ہی کم کرتے تھے اور اگر کچھ مختصر سی بات کہی تو جلدی سے ختم کر کے تسبیح لے کر اس میں مشغول ہوگئے کسی نے کوئی بات پوچھی تو جواب دے دیا اور اگر نہ پوچھی تو کوئی گھنٹوں بیٹھا رہے انہیں کچھ مطلب نہیں۔ مولانا قاسم صاحب کے پاس جب تک کوئی بیٹھا رہتا برابر بولتے رہتے:

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلہ کا واقعہ

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کا ارشاد حسن العزیز (جلد ۴ ص ۲۴۷) میں لکھا ہے کہ میں نے مولانا کو نہیں دیکھا۔ مولانا مظفر حسین صاحب اپنے معمولات کے ایسے پابند تھے کہ تہجد سفر میں بھی ناغہ نہ ہوتا، اس وقت ریل

نہ تھی۔ سفر بیل گاڑی میں ہوا کرتے تھے۔ بہلی میں جاتے ہوئے اور لوگ بھی ساتھ ہوتے تو راستہ میں تہجد پڑھتے مگر بہلی کو ٹھہراتے نہیں۔ اس خیال سے کہ رفقاء کا راستہ کھوٹا ہوگا، بلکہ تہجد اس طرح پورا کرتے کہ پہلے سے آگے بڑھ جاتے اور دو رکعت پڑھ لیتے پھر آگے بڑھ جاتے اور دو رکعت پڑھ لیتے۔ اسی طرح تہجد کو پورا کر لیتے۔ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کا وطن کا معمول یہ تھا کہ ہمیشہ ساری رات عبادت میں مشغول رہتے اور پوری رات کو تین حصوں پر منقسم فرمایا کرتے تھے۔ یہ بہت مشہور قصہ ہے۔ مختلف عبادتیں تھیں۔

تذکرۃ الخلیل میں لکھا ہے کہ کیرانہ میں ایک رافضی عورت تھی۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے اس کو اہل سنت والجماعت ہونے کی ترغیب دی، اس نے اس شرط پر منظور کیا کہ اگر آپ مجھ سے نکاح کر لیں تو میں اہل سنت ہونے پر راضی ہوں۔ اوّل تو حضرت نے تامل فرمایا، اس کے بعد منظور فرمالیا۔ قصہ تو بہت طویل ہے۔ یہ مسماۃ بیوہ تھی، کیرانہ میں رہتی تھی۔ محرم کے موقع پر جب سب عورتیں قصبہ سے باہر تعزیہ دیکھنے گئیں تو اس نے پہلے کاندھلہ پرچہ بھیج دیا۔ مولانا نے اپنے داماد کو چند آدمیوں کے ساتھ ڈولی لے کر کیرانہ بھیج دیا۔ وہ رات کو گیارہ بجے مسماۃ کو لے کر کیرانہ سے روانہ ہوگئے۔ کیرانہ والوں کو جب خبر ہوئی تو انہوں نے تعاقب بھی کیا، لیکن مولانا کے داماد مسماۃ کو لے کر کاندھلہ پہنچ گئے اور نکاح ہوگیا۔ نکاح کے بعد ان محترمہ نے حضرت کو بہت تکالیف پہنچائیں اور حضرت سب کو صبر سے تحمل فرماتے تھے۔ حضرت نے ہر دو زوجات کی منظوری سے رات کو تین حصوں میں منقسم کر رکھا تھا۔

اول ثلث پہلی بیوی کا جس میں ان کو قرآن شریف کا ترجمہ پڑھایا کرتے تھے۔ دوسرے ثلث میں صاحبزادیوں کو قرآن پڑھایا کرتے اور تیسرا حصہ کیرانہ والی بیوی کا تھا جس میں حضرت تہجد بھی پڑھا کرتے تھے۔ یہ بیوی بسا اوقات رات کو کواڑ بند کر کے سو جاتی تھیں اور کھلوانے پر بھی نہ کھولتی تھیں تو حضرت وہیں دروازہ پر لنگی بچھا کر تہجد پڑھتے رہا کرتے تھے۔ (تذکرۃ: ص ۱۰۲ بزیادۃ)

حضرت مولانا یعقوب صاحب کا واقعہ

ارواح ثلاثہ میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے صاحبزادے مولوی علاء الدین صاحب کا انتقال خاص بقرعید کے روز ہوا ہے۔ نماز سے پہلے ان کی بہت غیر حالت تھی۔ جب نماز کا وقت آیا تو مولانا یہ کہہ کر ''اللہ کے سپرد اللہ خاتمہ بالخیر کرے'' نماز میں پہنچ گئے نماز میں دیر نہ کی، حالانکہ مولانا کی وجاہت ایسی نہ تھی کہ اگر کتنی ہی دیر فرماتے تب بھی لوگوں کو گراں نہ ہوتا، مگر ایسا نہیں کیا وقت پر پہنچے۔ (ارواح ثلاثہ: ص ۲۲)

حضرت سہارنپوری کے واقعات

حضرت اقدس مرشدی وسیدی حضرت سہارنپوری کے متعلق تذکرۃ الخلیل میں لکھا ہے کہ پابندی اوقات کے دو چار، دس، بیس نہیں بلکہ صدہا واقعات ایسے ملیں گے جن میں ہر واقعہ اس کی مستقل شہادت ہے کہ پابندی وقت کا اہتمام آپ کی طبیعت کا حصہ بن گیا تھا اور کوئی صعوبت کیسی ہی دشوار کیوں نہ ہو آپ کی ہمت اور حوصلہ کو داب نہیں سکتی تھی۔ پھر کیا پوچھنا حاضری مدرسہ اور پابندی اسباق کا جو کہ آپ کا فریضہ منصب اور سارے کاموں میں اصل تھا کہ اس کی پابندی نے تو تمام مدرسہ کو پابند بنا دیا تھا اور بغیر اس کے کوئی نگرانی کرے، ہر چھوٹا بڑا اپنے وقت پر مدرسہ میں موجود اور خدمت مفوضہ میں مشغول نظر آتا تھا۔ آپ کا غایت مقصود یہ تھا کہ تمام نصاب سال بھر کا ہر مدرس کے پاس ایسے ماہواری اوسط سے پورا ہو کہ ختم سال پر نہ کوئی سبق بچے اور نہ آخر سال میں ختم کتاب کی خاطر زیادہ زیادہ سبق ہو کہ پڑھنے والوں کی سمجھ میں بھی نہ آئے۔ ضروری سے ضروری کام آپ مدرسہ کا وقت ہو جانے پر ملتوی کر دیتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ گھر میں اناج یا آٹا نہیں اور مدرسہ کا وقت آگیا تو آپ مدرسہ میں آجاتے اور منتظر رہتے کہ کوئی دوست آجائے تو اس سے آٹا منگوا کر گھر میں پہنچا دیا جائے۔ ایسا بھی ہوتا کہ کوئی نہ آتا یا آپ مشغولیت میں بھول جاتے اور جب فارغ ہو کر کھانے کا وقت آتا تب آپ کو خیال ہوتا کہ آٹا تو تھا ہی نہیں روٹی کہاں پکی ہوگی۔ (تذکرۃ الخلیل پاکی)

حضرت تھانوی کے واقعات

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا ارشاد ہے کہ میرے اوقات ایسے گھرے ہوئے اور بندھے ہوئے ہیں کہ اگر پانچ منٹ کا بھی حرج ہو جاتا ہے تو دن بھر کے کاموں کا سلسلہ گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ مغرب کے بعد بعض یا عشاء کے بعد بعض لوگ سہ دری میں کام کرتے ہوئے دیکھ کر جا پہنچتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں۔ فوراً اٹھا دیتے ہیں کہ یہ وقت جلسہ کا نہیں ہے۔ میں نے خود ہی سب باتوں کی رعایت کر کے ہر بات کے لیے وقت مقرر کر دیا ہے تاکہ کسی کو تنگی نہ ہو۔ چنانچہ ذاکر اور شاغل لوگوں کے لیے یہ کس قدر آسانی ہے کہ بعد عصر پرچہ دیکھ کر جو کچھ چاہیں کہہ سن لیں اور اپنی تسلی کر لیں، ورنہ اور جگہ مدت گزر جاتی ہے، لیکن خلوت کا موقع نہیں ملتا۔ ایک صاحب نے قبل عشاء کچھ گفتگو شروع کی۔ برافروختہ ہو کر فرمایا یہ کیسی بے انصافی کی بات ہے کہ کسی وقت بھی آرام نہ لینے دیں۔ کوئی وقت تو ایسا دینا چاہیے کہ جس میں دماغ کو فارغ رکھ سکیں۔ کیا ہر وقت آپ لوگوں

کی خدمت ہی میں رہوں۔ عقل نہیں، انصاف نہیں، رحم نہیں۔ کوئی لوہے کا پیر ڈھونڈ لو، لیکن وہ بھی سسرا گھس جائے گا۔ کسی کو میرا نصف کام بھی کرنا پڑے تو معلوم ہو۔

(حسن العزیز: ص ۳۸۶ رج ۱)

حضرت حکیم الامت نے بالکل صحیح فرمایا۔ انضباط اوقات سے جتنا کام عمدہ اور اچھا ہو سکتا ہے، بغیر انضباط کے نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ ناکارہ تو اپنے زمانہ حیات میں اپنے سے بیعت کا تعلق رکھنے والوں کو بھی اپنے سے خصوصی تعلق رکھنے والے طلبہ کو اس کی ہمیشہ تاکید کرتا تھا اور اس پر عمل بھی کراتا تھا کہ اپنے نظام الاوقات کا پرچہ لکھ کر مجھے دیں۔ بیعت سے تعلق رکھنے والوں کے لیے اب تک بھی یہ ہے کہ یہاں کچھ دنوں رہیں اور اپنا نظام الاوقات بنا کر مجھے سنائیں اور اس کے بعد اپنے دوسرے دوستوں کے ذریعہ سے ان کی نگرانی بھی کرتا رہتا ہوں کہ یہ مقرر کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ دل اپنے متعلق بھی بہت چاہتا ہے کہ انضباط اوقات رہے مگر کرم فرماؤں کی کثرت نے مجبور کر دیا۔ فلاں صاحب آ گئے، فلاں جگہ سے آ گئے ہیں، ابھی واپس جانا ہے۔ آنے والوں کے تو پندرہ (۱۵) بیس (۲۰) منٹ خرچ ہوتے ہیں، مگر اس تسلسل سے میرے تو سارے ہی اوقات ختم ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنے اکابر میں حضرت اقدس گنگوہی کے جہاں تک حالات سنے اور حضرت سہارنپوری اور رائے پوری نور اللہ مراقدہم ہر دو حضرات کو بغیر زمانہ بیماری کو چھوڑ کر اپنے اوقات کا بہت ہی زیادہ پابند پایا۔

حضرت رائپوری کے واقعات

علی میاں حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی سوانح میں حضرت رائے پوری کا نظام الاوقات تحریر فرماتے ہیں: ''یہ تھا کہ اخیر شب میں سب ہی جاگ جاتے اور ضروریات سے فارغ ہو کر نوافل میں مشغول ہو جاتے۔ اس کے بعد ذکر یا مراقبہ میں سب مشغول ہو جاتے اس وقت رات کے سناٹے میں اور جنگل کی خاموش فضا میں خانقاہ اللہ کے نام کی فضاؤں سے اور ذکر کی آوازوں سے گونج جاتی تھی اور سرور اور مستی کی ایک عام کیفیت ہوتی۔ صبح صادق کے ساتھ ہی مسجد میں اذان ہو جاتی، اذان و جماعت کے مابین چائے آ جاتی۔ خانقاہ کے ناظم مطبخ حاجی ظفر الدین جن کا چھپر خانقاہ کے اندر ہے، اپنی اہلیہ کے ساتھ پورے مجمع کے لیے تیار کر کے لاتے اور اسفار تک سب کو فارغ کر دیتے۔ حضرت بھی جب تک چائے نوش فرماتے تھے اسی وقت چائے سے فارغ ہو جاتے۔ بعد میں چائے کی بجائے دودھ اور دوائیں وغیرہ شروع کر دی تھیں۔ اخیر زمانہ کثرت امراض کے تین چار سال مستثنیٰ کر کے حضرت ہمیشہ نماز کے لیے مسجد تشریف لے جاتے۔ نماز سے

فارغ ہونے کے بعد جب تک آپ میں قوت تھی۔ چہل قدمی کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور نہر کی پٹری پر دوموئی تک جو تقریباً دومیل ہے، تشریف لے جاتے، آمدورفت کے چار میل ہوجاتے۔ صحت کے زمانہ میں خصوصی مہمانوں کی مشایعت کے لیے بھی حضرت تشریف لے جاتے اور کبھی کبھی خانقاہ کی جنوبی جانب روکی پٹری پر تشریف لے جاتے۔ ابتداءً حضرت اس سیر میں بالکل تنہا ہوتے، بعد میں ضعف کے زمانہ میں ایک دو خادم بھی ہوجاتے۔ حضرت کا معمول اس وقت قرآن شریف کی تلاوت کا تھا۔ واپسی پر تھوڑی دیر اپنے مرشد کے مزار پر تشریف رکھتے، فارغ ہونے کے بعد اپنے حجرہ میں تشریف لے جاتے اور گرمی ہو یا سردی، گیارہ بجے کے درمیان حجرہ سے باہر تشریف لے آتے۔''

حضرت کا نظام الاوقات یہ تھا کہ رات کے پچھلے حصہ میں بالعموم سب ہی جاگ جاتے اور طہارت اور وضو سے فارغ ہوکر نوافل میں مشغول ہوجاتے۔ بعض لوگ مسجد چلے جاتے، اکثر وہیں چٹائیوں اور چارپائیوں پر نوافل ادا کرتے، پھر ذکر جہر میں یا مراقبہ میں مشغول ہوجاتے۔ اس وقت رات کے اس سناٹے میں جنگل کی اس خاموش فضا میں خانقاہ اللہ کے نام کی صداؤں اور ذکر کی آوازوں سے گونج جاتی اور حسب استعداد توفیق لوگ اس فضا سے مکیف ہوتے اور سرور و مستی کی ایک عام کیفیت ہوتی، نماز صبح کے بعد پابندی سے سیر کو تشریف لے جاتے۔ بالعموم نہر کی پٹری پر تشریف لے جایا کرتے، واپسی پر مزار پر کچھ دیر بیٹھتے۔ بعد میں یہ معمول جاتا رہا۔ کچھ دیر موسم کے مطابق باہر تشریف رکھتے پھر اندر تشریف لے جاتے۔

کوئی موسم ہو، مہمان کم ہوں یا زیادہ حضرت باہر تشریف لاتے اور ساڑھے دس بجے یا گیارہ بجے تک کھانا آجاتا اور یہی وقت سہارنپور سے مہمانوں کے پہنچنے کا ہوتا تھا اور قرب وجوار کے دیہات سے آنے والوں کا عموماً وقت بھی یہی ہوتا تھا، جن کا پہلے سے کوئی اندازہ نہ ہوتا تھا، مگر حاجی ظفر الدین صاحب ناظم مطبخ اور ان کی اہلیہ اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے، مجھے تو ہمیشہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ پہلے سے چالیس (۴۰)، پچاس (۵۰)، مہمان ہوتے تھے، لیکن دسترخوان کے وقت سوڈیڑھ سو ہوجاتے تھے مگر ذرا سی تاخیر بھی کھانے میں نہیں ہوتی تھی۔ سالن تو زیادہ مقدار میں پہلے ہی سے ہوتا تھا، عین وقت پر حاجی ظفر کی اہلیہ اس سُرعت سے روٹیاں پکاتی کہ تار نہیں ٹوٹتا تھا۔ ایک جماعت کھانے سے اٹھتی اور فوراً دوسری جماعت بیٹھتی۔ اس کے بعد علی میاں لکھتے ہیں کہ کھانا عموماً سادہ بالعموم دال روٹی ہوتی تھی، جب تک حضرت کی صحت اجازت دیتی رہی مہمانوں کے ساتھ ہی کھانا تناول فرماتے تھے، کھانے کے بعد تھوڑی دیر مجلس ہوتی جس کا کوئی موضوع نہ ہوتا تھا۔ کبھی اکابر میں سے کسی کا قصہ چھڑ گیا اور کبھی کوئی اور مضمون۔

بارہ بجے کے قریب مجلس ختم ہوجاتی اور حضرت آرام فرماتے۔

ظہر کی اذان پر سب اٹھ جاتے اور مسجد میں جمع ہوتے رہتے۔ صحت کے زمانہ میں تو حضرت مسجد ہی میں تشریف لے جاتے تھے۔ نمازِ ظہر کے بعد حضرت تخلیہ میں تشریف لے جاتے اور کیواڑ بند ہوجاتا۔ سفر وحضر میں یہ قدیمی اور دائمی معمول تھا۔ البتہ اخیر زمانہ شدتِ مرض میں اس کی پابندی نہیں رہی۔ اس تخلیہ میں عموماً صلوٰۃ التسبیح اور ذکر بالجہر کا معمول تھا۔ (از زکریا)

جہر بہت ہلکی آواز سے ہوتا جو حجرہ کے باہر سہ دری سے آگے نہیں نکلتا تھا اور ہیبت سے اس سہ دری میں بھی لوگوں کو جانے کی ہمت نہ ہوتی۔ زکریا کی چارپائی حجرہ شریف کے دروازے کے بالکل متصل چونکہ حکما رہتی تھی اس لیے مجھے اس خفیف جہر کی آواز سننے کی بہت کثرت سے نوبت آتی، اس تخلیہ کا بہت اہتمام ہوتا تھا۔ تخلیہ سے باہر آنے کے وقت پر اتنا جلال اور انوار کا زور ہوتا تھا کہ چہرہ مبارک پر نگاہ ڈالنی مشکل ہوتی تھی اور تھوڑی دیر تک حضرت نور اللہ مرقدہٗ پر بھی کچھ استغراقی کیفیت کا ایسا غلبہ ہوتا تھا کہ خادم خاص بھائی الطاف کو بھی نہ پہچانتے فرماتے تو کون ہے۔ اس منظر کو اس ناکارہ نے بھی بہت دیکھا۔ میں تو حجرہ کے کیواڑ کھلنے کے وقت اپنی چارپائی سے اٹھ کر باہر آجاتا تھا، مگر چند منٹ بعد چائے اور اخبار آجاتے اور راؤ فضل الرحمن صاحب اخبار کی خاص خاص خبروں پر سُرخیاں لگا کر لاتے اور سناتے اور خصوصی ڈاک بھی سنائی جاتی، عصر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔

مولانا علی میاں رائے پور کے نظام الاوقات کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت اقدس رائے پوری کے مجاہدات بغیر رمضان کے بھی ابتداء زمانہ میں بہت سخت گزرے ہیں متفرق احوال وقتاً فوقتاً میری آپ بیتی میں جسے کشکول کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ چلتے پھرتے وقتاً فوقتاً اکابر کا جو واقعہ یاد آیا ''لقد کان فی قصصھم عبرۃ لأولی الألباب'' (سورہ یوسف) لکھواتا رہا کہ اول تو اہل اللہ کے قصے نزولِ رحمت کا بھی سبب ہیں اور مجھے بچپن ہی سے اپنے اکابر کے قصوں میں بہت لطف آیا۔

علی میاں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مجاہدات میں تحریر فرماتے ہیں، رائے پور کے قیام میں آپ نے اس عالی ہمتی جفاکشی اور مجاہدہ سے کام لیا جس کے واقعات اب صرف اولیاء متقدمین کے تذکروں اور تاریخوں میں ملتے ہیں اور جو انہیں لوگوں کا حصہ ہے جن کی استعداد اور جوہر نہایت عالی عزم وارادہ نہایت قوی اور طلب نہایت صادق ہوتی ہے جن کے ضمیر میں روزِ اول سے عشق کا مادہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو انہیں اس راہ کے اعلیٰ ترین مقامات اور کمالات تک پہنچا کر ان سے ہدایت اور تربیت خلق کا کام لینا ہوتا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ میں رائے پور پہنچ کر سارا دن باغ میں پھرتا رہا کہ میں کسی درخت کے پتے کھا کر گزارا کرسکتا ہوں۔ آپ نے بعض اوقات کسی درخت کا نام بھی لیا کہ اس کو منتخب کیا تھا، کبھی آپ کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شہتوت کے پتے کھائے ہے۔ فرماتے تھے کہ الحمدللہ اس کی بہت کم نوبت آئی، کیونکہ حضرت نے اپنے خادم میاں جی معزز الدین سے فرمادیا تھا کہ ان کے کھانے وغیرہ کا خیال رکھنا، رائے پور کا وہ دور بڑے مجاہدے اور جفاکشی کا تھا اور یہ سب ان لوگوں کی تکمیل حال کے لیے تھا جن کی ترقی اور پختگی اللہ تعالیٰ کو منظور تھی، لنگر کی روٹی اتنی موٹی اور کچی ہوتی تھی کہ بغیر پانی یا چاچھ کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ (چونکہ رائے پور خانقاہ میں پنجابی حضرات کی کثرت تھی ان کے معدے اچھے تھے اور قوی ہوتے تھے۔ ان کے لیے چھاچھ کے ایک پیالہ کے ساتھ ایک روٹی...... کھالینے میں کوئی اشکال نہیں تھا)۔

اخیر زمانہ میں اکثر فرماتے تھے کہ یہ ریاح کا مرض اور ضعف معدہ اسی وقت سے ہے فرماتے تھے کہ ایک روز روٹی جلی ہوئی تھی۔ حاجی جی مطبخ کے مہتمم تھے۔ میں نے کہا حاجی جی روٹی جلی ہوئی ہے کہا کہ اچھا کل جلی ہوئی نہ ہوگی۔ اگلے روز ایک طرف جلی ہوئی اور دوسری طرف کچی تھی، حاجی جی سے جب دوسری مرتبہ کہا کہ روٹی کچی ہے تو حاجی صاحب نے کہا کہ میاں اگر روٹی کھانے آیا ہے تو کہیں اور چلا جا۔ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں یہ حضرت سے نہ کہہ دے، میں نے اپنے کو بڑی ملامت کی اور دل میں کہا کہ ارے آیا تو ہے اپنے نفع کی خاطر اور پھر نخرے کرتا ہے اور یہ عہد کیا کہ آئندہ کبھی کچھ نہیں کہوں گا۔ پھر کبھی شکایت نہیں کی، چودہ سال تک کبھی باسی کبھی کچی کبھی سوکھی روٹی کھائی اور نام نہیں لیا۔

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے خود حضرت کے حوالے سے لکھا ہے۔ فرماتے تھے کہ مسلسل دس سال ایسے گزرے ہیں کہ ہم لوگوں کو جو طالبین کی حیثیت سے خانقاہ میں رہتے تھے ایک دن میں صرف ایک روٹی مکئی کی ملتی تھی اور وہ درمیان سے بالکل کچی ہوتی تھی جو صاحب پکانے والے تھے انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ روٹی سکی یا نہیں سکی سالن یا دال ترکاری کا کوئی سوال ہی نہ تھا، گاؤں سے کسی دن چھاچھ آجاتی تو کھانے پینے کے لحاظ سے ہم خانقاہ والوں کے لیے گویا وہ عید کا دن ہوتا۔

فرماتے تھے اس علاقہ (یوپی) کے ہمارے ساتھی تو وہی ایک روٹی آدھی آدھی کر کے دونوں وقت کھاتے تھے، لیکن میں پنجاب کا رہنے والا تھا، اس لیے ایک ہی وقت میں کھالیتا تھا اور دوسرے وقت بس اللہ کا نام، فرمایا کہ سوکھی روٹی کھانے کی وجہ سے میرے پیٹ میں درد رہنے لگا اور گڑگڑاہٹ ہوتی تھی۔ خیال آیا کہ حضرت سے عرض کروں گا خادم سے فرمادیا جائے کہ روٹی

اچھی طرح سینک لیا کرے پھر خیال آیا کہ اگر حضرت نے فرمایا کہ مولوی صاحب! جہاں پکی ہوئی روٹی ملتی ہو وہاں چلے جاؤ تو پھر کیا ہوگا۔ خود بخود دل میں خیال آیا تو سونٹھ پیس کر استعمال کی۔ استعمال کے بعد جب ایک مرتبہ استنجاء کیا تو ایک بڑا سا جونک جیسا کیڑا نکلا۔ میرا خیال ہوا کہ شاید آنت باہر آگئی مگر دیکھا تو کیڑا تھا اس وقت ڈر دیا بعد میں مفردات میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ سونٹھ کی ایسی ہی خاصیت ہے۔

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کبھی شفقتاً اپنے دستر خوان پر جب کبھی حضرت شیخ الہند یا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نور اللہ مرقدہما تشریف لاتے تو بلاتے کہ تم بھی کھانا کھالو۔ میں اپنے وقت ہر جو کچھ مجھے باسی مل جاتا تھا کھالیتا تھا اور سختی سے معذرت کرتا تھا۔ حضرت شدت سے اصرار کرتے اور فرماتے کہ مولانا میں آپ کے نفع کے لیے کہہ رہا ہوں۔ حضرت کی تعمیل ارشاد میں ان حضرات کے ساتھ بیٹھ کر کچھ کھالیتا۔ اسی طرح جب چائے کی پتی بچ جاتی میں اس کو کھالیتا جو گڑ رکھے رکھے پرانا اور خراب ہو جاتا اس کا شربت پکا کر اس کا شیرا چائے میں ڈال کر اس سے روٹی کھالیتا تاکہ جلدی لیٹ جاؤں اور حضرت کے اٹھنے سے پہلے ایک بجے حاضر ہو جاؤں۔

رہائش کے لیے حافظ یوسف علی صاحب کے چھپر میں جہاں ان کی گھوڑی بندھتی تھی، ان کی اجازت سے ایک طرف صاف کر کے اس پر اپنا بستر لگا دیا۔ (از زکریا حافظ یوسف علی صاحب اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے زمانہ میں قرآن پاک کے مکتب کے حافظ تھے، بہت ہی بزرگ تھے، بہت ہی صاحب کرامت تھے، میں نے بھی زیارت کی ہے بلکہ مرحوم بہت ہی شفقت فرمایا کرتے تھے مگر ٹانگوں سے بالکل معذور تھے۔ استنجاء وغیرہ نماز کے لیے تو کوئی شاگرد کمر پر بٹھا کر لے جاتا، لیکن قرب و جوار کے دیہات میں کبھی جانا ہوتا تو اس گھوڑی پر تشریف لے جایا کرتے تھے)۔

علی میاں لکھتے ہیں کہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک کوڑے کرکٹ کی ڈھیر پر ایک پھٹا ہوا کمبل ملا تھا اس کو دھو کر وہاں بچھا دیا اس کو اتنی تہیں دیں کہ اس کے سوراخ بند ہو گئے چودہ سال تک یہی بستر رہا یہی جائے نماز، خانقاہ میں اس وقت ایک ہی لالٹین تھی وہ حضرت کے حجرہ میں رہتی، دوسری لالٹین تھی ہی نہیں رائے پور میں سانپوں اور بچھوؤں اور حشرات الارض کی کثرت ہے۔ فرماتے تھے کہ میں نے ایک ٹوٹا ہوا بانس اٹھا لیا وقتاً فوقتاً اس کو بجاتا رہتا تھا کہ کوئی کیڑا یا سانپ نہ آئے الحمد للہ کہ سوائے ایک مرتبہ کے ایک کھنکھجورہ آیا کبھی کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس کے بعد علی میاں نے حضرت نور اللہ مرقدہٗ کا لحاف والا قصہ لکھا کہ سردی میں کوئی کپڑا سردی سے بچاؤ کا نہیں تھا، اتنے مسجد کے کیواڑ کھلے رہتے ہم حمام کے سامنے بیٹھے ہوئے آگ تاپتے رہتے۔

اس کو میں تفصیل سے آپ بیتی نمبر۳ میں اپنے بچوں کی شادی کے سلسلہ میں مفصل لکھوا چکا ہوں اور حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے بہت سے مجاہدات کے قصے آپ بیتی نمبر۱ میں بھی گزر چکے ہیں، حضرت کا بار بار ارشاد تھا کہ طالب علموں کی اسٹرائیک کے ہنگاموں کے ذمہ اہل مدارس ہیں، دونوں وقت پکی پکائی مل جاتی ہے، خالی بیٹھے لغویات ہی سوجھتی ہیں۔ ہمیں اپنی طالب علمی کے زمانے میں اسباق فارغ ہونے کے بعد روٹی پکانے کا فکر ہوتا تھا، جلدی جلدی کچی پکی کھا کر دوسرے سبق کا وقت آجاتا تھا، لغویات کے سوچنے کا وقت ہی نہیں آتا تھا۔

اس کے بعد علی میاں لکھتے ہیں کہ ذکر میں شدت سے انہماک تھارات میں بہت کم سونے کی نوبت آتی، فرماتے تھے کہ نزلہ کے زور کی وجہ سے ایک رومال رکھ لیتا اور ذکر شروع کرتا، رطوبت کی وجہ سے وہ تر ہو جاتا۔ (سوانح حضرت رائے پوری: ص۶۴)

ایک دفعہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ حضرت تھانوی کے یہاں حاضر ہوئے تو حضرت حکیم الامت نے فرمایا کہ میں تو رائے پور حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ مجھے یاد نہیں حضرت رائے پوری نے عرض کیا، حضرت! میں آپ کو کیا یاد رہتا، میری وہاں کوئی حیثیت اور امتیاز نہیں تھا، شاید آپ کو یاد ہو کہ حضرت کی خدمت میں ایک خادم بار بار آتا تھا، بدن پر ایک کمری ہوتی تھی اور تہبند باندھے ہوئے، فرمایا ہاں کچھ یاد تو آتا ہے عرض کیا کہ میں وہی ہوں۔ (سوانح حضرت رائے پوری: ص۶۹)

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر۵

قرآن وحدیث پر اعتماد

صحابہ کرام میں اور ہم لوگوں میں بڑا بنیادی فرق یہ ہے کہ ان کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشاد پر یقین اعتماد ایسا کلی اور قلبی تھا کہ اس میں ان کو کوئی تردد نہیں رہتا تھا اور ہم لوگوں کا اعتقاد زبانی ہے قلبی نہیں، لیکن میں نے اپنے اکابر میں اس اعتماد کو علی وجہ الاتم پایا۔ ان حضرات کے نزدیک حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز سے ڈرایا یا منع کیا، اس سے خوف اور بچنا ایسا طبعی بن گیا تھا۔ جیسا ہم لوگوں کو سانپ بچھو سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن پاک اور احادیث کے ارشادات ایسے قطعی تھے کہ ان میں کوئی عقلی نہیں طبعی بھی تردد نہ رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس دولت کا کوئی شمہ اس سیہ کار کو بھی نصیب فرمادے۔

چچا جان کے اعتماد کی پختگی کی ایک مثال

(الف)...... سہارنپور کے ایک دوست نے میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کو ایک جوابی لفافہ لکھا۔ جس میں اپنے کسی عزیز کے۔ نیے جو مایوسی کی حالت میں تھے، تعویذ منگایا اور چچا جان نے لفافہ پر سے ان کا نام کاٹ کر میرا نام لکھا اور لکھا کہ فلاں صاحب نے تعویذ منگایا ہے ان سے کہہ دو کہ میں صبح کی نماز کے بعد اور مغرب کے بعد مسجد سے نکلوں تو مجھ سے دم کرالیا کریں اور مجھے ایک دعاء لکھی کہ تین دفعہ یہ دعاء اول وآخر درود شریف پڑھ کر اس پر دم کردیا کرو اور یہ بھی لکھا کہ جو اس دعاء سے اچھا نہ ہو اس کا مرنا ہی اچھا ہے۔ میں نے ان صاحب کو بلا کر خط تو ان کو نہیں دکھلایا کہ آخری جملہ مجھے بھی چبھ رہا تھا، میں نے چچا جان کی ارشاد فرمودہ دعاء پڑھنی شروع کی اور وہ تین چار دن میں اچھے ہوگئے، یہ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے قوت اعتقاد کی بات تھی، یہ قصہ آپ بیتی نمبر۴ میں بھی گزر چکا ہے، چچا جان کے حالات میں اور بھی اس نوع کے متفرق واقعات گزر چکے ہیں۔

(ب)...... یہ واقعہ تو میں کثرت سے اپنی مجالس میں سناتا رہتا ہوں، معلوم نہیں آپ بیتی میں کہیں سے گزرا یا نہیں، ہمارے مدرسہ کے ابتدائی محسنوں میں بلکہ اگر ابتدائی بانیوں میں کہا جائے تو بے محل نہ ہوگا۔

حافظ فضل کے مکان پر چوروں کے آنے کا واقعہ:

ایک بزرگ تھے جن کا نام حافظ فضل حق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تھا، ان کے دو صاحبزادے الحاج حبیب احمد صاحب میرے حضرت قدس سرہٗ اور میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے خاص تعلق رکھنے والے تھے۔ ان کا ذکر آپ بیتی میں بھی کئی جگہ گزر چکا ہوگا، میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کے موقع پر ان کو اپنے قبرستان میں دفن کرنے میں ان ہی کا زور تھا، میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی بیماری میں ان کا یہ سوال بھی گزر چکا کہ آپ حضرت سہارنپوری کو لینے کے لیے بمبئی جائیں گے یا دہلی اور میرے والد صاحب کا یہ جواب کہ میں تو پڑے پڑے زیارت کرلوں گا وغیرہ وغیرہ، کئی قصے گزر چکے اور ان کے دوسرے صاحبزادے حافظ زندہ حسن صاحب کا ذکر بھی کئی جگہ گزرا ہوگا۔ بالخصوص میرے ابتدائی دور میں قرضہ کے سلسلہ میں شاید ان کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ حافظ فضل حق صاحب ان دونوں کے والد تھے اور میرے حضرت کے استاذ شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نور اللہ مرقدہٗ جن کے نام نامی پر مدرسہ کا نام مظاہر علوم رکھا گیا، ان کے بہت ہی جانثار اور معتقد تھے۔ ان ہی کی کوشش سے مدرسہ قاضی کے محلہ سے جہاں ابتداءً قائم ہوا تھا، یہاں منتقل ہوا جہاں اب ہے۔ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتے۔ گرمی میں کثرت سے پنکھا جھلتے، ان کا تکیہ کلام تھا ''اللہ کے فضل سے'' ہر بات میں یہی کہا کرتے تھے کہ ''اللہ کے فضل سے'' یہ ہوا۔ اللہ کے فضل سے وہ ہوا۔

ایک مرتبہ انہوں نے حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے صبح کو یہ عرض کیا کہ حضرت جی رات تو اللہ کے فضل سے اللہ کا غضب ہوگیا۔ حضرت قدس سرہٗ بھی یہ فقرہ سن کر ہنس پڑے اور دریافت کیا کہ حافظ جی اللہ کے فضل سے اللہ کا غضب کیا ہوگیا تھا انہوں نے عرض کیا کہ حضرت جی رات میں سو رہا تھا اور مکان میں اکیلا ہی تھا۔ میری جو آنکھ کھلی، میں نے دیکھا کہ تین چار آدمی میرے کوٹھے کے کیواڑوں کو چمٹ رہے ہیں۔ میں نے ان سے بیٹھ کر پوچھا کے اب تم چور ہو۔ کہنے لگے، ہاں ہم چور ہیں۔ میں نے کہا سنو، میں شہر کے رؤسا میں شمار ہوں اور مدرسہ کا خزانہ بھی میرے پاس ہے اور وہ سارا کا سارا اسی کوٹھی میں ہے اور یہ تالہ جو اس کو لگ رہا ہے چھ (۶) پیسے کا ہے تمہارے باپ دادا سے بھی نہیں ٹوٹے گا۔ تم تو تین چار ہو، دس بارہ کو اور بلا لاؤ اور اس تالے کو ٹھونکتے رہو یہ ٹوٹنے کا نہیں۔ میں نے حضرت جی! (مولانا محمد مظہر صاحب) سے سن رکھا ہے کہ جس مال کی زکوۃ دے دی جائے وہ اللہ کی حفاظت میں ہو جاتا ہے۔ میں نے اس مال کی

زکوۃ جتنی واجب ہے اس سے زیادہ دے رکھی ہے۔ اس لیے مجھے اس کی حفاظت کی ضرورت نہیں۔ اللہ میاں اپنے آپ حفاظت کریں گے۔ حضرت جی اللہ کے فضل سے میں تو یہ کہہ کر سو گیا۔ میں پچھلے کو اٹھا تو وہ لپٹ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ارے میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ دس بارہ اور بلالاؤ یہ تالہ اللہ کے فضل سے ٹوٹنے کا نہیں۔ حضرت جی یہ کہہ کر میں تو اللہ کے فضل سے نماز میں لگ گیا اور جب اذان ہوگئی تو میں ان سے یہ کہہ کر کہ میں نماز کو جارہا ہوں تم اس کو لپٹے رہو۔ پھر حضرت جی اللہ کے فضل سے وہ سب بھاگ گئے۔ فقط

یہ وہی توکل اور اعتماد علی اللہ کی بات ہے ہم نااہلوں کے گھر میں اگر ایک چور کا بھی شبہ ہو جائے تو چارپائی پر لیٹنا مشکل ہو جائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ ضروری ہے جیسا کہ میں شمائل ترمذی کے ترجمہ میں کئی احادیث کے ذیل میں اس قسم کے مضمون کو لکھ چکا ہوں کہ جب تک توکل اور اعتماد کا یہ درجہ حاصل نہ ہو، اس وقت یہ ان اعتماد والوں کی حرص نہیں کرنی چاہیے۔ امام بخاری نے بخاری شریف میں بھی اور اس ناکارہ نے اپنے رسالہ فضائل صدقات میں بھی لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چندہ کی تحریک پر گھر کا سارا مال لاکر سامنے رکھ دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشی سے قبول فرمالیا اور ایک موقع پر ایک اعرابی نے ایک سونے کا ڈلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا کہ مجھے ایک جگہ سے حاصل ہوگیا ہے، اس کے سوا میرے پاس کچھ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر سے منہ پھیر لیا، ان صاحب نے دوسری طرف حاضر ہوکر عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر سے بھی اعراض کرلیا اور سہ بارہ عرض کرنے پر حضور نے اس کو لے کر ایسا زور سے پھینکا کہ اگر اس کو لگ جاتا تو زخمی کردیتا۔ توکل علی اللہ اور اللہ پر اعتماد پیدا کرنے کی تو بڑی ضرورت ہے اور اگر یہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا دونوں کی فلاح ہے، مگر جب تک یہ پیدا نہ ہو اس وقت تک عمل کرنا ایسا ہے جیسے کہ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔

پیلو میں انگریز کی کوٹھی کا واقعہ

(ج)...... میں نے اپنے بچپن میں اپنے والد صاحب سے اور دوسرے لوگوں سے بھی یہ قصہ سنا ہے کہ ضلع سہانپور میں بہت سے آگے انگریزوں کی کچھ کوٹھیاں تھیں۔ من جملہ ان کے پیلو میں بھی جہاں اعلیٰ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کا وصال ہوا اور اس کے قرب و جوار میں بہت سی کوٹھیاں کاروباری تھیں، جن میں ان انگریزوں کے کاروبار ہوتے تھے اور ان کے مسلمان ملازم کام کیا کرتے تھے اور وہ انگریز دہلی، کلکتہ وغیرہ بڑے شہروں میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی معائنہ کے

طور پر آ کر اپنے کاروبار کو دیکھ جاتے تھے۔
ایک مرتبہ اس جنگل میں آگ لگی جو کبھی کبھی مختلف وجوہ سے لگتی رہتی تھی اور وہاں کے باغات، جنگلات کو جلا دیتی تھی۔ ایک دفعہ اس جنگل میں آگ لگی اور قریب قریب ساری کوٹھیاں جل گئیں۔ ایک کوٹھی کا ملازم اپنے انگریز آقا کے پاس دہلی بھاگا ہوا گیا اور جا کر واقعہ سنایا کہ حضور سب کی کوٹھیاں جل گئیں اور آپ کی کوٹھی بھی جل گئی۔ وہ انگریز کچھ لکھ رہا تھا، نہایت اطمینان سے لکھتا رہا، اس نے التفات بھی نہیں کیا۔ ملازم نے دوبارہ زور سے کہا کہ حضور سب جل گیا۔ اس نے دوسری دفعہ بھی لاپرواہی سے جواب دے دیا کہ میری کوٹھی نہیں جلی اور بے فکر لکھتا رہا۔ ملازم نے جب تیسری دفعہ کہا تو انگریز نے کہا میں مسلمانوں کے طریقہ پر زکوٰۃ ادا کرتا ہوں، اس لیے میرے مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ وہ ملازم جواب دہی کے خوف کے مارے بھاگا ہوا گیا تھا کہ صاحب کہیں گے کہ ہمیں خبر تک نہیں کی۔ وہ انگریز کے اس لاپرواہی سے جواب کو سن کر واپس آ گیا۔ آ کر دیکھا تو واقعی سب کوٹھیاں جل چکی تھیں مگر انگریز کی کوٹھی باقی تھی۔ رنجیت سنگھ کا بھی ایک واقعہ اسی نوع کا آگے آئے گا۔

(د)......اللہ کی شان! کہ اسلامی احکام پر عمل کر کے غیر مسلم تو فائدہ اٹھائیں اور ہم لوگ زکوٰۃ ادا نہ کر کے اپنے مالوں کو نقصان پہنچائیں۔ کہیں چوری ہو جائے، کہیں ڈاکہ پڑ جائے، کہیں کوئی اور آفت مسلط ہو جائے۔ فضائل صدقات کے مضامین بہت کثرت سے گزر چکے، جو دیکھنا چاہے تفاصیل وہاں دیکھ لے۔ زکوٰۃ کے ادا کرنے کے فضائل اور زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی وعیدیں کثرت سے اس میں مذکور ہیں۔ مجھے بھی بہت کثرت سے ایسے لوگوں کے حالات سننے کی نوبت آئی کہ زکوٰۃ کی معمولی رقم ادا کرنے میں کوتاہی کی وجہ سے بڑے بڑے ٹیکس بڑی بڑی چوریاں بھگتنی پڑیں۔ یہ اللہ کے بندے اگر زکوٰۃ کا مال طیب خاطر سے حق واجب سے زیادہ ادا کر دیں تو کتنا ثواب ہو۔ اس کے بالمقابل جبری نقصان سے حفاظت بھی رہے اور زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا وبال مستقل رہے گا۔ فضائل صدقات میں اس قسم کی حدیثیں بہت کثرت سے ذکر کی گئی ہیں۔ اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ جو مال کسی جنگل میں یا دریا میں کہیں بھی ضائع ہوتا ہے وہ زکوٰۃ کے روکنے سے ضائع ہوتا ہے۔ یہ مضمون غیر متعلق ہے مگر بہت اہم ہے، زکوٰۃ کے ادا نہ کرنے سے جو جانی اور مالی مصائب آتے ہیں وہ فضائل صدقات اول اور میرے رسالہ اعتدال میں تفصیل سے لکھے جا چکے ہیں۔ ان میں دیکھنا چاہے تو کوئی دیکھ لے، مگر دیکھنا تو وہ چاہے جس کو عمل کرنا ہو اور اللہ اور اس کے پاک رسول کے ارشادات پر اعتماد ہو۔ اس وقت تو اعتماد علی اللہ وعلی رسولہ کے واقعات لکھوانا شروع کیے تھے۔

(ر)......۱۹۴۷ء کا ہنگامہ تو ابھی تک سب کو معلوم ہے اس میں کیا گزر رہی تھی۔ ہم سب لوگ نظام الدین میں محبوس تھے اور دہلی کا راستہ بالکل بند ہو چکا تھا اور راشن سبزی منڈی میں ملتا تھا جہاں کوئی ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔ آپ بیتی نمبر ۵ میں بابو ایاز صاحب کا ایک مفصل قصہ لکھوا چکا ہوں کہ وہ اس حالت میں بھی کبھی کبھی راشن لینے کے لیے سبزی منڈی جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سبزی منڈی میں چند سکھوں نے انہیں دیکھ کر بہت گھورا اور جب وہ نظام الدین آنے لگے تو ان کے ساتھ تین سکھ تھے اور آپس میں وہ لوگ کہنے لگے کہ یہ مسلمان جا رہا ہے۔ انہوں نے نہایت جرأت سے کہا کہ تم تین ہو، تیس بھی ہو تب بھی مار نہیں سکتے۔ ان کی جرأت پر سب حیران رہ گئے۔ میں نے ان سے پوچھا بابو جی کیا بات تھی؟ انہوں نے کہا کہ تو نے یہی تو ایک دعاء بتائی تھی کہ ''اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُبِکَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ'' پڑھ کر چلے جایا کرو۔ مجھے یہ سن کر بہت ہی غیرت آئی۔ مفصل قصہ تو وہاں گزر چکا ہے، یہاں تو صرف حدیث پاک کی دعاء پر اعتماد ظاہر کرنا ہے۔ اب تک بھی جب یہ قصہ یاد آ جاتا ہے تو بڑی غیرت آتی ہے کہ جس نے بتلایا اس کی تو ہمت ہے نہیں۔ اس نابکار کے ساتھ تو کئی واقعات دوستوں کے اسی قسم کے پیش آئے ہیں، جس پر بہت ہی شرم آتی ہے کہ میری بتلائی ہوئی چیزوں پر لوگوں نے اعتقاد اور حسنِ ظن سے عمل کیا اور اس کے ثمرات خوب پائے۔

شاہ عبدالقادر صاحب کا واقعہ

(س)......ارواحِ ثلاثہ میں لکھا ہے کہ دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے زمانہ میں ایک شخص پر جن آتا تھا، اس کے قرابت دار اس کو شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ غلام علی صاحب اور دوسرے بزرگوں کے پاس لے گئے اور سب نے جھاڑ، پھونک، تعویذ، گنڈے کیے مگر افاقہ نہ ہوا۔ اتفاق سے شاہ عبدالقادر صاحب اس وقت دہلی میں تشریف نہ رکھتے تھے جب شاہ صاحب تشریف لائے تو ان کی طرف بھی رجوع کیا شاہ صاحب نے جھاڑ دیا وہ اسی روز اچھا ہو گیا جب شاہ عبدالعزیز صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے شاہ صاحب سے پوچھا، میاں عبدالقادر تم نے کون سا عمل کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ حضرت میں نے تو صرف ''الحمدللہ'' پڑھ دی۔ اس پر شاہ صاحب نے فرمایا کسی خاص ترکیب سے؟ انہوں نے فرمایا کہ ترکیب کوئی نہیں فقط ''یا جبار'' کی شان میں پڑھ دی تھی۔ (میں نے خان صاحب سے اس جملہ کا مطلب پوچھا، انہوں نے فرمایا کہ مطلب میں بھی نہیں سمجھا، راویوں نے یہی الفاظ فرمائے تھے)۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے اس کے حاشیہ پر تحریر فرمایا کہ احقر کے ذہن میں جو بے تکلف مطلب آیا اس کو

بسبیل احتمال عرض کرتا ہوں کہ کاملین میں ایک درجہ ہے "ابوالوقت" کہ وہ جس وقت جس تجلی کو چاہیں اپنے اوپر وارد کرلیں۔ کذا سمعت عن مرشدی رحمہ اللہ تعالیٰ پس عجب نہیں کہ حضرت شاہ صاحب نے اس وقت اپنے پر جبار کی تجلی کو وارد کیا ہو اور اس کی مظہریت کی حیثیت سے اس کو توجہ سے دفع فرما دیا ہو۔ (ارواح ثلاثہ: ص ۵۶)

میاں جی محمدی صاحب کا واقعہ

ارواحِ ثلاثہ میں لکھا ہے کہ میاں جی محمدی صاحب کے صاحبزادے سخت بیمار تھے اور اطباء نے جواب دے دیا تھا۔ ان کے والدین کو اس وجہ سے تشویش تھی۔ اتفاق سے میاں جی صاحب نے خواب میں دیکھا کہ مولوی اسماعیل صاحب مسجد کے بیچ کے در میں وعظ فرما رہے ہیں اور میں مسجد کے اندر ہوں اور میرے پاس عبدالعزیز بیٹھا ہے۔ اتفاق سے اسے پیشاب کی ضرورت ہوئی اور میں اسے پیشاب کرانے لے چلا آدمیوں کی کثرت کی وجہ سے اور طرف راستہ نہ تھا اور مولوی اسماعیل صاحب سے بے تکلفی تھی۔ اس لیے میں اسے مولوی اسماعیل صاحب کی طرف لے گیا۔ جب عبدالعزیز مولوی اسماعیل صاحب کے سامنے سے گزرا تو انہوں نے تین مرتبہ "یاشافی" پڑھ کر دم کر دیا۔ اس خواب کے بعد جب آنکھ کھلی تو انہوں نے اپنی بیوی کو جگایا اور کہا کہ عبدالعزیز اچھا ہو گیا۔ اطباء غلط کہتے ہیں کہ یہ نہ بچے گا میں نے اس وقت ایسا خواب دیکھا ہے۔ صبح ہوئی تو میاں عبدالعزیز بالکل تندرست تھے۔ (ارواح ثلاثہ: ص ۸۷)

(ش)......ارواحِ ثلاثہ میں ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ جس کی روایت حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی، حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی نقل کی ہے کہ بڑے میاں (شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) اور چھوٹے میاں (شاہ محمد یعقوب رحمہ اللہ تعالیٰ) دونوں بھائی جب مکہ حرم شریف میں داخل ہوتے تو دروازہ پر جوتے چھوڑ جاتے مگر باوجود اس کے وہاں جوتے کا محفوظ رہنا نہایت مشکل ہے اور سینہ کے سامنے سے اور سر کے سامنے سے خاص حرم کے اندر سے جوتا اٹھ جاتا ہے، ان کا جوتا کبھی چوری نہیں ہوا۔ یہ واقعہ دیکھ کر لوگ متعجب ہوتے اور ان حضرات سے پوچھتے کہ کیا وجہ ہے کہ آپ کا جوتا چوری نہیں ہوتا۔ وہ فرماتے کہ جب ہم جوتا اتارتے ہیں تو چور کے لیے اس کو حلال کر جاتے ہیں اور چور کی قسمت میں حلال مال نہیں، اس لیے وہ انہیں نہیں لے سکتا۔ میر شاہ خان نے کہا کہ جب میں نے یہ قصہ مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند) سے بیان کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ اصل میں تعلیم تھی۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کی جب شاہ صاحب کے زمانہ میں اکبری (دہلی) مسجد میں جوتے چوری جانے لگے تو شاہ صاحب نے لوگوں سے فرمایا

کہ تم اپنے جوتے چوروں کے لیے حلال کردیا کرو۔ پھر وہ انہیں نہیں لیں گے۔

(اروحِ ثلاثہ:ص۱۰۳)

(ص)......اروحِ ثلاثہ میں ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ تحصیل سکندر آباد میں ایک گاؤں ہے حسن پور بہت بڑا گاؤں ہے۔ ایک وقت میں وہ شاہ اسحاق صاحب اور شاہ یعقوب صاحب کا تھا۔ مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی فرماتے تھے کہ شاہ اسحاق صاحب اور شاہ یعقوب صاحب نہایت سخی تھے اور اکثر تنگی کی وجہ سے کچھ ملول سے رہتے تھے، لیکن ایک روز میں نے دیکھا کہ دونوں بھائی نہایت ہشاش بشاش ہیں اور خوشی میں اِدھر سے اُدھر آتے جاتے اور کتابیں یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں رکھتے اور خوشی کے لہجہ میں آپس میں باتیں کررہے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر سمجھا کہ شاید آج کوئی بڑی رقم ہندوستان سے آئی ہے۔ (کہ ہر دو اکابر اس وقت مکہ مکرمہ میں تھے)۔ جس سے یہ اس قدر خوش ہیں۔ یہ سمجھ کر میں نے چاہا کہ واقعہ دریافت کروں مگر بڑے میاں صاحب (شاہ اسحاق صاحب) سے تو یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چھوٹے میاں (شاہ یعقوب صاحب) سے پوچھا کہ حضرت آپ بہت خوش نظر آتے ہیں، اس کی کیا وجہ؟ انہوں نے متعجبانہ لہجہ میں فرمایا کہ تم نے نہیں سنا۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ فرمایا کہ ہمارا گاؤں حسن پور ضبط ہوگیا، یہ خوشی اس کی ہے، کیونکہ جب تک وہ تھا ہم کو خدا پر پورا توکل نہ تھا اور اب صرف خدا پر بھروسہ رہ گیا ہے۔

(اروحِ ثلاثہ:ص۱۰۲)

(ط)......حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جب میں گنگوہ حاضر ہوا تو حضرت کی سہ دری میں ایک کورا بدھنا رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس کو اٹھا کر کنویں سے پانی کھینچا اور اس میں بھر کر پیا تو پانی کڑوا پایا۔ ظہر کی نماز کے وقت حضرت سے ملا اور یہ قصہ بھی بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ کنویں کا پانی تو کڑوا نہیں ہے میٹھا ہے۔ میں نے وہ کورا بدھنا پیش کیا۔ حضرت نے بھی پانی چکھا تو بدستور تلخ تھا۔ آپ نے فرمایا اچھا اس کو رکھ دو۔ نماز ظہر کے بعد حضرت نے سب نمازیوں سے فرمایا کہ کلمہ طیب جس قدر جس سے ہوسکے پڑھو اور حضرت نے بھی پڑھنا شروع کیا۔ بعد میں حضرت نے دعاء کے لیے ہاتھ اٹھائے اور نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ دعاء مانگ کر ہاتھ منہ پر پھیر لیے۔ اس کے بعد بدھنا اٹھا کر پانی پیا تو شیریں تھا۔ اس وقت مسجد میں بھی جتنے نمازی تھے سب نے چکھا تو کسی قسم کی تلخی نہ تھی۔ بعد میں حضرت نے فرمایا کہ اس بدھنے کی مٹی اس قبر کی ہے، جس پر عذاب ہو رہا تھا۔ الحمدللہ کی برکت سے عذابِ قبر رفع ہوگیا۔

(ارواح ثلاثہ:ص۳۰۵)

(ع)......میرے دادا صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے زمانہ میں نظام الدین کی مسجد کا گھنٹہ چلتے چلتے

بند ہوگیا۔ گھڑی ساز کو دکھایا گیا۔ اس نے گھنٹہ کو دیوار ہی پر کھول کر دیکھا اور کہا کہ اس میں تو لمبا کام ہے دو تین دن میں ہو سکے گا۔ دادا صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے مسجد کے سب بچوں کو جمع کر کے فرمایا کہ بسم اللہ سمیت الحمد شریف سات دفعہ اول و آخر درود شریف سات سات دفعہ پھونک مارو۔ سب نے دم کیا اور گھنٹہ خود بخود چلنے لگا۔ بہت مشہور قصہ ہے۔

(ف)......مولانا محمد منظور صاحب نعمانی حضرت دہلوی کے ملفوظات میں تحریر فرماتے ہیں:

''ایک مرتبہ دہلی کے ایک تاجر ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ کام کر کے سندھ سے واپس آئے تھے۔ وہاں کے کام کی رپورٹ ان سے سن کر حضرت نے فرمایا، دوستو! ہمارا یہ کام (اصلاحی و تبلیغی جدوجہد) ایک طرح کا عمل تسخیر ہے۔ (یعنی جو کوئی اس کام میں لگے گا اور اس کو اپنی دھن بنالے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے کام بناتا رہے گا)۔ ''مَن کان للّٰہ کان اللّٰہ لہ'' اگر تم اللہ کے کام میں لگو گے تو زمین و آسمان اور فضا کی ہوائیں تمہارے کام انجام دیں گی۔ تم اللہ کے کام میں گھر اور کاروبار چھوڑ کر نکلے تھے، اب آنکھوں سے دیکھ لینا تمہارے کاروبار میں کتنی برکت ہوتی ہے۔ اللہ کی نصرت کر کے جو اس کی نصرت و رحمت کی امید نہ رکھے، وہ فاسق اور بے نصیب ہے۔''

مرتب عرض کرتا ہے کہ آخری فقرہ آپ نے ایسے انداز اور اتنے جوش سے کہا کہ حاضرین مجلس کے دل ہل گئے۔ (ملفوظات حضرت دہلوی: ص ۱۳۶،۱۱۲)

(ک)......حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''میں نے دیوبند کے ایک انگریزی داں سے سنا ہے کہ ایک شخص کا مقدمہ ڈپٹی ظہیر عالم کے یہاں تھا۔ یہ سہارنپور میں ڈپٹی تھے۔ وہ شخص حضرت حاجی محمد عابد حسین صاحب کے پاس آیا کہ حاجی جی مجھے ایک تعویذ دے دو میرا مقدمہ ظہیر عالم کے یہاں ہے، حاجی صاحب نے اس کو تعویذ دیا کہ اس کو پگڑی میں رکھ لینا جب یہ عدالت میں اجلاس پیشی پر پہنچا، ڈپٹی صاحب نے کچھ سوال کیا تو اس نے کہا ٹھہر جائیں دیوبند والے حاجی صاحب کا تعویذ لایا ہوں وہ لے آؤں پھر پوچھنا تو ڈپٹی صاحب اس پر ہنسے کیونکہ وہ عملیات کے معتقد ہی نہ تھے۔ جب وہ تعویذ لے آئے تو ڈپٹی صاحب سے کہا، اب پوچھے کیا پوچھتے ہیں اور دیکھے حاجی صاحب کا تعویذ یہ رکھا ہے (پگڑی دکھلائی)۔ ڈپٹی صاحب نے وہ مقدمہ قصداً بگاڑا۔ لیکن جب فیصلہ لکھا پڑھنے بیٹھے تو وہ موافق تھا۔ پھر ڈپٹی صاحب حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں معذرت کو حاضر ہوئے۔'' (جدید ملفوظات حضرت تھانوی: ص ۶۳)

رنجیت سنگھ کا واقعہ

(ل)......حضرت تھانوی نے ارشاد فرمایا کہ رنجیت سنگھ کی حکایت مشہور ہے کہ دریا اٹک پر پہنچا

تو آگے پار ہونے کا اس وقت سامان نہ تھا، (یعنی کشتی وغیرہ) اس نے اسی طرح گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ کسی نے کہا کہ جناب یہ اٹک ہے۔ رنجیت سنگ نے فوراً کہا کہ جس کے دل میں اٹک اس کے لیے اٹک۔ چونکہ اس کا بھروسہ کامل تھا پار ہو گیا۔ جب اہل باطل کے یقین میں یہ اثر ہے تو اہل حق کے یقین میں کیا کچھ ہوگا۔ (الکلام الحسن: ص ۲۱)

اسی نوع کا ایک واقعہ انگریز کی کوٹھی کا گزر چکا۔ حسن العزیز میں بھی رنجیت سنگھ کا واقعہ اس طرح ہے کہ مع فوج جا رہا تھا۔ درمیان میں دریائے اٹک پڑا، کشتی تھی نہیں لوگوں نے کہا کہ اٹک دریا ہے اس نے جواب دیا کہ جس کے دل میں اٹک اس کے لیے اٹک ہے اور گھوڑا ڈال دیا۔ گھوڑوں کے سم کے سوا اور کچھ بھیگا تک نہیں۔ ان کو خدا پر اعتماد تھا خدا نے پار اتار دیا۔

حضرت علاء بن الحضرمی کا واقعہ

سیر کی کتابوں میں علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ کا قصہ مذکور ہے۔ ''حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے ان سے کہہ دیا تھا کہ راستہ میں توقف مت کرنا۔ ایک موقع پر پہنچے کہ وہاں سمندر حائل تھا۔ حالانکہ مطلب خلیفہ کا یہ تھا کہ آرام کے لیے توقف مت کرنا نہ یہ کہ سمندر ہو جب بھی توقف نہ کرنا۔ پس عبور عزم بالجزم کر لیا اور دعاء کی کہ موسیٰ علیہ السلام کو راستہ ملا تھا۔ ہم غلامان محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اے اللہ ہم کو راستہ ملے اور بسم اللہ کر کے گھوڑا ڈال دیا اور اُتر گئے۔'' اب رہا یہ شبہ کہ کفار کے لیے ایسا کیوں ہوتا ہے تو بات یہ ہے کہ کفار کی دعاء بھی قبول ہو سکتی ہے یہ تو مسلم ہے اسی طرح ان کا توکل بھی مؤثر ہو سکتا ہے غرض جیسے دعاء قبول ہوتی ہے اسی طرح توکل بھی نافع ہو سکتا ہے۔ بلکہ کافر کی بعض دعاء تو ایسی قبول ہوئی ہیں کہ مسلم کی بھی کبھی نہیں ہوئی اور وہ دعاء ہے ابلیس کی ''اَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ''۔

غیر مسلموں کو بھی توکل نافع ہوتا ہے:

بات یہ ہے کہ ''انا عند ظن عبدی بی'' انسان خدا تعالیٰ کے ساتھ جیسا ظن کر لیتا ہے اسی طرح پورا فرما دیتے ہیں۔ بت پرستوں تک کی بھی حاجت پوری ہوتی ہے چونکہ ان کو حق تعالیٰ سے یہی گمان ہوتا ہے۔ (حسن العزیز ۱/۳: ص ۱۴۲)

حضرت تھانوی کے توکل پر ایک غیر مسلم کا تاثر

(ن)......انفاس عیسیٰ میں لکھا ہے کہ خلافت کی شورش کے زمانہ کا قصہ ہے کہ یہاں پر ایک شخص تھا۔ ہندو راجپوت پرانا آدمی تھا۔ میں صبح کو جنگل سے آ رہا تھا وہ مل گیا۔ کہنے لگا کہ کچھ خبر ہے

تمہارے لیے کیا کیا تجویزیں ہورہی ہیں، اکیلے مت پھرا کرو۔ میں نے کہا جس چیز کی تم کو خبر ہے مجھ کو اس کی بھی خبر ہے اور ایک اور چیز کی بھی خبر ہے جس کی تم کو خبر نہیں۔ پوچھا وہ کیا؟ میں نے کہا کہ وہ یہ کہ بدون خدا کے حکم کے کسی سے کچھ نہیں ہوسکتا، کہنے لگا پھر تو جہاں چاہو پھرو تمہیں کچھ جوکھم یعنی اندیشہ نہیں۔ دیکھئے ایک ہندو کا خیال کہ خدا پر بھروسہ رکھنے والے کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

(انفاسِ عیسیٰ: ص۵۸۹)

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر ۶

اکابر کا اپنی تنخواہوں کا زائد سمجھنا

میں نے اپنے اکابر کا یہ معمول بہت ہی اہتمام سے ہمیشہ دیکھا کہ انہوں نے اپنی تنخواہ کو اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھا۔ حضرت اقدس سیدی ومرشدی حضرت سہارنپوری اور حضرت شیخ الہند کے متعلق میں آپ بیتی میں کہیں لکھوا چکا ہوں کہ میرے حضرت کی تنخواہ مظاہر علوم میں چالیس اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی دار العلوم دیوبند میں پچاس روپے تھی۔ ان دونوں کے متعلق جب بھی ممبران اور سرپرستان کی طرف سے ترقی تجویز ہوتی تو دونوں حضرات اپنی اپنی جگہ یہ کہہ کر ترقی سے انکار کر دیا کرتے تھے کہ ہماری حیثیت سے یہ بھی زیادہ ہے۔ دونوں مدرسوں میں جب بھی مدرس دوم کی تنخواہ کے برابر پہنچ گئی تو ممبران نے یہ کہہ کر کہ اب ماتحت کے انکار سے ان کی ترقیاں رک جائے گی اس پر مجبوراً ہر دو اکابر نے اپنی اپنی ترقی قبول کی۔ میرے استاد حضرت مولانا عبداللطیف صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے کئی بار مجمع میں فرمایا:

''میں نے اپنی ساری ملازمت میں کبھی اپنی ترقی کی درخواست نہ تحریراً پیش کی نہ زبانی کبھی کسی سے کہا''۔

اشرف السوانح صفحہ ۳۷ میں لکھا ہے کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ جب جامع العلوم کانپور میں مدرس اول بن کر تشریف لے گئے تو حضرت کی تنخواہ پچیس روپے تھی، لیکن حضرت تھانوی اس کو زائد ہی سمجھتے رہے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا ہے:

''میں طالب علمی کے زمانہ میں جب کبھی اپنی تنخواہ سوچا کرتا تھا تو زیادہ سے زیادہ دس روپے سوچتا تھا۔ پانچ روپے اپنی ضروریات کے لیے اور پانچ روپے گھر کے خرچ کے لیے، بس اس سے زیادہ تنخواہ پر کبھی نظر ہی نہیں جاتی تھی۔ نہ اس سے زیادہ کا اپنے کو مستحق سمجھتا تھا''۔

حضرت مولانا یعقوب کا واقعہ

تذکرۃ الخلیل میں حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کے بھوپال جانے کی تقریب کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ اجمیری کی ایک صد ماہوار کی تنخواہ اور بریلوی کے انسپکٹری مدارس کو چھوڑ کر دار العلوم میں تیس (۳۰) روپے ماہوار پر اکابر کے مشورہ سے تشریف لے آئے تھے۔ اس کے بعد بھوپال کے مدار المہام صاحب نے جو حضرت

مولانا کے والد مملوک علی صاحب کے شاگرد تھے۔ بحق صاحبزادگی مولانا کو بھوپال تین سو روپیہ ماہوار پر بلانا چاہا۔ مولانا نے یہ جواب تحریر فرمایا ''لا حاجة في نفس يعقوب الاقضاها''۔ یعقوب کی جو کچھ دلی حاجت تھی وہ پوری ہو چکی کہ بقدر ضرورت معاش کے ساتھ اہل اللہ کا قرب اور علمیہ دینیہ خدمت نصیب ہو گئی۔ لہٰذا اب کہیں آنے جانے کا خیال نہیں۔

اضافاتِ یومیہ جلد نہم صفحہ ۳۵۰ میں حضرت حکیم الامت کا ایک ارشاد نقل کیا ہے فرماتے ہیں: ''نقل کرتے بھی صدمہ ہوتا ہے کہ ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ایسے بے نظیر بزرگ اور پھر بھی ان کی تنخواہ کیا تھی صرف چالیس روپے ماہوار جو آج کا ایک نو آموز طالب علم بھی مشکل سے قبول کرتا ہے کہ اگر تنخواہ کی کمی بھی منظور کرتا ہے تو اس طرح سے کہ اثر میں کمی نہ ہو۔'' چنانچہ ایک مدرسہ میں بوجہ قلت آمدنی مدرسین سے کہا گیا کہ اپنی تنخواہوں میں تخفیف منظور کر لیں۔ صدر مدرس صاحب نے کہا کہ اس طرح تو تخفیف نہیں کروں گا۔ میں تنخواہ تو پوری لوں گا، لیکن جتنی تخفیف ضروری سمجھی جائے اتنی رقم اپنی طرف سے مدرسہ میں داخل کر دیا کروں گا۔ تاکہ نام تو رہے کہ تنخواہ اتنی ہے۔ تو یہاں تک باتیں نظر میں آنے لگیں کہ چاہے تنخواہ کم ہو جائے، لیکن شان ویسی ہی رہے۔ اب تو اتنی تنخواہ کو کوئی خاطر میں بھی نہیں لاتا اور وہاں اس کی بھی بڑی قدر تھی۔ وجہ کیا کہ وہ حضرات اپنے کو صاحب کمال ہی نہ سمجھتے تھے، اس واسطے صاحبِ مال ہونا نہیں چاہتے تھے۔

حضرت گنگوہی کا واقعہ

تذکرۃ الرشید جلد ا صفحہ ۵۵ میں اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ طالبِ علمی کے بعد متاہل بھی ہو چکے تھے اور اپنا بار کسی دوسرے پر ڈالنا نہیں چاہتے تھے کہ اس دوران میں ایک جگہ سے قرآن شریف کے ترجمہ پڑھانے کی ملازمت سات روپیہ میں آئی آپ نے اپنے مرشد اعلیٰ حضرت سے اجازت چاہی۔ اعلیٰ حضرت نے منع فرما دیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ اس کو منظور نہ کرو اور زیادہ کی آئے گی۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ سہانپور کے رئیس نواب شائستہ خان نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے دس روپے تنخواہ پر بلایا۔ حضرت امام ربانی تو دنیا کی نگاہ میں بہت اونچے تھے، مگر اپنی نگاہ میں ارزاں تھے۔ اس لیے دس کو اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ اعلیٰ حضرت کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ اگر صبر کرتے تو اور زیادہ کی آتی اور چھ ماہ یہ ملازمت اختیار فرمائی تاکہ کسبِ حلال کا فریضہ بھی ادا ہو جائے اور بعد والوں کے لیے تعلیم پر اجرت لینے کا راستہ بھی کھل جائے۔

حافظ منگتو صاحب کا واقعہ

یہ ناکارہ آپ بیتی جلد۲ صفحہ۳۲ میں اپنے قرآن پاک کے استاد اور کاندھلہ کے جملہ اکابر کے استاذ حافظ منگتو کا قصہ لکھوا چکا ہے کہ میرے دادا نے ان کو دو (۲) روپے ماہوار پر رکھا تھا۔ پندرہ (۱۵)، بیس (۲۰) سال کے بعد سات روپیہ تک پہنچے تھے۔ اس وقت میرے کاندھلہ کے بہت سے اکابر کا علی گڑھ سے تعلق وابستہ ہوگیا تھا۔ ان لوگوں نے بہت ہی کوشش کی کہ حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو کاندھلہ سے علی گڑھ منتقل کریں اور ۴۰، ۵۰، ۶۰، ۱۰۰ روپے تک تنخواہ پیش کی۔ حافظ صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ایسے کا بٹھایا ہوا ہوں کہ سات (۷۰۰) سو پر بھی نہیں جا سکتا۔

شیخ علی متقی کا واقعہ

نظام تعلیم و تربیت میں مولانا مناظر احسن گیلانی نے علی متقی صاحب کنز العمال کا ایک عجیب قصہ لکھا ہے کہ حضرت مولانا شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ گجرات کا سلطان بہادر خان مدت العمر اس آرزو میں رہا کہ شیخ علی متقی اس کے شاہی محل کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سعادت اندوزی کا موقع دیں، لیکن آرزو پوری نہیں ہوتی تھی، وقت کے قاضی عبداللہ المسندی کو بادشاہ نے تیار کیا کہ وہ حضرت شیخ کے کسی طرح ایک مرتبہ سرائے کی تشریف آوری پر آمادہ کریں۔ المسندی بڑی جدوجہد کے بعد اس میں کامیاب ہوئے، لیکن شیخ نے اس شرط پر جانا قبول کیا کہ بادشاہ کے ظاہر و باطن میں اگر کوئی غیر اسلامی عنصر آئے گا تو میں چپ نہیں رہوں گا اور برسرِ دربار ٹوک دوں گا۔ بادشاہ نے شرط منظور کر لی اور شیخ سے کہلا بھیجا کہ آپ کا جو دل چاہے کہیں۔ شیخ تشریف لائے اور جو جی میں آیا بادشاہ کے منہ پر کہتے چلے گئے اور واپس چلے گئے۔ بادشاہ نے ایک کروڑ کی مقدار تنکہ گجراتی بعد میں ہدیہ بھیجا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ تنکہ کی کیا قیمت ہوگی، بہرحال ایک کروڑ کی مقدار بھی کچھ کم نہیں ہوتی۔ حضرت شیخ علی متقی نے وہ نذرانہ لانے والے قاصد کو قاضی صاحب ہی کے حوالے کر دیا کہ یہ تمہارے ہی ذریعہ سے آیا تم ہی اس کے زیادہ مستحق ہو۔

حضرت نانوتوی کا واقعہ

اور ارواحِ ثلاثہ میں لکھا ہے کہ مولوی امیر الدین صاحب نے فرمایا کہ ایک مرتبہ بھوپال سے مولانا (حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی) کی طلبی آئی اور پانچ سو (۵۰۰) روپے ماہوار تنخواہ مقرر

کی، میں نے کہا کہ اے قاسم تو چلا کیوں نہیں جاتا۔ تو فرمایا کہ وہ مجھے صاحبِ کمال سمجھ کر بلاتے ہیں اور اس بناء پر وہ پانچ سو روپے دیتے ہیں۔ مگر میں اپنے اندر کوئی کمال نہیں پاتا، پھر کس بناء پر جاؤں؟ میں نے بہت اصرار کیا مگر نہیں مانا۔ (ارواحِ ثلاثہ: ص ۲۱۷)

سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ نواب صدر یار جنگ صدر الصدور حکومت آصفیہ مزے لے لے کر اس واقعہ کا ذکر کرتے تھے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ خاکسار کے سامنے نواب صاحب مرحوم نے اس واقعہ کا اعادہ کتنی دفعہ فرمایا ہوگا۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ علی گڑھ کے جس ضلع میں نواب صاحب کی راجدھانی حبیب گنج واقع ہے، اسی علی گڑھ میں جب وہ کول کے نام سے مشہور تھا۔ ایک رئیس مولوی اسماعیل صاحب نامی تھے۔ جن کو حدیث پڑھنے کا شوق ہوا، لیکن ریاست کے کاروبار کی مشغولیت اس کا موقع نہیں دیتی تھی کہ گھر سے باہر نکل کر اپنے شوق کو پورا کریں۔ نواب صاحب فرماتے تھے کہ مولوی اسماعیل صاحب نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی خدمت میں معروضہ پیش کیا کہ کسی عالم کو جو حضرت کے نزدیک قابلِ اعتما ہو، علی گڑھ بھیج دیا جائے تاکہ میں ان سے حدیث پڑھوں۔ جواب میں مولانا نے ارقام فرمایا کہ اور کسی عالم کو اپنے کاموں سے فرصت کہاں ہے جو آپ کے پاس جانے پر راضی ہوسکتے ہوں، البتہ ایک بے کار آدمی خود یہ فقیر ہے حکم ہو تو بندہ ہی حاضر ہوکر آپ کی خدمت کی سعادت حاصل کرے۔

مولوی اسماعیل بے چارے کے لیے یہ نوید جاں افزا تھی کہ خود حضرت نانوتوی پڑھانے پر آمادہ ہوگئے ہیں۔ بہ دل و جان تشریف آوری کی تمنا انہوں نے ظاہر کی۔ کہتے تھے کہ ان کو پڑھانے کے لیے علی گڑھ میں مولانا نے قیام فرمایا اور مولوی اسماعیل جو کتابیں پڑھنا چاہتے تھے، ان کو پڑھا کر آپ علی گڑھ سے تشریف لے گئے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر اسی کے ساتھ دلچسپ کہئے یا دلدوز معاوضہ کی کمی بیشی کا بھی ذکر فرمایا کرتے تھے۔ وہ یہ ہے کہ شیروانی صاحب نور اللہ ضریحہ کے بیان کا مرکزی جزو یہ تھا کہ تنخواہ کا مسئلہ جب پیش ہوا تو مولوی اسماعیل نے دست بستہ عرض کیا، حضرت والا جو کچھ فرمائیں گے وہی رقم خدمت میں پیش کی جائے گی۔ جواب میں حکم ہوا کہ جب تک میں تمہارے یہاں ہوں ماہوار پندرہ روپے دے دیا کرنا تاکہ گھر بھیج دوں۔ اس قلیل رقم کو سن کر مولوی اسماعیل شرمندہ تھے، لیکن بات پہلے ہی طے ہوچکی تھی کہ یہ مسئلہ بجائے تمہارے فیصلہ کے میری رائے کے تابع رہے گا۔ اسی لیے خاموش ہوگئے۔ کئی مہینے حسبِ وعدہ پندرہ کی رقم پیش کرتے رہے۔

اسی عرصہ میں ایک دن مولوی اسماعیل جب پڑھنے کے لیے حاضر ہوئے تو مولانا نے فرمایا کہ میاں اسماعیل! جو رقم اب تک تم دیتے تھے اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت پیش آگئی۔ وہ خاموش ہوئے

کہ شاید کچھ اضافہ کی منظوری عطاء فرمائی جائے گی، لیکن جب ان سے مولانا یہ فرمانے لگے کہ بھائی پندرہ روپے جوتم دیتے تھے ان میں دس تو میں اپنے گھر کے لوگوں کو دیا کرتا تھا اور پانچ روپے والدہ کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا۔ کل خط آیا کہ والدہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ اس لیے ان پانچ روپے کی ضرورت اب باقی نہیں رہی، آیندہ بجائے پندرہ کے دس ہی روپے دیا کرنا۔ مولوی اسماعیل ششدر و حیران تھے۔ کہتے جاتے تھے کہ حضرت مجھ پر کوئی بار نہیں، لیکن اِدھر سے اصرار تھا کہ غیر ضروری روپے کا بار اپنے سر کیوں لوں؟ آخر بات دس ہی روپے والی طے ہوگئی۔ مگر قاری طیب صاحب جنہوں نے اس قصہ کو براہِ راست نواب صدر یار جنگ سے سنا ہے وہی خاکسار سے فرماتے تھے کہ اس قصہ کے آخری جزء کے متعلق خیال گزرتا ہے کہ نواب صاحب کو کچھ اشتباہ ہوگیا تھا۔ مختلف وجوہ سے فرماتے تھے کہ اس جزء کے صحت میں مجھے کلام ہے۔ مثلاً یہی کہ تصحیح کے سوا مولانا نے درس و تدریس پر کبھی معاوضہ نہیں لیا۔ اس پر تمام اکابر دیوبند کا اتفاق ہے۔

(سوانح قاسمی: ص ۴۲۸)

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر ۷

ماحول کا اثر

ماحول کے اثرات تو ایسے اظهر من الشمس ہیں کہ ان کا تو احصاء اور شمار بھی بہت دشوار ہے۔ ہر سال مدارس میں دیکھتے ہیں کہ جو طلبہ دوسرے مدارس میں اساتذہ کے ہاتھوں سے خوب پٹتے ہوئے آتے ہیں، وہ دوسرے مدارس میں جا کر اس قدر صاحبِ عزت اور صاحبِ نخوۃ بن جاتے ہیں کہ ان کی شان میں اساتذہ کی سخت کلامی بھی موجب توہین بن جاتی ہے، جو طلبہ دوسرے مدارس میں اپنے ہاتھ سے کچی پکی روٹی اللہ کا شکر ادا کر کے مزے سے کھاتے ہیں، ان کو بڑے مدارس میں جا کر اس پر تاؤ آتا ہے کہ نان ذرا سا جل گیا۔ لیجیو، دیکھو، پکڑ و، یوں طباخ کو نکالو، منشی کو معطل کرو، نظامت نا اہل ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں بھی کہاں سے کہاں بہک جاتا ہوں۔ ماحول کے اثرات لکھوا رہا تھا۔ مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روٹی پر کہیں سے کچی اور کہیں سے جل جانے پر ناراضی کے واقعات سن کر تو اتنی چوٹ لگتی ہے۔ ہر مدرسہ میں اور بڑے مدرسوں میں یہ مصیبتیں سنتا رہتا ہوں، جس پر ایک غیر متعلق واقعہ یاد آ گیا۔ جس کو میں فضائل صدقات حصہ دوم کے بھوکے رہنے کے دس فوائد کے ذیل میں لکھوا چکا ہوں کہ ایک بزرگ نے اپنے کسی ملنے والے کی دعوت کی اور ان میں سے الٹ پلٹ کر اچھی روٹی تلاش کرنے لگے۔ میزبان بزرگ نے فرمایا یہ کیا کر رہے ہو، جس روٹی کو تم بُری سمجھ کر چھوڑ رہے ہو اس میں اتنے اتنے فوائد ہیں اور اتنی اتنی مشقت اٹھانے والوں کی اس میں محنت ہوتی ہے کہ بہت سے کام کرنے والوں کے عمل کے بعد ابر میں پانی آیا پھر وہ برسا، پھر ہواؤں کی، زمین کی، چوپایوں کی اور آدمیوں کی محنت اس میں لگی جب تو یہ روٹی تمہارے سامنے آئی، اس کے بعد تم اس میں اچھی بری چھانٹنے لگے؟ کہتے ہیں کہ ایک روٹی پک کر تمہارے سامنے اس وقت تک نہیں آتی جب تک اس میں تین سو ساٹھ کام کرنے والوں کا عمل نہیں ہوتا۔

سب سے اول حضرت میکائیل علیہ السلام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے خزانے سے ناپ کر چیز نکالتے ہیں، پھر وہ جو اَبر پر مامور ہیں اور بادلوں کو چلاتے ہیں، پھر چاند، سورج اور آسمان، پھر وہ فرشتے جو ہواؤں پر مامور ہیں، پھر چوپائے، سب سے آخر میں روٹی پکانے والے، سچ ہے پاک ارشاد میرے رب سبحانہ وتقدس کا ''وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها'' اگر تم اللہ تعالیٰ کی ایک

نعمت اور اس کی تفصیلات کو شمار کرنے لگو تو کبھی بھی پوری نہیں گن سکتے۔

(فضائل صدقات حصہ دوم عکسی:ص ۴۱۷)

یہ غیر متعلق بات ویسے ہی یاد آ گئی، اس وقت تو مجھے ماحول کے اثرات بیان کرنے تھے۔اس قسم کے واقعات تو بہت ہی لا تعدو لا تحصٰی ہیں۔اس وقت چند واقعات لکھواتا ہوں۔

مولوی لئیق مرحوم کا واقعہ

(۱)..... مجھے اس وقت اپنے ایک دوست مولوی لئیق احمد سہارنپوری مرحوم کا قصہ یاد آیا، جو آپ بیتی نمبر ۴ میں بھی لکھوا چکا ہوں۔ جو بہت ہی ذی استعداد تھا اور میرے خاص دوستوں میں تھا۔مظاہر علوم میں جب فارغ التحصیل ہوا تو میں نے بلا اس کی تحریک کے ازخود اس کی مدرسی کی تحریک کی، حضرت ناظم صاحب مولانا عبد اللطیف صاحب بھی اس کی استعداد سے واقف تھے، انہوں نے پسند کیا۔ میں نے اس کے لیے ۲۰ روپے تنخواہ تجویز کی اور اس نے بہت خوشی سے اس کو قبول کیا، لیکن دو تین دن بعد آ کر اس نے قلت تنخواہ کا عذر کیا کہ کم از کم پچیس (۲۵) روپے میں کام کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا کہ بیس روپے بھی تمہاری خصوصی رعایت تھی۔ضابطہ کے موافق پندرہ سے زیادہ نہ ہونی چاہیے تھی۔اس نے منظور نہ کیا اور نظام الدین بسلسلہ تبلیغ و تدریس چلا گیا اور دونوں کاموں کا معاوضہ آٹھ (۸) روپیہ تنخواہ تجویز ہوئی۔ چونکہ نظام الدین کی سرپرستی بھی اس وقت اس سیہ کار کے متعلق تھی' در میں کثرت سے نظام الدین حاضر ہوتا رہتا تھا۔ایک سال بعد میری نظام الدین حاضری پر وہاں کے مہتمم نے وہاں کے مدرسین کی تنخواہ میں اضافہ کی درخواست پیش کی اور کہا کہ مدرسہ کے یہ مدرسین اگرچہ ان کی طرف سے تنخواہ میں اضافہ کی کوئی درخواست نہیں ہے، مگر ان کی ہر ایک کی آٹھ روپے تنخواہ ہے، لیکن دو روپیہ اگر اضافہ کر دیا جائے تو اچھا ہے۔ میں نے کہا کہ دو نہیں چار، مگر چچا جان نے فرمایا کہ ابھی تو دو ہی رہنے دو۔ ہمارے مدرسین کی عادت نہ بگاڑو۔

ان مدرسین میں ایک نام عزیز لئیق مرحوم کا بھی تھا۔ میں نے مغرب کے بعد عزیز مرحوم کو بلایا۔ وہ سمجھ تو گیا اور نہایت شرمندگی سے سر جھکائے ہوئے آیا۔ وہ منظر اس وقت بھی یاد ہے۔ میں نے پوچھا کہ لئیق تو وہی ہے، وہ چپ رہا۔ میں نے کہا خاموش رہنے کی ضرورت نہیں، میں تو صرف بات پوچھتا ہوں کہ تو نے وہاں کے بیس روپے کو قبول نہ کیا اور یہاں آٹھ روپیہ پر کام کر رہا ہے۔ اس مرحوم نے بہت ہی شرمندگی سے یہ کہا کہ صرف ماحول کا اثر ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے تو بیس روپے بڑی خوشی سے قبول کیے تھے، مگر وہاں کے مدرسین نے مجھے مجبور کیا

کہ اگر تیری پچیس روپے تنخواہ ہوگئی تو ہمارا بھی راستہ کھلے گا اور بھی اسی قسم کے واقعات وہاں لکھوا چکا ہوں۔ ماحول کے تغیرات کے تو بہت سے قصے میں سنا تا بھی ہوں۔ شاید آپ بیتی میں بھی کہیں دو چار گزر گئے ہوں۔

مولوی احمد احسن گنگوہی کا واقعہ

(۲)...... یہ قصہ میں نے اپنے والد صاحب سے متعدد مرتبہ سنا ہے کہ گنگوہ میں لال مسجد کے نام سے جو مشہور مسجد ہے۔ میرے والد صاحب کا ابتدائی طالب علمی کے زمانہ میں وہیں قیام تھا۔ اس کے سامنے مولوی احمد حسن صاحب مرحوم کی ایک ٹال تھی۔ اپنے بچپن میں میں نے بھی مرحوم کو دیکھا۔ بہت بوڑھے آدمی تھے، اپنی ٹال کے دروازے میں چار پائی پر پڑے رہا کرتے تھے۔ وہ اپنا قصہ سنایا کرتے تھے اور اپنے پوتوں سے یوں کہا کرتے تھے کہ بچو! تمھیں کیا کہوں۔ ماحول اور زمانہ کا تغیر تو خود مجھ پر بھی گزر چکا ہے۔ میں اپنی جوانی میں اسی ٹال میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک فوجی نوجوان گزرا اور اس نے لال مسجد کو جھک کر سلام کیا، میں نے اس کو بلایا کہ بھائی اور تو بہتری چیزیں دیکھی ہیں، مگر مسجد کو جھک کر سلام کرنا ابھی تک نہیں دیکھا۔ اس نے کہا اللہ کا گھر ہے۔ میرے بار بار اصرار سے پوچھنے پر اس نے یہ قصہ سنایا کہ میں اپنی ابتدائی جوانی میں گھر سے لڑ کر بھاگ گیا۔ صحت اچھی تھی، بدن میں طاقت تھی۔ سہار نپور جا کر پولیس میں نوکری کر لی۔

میری جوانی اور قوت کو دیکھ کر دو تین سال میں مجھے فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ فوج میں بھرتی ہونے کے بعد خوب لوٹ مار کی۔ جہاں سے جو کچھ ملا خوب جمع کیا۔ دو تین سال میں سو (۱۰۰) اشرفیاں جمع کر لی اور سو بوٹ تیار کر کے گھر والوں کو دکھلانے کے واسطے گیا اور جب گنگوہ پہنچا، گھر لکھنؤ کے قریب تھا تو میں نے سوچا کہ خوب نہا دھو کر بن سنور کر گھر جاؤں گا۔ اس مسجد کے غسل خانہ میں خوب صابن بوٹنہ وغیرہ مل کر نہایا، نہانے کے بعد خوب پاؤڈر ملا اور اس کی کھونٹی پر اپنی سو اشرفیاں والی ہمیانی لٹکا دی جو لکھنوتی کے قریب جا کر یاد آئی، جب ہی وہاں سے لوٹا، یہاں آکر دیکھا تو کون چھوڑتا، واپس چلا گیا۔ اس کے بعد سے جب اس مسجد پر آتے جاتے گزر ہوتا ہے تو اس مسجد کو سلام کرتا ہوں۔

حاجی احمد حسن نے کہا کہ میں نے اس فوجی سے کہا کہ دیکھ وہ چھپر کے نیچے کھونٹی میں ایک چیز لٹک رہی ہے وہ تیری تو نہیں۔ یا س نے اندر جا کر دیکھا اور خوشی سے اچھل پڑا۔ کہنے لگا وہی ہے، وہی ہے، اس نے اشرفیاں کو نکال کر گنا تو پوری سو تھیں۔ مجھے اس وقت اس میں سے دس اشرفیاں نکال کر دونوں ہاتھوں سے میرے سامنے پیش کیں۔ مجھے اس وقت اس قدر غصہ آیا کہ جیسا کسی

نے جوتا مارا ہو۔ میں نے اُسے بہت ہی خفا ہو کر برا بھلا کہا اور کہا کہ اس واسطے تین سال سے اس کی حفاظت کر رکھی ہے کہ تو اس کی مزدوری دے گا۔

مگر بچو! تمہیں ماحول کا کیا اثر بتاؤں کہ اب بڑھاپے میں یوں سوچا کرتا ہوں کہ جب وہ اتنی خوشامد کر رہا تھا، منت کر رہا تھا، اگر لے لیتا تو کیا حرج تھا۔ اس قصے میں جہاں ماحول کا اثر اور زمانہ کا تغیر اصل قصہ میں مذکور ہوا، دوسری چیز ماحول کہو یا زمانہ کا تغیر کہو۔ یہ بھی عجیب ہے کہ تین سال تک وہ ہمیانی چھپّر میں کھونٹی کے اوپر لٹکی رہی، نہ کسی نے اس کو اٹھائی نہ چرائی۔ وہ ٹال اس ناکارہ نے بھی دیکھی، زنجیر تالہ تو درکنار اس کو کواڑ اور چوکھٹ بھی نہیں تھی۔ اب تو اس جگہ بڑی تعمیرات ہوگئی ہیں۔

ایک سقہ کا واقعہ

(ب)...... اسی کے ساتھ ایک دوسرا قصہ بھی میں نے اپنے والد صاحب سے کئی مرتبہ سنا ہے کہ جب یہ نہر جمن کھودی جا ہی تھی جورائے پور سے لے کر سہارنپور کا ندھلہ ہوتی ہوئی دہلی تک پہنچی ہے تو نانوتہ کے قریب زمین کھودتے ہوئے زمین کے اندر سے سونے کی ایک سری بہت لمبی بہت موٹی نکلی جو مزدوروں نے سقہ کو دے دی، جو وہاں پانی ڈالا کرتا تھا اور وہی کل مزدوروں کا گویا چودھری یا امیر تھا۔ اس سقے نے دو مزدوروں کو لے کر اسے اٹھایا اور قریب ہی ایک انگریز کا ڈیرا تھا جو گویا اس سارے کاروبار کا افسر اعلیٰ تھا اور ٹھیکے دار تھا، اس کو لے جا کر دے دی۔ اس نے اس کو رکھ لی اور اس کا اندراج کرلیا، مگر ان مزدوروں پر اور سقے پر بہت تعجب کرتا رہا کہ اتنی بڑی دولت ان کو ملی آپس میں بانٹ لیتے تو خبر بھی نہ ہوتی۔

بیس (۲۰) پچیس (۲۵) سال بعد جب کہ یہ انگریز مظفر نگر کا کلکٹر بنا۔ اس کا عدالت میں یہ مقدمہ پیش ہوا کہ ایک سقے نے ایک کمسن بچی کے کان میں گلٹ کی بالیاں دیکھی تھیں، اس سقہ نے سونے کی سمجھ کر اس لڑکی کو قتل کر کے کنویں میں ڈال دیا اور بالیاں نکال لیں۔ یہ سقہ پیش ہوا اور اس نے اقرار بھی کرلیا۔ اس کلکٹر نے اس کو پہچان لیا اور اس سے دریافت کیا کہ تو وہی سقہ ہے جو نہر جمن کی کھدائی میں تھا اور سونے کی سری واپس کردی تھی۔ اس نے اس کا بھی اقرار کیا۔ کلکٹر نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا بات؟ اس نے کہا کہ اس وقت ہمارے ذہن میں یہ تھا کہ دوسروں کی چیز نہیں لی جا سکتی۔ اس کو ہم سُور کھانے سے زیادہ بُرا سمجھتے تھے اور آج کل یوں ہے کہ جو مل جائے وہ اپنا ہی ہے۔ کلکٹر نے مقدمہ یہ کہہ کر خارج کردیا کہ یہ ہماری حکومت کا اثر ہے اس کا قصور نہیں۔

میں نے یہ قصہ ان ہی الفاظ میں سنا۔ ممکن ہے کلکٹر کے یہاں کسی خاص وجہ سے مقدمہ گیا ہو۔

اس زمانہ کے قصوں میں یہ چیزیں خاص طور سے سمجھ میں آئیں کہ منصف انگریز بے تکلف اپنی حکومت پر تنقید کرلیا کرتے تھے۔

(ج)...... ماحول کا ایک عجیب اثر تو میں نے خود بھی اپنے گھر میں دیکھا۔ میری بچیاں مختلف العمر ۴ سال سے ۷ سال تک کی درمیان کی جب سڑک پر سے باجے یا ڈھول کی آواز آتی تو زور سے اپنے کانوں میں انگلیاں دے دیا کرتی تھیں اور ایک دم شور مچالیا کرتی تھی کہ شیطان بول رہا ہے اور اپنی ماں، بڑی بہنوں سے پوچھتی رہتی تھیں کہ شیطان چلا گیا یا نہیں۔ اب ان کی اولا د اس عمر والی جب ڈھول یا باجے کی آواز آتی ہے تو ایک دوسرے کو بلاتی ہیں کہ چل تماشہ دیکھیں۔ میں اپنی بچیوں کو بڑی غیرت دلاتا ہوں کہ تمہارا فعل تمہاری ماں کا اثر تھا اور تمہارے بچوں پر اثر تمہارا ہے۔

ہولی دنوں میں لال رنگ سے احتراز

(د)...... اس کے ساتھ ایک واقعہ اور بھی یاد آ گیا۔ اپنے بچپن میں اپنے سارے گھرانے میں بلکہ خاندان میں یہ معمول دیکھا کہ ہولی کے دنوں میں رنگا ہوا کپڑا نہیں پہنا جاتا تھا۔ عروس بھی سفید کرتیاں اور کالے پائجامے عموماً پہنا کرتی تھیں۔ سُرخ رنگ سے بچپن کا بڑا ہی اہتمام دیکھا تھا۔ اب تو وہ اہتمام نہیں دیکھ رہا ہوں۔

یہ قصہ بھی اپنے بچپن میں گھر کی عورتوں سے کثرت سے سنا۔ کسی مرد سے سنتا تو یاد نہ رہتا۔ ایک بزرگ بہت ہی نیک پابند صوم وصلوۃ واوراد وظائف تھے۔ ان کے انتقال کے بعد کسی نے خواب میں ان کو دیکھا۔ نہایت ہی پرتکلف مکان ہے، نہایت ہی عمدہ بستر ہے، قالین ہیں، نہایت ہی پرتکلف تخت پر آرام کررہے ہیں، مگر ہونٹوں پر ایک چھوٹا سا سانپ کا بچہ لپٹ رہا ہے۔ خواب میں دیکھنے والے نے ان سے بڑی حیرت کے ساتھ پوچھا کہ اس اعزاز واکرام کے ساتھ یہ سانپ کیسا؟

انہوں نے کہا کہ ہولی کے زمانہ میں میں نے پان کھا رکھا تھا اور ایک مریل سا گدھا سامنے کو جارہا تھا، میں نے ایک پان کی پیک اس پر تھوک کر مذاقاً یہ کہہ دیا تھا کہ آج ساری دنیا رنگی ہوگئی ہے تجھے کسی نے نہ رنگا، تجھے میں رنگ دیتا ہوں۔ یہ قصہ اور خواب میرے بچپن کے زمانے میں بہت ہی شائع ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے یاد ہے کہ پان کھانے والے بھی کچھ جھجکتے تھے اور یہ قصہ بوڑھیاں بہت ہی اہتمام کے ساتھ دلہنوں اور نوعمر لڑکیوں کو سنایا کرتی تھیں۔

(س)...... اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ارشاد تو میں بیسیوں جگہ لکھوا چکا ہوں اور ہزاروں

جگہ سنا بھی چکا ہوں۔ یوں فرمایا کرتے تھے کہ طالب علم چاہے کتنا ہی غبی ہو اور کند ذہن ہو اگر اس کو دوستیوں اور یار باشی کا شوق نہیں ہوا تو کسی وقت کام کا ہو کر رہے گا اور چاہے کتنا ہی ذہین ذی استعداد ہو اگر اس کو دوستیوں کا شوق ہوا تو آخر میں بے کار ہو کر رہے گا اور ماحول کے اثرات پر تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں بھی کثرت سے مختلف عنوانات سے متنبہ فرمایا ہے۔

اعتدال میں لکھا ہے کہ اہل اللہ سے جتنی بھی محبت پیدا کر سکو دریغ نہ کرنا اور بے دین لوگوں سے جتنا بھی ممکن ہو احتراز کرنا اور یکسو رہنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''صالح اور بہتر ہم نشین کی مثال اس شخص کی سی ہے جو مشک والا ہو کہ اگر اس سے مشک نہ بھی ملے تب بھی اس کو خوشبو تو پہنچے ہی گی اور برے ہم نشین کی مثال اس شخص کی سی ہے جو بھٹی کا دھونکنے والا ہو کہ اگر کوئی چنگاری وغیرہ گر گئی تو بدن جلا دے گی یا کپڑے جلا دے گی اور اگر چنگاری بھی نہ اڑے تو اس کا دھواں اور بو تو پہنچے ہی گی۔'' بخاری، مسلم وغیرہ میں یہ حدیث مختلف الفاظ میں نقل کی گئی ہے۔

حضرت لقمان حکیم کی نصیحت ہے کہ بیٹا! صلحاء کی مجلس میں بیٹھا کر اس سے تو بھلائی کو پہنچے گا اور ان پر رحمت نازل ہو گی تو تو اس میں شریک ہو گا اور بروں کی صحبت میں کبھی نہ بیٹھنا کہ اس سے بھلائی کی توقع نہیں اور کسی وقت ان پر کوئی آفت نازل ہوئی تو تو بھی شریک ہو جائے گا۔ اس لیے بری صحبت کے اثرات سے بہت احتراز کرنا چاہیے۔ اللہ والوں کی صحبت اور ان کے پاس بیٹھنے کو اکسیر سمجھنا چاہیے۔ ان کی صحبت نیک اعمال کی ترقی کا سبب ہوتی ہے۔ (اعتدال: ص ۱۹)

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالح ترا طالح کند

تقریباً بیس پچیس سال سے ماہِ مبارک میں یہاں ذاکرین کا مجمع ہوتا ہے جو ہر سال بڑھتا ہی رہتا ہے ان میں غیر ذاکر مہمان بھی آتے رہتے ہیں۔ ماہِ مبارک کے بعد کئی ماہ تک بہت ہی رنج و قلق کے خطوط آتے رہتے ہیں کہ عبادت میں اور لو میں اور ذکر میں تلاوت میں جو لذت وہاں آتی تھی اب نہیں رہی میں اس کا جواب یہی لکھوایا کرتا ہوں کہ یہ ماحول کا اثر ہوتا ہے، اس وقت میں یہاں اللہ کا نام لینے والے بہت جمع ہو جاتے ہیں ان کے ماحول کا اثر ہوتا ہے تم بھی اپنے یہاں چند دینی احباب کو جمع کر کے دین کا ماحول بنا لو تو یہ اثرات ان شاء اللہ پھر پیدا ہو جائیں گے۔ حضرت دہلوی نور اللہ مرقدہٗ کے ملفوظات میں بہت کثرت سے اس پر زور دیا گیا ہے کہ ماحول کو بدلو۔

اسی لیے وہ حضرات گھروں سے نکلنے پر زور دیتے ہیں کہ گھریلو ماحول میں دینی اثرات پیدا نہیں ہوتے اور جب دینی جماعت کے ساتھ چوبیس گھنٹے رہنا سہنا کھانا پینا ہو گا تو ماحول کے

اثرات ضرور پڑیں گے۔ مجھ سے سینکڑوں دیہاتی لوگوں نے جو بیعت کا تعلق رکھتے ہیں یہ کہا کہ تہجد کی بہت ہی کوشش کی مگر کبھی توفیق نہیں ہوئی، تبلیغی جماعت کے ساتھ ایک چلہ گزارا تھا، اللہ کے فضل سے ایسی عادت پڑ گئی کہ اب خود بخود آنکھ کھل جاتی ہے۔

حسن العزیز میں لکھا ہے کہ حضرت کی مجلس میں یہ ذکر تھا کہ انٹر کلاس اور جو درجے اس کے اوپر کے ہیں ریل میں ان میں متکبرین بیٹھتے ہیں اور اس کا اثر قلب پر پڑتا ہے ارشاد فرمایا جب کبھی تیسرے درجے میں بڑا آدمی بیٹھ جاتا ہے تو اس کا مزاج بھی نرم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ چارپائی پر بیٹھنے سے بہ نسبت کرسی کے مسکنت آجاتی ہے۔ (حسن العزیز ۲/۳: ص ۱۲۸)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد تو یہ ہے کہ جانوروں تک کا اثر ہوتا ہے، مشکوۃ شریف میں بخاری و مسلم کی روایت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد نقل کیا ہے کہ اونٹ والوں میں فخر اور تکبر ہوتا ہے اور بکری پالنے والوں میں مسکنت ہوتی ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ فخر و تکبر اونٹ اور گھوڑے والوں میں ہوتا ہے۔ بہت سی روایات میں ہے کہ فخر و تکبر اونٹ اور گھوڑے والوں میں ہوتا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ مزاج کی سختی اور ظلم کسانوں میں ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہت سی روایات اس مضمون کی ہیں کہ ان جانوروں تک میں اثرات ہوتے ہیں۔

اسی واسطے علماء میں مشہور ہے کہ ہر نبی سے پہلے بکریاں چروائی جاتی ہیں تا کہ ان میں مسکنت اور ہٹ دھرمی پر صبر کی عادت پڑ جائے۔ بکری ضعیف جانور ہے لیکن جب چلتے چلتے وہ اگلے دونوں پاؤں جما کر کھڑی ہو جائے تو وہ کھینچنے سے کھنچے گی نہیں اور ڈنڈا مارنے سے اس کا پیر ٹوٹ جائے گا اس لیے بکریاں چرانے والے کو بہت زیادہ متحمل مزاج اور ضد اور ہٹ دھرمی کی بجائے نرمی کا مشتاق ہونا پڑتا ہے اس لیے ہر نبی کو پہلے بکریاں چرانی پڑتی ہیں۔

حضرت موسیٰ کا واقعہ

حضرت پیران پیر نور اللہ مرقدہٗ کے مواعظ میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جو باتیں کی تھیں ان میں یہ بھی تھا کہ میں نے تم کو اپنے پیغامات اور بات چیت اور اپنا مقرب بنانے کے ذریعہ سے لوگوں پر بزرگی عنایت فرمائی ہے ایک دن وہ تھا کہ تم بکریاں چرا رہے تھے۔ پس ان میں سے ایک بکری بھاگ نکلی اور تم اس کے پیچھے دوڑ پڑے، یہاں کہ تم نے اس کو پکڑ لیا۔ حالانکہ تم بھی تھک گئے تھے اور بکری بھی تھک گئی تھی۔ پس تم نے اس کو اپنی گود میں لیا اور کہا کہ پیاری تو نے اپنے آپ کو بھی تھکایا اور مجھے بھی تھکایا۔ اسی شفقت کا یہ صلہ ملا کہ سرکش

بندوں کو خداوندی آستانہ پر لانے کے لیے شاہی سفیر قرار پائے۔

(مواعظ پیران پیر: ص ۵۶۴)

لیکن عام طور پر چونکہ بکری میں مسکنت ہوتی ہے اسی واسطے کان پکڑی بکری مشہور ہے کہ کان پکڑ کر جدھر کو چاہے لے جاؤ۔ اس کے لیے جانے کے واسطے رسوں کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی۔ سبعہ معلقہ کا دوسرا معلقہ جو طرفہ بن العبد کا ہے اس کے دو شعر ہیں۔

عن المرء لا تسئل و ابصر قرینہ

فان القرین بالمقارن یقتدی

کہتے ہے کہ جب آدمی کا حال معلوم کرنا ہو تو اس کے ہم نشینوں کو دیکھ کیسے ہیں۔ یعنی اگر اس کے ہم نشین یار دوست اچھے ہیں تو وہ بھی اچھا ہے اگر برے ہیں تو وہ بھی برا ہے اس لیے کہ آدمی اپنے ہم نشینوں کا مقتدی ہوا کرتا ہے۔ دوسرا شعر ہے:

اذا کنت فی قوم فصاحب خیارھم

ولا تصحب الأردی فتردی مع الردی

حضرت گنگوہی کی صاحبزادی کا واقعہ

جب تو کسی قوم میں پہنچے تو ان کے اچھوں کے ساتھ ہم نشینی اختیار کر۔ بروں کے ساتھ نہ رہنا کہ تو بھی ان کے ساتھ برباد ہو جائے گا۔ تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا: ”حضرت مرشدنا حاجی صاحب گنگوہ تشریف لائے۔ میری لڑکی کی عمر تین سال کی تھی، حضرت نے اس کے ہاتھ میں پانچ روپے شیرنی کے لیے دیے۔“

میری لڑکی نے وہ روپیہ لے کر حضرت کے قدموں میں رکھ دیے، پھر دیئے، اس نے ایسا ہی کیا ہر چند حضرت نے پھسلایا تو تو میری بیٹی ہے لے لے، مگر اس نے مانا ہی نہیں حضرت نے فرمایا۔ آخر تو فقیر کی بیٹی فقیرن ہی ہے اس کے بعد یہ دعاء فرمائی:

”ایں دختر صاحب نصیب است وہیچ عسرت در دنیا نہ بیند والا زاہد و صالح خاہد شد۔

حضرت نے فرمایا: ”الحمد للہ میری لڑکی کو دنیا کی محبت بالکل نہیں ہے۔“

(تذکرۃ الرشید: ص ۲۷۵ ر ج ۲)

یہ بھی ماحول کا ہی اثر تھا اس ناکارہ کو یاد نہیں کہ اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی زندگی میں گھر کی بڑی بوڑھیوں کے علاوہ کسی شخص کا بھی کوئی عطیہ یا ہدیہ میں نے اپنے ہاتھ سے قبول کیا ہو۔ لوگوں کو زیادہ اصرار پر کہہ دیتا تھا کہ آپ والد صاحب کی خدمت میں پیش کر دیجئے وہ چاہیں گے تو

مجھے دے دیں گے ورنہ نہیں، لیکن اب اپنی اولاد کو دیکھتا ہوں کہ وہ جو ملے چپکے سے جیب میں رکھ لیتے ہیں اور اولاد کی اولاد کو دیکھتا ہوں کہ وہ جو ملے چپکے سے لینے کے وندنا کر لیتی ہے۔ میں تو بسا اوقات کہہ دیتا ہوں کہ میرے باپ کا دور نہ ہوا، ورنہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔

مولوی محمد صاحب وکیل الٰہ آبادی کا واقعہ

جدید ملفوظات حضرت تھانوی میں لکھا ہے کہ فرمایا کہ مولوی محمد صاحب وکیل الٰہ آباد کا قصہ میرے ایک دوست نے سنایا کہ میں ایک دفعہ ان کے یہاں مہمان تھا۔ میں نے ایک روز دیکھا کہ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ہنستے کھیلتے یہ کہتے پھرتے ہیں۔ آپا جی ہمارے یہاں آج شیخ جی آئے ہیں، اس روز کھانے میں بہت دیر ہوگئی۔ انہوں نے سمجھا کہ شیخ جی کوئی بڑے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے لیے اچھے اچھے کھانے پک رہے ہیں۔ اسی وجہ سے کھانا آنے میں دیر ہوئی۔ جب بہت دیر ہوگئی اور کھانے کا وقت گزر گیا تو میں نے کسی سے پوچھا کہ بھائی یہ شیخ جی کون ہیں اور وہ اب تک دکھائی بھی نہیں دیئے لوگوں نے کہا کہ آج ان کے ہاں فاقہ ہے بچے اس کو شیخ جی کے لقب سے یاد کر کے خوش ہو رہے ہیں۔ ہمارے حضرت نے فرمایا کہ بزرگوں کی اولاد میں بھی اثر ہوتا ہے خواہ خود بزرگ نہ ہوں۔ یہ وکیل صاحب بزرگ زادہ تھے۔

(جدید ملفوظات: ص ۲۱)

یہ قصہ میں نے اس واسطے لکھوایا ہے کہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا اثر صاحبزادوں میں اور اس سیہ کار میں اپنے باپ کا اثر تھا، ورنہ میں خود نااہل ہوں، اس لیے اولاد پر میرا اثر ہوا۔ تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ ملحدوں سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہیے، پاس جانا بھی اچھا نہیں۔

(تذکرۃ الرشید: ص ۲۴۵ ر ج ۲)

اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کی احادیث میں کثرت سے فرمایا کہ جو اس کی خبر سنے دور رہے پاس کو نہ جائے۔

علی میاں نے جو ملفوظات حضرت شاہ یعقوب صاحب مددی بھوپالی کے نقل کیے ہیں، اس میں حضرت شاہ صاحب کا ارشاد نقل کیا ہے: ’’آدمی جس ماحول میں رہتا ہے عموماً اس میں رنگ جاتا ہے اس کا ذہن اور دل و دماغ اسی میں چلتا ہے اور سارے اعضاء اس سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ وہ جب دوسرے ماحول میں جاتا ہے تو بڑی اجنبیت محسوس کرتا ہے۔‘‘

حضرت مجدد صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ ایک چمڑے پکانے والے کا لڑکا چمڑے دار ماحول سے اتنا متاثر تھا کہ ایک بار وہ عطر کی دُکان سے گزرا تو عطر کی خوشبو کا متحمل نہ ہو سکا اور بے

ہوش ہر کر گر پڑا۔ جب باپ نے پرانے چمڑے کو سونگھایا تو ہوش آیا۔ یہی حال آج کل کے گندے ماحول کا ہے۔ اس ماحول میں پرورش پانے والا اچھے اور صالح ماحول میں گھٹن محسوس کرتا ہے اور وہ ماحول اس کے ذہن و دماغ پر بوجھ معلوم ہوتا ہے۔ (صحبتے با اہل دل: ص ۳۷۰)

شاہ فضل الرحمٰن صاحب کی مجلس کا ماحول

تذکرہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی میں علامہ شیروانی کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ قصہ تو بہت طویل ہے مختصر لکھواتا ہوں۔ اس میں ''آستانہ فقیر'' کے عنوان سے علامہ شیروانی نے لکھا ہے کہ مجھے ایک عرصہ مراد آباد حاضری کی تمنا تھی۔ جس کا منشا شبلی عہد جنید دہر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی زیارت تھا۔ ۲۰ رجب ۱۳۰۵ھ کو آستانہ کی زیارت کے ارادہ سے کانپور پہنچا۔ آگے اپنے سفر کی طویل روداد لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ دس بجے مراد آباد پہنچا۔ معلوم ہوا کہ اس وقت حضرت درس حدیث میں مشغول ہیں۔ میں مسجد کے قریب ایک مقبرہ میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہاں یک سیتل پاٹی پڑی ہوئی تھی۔ جس پر چند آدمی امیدوار زیارت بیٹھے تھے۔ ان کے پاس میں بھی جا کر بیٹھ گیا۔

مولانا اگرچہ یہاں سے دور مسجد میں تشریف فرما تھے، مگر یہاں تک بھی رعب اتنا تھا کہ کوئی شخص پکار کر بات نہیں کر سکتا تھا اور بے تکلف یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے حاکم کی آمد کا انتظار ہے۔ ایک گھنٹہ بعد حضوری حاصل ہوئی۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ چار پائی پر تشریف رکھتے تھے میں زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ تھوڑی سے دریافت حال کے بعد اشعار نعتیہ پڑھنا شروع کر دیا چند منٹ بعد حجرہ میں تشریف لے گئے۔ مجھے بھی اندر آنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ کچھ بزرگوں کے حالات ارشاد فرمائے۔ مثنوی کے اشعار نہایت درد سے پڑھے۔ منجملہ اوروں کے یہ شعر بھی تھا:

صحبت مرداں اگر یک ساعت است

بہتر از صد خلوت و صد طاعت است

کچھ عرصہ بعد استراحت کے لیے رخصت فرمایا۔ بعد ظہر مسجد میں تشریف لا کر حدیث کا درس شروع فرما دیا، جس میں مجھے حاضری کی عزت حاصل ہوئی، کچھ دیر بعد حجرہ میں تشریف لے جا کر رخصت کے واسطے طلب فرمایا دعائے خیر کے بعد اجازت فرما دی، اس کے بعد مسجد کے حالات لکھ کر لکھتے ہیں کہ کوئی چیز اس میں اہلِ دنیا کی دلچسپی کی نہیں ہے مگر صدہا امیر و غریب تونگر و مفلس آتے ہیں اور جاتے ہیں۔

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہو کر دو زبردست خیال میرے دل میں آئے جن

کے سبب یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرت کا مرتبہ میں نے پہچان لیا ہے، لیکن یہ جانا کہ ہم میں اور ان میں سوائے ظاہری مشابہت کے اور کوئی مشابہت نہیں، ہمارے خیالات سے ان کے خیالات الگ، ہمارے ارادوں سے ان کے ارادے جدا، ہمارے مشاغل سے ان کے مشاغل علیحدہ، ان کی امیدیں اور خوشیاں اور خوف اور مقصود اور اول خیال یہ تھا کہ مراد آباد دنیا میں ہے گاؤں نہیں قصبہ ہے، لیکن حضرت کی مسجد میں ایک دوسرا عالم نظر آتا تھا، دنیوی معاملات کا کوسوں پتہ نہ تھا، خود حضرت کی گفتار و کردار اور وہاں کے اہل قیام کے احوال سے (عام اس سے کہ وہ چند گھنٹے کے آئے ہوئے ہیں یا دو چار برس کے رہتے ہیں) یہ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ایسے لوگ ہیں جو تعلقات دنیا سے کنارہ کر آئے ہیں۔

حیدر آباد کے امیر کبیر نواب خورشید جاہ بہادر جو باون لاکھ کے معافی دار ہیں، میرے پہنچنے سے صرف ایک روز پہلے وہاں آئے تھے، مگر ان کا ذکر بھی نہ تھا اور نہ کوئی وقعت ان کی کسی کے ذہن میں معلوم ہوتی تھی، حالانکہ کانپور اور بلہور وغیرہ ان کے تذکروں کی صدا سے گونج رہے تھے اور ہر ایک سوسائٹی (خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ) ان کے تذکروں کو اپنے جلسوں کا دلچسپ مبحث بنائے ہوئے تھی۔

دوسرا خیال یہ تھا کہ خود میرا ذہن مجھ کو ذلیل سمجھتا تھا اور ہر چند حیرت سے غور کرتا تھا، لیکن کوئی وقعت اپنی میرے ذہن میں نہیں آتی تھی، دنیوی جلسوں میں لیفٹیننٹ کے دربار دیکھے، رؤسا کے مجمعے دیکھے، اہل علم کی مجلسیں دیکھیں مگر کہیں اپنے نفس کو اتنا بے حقیقت نہیں پایا۔ اپنے اعمال ذمیمہ ماضیہ پر خود نفس ملامت کرتا تھا اور اپنی بے مائے گی پر خود نفرین کن تھا۔ ہر شخص سے خواہ وہ کوئی ہو اپنے تئیں کم وقعت تصور کرتا تھا۔ غرض ایک عجیب خیال تھا کہ پورا بیان میں آنا مشکل ہے۔ وہاں سے آنے پر یہ خیال ایسے رہے جیسے کہ کسی دلچسپ خواب کا صبح کو خیال اور لطف ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ کیفیت زائل ہوگئی اور چند لحہ کے بعد پھر نفس ''امارہ انا و لا غیر لی'' اور ''ہمچو ما دیگرے نیست'' کے پھندے میں جا پھنسا۔ یہ خیال میرے نزدیک محض نئے اور نرالے تھے جو مدت العمر میں کسی جگہ اور کبھی پیدا نہیں ہوئے۔ اس سے قیاس چاہتا ہے کہ وہ جگہ بھی کچھ اور جگہوں سے نرالی تھی۔ اللہ بس باقی ہو۔

(تذکرہ فضل الرحمٰن: ص ۱۱۲)

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر ۸

اکابر کے مجاہدات

فی العِلم وَالسّلوك

یہ تو ایسی معروف ومشہور چیز اور اتنی کثرت سے ہیں کہ ان کو نمونہ کے طور پر لکھنا بھی مشکل ہے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے۔ من طلب العلی سهر اللیالی جو بلند درجات حاصل کرنا چاہتا ہے وہ راتوں کو جاگا کرتا ہے۔ سچ فرمایا، اکابر میں سے کوئی بھی میرے علم میں ایسا نہیں گزرا جس نے ابتداء میں مجاہدات کسی نہ کسی نوع کے نہ کیے ہوں۔ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ نے کئی مرتبہ ارشاد فرمایا کہ بزرگوں کا ارشاد ہے کہ جو ہماری ابتداء دیکھے وہ کامیاب اور جو ہماری انتہاد یکھے ناکامیاب۔ سچ ہے کہ ابتداء میں جتنی محنتیں کرنی پڑتی ہیں ان کو دیکھنے والا تو سمجھ لیتا ہے کہ بزرگی اس طرح حاصل ہوتی ہے اور ان کی انتہا دیکھنے والا جب وہ حضرات اپنی ساری قوتیں فنا کر کے معذوری کے درجہ میں پہنچ جاتے ہیں اور ان محنتوں کے ثمرات شروع ہو جاتے ہیں تو اس وقت دیکھنے والا یوں سمجھ لیتا ہے کہ بزرگی اس طرح بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

حضرت پیران پیر کا مجاہدہ

مواعظ حضرت پیرانِ پیر صفحہ ۵۴۴ میں لکھا ہے کہ میں ایسے مشائخ کی صحبتوں میں رہا ہوں کہ ان میں سے کسی ایک کے دانت کی بھی سفیدی نہیں دیکھی، کیونکہ کسی نے مسکرا کر مجھ سے بات ہی نہیں کی۔ وہ خود نفیس غذائیں کھایا کرتے اور مجھ کو یک نوالہ بھی نہ دیتے تھے۔ بایں ہمہ میری طبیعت میں ان کی طرف سے بدگمانی یا ملال کا مطلق اثر نہیں آتا تھا دوسری جگہ لکھتے ہیں۔ اے نادان میرے اس قیمتی کُرتے اور فرش کی طرف نظر مت کر۔ یہ لباس تو مر جانے کے بعد کا ہے، یہ تو کفن ہے اور مردے کا کفن نفیس ہی ہوا کرتا ہے۔ یہ لباس مدتوں میرے صفوف پہننے اور موٹا چھوٹا کھانے اور بھوکا رہنے کے بعد کا عطاء ہوا ہے۔ (مواعظ پیران پیر: ص ۵۸۸)

تیسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ ابتدائی زمانہ میں میرے پاس ایک کُرتا تھا۔ نہایت عمدہ میں بارہا (اس کو فروخت کرنے کے لیے) بازار کی طرف گیا (یعنی عمدہ ہونے کی وجہ سے میں نے اس کو نہیں پہنا) مقولہ مشہور ہے:

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد
مپندار جان پدر گر کسی
کہ بے سعی ہرگز بجائے رسی

''باپ کی جان! اگر تو کسی قابل ہے تو ہرگز گمان نہ کر کہ بے کوشش کوئی کہیں پہنچ سکتا ہے''۔ میں اپنے چچا جان کے حالات میں آپ بیتی کے متفرق نمبروں میں بہت کثرت سے لکھوا چکا ہوں۔ گولر پر افطار وقناعت، چھ ماہ تک پانی نہ پینا، مغرب سے عشاء تک نفلیں پڑھنا، اپنے ابتدائی سلوک میں ہر وقت چپکا رہنا وغیرہ وغیرہ۔ بہت سے واقعات آپ بیتی کے مختلف نمبروں میں مختلف مواقع پر ذکر کر چکا ہوں۔

حضرت مولانا گنگوہی کے مجاہدات

حضرت قطب الارشاد گنگوہی قدس سرہٗ کے مجاہدات تذکرۃ الرشید میں بہت کثرت سے مواقع میں لکھے ہیں۔ مقدمہ ارشاد الملوک میں تذکرۃ الرشید حصہ دوم کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تھانہ بھون کے ابتدائی چالیس روز کے قیام میں آپ کا امتحان بھی لیا گیا جس کے متعلق حضرت قدس سرہٗ نے خود فرمایا کہ تھانہ بھون میں رہتے ہوئے مجھ کو چند روز گزرے تو میری غیرت نے اعلیٰ حضرت پر کھانے کا بار ڈالنا گوارا نہیں کیا۔ آخر میں نے یہ سوچ کر کہ دوسری جگہ انتظام کرنا دشوار بھی ہے اور ناگوار بھی۔ رخصت چاہی حضرت نے اجازت نہ دی اور فرمایا کہ ابھی چند روز ٹھہرو، میں خاموش ہو گیا۔ قیام کا قصد تو کر لیا مگر اس کے ساتھ ہی یہ فکر ہوئی کہ کھانے کا انتظام کسی دوسری جگہ کرنا چاہیے۔

تھوڑی دیر کے بعد جب اعلیٰ حضرت مکان پر تشریف لے جانے لگے تو میرے وسوسہ پر مطلع ہو کر فرمانے لگے کہ میاں رشید احمد کھانے کی فکر مت کرنا، ہمارے ساتھ کھانا۔ دوپہر کو کھانا مکان سے آیا تو ایک پیالہ میں کوفتے تھے، نہایت لذیذ اور دوسرے پیالہ میں معمولی سالن تھا۔ اعلیٰ حضرت نے مجھے دستر خوان پر بٹھا لیا مگر کوفتوں کا پیالہ مجھ سے علیحدہ اپنی طرف رکھا اور معمولی سالن کا پیالہ میرے قریب سرکا دیا۔ میں اپنے حضرت کے ساتھ کھانا کھانے لگا۔

اتنے میں حضرت حافظ ضامن صاحب تشریف لائے کوفتوں کا پیالہ مجھ سے دور رکھا ہوا دیکھ کر اعلیٰ حضرت سے فرمایا، بھائی صاحب رشید احمد کو اتنی دُور ہاتھ بڑھانے میں تکلیف ہوتی ہے، اس پیالہ کو ادھر کیوں نہیں رکھ لیتے، اعلیٰ حضرت نے بے ساختہ جواب دیا اتنا بھی غنیمت ہے کہ اپنے ساتھ کھلا رہا ہوں، جی تو یوں چاہتا تھا کہ چوڑھوں، چماروں کی طرح الگ ہاتھ پر روٹی رکھ دیتا۔

اس فقرہ پر اعلیٰ حضرت نے میرے چہرہ پر نظر ڈالی کہ کچھ تغیر تو نہیں آیا، مگر الحمد للہ میرے قلب پر بھی اس کا کچھ اثر نہ تھا، میں سمجھتا تھا کہ حقیقت میں جو کچھ حضرت فرما رہے ہیں بالکل سچ ہے، اس دربار سے روٹی کا ملنا کیا تھوڑی نعمت ہے، جس طرح بھی ملے بندہ نوازی ہے۔

(مقدمہ ارشاد: ص ۱۲)

تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب اعلیٰ حضرت کے دستِ مبارک پر بیعت ہونے کا وقت آیا تو میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھ سے ذکر شغل اور محنت و مجاہدہ کچھ نہیں ہوسکتا اور نہ رات کو اُٹھا جاتا ہے، اعلیٰ حضرت نے تبسم کے ساتھ فرمایا، اچھا کیا مضائقہ ہے، اس تذکرہ پر کسی خادم نے دریافت کیا کہ حضرت پھر کیا ہوا تو آپ نے جواب دیا اور عجیب ہی جواب دیا کہ پھر تو مرمٹا، پہلی ہی شب میں اعلیٰ حضرت نے میری چارپائی اپنی چارپائی کے قریب بچھوائی اور جب آخر شب میں اعلیٰ حضرت نے میری چارپائی کے قریب بچھوائی اور جب آخر شب میں اعلیٰ حضرت بیدار ہوئے تو میری بھی آنکھ کھل گئی، تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کروٹیں لیں آخر نہ رہا گیا، اُٹھ کر وضو کیا، مسجد کے ایک کونہ میں اعلیٰ حضرت مشغول تھے، دوسرے کونہ میں میں جا کر کھڑا ہو گیا اور تہجد کے بعد ذکر نفی و اثبات بالجہر شروع کر دیا، گلا اچھا تھا، بدن میں قوت تھی، صبح کو جب حاضر خدمت ہوا تو اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ تم نے تو ایسا ذکر کیا جیسے کوئی بڑا مشتاق کرنے والا ہو، اس دن سے ذکر جہر کے ساتھ مجھے محبت ہوگئی، پھر کبھی چھوڑنے کو جی نہ چاہا اور نہ کوئی وجہ شرعی اس کی ممانعت کی معلوم ہوئی اور وصال تک دیگر مشاغل مراقبہ وغیرہ کے ساتھ ذکر بارہ تسبیح فرماتے رہے، ایسی ہلکی آواز کے ساتھ کہ جس کو حجرہ کے پاس بیٹھنے والا سن سکتا تھا۔

(تذکرۃ الرشید: ص ۴۸، ج ۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ تھانہ بھون سے واپسی کے متعلق مولانا ابو النصر صاحب فرماتے ہیں کہ تھانہ بھون سے واپسی پر حضرت کا قیام میرے مکان پر تھا۔ نصف شب کو جب آپ اُٹھتے اور سیدھے مسجد کی جانب رُخ فرماتے تو پیچھے پیچھے میں بھی لگا ہوا چلا آتا تھا، جس وقت حضرت بالجہر ذکر شروع فرماتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری مسجد کانپ رہی ہے، خود پر جو حالت گزرتی ہوگی اس کی تو کسی کو کیا خبر، آستانہ امدادیہ سے جو بات حاصل ہوئی اس نے نہ کھانے کا رکھا نہ پینے کا، ہر وقت تفکر و استغراق سے کام تھا اور رونا سبب راحت و آرام، اکثر تمام تمام شب روتے گزر جاتی اور سارا سارا دن کسی گہری فکر میں غرق ہوئے تمام ہو جاتا تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ نے ایک رضائی نیلے رنگ کی آپ کے لیے تیار کی تھی کہ شب کو مسجد میں آتے جاتے

خنکی سے محفوظ رکھے، آپ کے رونے اور آنسوؤں کے اسی رضائی سے پونچھنے کی وجہ سے اس کا رنگ بھی کچھ کا کچھ ہوگیا اور ہیئت ہی بدل گئی تھی۔ (تذکرۃ الرشید: ص۵۲/ج۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ریاضت ومجاہدہ کی یہ حالت تھی کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا اور ترس کھایا کرتے تھے، چنانچہ اس پیرانہ سالی میں جب کہ آپ ستر (۷۰) سال کی عمر سے متجاوز ہوگئے تھے، کثرتِ عبادت کا یہ عالم تھا کہ دن بھر کا روزہ اور بعد مغرب چھ کی جگہ بیس رکعت صلوٰۃ الاوابین پڑھا کرتے تھے، جس میں تخمیناً دو پارے قرآن مجید سے کم کی تلاوت نہ ہوتی تھی، پھر اسی کے ساتھ رکوع سجدہ اتنا طویل کہ دیکھنے والے کو سہو کا گمان ہو، نماز سے فارغ ہو کر مکان تک جاتے اور کھانا کھانے کے لیے مکان پر ٹھہرنے کی مدت میں کئی پارے کلام مجید ختم کرتے تھے، پھر تھوڑی دیر بعد نمازِ عشاء اور صلوٰۃ تراویح میں جس میں گھنٹے سوا گھنٹہ سے کم خرچ نہ ہوتا تھا، تراویح سے فارغ ہو کر ساڑھے دس گیارہ بجے آرام فرماتے اور دو ڈھائی بجے ضرور ہی اٹھ جاتے تھے۔ بلکہ بعض دفعہ خدام نے ایک ہی بجے آپ کو وضو کرتے پایا۔ اس وقت اٹھ کر ڈھائی تین گھنٹے تک تہجد میں مشغولیت رہتی تھی۔

بعض مرتبہ سحر کھانے کے لیے کسی خادم کو پانچ بجے جانے کا اتفاق ہوا تو آپ کو نماز ہی میں مشغول پایا۔ صلوٰۃ فجر کے بعد آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک وظائف واوراد اور مراقبہ وملاحظہ میں مصروفیت رہتی۔ پھر اشراق پڑھتے اور چند ساعت استراحت فرماتے۔ اتنے ڈاک آجاتی تو خطوط کے جوابات اور فتاویٰ لکھواتے اور چاشت کی نماز سے فارغ ہو کر قیلولہ فرماتے تھے۔ ظہر کے بعد حجرہ شریفہ بند ہوجاتا اور تا عصر کلام اللہ کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے۔ باوجودیکہ اس رمضان میں جس کا مجاہدہ لکھا گیا ہے پیرانہ سالی ونقاہت کے ساتھ وجع الورک کی تکلیف شدید کا یہ عالم تھا کہ استنجاء گاہ سے حجرہ تک تشریف لانے میں حالانکہ پندرہ سولہ قدم کا فاصلہ ہے مگر راہ میں بیٹھنے کی نوبت آتی تھی۔ اس حالت پر فرائض تو فرائض نوافل بھی کبھی بیٹھ کر نہیں پڑھے اور ان میں گھنٹوں کھڑا رہنا۔ بارہا خدام نے عرض کیا کہ آج تراویح بیٹھ کر ادا فرمائیں تو مناسب ہے، مگر آپ کا جواب یہی تھا ''نہیں جی یہ کم ہمتی کی بات ہے'' اللہ رے ہمت آخر ''افلا اکون عبدا شکورا'' کے قائل کی نیابت کوئی سہل نہ تھی جو اس ہمت کے بغیر حاصل ہوجاتی۔

یوں تو ماہِ رمضان المبارک میں آپ کی ہر عبادت میں بڑھوتری ہوتی تھی مگر تلاوت کلام اللہ کا شغل، خصوصیت کے ساتھ اس درجہ بڑھتا تھا کہ مکان تک آنے جانے میں کوئی بات نہ فرماتے تھے، نمازوں میں اور نمازوں کے بعد تخمیناً نصف قرآن مجید ختم آپ کا یومیہ معمول قرار پاتا تھا۔ جس شب کی صبح کو پہلا روزہ ہوتا، آپ حضار جلسہ سے فرمادیا کرتے تھے کہ آج سے کچہری

برخواست۔ رمضان کو بھی آدمی ضائع کرے تو افسوس کی بات ہے۔ اس مجاہدہ پر غذا کی یہ حالت تھی کہ کامل رمضان بھر کی خوراک پانچ سیر اناج تک پہنچنی دشوار تھی۔ (تذکرۃ الرشید: ص ۶۵ رج ۱)

دوسری جگہ حکیم اسحاق صاحب نہٹوری کے طویل مضمون میں جو بعد میں آنے والا ہے اس میں رمضان کے متعلق لکھا ہے کہ رمضان شریف میں صبح کو خلوت خانہ سے دیر میں برآمد ہوتے۔ موسم سرما میں اکثر دس بجے تشریف لاتے۔ نوافل اور قراءت قرآن وسکوت ومراقبہ میں بہ نسبت دیگر ایام بہت زیادتی ہوتی۔ سونا اور استراحت نہایت قلیل کلام بہت کم کرتے، بعد نماز مغرب ذرا دیر خلوت نشینی کا ذائقہ لے کر کھانا تناول فرماتے۔ تراویح کی بیس رکعات اوائل میں خود پڑھاتے تھے اور آخر میں صاحبزادہ مولوی حافظ حکیم محمد مسعود احمد صاحب کے پیچھے پڑھتے، بعد وتر دو رکعت طویل کبھی کھڑے ہو کر کبھی بیٹھ کر پڑھتے، دیر تک متوجہ بقبلہ بیٹھ کر پڑھتے رہتے۔ پھر ایک سجدہ تلاوت کر کے کھڑے ہو جاتے۔ بندہ نے بعض الفاظ سن کر اندازہ کیا ہے کہ اس درمیان سورۂ تبارک الذی اور سورۂ سجدہ اور سورۂ دخان پڑھتے تھے۔ اکثر تمام عشرہ ذوالحجہ اور عاشورہ اور نصف شعبان کا روزہ رکھتے تھے۔ (تذکرہ الرشید: ص ۶۷ رج ۲)

میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے یہ واقعہ بہت دفعہ سنایا کہ حضرت قدس سرہٗ کی حیات کے آخری رمضان میں قرآن پاک میں نے سنایا کہ حکیم مسعود احمد صاحب نے کسی مجبوری کی وجہ سے قرآن پاک سنانے سے عذر فرمایا تھا۔ والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے ماہِ مبارک سے کئی دن پہلے یہ فرمانا شروع کیا کہ اب کے تو مسعود احمد معذور ہیں، ہمیں تراویح کون پڑھائے گا۔ والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں بار بار اس لفظ کو سنتا۔ مگر ادباً یہ کہنے کی ہمت نہ پڑتی کہ میں پڑھا دوں گا۔ ماہِ مبارک سے دو دن قبل حضرت نے ارشاد فرمایا مولوی یحیٰی تم بھی تو حافظ ہو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت حافظ تو ضرور ہوں مگر میں تو فارسی میں قرآن پڑھتا ہوں اور حضرت والا حکیم صاحب کے قرآن سننے کے عادی ہیں جو جید قاری ہیں۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ نہیں تمہارا قرآن تو میں نے سنا ہے بس اب کے تم ہی تراویح پڑھاؤ گے۔ والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ پہلے دن تو مجھ پر بوجھ پڑا اور سوا پارہ قرآن پاک کا دن میں دیکھ کر پڑھا کہ سات سال کی عمر میں قرآن ختم کرنے کے بعد چھ مہینے تک ایک قرآن روز دیکھ کر پڑھا کرتا تھا، لیکن اس کے بعد سے کبھی دیکھ کر پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ یوں فرمایا کرتے تھے کہ پہلے دن سوا پارہ تو دن میں دیکھ کر پڑھا تھا۔ پھر دوسرے دن سے خوف نکل گیا۔ پھر سارے رمضان دیکھ کر پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ فقط

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ نے پہلا حج فرض ۱۲۸۰ھ میں کیا۔ اس کے واقعات میں حضرت

کے مجاہدے کا قصہ نکل گیا ہے کہ حضرت امام ربانی نے سفر کے دوران اپنے رفقاء میں ادنیٰ شخص کی تھوڑی راحت کو اپنی بڑی سے بڑی اور ضروری راحت پر مقدم سمجھا، ہر ایک کا تکلیف میں ساتھ دیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے معمولات نوافل تک میں فرق نہ آنے دیا۔ مدنی راہ میں ایک جگہ ڈپٹی عبدالحق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو کسی قسم کی کوفت لاحق ہوئی تو رنج وغصہ کے باعث اونٹ سے اتر پڑے اور قسم کھالی کہ اس اونٹ پر نہ بیٹھوں گا جنہوں نے یہ راستہ طے کیا ہے۔ (یہ قصے جب کہ ہیں جب حج اونٹوں پر ہوا کرتا تھا۔)

وہ شتربان بدؤوں کی طبائع سے واقف ہیں کہ انہیں اپنی قطار کے سامنے کسی کے مرنے اور جینے کی بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ ڈپٹی صاحب کے قسم کھانے اور اونٹ کی سواری سے کرایہ دے کر پیدل ہوجانے کی تو کیا پرواہ کرتے، چنانچہ بدو نے ڈپٹی صاحب کے اونٹ کی رسی قطار سے کھول دی۔ اونٹ جماعت سے علیحدہ ہوگیا۔ ڈپٹی صاحب مع اپنے دو ہمراہیوں کے کھڑے رہ گئے اور قافلہ چل دیا۔ حضرت مولانا کی نظر جو ڈپٹی صاحب پر پڑی تو فوراً اپنے اونٹ سے کود پڑے اور قافلہ کو چھوڑ کر ڈپٹی صاحب کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ حضرت امام ربانی کو قافلہ سے علیحدہ دیکھنا آپ کے ماموں زاد بھائی مولوی ابوالنصر کو کب گوارا تھا۔ انہوں نے بھی اپنا اونٹ قطار سے علیحدہ کردیا اور حضرت کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ قافلہ دور نکل گیا اور آناً فاناً دور ہوتا جارہا تھا اور یہ چند نفر لق ودق میدان میں ایسی خطرناک جگہ کھڑے ہوئے تھے جہاں پتھروں سے مسافر کا مار ڈالنا رہزنوں کے نزدیک کوئی بات نہیں تھی، مگر چلیں تو کس طرح چلیں۔ قسم کے باعث ڈپٹی صاحب اونٹ سوار نہیں ہوتے اور پیدل چلنے کی سکت نہیں۔ حضرت مولانا اور دیگر ہمراہی ڈپٹی کے بغیر چل ہی نہیں سکتے تھے۔ آخر کار مولوی ابوالنصر صاحب نے اپنی اہلیہ کو اونٹ سے اتارلیا اور ڈپٹی صاحب سے کہا کہ آپ میرے اونٹ پر سوار ہوجائیں تاکہ قسم بھی نہ ٹوٹے اور کسی طرح قافلہ میں جاملیں۔ چنانچہ ڈپٹی صاحب مع اپنے ایک ہمراہی کے اس اونٹ پر سوار ہوئے اور مولوی ابوالنصر صاحب کی اہلیہ ڈپٹی صاحب کے اونٹ پر سوار کی گئیں۔ اسی اونٹ پر امام ربانی کو جگہ ملی اور مولوی ابوالنصر مع دوسرے ہمراہی کے پاپیادہ روانہ ہوئے۔ کم وبیش تین کوس پر قافلہ ملا اور آخر دونوں اونٹ قطار میں باندھنے کے بعد مولوی ابوالنصر صاحب اپنے اونٹ پر اور حضرت مولانا قدس سرہٗ اپنے اونٹ پر سوار ہوئے (غالباً ڈپٹی صاحب کا اونٹ دوسرے رفقاء سے بدلا ہوگا)۔

(تذکرۃ الرشید جلد: ص ٢٠٧)

اسی سفر کی واپسی پر حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو خارش کا شدید مرض پیدا ہوا۔ خارش تو مکہ مکرمہ میں شروع ہوگئی تھی، مگر خشک تھی۔ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے تر ہوگئی۔ ابتداءً معمولی تھی۔ اس

وقت ہولناک بن گئی تھی۔ اسی حالت میں آپ جہاز پر سوار ہو گئے۔ جہاز پر سوار ہونا تھا اور گویا پھونس میں آگ کا لگنا تھا۔ دفعۃً بخار چڑھا اور اتنا شدید ہوا کہ سرسام ہو گیا۔ کامل تین دن تک آپ اس درجہ بے ہوش اور دنیا و مافیہا سے غافل رہے کہ اپنے تن بدن کی بھی مطلق خبر نہ رہی۔ دست جاری ہوئے اور اتنی تعداد میں کہ گنتی اور شمار دشوار ہو گئی۔ ایسی حالت میں جب کہ آپ اور آپ کے تمام رفقاء آپ کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ آپ کی تیمارداری آپ کے ماموں زاد بھائی مولوی ابوالنصر صاحب نے کی۔

مولانا ابوالنصر کی وہ خدمت گزاری جو اس ہولناک مرض میں واقع ہوئی، وہ مشہور خدمت تیمارداری ہے جو صفحہ سوانح کی پیشانی پر مدتوں روشن اور چمکتے حروف میں قائم رہے گی۔ بمقتضاء "من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ"۔ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کی زبانی اکثر سنا گیا کہ آپ فرماتے تھے، ایسا حقیقی بھائی بھی نہیں کر سکتا۔

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ میرا بھائی اور بھاوج میری خدمت نہ کریں تو میری ہڈیوں کا بھی پتہ نہ چلتا اور ایک مرتبہ یہ الفاظ فرمائے کہ ابوالنصر کے بدن کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں میرا پاخانہ نہ لگا ہو۔ ایک موقع پر حضرت امام ربانی سے کسی نے پوچھا کہ آپ مولوی ابوالنصر سے ناراض ہیں؟ حضرت نے فرمایا ابوالنصر میری ماں ہے، اس سے ناراض ہوں گا؟ ایک مرتبہ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ایسا حقیقی بھائی بھی نہیں کرتا جیسا ابوالنصر نے میرے ساتھ کیا کہ مثل مادر مشفقہ اپنی گود میں لے کر پاخانہ پیشاب کراتے تھے۔ مولوی ابوالنصر صاحب کے کپڑے ہمیشہ خارش کی پیپ اور لہو میں بھر جاتے اور اکثر پاخانہ پیشاب میں بھی ملوث ہوتے تھے، لیکن مولوی صاحب مردانہ وار اپنے کپڑے اور بدن اور نیز حضرت قدس سرہٗ کا بدن اور کپڑے روزانہ دھوتے تھے اور کچھ کراہت نہ کرتے تھے اور گویا پاخانہ کو صندل اور پیشاب کو گلاب بنا لیا تھا۔ حضرت امام ربانی کو تین دن بعد جس وقت ہوش آیا تو کروٹ لینے کی طاقت تھی، چوتھے دن پیشاب ہوا تو ایسا سُرخ جیسا خالص خون ہے، آنکھیں کھولیں تو اس درجہ لال کہ گویا بانات سُرخ کے ٹکڑے ہیں، اس وقت ہوش کہیئے یا بے ہوشی، حضرت قدس سرہٗ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلے کہ افسوس ایک بھائی تھا وہ بھی جدا ہو گیا، مولوی ابوالنصر صاحب جو حضرت مولانا کا سر اپنی گود میں رکھے ہوئے بیٹھے تھے بولے کہ بھائی میں تو آپ کو گود میں لیے بیٹھا ہوں اور یہ سامنے آپ کی بھاوج ہے، حضرت بولے تم تو ایسے ہو کہ میں تم کو ماں کہوں یا باپ کہوں۔

دقیق دستوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ تین لحاف بچھونوں کا روڑ کیے بعد دیگرے استنجاء میں ختم ہو گیا، آخر آپ کے نیچے بچھانے کو کوئی اور بستر نہ مل سکا تو احرام کے کپڑے جن کو تبرک بنا کر گھر لانا

چاہا تھا، اس ضرورت میں نکال لیے گئے اور یکے بعد دیگران کا استعمال ہوا، جب ایک کپڑا ملوث ہو جاتا تو اس کو جہاز سے سمندر کے شور پانی میں لٹکا دیا جاتا اور دوسرا دُھلا ہوا کپڑا نکال کر کام میں لایا جاتا تھا، پیشاب میں اس درجہ تعفن اور شوریت تھی کہ جس کپڑے پر پڑا اس کو بد بودار بنا کر تیزاب کا کام کر دیا اور جلا کر گویا راکھ بنا دیا۔

ہوائی جہاز تھا یا بادبانی کشتی تھی جہاں نہ دوا نہ دارو، علاج ہو تو کس کا اور دوا ہو تو کیونکر، خدا خدا کر کے ساتویں دن بمبئی کا کنارہ نظر آیا اور حجاج خوشی خوشی اپنے وطن یعنی سرزمین ہند پر جہاز سے اُترے، مولوی ابوالنصر نے حضرت قدس سرہٗ کو بھی بہ ہزار دقت و دشواری جہاز سے اُتارا اور بمبئی میں رامپوری قافلہ کے ہمراہ ایک کرایہ کے مکان میں مقیم ہوئے، حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو جو مرض لاحق ہوا تھا وہ اس درجہ شدید ہو لیا تھا کہ صحت و تندرستی کا خیال محض وہم اور گمان ہی گمان رہ گیا تھا۔

بمبئی پہنچ کر علاج بھی ہوا اور پوری سعی و کوشش کے ساتھ ہوا، مگر مرض میں رائی کے دانہ کے برابر بھی کمی نہ ہوئی جو لحظہ تھا وہ ترقی مرض کا تھا اور جو ساعت تھی وہ زیادتی بیماری کی تھی، اول اول مخلص دوست جناب حکیم ضیاء الدین صاحب نے اپنی رائے سے آپ کو یونانی ادویہ کا استعمال کرایا جب وہ مایوس ہو گئے تو ایک شخص عبداللہ شاہ نظاموی حکیم جو وہاں موجود تھے آپ کے معالج بنے، ایک دن انہوں نے بھی دوا دی آخر دوسرے دن دستبردار ہو گئے اور جواب دے دیا کہ کسی دوسرے طبیب کا علاج کرو، مولوی ابوالنصر جن کے دل کو لگی ہوئی تھی کبھی طبیب کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارے پھرتے اور کبھی حضرت کی چارپائی سے لگ کر آبیٹھتے اور خدمت اور تیمارداری میں مشغول ہوتے، وقت پر روٹی کھانا اور معمول کے موافق شب کو سو جانا عرصہ ہوا چھوٹ چکا تھا، اب تو نہ لیٹے چین تھا نہ بیٹھے کل پڑتی تھی، آخر ایک وید کے پاس پہنچے اور کہا کہ میرا بھائی بیمار ہے اس کو چل کر آپ دیکھ لیں، ویدجی نہایت ہی خلیق اور بامروت شخص تھا،

جس وقت مولوی ابوالنصر صاحب نے اپنے مریض کو دکھانے کی درخواست کی اس وقت وید کے پاس مریضوں کا ایک مجمع موجود تھا اور ہر ایک اپنا اپنا عرض حال کر رہا تھا، وید نے نووارد مسافر کا توحش اور جان سے زیادہ عزیز مریض کے شدتِ مرض کی وجہ سے سراسیمگی و اضطراب کو دیکھ لیا، اس لیے یہ کہہ کر دو منٹ ٹھہریے ابھی چلتا ہوں جلدی جلدی موجودہ بیماروں سے فراغت پائی، آخر چھڑی ہاتھ میں لے کر ساتھ ہو لیا اور حضرت امام ربانی کی نبض بھی دیکھی قارورہ بھی دیکھا اور اول سے آخر تک سارا حال اطمینان کے ساتھ سنا، تیمارداروں کو تسلی دی اطمینان دلایا ڈھارس بندھایا اور چند گولیاں اپنے پاس سے دیں کہا ایک ابھی کھلا دو، چنانچہ ایک گولی آپ کو کھلا دی گئی خدا کا فضل تھا

کہ مرض میں دوگنا خفت محسوس ہوئی مگر نہ ایسی جس پر اطمینان یا امید زیست قائم ہو، اس مرض میں حضرت کو تشنج کے دورے شروع ہوگئے جو پے در پے پڑتے اور نحیف جسم کو ضعیف کرتے رہتے تھے بمبئی میں ایک مہینہ قیام رہا آخر منشی علاء الدین صاحب کی اہلیہ کا وہیں انتقال ہوگیا، مضمون بہت طویل ہوگیا، آگے بھی کئی صفحے باقی ہیں۔

مجھے تو صرف حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے مجاہدات میں سے ایک مجاہدہ کا اور اس کے ساتھ ہی مولانا ابو النصر صاحب کے مجاہدات کے ساتھ اور مایوسانہ حالات کے ساتھ ان دونوں حضرات کا یہ طویل سفر گزرا، سفر کے آخر تک کی روداد تذکرۃ الرشید جلد ا صفحہ ۲۱۱ میں موجود ہے کہ آخر تک حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو کیسی کیسی سخت تکالیف برداشت کرنی پڑی، تذکرۃ الرشید میں دوسری جگہ حضرت امام ربانی کے معمولات حسب ذیل لکھے ہیں، مولانا مرحوم لکھتے ہیں کہ امام ربانی قدس سرہٗ کی عادت جاریہ اور معمول دائمی کے اظہار میں ایک تحریر اور ہدیہ ناظرین کرتا ہوں، جو حضرت کے شاگرد رشید اور مجاز طریقت جناب الحاج حکیم محمد اسحاق صاحب نہٹوری نے تحریر فرمائی ہے یہ ہے۔

عادت شریفہ یوم بلیلہ میں اس طرح تھی کہ بعد نمازِ صبح سے خلوت خانہ میں مشغول بذکر و فکر و مراقبہ جاڑوں میں نو بجے تک اور گرمیوں میں آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک رہتے پھر حاجت ضروری سے فارغ ہوکر وضو فرما کر چاشت کے نوافل ادا کرتے، کبھی چار رکعت کبھی آٹھ رکعت، نماز سے فراغ کے بعد تدریس میں مشغول ہوجاتے، دو گھنٹہ یا کچھ کم یہ شغل حدیث رہتا، پھر کھانا تناول فرما کر بارہ بجے وقت استواء کے دھوپ گھڑی سے گھڑی کو ملاتے پھر قیلولہ فرماتے۔ جاڑوں میں ایک بجے اور گرمیوں میں ڈیڑھ بجے سے پہلے بیدار ہوکر نماز ظہر سے سردی میں ڈیڑھ بجے تک فارغ ہوتے اور گرمی میں دو بجے تک فارغ ہوتے، بعد نماز ظہر تلاوت قرآن شریف کا معمول تھا اور خطوط کا ملاحظہ اور ان کا جواب مع فتاویٰ نویسی، صبح کو بعد صلوٰۃ ضحیٰ قبل تدریس معمول تھا، اگر جواب خطوط باقی رہتے تو بعد تلاوت یا بعد نمازِ عصر پورا فرماتے اور موسم گرما میں قبل نماز ظہر غسل فرمانے کا معمول تھا اور کبھی دوسری بار قریب عصر کے بھی غسل فرماتے پھر بعد تلاوت تدریس طلبہ میں عصر تک مشغول رہتے، بعد عصر تسبیح لے کر طالبین کی طرف متوجہ ہوکر بیٹھ جاتے اس میں کوئی مسئلہ پوچھتا، کوئی کچھ حال عرض کرتا، کوئی مراقبہ میں مشغول ہوکر مستفید ہوتا بعد نماز مغرب صلوٰۃ اوابین چھ رکعت ادا فرماتے، ان میں سے کسی قدر قرآن شریف آدھ پارے سے لے کر ایک پارہ تک تخمیناً پڑھتے بعد فراغ نوافل صحنِ حجرہ میں ذرا دیر مہمانوں سے بات چیت کرکے گھر میں تشریف لے جاتے، وہاں سے کھانا تناول فرما کر قریب اذان عشاء تشریف لاکر زائرین و

حاضرین سے مخاطب ہوتے، کبھی لیٹ جاتے اور کبھی بیٹھے رہتے، نماز عشاء جاڑوں میں نو بجے گرمیوں میں دس بجے شروع کرتے اگر نمازی جلدی جمع ہوتے تو دیر نہ فرماتے، خصوصاً اس نماز میں تحدید مخصوص نہ تھی، بعد فراغ نماز عشاء ذرا بیٹھ کر لیٹ جاتے اور گیارہ بجے کے قریب خدام پاؤں دباتے، اس میں بعض خواص کو عجیب وغریب کیفیات اور انوار مشاہد ہوتے، بعد گیارہ بجے یا ساڑھے گیارہ بجے سب کو رخصت کر دیتے، پھر قدرے مقرر استراحت فرما کر بیدار ہوتے، اس وقت بنفسِ نفیس سب کام خود کرتے اس وقت استعانت وخدمت غیر کو پسند نہ فرماتے، تہجد کو بقرات طویلہ بجہر غیر مفرط بلحن داؤدی ادا فرماتے۔ اس وقت اُٹھنے میں عادت شریفہ مختلف تھی، کبھی بالکل نہ سوتے جب خدام کو رخصت کیا اور جانا کہ سب لوگ لیٹ گئے ہوں گے، اُٹھ بیٹھتے اور عشاء کے وضو سے نفلیں ادا فرماتے، جب تھک جاتے قدرے استراحت فرماتے بعد استراحت پھر نفلیں شروع فرماتے، صبح تک یہی طور رہتا، باوجود ضبطِ کامل کبھی گریہ اس طرح مستولی ہوتا کہ تمام شب گریہ میں گزر جاتی، عدد رکعات اور قدر قراءت کا حال معلوم نہیں، الغرض پچھلی رات نوافل مسنونہ اور ذکر وفکر کی مشغولی میں گزرتی تھی پھر نماز صبح بوقت ابتداء یا توسط اسفار ادا فرماتے، فرض نماز آں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ بہت مختصر اور کامل پڑھاتے تھے، پارہ عم کی سورتوں کے سوا دوسری سورتیں شاذ ونادر ہی پڑھتے تھے، فرائض کے رکوع وسجود وغیرہ میں ادعیہ ماثورہ نہ پڑھتے تھے بلکہ تسبیحات پر قناعت فرماتے، لیکن نوافل میں اکثر پڑھتے تھے، اس رات دن کے عمل میں مریضوں کی دوا اس طرح ہوتی تھی کہ اس کے واسطے وقت ممتاز نہ تھا، معمولی مشغولی میں جب کوئی مریض آتا آپ اسی وقت اکثر دوا مفرد بتلا کر رخصت کر دیتے تھے، نسخہ لکھنے یا اور مرکب دوا بتلانے کا اتفاق بہت کم ہوتا تھا، آپ کی برکت سے مریضوں کو بکثرت شفا ہوتی اور امراض عسیرہ وممتدہ کا علاج بھی بطور مختصر فرماتے اور ہر قسم کے مریضوں کو شفاء ہوتی، یہ معمول دوازدہ ماہ کا تھا۔''

حضرت نانوتوی کے مجاہدات:

حضرت اقدس نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کے مجاہدات میں حضرت اقدس مولانا محمد یعقوب صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے سوانح قاسمی میں تحریر فرمایا ہے کہ میں اپنے مکان کوچہ چیلاں میں رہتا تھا، مولانا بھی اسی مکان میں آگئے، کوٹھے پر ایک جھلنگا پڑا ہوا تھا اس پر پڑے رہتے تھے، روٹی کبھی پکوا لیتے تھے اور کئی کئی وقت تک اس کو کھا لیتے تھے، میرے پاس آدمی روٹی پکانے والا نوکر تھا، اس کو یہ کہہ کر رکھا تھا کہ جب مولوی صاحب کھانا کھائیں تو سالن دے دیا کرو، مگر بدقت کبھی اس کے اصرار پر کھا لیتے تھے ورنہ وہی روکھا سوکھا ٹکڑا چبا کر پڑے رہتے تھے ایک سال کے قریب (بعد انتقال

والد مرحوم) احقر دہلی رہا پھر اجمیر کی نوکری کے سبب دہلی چھٹی اور مولوی صاحب سے جدائی پیش آئی، مولوی صاحب چند روز اسی مکان میں تنہا رہے پھر چھاپہ خانہ جا رہے، یہ واقعات میرے مشاہدے کے تو نہیں سنے ہوئے ہیں کہ اس مکان میں چند آدمی اور تھے مگر سب متفرق ہو گئے مولانا تنہا اس مکان میں رہ گئے باہر کا قفل لگا رہتا، رات کو مولوی صاحب کیواڑ اُتار کر اندر جاتے تھے اور پھر کیواڑ کو درست کر لیتے تھے اور صبح کو کیواڑ اتار کر باہر ہو جاتے اور پھر کیواڑ درست کر دیتے تھے، چند ماہ اسی ''ہو'' کے مکان میں گزر گئے۔

جس زمانہ میں مولانا میرے پاس رہتے تھے مولوی صاحب کی صورت پر جذب کی حالت برستی تھی، بال سر کے بڑھ گئے تھے نہ دھونا، کنگھی نہ تیل نہ کترے نہ درست کیے عجب صورت تھی، مولوی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہیبت عنایت کی تھی ان کے سامنے بولنے کا ہر کسی کو حوصلہ نہ تھا باوجودیکہ نہایت خوش مزاج اور عمدہ اخلاق تھے، اس لیے تو میں کچھ نہ کہہ سکا اور دوست سے کہلایا تب بمشکل بال کترواکر درست کیے اور دھلوائے، جوئیں بہت ہو گئی تھیں ان سے نجات ہوئی، مزاج تنہائی پسند تھا اس لیے کچھ عرض نہ ہو سکتا تھا۔

مولوی صاحب کو اول عمر سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات عنایت فرمائی تھی کہ اکثر ساکت رہتے اس لیے ہر کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا اور باوجود خوش مزاجی اور ظرافت کے ترش رو اور مغموم جیسی صورت رکھتے اور ان کے حال سے بھلا ہو یا برا نہ کسی کو اطلاع ہوتی نہ آپ کہتے یہاں تک کہ بیمار بھی اگر ہوتے تب بھی شدت کے ساتھ کبھی کسی نے جان لیا ورنہ خبر بھی نہ ہوتی اور دوا تو کہاں۔

(سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحب: ص ۳۰)

مولانا مناظر احسن گیلانی اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ شاید ''ہو'' اسی مکان کا وہ مشہور قصہ ہے جس کا ذکر خاکسار سے براہ راست حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم بھی فرمایا کرتے تھے اور قاری محمد طیب صاحب نے بھی بیان ذکر کیا کہ حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی میں نے یہ قصہ سنا ہے کہ حضرت نانوتوی اپنے بند حجرے میں ذکر میں مشغول تھے تو ہر ضرب کے ساتھ دھماکہ کی آواز بھی آتی تھی۔ لوگ متوحش ہوئے کہ یہ کیا قصہ ہے، حجرہ کے کیواڑ اُتارے گئے، چونکہ اندر سے زنجیر بند تھی اندر جا کر دیکھا تو حضرت کے برابر ایک سانپ ہے اور جب حضرت ضرب لگاتے ہیں تو وہ بھی سر اُٹھا کر کھڑا ہوتا ہے اور جب حضرت ضرب لگاتے ہیں تو وہ بھی زور سے زمین پر سر پٹکتا ہے یہ دھماکہ اسی کا تھا لوگوں نے اسے مار امار کر باہر لائے لیکن حضرت کو کچھ خبر نہیں ہوئی، قاری طیب صاحب نے بیان کیا کہ یہ واقعہ میں نے

امیر شاہ خاں اور متعدد لوگوں سے سنا ہے۔

(سوانح قاسمی: ص ۳۰۶ ر ج ۲)

حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق مشہور یہ ہے کہ حضرت نے پورا قرآن شریف جہاز میں یاد کیا دن کو ایک پارہ حفظ کر لیتے تھے اور رات کو سنا دیتے تھے، اروحِ ثلاثہ صفحہ ۲۶۷ میں حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی روایت سے یہی نقل کیا ہے لیکن حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے سوانح عمری میں خود حضرت نانوتوی کی روایت سے نقل کیا ہے کہ میں نے فقط دو سال رمضانوں میں قرآن پاک یاد کیا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا جمادی الثانیہ ۱۲۷۷ھ میں حج کے لیے روانہ ہوئے اور آخر ذیقعدہ میں مکہ مکرمہ پہنچے، بعد حج مدینہ شریف روانہ ہوئے اور ماہِ صفر میں مدینہ پاک سے مراجعت فرمائی، ربیع الاول کے اخیر میں بمبئی پہنچے اور جمادی الثانیہ تک وطن پہنچے، جاتی دفعہ کراچی سے جہاز بادبان میں سوار ہوئے تھے، رمضان کا چاند دیکھ کر مولوی صاحب نے قرآن شریف یاد کیا تھا اور اول وہاں سنایا بعد عید مکلا پہنچ کر حلواء مسقط خرید فرما کر شیرینی ختم دوستوں کو تقسیم فرمائی، مولوی صاحب کا اس سے پہلے قرآن یاد کرنا کسی کو ظاہر نہ ہوا تھا، بعد ختم مولوی صاحب فرماتے تھے کہ فقط دو سال رمضان میں میں نے یاد کیا اور جب یاد کیا پاؤ سپارہ کی قدر یا کچھ اس سے زائد یاد کر لیا، پھر تو بہت کثرت سے پڑھتے، ایک بار یاد ہے کہ ستائیس پارے ایک رکعت میں پڑھے اگر کوئی اقتداء کرتا رکعت کرا کر اس کو منع فرما دیتے اور تمام شب تنہا پڑھتے تھے۔ (سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحب: ص ۳۸)

مشہور روایت یکسالہ میں اور اس میں جمع تو آسان ہے کہ کچھ حصہ پہلے رمضان میں یاد کر لیا ہو اور بیشتر حصہ سفر حج کے رمضان میں یاد کیا ہو اور اسی سال پہلی مرتبہ تراویح میں قرآن پاک سنایا جس کے ختم پر مسقط کے حلوے کی تقسیم فرمائی ہو۔

حضرت مولانا یحییٰ کے مجاہدات

مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تذکرۃ الخلیل میں میرے والد صاحب کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری درخواست پر رمضان میں قرآن شریف سنانے کے لیے میرٹھ تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ دن بھر میں چلتے پھرتے پورا قرآن شریف ختم فرما لیتے اور افطار کا وقت ہوتا تو ان کی زبان پر ''قل اعوذ برب الناس'' ہوتی تھی، ریل سے اترے تو عشاء کا وقت ہو گیا تھا ہمیشہ باوضو رہنے کی عادت تھی اس لیے مسجد میں قدم رکھتے ہی مصلے پر آ گئے اور تین گھنٹے میں دس پارے ایسے رواں اور صاف پڑھے کہ کہیں نہ لکنت تھی نہ متشابہ گویا

قرآن شریف سامنے کھلا رکھا ہے اور با اطمینان پڑھ رہے ہیں، تیسرے دن ختم فرما کر روانہ ہو گئے کہ نہ دور کی ضرورت تھی نہ سامع کی۔ (تذکرۃ الخلیل: ص۲۰۴)

میرٹھ کے اس سفر کے متعلق والد صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ میرٹھ کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ جب لوگوں میں یہ تذکرہ ہوا کہ ایک شخص سہارنپور سے تین دن میں قرآن شریف سنانے کے لیے آرہا ہے تو تیس (۳۰) چالیس (۴۰) حافظ محض امتحان کے لیے میرے پیچھے تراویح پڑھنے آتے تھے، والد صاحب کو رمضان المبارک میں میری طرح سے بخار نہیں آتا تھا، دوستوں کے اصرار پر ایک دو دن کے لیے ان کے یہاں جا کر دو شب یا زیادہ سے زیادہ تین شب میں تراویح میں ایک قرآن پڑھ کر واپس آجاتے تھے، مساجد میں عموماً تین شب میں ہوتا تھا، غیر مساجد میں ایک یا دو شب میں بھی ہو جاتا تھا، ایک مرتبہ شاہ زاہد حسین مرحوم کے اصرار پر دو شب کے اندر قصبہ بہٹ میں ان کے مردانہ مکان میں قرآن پاک سنا کر آئے تھے، مسجد نواب والی قصاب پورہ دہلی میں بھی ایک دفعہ کا قرآن سنانا مجھے یاد ہے۔

عزیز مولوی نصر الدین سلمہ حکیم اسحاق صاحب مرحوم کی مسجد میں ایک مرتبہ قرآن پاک سنا رہے تھے، میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کسی سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے، حکیم اسحاق صاحب کی بیٹھک میں استراحت فرماتے تھے، نصیر الدین کا چودھواں پارہ تھا سامع بار بار لقمہ دے رہا تھا وہ باوضو تھے، مسجد میں تشریف لے گئے، نصیر الدین کو سلام پھیرنے کے بعد مصلے پر سے ہٹا کر سولہ رکعت میں سولہ پارے ختم کر دیئے، مصلیوں کو گراں تو ضرور ہوا مگر لوگوں کو جلد قرآن پاک ختم ہونے کی خوشی مشقت پر غالب ہوا کرتی ہے۔ بارہویں رات میں قرآن ختم کر کے سب تکان بھول گئے۔

بعض اعزہ کے اصراروں پر کاندھلہ میں بھی امی بی رحمہا اللہ تعالیٰ کے مکان پر اخیر زمانہ میں ایک دفعہ قرآن سنانے کا حال تو مجھے بھی معلوم ہے اور اپنی جوانی کا وہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ ساری رات نوافل میں قرآن سنانے میں گزرتی تھی اور چونکہ ہمارے یہاں نوافل میں چار سے زیادہ مقتدیوں کی اجازت نہیں ہوتی تھی، اس لیے مستورات تو بدلتی رہتی تھیں اور میرے والد مسلسل پڑھتے رہتے تھے، میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے بھی کئی رمضان المبارک امی بی رحمہا اللہ تعالیٰ کی وجہ سے کاندھلہ میں گزارے، تراویح تقریباً ساری رات میں پوری ہوتی تھی، مسجد کے فرض پڑھنے کے بعد مکان تشریف لے جاتے تھے اور سحر تک تراویح میں چودہ پندرہ پارے پڑھتے تھے، مولانا رؤف الحسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ میرے والد صاحب کے حقیقی ماموں اور میری سابقہ اہلیہ مرحومہ کے والد ان کا مفصل قصہ تو عنقریب تقویٰ کے مضمون میں آرہا ہے اس کا یہ جزء یہاں کے

مناسب ہے کہ ۳۰ رمضان المبارک کو ''الم'' سے ''قل اعوذ برب الفلق'' تک ایک رکعت میں اور دوسری میں ''قل اعوذ برب الناس'' پڑھ کر سحر کے وقت اپنی والدہ یعنی امی بی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر دو رکعت میں نے پڑھا دی، اٹھارہ آپ پڑھ لیں اور ان کی والدہ امی بی رحمہا اللہ تعالیٰ نے سارا قرآن کھڑے ہو کر سنا بات پر بات نکلتی جاتی ہے، مگر یہ واقعات بھی اکابر کے مجاہدات میں داخل ہیں اس لیے زیادہ بے محل نہیں۔

اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم کے مجاہدات

اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ رائے پوری کے رمضان المبارک کے معمولات تذکرۃ الرشید میں یہ لکھے ہیں کہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کو تعلیم قرآن پاک سے شغف تھا، (دون کے دیہات میں بیسیوں مکاتیب قرآن پاک کے جاری کرائے) اسی طرح خود تلاوت کلام اللہ سے عشق تھا، آپ حافظ قرآن تھے اور شب کا قریب قریب سارا وقت تلاوت میں صرف ہوتا تھا، رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں شاید آپ گھنٹہ بھر سے زیادہ نہ سوتے ہوں اور اسی لیے آپ کو لوگوں سے وحشت ہوتی تھی کہ معمول تلاوت میں حرج ہوتا تھا، عصر و مغرب کے درمیان کا وقت عام دربار اور سب کی ملاقات کے لیے مخصوص تھا (از زکریاؔ) صبح کے وقت میں بھی نو دس بجے کے قریب ایک گھنٹہ مہمانوں کی عمومی ملاقات کا تھا اور اس کے علاوہ بغیر کسی خاص ضرورت کے آپ کسی سے نہ ملتے اور حجرہ شریف کا دروازہ بند فرما کر خلوت کے مزے لوٹتے اور اپنے مولائے کریم سے راز و نیاز میں مشغول رہا کرتے تھے، خوراک آپ کی کم تھی اور ماہ رمضان میں تو مجاہدہ اس قدر بڑھ جاتا کہ دیکھنے والوں کو ترس آتا تھا، ماہِ رمضان میں صبح و عصر کے بعد کی مجلس بھی موقوف رہتی تھی، زکریا) افطار و سحر دونوں کا کھانا بمشکل دو پیالی چائے اور آدھی یا ایک چپاتی ہوتی تھی۔

شروع میں آپ قرآن مجید تراویح میں خود سناتے اور دو ڈھائی بجے فارغ ہوتے تھے، (ھکذا فی الاصل) مگر آخر میں دماغ کا ضعف زیادہ بڑھ گیا تو سامع بنتے اور اپنی تلاوت کے علاوہ تین چار ختم سن لیا کرتے تھے، ماہِ مبارک میں چونکہ تمام رات اور تمام دن آپ کا مشغلہ تلاوت کلام اللہ رہتا تھا، اس لیے تمام مہمانوں کی آمد آپ روک دیا کرتے تھے، (از زکریا۔ مہمانوں کا ہجوم تو رمضان میں اعلیٰ حضرت رائے پوری کے یہاں بہت بڑھ جاتا تھا، البتہ ملاقات بالکل بند تھی جب حضرت قدس سرہٗ نمازوں کے لیے مسجد میں آتے جاتے اس وقت دور سے زیارت کر لیا کرتے تھے) اور مراسلت بھی پورے مہینے بند رہتی تھی کہ کوئی خط کسی کا بھی (الا ماشاء اللہ) عید سے قبل

دیکھا یا سنا نہ جاتا تھا، اللہ جل جلالہ کا ذکر جس پیرایہ پر بھی ہو آپ کی اصل غذا تھی اور اسی سے آپ کو وہ قوت پہنچتی تھی جس کے سامنے دواء المسک اور جواہر مہرہ ہیچ تھا۔ (تذکرۃ الخلیل: ص ۲۴۸)

یہ اُوپر لکھا جا چکا ہے کہ اعلیٰ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں رمضان میں ہجوم تو بہت رہتا تھا، مگر حقیقی طالبین کا رہتا تھا، جس کے لیے ماہ مبارک میں کوئی ملاقات کا وقت نہیں تھا، صرف نماز کو جاتے ہوئے دور سے زیارت ان مشتاقین کے لیے کافی تھی، لیکن جن لوگوں کے آنے پر حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے قلبِ اطہر کو متوجہ ہونا پڑے، ان کا آنا بڑا گراں تھا، آپ بیتی نمبر۴ تحدیث بالنعمۃ میں لکھوا چکا ہوں کہ اپنے والد صاحب قدس سرہٗ کے زمانہ حیات کے آخری رمضام میں میں نے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں رمضان ۳۲ھ گزارنے کی خواہش کی تھی تو اعلیٰ حضرت نے ازراہِ شفقت تحریر فرمایا کہ رمضان کہیں آنے جانے کا نہیں ہوتا اور نہ ملنے کا، اپنی جگہ پر یکسوئی سے کام کرتے رہو، اس ناکارہ نے صرف اخیر عشرے میں حاضری کی اجازت چاہی، جس کا جواب میرے کاغذات میں سے مل گیا تھا اور وہ آپ بیتی نمبر۴ میں بھی لکھوا چکا ہوں کہ جو سبب شروع ماہ مبارک میں عدم قیام کا ہے وہ اخیر ماہ میں بھی موجود ہے باقی تم اور تمہارے ابا جان زبردست ہو، ہم غریبوں کی کیا چل سکے، یہ تمہاری زبردستی ہے کہ جو اس وقت ماہ مبارک میں تم کو جواب لکھوا رہا ہوں، باقی جو ذکر و شغل حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ نے تلقین فرمایا ہے وہی کرنا چاہیے، یہ خط تو وہاں گزر چکا مگر میرے والد صاحب نے فرمایا کہ تیری وجہ سے حضرت کی یکسوئی میں فرق پڑے گا اور حضرت کو تیرے کھانے پینے کا فکر رہے گا اس لیے حضرت کا حرج نہ کر۔

شیخ الاسلام حضرت مدنی کے مجاہدات

حضرت شیخ الاسلام مولانا الحاج سید حسین احمد صاحب المدنی نور اللہ مرقدہٗ کے مجاہدات کے لیے تو بڑے دفتر چاہئیں، یہ تو میرا متعدد اکابر سے سنا ہوا ہے کہ جب مدینہ پاک میں ذکر و شغل کی ابتداء کی تو مدینہ پاک سے باہر ایک مسجد اجابت تھی جو اب تو شہر کے اندر آگئی اور چاروں طرف آبادی بہت بڑھ گئی، اس وقت ویرانہ میں تھی، حضرت وہاں بیٹھ کر اس زور و شور سے ضربیں لگایا کرتے تھے کہ دور تک آواز جایا کرتی تھی اور بعض مرتبہ جوشِ عشق میں ضربیں لگاتے لگاتے اُٹھ کر مسجد کی دیواروں میں سر دے کر مارا کرتے تھے، یہ گستاخ بعض مواقع پر حضرت سے عرض بھی کر دیتا تھا کہ آپ کی دماغی قوت کا کون مقابلہ کر سکتا ہے جس کا سر دیواروں پر مارنے سے بھی نہ پھوٹا، حضرت نے کبھی اس کی تردید تو فرمائی نہیں، مگر ایسا گہرا سکوت فرماتے تھے کہ یہ گستاخ کہہ کر خود ہی پشیمان ہوتا تھا، حجاز سے واپسی اور صبح کو چھ بجے دیوبند پہنچنا اور اس وقت سات بجے بخاری شریف

کا سبق پڑھا دینا تو مجھے بھی معلوم ہے۔

الیکشن کے ہنگامہ میں ایک مرتبہ جمعرات کی شام کو چار بجے کی گاڑی سے دہلی تشریف لے گئے، دس بجے حاجی علی جان مرحوم کی کوٹھی میں کوئی میٹنگ تھی، اس میں مشغول رہے، وہاں سے فارغ ہو کر رات ہی کو نانوتہ پہنچے، صبح کی نماز کے بعد نانوتہ میں جلسہ میں تقریباً دو گھنٹے تقریر فرمائی، وہاں سے فارغ ہو کر سہارنپور ہوتے ہوئے سیدھے سنسار پور تشریف لے گئے، وہاں ایک اجتماع میں تقریر فرمائی، جمعہ بہٹ آ کر پڑھا اور جمعہ کے بعد دو گھنٹہ وہاں تقریر فرمائی، عصر کے بعد سہارنپور تشریف لائے، عشاء کے بعد سہارنپور کے ایک اجتماع میں تقریر فرمائی، شنبہ کی صبح کو دیوبند جا کر بخاری شریف کا سبق پڑھا دیا، حضرت کے مجاہدات کی تفصیل تو بہت لمبی ہے اور مجاہد اعظم کا لقب حضرت کے لیے حضرت کے مجاہدات کے مقابلہ میں کم ہے، البتہ سلہٹ کے ایک رمضان کا واقعہ لکھواتا ہوں جس کو مولوی عبدالمجید صاحب اعظمی نے ''مولانا مدنی کا قیام سلہٹ'' نامی رسالہ میں مفصلہ تحریر فرمایا ہے۔

یہ بہت ہی طویل مضمون اس رسالہ کے دس صفحے پر آیا تھا، اسی دوران میں اکابر کے رمضان کے نام سے مستقل ایک رسالہ لکھنے کی نوبت آ گئی، اس میں بھی یہ مضمون بعینہ مکرر آ گیا، اگر چہ میرا تو جی چاہتا تھا کہ دونوں رسالوں میں مستقل آ جائے مگر میرے بعض دوستوں کی رائے ہوئی کہ ایک ہی مضمون دو جگہ اتنا طویل تکرار ہے، مختصر ہوتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا، اس کے لیے یہاں سے لکھوانے کے بعد حذف کر دیا، مگر ہے قابل دید اور اکابر کے رمضان تو سارے ہی دیکھنے کے قابل ہیں، دوستوں کا مشورہ ہے کہ اس مضمون کو خاص طور سے اس میں ضرور دیکھیں، بعد میں مفتی محمود صاحب کی رائے یہ ہوئی کہ دونوں جگہ ہونا ضروری ہے، اس لیے باقی رکھا گیا۔

مولوی عبدالحمید صاحب اعظمی حضرت کے معمولات رمضان کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا کا قیام تو داروغہ عبدالستار صاحب مرحوم کے مکان پر ہوتا تھا اور نئی سڑک کی بڑی مسجد جو قیام گاہ سے تقریباً دو فرلانگ ہے، اس میں حضرت پانچوں وقت کی نماز پڑھا کرتے تھے اور اسی میں زائرین معتقدین دور دراز سے آ کر ماہِ مبارک میں فروکش ہوتے تھے چونکہ حضرت قدس سرہٗ کا پورے ماہ کا قیام ہوتا تھا۔ اس لیے نیت اقامت کی ہوتی تھی اور جملہ نمازوں میں حضرت خود ہی امامت فرمایا کرتے تھے اور ظہر کی نماز کے بعد مصلی کے چاروں طرف جو بیسیوں بوتلیں پانی دم کرنے کی رکھی رہتیں، ان پر دم کرتے اس کے بعد نیچے سے وہ درخواستیں نکالتے جو ظہر کی نماز تک وہاں جمع ہوتی رہتی تھیں اور ان کو ہر ایک کو پڑھ کر صاحب درخواست کو بلا کر اس کی درخواست پوری فرماتے تعویذ وغیرہ لکھتے، جس میں بیعت کی درخواست ہوتی، ان سب کو جمع

کرتے۔ ان درخواستوں سے فارغ ہونے کے بعد بیعت ہونے والے حضرات کو بیعت کرتے پھر کچھ ارشاد و نصیحت کے بعد دولت خانہ تشریف لے جاتے۔ جانے کے ساتھ کبھی ذرا سا لیٹ گئے ورنہ تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ ڈاک کا کام اگر باقی رہ گیا تو اس کو پورا کیا، اسی درمیان میں خصوصی ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا اتنے میں عصر کی اذان ہو جاتی۔ حضرت ضروریات سے فارغ ہو کر نمازِ عصر کے لیے تشریف لے جاتے۔ نمازِ عصر سے فارغ ہونے کے بعد مولانا محمد جلیل صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند کے ساتھ سوا پارے کا دور فرماتے اس طرح کہ پاؤ پارہ حضرت پڑھتے اور پھر وہی پارہ حضرت مولانا جلیل صاحب پڑھتے۔ مغرب تک اسی طرح رہتا۔ اگر غروب سے پہلے دور ختم ہو جاتا تو حضرت مراقب رہتے اور رفقاء اپنے ذکر و شغل میں مشغول رہتے اور معمولی افطار کے بعد جو عموماً کھجور اور زمزم سے اور ناشپاتی، اناس، عمدہ کیلے، آم، بصری کھجوریں، ناریل کا پانی، پپیتے، میٹھے اور نمکین چاول بھی ہو جاتے، تلے ہوئے انڈے بھی ہوتے اور عام ہندوستانی افطاری پھلیاں چنے وغیرہ سے دستر خوان خالی ہوتے۔ میں تو سمجھا کہ ان چیزوں کا یہاں رواج نہیں۔ مگر تحقیق سے معلوم ہوا کہ رواج تو خوب ہے مگر ان چیزوں کو گھٹیا سمجھا جاتا ہے۔ مگر حضرت نور اللہ مرقدہٗ نہایت استغراق میں ساکت رہتے، افطار گاہ مسجد کے قریب ہی تھی، لیکن دور ختم ہونے سے جو استغراقی کیفیت ہوتی تو بعض مرتبہ اذان کی بھی اطلاع کرنی پڑتی۔''

(از زکریا) یہ منظر اس ناکارہ نے بھی دیوبند کی حاضری پر بار ہا دیکھا کہ لوگ کسی سیاسی مسئلہ پر زور و شور سے بحث و مباحثہ کرتے رہتے اور کسی موقع پر حضرت زور سے فرماتے ''آئیں''، ''آئیں''۔

اس وقت میں یہ سمجھتا کہ حضرت جی تو یہاں ہیں ہی نہیں۔'' افطار کی ان تنوعات کے باوجود جو اوپر ذکر کیا گیا، حضرت کا افطار کھجور، زمزم کے بعد ایک آدھ قاش پھل کی نوش فرما کر ناریل کا پانی نوش فرماتے اور ایک یا آدھی پیالی چائے کی نوش فرماتے، لیکن دستر خوان کے ختم ہونے تک وہیں تشریف فرما ہوتے اور کبھی کبھی کوئی مزاحی تفریحی فقرہ بھی فرما دیا کرتے۔ آٹھ دس منٹ اس افطار میں لگ جاتے، اس کے بعد حضرت مغرب کی نماز نہایت مختصر پڑھتے اور اس کے بعد دو رکعت نفل نہایت طویل تقریباً نصف گھنٹے تک پڑھتے۔ اس کے بعد حضرت طویل دعاء مانگتے، جس میں سارے اہل مسجد چاہے مشغول ہوں یا فارغ، شرکت کرتے۔ اس کے بعد اگر کہیں دعوت ہوتی تو مسجد سے داعی کے مکان پر تشریف لے جاتے۔ ورنہ اپنی قیام گاہ پر تشریف لے جاتے۔

کھانے میں دو دستر خوان ہوا کرتے تھے۔ ایک حضرت اور ان کے رفقاء کا جو روٹی کھانے کے

عادی تھے اور دوسرا مہمانوں کا، جو چاول کھانے والے ہوتے تھے۔ حضرت کے رفقاء میں صاحبزادے مولانا اسعد اور عزیزان ارشد وریحان بھی ہوتے۔ یہ تینوں بھی چاول کھانے والوں میں ہوتے۔ حضت مزاحاً ارشاد فرمایا کرتے ''دو بنگالی میرے پاس بھی ہیں، ان کے لیے بھی چاول پکادیجئے''۔

دسترخوان پر مختلف قسم کے چاول کثرت سے ہوتے تھے۔ اس لیے کہ مجمع بنگالیوں کا ہوتا تھا اور وہ چاول کے عادی ہیں۔ پراٹھے کا دستور ہے، مگر سادی چپاتیاں نہ معلوم ہیں نہ کوئی پکانا جانتا ہے دسترخوان پر گوشت وغیرہ کے علاوہ کسی میٹھی چیز کا ہونا بھی ضروری ہے۔ حلوے اور شاہی ٹکڑوں کے علاوہ پپیتے اور پیٹھے کی سویاں اس تکلف سے پکائی جاتیں کہ ادھر کے لوگوں کو اس کی پہچان اور تمیز مشکل ہوتی۔ نیپال کی سبز مرچیں بھی تراش کر دسترخوان پر رکھنا بھی ضروری ہوتا۔ باوجود اس کے کہ یہ مچھلیوں کا ملک ہے، معلوم نہیں مچھلی دسترخوان پر کیوں نہیں ہوتی تھی۔ ایک نئی ترکاری بانس کی لائی گئی تھی، تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہاں بانسوں میں ایک گوپھا ہوتا ہے اس کی ترکاری پکائی جاتی ہے۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ کا عمومی دسترخوان دیوبند میں بھی اور یہاں بھی عرب کے قاعدہ کے موافق بڑے طباق میں ترکاری اور اس کے چاروں طرف حلقہ بنا کر کھانے والے بیٹھتے تھے۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے پاس ایک کپڑے میں گرم چپاتیاں لپٹی رہتی تھیں اور حسب ضرورت مہمانوں کو مرحمت فرماتے رہتے تھے۔ اگر کوئی شخص اپنی رکابی کو بھری ہوئی چھوڑ دیتا تو حضرت اس کو اٹھا کر اپنے دستِ مبارک سے صاف کر دیتے اور دسترخوان پر گرے ہوئے روٹی کے ٹکڑے کو اٹھا کر بے تکلف کھا لیتے تھے۔ جس کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو بھی اس کا اہتمام ہوگیا۔ حضرت کا معمول دو زانو بیٹھ کر کھانے کا تھا ایک چپاتی بائیں ہاتھ میں دبا لیتے اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے توڑ کر کھاتے۔ سب سے اول میں افتتاح کرتے اور سب سے آخر میں فارغ ہوتے۔ کھانے کے بعد سب مہمان چائے پیتے۔

یہ سب تفصیل دعوت کی تھی۔ اگر کہیں دعوت نہ ہوتی تو حضرت مغرب کی نماز سے فراغ کے بعد سیدھے قیام گاہ پر تشریف لاتے کھانا پہلے سے تیار ہوتا۔ تشریف لاتے ہی دو دسترخوان ایک چاول والوں کا اور دوسرا حضرت اوران کے رفقاء روٹی کھانے والوں کا۔ چونکہ مکان پر کھانے سے جلدی فراغ ہوجاتا، اس لیے حضرت کھانے کے بعد چند منٹ بیٹھ جاتے۔ احباب مختلف گفتگو علمی یا اخباری کرتے رہتے، حضرت بھی اس میں شریک ہوتے۔ اس کے بعد چند منٹ کے لیے حضرت آرام فرماتے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا مخصوص لہجہ اوران کی

نماز کا خشوع اور خضوع نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب اور حجاز میں بھی ممتاز و مسلم ہے۔
سلہٹ میں حضرت نماز اور تراویح کی امامت خود فرماتے۔ اس تراویح کی شرکت کے لیے دور دراز سے سینکڑوں آدمی آتے اور تراویح وتہجد کی شرکت فرما کر صبح سب اپنے گھر روانہ ہو جاتے۔
(از زکریا) حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ کی قراءت اور نمازوں کے متعلق جو لکھا لفظ بہ لفظ صحیح ہے۔ فرائض کی اقتداء تو اس ناکارہ کو سینکڑوں مرتبہ ہوئی ہوگی۔ لیکن ماہِ مبارک میں حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری کی کبھی توفیق نہیں ہوئی۔ البتہ تراویح میں دو مرتبہ اقتداء کی نوبت آئی۔
پہلی مرتبہ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ میں جب کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ الہ آباد جیل سے رہا ہو کر چودہ رمضان یکشنبہ کی صبح سہارنپور پہنچے اور اسی وقت دوسری گاڑی سے دیوبند روانہ ہو گئے اور ایک شب دیوبند قیام کے بعد دوشنبہ کی دوپہر کو بارہ بجے دہلی تشریف لے گئے۔ چونکہ اس سال ۲۱ رجب کے صبح کو چچا جان کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے حضرت قدس سرہٗ دہلی پہنچنے کے بعد مغرب کے بعد نظام الدین بسلسلہ تعزیت تشریف لے گئے۔ تراویح کے وقت حضرت نے فرمایا جو امام تراویح ہے وہ تراویح پڑھائے۔ میں نے عرض کیا کہ کس کی ہمت ہے کہ آپ کے سامنے تراویح پڑھا سکے، آج تو آپ ہی کو پڑھانی ہے۔ تھوڑی سی ردوقدح کے بعد حضرت نے منظور فرمالیا اور اسی شب کی تراویح کی امامت حضرت نے نظام الدین میں فرمائی اور اپنی تراویح کا قرآن جو پہلے سے شروع ہوا ہوا تھا اس میں پارہ ۱۴ کے نصف سے سورہ بنی اسرائیل کے ختم تک ایک پارہ بیس رکعت میں اسے اطمینان سے پڑھا کہ لطف آ گیا۔
دوسری مرتبہ دوسرے سال رمضان ۶۴ھ کی پہلی تراویح حضرت نے سہارنپور کے اسٹیشن پر پڑھائی کہ ۲۹ شعبان کی شب صبح کو چار بجے بخاری ختم ہوئی اور اس دن شام کو مع اہل وعیال لاری سے دیوبند سے روانہ ہو کر سہارنپور پہنچے اور بارہ بجے کے قریب سہارنپور کے اسٹیشن پر بہت بڑی جماعت کے ساتھ تراویح پڑھی۔ اہل مدرسہ واہل شہر کی بڑی جماعت جو اپنے اپنے یہاں سے تراویح پڑھ کر اسٹیشن پہنچتے رہے اور بہ نیت نفل شریک ہوتے رہے۔ زکریا کو حضرت نے حکم فرمایا کہ میرے قریب کھڑے ہو سامع تمہیں بننا ہے۔ میں نے عرض کیا، آپ کو لقمہ دینا آسان تھوڑا ہی ہے، مجمع میں حافظ بہت ہیں اچھے سے حافظ کو لاؤں، حضرت نے قبول نہیں فرمایا اور اس شب کے استماع کا فخر اس سیہ کار کو حاصل ہوا۔ فقط
مولوی عبدالحمید صاحب لکھتے ہیں کہ چونکہ مجمع دور دور سے آتا تھا۔ اذان کے بعد ہی مسجد پُر ہو جاتی تھی۔ بعد میں آنے والوں کو جگہ بھی نہیں ملتی تھی۔ حضرت کے تشریف لے جانے کے لیے درمیان میں تھوڑی سی جگہ خالی رکھی جاتی۔ مسجد میں تشریف لاتے وقت متولی مسجد پانی کا گلاس

پہلے سے بھر کر انتظار میں کھڑے ہوتے کہ حضرت مکان سے چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد ایک پان کھا کر موٹر میں تشریف فرما ہوتے اور کلی کر کے سیدھے مصلی پر پہنچتے تھے۔ کثرت ہجوم کی وجہ سے ایک دو مکبر تو ضروری تھے اور اخیر عشرہ میں کئی کئی مکبر ہو جاتے تھے۔ تراویح میں ڈھائی پارے قرآن پاک کے اس طرح پڑھتے کہ اول چار رکعتوں میں مولوی جلیل سوا پارہ پڑھتے اور اسی سوا پارہ کو سولہ رکعتوں میں حضرت قدس سرہٗ پڑھتے۔ ترویحہ بہت لمبا ہوتا۔ حضرت پر تراویح میں قرآن پاک پڑھتے ہوئے بعض وقت ایک جوش پیدا ہوتا کہ اس وقت کی لذت تو سننے والے ہی کو معلوم ہے۔ تراویح کے بعد بہت طویل دعاء ہوتی۔ جس میں حاضرین پر گریہ وبکا کا ایسا زور ہوتا کہ بسا اوقات ساری مسجد گونج جاتی۔ تراویح کے بعد حضرت اپنے رفقاء اور خدام کے ساتھ وہیں چائے نوش فرماتے اور تقریباً دس منٹ بعد حضرت کے وعظ میں شرکت کے لیے مسجد آجاتے اور لوگوں کی کثرت کی وجہ سے تل رکھنے کی جگہ نہیں رہتی۔ بلکہ لوگ مسجد سے باہر سڑکوں پر کھڑے ہوتے وہاں آواز نہیں پہنچتی تھی اس لیے آلہ مکبر الصوت کا انتظام کیا گیا اور اس وقت میں وعظ میں شرکت کرنے والوں کو جن کی ہزاروں کی تعداد ہوتی تھی۔ چائے بھی خاموشی سے ملتی رہتی مگر اس میں آواز بالکل نہ ہوتی تھی اور نہ کوئی ایسا شخص ہوتا تھا جس کو چائے نہ ملی ہو۔ اتنے حضرت نور اللہ مرقدہٗ اپنی چائے سے فراغت پاتے اتنے مجمع بھی چائے سے فارغ ہو جاتا۔

یہ وعظ بالکل اصلاحی ہوتا تھا۔ سیاسیات پر کوئی کلام طویل نہ ہوتا۔ ایک آدھ لفظ بیچ میں چاشنی کے طور پر آجاتا تھا۔ (لارڈ میکالے اور ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر تو حضرت قدس سرہٗ کے ورد زبان تھے)۔ حضرت کے وعظ میں پرچہ بھی پہنچتا رہتا اور حضرت ان کو سن کر جواب بھی تفصیل سے دیتے۔ جب وسط رمضان کے بعد سے حضرت قدس سرہٗ کی طبیعت ناساز ہوگئی تو دوسرے لوگ وعظ کرتے رہے، لیکن حضرت قدس سرہٗ باوجود ناسازی طبع کے جب تک وعظ ختم نہ ہوتا وعظ میں شرکت فرما ہوتے۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ بعد وعظ ختم ہو کر مصافحہ کا نمبر شروع ہوتا۔ باوجود انتظامات کے کار تک پہنچنے میں دیر لگ جاتی۔

مکان پر تشریف لانے کے بعد ہلکا سا ناشتہ پیش ہوتا۔ جس میں جملہ حاضرین شرکت کرتے۔ ڈیڑھ بجے رات کو یہ مجلس ختم ہو جاتی، اس کے بعد حضرت اپنے حجرہ میں تشریف لاتے۔ اس میں بھی بعض مخصوص حضرات سے تخلیہ میں بات کرتے۔ اس کے بعد تقریباً آدھ گھنٹے حضرت آرام فرماتے اور پھر تہجد کے لیے بیدار ہو جاتے

(از زکریا) اس کا اس ناکارہ کو بھی بہت ہی کثرت سے تجربہ ہوا ہے کہ میرے حضرت مرشدی سہارنپوری اور حضرت مدنی نور اللہ مرقدہما کی نیند اس قدر قابو کی تھی کہ جب سونے کا ارادہ

فرماتے، لیٹتے ہی آنکھ لگ جاتی اور جب اٹھنے کا ارادہ ہوتا تو بغیر کسی الارم یا جگانے والے کے خود بخود آنکھ کھل جاتی۔ میں دونوں اکابر کے متعلق آپ بیتی میں کہیں لکھوا بھی چکا ہوں کہ حضرت مرشدی جب اسٹیشن تشریف لے جاتے اور معلوم ہوجاتا کہ گاڑی دس منٹ لیٹ ہے تو حضرت فرماتے کہ دس منٹ میں ایک نیند لی جاسکتی ہے اور وہیں بستر منگوا کر آرام فرماتے اور دس منٹ بعد خود بخود اٹھ جاتے اور حضرت شیخ الاسلام کے متعلق سینکڑوں دفعہ یہ بات دیکھنے کی نوبت آئی کہ میرے مکان پر تشریف لاتے آرام فرماتے اور گاڑی چھوٹنے سے آدھے گھنٹے پہلے اپنے آپ اٹھ جاتے۔ میں نے بہت دفعہ کوشش کی کہ آنکھ نہ کھلے، کوئی آہٹ نہ ہو، مگر آدھے گھنٹے پہلے اٹھ کر فوراً اسٹیشن کے لیے روانہ ہوجاتے۔ فقط) اور ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد مسجد میں تہجد کے لیے تشریف لے جاتے۔ جو لوگ تہجد کی شرکت کے لیے دور دور سے آتے وہ سب حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے پہنچنے سے پہلے ورنہ پہلی رکعت میں ضرور شریک ہوجاتے۔

تہجد میں دو قرآن کا معمول تھا۔ ایک حضرت نور اللہ مرقدہٗ پڑھتے۔ دوسرا مولانا محمد جلیل صاحب۔ حضرت تہجد کے لیے تشریف لے جاتے وقت بہت اہتمام کرتے کہ آہٹ نہ ہو اور کسی کی آنکھ نہ کھلے، مگر فرطِ شوق میں لوگ جاگ ہی جاتے تھے۔ نفلوں کے بعد چونکہ سحری کا وقت بہت کم رہ جاتا ہے۔ اسی لیے فوراً اسی مکان پر سحری کا دستر خوان بچھ جاتا اور وقت کی تنگی کی وجہ سے جلدی جلدی انگلیاں اور منہ کھانے میں مشغول اور آنکھیں گھڑی پر اور کان مؤذن کی آواز پر ہمہ تن متوجہ رہتے اور حضرت سحری سے فراغت کے بعد تھوڑی دیر لیٹ جاتے اور پھر نماز کی تیاری کرتے اور مسجد تشریف لے جاتے اور اسفار میں نماز ہوتی، لیکن اخیر عشرہ میں اعتکاف کے زمانے ''غلس'' میں شروع ہوتی اور ''اسفار تام'' میں ختم ہوتی۔ واپس جانے والے حضرات الوداعی مصافحہ کرتے اور حضرت اپنی قیام گاہ پر تشریف لاتے اور فوراً لیٹ جاتے۔ ایک دو خادم بدن دباتے اور سر مبارک پر تیل مل جاتا اور حضرت بعض مرتبہ باتیں کرتے کرتے ہی سو جاتے۔ رفقاء بھی سب سو جاتے۔ حضرت تھوڑی دیر آرام کے بعد وضو استنجاء سے فارغ ہونے کے بعد تلاوت قرآن شریف میں مشغول ہوجاتے اور دس بجے تک ان لوگوں کی آمد شروع ہوجاتی جن کو تخلیہ کا وقت دے رکھا تھا۔ لیکن درمیان میں بھی اگر کچھ وقت ملتا تو حضرت قدس سرہٗ تلاوت میں مصروف ہوجاتے اور اسی وقت ڈاک بھی تحریر فرماتے۔ اس سال چونکہ ڈاک ہڑتال تھی، اس لیے دس رمضان تک تو ڈاک کا سلسلہ بند رہا اور گزشتہ ڈاک جو ساتھ تھی اس کی تکمیل فرماتے رہتے، لیکن دس رمضان کے بعد ڈاک جب شروع ہوگئی تو اس کا انبار لگ گیا تو اس میں بہت وقت خرچ ہونے لگا۔ اسی درمیان میں جن لوگوں کو کچھ خصوصی بات کرنی ہوتی وہ بھی آتے جاتے، یہ سلسلہ کبھی کبھی تو

ظہر تک چلتا اور اگر کبھی وقت مل جاتا تو ظہر سے پہلے آدھ گھنٹہ آرام فرما لیتے۔

اس سال حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی طبیعت بہت ناساز رہی اور وسط رمضان سے بخار وغیرہ کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ اس لیے بعض خدام نے اعتکاف کے متعلق استمزاج کیا کہ اعتکاف میں وقت زیادہ ہوگی۔ حضرت نے فرمایا کہ نہیں اعتکاف کی نیت کرلی ہے۔ چنانچہ مسجد کے ایک کونہ میں حضرت کا معتکف بنادیا گیا۔ لیکن بخار کی شدت کی وجہ سے بسا اوقات دورانِ نماز میں سردی لگ جاتی۔ حضرت چادر اوڑھ لیتے۔ برقی پنکھے بند کردیے جاتے۔ اسی طرح بخار ہی کی حالت میں تہجد میں طویل قیام اور لمبی قراءت کرنا پڑتی۔ کیونکہ قیام گاہ پر حضرت کی ناسازیٔ طبع کی وجہ سے چار راتوں میں تہجد کی نماز باجماعت نہیں ہوسکی تھی، اس لیے قرآن ختم ہونے کو کافی باقی رہ گیا تھا۔ اس کمی کو اس عشرہ میں پورا کرنا ضروری تھا، اس پر مزید یہ کہ مسجد میں قیام اور لوگوں کے ہجوم و اژدہام کے باعث رات کے نصف گھنٹے کا وہ سکون اور خاموشی بھی یہاں میسر نہیں تھی جو قیام پر حاصل تھی۔ اس لیے مشاغل کی زیادتی کے ساتھ آرام کا بھی خاص موقع نہیں۔ اخیر عشرہ میں ہجوم بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ مسجد سے باہر سڑکوں پر بھی آدمی رہتے تھے جس کی وجہ سے ظہر کے بعد کی درخواستوں میں بھی کافی اضافہ ہوگیا تھا۔ اسی طرح سے بیعت ہونے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور مخصوص طالبین سالکین جن کو اپنے مخصوص حالات سنا کر ہدایت لینی تھی، ان کی تعداد تو بہت ہی بڑھ گئی تھی، حتیٰ کہ ان کے لیے نمبروار باری مقرر کرنی پڑگئی۔ صبح کی نماز سے فارغ ہوکر جانے والوں کے مصافحوں کی بہت کثرت ہوتی۔ اس سے فارغ ہوکر حضرت اپنے معتکف میں تشریف لے جاتے اور تھوڑی دیر آرام فرمانے کے بعد جب کہ رات کا جاگا ہوا سارا مجمع گہری نیند سویا ہوا ہوتا، حضرت اٹھ کر نہایت آہستہ آہستہ قدم بچا کر استنجاء تشریف لے جاتے اور وضو فرما کر اپنے معمولات میں مشغول ہوجاتے۔

شب قدر کے متوالے ۲۶ کی صبح ہی سے مسجد میں آنے شروع ہوجاتے اور ہجوم بڑھتا رہتا۔ اس لیے کہ عوام میں شب قدر کے متعلق یہی ہے کہ وہ ۲۷ کو ہوتی ہے۔ اس لیے مسجد کے آس پاس کی جگہ بھی کھچا کھچ بھر گئی۔ ظہر کے بعد کی درخواستوں کی اتنی کثرت ہوگئی کہ حد نہیں اور رات کو دم کرنے والی بوتلوں کا ہجوم حضرت کے مصلے کے چاروں طرف پھیل گیا اور جب تہجد کے بعد حضرت نے دعاء کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ تو ساری مسجد رونے سے گونج گئی اور خود حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے اوپر جس کیف وسرور کی حالت دیکھی وہ بیان سے باہر ہے۔ شب قدر کی تعیین میں حضرت کی مجلس میں مختلف گفتگوئیں شروع ہوئیں۔ راقم الحروف (مولانا عبدالحمید صاحب اعظمی) نے کہا کہ اہل اللہ کو تو شبِ قدر کے کوائف سارے معلوم ہوجاتے ہیں۔ معلوم نہیں اس سال اخیر

راتوں میں سے کونسی رات میں شب قدر تھی۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ اس سال شب قدر ۲۳ شب میں تھی۔ تیسویں رمضان چہار شنبہ کو عید کا چاند دیکھنے کے بعد حضرت شیخ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ اس شب میں بھی تہجد کی نماز جماعت سے ہوئی اور حضرت نے اس قدر طویل قیام فرمایا کہ سارے رمضان میں کسی رات اتنا طویل قیام تہجد میں نہیں فرمایا ہوگا۔ صبح کو ٹھیک ساڑھے نو بجے حضرت نے اس مسجد میں عید کی نماز پڑھائی اور اس کے بعد عربی زبان میں جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اصل کتاب میں موجود ہے۔

مصنف نے حضرت کی واپسی کا ذکر نہیں فرمایا۔ چونکہ اس سال راستے بند تھے۔ ہنگاموں کی وجہ سے ریلوں میں مشکلات ہو رہی تھیں۔ اس واسطے بروایۃ مولوی محمود صاحب پیٹھڑوی جو اس رمضان میں حضرت کے ہم رکاب تھے۔ حضرت قدس سرہٗ، تو ہوائی جہاز سے واپس تشریف لے آئے اور خدام آہستہ آہستہ متفرق طور پر واپس ہوئے کہ فسادات کی وجہ سے ہر جگہ ریلوں پر ہنگامے ہو رہے تھے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری کے مجاہدات

حضرت اقدس مولانا الحاج عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے رمضان کے متعلق علی میاں نے لکھا ہے کہ رمضان مبارک میں خاص بہار ہوتی، لوگ بہت پہلے سے اس کے منتظر ہوتے اور تیاریاں کرتے۔ ملازمین چھٹیاں لے کر آتے، مدارس دینیہ کے اساتذہ اس موقع کو غنیمت جان کر اہتمام سے آتے، علماء و حفاظ کی خاصی تعداد جمع ہوتی، تقسیم سے پہلے مشرقی پنجاب کے اہلِ تعلق و خدام اور وہاں کے مدارس کے علماء کی تعداد غالب ہوتی، اہل رائے پور اور اطراف کے اہل تعلق اولوالعزمی اور عالی ہمتی سے مہمانوں اور مقیمین خانقاہ کے افطار طعام وسحر کا انتظام کرتے۔ رمضان مبارک میں اپنے شیخ کی اتباع میں مجلسیں سب ختم ہو جاتیں۔ باتوں کے لیے کوئی خاص وقت نہ تھا۔ ڈاک بھی بند رہتی۔ تخلیہ نماز کے وقت کے علاوہ تقریباً چوبیس گھنٹے کسی ایسے شخص کے آنے سے گرانی ہوتی جس کے لیے وقت صرف کرنا پڑتا۔

افطار علالت سے پیشتر مجمع کے ساتھ ہوتا، جس میں کھجور اور زمزم کا خاص اہتمام ہوتا۔ مغرب کے متصل کھانا علالت سے پہلے مجمع کے ساتھ ہوتا۔ اس کے بعد چائے عشاء کی اذان تک۔ یہی وقت چوبیس گھنٹے میں مجلس کا تھا۔ اذان کے بعد نماز کی تیاری اس درمیان میں حضرات علماء جن کا مجمع اگلی صف میں رہتا۔ بعض اہم اہم سوالات کرتے اور حضرت ان کا جواب دیتے۔ عشاء کے بعد تقریباً آدھ گھنٹہ کبھی نشست اور کبھی لیٹ جاتے۔ خدام بدن دبانا شروع کرتے۔ مسجد و خانقاہ

میں تراویح ہوتی، مسجد میں بھی قرآن ہوتا اور خانقاہ میں بھی۔ یوں حفاظ کی کثرت ہوتی، مگر حضرت اچھے پڑھنے والے بہتر حافظ کو پسند فرماتے۔ حضرت نے ایک سال ۱۹۵۳ء میں منصوری پر رمضان کیا۔ پچاس، ساٹھ خدام ساتھ تھے۔ مولوی عبدالمنان صاحب نے قرآن شریف سنایا۔ تراویح کے بعد حضرت کے تشریف رکھنے اور مجلس کا معمول تھا۔ طبیعت میں بڑی شگفتگی اور انبساط تھا۔ متعدد حضرات رات بھر بیدار اور مشغول رہتے، غرض دن رات ایک کیف محسوس ہوتی، ضعفاء وکم ہمت بھی سمجھتے تے:

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

ایک حاضر خدمت خادم نے جس کو آخری عشرہ گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی اور جو اپنی صحت کی کمزوری اور ہمت کی پستی کی وجہ سے مجاہدے سے قاصر رہا۔ اپنے ایک دوست کو ایک خط میں لکھا تھا۔

دکان مے فروش پہ سالک پڑا رہا
اچھا گزر گیا رمضان بادہ خوار کا

(سوانح حضرت اقدس رائے پوری: ص ۱۲۴)

حضرت حاجی صاحب کے مجاہدات

حضرت سید الطائفہ حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق حضرت حکیم الامت نے تحریر فرمایا ہے کہ یہاں (تھانہ بھون) جب حضرت حاجی صاحب تشریف رکھتے تھے، تو حافظ عبدالقادر جو حضرت کے شاگرد بھی تھے اور مرید بھی، رات کو یہیں سہ دری میں حضرت کی چارپائی کے نیچے لیٹتے تھے۔ حضرت کی چارپائی بہت مکلّف تھی، نواڑ سے بنی ہوئی۔ رنگین پائے، پیچ بند کسے ہوئے لوگ یوں سمجھتے تھے کہ نوابوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لیکن حال یہ تھا کہ مجھ سے خود حافظ عبدالقادر کہتے تھے کہ عشاء کے بعد حضرت اول میں چارپائی پر آ کر لیٹ جاتے بس اس وقت تو سب نے دیکھ لیا کہ حضرت عشاء کے بعد سو رہے ہیں لیکن جب سب نمازی چلے جاتے تو مؤذن سے دروازہ بند کرا لیتے اور مسجد میں مصلی بچھا کر ذکر میں مشول ہو جاتے۔ حافظ صاحب کہتے تھے کہ رات بھر میں شاید تھوڑی ہی دیر آرام فرماتے ہوں۔ کیونکہ جب آنکھ کھلی حضرت کو مسجد میں بیٹھے ہوئے ذکر میں مشغول ہی دیکھا اور کوئی دن ناغہ نہ جاتا تھا کہ روتے نہ ہوں اور بڑے درد سے بار بار یہ شعر نہ پڑھے ہوں:

اے خدا ایں بندہ را رسوا مکن
گر بدم من سرِّ من پیدا مکن

(اضافات ۹/۲: ص۴۳۰)

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بہت ہی نحیف نازک تھے مگر اب تک مجاہدہ کرتے تھے جس کی وجہ سے روح کا نشاط اور قلب کی تازگی تھی۔

ہر چند پیرو خستہ و بس ناتواں شدم
ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

از زکریا:

ان کے دیکھنے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

پھر اس قوتِ روحانیہ کی مناسبت سے فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے درِ خیبر قوت بشریہ سے نہیں اٹھایا بلکہ قوت الٰہیہ سے اٹھایا۔ چنانچہ اکھاڑنے کے بعد فرمایا تھا "ما حملنا ھا بقوة بشرية لكن حملنا ھا بقوة إلهية"۔ (حسن العزیز: ص۳۸۸ رج۲)

مجاہدہ کے سلسلہ کے متفرق واقعات

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے حضرت شاہ عبدالقدوس صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مجاہدات کا ذکر فرماتے ہوئے ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ حضرت شیخ عبدالقدوس رحمہ اللہ تعالیٰ عشاء کی نماز کے بعد ذکر بالجہر کرنے بیٹھتے اور صبح تک کرتے تھے، سو جس کا ذکر اتنا لمبا ہو اس کا حال کتنا لمبا ہوگا۔

(تذکرۃ الرشید: ص۲۵۴ رج۲)

اس کے حاشیہ پر حضرت گنگوہی سے نقل کیا گیا ہے حضرت شیخ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے قلب کو اول میں ذکر جہر سے جو زیادہ دھنا ہے تو اب مجھ کو مہلت نہیں دیتا۔ حضرت شاہ ابو سعید صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا مجاہدہ تو رلانے کے لیے کافی ہے، آپ بیتی نمبر ۵ میں مختصر گزر چکا ہے۔ حضرت سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ اولاً حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ سے بیعت ہوئے تھے اور بیعت ہونے کے بعد جب دوسری مرتبہ حاضر ہوئے تو تربیت و تعلیم کے لیے حضرت شاہ صاحب نے ان کو اس مسجد میں ٹھہرا دیا جو ان کے مدرسہ کے قریب تقریباً پچاس قدم کے فاصلہ پر واقع تھی۔ جس میں شاہ صاحب اور طلبہ نماز پڑھا کرتے تھے اور تعلیم میں اشغال فرما کر حکم دیا کہ آٹھویں روز ہم سے ملا کرو۔ سید صاحب نے چھ ماہ تک تعلیم حاصل کی، چھ ماہ کے بعد شاہ صاحب

کے خاندان میں کسی کے ہاں تقریب شادی ہوئی۔ اس تقریب میں شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب تینوں بھائی موجود تھے اور شامیانہ تانہ جار ہا تھا۔ اس مقام پر ایک نیم کا درخت تھا جس کی وجہ سے شامیانہ اچھی طرح نہ تنتا تھا، بلکہ اس میں جھول رہتا تھا۔ اتنے میں سید صاحب بھی مسجد میں تشریف لے آئے۔ جب آپ نے یہ رنگ دیکھا تو کُرتا کمر سے باندھ کر نیم پر چڑھ گئے اور نیم پر چڑھ کر جو شامیانہ کھنچا تو شامیانہ بالکل تن گیا اور جھول بالکل نکل گیا۔ سید صاحب کی یہ دھج شاہ عبدالقادر صاحب کو پسند آگئی اور انہوں نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے عرض کیا کہ سیداحمد کو مجھے دے دیجئے؟ شاہ صاحب نے فرمایا کہ لے جاؤ اور سید صاحب سے کہہ دیا کہ میاں عبدالقادر کے ساتھ چلے جاؤ۔

شاہ عبدالقادر صاحب ان کو اپنے ساتھ اکبری مسجد میں لے آئے اور ایک حجرہ میں رکھ دیا اور اشغال کے لیے فرمایا کہ میری سہ دری کے پاس بیٹھ کر کیا کرو، سید صاحب نے اس حکم کی تعمیل کی اور شاہ عبدالقادر صاحب کے حکم کے مطابق ذکر وشغل کرتے رہے اور جو جگہ شاہ صاحب نے ان کو بتادی، سید صاحب خواہ بارش ہو یا آندھی یا دھوپ، برابر اپنی جگہ بیٹھے رہتے تھے اور جب تک شاہ صاحب نہ کہتے تھے کہ اب یہاں سے اٹھ جاؤ اس وقت تک نہ اُٹھتے تھے۔

شاہ صاحب نے سید صاحب کو ڈھائی برس اپنی خدمت میں رکھا اور ڈھائی برس کے بعد ان کو لے کر شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں آئے اور شاہ صاحب سے عرض کیا کہ سیداحمد حاضر ہیں، ان کو پرکھ لیجئے پرکھا لیجئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ میاں عبدالقادر تم جو کچھ کہتے ہو ٹھیک کہتے ہو، اب ان کو بیعت کی اجازت دو شاہ عبدالقادر صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اجازت تو آپ ہی دیں گے اور ان سے آپ ہی کا سلسلہ چلے گا۔ شاہ صاحب نے ان کو بیعت کی اجازت دے دی۔ حضرت حکیم الامت اس کے حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں قولہ سید صاحب سے کہہ دیا۔ اقول اگر شیخ مرید کو کسی کے سپرد کرے اس کے ماننے میں ذرا تردد نہ کرے۔ جیسا خود راویوں کی عادت ہے قولہ جب تک شاہ صاحب الخ اقول یہ ہے انقیاد شیخ کہاں ہیں وہ حضرات جو ان حضرات کو درویشی کا منکر اور بزرگوں کی شان میں بے ادب کہتے ہیں آئیں اور آنکھیں کھول کر دیکھیں۔

(ارواحِ ثلاثہ: ص ۱۲۵)

دوسری جگہ سید صاحب کے بارش میں بیٹھنے کا قصہ اس طرح نقل کیا ہے کہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے ایک جگہ بتادی تھی کہ اس جگہ بیٹھ کر ذکر کیا کرو۔ رفتہ رفتہ برسات کا زمانہ آگیا۔ ایک روز شاہ صاحب نے اس حال میں دیکھا کہ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور اسی میں بیٹھے ہیں۔ سید صاحب سے پوچھا کہ تم بارش میں کیوں بیٹھے ہو تو فرمایا کہ آپ ہی نے یہ موقع بتایا تھا۔

ہمارے حضرت نے فرمایا ''یہ ہے اطاعت''۔ شاہ صاحب کو وہم وگمان بھی نہ تھا کہ میرے بتانے کو ایسا عام سمجھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تمام برسات اور جاڑا بھی گزر جاتا جب بھی سید صاحب اس جگہ سے نہ اٹھتے۔ (جدید ملفوظات: ص ۳۴)

جس نے جو پایا ہے مجاہدہ ہی سے پایا ہے۔ میں اس مضمون کو شروع میں لکھوا چکا ہوں:

مپندار جان پدر گر کسی
کہ بے سعی ہرگز بجائے رسی

محض مشائخ اور اکابر کی توجہ سے کچھ نہیں ہوتا، جب تک خود کچھ نہ کرے۔ غالباً آپ بیتی میں کسی جگہ لکھوا چکا ہوں کہ ہمارے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ ایک مرتبہ چلہ کشی کا ارادہ سے پیران کلیر شریف تشریف لے گئے تھے۔ جب بھی مراقب ہوئے یہی صدا آئی کہ اپنا کرنا بھرنا۔ تین دن کے بعد یہ سوچ کر واپس آگئے کہ یہی ہے تو حجرہ کے کیواڑ بند کر کے زیادہ ہوسکتا ہے اور تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ نری توجہ سے کیا ہوتا ہے، جب تک دوسری طرف سے بھی طلب نہ ہو۔ حضرات انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام سے تو زیادہ کسی کی توجہ نہیں ہوسکتی مگر جہاں دوسری طرف سے طلب نہ ہوئی کچھ بھی نہ ہوا۔ عطاء کا مدار طلب پر ہے۔ بدون طلب کے کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ عادۃ اللہ یہی ہے۔ عدم طلب کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''أنلزمكموها و انتم لها كارهون'' ادھر سے طلب اور ارادہ ہو اس طرف سے عطاء ہوتی ہے۔ (افاضات یومیہ ۲/۷: ص ۲۹۲)

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ بدون ریاضت اور مجاہدہ کے صرف کسی متصرف کی توجہ سے بھی کام ہوسکتا ہے، لیکن نادراً اور ''النادر كالمعدوم'' باقی توجہ سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کی عمر کچھ نہیں ہوتی، وہ وقتی چیز ہوتی ہے اور نہ توجہ سے رسوخ ہوسکتا ہے جو اصل اور روح ہے طریق کی۔ یہ دولت مجاہدات اور ریاضات اعمال ہی کی پابندی سے میسر ہوتی ہے۔ اس کو کبھی زوال نہیں ہوتا ان شاء اللہ تعالیٰ، بشرطیکہ یہ اس کی نگرانی کرتا رہے۔ (افاضات یومیہ ۱/۸: ص ۱۰۸)

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ مبتدی کو چاہیے کہ وہ منتہی کی حرص کر کے اپنے لیے کسی حالت کا طالب نہ ہو کہ جس کا فی الحال وہ تحمل نہ کر سکے اور راز اس میں یہ ہے کہ ہر وہ بات جو وقت سے پہلے واقع ہو جائے خطرناک ہوتی ہے اور یہ قاعدہ صرف تربیت روحانی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تربیت جسمانی میں بھی اس کو تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اطباء نے اس کی تصریح کی ہے کہ اگر مریض کو ضعف کے بعد دفعۃً قوت آجائے تو وہ بہت خطرناک ہے۔

یہی راستہ پہلے مشائخ کے اس طرز کا کہ وہ طالبین کی تربیت کے اندر تربیت وتدریج کی رعایت

کرتے تھے، یعنی یہ نہ تھا کہ جو آیا اس کو ذکر و شغل تعلیم کر دیا بلکہ جس کے لیے وہ اول مجاہدہ اور ریاضت کی ضرورت سمجھتے تھے، اس کو برسوں تک ریاضت اور مجاہدہ ہی میں مشغول رکھتے تھے۔ ذکر کی ہرگز تعلیم نہ کرتے تھے۔ جب دیکھ لیتے تھے کہ اب کامل طور پر اس میں استعداد پیدا ہوگئی ہے، اس کے بعد اس کو ذکر کی تعلیم کرتے تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر اس کو شروع سے ہی ذکر و شغل کی تعلیم کی گئی تو چونکہ یہ ریاضت و مجاہدہ کیے ہوئے نہیں ہے۔ اس لیے ذکر سے اس کے اندر کبر عجب پیدا ہو جائے گا اور بجائے نفع کے نقصان پہنچے گا۔ یہاں تک کہ بعض بزرگوں نے تو طالبین کو (۱۲) بارہ سال تک صرف مجاہدہ ہی میں مشغول رکھا ہے اور جب ان کو اطمینان ہوگیا ہے کہ اب طالب کے نفس کے اندر کامل تواضع اور شکستگی ہوگئی ہے، اس کے بعد اس کو ذکر کی تعلیم کی ہے۔

اب چونکہ یہ شخص پہلے سے ریاضت اور مجاہدہ کیے ہوئے ہوتا تھا اور ان مجاہدات کی وجہ سے اس کے اندر استعداد اور قابلیت پیدا ہو چکی تھی تو اس وقت جب ذکر کی تعلیم کی جاتی تھی تو پھر ایسے شخص کے اندر ذکر کا اثر بھی بہت جلد ہوتا تھا اور جن لوگوں کو ان مجاہدات کی خبر نہیں ہوتی صرف ذکر و شغل ہی کی مدت کو دیکھ لیتے ہیں، ان لوگوں کو اس شخص کی حالت پر تعجب ہوتا ہے کہ کیا وجہ کہ اس کو تو اتنی جلدی نفع ہوگیا اور ہم لوگ باوجود مدت دراز کی مشغولیت کے ابھی تک محروم ہی ہیں۔

چنانچہ ایک بزرگ کا قصہ ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ ان کی خدمت میں بہت سے ذاکرین شاغلین رہتے تھے، ایک مرتبہ ایک شخص کہیں باہر سے ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ حضور سے میں اپنے نفس کی اصلاح کروانا چاہتا ہوں۔ لہٰذا مجھ کو اپنے خدام کے زمرہ میں داخل فرمالیا جائے اور اپنی خدمت میں قیام کی اجازت دی جائے، شیخ نے اس کی درخواست کو منظور فرمالیا اور دوسرے طالبین کی طرح اس کو بھی اپنی خدمت میں قیام کی اجازت دے دی۔

چنانچہ وہ شخص وہاں رہ کر اپنے نفس کی اصلاح میں مشغول ہوگیا اور جو حالت نئی پیش آتی اس کی شیخ کو اطلاع کرتا اور جو کچھ وہ تعلیم فرماتے اس پر عمل کرتا، تھوڑے دن گزرے تھے کہ ایک دن بزرگ نے اس شخص کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا کہ یہاں قیام سے جو تمہارا مقصود ہے وہ بفضلہٖ تعالیٰ تم کو حاصل ہوگیا، لہٰذا یہاں قیام کی اب تم کو چنداں ضرورت نہیں اور اس کے بعد اس کو خلعت و خلافت سے بھی سرفراز فرمادیا، چنانچہ وہ شخص حضرت سے رخصت ہو کر وطن واپس ہوگیا، اب جو دوسرے طالبین برسوں پہلے سے شیخ کی خدمت میں حاضر تھے اور حضرت سے اپنی اصلاح کرا رہے تھے ان کو بڑا خیال ہوا کہ کیا بات ہے ہم کو تو اتنے دن کام کرتے ہوئے ہوگئے مگر اس درجہ کا نفع نہ ہوا اور اس شخص کو چند ہی روز میں سب کچھ عطاء ہوگیا اور اس مثل کو یاد کیا:

پیا جس کو چاہے وہی سہاگن ہو

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ کو ہماری طرف توجہ نہیں اب اتنی ہمت تو کسی کی نہ تھی کہ حضرت شیخ سے اپنے وسوسہ کی اطلاع کرتا، بس دل ہی دل میں افسوس کر کے رہ گئے مگر:

بندگان خاص علام الغیوب

درمیان شاں جواسیس القلوب

کشف سے شیخ کو ان طالبین کے اس وسوسہ پر اطلاع ہوگئی اور انہوں نے طالبین کے اس شبہ کا جواب حکیمانہ طریقہ سے دینا چاہا، چنانچہ انہوں نے اپنے مریدین کو حکم دیا کہ جنگل جا کر کافی تعداد میں گیلی لکڑیاں اکٹھی کر کے ہمارے پاس لاؤ، چنانچہ خدام حکم بجالائے اور کافی تعداد میں گیلی لکڑیاں جمع کر کے حاضر کر دیں۔

حضرت شیخ نے حکم دیا کہ ان لکڑیوں کو جلاؤ، خدام نے ان لکڑیوں میں آگ سلگانا شروع کی، چونکہ لکڑیاں کافی گیلی تھیں، اس لیے اول اول تو ان میں آگ کا اثر ہی نہ ہوا، جب ایک عرصہ گزر گیا اور انتہائی کوشش اور محنت کی گئی تب جا کر ان لکڑیوں میں کچھ آگ لگی، اس کے بعد شیخ نے حکم دیا کہ اچھا اب سوکھی لکڑیاں لاؤ، چنانچہ خدام سوکھی لکڑیاں لائے، شیخ نے حکم دیا کہ اچھا ان کو جلاؤ، چنانچہ ان لکڑیوں میں آگ سلگائی گئی، سو وہاں کہاں دیر تھی بس ایک دیا سلائی دکھانا تھی کہ ساری لکڑیوں میں آگ پڑ گئی اور ذرا سی دیر میں وہ سب لکڑیاں جل بھُن کر راکھ ہوگئیں۔

اب حضرت شیخ نے ان طالبین سے ان کی تعلیم و تفہیم کی غرض سے دریافت کیا کہ بھائی کیا بات ہے پہلی لکڑیوں میں تم نے اتنی کوشش کی مگر آگ نہ لگی اور بعد کی لکڑیاں ذرا سی دیر میں جل بھن کر ختم ہوگئیں، خدام نے عرض کیا کہ حضرت پہلی لکڑیاں چونکہ گیلی تھی اس لیے نہ جلیں اور بعد کی لکڑیاں چونکہ سوکھی تھیں اس لیے ان میں فوراً آگ لگ گئی۔

حضرت شیخ نے فرمایا، درست ہے، اب ہم تم کو اصل حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں کہ یہ جو ہم نے گیلی اور سوکھی لکڑیاں جمع کرا کر ان کو جلانے کا حکم دیا تو اس سے ہمارا مقصود تمہارے ایک شبہ کا جواب دینا ہے وہ یہ کہ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ فلاں شخص نے جو یہاں آ کر ہماری خدمت میں قیام کیا اور تھوڑے ہی دنوں بعد اس پر حق تعالیٰ نے فضل فرمایا اور وہ کامیاب ہوگیا تو تم کو اس شخص کی اس حالت پر تعجب ہے اور اس واقعہ سے ہمارے متعلق تم کو یہ شبہ ہوا کہ ہم کو تمہاری طرف پوری توجہ نہیں۔

سو یاد رکھو! یہ خیال تمہارا بالکل غلط ہے بلکہ ہم کو جیسی توجہ اس شخص کی طرف تھی ویسی ہی تمہاری

طرف ہے مگر باوجود اس کے پھر وہ جلد کامیاب ہوگیا اور تم کو دیر لگی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم لوگوں کا حال تو گیلی لکڑیوں کا سا ہے اور وہ جو شخص آیا تھا وہ سوکھی لکڑی تھا یعنی اس شخص کے اندر بھی گو مثل تمہارے اول رذائل نفس کی رطوبت تھی مگر وہ شخص اپنی ان رطوبات کو مجاہدات اور ریاضات اختیار یہ یا اضطراریہ کی حرارت سے یہاں پہنچنے سے مدتوں پہلے فنا کر چکا تھا، جس کی وجہ سے وصول حق کی اس کے اندر کافی استعداد پیدا ہو چکی تھی، اس لیے ہماری تعلیمات کا اثر اس کے اندر زیادہ ہوا اور وہ شخص جلد کامیاب ہوگیا۔

بخلاف تمہارے کہ تم نے یہاں آنے سے قبل کبھی ریاضت ومجاہدہ کی حرارت کا مزہ ہی نہ چکھا، اس لیے جب تم ہمارے پاس پہنچے تو تمہارا وہ حال تھا جو ایک گیلی لکڑی کا ہوتا ہے، اس لیے ہم کو اتنے دن کوشش کرتے ہوئے گزرے مگر ابھی تک تو تمہارے اندر سے رذائل نفس کی وہ رطوبت ہی خشک نہیں ہو چکیں جس سے استعداد تام وصول کی پیدا ہوتی، پھر وصول کہاں تو اس نو وارد کی جلد کامیابی اور تمہاری دیر میں کامیابی کی وجہ یہ تھی، پس اگر غور کرو تو نہ ہماری توجہ میں کچھ کمی ہوئی اور نہ تم کو وصول میں دیر لہٰذا مایوسی اور گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں، بلکہ جاؤ اور با اطمینان اپنے معمولات میں مشغول رہو، ایک دن وہ آئے گا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ تم پر بھی حق تعالیٰ کا ایسا ہی فضل ہوگا جیسا اس شخص پر ہوا۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ جو مشہور ہے کہ فلاں شخص کو فلاں بزرگ نے ایک نظر میں کامل کر دیا، سب غلط ہے بلکہ سب کو اول مجاہدہ وریاضت کرنا پڑتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ بعض لوگ شیخ کی تربیت میں پہنچ کر مجاہدات کرتے ہیں اور بعض لوگ ایسے شیخ کی خدمت میں پہنچنے سے قبل ریاضت اور مجاہدہ سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں تو ان آخر الذکر لوگوں کو دیکھ کر یہ مشہور ہو جاتا ہے کہ ان کو بلا مجاہدہ حصول کمال ہوگیا ہے، حالانکہ یہ غلط ہے، بلا مجاہدہ دفعۃً کسی کو حصول کمال نہیں ہوتا الا ماشاء اللہ اور اگر یہ شبہ ہو کہ بعض کتابوں میں ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہوا ہے کہ ان کے یہاں ایک بار مہمان آئے، ان مہمانوں کے لیے ان بزرگ کو کھانا پکوانے کی ضرورت ہوئی اور سامان تھا نہیں، تو ایک طباخ (اس کے بعد حضرت حکیم الامت نے اس قصہ کو مختصراً لکھا، یہ بزرگ خواجہ باقی باللہ ہیں، اس قصہ کو یہ ناکارہ آپ بیتی نمبر۵ ص ۵۷ میں نسبت اتحادیہ کے ذیل میں بہت مفصل لکھ چکا ہے)۔

اس کے بعد حضرت تھانوی نے لکھا ہے کہ جب حجرہ سے باہر آئے تو دونوں کی صورتیں ایک تھیں کہ لوگ یہ نہ پہچان سکے کہ ان میں سے کون طباخ ہے اور کون وہ بزرگ ہیں، صورت تک میں اس توجہ کا اتنا اثر ہوا تھا، باطنی احوال میں جو کچھ تغیر ہوا ہو اس کا تو کہنا ہی کیا۔ تو اس سے معلوم ہوتا

ہے کہ بلا مجاہدہ محض تصرف کے ذریعہ سے بھی دفعۃً حصول کمال ہوجاتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے تصرف سے کچھ کیفیات پیدا ہوجاتی ہیں جو مقصود نہیں قرب الٰہی حاصل نہیں ہوتا ہے جو کہ مقصود ہے، پھر یہ کیفیات بھی جو کہ توجہ سے پیدا ہوتی ہیں، دیرپا نہیں ہوتا، تیسرے ایسی توجہ سے طالب کو بوجہ ضعیف قویٰ طبعیہ بعض مرتبہ کوئی ضرر جسمانی پہنچ جاتا ہے۔

چنانچہ لکھا ہے کہ وہ طباخ اس توجہ کے بعد زندہ نہیں رہا، بلکہ کوٹھری سے نکلنے کے تھوڑے عرصہ بعد مر گیا، بلکہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے تو حضرت ابراہیم بن ادہم کے صاحبزادے محمود کے انتقال کی توجیہہ بھی یہی فرمائی ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادہم کے صاحبزادے کا قصہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ جب وہ مکہ معظمہ اپنے والد بزرگوار حضرت ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت ابراہیم کی نظر ان صاحبزادے پر پڑی تو فوراً ہی ان صاحبزادے کا انتقال ہوگیا تو ان صاحبزادے کے انتقال کی وجہ بعض مصنفین غیر محققین نے تو اور کچھ بیان کی ہے اور وہ یہ کہ جب حضرت ابراہیم رحمہ اللہ تعالیٰ کی نظر ان صاحبزادے پر پڑی تو چونکہ مدت تک باپ بیٹے میں جدائی رہی، اس لیے حضرت ابراہیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے صاحبزادے کو دیکھا تو شفقت ومحبت پدری کا جوش ہوا تو اس وقت حضرت ابراہیم رحمہ اللہ تعالیٰ کو الہام ہوا کہ:

جب حق ہو دل میں یا حب پسر
جمع ان دونوں کو تو ہرگز نہ کر

اس وجہ سے حضرت ابراہیم نے دُعاء کی کہ بارِ الٰہی تو مجھ کو موت دے دیجئے یا اس کو چنانچہ صاحبزادہ کا انتقال ہوگیا، مگر اصول شرعیہ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وجہ غلط ہے کیونکہ دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ محبت جو صاحبزادے کو دیکھ کر حضرت ابراہیم کے قلب میں پیدا ہوئی تھی حضرت حق کی محبت پر غالب تھی یا نہ تھی، اگر کہا جائے کہ غالب تھی ایسی محبت کا قلب میں جگہ دینا حضرت ابراہیم رحمہ اللہ تعالیٰ کی شان سے بالکل بعید تھا اور اگر کہا جائے کہ وہ محبت حضرت حق کی محبت پر غالب نہ تھی بلکہ مغلوب تھی تو ایسی محبت کسی کے لیے مضر نہیں، حتیٰ کہ انبیاء الصلوٰۃ علیہم والسلام کو ایسی محبت سے نہیں روکا گیا تو اولیاء کا درجہ تو بعد ہی میں ہے۔

چنانچہ حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو جتنی محبت حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے تھی سب کو معلوم ہے، مگر کہیں ثابت نہیں کہ حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس سے منع فرمایا گیا ہو، بلکہ اولاد کی ایسی محبت جو حضرت حق پر غالب نہ ہو ہر

مسلمان کے محمود ہے، کیونکہ اولاد کے حقوق کا ادا کرنا مامور بہ ہے اور یہ محبت اس کی معین ہے، لہٰذا حضرت ابراہیم رحمہ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی ایسی محبت سے ممانعت کی کوئی وجہ نہ تھی، البتہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان صاحبزادے کے متعلق جو واقعہ بیان فرمایا ہے وہ نہایت لطیف ہے، وہ یہ کہ جب یہ صاحبزادے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان پر حضرت ابراہیم رحمہ اللہ تعالیٰ کی نظر پڑی تو شفقت پدری کو جوش ہوا اور چاہا کہ جب میرا بیٹا دولتِ ظاہری سے مالا مال ہے، اسی طرح دولت باطنی سے بھی محروم نہ رہے، لہٰذا انہوں نے صاحبزادے کو توجہ دی اور جوشِ محبت میں یہ خیال نہ رہا کہ اس کا تحمل بھی ہو سکے گا یا نہیں تو چونکہ وہ توجہ نہایت قوی تھی اس لیے وہ صاحبزادے اس توجہ کی تاب نہ لا سکے اور فوراً جاں بحق ہو گئے تو توجہ کے ذریعہ سے جو دفعۃً بلا مجاہدہ کوئی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اس میں خطرہ ہوتا ہے مضرت کا، غرضکہ عادۃ اللہ یہی ہے کہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ بلا مجاہدہ کوئی کامل نہیں ہوتا ہے۔

ہمارے حیدرآبادی ماموں صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ بعض لوگوں کو شبہ ہوا کرتا ہے کہ علماء جو مشائخ سے تربیتِ باطنی کراتے ہیں انہوں نے جہاں کام کرنا شروع کیا ان کو نفع ہونا شروع ہوا اور ہم لوگوں کو مدتیں گزر جاتے ہیں اور نفع نہیں ہوتا، حالانکہ یہ علماء زیادہ ریاضت ومجاہدہ بھی نہیں کرتے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہ خیال صحیح ہے کہ علماء کو اول ہی دن نفع شروع ہو جاتا ہے اور غیر عالم کو نہیں ہوتا اور نہ یہ خیال صحیح ہے کہ علماء مجاہدہ نہیں کرتے، کیونکہ علماء جو یہ درس وتدریس میں مشغول رہتے ہیں اور پڑھتے پڑھاتے ہیں یہ سب مجاہدہ ہی تو ہے تو ان کا مجاہدہ اور ان کا سلوک تو اسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے جب سے یہ اول کتاب پڑھنا شروع کرتے ہیں اور جب تک درس وتدریس میں مشغول رہتے ہیں برابر مجاہدہ ہی رہتا ہے، تو علماء کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ بھی مجاہدہ ہی سے حاصل ہوتا ہے، ایسا کوئی نہیں جس کو بلا مجاہدہ حصول کمال ہوا ہو۔ (الا ماشاء اللہ)

لہٰذا سالک کو چاہیے کہ وہ صبر واستقلال ویکسوئی کے ساتھ اپنے شیخ کی تعلیمات پر عمل کرتا رہے، جب وقت آئے گا تو مقامات واحوال میں سے جو کچھ اس کے لیے مناسب ہوگا خود بخود اس کو عطاء ہو جائے گا۔ (افاضات یومیہ ۸۲: ص ۴۴۰)

حضرت نور اللہ مرقدہ نے علماء کے متعلق جو کچھ لکھا بالکل صحیح لکھا، میرا بعض دوستوں پر تجربہ ہے کہ شعبان میں وہ دورہ سے فارغ ہوئے اور صرف ماہ مبارک کے ایک ماہ میں نمٹ نمٹا کر شوال میں خلافت لے کر چل دیئے، مگر یہ ایسے ہی لوگوں کے متعلق میں نے دیکھا جو طالب علمی کے زمانہ علم میں زیادہ منہمک رہے ہوں اور تعلقات سے متوحش۔

انفاسِ عیسیٰ میں حضرت تھانوی سے نقل کیا گیا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ نے مجاہدہ کی توفیق دے

رکھی ہو تو سمجھ لے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور رسائی ہوگی، کیونکہ مجاہدہ پر رسائی کا وعدہ ہے اور وعدہ خلافی کا احتمال نہیں۔ (انفاس عیسیٰ: ص۲۹۶)

جس وعدہ کی طرف اشارہ ہے وہ قرآن پاک کی آیت ہے ''وَالَّذِینَ جاَ ھدُوا فِینَا لَنھدِینھم سبلنا'' اللہ پاک نے اپنے اس وعدے کو لام تاکید کے ساتھ مؤکد کیا ہے۔

سوانح مولانا عبدالقادر صاحب مرتبہ علی میاں میں لکھا ہے کہ تصوف کے بعض حلقوں اور عوام میں بزرگانِ دین کے بعض خصوصی واقعات و کیفیات کی بناء پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ اہلِ قلوب جس کو جس وقت دولتِ باطنی فرمانا چاہیں بلا استعداد و ذاتی سعی و محنت عطاء فرما سکتے ہیں، ایسے واقعات کی صحت اور امکان میں شبہ نہیں، جب کسی صاحب باطن نے اپنی یا طالب کی کسی خاص کیفیت پر جو بعض اوقات سعی و محنت کی قائم مقام بن جاتی ہے باذنِ خداوندی اس نسبت باطنی یا کسی خاص حال کا اضافہ فرمایا، لیکن یہ کوئی عمومی ضابطہ اور اختیاری چیز نہیں ہے عمومی طور پر اپنی ذاتی سعی و محنت ہی کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی میں دوام و استقلال ہے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ اسی پر بہت زور دیا کرتے تھے۔

علی میاں مولانا عبداللہ صاحب دھرم کوٹی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ رمضان کا آخری ہفتہ غالباً رائے پور میں ہوا (یعنی مولانا عبداللہ صاحب) کا اسی موقع پر ایک صاحب پنجاب کے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، پہلے وہ کسی اور بزرگ کی خدمت میں گئے تھے، ان بزرگ نے فرمادیا تھا کہ تمہارے حصہ رائے پور ہے وہاں جاؤ، رائے پور کا نقشہ تو تمہارے سامنے ہی ہے، خاص طور پر رمضان شریف میں سب حضرات مہمان اکثر اوقات ذکر، نماز تلاوت، مراقبہ بالخصوص ذکر بالجہر میں مشغول رہتے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر وہ صاحب کہنے لگے کہ ہم سے تو یہ چکی نہ پیسی جاسکے گی، غالباً کسی نے حضرت سے ذکر کر دیا ہوگا، شام کو کھانے کے بعد حضرت نے فرمایا کہ دوست آتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے حصہ کی پڑیا بنی رکھی ہے مل جائے گی، جیب میں ڈال کر لے آئیں گے مگر یہاں بغیر محنت کے کچھ نہیں ہوتا، اس راستہ میں محنت لازمی ہے، غالباً اس کے بعد آیت ''والذین جا ھدوا فینا لنھدینھم سبلنا'' پڑھ کر مزید روشنی ڈالی، مگر چند دنوں بعد حضرت کے کانوں میں پھر یہی الفاظ ڈالے گئے کہ فلاں بزرگ دوستوں کے یہاں شب و روز محنت دیکھ کر گھبراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اتنی محنت یہاں کون کرے، دوبارہ بڑے جوش سے فرمایا۔

اگر کوئی گھر آپ لوگوں کو معلوم ہو جہاں دو روٹیاں پکی پکائی مل جاتی ہوں تو میں بھی ٹوکری پکڑ کر تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں تا کہ کچھ حاصل کر سکوں، مگر دوست صرف چکی ہی پیسنے کی شکایت

کرتے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ چکی پینے کا ہنر تو بہت روز میں آتا ہے، پہلے تو زمین کو جوتنا ہے اچھا بھلا بیج گھر سے نکال کر کھیت میں بکھیر کر پھر سینچنا ہے تا کہ کھیتی بڑھ کر پکنے کی حد تک پہنچے اور پک جائے تو پھر کاٹنا اور گاہنا اور غلہ کو بھوسے سے علیحدہ کرنا پھر چکی پیسنا، آٹا بن جانے کے بعد پھر اسے مشقت سے گوندھنا بھی ہے اور آگ جلانے پکانے کا سامان مہیا کرنا ہے، پھر جیٹھ کی گرمی بھی برداشت کرنا ہے، پک کر تیار ہو جانے کے بعد مشقت سے توڑ کر منہ کے زور سے نگلنا ہے، اس ساری کوششوں کے بعد اگر ہضم ہو جائے تو محض میرے مولا کا فضل سمجھنا چاہیے ورنہ قے ہو کر باہر بھی نکل سکتا ہے، کسی دوست نے عرض کیا کہ حضرت ماں اپنے بچہ پر کتنی شفیق ہوتی ہے کہ سوئے ہوئے بچہ کو اُٹھا کر دودھ پلاتی ہے، اگر بچہ بھوکا ہو تو اُس کی چھاتیوں میں ایک قسم کی تحریک سی پیدا ہو کر اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ بچہ بھوکا ہے، مگر بزرگ لوگ ماؤں سے زیادہ شفیق ہوتے ہیں اس لیے ان سے ایسی امیدیں باندھی جاسکتی ہیں اس پر حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بھئی ماں کا کام تو اتنا ہی ہوتا ہے کہ چھاتی بچہ کے منہ میں دے دے، مگر اگر بچہ ہی مردہ ہو اور ہونٹ ہلا کر دودھ کو چوس نہ سکے اور اپنے پیٹ میں نہ پہنچا سکے تو اس میں ماں کا کیا قصور ہے اور اس کی شفقت میں کیا فرق آسکتا ہے۔

(سوانح حضرت رائے پوری: ص ۲۴۰)

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر۹

اکابر کا فقر وفاقہ

یہ نمبر درحقیقت پہلے نمبر کا جزء ہے اور پہلے نمبر میں اس کے متعدد واقعات گزر بھی گئے ہیں، لیکن فقر وفاقہ کو چونکہ سلوک میں خاص دخل ہے اور میں نے اپنے اکابر کے یہاں بہت کثرت سے اس کے مشاہدات بھی کیے ہیں، اس لیے اہمیت کی بناء پر اس کے چند واقعات بھی خاص طور سے لکھوانے کو جی چاہتا ہے کہ علماء بالخصوص جن کو سلوک کی ذوق بھی حاصل ہو ان کو اس سے ہرگز متاثر یا پریشان نہیں ہونا چاہیے، حدیث پاک میں حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے آکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! خدا کی قسم مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیکھ سوچ کر کہہ، کیا کہہ رہا ہے ان صاحب نے تین دفعہ قسم کھا کر یہ کہا کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے تیسری دفعہ کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تجھے مجھ سے محبت ہے تو فقر کے لیے تیار رہ، اس لیے کہ جو مجھ سے محبت کرتا ہے فقر اس کی طرف ایسا دوڑتا ہے جیسا پانی ڈھلان یعنی نیچی کی طرف دوڑتا ہے۔ (ترمذی: ص ۵۸/ج ۲)

حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ اہل علم پہلے زمانہ میں جو ہوئے ہیں ان میں استغناء کی شان ہوتی تھی، اب تو جس کو دیکھو امراء کے دروازوں پر نظر آتے ہیں، پہلے فقر وفاقہ کو اپنا زیور سمجھتے تھے، دنیا سے نفرت اور دین سے رغبت اور اس میں مشغولیت رہتی تھی اور اسی کی برکت تھی اور اسی سے عزت تھی، اب جب سے اپنے بزرگوں کا یہ مسلک اور مشرب چھوڑ دیا ویسے ہی ذلیل وخوار ہیں، باقی جو بڑے بڑے متکبرین ہیں وہ اب بھی فقیروں کے دروازے پر آتے ہیں اور کوئی سچا فقیر ان کے دروازوں پر نہیں جاتا اور یہ شان اس کے لیے اس قدر شایاں ہے کہ دوسری قوم کے لوگ ان کے لیے اس کو زیبا بتلاتے ہیں۔

ایک غلام مصطفےٰ نامی کانپور میں مولوی ہیں، بڑے دلیر ہیں، ایک بڑے انگریز یعنی لیفٹیننٹ گورنر کے پاس پہنچے ملاقات ہوئی کہا کہ کیا مولویوں کا آپ کے یہاں کوئی حق نہیں۔ کیا یہ آپ کی رعیت نہیں، لیفٹیننٹ گورنر نے کہا کہ حق ہے، حق کیوں نہ ہوتا، آپ فرمائیے بات کیا ہے؟ کہا کہ کوئی نوکری دلوایئے، گورنر نے کہا نوکری بہت ہے مگر آپ کو ایک نیک مفید مشورہ دیتا ہوں کہ آپ عالم ہیں، آپ کو اللہ نے دین عطاء فرمایا ہے، آپ ان کے بھروسہ پر کسی مسجد میں بیٹھ کر درس دیجئے

گا، آپ کی شان کے لیے یہی شایاں ہے، ہمارے یہاں کی نوکری آپ کے شان علم کے خلاف ہے، اللہ آپ کے کفیل ہوں گے، اس کے بعد اپنے خدمت گار کو اشارہ کیا، وہ ایک کشتی میں پچاس روپے لے کر حاضر ہوا، لیفٹیننٹ گورنر نے وہ کشتی اپنے ہاتھ میں لے کر نہایت احترام اور ادب سے ان مولوی صاحب کے سامنے پیش کی کہ یہ قبول فرمالیجئے، انہوں نے کہا کہ میں آپ کے مشورہ پر عمل کرنے کی نیت کر چکا ہوں کہ اب اللہ ہی دے گا تو لوں گا، اس مشورے پر یہیں سے عمل شروع کرتا ہوں اس لیے یہ نہ لوں گا، کس قدر حوصلہ کی بات ہے۔

اس کے بعد حضرت تھانوی ارشاد فرماتے ہیں میں نے سن کر کہا کہ اتنی ہی کمی نکلی، میں اگر ہوتا تو لیتا، اس لیے کہ دین پر نیت کر لینے ہی کے خلوص کی برکت تھی کہ اللہ نے وہیں سے کفالت شروع کر دی، وہ بھی اللہ ہی دلوا رہے تھے، وہ بے چارہ کیا دیتا، غرضکہ اہل علم کو استغناء کی سخت ضرورت ہے، خصوصاً امراء کے دروازوں سے تو ان کو بالکل اجتناب چاہیے، اس میں دین، علم (دین) اہل دین کی سب کی ذلت ہے سبکی ہے۔ مجھ کو تو اس سے بڑی نفرت ہے اور میں جب کوئی واقعہ اہل علم کا امراء کے ساتھ تملق کا سنتا ہوں سخت افسوس ہوتا ہے، میں تعلق کو منع نہیں کرتا، یہ اہل علم کی شان سے بہت ہی بعید ہے، مگر کس طرح دل میں ڈالوں۔ (افاضات ۲/۶: ص ۲۹۴)

اہل اللہ کا فقر و فاقہ ایسی لازمی چیز ہے کہ اکابر میں سے کوئی بھی اس سے الا ماشاء اللہ مستثنیٰ نہیں ہوگا اور جہاں بظاہر افراد نظر آتا ہے وہ مالک کی طرف سے دوسروں کی پرورش اور ان کی روزی رسانی کے لیے ان حضرات کو ذریعہ بنا دیا جاتا ہے، ورنہ جہاں تک ان اکابر کی اپنی ذات کا تعلق ہے عملاً بھی اور اس سے زیادہ قلباً بھی مسکنت اور فقر و فاقہ کے عاشق رہے ہیں، اس کی پہلی فصل مجاہدات میں بہت سے واقعات اس نوع کے گزر چکے ہیں، اس کی اہمیت کی وجہ سے خصوصی تنبیہ کے لیے اور اپنے اکابر کے بعض احوال کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس مضمون کو مستقل لکھوایا، صوفیاء کا یہ مشہور مقولہ لکھوا چکا ہوں کہ جو ہماری ابتداء دیکھے وہ کامیاب جو انتہا دیکھے وہ ناکام اور یہ صحیح ہے کہ ابتداء میں یہ حضرت جب پتھر سے رگڑے جاتے ہیں، ان مناظر کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بزرگی اور تقرب کس طرح حاصل ہوا کرتا ہے:

رنگ لاتی ہے حنا پتھر سے پس جانے کے بعد

اس مضمون کو یہ ناکارہ اپنے رسالہ فضائل صدقات حصہ دوم میں بہت تفصیل سے لکھوا چکا ہے، اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا گیا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر میں اپنی وفات تک کبھی جو کی روٹی بھی دو دن لگا تار پیٹ بھر کر تناول نہیں فرمائی، یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تھی اور یہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت رکھنے والوں کی زندگی ہے،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے دوسری حدیث میں یہ مضمون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے گھرانے کا نقل کیا گیا ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک کبھی بھی دو دن لگا تار جو کی روٹی سے پیٹ نہیں بھرا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے نقل کیا گیا ہے کہ جب میں پیٹ بھر کر کھانا کھاتی ہوں تو میرا رونے کو (بے اختیار) دل چاہتا ہے، پس رونے لگتی ہوں، کسی نے عرض کیا یہ کیا بات ہے؟ فرمانے لگیں کہ مجھے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ یاد آجاتا ہے کہ گوشت سے یا روٹی سے کبھی بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو وصال تک دن میں دو مرتبہ پیٹ بھر کر تناول فرمانے کی نوبت نہیں آئی۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اکثر بھوکے رہتے تھے بغیر ناداری کے یعنی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کھانا موجود ہو پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کم تناول فرماتے تھے، اس لیے کہ بھوکے رہنے سے انوار کی کثرت ہوتی ہے، یہ مضمون اور اس قسم کی روایات فضائل صدقات حصہ دوم میں بہت کثرت سے نقل کی گئی ہیں۔

جن اکابر کے یہاں آخر میں غذا میں تنعم دیکھا جاتا تھا وہ حقیقت میں دو وجوہ پر مبنی تھا اور میں نے اس کو خوب مشاہدہ کیا۔ بڑی وجہ تو ہدایا پیش کرنے والوں اور لانے والوں کی دل داری۔ مجھے بسا اوقات اکابر کا یہ رنگ دیکھنا پڑا کہ کسی چیز کو طبیعت بالکل نہیں چاہ رہی ہے مگر لانے والے کی دلداری کی وجہ سے بہت ہی بے رغبتی کے ساتھ طبعی گرانی کے ساتھ نوش فرماتے دیکھا۔ دوسری وجہ قویٰ کا ضعف تھا جو سابقہ مجاہدات کی وجہ سے پیش آتا تھا اور عبادات پر تقویت حاصل کرنے کے لیے دواء ہوتا تھا۔ میرے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا یہ ارشاد میں نے بار بار سنا کہ جب دانت تھے تو چنے نہ ملے اور جب دانت نہ رہے جب چنوں کا زور ہوا اور یہ سچ ہے کہ ان اکابر کی فتوحات بہت کثرت سے دیکھی گئیں۔ جب یہ شروع ہوتی ہیں، جب دل کو اس کی طرف لگاؤ نہ رہے۔ یہ مضامین تو بہت ہی تفصیل طلب ہیں اور بہت اہم ہیں اور فضائل صدقات حصہ دوم میں بہت تفصیل سے گزر بھی چکے ہیں۔ مجھے تو آپ بیتی میں اپنے اکابر کے وہ معمولات لکھوانے کو دل چاہتا ہے جو میں نے دیکھے ہیں۔

سید الطائفہ حضرت حاجی صاحب کے بعض حالات

سید الطائفہ حضرت الحاج امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے فقر و فاقہ کے حالات بہت ہی کثرت سے سننے میں آئے۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ، حضرت حاجی صاحب کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت قدس سرہٗ کے مرشد حضرت میانجیو صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ۱۲۵۹ھ

میں رحلت فرمانے کے بعد آپ کے قلب مبارک میں جذبہ الٰہیہ پیدا ہوا اور آپ آبادی سے ویرانے میں چلے گئے۔ مخلوق سے نفرت فرماتے تھے اور جنگل پنجاب وغیرہ میں اوقات بسر فرماتے تھے اور اکثر وقت فاقہ سے کہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مشرف ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ آٹھ آٹھ روز اور بھی زیادہ گزر جاتے اور ذرا سی چیز حلق مبارک میں نہ جاتی اور حالتِ شدت بھوک میں اسرار وعجائب فاقہ مکشوف ہوتے تھے۔

بیان فرماتے تھے کہ ایک دن بہت بھوک کی تکلیف میں ایک دوست سے کہ نہایت خلوص دل رکھتا تھا۔ چند پیسے میں نے بطور قرض مانگے تھے۔ باوجود ہونے کے انکار صاف کر دیا۔ اس کی اس ناالتفاتی سے تکدر وملال دل میں پیدا ہوا۔ چند منٹ کے بعد تجلی توحید نے استعلاء فرمایا اور معلوم ہوا کہ یہ فعل فاعل حقیقی سے متکون ہوا ہے، اس وقت سے خلوص اس دولت کا زائد ہوا اور وہ تکدر مبدل بلطف ہو گیا۔ اس واقعہ کو چند ماہ گزرے تھے کہ میں مراقبہ میں تھا۔ سیدنا جبرائیل، سیدنا میکائیل علیہم السلام کو بغایت جلال ملکانی ونہایت جمال نورانی سنبل کا کل سیاہ کندھوں پر ڈالے ہوئے اور سبزہ نہ اگا ہوا دیکھا۔ محو خود رفت ہو گیا۔ جو لذت کہ حاصل ہوئی احاطہ بیان میں نہیں آسکتی اور وہ دونوں تبسم کناں وزدیدہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے اسی طرح چلے گئے اور کچھ نہ کہا۔ (راقم مؤلف) ہیچکارہ نے بخدمت حضرت ایشاں قلبی وروحی فداہ عرض کیا کہ تعبیر دیکھنے ان فرشتگان اولعزم کیا تھی۔ ارشاد فرمایا کہ مرتبہ نزدیکی کا مجھ پر ظاہر ہوا۔ کیونکہ دیکھنا جبرائیل علیہ الصلوۃ والسلام کا بشارت اس امر کی ہے کہ بفضلہ سبحانہ حصہ وافر علم وتعلیم ارشاد وہدایت سے مجھ کو مرحمت ہوگا کہ یہ خدمت ان کو تفویض ہے اور دیکھنا میکائیل علیہ الصلوۃ والسلام کا اشارہ ہے، اس طرح کہ مایحتاج به فی الدنیا بے تکلف میسر آئے کہ قسمت وتقسیم رزق کی حضرت میکائیل سے متعلق ہے، راقم (مؤلف حضرت حکیم الامۃ) عرض کرتا ہوں کہ فی الواقع ایسا ہی ہوا، سائل چند منٹ میں ایک ادنیٰ اشارہ حضرت ایشاں سے صاحب حال ہوتا ہے۔

(حیات حاجی صاحب: ص ۱۴)

قرض لینے کا واقعہ حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ کی تحریر سے ہندوستان کا معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ واقعہ میں نے اپنے اکابر سے مختلف مشائخ سے سنا کہ مکہ مکرمہ کا ہے کہ کئی دن کے فاقہ کے بعد ایک بے تکلف خصوصی تعلق رکھنے والے تاجر سے دو ہلل (تقریباً دو پیسے) قرض مانگے تھے، باوجود بڑے تاجر ہونے کے اس نے معذرت کر دی تھی، جس پر حاجی صاحب کا ارشاد سنا گیا کہ مجھے بعد میں بڑی غیرت آئی کہ کیوں سوال کیا تھا، رات کو خواب میں دیکھا کہ امتحان کا دور ختم ہو نے والا ہے غالب یہ ہے کہ یہ دوسرا واقعہ ہے اور حضرت جبرائیل اور حضرت میکائیل والا واقعہ اس

دوسرے قصہ کے بعد کا ہے، اس لیے حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدۂ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ جب میں (حضرت حاجی صاحب) پہلے مکہ آیا تو نوبت فاقوں کی پہنچ گئی، کئی کئی دن تک اتفاق کھانے کا نہیں ہوتا تھا، میں نے عرض کیا کہ بارالہا مجھ میں طاقت امتحان نہیں ہے، بعدہ حضرت خواجہ شیخ معین الدین چشتی رحمہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا کہ فرماتے ہیں کہ لاکھوں روپے کا خرچ تمہارے ہاتھوں مقرر ہوگا، میں نے عرض کیا کہ اس مہم کی طاقت نہیں رکھتا، ہنس کر فرمایا کہ تمہاری حاجت بند نہیں رہنے کی، اس وقت سے خرچ ماہانہ کہ اقل مرتبہ سو (۱۰۰) روپے ہے، خدا اپنے خزانہ غیب سے پہنچاتا ہے۔

(حیات حاجی صاحب: ص ۱۱۵)

حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدۂ خود نوشت سوانح میں تحریر فرماتے ہیں کہ قطب عالم حضرت حاجی صاحب قدس سرۂ العزیز کو فرماتے ہوئے میں نے خود سنا کہ ایک ہفتہ تک موصوف کو صرف زمزم کے پانی پر گزارا کرنا پڑا، اسی اثناء میں ایک مخلص دوست سے جو کہ بہت زیادہ اخلاص کا مدعی تھا، چند پیسے قرض مانگے تو اس نے ناداری کا بہانہ کر کے انکار کر دیا، حالانکہ واقع میں نادار نہ تھا۔

حضرت قدس سرۂ العزیز نے فرمایا کہ میں اس انکار سے سمجھا کہ منشاء الوہیت یہی ہے، اس لیے میں بھی صبر کر کے چپکا ہو گیا، ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد جب کہ ضعف و نقاہت بہت زیادہ ہو گیا تھا، رات میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرۂ العزیز کو خواب میں دیکھا، ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اپنے باورچی خانہ کا ناظم اور مہتمم بنا دیا صبح کو اندھیرے میں ایک شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا، میں نے دروازہ کھولا تو اس نے ایک تھیلی دی جس میں سو (۱۰۰) ریال تھے اور پھر چلا گیا، اس کے بعد سے عسرت نہیں ہوئی۔

(نقش حیات: ص ۶۰ / ج ۱)

ایک اور جگہ حاجی صاحب کا مقولہ نقل فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بار چلّہ کا ارادہ کیا اور اس کے لیے آٹھ آنے جو خریدے تھے، میری بھاوج نے کہا کہ جو کی روٹی کھانی مشکل ہوگی، میں نے کہا، جس طرح بنے گا کھاؤں گا، انہوں نے جو کوٹ کر چھان دیا، ہر روز مجھے ایک روٹی ملتی تھی وہی کافی ہوتی تھی۔ (حیات حاجی صاحب: ص ۱۷۰)

ایک اور جگہ حضرت حکیم الامت حضرت سید الطائفہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں فرمایا کہ فقر و فاقہ بڑی نعمت ہے، مجھ پر یہ حالت اس طرح گزری ہے کہ میرے احباب مجھ کو قرض نہ دیتے تھے اور ظاہری حالت میری بھی امیرانہ تھی یعنی لباس بھی عمدہ ہوتا تھا اور مسند تکیہ بھی درست اور میری بھوک کے مارے یہ حالت ہوتی تھی کہ زینہ پر چڑھنا دشوار ہوتا تھا، بلکہ بار ہا گر بھی پڑتا تھا، اس

حالت میں عجائب وغرائب واقعے پیش آتے تھے کہ جن کا مزہ نہیں بھولتا۔

(امداد المشتاق :ص ۱۶۷)

حضرت حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ فقر دو طرح پر ہے، اختیاری و اضطراری، فقر اختیاری وہ ہے جو رضا حق کے واسطے ہو، یہ دولت مندی سے بدرجہا افضل ہے اور فقر اضطراری عوام کو ہلاکت کفر تک پہنچاتا ہے کہ حدیث ''کاد الفقر أن یکون کفرا'' سے یہی مراد ہے اور معنی فقر کے محتاجی ہیں اور فقر حقیقی وہ ہے کہ اپنے نفس سے بھی محتاج ہو یعنی مالک اپنے نفس کا بھی نہ رہے، کیونکہ جس قدر فقیر کا ہاتھ ہر چیز سے خالی ہوگا اسی قدر اس کا دل ماسوائے اللہ سے خالی ہوگا اور فانی فی اللہ اور باقی باللہ ہو جائے گا۔ (حیات حاجی :ص ۴۹)

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ فلاں عزیز الور چلا گیا، افسوس ہے کہ اس کے حال نیک میں خلل واقع ہوا، نہایت آزمائش پیش آئی، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، فقر وفاقہ مؤمنین کے حق میں معراج ہے، طاقت نہ رکھ کر قناعت کے گوشہ اور صبر سے باہر ہو گیا اگر چند روز تکلیف برداشت کرتا اور اس پر استقامت رکھتا تو چند عرصہ میں تمام تکلیف دور ہو جاتی۔

شاہ عبد القدوس صاحب کا واقعہ

شیخ المشائخ حضرت شاہ عبد القدوس گنگوہی قدس سرہٗ کے متعلق حضرت امام ربانی گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت شاہ عبد القدوس رحمہ اللہ تعالیٰ نے تمام عمر فاقہ پر فاقہ اُٹھائے ہیں، صاحبزادے بھوک کے مارے بلکتے چیختے اور رُوتے تھے، ان کی والدہ بہلانے کے واسطے چولہے پر خالی ہانڈی میں پانی بھر کر چڑھا دیتیں اور جب بچے بھوک سے بے تاب ہو کر کھانے کا تقاضا کرتے تو ان کو چمکارتیں اور تسلی دے کر فرماتیں تھیں کہ دیکھو چولہے پر کیا چڑھا ہوا ہے، گھبراتے کیوں ہو، جب تمہارے والد آئیں گے۔ ان کے ساتھ کھانا کھانا، بچے روتے ہوئے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مچلتے کہ جلدی چلو، ہمیں گھر چل کر کھانا کھلاؤ، حضرت ان کے ہمراہ گھر میں تشریف لاتے اور بیٹھ کر خود بھی ان کے ساتھ آبدیدہ ہوتے اور یوں فرمایا کرتے تھے کہ میرے گناہوں کے باعث ان معصوم بچوں پر بھی مصیبت آئی ہوئی ہے۔

(تذکرۃ الرشید :ص ۲۶۵ رج ۲)

شاہ عبد الغنی صاحب کا واقعہ

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ میرے استاذ حضرت شاہ عبد الغنی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ بہت بڑھا ہوا تھا، سینکڑوں مرید تھے اور ان میں اکثر امراء اور

بڑے آدمی تھے، مگر آپ کے ہاں اکثر فاقہ ہوتا تھا، ایک روز آپ کے ہاں کئی روز کا فاقہ تھا، خادمہ کسی بچہ کو گود میں لیے ہوئے باہر نکلی، بچہ کے چہرے پر بھی فاقہ کے سبب پژمردگی تھی، اتفاق سے مفتی صدر الدین صاحب کہیں سے تشریف لائے تھے، بچہ کا چہرہ مرجھایا ہوا دیکھا تو خادمہ سے پوچھا بچہ کیسا ہے، اس کا رنگ کیوں متغیر ہے اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا حضرت یہاں کئی وقت سے فاقہ ہے، مفتی صاحب کو سخت صدمہ ہوا، اسی وقت گھر پہنچ کر خادم کے ہاتھوں ڈیڑھ سو (۱۵۰) روپے روانہ کیے اور لکھا کہ یہ آمدنی فیس کی نہیں بلکہ تنخواہ ہے قبول فرمالیجئے۔ حضرت شاہ صاحب نے واپس فرمادیئے اور کہلا بھیجا، آپ کی تنخواہ ہی کہاں جائز ہے، یہ تو ہولیا، اس کے بعد شاہ صاحب کو فکر ہوا کہ فاقہ کا راز کس طرح ظاہر ہوا، تحقیق سے معلوم ہوا کہ خادمہ نے کہہ دیا تھا، آپ نے اس کو بُلایا اور فرمایا، نیک بخت اگر فاقہ کی برداشت نہیں تو اور گھر دیکھ لو، مگر خدا کے لیے ہمارا راز افشاء نہ کرو۔ (تذکرۃ الرشید: ص ۲۷۶ ج ۲)

قطب عالم حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے قصے تو آج تک بہت مشہور ہیں، ایک دفعہ حضرت امام ربانی نے خود ارشاد فرمایا کہ میں نے اور میرے گھر کے لوگوں نے فاقے اُٹھائے مگر الحمدللہ میں نے کبھی قرض نہیں لیا۔ (تذکرۃ الرشید: ص ۲۷۷ ج ۲)

تذکرۃ الرشید میں دوسری جگہ لکھا ہے کہ ایام طالب علمی میں آپ نے اپنے خورد و نوش کا دہلی میں کسی پر بار نہ ڈالا، تین روپے ماہوار آپ کے ماموں بھیجا کرتے تھے، اسی میں روکھی سوکھی روٹی اور دال ترکاری وقت پر جو بھی آسانی سے مل گیا آپ نے کھائی اور اسی تین روپے میں کپڑے، دُھلائی، اصلاح خط یا جو کچھ بھی ضرورت پیش آتی رفع کی، دہلی میں آپ کو کئی کیمیا گر اور مہوش بھی ملے اور انہوں نے آپ کی روش اور انداز کو دیکھ کر بہ نیت محبت بتانا اور آپ کو کیمیا کا بنانا سکھانا بھی چاہا، مگر آپ کی زہد اور قناعت پسند طبیعت نے خود طمع یا حرص تو درکنار اس کا سیکھنا بھی گوارا نہ فرمایا، آپ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں کئی شخص کیمیا بنانے والے ملے، دہلی میں ایک شخص نے بنا کر دکھلا بھی دی، ایک شخص نے ہمیں اس کا نسخہ دیا، وہ میری ترمذی میں پڑا ہے مگر میں نے کبھی دھیان بھی نہیں کیا، طالب علمی میں تو کیا بعد میں وسوسہ بھی نہ آیا کہ لاؤ دیکھیں تو سہی بنتی بھی ہے یا نہیں، گنگوہ میں جب آیا اتفاق سے کتاب سے وہ نسخہ نکل آیا، ایک شخص کا نام لے کر فرمایا، وہ میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے نسخہ کی نقل مانگی، ہمیں بخل کی ضرورت کیا تھی، ان کو نقل کرادیا اور اصل کو اسی وقت پھاڑ دیا، اس کے بعد غالباً حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ اس سے بن بھی گیا تھا۔

(تذکرۃ الرشید: ص ۳۶ ج ۱)

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے حالات میں کیمیا کا ایک اور قصہ علمی انہماک میں گزر چکا ہے، حسن العزیز میں ایک واقعہ لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مولانا مظفر حسین صاحب جہاں جاتے فوراً کہہ دیتے، میں تمہارا مہمان ہوں ایک دن ٹھہروں گا یا دو دن، ایک دفعہ یہ بزرگ مولانا گنگوہی کے مہمان ہوئے، روانگی کے وقت حضرت گنگوہی نے عرض کیا کہ آپ رام پور جانے والے ہیں جلدی کھانا تیار کرادوں، فرمایا کھانا تیار کرانے میں میری منزل کھوٹی ہوگی، ہاں اگر رات کا رکھا ہوا کچھ ہو تو لا دو۔ مولانا نے باسی روٹی اور ماش کی دال لادی، آپ نے دال روٹی پر اُلٹ کر پلّے میں باندھ لی اور رخصت ہو گئے، جب رامپور پہنچے تو حکیم ضیاء الدین صاحب سے کہا کہ مولوی رشید بڑے اچھے آدمی ہیں، حکیم صاحب نے کہا ہاں بڑے بزرگ ہیں، فرمایا میں ان کے بزرگ ہونے کی تعریف نہیں کر رہا ہوں، میں تو کہہ رہا ہوں کہ وہ بہت اچھے آدمی ہیں اگر خود نہیں سمجھتے ہو تو پوچھ ہی لو، انہوں نے کہا اچھا فرمایئے، آپ نے فرمایا دیکھو کیسے اچھے آدمی ہیں، انہوں نے مجھے کھانے کے لیے کہا مگر میرے کہنے پر جو کھانا رکھا ہوا تھا بلا تکلف لا دیا، میں اس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ (حسن العزیز: ص ۱۴۱ ج ۴)

حکیم معین الدین صاحب کا واقعہ

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ ایک مرتبہ نانوتہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے صاحبزادہ حکیم معین الدین صاحب کے یہاں مہمان ہوئے، یہ صاحب بہت ہی بے تکلف ہیں، اتفاق سے ان کے یہاں اس روز کھانے کو کچھ بھی نہ تھا، مولانا سے عرض کیا ہمارے یہاں تو آج فاقہ ہے لیکن اکثر احباب آپ کی دعوت کیا کرتے ہیں، اگر آپ فرمادیں تو میں آپ کی دعوت منظور کرلوں، فرمایا میں تمہارا مہمان ہوں جو حال تمہارا ہے وہی میرا، بس فاقہ ہی سے بیٹھ رہے، خدا کی قدرت شام کے قریب ایک جگہ سے گیارہ روپے (مطب میں) آگئے۔ وہ خوش خوش مولانا کے پاس آئے کہ لیجئے آپ کی برکت سے گیارہ روپے آگئے، اب معمولی ہم کیوں پکوائیں گے، اب تو جس طرح جی چاہے گا دعوت کریں گے۔ اس واقعہ کو نقل کر کے حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ جب ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا پھر ہماری نظروں میں آج کل کی خاطر داری کیا آسکتی ہے۔

حضرت نانوتوی کا واقعہ

حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق بھی علمی انہماک میں ایک واقعہ لکھوا چکا ہوں کہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایک جھلنگا پر پڑے رہتے تھے۔ روٹی ایک وقت پکوا کر کئی وقت تک

اسے ہی روکھی کھاتے رہتے تھے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے اپنے ملازم کو کہہ رکھا تھا کہ کھانے کے وقت ان کو سالن دے دیا کرو۔ بڑی دقت اور اصرار سے کبھی لے لیتے تھے اور اپنے کام میں مشغول رہتے تھے۔ حضرت مولانا الحاج قاری محمد طیب صاحب نے حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کے طفلی حالات میں اپنی ایک قلمی یادداشت میں لکھا ہے کہ مولانا مرحوم یعنی حضرت نانوتوی فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی تازہ باسی روٹی یا دانہ دنکا، مٹھائی کھٹائی اپنی زبان سے نہیں مانگی۔ اگر کسی نے دے دیا تو لے لیا اور کھالیا ورنہ خیر۔ بعض دفعہ بھوک بہت لگتی، مانگنے کی تکلیف کو بھوک کی تکلیف پر گوارا کر کے صبر کرتا اور جب مہینے دو مہینے میں دو چار روز کے واسطے گھر نانوتہ جاتے اور پھر دیوبند کی واپسی کا وقت قریب آتا تو آپ بھوک کی تکلیف یاد کر کے رو پڑتے۔ آپ کی والدہ ہر چند پیار کر کے چمکار کر پوچھتیں کہ تجھ کو دیوبند میں کچھ تکلیف ہے۔ مولانا فرماتے تھے کہ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ اگر میں نے والدہ سے اس تکلیف کا ذکر کیا تو دیوبند والوں کی ناشکری ہوگی اور ان کو رنج گزرے گا۔ اپنے نفس پر تکلیف کا ہونا مضائقہ نہیں۔ والدہ کو اصل حال سے مطلع نہیں کیا اور برابر اسی طرح گزار دی۔ (سوانح قاسمی گیلانی: ص ۱۸۲ ر ج ۱)

حضرت نانوتوی کے واقعات

حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کی سوانح میں مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی تحریر فرماتے ہیں کہ نکاح کرنے سے انکار کر دیا۔ بڑی مشکل کے بعد حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے حکم دلایا۔ جس پر حضرت راضی تو ہو گئے مگر اس شرط پر کہ تمام زوجہ کی نفقہ اور اولاد کی پرورش کے لیے کچھ کما لانے کے مجھ پر تقاضے نہ ہوں۔ بے چاروں نے ناچار یہ شرط قبول کی نکاح ہو گیا، اب نوکری کی تو چار پانچ روپے کی، کسی کتاب کی تصحیح کی اور اس کے ساتھ ہی مہمان نوازی فطرت میں داخل تھی اس سے کچھ کیا بچتا کہ اہل وعیال کو دیتے، جب مکان تشریف لاتے اور یہاں بھی مہمان آتے تو والدین پر بار ڈالنے کی بجائے اہلیہ کا زیور نہ صرف اس کی اجازت سے بلکہ اس کی رغبت سے فروخت کر کے مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے، اہلیہ بھی اللہ نے ایسی عطاء فرمائی تھی جو حضرت کی طبیعت مبارکہ کے ساتھ ہی ساتھ تھی کہ اپنے گھر کے زیور بھی بہت خوشی سے والدین سے مخفی بیچنے کے لیے دیتی رہتی خود حضرت قدس سرہٗ کا ارشاد ہے:

''ہماری سخاوت احمد کی والدہ کی بدولت ہے۔''

(سوانح قاسمی یعقوبی: ص ۳۲)

شیخ الاسلام حضرت مدنی کے واقعات

حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ خود نوشت سوانح میں اپنے مدینہ پاک کے ابتدائی حالات میں جو تفصیل سے تحریر فرمائے گئے ہیں، لکھتے ہیں کہ وطن سے یعنی ہندوستان سے مدینہ پاک آ کر ہم لوگوں کو بھی بہت سے مشکلات پیش آئیں، بالخصوص عورتوں کو، وطن اور اہل وعیال کی جدائی تو تھی ہی، بہت سے کام ایسے کرنے پڑے جن کی بچپن میں کبھی نوبت نہیں آئی تھی، مثلاً آٹا بھی خود ہی پیسنا پڑا، گھر میں جھاڑو دینا، برتنوں کو دھونا، والدہ صاحبہ باوجود ضعف وپیری بہت زیادہ جفاکش اور عالی ہمت تھیں، اپنی ہر بہو کی آٹا پیسنے کی باری مقرر تھی مگر خود بھی ہر بہو کے ساتھ چکی پیسنے میں اور گھر کے کاروبار میں شریک رہتیں، گھر والوں کے اور بچوں کے اور مردوں کے کپڑے بھی سب کو خود ہی دھونے پڑتے تھے، جس کی وطن میں کبھی نوبت نہیں آئی تھی، ہم مردوں کو بالخصوص مجھے اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر میٹھا پانی لانا پڑتا تھا کہ دن میں مشغولی کی وجہ سے وقت نہیں ملتا تھا۔

۱۳۱۸ھ میں مجھے اور بھائی صدیق احمد صاحب مرحوم کو ہندوستان کا سفر پیش آیا بھائی سید احمد مرحوم کی تنخواہ صرف بیس روپے ماہوار تھی والد صاحب مرحوم نے بہ مجبوری ایک مخلص سے پچاس روپے قرض لیے جس سے چاول خریدے، ایک وقت میں کھچڑی اور دوسرے وقت میں پیچ پر سارے گھر والوں کا گزر تھا، (چاولوں کو بہت سے پانی میں اُبال کر اس کا پانی جو گاڑھا ہوتا ہے اس کو پیچ کہتے ہیں) یہ سلسلہ کئی ماہ تک مسلسل رہا اور یہ چند ماہ گھر والوں پر بہت عسرت کے گزرے، لیکن الحمد للہ فاقوں کی نوبت کسی کو نہیں آئی۔

حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی دہلوی اور حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددی دہلوی قدس اللہ اسرارہما اور ان کے خاندان والوں پر عرصہ تک فاقوں کی نوبت آتی رہی۔

(نقش حیات: ص ۱۶ ج ۱)

حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کا ابتدائی دور کلکتہ کے قیام کا اور دیوبند کے قیام کا بھی بہت تنگی کا گزرا، باوجود وسیع تنخواہ کے مہمانوں کی کثرت اور فیاضیوں کا زور اکثر مقروض ہی بنائے رکھتا تھا، ایک چیز تو میرے ساتھ بہت ہی کثرت سے دیوبند کے ابتدائی قیام میں پیش آئی، کہ بیسیوں مرتبہ بلکہ اگر سینکڑوں کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا، دیوبند سے کلکتہ، لکھنؤ، شاہدرہ وغیرہ تشریف لے جاتے ہوئے سہارنپور دیوبند سے آ کر صرف اس لیے اُترتے تھے کہ حضرت جی کے پاس آگے جانے کا کرایہ نہیں ہے، اس سیہ کار پر حضرت کی شفقت اس وقت سے شروع ہوئی تھی جب میری عمر گیارہ بارہ

سال کی تھی اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے وصال کے بعد دو ماہ کا چلہ گنگوہ میں کیا تھا اور دو ماہ مسلسل روزے بھی رکھے تھے۔

حضرت مولانا عبدالقادر رائپوری کے واقعہ

حضرت مولانا الحاج شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے حالات میں کثرت سے گزر چکا کہ رائے پور کے ابتدائی قیام میں ایک روٹی روز ملتی تھی، جس کی تفصیل مجاہدات میں گزر چکی، وہ بھی کہیں سے کچی کہیں سے پکی بغیر سالن کے، گاؤں سے کسی دن چاچھ آجاتی تو اس سے حلق میں اُتاری جاتی ورنہ پانی سے، وہ ارشاد فرماتے تھے کہ ہمارے یوپی کے ساتھی تو اسی روٹی کو آدھی آدھی دو وقت میں کھاتے تھے اور پنجاب کا رہنا والا ایک ہی وقت میں کھالیتا تھا اور دوسرے وقت میں اللہ کا نام، باغ میں پتے تلاش کیا کرتے تھے جن پر گزر ہو جائے مختلف پتے بھی کبھی کھائے اکثر مہمانوں کی چائے سے جو پتی بچتی تھی اس کو پکا کر اور باورچی خانہ میں جو پرانا گڑ مل جاتا تھا اس کو پکا کر شیرا بنا کر اس میں وہ پتی ڈال کر روٹی اسی سے کھالیتا تھا، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر ایک پھٹا ہوا کپڑا کسی کا پڑا ہوا تھا، ردی کر کے ڈال دیا گیا تھا، حضرت نے اس کو اُٹھا کر دھو کر پاک کر کے کئی تہہ کر کے اس کو حافظ یوسف علی صاحب کی گھوڑی جہاں بنتی تھی وہاں بچھالیا تھا، وہی بستر تھا وہی مصلےٰ تھا، چودہ (۱۴) سال تک اسی پر گزر کیا، خانقاہ میں ایک ہی لالٹین تھی اور خانقاہ میں سانپ، بچھو، کنکھجورے، جنگل میں کثرت سے ہوتے تھے۔ حضرت فرماتے تھے کہ ایک ٹوٹا ہوا بانس بستر کے قریب رکھا رہتا تھا، اس کو کبھی زمین پر مار دیتا تھا کہ کوئی سانپ بچھو ہو تو بھاگ جائے۔

چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے چند واقعات

حضرت کے اور دوسرے اکابر کے بہت سے واقعات، مجاہدات میں گزر چکے ہیں، مکرر لکھوانے کو جی نہیں چاہتا، میرے چچا جان مولانا محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق کئی جگہ متفرق قصے گزر چکے ہیں، جن میں ماہ رمضان میں افطار وسحر میں گولر پر گزر کرنا اور ایک ضروری کارڈ اس ناکارہ کو کئی دن اس وجہ سے نہ لکھنا کہ پیسہ کوئی تھا نہیں، قرض لینے کو جی نہ چاہا اور بھی کئی واقعات ہیں، سوانح یوسفی میں لکھا ہے کہ جو زمانہ مولانا یوسف صاحب کی خوردسالی کا گزرا ہے وہ بستی نظام الدین میں بڑی تنگ دستی اور عسرت کا تھا، گھر میں کئی کئی فاقے ہو جاتے، لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی، اس حال سے وہی لوگ واقف تھے جو گھر کے افراد تھے یا معتمد علیہ تھے یا خدام ورفقاء، بچے اور بوڑھے سب ہی اس حال میں مست اور صبر وقناعت کے پیکر تھے۔

مولانا یوسف نے خود ایک موقع پر ایک صاحب کے استفسار پر بیان فرمایا، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے دور میں شروع شروع کئی کئی فاقے ہو جاتے تھے اور مدرسہ کاشف العلوم میں کام کرنے والے حضرات بھی اس سے لطف اندوز ہوتے ایک بار مسلسل کئی دن سے فاقہ تھا اور اندر باہر کچھ نہ تھا، حضرت اپنے حجرے سے نکلے اور حوض کے کنارے اہل مدرسہ کو جمع کر کے فرمایا کہ دیکھو تم لوگ میری وجہ سے پریشان مت ہو، تم یہاں سے کہیں اور جا سکتے ہو، کسی اور مدرسہ میں کام کر سکتے ہو، میں اکیلا ہوں حوض کا پانی پی کر گزارا کر لوں گا، گھر اور مدرسہ کے خزانہ میں کچھ نہیں ہے، حضرت کے اس فرمانے پر سب اہلِ مدرسہ نے ایک زبان ہو کر عرض کیا، حضرت! ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں چاہے ہمیں بھی حوض کا پانی پینا پڑے، حضرت اس جواب پر آبدیدہ ہو گئے، اپنے حجرے میں تشریف لے گئے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد نکل کر باہر آئے اور فرمایا اللہ برکت دے گا اور آسانی مہیا کرے گا۔

اس کے بعد مولانا یوسف صاحب ہی سے سنا ہوا واقعہ ہے کہ جب بھی کہیں سے آٹا آتا تھا تو ایک صندوق میں جو اسی مقصد سے رکھا رہتا تھا بھر دیا جاتا تھا اور اندر باہر صرف میں لایا جاتا تھا، ایک بار کا واقعہ ہے کہ صندوق میں آٹا بالکل نہ تھا اور کئی روز سے فاقہ کی حالت چل رہی تھی مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے صندوق کے درازوں سے آٹا نکال کر جمع کیا وہ اتنا کم تھا کہ بڑی محنت سے جمع ہوا اور اس کی چند ٹکیاں بن سکیں۔ مولانا محمد یوسف صاحب کی اس محنت اور عمل کو حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے حجرہ سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا، حال دریافت کیا اور انکشاف حال سے چہرہ پر ایک خاص قسم کا اثر پڑا اور حجرہ واپس تشریف لے گئے، کچھ دیر بعد نکلے اور فرمایا یوسف! اب اس چہار دیواری کے اندر ان شاء اللہ فاقہ نہ آئے گا۔

(سوانح یوسفی)

حضرت مولانا اسماعیل شہید کا واقعہ

اورِح ثلاثہ میں امیر شاہ خان صاحب فرماتے ہیں کہ ایک شخص بڑے لوگوں میں سے جن کا نام تو یاد نہیں مگر اتنا یاد ہے کہ ان کو منشی جی کہا کرتے تھے، انہوں نے مولانا اسماعیل صاحب شہید سے اپنے یہاں مردانہ مکان میں وعظ کہلوایا، وعظ میں مولانا کی یہ حالت تھی کہ جو تڑاک پڑاک ان کے وعظ میں ہوتی تھی اس وعظ میں نہ تھی، بلکہ لہجہ نہایت کمزور تھا، مولوی رستم خان بریلوی جو مولانا کے خازن اور نہایت جان نثار تھے، ان سے ان منشی صاحب نے دریافت کیا کہ آج مولانا کی آواز اُبھرتی کیوں نہیں، اس کا کیا سبب ہے، چونکہ منشی صاحب مخلص تھے اور پوچھا بھی اصرار سے اس

لیے انہوں نے جواب میں فرمایا کہ اس ضعف لہجہ کا سبب یہ ہے کہ مولانا پر تین وقت سے فاقہ ہے اور انہوں نے تین وقت سے کچھ کھایا نہیں ہے، منشی صاحب یہ سن کر اُٹھے اور مولانا سے کہا کہ مولانا اب وعظ کو موقوف فرما دیجئے مجھے اور بھی ضروری کام ہیں، وعظ موقوف ہو گیا اور وہ مولانا کو الگ ایک مکان میں لے گئے، وہاں ان کے سامنے کھانا رکھا، مولانا دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا، منشی جی! تم سے کسی نے کہہ دیا ہے مگر میں کھانا نہ کھاؤں گا اور میں ان سے الگ نہیں کھا سکتا، انہوں نے ساتھیوں کو بھی بلایا اور سب کو کھانا کھلایا اور کئی وقت تک دعوت کی۔ (اورِ ح ثلاثہ: ص ۶۴)

حضرت سہارنپوری کا واقعہ

مفتی محمود صاحب نے بروایت مولوی لطیف الرحمٰن مرحوم کاندھلوی بیان کیا ہے کہ میں (مولوی لطیف الرحمٰن) ایک مرتبہ پیالہ لے کر حضرت اقدس سہارنپوری کے دولت کدہ پر گیا، حضرت کے منتظم کار حاجی مقبول احمد صاحب آئے، میں نے ان سے کہا کہ مطبخ کی دال کھائی نہیں جاتی، تھوڑا سا سالن دیجئے، انہوں نے جواب دیا آج تو سالن ہے نہیں، میں نے کہا کہ حضرت کے سالن میں سے دے دو، انہوں نے جواب دیا کہ حضرت کا سالن بھی نہیں، آج گھر میں فاقہ ہے، اس پر میں نے کہا کہ اچھا میں بازار سے حضرت کے لیے کچھ لے آؤں، اس پر انہوں نے فوراً میرے پاؤں پکڑ لیے کہ اللہ کے واسطے ایسا نہ کرنا ورنہ میری آفت آجائے گی کہ گھر کا راز کیوں ظاہر کیا، لیکن گھر سے باہر جب حضرت تشریف لاتے تو بڑے اعلیٰ لباس میں کہ کسی کو ادنیٰ شبہ بھی نہ ہو کہ گھر میں فاقہ ہے، ایک شاہانہ انداز میں تشریف لاتے تھے، یہ عمدہ اور اعلیٰ لباس تو غیرت الٰہی کی وجہ سے تھا کہ صورتِ حال سے کسی کو شبہ نہ ہو کہ ان کے پاس ہے نہیں، صورت سوال نہ بن جائے اور حق تعالیٰ کا شکوہ و شکایت نہ ہو اور گھر کا فاقہ یہ غایت تحمل اور اتباع سنت ہو۔

حکایاتِ صحابہ کے تیسرے باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور صحابہ کرام کے فقر و فاقہ کے متعدد قصے لکھے جا چکے، سب کا اعادہ کرنا تو یہاں بہت طویل ہے مگر اس باب کو اس کا جزء سمجھنا چاہیے اور احادیث کی سب کتابوں میں کتاب الزہد تو اس باب کا ماخذ اور اصل اصول ہے، مگر میں اپنی ہر تالیف میں خاص طور سے شمائلِ ترمذی، فضائل قرآن، فضائل صدقات میں بار بار اس پر تنبیہ لکھواتا رہا ہوں کہ اور اب بھی لکھواتا ہوں کہ ان سب واقعات کے نہایت اہم نہایت مرغوب، نہایت مقصود اور قابل تقلید ہونے کے باوجود ہم لوگوں کو اپنے ضعف کا لحاظ بہت ضروری ہے، ایسی کوئی چیز ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہیے جس سے آدمی دوسری عبادت سے بھی جاتا رہے نہ بھاگ کر چلنا، نہ اُکھڑ کر گرنا۔

تقلیل طعام میں تحمل کا لحاظ ضروری ہے

آپ بیتی میں شاید کسی جگہ مفصل لکھوا چکا ہوں کہ ۳۵ھ کی ابتداء سے اس ناکارہ کے طلب علم کے ذوق کا دور شروع ہوا اور اسی ذیل میں رات کا کھانا چھوڑا تھا، جس میں حرج ہوتا تھا، کچھ دنوں تک تو میری ہمشیرہ مرحومہ میرے پاس بیٹھی رہتی، میں مطالعہ میں مشغول رہتا اور وہ لقمہ بنا کر کھلاتی رہتی، کئی سال تک تو محض حرج کی وجہ سے کھانا چھوٹا رہا پھر عادت ہوگئی، لیکن چند سال تک یہ رہا کہ اگر کوئی معزز مہمان آتا تو اس کی دل داری میں ضرور شریک ہوتا اور رغبت سے کھاتا، چند سال بعد طبیعت میں بار شروع ہوگیا اور صرف تین ہستیاں، حضرت شیخ الاسلام، حضرت رائے پوری ثانی اور میرے چچا جان نور اللہ مراقدہم اللہ ان حضرات کو بہت ہی اُونچے درجے عطاء فرمائے ان کے ساتھ شرکت کا معمول رہا اور ان کی برکت سے گرانی بھی نہیں ہوتی تھی، ان کے بعد سے تو یہ حالت ہوگئی کہ اگر کسی وجہ سے دوسرے وقت کھانے کی نوبت آجاتی ہے تو طبیعت اس کو قبول نہیں کرتی اور جب کبھی یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ آج رات کو کھانا ہے تو اس دن صبح کو حذف کر دیتا ہوں، لیکن میرے متعدد دوستوں کو یہ واقعہ پیش آچکا ہے، اسی وجہ سے اس چیز کو اہمیت سے لکھوا رہا ہوں کہ دو چار نہیں بیسیوں خطوط اس مضمون کے آگے آچکے ہیں کہ سہارنپور سے آنے کے بعد رات کا کھانا چھوڑ دیا اور میں نہایت شدت سے نہایت سختی سے ان کو منع کرتا رہتا ہوں۔

تقریباً بیس سال کا واقعہ ہے یا اس سے بھی زائد کا، ایک صاحب کا خط آیا کہ سہارنپور سے آنے کے بعد سے شام کا کھانا چھوڑ دیا، میں نے بہت ہی شدت سے انہیں منع کیا انہوں نے اتنی ہی شدت سے بلکہ اس سے بھی زیادہ سے رات کے نہ کھانے کے فوائد لکھے، طبیعت بہت ہلکی رہتی تھی معمولات میں دل لگتا ہے، ذکر میں بڑی لذت آتی ہے، تہجد میں بڑا انشاط رہتا ہے، نیند بالکل نہیں آتی وغیرہ وغیرہ۔

میں نے شدت سے اس پر بھی انکار لکھا مگر میرے کہنے کو تو انہوں نے قبول نہیں کیا مگر ایک ہفتہ بعد ان کا خط آیا کہ ضعف کی وجہ سے رات کا کھانا شروع کر دیا، طبیعت بالکل متحمل نہ رہی، رات کے معمولات بھی قضا ہونے لگے باوجود آنکھ کھلنے کے نماز تہجد نہیں پڑھی جاتی وغیرہ وغیرہ، اس قسم کے کئی واقعات میرے ساتھ پیش آچکے ہیں۔

اس ناکارہ کی صحت وقوت کے زمانہ میں تقریباً پچاس (۵۰) سال یہ معمول رہا کہ ماہِ مبارک میں ستائیس (۲۷) رمضان تک یعنی ختم قرآن تک ایک قرآن پاک روزانہ کا اہتمام کرتا تھا، اس

کی تفصیل تو آپ بیتی نمبر۲ میں گزر گئی، اس کا اعادہ تو بے محل ہے مگر یہاں تو یہ لکھنا ہے کہ میرے محترم مولانا واجد علی صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ ایک دن مغرب کے قریب حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے روزہ کی حالت غشی کی سی صورت، حضرت بھی ان کو دیکھ کر گھبرا گئے ان کو لٹایا پنکھا ونکھا کیا، افطار کے بعد خمیرہ وغیرہ کھلایا گیا، جب اوسان درست ہوئے، حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے ان سے حالت خود دریافت کی، کیا ہوا تھا؟ کیا بات پیش آئی تھی، انہوں نے کہا کہ شیخ کو ایک قرآن روز پڑھتے دیکھا تھا، کئی دن سے میں نے بھی شروع کر دیا دو تین دن تک تو پتہ نہیں چلا، مگر کل سے کچھ ضعف معلوم ہوا، آج زیادہ ہو گیا، حضرت قدس سرہٗ نے خوب ڈانٹا اور پھر حضرت نور اللہ مرقدہٗ ہی نے ابتداءً یہ قصہ تفصیل سے مجھے سنایا، بعد میں میں دوسرے لوگوں سے بھی سنتا رہا، میں نے بھی مولانا مرحوم سے عرض کیا کہ آپ نے اپنے ضعف و پیری کو تو خیال فرمایا ہوتا اور پھر میرے گھاس کاٹنے میں اور آپ کے تدبر اور تدبیر سے پڑھنے میں آسمان و زمین کا فرق ہے، میں بہت کثرت سے اس مضمون پر ضرور تنبیہ کرتا ہوں۔

فضائلِ صدقات حصہ دوم کا ایک مضمون یہاں نقل کراتا ہوں اس میں فقر و فاقہ کے دس فوائد بنہایت تفصیل سے احیاء العلوم سے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ بات قابلِ لحاظ ہے جو متعدد بار لکھی جا چکی ہے کہ ان فضائل کے حق ہونے میں تردد نہیں، یقیناً یہ وہ کمالات ہیں جس سے خوش نصیب کو حق تعالیٰ شانہ اپنے لطف سے عطاء فرما دیں، اس کے لیے دین اور دنیا دونوں کی راحت ہے اور آخرت کے لیے بے شمار درجات اور ترقیات کا زینہ یہی چیزیں ہیں، لیکن اپنے تحمل کی رعایت ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا، زیادہ شوق میں آدمی تھوڑے سے بھی جاتا رہے، اس لیے ان سب چیزوں کی طرف دل کو رغبت دینے کے ساتھ ان چیزوں کے اور اس طرزِ زندگی کے اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کے ساتھ اور ان امور کو نہایت وقعت سے دیکھنے کے ساتھ عمل اتنا ہی کرنا چاہیے جتنا اپنے اندر تحمل ہو، بیمار آدمی طاقت سے زیادہ بوجھ اُٹھائے گا تو جلدی مرے گا، ہم لوگ نفس کی بیماریوں کے بیمار ہیں، اعضاء اور قویٰ کے مارے ہوئے ہیں، اس لیے صحت کی تمنا اور کوشش، سعی اور رغبت کے ساتھ ایسی کوئی چیز عملی طور سے اختیار نہ کرنا چاہیے جو اس حالت سے بھی گرا دے جس پر اب موجود ہیں، امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''کم کھانے کی عادت آہستہ آہستہ پیدا کرنی چاہیے جو شخص زیادہ کھانے کا عادی ہو، وہ دفعۃً کم

کرے گا تو اس کا تحمل بھی نہ ہوگا، ضعف بھی ہو جائے گا، مشقت بھی بڑھ جائے گی، اس لیے بہت آہستگی اور سہولت کے ساتھ اس کو اختیار کرنا چاہیے، مثلاً اگر کوئی شخص دو نان کھاتا ہو تو اس کو ایک نان کا اٹھائیسواں حصہ روزانہ کم کرنا چاہیے، اس سے ایک مہینے کے اندر آدھی خوراک رہ جائے گی اور اگر اس کا بھی تحمل دشوار ہو تو چالیسواں حصہ کرنا چاہیے۔''

(فضائلِ صدقات: ص۱۶۳/ج۲)

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر ۱۰
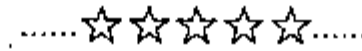
اکابر نور اللہ مراقدہم کا تقویٰ

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کے واقعات

یہ ایسا مشہور اور معروف معمول رہا ہے کہ اس کا احصار مشکل اور اس کے واقعات **لا تعد و لا تحصیٰ** ہیں، میں اپنے اکابر کے متعلق اسی رسالہ میں کسی جگہ چند اشعار لکھوا چکا ہوں، جن کا ایک مصرع ''انہیں کے اتقاء پر ناز کرتی ہے مسلمانی'' حرف بحرف صحیح ہے، اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اس کے واقعات اتنی کثرت سے ہیں کہ ان کا لکھنا تو بڑی ضخیم کتاب کو چاہتا ہے، خود اس رسالہ میں بھی اکابر کے مختلف حالات کے ذیل میں بھی شان اتقاء کا ظہور بہت کثرت سے گزر چکا ہے، حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی نور اللہ مرقدہٗ کے تقویٰ کے واقعات تو نہ معلوم اسی رسالہ میں کتنی جگہ گزرے ہوں گے کہ حضرت مرحوم کا معدہ مشتبہ چیز کو قبول نہیں کرتا تھا، فوراً قے ہو جاتی تھی، اس کی وجہ سے حضرت کے اعزہ واحباب اور جہاں کہیں تشریف لے جاتے میزبانوں کو فکر ہو جاتا کہ کہیں حضرت کے کھانے کے بعد اپنی رسوائی نہ ہو، مشتبہ مال کے سے قے ہو جانے کے متعدد واقعات اپنے بچپن میں گھر کی مستورات سے سننے کی نوبت آتی رہی، تذکرۃ الخلیل میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مولوی نور الحسن صاحب کاندھلوی کے پاس تشریف لے گئے، انہوں نے کچھ دام اپنے صاحبزادے مولوی محمد ابراہیم صاحب کو دیئے کہ خود جا کر ان کا سامان کھانے کے لیے لا دیں تا کہ کچھ گڑ بڑ نہ ہو، کھانا تیار ہوا اس میں فیرینی بھی تھی جس کے کھاتے ہی قے ہو گئی، مولوی نور الحسن صاحب بہت پریشان ہوئے، تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ جو دودھ مولوی محمد ابراہیم صاحب لائے تھے وہ گر گیا تھا، دودھ بادرچی حلوائی کے یہاں سے ادھار میں لے آیا تھا۔

(تذکرۃ الخلیل: ص ۱۰)

از زکریا: مولانا نور الحسن صاحب حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کے قریب ترین ہجد ہیں، مولانا نور الحسن بن مولانا ابو الحسن بن مفتی الٰہی بخش بن مولانا شیخ الاسلام اور حضرت مولانا مظفر حسین صاحب بن مولانا محمود بخش ابن شیخ الاسلام۔

(تاریخ کبیر: ص ۴۱)

مولانا نور الحسن صاحب فراغ تکمیل علوم کے بعد کچھ دنوں سرکاری ملازم رہے، کچھ عرصہ دیوبند، ضلع سہارنپور میں نائب تحصیل دار پھر نکوڑ ضلع سہارنپور میں تحصیل دار رہے، غالباً اسی زمانہ

نکوڑ کا یہ قصہ ہے جیسا کہ بچپن میں کان میں پڑا، خاندان میں اس قسم کا قصہ دودھ جلیبی کا بھی مشہور ہے کہ مولانا نورالحسن صاحب نے ایک سپاہی کو بہت سمجھا بجھا کر اور یہ واضح کر کے کہ کوئی گڑ بڑ نہ کیجئے، ورنہ تیری اور میری دونوں کی ذلت ہوگی، ایک سپاہی کے ہاتھ دودھ جلیبی بازار سے منگوائی اور اس کو بہت ہی بار بار سمجھا دیا تھا کہ ان ہی پیسوں کی لائے، ورنہ میری تیری دونوں کی ذلت فوراً ہو جائے گی، سپاہی کی عقل میں نہیں آئی کہ ذلت کیوں ہوگی، وہ حلوائی سے دودھ جلیبی تو تحصیل دار صاحب کے مہمان کے نام سے مانگ لایا اور پیسے جیب میں رکھ لیے اور دودھ جلیبی کا چمچہ نوش فرماتے ہی شور مچ گیا، سپاہی بیچارے کی عقل میں ہی نہیں آتا تھا کہ ایسی فوری گرفت ہوگی۔
حضرت نوراللہ مرقدہٗ کی طالب علمی کے زمانہ کا قصہ بھی آپ بیتی میں کئی جگہ گزر چکا کہ دہلی کے قیام طالب علمی میں بازار سے کھانے کا نظم تھا، مگر حضرت بغیر سالن کے روٹی کھایا کرتے تھے، اس لیے کہ دہلی کے سالنوں میں بازاری ہوں یا گھریلو اچور کا دستور بہت کثرت سے تھا اور آموں کی بیع قبل از وقت ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوتی ہے، اس لیے حضرت دہلی کے بازار کا سالن نہیں نوش فرمایا کرتے تھے۔

اور ح ثلاثہ میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی روایت سے نقل کیا گیا ہے وہ فرماتے تھے کہ شاہ اسحاق صاحب کے شاگردوں میں تین شخص نہایت متقی تھے، اول درجہ کے مولوی مظفر حسین صاحب، دوسرے درجہ کے شاہ عبدالغنی صاحب اور تیسرے درجہ کے نواب قطب الدین صاحب، اس کے بعد فرمایا کہ ایک مرتبہ نواب قطب الدین خان صاحب نے احباب کی دعوت کی، شاہ اسحاق صاحب نے منظور فرمالی اور مولوی یعقوب صاحب نے بھی مگر مولوی مظفر حسین صاحب نے منظور نہ فرمائی، اس سے نواب قطب الدین خان کو ملال ہوا اور انہوں نے شاہ اسحاق صاحب سے شکایت کی کہ میں نے مولوی مظفر حسین صاحب کی بھی دعوت کی تھی مگر انہوں نے انکار کر دیا شاہ صاحب نے مولوی مظفر حسین پر عتاب فرمایا اور فرمایا، ارے مظفر حسین! تجھے تقویٰ کی بدہضمی ہوگئی، کیا نواب قطب الدین کا کھانا حرام ہے، انہوں نے کہا کہ حاشا وکلا مجھے نواب صاحب پر اس قسم کی بدگمانی نہیں ہے۔

شاہ صاحب نے فرمایا پھر کیوں انکار کرتا ہے، انہوں نے عرض کیا کہ حضرت نواب صاحب نے آپ کی بھی دعوت کی ہے اور مولوی محمد یعقوب صاحب کی بھی اور ان کے علاوہ اتنے اور آدمیوں کی اور آپ کو پالکی میں لے جائیں گے، اس میں بھی ضرور صرف ہوگا اور نواب صاحب گو بگڑ گئے ہیں مگر پھر بھی نواب زادہ ہیں، وہ دعوت میں ضرور نوابانہ تکلف بھی کریں گے اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب مقروض بھی ہیں اور جتنا روپیہ وہ دعوت میں صرف کریں گے وہ ان

کی حاجت سے زائد بھی ہے تو یہ روپیہ وہ اپنے قرض میں کیوں نہیں دیتے، ایسی حالت میں ان کا کھانا کراہت سے خالی نہیں، یہ بات شاہ صاحب کے ذہن میں بھی آگئی اور شاہ صاحب نے فرمایا کہ میاں قطب الدین اب ہم بھی تمہارے یہاں کھانا نہ کھائیں گے۔

اس پر حضرت حکیم الامت تھانوی حاشیہ میں فرماتے ہیں:

''قولہ کراہت سے خالی نہیں، اول کہ وہ اعانت بعیدہ ہے مطل فی اداء القرض کی، کیا دقیق تقویٰ ہے اور اُستاد کیسے مقدس کہ یا تو شاگرد کو تاڑ رہے تھے یا ان ہی کا اتباع کرلیا۔''

(ارواح ثلاثہ: ص ۱۹۱)

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کے متعلق مشہور یہ ہے ''جب وہ کسی سواری کا کرایہ کرتے تو مالک کو چیزیں دکھلا دیا کرتے تھے اگر بعد میں کوئی خط بھی لاتا تو فرماتے کہ بھائی میں نے سارا اسباب مالک کو دکھا دیا ہے اور یہ اس میں سے نہیں، لہٰذا تم مالک سے اجازت لے لو۔''

(جدید ملفوظات: ص ۳۸)

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کا واقعہ

حضرت مولانا الحاج احمد علی صاحب محدث سہارنپوری محشی بخاری شریف کا واقعہ آپ بیتی میں کسی جگہ لکھوا چکا ہوں کہ حضرت کا قیام ہمیشہ کلکتہ رہا، کلکتہ اور اس کے نواح کے لوگ حضرت سے واقف تھے، اس لیے مدرسہ مظاہر علوم کے چندہ کے لیے کلکتہ کا سفر فرمایا اور سفر سے واپسی پر سفر خرچ کا ایک ایک پیسہ کا حساب درج تھا، اس حساب کو میں نے خود بھی نہایت بے غیرتی سے پڑھا کہ جن کے اکابر کی یہ احتیاط ہو ان کے اصاغر کی بے التفاتیاں انتہائی موجب قلق ہیں، اس حساب کہ اخیر میں ایک نوٹ یہ بھی تھا کہ کلکتہ سے فلاں جگہ میں اپنے ایک دوست سے ملنے کی غرض سے گیا تھا، اگرچہ وہاں چندہ اندازہ سے زیادہ ہوا لیکن میرے سفر کی غرض چندہ کی نیت سے جانے کی نہیں تھی اس لیے اتنی مقدارِ سفر کلکتہ سے وضع کرلیا جائے، یہ واقع آپ بیتی میں گزر چکا، اس میں یہ بھی گزر چکا کہ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نور اللہ مرقدہٗ جن کے نام نامی پر مدرسہ کا نام مظاہر علوم ہے، ان کے متعلق لکھوا چکا ہوں مدرسے کے اوقات میں جب کوئی مولانا قدس سرہٗ کا عزیز ذاتی ملاقات کے لیے آتا تو اس سے باتیں شروع کرتے وقت گھڑی دیکھ لیتے اور واپسی پر گھڑی دیکھ کر حضرت کی کتاب میں ایک پرچہ رکھا رہتا تھا، اس پر تاریخوں اور منٹوں کا اندراج فرمالیتے اور ماہ کے ختم پر ان کو جمع فرما کر اگر نصف یوم سے کم ہوتا تو آدھ روز کی رخصت اور اگر نصف یوم سے زائد ہو تو ایک روز کی رخصت مدرسہ میں لکھوا دیتے، البتہ اگر کوئی فتویٰ وغیرہ پوچھنے

آتا تو اس کا اندراج نہیں فرماتے تھے، آپ بیتی حصہ اول میں اس قسم کے بہت سے واقعات گزر چکے ہے، یہاں تو ان واقعات کی طرف اجمالی اشارہ یا دولانے کے لیے کرنا ہے۔

حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق بھی لکھا جا چکا کہ حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ ۳۴ھ میں یک سالہ قیام حجاز کے بعد جب سہارنپور تشریف لائے تو یہ کہہ کر مدرسہ کی تنخواہ بند کردی تھی کہ میں اپنے ضعف وپیری کی وجہ سے مدرسہ کا پورا کام انجام نہیں دے سکتا، مگر اب تک چونکہ مولانا یحیٰی صاحب میری جگہ اسباق پڑھاتے تھے اور تنخواہ نہیں لیتے تھے، وہ میرا ہی کام سمجھ کر کرتے تھے اور میں اور وہ دونوں مل کر ایک مدرس سے زیادہ کام کرتے تھے اب چونکہ ان کا انتقال ہو چکا ہے اور میں مدرسہ کی تعلیم کا پورا کام نہیں کر سکتا اس لیے قبول تنخواہ سے معذور ہوں، یہ بھی آپ بیتی میں گزر چکا ہے کہ حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ اتنے سبق پڑھاتے رہتے اتنے تو مدرسہ کی قالین پر تشریف فرما رہتے تھے، لیکن جب سبق کے بعد اپنے اعزہ میں ذی وجاہت شخص سے بات شروع کی تو قالین سے نیچے اُتر گئے اور فرمایا کہ مدرسہ نے یہ قالین ہمیں سبق پڑھانے کے لیے دیا ہے، ذاتی استعمال کے لیے نہیں۔

اس میں یہ بھی لکھا جا چکا کہ مدرسہ میں حضرت کی چارپائیاں مستقل دور رہتی تھیں، مدرسہ کی چارپائی یا بستر پر میں نے آرام فرماتے یا بیٹھتے نہیں دیکھا یہ بھی گزر چکا کہ مدرسہ کے سالانہ جلسوں میں مدرسہ کے جملہ اکابر حتیٰ کہ جو صاحب مطبخ میں مہمانوں کی دیگیں پکواتے تھے وہ بھی دیگ کا نمک خود نہیں چکھتے تھے، بلکہ کسی مہمان یا طالب علم سے چکھواتے تھے، جملہ اکابر مدرسین منتظمین جو شب وروز مدرسہ کے کام میں ہمہ وقت مشغول رہتے، لیکن مدرسہ کا کھانا تو درکنار مدرسہ کی چائے یا پان بھی یہ حضرات استعمال نہیں کرتے تھے، وہاں یہ بھی لکھا جا چکا کہ ہمارے مدرسہ کے مہتمم مولانا عنایت الٰہی صاحب کے پاس دفتر میں دو قلم دان تھے، ایک مدرسہ کا، دوسرا اپنا ذاتی اور ذاتی قلم دان میں چھوٹے چھوٹے پرچے پڑے رہتے تھے، اپنے گھر یا ذاتی پرچہ کہیں لکھنا ہوتا تو مدرسہ کے قلم دان یا مدرسہ کے کاغذ پر نہیں لکھتے تھے، یہ بھی گزر چکا کہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا کھانا اس زمانہ میں بازار سے آیا کرتا تھا کہ میری والدہ یہاں مستقل مقیم نہیں تھیں اور مدرسہ کا مطبخ اس وقت تک جاری نہیں ہوا تھا، قرب وجوار میں کوئی طباخ کی دُکان بھی نہیں تھی جامع مسجد کے بازار میں مسجد کے سامنے محمد اسماعیل نامی طباخ کے یہاں سے کھانا آتا تھا جو شام کو مدرسہ آتے آتے بالکل جم جاتا تھا، میرے والد صاحب سالن کے برتن کو مدرسہ کے حمام کے قریب حمام سے باہر رکھ دیتے تھے اور جب نیم گرم ہو جاتا تو نوش فرما لیا کرتے تھے، اس پر دو تین روپے ہر ماہ چندہ کے نام سے اس دور کی آگ کے انتفاع کی وجہ سے دیا کرتے تھے۔

حضرت گنگوہی کے واقعات

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ اپنے معاملہ میں آپ کا تقویٰ اور احتیاط اس قدر تھا کہ مسئلہ مختلف فیہا میں قول راجح پر اقرب الی الاحتیاط کو اختیار فرمایا کرتے تھے، باوجود ضرورت کے احتیاط کو ہرگز نہیں چھوڑتے تھے، آپ کی احتیاط کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ آپ اپنے امراض میں کیسا ہی شدید مرض کیوں نہ ہوا کبھی بیٹھ کر نماز نہیں پڑھی، مرض الموت میں جب تک اس قدر حالت رہی کہ دو آدمیوں کے سہارے سے کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکے اس وقت تک اسی طرح پڑھی کہ دو آدمیوں نے بمشکل اُٹھایا اور دونوں جانبوں سے کمر میں ہاتھ ڈال کر لے کر کھڑے ہوگئے اور قیام و رکوع و سجود انہیں کے سہارے سے نماز ادا کی، ہر چند خدام نے عرض کیا کہ حضرت بیٹھ کر نماز ادا کر لیجئے مگر نہ کچھ جواب دیا نہ قبول فرمایا، ایک روز مولوی محمد یحییٰ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اگر اس وقت بھی جائز نہیں تو پھر وہ کون سا وقت اور کون سی حالت ہوگی جس میں بیٹھ کر نماز پڑھنا شرعاً جائز ہے، آپ نے فرمایا ''قادر بقدرۃ الغیر تو قادر ہوتا ہے اور جب میرے دوست ایسے ہیں مجھ کو اُٹھا کر نماز پڑھاتے ہیں تو میں کیونکر بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہوں۔'' آخر جب نوبت ضعف اس قدر پہنچ گئی کہ دوسروں کے سہارے بھی کھڑے ہونے کی قدرت نہ رہی تو اس وقت چند وقت کی نمازیں آپ نے بیٹھ کر پڑھیں، گویا بتلا دیا کہ اتباع شرع اس کو کہتے ہیں تقویٰ اس کا نام ہے اختیار احوط اسی طرح ہوتا ہے۔ (تذکرۃ الرشید: ص۶۴ / ج۲)

مفتی محمود صاحب نے بروایت اپنے والد صاحب حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی کا ایک اور واقعہ بیان فرمایا ''نزول آب کے وقت حضرت سے آنکھ بنوانے کے لیے عرض کیا گیا تو آپ نے انکار فرما دیا۔''

ایک ڈاکٹر صاحب نے وعدہ کیا ''حضرت کی کوئی نماز قضا نہ ہونے دوں گا، فجر اول وقت اور ظہر آخر وقت میں پڑھ لیں، البتہ چند روز تک سجدہ زمین پر نہ فرمائیں، اونچا تکیہ رکھ کر اس پر کر لیں۔''

اس پر ارشاد فرمایا:

''چند دن کی نماز تو بہت ہوتی ہیں، ایک سجدہ بھی اس طرح گوارا نہیں، کسی خادم نے عرض کیا کہ حضرت درس حدیث دیتے تھے اب یہ فیض بند ہوگیا، آنکھ بنوانے سے پھر یہ فیض جاری ہو جائے گا۔''

اس پر ارشاد فرمایا:

''اس میں میرے کسی عمل کو کیا دخل ہے جب تک قدرت نے چاہا جاری رہا جب چاہا بند ہوگیا''

پھر کسی نے عرض کیا کہ حضرت اس میں حرج کیا ہے، فرمایا ''حدیث شریف میں بصارۃ سلب ہونے پر جنت کی بشارت ہے، مجھ کو یہ نعمت ملی ہے میں اس کو کیوں ضائع کروں چنانچہ اخیر تک آنکھ نہ بنوائی۔''

مفتی محمود صاحب نے ایک اور واقعہ بروایت مولوی منفعت علی صاحب وکیل بیان کیا کہ سخت ترین گرمی اور لُو کا زمانہ تھا، رمضان المبارک کا مہینہ تھا حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کی طبیعت ناساز چل رہی تھی پیچش کی شدید تکلیف تھی، حضرت نے کئی روز تک دوا سے افطار پر قناعت کی کوئی غذا نہیں کھائی، جمعہ کا دن آیا، مولوی عبداللہ جان وکیل بھی مدرسہ جمعہ پڑھنے کے لیے آئے انہوں نے دیکھا کہ چہرہ نہایت پژمردہ ہے اور ضعف ونقاہت کے آثار نمایاں ہیں تو یہ حالت دیکھ کر ستون کے پیچھے ہو کر رونے لگے، مولانا حافظ عبداللطیف صاحب (ناظم مدرسہ مظاہر علوم) نے عرض کیا کہ حضرت کا کئی روز سے فاقہ ہے، تکلیف زیادہ ہے، روزہ قضا فرمادیتے آخر فقہاء نے رخصت لکھی ہی ہے اور مولوی عبداللہ تو رو رہے ہیں، حضرت قدس سرہٗ کا چہرہ فوراً متغیر ہو گیا اور فرمایا کہ حافظ صاحب کیسی بات کہتے ہیں، ارے روزہ! اور پھر رمضان کا روزہ، پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ مقلب القلوب ہیں کہ مولوی عبداللہ جان جیسا کوہ وقار انسان بھی متاثر ہو جائے۔

ایسے ہی واقعات کے متعلق میرے اس رسالہ میں اپنے اکابر کے متعلق کئی دفعہ گزر چکا ہے۔

انہیں کے اتقاء پر ناز کرتی ہے مسلمانی

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو حدیث کا درس اپنے یہاں گنگوہ میں جاری کر رکھا تھا وہ سب توکل پر تھا، چنانچہ وہ درس جب بند ہوا کیونکہ مولانا کی بینائی جاتی رہی تھی تو اس کے بعد جب کبھی باہر سے بڑی بڑی رقمیں آئیں تو مولانا نے سب واپس کر دیں کہ اب درس نہیں رہا، بعض بعض لوگوں نے مولانا کو رائے بھی دی کہ حضرت واپس کیوں کی جائے، صاحب رقم سے کسی دوسرے مصرف خیر کی اجازت لے کر اس میں صرف فرما دیجیے گا، حضرت مولانا نے فرمایا ''میں لوگوں سے کیوں اجازت لیتا پھروں۔''

پھر حضرت حکیم الامت نے فرمایا: ''مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانہ میں گنگوہ کی جامع مسجد تعمیر ہو رہی تھی، لوگوں نے ایک بار نواب محمود علی خان کو بھی لکھوایا انہوں نے مولانا کی خدمت میں تحریر فرمایا کہ آپ اپنے کسی آدمی سے تخمینہ کرا کر مجھ کو مطلع کر دیجیے، حضرت مولانا نے اپنی آزادمزاجی سے صاف تحریر فرما دیا میرے پاس کوئی آدمی نہیں اگر آپ کو تخمینہ کرانا ہے تو کسی انجینئر کو بھیج کر تخمینہ کرا لیجیے اور انتظام کے لیے اپنا کوئی کارندہ بھیج دیجیے۔''

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''مولانا کا یہی مذاق تھا اور سب مقتداؤں کا یہی ہونا چاہیے۔'' (افاضات: ص ۱۳۶ ر ج ۱۰)

مولانا محمد منیر صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کا واقعہ

حضرت مولانا محمد منیر صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند، ایک مرتبہ وہ مدرسہ کے ڈھائی سو روپے لے کر مدرسہ کی سالانہ روداد طبع کرانے کے لیے دہلی تشریف لے گئے، اتفاق سے روپے چوری ہو گئے، مولوی صاحب نے اس چوری کی کسی کو اطلاع نہیں کی اور مکان آ کر اپنی کوئی زمین وغیرہ بیچ کی اور ڈھائی سو روپے لے کر دہلی پہنچے اور کیفیت چھپوا کر لے آئے، کچھ دنوں بعد اس کی اطلاع اہلِ مدرسہ کو ہوئی، انہوں نے مولانا گنگوہی کو واقعہ لکھا اور حکمِ شرعی دریافت کیا، وہاں سے جواب آیا کہ مولوی صاحب امین تھے اور روپیہ بلا تعدی کے ضائع ہوا ہے اس لیے ان پر ضمان نہیں، اہلِ مدرسہ نے مولانا محمد منیر صاحب سے درخواست کی کہ آپ روپیہ لے لیجئے اور مولانا کا فتویٰ دکھلا دیا، مولوی صاحب نے فتویٰ دیکھ کر میاں رشید صاحب نے فقہ میرے ہی لیے پڑھا تھا اور کیا یہ مسائل میرے ہی لیے ہیں ذرا اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر تو دیکھیں اگر ان کو ایسا واقعہ پیش آتا تو کیا وہ بھی روپیہ لے لیتے، جاؤ لے جاؤ اس فتویٰ کو، میں ہرگز دو پیسے بھی نہ لوں گا۔

(اوراحِ ثلاثہ: ص ۴۳۰)

مالِ وقف میں احتیاط اور اس کے چند واقعات

آپ بیتی نمبر ۱ میں اعلیٰ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کا ارشاد نقل کرا چکا ہوں اور حضرت کا بہت مشہور مقولہ ہے کہ مجھے مدرسہ کی سرپرستی سے جتنا ڈر لگتا ہے اتنا کسی سے نہیں لگتا، اگر کوئی شخص کسی کے یہاں ملازم ہو وہ مالک سے کام میں کچھ کوتاہی کرے، خیانت کرے، کسی قسم کا نقصان پہنچائے ملازمت سے علیحدہ ہوتے ہوئے یا مرتے وقت مالک سے معاف کرا لے تو معاف ہو سکتا ہے، لیکن مدرسوں کا روپیہ جو عام غرباء اور مزدوروں کے دو، دو پیسے، ایک ایک آنے کا چندہ ہوتا ہے، ہم سرپرستانِ مدرسہ اس کے مالک تو ہیں نہیں امین ہیں اگر اس مال کے اندر افراط و تفریط ہو تو ہم لوگوں کے معاف کرنے سے معاف ہو تو نہیں سکتا، اس لیے کہ دوسرے کے مال میں ہم کو معافی کا کیا حق ہے، اتنا ضرور ہے کہ ہم اگر بمصالحِ مدرسہ چشم پوشی کریں تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ ہم سے درگزر فرما لے لیکن اگر اپنے ذاتی تعلقات سے ہم لوگ تسامح کریں تو ہم بھی جرم کے اندر شریک ہیں، لیکن جرم کرنے والے سے کسی حال میں بھی معاف نہیں ہو سکتا کہ حقوق العباد ہے اور جن کا مال ہے وہ اتنے کثیر کہ ان سے معاف نہیں کرایا جا سکتا۔

آپ بیتی نمبر۱ میں یہ بھی گزر چکا کہ اپنی جوانی میں اس ناکارہ نے حضرت مولانا الحاج عنایت الٰہی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی ساری عمر مدرسہ کے ساتھ انتہائی جانفشانی بیک وقت تدریس، افتاء، تحصیل چندہ شہر اور عدالتی کارروائیوں کے ساتھ کہ جن کے لیے آج کل مستقل چار آدمی کام کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ مدرسہ کی دوسری ضروریات بھی انجام فرماتے رہتے تھے اور اپنے ضعف و پیری میں اس قدر معذور ہو گئے کہ گھر سے صبح کو ڈولی میں بیٹھ کر آیا کرتے تھے اور سارے دن مدرسہ کے کاموں میں مشغول رہتے تھے، دوپہر کو کوئی گھر سے کھانا لا دیتا تو دفتر کے کونے میں بیٹھ کر ٹھنڈا ہی کھا لیا کرتے، ان تمام امور کے پیش نظر میں نے یہ تحریک کی تھی کہ حضرت مہتمم صاحب کے لیے ان کی حسنِ کارگذاری کے ذیل میں کوئی معمولی سی پنشن مدرسہ سے ہو جائے۔

سب سے پہلے تو ہمارے مدرسہ کے ناظم حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے میری تجویز کی مخالفت کی، میں نے گستاخانہ عرض کیا کہ جناب کو یہ وقت پیش آنے والا ہے استاذی حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''ایسی نوبت آئی تو میں تو پانوں کی دُکان لے کر دار الطلبہ کے قریب بیٹھ جاؤں گا'' اور حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ سرپرست مدرسہ نے میری تجویز پر تحریر فرما دیا تھا کہ مدرسہ کے موجودہ چندہ سے پنشن دی جا سکتی ہے، مہتمم صاحب کے متعلق تم نے جو لکھا، بالکل صحیح ہے میں ذاتی طور سے خوب واقف ہوں ان کے لیے جو تم مناسب سمجھو تنخواہ تجویز کر کے مخصوص احباب سے چندہ مقرر کرا لو، پانچ روپے ماہانہ میں اپنی ذات سے دوں گا مال وقف کے سلسلہ میں اس نوع کے بہت سے واقعات آپ بیتی نمبر۱ میں گزرے ہیں، خود حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے حالات زندگی میں بھی اس قسم کے بہت سے واقعات بہت ہی کثرت سے ملتے ہیں، اشرف السوانح میں لکھا ہے کہ حضرت والا کی خصوصیات خاصہ میں سے یہ ہے کہ اگر کبھی تھوڑا سا بھی مسجد کا گرم پانی وضو سے بچ جاتا تو اس کو بھی وہ سقاوہ ہی میں جا کر ڈال آتے ہیں تا کہ مسجد کا اتنا سا مال بھی ضائع نہ جائے۔ (اشرف السوانح: ص۲۳۸ رج ۲)

دوسری جگہ لکھا ہے کہ اگر منی آرڈر کے کوپن پر کوئی مضمون نہیں ہوتا یا مبہم مضمون ہوتا ہے جس سے بھیجی ہوئی رقم کا مصرف یا اور کوئی ضروری جزء صاف طور پر واضح نہیں ہوتا تو حضرت والا اس کو واپس فرما دیتے ہیں اور اس پر سبب واپسی بھی تحریر فرما دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کوپن میں یہ بھی لکھا ہوا ہوتا ہے کہ اس رقم کے متعلق جداگانہ عریضہ بھیجا جا رہا ہے تب بھی واپس فرما دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر خط کے انتظار میں رقم وصول کر لی گئی اور پھر خط کے مضمون کو پڑھ کر وہ رقم قابلِ واپسی سمجھی گئی تو پھر علاوہ امانت رکھنے کی ذمہ داری کے واپسی میں بڑی دقت اور مزید صرفہ ہے پہلے حضرت والا رقم وصول فرما کر خط کا انتظار فرمایا کرتے تھے لیکن جب اس میں گونا گوں خلجانات پیش آئے

تب واپسی کا معمول مقرر فرمالیا۔ (اشرف السوانح: ص ۲۳۸ رج ۲)

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے اس قانون پر عمل کرانے کو تو میرا بھی بہت جی چاہتا ہے، بعض دفعہ لوگ منی آرڈر بھیج دیتے ہیں اللہ کے بندے کوپن میں کچھ نہیں لکھتے اور بعض کو پنوں پر یہی لکھا ہوا ہوتا ہے کہ خط آرہا ہے اور وہ نہیں پہنچتا تو اس امانت کی حفاظت میں بہت دقتیں اُٹھانی پڑتی ہیں کئی کئی مرتبہ جوابی خط لکھنے پڑتے ہیں اور ان کا بھی مرسل کی مصالح سے جواب نہیں ملتا، بعض مرتبہ ایک سال بعد یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ رقم مدرسہ کی تھی اور چونکہ تبلیغی احباب بھی یہاں کثرت سے آتے رہتے تھے اس لیے اتنے ان کے منی آرڈروں کی تحقیق کی جائے، مرسل الیہ اپنے تبلیغی سفروں میں آگے چلے جاتے ہیں جن کو پہنچانے میں بڑی دقت اٹھانی پڑتی ہے، لوگ منی آرڈر واپس کر دینے پر ناراضی کا اظہار تو کرتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے ذرا سے تساہل پر کہ وہ کوپن پر تفصیل نہیں لکھتے، ہم لوگوں کو کتنی دقتیں اٹھانی پڑتی ہیں، حضرات تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے حالات میں تو جو حضرت کی سوانح اور دوسرے رسائل میں کثرت سے ذکر کیے گئے ہیں، ایک واقعہ میں چونکہ اس ناکارہ کی بھی شرکت ہے اس کو ضرور لکھواتا ہوں۔

افاضات یومیہ میں لکھا ہے کہ والد مرحوم نے چار نکاح کیے اس وقت عام دستور تھا، معافی مہر کا، اس لیے اس طرف کبھی التفات نہیں ہوا، مگر ایک بار دفعۃً تنبہ ہوا اور اس عام عادت پر قناعت نہ ہوئی، اس بناء پر میرے حصہ پر شرعی مسئلہ کی رو سے جو رقم بیٹھی تھی اس کو تقسیم کرنے کا انتظام کیا، اس لیے کہ وہ جائیداد تو والد صاحب کی ہم ہی لوگوں کو پہنچی، اسی ترکہ میں یہ دین مہر بھی ہونا چاہیے اس لیے فرائض صرف مناسخہ کی اجرت میں مجھ کو چودہ روپے دینے پڑے اور تقریباً سال بھر کے عرصہ میں ورثاء کی تحقیق کی، کوئی مکہ معظمہ ہے کوئی مدینہ منورہ میں، کوئی کلکتہ میں، کوئی لاہور میں، غرض الحمد اللہ بعد تحقیق سب کو رقمیں پہنچادی گئیں، غالباً آٹھ سو روپیہ سے کچھ کم یا زائد میرے حصہ پر رقم بیٹھی جس میں سے صرف دو جگہ باقی ہیں، جہاں ابھی رقمیں پہنچیں، بمبئی اور مکہ معظمہ (جو بعد میں وہاں بھی پہنچ گئی، جامع) ورثاء کے حصص میں بعض بیچاروں کے حصہ پر ایک ہی پیسہ آیا، بعض کے حصہ پر دو ہی پیسے آئے کاندھلہ میں بڑے بڑے معزز متمول لوگ ہیں، بعض کے حصہ پر قلیل پیسے آئے، مگر میری درخواست پر کسی نے قبول کرنے سے انکار نہیں کیا مجھ کو بڑی ہی مسرت ہوئی کہ انہوں نے قبول فرمایا، اس خیال سے نہ تو معاف کیا کہ میری دل آزاری اور دل شکنی ہوگی، ما شاء اللہ کیا ٹھکانہ ہے ان کی سمجھ کا اور شرافت کا۔

افاضات ۲/۷ ص ۳۴۶ میں نے اس ملفوظ کے شروع میں ایک لفظ لکھوایا کہ اس واقعہ میں میری بھی شرکت ہے، اس کی شرح یہ ہے کہ حضرت قدس سرہٗ نے کاندھلہ کے ورثاء کی رقم کی تقسیم اس

ناکارہ کے حوالہ کی خود ہی کاندھلہ محض اسی کام سے گیا تھا، دو تین دن قیام کیا اور سب حضرات سے وصول کے دستخط لے کر اصل کاغذ تو حضرت کی خدمت میں بھیج دیا، لیکن اس تقسیم کے کارڈ کے ساتھ جو والا نامہ میرے نام آیا تھا، اس میں فرمایا تھا کہ بہت اہم تکلیف دیتا ہوں، حرج تو ہوگا، وہ والا نامہ میرے کاغذات میں کہیں ہوگا، اس ناکارہ کے حصہ میں جہاں تک یاد ہے دو پیسے آئے تھے، یہ ناکارہ اپنے اکابر کی شان میں بہت ہی گستاخ رہا، اللہ تعالیٰ ہی معاف فرمائے، ایک دفعہ اس سیہ کار نے حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ سے عرض کیا کہ آپ کی جلالتِ شان کی وجہ سے کوئی کہہ سکے یا نہ کہہ سکے لیکن مدرسہ کی تنخواہ کے ساتھ یہ اسفار کی کثرت بہت سوں کے لیے موجب اشکال ہے۔ حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ نے وہ شرائط نامہ جو مولانا انور شاہ صاحب کی تشریف بری اور حضرت شیخ الاسلام کی دار العلوم میں ابتدائی تقرر کے وقت طے ہوا تھا، مجھے مرحمت فرمایا کہ آپ اسے پڑھ لیجیے، اس میں تو واقعی اتنی وسعت تھی کہ حضرت قدس سرہٗ کے اسفار اس کے مقابلہ میں بہت کم ہوتے تھے جتنی ممبران کی طرف سے حضرت کو اجازت دی گئی، وہ وقت ہی ایسا تھا کہ دار العلوم کی موت و حیات حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی آمد پر موقوف تھی، کانگریسی اخبارات اور رسائل جو دار العلوم کی مخالفت میں بہت زوروں پر تھے، حضرت شیخ الاسلام کی تشریف آوری پر ایسے ساکت ہوئے کہ پھر کوئی مخالفت کی زوردار آواز نہیں نکلی، البتہ بعض حضرت کے مخالفین کی طرف سے چندہ کی کمی وغیرہ کے الزامات قائم کیے گئے مگر حضرت قدس سرہٗ نے دار العلوم کے چندہ میں جو مساعی جمیلہ اس وقت فرمائی ہیں، وہ اس ناکارہ کو خوب معلوم ہیں، ہر سفر میں بڑی بڑی رقمیں حضرت لے کر آتے تھے اور دار العلوم میں غلہ اسکیم کے سالانہ جلسہ کی بنیاد بھی حضرت نور اللہ مرقدہٗ ہی نے ڈالی تھی۔

اس سیہ کار نے ایک مرتبہ اپنے چچا جان قدس سرہٗ سے بھی اپنی گستاخانہ حرکات میں یہ عرض کیا کہ تبلیغ کے سلسلہ میں جو رقوم آتی ہیں وہ تنہا آپ کی رائے پر تقسیم ہوتی ہیں، اس کا کوئی ضابطہ ہونا چاہیے، کوئی معیار ضرور تجویز ہونا چاہیے، میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا تھا کہ میں تبلیغ کے نام سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتا، دینے والوں پر اصرار کرتا ہوں کہ تم اپنی رائے اور اپنے ہاتھ سے خرچ کرو اور مشورہ مجھ سے کرو، لیکن جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ رقم تمہاری ذاتی رائے پر ہے، چاہے اپنے اوپر خرچ کرو اہل وعیال پر چاہے کسی مبلغ پر ایسی رقم میں قبول کرتا ہوں، اس کے لیے کسی ضابطہ کی ضرورت نہیں، میں نے عرض کیا کہ میرا اشکال تو ختم ہوگیا، چونکہ یہ ناکارہ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے ہر مشورہ میں شریک رہتا تھا اور بعض قدیم لوگوں کو کم ملتا تھا اور مؤلفۃ القلوب کو زیادہ، اس لیے اس سیہ کار کو اشکال پیش آیا تھا۔

فصل نمبر۱۱

اُمراء کے ساتھ تعلق

امراء کے ساتھ تعلق بھی میرے اکابر کا بہت ہی عجیب اور قابل اقتداء رہا، تملق اور تعلق میں ایسا بین فرق محسوس ہوتا تھا، جس کو ہر شخص ذرا سے تامل سے سمجھ لیتا تھا، حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں امراء سے تعلق کو منع نہیں کرتا تملق کو منع کرتا ہوں علماء کو خصوصیت کے ساتھ اسی سے اجتناب کی ضرورت ہے اور یہ اس وجہ سے کہ دین اور اہل دین کی تحقیر نہ ہو۔

(افاضات:۲/۶ص۲۱۶)

میرے رسائل میں سے کسی رسالہ میں مالداروں کی طرف ان کے مال کی وجہ سے اور لالچ کی وجہ سے جھکنے کی وعیدیں بھی گزر چکی ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے جو بروایتِ ابن مسعود رضی اللہ عنہما نقل کیا گیا ہے ''جو شخص کسی غنی کے سامنے جھکے یا اس کے سامنے اپنے نفس کو ذلیل کرے، اس کی بڑائی کی وجہ سے یا اس کے مال میں طمع کی وجہ سے تو دو ثلث مروت (دینی وقار) جاتی رہتی ہے اور نصف دین بھی جاتا رہتا ہے''۔ ایک دوسری روایت میں آیا ہے ''جو کسی غنی کے پاس جائے اور اس کے سامنے ذلت کا اظہار کرے تو اس کے دین کا دو حصہ جاتا رہتا ہے''۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے ''جو کسی غنی کے سامنے اس کے لیے جھکے کہ اس کے مال سے کچھ پہنچے تو اس نے اللہ کو ناراض کیا''۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے:

''جو کسی غنی کے سامنے اس لیے جھکے کہ اس کے زائد مال کو حاصل کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے اعمالِ حسنہ کو ضائع فرما دیتے ہیں''۔ ان اخیر کی دونوں حدیثوں کو لوگوں نے ضعیف بتایا ہے، بلکہ علامہ ابنِ جوزی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تو موضوع بتایا ہے مگر پہلی روایت سے ان کو تقویت حاصل ہے اس لیے معنی میں کوئی اشکال نہیں، الفاظ حدیث میں کلام ہوسکتا ہے، علامہ سخاوی نے مقاصد حسنہ میں ان روایات کو مع حوالہ کتب نقل کیا ہے۔

حضرت حکیم الامت کا ارشاد امراء کے پاس اپنی حاجت لے جانا خلافِ شان عالم ہے یہ بہت ظاہر ہے لیکن اپنے آپ کو اتنا ان سے کھینچنا کہ باوجود اصرار اور قدردانی اور علم کی حق شناسی کے کبھی ان کی فرمائش پوری نہ کرنا یہ بھی محمود نہیں یہ دعویٔ تقدس اور تکبر ہے جس میں بہت سے علماء مبتلا ہیں۔

محققین کا قول ہے ''نعم الامیر علیٰ باب الفقیر و بئس الفقیر علیٰ باب الامیر''

اسی کے متعلق حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے ''جب امیر تمہارے دروازے پر آئے تو اس کی عزت کرو، وہ اس وقت صرف امیر نہیں نعم الامیر ہے اس کے نعم کی تعظیم ہے، ہاں یہ درست ہے کہ ان سے اپنی کوئی حاجت نہ مانگے''۔ (مجالس الحکمۃ: ص ۵۵)

حضرت حکیم الامت نے جو اپنی ضرورت پیش کرنے کے متعلق لکھا ہے وہ اہم ہے، اپنی ذاتی اغراض مراد ہیں دینی ضرورت یا دینی مصلحت سے ملاقات تو اس میں وہ داخل نہیں، خود حکیم الامت اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ امراء سے ملنا قبیح لغیرہ ہے یعنی خوشامد اور سکوت عن الحق اور مداہنت فی الدین اور اشتغال لا یعنی اور حب مال و جاہ اور احتیاج الی غیر اللہ وغیرہ کو مستلزم ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے اور اگر یہ مفاسد نہ ہوں خواہ امیر کی طرف سے کہ وہ دیندار اور ان مفاسد سے پرہیزگار ہو یا جانے والے کی طرف سے کہ وہ اس قدر قوی النفس ہو کہ ان مفاسد سے بچ سکے یا اور کسی وجہ سے ان بلیات سے حفاظت ہو سکے تو کچھ حرج نہیں اور اگر کوئی ضرورت دینی ہو کہ خود امیر کی اصلاح کی امید ہو یا اور کوئی ایسی ہی ضرورت دینی داعی ہو تو امیر کے پاس جانا مستحسن ہے، یہاں سے بہت سے اہل اللہ کے متعلق شبہات رفع ہو جاتے ہیں جن سے امراء سے ملنا ثابت ہے۔ (مجالس الحکمۃ: ص ۵۵)

حضرت شاہ اسحاق کا واقعہ

استاذ الاساتذہ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق ارواحِ ثلاثہ میں لکھا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے ایک رزیڈینٹ ملنے آیا کرتا تھا، شاہ صاحب اس کے لیے مونڈھا بچھوا دیتے تھے جو نذرانہ پیش کرتا تھا، شاہ صاحب موسم کا کوئی پھل اس کے پاس بھجوا دیتے تھے جب شاہ صاحب کی وفات ہوگئی تو سب نے مل کر صدر حضرت شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو مقرر کیا اور ان کو نذرانہ دیتے تھے حتیٰ کہ سید صاحب بھی جلالت قدر نذر پیش فرماتے، شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مدرسہ میں پڑھا رہے تھے کہ رزیڈینٹ آیا لیکن شاہ صاحب نے اس کو نہ دیکھا نہ ان کی مجلس میں کوئی تغیر آیا، شاہ صاحب ہمیشہ نگاہ نیچی رکھتے تھے، بعض کو تمنا تھی کہ شاہ صاحب کی آنکھیں جو بہت خوبصورت تھی دیکھیں مگر تمام عمر نہ دیکھ سکے، غرض رزیڈینٹ مدرسہ میں آیا اور ٹہلتا رہا، جب درس ختم ہوا تو شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس بوجہ پتلون کے ٹانگ پھیلا کر وہیں چٹائی پر بیٹھ گیا تھوڑی دیر میں رخصت ہونے لگا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے، شاہ صاحب مرحوم آپ کے لیے کچھ ہدیہ بھجوایا کرتے تھے، مگر میرے پاس کچھ ہے ہی نہیں کہ بھجواتا، جب رزیڈینٹ چلا گیا تو بعض مسلمانوں ہی نے یہ کہہ کر شاہ صاحب کی

طرف سے بدظن اور مشتعل کرنا چاہا کہ دیکھئے وہ حضرت سے کیسی بے التفاتی سے پیش آئے وہ متکبر ہو گئے ہیں، اس پر ریذیڈینٹ نے اسے ڈانٹا کہا خاموش، میں اس شاہ صاحب کا امتحان لینے گیا تھا کہ وہ اتنی دنیا پر بیٹھ کر دنیا سے کتنا مستغنی ہے حضرت تھانوی حاشیہ پرتحریر فرماتے ہیں کہ دونوں حضرات کے معمول کا تفاوت نیت اور مصالح کے اختلاف سے ہے اور چونکہ مبنیٰ اس دوسرے معمول کا بھی اخلاص پر تھا اس لیے رزیڈینٹ پر اس کا کیسا پسندیدہ اثر پڑا۔

(اورح ثلاثہ:ص ۱۱۹)

مدرسہ مظاہر علوم میں بھی بسا اوقات کلکٹر وغیر اپنی انتظامی مصالح سے آتے رہتے تھے، میں نے اپنے حضرت قدس سرہٗ کو کبھی مدرسہ کے دروازے تک یا اس کے اندر آنے پر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے نہیں دیکھا، حضرت مہتمم صاحب نور اللہ مرقدہٗ اور ان کے ساتھ ایک آدھ مدرس اور منتظم دفتر باہر ہی نمٹ لیتا تھا۔ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کا قصہ مشہور ہے کہ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے سفرِ حجاز سے چھ ماہ قبل سر جیمس مسٹن لفٹیننٹ گورنر ممالک متحدہ دار العلوم میں رونق افروز ہوئے تو حضرت شیخ الہند شریک جلسہ نہ ہوئے اور اپنے مکان پر رہے۔ (حیات شیخ الہند:ص ۱۵۲)

حضرت حاجی صاحب کا ارشاد

امداد المشتاق میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں ''حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی بہت خاطر داری کرتے تھے اور وجہ اس کی یہ فرماتے تھے ''نعم الامیر علی باب الفقیر ''یعنی جو امیر فقیر کے دروازے پر جائے وہ بہت اچھا ہے، پس جو کوئی امیر آپ کے دروازے پر آیا تو اس میں امارت کے ساتھ ایک دوسری صفت بھی پیدا ہو گئی، یعنی نعم کی پس اس صفت کی عظمت کرنی چاہیے۔ لہٰذا بداخلاقی کی اجازت نہیں۔'' (امداد المشتاق:ص ۲۱۷)

حضرت گنگوہی کی شان استغناء اور اس کے چند واقعات

معمولات کی پابندی میں حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا ایک مقولہ نقل کیا گیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت گنگوہی کی اور شان تھی، کوئی بیٹھا ہو جب وقت اشراق کا یا چاشت کا آیا وضو کر کے وہیں نماز پڑھنے کھڑے ہوئے، یہ بھی نہیں کہ کچھ کہہ کر اٹھے کہ میں نماز پڑھ لوں یا اٹھنے کی اجازت لیں، جہاں کھانے کا وقت آیا لکڑی لی اور چل دیے، چاہے کوئی نواب ہی کا بچہ بیٹھا ہو وہاں یہ شان تھی جیسا بادشاہوں کی شان تھی، ایک تو بات ہی کم کرتے تھے اور اگر کچھ مختصر سی بات کہی تو جلدی سے ختم کر کے تسبیح لے کر اس میں

مشغول ہو گئے، کسی نے کوئی بات پوچھی تو جواب دے دیا اور اگر نہ پوچھی تو کوئی گھنٹوں بیٹھا رہے، انہیں کچھ مطلب نہیں۔ (حسن العزیز: ص۴۹۵ ج۱)

یہ بات استغناء سے پیدا ہو سکتی ہے بہت ہی تجربہ ہوا کہ جہاں بھی استغناء جتنے زور سے ہوا اتنے ہی لوگوں پر ہیبت پائی، حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدۂ اپنے پہلے نکاح کا قصہ یاد یاراں میں تحریر فرماتے ہیں: ''جب اس احقر کا گنگوہ میں نکاح ہوا غالباً ۱۲۹۸ھ تھا، والد صاحب مرحوم کی درخواست پر شیخ غلام محی الدین مرحوم رئیس اعظم چھاؤنی میرٹھ کے والد مرحوم ان کی ریاست میں مختار تھے، شادی میں شامل ہونے کے لیے میرٹھ سے تشریف لائے تھے اور گنگوہ بھی تشریف لے گئے تو شیخ غلام محی الدین صاحب مرحوم بھی ساتھ ہو لیے، ایک موقع پر خود احقر سے بیان فرمایا ''میں نے بہت سے بزرگ دیکھے، بڑے بڑے حکام سے ملا اور بات چیت کی، لیکن جو رعب و ہیبت حضرت کی دیکھی کسی میں نہیں دیکھی، یہ حالت تھی کہ بات کرنا چاہتا تھا مگر ہمت نہ پڑتی تھی بڑی مشکل سے اتنی جرأت ہوئی کہ نذر پیش کر سکا'' یہ شیخ صاحب مردم شناسی و عالی حوصلگی میں مسلم و معروف تھے ان کی یہ شہادت ایک باوقعت شہادت ہے۔'' (یاد یاراں: ص۵)

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے واقعات

مکاتیب رشید یہ میں ایک گرامی نامہ ہے، ایک رئیس نے حضرت کی خدمت میں آنے کی درخواست پیش کی اور حضرت کے ایک مخلص کو ساتھ لانے کی، ان مخلص نے حضرت سے ان کے ساتھ آنے کی اجازت چاہی، ان کے جواب میں حضرت تحریر فرماتے ہیں حکیم عبد العزیز خان صاحب السلام علیکم دعاء سے تو دریغ نہیں مگر امراء سے بخدا میرا دل گھبراتا ہے بس وہیں ان کی طمانیت کر دیں، دعاء کرتا ہے، یہاں نہ لائیں، دور دور سے ہی ان کی تسلی رکھیں۔

(مکاتیب: ص۵۹، ۵۲)

تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے مذہب اسلام کا پاس و لحاظ اور کافر و مسلم کا فرق مراتب آپ کی طبعی عادت تھی، ایک مرتبہ عصر کا وقت تھا، حضرت امام ربانی صحن میں چارپائی پر تشریف فرما تھے، سامنے پورب رُخ دوسری چارپائی پڑی تھی، اس پر پائینتی کی طرف آپ کے خادم منشی تفضل حسین صاحب بیٹھے تھے، حضرت تسبیح پڑھ رہے تھے، یکایک آپ نے منشی صاحب سے خطاب فرمایا'' سرہانے کو بیٹھ جاؤ، یہ تکلف سمجھے اور بالحاظ ادب عرض کیا کہ حضرت آرام سے بیٹھا ہوں، اس پر آپ نے جھڑک کر بتاکید فرمایا کہ سرہانے بیٹھو، اس وقت ان کو تعمیل کرنی پڑی، چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک ہندو ساہوکار آیا، خادم کے سر پر مٹھائی کی تھالی تھی اور شاید کچھ نقد بھی تھا، رئیس جب سامنے آیا

تو اس نے جھک کر سلام کیا اور منتظر رہا کہ بیٹھنے کی اجازت ملے، مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی، وہ کھڑا ہی تھا کہ حضرت نے پوچھا، لالہ تمہاری لڑکی کو آرام ہے؟ اس نے عرض کیا کہ حضور کے صدقہ سے بالکل آرام ہے، اس خوشی میں تھوڑی سی مٹھائی خدام کے لیے لایا ہوں، آپ نے فرمایا اس کی کچھ حاجت نہیں، غرض معلوم نہیں کہ آپ نے واپس فرمادی یا وہیں طلبہ کو بانٹ دی، منشی تفضل حسین صاحب فرماتے ہیں، اس وقت سمجھا کہ پائینتی اس بیٹا کے لیے چھڑوائی گئی تھی۔

(تذکرۃ الرشید: ص۱۷۰ ر ج۲)

تذکرۃ الرشید میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے کہ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''جب کسی قوم کا سردار تمہارے پاس آئے تو تم اس کا اکرام کیا کرو'' اس لیے حضرت امام ربانی کی خدمت میں اگر مخالفین کی جماعت میں سے کوئی بڑا شخص آتا تو اکرام میں مطلق پہلو تہی نہ فرماتے تھے، مگر باوجود اس کے امر متنازع فیہ میں مداہنت ممکن نہ تھی کہ ذرہ برابر بھی ظاہر ہو۔

ایک مرتبہ مولوی عبدالسمیع صاحب کسی تقریب میں گنگوہ گئے اور حضرت کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تو آپ نہایت خلق کے ساتھ ملے اور فرمایا کہ آج کسی وقت کا کھانا میرے یہاں کھائیے حالانکہ یہ زمانہ وہ تھا کہ مولوی صاحب انوار ساطعہ لکھ چکے تھے اور ادھر سے بہ تصدیق امام ربانی اس کا جواب شائع ہوگیا تھا۔ (براہین قاطعہ شائع ہوگیا تھا) پس اب درجہ تھا اکرام ضیف اور اکرام امیر قوم کا سو اس کو آپ نے اس طرح پورا فرمایا۔ چنانچہ مولوی عبدالسمیع صاحب نے دعوت قبول کی اور حضرت کے مہمان بن کر کھانا کھایا۔ حضرت امام ربانی نے ایک مکتوب میں (بنام حضرت نانوتوی) اس دعوت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ میرا خیال تھا کہ بدعات کا زبانی تذکرہ ہوگا اور خوب خوب جواب دوں گا، مگر مہمان نے اشارۃً بھی کوئی لفظ نہیں کہا، سو میزبان کو کیا لازم تھا کہ یہ ذکر نکال کر مناظرہ کی کوفت میں ڈالیں، اب دیکھئے وہاں جا کر براہین کے جواب کی فکر کرتے ہیں یا نہیں، اگر کچھ لکھا تو پھر وہی جواب۔

(تذکرۃ الرشید: ص۱۸۲ ر ج۲)

مفتی محمود صاحب نے بیان فرمایا: ''ایک مرتبہ ایک کلکٹر گنگوہ آیا اور کسی سے یہ خواہش ظاہر کی کہ شاملی کے میدان میں مولانا گنگوہی نے جہاد کیا، میں ان کی زیارت کرنا چاہتا ہوں'' وہ اپنے بنگلہ سے چلا ادھر حضرت اپنی سہ دری سے اُٹھ کر کمرہ میں تشریف لے گئے اور کواڑ بند کر لیے، کلکٹر آیا اور کچھ دیر سہ دری میں بیٹھا رہا، پھر اُٹھ کر چلا گیا، تب حضرت حجرہ سے باہر تشریف لائے، کچھ مدت کے بعد پھر وہی کلکٹر گنگوہ آیا، بعض خدام نے عرض کیا کہ حکومت دارالعلوم کی طرف سے بہت بد ظن ہے، حضرت! کلکٹر سے ملاقات فرمالیں تو دارالعلوم کے لئے مفید ہے اور خطرات سے حفاظت

کی توقع ہے، فرمایا بہت اچھا، پالکی میں سوار ہوئے، کلکٹر کے بنگلہ پر تشریف لے گئے، علماء عصر بھی اس پالکی کو اُٹھا کر لے جانے والے تھے، جب پالکی بنگلہ پر پہنچی تو کلکٹر خود ہی بنگلہ سے باہر آیا، سامنے آکر مصافحہ کے لیے خود ہی ہاتھ بڑھایا۔ حضرت قدس سرہٗ نے بھی مصافحہ فرمایا، مگر نگاہ نیچی رکھی اُوپر نہیں اُٹھائی اور اس کی صورت نہیں دیکھی، کلکٹر نے کہا ہم کو کچھ نصیحت کرو، حضرت نے فرمایا کہ انصاف کرو، مخلوق پر رحم کرو، یہ کہہ کر پالکی میں سوار ہوئے اور واپس تشریف لے آئے، کلکٹر نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون آدمی تھا؟ ہمارا دل اس کو دیکھ کر کانپ رہا تھا اس کو بتلایا گیا کہ یہ وہی مولانا رشید احمد صاحب ہیں، جن کی زیارت کا آپ کو شوق تھا۔

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ ایک رئیس کی دینداری کے بہت مداح تھے لیکن کبھی ملے نہیں، حضرت علی گڑھ تشریف رکھتے تھے وہ رئیس صاحب ملنے کے لیے آئے جب سنا کہ وہ آرہے ہیں تو علی گڑھ چھوڑ کر چلے گئے ملے نہیں، حضرت مولانا گنگوہی عمر بھر کسی امیر کے دروازے پر نہیں گئے عرض کیا گیا (کسی نے حضرت تھانوی سے عرض کیا) کہ وہ رئیس صاحب تو طالب دین ہو کر آرہے تھے، پھر بھی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے اعراض فرمایا۔ فرمایا کہ ہر بزرگ کی جدا شان ہوتی ہے، طبائع مختلف ہوتی ہیں حضرت مولانا کی طبیعت ہی ایسی واقع ہوئی تھی کہ ان کو امراء سے انقباض ہوتا تھا تکبر تو بڑا، امیر کو بھی حقیر کیوں سمجھے، لیکن اختلاط بھی کیوں کرے کہیں پھنس ہی جاوے، تو پھر بد خلقی نہ کرے۔ (حسن العزیز: ص ۵۴۰ رج ۱)

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمارے حضرت میں یہ خاص بات تھی کہ وہ جامع مراتب اعتدال تھے نہ متکبر تھے نہ تصنع کے متواضع، سادگی کے ساتھ ان میں استغناء کی شان تھی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کسی دینی ضرورت سے ایک مرتبہ ریاست رامپور تشریف لے گئے، نواب صاحب کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا تشریف لائے ہیں، نواب صاحب نے مولانا سے ملاقات کے لیے تشریف لانے کی درخواست کی مگر مولانا تشریف نہیں لے گئے اور یہ عذر فرمایا کہ ہم دیہات کے رہنے والے ہیں، آداب شاہی سے ناواقف نہ معلوم ہم سے کیا گڑ بڑ ہو جائے جو آداب شاہی کے خلاف ہو اس لیے مناسب نہیں، نواب صاحب نے جواب میں کہلا کر بھیجا کہ آپ تشریف لائیں آپ سے آداب کون چاہتا ہے، ہم خود آپ کا ادب کریں گے، ملنے کا بہت اشتیاق ہے، مولانا نے پہلے تو انکسار کا جواب دیا تھا جب اس پر اصرار ہوا پھر ضابطہ کا جواب کہلا کر بھیجا کہ عجیب بات ہے کہ اشتیاق تو آپ کو اور آؤں میں، غرض یہ کہ مولانا تشریف نہیں لے گئے۔

(افاضات: ۱/۶ ص ۵۰)

حضرت نانوتوی نوراللہ مرقدہٗ چھتہ کی مسجد میں حجرہ کے سامنے چھپر میں حجامت بنوا رہے تھے کہ شیخ عبدالکریم رئیس لال کرتی میرٹھ، حضرت مولانا سے ملنے کے لیے دیوبند آئے، مولانا نے ان کو دور سے آتے ہوئے دیکھا جب وہ قریب آئے تو ایک تغافل کے ساتھ رخ دوسری طرف پھیرلیا، گویا کہ دیکھا ہی نہیں ہے وہ آکر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے، ان کے ہاتھ میں رومال میں بندھے ہوئے بہت سے روپے تھے، جب انہیں کھڑے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا تو حضرت مولانا نے ان کی طرف رخ کر کے فرمایا، آہا! شیخ صاحب ہیں مزاج اچھا ہے؟ انہوں نے سلام عرض کیا اور قدم چوم لیے اور وہ روپیہ بندھا ہوا قدموں میں ڈال دیا، حضرت نے اسے قدموں سے الگ کر دیا، تب انہوں نے ہاتھ باندھ کر بمنت قبول فرمالینے کی درخواست کی، بالآخر بہت سے انکار کے بعد انہوں نے تمام روپیہ حضرت کی جوتیوں میں ڈال دیا، حضرت جب اُٹھے تو نہایت استغناء کے ساتھ جوتے جھاڑے اور روپیہ سب زمین پر گر گیا، حضرت نے جوتے پہن لیے اور حافظ انوار الحق صاحب سے ہنس کر فرمایا کہ حافظ جی! ہم بھی دنیا کماتے ہیں اور اہل دنیا بھی کماتے ہیں، فرق یہ ہے کہ ہم دنیا کو ٹھکراتے ہیں اور وہ قدموں میں پڑتی ہے اور دنیا دار اس کے قدموں میں گرتے ہیں اور وہ انہیں ٹھکراتی ہے یہ فرمایا اور روپیہ وہیں تقسیم فرما دیا۔

(اورِ ح ثلاثہ: ص ۲۶۴)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ جب مرادآباد تشریف لے جاتے تو نواب محمود علی خان صاحب کی بہت آرزو اور تمنا تھی کہ ایک مرتبہ مولوی محمد یعقوب صاحب چھتاری تشریف لا دیں، مولانا نے فرمایا کہ ہم نے سنا ہے کہ جو مولوی نواب صاحب کے یہاں جاتا ہے نواب صاحب اس کو سو روپے دیتے ہیں وہ خود بلاتے ہیں اس لیے شاید دو سو روپے دے دیں، سو، دو سو روپے ہمارے کتنے دن کے، ہم وہاں جا کر مولویت کے نام کو دھبہ نہ لگا دیں گے۔

(ارواح ثلاثہ: ص ۳۱۷)

حضرت سہارنپوری کے واقعات

تذکرۃ الخلیل میں حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق لکھا ہے کہ بمبئی میں حج کو جاتے وقت ایک سیٹھ صاحب نے آپ کی خدمت میں سو روپے ملازم کے ہاتھ بھیجے کہ مجھے حاضری کی فرصت نہیں۔ اس لیے روپیہ آدمی کے ساتھ بھیجتا ہوں قبول فرما دیں آپ نے واپس فرما دیا کہ بحمد اللہ مجھے ضرورت نہیں آخر وہ خود آیا اور معذرت کی۔ تب آپ نے قبول کیا۔ اگر کسی غریب کا ہدیہ ہوتا تو آپ اس کی بڑی عظمت فرماتے اور ایسے قبول فرماتے تھے گویا اس کے محتاج ہوں۔

ایک شخص نے ٹوپی پیش کی جو شاید آٹھ آنے سے زائد کی نہ ہوگی۔ آپ نے مسکرا کر اس کو لے لیا اور اسی وقت اوڑھ کر اپنی ٹوپی کو بکس میں رکھوا دیا۔ (تذکرۃ الخلیل: ص۳۶۴)

آپ کسی تقریب نکاح میں میرٹھ تشریف لائے۔ لڑکے والوں نے درخواست کی کہ تبرکاً دولہا کو کپڑے حضرت پہنا دیں۔ آپ وہاں تشریف لے گئے جہاں دولہا غسل کے بعد کپڑے پہننے کا منتظر کھڑا تھا۔ بندہ بھی (مولانا عاشق الٰہی) حضرت کے ساتھ تھا۔ کرتا پاجامہ تو آپ نے اٹھا کر دے دیا۔ اچکن کا نمبر آیا تو آپ نے کہا کیا ریشم کی ہے؟ میں نے غور سے دیکھ کر عرض کی۔ جی حضرت ریشم ہی معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے اس کو رکھ دیا اور فرمایا اس کا پہننا اور پہنانا بھی حرام ہے۔ پھر ٹوپی دیکھی تو وہ بھی مغرق۔ اس پر حضرت نے تیز لہجہ میں فرمایا یہ بھی حرام ہے۔ لڑکے والے کچھ محتاط نہ تھے۔ انہوں نے حضرت کے انکار کی پرواہ نہ کی خود اٹھا کر دولہا کو پہنا دی۔ حضرت کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا تحمل فرمایا اور مجھ سے یہ کہہ کر ''چلو'' وہاں سے واپس آگئے۔ آپ قیام گاہ پر تشریف نہیں لائے بلکہ رنج وقلق کے ساتھ حاجی وجیہ الدین صاحب مرحوم کے مکان پر تشریف لے گئے۔ فرمایا یہ کیا تعلق ہے۔ معصیت میں شریک کرنے کو بلاتے ہیں اس نکاح میں شریک ہونے والے سب گنہگار ہوں گے جہاں دولہا حرام لباس پہنے بیٹھا ہو کہ کوئی عامل ہو کوئی اس پر راضی، یہ سن کر سب میں ہلچل مچ گئی کہ برادری کا تھا اور حضرت کے ساتھ کئی لوگوں کا تعلق تھا۔ نہ حضرت کو چھوڑ سکے نہ برادری کو۔ دوڑے ہوئے گئے کہ کسی طرح دولہا کے کپڑے بدلوا دیں، مگر بہتیرے تھے جن کو نہ حضرت سے تعلق تھا نہ اتباع شریعت کا اہتمام۔ اس لیے وہ تبدیل لباس کو نحوست اور بدشگونی سمجھتے اور کہتے تھے کہ جو دولہن کے یہاں سے جوڑا آیا ہے وہی پہننا ضروری ہے مگر یہ دوڑ دھوپ کرنے والے سربرآوردہ اور مدبر تھے آخر کامیاب ہوئے اور حاجی وجیہ الدین صاحب مصری کپڑے کی بیش قیمت اپنی اچکن نکال کر جلدی سے پہنچے کہا کہ اس سے بہتر تو اچکن دولہا، کو ہندوستان میں بھی کہیں نصیب نہ ہوگا۔ وہ پہنا کر اور ٹوپی کی بجائے عمامہ بندھوا کر حضرت کے سامنے لے آئے کہ حضرت اب تو تشریف لے چلیں۔ اس وقت آپ اٹھے اور شریک عقد ہوئے۔

ایسا ہی ایک قصہ دہلی میں پیش آیا تو اس میں بھی حضرت نے دولہا کا لباس حرام ہونے کی وجہ سے نکاح میں شرکت نہیں فرمائی۔ حکیم جمیل الدین صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مطب میں تشریف لا کر بیٹھ گئے اور حضرت نے کمال تاثر سے فرمایا کہ ہم لوگ اسی لیے امراء کی تقریبات میں شرکت کے قابل نہیں ہیں۔

ہم جیسے ضعفاء کے لیے بھی امراء کی تقریبات میں شرکت کے لیے یہ چیز بہت مانع ہوتی ہے کہ

نہ حضرت قدس سرہٗ جیسی صاف گوئی اور جرأت اپنے میں پاتے ہیں اور نہ اپنی ایسی حیثیت ہے کہ ناراضی سے دوسروں پر کوئی اثر پڑے، اسی لیے عدم شرکت ہی کو اہون سمجھتے ہیں اور دعاء گوئی پر قناعت کرتے ہیں۔

مولانا میرٹھی دوسری جگہ لکھتے ہیں اور بالکل صحیح لکھا، اس ناکارہ نے بھی اس پر اکثر غور کیا کہ بیعت کرنے پر حضرت کی خدمت میں اگر نذر پیش کی گئی تو حضرت نے کبھی قبول نہیں فرمائی کہ صورتاً یہ توبہ کرانے کا معاوضہ بن جاتا ہے اور اس رسم کے مشابہ ہے جو آج کل دنیادار پیروں میں چل پڑی ہے۔ ہاں اس کے بعد انس ومحبت کا تعلق پیدا ہو کر اگر کوئی قلیل سے قلیل ہدیہ بھی پیش کرتا تو مسنون طریقہ پر آپ اسے بخوشی قبول فرماتے۔

(تذکرۃ الخلیل: ص ۱۶۸)

یہ ناکارہ آپ بیتی میں کسی جگہ لکھوا چکا ہے کہ میرے حضرت نور اللہ مرقدہٗ کا معمول حجاز میں چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑے ہدیہ قبول فرمانے کا نہیں تھا۔ اول تو یہ ہدیہ دینے والے پر اصرار کرتے کہ یہاں کے لوگ ہدیہ کے زیادہ مستحق ہیں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے میری ضرورت سے زائد دے رکھا ہے۔ اگر اس پر کوئی شدید اصرار کرتا تو قبول فرما کر دس روپے سے زائد کی رقم تو کسی کو اہل حرمین میں سے دے دیتے، معلم اس کے بچوں کو بھی، حضرت قدس سرہٗ نے علاوہ ان کے حقوق لازمہ کے بڑی بڑی رقمیں جو کہیں سے آئی ہوتی تھی اسی طرح دوسرے اکابر اور مشائخ کو بہت جلد مرحمت فرمادیتے تھے اپنے پاس نہیں رکھتے تھے اور دس روپے سے کم کا ہدیہ ہوتا تو وہ اسی وقت اس ناکارہ کے حوالے ہو جاتا کہ یہاں کے دکاندار سے کوئی چیز خرید لاؤں، یہ ناکارہ اکثر انگور یا اس قسم کی چیزیں خرید کر لے آتا جو مجمع کے ساتھ حضرت بھی نوش فرماتے اور خدام کے تو مزے ہوتے ہی ہیں۔

حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے واقعات

حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ دیوبندی میں علاوہ اور کمالات کے ایک عجیب بات تھی کہ امراء سے ذرہ برابر دلچسپی نہ تھی جب تک کوئی امیر پاس بیٹھا رہتا اس وقت تک حضرت کے قلب پر انقباض رہتا ورنہ اکثر علماء میں کچھ نہ کچھ مدارت امراء کی ضرور ہوتی ہے۔ امیر شاہ خان صاحب راوی ہیں کہ نواب یوسف علی خان صاحب کو میں بعضے بزرگوں کی طرف زیادہ متوجہ کرتا تھا مگر ان کو حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف زیادہ میلان تھا۔ میں

نے ایک روز نواب صاحب سے دریافت کیا کہ میں آپ کو اور بزرگوں کی طرف متوجہ کرتا ہوں اور تم حضرت مولانا دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہو اس کی خاص وجہ کیا ہے۔

نواب صاحب نے ایک عجیب بات فرمائی کہ اور جگہ جو میں جاتا ہوں تو میرے جانے سے خوش ہوتے ہیں بہت زیادہ خاطر تواضع کرتے ہیں مدارت کرتے ہیں اور مولانا دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس جاتا ہوں تو مولانا مجھ سے طبعاً ایسی نفرت کرتے ہیں جیسے کسی کو ماس سے گند آتی ہو تو اس سے یہ سمجھتا ہوں کہ وہاں دین ہے اور خالص دین ہے دنیا بالکل نہیں۔ اسی وجہ سے میں مولانا کا زیادہ معتقد ہوں۔ عجیب بات فرمائی۔ نواب کیا تھے درویش تھے بلکہ یہ بات تو ان میں بھی نہیں جو مدعی صوفیت کے ہیں۔ (اضافات: ۱/۷ص ۵۰)

ارواحِ ثلاثہ میں امیر الروایات سے نقل کیا ہے کہ جب نواب محمود علی خان صاحب کا انتقال ہوا تو حضرات دیوبند کا ارادہ ہوا کہ وہ نواب کی تعزیت کے لیے چھتاری آئیں اور انہوں نے مولوی محمود حسن صاحب پر بھی زور دیا کہ تم بھی چلو۔ مولوی محمود حسن صاحب نے مجھے (امیر شاہ خان) خفیہ جوابی خط لکھا اور لکھا کہ تم اپنی اصلی رائے لکھو کہ میں آؤں یا نہ آؤں اور لکھا کہ اس کا جواب دھلی کے فلاں شخص کے نام بھیجنا اور جواب مجمل لکھنا۔ میں نے لکھ دیا کہ نہ آیئے اس پر مولوی صاحب نے دستوں کی گولیاں کھالیں اور اصرار کرنے والوں سے بیماری کا عذر کر دیا۔

(ارواحِ ثلاثہ: ص ۳۷۹)

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ حضرت مولانا دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایک مدرسہ کے مہتمم نے عرض کیا کہ حضرت ضرورت ہوتی ہے مدارس میں چندہ کی اور چندہ مانگنے میں ذلت ہے تو کیا صورت کی جائے۔ فرمایا غریبوں سے مانگو کچھ ذلت نہیں (از جامع وہ جو کچھ دیں گے نہایت خلوص اور تواضع سے دیں گے اور اس میں برکت بھی ہوگی۔) اور مال داروں تو بیچارے تنگ ہوتے ہیں۔ پانچ سو کی آمدنی ہے اور چھ سو کا خرچ ہے یہ تو رحم کے قابل ہیں (از جامع اور اگر کچھ دے بھی دیا تو محصل کو ذلیل اور خود کو بڑا سمجھ کر دیں گے)۔ (ارواحِ ثلاثہ: ص ۳۸۱)

حضرت تھانوی کے واقعات

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کا ارشاد ہے کہ خلوص بڑی چیز ہے اور یہ اکثر غرباء میں ہوتا ہے اور امراء میں فلوس تو ہوتا ہے مگر خلوص نہیں ہوتا۔ الا ماشاء اللہ، ایک غریب شخص نے مجھ کو (حضرت حکیم الامۃ) ایک اکنی دے کر کہا کہ ایک پیسہ دینا چاہتا ہوں، تین پیسے واپس کر دو۔ میں نے ایسا ہی کیا، بھلا اس میں کیا ریاء ہو سکتی ہے، سو غرباء سے ہمیشہ میرا یہ معاملہ رہا ہے۔ محض ان کے خلوص کی وجہ

سے اور امراء کے ساتھ دوسرا معاملہ ہوتا ہے۔

چنانچہ نواب ڈھاکہ سلیم خان صاحب نے مجھ کو مدعو کیا میں نے چند شرائط پیش کیں۔ منجملہ اور شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ مجھ کو کچھ دیا نہ جائے۔ سب شرائط طے ہو گئیں، میں ڈھاکہ پہنچا نواب صاحب نے ایک روز درخواست کی کہ میری دو لڑکیاں ہے ان کو بسم اللہ کرا دیجئے اور یہ بھی کہا کہ ہمارا خاندانی دستور یہ ہے کہ بسم اللہ شروع کرانے کے وقت کچھ دیا جاتا ہے، اگر نہ دیا جائے یا قبول نہ کیا جائے تو ہماری سبکی ہوگی۔ یہ ترکیب تھی کہ اس بہانے سے مجھ کو نقد دیں۔ میں نے کہا کہ میں آپ کی سبک گوارا نہیں کر سکتا، لیکن اپنی وضع کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتا، تو اس کی صورت یہ ہے کہ میں جلوت میں تو آپ کا عطیہ لے لوں گا اور خلوت میں واپس کر دوں گا اور عمر بھر واپسی کا کسی سے ذکر نہ کروں گا، مگر اپنے دل میں تو خوش ہوں گا کہ میں نے اپنے مسلک اور مشرب کے خلاف نہیں کیا۔ بس چپ رہ گئے اور رقعہ لکھا کہ میری غلطی تھی۔ اب میں آپ کی وضع پر اپنی تجویز کو نثار کرتا ہوں اور اس سے یہاں تک ان کا اعتقاد بڑھا کہ لوگوں سے یہ کہا کرتے تھے کہ جس نے صحابہ کو نہیں دیکھا وہ تھانہ بھون جا کر دیکھ لے اور یہ سب ذرا سے نسخہ کی بدولت ہے۔

(افاضات:ص ۲۷۴)

ایک اور واقعہ یاد آیا نواب جشید علی خان صاحب نے باغپت بلایا تھا، اس وقت ان سے ملاقات نہ ہوتی تھی۔ میں نے شرط کر لی تھی کچھ لوں گا نہیں۔ مگر گھر میں ان کی والدہ صاحبہ نے بلا لیا۔ یہ بی بی حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے بیعت ہیں۔ سو (۱۰۰) روپے دینے چاہیے۔ میں نے عذر کر دیا کہ خلاف شرط ہے۔ امراء کے ساتھ ضابطہ کا برتاؤ مناسب ہے جب تک بے تکلفی اور خلوص کا اطمینان نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس کے بعد موصوف کے تمام خاندان سے ایسا ہی تعلق ہو گیا اور برتاؤ بھی بدل گیا۔

(افاضات:۲/۸ص ۲۷۵)

ایک مرتبہ فرمایا کہ امراء سے از خود تعلق نہیں پیدا ہوتا، اگر وہ خود تعلق پیدا کریں تو اعراض بھی نہیں کرتا۔ اگر ان سے تعلق کی ابتداء کی جائے یوں خیال ہوتا ہے کہ کسی غرض سے ہم سے تعلق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ غریبوں سے اگر شیریں کلامی سے بول لیے تو نثار ہونے لگتے ہیں۔

(حسن العزیز:ص ۲۱۸/ج ۱)

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے واقعات افاضات وغیرہ میں بہت کثرت سے نقل کیے گئے ہیں۔ ان سب کا احاطہ تو اس رسالہ میں مشکل ہے۔ مجھے تو اپنے اکابر کے نمونہ کے طور پر چند واقعات لکھوانے تھے۔ البتہ ایک واقعہ اپنے اکابر ثلاثہ کا جو میں خواب خلیل کے حاشیہ میں لکھوا چکا ہوں۔ خوانِ خلیل میں حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ جام نمبر۱۲ کہ مولانا

رحمہ اللہ تعالیٰ (حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ) میں حضرات سلف کی سی تواضع تھی کہ مسائل و اشکالات علمیہ میں اپنے چھوٹوں سے بھی مشورہ فرما لیتے تھے اور چھوٹوں کی معروضات کو شرح صدر کے بعد قبول فرما لیتے تھے۔ چنانچہ بعض واقعات نمونہ کے طور پر معروض ہیں۔

پہلا واقعہ: ایک بار سفر بھاولپور میں اس احقر سے ارشاد فرمایا ''حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قبول ہدایا کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ پہلے سے اشراف نفس نہ ہو''۔

مگر سفر میں اکثر داعی کی عادت ہوتی ہے کہ مدعو کو کچھ ہدیہ دیتے ہیں اسی عادت کے سبب اکثر خطور بھی ایسے ہدایا کا ذہن میں ہو جاتا ہے سو کیا خطور بھی اشراف نفس و انتظار میں داخل ہے جس کے بعد ہدیہ لینا خلاف سنت ہے، اس حقیر میں کیا قابلیت تھی کہ ایسے عظیم الشان عالم و عارف کے استفسار کا جواب دے سکوں، لیکن چونکہ لہجہ استفسار امر بالجواب پر دال تھا اس لیے الامر فوق الادب کی بناء پر جواب عرض کرنا ضروری تھا، چنانچہ میں نے عرض کیا کہ میرے خیال میں اس میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ اس احتمال کے بعد دیکھا جائے کہ اگر وہ احتمال واقعہ نہ ہو تو آیا نفس میں کچھ ناگواری پیدا ہوتی ہے یا نہیں، اگر ناگواری ہو تو اس احتمال کا خطور اشراف نفس ہے اور اگر ناگواری نہ ہو تو اشراف نفس نہیں ہے خالی خطرہ ہے جو احکام میں مؤثر نہیں، اس جواب کو بہت پسند فرمایا اور دعاء دی۔

اس کے ضمیمہ میں بھی اس ناکارہ نے ایک واقعہ بھاولپور کا لکھوایا ہے کہ حضرت مولانا الحاج سر رحیم بخش صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جن کا ذکر آپ بیتی میں بار بار آچکا ہے، حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے مرید اور میرے جملہ اکابر کے بہت خصوصی تعلق رکھنے والے تھے، بھاولپور کے وزیر اعظم تھے اور نواب صاحب کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے موجودہ نواب کی صغرسنی کی بناء پر ان کے اتالیق اور جملہ امور میں نواب صاحب مرحوم کے قائم مقام رہے اور میرے اکابر کے ساتھ خصوصی تعلق کی وجہ سے ان حضرات کی بھی بھاولپور سے تشریف بری ہوتی تھی، ان کا مختصر حال خوان خلیل کے ضمیمہ پر لکھوا چکا ہوں۔

ایک مرتبہ ان کی دعوت پر حضرت اقدس سہارنپوری، حضرت شیخ الہند اور حضرت حکیم الامت نور اللہ مراقدہم تینوں ساتھ ہی بھاولپور تشریف لے گئے اور ساتھ ہی واپس تشریف لائے۔ واپسی پر انہوں نے ہر سہ حضرات کی خدمت میں علی التساوی ایک گرانقدر ہدیہ پیش کیا، شیخین نے تو قبول کر لیا اور حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے چونکہ اشراف نفس ہو گیا تھا، اس لیے قبول سے معذوری ہے اور ان دونوں حضرت کو نہ ہوا ہوگا مولانا رحیم بخش صاحب نے وہ رقم فوراً لے کر اپنی جیب میں رکھ لی اور اشارۃً بھی کوئی لفظ اس کے قبول کرنے کے متعلق نہیں

کہا۔ یہ سب حضرات ان سے رخصت ہو کر ریل میں سوار ہو گئے۔

مولانا رحیم بخش صاحب نے اپنے ایک ملازم کے ذریعہ حضرت حکیم الامت کی رقم ایک لفافہ میں بند کر کے بھیجی اور اس میں پرچہ لکھا کہ حضرت والا نے اشراف نفس کے احتمال سے یہ ناچیز ہدیہ واپس فرمادیا تھا اور اس خاکسار کو حضرت اقدس کی منشاء کے خلاف مکرر درخواست کی جرأت نہیں کی۔ لیکن اب تو حضرت واپس جاچکے اور اشراف کا کوئی احتمال نہیں رہا۔ اس لیے امید ہے کہ اس ناچیز ہدیہ کو قبول فرمالیں گے اور اگر اب بھی کوئی گرانی ہو تو حضرت کے طبع مبارک کے خلاف ذرا اصرار نہیں۔ اس مضمون کا پرچہ لفافہ میں بند کر کے اس نوکر سے کہا کہ جب سات، آٹھ اسٹیشن گزر جائیں تو فلاں جنکشن پر یہ بند لفافہ حضرت کی خدمت میں پیش کر دینا اور پوچھ لینا حضرت اگر کچھ جواب دیں تو لیتے آنا ورنہ چلے آنا، چنانچہ حسب ہدایت ملازم نے چند اسٹیشن جا کر وہ لفافہ پیش کیا اور حضرت نے پڑھا اور بہت ہی اظہار مسرت کیا اور فرمایا کہ محبت خود طریقے سکھلا دیتی ہے مجھے تو اس قصہ پر ہمیشہ ایک مصرعہ یاد آتا ہے کہ:

محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی

بہر حال حضرت نے قبول فرما کر تحریر فرمایا کہ خدا تعالیٰ آپ کی فہم و ذکاء میں ترقی عطاء فرمائے، واقعی اب مجھے کوئی عذر نہیں۔ (خوان خلیل: ص ۵۶)

حضرت حکیم الامت کے واقعات تو بہت زیادہ مدون ہو چکے ہیں اور کثرت سے شائع ہیں اس لیے ان ہی چند واقعات پر اکتفا کرتا ہوں حضرت کی تصانیف میں بہت کثرت سے اس قسم کے واقعات ملیں گے۔

حضرت حکیم الامت ارشاد فرماتے ہیں کہ ہدیہ لینے میں بعض اوقات ایک تو طبعی انقباض ہوتا ہے اس کا تو ذکر نہیں اور ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ بعض مرتبہ تجربہ کی بناء پر ہدیہ قبول کر کے پچھتانا پڑتا ہے، اس میں انتظام کی ضرورت ہے یہاں ہماری برادری میں ایک صاحب تھے جن کا حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے خادمیت کا تعلق تھا، اس بناء پر مجھ سے بھی محبت کرتے تھے ان کے یہاں کوئی پھل آیا۔ یا کوئی اچھا کھانا پکا۔ میرے لیے بھیج دیتے تھے اور یہاں سے بھی جاتا رہتا تھا مگر کم و بیش کا تفاوت تھا۔

اتفاق سے فرائض کا مسئلہ انہوں نے مجھ سے پوچھا میں نے بتلا دیا وہ ان کے خلاف تھا اور اس میں ان کے فریق مخالف کا نفع تھا اس پر کہا کہ ہم اتنے زمانہ سے خدمت کرتے ہیں مگر جب ہمارے کام کا وقت آیا تو ہماری کچھ رعایت نہ کی۔ دیکھئے کتنی رنج دہ بات ہے۔ اس وجہ سے بعض ہدیہ میں شبہ ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کا بھی یہی انجام نہ ہو اور ہدیہ دے کر کسی رعایت کی توقع تو

نہایت ہی منکر و قبیح ہے مجھ کو تو یہ بھی پسند نہیں کہ ہدیہ دے کر دعاء کے لیے کہا جائے۔ اس لیے کہ ہدیہ تو محض طیب قلب سے تطییب قلب کے لیے ہوتا ہے اس میں اور اغراض کی یا دوسرے مصالح کی آمیزش کیسی۔ اسی لیے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ اگر یہ شبہ ہوجائے کہ یہ شخص ہم کو غریب سمجھ کر ہدیہ دے رہا ہے لینے کو جی نہیں چاہتا۔ ہم غریب ہی سہی مگر اس کو کیا حق ہے کہ وہ غریب سمجھ کر دے تو مولانا نے دفع حاجت کی مصلحت کی آمیزش کو پسند نہیں فرمایا اور ایک یہ بھی معمول تھا کہ سفر میں ہدیہ لینا پسند نہ فرماتے تھے۔ بعض اوقات پہلے سے آمادگی نہیں ہوتی منہ دیکھ کر خیال ہوجاتا ہے تو طیب قلب سے نہ ہوا۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمہ اللہ تعالیٰ پر غالب حالت مجذوبیت کی تھی اگر کوئی شخص رخصت کے وقت ہدیہ پیش کرتا تو قبول نہ فرماتے تھے اور جو شخص آتے ہی دیتا لے لیتے تھے۔ جانے کے وقت دینے کے متعلق فرماتے کہ بھٹیارہ سمجھا ہے کہ حساب لگا کر دیتا ہے کہ آٹھ آنے کا کھایا ہوگا لاؤ روپیہ دے دو۔ دیکھئے یہاں بھی ہدیہ میں دوسری مصلحت یعنی اداء عوض مل گئی۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ زیادہ مقدار میں ہدیہ نہ لیتے تھے کم مقدار میں لیتے تھے اور لینے کے وقت بے حد شرماتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میری اتنی حیثیت نہیں۔ اپنے کو ہیچ در ہیچ سمجھتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ بھائی زیادہ سے زیادہ ایک روپیہ دے دو۔ اس میں بھی یہ راز ہے کہ بعض اوقات زیادہ مقدار میں طیب قلب نہیں ہوتا، قلیل مقدار سے شرما کر زیادہ دیتا ہے پھر استطراداً فرمایا کہ مجھ کو حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف زیادہ کشش ہے، دوسرے بزرگوں کے ساتھ تو ان کے کمالات کی بناء پر عقیدت ہے اور حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے اضطراری طور پر محبت ہے۔ ان کی ہر بات میں ایک محبوبانہ شان معلوم ہوتی ہے۔

(افاضات: ۲ر۷ص ۱۹۰)

میرے حضرت مرشدی حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کو تو مدرسہ کی وجہ سے مالداروں کے ساتھ مدارات کا برتاؤ مجبوراً کرنا پڑتا تھا، جس کو میں کثرت سے دیکھتا تھا، لیکن حضرت قدس سرہٗ کے دور میں میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو اہل چندہ کی مدارات کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس لیے امراء کی ملاقات سے بہت ہی گریز فرمایا کرتے تھے۔ غرباء کا تو اکثر مجمع دن بھر بیٹھا رہتا، ذرا وسعت نہ ہوتی، لیکن جب مدرسہ میں امراء میں سے کسی کی آمد کی اطلاع ہوتی تو مجھ سے ارشاد فرماتے کہ دروازے پر باہر کا قفل لگا دو۔ جب وہ لوگ چلے جائیں تو کھول دینا۔ میں خبر رکھتا لوگ دیکھنے آتے لیکن قفل لگا ہوا دیکھ سمجھتے کہ کہیں باہر تشریف لے گئے۔

جناب الحاج شیخ رشید احمد صاحب میرٹھی پھر چاٹگامی جو بعد میں مدرسہ کے سرپرست بھی ہوگئے تھے سے بہت گہرے تعلقات تھے نہایت ہی طرفین میں محبت اور تعلق تھا۔ ایک عجیب لطیفہ و شدت تعلق کا جملہ معترضہ کے طور پر یہ ہے کہ جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا اور میں پریشان زیادہ تھا کہ بار قرض بھی بہت تھا کتب خانہ کی بکری بھی کالعدم تھی اس کی تفاصیل تو آپ بیتی میں کہیں آ چکی کہ شیخ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے خواب دیکھا تھا کہ میرے والد صاحب نے خواب میں فرمایا کہ زکریا پریشان ہے اس کا خیال رکھنا، شیخ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجے عطاء فرمائے کہ اس خواب پر بہت ہی زیادہ عمل کیا، بچپن ہی سے میری خاطر مدارات میں کسر نہ چھوڑی اور اخیر تک بڑھتی ہی رہی

چنانچہ تقسیم کے بعد جب وہ چاٹگام منتقل ہوگئے اور بعض وجوہ سے ہند میں آنا ناممکن ہوگیا تو بہت ہی زیادہ خطوط میں ملاقات کا اشتیاق میرے بلانے پر تقاضے لکھتے رہے۔ ایک خط میں یہ لکھا کہ یہاں آنے کے بعد دار العلوم بھی مل گیا۔ مظاہر علوم بھی مل گیا ان کی سرپرستیاں بھی مل گئیں کہ ان ناموں سے مدارس شرقی پاکستان میں قائم ہوگئے مگر تم ہی نہ مل سکے۔ میرا تو وہاں آنا ناممکن اور تمہارا یہاں آنا اس سے زیادہ مشکل، ملنے کو طبیعت بے قرار ہے۔ میں تمہارے ہوائی جہاز کا بمبئی تا جدہ ٹکٹ بھیج دوں اور تمہاری معینہ تاریخ سے پہلے بھی وہاں آجاؤں۔ ایک دو ماہ ساتھ رہ لیں۔ یہ تو ضمناً شیخ صاحب کے تعلق کی طرف اجمالی اشارہ تھا۔ شیخ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے صاحبزادے کی تقریب نکاح میں جہاں میرے حضرت قدس سرہٗ بھی تشریف لے گئے تھے والد صاحب پر بلانے کا اصرار کیا۔ والد صاحب نے جواب میں ایک شعر لکھا تھا:

در مجلس خود راہ مدہ ہمچو منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

اس خط میں تو صرف شعر ہی تھا بعد میں مزید اصرار پر انہوں نے لکھا کہ تم سے جو انس و محبت ہے وہ محتاج بیان نہیں مگر مجلس امراء میں مجھے شرکت بہت مشکل ہے۔

چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا ملفوظ

میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ مدارس کی طرح سے امراء سے تبلیغ کی وجہ سے ملنے کی نوبت تو بہت آتی تھی مگر بہت ہی استغناء کے ساتھ جو قابل دید تھا۔ جب کوئی تبلیغ کے لیے بھی ہدیہ پیش کرتا تو ان کا مشہور مقولہ تھا کہ مجھے آپ کے پیسے نہیں چاہیے، مجھے تو آپ کی ذات چاہیے۔ آپ اس مبارک کام میں شرکت فرمادیں اور ان پیسوں کو اپنے اور اپنے رفقاء پر خرچ فرمادیں تو وہ میرے

لیے زیادہ موجب مسرت ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ بعض اہلِ دین اور اصحاب ثروت سے مطلقاً ملا ہی نہ جائے اور ان کے اختلاط سے کلی پرہیز کیا جائے حالانکہ استغناء کا منشاء صرف یہ ہے کہ ہم ان کی دولت کے حاجت مند بن کر ان کے پاس نہ جائیں اور طلب جاہ و مال کے لیے ان سے نہ ملیں، لیکن ان کی اصلاح کے لیے اور دینی مقاصد کے لیے ان سے ملنا اور اختلاط رکھنا ہرگز استغناء کے منافی نہیں بلکہ یہ تو اپنے درجہ میں ضروری ہے۔ ہاں اس چیز سے بہت ہوشیار رہنا چاہیے کہ ان کے پاس اختلاط سے ہمارے اندر حب جاہ و مال اور دولت کی حرص پیدا نہ ہو جائے۔
(ملفوظات حضرت دہلوی: ص ۱۵)

حضرت مولانا محمد یوسف کے واقعات:

عزیز مولوی یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ نور اللہ مرقدہٗ جو اپنی ابتداء میں تو میرے اصاغر میں تھا لیکن اللہ کی دین کہ انتہا آخر میں میرے اکابر میں بن گئے۔ ان کے سامنے استغناء کے واقعات تو اتنی کثرت سے ہیں کہ **لا تعد و لا تحصیٰ** میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں کہ نقل کراتے ہوئے بھی اپنی بدحالی کی وجہ سے شرم آتی ہے، ان میں سے صرف دو واقعات جن میں خود میری شرکت بھی ہے اس جگہ لکھوانے مقصود ہیں، لیکن اس سے پہلے سوانح یوسفی سے ایک واقعہ نقل کراتا ہوں کہ مولانا محمد یوسف صاحب نے اس دور میں بھی علم تقویٰ اور کامل احتیاط کی صفت اپنے آباء و اجداد سے ورثہ میں پائی تھی اور وہ اس دولت بے بہاء سے خوب نواز لیے گئے تھے۔ تبلیغی کام کے سلسلہ میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بعض حضرات کی چیزیں بعض دینی مصلحتوں سے استعمال فرمائیں تو مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مناسب نہیں جانا۔

وہ خود اپنا ایک واقعہ سناتے ہیں کہ حضرت جی (مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہٗ) بعض دفع دہلی کے تاجروں کی کاریں استعمال فرمالیا کرتے تھے مجھ کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی کہ امراء کا احسان لیا جائے۔ ایک دن میں نے حضرت سے خلوت میں وقت مانگا۔ حضرت جی نے دے دیا۔ میں نے ادب سے عرض کیا۔ امراء کی کاریں آپ استعمال فرماتے ہیں یہ بات بظاہر استغناء کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ حضرت جی نے فرمایا ''یوسف! جو کچھ کرتا ہوں سوچ سمجھ کر کرتا ہوں اور صرف دین کے لیے کرتا ہوں''۔ (سوانح یوسفی)

جو دو واقعے میرے ساتھ گزرے ہیں ان میں سے ایک واقعہ تو کرنل اقبال بھوپالی مرحوم کا ہے۔ کرنل صاحب بھوپال میں ایک فوجی افسر تھے۔ نہایت ہی تجیم شحیم، قد آور پہلوان، نہایت ہی

حسین صورت۔ میرے ان کے ساتھ تعلق کی ابتداء یہ ہے کہ بھوپال میں کسی صاحب نے ان سے حضرت اقدس رائے پوری ثانی کا ذکر کیا، جس پر وہ حضرت کی زیارت کے مشتاق ہوئے۔ ان صاحب نے کرنل صاحب کو رائے پور کا راستہ بتاتے ہوئے یہ بتایا کہ جب ریل سے آپ سہارنپور اتریں تو مظاہر علوم میں آپ سیدھے چلے جائیں اور زکریا سے حضرت کے متعلق معلوم بھی کرلیں کہ رائے پور میں ہیں یا کسی دوسری جگہ اور وہ رائے پور کے موٹر میں کسی کے ساتھ بٹھا دیں گے۔ وہ دس بجے کے قریب سہارنپور پہنچے۔ میرے روز نامچے میں ان کی ابتدائی آمد کی تاریخ بھی لکھی ہوئی ہوگی مگر کون تلاش کرے۔ جب وہ مدرسہ پہنچے تو میرا ایک مخلص دوست حافظ شیخ فرقان احمد جو اس وقت بچہ تھا اور مولوی نصیر الدین کے مکتب میں قرآن پڑھتا تھا، وہ ننگے پاؤں بھاگا ہوا میرے دار التصنیف میں اوپر پہنچ گیا۔ اس کے متعلق آپ بیتی میں کئی جگہ تذکرہ آچکا ہے کہ وہ زمانہ میری علمی انہماک کا تھا اور صبح کی چائے کے بعد سے دوپہر کے گیارہ بجے تک بجز اکابر ثلاثہ حضرت مدنی، رائے پوری اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے کسی شخص کی آمد گوارا نہ تھی اور ان کے علاوہ کوئی پہنچتا تو واقف ہوتا تو ڈانٹ پڑتی اور اجنبی ہوتا تو روکا جواب کہ اس وقت فرصت نہیں ہے، گیارہ بجے بات کرسکتا ہوں۔

حافظ فرقان نے اوپر جا کر گھبرائی ہوئی زبان میں کہا کہ ایک بزرگ چناں چنیں تانگہ سے اترے ہیں، تجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور ابھی رائے پور جائیں گے۔ میں نے اس غریب کو ایک ڈانٹ پلائی کہ کیوں آیا ان سے کہہ دیتا کہ وہ اس وقت فارغ نہیں ہیں۔ اس نے کہا میری تو ہمت نہیں پڑی وہ تو بہت بڑے آدمی ہیں۔ میں نے اس کو ڈانٹ کر کہا جا کہہ دے مہمان خانہ میں تشریف رکھیں، گیارہ بجے حاضر ہوں گا اور سامان لے کر مہمان خانہ میں پہنچا آ۔ اس نے مجبوراً جا کر کرنل صاحب سے کہا کہ اس نے کہا ہے کہ میں اس وقت بہت مشغول ہوں، مہمان خانہ میں تشریف رکھیں۔ وہ میرے کہنے پر ان کو مہمان خانہ میں پہنچا آیا اور سامان بھی رکھ آیا۔ مگر دوبارہ آ کر مجھ سے کہا کہ وہ ابھی رائے پور جارہے ہیں۔ میں نے کہا جانے دو، مگر وہ بہت مرعوب ہو رہا تھا، اس نے مجھ سے بہت اصرار کیا میں اس کے اصرار پر ننگے سر جوتے پہن کر مہمان خانہ میں پہنچا۔ مہمان خانہ میں پہنچ کر یاد آیا سر پر ٹوپی بھی نہیں ہے۔ وہ مرحوم چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ میں نے سلام کیا اور عرض کیا کہ زکریا میرا ہی نام ہے کیا ارشاد ہے؟ انہوں نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا اس لیے کہ وہ اپنے لمبے قد کی وجہ سے سیدھے مصافحہ نہیں کرسکتے تھے۔

انہوں نے فرمایا کہ میں بھوپال سے آیا ہوں اور اسی وقت رائے پور جانا چاہتا ہوں۔ کل کو مجھے علی الصبح واپس دس بجے کی گاڑی سے دہلی جانا ہے اور اسی وقت بھوپال کے لیے روانگی ہے۔ میں

نے کہا بہت اچھا۔ میں لڑکا ساتھ کراتا ہوں وہ موٹر اڈہ تک پہنچا دے گا، مگر میرا مشورہ اور درخواست یہ ہے کہ آپ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ یہاں آرام فرمالیں۔ میں فراغت پر آپ کو بلالوں گا۔ کھانے کے بعد آپ تشریف لے جائیں۔ اس لیے کہ حضرت کے تو آرام فرمانے کا وقت قریب ہے۔ اتنے آپ پہنچیں گے، حضرت لیٹ چکے ہوں گے۔ حضرت سے ملاقات تو ظہر کی نماز کے بعد ہوگی اور آپ بے وقت وہاں پہنچیں گے تو وہاں کے لوگوں کو انتظام کرنا پڑے گا۔ سب فارغ ہوکر سو رہے ہوں گے۔ اگر آپ کھانے کے بعد تشریف لے جائیں گے تب بھی ملاقات اسی وقت ہوگی۔ جو اس وقت کے جانے پر ہوگی۔ میرے اس کہنے پر وہ چارپائی پر اوپر کو بیٹھے۔ میں نے کہا جلدی لیٹ جاؤ۔ میں تو یہ کہہ کر دو منٹ میں نمٹا آیا اور واپس آکر اوپر زنانہ میں آواز دی کہ ایک مہمان ہیں، اس وقت کھانے میں ان کے لیے اہتمام کرنا ہے اور مولوی نصیر سے بھی کہہ دیا کہ ربڑی دودھ جلیبی وغیرہ ایک آدمی کے بقدر منگوالے۔ اللہ میرے گھر والوں اور مولوی نصیر کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ وہ میرے مہمانوں کا اہتمام میری خواہش سے بھی زیادہ کردیتے ہیں۔

میں نے اپنے اس حرج کی تلافی میں پندرہ منٹ زائد خرچ کیے اور اوپر سے اترتے وقت ایک لڑکے کو مہمان خانہ میں بھیجا کہا کہ ایک مہمان لیٹے ہوئے ہیں انہیں بلالائے۔ ان کے آنے سے پہلے دسترخوان بچھ چکا تھا، کھانا بھی رکھا جاچکا تھا اور ''جائزتہ یوم ولیلة'' کی وجہ سے تنوعات بھی کئی قسم کے ہوگئے تھے اور میں نے بھی تلافی مافات میں ان کی دل داری خوب کی اور کھانے کے بعد ان سے کہا کہ ابھی آدھ گھنٹہ کی گنجائش ہے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تھوڑی دیر لیٹ جاؤ۔ کھانا کھاتے ہی جانے میں دقت ہوگی اور ایک لڑکا ان کے سامنے کردیا کہ یہ آدھ گھنٹہ بعد آپ کو اڈہ پر پہنچادے گا۔ انہوں نے اس رائے کو بھی پسند کیا اور لیٹ گئے۔

دوسرے دن علی الصباح ساڑھے نو بجے کے قریب وہ موٹر اڈہ سے اسٹیشن کے لیے تانگہ لے کر میرے مکان سے گزرے۔ میرا ابھی یہی مشغولیت کا وقت تھا۔ مولوی نصیرالدین نے اوپر جاکر کہا کہ کرنل صاحب تانگہ میں بیٹھے ہیں ریل پر جارہے ہیں، میں نے صرف مصافحہ کیا اور پوچھا کہ آپ کی گاڑی میں دس منٹ کی گنجائش ہے، میں معلوم کرلوں اگر گھر میں کچھ موجود ہوگا تو کچھ نوش فرماتے جائیں، اس لیے کہ آپ کی گاڑی چار بجے پہنچے گی اور اگر گھر میں کچھ موجود نہیں ہوگا تو بے تکلف عرض کردوں گا۔ چونکہ کل گزشتہ خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا بہت اچھا اور تانگہ سے اترنے لگے۔ میں نے کہا کہ ابھی نہ اترو، میں معلوم تو کرلوں کہ کچھ ہے بھی یا نہیں۔ میں گھر میں آیا اور پوچھا کہ کچھ کھانے کو ہے۔ گھر والوں نے کہا کہ فلانے گھر میں پڑھنے

والی کا نکاح ہے اور گرم گرم پلاؤ زردہ ایک ایک رکابی میں ابھی آیا ہے، لانے والی بھی کھڑی تھی میں نے کہا جلدی سے ذرا سا گوشت بھی بھون دو اور باسی روٹی بھی اور جلدی یہ کہہ کر کرنل صاحب کو بُلانے کے واسطے نکلا ہی تھا کہ وہ دروازے تک پہنچ گئے تھے، میں نے کہا تمہارا مقدر ابھی آیا ہے جلدی آجاؤ، ان کو باسی روٹی بھنا ہوا گوشت اور پلاؤ زردہ کر ان کے پاس رکھا اور میں نے کہا اب تمہارا کام ہے جتنی جلدی کھاؤ گے سہولت رہے گی، وہ ماشاء اللہ بدیں جلالت شان فوجی بھی تھے، سالن کی رکابی پلاؤ کی رکابی پر اُلٹ کر اور دو تین منٹ میں نمٹا دی، باسی روٹی البتہ نہیں کھائی اور بہت ہی خوش ہوئے اور میں نے کہا کہ جلدی جاؤ دیر ہو رہی ہے اور ایک آدمی سے کہا جلدی ہاتھ دھلاؤ، میں تو یہ کہہ کر اوپر جانے لگا، انہوں نے کہا حضرت ذرا سی بات کہنی ہے آپ سے، تکلف تو رہا نہیں میرا بٹوہ کہیں جیب سے نکل گیا، دہلی کا کرایہ نہیں ہے، میں نے کہا اسی پر جانے کا زور دکھلا رہے تھے۔

اس زمانہ میں میری جیب میں پیسے کا بالکل دستور نہیں تھا، لیکن قرضے مانگنے میں اتنا مشاق ہو گیا تھا اور اب تک بھی ہوں کہ جیب میں ہاتھ ڈالنے سے مانگ لینا زیادہ آسان ہے اور محض اللہ کے فضل سے لوگوں کا اعتماد بھی اتنا ہو گیا تھا کہ وہ مجھے قرض دینا موجب مسرت سمجھتے تھے، باہر ہی ایک آدمی پر نظر پڑی، میں نے اس سے کہا کہ ارے جیب میں کچھ ہے، اس نے کہا جی بہت، میں نے کہا جلدی سے تیس روپے دے دے اور میں نے اس کے ہاتھ سے لے کر جلدی سے کرنل صاحب کے حوالہ کیے اور وہ جلدی سے تانگے میں بیٹھ کر چل دیے اور میں اُوپر چلا گیا، جہاں تک یاد ہے سارے قصے میں پندرہ سولہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے ہوں گے۔

کچھ دنوں بعد کرنل صاحب کا ایک بیمہ بھوپال سے موصول ہوا، جس میں ایک بڑی رقم تو مدرسہ کے لیے تھی اور اس سے آدھی اجراڑہ کے مدرسہ کے لیے، اس لیے کہ اس سے پہلے دن کھانے میں حافظ محمد حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مہتمم مدرسہ اجراڑہ بھی شریک تھے جن کا ذکر آپ بیتی میں گزر چکا کہ میرے حضرت کے رمضان المبارک کے سامع قرآن نہایت معذور، اپاہج منحنی، مگر کھانے میں ان کا اہتمام کرنل صاحب ہی کے برابر کر رہا تھا، انہوں نے مجھ سے ان کا حال دریافت کیا تھا تو میں نے ان کے اوصاف جمیلہ بتا دیئے تھے اور تیس سو روپے اس ناکارہ کو ہدیہ بھیجے تھے۔

میں نے کرنل صاحب کو لکھا کہ وہ ”در دنیا ستر در آخرت“ سنتے تو آئے تھے مگر عمل آپ نے کر کے دکھلایا، سود کی یہ شرح کسی ملک میں نہیں، اس لیے میں نے اپنے تین سو روپے وصول کر لیے بقیہ آپ کی امانت جمع ہے، آپ جہاں فرما دیں وہاں داخل کر دوں، میرا مشورہ یہ ہے کہ مدرسہ میں داخل کر دیں۔

ان کا بہت ہی لمبا چوڑا خط لجاجت اور اصرار کا آیا کہ خدانخواستہ یہ سو ہ نہیں ہے، میں تو آپ کی بے تکلفی اور ایک اجنبی سے اس برتاؤ پر پہلے ہی ارادہ کر چکا تھا، ایک دو دفعہ تو میں نے مکاتبت کی پھر دھر غلق میں، اس کے بعد کرنل صاحب کو اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجے عطاء فرمائے، ان کی شفقتیں زیادہ سے زیادہ بڑھتی ہی چلی گئیں اور ہر سفر میں کوئی نہ کوئی ہدیہ ضرور لے کر آتے، میں ہر مرتبہ اصرار بھی کرتا کہ مجھے مادی ہدایہ کی بجائے روحانی ہدایہ کی ضرورت ہے، مگر مرحوم بہت ہی اصرار فرمایا کرتے تھے اور اتنے تعلقات بڑھ گئے تھے کہ جب بھی کسی ضرورت سے دہلی آنا ہوتا، سہارنپور آئے بغیر واپس نہ جاتے۔

اصل واقعہ جو لکھوانا تھا وہ یہ ہے کہ مرحوم نے اپنی ایک جائیداد تقریباً سوا لاکھ کی چار جگہوں پر وقف کی، دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، جمعیۃ علماء دہلی اور تبلیغ نظام الدین، بقیہ تینوں حضرات نے تو شکریہ سے قبول کر لیا، مگر مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے انکار کر دیا، مرحوم نے کئی مرتبہ نظام الدین آکر مولانا مرحوم کی خوشامد بھی کی مگر مولانا مرحوم کا ایک ہی جواب تھا کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے تمہارے مال کی نہیں، چونکہ کرنل صاحب مرحوم کا مجھ سے تعلق بہت بڑھ گیا تھا، اس لیے انہوں نے مجھے بھی اس سلسلہ میں متعدد خطوط لکھے کہ میں مولانا یوسف صاحب مرحوم کو حکماً اس کو منظور کرنے کو لکھوں، میں نے بھی کرنل صاحب کی دل داری میں مولانا مرحوم کو کئی خط لکھے، مگر مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اللہ بہت ہی جزائے خیر دے ان کا جواب جو لفظی نہیں تھا بلکہ حقیقی تھا، یہ آیا کہا گر حکم ہے تو مجھے انکار نہیں مگر مجھے اس میں دقت بہت ہے، وقت کا حساب رکھنا، پھر اس کا حساب داخل کرانا، آڈٹ کرانا میرے بس کا نہیں، میں نے ان کو لکھا کہ بجائے تبلیغ کے مدرسہ کے لیے قبول کر لو، مدرسہ کے مہتمم تو آپ کے مستقل ہیں، یہ سب دھندے وہ کرتے رہیں گے، مدرسہ کے مہتمم اس وقت میں حاجی عبدالمجید صاحب دہلوی موتی والے تھے، وہ کاروباری آدمی تھے، ان کے لیے ان چیزوں میں کوئی اشکال نہ تھا، مگر مولانا مرحوم نے اس کو بھی گوارا نہ کیا، میں نے مولانا مرحوم کو لکھ دیا کہ تمہاری رائے کے خلاف مجھے بالکل اصرار نہیں۔

اتفاق سے اس دوران میں میرا نظام الدین جانا ہوا اور کرنل صاحب اس وقت نظام الدین میں موجود تھے، میں موٹر سے اُتر کر مسجد میں گھسا ہی تھا کہ حضرت مولانا محمد یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے پیچھے کرنل صاحب مرحوم بھی ننگے پاؤں مجھ سے مصافحہ کے لیے دوڑے، مولانا مرحوم سے تو معانقہ اور مصافحہ کے بعد میں نے کرنل صاحب کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور میں نے کہا کرنل صاحب! آپ کے یہاں موجود ہونے سے بہت ہی مسرت ہوئی، مرحوم نے کہا مجھے آپ سے زیادہ مسرت ہوئی، ان حضرت جی کی خوشامد کرتے کرتے تھک گیا، آپ کی تشریف

آوری پر میری اُمید بڑھ گئی کہ آپ میری تمنا پوری کرادیں گے اور بہت ہی خوشی کا اظہار کیا، میں نے کہا اجی کرنل صاحب پہلے میری سن تو لیجئے، مجھے آپ سے زیادہ خوشی ہو رہی ہے مجھے تو بہت ہی مسرت ہوئی کہ آپ یہاں تشریف فرما ہیں، اس لیے کہ آپ نے جو ہمارے مدرسہ کے لیے وقف کیا ہے اس کے متعلق ہمارے مدرسہ والوں کا اصرار یہ ہے کہ ایک وفد آپ کی خدمت میں بھوپال جائے، جو آپ کے اس احسانِ عظیم کا شکریہ ادا کرے، مگر ان کا اصرار یہ ہے کہ تیرا اس وفد میں ہونا ضروری ہے اور میرے لیے سفر ''قطعة من النار'' ہے، کئی دن سے ہمارے مدرسہ میں یہ مشورہ چل رہا ہے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ مدرسہ ایک وفد ضرور بھیجے اور اہل مدرسہ کا اصرار ہے کہ تیرا اس وفد میں ہونا بہت ضروری ہے کہ اس سے کرنل صاحب کو مسرت ہوگی، اس وقت آپ کے یہاں ہونے کی خوشی اس پر ہے کہ میں مدرسہ کی طرف سے بطور وفد آپ کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے اور کئی منٹ تک کھڑے ہی کھڑے صرف زبانی نہیں، میں نے ان کے لیے دل سے دُعائیں دیں اور آخر میں میں نے کہا کہ کرنل صاحب بڑھاپے میں کچھ آدمی کی عقل میں فتور آجاتا ہے ارے بڈھے! تو نے یہ کیا کیا! ان حضرت جی کا نام کیوں لکھ دیا، مرحوم نے کہا اجی حضرت! ایک ہی سانس میں دونوں، میں نے کہا کرنل صاحب بالکل اور پھر وہی کہوں گا جو میں نے شروع میں کہا کہ میں مدرسہ کا آدمی بھی ہوں اور ہم اہل مدرسہ چندہ کے لیے سفیروں کو بھی بھیجتے ہیں تم حضرات کی خدمت میں خوشامد کے خطوط بھی لکھتے ہیں، ایسی صورت میں اگر بلا طلب کوئی ہمارے مدرسہ میں دے تو اس کا ہم جتنا بھی شکریہ ادا کریں کم ہے، لیکن یہ شخص جو مال کے اُوپر فٹ بال کے گیند سے بھی زیادہ ٹھوکر مارتا ہو اس کو آپ مجبور کریں اور مجھے بھی آپ مجبور کریں کہ میں ان پر ان کی طبیعت کے خلاف جبر کروں یہ آپ کا کیسا ظلم ہے، یہ ساری گفتگو کھڑے کھڑے ننگے پاؤں ہو رہی تھی۔

کرنل صاحب نے فرمایا کہ آپ حجرہ میں تو تشریف لائیں، آپ کی خبر سن کر میرا دل تو باغ باغ ہو گیا تھا، مگر آپ نے تو مجھے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا، حجرہ میں جا کر تقریباً دو گھنٹے یہی منظر رہا کہ میں ایک ہی سانس میں مدرسہ کا شکریہ ادا کرتا اور عزیز مرحوم کی طرف سے معذرت کرتا، میں نے کرنل صاحب سے یہ بھی کہا کہ آپ ان کا حصہ مدرسہ کو دے دیں، آپ ایسے ناقدرے کو کیوں دیں، قدر دانوں کو دینا چاہیے، کرنل صاحب نے کہا کہ میری تمنا تو یہی ہے کہ آپ میری اس جائیداد میں تبلیغ کا بھی کوئی حصہ کرادیں، میں نے کہا کہ میں ان عزیز کی منشاء کے خلاف کوئی حکم ان کو نہیں دے سکتا، مرحوم نے اخیر تک اس کو منظور ہی نہیں کر کے دیا، اس کے بعد تو ہمارے مدرسہ کے ناظم مالیات بھائی اکرام مرحوم بھی بار بار یوں کہا کرتے تھے کہ مولانا

یوسف صاحب نے بڑا ہی اچھا کیا کہ قبول نہیں کیا اس لیے کہ اس جائیداد کے مقدمات کا سلسلہ ایسا لامتناہی ہوا اور جن پر وقف کیا تھا ان پر اتنے اخراجات پڑ گئے کہ مولانا مرحوم اگر میرے اصرار پر قبول کر لیتے تو میرے بھی آنکھ نیچی رہتی۔

دوسرا واقعہ: جناب الحاج وجیہ الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے، یہ میرے حضرت قدس سرہٗ کے اخص الخواص خدام میں تھے اور میرے حضرت قدس سرہٗ ان کا اور ان کے بڑے بھائی جناب الحاج فصیح الدین صاحب کا اور جناب شیخ الحاج رشید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا بہت ہی احترام کرتے تھے اور بہت ہی شفقت فرماتے تھے، انہی حضرات کے بچوں کے ختمِ قرآن میں حضرت رمضان المبارک میں شرکت کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ جیسے پہلے بھی اس کی تفاصیل گزر چکیں۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد اس ناکارہ نے کئی رمضان جزءاً وکلاً نظام الدین میں گزرے۔ اعتکاف تو اس زمانہ میں وہیں ہوتا تھا مولانا یوسف صاحب کے حجرہ کے قریب جو ایک لمبا چوڑا معتکف بنا ہوا ہے وہ میرا اور مولانا مرحوم کا مشترک معتکف ہوتا تھا کہ بڑا پردہ تو نہایت طویل وعریض لوہے کہ سرے پر پڑا رہتا تھا اور اندر کے حصوں کو معمولی چادروں سے دو حصوں میں منقسم کر رکھا تھا۔ غربی حصہ میں یہ سیہ کار رہتا تھا اور شرقی میں مولانا مرحوم۔ ایک مرتبہ ہم دونوں ظہر کے بعد اپنے اپنے معتکف میں تھے، بیچ میں مختصر سا پردہ پڑا ہوا تھا میں مشغول تھا کہ دفعۃً میں نے مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے گرجنے کی آواز سنی اور جب خیال کیا تو دوسری آواز جناب الحاج وجیہ الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تھی وہ کچھ تبلیغ میں دے رہے تھے اور مولانا مرحوم کہہ رہے تھے کہ مجھے پیسے نہیں چاہئیں، مجھے تو تمہاری ضرورت ہے۔ جب میں نے کئی منٹ تک یہ ردوقدح سنی تو میں اپنے معتکف سے مولانا مرحوم کے معتکف میں گیا اور حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو درخواست کر کے اپنے معتکف میں لے آیا اور میں نے نہایت ہی خوشامد، لجاجت، منت سماجت سے ان سے یہ معذرت کی کہ عزیز موصوف جناب سے واقف نہیں۔ آپ یہ رقم مجھے مرحمت فرما دیجئے۔

انہوں نے نہایت غصہ میں مجھے دینے سے انکار فرما دیا کہ میں تجھے نہیں دیتا۔ میں نے ہر چند اصرار سے مانگا کہ میں تبلیغ میں خرچ کروں گا اور کسی وقت مولانا یوسف صاحب کے ذریعہ خرچ کراؤں گا، انہیں بہت غصہ آ رہا تھا، انہوں نے صفائی سے انکار کر دیا کہ میں تجھے نہیں دوں گا جب وہ نہیں لیتے تو مجھے بھی اصرار نہیں جتنی دیر مولانا مرحوم سے جنگ وجدل میں گزری تھی اس سے دوگنی دیر میں نے خوشامد کی۔ مگر حاجی صاحب پر بہت ہی اثر تھا وہ راضی نہیں ہوئے اور اٹھ کر چل دیئے۔ ان کے جانے کے بعد میں عزیز مرحوم نور اللہ مرقدہٗ کے معتکف میں گیا۔

میں نے کہا کہ تم اپنے لوگوں کے ساتھ تو جو چاہے برتاؤ رکھو مگر اکابر کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کے ساتھ ایسا برتاؤ ہرگز نہیں چاہیے۔ یہ شخص وہ ہے جس کے لیے تمہارا باپ حضرت قدس سرہٗ کے مکان سے کھانا اور چائے لے کر آیا کرتا تھا۔ عزیز موصوف نے ناواقفیت کا عذر کیا اور یہ بالکل صحیح تھا کہ میں نے جو منظر بیان کیا تھا وہ عزیز موصوف کی پیدائش سے بھی پہلے کا یا بالکل ابتدائی زمانہ کا تھا۔ عزیز مرحوم نے مجھ سے کہا کہ آپ اسی وقت تشریف لا کر مجھے منع فرما دیتے۔ میں نے کہا تم اس قدر جوش پر تھے کہ اس وقت میں نے دخل دینا مناسب نہیں سمجھا مگر اس کا اہتمام بہت ضروری ہے اس عزیز مرحوم نے بھی دو ایک لڑکوں کو ان کے تعاقب میں بھیجا، معلوم ہوا کہ وہ یہاں سے درگاہ میں گئے ہیں مگر وہ نہ ملے۔

کئی ماہ بعد میرا دوبارہ دہلی جانا ہوا تو معمول کے موافق عزیزانم مولانا یوسف مرحوم اور مولانا انعام الحسن سلمہٗ اسٹیشن پر موجود تھے۔ میں نے اسٹیشن پر اترتے ہی کہا کہ پہلے حاجی وجیہ الدین صاحب کے یہاں جانا ہے اور تمہیں ان سے معافی مانگنا ہے۔ عزیز مرحوم نے بہت خوشدلی سے کہا کہ ضرور چلنا ہے۔ چنانچہ ہم تینوں ایک دو آدمی اور بھی ساتھ تھے۔ حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی دُکان پر جو نظام الدین کے راستے ہی میں تھی، پہنچے، رات کا وقت ہو گیا تھا، کیواڑ کھلوائے، خود حاجی صاحب مرحوم نے کیواڑ کھولے اور میں نے کیواڑ کھلتے ہی عرض کیا کہ مولانا یوسف صاحب آپ سے معافی مانگنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہیں نہیں اس کی بالکل ضرورت نہیں۔ بلکہ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں کہ آپ نے اس دن میری کتنی خوشامد کی مگر مجھے اس وقت قلق بہت ہو رہا تھا، اس لیے میں نے آپ کی خوشامد کی پرواہ نہ کی اور صاف انکار کر دیا، اس کی تو میں معافی چاہتا ہوں۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ ان کی ڈانٹ کا جتنا مجھے اثر ہوا آپ کی خوشامد کا نہیں اور حاجی صاحب نے فرمایا کہ اس دن سے لے کر آج تک میوات کا کوئی تبلیغی جلسہ ایسا نہیں ہوا، جس میں میں نے شرکت نہ کی ہو، اتنا تو ضرور ہے کہ رات کو میں نہیں ٹھہرا، صبح کو ناشتہ سے فارغ ہو کر اپنی کار میں ہمیشہ جلسہ میں گیا اور دعاء کے فوراً بعد واپس آ گیا، مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کی کہ جی ہاں میں بھی جلسہ میں ہمیشہ دیکھتا تو رہا ہوں، لیکن جلسہ کے بعد تلاش کرنے پر نہیں ملے، مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اللہ جل شانہ نے اسی استغناء کی وجہ سے ہیبت اور رعب اتنا عطاء فرما دیا تھا کہ بڑے سے بڑے آدمی کو ڈانٹنے میں بالا رادہ نہیں بلا ارادہ جوش آ جاتا تھا کہ پھر ان کو اس کا احساس نہیں رہتا تھا کہ سامنے والا کون ہے، ان کی نگاہ میں سب ایک عام آدمی سمجھے جاتے تھے، لاہور کی ان کی ایک تقریر اور جلسہ بہت مشہور ہے۔

قریشی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ لاہور میں بہت ہی خواص اعلیٰ عہدہ داروں اور اعلیٰ حکام کا ایک جلسہ کیا، جس میں بہت ہی اہتمام سے بڑے اعلیٰ عہدہ داروں کو جمع کیا، تا کہ وہ مولانا کی تقریر بہت اہتمام سے تفصیل سے سن سکیں اور جلسہ کے افتتاح کے موقع میں مرحوم نے ان کا تعارف بھی کرایا کہ یہ صاحب فلاں محکمہ کے انچارج ہیں، یہ صاحب وزیر ہیں، یہ انجینئر ہیں، یہ ڈاکٹر ہے، دیر تک اشخاص کا عہدوں اور ڈگریوں کے ساتھ تعارف ہوتا رہا اور نئے نئے الفاظ کے ساتھ جو ہم جیسوں کے لیے غیر مانوس بھی تھے، مولانا اس پوری مدت میں پیچ وتاب بھی کھاتے رہے، بعد میں کھڑے ہوئے اور فرمایا ابھی بھی جن لوگوں کا جن الفاظ اور جس طرز سے تعارف ہوا وہ میرے لیے غیر مانوس تھا اور اگر بجائے اس کے یوں کہا جاتا کہ یہ کتا ہے، یہ گدھا ہے، یہ سُور ہے تو میں بخوبی سمجھ لیتا کہ کون کون صاحب کیا ہیں، پھر اس طرزِ تعارف پر سخت تنقید فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اسلام کے مبارک دور میں جب کسی کا تعارف ہوتا تو اسی طرح ہوتا کہ فلاں نے اسلام کی یہ خدمت کی، فلاں نے اسلام کی راہ میں اس طرح جان دی، فلاں نے خدا کے لیے یہ کہا، فلاں نے اسلام کو اس طرح پھیلایا، فلاں جنگ میں شریک ہوئے، فلاں نے غزوہ میں شرکت کی، یہ بدری ہیں، یہ اصحاب العقبہ ہیں، غرض کہ تقریر کا اکثر حصہ اس پر مشتمل تھا، صاحب خانہ سر جھکائے سب سنتے رہے اور ڈرتے رہے کہ مولانا کی صاف گوئی سے اہلِ دنیا پر کیا اثر پڑے گا، اس کا بھی بہت فکر رہا کہ میں نے تو کیا سوچ کر اجتماع کیا تھا یہ تو اُلٹا ہی ہو گیا۔

مرحوم فرماتے ہیں کہ ہر وقت یہ فکر لگا رہا کہ مجمع میں سے کوئی اُٹھ کر مولانا کی شان میں بے ادبی نہ کر دے، مگر ہوا یہ کہ جن لوگوں کو ڈانٹا گیا تھا ان لوگوں پر بہت ہی اچھا اثر ہوا اور وہ دوسرے جلسوں میں اپنے ہم جنسوں کو اہتمام سے شرکت کے لیے لائے، یہ اجتماع تو بہت ہی پُر لطف اور بہت ہی طویل مضامین کا ہے، بندہ کے پاس بھی اس وقت بہت ہی کثرت سے اس جلسہ کی روداد کے خطوط بھی آئے، لوگوں کے تاثرات بھی معلوم ہوئے، سوانح یوسفی میں بھی اس واقعہ کو بہت مختصر طور پر ذکر کیا ہے اور مولانا مرحوم کے پورے الفاظ میں بھی یہاں باوجود یاد ہونے کے نقل نہیں کر رہا ہوں، اس لیے کہ ایک نہایت اور ضروری بات یہ ہے کہ اس کا مبلغین کو بہت اہتمام کرنا چاہیے کہ اکابر کی ان جیسی چیزوں کی نقل ہرگز نہیں اُتارنا چاہیے، اس لیے کہ جو بلا ارادہ جذبہ سے نکلتے ہوں وہ تو مؤثر ہوتے ہیں اور جو بناوٹ اور آورد سے ہوتے ہیں وہ مضر ہوتے ہیں:

ناز را روئے بباید ہمچو مدد
چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

''ناز کے لیے بھی گلاب کے پھول جیسا منہ چاہیے اور جب پھر یہ نہ ہو اس وقت تک ڈانٹ

ڈپٹ کی طرف متوجہ نہیں ہونا چاہیے''۔

زشت باشد روئے نازیبا و ناز عیب باد چشم نابینا و باز

''برے چہروں کے ساتھ ناز بہت بدنما ہے جیسے آندھی آنکھ کھلی ہوئی بری لگتی ہے، اگر بینائی جاتی رہے تو بند آنکھ ہی اچھی لگتی ہے''۔

میں نے حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد ان کے بعض خلفاء کو جو مجھ سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، بڑے اہتمام سے تاکید کی تھی کہ اتنے حکیم الامت نہ بنو، اتنے اصلاح میں تشدد نہ کیجئے، ان دوستوں نے میری بات کو بہت پسند کیا تھا، حدیث پاک میں آیا ہے کہ ''اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ اگر اللہ پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ اس کو پورا فرما دیتے ہیں'' لیکن اس کی حرص میں اگر ہر شخص بزرگی جتانے کے واسطے اللہ پر قسم کھا کھا کر غیب کی باتیں کرنے لگے تو دوسری حدیث میں آیا ہے کہ تو دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ ''ومن یتال علی اللّٰہ یکذبہ'' پہلے بھی اس مضمون کو میں آپ بیتی میں کئی جگہ لکھوا چکا ہوں کہ اکابر کی ان چیزوں پر جن کو وہ جوش میں فرما دیں وہ ڈانٹ ڈپٹ کے قبیلہ سے ہو یا اپنے متعلق تعریفی الفاظ ہوں نکیر نہیں ہونا چاہیے لیکن ان کی حرص بھی نہیں چاہیے۔

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر۱۲

اکابر کی تواضع

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے: ''من تواضع للّٰہ رفعه اللّٰہ'' یہ پاک ارشاد تو میرا بہت ہی مجرب ہے، جن حضرات میں جتنی بھی میں نے تواضع پائی اتنی ہی زیادہ ان میں رفع آنکھوں سے دیکھی۔

حضرت شاہ ولی اللہ ومولانا فخر الدین

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اور مولانا فخر الدین صاحب چشتی اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمہم اللہ تعالیٰ تینوں کا ایک زمانہ تھا اور تینوں حضرات دہلی میں تشریف رکھتے تھے، ایک شخص نے چاہا کہ تینوں حضرات ایک شہر میں موجود ہیں، ان کا امتحان لینا چاہیے کہ کس کا مرتبہ بڑا ہے، یہ شخص اول شاہ ولی اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کہ حضرت کل کو آپ کی میرے یہاں دعوت ہے قبول فرمائیں اور نو بجے دن کے غریب خانہ پر خود تشریف لائیں، میرے بلانے کے منتظر نہ رہیں، شاہ صاحب نے فرمایا بہت اچھا، اس کے بعد وہ شخص مولانا فخر الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا ساڑھے نو بجے میرے بلائے بغیر مکان پر تشریف لائیں اور ماحضر تناول فرمائیں۔

مرزا مظہر جان جاناں کا واقعہ

یہاں سے اُٹھ کر یہ شخص مرزا مظہر جانِ جاناں رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ کاروبار کے سبب حضرت خدمت نہ ہوسکوں گا پورے دس بجے دن کو غریب خانہ پر تشریف لائیں، تینوں حضرات نے دعوت قبول فرمائی اور اگلے روز ٹھیک وقتِ مقررہ پر اس شخص کے مکان پر پہنچ گئے۔

اول نو بجے شاہ صاحب تشریف لائے، اس شخص نے ان کو ایک مکان میں بٹھایا اور چلا گیا، ساڑھے نو بجے مولانا تشریف لائے، ان کو دوسرے مکان میں بٹھایا، پھر دس بجے مرزا صاحب تشریف لائے، ان کو تیسرے مکان میں بٹھایا، غرض تینوں حضرات بیٹھ گئے تو یہ شخص پانی لے کر آیا، ہاتھ دُھلائے اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ ابھی کھانا لے کر حاضر ہوتا ہوں، کئی گھنٹے گزر گئے اس شخص نے خبر نہ لی، آکر یہ بھی نہ دیکھا کہ کون گیا اور کون بیٹھا ہے، جب ظہر کا وقت قریب آگیا اور اس

نے سوچا کہ مہمانوں کو نماز بھی پڑھنی ہے تو اول شاہ ولی اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور شرمندہ صورت بنا کر عرض کیا، حضرت کیا کہوں گھر میں تکلیف ہوگئی تھی، اس لیے کھانے کا انتظام نہ ہوسکا۔ دو پیسے نذر کیے اور کہا ان کو قبول فرمایئے، شاہ صاحب نے خوشی سے لے لیے اور فرمایا کیا مضائقہ ہے، بھائی گھروں میں اکثر ایسا ہوہی جاتا ہے، شرمندہ ہونے کی کوئی بات نہیں، یہ فرما کر چل دیئے، پھر یہ شخص مولانا فخر الدین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہی کہا جو وہاں کہا تھا اور دو پیسے نذر کیے، مولانا نے فرمایا، بھائی فکر کیا بات ہے، اکثر گھروں میں ایسے قصے پیش آجایا کرتے ہیں اور کھڑے ہوکر نہایت خندہ پیشانی سے تعظیم کے ساتھ رومال پھیلادیا، دو پیسے کی نذر قبول فرمائی اور رومال میں باندھ کر روانہ ہوئے، دونوں کو رخصت کر کے یہ شخص حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی خدمت میں پہنچا اور وہی عذر بیان کر کے دو پیسے نذر کیے، مرزا صاحب نے پیسے تو اُٹھا کر جیب میں ڈال لیے اور پیشانی پر بل ڈال کر فرمایا کچھ مضائقہ نہیں، مگر پھر ہمیں ایسی تکلیف مت دیجئے، یہ فرما کر تشریف لے گئے۔

اس شخص نے یہ قصہ اور بزرگوں سے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ مولانا شاہ فخر الدین صاحب فن درویشی میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں کہ انہوں نے وہ نذر خندہ پیشانی کے ساتھ تعظیم سے کھڑے ہوکر قبول فرمائی اور ان سے کم درجہ شاہ ولی اللہ کا ہے کھڑے تو نہیں ہوئے مگر بخوشی نذر کو قبول فرمایا اور تیسرے درجہ پر مرزا صاحب کی نذر کی قبولیت کے ساتھ ملال بھی ظاہر فرمایا، یہ قصہ نقل فرما کر حضرت امام ربانی نے ارشاد فرمایا "اس زمانہ کے بزرگوں کا یہی خیال تھا مگر میرے نزدیک تو حضرت مرزا صاحب کا درجہ بڑھا ہوا ہے کہ باوجود اس قدر نازک مزاج ہونے کے اتنا صبر وتحمل فرمایا اور کچھ مضائقہ نہیں، جواب عطاء فرمایا"۔ (تذکرۃ الرشید: ص۲۵۸رج۲)

اس قصہ کو مختصر طور پر اورح ثلاثہ میں بھی ذکر کیا گیا ہے، اس میں امیر شاہ خان صاحب نے بیان کیا ہے کہ یہ قصہ مجھ کو حضرت حاجی صاحب نے بھی سنایا اور حضرت نانوتوی نے بھی، حضرت گنگوہی نے بھی، حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس قصہ کو بیان فرما کر یہ فرمایا کہ مولانا فخر الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی بات بہت انکساری کی ہے اس سے حیثیت ٹپکتی ہے اور مولانا نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شاہ ولی اللہ صاحب کی بات بڑھی ہوئی ہے کہ ان کے نفس نے اصلاً حرکت نہ کی اور حضرت گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ مرزا صاحب کی بات بہت بڑھی ہوئی، عدل کا اقتضا یہی ہے کہ جو کچھ مرزا صاحب نے فرمایا، حاشیہ پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ قولہ حضرت گنگوہی الخ اقول احقر کا میلان حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے کی طرف ہے۔ (اورحِ ثلاثہ: ص۱۶)

حضرت شاہ اسحاق کا واقعہ

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد اجمیر میں رہا کرتے تھے اور وہاں مواعظ کے ذریعہ سے اشاعتِ دین کرتے تھے انہوں نے حدیث **لا تشد الرحال** کا وعظ کہنا شروع کیا اور لوگوں پر اثر بھی ہوا، اتفاق سے شاہ اسحاق صاحب کا اس زمانہ میں قصد ہجرت ہوگیا، جب شاہ صاحب کے قصد کی ان کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے شاہ صاحب کو لکھا کہ جناب جب عازمِ سفر ہجرت ہوں تو اجمیر تشریف نہ لاویں، کیونکہ میں **لا تشد الرجال** کا وعظ کہہ رہا ہوں۔ لوگ راہ پر آچلے ہیں آپ کی تشریف آوری سے جو کچھ اثر ہوا ہے اس کے غتر بود ہوجانے کا اندیشہ ہے۔

شاہ صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ میں اجمیر کے قصد سے نہ آؤں گا لیکن چونکہ اجمیر راستہ میں پڑے گا اور خواجہ صاحب ہمارے مشائخ میں ہیں، اس لیے مجھ سے نہ ہوسکے گا کہ میں بلا حاضر ہوئے بالا بالا چلا جاؤں، ہاں جب میں آؤں تم وعظ کہنا اور وعظ میں بیان کرنا کہ اسحاق نے غلطی کی جو وہ اجمیر آیا اس کا فعل حجت نہیں اور میرے سامنے کہنا اور یہ خیال نہ کرنا کہ شاید مجھے ناگوار ہوئے گا، مجھے ہرگز ناگوار نہ ہوگا اور میں اقرار کرلونگا کہ واقعی میری غلطی سے ہے اس سے وہ ضرور دفع ہوجائیگا جس کا تم کو اندیشہ ہے اور شاہ صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ یہ مجاور اور قبر پرست ہمارے رقیب ہیں، رقیبوں کے ڈر سے محبوب کو نہیں چھوڑا جاسکتا۔

یہ قصہ اورِ ح ثلاثہ صفحہ ۱۱۸ میں بھی ذکر کیا ہے، اس میں حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کا حاشیہ ہے، قولہ وعظ میں بیان کرنا الخ۔ اقول کیا انتہا ہے، اس محبت دین و نصح مسلمین کا کہ اپنی شان کو ان پر بالکل نثار کردیا، حالانکہ اس مقام میں علاوہ اس جواب کے کہ حدیث کے کیا معنی ہیں کہ یہ جواب تو خلاف مصلحت وتقیہ تھا، دوسرا اسہل جواب یہ ہوسکتا تھا کہ ہم خاص اس قصد سے نہیں آئے آگے جاتے ہوئے ٹھہر گئے، مگر اس کو بھی پسند نہیں کیا کہ ہر شخص ایسا بہانہ کرسکتا ہے، وہ جواب تجویز کیا جس میں شغب بالکل ہی قطع ہوگیا، گو اپنا جاہ بھی قطع ہوگیا ہو۔

مولانا اسماعیل شہید کے واقعات

ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید رحمہ اللہ تعالیٰ وعظ فرمارہے تھے، اثناء وعظ میں ایک شخص اُٹھا اور کہا کہ مولوی صاحب! ہم نے سنا ہے کہ تم حرامی ہو، آپ نے نہایت متانت سے جواب دیا، میاں تم نے غلط سنا ہے، میرے ماں باپ کے نکاح کے گواہ بڈھانہ پھلت اور خود دہلی میں ہنوز موجود ہیں اور یہ فرما کر وعظ شروع کردیا، حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ اس حاشیہ میں

تحریر فرماتے ہیں کہ اس سے طالب علم کو معلوم ہوسکتا ہے کہ حضرت مولانا شہید کی تیزی سب دین کے لیے تھی ورنہ پہچان نفس کا اس سے بڑھ کر اور کونسا موقع ہوسکتا تھا۔ (اورِ حِ ثلاثہ: ص ۵۷)

میرے حضرت شیخ مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ بھی اس نوع کا ایک واقعہ پیش آچکا ہے مسلم لیگ اور کانگریس کے ہنگامے میں بہت سے نالائقوں نے اخباروں میں حضرت قدس سرہٗ کی سیادت سے انکار کیا، اخباروں میں تو جھوٹ سچ، گالی گلوچ ہوتی رہتی ہے، مگر کسی احمق نے حضرت نور اللہ مرقدہ کو درس بخاری میں اس مضمون کا پرچہ دے دیا کہ اخبارات میں یہ شائع ہورہا ہے، حضرت نے سبق کے دوران ہی میں نہایت متانت سے فرمایا کہ میرے والدین کے نکاح کے گواہ ابھی تک ٹانڈا اور فیض آباد وغیرہ کے نواح میں موجود ہیں، جس کا دل چاہے وہاں جا کر تحقیق کرلے اور سبق شروع کروادیا، چونکہ بخاری شریف کی جماعت بہت بڑی ہوتی تھی، اس لیے اثناء سبق میں سوالات کا دستور یہ تھا کہ سائل کوئی پرچہ لکھ کر واسطہ در واسطہ حضرت تک پہنچاتا اور حضرت اس پرچہ کو پڑھ کر سبق ہی میں اس کا جواب مرحمت فرمایا کرتے تھے کہ حضرت کے سامنے تو آلہ مکبر الصوت ہوتا تھا، ہر جگہ آواز پہنچ جاتی تھی، مگر سائل کی آواز نہیں پہنچتی تھی، حضرت شاہ اسماعیل صاحب کے تو واقعات اس قسم کے بہت معروف و مشہور ہیں۔

رنڈی کے یہاں کا قصہ تو بہت مشہور ہے ایک مرتبہ حضرت مولانا عشاء کی نماز پڑھ کر جامع مسجد کے اس دروازہ سے باہر تشریف لے گئے جو قلعہ کی طرف ہے، مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اُٹھ کر لپک کر ان کو پکڑا کہ کہاں جاتے ہو، میں اس وقت تم کو تنہا نہ جانے دوں گا، اگر تم کہیں جاؤ گے میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ مولانا نے فرمایا کہ میں ایک خاص ضرورت سے جا رہا ہوں، تم مجھے جانے دو اور میرے ساتھ نہ آؤ۔ میں نے اصرار کیا گروہ نہ مانے اور تنہا چل دیے، میں بھی ذرا فاصلے سے ان کے پیچھے ہولیا، خانم کے بازار میں ایک بڑی اور مشہور رنڈی کا مکان تھا، اس کا نام موتی تھا، مولانا اس مکان پر پہنچے اور آواز دی، تھوڑی دیر میں مکان سے ایک لڑکی نکلی اور پوچھا کہ تم کون اور کیا کام ہے۔ انہوں نے کہا، میں فقیر ہوں، وہ لونڈی یہ سن کر چلی گئی اور جا کر کہہ دیا کہ ایک فقیر کھڑا ہے، رنڈی نے کچھ پیسے دیئے اور کہا کہ جا کر دے دے، وہ لڑکی پیسے لے کر آئی، مولانا نے کہا میں ایک صدا کہا کرتا ہوں اور بغیر صدا کہے لینا میری عادت نہیں، تم اپنی بی بی سے کہو کہ میری صدا سن لے، اس نے جا کر کہہ دیا، رنڈی نے کہا کہ اچھا بلالے، وہ بلا کر لے گئی، مولانا جا کر صحن میں رومال بچھا کر بیٹھ گئے اور سورۂ والتین ''ثم رددنه اسفل سافلين'' تک تلاوت فرمائی، میں بھی وہاں پہنچ گیا اور جا کر مولانا کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔

مولانا نے اس قدر موثر تقریر فرمائی کہ گویا جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرادیا اس رنڈی کے

یہاں بہت سی اور رنڈیاں بھی تھیں ان کے علاوہ اور لوگ بھی بہت تھے، ان پر اس کا یہ اثر ہوا کہ سب لوگ چیخ چیخ کر رونے لگے اور کہرام مچ گیا، انہوں نے ڈھولک ستار وغیرہ توڑنے شروع کر دیئے اور موتی اور اس کے علاوہ کئی رنڈیاں تائب ہوگئیں۔ اس کے بعد مولانا اُٹھ کر چل دیے، میں بھی پیچھے پیچھے چل دیا، جب مولانا جامع مسجد کی سیڑھی پر پہنچے تو میں نے مولانا سے کہا کہ میاں اسماعیل! تمہارے دادا ایسے تھے، تمہارے چچا ایسے تھے اور تم ایسے خاندان کے ہو جس کی سلامی بادشاہ رہے ہیں، مگر تم نے اپنے آپ کو بہت ذلیل کرلیا، اتنی ذلت ٹھیک نہیں۔

اس پر مولانا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور حیرت سے میرے طرف دیکھا اور کھڑے ہوگئے، مجھ سے فرمایا مولانا! آپ نے یہ کیا فرمایا، آپ اس کو میری ذلت سمجھتے ہیں یہ تو کچھ بھی نہیں میں تو اس روز سمجھوں گا کہ آج میرے عزت ہوئی ہے جس روز دلی کے شہدے میرا منہ کالا کر کے اور گدھے پر سوار کر کے مجھے چاندنی چوک میں نکالیں گے اور میں کہتا ہوں'' **قال اللّٰہ کذا و قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم کذا** '' یہ سن کر میرے یہ حالت ہوئی کہ میں کہنے کو تو کہہ گیا مگر مارے شرم کے پانی پانی ہوگیا اور زبان بند ہوگئی، اس کے بعد مجھے ان سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں، قولہ میں تو اس روز سمجھوں گا الخ اقول اللہ اکبر! مدعیان فنا آئیں اور دیکھیں فناء اس کو کہتے ہیں۔ (اورِ ح ثلاثہ: ص ۷۰)

یہاں ایک امر پر تنبیہ ضروری ہے کہ ہر شخص کو یہ درجہ یا حوصلہ نہیں کہ وہ وعظ کے بہانے رنڈی کے مکان پر پہنچ جائے اور کہہ دے کہ میں تو تبلیغ کرنے گیا تھا، یہ حق اسی کو حاصل ہے جو شاہ اسماعیل بن گیا ہو، اس کی فنائیت محقق ہوچکی ہو، دین کے اعلان و اشاعت میں کالا منہ کر کے گدھے پر گھمانے کو بھی عزت سمجھتا ہو اور مختصر الفاظ میں مامور من اللہ بن گیا ہو۔

حضرت شاہ اسماعیل رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ ادب بھی مشہور تھا کہ جس جلسہ میں حضرت سید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ہوتے اس جلسہ میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ وعظ نہیں فرماتے تھے، حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے تواضع کے قصے جیسا کہ اُوپر لکھوا چکا ہوں **لا تعدو لا تحصیٰ** ہیں، ایک مرتبہ وعظ فرما رہے تھے، اس میں ایک حدیث نقل کی، اسی وقت ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں نے شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے سنا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، آپ نے فرمایا ''مجھ کو خبر نہیں'' اسی وقت وعظ چھوڑ کر شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچے اور تصدیق کی اور پھر وعظ کے جلسہ میں آکر فرمایا، واقعی تم سچ کہتے ہو، یہ حدیث ضعیف ہے۔

(حسن العزیز: ص۱۸۲/ج ۳)

میں نے اپنے اساتذہ کے اساتذہ کا معمول سنا ہے کہ سبق پڑھانے کے دوران میں اگر کوئی طالب علم اشکال کرتا جس کا جواب سمجھ میں نہیں آیا تو دوران سبق میں اپنے اُستاذ سے جا کر پوچھ آتے اور آ کر تقریر فرماتے، حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے ترجیح الراجح کا سلسلہ اسی لیے قائم کیا ہے کہ جس کو میری تصانیف میں غلطی معلوم ہو مجھے تنبیہ کر دے تاکہ مجھے اگر اپنی غلطی کا سامنا ہو جائے تو اس سے بالاعلان رجوع کر لوں، چنانچہ مجھ سے جہاں کہیں کوئی لغزش ہوئی ہے اس کا دل کھول کر بہت فراغ دلی سے اقرار کیا ہے اور جہاں مجھے شرح صدر اپنی غلطی کا نہیں ہوا وہاں دوسرے کا قول بھی نقل کر دیا تاکہ جو قول جس کے جی کو لگے وہ اسی کو اختیار کر لے، میں نے ہمیشہ یہی کیا خواہ مخواہ اپنی بات کو نبھایا نہیں۔

یہ برکت حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی ہے، ویسے تو یہ خصلت اپنے سب ہی اکابر میں تھی، لیکن جیسا رنگ مولانا (محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) میں اس صفت کا نمایاں تھا اور حضرات میں ایسا نہ تھا، دوران درس جہاں کسی مقام پر شرح صدر نہ ہوا، جھٹ اپنے کسی ماتحت مدرس کے پاس کتاب لیے جا پہنچے اور بے تکلف کہا کہ مولانا! یہ مقام میری سمجھ میں نہیں آیا، ذرا اس کی تقریر تو کر دیجیے، چنانچہ بعد تقریر کے واپس آ کر طلبہ کے سامنے اس کو دُہرا دیتے اور فرماتے کہ مولانا نے اس مقام کی یہ تقریر کی ہے، اسی طرح اگر کوئی طالب علم کسی مقام کی مولانا کی تقریر کے معارض تقریر کرتا اور وہ صحیح ہوتی تو اپنی تقریر سے فوراً درس ہی میں رجوع فرما لیتے اور صاف لفظوں میں فرماتے ہاں واقعی مجھ سے غلطی ہوئی، مولانا کو ایسی باتوں سے ذرا عار نہ آتی، بات یہ ہے کہ جن کی بڑی شان ہوتی ہے وہ کہیں ایسی باتوں سے گھٹتی ہے اگر کسی کی ایک من شان ہو اور اس میں سے ایک تولہ گھٹ جائے کی اس کی کمی کی کیا پرواہ ہوگی، ہاں جن کی ایک چھٹانک ہی شان ہوگی اس میں سے اگر آدھی چھٹانک جاتی رہے تو اس کے پاس آدھی چھٹانک ہی رہ جائے گی۔

(افاضات: ۲/۹ص ۴۰۸)

کتاب ’’تقویت الایمان‘‘ کا ذکر

حضرت شاہ اسماعیل صاحب شہید رحمہ اللہ تعالیٰ نے ’’تقویۃ الایمان‘‘ عربی میں تحریر فرمائی جس کا ایک نسخہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے کتب خانہ میں بھی تھا، ایک نسخہ امیر شاہ خان صاحب کے پاس اور ایک نسخہ مولوی نصر اللہ خان صاحب خورجوی کے کتب خانہ میں بھی تھا، اس کے بعد مولانا نے اس کو اُردو میں لکھا اور لکھنے کے بعد اپنے خاص خاص لوگوں کو جمع کیا، جن میں سید صاحب، مولوی عبدالحیٔ صاحب، شاہ اسحاق صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولوی فرید

الدین صاحب مرادآبادی، مومن خان صاحب، عبداللہ خان علوی صاحب بھی تھے۔

ان کے سامنے ''تقویۃ الایمان'' پیش کی اور فرمایا کہ میں نے یہ کتاب لکھی ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ بھی آگئے اور بعض جگہ تشدد بھی ہوگیا مثلاً ان امور کو جو شرک خفی تھے شرک جلی لکھ دیا گیا ہے، ان وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی اشاعت میں شورش ضرور ہوگی، اگر میں یہاں رہتا تو ان مضامین کو آٹھ دس برس میں بتدریج بیان کرتا، لیکن اس وقت میرا ارادۂ حج کا ہے اور وہاں سے واپسی کے بعد جہاد ہے، اس لیے میں اس کام سے معذور ہوگیا اور میں دیکھتا ہوں کہ دوسرا اس بار کو اُٹھائے گا نہیں، اس لیے میں نے یہ کتاب لکھ دی ہے گو اس سے شورش ہوگی، مگر توقع ہے کہ لڑ بھڑ کر خود ٹھیک ہو جائیں گے، میرا یہ خیال ہے اگر آپ حضرات کی رائے اشاعت کی ہو تو اشاعت کی جائے ورنہ اسے چاک کر دیا جائے۔

اس پر ایک شخص نے کہا کہ اشاعت تو ضرور ہونی چاہیے، مگر فلاں فلاں مقام پر ترمیم ہونی چاہیے، اس پر مولوی عبدالحیؒ صاحب، شاہ اسحاق صاحب، عبداللہ خان علوی صاحب اور مومن خان صاحب نے مخالفت کی اور کہا کہ ترمیم کی ضرورت نہیں ہے اور اسی طرح شائع کرنی چاہیے، چنانچہ اسی طرح اس کی اشاعت ہوگئی، اشاعت کے بعد مولانا شہید رحمہ اللہ تعالیٰ حج کو تشریف لے گئے اور حج سے واپسی کے بعد چھ مہینہ دہلی میں قیام رہا، اس زمانہ میں مولانا اسماعیل صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ گلی کوچوں میں وعظ فرماتے تھے اور مولوی عبدالحیؒ صاحب مساجد میں (یہ مواعظ جہاد کی ترغیب کے ہوا کرتے تھے) چھ مہینہ کے بعد جہاد کے لیے تشریف لے گئے، اس پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں، قولہ تشدد ہوگیا، اقول الخ۔ اس تشدد فی العلاج کا سبب مرض کا شدید ہونا ہے قولہ ورنہ اسے چاک کر دیا جائے، اقول ایسے بزرگ پر تشدد یا اصرار کا استبداد کا شبہ ظلم نہیں تو کیا ہے؟ (اورِاح ثلاثہ: ص ۸۱)

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ اس کتاب سے بہت نفع ہوا، چنانچہ مولانا اسماعیل صاحب کی حیات ہی میں دو ڈھائی لاکھ آدمی دُرست ہوگئے تھے اور ان کے بعد جو کچھ نفع ہوا اس کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا، حضرت شاہ اسماعیل صاحب نور اللہ مرقدہ ایک زمانہ میں نہایت خوش پوشاک بہترین لباس پہنا کرتے تھے، اس زمانہ کا قصہ ہے کہ اکبری مسجد کے صحن میں پہلی صف میں کسی وجہ سے ایک پتھر نیچا ہوگیا تھا اور برسات کے موسم میں اس میں گارا کیچڑ ہو جاتا تھا، سب نمازی اپنے کپڑوں کو بچانے کے لیے اس کو چھوڑ کر کھڑے ہوا کرتے تھے، اس وجہ سے اس میں فرجہ رہتا تھا، ایک روز عمدہ پوشاک پہنے ہوئے مولانا اسماعیل صاحب اکبری مسجد میں

تشریف لائے، آپ نے صفِ اول میں فرجہ دیکھا، آپ اسی جگہ گارے کیچڑ میں بیٹھ گئے اور کپڑوں کا ذرا خیال نہ فرمایا۔ (اورح ثلاثہ: ص ۸۷)

حضرت شاہ غلام علی کا واقعہ

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ شاہ غلام علی صاحب میں عجز و انکساری اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک سید نے شاہ صاحب کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ حضرت! آپ مجھے اپنا خادم بنا لیں، شاہ صاحب گھبرا اُٹھے اور فرمایا...... ہا...... ہا...... یہ لفظ ہرگز زبان سے نہ نکالنا تم فرزند علی ہو اور میں غلام علی ہوں۔ (تذکرۃ الرشید: ص ۲۶۲ ر ج ۲)

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کے واقعات

حضرت مولانا مظفر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک واقعہ قریب ہی میں گزر چکا ہے کہ مولانا رشید احمد صاحب بہت اچھے آدمی ہیں، وہ بہت اچھے آدمی ہیں، بہت اچھے آدمی ہیں کہ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب جب گنگوہ سے رامپور جا رہے تھے تو حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ نے کھانے کی تواضع کی، حضرت مولانا نے فرمایا کہ دیر ہو جائے گی، جو گھر میں رکھا ہو دے دو، حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے چند باسی روٹیوں پر اُڑد کی دال رکھ کر لا دی اور حضرت مولانا مظفر حسین صاحب نے ان کو لپیٹ کر اپنی چادر میں باندھ لیا اور رامپور جا کر فرمایا کہ مولانا رشید احمد صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔

حسن العزیز میں لکھا ہے کہ مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلہ میں ایک بزرگ تھے، درویش بھی تھے، زمیندار بھی تھے، طرز ایسا تھا کہ کوئی ان کو عالم نہ سمجھا تھا، ان کے عجیب و غریب معمولات تھے کھانے کے متعلق۔ ان کے قرابت دار مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی دہلی کے مدرسہ میں مدرس تھے، دہلی سے نانوتہ کا یہی راستہ تھا، کاندھلہ راستہ میں واقع ہوتا ہے، مولانا مظفر حسین صاحب نے ان سے شکایت کی کہ جب کبھی آپ آتے ہیں تو بلا ملے چلے جاتے ہیں مولانا مملوک صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر اصرار نہ کیا جائے ٹھہرنے کا تو میں آ جایا کروں گا، اس وقت بہلی میں سفر ہوتا تھا، اس روز سے معمول ہو گیا کہ کاندھلہ پہنچ کر جنگل میں بہلی چھوڑ کر مولانا مظفر حسین صاحب سے ملنے آتے، پھر وہ ان کو پہنچانے آتے، ایک دفعہ جب وہاں پہنچے تو اول سوال یہ تھا کہ کھانا کھاؤ گے یا کھا کر آئے ہو اور اگر کھاؤ گے تو رکھا ہوا کھاؤ گے یا تازہ پکوا دیا جائے، مولوی صاحب نے کہا کہ رکھا ہوا کھاؤں گا، بس ایک برتن میں کھچڑی کی کُھرچن لا کر رکھ دی کہ رکھا ہوا تو یہ ہے، انہوں نے وہی کھا لی۔ (حسن العزیز: ص ۲۷۰)

حضرت مولانا ہی کا ایک واقعہ اور ہے کہ قصبہ بڈولی میں ایک دفعہ مولانا وہاں کی سرائے میں ٹھہرے، برابر میں ایک بنیا مع اپنے لڑکے کے ٹھہرا ہوا تھا اور لڑکے کے ہاتھ میں سونے کے کڑے تھے، مولانا کی اس سے بات چیت ہوتی رہی، جیسا کہ سفر میں عادت ہے کہ مسافر آپس میں بات چیت کیا کرتے ہیں، اس نے پوچھا میاں جی کہاں جاؤ گے، مولانا نے سب بتا دیا کہ فلاں جگہ اور فلاں راستہ سے جاؤں گا، اس کے بعد مولانا تہجد پڑھ کر روانہ ہوگئے، اس لڑکے کے ہاتھ میں سے کسی نے کڑے اُتار لیے، بنیا اُٹھا تو دیکھا کڑے ندارد، بس اس کی تو رُوح فنا ہوگئی، دیکھا کہ وہ میاں جی بھی نہیں، جن سے رات بات چیت ہو رہی تھی، اس نے کہا ہو نہ ہو وہی لے گئے، یہ کوئی ٹھگ تھا، وہ اسی راستہ پر روانہ ہوئے جس پر مولانا نے جانے کا ارادہ بیان کیا تھا، یہاں تک کہ مولانا اس کو مل گئے، بس پہنچتے ہی اس نے ایک دھول رسید کیا، مولانا نے کہا کیا ہے؟ کہنے لگا کڑے کہاں ہیں؟ مولانا نے کہا کہ بھائی میں نے تیرے کڑے نہیں لیے، اس نے کہا ان باتوں سے کیا تو چھوٹ جائے گا، میں تجھے تھانے لے چلوں گا، مولانا نے کہا کچھ عذر نہیں میں تھانہ بھی چلا چلوں گا، غرض وہ مولانا کو پکڑ کر جھنجھانہ کے تھانہ میں پہنچا، اتفاقاً تھانہ دار مولانا کا بڑا معتقد تھا، اس نے دیکھا کہ مولانا آرہے ہیں، کھڑا ہوگیا اور دُور سے ہی آلیا، یہ دیکھ کر بنیے کے ہوش خطا ہوگئے، مگر مولانا اس سے کہتے ہیں بھاگ جا، بھاگ جا، تجھے کوئی کچھ نہ کہے گا، تھانہ دار نے مولانا سے پوچھا یہ کون تھا، مولانا نے کہا تم اسے کچھ نہ کہو جانے دو، اس کی چیز کھو گئی ہے اس کی تلاش میں آیا تھا، دیکھئے کیا بے نفسی ہے، لطف یہ کہ نرا عفو ہی نہیں بلکہ مولانا اس کے احسان مند بھی ہوئے چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ اس سے مجھے بڑا نفع ہوا، جب لوگ مصافحہ کرتے ہیں، میرے ہاتھ چومتے جاتے ہیں تو میں نفس سے کہتا ہوں کہ تو وہی ہے جس کے ایک بنیے نے دھول لگایا تھا، بس اس سے عجب نہیں ہوتا۔ (حسن العزیز: ص۲۳۹ رج ۲)

حضرت حاجی صاحب کے بعض واقعات

اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ ایسا وظیفہ بتا دیجئے کہ خواب میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہو جائے، حضرت نے فرمایا کہ آپ کا بڑا حوصلہ ہے، ہم تو اس قابل بھی نہیں کہ روضۂ مبارک کے گنبد شریف کی زیارت نصیب ہو جائے، اللہ اکبر کس قدر شکستگی و تواضع کا غلبہ تھا، اس پر حضرت والا (حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ) نے فرمایا، یہ سن کر ہماری آنکھیں کھل گئیں، حضرت کی عجیب شان تھی، اس فن کے امام تھے، ہر بات میں شان محققیت و حکمت ٹپکتی تھی، یہی وجہ ہے کہ حضرت کے خادموں میں سے

کوئی محروم نہیں رہا، حضرت حاجی صاحب کی خود یہ حالت تھی کہ اپنے ہر ہر خادم کو اپنے سے افضل سمجھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کے آنے والوں کے قدموں کی زیارت کو اپنے لیے ذریعہ نجات سمجھتا ہوں، حضرت پر شانِ عبدیت کا غلبہ رہتا تھا، وہ عبدیت ہی اس ارشاد کا منشاء تھا، مطلب یہ تھا کہ اپنی اہلیت کا اعتقاد نہ رکھتے، باقی تمنا کی ممانعت نہیں۔ (افاضات: ص۹۷ رج۱)

امیر شاہ خاں صاحب نے فرمایا کہ ایک شخص پنجابی ڈاکٹر مکہ معظمہ گیا ہوا تھا، حافظ صاحب کی بیوی سے ان کا نکاح ہو گیا تھا، اس نکاح میں کچھ باتیں حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی طبیعت کے خلاف بھی ہوئی تھیں اور یہ ڈاکٹر اچھا آدمی بھی نہیں تھا، چنانچہ میں اس کو مکہ جانے سے پہلے سے جانتا تھا، اس ڈاکٹر نے ایک مرتبہ گستاخانہ طور پر حضرت حاجی صاحب سے کہا کہ مجھے آپ کے اندر کوئی کمال نظر نہیں آیا، رہی آپ کی شہرت، سو یہ مولوی رشید احمد صاحب اور مولوی محمد قاسم صاحب کی وجہ سے ہوئی ہے، پھر مجھے حیرت ہے کہ مولوی رشید احمد صاحب اور مولوی محمد قاسم صاحب آپ سے کس طرح بیعت ہوئے، اللہ رے نفوس قدسیہ کہ اس کو سن کر ذرا تغیر نہیں ہوا اور مسکرا کر فرمایا کہ ہاں بھائی بات تو ٹھیک کہتے ہو، مجھے خود بھی حیرت ہے کہ یہ حضرات میرے کیوں معتقد ہو گئے اور لوگ مجھے کیوں مانتے ہیں۔ (اورِح ثلاثہ: ص۱۷۰)

حضرت گنگوہی کے واقعات

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں کہ سچی تواضع اور انکسارِ نفس جتنا امام ربانی میں دیکھا گیا دوسری جگہ کم نظر سے گزرے گا، حقیقت میں آپ اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھتے تھے، بحیثیت تبلیغ جو خدمتِ عالیہ آپ کے سپرد کی گئی تھی یعنی ہدایت و رہبری اس کو آپ انجام دیتے، بیعت فرماتے، ذکر و شغل بتاتے، نفس کے مفاسد و قبائح بیان فرماتے اور معالجہ فرماتے تھے، مگر بایں ہمہ اس کا کبھی وسوسہ بھی آپ کے قلب پر نہیں گزرتا تھا کہ میں عالم ہوں اور یہ جاہل ہیں، میں پیر ہوں اور یہ مرید ہیں، میں مطلوب ہوں اور یہ طالب، مجھے ان پر فوقیت ہے، میرا درجہ ان کے اُوپر ہے، کبھی کسی نے نہ سنا ہوگا کہ آپ نے اپنے خدام کو خادم یا متوسل یا منتسب کے نام سے یاد فرمایا ہو، ہمیشہ ''اپنے لوگوں'' سے تعبیر فرماتے اور دعاء میں یاد رکھنے کی ضرورت اپنے لیے طالبین سے بھی زیادہ ظاہر فرمایا کرتے تھے، ایک مرتبہ تین شخص بیعت کے لیے حاضر آستانہ ہوئے، آپ نے ان کو بیعت فرمایا اور یوں ارشاد فرمایا کہ تم میرے لیے دُعاء کرو میں تمہارے لیے دعاء کروں، بعض مرید بھی پیر کو تیرا لیتا ہے۔

(تذکرۃ الرشید: ص۴۷ ارج۲)

دوسری جگہ لکھتے ہیں اپنے متعلق انکسار وتواضع کا یہ حال تھا کہ کبھی کسی تقریر سے اپنی خوبی کا کچھ بھی اثر ظاہر ہوا تو معا اس کی تردید فرماتے اور اپنے سے اس انتساب کی نفی فرما دیا کرتے تھے، ایک بار حضرت شیخ عبدالقدوس رحمہ اللہ تعالیٰ کے خرقہ کا تذکرہ فرما رہے تھے کہ پچاس برس حضرت کے بدن پر رہا ہے، اس ضمن میں فرمایا، اسی حجرہ میں حضرت شیخ اور شیخ جلال تھانیسری رہا کرتے تھے، بیچ میں دیوار حائل تھی، سو کہاں تو فقر کا یہ حال تھا اور اب اسی حجرہ میں دنیا بھری پڑی ہے۔

(تذکرۃ الرشید: ص۱۲۹ / ج۲)

حضرت حکیم الامت تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے مولانا گنگوہی کی خدمت میں اپنے کچھ حالات لکھے، مولانا نے جواب میں تحریر فرمایا کہ "بھائی ہمیں تو اب تک بھی یہ حالات نصیب نہیں ہوئے"۔ کیا ٹھکانہ ہے تواضع کا، پھر فرمایا کہ مولانا گنگوہی نے ایک جگہ قسم کھائی ہے کہ مجھ میں کوئی کمال نہیں ہے، بعض مخلص لوگوں کو اس سے شک ہو گیا کہ مولانا میں کمال کا ہونا تو ظاہر ہے تو اس قول سے مولانا کا جھوٹ بولنا لازم آتا ہے، پھر ہمارے حضرت (حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ) نے مولانا کے قول کی تفسیر میں فرمایا کہ بزرگوں کو آئندہ کمالات کی طلب میں موجودہ کمالات پر نظر نہیں ہوتی، پس مولانا اپنے کمالاتِ موجودہ کی کمالاتِ آئندہ کے سامنے نفی خیال فرماتے تھے۔

(حسن العزیز: ص۱۱۱ / ج۲)

ایک مولوی صاحب نے مولانا کی ایک تقریر سن کر جوش میں آکر کہا کہ آپ کے پاس آکر تو حدیث بھی حنفی ہو جاتی ہے، مطلب یہ تھا کہ آپ تو ہر حدیث سے حنفیہ کی تائید فرماتے ہیں اور حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی اس وقت زندہ ہوتے تو اس کا جواب نہیں دے سکتے تھے، اس پر مولانا سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ یہ کیا کہا اگر حضرت امام شافعی زندہ ہوتے تو کیا میں ان کے سامنے بولتا بھی؟ اور بولتا تو کیا میں تو ان کی تقلید کرتا اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی تقلید کو چھوڑ دیتا، کیونکہ مجتہد حی کے ہوتے مناسب نہیں ہے، مجتہد غیر حی کی تقلید کی جائے۔

(افاضات یومیہ: ۲/۹ ص۴۳۹)

امیر شاہ خان صاحب نے نقل کیا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے خود مجھ سے بیان فرمایا کہ جب میں ابتداء میں گنگوہ کی خانقاہ میں آکر مقیم ہوا ہوں تو خانقاہ میں بول و براز نہ کرتا تھا بلکہ باہر جنگل جاتا تھا کہ شیخ کی جگہ ہے، حتیٰ کہ لیٹنے اور جوتے پہن کر چلنے پھرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

(ارواحِ ثلاثہ: ص۲۸۸)

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ اپنے مکاتیب میں جو مکاتیب رشیدیہ کے نام سے طبع ہوئے ہیں، حضرت سہارنپوری کے نام سفرِ حجاز سے تحریر فرماتے ہیں، آپ کا نامہ آیا، یاد الفت کو دلایا، تم کو ذخیرہ

خیرات جانتا ہوں، تم قابلِ فراموشی نہیں ہو، دعاء کا طالب ہوں، (مکاتیب صفحہ ۳۸) ایک اور خط میں حضرت سہارنپوری کو لکھتے ہیں کہ آپ کا خط آیا حال معلوم ہوا، واردات رجوع الی اللہ تعالیٰ موجب فرحت ہیں، حق تعالیٰ کا نہایت شکر کرنا لازم ہے کہ بڑی نعمت کبریٰ ہے کہ بمقابلہ اس کے لاکھوں جہاں مثل پر پشہ بھی نہیں اور اس احقر کو تو نہایت ہی باعثِ شکر و افتخار ہے کہ اگر خود ایسی عطیات سے محروم ہے بارے احباب کو عطاء متواتر ہے۔

در گور برم از سر گیسوئے تو تارے
تا سایہ کند بر سر من روز قیامت آمین

(مکاتیب: ص ۴۰)

ایک خط میں حضرت سہارنپوری کو لکھتے ہیں، آپ کا خط آیا تھا بندہ کو بعد سخت بیماری بخار موسم کے اب افاقہ ہوا ہے، آپ کا جواب پسند آیا تھا، اس کی تحسین میں خط لکھنا ضرور نہ جانا تھا، اب حادثہ جدیدہ یہ ہوا کہ مولوی محمد مظہر صاحب مرحوم (صدر مدرس مظاہر علوم) ۲۴ شب ذی الحجہ یکشنبہ کو فوت ہوئے، عالم اندھیرا ہوا، اب سب رفیق رخصت ہوئے، دیکھئے کب تک میری قسمت میں اس دنیا کے دھکے لکھے ہیں۔ ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن''۔ (مکاتیب: ص ۴۴)

ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ نسبت یادداشت و احسان تھی کہ شمہ اس کا میرے سعید ازلی قرۃ العینین خلیل احمد کو نصیب ہوئی، جس پر ہزار فخر و ناز یہ بندہ ناساز کر کے اپنا وسیلہ قرار دیئے مطمئن بیٹھا ہے، اگر چہ خود اس دولت سے محروم رہا، مگر نادان اپنے دوستوں کا بنا اگر چہ سواقی کو ماء نہر سے حظ نہ ہو کہ مبدأ حوض ہے اور منتہاء مزرع، مگر تاہم کوئی حصہ سواقی کو بھی ہے گو معتد بہا نہ ہو، پھر آپ کی پوری تسلی کرتا ہوں کہ مولوی صدیق صاحب انبہٹوی کو جو کچھ یہ انکشافات ہیں ان کے ہی قلبی ہیں نہ اس مدبر کی طرف سے سوائے راہ بتانے کے اس کا کام کچھ نہیں، ان انوار و واردات سے خود بھی عاطل رہا ہے، مدت العمر میں اس قسم کو مشاہدہ نہیں کیا، ہاں نسبت حضور کا قدر نصیب مقدر حصہ ملا ہے جس کا ہم پلہ ان ہزار ہا انوار کو کچھ نہیں جانتا، تو جب خود ان سے غافل ہوں تو تم کو کہاں سے آگاہ کروں، ہاں اس قدر ہے کہ آپ کی نسبت کو جس قدر اس عاجز سے مناسبت ہے، اس قدر مناسبت نہیں، وہ حالات اپنے اختیار سے خارج ہیں، نہ افسوس سے ہاتھ آئے نہ مجاہدہ سے حاصل ہوئے، ہاں زیادہ تر مشغولی کرنا ضرور ہے تا کہ وہی حضور ترقی پر آجائے اور میرے واسطے بھی دعاء توجہ فرما دیں کہ بسبب مناسبت ساتھ ہی رہوں اور دوستوں کی ترقی کا طالب ہی رہوں اور دوستوں کی ترقی کا طالب ہوں ''المرء مع من احب'' جب اسفل سے اعلیٰ

کی جانب مرعی ہے، اعلیٰ سے اسفل میں بھی ملحوظ ہے۔ زیادہ بجز دعاء ترقی کے کیا لکھوں، می سوز، می دوز، می پیچ و می خروش۔

والله يهدينا و اياكم

فقط والسلام

۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۱ھ یکشنبہ

(مکاتیب: ص ۴۶)

ایک اور خط میں مولانا روشن علی خاں کو لکھتے ہیں کہ اپنا جو حال ہے لکھ نہیں سکتا، محض بیگانہ ہوں، چند باتیں اور بس فقط۔ (مکاتیب: ص ۷۰)

ایک اور خط میں مولانا موصوف کو لکھتے ہیں کہ حالات آپ لوگوں کے دریافت ہو کر خود شرمندہ و محجوب ہوا کہ آپ کو بندہ کے ساتھ یہ حسنِ عقیدت ہے اور خود ہیچ در ہیچ ہوں، کاش آپ کے حسنِ عقیدت کی وجہ سے مغفور ہو جاؤں، حق تعالیٰ رحم فرمائے۔ (مکاتیب: ص ۷۲)

حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے واقعات

حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے متعلق امیر شاہ خان صاحب لکھتے ہیں کہ حکیم عبدالسلام صاحب ملیح آبادی کو مولانا نانوتوی کی خدمت میں جانے کا بہت شوق تھا، مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ جب تو حضرت کی خدمت میں جائے مجھے اپنے ساتھ ضرور لے چلنا، لیکن مجھ بدنصیب کے دل میں ایک خیال جم گیا تھا وہ یہ کہ حکیم صاحب بہت خوش بیان و گویا آدمی ہیں، بہت طویل قصہ ہے، حکیم صاحب دوسری مرتبہ میرے ساتھ خود بخود ہو گئے اور جب دیوبند پہنچے مغرب کا بعد ہو چکا تھا اور مولانا کا قیام مولانا محمود الحسن صاحب کے مکان پر تھا، جب مکان تقریباً پچاس قدم رہ گیا تو میں چند قدم آگے بڑھ کر مولانا کے پاس پہلے پہنچ گیا، مولانا کا لباس اس وقت یہ تھا کہ سر پر میلا اور پھٹا ہوا عمامہ تھا جس میں لیرے پڑے ہوئے تھے اور چونکہ سردی کا زمانہ تھا اس لیے ایک دھوتر کی نیلی رنگی ہوئی مرزئی پہنے ہوئے تھے جس میں بند لگے ہوئے تھے اور نیچے نہ کرتا تھا (کرتا پہنتے ہی نہ تھے) اور نہ انگرکھا تھا اور ایک رزائی اوڑھے تھے جو نیلی رنگی تھی اور جس میں موی کی گوٹ لگی ہوئی تھی جو پھٹی ہوئی تھی اور کہیں تھی اور کہیں بالکل اڑائی ہوئی تھی، میں نے سلام کر کے مصافحہ کیا اور حکیم صاحب کی آمد کی اطلاع کی، میں تعارف کرا ہی رہا تھا کہ اتنے میں حکیم صاحب بھی آ گئے۔

اس وقت مجلس کا یہ رنگ تھا کہ دروازہ کے سامنے مولوی ذوالفقار علی صاحب بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے برابر میں مظفر نگر کے ایک عالم بیٹھے ہوئے تھے اور مولانا ایک طرف کو چار پائی سے کمر

لگائے بیٹھے ہوئے تھے اوران کے برابر میں دیوبند کے ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے جولباس بھی عمدہ پہنے ہوئے تھے اورڈاڑھی بھی شاندارتھی، جب حکیم عبدالسلام صاحب پہنچے توسب لوگ ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے، حکیم صاحب مولانا کے دھوکہ میں سب شاندارلوگوں سے مصافحہ کرتے رہے مگرمولانا کی طرف متوجہ نہ ہوئے میں نے بتایا کہ مولانا یہ ہیں تووہ مولانا سے مصافحہ کرکے وہیں بیٹھ گئے، طویل قصہ اورحِ ثلاثہ میں لکھا ہے، مجھے توصرف حضرت مولانا کی تواضع کی طرف اشارہ کرنا تھا۔ (اورحِ ثلاثہ:ص۲۰۹)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں کہ مولانا کی سادگی کا ڈھنگ یہ تھا کہ جب وہ میرے پاس رہتے تھے تومولوی صاحب کی صورت پر جذب کی حالت برستی تھی، بال سرکے بڑھ گئے تھے نہ دھونا، نہ کنگھی، نہ تیل، نہ کترے، نہ درست کیے عجیب صورت حال تھی، بعض احباب کی زبانی سنا ہے کہ چھاپا خانے میں جناب مولوی احمد علی صاحب کے ہاں جب مولوی صاحب کام کیا کرتے تھے مدتوں یہ لطیفہ رہا کہ لوگ مولوی کہہ کر پکارے ہیں اورآپ بولتے نہیں کوئی نام لے کر پکارتا خوش ہوتے، تعظیم سے گھبراتے، بے تکلف ہرکسی سے رہتے، اب تک جوشاگردیا مرید تھے ان سے یارانہ کے طور پر رہتے اورکچھ اپنے لیے صورت تعظیم کی نہ رکھتے، علماء کی وضع عمامہ یا کرتا کچھ نہ رکھتے، ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع عمامہ یا کرتا کچھ نہ رکھتے، ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کوایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا میں (مولانا محمد یعقوب صاحب) کہتا ہوں اس شہرت پر بھی کس نے کیا جانا، جوکمالات تھے وہ کس قدر تھے، کیا اس میں ظاہر ہوئے اورآخرسب کوخاک میں ہی ملادیا اپنا کہنا کردکھایا، مسئلہ کبھی نہ بتلاتے حوالہ کسی پرفرماتے، فتویٰ نام لکھنا اور مہرکرنا تو درکنار، اول امامت سے بھی گھبراتے آخرکواتنا ہوا کہ وطن میں نماز پڑھادیتے تھے، وعظ بھی نہ کہتے تھے، جناب مولوی مظفر حسین صاحب مرحوم کاندھلوی نے اول وعظ کہلوایا اورخود بھی بیٹھ کرسنا اوربہت خوش ہوئے۔ (سوانح قاسمی:ص۳۱)

مولانا امراء سے بھی بہت گھبراتے تھے اورکسی امیر سے ملاقات کا موقع نہیں آنے دیتے تھے، خورجہ کے ایک رئیس برسوں سے تمنا میں تھے کہ میرے گھر پرایک دفعہ حضرت والا آجائیں مگروہ کامیاب نہ ہوتے تھے، اتفاق سے جنگ روم وروس چھڑگئی اورحضرت نے ترکوں کی اعانت کے لیے چندہ کی تحریک شروع کی، جواس زمانہ میں سلطانی چندہ کے نام سے معروف ہوئی، ان رئیس صاحب کے لیے یہ زریں موقع ہاتھ لگ گیا، انہوں نے کہلوایا کہ اگرحضرت والا ان کے گھر تشریف لاکروعظ فرمائیں تووہ سلطانی چندہ میں دس ہزارروپے دیں گے، حضرت نے منظورفرمالیا

اوران کے یہاں وعظ فرمایا، انہوں نے حسب وعدہ دس ہزار روپے پیش کیے، ختم مجلس پر حضرت اُٹھے تو مجمع بھی اُٹھا اور لوگوں میں حضرت کی مہمانی کے بارہ میں کہا سنی ہوئی اور ردوقدح ہونے لگی، ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ حضرت کو میں اپنے گھر لے جا کر مہمان بناؤں، لوگ تو اس جھگڑے اور بحث میں سرگرداں تھے اور حضرت اسی ہجوم میں آہستہ سے نکل کر روانہ ہوگئے، مغرب کا وقت آچکا تھا اذان ہونے والی تھی، حضرت والا شہر کے کنارے ایک غیر معروف مسجد میں پہنچے، وہاں اتفاق سے امام مسجد موجود نہ تھا لوگوں میں تشویش ہوئی کہ نماز کون پڑھائے، ہر ایک دوسرے پر ٹالتا تھا، چند ایک نے حضرت جی سے کہا کہ بھائی تم ہی نماز پڑھادو، (یہ لوگ حضرت کو پہچانتے نہ تھے) مگر حضرت عذر فرماتے رہے، جب کوئی بھی امامت کے لیے تیار نہ ہوا تو لوگوں نے حضرت سے یہ کہہ کر زبردستی امامت کے لیے مصلے پر دھکیل دیا کہ بندۂ خدا تو مسلمان تو ہے، کہ تجھے دو چار سورتیں بھی قرآن شریف کی یاد نہیں جو امامت سے اتنا گھبرا رہا ہے، حضرت نے اب مجبور ہو کر امامت کرائی۔

مگر عجیب اتفاق یہ پیش آیا کہ پہلی رکعت میں تو ''قل اعوذ برب الناس'' پڑھ گئے اور دوسری میں ''قل اعوذ برب الفلق'' ختم نماز پر اس مسجد کے ان پڑھ نمازیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں کہ یہ عجیب آدمی ہے جس نے قرآن ہی اُلٹا پڑھ دیا، حضرت نے فرمایا کہ بھائی میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ میں امامت کے لائق نہیں ہوں لوگوں نے کہا کسی کو کیا پتہ تھا کہ تو قرآن بھی سیدھا پڑھنا نہیں جانتا، حضرت نے اس پر یہ فرمایا کہ مولویوں سے یہ سنا ہے کہ نماز تو اس طرح بھی ہو جاتی ہے اس پر لوگوں نے تند لہجہ میں کہا چوری اور سینہ زوری، ایک تو نماز اُلٹی پڑھادی اور اُوپر سے مولویوں کو بدنام بھی کرتا ہے، یہاں یہ جھگڑا چل رہا تھا کہ حضرت کو ڈھونڈتی ہوئی ایک جماعت ادھر آنکلی اور دیکھا کہ حضرت جاہلوں میں گھرے ہوئے ہیں، تب انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ تم کس کے ساتھ یہ معاملہ کر رہے ہو یہ تو مولانا محمد قاسم ہیں، اس پر لوگ نادم ہوئے اور عجز و نیاز سے معافی کے خواستگار ہوئے۔ (سوانح قاسمی: ص ۳۹۵ رج ۱)

شیخ المشائخ حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا معمول یہ تھا کہ لوگ بیعت و ذکر و شغل کے بعد اپنے حالات بیان کرتے مگر حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کچھ نہ عرض کرتے۔ ایک مرتبہ حضرت حاجی نور اللہ مرقدہٗ نے خود ہی دریافت کیا کہ آپ کچھ نہیں بیان کرتے، حضرت کے اس استفسار پر حضرت نانوتوی رونے لگے، پھر بڑے یاس انگیز الفاظ میں فرمانے لگے کہ اپنا حال کیا بیان کروں جہاں تسبیح لے کر بیٹھا بس ایک مصیبت ہوتی ہے اس قدر گرانی کہ جیسے سو سو من کے پتھر کسی نے رکھ دیئے ہوں، زبان و قلب سب بستہ ہو جاتے ہیں، حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ

تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ مبارک ہو مولانا! حق تعالیٰ شانہ کے اسم علیم کے ساتھ آپ کو خصوصی نسبت ہے اور اسی نسبتِ خصوصی کے یہ آثار ہیں جن کا تجربہ اور مشاہدہ آپ کو کرایا جارہا ہے، یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہوتا ہے اور یہ وہ ثقل ہے جو حضور پاک کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا جس کی تشریح خاں صاحب نے حاجی صاحب کی نقل سے یہ کی کہ تم سے حق تعالیٰ کو وہ کام لینا ہے جو نبیوں سے لیا جاتا ہے جا کر دین کی خدمت کرو، ذکر و شغل کا اہتمام چھوڑ دو۔

(مختصر من سوانح قاسمی: ص ۲۵۹ رج ۱)

حکیم منصور علی صاحب اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ مدینہ منورہ کے سفر میں میں حضرت کے ہم رکاب تھا، قبہ خضراء جونہی نظروں کے سامنے ہوا مولانا نے اپنے نعلین اُتار کر بغل میں دبالی اور پابرہنہ چلنا شروع کیا، میں نے ان کی دیکھا دیکھی اپنی جوتیاں اُتار کر ننگے پیر ہمراہ مولانا مرحوم کے چلنا شروع کیا، اس قدر پتھریاں پاؤں میں چبھنے لگیں کہ متحمل نہ ہوسکا، آخر جوتا پہن کر چلنے لگا، جو کنکریاں ایک پٹھان نوجوان کے پاؤں کے لیے ناقابلِ برداشت بن چکی تھی، مگر مولانا مرحوم جو از فرق تا قدم نہایت نازک و نرم اندام تھے، اسی خاردار جنگل میں مدینہ منورہ تک کئی میل آخر شب کی تاریکی میں چلتے رہے کہ قوتِ عشق کے نزدیک سنگ وگل برابر ہے۔

(سوانح قاسمی: ص ۱۵۶ رج ۱)

مولانا احمد حسن صاحب امروہوی فرماتے تھے کہ جب شاہجہاں پور کا مناظرہ ہوا تو مولانا بنفسِ نفیس چپکے سے تشریف لے گئے، جب مولانا محمود حسن صاحب کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی مولانا کے بعد پیچھے پیچھے تشریف لے گئے اور میں (مولانا احمد حسن بھی) بعد میں گیا تو شاہجہاں پور میں مولانا محمود الحسن صاحب سے میری ملاقات ہوئی، میں نے دریافت کیا کہ کیا مولانا مل گئے؟ مولانا محمود الحسن صاحب نے فرمایا کہ نہیں، مجھ کو تو ابھی نہیں ملے، تو میں نے کہا کہ اچھا چلو سرائے میں چل کر تلاش کریں، چنانچہ سرائے میں جا کر اس شخص سے معلوم کیا جو شخص نام لکھا کرتا تھا کہ یہاں کوئی شخص خورشید حسن بھی آئے، اس نے کہا کہ ہاں آئے ہیں، چنانچہ ہم نے تلاش کیا تو ایک کوٹھری کے اندر مولانا تشریف رکھتے تھے، جب صبح ہوئی تو مولانا میدانِ مناظرہ میں تشریف لے چلے، راستہ میں ایک دریا پڑتا تھا، مولانا پیدل تھے، تو مولانا پاجامہ پہنے ہوئے دریا میں اُتر پڑے جس سے پاجامہ بھیگ گیا، خیر مولانا نے پار اُتر کر لنگی باندھی اور پاجامہ اُتار کر نچوڑ کر پیچھے لاٹھی پر گاؤں والوں کی طرح سے ڈال لیا اور تشریف لے چلے اور میدان مناظرہ میں پہنچ گئے۔

(اورحِ ثلاثہ: ص ۲۷۶)

مولانا احمد حسن صاحب فرماتے ہیں کہ ایک جولاہے نے مولانا محمد قاسم صاحب کی دعوت کی،

اتفاق سے اس روز بارش ہوگئی اور وہ جولاہا وقت پر بلانے نہ آیا تو مولانا خود اس جولاہے کے یہاں تشریف لے گئے، اس نے عرض کیا کہ حضرت چونکہ آج بارش ہوگئی تھی، اس لیے میں دعوت کا انتظام نہ کر سکا، مولانا نے فرمایا، انتظام کیا ہوتا ہے، تمہارے یہاں کچھ پکا بھی ہے، اس نے کہا، جی ہاں وہ تو موجود ہے، فرمایا کہ بس وہی کھالیں گے، چنانچہ جو کچھ معمولی کھانا ساگ وغیرہ اس کے یہاں تیار تھا وہ بخوشی مولانا تناول فرما کر تشریف لے آئے اور فرمایا بس جی تمہاری دعوت ہوگئی۔ (ارواحِ ثلاثہ: ص ۲۴۷)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ مولانا نانوتوی کی شان عالمانہ تھی اور نہ دُرویشانہ، بلکہ عاشقانہ تھی اور آپ کی مجلس دوستانہ ہوتی تھی، گاڑھے کے کپڑے پہنتے تھے، ایک مرتبہ دیوبند سے نانوتہ کو تشریف لیے جاتے تھے، ایک جولاہے نے بوجہ سادگی کے اپنا ہم قوم سمجھ کر پوچھا کہ آج کل سوت کا کیا بھاؤ ہے، مولانا نے جواب دیا کہ بھائی آج بازار جانا نہیں ہوا، وہ جولاہا بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ (حسن العزیز: ص ۲۷۴/ج ۲)

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے واقعات

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی صدر دارالعلوم دیوبند کے متعلق ابھی لکھوا چکا ہوں کہ وہ سبق کے درمیان میں اُٹھ کر ماتحت مدرسوں سے پوچھ آتے تھے کہ مولانا اس عبارت کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ حسن العزیز میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے تمام مجمع میں خوش پوشاک، نازک مزاج، نازک بدن تھے اور حسین بھی ایسے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ شہزادہ ہیں، ان کی حکایت ہے کہ موضع املیا کے ایک شخص نے مولانا کی مع طالب علموں کے آموں کی دعوت کی، وہ گاؤں دیوبند سے تین کوس ہے، سواری بھی نہیں لایا، مولانا مع رفقاء کے پیدل گئے اور آم کھائے، جب چلنے لگے تو اس نے بہت سے آم گھر لے جانے کے لیے دیئے اور بدتمیزی یہ کی کہ ان کے پہنچانے کے لیے مزدور تک نہ دیا گیا، بس سامنے لا کر رکھ دیئے کہ ان کو لیتے جایئے، مولانا کا حصہ بھی اوروں سے زیادہ ہی دیا گیا، سب اپنے اپنے آم کپڑے میں باندھ کر چلے، مولانا بھی بغل میں لے کر چلے، ایک طرف کی بغل دکھ گئی تو دوسری طرف لے لیا، جگہ تھی دور، بار بار کروٹیں بدلتے تھے، یہاں تک کہ جب دیوبند پہنچے تو ہاتھ بہت زیادہ تھک گئے، مولانا نے اس گٹھڑی کو سر پر رکھ لیا اور فرماتے ہیں کہ یہ ترکیب پہلے سے سمجھ میں نہ آئی، اس وقت حالت یہ تھی کہ مولانا کو دونوں طرف سے بازار میں سلام ہو رہے تھے اور مولانا جواب دیتے جاتے تھے، اس حالت میں مولانا کو ذرا بھی تغیر نہ تھا،

سبحان اللہ کیا تواضع ہے نفس ان حضرات میں تھا ہی نہیں۔

(حسن العزیز:ص ۲۴۰ رج ۴)

حضرت سہارنپوری کے واقعات

حضرت اقدس سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کے تواضع کے قصے تو حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں سترہ سال قیام میں نہ معلوم کتنے دیکھے، اس لیے رجب ۲۸ھ میں سہارنپور حاضری ہوئی تھی اور ذیقعدہ ۴۵ھ میں مدینہ پاک میں حضرت نور اللہ مرقدہٗ سے مفارقت ہوئی، ہر ہر موقع پر تواضع و انکسار نشست و برخاست میں خوب ہی دیکھنے کے مواقع ملے، اسفار میں بھی بہت دفعہ ہمرکابی رہی، خدام کے ساتھ سامان اُٹھانے میں ذرا بھی حضرت کو تامل نہ ہوتا تھا، ریل پر اُترنے میں چڑھنے میں کچھ سامان حضرت نور اللہ مرقدہٗ بے تکلف اُٹھالیا کرتے تھے، خدام عرض کرتے ہیں کہ ہمیں دے دیجئے، فرماتے کہ وہ بڑا سامان رکھا ہے اُٹھالو، دعوتوں میں بھی حضرت کے ساتھ اکثر شرکت ہوئی، کبھی امتیازی جگہ پر داعی کی درخواست بغیر نہ بیٹھتے میں نے دیکھا کیف ما اتفق تشریف رکھنے کا ارادہ کرتے، مگر داعی کی درخواست پر ممتاز جگہ میں بھی انکار نہ کرتے تھے۔

ایک مسئلہ میں حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ اور بعض علماء کا اختلاف ہوا تو حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کو حکم بنانے پر فریق ثانی کو راضی کرلیا، جس کی تفصیل خوانِ خلیل کے صفحہ ۷ میں موجود ہے، اس پر حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ تحریر فرماتے ہیں کہ اس محاکمہ کی تمہید میں مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت قابل دید ہے، وہی ہذہ، (بندہ ناچیز باعتبار اپنے علم وفہم کے اس قابل نہیں کہ علماء اعلام کے اختلاف کا فیصلہ کرسکے، مگر ہاں امتثالا لامر الشریف اس مسئلہ میں جو کچھ خیال میں آیا عرض کرتا ہے الخ حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ تواضع اور اظہار حق میں اس طرح جمع کرنا جس درجہ کا کمال ہے ظاہر ہے، خوان خلیل صفحہ ۸) پر حضرت حکیم الامۃ خوان خلیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ میں حضرات سلف کی سی تواضع تھی کہ مسائل واشکالات علمیہ میں اپنے چھوٹے سے بھی مشورہ فرماتے تھے اور چھوٹوں کے معروضات کو شرح صدر کے بعد قبول فرمالیتے تھے، اس کے بعد حضرت سہارنپوری کا اشکال اشراف نفس کے متعلق ذکر کرنے کے بعد حضرت حکیم الامت تحریر فرماتے ہیں کہ اس واقعہ میں مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کے چند کمالات ثابت ہوتے ہیں، ایک تواضع جس کے سلسلہ میں یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے دوسرے دقیق تقویٰ کہ اشراف کے احتمال بعید تک نظر پہنچی اور اس پر عمل کا اہتمام ہوا، تیسرے اتباع سنت جیسا کہ ظاہر ہے، چوتھے اپنے معاملہ میں

اپنے نفس کو متہم سمجھا کہ اپنی رائے پر وثوق نہیں فرمایا، ورنہ جس کی نظر اتنی دقیق ہو کیا اس فیصلہ تک وہ نظر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ (خوان خلیل: ص۱۲)

خوان خلیل میں اور بھی متعدد قصے حضرت سہارنپوری نوراللہ مرقدہٗ کے ذکر کیے گئے ہیں۔

شیخو پورہ کی دعوت کا ایک قصہ جس میں یہ ناکارہ خود بھی شریک تھا اور حضرت حکیم الامت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ بھی شریک تھے، اس کو حضرت نے تحریر فرمایا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک بار سہارنپور میں بڑے جلسہ (سالانہ جلسہ مدرسہ مظاہر علوم) میں جانا ہوا، جلسہ سے اگلے روز شیخو پورہ والوں نے حضرت مولانا سہارنپوری اور دیگر بعض مہمانوں کو مدعو کر دیا، چلتے وقت سہارنپور کے ایک تاجر چانول نے اگلے روز صبح کی دعوت کر دی، مولانا نے دعوت منظور فرمالی اور شیخو پورہ چلے گئے، شب کو وہاں رہے، صبح کے وقت چھاجوں پانی پڑ رہا تھا، مگر چونکہ مولانا نے وعدہ کر لیا تھا، اس وجہ سے اسی حالت میں واپسی ہوئی، جب سہارنپور اُترے میں بھی (حضرت حکیم الامۃ) ہمراہ تھا، راستہ میں وہ صاحب جو دعوت کر گئے تھے، سڑک جاتے ہوئے ملے، مولانا نے پکار کر بلایا اور اپنے آنے کی اطلاع کی تو آپ کہتے ہیں، حضرت دعوت کا کچھ انتظام نہیں ہوا، مجھ کو واپسی کی امید نہ تھی، مولانا نے فرمایا اچھا بھائی پھر سہی، اس نے کل صبح کا وقت معین کیا اور تبسم سے فرمایا کہ ظالم نے شام کا وقت بھی تو نہ کہا۔

ہمارے حضرت (حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ) نے فرمایا اس گفتگو سے میرے غصے کی کچھ انتہا نہ تھی، مولانا چونکہ بزرگ تھے ان کے سامنے کچھ کہہ نہ سکا، مجھے بھی صبح دعوت میں شریک ہونے کا حکم ملا، میں نے عرض کیا حضرت! مجھے تو صبح صبح بھوک نہیں لگتی ہے، فرمایا اگر بھوک ہو کھالینا ورنہ مجلس میں بیٹھ جانا، میں نے عرض کیا بہت اچھا۔ صبح وقت پر پھر ہم سب گئے، مگر میں غصہ میں بھرا ہوا تھا۔ کوٹھے کے اوپر کھانا کھلایا۔ میں عذر کر کے مولانا سے رخصت ہو گیا اور اس دعوت کنندہ سے مولانا کے سامنے تو کہنے کا موقع نہ ملا اس لیے نیچے بلایا اچھی سے اس کے کان کھولے اور کہا کہ بزرگوں کو بلا کر ایسی ہی تکلیف اور اذیت دیا کرتے ہیں۔ تجھے تو یہ چاہیے تھا کہ اگر مولانا شیخو پورہ سے تشریف نہ بھی لاتے تب بھی انتظام کرتا۔ اس نے آیندہ کے لیے توبہ کی۔

(ارواح ثلاثہ: ص۳۸۶)

(از زکریا) بندہ کے خیال میں تو اس قصہ میں حضرت سہارنپوری سے زیادہ حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کی تواضع ہے کہ اس غصہ اور تکبر کے باوجود حضرت سہارنپوری کے کہنے پر دعوت بھی قبول کر لی اور حضرت کے سامنے کچھ ڈانٹ بھی نہیں پلائی، الگ لے جا کر ڈانٹا۔

تذکرۃ الخلیل میں حضرت سہارنپوریؒ کا معمول لکھا ہے کہ اعلیٰ حضرت گنگوہی کی حیات میں اول

تو کسی کو بیعت نہیں فرماتے تھے اور اگر کسی کو شدید اصرار پر بیعت کرتے بھی تو یہ الفاظ کہلواتے تھے۔ کہو بیعت کرتا ہوں میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے خلیل احمد کے ہاتھ پر۔

(تذکرۃ الخلیل: ص ۷۵)

بذل المجہود کی تالیف میں جب بھی کوئی اہلِ علم میں سے آتا اور ایک دو دن قیام کرتا۔ حضرت بڑے اہتمام سے بذل کا مسودہ اس حوالہ فرماتے کہ غور سے دیکھیں اور کوئی چیز قابلِ اصلاح ہو تو ضرور متنبہ فرمادیں اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جو بعد میں مدرس مظاہر علوم بھی ہوگئے تھے، ان کے ذمہ تو مستقل نظر ثانی تھی اور مولانا مرحوم بہت ہی اہتمام سے نظر ثانی کیا کرتے تھے اور جہاں جہاں مولانا نشانات لگاتے حضرت ان کو بہت غور سے ملاحظہ فرماتے اور اصلاح کی ضرورت سمجھتے تو اصلاح یا توضیح فرماتے۔

تذکرۃ الخلیل میں ایک قصہ لکھا ہے جو خود میرے بھی علم میں ہے کہ آپ کو اپنے کسی کمال پر ناز نہ تھا اور نہ ضد تھی۔ ایک بار آپ تھانہ بھون گئے اور فسادِ صلوٰۃ بمحاذاۃ النساء کے مسئلہ میں مولوی احمد حسن سنبھلی کا حضرت سے مکالمہ ہوا۔ حضرت تو حنفیہ کے قول کو قوی فرمارہے تھے اور مولوی احمد حسن ضعیف۔ حضرت نے فرمایا، پہلے میری تقریر سن لو پھر جو کہنا ہے وہ کہنا۔ مگر مولوی صاحب نے درمیان میں آپ کا کلام قطع کرنا شروع کردیا۔ حضرت کو تکدر ہوا اور لہجہ میں تیزی آگئی۔ مولوی احمد حسن بھی تیزی پر آگئے۔ تب آپ نے تحمل کیا اور خاموش ہوگئے۔ جب آپ ریل پر آنے لگے تو آپ نے خود ابتداء بالسلام کی اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا کر فرمایا، اگر مجھ سے کچھ گستاخی آپ کی شان میں ہوگئی ہو تو معاف فرمادینا۔ اس بندۂ خدا نے اس پر بھی کوئی معذرت نہ کی۔

(تذکرۃ الخلیل: ص ۲۹۷)

بعد میں مولوی صاحب موصوف کی تھانہ بھون سے بھی علیحدگی ہوئی اور حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کو بھی تکدر رہا کہ ان کو اپنے علوم پر بہت ہی گھمنڈ پیدا ہوگیا تھا۔

حضرت شیخ الہند کے واقعات

حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق سنا ہے کہ ابتداء میں بہت ہی خوش پوشاک تھے، رئیسانہ زندگی، مگر اخیر میں کھدر کی وجہ سے ایسا لباس ہوگیا تھا کہ دیکھنے والا مولوی بھی نہ سمجھتا تھا۔ حضرت تھانوی ایک جگہ ذکر محمود فرماتے ہیں کہ جیسے شباب میں لطافت مزاج کے سبب نفیس پوشش مرغوب تھی اب غلبہ تواضع کے سبب سادہ لباس اور جوتا اور ساری ہی وضع اختیار فرمائی تھی۔ جیسے مساکین کی وضع ہوتی ہے۔ وضع سے کوئی شخص یہ بھی گمان نہ کرسکتا تھا کہ آپ کو کسی قسم کا بھی امتیاز

مالی، جاہی، علمی حاصل ہے۔ حالانکہ:

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(النور: ص ۹ ۳ رج ۲)

جب حضرت نے قرآن پاک ترجمہ پورا کیا تو حضرت نے دیوبند میں سب علماء کو جمع کر کے جو کہ حضرت کے خدام اور تلامذہ تھے، یہ فرمایا کہ بھائی میں نے قرآن شریف کا ترجمہ پورا تو کر دیا ہے، لیکن سب مل کر اس کو دیکھ لو، اگر پسند ہو تو شائع کرو، ورنہ رہنے دیا جائے حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ اس واقعہ کو نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ اکبر اس تواضع کی بھی حد ہے۔

(النور ماہ شعبان ۳۹ھ: ص ۳۰)

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ یہ بھی بعض ثقات سے سنا ہے کہ حضرت مولانا (شیخ الہند) نے ارشاد فرمایا کہ بارہا حاضری گنگوہ کے وقت خیال ہوا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے حدیث کی اجازت کی درخواست کروں، مگر معاً یہ خیال مانع آ گیا کہ اگر پوچھ بیٹھیں کہ تجھ کو آتا ہی کیا ہے جو حدیث کی سند مانگتا ہے تو کیا جواب دوں گا۔ بس یہ سوچ کر چپ رہ گئے۔ اللہ اکبر کچھ حد ہے تواضع کی۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ میں نے کبھی نہ دیکھا نہ سنا کہ آپ نے کبھی امامت فرمائی ہو۔ بعض درست و نادرست مزاج طلبہ درس میں بہت ہی بے ادبی کے الفاظ کہہ ڈالتے تھے مگر حضرت مولانا کو کبھی اس پر تغیر نہیں ہوا۔

حضرت شیخ الہند و حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہما کے ایک مسلم لیگ و کانگریس کا اختلاف دیکھنے والے تو اب تک ہزاروں موجود ہیں اور بیسیوں رسائل اس سلسلہ کے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ اس ناکارہ کا رسالہ ''اعتدال'' بھی اس سلسلہ کا ہے۔ اس سے بھی اختلاف کی نوعیت معلوم ہو جائے گی۔ اس زمانہ میں جب حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ شوال ۳۳ھ حجاز مقدس تشریف لے گئے، جس کے بعد مالٹا جانا پڑا۔ اس زمانہ کے دو مکتوب بھی حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ نے ذکر محمود میں نقل فرمائے ہیں جو النور میں شائع ہوئے ہیں۔

پہلا مکتوب:

سراپا فضل و کمال شرفکم اللّٰہ تعالیٰ و جعلکم فوق کثیر من الناس السلام علیکم و رحمۃ اللّٰہ۔

بارہا آپ کی خیریت معلوم ہونے کا داعیہ پیدا ہوا اور ایک دو دفعہ بعض آیندگان کی زبانی آپ

کی خیریت معلوم بھی ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ کو مع جملہ متعلقین خیریت سے رکھے، اس وقت ایک صاحب بنگالی مسمّٰی عبدالمجید سے ملاقات ہوئی جو ہندوستان واپس ہورہے ہیں اور جناب کی خدمت میں حاضر ہونے کا قصد رکھتے ہیں۔ یہ موقع غنیمت معلوم ہوا، اس لیے یہ عریضہ روانہ کرتا ہوں۔ بندہ مع رفقاء بحمداللہ بالکل خیریت اور اطمینان سے ہے۔ شروع رجب میں مکہ مکرمہ حاضر ہوگیا تھا، اس وقت تک یہیں حاضر ہوں، مجھ کو امید ہے کہ فلاح وحسن خاتمہ کی دعاء سے اس دور افتادہ کو فراموش نہ فرمائیں گے۔ آیندہ قیام کی نسبت ابھی کچھ عرض نہیں کرسکتا۔ مولوی شبیر علی صاحب، مولوی محمد ظفر صاحب، مولوی عبداللہ صاحب وغیرہ حضرات سے سلام مسنون فرمادیجئے۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب، مولانا قمرالدین صاحب کی وفات سے افسوس بر افسوس ہے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون، رحمہما اللّٰہ تعالیٰ والسلام علیکم وعلی من لدیکم۔ فقط

بندہ محمود غفرلہٗ

مکہ معظّمہ ۱۲ محرم چہارشنبہ

دوسرا مکتوب:

معدن حسنات وخیرات، دام ظلکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ نامی سامی موجب مسرت و امتنان ہوا۔ جو ہوا مکرمین ومخلصین کی داعیہ مقبولہ کا ثمرہ ہے۔ ادام اللہ فیوضہم وبرکاتہم احقر اور رفقاء ومتعلقین بحمداللہ خیریت سے ہیں۔ سب کا سلام قبول ہو۔

والسلام علیکم وعلی من لدیکم۔ فقط

بندہ محمود

از دیوبند، دہم شوال، روز یکشنبہ

تلامذہ کے ساتھ اس طرح اختلاط وارتباط وانبساط رکھتا کہ دیکھنے والا کبھی نہ سمجھ سکے کہ یہ اس مجمع کے مخدوم ہیں۔ بعض خدام کے ساتھ جن میں کوئی خاص خصوصیت ہوتی، مثلاً مولانا کے کسی استاذ یا بزرگ کی اولاد میں سے ہونا یا عوام مسلمین کے نزدیک معظّم ہونا، وخو ذٰلک ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اجنبی شخص کو شبہ ہوسکے خادم پر مخدوم ہونے کا۔ جب خدام کے ساتھ یہ معاملہ ہوتو مساوی یا بڑوں کے ساتھ معاملہ کا اسی سے اندازہ کرلیا جائے۔ کسی سے کسی خدمت کی فرمائش کرنے کی عادت نہ تھی۔ بلکہ اکثر مہمانوں کے لیے کھانا گھر سے اپنے ہاتھ میں لاتے اور خود کھلاتے۔

ایک بار احقر (حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ) کی درخواست پر مدرسہ جامع العلوم کانپور کے جلسہ دستار بندی میں رونق افروز ہوئے اور احقر کے بے حد اصرار پر وعظ فرمانے کا وعدہ فرمایا۔

جامع مسجد میں وعظ شروع ہوا۔ جناب مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی کانپور میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ میرے عرض کرنے پر جلسہ میں تشریف لائے اور عین اثناء وعظ میں تشریف لائے اس وقت ایک بڑا عالی مضمون بیان ہو رہا تھا۔ جس میں معقول کا ایک خاص رنگ تھا۔ ہم لوگ خوش ہوئے کہ ہمارے اکابر کی نسبت معقولات میں مہارت کم ہونے کا شبہ آج جاتا رہے گا اور سب دیکھ لیں گے کہ معقول کس کو کہتے ہیں۔ مولانا (شیخ الہند) کی جونہی مولانا علی گڑھی پر نظر پڑی، فوراً وعظ بیچ ہی سے قطع کر کے بیٹھ گئے۔ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی بوجہ ہمدرس ہونے کے بے تکلف تھے۔ انہوں نے دوسرے وقت عرض کیا کہ یہ کیا کیا۔ یہی تو وقت تھا بیان فرمایا کہ ہاں یہی خیال مجھ کو آیا تھا، اس لیے قطع کر دیا کہ یہ تو اظہار علم کے لیے بیان ہوا نہ کہ اللہ کے واسطے۔

ثقات سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ مراد آباد سے وعظ کی درخواست کی گئی۔ بہت کچھ عذر کے بعد، منظور فرمایا اور بیان شروع ہوا۔ حدیث یہ تھی ''فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد اشد'' کے ترجمہ کا حاصل بھاری کے لفظ سے فرمایا۔ مجلس میں ایک پرانے عالم تھے جو محدث کے لقب سے معروف تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر فرمایا اشد کا ترجمہ غلط کیا گیا ہے، ایسے شخص کو وعظ کہنا جائز نہیں۔ تو مولانا بے ساختہ کیا فرماتے ہیں کہ حضرت مجھ کو تو پہلے سے معلوم ہے کہ مجھ جیسے شخص کا وعظ کہنا جائز نہیں اور میں نے ان صاحبوں سے اسی واسطے عذر بھی کیا تھا، مگر انہوں نے مانا نہیں۔ اب بہت اچھا ہوا، حضرت کے ارشاد سے بھی میرے عذر کی تائید ہو گئی اور بیان سے بچ گیا۔ حاضرین کو تو جس قدر ناگواری ہوئی اس کا تو کچھ پوچھنا نہیں۔ دانت پیستے تھے کہ کیا لغو حرکت تھی۔ گو مولانا کے ادب سے کچھ بول نہ سکتے تھے۔ مگر مولانا نے بجائے ناگوار سمجھنے کے یہ کمال کیا کہ نہایت سکون کے ساتھ ان کے پاس جا کر ان کے سامنے ادب سے بیٹھ کر نہایت نیاز مندی کے لہجے میں ارشاد فرمایا کہ حضرت غلطی کی وجہ معلوم ہو جائے تو آئندہ احتیاط رکھوں گا۔ انہوں نے کڑک کر فرمایا کہ اشد کا ترجمہ آپ نے اثقل سے کیا یہ کہیں منقول نہیں اضر سے کرنا چاہیے۔ مولانا نے فرمایا اگر کہیں منقول ہو تو۔ انہوں نے کہا کہاں ہے؟ مولانا نے فرمایا حدیث وحی میں ہے۔ کسی نے پوچھا ''کیف یاتیک الوحی'' جواب میں ارشاد فرمایا: ''یاتینی احیانا مثل سلسلة الجرس هو اشده علی'' اور ظاہر ہے کہ یہاں اضر کے معنی میں ممکن نہیں۔ اثقل ہی سے معنی صحیح ہو سکتے ہیں۔ بس یہ سن کر ان کا رنگ فق ہو گیا۔ مگر مولانا نے نہ کچھ اس پر فخر کیا نہ دوبارہ بیان شروع فرمایا۔ لیکن ان کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ اپنی غلطی کا اعلان فرما دیں۔ وذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء و نعم ما قیل:

نہ ہر کہ چہرہ بر افروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ دار و سکندری داند
ہزار نکتہ باریک ترز مو اینجاست
نہ ہر کہ سر بہ تراشد قلندری داند

(ذکر محمود النور جلد۲ ۳۹۲ھ)

مفتی محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بروایت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم ایک واقعہ سنایا کہ جب حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ سفر حجاز کے لیے تشریف لے جارہے تھے اور وہاں سے گرفتار ہوکر مالٹا گئے، اس وقت کی بات ہے کہ ہمارے مکان پر تشریف لائے، دادی صاحبہ (اہلیہ محترمہ مولانا نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ) کی خدمت میں عرض کیا کہ اماں جی! میں نے آپ کی کوئی خدمت نہیں کی، بہت شرمندہ ہوں، اب سفر میں جارہا ہوں ذرا اپنا جوتا دے دیجئے۔ انہوں نے پس پردہ سے جوتا آگے بڑھایا۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو لے کر اپنے سر پر رکھا اور روتے رہے کہ میری کوتاہیوں کو معاف فرما دیجئے۔

یہ دوسرا واقعہ بھی بروایت مولانا محمد طیب صاحب مفتی صاحب نے سنایا کہ ایک مرتبہ مغرب سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ نماز کے لیے حضرت شیخ الہند کی مجلس سے سب لوگ اٹھ کر چلے۔ میرے برادر خورد مولوی طاہر مرحوم ٹھہر گئے۔ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ اندر زنانہ مکان سے گرم پانی لائے اور مولوی طاہر مرحوم سے فرمایا کہ وضو کرلیں، وہ ذرا ہچکچائے کہ حضرت میرے واسطے لوٹا لائے، اس پر فرمایا کہ تم جانتے بھی ہو کہ میں کون ہوں؟ میں پیرو کا غلام ہوں (پیرو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے گھر کی خادمہ تھیں)۔

حضرت شاہ عبدالرحیم رائپوری کے واقعات

اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی تو پوری ہی زندگی تواضع و انکساری کی تھی۔ ہمارے جملہ اکابر میں اعلیٰ حضرت کی تواضع ضرب المثل تھی۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ کی حیات میں رائے پور تشریف لے گئے تو تو ارشاد فرمایا کہ اللہ اکبر اس باغ کے درختوں کے پتے پتے سے تواضع ٹپک رہی ہے۔

علی میاں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی سوانح میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ فرمایا میں اپنے حضرت کی تعریف اس لیے نہیں کرتا کہ اس میں بھی اپنی ہی تعریف ہے ورنہ ہمارے حضرت تو تصوف کے امام تھے اور تو کچھ عرض نہیں کرتا، البتہ اتنا جانتا ہوں کہ چودہ سال حضرت کی

خدمت میں رہا، اس طویل مدت میں کبھی ایک کلمہ بھی حضرت کی زبان مبارک سے نہیں سنا جس میں اپنی تعریف کی بو بھی آتی ہو، حب جاہ ایک ایسی چیز ہے جو سب سے آخر میں سالکین کے قلوب سے نکلتی ہے جب سالک صدیقین کے مقام تک پہنچتا ہے تب اس سے پیچھا چھوٹتا ہے، یہ بات میں نے اپنے حضرت میں خوب اچھی طرح سے دیکھی کہ حب جاہ کا وہاں سر کٹا ہوا تھا۔

(سوانح قادری: ص ۲۴۲)

پختہ تعمیر سے اعلیٰ حضرت کو بہت ہی وحشت ونفرت تھی، باغ کی مسجد بھی اخیر زمانہ تک کچی ہی رہی، کچی دیواریں اور اس پر چھپر پڑا ہوا تھا، اس ناکارہ نے بھی اپنی اوائل عمر میں بارہا دیکھا، حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی تذکرۃ الخلیل میں اعلیٰ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک نادان طبیب نے غلطی سے آپ کو زہر دے دیا، فوراً آپ کو قے ہوگئی اور مرض ترقی کر گیا ڈاکٹری تشخیص سے پتہ چلا کہ چند منٹ قے نہ ہوتی تو جانبری محال تھی۔

حضرت سے جس کو ذرا بھی تعلق تھا وہ حکیم صاحب پر آنکھیں نکالتا اور ان کی صورت سے بیزار ہو گیا مگر آپ کو حکیم صاحب کی ندامت اور اپنے خدام کی ان سے یہ وحشت ایک مستقل تکلیف بن گئی کہ وہ بھی کتمان اور ضبط میں رہی، جس کا اثر یہ تھا کہ حکیم صاحب تشریف لاتے تو آپ ان کو سب سے الگ اپنے پاس چارپائی پر بٹھاتے اور کسی کی بھی دوا کا استعمال ہو مگر حکیم صاحب سے مشورہ لیا کرتے اور وہ اس کو مناسب مرض بتاتے تو آپ استعمال کرتے ورنہ ان سے ایسی ہی باتیں کرتے جن سے ان کو یقین ہو جاتا کہ حضرت میرے معالجہ کے معتقد اور میری حزاقت ومزاج شناسی کے معترف ہیں اور مخلص خدام سے ایک مرتبہ نرم لہجہ میں اس طرح فرمایا کہ حکیم صاحب تو میرے محسن ہیں، غلطی تو ہر بشر کے ساتھ لگی ہوئی ہے، مگر جو کچھ کیا وہ محبت وشفقت ہی کی نیت سے کیا، ان کو کوئی ترچھی نظر سے دیکھتا ہے تو میرے دل پر ایک برچھی لگتی ہے، فاعل مختار بجز مولائے کریم کے کوئی نہیں، جو ہوا وہ اس کی مشیت سے ہوا، پھر کسی کو کیا حق ہے کہ آلہ واوزار کو سرزنش کرے۔

آخر سفر حج میں حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ سو سے زائد کا مجمع ہو گیا تھا، بمبئی پہنچے تو رفقاء کا ٹکٹ موجودہ جہاز سے ملنا مشکل تھا، حضرت اور حضرت کے اہل وعیال اور مخصوص رفقاء کو مل سکتا تھا، مگر حضرت نے جملہ رفقاء کے بغیر جانا قبول نہیں فرمایا اور جن کو عجلت تھی ان کو اس جہاز سے بھیج دیا اور خود پندرہ دن تک دوسرے جہاز کے انتظار میں بمبئی تشریف فرما رہے، اس موقع پر بہت سے لوگوں نے حضرت قدس سرہٗ سے اصرار بھی کیا کہ حضرت! باقی رفقاء دوسرے جہاز سے آتے

رہیں گے، مگر حضرت نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ان ساتھیوں کو رنج ہوگا۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر مکی احباب نے ایک بہت نفیس مکان حضرت اور حضرت کے رفقاء کے لیے پہلے سے کرایہ پر لے رکھا تھا اور خدام نے حضرت کے کمرہ کو بہت ہی راحت کا بنا رکھا تھا، بعض مکی خدام نے بہت عمدہ مسہری اور نفیس تکیے گدے حضرت کے کمرہ کے لیے مہیا فرما رکھے تھے کہ بعد میں حضرت صاحبزادہ صاحب حکیم مسعود احمد صاحب خلف الرشید حضرت قطب ارشاد گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ حج کے لیے پہنچ گئے، حکیم صاحب کے پہنچنے پر حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے اپنا کمرہ سجا سجایا مع سامان راحت کے حضرت حکیم صاحب کی نذر کر دیا اور فرمایا کہ مجھ فقیر کے لیے تو جہاں بھی بیٹھ جاؤں گا راحت ہی راحت ہے، خدام کے ہوتے ہوئے حضرت حکیم کو تکلیف ہو یہ تو بہت نا موزوں ہے، حتیٰ کہ میرے حضرت مرشدی سہارنپوری نے بھی جو بعد میں مکہ میں پہنچے تھے۔ اس پر نکیر فرمائی، سارا سامان لوگوں نے آپ کی راحت کے لیے دیا تھا، مگر حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ نے یہی ارشاد فرمایا کہ حضرت! مجھ سے دیکھا نہ گیا کہ خادم تو اسی راحت میں رہے اور مخدوم زادہ معمولی جگہ قیام کرے، حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے لیے تو خدام نے اس کا بدل کر ہی دیا مگر رائے پوری قدس سرہٗ کا عمل ہم نالائقوں کے لیے قابل رشک ہی ہوسکتا ہے

ایک مرتبہ مولوی وہاج الدین صاحب جو کہ حضرت گنگوہی سے بیعت تھے، رائے پور آئے، رات زیادہ جا چکی تھی اور سفر کی تھکان بہت تھی، ایک طرف لیٹ کر سو گئے، ذرا دیر بعد آنکھ کھلی تو دیکھا ایک شخص پائینتی بیٹھا ہوا آہستہ آہستہ ان کے پاؤں دبا رہا ہے، مگر اس احتیاط سے کہ آنکھ نہ کھل جائے، اول تو سمجھے کہ شاید حضرت نے کسی خادم کو بھیج دیا، مگر پھر غور کی نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ یہ تو خود حضرت مولانا ہیں، یہ گھبرا کر اُٹھے اور کود کر چار پائی سے نیچے آئے کہ حضرت یہ کیا غضب ہے فرمایا بھائی اس میں کیا حرج ہے آپ کو تھکان بہت ہو گئی ہوگی، ذرا لیٹ جایئے کہ آرام مل جائے، انہوں نے کہا بس حضرت معاف فرمایئے میں باز آیا ایسے آرام سے کہ آپ سے پاؤں دبواؤں:

تواضع اور مروت گر کوئی شخص مجسم ہو
تو وہ سر تا قدم عبدالرحیم با صفا ہوگا

ایک بار ایک صاحب حاضرِ خدمت ہوئے، جن کی اُنگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی حضرت کے اخلاق اور مہمان نوازی دیکھ کر وہ حیران ہو گئے اور جب رخصتی مصافحہ کرنے لگے تو عرض کیا کہ حضرت میرے لیے دعاء فرما دیں، حضرت نے ہاتھ تھامے ہوئے ان سے ارشاد فرمایا، بہت اچھا ان شاء اللہ حکم کی تعمیل کروں گا، مگر ایک عرض میری بھی ہے اس کو آپ قبول فرمالیں، وہ یہ کہ طلائی

انگشتری کو شریعت نے مرد کے لے حرام کہا ہے، اگر اس گناہ بے لذت کو ترک فرما دیں تو پھر خوش ہو کر دل سے دُعا نکلے گی، یہ سن کر وہ صاحب شرما گئے، پیشانی پر پسینہ آ گیا اور فوراً انگوٹھی اُتار کر ہاتھ میں لے لی۔

ایک مرتبہ بیماری میں بندہ (مولانا عاشق الٰہی صاحب) اور مولوی محمد یحییٰ صاحب مرحوم حاضر ہوئے، دونوں سے حضرت کو کمال بے تکلفی تھی، اس لیے جب سب اُٹھ گئے تو فرمایا مجھے ایک پریشانی لاحق ہے جس میں گھلا جاتا ہوں، وہ یہ کہ حدیث میں آتا ہے، بندہ مومن کو لقاء رب کی تمنا ہوتی ہے اور میں اپنے اندر اس مضمون کو نہیں پاتا ہوں، مولوی یحییٰ صاحب نے کہا حضرت یہ تمنا و شوق تو عندالموت ہوتا ہے اور آپ ابھی مرنے والے نہیں، آپ نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور فرمایا کہ مرنے کو تو پڑا ہی ہوں اور اسی لیے فکر ہے کہ شوق لقاء کیوں نہیں، مولوی صاحب نے کہا کہ پھر حضرت ہمارے لیے تو مبارک ہے کہ ابھی حق تعالیٰ نے اس وقت کو مؤخر فرما دیا کہ وہ وقت ہوتا تو شوق لقاء بھی غالب آتا، چنانچہ آپ تندرست ہو گئے اور زندہ رہے، حتیٰ کہ مولوی محمد یحییٰ صاحب نے بھی دفعۃً انتقال فرمایا۔

اس کے بعد پھر مرض نے زور پکڑا اور اس شدتِ مرض میں حضرت قدس سرہٗ کو آستانہ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حاضری کا غلبہ ہوا اور آپ نے سفرِ حج کا پختہ قصد کر لیا اور میں (مولانا عاشق الٰہی صاحب) حاضر ہوا تو آپ نے بڑے اہتمام سے مجمع کو اُٹھا کر تنہائی حاصل کیا اور مجسم شوق بن کر فرمایا، میں تو تیرا ہی انتظار دیکھ رہا تھا کہ دل کی بات کہوں، وہ یہ کہ امسال حج کا ارادہ کر چکا ہوں اور تمنا ہے کہ زندہ رہوں تو پہلے جہاز پر سوار ہو جاؤں، میں نے عرض کیا کہ آفریں ہے حضرت کی ہمت پر کہ کروٹ تو لی نہیں جاتی اور قصد ہے اس کٹھن سفر کا جس میں مستعد جوان چُور چُور ہو جاتے ہیں، بھلا کیسے ہو سکتا ہے، فرمایا، حضرت بوڑھے جوان سب ہی اس راستہ میں چلتے ہیں، بس مجھے تو کوئی پکڑ کر ریل میں ڈال دے تو پڑا پڑا ان شاء اللہ چلا ہی جاؤں گا۔

میں نے دیکھا کہ یہ غلبہ شوق دبنے والا نہیں تو موافقت کا پہلو لے لیا اور عرض کیا ہاں حضرت ہمت کا حمایتی خدا ہے، جب حضرت نے قصد فرما لیا تو ان شاء اللہ پہنچنا دشوار نہیں، فرمایا، الحمدللہ تو نے تو موافقت کر لی، اب ایک خاص درخواست ہے وہ یہ کہ اب حضرت سہارنپوری کا میرے بزرگوں میں ایک دم باقی ہے، جن کے سامنے چوں وچرا کی ہمت نہیں، اس کا سہم چڑھا ہوا ہے کہ حضرت نے اجازت نہ دی اور منع فرما دیا تو پھر کیا کروں گا، بس یہ خدمت تیرے سپرد ہے کہ حضرت سے بخوشی اجازت دلوا دے، میں چونکہ سمجھ رہا تھا کہ یہ تو سرکار کے بُلاوے کی علامت ہے کہ حاضری آستانہ کا شوق بیتاب بنا رہا ہے، ورنہ موسم حج میں ابھی اتنا وقت ہے کہ اس وقت تک

حضرت حیات ہی رہیں تو زہے نصیب، پھر آپ کے دل کو پژمردہ کیوں کروں، اس لیے میں نے عرض کیا کہ ہاں حضرت انشاء اللہ ضرور کوشش کرونگا اور امید قوی ہے ان شاء اللہ حضرت انکار نہ فرمائیں گے، بلکہ کیا عجب ہے حضرت بھی قصد فرمالیں اور پھر بندہ بھی ہمرکاب ہو، اتنا سن کر فرحت وسرور سے حضرت کا چہرہ چمکنے لگا اور الحمد للہ، الحمد للہ اب اطمینان ہو گیا فرماتے ہوئے از خود اُٹھ بیٹھے کہ تکیہ سے سہارا لگائے دیر تک اسی کی باتیں کرتے اور مزا لیتے رہے۔

حضرت نے اپنی شدت بیماری میں اپنا سارا سامان حتیٰ کہ بدن کے کپڑے بھی مولانا عبدالقادر صاحب کو ہبہ کر دیے تھے کہ اب تم سے مستعار لے کے پہنا کروں گا، مگر تیرا سو روپے نقد زادِ راہ بنا کر مولانا عبدالقادر صاحب کے حوالہ کر دیا تھا کہ اس کو محفوظ رکھو، یہ میرے اور تمہارے سفرِ حج کا خرچ ہے، آخر جوں جوں حج کا موسم قریب آتا گیا، آپ کا مرض اور ضعف بڑھتا اور وصال کا وقت قریب آتا گیا، حتیٰ کہ آپ نے سمجھ لیا کہ اب گنجائش نہیں رہی اور تیرہ سو روپے ترکہ بنانا چاہتا ہے تب آپ نے مولانا کو بلا کر وہ روپیہ بھی تقسیم کرا دیا، کیونکہ آپ مولائے کریم سے ایسی حالت میں ملنے کے متمنی تھے کہ دنیا کا کوئی حبہ اور پارچہ بھی آپ کی ملک میں نہ ہو، بیت کے دھیان سے ہٹ کر اب آپ رب البیت کے خالص تصور میں غرق ہو گئے اور آخر چند ہی روز بعد وہ مبارک وقت آیا جس کے شوق میں آپ کا رُواں رُواں پکارتا تھا، حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ نے خواب دیکھا کہ آفتاب غروب ہو گیا اور دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔

حسب معمول تہجد کے وقت حضرت اُٹھے اور نفلوں سے فارغ ہو کر متفکر بیٹھ گئے، اہلیہ نے پوچھا، آج عادت کے موافق آپ نفلوں کے بعد لیٹے کیوں نہیں اور طبیعت کچھ فکرمند معلوم ہوتی ہے، کیا بات ہے، آپ نے خواب کا اظہار کیا اور محزون لہجے میں فرمایا، اس کی تعبیر ایک تو یہ ہے کہ مولانا محمود حسن صاحب مالٹا میں محبوس ہیں، دوسرے مجھ کو یہ بھی اندیشہ ہے کہیں شاہ عبدالرحیم صاحب کی حالت نازک نہ ہو، غرض صبح کو حضرت بیلوں روانہ ہو گئے، جہاں تبدیل آب وہوا کے لیے حضرت کا قیام تھا، چنانچہ یہ سمجھ کر کہ آرام کی خواہش ہو گی نماز اول وقت پڑھ لی گئی اور آپ چارپائی پر لیٹ رہے اور حضرت (سہارنپوری) دوسرے کمرے میں جا لیٹے کہ دفعۃً آپ کو آخری کرب شروع ہوا اور حضرت اپنے کمرے سے لپک کر پاس آئے، مولانا نے حضرت کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور آپ کا ہاتھ تھام کر اپنے سینہ پر رکھ لیا، حضرت نے پڑھنا شروع کیا اور رائے پور کا آفتاب اپنے محبوب کا ہاتھ چھاتی پر رکھے ہوئے چند منٹ کے اندر شب کے گیارہ بج کر انیس منٹ پر غروب ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (منقول از تذکرۃ الخلیل)

حضرت شاہ عبدالقادر رائپوری کے واقعات

حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے دیکھنے والے تو ابھی تک ہزاروں ہیں تواضع میں اپنے شیخ قدس سرہٗ کا نمونہ تھے، اس غایت تواضع ہی کا ثمرہ تھا کہ ابتداء بیعت میں باوجود اعلیٰ حضرت رائے پوری کے مشورہ کے کہ گنگوہ میں حضرت قطب عالم سے بیعت ہوں، حضرت رائے پوری نے فیصلہ کیا کہ میں اتنے اُونچے دربار کے قابل نہیں، اس کی تفصیل سوانح حضرت رائے پوری مؤلفہ علی میاں میں ذکر کی گئی ہے، جس میں اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے مشورہ پر جو جواب حضرت رائے پوری نے دیا وہ یہ تھا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو جو کچھ ملا حضرت گنگوہی سے ملا، مگر میرا رجحان آپ کی طرف ہے، میری طرف سے اگر مہمانداری کی فکر ہے تو میرے حقوق حضرت کے ذمہ نہیں، میں اپنے قیام وطعام کا خود ذمہ دار ہوں، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب یہ خط دیکھ کر بہت خوش ہوئے، لوگوں کو یہ خط دکھایا اور فرمایا دیکھو! یہ ہیں طالب۔ (سوانح رائے پوری: ص۵۹)

مجاہدات کے بیان میں حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے بہت سے حالات گزر چکے، کچی پکی جلی ہوئی روٹی جو ملتی اس کو نہایت ہی صبر وشکر کے ساتھ تناول فرماتے، وہاں کے قیام میں چنے بھی چابے اور کبھی مہتمم باورچی خانہ کو بھی ایک دفعہ کے سوا اس وجہ سے نہیں ٹوکا کہ اگر اس نے حضرت سے شکایت کر دی اور حضرت نے جواب میں فرمایا کہ میاں! اچھا کھانا ہے تو کہیں اور جاؤ، تو کیا ہوگا، حضرت کے واقعات میں بہت کثرت سے آپ بیتی میں مختلف جگہ لکھوا چکا ہوں، یہاں سب کا اعادہ کرنا تو بہت مشکل ہے، یہ واقعہ بھی لکھوا چکا ہوں کہ حضرت رائے پوری ایک دفعہ تھانہ بھون حاضر ہوئے تو حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تو رائے پور حضرت شاہ عبدالرحیم کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، آپ مجھے یاد نہیں، فرمایا حضرت! میں آپ کو کیا یاد رہ سکتا تھا، میری وہاں کوئی حیثیت اور امتیاز نہیں تھا، شاید آپ کو یاد ہو کہ حضرت کی خدمت میں ایک خادم بار بار آتا تو تھا، بدن پر ایک کمری ہوتی تھی اور تہبند باندھے ہوئے، فرمایا ہاں کچھ یاد تو آتا ہے، فرمایا میں وہی ہوں۔ (سوانح قادری: ص۲۹)

حضرت اپنی انتہائی تواضع کی ہی وجہ سے اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی نگاہ میں بڑھتے چلے گئے اور ساری خصوصی خدمات اعلیٰ حضرت کی حضرت رائے پوری کی طرف منتقل ہوتی چلی گئی، یہ واقعہ تو پہلے گزر چکا کہ اعلیٰ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہ نے اپنے کپڑے بھی حضرت رائے پوری ثانی کو ہبہ کر دیئے کہ اپنی ملک میں کچھ نہ رہے، لیکن غایت تواضع سے حضرت اپنے شیخ کے کپڑوں کو

استعمال نہیں کرتے تھے اور چونکہ امامت بھی حضرت ہی کے سپرد تھی، اس کا ایک قصہ خود بیان فرمایا کہ میں ایک دفعہ نہر پر کپڑا دھونے گیا ایک ہی جوڑا کپڑوں کا تھا، اسی کو دھوسکھا کر پہن لیتا، اس دن سوکھنے میں ذرا دیر ہوگئی، جمعہ کا وقت ہوگیا، جمعہ میں ہی پڑھایا کرتا تھا، حضرت میرے انتظار میں تھے، جب حاضر ہوا، فرمایا کہاں رہ گئے تھے؟ میں نے سکوت کیا، دوبارہ پھر دریافت فرمایا، میں نے سکوت کیا، بار بار اصرار سے پھر دریافت فرمایا تو عرض کیا حضرت کپڑے نہیں سوکھے تھے، اس لیے حاضری میں دیر ہوگئی، حضرت نے غصہ سے فرمایا، آپ کے پاس میرے کپڑے موجود نہیں ہیں ان کو کیوں استعمال نہیں کرتے، کیا ان کو آگ لگانا ہے، مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے، اس کے باوجود کبھی حضرت کے کپڑے پہننے کی جرأت نہ ہوئی۔ (سوانح قادری: ص ۱۷)

اعلیٰ حضرت رائے پوری نے قولاً فعلاً اشارۃً حضرت رائے پوری ثانی کو جانشین بنا رکھا تھا، لیکن اعلیٰ حضرت کے وصال کے بعد کئی سال تک حضرت رائے پوری ثانی نے رائے پور کا قیام اختیار نہیں فرمایا، زیادہ پنجاب کے اسفار اور مکان پر رہتے اور جب رائے پور کی زیارت کا اشتیاق غالب ہوتا تو بہت جناب الحاج شاہ زاہد حسن صاحب مرحوم کے مکان پر چند روز قیام کرتے اور شاہ صاحب کی گاڑی میں اور کبھی پیدل روزانہ جاتے اور واپس آجاتے کہ کسی کو یہ واہمہ نہ ہو کہ مولانا اپنے کو گدی نشین سمجھتے ہیں، اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے اپنے وصال کے قریب صدیق صاحب کو ان کی زمین میں جو خانقاہ کے متصل تھی، ایک مکان بنانے کو فرمایا تھا، اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے وصال کے بعد جب چودھری صاحب نے حسبِ وصیت مکان بنانے کا ارادہ کیا تو مولانا نے فرمایا کہ میرے لیے مکان کی ضرورت نہیں، میرے لیے تو صرف ایک چھپر ڈال دیجئے، مگر چودھری صاحب کو اعلیٰ حضرت کی وصیت تھی، اس لیے مولانا کے ایک سفر کو غنیمت سمجھ کر ایک پختہ دالان بنا دیا، ایک سہ دری اس کے اندر ایک کوٹھا اور دونوں جانب ایک ایک حجرہ تعمیر کرادیا، جو اب تک حضرت رائے پوری ثانی کی خانقاہ کے نام سے مشہور ہے۔

۴۵ھ کے سفرِ حج میں جب کہ اعلیٰ حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کا قیام بھی مدینہ پاک میں تھا حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کا باوجود شیخ المشائخ ہونے کے حضرت سہارنپوری کی خدمت میں دوزانوں مؤدبانہ خادمانہ بیٹھنا تو مجھے بھی خوب یاد ہے، ہم خدام سے اتنا ادب نہیں ہوتا جتنا حضرت رائے پوری کیا کرتے تھے، جس کو دیکھ کر رشک آتا تھا اور حضرت رائے پوری کو یہ قلق رہتا تھا کہ ان کے متعلقین حضرت سہارنپوری کی خدمت میں اس وقت اہتمام سے کیوں نہیں حاضر ہوتے، اس کو آپ بیتی میں بھی کسی جگہ لکھوا چکا ہوں، تلاش میں دقت ہے اور تفصیل میں واقعات مکرر ہوتے جاتے ہیں، ایک دفعہ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنے حضرت کی تعریف

اس لیے نہیں کرتا کہ اس میں بھی اپنی ہی تعریف ہے ورنہ ہمارے حضرت تصوف کے امام تھے اور تو کچھ نہیں عرض کرتا، البتہ اتنا جانتا ہوں کہ میں چودہ سال حضرت کی خدمت میں رہا، اس طویل مدت میں کبھی ایک کلمہ بھی حضرت کی زبان مبارک سے ایسا نہیں سنا جس میں اپنی تعریف کی بو بھی آتی ہو، حبِ جاہ ایک ایسی چیز ہے جو سب سے آخر میں سالکین کے قلوب سے نکلتی ہے جب سالک صدیقین کے مقام تک پہنچتا ہے تب اس سے پیچھا چھوٹتا ہے، یہ بات میں نے اپنے حضرت میں خوب اچھی طرح سے دیکھی کہ حبِ جاہ کا وہاں سر کٹا ہوا تھا۔

(سوانح قادری: ص ۲۴۳)

علی میاں سوانح قادری میں لکھتے ہیں کہ حضرت رائے پوری نے اپنے مرشد و مربی حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ تعالیٰ کی فنائیت و بے نفسی کے متعلق اپنا ذاتی مشاہدہ و تاثر جو کچھ بیان فرمایا حضرت کے یہاں رہنے والوں کا بعینہ یہی تاثر حضرت کی ذات کے متعلق ہے کہ کبھی ایک کلمہ ایسا نہیں سنا جس میں اپنی تعریف کی بو بھی آتی ہو، حبِ جاہ کا یہاں سر کٹا ہوا تھا۔

اس خادم (علی میاں) کو ۱۳۶۹ھ آخری سفر حج میں ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا اور تقریباً تین مہینے شب و روز آپ کے ساتھ رہنا ہوا، بعض خدام نے ادراک و الطاف الٰہی کے واقعات بھی سنائے، پورے سفر میں حضرت نے کوئی بات ایسی نہیں فرمائی جس سے حضرت کے علو مرتبت یا کسی کشف و ادراک کا احساس ہو، حج کے علاوہ بھی کبھی کوئی ایسی بات قصداً نہیں فرمائی جس سے لوگوں کی عقیدت میں اضافہ یا آپ کی بزرگی کا احساس ہو، خدام نے جب سنا اپنی نفی، اپنا انکار، اپنی بے حسی اور غباوت کا اظہار سنا، مشیخت کی باتیں یا متصوفانہ نکات یا سلوک و معرفت کی تحقیقات بیان کرنے کا حضرت کے یہاں دستور ہی نہ تھا، مسئلہ علماء سے پوچھتے، تصوف کی کوئی بات پوچھتا تو اگر حضرت شیخ الحدیث صاحب یا کوئی دوسرا صاحب علم اور صاحب نظر قریب ہوتا تو اس کی طرف محول فرما دیتے۔ اگر اصرار کیا جاتا اور بات ضروری ہوتی تو نہایت نپے تلے لفظ میں مغز کی بات فرما دیتے اور ایسی بات سے گریز کرتے جس سے آپ کی ژرف نگاہی باریک بینی کا اندازہ ہو، لیکن اہلِ حقیقت سمجھ جاتے کہ غواص کو مطلب ہے گوہر سے نہ کہ صدف سے، کسی بھری مجلس میں خواہ اس میں کیسے ہی نئے نئے اور سربرآوردہ اشخاص کیوں نہ ہوں، اپنی لاعلمی اور اپنے عامی ہونے کا اظہار کرنے میں کوئی تامل نہ ہوتا خواہ اس کا اثر حاضرین مجلس اور خاص طور پر صاحب علم طبقہ پر کچھ پڑتا ہو۔ (سوانح قادری: ص ۲۴۷)

حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی خصوصیت جو بہت ہی نمایاں تھی کہ معاصر اکابرین میں بھی جس کسی کا تذکرہ حضرت کے یہاں ہوتا تو ناواقف یا نو واردیوں سمجھتا کہ ایک مرید اپنے شیخ کا

تذکرہ کررہے ہیں اور اگران بزرگوں میں سے کسی کے یہاں آپ کا ذکر خیر ہوتا تو معلوم ہوتا کہ کسی شیخ وقت کا تذکرہ ہورہا ہے۔ (سوانح رائے پوری: ص۳۰۴)

ایک مرتبہ کوئی شخص تھانہ بھون سے ناراض ہوکر آئے تھے اور حضرت کے سامنے بے ادبی کے ساتھ وہاں کا تذکرہ کرتے تھے، آپ نے فرمایا کہ حضرت تھانوی میرے بھی شیخ ہیں اس پر وہ خاموش ہوگئے۔ (سوانح رائے پوری: ص۳۰۵)

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہم کے ساتھ محبت وعقیدت احترام واعتماد کا جو غیر معمولی معاملہ تھا وہ دنیا پر روشن ہے، جس مجلس میں مولانا کا کوئی ناقد یا مخالف ہوتا وہاں اور زیادہ جوش کے ساتھ ان کے فضائل ومناقب بیان کرتے اور ان کے خلوص ومقبولیت کا اعلان فرماتے، ایک مرتبہ بعض آنے والوں نے مولانا کے سیاسی مسلک اور ان کے سیاسی انہماک پر کچھ اعتراض کیا تو فرمایا کہ اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو میں ان کے سفروں میں خادم کی طرح ان کے ساتھ رہتا اور ان کی ادنیٰ ادنیٰ خدمتیں انجام دیتا۔ (سوانح رائے پوری: ص۳۰۶)

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی بانی جماعت تبلیغ کے حضرت بہت معتقد تھے کبھی حضرت دہلوی کے سوا اور طرح کا نام نہیں لیا اپنے خدام کو بہت تاکید واہتمام کے ساتھ حضرت کی خدمت میں بھیجتے رہتے تھے اور خود بھی بڑے اہتمام کے ساتھ نظام الدین تشریف لے جاتے اور کئی کئی روز قیام فرماتے۔ (سوانح رائے پوری: ص۳۰۸)

حضرت نور اللہ مرقدہٗ کا اپنے معاصرین بلکہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ بھی تواضع وانکساری کا جو برتاؤ رہا ہے اس کا بیان حضرت رائے پوری کی سوانح مصنفہ علی میاں میں ملتا ہے ان سب کا یہاں نقل کرنا طول ہے۔

حضرت حکیم الامۃ تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے دور میں سیاست پر اتنا زور تھا اور حکیم الامۃ ہونے کا تقاضا تھا کہ مریدین مسترشدین کے اوپر تنبیہ اور امراض کی جراحت فرمادیں، جس کی وجہ سے عوام نہیں بلکہ خواص بھی حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی شان تواضع سے ناواقف رہے، لیکن میرے ان سب اکابر کے درمیان اوصاف حسنہ وجمیلہ جس قدر کوٹ کوٹ کر بھرے گئے تھے بسا اوقات ان میں سے کسی کا ظہور نہیں ہوتا تھا، یہ منظر اس ناکارہ کی نگاہ میں بیسیوں مرتبہ دیکھا کہ معاصرین کے ساتھ نشست وبرخواست اور گفتگو میں اس تواضع اور انکار کا منظر ہوتا تھا کہ قابل دید اور قابل رشک تھا، چنانچہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے طرز تربیت کے متعلق بارہا فرمایا کہ یہ طرز میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے اور مجھے بعد کو بڑی کلفت اور ندامت بھی ہوتی ہے اور رہ رہ کر سوچا کرتا ہوں کہ بجائے اس طرح کہنے کے اس طرح بھی کہہ سکتا تھا، بجائے یوں سمجھانے کے یوں

بھی سمجھا سکتا تھا، بجائے اس تجویز کے یہ تجویز بھی کر سکتا تھا، لیکن عین وقت پر مصلحت اصلاح کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ کوئی مصلحت پیش نظر رہتی ہی نہیں اور یہ جبھی تک ہے جب تک کہ میں نے اپنے ذمہ اصلاح کی خدمت سمجھ رکھی ہے اور اگر کبھی اس سے قطع نظر کر لی تو پھر میں ان شاء اللہ خود اخلاق بھی بن کر دکھلا دوں گا، میرا اصل مذاق تو یہی ہے کہ کسی سے کچھ تعرض ہی نہ کرو اور اپنے آپ کو سب سے یکسو رکھو، بقول احمد جام رحمہ اللہ تعالیٰ:

احمد تو عاشقی بمشیخت تراچہ کار
دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(اشرف السوانح: ص۶۳ رج ۶۳)

حضرت تھانوی کا ملفوظ

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مجھ میں حدت ہے شدت نہیں، بلکہ دوسروں کے جذبات کی تو میں اتنی رعایت رکھتا ہوں کہ دوسروں کی نظر بھی ان دقائق رعایت تک نہ پہنچتی ہوگی، بفضلہ تعالیٰ دور دور تک کے احتمالات اذیت پر بھی فوراً میری نظر پہنچ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے احتراز کی توفیق بھی عطاء فرما دیتے ہیں اور اسی لیے اور بھی غصہ آتا ہے کہ میں تو ان کی اتنی رعایت کروں اور یہ میرے ساتھ ایسی بے فکری برتیں اھ۔ (اشرف السوانح: ص۴۶ رج ۲)

حضرت تھانوی کا مشہور مقولہ ہے کہ میں اپنے بُرا بھلا کہنے والوں کو ہمیشہ معاف ہی کرتا رہتا ہوں۔ (ایضاً: ص۱۴۸ رج ۲)

مولانا یحییٰ صاحب کی تواضع

میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی سادی زندگی کو دیکھنے والے تو اب تک بکثرت موجود ہیں، ان کے لباس یا طرز معاشرت سے کوئی ان کو مولوی بھی نہیں سمجھتا تھا کپڑے زیادہ تر میل خورہ پہنتے تھے، جناب الحاج شاہ زاہد حسین صاحب رئیس بہٹ کے یہاں میرے حضرت قدس سرہٗ کے کپڑے بھی دُھلا کرتے تھے اور ہر ہفتے شنبہ کو ان کا آدمی آکر دھوبی کے گھر کے کپڑے دے جاتا تھا اور جمعہ کے اُتارے ہوئے کپڑے لے جاتا تھا۔ میں اکثر خیال کیا کرتا تھا کہ دُھلے ہوئے کپڑوں میں اور اُتارے ہوئے کپڑوں میں سلوٹوں کے سوا کوئی فرق نہ ہوتا تھا کہ پاجامہ پر خدام کے دبانے کی وجہ سے کچھ سلوٹیں پیدا ہو جاتی تھیں، شاہ صاحب نے کئی دفعہ والد صاحب پر اصرار کیا کہ اعلیٰ حضرت کے ساتھ ساتھ آپ بھی اپنے کپڑے بھیج دیا کریں، انہوں نے فرما دیا کہ میرے کپڑے ایسے ہوتے ہی نہیں کہ دھوبی کے ہاں دُھلیں، بہت کم دھوبی کے یہاں دُھلوانے

کی نوبت آتی تھی، ورنہ کوئی خادم یا میری والدہ نور اللہ مرقدہا پانی میں نکال کر سکھا دیتی تھیں، جو اگلے جمعہ کو میرے والد صاحب پہن لیتے تھے۔

میرے پھوپھا مولانا رضی الحسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی زندگی رئیسانہ تھی وہ گرمی سردی کئی کئی اچکن بنوایا کرتے تھے اور میرے والد صاحب کے کاندھلہ جانے پر ایک دو اچکن گرمی کے ساتھ کر دیتے تھے، وہی میرے والد صاحب کے استعمال میں رہتی تھیں، اپنے لیے اچکن سلوانا میرے علم میں نہیں، چونکہ دونوں کا بدن ایک سا تھا، اس لیے وہ کرتے پاجامے بھی ایک دو ساتھ کر دیتے تھے، چونکہ بے تکلفی تھی اور بچپن کا تعلق تھا، کاندھلہ میں ساتھ پڑھتے تھے، گنگوہ میں بھی ساتھ رہے، اس لیے والد صاحب کو بھی ان کے کپڑے پہن لینے میں تکلف نہیں ہوتا تھا۔

گنگوہ کے قیام میں بھی اور سہارنپور کے صدر مدرسی کے دور میں بھی کھانے کے وقت مخصوص خدام اور مخصوص احباب اپنے اپنے گھر سے کھانا لا کر شریک ہو جاتے تھے اور کھانے کے وقت سب جگہ کے سالنوں کو ایک بڑے طباق میں یکجائی ملا لیتے تھے، اس میں شوربا بھی ہوتا، دال بھی ہوتی، ساگ بھی ہوتا، بھوجی بھی، سردی میں ان سب کو ملا کر انگیٹھی پر رکھ کر چند منٹ گرم لیتے اور سب مل کر اسی طباق میں مشترک کھاتے تھے۔

میرے اُستاذ حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب سابق ناظم مظاہر علوم بھی اکثر کھانے کے وقت اپنے گھر سے کھانا لے کر آجاتے تھے، ناظم صاحب کے مزاج میں نفاست نزاکت بہت تھی، مگر میرے والد صاحب سے تعلق بھی بہت تھا وہ بھی اس کچوندے کو بہت رغبت سے کھاتے تھے اور کبھی کبھی گوشت منگا کر اور طلبہ کے کھانے سے پہلے اس کو پکوا کر یہ سب سالن اس میں ملا کر جوش دیئے جاتے تھے، تو ایسا لذیذ ہو جاتا تھا کہ ویسا لذیذ پھر نہیں ملا، اس واقعہ کو تو مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الخلیل میں بھی لکھا ہے، البتہ گوشت کا شوق ضرور تھا، جس زمانہ میں میری والدہ رحمہا اللہ تعالیٰ سہارنپور ہوتیں اس زمانہ میں تو والد صاحب کا گھر سے کھانا آجاتا ورنہ بازار سے دو چار نفر کا جس میں ہم لوگ بھی ہوتے منگا لیا جاتا، (شاید آپ بیتی میں اس کا ذکر کہیں آ بھی چکا ہے) وہ بھی اسی طشت میں ڈال دیا جاتا تھا، اکمال الشیم کے مقدمہ میں مولانا شیخ علی متقی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حالات میں بھی اس واقعہ کا ذکر کر چکا ہوں کہ حضرت شیخ کا بھی یہی معمول تھا، مجھے یاد نہیں کہ والد صاحب نے گھر میں اپنے لیے کبھی چیز کے پکانے کی فرمائش کی ہو، والدہ مرحومہ جو بھی اپنی تجویز سے پکا دیتیں وہی دستر خوان پر چلا جاتا۔

تذکرۃ الرشید میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے یہاں سے خمیری روٹی اور قورمہ آیا، نوش فرما کر خانقاہ تشریف لائے اور تشریف لا کر میرے والد صاحب

نوراللہ مرقدہٗ سے دریافت فرمایا "میاں یحیٰ تمہیں بھی کچھ بھاوے"؟ انہوں نے عرض کیا حضرت ایک ارہر کی دال تو بھاتی نہیں باقی جو ملے سب پسند ہے، آپ نے بیساختہ یہ شعر پڑھا:

کیا کہوں جرأت کہ کچھ بھاتا نہیں
کچھ تو بھایا ہے جو کچھ بھایا نہیں

(تذکرۃ الرشید: ص۶۷رج۲)

میرے اکابر کے واقعات تواضع کے تو اتنے زیادہ ہیں کہ ان کے لیے تو ایک دفتر چاہیے، یہ مضمون بھی اتنا بڑھ گیا کہ میرے کاتبوں کی تو رائے یہ ہے کہ اس مضمون کو بھی آپ بیتی سے نکال کر اکابر کے رمضان کی طرح سے اکابر کی تواضع کا ایک مستقل رسالہ علیحدہ کردوں، کیا بعید ہے کہ اگلی طباعت کے وقت ایسا بھی ہو جائے، یہ طبع کرنے والوں کی رائے پر ہے میں تو بہت ہی مختصر کرنا چاہتا ہوں، مگر جو سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے، اس کے واقعات ذہن میں اتنے آ جاتے ہیں کہ ان کو ترک کرنا ہی پڑتا ہے۔

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر۱۳

اکابر کی ذکاوت

میں نے اپنے سب اکابر کو بڑا ہی ذکی الحس دیکھا مگر ساتھ یہ ان کا ضبط وتحمل بھی قابلِ دید رہا، بہت سی باتوں کو میں نے دیکھا کہ وہ واقعات کے متعلق اخیر تک پہنچ گئے، مگر مبارک چہروں پر یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ ان کو اس واقعہ کا کوئی علم ہے، ضبط وتحمل کے متعلق تو کبھی موقع ہوا تو شاید ایک مستقل سرخی بھی لکھوا دوں، اس وقت تو اکابر کی ذکاوت کے واقعات جو یاد آ گئے ہیں ان ہی کو لکھوا رہا ہوں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ کی ذکاوت

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی ذکاوت کے قصے تو بہت ہی مشہور ومعروف اور بڑے دلچسپ ہیں، اور حِ ثلاثہ میں لکھا ہے کہ جب شاہ عبدالعزیز صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی تالیف "تحفہ اثناء عشریہ" لکھنؤ میں پہنچی تو لکھنؤ کے نواب نے جو اس وقت برسرِ حکومت تھا، مجتہدین شیعہ سے درخواست کی کہ اس کا جواب لکھا جائے، مجتہدین میں سے دلدار علی خان نے جواب کا بیڑا اُٹھایا، لیکن تحفہ کی زبان چونکہ بے نظیر تھی اس لیے مرزا قتیل سے درخواست کی گئی کہ مضامین قبلہ و کعبہ لکھیں گے اور آپ ان کو اپنی عبارت میں ادا کر دیں، تاکہ مضامین کا جواب مضامین سے اور عبارت کا جواب عبارت میں ادا کریں، مگر قتیل نے عذر کیا اور کہا کہ میں شاہ صاحب کی سی فارسی عبارت لکھنے پر قادر نہیں ہوں اور اس کی تائید میں اس نے بیان کیا کہ دلی میں ایک رنڈی سے میری آشنائی ہے اور میں نے نہایت دل سوزی سے اپنی پوری قابلیت صرف کر کے اسے ایک خط لکھا تھا، وہ رنڈی خط کو دلی کے تمام لائق فائق لوگوں کے پاس لے کر گئی اور درخواست کی کہ اس کا جواب لکھ دیا جائے مگر اس کے جواب کا کسی نے اقرار نہیں کیا، مجبور ہو کر وہ اس خط کو شاہ صاحب کی خدمت میں لے گئی اور ظاہر کیا کہ میں تمام جگہ پھر چکی ہوں، مگر کسی نے جواب کی حامی نہیں بھری، اب میں مجبور ہو کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں، حضور اس کا جواب لکھ دیں، شاہ صاحب نے خط سنتے ہی فی البدیہہ اس کا جواب لکھوا دیا، وہ خط چھ مہینے سے میرے پاس رکھا ہے اور میں کوشش کرتا ہوں کہ اس کا جواب لکھوں مگر اب تک اس کا جواب نہیں ہو سکا، اب آپ غور فرمالیں کہ میں تحفہ کا جواب کس طرح لکھ سکتا ہوں۔

جب قتیل نے عذر کیا تو ناچار قبلہ وکعبہ نے خود ہی جواب لکھا، اس جواب کو نواب صاحب نے مرزا قتیل کے سامنے پیش کیا اور پوچھا کہ بتایئے کیسا جواب ہے؟ مرزا قتیل نے اس کو دیکھ کر کہا کہ ناگوار خاطر نہ ہو تو عرض کروں؟ نواب صاحب نے فرمایا، فرمایئے! مرزا قتیل نے کہا کہ سچ تو یہ ہے کہ قبلہ وکعبہ سے اپنی کتاب کا نام بھی رکھنا نہیں آیا، شاہ صاحب تو ''تحفہ'' پیش کرتے ہیں اور قبلہ وکعبہ تحفہ کا جواب تلوار سے دیتے ہیں، مرزا قتیل کے اس اعتراض کا منشاء یہ تھا کہ قبلہ وکعبہ نے اپنی کتاب کا نام ''ذوالفقار'' رکھا تھا، اس کے بعد قبلہ وکعبہ نے فرمایا کہ اچھا عبارت کی نسبت کچھ فرمایئے، قتیل نے کہا کہ حضور! کہاں جائس کا جلاہا اور کہاں دلی کی سیڑھیوں کا بیٹھا ہوا شہدہ (یہ قتیل نے اس لیے کہا کہ قبلہ وکعبہ جائس کے تھے اور جائس کے جلاہے مشہور ہیں)

(اورح ثلاثہ: ص ۴۳)

دوسری جگہ لکھا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے پاس ایک جہاز راں انگریز آیا اور کہا کہ میں نے سنا ہے آپ کو ہر فن میں دخل ہے، جہاز رانی میں بھی آپ کو کچھ آتا ہے شاہ صاحب نے جو بعض پرزوں کے حالات بیان کیے ہیں تو وہ اس کو بھی یاد نہ تھے، اس کو حیرت ہوگئی، پوچھا تو فرمایا کہ بچپن میں اس فن کی ایک کتاب دیکھی تھی اس میں سے کچھ یاد رہ گیا۔

شاہ صاحب کے پاس دو قوال آئے ان میں کسی راگنی میں اختلاف تھا اور شاہ صاحب کو حکم بنایا دونوں نے شاہ صاحب کے سامنے گایا، شاہ صاحب نے ایک کی تصویب کی اور دوسرے کا تخطئہ اور بتا دیا کہ یہ خرابی ہے، ان کو بڑا تعجب ہوا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ جب ہم مکتب میں جاتے تھے تو ہمارے راستہ میں ایک ڈوم نے بالا خانہ کرایہ پر لے رکھا تھا، ہم آتے جاتے سنا کرتے تھے، اسی سے ہم نے کچھ معلوم کیا تھا جو ہمیں یاد ہے۔ (اورح ثلاثہ: ص ۴۷)

حضرت شاہ عبدالقادر کی ذکاوت

شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق اورحِ ثلاثہ میں متعدد قصے لکھے ہیں، اس میں بروایت مولانا نانوتوی یہ واقعہ لکھا ہے کہ اس خاندان کے دو غبی تھے۔ ایک شاہ عبدالقادر صاحب اور ایک شاہ اسحاق صاحب، مولوی فضل حق صاحب اور مفتی صدر الدین صاحب یہ فرمایا کرتے تھے کہ اس خاندان کے لوگ علوم دینیہ جیسے حدیث، تفسیر وغیرہ خوب جانتے ہیں، مگر معقولات نہیں جانتے، چنانچہ ایک روز جس وقت یہ دونوں پڑھنے جا رہے تھے، ابھی وہ شاہ صاحب تک پہنچے بھی نہیں تھے کہ شاہ صاحب نے اپنے خدام کو حکم دیا کہ ایک بوریہ مسجد سے باہر ڈال دو ایک مسجد کے اندر اور جب فضل حق اور صدر الدین آئیں تو ان کو وہیں بٹھا دو، بوریے حسب الحکم بچھا دیئے گئے

اور جب وہ دونوں واپس آ گئے تو ان کو وہیں بٹھا دیا گیا، جب ان کے آنے کی شاہ صاحب کو اطلاع ہوئی تو شاہ صاحب تشریف لائے اور آ کر اپنے بوریئے پر بیٹھ گئے اور فرمایا، میاں فضل حق اور میاں صدر الدین! آج سبق پڑھانے کو تو جی نہیں چاہتا، یوں جی چاہتا ہے کہ کچھ معقولیوں کے خرافات میں گفتگو ہو، انہوں نے فرمایا کہ جیسے حضرت کی خوشی ہو، اس پر شاہ صاحب نے فرمایا، اچھا یہ بتاؤ کہ متکلمین کا کون سا مسئلہ ایسا ہے جو فلاسفہ کے مقابلہ میں بہت ہی کمزور ہے، انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! متکلمین کے تو اکثر مسائل کمزور ہی ہیں، مگر فلاں مسئلہ تو بہت کمزور ہے، اس پر شاہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا تم فلاسفہ کا مسئلہ لو اور ہم متکلمین کا اور گفتگو کریں، انہوں نے عرض کیا بہت اچھا، اس پر گفتگو ہوئی اور شاہ صاحب نے دونوں کو عاجز کر دیا، اس کے بعد فرمایا اچھا اب بتاؤ فلاسفہ کا کونسا مسئلہ کمزور ہے، اس پر انہوں نے عرض کیا کہ فلاں مسئلہ کمزور ہے، اس پر شاہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا اب تم متکلمین کا پہلو لو اور ہم فلاسفہ کا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور شاہ صاحب نے اب بھی ان کو چلنے نہیں دیا، جب ہر طرح ان کو مغلوب کر دیا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ میاں فضل حق اور میاں صدر الدین! تم یہ نہ سمجھو کہ ہم کو معقول نہیں آتی، بلکہ ہم نے ان کو ناقص اور واہیات سمجھ کر چھوڑ دیا ہے، مگر انہوں نے ہمیں اب تک نہیں چھوڑا، وہ اب تک ہماری قدم بوسی کیے جاتے ہیں، خان صاحب نے یہ بھی بیان کیا کہ میں نے اپنے بزرگوں سے یہ سنا تھا کہ یہ گفتگو دونوں سے ہوئی تھی مگر مولوی احمد علی خیر آبادی اور مولوی ماجد علی کہتے ہیں کہ یہ گفتگو صرف مفتی صاحب سے ہوئی تھی۔

(اورحِ ثلاثہ: ص ۵۱)

حضرت شاہ اسماعیل شہید کی ذکاوت

حضرت شاہ اسماعیل شہید صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے حالات میں لکھا ہے کہ میں یعنی ملا نواب صاحب کی عمر پندرہ سال کی تھی، اپنے اُستاذ حافظ دراز صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ (محشی صدرا) کی اُنگلی تھامے ہوئے کہ وہ نابینا ہو گئے تھے، مولانا اسماعیل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، مولانا اسماعیل صاحب اس وقت پشاور میں تھے اور اپنے گھوڑے پر کھرا کر رہے تھے، حافظ صاحب نے اسی حالت میں چند معقولی سوالات کیے، جس کا جواب حضرت شہید رحمہ اللہ تعالیٰ نے نہایت متانت اور سادگی سے اسی وقت دے دیا، حافظ دراز صاحب شافی جوابات لے کر واپس ہونے لگے تو مولانا شہید رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حافظ صاحب ایک سوال میرا بھی ہے، حافظ صاحب ٹھہر گئے اور مولانا کا سوال سنا اور جواب دیا، اس پر مولانا نے شبہ فرمایا، اس کا جواب پھر حافظ

صاحب نے دیا، مولانا نے پھر شبہ فرمایا اور حافظ صاحب نے اس کا بھی جواب دیا، مولانا نے پھر تیسری دفعہ خدشہ پیش فرمایا تو حافظ صاحب کو غصہ آ گیا اور طیش میں آ کر بجائے جواب کہ غیر مہذب عربدہ شروع کر دیا، جس سے مولانا کی پگڑی زمین پر گر گئی، مولانا نے اسی سادگی سے خاک آلود پگڑی اُٹھا کر سر پر رکھ لی اور فرمایا کہ حافظ صاحب میں نے تو آپ کے کتنے سوالات کے جواب عرض کیے، مگر آپ تو ایک ہی سوال پر خفا ہو گئے۔ (اورِح ثلاثہ:ص۹۶)

دوسری جگہ لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی کا ارشاد ہے کہ مولانا شاہ اسماعیل شہید کا ذہن اس درجہ سریع الانتقال تھا کہ پانچ آدمیوں کو سامنے بٹھا کر پانچ مختلف مضامین لکھاتے تھے اور اس طرح بتلاتے اور املاء کراتے کہ کسی کا قلم نہ رُکتا۔ (اورِح ثلاثہ:ص۹۸)

حضرت گنگوہی نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مولانا رشید خاں صاحب جو شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد تھے اور بوجہ اپنی ذکاوت اور استعداد کامل کے رشید المتکلمین کے نام سے یاد کیے جاتے تھے، ایک دفعہ درس دیتے ہوئے فرمانے لگے کہ مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ تعالیٰ صاحب کو دینیات کے ساتھ شغف تھا، باقی معقولات کی طرف توجہ نہیں، اتفاقاً مولانا شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کو ایک دن بخار آ گیا اور رشید الدین خان صاحب عیادت کے لیے تشریف لے گئے، مولانا شہید فرمانے لگے کہ مولانا آج بخار میں جو دماغ پریشان تھا اسی پریشانی اور انتشار کی حالت میں فلاسفہ کے فلاں فلاں مسئلہ کی طرف ذہن منتقل ہو گیا اور ان مسائل پر میرے دل میں یہ یہ اعتراضات پیدا ہوئے، مولانا رشید الدین خاں صاحب بالکل ساکت رہے، واپس ہونے پر ان کے تلامذہ نے کہا کہ آپ تو فرماتے تھے کہ مولانا اسماعیل کو معقولات کی طرف توجہ نہیں، فرمایا کہ بے شک میں نے یہ کہا تھا، مگر اب میری رائے یہ ہے کہ اگر ارسطو اور افلاطون بھی قبر سے نکل کر آ جائیں تو مولانا کے بیان کردہ اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔

(اورِح ثلاثہ:ص۹۸)

دوسری جگہ لکھا ہے کہ ایک شخص کا نام محمد کالے تھا، وہ اپنا سجع کہلانا چاہتا تھا، اکثر نے انکار کر دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو گورے تھے، کالے کہاں تھے، اس میں جوڑ کیسے ملائیں، وہ مولانا اسماعیل شہید صاحب کے پاس پہنچے تو آپ نے فوراً سجع کہہ دیا:

ہر دم نام محمد کالے

(اورِح ثلاثہ:ص۱۰)

حضرت شاہ اسحاق صاحب کی ذکاوت

حضرت شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق لکھا ہے کہ ایک صاحب شمس بازغہ کی ایک عبارت پر بہت غور وخوض کر رہے تھے جو ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی، اتفاق سے شاہ اسحاق صاحب بھی اس وقت مسجد میں ٹہل رہے تھے، شاہ صاحب نے ان کے پاس آ کر دریافت کیا کہ میاں صاحبزادے بڑے مصروف ہو، کونسی کتاب دیکھ رہے ہو، ان صاحب نے اس پر کچھ التفات نہیں کیا اور ہوں ہاں کر کے ٹال دیا، شاہ صاحب نے دوسری مرتبہ پھر پوچھا کہ میاں صاحبزادے ہمیں تو بتاؤ کونسی کتاب دیکھ رہے ہو؟ ان صاحب نے پھر ٹال دیا، شاہ صاحب پھر چلے گئے، تیسری مرتبہ پھر ٹہلتے ہوئے آئے اور ان صاحب کے پاس بیٹھ گئے اور ذرا اصرار سے پوچھا میاں بتاؤ تو سہی کہ یہ کیا کتاب ہے اور تم اس میں اتنے مصروف کیوں ہو؟ تب ان صاحب نے مجبور ہو کر کہا کہ یہ کتاب شمس بازغہ ہے میں ایک مقام میں اُلجھا ہوا ہوں، اسے سوچ رہا ہوں، اس پر شاہ صاحب نے فرمایا کہ کونسا مقام ہے، انہوں نے اس کا جواب بھی لاپرواہی سے دیا، جب کئی مرتبہ شاہ صاحب نے دریافت کیا تب انہوں نے ان کو وہ مقام دکھلایا، وجہ ان کی بے التفاتیوں کی یہ تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے لوگ معقول نہیں جانتے، شاہ صاحب نے اس مقام کو ملاحظہ فرمایا کہ تمہارے اُستاد نے یہ بتلایا ہوگا اور تم یہ کہتے ہو گے؟ انہوں نے اقرار کیا، اس پر شاہ صاحب نے اس کا صحیح مطلب بتلا دیا اور عبارت پر اس کو منطبق فرما دیا۔

(اورحِ ثلاثہ: ص ۱۱۰)

حضرت گنگوہی کے واقعات

قطب الارشاد حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق اورحِ ثلاثہ میں لکھا ہے کہ اس قدر ذکی الحس تھے کہ ایک مرتبہ جب آپ مسجد میں عشاء کی نماز کے لیے تشریف لائے تو فرمایا، آج کسی نے مسجد میں دیا سلائی جلائی ہے، تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ ایک صاحب نے مغرب کے بعد جلائی تھی، جس کا اثر مولانا کو عشاء کے وقت محسوس ہوا اور آپ کے یہاں عشاء کی نماز قریب ثلث شب کے وقت ہوتی تھی۔ (اورحِ ثلاثہ: ص ۳۰۴)

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کا اتباع سنت ضرب المثل ہے، ایک مرتبہ لوگوں نے کہا کہ مسجد سے بایاں پاؤں نکالنا اور جوتا سیدھے پاؤں میں پہننا سنت ہے، (دیکھیں حضرت ان دونوں کو کیسے جمع فرماتے ہیں) لوگوں نے اس کا اندازہ کیا جب مولانا مسجد سے نکلنے لگے تو آپ نے پہلے بایاں پاؤں نکال کر کھڑاؤں پر رکھا، جب سیدھا پاؤں نکالا تو کھڑاؤں کی کھونٹی انگوٹھے میں

ڈالدی، اس کے بعد بائیں پاؤں میں کھڑاؤں پہنا۔ (اورحِ ثلاثہ:ص۳۰۶)

تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ استنجاء کے لیے تشریف لے جارہے تھے، گولر کے قریب پہنچے، ٹھٹکے اور فرمایا کہ تمبا کو کی بو آتی ہے، آپ تو یہ فرما کر چلے گئے، خادم نے غور کے ساتھ دیکھا تو پان کی پیک پڑی ہوئی تھی، جو خشک ہو چکی تھی، غرض اس کو کھرچا اور زمین کو صاف کر دیا گیا، واپس تشریف لائے تو فرمایا اب نہیں ہے، اس کے باوجود ضبط اس کمال کا تھا کہ جہاں اظہار سے کسی کی تاذی کا احتمال ہوتا تو تحمل وسکوت فرماتے یا ملیح اشارہ سے کسی مخلص خادم پر ڈھال کر فرمادیتے تھے کہ نصیحت بھی ہو جائے اور ناگوار بھی نہ گزرے۔

ایک مرتبہ چند آدمی آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، جن کے کپڑوں سے میلے اور عرق آلود ہونے کی وجہ سے بُو آتی تھی، آپ دل شکنی کے اندیشہ سے ان کو تو صاف طور پر نہ فرما سکے، مولوی محمد یحییٰ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر فرمایا، میاں مولوی محمد یحییٰ کبھی نہا بھی لیا کرو دیکھو بدن میں پسینہ کی بو آنے لگی۔ (تذکرۃ الرشید:ص۵۳،ج۲)

حالانکہ والد صاحب کے یہاں کثرتِ غسل کا اہتمام آخر تک رہا اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے یہاں حاضری کے دوران میں تو اس کا بہت اہتمام رکھتے تھے، تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ آپ تمام حواس کے اعتبار سے نہایت ذکی تھے، بیسیوں تعجب انگیز قصے آپ کی ذکاوت حس اور کمال ادراک کے مشہور ہیں، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے لکھا ہے کہ بھائی عبد الرحمٰن صاحب فرماتے تھے کہ مجھے چائے کا بہت شوق تھا اور اپنے ہاتھ سے پکایا کرتا تھا، حضرت جب چائے پیتے تو فرماتے چائے میں کچے پانی کا ذائقہ آتا ہے، میں نے ایک روز دل میں کہا کہ اچھا آج میں اس قدر پکاؤں گا کہ پانی بھاپ بن جائے، چنانچہ کئی گھنٹے تک پکائی، جب تیار ہوئی اور حضرت کو پلائی فرمایا کہ کچا پانی کا ذائقہ اس میں بھی ہے، میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ وہم کا درجہ ہے، پھر مجھے خیال ہوا کہ میں نے اس میں سے کچھ دودھ گھر سے لا کر ڈالا تھا جو کڑھا ہوا تھا، پوچھوں کہیں اس میں تو پانی نہیں تھا، آخر گھر جا کر معلوم ہوا کہ لوگوں نے اس میں کچھ پانی ڈال دیا تھا۔

مولانا سید احمد صاحب مدنی (برادر بزرگ حضرت شیخ الاسلام مدنی) ایک دن چائے کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے ایک پیالی سے دوسری پیالی میں لوٹ پوٹ رہے تھے، کچھ دیر میں حضرت نے فرمایا اس کی جھلک سے معلوم ہوتا ہے کہ پینے کے قابل ہوگئی ہے، جن ایام میں مولوی حبیب الرحمٰن صاحب دیو بندی حضرت کے لیے چائے پکایا کرتے تھے، کئی دن ایسا قصہ پیش آیا کہ جب حضرت کو چائے پلائی حضرت نے فرمایا، کچے پانی کی بو آتی ہے، ہر چند مولوی صاحب چائے

جوش دینے میں کوشش کی مگر جب فرمایا، حضرت نے یہی فرمایا کہ کچے پانی کی بو موجود ہے آخر بہت پریشان ہوئے کہ یا اللہ کیا بات ہے، پانی کو بہتیرا پکاتا ہوں دودھ اونٹتا ہوا ڈالتا ہوں پھر کچا پانی کیسا، آخر بہت غور کے بعد پتہ چلا کہ جس پیالی میں چائے نکالی جاتی ہے وہ دھو کر خشک نہیں کی جاتی، چنانچہ اس دن پیالی کو دھو کر کپڑے سے صاف کیے اور چائے لے کر حاضر ہوئے، حضرت نے چائے پی لی اور فرمایا آج کچے پانی کی بو نہیں ہے۔

حضرت کے مہمان سہ دری میں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے، حالانکہ دستر خوان اُٹھا کر بوریہ جھاڑ دیا جاتا تھا، مگر حضرت تشریف لاتے تو جو کھانا کھایا جاتا اس کا نام لے کر فرما دیتے کہ فلاں شے کی خوشبو آتی ہے، ایک مرتبہ کھانا کھاتے میں آپ نے فرمایا اس میں کوتھمیر کی خوشبو آتی ہے، ہر چند غور کیا مجمع میں سے کسی کو احساس نہ ہوا، تحقیق کیا تو پتہ چلا کہ پکتی ہانڈی میں چار پانچ پتے ڈال دیئے گئے تھے، آپ کے ادراک کے متعلق ایسے ایسے عجیب اور حیرت انگیز قصے لوگوں نے دیکھے کہ بغیر دیکھے غالبًا کہنے والوں کا یقین بھی نہ آتا۔

ایک مرتبہ جمعہ کے بعد مجمع کثیر آپ کی خدمت میں حاضر تھا کہ مولوی محمد یحییٰ صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی محمد الیاس جن کی عمر اس وقت دس گیارہ برس کی تھی، دبے پاؤں آئے اور چپکے سے ایک کونے میں بیٹھ گئے، معاً حضرت نے گردن اوپر اُٹھائی اور فرمایا بچہ کا سانس ہے، اس وقت کسی نے کہا کہ حضرت! محمد الیاس آئے ہیں۔

ایک بار نمبردار فضل حق کالڑکا اکرام الحق بعد نماز مغرب حاضر خدمت تھا، حضرت کو خبر نہ تھی، کہ کون کون موجود ہیں، جب کھانا کھانے کو مکان جانے لگے اور اکرام الحق کے قریب پہنچے تو حضرت ٹھہرے اور فرمایا نمبردار کی سی بو آتی ہے، تب کسی نے کہا کہ نمبردار کا لڑکا اکرام ہے۔

(تذکرۃ الرشید: ص۵۸رج۲)

اسی رسالہ میں آداب طلبہ میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا واقعہ نقل کرا چکا ہوں کہ ایک مرتبہ حضرت نے حنفیت کی تائید میں نہایت زوردار تقریر فرمائی، جس پر ایک شخص نے جھوم کر کہا کہ اگر حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی اس تقریر کو سنتے تو رجوع فرما لیتے، حضرت امام ربانی نے فرمایا، توبہ توبہ حضرت امام اگر موجود ہوتے تو میری یہ تقریر ایک شبہ ہوتی اور حضرت مجتہد اس کا جواب فرما دیتے، پورا قصہ وہاں گزر چکا۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے واقعات

حضرت امام کبیر نانوتوی قدس سرہٗ کی ذکاوت کے قصے بھی بہت مشہور ہیں، نواب اعظم

علی خان کے یہاں ایک قصہ خواں نوکر تھا اور یہ قصہ خواں بہادر شاہ کا قصہ خواں تھا اور اس سے بڑھ کر دہلی میں کوئی قصہ خواں نہ تھا، نواب صاحب کے یہاں اسے تیس روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی، اس کے اندر یہ کمال تھا کہ کیسا ہی ہکلا یا کسی قسم کا آدمی ہو اس کی اسی طرح نقل کر دیتا تھا کہ اصل اور نقل میں امتیاز نہ ہو سکتا تھا۔

ایک مرتبہ مولانا نانوتوی خورجہ تشریف لائے اور اعظم خان نے مولانا کی دعوت کی، یہ قصہ خواں رافضی تھا، اس نے مولانا سے سوال کیا کہ حضرت! میں ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں، مولانا نے اجازت دے دی، اس نے عرض کیا کہ خلافت کی قابلیت کس میں تھی اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کیسے خلیفہ ہو گئے، جب کہ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خلیفہ نہ بنایا تھا، اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ میں جواب عرض کرتا ہوں، مگر تم اس کے جواب میں نہ بولنا، جب میں تقریر کر چکوں اس وقت جو کچھ شبہ ہو اس کو پیش کر دینا، اس نے کہا بہت اچھا۔

مولانا نے فرمایا، اگر کوئی پہلوان پھکیت یا بکیت بیمار ہو جائے اور اس کی وجہ سے کشتی خود نہ سکھا سکے اور جب سکھانے کا وقت آئے، اپنے کسی شاگرد سے کہہ دے کہ تو سکھلا دے، یا کوئی رئیس اور اہلکار کہیں جائے اور اپنے کام کے متعلق اپنے بیٹے یا کسی عہدیدار سے کہہ جائے کہ میرا کام تم کر دینا اور اشخاص مامورین اور خدمت مفوضہ کو انجام دیں تو استخلاف عملی ہوگا اور اس قسم کا استخلاف اس استخلاف سے کہیں بڑھ کر ہے جو فقط اس کہنے سے ہو کہ فلاں میرا خلیفہ ہے، جب یہ مقدمہ ذہن نشین ہو گیا تو اب دوسرا مقدمہ سنو اور اس کو غور سے سنو۔

ارکانِ اسلام چار ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، مگر دو (۲) ان میں اصل ہیں اور دو (۲) ان میں تابع۔ نماز اصل ہے اور زکوٰۃ اس کے تابع، کیونکہ نماز کا تعلق براہِ راست حق تعالیٰ سے ہے اور وہ اس کے دربار کی حاضری اور اس کی تعظیم اور اس سے عرض معروض کا نام ہے اور زکوٰۃ کا تعلق بلا واسطہ محتاجوں اور فقراء سے ہے، پس نماز کے مقابلہ میں زکوٰۃ ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ اہلِ دربار کو اپنے دربار میں پانچ وقت حاضری کا حکم دے اور یہ بھی حکم دے کہ ہماری طرف سے جو انعامات و صلات تم کو وقتاً فوقتاً ملے ہیں، ان میں سے کچھ ہماری رعایا کو بھی جو دربار کے راستہ میں خیرات کے موقع پر بیٹھ جاتے ہیں، دے دیا کرو، سو ظاہر ہے کہ حاضری دربار مقصود ہے اور صدقہ و خیرات اس کے تابع اور یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تقریباً ہر جگہ قرآن میں زکوٰۃ کو نماز کے بعد بیان فرمایا، اسی طرح حج کا تعلق براہِ راست حق تعالیٰ سے ہے، کیونکہ اس میں محبوب کے درِ دولت پر حاضر ہو کر اپنے عشق و محبت کا اظہار ہے اور روزہ میں کسر شہوت نفس ہے جو مانع ہے اس محبت و عشق سے اور ان خامیوں کو دفع کرنا ہے جو اس ناصح نامہربان نفس امارہ کی بدولت اس کی خدمت میں پیدا ہو

گئی، اس لیے روزے تیس مقرر کیے گئے اور حج کا وقت رمضان کے بعد سے شروع کیا گیا، کیونکہ آخری وقت حج سے رمضان تک دس مہینے ہوتے ہیں، پس ہر مہینے کے لیے مسہل یعنی روزے تجویز کیے گئے اور ان سب کو ایک مہینہ رمضان میں جمع کر دیا گیا تاکہ دس مہینوں میں جس قدر نفس امارہ کی وجہ سے عشق و محبت کے جذبات میں خامی و خلل آ گیا ہے ان مسہلوں سے اس کی تلافی کی ہو جائے، وہ اس قابل ہو سکے کہ محبوب کے درِ دولت پر حاضر ہو کر صحیح طور پر اپنی محبت کا اظہار کر سکے اور جب رمضان میں وہ ان مسہلوں سے اس قابل ہو گیا تو اب یکم شوال سے اس کو اجازت ہوئی کہ اب آؤ اور آ کر اپنی محبت کا اظہار کرو، یعنی اس وقت سے حج کا وقت شروع ہو گیا، اس کی ایسی مثال سمجھ لیجئے جیسے بادشاہ اپنے اہلِ دولت کو جشن شاہی کی شرکت کے لیے دعوت دے، اس کے ساتھ یہ بھی حکم دے کہ سب لوگ خوب نہا دھو کر اعلیٰ اعلیٰ خوشبوئیں لگا کر پوری طرح شرکتِ جشن کے قابل ہو کر شریک جشن ہوں، سو ظاہر ہے کہ شرکتِ جشن مقصود ہے اور باقی امور اس کے تابع، جب یہ ذہن نشین ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ نماز اور حج ارکان مقصودہ ہیں اور زکوٰۃ اور روزہ ان کے تابع تو اب اصل مقصود سنو۔

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں صدیق اکبر کو امیر حج بنایا اور باوجود تمام صحابہ کی موجودگی کے اس خدمت پر آپ کے سوا کسی اور کو مامور نہیں فرمایا، پس اسلام کے ایک رکن اصلی کے متعلق آپ کا استخلافِ عملی ثابت ہو گیا اور اس کے ضمن میں اس کے تابع روزہ کے متعلق بھی استخلاف ثابت ہو گیا، پھر آپ نے اپنے مرض وفات میں خدمت امامت صلوٰۃ آپ کے سپرد کی اور سترہ (۱۷) وقت کی نمازیں اپنے سامنے آپ سے پڑھوائیں اور باوجود تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی موجودگی کے یہ خدمت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی اور کے سپرد نہیں فرمائی، پس نماز کے متعلق آپ کا استخلاف عملی ثابت ہو گیا، اب کیا وجہ ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ برحق نہ مانا جائے اور کس طرح کہا جائے کہ خلافت کی ان میں اہلیت نہ تھی اور اہلیت خلافت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ میں تھی اور وہی خلیفہ تھے۔

مولانا نے اس تقریر کو نہایت وضاحت اور بسط کے ساتھ فرمایا تھا اور قدر دلکش پیرایہ میں بیان فرمایا تھا کہ میں نے مولانا کی کوئی تقریر ایسی دل کش نہیں سنی، مگر وہ تقریر مجھے (امیر شاہ خان) محفوظ نہیں رہی، اس لیے اس کا قریب قریب خلاصہ بیان کر دیا گیا، اس تقریر کا قصہ خواں پر یہ اثر ہوا کہ اسی وقت رفض سے تائب ہو کر سنی ہو گیا۔ (ارواحِ ثلاثہ: ص ۲۲۱)

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ باوجود جفاکش اور مجاہد ہونے کے لطیف الطبع اور نازک دماغ تھے، اتفاقاً ایک نہایت ہی بدہیئت شخص

سامنے آکر بیٹھ گیا تو حضرت مولانا کی طبیعت رک گئی، بالآخر کسی انداز سے اُٹھے اور مجمع ایک دم تہ و بالا ہوا، اس گڑبڑ میں وہ شخص سامنے سے ٹل گیا، پھر آکر تقریر شروع فرمائی اور اب طبیعت بے تکان تھی۔ (اورِ ثلاثہ: ص ۲۵۷)

مولانا حبیب الرحمن صاحب نے فرمایا کہ مولانا نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ اکثر تقریر فرماتے ہوئے بیچ میں چند ایک منٹ سکوت فرماتے تھے اور ایک دم رُک جاتے تھے، اس پر عرض کیا گیا کہ حضرت مسلسل تقریر فرماتے ہوئے آپ کیوں رُک جاتے ہیں، فرمایا ایک ہی مضمون کے بیسیوں پیرائے اور عنوان ذہن میں ایک دم آجاتے ہیں اور طبیعت رک جاتی ہے تو اس پر غور کرنے لگتا ہوں کہ کس کو لوں اور کس کو چھوڑوں۔ (اورِ ثلاثہ: ص ۲۵۸)

طرزِ تعلیم میں ایک واقعہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا بہت مفصل لکھوا چکا ہوں کہ ایک انگریز مہندس نے اشتہار دیا تھا کہ کوئی شخص مثلث کے زاویہ کو تین حصوں میں دلیل سے ثابت اور منقسم کردے تو ڈیڑھ لاکھ روپے انعام ہے، اس پر مظفرنگر کے منصف صاحب نے بڑی کاوش اور محنت سے اس کو ثابت کیا اور کئی ماہرین ہندسہ نے مصنف کو مشورہ دیا کہ اس کو شائع کردیں اور ڈیڑھ لاکھ روپے کا انعام وصول کرلیں، مگر مصنف صاحب کا اصرار یہ تھا کہ حضرت نانوتوی صاحب اگر بغور ملاحظہ فرما کر تصویب کردیں تو شائع کردوں، مولانا اتفاق سے مظفرنگر تشریف لے گئے اور واپسی میں ریل پر سوار ہونے کے لیے جب اسٹیشن پر تشریف لائے تو گاڑی میں دس بارہ منٹ باقی تھے، ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب جو حضرت گنگوہی کے بعد خاص خدام میں ہو گئے تھے منصف صاحب کی تمنا ظاہر کی، خیال تھا کہ حضرت اس تحریر کو اپنے ساتھ لے جائیں گے، حضرت نے گاڑی کے انتظار میں کھڑے کھڑے سرسری اس کو سنا اور فرمادیا کہ اس کا فلاں مقدمہ نظری ہے، حالانکہ اقلیدس کے تمام مقدمات کی انتہا بدیہیات پر ہوتی تھی، چونکہ وہ صاحبِ فن تھے فوراً سمجھ گئے اور اشتہار دینا ملتوی کردیا، لوگوں نے کہا بھی کہ تم نے ڈیڑھ لاکھ کھویا، اس وقتِ نظر کو کون پہچانتا۔

اس جگہ مولانا کی ذکاوت کے اور بھی قصے گزر چکے ہیں، طرزِ تعلیم میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ بھی قصہ گزر چکا کہ دیوبند چھتہ کی مسجد میں اقلیدس پڑھاتے ہوئے جب کسی شکل کھینچنے کی ضرورت ہوتی تھی تو بوریہ کا کونہ اُٹھا کر کچی زمین پر اُنگلی سے شکل کھینچ کر سمجھا دیتے تھے، نہ پرکار کی ضرورت تھی نہ کسی اوزار کی۔

حضرت مولانا یعقوب صاحب کا واقعہ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی نوراللہ مرقدہٗ کے متعلق احسن العزیز میں لکھا ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب وضو کرتے ہوئے اقلیدس ومساحت کے سوالات حل کرتے جاتے تھے، ایک وہاں اسکول تھا، وہاں کے مدرس پوچھنے آجاتے تھے، مولانا یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اول مرتبہ ہی میں جہاں تک میرا ذہن پہنچنا ہوتا ہے پہنچ جاتا ہے، اگر نہیں پہنچتا تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ یہ میری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ (حسن العزیز: ص۲۰۲رج۲)

حضرت تھانوی کا واقعہ اکابر کے وصیت نامے

حضرت حکیم الامت نوراللہ مرقدہ کا ارشاد ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی نوراللہ مرقدہٗ جس وقت نابینا ہو گئے تو میں کبھی ویسے ہی چپکے سے جاکے نہیں بیٹھا، بلکہ جب گیا یہ کہہ دیا کہ اشرف علی آیا ہے اور جب چلنے لگا تو کہہ دیا کہ اشرف علی رخصت چاہتا ہے، ویسے چپکے سے جاکر بیٹھنے میں تجسس کا شائبہ ہے، تشبہ بالمجسس بھی تجسس ہے، آنے جانے کی اطلاع سے یہ فائدہ تھا کہ شاید کوئی بات میرے سامنے فرمانا نہ چاہیں اور حضرت فرمانے لگیں۔ (اورِاح ثلاثہ: ص۳۸۵)

حضرت حکیم الامۃ نوراللہ مرقدہٗ کی ذکاوت کے قصے اتنے محفوظ اور ضرب المثل ہیں کہ ان کا احاطہ بہت مشکل ہے، حضرت کے سارے معمولات سراسر ذکاوت اور کثرتِ احساس پر مبنی ہیں، نمونے کے طور پر صرف اشراف السوانح سے وصیت کی ایک یادداشت عبرت اور عمل کے لیے لکھواتا ہوں۔

حضرت تحریر فرماتے ہیں یادداشت ہائے ضروری متعلقہ امانت حجرہ نمبر۱ تمام نسخ رافع الضنک غیر مجلد کے تقسیم کے لیے ہیں اور شیخ (فلاں) صاحب کی مملوک ہیں، نمبر۲ تمام نسخ غیر مجلد ہدیہ سنیہ وتقلیل الاختلاط مع الانام واسرار العبادۃ کے تقسیم کے لیے ہیں اور مملوکہ حاجی (فلاں) صاحب کے ہیں ان سب کے ساتھ مثل دیگر امانت کے معاملہ کیا جائے اور اگر انہیں کتابوں کے نسخے حجرہ نمبر۲ میں پائے جائیں وہ میری ملک ہیں، اسی طرح اسی حجرہ کی رسی پر جو کپڑے رکھے ہیں وہ مساکین کے لیے ہیں، میں ان کی تقسیم میں وسیع ہوں، یہ تقسیم کردیئے جائیں، نمبر۳ لانبی تپائی مولوی فلاں کی ہے، وہ ان کو دے دی جائے، نمبر۴ سہ دری میں جو گھڑی، گھنٹہ دار رکھی ہے، یہ مدرسہ کی ہے وہ ان کو دے دی جائے، نمبر۵ سہ دری میں جو کھونٹی پر چوبی تختی رمضان کے نقشہ کی ہے وہ بھی میری ملک نہیں ہے، نمبر۶ لفافہ دان جو میری چوکی کے برابر رکھا رہتا ہے، اس کے سب سے اخیر اور نشیبی درجہ میں اور اسی طرح سہ دری کی جنوبی دیوار کے بڑے طاق میں باستثناء رسائل

کہ وہ میری ملک ہیں، اکثر کچھ کاغذ ارت رہتے ہیں وہ دوسروں کی ملک ہیں، مطبوعات پر تو مالکوں کے نام ہیں، ان کو دے دیے جائیں اور خالی لفافہ بلا نمبر جوابی کارڈ بلا نمبر کاتبوں کے پاس مع اطلاع واقعہ بھیج دیے جائیں اور نمبروار لفافے یا کارڈ استفتوں کے متعلق ہیں، انہی نمبروں کے فتوے کاتب یا ناقل فتاویٰ سے لے کر بھیج دیے جائیں اور اگر ان نمبروں کے فتوے نہ ملیں تو گم ہو جانے کی اطلاع کر دی جائے اور جن پر لفظ لقطہ لکھا ہے وہ مصارف لقطہ میں صرف کیے جائیں، اسی طرح جن میں ٹکٹ ہوں اور پتہ نہ ہو وہ بھی لقطہ ہیں مضمون کیسہ جات و لفافہ جات مذکورہ نمبر ۵ و نمبر ۷۔

(۱)...... یہ رقم حاجی فلاں بابت صفائی مواعظ ہے، ان کو اطلاع دے کر حسب اجازت ان کے عمل کیا جائے، مگر مواعظ کا کام فوراً بند کر کے اس کو بھی ان کو مع اس حالت کے جس حالت پر کام بند ہوا ہے اطلاع کر دی جائے اور بند ہونے تک وقت کا حساب کر کے اس میں سے اجرت دے دی جائے۔

تنبیہ ضروری

مذکورہ رقم کی تھیلی میں ایک لفافہ بھی ہے، اس کی یہ یادداشت ہے، یہ بھی رقم بالا کا جزو ہے جس کی مقدار (اتنا روپیہ) ہے، یہ جدا اس لیے رکھی ہے کہ میں نے یہ رقم ان کی اذن دلالۃً کی بناء پر قرض لے لی تھی، پھر جلد ہی اس میں رکھ دی، مگر اس کے ضمان سے براءت نہیں ہوئی، اس لیے اگر یہ قبل ان کے پاس پہنچنے کے یا قبل ان کے اذن آنے کے ضائع ہو جائیں میرے ترکہ سے ادا کی جائیں اور اگر ترکہ ورثہ میں تقسیم ہو چکا ہو تو نسبت سے حصہ رسد سب سے واپس ادا کی جائے کہ دین مقدم ہے میراث پر۔

(۲)...... یہ رقم فلاں خاں صاحب کی ہے، روشنی صحن مدرسہ و غسل خانہ وغیرہ کے لیے ان سے یا ان کے ورثہ سے اطلاع کر کے حسب اجازت عمل کیا جائے۔

(۳)...... یہ رقم مسجد فلاں کی ہے جو مجھ کو فلاں صاحب نے سپرد کی ہے، ان کو واپس کر دی جائے۔

(۴)...... صاحب رقم کا یہ پتہ ہے انہوں نے اس رقم کا نہ خود مصرف لکھا نہ میرے خط کا جواب دیا، ان سے پھر پوچھا جائے، اگر دو ماہ تک جواب نہ آئے تو اعلاء السنن کے کسی حصہ کی اشاعت یا تصنیف جس میں حاجت ہو صرف کیا جائے۔

(۵)...... یہ رقم فلاں خان صاحب کی زکوۃ کی ہے، ان کو اطلاع دی جائے کہ اشرف کی رائے

تھی کہ یہ رقم نصب اس کے دونوں اہلیہ کے ہاتھ سے مساکین کو تقسیم کرائی جائے، آگے خان صاحب جو فرمائیں۔

(۶)......اس کا مضمون بھی مثل نمبر ۵ کے ہے، مگر اس میں ایک حصہ صدقہ نافلہ کا بھی ہے، صرف حصہ نافلہ کے متعلق میری رائے طلبہ وذاکرین کو نقد تقسیم کرنے کی لکھ دی جائے۔

(۷)......اس تھیلی میں حاجی فلاں صاحب کی دی ہوئی رقم بابت فدیہ نماز فلاں خاں صاحب کی ہے، مساکین قصبہ کے لیے ان سے مکرر پوچھا جائے۔

(۸)...... یہ رقم فلاں صاحب کی ہے بنابریں اذن دلالۃ کے مولوی فلاں صاحب کو قرض دے دی ہے، ان سے وصول کر کے جس طرح فلاں صاحب کہیں صرف کیا جائے اور اگر وصول نہ ہوتو میرے ترکہ سے صاحب رقم کو دے دی جائے، پھر جب وصول ہو میرے ترکہ میں شامل کر دی جائے اور فلاں صاحب مجھ کو معاف کریں، معافی کو قبول کر لیا جائے پھر وصول کے وقت وہ میرا ترکہ ہوگا۔

تنبیہ

نیز اہلِ امانات کو یہ بھی اطلاع دی جائے کہ امانت بھیجنے کی مدت تحقیقاً یا تخمیناً یاد کر کے استفتاء کر لیں کہ بقایا رقم کی وجہ سے اس میں زکوٰۃ تو واجب نہیں ہوئی۔

نوٹ

اور مدت ختم کی رقم کو امانت واجبۃ الرد میں اس لیے نہیں لکھا کہ ظاہراً مالکوں کو اس رقم کا ختم ہی میں خرچ کرنا مقصود ہے پس دلالۃً اجارہ باقی ہے، لیکن اگر علماء اس کے خلاف فتویٰ دیں تو کام بند کر کے میرے ربع وصیت (مذکورہ نمبر ۴) سے کارڈ خرید کر سب کو اطلاع دے دیں، اگر فیس منی آرڈر کی ضرورت ہو انہی کی رقم سے ادا کریں، سب کے پورے پتے حافظ فلاں کے پاس لکھے ہیں اور جو رقم میری معرفت میں نہ ہو اس سے خارج ہے اسی طرح اگر اہلِ رقم کی جانب سے کوئی تغیر پیش آئے وہ بھی اس سے خارج ہے۔ فقط

تنبیہ

ان سب وصایا اور ضمیمہ میں اول سے آخر تک اگر مجھ سے کچھ ابہام یا نقص یا خلط ہو گیا ہو یا کسی جزء میں شبہ یا تردد ہو جائے، بہر حال میں احکام شرعیہ کی تحقیق کر کے ان پر عمل کیا جائے، بلکہ اس سے تمام مضمون کو ہر ناظر وصیت جو کہ عالم نہ ہو کسی عالم سے سمجھ کر پڑھ لے تو اپنی وصیت لکھنے میں

اور دوسروں کی وصیت کی باقاعدہ جاری کرنے میں بہت اعانت ہو۔

(اشرف السوانح: ص۱۲۷ ج۳)

میرے اکابر نور اللہ مراقدہم کے وصیت نامے تو اکثر مطبوع اور سوانحوں میں درج ہیں، اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی وصیت مستقل میں نے ہی کئی ہزار شائع کر کے تقسیم کیے ہیں اور اعلیٰ حضرت قطب ربانی حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا وصیت نامہ میرے والد صاحب قدس سرہٗ نے کئی ہزار پمفلٹ کی صورت میں تقسیم فرمایا تھا، حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا وصیت نامہ مکمل تو وصل الحبیب میں شائع ہوا ہے، اس کا ابتدائی حصہ مختصر تذکرۃ الرشید میں بھی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

''حامداً ومصلیاً یہ وصیت عام ہے، سب دیکھیں اور سنادیں اور عمل کریں، اپنی اولاد اور زوجہ اور سب دوستوں کو بتاکید وصیت کرتا ہوں کہ اتباع سنت کو بہت ہی ضروری جان کر شرع کے موافق عمل کریں، تھوڑی مخالفت کو بہت سخت دشمن اپنا جانیں اور رسوم دنیا کو سرسری جان کر نہایت خرابی کی بات ہے اور لذت کھانے اور کپڑے کی قید نہایت خرابی ڈالنے والی دین اور دنیا کی ہے، اس سے بہت اجتناب کریں، اپنے مقدور سے بڑھ کر کام کرنا مآل کار ذلیل ہونا ہے، اس کی رسوائی دین و دنیا میں اُٹھانی ہوتی ہے، بدمزاج و کج خلقی سخت نامرضی حق تعالیٰ کی ہے، دنیا میں ایسا آدمی خوار رہتا ہے اور آخرت میں نہایت ذلت اُٹھاتا ہے، نرمی سب کے ساتھ لازم ہے اور بُرا کام قلیل بھی بُرا ہے اور اطاعت و اچھا کام اگرچہ تھوڑا ہو بہت بڑا رفیق ہے۔ تکلفات شادی و غمی کے بدعت سے خالی نہیں ہے، اس کو سرسری نہ جانے، طعن و تشنیع خلق و برادری کے سبب سے اپنے مقدور سے زیادہ کام کرنا یا خلاف شرع یا بدعت کو کرنا عقل کی بات نہیں، دنیا و دین میں اس کا خمیازہ بُرا ہے، اسراف کی مذمت اور بُرائی شریعت میں سخت آئی ہے کہ شیطان کا بھائی اس کو قرآن میں فرمایا ہے، اگر میرا انتقال ہو جائے تو حسبِ مقدور ثواب پہنچا دیں، اندازے سے ہرگز نہ کرے، نہ کوئی تکلف غیر مشروع کریں جو کچھ ہو موافق سنت کے ہو، باہم اتفاق سلوک سے رہیں، میرے ذمہ کسی کا ایک پیسہ تک قرض نہیں، اس کا کچھ فکر نہ کریں۔'' الخ

مولانا یحییٰ صاحب کے واقعات

میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ علمی ذکاوت تو ان کی ان تقریروں سے ظاہر ہے جو حدیث پاک کی لکھی ہیں اور اب دنیا میں شائع بھی ہو گئیں اور علماء بھی ان کی تحریر کو اور طویل مضمون کو مختصر عبارت میں لکھنے کی داد دیا کرتے ہیں، وہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ گنگوہ میں دورۂ حدیث سے

فراغت کے بعد میں حضرت اعلیٰ کی خدمت میں قیام کی نیت سے پڑ گیا تھا، حضرت قدس سرہٗ نے رنگون سے آیا ہوا ایک استفتاء جو سود کے متعلق تھا اور کمپنیوں کے حصص کے متعلق متعدد سوالات تھے، میں نے اس کا بہت ہی مفصل جواب لکھا تھا، حضرت اقدس سرہٗ نے میرا جواب سن کر بہت ہی اظہار مسرت فرمایا تھا اور اسی دن اپنی مہر شریف میرے حوالے کر دی تھی کہ فتاویٰ کے جواب لکھا کرو اور کوئی بات مجھ سے دریافت کرنی ہو تو دریافت کر لیا کرو، فرماتے تھے کہ ابتداء میں تو عام اور روزمرہ کے مسائل کے علاوہ کوئی خاص مسئلہ ہوتا تو میں جواب اہتمام سے سنا یا کرتا تھا، اس کے بعد اجمالی جواب حضرت سے عرض کر کے تفصیلی لکھ دیا کرتا تھا، تذکرۃ الخلیل میں بھی متعدد واقعات لکھے ہیں، اس میں بھی لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ مولانا کی علمی استعداد اور علوم نقلیہ کے ساتھ فنون عقلیہ کی مہارت تامہ مسلم اور مشہور ہونے کے ساتھ علماء عصر میں حیرت کی نظر سے دیکھی گئی، مگر اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی اکثر کتابیں آپ نے خود دیکھی ہیں اور استاذ سے بہت ہی کم پڑھی ہیں، یوں فرمایا کرتے تھے کہ سارے ادب میں میں نے استاذ سے مقامات کے صرف نو (۹) مقامے پڑھے ہیں، وہ اس طرح سے کہ جب استاذ فرمادیا کرتے تھے کہ اس لفظ کا ترجمہ مجھے معلوم نہیں، لغت میں دیکھ لو، یہ واقعات آپ بیتی میں بھی تفصیل سے گزر چکے ہیں اور طبعی ذکاوت کے قصے تو خاندان میں بہت مشہور ہیں، میں نے خود والد صاحب سے بھی سنا ہے کہ وہ اپنی والدہ کی روایات سے نقل کیا کرتے تھے کہ دادی صاحبہ کا دودھ کم تھا اس لیے دایہ کا دودھ پلایا جاتا تھا، مگر وہ جب تک نہا کر کپڑے پہن کر خوشبو لگا کر دودھ نہیں پلاتی تو دودھ نہیں پیا کرتا تھا اور دودھ پینے کے زمانہ میں پاؤ پارہ قرآن کا حفظ کر لینا اور سات برس کی عمر میں پورا قرآن حفظ اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر لی تھی، یہ قصے تو پہلے آپ بیتی میں گزر چکے ہیں، وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میرے لیے دہلی کے اطباء نے بھینس کے پائے خاص طور سے کھانے کہ تاکید کر رکھی تھی کہ تیرا حس بہت بڑھا ہوا ہے، چنانچہ بہت دنوں تک دہلی کے بھٹیارے کے یہاں سے بھینس کے پائے کھلائے گئے۔

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر۱۴

اکابر کے تصرفات

اکابر کے تصرفات کے قصے بہت ہی مشہور ہیں اور حیرت انگیز ہیں، مگر اس نوع کو نہ تو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا گیا اور نہ عام طور سے ان کے تذکرہ کا رواج تھا، واقعات تو میرے علم میں بھی بہت ہیں، مگر چونکہ اکابر کی طرف سے بھی اس نوع کے واقعات کا اظہار پسند نہیں تھا اور خود اپنی طبیعت کو بھی اس سے مناسبت نہیں ہوئی، اس لیے اس طرف طبیعت چلتی نہیں، تاہم نمونۂ چند واقعات اکابر کے بھی جو نظر سے گزرے یا خود بھی دیکھے لکھوا رہا ہوں۔

شاہ عبدالقادر صاحب کا ایک واقعہ

اورِ ثلاثہ میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ کے زمانہ میں ایک آدمی پر جن آیا، اس کے قرابت دار اس کو شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ غلام علی صاحب اور دوسرے بزرگوں کے پاس لے گئے اور سب نے جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈے کیے، مگر کچھ افاقہ نہ ہوا، اتفاق سے شاہ عبدالقادر صاحب اس وقت دہلی میں تشریف نہ رکھتے تھے، جب شاہ صاحب تشریف لائے تو ان کی طرف بھی رجوع کیا، شاہ صاحب نے جھاڑ دیا اور وہ اسی روز اچھا ہو گیا، جب شاہ عبدالعزیز صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے شاہ صاحب سے پوچھا، میاں عبد القادر! تم نے کون سا عمل کیا تھا، انہوں نے فرمایا حضرت! میں نے تو صرف الحمد پڑھ دی تھی، اس پر شاہ صاحب نے دریافت فرمایا کہ کسی خاص ترکیب سے، انہوں نے فرمایا کہ ترکیب کوئی نہیں، فقط یا جبار کی شان میں پڑھ دی تھی، ناقل قصہ نے امیر شاہ خاں صاحب راوی سے اس کا مطلب پوچھا، انہوں نے کہا کہ مطلب تو میں بھی نہیں سمجھتا، جو الفاظ سنے تھے نقل کر دیئے، اس پر حکیم الامۃ حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں، احقر کے ذہن میں جو بے تکلف مطلب آیا اس کو بہ سبیل احتمال ذکر کرتا ہوں کہ کاملین میں ایک درجہ ہے ابوالوقت، کہ وہ جس وقت تجلی کو چاہیں اپنے اُوپر وارد کر لیں، کذا سمعت مرشدی۔ (سید الطائفہ الحاج امداد اللہ قدس سرہٗ) پس عجب نہیں کہ حضرت شاہ صاحب نے اس وقت اپنے پر جبار کی تجلی کو وارد کیا ہو اور اس کی مظہریت کی حیثیت سے اس کی توجہ سے دفع فرما دیا ہو۔ (اورِ ثلاثہ: ص ۵۵)

ایک مجذوب دہلی کی جامع مسجد کے پیچھے دُکان میں رہا کرتے تھے اور اس زمانہ کے لوگ اس

کے نہایت معتقد تھے، وہ مجذوب کبھی کبھی جامع مسجد کی ان سیڑھیوں پر آبیٹھتا تھا جو دریبہ کی جانب ہیں اور اس کی شکل اس قدر ہیبت ناک تھی کہ اکثر لوگ اس کے خوف سے اس طرف کا راستہ چھوڑ دیتے تھے اور وہ اپنی کوٹھری میں بھی اور سیڑھیوں پر بھی شیر کی طرح غرایا کرتا تھا، رات کے وقت اس کی کوٹھری میں کوئی کبھی گیا ہی نہیں، اگر کسی کو کچھ عرض معروض ہوتی تو بہت ڈرتے ڈرتے سیڑھیوں ہی پر کچھ کہہ لیتا تھا، وہ مجذوب لوگوں کو مارتا بھی تھا اور اینٹیں بھی پھینکتا تھا۔

شاہ اسمٰعیل شہید کا واقعہ

مولانا اسمٰعیل شہید نے ایک روز اس کی دُکان میں جانے کا ارادہ کیا تو احباب نے بہت منع کیا، مگر انہوں نے کسی کی نہ سنی اور دُکان میں پہنچ گئے، مجذوب مولانا کو دیکھ کر اس قدر غرایا کہ کبھی اس قدر نہ غرایا تھا، مخالفین تو بہت خوش ہوئے کہ ان پر مجذوب کی مار پڑے گی اور یا تو مر جائیں گے یا دیوانہ ہو جائیں گے یا اور کوئی بلا نازل ہوگی، مگر کچھ نہ ہوا بلکہ وہ مجذوب تھوڑی دیر تو غرایا اس کے بعد اس کا غرانا موقوف ہو گیا اور دونوں کی باتوں کی آواز آنے لگی، نتیجہ یہ ہوا کہ دو گھنٹے کے بعد مولانا اس کو نکال لائے اور باہر لا کر نماز پڑھوا دی، اس کے بعد سے یہ حالت ہوئی کہ برابر نماز پڑھنے لگا اور غرانا وغیرہ سب موقوف ہو گیا، مگر کسی قدر دیوانگی باقی رہی۔ (اورِاح ثلاثہ: ص ۶۲)

حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب قدس سرہٗ کے مواعظ کے واقعات تو بہت کثرت سے ہیں اور ان مواعظ کی تاثیر کی وجہ سے غنڈے ان کے بہت ہی مخالف ہو گئے تھے، حتیٰ کہ ہر وقت لوگ ان کے قتل کے درپے رہتے تھے، اس لیے خاندان کے لوگ حضرت شاہ صاحب کی بڑی حفاظت کرتے تھے، ایک مرتبہ عشاء کی نماز کے بعد جامع مسجد دہلی سے اس دروازے کو چل دیئے جو قلعہ کی طرف کھلتا ہے، مولانا محمد یعقوب صاحب نے لپک کر ان کو پکڑا اور پوچھا کہ کہاں جاتے ہو، میں اس وقت میں تنہا نہ جانے دوں گا، اگر تم کہیں جاؤ گے تو میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا، مولانا نے فرمایا کہ میں خاص ضرورت سے جا رہا ہوں، تم مجھے جانے دو اور میرے ساتھ نہ آؤ، میں نے اصرار کیا مگر وہ نہ مانے اور تنہا چل دیئے، میں بھی ذرا فاصلے سے ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

خانم کے بازار میں ایک بڑی مالدار اور مشہور رنڈی کا مکان تھا اور اس کا نام موتی تھا، مولانا اس مکان پر پہنچے اور آواز دی، تھوڑی دیر بعد مکان سے ایک لڑکی نکلی اور پوچھا کہ تم کون ہو اور کیا کام ہے انہوں نے کہا کہ میں فقیر ہوں، وہ لونڈی یہ سن کر چلی گئی اور جا کر کہہ دیا کہ ایک فقیر کھڑا ہے، رنڈی نے کچھ پیسے دیئے اور کہا کہ جا کر دے دے، وہ لڑکی پیسے لے کر آئی اور مولانا کو دینا چاہا، مولانا نے کہا کہ میں ایک صدا کہا کرتا ہوں اور بغیر صدا کہے لینا میری عادت نہیں، تم اپنی بی بی سے

کہو کہ میری صدا سن لے، اس نے جا کر کہہ دیا، رنڈی نے کہا کہ اچھا بُلا لے، وہ بُلا کر لے گئی مولانا جا کر صحن میں رومال بچھا کر بیٹھ گئے اور آپ نے سورۂ والتین ''ثم رددنہ اسفل سافلین'' تک تلاوت کی، میں بھی وہاں پہنچ گیا اور جا کر مولانا کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور مولانا نے اس قدر بلیغ اور مؤثر تقریر فرمائی کہ گویا جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرا دیا، اس رنڈی کے ہاں بہت سی اور رنڈیاں بھی تھیں اور ان کے علاوہ اور لوگ بھی بہت تھے، ان پر اس کا یہ اثر ہوا کہ سب لوگ چیخ چیخ کر رونے لگے اور کہرام مچ گیا اور انہوں نے ڈھولک، ستار وغیرہ توڑنے شروع کر دیئے اور موتی اور اس کے علاوہ کئی رنڈیاں تائب ہو گئیں، یہ قصہ مفصلاً اکابر کی تواضع میں گزر چکا ہے، یہاں تو مولانا کے اس تصرف کی وجہ سے دوبارہ مختصر لکھوا دیا۔ (اور ح ثلاثہ: ص ۲۹)

حضرت حاجی صاحب کا واقعہ

سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے تصرفات بھی بہت مشہور و معروف ہیں، ایک شخص نے حضرت سے بیعت کی درخواست کی اور یہ شرائط پیش کیں کہ ایک تو یہ نماز نہیں پڑھوں گا، دوسرے یہ کہ ناچ دیکھنا نہیں چھوڑوں گا، حضرت نے دونوں شرط کے ساتھ بیعت میں قبول کر لیا، مگر حضرت کو خدا تعالیٰ کی ذات پر ایسا بھروسہ تھا کہ کیسا ہی کوئی آیا اس کو لے لیا، اب برکت سنیے۔

بیعت ہونے کے بعد جب نماز کا وقت آیا، اس شخص کے بدن میں خارش شروع ہوئی اور ایسی ہوئی کہ پریشان ہو گیا اور اتفاق سے جو اعضاء وضو میں دُھلتے ہیں ان میں زیادہ خارش تھی، اس شخص نے پانی سے وہ اعضاء دھوئے صرف مسح رہ گیا، پھر خیال آیا کہ اور اعضاء تو دھل گئے صرف مسح رہ گیا لاؤ مسح بھی کر لیں وضو ہی ہو جائے گا، چنانچہ مسح بھی کر لیا، جس سے نصف خارش جاتی رہی، پھر خیال آیا کہ وضو تو ہو ہی گیا لاؤ نماز بھی پڑھ لیں، بس نماز کی نیت باندھنا تھا کہ دفعۃً تمام خارش بند ہو گئی، اس نماز کے بعد دوسری نماز کا وقت آیا پھر وہی خارش پھر وضو کر کے نماز شروع کی تو خارش بند، اب یہی سلسلہ جاری ہو گیا، وہ شخص اب سمجھا اور کہنے لگا واہ حضرت یہ تو مجھ پر اچھا ہی سپاہی مسلط کر دیا، غرض پکا نمازی بن گیا، اب ہندوستان میں آیا خیال اور نیت یہ تھی کہ ناچ دیکھنا نہ چھوڑوں گا، رہا نماز کا معاملہ، نماز کے وقت ناچ میں سے اُٹھ آیا کروں گا، اول موقع پر ناچ میں جانے کا ارادہ کیا، دل میں خیال آیا کہ بڑی شرم کی بات ہے، ناچ دیکھ کر پھر یہی منہ لے کر مسجد میں جاؤں بڑی بے غیرتی کی بات ہے، بس ناچ دیکھنا بھی چھوٹ گیا۔

(افاضات: ۷/۲ ص ۳۱۵)

حضرت گنگوہی کے واقعات

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا ایک واقعہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا کہ جب گنگوہ میں حاضر ہوا تو حضرت کی سہ دری میں ایک کورا بدھنا رکھا ہوا تھا، میں نے اس کو اُٹھا کر کنویں سے پانی کھینچا اور اس میں بھر کر پانی پیا تو پانی کڑوا پایا، ظہر کی نماز کے وقت حضرت سے ملا اور یہ قصہ بھی بیان کیا، آپ نے فرمایا کہ کنویں کا پانی کڑوا نہیں میٹھا ہے، میں نے دو کڑوا بدھنا پیش کیا، حضرت نے بھی چکھا تو بدستور تلخ تھا، آپ نے فرمایا کہ اچھا اس کو رکھ دو نماز ظہر کے وقت حضرت نے سب نمازیوں سے فرمایا کہ کلمہ طیبہ جس سے جس قدر ممکن ہو سکے پڑھو اور حضرت نے بھی پڑھنا شروع فرما دیا، بعد میں حضرت نے دعاء کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور نہایت خشوع خضوع کے ساتھ دعاء مانگ کر ہاتھ منہ پر پھیر لیے اور اس کے بعد بدھنا اُٹھا کر پانی پیا تو شیریں تھا، اس وقت میں جتنے نمازی تھے سب نے چکھا تو کسی قسم کی تلخی نہ تھی، بعد میں حضرت نے فرمایا کہ اس بدھنے کی مٹی اس قبر کی ہے جس پر عذاب ہو رہا تھا، الحمد للہ کلمہ کی برکت سے وہ عذاب رفع ہو گیا۔

(ارواح: ص ۲۷۱)

حضرت امام ربانی قطب عالم گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے ۱۲۹۹ھ والے حج میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ جس جہاز کے ارادہ سے چلے تھے وہ بمبئی پہنچنے سے ایک دن پہلے روانہ ہو گیا تھا، دوسرا جہاز ریڈی کھڑا تھا، مگر اس کے روانہ ہونے میں دیر تھی، اس لیے ہم کو بمبئی میں گیارہ روز اور ٹھہرنا پڑا، وہ تو ۲۰ ذیقعدہ کو چلا نہ ۲۱ کو نہ ۲۲ کو اب لوگ گھبرا گئے اور سمجھے کہ اب حج نہیں مل سکتا کیونکہ دن تھوڑے باقی ہیں اور گیارہ دن کا قرنطینہ بھی کرنا ہے، لوگوں نے تو اُترنا شروع کیا تو آپ نے ہم لوگوں سے کہہ دیا کہ عزم حج فسخ نہ کریں، ہمیں حج ضرور ملے گا، ہم نے لوگوں سے کہہ دیا کہ اس پر تو کچھ لوگ رہ گئے اور کچھ پھر بھی اُتر گئے۔

حافظ...... بھی اس جہاز میں سوار تھے، انہوں نے بھی جہاز سے اُترنے کا ارادہ کیا تھا، مولانا کو چونکہ ان سے حسنِ ظن تھا اس لیے مولانا نے مجھ سے اور ایک صاحب سے فرمایا کہ حافظ کو سمجھاؤ کہ ہرگز نہ اُتاریں، ہمیں حج ضرور ملے گا، ہم نے انہیں سمجھایا اس پر وہ خود مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، مولانا نے اپنی عادت کے خلاف خود ان کو سمجھایا اور انہوں نے اقرار کر لیا اب میں نہ اُتروں گا، مگر باوجود اس کے بھی وہ اُتر گئے، مولانا کو جب ان کا اُترنا معلوم ہوا تو آپ کو بہت ملال ہوا اور آپ نے فرمایا کہ ناحق اُتر گئے، بس جی ان کی قسمت ہی میں حج نہیں اس کے بعد حافظ ہر سال حج کا ارادہ کرتے تھے مگر کوئی نہ کوئی مانع پیش آجاتا تھا، مگر تا انتقال ان کو حج میسر نہ ہوا۔

اللہ اللہ کر کے ہمارا جہاز ۲۳ ذیقعدہ کو عصر کے وقت چلا۔ جب عدن سے آگے پہنچا تو اس میں جس قدر ولایتی تھے سب تبرلے کر جہاز والوں پر چڑھ گئے اور کہا کہ اگر تم نے جہاز کا رخ کامران (قرنطینہ کی جگہ) کی طرف پھیرا تو ہم تمہیں مار ڈالیں گے۔ سیدھا جدہ لے چلو۔ جہاز والے ڈر گئے اور مجبوراً ان کو جہاز جدہ لے جانا پڑا۔ جب جہاز جدہ پہنچا تو ان کو معلوم ہوا کہ مسافروں کو اترنے کی اجازت نہ ہوگی اور جہاز کو قرنطینہ کے لیے کامران واپس کیا جائے۔ اس خبر سے حاجیوں کو سخت پریشانی ہوئی کہ اللہ اللہ کر کے تو ہم نے قرنطینہ کی قید سے نجات پائی تھی اب پھر وہیں جانا ہوگا۔

تھوڑی دیر میں ایک عرب صاحب تشریف لائے اور انہوں نے کہا کہ گودی کے افسر رشوت خور ہیں اور وہ لینے کے لیے یہ حجت کر رہے ہیں۔ تم جلدی کچھ چندہ کر دو میں انہیں دلا کر راضی کرلوں گا۔ جب یہ خبر مولانا تک پہنچی تو آپ نے فرمایا یہ شخص بالکل جھوٹا ہے کوئی اسے کچھ نہ دے۔ ہم کو کامران واپس ہونا نہیں پڑے گا اور ہم یہاں اتریں گے لیکن آج نہیں اتریں گے۔ کل اتریں گے، چنانچہ دوسرے روز یہ حکم ہوا کہ حاجیوں کو اتر جانا چاہیے۔ ان کا کوئی قصور نہیں، قصور جہاز والوں کا ہے اس لیے اس کی سزا میں جہاز کو دونا قرنطینہ کرنا ہوگا، اسی پر حاجی اتر گئے اور ہم آٹھ تاریخ کو مکہ پہنچ گئے۔ حاجی صاحب (سید الطائفہ) ہم کو شہر کے باہر کھڑے ہوئے ملے۔ سنا ہے کہ حاجی صاحب فرماتے تھے کہ اگر مولوی رشید احمد صاحب اس جہاز میں نہ ہوتے تو کسی کو حج نہ ملتا۔

(ارواح: ص ۲۸۳)

صوفی کریم حسین صاحب جو امام ربانی کے خاص مریدین میں بڑے عامل تھے یہ ایک بار اپنے وطن میں مقیم تھے نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد دنیاوی ایک کام میں ایسے مشغول ہوئے کہ ظہر کی اذان ہوگئی۔ مجبوراً کام چھوڑ کر انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی اور پھر اسی کام میں لگ گئے، یہاں تک کہ عصر کی نماز کا وقت ہوا اور پھر مغرب کا وقت ہوا۔ یہ فرض نماز تو پڑھتے رہے مگر اوراد و ظائف بھی چھوٹ گئے۔ دفعۃً قلب کسی بیرونی اثر سے متاثر ہوا۔ جو یہ چاہتا تھا کہ یہ کام چھوڑ و اوراد کی قضا کرو۔ صوفی کریم حسین جوں جوں اس خیال کو دفع کرتے اور اپنے دھندے میں لگنا چاہتے ووں ووں وہ بڑھتا اور زور کرتا جاتا تھا یہاں تک کہ وہ اثر موسلا دھار بارش کی طرح قلب پر اس زور سے برسا کہ ان کے ہاتھ پاؤں بے قابو ہوگئے اور کام چھوٹ گیا، آخر عشاء کی نماز پڑھی اور کئی گھنٹے کامل ندامت و انابت الی اللہ کی لذت قلب کو حاصل ہوتی رہی۔

(تذکرۃ الرشید: ص ۱۴۰/ج ۲)

مولوی محمد سہول صاحب (جو بعد میں دار العلوم کے مدرس بھی رہ چکے) جس زمانہ میں مدرسہ

شاہجہان پور کے مدرس تھے ایک دن عشاء سے قبل لیٹ گئے اور آنکھ لگ گئی، خواب دیکھا کہ گویا گنگوہ حاضر ہیں جماعت ہورہی ہے اور حضرت نماز پڑھارہے ہیں، یہ بھی شرکت جماعت کے لیے وضو کرنے لگے مگر وضو پورا نہ ہو پایا تھا کہ سلام پھیر گیا اور یہ مع چند اور آدمیوں کے جماعت سے محروم رہے۔ نماز سے فارغ ہوکر حضرت امام ربانی قدس سرہٗ مسجد کے صحن میں کھڑے ہوکر ان لوگوں کی طرف مخاطب ہوئے جو جماعت سے نماز پڑھ سکے اور غصہ کے ساتھ یوں ارشاد فرمایا، لوگ میری طرف منسوب ہوکر نماز سے اس قدر غافل رہتے ہیں۔ اس ارشاد پر مولوی محمد سہول صاحب اپنی غفلت پر نادم ہوئے اور فوراً آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو شب کے بارہ بج چکے تھے۔ اسی وقت اٹھ کر نماز پڑھی اور آیندہ کے لیے احتیاط کی۔

تذکرۃ الرشید میں حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ آپ کی صحبت میں یہ اثر تھا کہ کیسی ہی پریشانی یا وساوس کی کثرت کیوں نہ ہو جونہی آپ کی صحبت میں بیٹھے اور قلب میں ایک خاص قسم کا سکینہ اور جمعیت حاصل ہوئی، جس سے سب کدورت رفع ہوگئیں اور قریب قریب آپ کے کل مریدوں میں عقائد کی درستی، دین کی پختگی خصوصاً ''**حب فی اللّٰہ** اور **بغض فی اللّٰہ**'' بدرجہ کمال مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ یہ سب برکت آپ کی صحبت کی ہے اور ان کمالات کی شہادت میں بے شمار واقعات موجود و مشہور ہیں۔ احقر پر یوں تو ہر صحبت اور ہر مخاطبت میں کچھ نہ کچھ فیض و احسان فائض رہتا تھا لیکن حسب ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ''**من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ**'' وہ احسان زیادہ قابل ذکر ہیں۔ ایک علم ظاہری کے متعلق، دوسرا باطن کے متعلق۔

اوّل احسان: کا مختصر بیان یہ ہے کہ مسائل اختلافیہ میں اہلِ حق اور اہلِ بدعت کے متعلق باوجود صحت عقیدہ کے والحمدللہ کے ایک غلطی میں مبتلا رہا اور اس غلطی پر بہت سے خیالات اور بہت سے اعمال متفرع رہے۔ یعنی بعض اعمال رسمیہ مثل مجلس متعارف میلاد شریف و امثالہ جن کو محققین بعض مفاسد کی وجہ سے عوام کے لیے مطلقاً ممنوع بتاتے اور ان سے عوام الناس کے ساتھ خواص کو بھی روکتے ہیں۔ ان مفاسد کو تو میں ہمیشہ مذموم اور ان کے مباشر کو ہمیشہ ملوم سمجھتا تھا اور یہ صحت عقیدہ کی تھی اور عوام الناس کو ہمیشہ ان مفاسد پر متنبہ اور مطلع کرتا تھا۔ لیکن یہ بات میرے خیال میں جم رہی تھی کہ علت نہی کے وہ مفاسد ہیں اور جہاں علت نہ ہوگی وہاں معلول بھی نہ ہوگا۔ پس خواص جو کہ ان مفاسد سے مبرا ہیں ان کو روکنے کی ضرورت نہیں اور اسی طرح عوام کو بھی علی الاطلاق روکنے کی حاجت نہیں، بلکہ ان کو نفسِ اعمال کی اجازت دے کر ان کے ان مفاسد کی اصلاح کردینا چاہیے بلکہ اس اجازت دینے میں یہ ترجیح اور مصلحت سمجھتا تھا کہ اس طریق سے تو عقیدہ کی بھی اصلاح ہوجائے گی، جس کا فساد مدار نہیں ہے اور بالکل منع کردینے میں عوام مخالف

سمجھیں گے اور عقیدہ کی اصلاح بھی نہ ہوگی۔ ایک مدت اس حالت میں گزر گئی اور باوجود دوائی درس تدریس فقہ وحدیث وغیرہما کے کبھی ذہن کو اس کے خلاف انتقال والتفات نہیں ہوا۔

حضرت قدس سرہٗ کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں کہ خود ہی غایت رأفت وشفقت سے مولوی منور علی صاحب در بھنگوی مرحوم سے اس امر میں میری نسبت تأسف ظاہر فرمایا اور اسی غلطی کے شعبوں میں سے ایک شعبہ یہ بھی واقع تھا۔ بعض درویشوں سے جن کی حالت کا انطباق شریعت پر تکلف سے خالی نہ تھا۔ میں یہ خیال خذ ما صفا دع ما کدر بعض اذکار واشغال کی تلقین بھی حاصل کرلی تھی اور آمدرفت وصحبت کا بھی اتفاق ہوتا تھا اور لزوم مفاسد کی نسبت وہی خیال تھا کہ خواص کے عقائد خود درست ہوتے ہیں، وہاں مفسدہ لازم نہیں اور عوام کے حق و باطل پر تقریراً متنبہ کرتے رہنا، دفع مفسدہ کے لیے کافی ہے، سو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ اس پر تأسف ظاہر فرمایا اور غایت کرم یہ قابل ملاحظہ ہے کہ جیسا حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غایت کرم وحیاء سے بالمشافہ کسی پر عتاب نہیں فرماتے تھے، اسی طرح حضرت قدس سرہٗ نے باوجود حاضری کرۃ بعد مرۃ کے بالمشافہ کبھی اس سے تعرض نہیں فرمایا اور اس سے زیادہ لطف وکرم یہ کہ اگر کبھی کسی نے اعتراض کیا تو میرے فعل کی تاویل اور اس کو محمل حسن پر محمول فرمایا۔ اسی غلطی کی ایک فرع یہ تھی کہ حضرت پیر ومرشد قبلہ وکعبہ حاجی صاحب نے ایک تقریر درباب ممانعت تنازع و اختلاف مسائل معہودہ میں اجمالاً ارشاد فرمائی اور مجھ کو اس کی تفصیل کا حکم دیا۔ چونکہ میرے ذہن میں وہی خیال جما ہوا تھا، اس لیے اس کی تفصیل بھی اسی کے موافق عنوان سے حیز تحریر میں لایا اور حضرت حاجی صاحب کے حضور میں اس کو سنایا۔ چونکہ حضرت کو بوجہ لزوم خلوت وقلت اختلاط مع العوام وبنا بر غلبہ حسن ظن عوام کی حالت وجہالت وضلالت پورا پورا التفات نہ تھا لامحالہ اس مفصل تقریر کو پسند فرمایا اور کہیں کہیں اس میں اصلاح اور کمی بیشی بھی فرمائی اور ہر چند کہ وہ عنوان میرا تھا۔ مگر چونکہ اصل معنون حضرت نے از خود ارشاد فرما کر قلمبند کرنے کا حکم دیا تھا۔ لہٰذا حضرت نے اس تقریب کو اپنی ہی طرف سے لکھوایا اور خود اپنے دستخط ومہر سے مزین فرمایا اور اپنی ہی طرف سے اشاعت کی اجازت دی جو بعنوان فیصلہ ہفت مسئلہ شائع کردی گئی۔ جس کو بعض کم سمجھوں نے اپنی بدعات کا مؤید سمجھا۔ وانی لھم ذالک، کیونکہ ان مفاسد کا اس میں بھی صراحتاً رد ہے۔ صرف خوش عقیدہ اور خوش فہم لوگوں کو البتہ رخصت ووسعت اس میں مذکور ہے۔ اس کا مبنیٰ وہی خیال مذکور ہے کہ عوام کے مفاسد کا خواص پر کیوں اثر پڑے۔ غرض حضرت قدس اللہ سرہٗ نے اس سب کے متعلق مولوی منور علی صاحب سے اجمالاً تو مجھ سے فوراً اپنی غلطی پر تنبیہ ہوگیا، لیکن زیادت بصیرت کے لیے میں نے اس بارے میں مکاتبت کی بھی ضرورت سمجھی۔ چنانچہ چند بار جانبین سے

تحریات ہوئی، جو تذکرۃ الرشید حصہ اول میں شائع ہو چکی ہیں۔ بالجملہ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ کو بصیرت و تحقیق کے ساتھ اپنی غلطی پر بفضلہ تعالیٰ اطلاع ہوگئی اور اس پر اطلاع ہونے سے ایک باغ عظیم علم کا جو کہ مدت کا مغلق تھا، مفتوح ہو گیا اور جب میرے اس خیال کی اصلاح ہوگئی تو خلافِ شریعت درویشوں کی صحبت و تلقی سے بھی نجات ہوئی اور فیصلہ ہفت مسئلہ کے متعلق ایک ضمیمہ لکھ کر شائع کر دیا گیا، جس سے اس کے متعلق افراط و تفریط کے سب اوہام کو رفع کر دیا گیا۔

دوسرا احسان: متعلق باطن کے اس تفصیل میں چونکہ مخفیات کا اظہار بھی ہے اور وہ قضیہ بھی نہایت دردناک اور ناگوار بھی ہے۔ اس لیے محض اس اجمال پر اکتفاء کرتا ہوں کہ میری شامتِ اعمال سے مجھ پر ایک ایسی حالت شدید طاری ہوئی تھی کہ باوجود صحت بدنی کے زندگی سے مایوسی تھی، بلکہ موت کو ہزار ہا درجہ حیات پر ترجیح دیتا تھا اور اس کو اس سے زیادہ عنوان کے ساتھ تعبیر نہیں کر سکتا:

دو گونہ رنج و عذاب است جان مجنوں را
بلائے فرقت لیلےٰ و وصلت لیلےٰ

اس وقت حضرت قدس سرہٗ نے دعاء و تعلیم و ہمت سے خاص توجہ فرمائی جس سے ہوش و حواس درست ہوئے اور جان میں جان آئی اور اس حالت کے طریان کے فوائد اور پھر اس کے زوال کے منافع بحمد اللہ محسوس ہوئے۔ ان دونوں احسانوں کو امید ہے کہ عمر بھر کبھی نہیں بھولوں گا اور حکم بھی یہی ہے۔ ''من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ'' (تذکرۃ الرشید: ص ۱۴۴ ؍ ج ۲)

خود حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے بھی اپنے رسالہ ''یاد یاراں'' میں ان دونوں واقعوں کو تحریر فرمایا ہے۔

ایک مرتبہ آپ درس حدیث میں مشغول تھے کہ ایک شخص نہایت پریشان حال حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضرت للہ میری طرف توجہ فرمائیے۔ آپ نے جواب دیا، بھائی میں تو مُلّا ہوں کوئی مسئلہ پوچھنا ہو تو مجھ سے پوچھو۔ درویشوں کی باتیں درویش جانے۔ اس شخص نے کہا کہ حضرت میں زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ کیا آپ کو گوارا ہے کہ میں خودکشی کر لوں اور مر رہوں۔ آپ مسکرائے اور فرمایا، اچھا مجھے پڑھانے دو۔ سامنے دیوار سے لگ کر جا بیٹھو۔ اتنا فرما کر آپ نے درس شروع فرما دیا اور وہ شخص سامنے دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ پڑھاتے پڑھاتے دو تین مرتبہ آپ نے اس مبتلا کی جانب نظر فرمائی اور پھر تقریر میں طلبہ کی طرف مخاطب ہو گئے۔ سبق ختم نہ ہونے پایا تھا کہ وہ شخص ہنستا ہوا اٹھا اور اس درجہ مسرور ہو کر چلا کہ سلام کرنا بھی بھول گیا۔ جب وہ چلا گیا تو بعض طلبہ نے حضرت سے دریافت کیا حضرت یہ کون تھا اور کس مرض میں مبتلا تھا۔ آپ نے فرمایا

درویش ہے، قبض طاری تھا، الحمد للہ رفع ہوگیا۔ اتنے مسرور ہوئے کہ چلتے وقت سلام بھی نہ کیا۔

(تذکرۃ الرشید: ص۱۴۸ ر ج ۲)

ایک بزرگ ذاکر۔شاغل تھے۔ان کو عادت پڑگئی مغرب وعشاء کے مابین سوجانے کی۔ ہر چند اس کے ترک کی کوشش کرتے تھے مگر عشاء سے قبل نیند کا اتنا غلبہ ہوتا کہ بے اختیار سوجاتے اور آنکھ لگ جاتی۔ان کو خیال ہوتا تھا کہ حدیث میں اس عادت کی مذمت بھی آئی ہے اور نیز عشاء کی نماز میں وقت مستحب کے ہاتھ سے جاتے رہنے یا کم سے کم کسل واضمحلال پیدا ہونے کا سبب ہے اس لیے ہمت ضرور کرتے تھے کہ نہ سوؤں مگر کچھ مجبوری کی سی حالت ہوگئی تھی کہ آنکھ لگ ہی جاتی تھی۔آخر گنگوہ حاضر ہوئے، جس وقت خانقاہ میں پہنچے ہیں، مغرب کے نماز ہوچکی تھی اور حضرت دولت کدہ تشریف لے گئے تھے۔چھپر کے نیچے چار پائی پر بیٹھ گئے اور عادت کے موافق جب نیند کا غلبہ ہوا تو راستہ کی جانب پشت کر کے وہیں پڑ کر سوگئے۔

خواب میں دیکھا کہ حضرت دولت خانہ سے تشریف لائے اور ان کی کمر میں لات مار کر غصہ کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ یہ کیا واہیات حرکت ہے۔حدیث کے خلاف یہ کوئی وقت ہے سونے کا۔ دفعتہً آنکھ کھل گئی تو کروٹ بدل کر دیکھا کہ نہ آدمی نہ آدم زاد۔خیال ہوا کہ شاید حضرت تشریف لے آئے ہوں گے۔خانقاہ میں گئے تو معلوم ہوا کہ حضرت ابھی دولت خانہ سے واپس تشریف نہیں لائے۔خواب کو خیال سمجھ کر دوبارہ چار پائی پر آلیٹے۔ ہر چند کوشش کی کہ سورہوں مگر آنکھ ہی نہ لگی۔تھوڑی دیر کے بعد حضرت تشریف لائے تو یہ بھی حاضر خدمت ہوئے۔اس دن کے بعد پھر کبھی مابین المغرب والعشاء ان کو نیند نہیں آئی، اگر لیٹ بھی گئے تو عشاء کا فکر ایسا دل پر سوار ہوا کہ بے چینی کے ساتھ کروٹیں بدلتے رہے اور جب تک نماز سے فراغت نہ ہو لی آنکھ ہی نہ لگتی۔

(تذکرۃ الرشید: ص۱۱۸ ر ج ۲)

ایک شخص ذاکر شاغل حضرت کی خدمت میں رہتے تھے۔ان کا کھانا قصبہ میں ایک شخص کے یہاں مقرر تھا، وہیں مسجد میں نماز پڑھانے جایا کرتے تھے۔شیطان تو ہر مسلمان کے ساتھ لگا ہوا ہے۔اتفاق سے ان کو کسی عورت سے تعلق ہوگیا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ ملاقات کا وقت مقرر ہوگیا۔شیطانی حرکت کسی پر ظاہر کرنے کے قابل نہ تھی، اس لیے کسی کو خبر نہ ہوئی کہ چلتے چلاتے کام میں شیطان نے کس رخنہ اندازی کا انداز اختیار کیا۔وعدہ کی شب میں عشاء کے بعد حضرت کے پاؤں دبا کر جب سمجھے کہ حضرت سوگئے، وہاں سے کھسکے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے خانقاہ سے باہر ہوئے۔جس وقت باہر قدم نکالا تو مطلع بالکل صاف تھا۔دو چار قدم چلے تھے کہ آسمان پر سیاہ بدلی نظر آئی۔جوں جوں یہ آگے بڑھتے رہے ووں ووں بادل بڑھتا اور اوپر چڑھتا رہا یہاں

تک کہ جس وقت اس مکان کی دیوار کے نیچے پہنچے جہاں عورت حسب وعدہ کھڑی ہوئی تھی تو اس سے قبل کہ بات کریں، دفعۃً بادل اس زور سے گرجا کہ دونوں گھبرا گئے۔ ادھر وہ بھاگی کہ گھر والے جاگیں گے اور مجھے نہ پائیں گے تو کیا گل کھلے گا۔ ادھر یہ سراسیمہ دوڑے کہ حضرت کی چارپائی باہر بچھی ہوئی ہے، میں قریب ہی سوتا ہوں، حضرت آواز دیں گے اور میں نہ ہوں گا تو کیا نتیجہ ہوگا۔ غرض بے نیل ومرام دوڑتے ہانپتے خانقاہ میں پہنچے۔ جس وقت اندر قدم رکھا، مطلع بالکل صاف ہوگیا تھا۔ آہستہ آہستہ حضرت کی طرف چلے، جھانک کر دیکھا تو حضرت امام ربانی چارپائی کی دونوں پٹیوں پر ہتھیلیاں ٹیکے گردن جھکائے اس طرح بیٹھے ہیں جیسے توجہ دینے کی حالت میں شیخ مستغرق ہوکر بیٹھتا ہے یہ چپکے چپکے ہی دبے پاؤں چل کر اپنی چارپائی تک پہنچے جو حضرت کی چارپائی سے کچھ ہی فاصلہ پر گولر کے نیچے بچھی ہوئی تھی۔ جس وقت پہنچ لیے، حضرت نے گردن اوپر اٹھائی اور لیٹ رہے۔ صبح ہوئی تو اشارۃً حضرت نے نصیحت فرمائی اور امتحان کے موقع پر نفس کو قابو میں رکھنے کے فضائل بیان کیے۔ یہ چند کلمات سن کر ندامت کا قلب پر اتنا غلبہ ہوا کہ جس حد تک معصیت ہوئی تھی اس کو یاد کر کے رویا کرتے اور گڑگڑا کر توبہ کیا کرتے تھے۔ چند ماہ میں حق تعالیٰ نے نسبت معتبر سے نوازا اور مجاز طریقت ہر کر اپنے وطن واپس ہوئے۔

(تذکرۃ الرشید: ص ۲/۱۴۸)

حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے واقعات

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے بھی تصرفات کے قصے تو بہت مشہور ہیں۔ خورجہ میں ایک شخص تھے محمد اسحاق۔ نہایت پابند صوم وصلوۃ اور ذاکر وشاغل تھے۔ یہ صاحب مولانا نانوتوی سے بیعت تھے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ دو تین روز مسجد میں نہیں آئے۔ میں سمجھا کہ شاید کچھ بیمار ہوگئے، اس لیے میں ان کی عیادت کے لیے گیا، جا کر دیکھا تو ایک کوٹھری میں چھپے بیٹھے تھے اور کانوں میں روئی ٹھونس رکھا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا حالت ہے، تم کئی روز سے نماز کے لیے نہیں آئے۔ انہوں نے کہا اچھا ہوں، مگر کوئی چار روز سے ایک سخت عذاب میں مبتلا ہوں، وہ یہ کہ کوئی گاڑی نکلتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے اوپر چل رہی ہے اور جب بیلوں کو سانٹا مارا جاتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے لگتا ہے اور جب کتوں میں آپس میں لڑائی ہوتی ہے تو سمجھتا ہوں کہ وہ میرے کاٹتے ہیں۔ جب چکی چلتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ گیہوں کے بدلے میں پس رہا ہوں۔ لڑکے بھاگتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھ پر دوڑتے ہیں اس لیے سخت تکلیف میں ہوں اور باہر نہیں نکل سکتا۔ نہ چکی کی آواز سن سکتا ہوں۔ اس لیے میں چھپا ہوا بیٹھا ہوں اور میں نے کانوں

میں رور ڈ ٹھونس رکھا ہے۔ میں نے کہا کہ اپنی اس حالت کی مولانا نانوتوی صاحب کو اطلاع دو۔ انہوں نے کہا کہ تم لکھ دو۔ میں نے کہا تم ہی لکھ کر دو، میں اپنے خط میں بھیج دوں گا۔ انہوں نے اپنی حالت لکھ کر مجھے دے دی اور میں نے اپنے عریضے کے ساتھ مولانا کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ مولانا اس زمانہ میں دہلی میں تھے۔ مولانا نے جواب دیا کہ اس اس کا جواب تحریر سے نہیں ہوسکتا۔ تم ان سے کہہ دو کہ وہ میرے پاس چلے آئیں۔ چنانچہ یہ گئے۔ مولانا نے کچھ نہیں کیا صرف اوراد و اشغال کے اوقات بدل دیئے۔ یہ شخص دوسرے دن اچھے ہو گئے۔

(ارواحِ ثلاثہ: ص ۲۴۰)

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ اس واقعہ پر لکھتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ مولانا نے تصرف فرمایا اور اخفاء تصرف کے لیے اوراد و اشغال کے اوقات بدل دیئے۔ واللہ عالم باسرار عبادہ۔

مولانا منصور علی صاحب مرحوم مراد آبادی حضرت نانوتوی کے تلامذہ میں تھے۔ طبیعت کے بہت پختہ تھے۔ اس لیے جدھر طبیعت مائل ہوتی تھی پختگی اور انہماک کے ساتھ ادھر تھے۔ انہوں نے اپنا واقعہ خود ہی مجھ سے نقل فرمایا کہ مجھے ایک لڑکے سے عشق ہو گیا ہے اور اس قدر اس کی محبت نے طبیعت پر غلبہ پایا کہ رات دن اس کے تصور میں گزرنے لگے۔ میری عجیب حالت ہوگئی، تمام کاموں میں اختلال ہونے لگا حضرت کے فراست نے بھانپ لیا، لیکن سبحان اللہ تربیت و نگرانی اسے کہتے ہیں کہ بے تکلفی کے ساتھ حضرت نے میرے ساتھ دوستانہ برتاؤ شروع کیا اور اسے اس قدر بڑھایا کہ جیسے دو یار آپس میں بے تکلف دل لگی کیا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود ہی میں نے اس کی محبت کا ذکر چھیڑا۔ فرمایا ہاں بھئی وہ (لڑکا) تمہارے پاس کسی وقت آتا بھی ہے یا نہیں؟ میں شرم و حجاب سے چپ رہ گیا تو فرمایا کہ نہیں بھائی یہ حالات تو انسان پر ہی آتے ہیں۔ اس میں چھپانے کی کیا بات ہے، غرض اس طریق سے مجھ سے گفتگو کی کہ میری ہی زبان سے اس کی محبت کا اقرار کرالیا اور کوئی خفگی اور ناراضگی نہیں ظاہر کی۔ بلکہ دل جوئی فرمائی۔ اس مخصوص بے تکلفی کے آثار اب مجھ پر ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ میں ایک دن تنگ آ گیا اور دل میں سوچنے لگا کہ یہ میری محبت رگ و پے میں سرایت کر گئی، مجھے تمام امور سے بیکار کر دیا، کیا کروں اور کہاں جاؤں، آخر عاجز آ کر دوڑا ہوا حضرت کی خدمت میں پہنچا اور مؤدب عرض کیا کہ حضرت للہ میری اعانت فرمایئے، میں تنگ آ گیا ہوں اور عاجز ہو چکا ہوں۔ ایسی دعاء فرما دیجئے کہ اس لڑکے کا خیال تک میرے قلب سے محو ہو جائے، تو ہنس کر فرمایا کہ بس مولوی صاحب کیا تھک گئے، بس جوش ختم ہو گیا، میں نے عرض کیا کہ حضرت میں سارے کاموں سے بیکار ہو گیا۔ اب مجھ سے یہ برداشت

نہیں ہوسکتا۔ خدا کے لیے میری امداد فرمائیے۔ فرمایا اچھا بعد مغرب جب نماز سے فارغ ہوں تو آپ موجود ہوں۔ میں نماز پڑھ کر چھتہ مسجد میں بیٹھا رہا۔ جب حضرت صلوٰۃ الاوابین سے فارغ ہوئے تو آواز دی۔

مولوی صاحب! میں نے عرض کیا، حضرت حاضر ہوں، میں سامنے حاضر ہوا اور بیٹھ گیا۔ فرمایا ہاتھ لاؤ۔ میں نے ہاتھ بڑھایا، میرا ہاتھ اپنی ہتھیلی پر رکھ کر میری ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی سے اس طرح رگڑا جیسے بان بٹے جاتے ہیں۔

خدا کی قسم! میں نے بالکل عیاناً دیکھا کہ میں عرش کے نیچے ہوں اور ہر چہار طرف سے نور اور روشنی نے میرا احاطہ کرلیا، گویا میں دربارِ الٰہی میں حاضر ہوں۔ میں اس وقت لرزاں اور ترساں تھا کہ ساری عمر مجھ پر کپکپی اور یہ خوف طاری نہ ہوا تھا۔ میں پسینہ پسینہ ہوگیا اور بالکل خودی سے گزر گیا اور حضرت برابر میری ہتھیلی پر اپنی ہتھیلی پھیر رہے ہیں۔ جب ہتھیلی پھیرنا بند فرمایا تو یہ حالت بھی فرو ہوگئی۔ فرمایا جاؤ۔ میں اٹھ کر چلا آیا اور دو ایک دن بعد حضرت نے پوچھا۔ مولوی صاحب کیا حال ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اس لڑکے کا تصور یا عشق تو کجا دل میں اس لڑکے کی گنجائش تک باقی نہیں۔ فرمایا اللہ کا شکر کرو۔ والحمدللہ علی ذلک۔

حضرت حکیم الامۃ تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے اس پر طویل حاشیہ تحریر فرمایا ہے اور فرمایا کہ یہ اثر تھا تصرف کا مشابہ اس اثر کے جو حدیث مسلم شریف میں وارد ہے کہ حضرت ابی بن کعب (اختلاف قرآن کی طویل حدیث میں) فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میری حالت کو دیکھا تو میرے سینہ پر دستِ مبارک مارا تو پسینہ پسینہ ہوگیا اور گویا اللہ جل شانہٗ کو اپنی آنکھ سے دیکھنے لگا۔ امام نووی اس کی شرح میں قاضی عیاض سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک اس لیے مارا کہ ان کے دل میں جو مذموم وسوسہ پیدا ہوگیا ہے وہ جاتا رہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ مشائخ نے اس قسم کے تصرفات کو کمالات مقصودہ سے شمار نہیں کیا اور راز اس میں یہ ہے کہ تصرفات کا صدور قوت نفسانیہ سے ہوتا ہے اور جس طرح قوت جسمانیہ کمالات مقصودہ سے نہیں جیسے کشتی میں پچھاڑنا، اسی طرح قوتِ نفسانیہ بھی۔ اسی وجہ سے یہ قوت اہل باطل میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسی لیے مشائخ نے لکھا ہے کہ عارف کے لیے تصرف مناسب نہیں کہ وہ اس کے عدم کو اس کے وجود پر ترجیح دیتے ہیں اور وجہ اس کی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں شانِ عبدیت سے بُعد ہے اور یہ وجہ افعال جسمانیہ میں نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ اس میں اسباب مادیہ کی طرف احتیاج ظاہر ہے جو عین عبدیت ہے اور عبدیت اور تصرفاتِ نفسانیہ میں اسباب خفی ہیں۔ اس لیے احتیاج کی

شان اس میں خفی ہے۔ نیز افعال جسمانیہ کے صدور میں عوام معتقد نہیں ہوتے اور تصرفات میں معتقد ہو جاتے ہیں تو اس میں افتتان اور عجب کا خطرہ بھی ہے۔ واللہ اعلم

(ارواح ثلاثہ: ص ۲۴۵)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کے واقعات

حضرت مولانا محمد یعقوب قدس سرہٗ نے ایک دفعہ چھتہ کی مسجد میں فرمایا کہ بھائی آج تو ہم صبح کی نماز میں مر جاتے، بس کچھ ہی کسر رہ گئی۔ عرض کیا گیا، کیا حادثہ پیش آیا؟ فرمایا، آج صبح کی نماز میں سورہ مزمل پڑھ رہا تھا کہ اچانک علوم کا اتنا عظیم الشان دریا میرے قلب کے اوپر سے گزرا کہ میں تحمل نہ کر سکا اور قریب تھا کہ میری روح پرواز کر جائے مگر وہ دریا جیسا کہ ایک دم آیا ویسا ہی نکلا چلا گیا، اس لیے میں بچ گیا۔ نماز کے بعد جب میں نے غور کیا کہ یہ کیا معاملہ تھا تو منکشف ہوا کہ حضرت مولانا نانوتوی اس ساعتوں میری طرف میرٹھ میں متوجہ ہوئے، یہ ان ساعتوں کا اثر تھا۔ پھر فرمایا اللہ اکبر جس شخص کی توجہ کا یہ اثر ہے کہ علوم کا دریا دوسروں کے قلب پر موجیں مارنے لگے اور تحمل دشوار ہو جائے تو اس شخص کے قلب کی وسعت وقوت کا کیا حال ہوگا جس میں خود وہ علوم ہی سمائے ہوئے ہیں اور وہ کس طرح ان علوم کا تحمل کیے ہوئے ہوگا۔

(ارواح ثلاثہ: ص ۲٦۵)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تصرفات بھی بہت مشہور ہیں۔ جس زمانہ میں ہیضہ کی وبا پھیلی ہے، اس زمانہ میں حضرت مولانا محمد یقوب صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے ایک پیشین گوئی فرمائی تھی اور لوگوں سے فرمایا تھا کہ ایک وباء آنے والی ہے اگر ہر چیز میں سے صدقات کیے جائیں، اللہ سے امید ہے کہ یہ بلا ٹل جائے۔ بعض اہلِ دیوبند نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ میں کچھ ضرورت ہوگئی ہے اس کی خبر کسی نے مولانا کو کر دی تو مولانا کو اس پر بہت غیظ آیا اور فرمایا کہ یعقوب اور یعقوب کی اولاد اور سارا دیوبند، یعقوب اور یعقوب کی اولاد اور سارا دیوبند، اس جملہ کو چند بار تکرار فرمایا۔ اس وقت حاجی محمد عابد صاحب حجرہ کے اندر بیٹھے ہوئے اس کلمہ کو سن رہے تھے اور وہ گھبرا کر باہر نکلے اور کہنے لگے یہ حضرت کیا کہہ رہے ہو۔ مولانا نے دریافت فرمایا کہ کیا کہا ہے۔ حاجی محمد عابد صاحب نے وہی جملہ دھرا دیا کہ یوں فرما رہے تھے۔ مولانا نے فرمایا، اب تو یوں ہی ہوگا۔ اس کے بعد اس کثرت سے وباء پھیلی کہ ۲۰، ۲۵، ۲۰، ۲۵ جنازوں کی نماز ایک دفعہ ہوتی تھی۔ بس دیوبند خالی ہی ہوگیا۔ جب یہ وباء ختم ہوئی تو آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ میں تو سمجھا تھا کہ میرا بھی وقت آگیا، کیا ابھی کچھ دیر ہے اس کے بعد اپنے

وطن نانوتہ پہنچے اور وہیں جا کر مبتلا مرض ہو کر واصل بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(ارواحِ ثلاثہ: ص۳۲۱)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے بڑے صاحبزادے جناب حکیم معین الدین صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہمارے نانوتہ میں جاڑا بخار کی بہت کثرت ہوئی۔ سو جو شخص مولانا کی قبر سے مٹی لے جا کر باندھ لیتا اسے ہی آرام ہو جاتا۔ بس اس کثرت سے مٹی لے کر گئے کہ جب بھی قبر پر مٹی ڈلواؤں تب ہی ختم ہو جائے۔ کئی مرتبہ ڈال چکا، پریشان ہو کر ایک دفعہ میں نے مولانا کی قبر پر جا کر کہا (یہ صاحبزادہ بہت تیز مزاج تھے) آپ کی کرامت ہوئی اور ہماری مصیبت ہو گئی۔ یاد رکھو کہ اب کے کوئی اچھا ہوا تو ہم مٹی نہ ڈالیں گے۔ ایسے ہی پڑے رہئے گا۔ لوگ جوتا پہنے تمہارے اوپر ایسے ہی چلیں گے۔ بس اسی دن سے پھر کسی کو آرام نہ ہوا۔ جیسے شہرت آرام کی ہوئی تھی ویسے ہی یہ شہرت ہو گئی کہ اب آرام نہیں ہوتا۔ پھر لوگوں نے مٹی لے جانا بند کر دیا۔ (ارواحِ ثلاثہ: ص۳۲۲)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا مزار مبارک دہلی تا سہارنپور جو موٹروں کی آمد کی سڑک ہے اس پر نانوتہ کے موٹر اڈہ سے ایک فرلانگ سہارنپور کی طرف چل کر ایک باغ میں سڑک کی بائیں طرف لب سڑک ہی موجود ہے۔ وہاں حضرت کے خاندان کے دوسرے مزارات بھی ہیں۔ پکی قبریں کثرت سے ہیں۔ حضرت کی قبر مبارک کے سرہانے ایک بڑا سا پتھر بھی گڑا ہوا ہے۔

میرے دادا مولانا اسماعیل کا واقعہ

اپنے دادا صاحب محمد اسماعیل صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا بھی ایک واقعہ اعتماد کے بیان میں لکھوا چکا ہوں کہ نظام الدین کا گھنٹہ ایک دفعہ چلتے چلتے بند ہو گیا، گھڑی ساز کو دکھلایا گیا اس نے دیوار پر لگے لگے کھول کر دیکھا اور کہا کہ اس میں تو بڑا لمبا کام ہے، تین چار دن لگیں گے۔ دادا صاحب نے مسجد کے سب بچوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ ہر شخص بسم اللہ سمیت الحمد شریف سات دفعہ اول وآخر درود شریف سات سات دفعہ پڑھ کر دم کرے۔ سب نے دم کیا، گھنٹہ خود بخود چلنے لگا۔

حضرت سہارنپوری کے واقعات

حضرت اقدس سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کے تصرفات کے قصے بھی بہت سے مشہور ہیں، لیکن آریہ سے مناظرہ کا واقعہ مشہور اور طبع شدہ ہے کہ ہر شخص کے علم میں ہے۔ مولانا میرٹھی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت اپنی قوت قلبیہ کے تصرف کو بہت کم کام میں لاتے اور خاص ضرورت کے وقت ہی

صرف فرماتے۔ سہارنپور میں اہل اسلام اور آریہ کا مناظرہ ہوا جو موضع ٹوپری سے منتقل ہوکر سہارنپور آیا تھا۔ حضرت شریک جلسہ تھے اور مسلمانوں کی طرف سے فریقین کی تقریروں کو قلمبند کرنے کے لیے مولوی کفایت اللہ صاحب اور مولوی احمد اللہ صاحب تجویز ہوئے تھے۔ مگر مولوی احمد اللہ تھک گئے تو صرف مولوی کفایت اللہ صاحب نے اس خدمت کو انجام دیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ مجلس مناظرہ میں آریوں کی طرف ایک جوان، خوبصورت گیروی کپڑے پہنے ہوئے سادھو تھا جو آرام دہ کرسی پر لیٹا رہتا اور جب مسلمانوں کے مقرر تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوتے تو وہ گردن جھکا کر بیٹھ جاتا تھا۔ مقررین اسلام کی تقریریں نہایت پراگندہ اور خراب ہو رہی تھیں۔ حتیٰ کہ مولانا عبدالحق حقانی سے دور و تسلسل کی تقریر بھی نہ ہوسکی، تو میں نے صدر جلسہ مرزا عزیز بیگ کو ایک پرچہ لکھ کر دیا کہ مسلمانوں کی طرف سے جب مناظر تقریر کرنے کو کھڑا ہوتا ہے تو یہ جوگی اثر ڈالتا ہے اور متوجہ ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ لہٰذا مولانا خلیل احمد صاحب کو اس کی اطلاع دے دو۔ صدر جلسہ نے یہ پرچہ پڑھ کر حضرت کی طرف سرکا دیا اور حضرت نے پرچہ پڑھتے ہی گردن جھکالی کہ دونوں حق و باطل میں تصرف قلب کی جنگ ہونے لگی۔ دو منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ وہ سادھو بے قرار ہو کر آرام کرسی سے اٹھا اور میدان جلسہ سے باہر چلا گیا۔

پھر کیا تھا مسلمانوں کی وہ تقریریں ہوئیں گویا دریا کا بند کھل گیا حالانکہ اس مناظرہ میں بہت کچھ بے عنوانیاں ہوئی۔ مگر نتیجہ یہ نکلا کہ گیارہ آدمی مشرف با اسلام ہوئے اور اسی دن دوپہر کے کھانا کھانے میں حضرت نے فرمایا، اس کا تو مجھے یقین تھا اور ہے کہ اسلام غالب رہے گا ''الحق یعلو ولا یعلی۔'' مگر حق تعالیٰ کی شان بے نیاز ہے اس کا خوف ہر وقت اور ہر بشر کو ہے۔ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے سالانہ جلسہ سے فارغ ہوکر باہر کے مہمان رخصت ہوئے۔ پنجاب جانے والی گاڑی پہلے آئی اور اس طرف کے مہمان گاڑی میں پہلے سوار ہوئے، گاڑی میں ایک سادھو بیٹھا تھا جو ہردوار سے آ رہا تھا۔ اسٹیشن پر اژدہام دیکھ کر اس نے دریافت کیا کہ یہ بھیڑ کیسی ہے۔ حضرت کے خادم نے جو اس گاڑی میں سوار ہوئے تھے جواب دیا کہ یہاں سہارنپور مین ایک بزرگ شیخ ہیں سب لوگ مختلف اطراف سے ان کی زیارت کو آئے تھے اور اب اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو رہے ہیں وہ حضرت کے حالات پوچھنے لگا اور پھر خاموش ہو کر بیٹھ گیا وہ خادم کہتے تھے کہ کچھ دیر کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ قلب پر ایک غیر مانوس اثر اور دباؤ پڑ رہا ہے۔ جس کا ظاہری سبب کچھ معلوم نہیں ہوتا اور دل اندر سے گھبراتا اور اڑان ہوا جاتا ہے، حیران تھا کہ دن ہے رات نہیں، مجمع ہے تنہائی نہیں، ریل کا ڈبہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جنگل یا بیابان نہیں ہے، پھر یہ وحشت و پریشانی کیوں ہے طبیعت آپے سے نکلی جاتی ہے اور زبان گنگ اور سن ہوئی جاتی ہے، اسی پریشانی میں تھا کہ دفعتہً

حضرت کی شبیہ نظر آئی اور اس کا عکس دل پر پڑنا شروع ہوا اور اشارہ ہوا کہ پڑھو "حسبی اللّٰہ و نعم الوکیل" چنانچہ زبان گنگ تھی مگر دل نے اس کا ورد شروع کیا اور گھبراہٹ اور اضطراب کے بادل پھٹنا شروع ہو گئے۔ چند منٹ میں وہ کیفیت جاتی رہی اور قلب کو سکون نصیب ہوا۔ کان میں آواز آئی سادھو کہتا ہے تمہارے گرو واقعی بڑے کامل اور بہت زور والے ہیں۔ اس وقت میں سمجھا کہ یہ اثر ڈال رہا تھا۔ اس لیے میں نے کہا کہ بس تم میں اتنی ہی ہمت تھی ذرا کچھ کر کے دکھایا ہوتا وہ کھسیانہ ہو گیا اور منہ موڑ کر بیٹھ گیا، کہ پھر بات تک نہ کی۔ (تذکرۃ الخلیل: ص ۴۱۰)

اس ناکارہ کے سامنے بھی ایک واقعہ پیش آیا، حضرت قدس سرہٗ ایک ضرورت سے مظفر نگر کسی صاحب سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے۔ یہ ناکارہ بھی ساتھ تھا۔ جب ان کے مکان پر پہنچے تو صاحب مکان وہاں موجود نہیں تھے، گھر میں گئے ہوئے تھے اور ایک پیر صاحب ایک آرام کرسی پر نہایت جبہ قبہ پہنے ہوئے آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ حضرت تشریف لے گئے اور بہت دور ایک معمولی سی کرسی پر بیٹھ گئے۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ پیر صاحب نہایت گھبرا کر یوں کہتے ہوئے بڑا گرم ہے بڑا گرم ہے۔ یہ لفظ تو میں نے بھی کئی دفعہ زور سے سنے، تھوڑی دیر بعد وہ صاحب مکان سے آئے حضرت کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر بہت ہی ندامت اور قلق کا اظہار کیا کہ حضرت اطلاع نہیں ہوئی ورنہ اسٹیشن پر حاضر ہوتا، حضرت نے ارشاد فرمایا، اس کی کیا ضرورت تھی مجھے مکان تو معلوم تھا، حضرت اپنی ضرورت سے فارغ ہو کر واپس تشریف لانے لگے، انہوں نے قیام وطعام پر اصرار بھی کیا حضرت نے فرمایا کہ مشغولی تھی فلاں ضروری بات کی وجہ سے آنا ہوا تھا اور حضرت معذرت فرما کر اسٹیشن تشریف لے آئے اور واقعہ میرے سامنے کا تو ہے نہیں لیکن مشہور ہے جب مظاہر علوم کے جلسہ کے موقع پر بسا اوقات مہمان اندازہ سے زیادہ ہو جاتے تو حضرت قدس سرہٗ اپنی لنگی دے دیا کرتے کہ اسے کھانے پر ڈال دو۔

حضرت میرٹھی نور اللہ مرقدہٗ تذکرۃ الخلیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ سالانہ جلسہ میں ایک مرتبہ دیہاتی مہمان امید سے زیادہ آگئے کہ کھانا تیار شدہ نصف کو بھی بمشکل کافی ہوتا، کارکنان مدرسہ گھبرا گئے کہ نہ تیار کرانے کا وقت کیونکہ جلسہ سے ایک بجے فراغ ہوا تھا، حافظ عبد اللطیف صاحب نے یہ حالت حضرت سے عرض کی اور یہ بھی کہا کہ باورچی بھی تھک گئے، ان میں پکانے کو ہمت بالکل نہیں، حضرت نے فرمایا کہ کھانے کو چادروں سے ڈھانک دو میں آتا ہوں، چنانچہ حضرت نے تشریف لا کر کچھ پڑھا اور کھانے پر دم کر کے دعاء برکت فرمائی اور حکم دیا کہ کپڑا دیگ کے منہ سے نہ ہٹایا جائے اور نیچے سے کھانا نکال کر کھلانا شروع کر دیا جائے الحمد للہ کہ سب مہمان فارغ ہو گئے اور کھانا بہتر انچ رہا۔ (تذکرۃ الرشید: ص ۳۷۴)

مولوی کفایت اللہ صاحب مدرس مدرسہ اسلامیہ میرٹھ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی سے بیعت تھے اور گنگوہ میں پرورش پائی تھی، مولانا جس زمانے میں مالٹا میں تھے ان پر اثناء ذکر و شغل میں ایک کیفیت پیدا ہوئی کہ خودکشی کی رغبت ہوئی تھی مگر کر نہ سکے اور اس وجہ سے ایسے ضیق میں مبتلا تھے کہ مرجانا بہتر سمجھتے تھے، انہوں نے حضرت کی خدمت میں خط لکھا اور مدد چاہی حضرت نے حسب عادت انکسار کا جواب لکھا، جس میں یہ فقرے بھی تھے کہ "حیرانم کہ بچہ دہقان، را بچہ کار سپر انند، صلاح کار کجا و من خراب کجا ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا" مجھے ایسے کام کے لیے اہل کیوں سمجھ لیا وغیرہ وغیرہ۔

آخر میرٹھ سے دیوبند گئے اور وہاں سے تھانہ بھون کا ٹکٹ لے کر سہارنپور پہنچے۔ اتفاق سے تھانہ بھون کی گاڑی نہ ملی مجبوراً مدرسہ مظاہر علوم میں آئے۔ بعد نمازِ ظہر حضرت سے ملے تو حضرت نے محبت کے ساتھ پاس بٹھایا اور جب حاضرین چلے گئے تو ان کی طرف خطاب فرمایا کہ تم نے کیا لکھا تھا، مجھے تعجب ہوا کہ جانتے بوجھتے تم ایسی بات لکھتے ہو، بھلا میں اس کا اہل کہاں۔ مولوی کفایت اللہ صاحب نے جرأت سے کام لیا اور کہا کہ حضرت اگر کوئی کہے کہ آپ اہل نہیں تو یہ آپ پر نہیں بلکہ حضرت گنگوہی پر اعتراض ہے کہ انہوں نے آپ کو خلیفہ کیوں بنایا آپ یقیناً اہل ہیں اور حضرت گنگوہی کے خلیفہ ہیں چونکہ میں نے اسی دروازے پر تربیت پائی ہے جہاں سے آپ کو سب کچھ ملا ہے۔ اس لیے میرا فرض تھا کہ اپنا دکھ درد عرض کردوں۔ اس پر حضرت نے سکوت فرمایا اور پھر پوچھا کہ اب کیا حالت ہے۔ عرض کیا کہ کچھ نہیں۔ بعد عشاء بکمال شفقت حال سنا اور ذکر دوازدہ تسبیح میں کچھ ترمیم فرما کر ارشاد فرمایا کہ حضرت گنگوہی کے یہاں ایک شخص کو یہی حالت پیش آئی تھی تو حضرت نے بھی یہی بتایا تھا جو میں نے بتایا ہے۔ یہ کہیں کہ کسی طرح اس مصیبت سے نجات مل جائے کہ درس تدریس میں لگیں چھوڑو اس ذکر و شغل کو جس میں جان سے عاجز ہو گیا اور حضرت اصرار فرمادیں کہ گھبراؤ مت، ذکر و شغل جاری رکھو اور کرتے رہو جو کر رہے ہو، یہاں تک کہ جب مکان تشریف لے جانے لگے تو فرمایا کہ کتب خانہ کے سامنے والے کمرے میں پچھلی رات کو بیٹھ کر اتنے زور سے بارہ تسبیح کرنا کہ میرے گھر تک آواز جائے اور پھر صبح کو نماز فجر کے بعد ارشاد ہوا کہ یہاں حجرے سے باہر مراقب ہو کر بیٹھ جاؤ۔

مولانا لکھتے ہیں کہ اس وقت کی کیفیت ذکر میں نہیں آسکتی کہ اندر بیٹھے کیا کر رہے تھے، پھر مجھے اپنا قلب زخمی نظر آتا ہے جیسے اس میں پیپ پڑ گئی ہے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ حضرت اس کو اپنے دستِ مبارک سے صاف فرما رہے ہیں۔ بعض دفعہ میں چونک پڑتا اور پھر مراقب ہو کر بیٹھ جاتا تھا، بعد اشراق حضرت حجرہ سے باہر تشریف لائے اور درس کے لیے تشریف لے چلے تو مجھے ساتھ

لیا اور بخاری شریف کا سبق ہونے لگا۔ سبق میں مجھے وہ کیفیت نظر آئی کہ پھر نصیب ہونا مشکل ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ حضرت تقریر کو طول دیں اور اس کے لیے حضرت کو چھیڑنے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا میں نے الٹے سیدھے سوالات شروع کر دیئے، پھر کیا تھا گویا سمندر میں تلاطم آ گیا۔ حضرت نے ایک ایک سوال کے کئی کئی جوابات دینا شروع کیے اور بعض دفعہ یہ بھی فرمایا کہ اس جواب کو کتاب میں تلاش مت کرنا یہ جواب کتابی نہیں بعض دفعہ میں اشکال پیش کرتا تو اس کا جواب دے کر فرماتے کہ یہاں ایک دوسرا اشکال اور ہے جس سے شراح نے تعرض نہیں کیا اور اس کے بعد وہ اشکال مع جواب خود ارشاد فرماتے۔ غرض وہ حال رہا اور طبیعت میں سکون پیدا ہو گیا تو میں نے عرض کیا کہ میں نے ٹکٹ تھانہ بھون کا لیا تھا۔ فرمایا کہ اچھا جاؤ مگر واپسی میں کم از کم ایک دن یہاں کے واسطے رکھنا کہ ابھی خامی باقی ہے، چنانچہ واپسی میں بجائے ایک دن کے دو دن حضرت کے پاس قیام کیا اور جو خامی مجھے محسوس نہ ہوتی تھی وہ محسوس ہونے لگی کہ جب نماز فجر کے بعد حجرہ کے باہر مراقب ہو کر بیٹھتا تو معلوم ہوتا کہ قلب میں کوئی چیز بھری جا رہی ہے جس سے دل میں سکون وقوت اور راحت معلوم ہوتی، غرض اول حاضری میں زخم قلب کو آلائش سے پاک صاف فرمایا اور دوسری میں زخموں کو مندمل کیا اور آئندہ مرہم پٹی سے مستغنی اور بے نیاز بنا دیا۔ اللہ جزائے خیر دے حضرت کو کہ میری ایسی دستگیری فرمائی کہ جس کا شکریہ تمام عمر ادا نہیں ہو سکتا۔ فقط

(تذکرۃ الخلیل: ص ۴۰۹)

مفتی محمود صاحب بیان فرماتے ہیں کہ میرے والد صاحب فرماتے تھے کہ یہ واقعہ براہِ راست مولوی کفایت اللہ صاحب نے مجھ سے بھی بیان فرمایا تھا۔

اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری کے واقعات

اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری نور اللہ مرقدہٗ کی کرامات اور تصرفات تو بہت مشہور ہیں۔ مگر جیسا پہلے بھی لکھوا چکا ہوں ان چیزوں کا اخفاء اکابر کے ہاں بہت رہتا تھا۔ ایک قصہ متعدد لوگوں سے سنا کہ حضرت کے باغ کے قریب جو نہر چلتی ہے اس کی سڑک پر حضرت حسب معمول صبح کے وقت چہل قدمی کے لیے تشریف لے جا رہے تھے ایک ضرورت سے دوسری طرف جانا پڑا۔ لنگی نہر پر ڈال کر کشتی کی طرح سے دوسری طرف تشریف لے گئے۔ مولانا میرٹھی تذکرۃ الخلیل میں حضرت رائپوری کے حالات میں لکھتے ہیں کہ حضرت کو حق تعالیٰ نے توکل کی نعمت نصیب فرمائی تھی اور اس لیے مدرسہ کا یہ بڑا کارخانہ نہ کسی محصل کا محتاج تھا نہ سفیر کا:

ہر کسے را بہر کا رے سا ختند

آپ کا ایک رنگ خاص تھا۔ جس میں آپ مستغرق تھے اور اس لیے بلا اسباب ظاہری آپ کے سارے کام منجانب اللہ انجام پایا کرتے تھے۔ کیونکہ آپ کا قدم ابتلاء و امتحان کے وقت ڈگمگاتا نہ تھا۔ ایک ،مرتبہ مُلا عبدالعزیز صاحب، کہ آپ کے قدیم مخلص خادم اور مدرسہ کے نگران اعظم تھے۔ آ کر اطلاع دی کہ آٹا بھی ختم ہو چکا اور لکڑیاں بھی ختم ہوگئیں۔ کل کے لیے نہ جنس کا دانہ ہے نہ پاس کوئی پیسہ ہے۔ آپ سن کر خاموش ہوگئے اور کچھ جواب نہ دیا۔ مگر خود فرماتے تھے کہ دل میں اپنے مالک سے یہ دعاء ہوئی کہ اے کریم آقا یہ تیری مخلوق جو تیرے کلام کی تلاوت وتعلیم میں مشغول ہے کیا فاقہ کرے گی اس کے بعد خود ہی یہ مضمون دل پر جما کہ تو جان تیرا کام۔ اگر فاقہ ہی کرانا منظور ہے تو صبر کی توفیق بخشئے کہ یہ بھی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

رات ہوئی اور موجودہ غلہ پک پکا کر مٹکے خالی ہوگئے۔ مگر آپ کی طبیعت پر نہ ہراس و پریشانی آئی نہ کسی سے قرض مانگنے کا وسوسہ ہوا۔ صبح نہ ہوئی تھی کہ طالب علم جو نہانے کے لیے ندی پر گئے ہوئے تھے، دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ حضرت جی ندی میں تو لکڑیاں بہی چلی آرہی ہیں۔ خوشی کے مارے آپ کا چہرے دمکنے لگا اور آپ نے فرمایا کہ کریم رزاق نے تمہاری روزی کا سامان بھیجا ہے جاؤ جتنی سمیٹی جائیں سمیٹ لاؤ، چنانچہ سارے طالب علم دوڑ پڑے اور روک لگا کر لکڑیاں لادنا شروع کردیں کہ دو گھنٹے میں اتنا اونچا ڈھیر لگ گیا جس سے زیادہ کی گنجائش بھی نہ تھی۔ لکڑیوں کی آمد بھی بند ہوگئی اور اب آٹے کی ضرورت رہ گئی۔ دو گھنٹے کے بعد ڈاکیہ آیا کہ ڈیڑھ سو روپے کا منی آرڈر پیش کیا۔ جس میں لکھا تھا مدرسۃ القرآن کے لیے بھیجتا ہوں، اس کے خرچ میں لائیں۔ آپ فرماتے تھے کہ میں نے بھیجنے والے کا نام پوچھا تو ایسے شخص کا نام جس کو میں جانتا بھی نہ تھا۔ میں نے بارہا کہا کہ کسی اور کا ہوگا۔ کیونکہ بھیجنے والا میرے ذہن میں نہیں آیا۔ مگر ڈاکیے نے کہا کہ پتہ، آپ کا نام آپ کا مرسل کو آپ پہچانے یا نہ پہچانے مگر اس میں کوئی شک ہی نہیں یہ آپ کا ہے۔ بس آپ نے وصول فرمایا اور یہ کہہ کر ملا عبد العزیز کے حوالہ کیا، لو ملا جی! اللہ نے اپنے مہمانوں کے آگے لکڑی کا سامان کردیا۔ روٹی کا وقت آگیا، اس لیے جلدی آٹا منگالو کہ لکڑی موجود ہے، موٹی موٹی روٹیاں پکا کر نمک سے سب کھالیں، آپ فرمایا کرتے تھے کہ وہ لکڑیاں پورے چھ مہینے کام آئیں اور روپیہ تو آج تک پتہ نہ چلا کہ کس نے بھیجا تھا۔ الحمد للہ اس کے بعد مدرسہ کو کبھی ایسی صورت پیش نہ آئی اور نہ میں نے جانا کہ مولائے کریم کہاں سے بھیجتے ہیں اور کس سے دلواتے ہیں۔ (تذکرۃ الخلیل: ص ۲۴۰)

کار ساز ما بساز کار ما
فکر ما در کار ما آزما

اب سب واقعات کے ساتھ اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہے جیسا کہ میں آپ بیتی نمبر۲ میں لکھوا چکا ہوں کہ میرے اکابر کے یہاں تصرفات کی کوئی وقعت کبھی نہیں ہوئی۔ بلکہ ان کے روکنے کی کوشش ہوئی۔ اپنے ایک مخلص دوست مولوی عبدالرحمٰن گنگوہی کا واقعہ لکھوا چکا ہوں کہ وہ جب کسولی میں امام تھے اور ذکر شغل کیا کرتے تھے تو ان کے خطوط اپنے حالات رفعیہ کے بہت آیا کرتے تھے۔ جن میں اپنی اجابت دعاء اور تصرفات کا ذکر ہوتا تھا۔ میں نے ان کا ایک خط حضرت قدس سرہٗ کو سنایا۔ جس میں بہت ہی تصرفات اور خوارق لکھے تھے اور میں سمجھ رہا تھا کہ اس پر حضرت بیعت کی اجازت لکھوائیں گے کہ لونڈا تو چوتھے آسمان پر پہنچ گیا۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب حضرت قدس سرہٗ نے اس کے جواب میں مجھ سے یہ لکھوایا کہ اذکار و اوراد سب چھوڑ دو۔ فرائض اور سنن مؤکدہ کے علاوہ جملہ نوافل جملہ اوراد فوراً بند کردو۔ وہاں یہ بھی لکھوا چکا ہوں کہ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے ابتدائی سلوک میں جو خطوط خوارق یا مکاشفات کے ہوتے تھے تو میرے حضرت ان کے جوابات میں یہ لکھوایا کرتے تھے کہ ان چیزوں کی طرف التفات ہرگز نہ کریں یہ ترقی سے مانع ہیں۔

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر۱۵

اکابر کا معمول، تنقیدات

اور آپس کے اختلاف کے بارے میں

اکابر کا معمول اپنے اوپر تنقیدات کے بارے میں بہت ہی اونچا اور قابل رشک تھا۔ کاش اس سیہ کار کو بھی ان اکابر کے اوصاف حسنہ میں سے کچھ مل جاتا تو کیسا اچھا ہوتا۔ یہ حضرات اجانب کی نہیں بلکہ مریدین اور شاگردوں کی تنقیدوں کو بھی بشرطیکہ اخلاص پر مبنی ہوں، محض عناد مقصود نہ ہو، بہت غور سے سنتے تھے اور اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ جس کے واقعات بہت کثرت سے سنے اور پڑھے۔

سید احمد شہید کے واقعات

تذکرۃ الرشید میں حضرت سید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ لکھا ہے کہ حضرت سید احمد شہید صاحب قدس سرہٗ کی شادی کے بعد نماز میں کچھ دیر سے تشریف آوری ہوئی۔ مولانا عبدالحیٔ صاحب نے سکوت فرمایا کہ شائد نئی شادی کی وجہ سے تاخیر ہوگئی ہو، اتفاقیہ کچھ دیر ہوگئی ہو۔ اگلے دن پھر ویسا ہی ہوا کہ سید صاحب کو اتنی دیر ہوگئی کہ تکبیر اولیٰ ہو چکی تھی۔ مولوی عبدالحیٔ صاحب نے سلام پھیرنے کے بعد کہا عبادت الٰہی ہوگی یا شادی کی عشرت سید صاحب چپ ہو رہے اور اپنی غلطی کا اقرار کرلیا اور پھر نماز میں اپنے معمول طریق پر تشریف لانے لگے۔

(تذکرۃ الرشید: ص۲۷۲رج۲)

حضرت سید صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے باورچی خانہ کے منتظم میاں عبدالقیوم اور عبداللہ بہرے تھے اور قادر بخش حضرت کا کھانا پکایا کرتے تھے۔ ایک روز وہ گوشت پکا رہے تھے اور گوشت میں پانی کم تھا۔ اس عرصہ میں مغرب کی اذان ہوگئی۔ انہوں نے حاجی عبداللہ سے یہ کہہ کہ ذرا گوشت کی خبر رکھنا، میں نماز کو جا رہا ہوں۔ حاجی عبداللہ نے گوشت کے نیچے سے آگ کھینچ کر خود بھی نماز کو چلے گئے۔ بعد نماز جب قادر آئے تو دیکھا کہ گوشت میں داغ لگ گیا تھا۔ انہوں نے صاف بوٹیاں نکال کر اس میں شوربہ کر دیا، پھر بھی جلنے کا اثر باقی رہ گیا اور جب سید صاحب کی خدمت میں کھانا پیش کیا گیا تو حضرت نے قادر بخش سے فرمایا کہ آج کیسا کھانا پکایا کہ گوشت جل گیا۔

انہوں نے واقعہ عرض کیا۔ یہ واقعہ سن کر بے ساختہ حضرت کی زبان سے نکل گیا کہ تم اس مردود کے گوشت حوالہ کر کے نماز کو کیوں چلے گئے۔ یہ سخت لفظ حضرت کی زبان سے عادت کے خلاف سن کر سب متحیر رہ گئے۔ جب عشاء کے بعد فارغ ہو کر حضرت تشریف لائے تو چند خدام نے آپس میں کہا کہ حضرت کی زبان سے یہ لفظ خلافِ معمول نکل گیا، اس پر متنبہ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ حضرت نے بار بار ارشاد فرمایا ہے کہ میں بشر ہوں، اگر کسی وقت بے جا کلام شریعت کے خلاف میری زبان سے صادر ہو تو مجھ سے ضرور اطلاع کرو اور اگر نہ کرو گے تو قیامت کے روز تمہارے دامن گیر ہوں گا۔ اس لیے اس بات کی اطلاع کرنی ہم پر واجب ہے کہ ہم بری الذمہ ہو جائیں۔

اس بات پر متفق ہو کر سب آپ کے پاس دستور کے موافق آئے اور بیٹھ گئے۔ پھر دو صاحبوں نے عرض کیا کہ حضرت سب بھائی لوگ جو حاضر ہیں، یہ کہہ رہے ہیں آج حضرت کی زبان سے مردود کا لفظ نکل گیا، یہ لفظ کسی مسلمان کو کہنا کیسا ہے آپ نے اس سوال کو سن کر دیر تک سکوت فرمایا اور کہا کہ یہ بات کسی مسلمان کو نہیں کہنا چاہیے۔ یہ کلمہ میری زبان سے بے اختیاری میں بے ساختہ نکل گیا اور بڑا قصور ہوا اور تم سب بھائیوں نے خوب کیا جو اس قصور سے مجھ کو آگاہ کیا، پھر آپ نے حاجی عبداللہ کو اور باورچی خانہ کے سب لوگوں کو بلوایا اور ہر ایک جماعت کے بہت لوگ اس وقت حاضر تھے اور حاجی عبداللہ بہت سادہ مزاج صالح آدمی تھے۔ حضرت نے ان کو پاس بٹھا کر فرمایا کہ حاجی صاحب! ہم تمہارے قصور مند ہیں۔ اس وقت غصہ میں بے اختیار ہماری زبان سے مردود کا جو لفظ نکل گیا ہماری یہ خطا للہ معاف کر دو اور ہم سے مصافحہ کر لو۔ وہ سنتے کم تھے۔ اپنے جی میں ڈر گئے اور عذر کیا کہ حضرت آپ کا سالن مجھ سے جل گیا، میں بہت نادم ہوں، میری یہ خطا خدا کے واسطے معاف کر دیں۔ آپ نے ان کے کان میں زور سے پکار کر کہا، تمہاری کچھ خطا نہیں ہے، خطا ہم سے ہوئی کہ مردود کا لفظ ہماری زبان سے نکل گیا۔ تم ہم کو معاف کر دو۔ یہ سن کر انہوں نے حضرت کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ حضرت میں نے معاف کر دیا، آپ میرے لیے دعاء کریں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت کرے اور آپ نے مصافحہ کیا۔ پھر آپ نے اسی مجلس میں سب کے سامنے بآواز بلند کہا، میں اپنی خطا سے توبہ کرتا ہوں۔ اب کبھی ایسا بے جا کلام ان شاء اللہ میری زبان سے نہ نکلے گا۔ پھر دیر تک اسی مضمون پر تقریر فرماتے رہے۔

چند روز بعد حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب تشریف لائے تو لوگوں نے سارا واقعہ حضرت شہید کو سنایا تو حضرت نے فرمایا کہ اولیاء کی زبان سے بشریت کے سبب کوئی کلام مکروہ شریعت کے خلاف نکل جاتا ہے اور وہ اس سے توبہ کرتے ہیں تو حقیقت میں وہ کلام حکمت اور فائدہ سے

خالی نہیں ہوتا اور نہ اس سے ان کا مرتبہ کم ہو جاتا ہے بلکہ ان کا درجہ اس کے سبب بڑھ جاتا ہے۔

چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کا گیہوں کھانا اور جنت سے نکالا جانا بظاہر تو بے شک ان سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوئی اور انہوں نے اپنی خطاء سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے وہ خطا عفو فرمائی مگر اس میں حکمت الٰہی یہ تھی کہ اس خطا کے سبب وہ جنت سے نکالیں جائیں اور دنیا میں آئیں ان سے انبیاء و اولیاء مومن مسلمان پیدا ہوں، دنیا کا کارخانہ جاری ہو۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک قبطی کو قتل کیا اور فرعون کے خوف سے مدین چلے گئے۔ وہاں حضرت شعیب علیہ السلام کی لڑکی سے ان کا نکاح ہوا اور چند سال وہاں رہ کر مصر کو چلے تو کوہِ طور پر رسالت ملی۔ اب خیال چاہیے کہ اس خطا میں اور وہاں سے بھاگنے میں کتنی حکمتیں تھیں۔ اگر ان سے وہ خطا نہ ہوئی ہوتی تو یہ فوائد کیوں کر ظہور میں آتے۔

(مختصراً سیرت سید احمد شہید: ص ۵۰۵ / ج ۲)

سفر حج میں آپ کے ساتھ عبداللہ نومسلم دہلوی اور ان کی بیوی جو آپ کے گھر کی ملازمہ اور خدا کی ایک نیک بندی تھی، ساتھ تھے۔ اس عورت کی گود میں ایک بچہ تھا اور آپ کی ایک صاحبزادی بھی، شیر خوار تھی۔ وہ عورت دونوں بچوں کو دودھ پلاتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد اس کا دودھ کم ہو گیا۔ اس نے صاحبزادی کو دودھ پلانا چھوڑ دیا۔ آپ کی اہلیہ محترمہ کو اس پر غصہ آیا اور انہوں نے ایک دن حضرت سے شکایت کی۔ آپ نے اس خادمہ سے کہا کہ تم اس بچی کو ضرور دودھ پلاؤ۔ ہم تمہاری خوراک ایسی مقرر کر دیں گے کہ دودھ بڑھ جائے گا۔ اس نے کہا کہ میں نے بہت سے چیزیں کھائیں لیکن دودھ نہیں بڑھا۔ میں اس بچی کو دودھ پلانے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن پوچھتی ہوں اگر میرا بچہ بھوکوں مر گیا تو اس کا گناہ مجھ پر ہے یا نہیں۔ آپ نے اپنی بچی کا دودھ اس سے چھڑا دیا۔ اس کا میاں عبداللہ کو بھی بہت رنج ہوا۔

چار پانچ دن کے اندر آپ کو بہت تردد و پریشانی لاحق ہوئی اور دعاء و مناجات وغیر میں کمی محسوس ہوئی۔ اس پر آپ نے مغموم ہو کر بارگاہ بے نیاز میں بہت دعاء و التجاء کی آپ کو متنبہ ہوا کہ بچی کو دودھ پلانے کے واقعہ میں آپ سے ایک غریب عورت کی دل شکنی ہوئی اور اس کے بچہ کی حق تلفی ہوئی۔ آپ صبح ہی صبح مکان پر تشریف لائے اور لوگوں کو جمع کر کے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے اس معاملہ میں قصور ہوا اور سب واقعہ بیان کیا پھر سب مستورات کو ساتھ لے کر آپ میاں عبداللہ کی بیوی کے پاس تشریف لے گئے۔ وہ یہ دیکھ کر ڈر گئیں اور رونے لگیں۔ آپ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا، ہم سے خطا ہوئی کہ ہم نے تم کو بچی کے دودھ پلانے کا حکم دیا، خدا کے لیے معاف کر دو۔ یہ سن کر وہ زیادہ رونے لگی۔ عورتوں نے ان کو سمجھایا کہ زبان سے کہہ دو کہ ہم نے معاف کیا۔ اس

طرح تین بار ان کی زبان سے کہلوایا اور پھر آپ نے ان کے لیے دعاءِ خیر فرمائی اور اہلیہ محترمہ کو بڑی تاکید فرمائی کہ اس عورت کی پہلے سے بھی زیادہ خاطر مداری اور دل جوئی کرنا، پھر آپ شیخ عبداللطیف تاجر کے مکان پر تیز قدمی کے ساتھ تشریف لائے۔

شیخ صاحب موصوف، مولانا عبدالحیؒ، مولانا محمد اسماعیل اور حکیم مغیث الدین وغیرہ دالان میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا کہ میں اس وقت تمہارے پاس ایک ضروری کام کے لیے آیا ہوں، آپ نے میاں عبداللہ کو پہلو میں بٹھایا اور ایک بڑی پراثر تقریر کی، جس میں پروردگارِ عالم کی بے نیازی کا مضمون بیان کیا اور یہ کہ سب بندوں سے قصور اور نافرمانی ہوتی ہے اور سب یکساں خدا کے محتاج ہیں۔ پھر آپ کھڑے ہوگئے اور آپ کے ساتھ سب اہلِ مجلس کھڑے ہوگئے۔ آپ نے بچی کو دودھ پلانے کا واقعہ بیان کیا اور فرمایا کہ میں نے میاں عبداللہ کی بیوی سے تمام عورتوں کے روبرو معافی مانگ لی ہے لیکن چاہتا ہوں کہ میاں عبداللہ سے آپ کے اور سب مسلمانوں کے سامنے معافی مانگ لوں تاکہ آپ سب بھی دعاء میں داخل ہو جائیں۔ آپ کے اس فرمانے سے تمام اہلِ مجلس پر رقت طاری ہوگئی۔ میاں عبداللہ اتنا روئے کہ جواب کی طاقت نہ رہی۔ انہوں نے انتہائی عجز سے عرض کیا کہ میں آپ کا خادم اور فرمانبردار ہوں۔ آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ تم ہمارے بھائی ہو۔ ہم سے قصور ہوا اب ہمارے معافی مانگنے اور تمہارے معاف کر دینے میں بڑی خیر و برکت ہے تم کو معاف کر دینا چاہیے۔ میاں عبداللہ پر ایسا گریہ طاری تھا کہ بات زبان سے نہ نکلتی تھی، ایک دوسرے شخص نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہو میں نے معاف کیا۔ میاں عبداللہ نے عرض کیا کہ اگر میرے کہنے ہی پر موقوف ہے تو میں نے دل و جان سے معاف کیا۔ اس کے بعد آپ نے دعاء کے لیے ہاتھ اٹھائے اور بڑے گریہ و زاری سے مسلمانوں کے لیے عموماً اور میاں عبداللہ کے لیے خصوصیت سے دعاء فرمائی۔ (سیرت سید احمد شہید: ص ۵۰۳)

اس نابکار کا بھی اپنی ابتدائی مدرسی ۱۳۳۵ھ سے اولاً مولانا عبدالرحمٰن صاحب سابق صدر مدرس مظاہر علوم اور ان کے بعد میرے محترم دوست قاری سعید مرحوم کے ساتھ یہ معمول اور میری تاکید رہی کہ اس سیہ کار کے اقوال و افعال کی نگرانی تمہارے ذمہ ہے۔ ان دونوں دوستوں کو اللہ تعالیٰ بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ یہ ہمیشہ میری بہت ہی نگرانی فرماتے رہے۔ اس زمانہ میں چونکہ اس نابکار پر غصہ اور جوش کا دور دورہ تھا اور یہی دونوں حضرات بلکہ دیگر اکابر بھی مجھے اس پر ابھارتے رہتے تھے کہ ان خواص پر چاہے روساء ہوں، چاہے اکابر مدرسہ میرے حضرت قدس سرہٗ حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے اعزہ اقارب ہوں، ان پر نکیر تو ہی کر سکتا ہے ہم لوگوں کے بس کی بات نہیں۔

یہ کم ظرف ان فقروں سے اور بھی پھول جاتا اور بہت سختی ان خواص کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ اگرچہ میرا معمول ہمیشہ یہ بھی رہا کہ جس پر سختی کرتا کسی دوسرے وقت اس کی تلافی بھی کر دیتا۔ حتیٰ کہ اس وقت میں بعض طلبہ کے یہ فقرے بھی میرے کان میں پڑتے تھے کہ شیخ نے بہت دنوں سے کچھ مرمت نہیں کی۔ یہاں چائے پینے کے واسطے پیسے نہیں رہے۔ اس کے باوجود جن طلبہ کے متعلق یہ دونوں حضرات اپنے اپنے وقت میں یہ کہہ دیتے کہ فلاں کو سزا جرم سے زیادہ ملی۔ میں ان کی تلافی کا بہت اہتمام کیا کرتا تھا اور بے تکلف معافی مانگ لیتا تھا۔ ان دونوں حضرات کے بعد بھی موجود احباب سے بھی درخواست کرتا رہتا ہوں۔ مگر یہ حضرات ان دنوں حضرات جیسی نگرانی اس سیہ کار کی نہیں کرتے۔

اس ناکارہ کا معمول اپنی جملہ تصانیف عربی اور اردو میں ہمیشہ یہی رہا کہ ان دونوں اکابر کی زندگی میں تو بڑے اہتمام سے دونوں کو ہر چیز دکھلاتا تھا اور وہ دونوں حضرات بڑی فراخدلی سے میرے مسودوں کے صفحے قلم زد کر دیتے تھے میں قرآن و حدیث سے دلائل بھی پیش کرتا مگر ان کا آخری جواب یہ ہوتا تھا مضمون تو صحیح ہے، مگر عوام کے قابل نہیں۔ فقہا کے قول ''ھذا مما یعلم ولا یقتدی'' کی آڑ لے کر قلم زد کر دیتے تھے۔

اب تو نہ وہ جوش و خروش رہا اور نہ لکھنے پڑھنے کا سلسلہ رہا۔ پھر بھی جو کچھ تھوڑا بہت ہوتا ہے وہ موجودہ احباب کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں اور ہمیشہ بہت اہتمام سے رمضان میں اور حرمین شریفین میں اس کی دعاء کرتا رہتا ہوں، جس کی سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی تعلیم فرمائی ہے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا ارشاد ابوداؤد شریف میں نقل کیا گیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کسی پر ناراض ہوتے تو ناراضی میں کچھ الفاظ فرما دیا کرتے تھے۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبہ میں فرمایا:

''میری امت میں سے جس شخص کو میں نے غصہ میں کوئی گالی دی ہو یا لعنت کی ہو، میں بھی بشر ہوں جب لوگوں کو غصہ آتا ہے مجھے بھی کسی وقت غصہ آ جاتا ہے یا اللہ تو میری سخت کلامی کو ان لوگوں کے لیے رحمت بنا دیجیے۔''

ابوداؤد میں اس حدیث کے ساتھ ایک قصہ لکھا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر غصہ میں کوئی لفظ یا کچھ زیادتی کسی پر ہو جائے اولاً اس کو معاف کرانے کی کوشش کی جائے اور ثانیاً اس کے لیے دعاء اتنی کثرت سے کی جائے کہ قیامت کے دن جب اس کو اس زیادتی کے اجر و ثواب اور دعاؤں کا حال معلوم ہو تو وہ بجائے مطالبہ کرنے کے خود یہ تمنا کرنے لگے کہ اس سے زیادہ پڑتی تو بہت ہی اچھا ہوتا۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا اسماعیل صاحب شہید نور اللہ مرقدہٗ ہندوؤں کے کسی میلہ میں گئے۔ سید صاحب اس زمانہ میں ان سے پڑھتے تھے وہ بھی ان کے ساتھ گئے جب یہ دونوں میلے میں پہنچے تو سید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر ایک جوش سوار ہوا اور نہایت غصہ آیا اور تیز لہجے میں مولانا شہید سے فرمایا۔ آپ نے فرمایا آپ نے کس لیے پڑھا تھا کیا سوادِ کفار بڑھانے کے لیے، آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت کہاں ہیں، آپ غور فرمائیں کہ ایک عالم اور شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کا بھتیجا کفار کے میلہ کی رونق بڑھائیں کس قدر شرم کی بات ہے۔

مولانا پر اس کا خاص اثر ہوا اور انہوں نے فرمایا کہ سید صاحب آپ نہایت بجا فرماتے ہیں واقعی یہ میری غلطی ہے اور یہ فرما کر فوراً لوٹ آئے اور پھر کبھی کسی میلہ میں نہیں گئے، حضرت حکیم الامۃ اس کے حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں ''شاگرد کی نصیحت کو تیز لہجہ میں قبول کر لینا اور عمل کرنا کس قدر مجاہدہ عظیمہ ہے''۔ (ارواح: ص ۹۰)

حضرت شاہ اسحاق کا واقعہ

استاذ الکل حضرت شاہ اسحاق صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ایک شاگرد اجمیر میں رہا کرتے تھے اور وہاں مواعظ کے ذریعہ سے اشاعت دین کیا کرتے تھے۔ انہوں نے حدیث ''لا تشد الرحال'' کا وعظ کہنا شروع کیا اور لوگوں پر اثر بھی ہوا، اتفاق سے شاہ اسحاق صاحب کا اس زمانہ میں قصد ہجرت ہوگیا۔ جب شاہ صاحب کے قصد کی ان کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے شاہ صاحب کو لکھا کہ جناب عازم سفر ہجرت ہوں تو اجمیر تشریف نہ لاویں۔ کیونکہ میں لاتشد الرحال کا وعظ کہہ رہا ہوں اور لوگ راہ پر آچلے ہیں۔ آپ کی تشریف آوری سے جو کچھ اثر ہوا ہے اس کے غتر بود ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ شاہ صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ میں اجمیر کے قصد سے نہ آؤں گا، لیکن چونکہ اجمیر راستہ میں پڑے گا اور خواجہ صاحب ہمارے مشائخ میں ہیں۔ اس لیے مجھ سے نہ ہوسکے گا کہ میں بلا حاضر ہوئے بالا بالا چلا جاؤں۔ جب میں آؤں تم وعظ کہنا اور وعظ میں بیان کرنا کہ اسحاق نے غلطی کی جو وہ اجمیر آیا اس کا فعل حجت نہیں اور میرے سامنے کہنا اور یہ خیال نہ کرنا کہ شاید مجھے ناگوار ہو مجھے ہرگز ناگوار نہ ہوگا اور میں اقرار کرلوں گا کہ واقعی میری غلطی ہے اس سے وہ ضرر رفع ہوجائے گا جس کا تم کو اندیشہ ہے اور شاہ صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ یہ مجاور اور قبر پرست ہمارے رقیب ہیں۔ رقیبوں کے ڈر سے محبوب کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔

(ارواح ثلاثہ: ص ۱۱۷)

حضرت گنگوہی کے واقعات

میرے والد حضرت مولانا محمد یحیٰؒ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ایک واقعہ ارواح ثلاثہ میں نقل کیا گیا ہے کہ مولانا محمد یحیٰؒ صاحب کہا کرتے تھے کہ مجھ سے مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ مولوی یحیٰؒ! احمد رضا خاں مدت سے میرا رد کر رہا ہے۔ ذرا اس کی تصنیف ہمیں بھی تو سنا دو۔ میں نے عرض کیا حضرت! ان میں تو گالیاں ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ اجی دور کی گالیوں کا کیا ہے، پڑی گالیاں ہوں تم سناؤ۔ آخر اس کے دلائل تو دیکھیں۔ شاید کوئی معقول بات ہی لکھی ہو، تو ہم ہی رجوع کرلیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھ سے تو نہیں ہوسکتا۔ حضرت حکیم الامۃ اس کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں اللہ اکبر یہ ہے حق پرستی کہ اس کے طلب واتباع کے غلبہ میں دشمن کی بیہودگی سے بھی متاثر متغیر نہ ہوں اور مولانا محمد یحیٰؒ صاحب کا یہ کہنا کہ مجھ سے تو نہیں ہوسکتا۔ ''ھو کقول علی لا امحوک''۔ (ارواحِ ثلاثہ)

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جس قول کی طرف اشارہ فرمایا ہے، وہ صلح حدیبیہ کا فقرہ ہے۔ جس کا پورا قصہ بڑی تفصیل کے ساتھ بخاری شریف میں ذکر کیا گیا ہے کہ جب عمرہ حدیبیہ میں کافروں نے مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا اور کئی دن کی رد وقدح و آمد ورفت کے بعد یہ طے ہوا کہ اس سال کفارِ مکہ مسلمانوں کو عمرہ نہیں کرنے دیں گے۔ آئندہ سال آکر کریں۔ اس گفتگو کے طے ہونے کے بعد جب یہ صلح نامہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوانا شروع کیا تو ان ضدی جاہلوں نے ہر ہر چیز پر ضدیں شروع کیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح نامہ کی ابتداء ان الفاظ سے کرائی۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

تو بے وقوفوں نے اسی پر جھگڑا شروع کردیا کہ ہم نہیں جانتے رحمٰن کیا ہے باسمک اللّٰھم لکھ جو زمانہ جاہلیت کا دستور ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت میں ان نالائقوں کی ہر شرط کو قبول فرما رہے تھے، اس کو بھی منظور فرمالیا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوانا شروع کیا ''ھذا ما قاضیٰ علیہ محمد رسو ل اللّٰہ'' یہ تحریر وہ فیصلہ ہے جس پر محمد رسول اللہ اور فلاں فلاں کا معاہدہ ہوا۔ اس پر بھی وہ سب اکڑ گئے کہ ہم رسول اللہ نہیں لکھنے دیں گے۔ محمد ابن عبداللہ لکھ، یعنی محمد عبداللہ کا بیٹا جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا نام نامی ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں چاہے تم مانو یا نہ مانو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جو اس معاہدہ کے کاتب تھے، ان سے فرمایا کہ رسول اللہ کے لفظ کو مٹادو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ کے لفظ کو نہیں مٹا سکتا، مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کاغذ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے لے کر اپنے دستِ مبارک سے مٹایا۔ اسی کی طرف حکیم الامۃ نے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ سے افاضات یومیہ میں نقل کیا ہے کہ میں نے اپنے ابتدائی استاد مولانا فتح محمد صاحب سے سنا ہے کہ ایک بار جب کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں بمقام مکہ معظمہ حاضر تھے۔ حضرت حاجی صاحب کے پاس مولود شریف کا بلاوا آیا۔ حضرت نے مولانا سے پوچھا مولوی صاحب چلو گے۔ مولانا نے فرمایا کہ نا حضرت میں نہیں جاتا۔ کیونکہ میں ہندوستان میں لوگوں کو منع کیا کرتا ہوں۔ اگر میں یہاں شریک ہوگیا تو وہاں کے لوگ کہیں گے، وہاں بھلے شریک ہوگئے تھے۔

حاجی صاحب نے بجائے برا ماننے کے مولانا کے اس انکار کی بہت تحسین فرمائی اور فرمایا کہ میں تمہارے جانے سے اتنا خوش نہ ہوتا جتنا تمہارے نہ جانے سے خوش ہوں۔ اب دیکھیے پیر سے زیادہ کون محبوب و معظم ہوگا، مگر دین کی حفاظت ان کے اتباع سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے دونوں کے ظاہری تعارض کے وقت اسی کو ترجیح دی۔ واقعی حفاظت دین بڑی نازک خدمت ہے۔ سارے پہلوؤں پر نظر رکھنی پڑتی ہے کہ نہ چھوٹوں کو نقصان پہنچے، نہ بڑوں کے ساتھ جو عقیدت ہونی چاہیے اس میں فرق آئے۔

مولانا نصیر الدین صاحب کو اپنے شیخ حضرت سلطان جی سے مسئلہ سماع میں اختلاف تھا۔ مزامیر کے ساتھ وہ بھی نہ سنتے تھے۔ لیکن مولانا نصیر الدین بلا مزامیر سننے کو بھی خلاف سنت سمجھتے تھے۔ کسی نے کہا کہ سلطان جی تو سماع سنتے تھے۔ مولانا نے جواب دیا ''فعل پیراں سنت نباشد۔'' کسی نے ان کا یہ قول سلطان جی سے نقل کر دیا تو آپ نے فرمایا ''نصیر الدین راست می گوید۔'' سبحان اللہ یہ حضرات تھے دین کے سچے خادم اور سچے عاشق۔ ع

وزیرے چنیں شہر یارے چناں

حاجی محمد علی انبہٹوی نے حج سے واپس آ کر یہ مشہور کیا کہ حضرت حاجی صاحب نے مجھ کو سماع کی اجازت دے دی ہے۔ کسی نے حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے یہ روایت نقل کی۔ مولانا سن کر فرمایا کہ وہ غلط کہتے ہیں اور وہ اگر صحیح کہتے ہیں تو حاجی صاحب غلط کہتے ہیں۔ ایسے مسائل میں خود حاجی صاحب کے ذمہ ہے کہ وہ ہم سے پوچھ پوچھ کر عمل کریں، البتہ اصلاح نفس کے مسائل میں ہمارے ذمہ ہیں حضرت حاجی صاحب کا اتباع۔ اس ارشاد پر عوام میں بڑا چرچا ہوا مگر اس مفسدہ کا جو ان صاحب کی روایت سے ہوتا، بالکل انسداد ہوگیا تو مولانا نے حفاظت دین

کے مقابلہ میں اپنی بدنامی کی بھی پرواہ نہ کی۔ لوگوں نے حضرت حاجی صاحب تک یہ شکایتیں پہنچائیں مگر وہاں بھلا کیا اثر ہوتا۔ گو اوروں کو شکایت ہوئی مگر حضرت پر کچھ اثر نہ ہوا جن کے ساتھ اختلاف تھا۔

اس محبوب اختلاف پر یاد آیا۔ ان ہی بزرگوں کے صدقہ میں ہم جیسوں کو بھی ان حضرات کے تشبہ کی تھوڑی بہت توفیق ہوگئی۔ چنانچہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ میرے استاذ اور ہر لحاظ سے مجھ سے بڑے تھے۔ مگر سیاسی تحریک میں شرکت کے متعلق میں نے مولانا سے اختلاف کیا، مگر نہایت ادب کے ساتھ اور مولانا کو بھی میرے اس اختلاف سے ذرہ برابر ناگواری نہیں ہوئی۔ چنانچہ ایک بار ایک مقرب معتقد نے میرٹھ میں مجمع کے سامنے مجھ پر نکتہ چینی کی۔ جو مولانا کو اس کی خبر پہنچی تو اظہار ناراضگی فرمایا اور فرمایا کہ وہیں جا کر اسی مجمع میں اپنے قول کو رد کرو اور اس مسئلہ میں کیا مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے، یہ محض میری رائے ہے، ممکن ہے کہ اس کی رائے صحیح ہو اور مولانا سے تجاوز کر کے میں نے تو حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی بعض مسائل میں اختلاف کیا اور اس اختلاف کا علم بھی مولانا کو میں نے کرادیا۔ لیکن شفقت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں۔ بلکہ جب میں نے والد صاحب مرحوم کی بینک اس میں تنگی نہ تھی، تو مولوی محمد یحییٰ صاحب نے عرض کیا کہ پھر آپ اسے (یعنی مجھ سے) لے لینے کو کیوں نہیں فرماتے۔

اس پر مولانا نے فرمایا کہ سبحان اللہ! ایک شخص اپنی ہمت سے تقوی اختیار کرنا چاہتا ہے کیا میں اس کو تقوی سے روکوں تو دیکھئے مولانا اس اختلاف سے ناراض تو کیا ہوئے، اس کا نام تقویٰ قرار دے کر اس سے خوش تھے۔ غرض اگر اپنے بڑوں سے بھی اختلاف نیک نیتی کے ساتھ اور محض دین کے لیے ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ (اضافات: ۹/۲ ص ۳۰۶)

حضرت حکیم الامۃ نے فرمایا ایک بے تکلف دیہاتی نے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بمقام آبہہ، جبکہ خدام مولانا کا بدن دبا رہے تھے۔ سوال کیا کہ مولوی جی! تم تو بہت ہی دل خوش ہوتے ہو گے لوگ خوب خدمت کر رہے ہیں فرمایا بھائی جی تو خوش ہوتا ہے کیونکہ راحت ملتی ہے۔ لیکن الحمد للہ بڑائی دل میں نہیں آئی۔ یہ دل میں نہیں آتا کہ میں بڑا ہوں اور جو خدمت کر رہے ہیں وہ مجھ سے چھوٹے ہیں۔ یہ سن کر وہ گاؤں والا کیسا صحیح نتیجہ نکالتا ہے۔ بولا کہ اجی! اگر یہ دل میں نہیں آتا تو بس خدمت لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (اضافات: ۹/۲ ص ۴۲۲)

حضرت گنگوہی کا ایک مکتوب

حضرت امام ربانی نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے ایک گرامی نامہ میں جو حکیم عبدالعزیز صاحب کو لکھا

ہے فرماتے ہیں۔
حکیم عبدالعزیز خان صاحب السلام علیکم!
آپ کا پہلا خط مع مولوی اسماعیل کے آیا۔ اب کیا لکھوں کہ مولوی اسماعیل کو فقط زبانی باتیں سن کر خیال پک گیا اور وہ فقط اس کی ظاہری باتیں تھیں۔ چنانچہ مفصل لکھ چکا ہوں۔ اب دوسرا خط آپ کا آیا۔
الحق یہ بیس روپے مجھ کو لینا سخت معلوم ہوتا ہے کہ اس وجہ سے لیے جائیں۔ میرے دل کی خواہش یہ کہ اس کو واپس کردوں۔ مگر تم ایسا کچھ لکھتے ہو۔ اب پھر بار بار لکھنا تو فضول ہے مگر اس قدر محقق ہے کہ لاریب آپ کو بوجہ حضرت کے بندہ سے خیال ہے اور یہ ناکارہ خودغرض ہے نہ کسی کی بھلائی مجھ سے ہوسکے نہ کسی کے کام کا ہوں۔ اگر زبانی دعاء کردی تو کیا ہوا۔ تم کو جو کچھ مجھ سے خیال ہے وہ محض حسن ظن ہے اور میں اپنے اندر کو جانتا ہوں کہ اپنی محبت اور غرض سے پُر ہے۔ تم تو وہ دوسرے درجہ میں الحق کہ خود حضرت مرشدنا سے بھی مجھ کو جیسی چاہیے اعتقاد و محبت نہیں۔ ایک بار خدمت میں حضرت کے بھی عرض کردیا تھا کہ آپ کے سب خادموں سے اس بات میں کم ہوں۔ ہر شخص کو کسی درجہ کی آپ کی محبت ہے اور اعتقاد، مگر مجھ نالائق کو کچھ بھی نہیں اور یہ اس واسطے ذکر کیا تھا کہ نفاق اپنا ظاہر کردوں اور حقیقت الحال کو عرض کردوں۔ سو اب دیکھو کہ جب خود اس شخص مبارک سے کہ جس کے پاپوش کے بدولت دنیا میں عزت ہورہی ہے اور یہ توجہ آپ کو ہے اس کے ہی ساتھ اپنا یہ حال ہو تو پھر اور کوئی تو دوسرے درجہ میں ہے۔
پس جب یہ حال خار اپنا اپنے دوستوں کے ساتھ ہوا تو کس طرح ہدایا اپنے حوصلہ سے زیادہ قبول کردوں۔ وہ کسی خیال میں اور اپنا کچھ اور حال۔ تو اب کیا کہوں، نہ کہہ سکتا ہوں نہ چپ رہ سکتا ہوں۔ اس قدر پھر لکھتا ہوں کہ یہ روپیہ تمہاری غرض میں خرچ نہ ہو آپ ایسی حالت میں اگر قبول کرلو تو بہتر ہے۔ آخر ہر روز لیے جاتا ہوں۔ فی الواقع یہ امر مقرر ہے کہ مجھ کو کسی محسن دوست، عزیز سے آشنائی نہیں۔ اپنے دل میں اپنی راحت وغرض اس قدر جاگزیں ہے کہ نہ کسی کے رنج سے رنج ہے نہ کسی کی فرحت سے فرحت۔ ہر دم اپنی ہی غرض درپیش ہے۔ اگرچہ اس اپنے حال زار سے نادم ہوں، مگر طبعی بات کو ندامت سے سود نہیں ہوگا شرمندہ ہوتا ہوں اور پھر تو وہی طبیعت سرزد ہوتی ہے تو اب آپ چشم پوشی کریں تو بہتر ہے ورنہ کیا کروں۔
حق تعالیٰ آپ کے حسن سے میرے ان اخلاق نازیبا کو زائل کردے اور تھوڑی سے عقیدت اپنے مرشد کی اگر دے دیں تو پھر برادران دینی سے البتہ کچھ الفت ہوجائے ورنہ قیامت کو میری حقیقت منکشف ہوکر اندیشہ ندامت ہے۔ اس ہی واسطے اب ظاہر کرتا ہوں کہ میرا نفاق ظاہر

ہو جائے کہ دوست یوں جانتے ہیں کہ یہ ہم سے محبت کرتا ہے اور میں بالکل ان کی طرف سے غافل اپنی غرض میں مبتلا ہوں۔

سوائے برادر دین! تم سے بھی توقع ہے کہ میرے واسطے اس امر کی دعاء کرو کہ حق تعالیٰ مجھ کو اپنی حب دے تو اس کی حب سے حب لے کر اولیاء کی ہووے اور پھر اس حب سے حب برادران دینی کی ہووے۔ ورنہ جس قدر میری کوئی شکایت کرے بجا ہے، میں خود مقر ہوں اور اپنا حال جانتا ہوں اور یہ بھی ضرور ہے کہ جب آدمی کو رنج ہوتا ہے تو خلاف توقع ہوتا ہے کہ جہاں آدمی توقع کسی امر کی رکھتا ہے اور وہ توقع بر آمد نہیں ہوتی تو رنج ہو جاتا ہے، اس واسطے غیروں سے رنج کم ہوتا ہے اور عزیزوں سے اور دوستوں سے رنج ہو جاتا ہے کہ ان سے توقع بھلائی رکھتا ہے، جب بھلائی وقوع میں نہ آئی رنج ہوا، خلاف توقع ہونے کے سبب دل پر صدمہ ہوا سو چونکہ اپنے آپ سے مجھے خود توقع نہیں کہ کسی سے سلوک کروں اور اپنے آپ قابل دوستی کے نہیں جانتا تو الحق اگر کوئی میری شکایت کرے تو مجھ کو ہی بری نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اپنے آپ کو ایسا ہی جان رہا ہوں اور کی شکایت کو بجا جانتا ہوں کیونکہ میرے افعال ظاہر پر لوگ مغرور ہو کر وہ مجھ کو اپنا دوست جان گئے پھر جب معاملہ خلاف پیش آیا تو ضرور شکایت ہونی چاہیے۔

سو اب آپ سنو! کہ سہارنپور کا آنا یا جھلا سہ پہنچنا ایسا کیا مشکل تھا، مگر اپنی غرض سے جو دل پر تھا سو حیلہ حوالہ پیش کر دیئے تو آپ کی کمی توجہ کا باعث نہیں، تم تو حضرت کی محبت وعقیدت کے ظل سے اس ناکارہ پر توجہ تام رکھتے ہو تم میں کوئی قصور نہیں، سراسر کوتاہی بندہ کی ہے۔ اب میں صاف صاف لکھتا ہوں کہ اگر خود حضرت مرشدنا کو کوئی خدانخواستہ تکلیف پیش آجائے تو بخدا مجھ کو توقع اپنے نفس سرکش سے یہ نہیں کہ ان کی خدمت گزاری میں ذرا بھی تکلیف گوارا کرے، سو یہ میری شامتِ اعمال ہے کہ کسی کا کیا قصور۔ حضرت کی عنایات سے تو دنیا میں سب کچھ مشہور ہو گیا، اپنا کیا علاج کروں۔

اے خدا! اگر آخرت میں اس کا دسواں حصہ بھی نصیب ہو جائے تو میرے برابر کوئی صاحب نصیب نہیں۔ مگر چونکہ دنیا ظاہر ہے اور آخرت میں باطن ظاہر ہو جائے گا وہاں کچھ بھی تو توقع نہیں بنتی۔ الٰہی توبہ توبہ! بس ختم کرتا ہوں اور یہ بھی کہتا ہوں کہ تم نے مولوی پیر محمد خاں سے شکر رنجی کا قصہ لکھا، مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ کیا وجہ ہوئی، باہم شکر رنجی چاہی نہیں۔ گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ قصور فہم ہو جاتا ہے، بات کچھ ہوتی اور فہم میں دوسری طرح آجاتی ہے، تو صفائی عمدہ بات ہے، جب آپ ظاہر لکھ دیں، اس وقت پیر محمد سے پوچھو اور زیادہ اب کو بھی نہیں لکھ سکتا کہ بیمار ہو۔ کیا تکلیف دوں۔ فقط اہلِ جھلا سہ کی دشمنی پر صبر کرنا لازم، وہ جو کچھ کرتے ہیں اپنے واسطے کرتے ہیں۔

عبدالمجید کا البتہ افسوس آتا ہے کہ وہ کیوں ایسا کام کرے جس سے آپ کو ناخوشی ہو۔ مگر ایک نصیحت آپ کو لکھتا ہوں کہ حتی الامکان دوسرے کے فعل کی تاویل حسن کرنا اور جہاں تک ہو سکے دوسرے کی بات کو بھلائی پر حمل کرنا اچھا ہے اور تھوڑے سے قصور پر چشم پوشی کرنا عمدہ ہے، اس میں آپ کو بہت راحت رہے گی اور دشمن کے فعل کے بدلہ نکوئی کرنا تو بہت عجیب بات ہے کہ ہر ایک کا کام نہیں، فقط ان فقرات کو اس طرح نہ جاننا کہ آپ پر طعن ہے یا عبدالمجید کی طرف داری ہے بلکہ تمہاری ہی راحت کے خیال سے لکھتا ہوں۔ ان فقروں سے ناراض نہ ہونا اور ان فقرات کی تصدیق حضرت مرشدنا سے کرانا کہ یہ فقرات مجھ سے عمل میں نہیں ہے آپ کو لکھتا ہوں، بھلا آپ ہی عمل کریں، یہ قدیم نصائح ہیں۔ فقط والسلام (مکاتیب رشیدیہ: ۶۰ ص ۵۲)

حضرت سہارنپوری کے واقعات

حضرت اقدس سہارنپوری قدس سرہٗ کے متعلق تذکرۃ الخلیل میں لکھا ہے کہ بایں تفقہ (حضرت کے تفقہ کے چند واقعات ذکر کیے ہیں) آپ کو اپنے کسی کمال پر ناز نہ تھا اور نہ ضد تھی۔ ایک بار آپ تھانہ بھون گئے اور فساد صلوۃ بحاذاۃ النساء کے مسئلہ میں مولوی احمد حسن سنبھلی کا حضرت سے مکالمہ ہوا تو حضرت تو حنفیہ کے قول کو قوی فرما رہے تھے اور مولوی احمد حسن ضعیف۔ حضرت نے فرمایا تم پہلے میری تقریر سن لو پھر جو کہنا ہے وہ کہنا، مگر مولوی صاحب نے درمیان میں آپ کا کلام قطع کرنا شروع کر دیا۔ حضرت کو تکدر ہوا اور لہجہ میں تیزی آ گئی۔ مولوی احمد حسن بھی تیزی پر آ گئے، تب آپ نے تحمل کیا اور خاموش ہو گئے۔ جب آپ ریل پر آنے لگے تو آپ نے خود ابتداء بالسلام کی اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا کر فرمایا، اگر مجھ سے کچھ گستاخی آپ کی شان میں ہو گئی ہو تو معاف فرما دیں۔ اس بندہ خدا نے اس پر بھی کوئی معذرت نہیں کی۔

(تذکرۃ الخلیل: ص ۲۹۷ پاکی)

تذکرۃ الخلیل میں تو یہ قصہ اتنا ہی نقل کیا ہے۔ لیکن حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ کو اس واقعہ سے بہت قلق ہوا اور مولوی احمد حسن کو تنبیہ بھی کی کہ اکابر کے سامنے یوں گستاخانہ گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ حضرت حکیم الامت خوان خلیل میں تحریر میں فرماتے ہیں کہ مسجد پیر محمد والی سمت جنوب میں جو سہ دری مسجد میں ملی ہوئی ہے۔ اس پر سائبان ڈالا گیا تو مولانا نے اس کے متعلق از خود کچھ تحریر فرمایا جس کا یہاں جواب عرض کیا گیا۔ چند بار اس میں مکاتبت ہوئی، جس میں کوئی اخیر فیصلہ نہیں ہوا اس مکاتبت کا نام "مسائلة اهل الخلة في مسئلة الظلة" ہے جو ترجیح الراجح کے حصہ دوم کے اخیر میں شائع ہوا ہے۔ اس میں مکتوب سوم کے شروع میں ایک عجیب دلربا جملہ ہے وہی

ھذہ گرامی نامہ موجب برکت ہوا۔ کئی کئی روز تک تو یہ خیال رہا کہ مسئلہ کے متعلق کچھ عرض کروں یا نہ کروں مبادا تکرار موجب بار ہو۔ بالآخر یہ خیال ہوا کہ اپنا خیال ایک دفعہ اور عرض کر دوں۔ الخ
ملاحظہ فرمایا جائے اس جملہ میں رعایت حق اور رعایت خاطر دونوں کو کس طرح جمع فرمایا گیا ہے۔
اس کا اثر احقر پر یہ ہوا کہ اس پر جو عرض کیا گیا باوجودیکہ اس کا جواب نہیں آیا۔ مگر مجھ کو ایک تنبیہ میں اس لکھنے کی ضرورت ہوئی کہ اس جواب نہ آنے کو محبت نہ سمجھا جائے۔ الی قولی، اس باب میں اہلِ علم سے مزید تحقیق کی جائے۔ (خوان خلیل: ص۹ رج ۷)

حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ نے حسن العزیز میں حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کا ایک واقعہ ذکر فرمایا ہے کہ حضرت شیخ الہند مراد آباد مدرسہ کے جلسہ میں تشریف لے گئے، لوگوں نے وعظ کے لیے اصرار کیا (مولانا وعظ سے بچتے تھے) عذر کیا مجھے عادت نہیں، لوگوں نے نہ مانا۔ آخر مولانا کھڑے ہوئے اور حدیث "**فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد**" پڑھی اور اس کا ترجمہ یہ کیا "یہ ایک عالم شیطان پر ہزار عابد سے بھاری ہے۔" وہاں ایک مشہور عالم بھی تھے وہ کھڑے ہوئے اور کہا یہ ترجمہ غلط ہے اور جس کو ترجمہ بھی صحیح کرنا نہ آئے اس کو وعظ کہنا جائز نہیں۔ بس مولانا فوراً ہی بیٹھ گئے اور کہا میں پہلے ہی کہتا تھا کہ مجھے وعظ کی لیاقت نہیں ہے اور بعد میں مولانا ان کے پاس آئے اور پوچھا کیا غلطی ہوئی، کہا اشد کا ترجمہ اضر ہے نہ کہ اثقل۔ مولانا نے کہا حدیث کیفیت وحی میں بھی یہ لفظ آیا ہے "**ویاتینی احیانا کصلصلۃ الجرس و ھو اشدہ علی**" وہاں اضر کا ترجمہ کیسے بنے گا۔ بس ان عالم صاحب کی یہ حالت کہ رنگ فق تھا اور سر سے پیر تک عرق میں ڈوبے ہوئے تھے۔ (حسن العزیز: ص۲۴۰ رج ۴)

حضرت تھانوی کے واقعات

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق یہ ناکارہ خوان خلیل کے حواشی میں حکایات شکایات سے ایک مضمون نقل کر چکا ہے اور اپنے رسالہ جوابات میں بھی نقل کر چکا ہوں جس کی تمہید میں حضرت حکیم الامۃ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مدت دراز سے مجھ پر عنایت فرماؤں کی طرف سے بے جا اعتراضوں کی بوچھاڑ ہے۔ جس میں سے اکثر کا سبب تعصب اور تحزب ہے جس کے جواب کی طرف احقر نے اس لیے التفات نہیں کیا کہ میں نے ان اعتراضوں کو قابل التفات نہیں سمجھا۔ نیز یہ بھی خیال ہوا کہ آج کل جواب دینا قاطع اعتراضات نہیں ہوتا بلکہ زیادہ مطول کلام ہو جاتا ہے تو وقت بھی ضائع ہوا اور غایت بھی حاصل نہیں ہوئی، تیسرے مجھ کو اس سے زیادہ اہم کام اس کثرت سے رہا کہ اس کام کے لیے مجھ کو وقت بھی نہیں مل سکتا تھا،

چوتھے میں نے جہاں تک دل کو ٹٹولا ایسے اعتراضوں کا جواب دینے میں نیت اچھی نہیں پائی۔ میں اہلِ خلوص کو کہتا نہیں مگر مجھ جیسے مغلوب النفس کی نیت تو زیادہ یہی ہوتی ہے کہ جواب نہ دینے میں معتقدین کم ہو جائیں گے، شان میں فرق آ جائے گا جس کا حاصل ارضاء عوام ہے سو طبعاً مجھ کو اس مقصود یعنی ارضاء عوام سے غیرت آتی ہے۔ (خوان خلیل: ص ۳۲)

اشرف السوانح میں حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ پر معترضین کی بھرمار بوچھاڑ کے ذیل میں لکھا ہے کہ حضرت والا نے اپنے معترضین کے مقابلہ میں کبھی رد کی کوشش نہیں فرمائی، بلکہ ان کے اعتراضوں پر بھی بالخصوص جہاں مظنہ نیک نیتی کا تھا، اس نیت سے نظر فرمائی کہ اگر اعتراضات میں کوئی امر واقعی قابل قبول ہو تو اس کو قبول کر کے اس پر عمل کیا جائے۔ (اشرف السوانح: ص ۶۳ ر ج ۲)

افاضات یومیہ میں حضرت الامت نقل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مولانا شہید رحمہ اللہ تعالیٰ صاحب اور حضرت سید صاحب میں ایک مسئلہ پر طویل گفتگو ہوئی۔ بالآخر مولانا شہید رحمہ اللہ تعالیٰ نے معافی چاہی اور عرض کیا کہ مجھ کو آپ کی بات بلاچوں وچرا مان لینا چاہیے تھا اس پر سید صاحب نے فرمایا توبہ کرو یہ تو نبی کا مرتبہ ہے کہ اس کی بات کو بلاچوں وچرا مان لیا جائے اور یہ بھی شرک فی النبوت ہے، مولانا شہید فرماتے ہیں کہ اس ارشاد سے مجھے شرک فی النبوت کے متعلق ایک باب عظیم علم کا مفتوح ہوا۔ (افاضات: ۱/۱ص ۹۱)

اشرف السوانح میں دوسری جگہ لکھا ہے کہ حضرت والا پر اگر کوئی کسی قسم کا اعتراض کرتا تو اس سے اپنا تبریہ فرمانے کی ہرگز کوشش نہیں کرتے بلکہ اگر وہ اعتراض علمی رنگ کا ہوتا ہے اور قابل قبول ہوتا ہے تو اس کو قبول فرما کر اپنی تحقیق سابق سے بلاتامل رجوع فرما لیتے ہیں اور ترجیح الراجح میں اپنا رجوع شائع فرما دیتے ہیں۔ یہ معاملہ تو علمی رنگ کے اعتراضات کے ساتھ فرماتے ہیں اور اگر اعتراض معاندانہ رنگ کا ہوتا ہے تو اس کی مطلق پرواہ نہیں فرماتے۔

چنانچہ اگر ایسا اعتراض بذریعہ جوابی لفافہ کے موصول ہوتا ہے تو بجائے اپنا تبریہ فرمانے کے نہایت استغناء کا جواب تحریر فرما دیتے اور ایسے عنوان سے کہ معترض پر ظاہر ہو جائے کہ اس کے اعتراض کو بالکل لغو اور غیر قابل التفات سمجھا گیا، مثلاً ایک شخص کو جس نے واہی تباہی اعتراضات لکھ کر بھیجے تھے تحریر فرما دیا کہ مجھ میں اس سے زیادہ عیوب ہیں، مگر مجھے تو اپنے عیوب کی اشاعت کی توفیق نہیں ہوتی تم ان کو مشتہر کر دو تا کہ لوگ دھوکے میں نہ رہیں اھ اور اگر خط جوابی نہیں ہوتا تو اس کو پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ (اشرف السوانح: ص ۵۴ا ر ج ۳)

ایک سلسلہ میں فرمایا کہ مولوی محمد رشید مرحوم جنہوں نے مجھ سے پڑھا تھا بڑے حق گو لیکن اس کے ساتھ بڑے باادب تھے، ایک بار میں مسجد میں بیٹھا ہوا تھا وہاں ریزگاری کی ضرورت پڑی،

ایک صاحب کے پاس موجود تھی، ان کو روپیہ دے کر میں نے ریزگاری لے لی۔ مولوی صاحب بھی اس وقت موجود تھے وہ آگے بڑھے اور مجھ سے پوچھا کہ یہ معاملہ کیا بیع میں تو داخل نہیں مجھے فوراً تنبیہ ہوا میں نے کہا کہ خیال نہیں رہا یہ معاملہ واقعی بیع ہی میں داخل ہے، جو مسجد میں جائز نہیں۔ پھر میں نے ان صاحب کو جن سے معاملہ ہوا تھا، ریزگاری واپس کر کے کہا کہ میں اب اس معاملہ کو فسخ کرتا ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ مسجد سے باہر چلو، وہاں پھر اس معاملہ کو از سرنو کریں گے، چنانچہ مسجد سے باہر آ کر اور روپیہ دے کر میں نے پھر ان سے ریزگاری لے لی۔ مولوی محمد رشید کی اس بات سے میرا جی بڑا خوش ہوا۔ کیونکہ ظاہر کرنا تو ضروری ہی تھا، لیکن انہوں نے نہایت ادب سے ظاہر کیا، یہ پوچھا کہ کیا یہ بیع میں تو داخل نہیں۔ (اضافات: ۲/۹ص ۳۵۳)

مضمون بالا بہت طویل ہے اور میرے اکابر کا معمول اس میں بہت ہی قابلِ رشک ہے۔ حقیقت میں تو یہ تواضع کے ابواب سے ہے اہمیت کی وجہ سے ان واقعات کو علیحدہ لکھوایا اور نمونہ کے طور پر علیحدہ لکھوایا۔ ان سب کا مدار اپنی کم مائیگی کے استحضار پر ہے، جتنی بھی اندر میں اپنی کم مائیگی ہوگی اور اس کا استحضار ہوگا اتنا ہی زیادہ دوسروں کے اعتراض اور تنقید پر غصہ کم آئے گا۔

حضرت شاہ عبدالرحیم سہارنپوری کے واقعات

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب سہارنپوری جو بڑے صاحب کشف و کرامات تھے سہارنپور ہی میں ان کا مزار بھی ہے۔ عیدگاہ سے سرسادہ کی سڑک پر جاتے ہوئے بائیں جانب ایک مسجد کے قریب ہے اور ان کے کشف و کرامات کے بہت قصے مشہور بھی ہیں۔ ''میرا چاند'' ان کا تکیہ کلام تھا۔ ہمارے کاندھلہ کے مولوی روشن علی خاں اپنے بچپن میں ان کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔

ایک دفعہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ وضو کر رہے تھے، ایک قندیل اوپر اڑا جا رہا تھا۔ فرمانے لگے میرے چاند! یہ دیکھا کیا جا رہا ہے۔ مولوی روشن علی صاحب نے فرمایا کہ حضرت مجھے تو پتہ نہیں یہ کیا ہے۔ فرمانے لگے یہ جادو جا رہا ہے اور مجھے اللہ نے یہ قدرت دی ہے کہ میں اس کو اتارلوں، مولوی روشن علی صاحب نے کہا ضرور اتالیں۔ حضرت شاہ صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کیا وہ نیچے اتر آئی، اس میں ایک آدمی کا پتلا بنا ہوا تھا اور اس میں بہت سی سوئیاں اوپر سے نیچے تک چبھائی ہوئی تھیں۔

حضرت نے اس سے پوچھا تو کون ہے۔ اللہ نے اس کو گویائی عطاء فرمائی، اس نے کہا میں جادو ہوں۔ حضرت نے اس سے فرمایا کہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا، اس نے بتایا فلاں جگہ سے آیا ہوں فلاں کو مارنے جا رہا ہوں۔ حضرت نے اس سے دریافت فرمایا کہ جس نے بھیجا اس کا

کہنا مانے گا یا ہمارا۔ اس نے عرض کیا کہ اب تو آپ کا ہی کہنا مانوں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ میں نے اس لیے کیا کہ نہ معلوم وہ اور کتنوں کو مارے گا۔

ایسے ہی ان کی کرامات و کشف کے سلسلہ کا دوسرا واقعہ بھی مشہور ہے کہ پنجاب سے حکیم نور الدین بسلسلہ معالجہ حضرت شاہ صاحب کے پاس آئے۔ حضرت نے ان سے فرمایا کہ حکیم صاحب پنجاب میں کوئی جگہ قادیان ہے۔ وہاں سے کسی نے نبوت کا دعویٰ تو نہیں کیا؟ حکیم صاحب نے کہا کہ کسی نے نہیں کیا، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ وہاں سے ایک شخص نبوت کا دعویٰ کرے گا اور لوح محفوظ میں آپ کو اس کا مصاحب لکھا ہے۔ آپ کے اندر ایک مرض ہے (بحث کرنے اور الجھنے کا) یہ مرض آپ کو وہاں لے جائے گا اور آپ مبتلا ہوں گے۔ ہم تو اس وقت نہ ہوں گے، مگر آپ کو پہلے سے مطلع کیے دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا اور یہ حکیم صاحب اس سے مناظرہ کرنے کے لیے گئے اور اس کے دام میں پھنس گئے اور اس پر ایمان لے آئے اور پھر اس کے خلیفہ اول ہوئے۔ (نعوذ باللہ منہ)

ہمارے اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ انہی عبدالرحیم صاحب سے بیعت تھے اور ان کے اجل خلفاء میں تھے۔ اس کے بعد حضرت امام ربانی قطب عالم گنگوہی کی طرف رجوع کیا۔ کسی نے حضرت سے پوچھا کہ آپ نے اپنے دونوں مشائخ میں کیا فرق پایا؟ تو حضرت نے جواب دیا کہ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں عجب و پندار کا سر کٹا ہوا تھا۔ درحقیقت یہ ایسا سم قاتل ہے کہ اس کی نحوست بہت ہی مہلک اور اکابر کے ہوتے ہوئے بھی اپنی نحوست دکھلائے بغیر نہیں رہتی۔

اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ حنین کی لڑائی میں سید الکونین خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہوتے ہوئے بھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ابتداء مغلوب ہونا پڑا۔ فتح مکہ کے بعد معلوم ہوا کہ حنین کے کفار یعنی قبیلہ ہوازن کے لوگوں نے جو تیر اندازی میں بہت مشہور تھے، قبائ عرب کو جمع کر کے حنین میں اجتماع کیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو یہ خیال کر کے کہ بدر کی لڑائی میں ہم چند سینکڑوں نے ایک ہزار کے چھکے چھڑا دیئے تھے یہ ہمارے سامنے کیا چیز ہیں۔ ابتداءً ہزیمت اٹھانی پڑی۔ جس کو قرآن پاک میں "و یوم حنین اذا عجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئاً" سے ذکر فرمایا گیا ہے۔ حنین کی لڑائی میں جب تمہاری کثرت نے تمہیں گھمنڈ میں ڈالا تو اس کثرت نے تمہیں کچھ کام نہ دیا اور زمین باوجود وسعت کے تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگے، حالانکہ سید الکونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم خود بہ نفس نفیس اس جنگ میں شریک تھے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرام جب مسیلمہ کذاب (جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا) کی سرکوبی کے لیے تشریف لے گئے، اعتدال میں یہ قصہ مفصل لکھا ہے کہ طلیحہ الکذاب پر فتح پانے کے بعد مسیلمہ کی جماعت سے لڑائی ہوئی جس میں بہت سخت مقابلہ ہوا اور ہزاروں آدمی اس کی جماعت کے قتل ہوئے اور مسلمانوں کی بھی بڑی جماعت شہید ہوئی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ان لوگوں کے سپہ سالار تھے۔ فرماتے ہیں کہ جب ہم طلیحہ کذاب سے فارغ ہوگئے اور اس کی شوکت کچھ زیادہ نہ تھی تو میری زبان سے ایک کلمہ نکل گیا اور مصیبت گویائی کے ساتھ وابستہ ہے۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ بنوحنیفہ ہیں ہی کیا چیز یہ بھی ایسے ہی ہیں جیسے لوگوں سے ہم نبٹ چکے ہیں۔ مگر جب ہم ان کی جماعت سے بھڑے تو ہم نے دیکھا کہ وہ کسی سے مشابہ نہیں ہیں۔ طلوع آفتاب سے لے کر عصر کے وقت تک وہ برابر مقابلہ کرتے رہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ خود اقرار فرماتے ہیں کہ ایک کلمہ زبان سے نکل گیا تھا، جس کی وجہ سے اتنے سخت مقابلہ کی نوبت آئی۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یرموک کی لڑائی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو جو عراق میں تھے ایک خط لکھا کہ عراق پر اپنا جانشین مقرر کر کے فوراً یرموک پہنچو۔ اس خط میں ان کی تعریف فرمائی تھی اور کامیابی پر مبارکباد تھی اور یہ لفظ بھی لکھا تھا "تمہارے اندر عجب ہرگز پیدا نہ ہو کہ اسی سے نقصان اٹھاؤ گے اور ذلیل ہو جاؤ گے اپنے کسی عمل پر ناز نہ کرنا۔ اللہ ہی کا احسان ہے وہی بدلہ کا مالک ہے"۔ (اعتدال: ص ۱۲۰)

عجب و پندار کے مضر اثرات اور مظاہر العلوم کی اسٹرائیک

اس ناکارہ نے اپنی زندگی میں عجب و پندار کے بہت ہی نقصانات اپنی آنکھوں سے دیکھے اور چھوٹوں کی اور نادانوں کی زبان کی بدولت بڑے بڑے اکابر کو پریشانیوں میں مبتلا دیکھا۔ واقعات تو بہت ہی کثرت سے اس ناکارہ پر اور اس کے سامنے گزرے ہیں۔ اس وجہ سے میں تو اس سے بہت ہی زیادہ ڈرنے لگا۔

ہمارے مدرسہ مظاہر علوم کی ۱۳۸۴ھ کی ناکام اسٹرائیک اسی عجب و پندار و ثمرات کا نتیجہ تھی۔ مدارس میں طلبہ کا اخراج ہوتا ہی رہتا ہے روزمرہ کے واقعات ہیں۔ لیکن اس عجب کی نحوست نے ایک معمولی طالب علم کے اخراج کو اسٹرائیک تک پہنچا دیا، اس سیہ کار کو سوچنے کا مرض بہت ہے اور خالی پڑا پڑا واقعات کا ایک دوسرے سے جوڑ پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اس ہنگامہ کی بنیاد تو اس سیہ کار کی نگاہ میں حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کا سایہ سرپرستی مدرسہ سے

اٹھنا تھا کہ حضرت قدس سرہٗ کا وصال لاہور میں ۲۴ ربیع الاول ۸۲ھ پنجشنبہ کو ہوا اور مدرسہ پر خس و خاشاک گرنے شروع ہوئے، اسی وجہ سے میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا کہ مدرسہ کے ممبران میں اہل الرائے، اہل تجربہ محاسب دنیا کے حالات سے واقف جتنے بھی ہوں لیکن ہر مدرسہ کی حیثیت کے موافق اس کے ممبران کی ایک مقدار اللہ والوں کی ضرور ہونی چاہیے۔ اہل مدارس کو بھی میں ہمیشہ یہی مشورہ دیتا رہا۔ اس کی جزئیات تو بہت ہیں جن کا یہ موقع نہیں۔ مگر مدرسہ پر تو میری نگاہ میں خس وخاشاک اسی وقت سے گرنے شروع ہوگئے تھے جب سے حضرت کا وصال ہوا اور مدرسہ حضرت قدس سرہٗ کی سرپرستی سے محروم ہوا۔

اس ایندھن پر دیا سلائی ہمارے ایک مخلص دوست کے ایک فقرہ نے لگائی اس نے جلالین کے سبق میں ایک مدرسہ کی اسٹرائیک کا ذکر کرتے ہوئے کہہ دیا کہ مظاہر میں نہ کبھی اسٹرائیک ہوئی نہ ہوگی۔ بقول حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ''البلاء موکل بالمنطق'' جو اوپر گزرا، دیا سلائی جلادی اور ایک طالب علم جس کی بہت سی شکایتیں بہت دنوں سے شاخ مدرسہ خلیلیہ کے ناظم کے پاس پہنچ رہی تھیں، سینما بازی، انگریزی بال، اساتذہ کا عدم احترام، نماز کی عدم پابندی۔ مدرسہ کے اہلِ شوریٰ کے مشورہ سے اس کا اخراج کیا گیا۔ ۱۰ ربیع الثانی کی شب میں جب کہ شاخ کے کیواڑ بند ہوگئے تو لیبر یونین کے ایک غیر مسلم لیڈر کے مشورہ پر جس سے اس کے قدیم تعلقات تھے۔ رات میں تقریر کی کہ میرا اخراج تم سب کے اتفاق سے رک سکتا ہے، ورنہ میرا تو اخراج ہو ہی گیا، لیکن اگر تم سب متفق ہوجاؤ تو میرا بھی اخراج رک سکتا ہے اور تم سب بھی اخرج سے رک سکتے ہو۔

زکریا کو پنجشنبہ ۱۰ ربیع الثانی کو یہ اطلاع ملی کہ رات شاخ میں یہ گزرا۔ اس نے اسی وقت ناظم صاحب شاخ کو بلا کر ان سے تاکید کی کہ اس ہنگامہ کی خبر لے، مگر انہیں بھی کچھ اپنی نظامت پر اس قدر گھمنڈ تھا کہ انہوں نے بہت زور سے زکریا کو اطمینان دلایا کہ آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں۔ اس کی یہ مجال نہیں کہ وہ کوئی حرکت کرسکے، ہر چند زکریا نے اس کی اہمیت بیان کی کہ اس کے پاس تفصیل پہنچ چلی تھی۔ مگر ناظم صاحب شاخ کو بہت ہی اپنے زور پر اعتماد تھا۔ انہوں نے کچھ اہمیت نہ دی۔

۱۷ ربیع الثانی شنبہ کی صبح کو معلوم ہوا کہ طلبہ شاخ نے اندر سے کیواڑ بند کرکے ایک درخواست ناظم صاحب مدرسہ کے پاس بھیجی، جس میں بہت سے لغو مطالبات پاخانوں، غسل خانوں کی عدم صفائی، شاخ کے درمیان میں ایک بہت بڑا بجلی کا بلب لگایا جائے، جو ساری رات جلے۔ منجملہ یہ بھی تھا کہ فلاں طالب علم کا اخراج ملتوی کیا جائے اور جب تک ہمارے مطالبات پورے نہ ہوں

ہم اپنا عمل جاری رکھیں گے۔ مدرسہ کے سب اکابر ناظم صاحب حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب ناظم مدرسہ مولانا امیر احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ صدر مدرس مدرسہ اور اکابر مدرسین نے بار ہا فہمائش کی۔ مگر ان کے لیڈر نے ان کو سمجھا دیا تھا کہ اتنے مطالبات پورے نہ ہوں جمے رہنا۔ اس ناکارہ نے بھی کئی دفعہ جانے کا ارادہ کیا مگر ہمارے شہر کے قاضی جناب قاضی ظفر احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے شدت سے زکریا کو منع کرایا اور کئی دفعہ آدمی بھیجا کہ تم نہ جانا، میں نے ان سے درخواست بھی کی مگر مرحوم نے بار بار آدمی بھیج کر منع کیا۔

کئی دن کی گفت وشنید افہام وتفہیم کے بعد ان نادانوں نے کیواڑ نہ کھولے تو ربیع الثانی پنجشنبہ کو ناظم صاحب شاخ اور بعض اکابر مدرسین نے جا کر زبردستی کیواڑ کھلوائے اور احتیاطاً حلقہ کے تھانہ والوں کو بھی اطلاع کردی تھی۔ وہاں حفاظتی پولیس بھی باہر پہنچ گئی اور اس ہنگامہ پر مدرسہ کے طلبہ نے بھی عصبیت جاہلیہ میں ان کا ساتھ دینے کا تہیہ کیا۔ ہر چند کہ ان کا تعلق اس واقعہ سے نہیں تھا۔ مگر مدرسہ میں بھی ایک جمعیۃ الطلبہ فوراً قائم ہوئی اور ناظم اور صدر متعین ہوکر حلفاً حلفی ہوئی کہ اتنے شاخ والوں کے مطالبات پورے نہ ہوں مدرسہ میں بھی اسٹرائیک کی جائے۔

مدرسہ کی مجلس شوریٰ میں جب یہ مسئلہ پیش ہوا تو اس سیہ کار سے بھی ایک بڑی حماقت سرزد ہوئی کہ شوریٰ میں اس سیہ کار نے بڑے زور اور گھمنڈ کے ساتھ کہا تھا کہ دورہ کا کوئی طالب علم شریک نہیں۔ ہمارے مدرسہ کے نائب مہتمم تعلیمات مولوی عبد المجید صاحب نے بڑی دبی زبان میں کہا کہ نہیں "دورہ والے" بھی ہیں۔ مگر مجھے اپنا گھمنڈ تھا کہ میں نے ان کی بڑے زور سے تردید کی کہ وہ دورہ کا کوئی شخص نہیں ہوسکتا اور اس گھمنڈ کا مبنیٰ یہ تھا کہ اس سیہ کار کو حدیث کے اسباق پڑھانے کا سلسلہ ۴۰ھ سے شروع ہوگیا تھا اور یہ ناکارہ حدیث کے طلبہ کو ہر سال بار بار ان کا مقام ان کی حیثیت اور یہ کہ تم عنقریب مقتدائے قوم بننے والے ہو، تمہارا قول وفعل امت کے لیے اسوہ بننے والا ہے اور اس سال خاص طور پر مجھے یاد ہے کہ بخاری شریف کا کوئی سبق ایسا نہیں ہوا ہوگا جس میں میں نے پانچ سات منٹ کی ادنیٰ مناسبت بلکہ بغیر مناسبت کے بھی اس مضمون کو زور شور سے نہ کہا ہو۔ اس وجہ سے مجھے بہت ہی پختہ یقین تھا کہ اس سال کے دورہ والوں کی اکثریت اپنے زمانہ کے جنید وشبلی بنیں گے۔

مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب آہستہ آہستہ یہ تحقیق ہوتی رہی کہ دورہ کی تو پوری جماعت الا ماشاء اللہ اس میں پیش پیش ہے اور زیادہ قلق اس کا ہوا کہ مجھ سے خصوصی تعلق رکھنے والے، ناظم صاحب دام مجدہم سے خصوصی تعلق رکھنے والے مولانا امیر احمد صاحب، صدر مدرس سے خصوصی تعلق رکھنے والے اس میں در پردہ شریک رہے۔ صورۃً ہم لوگوں کے ساتھ رہے اور ہماری باتیں

جو اپنے خیال میں ان سے راز میں نہیں سمجھی گئیں دوسروں تک پہنچاتے رہے۔ دورہ کی اس جماعت کے حالات پر جو قلبی چوٹ لگی ہے وہ آج دس برس تک بھی فراموش نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ اس ناکارہ کو اس جماعت کے ساتھ بہت ہی تمنائیں وابستہ تھیں:

وہ محروم تمنا کیوں نہ سوئے آسماں دیکھے
کہ جو منزل بہ منزل اپنی محنت رائیگاں دیکھے

زیادہ رنج اس بات کا ہوا کہ کذب، فریب، جھوٹی قسموں میں بھی ان لوگوں نے کوئی باک نہیں کیا، اس ہفتہ میں شاخ مقفل رہی، ان لوگوں نے مولانا عبدالحفیظ صاحب پشاوری مرحوم مدرس شاخ کو بار بار بلایا اور ہر دفعہ میں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ ہمارے لیڈر نے منع کر دیا ہے۔ ایک مرتبہ مولانا وقار صاحب مدرس اور مولانا عبدالحفیظ صاحب کو دو قاصد بھیج کر بلایا گیا۔ یہ دونوں حضرات پہنچے تو یہ کہہ کر کیواڑ کھولنے سے انکار کر دیا کہ ہم نے نہیں بلایا۔ جناب الحاج شاہ مسعود صاحب رئیس بہٹ سرپرست مدرسہ کے پاس یہ خود گئے کہ آپ سرپرست ہیں، آپ ہماری مدد کریں۔ انہوں نے کہا کہ کل دن میں آؤں گا اور دن میں جب وہ پہنچے تو باوجود بلانے کے ان کے لیے بھی کیواڑ نہیں کھولے۔

۱۲ ربیع الثانی کو جب شاخ کے کیواڑ کھلے اور چودہ طلبہ کا اخراج ہوا، جس کا اوپر ذکر آیا، تو شاہ صاحب کو اللہ جزائے خیر دے وہ ان چودہ کو بہٹ ہاؤس اپنے مکان میں یہ کہہ کر لے گئے کہ تم میرے یہاں ٹھہرو۔ میں ایک دو دن میں مدرسہ سے تمہاری معافی کرا کر اخراج واپس کرا دوں گا، مگر اصل مبنی فساد نہ آئے، لیکن یہ لوگ اس کو بھی اپنے ساتھ لے گئے، شاہ صاحب نے بہت زیادہ اہتمام ان کے کھانے کا کیا۔ مگر ان ناقدروں نے ان کے باورچی کے ساتھ بھی ہر وقت جنگ و جدل رکھا۔ مظاہر کے طلبہ بھی وہاں ہر وقت مسلط رہتے تھے۔

شاہ صاحب نے تنگ آ کر چند روز بعد ان کی مہمانی سے معذرت کر دی، مگر انہوں نے شاہ صاحب کے مکان سے جانے سے انکار کر دیا، سڑک پر سے گزرتے ہوئے جب لوگ شاہ صاحب کے ملازمین سے پوچھتے کہ یہ شاہ صاحب کے مکان میں کیا ہنگامہ ہو رہا ہے تو ان کے ملازمین کہتے کہ چند مولویوں کو شاہ صاحب نے مہمان بنا لیا تھا وہ اب جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اس وقت اللہ کی وہ کھلی مددیں ہوئیں کہ ان کی تفصیل تو بہت ہی زیادہ لمبی ہے اور میرے کاغذات میں سب محفوظ ہے، یہاں تفاصیل کا موقع نہیں۔

سب سے بڑا احسان حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ہے کہ ہنگامہ کی خبر سننے کے بعد تقریباً فرو ہونے تک گویا سہارنپور ہی میں رہے۔ ایک دو دن کے واسطے نظام الدین

تشریف لے جاتے۔ ہنگامہ کے شروع ہی میں انہوں نے اپنی ایک تبلیغی جماعت کو علی التبادل دار الطلبہ جدید کی مسجد میں مستقل ٹھہرادیا جوذکر و تلاوت اور ادعیہ میں مصروف رہتے اور چونکہ مولانا کا بھی قیام اس زمانہ میں زیادہ یہیں رہا، اس لیے کلکتہ، بہار، مدراس اور مختلف اضلاع وصوبہ جات کی جو جماعتیں نظام الدین آتیں وہ بھی مولانا کے وہاں ہونے کی وجہ سے یہاں آتی رہیں اور ہر صوبہ والے اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطاء فرمائے اپنے اپنے صوبہ کے طلبہ کو بہت ہی سمجھاتے رہے، مگران پر اصلاح کا وہ جذبہ غالب تھا کہ اپنے صوبہ کے بڑوں کا بھی احترام نہ کیا۔

اہلِ کلکتہ جناب الحاج غلام رسول صاحب وغیرہ ۳۰ ربیع الثانی کی شب میں کلکتہ کی بڑی جماعت کے ساتھ سہارنپور پہنچے دراصل تو نظام الدین آئے تھے مگر مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ان کو سہارنپور بھیج دیا کہ بنگالی طلبہ کو سمجھائیں۔ حاجی صاحب کا قیام ہفتہ عشرہ رہا، ان کے رفقاء واپس جاتے رہے اور دیگر اہلِ کلکتہ آتے رہے حاجی صاحب نے بھی بہت کوشش کی ان سورماؤں کو سمجھانے کی مگر ان سب کا ایک ہی جواب تھا کہ ہم حلف اٹھا چکے ہیں کہ صدر اور ناظم صاحب کی اجازت کے بغیر کوئی اقدام نہیں کر سکتے۔ حالانکہ یہ مدرسہ کے داخلہ فارم پر جو شرائط داخلہ لکھی گئی ہیں، اس میں نمبر۱۲ یہ ہے کہ تم قیام مدرسے کے زمانہ میں کسی انجمن یا جماعت بنانے یا اس میں شریک ہونے اور کسی قسم کا رسالہ وغیرہ نکالنے کے ہرگز مجاز نہ ہوگے اور اس فارم پر ان کا حلفیہ بیان اور تصدیق کے دستخط ہوتے ہیں، مگر مدرسہ کا حلف تو ان کے نزدیک نا قابلِ اعتبار تھا۔

کلکتہ کے بعض لوگوں نے مجھ سے خود بیان کیا کہ کئی سال ہوئے، شاہی مسجد مرادآباد میں ایک اسٹرائیک ہوئی تھی، وہاں کے طلبہ نے ہم لوگوں کو اپنی مظلومیت کی جو داستانیں لکھیں اور ہمارے یہاں کے اخبارات میں شائع ہوئیں اس کی بناء پر ہم لوگوں نے مظلوم طلبہ کی بہت ہی حمایت اور مدد کی، ان کے اصرار پر مدرسہ کا چندہ بند کرانے کی بہت کوشش کی۔ مگر جو مناظر ہم کئی روز سے یہاں دیکھ رہے ہیں اس سے تو بہت رنج ہوا اور اپنی ناپاک حرکت پر بہت ہی ندامت ہے۔ اب واپس جا کر مدرسہ شاہی کو ہماری کوششوں سے جو نقصان پہنچا ہے، اس کی بہتر تلافی کریں گے۔ بہار کی ایک جماعت نے مجھ سے کہا کہ بہار کے اخبارات میں تو یہاں کے متعلق جو واقعات ہم پڑھ کر آئے ہیں اور فلاں فلاں طلبہ کے دستخطوں سے شائع ہوئے ہیں، یہاں آکر تو بالکل ہی ضد دیکھی۔

مولانا الحاج اسعد مدنی کو بھی اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطاء فرمائے کہ وہ بھی بار بار اس ہنگامے کے دوران دو تین گھنٹے کے لیے اکثر آتے رہتے تھے۔ ان سورماؤں کے رکن اعظم چونکہ حضرت شیخ

الاسلام مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے عقیدت کا بھی دم بھرتے تھے۔ اس لیے مولانا اسعد صاحب نے اور حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے متعدد اعزہ نے ان کو بار بار سمجھایا مگر وہ تو اس وقت اسلام اور دین اور علم کی کوشش میں منہمک تھے، ان پر حضرت شیخ الاسلام یا ان کے اخلاف کیا اثر ہوتا۔

۱۹ ربیع الثانی کو لکھنؤ سے واپسی پر مولانا اسعد صاحب کے ساتھ مولانا عبدالرحیم صاحب صدر مدرس مدرسہ دھامپور بھی آئے تھے جنہیں دیوبند جانا تھا مگر مولانا اسعد صاحب نے ان سے کہا کہ ان میں آپ کے بھی تو شاگرد جو دھامپور سے پڑھ کر آئے ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ کئی ہیں۔ مولانا اسعد صاحب نے ان کا دیوبند جانا ملتوی کر دیا۔ جس کو مولانا عبدالرحیم صاحب نے بھی بہت ضروری سمجھا اور کئی دن یہاں قیام کر کے اپنے شاگردانِ رشید کو بہت سمجھایا، مگر اس وقت ان کے افہام اپنے سب اکابر سے اونچے پہنچے ہوئے تھے۔

مولانا محمد قاسم صاحب شاہجہان پوری نائب ناظم جمعیۃ علماء یوپی ۲۸ ربیع الثانی کو مظفر نگر میں تعلیمی کانفرنس کے افتتاح کے لیے شب میں تشریف لائے۔ اشتہارات میں اخبارات میں ان کا افتتاح شائع بھی ہو چکا تھا مگر جب سہارنپور کے اسٹیشن پر ان کو مظاہر کے ہنگامہ کا حال معلوم ہوا تو اس ناکارہ پر احسان فرمایا اور اپنا مظفر نگر کا سفر ملتوی فرما کر مدرسہ تشریف لے آئے۔ ایک ہفتہ تک یہاں قیام کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہت جزائے خیر عطاء فرمائے کہ انہوں نے اپنے بہت ضروری کاموں کا حرج بھی کیا۔

۳۰ ربیع الثانی کی صبح کو حضرت ناظم صاحب کا قاصد پہنچا جب کہ یہ ناکارہ مہمانوں کو چائے پلا رہا تھا کہ طلبہ نے دارالطلبہ کے دونوں زینوں پر ہجوم کر رکھا ہے، دربان کو گھنٹہ بجانے سے منع کر دیا۔ میں نے قاصد سے کہا کہ میں حاضر ہو رہا ہوں، خود ہی گھنٹہ بجا دوں گا آپ فکر نہ کریں۔ مگر مولانا محمد قاسم صاحب نے پیش قدمی کی اور اپنی پیالی نہایت عجلت سے پوری کر کے دارالطلبہ جا کر خود گھنٹہ بجایا۔ بعض سور ماؤں نے ان سے بھی مزاحمت شروع کی مگر ان کی اکثریت نے شدت سے مخالفت کی کہ ان کو نہ چھیڑو۔ مولانا نے جا کر گھنٹہ بجایا، پیچھے پیچھے یہ ناکارہ بھی پہنچ گیا اور مدرسین حضرات سے درخواست کی کہ اسباق کے لیے درس گاہوں کا ہونا ضروری ہے نہ کہ چٹائیوں اور بوریوں کا، زمین پر بیٹھو اور اسباق شروع کراؤ۔

مدرسین حضرات کو اللہ جزائے خیر دے کہ انہوں نے بلا تامل زمین پر بیٹھ کر اسباق شروع کرا دیے۔ مولانا امیر احمد صاحب صدر مدرسہ مرحوم نے دارالطلبہ کے بیچ میں چبوترے پر بیٹھ کر سبق شروع کرایا، مگر ایک طالب علم نے اپنے حجرہ سے جا کر فوراً دوتہی لا کر بچھا دی، اس پر دوسرے مدرسین حضرات کے نیچے بھی طلبہ نے اپنے اپنے کپڑے بچھا دیے اور اسباق شروع ہو گئے۔ ایک

گھنٹہ کا بھی سبق ضائع نہیں ہوا۔ اسی لیے میں اس اسٹرائیک کونا کام اسٹرائیک لکھا کرتا ہوں۔

ابتداء میں تو ہر جماعت میں نصف سے زائد تھے، مگر سبق شروع ہونے کے بعد چند سورماؤں کے سواخواستہ یانخواستہ سبھی اسباق میں شریک ہوئے۔ اسی دوران میں جناب الحاج ابراہیم اسحاق ممباسہ افریقی نظام الدین آئے تھے اور مولانا یوسف صاحب کے ارشاد پر فورا سہارنپور آئے اور عشاء کے وقت پہنچے۔ انہوں نے کھانے کے دوران مجھ سے فرمایا کہ میرے جواہر لال سے بہت خصوصی تعلقات ہیں۔ اگر تو اجازت دے تو میں ابھی رات کی گاڑی سے دلی واپس جاؤں اور یہاں کے حکام کے نام وزیراعظم کا حکم بلا تردد لاسکتا ہوں کہ ان سب شورش پسند مفسدوں کو شہر بدر کر دیا جائے۔

میں نے شدت سے منع کر دیا کہ میں تو یہاں کے حکام تک بھی ان کے خلاف کوئی چیز پہنچانا نہیں چاہتا۔ گو یا لوگ ہماری جھوٹی شکایتیں حکام تک بلکہ لکھنؤ تک بھیج رہے ہیں۔ اسی پر حاجی صاحب نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں ان کے صدر سے بات کرلوں۔ میں نے کہا بڑے شوق سے۔ میں نے اسی وقت ایک آدمی اعلیٰ حضرت صدر صاحب کی خدمت اقدس میں بھیجا کہ میرے ایک معزز مہمان فلاں صاحب افریقہ سے آئے ہیں تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ مدرسے کے مہمان خانہ میں تم ان سے آکر مل لو۔ انہوں نے جواباً ارشاد فرمایا:

''ہمیں کسی سے ملنے کی ضرورت نہیں، جس کو ملنا ہو ہم سے یہاں آکر مل جائے۔

مجھے تو اس جواب کی ندامت شرمندگی آج تک ہے۔ مگر حاجی صاحب کو اللہ بہت بلند درجہ عطاء فرمائے، انہوں نے فرمایا کہ صحیح ہے کہ ملنے کی غرض تو ہماری ہے میں وہیں جا کر ان سے ملوں گا۔ میں نے مدرسہ کے ایک منشی کے ساتھ ان کو دارالطلبہ بھیج دیا۔ جو ان کے صدر صاحب کے حجرہ تک پہنچادے۔ حاجی صاحب تشریف لے گئے۔

انہوں نے حجرہ ہی میں بیٹھے ہوئے صدر صاحب سے کہا کہ ہم آپ سے تنہا گفتگو کر سکتے ہیں، مدرسے کا کوئی آدمی ساتھ نہ ہو، صدر صاحب نے منشی کو واپس کر دیا اور تنہا ان سے گفتگو کی۔ حاجی صاحب نے ان سے اسٹرائیک کی وجوہ پوچھیں، جس کو انہوں نے اپنے زعم میں بہت ہی مدلل بیان کیا۔ حاجی صاحب نے پوچھا کہ آپ لوگ مدرسہ میں کتنی فیس داخل کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے مدرسہ میں فیس نہیں ہوا کرتی۔

سوال: آپ لوگ فارغ ہونے کے بعد مدرسہ کی کیا خدمت کرتے ہیں؟

جواب: کوئی متعین نہیں، جس کو جو توفیق ہو۔

سوال: آپ لوگ کھانے کا اپنے خود انتظام کرتے ہیں یا مدرسہ میں قیمت داخل کرتے ہیں؟

جواب: ہمارا کھانا مدرسہ کی طرف سے مفت ملتا ہے، وغیرہ وغیرہ چند سوال جواب ہوئے۔

حاجی صاحب نے ان سے کہا کہ ہم لوگوں کو مزدوروں کی اسٹرائیک سے بہت سابقے پڑتے ہیں اور خوب پڑتے ہیں۔ ان کے مطالبہ کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ محنت ہم کرتے ہیں، کماتے ہم ہیں اور ہماری کمائی میں سے ہم کو حصہ محنت سے کم ملتا ہے۔ آپ لوگ نہ مدرسہ کی کوئی مدد کرتے ہیں نہ کما کر اس کو کچھ دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف مدرسہ آپ کو مفت کھانا دیتا ہے، مفت کتابیں دیتا ہے، مفت کپڑا دیتا ہے۔ پھر آپ کا کیا زور ہے کہ آپ اسٹرائیک کریں۔

تین گھنٹے تک حاجی صاحب ان کو سمجھاتے رہے مگر اخلاص کے جذبہ نے حاجی صاحب کی کوئی بات قبول نہ ہونے دی۔ بالآخر مجبور ہو کر ۲ جمادی الاولیٰ کو رؤس المفسدین چھ طلبہ کے اخراج کا اعلان مدرسہ کے بورڈ پر چسپاں کیا گیا۔ اس پر ان لوگوں نے لکھ دیا کہ یہ اخراج غیر قانونی ہے۔ لہٰذا نا قابلِ تسلیم ہے۔ اس پر جناب الحاج مولوی ظہور الحق صاحب بیرسٹر سہارنپور سے مشورہ کیا گیا۔ انہوں نے اسی مضمون کو قانونی الفاظ میں لکھ کر دیا، جس کو چسپاں کیا گیا۔ اس پر ۴ جمادی الاولیٰ کو ان چھ طلبہ کا اخراج کیا گیا۔ جس پر ان کے حامیوں نے از خود کتابیں داخل کرنا شروع کیں، جو بطیب خاطر قبول کر لی گئیں اور شام تک خارجین کی تعداد ساٹھ تک پہنچ گئی۔ جب انہوں نے اپنی مغلوبیت دیکھی تو شہر کے ایک لیڈر کی خوشامد درآمد کر کے کلکٹر صاحب اور ایس پی کی خدمت میں اس کی کوشش کی کہ اخراج واپس ہو جائے۔

سہارنپور کے جج صاحب جو حضرت ناظم صاحب کے خاص معتقدین میں تھے اور ان ہی کی وجہ سے اس ناکارہ سے بھی کبھی کبھی ملاقات کر لیا کرتے تھے۔ ان تک لیڈر صاحب مذکور کی معرفت پر پہنچا کہ زکریا یہ کہتا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں جج صاحب کے مشورہ سے کر رہے ہیں اور اسی قسم کی ایک درخواست لکھنؤ بھی بھیج دی۔ جس پر جج صاحب کو جتنا بھی رنج ہم لوگوں سے ہو قرین قیاس اور ضرور ہونا چاہیے تھا۔ چونکہ حکام سے یہ ہنگامہ واقعہ سے بھی زیادہ بھیانک صورت میں پہنچایا جا رہا تھا۔ اس لیے شہر کے چار حلقوں کے چار تھانیداروں کو باخبر اور متنبہ رہنے کی ہدایت تھی۔ وہ غریب بار بار دن میں اور رات میں کئی کئی دفعہ آتے، حالات کی تحقیق کرتے۔ ان کو یہ باور کرایا گیا کہ یہ درحقیقت زکریا کی اور ناظم صاحب کے اقتدار کی جنگ ہے۔ زکریا چاہتا ہے کہ ناظم صاحب کو نظامت سے ہٹا کر اپنے سمدھی جناب الحاج محمد ایوب صاحب کو ناظم بنایا جائے۔ یہ سب داروغہ بہت ہی حیرت میں تھے کہ ہم جب ناظم صاحب سے کسی بات کو پوچھتے ہیں، ان کا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ اتنے شیخ سے مشورہ نہ کر لوں کوئی جواب نہیں دے سکتا اور زکریا سے جب وہ گفتگو کرتے تو اس کا یہ جواب ہوتا تھا کہ

میں اتنے ناظم صاحب سے بات نہ کرلوں اتنے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

بعض تھانیداروں نے مجھ سے خود بیان کا کہ طلبہ کی بات کا ہم یقین نہ کرتے مگر آپ کے مدرسہ کے بعض ذمہ داروں نے ہم سے یہ بات کہی ہے۔ میں نے زور سے اس کی تردید کی آپ کو میرے اور ناظم صاحب کے تعلقات کا خود ہی اندازہ ہوگیا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ حیرت اس پر ہو رہی ہے کہ ہم آنکھوں سے تو یہ مشاہدہ کررہے ہیں اور روایات یہ سن رہے ہیں۔ ان لوگوں نے ناظم سے بھی یہ اشکال کیا۔ ناظم صاحب نے جواب دیا کہ میں تو شیخ ہی کے حکم پر اس مصیبت کو بھگت رہا ہوں۔ اگر وہ کسی دوسرے کو تجویز کرنا چاہیں تو میں بڑے شوق سے استعفیٰ دوں گا اور ہر نوع سے نئے ناظم کی اعانت کروں گا۔ اسی دوران میں حضرت ناظم صاحب میرے پاس آئے کہ محلّہ کے فلاں فلاں نے ہمارے سامنے یہ کہا ہے کہ یہ صرف اقتدار کی لڑائی ہے، ان کا اصرار ہے کہ ان صاحب کو بلا کر ہمارے سامنے حلف اٹھوادیں کہ انہوں نے یہ نہیں کہا ہے ورنہ ان کو مدرسہ سے فوراً علیحدہ کیا جائے وہ فساد پھیلا رہے ہیں۔ ناظم صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ وہ سب مدرسہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، اگر آپ مشورے دیں تو میں ان صاحب کو ان سب کے سامنے بلا کر دریافت کروں۔ میں نے عرض کیا بالکل نہیں، ہرگز نہیں۔ آپ ان حضرات کا شکریہ ادا کیجئے کہ انہوں نے ہماری مدد کی اور ان سے کہہ دیجئے کہ آئندہ بھی اس قسم کی کوئی بات آپ کے علم میں آئے تو ناظم صاحب کو مطلع کردیجئے اور ہم آپس میں مشورہ کے بعد اس کا تدارک کریں گے۔

قصہ کہاں سے کہاں چلا گیا۔ مجھے تو صرف یہ کہنا تھا کہ تین شخصوں کے گھمنڈ اور پندار نے جن میں سب سے زیادہ اس سیہ کار کا غرور و پندار تھا یہ ہنگامہ پیدا کیا اور جب اس کی سمیت نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہوتے ہوئے حنین میں اپنی مضرت دکھلائی اور یمامہ کی لڑائی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو یہ کہنا پڑا کہ یہ ساری مشقت میرے ایک جملہ کی وجہ سے تھی، جو میری زبان سے نکل گیا تھا، تو ماوشما کا شمار ہی کیا۔ اس سے بچنے کی بہت ضرورت ہے کہ بڑی نقصان وہ ہے۔

اسی اسٹرائیک کے واقعہ کے ذیل میں ''تحدیث بالنعمۃ'' کے طور پر مجھے خیال آیا کہ اپنے حج کے اسفار کا تذکرہ بھی اسی موقع پر کروں کہ میرے مسلسل اسفارِ حجاز کا سلسلہ اسی اسٹرائیک کے بعد ایسا شروع ہوا کہ تلافی مافات ہوگئی:

عدو شرے بر انگیزد کہ خیر ما دراں باشد

ناکارہ کا سفرِ حج ۹۰ھ

مظاہر کی اس اسٹرائیک کے بعد میرے مسلسل سفرِ حجاز حج وعمرہ ہوتے رہے جن کی تفصیل آپ بیتی نمبر ۴ میں گزر چکی ہے۔ وہ رسالہ چونکہ ۹۰ھ میں طبع ہو گیا تھا اور اس میں آخری سفرِ حج ۸۹ھ کی تفصیل آئی تھی۔ دو سال سے احباب کا شدید اصرار تھا کہ اس کے بعد کا سفر لکھواؤں، جس کا کوئی جوڑ تو اب تک سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ مگر اس سیہ کار کے اسفارِ حج کا سلسلہ اسٹرائیک ہی کے بعد سے اللہ کے فضل سے شروع ہوا۔ اس لیے اس کے بعد کے سفرِ حج کا ذکر بھی متبعاً ذکر کر دینا بہیں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

آپ بیتی نمبر ۴ میں لکھ چکا ہوں کہ ذی الحجہ ۸۸ھ کے سفرِ حج میں یہ ناکارہ مولانا انعام الحسن صاحب کے ساتھ بوجوہ حاضر نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن اس سال مکہ مکرمہ میں بہت ہی طوفانی بارش کہ حرم کعبہ کے دروازہ تک پانی پہنچ گیا اور کاریں اتنی کثرت سے بہیں کہ حد وحساب نہیں اور اموات بھی کثرت سے ہوئیں۔ نہ معلوم کس جذبہ کے تحت علی میاں نے جو مولوی انعام الحسن صاحب کے ساتھ حج کے موقع پر جانے کے حامیوں میں تھے، بہت ہی شدت سے اس وقت حجاز جلد حاضری کا اصرار کیا اور ان کے شدید اصرار پر جیسا کہ آپ بیتی نمبر ۴ میں تفصیل سے گزر چکا ہے کہ ۵ صفر ۸۹ھ مطابق ۱۵ دسمبر کو مدینہ پاک سے بہ نیت ہند واپسی ہوئی۔ ۲۱ دسمبر یکشنبہ کو مکہ سے جدہ اور ۱۱ شوال ۸۹ھ مطابق ۲۲ دسمبر ۶۹ء کو جدہ سے کراچی پہنچے اور وہاں ڈھڈیاں، سرگودھا، لائل پور کے اسفار کے بعد ۱۰ ذیقعدہ ۸۹ھ مطابق ۱۹ جنوری ۷۰ء دوشنبہ کو کراچی سے دہلی کے لیے روانگی ہوئی اور ڈیڑھ گھنٹے میں دہلی پہنچ گئے۔ بہت ہی بڑا مجمع دہلی میں مطار پر تھا مگر حضرت نظام الدین بھوپال کے اجتماع میں گئے ہوئے تھے۔

جناب الحاج بھائی محمد شفیع صاحب نے مطار ہی پر مولانا انعام صاحب اور مولانا عمران خاں صاحب کا پیغام پہنچایا کہ میں طیارہ سے یا فرسٹ کلاس سے بھوپال روانہ ہو جاؤں۔ میرا بھی حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی نور اللہ مرقدہٗ کی زیارت کی وجہ سے بہت ہی جی چاہ رہا تھا، مگر ہجوم بہار، بنگال، بمبئی کلکتہ، علی میاں، مولانا منظور نے بھی اس ناکارہ کی وجہ سے بھوپال کے اجتماع کی شرکت ملتوی کر رکھی تھی، اس لیے نہ جا سکے۔ بہت افسوس کے ساتھ ٹیلیفون سے معذرت کرا دی۔

اسی وقت مولانا انعام صاحب نے اطلاع دی کہ میں بذریعہ طیارہ واپس آ رہا ہوں۔ اس لیے نظام الدین میں قیام کرنا پڑا اور ۱۳ ذیقعدہ مطابق ۲۲ جنوری پنجشنبہ کو نظام الدین سے چل کر

سہارنپور پہنچنا ہوا۔ سب ہی کو حیرت رہی اور خود مجھے بھی کہ گزشتہ سال حج کے موقع پر مولانا انعام صاحب کے ساتھ حاضری نہ ہوسکی اور حاضری ہوئی تو حج کے بعد اور واپسی ہوئی ذیقعدہ میں عین حج کے وقت نہ تو حجازی دوستوں میں سے کسی کی سمجھ میں آیا نہ ہندی پاکی اور خود میری بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے بعد احباب حرمین کے اصرار تو ہر وقت موقع حج پر ہوتے رہتے ہیں، غیر موقع حج میں بھی۔ مگر:

قدم یہ اٹھتے نہیں اٹھائے جاتے ہیں

چونکہ ۸۸ھ کے سفر حج میں یہ ناکارہ مولانا انعام الحسن صاحب کے ساتھ نہیں تھا اور اس پر اہلِ حجاز پاکی اور غیر ملکی احباب کو بہت رنج وقلق ہوا جس کا سبھی دوستوں نے مولانا انعام صاحب سے اظہار کیا اس لیے (حج ۹۰ھ) کے سفر میں اس سیہ کار کا جانا گویا ۸۸ھ ہی سے طے شدہ تھا۔ مگر اس سال کے سفر میں نظام الدین میں بہت زیادہ بے ترتیبی اور گڑبڑ رہی۔ تاریخوں میں کئی مرتبہ ناسخ منسوخ ہوتا رہا۔ آخری تجویز یہ قرار پائی کہ زکریا ۲۳ جنوری ۷۱ء کو سہارنپور سے روانہ ہوئے اور ۲۵ کو دہلی سے بمبئی حضرات دہلوی کے ساتھ روانگی ہوئی اور ۲۹ ذیقعدہ ۹۰ھ مطابق ۲۷ جنوری ۷۱ء کو بمبئی سے جدہ کے لیے روانگی ہوئی۔ مگر جناب الحاج محمد یعقوب صاحب کا برقیہ پہنچا کہ سفر ایک ہفتہ مقدم ہوگیا۔ لہٰذا نہایت عجلت میں سفر کے نظامات متغیر کرنے پڑے۔

۱۵ ذیقعدہ ۹۰ھ مطابق ۱۳ جنوری ۷۱ء بدھ کو نظام الدین کی مستورات عزیزان مولوی اظہار و ہارون، زبیر سلمہم کے ہمراہ دو کاروں میں ایک حاجی شفیع صاحب کی، دوسری بھائی کرامت کی سہارنپور پہنچے اور مولانا انعام الحسن صاحب کا یہ پیام کہ تو اپنی آمد کے لیے دونوں رکھنی چاہے تو دونوں رکھ لے اور ایک رکھنی چاہے تو بھائی کرامت کا ڈرائیور اس سے پہلے کبھی ان اسفار میں زکریا کے ساتھ نہیں رہا، راستوں سے واقف نہیں تھا۔ اس لیے بھائی شفیع صاحب کی گاڑی اپنے لیے روک لی اور کرامت کی گاڑی میں بھائی اکرام مرحوم عزیزان ہارون زبیر وغیرہ نظام الدین روانہ ہوگئے اور زکریا پنجشنبہ ۱۶ ذیقعدہ ۹۰ھ مطابق ۱۴ جنوری گنگوہ اور وہاں سے دس بجے سیدھے رائپور حاضر ہوا اور بعد عصر رائپور سے واپسی ہوئی۔ جناب الحاج حافظ عبدالعزیز صاحب گم تھلوی پہلے سے رائپور شریف تشریف رکھتے تھے۔ ایک دن قبل لودھی پور جا چکے تھے۔ تجویز تو یہ تھی کہ وہ جمعرات کے دن دوپہر تک تشریف لے آئیں گے۔ مگر واپسی نہ ہوئی۔

۱۸ ذیقعدہ مطابق ۱۶ جنوری کو براہِ دیوبند ساڑھے چھ بجے سہارنپور سے چل کر سات بجے دیوبند اور دس بجے وہاں سے اٹھ کر پونے بارہ بجے میرٹھ حضرت میرٹھی کے مزار پر گزرتے ہوئے ۱۲ بجے ننھے خان کے مکان پر پہنچے۔ رفقاء نے وہاں کھانا کھایا، زکریا نے وہاں مردوں اور عورتوں کو بیعت

کر کے سوا بجے وہاں سے چل کر چند منٹ حاجی شفیع صاحب کے کوکا کولا کے کارخانہ پر ٹھہرتے ہوئے تین بجے نظام الدین پہنچے۔

۱۸ جنوری کو ۹ بجے دہلی سے طیارہ کی پرواز کی اطلاع تھی۔ اس لیے صبح آٹھ بجے بھائی کرامت کی گاڑی میں کہ انہوں نے اپنی گاڑی کے لیے پہلے سے طیارہ تک لے جانے کی اجازت لے رکھی تھی سوار ہوکر مطار کے اندر کے حصہ میں پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بمبئی جانے والا طیارہ تو ابھی تک دہلی نہیں پہنچا کلکتہ کھڑا ہے۔ اس لیے زکریا اپنی کار میں رہا اور مولانا انعام صاحب نے کار سے باہر کھڑے ہوکر دعاء کرائی۔

علی میاں اور مولانا محمد منظور صاحب حاجی شفیع صاحب کی کار میں پہلے سے مطار کے اندر پہنچ چکے تھے اس لیے اطمینان تھا کہ وہ تو طیارہ تک پہنچ ہی جائیں گے۔ مگر عین وقت پر معلوم ہوا کہ صرف کار میں جو ہیں وہی جاسکتے ہیں۔ اسی لیے مولوی انعام صاحب نے کار میں ایسے لوگوں کو تجویز کیا جو آگے جانے والے نہ ہوں اور خود مع زبیر ہارون وغیرہ کے کار سے اتر گئے اور کار میں صرف سلمان، شاہد زکریا کے ساتھ طیارہ تک پہنچے۔ علی میاں وغیرہ سے الوداعی ملاقات نہ ہونے سے بہت قلق ہوا کہ پہلے سے اطمینان تھا کہ طیارہ پر الوداع ہوگی۔ مگر زکریا کی کار کے طیارہ پر پہنچنے پر یہ معلوم ہوا کہ جانے والوں کے علاوہ بجز سلمان، شاہد کے یہ اٹھانے والوں میں تھے اور کسی کو طیارہ تک آنے نہیں دیا۔

طیارہ ایک گھنٹہ لیٹ ہونے کی وجہ سے سوا دس بجے چل کر ۱۲ بجے بمبئی پہنچا، وہاں طیارہ کی کرسی پر زکریا باہر گیا اور عزیزان ابوالحسن زبیر میرے ساتھ رہے، بقیہ سب احباب معروف راستہ سے کسٹم میں ہوکر آئے، مطار پر بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں، مولوی انعام صاحب نے اول بڑی طویل دعاء کرائی، اس کے بعد بھائی عبدالکریم ماہیم والوں کی گاڑی میں زکریا، ابوالحسن طلحہ کو ان کے گھر بھیج دیا اور مولانا انعام الحسن صاحب مع بقیہ رفقاء کے بہت دیر میں پہنچے۔ عزیزان ابوالحسن اور طلحہ بمبئی تک پہنچانے کے لیے گئے تھے۔ آیندہ سفر میں دونوں ساتھ نہیں تھے۔

جناب الحاج مفتی محمود حسن صاحب بھی اس سال بعض احباب کے اصرار پر بذریعہ طیارہ حج کو جارہے تھے اور ہم سے ایک ہفتہ قبل بمبئی پہنچ چکے تھے اور وہ دن مفتی صاحب کی روانگی کا تھا۔ چنانچہ وہ حسب قرارداد عصر کے وقت احرام باندھ کر ہم سے رخصت ہوکر مطار پہنچے۔ رات کو ساڑھے دس بجے مطار سے ان کا ٹیلیفون پہنچا کہ جہاز جدہ سے نہیں آیا۔

منگل ۱۹ جنوری کو صبح کو مفتی صاحب احرام کی حالت میں ہمارے مستقر پر پہنچے اور یہ خبر لائے کہ جدہ کا جہاز جو حجاج کو لے جانے والا تھا وہ رات نہیں پہنچا اور ۱۸ جنوری دوشنبہ کی صبح جو بمبئی سے

جدہ گیا تھا وہ جدہ پر روک دیا گیا اور واپس نہیں آیا۔ اس لیے سارے ہندوستان کی طرح سے بمبئی بھی لڑا کا شہر قرار دے دیا تھا۔ پہلے سے بمبئی مستثنیٰ تھا۔ اس دن اور بدھ کے دن بلکہ جمعرات جمعہ کو بھی کوئی طیارہ حاجیوں کا بمبئی سے نہیں چلا۔

جناب الحاج بھائی یونس سلیم صاحب بھی کسی سرکاری ضرورت سے اور ہم لوگوں سے ملاقات کی وجہ سے دہلی سے بمبئی پہنچ گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ انہوں نے ہماری اور سارے جہازوں کی روانگی کے سلسلہ میں بہت ہی جدوجہد کی۔ نیز بمبئی کے حج کمیٹی والوں نے اور سفیر ہند مقیم جدہ نے بھی بہت ہی سعی کی۔ امیر فیصل صاحب سے بار بار ٹیلیفون پر گفتگو کرتے رہے۔

جمعرات کی صبح کو یونس صاحب یہ مژدہ لے کر آئے قرنطینہ یہاں ہوگیا اور جمعہ سے بمبئی سے طیاروں کی روانگی شروع ہوجائے گی، یونس سلیم صاحب کی بہت کوشش سے زکریا مولوی انعام اور ایک رفیق صرف تین ٹکٹوں کی اجازت ہوئی اس لیے کہ مفتی صاحب والا جہاز جو کئی دن سے کھڑا تھا اس کی سواریاں مقدم تھیں مگر مولانا الحاج انعام الحسن صاحب نے پنجشنبہ کی شب میں کراچی ٹیلیفون کرایا تھا کہ یہاں سے جدہ جہازوں کی پرواز بند ہے۔ کوئی صورت ایسی نہیں ہوسکتی ہے کہ ہم کراچی کے راستہ کو جاسکیں۔

جناب الحاج محمد یعقوب صاحب بمبئی والے اور دیگر احباب بمبئی بھی اس سلسلہ میں مختلف کوششیں دن رات کرتے رہے کہ کسی دوسری کمپنی کے جہاز میں براہِ راست جدہ کے علاوہ کسی کویت وغیرہ کے راستے سے جانے کی صورت پیدا ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ ان دوستوں کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے۔ جناب الحاج یونس سلیم صاحب کی پیشکش پر مولوی انعام صاحب نے کہہ دیا کہ تین آدمی تو صرف زکریا کو چاہیے ہم نے کراچی ٹیلیفون کررکھا ہے۔ شاید وہاں سے کوئی صورت سہولت کی پیدا ہوجائے۔

کراچی سے جناب الحاج پوری صاحب اور بھائی یوسف رنگ والوں کا ٹیلیفون آیا کہ تم کسی بھی جہاز میں کراچی آجاؤ۔ یہاں سے روانگی بہت آسان ہے۔ مگر چونکہ ہم لوگوں کے پاس کراچی کا ویزا نہیں تھا۔ بغیر ویزا کے محض اس اطمینان پر کہ مطار پر ویزا مل جائے گا جانا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ احباب بمبئی جناب الحاج محمد یعقوب صاحب اور دیگر احباب کو اللہ جل شانہ بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ انہوں نے بمبئی سے کراچی کے لیے ویزا حاصل کرلیا۔

دو دن اہلِ بمبئی بھی دن رات جدوجہد اور گردش میں رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ ان کی مساعی جمیلہ سے یہ مسئلہ حل ہوگیا اور اتفاق کی بات کہ پنجشنبہ ۲۱ جنوری ۷۱ء

ہی کو مطار سے ۱۲ بجے کے قریب ان دوستوں کا ٹیلیفون پہنچا کہ ایک افریقی جہاز دو بجے کراچی ہوتا ہوا افریقہ جارہا ہے۔ اس میں جملہ رفقاء نو آدمیوں کے ٹکٹ لے لیے گئے ہیں۔ ساڑھے بارہ بجے تک مطار پر ضرور پہنچ جائیں۔ اس لیے انتہائی عجلت میں جو جس حال میں تھا سب چھوڑ کر سامان کچھ باندھا کچھ بھائی عبدالکریم بھائی کے مکان پر چھوڑا کہ بمبئی سے بعد میں آنے والے رفقاء میں سے کوئی لا سکے تو لا دے اور ساڑھے بارہ بجے بمبئی کے مطار پر پہنچ گئے۔ جناب الحاج یونس سلیم صاحب بھی مطار پر وقت سے پہلے پہنچ گئے اور ان کی کوشش سے بھائی عبدالکریم کی کار کو طیارہ تک جانے کی اجازت مل گئی۔ مطار پر ظہر کی نماز پڑھ کر زکریا کی کار کو طیارہ سے دور کھڑا کر دیا گیا، اس لیے کہ مطار پر ہجوم بہت بڑھتا جارہا تھا کہ طیارہ کی پرواز کے وقت یہ کار طیارہ کے قریب پہنچا دے گی اور صرف دو آدمیوں کو زکریا کے پکڑنے کے واسطے طیارہ پر جانے کی اجازت ہوئی۔ اس لیے ابوالحسن اور طلحہ کار میں رہے اور بقیہ سب پاؤں کے راستہ سے گئے۔

سوا تین بجے جہاز بمبئی سے چلا پونے پانچ بجے کراچی پہنچے، وہاں کراچی میں چونکہ کوئی اطلاع بجز اس ٹیلیفون کے جو بمبئی سے مولانا انعام صاحب نے پوری صاحب اور بھائی یوسف رنگ والے عزیزان مولوی احسان واسرار جو اپنے والد صاحب کو رخصت کرنے کے لیے کراچی گئے ہوئے تھے باہر کھڑے تھے۔ جناب الحاج فریدالدین صاحب بھی ہمارے مطار سے باہر جانے کے بعد پہنچے، لیکن طیارہ والوں نے بمبئی کا منظر یونس سلیم صاحب اور بمبئی کے چیئرمین وغیرہ کا مطار پر ہونا دیکھ رکھا تھا اس لیے انہوں نے زکریا کو طیارہ سے اپنی کرسی پر بذریعہ لفٹ اتارا اور اپنی ہی کرسی پر کسٹم تک پہنچایا۔ وہاں یہ حضرات جو باہر کھڑے تھے مل گئے۔ حاجی فریدالدین صاحب بھی پہنچ گئے جن کی وجہ سے کسٹم میں کوئی چیز کھول کر دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اتنے میں ہم باہر پہنچے بہت سی کاریں اور احباب ٹیلیفون کی اطلاع پر مطار پر جمع ہو گئے عصر کے بعد نماز کسٹم کے میدان میں پڑھی اس کے بعد کاروں میں مکی مسجد پہنچ گئے، جمعہ کے دن وہاں قیام رہا۔

شب جمعہ میں مولوی انعام مولوی عمر وغیرہ نے تقریریں کیں جس کے متعلق یہ اشکال بھی ہوا کہ موجودہ حالت میں نہیں کرنی چاہیے۔ مگر دوستوں کے اصرار پر ہو ہی گئی۔ شنبہ ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۹۰ھ جنوری ۱۹۷۱ء کراچی سے نو بجے طیارہ کی پرواز کی اطلاع تھی، حاجی فریدالدین صاحب کار لے کر مسجد پہنچ گئے، مگر طیارہ دس بجے وہاں سے چلا، جدہ میں جدہ کی ظہر سے ایک گھنٹہ پہلے طیارہ پہنچا۔

عزیز سعدی ماموں یامین اور جدہ اور مکہ کے مختلف احباب شب جمعہ سے جدہ کے مطار پر گشت کرتے رہے، دن رات تلاش میں رہے۔ مگر چونکہ بمبئی سے جہازوں کی بندش کی اطلاعات مل رہی تھیں اور اتنا وقت نہیں تھا کہ بمبئی سے انہیں اطلاع مل سکے یا اطلاع پہنچ نہیں سکی، اس لیے یہ

حضرات بمبئی سے آنے والے جہازوں کو دیکھ کر واپس چلے جاتے تھے۔

ہمارا طیارہ جس وقت جدہ کے مطار پر اُتر رہا تھا اس وقت یہ سب حضرات جدہ کے مطار پر تھے مگر یہ معلوم ہو کر کہ یہ تو کراچی سے آ رہا ہے یہ حضرات واپس چلے گئے، البتہ عزیز عبدالحفیظ اپنی گاڑی سمیت ایک دن پہلے جدہ کے مطار پر پڑا ہوا تھا اور ڈاکٹر اسماعیل بھی صبح سے مطار پر گھوم رہے تھے، طیارہ والوں نے اپنی کرسی پر مجھے کسٹم تک پہنچا دیا، اس لیے کہ وہ بھی کراچی میں چڑھانے کا منظر دیکھ چکے تھے۔

کسٹم کے باہر سے جناب الحاج ڈاکٹر ظفیر صاحب اور بھائی اشفاق صاحب نے دیکھ لیا تھا اور بڑی مشکل اور بڑی جدو جہد سے وہ زکریا کو اس کی کرسی پر کسٹم سے باہر لے گئے، کسٹم میں ڈاکٹر اسماعیل اور بہت سے احباب مل گئے، جو مجھے عبدالحفیظ کی گاڑی میں جدہ کے مطار کی مسجد میں پہنچا گئے، وہاں بھائی یحییٰ کراچی والے مقیم مدینہ اور متعدد احباب ملے، پیشاب و وضو وغیرہ کے بعد جماعت کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی۔

ظہر کے بعد احباب جدہ نے اپنے یہاں لے جانے پر اصرار کیا اور بعض دوستوں نے ٹیکسی کر کے سیدھے مکہ جانے پر اصرار کیا مگر زکریا نے کہہ دیا کہ اتنے مولوی انعام صاحب نہ آئیں اتنے تو یہیں انتظار کرنا ہے، ظہر کے بعد مولوی انعام بھی مسجد میں پہنچ گئے، مولوی عبیداللہ، عزیز ہارون، مولوی محمد عمر وغیرہ کسٹم میں سامان کے ساتھ محبوس رہے۔

کسی شخص نے مجھے مطار کی مسجد میں دیکھ کر صولتیہ ٹیلیفون کر دیا کہ وہ سب حضرات دو روز سے جدہ کے مطار پر گھومتے رہتے تھے، مولوی عبداللہ عباس صاحب نے طیارہ تک گاڑی لے جانے کی اجازت لے رکھی تھی، صولتیہ کے اس فون پر عزیز شمیم نے سعدی کو اس وقت فون کیا، عزیز سعدی جدہ سے واپسی پر جبھی دستر خوان پر بیٹھا تھا، فون سنتے ہی مولوی عبداللہ عباس صاحب کو ساتھ لے کر ان کی گاڑی میں جدہ کے لیے روانہ ہو گئے اور پہلی چوکی پر انتظار میں رہے۔

مولوی انعام صاحب زکریا بذریعہ ٹیکسی صوفی اقبال بھائی یحییٰ ٹیکسی سے جدہ سے روانہ ہوئے اور عزیز عبدالحفیظ مع اپنی گاڑی کے کسٹم والوں کے انتظار میں مطار پر ٹھہرے رہے، مکہ کے بعد پہلی چوکی پر عزیز سعدی اور مولوی عبداللہ عباس صاحب کھڑے ہوئے تھے، زکریا تو جو جدہ ہی سے دونوں طرف دیکھتا آ رہا تھا عزیز سعدی کو پہچان کر آواز دی وہاں سے عزیز سعدی ہماری ٹیکسی میں اور ہماری گاڑی میں سے بھائی یحییٰ مولوی عبداللہ عباس کی گاڑی میں منتقل ہو گئے۔

زکریا نے مولوی انعام صاحب وغیرہ کے لیے چائے تیار کرنے کا تقاضا کیا کہ حرم شریف کے عصر سے پہلے فراغ ہو جائے اور صولتیہ فون کرایا وہاں سب شدید انتظار میں تھے، قاضی

صاحب بھائی افضل شمیم وغیرہ فوراً پہنچ گئے، بھائی سلیم کا اصرار تھا کہ پہلے صولتیہ لاکر پھر حرم جایا جائے، مگر نماز میں اتنی گنجائش نہیں تھی، سعدی کے گھر سے حرم کاروں میں جاکر بعد عصر صولتیہ پہنچے، عزیز ہارون وغیرہ مغرب کی اذان تک کسٹم میں محبوس رہے، مغرب کے بعد عبدالحفیظ کی گاڑی میں مکہ مکرمہ پہنچے۔

۴ فروری کو منیٰ حاضری ہوئی اور ۵ فروری جمعہ کے دن عرفات پر حاضری ہوئی، چونکہ پاکستانی احباب کے ساتھ اس سال ان کی مستورات بھی تھیں، اس لیے وہ حضرات اپنی اپنی مستورات کے ساتھ علیحدہ گاڑیوں میں گئے اور ہم سب مکی مرزوقی کی زیر قیادت ان کی لاری میں ان کے خیمہ میں پہنچ گئے، وہاں پہنچ کر جملہ رفقاء جو مستورات کی وجہ سے علیحدہ علیحدہ ہوگئے تھے، ایک جگہ مجتمع ہوگئے۔

مکی مرزوقی نے بڑی فراخدلی سے بہترین دعوت کوزی کی حسبِ معمول کی، زکریا نے اتباعا للسنت صرف دودھ پیا، بعد مغرب وہاں سے چل کر شب کو مزدلفہ میں مزدلفہ کے منتہاء پر بہترین جگہ اللہ کے فضل سے مل گئی جو بہت وسیع اور کھلی ہوئی تھی، علی الصباح نماز پڑھ کر وہاں سے منیٰ چاشت کے وقت پہنچ گئے اور عصر کے وقت ملک عبدالحق صاحب کی گاڑی میں طواف زیارت کے لیے آئے، مگر راستے بند ہونے کی وجہ سے بہت چکر کاٹنا پڑا، ۱۳ ذی الحجہ کو رمی سے فراغ پر با اطمینان مکہ مکرمہ حاضری ہوئی۔

منیٰ کے قیام میں تبلیغی حلقے، تعلیمی حلقے تقریباً ہر معلم کے خیموں میں ہوتے رہے اور مسجد خیف مبلغین کا خاص مرکز رہا کہ وہاں سے جماعتیں دوسرے مقامات پر منتشر ہوتی تھیں اور مجتمع ہوتی تھی، حج کے بعد مکہ مکرمہ میں بھی تبلیغ وتعلیم کا سلسلہ اور ملک وار اجتماعات ہوتے رہے، جس مین ۱۰ فروری کو بحرین اور سارے پرانے عرب حضرات کا اجتماع ہوا، اسی دن اہلِ کویت کا اجتماع ہوا، ۱۱ فروری افریقہ وبیرونِ ممالک کا اجتماع ہوا۔

۲۱ فروری اتوار کے دن عصر کے وقت مدینہ منورہ پہنچے، اس سیہ کار کی ڈائری مکہ مکرمہ کی باوجود تلاش کے نہیں ملی، اس میں تو بہت تفاصیل تھیں، مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد سے تواریخ مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری کی ڈائری سے نقل کرائیں، ۲۵، ۲۶، ۲۷ فروری کو مدینہ طیبہ کا ماہانہ اجتماع ہوا، جو ہر مہینے مکہ، جدہ، طائف وغیرہ میں بدلتا رہتا ہے، جیسا کہ آپ بیتی نمبر۴ میں مفصل گزر چکا۔

۱۳ مارچ کو قبا جاکر قبیل ظہر واپسی ہوئی، ۱۴ مارچ کو خیبر جانا ہوا، وہاں مسجد علی اور مسجد سوق میں تقریریں بھی ہوئیں، شام کو وہاں سے واپسی ہوئی، خیبر کے مزارات پر جو جذب وکشش سابقہ حاضری میں ہوئی تھی، جس کو آپ بیتی نمبر۴ میں لکھوا چکا ہوں، اس کی وجہ پر بھی بہت

مختلف تبصرے ہوتے رہے۔

۱۷ تا ۱۹ مارچ مدینہ پاک میں مشورہ کا اجتماع ہوا، جس میں طائف، مکہ، جدہ، الخبر، دمام تک کے حضرات بھی شریک ہوئے، اس میں مسجد حفائر مکہ مکرمہ جو زیر تعمیر ہے کے نام پر بھی طویل گفتگو ہوئی، مگر کوئی استقلال اس وقت نہیں ہوا، ۳ اپریل ۷۱ھ شنبہ کو حاجی صالح کی کار میں مدینہ پاک سے مکہ مکرمہ کے لیے روانگی ہوئی، بعد ظہر مکہ پہنچے اپنی ظہر صولتیہ میں پڑھی کہ جدہ کا ماہانہ اجتماع ۵ تا ۷ اپریل مدینہ پاک کے اجتماع میں طے ہو چکا تھا، ۸ اپریل کو مکہ مکرمہ واپسی ہوئی، ۱۰ اپریل کو مغرب کے بعد مہاجرین کا اجتماع مدرسہ صولتیہ میں ہوا، ۱۲ اپریل کو مدرسہ صولتیہ میں اہلِ بنگال کا بہت بڑا اجتماع ہوا، ۱۲ اپریل دوشنبہ کو بعد مغرب مدرسہ صولتیہ میں بہت بڑا اجتماع ہوا، جس میں سید علوی مالکی اور سید حمزہ جعلی، الحاج رشید فارسی صاحب، شیخ غزاوی شاعر ملک وغیرہ اعیان مکہ مدعو تھے، بہت زوردار دعوت الوداعی جناب الحاج محمد سلیم صاحب کی طرف سے ہوئی اور اس میں خاص لوگوں سے تبلیغ پر مولانا انعام الحسن صاحب کی گفتگو بھی ہوئی۔

۱۳ اپریل کو جدہ اور ۱۴ اپریل کو سعودی ایئر لائن سے جدہ سے سیدھے بمبئی، تین دن بمبئی قیام کے بعد ۱۷ اپریل کو بمبئی سے بذریعہ طیارہ دہلی اس ناکارہ کا ارادہ کچھ طویل قیام کا تھا کہ اپنے امراض کی کثرت اور اعذار کی وجہ سے بار بار آنے جانے میں بڑی ہی دشواریاں ہیں، بالخصوص ٹانگوں کی معذوری کی وجہ سے مگر جدہ کے اجتماع میں جب اس ناکارہ کی آمد ہوئی تو مجھے بھائی افضل صاحب کے ذریعہ یہ روایت متعدد حضرات کی طرف سے پہنچی کہ بضرورت تبلیغ تیرا ہندوستان جلد جانا بہت ضروری ہے۔

میرے ذہن میں تو کوئی خاص ضرورت نہیں آئی، لیکن چونکہ سب ہی حضرات کا اصرار میری جلد واپسی پر تھا اس لیے میں نے کہہ دیا کہ اس وقت تو میں صرف جدہ کے اجتماع میں شرکت کے لیے آیا تھا، میرا سب سامان مدینہ پاک میں پڑا ہوا ہے اور سب سے اہم وہ کتابیں ہیں جو اس سیہ کار نے مدینہ پاک کے قیام میں اِدھر اُدھر سے جمع کر رکھی ہیں، اس لیے کہ اس سیہ کار نے بخاری شریف کے پڑھانے کے دوران میں اس کے تراجم کے متعلق عربی میں کچھ یادداشتیں لکھی تھیں۔

مدینہ پاک کے اس طویل قیام میں ان کو سننا شروع کر دیا تھا، یہ سمجھ کر کہ سہارنپور کے قیام میں تو بیگاریں بہت مسلط رہتی ہیں، مدینہ پاک کے قیام میں علاوہ فراغت کے وہاں کی برکات کا خاص طور سے اوجز کے زمانہ میں مشاہدہ کر چکا تھا کہ وہاں تین مہینے میں اتنا مسودہ ہو گیا تھا کہ سہارنپور واپس آنے پر اس کی نظر ثانی اور تبییض کئی ماہ میں ہوتی، اس لیے میں نے وقت کو غنیمت سمجھ کر اس کا سننا شروع کیا تھا اور اس کی وجہ سے مدرسہ شرعیہ سے اور دوسرے احباب سے کچھ کتابیں بھی جمع کر

رکھی تھیں، ان کی واپسی کا مجھے بہت فکر تھا، اس لیے ان حضرات کے ساتھ واپس نہ آسکا۔
عزیزان مولوی ہارون، مولوی زبیر سلمہما کو بھی میرے ساتھ آنے کے لیے مولانا انعام صاحب چھوڑ گئے اور جناب الحاج قاضی عبدالقادر صاحب جھاوریاں پاکستانی اللہ ان کو بہت ہی بلند درجے عطاء فرمائے اپنے قرب خاص سے نوازے، اس ناکارہ کے ان طویل اسفار حجاز میں میری سرپرستی کے لیے بہت اہتمام سے میرے ساتھ رہے اور میری ہر نوع کی راحت رسانی کی ہر وقت فکر رکھتے تھے اس سفر میں بھی اپنے رفقاء اور مولانا انعام الحسن صاحب کی واپسی کے بعد اس ناکارہ کی سرپرستی کے لیے میرے ساتھ ہی ٹھہر گئے اور کراچی تک میرے ساتھ ہی آئے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطاء فرمائے، درجات عالیہ نصیب فرمائے اپنے قرب خاص سے نوازے، ان کے احسانات کا دونوں جہان میں اپنی شایان شان بہترین بدلہ عطاء فرمائے۔
اس ناکارہ نے چونکہ مدینہ پاک میں طویل قیام کا ارادہ کر رکھا اور اس کے لیے عزیزم الحاج ملک عبدالحفیظ مکی اور اپنے نواسے الحاج مولوی زبیر الحسن ابن امیر التبلیغ مولانا انعام الحسن صاحب سے ''الابواب و التراجم للبخاری'' سب کی تسوید یہ ناکارہ اپنے بخاری شریف پڑھانے کے دوران میں وقتاً فوقتاً تقریباً چالیس سال تک کرتا رہا، اس کو از سرنو سننا شروع کیا اور اس کے لیے کتابیں بھی بہت جمع کر لی تھیں، مگر ان حضرات کے تقاضے پر مجھے آنا ہی پڑا، اخیر اپریل میں مدینہ پاک سے بصد حسرت واپسی ہوئی، تین چار روز مکہ مکرمہ میں قیام رہا، اس کے بعد کراچی کا ویزہ تو ہم لوگوں کے پاس نہیں تھا مگر مرور کا ویزہ تین دن کا ملا، تین دن کراچی کے قیام کے بعد ۴ جون جمعہ کو عین جمعہ کے وقت دہلی پہنچنا ہوا، اس کا بہت ہی قلق ہے کہ اس ناکارہ کی کاپی حجاز کے قیام کی اس وقت تک نہ ملی، اگر بعد میں مل جائے تو عزیزان اس سے اس قیام کی تفصیلات نقل کر دیں۔
اسی قیام میں روانگی سے تقریباً بیس یوم قبل اس ناکارہ کے قدمچہ پر سے گرنے اور پاؤں کی ہڈی ٹوٹنے کا واقعہ پیش آیا، مدرسہ شرعیہ میں اس ناکارہ کا قیام تھا، وہاں قبل ظہر استنجاء کے لیے اور نماز کی تیاری کے لیے تقریباً ایک گھنٹہ قبل جانا ہوا، استنجاء پاک کرنے کے وقت دورانِ سر ہو کر یہ ناکارہ گرا، دوست احباب باہر پہلے ہی سے کھڑے ہوئے تھے، میرے گرنے کی آواز پر اندر آگئے، چونکہ لنگی باندھنے کی عادت پہلے سے تھی اس لیے کشفِ عورت سے محفوظ رہا وہاں سے اُٹھا کر دو آدمی پکڑ کر باہر لائے اور پردہ کر کے لنگی بدلی، ٹانگیں پاک کیں اور مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حسب معمول ظہر کی نماز کے لیے چلا گیا، نماز کے بعد سے احباب کا اصرار ہوا کہ ایکسرے لیا جائے، وہاں کے ایک ڈاکٹر صاحب مدینہ پاک حاضری کے بعد سے ہی برابر مجھ پر ایکسرے کا

اصرار کررہے تھے، اس لیے کہ اس مرتبہ مکہ مکرمہ کے قیام میں اولاً تھوک کے ساتھ اوراس کے بعد ناک سے خون نکل چکا تھا اور کئی دن مسلسل رہا تھا۔

جناب الحاج ڈاکٹر وحید الزمان صاحب اوران ہی کی شفقت سے متعدد ڈاکٹروں کی تجویز سے متعدد دوائیں ہوئیں، جس سے وہاں تو تین دن کے بعد خون بند ہوگیا، لیکن مدینہ پاک کی حاضری کے موقع پر بدر میں پھر ناک سے خون آگیا، اس لیے مدنی اور پاکی احباب کا بہت ہی اصرار تھا کہ میں ایکسرے کراؤں اور میں یہ کہتا رہا کہ ایسی معمولی چیزیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں، لیکن اس گرنے کی وجہ سے شفاخانہ جانا ہی پڑا اور ڈاکٹر صاحب نے پاؤں کے ساتھ سینہ پسلیاں کمر وغیرہ سب ہی چیزوں کا ایکسرے موقع غنیمت جان کر کیا، مگر اللہ کے فضل سے بدن اور کسی حصہ میں تو کوئی اثر معلوم نہیں ہوا البتہ بایاں پاؤں کی ایڑھی کی ہڈی میں شگاف آگیا، جس کے متعلق ان ڈاکٹر صاحب کی تجویز تو یہ تھی کہ میں ایک ہفتہ قیام مدینہ پاک میں کرلوں تو یہ ہڈی جڑ جائے گی، مگر میں اپنے نظامِ سفر کی اطلاع مکہ مکرمہ، کراچی، ہندوستان کر چکا تھا اور تغیر میں بہت دقت تھی کہ مطہرہ اور ہند کے احباب خبر سننے کے بعد دور دور سے جمع ہوجاتے، وہاں مدینہ پاک کے قیام میں نہ تو پلاسٹر کی ضرورت پیش آئی نہ کسی اور چیز کی، وہاں کے ڈاکٹر صاحب نے ایک دوا ایڑھی پر مالش کی دی تھی، دو تین وقت مالش ہوتی رہتی تھی اور وہاں کے قیام میں بلا کسی دقت کے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری بھی ہوتی رہی اور کوئی تکلیف بھی نہیں ہوتی تھی۔

تین دن بعد جب مکہ مکرمہ حاضری ہوئی تو ڈاکٹر وحید الزماں زادمجدہم اور دوسرے ڈاکٹروں نے اصرار کیا کہ چونکہ سفر قریب ہے اور اس میں مرض کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے، ہڈی اچھی طرح نہیں جڑی، اس لیے پلاسٹر کا لگانا نہایت ضروری ہے، ان سب احباب کی مساعی سے ایک ڈاکٹر نے اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے میری کاپی میں ان کا نام لکھا ہوا ہے، اس وقت تو مجھے یاد نہیں، مجھ سے پوچھا کہ آپ کو پلاسٹر بندھوانے میں کس وقت سہولت ہے، میں نے کہا عشاء سے دو تین گھنٹے بعد، اس لیے کہ میں عشاء کے بعد طواف کیا کرتا ہوں۔

انہوں نے بہت ہی شفقت ومحبت سے عشاء سے دو گھنٹے بعد میرے مستقر عزیزم الحاج محمد سعید رحمت اللہ کاتب العدل کے مکان پر جہاں میرا قیام تھا کہ اس زمانہ میں گرمی کی شدت کی وجہ سے میرا قیام شب میں تو عزیز موصوف ہی کے مکان پر ہوتا تھا کہ وہاں بہت کھلی جگہ ہوادار اور دن کو مدرسہ صولتیہ کے دیوان اکابر میں رہتا تھا، ڈاکٹر صاحب نے آدھے گھنٹے کے اندر پلاسٹر باندھا، اس قدر نرم تھا کہ ذرا بھی اس میں کوئی چیز محسوس نہیں ہوئی، بلکہ بڑی ہی راحت محسوس ہوئی اور دو گھنٹے میں وہ اس قدر خشک ہوگیا کہ ذرا بھی نمی اس میں نہ رہی، مگر مقدر کہ دوسرے دن دوپہر کو ظہر

کے قریب پیشاب کے لیے اُٹھا اور جہاں دوسرے بہت سے عوارض ساتھ لگے رہے ہیں، پیشاب بھی تقاضے کے بعد پھر مہلت نہیں دیتا، اتنے میں پیشاب کے لیے بیت الخلاء جو بالکل دیوان کے اندر ہے گیا تو راستہ ہی میں جو چند قدم ہے، پیشاب کے ساتھ اسہال ہو گیا، جس سے پلاسٹر بہت ہی خراب ہو گیا۔

میرے دوستوں نے نماز کے قرب کی وجہ سے اس کو کھولنا چاہا تو اتنا مضبوط کہ کلہاڑی سے بڑی دقت سے وہ کاٹا گیا، نماز کے بعد ڈاکٹر صاحب کو دوبارہ ٹیلیفون کیا، وہ اسی وقت آئے تسلی دی کہ کوئی ایسی بات نہیں، رات کو دوسرا باندھ دوں گا۔

عشاء کے بعد ڈاکٹر صاحب کی تلاش میں عزیز سعدی اور مولانا عبداللہ عباس وغیرہ احباب پھرتے رہے مگر وہ کہیں چلے گئے تھے، کئی گھنٹے بعد واپس آئے تو دیر ہو گئی تھی، انہوں نے مشورہ دیا کہ پرسوں کو تو پاکستان جانا ہے وہاں بندھوالیا جائے تو زیادہ اچھا رہے گا، پاکستان چونکہ قیام دو ہی دن کا تھا اس لیے وقت نہیں ملا، دہلی پہنچنے پر احباب کا مزید اصرار ہوا بالخصوص مولانا الحاج انعام الحسن صاحب، جناب الحاج محمد شفیع صاحب، جناب الحاج بھائی کرامت صاحب وغیرہ کا کہ سہارنپور جانے سے پہلے پلاسٹر بندھنا ضروری ہے۔

یہ ناکارہ جمعہ کے دن نظام الدین پہنچا تھا، شنبہ کی دوپہر کو ایک ڈاکٹر صاحب کے شفاخانہ میں جانا ہوا، انہوں نے بہت ہی محنت سے آدھے گھنٹے میں پلاسٹر لگایا، مگر وہ دو گھنٹے تک بھی خشک نہ ہوا تو عزیز الحسن نے ہیٹر سے چار گھنٹے میں اس کو خشک کیا اور زکریا نے شکایت کی کہ مکہ مکرمہ میں تو دس منٹ میں پلاسٹر بندھ گیا تھا اور آدھ گھنٹہ میں خود بخود خشک ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس کا جواب دیا کہ وہاں والوں کے پاس اپنی تو کوئی چیز ہی نہیں، کچھ جرمن، کچھ امریکہ، کچھ لندن سے منگاتے ہیں، ہمارے یہاں ساری چیزیں اپنی ہیں، ہم باہر سے تھوڑا ہی منگاتے ہیں، یہ جواب میرے دماغ میں آیا تو نہیں مگر احتراماً چپکا ہو گیا اور پلاسٹر کے بعد ۶ جون اتوار کو نظام الدین سے تین کاروں میں بمعیت مولانا انعام الحسن صاحب دیوبند ٹھہرتے ہوئے ظہر کے وقت سہارنپور پہنچے اور عصر کے بعد دارالطلبہ جدید میں حسب اعلان مصافحے ہوئے۔

۶ تا ۸ جون سہارنپور کا تبلیغی اجتماع تھا، اس میں شرکت کے لیے روانگی ہوئی اور ۷ جون کی صبح کو علی الصباح گنگوہ حاضری ہوئی، گیارہ بجے وہاں سے واپس ہو کر اجتماع میں شرکت ہوئی، ۹ جون کی صبح کو مولانا انعام الحسن صاحب اجتماع سے فراغ پر عبدالحفیظ دہلوی کی کار میں نظام الدین دہلی کو روانہ ہوئے، اسی دن مولانا عیسیٰ محمد صاحب گجراتی پالنپوری کا دوپہر ۱۲ بجے انتقال ہوا جو تبلیغ کے سرگرم کارکنوں میں تھے اور اس سیہ کار سے بھی خصوصی تعلق تھا۔

سہارنپور آنے کے بعد وہ پلاسٹر سخت ہوگیا، ۱۵ دن کے بعد بھائی کرامت صاحب کے بھائی صاحب ایک دوسرے ڈاکٹر کو لے کر آئے، انہوں نے دیکھ کر کہا کہ پہلا پلاسٹر سخت بندھ گیا اس لیے تکلیف بڑھ گئی، انہوں نے پہلے پلاسٹر کو کاٹ کر دوسرا بدلا، دو ماہ تک وہ بھی بندھا رہا مگر ٹانگوں میں ایسا جمود ہوگیا کہ اب کھڑا ہونا تو در کنار زمین پر پاؤں رکھنا بھی دشوار ہوگیا، چارپائی کے قریب قدمچہ لگا رہتا تھا، چار احباب چارپائی سے میت کی طرح اُٹھا کر قدمچہ پر بٹھا دیتے ہیں، فراغ پر اُٹھا کر چارپائی پر ڈال دیتے ہیں، اسی درمیان میں ڈاکٹری، یونانی، ہومیو پیتھک اور پہلوان کی مالش کے علاج بدلتے رہے مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

یہ تو پہلے بار بار لکھا جا چکا ہے کہ اس ناکارہ کے اسفار حج کا سلسلہ اسٹرائیک کے بعد سے ہی شروع ہوا، جس کی اصل وجہ یہ ہوئی کہ اس اسٹرائیک نے اس سیہ کار کی طبیعت کو اس قدر متکدر اور رنج پہنچایا کہ تعلیم وتدریس سے طبیعت بالکل ٹھنڈی ہوگئی، بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ اسٹرائیک والے سال میں اس سیہ کار نے طلبہ کی اصلاح اور ان کو اپنے مقام پہچاننے کی اسلاف کے اتباع کی ہر سبق میں اتنی ترغیبیں دی تھیں کہ جن کا ذکر اسٹرائیک کے سلسلہ میں گزر چکا ہے۔

مجھے اس سال کے طلبہ پر بہت ہی حسنِ ظن قائم ہوگیا تھا اور جب نتیجہ اس کے بالکل ضد اور خلاف نکلا اور مجھے واقعی یہ خیال ہوا کہ اس ناکارہ ہی میں اس کی صلاحیت نہیں ورنہ اثر ہوتا ہی، اس لیے تدریس سے تو اسی سال طبیعت بالکل ہی سرد ہوگئی اور اس کے بعد سے جتنے سال بھی بخاری شریف پڑھانے کی نوبت آئی وہ جبر واکراہ اور آورد سے ہوئی، آمد سے نہیں ہوئی اور اسی بناء پر ہر سفر حج میں مدینہ پاک قیام کی تمنا لے کر جاتا تھا مگر میری گندگی وہاں بھی قیام نہ کرنے دیتی، جن کی تفاصیل تو گزر چکی اور بالآخر ۸۸ھ سے تعلیم کا سلسلہ چھوٹ ہی گیا، مگر بچپن سے چونکہ عادت کام کرنے کی پڑ چکی تھی اور وہ طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، اس لیے احباب کے اصرار بالخصوص عزیز شاہد سلمہ کی جولانی طبع سے پڑے پڑے بعض مسودات کے سننے کی نوبت آئی اور سلسلہ چلتا رہا۔

یہ رسالہ بھی جیسا کہ اس میں کئی جگہ لکھا جا چکا کوئی تالیفی چیز نہیں، بلکہ خالی پڑے پڑے کچھ بے ترتیب واقعات یاد آجاتے ہیں تو جوڑ بے جوڑ ان کے لکھوانے کی نوبت بھی آتی رہتی ہے، اسی لیے اعجاب کے مضمون کو لکھتے لکھتے اسٹرائیک کا منظر سامنے آگیا ورنہ اصل چیز تو اعجاب ہی چل رہی ہے۔

اعجاب کے متعلق جو کچھ میں نے اُوپر لکھوایا وہ اس سے احتراز اور بچنے کے لیے تنبیہ کے واسطے لکھوایا کہ یہ لعنت اکابر کے ہوتے ہوئے نقصان پہنچاتی ہے، اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے صحابہ کو اس اعجاب کی وجہ سے ابتداءً ہزیمت اُٹھانی پڑی۔

لیکن اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اہل اللہ کی لغزشوں پر ان کی شان میں گستاخی کرنا سم قاتل ہے، حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی آپس میں لڑائیوں کے متعلق حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ سے کسی نے استفسار کیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا:

''اللہ جل شانہ نے ہمارے ہاتھوں کو ان کے خونوں سے محفوظ رکھا ہے تو ہم اپنی زبانوں کو ان میں کیوں ملوث کریں۔'' یہ مضمون رسالہ اعتدال صفحہ ۲۴ میں تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے۔

اس کے ساتھ یہ قابل لحاظ بات ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو کسی چیز کی عار لگاتا ہے، اللہ جل شانہ مرنے سے پہلے اس کو اس عیب میں مبتلا کرتا ہے، اس مضمون کو یہ ناکارہ آپ بیتی نمبر۴ اعلیٰ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے حالات کے ذیل میں تفصیل سے لکھ چکا ہے، اس کو ضرور دیکھا جائے، اہل اللہ یا اکابر سے اگر لغزش ہو جائے تو اس میں لب کشائی ہرگز نہیں کرنی چاہیے، یہ بہت خطرناک ہے، علامہ شعرانی نے تحریر فرمایا ہے کہ ''لحوم العلماء مسمومۃ'' علماء کے گوشت زہریلے ہوتے ہیں یعنی ان کی غیبت کرنا سم قاتل ہے۔

اورِ ح ثلاثہ میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے ایک نہایت ہی سخت مقولہ نقل کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ہی ان سے محفوظ رکھے کہ جو لوگ علماء دین کی توہین اور ان پر طعن و تشنیع کرتے ہیں ان کا قبر میں قبلہ سے منہ پھر جاتا ہے اور یوں بھی فرمایا کہ جس کا جی چاہے دیکھ لے۔

(اورِ ح ثلاثہ: ص ۳۰۷)

اسی میں ایک دوسرا واقعہ لکھا ہے کہ مولوی محمد قاسم صاحب کمشنر بندوبست ریاست گوالیار ایک بار پریشانی میں مبتلا ہوئے، ریاست کی طرف سے تین لاکھ کا مطالبہ ہوا، ان کے بھائی یہ خبر پا کر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں گئے، حضرت مولانا نے وطن دریافت کیا، انہوں نے عرض کیا دیوبند، مولانا نے تعجب سے ساتھ فرمایا کہ گنگوہ حضرت مولانا کی خدمت میں قریب تر ہے وہاں کیوں نہ گئے، اتنی دُور دراز کا سفر کیوں اختیار کیا، انہوں نے عرض کیا کہ حضرت یہاں مجھے عقیدت کھینچ لائی، مولانا نے ارشاد فرمایا کہ تم گنگوہ ہی جاؤ، تمہاری مشکل کشائی حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ہی کی دعاء پر موقوف ہے، میں اور تمام زمین کے اولیاء بھی اگر دعاء کریں گے تو نفع نہ ہوگا، چنانچہ واپس ہوئے اور بوسیلہ حکیم ضیاء الدین صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، حکیم صاحب نے سفارش کی تو مولانا نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تو کوئی قصور نہیں کیا، بلکہ یہ صاحب مدرسہ دیوبند کے مخالف ہیں جو اللہ کا ہے، قصوروار اللہ کے ہیں اللہ سے توبہ کریں بندہ بھی دعاء کرے گا، چنانچہ اِدھر انہوں نے توبہ کی اُدھر مطالبہ سے برأت کا کمشنر صاحب کے پاس سے حکم آ گیا۔ (اورِ ح ثلاثہ: ۳۰۷)

درحقیقت آدمی پر جو مصائب آتے ہیں وہ اپنے ہی اعمال کا خمیازہ ہوتا ہے، اس مضمون کو یہ ناکارہ اپنے مختلف رسائل میں مختصر، مفصل، بہت ہی کثرت سے لکھوا چکا ہے۔

''ما اَصابَكُم مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُم''

مغالطہ اور غلط فہمی میں عوام اور جہلاء نہیں بلکہ خواص اور علماء بھی کثرت سے مبتلا ہوتے ہیں۔ جب آدمی پر کوئی مصیبت آتی ہے، مثلاً جیل ہوگئی، چوری ہوگئی کوئی جھوٹا مقدمہ قائم ہوگیا تو وہ سب اس سوچ میں لگ جاتے ہیں کہ اس قصہ میں تو یہ شخص بالکل بری ہے کہ یہ ناگہانی آفت منجانب اللہ کہاں سے آگئی جھوٹا مقدمہ کیسے قائم ہوگیا؟

حالانکہ میرا خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ مصائب بے محل کبھی نہیں آتے، مگر ہوتا یہ ہے کہ آدمی کو اپنا کیا ہوا کبھی نظر نہیں آتا، نہ اپنے مظالم کی طرف کبھی توجہ ہوتی ہے، نہ دوسروں کے حقوق مالی یا جانی جو ضائع کیے ہیں ان کو کچھ اہمیت دی جاتی ہے بلکہ یاد بھی نہیں رکھتے، لیکن اللہ کے سپاہی ہر وقت مونڈھوں پر سوار رہتے ہیں اور ''ما يلفظ من قول الا لديه رقيب عتيد'' کے تحت جرائم کی مثل تیار ہوتی رہتی ہے اور اللہ جل شانہ کے لطف وکرم اور حلم کی وجہ سے سزا میں تاخیر ہوتی رہتی ہے کہ شاید توبہ کر لے، لیکن بجائے توبہ کے جب تقاصیر میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے تو ملاء اعلیٰ سے سزا کا حکم ہوتا ہے، جو جرائم کی کثرت کے مناسب ہوتا ہے، چاہے سزا ہو، چاہے مقدمہ ہو، چاہے چوری ہو، چاہے بیماری ہو، چاہے کوئی اور سزا ہو۔

وہاں سے حکم تو دراصل ان مثلوں پر ہوتا ہے جس کا انبار ہوگیا تھا، البتہ وہ نافذ ایسے وقت میں ہوتا ہے جب یہاں کوئی دوسرا واقعہ پیش آیا ہوتا ہے، جس میں یہ بے قصور ہوتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ مصیبت فلاں واقعہ کی وجہ سے آئی ہے، جس میں بالکل بے قصور ہوں، جس کی وجہ سے دوسروں پر بھی الزام لگاتا ہے کہ ناحق میرا نام لیا، جھوٹا مجھ پر الزام لگا دیا اور بعض تو بے صبری میں مالک الملک پر بھی الزام لگا دیتے ہیں جو رؤف الرحیم ستار وغفار ہے، حالانکہ یہ سزا کسی ایک آدھ جرم کی نہیں ہوتی، مالک کے یہاں تو بڑی مہلت دی جاتی ہے کہ اپنے قصور کی تلافی توبہ یا ادائیگی سے کر دے، مگر جب ہمیں اپنی فکر ہی نہ ہو تو مثل مشہور ہے کہ مالک کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مصائب رفع درجات کے لیے ہیں

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ہمشیرہ اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سر میں جب درد ہوتا تو سر پر ہاتھ رکھ کر فرماتیں کہ یا اللہ! مجھ سے کیا گناہ ہوا، اعتدال میں یہ مضمون بہت تفصیل سے لکھا گیا ہے کہ اس کی تائید میں متعدد احادیث ذکر کی گئیں ہیں، خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا

گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس آیت "ما اصابکم" الآیۃ کی تفسیر تجھے بتاتا ہوں۔

"اے علی! جو کچھ بھی تجھے پہنچے مرض ہو یا کسی قسم کا عذاب ہو یا دنیا کی کوئی بھی مصیبت ہو وہ اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے۔"

اس پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ مصائب تو انبیاء کرام علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام پر بھی بہت کثرت سے آئے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے:

"أشد الناس بلاء الأنبياء ثم الأمثل فا لأمثل"

کہ سب سے سخت بلائیں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر ہوتی ہیں، پھر جو ان سے قریب ہو، پھر جو ان سے قریب ہو"۔

اس کا جواب بھی میں تو اپنے کسی رسالہ میں مفصل لکھ چکا ہوں، جو اس وقت ذہن میں نہیں، مگر حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کی تالیف "البدائع" میں ایک مستقل بدیعہ اس کے متعلق تحریر فرمایا ہے، جس میں آیت شریفہ "ما اصابکم من مصیبة" الخ کے جواب میں مفصل تحریر فرمایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

مصائب دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک حقیقت مصیبت۔ ایک صورت مصیبت ہوتی ہے اور جس کا معیار یہ ہے کہ جس مصیبت سے انقباض اور پریشانی بڑھے وہ گناہوں کی وجہ سے ہے اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہو وہ حقیقت میں مصیبت نہیں، گو صورت میں اس کی مشابہ ہو، اس معیار کو سامنے رکھ کر انبیاء کرام اور اولیاء عظام کے مصائب کو دیکھ لے کہ ان کو ان مصائب سے انقباض ہوتا ہے یا تسلیم و رضاء میں اضافہ، بغل میں لے کر دبانا دو طرح کا ہوتا ہے، ایک چور مجرم کو پکڑ کر بغل میں دبانا، گو دبانے والا حسین و محبوب ہی ہو مگر چور اس دبانے سے خوش نہ ہوگا اور ایک آغوش میں لینا یہ ہے کہ محبوب اپنے عاشق کو بغل میں لے کر دبائے، اب تم اس کے دل سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے، کیا وہ اس تکلیف کی وجہ سے آغوشِ محبت سے نکلنا چاہے گا، ہرگز نہیں"۔ بلکہ یوں کہے گا کہ:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اسی طرح حق تعالیٰ شانہٗ دو طرح کے لوگوں کو دباتے ہیں ایک تو ان کو جو چور ہیں اور ایک ان کو جو اللہ تعالیٰ کے عاشق ہیں، چور تو خدا کی بندش سے گھبراتا ہے اور عشاق کی یہ حالت ہے۔

اسیرش نخواہد رہائی زبند
شکارش نجوید خلاص ازکمند
اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا
اس کا شکار جال سے خلاصی تلاش نہیں کرتا

حقیقت مصیبت تو واقعی گناہوں سے آتی ہے اور صورت مصیبت رفع درجات اور امتحان محبت کے لیے بھی آتی ہے، حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو بہت تفصیل سے لکھا ہے، جس کو میں نے مختصراً نقل کرایا تاکہ اشکال رفع ہو جائے۔

جمعیۃ الطلبہ کے اثرات

''اکابر کی نظر میں''

اس کے متعلق اُوپر کے مضمون میں بھی مختصراً آچکا ہے، اہمیت کی وجہ سے کہ میرے نزدیک یہ بہت اہم مضمون ہے اس واسطے یہ دوبارہ لکھوانا پڑا کہ یہ ناکارہ مدارس عربیہ میں جمعیۃ الطلبہ کا انتہائی مخالف ہے، اس کی قباحت تو طالب علمی کے زمانہ ہی سے میرے دل میں پڑی ہوئی ہے، مگر دن بدن تجربات نے مجھ کو تو اس سے اس قدر متنفر بنا دیا کہ اس کے نام سے نفرت ہوگئی، اس کے شرکاء سے طبیعت میں انقباض ہوتا ہے، اس ناکارہ کا اپنے اکابر کے ساتھ ایک معمول ہمیشہ رہا ہے کہ یہ ناکارہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرح کہ وہ ہر فعل کو یوں فرمایا کرتے تھے ''**کیف افعل ما لم یفعله رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم**'' اور علامہ منذری نے ترغیب و ترہیب میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک روایت نقل کی ہے ''**البرکة مع اکابر کم**''
(ترغیب: ص۵۳ ج۱)

میرے اکابر جو حقیقی معنی میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وارثین و نائبین ہیں اور ان کے اقوال و افعال کو میں نے سنت کے بہت ہی زیادہ موافق پایا ہے اور اس کے خلاف ہمیشہ نقصان ہی پایا، ان سب اکابر کو بھی میں نے ہمیشہ جمعیۃ الطلبہ کے مخالف ہی پایا اسی رسالہ کی فصل ''اکابر کے طرزِ تعلیم'' میں اولین صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کے زمانے دار العلوم میں ایک جمعیۃ الطلبہ قائم ہوئی تھی، جس کا نام ''فیض رساں'' تھا۔

حضرت مولانا نور اللہ مرقدہٗ کو جب اس کا علم ہوا تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ خبیثو! ایک ایک آ دمیں انجمن قائم کراؤں گا اور سب نالائقوں کو نکالوں گا، بس فیض کی بجائے حیض جاری

ہو گیا اور حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے رسائل النور وغیرہ میں ۴۶ھ کے پرچوں میں بڑی کثرت سے اس کے خلاف مضامین پڑھے، جن میں سے بعض اپنے رسالہ اسٹرائیک میں نقل بھی کرا چکا ہوں اور پھر اپنی آنکھوں سے یہ مناظر بھی دیکھے کہ اس کی صدارت کے انتخاب پر ایک طالب علم کا قتل بھی ہوا۔

اکابر کی بے حرمتی اپنے نظماء اور صدر کے مقابلہ میں اکابر مدرسہ اور اساتذۂ کرام کی حکم عدولی توہین وغیرہ کے مناظر گزرے، جب سے تو بہت ہی نفرت بڑھ گئی، ان طلبہ میں اکابر کا احترام تو بالکل ہی نہیں رہتا، علوم سے مناسبت بھی قائم نہیں رہتی، اچھی تقریر تمرین سے پیدا ہو جاتی ہے، جس سے وہ اپنے آپ کو عالم فاضل سمجھنے لگتے ہیں اور اساتذہ پر تنقید شروع کر دیتے ہیں، جس سے علم سے محرومی طے شدہ ہے۔

الیکشنوں کے حالات سب ہی کو معلوم ہیں، یہ ساری چیزیں ان جمعیتوں کے انتخاب میں بھی پیش آتی ہیں، شہری اور قصباتی لوگ اپنے اپنے گھروں پر رہتے ہیں، ان کی مخالفتیں دور دور رہتی ہیں، لیکن ان طلبہ کا قیام ایک ہی جگہ رہتا ہے اور اس انتخابی مخالفت میں ایک فریق کی دوسرے فریق کے متعلق جھوٹی اور فرضی شکایتیں اکابر مدرسہ کے پاس ہر وقت پہنچنا اور آپس میں مار پیٹ کے قصے ہر وقت کے مشاہدے ہیں، اہلِ مدارس کے لیے بھی ایک مستقل مصیبت اور ایک مستقل مشغلہ ان کے مقدمات کے فیصلے کرنے کا بڑھ جاتا ہے اور ان کے لیے بھی اسباق کا پڑھنا مطالعہ کرنا تو الگ رہا ہر وقت کا ایک مستقل مشغلہ دوسرے فریق کی ایذاء رسانی اور مدرسہ سے اخراج کی تدابیر، جھوٹ، فریب ایک مستقل مشغلہ بن جاتا ہے، اس وجہ سے مجھے تو بہت ہی اس کے نام سے بھی نفرت ہو گئی ہے، اللہ تعالیٰ معاف کرے۔

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر۱۶

متفرقات

اس فصل کے اندر کچھ مضامین متفرق طور پر ذہن میں آئے ہیں، ان سب کو جمع کرایا، نیز خیال آیا کہ اپنے چند تجربات اور عادات کا ذکر کروں جو اپنے اکابر کے صدقہ اور ان کی جوتیوں کے طفیل سے حاصل ہوئے، شاید حق تعالیٰ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو متمتع فرمائے، نمبر وار جو ذہن میں آئے کیف ما اتفق ان کو لکھوا رہا ہوں۔

(۱)......نظر کی احتیاط

اس مضمون کا تعلق تقویٰ سے ہے اور اس میں کچھ اس کے مضامین آ بھی چکے ہیں، مگر اہتمام کی وجہ سے اور ابتلاء کی وجہ سے نیز اپنے اکابر کا معمول اس میں لکھوانے کے واسطے مستقل لکھوا رہا ہوں، اللہ جل شانہ نے کلام پاک میں مومنین کو اور مومنات کو نیچی نگاہیں رکھنے کا حکم دیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نامحرم (جس میں مرد بھی داخل ہے) کی طرف نگاہ آنکھ کا زنا ارشاد فرمایا ہے۔ (مشکوٰۃ:ص۲۶۱) دوسری جگہ ارشاد ہے کہ نظر کو نظر کے پیچھے نہ لگاؤ۔ (مشکوٰۃ:ص۲۶۱)
مقصد یہ ہے کہ اگر نظر پڑ جائے بے ارادہ ہو تو معاف ہے، لیکن دوبارہ اس کی طرف دیکھنا نگاہ جمائے رکھنا معصیت میں داخل ہے، ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''اللہ کی لعنت دیکھنے والے پر بھی اور جس کو دیکھا جائے اس پر بھی'' (یعنی اس کی طرف سے اگر بے حجابی و نظر کے اسباب پیدا ہوں) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''نامحرم عورتوں کے پاس آمد و رفت رکھنے سے بچا کرو''۔
ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھلا دیور کے حق میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ''دیور پوری موت ہے''۔ موت اس لیے شاید فرمایا کہ دیور ہر وقت گھر میں رہتا ہے، اگر خدانخواستہ آنکھ لڑ گئی تو اس سے جس قدر خطرناک نتائج پیدا ہوں گے ظاہر ہے۔
حافظ ابن قیم نے ''الجواب الکافی'' (صفحہ ۲۰۴) میں بہت تفصیلی بحث اس پر کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حوادث کی ابتداء نظر سے ہوتی ہے، جیسا کہ آگ کے شعلوں کی ابتداء ایک چنگاری سے ہوتی ہے، اس لیے شرمگاہ سے زیادہ حفاظت نظر کی ضروری ہے، اس لیے کہ ابتداء تو نظر سے ہوتی ہے، اس کے بعد دل میں خیال جمنا شروع ہوتا ہے، پھر ادھر قدم اُٹھتے ہیں اور اس کے بعد پھر

ابتلاء ہو جاتا ہے، اسی واسطے کہا گیا کہ جو ان چاروں چیزوں کی حفاظت کر لے، اپنے دین کی حفاظت کر لیتا ہے، نظر، پھر دل کا خیال پھر بات چیت پھر قدم، آدمی کو چاہیے کہ ان چاروں ہی چیزوں سے بچنے کی کوشش کرے کہ ان ہی دروازوں سے دشمن (شیطان) گھروں میں گھستا ہے اور پھر گھر کی بربادی اور ہلاکت کا ذریعہ بنتا ہے، اس کے بعد حافظ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان چاروں پر تفصیلی بحث کی ہے۔

سب سے پہلے نظر سے ابتداء کی ہے کہ اس کی حفاظت شرم گاہ کی حفاظت کا اصل ذریعہ ہے کہ جو اپنی نظر کو آزاد چھوڑ دے وہ ہلاکت کے مواقع میں پہنچا دیتی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا گیا ہے ''نظر شیطان کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔'' جو شخص اپنی نگاہ کی حفاظت کرے کسی عورت یا مرد کی خوبیوں سے اللہ تعالیٰ کے واسطے، اللہ تعالیٰ اس کے دل میں عبادت کی حلاوت پیدا کر دیتے ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عام راستوں پر نہ بیٹھا کرو، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا یارسول اللہ! ہماری نشست گاہیں تو وہی ہیں (یعنی مکانوں کے سامنے جو زمین پڑی ہوئی ہوتی ہے، غرباء کے لیے وہی مردانہ مجلسیں ہوتی ہیں) وہاں کے علاوہ تو ہمارے پاس بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر اس کے بغیر چارہ نہیں تو وہاں کے حقوق ادا کرو، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! وہاں کے کیا حقوق ہیں؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نگاہ کو محفوظ رکھنا، دوسرے کو تکلیف پہنچانے سے بچنا، سلام کا جواب دینا، فقط اور عام حوادث نگاہ ہی کی بدولت پیش آتے ہیں کہ نظر ہی دل میں وسوسہ اور خطرات کا سبب بنتی ہے۔'' حافظ ابن قیم نے بہت طویل کلام کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نگاہ کا تیر جس کی طرف پھینکا جائے، اس سے پہلے تیر پھینکنے والے ہی کو قتل کرتا ہے کہ نگاہ ڈالنے والا دوسری نگاہ کو اپنے زخم کا مداوا سمجھتا ہے، حالانکہ وہ زخم کو زیادہ گہرا کرتا ہے، بڑا اچھا مضمون ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی ''احیاء العلوم'' جلد ثالث ص ۹۰ میں اس پر بڑا اچھا کلام کیا ہے اور کئی قصے بھی لکھے ہیں، منجملہ ان کے حضرت سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہ کے دو قصے لکھے ہیں۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مدینہ منورہ سے حج کو گئے، راستے میں ابواء منزل پر مقیم تھے، ان کے رفیق نے دسترخوان لیا اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں لینے بازار گیا، حضرت سلمان خیمہ میں تھے، جو نہایت حسین وجمیل اور نہایت پرہیز گار تھے۔ ایک بدوی عورت نے پہاڑ کی چوٹی سے خیمہ میں بیٹھے ہوئے ان کو دیکھا اور فریفتہ ہوگئی اور پہاڑ سے اُتر کر ان کے خیمہ میں آئی، برقع بھی تھا اور ہاتھوں پر دستانے بھی تھے، ان کے پاس آکر برقع اُٹھا دیا وہ عورت

بھی حسن و جمال میں چاند کا ٹکڑا تھی اور حضرت سلیمان سے کچھ طلب کیا۔

سلیمان بن یسار کا قصہ

حضرت سلیمان رحمہ اللہ تعالیٰ سمجھے کہ کچھ کھانے کو مانگ رہی ہے وہ دستر خوان کی طرف بڑھے کہ کچھ کھانے کو دیں، اس نے کہا مجھے یہ نہیں چاہیے، مجھے تو وہ چاہیے جو آدمی اپنی بیوی سے چاہتا ہے، حضرت سلیمان نے فرمایا:

''تجھے شیطان نے میرے پاس بھیجا ہے'' یہ کہہ کر دونوں گھٹنوں پر منہ رکھ کر بے تحاشا رونا شروع کر دیا اور چلا چلا کر رونے لگے وہ عورت تو یہ منظر دیکھ کر چلی گئی، یہ بیٹھے روتے رہے، اتنے میں ان کے رفیق آئے دیکھا تو یہ رو رہے ہیں اور آنکھیں پھول رہی ہیں، انہوں نے یہ منظر دیکھ کر سبب پوچھا اور کہا بچے یاد آ گئے؟ انہوں نے کہا ہرگز نہیں تمہاری غیبت میں ایک قصہ پیش آ گیا اور پھر واقعہ سنایا، ان کے ساتھی بھی ان کے پاس بیٹھ کر زور و شور سے رونے لگے، دستر خوان وغیرہ بھی اُٹھا لیا۔

حضرت سلیمان رحمہ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ تم کیوں رو رہے ہو، انہوں نے کہا کہ اس پر رو رہا ہوں کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو مجھ سے صبر نہ ہوتا، یہ دونوں روتے ہی رہے اور جب مکہ پہنچے، طواف سعی سے فارغ ہو کر حجرِ اسود کے سامنے حضرت سلیمان رحمہ اللہ تعالیٰ ایک چادر میں لپٹے بیٹھے تھے کہ نیند آ گئی۔

خواب میں ایک نہایت حسین و جمیل شخص کی زیارت ہوئی، انہوں نے ان سے پوچھا کہ آپ کون ہیں فرمایا یوسف! انہوں نے عرض کیا یوسف صدیق آپ ہی ہیں؟ انہوں نے فرمایا ہاں، انہوں نے فرمایا کہ آپ کے اور زلیخا کے قصہ میں بڑی تعجب کی بات ہے تو حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ابواء والی عورت کا قصہ اس سے زیادہ عجیب ہے۔

میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ ایک زمانہ میں جب کہ جناب الحاج حافظ قمر الدین صاحب نور اللہ مرقدہٗ بیمار تھے تو ان کی نیابت میں جامع مسجد سہارنپور پانچوں وقت نماز پڑھانے کے لیے مدرسہ سے تشریف لے جایا کرتے تھے، عصر کے وقت جا کر مغرب کی نماز پڑھا کر تشریف لایا کرتے تھے، اس تشریف بری میں یہ ناکارہ بھی کبھی کبھی ساتھ ہوا کرتا تھا، میں ہمیشہ غور سے دیکھتا تھا کہ مدرسہ سے لے کر جامع مسجد تک اپنے پاؤں پر نظر جمائے رہتے تھے کہ بازار میں راستہ تھا، مگر نگاہ کبھی بھی اِدھر اُدھر دوکانوں پر نہیں پڑتی تھی، میں نے اپنے حضرت قدس سرہٗ کو بھی بارہا دیکھا راستہ میں تشریف لے جاتے وقت بہت کم نگاہ اُوپر اُٹھاتے تھے زمین ہی پر اکثر نگاہ ہوتی تھی یہ نہایت ہی مہلک مرض ہے ایک تجربہ تو میرا بھی اپنے بہت سے احباب پر ہے کہ ذکر شغل کی

ابتداء میں لذت و جوش پیدا ہوتا ہے اور اس جوش سے عبادات میں ایک لذت پیدا ہوتی ہے مگر اس بدنظری سے سب سے پہلے عبادت کی حلاوت اور لذت فنا ہوتی ہے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ عبادات کے چھوٹنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی بہت سے قصے اس کے ذکر کیے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک قصاب کا قصہ ذکر کیا ہے کہ ایک قصائی اپنی کسی پڑوسی عورت پر فریفتہ ہوگیا۔ اس عورت کو اس کے گھر والوں نے کسی ضرورت سے دوسرے گاؤں میں بھیج دیا۔ تو یہ بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا اور موقع پاکر اس سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ اس عورت نے کہا کہ ایسا نہ کر، اس لیے کہ محبت تو مجھے تیرے ساتھ تجھ سے بھی زیادہ ہے مگر اللہ کا خوف غالب ہے۔ اس نے کہا تو اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور میں نہ ڈروں؟ اور یہ کہہ کر توبہ کرتا ہوا لوٹ آیا۔

راستہ میں نہایت شدت سے پیاس نے ستایا کہ پیاس کی شدت سے موت کے قریب پہنچ گیا۔ اتنے میں اس زمانہ کے نبی کا کوئی قاصد ملا اس نے کہا کیا حال ہے۔ اس نے پیاس کی شدت بیتابی بتائی۔ انہوں نے کہا اللہ سے دعاء کر۔ اس نے کہا میرے پاس تو کوئی نیک عمل نہیں۔ جس کی وجہ سے دعاء کروں، آپ دعاء کریں۔ انہوں نے کہا اچھا میں دعاء کرتا ہوں تو آمین کہنا۔ اس کے بعد ان نبی کے قاصد نے دعاء کی اور اس قصائی نے آمین کہی تو ایک نہایت گھرے بادل نے ان پر سایہ کیا۔ گاؤں تک تو وہ دونوں ساتھ چلتے رہے مگر گاؤں پہنچنے کے بعد جب دونوں کا راستہ علیحدہ علیحدہ ہوا تو وہ ابر اس قصائی کے ساتھ ہولیا۔ ان رسول نے فرمایا کہ تو تو کہتا تھا کہ میرے پاس کوئی عمل نہیں۔ اپنی صحیح صحیح حالت بیان کر اس پر اس نے سارا قصہ سنایا تو ان رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچی توبہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے کہ دوسرا وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔

ایک دوسرا قصہ طویل لکھا ہے کہ ایک نہایت حسین و جمیل نوعمر جوان متقی پرہیزگار مسجد میں رہا کرتا تھا۔ ہر وقت عبادت میں مشغول رہتا تھا۔ ایک دفعہ وہ مسجد میں آرہا تھا ایک حسین و جمیل عورت مسجد میں ملی، جو حسن و جمال میں رشکِ قمر تھی۔ اس نے کہا کہ اے جوان! میری ایک بات سنتا جا۔ انہوں نے اس کی طرف التفات نہیں کیا اور اس کی بات کا جواب بھی نہیں دیا۔ چند روز بعد پھر ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔

اس لڑکی نے پھر بھی کہا کہ میری ایک بات سنتے جاؤ۔ انہوں نے تھوڑی دیر توقف کیا اور کہا کہ یہ جگہ تہمت کی ہے، ایسی جگہ پر بات کرنا مناسب نہیں اور عورت نے کہا کہ میں بھی سمجھتی ہوں کہ تم عابد زاہدوں کے لیے تھوڑی سی چیز بھی بڑی سخت ہے، مگر میری حالت تمہاری محبت

میں بے قابو ہے اور اس نوجوان نے اس کی بات سنی اور مسجد میں چلے گئے۔ مگر وہاں جانے کے بعد جب نماز کی نیت باندھی تو کچھ پتہ نہیں چلا کہ کیا پڑھیں اور کس طرح پڑھیں، تو اس نے ایک پرچہ لیا اور اس پر لکھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

اے عورت!

''جب کوئی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے تو پہلی مرتبہ تو مالک حلم کا معاملہ فرماتا ہے اور دوسری مرتبہ ستاری فرماتا ہے اور تیسری مرتبہ ایسا ناراض ہوتا ہے کہ آسمان وزمین بھی اس سے تنگ ہوجاتے ہیں'' قصہ تو بہت طویل ہے مجھے تو صرف متوجہ کرنا تھا کہ مالک اپنے حلم وکرم سے اولاً درگزر اور ستاری فرماتا ہے۔ خوش نصیب ہے وہ جس کو اللہ جل شانہٗ نظر بد سے محفوظ رکھے اور دوسرے درجہ میں وہ جس کے مالک توبہ کی توفیق عطاء فرمائے۔ (فضائل ذکر:ص ۱۲۴)

فضائل ذکر میں ایک قصہ لکھا ہے ایک شخص کے جب مرنے کا وقت ہوا اس کو لوگ کلمہ طیبہ کی تلقین کرتے تھے تو کہنے لگا کہ مجھ سے نہیں کہا جاتا۔ لوگوں نے کہا کہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ ایک عورت مجھ سے تولیہ خریدنے آئی تھی مجھے وہ اچھی لگی میں اسے دیکھتا رہا۔

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کا ایک مستقل ''وعظ غض البصر'' کے نام سے مطبوع ہے اس میں آنکھ کی حفاظت کے متعلق بہت ہی اہم مضمون قابل دیکھنے کے ہے۔ جس کی ابتداء اللہ جل شانہٗ کے پاک ارشاد: ''یعلم خائنة الاعین وما تخفی الصدور'' سے ہے۔ حضرت نے تحریر فرمایا کہ بدنگاہی کا گناہ ایسا ہے کہ لوگ اس کو گناہ سمجھتے بھی نہیں ایسا سمجھتے ہیں جیسا کہ کسی اچھے مکان کو دیکھ لیا۔ اس لیے اس گناہ کے بعد دل پر رنج کا بھی اثر نہیں ہوتا اور یہ ایسا سخت گناہ ہے کہ اس سے بوڑھے بھی بچے ہوئے نہیں۔ بدکاری کے لیے تو بہت سی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں۔ پیسہ بھی پاس ہو۔ دوسرا بھی راضی ہو وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس گناہ کو کرنے میں کچھ سامان کی ضرورت نہیں اور نہ اس میں کچھ بدنامی ہے۔ چونکہ اس کی خبر تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے کہ کیسی نیت ہے۔ کسی کو گھور لیا، مولوی صاحب مولوی صاحب رہے، قاری صاحب قاری صاحب رہے، نہ اس گھورنے سے مولوی صاحب کے مولوی ہونے میں فرق آیا نہ قاری صاحب کے قاری ہونے میں فرق آیا اور اس گناہ کی کسی دوسرے کو خبر نہیں ہوتی اور جن اکابر کو خبر بھی ہوجاتی ہے تو وہ ایسے عالی الظرف ہوتے ہیں کہ وہ اس کا اظہار بھی گوارا نہیں کرتے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص آیا، جو بدنظری کے گناہ میں مبتلا تھا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تو اس کا نام لے کر کچھ نہیں فرمایا لیکن یہ فرمایا کہ ''لوگوں کا کیا حال ہے کہ ان

کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے'' جن اکابر کو چھپی ہوئی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں اور کشف ہوتا ہے۔
انہوں نے لکھا ہے کہ بدنگاہی سے آنکھوں میں ایسی بے رونقی پیدا ہو جاتی ہے جس کو تھوڑی سی بھی سمجھ ہوگی، وہ پہچان لے گا کہ اس شخص کی نگاہ پاک نہیں ہے۔ خاص طور سے لڑکوں پر بدنگاہی کرنا بالکل ہی زہر ہے، اس سے کھلم کھلا شرع نے منع کیا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے بھی اس کی جو برائیاں لکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی بھاری بلاء ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں بد نگاہی شیطان کا تیر ہے۔ یعنی اس بدنگاہی کی بدولت آدمی شیطان کا شکار ہو جاتا ہے۔
حضرت ابو قاسم قشیری ایک بزرگ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص دیندار ہونا چاہے اس کے لیے عورتوں اور لڑکوں کے ساتھ ملا جلا رہنا نہایت نقصان کی چیز ہے اور اس کے حق میں یہ ڈاکو ہے کہ اس کو اس کے مطلب تک ہرگز پہنچنے نہ دے گا۔ ایک اور بزرگ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ جس کو اپنے دربار سے نکالنا چاہتے ہیں اس کو لڑکوں کی طرف خواہش اور محبت دے دیتے ہیں'' اور بد نگاہی میں ایک اور بھی بڑی بھاری خرابی یہ ہے کہ جو اور کسی گناہ میں نہیں وہ یہ کہ اور گناہ تو ایسے ہیں کہ جب ان کو خوب دل بھر کے کر چکے تو پھر ان سے دل ہٹ جاتا ہے۔ مگر بدنگاہی ایسی بری چیز ہے کہ جتنی بدنگاہی کرتا ہے اتنی ہی اور زیادہ خواہش بڑھتی جاتی ہے۔
ایک بزرگ تھے وہ پردہ کرانے میں زیادہ احتیاط نہ کرتے تھے بلکہ عورتوں کو اپنے سامنے آنے دیتے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ میں تو اب بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اب میرے سامنے آنے میں کیا خرابی ہے۔ ایک اور بزرگ تھے، انہوں نے ان کو نصیحت کی کہ میاں غیر عورتوں کو اپنے سامنے مت آنے دیا کرو، انہوں نے ان کی نصیحت کا کچھ خیال نہ کیا۔ آخر ایک مرتبہ خود انہوں نے خواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی مسئلہ کو دریافت کیا کہ میں بوڑھا ہوں اب عورتوں کو میرے سامنے آنے میں کسی بری بات کا تو خوف ہے نہیں تو کیا اب بھی پردہ کرانا ضروری ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''اگر مرد اتنا بزرگ ہو جائے جتنا جنید کے مرتبہ کو پہنچ جائے اور عورت اتنی بزرگ ہو جائے کہ رابعہ بصری کے مرتبہ کو پہنچ جائے، پھر بھی اگر یہ دونوں ایک جگہ تنہا مکان میں جمع ہوں گے، تو شیطان بھی ان کے پاس آموجود ہوگا۔
اور ان سے کچھ نہ کچھ کراہی دے گا۔ پھر تمہیں کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ عورتوں کو اپنے سامنے آنے دو''۔
ایک بزرگ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے اور ان کی ایک آنکھ پھوٹی ہوئی تھی وہ طواف کرتے

جاتے اور یہ کہتے جاتے تھے۔ اے اللہ! میں آپ کے غصہ سے پناہ مانگتا ہوں۔ کسی نے پوچھا اس قدر کیوں ڈرتے ہو۔ کیا بات ہے؟ فرمایا ''میں نے ایک لڑکے کو بری نظر سے دیکھ لیا تھا، غیب سے ایک چپت لگا اور آنکھ پھوٹ گئی''۔ اس لیے ڈرتا ہوں کہ کہیں دوبارہ ایسا نہ ہو جائے۔

ایک بزرگ کی خوبصورت لڑکے خدمت کیا کرتے تھے اور یہ بزرگ کبھی کبھی انہیں پیار بھی کرلیا کرتے تھے۔ ایک روز ان کے مرید نے بھی اس لڑکے کو پیار کرلیا۔ پیر صاحب سمجھ گئے کہ اس نے میری دیکھا دیکھی ایسا کیا ہے۔ ایک روز بازار گئے لوہار کی دُکان پر گئے دیکھا کہ لوہا سرخ انگارہ سا ہو رہا ہے پیر صاحب نے فوراً جا کر اس کو پیار کرلیا اور اس مرید سے کہا کہ آیئے تشریف لایئے اس کو بھی پیار کر لیجئے۔ پھر تو گھبرا گئے اس وقت انہوں نے اس کو ڈانٹا کہ خبردار کبھی ہم سے برابری کا خیال نہ لانا کیا اپنے کو ہمارے برابر سمجھتا ہے۔ ایک اور بزرگ تھے ان کو کسی نے دیکھا کہ ایک خوبصورت لڑکے سے پاؤں دبوا رہے ہیں۔ اس شخص کو وسوسہ ہوا کہ یہ کیسے بزرگ ہیں لڑکے سے پاؤں دبواتے ہیں۔ فرمایا آگ کی انگھیٹی لاؤ۔ دہکتی ہوئی آگ میں پاؤں رکھ دیئے اور یہ فرمایا کہ ہم کو کچھ حق نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ آگ اور یہ لڑکا دونوں برابر ہیں۔

(ماخوذ از وعظ غض البصر)

حضرت حکیم الامت ''السنۃ الجلیہ'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ واسطی کا ارشاد ہے:

''جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو ذلیل فرمانے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کو ان مردار گندوں میں پھانس دیتے ہیں یعنی نو عمروں کی صحبت میں مبتلا کر دیتے ہیں''۔

حضرت نے جو اُوپر مضمون میں تحریر فرمایا ہے کہ بدنگاہی سے آنکھوں میں ایسی بے رونقی ہو جاتی ہے کہ جس کو تھوڑی سی بھی سمجھ ہوگی وہ پہچان لے گا۔ اس مقولہ پر مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نے حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی زبان سے سنا ہوا اپنے شیخ اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کا واقعہ بیان کیا ہے کہ اعلیٰ حضرت ایک مرتبہ وضو فرما رہے تھے۔ ایک پیر دھو چکے تھے اور دوسرا دھو رہے تھے کہ دو شخص آئے، ایک پہلے سے بیعت تھا دوسرا نیا آدمی تھا، جو پہلے سے بیعت تھا۔ اس کے متعلق فرمایا کہ تمہارا تو کچھ بگڑا نہیں سستی چستی آدمی کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ (ذکر کی پابندی یہ شخص نہیں کرتے تھے) نئے آدمی کے متعلق فرمایا کہ ایک مرض تو اس کی آنکھ میں ہے اور قلب بھی خراب ہے، یعنی بدنگاہی کا مرض تھا اور عقائد بھی صحیح نہیں تھے۔

(۲) میری ایک عادت خط لکھنے کے سلسلے میں

اس ناکارہ کی بری عادتوں میں جن کا سلسلہ تو بہت ہی لمبا ہے اور بہت سی چیزیں یاد بھی آتی

رہتی ہیں مگر سراپا عیوب کے عیب آدمی کہاں تک لکھوائے اور کہاں تک یاد رہے سابقہ مضمون لکھوارہا تھا کہ متعدد وجوہ سے یہ عیب دفعۃً خیال آیا کہ اسے ضرور لکھوایا جائے۔ اس ناکارہ کی ہمیشہ بہت بری اور گندی عادت یہ رہی کہ اکابر کو چھوڑ کہ ان کی خدمت میں تو ہمیشہ عمدہ کاغذ اور سادے لفافے کا اہتمام رہا لیکن دوستوں اور چھوٹوں کے خطوط میں عمدہ کاغذ اور سادہ لفافہ لکھنے کا معمول نہیں رہا۔ ایک عرصہ تک تو حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ کی طرح سے میرا بھی یہ دستور رہا کہ ڈاک کے لفافوں کو پلٹ کر ان ہی پر خطوط بھیجا کرتا تھا۔ اگر ڈاک کے ہوں تو مستقل کوئی خط لکھنا ہوا تب تو سادہ لفافہ ڈاکخانہ سے خریدنا پڑتا تھا، لیکن جن خطوط میں ٹکٹ آتے یا دستی خط ہوتا ان کو پلٹے ہوئے لفافے میں بھیجا کرتا اور اب تو ڈاک کے ہجوم اور کثرت کی وجہ سے کہ چالیس پچاس خطوط کا روزانہ کا اوسط ہے۔ یہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا کہ ڈاک کے آئے ہوئے خطوط پر اپنا پتہ کاٹ کر مکتوب الیہ کا پتہ لکھوا دیتا ہوں۔

غالباً آپ بیتی میں کسی جگہ اپنے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کا ایک واقعہ لکھوا چکا ہوں کہ ایک مرتبہ معمولی کاغذ میں ردی لفافہ میں حضرت کے نام عریضہ لکھ دیا۔ حضرت قدس سرہٗ کی تشریف آوری تو خوب کثرت سے ہوتی ہی تھی۔ خالی تو کوئی ہفتہ نہیں جاتا ہوگا۔ ایک ہفتہ میں دو دو، تین تین مرتبہ بھی تشریف آوری ہو جاتی تھی۔ میری اس حماقت کے بعد جب حضرت کی تشریف آوری ایک دو دن بعد ہوئی تو اپنے سفری بیگ میں سے نہایت نفیس عمدہ لفافے تقریباً پانچ سو ہوں گے یا شاید ہزار اور خطوط کے کاغذ کے پیڈ دس بارہ نہایت نفیس کاغذ کے نکال کر مجھے مرحمت فرمائے کہ تمہارے پاس خط لکھنے کے واسطے نہ کاغذ ہے نہ لفافہ ہے۔

میں نے عرض کیا حضرت عطیہ تو سر آنکھوں پر مگر میرے استعمال میں یہ آنے کے نہیں۔ فرمایا کیوں؟ میں نے یہ عرض کیا کہ حضرت! یہ خطوط ''کوکب'' یا ''اوجز'' کا مسودہ تو ہے نہیں جن کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا جائے۔ خط کا مقصد تو وقتی بات معلوم ہو جانا ہے۔ اس کے لیے عمدہ کاغذ اور بہترین لفافہ ضائع کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ یہ تو حضرت ہی کو مبارک ہو کہ دو بالشت کے لمبے چوڑے عمدہ کاغذ پر دو سطریں لکھ کر اور نفیس لفافہ میں اس کو رکھ کر اس لفافہ پر بھی مکتوب الیہ کا پتہ تحریر فرمادیں، جس سے وہ لفافہ بھی بیکار ہو جائے۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے وہ لفافے اور پیڈ میرے ہاتھ میں سے لے کر اپنے بیگ میں رکھ لیے۔ ان ہی حرکتوں پر حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ مجھے بخیل فرمایا کرتے تھے اور ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ بخیل کے یہاں سے جو وصول ہو غنیمت ہے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کے حالات میں بھی یہ بخیل کا لفظ شاید کئی دفعہ گزرا ہو۔

گزشتہ سال ایک مخلص دوست قاری جلیل محمد، مولانا بدر عالم مرحوم کے نواسے نے ایک پیکٹ جس میں خطوط کے کاغذ کے پیڈ تھے اور بہت عمدہ لفافے بھی تھے ایک حاجی کے ہاتھ بھیجا۔ میں نے عزیز موصوف کو لکھا کہ پیارے! یہ بات نہیں کہ میرے پاس کاغذ نہیں یا لفافے نہیں۔ میری نگاہ میں اب تک خطوط جیسے بے کار کام کے لیے اچھے کاغذ اور لفافے خرچ کرنے کی ضرورت سمجھ نہیں آئی۔ اب واپس کرنا تو مشکل ہے کہ حاجیوں کی واپسی کا زمانہ ہے۔ البتہ تمہاری دل داری اور حرمین شریفین کے خطوط کے احترام میں یہ ارادہ ضرور کر لیا کہ حرمین شریفین کے خطوط تمہارے کاغذ پر لکھواؤں گا۔ مگر اس میں بھی ایک طرف مضمون اور دوسری طرف سادہ، مجھے اپنے لیے تو گراں گزرتا ہے۔ اس لیے بقدر ضرورت کاغذ لے کر دونوں طرف لکھوانے کی کوشش کرتا ہوں۔

بعض مرتبہ شروع مضمون خاص ذہن میں نہیں ہوتا، دورانِ خط میں مضمون ذہن میں آ جاتا ہے تو میں بے تکلف مکتوب الیہ کو لکھوا دیتا ہوں کہ کاغذ ختم ہو گیا۔ لہٰذا فقط والسلام اس پر میرے عزیز محمد شمیم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ نے میرے کاتب کو دو روپے مجھ سے مخفی بھیجے تھے کہ اس کے کاغذ خرید کر خطوط کے واسطے رکھوالیں اور یہ چیز دراصل میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ ہی کی تعلیمات کا اثر ہے۔ یہاں تجارت کا سلسلہ تو تھا ہی اور اس واسطے چٹیں جن پر مقام ضلع وغیرہ طبع ہوا ہوتا تھا اور دوسری طرف سادی ہوتی تھی۔ جدھر گوند لگایا جاتا تھا ان کا معمول اس سادے حصہ پر کچھ لکھنے لکھوانے کا رہا۔ اگر ان سے کوئی ذرا سا گوند مانگنے آتا کہ لفافہ چپکانا ہے یا کوئی چیز چپکانی ہے اور کاغذ پر یا کسی چیز پر لے جانا چاہتا تو انکار فرما دیتے تھے اور گوند دانی اس کے حوالے کر دیتے تھے کہ کاغذ چپکا کر یہ گوند دانی واپس کر دینا اور فرمایا کرتے تھے کہ تمہارا کاغذ چپکنے کے بعد جتنا گوند اس کاغذ پر رہ جائے وہ ضائع ہوگا اس کو تم پھینک دو گے۔

میرے دوستوں میں یا میرے چھوٹوں میں جو شخص محض اعزاز میں جوابی لفافہ لکھتا میں ہمیشہ اس کو بڑے اہتمام سے یہ لکھواتا ہوں کہ یہ مضمون تو جوابی کارڈ پر بھی آ سکتا تھا، جوابی لفافہ کیوں ضائع کیا گیا۔ البتہ جو تعویذ منگائے اس کی تو مجبوری ہے کہ وہ نہ کارڈ پر آ سکتا ہے نہ ۱۵ پیسے کے لفافہ میں۔ اس کے لیے تو ۲۵ پیسے کا لفافہ ضروری ہے، ورنہ جوابی کارڈ کا جواب بھی بہت آسان ہے اور جلدی جاتا ہے۔ لفافہ کے جواب میں دیر بھی لگتی ہے اور محض اعزاز میں پورا لفافہ جس میں نہایت مختصر مضمون ہو مجھے بہت ہی گراں گزرتا ہے۔ اسی لیے اور ان ہی حرکتوں پر مجھے حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ بخیل فرمایا کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ تبعاً یہ بھی لکھوا دوں کہ میرا گھر والوں سے ہمیشہ یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ بغیر کسی مہمان کے فلاں چیز کیوں پکی۔ محض اپنے یا اپنے گھر والوں کے لیے کوئی اچھی سی چیز پکنا مجھے بہت گراں گزرتا ہے۔ البتہ مہمانوں کے لیے مجھے ہمیشہ اہتمام

رہا کہ فرشتے اس چیز کو لکھیں تو مہمانوں کے نامۂ اعمال میں اور کھائیں ہم۔ اتفاق سے خاص ضرورت سے یہ مضمون بے محل آ گیا کہ بعض لوگ اس کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ خدانخواستہ ان کی اہانت مقصود نہیں بلکہ بخل کا اظہار ہے ورنہ عیوب کی مقدار تو لا تعدو لا تحصٰی ہے:

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(۳) ایک ضروری نصیحت یا بہترین عادت

یہ ناکارہ آپ بیتی میں متعدد مرتبہ کئی جگہ یہ لکھوا چکا ہے کہ مجھے اکابر کی جوتیوں کی بدولت اوران کی عادات شریفہ کو کثرت سے دیکھنے کی وجہ سے مدرسہ کے امور میں ہمیشہ بہت ہی فکر و احتیاط رہی۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کوئی لغزش نہیں ہوئی ہوگی۔ ''وَمَا أُبرِئُ نفسی اِن النفس لأمارة بالسو'' لیکن یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنی یاد کے موافق عمداً مدرسہ کے معاملات میں کوتاہی ان شاء اللہ نہیں ہوئی ہوگی۔ میں کہیں لکھوا چکا ہوں کہ میرے اعلیٰ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ واعلی اللہ مراتبہ کا مشہور قول تھا کہ مجھے مدرسہ کی سرپرستی سے جتنا ڈر لگتا ہے اتنا کسی سے نہیں۔

حضرت کا ارشاد تھا کہ ہم مدرسہ کے مال کے مالک تو نہیں، امین اور محافظ ہیں۔ اس لیے کسی کوتاہی پر ہمارے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوتا۔ البتہ اگر ہم بمصالح مدرسہ کسی کو معاف کریں یا چشم پوشی کریں تو اللہ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ ہم سے درگزر فرمادے گا، لیکن ہمارے معاف کرنے سے اس کا معاف نہیں ہوگا اور اگر اپنے تعلقات کی وجہ سے کسی سے درگزر کریں تو اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی مبتلاء معصیت ہوں گے۔ اپنے حضرت قدس سرہٗ اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مدرسہ کے سابق مہتمم حضرت مولانا الحاج عنایت الٰہی صاحب اعلی اللہ مراتبہم کے قصے وقتاً فوقتاً اپنے اپنے موقع پر گزر چکے ہیں۔

یہ ناکارہ رجب ۲۸ھ میں مدرسہ میں طالب علم کی حیثیت سے آیا تھا اور اب محرم ۹۳ھ تک طالب علمی مدرسی سرپرستی، سارے ہی مراحل طے کر چکا۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ ان سارے ادوار میں کسی طالب علم کی اپنے تعلق کی وجہ سے مدرسہ میں کھانا جاری کرنے کی سفارش کی ہو۔ بارہا بلکہ بیسیوں مرتبہ اس کی نوبت آئی کہ کسی طالب علم کا کسی جرم یا امتحان کی ناکامی پر کھانا بند ہوا اور اس نے حضرت مولانا الحاج عبداللطیف صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے خود یا اپنے اولیاء کے ذریعہ سفارش کرائی اور حضرت ناظم صاحب نے تحریر فرمادیا کہ اگر زکریا سے سفارش لکھوا دو تو میں جاری کردوں گا۔ (اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ حضرت ناظم صاحب قدس سرہٗ کو یہ خیال ہوتا تھا کہ یہی گستاخ جرح

کرے گا) اور جب وہ کاغذ یا پیام میرے پاس آتا تھا تو میرا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ مدرسہ سے تو سفارش نہیں کروں گا جب تک اس کا کھانا بند ہے میرے ساتھ کھالیا کرے۔

مدرسہ کے معاملات میں احتیاط اور ذاتی تعلق کی وجہ سے سفارش سے گریز

بارہا اس کی نوبت آئی کہ مدرسہ سے ایسے طلبہ کا اخراج ہوا، جن کو مجھ سے خصوصی تعلق تھا، مگر مجھے وثوق سے یاد ہے کہ میں نے اپنے تعلق کی وجہ سے کبھی اخراج کی مخالفت یا معافی کی سفارش کسی بھی ناظم سے کی ہو۔ بعض طلبہ کو مجھ سے کبیدگی ہوتی تھی وہ میری مخالفت بھی کرتے تھے۔ جھوٹے الزام بھی لگاتے تھے، مگر میں حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کبھی ان کے اخراج کی کنایۃً یا اشارۃً تحریک نہیں کی۔ طلبہ کی ناراضگی کی وجہ بھی برحق ہوتی تھی کہ یہ ناکارہ خواص یعنی اکابر کے متعلقین کے بارے میں ہمیشہ سخت رہا۔ کیونکہ میرے ذہن میں یہ تھا کہ ان پر نکیر یا تنبیہ ہر مدرس کے بس کی بات نہیں۔

مزید براں میرے دو مخلص دوست حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب صدر مدرس مدرسہ اور قاری مفتی سعید احمد صاحب صدر مفتی مدرسہ بھی مجھے ابھارتے ہوتے تھے کہ فلاں شخص کی یہ شکایت ہے، ہم نکیر پر قادر نہیں تو قادر ہے، تیرے عدم نکیر سے تجھ سے باز پرس ہوگی۔ وہ زمانہ بھی میری شدت کا تھا کہ اس زمانہ میں میرا ہاتھ میری زبان سے زیادہ چلتا تھا۔ اسی لیے یہ خواص مجھ سے ناراض رہا کرتے تھے۔

آپ بیتی نمبر۲ میں مخصوص طلبہ پر میرے تشدد کے ذیل میں یہ مضمون آبھی چکا۔ اسی میں یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ ۵۷ھ میں انہی خواص نے طلبہ پر سختی کی شکایات ظلم و تعدی کی شکایات اخبار ''مدینہ'' میں چھپوائی جو حضرت شیخ الاسلام حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ کی شفقتوں سے تحقیقات میں بالکل غلط ثابت ہوئی۔ اس کی تفصیل تو وہاں گزر چکی مگر جب مدرسہ نے ان کے سرغنہ لوگوں کا اخراج تجویز کیا تو اس ناکارہ نے بمصالح مدرسہ ان کے اخراج کی بہت شدت سے مخالفت کی۔ دو دن تک یہ مسئلہ ہماری مجلس شوریٰ میں زیر بحث رہا۔ سب اہلِ شوریٰ ان کے اخراج پر متفق و متحد تھے کہ ان کا جھوٹ علی الاعلان ثابت ہو چکا تھا۔ صرف یہ ناکارہ دو دن تک ان حضرات سے لڑتا رہا کہ ہرگز اخراج نہ کریں کہ ان کے اخراج سے آپ حضرات کو مشکلات پیش آجائیں گی مجھ تک ان شاء اللہ کوئی نہیں پہنچے گا۔ مگر ان طلبہ کے دینی یا دنیوی اکابر سے آپ حضرات کو خصوصی تعلق ہے۔ آپ حضرات کو ان کے اخراج میں بڑی مشکلات پیش آئیں گی۔ حضرت ناظم صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے تو یہ ارشاد فرمایا کہ یہ معاملہ اس کی ذات کا ہے اس میں اس کی رائے معتبر نہیں اور حضرت

مولانا عبدالرحمٰن صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ جن اکابر کا یہ اندیشہ بتا رہا ہے وہ محض اس کا خیال ہے ان کی طرف سے کوئی چیز ایسی پیش نہیں آئے گی مگر خوب آئی۔

ملازمین مدرسہ میں بھی اس سیہ کار نے کبھی تعلق کی وجہ سے نہ کسی سے سفارش کی نہ کسی کی علیحدگی کی تحریک یا کوشش کی۔ میرے محسن مخلص مولوی نصیر الدین سلمہ جس سال دورہ سے فارغ ہوئے انہوں نے چاہا کہ مدرسہ کا کوئی سبق پڑھانے کو مل جائے بلا تنخواہ میں نے ان سے کہا کہ تمہاری استعداد کے لوگ شاخ پڑھا رہے ہیں۔ ناظم صاحب کی خدمت میں درخواست میں کاغذ آیا تو میں موافقت نہیں کروں گا۔ کہ تمہارے بارے میں میری رائے متہم ہے۔

میرے حضرت مولانا الحاج عبدالقادر صاحب رائپوری نور اللہ مرقدہٗ کے عزیز مولوی عبدالرحمٰن شاہ پوری جس سال دورہ سے فارغ ہوئے ان کے ساتھ بھی یہی قصہ پیش آیا اور میں نے عزیز مولوی نصیر الدین والا جواب ان کو بھی دیا، مگر حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے، بمصالح مدرسہ میں نے ان کو ایک مشورہ دیا کہ حضرت ناظم صاحب اکثر میرے ساتھ رائے پور تشریف لے جاتے ہیں۔ اب کے جب تشریف لے چلیں تو تم ساتھ چلنا اور حضرت قدس سرہٗ کی مجلس میں بشرطیکہ میں اس مجلس میں موجود نہ ہوں۔ حضرت ناظم صاحب سے ایسے آہستہ سے درخواست کرنا کہ حضرت نہ سنیں۔ اس لیے کہ مجھے حضرت سے بھی یہی اندیشہ تھا کہ وہ اپنے تعلق کی وجہ سے کوئی لفظ خلاف کا نہ فرمادیں۔

چنانچہ ایک موقع پر جب کہ ہم دو تین آدمی ہی حضرت کی مجلس میں بیٹھے تھے میں گویا پیشاب کے لیے اٹھا اور مولوی عبدالرحمٰن کو اشارہ کر گیا۔ انہوں نے حضرت ناظم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے پاس بیٹھ کر بہت چپکے سے درخواست کی۔ حضرت ناظم صاحب نور اللہ مرقدہٗ مروّت اور ادب کے پتلے تھے اور یہ گستاخ اکابر کی شان میں بھی ہمیشہ گستاخ ہی رہا۔ چنانچہ عزیز موصوف نے چپکے سے درخواست کی اور حضرت ناظم صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ سہارنپور جا کر درخواست دیجیو۔ چنانچہ انہوں نے یہاں آکر درخواست دی اور عزیز موصوف کو سبق مل گیا۔

میرے مخلص دوست مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی حال سرپرست مدرسہ ذیقعدہ ۵۱ھ میں معین مفتی ہوئے اور دس روپے تنخواہ تھی۔ اس کے دو سال بعد شوال ۵۳ھ میں نائب مفتی ہوئے اور پندرہ روپے تنخواہ ہوئی۔ ان دو سالوں میں بہت ہی دوستوں نے مجھ پر اصرار کیا۔ بالخصوص جناب الحاج حافظ محمد یعقوب صاحب گنگوہی نواسہ قطب الارشاد حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے تو مجھے کئی دفعہ ڈانٹا کہ دس روپے میں کیا گزر ہوسکتا ہے تو سفارش کردے تو تنخواہ کا اضافہ ہوجائے۔ میں یہی کہتا رہا کہ ان کا مجھ سے خصوصی تعلق ہے۔ میں سفارش نہیں کروں گا

اور بھی بہت سے نظائر اس کے مفتی یحییٰ، عزیز عاقل، عزیز سلمان کے مواقع میں پیش آ چکے ہیں۔ جن کو ہمارے سرپرستان خوب جانتے تھے اور جانتے ہیں۔ اس کے بالمقابل اپنی ذاتی مخالفت کی وجہ سے میں نے کسی کو مدرسہ سے علیٰحدہ کرنے کی یا ترقی روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی بھی بیسیوں نظیریں اللہ کے فضل سے گزر چکیں۔

میری ابتداء ملازمت میں مدرسہ کے ایک ملازم جن کو اصالۃً تو میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے عناد تھا اور ان کی وجہ سے ان کے بعد اس ناکارہ سے اور میرے چچا جان حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے مخالفت تھی۔ انہوں نے اور ان کے اعوان نے ہم دونوں کے متعلق یہ مشہور کر رکھا تھا کہ یہ حضرت قدس سرہٗ کے اوپر انگریزوں کی طرف سے جاسوس مقرر ہیں اور یہ ناکارہ چونکہ حضرت قدس سرہٗ کی ڈاک بھی لکھا کرتا تھا۔ حجرہ شریفہ سے ڈاک کا نکالنا ڈیکس کا لانا، حجرہ کا قفل کھول کر ان سب چیزوں کو باہر حضرت کی خدمت میں لانا اور فراغ پر ان سب چیزوں کو اندر رکھ کر حضرت کے حجرہ کو قفل لگانا میرے ہی ذمہ تھا۔

حضرت قدس سرہٗ نے اس سیہ کار کے ڈیکس میں ایک امانت طلائی زیور کی رکھی تھی وہ چوری ہوگیا تو دوستوں نے اس سیہ کار ہی کو متہم کیا اور کرنا ہی چاہیے تھا کہ حجرہ کی آمد و رفت میری ہی تھی، اگرچہ میرے حضرت قدس سرہٗ اعلی اللہ مراتبہ نے اس الزام کو سنتے ہی فوراً تردید فرمادی کہ یہ اس کا کام نہیں جس پر احمقوں نے حضرت قدس سرہٗ پر بھی فرط محبت کا الزام لگایا اور مالک کے احسانات سے یہ بھی بعد میں ثابت ہوگیا کہ وہ ایک اور صاحب کی حرکت تھی اور انہوں نے اقرار بھی کرلیا۔ مگر جب تک وہ امانت نہیں ملی اس ناکارہ پر چوری کا الزام خوب زوروں پر عائد رہا۔ میرے کاتب کہتے ہیں کہ یہ قصہ تو پہلے گزر چکا۔ اس لیے مختصر کردیا۔ لیکن اس دور کے متعدد واقعات کثرت سے پیش آئے اور میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی مخالفت رنگ لائی کہ یہ صاحب حضرت قدس سرہٗ کے یہاں سے معتوب ہوئے۔ مدرسہ سے علیٰحدہ ہوئے اور جب اس سیہ کار نے حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں بہت اخلاص سے ان کی معافی کی سفارش کی اور میرے حضرت قدس سرہٗ نے بہت استعجاب سے فرمایا کہ تم بھی اس کی سفارش کرتے ہو مجھے اپنے الفاظ خوب یاد ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ حضرت کی ناراضی سے اس کے دین و دنیا دونوں برباد ہوجائیں گے اور اس گستاخیوں بے ادبیوں سے حضرت کی شان میں فرق تو پڑتا نہیں۔ مگر میرے حضرت نے میری سفارش تو قبول نہیں کی۔ مگر مجھے خوب محسوس ہوا کہ اس قصہ سے مجھ پر حضرت کی شفقت خوب بڑھ گئی تھی۔

بیماری کے نام سے رخصت لینے کا نتیجہ

اسی کے ساتھ اس سیہ کار کا ایک تجربہ اور بھی اپنی طویل زندگی میں گزرا۔ جس کا ظہور ابتداء میں تو بہت کثرت سے ہوتا تھا اور اب بہت دیر سے ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جس نے بھی بغیر بیماری کے مدرسہ سے بیماری کی چھٹی لے۔ وہ ضرور بیماری میں مبتلاء ہوا۔ یا کسی دوسری قسم کی خیانت مدرسہ کی کی، اوقات کی یا اموال کی، اس کو بہت بری طرح سے بھگتا۔ بیسیوں واقعات میرے تجربہ میں آئے ہیں۔ یا چوری ہوئی یا کسی مقدمہ میں ابتلاء ہوا اور سینکڑوں پر پانی پھرا اور عجیب بات یہ بھی دیکھی کہ جو دین سے جتنا زیادہ قریب تھا اس کو سزا جلدی ملی۔ مگر تھوڑی اور جو شخص دین سے جتنا دور تھا، اتنی ہی دیر میں سزا ملی مگر سخت ملی۔

اس کی وجہ تو میرے ذہن میں ہے جس کو یہ ناکارہ اعتدال کے باب چہارم میں جو مستقل ''مسلمانوں کی پریشانیوں کے علاج'' کے نام سے اس کا عربی ترجمہ ''اسباب السعادہ'' کے نام سے ندوہ، کراچی بیروت میں چھپ چکا اور انگریزی ترجمہ ''مسلم فلکشنس'' اور گجراتی ترجمہ ''وردودوا'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے میں تفصیل سے گزرا ہے اور اس لیے اس ناکارہ کی اپنے سے تعلق رکھنے والے دوستوں کو وصیت ہے مدرسہ کے معاملات میں بہت ہی محتاط رہیں۔ یہ نہ سمجھیں کہ ہمارا ٹوکنے والا کوئی نہیں یا ہمیں کون ٹوک سکتا ہے۔ کسی کا تو نہ ٹوکنا یا ٹوک سکنا اور بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس سیہ کار کو بھی اس لکھے ہوئے پر عمل کی مزید توفیق عطاء فرمائے اور میرے دوستوں کی بھی اس سے زیادہ سے زیادہ حفاظت فرمائے۔

(۴) ایک عجیب تجربہ

اپنے تجربات تو بہت سے ہیں، اچھے بھی برے بھی۔ اکابر میں بھی بہت سے تجربات کیے اور اپنی ذات میں بہت کچھ کیے ایک تجربہ میرا یہ بھی ہے کہ اکابر کے خدام اور مقبولیت میں روز افزوں اضافہ سے مجھے بجائے خوشی کے ہمیشہ ڈر لگا کرتا ہے۔ میرے حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کے اخیر رمضانوں کی جو مقبولیت عام اور وسعت بیعت کے خطوط ان جگہوں سے آتے ہیں، جہاں حضرت کا رمضان گزرتا تھا اور میرے دوست بہت ہی مسرتوں کے ساتھ ان رجوعات عامہ اور لوگوں کے زیادہ سے زیادہ حلقہ بگوش ہونے کی خبریں لکھا کرتے تھے۔ میں ان کے خطوط میں اجمالاً یہی لکھا کرتا تھا کہ بھائی یہ خبریں میرے لیے تو زیادہ موجب مسرت نہیں۔ زیادہ تفصیل تو میں نہیں لکھتا تھا مگر اجمالی ضرور لکھتا رہتا تھا۔

اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کا بھی آخری دور دیکھا، پھر حضرت رائے پوری ثانی نور اللہ

مرقدہٗ کا بھی آخری دور دیکھا۔ عزیز مولوی یوسف نور اللہ مرقدہٗ کے وصال سے دو سال قبل میں نے عزیز ہارون سلمہ کو نہایت اہتمام سے بہت تنہائی میں بلا کر بہت ہی تفصیل سے یہ مضمون سمجھایا تھا کہ تیرے ابا جان کی جو پرواز ہو رہی ہے میرے نزدیک خطرناک ہے جو کچھ کرنا ہے کر لے، غنیمت سمجھ، بہت ہی وضاحت سے بہت کچھ اس کو کہہ دیا تھا۔ مگر وہ تو بچہ تھا۔

اس ستتر (۷۷) سالہ بوڑھے کو بھی باوجود تجربات کے اور دیکھنے کے عبرت حاصل نہ ہوئی اور یہ مضمون دراصل مشکوٰۃ شریف کے پڑھنے کے زمانہ سے غور کرنا شروع کیا تھا کہ جب احادیث میں یہ مضمون نظر سے گزرا کہ جب حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا ابتدائی اشارہ سورۂ نصر کے نزول سے ہوا اور اس میں ''اذا جاء نصر اللّٰہ والفتح'' کے ساتھ ''ورایت الناس یدخلون فی دین اللّٰہ افواجا'' پر ''فسبح بحمد ربک'' کو مرتب فرمایا۔ اسی وقت سے یہ مضمون سوچ اور غور میں آنے لگا تھا۔ اس لیے اکابر کے ہر آخری دور میں بہت ہی ڈرتا رہا۔ اپنے دوستوں کو یہ بھی وصیت کرتا ہوں کہ اکابر کی کثرت رجوع سے محض خوشی پر اور مسرتوں پر قناعت نہ کریں بلکہ جو لینا ہو غنیمت سمجھیں۔

اسی تکملہ میں ایک ضروری تنبیہ یہ بھی ہے کہ شاید کہیں ابھی لکھوا چکا ہوں کہ اکابر کے دیکھنے والے اور ان سے متمتع ہونے والے اس کے وصال کے بعد انتہائی محرومیوں میں مبتلاء ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ کہ اکابر کے جانے کے بعد وہ بعد والوں کا مقابلہ جانے والوں سے کرتے ہیں۔ یہ بڑی غلطی کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے بعد والوں کے فیوض و برکات سے محروم رہتے ہیں۔

بزرگوں کی طرف رجوع عام ان کی اخیر عمر میں

میں نے حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ کے وصال کے بعد بعض اکابر کو حضرت کے بعض اجل خلفاء کی طرف رجوع کا مشورہ دیا، مگر ان کی نگاہوں میں حضرت قطب الارشاد سمائے ہوئے تھے، انہوں نے رجوع نہ کیا۔ جس کا مجھے بہت ہی قلق ہے کہ وہ حضرات بہت ہی اونچے تھے۔ اسی طرح قطب الارشاد کے اجل خلفاء کے وصال کے بعد میں اپنے دوستوں کو ان کے خلفاء کی طرف متوجہ کرتا رہا۔ بہت سوں نے تو مانا، بہت سوں نے نہ مانا۔

خلفاء میں اکابر کے کمالات نہ پاکر ان سے ترک استفادہ سخت محرومی ہے

اب اس آخری دور میں مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے وصال کے بعد مجھ سے بعض لوگوں نے جب یہ شکایت کی کہ مولانا انعام الحسن صاحب اللہ تعالیٰ ان کو بہت دیر تک زندہ سلامت رکھے۔ ان میں وہ باتیں نہیں جو حضرت جی (مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ)

میں تھیں۔ تو میں نے ان کو یہی جواب دیا کہ حضرت جی میں وہ باتیں نہیں تھیں جو ان کے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ میں تھیں اور مولانا انعام الحسن صاحب کے بعد والوں میں یہ بھی نہیں دیکھو گے جو ان میں ہیں۔

اس لیے بہت ضروری تنبیہ، نصیحت اور وصیت ہے کہ میرے دوست احباب بعد والوں کو اس نگاہ سے نہ دیکھا کریں جس نگاہ سے جانے والوں کو دیکھا۔ بلکہ اس نگاہ سے دیکھا کریں کہ ان کے بعد ایسا بھی نہیں ملنے کا اور ظاہر بات ہے کہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں تو بقیہ انبیاء میں بھی نہیں تھیں۔ چہ جائیکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خوبیاں حضرات تابعین میں اور ہلم جراً بعد والوں میں جانے والوں کی عادات کو تلاش کرنا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے۔

جبکہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے: "لایأتی علیکم عام إلا بعده، شر منه او کما قال صلی الله علیه و آله وسلم "، "تم لوگوں پر کوئی ایسا سال نہیں ہوگا کہ بعد والا اس سے بدتر نہ ہوگا"۔

میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا مقولہ بارہا سنا ہوا ہے کہ ہر سال کے دورہ والے پہلے سے گرے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنا بھی پچاس سالہ تجربہ یہی ہے۔ اپنی ابتدائی مدرسی میں طلبہ کی دینی حالت، دین کی رغبت وشوق جتنا دیکھا اب اس کی ضد دیکھ رہا ہوں:

ان نینوں کا یہی بسیکھ
وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

دینے والی ذات صرف اللہ کی ہے

میں نے اسی سلسلہ میں اپنے اکابر کا یہ تجربہ کیا کہ وہ حضرات جو کتابیں پڑھاتے تھے، ان کو اپنی حیثیت سے اونچا سمجھتے تھے اور اب یہ دیکھ رہا ہوں کہ جو کوئی بھی کوئی کتاب پڑھاتا ہے اپنے کو اس سے اونچا سمجھتا ہے۔ وہ حضرات اپنی تنخواہ کو چاہے کتنی ہی قلیل ہو اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھتے تھے اور اب جتنا بھی تنخواہوں میں اضافہ ہو جائے وہ اپنے کو اس سے زیادہ مستحق سمجھتے ہیں۔ اس مضمون کو میں اسی رسالہ میں فصل نمبر ۶ میں اکابر کا اپنی تنخواہوں کو زائد سمجھنے کے ذیل میں تفصیل لکھوا چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ مجھے بھی توفیق عطاء فرمائے کہ یہ مضمون ذہن میں راسخ ہو جائے کہ دینے والی ذات صرف مالک کی ہے وہی رازق ہے وہی رب العلمین ہے اور باقی سارے ذرائع چاہے وہ مدرسہ ہو، ملازمت ہو، تجارت ہو، یہ سب مالک کے قاصد ہیں مالک کے یہاں سے جو مقدر ہے

وہ ضرور پہنچ کے رہتا ہے۔ چاہے وہ مہتمم مدرسہ کے ذریعہ سے پہنچے یا تجارت کے ذریعہ سے پہنچے یا کسی کے ذریعے سے ہدیہ پہنچے۔

اگر آدمی یہ غور سے سوچا کرے کہ مجھے اس ماہ میں کیا ملا پھر اس کا اس پر اصرار کہ وہ مدرسہ کی تنخواہ سے ملا ہے یا کسی کے ہدیہ سے یا کسی اور ذریعے سے، حماقت کے سوا اور کیا ہے۔ زبان سے تو یہ چیزیں ہم لوگ بھی کہتے رہتے ہیں، لیکن دل میں جگہ کر لیں تو دین و دنیا دونوں کی راحت ہے اور اس ناکارہ کو اس کے ذاتی تجربے بارہا ہوئے۔ ہزاروں سے بھی کہیں زیادہ کہ جب بھی کسی جگہ سے آمد کا ذریعہ کوئی بند ہوا۔ مسبب الاسباب مالک نے دوسرا دروازہ ہاتھ کے ہاتھ کھول دیا۔ آدمی اپنی کمائی سے عمدہ غذائیں کھائے یا دوستوں کے اصرار و ہدایا سے عمدہ غذائیں کھائے دونوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ غذا جو مقصود تھی وہ ہر حال میں ایک ہی سی پہنچی پھر یہ سوچنا کہ فلاں کے ہاتھ سے آئی، فلاں کے ہاتھ سے نہیں آئی، یا فلاں کے ذریعہ آئی، فلاں کے ذریعہ سے نہیں آئی بیوقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔

جوتے کھا کر پلاؤ کھانے کی حکایت

بچپن میں اپنے والد صاحب قدس سرہٗ سے ایک قصہ سنا تھا کہ ایک رئیس زادہ تھا باپ مر چکا تھا، ماں بہت ہی لاڈو پیار کرتی تھی۔ اول تو باپ کے مرنے کے بعد اولادیں ویسے ہی ماؤں کے قبضہ میں نہیں آیا کرتیں اور رئیسوں کی اولاد تو ماؤں کے قبضہ میں کبھی نہیں آئیں۔ وہ رئیس زادے فارسی پڑھا کرتے تھے۔ جب اس میں یہ مضمون گزرا جس کا حاصل یہ تھا کہ جو آدمی کے مقدر میں ہو وہ جبراً کھاتا ہے۔ خوشی سے نہ کھائے تو جبر سے کھانا پڑتا ہے۔ وہ من چلے صاحبزادے اس پر پہنچ کر استاد سے جھگڑ پڑے کہ میں نہیں کھاتا ہے کسی کے باوا کی مجال جو مجھے کھلائے اور یہ کہہ کر کتاب بند کر کے چلے آئے کہ آئندہ سبق جب پڑھوں گا جب کوئی اپنی ماں کا لال مجھے جوت مار کر کھلا کر دیکھے اور جا کر ماں پر بھی برس پڑے۔ کتاب بھی پھینک دی کہ میں ایسی جھوٹی کتاب نہیں پڑھوں گا۔ میں عہد کر کے آیا ہوں کہ میں نہیں کھاؤں گا۔ میں بھی دیکھوں کون یوں توں کرنے والا مجھے کھلا سکے۔

ماؤں کی شفقت تو ضرب المثل ہے۔ دن بھر بیٹے کی خوشامد، منت سماجت سب کچھ کر لی مگر اس پر تو ریاست کا سور چڑھ رہا تھا۔ مجھے تو یہ یاد پڑتا ہے کہ یہ قصہ کہیں لکھوا چکا ہوں مگر میرے کاتب یوں کہتے ہیں کہ آپ بیتی میں نہیں لکھوایا۔ اس لیے قصہ کو پورا کرتا ہوں کہ وہ لڑکا دن بھر تو اپنی ضد پر رہا۔ رات کو اس کو یہ خیال ہوا کہ بھوک بھی لگے گی اور ماں کا اصرار بھی ہوا، کہیں بات نہ بگڑ جائے۔

اس لیے آبادی کے قریب ایک تکیہ قبرستان میں چلا گیا۔ ماں کو تڑپ لگ رہی تھی۔ اس نے بچہ کے دوستوں سے پوچھا کہ ارے وہ تو گھر سے چلا گیا، کہیں تلاش کرو، تمہیں انعام دوں گی۔ بچوں نے تلاش کر کے بتایا کہ وہ تو قریب ہی تکیہ میں ہے۔ ماں نے ایک دیگچی بہت ہی نفیس پلاؤ پکائی، جس میں سونف، گرم مصالحہ وغیرہ بھی ڈلوایا، جس کی خوشبو دور تک جارہی تھی اور اس خیال سے کہ یہ بچے ضرور ساتھ کھائیں گے، ایک بڑی سی دیگچی میں پلاؤ پکا کر ان لڑکوں سے یہ کہا کہ میں تمہیں انعام دوں گی یہ دیگچی تکیہ میں اس کے قریب رکھ دو، اس کو خبر نہ ہو وہ ضدی ہے۔ اگر اسے پتہ چل گیا تو وہ بالکل نہیں کھائے گا، جب رات کو بھوک لگے گی، اِدھر اُدھر پھرے گا اس کے پاس آئے گا تو کھا ہی لے گا۔ لڑکے انعام کے شوق میں وہ دیگچی عشاء کے قریب اندھیرے میں اس تکیہ میں رکھ آئے۔

اتفاق سے رات کو کچھ ڈاکو اس بستی میں ڈاکہ ڈالنے کو آرہے تھے جب اس تکیہ پر پہنچے تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ ارے یار پلاؤ کی خوشبو آرہی ہے۔ وہ خوب مہک رہی تھی۔ دیکھا تو ایک دیگچی میں گرم گرم پلاؤ رکھا تھا۔ اور اس کے قریب ہی ایک لڑکا چادر اوڑھے پڑا ہے۔ لڑکے کو ٹھوکر مار کر اٹھایا کہ یہ پلاؤ کیسی رکھا ہے۔ اول تو اس نے کہا کہ مجھے خبر نہیں تو خوب پٹائی ہوئی اور کہا کہ جھوٹ بولتا ہے یہ ہمارے مارنے واسطے زہر ملا کر یہاں رکھا ہے۔ اس لڑکے نے کہا کہ اس میں زہر وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ سارا قصہ سنایا تو دو جوت پھر کھائے کہ بات ملاتا ہے۔ اگر زہر نہیں تو پہلے کھا پھر ہم کھائیں گے اور جوت بازی شروع کر دی۔

وہ اکیلا تھا یہ کئی تھے۔ پلاؤ کھانا شروع کر دیا۔ جہاں سے یہ لڑکا کھاتا، وہاں سے چار لقمے وہ بھی جلدی جلدی کھا کر اس لڑکے سے کہتے اب ادھر سے کھا۔ تجھے خبر ہے کہ زہر کدھر ملایا ہوا ہے اور وہ جوتے کھاتا رہا اور پلاؤ کھاتا رہا اور جب وہ دیگچی صاف ہوگئی تو ڈاکو آگے چلے گئے۔ کیواڑ کھلوائے اور ماں سے کہا کہ ماں جوتے بھی کھائے اور پلاؤ بھی کھایا اور سارا قصہ سنایا صبح کو کتاب لے کر استاد کے پاس پہنچ گیا اور کہنے لگا استاد جی جو شعر لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ میں جوتے بھی کھا آیا اور پلاؤ بھی کھا آیا اور سارا قصہ سنایا۔ خود اس ناکارہ کے ساتھ بھی کئی واقعے اس نوع کے پیش آئے ہیں۔ واقعات تو کئی یاد ہیں اس وقت ایک ہی واقعہ لکھواتا ہوں۔

تقریباً بیس (۲۰) بیس سال قبل کا قصہ ہے۔ میرے مخلص دوست جناب حافظ محمد اسحاق صاحب سہارنپوری بیمار ہوئے اور بہت زیادہ بیمار ہوئے کہ مایوسی کی حالت ہوگئی۔ میں اپنے مخلص دوست قاری سعید احمد صاحب مرحوم کے ساتھ ان کی عیادت کو گیا۔ اس زمانہ میں ایک جذبہ اس سیہ کار پر غالب ہو رہا تھا کہ فضول چیزیں پھل مٹھائی وغیرہ نہیں کھانی چاہیے، جو کہیں سے آئے احباب کو دینی چاہیے۔ کئی دن سے یہ جذبہ غالب ہو رہا تھا۔

ہم دونوں کے پہنچنے پر حافظ صاحب کو اتنی زیادہ خوشی ہوئی کہ یا تو بغیر سہارے کے کروٹ بھی نہیں لے سکتے تھے یا فرطِ خوشی میں ایک دم بیٹھ گیا اور اپنے بچہ کو آواز دے کر جو پھل انگور، انار وغیرہ ان کے لیے آئے رکھے تھے وہ منگا کر اصرار کیا کہ اس میں سے کچھ کھا لے۔ میں نے ان سے بہت اصرار کیا کہ میں اپنا حصہ لے جاؤں، انہوں نے اصرار کیا کہ حصہ تو میں ضرور دوں گا مگر میرے سامنے اگر کچھ انگور اور فلاں فلاں چیز کھالے تو میرا بہت جی خوش ہوگا۔ میں نے بہت ہی خوشامد کی کہ میرا حصہ دے دو، خیال تھا کہ بچوں یا دوستوں میں سے کسی کو دے دوں گا۔ مگر انہوں نے اس قدر بری طرح اصرار کیا کہ ان کی خاطر میں کھانا ہی پڑا۔ جوانی میں تو اس قسم کے جذبے وقتاً فوقتاً آتے رہتے تھے مگر اب ضعف و پیری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ''یشیب ابن آدم یشیب فیہ خصلتان الحرص و طول الامل۔'' (آدمی جوں جوں بوڑھا ہوتا ہے دو عادتیں اس میں جوان ہوتی رہتی ہیں، ایک حرص، دوسری لمبی امیدیں)۔

اس ناکارہ پر تو آج کل حدیث پاک کے دونوں اجزاء کا بہت ظہور ہو رہا ہے۔ پہلے جن چیزوں کے کھانے کی طرف التفات و خیال بھی نہیں ہوتا تھا، بلکہ اضاعت وقت سمجھتا تھا۔ اب ہر کھانے کی چیز کا شوق ہے پہلے اپنی موت اس قدر قریب معلوم ہوتی تھی کہ ضروری کام بھی اور ضروری تعمیرات بھی اس جذبہ سے ملتوی کر دیتا تھا کہ زندگی کتنے دن کی ہے اور اب تعمیرات وغیرہ کا تو اللہ کے فضل سے شوق نہیں ہوا مگر قرض سے بڑی بڑی کتابیں چھپوانے کا جذبہ غالب ہو رہا ہے۔ میرے حضرت قدس سرہٗ کی شرح ابی داؤد ''بذل المجہود'' جو تقریباً تیس سال سے نایاب ہے اس کی ہندی اور عربی رسم الخط میں دو جگہ طباعت شروع کرا رکھی ہے۔ مصر میں اوجز المسالک شرح موطا امام مالک جس کے ٹائپ پر طبع ہونے کا کبھی واہمہ بھی نہیں گزرا اب وہ مصر میں طبع ہو رہی ہے۔ میرے قدیم اور ناقص مسودات میرا نواسہ عزیز شاہد سب کے طبع کرنے پر تل رہا ہے:

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

(۵) ایک اور عادت

اس سراپا عیوب کی بری عادتوں کا تو پوچھنا ہی کیا:

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

یہ مضمون لکھواتے وقت جو پہلے سے چل رہا تھا ایک خاص واقعہ کی وجہ سے ایک بری عادت کی طرف اور ذہن منتقل ہوا جو بہت ہی قدیم اور اس ناکارہ کے بخل کا ثمرہ ہے۔ ان ہی حرکتوں کی وجہ سے میرے حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ اور ان کے بڑے بھائی مولانا سید احمد مدنی رحمہ اللہ

تعالیٰ نے مجھے بخیل کا لقب دے دیا تھا جو بالکل صحیح ہے۔ وہ بری عادت یہ ہے کہ میرے دوستوں میں سے بالخصوص جو مجھ سے بیعت کا تعلق بھی رکھتے ہوں اور خصوصی تعلق بھی رکھتے ہوں۔ ان کا کسی چیز کو بغیر اجازت لے لینا اور کھالینا بہت ہی ناگوار ہے بالخصوص جب میری کوئی چیز اٹھائیں اور کھائیں۔ نفس امارہ یہ توجیہ دل میں ڈالتا ہے کہ جب یہ لوگ بیعت کے وقت میں مجھ سے یہ عہد کرتے ہیں کہ پرایا مال بے اجازت نہیں کھاؤں گا اور پھر میرے ہی مال میں کوئی تصرف بلا اجازت کرتے ہیں، تو بہت گراں ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا کوئی مطالبہ دنیا یا آخرت میں میرا ان سے نہیں ہے۔ مگر میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ جب میرے ساتھ یہ بے التفاتی ہے تو دوسروں کے ساتھ کیا ہوگا۔

میں نے اپنے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد کئی سال تک پورا رمضان یا آخر رمضان یا آخری عشرہ عزیز مولانا یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کی دل داری میں نظام الدین گزارا اور جو زمانہ نظام الدین میں گزرتا پورا رمضان ہو یا اخیر عشرہ وہ اعتکاف میں گزرتا اور عزیز مرحوم نور اللہ مرقدہٗ اخیر عشرہ کا اعتکاف ہمیشہ کیا کرتا تھا۔ اس کا معتکف میرے معتکف کے برابر ہی ہمیشہ رہا کرتا تھا مسجد کے غربی حصہ میں میرا معتکف ہوتا تھا، شرقی میں اس کا، مرحوم کی عادت شریفہ اپنے والد صاحب قدس سرہٗ کے اتباع میں ماہ مبارک میں مغرب کے بعد طویل نوافل کی تھی۔ عشاء کی اذان کے قریب سلام پھیرا کرتا تھا اور دس پندرہ منٹ کے لیے گرمی میں مسجد کے صحن میں اور سردی میں اپنے معتکف میں لیٹ جایا کرتا تھا۔ خدام بہت سے گھیر لیتے تھے اور دس پندرہ منٹ تک خوب بدن دباتے تھے۔

دوسرے کے مال میں زیادتی تعلق کی وجہ سے تصرف اور اس کا واقعہ

ایک مرتبہ عزیز مرحوم اپنی عادت کے موافق نفلوں کے بعد لیٹا، لوگ بدن دبا رہے تھے۔ کسی نے یہ شکایت کر دی کہ فلاں آپ کی ڈبیہ میں سے پان نکال کر لے گیا۔ عزیز مرحوم کو اس قدر غصہ آیا کہ شاکی کو اس بری طرح ڈانٹا کہ شکایت کیوں کی۔ پان کھانے ہی کے واسطے ہوتے ہیں اور کاہے کے واسطے ہوتے ہیں۔ اس بے چارے کو لینے کے دینے پڑ گئے اور عزیز موصوف نے تقریباً دس منٹ تو اتنا ڈانٹا کہ حد نہیں۔ میں بھی اپنے معتکف میں سب کچھ سن رہا تھا۔ جب عزیز موصوف ڈانٹ چکا تو میں اپنے معتکف سے اٹھ کر اس مجمع کے قریب گیا اور میں نے شاکی سے کہا کہ بھائی حضرت جی نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ اپنی ڈبیہ کے متعلق ارشاد فرمایا۔ میری ڈبیہ میں سے کسی کو پان نکالتے دیکھو تو دو تھپڑ تو میرے حکم سے وہیں مار دینا اور پھر کان پکڑ کر اس کو میرے پاس لانا۔ پان تو

کھانے کے واسطے یقیناً ہوتے ہیں مگر چرا کر کھانے کا کیا مطلب۔ اللہ تعالیٰ میرے ابتدائی عزیز، انتہائی بزرگ مولانا یوسف صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو بہت ہی بلند درجہ عطاء فرمائے کہ میں جب کبھی ان کی طبیعت کے خلاف کوئی بات کہتا تھا تو بجائے چہرے پر کسی قسم کے تکدر کے مرحوم بڑی خندہ پیشانی سے اس کو قبول کرتے۔

میں اس آپ بیتی میں اور اپنے دوسرے رسائل اعتدال، اکابر کا رمضان وغیرہ میں یہ مضمون تو کثرت سے لکھوا چلا ہوں کہ میرے اکابر نور اللہ مراقدہم ایک گلدستہ تھے۔ جس میں ہر رنگ اور ہر خوشبو کے مختلف انواع جمع تھے۔ میں نے اپنے اکابر میں بھی دونوں رنگ دیکھے ہیں۔ عزیز مولانا یوسف نور اللہ مرقدہٗ کا جو میں نے واقعہ لکھوایا۔ یہ رنگ میرے اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ میں خوب نمایاں تھا۔

اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے یہاں سے لوگ مختلف قسم کے قیمتی ہدایا کھانے پینے کے پیش کرتے اور جب یہ معلوم ہوتا کہ وہ کسی تبرک کے شوقین نے صاف کر دیئے تو بہت ہی اظہار مسرت سے فرمایا کرتے کہ الحمد للہ میرے سے بہتر جگہ خرچ ہوگئی۔ اگرچہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے خاص خدام تو اتنی احتیاط کرتے تھے کہ حضرت قدس سرہٗ کی شرعی اجازت بلکہ حکم کے باوجود بھی کوئی چیز اس وقت تک نہیں کھاتے تھے جب تک حضرت خود نہ مرحمت فرمادیں۔ حضرت رائے پوری ثانی نور اللہ مرقدہٗ کی سوانح میں علی میاں نے اس قسم کے واقعات مختلف مقامات پر ذکر بھی کیے ہیں، اس کے بالمقابل میرے بعض دوسرے اکابر کا دستور یہ تھا کہ بلا اجازت کوئی شخص کوئی چیز لے لیتا تو خوب ڈانٹ پڑتی، اس نوع کے بھی واقعات ان آنکھوں نے بہت دیکھے اور اپنے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور عزیز مولوی یوسف کے یہاں رحیمی رنگ کے مظاہر بھی بہت دیکھے۔

(۶) میری ایک اور بُری عادت

اس سیہ کار پر ایک قدیم الزام جو اخبارات میں بھی شائع ہو چکا ہے اور خطوط میں تو اس کی بہت ہی بھرمار رہتی ہے اور صحیح بھی ہے، وہ یہ ہے کہ زکریا کے یہاں صورت دیکھ دیکھ کر چیز دی جاتی ہے، سب سے پہلے تو یہ الزام میرے ایک عزیز کی طرف سے جس کی میں بہت خاطریں کیا کرتا تھا اور اس کی آمد پر خاص طور سے روٹی بھی چپڑ وایا کرتا تھا ایک خط میں مجھ پر یہ الزام لکھا تھا کہ صورت دیکھ دیکھ کر چیز دی جاتی ہے، دسترخوان پر سب کو یکساں ہونا چاہیے، میرے لیے تو روٹی چپڑی گئی مگر میرے ساتھ دو طالب علم اور تھے ان کو بے چپڑی دے دی گئی، اس کے بعد خطوط کی بھرمار شروع ہوگئی، ان خطوط میں اگر جوابی ہوتے ہیں یا جواب کا پتہ ہوتا ہے تب تو میں ان کو ان کے

الزام کی حقیقت بتادیتا ہوں، گمنام ہوتے ہیں جواب کے لیے کچھ نہیں ہوتا تو پھر جواب دینے کی کوشش نہیں کرتا۔

مہمانوں کی حیثیت میں امتیاز

میرا قدیم دستور یہ ہے کہ جب صبح کی چائے میں میوات کی جماعت ہوتی ہے تو میں خاص طور سے ان لوگوں کے لیے چائے کے ساتھ باسی روٹی کا بھی اہتمام کرتا ہوں حتیٰ کہ اگر میرے یہاں نہ ہو تو میں اپنی بچیوں کے یہاں بھی آدمی بھیج کر دریافت کراتا ہوں کہ جلد بھیج دو، جس کی زیادہ وجہ یہ ہوتی ہے یہ بے چارے پیدل لمبا لمبا سفر کرتے ہیں، میرا خیال ہوتا ہے کہ نہ معلوم جس گاؤں میں جائیں گے کس وقت پہنچیں گے، وہاں کھانے کا وقت ہوگا یا نہیں، حتیٰ کہ بعض مرتبہ اگر کوئی چیز نہ ملی تو بازار سے گڑ اور چنے منگا کر ساتھ کر دیئے، اگرچہ میرے امراض اور مہمانوں کے ہجوم کی وجہ سے آج کل یہ معمول بہت مغلوب ہو رہا ہے جس کا مجھے بہت قلق ہے، اس پر متعدد جگہوں سے جن کے نام نہیں لکھواتا، یہ ڈانٹ پہنچی کہ ہم بھی تبلیغ میں گئے ہوئے تھے اور ہم بھی بھوکے تھے لیکن میوات والوں کے واسطے تو روٹی سالن بھی منگایا گیا تھا، بازار سے گڑ بھی منگوایا گیا، مگر ہمیں جھوٹوں بھی نہیں پوچھا گیا کہ تم بھی شریک ہو جاؤ۔

ایک صاحب کا خط آیا کہ ہم بھی مہمان تھے اور کلکتہ والے بھی مہمان تھے ہم غریب تھے وہ رئیس تھے، ان کے لیے تو کئی کئی طرح کے سالن بھی تھے، چاول بھی تھے اور ہم کو غریب ہونے کی وجہ سے صرف شوربا اور دال پر ٹال دیا وغیرہ وغیرہ خوب ڈانٹ تھی، حالانکہ کلکتہ کے احباب جب آتے ہیں تو میرے محسن ان کے مخلص دوست صابری صاحب کے یہاں سے ان کے لیے کھانا آتا ہے، صابری صاحب کا تو ہمیشہ یہ اصرار رہتا ہے کہ یہ حضرات ان کے مہمان بنا کریں اور میں بھی اپنی عادت کے موافق جو آپ بیتی نمبر۲ میں مہمانوں کے متعلق اپنی عادت لکھوا چکا ہوں بڑی خوشی سے قبول بھی کر لیتا ہوں، مگر کلکتہ کے ان دوستوں کا اصرار ہوتا ہے کہ دن کا کھانا میرے ہی ساتھ کھائیں، اس لیے یہ ناکارہ صبح ہی کو کھایا کرتا ہے، اس لیے صابری صاحب میرے ان مہمانوں کے لیے اپنے یہاں سے اپنی اور ان کی شان کے موافق کچھ بھیجتے ہیں اور چونکہ یہ ان ہی کے لیے ہوتا ہے اس لیے میں اہتمام سے وہ ان ہی لوگوں کے سامنے رکھواتا ہوں، مگر بہت سے دوستوں کو اس پر بہت ہی غصہ آتا ہے کہ رؤسا کے لیے تو اہتمام کیا جاتا ہے، حالانکہ اگر ایسا ہو بھی تو ناگواری یا غصہ کی بات نہیں، یہ غصہ دین سے ناواقفیت کی علامت ہے۔

ابوداؤد شریف میں ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک سائل آیا

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو ایک روٹی کا ٹکڑا دے دیا، اس کے بعد ایک شخص ذی ثروت جس پر اچھا لباس بھی تھا آیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو بٹھایا اور کھانا کھلایا (اعتراض کرنے والوں سے تو کونسا زمانہ خالی ہوگا) کسی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اعتراض کیا کہ ایسا کیوں کیا؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا کہ ہمیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "لوگوں کو ان کے مرتبہ پر اُتارو۔"

سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک بالکل حکمت پر مبنی ہے کہ "جو لوگ اپنے گھر دو، دو وقت کے فاقے کے بعد روٹی چٹنی یا پیاز سے روٹی کھاتے ہوں ان کے کھانے میں اگر دال گوشت دونوں چیزیں مل جائیں تو ان کے لیے پلاؤ زردہ ہے، لیکن جو لوگ اپنے یہاں مرغن غذائیں کھانے کے عادی ہیں، ان کے لیے تو پہلی قسم کا کھانا فاقہ ہے شاید پیٹ میں بھی درد ہو جائے۔

انفاس عیسیٰ صفحہ ۵۹۴ میں حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کا ایک ملفوظ نقل کیا ہے کہ غرباء اور امراء کی ملاقات میں دلجوئی کی رعایت تو امر مشترک ہے مگر کیفیت دلجوئی ہر شخص کی جدا ہے اس کی حالت وطبیعت وعادت کے تفاوت سے یعنی امراء کی مجموعی حالت طبیعت وعادت کی ایسی ہے کہ جب تک زیادہ توجہ ان کی طرف نہ کی جائے وہ خوش نہیں ہوتے اور غرباء تھوڑی توجہ سے راضی ہو جاتے ہیں، اس لیے دونوں کی دلجوئی کے طریق میں ایسا تفاوت مذموم نہیں، فقط۔

مہمانوں کے بارے میں گلدستہ امدادیہ کے پھولوں میں بھی بڑا فرق ہے، حضرت شیخ الاسلام مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں اس کا بہت اہتمام تھا کہ اگر خصوصی مہمانوں کے لیے کوئی چیز پکے تو سارے مہمانوں کے لیے ہو ورنہ ان خصوصی مہمانوں کو علیحدہ کمرے میں کھلایا جاتا تھا، مگر میرے حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں بارہا اس کی نوبت اس سیہ کار کو پیش آئی کہ کوئی خاص چیز دسترخوان پر آئی تو حضرت نے دوسروں کا حصہ بھی اس سیہ کار کے پاس رکھوا دیا، اس گستاخ نے کئی دفعہ بے ادبی سے سختی سے انکار بھی کر دیا، مگر حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ یہ مخصوص نہیں ہوا، جب ان کے پاس رکھا جائے گا جب ان کا ہوگا، چونکہ جوانی میں اس سیہ کار کو گوشت اور مرچوں کا بڑا شوق تھا، جو اب بالکل متروک ہو گیا تو حضرت نور اللہ مرقدہٗ ایسی چیزوں میں خاص طور سے فرمایا کرتے تھے کہ یہ اس کے پاس رکھ دو، اس نوع کے واقعات تو بڑے پر لطف اور بہت یاد ہیں مگر معلوم نہیں کہ ان کی نقل میں کہیں کوئی بے ادبی نہ ہو جائے۔

(۷) ایک اور تجربہ

سیدوں سے ناجائز محبت انتہائی خطرناک ہے اور اگر اس میں کچھ جبر بھی شامل ہو جائے تو کریلا اور نیم چڑھا، ایسے شخص کی دیر ہو یا سویر رسوائی ہوئے بغیر نہیں رہتی، اس سیہ کار کے علم میں بہت سے واقعات اس قسم کے آئے ہیں جو لکھنے کے قابل نہیں، اسی طرح سے ان سے عداوت ان کی ایذا رسانی بھی انتہائی خطرناک ہے، اس کے بھی سینکڑوں واقعات اس سیہ کار کی نظر سے گزرے ہیں، ان دونوں جزؤں سے بہت ہی احتیاط کرنا چاہیے، ان حضرات کو ستانے والا ایذا دینے والا انتہائی مصائب میں مبتلا ہوتا ہے، پہلے جزء والا تو رسوا ہوتا ہے اور دوسرے جزء والا مصائب میں مبتلا ہوتا ہے، یہ اس سیہ کار کا ساٹھ سالہ تجربہ ہے، بعض لوگ اپنی کسی علوشان یا علو مرتبت کی وجہ سے کسی سید کے ساتھ بُرا معاملہ کرتے ہیں تو بہت جلد انقلاب کا شکار ہوتے ہیں، اپنے دوستوں کو اور اپنے سے تعلق رکھنے والوں کو ان دونوں چیزوں کی طرف بہت ہی اہتمام سے متوجہ کرتا ہوں۔

(۸) اس ناکارہ کی ایک اور عادت

یہ ناکارہ اپنے بُری عادتوں میں ایک عادت سفارش نہ کرنے کے سلسلہ میں آپ بیتی نمبر۳ پر لکھوا چکا ہے کہ سفارش کرنے سے مجھے بہت ہی گرانی اور گریز رہا اور اس سلسلہ میں اپنے دادا صاحب نور اللہ مرقدہٗ اور شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کا معمول بھی اپنے خلاف لکھوا چکا ہوں، اور رحِ ثلاثہ میں ایک قصہ سننے میں آیا، جس میں اپنے اکابر کا معمول اس سلسلہ میں مختلف رہا، وہ یہاں لکھوا رہا ہوں، آیندہ طباعت میں اس کو بھی بُری عادتوں ہی میں ذکر کر دیا جائے تاکہ سارا مضمون ایک ہی جگہ ہو جائے۔

امیر شاہ خان صاحب نے فرمایا کہ چار شخص حضرت شاہ (ولی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ) کے خاندان میں بہت سخی تھے، ایک شاہ رفیع الدین صاحب (خان صاحب نے حضرت شاہ صاحب کی سخاوت کے چند قصے لکھے پھر لکھا کہ) دوسرے سخی مولانا شاہ اسحاق صاحب تھے، حضرت شاہ صاحب کی سخاوت کا قصہ لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ حال تو ان کا اپنا تھا اور اگر کوئی درخواست کرتا کہ حضرت فلاں شخص سے میری سفارش کر دیجئے تو آپ بے تکلف سفارش کرتے تھے، چنانچہ فرخ آباد والے نواب کو ایک سال میں ایک ہزار سفارشی خط لکھے اور اس نے ہر خط کی تعمیل کی، آخر مجبور ہو کر عرض کیا کہ حضرت کے سفارشی والا نامے اس سال ایک ہزار پہنچے ہیں، اس پر آپ نے فرمایا کہ واقعی آپ کو بہت تکلیف ہوئی، مگر میں سفارش کیے بغیر رہ نہیں سکتا، تم میری تحریروں پر عمل نہ کیا کرو۔

مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ قصہ بیان فرما کر فرمایا کہ اپنی اپنی طبیعت ہے، چنانچہ مولوی محمد یعقوب صاحب کی طبیعت اس کے خلاف تھی اور وہ کبھی کسی کو سفارشی خط نہ لکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس میں دو تکلیفیں ہوتی ہیں، اگر سفارش نہ کی جاوے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے جو خواہان سفارش ہے اور سفارش کی جائے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے جس سے سفارش کی جاتی ہے، لیکن چونکہ طالب سفارش کی تکلیف کا منشاء خود اس کی طلب ہے اور جس سے سفارش کی جاتی ہے اس کی تکلیف محض بلا وجہ، اس لیے میں طالب سفارش کی تکلیف کو اس کی تکلیف پر ترجیح دیتا ہوں، جس سے سفارش کی جائے اور یہ بیان فرما کر مولانا گنگوہی نے فرمایا:

''میرا مذاق بھی وہی ہے جو مولانا محمد یعقوب صاحب کا تھا اور میں بھی سفارش نہیں کرتا''۔

اس پر حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ احقر بھی اسی مذاق کا متبع ہے، یعنی بشاشت سے سفارش نہیں کرتا، کیونکہ جو سفارش مسنون ہے وہ اس وقت نہیں رہی، جبر و کراہت رہ گئی جو کہ ناجائز ہے، اس کے بعد خان صاحب نے تحریر فرمایا کہ تیسرے سخی حضرت مولانا اسماعیل صاحب شہید رحمہ اللہ تعالیٰ تھے اور چوتھے ان کے صاحبزادے مولانا محمد عمر صاحب دونوں کی سخاوت کے قصے لکھے، میرا مقصود چونکہ صرف سفارش کا مضمون تھا اس لیے اسی پر قناعت کی۔

(اورِح ثلاثہ)

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر۱۷

تصوف کا بیان

تصوف میرے اکابر کا اہم ترین مشغلہ ہے۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

ہر ہو سنا کے ندا ندا جام و سنداں باختن

کے سچے مصداق تھے، یہ حضرات ایک جانب فقہ، حدیث اور علوم ظاہر یہ میں اگر ائمہ مجتہدین اور ائمہ حدیث کے حقیقی جانشین اور سچے متبع تھے تو دوسری جانب تصوف کے ائمہ جنید وشبلی کے قدم بقدم ان اکابر نے تصوف، فقہ، حدیث کے ماتحت چلایا اور اپنے قول وفعل سے بتادیا کہ یہ مبارک فن حقیقت میں قرآن وحدیث کا ہی ایک شعبہ ہے اور جو رسوم وبدعات اس مبارک فن میں بعد زمانہ سے بڑھ گئی تھیں ان کو چھانٹ دیا، تصوف کو بعض ناواقفوں نے ظاہر شریعت کا مقابل نہیں تو علیحدہ ضرور بنادیا، یہ یا غلو ہے یا جہل، حقیقی تصوف کو جس کا دوسرا نام احسان ہے، حضرت جبرائیل علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی حقیقت لوگوں کے سامنے دریافت کرکے یہ واضح کردیا کہ یہ شریعت ہی کی روح اور مغز ہے اور حضرت جبرائیل کے اس سوال پر کہ احسان کیا چیز ہے، سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پاک ارشاد نے ”أن تعبد الله کانک تراہ “ (تو اللہ کی عبادت ایسی کرے گویا کہ اس کو دیکھ رہا ہے) احسان کے معنی اور تصوف کی حقیقت واضح کردی، عنوانات تو اس کے جو جو بھی اختیار کرلیے جائیں لیکن مرجع سب کا یہی حقیقت ہے۔

اوری بسعدیٰ والرباب وانما

انت الذی تعنی وانت المؤمل

شاعر کہتا ہے کہ چاہے میں مشہور محبوبہ سعدیٰ کا نام لوں یا معروف معشوقہ رباب کا نام لوں، ہر چیز سے مقصود تو ہی ہے اور تو ہی مطلوب ہے، یہ تو حقیقت ہے اس کے بعد جو چیزیں ذکر وشغل مجاہدات، ریاضات، یہ حضرات تجویز کرتے ہیں، وہ حقیقت میں سب علاج ہیں، چونکہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے جتنا بعد ہوتا جاتا ہے، اتنا ہی قلوب میں زنگ اور امراض ردیہ دلوں میں پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور جیسا کہ یونانی اطباء اور ڈاکٹر جدید امراض کے لیے تجربات یا قواعد سے وقتی اور نئی نئی دوائیں تجویز کرتے ہیں، اسی طرح سے یہ روحانی اطباء قلبی

امراض کے لیے ہر شخص کے حال کے موافق اور زمانہ کے موافق دوائیں تجویز کرتے ہیں۔

حضرت مولانا وصی اللہ صاحب جو حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے اجل خلفاء میں ہیں، ان کا ایک رسالہ ''تصوف اور نسبت صوفیہ'' مختصر اور قابل دید ہے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت ابو یحییٰ زکریا انصاری شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تصوف کی اصل، حدیث جبرائیل ہے، جس میں آیا ہے کہ ''ما الا حسان قال ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ '' [الحدیث] چنانچہ تصوف احسان ہی کا نام ہے، اس سے معلوم ہوا کہ صوفی مقرب اور محسن کو کہتے ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ خود کتاب اللہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُمت میں مختلف درجہ کے لوگ ہیں بعض ان میں سے اصحاب الیمین ہیں اور بعض کو مقربین کہا جاتا ہے، جو شخص اپنے ایمان کو صحیح کرے اور شرعی اوامر ونواہی کے مطابق اپنا عمل رکھے تو یہ وہ لوگ ہیں جو اصحاب الیمین کہلاتے ہیں اور ان امور کے ساتھ ساتھ جس شخص کی غفلات بھی کم ہوں اور نوافل وطاعات کی کثرت ہو اور اس کے قلب پر ذکر اللہ کا استیلا ہو جائے اور حق تعالیٰ سے مناجات کا تسلسل اور دوام اس کو حاصل ہو گیا ہو، ایسے شخص کو مقرب اور محسن کہتے ہیں اور اسی کو صوفی بھی کہا جاتا ہے، حضرت ابو یحییٰ زکریا کا جو قول نقل کیا گیا ہے یہاں ہم اس کو ناظرین کے افادہ کے لیے بعینہ درج کرتے ہیں۔

اصل رسالہ میں تو عربی عبارت بھی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

''اور یہ حضرات جو صفات بالا کے ساتھ متصف ہیں مقربین کہلاتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو کہ صفت احسان کے ساتھ متصف ہیں، اُمت کے لوگوں کے درجات مختلف ہیں، بعضے اصحاب یمین کہلاتے ہیں اور بعضوں کو مقربون کہا جاتا ہے، جیسا کہ خود قرآن حکیم میں آیا ہے، لہٰذا جن کا ایمان دُرست ہو گیا اور انہوں نے مامورات شرعیہ پر عمل کیا وہ اصحاب یمین کہلاتے ہیں اور جس کی غفلات کم ہو گئیں اور نوافل میں دوام واستمرار اس کو حاصل ہو گیا اور اس کی طاعات کثیر ہو گئیں اور ذکر اللہ کا قلب پر استیلاء ہو گیا اور اپنی تمام حوائج میں حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اور اسی سے دُعا کرنا جس کا حال بن گیا وہ مقرب کہلاتا ہے اور اسی شخص کو محسن کہا جاتا ہے اور اس کو صوفی بھی کہا جاتا ہے، جو صفاء سے مشتق ہے یعنی یہ شخص اخلاق مذمومہ سے پاک وصاف ہو گیا اور اخلاق محمودہ کے ساتھ متصف ہو گیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو محبوب بنا لیا اور جملہ حرکات اور سکنات میں اس کا محافظ اور نگران ہو گیا، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ مجھ سے تقرب حاصل کرنے والوں میں سے کسی نے اس جیسا تقرب حاصل نہیں کیا جو کہ فرائض کی ادائیگی کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے، یہ قرب فرائض کہلاتا ہے اور بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قرب حاصل کرتا رہتا ہے یعنی ادائے فرض کے بعد کیونکہ (اس کے بدون نوافل سبب قرب تو کیا معتبر بھی نہیں) یہاں تک

کہ میں اس کو محبوب بنالیتا ہوں اور جب وہ مجھے محبوب ہو جاتا ہے تو پھر میں اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے اور آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، یہ قرب نوافل کہلاتا ہے۔

بعنوان دیگر اس کو یوں کہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک کے بعد مسلمانوں میں سے جو لوگ کہ اپنے وقت کے فاضل ہوتے تھے، ان کا کوئی خاص نام بجز صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ ہوتا تھا، اس لیے کہ صحابیت سے بڑھ کر کوئی فضل وشرف ہی نہ تھا، جس کی جانب ان کو منسوب کیا جاتا، پھر جب صحابہ کا دور ختم ہوا اور قرنِ ثانی آیا تو جن حضرات نے صحابہ کی صحبت پائی تھی ان کو تابعین کہا جانے لگا اور یہی اس وقت ان کے حق میں سب سے بڑی تعریف سمجھی جاتی تھی۔

پھر ان کے بعد تبع تابعین لقب سے ملقب ہوئے پھر اس کے بعد یہ ہوا کہ لوگ مختلف درجات اور متباین مراتب میں تقسیم ہو گئے تو اس وقت خواص ناس جن کو امور دین کا شدت کے ساتھ اہتمام تھا زہاد اور عباد کے نام سے پکارے جانے لگے، یعنی یوں کہا جاتا تھا کہ فلاں عابد، فلاں زاہد۔

پھر اس کے بعد بدعات کا شیوع ہو گیا اور سب فرقوں میں باہم تقابل اور تنافس ہونے لگے، یہاں تک کہ ہر فریق دعویٰ کرنے لگا کہ ان کے اندر زہاد ہیں یہ دیکھ کر خواصِ اہل سنت نے جنہوں نے کہ اپنے لیے معیت الٰہی کو تجویز کیا اور جنہوں نے اسباب غفلت سے اپنے قلوب کی حفاظت کی انہوں نے اپنے مسلک اور طریق خاص کے لیے اسم تصوف تجویز کیا۔

چنانچہ اسی نام سے اس جماعت کے اکابر دوسو (۲۰۰) ہجری سے پہلے پہلے مشہور ہو گئے، یعنی ان ہی حضرات کو صوفی کہا جاتا تھا اور اس میں شک نہیں کہ تصوف کا نام اگر چہ بہت دنوں کے بعد زبانوں پر آیا، تاہم اس کا مصداق اسلام کے قرن اول میں بھی موجود تھا، جیسا کہ صاحب ابداع لکھتے ہیں (یہاں اصل عبارت عربی کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے):

''اور تصوف جس وقت اسلام کے قرن اول میں ظاہر ہوا تھا اس کے لیے ایک عظیم شان تھی، یعنی وہ ایک عظیم المرتب چیز تھی اور ابتداء اس سے مقصود تقویم اخلاق، تہذیب نفوس اور طبائع کو اعمالِ دین کا خوگر بنانا اور ان کو اس کی جانب کھینچ کر لانا اور دین وشریعت کو نفس کی طبیعت اور اس کا وجدان بنانا، نیز دین کے حکم واسرار سے تدریجاً نفس کو واقف کرانا تھا''۔ (ترجمہ ختم ہوا)

اور یہ ظاہر ہے کہ ان مقاصد میں سے ہر ہر مقصد اپنی جگہ پر نہایت ہی صحیح ضروری اور شریعت کے عین مطابق تھا، اس لیے ان سے کسی کو اختلاف یا ان کا انکار نہ ہونا چاہیے۔

غرض تصوف ایک عظیم الشان چیز تھی، جس کی تعریف علماء تصوف نے یہ فرمائی ہے کہ ھو علم الخ وہ ایسا علم ہے کہ جس کے ذریعہ نفوس کا تزکیہ، اخلاق کا تصفیہ اور ظاہر وباطن کی تعمیر کے احوال پہچانے

جاتے ہوں، جس کی غرض ابدی سعادت کی تحصیل ہے، اب آپ خود غور فرمایئے کہ اس میں کونسی چیز غلط ہے، نفس کا تزکیہ غلط ہے یا اخلاق کا تصفیہ بُرا ہے، ظاہر و باطن کی تعمیر لغو ہے؟ یا سعادت ابدیہ کی تحصیل بے کار ہے، اسی طرح تقویم اخلاق تہذیب نفس نیز نفس کو اعمال دین کا خوگر بنانا اور شریعت کو نفس کے حق میں وجدان بنالینا ان امور میں کونسی شے مقاصد شرع کے خلاف ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں، بلکہ ان سے ہر ایک شے کتاب وسنت کے عین مطابق اور اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منشاء کو پورا کرنے والی ہے۔

غرض ہم جس تصوف کے اثبات کے قائل ہیں وہی ہے جس کو شرع میں احسان کہتے ہیں یا جس کو علم الاخلاق کہا جاتا ہے یا تعمیر الظاہر والباطن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ اُصول وآداب ہیں جن کی رعایت کرنے کے بعد اس کو شریعت کا مغز اور دین کا لُب کہنا بجا ہے اور جب ان آداب وشرائط ہی کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ غیر تصوف قرار دے دیا جائے تو پھر تو وہ طریق ہی نہیں جو کہ ہمارا موضوع بحث ہے، اس لیے کہ ان کی خرابیاں اور ان پر عمل کرنے کی وجہ سے سالک میں جو خرابیاں پیدا ہوں اس کا ذمہ دار کسی طرح حقیقی تصوف اور طریق کو نہیں قرار دیا جاسکتا، اب اگر آپ کو تصوف سے محض اس بناء پر چڑ اور انکار ہے کہ اس کا نام محدث ہے تو اس میں تصوف ہی تو متفرد نہیں نہ معلوم کتنی چیزیں اس وقت موجود ہیں اور آپ کا ان سے تعلق بھی ہے جو کہ ابتداء اسلام میں ان ناموں سے معروف نہ تھیں، میں کہتا ہوں کہ اس کا اسم اگر بدعت ہے تو مسمّی تو اس کا بدعت نہیں، آپ اس کو احسان سے تعبیر کر لیجئے، علم الاخلاق اس کا نام رکھ لیجئے اور جو شخص کہ اس سے متصف ہو اس کو محسن، مقرب، متقی اور مخلص کہہ لیجئے اور احسان اور محسن اور متقی مخلص کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے، حدیث شریف میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نور اللہ مرقدہٗ تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں کہ (اصل کتاب میں صرف عربی عبارت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کی دعوت دی تھی، ان میں سب سے مہتم بالشان امور تین ہیں:

(۱)...... تصحیح عقائد جس کا ذمہ علماء اُمت کے اہل اصول نے اُٹھایا ہے، اللہ جل شانہ ان کی مساعی کو مشکور فرمائے۔

(۲)...... دوسری چیز اعمال کا صحیح طور پر ادا کرنا اور سنت کے موافق ان سب کو ادا کرنا، اس فن کو اُمت کے فقہاء نے اپنے ذمہ لیا، جن کی کوشش سے اللہ جل شانہ نے بہت سے لوگوں کو ہدایت فرمائی اور گمراہ فرقوں کے اعمال کو راہ راست پر لائے، اس کے بعد شاہ صاحب نے احسان کا بیان فرمایا ہے اور آیات واحادیث سے اس کو مبرہن فرمایا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ تصحیح اخلاص واحسان کہ

جو اس دین کی اصل ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پسند فرمایا ہے۔

(۳)......اس کے بعد شاہ صاحب نے آیات و احادیث اخلاص و احسان کی تحریر فرما کر تحریر فرمایا ہے کہ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، یہ تیسرا جزء شریعت کے مقاصد کا سب سے دقیق فن ہے اور بہت گہرا ہے جملہ شرائع کے مقابلہ میں جو بمنزلہ روح کے ہے بدن کے مقابلہ میں اور فن کا تکفن صوفیاء نے کیا ہے کہ انہوں نے خود ہدایت پائی اور دوسروں کو ہدایت فرمائی، خود سیراب ہوئے اور دوسروں کو سیراب کیا اور انتہائی سعادت کے ساتھ کامیاب ہوئے۔

دیکھئے! شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اخلاص و احسان ایسی عظیم چیزیں ہیں کہ علوم و اعمال کی ان کے بغیر حیثیت ہی باقی نہیں رہتی، اسی مضمون کو ملا علی قاری نے حدیث جبرائیل کی شرح میں فرمایا ہے کہ اس سے مراد اخلاص ہے، اس لیے کہ اخلاص شرط ہے ایمان و اسلام کی صحت کے لیے۔

اس سے معلوم ہوا کہ احسان مرادف ہے اخلاص کا بغیر اس کے اسلام و ایمان دونوں صحیح نہیں ہوتے اور عمل کی قبولیت بھی اسی پر منحصر ہے، اس کے بغیر علوم و اعمال کی کچھ حیثیت ہی نہیں رہ جاتی، چنانچہ اعمال کے اعتبار سے تو یہ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ بدون اخلاص کے وہ جسم بلا روح رہ جاتے ہیں، یعنی مُردہ اور علوم کے اعتبار سے یوں تشبیہ دی کہ وہ گویا الفاظ بلا معنی رہ جاتے ہیں، بالکل مہمل اور شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی بھی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں کہ احسان اشارہ ہے اصل تصوف کی طرف اور تصوف کے جملہ معنی جن کی طرف مشائخ طریقت اشارہ فرماتے ہیں اسی طرف راجع ہیں۔

آگے شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اگرچہ علم حدیث بالذات ہر چیز پر مقدم ہے لیکن حقیقت میں تصوف کتاب اللہ اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح ہے، علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں کہ طریقت شریعت پر عمل کرنے کا نام ہے اور شریعت اعمالِ ظاہرہ کا نام ہے اور یہ دونوں اور حقیقت تینوں چیزیں آپس میں متلازم ہیں۔

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی ایک تحریر اور چند ملفوظات در بارہ تصوف

چنانچہ حضرت امام ربانی گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ بھی اپنے مکاتیب میں تحریر فرماتے ہیں ''فی الواقع'' شریعت بھی فرض اور مقصد اصلی ہے، طریقت بھی شریعت باطنی ہے اور حقیقت و معرفت متمم شریعت ہے، اتباع شریعت بکمال بدون معرفت نہیں ہو سکتا۔''

(مکاتیب رشیدیہ: ص ۴۴)

مولانا وصی صاحب کا یہ رسالہ بہت طویل ہے اور اس کا اقتباس بھی بہت طویل ہے، اس میں

تصوف کی حقیقت، بیعت کی ضرورت، شیخ کی شرائط اور اس کے اتباع کی ضرورت پر بہت زیادہ کلام کیا گیا ہے، اس کا اختصار بھی بہت طول کو چاہتا ہے اسی طرح حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت امام ربانی گنگوہی قدس سرہٗ کی سوانح تذکرۃ الرشید کے حصہ دوم میں طریقت کے عنوان میں اس کی ضرورت پر بہت تفصیلی کلام کیا ہے، تحریر فرماتے ہیں کہ سلوک نام ہے ''تعمیر الظاہر والباطن'' کا یعنی اعضاء ظاہر اور قلب کا اپنے مولیٰ تعالیٰ شانہ کی طاعت و خدمت میں مشغول رکھنا بایں طور کہ ہادی عالم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریق اور تعلیم فرمائی ہوئی شریعت کے اتباع کی اس درجہ عادت پڑ جائے کہ سنت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنا طبعی شیوہ اور خلقی شعار بن جائے تکلف کی حاجت نہ رہے۔

تصوف اصل ایمان ہے کوئی زائد شے نہیں، یہی ایمان جس کا ہر مسلمان مدعی ہے، اصل، سلوک ہے بشرطیکہ اس کی اصلیت اور حلاوت قلب کو عطاء ہو جائے، یہی شریعت جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عالم کو سکھائی ہے، اصل درویشی اور طریقت ہے مگر اس وقت جب کہ اعضاء سے متعدی ہو کر قلب تک پہنچ جائے اور عمل واکتساب قلبی انس و تعلق کا ثمرہ بن جائے۔ ایک بیمار شخص جس کو مطلق بھوک نہ معلوم ہو طبیب کے حکم سے غذا کھاتا ہے مگر جبراً و قہراً تاکہ طاقت بنی رہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جو بحالت تندرستی و بصحت تامہ صادق اشتہاء پر غذا کھا رہا ہے۔ غذا کھانے میں دونوں برابر ہیں۔ مگر ایک جبر و کراہت سے کھا رہا ہے اور دوسرا رغبت و اشتہاء سے۔ اسی طرح آدمی عبادت کرتا ہے مگر نفس کو مجبور بنا کر اور صاحب نسبت ولی اسی عبادت میں مشغول ہوتا ہے مگر بایں وجہ کہ دل کا تقاضہ اس طاعت میں مشغول ہونے پر اس کو مجبور کر رہا ہے۔ اسی صحت کاملہ کا نام طریقت ہے جو قلب کو حاصل ہوتی ہے اور اس روحانی غذا کا جس کو شریعت کہا جاتا ہے، سچا خواہش مند اور شیدا بنا دیتا ہے۔

مولانا نے تصوف کی حقیقت، اس کی ضرورت وغیرہ امور پر طویل کلام کرنے کے بعد حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کی ایک تحریر نقل کی ہے جو حضرت قدس سرہٗ نے اپنے اوائل عمر میں معلوم نہیں کس ضرورت سے تحریر فرمائی تھی اس کو تبرکاً بعینہ مع ترجمہ مولانا میرٹھی نقل کرتا ہوں۔

حضرت فرماتے ہیں:

''علم الصوفية علم الدين ظاهراً و باطناً و هوا لعلم الأعلى حالهم اصلاح الأخلاق ودوام الإفتقار إلى الله تعالىٰ، حقيقة التصوف التخلق بأخلاق الله تعالىٰ و سلب الإرادة كون العبد فى رضاء الله تعالىٰ، اخلاق الصوفية ما هو خلقه عليه السلام بقوله إنك لعلىٰ خلق عظيم وما ورد به الحديث وتفصيل أخلاقهم''

''هكذا التواضع ضده الكبر، المداراة واحتمال الاذىٰ عن الخلق المعاملة برفق و خلق حسن، و ترك غضب و غيظ، المواسات و الإيثار بفرط الشفقة على الخلق وهو تقديم حقوق الخلق على حظوظه، السخاوة، التجاوز والعفو، طلاقة الوجه والبشرة، السهولة ولين الجانب، ترك التعسف والتكلف، انفاق بلا اقتار و ترك الإدخار التوكل، لقناعة بيسير من الدنيا ألورع، ترك المراء و الجدال و العتب الابحق، ترك الغل والحقد والحسد، ترك المال و الجاه، وفاء الوعد، الحلم الإناءة، التواد و التوافق مع الإخوان والعزلة عن الأغيار، شكر المنعم، بذل الجاه للمسلمين الصوفي يهذب الظاهر والباطن في الأخلاق، والتصوف، أدب كله ادب الحضرة الإلهية، الاعراء عما سواه حياء و إجلا لا وهيبة، أسؤالمعاصي حديث النفس وسبب الظلمة۔''

ترجمہ: صوفیاء کا علم نام ہے ظاہر و باطن، علم دین اور قوت یقین کا اور یہی اعلیٰ علم ہے، صوفیاء کی حالت، اخلاق کا سنوارنا اور ہمیشہ خدا کی طرف لو لگائے رکھنا ہے، تصوف کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے مزین ہونا اور اپنے ارادہ کا چھن جانا ہے اور بندہ کا اللہ تعالیٰ کی رضا میں بالکلیہ مصروف ہوجانا ہے، صوفیاء کے اخلاق وہی ہیں جو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق ہے، حسب فرمان خداوند تعالیٰ کہ بے شک تم بڑے خلق پر پیدا کیے گئے ہو اور نیز جو کچھ حدیث میں آیا ہے، اس پر عمل اخلاق صوفیاء میں داخل ہے، صوفیاء کے اخلاق کی تفصیل اس طرح ہے، اپنے آپ کو کمتر سمجھنا اور اس کی ضد ہے تکبر، مخلوق کے ساتھ تلطف کا برتاؤ کرنا اور خلقت کی ایذاؤں کو برداشت کرنا، نرمی اور خوش خلقی کا معاملہ کرنا، غیظ و غضب کا چھوڑ دینا، ہمدردی اور دوسروں کو ترجیح دینا، خلق پر فرطِ شفقت کے ساتھ جس کا یہ مطلب ہے کہ مخلوق کے حقوق کو اپنے حظِ نفسانی پر مقدم رکھا جائے، سخاوت کرنا، درگزر اور معاف کرنا، خندہ روئی اور بشاشت جسم سہولت اور نرم پہلو رکھنا، تصنع اور تکلف کا چھوڑ دینا، خرچ کرنا بلا تنگی اور بغیر اتنی فراخی کے کہ احتیاج لاحق ہو، خدا پر بھروسہ رکھنا، تھوڑی سی دنیا پر قناعت کرنا، پرہیز گاری، جنگ وجدل اور عتاب نہ کرنا مگر حق کے ساتھ، بغض و کینہ و حسد نہ کرنا، عزت و جاہ کا خواہش مند نہ ہونا، وعدہ پورا کرنا، بردباری، دور اندیشی، بھائیوں کے ساتھ موافقت و محبت رکھنا، اغیار سے علیحدہ رہنا، محسن کی شکر گذاری، جاہ کا مسلمانوں کے لیے خرچ کرنا، صوفی اخلاق میں اپنا ظاہر و باطن مہذب بنالیتا ہے اور تصوف سارا ادب ہی کا نام ہے، بارگاہِ احدیت کا ادب یہ ہے کہ ماسوی اللہ سے منہ

پھیر لیا جائے، شرم کے مارے حق تعالیٰ کے اجلال و ہیبت کے سبب، بدترین معصیت ہے تحدیث نفس یعنی نفس سے باتیں کرنا اور ظلمت کا سبب ہے''۔ (تذکرۃ الرشید:ص۱۲ار ج۲)

امام ربانی قدس سرہٗ کی یہ چند سطور سرنامہ اور عنوان ہیں، ان تمام مباحث کا جو طریقت کے فن میں ہزار ہا ضخیم کتابوں کے اندر اولیاء اللہ نے جمع کیے ہیں۔

۶ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ چند خاص لوگوں کے مجمع میں جب کہ آپ بوقت چاشت گولر کے نیچے دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ کی زبان مبارک سے یہ تقریر ظاہر ہوئی، جس کو مولوی برکت اللہ صاحب نے اسی وقت قلمبند کر لیا تھا، ہدیہ ناظرین کرتا ہوں وہ یہ ہے:

''تمام اذکار و اشغال و مراقبات وغیرہ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی حضوری ہر وقت میسر رہے، بعض نے اس حضوری کے بھی دو درجے کر دیئے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ اسمِ ذات مخیلہ میں قائم ہو جائے، پھر اسم سے مسمّیٰ کی طرف آسانی سے راستہ مل جاتا ہے یہ جو بزرگوں نے چلہ وغیرہ کا طریقہ ایجاد کیا تھا، اس کا مطلب بھی یہی تھا کہ کوئی دوسرا خیال اور نقش مخیلہ پر نہ پڑے، مثلاً باہر نکلو تو گھونگھٹ کر کے نکلو کہ کسی کو دیکھو تو اس کی صورت کا نقشِ مخیلہ کو مکدر کر دے گا، جس طرح انسان کو اپنی ہستی کا ہمہ وقت علم ہے کہ میں ہوں، بس ایسا ہی علم حق تعالیٰ کے ساتھ رہنا چاہیے۔''

اپنے شیخ سے محبت اور اس کے چند واقعات

''پہلے بزرگ اخلاق سیئہ چھڑانے کی محنتیں کرایا کرتے تھے، تاکہ یہ کام آسان ہو جائے، مگر متاخرین خصوصاً ہمارے سلسلہ کے بزرگوں نے یہ طریق پسند کیا ہے کہ ذکر کی اس قدر کثرت کرے کہ اخلاق کے نیچے دب جائیں اور تمام باتوں پر غالب آ جائے، اخلاق سیئہ بہت سے ہیں مگر اکثر نے دس میں محصور کر دیا ہے، پھر ان دسوں کا خلاصہ تکبر کو بتایا ہے کہ اگر یہ دُور ہو جائے تو باقی خود دُور ہو جاتے ہیں''۔

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی شخص بیس سال رہا اور ایک روز عرض کیا کہ حضرت اتنی مدت میں مجھے آپ سے کچھ حاصل نہ ہوا، وہ شخص قوم کا سردار اور برادری میں ممتاز تھا، آپ سمجھ گئے کہ اس کے دل میں بڑائی ہے، فرمایا اچھا ایک بات کرو، اخروٹوں کا ایک ٹوکرا بھر کر خانقاہ کے دروازے پر بیٹھ جاؤ اور پکارو کہ جو شخص مجھے ایک جوتا مارے گا، اس کو ایک اخروٹ دوں گا اور جو دو مارے گا تو دو دوں گا، اسی طرح زیادہ کرتے جاؤ، جب یہ کام کر چکو اور اخروٹ کا ٹوکرا خالی ہو جائے تب میرے پاس آؤ، اس شخص نے کہا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ حضرت! یہ کام مجھ سے

ہرگز نہ ہوگا، حضرت جنید رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ وہ مبارک کلمہ ہے کہ اگر ستر برس کا کافر ایک مرتبہ صدق دل سے پڑھ لے تو واللہ مومن ہو جائے، مگر تو اس وقت اس کے پڑھنے سے کافر طریقت ہوگیا، جا نکل تجھے مجھ سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

دوسرے کسی بزرگ کا نام لے کر فرمایا کہ ان کے پاس ایک شخص مدتوں رہا اور پھر شکایت کی کہ قلب کی حالت دُرست نہ ہوئی، شیخ نے دریافت فرمایا کہ میاں، درستی سے تمہارا کیا مقصود ہے؟ اس شخص نے جواب دیا کہ حضرت! جو نعمت آپ سے ملے گی وہ آپ سے لے کر دوسروں کو پہنچاؤں گا، شیخ نے فرمایا بس! اسی نیت کی تو ساری خرابی ہے کہ پہلے سے پیر بننے کی ٹھان رکھی ہے۔

اس بیہودہ خیال کو جی سے نکال دو اور یوں خیال کرو کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہمیں طرح طرح کی نعمتیں دی ہیں ان کا شکر اور بندگی ہم پر فرض ہے۔ پس اس اُمید پر جو لوگ ذکر و شغل کرتے ہیں یا نماز پڑھتے ہیں کہ ہمیں اس کا نفع ملے گا یہ ان کی حماقت ہے، ان کی نیت میں فساد ہے، کیسا نفع؟ کہاں کا اجر؟ یہ ہستی، یہ جسم، یہ آنکھیں، یہ ناک، یہ کان، یہ زبان، یہ حواس جو حق تعالیٰ نے ہمیں دے رکھے ہیں پہلے ان کا شکریہ سے تو فراغت ہو لے تب دوسرے نفع اور اجر کی توقع کرے۔

حافظ زاہد حسین صاحب نے اس موقع پر سوال کیا کہ حضرت جیسا کہ آپ نے فرمایا اگر کوئی شخص ہر وقت اللہ کو یاد رکھے تو کافی ہے اور کچھ اس کے واسطے ضروری نہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا، بس فرائض اور سنن موکدہ، اللہ کا ذکر کرنا ہی زندگی کا فائدہ ہے، باقی تمام نقصان ہی نقصان ہے، اگر کسی سے بحضور قلب نہ ہو سکے زبان ہی زبان تک رہے، تاہم فائدہ سے خالی نہیں۔

(تذکرۃ الرشید: ص ۱۳/ ج ۲)

حضرت گنگوہی قدس سرہ کا یہ ارشاد میں غالباً آپ بیتی میں بھی کسی جگہ لکھوا چکا ہوں کہ ایک دفعہ حضرت قدس سرہٗ گھر سے کھانا تناول فرما کر دوپہر کے وقت تشریف لا رہے تھے، حجرہ کے قریب پہنچ کر ارشاد فرمایا کوئی ہے؟ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا، حضرت یحیٰؒ! اور الیاس! یعنی میرے چچا جان، حضرت قدس سرہٗ نے نہایت بھرائی ہوئی آواز میں ارشاد فرمایا، غور سے سنو! اللہ کا نام چاہے کتنی ہی غفلت سے لیا جائے اثر کیے بغیر نہیں رہتا، میں نے اپنے اکابر کو اس سلسلہ میں ایک چیز کا بہت ہی پابند اور اہتمام کرتے ہوئے دیکھا ہے، یعنی شیخ سے محبت عشق کے درجے سے بھی آگے، میں اپنے رسالہ اسٹرائیک کے شروع میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے لکھوا چکا ہوں کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا الحاج صدیق احمد

صاحب انبہٹوی خلیفہ حضرت گنگوہی سے نقل کیا ہے کہ ہمارے حضرات کے سلسلہ میں بطریق جذب نفع پہنچتا ہے، نہ بطریق سلوک۔ (النور، ص ۱۱، ربیع ۲ ۴۶ھ)

میں نے اپنے اکابر کے حالات میں خود بھی دیکھا اور سوانحوں میں بہت کثرت سے پڑھا اور جو پڑھا وہ واقعی آنکھوں سے دیکھا بھی کہ اپنے شیخ سے محبت عشق کے درجہ سے زیادہ پائی، اعلیٰ حضرت گنگوہی نوراللہ مرقدہٗ پان نہیں تناول فرمایا کرتے تھے لیکن اُگالدان رہتا تھا، کبھی کھانسی وغیرہ میں بلغم اس میں ہوتا تھا، سوکھ بھی جاتا تھا۔

حضرت شیخ الہند نوراللہ مرقدہٗ نے ایک مرتبہ اس اُگالدان کو بہت چپکے سے کوئی نہ دیکھے اُٹھایا اور باہر لے جاکر اس کو دھو کر پی لیا، علی میاں نے حضرات رائے پوری ثانی نوراللہ مرقدہٗ کی سوانح صفحہ ۶۸ میں یہ لکھا ہے کہ حضرت کا اپنے شیخ سے وہ عاشقانہ اور والہانہ تعلق تھا جس کو مناسبت اور ترقی باطن میں ہزار اذکار اور ریاضوں سے زیادہ دخل ہے اس کی کیفیت یہ تھی:

انبساط عید دیدن روئے تو
عید گاہِ ما غریباں کوئے تو

ذکر کے علاوہ حضرت کی خدمت میں مشغولیت رہتی تھی، ایک مرتبہ فرمایا کہ حضرت کو لٹا کر بدن دباتا تو دیر کے بعد حضرت فرمادیتے کہ جاؤ مولوی صاحب آرام کرو، میں کیواڑ بند کرکے اپنی جگہ آجاتا، پھر خیال آتا کہ کوئی مکھی منہ پر بیٹھ کر نہ ستاتی ہو، پھر دبے پاؤں آکر دیکھا، اسی طرح آتا جاتا رہتا، یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہوجاتا، فرمایا کہ کبھی حضرت کی خدمت میں بے وضو حاضر نہیں ہوا اور ہر وقت باوضو رہتا تھا، حضرت اکثر شفقت اور محبت کا برتاؤ فرماتے، میں کبھی ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا کہ میں تو اپنی اصلاح کے لیے آیا ہوں اور حضرت کی شفقتیں ایسی ہیں کہ جن سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں میں نااہل نہ سمجھا جارہا ہوں اور مجھے ناکارہ سمجھ کر یہ شفقتیں ہورہی ہیں۔

اس پر حضرت جواب فرماتے نہیں مولوی صاحب! میں تمہاری طرف سے بے خبر نہیں ہوں، اکثر یہ بھی ہوتا کہ بلا کسی قصور کے ڈانٹ دیا کرتے، پھر دیکھتے کہ مجھ پر اس ڈانٹ کا کوئی اثر تو نہیں، مگر الحمدللہ کہ مجھ پر اس کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ (سوانح حضرت رائے پوری: ص ۶۸)

تذکرۃ الرشید میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے ابتدائی حالات میں میں ایک واقعہ شاید کہیں لکھوا بھی چکا ہوں، حضرت امام ربانی نوراللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ کو تھانہ بھون میں رہتے ہوئے چند روز گزرے تو میری غیرت نے اعلیٰ حضرت پر کھانے کا بار ڈالنا گوارا نہیں کیا، آخر میں نے یہ سوچ کر کہ دوسری جگہ انتظام کرنا بھی دشوار ہے اور ناگوار بھی، رخصت چاہی، حضرت نے اجازت نہ دی اور فرمایا کہ ابھی چند روز ٹھہرو، میں خاموش ہوگیا، قیام کا قصد تو کرلیا مگر اس کے

ساتھ ہی یہ بھی فکر ہوا کہ کھانے کا انتظام کسی دوسری جگہ کرنا چاہیے، تھوڑی دیر بعد جب اعلیٰ حضرت مکان تشریف لے جانے لگے تو میرے وسوسہ پر مطلع ہو کر فرمانے لگے۔ میاں رشید احمد! کھانے کی فکر مت کرنا ہمارے ساتھ کھانا، دوپہر کو کھانا مکان سے آیا تو ایک پیالے میں کوفتے تھے، نہایت لذیذ اور دوسرے پیالہ میں معمولی سالن، اعلیٰ حضرت نے مجھے دسترخوان پر بٹھا لیا مگر کوفتوں کا پیالہ مجھ سے علیحدہ اپنی طرف رکھا اور معمولی سالن کا پیالہ میرے قریب سرکا دیا، میں اپنے حضرت کے ساتھ کھانا کھانے لگا، اتنے میں حضرت حافظ ضامن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تشریف لائے، کوفتوں کا پیالہ مجھ سے دور رکھا ہوا دیکھ کر اعلیٰ حضرت سے فرمایا۔ بھائی صاحب! رشید احمد کو اتنی دُور ہاتھ بڑھانے میں تکلیف ہوتی ہے اس پیالہ کو ادھر کیوں نہیں رکھ دیتے، اعلیٰ حضرت نے بے ساختہ جواب دیا، اتنا بھی غنیمت ہے کہ اپنے ساتھ کھلا رہا ہوں، جی تو یوں چاہتا ہے کہ چوڑوں چماروں کی طرح الگ ہاتھ پر روٹی رکھ دیتا، اس فقرہ پر اعلیٰ حضرت نے میرے چہرے پر نظر ڈالی کہ کچھ تغیر تو نہیں آیا۔ مگر الحمد للہ میرے قلب پر بھی اس کا کچھ اثر نہ تھا، میں سمجھتا تھا کہ جو کچھ فرمار ہے ہیں بالکل سچ ہے، اس دربار سے روٹی ہی کا ملنا کیا تھوڑی نعمت ہے، جس طرح بھی ملے بندہ نوازی ہے، اس کے بعد حضرت نے پھر کبھی میرا امتحان نہیں لیا، اس کے بعد فرمایا، اسی لیے مجھے کچھ یاد آیا نہیں۔

حضرت تھانوی کے ملفوظات

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حافظ محمد ضامن رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے مرشد حضرت میاں جیو کے ہمراہ ان کا جوتا بغل میں لے کر توبرہ گردن میں ڈال کر جھنجھانہ جاتے تھے اور ان کے صاحبزادے کے سسرال بھی وہیں تھے، لوگوں نے عرض کیا کہ اس حالت سے جانا مناسب نہیں، وہ لوگ حقیر سمجھ کر رشتہ نہ توڑ ڈالیں، حافظ صاحب نے فرمایا کہ رشتہ کی ایسی تیسی، میں جانے میں اپنی سعادت ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ (اروحِ ثلاثہ: ص)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ مولوی احمد حسن کانپوری جب حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ العزیز کی خدمت میں پہنچے ہیں، منشی محمد جان مرحوم کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز مولوی صاحب کو دیکھا کہ حضرت کی جوتی جو کہ مجلس سے باہر رکھی تھی سر پر رکھ کر زار زار رو رہے تھے۔ (اورحِ ثلاثہ: ص۴۲۵)

آپ بیتی نمبر۲ میں ایک مضمون لکھوا چکا ہوں کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی رئیس الاحرار نے مجھ سے پوچھا تھا، بہت عرصہ کی بات ہوگئی کہ یہ تصوف کیا بلا ہے؟ بہت دلچسپ قصہ

ہے، مفصل تو اپنی جگہ گزر چکا، اس ناکارہ نے اس وقت یہ جواب دیا تھا کہ تصوف کی حقیقت صرف تصحیح نیت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں، جس کی ابتداء ''إنما الأعمال بالنیات'' سے ہوتی ہے اور انتہا ''ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ'' اسی کو یادداشت کہتے ہیں اسی کو حضوری کہتے ہیں، اسی کو نسبت کہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ مولانا! سارے پاپڑ اسی ایک بات کے لیے بیلے جاتے ہیں اسی کے لیے شغل ہوتا ہے، اسی کے لیے مجاہدات اور مراقبے ہوتے ہیں اور جس کو اللہ جل شانہ اپنے لطف و کرم سے کسی بھی طرح سے یہ دولت عطاء کردے اس کو کہیں کی بھی ضرورت نہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کیمیا اثر سے ایک ہی نظر میں سب کچھ ہو جاتے تھے اور ان کو کسی چیز کی بھی ضرورت نہ تھی، اس کے بعد اکابر اور حکماء اُمت قلبی امراض کی کثرت کی بناء پر مختلف علاج جیسا کہ اطباء بدنی امراض کے لیے تجویز کرتے ہیں، رُوحانی اطباء روحانی امراض کے لیے ہر زمانہ کے مناسب اپنے تجربات جو اسلاف کے تجربات سے مستنبط تھے، نسخے تجویز فرماتے ہیں جو بعض کو بہت جلد نفع پہنچاتے ہیں، بعضوں کو بہت دیر لگتی ہے، پھر میں نے مرحوم کو متعدد قصے سنائے جو وہاں گزر چکے اور جیسے شیخ کے ساتھ محبت اس سلسلہ میں ضروری ہے ایسے ہی شیخ کی ناراضی اس میں سم قاتل ہے۔

اشرف السوانح میں لکھا ہے کہ بالخصوص تعلق ارادت قائم کر لینے کے بعد پھر گستاخی اور بے ادبی کرنا تو خاص طور سے زیادہ موجب وبال ہوتا ہے، چنانچہ خود حضرت والا (حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ) فرماتے ہیں کہ اس تعلق میں بعض اعتبارات سے معصیت اتنی مضر نہیں ہوتی جتنی بے ادبی مضر ہو جاتی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ معصیت کا تعلق تو اللہ تعالیٰ سے ہے اور چونکہ وہ تاثر و انفعال سے پاک ہیں اس لیے توبہ سے فوراً معافی ہو جاتی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ویسا ہی تعلق پیدا ہو جاتا ہے، بخلاف اس کے بے ادبی کا تعلق شیخ سے ہے اور وہ چونکہ بشر ہے اس لیے طالب کی بے ادبی سے اس کے قلب میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے جو مانع ہو جاتی ہے تعدیہ فیض سے، پھر حضرت والا نے فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی خوب مثال دی تھی۔

فرمایا کہ اگر کسی چھت کی میزاب کے مخرج میں مٹی ٹھونس دی جائے تو جب آسمان سے پانی برسے گا تو گو وہ چھت پر تو نہایت صاف و شفاف حالت میں آئے گا لیکن جب میزاب میں ہو کر نیچے پہنچے گا تو بالکل گدلا اور میلا ہو کر، اسی طرح شیخ کے قلب پر جو ملاء اعلیٰ سے فیوض و انوار نازل ہوتے رہتے ہیں ان کا تعدیہ ایسے طالب کے قلب پر جس نے شیخ کے قلب کو مکدر کر رکھا ہے مکدر صورت ہی میں ہوتا ہے جس سے اس طالب کا قلب بجائے منور و مصفا ہونے کے

تیرہ ومکدر ہوتا چلا جاتا ہے اھ۔

حضرت والا یہ بھی فرماتے ہیں کہ اپنے شیخ کے قلب کومکدر رکھنے کا طالب پر یہ وبال ہوتا ہے کہ اس کو دنیا میں جمعیت قلب کبھی میسر نہیں ہوتی اور وہ عمر بھر پریشان ہی رہتا ہے، لیکن چونکہ یہ ضروری نہیں کہ ہر فعل موجب تکدر شیخ معصیت ہی ہو، اس لیے ایسی صورت میں اس فعل سے براہِ راست تو کوئی دینی ضرر نہیں پہنچتا، لیکن وہ بواسطہ اکثر سبب ہو ہی جاتا ہے جس کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ اول شیخ کے قلب کا تکدر سبب ہوتا ہے، طالب کے انشراح قلبی کے زوال کا اور پھر یہ عدم انشراح اکثر سبب ہو جاتا ہے کوتاہی اعمال کا اور پھر یہ کوتاہی اعمال سبب ہو جاتی ہے دینی ضرر اور اخروی وبال کا، گو عدم انشراح کی حالت میں بھی اگر وہ اپنے اختیار و ہمت سے برابر کام لیتا رہے اور اعمالِ صالحہ کو بتکلف جاری رکھے تو پھر کوئی بھی دینی ضرر نہ پہنچے، لیکن اکثر یہی ہوتا ہے کہ انشراح کے فوت ہو جانے سے اعمال میں بھی کوتاہیاں ہونے لگتی ہیں، اس طرح بالواسطہ دینی ضرر کا بھی اکثر تحقق ہو ہی جاتا ہے، کیونکہ جو داعیہ عادیہ تھا، یعنی انشراح وہ تو جاتا رہا اور بلا داعیہ اکثر عمل بہت دشوار ہوتا ہے اھ۔

اسی سلسلہ میں حضرت والا یہ بھی فرمایا کرتے ہیں کہ گو میں خود کوئی چیز نہیں لیکن جس کسی نے کسی شخص کو اپنا معتقد فیہ بنالیا اور پھر بلا وجہ اس کے ساتھ خلاف اعتقاد معاملہ کر کے اس کو مکدر کر دیا تو اس صورت میں بھی ایسی ہی مضرتیں پہنچیں گی، جیسی کاملین ومقبولین کو مکدر کرنے سے پہنچتی ہیں۔

(اشراف السوانح: ص ۲۵ رج ۲)

آپ بیتی نمبر ۴ پر اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک کشفی پیام لکھوا چکا ہوں کہ اللہ والوں سے ڈرتے رہنا، ان کی اُلٹی بھی سیدھی ہوتی ہے، اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا تھا، حضرت اقدس مولانا الحاج عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے میں نے اس کا مطلب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ صحیح ہے کہ اُلٹی بات اُلٹی ہی ہوتی ہے لیکن اہل اللہ کے قلوب میں اگر کسی کی طرف سے تکدر پیدا ہو جائے، خواہ وہ کسی غلط بات ہی کی وجہ سے ہو تو ان کے پاک دل کا تکدر، خواہ وہ کسی غلط بات ہی کی وجہ سے رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ اس شخص کو کسی مصیبت میں پھانس دیتا ہے، یہ بات میری خوب سمجھ میں آ گئی اور اس کے نظائر میں نے بہت دیکھے، اسی لیے میں اسباق حدیث میں طلبہ کو اس پر بہت ہی زیادہ تنبیہ کرتا رہا کہ ان اللہ والوں سے بہت ڈرتے رہنا، ان کے دل میں تمہاری طرف سے تکدر نہ پیدا ہونا چاہیے اور یہ جب جملہ اہل اللہ کے ساتھ ہے تو جس شخص سے بیعت کا تعلق ہو اس کے قلبی تکدر سے تو بہت زیادہ ڈرنا چاہیے جیسا کہ حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں بھی گزر چکا اور میرے ذاتی تجربے بھی اس کے متعلق بہت کثرت سے

ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے بھی اہلِ اللہ کے تکدر سے محفوظ فرمائے۔

ایک سلسلہ گفتگو میں حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ اصلاح کا باب نہایت ہی نازک ہے ایسا ہی شیخ کا تعلق بھی نازک ہے، کیونکہ اس طریق میں نفع کا مدار مناسبت پر ہے، بدون مناسبت کے نفع نہیں ہوسکتا یہ اعظم شرائط ہے اور یہی مناسب پُلِ صراط ہے، ایک صاحب نے بہت عرصہ تک خط و کتابت کی اور ہر خط میں بیعت کی درخواست کی مگر میرا جی قبول نہ کرتا، آخر بہت ہی کھود کرید کے بعد چور نکلا، ایک خط میں لکھا کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کے مزاج میں سختی ہے، کیا اس خیال کے ساتھ نفع ہوسکتا ہے، اب بتلایئے میں مرید کرلیتا اور اس کے بعد یہ خط آتا تو کتنا رنج ہوتا، بعض چیزیں ذوقی اور وجدانی ہوتی ہیں، پہلے سے انقباض کی دلیل کیا بیان کی جائے، اس کا کوئی کیا انتظام کرسکتا ہے، میں نے لکھ دیا کہ کہیں اور جگہ اصلاح کا تعلق پیدا کرلو، مجھ سے تم کو نفع نہ ہوگا، اعتراض اور نفع دونوں متضاد چیزیں ہیں۔ (افاجات: ص ۲۵۰)

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک مقولہ نقل کیا ہے کہ ’’ہر درویشے کہ چوں وچرا کند و ہر طالب علمے کہ چوں وچرا نکند ہر دو را در چراگاہ باید فرستاد‘‘ (یعنی جو مرید شیخ کے ساتھ چوں چراں کرے اور ہر طالب علم جو اُستاد کے ساتھ چوں و چراں نہ کرے ان دونوں کو چراگاہ میں بھیج دینا چاہیے یعنی جانور ہیں آدمی نہیں)۔

اس طریق میں اہم چیز طلب ہے

اس کے ساتھ ہی اس سلسلہ کی اہم چیز طلب ہے میں کسی جگہ غالباً لکھوا چکا ہوں کہ میرے حضرت میرے مرشد نور اللہ مرقدہٗ نے میرے ہی ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ میری (حضرت قدس سرہٗ) کوئی حقیقت نہیں، میری تو مثال تو نل کی سی ہے کہ پانی کھینچنے والا جس قوت و شدت سے پانی کھینچتا ہے مبداء فیاض کی طرف سے اسی کے موافق عطاء ہوتا ہے، لیکن عطاء ہوتا ہے نل ہی کے ذریعہ سے، حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ اصل چیز طلب ہے اسی طلب پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جیسے بچے کو ماں کے دودھ کی طلب ہوتی ہے تو دودھ اس کے اثر سے اُترتا ہے تو ماں کو ناز نہ کرنا چاہیے کہ میں دودھ دیتی ہوں، دودھ خود بچے کی طلب کا اثر ہے، تجھ کو اسی واسطے عطاء فرمایا ہے کہ تو بچے کو دے، البتہ بچے کو ضروری ہے کہ اس کو اپنا محسن سمجھے، اسی بناء پر حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک بار فرمایا کہ شیخ اپنے پاس سے کچھ نہیں دیتا، مرید ہی میں سب ذخیرہ ہے، شیخ سے اس کا ظہور ہوجاتا ہے، ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ لیکن مرید کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے، سبحان اللہ تحقیق اور تربیت دونوں کو کس طرح جمع فرمادیا۔

(افاضات: ص ۲۹۲)

اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے مکاتیب میں بکثرت یہ مضمون مختلف عنوانات سے مذکور ہے کہ اصل چیز طلب ہے، ایک جگہ اپنے اجل خلیفہ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبہٹوی نوراللہ مرقدہٗ کے خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں، اصل سب کا حضور ہے اور بس اور یہ نعمت دفعۃً حاصل ہوجانا محض احسان حق تعالیٰ کا ہے، اس ناکارہ کو ساری عمر گزری کچھ بھی نصیب نہ ہوا، چاہ (کنویں) سے پانی چلتا ہے اور بذریعہ نالی ونل کے زراعت میں جاتا ہے، نل نالی کو کچھ حظ نہیں محض واسطہ ہے، علیٰ ہذا یہ ناقص واسطہ واقع ہوا ہے گو خود خشک لب ومحروم ہے، اب خود آپ سے التجاء دعاء کرتا ہوں۔ (مکاتیب رشیدیہ: ص ۱۷)

دوسرے طویل مکتوب میں جو حضرت مولانا مرحوم ہی کے نام سے ہے تحریر فرماتے ہیں کہ خواب جو دیکھے اور نقل کیے، سب رویاء صالحہ ہیں، تعبیر کی ضرورت نہیں، البتہ اس کے بیان کی ضرورت ہے کہ آپ اس عاجز یا بر ہنہ کے پیچھے جو اپنے آپ کو دیکھتے ہو اس کی دو وجہ ہیں، ایک تو آپ کے عقیدہ میں یہ امر قرار پایا کہ یہ گمنام کچھ ہے، دوسرے فی الواقع اس ناکام کو اپنا وسیلہ ظاہر بنایا ہے، سو اگرچہ چاہ سے پانی نکلتے وقت رہٹ کے ظروف میں اول پانی آتا ہے مگر کھیت میں جا کر جمع ہو جاتا ہے، سو اولاً تو ظروف جز و طریق زراعت اور کچھ نہیں اور جو پانی ان میں آتا ہے یا رہتا ہے وہ بہت قلیل نسبت بزراعت ہے، اگرچہ ظروف مقدم زراعت پر ہیں، مگر نفس تقدم کو کیا شرف ہے، لہٰذا تقدم موجب فخر نہیں ہاں آپ کے اتباع سے فخر ہے۔

میرے اکابر نوراللہ مراقدہم کے واقعات سلوک کے لائن کے تو بہت کثرت سے ہیں، ان کا احاطہ بھی دشوار ہے اور ان سب اکابر کی سوانح عمریاں بھی مستقل شائع ہو چکی ہیں، چند قصے نمونے کے طور پر لکھواتا ہوں:

حضرت سید احمد شہید کی بیعت کے واقعات

حضرت سید احمد شاہ صاحب شہید رائے پوری بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت اُستاذ الاساتذہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے بیعت ہوئے تھے، اورِ ح ثلاثہ میں لکھا ہے کہ جب بیعت ہونے کے بعد دوسری مرتبہ بغرض تعلیم حاضر ہوئے تو شاہ صاحب نے ان کو اس مسجد میں ٹھہرا دیا جو ان کے مدرسہ سے تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر واقع تھی، جس میں شاہ صاحب اور طلبہ نماز پڑھا کرتے تھے اور تعلیم اشغال فرما کر حکم دیا کہ آٹھویں روز ہم سے ملا کرو۔

چھ ماہ کے بعد شاہ صاحب کے خاندان میں کسی کے یہاں شادی کی تقریب ہوئی، اس تقریب میں شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب تینوں بھائی موجود

تھے اور شامیانہ تانا جارہا تھا، اس مقام پر ایک نیم کا درخت تھا، جس کی وجہ سے شامیانہ اچھی طرح نہ تنتا تھا، بلکہ اس میں جھول رہتا تھا، اتنے میں سید صاحب بھی مسجد سے تشریف لے آئے، جب آپ نے یہ رنگ دیکھا تو کُرتے کو کمر سے باندھ کر نیم پر چڑھ گئے اور نیم پر چڑھ کر جو شامیانہ کھینچا تو شامیانہ بالکل ٹھیک تن گیا اور جھول بالکل نکل گیا، سید صاحب کی یہ دھج شاہ عبدالقادر صاحب کو پسند آ گئی اور انہوں نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے عرض کیا کہ سید احمد کو مجھے دے دیجئے، شاہ صاحب نے فرمایا کہ لے جاؤ اور سید صاحب کے کہہ دیا کہ میاں عبدالقادر کے ساتھ جاؤ۔

شاہ عبدالقادر صاحب ان کو اپنے پاس اکبری مسجد میں لے آئے اور ایک حجرہ میں ٹھہرا دیا اور اشغال کے متعلق فرمایا کہ میری سہ دری کے پاس بیٹھ کر کیا کرو، سید صاحب نے اس حکم کی تعمیل کی اور شاہ صاحب عبدالقادر صاحب کے حکم کے مطابق ذکر و شغل کرتے رہے اور جو جگہ شاہ صاحب نے ان کو بتادی تھی، سید صاحب خواہ مینہ ہو یا آندھی یا دھوپ برابر اپنی جگہ بیٹھے رہتے تھے اور جب تک شاہ صاحب نہ کہتے تھے کہ اب یہاں سے اُٹھ جاؤ اس وقت تک نہ اُٹھتے تھے۔

شاہ صاحب نے سید صاحب کو ڈھائی برس اپنی خدمت میں رکھا اور ڈھائی برس کے بعد ان کو لے کر شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں آئے اور شاہ صاحب سے عرض کیا کہ سید احمد حاضر ہیں، انہیں پرکھ لیجئے پرکھا لیجئے، شاہ صاحب نے فرمایا کہ میاں عبدالقادر تم جو کچھ کہتے ہو ٹھیک کہتے ہو اب ان کو بیعت کی اجازت دے دو، شاہ عبدالقادر صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اجازت تو آپ ہی دیں گے اور ان سے آپ کا ہی سلسلہ چلے گا، شاہ صاحب نے ان کو بیعت کی اجازت دے دی۔ (اورح ثلاثہ: ص ۱۲۴)

فرمایا کہ سید احمد شہید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جس وقت حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں تھے تو شاہ صاحب نے ان کو شغل رابطہ بتایا تو سید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس شغل سے عذر فرما دیا، اس پر شاہ صاحب نے فرمایا:

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

تو سید صاحب نے جواب دیا کہ آپ کسی معصیت کا حکم دے دیجئے کرلونگا یہ تو معصیت نہیں شرک ہے، یہ تو گوارا نہیں، شاہ صاحب نے یہ سن کر ان کو سینے سے لگالیا کہ اچھا ہم تم کو طریق نبوت سے لے کر چلیں گے، تم کو طریق ولایت سے مناسبت نہیں ہے۔

(جدید ملفوظات: ص ۱۴۴)

تصور شیخ کے متعلق اورحِ ثلاثہ میں بھی خود سید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ لکھا ہے، خاں

صاحب فرماتے ہیں کہ سید صاحب ایک مرتبہ اکبری مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک نوجوان سر سے پا تک حریر کا لباس پہنے ہوئے اور ڈاڑھی منڈائے ہوئے اور پوری پوری میں انگوٹھی چھلے پہنے ہوئے حاضر ہوا اور سلام کر کے بیٹھ گیا اور چونکہ اس زمانے میں بانکوں کی وضع یہ تھی کہ ڈھیلا پاجامہ کلیوں دار پہنا کرتے تھے، اس لیے یہ شخص بھی ڈھیلا ہی پاجامہ پہنے ہوئے تھا، یہ شخص فوج میں ملازم تھا، مگر یہ یاد نہیں کہ دفعدار تھا یا کچھ اور، اس نے عرض کیا کہ حضور! میں فوج میں ملازم ہوں اور ہماری فوج کو یہاں چھ مہینے رہنے کا حکم ہے، میں چاہتا ہوں کہ حضور مجھے بیعت کر لیں۔

سید صاحب نے فرمایا کہ بیعت! کیا یہ صورت بیعت کی ہے؟ ڈاڑھی آپ کی منڈی ہوئی ہے، لباس سارا حریر کا ہے، ہاتھوں میں مہندی ہے، پوری پوری میں چھلے ہیں، اس نے جواب دیا کہ میں ان باتوں سے توبہ کرتا ہوں اور چھلے میں اسی وقت اُتار دیتا ہوں، لیکن کپڑے ابھی نہیں اُتار جا سکتا، کیونکہ نہ دوسرے کپڑے یہاں میرے پاس ہیں نہ گھر، رہی مہندی اور ڈاڑھی سو میں مہندی کے زائل کرنے سے بھی اس وقت عاجز ہوں اور ڈاڑھی بھی نہیں پیدا کر سکتا۔

سید صاحب نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ان کے لیے کپڑوں کا انتظام کرایا جائے، چنانچہ لوگوں نے کرتہ پاجامہ دے دیا اور سید صاحب نے اپنا عمامہ اور چادر دی اس نے کپڑے اتار کر کپڑے خوشی خوشی پہن لیے اس کے بعد سید صاحب نے اسے بیعت کیا اور علیحدہ لے جا کر کچھ تعلیم فرمایا، بیعت ہونے کے بعد یہ شخص چھ سات روز تک صبح کے وقت اور بعد عصر روزانہ آتا رہا، لیکن ساتویں یا آٹھویں روز جو وہ آیا نہایت پریشان اور روتا ہوا آیا اور عرض کیا کہ میں تو سمجھتا تھا کہ ہمارا قیام چھ، سات مہینے ہوگا اور میں حضور سے مستفید ہوں گا، مگر آج ہماری فوج کے تبادلہ کا حکم آ گیا کل ہمیں یہاں سے جانا ہوگا، مجھے اپنی محرومی اور حضور کی مفارقت کا نہایت صدمہ ہے۔

سید صاحب اس کا ہاتھ پکڑ کر شاہ عبدالقادر صاحب کے حجرہ میں لے گئے اور آدھ گھنٹہ یا پون گھنٹہ حجرہ میں رہے، اس کے بعد سید صاحب تنہا حجرہ سے نکلے اور ہم لوگوں سے فرمایا کہ ان کو اُٹھا لاؤ اور ہوا دو اور یہ کہہ کر تیز قدمی کے ساتھ دوسرے حجرے میں تشریف لے گئے، ہم لوگ جب اندر گئے ہیں تو دیکھا کہ وہ شخص بالکل بے ہوش تھا، اسے حجرے سے سہ دری میں لے آئے اور پانی کے چھینٹے دیئے، پنڈول سنگھایا، کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا تو یہ حالت تھی کہ بالکل مست تھا اور آنکھیں پھٹی پھٹی ہوئی تھیں اور کہتا تھا کہ واللہ باللہ جس طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہوں سید صاحب ہی نظر آتے ہیں "وہ میری آنکھوں میں بھی ہیں" یہ الفاظ اس نے تین دفعہ زور زور سے کہے۔

سید صاحب نے کیواڑ کھول کر اپنا چہرہ نکالا اور زور سے فرمایا کہ خاموش اور مجھ کتے کی صورت اپنے سامنے سے منہدم کر اور یہ الفاظ آپ نے بھی تین مرتبہ فرمائے اُس کا اثر یہ ہوا کہ وہ بالکل اچھا

ہوگیا۔ خان صاحب نے اپنے اُستاذ سے نقل کیا کہ تصور دوطرح کا ہوتا ہے، ایک تو وہ جواز خود ہو دوسرا وہ جو تصور کرنے سے ہو، سید صاحب جو تصور شیخ کو منع فرماتے تھے وہ وہ تصور تھا جو قصداً اور بتکلف کیا جائے اور جو تصور از خود ہو اس کو منع نہیں فرماتے تھے، اس پر حضرت حکیم الامت تحریر فرماتے ہیں قولہ جس طرف آنکھ اُٹھا کر الخ اقول یہ تصرف اس کے رنج مفارقت کے تدارک کے لیے کیا گیا ہو کہ اس طرح آجانے سے تسلی رہے گی اور اچھا ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ نظر بند ہوگیا ہو، بلکہ اس میں تقلیل وتعدیل ہوگئی ہو۔

قولہ وہ تصور تھا جو قصداً اور بتکلف الخ اقول اس سے بھی وہ درجہ مراد ہے جس سے مقصودیت کی شان ہو، جیسے بطور شغل مستقل کے کرتے ہیں، جس میں قلب سے غیر کی نفی کا اہتمام کرتے ہیں کہ اس میں مشابہت شرک کی ہے، ورنہ اگر محبت میں قصداً بھی تصور کرے تو کچھ حرج نہیں اور جن بزرگوں سے اجازت منقول ہے وہ بقدر ضرورت ہے کہ خطرات دفع نہ ہو تو کسی شاہد چیز کے تصور سے حسب قاعدہ ''النفس لا تتوجه إلى شيئين في آن واحد'' ہو جاتے ہیں اور اس میں صورت شیخ وصورت دیگر اشیاء سب مساوی ہیں، مگر شیخ سے چونکہ طبعاً محبت زائد ہوتی ہے اس کی طرف توجہ اقوی ہونے سے دفعہ سہل تر ہوتا ہے، مگر بعد دفع خطرات کے پھر اس کو زائل کر دیتے ہیں اور عین تصور کے وقت بھی اس کا اہتمام نہیں کرتے کہ دوسرا کوئی تصور آنے نہ پائے، گو اس سے زیادہ محمود یا مقصود ہو۔ فقط (ارواحِ ثلاثہ: ص ۱۳۴)

عزلت نشینی میں ہمارے اکابر کا طرز عمل

اس شعر کے متعلق میں نے اکابر سے حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک قصہ بھی سن رکھا ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایک مولوی صاحب نے جو حضرت کے یہاں پڑھتے تھے اس شعر کا مطلب بھی پوچھا اور شرعی اشکال بھی کیا، حضرت قدس سرہٗ نے اس کو دس روپے دیئے اور فرمایا کہ فلانی سرائے میں چلے جاؤ اور خواجہ سرائے سے معلوم کرلو کوئی لڑکی خالی ہے یا نہیں۔

اول تو مولوی صاحب بہت سوچ میں پڑے مگر چونکہ خود ہی استفسار کیا تھا اس لیے تعمیل حکم میں گئے، خواجہ سرا نے کہا کہ ایک بہت حسین لڑکی ابھی آئی ہے، فلانی کوٹھری میں ہے، اس سے بات کر کے آتا ہوں وہ گیا اور اس سے کہا کہ اس کو راضی کر کے کہہ دیا کہ رات کو آجائیں، یہ رات کو پہنچے تو نہایت سر جھکائے بیٹھی رو رہی تھی، یہ بہت حیرت میں پڑ گئے، انہوں نے بہت زیادہ اصرار سے کہا کہ میں نے کوئی جبر نہیں کیا، کوئی زبردستی نہیں کی، مگر وہ ہچکیاں مار کر رونے

لگی، یہ مولوی صاحب مصیبت میں پھنس گئے۔

ایک گھنٹہ کے بعد اس عورت نے بتایا کہ میں ستم رسیدہ ہوں، مظلومہ ہوں کئی دن کا فاقہ ہے، پاؤں پھر رہی ہوں، میرا خاوند مجھے چھوڑ کر چلا گیا، ان کا کہیں پتہ نہیں چلا، دو تین ماہ سے ان کو تلاش کرتی پھر رہی ہوں، معلوم ہوا کہ اس کے خاوند یہی مولوی صاحب تھے، جو طلب علم کے شوق میں گھر سے بھاگ آئے تھے، کسی کو پتہ نہیں تھا، اس نے منہ کھولا ایک نے دوسرے کو پہچانا۔

رات بھر مولوی صاحب نے وہاں قیام کیا صبح کو حضرت کی خدمت میں آکر عرض کیا حضرت شعر بالکل سچ ہے اس نوع کے اور بھی میرے اپنے اکابر سے قصے سنے ہوئے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ واقعی پیر مغاں ہو، جامع شریعت وطریقت ہو، واقف رموز اسرار الٰہی ہو، ہر مدعی بزرگی کا یہ کام نہیں، یہ وہی ہے کہ اللہ والوں کی اُلٹی بھی سیدھی ہوتی ہے۔

خان صاحب نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ جوش میں تھے اور تصور شیخ کا مسئلہ درپیش تھا، فرمایا کہ کہہ دوں؟ عرض کیا گیا فرمایئے، پھر فرمایا کہ کہہ دوں؟ عرض کیا گیا کہ فرمایئے، پھر فرمایا کہ کہہ دوں؟ عرض کیا گیا کہ فرمایئے، تو فرمایا کہ تین سال کامل حضرت امداد کا چہرہ میرے قلب میں رہا ہے اور میں نے ان سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کیا پھر اور جوش آیا، فرمایا کہہ دوں؟ عرض کیا گیا حضرت ضرور فرمایئے، فرمایا کہ اتنے (ناقل کو مقدار یاد نہیں رہی کہ خان صاحب نے کتنی بتائی تھی) سال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے قلب میں رہے اور میں نے کوئی بات بغیر آپ سے پوچھے نہیں کی، یہ کہہ کر اور جوش ہوا، فرمایا کہ اور کہہ دوں؟ عرض کیا گیا کہ فرمایئے! مگر خاموش ہو گئے، لوگوں نے اصرار کیا تو فرمایا کہ بس رہنے دو، اگلے دن بہت سے اصراروں کے بعد فرمایا کہ بھائی پھر احسان کا مرتبہ رہا، اس پر حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں، بار بار استفسار فرمانا کہ کہہ دوں امتحان واشتیاق واہلیت مخاطب کے لیے ہوگا، کیونکہ ایسے اسرار کے تحمل کا ہر شخص اہل نہیں ہے:

بر سماع راست ہر تن چیز نیست
طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

اور دوسری بار میں اس سوال کا تکرار نہ کرنا شاید اس لیے ہو کہ اب ضرورت نہیں رہی اور ایک بار سوال کرنا اس لیے کہ طلب کے بعد حصول واقع فی النفس ہے اور صورت کا حاضر رہنا اور اس سے مشورہ لینا یہ اکثر تو تخیل کی قوت سے اور کبھی بطور خرق عادت کے رُوح کا تمثل بشکل جسد ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں لزوم ودوام کے ساتھ حاضر و ناضر ہونے کے اعتقاد کی یا استعانت واستغاثہ کے عمل کی گنجائش نہیں اور اس کے بعد کے مرتبہ کی نسبت فرمایا کہ بس رہنے دو

اور اس کے بعد اصرار پر جواب میں مرتبہ احسان کا ذکر فرمانا، اگر یہ اسی مرتبہ مسکوت عنہا کی تفسیر ہے تب تو اس وقت کا نہ بتلانا شاید اسی حکمت کے لیے ہو کہ اہل ظاہر کی نظر میں یہ پہلے دو مرتبوں سے زیادہ نہیں ہے تو اس کی کچھ وقعت نہ ہوتی، بعد اصرار کے فرمانے میں حالاً اس کی تعلیم ہے کہ یہ ان سب سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ یہ مقصود اور مقام ہے اور وہ مرتبے غیر مقصود اور حال ہیں، اشتان ما بینھما اور اگر یہ اس کی تفسیر نہیں ہے تو اس کا اخفاء فرمایا، شاید افہام عامہ اس کے متحمل نہ ہوتے، شاید تجلیات ربانیہ میں سے کوئی تجلی ہو اور اس کی کیفیت بتلانے سے علمی اشکالات واقع ہوں، جیسا کہ صوفیاء کے ایسے اسرار میں اہل ظاہر کو ایسے اشکالات ہوا کرتے تھے۔

(اورح ثلاثہ: ص۲۹۰)

تجلیہ اور تخلیہ کے بارے میں حضرت تھانوی کا ملفوظ

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے حضرات خلوت عرفیہ پسند نہیں کرتے تھے، اس سے شہرت ہوتی ہے، مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی کبھی گوشہ نشینی اختیار نہیں کی، البتہ مولانا رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ پر بہ نسبت دوسرے حضرات کے قدرے اس کا غلبہ تھا (اور یہ اثر ان کے پہلے پیر کا تھا) باقی بقدر ضرورت خلوت یہ سب حضرات کا معمول تھا، چنانچہ مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی تھوڑی سی دیر حجرہ بند کر کے اس میں بیٹھتے تھے، ایک دفعہ میں نے مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کو لکھا کہ میرا جی یوں چاہتا ہے کہ سب سے علیحدہ ایک گوشہ میں بیٹھ جاؤں، مولانا نے تحریر فرمایا:

''ہمارے بزرگوں نے ایسا نہیں کیا اس سے شہرت ہوتی ہے''۔ (اورح ثلاثہ: ص۳۰۲)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کے سبق پڑھانے کے اندر آنسو کثرت سے جاری ہو جاتے تھے، ایک دفعہ ہم نے چاہا کہ مولانا سے مثنوی شروع کریں تو مہتمم صاحب (حضرت مولانا رفیع الدین صاحب) نے فرمایا کہ انہیں مدرسہ میں بیٹھنے بھی دو گے یا نہیں؟ مثنوی پڑھانے لگے تو جنگلوں کو نکل جائیں گے، آگ بھڑک اٹھے گی۔

(اورح ثلاثہ: ص۳۱۹)

ایک مرتبہ اجمیر میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ صبح کی نماز کو تشریف لا رہے تھے، راستہ میں کان میں بھڑ بھوجوں کے دھان کوٹنے کی آواز آئی، بس مولانا کو وہیں وجد ہو گیا۔

کسانیکہ یزدا پرستی کنند
بر آواز دولاب مستی کنند

حضرت امام ربانی گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کا ارشاد ہے وہ شخص جو شریعت کا تابع ہوگا اگرچہ اس کے قلب میں نور نہ ہو مگر اس شخص سے بہتر ہے جس کے قلب میں نور معلوم ہوتا ہے مگر وہ خلاف شرع ہو۔ (تذکرۃ الرشید:ص۳۳۴؍ج۲)

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ سائیں توکل شاہ صاحب مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ دیوبند سے فرماتے تھے کہ مولوی جی جب ذکر اللہ کرتا ہوں تو اللہ کی قسم منہ میٹھا ہو جاوے ہے، سچ مچ میٹھا ہو جاوے ہے، جیسے مٹھائی کھا کر، پھر فرمایا:

اللہ اللہ ایں شیریں است نام
شیر و شکر می شود جانم تمام

(اصل کتاب میں یہی لفظ ہے اور مجھے تن من تمام یاد ہے، (ناقل روایت لکھتے ہیں) ہمارے حضرت کے خادموں میں سے بھی ایک صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ ذکر کے وقت میرا منہ میٹھا ہو جاتا ہے، حضرت نے تحریر فرمایا کہ حلاوت معنویہ کا حلاوت حسیہ ہو جانا علامت ہے سرایت الذکر فی الذاکر کی، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے ''اللّٰھم اجعل فی قلبی نورا وفی لسانی نورا وفی لحمی نورا وفی دمی نورا'' ۔الخ (حسن العزیز:ص۱۲۸،۲۵۴؍ج۱)

ایک چیز اس ناکارہ نے اپنے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے ذکر میں بہت کثرت سے محسوس کی، یہ تو میں پہلے بھی لکھوا چکا ہوں کہ مرض الوفات تک ان کا معمول ذکر بالجہر کا نہیں چھوٹا تمام سال تہجد کے بعد کیا کرتے تھے اور ماہ مبارک میں عصر سے مغرب تک ذکر کرتے، اس وقت ان کے ذکر میں بہت کثرت سے ایسی رطوبت محسوس ہوتی تھی کہ جو سننے والوں کو بھی بہت صاف محسوس ہوتی تھی، اس منظر کو دیکھ کر مجھے اکثر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشاد کی حقیقت ذہن میں آیا کرتی تھی، مشکوٰۃ شریف ص۱۹۰ میں بروایت عبد اللہ بن بُسر سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پاک نقل کی گئی ''ان رجلا قال یا رسول اللّٰہ !إن شرائع الاسلام قد کثرت علی فاخبرنی بشیء أتشبث بہ قال، لا یزال لسانک رطبا من ذکر اللّٰہ''۔
(مشکوٰۃ شریف:ص۱۹۰)

عبد اللہ بن بُسر نے نقل کیا کہ ایک صاحب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ !شریعت کے احکام تو بہت کثرت سے ہیں، مجھے تو کوئی ایسی چیز بتا دیجئے جس کو میں مضبوط پکڑ لوں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تیری زبان ہمیشہ اللہ کے پاک ذکر سے تر رہے''۔

مشکوٰۃ شریف کی ہی دوسری حدیث میں جو انہی صحابی سے نقل ہے ''قال جاء اعرابی إلی

النبي قال یا رسول الله !أی الأعمال أفضل، قال أن تفارق الدنیا ولسانک رطب من ذکر الله۔

ایک صاحب نے عرض کیا یا رسول اللہ! بہترین عمل کیا ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو دنیا سے ایسی حالت میں رخصت ہو کہ تیری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے''۔

(مشکوۃ شریف: ص۱۹۰)

یہ چیز جب حاصل ہوتی ہے جب اللہ کا پاک ذکر ذوق وشوق سے کیا جائے کہ اس سے لذت محسوس ہونے لگتی ہے، پھر زبان پر اس سے تراوٹ بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک دوست بہت ڈرتے ڈرتے کہتے تھے کہ مجھے یہ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کبھی اللہ میاں اس پر خفا نہ ہوں کہ تو اتنا متقی کیوں تھا، پھر فرمایا کہ حال بھی عجیب چیز ہے بعض وقت رخصت سے گزر کر عزیمت پر عمل کرنے سے دعویٰ کی صورت ہو جاتی ہے، اس سے ڈرنا عجب رستہ ہے، بعض دفعہ جب اس رستہ میں غلطی ہوتی ہے، تو کفر سے اِدھر نہیں رُکتا، بہت ہی نازک طریق ہے، اس لیے بہت مبصر شیخ کامل کی ضرورت ہے اور اس شیخ کو بھی خود تنبیہ علی الاغلاط کی ضرورت ہے، اگر کوئی زندہ بزرگ متنبہ کرنے والا نہ ہو تو خود اللہ تربیت فرماتے ہیں اور جس شخص کو وسائط میسر ہوں وہاں عادت اللہ یہ ہے کہ وسائط سے تربیت فرماتے ہیں، ہاں جب خود مستقل ہو جائے تو اس کی حق تعالیٰ خود تربیت فرمانے لگتے ہیں۔

(حسن العزیز: ص۱۲۹، ۲۵۵/ج۱)

''البدائع'' صفحہ ۲۳۰ میں حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے مشائخ چشتیہ نقشبندیہ کے درمیان میں تربیت کے فرق کی بہت تفصیل تحریر فرمائی ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں، مشائخ کا طریق یہ ہے کہ وہ وصل کی تدبیر پہلے کرتے ہیں، پھر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ غیر اللہ سے تعلق قطع ہوتا جاتا ہے اور دوسرے فصل کو مقدم کرتے ہیں پھر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جتنا غیر سے تعلق قطع ہوتا ہے اتنا ہی خدا تعالیٰ سے بڑھتا ہے کیونکہ وہ ہی تعلق ہیں، ان میں اگر ایک بڑھے گا، دوسرا گھٹے گا اور ایک گھٹے گا تو دوسرا بڑھے گا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے اطباء میں اختلاف ہے کہ مریض کو صحت وقوت کی طرف لانا ہو تو اول صحت یعنی ازالہ امراض کی تدبیر کرنا چاہیے یا قوت کی، اطباء یونانی صحت یعنی ازالہ امراض کی تدبیر مقدم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ازالہ مرض وصحت کے بعد قوت خود بخود آنے لگتی ہے اور ڈاکٹر تقویت طبع کی تدبیر مقدم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب طبیعت میں قوت ہو جائے گی تو مرض خود ہی جاتا رہتا ہے۔

یہی اختلاف اطباء روحانی میں ہے کہ بعض ازالہ مرض کا اہتمام اول کرتے ہیں، یہ فصل ہے اور بعض تقویت کی تدبیر پہلے کرتے ہیں، یہ وصل ہے اور ان دونوں میں سے کسی ایک طریق کو کسی ایک خاندان کی طرف منسوب کرنا مناسب نہیں، کیونکہ ہر شیخ مجتہد ہوتا ہے وہ کسی کی تقلید نہیں کرتا، اگر ایک شیخ چشتی ہو اور کسی وقت اس کے اجتہاد میں مذاق چشتیہ سے نقشبندیہ کا مذاق راجح ہو تو وہ نقشبندی مذاق کو اختیار کرے گا اور اگر شیخ نقشبندی ہو اور اس کے مزاق میں چشتیہ کا مذاق راجح ہو تو وہ اسی کا مذاق اختیار کرے گا، فروع میں ہر شیخ مجتہد ہوتا ہے، کوئی بھی کسی خاص طریقہ کا پابند نہیں ہوتا، مگر اصول میں اکثر اپنے سلسلہ کا متبع ہوتا ہے، اس لیے اصولاً نقشبندیہ کی طرف تقدیم وصل منسوب ہے اور چشتیہ کی طرف تقدیم فصل منسوب ہے اور گو دونوں خاندانوں کے مشائخ ہر وقت اس کے پابند نہیں ہوتے، بلکہ طالب کے مناسب جو طریق ہوتا ہے اسی کو اختیار کرتے ہیں، لیکن نقشبندیہ پر اکثر تقدیم وصل کا رنگ غالب ہے اور چشتیہ پر تقدیم فصل کا رنگ، چنانچہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ ایک طالب علم کی مناسبت کا اسی اصل سے امتحان فرمایا تھا۔

وہ واقعہ اس طرح ہوا تھا کہ مولانا منیر احمد صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ میں بیعت ہونا چاہتا ہوں مگر متردد ہوں کہ سلسلہ چشتیہ میں بیعت ہوں یا نقشبندیہ میں تو آپ بتلا دیجئے کہ میرے لیے زیادہ کیا مناسب ہے، حضرت نے فرمایا کہ اچھا یہ بتلاؤ ایک شخص ایسی زمین پر تخم پاشی کرنا چاہتا ہے جس میں جھاڑ جھنکار بہت کھڑے ہیں تو اسے کیا کرنا چاہیے، آیا اول زمین کو جھاڑو سے صاف کرے، پھر تخم ریزی کرے یا پہلے تخم ریزی کر دے پھر جھاڑ و کو صاف کرتا رہے۔

مولوی منیر احمد صاحب نے فرمایا کہ حضرت میرے نزدیک تو مناسب یہ ہے کہ اول تخم ریزی کر دے تا کہ کچھ تو ثمرہ حاصل ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ جھاڑو کی صفائی میں موت آ جائے، پھر یہ خالی ہاتھ ہی جائے، حضرت نے ہنس کر فرمایا کہ تم نقشبندیہ میں جاؤ۔

شرح اس کی یہ ہے کہ نقشبندیہ کا مذاق یہ ہے کہ وہ پہلے ہی دن ذکر کی تلقین کر کے تخم ریزی شروع کر دیتے ہیں اور چشتیہ اول ازالہ رذائل کا کام شروع کر کے ناک چنے چبواتے ہیں، مگر چبواتے نہیں، بلکہ چبواتے تھے، کیونکہ اب تو وہ طالب علموں کی ضعف ہمت کی وجہ سے نقشبندیہ کے طریق پر عمل کرنے لگے، ورنہ پہلے یہ حالت تھی کہ حضرت شیخ ابو سعید گنگوہی جب طلب طریق کے لیے سلطان نظام الدین بلخی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں پا پیادہ گنگوہ سے بلخ پہنچے اور حضرت شیخ کو اطلاع ہوئی تو اول تو بڑی خاطر کی، شہر سے باہر تک استقبال کو تشریف لائے اور ساتھ میں سلطان بلخ بھی تھا، کیونکہ وہ شیخ کا معتقد تھا۔

غرض مرشدزادہ کا بڑی شان سے استقبال کیا اور شہر میں لے جا کر خوب خدمت کی اور کئی روز تک بادشاہ اور وزراء وامراء کے یہاں ان کی دعوتیں ہوتی رہیں، جب کئی دن ہوگئے تو شاہ ابوسعید صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میں گنگوہ سے بلخ تک پیادہ چل کر دعوتوں کے لیے نہیں آیا، فرمایا صاحبزادے، پھر جو خاص مطلب ہو وہ بیان فرمایئے، کہا میں وہ دولت لینے آیا ہوں جو آپ میرے گھر سے لائے ہے، بس یہ سنتے ہی شیخ کا یہ رنگ بدل گیا اور بزبان حال فرمایا:

ناز پروردہ تنعم نہ برد راہ بدوست
عاشقی شیوہ رنداں بلاکش باشد

''ناز ونعمت سے پلا ہوا مقصود تک نہیں پہنچا کرتا، عاشقی تو جفاکش رندوں کا طریقہ ہے''۔

فرمایا صاحبزادے! اگر وہ دولت لینا چاہتے ہو تو پھر یہ شان وشوکت رخصت کرو اور آج سے حمام کی خدمت تمہارے سپرد ہے، جا کر حمام جھونکو (یہاں حضرت شاہ ابوسعید صاحب کا قصہ بہت مختصر نقل کیا ہے اور یہ قصہ آپ بیتی میں کئی جگہ گزر چکا ہے، اس لیے اس کو چھوڑ کر آگے لکھواتا ہوں) چنانچہ اس ریاضت شاقہ کے بعد اب شاہ ابوسعید کو اتنی اجازت ملی کہ شیخ کی مجلس میں آجایا کریں اور باتیں سنا کریں پھر کچھ عرصہ بعد ذکر تعلیم کیا گیا، گویا اب وصل کی تدبیر شروع ہوئی، ذکر شروع کرنے کے بعد کچھ حالات اور کیفیات طاری ہوئیں تو شیخ کو معلوم ہوا کہ ابوسعید میں عُجب پیدا ہوگیا ہے تو فوراً سب ذکر وشغل چھڑا دیا اور کتوں کی خدمت سپرد کی (اس کی تفصیل بھی پہلے گزر چکی ہے)۔

جب وہ کتوں کے ساتھ گھسٹ رہے تھے اسی حالت میں ان پر غیبی فضل ہوا کہ ایک تجلی خاص ان کے اوپر ہوئی، جس کی لذت نے تمام تکلیف کو بھلا دیا، اِدھر حضرت شیخ کو یہ حالت منکشف ہوئی اور انہوں نے خدام سے فرمایا کہ اس وقت ابوسعید پر فضل ہوگیا اور ایک خاص تجلی سے حق تعالیٰ نے ان کو مشرف فرمایا، جاؤ جنگل سے ان کو اُٹھا لاؤ، خدام تو ادھر دوڑے اور ادھر سلطان نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ پر شیخ الشیوخ حضرت شاہ عبدالقدوس قدس سرہٗ کی روحانیت منکشف ہوئی اور فرمایا:

''نظام الدین! تم کو اس سے زیادہ مشقت لینے کا بھی حق تھا، مگر ہم نے تو تم سے اتنی مشقت نہ لی تھی، یہ ایک محبت آمیز عتاب تھا، جس سے سلطان نظام الدین کے دل پر بڑا اثر ہوا، چنانچہ اب جو شاہ ابوسعید سامنے آئے ہیں تو سلطان جی نے ان کو محبت سے سینہ لگایا اور پھر ذکر وشغل میں لگا دیا اور خاطر ومدارات ہونے لگی''۔

شاہ ابوسعید کو اس تجلی کا بہت اشتیاق تھا کہ وہی تجلی پھر ہو، روزانہ ذکر کرتے وقت اس کے مشتاق

رہتے تھے، جب کئی روز تک نہ ہوئی تو ایک دن حبسِ دم کر کے بیٹھ گیا اور پختہ ارادہ کر لیا کہ جب تک وہ تجلی نہ ہوگی سانس نہ چھوڑوں گا، چاہے دم نکل جائے، کیونکہ ایسی زندگی سے مرجانا ہی اچھا ہے، اس طریق میں بھی کیا کیا حالتیں پیش آتی ہیں، جس پر گزرتی ہیں وہی جانتا ہے، چنانچہ کئی گھنٹے تک سانس روکے بیٹھے رہے، بالآخر وہ تجلی پھر ہوئی اور اس کی مسرت میں سانس اس زور سے چھوٹا کہ پسلی پر ضرب پہنچی اور ٹوٹ گئی اسی وقت غیب سے ایک ہاتھ نمودار ہوا جس میں چمچہ کے اندر کوئی دوا تھی وہ ان کے منہ میں لگا دی گئی، اس کے کھاتے ہی پسلی فوراً جڑ گئی وہی حالت ہوگئی کہ:

در دم نہفتہ بہ ز طبیبان مدعی
باشد کہ از خزانہ غیبش دوا کنند

''میرا درد مدعی طبیبوں سے پوشیدہ رہے یہی اچھا ہے، ہوسکتا ہے کہ غیبی طور پر میرا علاج کر دیں'' اور اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ چوزے کا شوربا چند روز تک پینا، انہوں نے حالت فرو ہونے کے بعد شیخ سے یہ قصہ عرض کیا، شیخ نے فوراً چوزوں کا انتظام کر دیا اور کئی روز تک چوزے کھلائے گئے، اب حق تعالیٰ کی طرف سے خود حکم ہوتا ہے کہ عمدہ عمدہ غذائیں کھاؤ اور پہلے وہ مشقت تھی کہ حمام جھونکو جو کی روٹی کھاؤ، اس کے بعد خلافت عطاء ہوئی اور یہ شیخ کامل بن کر گنگوہ آئے۔

تو صاحب! پہلے تو چشتیوں کے یہاں یہ مصیبت تھی، ان کے یہاں پہلے فصل مقدم تھا اور نقشبندیہ کے یہاں وصل مقدم تھا، مگر اب تو چشتی بھی نقشبندی ہوگئے، کیا کریں طالبوں کی ہمتیں اب ویسی نہیں رہیں چونکہ اب ہمتوں میں ضعف ہے اور شیوخ مجتہد ہوتے ہیں، اس لئے مجتہدین طریق نے اب یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وصل وفصل دونوں کو ساتھ ساتھ لے چلتے ہیں، اب چشتیہ نے تقدیم فصل کو ترک کر دیا ہے، کیونکہ یہ صورت اس وقت کے مناسب نہیں اور طبیب مجتہد ایک بات کا پابند نہیں ہوا کرتا، بلکہ مناسب کو اختیار کرتا ہے، سو آج کل یہی صورت مناسب ہے کہ دونوں ساتھ ساتھ ہوں اور جو شیخ مجتہد نہ ہو وہ شیخ بنانے کے قابل نہیں اور یہ فیصلہ معیت ویسا ہی ہے، جیسے درس ظاہر میں مدرسین کی رائے پہلے مختلف تھیں، بعض معقول کی تقدیم کرتے تھے، بعض منقول کی اور ہر ایک کے پاس اپنی رائے کی ترجیح کے دلائل تھے، مگر اب محققین نے فیصلہ کر دیا ہے کہ دونوں کو ساتھ ساتھ رکھنا چاہیے، اسی باطن میں محققین نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وصل وفصل دونوں کو دوش بدوش لے چلو۔

مگر آج کل ایک نئی بدعت ایجاد ہوئی ہے کہ بعض نے محض وصل کو ہی لے لیا اور فصل سے بالکل ہاتھ روک لیا ہے، نہ اس کو مقدم رکھا نہ موخر، نہ ساتھ ساتھ ہی رکھتے ہیں، چنانچہ بعض اہل غلو جن پر

جوگیہ کا مذاق غالب ہے وہ تو وصل یعنی اعمال کو چھوڑ بیٹھے اور بڑا اہتمام جنگل میں رہنے اور لذت کے ترک کرنے لگے، یہ تو اہل باطل کا طریق ہے اور اہل حق میں سے اکثر مشائخ محض تعلیم ذکر پر اکتفا کرنے لگے، تزکیہ رذائل کا اہتمام مطلق نہیں کرتے، نہ مرید کے اعمال واخلاق پر روک ٹوک کرتے ہیں، نہ تعلقات بڑھانے پر اسے زجر کرتے ہیں اور جو ایسا کرے وہ بدنام ہے۔

مگر میں نصوص سے بتلا چکا اور صوفیاء کا اس پر اتفاق ہے کہ بدون وصل وفصل دونوں طریق طے نہیں ہو سکتا اس کا تو یہ اختیار ہے کہ تقدیم وتاخیر کسی کی کردی جائے مگر ایک سے بالکل ہاتھ روک لینا یہ طریق کے بالکل خلاف ہے اور جب تقدیم وتاخیر کا آج کل خلاف مصلحت ہونا اور معیت ہی کا مناسب ہونا اُوپر معلوم ہو چکا تو دونوں کام ساتھ ساتھ ہونے چاہئیں کہ سالک کو ذکر وشغل کی تعلیم کے ساتھ اصلاح رذائل کا بھی امر کیا جائے اور ہر رذیلہ کی اصلاح کا علاج بتلایا جائے گا، گو زیادہ ضروری یہی علاج ہے رذائل کا مگر ذکر کے ساتھ رذائل کا علاج بہت سہل ہو جاتا ہے اس لیے ذکر میں بھی لگانا ضروری ہے، کیونکہ ذکر سے خود بھی ان بہیمی وسبعی قوت میں کسی قدر ضعف ہو جاتا ہے، اب اگر تھوڑی سی توجہ سے کام لیا جائے تو اس طرح جمع کرنے سے وصل کے ساتھ فصل بھی کامل ہو جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ وصل وفصل دونوں کا اہتمام کرو، خدا سے تعلق بڑھاؤ اور غیر سے تعلق کم کرو اور اس کا طریقہ کسی محقق سے پوچھو اور اگر شیخ میسر نہ ہو تو محققین کی کتابوں کا مطالعہ کر کے کام شروع کرو، ان شاء اللہ ناکامی نہ ہوگی اور اگر مشائخ محققین موجود ہوں تو ان سے مل کر طریق معلوم کرو، اگر ملنا نہ ہو سکے تو خط وکتابت سے مراجعت کرو اور عمل کا اہتمام کرو، کیونکہ بدون عمل کے باتیں یاد کر لینا اور تصوف کے مسائل رٹ لینا محض بے کار ہے۔　　　　(البدائع: ص ۲۳۰)

حضرت مدنی کی سفارش مولوی عبدالماجد وعبدالباری کے بارے اور حضرت تھانوی کا جواب

حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ میرے پاس مولوی حسین احمد صاحب آئے تھے، مولوی عبدالماجد صاحب اور مولوی عبدالجبار صاحب کے لیے مجھ سے سفارش کی کہ آپ انہیں بیعت کرلیں، انہیں بہت اشتیاق ہے، میں نے کہا کہ آپ ہی کرلیں، انہوں نے کہا میں تو اس لائق نہیں میں نے کہا کہ یہ تو میں بھی کہہ سکتا ہوں لیکن سچی بات یہ ہے کہ جنید اور شبلی نہ تو میں ہوں نہ آپ، لیکن انہیں

جنید وشبلی کی ضرورت نہیں ان کی خدمت کے لائق میں بھی ہوں اور آپ بھی، جیسے یہ طالب ہیں اسی درجہ کے ان کے شیخ کا ہونا بھی کافی ہے۔

اب جس طرح اساتذہ حدیث میں بخاری و مسلم نہیں اسی طرح مشائخ تصوف میں جنید وشبلی نہیں ہیں، مگر پھر بھی موجودہ اساتذہ ومشائخ ہی سے بقدر ضرورت کام چل رہا ہے، اگر تصوف میں جنید وشبلی کی ہی ضرورت سمجھی جائے تو پھر حدیث میں بھی بخاری و مسلم ہی کی ضرورت سمجھی جائے، جس کے معنی یہ ہوں گے کہ آج کل کوئی علم ہی حاصل نہ کیا جائے، اس لیے اگر آپ اور میں یہ کہیں کہ ہم جنید وشبلی نہیں تو آپ بھی سچے اور میں بھی سچا اور اگر میں کہوں گا یا آپ کہیں گے کہ ہم لوگ ان کی بھی خدمت کے لائق نہیں، تو میں بھی جھوٹ بولتا ہوں اور آپ بھی جھوٹ بولتے ہیں۔

سچ یہ ہے کہ کامل نہ تو میں ہوں نہ تو آپ، لیکن ان کی خدمت کے لیے میں بھی کافی ہوں اور آپ بھی آپ تو تواضع فرما رہے ہیں، لیکن اللہ نے مجھے کبر سے محفوظ رکھا ہے عرفی تواضع سے بھی محفوظ رکھا ہے ایسی تواضع میں طالبین کا ضرر ہے، اگر ہر مالدار یہی کہے کہ میں مفلس ہوں تو جو حاجت مند ہیں وہ کہاں جائیں اور کس کے سامنے اپنی حاجت پیش کریں، یہ نہیں چاہیے، بلکہ اگر کوئی اپنی ضرورت سے زائد مال رکھتا ہو اور اس کے پاس کوئی حاجت مند آئے تو بجائے اس کے کہ یوں کہے کہ میں مفلس ہوں یہ کہے کہ میں گو قارون کے برابر تو نہیں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ تیری خدمت کے لائق میرے پاس مال موجود ہے۔

خود حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مالدار آدمی کو میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ یہ کیا ہیئت بنا رکھی ہے؟ اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں کہ اپنے بندوں پر اپنی نعمت کا اثر دیکھیں، جب خدا نے پہنے، کھانے کو دیا ہے تو پہنو، کھاؤ، اس میں یہ مصلحت بھی ہے کہ حاجت مندوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ موقعے ہیں حاجت پیش کرنے کے نہیں تو ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ کس کے سامنے اپنی حاجت پیش کریں، غرض میں نے کہا کہ ان کی خدمت کے لائق تو میں بھی ہوں اور آپ بھی، لیکن اس طریق میں شرطِ نفع مناسبت ہے اور مناسبت ان کو جیسی آپ سے ہے مجھ سے نہیں کیونکہ آپ بھی خادم قوم ہیں یہ بھی خادم قوم ہیں اور میں ہوں نادم قوم، غرض میں نے دونوں کو ٹال دیا، بعض لوگ مجھ پر اعتراض کرتے ہیں کہ پہلے تمہارے اکابر میں اتنا تشدد نہ تھا میں اس کا یہ جواب دیتا ہوں کہ پہلے اصاغر میں اتنی خود رائی بھی نہ تھی، اس پر مامون الرشید کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔

سب جانتے ہیں کہ مامون الرشید کی سلطنت کوئی معمولی سلطنت نہ تھی، بڑی آب وتاب اور شان وشوکت کی سلطنت تھی، مگر اس کے ساتھ ہی وہ بڑا حلیم اور خوش اخلاق بادشاہ تھا، یہاں تک

کہ اس کی خوش اخلاقی اور حلم کی وجہ سے اس کے غلام تک اس کے ساتھ گستاخی کا برتاؤ کرتے تھے، لیکن اس کو غصہ نہیں آتا تھا، اس لیے لوگ عموماً دلیر ہو گئے تھے، کسی نے ان سے کہا کہ آپ نائب ہیں خلفاء راشدین کے، کیونکہ وہی سلسلہ ہے سلطنت کا جواب تک چلا آ رہا ہے، ان حضرات کے یہاں نہ یہ حشم وخدم تھے، نہ یہ ساز وسامان نہ نقارچی نہ نقیب، غرض بالکل سادگی تھی۔

مامون الرشید نے اپنے افعال کی تاویل نہیں کی بلکہ ایک عجیب جواب دیا کہا کہ تم نے حضرات خلفاء راشدین کے زمانے کے خواص کو تو دیکھا، مگر یہ نہ دیکھا کہ اس زمانہ کے عوام بھی ایسے تھے جیسے ابو ہریرہ، مقداد، انس رضوان اللہ علیہم اجمعین اور فلاں فلاں لوگ، اس زمانہ کے عوام جیسے ہو جاؤ تو میں بھی حضرات خلفاء جیسا ہو جاؤں گا اور اگر عوام تو ہوں متکبر جیسے ہامان اور فرعون اور میں بن جاؤں معمولی، تو تم لوگ تو مجھے چار ہی دن میں پاگل سمجھ کر نکال باہر کرو گے، اب تو برابر کا معاملہ ہے کہ جیسی رعیت ویسا بادشاہ، واقعی خوب جواب دیا یہ مامون الرشید بہت حلیم تھے۔

(افاضات:۹/۲ص ۲۳۲)

سلب نسبت کی تشریح

(۱۳)......حضرت تھانوی نے ارشاد فرمایا کہ ایک کام کی بات یاد آئی، یہ جو مشہور ہے کہ فلاں بزرگ نے فلاں بزرگ کی نسبت سلب کر لی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نسبت قرب الٰہی کا نام ہے اس کو کوئی سلب نہیں کر سکتا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک چیز حق تعالیٰ بندے کو عطاء فرمائیں اور دوسرا کون ہے جو اس سے سلب کر لے، حقیقت اس کی صرف یہ ہے کہ کسی تصرف کسی کیفیت نفسانیہ کو مضمحل کر دے جس سے نشاط کی جگہ غباوت ہو جائے مگر وہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے، لیکن اگر مقاومت نہ کی پھر اخلال عمل کے سبب اس کا اثر نسبت تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ (افاضات: ص ۶۱/ج ۱)

(۱۴)......حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے نقل کیا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ایک مجلس میں حضرت جنید رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ہوں اور حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ہوں تو ہم حضرت جنید کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔

(افاضات:۱/۷ص ۱۷۲)

دیر و حرم میں روشنی شمس و قمر سے ہو تو کیا
مجھ کو تم پسند ہو اپنی نظر کو کیا کروں

حضرت حاجی صاحب کا ایک مکتوب گرامی بنام

حضرت مولانا یعقوب صاحب

حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک مکتوب تصوف کے بارے میں نہایت قیمتی نظر سے گزرا اس کو بعینہ نقل کراتا ہوں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد حمد صلوٰۃ بخدمت بابرکت سعید دارین مقبول کونین مولوی محمد یعقوب صاحب زاد اللہ شوقہ و ذوقہ، وعرفانہ بعد از اداء مراسم، سلام مسنون! واشتیاق کثیر بہت:

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل
می گویمت دعاء ثنائی فریست

واضح رائے آں عزیز کے ہو کہ بندہ جس حال میں کہ حق تعالیٰ رکھے خوش وخرم ہے۔ شعر:

تا خوش او خوش بو دور جان من
جاں فدائے یار دل انجان من

نامہ محبت شامہ پہنچا، جس سے آتش اشتیاق اور تیز ہوگئی، حقیقت عزیز باتمیز کا اس کم نصیب کی نسبت ایسی ہی خوش اعتقادی ہے جیسے کہ حوالہ قلم کیا ہے، اگرچہ یہ کم نصیب روسیاہ اس قابل نہیں ہے، مگر کثیر طالبین خدا اسی حسنِ ظن کی وجہ سے ایسے مرتبے پر فائز ہوگئے کہ مرشد بھی اس مقام تک نہیں پہنچے۔

جب نہیں کہ آں عزیز بھی اپنی حسن عقیدت سے مقصود پر پہنچ جائیں، اس سے پہلے چاہتا تھا کہ چند احباب ہم مذاق جمع ہو کر سلوک کے حال وقال کا مذاکرہ کریں کہ رفتہ رفتہ یہ قیل وقال حال سے بدل جائے اور مقصود پر پہنچے:

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کین دولت از گفتار خیزد

مگر کیا کیا جائے کہ بندہ مجبور ہے بجز تہمت اختیار کے کچھ نہیں ہے۔

ماہمہ شیراں دلے شیر علم
حملہ شاں از باد باشد دم بدم

حق تعالیٰ جو چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں اور جو ارادہ کرتے ہیں وہی حکم کرتے ہیں بندہ پریشان

ہے کہ کیا کرے، روتا رہتا ہے اور کہتا ہے۔

اے رفیقاں راہ ہارا بستہ مار
آ ہوئے لن گیم او شیر شکار
جز کہ تسلیم و رضا چہ چارہ تر
درکف شیر نر خونخوار

اے عزیز تاہم طالب صادق کو چاہیے کہ اپنے مطلوب کی طلب میں مردانہ وار سرگرم و پرجوش رہے، ایک دم آرام نہ لے بقول عاشق۔

یا بم اور ایا نیا بم جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم
راز ہائے دل بیاں سازم بہ پیش یار خود
بشنو دیا نشنو من گفتگوئے می کنم

اگر ایسا ہوتا رہے تو اس کے عام کرم سے امید قوی ہے کہ اپنے طالب کو محروم نہ چھوڑے گا۔

سایہ حق بر سر بندہ بود
عاقبت جویندہ پائندہ بود
گفت پیغمبر کہ چوں کوبی درے
عاقبت زاں در بیروں آید سرے
چوں نشینی بر سرے کوئے سرے
عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

”لا تقنطوا من رحمة الله إن الله يغفر الذنوب جميعا إنه هو الغفور الرحيم“

عزیز مولوی خورشید حسن (مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ) کہ خورشید حقیقی ہیں، بندہ کی طرف سے اس طرح اجازت بیعت و تعلیم کی ہے، جس طرح بندہ کو اپنے بزرگوں سے ہے، جو چاہے ان سے بیعت کر کے استفادہ کرے نیز ایک خط ان کے نام آپ کی درخواست کے موافق اخذ بیعت کے لکھا گیا ہے ان شاء اللہ پہنچے گا، صاحب موصوف انکار نہ کریں گے، اکرم الاکرمین سے امید قوی ہے کہ بہت فیضان ہوگا، عاقبت بخیر باد۔

(مکتوبات امدادیہ نمبر۴: ص۲۹۹)

خط طویل ہے، اصل مکتوب شریف فارسی میں تھا اور اس کا ترجمہ بھی ساتھ تھا، اس لیے اس

ناکارہ نے ترجمہ پر ہی اکتفاء کیا کہ فارسی سمجھنے والا اب کون ہے۔

(۱۶)......اصل مقصود میرا اس مکتوب گرامی سے وہی مضمون تھا کہ شیخ کے ساتھ حسنِ ظن اس طریق میں بہت مجرب اور موجب ترقی ہے، حضرت سید الطائفہ کا ارشاد ہے کہ حقیقۃً عزیز باتمیز کو اس کم نصیب کی نسبت ایسی خوش اعتقادی ہے جیسے کہ حوالہ قلم کیا ہے، اگر چہ یہ کم نصیب روسیاہ اس قابل نہیں مگر کثیر طالبین خدا اسی حسن ظن کی وجہ سے ایسے مرتبے پر فائز ہو گئے کہ مرشد بھی اس مقام تک نہیں پہنچے۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ایک طویل مکتوب جو مستقل بھی طبع ہو چکا ہے، نواب صاحب چھتاری کے نام آیا تھا جب کہ انہوں نے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ مستقل قیام کا ارادہ فرمایا تھا، اس میں ارشاد ہے کہ قیام کے لیے ریاست سے اپنے اخراجات کے لیے روپیہ منگانا تجویز کریں، مگر داد و دہش کے لیے منگانے کا انتظام نہ کریں کہ یہ بھی غیر حق کی طرف مشغولی ہے جو عابد مجرد کے لیے تو زیبا ہے مگر عاشق کے لیے زیبا نہیں اور یہ شعر لکھا:

نان دادن خود سخائے صادق ست
جان دادن خود سخائے عاشقی ست

اور یہاں مکہ مکرمہ میں رہ کر مشغول بغیر حق سخت مضر ہے اور اصل بات تو یہ تھی کہ تم اپنے لیے منگانا تجویز نہ کرتے، اس لیے کہ کریم کے دروازہ پر کھانا باندھ کر لانا بہت ہی سوءِ ادب ہے، مگر چونکہ تم ابتداء سے اس کے خوگر ہو اس لیے تم اپنے لیے انتظام کر کے لاؤ، ورنہ موجب تشویش ہوگا اور تشویش بھی مضر ہے، کیا ٹھکانا ہے حضرت کی اس بصیرت کا بزرگوں کے یہاں اس کا ہمیشہ اہتمام رہا کہ مشغولی بغیر حق نہ ہو۔ (افاضات الیومیہ: ۱/۷ ص ۱۴۳)

حضرت سید الطائفہ نے جو ارشاد فرمایا، بہت ہی اہم قابلِ قدر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے، مگر اس کا لحاظ ضروری ہے کہ یہ ارشاد ان ہی لوگوں کے لیے ہے کہ جو غیر حق کے ساتھ مشغول نہ ہونے پر قادر ہوں۔

محض ان الفاظ کو دیکھ کر نااہلوں کو ان الفاظ کی اتباع میں بغیر زادِ راہ سفر ہرگز نہیں کرنا چاہیے کہ وہاں کی حاضری کے بعد بجائے حق کے ساتھ مشغولی کے مخلوق کے سامنے ہاتھ پھیلانے پڑیں، کھانے کے وقت پر کھانے والوں کے پاس جا کر بیٹھ جائیں کہ شریف آدمی بلا دے ہی گا اور ہر وقت لوگوں سے پیسے ملنے کی اُمیدیں، کوشش اور تدبیروں میں لگے رہیں، کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔

بنام حضرت مولانا قاسم نانوتوی

(۱۷)......مکتوب سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ بنام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد حمد وصلوٰۃ بخدمت بابرکت مقبول دارین مولوی محمد قاسم صاحب دام ذوقہ وشوقہ،

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اور اشتیاق ملاقات واضح رائے شریف ہو کہ نامہ عالی پہنچا، مسرور کیا مضمون سے اطلاع ہوئی، آپ جیسے مقبول الٰہی کے جو کچھ حوالہ قلم کیا ہے ایک بندہ عاجز کو اپنی نسبت ایسا ہی گمان کرنا چاہیے، اگر چہ اپنی دانست واعتقاد واعمال کو بہتر اور لائق خیال کرتے ہیں، لیکن نعوذ باللہ منہا حضرت کردگار کے دربار عالی وقار کے ساتھ ہرگز لائق وشایان نہیں ہے، لیکن بندہ گندہ ونادم کے لیے اس سے چارہ نہیں ہے کہ بُری بھلی طرح بندگی کرتا رہے، بہر صورت اسی شکستہ وخستہ حالت میں اپنی کوتاہی کے اقرار کے ساتھ درگاہ کریم کارساز پر ہمیشہ پڑا رہے اور نہ یہ خیال کرے کہ میں سبحانہ تعالیٰ کے دربار کے لائق نہیں ہوں:

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست
با کریماں کارہا دشوار نیست

از زکریا عفی عنہ حضرت حاجی صاحب ہی کا ایک شعر مضمون بالا کے مناسب یاد آ گیا۔

گرچہ میں بدکار و نالائق ہوں اے شاہ جہاں
پر تیرے در کو بتا اب چھوڑ کر جاؤں کہاں
کون ہے تیرے سوا مجھ بے نوا کے واسطے

اس کے بعد سید الطائفہ اپنے مکتوب بالا میں تحریر فرماتے ہیں، بلکہ ہمت کے ہاتھ سے رحمت کے دامن کو نہ چھوڑے اور امیدوار رہے، اگر اسی طرح کرتا رہے تو امید قوی ہے کہ ارحم الراحمین اپنے بندہ شکستہ کو نہ چھوڑے گا، کیونکہ خداوند تعالیٰ اپنے بندہ سے جز شکستگی وخستگی کچھ نہیں چاہتے، چنانچہ عارف روم کا قول ہے:

من نہ گردم پاک از تسبیح شاں
پاک ہم ایشاں شوند و درفشاں
چند ازیں الفاظ و اضمار و مجاز
سوز خواہم سوز با آں سوز ساز

غرض ان کی درگاہ بے نیاز میں بجز تضرع وزاری کے کوئی کامیابی کا طریقہ نہیں اس سے زیادہ عرض کرنا تکلف ہے کہ بفضلہ آں عزیز عالم وعاقل ہیں، الغرض کریم کارساز پر نظر کرکے اور اپنے پیروں اور پیشواؤں کا طریقہ سمجھ کر جو کچھ آپ کو بزرگوں سے پہنچا ہے اور نیز کتاب ''ارشاد الطالبین'' و ''جواہر خمسہ'' و ''رسالہ مکیہ'' کو کہ ان میں ہمارے خاندان کے اشغال ہیں لے کر جو طالب صادق آئے، اس کے مناسب حال واستعداد تعلیم میں مضائقہ نہ کریں اور آئندہ جس ہادی اور نافع رساں نے طالب کو بھیجا ہے خود وہی فائدہ وہدایت وتوفیق بخشیں گے۔

(مکتوبات ۱۰ امدادیہ: ص ۲۸۸)

حضرت سید الطائفہ نے جو کچھ تحریر فرمایا حقیقت واضح ہے کہ ہر جگہ اسی چیز کی قدر ہوتی ہے جو چیز وہاں نایاب ہو، ہندوستان میں کوئی مرچوں کا تحفہ لائے یا کابل میں انگور کا تحفہ لے جائے تو اس کی قدر نہیں ہر جگہ اسی چیز کی قدر ہوتی ہے جو وہاں نایاب ہو، عجز وافتقار احتیاج مالک کے دربار میں مفقود ہے اس لیے اس کریم آقا کے یہاں جتنی قدر اس جنس کی ہے اوروں کی نہیں ہے۔

(۱۸) ...... مکتوب سید الطائفہ بنام حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ (اور اپنے اسم گرامی کو عبد الکریم سے تعبیر فرمانا ایک خاص وقتی مصلحت سے تھا) طرف سے فقیر عبدالکریم کے عزیز القدر عالی مرتبت مولوی محمد قاسم زاد شوقہ وذوقہ باللہ تعالیٰ کو بعد سلام مسنون اشتیاق مشحون کے ملاحظہ فرمائیں، دو خط مسرت نشان عزیز القلوب کے پہنچے جو مورخہ پندرہ ۱۵ ارجب کے تھے، تیسرا خط ...... رشید احمد گنگوہی کے ہاتھ جو درد وسوز سے بھرا ہوا تھا پہنچا، طبع کو مسرور کیا، ہمیشہ ایسا ہی ''ھل من مزید'' رہے۔

عزیز من! اس راہ میں سوائے درد و نا کامیابی کا ادعاء ہستی کی صورت ہے اور ہستی سالک کے لیے بلا ہے اور نیستی بے انتہا ثمرات کا باعث، پس جب تک زندگی ہے اسی درد و نایافت میں بسر کرے اور کام میں مشغول رہے اور حسب اجازت مشائخ مخلوق کی خدمت کرے ہم اور تم وسیلہ سے زیادہ نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ ان ہی وسائط کے بہانے سے اپنے فیضان کو چھپا کر اپنے ممالک کا خود انتظام کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہمارے تمہارے ساتھ ہے۔ الخ

(امداد المشتاق: ص ۳۰۴)

بنام حکیم ضیاء الدین صاحب

(۱۹) ...... مکتوب سید الطائفہ بنام جناب حکیم ضیاء الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مناسب ہے کہ اوراد واشغال کی تعلیم میں یاران طریقت کی قصور اور سستی کو راہ نہ دیں اور کتب اخلاق اور

ملفوظات مشائخ اور مکتوبات کا مطالعہ کرتے رہیں اس واسطے کہ کلمات مشائخ مرد کو شیر بناتے ہیں اور نامرد کو مرد اور اپنے حال سے اطلاع کرتے رہیں، اسی خط میں جناب احمد حسین صاحب کے خط سے عزیزم یوسف کا الور جانا معلوم ہوا افسوس ہے کہ اس کے حال نیک میں خلل واقع ہوا، نہایت آزمائش پیش آئی اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، فقر وفاقہ مومنین کے حق میں معراج ہے، طاقت نہ رکھ کر قناعت کے گوشہ اور صبر سے باہر ہوگیا، اگر چند تکلیف برداشت کرتا اور اس پر قناعت رکھتا تو چند عرصہ میں تمام تکلیف دور ہو جاتی۔ (مکتوبات ۱۱: ص ۳۳۰)

بنام عبدالواحد خان صاحب

(۲۰)......مکتوبات سید الطائفہ بنام عبدالواحد خان صاحب......اپنے مرشد کو اپنے سے غافل نہ جانیں اور دوسری طرف مائل نہ ہوں جب تک کہ اجازت شیخ کی نہ ہو، کیونکہ ہر جائی ہمیشہ خراب ہوتا ہے اور پیروں کی نظر سے گر جاتا ہے اور ہرگز منزل مقصود پر نہیں پہنچتا، یک در گیر محکم گیر ان شاء اللہ طالب صادق محروم نہ رہے گا، خاطر جمع اس میں (اس کے بعد دو رکعت نفل اور مراقبہ کا عمل لکھنے کے بعد تحریر فرمایا کہ) اس زمانہ میں جو کچھ واردات واقعہ ہوں مولوی رشید احمد صاحب یا مولوی محمد قاسم صاحب سے دریافت کرلیں، تحریر کی حاجت نہیں۔ (مکتوبات: ص ۴۰۹)

(۲۱)......مکتوب سید الطائفہ بنام عبدالواحد خان صاحب، چاہیے کہ باوجود مشغولی بارہ تسبیح و پاس انفاس وغیرہ کے ذکر لسانی اسم ذات کا بھی چوبیس ہزار اللہ۔ اللہ اس طریقہ سے کہ اس کو غیر ذات نہ جانیں اس تصور کے ساتھ کہ زبان دہن ولسانی قلب باہم تلفظ کریں۔ ہر روز کرتے رہیں۔ اگر نہ ہوسکے بارہ ہزار بار ضرور مکمل رکھیں۔ نیز اپنی استعداد کے موافق حبس دم کا شغل بھی مناسب اور کیفیت اس کی مشغولی کے وقت واضح ہوگی اور اس کی ترکیب مولویوں یعنی مولوی رشید احمد صاحب یا مولوی محمد قاسم صاحب سے دریافت کرلیں۔ تحریر کی حاجت نہیں۔

(مکتوبات: ص ۴۰۹)

(۲۲)......مکتوب سید الطائفہ بنام عبدالواحد خان صاحب، میاں رحیم بخش کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کو کوئی مرض لاحق ہوگیا ہے جس کا علاج چاہتے ہیں عشق مجازی حقیقت کا رہبر اسی وقت تک ہے کہ معشوق مجازی سے وصال نہ ہو ورنہ نقصان عاشق ہے۔

عاشقی گر زیں سر و گر زاں سر است

عاقبت مارا براں شہ رہبر است

یعنی طالب حق کو چاہیے کہ مجاز میں حقیقت کو دیکھے اگر مجاز کا غلبہ ہو تو اس کے دفعہ کی صورت یہ

ہے کہ نفی واثبات کے ذکر کے وقت معشوق مجازی کی صورت اپنے قلب میں تصور کرے اور کلمہ ''لا'' کو اندرون دل سے تمام شدت وقوت سے کھینچ کر اور ''الٰہ'' کو داہنے مونڈھے پر پہنچا کر اور سر کو پشت کی طرف کر کے تصور کرے کہ محبوب مجازی کی صورت اور اس کی محبت کو دل سے باہر نکال کر پس پشت ڈال رہا ہوں اور سانس کو چھوڑ کر لفظ ''الا اللّٰہ'' قوت وزور کے ساتھ دل پر ضرب کرے اور ملاحظہ کرے کہ نور الٰہی اور محبت کو دل میں لایا ہوں اسی کشاکش ودمادم کے ساتھ ذکر کرے اور چندروز عمل کرے ان شاء اللہ چند عرصہ میں عشق مجازی عشق حقیقی ہو جائے خاطر جمع رکھے اور پانچ سو بار ''اللہ الصمد'' پڑھیں اور بعد نماز عشاء ایک سو ایک بار ''یا عزیز'' اور اسی قدر ''یا ارحم الراحمین'' ہمیشہ پڑھے اور ہمیشہ اپنا حال لکھتے رہیں۔ (مکتوبات امدادیہ: ص ۴۲۱)

بنام حکیم ضیاء الدین صاحب

(۲۳)......مکتوب سید الطائفہ بنام حکیم ضیاء الدین صاحب...... معلوم ہوا کہ صورت قیام آں عزیز کی بھوپال میں بذریعہ طباعت چالیس روپے تنخواہ پر ہوئی تھی، آں عزیز نے قبول نہ کیا خیر! جو کچھ مناسب جانیں بہتر ہے مگر فقیر کے نزدیک ایسی سرکار اسلامیہ اور زمرہ اہل اسلام میں آں عزیز کا قیام مناسب معلوم ہوتا ہے اس واسطے کہ وطن کے خرخشوں سے محفوظ رہنا اور دلجمعی سے مشغول ہونا بہتر ہے، خصوصاً حق میں آں عزیز از جان کے۔

بہر حال دلجمعی سے اشتغال باطنی خصوصاً آخر عمر میں بہت ہی ضروری ہے اگر ایک بار ملاقات آں عزیز کی پھر میسر آئے فقیر کی دلی خواہش کا سبب ہے اور میں نے سنا ہے کہ مولوی رشید احمد کا بھی ارادہ ہے، خدا کرے اس حج میں شریک ہوں آمین اور اب فقیر ارادہ کرتا ہے کہ باقی عمر مدینہ میں بسر ہو اور خاتمہ اس متبرک جگہ میں میسر ہو اور خاک بقیع ہو، مولوی رشید احمد صاحب وغیرہ کی ملاقات کا انتظار ہے۔

ملفوظ حضرت تھانوی

(۲۴)......حضرت تھانوی نے فرمایا کہ بہت لوگوں نے مجھ سے پیری مریدی کے متعلق خط وکتابت کی، جب دیکھا کہ کچھ کرنا پڑتا ہے، بیٹھ گئے، آج کل یہی ہو رہا ہے، چاہتے ہیں کہ جنت میں پہنچ جائیں اور کچھ کرنا نہ پڑے، یہ کیسے ہو سکتا ہے جو کام کرنے سے ہوتا ہے اس میں تو کرنا ہی پڑے گا تب ہی کوئی نتیجہ مرتب ہوگا اور اس مرض میں اہل علم تک کو ابتلاء ہے عوام بیچاروں کی تو شکایت ہی کیا ہے۔ (افاضات: ۸/۲ ص ۳۲۷)

ملفوظ حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ

(۲۵)..... سوانح حضرت رائے پوری میں علی میاں لکھتے ہیں کہ ایک صاحب رائے پور شریف حاضر ہوئے وہاں ماہ مبارک میں سب حاضرین ذکر و شغل تلاوت وغیرہ میں مشغول رہتے ہی تھے، وہ صاحب یہ منظر دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم سے تو یہ چکی نہ پیسی جائے گی، غالباً! کسی نے حضرت سے ذکر کر دیا ہوگا، شام کے کھانے کے بعد حضرت نے فرمایا کہ دوست آتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے حصہ کی پڑیا بنی رکھی ہے، مل جائے گی، جیب میں ڈال کر لے آئیں گے، مگر یہاں بغیر محنت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اس راستہ میں محنت لازمی ہے، غالباً اس کے بعد آیت:

"والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا" پڑھ کر روشنی ڈالی۔

مگر چند دنوں بعد حضرت کے کانوں میں پھر یہی الفاظ ڈالے گئے کہ فلاں بزرگ دوستوں کی یہاں شب و روز محنت دیکھ کر گھبراتے اور کہتے ہیں کہ اتنی محنت یہاں کون کرے، دوبارہ بڑے جوش سے فرمایا کہ اگر کوئی گھر آپ لوگوں کو ایسا معلوم ہو جہاں دو روٹیاں پکی پکائی مل جاتی ہوں تو میں بھی ٹوکری پکڑ کر تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں تا کہ کچھ حاصل کر سکوں، مگر دوست صرف چکی ہی پیسنے کی شکایت کرتے ہیں۔

مگر میں کہتا ہوں کہ چکی پیسنے کا ہنر تو بہت روز میں آتا ہے، پہلے تو زمین کو جوتا ہے، اچھا بھلا بیج گھر سے نکال کر کھیت میں بکھیرتا ہے، پھر سینچتا ہے، تا کہ کھیتی بڑھ کر پکنے کی حد تک پہنچے اور پک جائے تو پھر کاٹنا اور گاہنا اور غلہ کو بھوسے سے الگ علیحدہ کرنا ہے، پھر جیٹھ کی گرمی کو برداشت کرنا ہے، پھر چکی پیسنا ہے، آٹا بن جانے کے بعد مشقت سے گوندھنا بھی ہے اور آگ جلانا پکانے کا سامان مہیا کرنا ہے، پک کر تیار ہو جانے کے بعد مشقت سے توڑ کر منہ کے زور سے نگلنا ہے، ان ساری کوششوں کے بعد اگر ہضم ہو جائے تو محض میرے مولا کا فضل سمجھنا چاہیے ورنہ قے ہو کر باہر نکل سکتا ہے۔ (سوانح حضرت رائے پوری: ص ۳۳۹)

(۲۶)..... خان صاحب نے فرمایا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ چھتہ کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے وضو کر رہے تھے اور میں پیچھے کھڑا ہو گیا تھا، آپ مجھ سے باتیں کر رہے تھے، حکیم عبدالسلام ملیح آبادی حاجی محمد عابد حسین صاحب سے باتیں کر رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ ایک میرے دوست لکھنؤ کے باشندے نصف مجذوب مکہ معظمہ کو ہجرت کر گئے تھے۔ جب میرا مکہ جانے کا اتفاق ہوا تو واپسی کے وقت انہوں نے بہت شد و مد سے یہ فرمایا کہ تم یہیں رہو ہندوستان مت جاؤ، اس واسطے کہ وہاں انقلاب ہو رہا ہے جو غدر سابق سے بڑھ کر ہوگا،

یہ سن کر جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے چونک کر اور پیچھے کو مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ وہ کون ہے اور ان کو ہندوستان سے کیا تعلق ہے، ہندوستان ہمارا ہے یا اُن کا؟ یہاں کچھ نہیں ہونے کا، رات کو ان کی دن کو ان کا، یہ فقرہ کئی دفعہ فرمایا، بوریا لپٹ جائے گا، جھاڑو پھر جائے گی، کسی قسم کا غدر نہیں ہوگا، اس پر حاجی محمد عابد صاحب نے حکیم عبدالسلام سے کہا کہ سن لو یہ ہمارے مجذوب ہیں، اس پر حضرت تھانوی لکھتے ہیں کہ قولہ وہ کون ہے اقول یہ اسی شان قطبیت کی فرع ہے۔ (اورِ ثلاثہ: ص۳۱۳)

(از زکریا، واقعہ بھی ایسا ہی ہوا کہ رات انگریزوں کی اور دن کانگریس کا، غدر تو واقعی نہیں ہوا مگر جھاڑو پھر گئی)

(۲۷)......ایک مرتبہ صبح کے وقت جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدرسہ میں اپنی درسگاہ میں پریشان اور خاموش بیٹھے ہوئے تھے، میں اور چند دوسرے اشخاص اس وقت پہنچ گئے، مولانا نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ:

اُفو! رات مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی، میں نے حق تعالیٰ سے کچھ عرض کیا، حضور نے کچھ جواب ارشاد فرمایا، میں نے پھر عرض کیا (جو کچھ ظاہراً گستاخی میں داخل تھا) اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ بس چپ رہو، بکومت، ایسی گستاخی، یہ سن کر میں خاموش ہو گیا اور بہت کچھ استغفار معذرت کی، بالآخر میرا قصور معاف ہو گیا۔

اس کے بعد آسمان سے ایک پیڑھا یا کھولا اترا جس کی پٹیاں، سیرودے، پائے سب الگ الگ تھے۔

میں نے عرض کیا کہ حضور میں سمجھا یا حضور نے فرمایا: ''ہاں''۔

اس کے بعد خان صاحب فرماتے ہیں کہ یہ وہ زمانہ تھا جس زمانہ میں حضرت مولانا نانوتوی بمرض الموت علیل تھے، مولوی فخر الحسن نے اس واقعہ کو حضرت مولانا (نانوتوی) کی خدمت میں بیان کیا تو آپ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور گھبرا کر فرمایا۔

اُفو! مولوی محمد یعقوب نے ایسا کہا، توبہ توبہ توبہ، بھائی یہ انہی کا کام تھا، کیونکہ وہ مجذوب ہیں، اگر ہم ایسی گستاخی کرتے تو ہماری تو گردن نپ جاتی، اس کے بعد حضرت تھانوی ارشاد فرماتے ہیں کہ بعض مراتب مجذوبیت میں ایسے اقوال دخل ادلال ہو کر عفو فرما دیئے جاتے ہیں اور بعض مجاذیب ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر جذب کا اثر کسی وقت ہوتا ہے۔

(اورِ ثلاثہ: ص۳۱۴)

(۲۸)......حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ چندہ کے متعلق میری مولانا صاحب سے بہت گفتگو ہوئی، میں کہتا تھا کہ خطاب خاص میں وجاہت کا دخل ہوتا ہے دینے والے کے قلب پر

ماننے والے کی وجاہت کا اثر پڑتا ہے، مولانا نے فرمایا کہ ہم کیا اور ہماری وجاہت کیا؟ اس کا کیا اثر ہوتا ہے، میں نے جواب دیا آپ کی نظر میں بیشک اپنی وجاہت نہیں ہے، لیکن لوگوں سے پوچھیے کہ ان کے قلوب میں آپ کی کتنی وجاہت ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ نہیں جی، بہت دیر گفتگو رہی لیکن انہوں نے میری رائے نہیں مانی اپنی رائے پر قائم رہے۔

(ارواح ثلاثہ:ص ۳۸۵)

(۲۹)......حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک مولوی صاحب نے مجھ کو عربی میں درخواست بیعت کا خط لکھا ہے، میں نے لکھ دیا کہ مفید کا مستفید سے افضل ہونا لازم ہے اور یہاں معاملہ برعکس ہے، کیونکہ میں ایسی عربی لکھنے پر قادر نہیں، اس لیے تعلق رکھنا ہی بے کار ہے۔

دیکھئے خواہ مخواہ عربی لکھتے ہیں، مقصود لیاقت کا اظہار ہے جو ناشی ہے جاہ سے۔

سمجھتے ہیں کہ اظہار قابلیت پر قدر ہوگی، یہاں یہ قدر ہوتی ہے کہ لتاڑ پڑتی ہے وہ عالم ہی کیا جو اپنے کو عالم سمجھے۔

ایک اور صاحب نے عربی میں خط لکھا تھا، میں نے لکھا کہ عربی میں خط لکھنے کی کیا مصلحت تھی؟ لکھا کہ اہلِ جنت کی زبان ہے، میں نے لکھا کہ "قسم کھا کر لکھو کہ اگر یہاں آنا ہو تو عربی زبان میں گفتگو کرو گے، اس لیے کہ اہلِ جنت کی زبان ہے" پھر جواب نہیں آیا۔

تاویل کرتے ہوئے شرم بھی تو نہیں آئی کیا لکھنے کے وقت یہی نیت تھی یا اظہار قابلیت مقصود تھا، اپنے کو بڑا عقل مند سمجھتے ہیں، یہاں یہ چالاکیاں چلنا مشکل ہیں۔

اللہ کا شکر ہے اپنے بزرگوں کی دعاء کی برکت سے فوراً ذہن میں اصل حقیقت آجاتی ہے۔

چاہے لوگ ظاہر نہ کریں، مگر نکلتی وہی بات ہے جو سمجھ میں آتی ہے۔

میں نے ایک صاحب سے کہا تھا کہ "تمہارے اندر کبر ہے اس کا علاج کرو۔ اس وقت قبول نہیں کیا بلکہ اور برا مانا۔ پھر پانچ برس کے بعد خود اقرار کیا کہ تمہاری تشخیص بالکل صحیح تھی۔ میرے اندر کبر کا مرض ہے"۔ (اضافات:۳۰/۸/ص ۲۴۰)

اس رسالہ میں چند امور اور لکھنے کا ارادہ تھا۔ مگر دو ہفتہ سے ایسا ہجوم مہمانوں کا رہا کہ لکھوا نہ سکا اور اب تو سفر حجاز سر پر ہے۔ جو امور لکھوانے کے تھے ان کو اجمالاً نوٹ کر دیا اور عزیزان مولوی عاقل، مولوی سلمان سلمہما سے کہہ دیا کہ میری زندگی میں واپسی ہوگئی تب تو ان شاء اللہ پوری کرادوں گا، ورنہ وہ ہر دو عزیزان اس کا اضافہ کر دیں۔

حق تعالیٰ شانہ اپنے فضل و کرم سے جو اس بے ربط تحریر میں لغزشیں ہوئی ہیں، ان کو معاف

فرمائیں۔

"واللّٰہ الموفق لما یحب ویرضی وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و الہٖ وصحبہٖ وبارک وسلم تسلیماً کثیرا کثیراً برحمتک یاارحم الراحمین"۔

ناکارہ
محمد زکریا کاندھلوی

......☆☆☆☆☆......

مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ
اور مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ سے
ذکر کے سلسلے میں حضرت شیخ کے مکاتیب حضرت
رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہند و پاک وحجاز کے اسفار
سہارنپور میں کیے جانے والے رمضانوں کی
تفصیل نیز تصوف وسلوک کے متعلق بعض اہم
مضامین شامل ہیں

مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ، شاہ فیصل کالونی نمبر ۴ کراچی

حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مدظلہٗ العالی کی

آپ بیتی (خودنوشت سوانح)

ایک نظر میں

حضرت شیخ مدظلہ بچپنے سے پیرانہ سالی تک حق تعالیٰ شانہٗ کے جن گوناگوں خصوصی الطاف و عنایات کے مورد رہے ہیں وہ اس دور میں نادر الوجود ہیں۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح مولانا محمد ثانی حسنی نے مرتب کی، اس کے باب اول میں جو حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں زید مجدہم کے قلم سے تھا۔ حضرت شیخ مدظلہ کے حالات وسوانح اور آپ پر الطاف ربانی کا مختصر تذکرہ آیا، حضرت شیخ مدظلہٗ نے اس کی اشاعت پر مؤلف "سوانح یوسفی" کے نام ایک گرامی نامہ تحریر فرمایا کہ جو باتیں لکھنے کی تھیں وہ چھوڑ دیں اور جو نہ لکھنے کی تھیں وہ لکھ دیں۔

یہ گرامی نامہ "آپ بیتی نمبر ا" قرار پایا، اس کے بعد احباب کے تقاضوں سے مزید واقعات لکھوانے شروع کیے اور انہیں ابواب وفصول پر مرتب فرمادیا، چنانچہ اب تک اس کے سات نمبر طبع ہو چکے ہیں۔

سیر وسوانح میں "آپ بیتی" سب سے دلچسپ اور مبنی بر حقائق تصنیف ہے اور کسی نابغہ شخصیت کی آپ بیتی سے تمام تر سادگی، جذبہ خمول وکسر نفسی کے باوجود محض دلچسپ ہی نہیں حکمت آگیں اور سبق آموز بھی ہوتی ہے۔ "آپ بیتی" سے مصنف کی شخصیت، اس کے اخلاق وعادات اور نفسیات کے دقیق سے دقیق پہلو بھی بلاحجاب سامنے آجاتے ہیں اور پھر حضرت مدظلہٗ کی آپ بیتی صرف آپ بیتی ہی نہیں ہے بلکہ اپنے اکابر کے حالات وسوانح کا حسین مرقع اور مختصر سا "انسائیکلوپیڈیا" ہے۔ جس کے مطالعہ سے نہ صرف دل اور دماغ اور قلب ونظر کی بہت سی گرہیں کھلتی ہیں بلکہ قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان ملکوتی صفت اہل اللہ کی محفل علم وعرفان سے مستفیض ہو رہا ہے۔

تقریظات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

حامداً ومصلیاً ومسلماً۔ یہ رسالہ ''آپ بیتی'' بھی میرے گلے کا کچھ ایسا ہار بن گیا کہ بار بار اس کو ختم کر چکا ہوں، کئی مرتبہ تمت کر چکا ہوں مگر کچھ تو دوستوں کا اصرار حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے اور بعض اکابر کے واقعات کے متعلق اپنا بھی سر کھجلانے لگتا ہے کہ یہ کہیں محفوظ ہو جاتے تو اچھا تھا، مگر مشاغل اور امراض کے ہجوم کے علاوہ میری نگاہ میں اس تالیف کی کچھ اہمیت اب تک نہیں ہوئی۔ جب لوگ اس کے متعلق کچھ ذوق شوق ظاہر کرتے ہیں تو میں ان کو یہی کہتا ہوں کہ اللہ کے بندو! فضائل کی کتابیں پڑھو وہ اصل سرمایہ ہے، یہ تو خالی بیٹھے کے قصے تھے اخباری حیثیت کے، مگر ایسے اونچے لوگوں کی طرف سے کہ جن پہ مجھے بھی حیرت ہے زبانی اور خطوط میں اس کی اہمیت پہنچتی رہی اور میں اس پہ تعجب بھی کرتا رہا۔ ان کو محفوظ رکھنے کی یا طبع کرانے کا تو کبھی خیال نہیں آیا، مگر حال ہی میں حضرت مولانا الحاج مفتی محمد شفیع صاحب ناظم دارالعلوم کا گرامی نامہ آیا جو بعض دوستوں کے اصرار پر یہاں بھی نقل کراتا ہوں:

مخدومنا المحترم حضرت شیخ الحدیث صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت کا مراسلہ تحفہ گرمی تمور مدینہ اور تمور ہی کی تسبیح وصول پائی۔ حیرت ہوئی کہ اتنے مشاغل اور اتنے احباب واصحاب کے ہجوم میں بھی اس ناکارہ کا خیال آپ کے ذہن سے نہ گیا، اول تو ساری ہی عمر فضولیات بلکہ معاصی میں گزری اور جو کچھ بشکلِ حسنات کیا بھی اب غور کرنے سے وہ بھی بے رُوح معلوم ہوتا ہے اور اس وقت حال یہ ہی ہے کہ ضعف نے پوری نماز کھڑے ہو کر پڑھنے کے قابل نہیں چھوڑا، اب تو یہ صرف بزرگوں کی شفقت و دُعاء ہی کا سہارا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت کے ساتھ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے، آپ کی تصنیف آپ بیتی جو پاکستان میں چھپی اور غالباً آپ ہی کے ارشاد سے اس ناکارہ کے پاس پہنچی، نصائح وعبر کا خزانہ ہے اس میں جو

خط آپ نے مظاہرِ علوم کے مدرسین اور ملازمین کے نام لکھا ہے آج ہی میں نے اپنے مدرسہ کے سب مدرسین کو جمع کر کے وہ خط سنایا الحمدللہ بہت ہی مؤثر نظر آیا، وفقنا اللّٰہ لا تباعہ ،حضرت کی دُعاء کا بہت ہی محتاج اور امیدوار ہوں، والسلام

بندہ محمد شفیع

۱۹ محرم ۱۳۹۴ھ

اس جیسے بہت سے خطوط اور اس سے بڑھ کر اکابر زمانہ کے اصرار کی بناء پر آج مدنی ۱۳ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ، ہندی ۱۲ ربیع الاول جمعۃ المبارک فی آخر ساعۃ من یوم الجمعۃ، میں عزیز محترم الحاج ملک عبدالحفیظ سلمہ اللہ تعالیٰ ورقاہ اللہ المراتب العلیاء واسقاہ من شراب حبہ جرعۃ واسعۃ کے مبارک ہاتھ سے بسم اللہ کراتا ہوں، عزیز موصوف اور ان کے والد ملک عبدالحق اللہ تعالیٰ دونوں کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے، اپنے قربِ خاص سے نوازے، مکارہ سے حفاظت فرمائے اور اپنے اپنے وقت پر حسنِ خاتمہ کی دولت سے مالا مال کرے، میرے ان مخلص محسنوں میں ہیں جنہوں نے میرے سفرِ حجاز میں جس کا سلسلہ ۱۳۳۸ھ سے شروع ہوا تھا جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا، اس وقت سے آج تک میرے ہر سفرِ حجاز میں ملک صاحب کی ایک گاڑی میرے لیے وقف رہتی، جو حسبِ ضرورت بڑی اور چھوٹی ہونے کے اعتبار سے بدلتی بھی رہتی، مثلاً مدینہ پاک کے سفر میں جس میں سامان بھی خوب ہوتا ہے اور رفقاء بھی بہت ہوتے ہیں، بڑی سے بڑی گاڑی بدلی جاتی ہے اور مکہ کے قیام میں چونکہ صرف حرم شریف جانا ہوتا ہے یا عزیز سعدی کے گھر، تو چھوٹی گاڑی کافی ہوتی ہے، مدینہ پاک میں تو چونکہ اس سیہ کار کا مستقر جناب الحاج سید محمود صاحب نور اللہ مرقدہٗ برادر خورد حضرت شیخ الاسلام مدنی نور اللہ مرقدہما کی شفقت سے مدرسہ شرعیہ کا ایک حجرہ مستقل رہا اور آپ کے صاحبزادے عالی جناب سید حبیب صاحب مدیر اوقاف مدینہ منورہ کی شفقت سے وہی مستقر ہے اور وہ مسجدِ نبوی کی دیوار کے بالکل قریب ہے، کار کی ضرورت نہیں ہوتی، میں ہی خود تقاضے سے واپس کر دیتا ہوں کہ وہاں کے لیے تو میری ہاتھ کی گاڑی جس کو میرے دوست کھینچتے ہیں کافی ہو جاتی ہے، میں نے یہ بھی سنا کہ میری آمد کی خبر سن کر ملک صاحب نے بعض مرتبہ پندرہ بیس ہزار ریال میں نئی گاڑی یہ کہہ کر خریدی کہ وہ اب آرہا ہے یہ اُس کے لیے ہے اور ان کے صاحبزادے بلند اقبال عزیزی، محبی ومحبوبی الحاج عبدالحفیظ سلمہ اپنے انتہائی مشاغل کے باوجود میرے ساتھ ہی رہتے ہیں اور وہی گاڑی چلاتے ہیں اور میرا اور میرے مہمانوں کا جب تک کوئی مستقل انتظام نہ ہو اپنے آپ کو واحد ذمہ دار میزبانی کا سمجھتے ہیں۔

عزیز عبدالحفیظ سلمہ کو اس کے والد صاحب نے سب سے پہلے ۸۱ھ میں اس ناکارہ کے پاس سہارنپور بھیجا تھا، میں نے عزیز موصوف سے پوچھا تھا کہ تمہاری سہارنپور کی ابتدائی روانگی کی تاریخ معلوم ہے؟ اس نے بتایا کہ مجھے تو یاد نہیں لیکن بھائی تاج القادری میرے ساتھ تھے، اس لیے کہ ابا جان نے مکہ سے مفتی زین العابدین کے ساتھ بھیجا تھا کہ کسی کے ساتھ اس کو سہارنپور بھیج دیں، ان کے پاس سب لکھا ہوا ہے میں اُن سے منگاتا ہوں، عزیز موصوف کے کہنے پر انہوں نے جو خط لکھا میرا خیال ہے کہ اسی کا خلاصہ نقل کرادوں، وہ لکھتے ہیں کہ:

''اگست ۱۹۶۱ء کے پہلے ہفتے کی بات ہے کہ جناب مفتی زین العابدین نے مجھے یاد فرمایا اور کہا کہ مکہ سے ملک عبدالحق صاحب کا لڑکا عبدالحفیظ آیا ہوا ہے چونکہ انہیں معلوم تھا کہ میرے پاس انڈیا کا ویزا موجود ہے اس کو میں تمہارے ساتھ حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہ العالی کی خدمت میں بیعت کے لیے بھیجنا چاہتا ہوں، میں نے حامی بھرلی اور دوسرے یا تیسرے روز ہم انڈیا کے لیے عازم سفر ہوئے، پہلے لاہور جاکر سلطان فونڈری میں دو (۲) شب قیام کیا، اسی دوران میں ہم نے کرنسی حاصل کرلی، لاہور سے ۱۲ بجے ریل چل کر امرتسر سے گاڑی بدلنا پڑی، رات کے ۳:۳۰ بجے سہارنپور پہنچی اور سیدھے مدرسہ پہنچے، حضرت شیخ سے ملاقات صبح کو ہوئی، چائے کے وقت میں نے عبدالحفیظ کا تعارف حضرت شیخ سے کرایا اور حاضری کا مقصد بیان کیا، حضرت شیخ نے بیان فرمایا کہ تم تو رائے پور جارہے ہو چلے جاؤ اس کو یہاں چھوڑ جاؤ، میں ایک ہفتہ بعد واپس ہوا اور دریافت کیا شیخ نے فرمایا کہ ابھی بیعت نہیں ہوا تم اُس سے خود پوچھ لو وہ چاہتا ہے یا نہیں اس نے نوعمری کی وجہ سے صاف جواب نہیں دیا، اس پر شیخ نے فرمایا کہ اس کو لے کر تم رائے پور چلو میں بھی کل آرہا ہوں، چنانچہ شیخ دوسرے دن پہنچ گئے اور نمازِ عصر سے پہلے مجھ سے فرمایا کہ عبدالحفیظ سے کہو کہ غسل کرے، حضرت سے بیعت کرادوں گا اور عصر کے بعد حضرت شیخ نے حضرت رائے پوری سے بیعت کرادیا، شیخ تو سہارنپور واپس آئے اور عبدالحفیظ وہیں رہ گیا، چند روز کے بعد عبدالحفیظ کا نظام، نظام الدین مولانا یوسف صاحب کی خدمت میں جانے کا تھا، میرا ویزا چونکہ دہلی کا نہیں تھا اس لیے خانقاہ میں مشورہ ہوا، اتفاق سے شاہ نفیس احمد دہلی جانے والے تھے، ان کے ساتھ عزیز عبدالحفیظ کو بھیج دیا، ۲۰ اگست ۶۱ھ کو رائے پور سے عزیز موصوف دہلی پہنچ گیا۔ عبدالحفیظ وہاں جماعت کے ساتھ روانہ ہوا اور وہاں سے لائل پور واپس چلا گیا۔

حضرت قدس سرہٗ کے وصال کے بعد اس نے اس ناکارہ سے رجوع کیا، مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے آخری سفرِ پاکستان میں اُن کے ساتھ رہا، وصال کے بعد صفر ۸۵ھ میں سہارنپور دوبارہ گیا اور اس سفر میں اس ناکارہ سے رجوع کیا، اس کے بعد وقتاً فوقتاً سہارنپور کی آمدورفت

ہوتی رہتی اور ۸۸ھ میں ایک سال دورہ حدیث کے لیے قیام بھی کیا وہ سال اس ناکارہ کی تدریس حدیث کا آخری سال تھا، اس کے بعد اپنے امراض کی وجہ سے یہ ناکارہ تدریسِ حدیث سے معذور ہو گیا، ۲۷ رمضان ۸۶ھ کی شب میں اس نابکار نے اپنی نااہلیت کے باوجود عزیز موصوف کو بیعت کی اجازت بھی دے دی، اللہ تعالیٰ ترقیات سے نوازے۔

سفرِ حجاز ۹۳ھ

خدا شرے برانگیزد رو خیرے نہاں باشد

کھلایا بتوں نے جو دل سے مجھے
میرے ساتھ یادِ خدا ہو گئی

یہ تو متفرق مواقع پر مختلف مضامین کے ذیل میں یہ ناکارہ لکھ چکا ہے کہ اس ناکارہ کی پیدائش ۱۱ رمضان ۱۵ھ کو ہے، سات (۷) سال کی عمر تک تو پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ کچھ ایسا شروع نہیں ہوا، جس کی بہت تفاصیل پہلے گزر چکیں کہ میری دادی صاحبہ میرے باپ اپنے لڑکے نور اللہ مرقدہٗ کو بہت بری طرح سے ڈانٹا کرتی تھیں کہ تو تو سات (۷) سال کی عمر میں حافظ ہو چکا تھا اور یہ بیل جانوروں کی طرح سے یونہی پھر رہا ہے اور میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک ہی خواب تھا کہ آپا جتنے دن کھیلنے کے ہیں کھیلنے دو، ایک دفعہ جب اوکھل میں سر رکھے گا تو قبر میں جا کر ہی سر اُٹھا دے گا۔

سات (۷) سال کی عمر میں ضابطہ کی تعلیم شروع ہوئی تھی، چند روز تو پیار محبت میں اور اس کے بعد باپ کے جوتے نے پڑھنے پڑھانے کی طرف متوجہ کیا اور پندرہ (۱۵) سال کی عمر تک یوماً فیوماً اپنی طبیعت بھی پڑھنے کی طرف چلنی شروع ہو گئی اور ۳۰ھ سے علمی ذوق شروع ہوا اور وہ بڑھتا ہی چلا گیا، محض مالک کا احسان اور صورتاً باپ کے ابتدائی جوتوں نے ایسا یکسو کیا کہ علمی اشتغال کے سوا کسی طرف دل کا میلان نہ ہوا۔

بہت مختلف جگہ مختلف قصے ہے اس کے لکھوا چکا ہوں کہ شادیوں میں جانا یا کسی دوسری تقریب میں شرکت میرے لیے انتہائی وحشت کی چیز بن گئی، البتہ جنازوں میں شرکت میری انتہائی مرغوب چیز رہی، اموات کو غسل دینا، حتیٰ کہ اجانب تک کو بھی اور طلبہ کو تو خاص طور سے، ان کی تجہیز

وتکفین، تدفین میں شرکت میری ٹانگوں کی معذوری سے پہلے تک بدستور رہی، اس کی تفصیل پہلے شاید کہیں گزر چکی، اس کے بہت سے واقعات متفرق جگہوں میں لکھوا چکا ہوں کہ ایک مرتبہ میرا جوتا اُٹھ گیا تھا تو چھ (۶) مہینے تک مجھے اس کی ضرورت پیش نہ آئی کہ مدرسہ کے دروازے سے نکلنے کی ضرورت پیش نہ آئی، حد یہ ہے کہ میرے دو (۲) بزرگ حضرت شیخ الاسلام، حضرت رائے پوری ثانی نور اللہ مرقدہما نے اپنے ساتھ حج میں لے جانے کی کوشش کی اور اس ناکارہ کے علمی انہماک نے اس سعادت سے بھی محروم رکھا، مگر ۸۲ھ کے مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ نالائق کو تدریس سے ایسا مایوس کیا اور ایسا اُچاٹ کیا کہ ساری اُمنگیں ختم کردیں، امیر شریعت بہار میرے مخلص کرم فرما مولانا منت اللہ صاحب بہاری نے جب اس ناکارہ نے دارالعلوم کی ممبری سے استعفاء دیا تھا مولانا کا خیال تھا کہ میں نے وہاں کے اسٹرائیک کی وجہ سے استعفاء دے دیا ہے تو مظاہر کی اسٹرائیک پر یہ پیام بھیجا تھا کہ دارالعلوم کی ممبری سے استعفاء دے دیا اب کیا کروگے؟ میں نے زبانی پیام کا جواب زبانی بھیجا تھا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ بھی دیکھ لیں گے میں کیا کروں گا، ان شاء اللہ ایسا قدم تو نہ کبھی اُٹھایا نہ اُٹھاؤں گا کہ جس سے کسی مدرسہ کو نقصان پہنچے، چہ جائیکہ دارالعلوم مظاہر علوم، مگر مالک کے احسانات **تولا تعد و لا تحصی** ہیں ''**وان تعدو نعمة الله لا تحصوها**'' کہ مالک نے اپنے اور اپنے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار کی حاضری کی آسانیاں پیدا کردیں۔

آپ بیتی نمبر ۴ میں سفرِ حجاز ۹۰ھ لکھوا چکا ہوں، میرے احباب کا اصرار اس آپ بیتی میں اسفار حج کا بہت زیادہ ہے، جب سے سفرِ حجاز کا سلسلہ شروع ہوا مکی مدنی احباب کے علاوہ پاکی احباب کا اصرار سب سے زیادہ، اس لیے کہ یہاں کہ راستے تو اکثر مسدود ہی رہتے ہیں اور ان حضرات کے لیے حجاز کی آمد جتنی آسان ہے کہ ہم لوگوں کے لیے ہندوستان آنا تو مشکل ہے اور تیرا پاکستان آنا مشکل ہے اور حجاز آنا دونوں کے لیے آسان ہے، اس کے علاوہ افریقی لندنی احباب کو بھی وہاں کی حاضری آسان ہے اور اس ناکارہ کے لیے بینائی سے معذوری کی وجہ سے کوئی علمی مشغلہ بھی نہیں رہا، اس لیے ظاہر ہے کہ خالی پڑے رہنے کے لیے ایک مسلمان کے واسطے حرمین سے زیادہ اچھی کونسی جگہ ہوگی؟ مگر کچھ اہل مدرسہ کا اصرار اور کچھ اہلِ تبلیغ کا اصرار اور کچھ دوسرے عوارض سے تاخیر ہوتی ہی چلی گئی۔

بالآخر وہ وقت آ ہی گیا، جس میں حجاز کی مستقل حاضری مقدر تھی اور ۱۸ ربیع الاول ۹۳ھ مطابق ۲۴ اپریل ۷۳ء کو بابو جی کی کار میں زکریا، مولوی انعام، شاہ ابوالحسن، حبیب اللہ، ابراہیم افریقی اور کاندھلہ تک مفتی محمود بھی ساتھ تھے۔ اپنی فجر پڑھ کر ۵:۳۰ پر روانہ ہوئے، ۶ بجے مولانا محمد

یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مزار پر جو سڑک ہی پر ہے تقریباً نصف گھنٹہ قیام ہوا، اس کے بعد نانوتہ کی بسوں کے اڈہ پہنچ کر تقریباً دس منٹ قیام ہوا جہاں حافظ عبدالعلام کے لڑکے کی بسم اللہ کرائی اور مسجد اور مدرسہ کی بنیاد کے لیے اینٹیں پڑیں، ۶:۴۵ پر وہاں سے چل کر ۷ بجے تھانہ بھون کے اڈہ پر پہنچے اور ۷:۳۵ پر بیروں میں حاضری ہوئی اور وہاں سے ۹:۱۵ پر چل کر ۲۰ منٹ شاملی میں ایک جانب سے دوسری جانب تک پہنچنے میں لگ گئے، ۱۰:۲۰ پر جھنجھانہ پہنچے، ۱۰:۳۰ پر اُٹھ کر ۱۵ منٹ مصافحوں میں لگے اور ۱۲:۳۰ پر کاندھلہ پہنچے۔

چونکہ سب کا وضو تھا اس لیے جاتے ہی نماز پڑھی باقتداء مولوی انعام صاحب، نماز کے بعد زکریا تو سو گیا، بقیہ احباب نے صوفی افتخار صاحب کے مکان پر جا کر کھانا کھایا، ۳ بجے اُٹھ کر پیشاب وضو کے بعد اول مردوں کو بیعت کرایا، پھر زنانہ میں جا کر عورتوں کو بیعت کرایا، ۴:۲۰ پر وہاں سے چل کر عزیزم الحاج قاضی ابرار کے باغ میں باقتداء مولوی انعام عصر پڑھی، زکریا نے لسی پی اور رفقاء نے طویل ناشتہ کیا جس میں چھ (۶) سات (۷) قسم کے پھل، چائے، کوکا کولا بھی تھا، کسی نے پیا کسی نے نہ پیا، عزیز ابرار سے یہ شرط ہوگئی تھی کہ چائے کے سوا کچھ نہ ہوگا مگر اُس نے وعدہ خلافی کی جس کی وجہ سے حجاز سے واپسی پر جب اُس نے مکرر اپنے باغ میں جانے کا اصرار کیا تو زکریا نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تو نے چونکہ پہلے وعدہ خلافی کی تھی اس لیے اب نہیں جاؤں گا۔

کاندھلہ سے چل کر ۷ میل پر بابو جی کی گاڑی خراب ہوگئی اس لیے وہ حافظ عبدالعزیز کی گاڑی میں جو ساتھ تھی بڑوت جا کر سامان لائے اور حاجی عبدالعلیم صاحب مُرادآبادی نے جن کی کار ساتھ تھی زکریا اور انعام کو مع رفقاء باصرار بٹھا کر روانہ کر دیا اور خود مع رفقاء بابو جی کی کار میں منتقل ہو گئے، حاجی صاحب نے اپنے ڈرائیور کو حکم دے دیا تھا کہ تیز نہ چلانا، اس نے ان کے تعمیل حکم میں اتنا آہستہ چلایا کہ پونے ۹ بجے دہلی نظام الدین پہنچے، اس سفر میں کاروں کا بڑا جمگھٹا ہو گیا، اس لیے حافظ عبدالعزیز صاحب کی ایک کار علی گڑھ اور ایک کار مرادآباد والوں کی حاجی صاحب کی کار کے علاوہ اور بھائی کرامت کی گاڑی مستورات کے لیے چھوڑ دی تھی جو صبح کو فجر کے بعد سہارنپور سے روانہ ہو کر ۹:۳۰ بجے دہلی پہنچی، منگل کی صبح کو اپنی نماز پڑھ کر مہندیوں میں حاضری ہوئی، ۷ بجے وہاں سے اُٹھ کر خواجہ باقی اللہ کے مزار پر گئے اور دوسرے دن قطب صاحب حاضری ہوئی اور وہاں سے واپسی پر عزیز گرامی قدر مولانا الحاج اسعد صاحب مع اپنے رفقاء کے الوداع کے لیے آئے کہ رات کو اُن کو طویل سفر پر جانا تھا، میں سہارنپوری اعزہ کو شدت سے منع کر آیا تھا کہ دہلی کوئی نہ آئے، مگر ان سے نہ رہا گیا، عزیزان

عاقل سلمان ودیگر احباب یکے بعد دیگرے پہنچتے رہے۔
۲۴ ربیع الاول شنبہ کی صبح کو مولانا محمد عمر صاحب، عزیز ابوالحسن صاحب شاہد وغیرہ رفقاء تو سامان لے کر نماز سے پہلے مطار پر چلے گئے وہیں نماز فجر پڑھی، صبح کی نماز کے بعد بھائی کرامت کی گاڑی میں یہ ناکارہ مولانا انعام صاحب، علی میاں، عزیز ہارون میاں اور عزیز زبیر مطار پر گئے، چونکہ بمبئی تک جانے والوں میں الحاج ابوالحسن، الحاج نصیر الدین علی گڑھی، بھائی کرامت، مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری بھی تھے اس لیے سامان کے کرایہ میں کچھ دینا نہیں پڑا بلکہ بہت گنجائش باقی رہی۔
یہ نابکار اپنی نااہلیت کی وجہ سے نہ تو تقریر کے قابل نہ وعظ کے، نہ جہری دُعاء کے، نہ اجتماعات میں شرکت کے، اب تک کا اس ناکارہ کا سفر ہمیشہ مولانا یوسف علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا انعام الحسن صاحب اور علی میاں کے ساتھ ہوتا رہا، اس لیے یہ ضروریات وہ حضرات پوری کرتے رہے، اس مرتبہ ان اکابر میں سے کوئی بھی ساتھ نہیں تھا اس لیے اس ناکارہ نے مولوی انعام صاحب اور مولانا محمد عمر صاحب کی خدمت میں ۲۰، ۲۵ دن پہلے سے یہ اطلاع کردی تھی کہ مولانا محمد عمر صاحب ان ایام کو خالی رکھیں اور اس سیہ کار کو جہاز تک پہنچا کر آئیں، ان دونوں بزرگوں نے میری درخواست کو قبول فرما کر مولانا محمد عمر صاحب کے ایام خالی کر رکھے تھے، اس لیے وہ بھی میرے ساتھ بمبئی تک تشریف لے گئے، عزیز مولوی ارشد سلمہ سے حجاز سے واپسی پر بمبئی میں ملاقات ہوئی کہ وہ حج سے واپس آرہے تھے، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، مولانا عمران خان صاحب بھوپالی بھی میری وجہ سے بمبئی تشریف لے گئے تھے۔
اللہ تعالیٰ ان سب دوستوں کو ان کی محبت کا بہترین بدلہ عطاء فرمائے، چونکہ اس سال بچیوں کا حج بھی طے تھا، عزیزان عاقل سلمان مع اپنے اہل وعیال کے حج کو جانے والے تھے، اس لیے بمبئی کے دوران قیام میں چیئر مین صاحب اور دیگر عمال حج سے جو ملنے آتے رہتے تھے زکریا گفتگو کرتا رہتا تھا، مگر سب اطمینان دلاتے رہتے تھے کہ بے فکر رہیں سب کام ہو جاوے گا، اس سفر کی تفصیلات تو بہت مفصل میری ڈائری میں موجود ہیں، مختصر یہ کہ منگل ۲۶ ربیع الاول ۹۳ھ یکم مئی ۷۳ء کو ۳:۳۰ بجے بعد ظہر رفقاء سامان وغیرہ لے کر مطار پہنچے، ۴:۳۰ پر عصر کی نماز پڑھ کر زکریا وغیرہ بھائی عبدالکریم کی گاڑی میں مطار پر گئے، وہاں پہنچ کر مولانا محمد عمر صاحب کو بُلایا اور انہوں ۶ بجے تک لمبی چوڑی دعاء کرائی، مجمع **لا تعد و لا تحصیٰ** تھا، زکریا تو اپنی کار میں مجمع سے الگ بیٹھ گیا اور عین جہاز کے وقت پر اندر چلا گیا، بقیہ رفقاء کسٹم سے گزر کر گئے، ساتھ جانے والوں میں عزیز شاہد، مولوی حبیب اللہ چمپارنی، مولوی محمد علی مینار سُورتی، مولوی

ابراہیم میاں افریقی تھے، بمبئی سے روانگی کے وقت تو غروب بہت قریب تھا مگر جوں جوں جہاز اُوپر کو چڑھتا رہا غروب مؤخر ہوتا رہا، مغرب سے پہلے جہاز والوں نے کھانے سے بھی نمٹا دیا، ہندی ۹ بجے جہاز ہی میں مغرب کی نماز جماعت سے پڑھی، زکریا کا اصرار تھا کہ دو (۲) بجے، دو (۲) آدمی الگ الگ جماعت کرلیں، مگر شاہد نے نا مانا اور کہا کہ جگہ وسیع ہے ایک ہی جماعت ہوجائے گی، زکریا نے کہا کہ جہاز کے عملہ کو دِقت ہوگی کہ وہ چل پھر رہے ہیں، مگر شاہد نے کہا کہ کوئی دِقت نہیں، چنانچہ ایک ہی جماعت ہوئی۔

۹ بج کر ۲۰ منٹ پر طیارہ دُبئی اُترا، زکریا کو تو خیال نہیں تھا، مگر مولانا محمد عمر صاحب نے بمبئی میں حبیب اللہ سے کہہ دیا تھا کہ شاید دبئی میں کوئی ملنے آجائے، مولوی حبیب اللہ پیچھے کی سیڑھی تلاش کررہے تھے کہ ایک نوجوان نے آگے کے زینے سے آکر پیچھے کی جانب سے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا کہ نیچے چلیے، میں نے کہا کہ بھائی میں تو اُترنے سے معذور ہوں، اس نے کہا کہ نہیں آپ کو چلنا ہوگا، بہت بڑا مجمع آپ کے انتظار میں ہے۔

جب میں نے دیکھا کہ میں بالکل بے قابو ہوگیا ہوں تو ساتھیوں کو آواز دی، وہ میری کرسی لائے اور مجھے اس میں بٹھا کر سیڑھی سے نیچے اُتارا، جہاز سے اُترتے وقت کپتان نے بڑے زور سے کہا "خمس دقائق خمس دقائق" اس نوجوان نے کہا کہ ایسی کی تیسی اس کی بھی اور اس کے خمس دقائق کی بھی، اتنے آپ واپس نہیں آتے، جہاز چھوٹ نہیں سکتا، واپسی پر معلوم ہوا کہ اصل وقت میں بھی دو تین منٹ باقی ہیں اور اس نے مطار کی کرسی پر بٹھا کر اس زور سے بھگایا کہ مجھے گرنے کا خوف ہوتا رہا، مگر اس ناکارہ نے جدہ، کراچی، لاہور، دہلی، بمبئی کے مطار دیکھے اس قدر صاف سڑک کہیں کی نہیں دیکھی، نہ کہیں اُونچ نیچ نہ کہیں روڑا تھا، چار پانچ سڑکوں کو عبور کر کے ایک بہت بڑے کمرے میں لے گیا، جس کے قریب ایک بہت ہی ضعیف، نحیف، خفیف الجثہ ایک بڑے میاں کھڑے تھے، اس نوجوان نے وہاں گاڑی روکی اور کہا کہ یہ ہمارے تبلیغی امیر ہیں، ان سے مصافحہ کیجئے، بہت ہی شفقت سے ملے اور کمرے کے اندر میرے ساتھ گئے، وہاں پہنچ کر انہوں نے بہت دھیمی آواز سے کہا کہ کوئی اپنی جگہ سے نہ اُٹھے نہ مصافحہ ہوگا نہ کچھ اور صرف بیعت ہوگی اور دُعاء، میری جتنی حیرت دبئی کی سڑکوں سے ہوئی تھی، اس سے زیادہ حیرت اس منظر سے ہوئی کہ ان بڑے میاں کی آواز پر کسی شخص نے جنبش نہ کی۔

چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا دور بھی دیکھا، مولانا یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی دیکھا اور اب مولانا انعام صاحب سلمہ کا دور دیکھ رہا ہوں، ہر جگہ پر، ہر موقع پر ان حضرات کو انتہائی زور شور لگانے پڑتے ہیں پھر بھی کسی جگہ آج تک مجمع قابو میں نہیں آیا، معلوم نہیں ان بڑے میاں کی زبان میں کیا

تاثیر تھی کہ کسی نے حرکت تک نہ کی، اس ناکارہ نے مجمع کو بیعت کیا اور پھر مختصر دعاء کرائی اور بغیر مصافحہ کے وہاں سے آکر طیارہ پر پہنچ گیا۔ اللہ تعالیٰ ہی کا انعام تھا کہ اتنے مراحل گزرے مگر آٹھ دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

واپسی پر جناب الحاج میر آلِ علی صاحب کے برادرزادہ میر قمرالحسن نے دوسو (۲۰۰) ریال دیئے، زکریا نے تو یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں لے جانا مشکلات کا سبب ہوتا ہے میں کبھی نہیں لے جاتا، مگر مولوی ابراہیم افریقی صاحب نے یہ کہہ کر کہ ہم افریقہ والے ان قواعد سے بالاتر ہیں ان سے لیے اور مکہ میں دے دیے، اللہ تعالیٰ معطی اور وسائط کو جزاء خیر دے، واپسی پر اس نوجوان نے اپنا تعارف کرایا کہ الطاف حسین نام ہے، لاہور کا رہنے والا ہوں، یہاں ہسپتال میں ملازم ہوں، میں نے پندرہ (۱۵) دن ہوئے تجھے خواب میں دیکھا تھا اور خواب ہی میں تجھ سے بیعت ہوا تھا اس لیے تیری صورت دیکھتے ہی پہچان لیا آمدورفت میں آٹھ دس سپاہی بندوقیں لٹکائے ہوئے ملے مگر کسی نے نہ ٹوکا نہ پوچھا کہ کون ہے، جب وہ مجھے طیارہ پر سوار کرا کر واپس ہوا تو بعد میں لوگوں نے روایت نقل کی کہ اس کو چار پانچ جگہ سپاہیوں نے ٹوکا اور وہ یہ کہتا ہوا ہر جگہ جواب دیتا ہوا گزر گیا کہ اب جتنا چاہو سوال جواب کرلو، میرے ساتھ وہ زور نہیں جس نے تمہاری زبان بند کر رکھی تھی، وہاں سے چل کر ظہران انگریزی ۱۱:۴۵ پر پہنچے، ظہران میں کسٹم ہوا رفقاء کسٹم میں گئے مگر عزیز اختر علی سہارنپوری کی برکت سے کہ وہ دن میں پہنچ گیا تھا کسٹم کا افسر میرے پاسپورٹ وغیرہ کاغذات طیارہ پر ہی دیکھ گیا، ۱۲ بجے ظہران سے روانہ ہوئے، ۱:۵۰ پر جدہ کے مطار پر پہنچے، وہاں سے عزیز سعدی اور بھائی اشفاق مطار کی گاڑی میں بٹھا کر باہر لائے، وہاں بہت بڑا مجمع تھا، مامون یامین، شمیم مع ابناء، قاری سلیمان وغیرہ بڑا مجمع تھا اور بہت نفیس بڑی ساری کار کسی کی لے گئے تھے جس میں میں اور میرا کموڈ اور میرے رفقا بھی جو کسٹم سے دیر میں پہنچے سعدی کے گھر آئے۔

میں نے تو بہت اصرار کیا تھا کہ میرا کوئی سامان بلٹی نہ ہوگا سب ساتھ جائے گا، محصول جتنا بھی ہو، مگر بمبئی میں حاجی یعقوب اور عزیز ابوالحسن کے مشورہ سے یہ طے پا گیا کہ دو اٹیچیاں ایک دن پہلے بلٹی کردی جائیں، آدھا محصول لگے گا۔ ساتھ کا سامان تو ہمارے ساتھ تقریباً ایک گھنٹہ بعد پہنچ گیا مگر ان دونوں اٹیچیوں نے بہت دق کیا۔ اس وقت تو کہہ دیا کہ مدیر صاحب نہیں ہیں کل صبح کو پانچ بجے ملیں گے۔ ان دونوں کی کنجیاں جدہ کے احباب کو دے کر آ گئے۔ اگلے دن بھی وہ نہ نکل سکیں تیسرے دن بھائی اقبال خلجی اور کئی احباب نے کئی گھنٹے صرف کیے اور ان لوگوں نے بھی بہت بری طرح سے ایک ایک کپڑے کو نکال کر دیکھا، ایک ایک رسالہ پر جرح کی۔ میری عطر کی شیشیاں

اور کئی ڈبے بھی گم ہو گئے، ایک مخملی عطردان بہت خوب صورت بھی کسی کو پسند آ گیا۔ یہ مصیبت ہر سال کی ہے کہ کسٹم والوں کو اشکال ہوتا ہے کہ کیا یہ عطر کی تجارت کرتا ہے اور ہر سفر میں ۵، ۷ شیشیاں تو لے ہی لیتے ہیں۔ اس سال چونکہ ہم میں سے کوئی ساتھ نہ تھا اس لیے جو پسند آیا لیا۔ میرے ساتھ تاریخ کبیر بھی تھی بہت گھورتے رہے کہ یہ کیرم کانٹے کیا ہیں۔

عزیز سعدی کے گھر سے پیشاب وضو کر کے طواف کے لیے گئے، طواف کے بعد عشاء کی نماز وہیں جماعت سے پڑھی اور سعدی کے گھر آ گئے۔ سعدی نے کہا کچھ کھاؤ گے؟ زکریا نے کہا ضرور۔ اس لیے کہ ایک عشرہ سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ اس کا واہمہ بھی نہیں تھا کہ میں کچھ کھاؤں گا۔ تاہم کوفتے اور بازار کی روٹی رفقاء نے کھائی اور زکریا نے کوفتے اور کچھ پھل وغیرہ کھائے۔ دہلی میں بڑے لذیذ کھانے دعوتوں میں آتے رہے مگر ذرا طبیعت نہیں چلی، صبح کی نماز کے دو گھنٹے بعد سلیم بھی سعدی کے گھر پہنچ گئے۔ جس پر زکریا کو بہت ہی گرانی ہوئی۔ ان کو الوداع کر کے عبدالحفیظ کی گاڑی میں اول مسعیٰ پر جا کر سعی کی پھر صولتیہ پہنچے۔ حسب سابق صبح کا کھانا تو رفقاء نے اپنا کھایا اور زکریا نے شرکت نہیں کی۔ عشاء کے بعد کھانے میں بہت بڑا مجمع ہوتا۔

دیوان میں زکریا، شاہد، عبدالحفیظ، حبیب اللہ اور مولوی اسماعیل جو کہ پہلے سے مکہ میں موجود تھے دیوان میں ٹھہرے اور بقیہ رفقاء مولانا انعام صاحب والے دیوان میں قیام پذیر ہوئے، طواف کے بعد عزیز سعدی کے یہاں گرمی کی وجہ سے آنا ہوا تھا اور صبح کو ناشتہ کے بعد صولتیہ، ۲ مئی کی شام کو بھائی سلیم نے بہت پُر تکلف دعوت سلیق کی جس میں علماء مکہ اور عمائدین کو بھی مدعو کیا تھا، ۳ مئی کی شام کو مسجد حفائر کا ہفتہ واری اجتماع تھا، زکریا بھی عصر کے بعد پہنچ گیا، اُس وقت تک تبلیغی اجتماع میں مکہ کا ہو یا مدینہ کا زکریا کی طبیعت اتنی خراب نہ تھی اس لیے اہتمام سے شرکت کرتا تھا، اجتماع سے فارغ ہو کر سعدی کے یہاں رفقاء کی وجہ سے کھانا کھایا پھر وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر حرم میں آیا، میں کار سے اُتر رہا تھا تو کسی نے کہا کہ قاضی صاحب بھی کار سے اُتر رہے ہیں، جناب الحاج قاضی عبدالقادر صاحب کو اللہ تعالیٰ بہت ہی جزائے خیر مرحمت فرمائے کہ یوسف مرحوم کے بعد سے جب بھی میری حجاز حاضری ہوتی ہے قاضی صاحب اس سے ایک دو دن پہلے ہی پہنچ جاتے ہیں اور میرے قیام تک تشریف فرما رہتے ہیں، چاہے کتنا ہی طویل ہو جائے، ہر چند کہ قاضی صاحب سے مجھے رُوحانی اور مادی دونوں طرح کی بہت ہی راحت ہے، روحانی برکات تو قابلِ ذکر نہیں اور نہ پسند کریں گے کہ کیا کیا وہ مجھ پر شفقتیں فرماتے ہیں، مبشرات ملاحظہ فرماتے ہیں مگر مادی اعانتیں بھی لا تعد و لا تحصیٰ ہیں۔

عزیز مولوی نصیر الدین نے میری شکایت ایک مرتبہ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے کی تھی شاید کہیں

تفصیل گزر چکی ہو کہ زکریا کو نہ تو آمد سے تعلق کہ کہاں سے آوے، کیا آوے، نہ انتظام سے تعلق، دسترخوان پر بیٹھ کر جو آس پاس ہوں ان کو دعوت دے دینا اور ویسے بھی جو ملنے والا کوئی خصوصی آئے چاہے وہ مدرسہ میں آئے چاہے محلّہ میں کہیں، اس کو یہ کہہ دینا کہ کھانا میرے ساتھ کھانا اور مجھے خبر بھی نہیں ہوتی۔

یہی بری عادت اس ناکارہ کی ہمیشہ سے حجاز میں بھی ہے، فرق اتنا ہے کہ سہارنپور میں تو میرا دسترخوان دن میں ہوتا ہے اور حجاز میں عشاء کے بعد، قاضی جی کو اللہ تعالیٰ دونوں جہان میں بہترین جزائے خیر عطاء فرمائے، درجاتِ عالیہ نصیب فرمائے کہ وہ عشاء کے بعد دسترخوان کے وقت معلوم کیا کرتے ہیں کہ کتنے آدمی زائد ہیں اور جتنی ضرورت ہو فوراً آدمی بازار دوڑا کر روٹیاں منگواتے ہیں، اتنے پہلا کھانا ختم نہیں ہوتا کہ جدید روٹیاں آجاتی ہیں، سالن تو افراط سے ہوتا ہی ہے، مجھے قاضی صاحب کا یہ طویل قیام اور غیب عن الپاکستان بہت گراں ہے، اس لیے کہ پاکستان کے تبلیغی مراحل کے مشیرِ اعلیٰ، روحِ رواں، وہاں کی مجلسِ شوریٰ کے سربراہ قاضی صاحب ہی ہیں، میں ہر چند قاضی صاحب سے بواسطہ، بلا واسطہ بار بار درخواست کرتا رہتا ہوں کہ آپ کے طویل قیام سے پاکستان کے تبلیغی کام کا بہت حرج ہو رہا ہے، یہ سیہ کار نابکار بجائے اس کے کہ تبلیغی کاموں میں خود شرکت کرے میری وجہ سے قاضی صاحب جیسے اہم آدمی سے بھی پاکستان کی تبلیغ محروم ہے، اس کا مجھ پر واقعی بہت بار رہا، مگر قاضی صاحب کی محبت اس تذکرہ کو سننا بھی گوارا نہیں کرتی بلکہ میرے بار بار کے اصرار پر ان کو گرانی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ہی قاضی صاحب کو درجاتِ عالیہ نصیب فرمائے اور قاضی صاحب کی غیبت سے پاکستان کے قیام میں کوئی نقص پیدا نہ ہو۔

اس مرتبہ سفر چونکہ سخت گرمی کے زمانہ میں ہوا تھا، سہارنپور میں بھی خوب گرمی تھی اور مکہ میں بھی، اس لیے میری طبیعت پر بہت اثر ہوا، تیمارداروں کے علاوہ ڈاکٹر وحید الزماں صاحب حیدرآبادی جو حجاز کے میرے اصل معالج ہیں انہوں نے کئی ڈاکٹروں کے ساتھ دو دن تک ملاحظہ کرنے کے بعد یہ بتایا کہ تعب کا اثر اعصاب پر ہو گیا، ڈاکٹر صاحب مسجدِ حفائر کے اجتماع میں شریک تھے، وہاں سے واپسی پر سعدی کے مکان پر بہت غور سے دیکھا اور کہا کہ اس وقت تو ایک انجکشن بہت ضروری ہے اور بہت اصرار سے ایک انجکشن اسی وقت لگایا اور کہا کہ بغیر اس کے مرض کے طویل ہو جانے کا اندیشہ ہے اور دوسرا دوسرے دن، تفاصیل تو میری ڈائری میں بہت کچھ ہیں خدا کرے شاہد کے حوالہ نہ ہوں وہ اس الف لیلہ کو بھی چھاپ دے گا۔

مدینہ پاک جانے کا تقاضا تو مکہ مکرمہ پہنچنے کے دوسرے ہی دن سے شروع ہو گیا مگر مرض کا جس شدت سے حملہ ہو رہا تھا تو کہ بھوک بالکل بند، اس لیے نہ تو تیمارداروں میں سے کسی کی رائے

ہوئی اور نہ ڈاکٹروں میں سے اور سب سے بڑھ کر قاضی صاحب جن کا احترام میں ان کے احسانات کی وجہ سے بہت ہی زیادہ کرتا ہوں اور حتی الوسع ان کی رائے کو مانتا ہوں، احباب کو بہت زیادہ اصرار تھا اور سید حبیب صاحب ہمیشہ مجھ پر اصرار کرتے ہیں کہ بجائے کار کے مکہ سے آمد ورفت ہوائی جہاز سے رکھ، سید صاحب نے یہ بھی کئی دفعہ فرمایا کہ تیرے اور تیرے ساتھیوں کے جتنے ٹکٹ ہوں میں منگا دوں، مگر مجھے اس میں بڑی مشقت معلوم ہوئی کہ طیارہ اگرچہ مدینہ سے جدہ تک ۲۳ منٹ میں پہنچتا ہے مگر یہاں کے مطار پر ایک گھنٹہ پہلے جانا پڑتا ہے ورنہ باوجود ٹکٹ اور سیٹ ہونے کے سب فسخ ہو جاتا ہے اس کا تجربہ عزیز مولوی اسعد مدنی کو مجھ سے بہت زیادہ ہے اور پھر جدہ سے مکہ ان کے واسطے کاروں کے انتظام سے ہمیشہ مجھے یہ اھون معلوم ہوا کہ اپنے قبضہ کی سواری میں صولتیہ سے چل کر مدرسہ شرعیہ پہنچ جاؤں یا اس کا الٹا، اس لیے کہ میں نے ہمیشہ موٹر ہی کو ترجیح دی اور پھر جب کہ وہ اختیاری بھی ہو۔

۱۹ مئی ۷۳ء کو شنبہ کے دن عصر کے بعد عزیز عبدالحفیظ کی بیجو میں ۱۱ بجے چلے، میری گاڑی میں قاضی صاحب، شاہد، حبیب اللہ، عبدالقدیر اور حسان تھے اور الحاج یونس کی گاڑی میں مولوی سعید خان وغیرہ و دیگر رفقاء، ملک عبدالغنی کی گاڑی میں وہ خود اور بقیہ رفقاء اور عبدالوحید کی گاڑی میں محمد علی بمبئی وغیرہ تھے، مفرق پر جا کر مغرب پڑھی، اسی جگہ عبدالوحید کی گاڑی بھی پہنچ گئی ۱۲:۳۰ پر مفرق سے چلے، قرار یہ پایا تھا کہ کھانا بدر میں کھائیں گے، مگر زکریا نے شاہد، حبیب اللہ وغیرہ اپنے نئے رفقاء سے مستورہ کی مچھلی کا وعدہ کر رکھا تھا، مستورہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ حکومت نے دو سڑکیں کر دیں، ایک مستورہ کے اندر کو جہاں بازار وغیرہ ہے اور دوسری باہر کو جہاں کچھ نہیں ملتا، مگر عزیز عبدالحفیظ نے واقعی یا شاہد کی خاطر یوں کہا کہ مجھے تیل ڈلوانا ہے اس لیے اندر کو جانا ہے، مستورہ پہنچ کر قاضی صاحب نے شدت سے انکار کیا کہ مچھلی اُچھلی کچھ نہیں لینا ہے جلدی سے تیل ڈلوالو، عزیز عبدالحفیظ اپنی گاڑی کو تیل کے پمپ پر کھڑی کر کے دکان سے تین مچھلیاں گرم گرم تلوا لایا، زکریا نے کہا کہ مجھے تو کھانا نہیں تم لوگ دکان پر ہی کھڑے ہو جاؤ، شلّہ وغیرہ جو کچھ لینی ہو لے لیجو، قاضی جی اول تو کار ہی میں بیٹھے رہے، مگر زکریا کی درخواست پر شریک ہو گئے اتنے میں مولانا سعید خان صاحب آئے، کہنے لگے یہ کیا ہو رہا ہے؟ معاہدہ تو بدر کا تھا، ہم نے کہا کہ وہ تو برقرار ہے، گاڑی میں تیل ڈلوانا ہے اور بچوں کو تفریح کرنی ہے، قاضی صاحب اول تو بہت متشدد، مخالفت میں تھے مگر پھر بچوں کے امام بن گئے۔

بدر پہنچ کر بھی زکریا نے کھانے سے انکار کر دیا، رفقاء نے کھانا کھایا اور زکریا نے وضو کر کے چند رکعت اہل بدر کو ایصال ثواب کے لیے پڑھیں، زکریا کا بستر قہوے کی دو کرسیوں کو ملا کر بنایا گیا تھا

جو بڑی وسیع مسہری بن گئی تھی، صبح کی نماز پڑھ کر صبح کا وقت ۹:۳۰ کے قریب ہو جاتا تھا رفقاء نے مختصر چائے پی، زکریا نے پیشاب کے ڈر کے مارے نہیں پی، ۱۰:۳۰ پر شہداء حاضری ہوئی، ۱۱ بجے واپسی ہوئی، سیدھے مدرسہ شرعیہ ۱۲:۳۰ بجے پہنچ گئے جہاں صبح سے صوفی اقبال، مولوی انعام کریم صاحب، الحاج عدنان ناظم مدرسہ انتظار کر رہے تھے، مولانا سعید خان صاحب کا اصرار تھا کہ اول سب کاریں مسجد نور جائیں مگر زکریا نے طول امل ہونے کی وجہ سے انکار کر دیا اس پر قاضی صاحب نے یہ طے کیا کہ زکریا کی گاڑی صرف مدرسہ شرعیہ جائے گی، بقیہ سب مسجد نور، مگر زکریا کی گاڑی کے پیچھے پیچھے مدرسہ آ گئیں۔

صوفی اقبال نے دو طرح کا قہوہ تیار کر رکھا تھا، سب نے پیا اور غسل کر کے سب روضۂ اقدس پر حاضر ہو گئے اور زکریا تکان کی وجہ سے لیٹ گیا، ۴:۳۰ بجے حاضر ہوا اور چونکہ گزشتہ سفرِ مدینہ میں ٹانگ کے ٹوٹنے کی وجہ سے اب اقدام عالیہ سے محروم ہو گیا، اس لیے مشرق دیوار کے برابر بابِ جبرائیل سے ملحق جو چبوترہ ہے اس کو مستقر بنایا، یہاں کا نظام یہ رہا کہ ۴:۳۰ پر ظہر کے لیے حاضری، تقریباً ۵:۳۰ پر ظہر کی نماز، اس کے دس منٹ بعد مدرسہ واپسی، اس کے بعد جملہ رفقاء صوفی اقبال کے گھر کھانا کھانے جاتے تھے اور ڈاکٹر اسماعیل اور صوفی اقبال میرے پاس رہتے تھے، ان کھانے والوں کی آمد کے بعد یہ دونوں گھر چلے جاتے تھے، ۸:۳۰ پر عصر کے لیے روانگی اور پونے دس بجے پر واپسی، اس کے بعد مجلس عامہ مدرسہ شرعیہ کے صحن میں اور ۱۱:۳۰ پر مغرب کے لیے حرم کی روانگی، بعد عشاء ۲:۳۰ پر واپسی، اس کے بعد دستر خوان عامہ۔

مولوی سعید خان صاحب کا اصرار تھا کہ رات کا کھانا مسجد نور ہوا کرے، مگر چوں کہ بہت سے احباب اپنا اپنا کھانا لے کر آتے تھے تو ان سب کو مسجد نور جانے میں دِقت ہوتی اس لیے بمشورہ قاضی صاحب یہ قرار پایا کہ کھانا تو مدرسہ شرعیہ ہی میں ہو کہ بہت سے رفقاء کو سہولت رہے گی، چونکہ گرمی بہت شدید تھی اور مسجدِ نور میں بہت ہوادار جگہ، صبح کو ناشتے کے بعد ایک بجے مسجدِ نور سے واپسی طے تھی، مگر اس پر عمل نہ ہوا کہ ناشتہ بہت لمبا ہوتا تھا، صبح کی نماز کے بعد مجلسِ ذکر ہوتی پھر تھوڑی دیر لیٹتے، پھر رفقاء ناشتہ کرتے، قرار یہ تھا کہ واپسی میں بقیع قیام ہو مگر دھوپ اتنی شدید ہو جاتی کہ اس کا تحمل دشوار ہوتا، حتیٰ کہ اس کی وجہ سے شدت سے بخار کا سلسلہ شروع ہوا، البتہ منگل کی شب میں چونکہ مسجد نور کا اجتماع ہوتا تھا اس لیے مغرب پڑھتے ہی وہاں روانگی ہو جاتی تھی اور عشاء بھی وہیں ہوتی تھی۔

اس ناکارہ کی کفالت، ٹکٹ کا بھیجنا وغیرہ امور مستقلاً عزیز الحاج محمد سعید رحمہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ رہتا تھا اور میرے آنے کے بعد ویزے میں توسیع کی ہمیشہ کوشش شروع کر دیتا تھا، چنانچہ اس

مرتبہ بھی عزیز موصوف نے آنے کے بعد سے ہی کوششیں شروع کر دی اور شیخ محمد صالح قزاز امین عام رابطہ کے ذریعہ سے سلسلہ جنبانی شروع کی، شیخ صاحب کو بھی اس کا بہت اہتمام تھا، وہ بھی عزیز سعدی پر بار بار تقاضا کرتے رہتے تھے کہ درخواست جلد بھیجنی چاہیے کہ دفتروں میں بہت دیر لگ جاتی ہے، عزیز سعدی کا خیال تھا کہ مولانا عبداللہ عباس صاحب کہیں سفر پر گئے ہیں اُن کی واپسی پر رکھا جائے، مگر شیخ صالح کا خیال تھا کہ اس میں تاخیر کا احتمال ہے وقت کے اندر توسیع ہونی چاہیے، اس نابکار وسیہ کار پر مالک کے **لا تعد و لا تحصی** احسانات میں سے یہ بھی ہے کہ حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدۂ اعلیٰ اللہ مراتبہ کے وصال کے بعد سے سلسلہ کے اکابر علماء کی حد سے زیادہ خصوصی توجہات رہیں۔

مولانا یوسف بنوری ناظم مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن کراچی سے پاکستان کے سفر میں اور حجاز میں متعدد دفعہ ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور ہر بار ملاقات میں ان کی شفقتیں پہلے سے زیادہ بڑھتی رہتی تھیں، ان پر اللہ جل شانہ کے احسانات میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ اُن کے لیے حجاز آنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی، اخیر عشرہ رمضان کا مدینہ منورہ کا اور حج کا سفر تو مستقل مولانا کے لیے سبب آمد ہے اور درمیان سال میں بھی جب جی چاہتا ہے تشریف لا سکتے ہیں۔

مولانا افریقہ کے اجتماع کے بعد یورپ کا دورہ کر کے ۳۰ مئی کو بذریعہ طیارہ جدہ اور اسی وقت مدینہ منورہ بذریعہ کار پہنچے اور فرمایا کہ میں نے سفر ہی میں یہ نیت کر لی تھی کہ واپسی میں سب سے پہلے روضۂ اقدس کی زیارت کروں گا، اس کے بعد تم سے ملوں گا، پھر کسی اور سے ملوں گا، مولانا کا کئی دن قیام رہا اور مولانا کی وجہ سے مکی علماء کثرت سے مولانا سے ملنے آتے رہتے تھے اور چونکہ مولانا عصر کے بعد مستقل طور پر میرے پاس تشریف لاتے تھے اس لیے عصر کے بعد جو مجمع آتا وہ سید ھا مدرسہ شرعیہ آتا، دو تین دن بعد عصر کے بعد کی مجلس میں مکی علماء کے ساتھ استاذ الحرم الشیخ محمد علوی المالکی بھی تشریف لائے، ان علماء میں سے کسی نے مجھ سے پوچھا کہ کب تک قیام ہے میں نے کہہ دیا کہ تین ماہ کا ویزا ہے، الشیخ الاستاذ محمد علوی نے کہا کہ یہ نہیں ہوسکتا، آپ تین مہینے میں ہرگز نہیں جا سکتے۔

اس کے والد شیخ علوی اکابر علماء میں تھے اور ''اوجز المسالک'' کی وجہ سے اس نا کارہ سے کئی سال سے غائبانہ واقف، حجاج کی معرفت مرحوم کے پیام سلام بھی پہنچا کرتے تھے ان کا یہ مقولہ بھی کئی دفعہ پہنچا کہ اگر شیخ زکریا مقدمہ میں اپنے آپ کو حنفی نہ لکھتے تو میں کسی کے کہنے سے بھی اُن کو حنفی نہ مانتا، میں اُن کو مالکی بتاتا اس لیے کہ ''اوجز المسالک'' میں مالکیہ کی جزئیات اتنی کثرت سے ہیں کہ ہمیں اپنی کتابوں میں تلاش میں دیر لگتی ہے اور اس میں سہولت سے مل جاتی ہیں۔

میری ۸۳ھ والی آمد پر مرحوم نے اپنے صاحبزادے محمد علوی کو بہت اہتمام سے بار بار میرے پاس بھیجا، اُس وقت استاذ محمد علوی کو بہت خصوصی تعلق پیدا ہو گیا اور والد مرحوم کے بعد اُن کی جگہ استاد الحرم المکی بنائے گئے، اس کے بعد سے جب بھی اس ناکارہ کی حجاز آمد ہوتی ہے اور حرم مکہ میں میری آمد کی خبر اُن کو ہو جاتی ہے تو سبق کے بعد بہت اہتمام سے مع شاگردوں کے آکر ملتے ہیں۔

استاذ علوی کے اصرار پر میں نے کہہ دیا کہ عزیز سعدی کوشش کر رہا ہے آپ اس سے ملاقات کر لیں، انہوں نے کہا کہ ضرور کروں گا، مجھے چونکہ یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان دونوں کوششوں میں مزاحمت نہ ہو، اس لیے میں نے مولانا علوی سے کوشش کرنے کو قبول نہیں کیا، البتہ مکہ ایک آدمی جا رہا تھا، اس کے ذریعہ دستی خط عزیز سعدی کو لکھا جس میں مولانا علوی کی گفتگو نقل کی، عزیز موصوف نے اسی وقت ایک مستقل آدمی ایک خط میرے نام اور ایک مولانا علوی کے نام لے کر مدینہ بھیجا مجھے لکھا کہ ضرور مان لیجئے اس سے بہتر ذریعہ نہیں ملنے کا اور ایک بند خط مولانا علوی کے نام بھیجا جس کا مضمون مجھے معلوم نہیں، میں نے جواباً لکھدیا کہ وہ تو واپس جا چکے ہیں، مگر میں نے ان سے وعدہ لے لیا کہ آپ سے ملیں اس کے بعد کی کاروائی معلوم نہیں کیا ہوئی اور درخواست کس نے لکھی، کس ذریعہ سے گئی۔

مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ میں جون ۷۳ھ کی ۱۷ تاریخ مطابق ۱۶ جمادی الاولیٰ ۹۳ھ کو جب میں مغرب کو بیٹھا ہوا تھا کہ حاجی دلدار جو ملک عبدالحق صاحب کی دوکان میں ملازم ہیں وہ بھاگے ہوئے آگئے اور مجھ سے اقدام عالیہ میں ملے اور کہا کہ سعدی کا ٹیلیفون آیا ہے، آپ کو مبارکباد دی ہے، میں تو خالی الذہن تھا، ویزا یاد بھی نہیں رہا تھا، اس نے کہا کہ اقامہ بن گیا ہے، میں نے وہاں لمبی چوڑی بات نہیں کرنی چاہی (اس ناکارہ کا معمول حرمین میں مغرب سے ایک گھنٹہ پہلے جا کر عشاء بعد واپسی کا ہے) عشاء کے بعد آکر معلوم ہوا کہ حاجی دلدار نے تو سارے مدینہ میں اودھم مچا دیا، اتنا عزیز سعدی نے بھی کہا کہ تمہارا اقامہ معجزہ ہی ہے، یہاں دس دس پندرہ پندرہ برس سے لوگ پڑے ہوئے ہیں مگر اب تک باوجود بڑوں بڑوں کی سفارش کے بھی نہیں بنا، عزیز موصوف نے یہ بھی کہا کہ درمیانی عملہ کو اس پر غصہ بھی ہے کہ یہ بالا بالا بادشاہ تک کیسے پہنچ گیا، اس لیے کہ اس ناکارہ کا اقامہ براہِ راست ملک فیصل مرحوم نے بغیر مجلس کے خود ہی منظور کر کے بھیج دیا، عزیز سعدی نے لکھا کہ درمیانی عملہ کو اس پر تعجب ہے کہ ہماری بغیر منظوری درخواست کیسے چلی گئی، بہر حال اس میں شیخ صالح قزاز ار شیخ محمد علوی کی مساعی جمیلہ کو دخل ہے، اللہ تعالیٰ دونوں کو جزائے خیر دے، اقامہ تو ضابطہ کی کاروائیوں کے

بعد بہت تاخیر سے ملا، اقامہ کی ابتداء ۲۳ جمادی الثانیہ ۹۳ھ کو ہوئی۔
اس ناکارہ کی تمنا وخواہش عرصہ سے رائے ونڈ اور بھوپال کے اجتماع میں شرکت کی ہمیشہ رہی اور احباب کے اصرار پر ایک دفعہ کلکتہ کا بھی وعدہ اور ارادہ رہا اور اپنے قلبی تقاضہ سے رائے بریلی کا بھی کئی سال سے تقاضا ہو رہا ہے، مگر جب بھی ارادہ کیا کوئی مانع پیش آتا رہا، اس مرتبہ اہل رائے ونڈ کا مشورہ یہ ہوا کہ میں حجاز سے واپسی پر رائے ونڈ کے اجتماع میں شرکت کر کے سہارنپور پہنچ جاؤں رمضان وہاں گذار دوں، اس سلسلہ میں پاکی احباب تو پاکی ویزے کی بہت امیدیں دلاتے رہے اور ہندوستان کی سفارتِ جدہ کے سفیر صاحب نے تو شروع ہی میں انکار کر دیا تھا کہ میرے اختیار میں نہیں، مگر چونکہ سفیر صاحب پہلی مرتبہ سفیر بن کر آئے ہیں قواعد سے واقف نہیں، اس لیے قاضی صاحب، مفتی زین العابدین صاحب مولانا اسعد صاحب کا اصرار تو یہ رہا کہ مرور کے واسطے سفارت کی اجازت کی ضرورت نہیں، مگر علی میاں جو رابطہ کی طرف سے افغانستان، ایران کے دورہ پر تجویز ہوئے تھے اور ۲۳ جون کو مکہ اور مدینہ پہنچ گئے تھے اور اتوار کو لبنان کا سفر تجویز تھا ان کی رائے زکریا کے موافق تھی کہ تجھے بغیر اجازت سفارت ہند کے جانا نہیں چاہیے اس لیے کہ ہمارے پاسپورٹ پر پاکستان کٹا ہوا ہے، مگر قاضی صاحب کا اصرار تھا کہ ہم نے کئی ملکوں کے سفر کیے ہیں جہاز کی اجازت نہیں مگر مرور میں کوئی حرج نہیں اور مولوی اسعد قاضی صاحب کے ہم زبان تھے کہ میں نے کئی ملکوں کے سفر اسی طرح کیے، پاسپورٹ پر لکھوانے کی ضرورت نہیں، مفتی زین العابدین صاحب ۱۲ اگست کو مدینہ منورہ پہنچے انہوں نے فرمایا کہ پاکستانی ویزا کے کاغذات سب مکمل کرا آیا ہوں، پرسوں جہاز کے وقت تک آ نہیں سکا تھا، اب روانہ ہو گیا ہوگا، مگر پاکستان سے خطوط اور برقیات پہنچتے رہے کہ فلاں وجہ سے دیر ہوئی، مفتی صاحب، قاضی صاحب کا اصرار یہ ہوا کہ پاکستانی ویزا تو پہنچ گیا ہوگا، مکہ چل کر ہندوستانی کی کوشش کرنی چاہیے، چنانچہ ۲۳ اگست کو مفتی صاحب مع اہلیہ کے مکہ گئے اور شام کو اُن کا ٹیلیفون آیا کہ سفارتِ پاکستان نے پوچھا ہے کہ زکریا ہے کون؟ اس کو لکھو، کراچی کی سفارت سے جدہ کی سفارت کو آیا کہ زکریا کون ہے؟ جس پر قاضی صاحب کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور بھائی یوسف رنگ والوں کا پندرہ اگست کا خط ملا کہ روانہ ہو چکے، جس سے اور بھی زیادہ تعجب ہوا، سفارت ہند میں جدہ کے ایک صاحب نے یہ وعدہ کرالیا تھا کہ ایک ماہ کا حق سفر صاحب کو ہے اور پندرہ دن کا مجھے، میں پندرہ دن کی اجازت خود بھی دے دوں گا، مگر اتفاق سے ڈاکٹر ظفیر صاحب سے اُن کی ملاقات پر اور دریافت پر ان صاحب نے جنہوں نے وعدہ کیا تھا زکریا کا حال دریافت کیا، انہوں نے وہ آسمان زمین کے قلابے ملائے کہ اتنے مرید ہندوستان میں اور اتنے پاکستان میں ہیں، اس نے کہا کہ اتنے مشہور کو

میں اجازت نہیں دے سکتا، قاضی صاحب کے اصرار پر ہم لوگ ۲۵ اگست شنبہ کی شام مولوی عبد اللہ عباس کی گاڑی میں مکہ کے لیے روانہ ہوگئے، وہاں پہنچ کر ایک طرف تو سفارت ہند میں کوششیں ہوتی رہیں اور دوسری طرف پاکستانی ویزے کا انتظار رہا، بقیہ رفقاء عبدالوحید کے ساتھ ملک صاحب کی گاڑی میں مع سامان روانہ ہوئے، مغرب بدر میں پڑھی، رفقاء نے چائے پی، وہاں سے چل کر ۴ بجے شام کو عزیز سعدی کے مکان پہنچے اس کے بعد فوراً پیشاب وضو کے بعد حرم گئے، اولاً عشاء کی نماز پڑھی، پھر طواف کیے اور سعدی کے یہاں روانہ ہوگئے، مگر قاضی صاحب اور حبیب اللہ ٹھہر گئے کہ ہم سعی کر کے آئیں گے، یکشنبہ کی صبح کو ۲ بجے عربی چل کر سعی کرتے ہوئے دیوان میں پہنچے، بقیہ رفقاء جو عبدالوحید کے یہاں تھے وہ بعد میں پہنچے معلوم ہوا کہ محمد بن ملک عبدالحق نے ناشتہ میں بہت زور باندھے تھے۔ اس لیے دیر ہوگئی، زکریا نے محمد کو تنبیہ کی کہ تو نے ۱۰، ۱۲ ہی چیزوں پر قناعت کی، تیرے پاس پیسے نہیں تو کسی سے قرض لے لیتا۔

چونکہ رائے ونڈ کا اجتماع قریب آ گیا تھا اس لیے زکریا نے کوشش کر کے ۹ ستمبر ۷۳ء مطابق ۱۲ شعبان ۹۳ھ کو قاضی صاحب کو اور مولوی سعید خان صاحب کو روانہ کر دیا، اس لیے کہ ۱۶ تا ۱۸ ستمبر اجتماع رائے ونڈ میں تھا اور زکریا مکہ میں عزیزان عاقل سلمان کے انتظار میں جن کا بحری جہاز سے آنا تجویز تھا، ٹھہر گیا، مکہ کے قیام کا نظام پہلے لکھ چکا ہوں کہ گرمی کی وجہ سے رات سعدی کے یہاں گزرتی تھی، عشاء کے بعد صولتیہ کے دیوان میں کھانا کھانے کے بعد جو حسب معمول چندہ کا ہوتا تھا کہ متعدد احباب اپنا اپنا کھانا لے کر آتے تھے مگر ہر ایک اپنے کھانے کے بعد ایک کھانا میرا بھی، جس کی وجہ سے بے تکلف ۲۰، ۲۵ مہمانوں تک کو دعوت دے دیتا تھا، کھانے کے بعد پیشاب وضو سے فارغ ہو کر حرم شریف طواف کے لیے جانا ہوتا اس لیے کہ میں اپنی ٹانگوں کی معذوری سے عربیہ پر کرتا تھا جس میں عزیز سعدی کا ہونا تو بہت ضرور تھا اس لیے کہ عربیہ کا اجازت نامہ اُسی کے پاس رہتا تھا، عزیز موصوف نے اس کے فوٹو تو کئی کرا رکھے تھے، لیکن اس سے مدیر حرم بھی واقف تھا اور بڑے بڑے شرطی بھی، اس لیے اوروں کو دق ہونا پڑتا، اس کو سہولت سے شرطی چھوڑ دیا کرتے تھے، ان طوافوں میں عزیزان عبدالقدیر اور حسان میں مقابلہ بھی ہوتا تھا کہ یہ دونوں میری گاڑی کو بہت چلاتے تھے، میں نے رفع نزاع کے واسطے چار چار طواف ہر ایک کے مقرر کر دیئے تھے مگر ہر ایک اپنے نمبر پر کوشش کرتا کہ اس کے پانچ ہو جائیں، میں تو دونوں کے پانچ پانچ کر دیتا، مگر ہمارے قاضی صاحب خود تو طواف دن میں بھی کر آتے مگر اُس وقت مجھ پر کنٹرول کرتے کہ سونا بھی ہے، اس لیے ۸ سے زیادہ عموماً نمبر نہیں ہوتا تھا، یہ طواف میں اپنے اکابر، اعزہ، احباب اور محسنوں کی طرف سے کرتا رہتا تھا۔

عزیزان عاقل سلمان ابوالحسن مع اپنی مستورات کے حجازی ۲۷ شعبان کے مطابق ۲۴ ستمبر دوشنبہ کو پہنچے، میں تو بھلا جدہ کہاں جاتا، ایک ڈاکٹر جو مکہ میں رہا کرتے تھے اور حجاج کی خبر گیری ان کے ذمہ تھی اتفاق سے صولتیہ عشاء کے بعد کی مجلس میں آئے اور باہر کھڑے ہو کر عزیز شمیم کو بلایا اور میرا دسترخوان بچھا ہوا تھا میں نے بجائے شمیم کے جانے کے ان سے کہہ دیا کہ یہاں پردہ نہیں ہے، یہیں تشریف لے آیئے، ان کو دیکھ کر عزیز شمیم نے بڑی تعریف کی چناں ہیں چنیں ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ بہت اچھے موقع پر آئے اور میں نے بہت اچھا کیا کہ آپ کو بُلا لیا، میری مستورات فلاں جہاز سے پرسوں ترسوں کو آرہی ہیں اُس میں آپ جو مدد کر سکتے ہوں، انہوں نے کہا یہ وہی مستورات ہیں جن کے متعلق عزیز عبدالقدیر نے مدینہ میں مجھ سے بات کی ہے؟ میں نے کہا کہ ضرور، میں جب گودی پر جاؤں تو میری کار میں بیٹھ جانا، عبدالقدیر جو صبح ہی سے جدہ گیا تھا ان کی یا کسی اور کی کار میں گودی پر پہنچ گیا، گودی والوں نے سمجھا کہ ڈاکٹر صاحب کا ملازم ہے، اس نے جہاز پر چڑھ کر سامان کے لیے ایک مزدور سے بات چیت کر لی، چونکہ جہازوں کا ہجوم بہت تھا اس لیے محمدی جہاز کے کپتان نے وائرلیس سے جدہ کے کسٹم افسر سے پوچھا کہ اگر تم میرے جہاز کو جلدی لے تو میں جس طرح ہو سکے فلاں دن کو آجاؤں ورنہ اطمینان سے آؤں، عزیز سعدی، ماموں یامین وغیرہ جو بچوں کے استقبال کے لیے جدہ دوپہر سے گئے ہوئے تھے ٹیلیفون سے معلوم کر کے جہاز شام کو پہنچے گا بھائی شجاع کے گھر چلے گئے۔ ابوالحسن اور مفتی محمود صاحب سامان کی وجہ سے کسٹم میں رہے اور جہاز ۳:۳۰ بجے ہندی پہنچ گیا۔

عبدالقدیر نے جہاز پر جا کر ڈاکٹر صاحب کی مدد سے بچیوں کے پاسپورٹ کی تکمیل کرائی اور عبدالوحید کی گاڑی میں بھائی شجاع کے گھر پہنچ گیا، حاجی محمد سردار جو تبلیغی جماعت کے بڑے کارکن ہیں انہوں نے بڑے احتیاط سے سامان کو مدینۃ الحجاج میں پہنچا دیا، سعدی فوراً معلم کے وکیل کے یہاں گیا اور وہاں سے کاغذات کی تکمیل کے بعد بھائی شجاع کے گھر آکر سب نے کھانا کھایا اور مستورات کو لے کر عبدالوحید کی گاڑی میں ۵ بجے رات کو گھر پہنچا جبکہ زکریا اُسی وقت طواف سے فارغ ہو کر پہنچا تھا، بھائی سلیم کا تقاضا مستورات کو بُلانے کا دوسرے ہی دن تھا، مگر سامان کی گڑبڑی کی وجہ سے دو چار روز بعد گئیں، بھائی سلیم صاحب نے بڑی زوردار دعوت کی دو تین دن میرے عمرے کا نظام بدستور رہا۔ اس میں لڑکے میرے ساتھ رہتے مگر علی التوالی ایک عورتوں کے ساتھ رہتا، میں طواف سے فارغ ہو کر عبدالحفیظ کی گاڑی میں سعدی کے گھر پہنچ جاتا اور عورتیں بعد میں عبدالحفیظ کی دوسری گاڑی میں پہنچتیں۔

جمعرات کو مکہ میں پہلا روزہ ہوا اور دھلی میں شنبہ کا پہلا روزہ ہوا، رمضان کا نظام یہ رہا کہ بھائی سلیم کے یہاں سے کھانے سے فراغ کے بعد سیدھے تنعیم جاتے وہاں سے احرام عمرے کا باندھ کر طواف سعی سے فارغ ہوکر پھر عزیز سعدی کے یہاں جاتے، جمعہ اور شنبہ کی درمیانی شب میں سحر کے قریب ابوالحسن نے مجھے جگایا کہ میں جب ہی لیٹا تھا، ابوالحسن نے روتے ہوئے یہ خبر سنائی کہ بھائی ہارون کا انتقال ہوگیا جو جمعہ کے دن ۱۱:۳۰ بجے دوپہر کو ہوا تھا، اُسی وقت نظام الدین سے بمبئی ٹیلیفون کیا گیا تھا کہ زکریا کو اطلاع کردو۔

حاجی یعقوب صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ وہ ان کاموں میں بہت مستعد اور ہم لوگوں سے زیادہ ہمت والے ہیں، انہوں نے اس ٹیلیفون کی ایک نقل ایک پرچہ پر کرکے مطار پر بھیجی کہ جمعہ کی شام کو جہاز آرہا تھا اس میں ڈاکٹر ظفیر صاحب جو میرے بہت ہی محسن قدیم کرم فرما ہیں ان کو دیا کہ یہ بہت ہی اہم کاغذ ہے اس کو زکریا تک جلدی پہنچانا ہے، انہوں نے ۸ بجے داؤد ساعاتی کو دیا انہوں نے اولاً صولتیہ میں ٹیلیفون کیا وہاں کوئی نہ بولا تو ماموں یامین کو کیا، اُنہوں نے سعدی کے یہاں ٹیلیفون کیا کہ ڈاکٹر ظفیر بہت اہم پرچہ زکریا کے نام لائے ہیں، ابوالحسن اور سعدی نے کہ دونوں ٹیلیفون پر تھے کہا کہ یہ پڑھ کر بتادیجئے، بھائی داؤد ساعاتی نے پڑھ کر حادثہ کی اطلاع دی، زکریا نے سعدی اور ابوالحسن کو کہہ دیا کہ ابھی تو نہ بچوں کو خبر کریں نہ گھر میں، سحری ضائع ہوگی، سحری کے بعد بچوں کو خبر کردیں اور کہہ دیں کہ مستورات کو سوکر اُٹھنے سے پہلے نہ کہیں۔

سحری کے وقت عزیزان عاقل سلمان کو خبر تو نہ کی گئی مگر وہ سعدی اور ابوالحسن کے انداز سے کچھ سوچ میں پڑے رہے، کھانا کھانے کے بعد ان دونوں نے لڑکوں کو حادثہ کی اطلاع دی اور ساتھ ہی مستورات کو اطلاع کرنے سے منع کردیا، مگر معلوم نہیں کس طرح مستورات کو بھی سحری کے بعد علم ہوہی گیا میں نے سوکر اُٹھنے کے بعد بچیوں کو بلایا اور اپنے دستور کے موافق ان سے کہا کہ تمہیں تو میرا قانون معلوم ہے، رنج وغم فطری چیز ہے مگر رونے سے نہ تو تمہیں کچھ فائدہ نہ مرحوم کو، جاؤ دن بھر بیٹھ کر مرحوم کے لیے کچھ پڑھو اور رات کو مرحوم کی طرف سے عمرے کرو۔

ان کا دستور پہلے سے بھی عشاء کے بعد دوسری گاڑی میں تنعیم جانے کا تھا، اللہ تعالیٰ اُن کو بہت جزائے خیر دے کہ انہوں نے ہر موقع پر میری نصیحت پر بہت ہی زیادہ عمل کیا، صبح کو جب صولتیہ پہنچا تو معلوم نہیں مکہ میں یہ خبر کیسے پھیل گئی، پچاسوں افراد صولتیہ پہنچ گئے اور ہر شخص نے یہ کہنا شروع کردیا کہ بڑا صدمہ ہوا، بہت ہی رنج ہے، کب ہوا؟ کس طرح ہوا؟ میں نے ان سب سے خطاب کرکے کہا کہ رنج وقلق تو فطری چیز ہے مگر اس سے نہ تو مرحوم کو کوئی فائدہ اور نہ میری تعزیت ہوتی ہے، آپ ہی بتایئے کہ آپ نے خبر سننے کے بعد اس کو کیا بھیجا؟ میرا ان

حوادث میں فضول باتیں کرنے کو جی نہیں چاہا کرتا، آپ جایئے، ہوسکے تو اُس کی طرف سے عمرے کیجئے ورنہ کم سے کم طواف۔

سب اُٹھ کر چلے گئے اور جب عشاء کے بعد میں حسبِ معمول عمرے کو جانے لگا تو معمول کے خلاف بہت بڑا مجمع ساتھ تھا اور یکے بعد دیگرے تنعیم گاڑیاں پہنچتی رہیں، تنعیم پہنچ کر میں نے ان دوستوں سے دریافت کیا کہ ہارون کو کیا کیا بھیجا؟ بلا توریہ بلا مبالغہ مجھے دو (۲۰۰) سو سے زیادہ عمروں کی فہرست ملی، اللہ تعالیٰ ان دوستوں کو جزائے خیر دے بعضوں نے دو دو تین تین بھی عمرے دن میں کیے، اس کے بعد سے مکہ کے قیام تک تو روزانہ جب میں عمرے کو جاتا رہا مجھے ۲۰، ۳۰ عمروں کی بشارت ملتی تھی اور ۱۵ کو جب میں مدینہ منورہ روانہ ہوگیا تو وہاں کے دوران قیام ختم قرآن اور مالی ایصال ثواب کا مژدہ سنتا رہا جس سے بڑا ہی جی خوش ہوا، اللہ تعالیٰ نے مرحوم پر بڑا ہی فضل فرمایا کہ اتنے عمرے وہ بھی رمضان کے کہ ''عمرة في رمضان كحجة معي'' کے اس کو ملے، حسبِ معمول کہ میرا جو رمضان حجاز میں ہوتا ہے اس کا نصف اول مکہ میں عمروں کے شوق میں اور نصف آخر مدینہ پاک میں مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اعتکاف کی طلب میں۔

اس مرتبہ بھی ۱۵ رمضان کی تراویح پڑھ کر مع بچوں کے چلے، بدر میں سحری کھائی اور تھوڑی دیر سو کر صبح کی نماز کے بعد شہداء کی زیارت کر کے عربی ۳ بجے مدینہ منورہ پہنچ گئے، مستورات کے لیے صوفی اقبال کے گھر میں پہلے سے دو کمرے محفوظ کر رکھے تھے، بڑے میں عزیز عاقل مع اپنے اہل و عیال اور چھوٹے میں عزیز سلمان اہل وعیال، ابوالحسن چونکہ رات کو میرے پاس سوتا تھا اس لیے اس کی اہلیہ اُوپر کی منزل میں صوفی اقبال کی اہلیہ کے ساتھ رہتی تھی۔

شروع رمضان میں چونکہ رویت کا ثبوت دیر میں ہوا تھا اس لیے پہلی شب میں قرآن شریف شروع نہیں ہوا تھا، دوسری تاریخ سے شروع ہوا تھا، حرمین کا معمول ایک پارہ روز پڑھنے کا ہے، دس رکعت میں ایک امام آدھا پارہ پڑھتا ہے اور دوسری دس میں دوسرا امام آدھ پارہ پڑھتا ہے، ۱۵ کی شب میں یہاں ۱۴ پارے ہوئے تھے، خیال یہ تھا کہ حسبِ معمول مدینہ منورہ میں جا کر جوڑ مل جائے گا، مگر یہاں امام صاحب نے ۱۶ کی شب میں پارہ نمبر ۱۷ سے شروع کیا جس کی وجہ ایک تو یہ ہوئی کہ یہاں پہلی شب کو قرآن شروع ہوگیا تھا، دوسری وجہ یہ ہوئی کہ مکی امام ایک پارہ روز پڑھتے ہیں قرآن پورا ہو یا نہ ہو اور مدنی امام ایک پارہ تھوڑا تھوڑا کر کے وسط میں پڑھ لیتے ہیں اور ۲۹ کو قرآن ختم کر دیتے ہیں۔

بہر حال ہم لوگوں سے جو دو پارے رہ گئے تھے وہ عزیز سلمان نے اعتکاف کے زمانہ میں تیئیسویں (۲۳) شب میں پڑھے، رفقاء سے کہہ دیا تھا کہ امام کے ساتھ تراویح کی نیت نہ

کریں نفلوں کی نیت کریں دو پارے اور چوبیسواں پارہ اس شب کا عزیز سلمان نے چار رکعت میں سنائے۔

عزیزم مولانا اسعد سلمہ اور عزیزم مولوی ارشد نے بھی یہ رمضان مدینہ ہی میں گزارا تھا کہ اس سے پہلے سال جب وہ حج کو آئے تھے تو بھائی حبیب کے کہنے پر وہ وعدہ کر گئے تھے کہ اگلا رمضان میں مدینہ کروں گا اور زکریا کو بھی ساتھ لاؤں گا، چنانچہ وہ افریقہ وغیرہ کے طویل سفر سے لوٹ کر رمضان سے ایک ہفتہ پہلے مکہ پہنچ گئے تھے اور عزیز ارشد ہندوستان سے ۲۹ ہندی کو مکہ پہنچ گئے تھے اور مولوی اسعد مدینہ سے عمرہ کی نیت سے جمعہ کو مکہ پہنچ گئے، وہاں دونوں کی ملاقات ہوئی اور عمرہ کے بعد دونوں مدینہ آئے، رات کو طواف میں ان دونوں عزیزوں سے ملاقات ہوئی، یہ دونوں تو طواف اور عمرے سے فارغ ہو کر جدہ روانہ ہوگئے اور وہاں سے اگلے دن مدینہ منورہ۔

مولانا بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق اُوپر لکھوا چکا ہوں کہ ان کا اخیر عشرہ رمضان مدینہ میں گزرتا ہے وہ بھی ۲۰ رمضان کو مدینہ منورہ پہنچ گئے تھے، مدینہ پاک میں اعتکاف کی جگہ بابِ سعود سے بابِ عمر تک اور وہاں سے بابِ مجیدی تک ہوا کرتی ہے، اس مرتبہ اس سیہ کار کا معتکف بابِ سعود سے ذرا آگے چل کر تھا اور اس سے آگے چل کر بابِ عمر کے قریب عزیز مولوی اسعد سلمہ کا اور ان کے مقابل بابِ عمر کی دوسری جانب مولانا بنوری کا، مسجد کی تراویح کے بعد اس ناکارہ کے معتکف پر وہ دونوں حضرات بھی کبھی کبھی تشریف لے آتے اور کچھ تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنے اپنے مستقر پر جا کر اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتے۔

۲۶ ویں رمضان کی شب میں اسرائیلی جنگ کی بڑی سخت خبریں سننے میں آئیں مولانا بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کل کو ختمِ بخاری کرنا ہے، میری عقل میں نہ آیا کہ کس طرح ہوسکتا ہے، میں نے کہا کہ یہاں بخاری پڑھنے والے کہاں ملیں گے اور پارے کہاں ملیں گے؟ انہوں نے فرمایا کہ اس سال اعتکاف میں علماء کی جماعت بہت زیادہ ہے، زیادہ تر تو تیری وجہ سے آئے ہوئے ہیں اور کچھ تھوڑے سے میرے ساتھ ہیں، مجھے پھر بھی یقین نہ ہوا، یہ تو میں خبریں سن رہا تھا کہ اس ناکارہ کے اعتکاف کی وجہ سے بہت سے ملکوں کے احباب اعتکاف کے لیے آئے ہوئے ہیں، مگر میرا اندازہ نہ تھا کہ ان میں علماء اتنے ہوں گے مولانا بنوری نے کہا کہ پاروں کا انتظام میں کردوں گا، چونکہ مولانا نے مختلف مدارس اور احباب سے علی الصباح بخاری کے پارے جمع کر لیے اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب عربی ۴ بجے بخاری شروع ہو کر ۶ بجے پر ختم ہوگئی، ۵:۳۰ پر نماز ہوتی تھی، نماز کے بعد عزیز عبدالحفیظ نے دعاء کرائی اور مولانا بنوری کے اخلاص ہی کی برکت سمجھتا ہوں کہ رات کے ریڈیو پر جنگ کے بند ہونے کا اعلان ہوگیا۔

اس سال رمضان گزارنے والے حضرات تو مدینہ میں جمع ہو گئے تھے، مگر یہ ناکارہ اپنی نااہلیت سے ہر آنے والے سے یہ کہہ دیتا تھا کہ سہارنپور نہیں ہے، اپنے قیام وطعام کا انتظام خود کریں، اس لیے کہ مدینہ پاک میں کوئی ایسی اجتماعی جگہ نہیں ہے، جہاں مہمان سب اکٹھے رہ سکیں، چنانچہ میرے احباب سب اپنی اپنی تجویز سے مختلف جگہ قیام کا انتظام کرتے رہے اور بطور خود کھانے کا انتظام کرتے رہے مگر ہمارے قاضی صاحب کی رحمدلی نے اس کو گوارا نہ کیا کہ اعتکاف کے زمانہ میں بھی یہ حضرات اپنے کھانے کا انتظام کریں۔ زکریا نے قاضی صاحب سے کہلایا کہ جس کا انتظام آپ کریں دس روز کے ۴۰ ریال ہر شخص سے پہلے وصول کرلیں، جو جمع کرے اُس کا انتظام کریں، جو جمع نہ کریں اُس کا انتظام نہ کریں۔

قاضی صاحب نے اول تو کہا کہ میں خود زکریا سے بات کروں گا اور مجھ سے گفتگو میں یوں فرمایا کہ حضرت! اعتکاف کے دنوں میں تو سب کو اپنا ہی مہمان رکھیں۔ میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ قاضی صاحب نے ابوالحسن وغیرہ سے کہلوایا کہ میری ہمت تو پڑتی نہیں آپ اپنی طرف سے اعلان کرادیں زکریا نے ابوالحسن سے شدت سے اعلان کرادیا کہ قاضی صاحب صرف اُسی کا انتظام کریں گے جو ۴۰ ریال پیشگی جمع کرادے۔ لہٰذا بہت سے ایسے لوگوں نے جو بغیر اعلان کے یقیناً قاضی صاحب کے ذمہ ہوتے اعلان کے بعد اپنا انتظام کرلیا اس لیے کہ وہ ایک ریال روزانہ میں اپنی سحری اور افطاری کے کھانے کا انتظام سہولت سے کر سکتے تھے۔

میں نے قاضی صاحب سے کہا کہ آپ جس شخص کو بغیر داموں کے شریک کرنا چاہیں بہت شوق سے اور جن کے پیسے جمع کرائے ہیں رمضان بعد ان کے بھی واپس کر دیں تو بہت شوق سے بلکہ ضرور کر دیں۔ میں نے اس لیے اعلان کرایا کہ بغیر اس کے کھانے والے اتنے زیادہ ہو جائیں گے کہ انتظام آپ کے بس کا نہیں رہے گا۔ ایک دو آدمی ۴۰، ۵۰ کا تو سہولت سے پکا سکتے ہیں، دو سو سے زیادہ کا پکانا مشکل ہے۔ اس وقت قاضی صاحب نے بھی اس رائے کو پسند کیا، رمضان بعد جن سے پیسے لیے گئے تھے اُن کے واپس کیے، لیکن جن لوگوں نے واپس لینے سے انکار کیا ان کو رکھ لیا۔

۱۵ رمضان کو مکہ سے مدینہ آتے وقت یہ طے ہو گیا تھا کہ مولانا انعام صاحب یا علی میاں کسی کی آمد ہو جائے گی تو اس وقت بندہ دوبارہ حاضر ہو جائے گا اور حج تک قیام کرے گا مگر رمضان کے بعد سے زکریا کو اتنی شدت سے بخار کا سلسلہ روز افزوں شروع ہوا کہ سفر کی ہمت نہ رہی۔ رفقاء اور مکی احباب کا اصرار حج پر ہونا ہی چاہیے۔ مدنی صاحب کا بھی اصرار تھا کہ میں حج کو جاؤں اس لیے کہ وہ مجھے مدینہ چھوڑ کر حج کو جانا نہیں چاہتے تھے اور ان کی وجہ سے نیز اپنے جنازہ برداروں کی

وجہ سے دل میرا بھی چاہتا تھا کہ ضرور جاؤں۔ مگر بیماری نے ایسا زور باندھا کہ ہمت نہ ہوئی۔ اسی دوران شب ۱۲ ذیقعدہ میں زکریا نے خواب دیکھا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قاضی عبدالقادر صاحب کو پیام بھیجا ہے کہ زکریا کو حج پر لیجانے پر اصرار نہ کریں اور خود قاضی صاحب نے بھی ''بین النوم و الیقظہ'' دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم احرام تقسیم کر رہے ہیں اور زکریا پاس کھڑا ہے مگر تجھے احرام نہیں دیا اور میں قاضی صاحب دل میں سوچ رہا ہوں کہ اس کو احرام کیوں نہیں دیا۔ زکریا نے قاضی صاحب سے کہا کہ اب تو آپ نے خود بھی ملاحظہ فرمالیا کہ اس ناکارہ کو حج کو جانا نہیں ہے، مگر احباب کا اصرار ہوتا ہی رہا مگر یہ ناکارہ نہ گیا۔

مولانا انعام الحسن صاحب بمبئی سے بذریعہ طیارہ ۱۰ ذیقعدہ ۴ دسمبر منگل کو دبئی کے لیے روانہ ہوئے اور اسی دن عزیز زبیر، صوفی افتخار، ماسٹر محمود صاحب، زبیر کی اہلیہ اور ہمشیرہ کو لے کر بحری جہاز سے جدہ کے لیے روانہ ہوئے، ان دونوں بچیوں کی روانگی میرے سامنے طے نہیں ہوئی تھی ورنہ عاقل سلمان ہی کے ساتھ آجاتیں۔ ان کی روانگی کے بعد مولانا انعام صاحب کو خیال ہوا کہ یہ دونوں بچیاں بھی اگر چلی جائیں تو اپنی بڑیوں کے ساتھ حج کر لیں۔ میں تو ان کے تنہا آنے کی موافقت نہ کرتا کہ دونوں کمسن بچیاں تھیں اور دونوں کے ساتھ ایک ایک چوزہ بھی، مگر اچھا ہی ہوا کہ وہ دونوں بھی نمٹ گئیں، ورنہ اس سال تو ضعفاء اور عورتوں کا حج بہت مشکل ہو گیا۔

مولانا انعام صاحب ۴ دسمبر کی شام کو دبئی کے لیے روانہ ہوئے، دو دن دبئی قیام کے بعد ۷ کو شارجہ، ۸ کو ابوظہبی اور ۹ کو دوبئی واپسی ہوئی اور اس دن شام کو جدہ کے لیے روانہ ہوئے، عربی سوا چھ پر رات کو جدہ پہنچے، اسی وقت سعدی کے ساتھ مولوی محمد عمر، ماموں یامین، زعیم حشیم، شاہد جو مولوی انعام کے استقبال کے لیے جدہ گیا ہوا تھا، سعدی کے گھر روانہ ہوئے، وہاں پہنچ کر مدرسہ صولتیہ ٹیلیفون کیا اس لیے کہ شمیم کا اصرار سعدی پر یہ تھا کہ ان کو مدرسہ سیدھے لائیں اپنے یہاں نہ ٹھہرائیں، مگر صولتیہ سے کوئی جواب نہ ملا تو زعیم حشیم کو مدرسہ بھیجا کہ اگر وہ لوگ منتظر نہ ہوں تو مدرسہ آئیں، اس نے ٹیلیفون پر جواب دیا کہ یہاں کوئی نہیں صرف مفتی زین العابدین صاحب سو رہے ہیں، اس لیے مولانا انعام الحسن صاحب مع رفقاء عزیز سعدی کے گھر سو گئے اور صبح کو ½۲ بجے ناشتہ سے فارغ ہو کر مولانا عبداللہ عباس کی گاڑی میں مدرسہ گئے مدرسہ کا سالانہ اجتماع شروع ہو چکا تھا، عزیز شمیم خبر سنتے ہی مسجد میں لے گئے۔ عصر کے بعد مولانا انعام صاحب نے عمرہ ادا کیا اور عزیز زبیر مع اپنی مستورات کے ۱۸ ذیقعدہ کو مکہ پہنچے۔

مولانا انعام صاحب کو مکہ پہنچ کر زکریا کی بیماری اور حج کو نہ جانا معلوم ہوا تو انہوں نے زکریا کی عیادت کے لیے مدینہ آنے کا ارادہ کیا۔ زکریا نے شدت سے اصرار سے بار بار منع کرایا مگر وہ ۲۲

ذیقعدہ یکشنبہ کو عصر کے بعد مدینہ پہنچ گئے۔ عزیز زبیر، مولوی محمد عمر اور مفتی زین العابدین صاحب بھی ہمراہ تھے چونکہ مدرسہ میں قیام کی جگہ نہ تھی اس لیے یہ حضرات بعد عشاء کھانے کے بعد مسجد نور چلے گئے، پیر کی صبح کو پھر آئے اور بعد ظہر کھانے سے فراغ پر پھر مسجد نور گئے اور عصر کے بعد پھر آئے اور عشاء کے بعد گئے۔

۲۴ ذیقعدہ منگل کی صبح کو عزیز عبدالحفیظ کی بیجو میں یہ سب حضرات مکہ گئے، عزیزان عاقل سلمان مع اپنی زوجات کے ۱۹ ذیقعدہ کو عزیز عبدالحفیظ کی بیجو میں ۵ بجے روانہ ہو کر ایک بجے بعد مغرب عزیز سعدی کے گھر پہنچ گئے۔ سامان ان کا عزیز عبدالحفیظ کے ٹرک میں گیا قاضی صاحب، ابوالحسن صاحب عزیز حبیب اللہ زکریا سے مایوس ہو کر ۲ ذیقعدہ کو مکہ روانہ ہو گئے زکریا کے پاس مولوی اسماعیل بدات ڈاکٹر اسماعیل یحییٰ کراچوی عبدالوحید اور ڈاکٹر شہید الدین مولوی سلیمان پانڈور، صوفی اقبال، احمد ناخدار ہے۔ سبھی کا حج اس ناکارہ کی وجہ سے فوت ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان سب دوستوں کو حج کا بہترین بدلہ عطاء فرمائے۔

حج کے بعد عزیزان عاقل سلمان، ابوالحسن مع اپنی زوجات کے ۱۵ ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ سے جدہ کے لیے اور ۱۶ ذی الحجہ کو جدہ سے بمبئی کے لیے محمدی جہاز سے روانہ ہوئے اور ۲۶ ذی الحجہ کو ان کا جہاز بمبئی پہنچ گیا۔

عزیز شاہد میرے ساتھ طیارہ سے آیا تھا اور اس کے والدین اور اہل وعیال کی وجہ سے طبیعت کے خلاف میں نے عزیزان عاقل سلمان کے ساتھ جانا تجویز کر رکھا تھا اور اس کے طیارہ کے ٹکٹ کے دام کہہ دیا تھا کہ بمبئی جا کر واپس کرالے۔ مگر جب مولانا انعام الحسن کے ساتھ اس کی اہلیہ اور ہمشیرہ بھی پہنچ گئی تو پھر عزیز شاہد کا جانا بجائے عزیز عاقل کے ساتھ کے اس کی اہلیہ اور ہمشیرہ کے ساتھ تجویز کر دیا۔ اس لیے عزیز شاہد جدہ تک ان کو پہنچا کر مکہ واپس آ گیا۔

عزیز عاقل سلمان کے جہاز کے پہنچنے میں دو دن کی تاخیر ہوئی یعنی بجائے ۸ دن کے بمبئی ۱۰ دن میں پہنچا۔ عجائب قدرت کا کرشمہ ہے کہ محمدی جہاز میں پیٹرول کی کمی ہو گئی تھی، سعودی اور عدن کی بندرگاہوں نے تیل دینے سے انکار کر دیا اور وائرلیس سے فرانس کے تابع بندرگاہ جیبوٹی سے دریافت کرنے پر اس نے وعدہ کر لیا اور وہاں سے تیل لے کر آیا اس لیے تاخیر ہوئی۔

عزیزان عاقل سلمان کا جہاز بمبئی ۱۹ جنوری ۲۶ ذی الحجہ کو پہنچا۔ خالد انصاری وغیرہ ان کے استقبال کی مد میں ایک ہفتہ پہلے پہنچ گئے جس پر زکریا نے شدت سے نکیر کی کہ اول تو استقبال کے نام سے تفریح کے لیے آنا بہت بے محل تھا اور پھر خواہ مخواہ ایک ہفتہ پہلے آ کر دوسروں پر بوجھ بننا ہرگز مناسب نہ تھا۔ عزیزان مذکور ۲۰ جنوری ۲۷ ذی الحجہ کو بمبئی سے دہرہ ایکسپریس سے روانہ ہو کر

۲۸ کو سہارنپور پہنچے مگر راستہ میں میرٹھ سہارنپور کے درمیان ہنگامہ ہوجانے کی وجہ سے گاڑی ۸ گھنٹے لیٹ پہنچی جس کی وجہ سے سہارنپور والے بہت پریشان رہے۔

مولانا انعام الحسن صاحب نے مع اپنے رفقاء مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ کے اور عزیزان زبیر شاھد نے مع اپنی زوجات کے ۲۴ ذی الحجہ کو عزیز عبد الحفیظ کی بیجو میں عربی ۴ بجے چل کر ظہر بدر میں پڑھی اور وہاں کھانا وغیرہ جو سعدی نے بہت پُر تکلف ساتھ کیا تھا اور بدری مچھلیاں کھا کر شہداء کی زیارت کر کے عصر مسجدِ عریش میں پڑھ کر مغرب مدینہ پاک میں مسجدِ نور میں پڑھی اور وہاں چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر سامان اُتروا کر مع مستورات عشاء مسجدِ نبوی میں پڑھی۔

مستورات کو صوفی اقبال کے یہاں پہنچا دیا کہ عزیزان عاقل سلمان کے کمرے خالی تھے، ان دونوں میں زبیر شاہد مع اپنی زوجات مقیم ہوگئے اور مولانا انعام صاحب مع اپنے رفقاء مسجدِ نور چلے گئے، مولانا کا قیام مسجدِ نور ہی میں رہا، مولانا انعام الحسن صاحب مع اپنے رفقاء کے عزیز عبد الحفیظ کی گاڑی میں صبح اور ظہر پڑھ کر واپس چلے جاتے تھے اور عصر پڑھ کر تشریف لاتے تھے بعد عشاء کھانے سے فراغ کے تقریباً دو گھنٹے پھر شوریٰ میں خرچ ہوتے اس لیے کہ ان کے دن بھر کے مشوروں میں جو مسجدِ نور میں ہوتے تھے جن چیزوں کا ذکر زکریا کے مناسب ہوتا وہ اس مجلس میں طے ہوتی تھیں۔

دو تین دن مولانا انعام صاحب کی طبیعت ناساز رہی اس لیے بجائے ان کے زکریا مسجد نور جاتا رہا، جماعتوں کی رخصت ہمیشہ سے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا کرتی تھی مگر بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس سال مسجدِ نور ہی سے کرنی پڑی اس لیے زکریا یکم محرم جمعرات کو علی الصباح مسجدِ نور چلا گیا اور عصر کے بعد واپس آگیا کہ عصر کے بعد مستقل زکریا کے یہاں مجلس کا دستور تھا، دوسرے دن جمعہ ہونے کی وجہ سے زکریا نے صبح کی حاضری سے معذرت کر لی اور شنبہ کی صبح کو الوداعی مصافحہ کے لیے مسجدِ نور چلا گیا اور جماعتیں روانہ ہوئیں۔

ان مشوروں میں بڑا اہم مسئلہ جدہ کی مسجدِ بن لادن کے مرکز کے باقی رہنے کے سلسلہ میں تھا جو طویل الابحاث ہے، آخر فیصلہ یہ ہوا کہ بدھ کا اجتماع تو مسجدِ مذکور میں بدستور رہے اور جماعتوں کے قیام کے لیے مسجدِ عتیق جس کو جدید مرکز بنانے کے لیے جدہ کے عرب مصر تھے وہاں رہے، مسجدِ بن لادن میں جماعتوں کے ٹھہرنے پر طرفین کی طرف سے ناگوار واقعات پیش آرہے تھے۔

مولانا انعام الحسن صاحب مع اپنے رفقاء اور عزیزان زبیر و شاہد مع اپنی مستورات کے ۲۴ محرم ۹۴ھ مطابق ۱۶ فروری ۷۴ء مدینہ سے روانہ ہوئے، مولانا انعام صاحب کی رائے تو صبح کی نماز پڑھ کر ہی روانگی کی تھی مگر چھوٹے بچوں کی وجہ سے عبد الحفیظ کی گاڑی میں ۲ بجے روانہ

ہوئے کہ عزیزان کا بحری جہاز ۲۲ فروری کو جدہ سے روانہ ہونے والا تھا اور ان کو روانہ کرنے کے بعد مولانا انعام صاحب کا طیارہ سے سوڈان جانا تجویز تھا، مگر مولانا کا سفر سوڈان کا ویزانہ ملنے کی وجہ سے نہ ہوسکا۔

عزیزان زبیر و شاہد مع مستورات صوفی افتخار وغیرہ مکہ سے جمعرات ۲۹ محرم ۲۱ فروری کی صبح کو جدہ کے لیے روانہ ہوئے کہ جمعہ کے دن ان کا بحری جہاز تھا، جمعہ کے دن عربی چھ بجے جہاز پر سوار ہوئے آٹھ بجے روانگی کی اطلاع تھی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ جہاز رات بھر وہیں کھڑا رہا، شنبہ کی صبح کو روانہ ہوا اور حاجی یعقوب صاحب کا برقیہ مرسلہ ۴ مارچ جو چھ کو مدینہ پہنچا، اس میں ... تھا آج عزیزان زبیر و شاہد مع مستورات بخیریت پہنچ گئے۔

مولانا انعام صاحب کا سوڈان کا سفر تو ملتوی ہو گیا مگر ۴ صفر ۲۶ فروری کو ظہران سے مع رفقاء کے طیارہ سے تشریف لے گئے، وہاں ۲۴ گھنٹے قیام رہا، ۲۷ کو ظہران سے بذریعہ طیارہ بمبئی کے لیے روانہ ہوئے اور تین بجے شام کو بمبئی پہنچ گئے، مطار پر بہت بڑا مجمع تھا، مولانا نے دُعاء کرائی اور وہاں سے کھوکھا بازار کی مسجد میں تشریف لے گئے، عشاء کے بعد بمبئی کی جامع مسجد میں اجتماع طے تھا، اُس میں مولانا نے تقریر کی اور یہاں کے چار روز قیام میں پونہ، بھیمڑی، باندرہ اور گورے گاؤں کا دورہ ہوا، پہلے سے بمبئی کے اس قیام میں متعدد جگہ کے قیام تجویز تھے، اس لیے خود مولانا انعام الحسن صاحب نے یہ ارادہ فرما رکھا تھا کہ زبیر و شاہد کا انتظار بمبئی میں کریں گے اس دوران میں بمبئی کے قرب و جوار میں کئی جگہ تشریف لے گئے۔

۵ مارچ مطابق ۱۱ صفر منگل کو بمبئی سے چل کر ۶ مارچ کو مع زبیر و شاہد اور مستورات کے نظام الدین پہنچ گئے، شاہد اپنی ہمشیرہ اور اہلیہ کے ساتھ ۱۱ مارچ کو سہارنپور پہنچ گیا۔

......☆☆☆☆☆......

سفر ہندوستان ۹۴ھ

اب تک یہ ناکارہ "سفرِ حج سنہ فلاں" یا "سفرحجاز سنہ فلاں" لکھواتا تھا، آج پہلی مرتبہ "سفرِ ہند سنہ فلاں" لکھوا رہا ہوں، اس لیے کہ اُوپر کے مضامین سے تو یہ معلوم ہو چکا کہ ۲۳ جمادی الثانیہ ۹۳ھ کو اس ناکارہ کو اقامہ مل گیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اب حجاز کا قیام اصل ہے اور ہندوستان کا عارضی کہ چھ ماہ سے زیادہ صاحبِ اقامہ کو باہر رہنے کی اجازت نہیں ورنہ اقامہ منسوخ ہو جائے گا۔

ہارون مرحوم (اللہ تعالیٰ اُس کو بہت بلند درجے عطاء فرمائے) کے حادثہ کے بعد میرے محسن مخلص قاضی عبدالقادر صاحب زادمجدہم کا تو شدید اصرار یہ تھا کہ میں رمضان ہی میں نظام الدین جاؤں اور بار بار تقاضا فرمایا، میں نے کئی دفعہ پوچھا کہ میرے جانے کا تو خود بھی دل چاہتا ہے ہارون مرحوم کے بچوں کی وجہ سے، مگر فوری جانے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی، میں نے کہا کہ آپ ضرورت بتا دیں میں جا کر کیا کروں گا؟ مولانا انعام الحسن صاحب وہاں موجود ہیں جو مقدر تھا وہ ہو گیا۔

قاضی صاحب نے کوئی وجہ تو بتائی نہیں مگر یہ فرماتے رہے کہ میرا طبعی تقاضا ہے کہ تو جلدی جا، مگر اس ناکارہ کے لیے اول تو ہمیشہ سے ہی "السفر قطعة من النار" کا ظہور ہے اور پھر رمضان کا سفر تو اور بھی ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ تحمل ہے، اس کے علاوہ ذیقعدہ میں مولانا انعام الحسن صاحب خود آ رہے ہیں اور شروع ذی الحجہ میں علی میاں رابطہ کے اجتماع میں آ رہے ہیں، ان حضرات سے بھی کچھ مشورے کرنے ہیں، اس لیے حج کے بعد ان کے ساتھ ہی چلا جاؤں گا۔

دہلی سے بھی اور میوات سے بھی میرے فوری پہنچنے کے تقاضے کے خطوط تو آتے رہے مگر عجلت کی وجہ کسی نے نہ لکھی اور میں خصوصی لوگوں کو یہ لکھتا رہا کہ میری آمد کی وجہ جلد تحریر فرما دیں اور عام طور سے یہ لکھتا رہا کہ یہ ناکارہ یہاں رہ کر مرحوم کے لیے جتنا کچھ کرا سکتا ہے وہاں نہیں ہو سکتا۔

علی میاں اور مولانا انعام صاحب نے بھی آنے کے بعد جانے پر تو زور دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی مشورہ دیا کہ تیرا گزشتہ رمضان حجاز میں ہوا تھا اس لیے سفر کی ترتیب ایسی رکھنی چاہیے کہ رمضان سہارنپور میں ہو جاوے، میری نگاہ میں تو زیادہ اہمیت اس کی بھی نہیں رہی اس لیے کہ ہندوستان میں میرے متعدد احباب ایسے ہیں کہ جو اپنے اپنے مقامات پر رمضان کا اہتمام کر سکتے ہیں، مگر خود ان دوستوں کا بھی جن کے متعلق میرا خیال تھا، میرے آیندہ رمضان سہارنپور گزارنے کے تقاضے آئے۔ میں تو ہارون مرحوم کے بچوں کی وجہ سے جلدی جانا چاہتا تھا مگر یہ مصلحت بھی جو یہ احباب وہاں رمضان گزارنے کی بتا رہے تھے بالکل نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لیے یہ طے

ہوا کہ میں ایسے وقت میں سفر کروں کہ چھ ماہ کے اندر رمضان بھی آجائے۔ اس کے ساتھ ہی پاکی احباب نے جب یہ سنا کہ جب میرا سہارنپور کا ارادہ ہے تو ان کے از سرنو تقاضے شروع ہوئے کہ ہندوستان جاتے وقت پاکستان کا ضرور وقت رکھنا ہے اس لیے کہ شعبان میں باوجود کوشش کے کوئی صورت نہ ہو سکی تھی۔

عزیز مولوی اسعد سلمہ ۱۴ ربیع الاول ۹۴ھ مطابق ۶ اپریل ۷۴ء رابطہ کے ایک خصوصی اجتماع میں شرکت کے لیے آئے تھے اور اس جہاز سے مولانا ابواللیث بھی ساتھ تھے اور ہمارے قاضی صاحب بھی جو عالمی اجتماع مسلم سربراہوں کا لاہور میں ۲۲ فروری ۷۴ء سے طے تھا، زکریا کا اصرار تھا کہ قاضی صاحب، مفتی صاحب اور رائے ونڈ کے اکابر اس وقت لاہور میں ضرور موجود ہوں اور رائے ونڈ کے دیگر اکابر جن میں خاص طور سے مولوی احسان، بھائی عبدالوہاب لاہور رہے۔ اس اجتماع کی تفاصیل تاریخ کبیر میں ہیں۔

قاضی صاحب بھی اس اجتماع سے فراغ پر اسی جہاز سے تشریف لائے جس سے مولوی اسعد صاحب۔ مولانا اسعد صاحب رابطہ کے اجتماع سے فراغ پر ۱۰ اپریل کو مدینہ پہنچ گئے۔ ان کا بھی اصرار تھا کہ زکریا پاکستان ضرور چلے۔ زکریا کا وہی شعبان والا عذر تھا کہ اتنے سفارت ہند سے اجازت نہ ہو اتنے میں نہیں اتروں گا۔

مولانا اسعد صاحب نے (اللہ تعالیٰ ان کو بہت جزائے خیر دے) ہندوستان واپس جا کر زکریا کے پاکستان اترنے کی اجازت پر کوشش کی اور ۱۵ مئی کو ان کا پہلا برقیہ مدرسہ صولتیہ کے پتہ سے پہنچا کہ آپ کے پاسپورٹ میں مع دو رفقاء کے خصوصی حکم نامہ پاکستان درج کرنے کے لیے احکامات جدہ سفارت خانہ کو جا چکے ہیں۔ سفارت سے رجوع کریں۔ اسی مضمون کا دوسرا برقیہ مدینہ کے پتہ سے ۲۰ مئی کو پہنچا جو عرفات مدینہ کے پتہ سے بھائی حبیب اللہ کے پاس پہنچا۔ اس پر سفارت ہند مقیم جدہ سے مراجعت کی تو معلوم ہوا کہ اجازت آچکی۔ پاکی احباب کو تو شعبان میں بہت اطمینان تھا کہ پاکی ویزا ضرور آجائے گا اس لیے اس وقت تو اور اطمینان ہو گیا۔ اس مساعی سے پاکستان کے ۴ مواضع کا ویزا مل گیا۔ جن میں سب سے اول ایبٹ آباد تھا کہ وہاں سے میرے رشتہ کے ماموں الحاج مولوی داؤد صاحب ایڈوکیٹ ایبٹ آباد کی درخواست پر شعبان میں کوشش شروع ہوئی تھی۔ اسی درخواست کی بنیاد پر ویزا منظور ہوا اور کراچی رائے ونڈ، ایبٹ آباد، پنڈی، ڈھڈیاں جو ضلع سرگودھا میں آگیا اور لائل پور کے ویزے منظور ہوئے اور اس بناء پر ۲۴ مئی مطابق ۳ جمادی الاولی کو مدینہ پاک سے مکہ کے لیے روانگی ہو گئی۔

بھائی یونس دہلوی اور مولانا عبداللہ عباس کی گاڑیوں میں یہ ناکارہ، علی میاں اور قاضی صاحب

اور رفقاء روانہ ہوئے۔ بعد مغرب روانہ ہوئے اور شب ڈاکٹر اسماعیل صاحب (جو اس زمانہ میں بدر کے ڈاکٹر تھے۔) کی درخواست پر تقریباً ۲۰ گھنٹے بدر میں قیام رہا۔ شب کو مسجد عریش کے میدان میں سوئے۔ صبح کو شہداء کے مزارات پر حاضری ہوئی۔ بعد عصر بدر سے چل کر پونے تین بجے مدرسہ صولتیہ پہنچے۔

بھائی سلیم نے بہت پر تکلف دعوت کا انتظام کر کے رکھا تھا۔ اس میں نہ معلوم کتنے مرغ کاٹ دیئے۔ زکریا کے نکیر پر فرمایا کہ دنبہ سے مرغ سستا پڑتا ہے اور یہ صحیح کہا کہ گوشت اس زمانہ میں بارہ ریال کلو تھا اور مرغ چار ریال جس میں تقریباً پون کلو گوشت ہوتا ہے اور آج کل صفر ۹۵ھ میں مدینہ میں دنبہ بکرا ۱۸ ریال فی کلو اور مرغ چھ ریال۔ بھائی سلیم کی دعوت میں مرغ پلاؤ، مرغ مسلم اور نہ معلوم کتنی چیزیں تھیں۔ کھانے کے بعد علی میاں کو مولوی عبداللہ عباس کے گھر بھیج دیا اور ہم عمرہ سے فارغ ہو کر چھ بجے عزیز سعدی سلمہ کے گھر پہنچ گئے۔

زکریا کی واپسی کے ٹکٹ کی میعاد چند روز پہلے ختم ہو رہی تھی اور اس کی توسیع کے لیے جدہ بھیج رکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ توسیع کا وقت ختم ہو چکا تھا اس لیے اس کو بھائی یونس کے مشورہ سے جدید ٹکٹ کے ساتھ تبدیل کرا دیا گیا۔ جو جدہ تا کراچی تا لاہور تا دہلی تا بمبئی تا کراچی تا جدہ تھا۔ اس میں پیسے تو زیادہ لگے مگر سابقہ ٹکٹ بے کاری سے بچ گیا۔

علی میاں مدینہ منورہ سے تو ہمارے ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے لیکن میرا سفر تو کچھ تاخیر سے تھا اور پاکستان ہو کر جانا تھا اور علی میاں کو سیدھے ہندوستان جانا تھا، اس لیے علی میاں ۵ جون جمادی الاولیٰ کو طیارہ سے بمبئی روانہ ہوئے۔ کراچی کے مطار پر بڑا جمع تھا۔ ظہر عصر وہیں جماعت سے پڑھیں اور مغرب کے وقت بمبئی پہنچ گئے اور بمبئی سے اندور مولانا معین اللہ کے یہاں ان کے لڑکے لڑکی کی شادی میں تشریف لے گئے۔ اتوار کو بمبئی اور دوشنبہ کو دہلی اور سہ شنبہ کو لکھنؤ پہنچ گئے۔

اس ناکارہ کی جدہ سے روانگی شنبہ ۲۲ جون کی طے تھی۔ اگرچہ اس سال طیاروں کی تاریخوں میں بار بار تقدیم تاخیر ہوتی رہی اور اس سے فکر بھی تھا کہ علی میاں کو اس کی وجہ سے دقت اٹھانی پڑی۔ مگر اس ناکارہ کا طیارہ بدستور رہا اہلِ جدہ کا اصرار تھا کہ یہ ناکارہ جمعہ کے دن جدہ پہنچ جائے اور شب کو وہاں قیام کر کے آگے جائے، مگر قاضی صاحب نے (اللہ تعالیٰ بہت جزائے خیر دے کہ وہ میری راحت کا اس قدر فکر رکھتے ہیں کہ اس کا تصور بھی نہیں ہوتا) اس کو یہ کہہ کر قبول نہیں کیا کہ جدہ کے قیام میں زکریا کو دقت ہوگی۔

ان ایام میں صبح کی نماز پونے دس بجے ہوتی تھی، عزیز سعدی کے مکان سے سوا دس بجے عزیز عبدالوحید کے ساتھ اس کی اڈنیٹ میں عزیزان مولوی حبیب اللہ، مولوی اسماعیل اور

عزیز اختر علی سہارنپوری جو کئی سال سے جدہ میں مقیم ہے اور ہر آمد پر ظہران مجھے لینے کے لیے جاتے ہیں، روانگی کے وقت بھی میری مشایعت کا بہت اہتمام کرتے ہیں، جمعرات کی شام سے یہاں آئے ہوئے تھے، جدہ روانہ ہوئے کہ وہ جدہ کی ایئر لائن میں ملازم ہیں ان کی وجہ سے بہت سہولت ہوتی ہے۔

۱۰:۳۰ بجے بھائی عبدالکریم مہندس کی کار میں یہ ناکارہ، قاضی صاحب، عزیز سعدی اور خود بھائی عبدالکریم چل کر ۱۱:۳۰ پر مطار پہنچ گئے۔

عزیز عبدالحفیظ اس وقت بیروت میں تھے ان کا وعدہ تو یہ تھا کہ وہ پاکستان کے سفر سے پہلے یہاں واپس آجائیں گے اور میرے ساتھ پاکستان وہندوستان جائیں گے مگر اہلِ مطابع کے کرم سے نہ پہنچ سکے۔

ڈاکٹر ظفیر صاحب کو بھی اللہ تعالیٰ بہت جزائے خیر دے، میرے اور میرے متعلقین کی آمد ورفت میں بہت مدد ڈاکٹر صاحب سے ملتی ہے، اس مرتبہ بھی انہوں نے کئی دن پہلے سے اجازت لے رکھی تھی کہ طیارہ پر میں ان کی کار میں جاؤں گا، مگر عین وقت پر معلوم نہیں کیا گڑ بڑ ہوئی کہ مطار والوں نے ڈاکٹر صاحب کی گاڑی کو جانے سے روک دیا جس پر فوراً ڈاکٹر صاحب اپنے کسی واقف ملازم مطار کی کار میں لے کر آئے اور طیارہ پر پہنچا دیا، قاضی صاحب اور دوسرے رفقاء کسٹم ہو کر طیارہ پر پہنچ گئے، ہاتھ کا سامان بھی اُوپر نہ پہنچ سکا اس لیے کہ جو مجھے پہنچانے گئے تھے اُن کو میرے پاس بیٹھنا زیادہ اہم معلوم ہوا اس لیے دستی سامان بھی دوسرے سامانوں کے ساتھ اندر پہنچ گیا۔

جدہ سے ۷ بجنے والی (انگریزی) چل کر پون گھنٹہ طیارہ دبئ ٹھہرا، بڑا فکر تھا کہ دبئ میں اگر پہلے کی طرح سے اطلاع ہوگئی ہوگی تو دقت ہوگی کہ میری گاڑی بھی اندر ہی ہے، مگر ساتھ ساتھ ہی دوستوں سے ملنے کا اشتیاق بھی تھا، مگر دبئ میں باوجود تلاش کے کوئی نہیں ملا اور عربی سوا چھ بجے اور پاکی ۳:۲۵ پر کراچی پہنچ گئے وہاں مجمع بہت تھا حاجی فریدالدین صاحب کو اللہ تعالیٰ بہت جزائے خیر دے، حسبِ معمول اپنی کار لے کر طیارہ پر پہنچ گئے تھے، انہوں نے دریافت فرمایا کہ ظہر پڑھ لی ہے یا پڑھنی ہے؟ میں نے کہا نہیں پڑھی مطار پر ڈھائی تین ہزار کا مجمع ہے یہاں پڑھی گئی تو دیر لگے گی، میں نے کہہ دیا کہ مکی مسجد میں پڑھنی ہے پیشاب بھی کرنا ہے، اس لیے حاجی صاحب نے اپنی کار میں مجھے اور عزیز مولوی احسان، مولوی اسرار، بھائی یحییٰ کراچوی اور اپنے صاحبزادے کو بٹھا کر نہایت تیزی سے مطار سے ایک میل باہر مجھے چھوڑ گئے اور گاڑی صاحبزادے کے حوالہ کر دی اور خود رفقاء اور سامان کی وجہ سے دوبارہ مطار پر آ گئے۔

کی مسجد میں بہت بڑا مجمع تھا، نگران سے یہ کہہ کر ملاقات اور مصافحہ عصر کے بعد ہوں گے اپنے مستقر پر پہنچ گیا، وہیں پیشاب، وضوء کر کے جماعت کی، کراچی کی گرمی سے بہت فکر تھا، مگر وہاں کے ایئر کنڈیشن اور کولروں نے بھائی سلیم اور عزیز سعدی کے کولر اور ایئر کنڈیشن کو بھی مات دے رکھی تھی، کئی کئی لگ رہے تھے، ایک گھنٹہ بعد رفقاء بھی مع سامان کے پہنچ گئے، وہاں بجائے گرمی کے اس قدر سردی لگی کہ ایک گھنٹہ بعد کولر بند کرنا پڑا اور رات کو بھی سردی لگی۔

عصر کی نماز کے بعد حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری اور پیر ہاشم جان مجددی صاحب وغیرہ تشریف لے آئے اور مغرب تک تشریف فرما رہے اور قادیانی سلسلہ کا ہنگامہ سناتے رہے۔

میں نے جمعہ کی شب سے کھانے کا مکمل بائیکاٹ کر رکھا تھا، مگر کراچی کے دوستوں نے اتوار کی شب میں اتنا بڑا دستر خوان تیار کر رکھا تھا کہ اس کو دیکھ کر رہی سہی بھوک بھی جاتی رہی، ایک بُری عادت یہ بھی ہے کہ اگر دستر خوان پر بہت سی چیزیں ہو تو رغبت ختم ہو جاتی ہے، یہ اصل میں گدھے کی عادت ہے، یہ مشہور ہے کہ گدھا جتنا برسات میں دُبلا ہوتا ہے اور کسی موسم میں نہیں ہوتا، اس لیے کہ سبزہ بہت زیادہ ہوتا ہے وہ کھڑا سوچتا ہے کہ کہاں سے چروں، یہ ہماری عادت مشابہ بالحمار میں بھی ہے، دستر خوان پر پانچ چھ طرح کی مچھلیاں، سات آٹھ قسم کے چاول اور اتنے ہی مختلف سالن اور سات آٹھ قسم کے میٹھے کہ طبیعت ان کو دیکھ کر بالکل بھر گئی اور باوجود خواہش کے کچھ نہ کھایا گیا۔

حاجی فریدالدین صاحب نے مدینہ پاک ہی میں یہ وعدہ لے لیا تھا کہ کراچی کے قیام میں ایک شب میری ہے، ان سے یہ وعدہ ہو گیا تھا کہ جس دن بھی پہنچنا ہو اس سے اگلے دن کی شام کی دعوت آپ کے یہاں طے ہے اور حضرت قاضی صاحب سے بھی اس کی منظوری لے لی گئی، چنانچہ حاجی صاحب نے بھی دوشنبہ کی شب میں اپنی شایانِ شان دعوت کے وہ زور باندھے اور اتنے اکابر کو جمع کر رکھا تھا کہ کھانا تو نہیں مگر ان سب دوستوں سے بیک وقت ملاقات ہو گئی۔

کراچی سے منگل کے طیارہ سے لاہور ہوتے ہوئے رائے ونڈ کا جانا طے تھا کہ پیر کی صبح کو میرے پاس سرکاری حکمنامہ زبانی پہنچا کہ تمہارے سارے ویزے کراچی کے علاوہ منسوخ، تم اپنی طرف سے سب جگہ التواء لکھ دو، میں نے کہہ دیا کہ میں سب جگہ اطلاعات دے چکا ہوں، میرے پاس التواء کی کوئی وجہ نہیں، آپ باضابطہ منع کر دیں تو عذر ہو جائے گا، چنانچہ پیر کی شام کو تحریری حکم نامہ بھی پہنچ گیا۔

پیر کی صبح کو جناب الحاج مفتی محمد شفیع صاحب کے مدرسہ میں جانا ہوا، مفتی صاحب نے بھی ناشتہ کا بڑا اہتمام کر رکھا تھا، واپسی میں بھائی یوسف رنگ والے اور جس جس کا گھر سڑک پر پڑتا

رہا، کہیں صرف موٹر میں بیٹھ کر اور کہیں تھوڑی دیر کو اُترتے ہوئے مکی مسجد پہنچنا ہوا، یہاں پہنچنے کے کچھ دیر بعد حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی ٹنڈو الہ یار سے تشریف لائے، اُن کی آمد پر سارے مجمع کو اُٹھا دیا، مولانا نے خلاف معمول سو (۱۰۰) روپے زکریا اور پچاس (۵۰) روپے مولانا اسعد اللہ صاحب ناظمِ مظاہر علوم کے لیے مرحمت فرمائے میں نے بہت ہی معذرت پر اصرار کیا، مگر مولانا نے حکماً فرمایا کہ اسے قبول کرنا ہوگا۔

شام کو ظہر کے بعد مولانا بنوری صاحب کے مدرسہ میں جانا ہوا، ناشتہ تو یہاں بھی بہت زور کا تھا، مگر زکریا نے عزیز محمد بنوری سے کہہ دیا تھا کہ صرف سادی چائے پیوں گا، ناکارہ نے تو اپنی جگہ بیٹھے ہوئے چائے پی اور رفقاء نے تھوڑی دور پر ناشتہ کیا۔

دوسرے دن مفتی شفیع صاحب باوجود علالت کے خود بھی تشریف لائے، زکریا کی نکیر پر فرمایا کہ دل نہ مانا، زکریا اس دوران میں بار بار اصرار کرتا رہا کہ مجھے کراچی سے دہلی بھیج دو مگر قاضی صاحب پر اصرار کرتے ہوئے شرم آتی تھی، ویزے کی منسوخی جو مجھ تک تو نہیں پہنچا تھا، بھائی افضل کو ملا اسی وقت جناب الحاج فرید الدین صاحب نے (جو میرے پاک سفروں میں بہت زیادہ اہتمام فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ بہت ہی زیادہ دارین میں بہترین صلہ عطاء فرمائے) ٹیلیفون کی بھرمار شروع کی اور جناب الحاج مفتی زین العابدین صاحب نے اور الحاج احمد شاہ صاحب نے رات ہی کو طیارہ سے اسلام آباد اور لاہور کے سفر شروع کیے اور اگلے دن شام تک ان سب حضرات کی مساعی جمیلہ سے رائے ونڈ کی اجازت ملی اور یہ ناکارہ بجائے منگل کے جمعہ کی صبح کو رائے ونڈ طیارہ سے گیا۔

بھائی احمد حسین قادری صاحب جو عرصہ سے پاکی جہازوں کے کیپٹن ہیں اور اتفاق سے مولانا محمد یوسف مرحوم کی معیت میں پہلی دفعہ ان سے ملاقات ہوئی تھی جب بھی اس ناکارہ کے پاکستان جانے کی خبر سنتے اُسی جہاز میں اپنی ڈیوٹی لگوا لیتے، وہ رات ہی امریکہ سے آئے تھے اور آج کا دن اُن کا فارغ تھا، مگر اُنہوں نے دوسرے کیپٹن سے بات کر کے ہمارے جہاز پر اپنی ڈیوٹی لگوالی اور خود ہمارے جہاز کو لے گئے، راستے میں انہوں نے تواضع کی کہ جہاز رانی کا معائنہ کریں، زکریا نے تو انکار کر دیا کہ مجھے کونسا جہاز چلانا ہے، مگر احسان اسماعیل، حبیب اللہ کے منہ میں پانی بھر آیا، میں نے بجائے اپنے ان کو بھیج دیا، انہوں نے خوب تفصیل سے دکھایا۔

رائے ونڈ میں کئی دن سے منگل کے پہنچنے کی خبر پر ہجوم جمع ہوتا جا رہا تھا اور خوب جمع ہو گیا، وہاں پہنچنے کے بعد چار پانچ ڈاکٹر بھی ازراہِ شفقت ومحبت میرے اوپر مسلط ہو گئے، ایکسرے کا سامان اور بجلی کا گھٹنوں کا علاج وغیرہ سب میرے کمرے کے پاس جمع ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ ان دوستوں کو بہت جزائے خیر دے۔ ہر چند کہ میں اپنی عادت کے موافق شدت سے انکار کرتا رہا کہ سفر میں ایسے اہم علاج نہیں ہوا کرتے، مگر ان محبت کے پتلوں نے ازراہِ محبت یہ اصرار کیا کہ ڈاکٹر بھی سفر میں ساتھ رہیں گے اور ایک کار مستقل بجلی کے سامان کی اور تیری دواؤں کے سامان کی مستقل ساتھ رہے گی، مگر:

از قضا سر کنگبیں صفر انمود
روغن بادام خشکی می نمود

میرے امراض کہ جن کا سلسلہ کئی سال سے چل رہا ہے علاجات تو ڈاکٹری، یونانی، ہومیو پیتھک، مالش سبھی کچھ دوستوں کی محبت سے ہو رہے ہیں، مگر میری طرح سے جو مرض بھی آتا ہے وہ ایسا عہدی بن کر آتا ہے کہ اُس سے اُٹھا نہیں جاتا۔

چونکہ میرے سب دوستوں کو یہ بات معلوم تھی کہ میرے پاکستان پہنچنے کے بعد ڈھڈیاں کی حاضری سبھی کی نگاہ میں اہم ہے، میں نے تو یہ حالت دیکھ کر دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ زیادہ جہد وجہد نہ کریں مبادا یہاں کے حکام کو ناگوار گزرے، مگر دوستوں نے نہ معلوم کس کس ذرائع سے ڈھڈیاں کی بھی اجازت لے لی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ ہماری روانگی کے بعد وہاں مرکز سے یہ حکم آیا تھا کہ رائے ونڈ کے علاوہ کسی دوسری جگہ کی اجازت نہ دی جائے جو ہماری روانگی ڈھڈیاں کے بعد پہنچا، اسی وجہ سے جن جگہوں کا ویزا حاصل تھا اُن میں جانا نہ ہو سکا، اسی وجہ سے ایبٹ آباد کا زیادہ قلق ہے کہ ابتدائی کوشش جو شعبان سے ہو رہی تھی اور میرے ماموں مولوی داؤد کی کوشش سے ہو رہی تھی وہ بھی رہ گیا اور قریشی صاحب کے حادثہ کے بعد سے پنڈی کا بھی تقاضا ہو رہا تھا اور رائے ونڈ کے چند روزہ قیام میں قریشی صاحب مرحوم کی اہلیہ محترمہ مع صاحبزدگان اور ملک دین محمد صاحب اپنی علالت اور ضعف کے باوجود رائے ونڈ ہی رہے اور میرے ڈھڈیاں جانے پر دوستوں سے وعدہ اور اُمید لے کر پنڈی گئے تھے کہ ڈھڈیاں سے واپسی پر پنڈی کی اجازت بھی ان شاءاللہ تعالیٰ مل جائے گی مگر نہیں ہو سکی۔

ان ڈاکٹروں نے پانچ چھ جگہ سے خون لیا، سوکر اُٹھنے کے بعد، ناشتہ کے بعد، کھانے کے بعد، ہر وقت کا پیشاب بار بار جانچا، ایک خاص رگ کی تلاش میں کئی جگہ انجکشن لگائے مگر وہ نہ ملی، پانچ جگہ کے پیشاب کے بعد انہوں نے خون نکالا، پانچویں مرتبہ میں رگ ملی اور ڈیڑھ تولہ خون نکالا، اس کے بعد دفعۃً کپکپی شروع ہوگئی اور بہت شدت کے ساتھ بخار ہو گیا، سب پنکھے وغیرہ بند کر دیئے گئے، مگر سردی نہ گئی، کمبل بھی دو تین اوڑھے، ایک گھنٹہ کے بعد بخار ۱۰۳ ڈگری زور کا ہوا،

اس کے ایک گھنٹہ کے بعد ۱۰۱ ہوا پھر ۹۹ ہوا۔ رات کے ایک بجے تک یہ ڈاکٹر حضرات مسلط رہے، خاص طور سے سعید رانا صاحب، بدھ کی صبح کو بخار تو نہیں تھا مگر ضعف بہت زیادہ تھا۔

یکم جولائی دوشنبہ کو رائے ونڈ کے مدرسہ عربی فارسی خاص طور سے قرآن کے مکتب کا معائنہ اور بچوں کا قرآن سننا، قرآنی مکتب کی بدنظمی کی شکایت پر ایک تحریر رجسٹر پر لکھی جس میں مولوی احسان کو تعلیم کا نگراں اور حاجی متین احمد صاحب ابن مخدوم رشید احمد صاحب مرحوم کو مالیات کا نگراں بنا کر میاں جی عبداللہ کے سامنے دونوں سے کہا کہ آج سے مدرسہ کی نگرانی میری ہے، تم دونوں حضرات ہر تیسرے ماہ تعلیمی رپورٹ بھیجتے رہو۔

پنجاب کی حکومت نے تو ایبٹ آباد کے علاوہ سب کی اجازت دے دی تھی مگر مرکز کی ممانعت کی وجہ سے جو بعد میں پہنچی مجبوری ہوگئی۔ ۶ جولائی شنبہ کے متعلق طے ہوگیا تھا کہ علی الصباح اپنی جماعت کر کے کاریں یکے بعد دیگرے روانہ ہوتی رہیں۔ اکٹھی نہ جائیں کہ خواہ مخواہ نگاہیں اٹھیں گی۔ لیکن رات کے بارہ بجے لاہور سے ٹیلیفون ملا کہ بھائی افضل کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ بھائی افضل نے تو اس پر اصرار کیا کہ میں ابھی لاہور جا کر گھر والوں کی تعزیت کر کے واپس آجاؤں اور سابقہ نظام باقی رہے، برادران تجہیز و تکفین کر لیں گے۔ مگر زکریا نے اس کو نہ مانا کہ میں نمازِ جنازہ پڑھ کر ڈھڈیاں جاؤں گا۔ اس لیے شنبہ کی صبح کو اپنی نمازیں پڑھ کر بجائے ڈھڈیاں کے لاہور روانگی ہوئی۔

یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بھائی افضل کے برادروں نے ۱۰ بجے نمازِ جنازہ کا اعلان کر رکھا ہے۔ اس لیے زکریا کے اصرار پر صبح کو جنازہ کی نماز زکریا، قاضی صاحب بھائی افضل وغیرہ نے الگ پڑھی اور دس بجے بقیہ برادران نے مجمع کے ساتھ سابقہ تجویز میں تو یہ تھا کہ اپنی نماز پڑھ کر ڈھڈیاں چلے جائیں گے تاکہ دھوپ سے پہلے پہلے پہنچ جائیں، مگر اس حادثہ کی وجہ سے لاہور سے چلنے میں تاخیر ہوئی۔ اس لیے زکریا نے یہ کہا کہ واپسی کا انداز معلوم نہیں کہ کیا ہو، دیر تو ہو ہی گئی ہے اس لیے ماموں شعیب اور عزیز مولوی ادریس کاندھلوی مرحوم سے بھی ملاقات کرتا جاؤں۔

ماموں شعیب نے تو (اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے) دھوپ کی وجہ سے جلدی ہی اجازت دیدی، مگر مولوی ادریس مرحوم نے اپنی قدیم عادت کے موافق بیجا اصرار شروع کیا کہ دھوپ اوپ کچھ نہیں اور جب زکریا نے اپنے رفقاء سے کہا کہ مجھے اٹھا کر کار میں بٹھا دو تو مرحوم بھی اپنے تلامذہ کی مدد سے میری کار کے برابر کیواڑ کھول کر زمین پر بیٹھ گیا جس سے نہ کیواڑ بند ہوسکے نہ کار آگے یا پیچھے ہوسکی۔ زکریا بار بار اصرار کرتا رہا کہ دھوپ ہو رہی ہے آپ تشریف لے جائیں ان کے خدام سے بھی کہا کہ مولانا ادریس کو اٹھا کر جاؤ، مگر وہ مولانا کی منشاء کے خلاف کیوں مانتے۔ اس

لیے زکریا نے اپنے رفقاء سے کہا کہ مولانا کو اٹھا کر ان کے کمرے میں بٹھا دو اور میں جا رہا ہوں تمہارا سڑک پر انتظار کروں گا۔ میرے چار پانچ رفقاء نے مولانا کو اٹھایا اور زکریا نے بھائی افضل سے کہا کہ جلدی چلو۔ دو فرلانگ آ کر سڑک پر کار روکی۔

عزیز ماموں داؤد ایبٹ آباد مجھے لے جانے کے لیے میرے لاہور پہنچنے سے پہلے سے مقیم تھے اور اخیر تک ساتھ رہے۔ ان کا ارادہ ڈھڈیاں جانے کا بھی تھا مگر جمعہ کے دن ان کو ایبٹ آباد سے کوئی تار ملا جس کی وجہ سے ان کو ایبٹ آباد کسی عدالتی کام کی وجہ سے جانا ہو گیا اس لیے شنبہ کی صبح کو ان سے رخصت ہو کر ڈھڈیاں روانگی ہوئی۔

سابقہ تجویز تو یہ تھی کہ ۶ جولائی کو دس گیارہ بجے تک ان شاء اللہ تعالیٰ ڈھڈیاں پہنچ جائیں گے، مگر لاہور تاخیر ہوتی چلی گئی اور زکریا جو اس پر مصر تھا کہ راستہ میں کہیں ٹھہرنا نہیں ہو گا، مگر دھوپ اتنی تیز ہو گئی کہ دوران سر شروع ہو گیا اس لیے ۱۲ بجے جھاوریاں پہنچ کر زکریا تو لیٹ گیا۔ رفقاء نے کھانا کھایا اور قاضی صاحب نے جھاوریاں میں بہت اہتمام فرما رکھا تھا۔

مرد تو سارے کچھ لاہور سے ساتھ تھے اور کچھ ڈھڈیاں پہنچ گئے تھے مگر مردوں سے دس گنی زیادہ عورتیں ساری سڑک کو گھیرے کھڑی تھیں۔ بھائی افضل صاحب کار چلانے والے تھے اور وہ یہاں کے رگ ریشہ سے خوب واقف تھے، عورتوں کو ہٹاتے ہوئے مجھے پہنچا کر کیواڑ بند کر کے باہر چلے گئے۔ بعد میں قاضی صاحب وغیرہ کی کاریں پہنچتی رہیں۔

۴ بجے اٹھ کر زکریا نے ظہر پڑھی اور عورتوں کو بیعت کرایا اور عصر پڑھ کر مسجد پہنچا جہاں بڑا ہجوم تھا۔ مصافحہ ہوئے اور غروب سے آدھ گھنٹہ چل کر مغرب ڈھڈیاں میں پڑھی۔ یہاں کے قیام میں اہل الرائے کے مشورہ سے یہ طے ہو گیا تھا کہ دس جولائی بدھ کے دن یہاں سے چل کر ایک روز لاہور ٹھہر کر جمعہ کو دوبارہ کراچی اس لیے جانا پڑا۔ کہ جس جہاز کے ٹکٹ تھے اور پہلے سے طے تھا وہ لاہور سے سیدھا دہلی جاتا تھا، مگر افغانی حکومت نے بلا سابقہ اطلاع کے ایک دم اس جہاز کی روانگی ملتوی کر دی تھی جس کی وجہ میں مختلف آراء گھومتی رہیں۔ بہر حال ۱۰ جولائی کی صبح کو اپنی نماز پڑھ کر جھاوریاں ہوتے ہوئے روانگی ہوئی۔ زکریا نے احباب سے مشورہ کیا کہ سرگودھا حافظ صاحب کی خدمت میں جانا بہت ضروری ہے مگر سب کی رائے یہ ہوئی کہ سرگودھا کا ویزا ہے نہیں اور اس کو قادیانی مرکز اور فوجی مرکز ہونے کی وجہ سے اہمیت زیادہ ہے اس لیے شہر میں نہیں جانا چاہیے۔

بہر حال لائل پور ہوتے ہوئے کہ مفتی صاحب کی علالت کے علاوہ ابراہیم پہلوان کے کارخانے میں بھی جو شہر سے باہر ہے اس کے قدیم وجدید احسانات کی وجہ سے چند منٹ قیام کا وعدہ تھا اور پیشاب کا بھی تقاضا تھا، لاہور روانہ ہو گئے۔ مفتی صاحب کو کسی نے یہ غلط اطلاع

دے دی تھی کہ شام تک قیام رہے گا اس لیے انہوں نے کھانے کا بہت اہتمام اور لوگوں کو بھی مدعو کر رکھا تھا مگر وہاں چند منٹ ہی قیام رہا۔ ساڑھے دس بجے لاہور پہنچ گئے۔ مفتی صاحب کو اس غلط اطلاع کا بہت قلق رہا مگر یہ اطلاع ہم میں سے کسی کی طرف سے نہیں تھی لوگوں نے خود ہی تجویز کر کے اطلاع کر دی تھی۔

حاجی فریدالدین صاحب کو اللہ تعالیٰ بہت ہی جزائے خیر دے کہ وہ رات ہی کو میرے اور رفقاء کے ٹکٹ لے کر کراچی روانہ ہوگئے تاکہ اتوار ۱۲ جولائی کے امریکن جہاز سے جو بہت بڑا تھا ٹکٹوں کی تبدیلی کرادیں۔ یہ غالباً پہلے لکھوا چکا ہوں کہ میرا سابقہ ٹکٹ مدت گزرنے جانے کی وجہ سے بے کار ہوگیا تھا تو مکہ اور جدہ کے احباب کی تجویز پر کچھ پیسے زیادہ دے کر اس کو جدہ، کراچی اور لاہور، دھلی بمبئی جدہ تک واپسی کا کرالیا تھا۔ حاجی فریدالدین صاحب جو کراچی سے ٹکٹ تبدیل کرائے وہ کراچی، دھلی، بمبئی، مدینہ، جدہ کے کرائے جو زائد پیسے تھے وہ ادا کیے اور یہ مصلحت بتائی کہ واپسی میں حج کا زمانہ ہوگا ہجوم بہت زیادہ ہوگا جو تیرے بس کی نہیں اور پس منظر یہ بھی تھا کہ دوبارہ کراچی آوے کئی ماہ سے ایک جہاز کراچی سے سیدھا مدینے آنے لگا جو جدہ نہیں جاتا۔

جمعرات کے دن صبح کو اولاً حاجی متین صاحب کے یہاں ناشتہ ہوا۔ پھر ماموں شعیب سے ملنے ان کے مکان پر گیا۔ ماموں محمد عمر صاحب نے کھانے پر بہت اصرار کیا کہ آج رات کو یا کل صبح کو، مگر زکریا نے عذر کردیا، لیکن وہ شدید اصرار کرتے رہے البتہ ماموں شعیب صاحب نے اُن کو اصرار سے روک دیا، ۱۲ جولائی کو لاہور سے کراچی جانا ہوا، کیپٹن احمد حسین رات ہی فرانس سے آئے تھے، یہ اُن کی تعطیل کا دن تھا، مگر انہوں نے اپنی عادت کے موافق ساتھی سے دن مانگ لیا اور کراچی لے گئے، چونکہ نظام الدین میں پہلے سے جمعہ کو پہنچنے کی اطلاع تھی اس لیے تجویز یہ ہوا کہ مستقل آدمی بھیجنا چاہیے، اس لیے مولوی محمود افریقی کو جو مفتی صاحب کے مدرسہ میں تعلیم پا رہے ہیں خط دے کر نظام الدین بھیجا اس لیے کہ افریقہ والوں کے لیے ہندی ویزا کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

۱۰:۳۰ بجے لاہور سے جہاز چلا اور ۱۲ بجے کراچی پہنچا اور جہاز پر حسب معمول جناب الحاج فریدالدین صاحب اپنی کار لے کر موجود تھے، وہ مجھے، مولوی احسان، حبیب اللہ اور اسماعیل کو لے کر مکی مسجد پہنچ گئے، ۱:۳۰ بجے جمعہ کی نماز پڑھی، حاجی فریدالدین صاحب نے ٹکٹوں کی تبدیلی اور پاسپورٹ وغیرہ کا اندراج کرایا پاکستان کے سفر کی تفصیلات عزیز احسان نے جو عزیز طلحہ کے نام ایک روزنامچہ لکھا تھا، اُس میں زکریا کے اس سفر میں جدہ میں بڑی گڑبڑ رہی اور کراچی میں بھی، جدہ میں تو مدت کی توسیع کے لیے ٹکٹ بھیجے گئے تھے انہوں نے تاخیر ہوجانے کی وجہ سے اس

کو جدہ تا کراچی تا لاہور تا دہلی تا بمبئی تا جدہ بنوایا، مگر لاہور کا جب جہاز بند ہو گیا اور دوبارہ کراچی جانا پڑا اور حاجی فریدالدین صاحب کو ٹکٹ اس لیے دیئے کہ ان کو کراچی تا دہلی بنوا دیں تو انہوں نے ازراہِ شفقت بجائے کراچی تا دہلی تا بمبئی تا جدہ کے دھلی تا بمبئی تا کراچی تا مدینہ تا جدہ بنوا دیئے کہ چند ماہ سے کراچی سے ایک طیارہ سیدھا مدینہ منورہ آتا ہے جو جدہ وغیرہ نہیں جاتا اور مصلحت یہ بتائی کہ تیری واپسی کے وقت حجاج کا ہجوم بہت ہوگا جو تیرے بس کا نہیں، اس لیے واپسی میں بمبئی سے کراچی آ جائیے، چند روز قیام کے بعد سیدھا مدینہ چلے جائیے اور حج کے بعد اسی ٹکٹ سے مکہ ہو آیئے۔

اس میں تو شک نہیں کہ میرے لیے اس طرح بہت سہولت تھی اور یہ ناکارہ چونکہ صورۃً حج کئی مرتبہ پہلے ادا کر چکا ہے اس لیے مکہ جانا ضروری بھی نہیں تھا مگر ٹانگوں کی معذوری کی وجہ سے ۴ رفقاء میرے ساتھ ضروری ہیں اور میری وجہ سے ان کا حج بھی خطرے میں پڑتا تھا، اگرچہ میرے رفقاء (اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے) اس پر تیار تھے کہ سیدھے مدینہ جاویں اس لیے کہ وہ سب بھی حج کر چکے تھے مگر میری غیرت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ میری وجہ سے دوسروں کے حج بھی ضائع ہوں، اس لیے واپسی میں بمبئی تا جدہ آنا ہوا، جس کی تفصیل تو اپنی جگہ پر آئے گی مگر ہارون مرحوم کے انتقال کے بعد ہمارے قاضی عبدالقادر صاحب کا (اللہ تعالیٰ ان کو بہت جزائے خیر دے) شدید اصرار تھا کہ میں رمضان ہی میں ہندوستان واپس جاؤں۔

ہر چند میں نے جلدی کا سبب پوچھا اور یہ رمضان کا سفر میرے بس کا نہیں، اس کے بعد شوال ذیقعدہ میں دہلی اور میوات کے بہت سے خطوط شدید تقاضے کہ پہنچے کہ ہارون مرحوم کے حادثہ کی وجہ سے تیرا آنا بہت ضروری ہے اور میں یہی جواب دیتا رہا کہ جو ہونا تھا ہو گیا میں آ کر کیا کروں گا، تقاضے کی وجہ کسی نے نہیں لکھی، البتہ یہ سنتا رہا کہ کچھ حاسدین تبلیغ نے مرحوم کے حادثہ کو فتنہ بنانا چاہا مگر اللہ کے فضل سے نہ بن سکا، البتہ مولانا انعام الحسن صاحب کی بھی رائے مدینہ پاک میں ہوئی تھی کہ ہندوستان آنا ہو تو میوات کا ایک سفر بھی ضروری ہے اور یہ صحیح بھی تھا کہ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے دور میں تو بہت کثرت سے میوات جانا ہوتا تھا، چچا جان کا جب گرامی نامہ پہنچ جاتا کہ فلاں وقت میوات جانا ہے تو یہ ناکارہ تعمیل میں فوراً آ جاتا، بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ یہ ناکارہ دہلی پہنچا اور چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نظام الدین سے دہلی اُسی وقت پہنچ گئے اور میوات سے واپسی پر سہارنپور پہنچ گئے، نظام الدین جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

عزیز مولانا یوسف مرحوم کے ابتدائی دور بھی تقسیم ہند تک دو تین ماہ میں ایک سفر ہو ہی جاتا تھا، مگر تقسیم کے بعد اول تو راستوں کے مخدوش ہو جانے کی وجہ سے دوسرے اس ناکارہ کے روز

افزوں امراض کی وجہ سے کالعدم سا ہوگیا تھا اس لیے یہ ناکارہ ۱۴ جولائی کو جب کہ کراچی سے دہلی پہنچا تو میں نے مولانا سے درخواست کی کہ آپ نے میوات کا سفر تجویز فرمایا تھا ایک ہفتہ اس کے لیے تجویز فرما دیجئے، اسی وقت مشورہ سے طے ہو گیا تھا کہ ۱۰ اگست کو میوات کا سفر ہے، میں تو جلدی چاہتا تھا مگر مولانا کی اور مولانا محمد عمر صاحب منشی بشیر صاحب وغیرہ کی رائے یہ ہوئی کہ ذرا تاخیر سے کیا جائے تاکہ ہم نظام بنا سکیں اور لوگوں کو اطلاع کر سکیں، اس لیے تاخیر کرنی پڑی اور ایک دن دہلی قیام کے بعد منگل ۱۶ جولائی کو علی الصباح براہ میرٹھ سہارنپور جانا ہوا کہ حضرت مولانا الحاج قاری محمد طیب صاحب کی اہلیہ کا انتقال ۱۲ محرم ۹۴ھ کو ہو چکا تھا۔

قاری صاحب کی خدمت میں تعزیت کے لیے بھی حاضری ضروری تھی، نیز مولوی اسعد سلمہ سے بھی مدینہ پاک میں وعدہ ہو گیا تھا کہ سہارنپور جاتے ہوئے تمہارے جدید مکان میں تعمیل حکم میں حاضری دوں گا، اس لیے دیوبند حاضری پر اول حضرت قاری صاحب کے مکان پر بسلسلہ تعزیت حاضری ہوئی اور وہاں سے مزارات پر حاضری کے بعد مولانا اسعد صاحب کے مکان پر جانا ہوا، مولانا نے اس ناکارہ کے لیے خاص طور سے ثرید تیار کر رکھا تھا اور رفقاء کے لیے کھانا، انہیں کے مکان پر حضرت قدس سرہٗ کی اہلیہ محترمہ بھی آ گئی تھیں، ورنہ میرا خیال حضرت قدس سرہٗ کے مکان پر جانے کا تھا، وہاں زنانہ اور مردانہ میں اتنی دیر ہو گئی کہ ظہر کا وقت ہو گیا، مولانا ہی کے مکان پر ظہر پڑھ کر سہارنپور روانگی ہوئی۔

باوجودیکہ میں مدینہ پاک ہی سے احباب کو لکھوا رہا تھا کہ میری آمد پر کوئی صاحب سہارنپور نہ آویں، سہارنپور کا تبلیغی اجتماع وسطِ شعبان میں ہے اُسی وقت تشریف لے آویں ملاقات بھی ہو جاوے گی اجتماع میں شرکت بھی، میں نے تو سہولت کے لیے یہ تجویز کی تھی مگر کارآمد نہ ہوئی، ہجوم ہر سال سے زیادہ ملا، کئی دن لا تعد و لا تحصیٰ مجمع رہا، یہ دہلی سے اطلاع کرادی تھی کہ سہارنپور میں ملاقات اور مصافحے دارِ جدید کی مسجد میں عصر کے بعد ہوں گے، دیوبند سے ظہر کے بعد چل کر اول مدرسہ قدیم کی مسجد میں حاضری ہوئی وہاں بھی مصافحوں کا ہجوم ہو گیا، وہاں سے فراغ پر دارِ جدید کی مسجد میں جانا ہوا اور مغرب تک بلکہ عشاء کے بعد گھر پر بھی ہجوم رہا، یہ سلسلہ تو کئی دن تک قائم رہا۔

۶ رجب کو عزیز مولوی عاقل سلمان سلمہ کی لڑکی کا عقیقہ ہوا، ۲۹ جولائی کو دو بجے دوپہر کو کوثر نیازی نے پاکستان سے آ کر اعلان کیا کہ شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس صاحب کا انتقال کل ۱۱:۳۰ شب میں ہو گیا، چونکہ قرب و جوار میں لوگ عزیز مولوی ادریس صاحب سے تو واقف نہیں تھے، شیخ الحدیث سے یہی ناکارہ مشہور تھا اس لیے شہر میں کہرام مچ گیا، تحقیقات کے واسطے جوق در جوق آدمی

زکریا کے مکان پر پہنچتے رہے اور باہر سے ٹیلیفون اور تاروں کی بھرمار ہوئی کہ زکریا کی خیریت سے مطلع کرو، مولوی انعام صاحب نے لکھا کہ نظام الدین میں بھی اس ناکارہ کی خیریت کے تار اور ٹیلیفون کثرت سے آئے۔

علی میاں اس ناکارہ سے ملنے کے لیے مع رفقاء ۹ رجب ۲۷ جولائی کو آئے اور شام کو دیو بند میں شوریٰ میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے، بدھ کے دن ظہر کے قریب واپس آئے، دیگر ممبران بھی زکریا سے ملاقات کے واسطے ظہر کے قریب پہنچے، زکریا نے قاضی زین العابدین صاحب پر اعتراض کیا کہ اور حضرات سے تو بے تکلفی نہیں مگر آپ سے بے تکلفی ہے اکابر کو مجمع کے ساتھ بے وقت پہنچنا جس میں مہمانوں کو دِقت ہو میزبانوں کو بھی آپ کی شان کے مناسب نہ تھا، انہوں نے فرمایا کہ اعتراض بالکل صحیح ہے مگر ہم ۹ بجے کے دیو بند سے چلے ہوئے ہیں، مدرسہ کی جیپ میں آئے تھے۔

سہارنپور پہنچ کر ہم نے ڈرائیور سے کہا کہ ادھر کو چلو اُس نے کہا کہ آپ مجھے مدرسہ کا پتہ بتا رہے ہیں میں تو کثرت سے آتا رہتا ہوں اور وہ ان کو بجائے مظاہر علوم کے اسلامیہ اسکول لے گیا، اس لیے کہ جناب الحاج قاری طیب صاحب کی یہاں کثرت سے آمد و رفت ہوتی رہتی ہے اور جو ہم نے کہا کہ مظاہر علوم جانا ہے تو وہاں سے مظاہر کا راستہ نہ وہ جانتا تھا نہ ہم جانتے تھے اس لیے خوب چکر کاٹ کر پہنچے، علی میاں نے تو یہ کہہ کر مجھے تکان بہت ہوگئی ہے اگر زکریا کھانے پر بلاوے تب بھی نہ جگانا لیٹ لیے۔

اہلِ رائے پور کا علی میاں پر عرصہ سے اصرار تھا کہ دو تین دن کے لیے رائے پور آئیں علی میاں نے ان کو لکھا تھا کہ اس سفر میں رائے پور بھی آؤں گا اور دیو بند سے واپسی پر جمعرات علی الصباح رائے پور جانا شاہ مسعود صاحب سے طے ہوگیا تھا، چائے رائے پور جا کر پینی ہے مگر کار کے آنے میں دیر ہوئی اس لیے چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر ۸ بجے کے قریب گئے، زکریا پر بھی چلنے کا اصرار کیا مگر زکریا نے عذر کر دیا کہ مجھے معلوم ہے کہ وہ حضرات آپ سے تخلیہ میں بات کرنا چاہتے ہیں اس وقت میں نہیں جاؤں گا، علی میاں کی سیٹیں چونکہ جمعہ کی شام کی ریزرو تھیں اس لیے جمعہ کی صبح کو واپس ہوئے اور بہت ہی متاثر واپس آئے اور زکریا پر بہت اصرار کیا کہ رائے پور کی حاضری میں کمی بالکل نہ آوے، بلکہ اضافہ ہوسکے تو اچھا ہے، بلکہ میری تمنا تو یہ ہے کہ رمضان تیرا رائے پور میں گزرے، مگر مجمع کی کثرت کی وجہ سے اس کی تو کوئی صورت ہے نہیں۔

علی میاں رائے پور کے حضرات سے یہ وعدہ کر کے آئے تھے کہ شوال میں زکریا کو ساتھ لے کر دو تین دن کے لیے آؤں گا، علی میاں نے یہ بھی کہا کہ اتنا زمانہ گزر گیا مگر انوار و برکات خوب

زوروں پر ہیں، مگر شوال میں علی میاں کو فرصت نہیں ہوئی، ذیقعدہ میں زکریا کی واپسی حجاز ہوگئی اس لیے اجتماعی حاضری نہ ہوسکی۔

اس سال حجاج پر تین تنگیاں عائد ہوئیں، نمبر ا ڈیک کے کرایہ میں پانچ سو کا اور فرسٹ میں پندرہ سو کا اضافہ ہوا، نمبر ۲ ایک سال سے سولہ سال تک بچوں کو لے جانے کی ممانعت ہوگئی، نمبر ۳ سعودی نے چونکہ کرنسی بڑھادی اس لیے پہلے دو ہزار میں نو سو ریال ملتے تھے اس سال دو ہزار چھ سو میں گیارسو ریال ملیں گے اور جس کے پاس اتنی رقم نہ ہو اُس کو جانے کی ممانعت ہے۔

۱۲ شعبان کو یکے بعد دیگرے دو برقیے پہنچے، نمبر ا مولوی یوسف تتلی کا کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا، نمبر ۲ اہلیہ عبدالحفیظ مکی کی طرف سے کہ ہفتہ کی شب میں لڑکا پیدا ہوا مبارکباد، نمبر ۳، ۱۸، ۱۹ شعبان، ۶، ۷ ستمبر کی درمیانی شب میں وزیراعظم بھٹو نے قادیانیوں کو اقلیت ماننے کا اعلان کر دیا، مولانا بنوری نے لکھا کہ اعلان پر سارے پاکستان میں انتہائی خوشی منائی گئی کہ دکانوں پر مٹھائیاں ختم ہوگئیں، ہر محلہ میں مستقل دیگیں تیار ہوئیں اور خوب جشن منے، ہر محلہ میں مستقل شادیوں کا سا ہنگامہ ہورہا تھا۔

۲۳ شعبان کی صبح کو مدرسہ قدیم کی مسجد میں ایک شخص نے مصلے پر پہنچ کر تکبیر کا تقاضا کیا، ہم لوگ سمجھے کہ اصل امام کہیں گیا ہوگا، مگر نماز اُس نے بہت بے تکی پڑھائی، کبھی بہت آہستہ کبھی خوب جہر سے، زکریا نے نماز کے بعد اُس کو بلوایا تو ننگے پاؤں باہر بھاگ گیا معلوم ہوا کہ کوئی دیہات کا رہنے والا مدرسہ کا قدیم طالب علم جس کا پہلے بھی دماغ خراب ہوکر گھر چلا گیا تھا کئی دن سے آیا ہوا تھا، مفتی عبدالقیوم صاحب کے فتوے پر نماز کا اعادہ کیا گیا کہ اِس کی پاکی ناپاکی کا حال معلوم نہیں۔

سفرِ میوات

اس کے بعد دہلی کے قرارداد کے موافق ۱۰ اگست کی صبح کو بھائی کرامت کی گاڑی میں کہ مولانا انعام صاحب اسی میں شب شنبہ میں سہارنپور پہنچ گئے تھے، زکریا نے تو بڑے زور سے بابوجی سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ جیپ لے کر آدیں کہ بارش کا موسم تھا کہ راستہ میں تھانہ بھون اور جھنجھانہ بھی حاضری کا خیال تھا، لیکن بھائی کرامت کے اصرار پر یہ ناکارہ اُن کی گاڑی میں اور بقیہ رفقاء بابوجی کی گاڑی میں ۵:۳۰ بجے سہارنپور سے چل کر ۸ بجے کاندھلہ پہنچے اس لیے کہ بارش بہت ہورہی تھی، خیال یہ تھا کہ آدھ گھنٹہ کاندھلہ ٹھہر کر ۱۱ بجے تک دہلی پہنچ جائیں گے مگر صوفی افتخار نے کہا کہ میں کھانے کا انتظام کر چکا ہوں اور خیال یہ تھا کہ ۱۲ بجے تک پہنچو گے اور لوگوں کو بھی مدعو کر چکا ہوں، اس لیے ٹھہرنا پڑا۔

ہندوستان میں اس زمانہ میں بجلی کی گڑبڑ ہو رہی تھی، کئی کئی گھنٹے بند رہتی تھی اور کاندھلہ تو قصبہ تھا اس لیے ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی بجلی بند ہو چکی تھی، مگر بابو سعید صاحب کاندھلہ نے بجلی گھر پر پرچہ بھیجا کہ میرے بہت معزز مہمان آئے ہوئے ہیں اس لیے ۱۱ بجے تک بند نہ ہو، چنانچہ فوراً بجلی جاری ہوگئی اور ۱۱ بجے بند ہوگئی، مگر موصوف نے دوبارہ پرچہ بھیجا لہٰذا پھر دوبارہ جاری ہوگئی۔

شنبہ کا دن کاندھلہ میں پینٹھ کا ہوتا ہے مگر بارش کی کثرت کی وجہ سے راستہ صاف تھا، عزیز ابرار سلمہ سے یہ طے ہو گیا تھا کہ چند منٹ تمہارے باغ میں ٹھہرنا ہے بشرطیکہ تم زور شور نہ باندھو، انہوں نے تو اپنی شرط کو پورا نہ کیا مگر بارش نے اتنا زور باندھا کہ عزیز موصوف کی دعوت ناقص رہ گئی، زکریا تو اپنی کار سے اُترا نہیں بقیہ رفقاء نے اُتر کر کھایا عزیز ابرار سلمہ کی ہمشیرہ کی سسرال کے معززین بھی مدعو کیے گئے تھے مگر ان سے بھی کار ہی میں بیٹھے بیٹھے مصافحے ہوئے اور پون بجے وہاں سے چل کر ۲:۳۰ بجے نظام الدین پہنچے اور ظہر کی نماز پڑھ کر زکریا تو لیٹ گیا، رفقاء نے کھانا کھایا۔

یکشنبہ کی صبح کو اپنی جماعت کر کے قطب صاحب ایک گھنٹہ ٹھہرتے ہوئے نمبردار محراب کی قبر پر جو فیروز پور نمک میں مرحوم کی وصیت سے لب سڑک بنائی گئی ہے تاکہ اکابر نظام الدین میوات کے سفر میں تھوڑی دیر یہاں ٹھہرتے جائیں، وہاں کے لوگوں نے بہت انتظام کر رکھا تھا، زکریا تو کار ہی میں رہا مگر مولانا انعام صاحب نے تقریر شروع کر دی دعائیں اور نصیحتوں کے بعد ۹:۳۰ بجے مدرسہ معین الاسلام قصبہ نوح میں پہنچ گئے، عصر کے وقت پنڈال میں اجتماع تجویز تھا، کچھ دیر بعد زکریا کو بھی بُلایا گیا، وہاں تقاریر پر تشکیل وغیرہ ہوئی۔

واپسی پر چوہدری طیب صاحب کے اصرار پر اُن کے اسکول کے ایک کمرے کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور مغرب کے بعد سے پھر طویل اجتماع شروع ہوا، پیر کی صبح کو ۱۰ بجے تک جماعتوں کی روانگی مصافحے ہوئے اور فراغ کے بعد کامیڈا کے لیے روانہ ہوئے، ہجوم نوح میں بھی کافی تھا اور کامیڈا میں اضعافاً مضاعفاً ہو گیا، وہاں ۲۴ گھنٹے تقاریر پر تشکیل وغیرہ ہوتی رہیں اور منگل ۱۴ اگست کی صبح کو جماعتوں کی روانگی سے نمٹ کر ایک بجے کھانے اور نماز سے فراغ پر سنگھار کے لیے روانہ ہوگئے، راستہ میں شاہ چوکھے کے مدرسہ میں ٹھہرتے ہوئے ۳ بجے سنگھار پہنچے۔

یہاں تو اتنا ہجوم تھا کہ دو فرلانگ پہلے ہی سے ہجوم شروع ہو گیا، زکریا نے تو واپسی شروع کر دی مگر عزیز مولوی اظہار سلمہ کے شدید اصرار پر قیام کا ارادہ کرنا پڑا اور اچھا ہی ہوا، بعد میں معلوم ہوا کہ زکریا کے واپسی کے ارادہ پر کئی سو آدمی سڑک پر لیٹ گئے کہ کار واپس نہیں جانے دیں گے، بدھ کے دن تین بجے طعام اور نماز سے فراغت پر واپسی ہوئی اور آدھ گھنٹہ سرائے کے مدرسہ پر

قیام ہوا، ۳ بجے کے قریب نظام الدین پہنچے۔

زکریا کا ارادہ پہلے سے تو جمعرات ہی کو سہارنپور واپسی کا تھا جس کی زیادہ اہمیت عزیز ابو الحسن کی وجہ سے تھی کہ اس کی رخصت جمعرات تک کی تھی، مگر اتوار کے دن مولانا انعام الحسن صاحب کو گلاؤٹھی کے اجتماع میں جانا تھا اس لیے زکریا نے بھی شرکت کا ارادہ کرلیا اور ابوالحسن کو واپس کردیا۔

۱۵ اگست کو مہندیوں میں جانا تجویز تھا، مگر معلوم ہوا کہ یوم آزادی ہے، سارے راستے بند ہیں، لیکن بھائی کرامت کا ڈرائیور گاڑی کو نکال کر لے ہی گیا، بعد میں زکریا کی رائے اور خود مولانا انعام صاحب کی رائے بھی گلاؤٹھی کی نہیں ہوئی، لیکن سابقہ تجویز کی بناء پر اتوار تک دہلی قیام رہا۔

اتوار ۲۸ اگست کی صبح کو بھائی کرامت کی گاڑی میں زکریا سہارنپور روانہ ہوگیا سہارنپور واپسی پر معلوم ہوا کہ مولانا یونس صاحب نے بخاری کا ختم روک رکھا ہے اس لیے حسب سابق دوشنبہ کی صبح کو ۹:۳۰ پر زکریا اور ناظم صاحب بھی پہنچ گئے، معلوم ہوا کہ ایک حدیث روک رکھی ہے، عبارت تو خود مولانا نے پڑھی، دعاء کے بعد زکریا اور ناظم صاحب تو واپس آگئے، اس کے بعد مولوی یونس صاحب نے سبق ختم کرایا، دعاء مولوی وقار صاحب نے کرائی اور اس کے بعد ناظم صاحب نے کچھ طلبہ کو نصائح فرمائے۔

سہارنپور کے تبلیغی اجتماع کی تاریخ کئی ماہ پہلے سے ۳۱ اگست تا ۲ ستمبر طے شدہ تھی، سہارنپور میں اسلامی شفاخانہ کی بنیاد دو (۲) سال پہلے زکریا نے ہی رکھی تھی، اس سال اس کی جدید تعمیر کے سنگِ بنیاد پر بھی بہت اصرار ہوا، اول تو زکریا نے بہت معذرت کی مگر جناب حکیم عبدالخالق صاحب کے اصرار کی وجہ سے کہ ان کے احسانات مدرسہ پر بہت ہیں قبول کرنا پڑا، ۲۵ اگست کو اس کا سنگِ بنیاد زکریا نے بمعیت ناظم صاحب مدرسہ رکھا، یہ اُن لوگوں نے احسان کیا کہ ہم دونوں کو جلدی واپس کردیا اور ان کے جلسہ کی کاروائی شام تک ہوتی رہی۔

......☆☆☆☆☆......

اجتماع سہارنپور ۱۳۹۴ھ

سہارنپور کا تبلیغی اجتماع عزیز مولانا یوسف صاحب مرحوم کے زمانہ سے اسلامیہ اسکول میں ہوتا چلا آتا ہے اور کسی سال ملتوی بھی ہو جاتا ہے، اس مرتبہ کئی ماہ پہلے سے اجتماع کی تاریخیں ۳۱ اگست تا ۲ ستمبر طے شدہ تھیں، اس اجتماع کے درمیان میں عزیز مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا انعام الحسن صاحب سلمہ کا معمول یہ رہا اور ہے کہ اجتماع کے دنوں میں وہ گھر بھی نہیں آتے، اسکول ہی میں شب و روز قیام رہتا ہے، اجتماع سے فارغ ہو کر گھر آیا کرتے ہیں اور یہ ناکارہ بھی یہ تین دن اسکول ہی میں شب و روز گزارتا ہے جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا، کئی ماہ پہلے سے زکریا مدینہ منورہ سے احباب کو جو میرے ہند پہنچنے کی تاریخیں معلوم کرتے تھے، یہی لکھتا رہا کہ میری آمد پر دہلی یا سہارنپور کا ارادہ نہ کریں، اجتماع کے موقع پر آئیں کہ ملاقات بھی ہو جائے گی اور اجتماع میں شرکت بھی ہو جائے گی۔

اس کی وجہ سے آمد کے موقع پر تو کچھ کمی نہ ہوئی لیکن اجتماع کے موقع پر اضعافاً مضاعفاً مجمع بڑھ گیا، زکریا کے کمرے کو ایسا بُری طرح گھیرا کہ ہر وقت کیواڑ بند رکھنے پڑے، ہر چند لوگوں کو سمجھایا جاتا کہ اجتماع گاہ میں جائیں اور حسب نظام الاوقات صبح کو بھی زکریا پنڈال میں رہے گا اور عشاء کے بعد بھی وہیں آپ حضرات بھی تشریف رکھیں اور مصافحے اجتماع کے ختم پر ایک دفعہ ہی ہوں گے، اس پر سبھی نے زور دیا، سمجھایا مگر ہجوم نے ایسا گھیراؤ کیا کہ اسکول کے کیواڑ ٹوٹنے کا بھی ڈر ہو گیا۔

پہلی رات کو ۱۲ بجے مولانا انعام صاحب نے کہا کہ ہم لوگوں کے سونے میں تو کوئی دقت نہیں مگر تو تو باہر نہیں سو سکتا اس لیے رات کو ۱۲ بجے بند کار میں مکان پہنچا ہوا، دوسری رات کو بھی یہی ہوا، اجتماع تو صبح کی نماز کے بعد سے ہی شروع ہو جاتا تھا مگر متفرق تقاریر ہوئی تھیں اور ۸ بجے ناشتہ کے لیے حسب دستور سابق وقت دیا جاتا تھا اور ۹ بجے سے اصل اجتماع شروع ہوتا تھا اس لیے زکریا دونوں راتوں میں یہ طے کر آیا تھا کہ صبح کو ۹ بجے تک پہنچ جاؤں گا۔

چونکہ کاریں بہت تھیں اور صبح کا وقت خالی تھا اس لیے مولوی انعام صاحب سے یہ طے ہو گیا تھا کہ میں صبح کی نماز پڑھ کر گنگوہ پہنچ جاؤں گا اور آپ بھی موقع پا کر پہنچ جائیں واپسی ساتھ ہو جاوے گی اور دوسرے دن یہی صورت رائے پور کے متعلق طے ہوئی، زکریا بابو جی کی گاڑی میں یک شنبہ کو گنگوہ اور دوشنبہ کو رائے پور حاضر ہوا مولانا انعام صاحب بھی متعدد کاروں کے ساتھ گنگوہ پہنچ

گئے اور رائے پور کے دن تو اذان ہی کے وقت مدرسہ پہنچ گئے اور چونکہ کاریں بہت سی تھیں، اس لیے جو بھی سنتار ہا گنگوہ یا رائے پور پہنچتا رہا۔

حاجی غلام رسول صاحب کو مدینہ سے زکریا نے لکھ دیا تھا کہ وہ آمد کے موقع پر نہ آئیں، اجتماع میں آئیں، وہ تقریباً سو (۱۰۰) نفر کے ساتھ پنجشنبہ کی شب میں سہارنپور پہنچ گئے۔

اجتماع تو شنبہ کی شب سے شروع ہو گیا تھا لیکن مولانا انعام صاحب وغیرہ حضرات شنبہ کو دس (۱۰) بجے پہنچے، زکریا نے حکماً کہا کھانا کھا کر یہیں سو جاؤ، عصر پڑھ کر چلے جانا، میں بھی اسی وقت چلا جاؤں، حاجی غلام رسول کے علاوہ ۳۰۰ نفر بنگال کے پہنچے اور اسی طرح بہار، گجرات وغیرہ کا مجمع **لا تعد و لا تحصیٰ** پہنچتا رہا۔

اتوار کی صبح کو افضال صابری کے بھائی کا نکاح تھا جس کا پہلے سے زکریا پر اصرار تھا، زکریا نے اجتماع پر طے کر دیا تھا، اس لیے گنگوہ سے واپسی پر زکریا تو سیدھا پنڈال پہنچ گیا اور مولانا انعام صاحب سے کہہ دیا کہ آپ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر آویں، مگر ان حضرات کے آنے میں تاخیر ہوئی، عزیز ابوالحسن نے بار بار ٹیلیفون بھی کیے، ۱۱ بجے کے قریب آئے، اُسی وقت مہرِ فاطمی پر نکاح ہوا۔

قاری طیب صاحب ہمیشہ کے معمول کے خلاف اس اجتماع میں شریک نہ ہو سکے جس کا قلق رہا، جب قاری صاحب کو ابتدائی دعوت نامہ گیا تھا اُس وقت تو قاری صاحب طویل سفر میں تھے، اتوار کے دن ظہر کے بعد قاری صاحب کی تشریف آوری کا حال معلوم ہوا اُسی وقت آدمی بھیجا گیا مگر چونکہ وقت تھوڑا تھا اور شام ہی کو جلسہ کا اختتام تھا اور پیر کی صبح کو جماعتوں کی روانگی، ہدایات اور مصافحے تھے، اس لیے شرکت نہ ہو سکی جس کا بہت قلق ہے۔

زکریا مجمع کے مصافحے سے یہ کہہ کر انکار کر رہا تھا کہ جلسہ کے اختتام پر جماعتوں کے ساتھ ہوگا لیکن جب مصافحوں کا وقت شروع ہوا تو ہجوم سے اسلامیہ اسکول کا سارا میدان لبریز تھا، اس لیے مصافحوں پر قابو نہ پا سکے، سبھی نے مقامی اور منتظم جلسہ نے آدھ گھنٹے تک زور باندھا، لوگوں کو سمجھایا مگر پنڈال کے بھی گر جانے کا ڈر ہوا۔

اس لیے مولانا انعام صاحب نے تجویز کیا تو بند کار میں چپکے سے بیٹھ کر مدرسہ چلا جا، بہت مشکل سے نیچے کو جھکے جھکے کار میں بیٹھ کر زکریا تو چلا گیا اس کے بعد مولانا انعام صاحب نے بہت اطمینان سے مصافحے کیے، جماعتوں کو روانہ کیا اور مغرب کے قریب مدرسہ پہنچے اور منگل کی صبح کو وہ حضرات مع مستورات دہلی کے لیے ۸ بجے روانہ ہو گئے۔

حاجی غلام رسول کے رفقاء تو منگل ہی سے جانے شروع ہو گئے مگر وہ مع اپنے مخصوص رفقاء کے

جو تقریباً ۳۰ تھے، جمعرات کے دن روانہ ہو گئے، اجتماع کی تفاصیل زکریا کے روزنامچہ میں تفصیل سے ہیں، یہ مختصر رسالہ اس کا متحمل نہیں ہے۔

رمضان ۱۳۹۴ھ

اس ناکارہ کے پاس احباب کے رمضان گزارنے کا سلسلہ تو تقریباً تیس چالیس سال سے ہے، شروع میں تو دس بارہ آدمی ہوتے تھے اور اس ناکارہ کا معمول یہ تھا کہ رمضان کے چند روز ان مہمانوں کو اپنے پاس رکھ کر رائے پور حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں رمضان گزارنے کے واسطے بھیج دیتا اور ایک پرچہ بھی لکھ دیتا کہ ان کو حضرت کی خدمت میں رمضان گزارنے کے واسطے بھیج رہا ہوں اس کی وجہ سے حضرت قدس سرہٗ کی توجہات عالیہ میرے مہمانوں پر خصوصی رہتیں، اس میں مولوی عبداللہ کرسوی کے رفقاء خاص طور سے بہت قدیم آنے والوں میں تھے اور کئی رمضان انہوں نے رائے پور ہی میں گذارے، بعض لوگوں کی حالت بہت اچھی ہوئی اور حضرت قدس سرہٗ کی توجہات سے اور بھی زیادہ پرواز کرتے مگر وہاں کے بعض مقیمین حضرات نے میرے بعض مہمانوں سے یہ کہہ دیا کہ تمہیں اب تک شیخ نے اجازت کیوں نہیں دی، یہ چیز ان بیچاروں کے لیے سمِ قاتل بن گئی کہ وہ اپنے کو کچھ سمجھنے لگے اس فن کا مسلم اصول یہ ہے کہ جب تک آدمی اپنے کو ناکارہ و نااہل سمجھتا رہے تو کامیاب ہے اور جب اپنے کو اہل سمجھنے لگے تو ناکام ہے، مجھے اپنے اکابر کے خدام اور دوستوں میں بہت سوں پر اس کا تجربہ ہوا، اس نابکار کو میرے حضرت قدس سرہٗ نے ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ میں مدینہ منورہ میں اجازت دی تھی، مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے بلا کسی توریہ اور مبالغہ کے حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے پاؤں پکڑے تھے کہ ہندوستان میں اس کا ذکر مت کیجئے گا مگر حضرت نے فرمادیا کہ میں تو ضرور کروں گا اور وہیں سے لکھنا شروع کر دیا۔

یہاں آنے کے بعد ایک عرصہ تک بیعت کی ہمت نہیں پڑی، شاید آپ بیتی میں کہیں اس کا ذکر آ گیا کہ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کی ڈانٹ پر بلکہ شدید عتاب پر شروع کی، اس کے بعد حضرت شیخ الاسلام اور حضرات رائے پوری نور اللہ مرقدھما کی خدمت میں بار بار عرض کیا کہ میری نااہلیت کے پیشِ نظر آپ حضرات میں سے کوئی بیعت منع کر دے تو میرے لیے گنجائش نکل آئے مگر ہر مرتبہ ان حضرات نے اُلٹا مجھے ہی ڈانٹ دیا، اس وقت تو مجھے حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کا ایک فقرہ یاد آ گیا کہ میری درخواست پر حضرت نے نہایت غصہ میں فرمایا تھا "اپنے کو اہل سمجھ کر کون بیعت کرتا

ہے، جو اپنے کو اہل سمجھے وہ نا اہل ہے'' کامیاب وہی ہے جو اپنے کو نا اہل سمجھتا رہے۔

مضمون تو یہ بہت اہم ہے اور لکھنے کے قابل، مگر غیر متعلقہ ہے اس وقت تو صرف اتنے ہی پر تنبیہ کافی ہے کہ اس لائن میں جو شخص بھی اپنے کو کسی قابل سمجھنے لگتا ہے وہ بجائے ترقی کے تنزل کی طرف چلنے لگتا ہے۔

بہر حال لکھ تو یہ رہا تھا کہ میرے بعض دوستوں کی ترقی اس سے رک گئی، اس کے علاوہ ہر سال مجمع بھی بڑھنا شروع ہو گیا اس لیے رائے پور بھیجنے کا مستقل اہتمام تو چھوٹ گیا کہ حضرت قدس سرہٗ کے بھی رمضان پاکستان وغیرہ میں ہونے لگے، ۱۳۸۲ھ سے حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے وصال کی وجہ سے مجمع میں اضافہ شروع ہو گیا، ۱۳۸۴ء میں تو مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی معیت کا اعتکاف چھوڑ کر ۱۵نفر سہارنپور پہنچے مگر یہاں جگہ نہیں تھی، ان بیچاروں کا اعتکاف بھی رہ گیا، اللہ تعالیٰ اجر عطاء فرمائے، زکریا نے اس سال پورے ماہ کا اعتکاف مدرسہ قدیم کی مسجد میں کیا تھا اس وجہ سے جگہ کی اور بھی تنگی ہوگئی، اس لیے ۱۳۸۵ھ سے دار الطلبہ جدید کی مسجد میں رمضان گذارنا شروع کیا، وہاں بھی ہر سال مجمع بڑھتا ہی چلا گیا، چنانچہ اس سال ۴۰نفر معتکف تھے اخیر میں ۲۰۰ تک مقدار پہنچ گئی۔

۱۳۸۶ء میں معتکفین ۲۰۰ تک شروع ہی سے ہو گئے، ۱۳۸۷ھ میں تقریباً ۵۰ نفر کو یہ کہہ کر انکار کرنا پڑا کہ مسجد میں جگہ نہیں رہی، دار الطلبہ جدید میں خیمے لگانے پڑے طلبہ کے حجرے خالی تھے اُن میں مہمانوں کو ٹھہرانا شروع کیا۔

۱۳۸۹ میں تو اس ناکارہ کا حرمین شریفین میں رمضان گزرا، حرمین شریفین کے رمضان کا معمول یہ ہے کہ نصف اول مکہ مکرمہ میں تاکہ عمرات فی رمضان ہو جائیں ''**عمرة فی رمضان تعدل حجة معی**'' اور نصف آخر مدینہ منورہ میں تاکہ مسجد نبوی میں اعتکاف نصیب ہو جائے۔

چونکہ ۱۳۹۳ھ کا رمضان بھی اس ناکارہ کا حرمین شریفین میں گزرا تھا اس لیے احباب کا اندازہ یہ تھا کہ ۱۳۹۴ھ میں مجمع بہت ہوگا چنانچہ ایسا ہی ہوا ۱۳۹۳ھ ہی سے احباب نے زکریا پر یہ زور دینا شروع کیا تھا کہ دار الطلبہ جدید کی مسجد دو منزلی ہو جائے تو معتکفین کو سہولت ہو مگر زکریا عذر کر دیتا تھا کہ میری زندگی کتنے دن کی ہے۔

چونکہ ۱۳۹۳ھ میں اہلِ مدرسہ نے بھی زکریا پر زور دینا شروع کیا کہ مدرسہ کی ضرورت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ دارِ جدید کی مسجد دو منزلی ہو جائے کہ طلبہ ہر سال بڑھتے جاتے ہیں اور اس وقت چونکہ احباب کا خود اصرار ہو رہا ہے اس لیے مسجد کے بننے میں سہولت رہے گی، زکریا نے بھی خوب خیال کیا کہ واقعی مدرسہ کی ضرورت تو بڑھے گی ہی اس لیے زکریا نے منظوری دے دی اور احباب

نے (اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطاء فرمائے) چند ماہ میں دار الطلبہ جدید کی مسجد کو دو منزلی بنوا دیا۔
مگر چونکہ گزشتہ سال زکریا کا رمضان سہارنپور نہیں ہوا تھا، اس لیے مجمع اندازہ سے زیادہ بڑھ گیا اور دو منزلی مسجد بھی معتکفین کے لیے کافی نہیں ہوئی، جتنے مسجد کے دونوں حصوں میں آ سکے، اُن کا اعتکاف ہوا باقی مہمانوں کے لیے دار الطلبہ جدید کے حجرے خالی کرائے گئے کہ طلبہ اپنے گھر جانے والے تھے، اُن کا سامان ایک حجرے میں منتقل کیا اور جو رمضان سہارنپور گزارنے والے تھے اُن کو ایک ماہ کے لیے دار الطلبہ قدیم میں منتقل کیا، شروع رمضان میں آٹھ نو سو کا اندازہ تھا اور اخیر رمضان میں عزیز مولوی نصیر الدین نے کہا کہ آج ۱۸سو مہمان ہیں، اجتماع میں جو لوگ آئے تھے اُن میں سے بھی ۳۰، ۴۰ کے قریب رمضان گزارنے کے لیے ٹھہر گئے تھے۔
اس ناکارہ کا اصل مذاق پہلے کہیں گزر چکا ہے کہ انتہائی یکسوئی کا ہے۔ جس کو حکیم طیب مرحوم کے الفاظ میں کہیں پہ نقل کرا چکا ہوں کہ "بھائی جی رمضان سب کے یہاں آوے مگر بخار کی طرح سے نہیں آتا"، مگر اپنے ذوق اور طبیعت کے خلاف موجودہ دور کے اکابر اور احباب کے اصرار پر یہ ہجوم گوارا کرنا پڑتا ہے۔ ہمیشہ سے اس کی کوشش رہتی ہے کہ اگر خدانخواستہ کچھ اپنے کو معمولی نقصان بھی پہنچ جائے اور دوسرے کو اس سے زیادہ نفع پہنچ جائے تو اسے برداشت کر لینا چاہیے۔
اس روز افزوں ہجوم کی کمی کے سلسلہ میں تو کئی سال سے اپنے مخلصین مولانا منور حسین صاحب، مفتی محمود حسن صاحب، بھائی جمیل صاحب حیدر آبادی جو پورا رمضان وہاں گزارتے ہیں یا رمضان میں آمد کا خاص طور سے اہتمام کرتے ہیں۔
جیسے مولانا یوسف مرحوم مولانا انعام الحسن صاحب سلمہ، علی میاں مولانا منظور احمد صاحب نعمانی وغیرہ سے ہر سال مشورہ بار بار ہوتا رہتا ہے، مگر یہ حضرات اس مجمع کی زیادتی کو لوگوں کے لیے مفید بتاتے ہیں۔ گو ان میں بہت سے لوگ غیر متعلق بھی آ جاتے ہیں اس ناکارہ کو کام کرنے والوں کی آمد پر تو زیادہ گرانی نہیں ہوتی، چاہے اس سے بھی بڑھ جائیں بشرطیکہ وہ رمضان کو نہایت یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رکھیں۔
لیکن ایسے لوگ جو محض تفریحاً رمضان گزارنے آتے ہیں یا مدارس کے وہ طلبہ جن کے کھانے رمضان میں بند ہو جائیں اور ان کو دوسرے سال کسی دوسرے مدرسہ میں منتقل ہونا ہو اور تعطیل کے یہ ایام یہاں گزار دینا چاہتے ہوں، ایسوں کی آمد گراں گزرتی ہے۔ اس ناکارہ کے یہاں ماہ مبارک میں کھانے پر کوئی پابندی نہیں لیکن بلا مجبوری کسی سے بات کرنا بدترین جرم ہے۔ اسی لیے جب میرے کان میں کسی کے متعلق یہ پڑتا ہے کہ وہ باتیں کرتا ہے تو ایک دو دفعہ کی تنبیہ کے بعد اس سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کہیں دوسری جگہ رمضان گزاریں۔

بعض احباب نے یہ مشورہ دیا کہ مدارس کے مدرسین کے علاوہ کو آنے کی اجازت نہیں دے جائے۔ مدرسین کو تو یہ مجبوری ہے کہ سال بھران کو اپنے مدارس کی وجہ سے آنے کا وقت نہیں ملتا مگر دوسرے لوگ تو دوسرے وقت بھی آسکتے ہیں لیکن اس ناکارہ نے اس کو کبھی قبول نہیں کیا کہ مجھے بھی دوستوں سے یکسوئی سے ملنے کا وقت رمضان ہی میں ملتا ہے اور بھی بہت سی تجویزیں احباب ہر سال پیش کرتے رہتے ہیں مگر اس ہجوم کی تقلیل کی کوئی ایسی صورت اب تک قابو میں نہیں آئی۔

بعض مخلصین کا یہ اصرار ہے کہ بعض اکابر کی طرح رمضان میں کھانے کا انتظام اپنے ذمہ نہ رکھا جائے۔ یہ تو ظاہر ہے ایسی صورت میں مجمع کی قلت بہت ہو جائے گی مگر اس میں ان لوگوں کا بہت حرج ہے کہ جو واقعی کام کرنے کی نیت سے آتے ہیں کہ ان کو سحر و افطار کے انتظام میں وقت بہت ضائع کرنا پڑے گا۔ ماہِ مبارک بہت ہی قیمتی زمانہ ہے کاش میرے دوست اس کی اہمیت کو پہچانیں اور اس کو زیادہ سے زیادہ وصول کرنے کی کوشش کریں کہ اس کی برکات سال بھر تک رہتی ہیں۔

حضرت قطب الارشاد قطب عالم گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کا تو دور میرے بہت بچپن کا تھا اس کا تو خواب سا نقشہ یاد ہے مگر اس کا خاکہ بڑے حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے دور میں خوب دیکھا۔ چار سو سے زیادہ مجمع ہوتا تھا اور حضرت قدس سرہٗ کے یہاں مجلس میں حاضری کا کوئی وقت نہیں تھا، جب حضرت قدس سرہٗ مسجد میں نماز کے لیے جاتے تھے تو ہر شخص اپنی اپنی جگہ کھڑا ہوا مجسمہ دیوار بنا ہوا سراپا اشتیاق زیارت کر لیتا تھا، اس کے علاوہ نہ آپس کا ملنا جلنا نہ بات چیت، مہمانداری حضرت قدس سرہٗ کے یہاں تھی مگر افطار ہو یا سحر ایسا خاموشی سے سب حضرات کھانے پینے سے چائے اور افطار سے ایسی فراغت پاتے تھے کہ شور و شغب کی آواز اس وقت بھی کان میں نہیں پڑتی تھی۔

جب سے اس ناکارہ کا رمضان دا۔ جدید میں منتقل ہوا ہے تراویح میں ۳ پارے روز سننے کا معمول ہے تاکہ ہر عشرہ میں ایک قرآن ہو سکے اور جو لوگ ایک عشرہ کے لیے آتے ہیں اُن کا قرآن ناقص نہ رہے، میرا تراویح کا مستقل امام عزیز سلمان سلمہ جو ماشاء اللہ بہت اچھا پڑھتا ہے اور یاد بھی خوب ہے اور نمازی اس سے خوش بھی خوب ہیں، لیکن ایک قرآن بعض وجوہ سے کوئی دوسرا بھی پڑھ دیتا ہے، ۱۳۹۱ھ میں حضرت ناظم صاحب کے حکم سے پہلا قرآن قاری احمد گورا مدرس تجوید مدرسہ نے پڑھا اور ۱۳۹۰ھ میں عزیز زبیر سلمہ نے ایک قرآن پڑھا، ۱۳۸۸ھ میں حافظ فرقان پارچہ فروش نے ایک قرآن درمیانی عشرہ میں پڑھا، مفتی یحییٰ نے بھی دو رمضانوں میں ایک ایک قرآن سنایا اور ۱۳۹۴ھ میں ایک قرآن عزیز سلمان کے چھوٹے بھائی عزیز خالد نے سنایا۔

اس سال ''اوجز'' کی بیروت میں طباعت کی تجویز عزیز عبدالحفیظ نے کی تھی اور اہلِ بیروت نے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ اگر پروف دیکھنے والے متعدد ہوں تو ہم ڈیڑھ ماہ میں کتاب پوری کر دیں گے، اس لیے عزیز عبدالحفیظ، قاری یوسف متالا مع اہل وعیال، مفتی اسماعیل، مولوی اقبال ندوی ان سب حضرات کو بیروت جمع کر دیا، مگر وہ ڈیڑھ ماہ چار پانچ سال میں بھی پورا نہ ہوا اور شعبان میں یہ مجمع منتشر ہو گیا، مولوی یوسف متالا مع اہل وعیال لندن چلے گئے، مفتی اسماعیل عمرہ کرتے ہوئے ۱۰ رمضان کو بمبئی پہنچے اور ایک ہفتہ گھر رہ کر ۱۹ رمضان کو سہارنپور پہنچے، عزیز مولوی عبدالحفیظ سلمہ، ۲۱ رمضان کو جدہ سے چل کر بمبئی ہوتے ہوئے ۲۲ کو عصر کے وقت سہارنپور سیدھے پہنچ گئے۔

اس سال مسجد کے دوچند ہونے کی وجہ سے خیال تھا کہ سہولت رہے گی مگر ہجوم اندازہ سے زیادہ ہو گیا، عشرہ اولیٰ کے ختم پر ایک ہزار تک پہنچ گئے، ۲۷، ۲۸ کو تقریباً دو ہزار تک پہنچ گئے۔

کئی سال سے ماہِ مبارک میں صبح کو گیارہ بجے کے قریب ایک گھنٹہ وعظ بھی سلسلہ رہا، ظہر کے بعد عصر تک حسب ختم خواجگان اور ذکر بالجہر، عصر کے بعد اکمال الشیم، ارشاد الملوک مغرب کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ نوافل اور طعام اس کے بعد عشاء کی اذان تک نو وارد آنے والوں سے اور مقیمین سے ملاقات، یہ معمولات قدیم رہے، اس سال مولانا منور صاحب اور مولانا عبید اللہ صاحب مع اپنے اہل وعیال کے سہارنپور میں مقیم رہے۔

یکم شوال ۱۸ اکتوبر یوم جمعہ کو نمازِ عید طلوع آفتاب کے آدھ گھنٹہ بعد مولانا عبید اللہ صاحب نے دارِ جدید میں اور دار الطلبہ قدیم میں ۹ بجے قاری رضوان نسیم نے پڑھائی، اس سال چونکہ مجمع بہت زیادہ ہو گیا تھا جس کی واپسی میں تاخیر ہوتی رہی، اس لیے اس ناکارہ کو بھی عید کے بعد دارِ جدید کی مسجد میں کئی دن تک قیام کرنا پڑا ورنہ ہمیشہ کا معمول ۲ یا ۳ شوال کو گھر آ جانے کا تھا، مگر مجمع جو رمضان کا بچا ہوا تھا وہ مدرسہ قدیم میں نہیں آ سکتا تھا اس لیے اس ناکارہ کو بھی دیر تک ٹھہرنا پڑا۔

۲ شوال کی صبح کو کار سے حضرت مولانا قاری طیب صاحب، مولانا فخر الحسن صاحب صدر المدرسین دار العلوم وغیرہ حضرات تشریف لائے اور مولانا منور حسن صاحب، مولانا عبید اللہ صاحب کی درخواست پر پون گھنٹے سے زائد تقریر بھی فرمائی، قاری صاحب نے فرمایا کہ کوئی بات تقریر کی تو ہے نہیں میں تو صرف دعائیں اور مبارکباد دینے آیا تھا، زکریا نے کہا کہ دعائیں تو بہت اہم ہیں اللہ تعالیٰ ان دوستوں کی آمد کو قبول فرمائے، حضرت قاری صاحب نے اس پر تفصیل سے مبارکباد دی اور دعاء کی اپنی راحت و آرام کو چھوڑ کر ایک ماہ اعتکاف کیا، جناب الحاج عبد العلیم صاحب مرادآبادی نے بھی پورا ماہ مع اپنے رفقاء کے دار الطلبہ جدید ہی میں قیام کیا جن کی وجہ سے

مرادآبادی احباب کا بہت بڑا مجمع وقتاً فوقتاً آتا رہا۔

علی میاں اور مولانا منظور صاحب بھی متفرق اوقات میں تشریف لائے کہ رمضان کے بعد اس ناکارہ کی واپسی حجاز کی جلد ہی تجویز تھی، بھائی سعید گنگوہی کا قدح چشم بھی گنگوہ میں اسی ماہ ہوا۔

۱۳ شوال کو قاری طیب صاحب کی دوبارہ تشریف آوری کچھ مہمانوں کے ساتھ ہوئی، قاری صاحب نے فرمایا کہ یہ حضرات بذریعہ کار تجھ سے ملنے کے لیے آرہے تھے میں نے سوچا کہ میں بھی تھوڑی دیر کو قند مکرر ان کے ساتھ آجاؤں۔

۱۱ شوال کو اٹلی کے دو صاحب مع اپنی مستورات کے آئے جو پہلے بھی دو (۲) سال پہلے آئے تھے اور ایک اُن میں سے بیعت بھی ہو کر گیا تھا، اُنہوں نے تخلیہ کا وقت مانگا، بندہ نے عشاء کے دو (۲) گھنٹے بعد بتادیا، وہ آئے اور تصوف کے ابحاث وسوالات شروع کیے "وحدۃ الوجود" "وحدۃ الشھود" وغیرہ امور کی تفصیل، زکریا نے کہہ دیا کہ یہ چیزیں بحثوں اور تقریروں کی نہیں اور مبتدیوں کو ان چیزوں میں نہیں پڑنا چاہیے معمولات کا انگریزی پرچہ جو دو (۲) سال پہلے لے گئے تھے اُس پر بتاؤ کیا کیا عمل ہوا، اس پر عمل میں تقصیر پر زکریا نے تنبیہ بھی کی کہ جو کرنے کا کام ہے وہ تو ہوتا نہیں ان زوائد کے درمیان میں اوقات ضائع کر رہے ہو اُنہوں نے اصرار کیا کہ ہم سمجھنا چاہتے ہیں، زکریا نے کہہ دیا کہ یہ سمجھنے کی چیز نہیں جب یہاں پہنچو گے تو خود ہی سمجھ میں آجائے گی، اُنہوں نے کہا کہ دہلی میں حضرت شاہ ابوالخیر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خانقاہ میں اس پر بحث ہوتی ہے، زکریا نے کہا کہ آپ کا جی چاہے تو شریک ہوجایا کرو ورنہ محض وقت ضائع کرنا ہے۔

۷ا شوال کو دہلی سے مستورات عزیز خالد کے نکاح میں شرکت کے لیے بابو جی کی گاڑی میں آئیں، زکریا نے مفت کی گاڑی دیکھ کر علی الصباح دیوبند کا ارادہ کیا، دیوبند پہنچ کر معلوم ہوا کہ قاری طیب صاحب مع متعدد حضرات ممبران دارالعلوم کے مجھ سے ملنے سہارنپور گئے ہیں، اس لیے اپنے قیام دیوبند کو مختصر کر کے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ قاری صاحب تو واپس تشریف لے جا چکے مگر قاضی زین العابدین وغیرہ ابھی انتظار میں موجود تھے۔

عزیز خالد، برادرِ خورد عزیز سلمان کا نکاح جو ایک سال پہلے سے زکریا کی تجویز میں تھا بعض وجوہ سے نہیں ہوسکا، ۲۵ شوال دوشنبہ کی شب میں بعد مغرب بعبارت مولانا انعام الحسن صاحب بمہر پانچ ہزار ہوا، مہر پر ردوقدح بھی ہوئی، حکیم جی نے یہی مقدار تجویز کر رکھی تھی کہ ہمارے خاندان کا مہر مثل یہی ہے، مہر مثل کی رعایت ضروری ہے عزیز خالد کا نکاح از دخترِ حکیم الیاس، مولوی انعام صاحب نے فرمایا کہ مہر مثل ماں اور خالہ کا معتبر ہوتا ہے ان دونوں کا مہر مہر فاطمی ہے

مگر حکیم جی کے اصرار پر ان ہی کی رائے پر عمل ہوا، اجتماع سرپرستان بھی جو پہلے سے تجویز تھا مگر اس خیال سے کہ دو وقت آنا مشکل ہے اسی وقت پر محول کر دیا تھا۔

زکریا کے سفر کی وجہ سے مظاہر کے تقسیم اسباق میں بھی عجلت کی گئی، ۲۵ شوال کو اسباق کا افتتاح ہوا، مولوی یونس صاحب شیخ الحدیث نے اول مسلسل بالاولیت پڑھی، پھر بخاری شریف کی حدیث پڑھی اور مولانا انعام الحسن صاحب نے طویل دُعاء کرائی۔

عزیز مصباح مرحوم کو صبح کی چائے میں ۲۷ شوال کو کھانسی شروع ہوئی اور غفلت، حاجی نصیر، حاجی عظیم اللہ وغیرہ حضرات بھی سہارنپور گئے ہوئے تھے، مگر زکریا کی درخواست پر ان لوگوں نے قیام ملتوی کر دیا اور عزیز موصوف کو لے کر علی گڑھ آ گئے، وہاں مرض بڑھتا ہی گیا، بالآخر ۱۵ جنوری کو علی گڑھ کے ہسپتال میں مرحوم کا انتقال ہو گیا نعش کاندھلہ لائی گئی، مولوی انعام صاحب بھی خبر پا کر سیدھے کاندھلہ پہنچ گئے اور خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

اس سال رمضان میں بھی زکریا کی طبیعت خراب رہی اور امراض بڑھتے ہی چلے گئے، پندرہ (۱۵) ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۷۴ء شنبہ کو سہارنپور سے سفر حجاز کی روانگی شروع ہوئی، تین چار کاریں تھیں، باوجود زکریا کی شدید ممانعت کے کہ روانگی کے وقت کوئی نہ آئے اتنا ہجوم ہو گیا کہ زکریا کے گھر سے دار الطلبہ تک آدمی ہی تھے، بہت مشکل سے دوستوں کی مدد سے کار سے روانگی ہوئی، آنے والوں کو بہت شکایت ہوئی کہ الوداعی مصافحہ نہ ہو سکا، حجاز بھی شکایت کے خطوط پہنچے کہ ہم تو مصافحے کے لیے گئے تھے، مگر کار کا دروازہ بند کر دیا کہ ہجوم اتنا تھا کہ مصافحہ شروع ہوتا تو ظہر تک بھی نہ نمٹتا۔

شاہ معین الدین صاحب اعظم گڑھی بمعیت ہارون ندوی جو کئی سال سے بار بار تشریف لا رہے تھے، روانگی سے چند روز قبل دفعۃً بلا اطلاع پہنچ گئے، زکریا نے نکیر بھی کی کہ اس ہجوم میں آپ کہاں آ گئے، مرحوم نے فرمایا کہ بے اختیار طبیعت پر ایسا تقاضا ہوا کہ علی میاں کو اطلاع نہیں کی بس سیدھا چلا ہی آیا، میں نے کہا کہ اس قدر ہجوم ہو رہا ہے کہ ملاقات کا بھی وقت ملنا مشکل ہے۔

مرحوم نے کہا کہ مجھے دار الطلبہ قدیم یا جدید میں ایسی جگہ بتا دو کہ میں قیام کر لوں، میں نے دار الطلبہ جدید میں ایک حجرہ ان کے لیے تجویز کرایا جس کو مرحوم نے بہت پسند کیا اور خوش ہوئے، مگر بعد میں مولوی عبد المالک صاحب مہتمم مالیات نے مدرسہ قدیم میں اپنے حجرہ قیام کی پیش کش کی جس کو مرحوم نے اور بھی زیادہ پسند کیا اور بہت خوش ہوئے کہ نمازوں میں شرکت ہوتی رہے گی۔

چند روز قیام کے بعد ۲۷ شوال چہار شنبہ کو ہجوم کی کثرت کی وجہ سے یہ کہہ کر واپس ہو گئے کہ جی تو نہیں چاہتا مگر ہجوم بڑھتا جا رہا ہے، دورانِ قیام میں صبح کو ذکر کی مجلس میں اہتمام سے شرکت

فرماتے اور اپنے حالات بھی تبتل اور انقطاع کے یکسوئی کے خواہش کے ذکر کرتے رہتے تھے کہ سب چیزوں کو چھوڑ یکسو رہنے کو جی چاہتا ہے، زکریا نے دارالمصنفین کے قیام پر شدت سے اصرار کیا کہ وہیں رہتے ہوئے جتنی یکسوئی ہوسکے کرتے رہیں، اس کو چھوڑ کر نہ جائیں، یہاں سے واپسی کے بعد اپنی آمد پر اور دلبستگی پر بہت لمبا خط بھی لکھا، دوبارہ طویل قیام کی تمنا بھی لکھی لیکن مقدرات اپنی جگہ پر اٹل ہوتے ہیں، یہاں سے واپسی کے بعد سے علالت کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ۱۳ دسمبر جمعہ کے دن جمعہ کی نماز پڑھی پھر آرام کیا اور عصر کے وقت وضو کے لیے پانی منگایا اتنے میں خادم پانی لایا اتنے حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے انتقال فرماگئے۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون، اللّٰھم اغفرلہ، وارفعو درجاتہ

چونکہ زکریا کو بخار کی شدت تھی اس لیے حسب معمول صبح کی نماز سے پہلے روانگی نہ ہوسکی کہ سردی بہت تھی ورنہ ہمیشہ کا معمول اپنی صبح کی نماز پڑھ کر روانگی کا تھا کہ اس میں ہجوم نہیں ملتا تھا، جلال آباد پہنچ کر معلوم ہوا مسیح اللہ خان صاحب زاد مجدھم دیر سے مدرسہ کے باہر سڑک کے قریب انتظار میں ہیں، زکریا کا ارادہ پہلے مدرسہ ہوکر جانے کا تھا مگر حضرت مولانا کی ملاقات کی وجہ سے سڑک ہی پر طلبہ اور مدرسین سے مصافحہ کرنے کے بعد آگے روانگی ہوئی، ظہر جھنجھانہ میں پڑھ کر ایک گھنٹہ بعد کاندھلہ پہنچے اور کاندھلہ میں شنبہ کو ہمیشہ پینٹھ لگتی ہے اس لیے قصبہ میں پہنچنا تو مشکل تھا اس لیے صوفی افتخار الحسن صاحب نے عیدگاہ کے قریب قیام کا انتظام کر رکھا تھا، وہاں پہنچ کر زکریا کا قیام تو عیدگاہ ہی پر رہا اور رفقاء نے صوفی جی کے گھر جا کر کھانا کھایا۔

زکریا کی علالت اور ہجوم کی کثرت اور مولانا انعام الحسن صاحب کے سفر گجرات کی وجہ سے اس مرتبہ دہلی کا قیام بھائی کرامت صاحب کے گھر پر رہا وہاں ہجوم پر بھی قابو رہا اور بیعت اور ملاقات کے لیے مسجد میں وقتاً فوقتاً آمد رہی، مولانا انعام الحسن صاحب وغیرہ حضرات ۱۳ ذیقعدہ کو گجرات کے دورہ کے لیے روانہ ہوچکے تھے اور یہ طے ہوگیا تھا کہ وہ وہاں سے فارغ ہوکر بمبئی تشریف لے آئیں گے۔

۳ دسمبر ۱۹۷۴ء مطابق ۱۸ ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ سہ شنبہ کی صبح کو دہلی سے طیارہ سے روانہ ہوکر زکریا ۱۰:۳۰ بجے بمبئی پہنچا، اُسی دن علی الصباح مولانا انعام الحسن صاحب بمبئی پہنچ چکے تھے، مطار پر ملاقات ہوئی، ۶ دسمبر مطابق ۲۱ ذیقعدہ ہندی جمعہ کے دن بعد مغرب بھائی عبدالکریم کے مکان سے چل کر مطار پر پہنچے، رفقاء مع سامان مغرب سے پہلے جاچکے تھے، جہاز کی پرواز پہلے ۱۰ بجے تجویز تھی مگر لیٹ ہونے کی وجہ سے ۱۱ بجے چلا، سردی شدت کی تھی اور زکریا کو بخار بھی تھا، کراچی کے مطار پر حاجی فریدالدین صاحب (اللہ تعالیٰ اُن کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ میرے

ہر سفر کا بہت انتظام فرماتے ہیں) جہاز پر تشریف لائے اور فرمایا کہ مجمع تو باہر بہت زیادہ ہے مگر سردی بہت شدید ہے، ہوا بھی ٹھنڈی چل رہی ہے اور تجھے بخار ہو رہا ہے میری رائے اُترنے کی نہیں ہے، مولوی احسان وغیرہ متعدد احباب نے بھی یہی مشورہ دیا، تقریباً ایک گھنٹہ جہاز وہاں رہا، پھر ظہران ٹھہرتے ہوئے ریاض پہنچا، خیال تھا کہ وہاں صبح کی نماز پڑھ لی جائے، مگر وقت میں بھی کچھ دیر تھی اور سواریوں کی آمد و رفت بھی ہو رہی تھی اسی لیے تجویز یہ ہوا کہ طیارہ کی روانگی کے بعد طیارہ ہی میں صبح کی نماز پڑھ لی جائے گی کہ طلوع آفتاب میں ایک گھنٹہ بتایا گیا تھا مگر ریاض سے طیران کے بعد چند ہی منٹ میں آفتاب بالکل سامنے آگیا اور نماز قضاء ہوگئی، اس کا اندازہ نہیں تھا کہ چند منٹ میں آفتاب سامنے آجائے گا، ہندی سوا دس بجے جدہ پہنچے معلوم ہوا کہ احباب رات کو بھی جہاز کی تحقیقات کرتے رہے کہ وہ لیٹ پر لیٹ ہوتا رہا، عزیز سعدی وغیرہ کے ساتھ اس کے گھر پہنچے، ہجوم حرم میں اتنا تھا کہ وہاں تک رسائی مشکل تھی، صبح کی قضاء وظہر سعدی کے گھر میں پڑھی، ظہر کے بعد ہجوم کم تھا تو طواف کرتے ہوئے صولتیہ آگئے اور بعد عشاء سعی کی اور صولتیہ واپس آکر حلق کرا کر عمرہ کا احرام کھولا۔

زکریا کا اصرار جلد از جلد مدینہ کا تھا اور ایک خواب کی بناء پر مولوی اظہار کے کسی دوست نے دیکھ رکھا تھا کہ مولوی اظہار بھی اس سال حج میں شریک تھے زکریا کو اور بھی زیادہ تقاضا مدینہ کا ہو رہا تھا۔ مگر مکی احباب کے علاوہ ہمارے قاضی صاحب کا شدید اصرار حج کے بعد ان کے ساتھ مدینہ آنے کا تھا۔ اس زمانہ میں ہجوم کی کثرت کی وجہ سے شب روز مدرسہ ہی میں قیام رہا لیکن ۷ تاریخ کو مستقلاً عزیز سعدی کے یہاں روانگی ہوگئی جب کہ میرے رفقاء مولوی حبیب اللہ وغیرہ منٰی کے لیے روانہ ہونے لگے تھے۔

اس سال حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی اہلیہ عزیز امجد کے ساتھ پہلے سے تشریف لائی ہوئی تھیں، مدینہ پاک میں قیام تھا اور ۲۶ ذیقعدہ کو مولانا الحاج اسعد مدنی طیارہ سے جدہ آکر سیدھے مدینہ منورہ پہنچ گئے، حج کے بعد دوبارہ مدینہ آکر ۳ جنوری کو افریقہ کی روانگی تجویز تھی، طیارہ کا ٹکٹ بھی آگیا تھا۔ مگر جب مدینہ کے مطار پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ سیٹ تو دوسرے کو دے دی گئی اس لیے بذریعہ کار جدہ روانہ ہوگئے اور وہاں سے افریقہ کے لیے روانہ ہوگئے۔

اس سال مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی اور مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری بھی اسی طیارہ سے تشریف لائے جس سے زکریا آیا، مگر ان دونوں حضرات کا ارادہ جدہ سے سیدھے مدینہ جانے کا تھا اس لیے احرام بھی نہیں باندھا تھا اور جدہ اتر گئے، مگر مدینہ کے راستہ میں ایک دن پہلے سے طوفانی بارش ہوئی تھی اس لیے بہت مشقت سے کئی دن مدینہ پہنچے اور وہ حضرات

حج کے بعد دوبارہ بھی مدینہ گئے۔

مولانا سعید خان صاحب وغیرہ کا اصرار تھا کہ زکریا حج میں ضرور شریک ہو، مگر زکریا اپنی معذوری اور بیماری کی وجہ سے معذرت کر رہا تھا۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ زکریا ۸ تاریخ کو منیٰ نہ جائے، ۹ کی صبح کو عزیز عبدالحفیظ کی کار میں عزیز سعدی، مولوی اسماعیل، مولوی احمد درویش، ڈاکٹر اسماعیل سعدی کے مکان سے چل کر ۱۵ منٹ میں منیٰ اور ۵ منٹ میں مزدلفہ اور ۵ منٹ میں عرفات میں ملکی کے خیمہ میں پہنچ گئے۔

اللہ تعالیٰ ملک فیصل مرحوم کو بہت بلند درجے عطاء فرمائے کہ مرحوم نے اس سال مکہ سے عرفات تک بالا بالا کئی سڑکیں بنوادی تھیں جن میں نہ منیٰ میں جانا پڑتا تھا نہ مزدلفہ میں۔ آدھ گھنٹہ میں معلم سید ملکی مرزوقی کے خیمہ میں پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بھی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ وہ ہر سفر میں اس ناکارہ کی راحت کا بہت اہتمام کرتے ہیں۔

انہوں نے خیمہ کا نصف حصہ زکریا کے لیے متعین کر رکھا تھا اور دوسرا نصف رفقاء کے لیے۔ ہمارے پہنچنے کے ۲ گھنٹے کے بعد رفقاء اور قاضی صاحب وغیرہ جو شب میں منیٰ میں مقیم تھے پہنچے کہ راستے میں لاریوں کی وجہ سے بہت تاخیر ہوتی رہی۔ غروب کے بعد عرفات چل کر زکریا کی کار اور رفقاء کی گاڑی مزدلفہ پہنچی۔ وہاں مغرب عشاء پڑھ کر کچھ دیر قیام کرنے کے بعد زکریا تو عزیز عبدالحفیظ کی کار میں عزیز سعدی کے گھر پہنچ گیا اور ۱۰ ذی الحجہ کو صبح حرم شریف پہنچ گئے اور عید کی نماز کے بعد طواف زیارت کر کے عزیز سعدی کے گھر پہنچ گئے۔

حجاج کا ہجوم اس سال اتنا زیادہ تھا کہ صولتیہ سے عزیز سعدی کے گھر آنا جانا مجھ جیسے ضعیف کے لیے ناممکن تھا۔ اس لیے کئی دن قیام عزیز سعدی ہی کے مکان پر شب و روز رہا۔ زکریا کی رمی تو توکیل سے ہوئی کہ منیٰ پہنچنا مشکل تھا۔ اس پر احباب میں رسہ کشی ہوئی کہ میری وکالت کون کرے۔ پہلے دن عزیز عبدالحفیظ نے، دوسرے دن قاضی صاحب نے، تیسرے دن مفتی زین العابدین صاحب نے، چوتھے دن کی مولانا سعید خان صاحب کی تجویز قرار پائی تھی مگر بعض وجوہ سے ۱۲ کی شام کو ہی یہ حضرات چلے آئے تھے۔

۱۵ ذی الحجہ ۲۹ دسمبر اتوار کو عصر کی اذان کے وقت مدرسہ صولتیہ سے چل کر عصر تنعیم میں پڑھی۔ رات کو عربی ۲ بجے بدر پہنچے۔ ڈاکٹر اسماعیل کے مکان پر جو آج کل وہاں ڈاکٹر ہیں ان کے گھر والے مکہ ہی تھے رات میں قیام کر کے صبح ۲ بجے بدر سے چل کر ۴ بجے مدینہ پاک پہنچے مگر اتنا ہجوم تھا کہ بقیع سے آگے گاڑی نہ آسکی۔ زکریا تو اپنی عربیہ پر دوستوں کی مدد سے پہنچ گیا۔ حمالوں کے ذریعہ سے سامان منتقل کیا گیا۔ قاضی صاحب بھی زکریا کے ساتھ ہی تھے۔ روضہ اقدس پر پہنچا تو

مشکل تھا، نمازیں بھی مدرسہ کی چھت پر ہوتی تھیں، لیکن حاجی دلدار صاحب نے (اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطاء فرمائے) رئیس الاغوات، رئیس الشرطہ وغیرہ سے اجازت لے لی تھی۔ زکریا سلام کے لیے ہجوم میں تو آنہیں سکتا۔ رات کو کیواڑ بند ہونے کے وقت اس کو بلالیا جائے۔

اس لیے ۱۸ ذی الحجہ کی شام کو ۳:۳۰ بجے جب کے ہم لوگ مصلی الجنائز پر کھڑے تھے بلایا۔ زکریا نے تو منع کیا تھا کہ اس اہتمام کی ضرورت نہیں، مگر ان دوستوں نے نہ مانا اور جب کے مسجد نبوی بالکل خالی تھی زکریا کو اپنی عربیہ پر اندر پہنچا دیا۔ اس قدر رعب اس وقت طاری ہوا کہ نہ اس سے پہلے طاری ہوا نہ بعد۔ زکریا تو اقدام میں رہا چند منٹ قیام رہا اس کے بعد زکریا کے تقاضے پر فوراً آگئے۔

اس سال جناب الحاج قاری طیب صاحب بھی اپنے چند مدراسی رفقاء کے ساتھ حج کے لیے تشریف لائے تھے اور ان رفقاء کی وجہ سے فندق افریقیہ میں خلاف معمول قیام فرمایا اور ورنہ ہمیشہ کا معمول مدرسہ صولتیہ میں قیام کا تھا اور حجاج کی کثرت اتنی زیادہ تھی کہ ہوٹل سے صولتیہ تک پہنچنا بھی جوئے شیر لانا تھا۔ اس لیے کہ اس سال حجاج کی اتنی کثرت تھی کہ بروایت عزیز محمد سعید رحمت اللہ ۷ ادسمبر کو ۵۰ طیارے فضاء میں گھومتے رہے کہ جدہ کے مطار پر ان کے اترنے کی جگہ نہیں تھی۔

۱۹ دسمبر کی شب میں قاری صاحب جدہ پہنچے تھے اور ۱۰ جنوری ۲۷ ذی الحجہ کو مدینہ منورہ پہنچے۔ یہاں کے تبلیغی احباب کا اصرار تھا کہ ان کے اجتماع میں قاری صاحب کی تقریر ہو، مگر مرکز تبلیغ مسجد نور ذرا دور ہے اور وہاں عربوں کا مجمع ذرا زیادہ ہوتا ہے اس لیے اس ناکارہ کے مشورہ سے مدرسہ شرعیہ کی چھت پر جو مسجد نبوی کے بالکل برابر میں ہے بعد عصر ۲ محرم کو ایک گھنٹہ تقریر ہوئی جس میں بہت تفصیل سے قاری صاحب نے فرمایا کہ دین کی مرکزیت بھی مدینہ پاک کو حاصل ہے۔ تبلیغ کی مرکزیت کو بھی یہاں اہمیت دی جائے۔

مکہ اور مدینہ منورہ کے قیام میں قاری صاحب کی طرف سے اور اہل پاکستان کی طرف سے اس کی برابر کوشش رہی کہ واپسی میں چندروز پاکستان اترنے کا ویزا مل جائے۔ احباب کی کوشش سے وہ مل گیا اور ۱۹ جنوری ۷۵ء ۷ محرم ۹۵ھ کو مدینہ سے سیدھے جدہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وقت ویزا قاری صاحب کا نہیں ملا تھا مگر کراچی پہنچ کر جناب الحاج فریدالدین صاحب جو ہم لوگوں کے لیے کراچی کے طیاروں کے سفر میں بہت معین اور مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے کہ اس ناکارہ کو تو حجاز کی آمدورفت میں ہمیشہ کراچی مطار پر اترنے میں اور وہاں کے قیام میں بہت ہی سہولتیں رہیں، قاری صاحب کی روانگی تو بمبئی کے لیے تھی مگر کراچی کے مطار پر حاجی صاحب نے فرمایا کہ ویزا مل گیا دو ہفتے پاکستان کی

مختلف جگہوں پر قیام کے بعد ۷ کو بمبئی کے لیے روانہ ہوئے اور ۸ کو دہرہ سے دیوبند کے لیے روانہ ہو گئے۔

عزیز مولوی مصباح الحسن مرحوم اس ناکارہ کی روانگی حجاز کے وقت بیمار ہوئے تھے اور ان کو علی گڑھ کے ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا خطوط کے ذریعہ ان کی بیماری کا مدوجزر بہت کثرت سے پہنچتا رہا۔ ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء ۵ محرم ۹۵ھ یوم جمعہ کو حاجی نصیر کا برقیہ علی گڑھ سے چلا ہوا ملا کہ مولوی مصباح کا انتقال ہو گیا۔ مولانا انعام الحسن صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ بدھ ۱۵ جنوری کو صبح دس بجے کے قریب انتقال ہوا، مگر ان کی اہلیہ کے اصرار پر تدفین کاندھلہ میں ہوئی، علی گڑھ سے نعش کاندھلہ مع ان کی اہلیہ کے گئی اور نظام الدین ٹیلیفون کر دیا۔ مولوی انعام صاحب وغیرہ عصر کے وقت کاندھلہ پہنچ گئے اور مغرب کے بعد مولانا انعام صاحب کی امامت میں صلوۃ جنازہ کے بعد خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ بکثرت خطوط سے معلوم ہو کہ تدفین کے وقت چہرہ اتنا منور تھا کہ روشنی ہر شخص کو نظر آ رہی تھی۔ حادثہ کی خبر سن کر یہ ناکارہ مکہ مکرمہ تعزیت کے لیے جانے کا برابر ارادہ کرتا رہا اس لیے کہ مرحوم کی صاحبزادی عزیز محمد سعید رحمت اللہ کے نکاح میں مکہ مکرمہ میں ہے۔ مگر اس ناکارہ کو مسلسل بخار تپ ولرزہ وغیرہ عوارض رہے نیز ہمارے قاضی عبدالقادر صاحب نے اللہ تعالیٰ ان کو بہت بلند درجے عطاء فرمائے مجھ سے مخفی ڈاکٹر منیر صاحب کو لاہور سے آنکھ بنانے کے لیے آنے کا تقاضہ کر رکھا تھا جس کا مجھے علم نہ تھا وہ بھی تاخیر پر اصرار فرماتے رہے۔ سردی بھی بہت شدید تھی، امروز فردا ہوتے رہے۔

۱۱ مارچ کو بسلسلہ تعزیت مکہ جانا پڑا۔ سلیم دہلوی نے نئی کار خریدی تھی اور اس کا اصرار تھا کہ اس میں زکریا مکہ کا سفر کرے کہ اس میں ایئر کنڈیشن ہے۔ جس کی وجہ سے عربی ۴ بجے صبح کو چل کر ظہر مستورہ پڑھی اور عصر کے وقت مکہ پہنچے۔ ان ہی ایام میں مکرم ومحترم جناب الحاج مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب جامعہ اسلامیہ کے اجتماع میں ۲۶ جنوری کو تشریف لائے ۱۴ فروری کو واپسی کے ارادہ سے مکہ روانہ ہوئے اور ۲۱ فروری کو جدہ سے بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے۔

۲۱ فروری جمعہ کے دن میرٹھ میں حضرت مولانا عاشق الٰہی نور اللہ مرقدہٗ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے حافظ مقبول الٰہی کا انتقال ہو گیا۔ طبیعت تو معمولی سی دو تین دن سے خراب تھی، جمعہ کے دن غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر جامع مسجد جانے کے انتظار میں قرآن شریف پڑھ رہے تھے کہ ہارٹ فیل ہو گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ

عزیزان مولوی عاقل صدر مدرس مدرسہ مظاہر علوم اور عزیز مولوی سلمان یکے از مدرسین علیا

مظاہرعلوم اس ناکارہ کے تراجم بخاری جووقتاً فوقتاً زکریا بخاری پڑھانے کے زمانے میں تقریباً ۲۵ سال میں لکھتا رہا اس کی تبیض عرصہ سے کررہے تھے، لیکن مدرسہ میں اسباق کے مشاغل خانگی مشاغل کی وجہ سے بہت تاخیر ہورہی تھی۔

ذیقعدہ میں زکریا کے ساتھ مدرسہ سے ایک سال کی چھٹی لے کر مدینہ پاک میں اس کی تبیض کے لیے آنے پر اصرار کررہے تھے۔ زکریا نے اول تو مدرسہ کے اسباق کے حرج کی وجہ سے خلاف کیا کہ مدرسہ کا حرج ہوگا، لیکن قاری مظفر صاحب نائب ناظم مدرسہ نے (اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطاء فرمائے) بڑی بشاشت سے اس کو قبول کیا اور یہ کہا کہ اسباق کا انتظام کرلیا جائے گا۔ نیچے کے درجے میں ضرورت ہوئی تو کسی مدرس کا انتظام کرلیں گے۔

اس لیے زکریا عزیزان سے یہ کہہ آیا تھا کہ اس وقت توجہ کا ہنگامہ ہے کام نہیں ہونے کا، محرم میں ایک سال کی چھٹی لے کر آجائیں، مگر مختلف عوارض کی وجہ سے قانونی اور مدرسہ کی چھٹی وغیرہ میں تاخیر ہوتی رہی نیز حاجی یعقوب صاحب نے بمبئی سے لکھا کہ بمبئی سے اگر ظہران کا ٹکٹ لیا جائے تو تین ہزار سات سو میں آئے گا اور بمبئی جدہ پانچ ہزار ایک سو پچاسی میں آئے گا اس لیے مناسب یہ ہے کہ یہ حضرات بمبئی سے ظہران کا ٹکٹ لیں اور وہاں سے کار سے مکہ۔ دونوں ٹکٹوں میں چونکہ ڈیڑھ ہزار کا فرق تھا اس کے علاوہ زکریا کو اس کی لالچ تھی کہ ظہران سے مکہ کے راستہ میں طائف پڑتا ہے، مستقل سفر تو وہاں کا مشکل ہوگا، دوران سفر میں ایک شب کا قیام طائف کا ہوجائے گا۔ اس تجویز کو پسند کرکے اطلاع کردی، نیز اسی دوران میں مولانا انعام الحسن صاحب کے ساتھ بمبئی آجائیں اور وہاں سے یہ ظہران کو اور وہ افریقہ کو روانہ ہوجائیں۔

چنانچہ ۱۳ مارچ کی شام ایکسپریس سے عزیزان دھلی پہنچ گئے اور ۱۵ کی صبح کو بذریعہ طیارہ مولانا کے ساتھ بمبئی پہنچ گئے۔ پہلے سے یہ تجویز تھی کہ ظہران سے سیدھے مدینہ آجائیں گے، مگر اس زمانہ میں زکریا مکہ مکرمہ بسلسلہ تعزیت گیا ہوا تھا، اس لیے عزیز الحاج عبدالحفیظ سلمہ کو (اللہ تعالیٰ اس کو اور اس کے والد کو بہت ہی جزائے خیر دے) کہ ان کی گاڑیاں زکریا کے لیے وقف ہیں۔ عزیز عبدالحفیظ اپنی کار لے کر ظہران پہنچ گیا اور عزیز عبدالقدیر کو بھی ساتھ لے گیا۔ میری تمنا تو یہ تھی کہ ایک شب طائف کا قیام ہوتا مگر راستہ میں اتنی تاخیریں ہوتی رہیں کہ طائف میں چند ہی گھنٹے قیام رہا۔

۱۸ مارچ کی صبح کو عزیزان بمبئی سے ظہران پہنچے اور اسی دن شام کو مولانا انعام الحسن صاحب افریقہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ میرے مخلص دوست الحاج اختر علی سہارنپوری جو جدہ میں سعودی ایئر لائن میں ملازم ہیں اور میری ہر آمد پر ظہران میں مجھے ملا کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے مجھے بہت

راحت ظہران پر ملتی ہے۔ میں نے ان کو بھی لکھ دیا تھا کہ ۱۸ کی صبح کو ظہران پہنچ جائیں اور عزیزان کو اتار کر جدہ آجائیں۔ اللہ تعالیٰ اس عزیز کو بھی بہت جزائے خیر کہ وہ بھی ظہران پہنچ گیا تھا۔

عزیزان نے ظہران میں بھائی عبدالباسط کے یہاں کھانا کھایا اور پیٹرول کا مخزن اور کمپنیوں کی سیر کی۔ عصر کے بعد وہاں سے چل کر شب کو ریاض پہنچے اور اگلے دن صبح کو ریاض سے چل کر چند گھنٹے طائف ٹھہرتے ہوئے عصر کے وقت مدرسہ صولتیہ پہنچ گئے، زکریا کا ارادہ مکہ کے قیام کا اس سفر میں مختصر ہی تھا، مگر حاجی یعقوب صاحب کا برقیہ مل گیا کہ ۱۸ کو عزیزان ظہران کے لیے روانہ ہو رہے ہیں اس لیے مزید قیام کرنا پڑا اور ۲۴ مارچ کو دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول کو عصر کی نماز کے وقت عزیز عبدالحفیظ کی کار میں صولتیہ سے چل کر تنعیم میں عصر کی نماز پڑھی، عزیز سلیم کا پہلے سے اصرار تھا اور کئی ٹیلیفون بھی جا چکے تھے کہ مکہ سے میں تجھے اپنی گاڑی میں لاؤں گا مگر زکریا شدت سے انکار کر رہا تھا کہ عبدالحفیظ کی کار کو جانا ہے کہ وہ مجھے پہنچا کر ریاض جاوے گی، دوسری کار کی ضرورت نہیں، مگر وہ اپنی کار لے کر اپنے والد کے ساتھ ایسے وقت مکہ مکرمہ پہنچا کہ میں عبدالحفیظ کی کار میں مدینہ کے لیے بیٹھ چکا تھا۔

میں صولتیہ سے چل کر عزیز سعدی کے گھر پر اُس کی اہلیہ سے الوداعی ملاقات کے لیے اُس کے مکان پر پہنچا اور ماموں یامین، عزیز سعدی، بھائی حبیب اللہ سلیم کی کار میں تنعیم پہنچے کہ وہاں عصر پڑھنا پہلے سے طے تھا اور ہمیں نہ دیکھ کر یہ لوگ واپس ہو رہے تھے کہ ایک پیٹرول پمپ پر ملاقات ہوگئی اور ہمارے ساتھ تنعیم واپس جا کر عصر پڑھی اور سلیم کے اصرار پر تنعیم سے ہم تو مع عاقل سلمان سلیم کی کار میں اور سلیم مع بھائی حبیب اللہ وغیرہ رفقاء عبدالحفیظ کی کار اور اونیٹ میں آئے۔

دو بجے ہم لوگ بدر پہنچ گئے، وہاں عشاء کی تکبیر ہو رہی تھی ہم لوگ تو نماز میں شریک ہو گئے مگر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اسماعیل نے تو وہاں کے مقامی آدمیوں کو بھی کئی کو مدعو کر رکھا ہے اس لیے زکریا نے نماز کے بعد دستر خوان بچھانے کا تقاضا کیا اور کھانا شروع ہونے تک یکے بعد دیگرے ہمارے رفقاء بھی پہنچ گئے، شب کو کچھ لوگ مسجد عریش کے اندر اور کچھ باہر میدان میں سوئے اور صبح کی نماز کے بعد چائے سے فراغ پر شہداء میں حاضری دیتے ہوئے پونے دو پر چل کر سوا تین پر مدرسہ شرعیہ پہنچ گئے، راستہ میں چند منٹ حبیب صاحب کے مکان کے سامنے کار ہی میں سید صاحب سے ملاقات کی، زکریا نے تو اندر آدمی دیکھنے کو بھیجا تھا کہ وہ ہیں یا نہیں مگر وہ آدمی کے ساتھ ہی چلے آئے۔

یہاں پہنچ کر عصر سے پہلے شاہ فیصل مرحوم کے حادثہ کی اطلاع ملی کہ اُن کے بھتیجے فیصل بن مساعد نے تین گولیاں یکے بعد دیگرے مار کر شہید کر دیا، مرحوم کی بیدار مغزی، سطوت وغیرہ

اوصافِ جمیلہ اتنے زیادہ ہیں کہ اس مختصر میں آنے مشکل ہیں، اللہ تعالیٰ مغفرت فرما کر اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطاء فرمائے، سیاسی باتیں تو اہلِ سیاست جانیں ہم جیسے ضعفاء مرضاء کے لیے تو مرحوم کا ایک ہی کارنامہ مشاعر حج وغیرہ کے راستوں کی سہولت ایسا بڑا کارنامہ ہے کہ ہر حاجی بے اختیار دُعائیں کرنے پر مجبور ہے، حج کے زمانہ میں منیٰ سے عرفات پہنچنا ایسا مشکل اور تھکا دینے والا تھا کہ لاریوں کی لائن منیٰ سے عرفات تک آٹھ دس گھنٹے لے لیتی تھی مگر اس سال میں نے اپنی معذوریوں اور بیماریوں کی وجہ سے حج میں شرکت کا ارادہ ملتوی کر رکھا تھا مگر دوستوں نے کہا کہ اتنی نئی سڑکیں بن گئیں ہیں کہ دِقت نہیں ہوگی۔

چنانچہ شارع منصور سے چل کر راستہ میں ایک دکان سے دوستوں نے کھانا بھی خریدا اور دس منٹ میں منیٰ کے مقابل اور وہاں سے پانچ منٹ میں مزدلفہ اور وہاں سے پانچ منٹ میں اپنے معلم جناب الحاج سید مکی مرزوقی کے خیمہ میں پہنچ گیا، سید صاحب کو اللہ تعالیٰ بہت ہی درجات عالیہ نصیب فرمائے وہ ہمیشہ میرے لیے ایک خیمہ کا مخصوص حصہ اس میں چارپائی، پانی وغیرہ کا انتظام پہلے سے کر کے رکھا کرتے ہیں، ۲۰ منٹ میں مکہ سے چل کر اُن کی چارپائی پر پہنچ گیا اور یہی صورت تقریباً واپسی میں ہوئی، جاتے آتے اور اس کے بعد بھی ملک مرحوم کے لیے بہت دُعائیں کرتا رہا، اللہ تعالیٰ سیئات سے درگزر فرمائے اور اپنے قربِ خاص سے نوازے، حادثہ کی خبر سننے کے بعد سے دوستوں کو زبانی اور تحریری دُعائے مغفرت اور ایصال ثواب کی بہت ہی تاکید کرتا رہا اور اب بھی جب اپنے حج کا منظر یاد میں یا ذکر تذکرہ میں آجائے تو دُعاء ضرور کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ اہلِ عرب اور دُنیائے اسلام کے لیے نعم البدل نصیب فرمائے۔

یہاں پہنچ کر دوسرے ہی دن سے عزیزان نے تراجم جلد چہارم کی تبییض شروع کر دی، مدینہ پاک کی برکات کا تو پوچھنا ہی کیا اس ناکارہ کو تو ۹۵ھ میں اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ بذل کے اختتام پر شعبان میں اوجز کا افتتاح اقدام عالیہ میں کیا تھا اور آخر ذیقعدہ میں مکہ کے لیے روانگی ہوئی تھی، ساڑھے تین ماہ میں اوجز کی ڈیڑھ جلد کی تسوید یہاں ہوگئی تھی اور ہندوستان پہنچنے کے بعد ساڑھے چار جلدیں ۳۰ برس میں پوری ہوئیں اگرچہ اس دوران میں متفرق رسائل، کوکب حاشیہ بھی لکھا گیا پھر بھی دیر لگی، عزیزان نے ۱۴ ربیع الاول کو جلد رابع کے تراجم کی تبیض شروع کی تھی اور ۲۷ جمادی الاولیٰ کو ایک تبیض پوری ہوگئی۔

میری آنکھ میں نزولِ آب کا سلسلہ تو دسمبر ۶۰ء سے شروع ہوا تھا، شاید اس کی تفصیل کہیں آچکی ہو مگر اس طرح کہ بائیں آنکھ میں زیادہ تھا داہنی میں کم، جب بائیں آنکھ قدح کے قابل ہوگئی تو علی گڑھی دوستوں نے بالخصوص حاجی نصیر الدین اور حاجی عظیم اللہ نے بہت اصرار کیا، بار بار مستقل

میرے لینے کے لیے کار بھی لاتے رہے، عزیزم الحاج مولانا یوسف صاحب نور اللہ مرقدہٗ اعلیٰ اللہ مراتبہ تقاضا کرتے رہے کہ اگر میرے سامنے آنکھ بنوالے تو تیرے قیام علی گڑھ میں مستقل یہاں قیام کرلوں گا اور اپنے سارے اسفار ملتوی کردوں گا۔

ایک مرتبہ سب کے تقاضے پر علی گڑھ جانا بھی ہوا تو سول سرجن نے بہت غور سے آنکھ دیکھنے کے بعد کہا کہ بننے کے قابل تو ہوگئی مگر مجھ سے تنہائی میں یہ کہہ دیا کہ اگر تین چار سال مؤخر ہو جائے تو کچھ نقصان نہیں چونکہ داہنی آنکھ اتنا کام دے رہی تھی کہ چلنے پھرنے میں دِقت نہیں تھی اور علمی مشاغل کی امراض کی کثرت اور دماغی کمزوری کی وجہ سے چھوٹ رہے تھے اس لیے میں نے کہہ دیا کہ ابھی ضرورت نہیں۔

جس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ ڈاکٹر نے مجھ یہ کہا کہ تمہارے رمضان کا مہینہ آرہا ہے اور اس میں تم سنا جاگا بھی بہت کرو اور کام بھی زیادہ ہو اور آنکھ بننے کے چند ماہ بعد تک راحت کی ضرورت ہوگی، مشقت کا کام اس میں بالخصوص زیادہ جاگنا اور محنت کا کام کرنا مضر ہوگا، لیکن احباب کے بار بار اصرار پر مارچ ۷۰ء داہنی آنکھ کا آپریشن علی گڑھ میں ہوا، ڈاکٹر اگرچہ غیر مسلم تھے لیکن اللہ تعالیٰ اُس کے احسانات کا بہترین بدلہ نصیب فرمائے کہ اُس نے میری راحت رسانی میں اتنی کوشش کی کہ دوسری آنکھ کے آپریشن پر اُس کی تفاصیل معلوم ہوئیں۔

۱۲ مارچ پنجشنبہ کو ڈاکٹر نے کہا کہ ہمیں جتنے معائنے خون، پیشاب، پاخانے وغیرہ کے کرنے تھے سب کر چکے اور آج آنکھ بنانے کے لیے بالکل تیار ہوں مگر کل کو جمعہ ہے جو آپ کے یہاں بہت اہم ہے، اگر اس کی نماز کے لیے جامع مسجد جانا چاہیں تو پرسوں پر رکھوں؟ میں نے کہا ضرور چنانچہ ۱۴ مارچ شنبہ کی صبح کو دس بجے کے قریب اُس نے آنکھ بنائی اور یہ کہہ دیا کہ تین چار گھنٹے سیدھے لیٹے رہو اس کے بعد کروٹ دے دوں گا، اس نے نرسوں کو منع کر دیا کہ اس کے کمرے میں کوئی نہ جائے صرف مرد کام کریں، کارکنوں نے پیشاب دانی اور پاخانے کا برتن میری چارپائی کے نیچے رکھ دیا، ڈاکٹر نے پاخانہ کا برتن وہاں سے اُٹھوا دیا صرف پیشاب دانی رہنے دی اور اسی وقت میری چارپائی کے قریب کمرہ کی دیوار کے نیچے سے تڑوا کر اُس میں ایک نالی بنوائی جو باہر نکلتی تھی اور کہا کہ جب استنجے کی ضرورت ہو تو اس نالی پر کرلیں، بھنگی باہر سے کمالے گا اور ظہر کی نماز میری چارپائی پر بیٹھے بیٹھے میرے ساتھیوں کے ساتھ جماعت سے پڑھوائی، میری آنکھ پر تو جو کچھ بھی لگا ہو مگر مجھے بے ہوش کرنے کی یا نیند آور کوئی گولی نہیں دی اور تیسرے دن آکر کہا کہ آپ کی عیادت کے واسطے سارے دن آدمی آتے رہتے ہیں، ہر وقت کے آنے میں مشکلات ہیں، اگر آپ کوئی وقت مقرر کر دیں تو میں اس وقت میں اجازت دے دیا کروں کہ جو پریشان پھرتے ہیں

اُن کو سہولت ہو اور مجھے بھی، میں نے عصر کے بعد کا وقت مقرر کر دیا۔

اُس وقت مجمع دوسو، ڈھائی سو تک ہو جاتا تھا اور وہ اپنے عملہ کے لوگوں کو بھی حتیٰ کہ اپنے لڑکوں کو بھی تاکید سے اُس وقت بھیجا کرتا کہ جاؤ درشن کر کے آؤ، اس وقت چونکہ مجمع بہت ہو جاتا تھا اور بولنے کو میرا بھی دل نہیں چاہتا تھا، اس لیے اپنے معمول کے موافق اس وقت میں نے اپنے مشائخ کی کتابیں سننی شروع کر دیں، دو تین دن تک نیند نہیں آئی تو اُس نے کہا کہ ہمارے یہاں ایک ہی علاج ہے، نیند آور گولی، مگر میری درخواست یہ ہے کہ چاہے کوئی بھی ڈاکٹر تجویز کرے نہ کھاویں، اس واسطے کہ نیند تو اس سے خوب آتی ہے مگر قلب کو نقصان پہنچتا ہے۔

ایک چھوٹا ڈاکٹر نوعمر شاملی کا رہنے والا اس سے تو خاص دوستی ہو گئی تھی کمپوڈر کا کام اپنے اصرار سے وہی کیا کرتا تھا اُس نے سہارنپور آ کر دو تین دن رہنے کا وعدہ بھی کیا تھا مگر جس دن میں علی گڑھ سے چلا اُس کے دوسرے دن وہ آگرہ کا سول سرجن بنا کر بھیج دیا گیا۔

یہ تو شاید تفصیلات اپنی جگہ پر پہلے آ چکی ہیں، اس کے دو برس کے بعد سے دوسری آنکھ بنوانے پر اصرار شروع ہو گیا اور میری آمد و رفت حجاز کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا، جب میں ہندوستان جاتا تو علی گڑھ کے احباب کا شدید اصرار آنکھ بنوانے پر ہوتا اور میں یہ عذر کر دیتا کہ میرا سفر قریب ہے اور جب حجاز آتا تو میرے محسن مخلص ڈاکٹر ظفیر الدین صاحب جو آنکھ بنانے میں بہت ماہر ہیں، جدہ کے شفاخانہ میں سول سرجن تھے اور حجاز کی آمد میں ہمیشہ طیارہ سے اُتارنے اور باہر لانے میں میرے معین رہے کہ ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے وہ طیارہ پر پہنچ جاتے تھے، کئی بار مدینہ طیبہ تشریف لائے اور آنکھ بنانے کا سامان بھی ساتھ لائے کہ میں حجرہ ہی میں آنکھ بناؤں گا اور دو دن بعد مسجدِ نبوی میں بھیج دوں گا میرا ان سے وعدہ بھی تھا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ جب بنواؤں گا آپ ہی سے بنواؤں گا، مگر اس وقت تو ہندوستان کا سفر درپیش ہے، اسی طرح یہ زمانہ گزرتا رہا مگر ہمارے قاضی صاحب جناب الحاج عبد القادر صاحب جو میرے سفرِ حجاز کے قیام میں ہمیشہ یہاں قیام فرماتے ہیں اور اپنا اور تبلیغ کا بہت سا حرج کرتے، یہیں تشریف فرما ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے روحانی برکات کے علاوہ مادی برکات بھی بہت پہنچتی ہیں کہ مجھے اپنے مہمانوں کے کھانے، پینے، چائے ناشتہ کسی چیز کا فکر نہیں رہتا۔

قاضی صاحب ہی ماں باپ بن کر اپنے ذمہ رکھتے ہیں، اُنہوں نے میری بلا اطلاع جناب الحاج ڈاکٹر منیر لاہوری پاکستان کو جو اس فن کے بہت ماہر ہیں اور لندن سے خاص ڈگری آنکھ بنانے کی حاصل کر کے آئے ہیں، جس میں آپریشن کے بعد آنکھ کو سینا نہیں پڑتا پھر نہ ٹانکے کاٹنے پڑتے ہیں، زخم کو کسی چیز سے چپکا دیا جاتا ہے، جو خود بخود اندر ہی اندر اچھا ہو جاتا ہے ان کو خط لکھ کر

کہ زکریا کی آنکھ بنانے کے لیے چھٹی لے کر آجاؤ۔

قاضی صاحب کا مولانا انعام الحسن صاحب کے ساتھ افریقہ کا سفر بھی طے تھا مگر انہوں نے مولانا انعام الحسن صاحب کو لکھ دیا تھا کہ اگر ڈاکٹر منیر صاحب کی چھٹی اس زمانہ میں منظور ہوگئی تو میں نہیں جانے کا، مجھے اس قصے کی خبر جب ہوئی جب ڈاکٹر منیر صاحب کا خط میرے پاس آیا کہ میری چھٹی فلاں تاریخ تک منظور ہوگئی اور سامان سب ساتھ لے کر آؤں گا۔

جب میں نے تحقیق کیا کہ سامان کیسا؟ تو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب نے کوئی منصوبہ بنا رکھا ہے اور جب میں نے قاضی صاحب سے عرض کیا کہ آپ کو تو افریقہ کا سفر درپیش ہے جو مولانا انعام صاحب کے خط سے خبر ہوئی، مگر ڈاکٹر صاحب کی جو تاریخ منظور ہوئی تھی وہ افریقہ کے اصل اجتماع کی تاریخ کے بعد تھی اس لیے قاضی صاحب افریقہ کے اجتماع میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے اور ۱۸ اپریل کو جدہ واپس تشریف لے آئے مگر اس زمانہ میں مکہ مدینہ کے درمیان میں سیلاب کا زور تھا اس لیے مکہ مکرمہ دو دن قیام کے بعد ۲۰ اپریل کو مدینہ منورہ تشریف لے آئے اور پاکستان میں بھی ریلوں کی ہڑتال ہو رہی تھی اس لیے ہمارے ڈاکٹر صاحب کے آنے میں تاخیر ہوئی اور ۲۱ اپریل کو جدہ تشریف لا کر ۲۲ اپریل کو طیارہ سے مدینہ تشریف لائے، سید آفتاب صاحب بن مولانا بدر عالم نور اللہ مرقدہٗ اپنی کار میں مطار سے ان کو لائے۔

سابقہ تجویز تو یہ تھی کہ مدرسہ شرعیہ میں میرے ہی حجرہ میں آپریشن ہوگا مگر یہاں شور وشغب کی وجہ سے سب کا مشورہ یہ ہوا کہ آپریشن تو شفا خانہ میں ہونا چاہیے، اس لیے ۲۴ اپریل کو صبح کو سید آفتاب صاحب کی کار میں ہسپتال گیا اور دو گھنٹے بعد وہاں آپریشن ہوا جس میں ہسپتال کے مدیر اور جناب الحاج ڈاکٹر ظفر احمد صاحب بھی شریک تھے، ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ بہت ہی جزائے خیر دے کہ اُنہوں نے از راہ شفقت خود ہی یہ فرمایا کہ اجازت ہو تو میں بھی آپریشن کے وقت آجاؤں۔

مجھے تو بڑی شرم آرہی تھی کہ وہ بار بار اصرار کر چکے تھے اور میں وعدہ بھی کر چکا تھا مگر قاضی صاحب نے سارا منصوبہ میری بغیر اطلاع کے بنا دیا تھا اس لیے میں مجبور تھا، ڈاکٹر منیر نے ڈاکٹر ظفر سے کہا کہ ضرور تشریف لاویں چنانچہ وہ بھی تشریف لے آئے۔

۲۸ کی صبح کو ہسپتال سے مدرسہ واپسی ہوئی، یہاں آنے کے تقریباً ایک ماہ بعد میرے دوستوں نے بتایا کہ تو اپنی تین دن کی نمازیں قضا کیجیے، ان تین دن میں تجھے نیند کی گولیاں اور غفلت کے انجکشن کثرت سے لگتے رہے، جس سے بہت ہی رنج اور قلق ہوا، اللہ تعالیٰ ہی معاف فرمائے۔

عزیزم الحاج ابوالحسن میرے آپریشن کی خبر سن کر ایک دم تڑپ گیا اور بار بار اس کے دمادم خطوط آئے کہ میں آپریشن کے موقع پر ضرور آنا چاہتا ہوں، اس کو اللہ تعالیٰ بہت جزائے خیر دے کہ علی

گڑھ کے آپریشن میں بھی وہ کثرت سے آتا جاتا رہا، چنانچہ عزیز موصوف بھی بمبئی سے بذریعہ طیارہ ظہران اور وہاں سے بذریعہ طیارہ ۱۸ اپریل کو عین جمعہ کے وقت جب کہ میں مسجد میں جاچکا تھا مسجد میں پہنچا اور میرے مخلص احباب ڈاکٹر اسماعیل اور صوفی اقبال محض اندازہ پر مطار پہنچ گئے تھے کہ ظہران سے آنے والا جہاز قبیل جمعہ یہاں پہنچتا تھا اس وجہ سے عزیز موصوف کو جمعہ بھی مل گیا، اللہ تعالیٰ اس کو بہت جزائے خیر عطاء فرمائے کہ میری راحت رسانی میں بہت ہی کوشاں رہتا ہے نہ کسی کی طعن وتشنیع کی پرواہ کرتا ہے نہ میری ڈانٹ کا، اس کے یہاں ڈاکٹروں کے احکام میری درخواست پر بھی مقدم ہیں، اس کے تفصیلی حالات تو آپ بیتی اور مختصرا اکابر کے رمضان میں آئے ہیں۔

ڈاکٹر منیر صاحب اپنی چھٹی ختم ہوجانے کی وجہ سے ۱۳ مئی کو تشریف لے گئے اور ابوالحسن کو ساری دوائیں لکھوا گئے جس کو عزیز موصوف بہت اہتمام سے کرتا رہا، ڈاکٹر ظفیر صاحب بھی دو جمعہ آنکھ دیکھنے کے لیے تشریف لاتے رہے مگر چونکہ وہ طیارہ سے آتے تھے اور ہمراہ طیارے سے واپس جاتے تھے اور دوسو (۲۰۰) ریال کا ٹکٹ تھا، زکریا کے اصرار پر بھی اُنہوں نے کرایہ لینے سے انکار کردیا اس لیے زکریا نے کہہ دیا کہ بار بار تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں، دوائیں تو آپ نے ملاحظہ فرما ہی لیں، جون کے پہلے ہفتہ میں ڈاکٹر منیر بھی کہہ گئے اور آپ کی بھی رائے ہے تو اس وقت اگر ملاحظہ کی ضرورت ہوگی تو تکلیف فرمالیں، ان کے آنے میں تاخیر ہوئی اس لیے ان کے ٹیلیفون سے ۲۱ جون کو دس نمبر کا آئینہ لگایا گیا، ڈاکٹر کو بھی تقاضا کر گئے تھے کہ وہ وقتاً فوقتاً دیکھتے رہیں، میں نے بھی اُن کو کئی مرتبہ اطلاع دی مگر وہ تو تشریف نہیں لاسکے۔

ڈاکٹر ظفیر صاحب سے ٹیلیفون پر ان کے بار بار دریافت کرنے پر حالت بتائے جاتے تھے اور وہ دواؤں میں تغیر کرتے رہتے تھے، جس کی تفصیلی اطلاع عزیز ابوالحسن ڈاکٹر منیر کو کرتا رہتا تھا مگر ڈاکٹر صاحب کا کوئی خط نہیں آیا، معلوم نہیں میرا خط نہیں پہنچا یا اُن کا جواب نہیں پہنچا یا خط لکھنے کی فرصت نہیں ہوئی، اسی لیے میں اب تک انتظار کررہا تھا کہ میری رائے یہ تھی کہ آنکھ اُسی سے بنوائی جائے جس سے ہر وقت ملاقات ہوسکے اور چونکہ ہندستان کو سفر بار بار ہوتا تھا اس لیے ڈاکٹر ظفیر صاحب سے بنوانے کی نوبت آئی اور علی گڑھ میں بنوانے کی نوبت آئی۔

مولانا انعام الحسن صاحب ۱۸ مارچ کو افریقہ روانہ ہوئے تھے اور دس بارہ ملکوں میں مارشیش، ری یونین، جنوبی افریقہ، موزمبیق، روڈیشیا، ملاوی، کینیا، تنزانیہ وغیرہ وغیرہ ہوکر ۶ مئی کو جدہ پہنچے، اصل اجتماع ۲۸ مارچ سے ۳۱ مارچ تک کینیا اور جنوبی افریقہ کا تھا، باقی سارا دورہ تبعا، جس کی تفاصیل مولانا محمد عمر صاحب کی کاپی میں ہیں اور مولوی محمد سلیمان جھانجھی کے

خطوط میرے کاغذات میں ہیں۔

۶ مئی کو جدہ اور ۱۰ مئی کو مدینہ منورہ تشریف لائے، ۳۱ مئی کو یہاں سے عزیز سلیم کی کار میں اور بقیہ رفقاء جو تقریباً ۴۰ کے قریب تھے عبدالحفیظ کی کار اور اونیٹ میں مکہ سے جدہ اور جدہ سے عین زوال کے وقت پی آئی اے کے طیارہ کی پرواز تھی، مگر اللہ جل شانہ کے فضل سے جہاز لیٹ ہوا اس لیے ظہر جدہ کے مطار پر اور عصر کراچی کے مطار پر پڑھی۔

وہاں بڑا ہجوم تھا، مولانا بنوری مطار پر تشریف فرما تھے، وہاں نماز کے بعد بڑی طویل دُعاء ہوئی اس کے بعد مکی مسجد کے لیے روانہ ہوئے، مغرب راستہ میں پڑھی، مکی مسجد میں اتنا ہجوم تھا کہ کاریں باہر روکنی پڑیں عشاء کے بعد مختصر بیان ہوا، پھر حیاۃ الصحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پڑھی گئی، ۱۶ جون کو کراچی سے بمبئی پہنچے۔

یہ آپ بیتی کوئی مستقل تصنیف نہیں یہ کئی دفعہ لکھا جا چکا ہے کہ کشکول ہے کوئی بات یاد آجائے اور طبیعت میں تقاضا ہو جائے تو بے جوڑ بھی لکھوا دیتا ہوں، آج ۹ جمادی الثانیہ ۹۵ھ مطابق ۱۸ جون ۷۵ء کو اپنے چچا نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ کا ایک واقعہ یاد آ گیا اور طبیعت میں بہت ہی تقاضا ہوا کہ اس کو ضرور لکھنا چاہیے۔

یہ تو میں اپنی مختلف تالیفات میں نہ جانے کہاں کہاں لکھوا چکا ہوں کہ کاندھلہ میں ہمارے خاندان کے آپس کے تعلقات مودت، محبت، اخلاص ایسے ضرب المثل تھے کہ دور دور تک شہرہ تھا اور میری پیدائش سے پہلے کا یا پیدائش کے بعد بے شعوری کے زمانہ کا ایک واقعہ دو بھائیوں کا بھی لکھوا چکا ہوں کہ دو حقیقی بھائیوں میں ایک جائیداد پر مقدمہ بازی تھی، کاندھلہ سے سات میل کیرانہ میں تحصیل تھی جس میں مقدمہ تھا، دونوں بھائی رئیس تھے، دونوں کے پاس اپنی بیل گاڑیاں تھیں، جونسا بھائی اپنے بہلوان کو گاڑی جوڑنے کو کہہ دیتا دوسرا بھی اسی میں بیٹھ جاتا، نہ پوچھا نہ کچھ۔

کیرانہ جا کر ایک ہی سرائے میں قیام ہوتا، وہاں پہنچ کر بھٹیاری سے جونسا پہلا کھانے کو کہہ دیتا دوسرا اُسی کے ساتھ کھانا کھاتا اور عدالت میں خوب زوردار بحثیں ہوتیں اور عدالتی کمرہ سے باہر آکر پھر بھائی بھائی۔

بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا، چھوٹے بھائی نے مرحوم کی اہلیہ کے پاس مقدمہ کے سارے کاغذات بھیج دیے اور کہلا بھیجا کہ میری لڑائی بھائی سے تھی تم سے یا ان کے بچوں سے نہیں، ان کاغذات کو چاہے جلا دو اور اب فیصلہ وہ ہوگا جو تم کہو گی، یہ قصہ تو میں نے اپنے والد صاحب سے ابتداً سنا تھا مگر پھر تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ تو ہمارے گھر کا بڑا مشہور قصہ ہے۔

یہ دور میرے عنفوان شباب تک رہا اس کے بعد کاندھلہ میں الیکشن کی لعنت پہنچ گئی، گھر گھر میں لڑائی، باپ بیٹوں میں مخالفت، بھائی بھائی میں مخالفت، الیکشن تو بڑی قیمتی چیز تھی اور بڑی کارآمد اور بہت مفید بشرطیکہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خلافت کے سلسلہ میں حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جیسا الیکشن ہوتا، یہ قصہ تو بہت طویل ہے لیکن کتب حدیث اور کتب تواریخ میں بہت مشہور ہے، کسی مولوی سے سنا جا سکتا ہے۔

اسی دوران میں اپنے عزیزوں میں دو بزرگوں میں لڑائی تھی، دونوں نیک ایک عمر میں بڑے مگر چچا جان نور اللہ مرقدۂ سے رشتہ میں دور، دوسرے عمر میں چھوٹے مگر رشتہ میں بہت قریب اور مسجد کے امام بھی تھے، بڑے نے اس مسجد میں نماز پڑھنی بھی چھوڑ دی، میرا یا چچا جان نور اللہ مرقدۂ کا اس دور میں ایک دو دن کے لیے صرف جانا ہوا کرتا تھا اور جانے پر وہاں کی نئی سیاست اور نئی لڑائیوں کے قصے سننے میں آتے تھے۔

ایک مرتبہ چچا جان کاندھلہ تشریف لے گئے یہ ناکارہ بھی ساتھ تھا، چھوٹوں سے چونکہ قرابت زیادہ تھی، اس لیے چچا جان نے ان سے درخواست کی اور مصالحت فضائل اور صلح کی ابتداء کی درخواست کی اور ان کو راضی کر کے بڑوں کے گھر لے گئے، معافی مانگنے پر آمادہ کر لیا کہ وہ بڑے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان چھوٹے کو بہت ہی جزائے خیر دے بہت بلند درجے عطاء فرمائے، یہ گئے اور جا کر معافی کی درخواست کی، مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، ان بڑوں نے پہلے تو ان کی کمر پر تھپڑ مارا اور پھر مصافحہ کیا صلح صفائی ہوگئی، مجھے چچا جان کی جو ادا اُس وقت پسند آئی وہ یہ کہ جب وہاں سے چلنے لگے تو چچا جان نے ان بڑوں کے پاؤں کو بوسہ دیا تھا میرے اکابر کا معمول یہی رہا اور میں نے بہت ہی دیکھا:

اودستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

اس وقت یہ مضمون ایک خاص وقتی ضرورت سے ذہن میں آگیا اگرچہ اکابر کا معمول مخالفین کے ساتھ پہلے تفصیل سے گزر چکا ہے، میری اپنے دوستوں کو نصیحت ہے کہ مخالفت کے حدود ہوتے ہیں جس میں آج کل بہت ہی افراط و تفریط ہو رہی ہے، جس سے ذرا سی مخالفت ہوئی ہر برائی اس کی طرف منسوب کر دی جاتی ہے محض توہمات پر حکم لگائے جاتے ہیں، حالانکہ قرآن پاک کا ارشاد ہے ''اِن السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسؤلا'' اللہ جل شانہ کا پاک ارشاد ہے کہ کان، آنکھ، دل ہر چیز سے قیامت میں سوال کیا جائے گا بلا تحقیق ایسی حالت

ہیں کہ ہماری اس سے مخالفت ہے ہر چیز کو اس کی طرف منسوب کر دینا بڑی سخت ذمہ داری ہے۔

وعين الرضا عن كل عيب كليلة

كما أن عين السخط تبدى المساويا

(محبت کی آنکھ ہر عیب سے اندھی ہوتی ہے جیسا کہ غصہ کی آنکھ ہر عیب کو ظاہر کرتی ہے۔

ایک قصہ یاد آ گیا ایک صاحب کے یہاں چولہے پر دودھ کا دیگچہ رکھا ہوا تھا اور اس پر ملائی خوب جمی ہوئی تھی وہ جب آئے تو گھر میں سے کتا نکل رہا تھا اُس کا منہ دودھ میں بھرا ہوا تھا بلکہ دودھ ٹپک رہا تھا، دودھ کے اندر ملائی ٹوٹی ہوئی تھی، مولوی نے فتویٰ دیا کہ دودھ ناپاک ہے اس واسطے کہ ظاہر یہی ہے۔

ایک محقق عالم نے سوال کیا کہ کتے کو دودھ میں منہ ڈالتے کسی نے دیکھا ہے؟ لوگوں نے کہہ دیا کہ دیکھا تو ہے نہیں، انہوں نے کہہ دیا کہ دودھ پاک ہے۔

بعض لوگوں کو علماء سے للہ بغض ہوتا ہے، اسی قسم کے ایک صاحب نے اس فتوے کو بہت اُچھالا، ان عالم پر بڑی گالیاں برسائیں، ہر جگہ جا کر اس کا چرچہ کرتے کہ فلاں مولوی صاحب نے ایسا غلط فتویٰ دے دیا، مالک کے یہاں دیر تو ہے اندھیر نہیں۔

چند سال بعد یہ صاحب جنگل سے آ رہے تھے، راستہ میں ایک غار میں سے کچھ آواز گڑگڑانے کی آئی، انہوں نے وہاں جا کر دیکھا تو ایک آدمی تازہ مرا پڑا ہے، خون نکل رہا ہے، ایک چھری بھی خون میں بھری پڑی ہے، یہ اُدھر کو حالت دیکھنے کے واسطے گئے تھے، پیچھے سے دو تین آدمی اور آ گئے اُن کو غار میں سے نکلتے دیکھا، ان کو پکڑ لیا، قاضی کے یہاں مقدمہ پہنچا۔

قصہ تو بڑا طویل ہے، انہوں نے درخواست پیش کی فلاں مولوی صاحب سے مسئلہ دریافت کیا جائے، ان مولوی صاحب نے یہاں بھی یہی سوال کیا کہ کسی نے قتل کرتے دیکھا؟ اور جب ان عالم صاحب نے فتویٰ دیا جو پہلے کتے کے مسئلہ میں دیا تھا تو ان معترض صاحب کی جان خلاصی ہوئی۔

یہاں ایک بات اور بھی ضروری قابلِ تنبیہ یاد آئی، شاید پہلے بھی لکھوا چکا ہوں اور چونکہ آج کل چند واقعات اس قسم کے پیش آ رہے ہیں اس واسطے جی تو بہت تفصیل سے لکھوانے کو چاہ رہا ہے مگر طبیعت بہت گری ہوئی ہے اس لیے مختصر ہی پر قناعت کر رہا ہوں اور دو ضروری چیزوں پر تنبیہ کرنا چاہتا ہوں۔

بڑی اہم تو یہ ہے کہ محض معمولی سی مخالفت پر ہر چیز کو بلا تحقیق دوسرے کے ذمہ تھوپنا بڑی خطرناک چیز ہے اور پھر قیاسات سے ان کو روایات بنا دینا بڑی سخت ذمہ داری ہے، اس سے

میرے دوستوں کو بڑے احتراز کرنے کی ضرورت ہے، یہ بہت خطرناک چیز ہے دوسری چیز نہ معلوم کتنے دفعہ لکھوائی ہوگی وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ظلم کسی پر نہیں۔

"اِن اللّٰہ لا یظلم مثقال ذرۃ" (اللہ تعالیٰ ایک ذرہ کے مقدار میں بھی کسی پر ظلم نہیں فرماتے)۔

لیکن ایک بہت قابلِ غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں گرفت میں جلدی نہیں ہوتی، مہلت اور ڈھیل دی جاتی ہے کہ شاید یہ توبہ کرلے اور اپنی حرکت سے باز آجائے اور جب یہ نہیں ہوتا تو گرفت ہوتی ہے لیکن جب گرفت ہوتی ہے تو اس وقت اتفاق سے کوئی واقعہ ایسا ہو چکا ہوتا ہے جس میں یہ بے گناہ ہوتا ہے مگر وہ واقعہ چونکہ قریب کا ہوتا ہے یہ سمجھتا ہے کہ اس واقعہ میں گرفت ہوئی ہے، حالانکہ یہ گرفت اس سے پہلے واقعہ کی وجہ سے ہوئی ہوتی ہے، اس لیے اس شور مچانے کی بجائے کہ میں تو بے قصور ہوں مجھ پر ظلم ہوا، فلاں نے جھوٹا الزام مجھ پر لگادیا وغیرہ وغیرہ۔

بہت غور سے بیٹھ کر اپنی پرانی حرکتوں کو سوچا کریں اور بہت زور سے استغفار میں مشغول رہا کریں، بہت اہتمام سے توبہ کیا کریں۔

"ماأصابا کم من مصیبة فبما کسبت أیدیکم و یعفو عن کثیر"

"جو مصیبت تم پر پیش آتی ہے تمہارے ہی اعمال کا ثمر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو بہت معاف کرتے ہیں"۔

حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مشہور قصہ ہے کہ جب ان کے سر میں درد ہوتا تو سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کرتیں کہ اللہ! "مجھ سے کیا گناہ ہوا"

اگرچہ بعض موقع پر کسی دوسری مصلحت سے تکالیف پہنچتی ہیں، جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، مجھے تو اس وقت چند وقائع کی وجہ سے اس اہم مضمون کو بیچ میں ذکر کر دینا تھا۔

اس سلسلہ کی بہت اہم بات یہ بھی ہے کہ انتقام جوارح سے نہیں ہوتا بلکہ بددعاؤں سے بھی ہوتا ہے، کسی پر انتقامی جذبہ میں بددعاء ہرگز نہیں کرنی چاہیے، بالخصوص علماء اور سیدوں پر کہ جو واقعات تمہارے نزدیک ان کی طرف منسوب ہیں اُن کی قطعیت تو معلوم نہیں، ممکن ہے کہ کتے کے دودھ کی طرح سے واقعہ کسی اور کا ہوا اور تم اپنے قیاس سے کسی کی طرف منسوب کر کے اس پر بدُعائیں شروع کردو تو اس کے حق میں تم ظالم ہوگئے۔ یہ تو بہت اُونچی چیز ہے کہ تم انتقام کا ارادہ ہی نہ کرو۔

"ولمن صبرو غفران ذالک لمن عزم الامور"

لیکن اگر اس پر قدرت نہ ہو اور آدمی سے بدُعاء کیے بغیر رہا نہ جائے تو نام لے کر نہ کرے بلکہ یوں کہے یا اللہ! "جس نے میرے ساتھ ظلم کیا تو ہی اس کا بدلہ دے میں تو عاجز ہوں تو ہی

میری حفاظت فرما۔"

اسی کے ساتھ بیچ میں ایک مضمون اور ضرورۃً پیش آگیا، وہ یہ کہ میں اس مضمون کو آپ بیتی میں کئی جگہ لکھوا چکا ہوں مگر آج کل پھر اس کا زور ہو رہا ہے کہ اکابر کے بعض خلفاء پر لوگ تنقیدیں کرتے ہیں اور وہ صورۃً تو ان لوگوں پر تنقید ہوتی ہے مگر پس منظر ان اکابر پر ہوتی ہے جنہوں نے اجازت دی۔

ان میں زیادہ تر حصہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جن میں بدگمانیوں کو زیادہ دخل ہوتا ہے، محض سنی سنائی باتوں پر بلاتحقیق بدگمانیاں اور غلط فہمیاں اس کا سبب ہوتی ہیں، حالانکہ اس کے متعلق تو میں کئی دفعہ تنبیہ کر چکا ہوں کہ آدمی کو دوسروں کی فکر نہیں کرنی چاہیے، اپنی فکر رکھنی چاہیے، قیامت میں کسی سے یہ سوال نہیں ہونے کا کہ فلاں نے فلاں کو اجازت کیوں دی تھی، وہاں سوال تو اپنے ہی اعمال سے ہوگا:

مرا پیر دانائے مرشد شہاب
دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ بر خویش خودبیں مباش
وگر آنکہ بر غیر بدبیں مباش

اس لیے آدمی کو اپنے اعمال میں فکر کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ مجھے بھی توفیق عطاء فرمائے کہ یہ ناکارہ "ما استقمت فما قولی لک استقم "میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اکابر پر تنقید کی نحوست سے ہمیشہ محفوظ رکھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ غیب کا علم تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں ہے، خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"حوضِ کوثر پر چند لوگ میرے پاس پیش کیے جائیں گے۔"

"لیردنّ علی اقوام اعرفهم و یعرفوننی ثم یحال بینی و بینهم فاقول إنهم منی فیقال إنک لا تدری ما أحدثوا بعدک فاقول سحقا سحقالمن غیّر بعدی۔"

"حوضِ کوثر پر کچھ لوگ میرے پاس پیش کیے جائیں گے جن کو میں پہچانتا ہوں اور وہ مجھے پہچانتے ہوں گے، پھر میرے اور ان کے درمیان آڑ کر دیا جائے گا میں کہوں گا یہ تو میری اُمت میں سے ہیں تو کہا جائے گا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد دین میں کیسا تغیر کر دیا تو میں کہوں گا کہ ہلاکت ہو ان لوگوں کے لیے جنہوں نے میرے بعد دین میں تغیر پیدا کیا۔"

فتحِ مکہ کے بعد حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معافی عامہ کا اعلان فرمایا اور فرمایا:
''جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو جائے اُس کو بھی امن ہے جو ابوسفیان کے گھر میں ہو جائے اُس کو بھی امن ہے وغیرہ وغیرہ۔''

ایک شخص نے آکر کہا کہ حضور! ابن خطل کعبہ کے پردہ سے لپٹا ہوا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قتل کر دو'' حالانکہ یہ شخص کاتبِ وحی تھا مسلمان ہو چکا تھا اور بھی اس قسم کے متعدد واقعات حدیث میں آئے ہیں۔

مشائخ حضورِ اکرام صلی اللہ علیہ وسلم تو کیا صحابی کے برابر نہیں ہو سکتے اور آج کل کے مشائخ تو قدماء مشائخ کے بھی برابر نہیں ہو سکتے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بعد والوں کا حال معلوم نہ ہو سکا کہ کیا کریں گے تو مشائخ کو علمِ غیب تو ہوتا نہیں، موجودہ حالت پر اجازت دی جاتی ہے اگر بعد میں کسی کی حالت بدل جائے تو اکابر پر اس کا کیا الزام آسکتا ہے، اس لیے بہت ہی ڈرنے کی چیز ہے۔

میرا جی تو اس کو بہت تفصیل سے لکھوانے کو چاہ رہا تھا مگر طبیعت اس وقت خراب بھی ہے، موت وحیات کا اعتبار نہیں، اس لیے دوستوں کو تنبیہ کے واسطے یہ مختصر لکھوا دیا جہاں صریح بے دینی کسی خلیفہ کی معلوم ہو جائے اُس وقت بھی اکابر پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے، اس میں اپنے آپ کو ہی برباد کرنا ہے، اس لیے کہ جیسا اُوپر لکھا گیا اجازت تو اجازت کے وقت کے حالات پر ہوتی ہے، اگر اجازت کے وقت کسی شخص کا حال اس قابل ہو اور بعد میں بدل جائے تو اس میں اجازت دینے والے پر کیا الزام ہو سکتا ہے۔

حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے یہاں تو تنبیہات وصیت کا ضمیمہ ہر سال چھپتا تھا، اس میں بعض خلفاء کے متعلق لکھا جاتا تھا کہ اب وہ دوسرے کام میں لگ گئے یا اب اہل نہیں رہے۔ لہٰذا اب اجازت باقی نہیں رہی۔

حضرت شیخ الاسلام مدنی نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ اپنے مکاتیب (ص ۱۶۶ جلد ۴ مکتوب نمبر ۴۹) میں تحریر فرماتے ہے اجازت کے لیے الہام اور کشف ضروری نہیں ہے، ممکن ہے بڑوں میں یہ پایا گیا ہو مگر ہم جیسے ناکارہ اور نالائق ایسی قابلیت کہاں رکھتے ہیں اجازت استعداد اور قابلیت پر ہوتی ہے''۔

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معیارِ قابلیت اجازت مندرجہ امور تھے، مرقوماتِ امدادیہ صفحہ نمبر ۳۰۹ کے حاشیہ پر فرماتے ہیں وہ امور بنائے خلافت یہ ہیں۔

(۱) صلاحیتِ ظاہرہ قدر معتدبہ۔ (۲) مناسبت طریق علماً وعملاً۔ (۳) توقع اہتمام صلاحیت و

رسوخ حال مگر حضرت گنگوہی قدس سرہٗ العزیز فقط امور مذکورہ بالا پر اکتفاء نہیں فرماتے تھے جب تک ملکہ یادداشت پیدا ہو کر قائم نہ ہو جائے جب تک اجازت نہیں دیتے، ملکہ یادداشت کی تعریف ''صراط مستقیم'' میں حسب ذیل الفاظ میں کی گئی ہے۔

''وحقیقتش التفات دائمی ست بسوئے ذات بے چوں و بیچگون درہمہ اوقات نشست و برخاست برکاست دعروض مکاسب ومصائب واوقات خوردن و آشامیدن بہ حیثیتے کہ ہیچ امر مانع التفات نہ گردد، بمثا آنکہ ہر گاہ محبت چیزے یا اہتمام کارے در دل شخصے کہ راسخ می گردد پس درعین اشتغال بحوائج ضروریہ اعمالِ معاشیہ کما ینبغی بسوئے ہمہ امر متوجہ می ماند''

(ص ۱۰۸)

الغرض ہر وقت ذاتِ مقدسہ جناب باری عزوجل کی طرف متوجہ رہے اور اس کو بلا رنگ وروپ تمام کمالات سے متصف اور تمام نقائص سے منزہ دھیان میں رکھے کہ وہ ہر چیز کا دیکھنے والا سب سے زیادہ قریب اور ہر وقت میں ساتھ ہے اپنی توجہ اور دھیان میں ہمیشگی پیدا کرنی چاہیے، اسی کو ملکہ یادداشت کہتے ہیں، اپنے تمام کاروبارِ دینی اور دنیوی انجام دیتے ہوئے بھی اس التفات اور دھیان کو قائم رکھنا چاہیے۔ فقط

مختصر الفاظ میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت مدنی قدس سرہما کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ سخت گرمی کے زمانہ میں روزہ دار کو پیاس کی شدت کی وجہ سے جو اثر ہوتا ہے وہ اثر ہونا چاہیے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے دل میں برابر لگی ہوئی

اس ناکارہ کو جب میرے مرشد حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ نے اجازت دی تھی اس کے بعد تو حضرت کی خدمت میں قیام کی بہت کم نوبت آئی اور اس کے ساتھ ساتھ پوچھتے ہوئے ڈر بھی معلوم ہوا کہ ابھی سے مشیخت کا خواب دیکھنے لگا البتہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے کئی سال بعد اس سیہ کار نے پوچھا تھا کہ اجازت کن چیزوں پر دی جاتی ہے تو حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے نہایت مختصر الفاظ میں بڑی جامع بات ارشاد فرمائی تھی کہ شیخ کے قلب پر بلا کسی محرکِ ظاہری کے بار بار تقاضا ہو اس کو اول چند مرتبہ دفعہ کیا جائے اس کے بعد بھی اگر یہ تقاضا غالب رہے تو اجازت دی جائے۔ فقط

بندہ کے خیال میں اکابر کے طرز سے جو چیز میں نے استنباط کی وہ مرید کے قلب میں اجازت کا داعیہ بلکہ واہمہ بھی نہایت مضر ہے، میں نے اپنے اکابر کو بہت کثرت سے دیکھا کہ جس کے متعلق بھی یہ خیال ہو جاتا کہ یہ خلافت کا اُمیدوار یا خواہش مند ہے اس کو اجازت دینے میں بہت دیر کرتے۔

کسی سے بیعت ہونے کے لیے یہ کافی نہیں کہ فلاں کا مجاز ہے بلکہ اس کے موجودہ حالات کا دیکھنا ہے کہ اتباع شریعت کس درجہ میں ہے کہ اصل مدار اتباع شریعت ہے، اتباع سنت میں جو شخص جتنا عالی ہوگا اُتنا ہی مقتدا بننے کے قابل ہے کسی پر بدگمانی کرنا دوسری چیز ہے اور اُس کا معتقد ہو کر بیعت ہونا دوسری چیز ہے ان دونوں میں بہت فرق ہے اور دونوں میں احتیاط کی ضرورت ہے کسی پر بدگمانی کرنے میں بھی اور کسی کو شیخ بنانے میں بھی، ارشاد الملوک میں شیخ بنانے کے لیے جو شرائط لکھی ہیں وہ بہت اہتمام سے دیکھنے کی ہیں اُن کو سرسری نہیں سمجھنا چاہیے، بہت اہتمام سے دونوں مضمونوں کو علیحدہ علیحدہ سمجھنا چاہیے اور اس پر عمل بھی کرنا چاہیے، محض سنی سنائی باتوں پر نہ بدگمانی کرنی چاہیے نہ شیخ بنانا چاہیے۔

ارشاد الملوک صفحہ ۷ میں شیخ بنانے کی شرائط بہت تفصیل سے لکھی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سالک کے لیے شیخِ کامل کا ہونا بہت ضروری ہے تاکہ اس کے راستہ کا رفیق بنے اور اس کو راستہ کی اونچ نیچ سمجھاتا رہے جس کا اصل مدار اتباع سنت اور اتباع شریعت پر ہے اور طریقہ کار میں تجربہ کار ہونا ضروری ہے، اس کا شریف النسب ہونا ضروری نہیں بلکہ بہت سے غریب و نادار اور وہ پیشہ ور جن کو لوگ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے باعزت مشائخ بن چکے ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''کسی کا ظاہری اسلام تم کو مسرور نہ بنائے جب تک اس کی قلبی حالت اور عقیدہ سے پوری واقفیت حاصل نہ کرلو۔'' اس سے معلوم ہوا کہ حقانیت کا مدار اصلاح عقائد پر ہے۔

پس جو شخص اجماع اُمت اور کتاب وسنت کے موافق عقائد رکھتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ طریقت وحقیقت کے علم کا بھی ماہر ہو وہ بے شک شیخ بنانے کے قابل ہے اور یہ حالات اس کے مریدوں کے حالات اور ہم عصر ثقہ و دیندار لوگوں کی زبانوں سے دریافت کرنا چاہیے کہ اس کے مریدوں کے دین کی پختگی اور اتباع شریعت میں کیا حالت ہے اور صلحاء زمانہ اس کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ سو اگر علماء وقت اس پر معترض نہ ہوں بلکہ بعض اہلِ علم اور سمجھدار صلحاء اور اہلِ دانش بھی اس سے فیض حاصل کرتے ہیں اور دینی محبت اس سے رکھتے ہوں اور طریقت وحقیقت میں مستند تسلیم کرتے ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ ور حقیقت وراہِ حق کا ماہر ہے پس اُس کا دامن پکڑ لینا چاہیے

اور جب اُس سے بیعت کر لے تو دل سے اُس کا فرمانبردار بن جانا اور توحیدِ مطلب کے ساتھ اس کی اطاعت کا حلقہ کان میں پہن لینا چاہیے۔

توحید مطلب یہ ہے کہ اپنے شیخ کے متعلق اس کا یقین رکھے کہ دنیا میں اس کے علاوہ مجھ کو مطلوب تک کوئی نہیں پہنچا سکتا اور اس زمانہ میں دوسرے مشائخ بھی ہوں اور انہی اوصاف کاملہ سے متصف بھی ہوں مگر میرا منزلِ مقصود پر پہنچنا اسی ایک کی بدولت ہوگا سو توحیدِ مطلب سلوک کا بڑا رکن ہے اور جس کو یہ حاصل نہ ہوگا وہ پراگندہ و پریشان اور ہرجائی بنا پھرے گا اور کسی جنگل میں بھٹکتا ہوا کیوں نہ ہلاک ہو جائے حق تعالیٰ کو مطلق پرواہ نہ ہوگی، یہ مضمون بہت ہی اہم اور سالکین کے بہت غور سے اصل کتاب میں پڑھنے کا ہے۔

اسی دوران میں حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ (صفحہ۱۲) ''مجذوب اگرچہ مطلوب تک پہنچا ہوا ہوتا ہے مگر چونکہ راستوں کی آفتوں سے انجان اور راہ کی بلاؤں سے بے خبر ہوتا ہے اس لیے شیخ بنائے جانے کے قابل نہیں، کیونکہ راستہ قطع کرانا اور رہبری اس سے نہیں ہو سکتی''۔

پس شیخ میں جن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے وہ یہ ہیں کہ قرآن و حدیث کا عالم ہو اور عالم ہی ہونا کافی نہیں بلکہ صفاتِ کمال سے متصف ہو، دنیا اور جاہ و مال کی محبت سے رُوگرداں ہو، ایسے مشائخِ ربانیین سے طریقت حاصل کیے ہوئے ہوں۔ جن کا سلسلہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مسلسل ہو، اپنے شیخ کے حکم کے موافق ریاضت و مجاہدہ کر چکا ہو کہ گفتگو، کھانا، سونا، مخلوق سے ملنا جلنا کم اور صدقہ و سکوت، نماز روزہ میں کثرت رکھ چکا ہو، مکارمِ اخلاق اور حسنِ ادب مثلاً صبر، شکر، توکل، یقین، سخاوت، قناعت، امانت، بردباری، تواضع اور آخرت پر کفایت، صدق، اخلاص، حیاء، وقار، سکون اور کام کو سوچ سمجھ کر کرنا اور جاہ و مال وغیرہ کو خیرباد کہہ دینا اس کی خصلت بن چکا ہو۔

مشعلِ نبوت کی روشنیاں اپنے اندر پیدا کر کے جملہ اخلاق ذمیمہ تکبر و خود پسندی، بخل و حسد کینہ، حرص و امل و خفیف الحرکاتی وغیرہ کو مضمحل بنا چکا ہو، بے تکلف مجاہدہ و ریاضت کی صورت تجلیات کے ساتھ حلاوت و لذت پانے کے سبب اس کے چہرے پر چمک رہی ہو، دنیا اور اہل دنیا سے خلوت اختیار کر کے دریائے جلال کے سیراب ہوا ہو، شطحیات یعنی ایسی باتیں جو غلبہ حال و مستی میں بے اختیار نکل جاتی ہیں جو بظاہر خلافِ شرع ہیں اس کی زبان سے نہ نکلتی ہوں، نیز شیخ کا جملہ علوم پر حاوی ہونا ضروری نہیں بلکہ عبادات میں فرائض و سنن و نوافل کی مقدار، محرمات و ممنوعات کی اقسام اور جائز و ناجائز کی تمیز کے قابل علم کافی ہے۔

کوچہ گرد، سیرانی نہ ہو کہ فضول سیر و سیاحت کرتا پھرے نہ دنیا پرست ہو نہ زینت و جاہ کا

طلبگار رہو، نہ مریدوں کی کثرت کا خواہش مند ہو، یہ طویل مضمون ہے اور بہت اہم شیخ بننے کے لیے اس کا دیکھنا ضروری ہے، ارشاد الملوک صفحہ ۷ سے صفحہ ۱۶ تک یہ مضمون شیخ بننے کے لیے پڑھنا ضروری ہے۔

سفرِ ہند ۱۳۹۵ھ

یہ ناکارہ جیسا کہ پہلے بھی لکھوا چکا ہے، جب تک کسی علمی کام کے قابل رہا باوجود اکابر کے تقاضے کے بھی حجاز کا ارادہ نہیں کیا، حضرت شیخ الاسلام مدنی اور حضرت رائے پوری نور اللہ تعالیٰ مراقدھما کے اصرار کے باوجود بھی ان اکابر کی ہمراہی نہ اختیار کر سکا، لیکن جب علمی کام کا نہ رہا جس کی ابتداء تو ۸۲ھ کی اسٹرائیک سے ہوئی جس کی تفصیل کہیں لکھوا چکا ہوں کہ مجھے اس کا بہت ہی رنج اس واسطے پہنچا کہ میں نے اس سال بہت اہتمام اس کا کیا تھا کہ طلبہ حدیث حقیقی معنی میں طالبِ علم اور مقتداء قوم بن کر نکلیں۔

بخاری کے اسباق میں روزانہ کچھ نہ کچھ نصیحتیں اور تنبیہوں میں اور طلبہ کے ان کے مقام پہچاننے میں خرچ کرتا اور یقین کر رہا تھا کہ اس سال کے طلبہ ان شاء اللہ تعالیٰ بہترین نمونہ ہوں گے جس کی تفصیل تو اپنی جگہ پر گزر چکی کہ میری تدریس سے بددلی کی ابتداء تو یہاں سے ہوئی اور اس پر مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے شدید اصرار ۸۲ھ سے سفرِ حجاز کا سلسلہ شروع ہوا اور مولانا مرحوم اس سال حجاز والوں سے وعدہ کر گئے تھے کہ ہر تیسرے سال میں آؤں گا اور زکریا بھی میرے ساتھ آئے گا۔ وہ خود چل دیئے مگر میرے لیے سفرِ حجاز کا راستہ کھول گئے اور مجھے بھی یہ خیال ہوا کہ جب علمی کام نہیں ہے تو دار الکفر میں خالی پڑے رہنے کی بجائے دیارِ حبیب اللہ میں وقت گزر جائے تو یہاں کی برکات میں سے اس ناکارہ پر بھی شاید کچھ اثر پڑ جائے۔ اس لیے جی تو یوں چاہتا رہا کہ کہیں پڑا رہوں۔ میرے امراض اور عوارض کا تقاضا بھی یہی تھا سفر نہ کروں مگر جب بھی یہاں آنا ہوا ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے اکابر و احباب کا تقاضا واپسی کا مسلط رہا۔

اس سال میرا جانے کا بالکل دل نہیں چاہتا تھا اور ایک بزرگ نے جنہوں نے نام ظاہر کرنے کا منع کر دیا، استخارہ بھی کیا اور ۱۶ جمادی الاولیٰ ۹۵ھ کو خواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور میرے ہند کے سفر کے بارے میں استفسار کیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''کیا یہاں وہ بیکار ہے''؟ عرض کیا بیکار تو نہیں کام میں تو یہاں بھی لگا رہتا ہے تو ارشاد فرمایا:

''جب ہمارے مدینہ منورہ میں بھی کام میں لگے ہوئے ہیں تو پھر باہر جانے کی کیا ضرورت ہے''؟ عرض کیا کہ حضرت والا کیا آپ کا منشاء یہ ہے کہ حضرت شیخ مدینہ منورہ میں رہیں؟ تو ارشاد فرمایا:

''ہاں ہمارا منشاء تو یہی ہے''۔

عرض کیا بالکل پکی بات ہے جا کر کہہ دوں؟

تو ارشاد فرمایا:

''ہاں ہمارا منشاء تو یہی ہے''۔ تو اس پر زکریا نے نہ جانا بالکل طے کر لیا مگر تعجب ہے، اس سال مکی مدنی احباب اور پاکی احباب کا بہت شدید اصرار رمضان ہند گزارنے پر ہوا بالخصوص میرے محسن جناب الحاج قاضی عبدالقادر صاحب تو اتنے مصر ہوئے کہ باوجود باقی احباب کے ان کو بلانے کے تقاضے کے بھی انہوں نے جانے سے انکار کر دیا کہ میرے جانے کے بعد یہ سفر ہند ملتوی کر دے گا اس کا تصفیہ مولانا انعام الحسن صاحب پر رکھا کہ وہ افریقہ سے واپسی پر جو طے کر دیں گے اُسی پر عمل ہوگا، مگر مولانا موصوف نے بھی کوئی فیصلہ نہ کیا۔ بار بار دوستوں نے ان پر اصرار کیا کہ وہ کوئی فیصلہ کریں۔ وہ ہر دفعہ میں یہی کہتے رہے کہ وہاں کی مختلف ضرورتوں کا تقاضا تو جانے کا ہے مگر اس کی بیماری کی حالت کو دیکھ کر میری ہمت جانے کو کہنے کی نہیں پڑتی۔ اسی دوران میں عزیز عبدالحفیظ نے یکے بعد دیگرے استخاروں پر دو خواب مسلسل دیکھے، دوسرے خواب میں جانے کی تاکید حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریراً فرمائی۔

خواب دونوں طویل ہیں، اس لیے ارادہ کر ہی لیا۔ ہندوستان سے بھی بعض دوستوں کے خواب اسی کی تائید میں پہنچے اور اس ناکارہ کا تو ہمیشہ سے معمول ہے کہ جب ہندوستان جاتا ہے تو پہنچنے کے بعد واپسی کا استخارہ شروع کر دیتا ہے اور جب حجاز واپسی ہوتی ہے تو دو تین ماہ بعد سے احباب کے اصرار پر استخارہ شروع کر دیتا ہے۔

اس ناکارہ کا تقریباً پچاس (۵۰) سال سے معمول ہے کہ اہم کام میں استخارہ کا اہتمام کرتا ہے۔ مقاصد حسنہ صفحہ ۳۶۶ میں طبرانی کے حوالہ سے بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے ''ما خاب من استخار'' (الحدیث) کہ جو استخارہ کرے وہ نامراد نہیں ہوتا۔ اس لیے ہندوستان جانے میں یا حجاز آنے میں اپنا جذبہ کچھ نہیں ہوتا، استخارہ کا اہتمام ضرور کرتا ہوں اور دوستوں کو بھی اس کی تاکید کرتا ہوں کہ اہم امور میں بالخصوص نکاح کے بارے میں استخارہ کا ضرور اہتمام کیا کریں۔

جتنے تقاضے ہوتے رہے ہیں اس کو استخارہ کا ثمرہ سمجھتا رہا اور بہت سے موئیدات جن کا تحریر کرانا

بھی مناسب معلوم نہیں ہوا ایسے پیدا ہوئے کہ جن کی بناء پر اس ناکارہ نے رمضان ہندوستان گزارنے کا ارادہ کرلیا اور اس میں سب سے زیادہ دخل میرے محسن و مخلص الحاج قاضی عبدالقادر دام مجدھم کا ہے کہ وہ التواء پر کسی حال میں راضی نہیں ہوتے تھے۔

پاکی احباب کے زیادہ اصرار پر مبنیٰ یہ بھی تھا کہ ان کو بہت قوی امید تھی کہ کثرت سے ویزا مل جائے گا، مگر افسوس کہ بہت مشکل سے قاضی صاحب کو اور عزیز مولوی محمد بنوری بن مولانا محمد یوسف صاحب بنوری اور مولوی شاہد صاحب نائب مفتی مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن اور ایک دو کے علاوہ اور کسی کو ویزا نہیں ملا۔ عطاء الرحمٰن اور ان کے بھائی حاجی یعقوب الحاج احمد ناخدا۔ صوفی محمد اقبال، عزیز عبدالحفیظ، الحاج محمد الیاس، نیز ملک عبدالحق صاحب وغیرہم بھی تھے۔ چونکہ یہ ناکارہ قاضی صاحب سے پختہ وعدہ کر چکا تھا اور اسی بناء پر قاضی صاحب نے اپنا سفر پاکستان اختیار کرلیا تھا، وہاں سے بھی ان کے خطوط آتے رہتے کہ میں تجھے لینے کے واسطے حجاز آؤں گا اور اس ناکارہ نے اُن کو سختی سے منع کر دیا کہ میں آپ سے پختہ وعدہ کر چکا ہوں اور آپ کے آنے میں حرج و خرچ زیادہ ہوگا، اس لیے یہ ناکارہ بار اتوار کی شب میں سلیم کی کار میں زکریا عزیز عبدالحفیظ ابوالحسن، عبدالقدیر اور حبیب اللہ، اسماعیل تین بجے رات کو چل کر ۴:۳۰ بجے مسجد عریش پہنچے، کھانا وغیرہ کھا کر ۵:۳۰ پر آرام کیا، صبح کی نماز کے بعد پھر سو گئے، ۱۰:۳۰ بجے ناشتہ کیا۔

زکریا مکہ مکرمہ اور سلیم عبدالحفیظ کی کار کو لے کر مدینہ واپس چلا گیا، جس میں صوفی اقبال وغیرہ پہنچانے آئے تھے مگر صوفی اقبال اور الیاس کو زکریا نے روک دیا اس لیے کہ صبح کی نماز کے وقت یوسف تتلی افریقہ سے بدر پہنچ گئے اور وہی دن ان کے مدینہ قیام کے تھے اس لیے ان دونوں کو اقبال اور الیاس کی جگہ مدینہ بھیج دیا۔ زکریا براہ جدہ ۴:۳۰ پر مدرسہ صولتیہ پہنچ گیا اس لیے کہ وادی فاطمہ کا راستہ خراب تھا۔

راستہ میں ڈاکٹر ظفیر، وحید الزماں کے مکانات پر چند منٹ کو ٹھہرنا ہوا۔ اول الذکر ملے نہیں جس کی تلافی میں وہ شام کو مکہ آئے۔ احرام وعمرہ کا زکریا نے حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ، ابوالحسن نے والدہ طلحہ، اسماعیل نے والد زکریا فضل الرحمٰن نے والدہ زکریا، عبدالقدیر نے چچا جان، حبیب اللہ نے حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ، عبدالحفیظ نے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے باندھا۔

۲۸ رجب ۹۵ ھ ۶ اگست ۷۵ چارشنبہ کی صبح کو عربی نو بجے مکہ مکرمہ سے بارادہ ہند چل کر حدیبیہ میں صبح کی نماز پڑھی۔ عزیز شمیم اور ماموں یامین کو زکریا نے جدہ آنے سے منع کر دیا تھا، مگر وہ مولوی عبداللہ عباس کی گاڑی میں صبح کی نماز پڑھنے کے واسطے حدیبیہ تک آئے اور پھر ان کی گاڑی

میں واپس چلے گئے۔

حدیبیہ سے سیدھے مطار پر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر ظفیر نے اپنی گاڑی طیارہ تک لے جانے کی اجازت لے رکھی تھی مگر عین وقت پر مطار والوں نے کہہ دیا کہ نہیں یہ نہیں جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب کے کوئی دوست وزراء کے مخصوص دروازوں سے مطار کی کار میں لے گئے۔ اتنے میں رفقاء بھی کسٹم کے دروازہ تک پہنچ گئے تھے۔ جدہ سے ۱۵: ۱۲عربی وقت پر مشی اور ۴۰: ۱۲ پر پرواز کی۔ ظہران ۰۵: ۲ پر پرواز۔ دبئ ۲۵: ۴ اتار ۱۵: ۵ پر روانہ ہوا ۲۲: ۵ پر پرواز۔ کراچی ۰۵: ۷ پر پہنچا۔ ۵۵: ۷ پر مشی۔ ۰۰: ۸ پر پرواز ۹ بجے بمبئی پہنچا جب کہ وہاں مغرب کی نماز کا وقت تھا اور بارش دو گھنٹہ قبل ہی سے خوب ہو رہی تھی۔ میری کار میں اسماعیل ہاشم حاجی یعقوب کہ میرے رفقاء کسٹم میں تھے بارش چونکہ خوب ہو رہی تھی وہاں جگہ نہ تھی، اس لیے راستہ میں ایک شفاخانہ میں مغرب کی نماز پڑھی اور عشاء کے وقت بھائی عبدالکریم کے یہاں پہنچے۔ ہماری روانگی کے وقت مطار پر بہت زوردار بارش ہوئی کہ نکلنے کا راستہ رفقاء کو نہ ملا، دیر کے بعد پہنچے اور عشاء کی نماز کے بعد کھانا کھایا۔ کسٹم میں صرف دس منٹ لگے۔ دیر بارش کی وجہ سے ہوئی۔

بمبئی میں مولوی محمد عمر صاحب دو دن سے گئے ہوئے تھے چونکہ گزشتہ سال ان کی لفٹ خراب ہونے کی وجہ سے ان کے ناشتہ میں زکریا شریک نہیں ہو سکا تھا اس لیے ان کو بہت قلق تھا اور مدینہ میں ان کے خطوط پہنچنے شروع ہو گئے تھے اس کی قضاء میں اس لیے جمعرات کی صبح کو ان کے یہاں ناشتہ ہوا، خصوصی مصافحے تو رات سے ہی ہو رہے تھے لیکن عمومی مصافحوں کا نو بجے سے اعلان ہوا اور اس کے بعد اسی مجلس میں بیعت ہوئی، مولوی محمد عمر صاحب نے طویل دعاء کرائی عصر کے بعد کئی نکاح ہوئے اور بیعت بھی ہوئی، بھائی عبدالکریم کا نکاح اسی مجلس میں ہوا اور اتوار کو ولیمہ۔

جمعہ کے دن فجر اپنی پڑھ کر مطار پر روانگی ہوئی اور رفقاء سامان کی وجہ سے پہلے ہی چلے گئے تھے، اُنہوں نے مطار پر نماز پڑھی، پانچ ٹکٹ ہمارے اور چھٹا ٹکٹ مولوی محمد عمر کے دام وضع ہو کر ۵۰ کلو زائد رہا جس کے =/۲۴۲ روپے زائد محصول دینا پڑا، جب کہ حاجی یعقوب صاحب نے پانچ کرتون یہ کہہ کر روک لیے تھے کہ میں ان کو براہِ راست بمبئی سے سہارنپور بھیج دوں گا، ایک کرتون (ڈبہ) بمبئی سے مسلسلات کی کھجوروں کا خریدا تھا وہ بھی اسی میں تھا، جس کو انہوں نے پھلوں کے ڈبہ میں ریل سے ہمروز بھیج دیا تھا، بقیہ سامان دو پیٹیوں میں کئی دن میں پہنچا۔

بمبئی سے روانگی صبح سات بجے ہندی تجویز تھی مگر جہاز میں کوئی خرابی آ گئی ۲۵ منٹ اسٹارٹ نہ ہوا اور موٹر کی خرابی کی طرح وہ بھی سیٹی سی بجاتا رہا، بہت ہی فکر ہو گیا، یارب سلم سلم زکریا تو پڑھتا رہا ۲۵: ۷ پر اسٹارٹ ہوا مگر پھر ٹھہر گیا مگر پھر ۴۰: ۷ پر پرواز کی، مگر راستہ میں الحمدللہ کوئی دقت نہیں

ہوئی، ۹:۲۲ پر زمین پر مشی ہوا اور ۹:۳۰ پر استقرار، بھائی کرامت نے طیارہ پر اپنی موٹر لے جانے کی اجازت لے رکھی تھی اس میں مولوی انعام، طلحہ، زبیر طیارہ پر پہنچ گئے اور بقیہ کاریں، بسیں اور لاریاں باہر کھڑی رہیں جس میں سہارنپور کے بچے تھے ان سے ملاقات نہ ہوسکی، مولوی انعام نے کہا کہ اگر سب سکون سے بیٹھ جائیں تو دعاء ہوگی ورنہ ہم جاویں، دس منٹ کے شوروشغب کے بعد مولوی انعام نے طویل دعاء کرائی، اس کے بعد پھر یکے بعد دیگرے نظام الدین میں گاڑیاں پہنچتی رہیں۔

بحمد اللہ تعالیٰ ۱۸ اگست ۷۵ء یکم شعبان ۹۵ھ کو نظام الدین پہنچنا ہوا مولوی اظہار نے مصافحہ کے لیے پوچھا، میں نے کہا کہ کل صبح کو ہو جاوے گا، انہوں نے کہا کہ بہت سے لوگوں کو جانا ہے، میں نے کہا کہ عصر کے بعد ہو جاوے گا، مولوی انعام نے بھی بارکی صبح تجویز کی، مگر مولوی اظہار نے کہا کہ عصر کے بعد لوگ رُک جائیں گے اس لیے جمعہ کے بعد مصافحہ ہوا اور عصر کے بعد بخاری ختم ہوئی اور کئی نکاح ہوئے اور مفتی عتیق صاحب کو ٹیلیفون کر کے بلایا تھا تا کہ ان کو جج صاحب کا خط دیا جائے جو انہوں نے مولانا بدر عالم کو حزب الاعظم کے سلسلہ میں دیا تھا مولوی محمد میاں صاحب وغیرہ خصوصی احباب سے ملاقات ہوئی۔

زکریا کا ارادہ بمبئی ٹھہرنے کا تھا، بار کو وہاں سے روانگی تھی مگر مولوی انعام صاحب کو بار کی صبح کو مالیر کوٹلہ کے اجتماع میں جانا تھا اس لیے انہوں نے بمبئی والوں کو اطلاع کی تھی کہ زکریا کو جمعہ کو بھیج دیں، میں نے تو اس کو بہت غنیمت سمجھا مگر بمبئی والوں نے مولوی انعام کو اور زکریا کو بھی مدینہ خطوط لکھے کہ بمبئی کے دو دن اور بڑھا دیے جائیں کہ قرب وجوار کے لوگوں کو سہولت ہو، مگر زکریا نے کہا کہ میں دہلی اور سہارنپور دونوں جگہ اطلاع کر چکا ہوں اور دونوں جگہ سے بڑے مجمع کے اکٹھے ہونے کی (باوجود منع کرنے کے) اطلاع مل رہی ہے اس لیے جمعہ کی صبح کو بمبئی سے چل کر دہلی پہنچا۔

جیسا کہ اُوپر لکھا گیا اور بار کے دن کیونکہ وہاں سعودی مجمع بہت تھا اس لیے اپنے اکابر کے مزارات پر تو نہیں البتہ صبح کی نماز کے بعد کہ وہ لوگ تقریر میں مشغول رہے، سلطان جی کے مزار پر حاضری ہوگئی اور بارہ بجے کھانا کھا کر مولوی انعام صاحب ریل سے مالیر کوٹلہ روانہ ہوگئے اور میں ظہر پڑھ کر کاندھلہ کے لیے روانہ ہوا، چونکہ مستورات دلی کی بھی اور کاندھلہ کی بھی ساتھ آنے والی تھیں، اس لیے دو کاریں مستورات کی، دو زکریا اور رفقاء کی، زکریا کرامت کی گاڑی میں تھا مگر وہ خرابی کی وجہ سے آہستہ چلی، مستورات نے تو عصر کاندھلہ میں پڑھی، مگر زکریا کاندھلہ مغرب کے وقت پہنچا اور سیدھا عیدگاہ چلا گیا، وہاں بہت بڑا مجمع تھا۔

مغرب پڑھ کر اول قبرستان پر آدھ گھنٹہ قیام ہوا اور پھر مصافحے شروع ہوئے، مگر کچھ ہی ہوئے تھے کہ رول مچ گیا، پھر قصبہ میں گیا وہاں بھی بہت مجمع اکھٹا تھا مگر کار سے اترتے ہی سیدھا زنانے میں چلا گیا مگر وہاں پہنچتے ہی اہلیہ مصباح کو دورہ پڑ گیا، اس کے صبر وسکون کی تو بہت اطلاعیں پہنچ رہی تھیں اور بجائے متاثر ہونے کے متاثرین کو روک رہی تھیں، مگر معلوم ہوا کہ ایک دفعہ دورہ اس دن پڑا تھا جس دن عدت ختم ہوئی، آدھ گھنٹے بیٹھ کر چلا آیا، صبح کی نماز پڑھ کر چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر زکریا زنانے میں چلا گیا، اس وقت سکون رہا، اہلیہ مصباح نے کچھ راز میں باتیں کیں، اتنے ساتھیوں نے سامان رکھا اتنے زکریا گھر میں رہا اور سامان رکھنے کے بعد سیدھا کار میں بیٹھ گیا، مصافحوں سے انکار کر دیا، ۷ بجے چل کر ۸ بجے جھنجھانہ پہنچے۔

بھائی نسیم نے چائے پر اصرار کیا زکریا نے انکار کر دیا اور رفقاء کو کہا کہ پلا دو، ۱۰ بجے چل کر ۱۱ بجے تھانہ بھون اول حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مزار پر اور اس کے بعد حضرت حافظ صاحب کے مزار پر، اسی درمیان میں ظہر کی نماز بھی پڑھی، ۳ بجے وہاں سے چل کر ۴:۳۰ بجے سہارنپور پہنچ گئے، تحیۃ المسجد پڑھ کر اول گھر میں، پھر حکیم ایوب کے یہاں، پھر حضرت ناظم صاحب کے یہاں ہوتے ہوئے دارِ جدید پہنچ گیا، عصر کے بعد اول مولوی اظہار نے دُعاء کرائی اور پھر مغرب تک مصافحے ہوتے رہے۔

صوفی رشید مغرب کے وقت ملے انہوں نے کہا کہ گنگوہ کا ارادہ کیا ہے؟ میں نے کہا بالکل نہیں کیونکہ بارش سے راستہ مسدود ہے انہوں نے کہا کہ میں آج ہی قصداً راستہ دیکھ کر آیا ہوں باہر راستہ صاف ہے، میں نے کہا کہ پھر صبح ہی چلنا چاہیے حاجی عظیم اللہ کی کار میں ۵:۰۵ پر چل کر ۶ بجے گنگوہ پہنچا وہاں سے ۱۰ بجے اُٹھ کر حکیم نہنو سے ملتے ہوئے ہر دو خانقاہوں میں حاضری دے کر ۱۲ بجے صوفی رشید کے یہاں کھانا کھایا اور قاری شریف کی مسجد میں جا کر اول مشکوٰۃ شریف کا افتتاح کرایا پھر تھوڑی دیر لیٹ کر ظہر کی نماز پڑھی، ظہر کے بعد رفقاء نے چائے وغیرہ پی، مگر زکریا حاجی جی کی کار میں مع شاہد، خالد، ابوالحسن عصر سے قبل سہارنپور پہنچ گیا۔

عصر کے بعد مسجد ہی کا اعلان تھا، مگر نصیر الدین کے اصرار پر کہ انہوں نے زکریا کے لیے حاجی عظیم اللہ کی سعی سے کمرہ بنوایا تھا اور اس کا افتتاح ان کی موجودگی میں کرانا چاہتا تھا، اس لیے عصر کے بعد مجلس مولوی نصیر کی ٹال میں ہوئی اسی دن یعنی پیر کے دن عشاء کے قریب مولوی انعام بھی مالیر کوٹلہ سے واپس آئے، مولوی یونس نے بخاری و مسلسلات دونوں روک رکھی تھیں، ان کو عشاء کے بعد بُلا کر کہا کہ چونکہ طلبہ کو اطلاع نہیں اس لیے صبح کے تین گھنٹہ میں سب کو اطلاع کرا دو اور ہم اپنی نماز پڑھ کر چار کاریں اور حافظ عبدالحفیظ کا جونگہ رائے پور روانہ ہو گئے۔

سہارنپور میں بھٹ تک بارش نہ تھی مگر بھٹ سے بارش شروع ہوئی، خیال تو تین گھنٹے وہاں قیام کا تھا مگر ایک گھنٹہ کار ہی میں بیٹھ کر واپس آ گئے، ابوالحسن اس سفر میں ساتھ نہیں ہوسکا کہ رات کو اس کے محلہ میں چور آ گئے تھے اس کی وجہ سے جاگنا پڑا اس وجہ سے صبح کو آنکھ نہ کھلی، اس لیے وہ بھیگتا ہوا ٹھیلے میں گیا اور پٹری پر چلتا ہوا ملا، اس کو اپنی گاڑی میں بُلا لیا، شاہ صاحب کے مزار پر چند منٹ ٹھہرتے ہوئے ریڑھی کے مدرسہ میں گئے اس لیے کہ گزشتہ سال ریڑھی کے طلبہ ومدرسین یہ خبر سن کر کہ زکریا رائے پور گیا ہوا ہے، سڑک پر انتظار کرتے رہے اور بارش میں بھیگتے رہے اور بھاگ بھاگ کر آتے رہے، ان کی تلافی کے لیے جانا ہوا، تقریباً آدھ گھنٹہ وہاں قیام رہا اگرچہ کاروں ہی میں قیام رہا۔

وہاں سے چل کر ۹ بجے کے بعد سہارنپور پہنچ گئے اور دس بجے ۱۲ اگست ۷۵ء ۳ شعبان ۹۵ھ بخاری شریف کا ختم ہوا، اول مسلسل بالاولیۃ کی حدیث پڑھی گئی، اس کے بعد مولوی یونس نے بخاری کی آخری حدیث پڑھی، متن دونوں کا زکریا نے پڑھا، اس کے بعد کھانا کھایا اور حضرات نظام الدین ایک گھنٹہ لیٹ کر چلے گئے اور زکریا بھی چکنا چور ہو کر لیٹ گیا۔

یعقوب مدنی جو ایک ماہ سے نظام الدین تبلیغ میں گیا ہوا تھا، زکریا کے ساتھ کاندھلہ تک راشد کے اصرار پر اور تھانہ بھون تک زکریا کے کہنے پر اور سہارنپور تک اپنی رائے سے آیا اور گنگوہ رائے پور سفر میں ساتھ رہا اور آج مولوی انعام کے ساتھ کاندھلہ تک واپس آ گیا، صوفی افتخار صاحب جھنجھانہ تک اپنی رائے اور تھانہ بھون تک زکریا کی رائے سے آئے، دو کاریں جو دہلی سے ان سے ملنے آئی تھیں جھنجھانہ پہنچ گئی تھی اور تھانہ بھون تک آئیں اور یہاں سے صوفی جی راشد وغیرہ کو لے کر واپس چلے گئے۔

مسلسلات ۱۵ اگست ۹۵ھ، ۲ شعبان جمعہ کو ہوئی، مگر اس مرتبہ پہلے سے اطلاعات نہ ہونے کی وجہ سے مجمع کم تھا، ۱۷ شعبان ۹۵ھ منگل کی صبح کو علی میاں مولانا منظور نعمانی صاحب مع سات آٹھ افراد کے ملاقات کے لیے آئے، گزشتہ سال علی میاں سے رائے پور ایک دو دن قیام کی نیت سے جانے کا وعدہ ہو چکا تھا، علی میاں کے ذہن میں اس سال اس کی قضاء تھی مگر زکریا کو کوئی اطلاع نہیں۔

مجمع چونکہ زیادہ ہو گیا تھا اس لیے دو سو روپے میں پوری لاری آمدورفت کی گئی اس سے پختہ وعدہ بھی ہو گیا تھا، مگر منگل کی شام کو ایک صاحب حافظ صدیق کے ساتھ آئے اور بہت اصرار اس پر کیا کہ میں تجھے اپنی لاری میں لے جاؤں گا پہلے سے میں نے طے کر رکھا ہے، مگر ان کے شدید اصرار پر یہ طے ہوا کہ جس لاری والے سے ہم نے طے کیا ہے ان کو تم راضی کر لو، انہوں نے لاری

والے کو کچھ دے دلا کر راضی کر لیا، جس کی مقدار نہیں بتائی اور بدھ کے دن علی الصباح ۵ بجے مدرسہ سے چل کر ۶ بجے مزار پر پہنچے۔

زکریا نے پہنچتے ہی کہہ دیا کہ میں تو یہاں سے ۸:۳۰ پر اُٹھوں گا، آپ عطاء الرحمٰن سے جب چاہیں مل لیں میں ملاقات سے انکار کر چکا ہوں اور عطاء الرحمٰن کو بھی اطلاع کر دی کہ تمہیں جس جس کو بُلانا ہو ۹ بجے بلا لو، اس نے کہلا بھیجا کہ میرے بُلانے سے تو کوئی نہیں آئے گا، تو راؤ فضل الرحمٰن، عبدالحمید، عبدالرحمٰن کو بُلا لے، زکریا نے ان کے پاس آدمی بھیج دیا، مگر یہ حضرات وقت پر نہیں پہنچے اور ۱۰:۳۰ بجے یہ اطلاع ملی کہ کھانا آ گیا، لیکن جب کھانے کے لیے کوٹھی پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ غلط اطلاع تھی، ۱۱:۳۰ بجے کھانا ہوا اور لیٹ گئے اور طے یہ ہوا کہ ۳ بجے یہ سب حضرات پھر جمع ہوں گے مگر ۴ بجے صرف راؤ عطاء الرحمٰن آئے، مفتی عبدالعزیز صاحب نے میرے رفقاء سے عصر کے بعد اپنے مدرسہ لے جانے کا وعدہ لے رکھا تھا، لہٰذا وہ حضرات تو مدرسہ گئے اور زکریا عصر سے مغرب تک باغ کی مسجد میں رہا، مغرب کے بعد کھانا کھایا۔

اہل مرزاپور کا شدت سے اصرار تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے مرزاپور جاؤں، زکریا نے کہہ دیا کہ لاری والے کو آپ راضی کر لیں، سنا کہ مرزاپور والوں نے سو روپے دے کر اس کو راضی کیا، صبح کو نماز پڑھ کر زکریا تو مزار پر بیٹھ گیا اور رفقاء سے کہہ دیا کہ چائے سے فارغ ہو کر مجھے بھی لے لیں ۶:۳۰ بجے چل کر ۷ بجے مرزاپور پہنچے، دس لڑکوں نے حفظ قرآن ختم کیے، زکریا نے ختم کرنے والوں کو کچھ انعام بھی دیا ۷:۳۰ بجے چل کر ۸:۳۰ بجے کے قریب سہارنپور پہنچے، علی میاں وغیرہ کی شام کو ۵ بجے کی سیٹیں لکھنؤ کے لیے بک تھیں، ۳۱ اگست کی صبح کو مولانا عمران خان صاحب بھوپالی تشریف لائے، ان کا پیر کے دن واپسی کا ارادہ تھا مگر اتوار کی شام کو یونس سلیم صاحب ملنے آ گئے، ان کا قیام تو دوسری جگہ تھا مگر یہ طے ہوا کہ پیر کی صبح کو نماز پڑھتے ہی وہ آئیں گے اور مولوی عمران صاحب کو ساتھ لے کر جائیں گے، مگر پیر کی صبح کو یونس سلیم صاحب نے اپنی گاڑی بھیج دی کہ میں تو نہیں آ سکتا، آپ آ جائیے، چنانچہ وہ روانہ ہو گئے۔

اس کے بعد ایک ایک، دو دو دن کی فصل سے صوفی اقبال، عطاء الرحمٰن، یعقوب نیپالی، مولوی احمد ناخدا، احمد میاں افریقی، مولوی شاہد کراچوی، سعید انگار، عبدالحفیظ مع اہلیہ کچھ بوڈرے سے سیدھے اور کچھ دہلی ہوتے ہوئے کار سے پہنچتے رہے، یکم رمضان المبارک دوشنبہ ۸ ستمبر کو ہوئی، زکریا اپنے معمول کے مطابق اتوار کے دن عصر کے بعد ہی دارِ جدید پہنچ گیا اور سارے مہمان ظہر کے بعد سے اتوار کو دارِ جدید کی مسجد میں منتقل ہوتے رہے، دارِ جدید میں عشرہ اولیٰ زبیر، وسطیٰ خالد نے آخر میں سلمان نے پڑھا۔

دارالطلبہ قدیم میں ناظم صاحب کے پوتے نے تین قرآن پڑھے، صوفی عثمان نے اسی رمضان میں بیداری میں رات کو دو بجے نظام الدین میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے، پہلے مزارات پر تشریف لائے، تین منٹ مراقب رہے، پھر مسجد میں دو رکعت پڑی اور صوفی عثمان کو پیام دیا کہ حضرت جی کو سلام کہنا اور کہہ دینا کہ دعاؤں کی مقدار میں اضافہ کریں، اس کا ایک قدم مسجد کی چھت پر اور دوسرے قدم میں غائب، تین سال پہلے بھی یہ ان کو دیکھ چکے تھے۔

......☆☆☆☆☆......

نظام الاوقات رمضان ۹۵ھ

بعد مغرب اوابین میں دو پارے بعدہٗ چائے استنجاء وغیرہ بعدہٗ مجلس از ۸ تا ۸:۳۰، اسی میں بیعت اور گفتگو، عشاء از ۹ تا ۱۰:۳۰ بعدہٗ ختم یٰسین ودعاء، بعدہٗ فضائل رمضان تا سوا گیارہ بعدہٗ الوداعی مصافحوں کے بعد ۱۲ بجے کواڑ بند، کنجی زکریا کے پاس ۳ بجے تک، تین بجے کیواڑ کھلتے اور سحر کا انتظام ہوتا، اس کے بعد کچھ نماز پڑھنے والے، کچھ کھانا کھانے والے تا اذانِ فجر، زکریا تہجد دو پارے، بعدہ سحری دودھ پاپا جو کبھی نہیں کھایا، مگر اس سال اجابت نے پہلی مرتبہ اس کا استعمال کرایا، بعد نمازِ فجر آرام، زکریا ۹، ۹ بعدہٗ قرآن دو پارہ بالنظر تا گیارہ اور متفرقات تا ایک، بعد ظہر ختم خواجگان وذکر واسماع زکریا دو پارے، اس سال مولوی عاقل نے ذکر کی وجہ سے نہیں سنا، مفتی یحییٰ حکیم الیاس نے سنا، بعد عصر ارشاد واکمال، صبح ۹:۳۰ سے ۱۰:۳۰ تک حسب سابق وعظ مولانا عبیداللہ صاحب۔

۱۴ ستمبر کو کراچی میں مولانا بنوری احرام وغیرہ باندھ کر بہ نیت عمرہ مطار پر پہنچے۔ جہاز پر سوار بھی ہوگئے تو پولیس نے روک دیا کہ آپ نے صوبائی حکومت سے اجازت نہیں لی، دو دن بحالتِ احرام سعی بسیار کے بعد منگل ۱۶ ستمبر کو اجازت ملی، ڈاکٹر ظفیر بھی عشرہ ثانیہ میں پہنچ گئے، عزیزم زبیر کو ختم قرآن کے بعد شدت سے بخار ہوگیا، ۱۶ رمضان کو بھائی کرامت کی گاڑی میں مولانا انعام صاحب، مولانا محمد عمر صاحب وغیرہ آئے اور دو دن قیام کر کے واپس گئے، ۱۷ رمضان کی شب میں علی میاں وغیرہ ۴ انفر پہنچے اور ۱۹ کی صبح کو واپس گئے۔

اس رمضان میں بھی حاجی عبدالعلیم صاحب پورے رمضان رہے، جس کی وجہ سے مرادآباد والوں کی آمد ورفت کثرت سے رہی مولوی انعام کے خط سے معلوم ہوا کہ ان کی مسجد سے ۲۸ ملکوں کے دوسو سے زائد نفر معتکف رہے، دارالطلبہ قدیم میں مولوی عبدالغنی احمد آبادی نے مع اپنی جماعت کے اعتکاف کیا، کاندھلہ میں صوفی افتخار کے مریدین نے سات آٹھ نے اعتکاف کیا، دارالعلوم میں مولوی بہاری نے اعتکاف کیا مولانا اسعد صاحب نے اپنی مسجد میں آخری عشرہ کا اعتکاف کیا، مولوی رشید الدین نے باوجود زکریا کے انکار کے دارجدید میں پورے ماہ کا اعتکاف کیا، آمد ورفت کی بڑی تفصیل رجسٹر میں موجود ہے، مولوی عبدالرحیم متالا، مفتی اسماعیل ۲۰ کو واپس چلے گئے، بارش کی کثرت کی وجہ سے خیمہ کا انتظام سارے رمضان گڑبڑ ہی رہا، قاضی عبدالقادر صاحب ویزا کی گڑبڑ کی وجہ سے سیلون وغیرہ ہوتے ہوتے ۲۲ رمضان کی

دو پہر کو بڑی مشکلات سے پہنچے۔

اس رمضان میں امراض کی کثرت رہی، آنکھوں کا دکھنا، بخار کا آنا وغیرہ عوارض کثرت سے پیش آتے رہے۔ مولانا منور صاحب اور مولانا عبید اللہ صاحب کی طبیعت بھی خراب رہی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لانا اور معتکفین سے مصافحہ کرنا وغیرہ منامات تفصیل تو روزنامچہ میں ہے، ۴ اکتوبر ۷۵ھ کو مولانا فاروق احمد صاحب بن مولانا صدیق احمد صاحب انبہٹوی، شیخ الحدیث جامعہ عباسیہ بہاولپور کا انتقال ڈبل نمونیہ میں ہوا۔ یکم شوال منگل ۷ اکتوبر طلوع آفتاب کے آدھ گھنٹہ بعد دار جدید میں نماز عید عزیزم سلمان نے پڑھائی، دار الطلبہ قدیم میں ۸:۳۰ نماز عید ہوئی۔ عید کی شب میں چائے تو سحر کے وقت نمٹا دی تھی، فجر کے بعد مسلسل بالعید اور افطار بالتمر ہوا۔ قاضی عبد القادر صاحب ۴ شوال کو دہرہ ایکسپریس سے دہلی اور وہاں سے ۷ شوال کو بمبئی اور ۸ کو طیارہ سے کراچی روانہ ہوئے، ۶ شوال کو ملک عبد الوحید دورہ کی تکمیل کے لیے سہارنپور پہنچے اور سال بھر قیام کیا اور دورہ کی تکمیل کی، ۹ شوال کو عزیز عامر تا روانگی زکریا سہارنپور قیام کے ارادہ سے پہنچا، حاجی شفیع نے اس کو تقاضا کر دیا تھا کہ مدرسہ کے اوقات میں مدرسہ کی نگرانی بھی کرتے رہیں۔ قاری مظفر نے اس کو بلا کر حاجی شفیع صاحب کا خط بھی سنا دیا۔ ۱۵ شوال کو عزیزم شمیم مکی مع عزیزان زعیم و حشیم ندوہ کے جشن میں شرکت کے لیے نظام الدین پہنچے۔

۱۵ شوال کو مدرسہ کی تقسیم اسباق میں مدرسین مدرسہ کے سامنے بہت اہتمام سے ایک تقریر کی کہ یہ مضمون وقتاً فوقتاً سب کو سناتا رہتا ہوں، آج اجتماعی طور سے سب کو نصیحت وصیت کرتا ہوں کہ مدرسہ کے معاملات میں کسی طالب علم کا اخراج ہو، داخلہ ہو، بندش طعام یا اجراء ہو، اپنے ذاتی تعلقات کو ہرگز دخل نہ دیں، بہت ہی اہم مشورہ بیان کیا، روزنامچہ میں اس کی تفصیل ہے۔ ۱۶ شوال کو بروز بدھ شام کو ۶:۳۰ بجے مولانا محمد میاں صاحب سابق ناظم جمعیۃ علماء کا انتقال ہو گیا، تفصیل روزنامچہ میں ہے۔

۳۱ اکتوبر تا ۳ نومبر ۷۵ء اہم اجلاس ندوہ لکھنؤ بنام مہرجان تعلیمی، جس میں غیر ملکی حضرات نے کثرت سے شرکت کی، زکریا نے اجتماع سے دو دن پہلے خواب دیکھا کہ علی میاں نے بہت سے مہمان غیر ملکی بھیج دیئے اور زکریا نے ان کے کھانے وغیرہ کا انتظام کیا، معرکۃ الآراء اجتماع ہوا، مستقل رسائل اس کی تفاصیل میں شائع ہو چکے ہیں اجتماع سے فراغت پر ۲۷ شوال ۲ نومبر الحاج محمد علوی مالکی مکی مع محمد محمود حافظ زکریا سے ملنے کے لیے پہنچے زکریا نے بھی لکھنؤ لکھ دیا تھا کہ میں تو مکہ جا ہی رہا ہوں وہیں ملاقات ہوگی مگر انہوں نے نہ مانا کہ تیرے یہاں حاضری ضروری ہے۔ ۲۸ شوال ۳ نومبر دوشنبہ کو عزیز خالد مع اپنی اہلیہ و دادی و حکیم اسرائیل و حافظ صدیق دہلی کے لیے

روانہ ہوئے اور دوسرے دن دہلی سے بمبئی کو روانہ ہو گئے۔

حضرت مولانا سر رحیم بخش صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی شفقتیں اس ناکارہ پر بہت زیادہ رہیں، اللہ تعالیٰ ان کے احسانات کا بہترین بدلہ فرمائے، ہمیشہ مرحوم کے احسانات کے بدلہ کی دعائیں بہت کثرت سے کرتا ہوں۔ ایک دفعہ وہ حج کو تشریف لے گئے اور زکریا پر اپنے ہمراہ جانے پر بہت اصرار کیا اور فرمایا کہ اگر حضرت ہوتے تو میں ان پر اصرار کرتا، مگر اب تجھ پر اصرار کرتا ہوں، مگر زکریا کا وہ دور بہت مشغولی کا تھا، حضرت مدنی اور حضرت رائے پوری کے اصرار پر بھی ان کی ہمرکابی نہ ہو سکی، مولانا سر رحیم بخش صاحب نے حج کی واپسی پر ایک معتد بہ رقم مجھے دی اور یہ فرمایا کہ یہ رقم تجھے حج پر لے جانے کے لیے تجویز کر رکھی تھی، اب تجھے نذر ہے، ان کے انتقال کے بعد سے وہ ناکارہ مکہ مکرمہ سے کبھی کبھی حج بدل ان کی طرف سے کراتا رہا مگر یہ بھی پختہ ارادہ رہا کہ ان کی وطن تھسکہ سے خود حج بدل کے لیے جاؤں مگر اب تو نوبت نہ آئی۔

اس سال چونکہ عزیز خالد اور اس کی اہلیہ کو حج کو بھیجنا تجویز ہو گیا اور نو عمر بچی اور والدہ عاقل بھی ساتھ جو خود ضعیف، اس لیے زکریا نے ان کی امداد کے لیے حافظ صدیق کو مولانا سر رحیم بخش کے حج بدل میں بھیجنا تجویز کر دیا اور ان کے ساتھ بھیجا، تمنا تو یہی رہی کہ خود کروں مگر اب تو اس کی امید نہیں رہی۔ ۱۱ نومبر کی شام کو بمبئی سے ان کا جہاز چلا اور ۱۷ کو جدہ پہنچا، ان کے لیے انتظامات تو بہت سوچے تھے، مستورات کے لیے چار ٹکٹ فرسٹ کلاس کے تجویز کر دیئے تھے، مگر سفروں میں گڑبڑ ہوا ہی کرتی ہے، فرسٹ کلاس کے ٹکٹ تو مل گئے مگر ایک کیبن نہ ملا اس لیے ایک کیبن میں عزیز خالد اور اس کی بیوی کو اور دوسرے میں حکیم اسرائیل کی والدہ و اہلیہ کو تجویز کرنا پڑا، یہ تو بڑی لمبی چوڑی تفصیل ہے۔

......☆☆☆☆☆......

واپسی از ہند

ایک ماہ سے یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ واپسی طیارہ سے براہِ کراچی ہو یا بذریعہ باڈر، مولوی انعام صاحب کی صلاح براہ باڈر آنے کی تھی کہ کرایہ کا سوال نہیں، مفت کی موٹریں دونوں جگہ ملیں گی، احسان اور بھائی عبدالوہاب نے بھی بڑے زور شور کے خطوط باڈر سے آنے کے تقاضے کے لکھے، مولوی انعام کی واپسی سرہند کے راستہ سے آنے کی تھی اور یہ وجہ زکریا کے لیے بھی جاذب تھی، مگر موٹروں کا لمبا چوڑا سفر دشوار معلوم ہو رہا تھا، قاضی صاحب نے بھی زکریا کی بڑی زور سے تائید کی اور خط لکھا کہ موٹروں سے بڑی تکلیف ہوگی کرایہ کی پرواہ نہ کریں، ہوائی جہاز سے آئیں، اس لیے زکریا اس پر مصر تھا، مگر معلوم ہوا کہ طیارہ سے جانے کے درمیان میں شاہد اور ابوالحسن جو مجھے کراچی تک پہنچانے آئے تھے، ان کے لیے پی فارم کی ضرورت ہے اور اس کے ملنے کی امید نہیں، اس لیے باڈر ہی کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔

روانگی سے تقریباً پندرہ دن پہلے کلکتہ سے ایک خط آیا تھا کہ تو سرہند کب جا رہا ہے؟ بڑی حیرت ہوئی غصہ بھی آیا، ان کو لکھ دیا کہ میرا ارادہ نہیں، مولوی انعام نے کہا کہ میں بدھ کو سہارنپور پہنچ جاؤں گا، جمعرات کو علی الصباح روانگی ہو جائے گی مگر صوفی افتخار نے بتایا کہ اگر کاندھلہ سے براہ پانی پت جانا ہو تو وہاں کئی اکابر کے مزارات ملیں گے، اس لیے زکریا نے مولوی انعام صاحب کو لکھ دیا کہ آپ بدھ کے دن بجائے سہارنپور کے کاندھلہ آجائیں۔ میں بھی کاندھلہ آجاؤں گا اور وہاں سے براہ پانی پت جانا ہوگا۔

زکریا کو ایک ہفتہ سے بخار کی شدت ہو رہی تھی تاہم بدھ کی صبح کو اپنی نماز پڑھ کر حسبِ معمول اندھیرے میں کاندھلہ کا ارادہ کیا، نیز سلمان کا اصرار تھا کہ تو اگر کاندھلہ کو جاوے تو میں اپنے بھانجہ کا عقیقہ بھی کرا دوں، اس سے بھی زکریا نے کہہ دیا کہ بدھ کی شام کا کھانا تمہارے یہاں کھاؤں گا، زکریا بدھ ۳۰ شوال ۵ نومبر ۷۵ء کو سہارنپور سے پونے چھ پر چل کر سوا سات بجے بہت جلد عیدگاہ پہنچ گئے، وہاں کوئی نہیں تھا، بالکل تنہائی تھی، مگر قبرستان کے محافظ نے صوفی افتخار کو خبر دی، زکریا بھائی شفیع کی گاڑی میں تھا، حاجی عبدالعلیم صاحب اپنی گاڑی میں مرادآباد والوں کی دو گاڑیاں اور جورات میں ملاقات کے لیے آئی تھیں وہ بھی ساتھ ہو گئیں۔ مفتی محمود، مولوی منور سے زکریا نے پہلے کہہ دیا تھا کہ سید خلیل صاحب کی گاڑی میں بجائے سہارنپور کے بدھ کی شام کو کاندھلہ پہنچ جائیں کہ ان دونوں کا ساتھ جانا بھی زکریا نے تجویز کر رکھا تھا ان کے ساتھ حکیم

عبدالقدوس بھی ہو گئے تھے۔

۸ بجے کے قریب صوفی افتخار وغیرہ عیدگاہ پہنچ گئے اور زکریا ان کے ساتھ ۷، ۸ کاروں سمیت قصبہ میں پہنچ گیا، زکریا کو بخار ہو رہا تھا اس لیے وہ تو دھوپ میں لیٹ گیا۔ سلمان، شاہد، وغیرہ اپنے اپنے اعزہ میں پھیل گئے اور اجنبی مہمان متفرق جگہ لیٹ گئے۔ عزیز خالد حج کے لیے روانہ ہو چکا تھا اور عزیز عاقل زکریا کے اصرار پر ان کو بمبئی پہنچانے گیا، گیارہ بجے مولوی انعام صاحب، مولوی محمد عمر، زبیر وغیرہ بھائی کرامت کی گاڑی میں کاندھلہ پہنچے، ان کے ساتھ اور بھی کئی گاڑیاں تھیں، زکریا سہارنپور میں کئی دن سے عصر کے بعد اپنی بیعت کے اعلان میں حسب معمول یہ کہلایا کرتا تھا کہ میں دو چار دن کا مہمان ہوں، مرنے کو بیٹھا ہوں اوروں سے بیعت ہو جائیں۔

نجیب اللہ احمد لولات کے بعد اس کام کو کیا کرتا تھا، منگل کے دن بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا مغرب کے بعد زکریا کے گھر کا محاصرہ شروع ہو گیا، لوگ کثرت سے آتے رہے، کاروں والے تو یہ سن کر وہ کاندھلہ چلا گیا کاندھلہ آ گئے اور سرہند تک ساتھ رہے، بدھ کی شام کو سلمان کے بھانجہ کے عقیقہ میں زکریا مولوی انعام شریک ہوئے مگر صوفی افتخار شریک نہیں ہوئے، کھانے کے بعد مولوی انعام کے اٹھنے پر زکریا بیٹھا رہا اور اس نے قاضی نثار، سلمان، ابرار وغیرہ ان کے اعزہ کو بلا کر مجمع ہی کے درمیان میں کہا کہ بیٹھ جاؤ، مجھے معلوم ہوا ہے کہ صوفی افتخار صاحب دعوت میں نہیں آئے، مجھے ان کے نہ آنے سے بڑی خوشی ہوئی آنے سے شاید اتنی خوشی نہیں ہوتی۔

دنیا آج کل پاگل ہو رہی ہے، کل سے تمہارے ہاں چہ مگوئیاں ہوں گی، کچھ صوفی افتخار کو گالیاں دیں گے حلال و حرام کی پرواہ نہیں کرتے، یہ حالات کی باتیں ہیں، صوفی جی مقامی ہیں، ان کو یہاں کے حالات کی تفصیلات زیادہ معلوم ہیں اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ بھائی ریاض کے باغ کے قصہ سے نثار کو کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے اکابر اللہ تعالیٰ ان کو بہت درجے عطاء فرمائے ہمیں سب کچھ سکھا گئے، حکیم طیب مرحوم کے ختنہ میں باوجود رامپور جانے کے حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرکت نہیں کی اور حضرت سہارنپوری و حضرت شیخ الہند نے شرکت کی تھی، دنیا کو تو گالیاں دینے میں مزہ آوے، کچھ نے ان کو دی اور کچھ نے ان کو اور عاقبت اپنی خراب کی، اس سے بڑھ کر مکہ مکرمہ کے ایک مولود میں حضرت سید الطائفہ کی شرکت اور حضرت گنگوہی کا شرکت سے انکار اور حضرت حاجی صاحب کا یہ ارشاد کہ تمہارے جانے سے اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی تمہارے نہ جانے سے ہوئی۔

یہ مضمون تفصیل سے مجمع میں قصداً کہہ کر آیا، ۶ نومبر جمعرات کی صبح کو پونے سات پر کاندھلہ سے چل کر پہلے چند منٹ کیرانہ پہنچ کر مولانا انعام صاحب کی کار کو اہل کیرانہ نے گھیر لیا، مولوی انعام کی پہلے سے رائے تھی کہ چائے بجائے کاندھلہ کے کیرانہ میں پی لی جائے کہ لوگوں کا اصرار

ہے اس کو تو صوفی جی نے قبول نہیں کیا کہ دیر بہت ہو جائے گی، ۷:۳۰ پر پانی پت پہنچ گئے، سب سے اول شاہ شرف الدین کے مزار پر حاضری ہوئی ۲۰ منٹ قیام رہا، ان کے قریب ہی نواب مقری خان وزیر جہانگیر کا مزار تھا، جس کو ہمارا مورث اعلی بتایا گیا، وہاں بھی چند منٹ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے فاتحہ پڑھی، اس کے بعد شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء قاضی ثناء اللہ کے مزارات پر حاضری دیتے ہوئے شیخ جلال الدین تھانیسری کے مزار پر حاضری ہوئی جو بہت بڑی اونچائی پر تھا، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے اور دوستوں کی مدد سے یہ اعرج بھی پہنچ گیا۔

اس کے بعد ۱۱:۳۵ پر وہاں سے چل کر بلاسپور پہنچے، جہاں ۱۱۳ انبیاء علیہ الصلوۃ والسلام کی قبور بتائی جاتی ہیں، ایک احاطہ ہے جس میں یہ قبر ہیں، آس پاس سکھوں وغیرہ کی آبادیاں ہیں، فالی اللہ المشتکی معلوم ہوا کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تربیت السالک میں ان قبور کا ذکر ہے اور حضرت مجدد صاحب کے کسی مکتوب میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔ صوفی افتخار صاحب سے یہ طے ہوا تھا کہ وہ سرہند میں ان مضامین کو مجھے دکھا دیں گے، مگر ہجوم کی وجہ سے فرصت نہیں ہوئی اس ناکارہ نے ان کو خط لکھا جس کے جواب میں انھوں نے کتب کی درج ذیل عبارات لکھیں جو یہ ہیں۔

سرہندی میں میری گاڑی خراب ہو جانے کی وجہ سے میرا سامان ایسے وقت میں پہنچا کہ آپ آگے جا چکے تھے، اس لیے اس وقت تو دکھلانے کی ہمت نہ ہوئی، اب لکھتا ہوں۔

(ہندوستان میں انبیاء علیہم السلام کے مزار) حضرت تھانوی نے فرمایا، ہندوستان میں بھی بعض انبیاء علیہم السلام کے مزار ہیں، ''براس'' جو ایک جگہ ہے انبالہ سے آگے بنجارے کے سرائے اسٹیشن سے اتر کر وہاں ایک احاطہ ہے، اسمیں مزار ہیں، نشان کل قبروں کے نہیں، حضرت مجدد صاحب کو مکشوف ہوا کہ یہاں انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے مزار ہیں، ہم بھی مولانا رفیع الدین صاحب مرحوم مہتمم مدرسہ دیوبند کے ساتھ گئے تھے۔ مولانا نے مراقبہ کیا، ان حضرات کی ارواح سے ملاقات ہوئی، گنتی میں تیرہ حضرات ہیں، ان میں ایک باپ بیٹے بھی ہیں، باپ کا نام حضرت ابراہیم ہے، بیٹے کا نام حذر (نہ معلوم بالضاد ہے یا بالذال) مولانا نے ان کی بعثت کا زمانہ پوچھا تو ایک راجہ کا نام لیا کہ اس کے زمانہ میں ہم تھے۔ (فرمایا حضرت والا نے کہ یہ نام میں بھول گیا، پھر یاد آیا، راجہ کرن) مگر اتنا یاد ہے کہ تقریباً اب سے دو ہزار برس پہلے ہوا ہے اور فرمایا حضرت والا نے کہ مولانا نے مجھ سے اس مراقبہ کا قصہ بیان نہیں کیا بلکہ اپنے ایک مرید سے بیان کیا اور انہوں نے مولانا کے داماد سے بیان کیا، داماد صاحب نے مجھ سے بیان کیا اور ان مرید صاحب کا نام حاجی حسین، بسی، ضلع، سرہند اور داماد کا نام ضیاء الحق ہے۔

یہ عبارت تو حسن العزیز کی میں نے پیش کردی، ہمارے مولانا یونس صاحب مظاہری نے یہ بھی

فرمایا کہ حضرت اقدس حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات میں اور بھی اس کی وضاحت ہے اور غالباً وہاں کے الفاظ یہ ہیں کہ جس کو چشم بصیرت ہو وہ آج بھی ان کے انوارات دیکھ سکتا ہے۔

حضرت اقدس مجدد صاحب کی ایک سوانح جو حضرت مجدد الف ثانی کے نام سے مشہور ہے، مولانا سید زوار حسین شاہ کی تصنیف ہے اس کے صفحہ ۱۸۶، از ۱۲ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ تا ۱۱ ربیع الاول ۱۰۲۶ھ۔ اس سال وبا کے دور ہونے کے بعد ایک دن حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کا شہر سرہند سے باہر جنوب مشرق کی طرف چند میل کے فاصلہ پر ایک موقع مقام براس سے گزر ہوا، اس گاؤں کے متصل شمالی جانب ایک بلند ٹیلہ ہے، آپ وہاں تشریف لائے، وہیں نماز ظہر ادا فرمائی اور پھر دیر تلک مراقبہ کرنے کے بعد ہمراہیوں سے فرمایا کہ نظر کشفی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ پر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قبریں ہیں، مجھے ان بزرگوں کی روحانیت سے ملاقات بھی حاصل ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات وتنزیہ وتقدس کی نسبت جو کچھ اہل ہنود کے پیشواؤں نے لکھا ہے وہ ان ہی انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام کے علوم سے حاصل کیا ہے یہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ہجرت گاہ ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ ایک مکتوب میں جو صاحبزادے حضرت خواجہ محمد سعید قدس سرہٗ کے نام ہے ان انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے متعلق اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

اے فرزند! یہ فقیر جس قدر ملاحظہ کرتا ہے اور نظر کو وسیع کرتا ہے ایسی کوئی جگہ نہیں پاتا جہاں ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نہ پہنچی ہو بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ آفتاب کی طرح سب جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا نور پہنچا ہے، حتیٰ کہ یاجوج ماجوج میں بھی جن کی دیوار حائل ہے اور گزشتہ امتوں میں ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی جگہ بہت کم ہے جہاں کوئی پیغمبر مبعوث نہیں ہوا، حتیٰ کہ زمین ہند میں بھی جو اس معاملہ سے دور دکھائی دیتی ہے معلوم کرتا ہے کہ اہلِ ہند سے پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں اور صانع جل شانہ کی طرف دعوت فرمائی ہے اور ہندوستان کے بعض شہروں میں محسوس ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے انوار، شرک کے اندھیروں میں مشعلوں کی طرح روشن ہیں، ان شہروں کو متعین کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

(مکتوب: ۲۵۹ جلد اول ص ۳۸۴)

روضہ قیومیہ (صفحہ ۱۶۲)، (صفحہ ۱۶۳) پر بھی یہ مضمون ہے دو بجے "براس" سے روانہ ہو کر ۲:۳۰ بجے سرہند شریف پہنچے۔ وہاں پہلے سے ننھے خاں اور صوفی افتخار کے مریدین نے بہت کھانا بڑے مجمع کے لیے تیار کر رکھا تھا، نیز صوفی رشید گنگوہی جو سہارنپور سے سیدھے سرہند پہنچے تھے زکریا کے لیے خصوصی توشہ دان بھی لے گئے تھے زکریا کے حجرے میں تھے، ابوالحسن اللہ تعالیٰ ان کو جزائے

خبر دے، چونکہ ساتھ تھا، اس نے مختلف قیام گاہوں کو دیکھ کر خانقاہ کے باہر کے حصہ میں ایک مکان تجویز کیا، اسی میں پاخانہ، غسل خانہ، پانی کا نل وغیرہ سب چیزیں تھے، زکریا مع اپنے جملہ رفقاء اور جعفر وغیرہ اطفال کے جو زکریا سے پوشیدہ پہنچ گئے تھے ان کو ڈانٹا بھی تجھے کیا مصیبت تھی، باپ تو آیا نہیں تو آ گیا۔

صوفی افتخار صاحب نے درگاہ شریف کی کنجی لے لی تھی، لوگوں نے بیعت کے لیے بہت اصرار کیا مگر چونکہ مولوی انعام صاحب نے گزشتہ شعبان میں مالیر کوٹلہ کے اجتماع سے واپسی پر سرہند شریف حاضری ہوئی تھی تو خواب دیکھا تھا کہ حضرت مجدد صاحب نے اس کو فرمایا کہ یہاں والوں کو بیعت کر لے، اس خواب کی بناء پر زکریا نے بیعت کا تقاضا کرنے والوں کو انکار کر دیا کہ مولانا انعام صاحب کریں گے اور عصر مغرب کی نماز کے بعد بھی محمد کاندھلوی سے اعلان کرا دیا کہ جو بیعت ہونے کا ارادہ کرے مولانا انعام صاحب اسے بیعت کریں گے زکریا نہیں کرے گا، اس لیے مولانا انعام صاحب نے مجمع کو مختلف اوقات میں بیعت کیا، مجمع چونکہ بہت زیادہ تھا، اس لیے ظہر کے بعد کھانے میں دیر لگی، ہمارے پہنچنے پر چونکہ ظہر کی جماعت ہو چکی تھی اس لیے مختلف اپنی جماعتیں کیں، اس کے بعد زکریا اپنے توشہ دانوں سے نمٹ کر جس میں شاہد، ابوالحسن، ننھے خاں اور بابو ایاز بھی شریک تھے توشہ داں اصحاب توشہ دان کو واپس کر دیا کہ رات کو تو مجھے کچھ کھانا نہیں، تم کھاؤ یا بانٹو۔

عصر کے بعد مسجد میں زکریا کا مصافحہ ہوا اور پھر مولانا محمد عمر صاحب کی تقریر، مغرب کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپسی ہوئی، زکریا نے مولانا انعام صاحب، مفتی محمود، مولوی منور اور مولوی محمد عمر سے کہلا دیا کہ میں نے ہجوم کی وجہ سے مزار پر حاضری کا ارادہ ملتوی کر دیا، مگر آپ حضرات سب ضرور تشریف لے جائیں، عشاء کے بعد صوفی جی نے زکریا پر اصرار کیا مگر بدقسمتی سے حاضری نہیں ہو سکی کہ ہجوم بہت ہی آیا تھا، مولانا منور صاحب سے واپسی پر پوچھا، انہوں نے بڑے کوائف بیان کیے مگر سب لازمی تھے، یعنی ان کی ذات سے متعلق، انوار، تجلیات خاص ان کی ذات سے متعلق، مفتی محمود صاحب نے بیان کیا کہ اول میں نے سوال کیا کہ زکریا جا رہا ہے ہمارا کیا ہوگا؟ جواب ملا کہ وہاں سے خبر رکھے اور یہ کہ ہم تو یہاں موجود ہیں، پھر تبلیغ کے متعلق سوال کیا کہ مخالفین بہت ہو رہے ہیں، ارشاد ہوا کہ مخالفتوں کی پرواہ نہ کرو مگر اپنے لوگوں کی خبر رکھو کہ اصول سے باہر نہ ہوں، مولوی انعام نے بیان کیا کہ مجھے تو ایک ہی چیز کا ورد ہوتا رہا، سالماً غانماً سالماً غنماً۔

جمعہ ۷ نومبر صبح کو اپنی نماز اول وقت پڑھ کر اور اس کے بعد چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر بھائی کرامت کی کار میں زکریا مع ابوالحسن شاہد اور مولانا انعام الحسن صاحب اور دوسری گاڑی میں

مولانا انعام صاحب کے رفقاء مولوی محمد عمر، زبیر وغیرہ روانہ ہوگئے، میں نے تو سب کو روک دیا تھا کہ سب یہیں سے واپس ہوجائیں، ۵:۵۰ پر سرہند سے روانہ ہوئے بھائی کرامت نے بہت زور گاڑی چلانے میں دکھائے لیکن کرتار پور میں جا کر ان کی گاڑی کا ڈینمما خراب ہوگیا، اس کے بنوانے میں تقریباً سوا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا اور اس میں حاجی شفیع، سید خلیل، مولانا منور اور مفتی محمود بھی تھے اور سہارنپور سے بھائی شوکت کے دو جو نگے جس میں شیخ اظہار، عبدالوحید ملی اور نا معلوم کتنے حضرات وہاں ملتے رہے، ہم لوگ تو حاجی شفیع کی گاڑی میں منتقل ہوگئے اور ان کی گاڑی کے افراد دوسری گاڑیوں میں منقسم ہوگئے اور بھائی کرامت کی گاڑی مع ڈرائیور کرتار پور ہی میں چھوڑ دی جو چار گھنٹے میں تیار ہوئی اور ظہر تک باڈر پہنچی۔

باڈر سے بھائی کرامت نے میری گاڑی کے دوسرے باڈر تک پہنچنے کی اجازت لے رکھی تھی اور امرتسر سے کسی افسر کو جوان کا دوست تھا باڈر پر بلا رکھا تھا، وہاں پہنچتے ہی میری گاڑی کو اور ساتھ ہی مولوی انعام صاحب کے رفقاء کی گاڑی کو اندر لے گیا اور کوڑ بند کر دیا گیا، میں تو کسی سے نہ سلام کر سکا نہ مصافحہ، یہی میں سرہند سے کہتا آ رہا تھا کہ میں تو وہاں جا کر محبوس ہو جاؤں گا تم کیا کرو گے جا کر، مولوی انعام صاحب نے فرمایا کہ وہ سب دروازہ پر کھڑے ہیں، میں جا کر دعاء کرا آؤں، میں نے کہا ضرور اور میرا سلام بھی کہہ دیجیو اور یہ بھی کہ اسی واسطے میں باڈر تک آنے کو منع کر رہا تھا، تقریباً ایک گھنٹہ وقفہ کے بعد باڈر کی جیپ ہمارے آگے آگے چلی، جس کو دیکھ درمیانی زنجیر کا قفل کھول دیا گیا اور اس کے پیچھے پیچھے ہماری دو گاڑیاں پاکی باڈر تک پہنچی۔

ہندی باڈر کے خاتمہ پر شور وشغب کی آواز آئی میں نے تو سمجھا نہیں کہ کیا بلا ہے، ابوالحسن وغیرہ نے کہا کہ گورنر پنجاب کی طرف سے تجھے فوجی سلامی دی جا رہی ہے، مجھے تعجب بھی ہوا کہ گورنر پنجاب کو کیا خبر؟ بعد میں معلوم ہوا کہ پنجاب میں تو اخباروں میں بھی میری روانگی چھپ گئی، پاکی باڈر پر آ کر ہندی افسر نے جس کی گاڑی ہمارے آگے تھی کہا کہ اگر آپ ان ہی گاڑیوں میں آگے جانا چاہیں تو ہمیں اعتراض نہیں مگر پاکی باڈر پر بیسیوں کاریں کھڑی تھیں اور بڑا ہجوم تھا ہندی باڈر پر اتنے پاسپورٹ وغیرہ کا اندراج ہوتا رہا وہاں کے افسران ایک ایک کر کے ملنے آتے رہے، بڑی کلفت ہوئی، خواہ مخواہ اخفا چاہا تھا، انہوں نے پوچھا کہ پاکستان سے کب واپسی ہوگی؟ ان سے کہہ دیا کہ حجاز جانا ہے، واپسی ادھر کو نہیں ہوگی۔

پاکی باڈر پر پہنچ کر میں مع شاہد، ابوالحسن اور احسان کے ڈاکٹر منیر کی گاڑی میں اور مولانا انعام صاحب مع زبیر اور مولوی عمر اور مولوی احمد لاٹ کے بھائی افضل کی گاڑی میں منتقل ہوگئے، مگر یہاں بھی پاسپورٹوں کے اندراج میں ایک گھنٹہ لگا اور اس دوران میں یہاں کے افسران نے بھی

خصوصی ملاقاتیں کیں، لاہور کا ویزا اہم لوگوں کا نہیں تھا، اس لیے دونوں کاریں بالا بالا ایک بجے رائے ونڈ پہنچ گئیں۔

راستہ میں ڈاکٹر منیر اور بھائی افضل دونوں سے لڑائی ہوگئی بھائی افضل کی گاڑی آگے تھی اور بہت آہستہ چل رہی تھی، ڈاکٹر منیر سے ابوالحسن وغیرہ نے اول تقاضا کیا کہ وہ گاڑی آگے نکال لیں مگر انہوں نے انکار کر دیا کہ حضرت جی اور بھائی افضل سے آگے کیسے جا سکتا ہوں مگر جب میں نے ڈانٹ کر کہا کہ بھائی افضل آپ کے خسر ہیں میرے تو نہیں؟ اور حضرت جی کو بھی میں اپنے سے چھوٹا ہی سمجھتا ہوں اگرچہ وہ بہت بڑے ہیں، جب بھائی افضل کی گاڑی کے برابر چلا تو میں نے پوچھا کہ تم گاڑی چلانا کب سے بھول گئے یا نیند آرہی ہے، تو انہوں نے کہا کہ سڑک بہت خراب ہے، بہر حال مجھے پیشاب کا بھی تقاضا تھا اور گرمی کی وجہ سے دماغ بھی گھوم رہا تھا، بہت تیزی سے چل کر رائے ونڈ اپنے قدیم کمرہ میں پہنچ گیا، جاتے ہی پیشاب کیا، پانی پیا، کچھ دماغ ٹھیک ہوا، وضو کر کے جمعہ کی نماز کے لیے اپنے ہی حجرے میں کہ وہاں تک صفوف آگئی تھیں جمعہ ادا کیا۔

شاہد نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ باڈر پر چائے وغیرہ کا انتظام بھی رائے ونڈ والوں نے کر رکھا تھا، مگر اس کا وہاں موقع نہیں ملا، جمعہ کے بعد کھانے والوں نے کھانا کھایا اور میں یخنی پی کر لیٹ گیا، بارکی شام سے اجتماع بڑے زور وشور سے شروع ہوا، طلحہ قریشی اور محمد بنوری بھی پہنچ گئے تھے میں نے طلحہ سے اس کے نکاح کے متعلق سوال کیا اور مولوی انعام صاحب سے بھی، کہ اس کا نکاح یہاں جلسہ میں پڑھوادیں تو اچھا ہے، انہوں نے کہا کہ اس کا مجوزہ خسر اچھن میاں کا معمول مجھ سے پہلے پہنچنے کا ہے مگر اس مرتبہ تو اب تک نہیں پہنچا، اس کے آنے پر مولوی انعام صاحب نے بھی اس سے گفتگو کی اور زکریا نے بھی کہا کہ مرا جی چاہتا ہے کہ جلسہ میں اس کا نکاح پڑھ دیں اور تم اور یہ نکاح کے بعد کراچی جا کر اس کی بیوی کو راولپنڈی پہنچا دو تا کہ اس کا ولیمہ ہم کھا کر جاویں اور زندگی رہے تو آئندہ سال عقیقہ بھی کھا کر جاویں۔

انہوں نے کہا کہ تعمیل حکم میں کوئی انکار نہیں جس طرح خوشی ہو مگر انہوں نے کہا کہ نہ تو ملک صاحب کو اس تجویز کی خبر ہے نہ اہلیہ قریشی صاحبہ کو، میں نے اسی وقت ان دونوں کے نام اسی مضمون کا زوردار خط لکھ کر مولوی احسان کے ذریعہ مستقل آدمی کے ذریعہ بھیجا، دوسرے دن صبح ان کا جواب آیا کہ ہماری خوشی تو یہ تھی کہ راولپنڈی میں نکاح ہو باقی تو جو تجویز کر دے انکار نہیں۔ مگر احسان میاں نے اتنے میں مولوی انعام صاحب سے اپنی مجبوریاں فوری رخصتی کی بیان کی، مولوی انعام صاحب نے کہا کہ ان کو یہ مجبوریاں ہیں، میں نے کہا کہ مجبور تو ہم بھی نہیں کرتے کم سے کم

نکاح تو پڑھ دیں، چنانچہ نکاح پڑھ دیا گیا۔
۲۵ ہزار مہر نصف معجل اور نصف مؤجل طے ہوا اور بھی بہت سے نکاح پیر کے دن عصر کے بعد ہوئے، منگل کے دن دوپہر کو بحمد اللہ تعالیٰ جلسہ بہت ہی زور وشور کے ساتھ پورا ہوا، معلوم ہوا کہ اس اجتماع میں بہت سے جنات شریک تھے، جن میں صحابی اور تابعی بھی تھے، یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کافرین کی جانب سے بہت سے مضرات کی تجویز تھی، جس کی وجہ سے جلسہ کی حفاظت مسلم جنات کی طرف سے ہوتی رہی اور زکریا کے کمرہ میں بھی ایک محافظ رہا، جلسہ کی تفاصیل بہت لمبی چوڑی ہے جو شاہد کی ڈائری میں ہے مجھے اس کا نقل کرانا بہت مشکل ہے۔
قاری طیب صاحب بھی پاکستان دو تین دن پہلے لندن کے سفر سے پہنچے تھے اور ان کا پیام زکریا کو ملا کہ ملنے کو بہت جی چاہ رہا ہے، زکریا نے کہلا دیا کہ بہت اچھا موقع ہے رائے ونڈ کا اجتماع فلاں وقت سے فلاں وقت تک ہے میں بھی عمر بھر میں پہلی دفعہ شریک ہو رہا ہوں، آپ بھی شرکت فرمالیں تو بہت اچھا، ان کا پیام پہنچا کہ دل بہت چاہ رہا ہے مگر یہ تاریخیں تو میری دوسری جگہ گھر چکیں۔ جنات کے یہ واقعات اور بہت سے مزید ان کے ایک معمول سے معلوم ہوئے جو جنات کے کسی بڑے کے کہنے سے زکریا سے بیعت بھی ہوا، میں نے انکار بھی کیا کہ مولوی انعام صاحب سے ہو مگر ان کی طرف سے اصرار ہوا، اس لیے اس کو رائے ونڈ میں بیعت کر لیا معلوم ہوا کہ وہ لڑکا کراچی کا رہنے والا تھا۔
جلسہ کے اختتام تک مولوی انعام صاحب کی طبیعت بہت اچھی رہی مگر جلسہ ختم ہوتے ہی ان پر حرارت کا اثر ہوا جو میں نے تکان سمجھا، دو دن مزید رائے ونڈ قیام رہا، بدھ کی صبح کو ماموں شعیب اور ماموں محمد عمر نے پوچھ کر بھیجا تھا کہ تجھ سے ملنے کی کیا صورت ہے مجھے اس وقت تک معلوم نہ تھا کہ لاہور کا ویزا نہیں ہے، میں نے کہلا دیا کہ یہاں سے نمٹ کر لاہور ہی جانا ہے، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں کا ویزا نہیں ہے اس لیے بھائی غلام دستگیر کی گاڑی میں حاجی محمود کو بھیجا کہ وہ لے کر آئیں، چنانچہ بدھ کی صبح جو وہ آئے چلنے سے بالکل معذور، آتے وقت تو کچھ زیادہ اشکال نہیں ہوا مگر جب میری گاڑی پر وہ جانے لگے تو لوگوں نے گاڑی پہچان کر ان پر بلہ بول دیا، ہر چند لوگ کہتے رہے کہ شیخ نہیں ہیں مگر عوام نے ان کو ڈانٹ دیا کہ یہ گاڑی شیخ ہی کی ہے۔
چونکہ مولوی انعام صاحب کی طبیعت جلسہ کے بعد مضمحل اور حرارت کا اثر ہو گیا تھا اس لیے زکریا نے کہہ دیا کہ میری رائے یہ ہے کہ آپ ڈھڈیاں نہ جائیں، رائے ونڈ سے پنڈی چلے جائیں میں بھی ڈھڈیاں سے پنڈی پہنچ جاؤں گا، مولوی انعام صاحب نے کہا کہ جیسا حکم ہو۔ میں نے کہا کہ حکم کی بات نہیں آپ کی علالت کی وجہ سے مشورہ تھا، جمعہ کی صبح کو اپنی نماز پڑھ کر

۶:۳۰ بجے رائے ونڈ سے چل کر جڑاں والہ کے قریب گاڑی کو روک کر گاڑی سے نیچے اترا کہ دوران سر شروع ہوگیا، مولوی انعام صاحب بھی میری وجہ سے اترے ۹:۱۰ پر لائل پور پہنچے۔
مفتی صاحب کے مدرسہ میں جاتے ہی میں تو لیٹ گیا مولوی انعام صاحب بھی لیٹ گئے، مفتی صاحب مجمع کو نمٹاتے رہے کوئی ۲۵ منٹ کے بعد اٹھ کر مدرسہ میں گیا، اتنے ہمارے رفقاء نے ناشتہ کیا زکریا نے بخاری کی ابتداء کی اور مولوی انعام صاحب نے مولوی جلیل کے لڑکے شفیق کا نکاح پڑھا اور وہاں سے رخصت ہوکر مفتی صاحب نے خود ہی روک دیا تھا، ۱۱:۳۰ پر روانہ ہوکر الحاج ابراہیم پہلوان کے مکان پر گاڑی ہی میں چند منٹ ٹھہر کر مولوی انیس الرحمٰن کی مسجد میں گئے، وہاں ان کا مزار ہے اور گاڑی پر ہی ان کی اہلیہ برقعہ اوڑھ کر آ گئی، وہیں ان کی تعزیت کی، اس کے بعد مسجد ہلال مرکزِ تبلیغ میں گئے، زکریا گاڑی ہی میں رہا اور مولوی انعام صاحب نے اتر کر دعاء کرائی۔
اس کے بعد سرگودھا روانہ ہوئے ۱:۳۰ بجے وہاں پہنچے جب کہ حافظ صاحب کی مسجد میں خطبہ کی اذان ہو چکی تھی، زکریا کو وضو تھا، اس لیے خطبہ میں شریک ہوگیا تھا مگر مولانا انعام صاحب کو استنجاء کی ضرورت ہوگئی، اس لیے جمعہ میں شرکت نہ ہوسکی اپنی ظہر پڑھی، تجویز سرگودھا چند منٹ ٹھہر کر جھاوریاں روانگی کی تھی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ افضل نے علی الصباح حافظ صاحب کو ٹیلی فون کر دیا تھا کہ دو گاڑیاں جمعہ بھی پڑھیں گی اور کھانا بھی کھائیں گی، زکریا نے تو کھانا نہیں کھایا صرف یخنی پی اور مولوی انعام صاحب نے بھی علالت کی وجہ سے نہیں کھایا، بقیہ رفقاء حافظ صاحب کے مکان پر کھانا کھاتے رہے اور ہم لوگوں کے قیام کے لیے حافظ صاحب نے برابر کا مکان خالی کرا رکھا تھا، جس میں ایک کمرہ زکریا کا مستقل اور دوسرا انعام صاحب کا مستقل، شنبہ کی صبح کو چائے سے فراغت پر ڈھڈیاں کے لیے روانگی ہوئی، سرگودھا بھی اطلاع دو گاڑیوں کی تھی مگر ۸، ۱۰ جمع ہوگئیں۔
سرگودھا سے الوداعی مصافحہ کے وقت حافظ صاحب سے زکریا نے تخلیہ میں پوچھا کہ آپ نے عتیق کو اجازت دی ہے؟ انہوں نے کہا کہ اچھے چل رہے ہیں، میں نے کہا کہ تنقید مقصود نہیں تحقیق مقصود ہے، میری تمنا رائے پوری خانقاہ کی آبادی کی ہے، آپ کو معلوم ہے، اول آپ پر اصرار کیا مگر جب آپ نے فرمایا کہ میرا کوئی وعدہ نہیں تو حافظ عبدالرشید پر اصرار کیا، اس میں بھی ناکام رہا، معلوم ہوا کہ آپ نے مولوی عتیق کو تجویز کیا ہے، جب اجازت ہے تو مجھے بھی انکار نہیں مگر وہیں قیام کیا کریں، انہوں نے کہا کہ قیام وہیں کرتے ہیں، میں نے کہا کہ یہ غلط ہے، وہ مہینہ میں ایک دو دن کو آتے ہیں، انہوں نے کہا کہ وہ وہیں رہتے ہیں آپ کو معلومات نہیں، میں نے کہا کہ میں

چار ماہ رہ کر آیا ہوں، آپ کو معلومات نہیں، تقریباً آدھ گھنٹہ تخلیہ کے بعد رخصت ہو گیا۔

تقریباً ۹ بجے صبح کو ڈھڈیاں پہنچے، راستہ میں جھاوریاں پر قاضی محمود مع رفقاء کھڑے ملے، وہاں اتارنے کے لیے، مگر اشارہ سے انکار کر دیا، دونوں گاڑیاں بہت تیزی سے چلی گئیں، وہاں جا کر ابراہیم پہلوان مع برادران دو دن پہلے گئے ہوئے تھے اور وہاں دعوت کا انتظام کر رکھا تھا اور ہمیشہ میرے جانے پر ہی نہیں بلکہ میرے علاوہ بھی جب وہاں خواص میں سے کوئی جاتا ہے یا جلسہ ہوتا ہے تو کھانے کا انتظام یہی لوگ کرتے ہیں، ظہر کی نماز پڑھ کر زکریا مزار پر پہنچ گیا اور مولوی محمد عمر صاحب سے کہا کہ آپ کام جاری کر دیں انہوں نے تبلیغی تقریر شروع کر دی، عصر کے قریب زکریا بھی مسجد میں پہنچ گیا اور مولانا محمد عمر صاحب کے پاس بیٹھ کر شاہد سے یہ اعلان کرایا کہ!

ایک ضروری اعلان کرنا ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تبلیغ اور تصوف دو الگ الگ چیزیں ہیں، میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں کہ یہ علی العموم صحیح نہیں، کیونکہ میرا تعلق بذات خود تبلیغ سے بھی ہے اور بزرگی اور تصوف سے بھی، بعض مشائخ اپنے مریدوں کو تبلیغ میں لگنے سے منع کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ یہ توحید مطلب کے خلاف ہے یہ ان کا منع کرنا قاعدہ کلیہ اور اصول کلیہ نہیں ہے بلکہ مشائخ اور بزرگوں کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے یہ ان کا منع کرنا ایسا ہی ہے جیسے ڈاکٹر حکیم کسی کو شکر کے استعمال سے روک دے، چنانچہ ذیابیطس میں روک دیتا ہے، بعض بیماروں کو نمک سے روک دیتا ہے، بعض کو پانی سے روک دیا جاتا ہے تو اس کو یہ سمجھ لینا کہ یہ ممانعت ہر شخص کے لیے ہے، بالکل غلط ہے، یا یہ کہ میرے چچا جان کو حکیم مسعود احمد نے پانی کو روک دیا تھا متواتر سات سال تک پانی نہیں پیا تو اس کو قاعدہ کلیہ سمجھ لینا یہ سب غلط ہو گا میں چونکہ حضرت قدس سرہٗ کا آدمی ہوں اور حضرت رائے پوری سے بھی مجھے اجازت ہے، اس لیے بڑے زور سے کہوں گا کہ جہاں تک ہو سکے تبلیغ میں وقت لگانا۔

ڈھڈیاں میں مولانا انعام صاحب کی طبیعت اور بھی زیادہ خراب ہو گئی اور ۱۰۵ ڈگری تک بخار ہو گیا جس کی وجہ سے فکر ہو گئی، مغرب کے بعد ختم یٰسین کر دیا گیا، قاضی صاحب نے بہت درد انگیز الفاظ میں دعاء صحت کرائی جس کی اجابت فوری محسوس ہوئی اور اسی وقت افاقہ شروع ہو گیا، مولانا کی شدت علالت کی وجہ سے مشورہ ہوا کہ بجائے کاروں کے ریل سے سیدھا پنڈی بھیج دیا جائے مگر فسٹ کلاس میں صرف ایک سیٹ مل سکی اس لیے ملتوی ہو گیا، پیر کی صبح کو ڈھڈیاں سے روانہ ہو کر جھاوریاں پہنچے، وہاں ناشتہ کیا، مولوی انعام صاحب علیحدہ کمرے میں رہے اور وہیں سے سیدھے افضل کی گاڑی میں بیٹھ کر تلاگنگ کے لیے روانہ ہو گئے زکریا اول مسجد میں گیا وہاں ایک نکاح مولوی عبدالوحید ڈھڈیاں نے قاضی صاحب کے حکم سے پڑھایا، قاضی صاحب نے دعاء

کرائی، وہاں سے دس بجے کے قریب چل کر پہاڑی راستہ سے ۲ بجے کے قریب تلاگنگ پہنچے۔

مولوی ظہور بن جنرل حق نواز نے پہلے سے وعدہ لے رکھا تھا، جنرل صاحب تو جماعت میں گئے ہوئے تھے، وہاں پھل وغیرہ کھائے اور پیشاب وضو کر کے ظہر کی نماز پڑھی اور ڈھائی بجے روانہ ہوئے پہلے سے معلوم تھا کہ راولپنڈی کا ویزا ہے اس پر ملک صاحب اور اہلیہ قریشی کو رائے ونڈ آنے سے روک دیا تھا، مگر عین رائے ونڈ سے روانگی کے وقت معلوم ہوا کہ ویزا شہر کا ہے چھاؤنی ممنوع الدخول ہے اسی لیے رانا اقبال کے مکان پر شہر میں قیام تجویز ہوا کہ بڑی جگہ ہے، زکریا نے حاجی محمود کا مکان تجویز کیا تھا، ان کا بھی اصرار تھا مگر اہل شوریٰ نے یہ کہہ کر کہ ان کا مکان چھوٹا ہے رد کر دیا لیکن جب تلاگنگ سے پنڈی کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو فتح جنگ پر حاجی محمود وغیرہ متعدد آدمی یہ مژدہ لے کر پہنچے کہ چھاؤنی میں جانے کی اجازت ہوگئی، اس لیے بجائے شہر کے وہیں سے چھاؤنی کا رخ کیا، مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ صرف زکریا مسجد میں اجتماع کرنے کی اجازت ملی ہے قیام کی نہیں۔

چنانچہ مولانا محمد عمر صاحب نے جاتے ہی مسجد میں قیام کیا اور مغرب کے بعد سے تقریر شروع کر دی، زکریا مع مولوی انعام قریشی کے مکان پر دو کمروں میں ٹھہر گئے، مولوی انعام صاحب سیدھے ملک صاحب سے ملے مگر انہوں نے پہچانا نہیں، زکریا نے پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر ان سے دریافت کرایا انہوں نے کہا کہ تیرے آنے کی ضرورت نہیں میں خود آرہا ہوں، چنانچہ درمیانی کمرہ میں آگئے جو وسیع تھا زکریا کے ساتھ ہی نماز پڑھی پھر مولانا انعام صاحب کو دریافت کیا، میں نے کہا کہ وہ آتے ہی آپ سے مل چکے وہ مغرب تک زکریا کے پاس بیٹھے رہے، مغرب کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور زکریا اپنے کمرے میں چلا آیا اور اسی کمرے میں پردہ کرا کر مستورات آگئیں، سب سے پہلے ام طلحہ آئیں، زکریا نے کہا کہ میں نے تو چاہا تھا کہ جلسہ میں طلحہ کا نکاح کر دیں اور اتنے ہم یہاں پہنچیں وہ اپنی بیوی کو لے آئے اور ہم یہاں آکر ولیمہ کھالیں اور آئندہ سال عقیقہ کھالیں، وہیں عزیزی محمد کاندھلوی کی بہن ملیں اور محمد احمد تھانوی کی اہلیہ اور بہت سے رشتہ دار ملے، البتہ مولوی احتشام کی لڑکی نہ مل سکی اور بعد میں مستورات کا بہت جم غفیر ملا، انہوں نے اپنا تعارف کرایا، مگر زکریا کو کسی کا پتہ نہ چلا۔

عشاء کا وقت ہو جانے پر اول وقت اپنی نماز پڑھ کر جب کہ مسجد میں مولانا محمد عمر صاحب زوروں پر تھے ڈاکٹر منیر کی گاڑی میں قریشی صاحب کے مزار پر گئے وہاں ۲۰ منٹ بیٹھ کر ان کے مکان پر چلا گیا، قریشی صاحب کے مزار پر بہت یکسوئی سکون اور فرحت ہوئی بہت ہی برکات سے لبریز تھا اُٹھنے کو دل بالکل نہیں چاہتا تھا، مگر محض اس ڈر سے کہ اگر مولوی محمد عمر نے تقریر ختم کر دی تو

اتنا ہجوم ہو جائے گا کہ نکلنا مشکل ہو جائے گا۔

رانا اقبال کے مکان پر پہنچ گئے، مولوی انعام صاحب سے میں نے کہہ دیا کہ ملک صاحب تمہیں پوچھ رہے ہیں، انہوں نے پہچانا نہیں تو وہ دوبارہ مل کر آئے اور میرے پہنچنے کے کچھ دیر بعد رانا اقبال کے گھر پہنچے، پنڈی میں سردی اتنی زیادہ تھی کہ قریشی صاحب کے مکان پر بھی دو ہیٹر جلائے گئے اور رانا صاحب کے مکان پر ہی صبح کو رفقاء نے رانا صاحب کے یہاں ناشتہ کیا، زکریا نے حاجی محمود سے وعدہ کر لیا تھا، اس لیے زکریا کی گاڑی میں شاہد، مولوی احسان وغیرہ حاجی محمود کے یہاں گئے آدھ گھنٹہ وہاں ٹھہرے اور وہاں سے سیدھے ہوائی اڈہ پر نو بجے پہنچ گئے، وہاں بہت الگ کھڑے ہوئے تھے، مگر ہجوم نے یہاں بھی گھیر لیا پولیس والے بھی دق کرتے رہے اور مطاروں پر تو زکریا کی گاڑی ایسے موقع پر مطار کے احاطہ میں داخل ہو جاتی ہے، مگر یہاں نہ ہو سکی، بھائی افضل نے کہا تھا کہ تیری اور مولانا انعام صاحب کی گاڑی کی طیارہ تک اجازت ہو گئی، مگر معلوم ہوا کہ اجازت نہیں مل سکی تھی، اس لیے مطار کی کرسی پر طیارہ تک پہنچے اور میرے رفقاء میری کرسی لے کر ساتھ ساتھ، انہوں نے کہا میری کرسی کو قبول نہیں کیا۔

طیارہ پر بھی انہوں نے کہا کہ ان کی کرسی سے چڑھا جائے، مگر وہ ممکن نہ ہو سکا، اس لیے طیارہ سے اپنی کرسی پر منتقل ہو کر سب مسافروں سے پہلے زکریا کو فرسٹ کلاس کی اگلی سیٹ دے دی اور مولانا انعام صاحب کو اس کے بغل میں وہاں کپتان احمد حسن قادری سے ملاقات ہوئی، انہوں نے بہت کوشش کی کہ کپتان سے دلہ کر لیں، مگر وہ راضی نہ ہوا، اس لیے ساتھ ہی کراچی تک پہنچے، ڈیڑھ گھنٹہ میں کراچی کے مطار پر پہنچے، زکریا تو حسب معمول سیدھا مکی مسجد پہنچ گیا اور دوسری کار میں مولوی انعام صاحب اور بقیہ رفقاء سامان کے ساتھ دیر میں پہنچے معلوم ہوا کہ زکریا کا کموڈ گم ہو گیا بڑی مشکل پیش آئی، لاہور، پنڈی، سب جگہ برقیہ ٹیلی فون کیا گیا، مگر سب جگہ سے جواب ملا یہاں نہیں، اسی وقت کہیں سے قدیم لکڑی کا کموڈ منگایا گیا اور اس کا استعمال شروع ہوا، اگلے دن بڑی کوششوں کے بعد وہ کراچی کے مطار سے مل گیا۔

معلوم ہوا کہ جہاز والوں نے اس کو جہاز کا کوئی سامان سمجھ کر اپنے خزانہ میں ڈال دیا تھا اس کی ہیئت بھی ایسی ہی تھی، یہ کموڈ اس سفر میں خاص طور سے افضال نے ایسی طرح سے تیار کیا تھا کہ اندر پانی نہ جائے پہلے سے قرار یہ تھا کہ مطار سے سیدھے بھائی یوسف کے یہاں جانا ہے اور ان کے صاحبزادے کے ولیمہ کی قضاء کھانی ہے۔

بھائی یوسف نے اپنے لڑکے کے نکاح کا کارڈ وغیرہ قاضی صاحب کے کہنے پر اور ان کی اس تجویز پر کہ طیارہ سے آنا ہے، ۷ نومبر کو نکاح کا اعلان اور اگلے دن ولیمہ کا اعلان کر دیا تھا، مگر زکریا کا

باڈر سے آنا طے ہوگیا، اس لیے قاضی صاحب نے نکاح پڑھایا اور ہم لوگوں کی عدم شرکت کا قلق ہم سب کو ہی ہوا، اس لیے تجویز ہوا کہ کراچی پہنچ کر ان کے ولیمہ کی قضاء کرنی ہے۔

بھائی یوسف کے یہاں سے واپسی پر بھائی یحییٰ مدنی کے مکان پر پہنچے، یہ پہلے سے وعدہ تھا کہ کار سے نہیں اُتریں گے، اس لیے وہ کار ہی پر اپنی مستورات کو لے کر آئے اور ساتھیوں نے اس عرصہ میں کچھ کھایا پیا، اس کے بعد مکی مسجد گئے، پنڈی میں اس دن ترکی کا صدر آرہا تھا اس لیے زیادہ اہتمام پولیس وغیرہ کا تھا اگرچہ وہ صدر شام کو ۴ بجے آنے والا تھا مگر پولیس صبح ہی سے مسلط تھی اس وجہ سے تنگی کی گئی، عشاء کے بعد بھائی یوسف کے یہاں دعوت تھی، دوسرے دن ظہر کے وقت حاجی فریدالدین کی لڑکی کا نکاح پہلے طے ہوگیا، انہوں نے ڈھڈیاں ہی میں وقت مقرر کرالیا تھا، اس لیے بدھ کی صبح کو حاجی صاحب کی گاڑی میں اول مفتی شفیع صاحب کے مدرسہ میں جانا ہوا کیونکہ مفتی صاحب کی عیادت بھی اہم تھی۔

مفتی صاحب ضعف کی حالت میں چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے، زکریا کو دیکھتے ہی بہت اظہارِ مسرت کیا، ایک گھنٹہ زکریا ان کے پاس برابر کی چارپائی پر لیٹا رہا، احباب ناشتہ وغیرہ کرتے رہے، وہ چارپائیاں برابر تھیں اور میں اور مفتی صاحب اس طرح لیٹے تھے کہ ایک چارپائی پر یہ ناکارہ اور دوسری پر مفتی صاحب سر دونوں کے آمنے سامنے اور پاؤں الگ الگ، مفتی صاحب نے اپنے مدرسہ کی بہت ہی شکایات کیں، طلبہ کی طرف سے حکومت کی طرف سے اور یہ کہ بعض طلبہ پڑھنا تو ان کا مقصود نہیں ہوتا، غیروں کے تنخواہ دار محض فساد ڈالنے کے لیے ہمارے مدرسہ میں طالب علم بن کر ہوتے ہیں، مفتی صاحب نے اس کی بہت سی جزئیات بتائیں۔

زکریا نے بڑے اہتمام سے ساری گفتگو سنی اور کہا کہ یہ اشکالات آپ ہی کے یہاں نہیں۔ ہم سب مدارس والوں کو پیش آتے ہیں۔ صورت میں کچھ تھوڑا بہت فرق ہوجاتا ہے ہمارے یہاں کے اسٹرائیک ۱۳۸۲ء میں اس کے بڑے تجربات ہوئے کہ مدارس بلکہ اسلام کے مخالف لوگوں نے بعض لوگوں کو تنخواہیں دے دے کر ہمارے اسٹرائیک میں شریک کیا۔ میرے نزدیک تو ان سب کا واحد علاج ذکراللہ کی کثرت ہے کہ جب کوئی بھی اللہ تعالیٰ کا نام لینے والا نہ ہوگا تو قیامت قائم ہوجائے گی۔

جب اللہ تعالیٰ شانہ کا پاک نام ساری دنیا تھامے ہوئے ہے تو مدارس کی کیا حقیقت اور پھر مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد میں نے اس مضمون کو یاددہانی کے طور پر مفتی صاحب کو اور مولانا بنوری نوراللہ تعالیٰ مرقدھما کو الگ الگ لکھے جو خصوصی مضامین کے علاوہ مشترک مضمون دونوں میں یہ تھا:

مدارس کے روزافزوں فتن، طلبہ کی دین سے بے رغبتی بے توجہی اور لغویات میں اشتغال کے

متعلق کئی سال سے میرے ذہن میں یہ ہے کہ مدارس میں ذکر اللہ کی بہت کمی ہوتی جارہی ہے۔ بلکہ معدوم، بلکہ اس لائن سے تو بعض میں تنفر کی صورت دیکھتا ہوں۔ جو میرے نزدیک بہت خطرناک ہے ہندوستان کے مشہور مدارس دارالعلوم، مظاہر علوم شاہی مسجد مراد آبادی وغیرہ کی ابتداء جن اکابر نے کی تھی وہ سلوک میں بھی امام الائمہ تھے۔ ان ہی کی برکات سے یہ مدارس ساری مخالف ہواؤں کے باوجود اب تک چل رہے ہیں۔

میں اس مضمون کو کئی سال سے اہل مدارس منتظمین اور اکابرین کی خدمت میں تحریراً تقریراً کہتا اور لکھتا رہا ہوں میرا خیال ہے کہ آپ جیسے حضرات اس کی ساری توجہ فرمائیں تو مفید اور مؤثر زیادہ ہوگا۔ مظاہر علوم میں تو کسی درجہ میں اپنے ارادہ میں کامیاب ہوں اور دارالعلوم کے متعلق جناب الحاج حضرت قاری محمد طیب صاحب سے بارہا تقریراً تحریراً عرض کرچکا ہوں اور بھی اپنے سے تعلق رکھنے والے اہل مدارس کو متوجہ کرتا رہتا ہوں۔ مدارس کے روزافزوں فتنوں سے بہت ہی طبیعت کو کلفت پہنچتی رہتی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ فتنوں سے بچاؤ کی صورت صرف ذکر اللہ کی کثرت ہے، جب اللہ کا نام لینے والا کوئی نہ رہے گا تو دنیا ختم ہوجائے گی۔ جب اللہ تعالیٰ کے پاک نام کو اتنی قوت ہے کہ ساری دنیا کا وجود اسی پر قائم ہے تو مدارس بے چارے ساری دنیا کے مقابلہ میں دریا کے مقابلہ میں قطرہ بھی نہیں، اللہ تعالیٰ کے پاک نام کو ان کی بقاء اور تحفظ میں جتنا دخل ہوگا وہ ظاہر ہے اکابر کے زمانے میں ہمارے ان جملہ مدارس میں اصحاب نسبت وذاکرین کی کثرت جتنی رہی ہے۔ وہ آپ سے بھی مخفی نہیں اور اب اس میں جتنی کمی ہوگئی ہے وہ بھی ظاہر ہے۔

بلکہ اگر یوں کہوں کہ اس پاک نام کے مخالف حیلوں بہانوں سے مدارس میں داخل ہوتے جارہے ہیں تو میرے تجربہ میں غلط نہیں اس لیے میری تمنا ہے کہ ہر مدرسہ میں کچھ ذاکرین کی تعداد ضرور ہوا کرے۔ طلبہ کے ذکر کرنے کے تو ہمارے اکابر بھی خلاف رہے ہیں اور میں بھی موافق نہیں، لیکن منتہی طلبہ یا فارغ التحصیل یا اپنے سے یا اکابرین سے تعلق رکھنے والے ذاکرین کی کچھ تعداد مدارس میں علی التبادل ضرور رہا کرے اور مدرسہ ان کے قیام کا کوئی انتظام کردیا کرے۔

مدرسہ پر طعام کا بارڈالنا تو مجھے بھی گوارا نہیں کہ طعام کا انتظام تو مدرسہ کے اکابر میں سے کوئی شخص ایک یا دو اپنے ذمہ لے یا باہر سے مخلص دوستوں میں سے کسی کو متوجہ کرکے ایک ایک ذاکر کا کھانا اس کے حوالہ کردے جیسا کہ ابتداء میں مدارس کے طلبہ کا انتظام اسی طرح ہوتا تھا۔ البتہ اہل مدارس ان کے قیام کی کوئی صورت اپنے ذمہ لے لیں جو مدرسہ ہی میں ہو اور ذکر کے لیے ایسی مناسب تشکیل کریں کہ دوسرے طلبہ کا کوئی حرج نہ ہو۔ نہ سونے والوں کا نہ مطالعہ کرنے والوں کا۔

جب تک اس ناکارہ کا قیام سہارنپور میں رہا تو ایسے لوگ بکثرت رہتے تھے جو میرے مہمان

ہوکران کے کھانے پینے کا انتظام تو میرے ذمہ تھا لیکن قیام اہلِ مدرسہ کی جانب سے مدرسہ کے مہمان خانہ میں ہوتا تھا اور بدلتے سدلتے رہتے تھے، صبح کی نماز کے بعد میرے مکان پر ان کے ذکر کا سلسلہ ایک گھنٹہ تک ضرور رہتا تھا اور میری غیبت میں سنتا ہوں کہ عزیز طلحہ کی کوشش سے ذاکرین کی وہ مقدار اگرچہ نہ ہو مگر ۲۰، ۲۵ کی مقدار روزانہ ضرور ہو جاتی ہے۔

میرے سہارنپور کے قیام کے زمانہ میں سو، سوا سو تک پہنچ جاتی تھی اور غیبت کے زمانہ میں بھی سنتا ہوں کہ چالیس پچاس کی تعداد عصر کے بعد جمعہ کے دن ہو جاتی ہے ان میں باہر کے مہمان ہوتے، جو دس بارہ تک اکثر ہو جاتے ہیں۔ عزیز مولوی نصیر الدین سلمہٗ اللہ تعالیٰ اس کو بہت جزائے خیر دے ان کے کھانے کا انتظام میرے کتب خانہ سے کرتے رہتے ہیں اسی طرح میری تمنا ہے کہ ہر مدرسہ میں دو چار ذاکرین مسلسل ضرور رہیں کہ داخلی اور خارجی فتنوں سے بہت امن کی امید ہے، ورنہ مدارس میں جو داخلی اور خارجی فتنے بڑھتے جا رہے ہیں۔

اکابر کے زمانہ سے جتنا بعد ہوتا جائے گا اس میں اضافہ ہی ہوگا۔ اس ناکارہ کو نہ تحریر کی عادت نہ تقریر کی آپ جیسا یا مفتی شفیع صاحب جیسا کوئی شخص میرے مافی ضمیر کو زیادہ وضاحت سے لکھتا تو شاید اہلِ مدارس کے اوپر اس مضمون کی اہمیت زیادہ پیدا ہو جاتی۔ اس ناکارہ کے رسالہ فضائل ذکر میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب الوابل الصیب سے ذکر کے سو (۱۰۰) کے قریب فوائد نقل کیے گئے ہیں، جن میں شیطان سے حفاظت کی بہت سی وجوہ ذکر کی گئی ہیں شیاطینی اثر ہی ساری فتنہ وفساد کی جڑ ہے۔ فضائل ذکر سے یہ مضمون بھی اگر آپ جناب سن لیں تو میرے مضمون بالا کی تقویت ہوگی اس کے بعد میرا مضمون تو اس قابل نہیں جو اہلِ مدارس پر کچھ اثر انداز ہو سکے آپ میری درخواست کو زوردار الفاظ میں نقل کرا کر اپنی یا میری طرف سے بھیج دیں تو شاید کسی پر اثر ہو جائے۔ دارالعلوم، مظاہر علوم، شاہی مسجد کے ابتدائی حالات آپ کو مجھ سے بھی زیادہ معلوم ہیں کہ کن صاحب نسبت اصحاب ذکر کے ہاتھوں ان کی ابتداء ہوئی ہے۔ ان ہی کی برکت سے یہ مدارس اب تک چل رہے ہیں یہ ناکارہ دعاؤں کا بہت محتاج ہے بالخصوص حسن خاتمہ کا کہ گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ فقط والسلام

حضرت شیخ الحدیث صاحب

بقلم حبیب اللہ

۳۰ نومبر ۱۹۷۵ء ''مکہ مکرمہ''

میرے اس خط کے جواب میں مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ جواب آیا۔

''مخدوم المحترم حضرت شیخ الحدیث صاحب متعنا اللہ تعالیٰ بطول حیاتہ بالعافیۃ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کا کرم نامہ اتنی جلد خلاف وہم وگمان کے پہنچا اور بڑا تفصیلی پہنچا کہ حیرت ہوگئی، مگر حقیقت یہ ہے کہ عرصہ دراز سے آں مخدوم کے تمام ہی معاملات بالکل خرق عادت اور کرامات ہی کی قبیل سے نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو افاضہ خلق اللہ کے لیے دائم و باقی رکھیں۔ نظر اب لکھنے پڑھنے کے قابل نہیں رہی۔ گرامی نامہ بھی عزیزوں سے پڑھوا کر بار بار سنا دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ آپ کے ارشادِ عالیہ کو ذرا شرح وبسط کے ساتھ لکھ کر خوب شائع کیا جائے مگر ابھی تک طبیعت اس قابل بھی نہیں ہوئی کہ دوسروں کو املا کرا سکوں خدا کرے کہ ذرا قوت، ہمت پیدا ہو جائے تو یہ کام پورا کراؤں۔ آپ کی شفقت وعنایت تو ہمیشہ سے ہیں۔ اس گرامی نامہ نے تو گویا مسحور ہی کر دیا متعنا اللہ بافاضاتکم۔

فضائل ذکر کا مطلوبہ حصہ احقر نے پورا سن لیا ہے اور ایک عنوان کے ساتھ اس کا مضمون بھی ذہن میں آ رہا ہے، اللہ تعالیٰ آسان فرمائے تو تشریح کے ساتھ ورنہ پھر خود حضرت کا گرامی نامہ بعینہ شائع کر دینا بھی ان شاء اللہ تعالیٰ بہت مفید ہوگا۔ ایک امر عجیب ہے کہ اس مرتبہ جب مجھے دوسری مرتبہ دل کا دورہ پڑا اور ہسپتال میں دو ہفتے رہنا پڑا جب وہاں سے فراغت کے بعد گھر آیا تو انتہائی ضعف کے باوجود دو باتیں بڑی قوت سے دل میں وارد ہوئیں جن کا خیال عرصہ تین سال سے تقریباً چھوٹا ہوا تھا۔

ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ میں مجھے پہلا دل کا دورہ شدید ہوا تھا اس سے شفاء کے بعد بھی طبیعت میں بھی زندگی سے ایک مایوسی تھی اور اس کی وجہ سے دارالعلوم کے معاملات میں یہ خیال بار بار آتا تھا کہ جب کسی اصلاحی امر میں اقدام کی ضرورت ہوئی تو نفس یہ کہتا تھا کہ اب تو مر رہا ہے اب کوئی نیا کام کرنے کا وقت نہیں۔ تیرے بعد جو لوگ اس کے متکفل ہوں گے وہ خود دیکھ لیں گے اور کر لیں گے۔

اس مایوسانہ خیال سے بہت سے کام رہ گئے مگر اب دوسرے دورہ میں جبکہ سب ڈاکٹروں کو بھی مایوسی تھی پھر اللہ تعالیٰ نے حیات ثانیہ عطاء فرما دی تو بڑی قوت سے یہ خیال آیا کہ دارالعلوم میں جو خرابیاں تجھے نظر آ رہی ہیں۔ آخری دم تک جتنی قوت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس کی اصلاح میں ضرور خرچ کرنا چاہیے۔ نتائج کی ذمہ داری بندہ پر نہیں اپنا کام مقدور کی حد تک ضرور کرنا چاہیے اور دوسری بات یہ ذہن میں آئی کہ میں دیکھتا ہوں کہ دارالعلوم کے طلبہ بلکہ اساتذہ اور تمام متعلقین میں نماز جماعت کی پابندی بہت کم ہوتی جا رہی ہے۔ نماز کا اہتمام ہی گویا ذہنوں سے جا رہا ہے اس لیے اب میں سب مدرسین کو جمع کر کے علیحدہ اور طلبہ کو جمع کر کے علیحدہ اس کی پابندی کے لیے کہوں گا اس کا پہلا قدم تو اپنے گھر سے شروع کر دیا کہ اس معاملہ میں سست تھے ان کو اور سب گھر

والوں کو اس کا پابند کر دیا کہ اگر اب سے کسی کی کوئی نماز قضا ہو گئی ایک روپیہ جرمانہ کا صدقہ کرنا ہوگا اور جماعت قضا ہو گئی تو چار آنے کا۔

الحمدللہ تعالیٰ یہ نسخہ گھر میں تو کامیاب ہو گیا۔ مگر ابھی تک اتنی قوت نہیں آئی کہ طلبہ و مدرسین کو جمع کر کے خطاب کروں۔ امید کر رہا ہوں کہ ان شاء اللہ تعالیٰ چند روز میں یہ بھی ہو جائے گا اور حضرت کا گرامی نامہ وصول ہونے کے بعد سے کچھ ایسے ذاکر شاغل لوگ جن کا مجھ سے تعلق ہے اور پہلے سے یہ کہا کرتے تھے کہ ہم کچھ عرصہ دارالعلوم میں رہ کر ذکر شغل کریں میں اپنی بیماری اور عدم فرصت کا عذر کر کے دفع کر دیتا تھا۔ اب الحمدللہ تعالیٰ یہ کام شروع کر دیا ہے۔ دعاء فرمائیں اللہ تعالیٰ کامیابی عطاء فرمائے۔ اپنے لڑکوں میں سے جو دو عالم ہوئے ہیں ان دونوں کو احقر نے اصلاح ظاہر و باطن اور ذکر شغل سکھانے کے لیے ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب کے سپرد کیا ہے کیونکہ گھر کے اندر یہ کام ہونا چاہیے تاہم کچھ کام شروع ہوا ہے۔ آپ ان دونوں کے لیے خصوصی دعاء فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی مکمل توفیق عطاء فرمائے۔

والسلام

بندہ محمد شفیع

جمعرات ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ

بندہ نے اس گرامی نامہ کا یہ جواب لکھا تھا۔

مکرم و محترم حضرت مفتی صاحب! زادت معالیکم

بعد سلام مسنون!

اسی وقت شدید انتظار میں گرامی نامہ مورخہ ۱۴ ذی الحجہ حجازی ۲۴ ذی الحجہ کو پہنچا، مجھے بہت شدت سے اپنے اس خط کے پہنچنے کا انتظار تھا گرامی نامہ سے بہت ہی مسرت اور طمانیت ہوئی کہ جناب کو خود بھی اس کا احساس ہوا اور میرا عریضہ محرک ہوا یہ ناکارہ تو کئی سال سے خط بھی سننے میں اور لکھوانے میں دوسروں کا محتاج ہے، اس داعیہ سے کہ میرے خیالات کو آپ اپنے کلام میں شرح و بسط سے تحریر فرمائیں گے، بے حد مسرت ہوئی یقیناً وہ زیادہ مفید ہوگی، میری تحریر تو بے ربط و بے سر و پا ہوتی ہے، نہ تحریر کی مشق نہ تقریر کی۔ میں نے تو خود بھی درخواست یہی کی تھی کہ اس مضمون کی روشنی میں جناب خود تحریر فرما دیں تو زیادہ مفید ہوگا۔

اس ناکارہ کو اپنے اکابر کے حالات سننے پڑھنے کا تو بچپن سے اشتیاق ہے شاید پہلے بھی لکھا ہوگا کہ ''اشرف السوانح'' ''اسیر مالٹا'' حضرت میاں صاحب کا تحریر فرمودہ ''حیات شیخ الہند'' جو چھپتی رہی ایک ایک رات میں دیکھتا رہا جب صحت اور شباب تھا تو ساری رات جاگنا بہت آسان

تھا اب اپنی محتاجگی اور معذوری نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔

فضائل ذکر کا مضمون آپ نے سن لیا اور ایک عنوان کے ساتھ جناب کے ذہن میں مضمون بھی آ گیا اس سے بہت مسرت ہوئی یہ زیادہ مفید ہوگا جناب نے پہلے قلبی دورہ کے بعد مایوسانہ خیال لکھا میں تو اس میں آپ کا ہم خیال نہیں ہوں۔ میرا تو خیال یہ ہے اس ضعف و پیری اور مایوسی عن الحیات میں بھی جو نیک خیال دل میں آئے اس کو ضرور شروع کر دیا جائے کہ بعد والوں کے لیے اسوہ بنے اور کام کرنے والوں کے لیے رہنمائی کا سبب بنے۔

میرا خیال یہ ہے اور بہت قوت سے ہے کہ اکابر کی آنکھیں جنہوں نے دیکھی ہیں یا صحبت اٹھائی ہے۔ ان کو بعد میں آنے والوں کے لیے جو اکابر کی نگاہوں سے بھی محروم ہیں جو ہوسکے متن یا مسودہ کی طرح ضرور سامنے کر دینا چاہیے کہ کم سے کم ان کے لیے اس ماحول سے مناسبت تو رہے (میں تو) جناب کے دوسرے وعدہ دورہ کے بعد کے خیال کا ہم نوا ہوں۔

ضرور جو امور خیر بڑوں سے حاصل کیے ہیں، وہ ربط بے ربط بعد والوں کے لیے تحریراً تقریراً شروع کر جائیں۔ آپ نے نماز قضا ہونے پر جو جرمانہ تجویز کیا بہت مناسب ہے۔ اس کا شدت سے نفاذ کریں اور اس کا مطالبہ بھی فرمایا کریں کہ جرمانہ اداء کر دیا یا نہیں؟ آپ کے بعد یہی مقتداء اور آپ کے قائم مقام ہوں گے۔ احادیث سے بھی بکثرت اس مضمون کی تائید ہوتی ہے۔ اس مژدہ سے بہت ہی مسرت ہوئی کہ آپ نے ذاکرین کے دارالعلوم میں اجتماع کا اہتمام شروع فرمایا۔ اللہ تعالیٰ مبارک کرے اور موجب خیر فرمائے۔ آپ نے اپنے دونوں صاحبزادوں کو ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب کے حوالے کر دیا، بہت اچھا کیا، مگر شرط یہ ہے کہ ان کے دلوں میں ڈاکٹر صاحب کی محبت و وقعت پیدا ہو اور آپ خود بہت اہتمام سے اس کی نگرانی کیا کریں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے فرمودات پر اہتمام سے عمل بھی کریں اور وقعت بھی۔

مولویوں میں ایک خاص مرض یہ ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں اپنی علمیت کے گھمنڈ میں اپنے سے جو اعظم نہ ہو اس کی وقعت کم ہوتی ہے اس سلسلہ میں ان بچوں کو یہ مضمون ضرور سناتے رہیں، رشید، قاسم نے حضرت حاجی صاحب سے بیعت کی اور جب لوگوں نے دونوں سے الگ الگ اعتراض کیا جو ان کی شان تھی وہی جواب دیا۔

حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ ہم میں علم تو زیادہ تھے مگر آگ جو حضرت حاجی صاحب میں تھی وہ ہم میں نہیں تھی اور حضرت نانوتوی نے فرمایا کہ وہ عالم تو نہیں تھے مگر عالم گر تھے۔ (از زکریا)

اس مضمون کو میں تو نہ لکھوا سکا ہوں مگر آپ خوب سمجھ گئے ہوں گے۔ یہ ناکارہ ان دونوں (بچوں) کے لیے دل سے دعاء کرتا ہے۔ مگر آپ کی دعائیں ان کے حق میں زیادہ قوی ہیں اور

نگرانی اس سے بھی زیادہ قوی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وقوت زیادہ سے زیادہ عطاء فرمائے کہ آپ کے فیوض وبرکات سے لوگوں کو بہت زیادہ نفع ہے۔ خدا کرے صاحبزدگان کو میری یہ تحریر گراں نہ ہوا۔ اس سے زیادہ سخت بات لکھوں جو میرے والد کا مشہور فقرہ ہے۔ جو سینکڑوں دفعہ کا سنا ہوا ہے اور اپنے اوپر کا تجربہ کیا ہوا بھی ہے۔

وہ فرمایا کرتے تھے کہ صاحبزادگی کا سور بہت دیر میں نکلتا ہے اور اس کی مصلحت سے وہ بے وجہ مجمع میں ضرب یضرب بھی مجھے کر دیتے تھے اور میرے چچا جان کا معاملہ میرا ساتھ باوجود ان کے چچا اور استاد اور نائب الشیخ ہونے کے ایسا رہتا تھا کہ میں اس سے خود شرمندہ ہوجاتا تھا۔ مگر اس سب کے ساتھ کبھی کبھی مجمع میں ڈانٹ بھی دیتے تھے۔

ایسے ہی ایک موقع پر حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان سے عرض کیا کہ حضرت! آپ کی ناراضگی کی کوئی وجہ تو سمجھ میں آئی نہیں ہے۔ ہے تو گستاخی، تو چچا جان نے فرمایا تھا کہ آخر میں چچا بھی تو ہوں میں قصداً ایسا کرتا ہوں کہ کبھی اس کو اپنی مشیخت کی وجہ سے عجب نہ پیدا ہونے لگے میرے اکابر نے تو میری اصلاح کی بہت کوشش فرمائی، مگر افسوس کے کتے کی دم بارہ برس نلکی میں رکھنے کے بعد نکالی تو ٹیڑھی ہی نکلی اور اب تو مقدر سے کوئی ٹوکنے والا بھی نہ رہا۔ یہاں تک لکھ کر بہت دل بھر آیا۔ اس کے نظائر تو کئی یاد آئے مگر دل ودماغ میں ان سے لکھوانے کی گنجائش نہیں نہ وقت آپ بیتی میں پہلے بھی اسی قسم کے واقعات بہت آگئے ہیں۔ فقط والسلام

حضرت شیخ الحدیث صاحب

بقلم حبیب اللہ

۲۶ دسمبر ۷۵ء مکہ مکرمہ

جیسا کہ اوپر لکھا میں نے اپنے خط کا مضمون معمولی تغیر کے ساتھ حضرت مفتی صاحب اور مولانا بنوری دونوں حضرات کو لکھا حضرت مولانا بنوری نے میرے خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۹ محرم الحرام ۱۳۹۶ھ

مخدوم گرامی مفاخر ہذہ العصور حضرت شیخ الحدیث رفع اللہ تعالیٰ درجاتہ وافاض علینا من برکاتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

جب سے کراچی پہنچا ہوں عریضہ لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں لیکن توفیق نہیں ہوئی، ایک طرف مشاغل کا ہجوم، دوسری طرف کسل کا ہجوم، آپ کو تو حق تعالیٰ نے نظم کی توفیق عطاء فرمائی ہے ہر کام وقت پر ہوجاتا ہے میں اس نعمت سے محروم ہوں۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے آمین۔

عزیزم محمد سلمہ نے آپ کا مکتوب مبارک دیا بلکہ سنایا دوبارہ خود بھی پڑھا، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی عیادت وزیارت کے لیے دار العلوم گیا تھا، وہاں بھی میں نے ذکر کیا فرمایا کہ زبانی بھی اس کا تذکرہ آیا تھا، اساتذہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ کا شوریٰ کا اجلاس تھا، اس مجلس میں مکتوبِ مبارک سنایا گیا اور عمل کرنے کے لیے تدبیر ومشورہ پر غور بھی ہوا بات تو بالکل واضح ہے، ذکر اللہ کی برکات وانوار سے جو نتائج مرتب ہوں گے وہ بھی واضح ہیں اور میں اس کی تلافی کے لیے ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ ہر مدرسہ کے ساتھ ایک خانقاہ کی ضرورت ہے۔

ہمارے اکابر جو اخلاص اور تعلق مع اللہ کے مجسمہ تھے۔ وہ محتاج بیان نہیں، ان کی تدریس و تعلیم سے غیر شعوری طور پر ایسی تربیت ہوئی تھی اور ان کی قوت نسبت سے اتنا اثر ہوتا تھا کہ درس سے فراغت کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی ذاکر اعتکاف سے باہر آرہا ہے۔ بلاشبہ کاملین کا دور ختم ہوا تو اس کی تکمیل کے لیے اسی قسم کی تدابیر کی ضرورت ہے حق تعالیٰ جلد سے جلد عملی طور پر اس کی تشکیل کی توفیق نصیب فرمائے البتہ ایک اشکال ذہن میں آیا کہ ویسے تو علوم دین، تدریس کتب دینیہ سب ہی ذکر اللہ کے حکم میں ہیں اگر اخلاص اور حسن نیت نصیب ہو اور ذکر اللہ بھی اگر خدانخواستہ ریاکاری سے ہو تو عبث بلکہ وبالِ جان ہے، لیکن اگر کسی درسگاہ میں تعلیم قرآن کریم کا شعبہ بھی ہے اور بچے قرآن اور حفظ قرآن میں مشغول ہیں۔ الحمد للہ کہ ایسے مدارس بھی ہیں جہاں معصوم بچے اور مسافر بچے شب وروز میں بلاشبہ بارہ گھنٹہ تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتے ہیں۔ مقصد بھی الحمد للہ بہت اونچا اور نیت بھی صالح تو کیا یہ ذکر اللہ ان ذاکرین کے ذکر کی جگہ پر نہیں کر سکتے؟

اور یہ سلسلہ اگر اس طرح جاری وساری ہے۔ تو الحمد للہ اچھا خاصا بدل مل جاتا ہے ظاہر ہے کہ عہدِ نبوت میں یہ سلاسل وطرق کا نظام تو نہیں تھا بلکہ تلاوتِ قرآن کریم مختلف اوقات واعمال کے اذکار وادعیہ پھر صحبتِ مقدسہ قیام لیل وغیرہ کی صورت تھی۔ بظاہر اگر اس قسم کی کوئی صورت مستقل قائم ہو تو شاید فی الجملہ بدل بن سکے گا۔ ہاں یہ درست ہے کہ ذکر تبعاً ہوگا۔ بصورتِ مشائخ طریقت ذاکرین کا سلسلہ شاید قصداً وارادۃً ہوگا۔ شاید کچھ فرق ملحوظ خاطر عاملہ ہوگا۔

بہر حال مزید رہنمائی کا محتاج ہوں۔ مجھے اپنے ناقص ہونے کا بے حد افسوس ہے کاش رسمی تکمیل ہو جاتی تو محض افادیت ونفع کی غرض سے متعارف سلسلہ بھی جاری کرتا اور اس طرح ایک خانقاہی شکل بھی بن جاتی یہ چیز واضح ہے کہ عام طور پر طلبہ تعلیم کے زمانہ میں اپنی تربیت واصلاح کی طرف قطعاً متوجہ نہیں ہوئے اور یہ پہلو بے حد دردناک ہے، جب مدرسین بھی اس قوی نسبت سکینہ کے حامل نہ ہوں اور طلبہ بھی اپنی اصلاح سے غافل ہوں اذکار وادعیہ کا التزام بھی نہ ہو، دور فتنوں کا ہو

''حفت النار بالشهوات'' کا منظر قدم قدم پر ہوتو ذکر اللہ کی کثرت کے بغیر چارہ کار نہیں، میں آپ کی خاص دعوات وتوجہات کا محتاج ہوں، وقت کے ضیاع کا صدمہ ہے، لایعنی باتوں میں مشغولیت کا خطرہ رہتا ہے۔ والسلام مع العرف الاحترام مسک الختام

محمد یوسف عفی عنہ

جواب از زکریا

باسمہ سبحانہ

المخدوم المکرم حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب! زادمجدہم بعد سلام مسنون!

طویل انتظار کے بعد رات عشاء کے بعد ۲۰ جنوری کی شب میں رجسٹری پہنچی، آپ کے مشاغل کا ہجوم تو مجھے بہت معلوم ہے اور آپ کی ہمت ہے کہ بیک وقت اتنے مشاغل کو کس طرح نمٹاتے ہیں، سیاسی، علمی اور اسفار اور مجھے یہ اندیشہ تھا کہ وہ رجسٹری کہیں گم ہوگئی ہو، عزیز محمد سلمہ کسی آنے والے کے ہاتھ آپ کی خدمت تک اس کا پہنچ جانا لکھ دیتا تو اطمینان ہوتا آپ نے بہت اچھا کیا کہ اپنی مجلس شوریٰ میں میرے عریضہ کو سنایا کم سے کم ان سب حضرات کے کانوں میں تو یہ مضمون پڑ گیا۔

خدا کرے کسی کے دل میں بھی یہ مضمون اتر جائے تقریباً دو سال ہوئے مفتی محمد شفیع صاحب کا ایک خط آیا تھا، انہوں نے تحریر فرمایا تھا کہ تیری آپ بیتی میں مدرسین اور ملازمین کے لیے جو مضمون ہے مجھے بہت پسند آیا اور میں نے اپنے یہاں سب مدرسین اور ملازمین کو جمع کر کے بہت اہتمام سے اس کو سنوایا، عزیز محمد کے خط سے معلوم ہوا کہ جناب نے میرا خط اپنی تمہید کے ساتھ بینات میں طباعت کے لیے دیدیا مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ میں نے اپنے عریضہ میں لکھا تھا کہ آپ اپنے الفاظ میں اس مضمون کو تحریر فرمائیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ زیادہ موثر ہوگا، اس میں تو کوئی تواضع یا تصنع نہیں کہ میری تحریر بے ربط ہوتی ہے کہ بولنے کا سلیقہ نہ لکھنے کا، آپ نے اکابر کے متعلق جو لکھا وہ حرف بحرف صحیح ہے، بہت سے اکابر کی صورتیں خوب یاد ہیں۔

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے دور سے ان اکابر کو بہت کثرت سے دیکھنے کی نوبت آئی بلا مبالغہ صورت سے نور ٹپکتا تھا اور چند روز پاس رہنے سے خود بخود طبائع میں دین کی عظمت اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوئی تھی، حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے متعلق بہت سے جاہلوں کو میں نے خود دیکھا کہ بیعت ہونے کے بعد تہجد نہیں چھوٹا اور بعض جاہلوں کو تو یہاں تک دیکھا کہ کوئی نیا مولوی اپنے وعظ میں کچھ ادھر اُدھر کی کہہ دیتا تو وہ آکر پوچھتے کہ فلاں مولوی صاحب نے وعظ میں یوں کہا ہے۔

نانگل کے قریب ایک گاؤں تھا، اس وقت نام تو یاد نہیں رہا، میرے دوست کہتے ہیں کہ آپ بیتی

میں یہ قصہ آ گیا ہے، یہاں کے ایک رہنے والے جن کو میں شاہ جی کہا کرتا تھا ہر جمعہ کو سردی ہو یا گرمی یا بارش ہو ہر جمعہ کو نانگل سے پیدل چل کر جمعہ حضرت گنگوہی کے یہاں پڑھا کرتا تھا اور جمعہ کے بعد حضرت گنگوہی کی مجلس میں شریک ہو کر عصر سے پہلے چل کر عشاء کے بعد اپنے گھر پہنچ جایا کرتا تھا اور حضرت شیخ الہند کا قصہ تو مشہور ہے کہ جمعرات شام کو مدرسہ کا سبق پڑھا کر ہمیشہ پیدل گنگوہ تشریف لے جایا کرتے تھے اور شنبہ کی شب میں عشاء کے بعد یا تہجد کے وقت گنگوہ سے چل کر شنبہ کی صبح دیوبند میں سبق پڑھایا کرتے تھے، یہ مناظر آنکھوں میں گھومتے ہیں اور دل کو تڑپاتے ہیں، آپ نے جو اشکال کیا وہ بالکل صحیح ہے، مگر اس تالی کے ساتھ مقدم کا تحقق ہو جائے تو سب کچھ ہے یقیناً قرآن پاک کی اور حدیث کی تعلیم تو بہت اونچی ہے اور اس میں سب کچھ ہے۔ اس کا مقابلہ کوئی چیز کیا کر سکتی ہے۔

مگر تابعین کے زمانہ سے قلبی امراض کی کثرت ہے، اس زمانے کے مشائخ کو ان علاجوں کی طرف متوجہ کیا جیسا کہ امراض بدنیہ میں ہر زمانے کے اطباء نے نئے نئے امراض کے لیے نئی نئی دوائیں ایجاد کیں، ایسے ہی اطبائے روحانی نے قلوب کے زنگ کے لیے ادویہ اور علاج تجویز کیے، میری نظر میں ایسے اشخاص گزرے ہیں جو دورہ سے فراغ پر صاحب نسبت ہو جاتے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ کی تاثیر سے دل کے غبار چھٹ جاتے تھے اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے خود اعتراف کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن سے ہم نے ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے کہ اپنے قلوب میں تغیر پانے لگے۔ اوکما قال

اس قوت تاثیر کا نمونہ امت کے افراد میں بھی پایا گیا، چنانچہ حضرت سید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے لوگوں میں بہت سے ایسے ہیں جن کو بیعت کے ساتھ ہی اجازت مل گئی، اس کے نظائر تو آپ کے علم میں مجھ سے زیادہ ہوں گے، حضرت میانجی صاحب نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ کے یہاں تلاوت قرآن کے درمیان میں یہ بہت سے مراحل طے ہو جایا کرتے تھے، مگر یہ چیز تو قوت تاثیر اور کمال تاثیر کی محتاج ہے جو ہر جگہ حاصل نہیں ہوتی کہیں یہ چیز حاصل ہو جائے تو یقیناً ذکر و شغل کی ضرورت نہیں، یہ طرق وغیرہ تو سارے مختلف انواع علاج ہیں، جیسا ڈاکٹری، یونانی، ہومیو پیتھک وغیرہ اطبائے بدنیہ نے تجربوں سے تجویز کیے ہیں۔

اسی طرح اطبائے روحانی نے بھی تجربات یا قرآن و حدیث کے استنباطات سے امراض قلبیہ کے علاج تجویز فرمائے کہ قرآن پاک و احادیث میرے خیال میں مقویات اور جواہرات ہیں لیکن جس کو پہلے معدہ کے صاف کرنے کی ضرورت ہو اس کو تو پہلے اسہال کے لیے ہی دوا دیں گے، ورنہ قوی غذائیں ضعفِ معدہ کے ساتھ بجائے مفید ہونے کے مضر ہو جاتی ہیں، آپ نے فرمایا کہ

مزید رہنمائی کا محتاج ہوں، میں آپ کی کیا رہنمائی کر سکتا ہوں:

او کہ خود گم است کرا رہبری کند

چونکہ طلبہ میں اب (جیسا کہ آپ نے بھی لکھا) بجائے تلاوت کے لغویات کی مشغولی رہ گئی، بلکہ بعض میں تو انکار اور استکبار کی نوبت آجاتی ہے، اسی لیے اس کی ضرورت ہے کہ قرآن وحدیث اور اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے کے لیے کوئی لائحہ عمل آپ جیسے حضرات غور سے تجویز فرمائیں پہلے ہر شخص کو اپنی اصلاح کا خود فکر تھا وہ خود ہی امراض کے علاج کے لیے اطباء کو ڈھونڈتے تھے۔

اب وہ امراضِ قلبیہ سے اتنے بیگانہ ہو چکے ہیں کہ مرض کو مرض بھی نہیں سمجھتے، کیا کہوں اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا کرنے پر قادر بھی نہیں اور ان مہمانانِ رسول کی شان میں تحریر میں کچھ لانا بھی بے ادبی سمجھتا ہوں ورنہ اہلِ مدارس کو ان سب کے تجربات خوب حاصل ہیں کہ جماعت اور تکبیر اولیٰ کے اہتمام کے بجائے سگریٹ اور چائے نوشی میں جماعت ہی جاتی رہتی ہے، فالی اللہ المشتکی، آپ نے تو میرے مافی الضمیر کو خود ہی اپنی تحریر میں واضح فرمادیا۔

آپ جیسے ناقص تو ہم جیسے کاملوں سے بہت اُونچے ہیں میرا مطلب تو آپ اور مفتی شفیع صاحب وغیرہ بقیۃ السلف کو اس لائن کی طرف متوجہ کرنا تھا کہ یہ پہلو بھی آپ کے ذہن میں رہے تو اچھا تھا، میری بے ربط تحریرات تو اشاعت کے قابل نہیں ہوتیں، آپ حضرات اپنی حسنِ تدبیر، حسنِ رائے سے مدارس عربیہ کے طلبہ کو کم سے کم قرآن وحدیث کی عظمت اور اس سے محبت پیدا کرنے کی کوئی تجویز فرمائیں تو بہت حد تک اصلاح کی امید ہے، ورنہ آپ یہ دیکھ ہی رہے ہیں کہ قرآن وحدیث کے پڑھنے پڑھانے کا اسٹرائیکوں سے مقابلہ کیا جارہا ہے، فقط والسلام

حضرت شیخ الحدیث صاحب
بقلم حبیب اللہ

۲۰ جنوری ۷۶ء مدینہ طیبہ

اس پر مولانا بنوری کا جواب آیا:

۲۳ صفر ۱۳۹۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مخدوم گرامی مائر برکت ہذہ العصور حضرت شیخ الحدیث زادہم اللہ برکات وحسنات

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"تحیۃ من عند اللہِ مُبارکۃ طیبۃ"

والا نامہ گرامی نے ممنون ومشرف فرمایا، جواب میں حسبِ عادت تاخیر ہوتی جاتی ہے، اب تو یہ

تقصیر عادت ہی بن گئی، الحمدللہ تعالیٰ کہ قلمی ہے قلبی نہیں، سابق مکتوب برکت مختصر تمہید کے ساتھ بینات'' میں شائع ہوگیا، آپ کے کلمات میں جو تاثیر ہوگی، ہماری روایت بالمعنی اور تشریح میں کہاں وہ برکت اس لیے ان کلمات کو بعینہا شائع کرنا قرین مصلحت سمجھا اور اس لیے ادباً تعمیل حکم سے قاصر رہا میں تو کسی کے جوتوں کے صدقہ کچھ لکھ لیتا ہوں ورنہ اردو کہاں اور ہم کہاں۔

خیر، حق تعالیٰ جزائے خیر عطاء فرمائے کہ تفصیلی جواب سے سرفراز فرمایا اور بہت کچھ باتیں آجاتی ہیں اور ہمیں اور دوسروں کو استفادہ کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن مخدوما! میرا مقصد طرق و سلاسل ومشائخ کے اذکار واعمال واشغال ومراقبات ومجاہدات کی افادیت میں ہرگز نہ تھا۔ الحمدللہ تعالیٰ کہ ان پر قلب مطمئن ہے کہ امراض نفوس کا بھی علاج ہے اور ان تدابیر کے سوا چارہ کار نہیں اور اگر امراض نہ ہوں تو شارع علیہ السلام نے جو غذائے روحانی مقرر فرمایا ہے اور فرض قرار دے دیا ہے وہی نسخہ شفاء مزید کی حاجت ہی نہیں۔ مقصد شبہ کا صرف اتنا تھا کہ ذکر اللہ کی برکات وانوار تو بہرحال درس قرآن حفظ، تلاوت قرآن سے حاصل ہوجاتے ہیں۔ طلبہ کے نفوس کا علاج وہ نہیں بلاشبہ اس کے لیے مخصوص طرق علاج کی ضرورت ہے۔

اس لیے گزارش کی تھی کہ ہر درسگاہ کے ساتھ ایک خانقاہ کی بھی ضرورت ہے۔ جو طلبہ فارغ ہوں اس سے وابستہ ہوں اور کچھ عرصہ اس مقصد کے لیے اقامت بھی کریں۔ خدا کا شکر کہ آپ کی خواہش ذاکرین کے اجتماع اور اجتماعی ذکر کی تدبیر کی گئی۔ اس ہفتہ اس کا افتتاح بھی ہوجائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ شب جمعہ کچھ طلبہ ہفتہ وار مکی مسجد بھی جایا کرتے ہیں۔ امسال جو طلبہ فارغ ہوں گے۔ تیرہ (۱۳) طلبہ نے ایک سال کے لیے تبلیغ میں وقت لگانے کا عزم کرلیا ہے اور نام بھی لکھوا دیئے ہیں اور ایک چلہ والے تو بہت ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اگر آپ کی دعائیں رہیں تو ان شاءاللہ تعالیٰ مافات کی تلافی رہے گی آپ کا دوسرا گرامی نامہ بھی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے چند اساتذہ کے مجمع میں سنادیا بہت محظوظ ہوئے وہ آپ کی تدبیر وتجویز پر عمل کرنا سوچ رہے ہیں۔ بہت عجلت اور تشویش خاطر میں چند سطریں گھسیٹ دی ہیں تا کہ مزید تاخیر نہ ہو۔

والسلام

محمد یوسف بنوری

جواب از زکریا۔

باسمہ سبحانہٗ

المخدوم المکرم حضرت مولانا الحاج محمد یوسف صاحب بنوری زادت معالیکم۔

بعد سلام مسنون

گرامی نامہ مورخہ ۳ صفر بذریعہ رجسٹری پہنچا اور بینات کا وہ پرچہ بھی پہنچ گیا۔ جس میں جناب نے اس ناکارہ کا وہ خط بھی طبع کر دیا۔ میں نے لکھا تھا کہ میرا مضمون بعینہ نہ چھاپا جائے بلکہ میرے مضمون کو اپنے الفاظ میں مفصل تحریر فرمائیں وہ محض تواضع نہیں تھی بلکہ تحریر وتقریر پر عدم قدرت منشاء تھا، مگر جناب کے گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ جناب نے ازراہِ محبت اس کو بعینہ شائع فرمادیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس محبت کو طرفین کے لیے دینی ترقیات کا ذریعہ بنائے اس سے بہت مسرت ہوئی کہ جناب نے اس ناکارہ کی درخواست پر خانقاہ کا افتتاح بھی فرمادیا۔ اللہ تعالیٰ برکت فرمائے مثمر ثمرات بنائے۔ میرے اس مضمون پر کوئی تائید یا تنقید کسی سے آئی ہو تو مطلع فرمائیں۔ کسی اور مدرسہ نے اس پر توجہ کی یا نہیں؟

یہ امنگیں تو میرے سینہ میں کئی سال سے چل رہی ہیں اور اپنی طرف سے تدبیریں بھی اس کی کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہوں مگر ذکر کی طرف توجہ اب کم ہوتی جارہی ہے اور چونکہ اکابر کے زمانہ میں طلبہ کو اس سے الگ رکھا گیا اس لیے عام طور سے ذہنوں میں اس کی اہمیت بھی کم ہوتی جارہی ہے۔ طلبہ کو الگ رکھنا تو میرے ذہن میں اب بھی ہے۔ لیکن مدرسوں میں اس کا سلسلہ قائم کرنے کی ضرورت بڑھتی ہی جارہی ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی بہت اہتمام سے اس پر لبیک فرمائی تھی اور شروع کرنے کا وعدہ بھی فرمالیا تھا آپ کی مساعی جمیلہ سے اگر مدرسوں کا ذکر کا سلسلہ شروع ہوگیا تو میرا خیال ہے کہ بہت سے فتنوں کا سدباب ہو جائے گا۔

مصر سے مولوی عبدالرزاق صاحب کا خط آیا تھا جس سے معلوم ہوا کہ وہ (فتنہ مودودیت) کی تعریب کے کام میں مشغول ہیں انہوں نے شاہد کے نام ایک پرچہ بھیجا تھا جس میں اس کی روایات حدیث کا حوالہ لکھنے کو لکھا تھا عزیز شاہد ان کو لکھ رہا ہے۔ یہاں کتابیں کم ملتی ہیں۔ بلکہ زیادہ تر مصری ملتی ہیں۔ اس لیے اس کی تلاش میں دیر لگ رہی ہے۔ میرے مسودہ پر تو صفحات سب پر پڑے ہوئے ہیں مگر میرے مسودات میں کتابیں وہی ہوتی ہیں جو بہت قدیم چھپی ہوئی ہیں ان ہی میں پڑھا پڑھایا اور ان ہی سے دل چسپی ہے میری۔ ابوداؤد وہ ہے جس میں میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ۱۲ھ میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے ابوداؤد شریف پڑھی۔ بہت قدیم نسخہ ہے۔ اسی میں انہوں نے پڑھایا وہی پھر میرے پاس رہا۔ نئی مطبوعات باوجود بہت واضح اور صاف ہونے کے مجھے مناسبت ان ہی کتابوں سے ہے جو بہت پرانی ہیں۔ نئی کتابیں میرے لیے ایسی ہی اجنبی ہیں جیسے ممالک عربیہ والوں کے لیے لیتھو کی طباعت۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے جناب کی صحت وقوت میں اضافہ فرمائے اور اپنی رضا و مرضیات پر زیادہ سے زیادہ کام لے۔

فقط والسلام

حضرت شیخ الحدیث
بقلم حبیب اللہ
۱۲/۶/۶۲ء مدینہ طیبہ

اس موقع پر جہاں اہل مدارس سے درخواستیں کر رہا ہوں اور کرتا رہتا ہوں وہاں ذاکرین حضرات کی خدمت میں بھی ایک بہت اہم بات دفعۃً لکھوانے کا خیال آ گیا۔ میری تحریرات تو بے ربط ہوتی ہیں اور اس آپ بیتی میں تو نہ معلوم کتنے مضامین مکرر آ چکے ہیں مگر اس وقت اکابر کے خطوط کے ذیل میں اس پر تنبیہ کرنے کا خیال پیدا ہو گیا۔

شیخ المشائخ قطب الارشاد حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ ایک دفعہ دوپہر کا کھانا تناول فرما کر مکان سے تشریف لائے۔ بہت استغراق میں تشریف لا رہے تھے۔ خانقاہ میں اپنی سہ دری میں پاؤں رکھنے کے بعد فرمایا کہ یہاں کون کون ہے؟ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے عرض کیا۔ یحییٰ، الیاس (میرے چچا جان) حضرت نے نہایت بھرائی ہوئی آواز میں زور سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا نام چاہے کتنی ہی غفلت سے لیا جائے اثر کیے بغیر نہیں رہتا۔

اور بالکل سچ فرمایا مجھے بھی بہت تجربہ اس کا ہوا۔ رمضان میں جو ذاکرین جمع ہو جاتے ہیں صرف ایک ماہ میں ان پر ذکر کے اثرات بہت زیادہ ہو جاتے ہیں۔ مگر رمضان کے بعد اپنے مشاغل میں لگ کر وہ اثرات جاتے رہتے ہیں۔ بہت کثرت سے رمضان کے بعد خطوط آتے ہیں کہ جو بات رمضان میں تھی وہ اب نہیں رہی۔ میں لکھتا رہتا ہوں کہ یہ تو ذکر کی پابندی کا اثر ہے۔ یہاں ماحول کی وجہ سے پابندی ہوتی ہے اور گھر جا کر اپنے مشاغل میں مشغولی ہو جاتی ہے۔ اس لیے ذاکرین کے لیے بھی بہت ضروری ہے کہ وہ ذکر کے اثرات اگر محسوس ہوں تو ان کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر تو ضرور ادا کریں مگر اس سے اگر ذرا سا عجب گھمنڈ اور کچھ وقعت دل میں آئی تو شیطان ایسی بری طرح دھکا دیتا ہے کہ پھر جو ذکر کے اثرات ہوئے تھے نہ صرف یہ کہ وہ ضائع ہو جاتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

میری تحریرات میں کثرت سے یہ مضمون کئی جگہ گزر چکا ہے اور ''لامع'' کے شروع ہی میں نزول وحی کی حدیث میں جس میں حضرت جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اقراء پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ اس کے حاشیہ پر بہت تفصیل سے میں نے یہ مضمون نقل کیا ہے کہ ہمارے شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ نے تفسیر عزیزی میں تحریر فرمایا ہے کہ نسبت کی چار قسمیں ہیں۔

(۱)...... انعکاسی جو ذکر شروع کرنے کے بعد جب ذکر کا اثر قلب پر پڑتا ہے تو شیخ کے قلب کا

اثر ذاکر کے قلب پر پڑتا ہے اس کو نسبت انعکاسی کہتے ہیں۔ یہ بہت ضعیف ہوتی ہے۔

(۲)......القائی، جب ذاکر کے قلب میں رسوخ پیدا ہو جائے۔ تو شیخ کی توجہ سے نسبت کا القاء ہوتا ہے۔ میرے اکابر کی زیادہ اجازتیں اسی نسبت پر ہوتی ہیں۔ یہ پہلی سے زیادہ قوی ہے اور تیسری سے بہت کم۔

(۳)......اصلاحی۔ یہ پہلی دونوں سے بہت زیادہ قوی ہوتی ہے اور دیرپا۔ اس کی مثال حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھی ہے کہ کوئی شخص چھوٹی نہر کھودے اور اس کو خوب صاف شفاف کردے اور کسی دریا سے اس کا جوڑ ملا دے تو اس میں اگر کچھ معمولی عوارض بھی آجائیں پتے وغیرہ تو پانی کا بہاؤ ان کو بہالے جائے گا۔ بندہ کا خیال یہ ہے کہ قدماء کی اجازت زیادہ تر اسی پر ہوتی تھی۔

(۴)......اتحادی ہے اور بندہ کا خیال یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی نسبت حاصل تھی۔ یہ سب سے زیادہ قوی ہوئی۔ میرے کاتب نے بتایا کہ یہ مضمون تو تفصیل کے ساتھ آپ بیتی نمبر ۵ میں آچکا ہے۔ اس وقت تو متنبہ کرنا اس پر ہے کہ بعض آدمی پہلی نسبت پر مطمئن ہو جاتے ہیں وہ بہت ضعیف ہے اور مشائخ بھی بعض مصالح کی بناء پر پہلی پر اجازت دے دیتے ہیں۔ اجازت ملنے کے بعد ذاکرین اپنے کو شیخ سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ یہ بڑی خطرناک چیز ہے اس لیے ذاکرین کو بہت احتیاط کی ضرورت ہے کہ ذکر کے اثرات سے کبھی عجب و گھمنڈ میں مبتلا نہ ہوں کہ یہ بہت ہی خطرناک چیز ہے۔ اجازت ہونے کے بعد بھی جب اسباب اجازت زائل ہو جاتے ہیں تو وہ اجازت باقی نہیں رہتی۔ حضرت تھانوی نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ کا ایک مضمون اشرف السوانح جلد ثالث میں نقل کیا گیا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

نمبر۴: تنبیہ متعلق اجازت یافتگان میں نے مختلف اوقات میں جن صاحبوں کو بیعت لینے اور تعلیم و تلقین کی اجازت دی ہے ان میں سے بعض حضرات مجھ سے خط و کتابت اس قدر کم رکھتے ہیں کہ وہ ان کے حالات موجودہ کے اندازہ کرنے کے لیے کافی نہیں اور اجازت کی حالت کا (کہ ان کا حاصل حالاً درستی اور بنابر مناسبت مآلاً توقع رسوخ ہے) متغیر ہو جانا کچھ مستبعد نہیں ''فان الحی لا تومن علیه الفتنه'' بلکہ یہ احتمال بعد راسخ ہو جانے کے بھی محال نہیں اگرنادر بحکم معدوم ہے کیونکہ رسوخ واقعی کا جس میں تغیر عادتاً محال ہے علم قطعی کس کو ہو سکتا ہے اور ظن کی خود حقیقت جانب مخالف کے محتمل ہونے کو بتلا رہی ہے۔

اس لیے احتیاطاً سب مجازین کے متعلق بالخصوص مکاتبت نہ رکھنے والوں کے بارے میں عرض عام ہے کہ ان سے رجوع کرنے میں محض میری اجازت پر اعتماد نہ رکھیں بلکہ جو علامات احقر نے تعلیم الدین میں صاحب کمال کی لکھی ہیں ان پر منطبق کر کے عمل کریں۔ میں اپنے بعد اس کا بار

نہیں رکھنا چاہتا۔ تعلیم الدین میں شیخ کامل کے شرائط حضرت نے یہ تحریر فرمائے ہیں:
''اول علم شریعت سے بقدر ضرورت واقف ہو خواہ تحصیل سے یا صحبت علماء سے تا کہ فساد عقائد واعمال سے محفوظ رہے اور طالبین کو بھی محفوظ رکھ سکے۔ ورنہ مصداق!

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

کا ہوگا۔ دوم متقی ہو یعنی ارتکاب کبائر و اصرار علی الصغائر سے بچتا ہو۔ سوم تارک دنیا، راغب آخرت ہو۔ ظاہری باطنی طاعات پر مداومت رکھتا ہو۔ ورنہ طالب کے قلب پر برا اثر پڑے گا۔ چہارم مریدوں کا خیال رکھے کہ کوئی امر ان سے خلافِ شریعت وطریقت ہو جائے تو ان کو متنبہ کرے پنجم یہ کہ بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہو۔ ان سے فیوض و برکات حاصل کیے ہوں اور ضروری نہیں کہ اس سے کرامات اور خوارق بھی ظاہر ہوتے ہوں نہ یہ ضروری ہے کہ تارک کسب ہو بلکہ دنیا کا حریص وطامع نہ ہو۔ اتنا کافی ہے۔ (از قول جمیل)

اس ناکارہ نے اسی رسالہ کے شروع میں ارشاد الملوک سے شیخ کے شرائط تفصیل سے لکھے ہیں انہیں بھی اس کے ساتھ پڑھ لیا جائے۔

حضرت شاہ عبدالحق صاحب ردولوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح (صفحہ ۷۰) میں لکھا ہے کہ کسی شخص کو حلقہ ارادت میں لینے سے بیشتر آپ آزمالیتے تھے کہ ان میں غرور نفس، غلط قسم کی خودی، محنت سے عار، جھوٹی لگن تو نہیں ہے۔ اسی لیے یہ طریقہ بنالیا تھا کہ اصلاح نفس کے لیے طالب سے آٹھ دن خانقاہ کا پانی بھرواتے، لکڑی ڈھلواتے، جاروب کشی کرواتے اور دوسری خدمات لیتے، مرید کرنے کے بعد پرکھا اور جانچا کرتے کہ لغزش تو نہیں ہوئی، مرید کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھتے تھے کہ اس پر کوئی شرعی ذمہ داری تو نہیں ہوئی۔

مثلاً شیخ بختیار جونپوری نے حلقہ ارادات میں داخل ہونے کی گزارش کی، وہ ایک سوداگر کے غلام تھے، آپ نے ان سے فرمایا کہ جا کر اپنے آقا کی رضا حاصل کرو، اسی طرح مخلص شاہ صاحب سے فرمایا کہ اپنے لڑکے اور لڑکی کی شادی بیاہ وغیرہ سے فراغت پانے کے بعد آؤ۔ ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔

مریدین اپنی شرعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآمد ہونے کے بعد طاعت وعبادت میں مشغول ہوتے تھے ہر صحت مند مرید محنت اور روزگار سے اپنے کنبہ کی پرورش کرتا تھا باقی وقت خانقاہ شریف میں گزارتا تھا۔

یہ مضمون تو بہت طویل ہے اور اسی آپ بیتی میں بہت سی جگہ آ بھی چکا ہے اور میرے مخلص دوست صوفی اقبال نے میری آپ بیتی سے اس قسم کے مضامین یکجا جمع کر دیئے ہیں جس کا نام

''اکابر کا سلوک واحسان'' ہے یہاں ان مضامین کا لکھوانا طول کا سبب ہو جائے گا۔
میرا مقصد تو اس جگہ سالکین کو تنبیہ کرنا ہے کہ اجازت کے حاصل کے ہو جانے کے بعد بے فکر ہرگز نہ ہوں۔ نسبت ایک تعلق ہے اس کے بقاء بلکہ اضافہ کی کوشش ہر وقت کرتے رہیں اور اجازت پر بے فکر ہو کر کام نہ چھوڑ دیں ورنہ ہر وقت اس کے زائل ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہ مضمون تو بیچ میں طویل ہو گیا۔ اصل قصہ تو مفتی شفیع صاحب سے ملاقات کا چل رہا تھا۔ مفتی صاحب کے مدرسہ سے نمٹ کر مولانا یوسف بنوری کے مدرسہ میں گئے۔ محمد بنوری نے اپنا کمرہ تجویز کر رکھا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ابوالحسن کو دیکھنے کے لیے بھیجا۔ اس نے بہت پسند کیا۔ اس لیے اول ان کے مدرسہ میں گئے ناشتہ وغیرہ سارے رفقاء نے کیا۔ زکریا نے سادی چائے حسب وعدہ پی۔ پھر اس کے کمرہ میں گیا تو وہ واقعی بہت ہی پسندیدہ تھا۔
مولوی احسان نے رات ہی الٹی میٹم دے دیا تھا کہ شام کو عورتوں کا اجتماع ہے۔ کھانے کے بعد حاجی صاحب ہی کے یہاں سو جانا۔ مگر مجھے وہاں تکلف تھا۔ لیکن محمد کا کمرہ بہت پسند آیا اس لیے حاجی فرید کے یہاں سے وہیں آ گیا ظہر کی نماز پڑھ کر متصلاً جانا قرار پایا تھا۔ میرے لیے تو وہ اپنی گاڑی لے کر ظہر کے بعد محمد بنوری کے کمرہ میں پہنچ گئے اور میں سیدھا ان کے یہاں پہنچ گیا مولوی انعام صاحب علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔
قاری طیب صاحب اس وقت پنڈی سے طیارہ کے ذریعہ کراچی پہنچے اور مطار سے سیدھے حاجی صاحب کے مکان پر پہنچ گئے مولوی سالم بھی ساتھ تھے۔ قاری صاحب کا قیام مولوی طاہر مرحوم کے لڑکوں طاہر وغیرہ کے مکان پر ہوا کرتا تھا۔ ۲ بجے حاجی صاحب کی لڑکی صفیہ کا نکاح ہوا۔ زکریا کی درخواست پر قاری صاحب نے نکاح پڑھایا۔ پاکستان میں نکاحوں کا دستور یہ ہے کہ ورقہ سے پہلے جملہ امور لڑکی کا نام اس کے باپ کا نام لڑکے اور اس کے باپ کا نام وغیرہ سب چیزیں درج ہوتی ہیں وہ ناکح کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے۔ وہ اس کے موافق نکاح پڑھا دیتا ہے۔
کھانے کے بعد زکریا کو حاجی صاحب زنانہ میں لے گئے وہاں عورتوں کو بیعت کیا، ہر ایک نے الگ الگ اپنے لیے دُعاء کو کہا، تقریباً ایک گھنٹہ اس میں لگ گیا، حاجی فرید صاحب میرے زنانہ سے اُٹھنے کے بعد یہ کہہ کر کہ قاری صاحب میرے انتظار میں باہر آ گئے اور ان کے لڑکے کے ساتھ محمد بنوری کے کمرے میں آ گیا اور سو گیا، پونے پانچ پر اپنی نماز پڑھ کر طلحہ قریشی کی گاڑی میں اچھن میاں کے مکان پر مبارک باد کے لیے گیا وہ خود تو اوپر کی منزل پر رہتے ہیں، مگر زکریا کی وجہ سے انہوں نے اپنے پڑوس کے نیچے کی منزل خالی کرائی تھی۔

معلوم ہوا وہ صاحب بھی سہارنپور کے رہنے والے تھے اور ہمارے مہتمم مولانا عنایت الٰہی صاحب نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ کے پوتے ہیں، انہوں نے اپنا تعارف بھی تفصیل سے کرایا مگر مجھے اس وقت یادنہیں وہ اچھن میاں سے کہتے تھے کہ میری تو ہمت تھی نہیں کہ میں اپنے مکان پر آنے کی دعوت دوں، تمہاری برکت سے میرے مکان پر بھی آگئے وہاں چائے وغیرہ پی کر ایسے وقت اُٹھے کہ مغرب کی نماز تک کی مسجد پہنچ گئے اور سیدھے مسجد گئے، وہاں مولوی احمد لاٹ کی تقریر ہورہی تھی زکریا کے پہنچنے پر ایک دم مجمع ٹوٹ پڑا۔

مجبوراً تقریر بند کرنی پڑی اور زکریا کو بھی سب کو ڈانٹنا پڑا، فرض پڑھتے ہی اپنے حجرے میں پہنچ گیا، عمر احمد تھانوی، قمر علی تھانوی وغیرہ سے ملاقات ہوئی، عمر نے وعدہ کیا کہ مفتی عبدالمالک کے صاحبزادے جو مولانا ظفر احمد کی سوانح لکھ رہے ہیں، زکریا نے تقاضا کیا طباعت کے بعد فوراً میرے پاس بھیجے مگر ڈاک سے ہرگز نہ بھیجیں، کسی معتبر کے ہاتھ یا مولانا بنوری کے پاس بھیج دیں، وہاں سے دستی رسائل میرے پاس پہنچتے رہتے ہیں، جمعرات کے دن صبح کو خصوصی ملاقاتوں کا زور رہا ایک مسماۃ کمرہ میں آکر بیٹھ گئی اور کسی کے تقاضہ کرنے پر بھی نہیں اُٹھی آخر لوگوں کو بلا لیا گیا پھر بھی نہ اُٹھی تو مجبوراً احسان وغیرہ نے زبردستی اُٹھایا، ظہر کے بعد زکریا تو یخنی پی کر لیٹ گیا، احباب نے کھانا کھایا، عصر کے بعد مصافحہ تجویز تھا، مگر دس منٹ میں ہی مجمع بے قابو ہوگیا، تو یہ کہہ کر میں معذور ہوں مصافحہ نہیں کرسکتا، یہ کہہ کر اپنے کمرہ میں آگیا۔

مغرب کے بعد حسب قرارداد حاجی فرید صاحب اپنی گاڑی لے کر چلے آئے اور پیشاب وغیرہ سے فارغ ہوکر وضو کرکے ان کی گاڑی میں بیٹھ کر مطار آگئے، زکریا اور مولوی انعام کی گاڑی حاجی فرید صاحب کی مساعی سے طیارہ تک پہنچ گئی اور وہیں اول وقت عشاء پڑھی اور نہایت اطمینان سے سواریوں کے داخل ہونے سے پہلے سے جدہ جانے والے جہاز کے اگلے حصہ پر ایک سیٹ پر میں شاہد، زبیر دوسرے پر مولوی انعام صاحب، مولوی عمر اور سلیمان جھانجی بہت اطمینان سے بیٹھ گئے جانے والوں نے الوداعی مصافحہ معانقہ کیا، ابوالحسن نے رونے کا شور مچا کر جہاز والوں کو اکٹھا کردیا بڑی مشکل سے اس کو دھکیلا۔

قادری صاحب بھی ہمارے جہاز پر مشایعت کی نیت سے آئے ان کا نمبر نہیں تھا، مگر مردوں کے جانے کے بعد سیڑھی کے ہٹنے کے بعد جہاز میں کام کرنے والیاں مسمات کا دور دورہ شروع ہوا، انہوں نے اول مولانا انعام صاحب کی سیٹ خالی کرائی اور میرے پیچھے کی سیٹ پر منتقل کیا، میں تو یارب سلم سلم پڑھتا رہا، مگر اللہ کا شکر ہے کہ مجھ پر حملہ نہیں ہوا، جہاز کا کپتان تو روپوش ہوگیا اور لوگ جی حضور گردن جھکائے دیکھتے رہے، ۸:۱۰ پر پرواز کا وقت تھا مگر ۸:۳۰ پر پرواز ہوئی، دو گھنٹے بعد

کھانا لایا گیا۔ زکریا نے بھی اپنی تپسی لے کر عزیزان زبیر شاھد کو دے دی کہ مجھے تو کھانا نہیں تھا، فیرینی مولوی محمد عمر کو دے دی، سالن کی رکابی مکمل بچ گئی جو واپس کردی، باقی ان دونوں نے نمٹا دی، ظہران کے قریب جہاز کو نیچے اُتارا گیا اور کپتان نے اول زکریا کو حضرت شیخ الحدیث کے لفظ سے سلام کیا اور کہا کہ آپ کی وجہ سے جہاز کو نیچے کیا گیا ہے یہ جہاز کے دونوں طرف پیٹرول کے کنویں ہیں۔

زکریا کو بجز اس کے کچھ نظر نہ آیا کہ سینکڑوں کھمبے بجلی کے نظر آئے، شاہد نے بتایا کہ وہ بجلی نہیں تھی بلکہ آگ کے شعلے تھے جو کنویں سے نکل رہے تھے، ۱۲:۲۰ کے قریب جدہ کے مطار پر پہنچے اور اس سے پہلے تقریباً ۱۵ منٹ فضا میں چکر کاٹتے رہے، بعد میں معلوم ہوا کہ جدہ کے مطار پر ساٹھ جہاز تھے جن کی وجہ سے اُترنے کی جگہ نہیں تھی، اُترنے کے بعد بھی بیس منٹ تک قید میں رہے کہ سیڑھی نہ آئی بعد میں معلوم ہوا کہ کوئی سیڑھی خالی نہیں تھی ۲۰ منٹ کے بعد ایک سیڑھی آئی سب اسی سے اُترے البتہ اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر ظفیر اور عزیز سعدی دونوں طیارہ پر ہیں جن سے بہت اطمینان ہوا۔

جہاز والوں نے زکریا سے کہہ دیا کہ آپ اطمینان سے بیٹھے رہیے، ان سب کو پہلے اُتر جانے دیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، البتہ دستی سامان سارا رفقاء نیچے سعدی اور ڈاکٹر صاحب کی گاڑی میں رکھتے رہے سب سے آخر میں زکریا اپنی کرسی پر اُترا اور رابطہ کی گاڑی میں جو عزیز سعدی کی مساعی سے آئی ہوئی تھی، سعدی کے گھر پہنچ گئے، عزیزان زبیر، شاہد سامان کے ساتھ کسٹم سے ہو کر بعد میں پہنچے، رابطہ کی گاڑی میں زکریا مولوی انعام حبیب اللہ و اسماعیل تھے، ڈاکٹر اسماعیل کی گاڑی بھی جس میں صوفی اقبال وغیرہ رفقاء تھے اور سعدی کی گاڑی بھی جس میں ماموں یامین وغیرہ تھے سعدی کے گھر پہنچے، زکریا نے کہا کہ پہلے طواف کرنا ہے، پیشاب وضو کر کے رابطہ ہی کی گاڑی مین حرم پہنچے، مولوی انعام صاحب سعدی ہی کے مکان میں سو گئے، تجویز ان کی صفا پر جانے کی تھی، مگر حفاریز والے سب جدہ تھے، اس لیے وہ سعدی کے مکان پر لیٹ گئے، خالد، حکیم، اسرائیل وغیرہ بھی اسی کمرہ میں پہلے سے تھے۔

زکریا کو طواف عزیز حسان نے کرایا، عزیزان حبیب اللہ و اسماعیل وغیرہ بھی ساتھ تھے، ان سب کی خواہش تھی کہ سعی سے ابھی نمٹ جائیں مگر زکریا نے کہا کہ ساری رات ضائع ہو گی اس لیے واپس آ گئے، جب طواف سے واپس آیا تو سعدی کے مکان پر عزیزان زبیر و شاہد مولوی محمد عمر وغیرہ پہنچ گئے، بقیہ سامان کو عزیز عبد الحفیظ تقریباً ایک گھنٹہ بعد لے کر آیا، صبح کی نماز سب نے سعدی کے مکان پر ہی پڑھی اور اس کے بعد پھر لیٹ گئے، تین بجے ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر

عبدالحفیظ کی گاڑی میں مسعی پہنچے اس لیے کہ سعی کرنی تھی، مولوی انعام صاحب نے وہیں قیام فرمایا اور جمعہ کے قریب وہاں سے آئے زکریا نے اول سعی کی جس میں شاہد اور مولوی اسماعیل بھی شریک تھے، مولوی اسماعیل اس رات کو مدینہ سے پہنچے تھے، مولوی حبیب اللہ پہلے سے مکہ میں مقیم تھے، سعی سے فارغ ہو کر عزیز سعدی کے خلوہ نمبر ۳۰۰ میں پہنچ گئے جو کئی سال سے اس نے لے رکھا ہے اور اس وقت صالح دہلوی کو دے رکھا تھا، ان کو سعدی نے اپنے مکان سے ٹیلیفون کر دیا تھا کہ زکریا سعی کے بعد خلوہ میں جائے گا، اس لیے انہوں نے اپنے لڑکے کو بٹھا رکھا تھا اس کے ساتھ خلوہ میں پہنچ گئے۔

اللہ تعالیٰ عزیز سعدی کو بہت ہی جزائے خیر دے کہ اس کی وجہ سے بہت سی راحتیں مقامی اور عزیز عبدالحفیظ سلمہ جزاہُ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء کی وجہ سے ہر وقت ہر جگہ آنے جانے کی سہولت رہتی ہے کیونکہ وہ حرمین کے قیام میں مع گاڑی کے میرے لیے وقف رہتا ہے، جمعہ پڑھ کر مولوی انعام صاحب سمیت صولتیہ پہنچے، بھائی سلیم اُوپر تھے، زکریا نے زور سے کہا کہ آپ اُتریں گے تو مجھے تکلیف ہوگی، عشاء کے بعد کھانے پر ملاقات ہوگی، اللہ تعالیٰ بھائی سلیم کو بھی جزائے خیر دے کہ میری آمد پر وہ دیوان چھوڑ کر اُوپر تشریف لے جاتے ہیں، حالانکہ وہ بھی اب ٹانگوں سے معذور ہو گئے، ہر چند میں ان سے بار بار درخواست کرتا ہوں کہ میں دوسرے دیوان میں قیام کرلوں گا، مگر وہ اصرار کرتے ہیں کہ تیرا مستقر تو یہی ہے، یہی اکابر کا دیوان ہے۔

جمعہ کے بعد زکریا تو سو گیا اور احباب نے مولوی سعید خان کی دعوت کھائی جو مدرسہ میں آتی رہی، عصر مسجد مدرسہ میں پڑھ کر ملاقات کا وقت ہمیشہ کے دستور کے موافق رہا جس میں ہجوم آتا رہا مصافحہ کرتا رہا، ۱۱:۳۰ بجے حسب سابق وضو کر کے مسجد حرام باب العمرہ پر اپنی قدیم جگہ کنکریوں پر بیٹھ گیا، وہاں ایک دم ہجوم مصافحوں کا ہو گیا کہ ہنگامہ معلوم ہونے لگا، دو تین پولیس والے بھی آگئے، زکریا سے کہا کہ یہاں ہجوم نہیں ہونا چاہیے، زکریا نے کہا کہ میں نے تو نہیں بلایا، آپ ذمہ دار ہیں ہجوم کے ہٹانے کے، آپ ان سب کو ہٹا دیں، مگر وہ بار بار زکریا پر تقاضا کرتے رہے۔

زکریا نے کہا کہ تم سے تو ہٹتے نہیں میں کیسے ہٹاؤں، لوگوں کو بھی پولیس والوں نے ہٹانا چاہا، مگر مصافحہ کا دستور یہ ہے کہ دو چار کو کوئی کرتا دیکھے تو سارے ہی اُمنڈ آویں، بڑی مشکل سے مغرب تک کا وقت گزرا مگر ہجوم نے گھیرے رکھا، ایک شرطہ نے کرسی پر بھی اعتراض کیا، ساتھیوں نے کہا کہ ورقہ موجود ہے، پھر بھی اس نے کہا کہ اس کرسی کو باہر رکھ دو، مغرب سے عشاء تک بھی لوگ چکر لگاتے رہے مگر زکریا نے نفلوں کی نیت باندھ لی عشاء پڑھ کر واپسی ہوئی، اس وقت بھی ہجوم نے گھیر لیا، اس لیے دوسرے دن سے کنکریوں پر قیام ملتوی کر کے عزیز سعدی کے خلوہ کے سامنے

اوپر کی منزل پر مغرب وعشاء کی نماز تجویز کی گئی کہ وہاں بڑا سکون تھا۔
البتہ شرطوں کی طرف سے گاڑی پر اعتراض وہاں بھی رہا، جس کی وجہ سے جاتے ہی گاڑی کو خلوہ میں رکھوانا پڑا اور واپسی میں نکال کر آنا پڑا، زکریا کا معمول حسب سابق شب کو سعدی کے یہاں اور دن کو صولتیہ میں رہا، مگر حجاج کے ہجوم کی وجہ سے طواف رات کو نہ ہوسکا، اس لیے عشاء پڑھ کر کھانے سے فراغ پر جلدی ہی سعدی کے یہاں جانا ہوتا ہے اور صبح کو سعدی کے یہاں صبح کی نماز پڑھنے کی نوبت آتی تھی کہ مسجد تک بھی جانا مشکل تھا دو بجے تک ناشتہ وغیرہ سے فراغ پر صولتیہ دو، ڈھائی بجے کے درمیان میں پہنچنا ہوتا تھا، یہاں پہنچ کر ساڑھے پانچ تک خطوط اور خصوصی ملاقات وغیرہ پر بیعت کا وقت مقرر تھا اور ۶ بجے ظہر کی تیاری، ظہر کے بعد شوربہ پی کر لیٹ جانا اور عزیز حسان کا حسب دستور سابق ظہر تک آجانا اور تیل مل کر جانا، عصر کے بعد آدھ گھنٹہ کوئی کتاب سننا جو اولاً تازہ ''الفرقان'' جو مولانا منظور صاحب نعمانی نے دیا تھا اور اس کے بعد متفرق کتابیں ہوتی رہیں۔
اس کے بعد ملاقات عامہ ۱۱:۱۵ بجے تک، سوا گیارہ پر حرم کی تیاری مولوی انعام صاحب کی پہلی شب تو سعدی کے یہاں گزری اور جمعہ کی نماز کے بعد صولتیہ میں عزیز شمیم کی کوٹھری میں جو میرے دیوان کے سامنے ہی ہے قیام رہتا ہے، مولوی انعام صاحب نے چونکہ سعی اور طواف نہیں کیا تھا، اس لیے جمعہ کے دن بعد مغرب کے طواف کیا اور عشاء کے بعد سعی اور دیوان میں کھانا کھا کر مسجد حفائر چلے گئے، یہی ان کا مستقل معمول رہا کہ عشاء کے بعد مسجد حفائر چلے جاتے اور صبح کو وہیں تبلیغی شوریٰ ہوتا تھا اور ظہر حرم میں پڑھ کر مدرسہ صولتیہ آجاتے، عصر صولتیہ کی مسجد میں پڑھتے اور قبیل مغرب حرم چلے جاتے۔
مگر ۴ ذی الحجہ سے حرم کا جانا میرا اور ان کا بالکل بند ہوگیا اور نمازیں صولتیہ میں ہونے لگیں کہ ہجوم بہت زیادہ تھا، زکریا جب ۷ ذی الحجہ کی شام کو جب سعدی کے یہاں گیا تو اپنا اور رفقاء کا سامان ساتھ لے کر گیا کہ حج کے لیے مسجد حفائر سے جانا زکریا نے ہی طے کیا تھا کہ صولتیہ سے چلنے میں گاڑی کے پھنسنے کا قوی اندیشہ تھا اور حفائر سے منیٰ کا راستہ سیدھا تھا، مولوی انعام صاحب کے رفقاء کئی تھے ان کو سعدی کے یہاں آنا مشکل تھا، اس لیے طے ہوا کہ میں صبح کو نماز کے بعد حفائر آجاؤں گا اور وہیں سے منیٰ جاؤنگا، میرا ارادہ تھا کہ نماز پڑھتے ہی حفائر مگر قاضی جی نے بجائے حفائر جانے کے مجھے فون کردیا کہ گاڑی حفائر نہیں پہنچی سعدی وغیرہ کی رائے ہوئی کہ حفائر جانے میں وقت ہوگی۔ جب وہاں سے فون آجائے گا کہ گاڑی پہنچ گئی جب جائیں گے مگر زکریا تین بجے حفائر عبدالحفیظ کی گاڑی میں مع اپنی کرسی قدمچہ کموڈ کے پہنچا اور

سعدی اپنی کار میں ساتھ پہنچا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ لاری تو دو بجے سے کھڑی ہے اور سواق تقاضا بھی کر رہا ہے مگر اس کو ناشتہ وغیرہ کرا کر کہہ دیا گیا کہ ابھی ہمارے ساتھی جمع نہیں ہوئے جب ہی سعدی نے اپنے دوست کے مکان سے فون کیا کہ ہم پہنچ گئے اور گاڑی دو بجے سے کھڑی ہے اس پر قاضی جی اور دستگیر مع اپنی مستورات صولتیہ سے ٹیکسی میں روانہ ہوئے مگر وہ لائن میں پھنس گئی اس لیے پیدل پہنچے۔ بڑی دیر انتظار کے بعد سعدی اپنی گاڑی لے کر صولتیہ لینے گیا۔ مگر اس کی گاڑی بھی پھنس گئی تو سعدی عبدالحفیظ پاؤں چلے۔ راستہ میں قاضی صاحب ملے ان کے ہاتھ میں سامان بہت تھا وہ لے کر یہ لوگ حفائر پہنچے اسی لیت ولعل میں ۵ بجے رفقاء جمع ہوئے اور اسی وقت چل دیے۔

سواق بہت بھلا آدمی تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کو جزائے خیر دے مگر بالکل ناواقف سوڈانی تھا۔ حج کو آیا تھا اس کو مکی مرزوقی نے کرایہ پر رکھ لیا۔ وہ منیٰ اس سے پہلے کبھی گیا نہیں تھا۔ البتہ اس کا ایک رفیق جو مکی نے ساتھ کیا تھا وہ راستہ سے واقف تھا۔ منیٰ پہنچ کر شرطوں نے بہت چکر دلائے اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر گشت کرتے ہوئے پونے آٹھ پر منیٰ پہنچے۔ وہاں تین کمرے ساڑھے سترہ ہزار ریال میں کرایہ پر لے رکھے تھے جس میں تین کمرے تھے نمبر دو میرے لیے تجویز کر رکھا تھا۔ مع میرے رفقاء کے۔ اس سے چھوٹا مولوی انعام صاحب کے لیے جو میرے برابر تھا اور سب سے بڑا دستگیر کے لیے مع مستوارت۔

میں نے بھائی افضل کو پانچ ہزار ریال ابتداء میں دیے تھے اور پانچ سو قربانی کے مد میں منیٰ کا کرایہ اور قربانی وغیرہ شامل تھی۔

قربانی کی گائے بارہ سو ریال میں آئی چالیس جزار کو دیے۔ عزیزان خالد وغیرہ نے دوسرے دن قربانی کی جو عبدالحفیظ کے ساتھ خیمہ میں تھے۔ نو سو ریال میں ان کی گائے آئی اور دس ریال جزار کو دیے۔ مولوی یوسف متالا بھی میرے کمرے میں تھے۔ مگر انہوں نے ایک ہزار ریال اپنے حساب میں جمع کیے تھے۔ ان کو ۱۳۸ ریال بعد فراغ حج واپس کیے اور ان کی قربانی مولوی انعام قاضی صاحب وغیرہ کی گائے میں تھی۔ میری گائے میں شاہد حبیب اللہ اسماعیل مولوی محمد عمر صاحب، زبیری مولوی سلیمان جھانجی تھے۔ میں نے اپنی قربانی خالد کی گائے میں کرائی۔ یہ گائے مستقل دم تمتع کی تھی یہ قربانی کا مسئلہ تو ضمناً آ گیا۔

نویں کی صبح کو عرفات کے لیے منیٰ سے ۲:۳۰ بجے کے قریب چل کر تقریباً ۴ بجے مکی کہ خیمہ میں پہنچ گئے۔ وہاں آرام کیا اور جب مسجد میں خطبہ کی آواز آئی تو اپنے خیمہ میں جماعت کی۔ مولوی انعام صاحب زبیر وغیرہ نے ظہر کی نماز دیگر مبلغین کے خیمہ میں پڑھی۔ مسجد نمرہ میں نماز کی نوبت

ہم لوگوں کو نہیں آئی اس لیے امام کہ پتا نہیں چلتا کہ مقیم ہے یا مسافر، وہ دو ہی رکعات پڑھاتا ہے۔ خطبہ کے بعد مسجد میں اذان و باقامتین ظہر و عصر جمع ہوا کرتی ہے۔

حنفیہ مسلک کے نزدیک اذان خطبہ سے مقدم ہے۔ہم نے عصر ۳۰:۱۰ پر اپنے اپنے خیموں میں پڑھی۔ غروب کے بعد عرفات سے چل کر ۳ بجے مزدلفہ بہت اچھی جگہ پہنچے۔ حکومت کے بہترین انتظامات میں اس سال مزدلفہ کے قیام کے لیے برابر، برابر سڑک کے دونوں طرف موقف بنادیئے گئے ہیں۔ جس میں ہر قافلہ اپنی گاڑی سمیت اتر سکتا ہے۔ مختصر قافلہ ہوتو وہ قافلے ایک موقف پر ٹھہر جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ حکومت کی بہت مدد فرمائے کہ حجاج کی سہولت کے بہت انتظامات کرتی ہے۔ اگر چہ بعض امور میں کارندوں کی وجہ سے غلطی بھی ہوجاتی ہے۔ مثلاً اس سال معلمین کی تقسیم حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھی۔ جس میں بڑی گڑ بڑ ہوئی کہ مرد ایک معلم کے یہاں ہوگیا اور بیوی دوسرے معلم کے یہاں جس کی وجہ سے حجاج کو مکہ مکرمہ پہنچ کر بہت تکلیف اٹھانی پڑی، ہم لوگ تو حجاج کی فہرست میں نہیں تھے۔ میرا تو اقامہ تھا اور باقیوں کے زیارت کے ویزے تھے۔ البتہ قاضی صاحب وغیرہ کو حج کا ویزا ہونے کی وجہ سے دقت ہوئی۔ مگر مکی مرزوقی کو اللہ تعالیٰ بہت جزائے خیر دے ہمیشہ سے ہم لوگوں کا معلم وہی رہا۔ اس نے ایک خیمہ میرے لیے ایک مولوی انعام کے لیے مستقل قائم کر رکھا تھا اس میں رہے۔

مزدلفہ میں بھی ہم سب حاجی اور غیر حاجی ایک موقف پر رہے۔ صبح کی نماز پڑھ کر بہت اہتمام سے اس کی کوشش کی کہ طلوع سے پہلے نکل جائیں۔ چنانچہ روانگی تو ہوگئی مگر راستہ میں شرطوں کی بےتوجہی سے ٹریفک بہت ہی آہستہ رہا۔ ایک منٹ چل کر دس منٹ رکتا رہا۔ مولانا بنوری کا قیام بھی قاری سلیمان کے کمرے میں منیٰ میں ہمارے سامنے ہی تھا۔ ان کی کار تو مزدلفہ سے آتے ہوئے سیدھی نکل آئی، ہماری گاڑی کو شرطہ نے روک دیا۔ وہ بہت چکر کاٹ کر پہنچی۔ یہاں بھی منیٰ پہنچ کر تقریباً دو گھنٹے چکر کاٹتے ہوئے منیٰ پہنچے۔

منیٰ میں بھی اس سال حکومت نے رمی کا بہت بہترین انتظام کر رکھا تھا۔ جمرات کے آس پاس کے مکان گرا کر بہت وسیع کردیا اور رمی کی جگہ دومنزلی بنادی اور دو راستے بھی بنادیئے ایک جانے کا اور ایک آنے کا۔ مگر حجاج کی بےتمیزی سے کہ انہوں نے رمی کے نیچے کے حصے میں دونوں دیواروں اور بیچ میں قیام تجویز کرلیا۔ وہیں ان کے بستر ے کھانا پیشاب پاخانہ، جمعہ کے دن یعنی دس ذی الحجہ کو عین جمعہ کی نماز کے وقت زکریا نے رمی کی کہ فی الجملہ چھیڑ تھی اور محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور دوستوں کی حسن انتظام جمرہ عقبہ کے قریب جا کر اس کی رمی بہت سہولت سے ہوگئی۔

جمعہ کے بعد عصر کے قریب قربانی ہوئی اس لیے حلق میں دیر ہوئی اور عشاء کے بعد میرا حلق تو مولوی حبیب اللہ نے کیا اور بقیہ آپس میں ایک دوسرے نے کیا۔ مولوی انعام کا حلق صوفی عثمان نے اور زبیر کا بھی عزیز شاہد نے آپس میں ہم لوگوں سے حلق کرنا پسند نہ کیا۔ اس لیے دوریال میں حلاق سے کرا کر آئے۔ دوسرے تیسرے دن عصر کے بعد تینوں جمرات کی رمی بہت سہولت سے ہوگئی۔ جمرہ عقبہ کے قریب ہجوم زیادہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایک شرطہ کے دل میں رحم ڈالا۔ اس نے میری کرسی کو پکڑ کر جمرہ کے قریب پہنچا دیا۔ ۱۱، ۱۲ بجے کی درمیانی شب میں عزیز عبدالحفیظ کی گاڑی میں ہم لوگ طواف زیارت کے لیے آئے مگر غلطی سے کرسی پر طواف کرنے کا اجازت نامہ صولتیہ میں رہ گیا جس کو لینے کے لیے مولوی حبیب اللہ مولوی اسماعیل گئے اور ہم ان کے انتظار میں تقریباً ایک گھنٹہ باہر کھڑے رہے اس کی آمد پر اندر آئے اور کرسی پر طواف کیا جو دوستوں کی معاونت سے اور مفتی زین العابدین کی سرپرستی میں بہت سہولت سے ہوگیا۔ ہجوم اتنا تھا کہ ورقہ کو کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ خواہ مخواہ اس کی وجہ سے اتنی تاخیر بھی ہوئی مطاف ہی میں عزیز خالد سے بھی ملاقات ہوئی معلوم ہوا کہ اس کی مستورات بھی طواف کر رہی ہیں۔

طواف زیارت سے فارغ ہو کر عبدالحفیظ کے ساتھ اس کی گاڑی میں منیٰ گئے۔ راستہ تو دس منٹ میں طے ہوگیا۔ مگر منیٰ پہنچ کر پندرہ بیس منٹ کی تاخیر ہوگئی۔ طواف تو بہت سہولت سے ہوگیا مگر سعی میں دیر لگی کہ کرسی پر سعی کرنے والوں کی کثرت تھی کہ ٹریفک کی طرح سے وہ بھی کئی کئی منٹ رکی رہتی تھیں۔ صفا میں تو دعاء کا وقت مل جاتا تھا۔ مگر مروہ پر ایک جماعت حلقہ بنائے ہوئے گاڑیوں کو اوپر جانے سے روکنے کے لیے کھڑی رہتی تھی گاڑیوں کے ادھر آنے پر فوراً دوسری طرف منتقل کر دیتی ہے۔ اپنے حلقہ سے باہر نکلنے نہیں دیتی تھی۔

اس سال منیٰ میں آگ لگنے کا بہت شدید ترین واقعہ پیش آیا جمعہ کے دن جمعہ سے پہلے آگ لگنی شروع ہوئی اور آناً فاناً اتنی زور سے بھڑکی کہ اس کے شعلے آسمان تک پہنچے تھے۔ جہاں جہاں آگ لگ رہی تھی لوگ سامان وغیرہ چھوڑ کر پہاڑوں پر مع مستورات کے چڑھتے جا رہے تھے۔ عزیز خالد اپنی مستورات کو لے کر دستگیر کے کمرہ میں ہمارے قریب پہنچ گیا۔ بہت ہی عبرت انگیز واقعہ ہوا اور عجیب مالک کی قدرت کے کرشمے سننے میں آئے کہتے ہیں کہ ایک ماشی حاجی پیاس کی شدت کی وجہ سے ایک معلم کے خیمہ میں گزرا اور اس نے بہت لجاجت سے پانی مانگا۔ اس نے انکار کر دیا۔ اس نے بہت لجاجت سے خدا اور رسول کا واسطہ دیا اس معلم نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی بے ادبی کا لفظ کہا کہ وہ بھی آ جائیں تو پانی نہیں دوں گا۔

اس خیمہ میں چائے پک رہی تھی سب سے پہلے چولہا بھڑکا اور آس پاس جتنی گیس کی ٹنکیاں

تھیں وہ پھٹتی رہیں اور آگ بڑھتی رہی۔ سب سے زیادہ ایرانیوں کے خیمہ میں آگ لگی اور ہمارے مبلغین متفرق معلموں کے یہاں متفرق خیموں میں تھے۔ معلوم ہوا کہ کئی جگہ یہ شان قدرت نظر آئی کہ مبلغ کے خیمہ کے طرفین بالکل جل گئے اور یہ خیمہ محفوظ رہا۔ اسی طرح بہت سے خیمہ جلے اور ان میں قرآن پاک محفوظ رہا اور بھی عجائب قدرت بہت سننے میں آئے اللہ تعالیٰ کی شان ہے چونکہ روایات مبالغہ سے چلتی ہیں اس واسطے نقل نہیں کرتا۔ یہ واقعہ جو اوپر لکھا گیا متعدد لوگوں سے سننے میں آیا۔ ایرانیوں کے متعلق کثرت سے سننے میں آیا کہ زیادہ جانی مالی نقصان ان ہی کا ہوا۔

یہ بھی سنا کہ اسرائیلی ریڈیو نے سب سے پہلے یہ خبر نشر کی کہ سارا منیٰ جل گیا اور حجاج مر گئے۔ اس کی وجہ سے ہند پاکستان میں اور دیگر ممالک میں بہت تشویش پھیلی۔ بہت سے تار ٹیلی فون آئے۔ زکریا نے منیٰ سے واپسی پر حاجی یعقوب کو ”ہم سب بخیریت منیٰ سے آ گئے۔“ کا تار ڈلوایا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ بھائی دہلوی نے اپنے بھائی نعمت کی خیریت ٹیلی فون سے پوچھی انہوں نے سب کی خیریت بتا دی جو تار سے بھی پہلے پہنچ گئی ہوگی۔ اسی طرح سے اور بہت سی جگہوں کے تار اور فون کی خبریں سننے میں آئیں ہم لوگ ۱۳ ذی الحجہ کو رمی جمار کر کے واپس آئے۔ واپسی میں راستہ بالکل صاف ملا اور جلدی ہی حفاریہ پہنچ گئے۔

عصر کی نماز پڑھ کر بھائی شجاع اور عبدالحفیظ گاڑی میں جن کو آتے ہی فون کر دیا گیا سعدی کے گھر پہنچ گئے۔ بھائی شجاع فون پر اپنی گاڑی لے کر پہنچ گئے تھے اور عبدالحفیظ بھی شجاع کی گاڑی میں، میں شاہد مولوی اسماعیل عبدالحفیظ کی گاڑی میں سامان اور مولوی حبیب اللہ پہنچے۔ شب کو سعدی کے یہاں قیام رہا علی الصبح منگل کو مدرسہ پہنچے اور حسب معمول یہی قانون رہا۔ مدرسہ کے معمولات صبح کے وقت میں ڈاک وغیرہ۔ پانچ بجے تخلیہ والوں کا اور ۲، ۱۵ پر بیعت والوں کا وقت رہا جمعہ کے دن مصلح الدین کی کوششوں سے ایک نکاح حرم میں تجویز تھا مگر جمعہ کی شب میں زکریا دست کی وجہ سے حرم میں نہ جا سکا صولتیہ میں جمعہ پڑھا اور پھر ۷:۳۰ بجے پھر ۸ بجے پھر ۹ بجے تین دست صرف پانی کے آئے لنگی بھی خراب ہوئی۔

زکریا کا ارادہ حج سے پہلے ہی مدینہ جانے کا تھا اور پہلے نہ جانے کی صورت میں حج کے فوراً بعد۔ مگر تبلیغی جماعتوں کی روانگی پیر کے دن قرار پائی تھی۔ اس میں شرکت اور مولانا انعام صاحب کی معیت کی وجہ سے ملتوی کرنا پڑا، ۲۰ ذی الحجہ دوشنبہ کو جماعتوں کی روانگی ہوئی۔ اجتماع تو بارے ہی شروع ہو گیا تھا۔ زکریا سعدی کے یہاں سے براہ راست مسجد حفاریہ ۱۲:۲۰ بجے پہنچ گئے۔ مولوی انعام بھی خبر سن کر نیچے آ گئے تھے۔ ۵ بجے مولوی انعام نے فراغ پر زکریا مع رفقاء کے

صولتیہ چلا گیا اور مولوی انعام صاحب اوپر چلے گئے۔ شنبہ کی شب میں قاضی صاحب نے فرمایا کہ میں تیری گاڑی میں جاؤں گا۔ زکریا نے کہا کہ سر آنکھوں پر۔ مگر آپ تو نہیں جائیں گے اور پھر ہم بھی نہیں جاسکیں گے۔ شنبہ کی صبح قاضی صاحب نے فرمایا کہ میں بالکل تیار ہوں سامان صبح سے رکھا جا رہا تھا۔ مولوی انعام صاحب بھی اپنی کار میں صولتیہ پہنچ گئے جب سوار ہونے لگے تو فرمایا کہ قاضی صاحب نے میری گاڑی حفائر بھیج دی ان کا پاسپورٹ افضل کے پاس ہے کار کی واپسی میں پتہ چلا کہ بھائی افضل نہیں ملے وہ موقف گئے ہیں۔

زکریا نے تجویز کیا کہ مولوی انعام صاحب کی کار میں سے ایک ہم اپنی کار میں بٹھالیں اور جب قاضی صاحب کا پاسپورٹ مل جائے تو مولوی انعام صاحب کی کار میں آجائیں۔ مگر قاضی صاحب نے فرمایا کہ میں نے بھائی غلام دستگیر سے بات کر لی ہے۔ ان کی گاڑی میں آجاؤں گا۔ ہم لوگ سوا تین بجے مدرسہ صولتیہ سے چلے۔ مولانا انعام صاحب نے بہت ہی رقت انگیز دعاء کرائی جس میں سے بھائی سلیم بھی شریک ہوئے جو ۱۵ دن سے اوپر اپنے دفتر میں تھے نہ گھر گئے نہ نیچے اترے کہ طبیعت خراب تھی۔

دعاء کے بعد ہم لوگ بدر کے لیے روانہ ہوگئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ پیٹرول لینے میں لگا اور اس کے بعد ۱۵ منٹ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے مزار پر قیام کر کے سوا سات بجے بدر پہنچے۔ سڑک پر ڈاکٹر اسماعیل انتظار کر رہے تھے، ان کے ساتھ مسجد عریش گئے۔ پہلے نماز پڑھی اس کے بعد کھانا کھایا، ڈاکٹر صاحب نے بہت بڑا اہتمام کر رکھا تھا۔ مرغ پلاؤ، مچھلی فرائی وغیرہ وغیرہ کئی چیزیں تھیں۔ دسترخوان بچھا ہی تھا کہ بھائی افضل اور مفتی صاحب کی مشترک گاڑی پہنچ گئی۔ کھانے میں وہ سب شریک ہوئے۔ آدھ گھنٹہ لیٹے پھر عصر کے بعد شہداء کی زیارت کے لیے حاضری ہوئی۔

معلوم ہوا کہ دروازہ کے بالمقابل دوسری جانب کی دیوار نیچی ہے۔ ادھر زکریا بھی حاضر ہوا۔ ایک گھنٹہ بعد واپسی ہوئی۔ واپسی آہی رہے تھے کہ قاضی صاحب بھی پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی گاڑی میں انہیں مسجد عریش تک لائے۔ گاڑی والا رات کو بدر ٹھہرنے پر راضی نہیں تھا۔ انہوں نے بھی خوشامد کی۔ مگر اس نے یہ عذر کر دیا کہ میں مدینہ میں عشاء کے بعد سواریاں لانے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ عشاء کے بعد دوبارہ کھانا کھایا گیا۔

مغرب کے قریب ایک صاحب نے جو وہاں کے امام بھی ہیں اور کسی مدرسہ کے مدیر بھی اور عشاء کے بعد کی تعلیم کے طالب علم بھی انہوں نے کل دوپہر کے کھانے پر اصرار کیا ہم نے کہا کہ ہم مدینہ کا وعدہ کر چکے ہیں۔ اس پر انہوں نے صبح کے فطور پر اصرار کیا اور ان کے یہ کہنے پر کہ میں تو آ نہیں سکوں گا۔ البتہ ناشتہ بھیج دوں گا۔ صبح کی نماز کے بعد دو بجے سب سو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے

اپنی عادت کے مطابق ناشتہ خوب زوردار کرایا۔ دعوت کا فطور بھی آ گیا تھا۔ ناشتہ کے بعد قاضی مولانا انعام صاحب کی گاڑی میں اور مولوی محمد سلیمان جھانجی ہماری گاڑی میں۔

سوا تین بجے چل کر مسجد کے قریب سید آفتاب وغیرہ اپنی کار میں استقبالیہ ملے۔ پہلے بھی کئی دفعہ ایسا ہو چکا وہاں تو کار کو روکنے کی جگہ نہ تھی صرف مصافحہ کر کے اگلے قہوہ پر کار کو روکا اور ملاقات کی۔ قاضی صاحب نے ان لوگوں کی قہوہ پر چائے تواضع کی زکریا نے انکار کر دیا کہ دیر ہوگی میں تو جا رہا ہوں تم پیتے آئیو۔ راستہ میں سید حبیب کے مکان پر ان سے ملاقات کرتے ہوئے بھائی یحییٰ کے جدید مکان پر پہنچے جس میں تھوڑا سا مغالطہ ہوا بھائی صوفی اقبال وغیرہ سے مکہ میں طے ہوا تھا کہ اس وقت وہاں قیام کرنا نہیں۔ وہاں جا کر دیکھا جائے گا۔ مگر عبدالحفیظ نے راستہ میں کہا کہ بھائی یحییٰ نے اپنے مکان پر چائے کا انتظام کر رکھا ہوگا اور انتظار کر رہے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے وہیں گئے۔ مگر وہاں دروازہ بند تھا۔ یہ سب حضرات صبح سے مدرسہ میں انتظار کر رہے تھے۔

بھائی راشد نے اپنی کار سے اتر کر کہا کہ میں نے اپنی کار قصداً کھڑی کر رکھی ہے۔ عبدالحفیظ اپنی گاڑی یہاں روک لے۔ آگے راستہ نہیں ہے وہاں سے اتر کر ۵ بجے مدرسہ پہنچ گیا اور رفقاء سامان لے کر پہنچے۔ نمازیوں کا ہجوم بقیع تک تھا۔ اس لیے سب نمازیں مدرسہ شرعیہ کی چھت پر ہوئیں مولوی انعام صاحب ایک گھنٹہ پہلے حرم میں پہنچ گئے تھے مگر نماز باب السلام سے باہر پڑھی اور ظہر کے بعد کہہ گئے کہ ہمارے بس کا تو نماز پڑھنا حرم میں ہے نہیں۔ نمازیں تو یہاں نہیں پڑھنی ہیں۔ عشاء کے بعد بھی ان کا انتظار کیا مگر معلوم ہوا کہ وہ آج نہیں آئیں گے۔

۲ جنوری ۷۶ء یکم محرم ۹۶ھ یوم جمعہ کی صبح کو عزیز سعدی کا ٹیلیفون مکہ سے پہنچا کہ ماسٹر محمود کی طبیعت رات سے زیادہ خراب ہے منہ سے خون بھی آیا۔ دوسرا ٹیلیفون جمعہ کے بعد آیا جمعہ کی نماز سے ۵ منٹ پہلے ماسٹر محمود کا انتقال ہو گیا۔ غسل وغیرہ میرے دیوان کے سامنے ہوا اور پہلی نماز جنازہ بھائی سلیم کی وجہ سے مدرسہ صولتیہ میں مولوی مالک بن ادریس کاندھلوی کی اقتداء میں ہوئی اور دوسری نماز حرم میں پہلے عزیز عبدالحفیظ کی گاڑی میں جنازہ لے جانا تجویز تھا مگر مجمع کثیر تھا۔ اس لیے کاندھوں پر ہی معلّی لے گئے اور حکیم نعیم مرحوم کی قبر میں تدفین ہوئی۔

۶ محرم ۷ جنوری کو عصر کے بعد جب مولانا انعام الحسن صاحب صلاۃ وسلام پڑھ رہے تھے اور سامنے حاجی کامل گنگوہی بھی پڑھ رہے تھے۔ انہیں غشی تھی یا شُرطوں کو مرعوب کرنے کے واسطے لوگوں کو رائے ثانی ہے۔ بندہ کے نزدیک نیت پر حملہ کی کوئی وجہ نہیں۔

۱۳ جنوری ۷۶ء مطابق ۱۲ محرم حجازی ۱۳۹۶ھ شب سہ شنبہ میں ۲۰ یوم کی علالت کے بعد حکیم یامین صاحب کا سہارنپور میں انتقال ہو گیا۔

۱۴ جنوری ۱۳ محرم کو عزیز خالد مع اپنی اہلیہ، دادی اور حکیم اسرائیل کے مدینہ سے روانہ ہوئے تھوڑی دیر بدر ٹھہرنے کے بعد ۳ بجے عزیزی سعدی کے گھر پہنچے۔

۱۷ جنوری ۷۶ء ۱۶ محرم ۹۶ھ مولانا انعام الحسن صاحب ملک عبدالغنی کی کار میں مدینہ سے روانہ ہوئے بقیہ رفقاء مختلف گاڑیوں میں اور ۱۱ بجے شام کو قبل مغرب صولتیہ پہنچے۔ جمعرات کو جدہ کے اجتماع میں شرکت کے بعد مکہ مکرمہ واپس آئے اور جمعہ کے دن دوبارہ جدہ بارادہ ہند روانہ ہوئے اور ۲۴ جنوری ۲۳ محرم کو عربی سوا گیارہ بجے طیارہ پر پہنچے۔ اتوار کے دن بھائی یوسف رنگ والوں کا تار پہنچا کہ پار کی دوپہر کو مولانا انعام الحسن صاحب بخیریت کراچی پہنچ گئے۔ مکی مسجد جانے کی اجازت نہ ہوئی۔ رات کو عشاء کے دو گھنٹے بعد مکی مسجد کی اجازت ہوئی اور وہاں سے منگل کی صبح کو بمبئی پہنچے۔

۲۱ جنوری بدھ کے دن خالد پارٹی جدہ سے بحری جہاز پر سوار ہوگئی، جمعرات ۲۹ کو بمبئی پہنچے اور بار اتوار کی درمیانی شب میں ریل سے سہارنپور کے لیے روانہ ہوئے اور پیر کی دوپہر کو سہارنپور پہنچ گئے۔

۱۲ فروری ۷۶ء کو بڑے امام صاحب مدینہ منورہ کوثر نیازی کی دعوت پر پاکستان گئے شاہ فیصل نے اسلام آباد میں جو مسجد کے لیے بڑی رقم دی تھی اس کی سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے ۲۵ فروری ۷۶ء ۲۵ صفر ۱۳۹۶ھ بروز بدھ کو مسجد نبوی میں رسالہ عربی زبان کی فضیلت کی بسم اللہ کی۔

۲۵ مارچ ۷۶ء کو مولانا بنوری کا خط پہنچا کہ محمد کو چند ماہ تیرے پاس رکھنا چاہتا ہوں زکریا نے معذرت لکھ دی کہ کوئی جگہ یکسوئی کی نہیں ہے۔ مگر مولانا نے زکریا کا جواب پہنچنے سے پہلے ہی عزیز موصوف کو بھیج دیا اور کئی ماہ تک زکریا کے ساتھ رہا اور زکریا کی روانگی از مکہ کے ایک دن بعد کراچی روانہ ہوا۔

۲ اپریل ۷۶ء ۳ ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ سے تین دن تک عزیز عبدالحفیظ روضہ اقدس پر بہت الحاح اور دعاؤں کے ساتھ زکریا کے سہارنپور رمضان کے سلسلہ میں عرض معروض کرتا رہا اور تینوں دن یہی انکشاف ہوتا رہا کہ زکریا کا رمضان سہارنپور ہوگا۔ ہر سہ ایام کے مکاشفات تو بہت طویل ہیں۔

۱۱ ربیع الثانی ۱۰ اپریل ۷۶ء کو قاضی صاحب برائے پاکستان مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ پاکستان میں قدیم رفقاء تبلیغ کا اجتماع ہوتا ہے، اس میں قاضی صاحب کی شرکت بہت اہم ہوتی ہے۔

۲۴ اپریل ۷۶ء کو صدر جمہوریہ ہند فخر الدین علی احمد مولانا اسعد صاحب کی دعوت پر دیوبند پہنچے

اور سید ھے حضرت مدنی کے مزار پر گئے وہاں سے فارغ ہوکر دارالعلوم آئے وہاں چائے پیش کی گئی قلمی کتابوں کا معائنہ کرایا گیا۔ ۱۱ بجے دار الحدیث میں جلسہ ہوا ۱۲، ا بجے مولانا اسعد صاحب کے یہاں کھانا ہوا پولیس کا پہرہ ہر وقت صدر کے ساتھ رہا۔ عوام کو شرکت کی اجازت نہیں ہوئی۔ صدر صاحب ۹:۳۰ بجے صبح کو ہیلی کاپٹر سے دیوبند پہنچے تھے اور شام کو ۵ بجے اسی سے واپس ہو گئے۔

۲۵ اپریل ۷۶ء کو مولانا انعام صاحب حاجی شفیع کی کار میں دھلی سے چلے اور راستہ میں صوفی افتخار صاحب ملے ان کی سرپرستی مظاہر علوم کی منظوری لی اور ۱۰ بجے سہارنپور پہنچے۔ دوروزہ اجتماع سرپرستان رہا جس میں صوفی افتخار اور عزیز عامر کی سرپرستی منظور کی گئی اسی دوران میں مولانا انعام صاحب سہارنپور کے قریب کسی جلسہ میں شرکت کے لیے بھی گئے۔

۲۹ اپریل ۷۶ء کو ظہر کی نماز کے ۱۵ منٹ بعد صلاۃ الکسوف بلا سابقہ اعلان کے پڑھی گئی۔ باربع رکوعات واربع سجدات مدینہ طیبہ۔

۱۴ جمادی الاول ۱۳۹۶ھ مئی ۱۹۷۶ء کو شب جمعرات مغرب کے بعد جنازہ کی نماز میں زکریا کی نکسیر جاری ہوگئی مگر پتہ نہیں چلا نماز کے بعد دیکھا تو کرتا لنگی وغیرہ سب خون آلود تھے۔ جمعرات کو دوبارہ اسی طرح آئی۔

۲۴ مئی کو مولانا عبید اللہ صاحب مدینہ طیبہ سے ارادہ ہند مکہ مکرمہ گئے وہاں سے ۲۵ کو جدہ سے ظہران وہاں سے ۲۶ کو کراچی، ۲۸ کو بمبئی اور ۲۹ کو دھلی گئے۔

۲۸ مئی کو جمعہ کی شب میں ۱۱ بجے حاجی محمد ایام صاحب امیر تبلیغ سہارنپور کا حادثہ انتقال۔ انتقال کے قریب تکیہ سر سے نکال دیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور ہنستے ہوئے چل دیئے۔ اعلی اللہ تعالیٰ مراتبہ۔

اخیر مئی ۷۶ء میں حطیم کی قدیم دیوار توڑی گئی جدید پتھر لگائے گئے۔ سابقہ پتھروں پر تحریرات ترکوں کے زمانہ کی تھیں وہ سب محفوظ کر دی گئیں۔

۲ جون کو شمیم کی کا ٹیلیفون آیا کہ لاہور سے حاجی محمود کا تار آیا ہے کہ پرسوں ماموں شعیب کا انتقال ہوگیا۔

قومی آواز ۷ جون میں لکھا ہے کہ حکومت ہند نے ۷۵ برس پہلے سے مخطوطات، مجسمات، تصاویر کی رجسٹری کرانی ضروری قرار دی ہے اور لائسنس حاصل کرنا ضروری قرار دیا۔ ۵ جولائی کے بعد بغیر لائسنس جس کے یہاں یہ چیزیں ہوں گی اس کو قید اور جرمانہ دونوں کی سزائیں

ہوں گی۔ اس سال باب السلام سے باب عمر تک کا حصہ مکانات کا کثرت سے گرتا رہا اور اولاً امام ثالث نے نماز کے بعد اعلان کیا کہ یہ حصہ مسجد بنا دیا گیا۔ اس میں خرید و فروخت جائز نہیں اور مساجد کے سارے احکامات جاری ہوں گے۔

......☆☆☆☆☆......

سفرِ ہند ۱۳۹۶ھ

۱۲ جون ۷۶ء مطابق ۱۴ جمادی الثانیہ ۱۳۹۶ھ شنبہ کے دن عصر کے بعد بھائی یحییٰ صوفی اقبال، ڈاکٹر اسماعیل کی گاڑی میں بدر روانہ ہوئے کہ آج شام کو بعد میں بھائی یحییٰ کی طرف سے دعوت ہوگی اور ہم لوگ عشاء پڑھ کر بدر روانہ ہوگئے۔ ملک عبدالغنی کی گاڑی ایئر کنڈیشن میں مسجد نبوی سے عشاء کی نماز پڑھتے ہی روانہ ہوئے اور ۲ بجے بدر پہنچے۔ صوفی اقبال صاحب مسجد عریش کے میدان میں دری بچھا رہے تھے کہ پشت کی جانب کھڈ میں گر گئے۔ ہم لوگوں کو اس وقت اطلاع نہ ہوسکی کھانے میں معلوم ہوا کہ صوفی جی شریک نہیں ہیں۔ جب حادثہ کا علم ہوا تو جبھی ہسپتال بھیجا گیا اور سر میں ٹانکے لگے۔

اتوار کی صبح کو نماز کے بعد آدھ گھنٹہ شہداء پر حاضری کے بعد مکہ مکرمہ روانہ ہوگئے۔ ۳:۳۰ بجے سعدی کے مکان پر پہنچے، تجویز یہ تھی کہ پہنچتے ہی سو جائیں گے۔ مگر اہلیہ سعدی نے صولتیہ ٹیلیفون کردیا جس پر ماموں یامین وغیرہ سعدی کے گھر پہنچ گئے اور سعدی نے دستر خوان بچھا دیا۔ شام تک سعدی کے مکان پر قیام رہا، بعد عصر ۱۱ بجے رفقاء وسامان حرم پہنچے زکریا کو حرم میں اتار کر رفقاء صولتیہ میں سامان رکھنے گئے اور بعد عشاء بھائی سلیم کی دعوت کھا کر عمرہ کیا اور عزیز سعدی کے گھر جا کر آرام کیا مکہ کا معمول حسب دستور صبح کا ناشتہ کے بعد صولتیہ آنا اور عشاء کے بعد کھانے سے فراغ پر طواف کر کے سعدی کے گھر جانا۔

۲۱، ۲۲ جون ۷۶ء کی درمیانی شب میں نظام الدین میں عزیز شاہد کے لڑکا پیدا ہوا محمد صالح نام تجویز ہوا مگر ہمیں مکہ میں ایسے وقت اطلاع ہوئی کہ ہند کو روانگی ہو رہی تھی۔ مگر ماموں یامین کی مساعی جمیلہ نے ایک دنبہ عقیقہ کا روانگی کا ذبح کردیا جس کا گوشت نظام الدین تک پہنچ گیا۔ بمبئی پہنچتے ہی اس ناشتہ دان کو بھائی عبدالکریم کے فریج میں رکھ دیا اور وہاں سے جاتے ہوئے نکال لیا۔ اور ساتھ نظام الدین لے گئے۔

حسب تجویز ۲۹ جون کو عشاء کے بعد کھانے کے بعد طواف وداع کر کے ۵ بجے جدہ بھائی شجاع کے گھر پہنچ گئے ان کا کئی سال سے اصرار تھا مگر زکریا کبھی گیا نہیں تھا۔ انہوں نے اس سال اصرار کیا تھا کہ میں نے نیچے کا مکان تیرے لیے خالی کرادیا۔ وہاں پہنچے تو واقعی بڑی راحت کا مکان ملا میرا اور میرے رفقاء کا کمرہ الگ سامان کا الگ کھانے کا الگ ۸:۳۰ عربی اٹھ کر تہجد اور ضروریات سے فارغ ہو کر صبح کی نماز شجاع کے مکان پر پڑھ کر مطار پر گئے ڈاکٹر ظفیر صاحب مطار پر گئے۔

رفقاء اللہ تعالیٰ ان کو بہت جزائے خیر دے سامان وغیرہ لے کر نماز سے پہلے ہی مطار پر چلے گئے تھے۔ مطار پر پہنچ کر مطار ہی کی گاڑی میں ڈاکٹر ظفیر کی مساعی سے طیارہ پر پہنچے ۱۱ بجے طیارہ روانہ ہوا ایک بجے ظہران پہنچے۔ دو بجے وہاں سے چل کر ۳ بجے دبئی پہنچے۔ وہاں بڑا مجمع مع مولوی تقی وغیرہ مشائخ ابوظہبی۔ مطار پر موجود تھے۔ انہوں نے اترنے پر بہت اصرار کیا کہ بمبئی برقیہ کریں گے۔ مگر زکریا نے عذر کیا کہ بمبئی کے مطار پر اتنا مجمع مختلف بلاد کا مجمع ہوگا **لاتعدو لا تحصی**۔

۴ بجے وہاں سے چل کر عربی ۷ بجے بمبئی پہنچے۔ بمبئی کے وقت کے اعتبار سے ۴:۳۰ بجے، طیارہ سے سفر تو بار ہا کرنے کی نوبت آئی۔ مگر اس مرتبہ دبئی کے بعد اس زور کا چکر آیا کہ بمبئی پکڑنا مشکل ہوگیا۔ مجھے تو امید نہیں رہی تھی کہ زندہ بمبئی پہنچ سکوں گا۔ بمبئی کے مطار پر بہت بڑا مجمع موجود تھا۔

مولانا محمد عمر صاحب اور عزیز ابوالحسن بدھ کی صبح کو بمبئی پہنچ چکے تھے۔ یہ ناکارہ اپنی نااہلیت کی وجہ سے جب مولانا انعام الحسن صاحب یا علی میاں ساتھ نہیں ہوتے تو مولانا محمد عمر صاحب کو تکلیف دیا کرتا ہے کہ میرے طیارے سے پہلے بمبئی پہنچ جائیں تا کہ وہاں کے مجامع کی دعائیں نمٹائیں، چونکہ ظہر کی نماز اپنے اعذار کی وجہ سے اب تک نہیں پڑھی تھی مطار پر پہنچتے ہی اپنا کموڈ منگایا اور فوراً روانہ ہو کر مطار سے دو تین میل دور جا کر ایک جنگل میں پیشاب وضو کر کے ظہر پڑھی۔ اور چونکہ عصر کا وقت قریب تھا۔ اس لیے آدھ گھنٹہ انتظار کر کے عصر بھی پڑھی جگہ تو بہت دور مطار سے تجویز کی تھی مگر وہاں بھی مجمع بڑھتا ہی چلا گیا۔ عصر پڑھ کر بھائی عبدالکریم کے مکان پر پہنچے۔ رفقاء کسٹم سے نمٹ کر مغرب کے وقت پہنچے معلوم ہوا کہ کسٹم میں تو دس منٹ ہی دیر لگی اس نے صرف اتنا سوال کیا کہ کیمرہ وغیرہ کوئی چیز ہے؟

رفقاء نے کہہ دیا کہ یہ لغویات ہمارے ساتھ نہیں ہوتیں۔ ایک دو صندوق دیکھ کر سب پاس کر دیئے۔ حاجی یعقوب صاحب نے مطار پر ہی طلحہ کو برقیہ اور مولانا انعام صاحب کو ٹیلیفون سے پہنچنے کی اطلاع کر دی۔ تین دن بمبئی قیام کے بعد ۴ جولائی اتوار کے دن صبح کو ۶:۳۰ پر بمبئی سے دہلی روانہ ہوئے دہلی میں بھی مجمع بہت زیادہ تھا۔ مگر حسب دستور زکریا تو بھائی کرامت کی کار میں سیدھا چلا گیا۔ بچے کچے اور مجمع جو مطار پر جمع تھا وہ آہستہ آہستہ ظہر تک نظام الدین پہنچتا رہا۔ ملاقات بچوں سے بھی نظام الدین میں ہوئی۔ گرمی بہت شدید تھی اور زکریا کو نظام الدین پہنچ کر استفراغ کثرت سے ہوا کہ بمبئی میں آم اور مچھلی متفرق اوقات میں کھانا ہوا تھا۔

دہلی سے براہ میرٹھ سہارنپور جانا طے تھا مگر بخار استفراغ کی وجہ سے دہلی سے ننے خاں کو ٹیلیفون کرادیا کہ اب بجائے میرٹھ کے سیدھے کاندھلہ ہو کر سہارنپور جانا طے ہوگیا کاندھلہ کے اڈہ پر صوفی افتخار مع اپنے مریدین کے موجود تھے، مصافحہ ہوا ابرار نے اصرار کیا کہ اتنے تو مصافحہ کرے

اتنے رفقاء چائے پی لیں زکریا نے کہا کہ اگر اڈہ پر پلاؤ تو پی لیں گے۔ مگر معلوم ہوا کہ اس نے چائے کا انتظام تو اپنے باغ میں رکھا ہے اور رفقاء کو باغ لے جانے پر اصرار کیا۔ زکریا تو شرط کے خلاف ہونے کی وجہ سے اڈہ سے سیدھا سہارنپور روانہ ہوگیا۔ بعض رفقاء نے چائے پی اور بعض نے نہیں پی۔ عزیز ابراراسلم سب چائے وغیرہ چھوڑ کر زکریا کی کار میں اڈہ سے سوار ہوگیا۔ رفقاء کی کاریں یکے بعد دیگرے پہنچتی رہیں۔

زکریا کی طبیعت دہلی تا سہارنپور میں بھی خراب رہی دوران سفر چکر کثرت سے آتے رہے۔ جلال آباد میں مولانا مسیح اللہ خاں صاحب کی خدمت میں حاضری کا ارادہ تھا مگر نہیں جا سکے۔

۸ جولائی مطابق ۹ رجب کو ۸ بجے صبح کو سہارنپور پہنچے، اول مدرسہ کی مسجد میں تحیۃ المسجد اور وہاں کے احباب سے مصافحہ وغیرہ کرکے اول حکیم ایوب سے ملاقات پھر حکیم یامین مرحوم کے گھر ذوالنون کی تعزیت کے لیے گیا۔ پردہ کرا کر تھوڑی دیر گھر میں بیٹھا۔ پھر واپس اپنے گھر آیا۔ اعلان مصافحوں کا حسب دستور عصر کے بعد دار جدید میں تھا۔ مگر مکان پر بھی مصافحوں کا سلسلہ چلتا ہی رہا۔ دارِ جدید جاتے ہوئے راستہ میں حضرت ناظم صاحب کے پاس دس پندرہ منٹ ٹھہرا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ اب تیرا سہارنپور قیام بہت ضروری ہوگیا۔

دار الطلبہ جدید میں حسب دستور مصافحوں کا انتظام تو صحن میں تھا مگر گرمی کی شدت کی وجہ سے اندر ہی مصافحے ہوئے۔ جب عصر کے بعد دار جدید میں دعاء ہو رہی تھی کہ کسی نے فوارہ کے سامنے جو بُت تھا اس کو توڑ دیا۔

شنبہ کی صبح کو حاجی نصیر اور وصفِ الٰہی کی کاروں میں دیوبند حاضری ہوئی۔ حضرت مدنی کے گھر اطلاع بھیج دی کہ حاضری کا تو ارادہ تھا مگر بہت چکر آ رہے ہیں۔ اس لیے معذوری ہے بھائی سعید سے بھی کار میں بیٹھے ہوئے ملاقات ہوئی۔ اتوار کی صبح کو باوجود بہت اخفاء کے کچھ نہ کچھ شیوع ہو ہی گیا صبح کی نماز کے بعد سہارنپور سے چل کر رائے پور باغ میں حاضری ہوئی۔ رائے پور پہنچ کر اس قدر زوردار بارش ہوئی کہ نہ تو نیچے کا راستہ رہا اور نہ پُل کے اوپر، پٹرول نے قفل نہیں کھولا۔ مگر راؤ عطاء الرحمٰن صاحب زادہ عزیزم حافظ انیس الرحمٰن کو اللہ تعالیٰ بہت جزائے خیر دے کہ اس نے اس تیز بارش میں پٹرول سے کنجی لے کر قفل کھول کر ہمیں آگے چلتا کر دیا۔ بارش شدت سے ہو رہی تھی رفقاء کی گاڑیاں بھی بارش کی وجہ سے دیر میں پہنچیں۔ مگر رائے پور پہنچ کر اتنی زوردار بارش ہوئی کہ مزار پر حاضری کی صورت نہ ہوئی۔ کار ہی میں تھوڑی دیر بیٹھ کر فوراً واپس ہوگئے۔

مولوی حشمت صاحب سے ریڑھی ٹھہرنے کا وعدہ بھی تھا مگر اتنی زور سے بارش ہو رہی تھی کہ مدرسہ تک پہنچنا ناممکن تھا۔ سوا سات بجے کچے گھر پہنچے، سہارنپور پہنچنے کے بعد سردی سے بخار کا

سلسلہ خوب بڑھ گیا۔

۶ رجب ۱۳۹۶ھ، ۵ جولائی ۱۹۷۶ء کو عزیز سلمان کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی ساتویں دن عقیقہ کا نظام نہ ہوسکا چودھویں دن عقیقہ ہوا۔ بھائی جمیل سہارنپوری کی دماغی کیفیت آج کل بہت خراب ہو رہی تھی ناظم صاحب کا پیام پہنچا کہ ان کو مدرسہ میں آنے دیا جائے۔ بہت مشکل سے ان کو مجنونوں کے ہسپتال بھیجا۔

۱۴ جولائی کو ۷۶ء کو قاری طیب صاحب مولانا فخر الحسن صاحب وغیرہ ملاقات کے لیے تشریف لائے اور تخلیہ میں ماسٹر پلان پر خوب گفتگو ہوتی رہی زکریا اپنے مشورے پیش کرتا رہا۔

۱۴ جولائی کو مولانا بنوری پر دل کا دورہ پڑا جو بہت سخت تھا، ۱۶ جولائی ۷۶ء جمعہ کی دوپہر کی مجلس میں عزیز سلمان کے لڑکے عزیز عثمان کا پارہ نمبر ۲ شروع ہوا۔

۲۳ جولائی ۷۶ء مطابق ۲۴ رجب ۱۳۹۶ھ کو جمعہ کی صبح کو مسلسلات ہوئی یہ بھی سننے میں آیا کہ طلبہ بجائے مسلسلات میں شرکت کے سندوں کے چکر میں پھرتے رہے، فیالاسف حکیم نبو گنگوہی بھی مسلسلات کے دوران میں آئے تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے، ملاقات کا وقت نہیں ملا۔

۲۴ جولائی کو بخاری شریف ختم ہوئی۔

اس مرتبہ گنگوہ حاضری میں بہت تاخیر ہوئی کہ مولانا انعام صاحب کی آمد پر موقوف تھی تجویز یہ ہوا کہ ۲۴، ۲۵ جولائی کو جھنجھانہ میں تبلیغی اجتماع ہے اس سے فارغ ہو کر مولانا انعام صاحب سہارنپور آئیں گے، پھر گنگوہ جائیں، مگر جھنجھانہ میں مجمع اتنا زیادہ ہوگیا کہ وہاں کے غیر مسلم گھبرا گئے اور مظفرنگر میں ڈپٹی سے ممانعت جلسہ کی منظوری لے لی یہ تو بڑی لمبی چوڑی تفصیلات ہیں، اہل جھنجھانہ، کیرانہ، کاندھلہ وغیرہ کے حضرات کی دوڑ دھوپ سے منظوری ہوگئی اور جلسہ ہوگیا۔

اتوار کی شام کو مولانا انعام صاحب سہارنپور پہنچ گئے اور پیر کی صبح کو گنگوہ حاضری ہوئی، سید خلیل مفتی محمود سے طے ہوگیا تھا کہ پیر کی صبح کو سیدھے گنگوہ پہنچیں گے، مگر بارش اتنی ہوئی کہ سارا وقت مزار کی مسجد میں گزرا۔

پیر جی شریف کے صاحب زادہ کا صوفی رشید کی بھتیجی سے نکاح بھی ہماری آمد پر اسی دن طے ہو گیا تھا اور قاری طیب صاحب لڑکے والوں کی طرف سے مدعو تھے وہ دس بجے پہنچ گئے، زکریا ان کی خبر سن کر حجرہ سے ۱۲ بجے صوفی جی کے مکان پر پہنچ گیا اور آدمی بھیج کر قاری صاحب کو بلایا ایک بجے بعبارت قاری طیب صاحب صوفی جی کے مکان پر نکاح ہوا، گرمی بہت شدید تھی زکریا نے صوفی جی سے درخواست کی کہ آپ چھوہارے بانٹتے رہیں، مگر ہمیں کیوں محبوس کر رکھا ہے، انہوں نے ہمیں اجازت دے دی قاری صاحب اپنے مستقر پر چلے گئے اور ہم سب قاری شریف کے مدرسہ میں

ظہر کی نماز پڑھ کر مولانا انعام صاحب نے مشکوٰۃ شریف ختم کرائی اور دُعاء کرائی اس سے فراغ پر سہارنپور کے لیے فوراً روانہ ہوگئے۔

مزار پر چونکہ مجمع بہت زیادہ ہوگیا تھا، عزیز محمد کاندھلوی بھی ساتھ تھا، اس نے زکریا سے کہا کہ اگر تو اجازت دے تو میں مجمع سے بات کرلوں اس نے مزار کی مسجد میں ایک گھنٹہ تقریر کی۔

مولانا انعام صاحب منگل کی صبح دہلی روانہ ہوگئے۔

بارش کی کثرت کی وجہ سے یکم شعبان کی شب میں رؤیت نہیں ہوئی تھی مگر آنے والوں مہمانوں کی کثیر تعداد نے اور اس کے بعد مقامی دو آدمیوں نے رویت کی گواہی دی اس لیے ۱۳ شعبان کو مدرسہ اور قاضی صاحب کی طرف سے ۱۳ کو ۱۴ کا اعلان کر دیا، شہر والوں نے خوب گالیاں دی کہ اب حلوہ پکنے کا نہیں رہا، فللّٰہ الحمد۔

۱۰ اگست ۷۶ء مطابق ۱۲ شعبان ۱۳۹۶ھ کو مفتی صاحب اور قاضی صاحب بھوپالی تشریف لائے اور نس بندی کے سلسلہ میں بڑی طویل گفتگو رہی دونوں حضرات بہت زوروں پر تھے، مگر زکریا نے مکی مدنی دور کی تفصیل ذکر کی وہ علی الصباح دیوبند چلے گئے، آج کل ہندوستان میں نس بندی کے سلسلہ میں بڑے ہنگامے، بڑے جبر، گرفتاری وغیرہ ہو رہی ہیں جس کی وجہ سے کانگریس سے عام نفرت بڑھتی جارہی ہے، ۱۳ شعبان کو الیاس انچولی سرہند جاتے ہوئے مولوی وقار سے ملنے کے لیے سہارنپور اترے تو معلوم ہوا کہ میرٹھ بلند شہر وغیرہ میں اس کی بہت شہرت ہے کہ زکریا ۱۵ شعبان سرہند گزارے گا، اس لیے بہت سی موٹریں کاریں بسیں براہِ راست سرہند جارہی ہیں، بہت سی مرادآباد دہلی کی کاریں بھی پہنچ گئیں اور جب زکریا ۱۵ شعبان کو وہاں نہیں پہنچا تو سب واپسی میں سہارنپور پہنچے سب سے پہلے جمعہ کے دن سرہند سے ایک لاری ۶۰ نفر کی سہارنپور پہنچی اور عشاء تک مہمانوں کی واپسی ہوتی رہی، اللہ تعالیٰ مولوی نصیر کو بہت جزائے خیر دے، دین و دنیا کی راحت، چین نصیب کرے، عشاء کے بعد تک مہمانوں کے کھانے کا انتظام کرتے رہے، سنا گیا ہے کہ سرہند میں اس غلط روایت پر دو ہزار سے زیادہ مجمع جمع ہوگیا تھا۔

۱۶ شعبان ۱۳۹۶ھ ایک ہفتہ سے مفتی محمود کی آنکھ میں شدت سے تکلیف ہو رہی ہے، زکریا کے اصرار پر اول علی گڑھ گئے اور پھر رمضان کے بعد کلکتہ گئے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ کلکتہ کے علاج سے بہت فائدہ ہوا بھائی جمیل کلکتوی کے اصرار پر کلکتہ جانا ہوا تھا، زکریا نے اول تو ان کے اصرار کو مفتی صاحب کے کلکتہ لے جانے کا بہانہ سمجھا تھا، مگر تکمیل علاج کے بعد معلوم ہوا کہ ان کا اصرار بڑے اخلاص پر مبنی تھا اور بہت فائدہ ہوا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مفتی صاحب علاج سے بہت انکاری تھے مگر زکریا کے بار بار اصرار پر انہوں نے قبول فرمالیا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔

۲۰ شعبان ۱۳۹۶ھ ۱۸ اگست ۱۹۷۶ء کو حلیم بن شمیم مکی کراچی سے بذریعہ طیارہ دہلی پہنچا اور تعجب ہے کہ اختر علی سہارنپوری بھی اسی طیارہ میں تھا مگر ملاقات نظام الدین جا کر ہوئی اور اتوار ۲۲ اگست کو مولوی انعام و محمد کاندھلوی اور ابرار کے ساتھ کاندھلہ گیا، وہاں حسب ہدایت شمیم اس کو سیر کرائی گئی دعوتیں بھی خوب ہوئیں۔

۲۵ اگست کو صوفی افتخار کے ساتھ سرہند گیا اور ۲۶ اگست کو واپسی ہوئی۔

۳ رمضان کو جاوید کے ساتھ نظام الدین گیا، ۱۸ رمضان کو سہارنپور آیا۔

۲۱ شعبان ۹۶ھ مطابق ۱۹ اگست ۷۶ء کو مولانا عبدالحمید صاحب نائب ناظم تعلیمات مظاہر علوم جو عرصہ سے بہت بیمار تھے اور تقریباً معذور سے تھے اول مدرس فارسی کئی سال رہے پھر ناظم تعلیمات رہے، بہت نیک آدمی تھے اپنے گاؤں مہسیری میں ۶ بجے صبح کو انتقال فرما گئے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے بڑی خوبیوں کے مالک تھے، جناب الحاج حافظ قمرالدین صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں خادم خاص رہے تھے

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنیوالے میں

فارسی کے بہت اچھے مدرس تھے، قاری مظفر صاحب ان کی تجہیز و تکفین کے لیے تشریف لے گئے۔

۲۳ شعبان ۲۵ اگست کو اجتماع سرپرستان تجویز تھا، زکریا اور عاقل کی تجویزات بھی اہم تھیں جن کے لیے وقت نہیں ملا تو وہ عامر اور صوفی افتخار کے حوالہ کر دی گئی کہ شروع شوال میں مولوی انعام صاحب اور حاجی شفیع کو سنا کر دوبارہ غور ہو، حاجی عبدالعلیم صاحب حسب دستور ماہِ مبارک کے لیے ٹھہر گئے اور دارِ جدید اپنے حجرے میں منتقل ہو گئے حاجی صاحب کی وجہ سے ہر سال مراد آباد والوں کی آمد کثرت سے رہتی ہے۔

یکم رمضان ۲۸ اگست شنبہ کو ہوئی۔

اسمائے دارِ جدید، عشرہ اولیٰ، سلمان، ثانیہ خالد، ثالثہ زبیر بن مولانا انعام الحسن صاحب دارالطلبہ قدیم، مختار حفید ناظم صاحب حسب دستور روزانہ تین پارے، مدرسہ قدیم، محمد افریقی، گورا جامع مسجد شہر۔

طلحہ حسب دستور ثالث مولوی نصیر، دارالعلوم دیوبند مولوی سالم۔

قاری طیب صاحب نے رمضان بمبئی میں گزارا، ۲۳ شعبان کو بمبئی چلے گئے تھے۔

شاہد نے زکریا کے مکان میں شروع کیا تھا مگر تین چار دن کے بعد بیمار ہو گیا حافظ صدیق نے گھر میں پورا کیا، (ابوالحسن کے گھر سنانے کے بعد)۔

حضرت حافظ عبدالعزیز گمتھلوی نے ۷۲ء اور ۷۳ء کے رمضان لاہور میں گزارے اور اس سے پہلے اوراس کے بعد لائل پور میں۔

نظام الاوقات

اس سال زکریا کے دوران سر کی شکایت کی وجہ سے بجائے دو پارے کے ایک ہی رہ گیا، بعد مغرب وسحور وضحیٰ وسنن ظہر، اسماع بعد ظہر مولوی احمد لولات وضحیٰ کے وقت بجائے بالنظر کے مولوی اسماعیل کو سناتا کہ بالنظر پڑھنا مشکل تھا۔

بعد مغرب طعام وغیرہ سے فراغت کے بعد بجائے گفتگو کے صوفی اقبال کی کتاب ''اکابر کا سلوک'' وغیرہ اذان عشاء سے قبل بیعت، بعد تراویح فضائل رمضان وغیرہ مگر چونکہ حکام کی طرف سے یہ اعلان تھا کہ ۱۱ بجے کے بعد جو ملے گا اس کی نس بندی کردی جائے گی، اس لیے تراویح کے بعد مقامی لوگوں کو فوراً بھیج دیا جاتا تھا ۱۲ سے ۳ تک دار جدید منتقل، جس میں معتکفین کے مسجد کے بالائی حصہ سے چائے وغیرہ خریدنے کے قصے پیش آتے رہے ۳ بجے سے سحور اول آدھ گھنٹہ تیاری میں ۳:۳۰ سے اذان فجر سے آدھ گھنٹہ قبل تک اطعام اضیاف، اس کے بعد قرآن کی تلاوت اور نوافل وغیرہ صبح کی اذان کے بعد نماز اور اس کے بعد ۹ بجے تک اکثروں کا سونا، بعض کا مشغول رہنا، ۱۰ سے ۱۱ تک حسب معمول وعظ مولوی عبیداللہ صاحب وغیرہ بعد ظہر ختم خواجگان ذکر جہر، مجمع رمضان کے شروع سے ہی ایک ہزار کے قریب پہنچ گیا تھا اور اخیر رمضان میں اٹھارہ سو تک۔

خصوصی آمد

قاضی عبدالقادر صاحب جو ۲۷ رمضان کو پاکستان تشریف لے گئے، محمد بنوری، صوفی اقبال، ڈاکٹر اسماعیل، بھائی یحییٰ کراچوی، زبیر وشاہد کراچویان، مولوی احسان الحق، قاضی محمود، مولوی یوسف تتلی مع جماعت افریقہ، احمد ناخدا، مولوی عبدالحفیظ، عبدالوحید مکیان، عطاء الرحمٰن، یعقوب مدنیان، بھائی حبیب اللہ دہلوی مدنی، ڈاکٹر ظفیر اخیر رمضان میں پہنچے، مفتی محمود حسب سابق جمعرات کو آمد اور بار کو واپسی، مگر اخیر عشرہ کا اعتکاف زکریا کے اصرار پر چھتہ کی مسجد میں، مولوی رشید پورا رمضان۔

افتخار فریدی مرادآبادی حسب تجویز زکریا کئی سال سے رمضان رائے پور میں گزار رہے تھے مگر اس سال مقامی خرخشہ کی وجہ سے نہیں جاسکے۔

علی میاں اور مدرسین دارالعلوم ندوہ تین شب کے لیے آئے۔

مولوی انعام الحسن صاحب اس سال علالت کی وجہ سے نہیں آسکے، مولوی محمد عمر وغیرہ تین شب

کے لیے اور مولوی اظہار الحسن صاحب ایک عشرہ کے لیے آئے۔
۲۵ رمضان کو بعد ظہر مولانا اسعد مدنی کا بچہ مسعود اور عزیز ارشد کا لڑکا امجد اور رشید الدین تینوں کے قرآن پاک کا افتتاح دارِ جدید کی مسجد میں ان حضرات نے حکم بھیجا تھا کہ ان کا افتتاح تو کرا۔
یکم شوال ۲۶ ستمبر اتوار کے دن رویت عامہ سے عید ہوئی، دارِ جدید میں عزیز سلمان نے دار الطلبہ قدیم میں قاری نسیم نے، ناظم صاحب نے اپنے حجرہ میں بامامت گورا۔ دیوبند میں قاری طیب صاحب نے علالت کی وجہ سے نماز نہیں پڑھائی، مولوی سالم نے پڑھائی قاری صاحب رکشا سے عیدگاہ گئے۔
مولانا انعام صاحب کی اس سال رمضان میں طبیعت زیادہ خراب رہی ۳ شوال منگل ۲۸ ستمبر کو صبح ۱۰ بجے عزیز ارشد کاندھلوی کا نکاح بعبارت قاری طیب صاحب اور مولوی محمود پیڑوی کے لڑکے کا نکاح بعبارت مولوی اسعد صاحب دارِ جدید کی مسجد میں ہوا۔
۹ شوال کو نجم الحسن بن مولانا ظہور الحسن صاحب کا نکاح کاندھلہ میں مولوی طاہر کی لڑکی سے ہوا عزیز طلحہ نے شرکت کی۔
۱۰ شوال ۹۶ھ مطابق ۵ اکتوبر ۷۶ء منگل کی رات میں مفتی محمد شفیع صاحب کا کراچی میں انتقال۔
۹ شوال ۱۳۹۶ھ کو مولوی حبیب اللہ چمپارنی کا نکاح ان کے وطن میں مہر فاطمی پر بعبارت مولوی ریاض الحق ہوا۔
۱۸ شوال کو عزیز حماد کا نکاح بعد عصر حکیم ذوالنون کی لڑکی سے بعبارت مفتی محمود سے مسجد موچیان میں ہوا۔
۲۳ شوال کو مظفر نگر میں نس بندی پر فساد شروع ہوا۔
۲۴ شوال ۱۹ اکتوبر کو بھائی جمیل کے ساتھ مفتی محمود صاحب کلکتہ بسلسلہ قدح چشم گئے۔
۲۸ شوال ۲۳ اکتوبر کو قاری شریف کے مدرسہ میں زکریا نے مشکوٰۃ کی ابتداء کرائی کہ مولانا انعام صاحب کی طبیعت خراب تھی، یکم ذیقعدہ پیر کے دن مولوی انعام صاحب دہلی کے لیے روانہ ہوگئے، مولانا عبدالحکیم صاحب رمضان کے بعد میری روانگی تک قیام کے ارادہ سے ٹھہرے ہوئے تھے، ۴ ذیقعدہ کی شب میں ان کے کسی مخلص کا خط آگیا کہ آپ کے لیے حج کا انتظام ہوگیا، مولانا اسی وقت روانہ ہوگئے اور ۱۹ نومبر کو بمبئی سے جدہ روانہ ہوگئے۔
زکریا کے لیے پاکی احباب شوال سے ویزے کی کوشش میں تھے مگر حاصل نہ ہوسکا۔
حکیم عبدالمجید منگلوری نے خواب پر ذیقعدہ میں زکریا کے گھٹنوں کا علاج شروع کیا بہت محنت

کی مگر گھٹنوں پر پھنسیاں نکل آئیں اور علاج بیچ میں چھوڑنا پڑا کہ سفر شروع ہوگیا۔
مولوی یوسف تتلی گجرات سے آئے تھے مگر زکریا کی پریشانی دیکھ کر وہ رائے ونڈ کے اجتماع میں شرکت کے لیے گئے اور کہا کہ میں رائے ونڈ کے اجتماع سے فارغ ہوکر تجھے لینے واپس آؤں گا، مگر اہل پاکستان نے ان کو روک لیا کہ زکریا کا ویزا ملنے کی امید ہے اسے لے کر جانا۔
۳نومبر ۷۶ء ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۹۶ھ کی شب میں زکریا نے خواب دیکھا کہ حضرت سہارنپوری اور حضرت شیخ الہند کچے گھر میں تشریف فرما ہیں اور ہندوستان کے حالات حاضرہ پر مشورہ کر رہے ہیں کہ اس زمانہ میں نس بندی کے ہنگامہ چل رہے تھے، مگر اُٹھنے کے بعد کوئی بات یاد نہ رہی۔
۷نومبر ۱۴ ذیقعدہ کی شب میں عزیز عاقل کے گھر میں بہت سہولت سے لڑکا پیدا ہوا، اس سال زکریا کے یہاں حکام شہر اور وزراء وغیرہ کی کثرت سے آمد رہی جس سے بہت فکر رہا مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ کوئی بات پیش نہیں آئی۔
مولوی حبیب اللہ کی روانگی میں اس سال بہت مشکلات پیش آئیں دہلی اور بمبئی کا سفر کرنا پڑا، ۲۵ ذیقعدہ ۱۸ نومبر ۷۶ء کی شب میں عزیز زبیر کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا، زہیر نام رکھا گیا۔

......☆☆☆☆☆......

روانگی از ہند برائے حجاز ذیقعدہ ۹۶ھ

شعبان سے پاکی حضرات کا بہت شدید اصرار تھا کہ حج کو جاتے ہوئے مولانا انعام صاحب کے ساتھ رائے ونڈ کے اجتماع میں زکریا شریک ہوکر جاوے، مفتی زین العابدین صاحب نے شعبان میں بہت اطمینان دلایا تھا کہ اب ویزے مل جائیں گے، مولوی انعام صاحب کے رفقاء زکریا مع رفقاء جتنے بھی ہوں گے سب کے ویزے مل جائیں گے، مگر شوال میں بھائی عبدالوہاب کا دستی خط پہنچا کہ سب کے ویزوں کا انکار ہوگیا، وجہ انکار باوجود کوشش کے نہ معلوم ہوسکی البتہ مولوی عبیداللہ صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب کا ویزا مل گیا تھا وہ اجتماع میں شریک ہوگئے، مولانا انعام صاحب نے تو سفر ملتوی کر دیا، مگر زکریا کو حجاز آنا تھا۔

مولوی تلی نے رمضان سہارنپور گزارا تھا مگر مولوی حبیب اللہ کے بی فارم کا جھگڑا چل رہا تھا میرے ساتھ مولوی اسماعیل تنہا رہ گئے اس لیے مولوی یوسف تلی وعدہ کر گئے تھے کہ رائے ونڈ کے اجتماع سے فارغ ہوکر تجھے لینے آؤں گا مگر اہل پاکستان نے ان کو میرے ویزے کی امید پر روکے رکھا، اگرچہ زکریا کو بمبئی سے آنے میں بڑی سہولت تھی مگر ظہران کے کسٹم کا قصہ بڑی مشکلات کا سبب ہوتا ہے اس لیے اس سال براہ کراچی آنا تجویز کیا تھا پی آئی اے سے کہ اس میں ظہران کا قصہ نہیں ہوتا، پاکی احباب بہت کوشش کرتے رہے کہ زکریا کو عبور کا ویزا دو چار دن کا مل جائے مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی مولوی تلی کے پاکستان سے برابر خطوط آتے رہے کہ میں ہر وقت آنے کو تیار ہوں، مگر یہ حضرات روکتے ہیں ویزا ملنے کی امید ہے، لیکن مایوسی کے بعد ۱۵ نومبر ۷۶ء ۲۲ ذیقعدہ ۹۶ھ کی صبح کو سہارنپور سے دہلی کے لیے روانگی ہوئی زکریا کو رمضان کے بعد سے بخار کی شدت تھی اس دن بخار شدید تھا دہلی تک دو لنگیاں خراب ہوئیں، دہلی کے قیام میں کچھ کھانے کی نوبت نہیں آئی۔

سہارنپور سے روانگی کی شب میں مولوی یوسف تلی کراچی سے عبوری ویزا چار دن کا لے کر پہنچ گئے اس لیے ۲۵ ذیقعدہ ۱۸ نومبر کو عصر کے بعد رفقاء سامان لے کر مطار پر پہنچے اور مغرب کی نماز پڑھ کر زکریا بھائی کرامت کی کار میں سیدھے طیارہ پر پہنچا اور ۷ بج کر ۱۰ منٹ پر پاکی طیارہ سے روانہ ہوئے اور ۸ بج کر ۵۰ منٹ پر کراچی کے مطار پر پہنچے، وہاں حسب دستور حاجی فرید الدین صاحب مع اپنی گاڑی کے طیارہ پر تشریف فرما تھے وہ مجھے اپنی کار میں بٹھا کر مکی مسجد پہنچا گئے، رفقاء کسٹم سے نمٹ کر ایک گھنٹہ کے بعد پہنچے، چونکہ پہلے سے اتوار پیر کی درمیانی شب میں کراچی سے

روانگی تجویز تھی اور اسی طیارہ سے دہلی سے جدہ کے لیے ایک صاحب آرہے تھے، ان کو صولتیہ کا ٹیلیفون نمبر اور چند ریال دیئے، ریال لینے سے تو انہوں نے شدت سے انکار کیا مگر مکی مسجد پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہمیں صرف ۲۷ گھنٹے ٹھہرنے کی اجازت ہے۔

سابقہ اطلاع منسوخ ہر چند احباب نے کوشش کی کہ جہاز کی روانگی کے وقت تک مکی مسجد ٹھہرنے کی اجازت دی جائے مگر اجازت نہ مل سکی اور شنبہ کے دن مغرب کے بعد مکی مسجد سے مطار پر آنا پڑا اور یہ رات مطار کے ہوٹل میں گزارنی پڑی، دو کمرے کرائے پر لیے گئے، ایک میں زکریا احسان، حبیب اللہ، اسماعیل چار آدمیوں کی اجازت تھی، دوسرے کمرہ میں پہلوان ابراہیم، بھائی صغیر لاہوری وغیرہ نے لیا تھا، مگر لیٹنے کے بعد پہلوان بھی ہمارے ہی کمرے میں آگیا اور نیچے لیٹ گیا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے نہایت راحت و آرام سے رات گزری اتوار کی صبح کو حاجی فریدالدین صاحب اپنی گاڑی لے کر ہوٹل پہنچ گئے اور وہاں سے مطار پہنچے، مگر طیارہ پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہمارے ٹکٹ جو ساڑھے آٹھ بجے والے جہاز سے تھے وہ منسوخ کر دیئے گئے اس لیے کہ وقت سے پہلے سامان نہیں پہنچے تھے۔

اللہ تعالیٰ حاجی فریدالدین صاحب کو جزائے خیر دے کہ وہ مجھے تو طیارہ پر بٹھا گئے اور فرما گئے کہ تمہارے ٹکٹ ابھی لاتا ہوں، عین وقت پر قاضی صاحب اور مولوی یوسف تتلی بھی اسی میں آگئے، ۸ بج ۳۰ منٹ پر کراچی سے چل کر ۱ بج کر دس منٹ پر جدہ پہنچ گئے، چونکہ زکریا کو بخار کا سلسلہ ہو رہا تھا اس لیے نہ احرام باندھا نہ مکہ جانے کا ارادہ تھا، اس لیے جدہ میں بھائی شجاع کے مکان پر قیام رہا، تین گھنٹے بعد میرے رفقاء مولوی اسماعیل، حبیب اللہ کسٹم وغیرہ سے نمٹ کر بھائی شجاع کے مکان پر پہنچے۔

علی میاں پہلے سے مکہ پہنچے ہوئے تھے مگر مطار نہ پہنچ سکے مغرب کے وقت بھائی شجاع کے گھر پہنچے جدہ میں اول مولوی اسعد مدنی کا ٹیلیفون مدینہ میں ہجوم ہے، مدرسہ علوم شرعیہ تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں اس لیے یہاں آنے کا ارادہ نہ کریں دوسرا ٹیلیفون بھائی حبیب اللہ دہلوی کا پہنچا کہ مدینہ اس وقت بالکل نہ آویں مگر ایسی حالت میں عمرہ کرنا زکریا کے بس کا نہیں تھا، اس لیے جدہ سے پیر کی صبح کو یوسف کی بیجو میں زکریا مولوی حبیب اللہ، مولوی اسماعیل، قاضی جی روانہ ہوئے عزیز عبدالحفیظ نے گاڑی چلائی، ۱۲ بج کر ۵۰ منٹ پر جدہ سے روانہ ہوئے اور ۴ بجے بدر پہنچے۔ مگر وہاں سے جدہ کی تین گاڑیاں مسلط ہوگئیں وہ آگے آگے آہستہ آہستہ چل رہی تھیں کہ کوئی گاڑی قطار سے باہر نہ نکلے، ۶ بجے مدینہ پہنچے، سید حبیب صاحب کے مکان پر مولوی اسعد صاحب سے

ملنے کے لیے گاڑی روکی مولوی اسعد تو حرم جاچکے تھے سید حبیب صاحب سے ملاقات ہوئی اور ۶ بج کر ۳۰ منٹ پر مسجد نور پہنچے، عصر میں مولوی اسعد اور مولوی ارشد بھی مسجد نور پہنچے، رات کو ۴ بجے عبدالحفیظ نے کہا اس وقت سامان آسانی سے جاسکتا ہے ہم لوگ مدرسہ شرعیہ پہنچا آتے ہیں صبح کو تیرا جانا آسان ہوگا کہ جہاں تک گاڑی جاسکے گی گاڑی، اس کے بعد تو اپنی کرسی پر چلے جایئے۔

یکم ذی الحجہ ۹۶ھ ۲۳ نومبر کو اُم القریٰ میں پیر کی یکم اور منگل کا حج شائع ہوا تھا کہ اُم القریٰ کی تاریخ ہی پر یہاں مدار ہوتا ہے، مگر مدینہ پہنچ کر پہلے اعلان ہوا کہ بدھ کو حج ہوگا، جمعہ کو پھر اعلان ہوا کہ حج منگل ہی کو ہوگا۔

۵ ذی الحجہ کو قاضی صاحب عزیز عبدالحفیظ کے ساتھ حج کے لیے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے ہجوم کی وجہ سے بقیع جانے کی بھی نوبت نہیں آئی خیال تھا کہ ۸ ذی الحجہ کو ہجوم ختم ہو جائے گا تو بقیع جائیں گے مگر معلوم ہوا کہ بقیع بند ہو گیا صرف جنازہ کے وقت کھلتا ہے اور مخصوص آدمیوں کو جانے دیتے ہیں۔

۱۰ ذی الحجہ کو صبح کی نماز کے بعد اجتماعی تکبیرات تشریق جو ہمیشہ تک مکہ میں معمول تھی مگر مکہ والوں نے اب اس کو روک رکھا ہے، مدینہ میں اب بھی جاری ہے، قاضی صاحب نے لندنی احباب کے ساتھ ان ہی کے خیمہ میں حج کیا، ان ہی کے ساتھ آئے، زکریا نے تو اس سال امراض کی وجہ سے حج نہیں کیا تھا اللہ تعالیٰ ہی معاف کرے۔

سہارنپور دار جدید میں عیدالاضحیٰ میں قاری مظفر کی امامت میں مختصر جماعت قربانی کی وجہ سے ۷:۳۰ بجے ہوئی اور دارالطلبہ قدیم میں قاری نسیم کی امامت میں ۹:۳۰ بجے۔

۱۳ ذی الحجہ کی شب میں ڈاک خانہ میں آگ لگی دس ہزار خطوط جل گئے مدینہ میں دو ہفتے کے لیے مسجد نبوی اس سال ساری رات کھلی رہی ہجوم کی کثرت تھی۔

۱۵ ذی الحجہ کی شب میں علی میاں عشاء کے بعد پہنچے نوردلی کے مکان پر حجاج کا قیام تھا اس لیے مولوی امجد اللہ مرحوم کے لڑکے نے اپنے مکان پر قیام کرایا۔

۱۶ ذی الحجہ کو قبیل مغرب جب کہ نمازی کثرت سے مسجد آرہے تھے بھائی حبیب اللہ دہلوی کے مکان کے قریب ایک بوسیدہ دیوار گری جس سے ۵ آدمی شہید ہو گئے اور بہت سے زخمی۔

۹ دسمبر ۷۶ء کی شب میں مولانا قاسم صاحب شاہ جہان فتح پور میں شب کے ۱۲ بجے انتقال فرما گئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، اس ناکارہ پر تو بڑی شفقت تھی اور مظاہر علوم کی اسٹرائیک کے زمانہ میں جب کہ وہ مظفر نگر کے ایک جلسہ میں شرکت کے لیے جارہے تھے سہارنپور کے اسٹیشن پر جب انہیں اس ناکارہ کی پریشانی اور اسٹرائیک کا حال معلوم ہوا تو سہارنپور کے اسٹیشن ہی سے

ایک آدمی مظفرنگر بھیج دیا کہ میں نہیں آ سکتا اور ایک ہفتہ تک مسلسل قیام فرمایا اور اپنے سارے پروگرام منسوخ کردیے، مدینہ پاک میں مرحوم کے لیے دعاؤں اور ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا، مولانا مرحوم سے بہت قدیم تعلقات تھے اور جب بھی دیوبند یا قرب وجوار میں جلسہ میں تشریف لاتے تو آتے جاتے ضرور سہارنپور قیام فرماتے، یہ ناکارہ مولانا کے احسانات کا بدلہ دعاء اور ایصال ثواب کے سوا کیا کرسکتا ہے۔

علی میاں مدینہ منورہ میں ایک ہفتہ قیام کے بعد واپس تشریف لے گئے یمن والوں کا اصرار تھا کہ وہاں تشریف لے جائیں مگر باوجود کوشش کے وہاں کا ویزا نہ مل سکا۔

۶ محرم ۱۳۹۷ھ ۲۷ دسمبر ۷۶ء کو دارالعلوم بولٹن کا پہلا سالانہ جلسہ ہوا زیر صدارت مولانا اسعد مدنی۔

۸ محرم ۹۷ھ کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں حفاظ قرآن کا مقابلہ ہوا جن میں پانچ آدمی نمبر اول تھے ان میں عزیز عطاء الرحمٰن بھی تھا ڈیڑھ ہزار ریال انعام تجویز ہوا۔ ۱۴ صفر ۹۷ھ ۴ فروری ۷۷ء کی شب میں عزیز خالد سہارنپور کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا۔

۲۲ ماہ کی ایمرجنسی کے بعد اندرا کے الیکشن میں ہارنے کی وجہ سے آج ۲۱ مارچ ۷۷ء کو ایمرجنسی ختم ہوگئی، کانگریس ۳۰ سالہ دور میں پہلی دفعہ اس سال نس بندی کے مظالم کی وجہ سے تقریباً سارے ہی صوبہ جات ہند میں ناکام ہوگئی۔

پاکستان میں الیکشن اور اس کے بعد نہایت کثرت سے مظالم ہوتے رہے جب کہ ہندوستان میں اندرا نے اپنی ہار مان کر وزارت سے علیحدگی کا اعلان کردیا۔

۱۸ اپریل ۷۷ء کو ابراہیم پہلوان لائل پوری کا لڑکا جو جلوس میں جارہا تھا، شہید ہوگیا اور بہت ہی کثرت سے شہادتیں اور قید وبند اور زخمیوں کی خبریں پاکستان سے پہنچ رہی ہیں، اللہ تعالیٰ ہی رحم فرمائے۔

ملک خالد جو لندن اپنی ٹانگ کے علاج کے لیے گئے ہوئے تھے دو ماہ دس دن قیام کے بعد ۳۰ اپریل شنبہ کی شام کو ریاض پہنچے ریاض سے کئی طیارے لندن استقبال کے لیے گئے ہوئے تھے ان کی آمد کی خوشی میں **لا تعد و لا تحصیٰ** چراغاں ہوئے جس نے ہندوستان کی دیوالی کو بھی مات کردیا چھوٹے چھوٹے مکانات پر ایک ایک ہزار قمقمے جلے باب عثمان کے برابر جو ہوٹل ہے اس پر کئی ہزار قمقمے آتے ہوئے جلتے ہوئے نظر آتے تھے جو رات بھر جلتے تھے، فیاللاسف، مکہ مدینہ کی سڑکوں پر بہت کثرت سے گیٹ بنائے گئے حالانکہ ملک صاحب کا حرمین میں اس وقت آنا تجویز نہیں تھا بلکہ سیدھا ریاض جانا تجویز تھا۔

۲ مئی کی شب میں حکیم ذوالنون کی والدہ صاحبہ کا انتقال فجائی ہوا۔

۴ مئی کو قاضی صاحب پاکستان تشریف لے گئے کہ وہاں کے اہم اجتماعات شوریٰ وغیرہ کے موقوف تھے، قاضی صاحب نے ٹیلیفون کی کوشش کی مگر ہنگامہ کی وجہ سے ٹیلیفون تو نہیں مل سکا، ٹیلکس سے حالات معلوم کیے، احباب نے تو بہت زور سے قاضی صاحب کے آنے کا تقاضا کیا، مگر معلوم ہوا کہ ۷ مئی کو پیر پگاڑو کی قیادت میں ۲۰ لاکھ کا جلوس نکلنے والا ہے، اس زمانہ میں بھٹو کے خلاف بہت ہنگامے ہو رہے تھے، مارشل لاء اور قیدیں بہت زوروں پر تھیں۔

۵ مئی کو ایک صاحب تشریف لائے اور کہا کہ میں تیری ٹانگوں کے علاج پر مامور ہوا ہوں کب آؤں؟ میں نے بہت شکریہ کے ساتھ عرض کیا کہ میں خود ہی تکلیف دوں گا، انہوں نے اصرار کیا کہ میں مامور ہوں، زکریا نے اس وقت معذرت کر دی اور بعد میں احباب سے اور مولانا عبدالحق صاحب نقشبندی وغیرہ سے تحقیق کی تو انہوں نے کچھ زیادہ معتبر نہیں بتایا۔

۷ مئی آج حرم نبوی کی دھوپ گھڑی جو سینکڑوں سال سے حرم کی کنکریوں کے اوپر نصب تھی، اکھاڑ کر مصلی الجنائز کے آگے رکھ دی گئی، اس لیے کہ کنکریاں اُٹھائی جانی اور اس کی جگہ پتھر لگانا تجویز ہوئے ہیں اس لیے کہ عورتیں کنکریاں اُٹھا کر بچوں کو پیشاب پاخانہ کرا کر کنکریاں اُوپر رکھ دیتی تھیں۔

۱۴ مئی، آج عزیز زبیر الحسن سلمہ کی داہنی آنکھ کا آپریشن ہوا اور ڈاکٹروں نے آپریشن کے بعد کمرہ میں پاؤں پاؤں پہنچا دیا۔

۲۴ مئی آج عزیز محمد سعید رحمت اللہ کا مکہ سے خط آیا کہ آپ کی دعاء کی برکت سے جو درخواست جلالۃ الملک کو بھیجی تھی (بسلسلہ تابعیہ زکریا) ابھی ابھی اس کی منظوری کی اطلاع آ گئی پندرہ بیس روز میں ریاض سے معاملہ مکہ میں آئے گا اور اس کی تکمیل میں کم سے کم پندرہ روز مکہ میں لگیں گے، اخیر رجب امید ہے کہ تکمیل ہو جائے گا، اگر ہند کے سفر کا ارادہ ہو تو اس سے پہلے نہ کریں۔

۲۷ مئی آج رباط بھوپالی میں دفعۃً آگ لگی سب سے نیچے کی منزل میں پاکستانی ہوٹل کا مطبخ تھا اسی سے آگ کی ابتداء ہوئی بہت مشکل سے رباط کے آدمیوں کو نکالا گیا۔

۳۱ مئی آج لکھنؤ سے حیات خلیل کا پہلا نسخہ بذریعہ ڈاک پہنچا۔

۳ جون کی شب جمعہ میں مولانا شریف صاحب مدرس دار العلوم دیوبند کا حادثۂ انتقال۔

......☆☆☆☆☆......

سفرِ ہند ۱۳۹۷ھ

جمادی الثانی

زکریا کا معمول ہمیشہ سے یہ ہے کہ ہندوستان سے واپسی پر پہلے ہی دن سے آیندہ رمضان کے لیے استخارہ شروع کر دیتا ہے، اس سال بھی اولاً ممانعت آئی تھی، مگر ۲۴ جمادی الثانیہ کو ایک صالح آدمی کے مکاشفہ میں جو کئی دن سے ہو رہا تھا یہ الفاظ حضورِ اقدس کے پہنچے رحلة سعیدة، موفقة، مبارکة ومقبولة ان شاء اللہ تعالیٰ تقریباً چھ مرتبہ یہ الفاظ فرمائے، جن میں ایک دو مرتبہ مقبولة فرمایا اور بقیہ اس کے بغیر اس پر ارادہ کر لیا اور ۲۴ جمادی الثانیہ کو مکہ روانگی ہوگئی۔

مغرب بدر میں پڑھی، عشاء تک قیام رہا، صوفی اقبال، ڈاکٹر اسماعیل، بھائی یحییٰ کی مشترک دعوت ہوئی، صبح کی نماز کے بعد شہداء پر حاضری ہوئی، ایک گھنٹہ قیام رہا، ایک بجے بدر سے چل کر ۴ بجے سعدی کے گھر پہنچ گئے اور حسبِ معمول مغرب سے پہلے حرم شریف میں پہنچ گئے، عشاء کے بعد حسبِ معمول بھائی سلیم کے یہاں زوردار دعوت ہوئی اس کے بعد عمرہ کیا اور عزیز سعدی کے گھر جا کر سو گئے، عزیز سعدی نے کہا کہ تمہارے کاغذات تابعیہ کے آ گئے ہیں، مگر دفتر جانا ضروری ہے، دوپہر کو عزیز حلیم کی کار میں بھائی شمیم کے ساتھ دفتر پہنچے عزیز سعدی پہلے جا چکا تھا، اس کی تلاش میں آدھ گھنٹہ دھوپ میں رہنا پڑا، اس کے بعد جوازات کار ہی پر آ گئے، بہت معذرت کی کہ میں تو تکلیف نہ دیتا مگر حلف نامہ میں سامنے ہونا شرط ہے، دس منٹ میں میری کارروائی پوری ہوگئی اور میں واپس آ گیا، عزیزانِ سعدی اور شمیم اس کی تکمیل کراتے رہے۔

۵ رجب ۲۱ جون کو تابعیہ مجھ تک پہنچ گیا، اس پر ہجرت کی نیت کر لی، میں نے تو دو سال پہلے اولاً مولانا ابوالحسن علی میاں سے اور ثانیاً عزیز عبدالحفیظ سے کہا تھا کہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ ہماری حکومت نہ معلوم کب میرا پاسپورٹ ضبط کر لے، مجھے تابعیہ دلوا دو، مگر ان دونوں نے بڑے زور سے مخالفت کی تھی کہ اقامہ میں زیادہ سہولت ہے بہ نسبت تابعیہ کے، میں نے تو ارادہ ملتوی کر دیا تھا، مگر عزیز سعدی سے بھی تذکرہ آیا تھا، اس نے اللہ تعالیٰ اسے جزائے خیر دے، خود ہی درخواست دے کر اس مسئلہ کو نمٹا دیا کہ آں عزیز کو اللہ تعالیٰ فلاحِ دارین نصیب فرمائے، میرے حجازی کام ہمیشہ اسی نے نمٹائے اور بلا کسی مشقت کے، ۲۸ رجب ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۴ جولائی ۷۷ھ کو ۴ بجے عربی صولتیہ سے دعاء کرا کر سعدی کے گھر گئے، بھائی سلیم کی طبیعت ناساز تھی، وہ دعاء میں شریک نہ ہو سکے۔

سعدی کے یہاں سے اپنی عصر پڑھ کر سعدی کی گاڑی میں جدہ کے لیے روانگی ہوئی، قیام بھائی شجاع کے یہاں ہوا، جمعہ کی صبح کو عزیز عبدالحفیظ، ڈاکٹر ظفیر وغیرہ سامان لے کر مطار پر گئے، جس جہاز سے جانا تھا وہ نیروبی سے آتا تھا، اس میں تاخیر بھی ہوجاتی ہے، جہاز کی کمپنی کا منیجر گھر آ کر کہہ گیا تھا کہ آپ بے فکر رہیں، جہاز جب آئے گا تو آپ کو اس وقت مطلع کر دیں گے، ایک بجے عربی مطار پر پہنچے، جہاز کے آتے ہی سعدی کی گاڑی میں جہاز تک جا کر اطمینان سے سوار ہوگئے، عبدالحفیظ کے تقاضے پر تین ٹکٹ درجہ اولیٰ کے لیے گئے، ایک عبدالحفیظ کے لیے جو پہنچانے دہلی تک جارہا تھا، ایک زبیر لائل پوری کے لیے اور ایک نوکر کے لیے۔

جدہ سے روانگی کے ایک گھنٹہ بعد کیپٹن عثمان کا پیام پہنچا کہ مجھے بیعت ہونا ہے، کل کس وقت حاضر ہوں، میں نے کہہ دیا کہ اب اگر آسکتے ہو تو آجاؤ، وہ اپنا نائب مقرر کر کے آگیا، میں نے اپنے اعذار پیش کیے اور کہا کہ پاکستان میں بہت سے مشائخ موجود ہیں، اس نے کہا کہ دل قبضہ کا نہیں، چنانچہ اس کو بیعت کرلیا، اس نے کہا یہ پہلی نظیر ہوگی کہ جہاز پر بیعت کیا، میں نے کہا کہ بالکل صحیح۔

جہاز چونکہ لیٹ تھا اس لیے بجائے جمعہ کے دو گھنٹہ بعد پہنچا، جہاز سے اترتے ہی حاجی فرید کی گاڑی میں ملی مسجد پہنچ گئے اور وہاں اپنا جمعہ پڑھا اور بقیہ رفقاء بعد میں پہنچے، مفتی شفیع صاحب کی قبر اور مدرسہ میں بار کی صبح کو گئے، وہاں سے واپسی پر بھائی یوسف رنگ والوں کے یہاں ناشتہ کیا اور پھر اچھن میاں کے گھر گئے وہاں والدہ طلحہ قریشی سے ملاقات ہوئی اس نے اصرار کیا کہ آپ لڑکی سے براہِ راست بات کرلیں وہ تیار ہے میں نے لڑکی کو اور اچھن میاں کو اور اس کی اہلیہ سے الگ الگ بات کی کوئی راضی نہیں تھا اس لیے والدہ طلحہ قریشی سے معذرت کر کے چلا آیا کہ ان میں سے کوئی راضی نہیں، پیر کے دن میں ظہر کا وضو کر رہا تھا کہ حاجی فریدالدین صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ اسی وقت مکہ سے ٹیلیفون آیا ہے کہ رات بھائی سلیم کا انتقال ہوگیا زکریا نے ظہر کی نماز میں بھی عصر کی نماز میں بھی دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کے لیے اعلانات کرائے اور چلنے کے وقت تک اکثر مجلس میں یہ اعلانات ہوتے رہے۔

عزیز سعدی سے خط سے حادثہ کی تفصیل معلوم ہوئیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سانس کی تکلیف ان کو عرصہ سے چل رہی تھی ایک حالت پر زیادہ دیر نہیں رہ سکتے تھے، کبھی لیٹتے تھے، کبھی بیٹھتے تھے جس رات کو انتقال ہوا طبیعت بہت اچھی تھی کھانا سب کے ساتھ کھایا ہنستے بولتے رہے ۳:۳۰ بجے سب کو حکم دیا کہ اپنے اپنے بستروں پر سب جا کر آرام کریں سب چلے گئے آرام کیا ۹ بجے صبح کو والدہ شمیم کی آنکھ کھلی تو سردی سی محسوس ہورہی تھی، انہوں نے کولر بند کیا اور قریب جا کر دیکھا تو بے

سدھ سو رہے ہیں سانس وغیرہ کی آواز نہیں ہے، انہوں نے آوازیں دیں ہلایا مگر کوئی حرکت وآواز نہیں وہ شمیم کو بلا کر لائیں تو انہوں نے آ کر دیکھا تو وہ چل دیئے، صبح کی اذان پر بھائی شمیم کا ٹیلیفون آیا کہ ابا جان رات کو کسی وقت چل دیئے جنازہ کا وقت عصر کی نماز میں طے ہوا، ہجوم صبح ہی سے شروع ہو گیا تھا۔

ظہر کے بعد اوپر کی منزل سے مدرسہ کی درمیانی منزل میں اتار کر غسل دیا گیا مولوی غلام رسول اور مولوی عطاء المھیمن بن عطاء اللہ شاہ بخاری نے غسل دیا اس کے بعد مردوں عورتوں کو آخری زیارت کرانے کے بعد جنازہ کو نیچے اُتارا گیا مدرسہ کے نیچے کے ہال میں شیخ حسن نشاط نے اول نمازِ جنازہ پڑھائی اور عصر کی نماز کے بعد حرم میں دوبارہ نمازِ جنازہ ہوئی، جنازہ میں بہت ہجوم تھا سید علوی مالکی کے بعد یہ دوسرا جنازہ تھا جو حرم سے جنت المعلیٰ تک ذکر بالجہر کرتا ہوا گیا، ۹:۴۵ بجے معلیٰ اپنے احاطہ میں پہنچے حکیم نعیم کی قبر میں دفن کیا گیا، اسی میں شیخ الدلائل شیخ عبدالحق بھی مدفون ہیں۔

پیر کی شام کو محمد بنوری کے ولیمہ کی دعوت میں ان کے مکان پر گئے، منگل کی صبح کو دوبارہ مولانا بنوری کے اصرار پر ان کے مدرسہ جانا ہوا، پیر کی شام کو قاری طیب صاحب کا پیام ملا کہ پہلے سال یہیں ملاقات ہوئی تھی، ان کو دس بجے کا وقت دے دیا، مولانا بنوری کو جاتے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے قاری صاحب سے ملنا ہے صرف پون گھنٹہ ٹھہروں گا، پھر ناشتہ کیا پھر طلبہ دورہ حدیث کو بخاری شریف کی پہلی حدیث سن کر اجازت دی، حضرت قاضی عبدالقادر صاحب نے دعاء کرائی، وہاں سے فارغ ہو کر سوا نو بجے مکی مسجد آیا تاکہ قاری صاحب کو انتظار نہ کرنا پڑے مگر کسی بیوقوف نے میری طرف سے قاری صاحب کو یہ پیام دے دیا کہ میں آج مولانا بنوری کے یہاں جا رہا ہوں ملاقات نہیں ہو سکتی۔

حاجی فریدالدین صاحب نے اس کی اطلاع دی، میں نے فوراً کہا کہ آپ قاری صاحب کو جا کر اطلاع کر دیں کہ میں آپ کی وجہ سے مکی مسجد آ گیا ہوں، قاری صاحب کی تو دعوت تھی مگر وہ دعوت سے پہلے مکی مسجد آ گئے، آدھ گھنٹہ قیام کے بعد دعوت میں گئے، میں نے اپنی عادت کے موافق پھل وغیرہ بہت سے رکھوائے انہوں نے کہا کہ میری تو دعوت ہے، میں نے کہا کہ یہ میرا فریضہ تھا کھانے پر اصرار نہیں اپنے ساتھ اُٹھالیں مگر قاری صاحب نے اٹھانے سے انکار کر دیا کراچی میں حسب معمول بہت سے مدارس والوں نے اپنے یہاں لے جانے پر اصرار کیا، مگر بندہ نے اپنی معذوری کی وجہ سے انکار کر دیا، پیر کے دن عصر کی نماز مطار پر پڑھنی تجویز تھی مگر حاجی فرید نے کہا کہ رفقاء پہلے جائیں اور آپ نماز پڑھ کر میری گاڑی میں جائیں مطار پر پہنچ کر بہت راحت

سے فرسٹ کلاس میں بیٹھ گیا، مگر عین وقت پر معلوم ہوا کہ بلگرامی نے میرے چار ساتھیوں احمد بن مولانا اسعد مدنی، حبیب اللہ، حسان، سہیل بن ڈاکٹر اسماعیل چاروں کے ٹکٹ باوجود ساری کارروائی پہلے سے بکنگ ہونے کے کینسل کرادیئے اور اپنے کسی آدمی کو جو اسی جہاز سے جانا چاہتے تھے دے دیئے۔

حاجی فرید صاحب طیارہ کے افسر کو ساتھ لے کر بلگرامی کے پاس آئے اس سے بحث ومباحثہ طویل ہوا اس نے کہہ دیا کہ لسٹ میں ان کا نام نہیں ہے، حاجی صاحب نے کہا کہ ان کا نام تو جدہ سے منظور ہوا ہے، اس ردوقدح میں جہاز کی روانگی میں بھی دس منٹ کی تاخیر ہوگئی بالآخر اس نے مانا نہیں اور یہ چاروں رہ گئے، دہلی کے مطار پر مولوی اسعد بھی احمد کو لینے پہنچے تھے مگر اس کے ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے سامان لے کر چلے گئے دوسرے دن احمد حبیب اللہ اور حسان کے ساتھ نظام الدین پہنچ گیا، مولوی اسعد نے سارے دن ٹیلیفون کرنا چاہا مگر لائن نہ ملی، سہیل تنہا کراچی رہ گیا اس کو براہ بمبئی نہیں جانے دیا اس لیے کہ اس کا دخول براہ دہلی تھا، اس لیے زکریا نے بھائی یوسف رنگ کو تار دیا کہ سہیل کو یحیٰی مدنی کے ہاتھ مدینہ منورہ واپس بھیج دو تنہا ہندوستان نہ بھیجو مگر ان کو تار نہیں پہنچا، چہارشنبہ کی شام کو وہ تنہا آیا زکریا کی روانگی از دہلی شنبہ کو طے تھی۔

چنانچہ حسب تجویز اپنی جماعت سے فجر کی نماز پڑھ کر روانہ ہوگیا اس سال غازی آباد میں چونکہ حاجی شفیع صاحب کے لڑکے نے گھڑی کی فیکٹری کھولی تھی اس لیے وہاں چائے بھی پی نفل بھی پڑھے اور میرٹھ کے لیے روانہ ہوگیا میرٹھ میں حاجی شفیع صاحب کے سابقہ کارخانہ میں بھی تھوڑی دیر قیام کیا لالہ جی تو تھے نہیں ان کے کارندے تھے اس نے اصرار کیا کہ اس کے اصرار پر ایک بوتل پی لی اس نے ٹیلیفون کیا کہ میں ابھی،، تا ہوں مگر اس سے معذرت کرکے آگے چل دیئے۔

ننھے خان کے یہاں پہنچے ایک گھنٹہ وہاں قیام رہا زکریا نے بیعت کرائی، رفقاء نے ناشتہ کیا وہاں سے حضرت میرٹھی کے مزار پر ہوتے ہوئے دیوبند حاضری ہوئی، یہاں پہنچ کر بھائی کرامت کی گاڑی جس میں ہم آرہے تھے خراب ہوگئی، اطمینان سے مزار پر حاضری رہی تقریباً دو گھنٹے وہاں قیام رہا، دیوبند سے چل کر تلہیڑی تک پہنچے تھے کہ گاڑی میں آگ لگ گئی، اس لیے کے دیوبند کے مستری نے تار غلط جوڑ دیا تھا، بہت مشکل سے دوسری گاڑی میں منتقل ہوکر سہارن پور پہنچ کر زکریا حاجی نصیر کی کار میں آیا، بھائی کرامت اپنی گاڑی کو درست کرا کر کہ ایک مستری سہارنپور سے اور ایک دیوبند سے پہنچ گیا تھا، بعد میں سہارنپور پہنچے۔

سہارنپور کے قریب شیخ سعید کے کارخانہ میں زکریا اترا اور ان کا شکریہ مظلوم لڑکے کی حمایت میں ادا کیا، دو مٹھائی کے ڈبے پیش کیے، ایک ان کے لیے ایک ان کے بھائی کے لیے جو دہلی سے

ساتھ تھے، ابوالحسن دلی سے میرے ساتھ تھا، عافیت کے ساتھ ظہر کی نماز کے قریب سہارنپور پہنچ گئے، مگر تکان اور وقت کی قلت کی وجہ سے ظہر گھر پر ہی پڑھی خصوصی مصافحے ہوتے رہے۔

عصر سے ایک گھنٹہ پہلے ناظم صاحب سے ملتے ہوئے دار الطلبہ جدید پہنچ گئے وہاں عام مصافحوں کا اعلان صبح سے کردیا گیا تھا، اول عصر کے بعد مولانا عبدالحفیظ صاحب مکی نے دعاء کرائی اس کے بعد مصافحے ہوتے رہے، قبیل مغرب فارغ ہوکر کچے گھر میں آئے، وہاں پیشاب وضو وغیرہ سے فارغ ہوکر مدرسہ قدیم کی مسجد میں آگئے۔

اس مرتبہ جاتے ہی یہ قانون بنا دیا تھا کہ مغرب سے عشاء تک کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی آجائے تو اطلاع نہ کی جائے اس کے باوجود دوسرے دن مولانا اسعد صاحب مع اپنی والدہ محترمہ کے آئے تو اپنا نظام تغیر کرنا پڑا دوسرے دن اپنی فجر پڑھ کر گنگوہ کے لیے روانہ ہوئے، صوفی رشید گنگوہی نے بہت حلفیہ اطلاع دی تھی کہ میں آج ہی راستہ دیکھ کر آیا ہوں کہ راستہ صاف ہے معلوم ہوا کہ جھوٹ بولا، مزار تک راستہ خراب تھا کہ لکھنوئی والی سڑک پر اتنا پانی بھرا تھا کہ نہ میری کار جا سکتی تھی نہ کسی اور کی دونوں کاروں کو چھوڑ کر جونگوں میں بڑی مشکل سے مزار تک پہنچے، کاروں کو حکیم نہو کے گھر بھیج دیا۔

مزار سے دس بجے اُٹھ کر حکیم نہو کے یہاں ایک گھنٹہ ٹھہر کر دونوں خانقاہوں قدوسیہ اور سعیدیہ میں حاضری دیتے ہوئے قاری شریف کی اس غلط روایت پر کہ شہر کا سیدھا راستہ خطرناک ہے گھر کے راستہ سے لے گیا، ایک گھنٹہ اپنے یہاں خلافِ وعدہ ٹھہرایا آم وغیرہ کا اس نے انتظام کر رکھا تھا، وہاں سے مولوی ایوب کے یہاں پہنچے چونکہ ان کی اہلیہ دہلی میں تھیں اور وہاں ملاقات ہوچکی تھی اس لیے مولوی ایوب بھی صوفی جی کے یہاں پہنچ گئے، صوفی جی نے جاتے ہی کھانے سے فارغ کردیا، مگر حسب دستور سابق کھانے کے بعد مستورات کی جھاڑ پھونک ہوتی رہی۔

ظہر کے بعد قاری شریف کے مدرسہ میں مفتی محمود صاحب نے مشکوٰۃ شریف ختم کرائی مولانا عبدالحفیظ صاحب مکی نے دعاء کرائی مولانا انعام صاحب اس لیے ساتھ دہلی سے نہ آسکے کہ ان کو شاملی کے قریب کسی اجتماع میں جانا تھا۔

گنگوہ سے روانگی کے بعد شاہ نور کی مسجد میں جانے کا خیال تھا مگر سہارنپور کے قریب شدید بارش تھی کہ میری کار تو اسلامیہ اسکول پر نہ جاسکی چکر کاٹ کر شاخ پر آگئی مگر دونوں جونگے اسکول پر پہنچ گئے دوسرے دن حسب تجویز اپنی نماز پڑھ کر ۵ بجے رائے پور روانہ ہوئے ۶ بجے مزار پر پہنچ گئے، ۸ بجے وہاں سے سہارنپور کے لیے روانہ ہوئے، مگر مولانا ابرار صاحب ہردوئی والے کی کار کو باغ کے مدرسہ والوں نے روک لیا کہ ان سے امتحان لینے کا وعدہ تھا۔

راستہ پر شاہ زاہد حسین صاحب کے مزار پر حاضری دیتے ہوئے راستہ میں ریڑھی کے مدرسہ میں بھی جانے کا خیال تھا مگر رائپور میں معلوم ہوا کہ مولوی حشمت کو ریڑھی والوں نے الگ کردیا۔ اس لیے وہاں جانا ملتوی کردیا اور عافیت کے ساتھ دس بجے سہارنپور پہنچ گیا رائے پور میں ۴، ۵ بچوں کا ختم قرآن مجید بھی کرایا۔

۹ شعبان ۹۷ءمطابق ۲۷ جولائی ۷۷ھ میں جب عصر کا وضو کر کے نماز کے لیے گھر سے نکل رہا تھا کہ عزیز مولوی سالم دیوبندی، مولوی نصیر، مولوی معراج وغیرہ کی کار پہنچی۔ مسجد میں مولوی سالم کا پیام پہنچا کہ چند منٹ ضروری بات کرنی ہے نماز کے بعد مسجد ہی میں بیٹھ کر آدھ گھنٹہ تخلیہ میں بات ہوئی۔ جس میں انہوں نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے اس رسالہ کا ذکر کیا۔ جس میں حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی، حضرت مدنی اور تبلیغ والوں کو خوب لتاڑا تھا، انہوں نے کہا کہ حضرات دیوبند کا خیال اس کا جواب لکھوا کر اور جملہ مدارس کے اکابر سے دستخط کرا کر شائع کرانے کا ہے۔ میں نے بھی اس کی تائید کی اور کہا کہ بہت ضروری ہے انہوں نے کہا کہ قاری طیب صاحب کی آمد کے بعد اس کی تکمیل ہوگی، جو پاکستان کے سفر پر گئے ہوئے تھے، میں نے کہا کہ مسودہ کل کو مفتی محمود کے ہاتھ بھیج دیں مگر میرے قیام ہندوستان میں وہ نہیں پہنچ سکا۔

۱۰ شعبان ۲۸ جولائی کو مسلسلات اور بخاری کا ختم کرایا۔

۱۲ شعبان ۳۰ جولائی عزیز زبیر دوسری آنکھ کے آپریشن کے لیے ہسپتال میں داخل ہوا۔ بار کی صبح کو آپریشن ہوا۔

عزیزم مولوی حبیب اللہ ۲۷ جولائی ۹ شعبان کو اعجاز کے ساتھ سہارنپور لینے آیا ہوا تھا گھر گیا۔

۱۲ شعبان ۲۳ جولائی اپنے سسرال گئے اور ۱۳ شعبان کی شام کو رخصتی ہوئی۔

۱۲ شعبان کو شمیم نیرانوی کے قلم سے خوش خط اعلان مدرسہ کے بورڈ پر لگوادیا۔

۱۔ جو احباب مسلسلات میں شرکت کے لیے آتے ہیں مگر اس میں شریک نہیں ہوتے سند وغیرہ کے لکھوانے میں مشغول رہتے ہیں بغیر پڑھے اجازت یا سند کوئی معتبر نہیں میری طرف سے ایسے لوگوں کو اجازت نہیں۔

۲۔ جو حضرات کسی بھی مدرسہ کی اسٹرائیک میں شریک ہو چکے ہوں ان کو نہ میری طرف سے اجازت حدیث ہے نہ اجازت بیعت اور جو بیعت کے بعد اسٹرائیک میں شریک ہوئے ہوں ان کی بیعت بھی منسوخ ہے ہندوستان میں مشائخ حقہ کی کمی نہیں جدھر چاہیں رجوع کرلیں میری طرف سے اجازت ہے۔

اس سال ۹۷ھ رمضان کا ہجوم بہت پہلے سے بڑھ رہا تھا مدرسہ قدیم میں جگہ نہیں رہی تھی اس

لیے ۲۸ شعبان ہی کو دارِ جدید میں منتقل ہو گیا۔ رویت عامہ منگل کی شام کو ہو کر بدھ کو یکم رمضان ہندی شمار ہوا۔ اور حجاز میں یکم رمضان دوشنبہ کو ہوا۔

دارِ جدید میں حسبِ دستور تین قرآن ہوئے پہلا اور تیسرا سلیمان کا دوسرا خالد کا، دار الطلبہ قدیم میں مختار حفید ناظم صاحب نے بھی تین قرآن پڑھے۔ جامع مسجد میں قاری گورا، مدرسہ قدیم میں محمد افریقی نے طلحہ نے حسبِ دستور مولوی نصیر کی ٹال میں سنائے۔ دیوبند میں حضرت مدنی کی مسجد میں عزیز مولوی ارشد نے اور دار العلوم کی مسجد میں مولوی سالم نے قرآن سنایا۔ قاری طیب صاحب نے بمبئی میں رمضان گزارا۔

نظام الدین میں مسجد میں مولوی یعقوب نے اور مولانا انعام صاحب نے گھر میں پڑھا اس سال رمضان میں خصوصی لوگ قاضی عبدالقادر صاحب، عبدالحفیظ، عبدالوحید مکیان حاجی عبدالعلیم مع مراد آبادی حضرات جو بدلتے رہے، عزیزم مولوی رشید الدین حسبِ دستور سابق، ڈاکٹر اسماعیل، حافظ عبدالستار صاحب، مولوی یوسف تتلی متعدد رفقاء افریقہ کے ساتھ، مولوی یوسف متالا و مولوی ہاشم لندنیان، مولوی فقیر محمد انڈمانی مع خدام مستورات، اس سال مدینہ منورہ میں زکریا کے حجرہ کے برابر والے حجرہ کے مہمانوں کی وجہ سے بجلی کے تار میں آگ لگی۔ عطاء الرحمٰن نے بہت کوشش جلد آگ بجھوادی۔

۲۷ رمضان کو قاضی صاحب عید پڑھانے کے لیے پاکستان تشریف لے گئے اور اسی رات پہلوان ابراہیم لائل پوری سہارنپور پہنچا۔

دار الطلبہ جدید میں عید کی نماز سلمان نے پڑھائی اور دار الطلبہ قدیم قاری نسیم نے۔

۲ شوال کو مولوی اسعد مع چند خلفاء حضرت مدنی تشریف لائے۔ ابوالحسن نے چائے اور لوازمات فوراً کردیے۔

اس سال حاجی شاہ صاحب کا عرس دھوم دھام سے کیا گیا۔ اشتہار بازی ہوئی اور قوالی بھی اور نہ معلوم کیا کیا خرافات۔

۲ شوال مطابق ۷ ستمبر آج شب میں بھٹو دوبارہ مع اپنی جماعت کے گرفتار ہوا۔

۷ شوال کو رائے پور مزار پر حاضری ہوئی۔ مفتی عبدالعزیز کے مدرسہ میں قصبہ میں بھی گئے۔ محمد کاندھلوی نے دعاء کرائی۔ اس کے بعد مزار پور گئے وہاں جدید مدرسہ کی بنیاد رکھی کہ پہلا مدرسہ بہت تنگ ہو گیا تھا۔ واپسی میں شاہ صاحب کے مزار پر ٹھہرتے ہوئے سہارنپور آ گئے۔

حاجی نصیر علی گڑھی کے لڑکے پرویز کا نکاح مولوی انعام کی آمد پر ۶ شوال کو تجویز تھا مگر مولانا انعام صاحب کی عدم آمد کی وجہ سے اس دن ملتوی ہو گیا تھا اور ۱۰ شوال کو نکاح ہو گیا۔

اب کے رمضان میں حضرت خواجہ صاحب کلیری صابر کا سلام و پیام پہنچا تھا۔ اس کی شرم میں شروع شوال میں کلیر حاضری ہوئی۔

اس کے بعد گنگوہ حاضری ہوئی، وہیں مولوی عبدالمالک کے لڑکے مظفر کا نکاح قاری شریف کی لڑکی سے ہوا۔ حکیم تہو نے مہرِ فاطمی پر نکاح پڑھایا۔ ان سفروں کی تفاصیل روزنامچہ میں ہے۔

۲۳ شوال ۹۷ھ کی رات کو حافظ فرقان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔

۲۴ شوال مطابق ۱۹ اکتوبر کو مفتی محمود صاحب افریقہ کے لیے روانہ ہوئے۔

......☆☆☆☆☆......

واپسی از ہند

ذیقعدہ ۹۷ھ مطابق اکتوبر ۷۷ء

۱۷ اکتوبر کی صبح کو اپنی نماز پڑھ کر زکریا سہارنپور سے چلا اور متفرق کاریں آگے پیچھے چلتی رہیں نانوتہ پہنچ کر زکریا تو کار میں رہا اور رفقاء حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے مزار پر گئے اس سال مزار پر چار دیواری مسقف بن گئی وہاں سے واپسی سے تھانہ بھون مولانا ظہور الحسن صاحب کے مکان پر ان سے مل کر ان کو فالج پڑا ہوا تھا، پھر پیریوں میں حافظ ضامن صاحب اور حضرت تھانوی کے مزار پر حاضری کے بعد جھنجانہ ظہر سے پہلے پہنچے اس سال راستہ میں کاریں خراب ہوتی رہیں۔ جھنجانہ ظہر کی نماز پڑھ کر کار میں بیٹھ کر آدھ گھنٹہ مصافحے ہوئے وہاں سے چل کر سیدھ کاندھلہ عیدگاہ پہنچے زکریا تو عیدگاہ پر رہا رفقاء سب نے قصبہ میں آکر صوفی جی کے یہاں کھانا کھایا پھر لوگ عیدگاہ واپس آگئے اور کچھ قصبہ میں ٹھہرے رہے زکریا عصر پڑھ کر مکان آیا اور مغرب کے بعد مصافحوں کا انتظام کیا گیا تھا مگر قابو میں نہیں آیا اس لیے ملتوی کر دیا عشاء کے بعد زکریا حسب دستور اپنے چبوترہ پر اور بقیہ لوگ دوسرے مقامات پر ٹھہرے۔

۱۸ منگل کی صبح کو چائے کے بعد کار میں بیٹھ کر مصافحے ہوئے پھر کیرانہ کے اڈہ پر بھی آدھ گھنٹہ مصافحے ہوئے اور وہاں سے پانی پت کے مزارات پر حاضر ہوتے ہوئے زکریا نے اعلان کر دیا تھا کہ میں تو بر اس نہیں جاسکوں گا جس کا جی چاہے ہو کر آئے میں سیدھا سرہند جاؤں گا اور ظہر کے بعد ایک گھنٹہ بعد سرہند پہنچ گیا دورانِ سر اس سفر میں خوب رہا سرہند پہنچ کر تاخیر سے اپنی ظہر پڑھی۔

سجادہ صاحب اس سال وہیں تھے خبر سنتے ہی میرے مکان پر جو گزشتہ سال والا ابوالحسن نے اترتے ہی انتخاب کر لیا تھا آگئے اور بہت اعزاز و اکرام سے پیش آئے ہر چند زکریا ان کو اصرار کرتا رہا کہ آپ تشریف لے جائیں۔ مگر نہیں مانے عصر مسجد میں پڑھی اور مغرب تک مصافحے ہوئے مغرب کے بعد اپنے مستقر پر جا کر کیواڑ بند کر لیے، ہجوم بہت زیادہ رہا عشاء کے بعد سجادہ صاحب کی برکت سے مزار مقدس کے کیواڑ کھل گئے اور ان کی نگرانی میں ہجوم نہ ہو سکا اور زکریا اپنے چند رفقاء کے ساتھ گیا زکریا تو دو گھنٹے باہر کے حصہ میں بیٹھ کر آگیا۔ بقیہ رفقاء اندر بیٹھے رہے۔ دو گھنٹے کے بعد اپنے مستقر پر آیا تھوڑی دیر بعد مولوی احسان، قاضی محمود، زبیر سیدھے کار

میں ۱۸؍۱۱ کتوبر کو مغرب کے بعد سہارنپور سے چلے اور سیدھے سرہند پہنچے کہ ان کا ویزا کاندھلہ سرہند کا نہیں تھا۔

وہاں پہنچتے ہی ان کو بھی حجرہ شریف میں بھیج دیا اور ان کے حجرہ میں جاتے ہی پولیس کے آدمی تحقیقات کے لیے پہنچ گئے۔ ان سے کہہ دیا کہ یہاں تو کوئی پاکستانی نہیں ہے، وہ باہر تحقیقات کرتے رہے۔

۱۹ کی صبح کو اپنی نماز پڑھ کر زکریا ابوالحسن وغیرہ اپنی کار میں بورڈ پر چلے گئے۔

مگر رات میں بھائی کرامت کے بھائی کا ٹیلیفون پہنچا کہ مولوی انعام صاحب ریل سے امرتسر آرہے ہیں اس لیے اسی وقت محمد کاندھلوی ایک دو کاروں کو ساتھ لے کر امرتسر اسٹیشن پر پہنچ گیا۔

سرہند کے قیام میں مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کا حال ٹیلیفون سے معلوم ہوا۔ بورڈ پر پہنچ کر یہ خیال ہوا کہ مولوی انعام صاحب کا باہر ہی انتظار کیا جائے مگر اتنا ہجوم ہو گیا کہ بورڈ والوں نے کہا کہ آپ اپنی کار لے کر اندر چلے جائیں۔ جب مولانا انعام صاحب کی کار پہنچ گئی تو زکریا نے ان سے کہلایا کہ میں اور آپ اپنی اپنی کاروں سے نہ اتریں، رائے ونڈ میں ملاقات ہوگی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ رائے ونڈ پہنچ کر چونکہ مولانا انعام صاحب کی طبیعت زیادہ خراب تھی، اس لیے ان کو حجرہ میں ٹھہرا دیا اور منع کر دیا کہ کوئی اندر نہ جائے، نہ مصافحہ نہ دعاء۔ بھائی غلام دستگیر کو ان کے کمرہ کا پہرہ دار بنا دیا۔ زکریا عصر کے بعد اپنے حجرہ سے باہر نکل کر بیعت مصافحہ وغیرہ کرتا اور عشاء کے بعد جب مولوی محمد عمر کی تقریر قریب الختم ہوتی تو جلسہ گاہ میں پہنچ جاتا اور دعاء کے بعد تشکیل سے پہلے اپنے حجرہ میں واپس آجاتا۔ اس سفر میں سلمان شاہد بھی تھے۔ سلمان کی تو کئی ماہ سے کوشش ہو رہی تھی کہ ماموں شعیب اپنے بینک والے روپے میں اپنا اور اس کا نام لکھ گئے تھے، اس لیے روپے نکالنے کے لیے سلمان کی ضرورت تھی۔ کئی ماہ سے حاجی صاحب کوشش کر رہے تھے اور زکریا کی سہارنپور سے روانگی سے ایک دو روز پہلے اس کو ویزا ملا تھا، مگر خالد نے چپکے چپکے اپنا ویزا وغیرہ بنالیا تھا۔ عین وقت پر معلوم ہوا کہ وہ بھی جارہا ہے، مگر ان لوگوں کو صرف لاہور کا ویزا تھا، نہ ایبٹ آباد کا نہ کراچی کا۔

۲۶ اکتوبر کو لاہور سے ہم سب کراچی روانہ ہوئے، سلمان خالد لاہور ہی میں ٹھہر گئے کہ ان کے پاس کراچی کا ویزا نہیں تھا۔ ماموں داؤد مرحوم ان کی وجہ سے لاہور ٹھہر گئے۔ مگر خالد کو لاہور میں بخار وغیرہ کا سلسلہ شروع ہو گیا، جس کی وجہ سے سب پریشان ہو گئے۔ بڑی مشکل سے ایبٹ آباد کا ویزا ملا۔ ہماری روانگی کے بعد شاہد بھی کراچی سے لاہور ان کے پاس ہی آگیا اور پھر ان کے ساتھ

ایبٹ آباد جا کر ۸ نومبر کو سہارنپور واپس آیا۔ کراچی کے قیام میں اول مولانا بنوری صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مزار پر حاضری ہوئی اور بہت جی لگا، تقریباً دو گھنٹہ قیام رہا۔ لوگوں نے تو بہت کچھ دیکھا، مگر زکریا کو کچھ نظر نہیں آیا۔

محمد بنوری سے کہہ دیا تھا کہ کھانا بھی رات کو تیرے یہاں کھاؤں گا اور اسی وقت مستورات سے ملوں گا۔ رات کو مولانا مرحوم کے مدرسہ کے متعلق شوریٰ ہوتے رہے۔ کراچی میں حاجی فرید الدین صاحب نے ابوالحسن سے کہا کہ تو شیخ کو یہیں سے چلتا کر دے گا؟ ابوالحسن نے کہا کہ ویزا آپ دے دیجئے۔ حاجی فرید صاحب نے کہا ڈالر تو دے دے، ویزا میں دے دوں گا۔ مولوی یوسف تتلی جو سہارنپور سے ساتھ تھے، انہوں نے کہا کہ ڈالر میں دے دوں گا۔ حاجی صاحب ڈالر لے کر ویزا کی کوشش کی۔ چنانچہ ویزا مل گیا اور ابوالحسن اپنی گھر والی کو سسرال والوں کے ساتھ چھوڑ کر جدہ روانہ ہو گیا۔

۳۰ اکتوبر کو کراچی سے ۱۰:۳۰ بجے پاکی وقت سے چلے اور جدہ کے وقت سے ۱۲:۳۰ بجے پہنچے چونکہ طلوع و غروب کا فرق ہے۔ اسی لیے راستے کے اوقات میں تغیر ہوا۔ جدہ پہنچ کر دو شب و روز شجاع کے مکان پر ٹھہرے، اس لیے عزیز شمیم نے رمضان ہی میں تقاضے کیے تھے کہ اس سال سیدھے مدینہ نہ جانا کہ والدہ بہت اصرار کر رہی ہیں۔ مگر زکریا نے کہہ دیا تھا کہ اس ہجوم میں مکہ جانا میرے بس کا نہیں، اس لیے شمیم ماموں یامین وغیرہ جدہ ہی رہے۔

یکم نومبر منگل کو زکریا مدینہ کے لیے روانہ ہوا اور اس کے تھوڑی دیر بعد مولانا انعام صاحب مکہ کے لیے بدر میں ٹھہرتے ہوئے عصر کی نماز کے بعد مسجد نور پہنچے۔ حبیب اللہ اسماعیل بھی جدہ سے ساتھ تھے چونکہ مدرسہ شرعیہ پہنچنا ہجوم کی وجہ سے ممکن نہیں تھا، اس لیے رات کو ۳:۳۰ بجے مدرسہ پہنچے۔

مولوی انعام صاحب ۲ بجے جدہ سے چل کر سعدی کے مکان پر اس کے اہل و عیال سے ملتے ہوئے صولتیہ پہنچے اور اسی وقت پیشاب وضو سے فارغ ہو کر حرم گئے اور عمرہ کیا طواف پاؤں کیا اور سعی گاڑی پر۔ مولانا انعام صاحب کا مکہ میں نظام یہ رہا عربی ۵:۳۰ بجے مسجد حفائر سے حرم جاتے۔ ظہر کی نماز پڑھ کر صولتیہ، وہاں کھانا کھا کر دیوان میں آرام کرتے۔ بعد عصر خصوصی ملاقات کرتے سوا گیارہ بجے اٹھ کر پیشاب وضو کر کے حرم جاتے۔ مغرب سے عشاء تک بیٹھ کر نوافل پڑھتے۔ بعد عشاء حرم سے سیدھے حفائر جاتے اور اگلے دن ۵ بجے تک وہیں قیام رہتا اور تبلیغ کے مشورے ہوتے۔

قاضی صاحب کے ویزا میں کچھ گڑبڑ ہوئی جس کی وجہ سے ہمارے ساتھ نہ آسکے اور ۲ نومبر کو

کراچی سے جدہ پہنچے۔ اقبال خلجی کے یہاں قیام رہا۔ ۳ نومبر کو عربی ۴ بجے جدہ سے مکہ گئے۔ ۶ نومبر کو طیارہ سے مدینہ طیبہ تشریف لے آئے۔

ایام حج میں ہجوم بقیع تک پہنچا ہوا ہے۔ اس لیے مدرسہ شرعیہ کی چھت پر ہی نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ عشاء کی نماز کے دو گھنٹے بعد مخصوص دوستوں کے ساتھ مسجد سے مواجہ شریف کی سمت میں چند دن حاضری ہوتی رہی پھر مصلی الجنائز میں اقدام عالیہ کی طرف حاضری ہوتی ہے۔ عزیز عبدالحفیظ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ وہ اپنے مکاشفات سناتا رہتا ہے، جس سے جی خوش ہوتا ہے۔ روزانہ کی مصروفیات کی تو نقل کی ضرورت نہیں۔ البتہ ۴ نومبر کی شب کا مکاشفہ عزیز عبدالحفیظ نے سنایا کہ تو مجلس میں حاضر ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ذرا اونچی جگہ پر تشریف فرما ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے متعدد کتب ایسی خوشنما جلد کی رکھی ہیں کہ نگاہ بھی نہ جمے۔ ان میں سب سے اوپر فضائل حج، پھر فضائل درود، پھر حکایا صحابہ رضی اللہ عنہ اور ان کے نیچے دوسری کتب، اسی میں تھوڑی دیر میں مولانا بنوری نہایت خوش پوشاک ہنستے ہوئے تشریف لائے۔ سر پر ان کے پشاوری عمامہ گول سا بندھا ہوا۔ ان کو آنے پر تو اٹھا اور معانقہ کیا، مولانا نہایت خوش ہیں، تو نے پوچھا کہ کیا گزری؟ انہوں نے حضور کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان کی برکت سے بہت اچھی گزری۔ تو نے کہا کہ آپ کی برکتیں تو سب پر ہیں۔

حضور تم دونوں کی گفتگو سن رہے ہیں اور تبسم فرما رہے ہیں۔ چند روز کے بعد اس نے دوسرا مکاشفہ بیان کیا کہ تو کی مجلس میں بیٹھا ہوا ہے۔ حضور کی طرف سے کچھ عطایا ہو رہے ہیں اور تو کچھ کھا رہا ہے۔ اسی دوران میں ابوالحسن تجھے کوئی دوا پلانے کے لیے آیا اور تجھے وہ دوا دی تو نے پی لی۔ حضور نے اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''اکرمک اللہ تعالیٰ کما اکرمتنی باکرامک هذا'' ہذا میں تیری طرف اشارہ تھا۔ اللہ جل شانہ عزیز مولانا عبدالحفیظ صاحب کو بہت بلند درجات عطاء فرمائے کہ ان کی برکات سے مبشرات بہت سننے میں آتے ہیں۔

۴ نومبر ۷۷ھ جمعہ کو مولوی اکبر علی سہارنپوری کا کراچی میں انتقال ہوا۔

۲۸ ذیقعد مطابق ۱۱ نومبر کو جمعہ کی نماز کے بعد ملک خالد کی طرف سے تمام مملکت میں دوشنبہ کو صلوۃ الاستسقاء کا اعلان کیا گیا۔ کرنے والے نے بہت لمبی تقریر میں استسقاء کی اہمیت اور صدقہ و توبہ کی فضیلت بیان کی۔ ۱۴ نومبر پیر کے دن نماز استسقاء پڑھی گئی۔

۱۴ ذی الحجہ کو ٹیلیویژن وغیرہ پر اعلان ہوا کہ تاریخ بدل گئی اور اب حج بجائے ۲۰ نومبر کے ۱۹ نومبر کو ہوگا۔

ذی الحجہ کے پہلے ہفتہ میں جنوبی ہند حیدر آباد دکن، میسور، آندھرا پردیش میں طوفانی ہوا ایک ہفتہ تک بڑے زوروں پر رہی۔ سمندروں کی لہریں آسمان سے باتیں کرتی تھی، پانی اچھل کر آبادیوں پر آتا تھا۔ سمندر میں ہزاروں لاشیں مچھلی کی طرح تیر رہی تھیں۔ لاکھوں آدمی اور حیوانات ضائع ہوئے۔ اخبارات والے لکھتے ہیں کہ ایسا طوفان کبھی سننے میں نہیں آیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ آندھی کے ساتھ زلزلہ بھی تھا۔

۵ ذی الحجہ مطابق ۱۶ نومبر کو قاضی صاحب مع رفقاء کے طیارہ سے حج کے لیے روانہ ہوئے۔ ۵ ذی الحجہ کو مولوی اسعد لندن سے جدہ ہوتے ہوئے مدینہ طیبہ پہنچے۔ دو روز قیام کے بعد ۷ ذی الحجہ کو سیدھے منیٰ گئے۔ پھر ۱۲، ۱۳ ذی الحجہ کی درمیانی شب میں پھر مدینہ واپس آ گئے۔ سید حبیب صاحب نے مستقل ٹیکسی ساتھ کر دی تھی۔

۱۶ نومبر بدھ کو شب میں عزیز سعدی سلمہ کے گھر میں دوسرا لڑکا آپریشن سے پیدا ہوا۔

۱۸ نومبر کو سہارنپور میں حافظ فرقان پارچہ فروش کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ۱۲ ذی الحجہ کی شب منیٰ میں دو جگہ آگ لگی۔ ایک ملک صاحب کے خیمہ کے سامنے اور دوسری جگہ بھی۔

۲۴ نومبر کو پنڈی سے ٹیلیفون آیا کہ ۳ نومبر کو ملک دین محمد صاحب کا انتقال ہو گیا۔

۱۶ ذی الحجہ کو سعدی کا ٹیلیفون آیا کہ مکہ میں محلہ جیاد میں قبل فجر سے آگ لگی ہوئی ہے بہت مشکل سے عصر کے وقت قابو پایا گیا۔

۲۰ ذی الحجہ کو مفتی محمود صاحب مع اپنے پانچ رفقاء افریقی کے پہنچے۔ فندق الحرمین میں قیام ہوا۔

۲۳ ذی الحجہ کو مولوی انعام صاحب مع رفقاء مکہ سے چلے، رابغ والوں سے پہلے وعدہ تھا۔ ایک شب وہاں قیام کیا۔ رات کو مولانا محمد عمر صاحب کا بیان ہوا۔ فجر کے بعد فوراً چلے بدر میں اول شہداء کی زیارت کی۔ پھر ناشتہ کر کے وہاں سے چلے اور ۵:۳۰ بجے مسجد نور۔ پہنچے زکریا نے مولانا انعام صاحب کو منع کر دیا تھا کہ میری ملاقات کو آنے کی ضرورت نہیں ہیں خود کل صبح کو آ جاؤں گا مگر مولانا انعام صاحب ظہر سے پہلے ہی پہنچ گئے بعد ظہر مسجد نور گئے۔ زکریا منگل کی صبح مسجد نور گیا۔ صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا وہیں ہوا۔ خیال شام تک ٹھہرنے کا تھا، مگر لوگوں نے کہا ہجوم بہت ہو جاتا ہے، اس لیے ظہر کے بعد کھانا کھا کر چلے آئے۔

۲۴ ذی الحجہ مطابق ۵ دسمبر ماموں داؤد کا لڑکا احمد مولوی غلام رسول کے ساتھ آیا، اہلیہ بھی ساتھ تھی، اس کو ہوٹل میں ٹھہرایا اور عشاء کے بعد کا کھانا میرے ساتھ کھایا، ماموں داؤد اور ماموں یامین کے خطوط ساتھ لایا تھا، اس سے یہ طے ہوا کہ کھانا ہمارے ساتھ کھایا کرے اور ناشتہ دان میں اہلیہ کا کھانا لے جایا کرے، دس دن کے بعد مکہ واپس گیا اور بہت رطب اللسان، زکریا چونکہ بیمار تھا اور

کئی ڈاکٹروں کا علاج چل رہا تھا، مگر دسویں شب میں ڈاکٹروں نے خود اس کو شریک کرلیا۔

اس سال زکریا کی طبیعت شروع ہی سے خراب تھی، ۴محرم ۹۸ھ کو مکہ میں زبردست بارش ظہر کے وقت ہوئی، شمیم کے خط سے معلوم ہوا کہ ۱۷ موٹریں بہہ گئیں، حرم کے تہہ خانوں میں پانی بھر گیا، جدہ، ریاض، مدینہ تینوں مطار کئی گھنٹے بندرہے، ۶:۳۰ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک زور سے بارش ہوتی رہی۔

۶ محرم کو حکیم اسرائیل پہنچے، انہوں نے کہا کہ کئی دن سے کوشش کر رہا تھا، ابھی سعدی نے ٹیلیفون سے بتایا یہ ایک دوست کی گاڑی جارہی ہے، جانا چاہو تو فوراً چلے جاؤ، سب سامان چھوڑ کر فوراً چلا آیا۔

۶ محرم ۹۸ھ مطابق ۱۶ دسمبر ۷۷ء کو سہارنپور میں عزیز زبیر کے لڑکا پیدا ہوا۔

۲۲ دسمبر کو مفتی محمود گنگوہی بارادہ لندن مولوی یوسف متالا کے کئی سال کے اصرار پر روانہ ہوئے، ۲۷ کی شام کو ۸:۳۰ بجے لندن پہنچے اور فوراً دارالعلوم کے لیے روانہ ہوئے، ان کے اس قیام کے دوران میں علمی مذاکرے رہے، متفرق مقامات پر مواعظ بھی ہوئے اور مولوی یوسف وغیرہ کے اصرار پر آنکھ بنی تجویز ہوگئی اور ۵ جنوری ۷۸ء کو ہسپتال میں داخل ہو گئے، ۶ کو آپریشن ہوا، ۱۱ جنوری کو ہسپتال سے واپس آکر ۱۶ فروری کو لندن سے سیدھے کلکتہ گئے کہ آنکھ قابو میں نہیں آئی۔

۲۸ دسمبر کو سفیر عراق اسلامیہ اسکول سہارنپور کی دعوت پر گیا، اسلامیہ اسکول پر اعتراض تھا کہ نام تو اسلامیہ اسکول اور عربی پڑھائی نہیں جاتی، ان لوگوں نے مظاہر علوم کا ذکر کیا، عصر کے وقت مظاہر علوم پہنچے، قاری مظفر تو سفر میں تھے، مولوی یونس، مولوی محمد اللہ وغیرہ نے مدرسہ دکھایا، تعلیم کا وقت تو نہیں تھا، عمارت دیکھ کر چلا آیا۔

۲۴ تا ۲۶ دسمبر الہ آباد میں اجتماع ہوا، جس میں مولوی عبید اللہ کی طلب پر طلحہ اور شاہد بھی گئے، آخری تقریر شاہد کی ہوئی، دو ہفتہ کا یہ سفر رہا جس میں مختلف جگہوں کا دورہ ہوا۔

۳ جنوری ۷۸ء کو مولانا انعام صاحب مدینہ سے روانہ ہوئے، صبح کی نماز سے پہلے سامان رکھ کر نماز کے بعد فوراً روانہ ہو گئے، ۸ بجے مکہ پہنچے، حفائر میں قیام رہا۔

زکریا کا ارادہ مولانا انعام صاحب کے ساتھ جانے کا تھا، مگر ایک تو دائیں ہاتھ میں درد چل رہا تھا، دوسرے علی میاں کے کئی خط آئے کہ مجھے تجھ سے ضروری باتیں کرنی ہیں، اس لیے انتظار کیا، ۲ جنوری کی شب میں مدینہ پہنچے، علی میاں اور قاضی صاحب کے ساتھ ۷ جنوری کو زکریا بھی مکہ چلا گیا، ۱۶ جنوری کو مولانا انعام صاحب کراچی کے لیے روانہ ہوئے اور ۱۸ کو کراچی سے دہلی زبیر

اپنے اصرار سے ٹھہر گیا اور ساتھ ہی مدینہ واپس آ گیا۔ زکریا مکہ سے ۱۷ جنوری کی صبح کو مدینہ واپس آ گیا۔

۹ جنوری ۷۸ء کو فرقان پارچہ فروش کا دوسرا نکاح سہارنپور میں ہو گیا۔

۱۰ جنوری، آج حکیم اسرائیل کا جہاز جدہ سے چلا اور ۹ کی شام کو بمبئی پہنچا۔

۱۳ جنوری آج کاندھلہ کی عیدگاہ جمعہ کی نماز ہوئی، فقیروں نے تو لکھا کہ ہمارے خلاف تقریر ہوئی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ تجدید عیدگاہ کے لیے تقریر ہوئی، مخصوص حضرات کو ایک ایک ہزار کا ذمہ دار بنادیا اور ایک لاکھ کی اپیل کی گئی۔

۲۶ جنوری کو ابوالحسن مدینہ سے مکہ ہوتے ہوئے کراچی روانہ ہوئے۔

۵ فروری کی شب میں روضۂ مقدس کے اندر کے حصہ کی چہاردیواری کی اصلاح کی گئی، مٹی نکال کر سنگِ مرمر لگایا گیا، تعمیرات میں کواڑ بند ہونے کے بعد ہوتی تھی اور ملبہ صبح باہر نکالا جاتا تھا اور کسی باغ میں کنویں میں دفن کیا جاتا تھا۔

۵ فروری آج سے سعودی عرب کے مدارس میں دو ہفتہ کی چھٹی پہلی دفعہ ہوئی، کہتے ہیں یہ موسم بہار کی چھٹی ہوئی ہے۔

۲۵ فروری آج زبیر مولوی عبدالحفیظ کے ساتھ مکہ برائے ہند روانہ ہوا، عزیز عبدالحفیظ نے دہلی پہنچانے کا وعدہ کرلیا تھا، ۲۸ فروری کو دہلی پہنچا۔

۳ مارچ کو جمعہ کی نماز کے بعد ماموں داؤد کو قلب کا دورہ پڑا اور اتوار کی صبح کو ۸:۳۰ بجے دوبارہ شدید دورہ پڑا اور اسی میں انتقال فرما گئے، عصر کے بعد تدفین عمل میں آئی۔

۱۰ مارچ آج مولانا انعام صاحب کی دہلی سے گودہرا کے لیے روانگی ہوئی، گودہرا کا اجتماع بہت معرکۃ الآراء ہوا، لاکھوں کا مجمع تھا، بہت مبشرات بھی نظر آئے، پولیس اور غیر مسلم حیران تھے کہ کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

۱۴ مارچ کی شب میں بھائی عبدالوہاب کے والد کا انتقال لاہور کے ہسپتال میں ہوا، رائے ونڈ میں تجہیز و تکفین کے بعد اپنے وطن بورے والا میں تدفین ہوئی۔

۱۸ مارچ کو دہلی میں طوفانی بارش اور زلزلہ جس میں ۴۰، ۵۰ آدمی ہلاک ہوئے۔

۲۹ مارچ بدھ کی شب میں بابو اعجاز کاندھلوی کا گھنٹہ بھر کی قلبی بیماری کے بعد انتقال ہو گیا، ایک بجے دورہ پڑا سوا بجے شب میں انتقال ہو گیا۔

۱۲ اپریل کو ابوبکر بن بھائی عبدالکریم بمبئی کا نکاح محلہ کی مسجد میں ہوا، مدینہ منورہ بھی ولیمہ کرایا گیا اور سہارنپور بھی۔

۲ تا ۱۳ اپریل کو ڈھڈیاں کا چودہواں جلسہ۔

۱۸ اپریل کو تہجد کے وقت نظام الدین میں والدہ محمد کاندھلوی کا انتقال ہوا، بعد ظہر تدفین عمل میں آئی، اس لیے کہ اس دن مولانا انعام صاحب ڈھاکہ سے اجتماع سے واپس آنے والے تھے۔

یکم تا ۱۳ اپریل اجتماع ڈھاکہ۔

۲۵ اپریل کو قاضی صاحب با ارادہ سفر پاکستان مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ رائے ونڈ کے پرانوں کے جوڑ کے بعد گھر تشریف لے گئے اور واپسی میں سرگودھا کے بعد کار لاری سے ٹکرا گئی، سب ساتھیوں ڈاکٹر اسلم وغیرہ کو چوٹیں آئیں، اولاً سرگودھا کے ہسپتال میں داخل ہوئے پھر لاہور منتقل ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے جان بچالی حادثہ بڑا سخت تھا۔

۲۶ اپریل کو بھائی مظہر علی راجپوری کا پشاور میں انتقال ہو گیا۔

۲۸ اپریل سے افغانستان میں سخت اضطراب، قتل وقتال ہوا، حکومت میں انقلابات آئے، روس نواز پارٹی غالب آ گئی، سابق صدر داؤد کو قتل کر دیا گیا اور اسلام پسندوں کے خلاف سخت کارروائی کی گئی۔

۵ مئی کی شب میں باب مجیدی کے سامنے سونے کی دُکان میں چوری ہوئی، ۵۰ کلو سونا چوری ہو گیا، اس کے بعد چند سپاہیوں کی ڈیوٹی ۲۴ گھنٹے ان دُکانوں کے سامنے لگ گئی، برابر کے ہوٹل میں ایک ایرانی ٹھہرا تھا، اس نے رات میں دیوار توڑ کر اندر ہی اندر چوری کر لی، دُکاندار فوراً پاگل ہو گیا، کئی دن بعد اُردن کی سرحد پر چور پکڑا گیا۔

۷ مئی کو آج رات اہم رجسٹری اعتراضات کے جوابات کی بھیجی گئی اور متعدد خطوط ہندی کارڈ ان کو لکھے گئے کہ صرف اس کی رسید چاہیے، خط وکتابت بعد میں ہوتی رہے گی۔

۲۳ مئی کو شب میں مسجد خلیل جدہ میں چند مقیمین تھے، سب کو پولیس پکڑ کر لے گئی اور ۶ بجے رات کو بھائی داؤد ساعاتی کو ان کے گھر سے معلوم ہوا کہ مکہ مدینہ میں بھی گرفتاریاں ہوئیں مگر تبلیغی نہیں، باوجود سعی بلیغ کے یہ نہیں پتہ چلا کہ گرفتاری کس وجہ سے ہوئی، یہ سنا گیا کہ اُوپر سے آرڈر آیا تھا، اصل گرفتاری سلفیوں کی ہے، دوسرے لوگ دھوکہ میں پکڑے گئے۔

۲۷ مئی شنبہ کی شب میں مولوی سعید خان ظہران سے سیدھے مدینہ طیارہ سے پہنچے، دن میں ان کی بھی تحقیقات ہوتی رہی، مگر گرفتاری نہیں ہوئی۔

۳۱ مئی جوہر آباد میں مولوی جلیل کی لڑکی کا چھت گر جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا اور دو برس کا جوڑ کا ساتھ تھا زندہ رہا۔

۴ جون کو مغرب کے وضو میں زکریا کے منہ سے بہت سا خون نکلا، جو نکسیر تو نہیں تھا سینہ سے گیا

تھا اور اس کا سلسلہ پھر چلتا ہی رہا، دائیں ہاتھ میں درد کا سلسلہ حج کے بعد سے چل رہا تھا مگر مالش وغیرہ سے کچھ افاقہ ہو جاتا ہے۔

۶ جون کو ابوالحسن کا تار ڈاکٹر اسماعیل کے نام آیا کہ میرا ٹکٹ فوراً بھیج دو، ۷ بجے کی صبح کو ٹیلکس کے ذریعہ بھیج دیا اور تار بھی کر دیا کہ فوراً آ جاؤ، جس کی وجہ سے ہندوستان میں تشویش پیدا ہوئی، چند روز بعد بھائی شمیم کے پاس کرامت کا ٹیلیفون آیا کہ زکریا کی خیریت بتاؤ، شمیم نے کہہ دیا طبیعت اچھی ہے فکر کی بات نہیں ہے۔

یکم رجب کو حاجی یعقوب کو پرچہ لکھا کہ سہارنپور کا رمضان ملتوی ہو گیا، احباب کو اطلاع کر دیں اور خصوصی احباب کو تاکید کر دیں، رمضان اپنی اپنی جگہ کریں۔

۹ جون دو جمعے حجرہ میں پڑھنے کے بعد سب کی رائے سے مسجد جانا ہوا، مگر سایہ کی جگہ کہیں نہیں ملی، باب السلام کے سامنے مظلات (چھپر) میں جمعہ پڑھا، گرمی بہت سخت تھی، نماز کے بعد زکریا کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی، آتے ہی حجرہ میں پڑ گیا، ۱۴ جون اعجاز کی ہومیو پیتھک کی دوا شروع ہوئی، چند دن بعد گر جانے کی وجہ سے چونکہ دوسرا علاج شروع ہو گیا اس لیے یہ دوا چھوٹ گئی۔

۱۵ جون، آج ابوالحسن کا تار ڈاکٹر اسماعیل کے نام پہنچا کہ میں پیر کو آرہا ہوں، جدہ سے بھی سیٹ کا انتظام کر دو، انہوں نے اسی وقت بھائی خلجی کو ٹیلیفون کر دیا، چنانچہ رات کو بھائی اقبال خلجی ہی کے یہاں ٹھہرا۔

۲۰ جون کو طیارہ سے ابوالحسن جدہ سے مدینہ پہنچا، رات عشاء کے بعد طیارہ سے جدہ پہنچا تھا، ۱۹ جون کو جدہ پہنچا اور ۲۰ جون کی صبح کو مدینہ۔

۱۴ جون کی شب میں عبدالحفیظ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، صلاۃ وسلام کے بعد عرض کیا کہ حضرت بہت فکر مند ہیں کہ کس منہ سے سامنا ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انه حبيبنا'' پھر فرمایا: ''انه من حزبنا المفلحين الغر المحجلين۔''

پھر تھوڑی دیر کے بعد جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خوبصورت صندوقچہ ہے اس پر تہہ کیا ہوا خوبصورت عمامہ ہے، جس پر سفید رنگ کی کڑھائی ہوئی ہے جو بہت چمکدار ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت پیار سے اس کی تہہ کو کھولتے ہیں اور ہاتھ پھیرتے ہیں پھر اسی طرح تہہ فرما کر رکھ دیتے ہیں اور مسکرا کر فرمایا کہ یہ ان کے لیے تیار کر رکھا ہے۔

۱۵ کی شب میں عبدالحفیظ نے دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جیسے چار زانو تشریف فرما ہیں اور جیسے مدرسہ شرعیہ کی طرف کوئی نورانی دروازہ کھلا ہے، جہاں حضرت شیخ چارپائی پر مضطرب نظر

آرہے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف دیکھ کر فرمایا: ''**انہ مضطرب للقائنا و رؤیتنا و نحن فی شوق الیہ وحنین والأمر للّٰہ تعالیٰ۔**''

۱۶ جون چین اور پاکستان کے درمیان میں شاہراہِ قراقرم جو عرصہ سے بن رہی تھی، اس کا افتتاح ہوا، افتتاح کی صورت یہ ہوئی کہ ایک لمبا فیتہ باندھا گیا، جس کو دونوں سربراہوں نے قینچی سے کاٹا اور دونوں کی کاریں اِدھر سے اُدھر چلی گئیں۔

۱۷ جون آج اہلیہ مولانا بنوری مستقل طور سے کراچی سے سکھر چلی گئیں وجہ باوجود تحقیق کے معلوم نہ ہو سکی، زکریا نے تو دونوں فریق کو ڈانٹا کہ بہت نامناسب ہوا۔

۲۱ جون آج علی میاں بمبئی سے چل کر نصف شب میں جدہ پہنچے، دوسرے دن جمعرات کو مغرب سے پہلے جدہ سے بذریعہ طیارہ مدینہ پہنچے، قیام بستان نوردلی میں ہوا، زکریا نے عصر کے بعد سعید الرحمن سے کہلوا دیا تھا (جو کئی دن پہلے سے قاہرہ سے مدینہ آگئے تھے) کہ کھانے میں انتظار ہوگا، اس لیے علی میاں بھی مدرسہ آگئے، کھانے کے بعد ملاقات ہوئی اور معلوم ہوا کہ ان کا اجتماع پیر سے شروع ہوگا، علی میاں نے کہا کہ اجتماع کے بعد تو مشکل ہوتا، دو دن پہلے تم سے ملنے آگیا، بن باز بھی پہلے آگئے تھے اور مکہ وجدہ میں حکومت کی طرف سے گرفتاریاں عام ہو رہی تھیں، جن میں ہمارے چند مبلغین حضرات بھی جدہ، مکہ، طائف سے گرفتار ہوئے، اس طرح کہ لوگوں کو بلاتے تھے کہ کام ہے اور حوالات میں کر دیتے تھے باوجود تفتیش کے کچھ پتہ نہیں چلا۔

علی میاں نے بن باز سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ تبلیغ والوں کو گرفتار کرنا مقصود نہیں، کوئی خاص شخص کسی جھوٹی شکایت سے گرفتار ہو گیا ہوگا، بہت ردوقدح اور خفیہ تفتیش کے بعد ۴۳ دن کے بعد چھوٹنے شروع ہو گئے، علی میاں ۳۰ جون کو مکہ گئے اور ۵ جولائی کو کراچی اس لیے کہ اس سال رابطہ کا اجتماع بجائے مکہ کے کراچی میں طے پایا تھا، اس میں قاری طیب، مولوی منظور نعمانی اور مولوی اسعد بھی شریک تھے، اجتماع کے دنوں میں یکجائی ہوٹل میں قیام کیا اور اجتماع کے بعد اپنی اپنی جگہ منتقل ہو گئے۔

۲۹ جون کو مفتی محمود کی آنکھ کا آپریشن دوبارہ کلکتہ میں ہوا، اس سے پہلے لندن میں ہوا تھا۔

۳۰ جون کو قاری طیب صاحب امریکا سے سیدھے دیوبند گئے اور ایک دن ٹھہر کر رابطہ کے اجتماع میں شریک ہونے کے لیے کراچی گئے۔

۵ جولائی، آج صبح کو عربی پونے تین بجے مولانا عبدالحفیظ صاحب کے مطبع کا افتتاح زکریا نے کیا اور پہلی کتاب جو مولانا کے مطبع میں چھپنی تجویز ہوئی وہ ''اسباب السعادہ'' ہے، پہلا ورق فالتو چھپوا کر سہارنپور طلحہ شاہد کے نام بھیجے گئے۔

آج محمد اسلم کا تار مولوی یوسف متالا کے متعلق پہنچا کہ جو تو نے اجازت خلافت دے رکھی ہے، اسے فوراً واپس لے لے، اس مضمون کی نقل یوسف کو بھیجی کہ اس کی کیا حقیقت ہے اور تار دینے والے کو خط لکھا کہ میں نے آپ کے کہنے سے اجازت نہیں دی تھی کہ آپ کے کہنے سے واپس لے لوں، اپنے حکم نامہ کی وجوہ لکھئے تا کہ اس پر غور کروں مگر اس کا کوئی جواب نہیں آیا، بعد میں مولوی یوسف رمضان میں آئے تو بتایا کہ چند وجوہ سے اس کا مدرسہ سے اخراج کر دیا تھا، جس کی وجہ سے اس نے تار دیا، پہلے بھی کئی دفعہ اس کو علیٰحدہ کر دیا تھا مگر وہ معافی مانگ لیتا تھا۔

۴ جولائی کو مولانا سعید صاحب مدینہ سے مکہ اور تین دن کے بعد عمان اور وہاں سے مولانا انعام صاحب سے لندن کے سفر کے لیے مل گئے، مولوی انعام صاحب ۸ جولائی کو روانہ ہوئے تھے، ایک دن کراچی ٹھہر کر عمان، وہاں تین دن کا اجتماع تھا، اس کے بعد لندن، وہاں بھی کئی جگہ کا دورہ ہوا، منگل یکم اگست کو جدہ پہنچے۔

بدھ کی صبح کو عربی ۴ بجے پہنچے اور مدینہ منورہ سے اگلی بدھ ۹ اگست کی صبح کو عربی ۳ بجے جملہ رفقاء مکہ روانہ ہوئے اور دن بھر صولتیہ میں آرام کیا اور عشاء کے بعد عمرہ کرنے کے بعد مسجد حفائر پہنچے۔

۱۴ اگست کو کراچی، وہاں دو شب قیام کے بعد ۱۶ اگست چہارشنبہ کو دہلی پہنچے، حافظ عبدالعزیز صاحب کراچی کسی تقریب میں آئے تھے، مختلف جگہ قیام رہا اور روانگی ۱۸ جولائی کو ہوئی، روانگی سے دو ہفتہ قبل مدرسہ نیوٹاؤن میں قیام ہوا، مدرسہ میں اس کے دو تین مرید ہیں، ان کی سعی سے مدرسہ کے مکان میں قیام ہوا، عصر کے بعد مغرب تک مجلس ہوتی تھی۔

۱۹ جولائی، ابرار کے ولیمہ کی شرکت میں سعدی آیا تھا اور خود اسی نے ولیمہ بھی کیا، جس میں معلوم ہوا کہ ساڑھے تین ہزار ریال خرچ ہوئے، زکریا نے تو ابرار پر بھی نکیر کی، مجھ سے تو اخفاء کیا تھا، کھانا بہت بچ گیا، ایک دیگ سلیق کی زنانہ میں اور ایک مردانہ میں، ماموں یامین بھی زکریا کی عیادت کی مد میں آئے تھے اور سعدی ہی کے ساتھ واپس ہوئے۔

۲۰ جولائی کی شب میں عزیز مولوی احسان، قاضی محمود جدہ اُتر کر سیدھے مدینہ منورہ آئے اور عید کے بعد ۶ ستمبر کو مدینہ سے مکہ اور تین دن وہاں قیام کرنے کے بعد کراچی روانہ ہوئے۔

۲۳ جولائی کو قاری مظفر نے طباخوں پر ناراض ہو کر سب کو علیٰحدہ کر دیا اور تین دن تک مزدوروں سے کام لیا، پھر عارضی طباخ رکھے، وجہ ناراضگی معلوم نہ ہوئی، عتیق کی تو آنکھ میں بہت دنوں سے پانی اُتر آیا ہے۔

۲۵ جولائی کی شب میں مولوی ظہور الحسن کا جو عرصہ سے مفلوج تھے انتقال ہو گیا۔

۲۸ شعبان ہندی ۴ اگست کو مولوی منور مع اپنے داماد انوار کے رمضان سہارنپور گزارنے کے

لیے پہنچے، زکریا نے پہلے اس کو سہارنپور آنے سے منع کر دیا تھا کہ کٹھیار میں ہی رمضان کریں اس کے جواب میں مولوی منور کا تار آیا تھا کہ میں رمضان سہارنپور کروں گا تو بھی للہ ضرور آ، سہارنپور میں شروع میں معتکف تھے اور اخیر میں دس، مہمان پچاس تک ہو گئے تھے۔

مدرسہ قدیم کی مسجد میں اعتکاف ہوا، محمد بن مفتی یحییٰ نے قرآن سنایا، مولوی سلمان نے قاضی صاحب کی مسجد میں خالد نے فرخ کی مسجد میں، خالد کی مسجد شروع سے بھر گئی تھی، مولوی طلحہ نے ٹال میں، شاہد نے بغیر سامع کے زکریا کے گھر میں، جعفر اور عمار نے حکیم کی مسجد میں، مسجد کلثومیہ میں مختار بن مولوی محمد اللہ نے، دارِ جدید میں مفتی عبدالعزیز نے قرآن سنایا، دیوبند میں سالم نے، مولانا اسعد صاحب کے یہاں ارشد نے، مولانا اسعد صاحب کے یہاں شروع میں سو (۱۰۰) اور اخیر میں دوسو (۲۰۰) تک مہمان ہو گئے اور معتکف ۷۵ ہو گئے تھے، مسجد چھتہ میں ۶ آدمی مفتی محمود کے لوگوں نے اعتکاف کیا۔

مدینہ طیبہ میں مدرسہ شرعیہ کے حجرہ میں زکریا کی بیماری کی وجہ سے مولوی محمد افریقی اور زبیر لائل پوری نے حجاز کے دستور کے موافق دونوں نے مل کر ایک قرآن پڑھا، مولوی یوسف متالا نے مع اپنے تین چار مریدوں کے مولوی حبیب اللہ کے یہاں قیام کیا، مولوی ہاشم مع اپنی اہلیہ کے پہلے آ گئے تھے اور بنگالی رباط میں مستقل کمرہ لے لیے تھا، حکیم سعید رشید افریقہ کے دورہ سے ۴ رمضان کو آ گئے، افریقی چند حضرات مولوی یوسف تتلی وغیرہ پانچ چھ آ گئے تھے، قاضی صاحب ۲۹ ویں شعبان مطابق ۳ اگست کو رمضان گزارنے کے لیے قاضی صاحب پاکستان سے مدینہ پہنچے تھے اور ۲۷ رمضان کو جھاوریاں میں عید کرنے کے لیے تشریف لے گئے، مکہ میں عید پڑھ کر اسی دن جہاز سے کراچی چلے گئے، وہاں ۲۸ رمضان تھا۔

ہندوستان میں رمضان میں بارشوں کی بہت کثرت رہی، دہلی سہارنپور کے درمیان میں ریل اور بسیں بند ہو گئیں، بعض مواقع پر بہت بربادی ہوئی، اخبار والوں نے ایک کروڑ آدمیوں کا بے گھر ہونا لکھا تھا، اعجاز بہاری نے بتایا کہ اس کے پاس کے کئی گاؤں بہہ گئے۔

۱۵ اگست کو مولوی سعید خان کے سینہ میں درد محسوس ہوا ڈاکٹر نے دیکھ کر خطرناک بتایا اور وہ ہسپتال میں داخل ہو گئے، ۲۰ کو ہسپتال والوں نے اجازت دے دی، مگر احتیاط کی تاکید کی، ہسپتال کے زمانہ میں بہت زیادہ پہرہ رہا، بہت خاص خاص آدمیوں کو ملنے کی اجازت تھی۔

۲۱ اگست جو سردار جدہ والے سخت بیمار ہوئے ہسپتال میں داخل کر دیئے گئے ایک ہفتہ بعد انتقال ہو گیا، تدفین جنت المعلیٰ میں ہوئی۔

۲۶ اگست کو پاکستان میں مولانا عبدالہادی صاحب دین پوری کا انتقال ہو گیا۔

۷ اگست کو مفتی محمود رنگونی لندن سے سیدھے مدینہ پہنچے، تین دن قیام کے بعد کراچی اور پھر دہلی سہارنپور ہوتے ہوئے واپس رنگون چلے گئے۔

۳ ستمبر کی شب میں اذان حسب معمول ۲ بجے ہوئی ڈاکٹر اسماعیل نے اسی وقت کہا کہ ٹیلیویژن پر چاند کا اعلان ہو گیا، اذان کے بعد گولے اتنے کثرت سے چھٹے اور اس سے زیادہ مسجد نبوی میں تالیاں پیٹی گئیں، اس کے بعد امام صاحب نمبر ۲ نے فرضوں کے بعد تقریر کی اور خوب ڈانٹا، جنہوں نے ابتداء تالیوں کی کی تھی وہ دو مصری تھے وہ پکڑ لیے گئے۔

۲۷ رمضان کی شب میں جنرل ضیاء الحق حاکم عسکری پاکستان مکہ میں رہے ساری رات طواف کیے اور ۲۸ کی شب مدینہ میں گزاری، تراویح اور تہجد کی نفلوں میں شریک رہے۔

کئی دن سے طبیعت بہت خراب ہے، اس لیے اب تو اسی پر ختم کرتا ہوں اور کئی دفعہ پہلے بھی ختم کر چکا ہوں، مگر جیسا کہ بار بار لکھا، نہ تو احباب چھوڑتے ہیں اور مجھے بھی کوئی اکابر کا قصہ یاد آ جائے تو سر کھجانے لگتا ہوں، لہٰذا اب تو اس حصہ کو ختم کرتا ہوں مقدر میں ہے تو پھر دیکھا جائے گا۔

واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین و صلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقه سیدنا و مولانا محمد و اٰله و صحبه و بارک و سلم تسلیما کثیرا۔

محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی

یکم ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ مطابق ۵ فروری ۱۹۸۱ھ مدینہ طیبہ

......☆☆☆☆☆......

مخدوم ومکرم حضرت اقدس حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسن الندوی دامت برکاتہم

علالت کا تسلسل، وفات حسرت آیات

طویل علالت اور سفرِ ہندوستان:

حضرت شیخ کی علالت کا سلسلہ بہت طویل تھا اور سالہا سال ممتد رہا، اس میں بار بار ایسے مرحلے آئے کہ اہلِ تعلق اور معالجین کی طرف سے سخت خطرہ اور تشویش اور بعض اوقات مایوسی ہونے لگتی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کو ابھی ارشاد وتربیت، اپنے مشائخ اور مربیوں کے علوم وتحقیقات کی اشاعت، ان کی علمی وتصنیفی یادگاروں کی حفاظت اور توسیع تبلیغی جماعت کی نگرانی اور سرپرستی اور زیرِ تربیت افراد کی تکمیل کا جو کام لینا تھا، اس کے لیے بار بار اس فوری خطرہ اور تشویش کو دور فرماتا رہا اور اہلِ تعلق کی آس بندھتی رہی۔

علالت وضعف کی اسی حالت میں ۱۵ محرم ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۲ نومبر ۸۱ء کو حضرت شیخ مدینہ طیبہ سے ہندوستان تشریف لائے اور ۲۰ روز تک دہلی قیام رہا، مرض کا اشتداد اور ضعف کا شدید غلبہ ہوا اور صحت بہت نازک مرحلے پر پہنچ گئی، اہلِ تعلق اور اہلِ رائے کا مشورہ اور اصرار ہوا کہ دہلی میں کسی ایسے ہسپتال میں داخل کیا جائے جہاں پوری ذمہ داری وہمدردی کے ساتھ علاج ہوتا ہو، چنانچہ ہولی فیملی (Holy Family) میں داخل کرنے کا مشورہ ہوا، وہاں مکمل طبی معائنہ، ضروری ایکسرے اور ہر طرح کے امتحانات ہوئے۔

معالجین کو کینسر کا شبہ تھا، کئی بار ضعف کی وجہ سے خون چڑھانے کی نوبت آئی اور متعدد بار امید و بیم کی حالت پیدا ہوئی، ناچیز راقم سطور، مولانا محمد منظور صاحب اور رفقاء کی ایک جماعت کے ساتھ جن میں عزیزان محمد ثانی، مولوی معین اللہ، مولوی طاہر وغیرہ تھے، زیارت وعیادت کے لیے دہلی گیا، وہاں شیخ کے شدید ضعف وعلالت کی شدت کو دیکھ کر شدت سے قلب میں اس بات کا تقاضا ہوا کہ کسی طرح حضرت شیخ کو مدینہ طیبہ پہنچایا جائے مبادہ کوئی ایسا واقعہ پیش آئے جس پر ہمیشہ قلق وندامت ہو اور مخالفین ومعاندین کو شماتت کا موقع ملے، اس رائے میں مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند جو برابر حالات کا مطالعہ کر رہے تھے اور وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہتے تھے، نہ صرف شریک بلکہ اس رائے اور مشورہ میں ہم لوگوں سے کچھ آگے ہی تھے۔

بالآخر راقم سطور اور مولانا نے بڑی صفائی اور ایک حد تک جرأت وجسارت کے ساتھ منتظمین و

تیمارداروں کی خدمت میں اپنی رائے پیش کی، حالات کا تقاضا تھا کہ ایک دن کی بھی تاخیر نہ کی جائے، لیکن ذمہ داروں اور تیمارداروں نے (جن میں شیخ کے خادم خاص الحاج ابوالحسن پیش پیش تھے) اس سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ ابھی تو شیخ کو سہارنپور لے جانا ہے اور وہاں قیام کرانا ہے، جس کی شیخ کو خواہش بھی ہے اور کئی بار اشارے بھی فرمائے۔

ہم لوگ اس سے زیادہ اصرار نہیں کر سکتے تھے، ان حضرات کے احترام میں ''توکلاً علی اللہ'' خاموشی اختیار کی۔

ہولی فیملی سے شیخ حافظ کرامت اللہ صاحب کی کوٹھی میں تشریف لائے، جہاں آرام وعلاج کی سب سہولتیں تھیں، ۴ صفر ۱۴۰۲ھ مطابق ۲ دسمبر ۸۱ء کو سہارنپور تشریف لے گئے، اسی عرصہ میں ہم لوگوں کی دوبارہ حاضری ہوئی اور دیکھا تو دہلی سے بہتر حالت پائی، لیکن اطمینان اب بھی نہ تھا۔

مدینہ طیبہ واپسی

آخر اللہ نے ان کی آرزو اور مخلصین کی دعائیں قبول فرمائیں اور شیخ اپنے خدام ورفقائے خاص کے ساتھ ۱۸ ربیع الاول ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۶ جنوری ۸۲ء کو براہ کراچی جدہ کے روانہ ہوئے اور وہاں سے الحمدللہ بخیریت مدینہ طیبہ پہنچ گئے، علالت اور علاج کا سلسلہ جاری رہا، خدام کو ہندوستان میں کبھی تشویشناک اطلاعیں اور کبھی امید افزا خبریں ملتی رہیں۔

آخری ملاقات

اس عرصہ میں ۲۹ ربیع الاول ۱۴۰۲ھ مطابق جنوری ۱۹۸۲ء کو رابطہ عالم اسلامی کی ''المجلس الأعلیٰ للمساجد'' اور ''المجمع الفقهي'' کی شرکت کے لیے میں مولوی معین اللہ صاحب ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء کی معیت میں مکہ معظمہ حاضر ہوا، حضرت شیخ حسنِ اتفاق سے مکہ معظمہ ہی میں بھائی سعدی صاحب کے مکان پر فروکش تھے اور ہمارا قیام اس سے متصل ہی ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی کے مکان پر تھا جس کا صرف چند گز کا فاصلہ ہے، حضرت شیخ ہمیشہ معمول کے مطابق بڑی بشاشت وشفقت سے پیش آئے، ضعف بہت تھا لیکن دماغ اسی طرح بیدار وحاضر تھا، میرے ساتھ ازراہِ شفقت جو معاملہ مدینہ طیبہ کے قیام میں فرماتے تھے، اس کا اعادہ فرمایا۔

بھائی ابوالحسن سے کہا کہ علی میاں کو مدینہ طیبہ میں جو خمیرہ کھلاتے تھے وہ روزانہ دیا کرو، ٹھنڈے پانی کو بھی بار بار پوچھتے اور ہدایت فرماتے، اس وقت سب سے زیادہ حضرت کے قلب ودماغ پر جو چیز طاری اور حاوی تھی، وہ دارالعلوم دیوبند کا قضیہ تھا، دن میں دو مرتبہ حاضری ہوتی کوئی

حاضری ایسی یاد نہیں جس میں دار العلوم کی کوئی نئی خبر دریافت نہ فرمائی ہو اور اس کے اختلاف کے بارے میں اپنی دلی تشویش وفکر مندی کا اظہار نہ فرمایا ہو۔

میں نے عزیز محمد ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک نیاز نامہ بھی دیا اور عرض کیا کہ جب موقع ہو سن لیا جائے فرمایا نہیں ابھی سنوں گا، غالباً مولوی طلحہ صاحب نے پڑھ کر سنایا، فرمایا اس کا جواب بھی لکھواؤں گا، اس وقت کیا معلوم تھا کہ صرف دو ڈھائی مہینے کے فصل سے خادم ومخدوم اور مرید و مرشد اللہ کے یہاں پہنچ جائیں گے۔

ایک یادگار تعزیتی مکتوب

فروری کو ہم دونوں کی بمبئی واپسی ہوئی، یہاں ہندوستان پہنچ کر عزیز موصوف محمد ثانی مرحوم کا وہ حادثہ جاں گداز پیش آیا جس نے دل ودماغ کو مجروح اور اعصاب کو جھوڑ کر رکھ دیا، عجیب بات یہ ہے کہ ۱۶ فروری کو دن کے ۱۱، ۱۲ بجے یہ حادثہ پیش آیا اور اسی دن عصر کی نماز سے پیشتر حضرت شیخ کو مدینہ طیبہ میں ٹیلیفون کے ذریعہ اطلاع مل گئی، حضرت نے اس پر جو تعزیتی مکتوب میرے نام تحریر فرمایا، وہ ایک یادگار تاریخی مکتوب ہے، جس سے حضرت کی حاضر دماغی، حافظہ کے صحیح طور پر کام کرنے، اس کے ساتھ شدتِ تعلق کا پورا اظہار ہوتا ہے اور اس میں لطیف طریقہ پر اپنے سفر کے قرب کی طرف سے بھی اشارہ ملتا ہے وہ مکتوب یہاں بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔

باسمہ سبحانہ

المخدوم المکرم حضرت الحاج علی میاں صاحب زادمجدکم۔

بعد سلام مسنون، کل ۱۶ فروری ۱۹۸۲ء کو ظہر کی نماز کے بعد عزیزی مولوی حبیب اللہ نے حادثہ جانکاہ کی خبر سنائی کہ ظہر سے پہلے جب کہ میں سو رہا تھا، نور ولی صاحب کا ملازم آیا اور یہ خبر بتا گیا کہ آج ساڑھے گیارہ بجے دن میں محمد ثانی حسنی کا انتقال ہو گیا۔

”انا للّٰہ و انا الیہ راجعون، اللّٰہم أجرنا فی مصیبتنا و عوضنا خیرا منہا للّٰہ ما اخذ و لہ ما اعطی و کل شی عندہ بمقدار

إن العین تدمع و القلب یحزن و لا نقول إلا ما یرضی ربنا و إنا بفراقک یا محمد لمحزونون۔“

ترجمہ: ”آنکھ نمناک ہوتی ہے اور دل غمگین ہوتا ہے مگر ہم وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو راضی کرے اور اہم اے محمد، تمہاری جدائی پر غمزدہ ہیں۔“

علی میاں! حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا وہ شعر یاد آرہا ہے جو انہوں نے حضرت امام عبد الرحمٰن بن مہدی کو ان کے صاحبزادہ کی تعزیت میں لکھا تھا۔

إنـي مـعـزيـک لا أنـي عـلـى ثقة
مـن الـحـيـاة ولـكـن سنة الـديـن
فـمـا الـمـعـزى بـبـاق بعد ميته
ولا الـمـعـزى ولـو عـاشـا الى حين

ترجمہ: میں تم سے تعزیت دین کی پیروی میں کررہا ہوں، نہ کہ اس یقین پر کہ مجھے زندگی کا بھروسہ ہے، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ وفات پاجانے والے کے بعد جن سے تعزیت کی جارہی ہے نہ وہ باقی رہنے والے ہیں اور نہ تعزیت کرنے والے ہی کو بقاء ہے، اگرچہ ایک مدت تک زندہ رہے۔

علی میاں! حادثہ جانکاہ کی خبر سن کر دل پر کیا گزری بیان نہیں کرسکتا، ادھر آپ کی پیرانہ سالی اور پے در پے حادثات کا تسلسل اور بھی موجب رنج وخلق ہے، مگر محض رنج وقلق سے نہ تو جانے والے کو فائدہ، نہ رہنے والے کو سکون، میں نے خبر سنتے ہی اپنے دستور کے موافق دوستوں کو ایصال اور دعائے مغفرت کی تاکید شروع کردی کہ میرے یہاں اصل یہی تعزیت ہے اور اس کے بہت سے واقعات میری ''آپ بیتی'' میں بھی گزر چکے ہیں، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، اجر جزیل عطاء فرمائے اور پسماندگان کو خصوصاً آپ کو صبرِ جمیل۔

اس وقت رہ رہ کر عزیز مرحوم کی خوبیاں اور باتیں یاد آرہی ہیں اور آپ کا خیال بھی بار بار آرہا ہے کہ آپ پر کیا گزری ہوگی۔

قربان جائیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ ہر حرکت وسکون کے اعمال کو ہمارے لیے بیان فرما گئے اور اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ان صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ومحدثین کو جو ان سب چیزوں کو محفوظ فرما گئے، اس وقت بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک تعزیتی مکتوب جو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کو لکھوایا تھا نقل کرارہا ہوں، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ایک صاحبزادے کا انتقال ہوگیا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مکتوب مبارک لکھوایا۔

''من محمد رسول اللّٰه إلى معاذ بن جبل سلام اللّٰه عليک، فإني أحمد اللّٰه الذي لا إله إلّا هو، أما بعد إفعظم اللّٰه لک الأجر و ألهمک الصبر، ورزقنا وإياک الشكر، ثم أن انفسنا و أموالنا و أهالينا و أولادنا من مواهب اللّٰه

عزوجل الهنئة و عواريه المستودعه متعک اللّٰہ به فی غبطة و سرور، وقبضه بأ جر کبیر، الصلوة و الرحمة والهدی إن احتسبته''۔

''یا معاذ إفا صبر و لا یحبط جزعک أجرک فتندم علی ما فاتک و اعلم الجزع لا یر دمیتا ولا یرفع حزنا، فلیذهب أسفک علی ما هو نازل بک فکان قد''

والسلام

اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام:

ترجمہ: میں پہلے اس اللہ کی تم سے حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، (بعد ازاں دُعاء کرتا ہوں) اللہ تعالیٰ تم کو اس صدمہ کا اجرِ عظیم دے اور تمہارے دل کو صبر عطاء فرمائے اور ہم کو اور تم کو نعمتوں پر شکر کی توفیق دے، حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں اور ہمارے مال اور ہمارے اہل وعیال یہ سب اللہ تعالیٰ کے مبارک عطیے ہیں اور اس کی سونپی ہوئی امانتیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا خوشی اور عیش کے ساتھ تم کو اس سے نفع اُٹھانے اور جی بہلانے کا موقع دیا اور اب اس امانت کو اُٹھالیا، اس کا بڑا اجر دینے والا ہے، اللہ کی خاص نوازش اور اس کی رحمت اور اس کی طرف سے ہدایت کی تم کو بشارت ہے، اگر تم نے ثواب اور رضائے الٰہی کی نیت سے صبر کیا''۔

''پس اے معاذ! ایسا نہ ہو کہ جزع فزع تمہارے اجر کو غارت کر دے اور پھر تمہیں ندامت ہو اور یقین رکھو کہ جزع فزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آتا اور نہ اس سے دل کا رنج وغم دور ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم نازل ہوتا ہے وہ ہو کر رہنے والا ہے، بلکہ یقیناً ہو چکا ہے''۔

اور یہ حدیث مشہور ہی ہے:

''ما یزال البلاء بالمؤمن والمؤمنة فی نفسه وولده وما له حتی یلقی اللّٰه تعالیٰ وما علیه خطیئة''۔

''مرد وعورت برابر جان ومال اور اولاد میں مصیبت سے دوچار ہوتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملتے ہیں کہ ان پر کوئی گناہ نہیں ہوتا''۔

پھر:

''أشد الناس بلاءً الأنبیاء ثم الأمثل، فالأمثل، یبتلی الناس علی قدر دینهم فمن ثخن دینه اشتد بلاؤہ، ومن ضعف دینه، ضعف بلاؤہ۔''

''وان الرجل لیصیبه البلاء حتی یمشی فی الارض ما علیه خطیئة۔''

ترجمہ: ''سب سے زیادہ مصیبتوں سے انبیاء کو دوچار ہونا پڑتا ہے پھر جو ان کے جتنا قریب ہوتا ہے، لوگوں کی آزمائش ان کے دین کی مناسبت سے ہوتی ہے جس کا دین مضبوط ہوگا ہے،

اس کی آزمائش بھی سخت ہتی ہے، جس کا دین کمزور ہوتا ہے، اس کی آزمائش بھی ہلکی ہوتی ہے اور آدمی برابر مصیبت میں مبتلا رہتا ہے حتیٰ کہ زمین پر اس طرح چلتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں رہ جاتا ہے۔"

یہ بھی آپ کے اور آپ کے اہل خاندان کے حسب حال ہے:

اپنی بیماری اور معذوری میں یہ مختصر خط لکھوایا ہے اسی کو عزیز مرحوم کی والدہ، اہلیہ اور بچوں کو بھی پڑھوادیں اور اپنے دیگر اعزہ کو بھی ہر اک کو الگ الگ لکھوانا میرے لیے اس حال میں بہت مشکل ہے، اخیر میں اس بدوی کے دوشعروں پر ختم کرتا ہوں، جو اس نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی وفات پر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بطور تعزیت سنائے تھے۔

"اصبر نکن بک صابرین فانماصبر الرعية بعد صبرا لراس"

"آپ صبر کیجیے تو ہم بھی آپ کی اتباع میں صبر کریں گے، کیونکہ رعایا اسی وقت صبر کرتی ہے جب بادشاہ صبر سے کام لے۔"

خیر من العباس اجرک بعده

واللہ خیر منک للعباس

"حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے انتقال سے آپ کا اجر زیادہ باعث خیر ہے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں آپ کے لیے اللہ زیادہ بہتر ہے"۔

عزیز حمزہ اس کی والدہ، عزیزانم محمد رابع، محمد واضح، مولانا معین اللہ صاحب، مولوی سعید الرحمٰن صاحب اور دیگر اعزہ سے سلام مسنون کے بعد مضمون واحد۔

فقط والسلام حضرت شیخ الحدیث صاحب

بقلم: حبیب اللہ

مدینہ طیبہ ۷ افروری ۱۹۸۲ء

علالت کا اشتداد اور زندگی کے آخر ایام

مارچ، اپریل اور وسط مئی تک حضرت شیخ کی علالت وصحت وضعف قوت کے بارے میں اسی طرح کی مختلف ومتضاد خبریں آتی رہیں، جیسا کہ مہینوں سے معمول تھا، مئی ۸۲ کی ابتدائی تاریخوں میں راقم السطور عزیز سید سلمان ندوی سلمہ کے ساتھ سری لنکا کے سفر پر روانہ ہوا، وہاں غالباً ۱۴ یا ۱۵ مئی کو واپسی سے ایک شب پہلے خواب میں دیکھا کہ حضرت شیخ تشریف رکھتے ہیں، مجھے دیکھ کر

فرمایا کہ علی میاں، تمہیں معلوم نہیں کہ میں اتنا بیمار ہوں، تم دیکھنے نہیں آئے میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے اس کی بالکل خبر نہیں ہوئی، مجھے اس عرصہ میں کوئی خط نہیں ملا۔

میں نے عرض کیا کہ اس حادثہ کا ہمارے پورے خاندان پر بڑا اثر ہے، خاص طور پر محمد ثانی کی والدہ پر اب دیکھا تو حضرت شیخ وہاں پر موجود نہیں تھے، اس پر دہیں ماتھا ٹھنکا اور آنے والے واقعہ کا دھڑکا پیدا ہو گیا، میں نے دہلی آتے ہی پوچھا کہ حضرت شیخ کا مزاج کیسا ہے؟ کوئی تار یا اطلاع ملی؟ ہمارے میزبان حافظ کرامت صاحب نے کہا کہ ابھی کل ہی بھائی سعدی کا ٹیلی فون آیا ہے کہ حالت اطمینان بخش نہیں ہے، غشی بھی کبھی کبھی طاری رہتی ہے اور معالجین صحت کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں پھر میری موجودگی میں مکہ کے ٹیلی فون آئے اور معلوم ہوا کہ تشویش قائم ہے اور صحت میں بہتری پیدا نہیں ہوئی۔

خبر صاعقہ اثر

۱۸ مئی کو ہم لوگ لکھنؤ واپس آ گئے، ۲ شعبان ۱۴۰۲ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۹۸۲ء کو دہلی سے بذریعہ ٹیلی فون اور مدینہ طیبہ سے مولوی سعید الرحمن ندوی کے تار سے جو اس وقت وہاں موجود تھے، حادثہ فاجعہ کی اچانک اطلاع ملی۔

ایتھا النفس اجملی جزعا

ان الذی تحذرین قد وقعا

آخری ایام وساعات

اب اس کے بعد کی تفصیلات محب گرامی ڈاکٹر اسماعیل صاحب کے مکتوب سے اخذ کر کے انہیں کے الفاظ میں درج کی جاتی ہیں وہ حضرت شیخ کے مخلص ومحب خادم اور ہر وقت کے حاضر باش معالج تھے، وہ اپنے اس مکتوب میں جو انہوں نے مخصوص اہل تعلق کو بھیجا ہے، لکھتے ہیں:

حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کی علالت کا سلسلہ تو کئی سال سے چل رہا تھا، ۱۲ مئی کی چہار شنبہ سے قبل صحت نسبتاً اچھی تھی، کھانا بھی تناول فرماتے تھے، گفتگو بھی ٹھیک طرح سے فرماتے تھے پوچھنے پر مشورہ بھی حسب سابق دیتے تھے، مولانا عاقل صاحب مسلم شریف کی تقریر کا جو علمی کام کر رہے ہیں وہ روزانہ کا کام بعد عشاء حضرت کو سناتے حضرت غور سے سنتے اور ضروری مشورہ بھی دیتے تھے، گویا صحت اچھی تھی، البتہ ضعف بہت تھا، جس کی وجہ سے حرم شریف صرف ایک نماز کے لیے تشریف لے جاتے شروع میں ظہر کی نماز میں اور پھر دھوپ میں تیزی ہو جانے کی وجہ سے عشاء کی نماز میں حرم شریف جانے کا معمول تھا۔

چہار شنبہ ۱۲ مئی کو حضرت کو بخار ۱۰۲ ڈگری تک ہو گیا، علاج وغیرہ سے بخار اُتر گیا، لیکن ضعف میں بہت اضافہ ہو گیا اور حرم شریف جانا چھوٹ گیا، استغراق زیادہ رہنے لگا، ۱۴ مئی کو نماز جمعہ حرم شریف کی جماعت کے ساتھ مدرسہ علوم شرعیہ کے صدر دروازہ میں ادا فرمائی، جہاں تک حرم شریف کی صفوں کا اتصال رہتا ہے، بخار کے بعد سے کھانا تقریباً چھوٹ گیا، (مشروبات کا پینا کسی نہ کسی درجہ میں جاری رہا) جمعہ ۱۴ مئی سے روزانہ صبح وشام گلوکوز وغیرہ کی بوتلیں رگ میں دی جاتی رہیں جن کا سلسلہ وصال کے دن تک جاری رہا، دیگر علاج انجکشن وغیرہ بھی دیئے جاتے رہے۔

شنبہ ۱۵ مئی کو آنکھوں میں اور پیشاب میں یرقان محسوس ہوا، خون کا معائنہ کرایا گیا، جس سے جگر اور گردہ میں مرض معلوم ہوا اور دونوں اعضاء کے عمل میں خلل کا بھی پتہ چلا، یکشنبہ ۱۶ مئی کی شب میں نیم بے ہوشی تھی، دوسرے روز فجر سے مکمل بے ہوشی ہو گئی اور اتوار کا سارا دن مکمل بے ہوشی میں گزرا کہ جس کروٹ لٹایا جاتا اسی پر رہتے، نہ آواز دیتے، نہ حرکت نہ کھانسی وغیرہ نبض اور بلڈ پریشر دیکھ کر اطمینان ہوتا کہ فوری خطر نہیں ہے، علاج وغیرہ مختلف تدبیریں ہوتی رہیں، اتوار کی شام بخاری شریف کا ختم کرایا گیا، جو اتوار پیر دو روز میں مکمل ہوا، جس کے بعد صاحبزادہ مولانا طلحہ صاحب نے بہت الحاح کے ساتھ دعاء کرائی مکہ مکرمہ میں شیخ محمد علوی مالکی کے یہاں بھی یٰسین شریف کا ختم ہوا۔

دوشنبہ ۱۷ مئی کو بے ہوشی تو تھی، لیکن کل جیسی نہیں تھی بلکہ ہیجانی کیفیت تھی، صبح تو ''اللہ اللہ'' فرماتے رہے، ظہر کے بعد سے ''یا کریم یا کریم'' یا ''اوکریم اوکریم'' فرماتے رہے، کبھی کبھی ''یا حلیم یا کریم'' بھی فرماتے رہے۔ یا کریم کی یہ آوازیں اخیر وقت تک وقتاً فوقتاً دیتے رہے، علاج کے سلسلہ میں یہ ناکارہ دیگر ڈاکٹروں سے بھی برابر مشورہ کرتا رہا، بالخصوص ڈاکٹر اشرف صاحب، ڈاکٹر ایوب صاحب، ڈاکٹر سلطان صاحب، ڈاکٹر منصور عبدالاحد وغیرہ، خون وغیرہ کے معائنہ کے لیے ڈاکٹر انصرام صاحب بہت تعاون فرماتے رہے، البتہ جگر اور گردہ کا عمل برابر کمزور ہوتا گیا، خون، پیشاب کا معائنہ اور علاج و دیگر تدابیر ہوتی رہیں، غذا تقریباً بند تھی، رگ میں بوتلوں کے ذریعہ ہی غذا پانی اور گلوکوز وغیرہ دیا جاتا رہا، ۲۱ مئی کو نماز جمعہ حرم شریف کی جماعت کے ساتھ مدرسہ شرعیہ کے صدر دروازہ میں ادا فرمائی۔

اتوار ۲۳ مئی کی صبح تک بظاہر طبیعت کچھ ٹھیک رہی، ۲۳ مئی کو بعد ظہر سوء تنفس کی تکلیف ہوئی جس کی فوری تدبیر کر لی گئی، مغرب آدھ گھنٹہ قبل جب یہ ناکارہ مطب میں تھا حضرت کے خادم مولوی نجیب اللہ نے ٹیلی فون پر بتلایا کہ حضرت کی طبیعت خراب ہے، چنانچہ میں فوراً حاضر ہوا

تو دیکھا کہ سوءِ تنفس کی تکلیف بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے حضرت کو بے چینی ہے، سانس لینے میں بہت دقت محسوس ہو رہی ہے، بندہ نے معائنہ کر کے ضروری انجکشن لگائے جس کے بعد چند منٹ کے بعد سکون مل گیا اور سانس طبعی حالت پر آ گیا، عشاء کے بعد بندہ کے گھر جانے تک طبیعت نسبتاً ٹھیک تھی۔

۲۴ مئی فجر کے وقت بھی طبیعت ٹھیک تھی اور حضرت گفتگو بھی تھوڑی تھوڑی فرماتے رہے، البتہ تشویش کی بات یہ پیش آئی کہ کل ظہر کے بعد سے پیشاب بالکل نہیں آیا، صبح ۸ بجے دوبارہ سوءِ تنفس کی تکلیف شروع ہوئی، اس کے لیے اور پیشاب کے لیے تدبیر کی جانے لگیں، جس سے ظہر عصر کے درمیان پیشاب تو آ گیا تنفس کے لیے انجکشن آکسیجن وغیرہ لگائے گئے، بارہ بجے دوپہر تک بے چینی رہی، کبھی فرماتے بٹھاؤ، کبھی فرماتے لٹاؤ، کبھی فرماتے دوا لاؤ، وقتاً فوقتاً ''یا کریم'' اور ''او کریم'' بھی بلند آواز فرماتے رہے، یہ ناکارہ چونکہ مسلسل پاس ہی بیٹھا رہا تو کبھی کبھی اس ناکارہ کا ہاتھ پکڑ کر زور سے دباتے، تقریباً گیارہ بجے جب کہ الحاج ابوالحسن نے تکیہ اُونچا کیا تو بندہ کی طرف دیکھ کر فرمایا ڈاکٹر صاحب ہیں؟

ابوالحسن نے کہا، ہاں یہ ڈاکٹر اسماعیل ہیں یہ سن کر بندہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے یہ آخری گفتگو تھی، جو حضرت نے فرمائی اس کے بعد ''یا کریم''، ''او کریم'' فرماتے رہے، ظہر تک یہ کیفیت رہی، ظہر کے بعد سے مکمل سکون ہو گیا، جو آخری وقت تک رہا، یہ ناکارہ بار بار نبض و بلڈ پریشر وغیرہ دیکھتا رہا، رُوح پرواز کرنے سے کچھ قبل صاحبزادہ مولانا طلحہ صاحب نے بندہ سے پوچھا کہ کیا یہ آخری وقت ہے؟ بندہ نے اثبات میں سر ہلایا تو انہوں نے بلند آواز سے اللہ اللہ کہنا شروع کر دیا، اسی حال میں حضرت نے دو مرتبہ آخری ہچکیاں لیں، جس سے آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور روح پرواز کر گئی، اس وقت ٹھیک ۵ بج کر ۴۰ منٹ ہوئے تھے، یعنی مغرب سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل۔

''اِنا للّٰہ و انا الیہ راجعون''

اللّٰھم اجرنا فی مصیبتنا و عوضنا خیرا منھا و انا بفراقک یا شیخ لمحزونون

جس کی ساری عمر، اتباعِ سنت میں گزری، اس کو تکوینی طور پر یہ اتباع بھی نصیب ہو گیا کہ دو شنبہ کی عصر مغرب کے درمیان وصال ہوا۔

اس وقت حاضرین کا جو حال تھا، وہ بیان نہیں کیا جا سکتا، وصال کے وقت پاس موجود ہونے والوں میں صاحبزادہ مولانا محمد طلحہ صاحب، مولانا عاقل صاحب، ان کے صاحبزادہ جعفر، الحاج ابو الحسن، مولوی نجیب اللہ، صوفی اقبال، مولانا یوسف متالا، حکیم عبدالقدوس، مولوی اسماعیل، مولوی نذیر، ڈاکٹر ایوب، حاجی دلدار اسعد، عبدالقدیر اور یہ ناکارہ تھے۔

فوراً ہی تجہیز و تکفین کے انتظامات شروع ہو گئے، ڈاکٹر ایوب کو ہسپتال کا ورقہ لینے کے لیے اسی وقت بھیج دیا گیا، صاحبزادہ محمد طلحہ صاحب، مولانا عاقل صاحب و دیگر متعلقین و خدام کا مشورہ ہوا کہ تدفین عشاء کے بعد ہو یا فجر کے بعد؟ کیونکہ بعض مخصوص احباب و اعزہ کے مکہ مکرمہ سے پہنچنے کی اطلاع تھی، چونکہ ان کی وہاں کی روانگی کا وقت معلوم تھا، جس کے پیش نظر ان کا عشاء تک پہنچ جانا گویا یقینی تھا، اس پر یہ طے ہوا کہ عشاء میں ہی نماز جنازہ ہو جانی چاہیے اور فجر تک مؤخر نہ کیا جائے، اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔

لیکن اس کا بھی برابر افسوس رہے گا کہ وہ اعزہ جن کی آمد کا ہمیں شدت سے انتظار تھا، راستہ میں گاڑی خراب ہو جانے کی وجہ سے بروقت نہ پہنچ سکے اور چونکہ عشاء کا اعلان ہو چکا تھا، اس لیے عین وقت پر تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی، ہر جگہ ٹیلیفون سے اطلاع کر دی گئی، مغرب کے بعد غسل دیا گیا جو مولانا عاقل اور مولانا یوسف متالا صاحب کی ہدایات اور مشوروں سے دیا گیا، غسل کے وقت خدام کا بڑا مجمع موجود تھا، ہر شخص کی خواہش تھی کہ اس مبارک عمل میں شریک ہو، غسل میں شرکت کرنے والوں میں یہ حضرات قابل ذکر ہیں

مولانا یوسف متالا، الحاج ابوالحسن، مولوی نجیب اللہ، حکیم عبد القدوس، عزیز جعفر، شاہ عطاء المہیمن ابن مولانا شاہ عطاء اللہ بخاری، صوفی اسلم، مولوی صدیق، مولوی احسان، قاضی ابرار اور عبد المجید وغیرہ۔

ڈاکٹر محمد ایوب جو ورقہ لینے گئے تھے پورے دو گھنٹے کے بعد آئے اور بتایا کہ ورقہ حاصل کرنے میں کچھ قانونی رکاوٹ ہو رہی ہے اور صاحبزادہ محمد طلحہ کا جانا ضروری ہے، چنانچہ مولانا طلحہ صاحب کو بھی ان کے ہمراہ بھیجا گیا، قبرستان والوں سے قبر کھودنے کو کہا گیا تو انہوں نے کہا کہ جب تک ہسپتال کا ورقہ نہ آ جائے، ہم قبر نہیں کھود سکتے، اس وقت عشاء میں صرف پون گھنٹہ باقی تھا۔

دوبارہ مندرجہ بالا حضرات نے مشورہ کیا کہ اب بظاہر عشاء تک قبر تیار ہونا دشوار ہے، لہٰذا فجر میں جنازہ ہو، اس کے فوراً بعد سید حبیب صاحب تشریف لائے، انہوں نے فرمایا کہ میں خود جا کر قبر کی جگہ تیار کرا آیا ہوں اور قبر کھودنا شروع ہو گئی ہے، تقریباً بیس (۲۰) منٹ بعد ہسپتال کا ورقہ بھی آ گیا اور قبر تیار ہو جانے کی اطلاع مل گئی، نیز قبرستان والے مخصوص چارپائی بھی لے آئے۔

گویا عشاء کی اذان سے پندرہ منٹ قبل جنازہ بالکل تیار تھا، لہٰذا پہلے مشورہ کے مطابق جنازہ باب السلام سے حرم شریف لے جایا گیا، عشاء کے فرضوں کے متصل بعد یہاں کی عام روایت کے مطابق حرم شریف کے امام شیخ عبد اللہ زاحم نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع کی طرف باب جبرائیل سے نکل کر چلے، ہجوم بے پناہ تھا، ایسا ہجوم کسی اور کے جنازہ میں شاید ہی دیکھا ہو، قبر

شریف حضرت کی منشاء کے مطابق اہلِ بیت کے احاطہ اور حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی قبر شریف کے قریب کھودی گئی تھی، صاحبزادہ مولانا طلحہ اور الحاج ابوالحسن قبر شریف کے اندر اُترے اور اس کو بند کیا، اس طرح حضرت اقدس کی دیرینہ تمنا بھی پوری ہوئی۔

ایک خاص بات یہ دیکھی کہ وصال سے ایک روز قبل حضرت والا ہر ایک سے فرداً فرداً دریافت فرماتے رہے کہ کیا تم کیا کام کرتے ہو؟ صوفی اقبال صاحب سے، الحاج ابوالحسن صاحب سے، اس ناکارہ سے براہ راست دریافت فرمایا، صاحبزادہ مولانا طلحہ دوسرے کمرے میں تھے تو خادم کو بھیجا کہ طلحہ سے پوچھ کر آ کہ تو کیا کام کر رہا ہے؟ ہر ایک نے کچھ نہ کچھ پڑھنے، ذکر، تلاوت وغیرہ کا جواب دیا تو سکوت فرمایا، بندہ سے دریافت فرمایا بندہ سے قبل ابوالحسن نے جواب دیا کہ یہ تو ابھی مطب جا کر مریضوں کا علاج کریں گے، تو فرمایا یہ بھی کوئی کام ہے؟ گویا آخری وقت تک بھی اپنے لوگوں کے متعلق فکر تھی کہ کیا کرتے ہیں۔

تدفین کے بعد حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے ایک مجاز نے دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے:

''فتح له أبواب الجنة الثمانية''

یعنی ان کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے گئے۔

ایک اور صاحب نے دوسرے دن صبح روضۂ اقدس پر صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہوئے محسوس کیا، گویا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ تمہارے شیخ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دی گئی ہے، ایسا انسان لاکھوں کروڑوں میں کوئی کوئی ہوتا ہے۔

ایک مرثیہ کے چند اشعار

اس موقع پر کاندھلہ کے قادرالکلام وخوش گوشاعر شبیر صاحب جذبی کاندھلوی کے مرثیہ کے چند منتخب اشعار لکھے جاتے ہیں، جو صورت واقعہ کی صحیح تصویر اور زخمی دلوں کی صحیح ترجمانی اور تعبیر ہیں:

ایک جنازہ جا رہا ہے دوشِ عظمت پر سوار — پھول برساتی ہے اس پر رحمت پروردگار
غیرتِ خورشید عالم ہے کفن کا تار تار — ابر گوہر بار کے اندر ہیں دُرِّ شاہ وار
نوحہ خواں ہیں مدرسے اور خانقاہیں سوگوار — آفتابِ علم و تقویٰ چھپ گیا زیرِ مزار
اللہ اللہ ذوق و شوقِ آمدِ ماہِ صیام — مصحفِ حق کی تلاوت روز وشب اور صبح وشام
صحنِ مسجد میں ہزاروں ذاکروں کا اژدہام — وقت افطار و سحر ہر تشنہ لب بادہ بجام
شمعِ محفل بجھ گئی باقی ہے پروانوں کی خاک — اب نہ تڑپے گی کبھی محفل میں دیوانوں کی خاک
عمر بھر کرتا رہا وہ خدمتِ دینِ رسول — جان ودل میں بھر رہی تھی الفتِ دینِ رسول

عشق نے ہوکر فنا پائے مقامات بلند
عشق ہے دونوں جہاں میں کامیاب وارجمند

اے خوشا قسمت کہ ہجرت ہوگئی اس کی قبول
تا ابد سوئے گا عاشق زیرِ دامانِ رسول

خوابِ گاہ عشق ہوگی سبز گنبد کے قریب
میٹھی نیند آئے گی اصحابِ محمد کے قریب

حشر تک جب بھی مدینے میں ہوا لہرائے گی
بوئے زُلف مصطفےٰ اس کی لحد میں آئے گی

درد مندوں کی دوا ہے عشقِ محبوبِ خدا
کاش مل جائے مجھے بھی عشقِ نورِ مصطفےٰ

جان و دل کا نور ہو شمع شبستان رسول
رات دن چبھتے رہیں سینہ میں یثرب کے ببول

جدہ شاہ کر بلا کی یاد میں روتا رہوں
خونِ دل کا سیل ہو اور غرق میں ہوتا رہوں

اے خدائے دو جہاں اے مالکِ عرشِ عظیم
اے کریم کارساز اے رب رحمٰن و رحیم

رحم تیرا بے کراں ہے فضل تیرا بے حساب
بخش دے جذبی کو بھی کچھ دردسوز واضطراب

حلیہ اور پسماندگان

شیخ بڑے حسین وجمیل تھے، حسن وجمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے خصوصی وجاہت بھی عطاء فرمائی تھی، رنگ سُرخ وسپید، چہرہ گلاب کی طرح کھلتا ہوا، جسم گداز فربہی مائل، قد میانہ، عربی مشلح پہن لیتے اور عمامہ باندھ لیتے تو ہزاروں میں ممتاز نظر آتے، مجھے یاد ہے کہ میوات کے ایک جلسہ (غالبًا مالب کے جلسہ میں) ڈاکٹر ذاکر حسین خان مرحوم (سابق صدر جمہوریہ ہند) نے ان کو پہلی مرتبہ دیکھا تو مجھ سے فرمایا کہ 'شیخ بڑے شاندار آدمی ہیں'، آخر میں بیماریوں نے نحافت پیدا کردی تھی، پھر بھی چہرا ویسا ہی دمکتا ہوا نظر آتا تھا اور قلب ودماغ دونوں بیدار۔

حضرت شیخ نے اپنے پسماندگان میں اہلیہ محترمہ، ایک صاحبزادہ، مولوی محمد طلحہ اور پانچ صاحبزادیاں چھوڑی جن کی ضروری تفصیل یہ ہے:

اہلیہ محترمہ حضرت مولانا الحاج انعام الحسن صاحب زادمجدہ، ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ مطابق ستمبر ۱۹۲۰ء میں ان کی پیدائش ہوئی، حضرت نور اللہ مرقدہٗ اس وقت حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ اپنے پہلے سفرِ حجاز پر تشریف لے جاچکے تھے، ۳ محرم ۱۳۵۴ھ مطابق ۷ اپریل ۱۹۳۵ء میں آپ کا نکاح ہوا، مولوی محمد زبیر سلمہ آپ ہی کے صاحبزادہ ہیں۔

اہلیہ محترمہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، ۱۳۴۷ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۵ھ مطابق ۲۲ اپریل ۴۶ء میں موصوفہ کی شادی مولوی سعید الرحمٰن ابن مولانا لطیف الرحمٰن صاحب کاندھلوی سے ہوئی۔ ۱۹ اپریل ۶۶ھ میں مولوی سعید الرحمٰن کا انتقال ہوا۔ بعد ازاں موصوفہ کا دوسرا نکاح ۱۹ ربیع الثانی ۶۹ھ مطابق ۸ فروری ۵۰ھ چہار شنبہ میں حضرت

مولانا محمد یوسف صاحب سے ہوا۔ کوئی اولاد آپ کے نہیں ہے۔

اہلیہ محترمہ مولانا الحاج حکیم محمد الیاس صاحب (فرزند مولانا حکیم محمد ایوب صاحب) ۹ ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹ مارچ ۱۹۳۴ء میں آپ کی ولادت ہوئی۔ ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ چہارشنبہ میں آپ کا نکاح بعبارۃ حضرت مدنی مہر فاطمی پر ہوا۔ یہ مولوی محمد شاہد، حافظ محمد راشد، حافظ محمد سہیل اور محمد ساجد سلمہم کی والدہ ہیں۔

مولوی محمد طلحہ صاحب سلمہ آپ زوجہ محترمہ ثانیہ سے دوسرے صاحبزادے ہیں۔ ۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ مطابق ۲۸ مئی ۱۹۴۱ء شنبہ کے روز پیدا ہوئے، اولاً قرآن پاک حفظ کیا، جس کا اختتام ۱۶ رجب ۱۳۷۵ھ میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری کی مجلس مبارک میں ہوا۔ ۲ جمادی الاولی ۱۳۷۶ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۶۵ء میں سہارنپور میں فارسی تعلیم کا آغاز ہوا۔ یکم شعبان ۱۳۷۶ھ میں فارسی کی تکمیل کے بعد عربی کی ابتدائی تعلیم کے لیے نظام الدین گئے۔ وہاں مختلف اساتذہ سے تعلیم حاصل کر کے ۱۳۸۱ھ میں واپس سہارنپور آئے اور جامعہ مظاہر العلوم میں داخلہ لے کر شرح جامی، ہدایہ اولین، مقامات حریری وغیرہ پڑھیں۔ دورۂ حدیث آپ نے ۱۳۸۳ھ میں مدرسہ کاشف العلوم میں پڑھا۔ بخاری شریف آپ نے حضرت مولانا انعام الحسن صاحب سے اور طحاوی حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سے ترمذی و مسلم مولانا عبید اللہ صاحب سے ابوداؤد شریف مولانا اظہار الحسن صاحب سے پڑھی ہے۔

دینی تعلیم سے فراغت پا کر حضرت رائے پوری سے بیعت ہوئے اور پھر اپنے والد ماجد مخدوم الکل کی سرپرستی میں رہ کر ذکر و شغل میں مستعدی کے ساتھ مصروف ہوئے ماہ ربیع الاول ۱۳۹۳ھ میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے اجازت بیعت مرحمت فرمائی۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی وفات کے بعد شوال ۱۴۰۲ھ میں ان کی جگہ مظاہر علوم کے سرپرست بنائے گئے۔

اہلیہ محترمہ مولانا محمد عاقل (ابن مولانا حکیم محمد ایوب صاحب) یہ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی دوسری اہلیہ محترمہ کے بطن سے پہلی صاحبزادی ہیں۔ ۶ رمضان ۱۳۶۶ھ مطابق ۲۵ جولائی ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئیں۔ ۸ ربیع الثانی ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹ ستمبر ۱۹۶۱ء میں آپ کا نکاح ہوا۔ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی شرکت کے خیال سے اس نکاح کی مجلس رائے پور میں ہوئی۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے مہر فاطمی پر نکاح پڑھایا۔ حافظ محمد جعفر سلمہٗ حافظ محمد عمیر، محمد عادل، محمد عاصم سلمہم کی آپ والدہ ہیں۔

اہلیہ محترمہ مولانا سلمان صاحب (ابن مولانا مفتی محمد یحییٰ صاحب) ۲۹ صفر ۱۳۸۰ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ ۲ ذیقعدہ ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۹۶۷ء میں بعبارۃ حضرت مولانا انعام الحسن

صاحب مہر فاطمی پر آپ کا نکاح ہوا۔ حافظ محمد عثمان حافظ محمد نعمان سلہما آپ کی اولاد ہیں۔

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے سب داماد حضرت مولانا محمد یوسف صاحب، حضرت مولانا انعام الحسن صاحب، مولانا حکیم محمد الیاس صاحب، مولانا محمد عاقل صاحب، مولانا محمد سلمان صاحب، جید عالم، صاحب درس وافادہ اور صاحب تصنیف ہیں۔

مولانا محمد یوسف صاحب اور مولانا انعام الحسن صاحب کے متعلق تو کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ اول الذکر کی مساعی جمیلہ اور کمالات وہبیہ عالم آشکارا ہیں اور آپ کے تذکرہ میں ایک پوری ضخیم کتاب ''سوانح حضرت مولانا یوسف کاندھلوی'' (تالیف مولوی سید محمد ثانی حسنی مرحوم) موجود ہیں اور ثانی الذکر (بارک اللہ فی حیاتہ ومساعیہ) کی ذات جماعت تبلیغ کی امیر اور اس کی عالمی تحریک وجدوجہد کی سرپرست ونگراں ہیں۔

مولانا محمد الیاس مظاہر العلوم کے ممتاز فضلاء میں ہیں۔ شعبان ۱۳۷۱ھ میں فراغت پائی۔ بخاری شریف آپ نے حضرت شیخ سے پڑھی اور ایک علمی ودینی ادارہ کتب خانہ اشاعت العلوم کے نام سے قائم کیا، جس کے ذریعے بہت سی دینی کتابیں اور حضرت شیخ کی متعدد نادر تصفیفات منظر عام پر آئیں، شیخ کی مشہور ومعروف تصنیفات ''لامع الدراری'' اور ''الکوکب الدری'' وغیرہ کے اولین ایڈیشن آپ کی ہی توسط سے دہلی میں شائع ہوئے۔

آپ کے دوسرے خویش مولانا محمد عاقل صاحب نے ۱۳۸۰ھ میں مظاہر العلوم سے فراغت حاصل کی۔ بخاری شریف حضرت شیخ سے پڑھی۔ ذہانت وفطانت اور بلند پایہ علمی استعداد کے مالک ہیں۔ ۱۳۸۱ھ میں مظاہر العلوم کے استاد منتخب ہوئے۔ ۱۳۸۷ھ میں دورۂ حدیث کے استاد بن کر پہلی مرتبہ ابوداؤد شریف پڑھائی۔ اس وقت سے ابوداؤد کا درس آپ ہی سے متعلق ہے۔ شیخ کی جانب سے آپ کو اجازت بیعت بھی ہے۔ آپ شیخ کے تصنیفی وتالیفی سلسلہ میں معاون رہے ہیں، ''الکوکب الدری علی جامع الترمذی'' پر آپ کا ایک طویل مقدمہ ہے، جو ۱۳۹۴ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

مولانا محمد سلمان صاحب نے ۱۳۸۶ھ میں دورہ حدیث پڑھا۔ درس بخاری میں شیخ کے یہاں اکثر وبیشتر آپ ہی قراءت کرتے تھے۔ شوال ۱۳۸۷ھ میں تدریس کا آغاز کیا۔ ۱۳۹۶ھ میں اساتذہ حدیث کے سلک میں منسلک ہوئے۔ مشکوۃ شریف کا درس آپ ہی سے متعلق ہے شیخ کی عربی تصنیفات وتالیفات کی تکمیل وترتیب میں مولانا محمد عاقل صاحب اور مولانا محمد سلمان صاحب رفیق وشریک رہے۔ رمضان میں شیخ کی مجلس اعتکاف میں قرآن مجید سنانے کی ذمہ داری آپ نے بڑی مستعدی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دی۔

حضرت شیخ کے سب نواسے بھی جو سن بلوغ کو پہنچ چکے ہیں اور تکمیل علوم کر چکے ہیں، ماشاء اللہ عالم وفاضل اور علمی و دینی خدمت میں مشغول ومنہمک ہیں۔ ان میں آپ کے نواسے اور مولانا محمد الیاس صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد شاہد صاحب مظاہری ممتاز ہیں۔ وہ جید عالم، رواں قلم مصنف اور علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والے نوجوان فاضل ہیں۔ ''مکتوب علمیہ'' اور علمائے مظاہر علوم اور ان کی علمی و تصنیفی خدمات اور ''تاریخ مظاہر العلوم'' (جلد دوم) وغیرہ ان کی تصنیفی ذوق اور قلم کی روانی کے شاہد ہیں۔ حضرت شیخ کی ان پر خاص شفقت تھی اور نہیں کی توجہ اور محنت سے شیخ کے کئی قلمی مسودات اور خطوط کے مجموعے منظر عام پر آئے۔

آپ کے دوسرے نواسے مولوی محمد زبیر صاحب ابن مولانا انعام الحسن صاحب بھی مظاہر العلوم کے فاضل ہیں۔ تکمیل کے بعد حضرت شیخ کے زیر ہدایت وتربیت ذکر وشغل میں مصروف ہوئے اور شیخ نے ان کو مدینہ منورہ میں اجازت بھی مرحمت فرمائی، وہ اپنے والد ماجد کے زیر سایہ مرکز تبلیغ نظام الدین میں دعوت وتبلیغ اور وہاں کے مدرسہ کاشف العلوم میں درس وتدریس میں مصروف ہیں۔ ''بارک اللّٰہ فی حیاتہ''

دوسرے خورد سال نواسے حفظ قرآن کی سعادت سے بہرہ ور اور تحصیل وتکمیل علم میں مشغول ہیں، جن میں حافظ محمد جعفر سلمہٗ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو حضرت شیخ کے آخری سفر حجاز میں ہمرکاب اور مدینہ کے آخری قیام میں حاضر باش رہے۔ ''بارک اللّٰہ فی حیاتہم''

حضرت کی حیات میں آپ کی جو اولاد ذخیرہ آخرت بنی وہ یہ ہے۔

صاحبزادی زکیہ مرحوم: یہ ۴ شعبان ۱۳۳۷ھ مطابق ۵ مئی ۱۹۱۹ء شب دوشنبہ میں تولد ہوئیں۔ یہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی سب سے پہلی صاحبزادی تھیں۔ ۳ محرم الحرام ۱۳۵۴ مطابق ۱۷ اپریل میں مظاہر علوم کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ان کا نکاح حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کے ساتھ ہوا۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ مطابق ۳ جون ۱۹۳۹ء کو بعد عصر رخصتی ہوئی۔ طویل عرصہ تک تپ دق میں مبتلاء رہ کر ۲۹ شوال ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۵ ستمبر ۱۹۴۷ء بروز شنبہ مغرب کی نماز پڑھتے ہوئے سجدہ کی حالت میں انتقال ہوا۔ مولانا محمد ہارون صاحب مرحوم آپ ہی کے بطن سے تھے۔

محمد موسیٰ: رمضان المبارک ۱۳۴۳ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ تقریباً سات، آٹھ ماہ حیات رہ کر ۹ ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ میں انتقال ہوا۔

صاحبزادی شاکرہ مرحومہ: یہ حضرت کی تیسری صاحبزادی تھیں۔ ماہ صفر ۱۳۴۵ھ میں پیدا ہوئیں۔ اپنے ایک خاندانی عزیز مولوی احمد حسن کاندھلوی سے ۱۹ جمادی الاول ۱۳۶۵ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۹۴۶ء یوم دوشنبہ میں نکاح ہوا، حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے مہر فاطمی پر نکاح پڑھایا۔

۱۴ رجب ۱۳۶۹ھ مطابق یکم مئی ۱۹۵۰ء دوشنبہ میں وفات ہوئی۔ حادثہ انتقال کی کیفیت حضرت شیخ اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

''اتفاق سے مولانا یوسف صاحب سہارنپور آئے ہوئے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ گھر میں گیا، تو مرحومہ نے یٰسین شریف پڑھنے کی فرمائش کی۔ مولانا یوسف نے پڑھی اور جب ''سَلَامٌ قَوْلاً مِنْ رَبٍّ رَحِيمٍ'' پر پہنچے تو نہ معلوم مولانا یوسف صاحب مرحوم پر ایک جذبہ اور جوش آیا اور اس آیت شریفہ کو تین دفعہ پڑھا۔ تیسری کے درمیان میں میری مرحومہ کی روح پرواز کرگئی''۔

محمد ہارون: رجب ۱۳۴۹ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ مختصر سی عمر میں انتقال ہوگیا تھا۔

خالدہ مرحومہ: ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ میں تولد ہوئیں۔ بچپن میں ہی انتقال ہوگیا۔

محمد یحییٰ: ۶ جمادی الثانی ۱۳۵۶ھ میں پیدا ہوئے اور کچھ عرصے بعد وفات پائی۔

صفیہ: یہ پہلی زوجہ مرحومہ سے آخری اولاد ہے۔ ان کی ولادت ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ میں ہوئی۔ ایک سال بعد ۱۲ محرم ۱۳۵۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

عبدالحیٔ: یہ دوسری اہلیہ محترمہ سے پہلے صاحبزادہ ہیں۔ ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ تقریباً ایک ماہ حیات رہ کر ۲۱ جمادی الاولیٰ میں وفات ہوئی۔ حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ اپنے مشاغل عالیہ کے وجہ سے نہ خبر ولادت پر دہلی پہنچ سکے اور نہ خبر وفات پر۔

حضرت کی ایک ہی ہمشیرہ تھیں۔ جن کا نام عائشہ خاتون تھا۔ ان کی شادی ۹ صفر ۱۳۳۲ھ میں مطابق ۱۹۱۴ء میں جناب ماموں شعیب صاحب سے ہوئی تھی۔ ۱۶ ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ مطابق ۲۵ دسمبر ۱۹۴۴ء میں کاندھلہ میں ان کا انتقال ہوا۔ عمر تقریباً چالیس سال ہوئی۔ ان کی ایک لڑکی یادگار ہیں۔ جو مولانا مفتی محمد یحییٰ صاحب کی اہلیہ محترمہ (یعنی والدہ مولوی محمد سلمان والدہ مولوی محمد خالد سلمہما ہیں۔

مولوی محمد طلحہ صاحب: صاحبزادہ عزیز گرامی قدر مولوی محمد طلحہ شیخ کی زندگی ہی میں حافظ و عالم، ذاکر شاغل اور صاحبِ اجازت ہوگئے اور ان پر شروع سے حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی خاص نگاہ شفقت تھی اور بعض اوقات حضرت نے ان کی خاطر اپنے سفر کا پروگرام ملتوی فرمادیا اور فرمایا ''طلحہ نے مجھے روک دیا'' ویسے بھی تمام معاصر بزرگوں اور شیخ کے یہاں آنے جانے والے صلحاء علماء کی ان پر نظر خاص رہی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو انتظامی صلاحیت، توازن واعتدال تواضع اور خدمت کا جذبہ اور اصابت رائے کا جوہر عطاء فرمایا، جو ان کی پدری میراث بھی ہے۔ حضرت شیخ کے سہارنپور میں رمضان گزارنے کے آخر میں وہی بڑے محرک تھے۔ شیخ سے تعلق رکھنے والوں اور جن سے شیخ کو تعلق تھا، کے مراتب کو وہ دوسروں سے زیادہ

پہچانتے ہیں اور اسی کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں، شیخ نے ان کی خصوصی تربیت فرمائی اور امکانی حد تک ان کی اندر صاحبزادگی اور مخدومیت کی بُو نہیں پیدا ہونے دی۔ اسی لیے ان کے دوروں اور شیخ کے اہلِ تعلق میں جانے کو ہمیشہ ناپسند کرتے رہے اور خود بھی اس سے محترز رہے۔

شیخ کے آخری زمانہ قیام مدینہ میں اللہ تعالیٰ نے مع والدہ صاحبہ کے ان کو حضرت شیخ کے پاس پہنچا دیا اور ان کو خدمت کا پورا موقع دیا۔ شیخ کی وفات پر انہوں نے اسی صبر وتحمل اور وقار وسکینت کا مظاہرہ کیا اور دوسرے کے لیے باعث تقویت وتسلی بنے۔ جیسے خود شیخ اپنی زندگی میں تعزیت کرنے والوں کے لیے بن جاتے تھے۔

"اطال اللہ حیاتہ ونفع بہ المسلمین"

اللہ

"نور السموات والارض"

......☆☆☆☆☆☆☆......